شوکت صدیقی

جانگلوس

یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ جاگیروں اور نجی جائیدادوں کے موجودہ حقوق کس بنیاد پر جائز ہیں۔ سب سے پہلی دستاویز تو تلوار کی نوک سے تحریر کی گئی جسے جرنیلوں اور سپاہیوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا اور قیمت کے عوض تلوار، خنجر اور نیزے کی ضربیں لگا کے انسانی خون کی مہریں ثبت کی گئیں۔ وہ حضرات جو یہ فرماتے ہیں کہ وقت ہی ناجائز کو جائز بنا دیتا ہے ازراہ کرم اس سوال کا تسلی بخش جواب دیں کہ کسی گناہ کو نیکی بننے کے لئے کتنا وقت درکار ہوتا ہے اور کس سالانہ شرح سے ایک غیر قانونی اور ناجائز سودا قانونی اور جائز بن جاتا ہے؟

کارل مارکس

۱

ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ خزاں رسیدہ پتے درختوں سے ٹوٹ کر گرے اور دور دور تک بکھر گئے۔ یہ ۱۹۵۴ء کے موسم خزاں کی ایک ویران رات تھی۔ لاری اسٹینڈ سنسان تھا۔ دکانیں بند تھیں۔ روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ دونوں اندھیرے میں دم بخود کھڑے تھے۔ ڈرائیور ہوٹل کے سامنے لکڑی کی بنچ پر کوئی چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ قریب ہی ایک آوارہ کتا ہڈی چبا رہا تھا۔ ہڈی اس کے دانتوں تلے رک رک کر ایک ہی انداز سے بجتی اور اس کی آواز سناٹے میں تحلیل ہو جاتی۔

دونوں سایوں کی مانند تاریکی میں دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ ایک کا قد کسی قدر نکلتا ہوا تھا۔ چھریرا بدن تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور اندر دبی ہوئی تھیں۔ رنگ گندمی تھا۔ یہ رحیم داد تھا۔ دوسرا لال دین تھا۔ مگر سب اسے لالی کہتے تھے۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کا مضبوط جوان تھا۔ دونوں کی حجامت بڑھی ہوئی تھی۔ سروں کے بال خشک اور بے ترتیب تھے۔ لالی بنچ پر لیٹے ہوئے آدمی کی چادر اتار لینا چاہتا تھا۔ اس نے چادر کا کونا پکڑ کر آہستہ سے کھینچا۔ وہ چونک پڑا۔ کروٹ بدلی اور نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں بڑبڑایا۔

"اوئے تنگ نہ کر۔"

اب وہ خاموش لیٹا تھا۔ رحیم داد اور لالی کو مطلق اندازہ نہ تھا کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے دنوں سراسیمگی کے عالم میں کچھ دیر دم سادھے کھڑے رہے۔ جب نہ کوئی آہٹ ہوئی نہ آواز تو وہ بے دبے قدموں چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

رحیم داد نے چلتے چلتے لالی سے پوچھا۔ "رات کتنی رہتی ہے؟" اس کے لہجے سے تھکن اور بے

زاری جھلک رہی تھی۔

"ابھی بہت رہتی ہے۔" لالی نے گردن اٹھا کر آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھا۔ چند لمحے خاموش رہا، پھر قدموں کی رفتار تیز کرتے ہوئے اس نے رحیم داد کی جانب تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "اڑیل کھوتی نہ بن۔ مرداں والی چال چل۔"

"تونے فیر تھانیداری شروع کر دی۔" رحیم داد نے احتجاج کیا۔

"ایسا کر یہیں لیٹ جا۔" لالی نے ایک بار پھر مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ "میں بیٹھ کر تیرے پاؤں دباتا ہوں۔ یہی چاہتا ہے نا۔"

رحیم داد نے زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر جھنجلا کر لالی کو دیکھا اور چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

آدھی رات تک دونوں منٹگمری جیل میں قیدی تھے۔ رحیم داد کو بلوے اور اقدام قتل کے جرم میں تین سال قید بامشقت ہوئی تھی۔ جیل ہی میں اس کی ملاقات لالی سے ہوئی۔ وہ پہلے سے وہاں موجود تھا اور ڈیڑھ سال کی سزا بھگت رہا تھا۔ ایک روز لالی نے رحیم داد کو اعتماد میں لیا اور جیل سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا۔ رحیم داد کچا تھا۔ پہلے ذرا جھجکا اور انکار میں گردن ہلانے لگا۔ مگر جب لالی نے حوصلہ بڑھایا اور قید کی گھٹن سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لینے کی تمنا خوف و ہراس پر غالب آ گئی تو وہ لالی کے ساتھ فرار ہونے پر آمادہ ہو گیا۔ جیل کے گھڑیال نے رات کے بارہ بجائے۔ پہرہ بدلا۔ نئے پہرے دار بیرکوں اور چکیوں کے تالے بجا، بجا کر "کانٹا، تالا سب ٹھیک ہے۔" کی صدائیں بلند کر چکے تو لالی نے اپنا کام دکھایا۔ وہ رحیم داد کے ہم راہ نہایت صفائی سے جیل کی اونچی اونچی فصیلوں سے باہر نکلا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

جیل سے بھاگے ہوئے دو گھنٹے سے اوپر ہو چکے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ صبح گنتی ہونے سے پہلے کسی کو ان کے فرار کی خبر نہ ہو گی۔ ان کے پاس چند گھنٹے اور تھے۔ اس عرصے میں وہ جلد سے جلد بہت دور نکل جانا چاہتے تھے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد وہ کچھ دیر ایک ویرانے میں بھٹکتے رہے، پھر عارف والا روڈ پر آ گئے اور چلتے چلتے لاری اسٹینڈ پر پہنچ گئے۔

لاری اسٹینڈ اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ جیل اس سے بھی پیچھے تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ستارے اجلے اجلے کنول بن گئے تھے۔ سڑک ویران تھی۔ دونوں جانب درخت تھے۔ پت جھڑ کے دن تھے۔ ہوا میں تیزی کے ساتھ ہلکی ہلکی خنکی بھی تھی۔ سڑک پر بکھرے ہوئے خشک پتے تیز جھونکوں سے خاموشی میں کھڑکھڑا رہے تھے۔

لالی اور رحیم داد ننگے پیر تھے۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے مسلسل چل رہے تھے اور تھکن کے باوجود تیز تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھیں اس علاقے کے بارے میں کوئی اندازہ نہ تھا۔ نہ راستوں کا پتہ تھا اور نہ کوئی ایسا ٹھکانا جانتے تھے، جہاں وہ روپوش ہو سکتے۔ وہ منزل سے بے خبر آگے اور آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ رحیم داد کچھ زیادہ ہی تھکا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"لالی، یہ تو بتا ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"یہ تو مجھے بھی پتہ نہیں۔" لالی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"مخول نہ کر۔ ٹھیک، ٹھیک گل کر۔ اس طرح ہم نے کب تک چلتے رہنا ہے۔"

لالی نے رحیم داد کا بازو تھام کر انگلیوں سے گوشت ٹٹولا۔ "دیکھنے میں تو تگڑا لگتا ہے، پر باتیں زنانیوں کی سی کرتا ہے۔ رحیمے! حوصلے سے کام لے۔ ایسے تو اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دے گا۔"

رحیم داد کچھ کہنے ہی والا تھا کہ عقب سے ہارن کی تیز آواز ابھری۔ دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔ سڑک کے موڑ سے روشنی ابھری اور خزاں رسیدہ درختوں کی برہنہ شاخوں سے چھن چھن کر ہر طرف بکھرنے لگی۔ وہ جھٹ سڑک سے نیچے اترے اور ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ میں دبک کر بیٹھ گئے۔ رحیم داد زیادہ سہما ہوا تھا۔ وہ گہری گہری سانس بھر رہا تھا۔ لالی بھی خوف زدہ تھا۔ مگر چوکس نظر آتا تھا۔ روشنی قریب آتی گئی۔ سڑک پر پہیوں کے تیزی سے دوڑنے کی آواز بڑھتی گئی۔

ذرا دیر بعد ایک جیپ عین ان کے سامنے آ کر ٹھہر گئی۔ جیپ میں چار مسلح رینجرز سوار تھے۔ ایک ڈرائیور کے برابر بیٹھا تھا۔ تین پچھلی نشست پر تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں دبی تھیں۔ جیپ کے رکتے ہی اگلی نشست سے ایک شخص نیچے اترا۔ وضع قطع سے ڈرائیور معلوم ہوتا تھا۔ اس کے باہر آتے ہی ایک رینجر بھی جیپ سے اتر کر سڑک پر آ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا نشیب میں اترا۔ جھاڑی کے قریب پہنچا اور اطمینان سے پیشاب کرنے لگا۔

رحیم داد اور لالی سانس روکے بیٹھے رہے۔ سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ ہوا کے تھپیڑوں سے چھینٹے، اڑ اڑ کر ان کے چہروں پر گرتے رہے۔ مگر ڈر کے مارے انھوں نے ذرا بھی جنبش نہ کی۔

سڑک پر ڈرائیور جھک جھک کر جیپ کے پہیے دیکھ رہا تھا۔ رحیم داد کو کھانسی کا ٹھسکا محسوس ہوا۔ اس کے حلق کے اندر خر خر ہونے لگی۔ لالی نے ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کا منہ دبوچ لیا۔ اسی اثناء میں ڈرائیور کی آواز ابھری۔

"پنکچر تو نہیں لگتا جی، پر ایک پہیے میں ہوا ضرور کم ہے۔"

جھاڑی کے قریب کھڑے ہوئے رینجر نے گردن موڑ کر اونچی آواز سے کہا۔ ”سٹیشن تک تو پہنچ ہی جائے گی۔ وہیں پیٹرول پمپ سے پہیئے میں ہوا بھروا لینا۔“ وہ پتلون کے بٹن لگاتا ہوا مڑا اور جیپ کی جانب بڑھنے لگا۔

لالی اور رحیم داد جھاڑی کی اوٹ سے اسے دیکھتے رہے۔ ڈرائیور اور رینجر جیپ میں داخل ہوئے اور اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ رات کے سناٹے میں جیپ کا انجن زور زور سے گھڑگھڑایا۔ جیپ آگے بڑھی اور تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ ذرا دیر بعد نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ لالی گردن اٹھائے اسے دور تک دیکھتا رہا۔ پھر رحیم داد کی پیٹھ پر زور سے دھپ مار کر بے تکلفی سے بولا۔

”تونے تو مروا ہی دیا تھا رحمے۔“

”سور دا پتر بالکل منہ پر کھڑا موت رہا تھا۔“ رحیم داد نے منہ بگاڑ کر بے زاری سے کہا۔

”پر تیری کھانسی سے تو بیڑا ہی گرک ہو جاتا۔ وہ تو میں نے جھٹ تیرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ورنہ دونوں فیر جیل کی ہوا کھاتے۔“ لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ ”اب یہیں بیٹھا رہے گا؟ ہمیتی کر۔ ابھی تو بہت چلنا ہے۔“

رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ لیکن خاموش رہا۔ لالی نے دریافت کیا۔ ”کس سوچ میں پڑ گیا رحمے۔“

”سوچ رہا ہوں۔ یہ پولسئے ادھر کیسے آ گئے۔ کہیں انھیں ہمارے جیل سے فرار ہونے کا تو پتہ نہیں چل گیا؟“

”پولسئے تو نہیں تھے۔ وردی سے تو رینجر لگتے تھے۔ پر ہمیں یہاں سے جلد ہی دور نکل جانا چاہئے۔“

”ہم نے جانا کہاں ہے؟“ رحیم داد نے ایک بار پھر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ لالی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ ”پروا نہ کر۔ بس ذرا کدم بڑھا کے چل۔“

دونوں جھاڑی سے نکل کر سڑک پر آ گئے اور خشک پتّوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

انھوں نے دو ڈھائی میل راستہ طے کیا ہو گا کہ بنجر اور اجاڑ علاقہ ختم ہو گیا۔ اب کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ سڑک پر چلنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ دونوں سڑک سے اتر کر کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والے کچے راستے پر چلنے لگے۔ یہ پیہا تھا۔ یہ اتنا کشادہ کچا راستہ تھا کہ دونوں ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔

پی ہے کے دونوں طرف گندم اور جو کی فصلیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی

چلتی۔ گندم اور جو کی بالیاں جھومنے لگتیں۔ کھیتوں میں دور تک لہریں ابھرتی اور ڈوبتی نظر آتیں۔ ہوا کی سرسراہٹ سے فصلوں میں سیٹیاں بجتیں۔ لالی اور رحیم داد ہر آواز پر چونک پڑتے۔ ان کے قدم ڈگمگا جاتے۔

یکایک ان آوازوں میں ایک نئی آواز ابھری۔ یہ گیدڑوں کا بے ہنگم شور تھا۔ وہ زور زور سے چیخ رہے تھے۔ ذرا ہی دیر بعد گیدڑوں کا ایک غول کھیتوں سے نکل کر ان کے قریب سے گزرا۔ رحیم داد اور لالی جھجک کر کھڑے ہو گئے۔

دونوں کچھ دیر بعد آگے بڑھے۔ پیہا زیادہ طویل نہ تھا۔ مشکل سے دو ڈھائی فرلانگ کا راستہ تھا۔ دونوں بہت چوکنا تھے اور کسی انجانے خوف سے سہمے ہوئے تھے۔ پیہا ختم ہو گیا۔ وہ کھیتوں سے نکل کر باہر آ گئے۔ سامنے رڑ تھا۔ اس کھلے میدان کے اس پار درختوں کا جھنڈ تھا۔ جھنڈ کے پیچھے مٹی کے بنے ہوئے کچے مکانات تھے۔ مکانوں کے بیچ سے گلی گزرتی تھی۔ گلی کے نکڑ پر دو منزلہ پختہ ماڑی تھی۔ اس کے پہلو میں پھوس کی چھت کا لمبا ڈھارا تھا۔ ڈھارے میں مویشی تھے‘ جن کی گردنوں میں پڑی ہوئی گھنٹیاں رک رک کر سناٹے میں بج رہی تھیں۔

وہ آگے بڑھے۔ رڑ عبور کیا اور درختوں کے نیچے پہنچ کر اندھیرے میں کھڑے ہو گئے۔ ماڑی کی ایک کھڑکی سے روشنی ابھر کر اندھیرے میں بکھر رہی تھی۔ وہ دھندلی روشنی میں گرد و پیش کا جائزہ لینے لگے۔ دفعتاً قدموں کی آہٹ ابھری۔ ایک شخص نہایت مشتبہ حالت میں ان کے سامنے سے گزرا۔ اس کے چہرے پر ڈھاٹا بندھا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا ڈھارے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ لالی اور رحیم داد آنکھیں پھاڑے اسے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔ وہ آگے بڑھا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ رحیم داد کچھ دیر تو حیرت سے گم صم رہا‘ پھر اس نے لالی کے کان کے قریب منہ لے جا کر دھیرے سے پوچھا۔

”لالی‘ یار یہ چکر کیا ہے؟“

”مویشی چور جان پڑتا ہے۔“

لال کا خیال ٹھیک ہی نکلا۔ کچھ دیر بعد وہ شخص مویشیوں کے ڈھارے سے باہر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رسی دبی تھی۔ وہ آگے آیا تو پیچھے سے ایک بھینس بھی نمودار ہوئی۔ وہ کسی اور سمت جانے کے بجائے سیدھا درختوں کے جھنڈ کی جانب بڑھا۔ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر لالی ایک درخت کے تنے کی آڑ میں دبک گیا اور ہاتھ پکڑ کر رحیم داد کو اپنی پشت پر کر لیا۔ وہ شخص آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آتا گیا۔ قریب اور قریب۔ جب وہ بالکل ان کے نزدیک پہنچ گیا تو لالی نے

جھپٹ کر بائیں ہاتھ سے اس کا منہ دبوچ لیا۔ اس شخص نے نہایت پھرتی سے دھوتی کے ڈب سے چاقو نکالا۔ لیکن لالی نے چاقو کھولنے کی مہلت نہ دی۔ جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ کر مروڑ دیا۔ چاقو زمین پر گر پڑا۔

رحیم داد حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ لالی نے چاقو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ڈپٹ کر رحیم داد سے کہا۔ "کھڑا منہ کیا تک رہا ہے۔ اٹھا اور کھول لے اسے۔"

رحیم داد نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ جھک کر چاقو اٹھایا۔ اسے کھولا اور اس شخص کے قریب پہنچ گیا۔ اب رحیم داد کے ہاتھ میں دبے ہوئے چاقو کی نوک اس کی کمر سے لگی ہوئی تھی۔ لالی نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔

وہ سراسیمہ ہو کر دونوں کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ دونوں جیل کے قیدیوں کی وردی میں اس کے سامنے اس طرح کھڑے تھے کہ اندھیرے میں بھوتوں کی مانند ڈراؤنے نظر آتے تھے۔ وہ چند لمحے ہکا بکا رہنے کے بعد اٹکتے ہوئے بولا۔ "تسیں ہو کون؟" لالی نے تڑاق سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔

"سیدھی طرح گل کر۔ تیرا نام کیا ہے؟"

"بھجا۔" اس نے آہستہ سے اپنا نام بتایا۔

لالی نے قریب کھڑی بھینس کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "یہ مج اٹھا کر لایا ہے نا؟ سچ سچ بتا۔"

"ہاں جی۔" اس نے دھیرے دھیرے اپنی گردن ہلائی۔

"یار بھجے! تو، تو اونچا کاریگر لگتا ہے۔" لالی نے بے تکلفی سے کہا۔ "صاف اڑا لایا مج۔ ذرا بھی کھٹکا نہ ہوا۔"

"بس جی اوپر والے کی مہربانی ہے۔" وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر فخریہ لہجے میں بولا۔ "جس ڈنگر پر ہاتھ پھیر دیا، سمجھ لے اپنا ہو گیا۔" وہ بھینس کی گردن اور پیٹھ پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔

لالی نے رحیم داد کے ہاتھ سے چاقو لے کر اپنے قبضے میں کیا۔ بھجے سے پوچھا۔ "تیں نوں اب کتھے جانا ہے؟"

اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا لالی سے سوال کیا۔ "تسیں یہ کیوں جاننا چاہتا ہو؟"

لالی جل کر بولا۔ "تھانے میں تیرے خلاف پرچہ چاک کرانا ہے نا۔"

بھجے نے دونوں کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا۔ دھندلی دھندلی روشنی میں وہ شلوکے جیسے آدھی آستینوں کے کرتے اور گھٹنوں تک اونچے اونچے جانگیا نما پاجامے پہنے ہوئے تھے۔ کرتوں پر جیل کے نمبر نظر آ رہے تھے۔

"تسیں تھانے کیسے جا سکتے ہو؟" بھجا انھیں مشتبہ نظروں سے گھورنے لگا۔

"توں نے فیر ٹیڑھی گل بات کی۔" لالی نے کھلا چاقو اس کے سامنے کر دیا۔

بھجا ڈر گیا۔ عاجزی سے بولا۔ "مجھے اب جانے دے۔ جاگ ہو گئی تو سارا کام گڑبڑ ہو جائے گا۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ "غلطی شلطی ہو گئی تو معاف کر دے۔ میں نوں ابھی بہت دور جانا ہے۔"

"یہی تو پوچھ رہا ہوں تیں نوں کتھے جانا ہے؟" اس دفعہ لالی کا لہجہ نرم تھا۔

"میں نے جی پہلے اہر جانا ہے۔" بھجے نے شمال کی جانب ہاتھ اٹھایا۔ "اہر، ۵ میل ادھر جھنگر میں ہے۔ تیں نوں تو پتہ ہی ہو گا، چوری کے ڈنگر اٹھانے کے بعد اہر ہی میں چھپا کے رکھے جاتے ہیں۔ اگے میں نوں بھی ایسا ہی کرنا ہے۔ مج اہر میں لے جا کر رکھوں گا۔"

"ایہہ گل اے تو فیر ہاتھ ملا۔" لالی نے چہک کر کہا اور گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "جا، ایک مج اور اڑا لا۔"

بھجا انکار میں گردن ہلانے لگا۔ "ناجی نا، ایک ہی بہت ہے۔ میں دو مجیں اکیلے لے کر جا بھی تو نہیں سکتا۔ لما رستہ ہے۔ اگے نہر ہے۔"

"پروا نہ کر۔ ہم دونوں جو تیری مدد کو موجود ہیں۔ اہر تک تیرے ساتھ ہی چلیں گے۔" لالی نے اسے ہولے سے ٹھوکا دیا۔ "فٹافٹ جا، دیری نہ کر۔"

"مج یہیں چھوڑ دوں؟"

"چھوڑ دے، چھوڑ دے، کہیں نہیں جائے گی۔" لالی نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ "ہم نے رساگیری یا مویشی چوری نہیں کرنی۔ ہم ایسا گھٹیا دھندا نہیں کرتے۔ فکر نہ کر۔ واپسی پر مج تجھے یہیں ملے گی۔"

بھجا کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے ڈھارے کی سمت بڑھا اور ایک بار پھر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ رحیم داد اب تک خاموش کھڑا تھا۔ دل ہی دل میں لالی کی حرکتوں پر کڑھ رہا تھا۔ جب ضبط نہ ہو سکا تو جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یار لالی، تو نے یہ کیا چکر چلایا ہے۔ خاماخا اتنا وکھت خراب کیا۔ اب تک تو ہم بہت دور نکل

جاتے۔"

"کہاں نکل جاتے؟ نہ رستہ معلوم نہ جگہ کا کوئی اتا پتہ۔" لالی نے رحیم داد کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "رحیمے تو بیکار میں اپنا مغز خراب نہ کر۔ تو یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا۔ تیں نوں پتہ نہیں ہتجا اپنے بہت کام آئے گا۔"

"کیا کام آئے گا؟" رحیم داد کے لہجے میں ابھی تک جھنجلاہٹ تھی۔

"اہر میں ہتجا جہاں مویشی چھپاتا ہے وہیں ہم بھی چھپ سکتے ہیں۔ پہلے کہیں چھپنے کا ٹھکانا ملنا چاہئے۔ اس کا بندوبست ہتجا کر دے گا۔ آگے بھی وہ کام آئے گا۔ وہ بھی مجرم ہم بھی مجرم۔ اور مجرم کی مدد مجرم ہی کر سکتا ہے۔ کیا سمجھا؟"

رحیم داد کی سمجھ میں لالی کی بات آگئی۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ بھینس ان سے چند قدم کے فاصلے پر چپ چاپ کھڑی جگالی کر رہی تھی۔ دم ہلا ہلا کر مچھر اڑا رہی تھی۔ رحیم داد اور لالی اس سمت گردن اٹھائے دیکھ رہے تھے جدھر ہتجا گیا تھا۔

لیکن اس بار ہتجا جلدی نہ لوٹا۔ اسے دیر ہوئی تو رحیم داد کو تشویش ہوئی۔ اس نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"ہتجا ابھی تک نہیں آیا۔ ایسا نہ ہو کوئی گڑبڑ ہو جائے۔"

"حوصلے سے کام لے' حوصلے سے۔" لالی نے رحیم داد کو تسلی دی۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔ دونوں ہتجے کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کرتے رہے۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے درختوں کے خشک پتے کھڑکھڑاہٹ پیدا کر رہے تھے۔ اب لالی بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اچانک ڈھارے کی طرف کوئی زور سے کھنکارا۔ ساتھ ہی آواز ابھری۔

"اوئے' کون ہے؟"

لالی اور رحیم داد نے گھبرا کر دیکھا۔ ہتجا' ڈھارے کے چھپر سے باہر نکلا۔ اندھیرے میں اس کی سفید دھوتی اور قمیص دور سے نظر آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے' پیچھے مویشیوں کا رکھوالا بھی ڈھارے سے نکلا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی ڈانگ تھی۔ وہ ڈانگ سنبھالے ہتجا کے تعاقب میں دوڑا اور اونچی آواز سے "چور' چور" کی صدا بھی بلند کرتا رہا۔

لالی اور رحیم داد اس سے زیادہ کچھ نہ دیکھ سکے۔ وہ سراسیمہ ہو کر جدھر منہ اٹھا' سرپٹ بھاگے۔ نہ انھوں نے قریب کھڑی ہوئی چوری کی بھینس پر توجہ دی اور نہ ہتجا کی طرف کوئی دھیان دیا۔ وہ جلد سے جلد گاؤں سے نکل جانا چاہتے تھے۔

* * *

مشرقی افق پر ہلکا ہلکا دودھیا اجالا پھیل رہا تھا۔ رات رخصت ہو رہی تھی۔ صبح کی آمد آمد تھی۔ لیکن صبح کی آمد کے ساتھ لالی اور رحیم داد کے لیے خطرہ بھی قریب آتا جا رہا تھا۔ دن کی روشنی میں وہ گھوم پھر نہ سکتے تھے۔ ان کے جسموں پر جیل کی مخصوص وردی تھی' جو دور سے چغلی کھاتی تھی کہ وہ مفرور قیدی ہیں۔

وقت کم تھا اور انھیں جلد سے جلد چھپنے کے لیے کسی ٹھکانے کی تلاش تھی۔ لالی نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اسے نشیب میں کچھ فاصلے پر سکنالا نظر آیا۔ یہ برساتی نالا اب خشک اور اجاڑ تھا۔ اس کے ایک کنارے پر فراش اور سرس کے گھنے درخت تھے جو بلندی پر دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ لالی درختوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ اسے یہ جگہ چھپنے کے لیے مناسب معلوم ہوئی۔ اس نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ وہ زمین پر بے سدھ پڑا تھا اور گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ لالی نے جھک کر اسے جھنجوڑا۔

"بہت آرام کر چکا۔ اب اٹھ کے بیٹھ۔"

رحیم داد نے کروٹ بدلی اور تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "مجھے تو اونگھ لگ رہی ہے۔"

لالی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ "نہیں اٹھا تو میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔"

رحیم داد جھٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آنکھیں ملتے ہوئے بولا۔ "یہ تو بتا' جانا کدھر ہے؟ سویرا ہو رہا ہے۔ اجالا پھیلتا جا رہا ہے۔"

لالی نے نشیب میں اترتے ہوئے کہا۔ "میرے پیچھے' پیچھے چلا آ۔ سکنالے کے اس پار جو جھل ہے' دن وہیں گزاریں گے۔" اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر درختوں کے دور تک پھیلے ہوئے سلسلے کی جانب اشارہ کیا۔ یہ گھنا جنگل تھا اور قریب بھی تھا۔

رحیم داد چپ چاپ لالی کے ہم راہ نشیب میں اترنے لگا۔ دونوں آگے بڑھے۔ سکنالے پر پہنچے۔ کچھ دور جانے کے بعد ٹوبا ملا۔ اس میں ابھی تک پچھلی برسات کا پانی موجود تھا مگر زیادہ گدلا نہ تھا۔ دونوں ٹوبے کے کنارے بیٹھ گئے۔ چلو بھر بھر کر پانی پیا۔ منہ دھویا' ہاتھ دھوئے اور تروتازہ ہو کر درختوں کی جانب بڑھے۔

اب مشرق میں روشنی کا سرخ الاؤ' دہکنے لگا تھا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ مگر جھل کے درختوں کے نیچے ابھی تک اندھیرا تھا۔ وہ آگے اور آگے بڑھتے گئے۔ اجالا پھیلتا گیا۔ انھیں ایک پرانا درخت نظر آیا۔ اس کا تنا خوب چوڑا تھا اور اندر سے کھوکھلا بھی تھا۔ لیکن اس میں صرف ایک

آدمی کے چھپنے کی گنجائش تھی۔

دونوں دیر تک ادھر ادھر گھومتے رہے۔ اب درختوں کے پتوں سے دھوپ چھن چھن کر نیچے بکھرنے لگی تھی۔ ہر طرف پرندے چہچہا رہے تھے۔ تھکن سے دونوں کا برا حال تھا۔ انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ نیند غالب تھی اور بھوک بھی ستا رہی تھی۔ انھیں ایک پگڈنڈی نظر آئی۔ وہ آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر چلنے لگے۔

کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ ان کی نظر لکڑی کے تختوں کی بنی ہوئی بوسیدہ جھونپڑی پر پڑی۔ پہلے تو وہ قریب جاتے ہوئے ڈرے۔ مگر لالی نے اس دفعہ بھی ہمت سے کام لیا۔ اس نے جھونپڑی کے نزدیک پہنچ کر دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔

دروازہ چرچراتا ہوا کھل گیا۔ دونوں نے اندر جھانکا۔ جھونپڑی بالکل خالی تھی۔ فرش پر خشک گھاس بچھی تھی۔ جگہ جگہ گھوڑے کی لید بکھری ہوئی تھی۔ وہ اندر داخل ہوئے اور نڈھال ہو کر فرش پر گر پڑے۔

لالی کچھ دیر خاموش لیٹا رہا' پھر اٹھ کر دروازے کے پاس گیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ رحیم داد آنکھیں بند کیے خاموش پڑا تھا۔ لالی نے دروازہ کھلا رکھا اور چوکنا نظروں سے باہر دیکھتا رہا۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر جاگتا رہا۔ پھر نیند نے شب خون مارا۔ وہ جھومتے جھومتے ایک طرف لڑھک گیا۔

دروازہ کھلا تھا۔ لالی اور رحیم داد بے خبر سو رہے تھے۔

دوپہر ہوئی' سہ پہر ہوئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ سائے طویل ہو گئے۔ یکایک سناٹے میں پگڈنڈی پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ لالی کی آنکھ کھل گئی۔ خطرے کا احساس خوف بن کر اس کے چہرے پر منڈلانے لگا۔ اس نے آہستہ سے رحیم داد کو جھنجوڑا۔ وہ جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آہٹ اس نے بھی سن لی تھی۔

دونوں بالکل خاموش تھے۔ انجانے خوف سے سہمے ہوئے تھے۔ لالی کے پاس جیبی چاقو موجود تھا۔ اس نے چاقو کھولا اور دروازے کی اوٹ میں چوکس ہو کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔

آہٹ قریب ہوتی گئی۔ اتنی قریب کہ انھیں یہ اندازہ ہو گیا کہ آنے والا تنہا ہے اور بھاری بھاری بوٹ پہنے ہوئے ہے۔ مگر وہ ان کی طرف نہ آیا۔ آگے نکل گیا۔ اس کی چاپ خشک پتوں پر دیر تک ابھرتی رہی' اور جب سناٹے میں ڈوب کر ختم ہو گئی تو دونوں کے چہروں پر چھایا ہوا خوف

مٹ گیا۔ وہ تھکے ہوئے سے فرش پر بیٹھ گئے۔ ذرا سکون نصیب ہوا تو بھوک نے پریشان کیا۔

گھاس پر ادھر ادھر چنے کے دانے بکھرے ہوئے تھے۔ رحیم داد کی ان پر نظر پڑی تو چن چن کر کھانے لگا۔ لالی بھی کھانے لگا۔ انھوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک ایک دانہ کھا لیا۔ چنے خشک اور کیلے تھے۔ مٹھی بھر بھی نہ تھے۔ بھوک تو کیا مٹتی' البتہ پیاس شدت سے بڑھی۔ مگر وہ دروازے سے باہر نہ نکل سکتے تھے۔ دن کی روشنی ابھی تک پھیلی تھی۔ اور روشنی میں نکلنا خطرے کو دعوت دینا تھا۔

سورج ڈوب گیا۔ شام کا دھندلکا ہر طرف پھیل گیا۔ پیاس سے لالی اور رحیم داد کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ جب اندھیرا کسی قدر گہرا ہو گیا تو دونوں جھونپڑی سے باہر آئے۔ ہوا تیز تھی اور درختوں میں سنسناتی ہوئی گزر رہی تھی۔ خشک پتے اڑ اڑ کر شور مچا رہے تھے۔ دونوں خاموشی سے پگڈنڈی پر چلتے رہے۔ وہ ٹوبے کی جانب جا رہے تھے۔ لیکن لالی نے اس دفعہ نشیب میں پہنچنے کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

میل' سوا میل فاصلہ طے کر کے دونوں ڈھلان سے نیچے اترنے لگے۔ ٹوبا زیادہ دور نہ تھا۔ مگر راستہ خراب تھا۔ نشیب میں اترتے ہوئے رحیم داد کا پیر پھسلا۔ وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ چوٹ زیادہ نہیں آئی۔ لیکن وہ لنگڑا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ ٹوبے پر پہنچ کر انھوں نے اس بے قراری سے پانی یا کہ ان کے پیٹ پھول گئے۔ دونوں ٹوبے کے کنارے ہی لیٹ گئے اور دیر تک بے سدھ پڑے رہے۔

اس دفعہ ٹوبے کا پانی پی کر لالی کا جی متلانے لگا۔ مگر اس نے خود کو سنبھالا' اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ دونوں آگے بڑھے۔ لیکن وہ زیادہ دور نہ جا سکے۔ لالی کی بیعت پھر بگڑی۔ وہ ابکائیاں لینے لگا اور ایک جھاڑی کے قریب نڈھال ہو کر گر پڑا۔ اس پر غشی کی ی کیفیت طاری تھی۔

ذرا دیر وہ زمین پر لیٹا گہری گہری سانسیں بھرتا رہا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کیں اور سو گیا۔ رحیم اد اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ لالی کا سر دبانے لگا۔

کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ اجالا پھیلنے لگا۔ چاند درختوں کے عقب سے دھیرے دھیرے طلوع ہو ہا تھا۔ دیکھتے' دیکھتے چاندنی ہر طرف پھیل گئی۔ ٹوبے کا پانی جھلملانے لگا۔ لیکن چاندنی جس قدر کھرتی جا رہی تھی رحیم داد اسی قدر خوف زدہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر دیکھا فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ قطعی غیر محفوظ جگہ بیٹھا ہے۔ ہر طرف کھلا ریتلا میدان تھا۔

جھاڑی بھی زیادہ گھنی نہ تھی۔ اس کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ مگر لالی ہر خطرے اور ہر خدشے سے بے نیاز گہری نیند سو رہا تھا۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔ چاند چڑھ کر درختوں کے اوپر آ گیا۔ ریت کے ذرے جھلملانے لگے۔ سائے سمٹ گئے۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ ناگاہ رات کے گہرے سناٹے میں کوئی زور سے کھنکارا۔ ساتھ ہی خشک پتوں پر آہٹ ہوئی اور رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ کوئی ڈھلان سے نیچے اتر رہا تھا۔ مگر وہ ایک نہیں دو تھے۔

رحیم داد نے انھیں دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔ جب وہ اسی سمت آنے لگے تو رحیم داد سخت گھبرایا۔ اس نے لالی کو آنے والے خطرے سے خبردار کرنے کی غرض سے زور زور سے جھنجھوڑا۔ مگر لالی بیدار نہ ہوا۔ کروٹ بدل کر بے خبر سوتا رہا۔

آنے والے نزدیک آتے گئے۔ وہ دھیرے، دھیرے آگے بڑھنے لگے۔ رحیم داد اور زیادہ بدحواس ہوگیا۔ ایک لمحہ ایسا بھی آیا، جب اس نے اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ لیکن وہ ایسا نہ کرسکا۔ اپنی جگہ دم بخود بیٹھا رہا۔ اس نے دیکھا، ان میں ایک مرد ہے اور دوسری عورت۔ مرد آگے، آگے چل رہا تھا۔ اس کے سر پر بڑی سی گٹھری تھی۔ عورت کی گود میں بچہ تھا۔ دونوں نے رحیم داد کو دیکھ لیا تھا۔ مگر وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ جب وہ بالکل نزدیک پہنچ گئے تو عورت لمحے بھر کو ٹھٹکی۔ اس نے گردن موڑ کر رحیم داد کو دیکھا اور اس کے قریب پڑے ہوئے لالی کو بھی دیکھا۔ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

”کوئی بندہ جان پڑتا ہے۔“

”ہوگا کوئی۔ سدھی، سدھی چل۔“ مرد نے اسے ڈانٹا۔

دونوں نے مزید بات چیت نہ کی۔ چپ چاپ رحیم داد اور لالی کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گئے۔ البتہ عورت مڑ مڑ کر دیکھتی رہی۔ دونوں دور ہوتے ہوتے اندھیرے میں گم ہوگئے۔ ان کی چاپ دیر تک خشک پتوں پر ابھرتی رہی۔ ان کے جانے کے بعد بھی رحیم داد کا خوف رفع نہ ہوا۔ وہ چوکنا نظروں سے بار بار اس سمت دیکھتا رہا جدھر وہ گئے تھے۔ ہر آہٹ پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔

بہت دیر ہوگئی۔ کوئی نہ آیا۔ چاند چڑھتے چڑھتے آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا۔ رات پوری طرح جاگ رہی تھی اور لالی سو رہا تھا۔ وہ آدھی رات کے بعد جاگا۔ اٹھ کر بیٹھا تو رحیم داد نے پوچھا۔

”اب تیرا جی کیسا ہے؟“

لالی نے انگڑائی لے کر جواب دیا۔ ”ٹھیک ہی ہے۔“ اس نے آنکھیں پھاڑ کر چاند کو دیکھا۔ ”بہت رات ہوگئی۔ مجھے جگایا بھی نہیں۔“

”بہت جگایا، تجھے اپنا ہوش ہی کب تھا۔“

”طبیعت بہت گڑبڑ ہوگئی تھی۔“ لالی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ”رحیمے، کھڑا ہو جا۔ اپنے پاس تو چلنے کے لیے رات ہی ہے۔ دن میں کہیں چھپ کر آرام کریں گے۔“

رحیم داد چپ چاپ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ دونوں آگے بڑھے، اور کہیں ٹھہرے بغیر مسلسل چلتے رہے۔ چاند ڈوب گیا۔ اندھیرا چھا گیا۔ راستہ دشوار ہوگیا۔ وہ سکنالے کی گزرگاہ پر چل رہے تھے۔ زمین ریتلی اور ناہموار تھی۔ دونوں طرف اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبے تھے۔ کہیں کہیں ببول اور بیری کے درخت تھے۔ جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ تھے۔

انھوں نے ستانے کی مطلق کوشش نہ کی۔ آگے، اور آگے بڑھتے گئے۔ جب صبح کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلا اور اندھیر چھٹا تو وہ ایسی جگہ پہنچ چکے تھے جہاں گھاس اور سرکنڈوں کے اونچے اونچے پودے تھے۔ زمین دلدلی تھی، اس قدر نرم اور پولی کہ پیر اندر دھنستے تھے۔ ان میں دلدل عبور کرنے کی ہمت نہ تھی۔ دونوں تھکن سے نڈھال ہو رہے تھے۔ سورج بھی طلوع ہونے والا تھا۔

انھوں نے آگے جانے کا ارادہ ترک کردیا اور ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گئے۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔

دونوں نے بلندی سے دیکھا کہ دلدل کے اس پار بہت بڑا ٹوبا ہے، جو صبح کی روشنی میں شفاف جھیل کی طرح جھلملاتا دور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ کچھ دور آگے سکنالے پر پل تھا جس پر سڑک گزرتی تھی۔ یہ پاک پتن روڈ تھی۔

لالی کچھ دیر رحیم داد کے ساتھ ٹیلے پر خاموش کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر تھکن کے ساتھ، ساتھ اطمینان بھی جھلک رہا تھا۔ اسے کسی ایسے ہی مقام کی تلاش تھی جو سڑک سے نزدیک ہو اور محفوظ بھی۔ یہ ایسا ہی محفوظ علاقہ تھا۔ دور، دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ نہ کوئی پگڈنڈی تھی نہ راستہ تھا۔ ہر طرف ٹیلے اور ٹبے تھے۔ جنگلی پودوں کی جھاڑیاں تھیں۔ کہیں کہیں فراش کے اکا دکا درخت بھی تھے۔

دونوں نے ادھر ادھر گھوم پھر کر ٹیلوں کے درمیان چھپنے کا ٹھکانا تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جلد ہی انھیں ایک ٹھکانا مل گیا۔ یہ کشادہ اور قد آدم گہرا غار تھا۔ انھوں نے باہر سے غار کا جائزہ لیا۔ اندر داخل ہوئے اور چٹیل زمین پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔

وہ دن بھر گہری نیند سوتے رہے۔ آنکھ کھلی تو شام آہستہ آہستہ ٹیلوں اور ٹبوں پر اتر رہی تھی۔ دلدل پر اگی ہوئی اونچی اونچی گھاس اور سرکنڈوں کے پودے دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ غار سے نکل کر دونوں باہر آئے۔

سورج، ٹیلوں کے دور تک پھیلے ہوئے ناہموار سلسلے کے پیچھے ڈوب چکا تھا۔ مغرب میں گہری سرخ روشنی پھیلی تھی۔ اس روشنی میں رحیم داد بجّو کی مانند ڈراؤنا نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں کے اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر کر نمایاں ہوگئی تھیں۔ بھوک کے مارے اس کا برا حال تھا۔

لالی بھی بھوک سے نڈھال تھا۔ مگر اس ویرانے میں کھانے کے لیے کیا ملتا۔ اس وقت انھیں پیٹ کی آگ سرد کرنے کی فکر دامن گیر تھی۔ دلدل عبور کرنا خطرناک تھا اور ٹیلوں کے درمیان راستہ بنانا بھی آسان نہ تھا۔ مگر اندھیرا بڑھنے سے پہلے وہ آگے نکل جانا چاہتے تھے۔ جھٹ پٹے میں چلنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ انھیں ٹیلوں کی بلندی پر دور ہی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ سڑک پر گزرنے والی گاڑیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھیں۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد انھوں نے کہیں جانے کا ارادہ ملتوی کردیا اور غار کے دہانے پر بیٹھ کر چاند کے طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

رات کا ایک پہر گزرا۔ چاند طلوع ہوا تو دونوں غار سے باہر نکلے اور چھٹکی ہوئی چاندنی میں ٹیلوں اور ٹبوں کے درمیان چلنے لگے۔ وہ رفتہ رفتہ سڑک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مگر راستہ اس قدر پیچیدہ اور دشوار تھا کہ انھیں سنبھل سنبھل کر، ٹھہر ٹھہر کر چلنا پڑتا۔ آخر وہ اونچے نیچے ٹیلے عبور کرنے کے بعد نشیب میں اترے۔

سامنے چاندنی میں جھلکتا ہوا ٹوبا تھا۔ اس کے ایک کنارے پر اونچی اونچی گھاس تھی۔ عقب میں دلدل تھی۔ ٹوبے سے کوئی فرلانگ بھر کے فاصلے پر پل تھا۔ سڑک پر آمد و رفت قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

دونوں پل کی جانب بڑھنے لگے۔ چند ہی قدم آگے گئے تھے کہ سناٹے میں دور سے ہارن کی آواز ابھری۔ وہ جہاں تھے وہیں رک گئے۔ سڑک کے موڑ پر تیز روشنی جھلملائی۔ ذرا دیر بعد کار کی دونوں بتیاں نظر آنے لگیں۔ کار بہت تیز رفتار سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ پلک جھپکتے ہی پل پر پہنچ گئی۔ پھر زوردار دھماکہ ہوا۔

لالی اور رحیم داد نے خوف اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ کار بے قابو ہوئی۔ پل کے جنگلے سے ٹکرائی۔ اچھلی اور ڈھلان پر تیزی سے لڑھکتی ہوئی نیچے آنے لگی۔ ساتھ ہی انسانی چیخیں بھی ابھریں۔

ایک اور دھماکہ ہوا۔ یہ پہلے دھماکے سے زیادہ بڑا اور ہولناک تھا۔ لڑھکتی ہوئی کار سے اونچے، اونچے شعلے بلند ہوئے۔ کار ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئی۔ اس کے بعد گہری خاموشی چھا گئی۔ لالی اور رحیم داد بت بنے کھڑے رہے۔

سڑک بالکل سنسان تھی۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ اجلی چاندنی میں جلی ہوئی کار کا ڈھانچہ سیاہ دھبے کی مانند نظر آرہا تھا۔ یکایک خاموشی میں رک رک کر ایسی آواز ابھری جیسے کوئی شدید درد سے کراہ رہا ہو۔

لالی خاموشی سے کراہ سنتا رہا۔ مگر زیادہ دیر اسے سن نہ سکا۔ وہ آواز کی سمت بڑھا۔ رحیم داد بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ وہ بہت سہما ہوا نظر آرہا تھا۔ دونوں کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ کراہ بند ہوگئی۔ مگر وہ رکے نہیں۔ آگے ہی بڑھتے گئے۔

قریب جا کر انھوں نے دیکھا، کار کے جھلسے ہوئے ڈھانچے کے نیچے ایک لاش دبی ہے۔ آدھا دھڑ الٹی ہوئی کار کے نیچے سے باہر نکلا ہوا ہے۔ چہرہ اور ہاتھ جل کر سیاہ پڑ گئے ہیں۔ ہر طرف جلے ہوئے گوشت کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ ڈھانچے کے آس پاس کار کے ٹوٹے ہوئے دروازے، دو پہیے اور دوسرے حصے ادھر ادھر بکھرے تھے۔ چاندنی میں رحیم داد نے کوئی چیز دیکھی اور اس پر بلی کی طرح تیزی سے جھپٹا۔ یہ ایک مڑی تڑی روٹی تھی۔ رحیم داد نے اسے جھٹ اٹھایا۔ اس میں لگی ہوئی ریت اور مٹی صاف کئے بغیر بے صبری سے ہبڑ ہبڑ کھانے لگا۔ ریت کے ذرے اس کے دانتوں تلے کرکراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ مگر وہ جلدی جلدی ایک کے بعد دوسرا لقمہ نگلتا چلا گیا۔ لالی بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔ رحیم داد نے روٹی کا ٹکڑا اسے بھی دیا۔ روٹی باسی اور ٹھنڈی تھی۔ لیکن وہ اسے مزے سے کھاتے رہے۔

روٹی کھانے کے بعد انھوں نے ٹوبے پر جا کر پانی پیا۔ اب ان کے جسموں میں توانائی اور چستی آگئی تھی۔ انھوں نے کار کے ٹوٹے پھوٹے ڈھانچے کے آس پاس کھانے کی اشیاء تلاش کرنا شروع کردیں۔ جلد ہی انھیں بید کی الٹی ہوئی ٹوکری میں کھلا ہوا ناشتا دان مل گیا۔ اس میں بھنا گوشت تھا۔ ابلے ہوئے انڈے تھے۔ تین موٹے موٹے پراٹھے تھے۔ ٹوکری میں ایک ڈبل روٹی تھی اور بسکٹوں کے دو پیکٹ بھی تھے۔

کھانے کی اشیاء دیکھ کی ان کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ دونوں ٹوکری کے قریب بیٹھ گئے۔ رحیم داد نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر ایک پراٹھا اٹھایا۔ لالی نے فوراً اسے ٹوکا۔

"سب نہ کھا جانا' کئی روز کا راشن ہے یہ۔"

رحیم داد نے مسکرا کر آدھا پراٹھا لالی کو دیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آگے کی فکر ضرور کرنی چاہیے۔"

دونوں نے پراٹھوں کے آدھے آدھے ٹکڑوں پر تھوڑا سا بھنا ہوا گوشت رکھا اور اطمینان سے کھانے لگے۔ کھانے سے فارغ ہو کر انھوں نے ناشتا دان بند کیا جو ایک طرف سے ٹیڑھا پڑ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے بند ہوا۔ رحیم داد نے اسے ٹوکری میں ڈالا۔ ڈبل روٹی اور بسکٹوں کے پیکٹ بھی رکھے۔

دونوں نے ایک بار پھر ٹوبے پر جا کر پانی پیا۔ پانی پی کر لالی زور زور سے ڈکاریں لینے لگا۔ رحیم داد کو خطرے کے احساس نے خوف زدہ کیا۔

"یار' روٹی تو کھالی' اب چلنا چاہیے۔"

"کہاں چلیں؟" لالی نے پوچھا۔

"آگے چلتے ہیں سڑک کا رستہ ٹھیک رہے گا۔"

لالی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "سڑک کا رستہ ٹھیک نہیں رہے گا۔ آگے خطرہ ہے۔ یہ ٹھکانا ابھی چھوڑنا ٹھیک نہیں۔" وہ لمحے بھر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "یار روٹی کا تو بندوبست ہو گیا۔ پانی کا بھی راشن رکھنا ہو گا۔"

لالی کار کے ڈھانچے کی جانب چل دیا۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ ڈھانچے کے قریب ابھی تک جلے ہوئے گوشت کی بو پھیلی تھی۔ یہ بو اس قدر تیز اور ہولناک تھی کہ رحیم داد دور ہی ٹھہر گیا۔ لالی چند قدم آگے بڑھا پھر وہ بھی ٹھہر گیا۔ ڈھانچے میں اسے اپنے کام کی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ اس نے ڈھانچے کے ادھر ادھر جھک کر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر اسے ایک چمکتا ہوا ڈبا نظر آیا۔ لالی کو اسی کی تلاش تھی۔ یہ ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنے کا ڈبا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈبا اٹھا لیا اور رحیم داد کو دے کر بولا۔

"لے یار! اپنا کام تو بن گیا۔ اس میں پانی بھر لے۔ کئی دن چلے گا۔"

رحیم داد نے ڈبا سنبھالا اور ٹوبے پر چلا گیا۔ اس نے ڈبا اندر اور باہر سے کئی بار دھویا اور پانی بھر کر اوپر سے ڈھکنا بند کر دیا۔ پانی سے بھرا ہوا ٹین کا ڈبا خاصا وزنی تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ٹوکری تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا لالی کے پاس پہنچا۔ وہ ڈھانچے سے ہٹ کر کوئی بیس قدم دور ایک تودے

ے قریب کھڑا تھا۔ اس کے سامنے زمین پر ایک آدمی پڑا تھا۔ رحیم داد نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ دمی کا چہرہ اور بال خاک سے لتھڑے ہوئے تھے۔ داہنا ہاتھ کہنی کے پاس سے کٹ کر علیحدہ ہو گیا ا۔ وہ سفید بش شرٹ اور گہری نیلی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ پیروں میں سیاہ جوتے تھے۔ اجلی چاندنی ں ایک ایک چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ وضع قطع سے وہ سرکاری افسر لگتا تھا۔ رحیم داد نے آہستہ ے کہا۔

"مر گیا؟"

لالی نے پلٹ کر رحیم داد کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر جھک کر زمین پر پڑے ہوئے آدمی کے ہاتھ سے ھڑی اتاری اور اپنی کلائی پر باندھ لی۔ پھر اس کے پیروں سے جلدی جلدی جوتے اتارنے لگا۔ ں کے بعد اس نے پتلون کے بٹن کھولے اور دونوں پائنچے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ پتلون اتر کر ں کے ہاتھ میں آ گئی۔ لالی نے فوراً پتلون کی جیبیں ٹٹولیں۔ پچھلی جیب سے چمڑے کا بٹوہ نکلا۔ لالی نے بٹوہ کھول کر اندر نظر ڈالی۔ بٹوے میں نوٹ تھے۔ اس نے بٹوہ ٹوبے کی جانب اچھال دیا اور ٹ جیب میں رکھ لیے۔ جب وہ بش شرٹ اتارنے لگا تو لاش میں ہلکی سی حرکت ہوئی۔ ساتھ ہی ھڑی ہوئی سانس لینے کی آواز ابھری۔ رحیم داد چیخا۔

"ابھی زندہ ہے۔"

لالی نے گھوم کر اس کی جانب قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "چپ کر کے کھڑا رہ۔" ں نے بش شرٹ اس طرح اتاری جیسے قصائی بکرے کی کھال اتارتا ہے۔ پھر بنیان اور انڈرویر ارے۔ بنیان اور انڈرویر خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بش شرٹ پر بھی خون کے دھبے تھے۔ مگر یادہ بڑے نہیں تھے۔

زخمی آدمی کے جسم میں دوبارہ حرکت نہیں ہوئی۔ اس کے کٹے ہوئے ہاتھ سے خون بہنے کے ث ریت پر بڑا سا سیاہ دھبا بن گیا تھا۔

لالی نے سارے کپڑے لپیٹے اور ٹوبے کی جانب چل دیا۔ اس نے سب سے پہلے بش شرٹ پانی ں ڈال کر دھوئی' بنیان اور انڈرویئر ایک طرف پھینک دیے۔ لالی نے پتلون الٹ پلٹ کر دیکھی۔ ں پر بھی خون کے دھبے تھے۔

وہ پتلون دھونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اوپر سڑک پر آہٹ سنائی دی۔ لالی اور رحیم داد نے نک کر اس طرف دیکھا۔ یہ سڑک پر کسی گاڑی کے دوڑنے کی آواز تھی۔ دونوں کو خطرے کا ساس ہوا۔

لالی نے کپڑے سمیٹ کر بغل میں دبالیے اور رحیم داد کے ہاتھ سے ٹوکری لے لی۔ دونوں آگے پیچھے تیزی سے ٹیلوں کی جانب دوڑے۔ لیکن وہ ٹیلوں پر چڑھنے بھی نہ پائے تھے کہ بریک لگنے کی تیز آواز ابھری۔

یہ ٹرک تھا اور پل پر ٹھہر گیا تھا۔ دونوں نے سہمی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا۔ ٹرک ڈرائیور دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی ٹرک سے باہر آیا۔ دونوں پل کے قریب کھڑے ہو کر نیچے جھانکنے لگے۔ ذرا ہی دیر بعد دونوں آگے پیچھے ڈھلان سے نیچے اترنے لگے۔

رحیم داد اور لالی نے انھیں نشیب میں اترتے دیکھا تو ایک ابھرے ہوئے اونچے تودے کی آڑ میں دبک گئے۔ مگر یہ جگہ قطعی غیر محفوظ تھی۔ چاند پوری تابانی سے ان کے سروں پر چمک رہا تھا۔ اجلی چاندنی میں ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ ان سے قریب تر گھنی جھاڑی بھی خاصی دور اور بلندی پر تھی۔ جھاڑی تک پہنچنے کی کوشش کرتے تو دونوں دور سے صاف نظر آجاتے۔

آنے والے رفتہ رفتہ قریب آرہے تھے۔ وہ نیچے پہنچ کر پہلے ٹوٹی پھوٹی کار کے جھلسے ہوئے ڈھانچے کے پاس گئے۔ لیکن انھوں نے ڈھانچے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ادھر ادھر جھک جھک کر دیکھتے رہے۔ انھوں نے ڈھانچے کے نیچے دبی ہوئی لاش بھی دیکھی۔ چند منٹ تک وہ ڈھانچے کے آس پاس منڈلاتے رہے۔ ایک بار وہ اس تودے کے بہت قریب پہنچ گئے جس کے عقب میں رحیم داد اور لالی دبکے بیٹھے تھے۔

دونوں ان کی چاپ صاف سن رہے تھے۔ لالی نے چاقو کھول لیا تھا اور آنے والے خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے چوکس تھا۔ رحیم داد نے بھی ایک پتھر ہاتھ میں اٹھا لیا تھا۔

لیکن آنے والے زیادہ دیر نہیں ٹھہرے۔ انھوں نے جلی ہوئی کار سے ٹوٹ کر علیحدہ ہو جانے والے دونوں پہیے اٹھائے اور آہستہ آہستہ چڑھائی پر چڑھنے لگے۔ لالی اور رحیم داد نے دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔

وہ بھی آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے بلندی کی جانب بڑھنے لگے۔ جب گھنی جھاڑی کے عقب میں پہنچ گئے تو انھوں نے پل کی جانب دیکھا۔ ٹرک ابھی تک کھڑا تھا۔ وہ ٹرک کے اسٹارٹ ہونے اور آگے جانے کا انتظار کرنے لگے۔ مگر ٹرک اسٹارٹ نہیں ہوا۔ ذرا ہی دیر بعد دونوں پھر نشیب میں اترتے نظر آئے۔ وہ سیدھے ڈھانچے کے پاس گئے اور اس میں جڑے ہوئے پہیے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔

لالی اور رحیم داد بلندی سے انھیں پوری طرح دیکھ رہے تھے۔ اب وہ اس جگہ ٹھہرنے کے بجائے جلد سے جلد غار میں پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن جھاڑی سے نکل کر آگے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔

وہ خاموش بیٹھے دونوں کو دیکھتے رہے۔ خاصی دیر ہو گئی۔ چاند آہستہ آہستہ مغرب میں اترتا جارہا تھا۔ سائے طویل ہو گئے تھے۔ چاند غروب ہو جانے کے بعد اندھیرے میں چلنا اور غار تک پہنچنا بہت دشوار ہوتا۔ ان کی بے چینی لحہ بہ لحہ بڑھتی جارہی تھی۔ ادھر وہ دونوں کھسکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

چاند جب مغربی افق کے قریب پہنچ گیا اور ٹبوں کے نشیب میں اندھیرا پھیلنے لگا تو لالی اور بے چین ہو گیا۔ اس نے بڑا سا پتھر اٹھایا اور پوری قوت کے ساتھ ڈھانچے کی جانب پھینکا۔ پتھر کار کے آہنی ڈھانچے سے ٹکرایا۔ سناٹے میں ٹن سے آواز ہوئی۔ ڈھانچے پر جھکے ہوئے دونوں آدمی فوراً سیدھے ہو کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے گھبرائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ ان میں سے ایک پل کی جانب سرپٹ بھاگا۔ دوسرا بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ دونوں تیزی سے چڑھائی عبور کر کے پل پر پہنچے اور ٹرک پر سوار ہو گئے۔ فوراً ہی انجن کا شور خاموشی میں ابھرا۔ ٹرک اسٹارٹ ہوا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

ٹرک کے جانے کے بعد لالی ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ رحیم داد بھی مسکرانے لگا۔ لالی نے اس کی پیٹھ پر بے تکلفی سے دھپ مارا۔ ”کہو استاد! کیسی رہی ترکیب نمبر ۱۴؟“ وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ اس نے چاقو بند کیا۔ ٹوکری اٹھائی اور کپڑے بغل میں دبا لیے۔ دونوں سنبھل سنبھل کر ٹیلوں پر چڑھنے لگے۔ رحیم داد ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا ٹین کا ڈبا اٹھائے لالی کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

دونوں غار کے قریب پہنچے تو اندھیرا ہر طرف پھیل چکا تھا۔ رحیم داد بہت تھکا ہوا تھا۔ وہ پانی کا ڈبا کونے میں رکھ کر لیٹ گیا۔

لیکن لالی ٹوکری اور بغل میں دبے ہوئے کپڑے رکھنے کے بعد بھی نہیں لیٹا۔ اس نے گیلی بش شرٹ اٹھائی۔ جھٹکا دے کر پانی جھاڑا۔ غار کے دہانے پر پہنچا۔ بش شرٹ ایک تودے پر پھیلا دی اور اس کے کناروں پر بھاری بھاری پتھر رکھ دیے تاکہ تیز ہوا سے اڑ نہ جائے۔

ہوا سیٹیاں بجاتی ٹیلوں اور ٹبوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ چاند بہت دور ایک اونچے ٹبے کے پیچھے آہستہ آہستہ اتر رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ دہکتا ہوا الاؤ رہ گیا۔ بڑا دل آویز منظر تھا۔ لالی کھوئی کھوئی نظروں سے چاند کی الوداعی روشنی دیکھتا رہا۔ چاند ڈوب گیا۔ ٹیلے اور ٹبے تاریکی میں

ڈوب گئے۔ لالی مڑا اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا غار کے اندر چلا گیا۔

☆

لالی اور رحیم داد کے پاس اب صرف بسکٹوں کا ایک پیکٹ رہ گیا تھا۔ اس میں سے بھی وہ چار بسکٹ شام کو کھا چکے تھے۔ ڈبا بھی پانی سے قریب قریب خالی ہو چکا تھا۔ وہ ڈبے سے منہ لگا کر گھونٹ گھونٹ پانی پیتے۔ اگر کوئی زیادہ پانی پینے کی کوشش کرتا تو دوسرا جھٹ ڈبا اس کے ہاتھ سے چھین لیتا۔ دوپہر کو دھوپ تیز ہو جاتی۔ بنجر اور پتھریلے ٹیلے گرمی سے دہکنے لگتے۔ دونوں کو بار بار پیاس لگتی۔

شروع میں تو وہ اطمینان سے پانی پیتے رہے۔ مگر جب ڈبے میں پانی چوتھائی سے بھی کم رہ گیا تو دونوں کی خود غرضی بیدار ہوئی۔ وہ پانی پیتے وقت ایک دوسرے کو ٹوکتے، غصے سے گھورتے۔ زیادہ جھنجلاتے تو چھینا جھپٹی سے بھی دریغ نہ کرتے۔ لالی ہر بار زیادتی کرتا۔ رحیم داد ٹوکتا اور غصے سے بڑبڑاتا تو وہ بے غیرتی سے دانت نکال کر کھسیانی ہنسی ہنستا۔

اس شام انھوں نے دو دو بسکٹ کھائے اور ایک ایک گھونٹ پانی پیا۔ آپس میں یہ سمجھوتا ہوا کہ صبح تک نہ کوئی بسکٹ کھائے گا نہ پانی پیئے گا۔ اس سمجھوتے پر سختی سے عمل کرنے کا عہد کر کے دونوں پڑ کر سو گئے۔

رات گئے رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ اسے سخت بھوک لگی تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش لیٹا بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ جب قرار نہ آیا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لالی گہری نیند سو رہا تھا۔ باہر اجلی چاندنی چھٹکی تھی۔

رحیم داد آہستہ سے غار کے باہر نکلا اور اس کے دہانے پر کھڑا چاندنی میں ڈوبے ہوئے ٹیلوں اور ٹبوں کو دیکھتا رہا۔ وہ کئی منٹ تک خاموش کھڑا رہا۔ اس عرصے میں لالی نے نہ کروٹ بدلی نہ ہی جسم کو حرکت دی، بے خبر سوتا رہا۔

رحیم داد گردن موڑے اسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ پھر ہولے ہولے چلتا ہوا غار کے اندر گیا۔ ٹٹول کر بسکٹ کا پیکٹ اٹھایا اور آہستہ آہستہ بسکٹ کھانے لگا۔ اس نے ایک بسکٹ ختم کیا، ٹین کا ڈبا اٹھایا۔ اس کا ڈھکنا کھولا اور جیسے ہی گردن اونچی کی۔ ڈبا منہ سے لگایا۔ اچانک کسی نے اس کی گردن دبوچ لی۔

یہ لالی تھا اور اسے خون خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ لمحے بھر خاموش رہ کر وہ غصے سے دھاڑا۔

"اوئے کنجر، یہ چار سو بیسی۔" رحیم داد کھسیانا ہو کر بولا۔

"یار میری گردن تو چھوڑ۔"

لالی نے زور سے دھکا دیا۔ رحیم داد لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا۔ اس کا سر غار کی پتھریلی دیوار کے ساتھ کھٹاک سے ٹکرایا۔ آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ چند لمحے خاموش پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پانی کا ڈبا اٹھایا اور غار کے باہر پھینک دیا۔ بسکٹوں کا پیکٹ بھی اٹھا کے غصے سے پھینک دیا۔ اور غضب ناک ہو کر بولا۔

"لے جا، سب کچھ لے جا۔ میں نوں کچھ نہیں لینا۔"

لالی اس حرکت پر اور جھنجلایا۔ دانت پیس کر رحیم داد پر جھپٹا اور گھونسوں اور لاتوں سے اس کی مرمت کرنے لگا۔ رحیم داد کچھ دیر تو خاموشی سے پٹتا رہا، پھر جھپاک سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گردن جھکا کر اس نے لالی کے منہ پر زور سے ٹکر ماری۔ چوٹ کراری آئی۔ لالی کا جبڑا ہل گیا۔ وہ تکلیف سے بلبلا کر رحیم داد کو مارنے کے لیے پل پڑا۔ رحیم داد بھی پسپا نہ ہوا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

لالی کو جلدی ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ رحیم داد کو جس قدر کمزور اور بودا سمجھتا تھا ہرگز ایسا نہ تھا۔ اس کے ہاتھ پیروں میں خاصا کس بل تھا۔ ایک بار اس نے زور لگا کر لالی کو گرا دیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ لالی بے بس ہو گیا۔

وہ ذرا دیر تک زمین پر پڑا بے بسی سے ادھر، ادھر گردن ہلاتا رہا اور رحیم داد تابڑ توڑ مکے لگاتا رہا۔ آخر لالی نے ہاتھ بڑھا کر رحیم داد کا منہ دبوچ لیا اور دانت بھینچ کر پوری قوت سے دھکا دیا۔ رحیم داد کا سر زور سے پتھریلی دیوار سے ٹکرایا۔ وہ کراہتا ہوا وہیں ڈھے گیا۔

لالی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد دیوار کے پاس بے سدھ پڑا تھا۔ لالی خاموش بیٹھا اسے گھورتا رہا، اور ہونٹوں سے رستا ہوا خون ہاتھ سے بار بار پونچھتا رہا۔ وہ کھسکتا ہوا رحیم داد کے پاس گیا۔

رحیم داد آنکھیں بند کیے چت لیٹا تھا اور رک رک کر سانس بھر رہا تھا۔ لالی نے آہستہ سے جھنجھوڑا، مگر وہ بے سدھ پڑا رہا۔ لالی نے کئی بار جھنجھوڑا، لیکن رحیم داد نے آنکھ نہ کھولی۔ لالی کا سارا غصہ جھاگ کی مانند بیٹھ گیا۔ وہ پریشان ہو گیا اور رحیم داد کی پیشانی اور کنپٹیوں کو ہولے ہولے سہلانے لگا۔

بہت دیر بعد رحیم داد نے آنکھ کھولی۔ اس کے سر میں ابھی تک درد تھا۔ اس نے دیکھا، لالی اس کے سرہانے بیٹھا ہے۔ رحیم داد نے کروٹ بدلی اور اٹھنے کی کوشش کی۔ لالی نے پیار سے ڈانٹا۔

"لیٹا رہ۔ طبیعت کیسی ہے؟"

رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش لیٹا رہا۔ لالی نے پوچھا۔ ”بول‘ بولتا کیوں نہیں؟ طبیعت تو اب ٹھیک ہے نا؟؟“

اس دفعہ بھی رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی نے نرم لہجے میں کہا۔ ”یار! زیادتی ہوگئی۔ معاف کردے۔ یہ غصہ بہت حرام کا تخم ہوتا ہے۔“ اس نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ ”لے‘ اب تو اٹھ جا پیارے!“ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ لالی چپ چاپ اٹھا اور غار سے باہر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد واپس آیا۔ اس نے بسکٹ کا پکٹ اور پانی کا ڈبا رحیم داد کے سامنے رکھ دیا‘ چمکار کر گویا ہوا۔

”سارے بسکٹ کھا لے۔ پانی بھی سارا پی لے۔ میری پروا نہ کر۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔“ اس نے ایک بسکٹ اٹھایا اور رحیم داد کے ہونٹوں سے لگا کر بولا۔ ”لے اب تو کھالے۔ زیادہ نکھرا ٹھیک نہیں ہوتا۔“

رحیم داد نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ ”میں نے کچھ نہیں کھانا۔“ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگا۔

لالی نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ ”توں تو زنانیوں کی طرح ٹسوے بہانے لگا۔ یار! اس میں رونے کی کون سی گل ہے۔“ رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا خاموش بیٹھا سسکیاں بھرتا رہا۔ لالی نے پانی کا ڈبا اٹھا کر رحیم داد کے سامنے کردیا۔

”لے‘ گھونٹ بھر پانی پی لے۔“

”لالی! مجھے تنگ نہ کر۔ جی بھر کے رو لینے دے۔“

”مگر توں رو کیوں رہا ہے؟؟“

رحیم داد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اٹھا اور غار سے باہر جانے لگا۔ لالی اسے باہر جاتے دیکھ کر بولا۔ ”کہاں جا رہا ہے؟؟“

”جیل!“ رحیم داد نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

لالی اس کی جانب لپکا اور ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”تیرا گز چل گیا ہے؟؟“

رحیم داد نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے جانے دے۔ لالی! میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ ایسی زندگی سے تو جیل بھلی۔“ لالی بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ ”اتنی جلدی گھبرا گیا۔ یار! چند روز کی بات ہے۔ فیر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ رحیم داد بے زاری سے بولا۔ ”مجھے نہ روک۔ میں تیرے رستے پر نہیں چل سکتا۔ میرے نصیب میں جتنے دن کی جیل لکھی ہے‘ کاٹ لوں گا۔“

”مگر اب تو دگنی کاٹنی پڑے گی۔ مشقت بھی زیادہ کرنی پڑے گی۔ کیدِ تنہائی بھی ہوگی۔ جیل سے بھاگنا مخول نہیں ہے۔ کیا سمجھا؟“

”سب کچھ سمجھ گیا۔ مگر اب میں یہاں رہوں گا نہیں۔“

لالی نے ہلکا سا قہقہہ بلند کیا۔ ”میرے ساتھ بھی نہیں رہے گا؟ جان من! یہ بے وفائی؟“ وہ لمحے بھر رک کر بولا۔ ”مگر میں تجھے اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلیں گے۔ لے اب تو مان جا۔“

لالی نے رحیم داد کا بازو پکڑا اور کھینچ کر اندر لے آیا۔ رحیم داد خاموشی سے زمین پر بیٹھ گیا۔ لالی بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا دیوار سے ٹیک لگا کر بولا۔ ”اب آرام نال گل بات ہوگی۔ بول کیا کہتا ہے؟؟“

”گل ایہہ ہے لالی! مجھے یہ زندگی بالکل پسند نہیں۔“

”تو کیا مجھے چنگی لگتی ہے۔ ایک دم واہیات ہے۔ پر اب میں کچھ کر بھی تو نہیں سکتا۔“

”یہ تو سوچ‘ اس طرح کب تک کام چلے گا؟؟“

”ٹھیک کہہ رہا ہے‘ کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا اور جیتی کرنا پڑے گا۔“ لالی ذرا دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ”تیار ہو جا! ابھی تو رات رہتی ہے۔ چاندنی بھی ہے۔“ وہ لمحے بھر کے لیے رکا۔ ”بسکٹ کھا کر پانی پی لے۔ دیکھ انکار نہ کرنا۔“

رحیم داد نے کچھ کہے بغیر پیکٹ سے بسکٹ نکال کر کھانا شروع کردیے۔ وہ بسکٹ کھاتا رہا اور لالی اپنی جیل کی وردی اتارنے لگا۔ وردی اتار کر اس نے پتلون پہنی۔ پتلون ذرا تنگ تھی‘ البتہ بش شرٹ اس کے جسم پر ٹھیک رہی۔ لیکن جوتے ڈھیلے تھے۔ لالی نے جیل کا کرتا پھاڑا اور اس کی دھجیاں بھر کر جوتے پہن لیے۔ جب وہ کپڑے بدل چکا تو ہنس کر بولا۔

”کیسا لگ رہا ہوں؟؟“

”بالکل صاحب بہادر لگ رہا ہے۔“

”پروا نہ کر‘ تجھے بھی صاحب بہادر بنا دوں گا۔“ لالی نے جیب سے نوٹ نکالے۔ انھیں فضا میں لہرایا۔ ”ایک سو چالی سے اوپر ہیں۔“ وہ اپنی بات کہتے کہتے افسردہ ہوگیا۔ ”پتہ نہیں مرنے والا کون تھا۔ چنگا ہی بندہ تھا۔ اپنے لیے تو پتلون کی جیب میں یہ روپے چھوڑ گیا۔ کام بن گیا۔“

”اوپر سے راشن پانی کا بندوبست بھی ہوگیا۔ یار! میں کہتا ہوں‘ اس روز روٹی ٹکر نہ ملتا تو کیا ہوتا۔ ذرا سوچ‘ کیا ہوتا؟ چلا تک تو جا نہیں رہا تھا۔“ رحیم داد نے بسکٹ کا پیکٹ لالی کی طرف

بڑھا دیا اور بار بار انکار کے باوجود اصرار کر کے بچے ہوئے بسکٹ اسے کھلا دیے۔

مگر جب لالی نے پانی پینے کے لیے ڈبا اٹھا کر منہ سے لگایا تو مشکل سے چند قطرے نکلے۔ سخت کوفت ہوئی۔

بسکٹ کھانے سے گلا خشک پڑ گیا تھا۔ پیاس اچانک بڑھ گئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی جیل کی وردی بھاری پتھر کے نیچے چھپائی۔ ٹین کا ڈبا اٹھا کر دور پھینکا اور رحیم داد کے ہم راہ غار سے نکل کر ناہموار ٹیلوں پر چلنے لگا۔

دونوں ایک بار پھر نشیب میں اتر رہے تھے۔ سامنے چاندنی میں جھلکتا ہوا ٹوبا تھا۔ آگے پل تھا اور سڑک ویران تھی۔ ٹوبے کے پاس پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ حادثے میں ہلاک ہونے والوں کی لاشیں اٹھائی جا چکی ہیں۔ البتہ کار کا جلا ہوا ڈھانچہ بدستور اپنی جگہ موجود ہے۔ اس کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ اجلی چاندنی میں سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ لالی اور رحیم داد نے جھک کر ٹوبے سے پانی پیا، منہ ہاتھ دھوئے اور تر و تازہ ہو کر آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھتے ہوئے پل پر پہنچ گئے۔ دونوں کچھ دیر پل پر خاموش کھڑے رہے اور سوچتے رہے کہ انھیں کس سمت جانا چاہیے۔ مگر یہ فیصلہ لالی ہی کر سکتا تھا۔ رحیم داد ایسے موقعوں پر خاموش رہتا تھا۔ جدھر لالی چلتا، بغیر حیل و حجت اس کے پیچھے پیچھے چل دیتا۔ لیکن لالی بھی اس وقت تذبذب میں مبتلا تھا۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ کہاں ہے؟ نہ یہ اندازہ تھا کہ کون سا راستہ دونوں کے لیے محفوظ رہے گا؟ رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ چاند کی رنگت میں زردی آ گئی تھی۔ پاک پتن روڈ بالکل سنسان تھی۔ کئی منٹ گزر گئے۔ لالی کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔ اس نے رحیم داد سے مشورہ کیا۔

"رحیمے! اپنا تو مگز کام نہیں کر رہا، تو بتا کدھر چلیں؟"

"میں نے کیا بتانا۔ جدھر کہے گا، تیرے سنگ چل دوں گا۔"

"پر تیں نوں کہیں تو جانا ہی ہو گا۔ تیرا تو گھر بار بھی ہے۔"

"ہے تو، تجھے بتا بھی چکا ہوں۔ گھر والی ہے۔ ایک چھوہری ہے۔ دو پت ہیں۔ چھوہری مجھے بہت پیار کرتی ہے۔ یاد بھی بہت آتی ہے۔" رحیم داد اپنی بات کہتے کہتے غم زدہ ہو گیا۔ "مگر میں اس کے پاس کیسے جا سکتا ہوں۔ گھر جانے کے سارے رستے تو میں نے خود ہی بند کر دیے۔"

"یار تیرا تو پورا ٹبر ہے۔ میں نے یہ جھنجھٹ ہی نہیں پالا۔ تیری طرح کچھ یار دوست ہیں، انھی کے ساتھ گزرتی رہی۔"

یار دوستوں کے ذکر پر لالی کو شادو یاد آ گیا۔ اس کا بہت اچھا دوست تھا۔ عرصہ ہوا، وہ بھی اس کی

طرح جرائم پیشہ تھا۔ چوری اور رہزنی کرتا۔ کبھی اکیلے، کبھی لالی یا دوسروں کے ساتھ مل کر۔ ان کا باقاعدہ گروہ بن گیا۔ لالی بھی شادو کے ساتھ گروہ میں شامل تھا۔ انھوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ بے جگری سے ڈاکے ڈالے۔ خوب گل چھرے اڑائے۔ مگر ایک تانگے والے کی مخبری پر پکڑے گئے۔ مقدمہ چلا۔ سزائیں ہوئیں۔ جیل سے نکلے تو گروہ تتر بتر ہو چکا تھا۔ شادو نے جیل کاٹنے کے بعد ایسی توبہ کی کہ پھر ادھر کا رخ نہ کیا۔ لیکن پولیس اسے برابر پریشان کرتی رہی۔ علاقے میں چوری، ڈاکہ زنی کی کوئی واردات ہوتی اسے ضرور تھانے میں بلایا جاتا۔ پوچھ گچھ ہوتی۔ ڈرایا، دھمکایا جاتا۔

اب شادو لائل پور میں رہتا تھا اور سائیکلوں کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ اس نے شادی کر لی تھی۔ دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ لالی اس سے برسوں نہ ملتا۔ مگر جب بھی ملتا، وہ ہمیشہ لالی کے ساتھ محبت سے پیش آتا۔ ایک بار لالی ڈاکے کی ایک واردات کے بعد دو ہفتے شادو کے گھر میں روپوش رہا۔ حالانکہ اس کی بیوی گھر میں لالی کے رہنے پر خوش نہیں تھی۔ ہر وقت کڑ کڑ کرتی رہتی۔ شادو کبھی اسے پیار سے سمجھاتا، کبھی ناراض ہوتا۔ آئے دن جھگڑا رہتا۔ لیکن شادو کی آنکھوں میں کبھی میل نہ آیا۔ وہ لالی کا ہر طرح سے خیال رکھتا۔

لالی پل پر کھڑا شادو کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ کسی نہ کسی طرح شادو کے پاس لائل پور پہنچ جانا چاہتا تھا۔ لائل پور جانے کے لیے لاری کے اڈے یا ریلوے اسٹیشن تک پہنچنا ضروری تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جیل سے فرار ہوئے اتنے دن ضرور ہو چکے ہیں کہ پولیس نے راستوں کی ناکہ بندی اور اسٹیشنوں کی نگرانی ختم کر دی ہو گی۔ لیکن سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ لباس تبدیل کرنے کے بعد لالی تو ہر جگہ پہنچ سکتا تھا مگر رحیم داد کی جیل کی وردی مسلسل خطرہ تھی۔ لالی کہیں جانے سے پہلے رحیم داد کو اس خطرناک وردی سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ صرف اسی صورت میں دونوں سفر کرنے کے قابل ہو سکتے تھے۔ لالی کو یہ کام جلد سے جلد کرنا تھا۔

رحیم داد بھی کچھ دیر بھولی بسری یادوں میں کھویا رہا۔ مگر جب لالی گم صم کھڑا رہا اور آگے نہ بڑھا تو رحیم داد نے ٹوکا۔ "تو کس سوچ میں پڑ گیا؟ رات کم رہ گئی ہے۔"

لالی اس کی بات سن کر چونک پڑا۔ "ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"پر توں کب تک یہاں کھڑا رہے گا؟" رحیم داد نے اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔

"کہیں تو چلنا ہی ہو گا۔ یہاں اس طرح کھڑا رہنا بھی خطرناک ہے۔"

لالی آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ چلا۔ دونوں پاک پتن روڈ پر کچھ دور تک چلتے رہے، پھر

نشیب میں اتر گئے اور جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ علاقہ بنجر اور ویران تھا۔ جگہ، جگہ پھوگ اور لانا کے پودوں کے جھنڈ تھے۔ دونوں مغرب کی سمت بڑھ رہے تھے۔ اب وہ پاک پتن روڈ سے بہت دور جا چکے تھے۔

۲

درختوں کے پیچھے کہیں کہیں روشنی جھلملا رہی تھی۔ کوئی بستی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ لالی اور رحیم داد آگے بڑھے۔ اب بستی کے نشان واضح ہوتے جا رہے تھے۔ چراغوں کی ٹمٹماہٹ بڑھ گئی تھی۔ اکا دکا مکان صاف دکھائی دے رہے تھے۔

دونوں نے نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے رڑ عبور کیا اور گاؤں میں داخل ہو گئے۔ گاؤں خاصا بڑا تھا۔ دور تک مکانوں کا سلسلہ پھیلا تھا۔ بیشتر مکانات مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ اکا دکا پختہ اور نیم پختہ تھے۔ مگر وہ مکانوں کے قریب نہ گئے۔

رحیم داد خوف سے سہما ہوا تھا۔ لیکن لالی چاق چوبند نظر آ رہا تھا۔ اس نے گردن گھما پھرا کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ رحیم داد کے ہم راہ دبے دبے قدموں چلتا ہوا آگے بڑھا اور ایک گھنے درخت کے نیچے پہنچ کر رک گیا۔ سامنے کچا مکان تھا جو گاؤں کے نکڑ پر تھا، اور دوسرے مکانوں سے الگ تھلگ بھی تھا۔

لالی چند لمحے ٹھہر کر آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ دونوں اس مکان کے نزدیک پہنچے اور دیوار سے لگ کر اندھیرے میں چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ لالی نے جھک کر اپنے جوتے اتارے اور رحیم داد کے حوالے کر دیئے۔ اس نے گردن اٹھا کر دیوار کی بلندی کا اندازہ لگایا۔ دیوار زیادہ اونچی نہ تھی۔ لالی نے دونوں ہاتھ بلند کئے۔ اچھلا اور ہاتھوں سے دیوار کا بالائی حصہ تھام لیا۔ وہ پیروں سے سہارا لیتا ہوا، دھیرے دھیرے اوپر پہنچ گیا۔ دیوار پر پہنچ کر اس نے اندر کا جائزہ لیا۔ [illegible] دیوار سے چمٹا ہوا جھانکتا رہا، پھر خاموشی سے صحن میں اتر گیا اور دیوار کے ساتھ دبک

کر بیٹھ گیا۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ دیر تک جب کوئی کھٹکا نہ ہوا تو لالی اٹھا اور اس دروازے کی جانب بڑھا جو باہر گلی میں کھلتا تھا۔

لالی نے دروازہ کھولا۔ گردن باہر نکالی۔ آہستہ سے سیٹی بجائی اور ہاتھ کے اشارے سے رحیم داد کو اپنے قریب بلایا۔ رحیم داد اس کے پاس گیا اور گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ لالی نے دروازہ بند کر دیا، مگر کنڈی نہیں لگائی۔ دروازے کے سامنے صحن تھا۔ ایک طرف شیشم کا پیڑ تھا۔ اس کے نیچے پتل تھا جس میں ایک بھینس بندھی تھی۔ صحن سے ملا ہوا دالان تھا۔ اس پر پھوس کی خمیدہ چھت تھی۔ دالان کے عقب میں دروازہ تھا۔ اس کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا۔ روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔

لالی نے رحیم داد کو بیرونی دروازے پر ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ خود ہولے ہولے چلتا ہوا دالان میں پہنچا اور دروازے سے لگ کر اندر جھانکنے لگا۔ کچھ دیر وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

چھت سے لالٹین لٹک رہی تھی۔ مگر اس کی روشنی دھیمی تھی۔ لالی نے ہلکی ہلکی روشنی میں دیکھا۔ دیوار کے پاس چارپائی تھی۔ اس پر بستر بچھا تھا۔ مگر بستر خالی تھا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ ایک اور دروازہ بھی تھا۔ یہ ملحقہ کوٹھری میں کھلتا تھا۔ اس دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اندر ہلکی ہلکی روشنی تھی۔

کمرے میں عجب نامانوس سی بو پھیلی تھی۔ ایسی بو، جو اس سے پہلے لالی نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس پراسرار بو نے کمرے کا ماحول آسیب زدہ بنا دیا تھا۔ کسی ان جانے خوف سے لالی کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ واپس چلا جائے۔ عین اسی وقت کوٹھری کے اندر گہری گہری سانسیں بھرنے کی سرسراہٹ ابھری۔ لالی نے آہستہ سے چاقو نکال کر کھولا اور کوٹھری کے دروازے کی جانب چوکنا نظروں سے دیکھنے لگا۔ ایک منٹ گزرا، دوسرا گزرا۔ کوئی نہیں آیا۔ گہری گہری سانسوں کی سرسراہٹ بھی بند ہو گئی۔ لالی کی نگاہ لکڑی کے اس صندوق پر پڑی جو چارپائی سے ذرا ہٹ کر رکھا تھا۔

لالی نے صندوق دیکھتے ہی واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے ہاتھ اونچا کیا۔ لالٹین کی لو اور دھیمی کر دی۔ آگے بڑھا اور صندوق کے قریب جا کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ صندوق کے کنڈے میں تالا پڑا تھا، مگر تالا کھلا تھا۔ اس میں کنجی بھی لگی ہوئی تھی۔ لالی کو کسی قدر حیرت بھی ہوئی۔ لیکن اس پر توجہ صرف کرنے کے بجائے اس نے آہستہ سے ایک ہاتھ سے ڈھکنا اٹھایا اور دوسرا ہاتھ

اندر ڈال کر کپڑے تلاش کرنے لگا۔ کپڑے نیچے تھے۔ اوپر ایک موٹی کھیس تہہ کر کے رکھی گئی تھی۔

لالی نے ایک کپڑا نیچے سے نکالنے کی کوشش کی، اچانک اسے اپنی پشت پر آہٹ سنائی دی۔ ساتھ ہی آواز آئی۔

”وے کون ہے؟“

لالی نے پلٹ کر دیکھا، کوٹھری کے دروازے کے بیچوں بیچ ایک عورت کھڑی ہے۔ اس کے بال بکھر کر چہرے پر آ گئے تھے۔ آنکھیں جنگلی کبوتر کی مانند گہری سرخ تھیں۔ اس کے داہنے ہاتھ میں چھری تھی اور خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ دھندلی روشنی میں عورت خوں خوار اور ڈراؤنی نظر آ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ لالی کی جانب بڑھی۔ لالی اسے دیکھ کر سخت حواس باختہ ہو گیا۔ صندوق کے اندر پڑا ہوا ہاتھ بھی باہر نہ نکال سکا۔ جس حالت میں تھا، اسی حالت میں دم بخود بیٹھا رہا۔ لالی کو خاموش دیکھ کر عورت گرجی۔

”سور دے پتر، چوری کرنے آیا تھا؟“

لالی کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی جانب دیکھ بھی نہ سکا۔ اس نے گردن جھکا لی اور خاموشی سے فرش تکنے لگا۔ عورت اس کے سر پر آ کر کھڑی ہو گئی اور اسی درشت لہجے میں بولی۔ ”تیرے بھی ٹوٹے کر کے اسی کے برابر لٹا دوں گی۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر کوٹھری کی جانب اشارہ کیا۔

”دیکھے گا؟ چل دیکھ لے، کھڑا ہو۔“

لالی چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ عورت نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا اور کوٹھری کے دروازے کی جانب انگلی اٹھا کر بولی۔ ”اٹھ چل۔“ لالی اس کی ہدایت پر سرکس کے سدھے ہوئے جانور کی طرح لڑکھڑاتے قدموں دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازے کے قریب پہنچا تو عورت نے ڈپٹ کر کہا۔

”اندر ٹر جا۔“

لالی خاموشی سے اندر چلا گیا۔ عورت بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گئی۔ کوٹھری صاف ستھری تھی۔ طاق میں چراغ بھی جل رہا تھا۔ اس کی زرد زرد روشنی میں سامنے چٹائی پر کوئی لیٹا تھا۔ اس کا پورا جسم چادر سے ڈھکا تھا۔ عورت نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ لالی نے دہشت زدہ ہو کر دیکھا، اس کی گردن کٹی ہوئی ہے۔ ہلکی ہلکی نامانوس بو اچانک تیز ہو گئی۔ مقتول کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور اس قدر ڈراؤنی تھیں کہ لالی نظر بھر کر نہ دیکھ سکا۔ عورت، لاش کے

سرہانے بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپ رہی تھی۔ لالی سہما ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"اسے کس نے کتل کر دیا؟"

"کون کرے گا اسے کتل؟" عورت نے لالی کو سرخ سرخ آنکھوں سے گھورا اور پاگلوں کی طرح سینے پر ہاتھ مار کر بولی۔ "اسے میں نے کتل کیا ہے، ہاں میں نے کیا ہے۔" اس نے خون سے آلودہ چھری لالی کے سامنے کر دی۔ اس نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "یہ بھی پچھ۔ یہ کون ہے؟" اس نے قدرے توقف کیا۔ "یہ میرا یار ہے۔"

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ عورت نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ وہ ابھی تک گہری گہری سانسیں بھر رہی تھی۔ لالی اسے دیکھتا رہا۔ وہ اپنی عمر کی اس سرحد پر تھی جب جوانی کی دوپہر کا سورج ڈھلنے لگتا ہے۔ اس کے ہاتھ سخت اور کھردرے تھے۔ جسم کسا ہوا اور مضبوط تھا۔ چہرہ کڑی محنت اور تیز دھوپ سے سنولا کر صندلیں ہو گیا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں بجھ کر دھندلا گئی تھیں۔ چراغ کی دھندلی دھندلی روشنی میں لالی کو اب وہ نڈھال اور تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ کوٹھری کے ایک کونے میں مٹکا رکھا تھا اور اس پر المونیم کا گلاس بھی تھا۔ لالی نے رسان سے کہا۔

"پانی پی لے۔"

"پلا دے۔" عورت نے لالی کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ اس دفعہ اس کے لہجے میں پہلے جیسی درشتی نہیں تھی۔

لالی نے مٹکے کا ڈھکنا اٹھا کر گلاس اندر ڈالا اور پانی سے بھرا ہوا گلاس بڑھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ پورا گلاس اس طرح غٹاغٹ پی گئی گویا بہت دیر سے پیاسی ہو۔ پانی پینے کے بعد اس کے چہرے پر چھائی ہوئی وحشت کم پڑ گئی۔ اس نے دیوار سے پیٹھ نکالی اور چند لمحوں تک آنکھیں بند کئے بیٹھ رہی۔ مگر جلد ہی اس نے آنکھیں کھول دیں اور کھوئی کھوئی نظروں سے لاش کو دیکھنے لگی۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ "دیکھ تو کیسا گبھرو ہے۔"

لالی نے لاش کے چہرے کی جانب ایک بار پھر دیکھا۔ گھونگر والے لمبے لمبے بال، کھلتی ہوئی رنگت، تیکھے نقش و نگار اور مڑی ہوئی طرح دار مونچھیں۔ واقعی وہ بڑا وجیہہ اور بانکا جوان تھا۔ عورت رک رک کر کہتی رہی۔ "اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ پہلے اتنا سوہنا تھا۔ ایسا رنگ روپ تھا، ہاتھ لگاؤ تو میلا پڑ جائے۔ کوئی دیکھے تو دیکھتا رہ جائے۔" عورت اس کے ذکر میں لذت محسوس کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی سرخی رفتہ رفتہ ہلکی پڑتی جا رہی تھی۔ "اس کی میری یاری آشنائی ہو گئی۔ جانے کیسے ہو گئی۔ بس ہو گئی، فیر سب ہی کچھ ہوا، وہی جو ہوتا ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "جب بہت بدنامی ہوئی تب میں ایک رات اس کے ساتھ گھر سے نکل گئی۔ ہائے کیسی کالی رات تھی۔ اسی رات میں جہانگیرہ آ گئی۔ اس پنڈ کا نام جہانگیرہ ہے۔" وہ لاش کو دیکھتی رہی اور اس طرح ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ بولتی رہی جیسے خواب میں بڑبڑا رہی ہو۔

لالی نے اس کا بدلا ہوا انداز اور دھیما لہجہ محسوس کیا۔ "توں نے اس کا خون کیوں کر دیا؟"

عورت نے چونک کر اس طرح حیرت سے لالی کو دیکھا جیسے اسے یکسر فراموش کر چکی ہو۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے لالی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر لالی نے اسے خاموش نہیں رہنے دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ عورت سب کچھ کہہ ڈالے۔ وہ ساری باتیں کہہ دیتی تو ٹھنڈی پڑ جاتی۔ نہ اس کی آنکھیں خون خوار رہتیں نہ چہرہ ویران نظر آتا۔ بہت دنوں کی بات ہے۔ ایک بار حوالات میں اس کے ساتھ ایک قاتل بھی بند تھا۔ وہ ساری رات جاگتا تھا۔ کھا جانے والی نظروں سے گھورتا تھا۔ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرتا تھا۔ دوسرے ملزموں کا گلا گھونٹنے کے لیے جھپٹتا تھا۔ مگر جب اس نے پولیس کے سامنے سب کچھ اگل دیا تو واپسی پر حوالات میں آ کر دھڑام سے فرش پر گر گیا۔ مردے کی طرح ٹھنڈا پڑا رہا۔ ایسی گہری نیند سویا کہ دوسرے روز، زور زور سے جھنجھوڑنے پر جاگا۔

لالی نے اصرار کر کے عورت سے پوچھا۔ "بولتی کیوں نہیں؟ توں نے اس کا خون کیوں کر دیا؟"

"یہ نہ پچھ۔" عورت کی آنکھوں میں ایک بار پھر شعلے بھڑکنے لگے۔ وہ زور زور سے ہانپنے لگی۔ "اس نے میری طرف سے آنکھیں بند کر لیں، مجھے دھوکا دیا۔" وہ گلہ کرنے کے انداز میں کہنے لگی۔ "میں نے اس کے کارن گھر بار چھوڑا۔ اپنے دونوں نکے چھوڑے۔ گھر والے کو چھوڑا۔ وہ برا بندہ نہیں تھا۔ جان چھڑکتا تھا مجھ پر۔ جو کہتی کرتا تھا۔ بس ذرا..." اس نے نہایت بے باکی سے گالی دی اور سامنے پڑی ہوئی لاش کی جانب اشارہ کر کے نفرت اور غصے سے منہ بگاڑا۔ "یہ دھوکے باز نکلا۔ ایک دم ہڈ حرام، نہ کام کا نہ کاج کا۔ ہر وکھت مانگ کاڑھتا، مونچھیں مروڑتا، آڑا ترچھا ہو کر آئینہ دیکھتا۔ گلیوں میں اینڈتا پھرتا۔ شہر جا کر روز سینما دیکھتا۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اپنے زیور اور کپڑے لتے بیچ کر ایک مج خرید لی۔ دن رات محنت کرتی۔ نمبردار کی حویلی میں کام کاج کرتی۔ اپنا پیٹ پالتی اور اس کے نکھرے بھی پورے کرتی۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "اس کے لیے میں نے کیا نہیں کیا۔ اپنی ذرا بھی پروا نہ کی۔ میں ایسی نہ تھی۔ میرا ایسا روپ رنگ

نہ تھا۔ سب کچھ جل کر کوئلہ ہوگیا اور اس نے مجھے کیا دیا؟ میرا خانہ خراب کر کے کہیں اور آنکھ لڑالی۔"

عورت بات کرتے کرتے رک گئی۔ لاش کو گھورنے لگی۔ اس کا لہجہ تیکھا ہوگیا۔ "کہتا تھا شاداں! تیرے بنا زندہ نہیں رہ سکتا۔ ریل کے نیچے لیٹ جاؤں گا۔ گلے میں پھندا ڈال کر مرجاؤں گا۔" عورت کے لہجے میں تلخی بڑھتی گئی۔ اس کا چہرہ دحشت ناک ہوگیا۔ "جھوٹا' مکار۔ مجھے چھوڑ کے اس کنجری کے ساتھ چپکے سے نکاح کرلیا۔ ہفتوں نہ آتا۔ جب آتا' ہتھ پھیلائے ہوئے۔ کچھ لیے بنا نہ ٹلتا۔ میں جان بوجھ کر دھوکا کھاتی رہی۔"

وہ خاموش ہو کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود چھری ابھی تک دبی ہوئی تھی۔ مگر لالی کو اب اس سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ عورت اپنا خول توڑ کر آہستہ آہستہ باہر آرہی تھی۔

لالی چاہتا تھا کہ وہ کچھ بھی اپنے دل میں نہ رکھے۔ ہر بات کہہ ڈالے۔ کھرے سکے کی طرح ٹن ٹن بولنے لگے۔ لالی نے اسے کریدا۔

"یہ تو بتا' آج کیا ہوا؟"

وہ کھوئی کھوئی نظروں سے لالی کو دیکھتی رہی' پھر دھیرے دھیرے کہنے لگی۔ "آج شام' پورے تین مہینے بعد آیا تھا۔ پہلے تو ڈھیر سارا پیار جتایا۔ وہی ایکٹروں والی فلمی باتیں۔ روز روز سینما جو دیکھتا تھا۔ کہنے لگا' اپنی مُنج بیچ دے۔ اسے ادھار چکانا تھا۔ میں نے بار بار انکار کیا۔ وہ نہ مانا۔ اپنی ہی کہتا رہا۔ مجھے ایک دم کہہ آگیا۔ اٹھی اور جھلیانی سے چھری نکال لائی۔ چھری اس کے سامنے ڈال کر بولی۔ توں نے میرا خانہ خراب ہی کرنا ہے تو یہ چھری لے اور میرے گلے پر چلادے۔ میں جیتے جی تو اپنی مُنج بیچوں گی نہیں۔" وہ لمحے بھر رک کر بولی۔ "ایمان نال بتا' اپنی مُنج بیچ دوں گی تو میرا کیا بنے گا۔"

بات ادھوری ہی چھوڑ کے وہ پھر خاموش ہوگئی۔

لالی نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔ "شاداں! تیرا نام شاداں ہی ہے نا؟ تو چبا چبا کر کیوں بات کرتی ہے۔ یہ بتا' اس کا خون کیوں کردیا؟" وہ رفتہ رفتہ بے تکلف ہوتا جارہا تھا۔

"اس نے ایک ایسی بات کہی' میں غصے سے پاگل ہوگئی۔" شاداں اپنی بات کہتے کہتے ایک بار پھر بہکی۔

"میں نے تجھے اس کا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "ہوگا کوئی نام۔"

"بالا۔" اس نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ پڑا ہے بالا۔ اب تو بس نام ہی رہ گیا ہے۔"

لالی بیزاری سے بولا۔ "اس کا منہ ڈھک دے۔ آگے بتا۔"

شاداں نے جھک کر بالا کی لاش کا چہرہ چادر سے ڈھک دیا۔ "ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ چھری دیکھ کر وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ جب ہنس چکا تو منہ ٹیڑھا کر کے بولا۔ بوڑھی ڈھگی کے گلے پر تو کسائی چھری چلاتا ہے۔ میں ایسا کام نہیں کرتا۔ کسائی کے پاس چلی جا۔ مُنج میرے حوالے کردے۔ سنا توں نے' اس نے کیا کہا؟" وہ لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "اس نے مجھے بوڑھی ڈھگی کہا۔ کیا میں بوڑھی ڈھگی لگتی ہوں؟" اس کا چہرہ بجھ کر دھواں دھواں ہوگیا۔ اس نے گہری سانس بھری اور تڑپ کر بولی۔

"ہاں میں بوڑھی ڈھگی ہی لگتی ہوں۔ پر بوڑھی ڈھگی بھی تو میں اسی کے ہاتھوں بنی۔ اس نے میرا سب کچھ چھین لیا اور آنکھیں بھی پھیرلیں۔ ایک نمبر کنجر نکلا۔"

شاداں کی آنکھیں پھر خوں خوار ہوگئیں۔ اس نے چھری مضبوطی سے پکڑلی۔ "میں کچھ نہ بولی۔ چھری اٹھائی اور روتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس نے مجھے روکا بھی نہیں۔ آئینہ اٹھا کر اپنا حسن دیکھنے لگا' مونچھیں مروڑنے لگا۔ میں دیر تک اندھیرے میں بیٹھی روتی رہی۔ نہ وہ باہر آیا نہ میرے آنسو پونچھے۔ واپس آئی تو بستر خالی تھا۔ کوٹھری میں جا کر دیکھا تو آرام سے سو رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ سونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ بوڑھی ڈھگی کے ساتھ کیوں سوتا؟"

"فیر کیا ہوا؟" لالی نے بے قراری سے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا۔ میں کھڑی اسے گھورتی رہی۔ فیر دھیرے دھیرے اس کے پاس گئی اور سرہانے بیٹھ گئی۔ وہ اسی طرح آرام نال سوتا رہا۔ میں نے جل کر چاہا اس کے منہ پر تھوک دوں' پر میں نے تھوکا نہیں۔ چھری ہاتھ میں دبی تھی۔ اس کی گردن پر پھیردی۔ پورا گلا کاٹ دیا۔" یہ کہہ کر جیسے اس پر غشی طاری ہوگئی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سر دیوار سے ٹکالیا۔ وہ بے سدھ پڑی ہولے ہولے سانسیں لے رہی تھی۔

کوٹھری میں گہری خاموشی چھاگئی۔ فضا میں خون کی بو بسی ہوئی تھی۔

لالی جلد ہی اس خاموشی سے اکتاگیا۔ "اب تیں نوں کیہہ کرنا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" شاداں آنکھیں کھول کر رسان سے بولی۔ اس کی آواز اس قدر مبہم تھی' جیسے گھڑے کی اندر منہ ڈال کر بول رہی ہو۔

”کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ “

”بتا‘ کیا کروں؟“

لالی نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔ شاداں کی بڑی بڑی آنکھوں پر لمبی لمبی پلکوں کے سائے چھائے ہوئے تھے۔ چہرہ پچھلی رات کا چاند بن گیا تھا۔ اس وقت وہ اس شاداں سے قطعی مختلف تھی‘ جو کچھ دیر پہلے لالی کے سر پر خون سے لتھڑی ہوئی چھری تانے کھڑی تھی۔ جس کی آنکھوں میں شعلے دہکتے تھے‘ چہرے پر دہشت برستی تھی۔ لالی کو اب وہ ایسی عورت نظر آئی جو جوان تھی‘ سرکش تھی اور اپنی سفاکی کے باوجود قابل رحم بھی تھی۔ اسے شاداں سے لگاوٹ کی حد تک ہمدردی پیدا ہو گئی۔

”ایک بات کہوں‘ مان لے گی؟“

”بول۔ “ شاداں نے آہستہ سے کہا۔

”میرے ساتھ بھاگ چل۔ “

”تیرے ساتھ بھاگ چلوں؟“ شاداں نے غصے سے اسے گھورا۔ ”صورت دیکھی ہے اپنی۔ آخ تھو۔ “ اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

لالی کھسیانا ہو کر بولا۔ ”تو برا کیوں مانتی ہے؟ میں تو تیرے ہی بھلے کی کہہ رہا تھا۔ “

وہ اسے قہر آلود نظروں سے گھورتی رہی‘ پھر تیوری پر بل ڈال کر بولی ”وے دلّے‘ توں نے مجھے سمجھا کیا ہے؟ میں کوئی کنجری ہوں؟“ اس نے چھری لالی کے سامنے کر دی۔ ”یہ چھری دیکھی ہے؟“

مگر لالی اس کی دھمکی سے مرعوب نہیں ہوا۔ ”زیادہ اکڑ نہ دکھا۔ یوں بیٹھی رہے گی تو سدھی جیل جائے گی۔ “

وہ اسی طرح تیکھے لہجے میں بولی۔ ”جیل چلی جاؤں گی پر تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ “

”نہ جا‘ ہرگز نہ جا۔ بھول جا یہ بات۔ اپنے یار بالے کو بھی بھول جا۔ آگے کی سوچ۔ “

”مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔ توں جا یہاں سے۔ “

لالی ڈھٹائی سے بولا۔ ”میں تو نہیں جاؤں گا۔ “

”نہیں جائے گا؟“ وہ چھری تان کر غصے سے لالی پر جھپٹی۔ ”آنکھیں نکال لوں گی تیری۔ “ لالی نے جھٹ اس کی کلائی زور سے دبوچ لی۔ وہ بلبلا کر بولی۔ ”کنجر! میرا ہتھ چھوڑ۔ “

لالی نے چھری چھین لی‘ اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ”بول اب کیا کہتی ہے؟“ شاداں نے کوئی جواب

یں دیا۔ وہ اپنی ہزیمت پر غصے سے ہانپنے لگی۔

”دل سے میل نکال دے۔ میں اتنا برا بندہ نہیں ہوں جتنا تو سمجھ رہی ہے۔ “ لالی نے توقف لیا۔ ”جو ہونا تھا‘ ہو گیا‘ آگے کی سوچ‘ آگے کی۔ “

”میں نے ٹھیک نہیں کیا۔ “ وہ دل گرفتہ ہو کر بولی۔ ”مُنّ بچ دیتی تو کیا ہو جاتا؟“

”تو خود کو بھی بیچ دیتی‘ تب بھی وہ تیرا نہ بنتا۔ “

”سچ کہہ رہا ہے۔ پر میں اب کیا کروں۔ مجھے اب کچھ بھی چنگا نہیں لگتا۔ سب کچھ مک گیا۔ ارا کھیل ختم ہو گیا۔ “

لالی نے اس کی دکھتی رگ چھیڑی۔ ”تجھے اپنے بچے یاد نہیں آتے؟“

”آتے ہیں‘ بہت یاد آتے ہیں۔ “ ماتا کا جذبہ جاگ اٹھا۔ وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اب تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئے۔ جو نصیب میں لکھا ہے‘ پورا ہو گا۔ “

”نصیب کو چھوڑ۔ ہوش سے کام لے۔ “

وہ بے بسی سے بولی۔ ”کچھ سمجھ نہیں آتی‘ کیا کروں؟“

”میرا کہا مان۔ “ لالی نے بالے کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”زمین کھود کر اسے میں دبا دے۔ “ لالی نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ دور سے اذان بلند ہوئی۔ لالی گھبرا کر بڑبڑایا۔ صبح ہو گئی۔ “ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

شاداں نے ٹوکا۔ ”کہاں جائے گا؟ یہیں ٹھیر جا۔ میں اکیلے زمین کیسے کھودوں گی۔ “

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ رحیم داد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ چند لمحے خاموش کھڑا رہا‘ روہ دروازے کی جانب لپکا۔ شاداں نے پوچھا۔ ”نہیں رکے گا؟ اب تو اجالا ہو گیا۔ “ اس نے وٹھری کے روشن دان سے پھوٹتی ہوئی ہلکی ہلکی روشنی کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ”رات کو دھیرے میں چلا جاتا۔ “ اس کے انداز میں دبی دبی عاجزی تھی۔

”تو کہتی ہے تو نہیں جاؤں گا۔ باہر میرا ساتھی بیٹھا ہے۔ اسے لے کر آتا ہوں۔ “

لالی باہر چلا گیا۔ کمرے سے گزر کر آنگن میں پہنچا۔ اس نے دیکھا‘ رحیم داد دروازے کے برابر دار سے پیٹھ ٹکائے گہری نیند سو رہا ہے۔ لالی نے قریب پہنچ کر اسے جھنجوڑا۔ رحیم داد نے ہڑبڑا کر نکھیں کھول دیں۔ کھسیانا ہو کر بولا۔ ”یار! اونگھ آ گئی تھی۔ توں نے دیر بھی تو کتنی لگا دی۔ “ اس نے صبح کی ہلکی ہلکی روشنی دیکھی تو ایک دم گھبرا گیا۔

”صبح ہو گئی۔ اب کیا ہو گا؟“

"ٹھیک ہی ہوگا۔ ہم نے اب کہیں نہیں جانا۔ یہیں ٹھہریں گے۔"

رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر لالی کو دیکھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

لالی نے ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔ "میرے ساتھ آ۔"

دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کوٹھری کے دروازے پر پہنچے۔ شاداں ابھی تک اپنی جگہ بیٹھی تھی۔ لاش کے چہرے سے اس نے چادر اٹھا دی تھی اور کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

رحیم داد نے لاش دیکھی اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھیں تو سراسیمہ ہو کر دروازے پر ٹھہر گیا۔ حیران و پریشان ہو کر بولا۔ "یار! یہ کیا چکر ہے؟"

لالی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑھ کر چادر اور سرکا دی۔ رحیم داد نے دھندلی روشنی میں لاش کا کٹا ہوا گلا دیکھا تو خوف سے آنکھیں اور پھٹ گئیں۔ لالی نے لاش کا چہرہ چادر سے ڈھکتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ "دیکھ لیا تو نے؟ یہ چکر ہے۔" رحیم داد کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ دم بخود کھڑا رہا۔ لالی نے شاداں کی طرف نظریں اٹھائیں۔

"کھڑی ہو۔ بہت ہو چکا سیاپا۔"

مگر شاداں وہیں بیٹھی رہی۔ "مجھے یہیں بیٹھا رہنے دے۔ توں باہر جا۔" اس نے لاش کے چہرے سے پھر چادر ہٹا دی۔ رحیم داد اس کی ڈراؤنی آنکھیں نہ دیکھ سکا۔ پریشان ہو کر کوٹھری سے باہر چلا گیا۔

لیکن لالی اپنی جگہ کھڑا رہا۔ شاداں بڑبڑانے لگی۔ "وہی آنکھیں، وہی چلکتا متھا، وہی چھلے دار بال۔" وہ ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھا کرنے لگی اور لالی کی جانب دیکھے بغیر بولی۔ "لگتا ہے ابھی ابھی سویا ہے۔" وہ جھکی ہوئی اس کا چہرہ تکتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور بالے کے بے جان چہرے پر بکھرنے لگے۔ وہ بے قرار ہو کر اس کا ماتھا، اس کے ہونٹ چومنے لگی۔ اس نے سینے پر دو ہتڑ مارا اور دل دوز آہ بھر کر زور سے چیخی۔ "ہائے ربا، میں مر گئی۔" وہ لاش کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کوٹھری کی دھندلی روشنی میں گھٹی گھٹی سسکیاں ابھرنے لگیں۔

یکایک چراغ زور سے بھڑکا۔ کوٹھری کی دیواروں پر پرچھائیاں لہرائیں اور چراغ بجھ گیا۔ اندھیرا ہوتے ہی لالی اس طرح چونکا گویا سوتے سوتے آنکھ کھل گئی ہو۔ اس نے بوجھل آواز سے شاداں کو مخاطب کیا۔ "شاداں! اب اٹھ جا۔ بہت کر چکی پٹنی۔ وکھت کم ہے، ابھی بہت کام کرنا ہے۔"

شاداں پھر بھی نہ اٹھی۔ سسکیاں بھرتی رہی۔ لالی نے ڈپٹ کر کہا۔ "اٹھتی ہے کہ نہیں۔" شاداں چپ چاپ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لالی نے جھک کر بالے کے مردہ چہرے پر چادر ڈال دی۔ دونوں کوٹھری سے باہر آ گئے۔

رحیم داد کمرے میں گم صم کھڑا تھا۔ اس نے دونوں کو دیکھا مگر کوئی بات نہیں کی۔ لالی نے کوٹھری کا دروازہ بند کیا، کنڈی لگائی۔ شاداں کمرے کے ایک گوشے میں دیوار سے پیٹھ ٹکا کر فرش پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھوں اور کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے دھبے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ راکھ بن گیا تھا۔ آنکھیں ویران تھیں اور ابھی تک سرخ تھیں۔ لالی نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ کمرے سے نکل کر باہر آنگن میں گیا اور بیرونی دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ اب ہر سو صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ گھروں سے ملی جلی آوازوں کا شور آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ رات بھر کا سویا ہوا گاؤں بیدار ہو رہا تھا۔

لالی کمرے میں واپس آیا۔ رحیم داد خاموش کھڑا تھا اور شاداں اسی طرح کھوئی کھوئی بیٹھی تھی۔ اس نے لالی کی جانب نظر نہ اٹھائی۔ مگر لالی خاموش نہ رہا۔ اس نے شاداں کو مخاطب کیا۔

"یہ کپڑے تو بدل۔ جا فٹافٹ نہا لے۔"

لیکن شاداں اٹھنے پر آمادہ نہیں ہوئی۔ بیزاری سے بولی۔ "میں نوں کہیں نہیں جانا۔ یہیں بیٹھا رہنے دے۔ بہت تھک گئی ہوں۔"

"کیا چاہتی ہے؟ اگر تجھے جیل ہی جانا ہے تو مجھے کیوں روکا؟" شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی نے ڈپٹ کر کہا۔ "بولتی کیوں نہیں؟"

شاداں نے گردن اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ "کیا بولوں؟"

"جو کہہ رہا ہوں، وہ کر۔ کپڑے بدل لے۔ ج کو چھادتھا دے۔ ہمیں بھی روٹی کھلا۔ سخت بھوک لگی ہے۔ پہلے پانی پلا۔"

شاداں نے اس کی ساری باتیں خاموشی سے سنیں۔ اٹھی، باہر گئی اور کٹورے میں پانی بھر کر لائی۔ لالی نے کٹورا لیا اور غٹاغٹ پانی پینے لگا۔ شاداں نے صندوق سے کپڑے نکالے اور بغل میں دبا کر کمرے سے چلی گئی۔ رحیم داد کھسک کر لالی کے قریب پہنچا اور آہستہ سے پوچھا۔ "یار! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" وہ سخت پریشان تھا۔

"وہی جو دیکھ رہا ہے۔"

رحیم داد بے زاری سے بولا۔ "مخول نہ کر۔ صاف صاف بتا، معاملہ کیا ہے؟ کچھ سمجھ نہیں

آتی۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کو رکا اور کوٹھری کے دروازے کی جانب اشارہ کرکے بولا۔

"اسے تو نے کتل کیا ہے؟"

"گھاس تو نہیں کھا گیا؟ میں کیوں کتل کرنے لگا۔ خون کس کے ہاتھ اور کپڑوں پر لگا ہے؟ تجھے اتنا بھی دکھائی نہیں دیتا؟"

"تیرا مطلب ہے' اس زنانی نے کیا ہے؟" اس نے گردن موڑ کر باہر آنگن کی جانب دیکھا۔ شاداں وہاں نہیں تھی۔ رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔

"یہ تو بہت ظالم ہے۔"

"وہ اس سے بھی زیادہ ظالم تھا۔"

"ہو گا' مجھے تو یہ بہت خطرناک لگتی ہے۔ آنکھیں دیکھیں ہیں' کیسی لال لال انگارا ہیں۔"

"ڈرمت۔ ابھی اس کے سر پر خون سوار ہے۔ نہالے گی تو اتر جائے گا۔"

"گھروالا تھا اس کا؟"

"نہیں' اس کا یار تھا۔" لالی نے تفصیل سے ایک ایک بات رحیم داد کو بتا دی۔ وہ سب کچھ سن چکا تو پریشان ہو کر گویا ہوا۔ "یہ بتا' اب کرنا کیا ہے؟"

"زمین کھود کر لاش دبانی ہے۔"

رحیم داد سہما ہوا تھا۔ "یار! کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ شاداں مجھے ٹھیک نہیں لگتی۔"

"تو اسے نہیں جانتا۔ وہ ایسی ویسی زنانی نہیں ہے اور اگر بری ہے بھی تو اپنا کیا لے گی۔ اب تو اس کی ٹانگ بھی ہمارے ہی ساتھ بندھی ہے۔ چند روز یہاں چھپے رہیں گے۔ فیر آگے جانے کا پروگرام بنائیں گے۔ اس غار سے تو چنگی ہی جگہ ہے۔ روٹی بھی کھانے کو مل جائے گی اور کپڑے لتے بھی آرام سے مل جائیں گے۔"

دونوں چارپائی پر بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کرنے لگے۔

شاداں کمرے میں واپس آگئی۔ وہ ابھی ابھی نہا کر آئی تھی۔ اس کے گیلے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر تازگی تھی۔ اجلے لباس میں وہ رات والی شاداں سے مختلف لگ رہی تھی۔ نہ آنکھوں میں خون خوار چمک تھی نہ چہرے پر دحشت۔ اس کے ایک ہاتھ میں خون آلود کپڑے دبے تھے۔ لالی نے کپڑے اس سے لیے اور کوٹھری کی کنڈی کھول کر سارے کپڑے اندر ڈال دیئے۔ جب وہ کوٹھری کا دروازہ بند کرکے دوبارہ کنڈی لگا رہا تھا تو شاداں نے پوچھا۔

"میرے کپڑے لتے وہاں کیوں ڈال دیئے؟"

"لاش کے ساتھ ہی انھیں بھی دبادوں گا۔ چھری بھی رکھ دوں گا۔"

شاداں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں؟" پھر ذرا توقف سے بولی۔ "چھری تو دے دے۔ مجھے اس ضرورت ہوگی۔"

لالی بے پروائی سے بولا۔ "دوسری لے آنا۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں' کرنے دے۔ بیچ میں اپنی ل نہ اڑا۔"

شاداں نے خاموشی سے اس کی بات مان لی۔ "جیسی تیری مرضی" وہ دروازے کی جانب مڑی۔ یں تم دونوں کے لیے روٹی ٹکر لے آؤں۔"

لالی نے پوچھا۔ "تیں نوں کہیں دودھ تو نہیں پہنچانا؟"

"دودھی کو پہنچانا تو ہے۔ بعد میں پہنچا دوں گی۔ فکر نہ کر۔"

"نہیں' پہلے دودھ پہنچا دے۔ ہر کام ویسے ہی کر جیسے روز کرتی ہے۔ ہماری پروا نہ کر۔ ہم بعد ں بھی روٹی کھا لیں گے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کے لیے رکا۔ "گھر میں کوئی کدال گی؟"

"کدال تو ہے۔"

"بیلچا بھی ہو گا؟"

"نہیں' بیلچا نہیں ہے۔ پڑوس سے لے آؤں گی۔ ابھی لائی۔" شاداں دروازے کی جانب ھی۔

لالی نے فوراً ٹوکا۔ "ٹھیر جا شاداں! رہنے دے' بیلچے کے بغیر ہی کام چل جائے گا۔"

"پر اس میں ہرج کیا ہے!"

"بہت ہرج ہے۔ تو یہ باتیں نہیں سمجھتی۔ جیسا کہتا ہوں' ویسا کر۔ میرا کام مجھ پر چھوڑ دے۔ ل اپنا کام کر۔ منہ کیا تک رہی ہے میرا؟ جا کدال اور ایک ٹوکری لے آ۔"

شاداں باہر چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد کدال اور ٹوکری لے کر واپس آگئی۔ لالی نے کدال اور کری سنبھال کر رحیم داد سے کہا۔ "آ یار! تھوڑی سی کھدائی کر لیں۔ فیر اطمینان سے روٹی کھائیں ئے۔"

"پہلے کچھ کھا پی تو لے۔" شاداں نے اصرار کیا۔

"کھالیں گے' تو پہلے اپنا روز کا کام نمٹا لے۔ اور ہاں باہر جانا تو دروازے میں تالا ضرور ڈال

دینا۔" لالی نے چھت سے لٹکی ہوئی لالٹین اتاری' جو ابھی تک روشن تھی۔ اس نے لالٹین ہاتھ میں سنبھالی اور رحیم داد کے ہم راہ کوٹھری میں چلا گیا۔

اس نے اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ لالٹین کی بتی اونچی کردی۔ روشنی بڑھی اور پھیلی تو فرش پر چادر سے ڈھکی ہوئی لاش نظر آئی۔ رحیم داد خوف زدہ نظر آرہا تھا۔ مگر لالی نے لاش کی طرف مطلق توجہ نہ دی۔ اطمینان سے کدال اٹھا کر آہستہ آہستہ زمین کھودنے لگا۔ رحیم داد ٹوکری میں مٹی بھر کر ایک طرف ڈالنے لگا۔

زمین توقع کے خلاف اندر سے سخت نکلی۔ ایک بار لالی نے کدال چلائی تو زور سے ٹن کی آواز آئی۔ لالی نے ہاتھ روک لیا۔ جھک کر دیکھا تو ایک بھاری پتھر اڑا تھا۔ اسے نکالنے میں لالی اور رحیم داد پسینے پسینے ہوگئے۔ ذرا دم لینے کو رکے تھے کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ساتھ ہی شاداں کی آواز ابھری۔

"دروازہ کھول۔ میں ہوں شاداں۔"

لالی نے دروازہ کھول دیا۔ رحیم داد کے ہم راہ باہر آگیا۔ دونوں بہت تھکے ہوئے نظر آرہے تھے۔

شاداں نے آہستہ سے پوچھا۔ "ہوگیا کام؟"

لالی منہ بگاڑ کر بولا۔ "اتنی جلدی کیسے ہوجائے گا کام۔ کیا تو نے ہمیں گورکن سمجھ رکھا ہے؟"

"منہ ہاتھ دھولو۔ میں ابھی تمہارے لیے روٹی لاتی ہوں۔"

دونوں باہر آنگن میں گئے اور کنوئیں سے پانی نکال کر منہ ہاتھ دھونے لگے۔ اب ہر طرف زرد زرد دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ گلی میں بچے شور مچا رہے تھے۔ کہیں قریب دو عورتیں چیخ چیخ کر لڑرہی تھیں۔

رحیم داد نے یہ آوازیں سن کر بیرونی دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازہ بند تھا اور زنجیر چڑھی ہوئی تھی۔ دونوں آنگن میں زیادہ دیر نہیں ٹھہرے۔ کمرے کے اندر آکر چٹائی پر بیٹھ گئے۔

انھیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ شاداں ناشتا لے کر آگئی۔ ناشتے میں روٹی تھی' ساگ تھا۔ مٹی کی ٹھوٹھی میں تازہ تازہ مکھن تھا اور دو گلاسوں میں لسی تھی۔ دونوں کو سخت بھوک لگی تھی۔ وہ کھانے پر پل پڑے۔ شاداں ان کے قریب ہی بیٹھ گئی اور اصرار کرکے کھانا کھلانے لگی۔ بار بار مکھن نکال کر روٹی پر ڈال دیتی۔ اپنی بھینس کی اور اس کے دودھ کی تعریف کرتی۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے بال سنوار لیے تھے۔ اس کے چہرے پر ہلکا ہلکا دکھ کا سایہ تھا۔ آنکھوں میں جلتے بجھتے

اغ روشن تھے۔ اس کے جسم سے پسینے کی ہلکی ہلکی مہک اٹھ رہی تھی۔ وہ لالی کے بالکل قریب ہی تھی۔ اتنے قریب کہ لالی اس کے جسم کی مہک محسوس کرسکتا تھا۔ لالی کو اس کا اس طرح منے بیٹھ کر چاؤ سے کھانا کھلانا بہت اچھا لگا۔ وہ کچھ زیادہ ہی کھا گیا۔

اس نے لسی کا پورا گلاس چڑھایا اور زور سے ڈکار لی۔ "مزا آگیا۔" اس نے مڑ کر شاداں کو بلھا۔ وہ بڑی طرح دار عورت تھی۔ اس کے چہرے پر ڈھلتی دھوپ کی جگمگاہٹ تھی۔ شاداں نے ردن کو خم دے کر دروازے کی جانب دیکھا۔ لالی کو شاداں کا یہ انداز بھا گیا۔ مسکرا کر اس سے طب ہوا۔ "شاداں! تو بہت زور آور ہے۔ سوہنی بھی ہے۔ کیا بات ہے تیری۔" وہ اپنی بات کہتے تے رکا۔ "سچ جان۔ بالا تجھے پہچان نہیں سکا۔ بیچ اور گھٹیا تھا۔"

شاداں نے جھٹ لالی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسی بات مت کر۔" اس کا ہاتھ کھردرا اور ت تھا' لہجہ بھی کھردرا تھا۔

"توں میرے سامنے ایسی گل نہیں کہہ سکتا۔"

"وہ تجھے بھی ئ سمجھتا تھا۔ دودھ دینے والی ئ۔ بوڑھی ہوجائے تو کسائی کے کھونٹے سے باندھ ۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

شاداں کو اس کی بات پسند نہیں آئی۔ تلملا کر چیخی۔ "یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔ توں کون نا ہے بولنے والا؟ تھانے دار ہے؟"

لالی کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ انگلی سے سر کھجاتے ہوئے نرمی سے گویا ہوا۔ "یہ بتا....."

شاداں بات کاٹ کر بے زاری سے بولی۔ "مجھ سے کچھ نہ پوچھ۔" وہ ابھی تک ناراض تھی۔ ا نے کوئی بات نہیں کی۔ چپ بیٹھا رہا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔

رحیم داد خاموشی سے اکتا کر بولا۔ "مجھے تو اونگھ آرہی ہے۔ لالی! تیرا کیا ارادہ ہے؟"

لالی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شاداں بول پڑی۔ "سو جاؤ کچھ دیر۔ رات بھر کے جاگے ہوئے ۔"

شاداں کے لہجے میں پہلے جیسی تلخی نہیں تھی۔ لالی نے اس کا بدلا ہوا انداز دیکھا تو اسے مخاطب با۔ "تجھے بھی تو نیند آرہی ہوگی۔ تو سوئی کب۔"

"میری فکر نہ کر۔ میری آنکھوں میں بالکل نیند نہیں۔ دودھی کو دودھ پہنچانا ہے۔ ملک کی حویلی کام کرنے جانا ہے۔ اور بھی بہت کام دھندا کرنا ہے۔" وہ کھڑی ہوگئی۔ "دروازہ اندر سے بند کر ا۔ ویسے جب میں باہر جاؤں گی تو تالا ڈال جاؤں گی۔" شاداں کمرے سے باہر چلی گئی۔

رحیم داد نے اٹھ کر دروازہ بند کیا۔ دونوں وہیں چٹائی پر ٹانگیں پسار کے لیٹ گئے۔ رحیم داد کچھ دیر جاگتا رہا اور بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ لالی لیٹتے ہی سو گیا۔ کچھ دیر بعد رحیم داد کو بھی نیند آ گئی۔

دونوں تھکے ہوئے اور رات بھر کے جاگے ہوئے تھے‘ بے خبر ہو کر سو گئے۔ انھیں کچھ بھی خبر نہ ہوئی کہ شاداں کب گھر سے باہر گئی۔

☆

کمرے میں ہلکا‘ ہلکا اندھیرا چھایا تھا۔ باہر آنگن میں گہری خاموشی تھی۔ شاداں ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ دونوں اٹھ کر کوٹھری میں چلے گئے۔ دن کی دھندلی دھندلی روشنی میں کھدائی کرتے رہے۔ جب اندھیرا بڑھ گیا تو لالی نے لالٹین روشن کر لی۔ کھدائی مشکل تھی۔ بار بار کدال پتھروں سے ٹکرا کر پلٹ جاتی۔ مگر انھوں نے ہاتھ نہیں روکا۔ لالی تھک جاتا تو رحیم داد کدال سنبھال لیتا۔ دونوں باری باری ڈیوٹی بدلتے رہے۔

بہت دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ لالی نے دروازہ کھولا۔ سامنے شاداں کھڑی تھی۔ لالی اور رحیم داد کوٹھری سے نکل کر کمرے میں آ گئے۔ انھوں نے دیکھا‘ باہر آنگن میں اندھیرا پھیلا ہے۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ گاؤں پر بھی سناٹا چھا گیا تھا۔ شاداں نے آہستہ سے پوچھا۔

”کتنا کام رہ گیا ہے؟“

”ابھی بہت کام ہے۔ میں زمین زیادہ گہری کھودنا چاہتا ہوں۔“

”روٹی کھا لے۔“

لالی آمادہ نہ ہوا۔ ”ابھی نہیں‘ کام ختم کرنے کے بعد۔“ رحیم داد نے بھی لالی سے اتفاق کیا۔ دونوں جلد سے جلد کام نمٹا دینا چاہتے تھے۔

شاداں نے جھک کر سرگوشی کی۔ ”کدال آہستہ چلا۔ آواز سنائی پڑتی ہے۔“

لالی نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ ”ڈھول بجانا شروع کر دے۔“

”مسکری نہ کر۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”تجھے ڈر بھی لگتا ہے؟“

شاداں جھینپ کر رہ گئی۔ لالی نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ وہ رحیم داد کے ہم راہ کوٹھری میں چلا گیا۔ کھدائی شروع ہو گئی۔ اس دفعہ دونوں سنبھال سنبھال کر کدال چلا رہے تھے تاکہ آواز پیدا نہ ہو۔ مگر اس طرح کھدائی کی رفتار سست پڑ گئی۔ آدھی رات سے کچھ پہلے انھوں نے خوب گہری قبر

ھودلی۔ دونوں نے لاش اٹھائی اور نیچے اتارنے لگے۔

اسی وقت شاداں دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ اس نے آتے ہی لاش کے چہرے سے چادر اٹھا ی اور گہری نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ بالے کا بے جان چہرہ مٹیالا پڑ چکا تھا۔ آنکھیں کھلی ہوئی یں اور پہلے سے زیادہ ہی بے نور ہو گئی تھیں۔ لاش سے ہلکی ہلکی بدبو اٹھ رہی تھی۔ لالی نے اداں کو زیادہ دیر وہاں ٹھہرنے نہیں دیا۔ اس بار شاداں نے اپنے سینے پر نہ دوہتڑ مارا‘ نہ چیخی‘ نہ دئی چپ چاپ باہر چلی گئی۔

لالی اور رحیم داد نے اس کے جاتے ہی لاش بستر میں لپیٹ کر نیچے لڑھکا دی۔ شاداں کے خون لود کپڑے اور چھری بھی ڈال دی اور جلدی جلدی پتھر اور مٹی ڈال کر گڑھا بھرنے لگے۔ گڑھا رنے کے بعد جو مٹی بچ گئی‘ وہ انھوں نے کوٹھری میں پھیلا کر برابر کر دی۔ رحیم داد بالٹی میں پانی لے آیا۔

لالی نے کوٹھری کے فرش پر پانی چھڑک دیا۔ جب ہر کام لالی کی مرضی کے مطابق ہو گیا تو وہ وٹھری کا دروازہ بند کر کے رحیم داد کی ساتھ باہر آ گیا۔

شاداں دالان میں چپ بیٹھی تھی۔ لالی نے آتے ہی کہا۔ ”فٹافٹ روٹی لا۔ بہت بھوک لگی ہے۔“

شاداں خاموشی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ جب وہ جانے لگی تو لالی نے ٹوکا۔ ”کل کوٹھری میں لڑیاں یا بھوسا بھر دینا اور اس میں تالا لگا دینا۔ تجھ سے یہ کام نہ ہو تو ہم دونوں کر دیں گے۔ فکر نہ ر۔ سب کام ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔“

شاداں کھوئی کھوئی کھڑی رہی پھر خاموشی سے چلی گئی۔

☆

موسم اچانک بدل گیا۔ رات کسی قدر گرم تھی۔ ہوا بھی بند تھی۔ فضا غبار آلود تھی۔ شاداں نے اصرار بھی کیا مگر رحیم داد اور لالی چارپائی پر نہ لیٹے۔ چارپائی دالان میں پڑی تھی۔ شاداں نے لا ڈال دی تھی۔

دونوں اس پر نہ لیٹے تو شاداں خود لیٹ گئی۔ لالی اور رحیم داد جلدی سو گئے۔ صبح بہت تڑکے اداں نے دونوں کو بیدار کیا۔ مگر دونوں پر نیند کا غلبہ تھا۔ وہ دالان سے اٹھ کر کمرے میں جا کر سو ئے اور دیر تک بے خبر سوتے رہے۔

[illegible]‘ شاداں نے آ کر پھر انھیں جگایا۔ لالی کو اشارے سے دالان میں بلایا۔ وہ گھبرائی ہوئی

نظر آ رہی تھی۔ "یہ جو تیرا ساتھی رحیمے ہے، جیل سے بھاگا ہوا کیدی تو نہیں ہے؟"

لالی انکار نہ کر سکا۔ "ہے تو۔ توں نے اس کی جیل کی وردی نہیں دیکھی؟"

"اور تو بھی جیل سے بھاگا ہے؟"

لالی کو تشویش ہوئی۔ "تجھے کیسے پتہ چلا؟"

"میں ملک کی حویلی میں گئی تھی۔"

لالی نے اسے اپنی بات مکمل نہ کرنے دی۔ بیچ میں بول پڑا۔ "یہ ملک کون ہے؟"

"پنڈ کا لمبردار ہے۔ اس کا نام ملک اللہ نواز ہے۔ ملک کی حویلی میں تھانیدار بیٹھا تھا۔"

لالی نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "تھانیدار اس کی حویلی میں کس لیے آیا تھا؟"

"جب سے ادھر تھانیدار لگا ہے، روز ہی ملک کے پاس آتا ہے۔ وہ ملک کا بھائی جو ہے۔" شاداں نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔ "تھانیدار کہتا تھا۔ دو کیدی جیل سے بھاگ گئے۔ ابھی تک پکڑے نہیں گئے۔ پولیس ان کی کھوج میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔" شاداں نے لالی کے چہرے کی جانب دیکھا جس پر پریشانی چھا رہی تھی۔ "اس کی گلاں سن کر میرا متھا ٹھنکا۔ مجھے جھٹ تم دونوں کی یاد آئی۔ رحیمے پر تو مجھے پہلے ہی کچھ شبہ ہوا تھا۔"

"تجھ سے تو تھانیدار نے کچھ نہیں پوچھا۔"

"مجھ سے کیوں پوچھتا؟ پر یہ ضرور کہتا تھا، ہر تھانے میں تم دونوں کی تصویریں لگا دی گئی ہیں۔ پورے دو ہزار پکڑوانے والے کو انعام ملے گا۔"

"پہلے روٹی ٹکر دے، فیر گل بات ہوگی۔"

لالی کمرے میں آگیا۔ اس نے رحیم داد کو ہر بات بتا دی۔ تھوڑی دیر بعد شاداں لسی لے آئی۔ لسی کے ساتھ رات کی باسی روٹی بھی تھی۔ شاداں اس وقت بھی ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ لالی نے لسی پیتے پیتے پوچھا۔

"بالے کے کپڑے لتے تو تیرے پاس ہوں گے؟"

"ایک ایک لتا لے گیا تھا۔ وہ اپنی ہر چیز لے گیا۔ اس کنجری کے لیے میرے راکھواں کپڑے لتے تک چرا لے گیا۔ جادو کر دیا تھا اس پر۔ میلے سے ڈھیروں چیزیں میرے لیے لاتا تھا، پر یہ بہت پہلے کی گل ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ بات کرتے کرتے یادوں کے سہارے بہت دور چلی گئی۔

"چھوڑ یہ باتیں۔ کام کی بات سن۔ تجھے رحیمے کے لیے کمیص اور دھوتی لانی ہے۔ جوتا بھی لانا ہوگا۔ جوتا تو مجھے بھی چاہئے۔ یہ سب کچھ آج ہی کرنا ہوگا۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا بالے کے لیے چاہئے ہے۔"

لالی نے اپنی ڈاڑھی کے بڑھے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ "اس پنڈ میں داڑھی مونڈنے کے لیے بلیڈ شلیڈ بھی مل جائے گا؟ یہ تو بہت وڈا پنڈ ہے۔ موضع لگتا ہے۔ یہاں تو سب کچھ ملتا ہوگا۔"

"پنڈ میں نائی بھی ہے۔ اسے بلا لاؤں؟" شاداں نے نہایت سادگی سے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "نہیں، نائی کا یہاں آنا ٹھیک نہیں۔ میں نے تمہارے بارے میں کسی کو بتایا بھی نہیں۔"

رحیم داد نے تاکید کی۔ "بتانا بھی نہیں۔ کوئی پوچھے تب بھی نہ بتانا۔"

شاداں ہاتھ ہلا کر بولی۔ "فکر نہ کر، کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

لالی نے اسے ٹوکا۔ "جو کام میں نے بتایا ہے، فٹافٹ کرنا ہے۔ اب تو جا۔"

اس کے جانے کے بعد دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، آخر کمرے کا دروازہ بند کر کے فرش پر لیٹے اور سو گئے۔ دن ڈھلے شاداں واپس آئی۔ اس نے آتے ہی لالی اور رحیم داد کو اپنی کارگزاری سنائی۔ قمیص کا کپڑا خرید کر اس نے گاؤں کے درزی کو سلنے کے لیے دے دیا تھا اور اس سے دوسرے روز سہ پہر تک قمیص تیار لینے کا وعدہ بھی لے لیا۔ جوتوں کے بارے میں اس نے بتایا کہ بدھ کو بازار میں ملیں گے۔ بازار لگنے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ دھوتی کے بارے میں اس نے بتایا کہ اسے بھی بازار سے خرید لے گی۔ البتہ وہ گاؤں کی دکان سے ایک عدد بلیڈ خرید لائی تھی۔ لالی اس کی کارگزاری سن کر بہت خوش ہوا۔ جیب سے نوٹ نکال کر بولا۔ "میں نے پیسے تو تجھے دیئے ہی نہیں تھے۔ بھول گیا تھا۔ بول کتنے دے دوں؟"

وہ منہ بگاڑ کر بولی۔ "رہنے دے اپنے روپے۔ رکھ لے، آگے کام آئیں گے۔ میں ملک کی گھر والی سے کچھ روپے لے آئی تھی۔ کام چل جائے گا، فکر نہ کر۔"

شاداں زیادہ دیر ان کے پاس نہ ٹھہری۔

ابھی اسے گھر کا بہت کام کاج کرنا تھا۔ وہ بڑی جفاکش اور محنتی عورت تھی۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی۔ کہیں ٹک کر نہ بیٹھتی۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں، کبھی ادھر، کبھی ادھر، کسی لمحے قرار نہ تھا۔ جاتے ہی وہ بھینس کے لیے چارہ کاٹنے بیٹھ گئی۔

بلیڈ ہاتھ آیا تو لالی کو ڈاڑھی کے بال صاف کرنے کی سوجھی۔ رحیم داد کو ایسا شوق نہیں چرایا۔ ویسے اس کی ڈاڑھی کے بال اتنے بڑھ گئے تھے کہ بلیڈ سے مونڈنا آسان نہیں تھا۔ مگر اس نے کپڑے دھونے کا صابن اور پانی ملا کر لالی کی ڈاڑھی کے بال کسی نہ کسی طور صاف کر دیئے۔

داڑھی ٹھیک سے نہیں منڈی تھی۔ چہرے پر کئی جگہ بلیڈ کے چرکے بھی لگ گئے تھے' مگر لالی خوش تھا۔ آئینہ ہاتھ میں لے کر بار بار اپنی صورت دیکھتا تھا۔

شام ہوتے ہی دونوں لالٹین لے کر کوٹھری میں گھس گئے۔ مٹی خشک ہو کر جم گئی تھی۔ انھوں نے معائنہ کرنے کے بعد لکڑیاں اور دوسرا کاٹھ کباڑ کوٹھری میں بھر دیا۔ دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ شاداں کوٹھری خالی رکھنا چاہتی تھی۔ مگر لالی نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ جو مرضی میں آیا وہی کیا۔

رات کو کھانا کھاتے ہوئے لالی نے شاداں کے سامنے بالے کا پھر ذکر چھیڑ دیا۔ اس مرتبہ بھی اس نے بالے کو اچھے الفاظ سے یاد نہیں کیا۔ شاداں ایک دم بھڑک اٹھی۔

"توں چاہتا کیا ہے؟"

لالی نے اپنے صفاچٹ رخساروں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتا ہوں توں اسے بھول جا۔ اس سے نفرت کرنے لگے۔"

شاداں جل کر بولی۔ "اور تیرے ساتھ بھاگ جاؤں؟" اس نے حقارت سے اپنا منہ بگاڑا۔ "توں سمجھتا کیا ہے داڑھی منڈوا کر تو گبھرو بن گیا۔ جا' باہر چاندنی میں پیشاب کر کے اپنی شکل دیکھ لے۔"

وہ اس کی بات کی تلخی نظرانداز کر گیا۔ "میرا کہا مان' اپنے بال بچوں کے پاس چلی جا۔ بہت یاری آشنائی کر لی۔"

"میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ کہیں نہیں جاؤں گی۔" وہ بیزاری سے بولی۔

لالی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گویا ہوا۔ "تو کیسی ماں ہے' ایک میری ماں تھی۔ میرے پیؤ نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ مجھ سے ملنے راتوں کو چھپ چھپ کر آتی تھی۔ گھر کے راستوں پر دن دن بھر میرا انتظار کرتی تھی۔ کئی بار میرے پیؤ نے اسے بالوں سے پکڑ کر مارا' پر وہ باز نہ آئی۔ ایک بار اس کے سر پر ایسا گھما کر سوٹا مارا' وہیں ڈھیر ہو گئی۔ سانس بھی نہ لی۔ پیؤ کو لمبی جیل ہوئی۔ جانے زندہ ہے کہ مر گیا۔" لالی آہستہ آہستہ یادوں کے چراغ جلاتا رہا۔ اس نے گہری سانس بھر کر کہا۔

"مگر وہ ماں تھی۔"

شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی بھی نہ بولا۔ رحیم داد بھی خاموش تھا۔ تینوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ آنگن میں چاندنی اتر آئی تھی۔ اس کی رنگت کفن کی طرح سفید تھی۔ رات نڈھال کھڑی تھی۔

تینوں اپنے اپنے دکھوں کی پگڈنڈیوں پر بھٹک رہے تھے۔ کچھ دیر بعد شاداں اٹھی اور خاموشی سے بستر پر جا کر سو گئی۔

لالی اور رحیم داد بھی اپنی اپنی جگہ سو گئے۔

نہ جانے رات کتنی گزر چکی تھی۔ اچانک لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا' شاداں اس کے سرہانے بیٹھی ہے۔

لالی نے کچھ کہنا چاہا تو شاداں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور آنگن کے آخری سرے پر لے گئی۔ اجلی چاندنی میں اس کا چہرہ نکھر گیا تھا۔ آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔ وہ گردن کو خم دے کر ایسے زاویے سے کھڑی تھی کہ بھرپور عورت نظر آ رہی تھی۔ لالی چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ آہستہ سے بولی۔

"میری ایک گل مان لے گا؟"

"بول کیا کہتی ہے؟"

شاداں نے اس کا ایک ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ شاداں کا ہاتھ گرم بھی تھا اور گداز بھی۔ لالی کو اس وقت ایسا ہی محسوس ہوا۔ اس کی سانس تیز ہو گئی۔

شاداں کھسک کر لالی کے قریب آ گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بے ساختہ لالی سے چمٹ جائے گی۔ مگر شاداں نے ایسا نہیں کیا۔ جھکی اور جھک کر پیر سے جوتی نکالی۔ جوتی لالی کے ہاتھ میں دی اور تیکھے لہجے میں گویا ہوئی۔

"مجھے اس سے مار۔"

لالی گھبرا گیا۔ "کیوں؟"

"پہلے مجھے مار' فیر بتاؤں گی۔"

لالی خفا ہو کر بولا۔ "صاف صاف بتا۔"

"دھیرے بول۔"

لالی نے آہستہ سے استفسار کیا۔ "تو چاہتی کیا ہے؟"

وہ تڑپ کر بولی۔ "ہائے میں مر گئی۔ میں نے ملک سے صاف صاف بتا دیا' تم دونوں میرے گھر میں چھپے ہو۔" اس نے نظریں جھکا کر ٹھنڈی سانس بھری۔ "دو ہزار کے لالچ نے مجھے اندھا کر دیا۔

سوچا ایک بچہ اور خرید لوں گی۔ میں نے ٹھیک نہیں کیا۔" یہ کہتے کہتے وہ بے قرار ہو گئی۔ "لالی مجھے مار۔ مارتا کیوں نہیں؟ میں تیرے آگے ہتھ جوڑتی ہوں۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ لالی کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر وہ اس سے صرف اتنا کہہ سکا۔

"توں نے جو کرنا تھا' کر چکی۔ اب مجھے بتا کیوں رہی ہے؟" اس نے شاداں کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "توں نے یہ نہیں سوچا' مجھے اور رحیمے کو پکڑوا کر تو بھی تو پھنس جائے گی۔ توں نے بالے کا خون جو کیا ہے۔ یہ بھول گئی؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اب آگے کی سوچ۔ ملک اپنی گھوڑی پر تھانے گیا ہے۔" شاداں نے خوف زدہ نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا اور سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ "پولسے آتے ہی ہوں گے۔ تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ۔ جہانگیرہ سے دور نکل جاؤ۔"

لالی نے خطرہ سر پر منڈلاتا محسوس کیا۔ وہ سخت پریشان ہو گیا۔ لپک کر رحیم داد کے پاس گیا۔ اسے جھنجھوڑ کر گہری نیند سے بیدار کیا۔ صورت حال سے آگاہ کیا۔

رحیم داد بھی پریشان ہو گیا۔ دونوں فوراً چلنے پر کمربستہ ہو گئے۔ شاداں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلی۔ لالی کے منع کرنے کے باوجود چلی۔ تینوں گھر سے باہر نکلے۔ شاداں آگے' آگے چل رہی تھی۔ لالی چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا جا رہا تھا۔

گاؤں سنسان تھا۔ انھوں نے مشکل سے دو فرلانگ فاصلہ طے کیا ہو گا کہ رات سناٹے میں بھاری' بھاری بوٹوں کی آواز ابھری۔ لالی فوراً بھانپ گیا کہ یہ پولیس والوں کے قدموں کی آہٹ ہے۔ اس نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ تیزی سے آگے بڑھا اور جھپاک سے قریب کے کھیتوں میں گھس گیا۔

لالی اور رحیم داد اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے' پودوں سے الجھتے' گندم اور جو کی فصلوں کے درمیان راستہ بناتے۔ آگے اور آگے بڑھتے گئے۔

۴

دور سے ریل کے انجن کی چنگھاڑ سناٹے میں ابھری۔ ساتھ ہی لوہے کی پٹڑیاں کھٹ کھٹ بجنے لگیں۔ رحیم داد اور لالی سراسیمہ ہو کر ٹھہر گئے۔ پلٹ کر ادھر دیکھنے لگے جدھر سے ریل گاڑی آ رہی تھی۔ اب ریل کی پٹڑی پر کھڑے رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ دونوں نشیب میں اترے اور ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ پٹڑیوں پر ریل گاڑی دوڑنے کی آواز رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔

ذرا ہی دیر بعد سرمئی دھندلکے میں انجن کی تیز روشنی ابھری۔ دیکھتے دیکھتے ریل گاڑی ان کے سامنے آ گئی۔ دونوں چپ چاپ کھڑے اسے گزرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پہلے انجن دھاڑتا ہوا گزرا' پھر ایک ڈبا' دوسرا ڈبا' تیسرا ڈبا گزرا۔ پھر فرسٹ کلاس کا ڈبا سامنے آیا۔ ایک کھڑکی کھلی۔ دو ہاتھ ایک سوٹ کیس اٹھائے باہر نکلے۔

سوٹ کیس کھڑکی سے نیچے گرا اور پٹڑی کے نشیب میں دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ریل گاڑی کھٹ کھٹ کرتی تیزی سے آگے نکل گئی۔

سب کچھ "آناً فاناً" ہوا۔ دونوں حیران و پریشان جہاں تھے' وہیں کھڑے رہے۔ سوٹ کیس چند گز کے فاصلے پر ان کے سامنے پڑا تھا۔ وہ چند لمحے تک اسے حیرت سے تکتے رہے' پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ سیاہ چمڑے کا سوٹ کیس تھا۔ رحیم داد نے بے صبری سے جھک کر اسے اٹھانا چاہا۔

لالی نے روک دیا۔ "ٹھہر جا رحیمے!"

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں؟"

لالی نے مشتبہ نظروں سے سوٹ کیس دیکھا۔ “مجھے تو کچھ گڑ بڑ نظر آتی ہے۔” وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ہچکچاتے ہوئے بولا۔ “یار! اس کے اندر کہیں کٹی پھٹی لاش نہ رکھی ہو۔”

رحیم داد نے خوف زدہ ہو کر لالی کو دیکھا اور سہمے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ “دیکھنے میں بھی بھاری بھاری لگتا ہے۔”

لالی مخمصے میں پڑ گیا۔ خاموش کھڑا سوٹ کیس کو تکتا رہا۔ چند لمحے دونوں گو مگو کے عالم میں کھڑے رہے۔ آخر لالی نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھایا۔ سوٹ کیس کا ہینڈل پکڑا‘ اسے اٹھایا اور آہستہ آہستہ اونچا نیچا کر کے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اندر کیا ہے۔ سوٹ کیس زیادہ بھاری نہیں تھا۔ اس کے وزن سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اندر کپڑے اور دوسرا سفری سامان بھرا ہے۔

لالی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ “لے یار! بن گیا کام۔”

رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔ “کیا ہے؟”

“یہ تو کھولنے ہی پر پتہ چلے گا۔ مجھے تو کپڑے لتے معلوم ہوتے ہیں اور بھی کام کی بہت سی چیزیں ہو سکتی ہیں۔ فسٹ کلاس کے ڈبے سے گرا ہے۔ سامان بھی اس میں فسٹ کلاس ہی ہو گا۔ یار! کیسا کھٹاک سے آ کر گرا جیسے اپنے ہی لیے پھینکا گیا ہو۔”

“یار اسے کھول کر تو دیکھ” رحیم داد اپنی بے قراری پر زیادہ دیر قابو نہ رکھ سکا۔

“یہاں نہیں‘ آگے چل کے۔ اب یہاں زیادہ دیر ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔”

وہ سوٹ کیس ایک ہاتھ میں لٹکا کر چلنے لگا۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ دونوں نشیب سے نکل کر اوپر آ گئے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ریل گاڑی کی پٹڑی دھند میں لپٹی سنسان پڑی تھی۔

دونوں آہستہ آہستہ پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ مگر وہ ادھر نہیں گئے‘ جدھر ریل گاڑی گئی تھی بلکہ اس طرف بڑھنے لگے جدھر سے آئی تھی۔ مشکل سے وہ پچاس ساٹھ قدم آگے گئے ہوں گے‘ ناگاہ درختوں تلے خشک پتوں پر آہٹ ابھری۔ انھوں نے گھبرا کر اس طرف دیکھا‘ ایک شخص اندھیرے سے نکل کر ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دھندلی روشنی میں دونوں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ اس نے دور سے للکارا۔

“اوئے چھبڑ! سوٹ کیس رکھ دے۔”

لالی جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ لیکن اس نے سوٹ کیس نہیں چھوڑا۔ اجنبی اور قریب آ گیا۔ اس دفعہ وہ زیادہ گرج دار آواز سے بولا۔ “دیکھتا کیا ہے؟ جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔” وہ جھپٹنے کے انداز میں تیزی سے لپکا۔ لیکن آگے بڑھتے بڑھتے ٹھٹک کے حیرت سے چیخا۔

“اوئے لالی! کتے‘ حرام دے۔”

لالی نے فوراً اسے پہچان لیا۔ وہ اشرف تھا۔ کئی سال پہلے وہ اسی کے گروہ میں شامل تھا۔ جیل میں بھی ساتھ رہ چکا تھا۔ اشرف پیار سے گالیاں دیتا ہوا قریب آیا اور لالی کے گلے سے لپٹ گیا۔ نہایت گرمجوشی سے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچنے لگا۔ اس نے علیحدہ ہو کر لالی کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

اس کی ملگجی بش شرٹ اور پتلون دیکھی‘ بڑھی ہوئی حجامت اور گرد سے اٹے ہوئے بال دیکھے۔ کبیدہ خاطر ہو کر بولا۔

“یار! تو نے یہ اپنا حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟”

لالی نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ “تجھے نہیں معلوم؟”

“مجھے پتہ ہے تو منٹگمری جیل سے بھاگا ہوا ہے۔ نصیرا تو تیرے ساتھ ہی جیل میں تھا۔ پرسوں چھوٹ کے آیا ہے۔ وہی بتاتا تھا۔” اس نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ وہ لالی کے پیچھے کھڑا تھا۔ اشرف نے اس کی جانب اشارہ کیا۔

“یہ تیرے ساتھ کا دوسرا مفرور کیدی ہے نا؟ اس کی جیل کی وردی تو بدلوا دی ہوتی۔ یہ صاف تجھے پکڑوا دے گا۔”

لالی نے اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔ “یہ بتا‘ اتنے سویرے سویرے یہاں کیسے آ ٹپکا۔”

“ڈیوٹی پر تھا۔” اشرف نے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔ “اسی کے انتظار میں تھا۔”

“کچھ اونچا چکر لگتا ہے۔” لالی نے آنکھ مار کر پوچھا۔ “معاملہ کیا ہے؟”

“بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتا‘ تیرا پروگرام کیا ہے؟”

“میرا کیا پروگرام ہے۔” لالی کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ “چھپتا لکتا پھرتا ہوں۔ نہ رہنے کا ٹھکانا ہے نہ روٹی ٹکر کا۔ کبھی یہاں‘ کبھی وہاں۔”

“ایسا کر میرے ساتھ چل۔” اس نے لالی کا کندھا ہولے ہولے تھپ تھپایا۔ “راستے کی پروا نہ کر۔ کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ ادھر اپنی ہی عمل داری ہے۔ لہور تک کی میں گارنٹی لیتا ہوں۔”

“ایسا کر۔ سوٹ کیس کھول۔ اپنے مطلب کے کپڑے نکل آئے تو بن گیا کام۔”

اشرف سوٹ کیس کھولنے پر آمادہ نہ ہوا۔ “یہ سنڈیکیٹ کا مال ہے۔ اسے صرف باس کھول سکتا

ہے۔"

"باس؟" لالی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "یہ باس کیا چیز ہے؟"

"بہت اونچی چیز ہے۔ فسٹ کلاس سے نیچے نہیں چلتا۔ کراچی گیا ہے۔"

"سوٹ کیس اسی نے پھینکا تھا؟"

"ہاں۔" اشرف نے جواب دیا۔ "میں بھی اسی ٹرین میں تھا۔ فسٹ کلاس کے ساتھ والے انٹر کے ڈبے میں تھا۔ پیچھے کادر آباد سٹیشن ہے۔ وہیں اتر گیا تھا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہ رہا سامنے آؤٹر سگنل۔"

لالی نے سوٹ کیس اس کے حوالے کر دیا۔ "لے' سنبھال اپنی امانت۔" اس نے مسکرا کر پوچھا "کتنا مال پانی ہو گا اس کے اندر؟"

"مخبر نے تو لاکھ روپے سے اوپر کی اطلاع دی تھی۔ مال زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیش کے علاوہ جڑاؤ زیورات جا رہے تھے اس میں۔" اس نے سوٹ کیس کا ہینڈل پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اپنا سنڈیکیٹ چھوٹا شکار نہیں مارتا۔"

لالی مرعوب ہو کر بولا۔ "یار! یہ تو بہت اونچا چکر جان پڑتا ہے' پر خطرناک بھی اتنا ہی ہے۔"

"کوئی خطرناک شترناک نہیں۔" اشرف نے ہنس کر بتایا۔ "مہینے سوا مہینے میں صرف ایک بار نکلتے ہیں اور تگڑا شکار مارتے ہیں۔ اکیلے نہیں کھاتے' مل بانٹ کے کھاتے ہیں۔ اوپر سے نیچے تک سب کا حصہ بندھا ہے۔ اپنے پر کوئی آسانی سے ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔" اس نے ایک آنکھ دبائی۔ "جی چاہے تو لگ جا لین میں۔ بول کیا کہتا ہے۔ چلتا ہے میرے ساتھ؟"

لالی نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چلیں گے تو ہم دونوں ہی چلیں گے۔ تو سوٹ کیس کھولنے کو تیار نہیں۔ فیر اپنا رحیے کیسے چلے گا۔"

"اپنی بات کر۔" اشرف نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ "یار! برا نہ مان۔ یہ تو دیکھنے ہی میں یتیم مسکین لگتا ہے۔ اسے خاماخا نکال لایا۔ ایک بار پوری سزا کاٹ لینے دے' فیر فروٹ ہو کر نکلے گا۔ ابھی تو بہت کچا ہے۔"

"شرفے! بہت اونچا نہ اڑ۔ مارا جائے گا۔ یہ بتا میری جگہ کوئی اور ہوتا تو کیا کرتا؟"

اشرف نے گردن اونچی کی۔ "پورا راشن لے کر چلتا ہوں۔" اس نے پتلون کی جیب سے پستول نکالا اور لالی کے سامنے گھما پھرا کر بولا۔ "پورا لوڈ ہے۔ کیا سمجھا؟" اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ "جھیتی فیصلہ کر' بول کیا کہتا ہے؟ میرے پاس ٹائم بہت کم ہے۔" اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ "یوسف والا سٹیشن سے ٹرین آنے ہی والی ہے۔ مجھے اسی سے واپس لہور جانا ہے۔"

رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔ "چلا جا لالی! میری پروا نہ کر۔" اس کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔ "جو نصیب میں لکھا ہے' ہو کے رہے گا۔"

لالی نے اسے غصے سے ڈانٹا۔ "چپ کر رحیے! بکواس نہ کر۔ یہ میرا اور شرفے کا معاملہ ہے۔ خاماخا اپنی ٹانگ بیچ میں نہ اڑا۔" اس نے رحیم داد کا بازو پکڑا۔ اسے اپنی طرف کھینچا اور کمر میں ہاتھ ڈال کر بے تکلفی سے بولا۔ "شرفے! یہ اپنا جگر ہے۔ اسے میں نہیں چھوڑ سکتا۔ تو جا' میرا تیرا رستہ الگ ہے۔"

"جیسی تیری مرضی۔ جی تو چاہتا تھا تو ساتھ چلتا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے بٹوا نکال کر کچھ نوٹ نکالے اور لالی کی طرف بڑھا کر مخاطب ہوا۔ "یہ رکھ لے' کام آئیں گے۔ پیارے! ہم تو یاروں کے یار ہیں۔"

لالی نے روپے لینے سے انکار کر دیا۔ "انھیں اپنے ہی پاس رکھ۔ یاری دوستی کی بات کرتا ہے تو اتار دے قمیص' پتلون۔ تجھ سے زیادہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔" اشرف سٹپٹا کر خاموش کھڑا رہا۔ لالی منہ بگاڑ کر بولا۔ "جا دیکھ لیا تجھے بھی۔ خالی پیلی بڑھکیں مارنا جانتا ہے۔ اونہہ!" اس نے جھنجلا کر زمین پر تھوک دیا۔

اشرف بھڑک اٹھا۔ "گالی نہ دے لالی!" وہ جلدی جلدی اپنی قمیص اتارنے لگا۔ "تو بھی اتار اپنے کپڑے' جھیتی نال۔ ٹائم بہت کم ہے۔"

دونوں نے جھٹ پٹ کپڑے اتارے اور ایک دوسرے سے بدل لیے۔ لالی نے اشرف کا جوتا بھی ہتھیا لیا۔ وہ اس کے پیروں میں بالکل فٹ تھا۔ کپڑے البتہ ذرا ڈھیلے تھے۔ مگر لالی کے جسم پر بدنما نہیں لگتے تھے۔

اشرف نے ضد کر کے لالی کی جیب میں پچاس روپے بھی ڈال دیئے۔ لالی نے کہا۔ "یار! ذرا ٹھیر۔ ادھر کا کچھ اتا پتا تو بتا۔ اپنے کو تو کچھ نہیں ملوم۔ چاہتا ہوں جلد سے جلد اس ضلع سے باہر نکل جاؤں۔ تو بتا' کیا کروں؟"

"ایسا کر ریلوے لائن کے اس پار نکل جا۔ آگے ملتان روڈ ہے۔ اس سے کچھ ہی دور آگے نہر لوئر باری دو آب ہے۔ اسے پار کر لے تو جھل اور بیلے ہیں۔ تیرے لیے بہت محفوظ ٹھکانا ہے۔ دن بھر وہاں رہ۔ رات کو چک ۶۷ کی طرف نکل جا۔ کھبے ہتھ کو ہے۔ ادھر سے سدھی سڑک نور شاہ جاتی ہے۔ نور شاہ نہ جانا۔ نور شاہ سے پہلے فیر نہر آئے گی۔ اس کے کنارے کنارے چلتا ہوا عالم

شاہ پہنچ جا۔ راوی نزدیک ہی ہے۔ کسی پتن پر پہنچ کر بیڑی میں بیٹھ کر دریا کے دوسری طرف پہنچ جا۔ وہاں سے ضلع لائل پور شروع ہو جائے گا۔ میں اس رستے سے دو بار لائل پور جا چکا ہوں۔ لائل پور پہنچ کر جی چاہے تو میرے پاس لہور آجانا۔ دیکھ ضرور آنا۔“

لالی نے اشرف کو گرم جوشی سے گلے لگایا اور پیشانی چوم کر محبت سے رخصت کیا۔

اشرف سوٹ کیس اٹھا کے آگے بڑھ گیا۔ وہ لالی کی میلی کچیلی بش شرٹ، تنگ اور اٹنگی پتلون اور بڑے بڑے جوتوں میں بھدا اور بے ڈول لگ رہا تھا۔ لالی اسے جاتے ہوئے دور تک دیکھتا رہا۔ مگر اشرف نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا قادر آباد اسٹیشن کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو دونوں پٹڑی عبور کر کے اس پار چلے گئے۔ کچھ ہی دور گئے تھے کہ سڑک آگئی۔ یہ ملتان روڈ تھی اور اس وقت بالکل ویران تھی۔ وہ سڑک کے دوسری جانب چلے گئے۔ نہر بھی زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔

دونوں نہر پر پہنچے۔ کچھ دور اس کے کنارے کنارے چلے۔ پل آگیا۔ پل سے گزر کر وہ نہر کے اس پار پہنچ گئے۔

اشرف نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ نہر کے کنارے کھجور کے چند درخت تھے۔ ان کے عقب میں جنگلی درختوں اور جھاڑیوں سے بھرا ہوا جھنگر تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ وہ جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ جھنگر ختم ہوا تو اونچے نیچے ٹیلوں اور ٹبوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

وہ ایک ٹیلے پر چڑھنے لگے۔ اوپر پہنچے تو فراش کے اونچے اونچے درخت دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ دوسرے جنگلی درخت تھے۔ جھاڑیاں بھی تھیں۔ ٹیلے کی بلندی سے انھوں نے پیچھے مڑ کر نظر ڈالی۔ صبح کی ہلکی ہلکی دودھیا روشنی میں جھنگر کے اس پار نہر لوئر باری دو آب چاندی کے تار کی طرح جھلملا رہی تھی۔

وہ ڈھلانوں سے اترتے، چڑھائیوں پر چڑھتے اور آگے چلے گئے۔ اب وہ بہت تھک چکے تھے۔ انھیں کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش تھی۔ دونوں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ کچھ فاصلے پر انھیں جھاڑیوں کا جھنڈ نظر آیا۔ قریب ہی کبڑوں کی مانند جھکے ہوئے دو پتھریلے ٹیلوں کے درمیان ایسا خلا تھا جس کے اوپر ٹیلوں کی چوٹیاں ملنے سے محراب بن گئی تھی۔ یہاں وہ روپوش ہو سکتے تھے۔ دھوپ سے بچ کر دن میں سو بھی سکتے تھے۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی اور انھیں اس وقت ویرانی ہی کی ضرورت تھی۔

دونوں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے ڈھلان سے نیچے اترے اور محراب کے سامنے جا کر

ٹھہر گئے۔ محراب ان کے قد سے اونچی تھی۔ اندر کی زمین خاصی ہموار تھی۔ اس میں سخت مٹی کی تہہ اور پتھر تھے۔ مگر صاف ستھری تھی۔

محراب سے ذرا ہٹ کر فراش کا ایک درخت سر اٹھائے کھڑا تھا۔ محراب کے دوسری طرف کا حصہ بھی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس کے عین نیچے گہرا کھڈ تھا۔ کھڈ میں ریتلی مٹی کے اونچے اونچے تودے تھے۔

رحیم داد زیادہ کھڑا نہ رہ سکا۔ محراب کے نیچے چلا گیا اور نڈھال ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔ لالی بھی اس کے برابر لیٹ گیا۔ دونوں دیر تک خاموش پڑے رہے۔ باہر درختوں اور ٹیلوں پر زرد زرد دھوپ پھیلتی جا رہی تھی۔

رحیم داد زمین پر چت لیٹا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی۔ لمحے بھر لالی کے چہرے کو تکتا رہا، پھر گلہ کرنے کے انداز میں بولا۔

“میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ شاداں خطرناک زنانی ہے۔”

“ہے تو۔” لالی نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ “پر اس میں ایک بات ہے جو ہر زنانی میں نہیں ہوتی۔”

رحیم داد حیرت سے بولا۔ “وہ کیا؟”

“شاداں کھرا روپیہ ہے، بجاؤ تو ٹن سے بولے۔”

رحیم داد نے احتجاج کیا۔ “کیا بات کر رہا ہے لالی؟ بال بال بچ گئے۔ ورنہ اس نے تو مروا دیا تھا دونوں کو۔”

“دو ہزار بہت بھاری رکم ہوتی ہے رحیمے!” وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کو رکا۔ “میری تو سگی موسی نے صرف دو سو روپے کے لیے مجھے آگ میں جھونک دیا تھا۔”

“چوری کی ہوگی۔”

“نہیں۔” لالی اسی طرح چت لیٹا اوپر دیکھتا رہا اور آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ “میں نے اس کے دو سو کے نوٹ دیوے سے جلا کر روشنی کی تھی۔ ان دنوں میں بہت چھوٹا ہوتا تھا۔ شبرات پر ماں کے ساتھ موسی کے گھر گیا تھا۔”

رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ “بہت ظالم تھی۔”

“یہ بات بھی نہیں۔” لالی ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھ کر ہولے ہولے ہلانے لگا۔ “میرا موسا درزی تھا۔ سلائی کی مشین بیچ کر اپنی بیٹی کے ویاہ کے لیے دو سو روپے لایا تھا۔ موسی اس کی

دوسری گھر والی تھی۔ پہلی مرگئی تھی اور اسی کی بیٹی کا ویاہ تھا۔ میں نے موسا کے دو سو روپے جلا ڈالے تو وہ غصے سے پاگل ہوگیا۔ جلتا دیوا اٹھا کر موسی کے منہ پر مارا۔ اس کی ایک آنکھ جل گئی۔ اس نے اپنا غصہ مجھ پر اتارا۔ مجھے دھکا دے کر جلتے الاؤ میں پھینک دیا۔ ماں نہ ہوتی تو جل کر مرجاتا۔ ٹھیک ہی ہوتا۔" لالی کی آواز میں درد کی چبھن تھی۔

رحیم داد خاموش رہا۔ لالی بھی نہ بولا۔

دونوں یادوں کی دھوپ چھاؤں میں ڈولتے رہے۔ آخران کی آنکھ لگ گئی۔ وہ گہری نیند سو گئے۔ دھوپ ٹیلوں کی بلندی سے زینہ زینہ نیچے اتر رہی تھی۔ اندھیری گھاٹیاں روشن ہوگئی تھیں۔ دن کا ایک پہر گزر گیا۔ دوپہر ہوگئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ سورج کا الاؤ سرد پڑ گیا۔ دونوں بے خبر سوتے رہے۔

☆

ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ لالی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ لالی نے اسے بیدار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سخت بھوک لگی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ رحیم داد کو سوتا چھوڑ کر باہر نکلا اور کچھ دیر خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ پھر ایک طرف چل دیا۔ آگے بڑھ کے وہ آہستہ آہستہ نشیب میں اترنے لگا۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنیں درختوں کی اونچی اونچی شاخوں پر جھلملا رہی تھیں۔ نیچے گھاٹی میں نیل گوں دھندلکا پھیل رہا تھا۔ لالی آگے بڑھا تو سرس کے درختوں کا جھنڈ نظر آیا۔ ان میں پیلے پیلے پھولوں کے گچھے جھول رہے تھے۔ ان کی مہک ہوا میں بسی ہوئی تھی۔ فضا میں پہلی رات کی دلہن کی سی چھب تھی اور لالی کو شدید بھوک لگی تھی۔

وہ ٹیلوں اور ٹبوں کے دامن میں اونچے نیچے ناہموار راستوں پر چلتا ہوا دور تک چلا گیا۔ یکایک تیز بو کا بھبکا آیا۔ لالی ٹھہر گیا۔ اس نے ایک ٹیلے کی بلندی سے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر ایک مردار خچر پڑا ہے۔ دو گدھ اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ اوپر ٹیلے پر پانچ چھے گدھ قطار میں بیٹھے تھے اور اڑنے کے لیے پر تول رہے تھے۔

مردہ خچر کے جسم سے اٹھتی ہوئی تیز بو کے باوجود لالی وہیں کھڑا رہا اور گردن اونچی کر کے متجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

دور فراش کے درختوں کے پیچھے سے دھواں اٹھ رہا تھا جو شام کے دھندلکے میں آہستہ آہستہ تحلیل ہوتا جارہا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ قریب ہی کوئی آبادی ہے۔ وہ اسی طرف چل دیا۔ نزدیک جا کر دیکھا، ٹیلوں کے دامن میں ٹب ہی کی طرح کا اونچا اور ابھرا ہوا میدان ہے۔

میدان میں جگہ جگہ اونٹ کے سیاہ بالوں کے بنے ہوئے نمدے کے خیمے لگے ہیں۔ ان خیموں کو خانہ بدوش پاوندے گیرے کہتے ہیں۔ خیمے پھٹے پرانے تھے اور بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔

خیموں کے آس پاس اونٹ اور خچر بندھے تھے، بھیڑوں کے ریوڑ بھی تھے۔ خیموں کے باہر آگ روشن تھی۔ لالی نے دور ہی سے بھانپ لیا کہ وہاں پاوندوں نے پڑاؤ ڈالا ہے۔

وہ میدان میں پہنچنے کے لیے مڑا۔ جھٹ پٹے میں اس نے دیکھا، دو خانہ بدوش لڑکیاں آپس میں گتھم گتھا ہیں۔ ایک دوسرے کے بال نوچ رہی ہیں۔ زور زور سے چیخ رہی ہیں۔ ان کے قریب ہی زمین پر سوکھی شاخوں کے گٹھے رکھے تھے۔ سامنے مٹی کے تودے پر ایک نوجوان پاوندا بیٹھا نہایت سکون سے لڑکیوں کو ایک دوسرے کے جھونٹے کھسوٹتے دیکھ رہا تھا۔ لالی کی چاپ سن کر نوجوان نے پلٹ کر سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ذرا دیر ہکا بکا بیٹھا رہا۔ پھر ایک دم اٹھ کر خیموں کی سمت بھاگا۔

لڑکیاں بھی دھینگا مشتی چھوڑ کر لالی کو حیرت سے تکنے لگیں۔ ان کے لباس بوسیدہ اور گندے تھے۔ بالوں کی چھوٹی چھوٹی مینڈھیاں تھیں جو جھونٹے کھسوٹنے سے بکھر کر منہ پر آگئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ رخسار تازہ سیب کی طرح گلابی تھے۔ وہ بنجر ٹیلوں پر اگنے والے جنگلی پھولوں کی مانند تھیں جن میں رنگ ہی رنگ ہوتا ہے، خوشبو اور مہک نہیں ہوتی۔ توڑو تو ہاتھ میں کانٹے چبھ جائیں۔

ایک خانہ بدوش لڑکی بڑھ کر لالی کی قریب آئی۔ اس کے پہلو سے لگ کے اس طرح کھڑی ہوگئی کہ اس کے بدن کی تیز بو لالی کی سانس میں گھل مل گئی۔ لڑکی نے سر جھکا کر اپنے بکھرے ہوئے بال دکھائے اور دوسری لڑکی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ "اس نے مجھے مارا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ سٹ کر لالی کے اس قدر قریب آگئی کہ اس کی بھری بھری چھاتیاں لالی کے بازو میں پیوست ہوگئیں۔ لالی نے جھرجھری لی اور بے رخی سے اسے زور سے دھکا دیا۔ "پرے ہٹ کر بات کر۔" لڑکی کے بھورے بھورے بال اور بکھر گئے۔ وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچی۔ اس نے لالی کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

دوسری نے زور کا قہقہہ لگایا اور لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "ڈیرے جانا ہے؟"

"ہاں جی۔" لالی نے مختصر جواب دیا۔

مزید کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ خانہ بدوش لڑکیوں نے قریب پڑے ہوئے لکڑیوں کے گٹھے اٹھا کر

سروں پر رکھے اور ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھرتی آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ لالی آہستہ آہستہ ڈیرے کے جانب چلا۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ایک بوڑھا پاوندا' دو نوجوانوں کے ہم راہ خیموں کے پیچھے سے نکلا اور لالی کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب آکر تینوں پاوندوں نے مشتبہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔

بوڑھا پاوندا کھردرے لہجے میں بتانے لگا کہ پڑاؤ رات ہی کو ختم ہو جائے گا اور صبح تڑکے قافلہ کوچ کرے گا۔ وہ مظفر گڑھ کے راستے ڈیرہ غازی خان جا رہے ہیں۔ بوڑھا پوچھے بغیر لالی کے سامنے صفائی پیش کر رہا تھا۔ اسے یقین دلا رہا تھا کہ قافلے کا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے نہیں ہے۔

☆

لالی کئی برس پہلے چہار روز کے لیے پاوندوں کے ڈیرے میں قیام کر چکا تھا۔ چنانچہ عادات و اطوار اور ان کے طرز زندگی سے کسی حد تک واقف تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ پاوندے ان خانہ بدوش قبائل میں سے ہیں جو موسم سرما شروع ہوتے ہی افغانستان کے کوہستانی دروں سے نکل کر پنجاب اور سندھ کے میدانی علاقوں میں پھیل جاتے ہیں۔ اینٹوں کے بھٹوں پر تعمیروں کا کام کرتے ہیں۔ دیہات کے کچے مکانات کے لیے' مٹی کی دیواریں کھڑی کرتے ہیں۔ شہروں اور قصبوں میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ کمبل اور نمدے' بھیڑ اور لومڑی کی کھالیں' قراقلی ٹوپیاں' جڑی بوٹیاں' خشک میوے' ہینگ اور مشک' گھوڑے' ایرانی بلیاں اور گرے ہاؤنڈ شکاری کتے فروخت کرتے ہیں۔ ان کی عورتیں سخت جفاکش' محنتی اور منہ زور ہوتی ہیں۔ اس قدر آزاد اور بے باک ہوتی ہیں کہ غیر مردوں کے سامنے بھی ذرا حجاب محسوس نہیں کرتیں۔ پاوندے عورتوں اور بچوں کے ساتھ اونٹوں اور خچروں پر سوار ہو کر' خیمے اور سامان لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہیں۔

سفر کے دوران مرد اور عورتیں مل کر کوہستانی نغمے الاپتے ہیں۔ نغموں کے ساتھ ساتھ اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوئی پیتل کی گھنٹیاں بجتی ہیں جو نغمے کی لے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ساز کا کام دیتی ہیں۔ قافلے کی حفاظت کے لیے پاوندے اپنے ہم راہ روسی نسل کے کتے رکھتے ہیں۔ یہ کتے برف کی طرح سفید اور کوتاہ قامت ہوتے ہیں۔

درختوں میں پت جھڑ لگتے ہی پاوندوں کی واپسی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ دریائے سندھ عبور کر کے پہلے ڈیرہ اسماعیل خان پہنچتے ہیں جہاں دور دراز کے علاقوں میں بکھرے ہوئے قافلے مختلف سمتوں سے آکر اکٹھا ہوتے ہیں۔ یہ ان کا آخری پڑاؤ ہوتا ہے۔ گرمی بڑھنے سے پہلے پہلے وہ درہ گومل کے راستے جہاں سے آتے ہیں وہیں لوٹ جاتے ہیں۔

پاوندوں میں جرائم پیشہ بھی ہوتے ہیں جو ڈاکہ زنی اور مویشیوں کی چوری کرتے ہیں یا چرس اور افیون کا ناجائز دھندا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس ان کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی کرتی ہے۔ وہ جہاں پہنچتے ہیں' وہاں کے تھانے میں اپنی آمد کی باقاعدہ اطلاع دیتے ہیں۔

بوڑھے کی جانب سے خواہ مخواہ صفائی پیش کرنے پر لالی نے جلد ہی بھانپ لیا کہ پاوندے اس کی پتلون اور اجلی قمیص سے سخت مرعوب ہو گئے ہیں۔ اسے پولیس یا سی آئی ڈی کا افسر سمجھ رہے ہیں۔

لالی ان کی غلط فہمی سے فائدہ اٹھا کر ہراساں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس ویرانے میں اپنی آمد کا بھی اسے کوئی نہ کوئی عذر پیش کرنا تھا۔ لہٰذا اس نے یہ ظاہر کیا کہ محکمہ جنگلات کے سرکاری کام کے سلسلے میں ادھر آیا ہے۔ لیکن اس کے عملے کے دوسرے لوگ ابھی پہنچ نہیں سکے۔ اس کے بعد اس نے سیدھی سیدھی معاملے کی بات کی۔ انھیں بتایا کہ وہ سخت بھوکا ہے اور بھوک ہی سے بے قرار ہو کر اس طرف آیا ہے۔

وہ ان کے ہم راہ ایک خیمے کے اندر گیا' ان کا مہمان بنا۔ کٹورا بھر بھیڑ کا دودھ پیا۔ شہد اور پنیر کھایا۔ قہوے کا گرم گرم پیالہ پیا۔ مکئی کی ڈھیر سی روٹیاں لیں۔ شہد اور پنیر لیا۔ مشکیزے میں پانی لیا۔ ہاتھ کا بنا ہوا کمبل اور ایک نمدا لیا۔ بھیڑ کی چربی سے جلنے والا چراغ لیا اور ایک تیز دھار چھری بھی لی۔

تیس روپے میں یہ سودا کسی طور برا نہ تھا۔ پاوندوں نے اسے چرس بھری سگریٹ بھی پلائی۔ چرس پر دم لگا کے لالی کے جسم میں سرخوشی اور جولانی آگئی۔ خانہ بدوش اس کے ہاتھ چرس بھی فروخت کرنا چاہتے تھے مگر لالی اس چکر میں نہیں پڑا۔ وہ زیادہ دیر وہاں ٹھہرا بھی نہیں۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ راستہ ناہموار اور پیچیدہ تھا اور چڑھائی بھی چڑھنا تھی۔ وہ جلد سے جلد رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اسے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ رحیم داد اس کی اچانک غیر حاضری سے سخت پریشان ہو گا۔

دو پاوندے دور تک اس کے ہم راہ آئے۔ وہ اور بھی آگے تک اس کے ساتھ جانے پر آمادہ تھے مگر لالی نے ایک موڑ پر انھیں رخصت کر دیا۔ وہ انھیں نہ تو اپنا ٹھکانہ دکھانا چاہتا تھا نہ اپنے بارے میں کسی قسم کی اطلاع بہم پہنچانا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ پولیس والے برابر ان سے پوچھ گچھ

کرتے رہتے ہیں۔

لالی ایک ٹیلے کی آڑ میں کھڑا انھیں دور تک واپس جاتے دیکھتا رہا۔ دونوں نظروں سے اوجھل ہوگئے تو وہ آگے بڑھا۔ اس نے ناہموار چڑھائی عبور کی اور سامان سے لدا پھندا محراب کے قریب پہنچ گیا۔

☆

رحیم داد آہٹ سن کر گھبرایا ہوا باہر آیا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ مگر لالی نے کوئی بات نہیں کی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ رحیم داد اندھیرے میں ایک ایک چیز ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ جب اس نے کمبل کی تہہ کھولی اور اندر سے تازہ تازہ روٹیوں کی سوندھی سوندھی مہک نکلی تو وہ بچوں کی طرح چہک کر بولا۔

”او ہو‘ ہو یار! کمال کر دیا۔ روٹیوں کا تھبا تو بالکل گرم گرم ہے۔“

”شہد اور پنیر بھی ہے۔“ لالی نے اسے مطلع کیا۔ جیب سے ماچس نکالی‘ جھک کر چراغ اٹھایا اور اسے روشن کر دیا۔ ہوا تیز تھی‘ چراغ کی لو بار بار بھڑکتی۔ لالی نے ادھر ادھر سے پتھر اکٹھا کر کے چراغ ان کی اوٹ میں رکھ دیا۔ اس طرح وہ ہوا سے محفوظ ہوگیا۔ روشنی بھی باہر جانے کے بجائے محدود ہو کر رہ گئی۔

رحیم داد نے زمین پر نمدا بچھا دیا۔ دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ لالی پاوندوں کے ڈیرے کا حال بتانے لگا۔ رحیم داد نے روٹیاں نکال کر باہر رکھیں۔ آٹھ روٹیاں تھیں۔ موٹی موٹی اور خوب بڑی بڑی۔

”یہ ۸ دن کا راشن ہے۔“ لالی نے پاوندوں سے خریدی ہوئی چھری نکالی اور ہر روٹی کے چار چار ٹکڑے کر دیے۔

”روٹیاں تو چل جائیں گی۔ پر پانی کم ہے۔“

”بوکی تو اپنے پاس ہے اور نہر بھی زیادہ دور نہیں۔ پانی نہر سے آجائے گا۔“ لالی نے مسکرا کر مشکیزے کی جانب اشارہ کیا۔ ”پر ۸ دن تک یہاں کون پڑا رہے گا؟ تب تک ہم بہت آگے نکل جائیں گے۔“

رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”برا ہا مانا نا۔ تیرا معاملہ تو ایک دم فسٹ کلاس بن گیا۔“ اس نے اپنا میلا کچیلا لباس دیکھا۔ ”یہ جیل کی وردی نہ جانے اپنے بدن سے کب اترے گی اور جب تک یہ نہیں اترے گی‘ میرے لیے تو خطرہ ہی خطرہ ہے۔“

”پروا نہ کر۔ جلد ہی تیرے لیے بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ مجھے ہر دم اسی کی فکر رہتی ہے۔ خطرہ صرف تیرے لیے نہیں‘ میرے لیے بھی تو ہے۔ یہ تو سوچ تو اور میں کیا الگ الگ ہیں۔؟“ اس نے رحیم داد کو ٹھوکا دیا۔

”دیکھ کیا رہا ہے؟ شروع ہو جا۔“

رحیم داد فوراً شروع ہوگیا۔ اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔ اس پر تھوڑا سا شہد ڈالا‘ پنیر کا ٹکڑا رکھا۔ پھر روٹی گول گول لپیٹ کر دانتوں سے چباتے ہوئے بولا۔

”تو نہیں کھائے گا؟“

”نہیں۔“ لالی نے انکار کر دیا۔ ”مجھے دو گھونٹ پانی پلا دے۔ میں توں جانا ہے۔“ وہ لمحے بھر کو رکا۔ ”چرس پر دم لگا کر بھڑکی لگ جاتی ہے۔“

رحیم داد نے مشکیزہ لالی کی طرف بڑھا دیا۔ ”یار! تو نے تو پاوندوں کے ڈیرے پر زبردست عیش کیے۔“ لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مشکیزہ منہ سے لگا کر پانی کے کئی گھونٹ پیے۔ مشکیزہ ایک طرف رکھا‘ ہاتھ سے منہ پونچھا اور کھڑا ہوگیا۔

رحیم داد نے جلدی سے پوچھا۔ ”اکیلا ہی جائے گا؟“

لالی نے رسان سے کہا۔ ”ہاں۔“

”شاداں کے پاس تو نہیں جا رہا؟“

”جا تو وہیں رہا ہوں۔“ لالی نے اقرار کیا۔

رحیم داد آنکھ مار کر بولا۔ ”ایسا جان پڑتا ہے‘ شاداں پر تیرا دل آگیا۔“

”چھوڑ یار! کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔“ لالی نے بے نیازی سے کہا۔ ”اپنے پاس دل ہے کہاں؟ دل تو دل والوں کے پاس ہوتا ہے۔“

”تو چاہے کچھ کہے۔ تیری ایپل دیکھ کر تو مجھے ایسا ہی لگتا ہے‘ تو....“

لالی اس کی بات کاٹ کر بیزاری سے بولا۔ ”ٹھرک بازی چھوڑ۔ کام کی بات سن۔“ اس نے چھری پتلون میں اڑس لی اور اپنا چاقو نکال کر رحیم داد کو دیا۔ ”اسے رکھ لے۔ میں کل رات کو لوٹوں گا۔ واپسی پر دیر ہو جائے تو فکر نہ کرنا۔“

”ابھی اندھیرا ہے۔ چاند نکل آئے تب جانا۔“

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھا اور قریب کے ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ بلندی پر جا کر اس نے دیکھا‘ ہر طرف ہولناک تاریکی چھائی ہے۔ دور دور تک کچھ نظر نہیں آتا۔ اس نے جھک کر محراب کے نیچے نظر ڈالی۔

رحیم داد چراغ کی دھندلی روشنی میں بیٹھا روٹیوں کے ٹکڑے گن رہا تھا۔ لالی زیادہ دیر ٹیلے پر نہ ٹھہرا۔ آہستہ آہستہ دوسری طرف اتر گیا۔ وہ چڑھائیوں پر چڑھتا' ڈھلانوں سے اترتا' ناہموار راستوں سے گزرتا ہوا ٹیلوں کے نیچے گھنے جھنگر میں پہنچ گیا۔ جھنگر عبور کر کے وہ نہر کی جانب بڑھنے لگا۔

وہ شاداں کے پاس جانا چاہتا تھا اور اس سے رحیم داد کے لیے کپڑے لانا چاہتا تھا۔ کپڑے مل جاتے تو وہ رحیم داد کو جیل کی وردی سے چھٹکارا دلا سکتا تھا اور اس کے ہم راہ شرفے کے بتائے ہوئے راستے سے لائل پور کی طرف نکل جاتا۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ چلتے چلتے اچانک اسے خیال آیا کہ آج شاداں کے گاؤں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ کل ہی رات پولیس سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی ہے۔ اب پولیس نہ صرف شاداں سے پوچھ گچھ کرتی ہو گی بلکہ اس کے گھر کی نگرانی بھی کرتی ہو گی۔ گاؤں کے اندر اور باہر جگہ جگہ ناکوں پر پولیس تعینات ہو گی۔

یہ سوچتے سوچتے اس کی رفتار سست پڑ گئی۔ نہر اب زیادہ دور نہ تھی۔ مگر لالی نے آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ واپس مڑا اور اپنے ٹھکانے کی جانب روانہ ہوا۔ جب وہ جھنگر سے گزر کر ٹیلوں پر چڑھ رہا تھا تو رات خاصی گزر چکی تھی۔ ہر طرف گہری ویرانی چھائی تھی۔

وہ کچھ ہی دور چلا تھا کہ روشنی پھیلنے لگی۔ دور فراش کے اونچے اونچے درختوں کے پیچھے سے چاند ابھر رہا تھا۔ گول گول سونے کے بڑے سے تھال کی طرح چمکتا دمکتا چاند ویرانے میں اس قدر خوبصورت نظر آ رہا تھا کہ لالی ٹکٹکی باندھے اسے تکتا رہا۔ چاند ابھر کر اوپر آیا تو اندھیرے راستے روشن ہو گئے۔

اجلی اجلی چاندنی میں چلتا ہوا لالی کچھ ہی دیر بعد محراب کے قریب پہنچ گیا۔ رحیم داد ابھی تک جاگ رہا تھا۔ پتھریلے راستوں پر آہٹ سن کر وہ گھبرایا ہوا جھٹ نکل کر باہر آ گیا۔ لالی کو اس نے نکھری نکھری چاندنی میں دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

"یار' تو واپس کیوں آ گیا؟"

"اندر چل کر آرام سے گل بات کریں گے۔"

دونوں محراب کے نیچے پہنچ گئے۔ لالی دور سے چل کر آیا تھا۔ نمدے پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ مگر رحیم داد سخت بے چین تھا۔ خاموش نہ رہ سکا۔ "یہ تو بتا دے' رستے میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی۔"

"ذرا دم لے' سب کچھ بتا دوں گا۔ ویسے پریشانی کی کوئی گل نہیں۔" لالی کچھ دیر خاموش بیٹھا

رہا۔ "گل ایہہ ہے رحیمے! میں نے خود ہی شاداں کے پنڈ جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "کیوں؟"

"میں نے چلتے چلتے سوچا' وہاں تو ابھی پولیس لگی ہو گی۔ تفتیش کرتی ہو گی۔"

"یہ تو تیں نوں پہلے ہی سوچ لینا چاہئے تھا۔ میں تو کہتا ہوں شاداں نے ہمارے بارے میں پولیس کو سب کچھ بتا دیا ہو گا۔"

"بتانا تو نہیں چاہئے۔ اس نے بالے کا خون جو کیا ہے۔ یہ بلت ہم دونوں جانتے ہیں۔ ویسے ہمارے بارے میں وہ اتنا ہی جانتی ہے جتنا پولیس کو پتہ ہے۔"

"ایسا ہے تو اس نے ملک کو کیوں ہمارے بارے میں بتایا؟" رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔ "بتا اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"وہ تو اس نے دو ہزار انعام کے لالچ میں کیا۔ پر اسے جلد ہی اپنی غلطی کا پتہ چل گیا تھا۔ یار! وہ اتنی بری نہیں جتنی تو سمجھتا ہے۔"

"سوچ لے۔ ویسے میں تو یہی کہوں گا' تیرا اس کے پاس جانا ٹھیک نہیں۔"

"میں تو تیرے لیے کپڑے لینے اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔" لالی اسے سمجھانے لگا۔ "یہ تو تیں نوں بھی پتہ ہے جب تک تیرے بدن پر جیل کی وردی ہے' ہم کہیں جا بھی تو نہیں سکتے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ہم دونوں فٹافٹ یہاں سے لائل پور کی طرف نکل جائیں۔"

رحیم داد نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔

باہر چاندنی چھٹکی تھی۔ رات نکھرتی جا رہی تھی۔ خنکی بھی بڑھ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد رحیم داد جماہیاں لیتا ہوا بولا۔

"مجھے تو جھوک آ رہی ہے۔ میں تو اب سوتا ہوں۔"

یہ کہتا ہوا وہ نمدے پر لیٹ گیا۔ مگر لالی نہ لیٹا۔ اس نے پھونک مار کر چراغ بجھایا۔ باہر نکل کر کچھ دیر چاندنی میں ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ واپس آ کر وہ بھی لیٹ گیا۔ رحیم داد پہلے ہی سو چکا تھا۔ لالی ذرا دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔

صبح اٹھ کر دونوں نے شہد کے ساتھ روٹی کا ایک ایک ٹکڑا کھایا' پانی پیا۔ محراب کے نیچے بیٹھے رہے یا اس کے قریب ہی منڈلاتے رہے۔ مگر دور نہیں گئے۔ شام کو انھوں نے پھر روٹی کا ایک ایک ٹکڑا کھایا۔ تھوڑا تھوڑا پنیر بھی کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر انھوں نے فوراً چراغ بجھا دیا۔ اندھیرے میں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ چاند طلوع ہوا تو دونوں باہر نکلے اور کچھ دور جا

کر ایک ٹیلے پر چڑھ گئے۔ بلندی سے انھوں نے گھوم پھر کر ہر طرف نظر دوڑائی۔ اجلی اجلی چاندنی ہر طرف چھٹکی ہوئی تھی۔ مگر سناٹا بہت گہرا تھا۔ وہ بہت دیر بعد واپس آئے اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔

دوسرا دن بھی اسی طرح گزرا۔ تیسرا دن بھی گزر گیا۔ مگر چوتھے روز پانی ختم ہو گیا۔ البتہ روٹیاں ابھی موجود تھیں۔ شہد اور پنیر بھی تھا۔ دن بھر وہ پیاسے رہے۔ شام ہوئی اور اندھیرا پھیلا تو لالی نے مشکیزہ اٹھایا۔ رحیم داد کو اپنے ساتھ لیا۔

دونوں ٹیلوں سے اتر کر جھنگر میں پہنچے۔ اسے عبور کیا اور نہر پر پہنچ گئے۔ اب رات کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ لالی نے نہر سے مشکیزے میں پانی بھرا اور مشکیزہ رحیم داد کے حوالے کر کے بولا۔

"میں اب شاداں کے پنڈ جہانگیرہ جاؤں گا۔ کوشش کروں گا سورج نکلنے سے پہلے واپس آجاؤں۔ آج نہ آسکا تو کل آجاؤں گا۔ مان لے، مجھے آنے میں دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہونا۔ میں آؤں گا ضرور۔ میرا انتظار کرنا۔ تیرے پاس ابھی چار روٹیاں رہتی ہیں۔ شہد اور پنیر بھی ہے۔ یہ کئی دن کا راشن ہے۔ روٹیاں سوکھ جائیں تو پانی میں بھگو کر کھا لینا۔ صبح شام روٹیوں کا ایک ایک چپا کھانا۔ پانی مک جائے تو رات کے اندھیرے میں نہر سے لے آنا۔ پر دن میں ہرگز اپنے ٹھکانے سے باہر نہ نکلنا۔"

رحیم داد اس کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے بے چین ہو کر کہا۔ "یار! چھیتی نال آجانا اور میرے لیے کپڑے ضرور لانا۔ ویسے مجھے ساتھ لے چلتا تو ٹھیک رہتا۔ مجھے ادھر کے رستوں کا کچھ تو اتا پتا ہے۔ تیں نوں تو کچھ بھی پتہ نہیں، توں تو بچپن سے لہور میں رہا۔"

"پروا نہ کر۔ مجھے رستے کا سب پتہ ہے۔ میں چھیتی آؤں گا اور تیرے لیے کپڑے ضرور لاؤں گا۔" لالی محبت سے اس کی پیٹھ تھپک کر بولا۔ "اب تو ٹر جا۔"

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ وہ ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ لٹکائے جھنگر کی طرف چل دیا۔

لالی خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو لالی نہر کے کنارے کنارے چلتا ہوا پل پر پہنچا۔ اسے عبور کیا اور نہر کی دوسری جانب چلا گیا۔ وہ آگے بڑھا تو سڑک آگئی۔ اس نے دور ہی سے دیکھا، ایک لاری تیزی سے سڑک پر دوڑتی ہوئی گزر رہی ہے۔ اس کے جانے کے بعد گہرا سناٹا چھا گیا۔

لالی سڑک سے گزر کر ریل کی پٹڑی کی جانب بڑھا۔ ریل کی پٹڑی کے آس پاس سناٹا اور زیادہ گہرا

ھا۔ ہر طرف ویرانی تھی۔

وہ ریل کی پٹڑی کے کنارے کنارے کچھ دور تک چلتا رہا، پھر نشیب میں اتر کر جنگلی جھاڑیوں کے درمیان راستہ بناتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ لالی سنسان راستوں سے گزرتا، ہر آہٹ پر چونکتا، ایک ر پھر شاداں کے گھر کی دیوار کے نیچے کھڑا تھا۔ وہ ذرا دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر دیوار پر چڑھا اور اہستہ سے آنگن میں اتر گیا۔ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور دالان کی جانب بے دبے قدموں بڑھا۔ اس نے دیکھا کہ شاداں دالان کے ایک کونے میں فرش پر لیٹی ہے۔ وہ باگ رہی تھی۔ اس نے اجلی چاندنی میں لالی کا سایہ دیکھا تو گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ لالی اس کے قریب نچ چکا تھا۔

شاداں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لالی نے کچھ کہنا چاہا تو شاداں نے ہاتھ بڑھا کراس کے منہ پر رکھ دیا۔ کمرے کے بند دروازے کی جانب اشارہ کیا اور لالی کا ہاتھ پکڑ کر آنگن یں آگئی۔

وہ اسے پرچھتی میں لے گئی۔ آہستہ سے پوچھا۔ "توں آیا کیسے؟"

"دیوار پھاند کر۔" لالی بے نیازی سے بولا۔

"مسکری نہ کر۔ ٹھیک ٹھیک بتا۔"

"پہلے یہ بتا، کمرے میں کون ہے؟"

"ہے کوئی، کیا کرے گا جان کر۔" شاداں نے گول مول جواب دیا۔

لالی نے آنکھ مار کر بے تکلفی سے کہا۔ "کوئی نیا یار پھانس لیا؟"

شاداں ایک دم شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "میں کوئی ھنال ہوں؟ مجھے سمجھتا کیا ہے کنجر۔" یہ کہہ کراس نے غصے سے زمین پر تھوک دیا۔

لالی نے اس کی برہمی پر ذرا بھی برا نہ مانا۔ ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ "ایسا نہیں ہے تو فیر چھپا یوں رہی ہے؟ صاف صاف بتا کمرے میں کون ہے؟" اس نے لمحے بھر رک کر پوچھا۔

"تیرا خصم تو نہیں آگیا؟"

"نہیں۔" شاداں کے لہجے میں ٹھہراؤ آگیا تھا۔ "وہ یہاں کیسے آسکتا ہے۔"

"کیوں نہیں آسکتا؟ تو اس کی گھر والی جو ہے۔ چھوٹ تو نہیں گئی۔ اس نے تجھے طلاک تو نہیں

دی۔“

”دے بھی نہیں سکتا۔“ شاداں نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”جب بالے کے ساتھ میرے جانے کا اسے پتہ چلا تو اس نے نہ پرچہ چاک کرایا نہ تھانے گیا۔ سب نے بہت کہا تب بھی نہ گیا۔ وہ اور ہی طرح کا بندہ ہے۔“ اپنی بات کہتے کہتے وہ ذرا سا شرمائی اور ڈوپٹے کا پلو سر پر ڈال لیا۔ ”اب بھی جان دیتا ہے مجھ پر۔“

لالی نے نظر بھر کر شاداں کو دیکھا۔ وہ پیڑ چھتی کے کنارے پر اس طرح کھڑی تھی کہ ہلکی ہلکی چاندنی کی پھوار میں اس کا چہرہ اجلے پیتل کی طرح دمک رہا تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں میں کنول کھل رہے تھے۔

لالی نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ ”تجھ پر جان دینے والے اور تیرے لیے تڑپنے والے تو اور بھی بہت ہیں۔ تجھ میں بات ہی ایسی ہے۔“ اس نے شاداں کی دمکتی ہوئی پیشانی اور آنکھیں بھرپور نظروں سے دیکھیں۔

”توں تو ابھی تک متھیلی مٹیار لگتی ہے۔“

”وے مخول نہ کر۔“ وہ شرما گئی۔ پھر بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اب کیا رہ گیا مجھ میں، جل کر راکھ ہو گئی۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”بالے مجھے برباد کر گیا۔“

”اس کی گل چھوڑ۔ ٹھیک ٹھیک بتا، کمرے میں کون ہے؟“

”نراض تو نہیں ہو گا؟“ شاداں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”میرے سر پر ہتھ رکھ کر بتا۔“

”نہیں۔“ لالی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھے بغیر کہا۔ ”نہیں مناؤں گا۔ بالکل نہیں مناؤں گا۔“

”ایسے نہیں۔“ شاداں نے اصرار کیا۔ ”سر پر ہاتھ رکھ کر بتا۔ برا تو نہیں منائے گا؟“

لالی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”لے اب بتا۔“

شاداں نے ذرا سا آگے جھک کر سرگوشی کی۔ ”تاجی ہے، اندر منجی پر سو رہی ہے۔“

”کون تاجی؟“ لالی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ ہونق کی طرح شاداں کا چہرہ تکنے لگا۔

شاداں ناک سکیڑ کر تیکھے لہجے میں بولی۔ ”وہی کنجری، جس نے بالے کو مجھ سے چھین لیا تھا۔“

لالی نے خطرے کے احساس سے خوف زدہ ہو کر کہا۔ ”وہ یہاں کیسے آئی؟“

”آئی نہیں۔ میں خود جا کر لائی ہوں۔“ شاداں مطلق خوف زدہ نہیں تھی۔

لالی اس کی بات سن کر سخت پریشان ہوا۔ جھنجلا کر بولا۔ ”تیرا مگز تو نہیں چل گیا؟ یہ تجھے سوجھی کیا؟“

”نراض نہ ہو۔ تو نے میرے سر پر ہاتھ رکھا ہے۔“ وہ صفائی پیش کرنے لگی۔ ”تپ چڑھی تھی اسے۔ کوئی دوا دارو بھی نہیں۔ میں شام کو اس کے لیے دوائی لائی ہوں۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ تڑپ کر بولی۔

”ہائے سرسوں کے پھول کی طرح پیلی پڑ گئی ہے۔“

لالی اس کی باتوں سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ نہایت بے رخی سے بولا۔ ”تجھے کس نے کہا تھا اسے اپنے گھر میں لا، اس کا علاج کرا۔ اور کوئی نہیں اس کا؟ کوئی تو ہو گا؟“

”ہے تو۔“ شاداں نے جواب دیا۔ ”ویر ہے، پر وہ کراچی میں ہوتا ہے۔ بھرجائی تھی، وہ بھی پچھلے دنوں اس کے پاس چلی گئی۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”ٹھیک ہی ہوا۔ ایسی چنڈال تھی۔ ہائے، کیا بتاؤں، روز تاجی کا ہاتھ پکڑ کر نکالتی تھی۔ مارتی تھی، جھونٹے کھسوٹتی تھی۔ تبھی تو بالے کے گلے پڑ گئی۔“

لالی اس کی باتوں سے اکتا گیا۔ بات کاٹ کر بولا۔ ”خاماخا کی کڑ کڑ بند کر۔ یہ بتا وہ بالے کو تو نہیں پوچھتی تھی؟“

”کیوں نہیں پوچھتی تھی۔ میں اس کے پاس گئی تو اس نے پہلی بات یہی پوچھی۔ میں نے جھٹ کہا۔ بالے تو میرے پاس تین مہینے سے نہیں آیا۔ لہور گیا ہو گا، ایکٹر بننے۔ وہ تو اپنے کو سوہنا منڈا سمجھتا ہے۔“ شاداں نے غور سے لالی کا چہرہ دیکھا۔

”غلط بات تو نہیں کہی میں نے؟“

”بات تو ٹھیک ہی کہی، پر اسے یہاں لے کیوں آئی؟“

”نہ لاتی تو کیا کرتی۔ بیمار ہے۔ کھانے پینے کو بھی گھر میں کچھ نہیں۔ پیسہ کوڑی بھی اس کے پاس نہیں۔“ شاداں نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”توں چاہتا ہے مر جانے دیتی اسے؟“

وہ لالی سے اور قریب ہو گئی۔ اتنے قریب کہ لالی اس کے پتھر کے مانند سخت جسم کی چبھن محسوس کر سکتا تھا۔ شاداں رسان سے بولی۔ ”تاجی کے پیٹ میں بچہ ہے۔ بالے ہی کا ہے۔ سچ جان اسی کا ہے۔“ شاداں نے یہ بات ایسی لذت سے کہی کہ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے۔

لالی گم صم کھڑا رہا۔ اسے شاداں پر غصہ بھی آ رہا تھا اور اس سے ہمدردی بھی تھی۔ شاداں اس کی الجھن سے بے نیاز کہتی رہی۔ ”جینا یہیں ہو گا۔ بچے کو خود پالوں گی۔ اپنے ہی پاس رکھوں گی۔

تاجی بھی یہیں رہے گی۔ میرا کیا لے گی‘ اپنے نصیب کا کھائے گی۔"

"تو سفنا تو نہیں دیکھ رہی؟" لالی نے مسکرا کر ٹوکا۔ "اب تو جاگ جا۔"

شاداں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہ سب کرے گی کیسے؟"

شاداں نے شیشم کے پیڑ کے قریب پڑے ہوئے چھپر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ چٹل دیکھ رہا ہے؟ ادھر آ۔" وہ لالی کا ہاتھ پکڑ کر چھپر کے پاس لے گئی اور اس کے نیچے بیٹھی ہوئی بھینس کی تھوتھنی محبت سے سہلاتے ہوئے بولی۔

"میری بوری دھرلی ہے۔ نیلی بار کی نۓ ہے۔ بھاڑو ہے۔ کٹے کے بنا صرف چارے پر صبح شام پکا اٹھاراں سیر دودھ دیتی ہے۔"

"پر تیرا اس سے کیا بنتا ہو گا؟"

"لے یہ کم ہے۔" شاداں نے چمک کر کہا۔ "ملک کی حویلی پر دودھی آتا ہے۔ روز کے روز دام چکا کر دودھ لے جاتا ہے۔ شام کو چاٹی میں دودھ بلو کر مکھن نکال لیتی ہوں۔ وہ بھی بک جاتا ہے۔" شاداں نے قدرے تامل کیا۔ "اور سن‘ ساڑی کی فصل پر پھٹی کی چنائی بھی کرتی ہوں۔ خاصی چوگی مل جاتی ہے۔ ملک کی حویلی میں بھی کام کاج کرتی ہوں۔ محنت کرنے کے معاملے میں زبردست اہری ہوں۔ پرواہ نہ کر لالی۔ فکر کی کوئی گل نہیں۔"

"جب اتنے بہت سے کام کر لیتی ہے تو ایک کام اور کر۔" لالی مسکرانے لگا۔ "مجھے پکڑوا دے۔ ایک اور مۓ آ جائے گی۔"

"گالاں نہ نکال۔" وہ بگڑ کر بولی۔ "میں نے جتی تیرے ہاتھ میں دے دی تھی۔ جتی سے مار لے‘ پر ایسی گل بات نہ کہہ۔"

"مجھے پکڑوا دے گی تو تجھ سے کوئی گلہ نہ ہو گا۔ سچ کہہ رہا ہوں تجھے انعام ملے گا تو مجھے خوشی ہو گی۔" لالی کسی قدر جذباتی ہو گیا۔ "شاداں! توں بہت زوردوں کی ٹمیار ہے۔ مٹی جائے چندن بن کر مہکتی جائے۔ بالے تجھے پہچان ہی نہ سکا۔ وہ تو ایک نمبر......"

شاداں نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی‘ جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ لالی نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ مگر وہ چونک پڑا۔ شاداں کا ہاتھ بالکل خالی تھا۔ لالی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"شاداں! تیرے ہاتھ کی چوڑیاں کہاں گئیں؟"

"توڑ ڈالیں۔ بالے جو مر گیا۔"

"تجھ پر ابھی تک اس کی محبت کا بھوت سوار ہے۔" لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اس طرح اس اسیاپا کرے گی تو ضرور جیل جائے گی۔"

"زراض کیوں ہوتا ہے۔ تو چاہتا ہے‘ میں خوشی مناؤں‘ سلاری باندھوں‘ دانتوں پر دنداسا ملوں‘ نکھوں میں کاجل ڈالوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"بتاتا ہوں‘ ابھی بتاتا ہوں۔" لالی کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ "ایسا کر پھانسی کے پھندے پر جا رلٹک جا۔" شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی ذرا دیر چپ رہ کر بولا۔ "بھیجے سے کام لے بھیجے ے۔ تیری تو مت ماری گئی ہے۔ آج نہیں تو کل چرچا ہو گا۔ بالے کہاں گیا؟ ایسی گل بات زیادہ دن چھپی نہیں رہتی۔ خون سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ توں صاف پکڑی جائے گی۔ کچھ تو سوچ۔ سب نے کیا کہیں گے۔ مرنا ہی ہے تو ذلیل اور بدنام ہو کر کیوں مرنا چاہتی ہے؟" شاداں گم صم کھڑی اس باتیں سنتی رہی۔

لالی نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا‘ شاداں کی طرف بڑھا کر بولا۔ "لے‘ کل جا کر ڑیاں پہن لینا۔ جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔" لالی نے نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ کر ہاتھ بند کر دیا۔ مجھ گئی نا میری بات کا مطلب؟"

"سمجھ گئی۔" شاداں نے سر ہلایا اور نوٹ ٹلگیے لاچے کے ڈب میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ بتا ج آیا کیسے؟" پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "کپڑوں کے لیے آیا ہو گا‘ ہائے میں تو بھول ہی گئی۔ جس رات یا ہے‘ اس کے بعد تو دو روز تک تھانے دار نے پچھ پچھ کر میرا مغز خراب کر دیا۔"

"کیا بتایا توں نے؟"

"میں نے کہہ دیا‘ دونوں بالے سے ملنے آئے تھے۔ اس کا دوست بتاتے تھے۔ میں نے خوب ے بہائے۔ رو رو کر کہا‘ وہ مجھے چھری دکھا کر ڈراتے تھے۔ مار دینے کو کہتے تھے۔"

"توں تو ایک دم فروٹ نکلی۔ دیکھنے میں ایسی نہیں لگتی۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ "بالے کے ے میں بھی پوچھتے تھے؟"

"پوچھتے تھے۔" شاداں نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "میں نے وہی بات کہی جو تاجی سے تھی۔ کوئی غلط بات تو نہیں کہی میں نے؟"

"ابھی تک تو ٹھیک ہی جا رہی ہے۔"

"ر تجھ - ڈر لگتا ہے تیرا کیا بھروسا۔ چور اچکا جو ٹھہرا۔"

لالی اس کی چوٹ اس طرح سہ گیا جیسے گونگا چپ چاپ کڑوی دوا نگل جاتا ہے۔ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ شاداں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”آزما لے۔ لے چل ملک کے پاس پکڑوا دے مجھے‘ بھاگوں گا نہیں۔ بھاگ جاؤں تو پیشاپ سے مونچھ منڈوا دینا۔“ اس نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

”ایک رات تیرے پنڈ آؤں گا اور تجھے صاف اڑا لے جاؤں گا۔“

شاداں ایکدم بپھر گئی۔ ”تو اپنے کنجرپن سے باز نہیں آئے گا۔“ وہ غصے سے لالی کو گھورنے لگی۔ ”مر جاؤں گی۔ پر تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ ہرگز نہیں جاؤں گی۔“

لالی ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ ”توں ضرور چلے گی۔ میرے سوا تجھے کوئی بھگا کر نہیں لے جا سکتا۔ شرط بدلے مجھ سے۔“ اس نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ”آ ہاتھ مار۔“

شاداں نے تیوری پر بل ڈال کر کچھ کہنا چاہا۔ عین اس وقت کمرے کے اندر آہستہ آہستہ کھانسنے کی آواز ابھری۔ شاداں نے سہمی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا۔ گردن جھکا کر سرگوشی کی۔

”لگتا ہے‘ تاجی جاگ گئی۔ تو اب ٹر جا۔“

لالی نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بجنے والے تھے۔ چاند ڈوب گیا تھا۔ اندھیرے میں صبح کا ہلکا ہلکا اجالا ابھر رہا تھا۔

اس نے گھبرا کر کہا۔ ”ہاں اب مجھے چلنا چاہئے۔ صبح ہونے والی ہے۔ توں کمیض اور دھوتی ضرور لے آنا۔ میں بعد میں آؤں گا۔“ وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا۔

”ٹھیر میں بھی تیرے سنگ چلوں گی۔“

لالی آنکھ مار کر بولا۔ ”رہنے دے‘ ابھی وہ رات نہیں آئی۔“

”بکواس نہ کر۔“ شاداں نے اسے ڈانٹا۔ ”تیرا ایسے جانا ٹھیک نہیں۔ چل میں تجھے رڑ کے نکڑ تک چھوڑ آؤں۔ بوری کو بھی ساتھ لے چلوں گی۔ کوئی پوچھے گا تو کہہ دوں گی۔ بیمار ہے‘ اسے موک لگ گیا ہے۔ سلوتری کو دکھانے ساتھ والے چک لے جا رہی ہوں۔“

لالی جاتے جاتے رک گیا اور چوکنا نظروں سے کمرے کے بند دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ مگر کھانسی اب بند ہو چکی تھی۔ شاداں نے بھینس کھولی۔ اس کی گردن میں موٹی رسی کا ڈاہا ڈالا اور اسے ہنکاتی ہوئی لالی کے پاس پہنچی۔ دونوں گھر سے نکل کر گلی میں آ گئے۔ شاداں نے دروازہ بند کیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ ہر طرف دودھیا دھند پھیلتی جا رہی تھی۔ گھروں سے رک ‘ ک مویشیوں کی اڑاٹ‘ بوڑھوں کی کھانسی اور بچوں کے رونے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

شاداں نے ان آوازوں سے پریشان ہو کر کہا۔ ”بھیتی کر‘ بول برالا شروع ہو گیا۔“

لالی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تیز قدم اٹھا کر چلنے لگا۔ دونوں ویران راستوں سے گزرتے‘ درختوں کی آڑ لیتے آگے بڑھنے لگے۔ بھینس ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ شاداں کبھی اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتی کبھی لاڈ سے تھوتھنی سہلاتی اور اسے ہنکانے کے لیے رک رک کر منہ سے ”تت تت“ کی آواز نکالتی۔

لالی صبح کا پھیلتا ہوا اجالا دیکھ کر اور زیادہ تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے جوتوں کی تیز رگڑ سے خاموشی میں آہٹ ابھر رہی تھی۔

شاداں نے اسے ٹوکا۔ ”وے لالی! دھیرے چل۔ دگڑ دگڑ نہ کر۔“

لالی نے پلٹ کر شاداں کو دیکھا‘ اپنی رفتار سست کر دی اور خاموشی سے شاداں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا جاتا۔ دونوں گاؤں سے نکل کر باہر آ گئے۔ اب رڑ شروع ہو گیا تھا۔ رڑ کے ایک طرف ربیع کی فصلیں تیار کھڑی تھیں۔ صبح کی نرم نرم ہوا کے جھونکوں سے گندم کی بالیاں جھومتیں اور خشک پتوں سے سرسراہٹیں ابھرتیں۔ رڑ اس وقت سنسان تھا۔ اس کی زمین سخت اور ہموار تھی۔ کہیں کہیں بارش سے زمین میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ گاؤں کے سامنے کا یہ میدان کھیل کود کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ مگر صبح کے سناٹے میں چٹیل نظر آتا تھا۔

دونوں کھیتوں کے ساتھ ساتھ رڑ سے گزرتے رہے۔ شاداں کے بال بپھری ہوا کے جھونکوں سے اڑ اڑ کر اس کے صندلیں چہرے پر بکھر جاتے۔ وہ ہر بار انھیں سمیٹ کر پیچھے کرتی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ وہ گردن اونچی کئے چل رہی تھی۔ لالی چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اس کے جسم کے دائرے اور پیچ و خم دیکھتا رہا۔ اب نہ وہ خوف زدہ تھا نہ بے چین۔ شاداں کی پناہ میں وہ خود کو محفوظ سمجھ رہا تھا اور شاداں ملگجے لاچے میں اپنے بھاری کولھے گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہلاتی آگے آگے چل رہی تھی۔ وہ اپنی اوپر اٹھی ہوئی گردن کو ہلکا سا خم دے کر ادھر ادھر دیکھتی جاتی۔ ایسے جیسے کتیا اپنے پلے کی رکھوالی کرتے وقت چوکس نظر آتی ہے۔ سویرا بلندیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔

ہر چیز خواب کے مانند دھندلی اور خاموش نظر آ رہی تھی۔ یکایک اس خاموشی میں دور سے گھوڑے کے دوڑنے کی آواز ابھری۔

شاداں گھبرا کر بولی۔ "ہائے میں مرگئی۔ یہ تو ملک جان پڑتا ہے۔"

لالی بھی پریشان ہو گیا۔ دونوں رک گئے۔ دیکھتے دیکھتے کھڑی فصلوں کی آڑ سے نمبردار ملک اللہ نواز خان نکلا اور عین ان کے سامنے آگیا۔ وہ اپنی سفید گھوڑی پر مرغ کی طرح اکڑا بیٹھا تھا۔ آگے بندوق رکھی تھی۔ دونوں کو دیکھتے ہی اس نے گھوڑی کی راس زور سے کھینچی اور شاداں سے مخاطب ہوا۔ "اتنے سویرے کہاں چلی؟" اس نے شاداں کے پیچھے کھڑے ہوئے لالی کو مشتبہ نظروں سے دیکھا اور اونچی آواز سے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟" شاداں نے کچھ کہنا چاہا مگر ملک پہلے ہی بول پڑا۔ "یہ وہی جیل سے بھاگا ہوا کیدی تو نہیں ہے؟ وہی جان پڑتا ہے۔" ملک نے غصے سے ڈپٹ کر دریافت کیا۔

"ٹھیک ٹھیک بتا' کون ہے یہ؟"

شاداں کچھ نہ بتا سکی۔ اس کی آنکھیں خوف اور گھبراہٹ سے پھٹی ہوئی تھیں' ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ وہ بالکل ہونق نظر آرہی تھی۔ شاداں کو خاموش پا کر ملک زور سے چیخا۔ "آج یہ نکل کر نہیں جائے گا۔" اس نے جھٹ سامنے رکھی ہوئی بندوق اٹھائی اور لالی کو للکارا۔

"آگے بڑھا تو گولی سے اڑا دوں گا۔"

"ملک جی!" شاداں اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کے لہجے میں التجا تھی۔ لیکن ملک اس کی التجا سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ فلمی ولن کی طرح زور سے دہاڑا۔

"ہٹ جا میرے سامنے سے۔"

لالی خاموش کھڑا تھا۔ ملک بندوق تانے اسے خون خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی گھنی مونچھیں غصے سے ابابیل کے پروں کی مانند پھڑپھڑا رہی تھیں۔ اس کی کلف دار پگ کا اونچا طرہ ہوا سے لہرا رہا تھا۔

شاداں ابھی تک لالی اور ملک کے درمیان دیوار بنی کھڑی تھی۔ اچانک لالی نے پیچھے سے شاداں کی کمر پر اس زور سے لات ماری کہ وہ منہ کے بل زمین پر گری۔ ملک کی نظریں بھٹک گئیں۔ لالی جھٹ قریب کھڑی ہوئی بھینس کے اوٹ میں جھک کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ ملک نشانہ باندھتے ہوئے چلایا۔

"باہر نکل' نہیں تو میں فائر کھول دوں گا۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جھپاک سے چھری نکالی اور بھینس کی ٹانگوں کے بیچ سے ملک کی جانب تیزی سے پھینکی۔ چھری گھوڑی کی ایک ٹانگ چیرتی ہوئی گوشت میں پیوست ہو گئی۔ گھوڑی

نے ہنہنا کر دونوں ٹانگیں اوپر اٹھا دیں۔ ملک بے قابو ہو گیا۔ اس نے گھبراہٹ میں ٹریگر دبا دیا۔ گولی چلی اور چیختی ہوئی بھینس کے پیٹ میں اتر گئی۔ سب کچھ پلک جھپکتے ہوا۔ ملک کی گھوڑی ہنہناتی ہوئی سرپٹ بھاگی۔

ملک اللہ نواز پیٹھ پر بیٹھا اسے قابو میں کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر گھوڑی رکنا تھی نہ رکی۔ دوڑتی ہوئی دور نکل گئی۔ بندوق بھی ملک کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔

لالی نے تیزی سے دوڑ کر بندوق اٹھائی۔ اس میں ابھی تک کارتوس موجود تھا۔ وہ بندوق اٹھا کر پلٹا۔

شاداں کی بھینس زور زور سے ڈکرائی۔ چند قدم بھاگی پھر لڑکھڑا کر گر پڑی۔ اس کے پیٹ سے خون نکل کر دور تک زمین پر پھیل گیا۔ بھینس بے بسی سے گردن ہلا کر زمین پر منہ رگڑنے لگی۔ شاداں دوڑ کر زخمی بھینس سے دیوانوں کی طرح لپٹ گئی۔ اس کے کپڑے خون سے لت پت ہو گئے۔ دونوں آنکھیں اشکوں سے آبشار بن گئیں۔ لالی بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا بھینس کے قریب پہنچ گیا۔

شاداں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اور سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ "توں گیا نہیں؟"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بت بنا بھینس کو تڑپتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ "شاداں! تیری بوری مر رہی ہے۔"

"دیکھ رہی ہوں' پر توں یہاں سے ٹرجا۔"

لالی چپ کھڑا رہا۔ اس کی نظریں بھینس کے پیٹ سے ابلتے ہوئے لال لال خون پر جمی تھیں۔ یکایک شاداں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ غصے سے بولی۔ "کھڑا کیوں ہے؟ جا یہاں سے۔ ملک اپنے کرندوں کو لے کر آتا ہی ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ لالی پر جھپٹی اور اسے زور سے دھکا دیا۔

"جا' چھیتی نال ٹرجا۔"

لالی لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا اور مڑ مڑ کر شاداں کو اور اس کی تڑپتی ہوئی بھینس کو دیکھتا رہا۔ مگر جب اس راستے کی جانب بڑھا جدھر سے گاؤں میں داخل ہوا تھا تو اس نے دیکھا' کئی ہالی' ہل پنجالی لیے سامنے کھڑے ہیں اور اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ لالی کی ان پر نظر پڑی تو وہ ٹھٹکا۔ اس نے ہاتھ میں دبی ہوئی بندوق اٹھائی اور اس کی نال ان کی طرف کر دی۔ وہ خوف زدہ ہو کر پلٹے اور ہل پنجالی چھوڑ چھاڑ بگ ٹٹ بھاگے۔

لالی نے ان کی سراسیمگی سے فائدہ اٹھایا اور جھٹ کھیتوں میں داخل ہو کر ایک پگڈنڈی پر تیزی

سے دوڑنے لگا۔ اب اسے دور سے ملی جلی انسانی آوازوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ آوازیں اسی سمت سے آرہی تھیں جہاں شاداں کی زخمی بھینس دم توڑ رہی تھی۔

۷

پڑیلی میں دور دور تک جنگلی جھاڑیاں اور اونچی اونچی گھاس تھی۔ زمین خشک اور ریتلی تھی۔ صبح کا اجالا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ چڑیوں کے غول پھراٹا مار کر جھاڑیوں سے نکلتے اور چہچہاتے ہوئے فضا میں بکھر جاتے۔ لالی نے بندوق گھنی جھاڑیوں کے نیچے ایک گڑھے میں ڈال دی۔ اسے خشک پتوں اور پتھروں سے چھپا دیا۔ اب لالی کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خودرد پودے روندتا، جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس کے درمیان سے راستہ بناتا، جدھر منہ اٹھا، اسی طرف بڑھتا چلا گیا۔

جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس سے بھری ہوئی پڑیلی ختم ہوئی تو اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سامنے سڑک ہے۔ سڑک صبح کے اجالے میں سانپ کی طرح بل کھاتی دور تک چلی گئی تھی۔ سڑک نیم پختہ تھی اور زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ سڑک کے دونوں جانب بنجر اور غیر مزروعہ علاقہ تھا۔ کہیں کہیں مٹی اور ریت کے تودے سر اٹھائے کھڑے تھے۔

اس نے دو ڈھائی میل راستہ طے کیا تو دور سے ہریالی نظر آئی۔ آگے بڑھا تو کھیتوں اور درختوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی نہر ملی۔ سورج نکل آیا تھا۔ نہر کا پانی ہلکی ہلکی دھوپ میں جھلملا رہا تھا۔ سڑک نہر کے اوپر سے گزرتی تھی۔

لالی نے نہر دیکھی تو بے قرار ہو کر نیچے اترا۔ نہر کے قریب گیا۔ اسے شدت سے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چلو بھر بھر کر پانی پیا۔ منہ ہاتھ دھویا اور نہر کے کنارے لیٹ گیا۔ نرم اور نیم لیٹ کر بڑی فرحت محسوس ہوئی۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ ٹھنڈے جھونکے آئے تو

نیند سے آنکھیں بند ہونے لگیں۔ مگر وہ سویا نہیں۔ ذرا دیر سستا کر اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھر سڑک پر آگیا۔ اس نے پل عبور کیا اور آگے بڑھنے لگا۔

اب دن نکل آیا تھا۔ اسے کسی ایسے ٹھکانے کی تلاش تھی جہاں روپوش ہو کر دن گزارا جا سکے۔ سڑک کے دونوں طرف کھیتوں کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ ان کے پیچھے گاؤں کے مکانات نظر آرہے تھے۔ کچھ ہی دور آگے بڑھا تھا کہ ایک لاری شور مچاتی، دھول اڑاتی سامنے سے آتی نظر آئی۔ وہ سڑک سے اتر کر نشیب میں آگیا۔ لاری تیزی سے دوڑتی ہوئی گزر گئی۔ لالی پھر سڑک پر آگیا۔

فرلانگ سوا فرلانگ فاصلہ طے کیا تو اسے سڑک سے ایک کچا راستہ گاؤں کی طرف جاتا نظر آیا۔ یہی کچا راستہ سڑک کے دوسری طرف بھی جاتا تھا۔ مگر اس طرف لاگھا تھا۔ جگہ جگہ ریت کے ٹیلے تھے اور ان کے درمیان گندم اور جو کے پودے لہلہا رہے تھے۔ چنے اور سرسوں کے کھیت بھی تھے۔ ہوا زور سے چلتی تو سرسوں کے پیلے پیلے پھول کسی الھڑ مٹیار کے بسنتی آنچل کی طرح لہراتے۔ ایک سانڈنی سوار ٹیلوں اور کھیتوں کے درمیان کچے راستے پر گرد کے بگولے اڑاتا دور جاتا نظر آرہا تھا۔

لالی مخمصے میں پڑگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کدھر جائے اور کون سا راستہ اختیار کرے؟ وہ خاموش کھڑا سانڈنی سوار کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسی اثنا میں اسے اپنی پشت پر چاپ سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا کہ ایک شخص آہستہ آہستہ اسی کی جانب بڑھ رہا ہے۔ وہ ادھیڑ آدمی تھا۔ اس کا لباس اجلا تھا۔ آنکھوں پر عینک تھی۔ سر پر سفید پگڑی تھی۔ ڈاڑھی کے بال کھچڑی تھے۔ قریب آکر اس نے لالی سے پوچھا۔ ”کیا تم لاری سے اترے ہو؟“ لالی بات کا جواب فوراً نہ دے سکا۔

اسے خاموش پا کر وہ شخص مسکرایا۔ ”مجھے بھی اسی لاری سے جانا تھا۔ پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ لاری نکل گئی۔“

”ابھی ابھی گئی ہے جی۔“

”یہ لاری تو کوٹ لنگر سے آرہی تھی۔ تم بھی وہیں سے آرہے ہو؟“ لالی کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خود ہی بولا۔ ”لگتا ہے، تم غلط جگہ آگئے۔“

لالی اس کی بات کا جواب نہیں دے سکا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کس مقام پر کھڑا ہے۔ نہ اسے آگے کا پتہ تھا نہ پیچھے کا۔ وہ پہلے کبھی اس طرف آیا ہی نہ تھا۔

وہ شخص بولا۔ ”تم آگے چلے آئے، تمہیں پیچھے اترنا تھا۔ سفر میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ اسی لاری سے میں پہلی پہاڑ جا رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ جھوک آگئی۔ آنکھ کھلی تو دیپال پور میں تھا۔ پہلی پہاڑ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔“ اپنی بات کہتے کہتے وہ لمحے بھر کو رکا۔ ”مگر واپسی کے لیے تمہیں شام سے پہلے کوئی لاری نہیں ملے گی۔ اس سڑک پر پچھلی بارشوں کے بعد بہت کم لاریاں چلتی ہیں۔ سڑک ٹوٹ پھوٹ کر بہت خراب ہوگئی ہے۔ پہلی لاری صبح صبح نکل جاتی ہے۔“

لالی کو وہ بھلا آدمی لگا۔ اس کے لہجے میں نرمی اور شفقت تھی۔ مگر لالی خاموش رہا۔ وہ ابھی تک بھونچکا تھا اور خود کو ذہنی طور پر آمادہ نہیں کرسکا تھا کہ اس شخص کے ساتھ کس طرح کا رویّہ اختیار کرے۔ یکسر نظر انداز کردے یا اس کے جذبہ ہمدردی سے فائدہ اٹھا کر راستہ دریافت کرنے کی کوشش کرے۔ جب لالی نے اس کی باتوں کے جواب میں کچھ نہ کہا اور گم صم کھڑا رہا تو وہ شخص بولا۔

”تم کس سوچ میں پڑگئے؟“

آخر لالی کو بولنا پڑا۔ اس نے بات بنائی۔ ”بات یہ ہے جی! میں یہاں دوسری بار آیا ہوں۔ کئی سال پہلے آیا تھا۔ رات کا وکھت تھا۔ یاد پڑتا ہے، اسی جگہ اترا تھا۔“

”لاری سے آئے تھے یا تانگے سے؟“

”آیا تو لاری ہی سے تھا۔“ لالی نے گاؤں کی طرف نظر ڈالی جس کے مکانات درختوں کے پیچھے سے نظر آرہے تھے۔ اس نے پلٹ کر سڑک کے اس پار لاگھے کی جانب دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ”سمجھ نہیں آتی، یہی جگہ تھی یا کوئی اور۔“

”کوئی بات نہیں۔“ اس شخص نے درختوں کی سمت ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”یہ رہا اپنا چک۔ تم چاہو تو شام تک میرے ساتھ ٹھیر سکتے ہو۔ یہاں دھوپ میں کھڑے کھڑے پریشان ہوگے۔ آؤ میرے ساتھ۔ جہاں تمہیں جانا ہے پہنچا دوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔

لالی انکار نہیں کرسکا۔ چپ چاپ اس کے ہم راہ چلنے لگا۔ دونوں کچھ دور کچے راستے پر چلتے رہے۔ وہ شخص ایک پیا ہے کی جانب مڑگیا۔ لالی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ وہ کھیتوں کے درمیان سے گزرتے رہے اور جب پیہا طے کرکے باہر آئے تو گاؤں شروع ہوچکا تھا۔ وہ زیادہ دور نہیں گئے۔ ایک دو منزلہ پختہ مکان کے سامنے ٹھہر کر اس شخص نے کہا۔

”لو جی! یہ رہی اپنی ماڑی۔ یہ گھر کا اگواڑہ ہے۔ ساتھ ہی ڈیرا ہے۔ بیٹھک بھی اسی طرف ہے۔ ادھر ہی چلتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر گپ شپ ہوگی۔“

وہ مکان کے ساتھ ساتھ چلا اور سیدھے ہاتھ کو مڑ گیا۔ مکان کے آگے آم اور نیم کے پیڑ تھے۔ ان کے نیچے چارپائی بچھی تھی۔ اس شخص نے چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم یہاں بیٹھو۔ میں ذرا دیر میں آتا ہوں۔“ وہ جس طرف سے آیا تھا اسی طرف واپس چلا گیا۔

لالی چارپائی پر خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے سامنے مکان کا جو حصہ تھا‘ اس کے آگے کھلا ہوا نیچی چھت کا برآمدہ تھا۔ برآمدے میں ایک دروازہ کھلتا تھا اور اس کے ساتھ ہی کھڑکی بھی تھی۔ برآمدہ اس وقت خالی تھا۔

مکان آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا۔ اس کے گرد و نواح میں صرف چند کچے مکانات تھے۔ لالی نے گاؤں صرف ایک نظر دیکھا۔ اس میں کئی اور بھی دو منزلہ مکانات تھے۔ گاؤں اپنی آبادی اور رونق کے اعتبار سے جہانگیرہ سے بھی بڑا تھا۔ مکان دیکھ کر لالی کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا میزبان گاؤں کا کھاتا پیتا آدمی ہے۔ مگر وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

درختوں کے نیچے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لالی بہت تھکا ہوا تھا۔ وہاں بیٹھ کر اسے سکون ملا۔ اس نے دل میں کہا کہ دن گزارنے کے لیے اچھا ٹھکانا مل گیا۔ شام کو چلا جاؤں گا۔ موقع ملا تو شاداں سے مل لوں گا۔ پچھلی رات کے بارے میں معلوم کروں گا کہ بعد میں اس پر کیا بیتی؟ اگر وہ کپڑے لے آئی تو آج ہی رات رحیم داد کو جیل کی وردی سے چھٹکارا دلا دوں گا۔ پھر آگے جانے کا پروگرام بنے گا۔ مگر شاداں کے گھر جاتے ہوئے اسے خطرے کا بھی احساس ہوا۔ اتنے سنگین واقعے کے بعد گاؤں بھر میں کھلبلی مچ گئی ہو گی۔ ملک اللہ نواز بہت غصے میں ہو گا۔ ہو سکتا ہے‘ اس نے پولیس کو بھی بلایا ہو۔ تھانیدار اس کا بھائی ہے۔

لیکن شاداں کے گاؤں کی طرف جانا اس کے لیے ضروری تھا۔ رحیم داد کے پاس پہنچنے کا راستہ اسی طرف سے جاتا تھا۔ کوئی اور راستہ لالی جانتا بھی نہیں تھا۔ وہ اسی ادھیڑبن میں گردن جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

اس نے نظریں اٹھائیں تو دو کانسٹیبل سامنے سے آتے نظر آئے۔ لالی لرز کر رہ گیا۔ اس نے سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور بھاگ کر کسی گلی میں گھس جانے کا ارادہ کیا۔ عین اس وقت برآمدے کی طرف سے آواز آئی۔

”ادھر بیٹھک میں آجاؤ۔ کچھ کھا پی لو۔ تم نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہو گا۔“

لالی نے دیکھا‘ برآمدے میں اس کا میزبان دروازہ کھولے کھڑا ہے۔ لالی تو اس وقت چاہتا بھی یہی تھا۔ فوراً اٹھا‘ برآمدے میں پہنچا اور بیٹھک کے اندر چلا گیا۔ بیٹھک صاف ستھری تھی۔ ایک

طرف اونچے پایوں کا پلنگ تھا۔ اس پر اجلا بستر تھا۔ فرش پر دری بچھی تھی۔ موڑھے تھے۔ دو تین کرسیاں تھیں اور ایک میز بھی تھی۔ میز پر لیمپ رکھا تھا۔ اس کے قریب ہی چند پرانے اخبار پڑے تھے۔ دیواروں پر رنگین طغرے لگے تھے۔ ایک آئینہ بھی میز کے پاس ہی دیوار پر آویزاں تھا۔ اس شخص نے لالی کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ایک موڑھا کھینچ کر بولا۔

”میں تو جی اس پر بیٹھوں گا۔ مجھے تو اسی پر بیٹھنے میں آرام ملتا ہے۔“

لالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے جھجکا۔ میزبان نے اصرار کر کے اسے کرسی پر بٹھا دیا۔ ذرا دیر بعد ایک عورت دوپٹے کے آنچل سے سر ڈھانکتی ہوئی اس دروازے سے کمرے میں داخل ہوئی جو گھر کے اندر کھلتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں حقہ تھا۔ اس نے حقہ موڑھے کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ اس شخص نے حقے کی نے سنبھالتے ہوئے عورت سے کہا۔

”بھاگ بھری! کھانے کو کچھ روٹی شوٹی لا۔ جلدی کر۔“

”ابھی لائی جی۔“ یہ کہتی ہوئی وہ اندر چلی گئی۔

وہ شخص چپ بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہا۔ ذرا دیر بعد بھاگ بھری لوٹے میں پانی لائی۔ لالی نے باہر جا کر منہ دھویا‘ پھر اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ وہ شخص لالی سے مخاطب ہوا۔ ”برخوردار! تم سوچتے ہو گے۔ میں کون ہوں؟“ وہ زیرِ لب مسکرایا۔ ”میں مشرقی پنجاب کا مہاجر ہوں۔ میرا نام فیض محمد ہے۔ مگر لوگ مجھے ماسٹر جی کے نام سے جانتے ہیں۔ بات یہ ہے برخوردار کہ میں پہلے سکول ماسٹر تھا۔ جب پاکستان بنا تو میں بھوانی کے پرائمری سکول میں پڑھاتا تھا۔ ویسے میں رہنے والا سونی پت کا ہوں۔ فسادات اور بلوے ہوئے تو لٹ پٹ کر پاکستان آ گیا۔ کچھ دن ٹھوکریں کھاتا رہا‘ پھر پاک پتن میں سکول ماسٹر لگ گیا۔ سونی پت میں اپنی کچھ زرعی اراضی تھی۔ اس کا کلیم داخل کیا۔ بھاگ دوڑ کی تو کلیم منظور ہو گیا اور اس چک میں الاٹمنٹ بھی مل گیا۔ میں سکول ماسٹری چھوڑ چھاڑ یہاں آ گیا۔ اب غلہ منڈی میں آڑھت کا کاروبار بھی کرتا ہوں۔ چار مربعے کے لگ بھگ زمین ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ عزت کے ساتھ گزر رہی ہے۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”برخوردار! تم نے اپنے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا؟“

لالی صاف جھوٹ بول گیا۔ ”سرفراز۔ جی میرا نام محمد سرفراز ہے۔“

”اچھا‘ اچھا۔“ وہ مسکرایا۔ ”ادھر کیسے آنا ہوا؟“

”ایک دوست کے پاس آیا تھا۔“

”کیا نام ہے اس کا؟“

”جی وہ۔“ لالی ذرا سا الجھا۔ ”اس کا نام رحمت ہے۔“

”وہی تو نہیں، جو محمد حنیف پٹواری کا پتر ہے؟“

”مجھے اس کے پیو کا نام تو ملوم نہیں جی۔“

”اگر یہ وہی رحمت ہے تو وہ اب اس چک میں نہیں رہتا۔“ فیض محمد نے حقے کا کش لگا کر کہا۔ ”اس نے ریلوے میں نوکری کرلی ہے۔ کبھی کبھار یہاں آتا ہے۔“

وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا، اسی اثناء میں بھاگ بھری ناشتا لے کر آگئی۔ اس نے دری پر دستر خوان بچھایا اور ناشتے کا سامان اس پر رکھ دیا۔ ناشتے میں پراٹھے تھے، تلے ہوئے انڈے تھے، مکھن تھا اور چائے بھی تھی۔ ماسٹر جی نے لالی کو مخاطب کیا۔ ”لو برخوردار! ناشتا کرلو۔“ وہ اٹھا اور دستر خوان کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ لالی بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”میں نے تو صبح ہی ناشتا کرلیا تھا۔ تمہارا ساتھ دینے کے لیے صرف ایک پیالی چائے پیوں گا۔ تم میرا خیال نہ کرنا۔ اطمینان سے کھاؤ۔ کسی تکلف وکلف کی مطلق ضرورت نہیں۔“

لالی خاموشی سے بیٹھا ناشتا کرتا رہا اور فیض محمد اسے اپنے کاروبار اور زمیں داری کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں سناتا رہا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر لالی پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ فیض محمد نے اخبار اٹھایا اور اسے پڑھنے لگا۔ بھاگ بھری دستر خوان اور برتن اٹھا کرلے گئی۔ فیض محمد نے اخبار پڑھتے پڑھتے سر اٹھایا اور لالی کو مخاطب کیا۔

”لو جی! یہ تو اپنے ہی ضلعے کی خبر ہے۔ دو قیدی منٹگمری جیل سے نکل بھاگے۔ ہفتے بھر سے اوپر ہوگیا۔ ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں لگے۔ دو ہزار کا انعام بھی مقرر ہوا۔ تب بھی نہ پکڑے گئے۔“ وہ مسکرایا۔ ”پکڑے بھی کیسے جائیں۔ سب ملی بھگت ہے۔“

لالی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ فیض محمد نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔ ”سرفراز! تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ سوجاؤ۔“ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے لالی کو سونے سے منع کردیا۔ ”بھئی! پہلے حجامت بنوالو۔ بہت بڑھ گئی ہے۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ”میں نائی کو بھیجتا ہوں۔ تم حجامت بنوالو۔ پچھواڑے مویشیوں کا کڑا ہے۔ وہاں کنواں بھی ہے۔ جی چاہے تو نہالو۔ پھر اطمینان سے سوجانا۔“

فیض محمد کے اٹھتے ہی لالی بھی احتراماً کھڑا ہوگیا۔ فیض محمد گھر کے اندر جانے والے دروازے کی جانب بڑھا۔ جاتے جاتے ٹھٹک کر گویا ہوا۔

”میں گھوڑی پر بیٹھ کر منڈی چلا جاؤں گا۔ ویسے سائیکل بھی ہے۔ مگر مجھے گھوڑی کی سواری پسند ہے۔ شام ہونے سے پہلے پہلے واپس آجاؤں گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو کنڈی کھٹکھٹا کر بھاگ بھری کو بلا لینا۔ ادھر ڈیرے پر بھی کئی کمی اور نوکر چاکر موجود ہیں۔“

وہ گھر کے اندر چلا گیا۔ لالی اس کے جانے کے بعد بھی خوف زدہ رہا۔ طرح طرح کے اندیشے پریشان کرنے لگے۔ باہر جانا خطرناک تھا اور کمرے میں بیٹھا رہنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہ خاموش بیٹھا آنے والے خطرے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر خطرہ نہیں آیا۔ نائی آگیا۔ اس نے لالی کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی صاف کی۔ مونچھیں کاٹ چھانٹ کر درست کیں اور سر کے بال بھی تراش دیئے۔ اس نے حجامت بناتے ہوئے لالی سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ مگر لالی نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ خاموش بیٹھا رہا۔ نائی پھر بھی خاموش نہ رہا۔ گاؤں کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں بتاتا رہا۔

حجامت بنانے کے بعد نائی چلا گیا۔ لیکن لالی سو نہ سکا۔ وہ نہانے کے لیے کنوئیں پر بھی نہیں گیا۔ بستر پر لیٹ گیا۔ مگر بستر پر لیٹے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ بھاگ بھری کھانا لے کر آگئی۔ کھانا کسی قدر پر تکلف اور خوش ذائقہ تھا۔ لالی نے بھوک نہ ہونے کے باوجود کھانا کھایا۔ اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور تھکا ہوا بھی تھا۔ لیٹتے ہی ایسی گہری نیند سویا کہ چراغ جلے آنکھ کھلی۔

اس نے دیکھا، لیمپ روشن ہے۔ فیض محمد عرف ماسٹر جی سامنے مونڈھے پر بیٹھا ہے۔ اسے بیدار دیکھ کر فیض محمد نے کہا۔ ”برخوردار! تمہاری لاری تو نکل گئی۔ میں دن ڈھلے ہی واپس آگیا تھا۔ لیکن تم اس قدر گہری نیند سو رہے تھے کہ جگانے کو جی نہ چاہا۔“ اس نے تامل کیا۔ ”کوئی ضروری کام تو نہیں تھا؟“

”نہیں۔“ لالی نے بہت مختصر جواب دیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”تب تو ٹھیک ہے۔ ویسے میں نے معلوم کیا تھا۔ رحمت تین روز بعد آرہا ہے، کیوں نہ اس کا انتظار کرلو؟“

لالی پریشان ہوگیا۔ وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکا۔ بات یہ تھی کہ وہ سرے سے کسی رحمت کو جانتا ہی نہ تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس وقت اس کی زبان پر یہی نام آیا، ورنہ وہ کوئی دوسرا نام بتا دیتا۔ مگر اب رحمت اس کے لیے زحمت بن گیا تھا۔ اس مسئلے کا واحد حل اس کی سمجھ میں یہ آیا کہ رحمت کے پہنچنے سے پہلے ہی گاؤں سے نکل جائے۔ ساتھ ہی اسے رحیم داد کا بھی رہ رہ کر خیال آرہا تھا۔ رحیم داد اکیلا تھا اور لالی نے رات تک اس کے پاس پہنچنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ لالی کو

خاموش پاکر ماسٹر جی نے کہا۔

"برخوردار! تم کس سوچ میں پڑ گئے؟ اب آئے ہو تو رحمت سے مل کر ہی جانا۔ تین ہی دن کی تو بات ہے۔ تکلف چھوڑو۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔ جب تک چاہو، ٹھیرو۔"

"صبح نہیں تو کل شام ضرور چلا جاؤں گا۔ میں زیادہ دیر نہیں ٹھیر سکتا جی!"

"جیسی تمہاری مرضی۔ ویسے میں تو یہی کہوں گا، تمہیں رحمت سے مل کر جانا چاہیے۔" فیض محمد نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "بھئی برا نہ ماننا۔ سنا ہے، رحمت کا چال چلن کچھ ٹھیک نہیں۔ بازاری عورتوں کے چکر میں پڑ گیا ہے۔"

"مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں تو جی اسے بہت دنوں سے نہیں ملا۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ وہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ نوکری کے بعد اس نے پر پرزے نکالے ہیں۔ برخوردار! سچ پوچھو تو لڑکے کو جوان ہوتے ہی شادی کی زنجیر میں باندھ دینا چاہیے۔ زمانہ بہت برا ہے۔ محمد حنیف نے یہی غلطی کی۔ میں نے سمجھایا بھی مگر میری بات سن کر ٹال گیا۔ کہنے لگا، لڑکے کی مرضی نہیں ہے۔ لے بھئی اب دیکھ لڑکے کی مرضی۔" فیض محمد کھل کر مسکرایا۔ اس نے لالی کو غور سے دیکھا۔

"تم نے تو اپنا گھر بسا لیا ہوگا؟"

"نہیں۔" لالی معصوم صورت بنا کر بولا۔ "بات یہ ہے جی! ماں اور پیو تو اپنے ہیں نہیں۔ بھائی بہن بھی نہیں۔ بالکل اکیلا ہوں۔ نوکری چاکری بھی نہیں۔ رحمت کے پاس اسی لیے آیا تھا۔"

لالی کی بات سن کر فیض محمد نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ کچھ دیر سر جھکائے سوچتا رہا۔ لالی نے اس کا یہ رویہ دیکھا تو دل ہی دل میں پچھتایا کہ اس نے ماسٹر جی کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ناحق ایسی بات کہی۔ ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اپنی پریشاں حالی بتا کر خود کو ماسٹر جی کی نظروں میں گرا لیا۔ ذرا دیر بعد فیض محمد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "کھانا آ جائے گا۔ تم اکیلے ہی کھا لینا۔ میں رات کا کھانا نہیں کھاتا، عشاء کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھتا ہوں۔ یہ میرا روز مرہ کا معمول ہے۔ اب تم سے صبح ملاقات ہوگی۔ فجر کی اذان سے پہلے میرے لیے حجرے سے باہر نکلنے کا حکم نہیں۔" فیض محمد دروازے کی جانب بڑھا۔

"کھڑکی کھول دینا۔ بہت اچھی ہوا آتی ہے۔ کمرے میں گرمی ہو تو باہر چارپائی پڑی ہے۔ ڈیرے سے رحمان کو بلا لینا۔ بستر لگا دے گا۔"

"نہیں جی! یہیں ٹھیک ہے۔ میں کھڑکی کھول لوں گا۔ فکر نہ کریں۔"

"تم دن بھر سوتے رہے ہو۔ نیند جلدی نہیں آئے گی۔ کرسی نکال کر باہر برآمدے میں بیٹھ جاؤ۔ ذرا دل بہل جائے گا۔" فیض محمد نے شفقت کا اظہار کیا۔ "روٹی کھا کر سو جانا۔ ابھی تو سمجھو، رات شروع ہوئی ہے۔"

وہ چلا گیا۔ لالی چاہتا بھی یہی تھا کہ وہ زیادہ دیر اس کے پاس نہ ٹھہرے۔ وہ بیٹھا رہتا تو باتیں بھی کرنا پڑتیں۔ نت نیا جھوٹ بولنا پڑتا۔ لالی اس سے بات کرتے ہوئے کتراتا تھا۔ کم سے کم بولتا اور بہت سنبھل سنبھل کر بولتا۔ اسے ہر لمحے دھڑکا لگا رہتا کہ اس کا عامیانہ لب و لہجہ کہیں سارا بھرم نہ کھول دے۔

فیض محمد کے جانے کے بعد لالی کمرے سے باہر آ گیا۔ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا درختوں کے نیچے جا کر ٹہلنے لگا۔ گاؤں کی گہما گہمی اب اجڑنے لگی تھی۔ سناٹا رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ لالی دور نہیں گیا۔ درختوں کے نیچے اندھیرے میں ٹہلتا رہا۔ رات دھیرے دھیرے تاریک ہوتی گئی۔ اسی اثناء میں برآمدے کی کھڑکی سے منہ نکال کر کسی عورت نے اسے مخاطب کیا۔

"روٹی کھا لو باؤ جی!"

لالی خاموشی سے کمرے میں چلا گیا۔ مگر وہاں بھاگ بھری نہیں، کوئی دوسری عورت کھڑی تھی۔ عمر تیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ مگر سخت محنت اور خوراک کی کمی نے اس کی جوانی کا چراغ وقت سے پہلے ہی مدھم کر دیا تھا۔ لالی دسترخوان کے سامنے بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ عورت دروازے کے قریب کھڑی رہی۔ لالی نے کھانا کھاتے کھاتے مڑ کر اسے دیکھا۔

"کیا نام ہے تیرا؟"

"ربیا۔" اس نے جواب دیا۔ "میں جی رحمان کی گھر والی ہوں۔"

"ذرا پانی تو پلا۔"

ربیا نے گلاس میں پانی بھر کر دیا۔ لالی نے پانی پیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ربیا نے برتن سمیٹے، دسترخوان اٹھایا اور چلتے چلتے لالی سے پوچھا۔ "کوئی اور کام ہو تو جی بتا دیں۔ مجھے گھر جا کر ابھی اور کام کاج کرنا ہوگا۔"

"نہیں، اب تو جا۔"

ربیا خاموشی سے گھر کے اندر چلی گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ لالی ذرا دیر تک کرسی پر بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اٹھ کر برآمدے میں کھلنے والا دروازہ بند کیا اور کھڑکی کھول دی۔ پھونک مار کر لیمپ بجھایا اور بستر پر دراز ہو گیا۔

وہ دیر تک جاگتا رہا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ پلنگ سے نیچے اترا اور کھڑکی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ رات کے اندھیرے میں سنسان گاؤں اونگھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی کے قریب کھڑے کھڑے اس نے سوچا کہ اب یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ رحیم داد اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ مگر خالی ہاتھ رحیم داد کے پاس جا کر وہ کیا کرتا۔ جب تک رحیم داد کے جسم پر جیل کے قیدیوں کی وردی تھی اس وقت تک لالی کا ہر مقصد ادھورا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس دروازے پر پہنچا' جو گھر کے اندر کھلتا تھا۔ اس نے دروازہ ہولے ہولے ہلایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ لالی کو سخت کوفت ہوئی۔ وہ خاموشی سے بستر پر جا کر لیٹ گیا اور کروٹیں بدلتے' بدلتے سو گیا۔

سویرے بہت تڑکے فیض محمد نے اسے بیدار کیا۔ اصرار کر کے باہر لے گیا۔ برآمدے سے نکل کر وہ لالی کے ہم راہ گھر کے پچھواڑے گیا' جہاں باڑے میں اس کے مویشی اور چوکھر تھے۔ وہ ایک بھینس کے پاس گیا' جو کھوری میں منہ ڈالے سانی کھا رہی تھی۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ ماتھے اور کھروں پر سفید نشان تھے۔ فیض محمد نے بھینس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر بڑے فخر سے بتایا۔ ”برخوردار! یہ بلھا ہے۔ اس کے کھروں اور متھے پر سفید سفید پھلیاں دیکھ رہے ہو۔ ایسی مُ کو پنج کلیان بھی کہتے ہیں۔ یہ دھرلی ہے۔ پکا بیس سیر دودھ دیتی ہے۔“

لالی خاموش رہا۔ فیض محمد آگے بڑھا اور ایک بھوری بھینس کی گردن جھک کر آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ بھی دھرلی ہے۔ اس کا کٹا پچھلے دنوں مر گیا۔ صرف چارے پر دودھ دیتی ہے۔ یہ بھی اعلیٰ نسل کی مُ ہے۔“ اس نے فخر سے گردن اونچی کی۔ ”یہ نیلی بار کی مشہور مُ ہے۔ پنج کلیان کے ساتھ میں اسے بھی میلے سے خرید کر لایا تھا۔ منہ مانگی قیمت دی تھی۔“

لالی نے بھوری بھینس کو غور سے دیکھا اور اس کی چکنی چکنی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”ماسٹر جی' یہ نیلی بار کی مُ ہے نا؟ یہ نیلی بار کیا ہوا جی؟“

”برخوردار' پہلے یہ سمجھ لو کہ بار کسے کہتے ہیں۔“ فیض محمد' آڑھتی سے فوراً اسکول ماسٹر بن گیا۔ ”بار' ایسے غیر مزروعہ اور بنجر علاقے کو کہتے ہیں' جس پر کھیتی باڑی نہ ہوتی ہو۔ منٹگمری کسی زمانے میں ایسا ہی علاقہ تھا۔ اسے باری دو آب کہا جاتا ہے۔ یعنی راوی اور ستلج کے درمیان کا علاقہ۔ دراصل یہ پلیٹو ہے جس کا ایک ڈھلان راوی کی جانب ہے اور دوسرا ستلج کی جانب۔ پرانے زمانے کے جاٹوں نے باری دو آب کو چار باروں میں تقسیم کیا تھا۔ یہ ہیں راوی بار' گنجی بار' بماس بار اور نیلی بار۔“

”پر یہ نیلی بار کونسا ہوا ماسٹر جی؟“

”برخوردار! یہ تو تمہاری سمجھ میں آ گیا کہ بار کسے کہتے ہیں۔ اب آگے کی سنو۔ نہریں نکلنے سے پہلے' خاص طور پر نہر لوئر باری دو آب سے قبل' باری دو آب کا علاقہ اس قدر زرخیز اور سرسبز و شاداب نہ تھا جیسا آج ہے۔“ ماسٹر فیض محمد نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ”نیلی' دراصل دریائے ستلج ہی کا نام ہے۔ اس کا پرانا نام گھارا ہے۔ مگر اسے اب ستلج ہی کہا جاتا ہے۔ تحصیل دیپال پور میں بھی ستلج ہی کہا جاتا ہے۔ لیکن ساتھ کی تحصیل پاک پتن میں اسے نیلی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ستلج کا پانی گہرا نیلا ہے۔ اسی لیے اسے نیلی کہتے ہیں۔ نیلی بار بھی اسی نیلی سے پڑا۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔

”اب تو تمہاری سمجھ میں نیلی بار کا مطلب آ گیا۔“

لالی نے مسکرا کر مستعدی سے جواب دیا۔ ”بالکل آ گیا جی۔“ وہ ایک بار پھر بھوری بھینس کی پیٹھ سہلانے لگا۔

لالی کی یہ شیفتگی اور پیار دیکھ کر فیض محمد خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ ”ابھی یہ کھانگڑ تو نہیں ہوئی' پھر بھی اس کا دودھ گاڑھا ہوتا ہے۔ اس سے عجب طرح کی مہک آتی ہے۔ ایسی سوندھی' سوندھی خوشبو کہ دودھ کا گلاس منہ سے لگاؤ تو ہٹانے کو جی نہ چاہے۔“

فیض محمد اپنی دوسری بھینسوں کے بارے میں دیر تک خوش ہو ہو کر بتاتا رہا۔ آخر میں وہ گھوڑی کے پاس گیا اور اس کی خوبیاں گنانے لگا۔ دھوپ درختوں سے نیچے اترنے لگی تو وہ باڑے سے لالی کے ہم راہ واپس کمرے میں آیا۔ ناشتا تیار تھا۔ ذرا ہی دیر میں لگا دیا گیا۔ دونوں نے بیٹھ کر ناشتا لیا۔

ناشتے پر بھی فیض محمد اپنی بھینسوں اور دوسرے مویشیوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ لالی نے ں کی گفتگو میں دلچسپی کا اظہار کیا اور جان بوجھ کر ناشتا دیر تک کرتا رہا۔ وہ صبح کی لاری سے سفر رنا نہ چاہتا تھا۔ فیض محمد نے بھی اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی' بلکہ بار بار یہی اصرار کرتا رہا کہ ے رحمت سے مل کر ہی جانا چاہیے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ زیادہ دیر لالی کے پاس نہ ٹھہرا۔ ہوا یہ کہ اس کے کچھ ملنے والے آ گئے۔ ا نے انھیں کمرے کے اندر نہیں بلایا۔ دروازہ کھول کر برآمدے میں گیا اور ان کے ساتھ ختوں کے نیچے پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر کچھ دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کرتا رہا اور ان کے ساتھ

ہی اٹھ کر کہیں چلا گیا۔

دوپہر کو وہ لالی کے پاس آیا اور اس کے لیے سگریٹ کے پیکٹ اور ایک کنگھا بھی لایا۔ دونوں نے دوپہر کا کھانا ساتھ کھایا۔ مگر خلاف معمول وہ چپ چپ تھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے کھانا بھی رغبت سے نہیں کھایا۔ چند لقمے کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ پھر اس نے خود ہی اپنی پریشانی کا سبب بتایا۔ "میرے منشی کا آج صبح انتقال ہوگیا۔ کل شام تک بالکل بھلا چنگا تھا۔ رات کو ٹھیک ٹھاک سویا۔ فجر کے وقت سینے میں ایسا شدید درد اٹھا کہ چٹ پٹ ختم ہوگیا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ "اللہ اس کی مغفرت کرے۔ بڑا نیک اور محنتی بندہ تھا۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ یہی کوئی پینتیس سال کا ہوگا۔ چار چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔

"انھیں یہیں اپنے پاس لے آؤں گا۔ مگر ان پر یتیمی کا جو داغ لگ چکا ہے' اسے کون مٹا سکتا ہے۔"

لالی چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا۔ فیض محمد آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ "قریب ہی کے پنڈ میں رہتا تھا۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔ شاید شام تک واپس نہ آسکوں۔ دیر ہو جائے تو میرا انتظار نہ کرنا۔ شام کو جانا تو رحمان یا کسی نوکر کو بتا دینا۔ ویسے میں چاہتا ہوں' تم آج کی بجائے کل صبح کی لاری سے جاؤ۔ بولو' کیا ارادہ ہے؟"

"آپ کہتے ہیں جی تو میں کل صبح ہی چلا جاؤں گا۔"

فیض محمد نے اس کے بعد کوئی بات چیت نہیں کی۔ چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔ لالی دیر تک خاموش بیٹھا سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ پھر وہ بستر پر لیٹ گیا اور شام تک سوتا رہا۔

عشاء کی نماز سے کچھ پہلے فیض محمد تھکا ہارا واپس آیا۔ لالی سے اس کی زیادہ بات چیت نہیں ہوئی۔ چند منٹ ٹھہر کر وہ وظیفہ پڑھنے اپنے حجرے میں چلا گیا۔

رات کا کھانا کھا کر لالی کمرے سے باہر نہیں گیا۔ اس نے لیمپ پھونک مار کر بجھایا اور بستر پر لیٹ گیا۔

☆

بیٹھک کا دروازہ کھول کر لالی خاموشی سے باہر نکلا اور دبے قدموں چلتا ہوا گھر کے پچھواڑے گیا۔ مویشیوں کے باڑے پر پہنچا۔ باڑا مویشیوں کے عام ڈھارے کی طرح کا نہ تھا جس پر بارش اور سردی سے بچاؤ کے لیے چھپر ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ باڑا احاطے کی مانند تھا جس کے گرد قد آدم چار دیواری تھی۔ اس کا پھاٹک بند تھا اور پھاٹک کے عین سامنے مویشیوں کا رکھوالا چارپائی ڈالے سو رہا تھا۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ لالی ایک درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑا تھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ رات سنسان تھی۔ لالی گومگو کے عالم میں تھا۔ یکایک عقب میں آہٹ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ فیض محمد آہستہ آہستہ اسی طرف آرہا تھا۔ لالی جہاں تھا وہیں دم بخود کھڑا رہا۔ وہ قریب آکر ٹھہر گیا۔ مگر نہ اس نے کسی شک کا اظہار کیا نہ حیرت کا۔ حسب معمول نرم لہجے میں بولا۔

"برخوردار! تم یہاں ہو۔ بیٹھک میں تمھیں نہ پایا تو طبیعت پریشان ہوئی۔ خیریت تو ہے۔ تم اتنی رات گئے ادھر کیسے آگئے؟" وہ دم بھر کے لیے رکا اور جلد ہی بے تکلفی سے مسکرانے لگا۔ "سمجھ گیا۔ سگریٹ کی طلب نے ستایا ہوگا۔ ماچس نہیں ہوگی۔ دینو کے پاس ماچس لینے آئے ہوگے۔ یہی بات ہے نا؟"

لالی کو اس کی نیک نفسی اور سادہ دلی پر پیار آگیا۔ سعادت مندی سے سر جھکا کر بولا۔ "بات تو جی' کچھ ایسی ہی تھی۔"

"میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا۔" وہ بدستور مسکراتا رہا۔ "مجھے اس وقت یہاں دیکھ کر تمھیں بھی سخت حیرت ہوگی۔ مجھے تو اس وقت حجرے کے اندر وظیفہ پڑھنے میں مشغول ہونا چاہیے تھا۔ باہر کیسے آگیا؟ یہی بتانے تمھارے پاس آیا تھا۔"

مویشیوں کا رکھوالا دینو دونوں کی باتیں سن کر بیدار ہوگیا تھا اور حیران و پریشان آنکھیں پھاڑے انھیں دیکھ رہا تھا۔ مگر فیض محمد نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ لالی کو مخاطب کیا۔ "آؤ' بیٹھک میں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔" وہ مڑا اور لالی کے ہم راہ چپ چاپ چلتا ہوا بیٹھک میں پہنچ گیا۔

لالی کو کمرے میں چھوڑ کر وہ گھر کے اندر گیا اور ماچس ہاتھ میں لیے واپس آگیا۔ اس نے لیمپ روشن کیا اور میز کے قریب کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لالی بستر پر پیر لٹکائے بیٹھا تھا۔ ذرا دیر توقف کرنے کے بعد فیض محمد نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوا۔

"برخوردار! آج عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں وظیفے کا ورد کر رہا تھا۔ خلاف معمول نیند کا ایسا زبردست جھونکا آیا کہ آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں' ایک بزرگ سامنے کھڑے ہیں۔ سفید براق لباس' چہرے کے گرد نور کا ہالہ' آنکھوں میں ایسا جلال کہ نظریں خود بخود جھک گئیں۔ کیا بتاؤں' کیا شان تھی ان کی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "چند لمحے وہ خاموش کھڑے میری جانب دیکھتے

رہے۔ پھر حکم دیا‘ فیض محمد! اپنی بیٹی طاہرہ کو اس نوجوان کے حبالہ عقد میں دے دے جو دو روز سے تیرا مہمان ہے۔ نافرمانی کرے گا تو راندہ درگاہ ہوگا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ اب تک وہ آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔“

لالی بھونچکا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ ماسٹر فیض محمد نے اسے خاموش پایا تو نہایت شفقت سے کہا۔ ”بھئی! اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ضرور ہے۔ میں نے بہت غور کیا تو یہ نکتہ ہاتھ آیا۔ تمہارے سر پر کسی کا سایہ نہیں۔ پریشان حال بھی ہو مگر نیک اور سعادت مند ہو۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ مجھے بھی بیٹی کی فرض سے سبکدوش ہونا ہے۔ کسی نہ کسی کے ساتھ تو اس کا پلو باندھنا ہی ہوگا۔ ویسے خاندان میں کئی لڑکے ہیں۔ پڑھے لکھے اور برسرروزگار بھی ہیں۔ لیکن مجھے تو تمہارے لیے حکم ملا ہے۔ تمہیں اپنی فرزندی میں لینے پر مجھے خوشی ہوگی۔ تم میرے پاس رہو گے‘ کاروبار میں ہاتھ بٹاؤ گے‘ میرا سہارا بنو گے۔ میرے لیے اس سے اچھا رشتہ اور کیا ہو سکتا ہے؟“

اس نے ایک بار پھر کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”عزیزم! میری طرف سے تو ہاں ہے۔ رہ گئی تمہاری مرضی‘ تو جو چاہو‘ اپنے بارے میں فیصلہ کرو۔ البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ ہم دونوں ہی کے لیے تائید غیبی ہے۔“ لالی پھر بھی کوئی جواب نہ دے سکا۔ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ کمرے میں کچھ دیر گہری خاموشی چھائی رہی۔ آخر فیض محمد کی آواز ابھری۔

”برخوردار! کیا اس خاموشی کو میں تمہاری مرضی سمجھوں؟“

اب لالی کے لیے خاموش رہنا ممکن نہ رہا وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں کیا بتاؤں جی! میں تو کچھ بھی نہیں سوچ سکا۔“

”کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔“ فیض محمد نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ ”سوچ لو۔ اچھی طرح سوچ لو۔ تمہیں حق حاصل ہے‘ جو چاہو اور جیسا چاہو‘ اپنے بارے میں فیصلہ کرو۔“ اس نے بات کا رخ بدلتے ہوئے لالی سے پوچھا۔ ”تمہاری گھڑی میں کیا بجا ہے؟“

لالی نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر بتایا۔ ”ساڑھے چار۔“

فیض محمد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اب تم سو جاؤ۔ میں تو اب سو نہ سکوں گا۔ کچھ ہی دیر میں صبح ہو جائے گی۔ مسجد میں فجر کی نماز ادا کروں گا اور صبح کی بس سے منڈی چلا جاؤں گا۔ تم سے شام کو واپسی پر ملاقات ہوگی۔ تمہارے پاس خاصا وقت ہے۔ اچھی طرح غور کر لو۔ جو بھی فیصلہ کرو‘ مجھے بے جھجک بتا دینا۔“

اس نے لالی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ گھر کے اندر جانے کے بجائے بیٹھک کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ لالی نے سوچا تھا کہ اس کے جانے کے بعد چپکے سے نکل جائے گا۔ مگر اب اس کی گنجائش نہ تھی۔

صبح ہونے والی تھی اور فیض محمد ابھی باہر ہی تھا۔ اس نے سونے کی کوشش کی مگر بے چین رہا۔ ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ دن میں بھی وہ بے چین رہا۔

شام کو فیض محمد کی واپسی ہوئی۔ وہ روز کی طرح مسکراتا ہوا لالی کے پاس آیا اور نہایت شفقت سے مخاطب ہوا۔ ”کچھ تھکے تھکے نظر آ رہے ہو۔“ اس نے توقف کیا اور لالی کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی وضاحت کی۔ ”بات یہ ہے کہ تم کہیں آتے جاتے بھی تو نہیں‘ تمام وقت تو کمرے میں رہتے ہو۔ ذرا باہر نکلا کرو۔ مگر سوال یہ ہے کہ کس کے پاس جاؤ‘ کہاں جاؤ؟ تمہارا کوئی ملنے جلنے والا بھی یہاں نہیں ہے۔ یہاں رہو گے تو سبھی سے میل ملاپ پیدا ہو جائے گا۔“

لالی چپ چاپ بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔

فیض محمد کچھ دیر خاموش رہا پھر یوں گویا ہوا۔ ”برخوردار! تم بہت کم گو ہو۔ مجھے تمہاری یہ ادا پسند بھی ہے۔ مگر نوجوانوں کو اتنا خاموش نہیں رہنا چاہیے۔ ہنسا بولا کرو۔ کوئی بات نہیں۔ میرے ساتھ رہو گے تو بولنے کی بھی عادت پڑ جائے گی۔ بھئی! میں زیادہ دیر خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ سخت الجھن ہوتی ہے۔ اور تم سے باتیں کر کے تو دل بہت خوش ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے‘ تین روز نہیں‘ تمہارے ساتھ تین برس بیت گئے۔“

وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ لالی بھی چپ بیٹھا رہا۔ مگر فیض محمد سے زیادہ دیر خاموش نہ رہا گیا۔ وہ حرف مطلب پر آ گیا۔ ”برخوردار! کیا فیصلہ کیا تم نے؟“ پھر خود ہی بولا۔ ”فیصلہ کیا کرنا ہے۔ بھئی میں نے تو یہ سمجھ لیا ہے کہ میرا کوئی بیٹا نہیں‘ اللہ تعالیٰ نے تمہارے روپ میں مجھے بیٹا دے دیا۔ میری دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی تو بیاہ کر پشاور چلی گئی۔ سال دو سال میں آتی ہے۔ سمجھو وہ تو غیر ہو گئی۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔

”ہاں تو برخوردار! تم نے کیا سوچا؟“

لالی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ پچھلی رات سے جس سوال نے اسے الجھن میں ڈال رکھا تھا وہ ہنوز جواب کا محتاج تھا۔ لالی میں نہ صاف انکار کرنے کی جرات تھی‘ نہ وہ اپنے بارے میں اصل حقیقت سے آگاہ کر سکتا تھا۔ دونوں ہی صورتوں میں اس کے دل کو زبردست ٹھیس لگتی۔ لالی اسے کسی طور دکھ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اپنے جرائم پیشہ ہونے کا کبھی اتنی شدت سے احساس نہیں

ہوا تھا۔ وہ دلدل میں گر گیا تھا۔ اس دلدل سے نکلنے اور صاف ستھری زندگی بسر کرنے کا بہت اچھا موقع ملا تھا۔ مگر وہ اس دلدل میں اتنا دھنس چکا تھا‘ اس قدر لت پت ہوگیا تھا کہ اس موقعے سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اسے سب سے بڑا دکھ اس بات کا تھا کہ جس زندگی کے اس نے کبھی سہانے خواب دیکھے تھے‘ وہ خود چل کر اس کے گھر آئی تھی۔ مگر وہ دروازے کے پٹ کھول کر اس کا خیرمقدم نہیں کر سکتا تھا۔

لالی کو خاموش اور گم دیکھ کر فیض محمد نے کہا۔ ”برخوردار! جو کہنا ہے صاف صاف کہہ دو۔ تم انکار کردو گے تو میں یہی سمجھوں گا کہ مجھی میں کوئی خامی ہوگی۔ تمہیں میں اچھا سمجھتا ہوں‘ ہمیشہ سمجھتا رہوں گا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”مجھے جو حکم ملا‘ اس کی تعمیل میں سر جھکا دیا۔ اپنی پگڑی تمہارے سامنے ڈال دی۔ بیٹی باپ کی عزت ہی ہوتی ہے۔“ اس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں کے پیمانے چھلک اٹھیں گے۔ لالی تڑپ اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ جھک کر اس کے پیر پکڑ لے اور اسے اپنے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دے۔ وہ بے قرار ہو کر کھڑا ہوگیا۔ فیض محمد دل گرفتہ ہو کر بولا۔

”معلوم ہوتا ہے میری باتیں تمہیں ناگوار گزریں؟“

لالی کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ ”ہرگز نہیں۔ جو آپ کا فیصلہ‘ وہی میرا فیصلہ ہے جی۔“

وہ تڑپ کر اٹھا اور لالی کو گلے سے لگا لیا۔ چند لمحے تک وہ لالی کو گلے سے لگائے خاموش کھڑا رہا۔ لالی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ رو رہا ہے۔ اس کے جسم کی حرارت میں باپ کے پیار کا لاؤ تھا۔ اس نے شفقت سے لالی کے سر پر ہاتھ پھیرا‘ اس کی پیشانی چومی۔ ”تم نے میری لاج رکھ لی۔ مجھے حکم عدولی کے عذاب سے بچا لیا۔“ لالی سر جھکائے نہایت سعادت مندی سے کھڑا رہا۔

فیض محمد نے لحہ بھر خاموش رہ کر کہا۔ ”نیک کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ کسی دھوم دھام کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ وظیفے سے فارغ ہوتے ہی مسجد کے ملاجی کے پاس جاؤں گا۔ نمازیوں میں گواہ اور وکیل بھی مل جائیں گے۔ فجر کی نماز کے بعد نکاح ہو جائے گا۔ مجھے یہی بشارت ہوئی تھی۔“

وہ لالی کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ وظیفے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ گھر کے اندر چلا گیا۔

لالی بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس نے فیض محمد کا دل رکھنے کے لیے ہامی تو بھر لی تھی مگر اسے نباہ نہیں سکتا تھا۔ اب وہ جلد سے جلد اس گھر سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔

رات کو لالی سے کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ دو چار لقموں کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ پلنگ پر خاموش بیٹھا

رہا اور بار بار گھڑی دیکھتا رہا۔ اسے رات تاریک اور گلی کوچے سنسان ہو جانے کا انتظار تھا۔

کوئی دس بجے کا عمل ہوگا۔ لالی نے باہر جانے کا ارادہ کیا۔ عین اس وقت گھر کے اندر جانے والے دروازے کا ایک پٹ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ لالی نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ دھندلی روشنی میں ایک سایہ لہرایا۔ کوئی دروازے کی اوٹ میں دبکا کھڑا تھا۔

لالی حیران و پریشان بیٹھا اس جانب دیکھتا رہا۔ ذرا دیر بعد ایک نوجوان لڑکی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور سر جھکا کر لالی کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہ اپنا بدن سفید چادر سے چھپائے ہوئے تھی‘ صرف چہرہ نظر آرہا تھا۔ کھلتا ہوا چمپئی رنگ‘ سبک نقش و نگار‘ ابھری ہوئی سیاہ آنکھیں۔ وہ اچھی خوش شکل لڑکی تھی۔

لالی نے انکل سے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ ”تم طاہرہ تو نہیں ہو؟“

”ہاں میں طاہرہ ہوں‘ ماسٹرجی کی بیٹی۔“

”تم اتنی رات گئے یہاں کس لیے آئی ہو؟“

اس دفعہ طاہرہ نے گردن اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ تیوری پر بل ڈالا اور ایک دم پھٹ پڑی۔ ”یہ کہنے آئی ہوں کہ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔“

لالی سٹپٹا کے رہ گیا۔ حیران ہو کر بولا۔ ”کیوں؟“

”اس لیے کہ میں تمہارے ساتھ شادی وادی کا ڈھونگ رچانا نہیں چاہتی“ وہ ویسے ہی تیکھے لہجے میں بولی۔ ”تم مجھے بالکل پسند نہیں۔ تم صورت سے اجڈ اور لوفر لگتے ہو۔“ اس نے غصے سے لالی کو گھورا۔

”جاؤ یہاں سے نکل جاؤ۔“

لالی نے پریشان ہو کر کہا۔ ”دھیرے بولو۔ ماسٹرجی آجائیں گے۔“

”آجانے دو۔ مجھے کسی کی پروا نہیں ہے‘ نہ تمہاری‘ نہ اباجی کی۔ میں کسی سے ڈرتی نہیں۔ سنا تم نے۔“

لالی جل کر بولا۔ ”مجھے سنانے کیوں آئی ہو‘ جاؤ‘ جا کر اپنے اباجی کو سناؤ۔“

”میں ان کے پاس نہیں جاؤں گی۔“ طاہرہ نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”میں تم سے ت کرنے آئی ہوں۔ یہ بتانے آئی ہوں کہ میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی‘ نہیں چاہتی۔“

”نہ کرو۔ میں نے تمہارے آگے ہاتھ نہیں جوڑے‘ پیروں پر پگڑی نہیں ڈالی۔ نہ کبھی تمہیں ستے میں چھیڑا‘ نہ آنکھ ماری‘ نہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا‘ اوئے سوہنیو! ہم تو کتل ہوگئے۔ میں نے

تو.....“

”ارے ارے۔“ طاہرہ اس کی بات کاٹ کر حیرت سے بولی۔ ”تم تو بالکل لفنگے ہو۔“ وہ ایک بار پھر دھاڑنے لگی۔ ”تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے؟ جاؤ' ابھی چلے جاؤ۔“

پہلی نظر میں وہ طاہرہ کو بھولی بھالی شرمیلی دوشیزہ سمجھا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس قدر تیز اور طرار ہوگی۔ مگر جب وہ اپنی تمام تیزی اور طراری کے ساتھ کھل کر سامنے آگئی تو لالی نے دل ہی دل میں کہا۔ چھوہری تو زوردار ہے۔ اب اسے طاہرہ کو چھیڑنے میں مزا آنے لگا۔

”میں تو نہیں جاؤں گا۔ یہیں رہوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ ٹانگیں پسار کر بستر پر لیٹ گیا۔ طاہرہ کو مخاطب کرکے بولا۔

”کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ۔ آرام سے گل بات کرو۔“

وہ اسی طرح خفگی سے بولی۔ ”میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔ تم سے صاف صاف یہ کہنے آئی ہوں کہ تم میرے ساتھ شادی کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔“ چند لمحے رک کر اس نے کہا۔ ”ذرا اپنی شکل تو دیکھو۔ کیسی خطرناک غنڈوں کی سی مونچھیں ہیں۔ اونہ!“ طاہرہ نے حقارت سے منہ بگاڑا۔

مگر لالی بالکل ناراض نہ ہوا۔ مسکرا کر بولا۔ ”کوئی بات نہیں۔ کل صبح منڈوا دوں گا۔ تم چاہو تو استرا لا کر ابھی مونڈ دو۔ لے آؤ اسی بات پر استرا!“

طاہرہ نے غصے سے گردن ہلائی۔ ”گویا مونچھیں منڈوا کر تم گل فام بن جاؤ گے اور میں تمہیں اپنا سرتاج بنالوں گی۔ چغد! احمق کہیں کا۔“

”نکالو' نکالو جتنی چاہے گالاں نکالو۔ کل صبح کے بعد تم سے پوچھوں گا۔“

”کیا کرو گے تم؟“

لالی اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ گردن ذرا سی اکڑا کر نخوت سے بولا۔ ”کل صبح میں تمہارا خصم بن جاؤں گا۔“

”خصم!“ وہ تلملا کے بولی۔ ”تم غنڈے ہو۔ بالکل تھرڈ کلاس غنڈے۔“

لالی نے مطلق ناگواری ظاہر نہیں کی۔ قمیص کی آستین چڑھائی اور طاہرہ کو اپنے بازو کی مچھلیاں دکھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ دیکھ رہی ہو؟ نزدیک آجاؤ۔ چھو کر دیکھو۔“

”دیکھ رہی ہوں' دیکھ رہی ہوں۔ تم دور ہی سے اچھے خاصے مسٹنڈے نظر آتے ہو۔“

”میں تمہیں اپنے بازو اس لیے دکھا رہا ہوں۔“ لالی نے سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا۔ ”کل صبح کے بعد تم نے کڑکڑ کی تو سمجھ لینا۔ ایک چپیڑ ادھر سے لگاؤں گا دوسری ادھر سے۔“ لالی نے ہاتھ گھما گھما کر خبردار کیا۔

”اوپر سے ایک ٹھڈا بھی لگاؤں گا۔ وہ جاؤ گی دور تک گیند کی طرح لڑھکتی ہوئی۔ ساری کڑکڑ نکل جائے گی۔“

”کیا کہا؟ تم مجھے مارو گے؟“ اس نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”وحشی' درندے! بے غیرت! تمہیں ایسا کرتے ہوئے شرم نہیں آئے گی؟ تم تو بالکل جنگلی ہو۔“

لالی نے مصالحت کرنے کے انداز میں کہا۔ ”چلو' نہیں ماروں گا۔ اب تو غصہ تھوک دو۔ جو تم کہو گی' وہ کروں گا۔ مونچھیں بھی منڈوا دوں گا۔ ایک دم صفاچٹ۔ بال بھی نئے اسٹائل کے بناؤں گا۔ کیمض اور پتلون تو پہلے ہی پہنے بیٹھا ہوں۔ بولو اب تو میری گھروالی بننا منظور کرلو گی؟“

طاہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھکی ہوئی سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس دفعہ اس نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔ ”کیا واقعی تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ساتھ میری شادی ہوجائے گی؟“

”سمجھتا کیا' سولہ آنے پکی گل ہے۔“

طاہرہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ پھر دفعتاً اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ”اچھا تو پھر یہ بھی سن لو بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لو۔“ اس نے اپنے بدن سے چادر اتار کر میز پر رکھ دی اور نہایت بے باکی سے اپنا پھولا ہوا پیٹ دکھا کر بولی۔ ”یہ کسی کی امانت ہے اور جس کی یہ امانت ہے میں اسی کی امانت ہوں۔“

لالی بھونچکا رہ گیا۔ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر اس نے سنبھل کر آہستہ سے پوچھا۔ ”کس کا ہے؟“

”کسی کا بھی ہے۔ تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں ہے' بالکل ہے۔“ لالی نے ڈپٹ کر پوچھا۔ ”زیادہ کڑکڑ نہ کرو۔ صاف صاف بتاؤ۔“

”چلو' یہ بھی سن لو۔“ وہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ ”میں لہور میں اپنی خالہ کے پاس رہتی تھی۔ وہاں کالج میں پڑھتی تھی۔ کالج کے ایک پروفیسر مجھے گھر پر بھی پڑھاتے تھے۔ مجھے ان سے محبت ہوگئی۔ وہ بھی مجھ سے دیوانوں کی طرح محبت کرنے لگے۔“ یہ کہتے کہتے وہ یادوں کے سہارے بہت دور نکل گئی۔ ”ایک لمحے کی جدائی بھی برداشت نہ ہوتی۔ گھر اور کالج کے باہر بھی ہم چھپ چھپ کر ملتے۔ کبھی.....“

لالی بات کاٹ کر بولا۔ "شالیمار باغ اور لارنس گارڈن میں اس کے ساتھ ٹھمک ٹھمک کر گانے بھی گاتی ہوگی؟" وہ لمحے بھر کے لیے رکا۔ "یہ تو فلمی باتیں ہوئیں۔ آگے بتاؤ؟"

"آگے جو کچھ ہوا' وہ تمہارے سامنے ہے۔"

"اسے بھی دیکھ لیا۔ اور آگے بتاؤ۔"

"پروفیسر کی ایک بیوی پہلے سے موجود ہے۔ ایک بچہ بھی ہے۔ مگر مجھے اس کی دوسری بیوی بننا منظور ہے۔ میں اس کی محبت میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں' لیکن ابا جی تیار نہیں ہیں۔ وہ میری تعلیم ادھوری چھڑوا کر مجھے گھر لے آئے۔ اب تمہارے سرمنڈھنا چاہتے ہیں مجھے' تاکہ ان کی بدنامی نہ ہو۔"

لالی کچھ دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا' پھر بولا۔ "میں تو جی تم سے یہی کہوں گا' تمہیں بھی چاہیے کہ ماسٹر جی کی بدنامی نہ ہو۔ وہ بہت چنگے بندے ہیں۔ فرشتے' ہیں فرشتے' اتنے نیک اور بھلے مانس کہ جی چاہتا ہے ان کے پیر دھو کر پیوں۔" لالی نے دل کی بات صاف صاف کہہ دی۔

طاہرہ کے چہرے پر چند لمحوں کے لیے غم کا سایہ پھیل گیا۔ اس میں حیا بھی تھی اور دبا دبا کرب بھی تھا۔ وہ ذرا دیر تک اسی عالم میں بیٹھی رہی' مگر جلد ہی غم کا سایہ آہستہ آہستہ اس کے چہرے سے ہٹ گیا۔ غصے اور نفرت کی کڑی دھوپ چھا گئی۔ "تم نرے چغد ہو۔ تمہیں کچھ بھی پتہ نہیں۔ میں ان کی بیٹی ہوں۔ میں ابا جی کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ نہ وہ فرشتے ہیں نہ اتنے بھلے مانس جتنا تم انھیں سمجھ رہے ہو۔" طاہرہ نے قدرے تامل کیا۔

"وہ ایک نمبر فراڈ ہیں۔ پہلے تو انھوں نے چار سو بیسی کر کے بوگس کلیم منظور کرایا' پرائمری اسکول کے معمولی ماسٹر سے بڑے زمین دار بن گئے۔ پھر غلے کی آڑھت کا کاروبار شروع کر دیا۔" اس نے لالی کو نظر بھر کر دیکھا۔ "سن رہے ہو؟"

"ہاں جی' بالکل سن رہا ہوں۔ کہتی جاؤ۔"

"اچھا تو اب یہ بھی سن لو۔ آڑھت کا تو صرف بہانہ ہے۔ وہ سمگلنگ کرتے ہیں۔ ادھر سے کنک اور چینی سرحد پار بھیجتے ہیں ادھر سے ہندوؤں کی بیمار اور بوڑھی گائیں بھینسیں لاتے ہیں۔ قصائیوں کے ہاتھ بیچ کر ان کا سڑیل گوشت لوگوں کو کھلاتے ہیں۔ دن بھر سمگلنگ کا دھندا کرتے ہیں۔ رات کو وظیفے پڑھ پڑھ کر اپنے گناہ بخشواتے ہیں۔" طاہرہ کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ "سن لیا تم نے وہ کتنے نیک اور فرشتہ ہیں؟"

لالی کو ایسا محسوس ہوا جیسے قلابازی کھا گیا ہو۔ اسے دکھ بھی ہوا' حیرت بھی ہوئی۔ مگر طاہرہ کے ذہنی خلفشار سے بے نیاز بولتی رہی۔ "اب تمہیں یہ بھی بتادوں کہ وہ تمہیں اپنے سمگلنگ کے دھندے میں ایجنٹ کے طور پر استعمال کریں گے تاکہ رینجرز اور بارڈر پولیس کے ساتھ گولی چلے تو تمہی مارے جاؤ' تمہی جیل جاؤ۔ مگر یہ سلسلہ بھی چند ہی مہینے چلے گا۔ میرے بچے کی پیدائش کے بعد وہ کسی مقدمے میں پھنسوا کر تم سے فارخطی لکھوا لیں گے اور میرا بیاہ اپنے بھتیجے سے کر دیں گے۔ وہ بدصورت ہے اور ایک ٹانگ سے لنگڑا بھی۔ مگر بہت بڑی زمیں داری اور جائیداد کا اکلوتا وارث ہے۔ اپنی یہ سکیم وہ آج ہی شام ماں جی کو بتا چکے ہیں۔" اس نے نظریں نیچی کر کے آہستہ سے کہا۔

"تم نے سب کچھ سن لیا۔ اب بتاؤ' کیا تم ایسی لڑکی سے شادی کر لو گے جس کے پیٹ میں کسی اور کا بچہ ہے؟"

"کتنے دن کا ہے؟" لالی نے اس کے پھولے ہوئے پیٹ کی جانب دیکھ کر کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

"چھ سات مہینے سے تو کم کا نہیں لگتا۔"

"شاید!" طاہرہ نے مختصر جواب دیا۔

لالی مسکرا کر بے نیازی سے بولا۔ "صرف تین مہینے کی تو بات ہے۔ فیر تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔"

طاہرہ نے لالی کو خوں خوار نظروں سے دیکھا اور نفرت سے منہ بگاڑ کر بولی۔ "تم عجیب بے غیرت انسان ہو۔ تم ایسا بچہ قبول کر لو گے؟"

"کرلوں گا' ضرور کرلوں گا۔ حرج ہی کیا ہے جی!" وہ نہایت ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ "ویسے سچ پوچھو تو یہ میرا معاملہ ہے بھی نہیں۔ اولاد کے بارے میں صرف ماں بتا سکتی ہے کہ اس کا پیو کون ہے۔ میں کس کا پتر ہوں' یہ بات میری ماں بتا سکتی تھی۔ تم کس کی دھی ہو' یہ بات بھی ماسٹر جی نہیں' تمہاری ماں بتا سکتی ہے۔ غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں میں؟"

طاہرہ نے زچ ہو کر کہا۔ "جو کچھ تم کہہ رہے ہو' ٹھیک ہی کہہ رہے ہو گے۔" وہ نڈھال ہو کر پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔

لالی بھی خاموش رہا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اب لالی کو وہاں سے چلا جانا چاہیے۔ تھا۔ اس نے طاہرہ کو پھر چھیڑا۔

"تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ اندر جاؤ۔ وٹنا ملو' خوشبو لگاؤ' ریشمی پٹانگل پہنو' سرخ جمپی اوڑھو'

سنگھار کرو۔ سویرے سویرے سامنے ایسے نہ آنا۔ وہٹی بن کے آنا۔ میں تمھارا گھونگھٹ اٹھاؤں گا۔ گھنڈ چکائی دوں گا۔"

طاہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے گم صم بیٹھی رہی۔ پھر اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔ "میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔" اس نے لالی کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "کہو تو تمھارے پیروں پر سر رکھ دوں۔ خدا کے لیے میرے ساتھ شادی کا خیال دل سے نکال دو۔"

"اپنے ابا جی سے کیوں نہیں کہتیں؟ ویاہ تو انھوں نے ہی طے کیا ہے۔"

"کہہ چکی ہوں' ان سے بار بار کہہ چکی ہوں۔ ان کے سینے میں دل نہیں' پتھر ہے۔ ماں جی کو بھی یہ رشتہ پسند نہیں۔ جب سے سنا ہے' بے چاری بیٹھی زار و قطار رو رہی ہیں۔" طاہرہ تیزی سے بولتے بولتے اچانک دھیمی پڑ گئی۔ اس نے لالی کا چہرہ غور سے دیکھا اور غم زدہ ہو کر بولی۔ "تم اتنے سنگدل کیوں ہو؟ تم مجھ سے شادی کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟ تمھیں مجھ سے محبت بھی نہیں ہے۔"

"ہرگز نہیں۔" لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔ "سیدھی سیدھی معاملے کی بات یہ ہے کہ اب تو میں ماسٹر جی سے اپنا ٹیکس وصول کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے مجھ سے چار سو بیسی جو کی ہے۔"

طاہرہ چونک پڑی۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ جھٹ اپنے کانوں سے سونے کے جھمکے اتارے' ہاتھوں کے کنگن اتارے اور انھیں لالی کی طرف بڑھا کر بولی۔ "لو یہ لے لو۔ یہ تمھارا ٹیکس ہے۔ اب یہاں سے چلے جاؤ۔" لالی نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ طاہرہ تلملا کر بولی۔ "قسم کھا کر کہتی ہوں' زہر کھا لوں گی' خودکشی کر لوں گی مگر تمھارے ساتھ شادی نہیں کروں گی' نہیں کروں گی۔"

"زیور پہن لو۔ زہر کھانے اور خودکشی کرنے کی ضرورت نہیں۔" لالی نے اس دفعہ نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "میں یہاں سے ابھی چلا جاؤں گا' پر ایک شرط پر۔"

"کیا شرط ہے تمھاری؟" طاہرہ کے چہرے پر خوشی سے پھول کھل اٹھے۔

"مجھے تمھاری نہیں' تمھاری بوری مُجھ کی ضرورت ہے۔ وہ پکا اٹھارہ سیر دودھ دیتی ہے اور تمھارے پیٹ میں....."

طاہرہ بات کاٹ کر بولی۔ "ایک نہیں تم دو لے جاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ جاؤ' جا کر نکال لاؤ دونوں کو اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میں صرف بوری مُجھ لوں گا۔ مگر اسے لینے میں نہیں جاؤں گا۔ وہاں راکھا موجود ہے۔ تم خود جاؤ اور مُجھ لے کر آ جاؤ۔"

"مگر وہ مجھے بھی نہیں لے جانے دے گا۔ میں اس سے کہوں گی کیا؟"

لالی اپنی ضد پر اڑا رہا۔ "یہ میں نہیں جانتا۔ مُجھ نکال کر تم ہی لاؤ گی اور میرے ساتھ پنڈ کے آخری سرے تک جاؤ گی۔ بولو کیا کہتی ہو؟ اگر یہ کام کر سکتی ہو تو جلدی کرو۔ نہیں تو اندر جاؤ' مجھے سونے دو۔ صبح نکاح کے بعد تم سے ملوں گا۔"

طاہرہ کا دمکتا ہوا چہرہ ایک بار پھر سونا پڑ گیا۔ "تم یہ تو سوچو۔ میں اسے کیسے نکال کر لا سکتی ہوں۔" وہ گڑگڑانے لگی۔ "خدا کے لیے مجھے بتاؤ' میں کیا کروں؟"

لالی نے اس کا پریشان چہرہ دیکھا اور کھل کر مسکرایا۔ "تم مجھے بے وکوف' پُھد' احمق' جنگلی اور نہ جانے کیا کیا کہہ چکی ہو۔ پر تم نے یہ بھی سوچا' خود تمھارے پاس کتنی سمجھ ہے۔ اگر تمھارے پاس سمجھ بوجھ ہوتی تو یوں کُھبن مُجھ کی طرح پیٹ پھلائے نہ بیٹھی ہوتیں۔" اس نے کچھ تامل کیا۔ حقارت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ "ماسٹر جی وظیفے پڑھتے ہیں' بیٹی عشق لڑاتی ہے اور میں بے وکوف ہوں۔ احمق اور جنگلی ہوں۔"

طاہرہ خاموش بیٹھی اس کی جلی کٹی سنتی رہی۔ لالی اسے مخاطب کر کے بولا۔ "اس طرح یہاں بیٹھے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ بتاؤ آس پاس کے کسی پنڈ میں تمھارا کوئی شریکا' کوئی رشتے دار ہے۔ ماماں' چاچا' موسا' تاؤ۔ کوئی نہ کوئی تو ہو گا؟"

طاہرہ نے جھٹ جواب دیا۔ "ماموں ہیں۔ چھ میل ادھر ایک چک میں رہتے ہیں۔ مگر وہ ہمارے گھر کم آتے ہیں۔ سگے ماموں نہیں ہیں۔"

"سگے' سوتیلے کی چھوڑو۔ بھیجے سے کام لو بھیجے سے۔ ماں جی تو تمھاری ہی طرف دار ہیں نا؟"

"بالکل ہیں۔ انھوں نے ہی تو مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے۔"

"تو بس تم سیدھی ان کے پاس جاؤ۔ ان سے کہو کہ وہ راکھے کو ماماں کو بلانے بھیج دیں۔ وہ ادھر جائے اور ادھر تم بوری مُجھ نکال کر لاؤ۔ بن گیا دونوں کا کام۔"

طاہرہ نے خوش ہو کر گردن ہلائی۔ "یہ ترکیب ٹھیک رہے گی۔" اس نے موج میں آ کر چٹکی بجائی۔ "بالکل ٹھیک ہے۔"

"خالی پیلی ٹھیک کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ جاؤ اور بوری مُجھ لے کر فٹافٹ آ جاؤ۔"

طاہرہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ لالی نے اسے ٹوکا۔ "اور دیکھو ماسٹر جی کا ایک قمیض' پگڑی اور ایک دھوتی بھی لیتی آنا۔ ایک ڈانگ بھی لانا۔"

"وہ کس لیے؟"

"جیسا کہتا ہوں، ویسا کرو۔ بیچ میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔ ۓ ایسے ہی نہیں لے جاؤں گا۔ اس کے ساتھ چاک یا گوجر بن کر جاؤں گا۔ آیا بھیجے میں؟ اور ہاں دیکھو۔ جاتے ہی ماسٹر جی کے حجرے کی زنجیر باہر سے چڑھا کر اس میں چپکے سے تالا ڈال دینا۔ ہر کام چوکس ہونا چاہیے۔"

طاہرہ چلی گئی۔ لالی بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ پندرہ منٹ بعد طاہرہ واپس آئی، مسکراتے ہوئے بولی۔ "رکھوالا چلا گیا۔ کم بخت بڑی مشکل سے گیا۔ جب میں نے اور ماں جی نے نوکری سے نکال دینے کی دھمکی دی تب گیا۔" اس نے بغل میں دبے ہوئے کپڑے لالی کو دے دیے۔ ایک لاٹھی بھی لائی تھی، وہ بھی دے دی۔

لالی نے ساری چیزیں لے کر کہا۔ "اب اندر جا کر تھوڑی دیر انتظار کر لو۔ اتنی دیر میں راکھا پنڈ سے دور چلا جائے گا۔ جلدی نہ کرنا، ورنہ سارا کام گڑبڑ ہو جائے گا۔ سمجھ گئیں؟ اب تم جاؤ۔"

طاہرہ کے جاتے ہی لالی نے جھٹ پٹ کپڑے تبدیل کیے۔ اپنی پتلون اور قمیص تہہ کر کے بغل میں دبائی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے وہ جوتی بھی کپڑوں کے اندر رکھ لی جو ماسٹر جی نے عام استعمال کے لیے دی تھی۔ لالی نے گھڑی دیکھی، ساڑھے دس بج رہے تھے۔

طاہرہ دوبارہ کمرے میں آئی۔ اس نے لالی کو دیکھا اور حیرت سے بولی۔ "ارے! تم تو بالکل پینڈو لگ رہے ہو۔" اس نے لالی کو دو سو روپے کے نوٹ دیے۔ "لو، یہ رکھ لو۔ تمھیں ضرورت پڑے گی۔"

لالی نے روپے لے کر دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے۔ طاہرہ نے ذرا دیر خاموش رہ کر چادر کے اندر سے چمڑے کی چار گول گول تھیلیاں نکال کر لالی کو دیں۔ "یہ کھسے ہیں۔ ماں جی نے کہا ہے، انھیں ۓ کے چاروں کھروں میں پہنا دینا تاکہ کھوجی ۓ کا سراغ لگانے نکلیں تو کھروں کے نشان پہچان نہ سکیں۔ سمجھ گئے؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" لالی نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔ "اپنے ماسٹر جی رسا گیری کا دھندا بھی کرتے ہیں؟"

طاہرہ نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اب تم جاؤ۔ میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ بوری سامنے درختوں کے نیچے کھڑی ہے، اسے لے جاؤ۔"

لالی اڑ گیا۔ "نہیں، تمھیں بھی میرے ساتھ چلنا ہو گا۔" وہ آگے بڑھا۔ اس نے برآمدے میں کھلنے والا دروازہ کھولا اور طاہرہ کو مخاطب کیا۔ "چلو آگے بڑھو۔ جو طے ہوا ہے، وہی ہو گا۔" اس کا

لہجہ تلخ ہو گیا۔ "تمھیں بھگا کر نہیں لے جاؤں گا۔ ایسا ارادہ ہوتا تو یہاں سے جاتا ہی کیوں۔" طاہرہ نے گھبرا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازے کی اوٹ میں اس کی ماں کھڑی تھی۔ لالی نے طاہرہ کو خاموش پا کر کہا۔

"خاماخا کا نکھرا نہ کرو۔ آگے بڑھو۔ میرا منہ کیا تک رہی ہو۔"

طاہرہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھی اور لالی کے ساتھ بیٹھک سے باہر نکلی۔ بھینس درختوں کے نیچے کھڑی تھی۔ لالی نے اسے دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ بھوری بھینس تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ بھینس کے چاروں کھروں میں چمڑے کے کھسے چڑھا دیے۔ رسی کھولی اور بھینس کو آگے بڑھانے کے لیے دھیرے دھیرے تت تت کی آواز نکالی۔

بھینس آگے بڑھی۔ لالی اس کی رسی پکڑ کر چلنے لگا۔ طاہرہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے اپنا بدن چادر سے چھپا رکھا تھا۔

آسمان پر گہرا غبار چھایا تھا۔ چاندنی دھندلی اور میلی میلی تھی۔ طاہرہ بہت خوف زدہ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی چل رہی تھی۔ ہر آہٹ پر کانپ اٹھتی۔ کسی قریب کی گلی میں کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔ اس کی آواز سن کر طاہرہ ایسی بدحواس ہوئی کہ گرتے گرتے بچی۔

لالی نے جھٹ بازو پکڑ کر اسے سنبھال لیا اور جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ دونوں گھر سے لگ بھگ سو قدم کے فاصلے پر تھے اور ایک درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑے تھے۔ طاہرہ آہستہ آہستہ ہانپ رہی تھی۔ لالی کو اس پر ترس آ گیا۔

"تم واپس چلی جاؤ۔ زبان کی تم جتنی فروٹ ہو اتنی ہی بزدل اور ڈرپوک ہو، بالکل چھچھوندر کی طرح۔ آہٹ ہوئی اور چر چر کرتی بھاگی۔" طاہرہ نے اس کی باتوں کا بالکل برا نہ مانا۔ مسکرا کر بولی۔ "تمھارا بہت بہت شکریہ! تم بہت نیک بندے ہو۔"

لالی نے اس کی جانب ذرا جھک کر دھیرے سے سرگوشی کی۔ "میں بالکل نیک بندہ نہیں ہوں۔ ہاں تم بہت نیک اور چنگی ہو۔ نہ شادی ہوئی نہ ویاہ اور دھیجے میں میرے لیے یہ ۓ لے آئیں اور دو سو روپے بھی۔" طاہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑی تو لالی نے اسے ٹوکا اور اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"اپنے بچے کا نام لالی رکھنا۔"

"لالا!" وہ حیرت سے بولی۔ "یہ کیا نام ہوا؟"

”میرا نام بھی لالی ہے۔ میں بھی اپنی ماں کے پیٹ میں بالکل اسی طرح آیا تھا۔ علوم نہیں، میرا پیئو کون ہے؟ میری ماں کے ویاہ کے بعد جو میرا پیئو بنا، وہ مجھے ہمیشہ حرام دا کہتا۔ ماں کو گالاں نکالتا، اور گھر سے مار کر باہر کر دیتا۔ مجھے اس سے ملنے نہ دیتا۔“ وہ ایک لمحے کو رکا۔ ”میرے ساتھ تمہارا ویاہ ہو جاتا تو میں تمہارے بچے کو کبھی حرام دا نہ کہتا۔ تمہیں مار کر کبھی گھر سے نہ نکالتا۔ پر میرے ہاتھ میں تو ویاہ کی لکیر ہی نہیں ہے۔“

طاہرہ نے نظر بھر کو لالی کو دیکھا اور واپس جانے کا ارادہ بدل دیا۔ ”میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ تمہیں گاؤں کے نکڑ پر جا کر رخصت کروں گی۔“

لالی نے مسکرا کر کہا۔ ”اتنی جلدی جلدی فیصلے نہ بدلا کرو۔ ایک گڑھے سے نکلو گی تو دوسرے میں گر جاؤ گی۔“ معاً رات کے سناٹے میں آہٹ ابھری۔ لالی نے ہولے سے طاہرہ کو دھکا دیا۔

”جاؤ، کوئی آ رہا ہے۔“

طاہرہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے گھر کی جانب چلی گئی۔ لالی آگے بڑھ گیا۔

نو

لالی جہانگیرہ میں داخل ہو کر شاداں کے گھر پر پہنچا تو رات ڈھل رہی تھی۔ اس نے بھینس گھر کے دروازے کے نزدیک ایک درخت سے باندھی اور دیوار پھاند کر آنگن میں آہستہ سے اتر گیا۔ شاداں آنگن میں سو رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ لالی نے قریب جا کر دھیرے سے شاداں کا کندھا جھنجوڑا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”وے لالی توں، تو بالکل جٹ لگ رہا ہے۔ میں تو ڈر گئی تھی، کون آ گیا؟“

”ڈر مت، میں تجھے اغوا کرنے نہیں آیا۔ یہ بتا تیری بوری کا کیا بنا؟“

”مر گئی، ملک نے اسے مار ڈالا۔“ وہ دل گرفتہ ہو کر بولی۔ ذرا دیر خاموش رہی۔ پھر شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔ ”میں ملک کا خون پی لوں گی۔ اس کی بوٹیاں چبا ڈالوں گی۔“

”بوری کو ملک نے نہیں، میں نے مارا۔ لے میری بوٹیاں نوچ کر چبا۔“

”لالی! تو یہاں سے چلا جا۔ مجھے کچھ چنگا نہیں لگتا۔“ شاداں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”تیں نوں پتہ ہے، میں نے بوری کے کارن بالے کا گلا کاٹ ڈالا۔“

لالی نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”تاجی تو کمرے میں نہیں ہے؟“

”نہیں وہ آج سویرے مجھ سے لڑ جھگڑ کر اپنے گھر چلی گئی۔“

لالی نے شاداں کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ ”میرے ساتھ آ۔“

شاداں ہاتھ چھڑاتے ہوئے بیزاری سے بولی۔ ”لالی! مجھے تنگ نہ کر۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میرا جی کرتا ہے، اپنا گوشت نوچ ڈالوں۔“

انکار کے باوجود لالی اسے کھینچتا ہوا آنگن کے دوسرے سرے پر لے گیا۔ مگر جب وہ دروازے کی جانب بڑھا تو شاداں نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ آنکھیں نکال کر بولی۔ "کیا چاہتا ہے؟ میں تیرے سنگ نہیں جاؤں گی۔"

"پاگل نہ بن' تیری مرضی کے بنا تجھے کوئی اپنے سنگ نہیں لے جاسکتا۔ یہ بات تو بھی جانتی ہے۔ فیر کیوں ڈرتی ہے۔" لالی نے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی کھول دی۔ "دروازے تک تو آجا۔ یہ تو تیرے ہی گھر کی دہلیج ہے۔"

شاداں آہستہ آہستہ دروازے تک چلی گئی۔ لالی نے دروازہ کھولا۔ باہر گیا اور بھینس کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ شاداں حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"ہائے! یہ ںُ تو کہاں سے لے آیا؟"

لالی نے دروازہ بند کیا۔ "ٹھیک طرح دیکھ لے۔ بوری ہے اور دھرلی بھی ہے۔ پکا اٹھاراں سیر دودھ دیتی ہے۔ نیلی بار ہی کی کھولی ہے۔ اب تو ہنس دے۔ تیری بوری واپس آگئی۔"

شاداں نے بھینس کی گردن اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ "لگتی تو ویسی ہی ہے۔" پھر اس کی تھوتھنی سہلاتے ہوئے بولی۔ "اٹھاراں ہی سیر دودھ دیتی ہے نا؟"

"بیٹھ جا' تھنوں کے نیچے۔ دوہ کر دیکھ لے۔"

"اس دکھت؟ تیرا مگز تو نہیں چل گیا۔ یہ بتا کہاں سے لایا؟" اس کی نظر بھینس کے کھروں پر پڑی۔ "چوری کر کے تو نہیں لایا؟ اس کے کھرے میں کھسے کیوں پڑے ہیں؟"

"اس لیے کہ کھوجی اس کا کھرا نہ نکال سکیں۔" وہ نہایت ڈھٹائی سے بولا۔ "ویسے یہ مجھے دہیج میں ملی ہے۔ گھروالی تو نہیں ملی۔ اس کی مجھے ضرورت بھی نہیں تھی۔"

"ٹھیک ٹھیک بتا؟"

"میں نے کبھی تجھ سے جھوٹ بولا ہے۔" لالی نے مسکرا کر بتایا۔ "اسے نہ لاتا تو گھروالی گلے پڑ جاتی۔ تھی تو ایسی سوہنی' تجھے کیا بتاؤں۔ لہور کے کالج میں پڑھتی ہے' پر وہ گبھن ںُ ہے۔ اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔"

"تیری باتیں بالکل سمجھ نہیں آئیں۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "صاف صاف بات کر۔"

"آرام سے بیٹھ کر تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔ پہلے یہ بتا' اس روز میرے جانے کے بعد کیا ہوا؟"

"تیرے جاتے ہی ملک اپنے کرندوں کو لے کر آگیا۔ مجھے زبردستی پکڑ کر اپنی حویلی میں لے گیا۔ بہت لال پیلا ہوا۔ بہت نراض ہوا۔ مارنے کو بار بار اٹھا۔ مجھے دھمکی دی کہ کسی سے نہ کہوں کہ بوری اس کی گولی لگنے سے مرگئی۔ پر پنڈ میں یہ بات سب کو ملوم ہے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے دم بھر کو رکی۔ "بوری کو اس کے کی اور کرندے اسی وکھت ریڑھے میں ڈال کر لے گئے۔ کھائی کو دے دیا ہوگا۔ دور کسی گڑھے شڑھے میں ڈال دیا ہوگا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "ملک سو روپے دیتا تھا۔ میں نے نہیں لیے۔ خالی ہاتھ چلی آئی۔"

"ٹھیک ہی کیا۔ اس نے پولیس تو نہیں بلائی؟"

"نہیں! بوری کے مرنے کے بعد ڈر گیا۔ پر اپنی بندوک کے بارے میں بار بار پوچھتا تھا۔ توں نے اس کا کیا کیا؟"

"ادھر بڑیلی کی ایک جھاڑی میں پھینک دی۔" لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "اب تو یہ سوچ۔ کل سب پوچھیں گے' یہ ںُ کہاں سے آئی' تو کیا کہے گی؟"

"ہائے! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ بتا کیا کہوں؟"

"تیرا کھسم کہہ دے گا' یہ ںُ اس نے تجھے دی ہے؟"

"کہہ دے گا۔ ضرور کہہ دے گا۔ جو کہوں گی' وہی کہہ دے گا۔"

"وہ تجھے اتنا پیار کرتا ہے تب بھی اس کے پاس نہیں جاتی۔ اس سے اتنا خار کیوں کھاتی ہے؟"

"تمیں نوں پتہ نہیں' مجھے وہ کبھی پسند نہیں آیا۔" وہ خیالوں میں کھوگئی۔ ذرا دیر خاموش رہ کر بولی۔ "میری ماں مرگئی تھی۔ سوتیلی ماں تھی۔ وہ مجھے بہت تنگ کرتی تھی۔ مارتی تھی۔ کھانے کو نہیں دیتی تھی۔ ننگی ننگی گالاں نکالتی تھی۔ میں چھوٹی سی تھی تو اس نے کھیردین سے میرا دیاہ کردیا۔ میرے گھروالے کا نام کھیردین ہے۔ توں نے اسے نہیں دیکھا۔ بالکل ادھکڑ ہے۔ آدھے سے زیادہ تو اس کی داڑھی اور سر کے بال چٹے ہیں۔ ہائے' ایسی بری شکل ہے اس کی' تجھے کیا بتاؤں۔ یہ لما منہ اور باہر نکلے ہوئے یہ لمے لمے دانت۔ بالکل دندلو ہے۔ گصہ تو اسے آتا ہی نہیں۔ کبھی لڑائی جھگڑا نہیں کرتا۔ کوئی آنکھ دکھائے تو ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ سب کہتے ہیں۔ ہائے' کھیردین کتنا نیک بندہ ہے' کتنا بھلا ہے۔ فرشتہ ہے فرشتہ۔ شاداں ہی بری ہے۔" وہ غصے سے ایک دم بپھر گئی۔ "ایسا ہی بھلا ہے تو اس فرشتے سے اپنی دھی' اپنی بھین کیوں نہیں دیاہ دی؟ شاداں کیوں اس کے گلے میں ڈھول بنا کر ڈال دی؟ ماں نے چپکے سے تین سو روپے جو لیے تھے۔ ہائے کتنے سستے داموں بیچ دیا مجھے۔"

وہ نہ جانے اور کیا کیا کہتی مگر لالی نے اسے روک دیا۔ "اپنی ہی کہے جائے گی یا دوسرے کی بھی سنے گی؟"

”کمہ کیا کہتا ہے؟“

”میرا کہا مان۔ کل سویرے ہی سویرے اپنے کھصم کے پاس چلی جا۔ ہو سکے تو اسے اور بچوں کو چند روز کے لیے ‘یہاں لے آ۔“

”میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“ شاداں نے صاف انکار کر دیا۔ ”ایک بار اس کے گھر سے چلی آئی‘ اب اس کی دہلیج پر قدم نہیں رکھوں گی۔ اس نے پہلے بھی بہت منتیں کیں پر میں نہیں گئی۔ اب کیسے جا سکتی ہوں؟“

”نہ جا۔“ لالی جل کر بولا۔ ”پکڑی جائے گی۔“

”تو کیا سچ مچ‘ تُو نے چوری کی ہے؟“

”پیو کی طرف سے چوری کی ہے‘ ماں اور دھی کی طرف سے دہج میں ملی ہے۔ یہ دو سو روپے بھی ملے ہیں۔“ لالی نے دھوتی کے ڈب سے روپے نکالے اور شاداں کو دے کر بولا۔ ”لے یہ رکھ لے۔ مان لے‘ پولیس کوئی چکر شکر چلائے تو کچھ دے دلا کر معاملہ دبا دینا اور دیکھ‘ کل ضرور کھیر دین کے پاس جانا۔ وندلو تجھے اپنے لمے لمے دانتوں سے کاٹ تو نہیں کھائے گا۔ ویسے بھی تجھے برسوں کاٹتا رہا ہے۔ چند روز اور کاٹ لے گا تو تیرا کیا بگڑ جائے گا۔“ لالی نے اسے نرم لہجے میں سمجھایا۔ ”ضد نہ کر‘ میرا کہا مان۔ ورنہ گھر آئی تُو بھی ہاتھ سے جائے گی اور خود بھی کسی چکر میں پڑ جائے گی۔ بول‘ کیا کہتی ہے؟“

”توں کہتا ہے تو چلی جاؤں گی۔“ شاداں صورت حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے رضامند ہو گئی۔ ”سویرے ہی سویرے چلی جاؤں گی۔“

”یہ بتا کپڑے لے آئی؟“

”نہیں‘ درزی پنڈ چھوڑ کر شہر چلا گیا۔ برا نہ مان۔ کل شام تک ٹھہر جا۔ میں ضرور تیرے لیے‘ قمیض سلوا کر لے آؤں گی۔ دھوتی کا کیا ہے وہ میری لے لے۔ ویسے چدر سے بھی کام چل جائے گا۔“

”اب ضرورت بھی نہیں‘ مجھے اب جانا ہے۔ ابھی رات رہتی ہے۔ اندھیرے میں نکل جاؤں گا۔ دیکھ‘ سویرے اپنے کھصم کے پاس چلی جانا۔“

”تجھے کہہ تو دیا‘ چلی جاؤں گی‘ ضرور چلی جاؤں گی۔“ شاداں نے بھینس کی رسی پکڑی اور لالی کو روک کر بولی۔ ”بوری کو باندھ لوں۔ توں اکیلا نہیں جائے گا۔ میں بھی ساتھ چلوں گی۔“

”آج نہیں۔ اب تو میرے ساتھ اس روز چلے گی جس روز میں تجھے بھگا کر لے جاؤں گا۔ تار

رہنا۔“

”بکواس نہ کر۔“ شاداں منہ بگاڑ کر بولی۔ ”توں تو اڑیل ٹٹو ہے۔“

لالی کھل کر مسکرایا۔ ”دیکھ اتنا تو ہوا۔ کنجر سے مجھے اڑیل ٹٹو بنا دیا۔ سیڑھی سیڑھی نیچے اتر رہی ہے۔“ وہ آگے بڑھا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

☆

لالی اس راستے کی جانب بڑھا جو ریل کی پٹڑی کی طرف جاتا تھا۔ اسی راستے سے وہ پہلے بھی جہانگیرہ آ چکا تھا اور اب اس سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ وہ جلد سے جلد رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔

وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔ ابھی اسے خاصا لمبا فاصلہ طے کرنا تھا۔ رات ختم ہونے میں چند گھنٹے رہ گئے تھے۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ مگر وہ دو ڈھائی میل آگے گیا تھا کہ ایک موڑ پر قریب سے آواز آئی۔

”چوہدری! تیرے پاس ماچس تو ہو گی؟“

لالی سنی ان سنی کر کے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ ایک شخص اندھیرے سے نکل کر اس کی جانب بڑھا۔ ”تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ وہ سائیکل پر سوار تھا۔ لالی نے دھندلی دھندلی چاندنی میں فوراً بھانپ لیا کہ وہ سادہ لباس میں پولیس کا کانسٹیبل ہے۔ وہ لمبے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ ڈھلتی عمر کے باعث اس کی کمر ذرا جھک گئی تھی۔ لالی نے ٹالنے کے لیے کہا۔

”میرے پاس ماچس نہیں ہے۔ میں سگریٹ نہیں پیتا۔“

وہ آگے بڑھ گیا۔ لیکن کانسٹیبل نے اسے جانے نہیں دیا‘ پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”چوہدری! گل سن۔“

لالی ٹھہر گیا۔ مگر خاموش رہا۔ کانسٹیبل نے سائیکل ایک طرف کھڑی کی اور جھک کر اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”لگتا ہے‘ تجھے کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟“ وہ لالی کو مشتبہ نظروں سے گھورنے لگا۔

لالی نے جھٹ کہا۔ ”تجھے ایسے ہی شبہ ہوا۔ میں تو اس پنڈ میں پہلی بار آیا تھا۔“ اس نے چاہا کہ بڑھ کر آگے نکل جائے۔ لیکن کانسٹیبل نے اس کا بازو تھام کر روک لیا۔ ”بات تو سن۔“ وہ لمحے بھر کے لیے رکا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ”تو لالی تو نہیں ہے؟“

"نہیں۔" لالی نے صاف انکار کر دیا۔ "میں نے کہا نہیں، تجھے شبہ ہوا۔"

"میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔" کانسٹیبل نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "تو لالی ہے۔ پچھلے دنوں جیل سے نکل کر بھاگا ہے۔"

"تجھے کیسے ملوم ہوا میں لالی ہوں۔" لالی نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے اسے دیکھا۔ "خالی پیلی تھانے داری جمانے کھڑا ہو گیا۔"

"میں نے تھانے میں تیری تصویر دیکھی ہے۔ تو لالی ہی ہے۔" کانسٹیبل نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "تو میری نظروں کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ ۳۰ سال ہو گئے، پولیس کی نوکری کرتے۔ ایک سے ایک اونچا مجرم دیکھا ہے اور ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔"

لالی نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ دس روپے کا نوٹ دھوتی کے ڈب سے نکالا اور کانسٹیبل کی طرف بڑھاتے ہوئے گویا ہوا۔

"لے اسے رکھ لے"

کانسٹیبل نے دس روپے کا نوٹ تو لے لیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ "تیرے لیے تو دو ہزار روپے کا انعام ہے۔ تیرا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟"

لالی نے ایک نوٹ اور نکالا اور کانسٹیبل کو دے کر بولا۔ "میرے پاس اب صرف ریل کا کرایہ رہ گیا ہے، وہ تجھے نہیں دوں گا۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "ساتھ ہی یہ بھی سن لے۔ میرا رستہ روکا تو یہیں لٹا دوں گا۔"

لالی نے جھپٹ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ ہلکا سا جھٹکا دے کر ہاتھ کا شکنجہ کسا تو ادھیڑ عمر کانسٹیبل غیں غیں کرنے لگا۔ "خانہ خراب، میری گردن تو چھوڑ۔ میں نے کب تیرا رستہ روکا۔" لالی نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اپنی گردن سہلاتے ہوئے بولا۔ "تیرے ہاتھ تو لوہے کے لگتے ہیں۔ تو نے تو میری گردن ہی توڑ دی تھی۔" وہ ذرا سا رکا۔

"جائے گا کہاں؟"

"بیکار کی ٹر ٹر نہ کر۔" لالی نے اسے ڈانٹا۔

"ناراض نہ ہو۔ میں تو تیرے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں۔ پولیس کی ایک پارٹی ذرا دیر پہلے ادھر سے گزری ہے۔ سب کے سب مسلح ہیں۔ صوبے دار بھی ان کے ساتھ ہے۔"

"راؤنڈ پر نکلے ہیں؟" لالی نے دریافت کیا۔ اس کے لہجے سے تشویش جھلک رہی تھی۔

"نہیں۔" کانسٹیبل ابھی تک رک رک کر اپنی گردن سہلا رہا تھا۔ "پرسوں رات یوسف والا

ریلوے کراسنگ پر زبردست ڈاکا پڑا۔ ڈاکوؤں نے بس لوٹ لی۔ گولی بھی چلائی۔ ایک زخمی اسپتال جاتے جاتے راستے ہی میں چل بسا۔ جب سے یہ واردات ہوئی ہے پولیس ہر طرف بھاگ دوڑ کرتی پھر رہی ہے۔ ویسے میں تو اپنے بھائی کے پنڈ جا رہا تھا۔ وہ سخت بیمار ہے۔" اس نے توقف کیا۔ "مخبروں نے بتایا ہے، ڈاکو ادھر ہی کہیں چھپے بیٹھے ہیں۔"

"صوبے دار کدھر گیا ہے؟"

کانسٹیبل نے شمال کی سمت ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "پوری پارٹی ادھر گئی ہے۔" لالی کو بھی اسی طرف جانا تھا۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔ اسے کوئی دوسرا راستہ معلوم نہیں تھا۔ کانسٹیبل نے اسے خاموش دیکھ کر دریافت کیا۔ "تیں نوں کتھے جانا ہے؟"

"جدھر پولیس پارٹی گئی ہے۔"

"پر تو تو سٹیشن جائے گا۔"

"ہاں۔" لالی نے انکار نہیں کیا۔ حالانکہ اسے اسٹیشن ہرگز نہیں جانا تھا۔ مگر وہ یہ ضرور جانتا تھا لہ قادر آباد اسٹیشن کے قریب پہنچ کر اسے اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کا راستہ مل جائے گا۔

"میری مان تو اس طرف سے نکل جا۔" کانسٹیبل نے اس راستے سے ذرا ہٹ کر ایک طرف شارہ کیا۔ "یہ رستہ چھوٹا ہے اور تیرے لیے ٹھیک بھی رہے گا۔ ایسا کر سیدھا سیدھا چلا جا۔ آگے باکر چو ملے گا۔ یہ برساتی نالا چک ۱۰۲۔ بی کے نزدیک سے گزرتا ہے۔" وہ گردن اٹھا کر سوچنے لگا۔ چ یہاں سے چار میل تو ہو گا۔ اس پر پہنچ کر ایسا کرنا، اس پار نہ جانا۔ چو کے کنارے چلا انا۔ اس رستے پر جھنگر ہے، جھاڑیاں بہت ہیں۔ تجھے کوئی دیکھ بھی نہ پائے گا۔ جہاں چو مڑتا ہے اں سے پورب کی طرف جانے والا رستہ پکڑنا۔ آگے جا کر نہر ملے گی وہ قادر آباد سٹیشن کے نزدیک ے گزر کر لوئر باری دو آب سے مل جاتی ہے۔ سمجھ گیا؟"

"سمجھ گیا، بالکل سمجھ گیا۔" لالی تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "پر تجھے ایک گل بتا دوں۔ اگر دو ہزار نام کے چکر میں تو نے مجھے پھنسوا دیا اور میں پکڑا گیا تو اتنا سمجھ لے، میں جیل سے سیدھا یہاں ں گا۔ تجھے چھوڑوں گا نہیں۔" یہ کہہ کر لالی نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ "میرا نام لالی ہے۔ اتنا یاد ھنا۔"

"تو کس چکر میں پڑ گیا۔ میرا نام واحد ہے۔ ادھر مجھے سب جانتے ہیں۔ پہلے بھی کئی مجرم پکڑوا چکا ہوں۔ دو بار اسی چکر میں زخمی ہو کر اسپتال بھی گیا۔ ان پر تجھ سے زیادہ انعام تھا، پر ہر بار انعام اوپر ار کو ملا کس ی کی وردی میں ایک سے دو پھول لگ گئے۔ مجھے کیا ملا۔ کپتان صاحب نے ہاتھ ملایا

اور کندھا تھپک دیا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ میری تنخواہ ۲۰ روپے سے آگے نہ بڑھی۔ ۵ بچے ہیں۔ گھر والی ہے اور اندھی ماں ہے۔" اس کا لہجہ اور تلخ ہوگیا۔ "ذرا سوچ تو' اپنے پر کیا بیتتی ہے۔ میری ماں تو اندھی ہے۔ اوپر والوں کی دونوں آنکھیں ہیں۔ تب بھی اندھے ہیں۔"

لالی بہت متاثر ہوا۔ اس نے کانسٹیبل کی باتوں پر اعتبار بھی کرلیا۔ ڈب سے دس روپے کا ایک نوٹ اور نکالا اور کانسٹیبل کو دے کر بولا۔ "لے' یہ بھی رکھ لے۔ پروا نہ کر۔ اپنا کام چل جائے گا۔" وہ اس سمت بڑھا جدھر کانسٹیبل نے جانے کی ہدایت کی تھی۔

کانسٹیبل نے چلتے چلتے ٹوکا۔ "دیکھ بھال کے رستہ چلنا۔ اتنا دھیان رکھنا' ڈاکوؤں کی دھاڑ بھی اسی علاقے میں ہے۔" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ اس راستے پر چل پڑا جو کانسٹیبل نے بتایا تھا۔

چار' ساڑھے چار میل راستہ طے کر کے وہ برساتی نالے پر پہنچا اور اس کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگا۔ کانسٹیبل نے ٹھیک کہا تھا۔ اس راستے پر جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں' گھنی بھی اور اونچی بھی۔ لالی جھاڑیوں کی اوٹ میں تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھتا گیا۔ وہ مڑ مڑ کر چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا بھی جاتا۔ پولیس کا بھی خطرہ تھا اور ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ ہونے کا بھی دھڑکا تھا۔

☆

ایک گھنی جھاڑی کے قریب اندھیرے میں دو سائے لہرائے۔ لالی سنبھلا بھی نہ تھا کہ کسی نے پیچھے سے اسے دبوچ لیا۔ ایسی مضبوطی سے گرفت میں لیا کہ لالی بے بس ہوگیا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا' ایک قوی ہیکل نوجوان اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچے خونخوار نظروں سے گھور رہا ہے۔ آن کی آن میں اسی وضع قطع کے دو اور نوجوان جھاڑیوں سے نکل کر سامنے آگئے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے کرتے اور خوب گھیردار شلواریں پہنے ہوئے تھے۔ ایک کے چہرے پر ڈھاٹا بھی بندھا تھا۔ لالی فوراً سمجھ گیا کہ وہ کون ہیں۔ یہ وہی ڈاکو تھے جنھوں نے پرسوں رات ریلوے کراسنگ پر بس لوٹی تھی۔ ایک ڈاکو نے لالی سے پوچھا۔

"کون ہے تو؟"

لالی نے غچا دے کر نکل جانا چاہا۔ "سٹیشن جا رہا ہوں۔ میں نے ملتان کے لیے گڈی پکڑنی ہے۔"

پیچھے کھڑے ہوئے ڈاکو نے جو دونوں ہاتھوں سے لالی کو جکڑے ہوئے تھا' اونچی آواز سے کہا۔ "مجھے تو پولیسا جان پڑتا ہے۔"

"مخبر ہوگا۔" دوسرے نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

لالی نے انکار میں گردن ہلائی۔ "نہیں۔"

"ٹھیک ٹھیک بتا' کون ہے؟" سامنے کھڑے ہوئے ڈاکو نے لالی کے منہ پر تڑاق سے تھپڑ رسید کیا۔ لالی کا ایک گال اور کان جھنجھنا کے رہ گئے۔ آنکھوں تلے اندھیرا آگیا۔ اس نے بے بسی سے کہا۔ "یارو! مارتے کیوں ہو؟ میں سچ سچ بتادوں گا۔" اس نے اپنا گال سہلایا۔ "میرا نام لالی ہے۔ میں جیل سے بھاگا ہوا کیدی ہوں۔"

چند لمحے وہ خاموش کھڑے رہے۔ ان کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں لالی کی بات پر یقین نہیں آیا۔ ایک نے شبے کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"ادھر کس لیے آیا تھا؟"

"پولیس کے ڈر سے۔ پولیس میری تلاش میں ہے۔ دو ہزار کا انعام میری گرفتاری پر رکھا گیا ہے۔"

"دو ہزار کا انعام؟" دوسرے نے حیرت سے کہا۔ "اوئے پھیرو! یہ تو کوئی اونچی چیز لگتا ہے۔"

پھیرو نے لالی کے بازو کا گوشت ٹٹولا اور اس کی مونچھ مروڑ کر اونچی کی۔ مسکرا کر بولا۔ "لگتا بھی زور آور ہے۔"

لالی نے عاجزی سے کہا۔ "یار! میری کمر تو چھوڑ۔ میں بھاگا نہیں جا رہا ہوں۔"

پھیرو نے اونچی آواز سے کہا۔ "عالم! چھوڑ دے اسے۔" عالم نے لالی کو اپنی گرفت سے آزاد کردیا۔

لالی گڑگڑا کر بولا۔ "جو پوچھنا ہے' پوچھ لو۔ ابھی اندھیرا ہے' میں سٹیشن چلا جاؤں گا۔"

مگر انھوں نے لالی کو جانے نہیں دیا۔ اسے اپنے نرغے میں لے کر ایک طرف چل دیئے۔ انھوں نے خشک برساتی نالہ عبور کیا اور دوسری طرف پہنچ کر گھنے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھنے لگے۔

قریب جا کر لالی نے دیکھا' وہاں بھی دو ڈاکو موجود ہیں۔ ایک مٹی کے تودے پر درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس بارہ بور کی دونالی بندوق رکھی تھی۔ اپنی آن بان سے وہ ان کا سرغنہ لگتا تھا۔ اس نے لالی کو دیکھ کر دور ہی سے پوچھا۔

"کون ہے یہ؟"

بھ نے جواب دیا۔ "ٹھیک سے پتہ نہیں۔ کہتا ہے' جیل سے نکل کے بھاگا ہے۔"

عالم بولا۔ "یہ بھی کہتا ہے' اس کی گرفتاری پر دو ہزار کا انعام ہے۔"

سرغنہ نے لالی کو اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا۔ "سنا تو میں نے بھی ہے کہ پچھلے دنوں دو کیدی جیل سے نکل بھاگے۔" اس نے لالی سے پوچھا۔ "جیل کس چکر میں گیا تھا۔ کسی کا خون کیا تھا؟"

لالی نے جواب دیا۔ "نہیں۔"

"ڈکیتی کی تھی؟"

"نہیں۔" لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔

"فیر جیل کیوں ہوئی تھی؟ کوئی چھوہری شوہری بھگائی تھی؟"

"نہیں جی' میں ایسا کام نہیں کرتا۔" لالی نے آہستہ سے کہا۔ "سیکل چرائی تھی۔"

"اوئے چڈو! اتی وڈی توپ چلائی۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ اپنے ساتھیوں کی جانب متوجہ ہوا۔ "لو سن لو۔ اس نیولے کے جیل سے بھاگنے پر دو ہزار کا انعام رکھا ہے۔ پولیس کی مت ماری گئی ہے۔" اس نے ڈپٹ کر لالی سے کہا۔ "اوئے نیولے! ادھر آ میرے نزدیک۔"

لالی اس کے پاس چلا گیا۔ وہ اپنی ٹانگوں کی طرف اشارہ کرکے بولا۔ "لے' میری ٹانگیں دبا۔" لالی خاموشی سے اس کے نزدیک بیٹھ کر ٹانگیں دبانے لگا۔ ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے عالم کی جانب مڑ کر دیکھا۔

"رشید بلاّ ابھی تک نہیں لوٹا؟"

عالم نے جواب دیا۔ "اب تو جی مشکل ہی لگتا ہے۔ اجالا ہو گیا ہے۔ شام کو آئے گا وہ۔"

سرغنہ اونچی آواز سے گرجا۔ "تم سبھی چلے آئے۔ چاروں طرف پولیس پھیلی ہے اور تم یہاں کھڑے ہو۔ جاؤ' جا کر ہوشیاری سے ادھر ادھر دیکھتے رہو۔ خطرہ ہو تو فوراً سیٹی مارو۔" وہ پاس کھڑے ہوئے ڈاکو سے مخاطب ہوا۔ "کیرے' تو بھی جا۔ کسی اونچے درخت پر چڑھ کر دور دور تک نظر ڈال لینا۔"

سب چلے گئے۔ صرف لالی رہ گیا۔ وہ گردن جھکائے سرغنہ کے پیر دباتا رہا۔ ذرا دیر بعد اس نے لالی کو مخاطب کیا۔ "نیولے!"

اس دفعہ لالی بھڑک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "دیکھو جی! مجھے نیولا شیولا مت کہو۔" ڈاکو نے جھٹ بندوق پر ہاتھ رکھا۔ تیوری پر بل ڈال کر چیخا۔ "کیا کہا؟"

لالی مرعوب نہیں ہوا۔ گردن اونچی کرکے گویا ہوا۔ "میرا نام لالی ہے' نیولا نہیں۔"

"چل لالی ہی سہی۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا اور بندوق پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی جان لے' میرا نام داد محمد ساہو ہے۔ چھے خون کر چکا ہوں' پرسوں رات والا ساتواں تھا۔ تو چوری چکاری کرنے والا مجھے کیا جانے۔ پولیس جانتی ہے مجھے۔ میرے سر کی بولی پنج ہزار رکھی گئی ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے ساہو' میں تجھے نہیں جانتا۔" لالی اس کے پیر دباتے ہوئے بولا۔ "تجھے کون نہیں جانتا؟ مگر مجھے گلہ ہے پولیس تو مجھے جانتی ہے' توں نہیں جانتا۔ جانتا ہوتا تو میرا رستہ نہ روکتا۔ مجھ سے تو تیں نوں کوئی خطرہ نہیں۔"

"اب تو اجالا بھی پھیل گیا۔ یہاں سے نکل کے کہاں جائے گا؟" داد محمد ساہو نے لالی کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تو نے تو اپنا ٹھکانا بھی دیکھ لیا۔ ابھی تجھے نہیں جانے دوں گا۔ دن یہیں کاٹ لے۔ رات کو اپنے ساتھ نکل چلنا۔ رشید بلاّ آجاتا تو میں آج ہی نکل جاتا۔ مجھے اسی کا انتظار ہے۔ شام تک آ ہی جائے گا۔"

لالی دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا اور خاموشی سے ساہو کے پیر دباتا رہا۔ ذرا دیر بعد ساہو درخت سے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ "لے ذرا کندھے بھی دبا دے۔ بہت تھک گیا ہوں۔ رات بھر راؤنڈ پر رہا۔ پولیسیے گھات میں ہیں۔ اپنے کو بھی چوکس رہنا پڑتا ہے۔" وہ چند لمحے آنکھیں بند کیے چپ بیٹھا رہا پھر لالی سے مخاطب ہوا۔ "لگتا تو جی دار ہے۔ کہاں پڑ گیا چوری چکاری میں؟ کیا دھرا ہے اس میں؟ پوچھو چرایا کیا؟ صرف ایک سیکل' ملا کیا؟ دو سو سے بھی کم اور سزا دو سال سے اوپر ہی ہوئی ہوگی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "جی کرے تو لگ جا اپنے ساتھ لین میں۔ ڈکیتی کا مزا بھی دیکھ لے۔ لومڑی سے ایک دم شیر بن جائے گا' شیر۔ کیا سمجھا؟"

"ڈاکے تو میں نے بھی ڈالے ہیں۔ راشن ڈپو لوٹا تھا' ایک پیٹرول پمپ بھی لوٹا۔" لالی اپنی بات کہتے کہتے ذرا سا رکا۔ "پر اس وکھت تو مجھے رحیم داد کے پاس جانا ہے۔"

"کون رحیم داد؟"

"وہی جو میرے ساتھ جیل سے فرار ہوا ہے۔"

"گولی مار اسے۔ اپنی سوچ۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "میں اس سے دھوکا نہیں کر سکتا۔"

"جیسی تیری مرضی۔ لیکن جب تک اپنا ادھر پڑاؤ ہے' تو نہیں جا سکتا۔ دن تو تجھے یہیں کاٹنا پڑے گا۔ رات کو تیرے بارے میں سوچونگا۔"

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ مگر ذرا ہی دیر بعد لالی کو اس بیگار سے نجات مل گئی۔ داد محمد ساہو بولا۔ "بس کر۔ نیند آ رہی ہو تو یہیں لیٹ جا۔ پروا نہ کر۔ دوپہر کی روٹی تجھے بھی ملے گی۔"

لالی اٹھا اور کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے گٹھری سرہانے رکھ کر لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ نرم نرم جھونکوں سے آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

سہ پہر کو لالی بیدار ہوا۔ ساہو کھیس بچھائے بے خبر سو رہا تھا۔ سامنے فقیرا بندوق سنبھالے چوکس بیٹھا تھا۔ لالی بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ فقیرا اس کے لیے کھانا لے آیا۔ باسی روٹی تھی اور اس کے ساتھ صرف پیاز اور ہری مرچ تھی۔ البتہ پینے کو پانی گلاس بھر کر ملا۔ کھانا کھا کر لالی پھر لیٹ گیا مگر اسے نیند نہیں آئی۔ وہ پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ فقیرا خاموش بیٹھا لالی کو گھورتا رہا۔ عالم ایک بار آیا مگر ساہو کو سوتا پا کر چپ چاپ واپس چلا گیا۔

لالی پیشاب کرنے اٹھا۔ اس نے کچھ دور آگے جانا چاہا تو فقیرا بھی بندوق سنبھالے اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ لالی نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ پیشاب کرنے کے بعد اپنی جگہ آ کر لیٹ گیا۔ مگر اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ اس کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہے۔ اس نگرانی سے لالی سخت پریشان ہوا۔ رات کا جانا بھی مشکل نظر آیا۔

اسی پریشانی میں شام ہو گئی۔ داد محمد ساہو بیدار ہو گیا۔ مگر اس نے کوئی بات نہیں کی۔ کچھ دیر بیٹھا انگڑائیاں لیتا رہا۔ اس نے پانی منگوا کر پیا۔ بندوق سنبھالی اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ فقیرا جہاں تھا وہیں بیٹھا رہا۔

لالی اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ درختوں کے نیچے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد ساہو واپس آیا۔ اس کے ہم راہ پھیرو بھی تھا۔ دونوں کھیس پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ وہ اس قدر آہستہ آہستہ بول رہے تھے کہ لالی ٹھیک سے کچھ نہیں سن سکا۔ البتہ ان کی باتوں سے اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ رشید بلّا ابھی تک واپس نہیں آیا اور اس کے نہ آنے سے ساہو بہت پریشان ہے۔

اندھیرا خوب گہرا ہو گیا تھا۔ ہر چیز دھندلی دھندلی نظر آتی تھی۔ پھیرو جا چکا تھا۔ فقیرا بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا۔ ساہو اکیلا بیٹھا تھا اور سگریٹ سلگا کر آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔ دھوئیں کی تیز بو سے لالی تاڑ گیا کہ وہ چرس بھری سگریٹ پی رہا ہے۔ لالی اور ساہو ایک دوسرے سے چند گز کے فاصلے پر بیٹھے تھے۔ مگر دونوں خاموش تھے۔ اسی دوران سکنالے کے اس پار سے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی اونچی آواز سے بول رہا ہو۔ ساہو نے سگریٹ بجھا دی اور فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

بندوق اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ ذرا دیر بعد اندھیرے میں کوئی تیز تیز قدموں چلتا ہوا آیا۔ یہ عالم تھا۔

ساہو نے پوچھا۔ "عالم! یہ آوازیں کیسی آ رہی ہیں؟"

"رشید بلّے نے مروا دیا۔"

"بات کیا ہے؟ ٹھیک بتا؟"

"پولیس نے چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے۔ انسپکٹر منہ سے بھونپو لگا کر بول رہا ہے۔ کہتا ہے 'ہتھیار ڈال دو۔'" یہ کہہ کر عالم رکا' پھر غصے سے چیخا۔ "کہاں گیا وہ حرام دا؟ میں نے پہلے ہی کہا تھا' یہ پولیس کا مخبر ہے۔" یہ کہتا ہوا عالم اندھیرے میں اٹکل سے آگے بڑھا اور لالی کے قریب پہنچ کر اس نے زور سے کمر پر لات ماری۔ لالی بلبلا کر زمین پر گر پڑا۔

وہ لالی کو اور مارتا مگر ساہو نے روک دیا۔ "رہنے دے عالم! اس سے بعد میں نمٹ لیں گے۔"

وہ لالی سے مخاطب ہوا۔ "یہاں سے ہلا تو تیرے لیے فضول ایک کارتوس خراب کرنا پڑے گا۔"

"مجھے ایک کارتوس خراب ہی کر لینے دے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

ساہو نے ڈپٹ کر کہا۔ "بکواس نہ کر۔ اس چڑی چور کو گولی مار' کام کی بات کر۔ رشید بلّا جانے کس چکر میں پھنس گیا۔ راشن پانی اپنے پاس مک گیا ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے آج ہی کرنا ہو گا۔ کل پولیس کا گھیرا توڑ کر نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ بتا' انسپکٹر کتھے ہے؟"

"چو کے اس پار جھاڑیوں کے پیچھے۔ آواز وہیں سے آ رہی ہے۔ میں نے اپنے کانوں سے سنی ہے۔"

"ایسا کر' کیرے کو میرے پاس بھیج دے۔ تو ملنگی کے ساتھ مورچہ لگا کر انسپکٹر کی پارٹی پر فائر کھول۔ پھیرو سے کہہ' وہ اور دارا تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مورچے لگا دیں۔ سمٹ کر رہنا۔ دور دور نہ بکھر جانا۔ فائر ایک ساتھ کھولنا۔ ایسا لگے جیسے چاروں طرف سے فائرنگ ہو رہی ہے۔"

"اب میں چلوں؟"

ساہو زور سے دہاڑا۔ "پوری گل تو سن۔ جُجیتی نہ کر' ورنہ مروا دے گا۔ میں کیرے کے ساتھ پیچھے سے پولیس کا گھیرا توڑ کر نکلنے کی کوشش کروں گا۔ مال پانی اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔ جب میری طرف فائرنگ ہلکی پڑ جائے' تو تم چاروں تیز فائرنگ کرتے ہوئے پیچھے ہٹنا شروع کر دینا اور اندھا دھند گولی چلاتے ہوئے نکل جانا۔ میں نہر کی پلی کے پاس تمہارا انتظار کروں گا۔ ہر بات پوری سمجھ گیا؟"

”پروا نہ کر۔ پولیس سے پہلی بار ٹاکرا نہیں ہے۔ پہلے بھی بہت گولی چلی ہے۔ اس دفعہ صاف نکل جائیں گے۔ راؤنڈ بھی اپنے پاس کافی ہیں۔“

”اب تو جا۔ فقیرے کو بھیج دے۔“

عالم چلا گیا۔ ساہو بندوق سنبھال کر آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔

لالی زمین پر سہما ہوا پڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور ساہو کے قریب جا کر صفائی پیش کرنے لگا۔ ”سچ کہتا ہوں، میں لالی ہی ہوں، جیل سے بھاگا ہوا کیدی۔ میں پولیس کا مخبر نہیں ہوں۔ نہ جانے کیسے میرے بارے میں تجھے شبہ ہو گیا۔ میری بات کا یقین مان۔ جیسی چاہے قسم لے لے۔“ اس کے لہجے میں التجا تھی۔

ساہو بے نیازی سے بولا۔ ”میں کب کہہ رہا ہوں، تو لالی نہیں ہے۔ پولیس کا مخبر تو تجھے عالم بتاتا ہے۔ پتہ نہیں، کیسے اسے تجھ پر مخبر ہونے کا شبہ ہو گیا۔ کوئی بات تو ضرور ہو گی۔“

”میں تو صبح سے تیرے سامنے ہوں۔ کہیں گیا بھی نہیں۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تیرا ادھر آنا ہی کم شبے کی بات نہیں۔ تو کہتا تھا سٹیشن جانا ہے۔ کون سا سٹیشن؟ ادھر کوئی سٹیشن نہیں ہے۔ تو نے خود ہی شبہ پیدا کیا۔“

لالی عاجزی سے بولا۔ ”رب سوہنہ، میں لالی ہوں، جیل سے.....“

ساہو نے اس کی بات کاٹ کر غصے سے کہا۔ ”سن لیا، تو لالی ہے، جیل سے بھاگا ہوا کیدی ہے۔ میں نے تیری بات سچ مان لی۔ تو میرا بھیجا نہ کھا، بکواس بند کر اور چپ کر کے بیٹھ جا۔“

لالی نے اس کے بعد ایک لفظ نہیں کہا۔ خاموشی سے اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد فقیرا آ گیا۔ اس کے پہنچتے ہی ساہو درخت کے تنے کے پاس اندھیرے میں گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں گٹھری تھی۔ اس نے گٹھری مضبوطی سے فقیرے کی پیٹھ پر باندھی، مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔

”ادھر آ۔ تجھے بھی میرے ساتھ چلنا ہے۔“

لالی لرز اٹھا۔ انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے لاٹھی وہیں چھوڑ دی مگر اپنی گٹھری نہیں چھوڑی۔ اسے بغل میں دابا اور ساہو کے پاس پہنچ گیا۔

تینوں درختوں کے نیچے گھپ اندھیرے میں آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ لگ بھگ سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد داد محمد ساہو ٹھہر گیا۔ پلٹا اور منہ میں انگلیاں ڈال کر زور سے سیٹی بجائی۔ سیٹی بلند ہوتے ہی رات کے سناٹے میں برساتی نالے کے قریب گولیاں چلنے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ ساہو اور فقیرا چپ کھڑے رہے۔ لالی بھی دم بخود تھا۔ عقب میں تابڑتوڑ گولیاں چلتی رہیں۔ لالی نے ساہو کی پشت پر لٹکی ہوئی فاضل بندوق دیکھ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ”تیرے پاس کاربین ہے، مجھے بندوک دے دے۔ میں بالکل نہتا ہوں۔ تیری مدد بھی کر سکوں گا۔“ ساہو نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ ”دے دوں گا۔ ضرور دے دوں گا۔“ مگر اس نے بندوق دی نہیں۔ ذرا ہی دیر بعد اس نے لالی کو ہولے سے دھکا دیا۔

”آگے چل۔“

لالی آگے بڑھا۔ ساہو اور فقیرا اپنی جگہ کھڑے رہے۔ انھیں اپنے ہم راہ نہ پا کر لالی ٹھٹکا۔ پلٹ کر دیکھا۔ ساہو نے ڈپٹ کر کہا۔ ”دیکھتا کیا ہے؟ آگے بڑھ۔“ اس نے لالی کو قرابین کی زد پر رکھ لیا۔

لالی آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ آگے پولیس تھی، پیچھے ساہو اور فقیرا تھے۔ ادھر بھی بندوقیں تھیں اور ادھر بھی۔ لالی دونوں کے بیچ میں تھا اور بالکل غیر مسلح تھا۔ بھاگنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ اس کی پشت پر ساہو اور فقیرا بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھتا گیا۔ خشک پتے اس کے پیروں کے نیچے آہٹ پیدا کرتے رہے۔ جیسے ہی وہ درختوں سے نکل کر کھلی جگہ آیا سامنے سے پولیس نے بندوقوں سے باڑھ ماری۔ گولیاں چیختی ہوئی چلیں۔ لالی دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

فائرنگ مسلسل ہوتی رہی۔ گولیاں لالی کے سر پر سے، سینے پر سے، ٹانگوں پر سے سنسناتی ہوئی گزرتی رہیں۔ وہ دم سادھے پڑا رہا۔ موت اس کے چاروں طرف منڈلاتی رہی۔ وہ رک رک کر سانس لیتا رہا۔

ساہو اور فقیرا نے جوابی فائرنگ نہیں کی۔ کچھ دیر بعد پولیس نے گولی چلانا بند کر دی۔ لیکن برساتی نالے کے آس پاس فائرنگ پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔ لالی کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ کوئی گولی اس کے جسم کے کسی حصے میں لگی بھی ہے یا نہیں۔ اسے صرف اس قدر ہوش تھا کہ وہ زندہ ہے۔ لالی کی سمجھ میں یہ بات بھی نہ آئی کہ ساہو نے اسے تنہا آگے کیوں بڑھایا اور اسے پولیس کی گولیوں کی بوچھاڑ میں بالکل سامنے کیوں کر دیا؟ اپنے منصوبے کے مطابق نہ اس نے جوابی فائرنگ کی نہ ہی پولیس کا گھیرا توڑنے کی کوشش کی۔ لالی ذرا دیر دم سادھے پڑا رہا پھر آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا درختوں کی جانب بڑھنے لگا۔ آخر وہ درختوں تلے اندھیرے میں آ گیا۔ پولیس نے پھر فائرنگ شروع کر دی۔

مگر اب لالی فائرنگ کی زد سے باہر تھا۔ ساہو اور فقیرے نے اس بار بھی پولیس کے جواب میں

گولی نہیں چلائی۔

لالی اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور تیزی سے ایک طرف بھاگا۔ وہ فائرنگ کی زد سے زیادہ سے زیادہ دور چلا جانا چاہتا تھا۔ کچھ فاصلے پر پہنچنے کے بعد وہ ٹھہر گیا اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔

اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ گٹھری ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبی ہے۔ پولیس رک رک کر فائرنگ کرتی رہی۔ لالی نے اپنے بہت قریب چاپ سنی۔ ساتھ ہی دھیمے لہجے میں باتوں کی آوازیں بھی ابھریں۔

"لالی مارا گیا۔" یہ فقیرے کی آواز تھی۔

فقیرے کے ساتھ ساہو تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اسے تو مارا ہی جانا تھا۔ آگے بھیجا اسی لیے تھا۔ دیکھ' پولیس کیسے چکر میں آگئی۔"

"پولیس ابھی تک اسی طرف گولی چلا رہی ہے۔"

"چلانے دے۔ چلاتے دے۔ اپنے لیے ادھر کا رستہ صاف ہوگیا۔ چلا آ میرے پیچھے پیچھے۔"

دونوں دبے دبے قدموں آگے بڑھ گئے۔ لالی سانس روکے کھڑا رہا۔ ان کی آہٹ رفتہ رفتہ دور ہوتی گئی۔ پھر ختم ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد اس طرف بھی گولیاں گونجیں جدھر ساہو اور فقیرا گئے تھے۔

☆

لالی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے' کدھر جائے؟ ہر سمت گولیاں تڑاتڑ چیخ رہی تھیں۔ مگر ٹھہرنا بھی خطرناک تھا۔ اسے جلد سے جلد وہاں سے نکل جانا چاہئے تھا۔ وہ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا ایک طرف بڑھا اور کچھ دور تک بڑھتا گیا۔ وہ اندھیرے میں کسی چیز سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ اسی وقت دور سے ٹارچ کی روشنی ابھری۔ لالی نے دیکھا کہ پھیرو خون میں لت پت پڑا ہے۔ وہ مرچکا تھا۔ ٹارچ بجھ گئی' مگر اس کے ساتھ ہی گولیوں کی بوچھار شروع ہوگئی۔ لالی جھٹ زمین پر گر پڑا۔ گولیاں سنسناتی ہوئی اس کے برابر سے گزرتی رہیں۔ قریب ہی پھیرو کی لاش پڑی تھی۔

چاند نکل آیا تھا۔ مگر آسمان پر غبار اس قدر گہرا تھا کہ چاندنی بہت پھیکی اور دھندلی پڑ گئی تھی۔ درختوں کے نیچے گہرا اندھیرا تھا۔ لالی زیادہ دیر اس جگہ نہیں ٹھہرا۔ جیسے ہی فائرنگ ذرا تھمی' وہ درختوں کی آڑ لیتا ہوا تیزی سے بھاگا اور دور تک بھاگتا چلا گیا۔

وہ درختوں کے نیچے سے نکل کر باہر آگیا۔ مگر یہ دیکھ کر حواس باختہ ہوگیا کہ دھندلی چاندنی میں آ ۔ کانسٹیبل عین اس کے سامنے کھڑا ہے۔

کانسٹیبل بھی اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ لالی سراسیمہ ہو کر ٹھٹکا۔ ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو تیزی ، دوڑتا ہوا سامنے کی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں کچھ دور آگے گیا تھا کہ اس ، سنا' کانسٹیبل کہہ رہا تھا۔

"نہیں جی! وہ لالی ہی تھا۔ کانسٹیبل واحد نے جو کپڑے بتائے تھے' وہی پہنے ہوئے تھا۔ میرے مے بالکل اس طرح کھڑا تھا جیسے تم کھڑے ہو۔"

"تم نے جھپٹ کر دبوچ نہ لیا؟"

"موقع ہی نہیں دیا اس نے۔ چھلاوے کی طرح نکل گیا' پر جائے گا کہاں؟؟"

لالی ان کی باتیں سنتا' جھاڑیوں میں دبکتا' گھبرایا ہوا اندھیرے میں تیزی سے چلتا رہا۔ پچاس ٹھ گز فاصلہ اس نے جلدی جلدی طے کرلیا۔

اس کے آس پاس گہری خاموشی تھی۔ لیکن برساتی نالے کی طرف ابھی تک رک رک کر ولیاں چل رہی تھیں۔ چلتے چلتے وہ ایک طرف مڑا تو قریب سے بھاری بھاری بوٹوں کی آہٹ ھری۔ ساتھ ہی آواز بھی آئی۔

"محمد خاں! ادھر اندھیرے میں جھاڑیوں تلے کوئی سفید چیز ہلتی نظر آتی ہے۔"

لالی نے جھٹ راستہ بدل دیا اور تیزی سے بھاگا۔ مگر ایک جھاڑی سے اس کی دھوتی ایسی الجھی لہ وہ ننگا ہوگیا اور وہیں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہولے ہولے دھوتی جھاڑی سے علیحدہ کی۔ ڈب ے نوٹ نکل کر گر گئے تھے انھیں ٹٹول ٹٹول کر اکٹھا کیا اور دھوتی کے پلو میں باندھ لیا۔ مگر دھوتی یبارہ نہیں باندھی بلکہ جلدی جلدی قمیص بھی اتار دی۔

قمیص اور دھوتی سفید تھی۔ ان کا اجلا پن اندھیرے میں دور سے جھلکتا تھا۔ لالی نے جوتے بھی تار دیے۔ جوتوں سے آہٹ پیدا ہوتی تھی۔ اس نے دھوتی کے ساتھ قمیص اور جوتے بھی گٹھری بں باندھ لیے۔ اب وہ مادر زاد برہنہ تھا۔

کچھ دیر وہ جھاڑی کے نیچے دبکا بیٹھا رہا۔ جب قدموں کی آہٹ دور ہوگئی تو اس نے گٹھری بغل بں دبائی اور جھاڑیوں کے درمیان چھپتا چھپاتا آگے بڑھا۔ اسے پولیس والوں کی چاپ برابر سنائی ے رہی تھی۔ کبھی چاپ قریب آجاتی' کبھی دور ہوجاتی۔

کئی منٹ تک وہ اسی طرح جھاڑیوں کی اوٹ میں چلتا رہا۔ بار بار راستے بدلتا رہا۔ کہیں قدموں

کی رفتار تیز کر دیتا، کہیں جھاڑی کی آڑ لے کر دبک جاتا۔ جھاڑیوں میں کانٹوں کی بہتات تھی۔

لالی کے برہنہ جسم پر کانٹوں سے جگہ جگہ خراشیں پڑ گئیں۔ خون رسنے لگا۔ مگر اس برہنگی سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ اندھیرے میں گھل مل گیا۔ پولیس کے لیے اس کا سراغ لگانا مشکل ہو گیا۔

چلتے چلتے وہ ایسی جگہ آ گیا جہاں جھنگر ختم ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی جھاڑیوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ سامنے چٹیل میدان تھا اور اس سے آگے کسی قدر بلندی پر درختوں کا جھنڈ تھا۔ درختوں کی آڑ سے زرد زرد روشنی کا ایک دھبا نظر آ رہا تھا۔

لالی نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور سرپٹ بھاگا۔ وہ میدان سے گزرتا ہوا بلندی کی جانب لپکا۔ دور سے کوئی چیخا۔ "ٹھیر جا لالی!" مگر لالی ٹھہرا نہیں۔ دوبارہ اور زیادہ زور سے چیخنے کی آواز ابھری۔

"ٹھہر جا، نہیں، تو گولی چلا دوں گا۔"

لالی پھر بھی نہ ٹھہرا۔

گولی گہرے سناٹے میں زور سے گونجی اور لالی کے سر پر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ لالی نے بدحواس ہو کر اپنی رفتار اور تیز کر دی۔

۲

لالی ایک گھنے درخت پر بندر کی طرح پھرتی سے چڑھ گیا۔ کچھ دیر شاخوں کی اوٹ میں دبکا ہوا بیٹھا رہا اور چوکنا نظروں سے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ جب درخت کے آس پاس کوئی نظر نہ آیا تو وہ ایک مضبوط ڈال سے چمٹ کر آہستہ آہستہ آگے کھسکنے لگا۔

اس نے ڈال کو دونوں ہاتھوں سے تھاما۔ ٹانگیں نیچے لٹکائیں۔ بنگلے کی چار دیواری پر پیر ٹکائے اور نہایت ہوشیاری سے نیچے اتر گیا۔ بنگلہ سامنے ہی تھا۔ بنگلے کی ایک کھڑکی سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ وہ پودوں اور جھاڑیوں کی آڑ لیتا، دبے دبے قدموں چلتا، سیدھا اس کھڑکی پر پہنچا، جس سے روشنی جھلک رہی تھی۔ اس نے شیشے سے قریب ہو کر اندر جھانکا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

کھڑکی کا ایک شیشہ چٹخا ہوا تھا۔ لالی نے انگلی پھنسا کر شیشہ نصف سے زیادہ توڑ دیا۔ مگر ٹوٹے ہوئے شیشے کی تیز دھار سے انگلی کٹ گئی۔ خون بہنے لگا۔ اس نے انگلی ہونٹوں میں دبا کر خون چوسا اور گردن جھکا کر زمین پر تھوک دیا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے کے اندر جلدی سے ہاتھ ڈالا اور چٹخنی کھول دی۔ آہستہ سے کھڑکی کا ایک پٹ ہٹا کر راستہ بنایا۔ اوپر چڑھا اور اندر کود گیا۔

سامنے میز پر لیمپ رکھا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی میں ہر چیز نظر آ رہی تھی۔ لالی سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ چار دیواری کے اس پار آہٹ ابھر رہی تھی۔ ساتھ ہی زور زور سے سیٹیاں بھی بجنے لگیں۔ لالی اور سراسیمہ ہو گیا۔

بنگلے کے بیرونی پھاٹک کے کھلنے کی آواز سنی۔ وہ بدحواس ہو کر آگے بڑھا اور ایک کرسی

سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ کرسی الٹ گئی۔ کرسی الٹنے سے آواز پیدا ہوئی۔ ساتھ ہی سامنے کا دروازہ کھلا۔ ایک شخص دھاری دار گاؤن پہنے دروازے سے نمودار ہوا۔ وہ گوار چٹا دہرے بدن کا آدمی تھا۔ چہرے پر بھوری بھوری پر وقار مونچھیں تھیں۔ عمر چوالیس پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول دبا تھا۔ دوسرا ہاتھ گاؤن کی جیب میں تھا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر لالی کو دیکھا۔ لالی اس کے سامنے بالکل ننگ دھڑنگ کھڑا تھا۔ سر کے بال گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ جسم پر بھی گرد ہی گرد تھی۔ جگہ جگہ آڑی ترچھی خراشیں بھی تھیں۔ ہونٹوں کے نیچے تازہ تازہ خون کا دھبا تھا جو تھوڑی سے نیچے تک چلا گیا تھا۔ وہ شخص لالی کی یہ ہیئت دیکھ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کون ہے تو؟ اندر کیسے آگیا؟"

ابھی اس نے اپنا جملہ پورا ہی کیا تھا کہ بنگلے کے باہر زور زور سے بولنے کی ملی جلی آوازیں ابھریں۔ لالی دہشت زدہ ہو کر بولا۔ "وہ' وہ پولیس۔" گھبراہٹ میں وہ پوری بات نہ کہہ سکا۔ خوف اور بھاگ دوڑ سے اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ ہانپ رہا تھا۔

"کیا پولیس تیرا پیچھا کر رہی ہے؟"

لالی نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ اس شخص نے دریافت کیا۔ "پولیس تیرا پیچھا کیوں کر رہی ہے؟"

لالی گڑگڑانے لگا۔ "مجھے بچا لیجئے۔ میں سب کچھ بتا دوں گا۔" ننگا دھڑنگا' خاک سے اٹا ہوا لالی دھندلی روشنی میں بڑا مسکین نظر آرہا تھا۔ اس شخص نے اسے مسکرا کر دیکھا اور تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" اس نے ذرا تامل کیا۔ "یہیں کھڑا رہ۔ میں ابھی آتا ہوں۔" وہ جس کمرے سے نکلا تھا پھر اس میں چلا گیا۔

لالی ایک گوشے میں دبک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا' کمرے میں ہر طرف اونچی اونچی الماریاں ہیں۔ الماریوں کے شیشوں کے پیچھے ترتیب سے رکھی ہوئی طرح طرح کی کتابیں نظر آرہی تھیں۔ ایک طرف بڑی سی جھلکتی ہوئی میز تھی۔ میز پر لیمپ روشن تھا۔ اس پر دودھیا سرپوش تھا جس نے روشنی دھیمی کر دی تھی۔ میز پر کاغذات اور چند موٹی موٹی کتابیں رکھی تھیں۔

بنگلے کے پھاٹک پر آوازیں بند ہو گئیں تھیں۔ لالی ہنوز خاموش کھڑا تھا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ لالی نے اس کھڑکی کی جانب دیکھا جسے پھاند کر وہ کمرے کے اندر آیا تھا۔ کھڑکی کا ایک پٹ ابھی تک کھلا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کی جانب بڑھا۔ اس اثناء میں بنگلے کے صدر دروازے کے کھلنے اور بند

نے کی آواز سناٹے میں ابھری۔ لالی ٹھہر گیا۔ وہ دم بخود اور سہما ہوا تھا۔ کئی منٹ اسی عالم میں گزر گئے۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور وہ شخص کمرے میں دوبارہ داخل ہوا۔ اس نے تیکھی نظروں سے لالی لو دیکھا' غصے سے ڈانٹا۔ "کپڑے تو پہن لے۔"

لالی نے منہ سے ایک لفظ نہ نکالا۔ چپ چاپ گٹھری کھولی اور دھوتی نکال کر کمر کے گرد باندھنے کا۔ اس شخص نے پوچھا۔ "کیا تو جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہے۔"

"ہاں جی۔" لالی نے آہستہ سے گردن ہلائی۔

"میں نے تجھے پولیس سے بچا لیا ہے۔ اس لیے کہ میں نے تجھ سے وعدہ کیا تھا۔" اس نے لالی کو نظر بھر کر دیکھا۔ "میں میاں حیات محمد خان وٹو ہوں۔ تو میری پناہ میں ہے۔"

لالی نے نظریں نیچی کر کے آہستہ سے کہا۔ "آپ نے جی مجھ پر بہت احسان کیا۔" اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔ "بات یہ ہے جی....."

حیات محمد نے اس کی بات نہیں سنی۔ رعب اور دبدبے سے بولا۔ "تجھ سے صبح بات ہوگی۔" وہ چند لمحے خاموش کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر اس نے انگلی کے اشارے سے لالی کو اپنے قریب بلایا۔

"میرے ساتھ آ۔" وہ آگے بڑھا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

کمرے کا دروازہ کھول کر دونوں راہداری میں داخل ہوئے اور کچھ دور جا کر ایک دروازے کے سامنے ٹھہر گئے۔ دروازہ کھلا تھا۔ حیات محمد خاں وٹو نے لالی سے کہا۔ "اندر جا کر سو جا۔ دروازہ بند کر لینا۔ اب تو بالکل محفوظ ہے۔"

لالی اندر چلا گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ یہ مختصر سی کوٹھری تھی۔ ایک دیوار کی بلندی پر روشن دان تھا۔ اس پر لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں جڑی ہوئی تھیں۔ روشن دان سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آرہی تھی۔ لالی دروازے کے پاس خاموش کھڑا رہا۔ رفتہ رفتہ اس کی نظریں کوٹھری کے اندھیرے سے مانوس ہو گئیں۔ اس نے دیکھا' دیوار کے ساتھ اونچا چبوترہ ہے۔ لالی نے اس پر ہاتھ پھیرا۔ چبوترا صاف ستھرا تھا۔ وہ خاموشی سے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اس نے گٹھری سر کے نیچے رکھی اور ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ مگر اسے نیند نہیں آئی۔

وہ چپ لیٹا رہا۔ گھنٹے سوا گھنٹے بعد وہ چبوترے سے نیچے اترا' گٹھری بغل میں دبائی' ہولے ہولے چلتا ہوا دروازے پر پہنچا اور کان لگا کر سن گن لی۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ وہ چند لمحے دروازے کے قریب بت بنا کھڑا رہا۔ اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کے دروازہ کھولنا چاہا۔ مگر دروازہ باہر سے

بند تھا۔ لالی نے پریشان ہو کر دروازہ دھیرے سے ہلایا۔ باہر سے کسی کی کھنکار ابھری۔ لالی ایسا دہشت زدہ ہوا کہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ گہری سانس بھری اور دل گرفتہ ہو کر دروازے پر سر ٹکا دیا۔

صبح کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ لالی نے دھڑکتے دل اور سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا' دروازے کے بیچوں بیچ اونچے قد کا ایک بھاری بھرکم آدمی کمر سے ریوالور لگائے کھڑا ہے۔ تمتمایا ہوا گہرا سانولا چہرہ' سر پر گھنے بال' ڈاڑھی مونچھ صاف' آنکھیں موٹی موٹی اور سرخی مائل۔ اپنے ڈیل ڈول اور وضع قطع سے وہ خاصا ہیبت ناک لگتا تھا۔

اس نے لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ گردن کو ذرا سا خم دے کر باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لالی باہر آگیا۔ وہ شخص آگے بڑھا' لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ دونوں ایک تنگ غلام گردش سے گزر کر بنگلے کے باہر آگئے۔

لالی نے چلتے چلتے اسے ٹوکا۔ "مجھے کہاں لیے جا رہا ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔ دونوں ایک پرفضا باغ کے کنارے پگ ڈنڈی پر چل رہے تھے۔ پگ ڈنڈی خاصی کشادہ تھی۔ اس پر سرخ بجری بچھی تھی جو جوتوں کی رگڑ سے ہلکی ہلکی آہٹ پیدا کر رہی تھی۔ سورج چڑھ کر درختوں کے اوپر آگیا تھا۔ ہر طرف بسنتی دھوپ پھیلی تھی۔ مارچ کا تیسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا۔ دھوپ میں ہلکی ہلکی تمازت تھی۔ پت جھڑ ختم ہو رہا تھا۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ باغ بہت وسیع تھا۔ جگہ جگہ رنگا رنگ پھولوں کے تختے ہوا سے جھوم رہے تھے۔

باغ میں پھلوں اور میووں کے درخت تھے۔ نرم نرم گھاس کا دور تک پھیلا ہوا سبزہ زار تھا۔ درمیان سے پتھر کی بنی ہوئی پختہ نہر گزرتی تھی۔ نہر پر دو بڑے بڑے فوارے تھے۔ فواروں سے پھوٹتی ہوئی پانی کی جھالر دھوپ میں جھلملا رہی تھی۔ باغ کے اس پار درختوں کی اوٹ سے بنگلے کی اونچی چار دیواری نظر آتی تھی۔

پگ ڈنڈی سے ذرا ہٹ کر ایک بوڑھا شخص گردن جھکائے' ترنگلی سے خشک پتے اکٹھا کرنے میں مصروف تھا۔ دونوں اس کے قریب پہنچے تو اس نے مڑ کر دیکھا اور ترنگلی کا لمبا دستہ سنبھال کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور مسکرا کر آہستہ سے کہا۔

"کتھے چلا دھیور؟"

دھیور نے کوئی جواب نہیں دیا' نہ اس کی جانب دیکھا۔ وہ لالی کے آگے آگے مرغ کی طرح

ردن اونچی کیے چلتا رہا۔ مگر وہ جتنا قد آور جوان تھا' چال سے اتنا ہی ڈھیلا ڈھالا لگتا تھا۔ چلتا تو کمر واس طرح ہلکا سا خم دیتا کہ اس کے بھاری بھاری کولھے ہولے ہولے لچکتے۔ کچھ دور جا کر دھیور ھر گیا اور باغ کے اس گوشے کی جانب دیکھنے لگا جہاں چنبیلی کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے کنج کے نیچے ند کرسیاں اور ایک میز رکھی تھی۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ کرسیاں خالی تھیں۔ میز پر پانی سے بھرا ا شیشے کا قرابہ اور دو گلاس رکھے تھے۔ قریب ہی ایش ٹرے بھی موجود تھی۔ میز دیکھ کر اندازہ ہوتا ا کہ کچھ ہی دیر پہلے وہاں سے کوئی اٹھ کر گیا ہے۔ دھیور ذرا دیر رک کر واپس مڑا۔ اب وہ لالی کے م راہ بنگلے کے صدر دروازے کی جانب جا رہا تھا۔ دروازے کے سامنے اونچے' اونچے ستونوں کا رچ تھا۔ پورچ کے نیچے ایک لمبی چوڑی سیاہ بیوک کھڑی تھی۔ ڈرائیور جھاڑن سے کار کو جھاڑ نچھ رہا تھا۔

بنگلہ قدیم طرز کا تھا۔ مگر خوب بڑا اور نہایت شاندار تھا۔ جگہ جگہ عشق پیچاں کی بیلیں چڑھی یں اور کھپریلوں کی خمیدہ چھت پر دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ لالی نے بنگلے کی وہ کھڑکی بھی دیکھی س کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ یہ شیشہ اس نے پچھلی رات توڑا تھا۔ اس کی اس انگلی میں جو شیشہ ڑنے سے زخمی ہو گئی تھی' ابھی تک کسک تھی۔ دھیور بنگلے کی سمت بڑھتے بڑھتے لمحے بھر کو ٹھٹکا۔ ر کچھ سوچ کر اس نے راستہ بدل دیا۔

دونوں آگے بڑھے۔ سامنے چار دیواری کا اونچا چوبی پھاٹک تھا۔ اب وہ اس راستے پر چل رہے ھے' جو پھاٹک سے بنگلے کے پورچ تک جاتا تھا۔ راستہ سرخ اینٹوں سے بنا تھا۔ دونوں جانب سائے ر درخت تھے۔ پھاٹک سے کچھ فاصلے پر پختہ سائبان تھا۔ سائبان کے نیچے بجلی پیدا کرنے کا جنریٹر ا تھا۔ اس کا انجن' شور کرتا ہوا چل رہا تھا۔ قریب ہی باورچی خانہ تھا۔ باورچی خانے کا کشادہ بوترا فرش سے لگ بھگ چار فٹ اونچا تھا۔ چبوترے کے بیچوں بیچ تنور تھا۔ دو تندرویے اس کے دیک بیٹھے جھپا جھپ روٹیاں لگا رہے تھے۔ تنور سے ذرا ہٹ کر مٹی کا بڑا سا چولہا تھا' جس پر یگچا چڑھا تھا۔ دیگچے کے نیچے لکڑیاں جل رہی تھیں۔ باورچی خانے سے متصل نوکروں اور کمیوں کے کچے مکانات تھے۔ مکانات کا سلسلہ خاصی دور تک چلا گیا تھا۔ لیکن ہر طرف گہرا سکوت طاری ا۔ نوکر چاکر ادھر ادھر چل پھر رہے تھے۔ مگر وہ چپ چاپ چلتے تھے۔ کوئی اونچی آواز سے نہیں لتا تھا۔ جب لالی اور دھیور پھاٹک سے کچھ فاصلے پر رہ گئے تو لالی نے بے چین ہو کر ایک بار پھر ریافت کیا۔

"مار' نہ تو بتا' مجھے کہاں لیے جا رہا ہے؟"

اس دفعہ بھی دھیور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پلٹ کر قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا اور خام سے پھاٹک کی جانب بڑھنے لگا۔ پھاٹک کھلا تھا اور اس کے قریب دو مسلح پہریدار فرش پر بیٹھے حق گڑگڑا رہے تھے۔

انھوں نے نگاہیں اٹھا کر دھیور اور لالی کو دیکھا، لیکن کوئی بات نہیں کی۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پھاٹک سے گزر کر باہر آگئے۔ پھاٹک کے آگے کنکر کی بنی ہوئی نیم پختہ سڑک تھی جو شیشم اور بکائین کے درختوں کے سائے میں دور تک چلی گئی تھی۔

سڑک کے اس پار تا حد نظر کھیتوں کا سلسلہ پھیلا تھا۔ کھیتوں کے ایک طرف آم کے باغ تھے۔ ختوں سے بور جھڑ چکا تھا۔ کہیں کہیں شاخوں میں کیریاں بھی جھول رہی تھیں۔ دونوں نے سڑک ر کی۔ دوسری جانب پہنچے اور کھیتوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کھیتوں میں گندم کے پودے رہے تھے۔ پودوں کی لمبی لمبی پتیاں اور ان کے اوپر جھومتی ہوئی گندم کی بالیاں زرد پڑ گئی تھیں۔

دھیور اور لالی آگے بڑھتے گئے۔ دھیور آگے تھا اور لالی پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ گندم کے پودوں کو دیکھتا رہا اور پتوں اور بالیوں کا بدلتا ہوا رنگ دیکھ کر سوچتا رہا کہ ربیع کی فصل ابھی پک کر تیار نہیں ہوئی۔ اس کی کٹائی میں لگ بھگ مہینہ بھر باقی ہے۔ مگر فصل بہت اچھی تھی۔ بالیاں گندم کے دانوں سے لدی ہوئی تھیں۔

گندم کے کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو درختوں کے نیچے ایک ٹریکٹر نظر آیا جس کا بونٹ کھلا ہوا تھا۔ ایک ادھیڑ شخص، جو وضع قطع سے مکینک نظر آتا تھا، ٹریکٹر کے انجن پر جھکا ہوا کسی پرزے کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ٹریکٹر کے عقب میں کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر ٹیوب ویل تھا۔ ٹیوب ویل سے نکلتی ہوئی پانی کی موٹی دھار، آبشار کی مانند اوپر سے نیچے بم پل میں گر رہی تھی۔ بم پل میں بھرا ہوا پانی آڈ اور نالیوں کے ذریعے سرسوں اور چنے کے کھیتوں میں پہنچ رہا تھا۔ سرسوں کے بسنتی پھول ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہے تھے۔

دھیور کچھ اور آگے بڑھا۔ سامنے دور تک پھیلا ہوا سبزہ زار تھا۔ سبزہ زار کے ارد گرد ٹاہلی، شرینہ اور سرس کے گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ دھیور چلتے چلتے رک گیا اور گردن اٹھا کر تجسس انگیز نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لالی بھی اس کے قریب ہی کھڑا تھا اور بالکل خاموش تھا۔ اس نے دھیور سے بات کرنے کی کوشش نہ کی۔

ذرا ہی دیر بعد گھوڑے کے دوڑنے اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں دور سے سنائی دیں۔ دونوں

ی سمت دیکھنے لگے، جدھر سے آوازیں ابھر رہی تھیں۔ دیکھتے، دیکھتے درختوں کے ایک جھنڈ سے ہاں حیات محمد خاں وٹو نمودار ہوا۔ وہ اس وقت گھڑ سواری کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ ایک ہاتھ میں ڑے کا چابک دبا تھا۔

وہ پیروں سے ایڑ دیتا ہوا گھوڑے کو دوڑا رہا تھا۔ عقب میں شکاری کتوں کا غول تھا جو زور زو ے بھونک رہے تھے اور گھوڑے کے پیچھے، پیچھے بھاگ رہے تھے۔ حیات محمد نے نہ دھیور اور لالی و دیکھا اور نہ ہی ان کی طرف آیا۔ باگیں موڑیں اور اس راستے پر گھوڑا دوڑانے لگا جو گھنے ختوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ جب میاں حیات محمد وٹو نظروں سے اوجھل ہو گیا تو دھیور پس مڑا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

دونوں بنگلے کے پھاٹک پر پہنچے۔ دھیور نے ہاتھ کے اشاروں سے منہ پھاڑ کر طرح طرح کی وازوں سے پہریداروں سے بات کی۔ لالی کو پہلی بار اس حقیقت کا سراغ ملا کہ دھیور بالکل گونگا ہے۔ پھاٹک پر تعینات ایک پہریدار نے اس کے اشاروں کو سمجھتے ہوئے بنگلے کے صدر دروازے جانب ہاتھ اٹھا کر بتایا۔

”میاں صاحب اندر چلے گئے۔“

دھیور خاموشی سے بنگلے کی جانب چل دیا۔ وہ لالی کے ہم راہ پورچ میں پہنچا۔ کار ابھی تک وہیں ھڑی تھی۔ ڈرائیور، دروازے کے سامنے سیڑھیوں پر خاموش بیٹھا تھا۔ دھیور کو دیکھ کر وہ ایک رف سرک گیا۔ مگر اس نے دھیور یا لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ دھیور اس کے قریب سے گزرتا ا آگے بڑھا۔ دروازہ کھولا اور لالی کے ہم راہ اندر داخل ہو گیا۔ یہ خاصا طویل لاؤنج تھا۔ جگہ، ہ کیکٹس اور پام کے پودے گملوں میں لگے تھے۔ گملوں کے درمیان دو گرے ہاؤنڈ کتے چمڑے کے موٹے موٹے گدوں پر بیٹھے لمبی لمبی زبانیں نکالے ہانپ رہے تھے۔ انھوں نے قدموں کی آہٹ ن کر تیز نظروں سے دھیور اور لالی کو دیکھا۔ لیکن خاموش بیٹھے رہے۔

لاؤنج سے گزر کر دونوں وکٹورین طرز کے کشادہ ہال میں داخل ہوئے جس میں دبیز قالین کا فرش ا۔ ہال کی چھت، لاؤنج سے خاصی اونچی تھی۔ چھت کے بیچوں بیچ بہت بڑا بلوریں جھاڑ لٹک رہا ا۔ دیواروں پر چیتے اور تیندوے کے سروں اور کھالوں کے علاوہ قسم قسم کی تلواریں، خنجر، مانیں، پرانی وضع کی لمبی لمبی بندوقیں اور قرابین آویزاں تھیں۔ دیواروں پر چند بڑی بڑی روغنی اویر بھی لگی تھیں۔

ایک تصویر میں جو سب سے بڑی تھی اور نہایت نمایاں طور پر آویزاں تھی، حیات محمد گھنی

موچھوں والے ایک قد آور انگریز سے مصافحہ کر رہا تھا۔ مصافحہ کرتے ہوئے وہ اس قدر باادب باملاحظہ بنا ہوا تھا کہ اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آتا تھا۔ ہال میں مخمل اور زربفت کے صوفے اور دیوان قرینے سے رکھے تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر نرم اور باریک ریشم کے پردے لہرا رہے تھے۔

دو نوجوان خادمائیں جھاڑن سے کھڑکیوں کے شیشے اور تصاویر جھاڑ پونچھ کر چکا رہی تھیں۔ ایک شوخ اور عشوہ طراز خادمہ نے اپنی چھینٹ کی گھگریل ایک طرف سے پکڑ کر گھٹنے تک اوپر اٹھائی اور برہنہ پنڈلی کھجاتے ہوئے الھڑپن سے مسکرا کر دھیور کو دیکھا۔ دھیور نے غصے سے اس پر نظر ڈالی اور نفرت سے منہ بگاڑ کر آگے بڑھ گیا۔ ہال عبور کر کے لالی کے ساتھ ایک طویل غلام گردش میں داخل ہوا۔

غلام گردش میں بھی سرخ قالین کا فرش تھا۔ دیواروں پر دل فریب مناظر کی تصاویر آویزاں تھیں۔ دیوار گیریوں سے پھوٹتی ہوئی ہلکی ہلکی نیل گوں روشنی میں ہر چیز گویا خواب کے سایوں میں تیرتی نظر آتی تھی۔

غلام گردش میں کئی دروازے کھلتے تھے۔ ان پر ریشمی پردے پڑے تھے۔ دھیور ایک بند دروازے کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اندر جھانکا، لالی کی جانب متوجہ ہوا اور کمرے میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

لالی اس قدر گم صم تھا جیسے پگھل کر بنگلے کی طلسمی فضا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ اندر جاتے ہوئے اس کے قدم نہ اٹھتے تھے۔ دھیور نے اپنی لال لال آنکھوں سے اسے گھورا اور ہولے سے دھکا دیا۔ لالی جھٹ کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں روشنی بہت دھیمی تھی۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر دبیز پردے جھول رہے تھے۔ کمرے میں تمباکو کی تیز بو بسی ہوئی تھی۔ لالی ہکا بکا دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے دروازہ بند ہونے کی آہٹ سنی۔ پلٹ کر دیکھا، دھیور وہاں موجود نہیں تھا۔ اسی وقت کمرے کی پر اسرار خاموشی میں بھاری بھرکم آواز ابھری۔

"ادھر آ۔"

لالی نے چونک کر دیکھا، کمرے کے ایک گوشے میں میاں حیات محمد خاں وٹو چوڑے چکلے صوفے پر بیٹھا ہے۔ لالی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے روبرو جا کر کھڑا ہو گیا۔ حیات نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ دبایا۔ قریب رکھا ہوا پیڈسٹل لیمپ روشن ہو گیا۔ حیات محمد خاں خاموش بیٹھا پائپ پر ہلکے ہلکے کش لگا رہا تھا اور لالی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کے برابر والے صوفے پر جرمن شیفرڈ نسل کا موٹا تازہ السیشن لیٹا تھا۔ کتے کا چہرہ نہایت خوفناک تھا۔ رنگ گہرا سیاہ تھا۔ صرف ٹانگوں اور منہ کا کچھ حصہ بھورا تھا۔

وہ لالی کو قریب پا کر غرانے لگا۔ لالی نے اس پر نظر ڈالی تو دہشت زدہ ہو کر سہم گیا۔ کتا غرا کر اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس پر جھپٹنا ہی چاہتا ہو۔ وہ گردن اٹھا کر زور سے بھونکا۔ اس کی آواز اس قدر ڈراؤنی تھی کہ پورا کمرہ گونج اٹھا۔ لالی لرز کر رہ گیا۔

حیات محمد نے گردن موڑ کر کتے کی جانب دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" وہ اس کی پیٹھ ایک ہاتھ سے آہستہ آہستہ تھپکنے لگا۔ کتے نے گردن نیچی کر لی اور غرانا بند کر دیا۔ حیات محمد چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے پائپ کی راکھ میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے میں جھاڑی اور لالی سے مخاطب ہوا۔

"میں نے تجھے سٹور میں بند کر دیا تھا۔ پتہ ہے میں نے ایسا کیوں کیا تھا؟"

لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔ "مجھے نہیں ملوم جی۔"

"مجھے شبہ تھا، تو فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔" حیات محمد نے گردن کو ذرا سا خم دے کر نہایت بارعب انداز میں دیکھا۔ اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ "میں نہیں چاہتا کہ تو پکڑا جائے اور میری بدنامی کا سبب بنے۔"

لالی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کی بات کا کیا جواب دے۔ وہ مجرم کی طرح سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات نے کہا۔ "فی الحال یہاں سے جانے کا خیال چھوڑ دے۔ میں تیرے ہی بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ پورے علاقے میں پولیس پھیلی ہے۔ کل رات ڈاکوؤں سے پولیس کی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہوئی۔ ایک ڈاکو مارا گیا۔ دو پولیس والے زخمی ہوئے۔ پولیس نے پورے علاقے کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔" اپنی بلت کہتے، کہتے وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔

"کیا تو بھی ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہے؟ اگر ایسا ہے تو مجھے صاف، صاف بتا دے۔"

"میں تو جی انھیں بالکل نہیں جانتا۔ مجھے تو انھوں نے زبردستی پکڑ رکھا تھا۔ رات، پولیس کے ساتھ ان کی گولی چلی تو میں ان کے چنگل سے کسی نہ کسی طرح نکل بھاگا؟"

"سچ کہہ رہا ہے تو؟" میاں حیات محمد وٹو نے دریافت کیا۔

"میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا جی۔" لالی نے عاجزی سے کہا۔ "آپ نے جی مجھے

گرفتاری سے بچایا ہے۔"

"بندوق شندوق چلانی تو تجھے آتی ہی ہوگی؟"

"آتی ہے جی' بالکل آتی ہے۔" لالی نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "مجھے تو کاربین اور رائفل بھی چلانی آتی ہے۔ نشانہ بھی میرا سچا ہے۔"

حیات محمد نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ "اب تو جا۔ رات کو بات ہوگی۔ دھیور تیرے ٹھہرنے اور کھانے پینے کا بندوبست کردے گا۔ دھیور گونگا ہے' بول نہیں سکتا۔ مگر سن سکتا ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو اسے بتا دینا۔ یہاں تجھے کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوگی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "اب تو جا سکتا ہے۔"

لالی خاموشی سے باہر چلا گیا۔

* * *

برآمدہ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ اس کے سامنے سے راہداری گزرتی تھی۔ برآمدے میں دروازے کھلتے تھے۔ دھیور نے ایک بند دروازہ کھولا۔ یہ کوٹھری نما مختصر کمرہ تھا۔ اس میں چارپائی تھی۔ چارپائی پر معمولی بستر تھا۔ کمرے میں کھڑکی بھی تھی۔ اس میں لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی تھیں۔ کھڑکی کے عین سامنے ملحٹر تھا۔ کوڑے کرکٹ کے اس ڈھیر کے اردگرد جھاڑیاں اور گھنے درخت تھے۔ کمرے سے ملحق اتنا ہی بڑا ایک اور کمرہ تھا۔ اس میں دھیور کا قیام تھا۔ دونوں کمرے بنگلے کے عقبی حصے میں واقع تھے اور ایک بڑے کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے بنائے گئے تھے۔

دروازہ کھول کر دھیور نے لالی کی طرف دیکھا اور کمرے کے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ لالی نے کمرے میں جا کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دھیور دروازے پر خاموش کھڑا تھا۔ لالی نے اپنی بڑھی ہوئی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دھیور سے کہا۔ "یار' کوئی نائی شائی ہوگا؟ میں نے داڑھی بنوانی ہے۔ بہت بڑھ گئی ہے۔" دھیور نے اس کی بات سن کر آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور ایک طرف چلا گیا۔ لالی بستر پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد دھیور واپس آیا۔ اس کے ہم راہ نائی بھی تھا۔ وہ دبلا پتلا اور ادھیڑ تھا۔ اس نے لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ برآمدے میں دروازے کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا۔ لالی کمرے سے باہر آیا اور نائی کے سامنے فرش پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "داڑھی بنوانی ہے۔" نائی نے کوئی جواب نہ دیا۔ استرے سے اس کی ڈاڑھی مونڈنے لگا۔

دھیور برآمدے میں رکھے ہوئے ایک چوڑے اسٹول پر بیٹھا دونوں کو دیکھتا رہا۔ ڈاڑھی

مونڈنے کے بعد نائی نے اپنی کسبت سے آئینہ نکالا اور لالی کی طرف بڑھا دیا۔ لالی نے آئینہ ہاتھ میں لے کر اپنا چہرہ مختلف زاویوں سے دیکھا۔ مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے معاً اسے اپنا حلیہ بدلنے کا خیال آیا۔ اس نے نائی سے کہا۔ "یار' مونچھیں بھی صاف کردے۔" اس نے گردن موڑ کر دھیور کی جانب دیکھا' زیرلب مسکرایا۔ "مجھے بھی دھیور کی طرح صفاچٹ بنا دے۔" اس کی بات سن کر دھیور نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

نائی بھی نہیں بولا۔ اس نے استرے سے لالی کی مونچھیں صاف کردیں۔ حجامت بنا کر نائی نے اپنا سامان کسبت میں رکھا اور لالی سے کچھ کہے بغیر چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔ لالی نے رخساروں پر ہاتھ پھیرا۔ اور دھیور کو مخاطب کرتے ہوئے بے تکلفی سے بولا۔ "لے یار تیری محبت میں' میں نے بھی اپنی مونچھیں صاف کرادیں۔ کیا یاد کرے گا' کوئی لالی ملا تھا۔ اب یہ بتا' نہانے دھونے کا کیا سیتا ہوگا؟ میں نہانا چاہتا ہوں۔ بھوک بھی زوروں کی لگی ہے۔ تو نے سویرے سے روٹی بھی نہیں کھلائی۔"

دھیور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے لالی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ برآمدے کے برابر ہی دروازہ تھا۔ دھیور نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ یہ غسل خانہ تھا۔ سامنے دیوار پر آئینہ لگا تھا۔ اس کے برابر ہی لکڑی کے تختے پر کنگھا' صابن اور سر میں ڈالنے کے لیے شیشی میں تیل بھی موجود تھا۔ غسل خانے میں ایک طرف نلکا تھا اور اس کے نیچے فٹ بھر اونچا چبوترہ تھا۔ لالی نے غسل خانے کا دروازہ بند کیا۔ کپڑے اتارے اور نلکے کے نیچے چبوترے پر بیٹھ کر نہانے لگا۔ وہ صابن مل کر دیر تک نہاتا رہا۔

نہانے سے فارغ ہوا تو اس نے کھونٹی پر لٹکے ہوئے تولیے سے بدن پونچھا۔ کپڑے پہنے۔ سر میں تیل ڈالا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کنگھے سے بال سنوارے اور تروتازہ ہو کر غسل خانے سے باہر آگیا۔

دھیور برآمدے کے سامنے اسٹول پر بیٹھا تھا۔ لالی نے اسے دیکھا تو مسکرا کر بولا۔ "یار! میری گٹھڑی تو لا دے۔" اس نے اپنے لباس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "یہ کپڑے تو بہت گندے ہوگئے ہیں۔ گٹھڑی میں میرے کپڑے ہیں۔ انھیں نکال کر پہن لوں گا۔" دھیور نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

لالی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ غسل کرنے کے بعد اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ مگر وہ سویا نہیں۔ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ چند منٹ بعد دھیور واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں گٹھری دبی

تھی۔ اس نے گٹھری لالی کو دی اور اسٹول پر جا کر بیٹھ گیا۔ لالی نے کپڑے تبدیل نہیں کیے۔ گٹھری لے کر ایک طرف رکھ دی۔

کچھ اور وقت گزر گیا۔ ایک بوڑھی عورت کھانا لے کر آئی۔ اس نے دھیور کی جانب دیکھا اور کمرے میں داخل ہو کر کھانا لالی کے سامنے رکھ دیا۔ لالی نے اسے مخاطب کیا۔ "بے بے! پانی بھی پلادے۔" عورت نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے میں ایک طرف المونیم کا گلاس رکھا تھا۔ عورت نے گلاس اٹھایا' خاموشی سے غسل خانے میں گئی اور پانی سے بھرا ہوا گلاس سر جھکا کر چپ چاپ سامنے رکھ دیا۔

لالی نے حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھا اور آہستہ سے پوچھا۔ "بے بے کیا تو بھی گونگی ہے؟"

بوڑھی عورت نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ٹھہری۔ الٹے قدموں واپس چلی گئی۔

لالی کھانا کھانے لگا۔ کھانے میں تنوری روٹی اور چنے کی دال تھی۔ اس کے ساتھ جنڈ کی پھلیوں کا اچار بھی تھا۔

لالی نے کھانا کھایا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک بنگلے کے پراسرار ماحول کے بارے میں غور کرتا رہا۔ وہاں حیات محمد کے سوا ہر شخص گونگا تھا یا خاموش اور سہما ہوا نظر آتا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ دن ڈھلے وہ نیند سے بیدار ہوا۔ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ دروازے کے سامنے اسٹول خالی تھا۔ دھیور وہاں نہیں تھا۔ لالی چارپائی سے نیچے اترا اور کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگیا۔ اسی وقت دھیور بھی اپنے کمرے سے نکل کر باہر آگیا۔

لالی نے اسے دیکھ کر کہا۔ "یار دھیور! چائے شائے بھی ملے گی؟"

دھیور نے حسب معمول آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور راہ داری میں اس طرف چل دیا جدھر سے بوڑھی عورت کھانا لے کر آئی تھی۔ لالی کا جی چاہا کہ وہ بھی دھیور کے پیچھے پیچھے چلا جائے' لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ برآمدے میں خاموش کھڑا چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ مگر ہر طرف دیواریں تھیں اور جھکی ہوئی نیچی چھت تھی۔ ذرا دیر بعد دھیور مٹی کی ٹھوٹھی میں چائے لے کر آگیا۔ چائے گرم تھی اور بہت میٹھی۔ اس میں شکر کے بجائے گڑ ڈالا گیا تھا۔ مگر دودھ کی مقدار زیادہ تھی۔

لالی نے چائے پی کر دھیور سے یارانہ گانٹھنے کی کوشش کی۔ مسکرا کر دریافت کیا۔ "دھیور! تیری گھروالی اور بچے کہاں ہیں؟"

دھیور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بت بنا اسٹول پر خاموش بیٹھا رہا۔ مگر لالی خاموش نہ رہا۔ اس نے دھیور کو کریدا۔ "توں نے ویاہ نہیں کیا؟" دھیور نے انکار میں گردن ہلا دی۔ مگر اس کے چہرے سے بیزاری ٹپک رہی تھی۔

لالی نے اس کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے نہایت ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ "اپنے تو جی تین بچے ہیں۔ بہت یاد آتے ہیں۔ مہینوں ہوگئے دیکھے ہوئے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ویسے تو یاد گھروالی بھی آتی ہے اور رات کو تو بہت یاد آتی ہے۔ سونے سے پہلے بہت چاؤ سے اپنی مج کا کوسا پلاتی تھی۔ ایسا گرم اور گاڑھا گاڑھا دودھ کہ پی کر مزا آجاتا تھا۔"

دھیور نے اس کی باتیں سن کر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری اور بالکل سپاٹ تھا۔ لالی کہتا رہا۔ "جاڑے کی راتوں میں گھروالی ساتھ ہو تو یار' کوسا کیا بہار دکھاتا ہے۔ ایسی ایسی ہوتی ہے' تجھے کیا بتاؤں۔" یہ کہہ کر اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ دھیور کے چہرے پر رفتہ رفتہ جھنجلاہٹ بکھرنے لگی۔ اس نے اپنی لال لال آنکھوں سے گھورا۔ لیکن لالی اس کے گھورنے پر ذرا خائف نہ ہوا' بے تکلفی سے آنکھ مار کر بولا۔

"یار! تیرا ایسا ڈھو جوان' گھروالی کے بغیر تیرا گزارہ کیسے......"

دھیور نے اسے آگے کچھ نہ کہنے دیا۔ تیزی سے جھپٹا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا سر اور ٹھوڑی اس زور سے جھٹکا دے کر دبایا کہ لالی کی زبان دانتوں کے درمیان آکر زخمی ہوگئی۔ وہ تلملا کے رہ گیا۔ دیر تک اس کی زبان میں ٹیس اٹھتی رہی۔ تکلیف سے وہ بول بھی نہ سکا۔ بھونچکا کھڑا سوچتا رہا کہ دھیور اچانک اس قدر خفا کیوں ہوگیا؟ اس نے تھوکا تو تھوک کے ساتھ خون بھی آیا۔ لالی چند لمحے غصے سے ہانپتا رہا آخر وہ اس دروازے کی جانب بڑھا' جو غلام گردش میں کھلتا تھا۔ وہ میاں حیات محمد ونو کے پاس جا کر دھیور کے وحشیانہ رویے کے خلاف فریاد کرنا چاہتا تھا۔ مگر دھیور نے اسے آگے جانے نہ دیا۔ لپک کر سامنے آگیا۔ لالی نے آگے بڑھنا چاہا تو دھیور نے اس کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس زور سے دھکا دیا کہ لالی سنبھل نہ سکا۔ لڑھکتا ہوا کمرے کی دیوار سے ٹکرا کر زمین پر گر پڑا۔

وہ گہری سانسیں بھرتا رہا اور قہر آلود نظروں سے دھیور کو گھورتا رہا۔ کچھ دیر وہ اسی عالم میں پڑا ہانپتا رہا۔ پھر ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا اٹھا اور دھیرے دھیرے دھیور کی طرف بڑھا۔ دھیور خاموش کھڑا رہا۔ لالی نے چاہا کہ جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لے۔ لیکن دھیور نے نہایت پھرتی سے اس کے دونوں ہاتھوں کی کلائیاں پکڑ لیں۔ لالی نے

جھٹکا دے کر اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو اسے اندازہ ہوا کہ دھیور کے ہاتھ لوہے کے شکنجوں کی مانند سخت اور مضبوط ہیں۔

ذرا دیر تک دونوں میں زور آزمائی ہوتی رہی۔ لالی نے بہت زور مارا، مگر وہ دھیور کی گرفت سے اپنے ہاتھ نہ چھڑا سکا۔ دھیور چٹان کی طرح اپنی جگہ جما کھڑا رہا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ لالی نے کبڈی کے کھلاڑیوں کی طرح حلق سے “ڈھو” کی آواز نکالی۔ اور اس زور سے جھٹکا دیا کہ اس کے دونوں ہاتھ دھیور کی پکڑ سے آزاد ہوگئے۔ دھیور کے قدم لڑکھڑا گئے۔ لالی نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ اچھلا اور سر جھکا کر پوری قوت سے دھیور کے سینے پر ٹکر ماری۔ وہ دھڑام سے پیٹھ کے بل گرا۔ لالی نے چاہا کہ جھپٹ کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے، مگر دھیور نے گرتے ہی جھٹ ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا اور تیندوے کی مانند تیز نظروں سے لالی کو گھورنے لگا۔

لالی جہاں تھا وہیں رک گیا۔ دھیور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ آگے بڑھا اور قریب جا کر ایک ہاتھ لالی کی گردن پر رکھ کر پوری قوت سے دھکا دیا۔ لالی دہلیز سے ٹکرا کر لڑھکتا ہوا اپنی چارپائی کے پاس جا گرا۔ اس کے سر میں کراری چوٹ آئی۔ مگر سر پھٹا نہیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ سر میں شدید ٹیس اور کسک تھی۔ دھیور سامنے دروازے پر خاموش کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دبا تھا۔

لالی نے اس کی جانب نہیں دیکھا۔ سر کی چوٹ سے زیادہ لالی کو احساس ہزیمت نے تڑپا دیا۔ اپنی بے بسی پر اس کا دل بھر آیا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ دھیور ذرا دیر تک کھڑا اسے گھورتا رہا، آخر دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔

☆

شام کا جھٹپٹا ہوا تو اندھیرے کے ساتھ ہی بنگلے میں ہر طرف موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ لالی چارپائی کے پاس فرش پر گم صم بیٹھا رہا۔ جب اندھیرا زیادہ بڑھا تو دھیور نے لالٹین روشن کی۔ لالی کے کمرے میں آیا۔ اس نے لالٹین ایک طرف رکھ دی۔ لالی نے اس کی جانب نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ دھیور کمرے سے باہر چلا گیا، سناٹا اور بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد سناٹے میں چاپ سنائی دی۔ لالی نے گردن اٹھا کر دیکھا، سامنے بوڑھی عورت کھڑی ہے۔ وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ عورت لمحہ بھر کو ٹھٹکی۔ اس نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ جھک کر کھانا لالی کے سامنے رکھا۔ دن کے برتن اٹھائے اور سائے کی طرح خاموشی سے چلی گئی۔ لالی نے کھانا کھایا۔ مگر وہ ایک روٹی سے زیادہ نہ کھا سکا۔ چپ چاپ جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ خود کو بہت مضمحل اور تھکا ہوا محسوس کر رہا

تھا۔ دیر تک خاموش پڑا رہا، پھر سو گیا۔

دس بجے کے قریب دھیور نے لالی کو جگایا۔ باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ لالی نے اٹھ کر گٹھڑی کھولی۔ تلون اور بش شرٹ نکال کر پہنی۔ خاموشی سے باہر نکلا اور دھیور کے ہم راہ چلنے لگا۔ تھوڑی ہی ر بعد وہ میاں حیات محمد کے سامنے کھڑا تھا۔ سیاہ السیشن اس وقت بھی صوفے پر بیٹھا تھا۔ حیات محمد وہسکی سے شغل کر رہا تھا۔

اس نے لالی کو نظریں اٹھا کر دیکھا۔ مونچھوں سے صاف چہرے اور سلوٹیں پڑی ملگجی پتلون اور ش شرٹ کو دیکھا مگر ان کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ صرف اتنا پوچھا۔

“ٹھیک ٹھاک ہے، کوئی تکلیف شکایت تو نہیں؟”

لالی نے دھیور کی زیادتی اور اشتعال انگیزی کے خلاف احتجاج کیا۔ “ویسے تو جی ہر طرح کا آرام ہے، پر دھیور نے میرے ساتھ خامخا کا ٹنٹا کیا۔ مجھے دھکا دے کر گرا دیا۔ پستول تان کر کھڑا ہوگیا۔”

“میں اسے سمجھا دوں گا۔ آگے وہ ٹھیک طرح پیش آئے گا۔” حیات محمد نے وہسکی کی چسکی گاتے ہوئے کہا۔ “مگر وہ غیر ضروری بات کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دے گا اور جیسا وہ کہے گا تجھے یسا ہی کرنا ہوگا۔ تو اس کے چارج میں ہے۔ تجھے یہ بات نہیں بھولنی چاہئے۔”

لالی اپنی بات پر اڑا رہا۔ “ساب، میرا اس کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔ وہ اگر گرمی دکھائے گا ز اپنا کا بھی چل جائے گا۔ خامخا، فیر کسی دن جھگڑا ٹنٹا ہو جائے گا۔ آج تو جی میں چپ کر گیا۔ پر گے اس نے گرمی دکھائی تو.....”

حیات ایک دم بپھر گیا۔ لالی کی بات کاٹ کر زور سے چیخا۔ “کیا کہنا چاہتا ہے؟” اس کی برہمی کے ساتھ ہی کتے نے گردن اٹھائی اور زور زور سے غرانے لگا۔

لالی نرم پڑ گیا۔ سر جھکا کر کسی قدر عاجزی سے بولا۔ “میاں صاحب! مجھے جانے کی اجازت دے یجئے۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔”

حیات محمد نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے کہا۔ “جیل جانا چاہتا ہے؟”

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات محمد خاں چند لمحے چپ بیٹھا رہا ر قریب بیٹھے ہوئے کتے کی پیٹھ پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ “شام کو ڈی ایس پی میرے پاس یا تھا۔ یہ تو اسے جرات نہ ہوئی کہ کھل کر تیرے بارے میں مجھ سے پوچھتا۔ مگر اس کی باتوں سے اف معلوم ہوتا تھا کہ اسے شبہ ہے، تو میرے بنگلے میں ہے۔”

“... مجھے فوراً یہاں سے چلا جانا چاہئے۔”

"بیوقوف۔" حیات نے اسے غصے سے ڈانٹا۔ "یہاں سے نکلتے ہی تو گرفتار کرلیا جائے گا۔ پولیس تیری گھات میں ہر طرف بیٹھی ہے۔" اس نے وہسکی کا بڑا گھونٹ لیا۔ لہجے میں ٹھہراؤ پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

"تو یہاں سے جانے کے لیے اتنا بے چین کیوں ہے؟"

"آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ صاف بات یہ ہے جی! مجھے رحیم داد کی بہت فکر ہے۔ میں جیتی نال اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا ہوں۔"

"یہ رحیم داد وہی قیدی ہے نا جو تیرے ساتھ جیل سے فرار ہوا تھا؟"

"جی ساب! آپ اسے جانتے ہیں؟"

"نہیں۔" میاں حیات نے بے رخی سے جواب دیا۔ "اس کے بارے میں ڈی ایس پی نے صرف اتنا بتایا ہے کہ اسے اقدام قتل کے جرم میں سزا ہوئی تھی۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "سنا ہے دونوں پارٹیوں کے درمیان مسلح تصادم ہوا تھا۔ کچھ زخمی بھی ہوئے، مگر ان میں سے ایک زخمی پچھلے دنوں چل بسا۔"

لالی نے رحیم داد کی جانب سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "پر ساب! چھے سات مہینے تو کیس چلا۔ رحیم داد نے تین مہینے سے اوپر جیل میں سزا کے گزارے۔ اب تو یہ بات بہت پرانی ہو گئی۔"

"میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔" حیات محمد نے بے زاری سے کہا۔ "مجھے تو یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ بندہ مر گیا جو اس کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔ اب پولیس اس کے خلاف قتل کے الزام میں ۳۰۲ کا مقدمہ قائم کرنا چاہتی ہے۔ پہلے اسے دفعہ ۳۰۷ میں سزا ہوئی تھی۔ اب جرم کی نوعیت بدل کر زیادہ سنگین ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی ترمیم مقدمہ کی کارروائی بھی شروع ہو گئی ہے۔"

لالی نے کچھ نہ کہا۔ حیات بھی چپ بیٹھا رہا اور آہستہ آہستہ وہسکی کے گھونٹ بھرتا رہا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر اس نے لالی کو مخاطب کیا۔ "پولیس تجھے گرفتار کرنے کی سرتوڑ کوشش اس لیے کر رہی ہے۔" اپنی بات کہتے کہتے حیات محمد ذرا الجھا۔ "کیا نام ہے دوسرے مفرور قیدی کا؟"

لالی نے آہستہ سے جواب دیا۔ "رحیم داد۔"

"رحیم داد۔" حیات محمد نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ "پولیس تیرے ذریعے رحیم داد کا سراغ لگانا چاہتی ہے۔ پولیس کو ایسی اطلاعات ملی ہیں کہ کچھ دنوں پہلے وہ تیرے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ بعد میں روپوش ہو گیا اور اب تک لاپتہ ہے۔"

لالی نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ میاں حیات محمد وٹو نے ذرا دیر چپ رہنے کے بعد کہا۔ "میں تجھے یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو بندہ رحیم داد کے ہاتھوں قتل ہوا، وہ صوبائی وزیر زراعت کا قریبی عزیز ہوتا تھا۔ بھانجا یا بھتیجا تھا۔ شاید کوئی اور رشتہ ہو۔ مجھے صحیح طور پر نہیں معلوم۔ وزیر کا پیو پہلے ادھر ہی ہوتا تھا۔ بعد میں لہور چلا گیا اور وہیں کوٹھی بنوا کر رہنے لگا۔ اب تو وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ کسی زمانے میں وڈا سیاست داں ہوتا تھا۔ مقتول کے گھر والے اس پر اور اس کے پتر پر بہت دباؤ ڈال رہے ہیں۔ لہٰذا وہ تیری اور تیرے ساتھی رحیم داد کی گرفتاری میں ذاتی دلچسپی لے رہا ہے۔"

حیات نے اپنی بات کہتے کہتے قدرے تامل کیا۔ "جب کوئی وزیر کسی معاملے میں ذاتی دلچسپی لیتا ہے تو پولیس کی راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ ملازمت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ سن لیا تو نے؟"

لالی نے نہایت سادگی سے کہا۔ "یہ بات ہے، تب تو جی مجھے ساری بات رحیم داد کو فوراً بتا دینی چاہیے۔"

اس کی بات سن کر حیات محمد شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔ غصے سے آنکھیں نکال کر بولا۔ "تو بالکل الو کا پٹھا ہے۔"

لالی اس کے برہم ہونے پر ڈر گیا۔ گڑگڑا کر گویا ہوا۔ "ساب جی! ناراض نہ ہوں۔ پر یہ بھی تو ہو سکتا ہے، پولیس کو جب یہ شبہ ہے کہ میں یہاں ہوں تو وہ کسی دن چھاپا مار کر مجھے پکڑ بھی سکتی ہے۔"

"پولیس کی اتنی جرات نہیں ہو سکتی کہ وہ میرے بنگلے پر چھاپا مارے اور تلاشی لے۔" حیات نے نہایت رعونت سے کہا۔ "شاید تجھے پتہ نہیں۔ کل رات جو پولیس انسپکٹر میری اجازت کے بغیر بنگلے کی چار دیواری کے اندر داخل ہوا تھا، اسے میرے صرف ایک ٹیلی فون کھڑکھڑانے پر تین کانسٹیبلوں کے ساتھ آج معطل کر کے لائن حاضر کر دیا گیا۔ ڈی ایس پی کل رات ہی کے واقعے کے بارے میں معذرت کرنے میرے پاس آیا تھا۔" اس نے وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا۔ گلاس میز پر رکھا۔ "میں نے سہ پہر کو وزیر زراعت سے بھی گل بات کی تھی۔ وہ میرا پرانا یار ہے۔ کالج میں ساتھ پڑھتا تھا۔ میری ہی کوششوں سے وزیر لگا ہے۔" لالی بت بنا خاموش کھڑا رہا۔ میاں حیات محمد کہتا رہا۔

"تو یہاں ہر طرح محفوظ ہے۔ رہ گیا رحیم داد تو اسے اب بھول جا۔"

لالی خاموش نہ رہ سکا۔ بے چین ہو کر بولا۔ "میاں صاحب، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ایسے ہی جیسے میں کہہ رہا ہوں۔ رحیم داد جلد ہی گرفتار کرلیا جائے گا یا ہلاک کردیا جائے گا۔ مقتول کے بھائی اور خاندان والے بھی اس کی تلاش میں ہیں۔ دیکھتے ہی اسے قتل کردیں گے۔ پولیس کے ہاتھوں اگر وہ پکڑا گیا تب مقدمے کی سماعت کے دوران ہی اسے مار ڈالیں گے۔ تجھے تو پتہ ہی ہوگا کہ خون کا بدلہ یہاں ایسے ہی لیا جاتا ہے۔ عدالت کے فیصلے کا انتظار نہیں کیا جاتا' بلکہ عدالت کے احاطے کے اندر بھی قتل ہوجاتا ہے۔"

حیات محمد نے بوتل اٹھائی' خالی گلاس میں وہسکی انڈیلی' تھرماس سے برف نکال کر ڈالی' شیشے کے قرابے سے پانی ڈالا اور پیگ بنا کر وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ پھر سمجھانے کے انداز میں نرمی سے بولا۔ "دیکھ' رحیم داد کے ساتھ ہمدردی تجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ مجھے ڈر ہے اس کا ساتھ دینے کی کوشش میں تو بھی مارا جائے گا۔ گرفتار تو بہرحال کر ہی لیا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں تو میرے پاس ٹھیرا رہ۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "رحیم داد زیادہ دنوں تک روپوش نہیں رہ سکتا۔ پولیس اس کا سراغ لگالے گی۔ اس کی گرفتاری کے بعد پولیس تیری طرف سے غافل ہوجائے گی۔ میں اپنے اثر و رسوخ سے تجھے جیل جانے سے بچالوں گا۔ کوئی تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

لالی نے سر جھکا کر نہایت عاجزی سے کہا۔ "ساب' آپ رحیم داد کے لیے کچھ نہیں کرسکتے؟ گل ایسہ ہے میاں جی' جیل سے میں ہی اسے نکال کرلایا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔"

حیات نے لالی کو آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ بات کاٹ کر بولا۔ "رحیم داد کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔ سمجھ لے' وہ مرگیا۔" اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "میں اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ صرف تجھے بچا سکتا ہوں۔"

لالی نے ہچکچاتے ہوئے ایک بار پھر درخواست کی۔ "آپ کی بہت مہربانی ہے جی' مگر۔"

"اگر مگر چھوڑ۔" حیات محمد وٹو نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "مجھے دوٹوک جواب چاہیے۔ جیل جانا چاہتا ہے یا یہاں رہنا چاہتا ہے۔" اس نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ "مجھے صرف ٹیلیفون کرنا ہوگا۔ گھنٹے بھر کے اندر تو پولس کی حراست میں ہوگا۔ بول کیا چاہتا ہے؟"

لالی اس کی دھمکی سے مرعوب ہوگیا۔ گڑگڑا کر بولا۔ "میاں جی' میری کیا مرضی' جو آپ حکم کریں گے وہی کروں گا۔"

"شاباش۔" حیات محمد وٹو نے اونچی آواز سے کہا۔ اس کا چہرہ شگفتہ ہوگیا۔ وہ خاموش بیٹھا' اپنے السیشن کی نرم نرم پیٹھ پر محبت سے ہاتھ پھیرتا رہا۔ کتا دھیرے دھیرے' غراتا رہا۔ میاں حیات محمد نے گلاس اٹھایا اور ساری وہسکی غٹاغٹ چڑھا کر ایک بار پھر اسے خالی کردیا۔ اس نے گلاس میز پر رکھا۔ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"میرے ساتھ آ۔"

السیشن بھی صوفے سے اتر کر نیچے آگیا اور میاں حیات محمد کے ساتھ' ساتھ چلنے لگا۔ لالی کو اس سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ مگر وہ سہما ہوا حیات محمد کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ حیات محمد' غلام گردش میں کھلنے والے دروازے پر پہنچا۔ اسے کھولا۔ باہر دھیو رکھڑا تھا۔ حیات محمد نے اسے کمرے کے اندر بلایا۔

دھیو رکمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دروازہ بند کردیا۔ میاں حیات محمد نے جنوبی دیوار کا بند دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ یہ دروازہ کمرے کے دوسرے دروازوں سے کسی قدر مختصر تھا۔ اس میں تالا بھی پڑا تھا۔

دھیو ر نے شلوار کی چور جیب سے کنجی نکالی اور نہایت مستعدی سے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے۔ وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔

میاں حیات محمد اپنے السیشن کے ساتھ ذرا سا جھک کر اندر داخل ہوا۔ اس نے لالی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

لالی بھی اندر چلا گیا۔ دھیو ر باہر رہ گیا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ بند کردیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ حیات نے ہاتھ بڑھا کر دیوار میں لگا ہوا بجلی کا سوئچ دبایا۔ ایک بلب روشن ہوگیا۔ اس کی روشنی بہت دھیمی تھی۔

سامنے زینہ تھا جو نیچے جاتا تھا۔ دونوں آگے پیچھے نیچے اترے۔ یہ کشادہ تہہ خانہ تھا۔ فرش کچا تھا۔ تہہ خانے میں نمی تھی' گھٹن تھی اور عجیب طرح کی بساند پھیلی ہوئی تھی۔ تہہ خانے میں بھی دھندلا بلب روشن تھا۔ ہوا کی آمد و رفت کے لیے چمنی تھی جو کھپریلوں کی چھت کے اوپر نکلی ہوئی تھی۔ چمنی کے نیچے آتش دان تھا۔ اس میں تہہ خانہ گرم رکھنے کے لیے موسم سرما میں لکڑی کے ٹکڑے اور کوئلے سلگائے جاتے تھے۔

☆

دھندلی دھندلی روشنی میں ایک بوڑھا شخص زمین پر لیٹا تھا۔ اس کی ڈاڑھی اور سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ وہ جیل کے قیدیوں کا سا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ایک پیر میں لوہے کی موٹی زنجیر تھی جس میں وزنی گولا پڑا تھا۔ قریب ہی تام چینی کا بوسیدہ تسلا رکھا تھا۔ ایک طرف مٹی کا گھڑا اور المونیم کا گلاس تھا۔ آہٹ سن کر بوڑھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میاں حیات اور لالی کو گھورنے

لگا۔ اس کی آنکھیں غصے اور نفرت سے جلدی ہی بھڑکتا ہوا شعلہ بن گئیں۔ چہرے پر وحشت طاری ہوگئی۔ وہ منہ بگاڑ کر چیخنے لگا۔

”تو آگیا۔ کتے! ذلیل! دور ہوجا میری آنکھوں کے سامنے سے۔ میں تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ دفع ہوجا یہاں سے۔“

وہ چیخ چیخ کر حیات محمد کو گالیاں دیتا رہا اور گہری گہری سانس بھر کر ہانپتا رہا۔ حیات ٹھٹکا۔ ذرا دیر خاموش کھڑا رہا پھر دھیرے دھیرے چلتا ہوا، بوڑھے کی جانب بڑھا۔ حیات جس قدر قریب ہوتا گیا بوڑھے کی دیوانگی میں اسی قدر اضافہ ہوتا گیا۔ وہ اور زیادہ غصے سے چیخنے لگا۔ اس کے منہ سے کف جاری ہوگیا۔ آنکھیں وحشت سے ابل پڑیں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ حیات محمد پر تیزی سے جھپٹا مگر لوہے کے وزنی گولے نے اسے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کے پیر میں پڑی ہوئی زنجیر جھن جھنا اٹھی۔ حیات کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ وہ بوڑھے کے عین مقابل کھڑا تھا۔ بوڑھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ تلملا کر اٹھا، کھڑا ہوا اور نفرت سے حیات کے منہ پر تھوک دیا۔ حیات نے قہرآلود نظروں سے اسے دیکھا۔ جیب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ پونچھا۔ مڑ کر اپنے ساتھ کھڑے ہوئے السیشن کو دیکھا۔ اسے آہستہ سے شُشکارا۔ کتا غرایا، زور سے بھونکا اور اچھل کر بوڑھے پر حملہ آور ہوا۔ بوڑھا زمین پر گر پڑا۔ کتا اسے زور زور سے جھنجھوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

بوڑھا پھولی ہوئی سانس سے چیخا۔ ”مار دے، مار دے۔ مجھے جان سے مار دے۔“

میاں حیات چپ چاپ کھڑا رہا۔ بوڑھا بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ کتا اس کے پھڑکتے ہوئے جسم کو جگہ جگہ سے جھنجھوڑنے لگا۔ سینے پر سوار ہوکر اس نے بوڑھے کی گردن اپنے دانتوں سے دبوچنے کی کوشش کی۔ بوڑھے نے پھٹی پھٹی خوف زدہ آنکھوں سے حیات محمد وٹو کی جانب دیکھا۔

حیات نے ڈپٹ کر کتے کو اپنے پاس بلایا۔ کتے نے بوڑھے کو چھوڑ دیا۔ خاموشی سے حیات کے پاس آگیا اور اس کے پیروں کے قریب زمین پر لیٹ گیا۔ کتے کے جھنجھوڑنے سے بوڑھے کا لباس کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ مگر جسم پر کہیں کھرونچا بھی نہیں آیا۔ وہ کروٹ کے بل زمین پر لیٹا ہوا ہانپ رہا تھا۔ حیات محمد خاموش کھڑا بوڑھے کو گھورتا رہا۔ پھر واپس مڑا۔ اس نے زینے کے برابر دیوار میں لگی ہوئی الماری کھولی۔ لالی سہما ہوا جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔

میاں حیات نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور بھاری بھرکم لہجے میں کہا۔ ”ادھر آ۔“

لالی اس کے پاس چلا گیا۔ حیات نے الماری کے اندر سے ایک ڈبا نکالا۔ ڈھکنا کھول کر ڈبا لالی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کھلے ہوئے ڈبے کے اندر سے سرنج اور شیشی باہر نکالی۔ لالی کو اپنے ساتھ نے کا اشارہ کیا۔ حیات محمد ایک بار پھر بوڑھے کے پاس گیا۔ لالی اس کے عقب میں خاموش کھڑا ہا۔

سرنج دیکھتے ہی بوڑھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر خوف طاری ہوگیا۔ وہ تھرتھر کانپنے لگا۔ س نے دونوں ہاتھ ہلا کر انکار کیا اور گھگیا کر بولا۔ ”نہیں نہیں۔“

حیات نے اسے خوں خوار نظروں سے گھورا۔ بوڑھا سہم کر ایک طرف جھک گیا۔ حیات محمد س کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے بوڑھے کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ بوڑھے نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ بے چارگی سے گردن جھکا دی۔ حیات نے اس کے بازو پر روئی سے اسپرٹ لگائی اور سرنج ی سوئی کھال میں داخل کرکے دوا رگوں میں اتار دی۔ انجیکشن لگا کر وہ کھڑا ہوگیا۔ تہ خانے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ بوڑھا گم صم بیٹھا رہا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ حیات محمد وٹو اور لالی چپ کھڑے رہے۔

بوڑھا گردن کو ذرا سا خم دے کر اس طرح سکڑ کر بیٹھ گیا گویا کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے چہرے پر اچانک گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ وہ حیات سے مخاطب ہوا۔ ”سن رہا ہے حیات۔ بت تیز ہوا چل رہی ہے۔ طوفان آنے والا ہے۔ آندھی کے ساتھ بارش بھی ہوگی۔“ وہ زور سے چیخا۔ ”غضب ہوجائے گا۔ کنک کی واڈھو فصلیں تباہ ہوجائیں گی۔ اب کیا ہوگا حیات؟“

”ابھی فصلیں پک کر تیار نہیں ہوئیں۔ کٹائی میں دیر ہے۔“

”سچ۔“ وہ خوشی سے چہک کر بولا۔ ”سچ، سچ بتا۔ فصلوں کی واڈھی میں ابھی کتنی دیر ہے؟“

”اس بار مئی سے پہلے واڈھی نہیں ہوگی۔ یہ تو مارچ کا مہینہ ہے۔“ حیات محمد وٹو نے اسے تسلی دی۔ ”اب تم سوجاؤ۔“

بوڑھے نے بچوں کی سی معصومیت سے کہا۔ ”اب میں سوجاؤں؟“

”ہاں، ہاں، اب تم سوجاؤ۔“

بوڑھے نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ ذرا دیر چپ بیٹھا جھومتا رہا اور جھومتے، جھومتے ایک طرف لڑھک گیا۔ لالی خوف اور حیرت سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟

جب بوڑھا سوگیا تو حیات واپس ہوا۔ اس نے سرنج صاف کی۔ ڈبے میں رکھی۔ الماری کا

دروازہ کھولا اور ڈبا اس میں رکھ کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ مڑا، لالی کے ہم راہ زینے کی سیڑھیاں طے کیں اور اوپر پہنچ گیا۔ بلب بجھایا۔ دونوں باہر آ گئے۔ کتا بھی باہر آ گیا۔ دھیور دروازے کے قریب مستعدی سے کھڑا تھا۔ ان کے باہر آتے ہی اس نے بڑھ کر تہہ خانے کا دروازہ بند کیا اور تالا ڈال دیا۔ کنجی اپنے پاس رکھ لی۔

حیات نے دھیور کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ کمرے سے چلا گیا۔ لالی نے بھی دھیور کے ساتھ باہر جانا چاہا۔ حیات نے اسے ٹوکا۔

"لالی تو ٹھہر جا۔"

میاں حیات محمد آگے بڑھا اور تھکا ہوا سا صوفے پر بیٹھ گیا۔ قریب کے صوفے پر اس کا السیشن بھی بیٹھ گیا۔ حیات نے وہسکی کا بڑا پیگ بنایا اور آہستہ آہستہ چسکی لگانے لگا۔ لالی اس کے روبرو خاموش کھڑا تھا۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ بنگلے کے باہر ہوا کے جھونکوں سے پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ سناٹے میں خشک پتوں کے کھڑکھڑانے کی ہلکی ہلکی آہٹیں سنائی دی رہی تھیں۔ گہری خاموشی میں حیات کی آواز ابھری۔ وہ لالی سے کہہ رہا تھا۔ "دیکھ لیا تو نے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "یہ میرا وڈا بھرا میاں ریاض محمد خاں وٹو ہے۔ پاگل ہو گیا ہے۔"

"میاں ساب، آپ انھیں پاگل خانے کیوں نہیں بھیج دیتے۔"

"فضول بات نہ کر۔" حیات محمد نے خفا ہو کر کہا۔ "میرا بھائی پاگل خانے نہیں جا سکتا۔ وہ یہیں رہے گا۔"

لالی کے ذہن میں کئی سوالات ابھرے۔ مگر وہ حیات کی برہمی کے ڈر سے کچھ نہ کہہ سکا۔ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات محمد چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "میں اس لیے تجھے اپنے ساتھ تہہ خانے میں لے گیا تھا کہ جو کام آج میں نے کیا ہے، کل سے تجھے کرنا ہو گا۔" وہ مسکرایا۔ "تیری صرف اتنی ہی ڈیوٹی ہو گی۔ باقی وقت میں عیش کر۔ کھا پی، موجاں کر۔"

لالی نے دبی زبان سے پہلوتہی اختیار کرنے کی کوشش کی۔ "میں نے جی یہ کام کبھی نہیں کیا۔"

"کوئی بات نہیں۔" حیات نے بے نیازی سے کہا۔ "بہت معمولی کام ہے۔ دوا کی شیشی تو دیکھ ہی لی ہے۔ سرنج میں دوا بھرنا۔ مریض کا ہاتھ پکڑنا اور کھال میں سوئی چبھو کر دوا اندر داخل کر دینا۔ کام ختم۔"

لالی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "میاں جی، یہ کام تو دھیور بھی کر سکتا ہے۔"

"نہیں۔" میاں حیات محمد نے تیوری پر بل ڈال کر لالی کو دیکھا۔ "دھیور یہ کام نہیں کر سکتا۔ وہ

کیلا تہہ خانے کے اندر بھی نہیں جا سکتا۔" اس نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ "دھیور اگر اس کے پاس گیا تو ہو سکتا ہے، وہ اس کا خون کر دے۔ میرے بھائی نے ناراض ہو کر دھیور کی زبان کٹوا دی تھی۔ تب سے وہ گونگا ہے۔ مگر دھیور اس سے جتنی نفرت کرتا ہے، میرا اتنا ہی وفادار ہے۔ دھیور بہت ہی وفادار ہے۔ میرے دو ہی وفادار ہیں۔" اس نے قریب بیٹھے ہوئے السیشن کی طرف اشارہ کیا۔ "ایک یہ، دوسرا دھیور۔"

لالی نے آہستہ سے کہا۔ "میاں ساب! اپنے بھرا کا کسی چنگے ڈاکٹر سے علاج کرائیے۔ ایسے کب تک کام چلے گا۔"

"مجھے تیرے مشورے کی ضرورت نہیں۔" حیات نے لالی کو ڈانٹ دیا۔ "میں خود ڈاکٹر ہوں۔"

"اچھا جی! آپ ڈاکٹر بھی ہیں؟" لالی نے حیرت کا اظہار کیا۔ "یہ مجھے پتہ نہیں تھا۔"

"میں نے ڈاکٹری لہور میں نہیں پڑھی۔" حیات نے بڑے فخر سے کہا۔ "انگلستان میں پڑھی ہے۔"

لالی نے اور زیادہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میاں ساب! آپ ولایت میں بھی رہ چکے ہیں؟"

"برسوں رہا ہوں۔"

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ ذرا دیر بعد لالی نے خاموشی توڑی اور عاجزی سے بولا۔ "برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں؟"

"کہہ، کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"میری کوئی اور ڈیوٹی لگا دیجیے۔"

حیات محمد چند لمحے لالی کو گہری نظروں سے دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کر مسکرایا۔ "مجھے معلوم ہے، تو بندوق چلانا بھی جانتا ہے۔ نشانہ بھی تیرا بہت ٹھیک ٹھاک ہے۔" اس نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ گلاس میز پر رکھا۔ "میں تیری نشانے بازی اور زور آوری بعد میں دیکھوں گا۔ تو کام کا بندہ لگتا ہے۔" حیات نے ایک بار پھر اسے بغور دیکھا اور ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا۔ "فی الحال تجھے یہی کام کرنا ہو گا۔ بات یہ ہے کہ میں تہہ خانے میں جا کر انجکشن خود لگانا نہیں چاہتا۔ وہ پاگل بندہ ہے۔ اس کے پاگل پن پر مجھے غصہ بھی آتا ہے اور دکھ بھی ہوتا ہے۔ وہ میرا بھائی ہے نا۔"

"ساب! آپ کو ان پر غصہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"تو فضول باتیں شروع کر دیں۔" حیات نے بگڑ کر کہا۔ "میں چاہتا ہوں، تو اس کے بارے میں

بالکل نہ سوچ۔ یہ تیرا کام نہیں۔ تیرا کام صرف اتنا ہی ہے جس کے لیے میں نے تیری ڈیوٹی لگائی ہے۔ تجھے روزانہ دو بار اسے انجیکشن لگانا ہوگا۔ اور اس وقت لگانا ہوگا جب دھیور تجھے کہے گا۔ تہہ خانے کی کنجی اسی کے پاس رہتی ہے۔ تہہ خانے کے اندر صرف تو جائے گا' وہ نہیں جائے گا۔ سمجھ گیا؟"

"جی' بالکل سمجھ گیا۔"

"اور یہ بھی جان لے کہ تہہ خانے میں تیرے علاوہ صرف مائی جنتے جاتی ہے۔ وہ تہہ خانے کی صفائی کرتی ہے۔ روٹی ٹکر پہنچاتی ہے۔ وہ گونگی ہے اور بہری بھی۔ تجھے بھی یہاں گونگا اور بہرہ بن کر رہنا ہوگا' صرف آنکھیں کھلی رکھنا۔ منہ اور زبان بند رکھنا۔" حیات محمد نے قریب رکھی ہوئی میز کی دراز کھولی۔ اندر سے سرنج اور دو شیشیاں نکالیں۔ ایک شیشی اس نے میز پر رکھ دی' دوسری شیشی کی دوا سرنج میں بھری اور سرنج لالی کے ہاتھ میں تھما کر بولا۔ "میں چاہتا ہوں تو میرے سامنے انجیکشن لگا کر دکھا۔"

لالی نے گھبرا کر کہا۔ "کس کے لگاؤں جی؟"

"میں تو بہرحال تجھ سے انجیکشن نہیں لگوا سکتا اور نہ ہی تو اپنے بدن میں انجیکشن لگا سکتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ مسکرایا اور اپنے خوفناک السیشن کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے انجیکشن لگانا ہوگا۔"

"اسے؟" لالی نے خوف زدہ نظروں سے دیکھا' کتا صوفے پر لیٹا اسے گھور رہا ہے۔ "میاں ساب! اس سے تو مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر نہیں' یہ تجھے کاٹے گا نہیں۔" یہ کہہ کر حیات نے میز کی دراز سے چمڑے کا پوزہ بند نکالا۔ اسے کتے کے منہ پر چڑھایا اور اس کی پشت آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ کتا سر نیچے جھکا کر لیٹ گیا۔ حیات نے اس کی ران پر ایک جگہ انگلی رکھ کر حکم دیا۔ "یہاں انجیکشن لگا دے۔" لالی جھجکا۔ حیات نے ڈپٹ کر کہا۔ "منہ کیا تک رہا ہے؟ لگا انجیکشن۔"

لالی نے جھٹ کتے کی کھال میں سرنج کی سوئی داخل کر کے دوا اندر اتار دی۔ کتا خاموش پڑا رہا۔ جب لالی انجکشن لگا چکا تو حیات محمد نے مسکرا کر کہا۔ "بالکل اسی طرح تجھے تہہ خانے میں اس پاگل کو انجکشن لگانا ہوگا۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تو اس کتے سے ڈر رہا تھا۔ یہ نہ کاٹتا ہے' نہ پنجے مارتا ہے اور اس انجکشن کے بعد تو یہ بالکل

ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔"

لالی نے دیکھا' کتا نڈھال پڑا ہے۔ حیات محمد نے پوزہ بند اس کے منہ سے اتار دیا اور تیکھے لہجے بولا۔ "لیکن یہ کبھی کبھی نہایت خطرناک بھی ہو جاتا ہے۔" اس نے میز پر رکھی ہوئی دوسری شی اٹھائی۔ "اگر اس کا انجیکشن لگا دیا جائے تو یہ کتا اتنا خوں خوار ہو جاتا ہے کہ جس پر حملہ رے' اسے چیر پھاڑ کر ختم بھی کر سکتا ہے۔"

لالی نے خوف زدہ نظروں سے شیشی دیکھی اور سرنج ہاتھ میں دبائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات نے ں سے سرنج لی' اسے میز پر رکھا اور لالی سے مخاطب ہوا۔ "یاد رکھ' جیسا تجھ سے کہا جائے تجھے با ہی کرنا ہوگا۔ میرے حکم کی خلاف ورزی تجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ کچھ عرصے تک تیری کڑی رانی کی جائے گی۔ اگر تو نے ہر کام ٹھیک ٹھاک کیا تو نگرانی ختم کر دی جائے گی۔" اس نے دھمکی گھونٹ بھرا اور بھاری بھرکم لہجے میں بولا۔

"جا' جا کر سو جا۔"

لالی نے سر جھکا کر خاموشی سے حیات محمد کی باتیں سنیں۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے پر نچا۔ دروازہ کھولا۔ باہر دھیور مستعدی سے کھڑا تھا۔ وہ اس کے ہم راہ اپنے کمرے میں پہنچا اور تر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد دھیور نے اپنی چارپائی نکالی اور عین دروازے کے سامنے برآمدے میں لی۔ بستر لگایا اور لیٹ گیا۔

دھیور کچھ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا پھر سو گیا۔ مگر لالی کو نیند نہیں آئی۔ وہ سخت بے چین تھا۔ اس ، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے' کیا نہ کرے؟

رات کے پچھلے پہر وہ آہستہ سے اٹھا اور کھڑکی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ باہر زرد زرد چاندنی بکھری ی۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ لالی نے کھڑکی کی آہنی سلاخیں دونوں ہاتھوں سے تھام کر پورا زور لگایا مگر لاخیں بہت مضبوط تھیں۔ ایک بھی سلاخ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

اچانک اسے اپنی پشت پر چاپ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا' لالٹین کی مدھم روشنی میں یور اس کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ خوں خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور لالی کا بازو لڑ کر اس زور سے دھکا دیا کہ لالی لڑکھڑاتا ہوا بستر پر جا کر گرا۔ اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ بستر پر اموش پڑا رہا۔ دھیور نے کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر کے چٹخنی لگائی اور کمرے سے باہر جا کر اپنی ارپائی پر لیٹ گیا۔

چارپائی سے ٹکرانے کے باعث لالی کے کندھے میں چوٹ بھی آئی مگر وہ خاموش رہا اور کروٹ

بدل کر لیٹ گیا۔ آخر اسے نیند آ گئی۔ وہ سو گیا۔ صبح مائی جنتے نے لالی کو آہستہ سے جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔ وہ اس کے لیے چائے لے کر آئی تھی۔ چائے کے ساتھ روٹی اور ساگ بھی تھا۔ یہ صبح کا ناشتا تھا۔ مائی جنتے نے لالی کی جانب نظر بھر کر بھی نہ دیکھا۔ وہ چپ چاپ آئی اور چپ چاپ چلی گئی۔ لالی منہ دھونے کے لیے غسل خانے میں گیا۔ واپس آیا تو اس نے دیکھا' دھیور اپنے کمرے میں چٹائی پر بیٹھا ناشتا کر رہا ہے۔ لالی کے کمرے کی کھڑکی بھی اب کھلی ہوئی تھی۔

لالی ناشتے سے فارغ ہوا تو دھیور اسٹول پر آ کر بیٹھ چکا تھا۔ وہ چپ بیٹھا لالی کو تک رہا تھا۔ لالی نے جتنی بار نظر اٹھائی' اسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ اس طرح گھورنے پر لالی جھنجلا گیا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھیور کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر تک دونوں پلک جھپکائے بغیر ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ آخر دھیور کی پلک جھپک گئی۔ لالی مسکرانے لگا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر دھیور کی تیوری پر بل پڑ گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نفرت سے منہ بگاڑ کر زمین پر تھوک دیا۔ اس کی اس اشتعال انگیزی پر لالی کا خون کھول گیا۔ مگر وہ طرح دے گیا۔ وہ نہتا تھا اور دھیور مسلح۔ لالی نظریں جھکا کر بستر پر لیٹ گیا اور کھڑکی کی سلاخوں سے باہر دیکھنے لگا۔ باہر ہلکی ہلکی دھوپ پھیلی تھی۔ ذرا ہی دیر بعد ایک نوجوان مٹیار ٹوکری میں کوڑا کرکٹ بھر کر لائی اور اسے جھاڑیوں کے پاس انڈیل دیا۔ کوڑے میں شیشے کی ٹوٹی ہوئی بوتلیں بھی تھیں۔ ان کے گرنے سے چھناکا ہوا۔ لڑکی نے نظریں اٹھا کر بستر پر لیٹے ہوئے لالی کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ اس نے اپنی اوڑھنی کے پلو سے سر ڈھکا اور شرما کر زیرِ لب مسکرائی۔ لالی بھی مسکرانے لگا۔ دھیور جھٹ کمرے کے اندر داخل ہوا' کھڑکی کے پاس پہنچا اور قہر آلود نظروں سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔ لڑکی خالی ٹوکری بغل میں دبا کر سہمی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔

دھیور نے ایک بار پھر کھڑکی کے پٹ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ لالی تلملا کے رہ گیا۔ اس نے دھیور کی طرف نہیں دیکھا۔ کروٹ بدل کے منہ دوسری طرف کر لیا۔ دھیور اس کے پاس نہیں آیا' باہر چلا گیا۔

لالی خاموش لیٹا رہا۔ اس کے لیے وقت کاٹنا عذاب ہو گیا۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ ٹھیک بارہ بجے دھیور اس کے پاس آیا اور باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ لالی خاموشی سے اٹھا اور دھیور کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں غلام گردش کے راستے حیات محمد کے کمرے میں داخل ہوئے۔ حیات کمرے میں موجود نہیں تھا۔ دھیور نے تہہ خانے کا دروازہ کھولا اور لالی کو ٹھوکا دے کر اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ لالی نے اندر جا کر سوئچ دبایا۔ بلب روشن ہو گیا۔ اس کی روشنی میں لالی سیڑھیوں سے نیچے تہہ

خانے میں چلا گیا۔

بوڑھا ریاض محمد خاں وٹو آتش دان کے قریب زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے کھانے کے برتن پڑے تھے۔ اس وقت وہ ہونٹوں سے گلاس لگائے پانی پی رہا تھا۔ پانی پیتے پیتے اس نے نظریں اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ خاموشی سے گلاس ایک طرف رکھا اور لمحے بھر تک لالی کو گھورتا رہا۔ لالی سیڑھیوں کے پاس ٹھہر گیا۔ دبے دبے خوف اور حیرت سے ریاض کو تکنے لگا۔ ذرا دیر تہہ خانے میں خاموشی رہی' پھر بوڑھے میاں ریاض محمد کی آواز ابھری۔

“آ' میرے نزدیک آ جا۔”

مگر لالی جہاں تھا' وہیں کھڑا رہا۔ اس دفعہ بوڑھے نے کسی قدر نرمی سے کہا۔ “ڈر نہیں' نزدیک چلا آ۔” لالی نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ آہستہ' آہستہ اس کی جانب بڑھا' مگر نزدیک جانے کے بجائے کچھ فاصلے پر رک گیا۔

میاں ریاض محمد نے کہا۔ “میں نے کل رات ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ اب تیری ڈیوٹی لگائی جائے گی۔” وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ “دور کیوں کھڑا ہے؟ نزدیک آ جا۔ تو تگڑا جوان ہے اور میں بوڑھا' کمزور۔ پاؤں میں زنجیر بھی پڑی ہے۔ فیر بھی تو مجھ سے ڈر رہا ہے۔”

لالی نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھ کر نزدیک چلا گیا۔ ریاض محمد وٹو تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولا۔ “جب کوئی نیا نیا ڈیوٹی پر لگایا جاتا ہے' وہ مجھ سے اسی طرح ڈرتا ہے۔ سمجھتا ہے میں پاگل ہوں۔ کیا میں تجھے پاگل نظر آتا ہوں۔” لالی بدستور خاموش کھڑا رہا۔ بوڑھے ریاض نے گہری سانس بھری۔ “تو میری گل بات کیوں ماننے لگا؟” وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ لالی گم صم کھڑا رہا۔ تہہ خانے میں گہرا سناٹا چھا گیا۔

میاں ریاض محمد نے نظریں اٹھا کر لالی کو دیکھا اور کسی قدر بیزاری سے بولا۔ “کھڑا منہ کیا تک رہا ہے۔ جا' جا کر الماری سے سرنج نکال اور گھسیڑ دے اس کی سوئی میری کھال میں۔ یہی تیری ڈیوٹی ہے اور اسی کے لیے تو یہاں آیا ہے۔ خاماخا کیوں وقت برباد کر رہا ہے۔”

لالی نے پھر بھی کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے الماری کے پاس گیا۔ اسے کھولا۔ سرنج میں دوا بھری۔ میاں ریاض کے پاس پہنچا۔ جھک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور بازو میں انجکشن لگانا چاہا۔ مگر ریاض نے منع کر دیا۔ نرم لہجے میں کہا۔ “آرام سے بیٹھ جا۔” لالی اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑا۔ بوڑھے ریاض نے ٹوکا۔ “میرا ہاتھ چھوڑ دے۔” اس نے کرتے کا دامن اٹھایا اور اپنی برہنہ کمر کا رخ لالی کی طرف کر دیا۔

"ہاتھ میں نہیں، کمر میں انجکشن لگا دے۔"

لالی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ سرنج کی سوئی ریاض کی کمر میں چھونے کی کوشش کی تو وہ بلبلا کر چیخا۔ "تو تو بالکل اناڑی لگتا ہے۔ پہلے کبھی انجکشن لگایا ہے؟" لالی نے زبان سے تو کچھ نہ کہا، صرف انکار میں گردن ہلا دی۔ ریاض نے سرنج اپنے ہاتھ میں سنبھالی اور اس کی نوک کمر پر لگا کر بولا۔ "لے اب لگا دے انجکشن۔"

لالی نے اس کی ہدایت کے مطابق انجکشن لگایا۔ ریاض نے نہایت اطمینان سے انجکشن لگوالیا۔ مسکرا کر کہا۔ "اب تجھے انجکشن لگانا آگیا۔ کچھ دنوں بعد تو فٹافٹ انجکشن لگانے لگے گا۔" لالی نے اس دفعہ بھی کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اٹھ کر الماری کے پاس گیا۔ سرنج صاف کی۔ ڈبے میں رکھی اور الماری میں بند کردی۔

لالی ایک بار پھر ریاض کے قریب گیا۔ مگر اس نے لالی کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ آنکھیں بند کیے دھیرے دھیرے سانس بھرتا رہا۔ چند لمحے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں ہلکا ہلکا خمار تھا۔ اس نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ "اب تو جا سکتا ہے۔ تیری ڈیوٹی ختم ہوگئی۔ میں تھوڑی دیر بعد سو جاؤں گا۔" مگر لالی نہیں گیا۔ ریاض نے بھی کچھ نہ کہا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ دیر آنکھیں بند کیے جھومتا رہا۔ اور جھومتے جھومتے فرش پر لڑھک گیا۔

لالی واپس ہوا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرکے اوپر چڑھنے لگا۔ وہ سخت حیرت زدہ تھا۔ اس نے پچھلی رات جس ریاض محمد کو دیکھا تھا وہ اس ریاض محمد سے قطعی مختلف تھا، جس سے ذرا دیر پہلے اس کا سابقہ پڑا تھا۔ نہ وہ اسے دیکھ کر دیوانوں کی طرح چیخا، نہ گالیاں دیں اور نہ مارنے کے لیے جھپٹا، بلکہ نرمی اور شفقت سے پیش آیا۔ حتیٰ کہ انجکشن لگانے میں بھی اس کی رہنمائی کی۔ پورا پورا تعاون کیا۔

لالی نے اوپر جا کر بجلی بجھائی۔ بند دروازے پر دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ دھیور اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے تہہ خانے کا دروازہ بند کیا اور تالا ڈال دیا۔ لالی کے ہم راہ کمرے میں واپس آگیا۔ لالی نے دوپہر کا کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گیا۔

رات کے گیارہ بجے وہ پھر دھیور کے ساتھ تہہ خانے کے دروازے پر پہنچا۔ حیات کمرے میں اس وقت بھی موجود نہ تھا۔

لالی تہہ خانے کے اندر گیا۔ ریاض محمد وٹو کو دیکھا، وہ جاگ رہا تھا۔ مگر اس نے لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ لالی بھی خاموش رہا۔ ریاض نے انجکشن لگوایا اور سو گیا۔ لالی واپس ہوا۔ دھیور کے ہم راہ اپنے کمرے میں پہنچا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ کھڑکی سے ہوا کے نرم نرم جھونکے اندر آرہے تھے۔ باہر چاندنی چھٹکی تھی۔ مگر دھیور کے ڈر سے لالی کھڑکی پر نہیں گیا۔

☆

لالی دن کے بارہ اور رات کے گیارہ بجے دھیور کے ہم راہ تہہ خانے کے دروازے پر جاتا۔ تنہا اندر داخل ہوتا اور بوڑھے ریاض کے جسم میں انجکشن لگاتا۔ انجکشن لگاتے وقت کبھی کبھار ریاض نے بات کرنے کی کوشش بھی کی مگر لالی نے مطلق حوصلہ افزائی نہ کی۔ حیات محمد کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بالکل خاموش رہتا۔ لیکن ریاض کبھی ناراض نہ ہوا۔ نہ چیخا نہ چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیا۔ بلکہ عام طور پر خاموش ہی رہتا۔

لالی واپس کمرے میں جاتا تو دھیور اس کی کڑی نگرانی کرتا۔ ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتا۔ نہایت بے رخی اور حقارت سے پیش آتا۔ لالی تنہائی سے اکتا کر کبھی کھڑکی کی جانب جانے کی کوشش کرتا تو دھیور جھٹ کمرے میں جاتا اور لالی کی گردن پکڑ کر زور سے دھکا دیتا۔ دو بار ایسا ہی ہوا۔ لالی اس سے جھگڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کھڑکی پر جانے کا ارادہ ہی ترک کردیا۔ بستر پر لیٹتا تو کروٹ بدل کر منہ موڑ لیتا۔

کمرے سے نکل کر وہ صرف برآمدے میں آسکتا تھا یا غسل خانے تک جا سکتا تھا اور چوبیس گھنٹے میں صرف دو بار راہ داری سے گزر کر تہہ خانے میں جا سکتا تھا۔ دھیور ہر وقت اس کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا۔ کوئی بات کرنے والا بھی نہ تھا۔ مائی جنتے بھی گونگی تھی اور دھیور بھی گونگا تھا اور بوڑھے ریاض سے اسے بات کرنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔ اس دوران حیات محمد وٹو سے بھی اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔

لالی اس ماحول سے جلد ہی اکتا گیا۔ فرار ہونے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ دھیور اس کے راستے میں دیوار بنا کھڑا تھا۔ دھیور پر قابو پانا یا اسے رام کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کا رویہ اس قدر اشتعال انگیز تھا کہ لالی نے جب بھی اس کی طرف دیکھا، ہمیشہ قہر آلود نظروں سے اپنی جانب گھورتے پایا۔ دھیور صرف رات کو سوتا تھا اور لالی کے کمرے کے دروازے کے سامنے چارپائی ڈال کر سوتا تھا۔ مگر وہ اس قدر چوکنا اور چوکس رہتا کہ اگر لالی رات کو پیشاب کے لیے بھی اٹھتا تو اس کی چاپ کے ساتھ ہی دھیور جھٹ اٹھ کر بیٹھ جاتا۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ صبح ہوتی، شام ہوتی۔ مگر لالی نے سورج نہ طلوع ہوتے دیکھا، نہ

غروب ہوتے۔ بنگلے کے باہر کی دنیا کے بارے میں اسے کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ اسے رہ رہ کے رحیم داد کا خیال آتا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتا کہ رحیم داد اس کے بارے میں نہ جانے کیا سوچتا ہوگا۔ حیات محمد کا کہنا تھا کہ وہ رحیم داد کو بھول جائے۔ اس کا خیال دل سے نکال دے۔ اسے مردہ سمجھ لے۔ مگر لالی کے لیے یہ ممکن نہ تھا۔

وہ رحیم داد کو بھولنا بھی چاہتا تو بھول نہیں سکتا تھا۔ اس نے رحیم داد سے ہر حال میں مدد کرنے کا عہد کیا تھا اور وہ اپنا یہ عہد پوری نیک نیتی سے نباہنا چاہتا تھا۔ لیکن میاں حیات محمد خاں وٹو کی قید میں رہ کر وہ رحیم داد کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پولیس رحیم داد کی تلاش میں سرگرداں تھی اور رحیم داد کے مخالف اسے قتل کرنے کے لیے گھات میں لگے تھے۔ لالی کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے؟

☆

رات کے گیارہ بجے وہ معمول کے مطابق دھیور کے ہم راہ تہہ خانے کے دروازے پر پہنچا۔ اس وقت بھی میاں حیات محمد کا کمرہ خالی تھا۔ لالی تہہ خانے کے اندر گیا۔ بوڑھے ریاض نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ چپ چاپ انجکشن لگوایا اور سونے کے لیے فرش پر لیٹ گیا۔

لالی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ خلاف معمول تہہ خانے کے دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھلا ہے۔ وہ بھونچکا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسی اثنا میں حیات محمد کی آواز خاموشی میں ابھری۔

"دھیور کمرے کے باہر کھڑا ہے۔ تہہ خانے کا دروازہ بند کردے اور میرے پاس چلا آ۔"

لالی تہہ خانے کا دروازہ بند کر کے حیات محمد خاں وٹو کے پاس چلا گیا۔ وہ مدھم روشنی میں صوفے کی پشت سے سر ٹکائے اس طرح بیٹھا تھا کہ دور سے نظر نہ آتا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں سامنے رکھی ہوئی میز پر پھیلی تھیں۔

وہ اس وقت تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کے جوتوں کے تلوں میں تازہ تازہ مٹی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ بھی تہہ خانے میں گیا تھا اور غالباً "اس وقت گیا تھا' جب لالی گردن جھکائے ریاض کے جسم میں انجکشن لگا رہا تھا۔ لالی فوراً بھانپ گیا کہ حیات محمد بھی نہایت رازداری سے اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہا ہے۔

حیات محمد وٹو کا سیاہ السیشن قریب ہی صوفے پر بیٹھا تھا۔ حیات کی آنکھیں نشے سے چڑھی ہوئی تھیں۔ اس نے لالی سے پوچھا۔ "اس پاگل نے تجھے تنگ تو نہیں کیا؟"

لالی نے جھٹ بتایا۔ "نہیں میاں جی' بالکل تنگ نہیں کیا۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے حیات محمد کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "ویسے تو جی وہ پاگل لگتے نہیں۔"

"نہیں۔" میاں حیات نے تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ پاگل ہی ہے۔ تجھے جلد ہی پتہ چل جائے گا۔"

لالی نے سر جھکا کر دھیرے سے کہا۔ "سمجھ نہیں آتی جی۔"

"اس کے ساتھ تیری بات چیت تو نہیں ہوئی؟"

"انھوں نے جی بات کرنے کی کوشش تو بہت کی' پر میں بولا ہی نہیں۔ بالکل چپ رہا۔ اب تو جی وہ بھی نہیں بولتے۔ چپ کر کے انجکشن لگوا لیتے ہیں۔" لالی نے میاں حیات کی طرف نظریں اٹھائیں۔ "میں جی آپ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے' تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

لالی نے ایک بار پھر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میاں جی' آپ تہہ خانے میں بھی گئے تھے؟"

حیات نے حیرت سے چونک کر پوچھا۔ "تجھے کیسے پتہ چلا' میں تہہ خانے میں گیا تھا؟"

لالی نے اس کے جوتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے جوتوں میں جی ابھی تک تہہ خانے کی کچی زمین کی مٹی لگی ہے۔ آج تہہ خانے کا دروازہ بھی کھلا تھا' دھیور بھی دروازے پر نہیں تھا۔"

"تو دیکھنے میں جتنا گھامڑ لگتا ہے' اتنا ہے نہیں۔" حیات نے مسکرا کر کہا۔ "خاصا تیز ہے۔ عادی مجرم جو ٹھیرا۔"

لالی نے ہاتھ باندھ کر انکساری کا اظہار کیا۔ "میاں ساب' میں آپ سے بہت ڈرتا ہوں۔ اتنا تو کبھی پولیس سے بھی مجھے ڈر نہیں لگا۔"

میاں حیات نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی ٹھیک ہی ہوا کہ تجھے یہ معلوم ہوگیا کہ میں خفیہ طور پر معائنہ کرنے تہہ خانے میں گیا تھا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا' یہ بات تجھے معلوم ہوجائے تاکہ تو آئندہ بھی اسی طرح احتیاط سے کام لے۔"

"جیسا آپ حکم کریں گے جی' ویسا ہی کروں گا۔"

"میں چاہتا ہوں' تو اس پاگل سے بالکل بات نہ کر۔" حیات محمد تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "وہ بات بھی کرے تو سختی سے روک دے۔ ضد کرے تو منہ پر تھپڑ مار کر اس کی زبان بند کردے۔ وہ پاگل پن میں الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں تو ایسے باتیں نہ سن۔ ان پر بالکل دھیان نہ دے۔ میں ایک بار فیر تجھے خبردار کرتا ہوں' میرے اس حکم پر سختی سے عمل کرنا۔ ٹھیک اسی طرح

جیسے میں کہہ رہا ہوں۔ سمجھ گیا؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" لالی نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "فکر نہ کریں جی۔"

"امید تو یہی ہے تو ایسا ہی کرے گا۔ تو خاصا تیز اور ہوشیار ہے اور کوئی ہوشیار بندہ جانتے بوجھتے گڑھے میں گرنے کی کوشش نہیں کرتا۔"

کمرے کی خاموشی میں صرف السیشن کے دھیرے دھیرے غرانے کی آواز ابھرتی رہی۔ حیات محمد نے نظر بھر کر لالی کو دیکھا۔ "میں صبح گورنر کے ساتھ شکار کھیلنے جا رہا ہوں۔ شام کو واپسی ہوگی۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے پروگرام لمبا ہو جائے۔ دو تین روز بعد واپس آؤں۔ میری غیر حاضری میں ہر کام بالکل ٹھیک ٹھاک ہونا چاہیے۔" اس نے قریب رکھی ہوئی بڑی میز کی دراز کھولی' سو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اسے لالی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ رکھ لے۔ ویسے جس چیز کی ضرورت ہو دھیور سے منگوا لینا۔"

لالی نے نوٹ لے کر کہا۔ "ساب' ویسے تو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ پر میرے پاس کپڑے بالکل نہیں' جو ہیں بہت میلے ہو چکے ہیں۔ دھونے سے بھی صاف نہیں ہوتے۔ میرے لیے قمیص شلوار بنوا دیجئے۔ برسوں سے شہر میں رہتا ہوں۔ ایسے ہی کپڑے پہنتا ہوں۔"

میاں حیات محمد نے غور سے لالی کا لباس دیکھا۔ "ہاں' تیرے کپڑے بہت گندے ہیں۔ میں شکار پر روانہ ہونے سے پہلے دھیور سے کہتا جاؤں گا وہ تیرے لیے نئے کپڑے سلوا دے گا۔ بنگلے میں درزی موجود ہے۔ وہ کل تیرے پاس آ جائے گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "اور کوئی بات؟"

"کمرے میں پڑے پڑے جی بہت گھبراتا ہے۔ دھیور بنگلے سے باہر نکلنے ہی نہیں دیتا۔ وہ تو جی اتنی سختی کرتا ہے' کھڑکی پر کھڑا ہو جاتا ہوں تو گردن سے پکڑ لیتا ہے۔ میرا مطلب ہے۔"

"میں تیرا مطلب سمجھ گیا۔" حیات نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "ابھی تو بنگلے سے باہر نہیں جا سکتا۔ تیری کچھ دنوں اور اسی طرح سختی سے نگرانی ہوگی۔"

"جیسی آپ کی مرضی جی' میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تو اس معاملے میں کچھ نہ کہہ۔ ٹھیک ٹھاک رہے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تو یہاں محفوظ بھی رہے گا اور آرام سے بھی رہے گا۔ میں تیری تنخواہ بھی لگا دوں گا اور بھی تیرے لیے بہت کچھ کروں گا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہوگا جب تو آزمائش پر پورا اترے گا۔ جیسا میں کہوں گا تجھے ٹھیک ویسا ہی کرنا ہوگا۔" لالی گردن جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات ذرا دیر چپ بیٹھا رہا پھر اس نے پوچھا۔ "کوئی اور ضرورت ہو تو صاف صاف بتا دے۔ نشہ وشہ تو نہیں کرتا؟"

"کرتا تو ہوں جی!" لالی نے دبی زبان سے اظہار مدعا کیا۔ "پر بہت دنوں سے بالکل نشہ پانی نہیں کیا۔ سگریٹ بھی پینے کو نہیں ملی۔"

میاں حیات مسکرا کر بولا۔ "مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی لیے یہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب تیری یہ ضرورت بھی پوری ہو جائے گی۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ دروازہ کھول' اندر جا۔ جو بوتل پسند آئے اٹھا لے۔ سگریٹ کل مل جائے گی۔"

لالی خاموشی سے آگے بڑھا۔ دروازہ کھولا' اندر گیا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کمرہ نہایت کشادہ تھا۔ جگہ جگہ قیمتی صوفے پڑے تھے۔ فرش پر نرم نرم قالین بچھا تھا۔ ہر طرف ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ ایک گوشے میں نہایت شاندار بار تھا۔ شیشے کی الماریوں میں قسم قسم کی شراب کی بوتلیں تھیں' کنستر تھے۔ ہر رنگ کی شراب تھی اور ہر وضع کی بوتل۔ اسکاچ وہسکی تھی۔ عام وہسکی بھی اور ڈی لکس بھی۔ جونی واکر' ہیگ' اولڈ اسمگلر' وہائٹ ہارس' ڈمپل' بلیک ڈاگ' شیواز ریگل' جونی واکر' بلیک لیبل' رائل سیلوٹ۔ وہسکی کے علاوہ شمپین تھی' شیری تھی' مارٹینی تھی' ووڈکا تھی' جن تھی' پورٹ تھی' رم تھی' ہر طرح کی برانڈی اور کونیک تھی۔ خوشنما بلوری کنستروں میں فرانسیسی وائنز' چیلیس تھورن' چیلیس اردت تھی۔ بلیوتن تھی۔ لالی گھبرائی ہوئی نظروں سے ہر سمت دیکھتا تھا۔ کبھی ادھر نظر ڈالتا' کبھی ادھر۔ اس کے لیے انتخاب کرنا مشکل ہو گیا۔ آخر اس نے اسکاچ وہسکی کی ویسی ہی بوتل اٹھائی جیسی اس نے حیات محمد کی میز پر دیکھی تھی۔ بوتل عام سائز کی بوتلوں سے بڑی بھی تھی۔

وہسکی کی بوتل ہاتھ میں دبائے وہ واپس آیا۔ میاں حیات نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "جا موجاں کر۔ آگے تیرے نشے پانی کا بندوبست دھیور کر دے گا۔ مگر ایک بات یاد رکھنا۔ تو شراب پی کر کبھی میرے سامنے نہیں آئے گا۔ نہ نشے کی حالت میں کوئی گڑبڑ کرے گا۔" اس نے پیچھے دیوار پر کھونٹی سے لٹکے ہوئے چمڑے کے ہنٹر کو ہاتھ بڑھا کر زور سے کھینچا اور اونچی آواز سے ڈپٹ کر کہا۔ "کبھی ایسا ہوا تو چمڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔" لالی سہما ہوا خاموش کھڑا رہا۔

کمرے کی خاموشی میں حیات کی آواز ابھری۔ "جا' باہر دھیور تیرا انتظار کر رہا ہے۔"

بان سے ایک لفظ نکالے بغیر کمرے سے چلا گیا۔ دھیور دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے لالی

کے ہاتھ میں دبی ہوئی وہسکی کی بوتل حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھی۔ مگر بالکل چپ رہا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ لالی نے اپنے کمرے میں پہنچ کر بوتل ایک کونے میں رکھ دی۔ وہ بہت سہما ہوا تھا۔ خاموشی سے بستر پر لیٹ کر سوگیا۔ صبح دن چڑھے اٹھا۔ رات کو دیر سے سونے کے باعث اب وہ دیر ہی سے بیدار ہوتا تھا۔

☆

دروازے کے پیچھے سے چیخنے چلانے کی آوازیں، رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ لالی کو سخت حیرت ہوئی۔ وہ ڈرتے ڈرتے تہہ خانے کے اندر داخل ہوا۔ زینے سے اتر کر نیچے پہنچا۔ سامنے بوڑھا ریاض بیٹھا تھا۔ لالی کو دیکھتے ہی آنکھیں نکال کر بولا۔ ”آگیا کتا میری ہڈیاں چچوڑنے۔“ لالی کو تعجب تو ہوا مگر بالکل خاموش رہا اور آہستہ آہستہ ریاض کی جانب بڑھنے لگا۔ ریاض محمد خاں دتو نے لالی کو اپنی جانب آتے دیکھا تو زور سے چیخا۔ ”ہٹ جا میری نظروں کے سامنے سے، حرام کے تخم!“

لالی اس کے رویے میں یہ اچانک تبدیلی دیکھ کر بہت سٹپٹایا۔ جھجک کر کھڑا ہوگیا۔ میاں ریاض اور زیادہ غضب ناک ہو کر چلایا۔ ”بے غیرت، دلّے! میں تیری منحوس صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔“ اس نے جھٹ سامنے رکھی ہوئی المونیم کی پلیٹ اٹھا کر ماری۔ پلیٹ لالی کے ماتھے پر کھٹاک سے لگی۔ ساتھ ہی ریاض کی آواز ابھری۔

”دفع ہو جا یہاں سے۔“

لالی چوٹ کھا کر تلملا اٹھا۔ غصے سے بے قابو ہو کر بوڑھے پر جھپٹا۔ اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مار کر چیخا۔ ”اوئے چپ کر کے کھڑا ہو جا۔“ اس نے ریاض کی گردن ایک ہاتھ سے دبوچی اور جھٹکا دے کر کھڑا کر دیا۔

ریاض محمد خاں اپنی گردن بے بسی سے ادھر ادھر جھٹک کر چلانے لگا۔ ”مار دے مجھے، جان سے مار دے۔“

لالی نے اسے زور سے دھکا دیا۔ میاں ریاض محمد زمین پر گر کر ہانپنے لگا۔ لالی نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ الماری سے سرنج نکالی۔ دوا بھری اور قریب بیٹھ کر ریاض کا بازو اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس نے نہ مزاحمت کی نہ چیخا۔ خاموشی سے انجکشن لگوا لیا۔ جب واپس جانے لگا تو لالی نے گہری گہری سانسوں کی سرسراہٹ سنی۔ پلٹ کر دیکھا، بوڑھا ریاض دونوں گھٹنوں پر سر رکھے سسکیاں بھر رہا ہے۔ اسے روتے دیکھ کر لالی کے دل کو ٹھیس لگی۔ وہ اداس ہوگیا۔

لالی تہہ خانے سے باہر نکلا اور دھیور کے ہم راہ اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ آج کے واقعے کے بعد ریاض اس کے لیے معمہ بن گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر اسی روپ میں نظر آیا، جو اس نے حیات محمد کے ساتھ پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نے سوچا حیات محمد ٹھیک ہی کہتا ہے۔ میاں ریاض واقعی پاگل ہے۔

دوپہر کا کھانا کھا کر لالی بستر پر لیٹا ہی تھا کہ درزی آگیا۔ اس کا قد اونچا تھا۔ چہرے پر سفید چگّی ڈاڑھی تھی۔ اس نے لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ نہ مسکرایا نہ نظر ملائی۔ گردن جھکائے مختلف زاویوں سے لالی کے جسم کی ناپ لیتا رہا۔ لالی نے اس کی خاموشی پر ہنس کر بے تکلفی کا اظہار کیا۔

”بابے تو بھی گونگا ہے؟“

درزی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی نے کہا۔ ”ایک قمیض اور شلوار تو فٹا فٹ تیار کر دے۔ دیکھ تو میرے کپڑے کتنے گندے ہو رہے ہیں۔“ درزی پھر بھی خاموش رہا۔ لالی کی جانب دیکھے بغیر چپ چاپ کمرے سے باہر چلا گیا۔

سہ پہر کو دھیور دیسی شراب کا ادھا اور سستے برانڈ کی سگریٹوں کے کئی پیکٹ لایا۔ لالی کے حوالے کئے اور دروازے کے باہر اسٹول پر بیٹھ گیا۔ لالی نے ادھا بھی وہسکی کی بوتل کے پاس رکھ دیا۔

دن گزرا، جھٹپٹا ہوا تو لالی کا دل مچلا۔ اس نے وہسکی کی بوتل اٹھائی۔ اسے آنکھوں کے سامنے کیا۔ مسکرا کر ہونٹوں سے چوما۔ بوتل کھولی، ناک سے لگا کر سونگھی۔ خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے وہسکی گلاس میں انڈیلی، پانی ڈالا اور گلاس سامنے رکھ لیا۔ دھیور خاموش بیٹھا لالی کو دیکھتا رہا۔ لالی نے دھیور کی جانب دیکھا۔ گلاس اٹھا کر اس کے قریب پہنچا۔ مسکرا کر گلاس اس کے سامنے کیا۔

”لے یار تو بھی ذرا سی لگا لے۔ ولایتی شراب ہے۔ فسٹ کلاس چیز ہے۔ مزا آجائے گا۔“

دھیور اس حرکت پر لالی سے ذرا بھی خفا نہیں ہوا۔ صرف انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگا۔ لالی نہ مانا۔ بار بار گلاس دھیور کی طرف بڑھاتا رہا۔ جب مسلسل اصرار کے باوجود دھیور پینے پر رضامند نہ ہوا تو لالی نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”یار اگر تو نہیں پیئے گا تو میں نے بھی نہیں پینی۔“ اس نے شراب پھینکنے کے لیے ہاتھ موڑا، دھیور جھٹ اپنی جگہ سے اٹھا۔ مسکرایا اور گلاس لالی کے ہاتھ سے لے کر غٹاغٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔

لالی اس قدر خوش ہوا کہ اس نے بے ساختہ دھیور کا منہ چوم لیا۔ دھیور نے خلاف معمول اس

بے تکلفی پر نہ لالی کو گھورا نہ مارنے کے لیے جھپٹا' بلکہ کھل کر مسکرانے لگا۔ اس نے گلاس لالی کی طرف بڑھایا۔ لالی نے بھی تھوڑی سی وہسکی پی۔

ذرا دیر بعد دونوں لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی میں اطمینان سے فرش پر بیٹھے شراب نوشی کر رہے تھے۔ دھیور بھی اپنا گلاس اٹھا لایا تھا۔ دونوں وہسکی کی چسکی لگا رہے تھے۔ گلاس ٹکرا رہے تھے۔ بے تکلفی سے ہنس رہے تھے۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ رات آہستہ آہستہ اپنا دامن پھیلا رہی تھی۔ دونوں دیر تک وہسکی سے شغل کرتے رہے۔ انھوں نے آدھی سے زیادہ بوتل ختم کر دی۔ کھانا بھی ساتھ بیٹھ کر کھایا اور دیر سے کھایا۔

گیارہ بجے دھیور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی کی جانب دیکھا اور چلنے کا اشارہ کیا۔ دونوں راہ داری میں داخل ہوئے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ہلکی نیل گوں روشنی میں ہر چیز خواب میں تیرتی نظر آتی تھی۔ ان کی آنکھیں نشے سے مخمور تھیں۔

دھیور کچھ زیادہ ہی چڑھا گیا تھا۔ اس نے بے تکلفی سے لالی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ دونوں جھومتے جھامتے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئے۔ لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک دم سنبھل گئے۔

کمرہ خالی تھا۔ حیات محمد ابھی شکار سے واپس نہیں آیا تھا۔ دھیور نے تہہ خانے کا دروازہ کھولا۔ لالی سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ اس کے قدم نشے سے کسی قدر لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ تہہ خانے میں پہنچا تو بوڑھے ریاض محمد خاں وٹو کی آواز ابھری۔

"آ گیا تو؟ میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ ریاض نے اس کی نشے سے چڑھی ہوئی آنکھیں دیکھیں تو مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔ "اچھا تو یہ رنگ ہے۔ کتنی پی؟" لالی پھر بھی نہ بولا۔ ریاض نے ایک بار پھر اسے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور دوپہر والے شوریدہ سر ریاض سے بالکل مختلف تھا۔ لالی کو خاموش دیکھ کر ریاض نے نرم لہجے میں کہا۔ "میرے پاس بیٹھ جا۔ لگا دینا انجکشن۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" مگر لالی بدستور کھڑا رہا۔ ریاض مسکرایا۔ "ڈر کیوں رہا ہے؟ بیٹھ جا۔ میں تجھے کاٹ نہیں کھاؤں گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "تیرے پاس سگریٹ تو ہوگی؟"

لالی نے آہستہ سے کہا۔ "نہیں۔"

"تیرا نام کیا ہے؟"

"لالی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تو مجھے آبادکار نہیں لگتا۔" بوڑھے ریاض نے اسے غور سے دیکھا۔ "دیکھنے میں تو جانگلی لگتا ہے۔ تو جانگلی ہے نا؟"

"میری ماں بھی یہی کہتی تھی۔"

"تو رہنے والا کہاں کا ہے؟"

"گوگیرہ کے نزدیک اپنا پنڈ ہے جی۔ پر میں زیادہ تر لہور میں رہا۔"

"تب تو تو اسی ضلعے کا ہوا۔" ریاض نے مسکراتے ہوئے لالی کو دیکھا۔ "مگر تو لہور میں رہ کر بھی ڈے لڑ ہی لگتا ہے۔ شراب پی کر تو اپنی آنکھوں سے اور بھی زیادہ خوف ناک ڈے لڑ لگتا ہے۔" اس نے آنکھ مار کر سرگوشی کی۔ "یہ بتا تو کس چکر میں یہاں آ گیا؟"

لالی اس کی بات ٹال گیا۔ خاموشی سے الماری کے پاس گیا اور دوا سے بھری ہوئی سرنج نکال کر ریاض کے پاس واپس آ گیا۔ وہ انجکشن لگانے کے لیے اس کے نزدیک بیٹھا تو ریاض نے کہا۔ "ٹھیک سے بیٹھ جا۔ آرام سے لگا دینا انجکشن۔ مجھے ایسی کوئی جلدی نہیں۔"

"پر مجھے تو جلدی ہے۔" لالی نے کسی قدر بے رخی سے کہا۔ "نیند آ رہی ہے' جا کر سو جاؤں گا۔"

"نیند آ رہی ہے تو یہیں سو جا۔ ایک دن تو' تجھے یہاں سونا ہی ہو گا۔"

لالی اس کی بات سن کر چونکا۔ "کیوں؟" اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"ہر نیا آنے والا یہی بات پوچھتا ہے۔ میں اسے جواب دیتا ہوں تو وہ یقین نہیں کرتا۔ تو بھی میری بات پر یقین نہیں کرے گا۔ ایسی بات پوچھنے سے کیا فائدہ جس پر یقین نہ آئے۔" ریاض کے لہجے میں دبا دبا کرب تھا۔ اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔

لالی اور پریشان ہو گیا۔ گھبرا کر بولا۔ "مجھے ایسا لگتا ہے' بابے تو پاگل شاغل نہیں ہے؟" ریاض صرف مسکرا کر رہ گیا۔ مگر یہ مسکراہٹ نہیں تھی' زہرخند تھا۔ لالی نے اصرار کیا۔ "بابے' کیا تو سچ مچ پاگل نہیں ہے؟"

"یہ سوال نہ کر۔ تیری زندگی اور مختصر ہو جائے گی۔" ریاض نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جس نے بھی مجھ سے یہ سوال کیا' وہ کچھ ہی دنوں بعد غائب ہو گیا۔ فیر یہاں نہیں آیا' اس کی لاش آئی۔ یہ جگہ جگہ سے کھدی ہوئی زمین دیکھ رہا ہے؟" اس نے تہہ خانے کے فرش کی جانب اشارہ کیا۔ "یہاں ان کی لاشیں دبی ہیں۔ اب تک ایسی تین لاشیں یہاں دبائی جا چکی ہیں۔ پچھلے چار مہینے سے

یہی تماشا دیکھ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں تو چوتھی لاش بن کر یہاں نہ آئے اور مجھے بھوت بن کر رات کی تنہائی میں نہ ڈرائے۔“ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ چہرے پر دہشت طاری ہوگئی۔ ”ہر رات جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو یہ بھوت اپنی کٹی ہوئی گردنیں اور زخمی سینے لے کر خون میں لتھڑے ہوئے یہاں آتے ہیں۔ ہنستے ہیں‘ ناچتے ہیں‘ شور مچاتے ہیں۔ کبھی میری گردن مروڑتے ہیں۔ کبھی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتے ہیں۔ میں ڈر کر چیختا ہوں تو حیات آجاتا ہے۔ مجھے ہنٹر سے سڑاک سڑاک مارتا ہے۔ یہ دیکھ میری پیٹھ۔“ اس نے کرتا اٹھا کر اپنی برہنہ پیٹھ لالی کے سامنے کردی۔

ریاض کی پیٹھ اور کمر پر لمبی لمبی سیاہ دھاریاں اور بلٹیں پڑی تھیں۔ لالی نے یہ بھی دیکھا کہ تہہ خانے کا کچا فرش جگہ جگہ سے کھدا ہوا ہے۔ لالی نے گنا‘ فرش تین جگہ سے ادھڑا ہوا ہے۔ گویا ریاض ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ لالی کسی ان جانے خوف سے لرز کر رہ گیا۔ اس نے سرنج ایک طرف رکھی اور ریاض کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر کسی قدر عاجزی سے بولا۔

”بابے! یہ تو بتا‘ یہ سب چکر کیا ہے؟“

”تو زیادہ دیر یہاں ٹھیرے گا تو حیات آجائے گا۔ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے اس نے دیکھ لیا تو میرے ساتھ تیری چمڑی بھی ادھیڑ ڈالے گا۔“

لالی نے جھٹ کہا۔ ”وہ تو شکار پر گئے ہیں جی! کل یا پرسوں آئیں گے۔“ اسے فوراً دھیور کا خیال آیا۔ لالی کو اس سے بھی خطرہ تھا۔

وہ میاں ریاض سے کچھ کہے بغیر اٹھا اور تیزی سے سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر پہنچا۔ دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ کمرہ ہنوز خالی ہے۔ دھیور دروازے کے قریب فرش پر بے خبر سو رہا تھا۔

لالی تہہ خانے میں واپس پہنچا۔ ریاض نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”تو اچانک کہاں چلا گیا تھا؟“

”میں دھیور کو دیکھنے گیا تھا جی۔“

دھیور کا نام سن کر بوڑھے ریاض کا چہرہ مکدر ہو گیا۔ نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ ”وہ نمک حرام‘ حیات کا پالتو کتا ہے۔ اس کے پاس دو کتے ہیں۔ ایک السیشن دوسرا دھیور۔ ہر قتل کے لیے وہ انھی کو استعمال کرتا ہے۔ حیات بیرسٹر بھی ہے۔ ہر جرم میں اپنا ہاتھ صاف رکھتا ہے۔ قانون کو پوری طرح جانتا ہے نا۔“

”پر ابھی تو دھیور سو رہا ہے۔ اس نے بھی میرے ساتھ ہی پی تھی اور زیادہ ہی چڑھا گیا تھا۔ اب نشے میں دھت پڑا ہے۔“ لالی نے مطلع کیا۔

بوڑھے ریاض محمد وٹو نے دریافت کیا۔ ”تجھے ٹھیک سے پتہ ہے حیات آج رات شکار سے نہیں لوٹے گا۔“

”مجھ سے تو جی پچھلی رات انھوں نے یہی بتایا تھا‘ شام کو نہ لوٹے تو دو تین روز بعد واپسی ہوگی۔“

میاں ریاض محمد خاں نے لالی کی بات سنی تو گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ لالی زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ وہ معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے بے قرار تھا۔ اس نے بوڑھے ریاض کو کریدا۔

”میاں ساب‘ آپ کے جی سگے بھائی ہیں؟“

”ہاں۔“ ریاض نے مختصر جواب دیا۔ وہ ابھی تک سوچتا ہوا نظر آرہا تھا۔

لالی نے اس کی خاموشی سے اکتا کر استفسار کیا۔ ”پر انھوں نے آپ کو یہاں تہہ خانے میں کیوں ڈال دیا؟ کوئی بات تو ہوگی۔“

”تو بھی سن لے۔ کوئی لمبی چوڑی داستان نہیں‘ پر تو نہ سن تو اچھا ہے۔“ اس نے چوکنا نظروں سے زینے کی جانب دیکھا۔ خوف زدہ ہو کر پوچھا۔ ”تجھے پورا یقین ہے‘ حیات آج شام واپس نہیں آیا اور دھیور نشے میں مدہوش سو رہا ہے۔“

”میں جی کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔ ابھی آپ کے سامنے ہی تو دیکھ کے آیا ہوں۔“ لالی کھسک کر ریاض کے اور قریب ہوگیا اور اپنی بے چینی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے کچھ تو بتایئے جی۔ سمجھ نہیں آتی‘ یہ سارا چکر کیا ہے؟ سوچتے‘ سوچتے تھک گیا۔ اپنا تو بھیجا کام نہیں کرتا۔“

”بات صرف اتنی ہے۔ حیات جب بہت چھوٹا تھا۔ مشکل سے دو سال کا رہا ہوگا کہ ماں فوت ہوگئی۔ سال بھر بعد بیبو بھی نہ رہے۔ میری پہلی گھر والی سے کوئی اولاد نہ تھی۔ میں نے حیات ہی کو اپنی اولاد سمجھا‘ اور اولاد ہی کی طرح اسے پالا پوسا۔ وہ میرا اکلوتا بھائی ہے۔ مجھ سے لگ بھگ ٢٠ برس چھوٹا ہے۔ میری کوئی بہن بھی نہیں۔ میری تمام جائیداد کا وارث حیات ہی تھا۔ وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ ساری جائیداد کا وارث وہی بنے گا۔“

لالی نے اس کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے لقمہ دیا۔ ”ویسے بھی جی آدھی جیداد تو ان کی بنتی ہے۔“

”نہیں‘ ایسی کوئی گل بات نہیں۔“ میاں ریاض نے فوراً وضاحت کی۔ ”یہ جائیداد مجھے اپنے بیبو سے ورثے میں نہیں ملی۔ وہ تو بہت معمولی زمیں دار تھے۔ ان کے پاس ١٢٥ ایکڑ سے بھی کم اراضی تھی۔ ان کو زمیں داری سے کچھ زیادہ دلچسپی بھی نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے‘ میں پولیس میں بھرتی

ہو جاؤں یا پٹواری لگ جاؤں۔ اسی لیے انھوں نے مجھے مڈل تک تعلیم دلوائی۔" اس نے اپنا ماضی کریدتے کریدتے ٹھنڈی سانس بھری۔ "مگر انھوں نے جو چاہا' وہ نہ ہوا۔ ہوتا تو وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔" میاں ریاض محمد نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔ "یہ اتنی وڈی جاگیر میں نے اپنی صلاحیت اور محنت سے حاصل کی ہے۔"

لالی خاموش بیٹھا رہا۔ ریاض محمد خاں وٹو بتاتا رہا۔ "فیر ایسا ہوا کہ میں نے دوسرا ویاہ کر لیا۔ تب تک میں اس جائیداد کا مالک نہیں تھا۔ منیجر لگا ہوا تھا۔ دوسری گھر والی سے میرا پتر نیاز پیدا ہوا۔ حیات تب جوان تھا۔ ان دنوں وہ لہور میں پڑھتا تھا۔ جب یہ جاگیر میری ہو گئی تو وہ بھی ادھر ہی آگیا۔ زمیں داری کی دیکھ بھال میں میرا ہاتھ بٹانے لگا۔ سچ پوچھو تو ساری ہی ذمہ داریاں میں نے اسے سونپ دی تھیں۔ اب نیاز بھی کچھ لمبا ہو گیا تھا اور سکول میں پڑھتا تھا۔" اس کا لہجہ قدرے تیکھا ہو گیا۔ "پر حیات اس سے خوش نہ تھا۔ خار کھاتا تھا۔ پریشان رہتا۔ میں نے جلد ہی اس کی پریشانی کا سبب جان لیا۔"

"وہ پریشانی کیا تھی جی؟" لالی بیچ میں بول پڑا۔

"سیدھی سادی گل ہے۔" ریاض نے لالی کو مطلع کیا۔ "نیاز کے ہوتے ہوئے حیات میری جائیداد کا وارث کیسے بن سکتا تھا۔ میں نے حیات کی پریشانی کا علاج یہ نکالا کہ اسے اپنے دوست کرنل جانسن کے پاس پڑھنے کے لیے لندن بھیج دیا۔ یہ جاگیر اور تمام فارم شارم پہلے کرنل جانسن ہی کی ملکیت ہوتے تھے۔"

"پر جی' یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ کرنیل نے اتنی وڈی جگیر کیسے دے دی؟" لالی ایک بار پھر بیچ میں بول پڑا۔ "دیکھو نا جی' کوئی اپنی جیداد کسی کو کیسے دے سکتا ہے؟" اس نے نشے کی ترنگ میں لہرا کر بے تکلفی سے آنکھ ماری۔ "کوئی اونچا ہی چکر چلایا ہو گا۔"

"بکواس نہ کر۔" میاں ریاض محمد نے لالی کو غصے سے ڈانٹا۔ "بیچ میں بولے گا تو میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" وہ روٹھنے کے انداز میں منہ موڑ کر بیٹھ گیا۔

مگر لالی نے اسے خاموش نہ رہنے دیا۔ ریاض کا گھٹنا چھو کر گڑگڑانے لگا۔ "غلطی ہو گئی جی۔ اب نہیں بولوں گا۔"

لالی نے منت سماجت کر کے میاں ریاض کو منا لیا۔ وہ بتانے لگا۔ "میں چاہتا تھا حیات بہت تعلیم حاصل کرے۔ اسے بچپن میں ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ وہ ڈاکٹری پڑھنے لندن چلا گیا۔ پر ڈاکٹری پڑھتے' پڑھتے اچانک اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ مجھے لکھا کہ بیرسٹری پڑھوں گا۔ میں نے اسے خوشی

ے اجازت دے دی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ "بیرسٹری کو میں نے ں بھی پسند کیا کہ میں چاہتا تھا وہ بیرسٹر بن کر سیاست میں حصہ لے۔ اسمبلی کا ممبر بنے۔ وزیر بنے۔ ور نر لگے۔ سارے ہی سیاست داں عام طور پر وکیل یا بیرسٹر ہی ہوتے ہیں۔"

"فیر ایہہ گل بھی تو ہے۔" لالی نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔ "بیرسٹری کے ساتھ' ساتھ وہ سیاست میں لگ جاتے تو جگیر اور جیداد کی طرف ان کا دھیان ہی نہ جاتا۔ ورثے کی سوچتے اور نہ نیاز سے خار کھاتے۔" لالی نے داد طلب نظروں سے ریاض کو دیکھا۔ "میں نے غلط تو نہیں سوچا جی؟"

"تیرا خیال ٹھیک ہے۔ میں نے بھی یہی سوچا تھا۔" میاں ریاض نے اس دفعہ لالی کی مداخلت پر خفگی کے بجائے تائید کی۔ "ویسے یہ بھی ہے کہ اپنی برادری کے کئی زمیں دار سیاست میں ہیں۔ پچھلے صوبائی الیکشن میں' جو ۱۹۵۱ء میں ہوئے تھے' ادھر سے میاں خدا یار خاں وٹو جیتا تھا۔ اس کے سسر خاں بہادر میاں نواز احمد خاں مانیکا کا نام تو' تو نے بھی سنا ہو گا۔ اپنی ہی قوم کا بندہ ہے۔"

"نہیں جی' میں اسے نہیں جانتا۔" لالی نے گردن ہلا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

"حد ہو گئی۔ تو اسے نہیں جانتا۔ اسے تو سب ہی جانتے ہیں۔" ریاض نے حیرت زدہ ہو کر کہا "خاں بہادر نور احمد مانیکا' پاک پتن کا بہت وڈا زمیں دار ہے۔ وہ تو پاکستان بننے سے بھی پہلے پنجاب اسمبلی کا ممبر رہ چکا ہے۔"

"وہ تو جی مانیکا ہوا اور تم ٹھیرے وٹو۔ فیر وہ تمہاری کوم کا کیسے ہوا؟"

"مانیکا بھی وٹو ہی ہوتے ہیں۔" ریاض نے لالی کو بتایا۔ "سارے ہی وٹو دراصل سورج بنسی راجپوت ہیں۔ پہلے ہندو ہوتے تھے۔ کہتے ہیں بابا فرید گنج شکر نے انھیں مسلمان بنایا تھا۔ اور اب تو بابا فرید کے خاندان سے وٹوؤں کی رشتہ داری بھی ہو گئی ہے۔ خاں بہادر میاں نور احمد مانیکا کی ایک دھی' بابا فرید کے گدی نشین دیوان غلام قطب الدین چشتی سے ویاہی ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "مانیکا' کالوکا' تیجے کا' ٹھاکر کا' لالیکا' وٹوؤں کی گوتیں ہیں۔ اور بھی نہ جانے کتنی ہیں۔ ہماری گوت کالوکا ہے۔"

"میرے ساتھ جیل میں ایک کیدی ہوتا تھا۔ وہ اپنے کو راجپوت بتاتا تھا۔" لالی نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "پر وہ سیال تھا۔ میاں نہیں چوہدری کہلاتا تھا۔"

"چوہدری اور ملک تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔" میاں ریاض محمد نے وضاحت کی۔ "چوہدریوں اور ملکوں کی کوئی ذات' کوئی برادری نہیں ہوتی۔ چوہدری اور ملک تو ایک طرح کا خطاب ہوتا ہے۔ لیکن میاں صرف راجپوتوں کا خطاب ہوتا ہے۔ ویسے تو اب آرائیں اور شیخ بھی خود کو میاں

کہلواتے ہیں۔ مگر اصل میں یہ اونچی ذات کے راجپوتوں کا خطاب ہوتا ہے۔ خاص طور پر پہاڑی علاقے کے راجپوت، جو یہاں ہوتے ہیں، اس معاملے میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ وہ کھیتی باڑی نہیں کرسکتے۔ اپنی دھی کسی نچلی ذات کے راجپوت کو نہیں ویاہ سکتے۔ نہ وہ اپنی دھی کے لیے روپیہ پیسہ لیتے ہیں۔ ان کی زنانیاں سخت پردہ کرتی ہیں۔ اگر کوئی میاں راجپوت خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ میاں نہیں رہتا۔ نچلے درجے کا راجپوت بن جاتا ہے۔ اس کو ہل باہ یا بالی کہا جاتا ہے۔ راجپوت تو چھتری ہوتے ہیں ناں۔ ان کی شان تو تلوار ہوتی ہے۔ وہ فوجی بننا پسند کرتے ہیں۔ میاں سب سے اونچی ذات کے راجپوت ہوتے ہیں۔ ان کے بعد رانا ہوتے ہیں۔ فیر ٹھاکر ہوتے ہیں۔ اور سب سے نچلے درجے کے راؤ ہوتے ہیں۔ وہ رانگھڑ کہلاتے ہیں۔ سیال، چوہان، جویا، مہر، ٹوانے اور راٹھور بھی راجپوت ہوتے ہیں۔ جنجوعہ بھی راٹھوروں ہی کی ایک گوت ہے۔“

میاں ریاض محمد کو عرصے سے کسی کے ساتھ بات چیت کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ لالی نے اسے کریدا تو بات سے بات نکلتی رہی۔ میاں ریاض ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ اپنی اور اپنی ذات برادری کی بڑائی جتانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر لالی اس کی باتوں سے جلد ہی اکتا گیا۔ اسے نہ راجپوتوں سے دلچسپی تھی، نہ وٹوؤں سے اور نہ ان کی مختلف گوتوں سے۔ اسے صرف میاں حیات محمد سے دلچسپی تھی، جس نے اسے اپنے بنگلے میں اس طرح قید کردیا تھا کہ نہ وہ باہر نکل سکتا تھا اور نہ رحیم داد کے پاس پہنچ سکتا تھا۔ لہٰذا میاں ریاض کی بات نظرانداز کرکے اس نے ایک بار پھر میاں حیات محمد کا ذکر چھیڑ دیا۔

”یہ تو بتائیں جی، میاں ساب نے بیرسٹری پڑھی یا اسے بھی ڈاکٹری کی طرح چھوڑ دیا؟“

”نہیں، وہ ۵ سال بعد بیرسٹر بن کر لندن سے واپس آگیا۔ لندن سے اپنے ساتھ میم بھی لایا تھا۔“

”میں نے تو جی یہاں کوئی میم شیم دیکھی نہیں۔“

”وہ تھوڑے ہی دنوں بعد انگلستان چلی گئی۔ فیر واپس نہیں آئی۔ میں نے حیات کا ویاہ کردیا۔ اس سے ایک بچی بھی ہے۔ مگر گھر والی حیات کے ساتھ نہیں رہتی۔ وہ بری کڑی نہیں ہے۔ پڑھی لکھی اور سمجھدار ہے۔ یہی کمینہ اور بدمعاش ہے۔ شراب کے نشے میں دھت ہو کر اسے ہنٹر سے مارتا ہے۔ وہ لنگریالوں کی دھی ہے۔ اتنے اونچے گھرانے کی بیٹی کب تک اس کا ظلم برداشت کرتی، آخر روٹھ کر اپنے میکے چلی گئی۔ کبھی کبھار آجاتی ہے۔“ ریاض نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔ ”لندن سے واپسی کے بعد حیات نے کبھی بیرسٹری نہیں کی۔ میرے بار بار کہنے پر بھی اس نے

پریکٹس شروع نہیں کی۔ ہاں سیاست میں ضرور حصہ لینے لگا۔ مگر نہ وزیر لگا نہ گورنر اور نہ کبھی اسمبلی کی ممبری کی کوشش کی۔ وہ صرف بادشاہ گری کرتا ہے۔“

لالی نے ہونق کی طرح منہ پھاڑ کر حیرت سے پوچھا۔ ”یہ بادشاہ گری کیا ہوتی ہے جی؟“

”وہ یہ ہوتی ہے۔ کسی کو اسمبلی کا ممبر بنوا دیا، کسی کو وزیر لگوا دیا۔ کسی پارٹی کو اوپر کرا دیا کسی کو نیچے۔ کبھی اس ٹولے کے ساتھ، کبھی اس ٹولے کے ساتھ۔ کہتا ہے، اصلی سیاست یہی ہے۔ پیچھے بیٹھے ڈوری ہلاتے رہو۔“

”اپنا میاں ساب تو بہت اونچا کاری گر معلوم ہوتا ہے۔“ لالی نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ نشے کا ایک بار پھر ریلا آیا۔ لالی بہکنے لگا۔ ”وہ فلم تو آپ نے دیکھی ہوگی جی، استاد چکرم، کیا زوروں کی فلم تھی۔“ لالی نے نیم وا آنکھوں سے ریاض کو دیکھا اور جھوم کر اپنی بھونڈی آواز میں گنگنانے لگا۔ ”آنکھیں شرابی، چہرہ گلابی۔“

ریاض نے غصے سے گھورا۔ ”فیر تو نے بکواس شروع کردی۔“

لالی چونک پڑا۔ کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا۔ ”معاف کرنا جی! تھوڑی سی چڑھ گئی ہے۔“ لالی نے منانے کے لیے ایک بار پھر اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ ”اب نہیں بولوں گا جی۔ رب سوہنہ بالکل نہیں بہکوں گا۔“

”معلوم نہیں، میں کیا کہہ رہا تھا۔“ ریاض کچھ دیر خاموشی سے سوچتا رہا، پھر بولا۔ ”یاد آیا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا، حیات سیاست میں چور دروازے سے حصہ لینے لگا۔ مگر وہ زمیں داری کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتا۔ فیر اس نے ایک بہت کمینی حرکت کی۔ ادھر ادھر یہ مشہور کردیا کہ نیاز میرا نہیں، کرنل جانسن کا پتر ہے۔“

لالی پھر بیچ میں بول پڑا۔ ”یہ تو بہت شرم کی گل ہے جی! بہت بدنامی ہوئی ہوگی۔“

لالی کی مداخلت پر ریاض خفا نہیں ہوا۔ گہری سانس بھر کر بولا۔ ”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ نیاز کی ماں نے یہ بات سنی تو اسے اتنا دکھ ہوا کہ خودکشی کرلی۔ میں نے تب ہی سوچا تھا، حیات کو دھتکار کر نکال دوں۔ مگر وہ میرے پیر پکڑ کر رونے لگا۔ میں نے اسے معاف کردیا۔ پر نیاز نے معاف نہیں کیا۔ وہ مشکل سے ۱۹ سال کا تھا۔ لیکن اتنا ناراض ہوا کہ اس کا بس چلتا تو حیات کو گولی سے اڑا دیتا۔ وہ بہت سرکش اور ضدی ہے۔ میں نے سوچا، کسی روز چاچا بھتیجے میں گولی نہ چل جائے، نیاز کو پڑھنے کے لیے امریکہ بھیج دیا۔ اسے وہاں گئے ہوئے لگ بھگ ڈیڑھ سال ہوچکا ہے۔ ابھی سال بھر اور امریکہ میں تعلیم حاصل کرے گا۔“

"آپ نے جی! اپنے لیے یہ ٹھیک نہیں کیا۔"

ریاض بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کیا کرتا۔ کوئی اور رستہ بھی نہیں تھا۔ مگر سال بھر بعد میں نے اسے واپس بلانا چاہا۔ ہوا یہ کہ نیاز کے امریکہ جانے کے چند ہی مہینوں بعد میری پہلی گھر والی بھی مرگئی۔ میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ میں چاہتا تھا' میرا پتر میرے پاس رہے۔ لیکن حیات نے کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے اسے واپس نہ آنے دیا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "میں نے یہ بھی غور کیا کہ زمیں داری کے معاملوں میں حیات من مانی کرنے لگا تھا۔ میری ذرا پرواہ نہ کرتا۔ جو جی چاہتا' فیصلہ کرتا۔ مجھ سے دور دور رہتا۔ بلاتا تو نہ آتا۔ ٹال مٹول سے کام لیتا۔"

"آپ کو تو جی تب ہی ہوشیار ہوجانا چاہئے تھا۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔" بوڑھے ریاض نے لالی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے یہی غلطی ہوئی۔ کیا کرتا' بھائی کی محبت نے اندھا کردیا تھا۔" اس نے لالی کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ "انہی دنوں کا ذکر ہے۔ ایک رات میں دیر سے واپس آرہا تھا۔ بنگلے سے کوئی فرلانگ بھر کے فاصلے پر اندھیرے میں مجھ پر اندھادھند فائرنگ ہوئی۔ میں بال بال بچ گیا۔ البتہ میرا ایک کرندہ بری طرح زخمی ہوگیا۔ بعد میں پوچھ تاچھ کرنے پر پتہ چلا' مجھ پر یہ قاتلانہ حملہ حیات کے اشارے پر دھیور نے کیا تھا۔ دھیور کو تو میں نے ایسی سزا دی کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ ساتھ ہی میں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ حیات کو جاگیر سے علیحدہ کردوں تاکہ اس کے دماغ سے وارث بن جانے کا خناس ہی نکل جائے۔ مگر اس سے پہلے کہ میں اسے ہٹاتا' اس نے مجھے اپنے راستے سے 'ہٹا دیا۔ لگ بھگ چار مہینے سے اس تہہ خانے میں بند ہوں۔"

"پر یہ چکر کب تک چلے گا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ وہ مجھے قتل بھی کرنا نہیں چاہتا۔"

لالی نے پوچھا۔ "کیوں؟"

"مجھے قتل کرنے سے ابھی اسے کیا ملے گا۔ میری جائیداد کا وارث حیات نہیں میرا پتر نیاز ہے۔ حیات میرے سامنے باربار وصیت نامے کی دستاویز لے کر آتا ہے' جس کے ذریعے وہ چاہتا ہے میں نیاز کو عاق کردوں اور تحریری طور پر یہ تسلیم کرلوں' نیاز میرا نہیں کسی اور کا نطفہ ہے۔ اس طرح نیاز کو جائیداد سے محروم کرکے حیات کو اپنا وارث بنادوں۔"

"میں تو کہتا ہوں جی' آپ دستاویز پر دستخط کردیں۔ کید سے تو چھٹکارا مل جائے گا۔ فیر عدالت میں جاکر کہہ دیجئے گا' مجھ سے زبردستی دستخط کرائے گئے تھے۔"

"وہ تیری طرح بیوقوف نہیں ہے۔ دستاویز پر دستخط کرتے ہی مجھے مار کر یہیں تہہ خانے میں دبا دے گا۔ وہ ایک سال پہلے کی دستاویز پر مجھ سے دستخط کرانا چاہتا ہے۔ وہ بیرسٹر ہے' بیرسٹر۔ قانون کو ہر معاملے میں سامنے رکھتا ہے۔"

ریاض نے اپنی بات ختم کی تو تہہ خانے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ چند لمحے بعد لالی نے کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا جی کہ آپ پاگل شاغل بالکل نہیں ہیں؟"

"ویسے تو اس نے مجھے پاگل ہی بنا رکھا ہے۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ مدت بعد سچ مچ پاگل ہوجاؤں گا۔ کبھی کبھی مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑتا بھی ہے۔ میں بالکل پاگلوں کی سی حرکتیں کرتا ہوں۔ تب مجھے کسی بات کا ہوش نہیں ہوتا۔ جب سے حیات نے یہ انجکشن لگانے شروع کئے ہیں' اس وقت سے مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہونے لگا ہے۔"

"یہ بات تو میں نے بھی نوٹ کی۔ مجھے بھی ان انجکشنوں کا ایسا ہی چکر لگتا ہے۔"

"ویسے تو مجھے ان سے نیند آجاتی ہے۔" ریاض ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا۔ "انجکشن لگنے کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے میں بادل کی طرح بالکل ہلکا پھلکا ہوگیا ہوں۔ کبھی تیز ہواؤں کی آوازیں سنتا ہوں' کبھی پانی کا شور۔ کبھی اوپر سے نیچے جاتا ہوں' کبھی خود کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ فیر میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہوجاتی ہیں۔"

"نیاز کو ان باتوں کا پتہ ہے؟"

"نہیں۔ میرا خیال ہے' اسے کچھ نہیں معلوم۔ اسے معلوم ہوتا تو فوراً یہاں آتا اور مجھے قید سے نکالنے کی کوشش کرتا۔ وہ ضرور ایسا کرتا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا' اسے یہ باتیں معلوم ہوں اور وہ چپ کرکے بیٹھا رہے۔ تمہی سوچو' یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ میرا پتر ہے' میرا اپنا خون ہے۔"

ریاض جذباتی ہوگیا۔

لالی بھی اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ "مجھے نیاز کا پتہ بتائیں جی۔ میں ساری باتیں خط کے ذریعے اسے بتادوں گا۔" لالی نے گرم جوشی سے ریاض کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا اور بڑے جوش سے یقین دلایا۔

"پروا نہ کریں جی' یہ کام تو میں ضرور کردوں گا۔"

لالی کی بات سن کر ریاض پریشان ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ وہ انکار میں دونوں ہاتھ ہلا کر بولا۔ "نہیں' نہیں تو ایسا نہیں کرسکتا۔" وہ گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ "تجھ سے پہلے ان تینوں نے بھی ایسی ہی کوشش کی تھی۔ اب وہ اس تہہ خانے میں دفن ہیں۔ میں نے منع بھی کیا

مگر نہیں مانے۔ اب مجھے رات کی تنہائی میں اپنے کٹے ہوئے سر اور زخمی سینے دکھا کر ڈراتے ہیں۔"

ریاض کسی ان جانے خوف سے لرزنے لگا۔ "حیات تجھے ایسا نہیں کرنے دے گا۔ وہ خوں خوار چیتے کی طرح بہت چوکنا رہتا ہے۔ تو اسے نہیں جانتا۔" یہ کہتے کہتے یکایک اس کے چہرے پر دحشت طاری ہو گئی۔ وہ انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے زور سے چیخا۔

"دیکھ' وہ آگیا۔"

لالی نے گھبرا کر پیچھے دیکھا' میاں حیات زینے کے پاس کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہنٹر تھا اور سرخ سرخ آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ خوں خوار نظروں سے دونوں کو گھورتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ اس کا سیاہ کتا بھی تھا۔ لالی ذرا دیر تو سہما ہوا خاموش بیٹھا رہا' مگر جب حیات اس کے قریب پہنچ گیا تو اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ حیات محمد نے گرج دار لہجے میں کہا۔ "بیٹھا رہ۔" لالی جہاں تھا' وہیں بیٹھا رہا۔

ریاض نے حیات سے نظریں نہیں ملائیں۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کر کے گردن جھکا لی حیات تیزی سے ریاض پر جھپٹا اور اسے ہنٹر سے سڑاک سڑاک مارنے لگا۔ بوڑھے نے بے بسی سے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ گڑگڑا کر بولا۔ "نہیں' نہیں۔" مگر حیات باز نہ آیا۔ گھما گھما کے ہنٹر چلاتا رہا۔ ریاض بے سدھ ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔ خوف اور دہشت سے اس کا پیشاب نکل گیا۔ دونوں ٹانگیں شرابور ہو گئیں۔ فرش بھی گیلا ہو گیا۔ حیات نے ہاتھ روک لیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے لالی سے دریافت کیا۔

"انجکشن لگا دیا تو نے؟"

لالی نے آہستہ سے کہا۔ "ابھی نہیں۔"

"انجکشن لگا۔"

لالی نے خاموشی سے سرنج اٹھائی اور ریاض کی کمر میں انجکشن لگا دیا۔ ریاض فرش پر پڑا آہستہ آہستہ کراہتا رہا' گہری گہری سانس بھرتا رہا۔ جب لالی انجکشن لگا چکا تو حیات نے اس کے ہاتھ سے سرنج لے کر الماری میں رکھ دی اور لالی کو مخاطب کیا۔

"میرے ساتھ آ۔"

لالی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں سیڑھیوں کے قریب پہنچے تو پیچھے سے ریاض کی آواز ابھری۔ "سنو۔"

لالی نے پلٹ کر دیکھا۔ ریاض اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا چہرہ مٹیالا پڑ گیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اس سے کہہ رہا تھا۔ "لاش بن کر یہاں آنا تو مجھے بھوت بن کر نہ ڈرانا۔ اپنی کٹی ہوئی گردن اور خون سے تھڑا ہوا سینہ نہ دکھانا۔"

حیات نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں زینے کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچ گئے۔ لالی سہما ہوا بوجھل قدموں سے چل رہا تھا۔ تہہ خانے کے دروازے سے گزر کر دونوں کمرے میں آ گئے۔ دھیور مدھم روشنی میں ایک طرف کھڑا تھا۔ اس نے بڑھ کر تہہ خانے کا دروازہ بند کر دیا۔

حیات محمد آگے بڑھا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ ہنٹر ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔ لالی اس کے روبہ رو نظریں جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ اس کی پشت پر دروازے کے قریب دھیور موجود تھا۔ حیات تھوڑی دیر خاموش بیٹھا رہا پھر لالی کی طرف متوجہ ہوا۔ تیکھے لہجے میں گویا ہوا۔ "کیا کہتا تھا وہ؟" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گردن جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

حیات غصے سے ڈپٹ کر بولا۔ "خاموش کیوں ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟"

لالی گڑگڑانے لگا۔ "ساب غلطی ہو گئی۔ معاف کر دیجیے۔"

حیات تیوری پر بل ڈالے خوں خوار نظروں سے اسے گھورتا رہا' گردن کو ذرا سا خم دے کر بولا۔ "مجھے معلوم ہے اس نے کیا کہا ہو گا۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔ "وہ بہت مظلوم ہے۔ خود کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے اس نے تجھے بھی ایک دردناک داستان سنائی ہو گی۔ مگر اس نے یہ نہیں بتایا ہو گا کہ خود اس نے کتنا ظلم ڈھایا ہے۔ اس کے ظلم و ستم کا جیتا جاگتا ثبوت یہ کھڑا ہے۔" اس نے دھیور کی جانب اشارہ کیا۔ "اس کی زبان اس نے صرف اس لیے کٹوا دی کہ یہ اس کے گرے ہاؤنڈ کتوں کے راتب سے گوشت چرا کر کھا جاتا تھا۔ یہ دھیور تیرے سامنے کھڑا ہے۔ اس سے پوچھ' کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

لالی نے مڑ کر دیکھا' دھیور دروازے کے قریب کھڑا آہستہ آہستہ گردن ہلا کر اقرار کر رہا ہے۔ حیات کہتا رہا۔ "اس سے یہ بھی پوچھ' اس نے اسے خصی بھی کرا دیا ہے۔ یہ اکیلا نہیں' اس بنگلے میں اور بھی ایسے ہی کئی کھسرے ہیں۔ ان سب کو اس نے خصی بنایا ہے۔ پتہ ہے اس نے ایسا کیوں کیا؟"

لالی نے آہستہ سے انکار میں گردن ہلا دی۔

حیات نے بتایا۔ "اسے اپنی دونوں گھر والیوں پر اعتماد نہیں تھا۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "اس

نے یہ بھی نہیں بتایا ہوگا کہ یہ جائیداد اور جاگیر اس نے کرنل جانسن سے کس طرح حاصل کی۔ ریاض تو اس کا معمولی کرندہ تھا۔ ایسا خوشامدی اور وفادار تھا کہ اس کی خاطر مزارعوں کے کھیت کھلیان جلوا دیتا، ان کے گھربار تباہ کرا دیتا، ان کی لڑکیوں اور گھر والیوں کو اٹھوا لیتا۔ انھیں بے دخل کرنا، ان کے خلاف جھوٹے مقدمے بنوانا، انھیں جیل بھجوانا، قتل کرا دینا اس کے نزدیک بہت معمولی بات تھی۔ اس کارگزاری کے صلے میں وہ کرندے سے ترقی کر کے منیجر بن گیا۔" حیات محمد نے تہہ خانے کے دروازے کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "یہ تہہ خانہ پہلے بھی جیل خانہ تھا۔ اس کے اندر نہ جانے کتنی لاشیں دفن ہیں۔ اس بنگلے میں ایسے دو تہہ خانے اور بھی ہیں۔ ان میں ہمیشہ قیدی بند رہے اور بہت سوں کا قبرستان بھی بنے۔ اب تو صرف وہ اکیلا قیدی رہ گیا ہے۔ دوسرے تہہ خانے میں نے گودام بنا دیے۔"

حیات نے قدرے توقف کے بعد اونچی آواز سے کہا۔ "سن لیا تو نے؟"

"میاں ساب! آپ نے تو ایسی باتیں بتائیں کہ اپنا سر چکرا گیا۔"

"وہ کہتا ہے، یہ جاگیر اور جائیداد اس نے اپنی محنت اور صلاحیت سے حاصل کی ہے۔ جانتا ہے اس نے کیسی صلاحیت دکھائی۔ اس نے اپنی عزت بھی داؤ پر لگا دی۔ اپنی نوجوان گھر والی کو کرنل جانسن کی رکھیل بنا دیا، پھر گلا گھونٹ کر اس کا خون بھی کر دیا۔ مشہور کر دیا کہ اس نے خودکشی کر لی۔"

حیات محمد خاموش ہو کر بے چینی سے اپنا ایک پیر آہستہ آہستہ ہلانے لگا۔ کمرے میں گہری خاموشی پھیل گئی۔ چند لمحے بعد حیات کی آواز ابھری۔ وہ غصے سے کہہ رہا تھا۔ "نیاز اس کا پتر نہیں ہے۔ وہ جھوٹ بولتا ہے، بکواس کرتا ہے۔ دربار ہال میں کرنل جانسن کی تصویر لگی ہے۔ نیاز کو تصویر کے برابر کھڑا کر دے اور دیکھ لے، وہ جانسن کا پتر ہے یا ریاض کا۔ یہ بات وہ بھی جانتا ہے۔ وہ چھوٹے بھائی کو جائیداد کا وارث بنانا نہیں چاہتا۔ کرنل جانسن کے پتر نیاز کو وارث بنانا چاہتا ہے۔ اس کا وفادار جو ہے۔" حیات نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "اونہہ، یہ اس کا بھی تو وفادار نہیں۔ پاکستان بنا اور انگریزی راج ختم ہوا تو اس نے جاگیر اور جائیداد ہتھیانے کے لیے اس کے خلاف سازشوں کا جال پھیلا دیا۔ میرے ذریعے مزارعوں کو بھڑکایا، سرکشی پر اکسایا۔ مزارعوں سے کہا، بٹائی دینا بند کر دو، فارموں پر کام کرنا چھوڑ دو۔ دوسری طرف کرنل کی حمایت میں ان پر فائرنگ بھی کرائی۔ ایسے سنگین حالات پیدا کر دیے کہ جانسن سخت خوف زدہ ہو گیا۔ ایسا پریشان ہوا کہ دو لاکھ روپے سالانہ پر اپنے تمام فارم اور پوری زمینداری اس کے سپرد کر کے لندن چلا گیا اور اب تو وہ

رنل جانسن کو کچھ بھی نہیں دیتا۔ ساری جاگیر ہتیا کر اپنے نام کرالی۔"

حیات محمد چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر تیکھے لہجے میں گویا ہوا۔ "مجھے کہتا ہے، میں بے ایمان وں، ظالم ہوں۔ اب تو بتا۔ بے ایمان اور ظالم کون ہے؟" لالی نے زبان سے ایک لفظ نہیں کہا۔ ظریں نیچے کیے چپ کھڑا رہا۔ حیات نے اونچی آواز سے پوچھا۔ "بول، جواب دے۔ خاموش کیوں ہے؟؟"

لالی نے ایک بار پھر گڑگڑا کر کہا۔ "میاں ساب! غلطی ہو گئی۔ معاف کر دیجیے۔"

حیات محمد خاموش بیٹھا رہا۔ لالی نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "وہ ایسا ہوا جی، کچھ زیادہ ا چڑھ گئی تھی۔ بہت دنوں بعد پی تھی۔ بالکل یاد نہیں رہا۔ میں تو جی ان سے کبھی بات ہی نہیں رتا تھا اور نہ ان کی سنتا تھا۔ فٹافٹ انجکشن لگا کر آ جاتا تھا۔ وہ تو جی مجھے بھی گونگا بہرا سمجھتے تھے۔ آج اپنی مت ماری گئی۔"

حیات محمد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تیری نہیں، اس کی مت ماری گئی تھی۔" اس نے دھیور کی انب گردن موڑ کر دیکھا۔ "مگر اسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ میرا حکم نہ ماننے کی کیا سزا ہوتی ہے۔ اس ا چہرہ ٹھیک سے دیکھ۔"

لالی نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھا کر غور سے دھیور کی طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی سے کنپٹی کے نیچے تک سیاہ لکیر پھیلتی چلی گئی تھی۔ حیات بولا۔ "قمیص اٹھا کر اس کی پیٹھ بھی دیکھ لینا۔ میں نے جھے اس کی نگرانی میں اس لیے نہیں دیا تھا کہ یہ نشے میں مدہوش ہو کر تہہ خانے کے دروازے پر وجائے۔ اور تو تہہ خانے کے اندر آرام سے بیٹھ کر میرے خلاف اس بڈھے کھوسٹ کی بکواس نے۔"

لالی عاجزی سے بولا۔ "ساب! معاف کر دیجیے۔ اب کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ آپ سے لکل سچ کہہ رہا ہوں۔" حیات محمد وٹو نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ چپ بیٹھا ہنٹر مروڑتا رہا۔ لی نے چند لمحے خاموش رہ کر ایک بار پھر التجا کی۔ "ساب جی اس بار معافی دے دیجیے۔ آگے ایسی طی ہو تو گولی مار دیجیے۔"

حیات نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور اونچی آواز سے بولا۔ "اس تہہ خانے میں چھلے چند مہینوں میں تین لاشیں دبائی جا چکی ہیں۔ یہ بات شاید اس نے بھی تجھے بتائی ہوگی۔ میں ہتا ہوں چوتھی لاش تیری نہ ہو۔" اس نے قریب بیٹھے ہوئے اپنے السیشن کی طرف اشارہ کیا۔ ا سے [illegible] سرا انجکشن لگایا جاتا ہے تو یہ السیشن نہیں رہتا، تیندوا بن جاتا ہے۔ خونخوار ہو کر

جس پر جھپٹتا ہے' اسے چیر پھاڑ کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا ہے۔ تو نے دوسرا انجکشن بھی دیکھا ہے' لیکن یہ نہیں دیکھا' اس کے لگنے کے بعد یہ کتنا خوفناک بن جاتا ہے۔" لالی خوف سے لرز گیا۔ السیشن حیات محمد کے پیروں کے پاس لیٹا دھیرے دھیرے غرا رہا تھا۔

لالی نے السیشن کی جانب نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ سہما ہوا خاموش کھڑا رہا۔ یکایک کتا زور سے بھونکا رات کے گہرے سناٹے میں اس کی آواز بہت ڈراؤنی معلوم ہوئی۔ لالی اور زیادہ خوف زدہ ہو گیا۔ حیات محمد جھک کر السیشن کی پیٹھ سہلاتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ "نہیں' ابھی وقت نہیں آیا۔" اس نے گردن اٹھا کر لالی کی طرف دیکھا اور ایک ٹک دیکھتا رہا۔ پھر بھاری بھرکم لہجے میں بولا۔ "لالی!" وہ لمحہ بھر خاموش رہا۔ "آئندہ ایسی غلطی نہ ہو۔ میں تجھے آخری موقع دے رہا ہوں اور اس لیے دے رہا ہوں کہ وہسکی کی بوتل میں نے ہی تجھے دی تھی۔ اس کے نشے میں تو سب کچھ بھول گیا۔ میرا حکم بھی بھول گیا۔ تجھے یہ پتہ نہیں' میں کبھی غافل نہیں رہتا۔ ہمیشہ چوکنا رہتا ہوں۔"

لالی نے دونوں کان انگلیوں سے پکڑ کر کہا۔ "میاں ساب' اب شراب کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔"

"میں تجھ پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگانا چاہتا۔ صرف یہ چاہتا ہوں' میں جیسا کہوں' تو بالکل ویسا ہی کر۔ جب تک یہاں رہنا ہے' تجھے گونگا اور بہرا بن کر رہنا ہوگا بلکہ آنکھوں سے بھی کم سے کم کام لینا ہوگا۔ سمجھ گیا؟"

"سمجھ گیا جی' بالکل سمجھ گیا۔"

حیات نے حکم دیا۔ "جا' جا کر اب اپنی جگہ سو جا۔"

لالی نظریں جھکائے دروازے پر پہنچا۔ دھیور نے دروازہ کھول دیا' اور لالی سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ لالی باہر آگیا۔ مگر دھیور نہ آیا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔ لالی کو دھیور کے نہ آنے پر تعجب تو ہوا مگر وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر لیٹ گیا۔

☆

رات کے پچھلے پہر اچانک لالی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ کمرے کے دروازے کے سامنے دھیور حسب معمول اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ لالی کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ مگر جب دھیور مسلسل کراہتا رہا تو وہ اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ دھیور بستر پر اوندھا پڑا تھا۔

لالی اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور دھیرے دھیرے اس کا سر دبانے لگا۔ دھیور نے اسے منع نہیں

نیا' نہ گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ بے حال پڑا کراہتا رہا۔ لالی نے اس کی قمیص کا دامن ٹھایا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں دیکھا' دھیور کی پیٹھ پر ہنٹر کی مار سے نیل پڑ گئے ہیں۔ کھال جگہ بلہ سے پھٹ گئی ہے۔ زخموں سے خون نکل کر جم گیا ہے۔ لالی پریشان ہو کر بولا۔ "اوے ربا! میاں اب نے تو سچ مچ تیری چمڑی ادھیڑ ڈالی۔ کیسے لمبے لمبے لاس پڑے ہیں۔"

دھیور خاموش لیٹا رک رک کر کراہتا رہا۔ لالی ذرا دیر دھیور کی زخمی پیٹھ تکتا رہا' پھر اٹھا۔ مرے کے اندر گیا۔ کونے میں رکھی ہوئی وہسکی کی بوتل اٹھائی اور دھیور کے پاس آگیا۔ اس نے تل کھولی۔ تھوڑی سی وہسکی ہتھیلی پر ڈالی اور اسے دھیور کے زخموں پر آہستہ آہستہ لگایا۔ وہسکی لگتے ہی دھیور نے تکلیف سے بلبلا کر ہائے کی۔

لالی نے اس کا سر پیار سے تھپک کر نرم لہجے میں کہا۔ "صبر کر۔ ذرا دیر میں چنگا ہو جائے گا۔"

دھیور نے مزاحمت نہیں کی۔ کراہتا رہا اور گہری گہری سانس بھرتا رہا۔ لالی چپ بیٹھا اس کی پیٹھ وہسکی لگاتا رہا۔ وہ اپنی چوٹ اور زخموں کا علاج بھی اسی طرح کرتا تھا۔ یہ نسخہ اس نے ورڈشکرے سے سیکھا تھا۔ ان دنوں انور اس کے گروہ کا سرغنہ تھا۔ وہ لمبا چوڑا قوی ہیکل جوان ا۔ لگتا بھی ڈشکرا تھا۔

لالی' دھیور کی پیٹھ کے زخموں پر ہولے ہولے وہسکی لگاتا رہا۔ دھیور کچھ دیر تو بے قرار ہو کر ادھر ھر گردن ہلاتا رہا۔ رفتہ رفتہ زخموں کی ٹیس کم ہوتی گئی۔ سکون ملا تو اس نے کراہنا بند کر دیا۔ کچھ ی بعد وہ سو گیا۔ لالی اس کے قریب خاموش بیٹھا رہا۔ دھیور منہ اوندھا کیے پیٹ کے بل بے سدھ ا تھا۔

اس کا ریوالور تکیے کے نیچے رکھا تھا۔ لالی نے اسے دیکھا اور چند لمحوں تک دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ چمڑے کے ہولسٹر سے نہایت ہوشیاری سے ریوالور نکالا۔ اسے گھما پھرا ر دیکھا۔ دھیور کو مطلق خبر نہ ہوئی۔

لالی آہستہ سے نیچے اترا اور چند لمحوں تک دھیور کے سرہانے چپ چاپ کھڑا رہا۔ ہر طرف گہرا ٹا چھایا تھا۔ لالی نے وہیں کھڑے کھڑے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا۔ دھیور گہری نیند سو رہا تھا اور ں کا ریوالور لالی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ دبے دبے قدموں چلتا ہوا غلام گردش کے دروازے پر پہنچا۔ ں نے ہولے سے دروازہ کھولا۔ سامنے نیل گوں روشنی میں سیاہ السیشن بیٹھا تھا۔ لالی کو دیکھتے ہی ہ پھاڑ کر غرایا۔

لالی نے جھٹ غلام گردش کا دروازہ بند کر دیا۔ الٹے قدموں واپس ہوا۔ دھیور کے سرہانے پہنچ

کر اس نے جس ہوشیاری سے ریوالور نکالا تھا' اسی ہوشیاری سے ہولسٹر میں رکھ دیا۔ وہ اپنے کمرے میں گیا اور بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

دوسرے روز دن چڑھے درزی کرتا اور شلوار سی کر لے آیا۔ لالی نے غسل کیا۔ نیا لباس پہنا اور دوپہر کو دھیور کے ہم راہ تہہ خانے کے دروازے پر پہنچا' اندر گیا' الماری سے سرنج نکالی' اس میں دوا بھری اور ریاض کے قریب پہنچ گیا۔ لالی نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بات کرتا بھی تو لالی نہ بولتا۔ وہ یہی طے کر کے تہہ خانے میں گیا تھا۔ ریاض بھی خاموش رہا۔ مگر جب لالی نے جھک کر اس کی کمر میں انجکشن لگایا تو ریاض نے سرگوشی کی۔

"بھاگ سکتا ہے تو بھاگ جا۔ آج رات تجھے قتل کر دیا جائے گا۔"

لالی کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے بوڑھے ریاض کو دیکھا۔ مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔

ریاض نے گردن اٹھا کر زینے کی جانب دیکھا اور لالی کے چہرے کے قریب منہ لا کر بولا۔ "پچھلی رات حیات اور دھیور یہاں آئے تھے۔ انھوں نے تیری لاش دفن کرنے کے لیے قبر کا نشان بھی ڈال دیا ہے۔ وہ دیکھ۔" اس نے انگلی اٹھا کر ایک طرف اشارہ کیا۔ لالی نے دیکھا' آتش دان سے ذرا ہٹ کر دیوار کے پاس فرش تازہ تازہ اکھڑا ہوا ہے۔ لالی پریشان ہو گیا۔ وہ بدستور خاموش رہا۔ ریاض مدھم لہجے میں اس طرح بولنے لگا جیسے بڑبڑا رہا ہو۔

"ٹھیک بارہ بجے رات کو بنگلے کی تمام بتیاں بجھ جائیں گی۔ ہر طرف اندھیرا چھا جائے گا۔ فیر رات کے سناٹے میں حیات کے السیشن کے زور زور سے بھونکنے کی خوف ناک آواز ابھرے گی۔ جب بتیاں دوبارہ جلیں گی تو ایک لاش یہاں آئے گی۔ ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے۔" میاں ریاض محمد دٹو ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ "ایک لاش' دوسری لاش' تیسری لاش اور اب چوتھی لاش آنے والی ہے۔" اس نے نظر بھر کر لالی کا چہرہ دیکھا۔ "ابھی تو میرے سامنے زندہ بیٹھا ہے۔ جب رات آدھی ہو جائے گی' تو خون میں لتھڑی لاش بن جائے گا۔ دھیور لاش اٹھائے کپڑوں کی طرح جھکا جھکا زینے سے نیچے اترے گا۔ اس کے پیچھے حیات ہو گا۔ دھیور لاش ایک طرف ڈال دے گا۔ فیر نہ تو رہے گا نہ لاش۔" یہ کہتے کہتے بوڑھے کے چہرے پر دہشت طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ ٹھٹھا مار کر زور سے ہنسا۔

لالی کا تمام جسم ستار کے تاروں کی مانند جھنجھنا اٹھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے انجکشن لگایا۔ اور بوڑھے ریاض کی جانب دیکھے بغیر جلدی سے اٹھا۔ مگر جب سرنج الماری میں رکھ رہا تھا تو اس نے سیڑھیوں پر آہٹ سنی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا' حیات محمد سیڑھیوں سے اتر کر نیچے پہنچ چکا ہے۔ اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔

"تو نے انجکشن لگا دیا؟"

"جی ساب!"

"کیا تو آج مقررہ وقت سے پہلے یہاں نہیں آ گیا؟"

"مجھے نہیں ملوم جی۔" لالی نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے تو دھیور جب اشارہ کرتا ہے' میں اس کے ساتھ آ جاتا ہوں۔"

میاں حیات محمد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ اس نے بوڑھے ریاض محمد کی طرف دیکھا' وہ زمین پر سکڑا سکڑایا' آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ حیات نے لالی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ دونوں تہہ خانے سے باہر آئے۔ دروازے پر دھیور بت بنا کھڑا تھا۔ حیات محمد نے اس سے بھی بات نہیں کی۔

دھیور نے تہہ خانے کا دروازہ بند کر کے قفل لگایا اور لالی سے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ میاں حیات محمد دٹو صوفے پر خاموش بیٹھا رہا۔ السیشن اس وقت بھی اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ وہ گردن اٹھائے لالی اور دھیور کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں آگے بڑھے اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر چلے گئے۔

کمرے میں پہنچ کر لالی نڈھال ہو کر بستر پر گر گیا۔ تھوڑی دیر بعد مائی جنتے کھانا لے کر آ گئی۔ لالی نے کھانا رغبت سے نہیں کھایا۔ وہ ذہنی طور پر اس قدر پریشان تھا کہ کھانا کھایا ہی نہ گیا۔ وہ پھر لیٹ گیا۔ لیکن نیند نہیں آئی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے جتنی بار باہر نظر ڈالی ہر بار دھیور کو اسٹول پر بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ اس وقت ڈھیلا ڈھالا سفید کرتا پہنے ہوئے تھا۔ دھوتی بھی اجلی تھی اور اس کا چوڑا کنارا سرخ تھا۔ کندھے پر پرنا پڑا تھا جس سے وہ بار بار منہ پونچھتا۔ پیروں میں نئی گابے شاہی جوتی تھی۔ بالوں میں تیل پڑا تھا اور بیچ سے مانگ نکال کر لمبے لمبے پٹے قاعدے سے جمائے گئے تھے۔ وہ خوب بن سنور کر بیٹھا تھا۔

لالی اسے دیکھتا تو وحشت ہوتی۔ بے چینی بڑھ جاتی۔ دن اسی بے چینی میں گزر گیا۔ سورج غروب ہو گیا۔ کمرے میں شام کا دھندلکا پھیلنے لگا۔ دھیور نے لالٹین روشن کی۔ لالی کے کمرے میں آیا۔ مگر اس نے لالی سے نظر نہ ملائی۔ چپ چاپ لالٹین رکھ کر چلا گیا۔ لالی دیوار سے سر ٹکائے ہارا ہوا سا خاموش بیٹھا رہا۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ رات ہو گئی۔ مائی جنتے کھانا لے کر آئی اور لالی کے

سامنے رکھ کر ہوا کے جھونکے کی مانند باہر چلی گئی۔

لالی نے کھانا نہیں کھایا۔ دھیور نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ اسٹول پر خاموش بیٹھا رہا۔ رات کا ایک پہر گزر گیا۔ سناٹا گہرا ہوگیا۔ کچھ دیر بعد دھیور اپنی جگہ سے اٹھا اور دھیرے' دھیرے چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ لالی کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ اور لمحے بھر تک آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ دھیور نے مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا اور بڑھ کر دروازہ بند کردیا۔

لالی چارپائی سے نیچے اترا' مگر دھیور اس کے پاس نہ آیا۔ اس نے جھک کر وہسکی کی بوتل اٹھائی اسے کھولا اور منہ سے لگا کر غٹاغٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ اس نے بوتل لالی کی طرف بڑھادی۔ لالی نے بوتل ہاتھ میں لے لی۔ وہ کچھ دیر بوتل ہاتھ میں لیے خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے بھی بوتل منہ سے لگائی اور تھوڑی سی وہسکی پی کر بوتل دھیور کو واپس دے دی۔

انھوں نے کھڑے کھڑے بوتل خالی کردی۔ دھیور دیسی شراب کا ادھا بھی اٹھا لایا۔ دونوں فرش پر بیٹھ کر پینے لگے۔ ادھا بھی خالی ہوگیا۔ وہسکی اور ٹھرے نے مل کر نشے کو کریلا اور نیم چڑھا بنادیا۔ لالی نے کھانا اٹھا کر دھیور کے سامنے رکھ دیا۔ دونوں کھانا کھانے لگے۔ کھانا کھاتے کھاتے نہ جانے کیا سوچ کر دھیور بطخ کی طرح قیں قیں کرکے ہنسنے لگا۔ لالی نے خمار آلود نظروں سے دھیور کو دیکھا اور وہ بھی ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے بولا۔

"ہنس لے پیارے! ہنس لے۔ میں نوں پتہ ہے' تو کیوں ہنس رہا ہے؟"

دھیور نے گردن اونچی کی۔ لالی کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ لالی ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ اس نے انگلیوں میں دبا ہوا نوالہ پلیٹ میں ڈال دیا۔ اونچی آواز سے بولا۔ "تو مجھے کتل کرنا چاہتا ہے۔ بوڑھے ریاض نے مجھے یہی بتایا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟" دھیور نے اس کی بات سن کر کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ نظریں نیچی کرکے کھانا کھانے لگا۔ لالی کہتا رہا۔ "تو مجھے کیوں کتل کرنا چاہتا ہے؟ مجھے نہیں ملوم' پر تجھے یہ ضرور بتادینا چاہتا ہوں' میں چاہتا تو کل رات تجھے کتل کردیتا۔ میں نے تیرا پستول نکال لیا تھا۔ فیر جیسے نکالا تھا' ویسے ہی اسے رکھ بھی دیا۔ تجھے بالکل پتہ نہیں چلا۔ تو بے خبر سو رہا تھا۔" دھیور نے نظریں اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"دیکھ کیا رہا ہے؟ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" لالی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ نشے کی جھونک میں جھوم کر بولا۔ "پر یار! میں تجھے کیسے کتل کرتا؟ تجھ پر مجھے کہ ہی نہیں آیا۔ جب تک کہ نہ آئے' کوئی کسی کو کیسے کتل کرسکتا ہے۔ کبھی تو نے یہ بات سوچی؟ پر تو سوچتا ہی کب ہے؟" لالی ہنسنے لگا۔

ھیور نے کھانا چھوڑ دیا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ لالی نے اسے ٹوکا۔ "میری بات تو سن۔" لیکن دھیور نے اس کی جانب مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

وہ کمرے سے باہر نکلا اور اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

لالی دیر تک بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ واپس نہیں آیا۔ لالی اٹھ کر دروازے تک گیا۔ س نے گردن باہر نکال کر دھیور کے کمرے میں دیکھا۔ دھیور وہاں بھی نہیں تھا۔ نہ جانے کہاں پلا گیا تھا۔ لالی کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہوگیا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا اور لالی کے ذہن میں بہت سی نیاں جل رہی تھیں بجھ رہی تھیں۔ تیز نشے کا ریلا سمندر کی سرکش موجوں کے مانند بار بار اٹھتا ور جھاگ بن کر بکھر جاتا۔ ایک بار زور کا ریلا آیا۔ لالی نے لڑکھڑا کر کھڑکی کی سلاخیں دونوں اتھوں سے تھام لیں۔ انھیں پوری قوت سے کھینچا۔ کئی بار زور آزمائی کی مگر سلاخیں نہیں ہلیں۔ الی ہانپنے لگا اور جھومتا ہوا بستر پر جا کر دراز ہوگیا۔ لیکن قرار نہ آیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دھیور ابھی تک غائب تھا۔

وقت قطرہ قطرہ بن کر رات کے سناٹے میں تحلیل ہوتا گیا۔ لالی نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ گیارہ بج رہے تھے۔ یہ تہہ خانے میں جانے اور انجکشن لگانے کا وقت تھا۔ لالی اٹھ کر کمرے سے باہر آگیا۔ اب دھیور کو واپس آجانا چاہئے تھا۔ کئی منٹ گزر گئے' دھیور نہیں آیا۔ لالی برآمدے میں خاموش کھڑا رہا اور وہیں کھڑے کھڑے اس نے بنگلے سے فرار ہونے کا ایک بار پھر تہیہ کیا۔ وہ اس راہ داری کی جانب بڑھا جس سے گزر کر وہ کچھ عرصہ قبل دھیور کے ہم راہ باغ میں پہنچا تھا۔

راہداری میں اندھیرا تھا۔ لالی لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھتا گیا اور دیوار کا سہارا لیتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھا کہ دروازہ بند ہے۔ لالی نے دروازہ آہستہ سے ہلایا۔

دروازہ تو نہ کھلا البتہ باہر سے کسی کی کھنکار ابھری۔ لالی سہم کر رہ گیا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا واپس ہوا۔ وہ ایک بار پھر برآمدے کے سامنے کھڑا تھا۔ دھیور وہاں نہیں تھا۔

لالی برآمدے کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ غلام گردش کی جانب بڑھا اور اندر داخل ہوگیا۔ غلام گردش میں گہرا سناٹا تھا۔ وہ اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا جس میں داخل ہو کر تہہ خانے میں جاتا تھا۔

' آہستہ سے دروازہ کھولا' اندر جھانکا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ وہ چپ چاپ کمرے میں چلا

گیا۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ تہہ خانے کا دروازہ کھلا ہے۔ وہ کھلے دروازے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر جھومتا جھامتا اندر داخل ہو گیا۔ زینے سے نیچے اتر کر اس نے دیکھا' بوڑھا ریاض محمد دنو دھندلی روشنی میں فرش پر لیٹا ہے۔

لالی نے الماری سے سرنج نکالی اور انجکشن لگانے کے لیے ریاض کے قریب پہنچ گیا۔ ریاض چت لیٹا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت تک رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا تھا' زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ ایک کان اور رخسار کا نچلا حصہ خون سے لت پت تھا۔ فرش پر بھی خون پھیلا تھا۔ زنجیر اور اس میں لگے ہوئے لوہے کے گولے پر بھی گاڑھا گاڑھا خون تھا۔ لالی نے گھبرا کر میاں ریاض محمد کو جھنجھوڑا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

لالی کو ایسا محسوس ہوا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا۔ اسے اپنے چاروں طرف خطرہ منڈلاتا محسوس ہوا۔ وہ سرنج وہیں چھوڑ کر گھبرایا ہوا تیزی سے زینے کی جانب لپکا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ دروازے سے گزر کر باہر آیا۔ کمرہ ابھی تک خالی تھا۔ لالی جلدی سے کمرے کا دروازہ کھول کر غلام گردش میں پہنچ گیا۔

☆

دیوار گیریوں کی ہلکی' ہلکی روشنی میں ہر چیز اونگھتی ہوئی نظر آتی تھی۔ غلام گردش کے آخری سرے پر ہال کا دروازہ تھا۔ دروازے کے شیشوں سے ہال کی روشنی جھلک رہی تھی۔ ہال بالکل خالی تھا۔ غلام گردش میں کئی دروازے کھلتے تھے۔ ان پر خوش رنگ پردے پڑے تھے۔ لالی نے گھڑی دیکھی' بارہ بجنے میں تین منٹ باقی تھے۔

لالی بدحواس ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ دھیو راس کی گھات میں کہیں قریب ہی چھپا بیٹھا ہے۔ ذرا دیر میں بتیاں بجھ جائیں گی' اور دھیو اندھیرے میں کسی دروازے سے نکل کر اس پر تیندوے کی طرح جھپٹے گا۔

لالی نے خوف زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ چھپنے کی کہیں گنجائش نہیں تھی۔ فرار ہونے کے لیے ہال سے گزرنا ضروری تھا۔ اس نے سوچا' جب روشنیاں گل ہو جائیں گی تو وہ اندھیرے میں ہال کے اندر داخل ہو جائے گا اور بنگلے سے نکل کر چار دیواری تک پہنچ جائے گا۔ چار دیواری پھاندنا اس کے لیے دشوار نہ تھا۔ مگر اندھیرا ہونے سے پہلے ہی اسے ہال کے دروازے تک پہنچ جانا چاہیے۔

وہ آہستہ آہستہ ہال کی جانب بڑھنے لگا۔ قریب' اور قریب ہوتا گیا۔

مگر جب ہال کے دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر تھا تو اس نے دیکھا' حیات محمد دنو ہال میں اخل ہو رہا ہے۔ اس کے ہم راہ کوئی اور بھی تھا۔ لالی نے دروازے کے شیشوں سے دونوں کی ہلکی ی جھلک دیکھی۔ وہ خوف سے لرز کر رہ گیا۔ جلدی سے مڑا۔ غلام گردش خاصی طویل تھی۔ وہ لام گردش سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تو حیات محمد اسے دور ہی سے دیکھ لیتا۔ اس نے گھبرا کر چاہا کہ کوئی دروازہ کھول کر اندر چلا جائے۔ اس نے ایک دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اندر سے بند تھا۔ لالی لپک کر دوسرے دروازے پر پہنچا۔ وہ بھی بند تھا۔

لالی دیوار سے لگا لگا آگے بڑھا۔ اس نے مڑ کر ہال کی جانب دیکھا۔ میاں حیات محمد دنو دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ لالی نے سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور جو دروازہ قریب ترین پایا اس کے پردے کے پیچھے دبک گیا۔ اس نے آہستہ سے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھل گیا۔ لالی جھٹ اندر چلا گیا اور دروازے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔

یہ خواب گاہ تھی۔ نہایت نفاست سے آراستہ کی گئی تھی۔ کمرے کے وسط میں چوڑی چکلی مسہری تھی۔ مسہری کے قریب اونچے اسٹول پر پیتل کا اجلا اجلا گل دان تھا۔ اس میں گلاب کے سفید اور گہرے سرخ پھول تھے۔ مسہری سے ذرا ہٹ کر صوفہ سیٹ قرینے سے رکھا تھا۔ دروازوں پر جھلملاتے ہوئے ریشمی پردے تھے۔ کمرہ خاصا کشادہ تھا اور ہلکی ہلکی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ کمرے میں گہرا سبز بلب روشن تھا۔

لالی دروازے کے قریب سہما ہوا کھڑا تھا اور رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ باہر غلام گردش میں قدموں کی آہٹ ابھر رہی تھی اور رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ دھب' دھب' دھب' آہٹ دروازے کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

لالی کا بے قرار دل دھڑکتے دھڑکتے پل بھر کے لیے ٹھہر گیا۔ اس نے چاہا کہ لپک کر مسہری کے نیچے دبک جائے۔ مگر فوری طور پر مسہری تک پہنچنے کی گنجائش نہ تھی۔ وہ دروازے سے ہٹ کر ایک کونے میں دیوار سے چمٹ کر کھڑا ہو گیا۔

دروازہ آہستہ سے کھلا۔ لالی نے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میاں حیات محمد خاں کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ وہ سفید ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔ اس کے داخل ہوتے ہی تیز خوشبو کا جھونکا آیا۔ حیات نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کی چٹخنی چڑھا دی اور یہ کہتا ہوا عورت کے قریب پہنچ گیا۔ "ناصرہ تمہارے بغیر' یہ کمرہ کتنا ویران' ویران لگتا ہے۔"

حیات محمد نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے سمیٹ کر اپنے قریب کر لیا۔

ناصرہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے بڑے ناز سے کہا۔ "ایسی باتیں سوچنے کی تمہیں فرصت مل جاتی ہے؟"

"نہیں جان من! ایسی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو تم شدت سے یاد آتی ہو۔" میاں حیات محمد نے گہری سانس بھری۔ "جب تم آجاتی ہو تو ایسا محسوس ہوتا جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔"

"آج کچھ زیادہ ہی مہربان نظر آرہے ہو۔" ناصرہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "بات کیا ہے؟"

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" حیات محمد وٹو صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑے پیار سے ناصرہ کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ بازو کے حلقے میں لے کر اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا اور اس کے بال انگلیوں سے آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ چند لمحے خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔ "کل رات بنگلے میں بڑی شاندار پارٹی ہے اور تم تو اس پارٹی میں جان محفل ہوگی۔ میں تو صرف میزبان ہوں گا۔"

ناصرہ نے اپنا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کسی قدر بیزاری سے کہا۔ "میں سمجھتی ہوں، میرا اس میں موجود ہونا ضروری نہیں۔"

"جان من! پہلے میری بات تو سن لو۔" حیات محمد نے اسے پھر سینے سے لگایا۔ "یہ پارٹی میں نے ایک ایم، سی، اے کے اعزاز میں دی ہے۔ دستور ساز اسمبلی میں اس نے اپنا تگڑا گروپ بنالیا ہے۔ تم تو اسے جانتی بھی ہو۔ میرا مطلب ہے....."

ناصرہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ عورتوں سے باتیں کرتے ہوئے تم نے کبھی اس کے چہرے اور آنکھوں کو دیکھا ہے؟ مجھے تو اس کی صورت دیکھ کر دحشت ہوتی ہے۔"

"کاک ٹیل پارٹی ہوگی۔ تم شیری پیتی رہنا۔ میں نے سیلریشن کریم اور ڈرائی فلائی پچھلے ہی دنوں منگوائی ہے۔ دونوں ہی اعلیٰ درجے کی شیری ہیں۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "پھر کوئی دحشت وحشت نہیں رہے گی۔" اس نے ہولے ہولے ناصرہ کا رخسار تھپ تھپایا۔ "جان من! مجھے اس کے گروپ کے دوٹوں کی شدید ضرورت ہے۔"

"کسی کو مرکزی وزیر بنوانا ہوگا۔"

"بالکل ٹھیک سمجھیں تم۔" حیات نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "اب تو تم سیاست کو پوری طرح سمجھنے لگی ہو۔"

"نہیں حیات! اپنی اس گندی سیاست میں مجھے نہ گھسیٹو۔" ناصرہ نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔

"تم جو چاہتے ہو، اب وہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں تمہاری اس سیاست سے اتنی عاجز آچکی ہوں کہ مجھے خود اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ مجھ میں اور ایک....."

حیات نے محبت سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "فضول باتیں نہ کرو۔" اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔ "تم دو تین روز یہاں رہوگی اور پارٹی میں بھی شریک ہوگی۔" اس نے قدرے تامل کیا، پھر ناصرہ کے ہونٹ چوم کر بولا۔ "ناصرہ، میری جان! مجھے یہ کام ضرور کرنا ہے اور تم اس میں میری مدد کروگی۔ یوں سمجھ لو، وہ مرکزی وزیر بن گیا تو حکومت میں اپنی پوزیشن بہت مضبوط ہوجائے گی۔ جو چاہوں گا، حکومت سے کروالوں گا۔ کیا سمجھیں؟" اس نے قہقہہ لگایا اور ناصرہ کو اپنے سینے سے چمٹالیا۔

ناصرہ اس کے پہلو میں اس طرح دبکی بیٹھی تھی کہ اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ حیات محمد اسے رام کرنے کے لیے سر جھکائے پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھا۔ دونوں صوفے پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ لالی خوف زدہ نظروں سے انھیں دیکھتا رہا۔ دونوں میں سے کوئی بھی پلٹ کر دیکھتا تو ہلکی ہلکی سبز روشنی میں وہ دیوار کے ساتھ سائے کی طرح چمٹا ہوا نظر آتا۔ مگر جب ناصرہ کسمسا کر حیات کے بازوؤں کی گرفت سے نکلنے کے لیے مڑی تو اس کا چہرہ لالی کی طرف تھا۔ عین اس وقت خواب گاہ کا سبز بلب بجھ گیا۔ ناصرہ کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ پھر اندھیرے میں حیات کی آواز ابھری۔

"معلوم ہوتا ہے جنریٹر میں پھر گڑبڑ ہوگئی۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر ناصرہ کی تھرتھراتی ہوئی آواز ابھری۔ "آدھی رات کو جب اس طرح بلیک آؤٹ ہوجائے تو یہ بنگلہ کتنا خوف ناک لگتا ہے۔ ہر طرف موت کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔"

اسی وقت باہر غلام گردش میں تیز تیز قدموں سے چلنے کی آہٹ ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ گھپ اندھیرے میں السیشن کے زور زور سے بھونکنے کی آواز بھی ابھری۔ ناصرہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ "یہ خوف ناک آوازیں سن رہے ہو۔ یہ سب کیا ہے حیات؟ موت کا یہ کھیل کب تک چلتا رہے گا؟ آج کون....."

حیات نے اس کی بات کاٹ کر اونچی آواز سے کہا۔ "خواہ مخواہ کی باتیں نہ کرو۔ ذرا دیر میں روشنی ہوجائے گی۔ میں تو کل صبح تمہارے پاس آنے ہی والا تھا۔ مگر تم اتنی رات گئے اچانک کیسے آگئیں؟"

"میں موت کا کھیل دیکھنے نہیں آئی تھی۔ تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ نیاز کل رات کیلی فورنیا

سے واپس آگیا ہے۔"

حیات کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "نیاز' نیاز واپس آگیا؟ نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ کیسے واپس آسکتا ہے؟"

"میں تم سے غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔"

"کہاں ہے وہ؟ یہاں کیوں نہیں آیا؟"

لالی دیوار کا سہارا لیتا ہوا دھیرے دھیرے دروازے کی جانب کھسکنے لگا۔ اس نے سنا' ناصرہ کہہ رہی تھی۔ "نیاز اپنے ماماں کے پاس ٹھیرا ہے۔" وہ کچھ رکی۔ اس نے رسان سے بتایا۔ "وہ تمہارے خلاف مقدمہ چلانے کی تیاری کر رہا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے سب کچھ معلوم ہو گیا؟"

"نہیں! وہ کچھ نہیں جانتا۔ وہ صرف جائیداد اور زمینداری پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اپنے پیئو کی جاگیر کا وارث جو ہوا۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ مقدمے کی تیاری کر رہا ہے؟"

"آج شام وہ میرے پاس آیا تھا۔"

حیات غصے سے چیخا۔ "وہ تمہارے پاس کیوں آیا تھا؟"

"میرا خیال ہے اس کے ساتھ کوئی سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ اس کی باتوں سے ایسا ہی لگتا تھا۔"

"نہیں! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ جاگیر نہ اس کی ہے نہ اس کے پیئو کی۔ اور نہ وہ کسی طور اس کا وارث ہے۔" حیات تیز لہجے میں بول رہا تھا۔ "میں اسے جاگیر پر قبضہ کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔ وہ سمجھتا کیا ہے؟ میں اس کی لاش بھی یہیں تہہ خانے میں لا کر دبا دوں گا۔"

"حیات!" ناصرہ کے لہجے میں التجا تھی۔ "یہ خطرناک کھیل اب ختم ہو جانا چاہئے۔"

"بکواس نہ کرو۔" حیات تلملا کر بولا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے' تمہی نے اسے بلایا ہے۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکا۔ "تم نے اسے سب کچھ بتا دیا۔"

"پاگل نہ بنو۔" ناصرہ نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "تمہیں میرے بارے میں اس طرح نہیں سوچنا چاہئے۔ میں تمہاری بیوی ہوں' تمہاری بیٹی مونا کی ماں ہوں۔ تمہیں مجھ پر اعتماد کرنا چاہئے۔"

"میں کسی پر اعتماد شیدماد نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہے' تم یہاں کس لیے آئی ہو۔ تم میرے خلاف اس سازش میں برابر کی شریک ہو۔"

لالی کھسکتا ہوا اب دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے سنا۔ حیات اندھیرے میں چیخ رہا تھا۔ "میں یہ سازش کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ میں نہ اسے زندہ چھوڑوں گا نہ تجھے۔"

اندھیرے میں کسی چیز کے زور سے ٹکرانے کی آواز ابھری۔ ساتھ ہی ناصرہ کی تیز کراہ سنائی دی۔ "ہائے۔" چند لمحے خاموشی رہی پھر صوفے پر گتھم گتھا ہونے کی سرسراہٹیں ابھرنے لگیں۔ لالی نے آنکھیں پھاڑ کر اس طرف دیکھا۔ گھپ اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ لالی دروازہ کھولنے کے لیے انگلیوں سے چٹخنی ٹٹولنے لگا۔ یکایک اسے عقب میں ناصرہ کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ وہ گڑگڑا رہی تھی۔

"نہیں نہیں۔ خدا کے لیے نہیں۔"

لالی نے ایک بار پھر گردن موڑ کر ادھر نظر ڈالی۔ اسی وقت کمرے کا سبز بلب روشن ہو گیا۔ لالی نے دیکھا' ناصرہ کا سر صوفے کی پشت سے ٹکا ہے۔ حیات دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچے ہوئے تھا۔ ناصرہ کے بال بکھر کر اس کے چہرے پر آگئے تھے۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں لالی کی جانب اٹھی تھیں۔ اس نے لالی کو دیکھا اور اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"وہ' وہ۔"

حیات نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ ناصرہ کی گردن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "تو ابھی تک زندہ ہے۔" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا' خاموش کھڑا رہا۔ حیات نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"تو یہاں آ کیسے گیا؟"

"میں یہ بتانے آیا تھا' آپ کا بھائی میاں ریاض محمد مر گیا۔"

حیات بوکھلا گیا۔ "نہیں' وہ نہیں مر سکتا۔ وہ کیسے مر سکتا ہے۔ تو جھوٹ بول رہا ہے۔"

لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

حیات سخت بدحواس ہو رہا تھا۔ "مگر وہ کیسے مر گیا؟" وہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔ "اس نے وصیت نامے کی دستاویز پر دستخط نہیں کئے۔ مجھے اپنا وارث نہیں بنایا۔ اسے ابھی نہیں مرنا چاہئے۔" وہ بے قرار ہو کر بولا۔ "اسے کس نے مار ڈالا؟ اسے تو نے قتل کیا ہے۔"

"میں ایسا کام نہیں کرتا۔ میں نے آج تک کسی کا خون نہیں کیا۔"

"پھر اسے کون قتل کر سکتا ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "دھیرو؟ ہاں دھیرو ہی ہو سکتا ہے۔" وہ ہولے ہولے اپنی گردن ہلانے لگا۔ "دھیرو نے آج اپنا بدلہ لے ہی لیا۔" پھر وہ غصے سے پاگلوں کی

طرح چیخنے لگا۔ “مگر اس کتے کو ایسی جرات کیسے ہوئی؟ کہاں ہے دھیور؟ کہاں ہے وہ؟”

“مجھے نہیں پتہ۔”

“ایسا نہیں ہو سکتا۔ تجھے ضرور پتہ ہو گا۔”

“میاں ساب! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نوں تو یہ پتہ ہے ‘جب بارہ بجے سب بتیاں بجھ گئی تھیں ‘اس وکھت آپ کا خونی کتا مجھے چیر پھاڑ کر ختم کر دیتا۔ میری لاش تہہ خانے میں زمین کھود کر دبا دی جاتی۔”

حیات نے خونخوار نظروں سے لالی کو دیکھا اور سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کی بیوی ناصرہ صوفے پر خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹ کر پیچھے کر لیے تھے۔ اس کا حسین چہرہ اجلی چاندنی کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں خوف تھا۔ وہ اپنی لمبی گردن داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے باربار سہلا رہی تھی۔ کمرے کی فضا پر گہرا سکوت طاری تھا۔

لالی نے سکوت توڑا۔ عاجزی سے بولا۔ “ساب ‘میں جسے انجکشن لگاتا تھا ‘وہ تو مر ہی گیا۔ ساتھ ہی میری ڈیوٹی بھی ختم ہو گئی۔” وہ گڑگڑانے لگا۔ “اب مجھے بھی چھٹی دے دیجئے۔ آپ کی مہربانی ہو گی جی۔”

“نہیں ‘تو ابھی نہیں جا سکتا۔ یہاں سے نکلتے ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔”

لالی نشے کی ترنگ میں تھا۔ جل کر بولا۔ “گرفتار کر لیا جاؤں گا تو کیا ہو گا۔ جیل ہی تو چلا جاؤں گا۔ گولی تو نہیں ماری جائے گی۔”

“تو یہاں کے کئی راز جانتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تو پکڑا جائے اور میرے خلاف قانون کے ہاتھ مضبوط کرے۔”

“ساب ‘کون سا کنون ‘کیسا کنون؟” اب وہ خوف اور دہشت کا خول توڑ کر رفتہ رفتہ باہر نکل رہا تھا۔ “کنون تو میرے جیسے چھوٹے آدمی کے لیے ہے۔ میں تین بار جیل کاٹ چکا ہوں۔ میں نے تو کسی وڈے آدمی کو اپنی طرح جیل کاٹتے نہیں دیکھا ‘نہ پھانسی پر چڑھتے دیکھا۔” لالی کھل کر مسکرانے لگا۔ “میاں جی ‘آپ وڈے آدمی ہیں۔ آپ کنون شنون سے کیوں ڈرتے ہیں؟ آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔” اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ اس نے قسم کھا کر حیات کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ “رب سونہ ‘میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ میں تو یہاں سے سیدھا رحیمے کے پاس جاؤں گا۔ اس کے ساتھ آج ہی رات ‘بہت دور نکل جاؤں گا۔ آپ میری بات مان لیں۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔”

ناصرہ ‘جو اب تک خاموش بیٹھی دونوں کی گفتگو سن رہی تھی ‘لالی کی حمایت میں بولی۔ “اسے جانے دو حیات۔”

“تاکہ میرے خلاف تمہارے ہاتھ چشم دید گواہ آ جائے۔” میاں حیات محمد نے قہر آلود نظروں سے ناصرہ کو دیکھا۔ “میں جانتا ہوں ‘تم اس کی سفارش کیوں کر رہی ہو؟”

“تم میرے بارے میں اتنی بدگمانی میں مبتلا کیوں ہو؟”

“یہ بدگمانی خود تم نے پیدا کی ہے۔ نیاز کیوں واپس آ گیا؟ وہ کیوں تمہارے پاس گیا؟ میرے پاس کیوں نہیں آیا؟”

“مجھے کیا معلوم۔” وہ آہستہ سے بولی۔

حیات محمد نے اونچی آواز سے کہا۔ “مجھے معلوم ہے ‘وہ کیوں واپس آیا اور کیوں تمہارے پاس پہنچا؟” وہ اپنی مونچھوں کی نوکیں انگلیوں سے مروڑنے لگا۔ “میرے علاوہ صرف تین بندے ہیں جو ریاض کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ مگر وہ بنگلے سے باہر نہیں جا سکتے۔ تم اور صرف تم ہو جو بنگلے سے باہر بھی رہتی ہو۔ یہ راز صرف تمہارے ذریعے نیاز تک پہنچا۔ مجھے یقین ہے ‘ تمھی نے اسے نیاز تک پہنچایا ہے۔”

“افوہ! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ تمہارا وہم ہے۔ سراسر وہم ہے۔” ناصرہ نے زچ ہو کر کہا۔

“ہرگز نہیں۔” حیات اپنی بات پر اڑا رہا۔ “دو ہفتے پہلے فون پر نیاز سے میری بات ہوئی تھی۔ اس کا امریکہ سے یہاں آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ اسی روز کی بات ہے جس روز تم مجھ سے لڑ جھگڑ کر روتی ہوئی یہاں سے گئی تھیں۔ مجھے یاد ہے ‘اس روز تم نے خودکشی کر لینے کی دھمکی بھی دی تھی۔” اس نے ناصرہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

“اس روز تم غصے سے پاگل ہو رہی تھیں۔ تم نے یہاں سے جاتے ہی غصے کی حالت میں نیاز کو خط لکھا اور اسے ساری باتیں بتا دیں۔”

“تم ‘ تم پاگل ہو گئے ہو۔” وہ جل کر بولی۔ “ریاض کے جسم میں پاگل آدمی کے جراثیم ‘ انجکشنوں کے ذریعے داخل کرتے کرتے خود بھی پاگل ہو گئے ہو۔”

حیات کی آنکھیں بھڑکتا شعلہ بن گئیں۔ وہ سانپ کی طرح پھنکارنے لگا۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ ٹکٹکی باندھے بیوی کو گھورتا رہا ‘پھر تیزی سے جھپٹا اور اس کا گلا دبوچ لیا۔ وہ بے بسی سے اپنی گردن ادھر ادھر ہلانے لگی۔ لالی ذرا دیر تک یہ لرزہ خیز منظر دیکھتا رہا۔ اس نے

حیات کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"میاں ساب! یہ کیا کر رہے ہیں؟"

حیات محمد نے اس کی جانب دیکھے بغیر ڈپٹ کر کہا۔ "بکواس نہ کر۔" اس نے بیوی کو نیچے گرا دیا اور دونوں ہاتھوں کی پوری قوت سے اس کا گلا دبانے لگا۔ ساتھ ہی وہ غصے سے بڑبڑاتا رہا۔ "میں یہ ثبوت بھی مٹا دوں گا۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

لالی لپک کر دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ ناصرہ صوفے پر بے بس پڑی تھی۔ اس کے لمبے لمبے بال دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر دہشت طاری تھی۔ حیات کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔ ناصرہ آنکھیں پھاڑے بے بسی سے لالی کو دیکھ رہی تھی۔ لالی بے قرار ہو گیا۔ اس نے حیات کا کندھا پکڑ کر کھینچا اور گڑگڑا کر بولا۔

"ساب جی! اب چھوڑ دیجیے۔"

حیات نے پلٹ کر لالی کو دیکھا' غصے سے اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ "ہٹ جا میرے سامنے سے۔" اس نے لالی کو دھکا دیا۔ لالی لڑکھڑا کر گرا۔ اس نے اٹھنا چاہا تو حیات نے اور بھی زیادہ زور سے دھکا دیا۔ اس دفعہ وہ لڑھکتا ہوا میز سے جا کر ٹکرایا۔ میز الٹ گئی اور لالی کے سر پر گری۔ چوٹ ایسی سخت آئی کہ وہ چکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ نظریں دھندلی پڑ گئیں۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ رک رک کر سانس بھرنے لگا۔

ناصرہ نے اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ مگر حیات نے جھپٹ کر اس کی ساڑھی کا پلو پکڑ کر زور سے کھینچا۔ ساڑھی کھل کر اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے غصے سے ساڑھی ایک طرف پھینک دی۔ ناصرہ کے منہ پر تابڑ توڑ کئی تھپڑ مارے۔ پیٹ پر اس زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ ڈگمگا کر صوفے پر گر پڑی۔ حیات نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ جھپٹ کر ایک بار پھر اس کی گردن دبوچ لی۔ ناصرہ گلا پھاڑ کر چیخی۔

"نہیں' نہیں۔"

لالی نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ میاں حیات محمد خاں صوفے پر جھکا ہوا تھا۔ ناصرہ کی دونوں ٹانگیں بالکل برہنہ تھیں اور خزاں رسیدہ درخت کی شاخوں کے مانند جھول رہی تھیں۔ لالی ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا حیات کی جانب بڑھا۔ حیات نے چاپ سنی۔ پلٹ کے دیکھا اور زور سے چیخا۔

"ہٹ جا یہاں سے کنجر!"

لالی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "یہ نہیں ہو گا۔" حیات نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ لالی نرم پڑ گیا۔ گڑگڑانے لگا۔ "ساب! تم نے اس کے کپڑے اتار دیے۔ وہ تمہاری گھر والی ہے' تمہاری عزت ہے۔" حیات اور غضب ناک ہو گیا۔ اس نے جھنجلا کر لالی کے منہ پر تھپڑ مارنا چاہا۔ لیکن لالی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

حیات نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور تیزی سے مسہری کی جانب لپکا۔

ناصرہ نے ہانپتے ہوئے نحیف آواز میں لالی سے کہا۔ "وہ' وہ پستول لینے گیا ہے۔"

لالی نے دیکھا کہ حیات مسہری کے تکیے کی جانب جھک رہا ہے۔ لالی تیزی سے اس پر جھپٹا اور اس زور سے دھکا دیا کہ حیات چاروں خانے چت بستر پر گر گیا۔ وہ دانت پیستا ہوا اٹھا' چیخ کر بولا۔ "کتے! نمک حرام! تیری یہ ہمت۔" اس نے لالی کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔

لالی کا ایک کان جھن جھنے کے مانند جھن جھن کرنے لگا۔ وہ تکلیف سے تلملا اٹھا۔ نشے کا ایسا زبردست جھونکا آیا کہ وہ حیات کے ٹنٹنے اور طمطراق کے حصار سے باہر نکل آیا۔ اس نے خوں خوار نظروں سے حیات کو دیکھا اور دونوں ہاتھ بڑھا کر جھومتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔

حیات محمد نے رعب اور دبدبے کے ساتھ اسے ڈانٹا۔ "آگے نہ بڑھ۔"

مگر لالی نہیں رکا۔ نشے کے غلبے نے اونچ نیچ کے تمام بندھن توڑ دیے تھے۔ اس کا امڈتا ہوا سیلاب خوف و دہشت کے سارے پشتے اور رکاوٹیں اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ حیات نے جلدی سے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔

لالی نے اچھل کر اس کی کمر پر لات ماری۔ میاں حیات پھر بستر پر لڑھک گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر لالی نے جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ حیات غیں غیں کرنے لگا۔ اس نے گرفت سے نکلنے کے لیے لالی کا منہ نوچ لیا۔ لیکن لالی نے اسے نہیں چھوڑا۔ گریبان پکڑ کر اٹھایا اور ڈھکیلتا ہوا دیوار تک لے گیا۔

حیات گھٹی ہوئی آواز سے چیخا۔ "دھیورا!"

لالی نے دیوار سے اڑا کر اس کا سر زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ آگے کھینچا' پھر ٹکرایا۔ کھٹ' کھٹ' کھٹ۔ لالی نشے کی جھونک میں پاگلوں کی طرح اس کے سر کو جھٹکے دے دے کر دیوار سے ٹکراتا رہا۔

لالی کا چہرہ کرخت ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے۔ میاں حیات محمد خاں وٹو کے سر دھار نکلی اور پیشانی سے ٹپکتی ہوئی چہرے پر پھیلتی گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

گردن لٹک کر ڈگمگانے لگی۔

☆

ناصرہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے اپنی ساڑھی اٹھائی۔ اسے باندھا۔ جلدی' جلدی اپنا بے ترتیب لباس درست کیا۔ حیات محمد کی جانب بڑھی۔ وہ فرش پر بے سدھ پڑا تھا۔ ناصرہ نے جھک کر دیکھا۔ حیات کا چہرہ خون سے تربتر تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ رک' رک کر سانس لے رہا تھا۔ ناصرہ نے پریشان ہو کر لالی کی جانب دیکھا۔ لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ کیا کر دیا؟"

لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "گھبراؤ نہیں۔ وہ مرا نہیں ہے۔"

دونوں خاموش کھڑے رہے۔ مگر لالی اب وہاں مزید ٹھہرنا نہ چاہتا تھا۔ وہ اس دروازے کی جانب بڑھا' جو غلام گردش میں کھلتا تھا۔

"کہاں جا رہا ہے؟" ناصرہ نے پوچھا۔

"باہر" لالی نے دروازے کے قریب پہنچ کر کہا۔ "مجھے اب یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"ٹھیر جا۔"

"تم ٹھیر جاؤ۔" لالی دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ "یہاں رک کر تم اپنے کھسم کی مرہم پٹی کرو تاکہ وہ تمھیں اطمینان سے کتل کر سکے۔ میں نہیں ٹھیر سکتا۔"

"حماقت نہ کر۔ باہر حیات کے بہت سے کتے پھر رہے ہیں۔ وہ تجھے بنگلے سے باہر نکلنے نہیں دیں گے۔" وہ تلخی سے بولی۔

"تمھارا مطلب شکاری کتوں سے۔ ہے؟" لالی رک گیا۔ اور مڑ کر ناصرہ کی جانب دیکھنے لگا۔

"نہیں' میں اس کے خونخوار کرندوں کی بات کر رہی ہوں۔ انھیں پتہ چل گیا تو تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "میں بھی یہاں نہیں ٹھیروں گی۔" ناصرہ نے اپنے بکھرے ہوئے بال ایک بار پھر سنوارے' ساڑھی کی شکنیں اور سلوٹیں درست کیں۔ دروازے کی جانب بڑھی۔ قریب پہنچ کر آہستہ سے دروازے کی چٹخنی کھولی۔ گردن بڑھا کر باہر دیکھا۔ رسان سے بولی۔

"باہر کوئی نہیں ہے۔"

لالی نے پلٹ کر میاں حیات محمد کو دیکھا۔ وہ ٹانگیں پھیلائے مردے کی طرح دیوار کے پاس بے حال پڑا تھا۔ لالی دروازے کی جانب بڑھا۔ پہلے ناصرہ باہر نکلی۔ اس کے پیچھے پیچھے لالی باہر آ

ناصرہ ہال کے دروازے کی جانب نہ گئی۔ اس کمرے کی جانب بڑھی' جس میں تہہ خانہ تھا۔ لالی نے ناصرہ کو ادھر جاتے دیکھا تو سرگوشی کی۔

"اس کمرے میں نہ جاؤ۔"

ناصرہ نے دھیرے سے بتایا۔ "اس کمرے کا ایک دروازہ باغیچے میں کھلتا ہے۔ یہ سب سے محفوظ راستہ ہے۔" وہ آگے بڑھی۔ کمرے کے دروازے پر پہنچی۔ اس نے دروازہ کھولنا چاہا۔ مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔

ناصرہ نے اسے کھولنے کے لیے آہستہ آہستہ ہلایا تو اندر سے السیشن کے غرانے اور زور زور سے بھونکنے کی آواز ابھری۔ وہ دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کی خوفناک آواز سن کر دونوں سہم گئے اور جہاں تھے' وہیں دم بخود کھڑے رہے۔

غلام گردش میں پراسرار سناٹا تھا۔ دونوں خاموش کھڑے رہے' ناصرہ مڑی۔ وہ اس دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی جو ہال میں کھلتا تھا۔ لالی اس کے پیچھے' پیچھے چلا۔ ناصرہ کشیدہ قامت خوبصورت عورت تھی۔ وہ سفید ساڑھی میں ملبوس راج ہنس کی طرح گردن اونچی کئے چل رہی تھی۔ اس کی چال میں وقار تھا' تمکنت تھی۔ لالی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دونوں دروازے سے گزر کر ہال میں آگئے۔

ہال میں دھیمی دھیمی روشنی تھی۔ صرف ایک بلب روشن تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ مگر جب ہال عبور کر کے باہر نکلے تو انھوں نے دیکھا' دروازے پر مسلح پہریدار کھڑا ہے۔ ناصرہ کو دیکھ کر وہ ادب سے جھک گیا۔ ناصرہ نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ گردن اٹھائے آہستہ' آہستہ پھاٹک کی سمت بڑھنے لگی۔

لالی اس کے پیچھے' پیچھے چلتا رہا۔ پھاٹک کے قریب درختوں کے نیچے ایک سیاہ سیڈان کھڑی تھی۔ ناصرہ نے آہستہ سے آواز دی۔ "چوکیدار۔" اس کی آواز سنتے ہی پھاٹک پر کھڑا ہوا چوکیدار اپنی بندوق سنبھالے دوڑتا ہوا قریب آیا۔ ناصرہ نے پوچھا۔

"میرا ڈرائیور کہاں ہے؟"

"وہ تو جی سو گیا۔ وہ تو شاید ہی گاڑی چلا سکے۔"

ناصرہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "کیوں؟ کیا ہو گیا اسے؟"

اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ڈریور نے تو جی نشہ وشا کر رکھا ہے۔"

"[illegible] ر۔" ناصرہ نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ چوکیدار کو مخاطب کیا۔ "تم جا کر جلدی سے اس

کی جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر لاؤ۔ میں خود ڈرائیور کروں گی۔"

چوکیدار تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ ناصرہ اور لالی خوف زدہ نظروں سے ہال کی جانب دیکھنے لگے۔ دروازے پر مسلح پہریدار مستعدی سے کھڑا تھا۔ ہال خالی تھا۔ یکایک باغ کی جانب سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ دونوں گھبرا گئے۔ چوکیدار ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

دونوں بے چین ہو کر بار بار اس سمت دیکھتے جدھر چوکیدار گیا تھا۔ کتوں کی آواز کے ساتھ ساتھ قدموں کی آہٹ بھی ابھری۔ لالی نے جھک کر سرگوشی کی۔

"کوئی آرہا ہے؟"

"ہاں۔" ناصرہ نے آہستہ سے کہا۔ "مگر وہ حیات نہیں ہوسکتا۔ اسے اب تک ہوش نہیں آیا ہوگا۔" اس نے ہال کی جانب دیکھا۔ "حیات آئے گا تو ہال ہی کے دروازے سے آئے گا۔"

خشک پتوں پر آہٹ بڑھتی گئی۔ لالی نے ناصرہ کی طرف جھک کر کہا۔ "میں دیوار پھاند کر باہر نکل جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ مڑا۔

ناصرہ نے اسے حیرت سے دیکھا اور رسان سے کہا۔ "ٹھیر جا۔"

آہٹ اور قریب آگئی۔ لالی سہما ہوا کھڑا رہا۔ مگر آہٹ کچھ فاصلے پر بند ہوگئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس طرف آتے آتے یکایک ٹھٹک کر رہ گیا ہے اور ان کے قریب ہی درختوں تلے اندھیرے میں کھڑا ہے۔ دونوں کی بے چینی بڑھ گئی۔ مگر نہ چاپ سنائی دی' نہ کوئی ان کے پاس آیا۔

چوکیدار اینٹوں کے پختہ فرش پر تیز تیز چلتا ہوا اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا۔ اس نے قریب آکر کار کی کنجی ناصرہ کو دیتے ہوئے کہا۔ "ڈریور تو جی ایسا پڑا ہے کہ اسے بالکل ہوش نہیں۔ میں نے بہت مشکل سے چابی تلاش کر کے اس کی جیب سے نکالی۔"

"گیٹ کھول دو۔"

چوکیدار نے لالی کی طرف دیکھا۔ "کیا اس نے بھی باہر جانا ہے؟"

ناصرہ نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے جی! بنگلے کا کوئی بندہ میاں ساب کے حکم کے بغیر رات کو باہر نہیں جاسکتا۔" چوکیدار نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تو جی ہرگز نہیں جاسکتا۔"

ناصرہ نے کار کا دروازہ کھولا اور تیوری چڑھا کر کہا۔ "نہیں' یہ میرے ساتھ ہی جائے گا۔"

چوکیدار عاجزی سے بولا۔ "میاں ساب کو تو آپ جانتی ہی ہیں جی۔ آپ سے تو وہ کچھ نہیں

کہیں گے' میں غریب ایں دیں مارا جاؤں گا۔ میری تو وہ چمڑی ادھیڑ ڈالیں گے۔" اس نے مڑ کر ہال کے دروازے کی جانب دیکھا۔

ناصرہ نے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں نوں جھیتی نال جانا ہے۔ میاں صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ ٹیلی فون میں بھی گڑبڑ ہے۔ میں نوں خود جا کر ڈاکٹر کو لانا ہے۔"

"ایسی گل بات ہے جی تو میں ساب کے ڈریور کو بولتا ہوں۔ وہ ڈاکٹر کو لے آئے گا۔"

"فضول بحث نہ کر۔ جو میں کہتی ہوں وہ کر۔" ناصرہ نے چوکیدار کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور ڈپٹ کر حکم دیا۔ "جا' جا کر گیٹ کھول۔"

چوکیدار چند لمحے خاموش کھڑا سوچتا رہا پھر آہستہ آہستہ گیٹ کی جانب بڑھا۔ ناصرہ فوراً اسٹیرنگ وھیل سنبھال کر بیٹھ گئی۔ اس نے سیڈان کا پچھلا دروازہ کھولا۔ کچھ سوچ کر لالی سے مخاطب ہوئی۔ "نہیں' تم اگلی ہی سیٹ پر میرے برابر بیٹھ جاؤ۔" لالی کار کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔

ناصرہ نے کار اسٹارٹ کی۔ کار کی بتیاں روشن ہوگئیں۔ لالی نے ان کی تیز روشنی میں دیکھا بائیں ہاتھ پر ایک درخت کے تنے کے ساتھ کوئی اندھیرے میں دبکا کھڑا ہے۔ اس کے پیروں کا نچلا حصہ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ نئی گابے شاہی جوتی پہنے ہوئے تھا اور اس کی اجلی دھوتی کا نچلا کنارہ گہرا سرخ تھا۔ لالی کو محسوس ہوا کہ وہ دھیو رہے۔ کار تیزی سے آگے بڑھی اور پھاٹک سے گزر کر باہر آگئی۔ لالی چپ بیٹھا دھیور کے بارے میں سوچتا رہا۔

اسے گم صم دیکھ کر ناصرہ نے دریافت کیا۔ "کیا سوچ رہا ہے؟"

"میں نوں ایسا لگتا ہے جی' دھیور ہمارے نزدیک ہی درختوں کے نیچے کھڑا تھا۔"

"دھیور!" ناصرہ نے حیرت سے کہا۔ "نہیں' وہ نہیں ہوسکتا۔ وہ بہت سنگدل اور خونخوار ہے' تجھے ہرگز گیٹ سے باہر آنے نہ دیتا۔"

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔"

ناصرہ خاموش بیٹھی رہی۔ سیاہ سیڈان دھول اڑاتی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ لالی بھی چپ بیٹھا تھا۔ کچھ دور جا کر نہر آگئی۔ سیڈان نہر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھی۔ یہ راستہ بھی کچا تھا مگر کشادہ تھا۔ زمین بھی قدرے نم تھی۔ اب زیادہ دھول نہیں اڑ رہی تھی۔ ایک طرف نہر تھی' دوسری طرف گندم اور جو کی فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ چاند چڑھ کر آسمان کے بیچوں بیچ آگیا تھا۔ ہر طرف اجلی اجلی چاندنی بکھری تھی۔ لگ بھگ چار میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سیڈان بائیں ہاتھ کو مڑی اور ایک نیم پختہ سڑک پر آگئی۔

لالی نے منہ باہر نکال کر پیچھے دیکھا اور دبی زبان سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "اگر میاں ساب کو ہوش آگیا اور انھوں نے ہمارا پیچھا کیا تو کیا ہو گا؟"

"موت۔" ناصرہ نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ ہم دونوں کو قتل کردے گا۔ اس کے لیے قتل کرنا ایسا ہی ہے جیسے بچے کے لیے کھلونا توڑنا۔"

ناصرہ نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ کار ہچکولے کھانے لگی۔ اس نے رفتار سست کردی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "پچھلے پہیے میں پنکچر ہو گیا۔" اس نے کار سڑک کے کنارے کھڑی کردی۔

دونوں کار سے اتر کر باہر آگئے۔ سڑک کے دونوں طرف ویران اور بنجر رکڑ تھا۔ البتہ کچھ دور آگے سڑک کے دائیں طرف درختوں کا گھنا جھنڈ تھا۔ رات چپ چاپ کھڑی تھی۔ ہوا میں شوریدہ سری تھی۔ تیز جھونکوں سے ناصرہ کے بال بکھر گئے تھے۔ ساڑھی کا آنچل باربار ڈھلک جاتا۔ وہ اپنے بال درست کرتی، ساڑھی سنبھالتی کار کے پچھلے حصے کی جانب گئی۔ اس نے کار کی ڈکی جلدی سے کھولی۔ لالی سے پوچھا۔

"تیں نوں پہیا بدلنا آتا ہے؟"

"میں نے تو جی کبھی یہ کام نہیں کیا۔" لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔

"کوئی گل نہیں۔ جیسا میں کہوں ویسے کرنا۔ یہ ایسا مشکل کام نہیں۔" ناصرہ نے اسٹپنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ پہیا باہر نکال اور کونے میں رکھا ہوا جیک اور ٹول باکس بھی نکال لے۔"

لالی اسٹپنی اٹھانے لگا۔ اسی وقت عقب میں تیز روشنی ابھری۔ ناصرہ نے روشنی دیکھی۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ وہ بدحواس ہو کر بولی۔

"وہ آرہا ہے، وہ آرہا ہے۔"

لالی نے مڑ کر روشنی دیکھی۔ وہ بھی پریشان ہو گیا۔ مگر اس نے جلدی سے اسٹپنی نکالنے کی کوشش کی۔ ناصرہ نے اسے روک دیا۔ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اسٹپنی باہر نہ نکال۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" لالی خاموش کھڑا رہا۔

ناصرہ نے ایک بار پھر روشنی کی سمت دیکھا اور ڈکی کے ڈھکنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے لالی سے کہا۔ "بھاگ سکتا ہے تو بھاگ جا۔" اس نے ڈکی بند کردی۔

"نہیں جی، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں تمھیں اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟"

"نہیں، میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ مجھے اکیلا چھوڑ دے۔ ورنہ تو بھی میرے ساتھ مارا جائے گا۔" ناصرہ نے گہری سانس بھری۔ اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ "مگر وہ مجھے قتل نہیں کرسکے گا۔ میں اس کے ہاتھوں نہیں مروں گی۔" وہ آگے کے دروازے کی جانب بڑھی۔

لالی نے گھبرا کر کہا۔ "کہاں جا رہی ہو؟"

وہ اس کی جانب دیکھے بغیر بولی۔ "میں خودکشی کرلوں گی۔ خود کو گولی مارلوں گی مگر اس کے ہاتھوں نہیں مروں گی۔ میرے پاس بھرا ہوا پستول ہے۔"

لالی بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ ناصرہ دروازے کے اندر جھک کر ڈیش بورڈ کے خانے کا ڈھکنا کھولنے لگی۔ لالی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "میری گل تو سنو۔"

ناصرہ نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "جلدی سے بھاگ جا۔ تو کچھ نہیں کرسکتا۔" وہ زور سے چیخی۔ "جا یہاں سے۔" اس کے بال بکھر کے چہرے پر آگئے تھے۔ آنکھیں تیزی سے چمک رہی تھیں۔

"تمھارے پاس بھرا ہوا پستول ہے۔ فیر پروا نہ کرو۔"

"تو کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ اکیلا نہیں ہو گا۔ اپنے خوں خوار کرندوں کے ساتھ ہو گا۔"

"اس سے کیا فرک پڑتا ہے جی۔" لالی نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "کیا گڈی آگے نہیں جاسکتی؟"

"جا تو سکتی ہے، مگر اس سے کیا ہو گا؟"

"گڈی سامنے درختوں کے نیچے لے چلو۔ سڑک سے اتار کر کچے میں ڈال دینا۔" اس نے دور تک پھیلے ہوئے بنجر میدان پر نظر ڈالی۔ "یہاں تو چھپنے کی بھی کوئی جگہ نہیں۔"

دیکھتے دیکھتے روشنی بہت قریب آگئی۔ سڑک پر کسی گاڑی کے تیزی سے دوڑنے کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ ناصرہ نے اس کی طرف دیکھا اور بدحواس ہو کر بولی۔ "لو، وہ آگیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"فکر نہ کرو۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ لاؤ پستول مجھے دو، جھیتی نال۔"

ناصرہ نے ڈیش بورڈ کے خانے سے پستول نکال کر لالی کو دیا۔ پستول لے کر لالی بولا۔ "تم یہیں گڈی کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔"

ناصرہ بیزاری سے بولی۔ "یہ تو کیا کر رہا ہے؟ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"زبان بند رکھو۔ جیسا کہتا ہوں، وہ کرو۔"

[illegible] کے پچھلے حصے کی جانب بڑھا اور گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ روشنی اور قریب آگئی۔ اتنی

قریب کے لالی نے یہ بھی دیکھ لیا کہ آنے والی سفید رنگ کی کار ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا، کار کی رفتار ست پڑی، بریک لگانے کی آواز ابھری۔ کار کچھ فاصلے پر رک گئی۔ لالی نے نشانہ باندھا اور چوکس ہو کر سامنے دیکھنے لگا۔

ذرا دیر بعد کار کا دروازہ کھلا۔ ایک شخص نکل کر باہر آیا۔ مگر وہ حیات محمد نہیں تھا۔ میانہ قدو قامت کا نوجوان تھا۔ وہ پتلون اور بش شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ لالی اندھیرے میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ اس کے نیچے اترتے ہی ایک اور شخص بھی دروازہ کھول کر باہر آیا۔ دونوں سیڈان کی جانب آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔ وہ کچھ فاصلے پر رک گئے۔ ایک نے تبصرہ کیا۔ "ایکسی ڈنٹ تو نہیں لگتا۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکا اور اونچی آواز سے بولا۔ "کوئی ہے یہاں؟" لالی اس کی آواز سن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ پیچھے کر لیے۔ دونوں سیڈان کے قریب آگئے۔ بش شرٹ والے نوجوان نے پوچھا۔

"کیا ہو گیا جی؟"

لالی نے جواب دیا۔ "پنکچر ہو گیا ہے۔"

ناصرہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنے بکھرے ہوئے بال درست کر رہی تھی۔ نوجوان نے اسے دیکھ کر حیرت سے کہا۔ "ارے آپ! آپ تو میاں حیات محمد وٹو کی بیگم ہیں نا؟"

ناصرہ نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں جی۔"

نوجوان مسکرا کر بولا۔ "میرا نام چوہدری ولی داد خاں بھٹی ہے۔ ادھر اپنی بھی زمیں داری ہے۔" اس نے توقف کیا۔ "میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

ناصرہ نے نرم لہجے میں کہا۔ "شکریہ! میرا ڈرائیور اسٹپنی لگا دے گا۔"

بھٹی نے کہا۔ "جیسی آپ کی مرضی۔"

مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ دونوں واپس چلے گئے۔ اپنی کار میں جا کر بیٹھے۔ اسے اسٹارٹ کیا ذرا دیر میں ان کی کار سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگی۔ جب کار دور چلی گئی اور اس کی پچھلی سرخ بتیاں دھندلی پڑ گئیں تو ناصرہ نے ایک بار پھر ڈکی کھولی۔ لالی نے اسٹپنی اور ٹول بکس نکالا۔ ناصرہ کی ہدایت کے مطابق لالی نے جیک لگا کر کار کا پچھلا حصہ اونچا کیا۔ وھیل کیپ اتار کر نٹ بولٹ کھولے اور پہیا نکال کر اسٹپنی لگا دی۔ ناصرہ اس کے قریب بیٹھی ضروری ہدایات دے رہی تھی اور اس کی مدد بھی کر رہی تھی۔

لالی نے پہیا اور ٹول بکس ڈکی میں رکھ دیے اور اسے بند کر دیا۔ دونوں پھر کار میں بیٹھ گئے۔ لالی نے پستول ناصرہ کو واپس دے دیا۔ ناصرہ نے پستول ڈیش بورڈ کے خانے میں بند کیا۔ کار اسٹارٹ کی۔ لالی کی جانب متوجہ ہوئی۔

"جانتا ہے میں نے کیا سوچا تھا؟ اگر حیات آجاتا تو تجھے کہتی، مجھ پر گولی چلا دے۔"

"نہیں جی! میں ایسا کام نہیں کرتا۔ میں کسی زنانی کا خون کرنے کے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ کام تو میاں حیات محمد کر سکتا ہے۔ وہ تو جی بہت ہی ظالم ہے۔ اس نے تو جی تمہیں مار ہی ڈالا تھا۔ ایسا گلا دبوچا تھا، چھوڑتا ہی نہ تھا۔" لالی یہ کہتے ہوئے نشے سے جھوم کر مسکرانے لگا۔ "برا نہ منانا۔ تسیں صرف بیگم ہو۔ تاش کی بیگم۔ اس کی موچھیں ہی نوچ لیتیں، کاٹ کھاتیں، منہ پر تھوک دیتیں۔ کچھ تو کرتیں۔ نہ ہوئی شاداں، میاں حیات اس کا گلا دباتا تو وہ اس کی گردن چھری سے کاٹ کر سر الگ کر دیتی۔"

"کون ہے وہ؟"

"ہے کوئی۔ پر وہ بہت زور آور ہے جی!"

"تیری گھر والی ہے۔"

"اپنی کوئی گھر والی شر والی نہیں۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ "اپنے سے بھلا کون کڑی ویاہ کر سکتی ہے۔"

"کیا یہ سچ ہے، تو تین بار جیل کاٹ چکا ہے؟"

"ہاں جی۔" لالی انکار نہ کر سکا۔ "اور چوتھی بار جیل میں بند کرنے کے لیے پولیس میری تلاش میں ہے۔"

"سمجھ نہیں آتی، تم لوگ جرائم پیشہ کیسے بن جاتے ہو؟"

"چھوٹا سا تھا تو ماں مر گئی۔ پیو جیل چلا گیا۔ پتہ نہیں، زندہ ہے کہ مر گیا۔" لالی افسردہ ہو گیا۔ "میں تو جی کوڑے کا ڈھیر ہوں۔ کوڑے کے ڈھیر پر پلا اور کوڑے کا ڈھیر ہی رہا۔ کھاد بھی نہ بن سکا۔ مگر تمہارا خصم۔" لالی جھجکا پھر مسکرا کر بولا۔ "معاف کرنا جی! میں ایسے ہی بولتا ہوں۔"

"کہتا جا۔ میں تیری گل سن رہی ہوں۔"

"میں یہ کہہ رہا تھا، تمہارا خصم، میاں حیات محمد کیسے جرائم پیشہ بن گیا؟ وہ تو جی ولایت سے بیرسٹری پڑھ کر آیا ہے۔ کنون کو پوری طرح جانتا ہے۔"

ناصرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی بھی خاموش ہو گیا۔ ذرا دیر بعد لالی کی آواز ابھری۔ "میاں ریاض تو مر گیا۔ اب کیا ہو گا بی بی جی؟"

”وہ زندہ ہی کب تھا۔ اسے تو مرے ہوئے بھی تین مہینے سے اوپر ہو گئے۔ اس کی تو قبر بھی موجود ہے۔“

لالی نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ ”اور وہ جو تہہ خانے میں تھا‘ وہ کون تھا؟“

”وہ ریاض ہی تھا؟“

”فیر وہ کبر کس کی ہے؟“ لالی بدستور حیرت زدہ تھا۔

”یہ تو حیات ہی جانتا ہو گا‘ اس قبر میں کس کی لاش دفن ہے۔ مگر اس نے مشہور یہی کر رکھا ہے کہ وہ ریاض کی قبر ہے۔“

لالی اور حیرت زدہ ہو گیا۔ ”تو یہ چکر بھی چل رہا تھا۔“

”حیات نے جب اپنے بھائی ریاض کو تہہ خانے میں بند کیا تو چند ہی روز بعد یہ خبر پھیلا دی کہ ریاض کار کے ایکسی ڈنٹ میں مر گیا۔“ ناصرہ نے بتایا۔ ”حیات کسی لاوارث کی لاش بھی لے آیا۔ اسپتال کے مردہ خانے سے رشوت دے کر منگوائی تھی یا کسی قبر سے نکالی تھی۔ لاش رات کو آئی تھی۔ ایسی گلی پھٹی اور مسخ تھی کہ نہ چہرہ نظر آتا تھا‘ نہ گردن۔ اس میں اتنی سڑاند تھی‘ اتنی بدبو تھی کہ میرا جی متلا گیا۔ نہ معلوم لاش کو غسل بھی دیا کہ نہیں۔ رات ہی کو فٹافٹ دفن کر دیا۔ قبر بھی بنا دی گئی۔“

”پیسے میں جی بہت طاقت ہے۔ زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ بنا سکتا ہے۔“

”شروع میں تو میں یہ سمجھی میاں ریاض مر گیا۔ مگر ایک روز ایسا ہوا‘ میں حیات کی تلاش میں تہہ خانے میں چلی گئی۔ اس وقت دروازہ کھلا تھا اور دھیور بھی پہرے پر موجود نہیں تھا۔ میں تہہ خانے کے اندر گئی تو کیا دیکھتی ہوں‘ ریاض زندہ بیٹھا ہے۔ حیات بھی وہاں موجود تھا۔ وہ اتنا ناراض ہوا کہ دھیور کو ہنٹر سے ڈنگر کی طرح پیٹا۔ مجھے بھی مارا۔“

”ریاض کے پتر میاں نیاز محمد کو بھی یہ گل بات ملوم ہے؟“

”نہیں۔ نیاز کو کچھ نہیں معلوم۔ وہ یہی جانتا ہے‘ اس کا پیو مر گیا۔ حیات نے اسے جو کچھ بتایا‘ اس نے مان لیا۔“

”فیر وہ مکدمہ سکدمہ کیوں چلا رہا ہے؟“

”جاگیر اور جائیداد اپنے قبضے میں لینے کے لیے۔ مجھے تو ایسے لگتا ہے یہ سارا منصوبہ نیاز کے ماماں کا ہے۔“ ناصرہ چند لمحے خاموش بیٹھی رہی اور ونڈ اسکرین سے سنسان سڑک کو دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر یکایک جھنجلاہٹ آ گئی۔ کسی قدر تیکھے لہجے میں بولی۔ ”یہ جاگیر‘ سچ پوچھو تو ایسی

ہڈی ہے‘ جس کے لیے تین کتے لڑ رہے تھے۔ ایک مر گیا‘ دو ابھی رہ گئے ہیں۔“

”کیا یہ سچ ہے کہ نیاز‘ میاں ریاض کا نہیں‘ کرنیل جانسن کا پتر ہے؟“

”میں نوں اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔“ ناصرہ نے بے نیازی کا اظہار کیا۔ ”مگر حیات یہی کہتا ہے۔“

”وہ تو یہ بھی کہتے ہیں جی‘ ریاض اپنی گھر والی کو کرنیل کے پاس سونے کے لیے بھیجتا تھا۔ مجھے خود انھوں نے بتایا تھا۔ میں غلط نہیں کہہ رہا۔“

”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔“ ناصرہ نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے بھی یہی بتاتا ہے۔ وہ سب سے یہی کہتا ہے۔“ اس کے چہرے پر برہمی چھا گئی۔ ”ریاض بھی بے غیرت تھا اور حیات بھی بے غیرت ہے۔ دونوں ایک جیسے ہیں۔“

لالی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تمہارا خصم بھی ایسا ہی چکر چلاتا ہے؟ میرا مطلب ہے....“

”میں تیرا مطلب سمجھتی ہوں۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”اسی بات پر میرا اس کا جھگڑا شروع ہوا۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے مہمانوں کے دل بہلاؤں۔ ان کے ساتھ سوؤں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میں اب تک آٹھ مہمانوں کے ساتھ سو چکی ہوں۔ کل رات وہ مجھے نویں کے ساتھ سلانا چاہتا تھا۔ اسے وہ سیاست کہتا ہے۔ بادشاہ گری بتاتا ہے۔ جب میں اس کی اس سیاست اور بادشاہ گری میں مدد کرنے سے انکار کرتی ہوں تو مجھے بے رحمی سے مارتا ہے۔ ہڈی پسلی توڑ دیتا ہے۔ لہو لہان کر دیتا ہے۔ تجھے کس طرح بتاؤں۔ کیسے کیسے ظلم کرتا ہے۔“ ناصرہ کی آواز میں کسک تھی۔ وہ خاموش ہو گئی۔

لالی اندھیرے میں ناصرہ کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ لالی بھی اداس ہو گیا۔ سیاہ سیڈان سنسان سڑک پر تیزی سے دوڑتی رہی۔

لالی اسے تسلی بھی نہ دے سکا۔ بت بنا خاموش بیٹھا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ ایک منٹ‘ دو منٹ‘ تین منٹ‘ کئی منٹ گزر گئے۔

لالی نے خاموشی سے اکتا کر کہا۔ ”بی بی جی‘ ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھ‘ کیا پوچھنا چاہتا ہے۔“

”کیا نیاز کو امریکہ سے تم نے بلایا ہے؟“

”نہیں‘ وہ خود آیا ہے۔“ ناصرہ نے جواب دیا۔ ”ہاں‘ میں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ جاگیر اور جائیداد نیاز کو مل جائے۔“

"اس لیے کہ وہ اصلی وارث ہے۔ جیداد پر اس کا حک بنتا ہے؟"

"کسی کا حق دق نہیں بنتا۔ اور نہ مجھے کسی کے حق سے کوئی دلچسپی ہے۔" وہ جھنجلا کر بولی۔ "میں تو یہ چاہتی ہوں کہ جاگیر حیات کے پاس نہ رہے۔ اگر جاگیر اور زمینداری اس کے پاس رہے گی تو وہ ساری عمر اپنی اکلوتی بیٹی کا ویاہ نہیں کرے گا۔ اس ڈر سے کہ جاگیر اور جائیداد اس کے خاندان سے باہر چلی جائے گی۔ وہ جاگیر کم کرنے کی بجائے بڑھانا چاہتا ہے۔ یہ بات وہ مجھ سے صاف صاف بتا چکا ہے۔ وہ جاگیر اور جائیداد کے سوا کسی سے بھی محبت نہیں کرتا۔" ناصرہ نے گہری سانس بھری۔ "جب تک یہ جاگیر اور زمینداری ہے' نہ وہ اپنی بیٹی کا پیو بن سکتا ہے' نہ میرا شوہر۔"

"جیداد اور زمینداری تو جی وہ چھوڑے گا نہیں۔ یہ بالکل پکی گل ہے۔" لالی نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "پر بی بی جی تم اتنی پڑھی لکھی ہو۔ وڈے گھر کی دھی ہو۔ تمہارے لیے کسی چیز کی کمی نہیں۔ فیر تم اس کی پروا کیوں کرتی ہو؟ کاگز لکھوا کر اس سے چھٹکارا کیوں نہیں پالیتیں۔"

"کیسے چھٹکارا پالوں۔ میرا پیو نہیں مانتا۔ وہ خاندانی جاگیردار ہے۔ کہتا ہے ہمارے خاندان کی کسی زنانی نے آج تک طلاق نہیں لی۔ جس کے ساتھ ایک بار ویاہ ہوگیا' ساری زندگی اسی کے نام پر کاٹ دی۔ میں نے کاغذ لکھوایا تو خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔" ناصرہ نے تامل کیا۔ "مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ میری بچی مونا کا مستقبل خراب ہوجائے گا۔ سب کہیں گے طلاقن کی بیٹی ہے۔"

"تمہاری مونا کتنی عمر کی ہوگی؟"

"ابھی تو بہت چھوٹی ہے اور بہت معصوم ہے۔ ابھی تو وہ کچھ بھی نہیں جانتی۔ اسے کچھ پتہ نہیں۔"

"جب میں چھوٹا سا تھا تو ساری گالاں سیکھ گیا تھا۔ ان کا کچھ کچھ مطلب بھی جان گیا تھا۔" یہ کہتے کہتے لالی یادوں کے دھندلکوں میں گم ہوگیا۔ ایک بار پھر نشہ اس پر حملہ آور ہوا۔ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ جھوم کر بولا۔ "ایک بار ایسا ہوا جی کہ میں نے پنڈ کی ایک سلے بار مٹیار کو آنکھ مار دی۔ وہ فصل کی واڈھی کے بعد کھیت میں پڑے ہوئے کنک کے سٹے چن رہی تھی۔ اس نے آنکھیں نکال کر مجھے گھورا اور دبا کے پٹائی کی۔ فیر تو جی چاچا نے مجھے اینٹوں کے بھٹے پر لگا دیا۔ سویرے تڑکے کام پر جاتا اور شام کو گھر آتا۔ چلچلاتی دھوپ میں پتھیروں کے ساتھ کام کرتا۔ بہت دنوں اینٹیں ڈھوتا رہا۔ ہاتھوں میں گھاؤ پڑ گئے۔ سر کے بال ایسے اڑے کہ بالکل گھون مون ہوگیا۔ کرتا بھی کیا۔ کھانے کو نہ ملتا۔"

ناصرہ خاموش بیٹھی رہی۔ لالی کہتا رہا۔ "میرا چاچا بے چارہ بہت بوڑھا تھا۔ اوپر سے اسے دمہ ہ تھا۔ پڑا پڑا' کھوں کھوں کھانستا رہتا۔ میری چھوٹی بہن پورے دس سال کی بھی نہ ہوئی تھی کہ چا نے اس کا ویاہ کردیا۔ وہ کھاتی ڈھیر ساتھی اور گھر میں کھانے کو نہ تھا۔ ویاہ کے بعد اسے سب ہ ملوم ہوگیا۔ کھٹا کھٹ بچے جننے لگی۔ اس نے تین کھسم کیے۔ پر روٹی کو ترستی ہوئی مرگئی۔"

"ہمارے گھرانے میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہمارا خاندان بہت اونچا ہے۔" ناصرہ نے فخر سے گردن نچی کی۔ "ہم کوٹ کمالیہ کے لنگریال ہیں۔ تمیں نوں پتہ ہے لنگریال کون ہوتے ہیں؟"

"اپنے کو تو جی کچھ پتہ نہیں۔"

"پرانے زمانے میں ہمارے وڈوں اور بزرگوں کے گھر کے دروازے محتاج اور حاجت مندوں ے لیے دن رات کھلے رہتے تھے۔ وہ بہت امیر ہوتے تھے۔ ان کی حویلیوں میں لنگر خانے ہوتے ے۔ جس کا جی چاہتا' لنگر سے روٹی کھاتا۔ کوئی بھوکا نہ جاتا۔ ان کے لنگر خانے اتنے مشہور تھے کہ ری برادری کا نام لنگریال پڑگیا۔" ناصرہ چند لمحے خاموش رہی۔ "حیات کی ذات کا کچھ پتہ نہیں۔ د کو وٹو کہتا ہے۔ لیکن کوئی ڈوگر بتاتا ہے کوئی آرائیں۔ ڈوگروں کے بارے میں مشہور ہے' ڈنگر ر ہوتے تھے اور آرائیں پہلے شاہی مالی ہوتے تھے' اب تو خود کو میاں کہلواتے ہیں۔" اس نے رت سے منہ بگاڑا اور تیکھے لہجے میں بولی۔ "نہ جانے ابا جی نے کیا سوچ کر مجھے حیات کے پلے ندھ دیا۔"

لالی اس کی باتیں سن کر بے تکلفی سے ہنس پڑا۔ "یہ خاندان اور برادری کا بھی عجیب چکر ہے ت یہ ہے جی' اپنا تو سرے سے کوئی خاندان ہی نہیں۔ میں نوں تو ٹھیک سے یہ بھی پتہ نہیں میرا پیو ن تھا۔"

ناصرہ نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ "تو کیا تیری ماں....." اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"نہیں جی' وہ کنجری شنجری نہیں تھی' بہت نیک بندی تھی۔" لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "برا تو ہ زمیندار تھا جس کی حویلی میں ویاہ سے پہلے میری ماں کام کاج کرتی تھی۔ غریب کمی تھی۔ زمیندار نے اسے خراب کردیا۔ فیر ایسا ہوا جی کہ میرا نانا اپنا پنڈ چھوڑ کر میری ماں کے ساتھ گوگیرہ کے زدیک ایک چک میں آکر بس گیا۔ جب اس نے میری ماں کا ویاہ کیا تو میں اس کے پیٹ میں تھا۔"

ہ خاموش ہوگیا۔ ناصرہ بھی خاموش بیٹھی رہی۔

کھلی کھڑکی سے ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ نشے کا تیز ریلا آیا۔ لالی مسکرا کر بولا۔ "جب میں تگڑا جوان ہوگیا اور چوری چکاری بھی کرنے لگا تو مجھے اپنی ماں کے بارے میں بہت سی باتوں کا پتہ

چل گیا۔ مجھے زمیندار پر بہت غصہ تھا۔ ایک رات میں کتل کرنے کے ارادے سے اس کی حویلی میں گھسا۔ جیسے ہی کھڑکی کے رستے کمرے میں گیا‘ کیا دیکھتا ہوں‘ وہ ایک چھوہری کے ساتھ بالکل ننگا کھڑا ہے۔ وہ اس کی دھی سے بھی چھوٹی تھی۔ میں نے چاقو کھول کر دکھایا۔ اسے کہا‘ ابھی کھسی کردوں گا۔ وہ ایسا ڈرا کہ تھر تھر کانپنے لگا۔ مجھے ہنسی چھوٹ گئی۔ میں نے اسے کتل کرنے کا ارادہ چھوڑ دیا اور اس سے پورے چار ہزار روپے لے کر چلا آیا۔ وہ بہت مالدار ہے جی۔ وڈا زمیندار ہے۔ سنا ہے ملوٹ کا جنجوعہ ملک ہے۔ اسمبلی کا ممبر شمبر بھی رہ چکا ہے۔ اخباروں میں اس کی تصویریں بھی چھپتی ہیں۔ آج کل وہ اپنی زمین داری میں بہت شاندار مسجد بنوا رہا ہے۔ اس کے ساتھ یتیم خانہ اور مدرسہ بھی ہوگا اور میں نے جو تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا سیکھا‘ وہ جیل میں سیکھا۔"

لالی ٹھٹھا مار کر ہنسا۔

ناصرہ خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی لمبی چوڑی کار تیزی سے سڑک پر دوڑتی رہی‘ ایک موڑ کاٹ کر پختہ سڑک پر آگئی۔ کچھ دیر بعد ناصرہ نے پوچھا۔ "تیں نوں کتھے جانا ہے؟"

"میں نوں تو جی کادر آباد سٹیشن جانا ہے۔"

"قادر آباد تو ادھر رہ گیا۔" ناصرہ نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "آگے تو منٹگمری شہر ہے۔ مگر میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ کچھ دور جا کر نہر آئے گی اور اس کے ساتھ ہی میں لال ٹبے کی جانب مڑ جاؤں گی۔ میں اپنی بھین کے گھر جاؤں گی۔"

"ایسا ہے جی تو مجھے یہیں اتار دو۔ اب تمہیں اپنے خصم کا بھی ڈر نہیں رہا۔"

ناصرہ اس کی بات نظرانداز کر کے بولی۔ "حیات کے سر سے بہت خون بہہ گیا تھا۔ جانے اب اس کا کیا حال ہوگا۔"

لالی بے نیازی سے بولا۔ "مر گیا ہوگا۔"

ناصرہ غصے سے پھٹ پڑی۔ "تو بالکل جانگلی ہے اور بے رحم بھی ہے۔"

لالی اس کی برہمی خاموشی سے پی گیا۔ کار سڑک پر دوڑتی رہی۔ نہ ناصرہ نے اسے روکا نہ لالی نے روکنے کے لیے کہا۔ دونوں چپ بیٹھے تھے۔ کار کسی بستی کے قریب سے گزر رہی تھی۔ درختوں کے جھنڈ کے پیچھے اکا دکا چراغ ٹمٹما رہے تھے۔

کار آن کی آن میں بستی کے آگے سے گزر گئی۔ سڑک کے دونوں طرف درخت اور ہرے بھرے کھیت تھے۔ پت جھڑ کے مارے ہوئے درخت اجڑے اجڑے نظر آتے تھے۔ فضا غبار آلود تھی۔ چاندنی دھندلی پڑ گئی تھی۔ لالی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آرہا تھا۔ ناصرہ نے خاموشی سے اکتا کر

چھا۔

"کیا سوچ رہا ہے؟"

"تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔"

ناصرہ نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ "میرے بارے میں؟"

"ہاں۔" لالی نے رسان سے کہا۔ "میں سوچ رہا تھا‘ جب وہ جھکا ہوا دونوں ہاتھوں سے تمہارا ا دبا رہا تھا۔ میں نیچے زمین پر پڑا تھا۔ تمہاری ساڑھی الگ پڑی تھی۔ تمہاری سوہنی سوہنی نگیں چھپی ہوئی تھیں‘ بال بکھر گئے تھے۔"

لالی بالکل بھول گیا کہ وہ شاداں سے نہیں میاں حیات محمد خاں وٹو کی بیگم ناصرہ سے بات کر رہا ہے‘ جو ایک خاندانی جاگیردار کی بیٹی بھی تھی۔ لالی نشے کی ترنگ میں کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا۔ ایت بے باکی سے کہتا رہا۔ "تمہاری دونوں ٹانگیں ننگی تھیں۔ ایک دم ننگی۔ ہری‘ ہری روشنی ں......"

ناصرہ نے فوراً بریک لگایا۔ کار کے پہیے سڑک کی تیز رگڑ سے سناٹے میں زور سے چیخے۔ لالی کی ت ادھوری رہ گئی۔ کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ناصرہ غضب ناک ہو کر چیخی۔ "بے غیرت! تمیز! فوراً گاڑی سے نیچے اتر جا۔ نکل باہر۔"

لالی کھسیانا ہو کر بولا۔ "اتنا ناراض کیوں ہوتی ہو۔"

وہ ڈپٹ کر بولی۔ "میں کہتی ہوں نکل باہر۔" اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا اور ڈیش بورڈ کا نہ کھولنے لگی۔

"میں نوں پتہ ہے‘ تمہارے پاس بھرا ہوا پستول ہے۔ پستول نہ نکالو۔ میں چلا جاؤں گا۔"

لالی نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا‘ ناصرہ کی طرف مڑا اور ڈھیٹ بن کر مسکراتے ہوئے لا۔ "مجھے جی زنانیوں کی ننگی ٹانگیں دیکھنے کا چسکا نہیں ہے۔ وہ تو میں دس روپے خرچ کر کے بھی یکھ سکتا ہوں۔ صرف ٹانگیں نہیں‘ پورا بدن دیکھ سکتا ہوں۔ میرے پاس جگیر اور جیداد ہوتی تو دز زنانیوں کو ننگا کر کے دیکھتا۔ خود بھی دیکھتا‘ دوسروں کو بھی دکھاتا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا‘ تمہارا خصم بے رحم بھی ہے‘ بے گیرت بھی۔ میں نے اس کے منہ پر ی لیے تھوکا تھا اور اسی لیے اس کا سر دیوار سے ٹکرا کر پھوڑا تھا کہ وہ بہت وڈا بے گیرت دلا ہے۔"

لالی نے کار کا دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا۔ ناصرہ گردن موڑے اسے غور سے دیکھتی رہی‘ پھر

اس نے آہستہ سے کہا۔ "ٹھہر جا۔" وہ اپنا پرس کھولنے لگی۔

لالی نے کار کا دروازہ دھیرے سے بند کیا اور اس کا سہارا لے کر زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ "اسے نہ کھولو۔ اس میں ۱۷۰ روپے تھے، وہ میں نے پہلے ہی نکال لئے ہیں۔ پروا نہ کرو۔ اپنا کام چل جائے گا۔ اب تم جاؤ۔"

لالی الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ناصرہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ کار اسٹارٹ کی، گیئر میں ڈالی اور جھنجلا کر ایکسی لیٹر اس قدر زور سے دبایا کہ سیاہ سیڈان چیختی ہوئی تیزی سے بھاگی اور آن کی آن میں بہت دور نکل گئی۔

۵

ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ سڑک نیم پختہ تھی اور زیادہ کشادہ بھی نہ تھی۔ سڑک کے دونوں طرف
ے درخت تھے۔ لالی آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ کچھ ہی دور آگے گیا تھا کہ درختوں کی اوٹ سے روشنی
ر آئی۔ وہ اسی سمت بڑھنے لگا۔ قریب پہنچا تو پتھروں کی بنی ہوئی دو منزلہ عمارت نظر آئی۔ یہ ریسٹ
س تھا۔

لالی ٹھہر گیا اور چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسی اثناء میں درختوں کے نیچے سے کتوں کا
ں نکلا۔ کتے زور زور سے بھونکتے ہوئے لالی پر جھپٹے۔ وہ گھبرا کر سرپٹ بھاگا۔ کتوں نے اس کا
قب کیا۔ لالی دوڑتا ہوا ریسٹ ہاؤس کے قریب پہنچ گیا۔ مگر کتوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر
۔ وہ زور زور سے بھونکتے اور دانت نکال کر غراتے ہوئے اس پر جھپٹتے۔ ان کے نرغے سے بچنے
ے لیے قریب نہ کوئی جھاڑی تھی نہ درخت تھا۔ پتھر بھی نہ تھے کہ اٹھا، اٹھا کر مارتا اور کتوں کو
گانے کی کوشش کرتا۔

اس کے پیروں کے نیچے خشک اور ریتلی زمین تھی۔ لالی جھٹ زمین پر جھکا اور دونوں ہاتھوں سے
ی اڑانے لگا۔ یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ کتے بکھر کے پیچھے ہٹے۔ گرد کا غبار چھا گیا۔ لالی کو ریسٹ
ؤس کی دیوار تک پہنچنے کا موقع مل گیا۔ اس نے زقند بھری اور دیوار پھاند کر اندر چلا گیا۔ دیوار
کے باہر کتے مسلسل بھونک رہے تھے۔

ریسٹ ہاؤس میں ہر طرف ویرانی تھی۔ وسط میں دو منزلہ عمارت تھی۔ اوپر کی منزل کے ایک
ریچے سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ عمارت کے اردگرد وسیع احاطہ تھا۔ احاطے میں اونچے

اونچے درخت تھے۔ درختوں کے پتے گر چکے تھے۔

برہنہ شاخیں تاریکی میں مکڑی کے جالوں کی مانند الجھی الجھی نظر آتی تھیں۔ خزاں کی اجاڑ رات نڈھال کھڑی تھی۔ ہوا چلتی تو خشک پتے کھڑکھڑاتے اور دور تک بکھر جاتے۔ لالی احاطے میں پہنچنے کے بعد اندھیرے میں دیوار کے ساتھ دبک کر بیٹھ گیا۔ چاردیواری کے اس پار کتے ابھی تک بھونک رہے تھے۔

لالی نے دم بھی نہ لیا تھا کہ عمارت کے عقب سے ایک شخص جھپاک سے نکلا اور عین اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لمبی لاٹھی تھی‘ دوسرے میں لالٹین لٹک رہی تھی۔ وضع قطع سے وہ ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار لگتا تھا۔ اس نے جھٹ لالٹین ایک طرف رکھی اور لالی پر لاٹھی تان کر بولا۔

"کون ہے تو؟"

چوکیدار اس طرح آنا" فانا" نکل کر سامنے آیا کہ لالی کے لیے راہ فرار اختیار کرنے کی گنجائش نہ رہی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور آہستہ سے کہا۔

"چاچا! ڈر نہیں۔"

"پر تو ہے کون؟" چوکیدار بدستور لاٹھی تانے کھڑا تھا۔ اس نے کسی قدر اونچی آواز سے کہا۔ "ٹھیک‘ ٹھیک بتا‘ یہاں آیا کیسے؟"

وہ دبلا پتلا ادھیڑ آدمی تھا۔ لالی نے اسے کمزور اور سن رسیدہ پایا تو نڈر ہو کر بولا۔ "چاچا! خاما خا گرمی نہ دکھا۔" وہ مسکراتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "اپنی ڈانگ تو ہٹا۔ ذرا دم لے۔ میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔"

چوکیدار نے لاٹھی نیچے کرلی۔ چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے لالٹین اٹھائی اور لالی کے چہرے کے سامنے لاکر اس طرح چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے پوچھا۔ "تو عیدو کا پت ملّی‘ تو نہیں ہے؟ لگتا تو کچھ ویسا ہی ہے۔"

"نہیں جی‘ نہ میں عیدو کا پتر ہوں‘ نہ ملّی ہوں۔" لالی نے اس کا شک رفع کیا۔ "گل ایہہ ہے جی! میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ کتے بھونکتے ہوئے پیچھے لگ گئے۔ گھبرا کر بھاگا اور یہاں آگیا۔"

چوکیدار نے مڑ کر دیکھا‘ پھاٹک قریب ہی تھا۔ اس نے حیرت سے کہا۔ "پھاٹک میں تو تالا لگا ہے۔ تو آیا کیسے؟"

"پھاٹک پھاند کر اندر آگیا۔" لالی ایک بار پھر مسکرایا۔ "کرتا بھی کیا۔ یہاں نہ آتا تو کتے مجھے نہ

چھوڑتے۔ ایک دو نہیں‘ پورا غول ہے۔" احاطے کے باہر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ لالی نے پشت کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "سن رہا ہے؟ ابھی تک کھڑے بھونک رہے ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔" چوکیدار نے لالٹین زمین پر رکھ دی۔ "پچھلے دنوں ادھر ایک کھوتا مر گیا تھا۔ جانے کہاں کہاں کے کتے اسے کھانے آگئے۔ رات بھر بھونکتے ہیں۔" چوکیدار کا رویّہ اب نرم ہوگیا تھا۔ وہ مسکرا کر کسی قدر بے تکلفی سے بولا۔ "یہاں کھڑا کیوں ہے؟ ادھر منجی پر آجا۔ آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔" چوکیدار مڑا‘ لالٹین اٹھائی اور آگے بڑھ گیا۔

لالی بھی ساتھ ساتھ چلا۔ چلتے چلتے اس نے پوچھا۔ "چاچا یہ کس کی حویلی ہے؟"

چوکیدار نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "یہ حویلی نہیں‘ ریسٹ ہاؤس ہے۔ یہاں سرکاری افسر آکر ٹھیرتے ہیں۔"

لالی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "آج یہاں کوئی ٹھیرا ہے؟"

"نہیں!" چوکیدار نے جواب دیا۔ "ریسٹ ہاؤس بالکل خالی ہے۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے درختوں کے نیچے پہنچ گئے۔ قریب ہی نیچی چھت کا پختہ کوارٹر تھا۔ کوارٹر کا دروازہ بند تھا۔ اس کے سامنے بوسیدہ چارپائی پڑی تھی۔ چوکیدار نے چارپائی کے نزدیک جا کر کہا۔

"لے‘ اب تو آرام سے یہاں بیٹھ۔"

لالی چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چوکیدار نے لاٹھی ایک طرف رکھ دی۔ لالٹین کی لو دھیمی کی اور اسے بھی چارپائی کے قریب رکھ دیا۔ وہ لالی کے نزدیک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ لالی نے ذرا دیر خاموش رہ کر پوچھا۔ "جب یہاں کوئی ٹھیرا نہیں ہے تو یہ اوپر بتی کیوں جل رہی ہے؟" اس نے گردن اونچی کی اور اوپر کی منزل کی وہ کھڑکی دیکھنے لگا جس کے شیشوں سے زرد زرد روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔

"وہ تو میں اس لیے روز جلا دیتا ہوں کہ صاحب لوگ ادھر آئیں تو دور سے ریسٹ ہاؤس نظر آجائے۔ پر اب یہاں آتا ہی کون ہے۔ جو افسر کبھی دورے پر ادھر آتے بھی ہیں‘ وہ لمبردار اور زمیں داروں کی حویلیوں میں ٹھیر جاتے ہیں۔ مہینوں میں کوئی بھولا بھٹکا ادھر آجاتا ہے۔"

کتے اب ریسٹ ہاؤس سے دور جا چکے تھے۔ مگر ان کے بھونکنے کی آوازیں رات کے سناٹے میں برابر سنائی دے رہی تھیں۔ لالی نے سوچا‘ ابھی باہر جانا مناسب نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ریسٹ ہاؤس

سے نکلتے ہی کتے پھر پیچھے لگ جائیں اور کسی نئے خطرے کا باعث بن جائیں۔ ریسٹ ہاؤس محفوظ جگہ تھی۔ چوکیدار سے اس نے یارانہ بھی گانٹھ لیا تھا۔ لالی نے کچھ دیر وہاں ٹھہرنے کا ارادہ کیا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور چوکیدار کی طرف بڑھا کر بولا۔

"چاچا! سگریٹ پیئے گا؟"

"پلا دے۔" چوکیدار نے بے نیازی سے کہا اور ایک سگریٹ پیکٹ سے نکال لی۔ "سگریٹ پینے سے کھانسی بہت ہوتی ہے پر طبیعت بھی تو نہیں مانتی۔" لالی نے اپنی اور چوکیدار کی سگریٹیں ماچس جلا کر سلگائیں۔ چوکیدار سگریٹ پر کش لگاتے ہی کھانسنے لگا۔ ذرا دیر کھانستا رہا' کچھ سکون ہوا تو پوچھنے لگا۔

"تیرا ناں کیہ ہے؟"

لالی ایسے سوالات کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ اس نے نہایت ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ "ناں تو جی اپنا محمد ابراہیم ہے' پر سب مجھے ہیما کہتے ہیں۔"

"ہیمے! یہ تو بتا' تو اتنی رات گئے ادھر آیا کیسے؟" چوکیدار نے دریافت کیا۔ "تیں نوں شمس پور تو نہیں جانا؟"

"جانا تو جی مجھے بہت آگے ہے۔" لالی نے گول مول جواب دیا۔ "سوچا' اسی رستے سے چلا جاؤں۔"

چوکیدار نے سگریٹ کا کش لگایا' لالی کے کرتے شلوار کو نظر بھر کر دیکھا۔ "تو کرتا کیا ہے ہیمے؟"

"میں جی اوکاڑہ ڈیری فارم میں نوکری کرتا ہوں۔"

چوکیدار نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "تو کیا تو اوکاڑے جا رہا تھا؟" مگر لالی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ مسکرا کر بولا۔ "پیدل اوکاڑے کیسے جا سکتا ہے؟ وہ تو بہت دور ہے۔" اس نے ذرا تامل کیا۔ "تیں نوں کہیں اور ہی جانا ہو گا۔ کہاں کا ارادہ ہے؟"

"میں نوں تو جی کادر آباد سٹیشن جانا ہے۔ ایک دو روز ادھر ٹھہر کر اوکاڑے چلا جاؤں گا۔"

"پر کادر آباد سٹیشن بھی یہاں سے دور ہے۔ ۲۰ میل سے کم نہیں ہو گا۔ تیرے لیے تو سیدھا رستہ منٹگمری کا ہے۔ لاری پکڑتا' منٹگمری جاتا اور وہاں سے ریل یا راوی ٹرانسپورٹ کی لاری سے کادر آباد چلا جاتا۔ تجھے اس طرف کا رستہ کس نے بتایا؟"

"اب تجھ سے کیا بتاؤں چاچا!" لالی نے بات بنائی۔ "ہوا یہ کہ میں جہاں خان پنڈ میں اپنے ایک دوست کے ویاہ میں آیا تھا۔ وہاں ہنسی مخول میں ہو گیا جھگڑا۔ میں ایسا گرمی میں آگیا کہ آدھی رات ہی کو اٹھ کر چل کھڑا ہوا۔"

"کچھ زیادہ جھگڑا تو نہیں ہوا؟" چوکیدار نے مشتبہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "میرا مطلب ہے' کوئی خون شون تو نہیں ہو گیا جو تجھے اس طرح رات ہی کو وہاں سے بھاگنا پڑا؟"

"نہیں چاچا! ایسی کوئی گل نہیں۔" لالی نے ہنس کر کہا۔ "جھگڑا بڑھ تو جاتا پر میں ٹال گیا۔ جیسے بیٹھا تھا ویسے ہی اٹھ کر چل کھڑا ہوا۔ کپڑے لتے بھی ساتھ لایا تھا' وہ بھی وہیں چھوڑ آیا۔ میرے دوست اور دوسرے بندوں نے روکا بھی' پر میں نے کسی کی نہ مانی۔ پنڈ سے نکل کر آگے بڑھا تو پکی سڑک آ گئی۔ سڑک کے دوسری طرف تیرے ریسٹ ہاؤس کا رستہ نظر آیا۔ میں اسی پر چل کھڑا ہوا۔ سوچا' آگے جا کر کسی راہ گیر سے کادر آباد کا رستہ پوچھ لوں گا۔" اس نے باتوں باتوں میں چوکیدار سے قادر آباد اسٹیشن کا راستہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ "کوئی نہ کوئی رستہ تو ادھر سے کادر آباد جاتا ہی ہو گا۔ چاچا تجھے تو رستے کا پتہ ہو گا؟"

"رستہ تو ادھر سے جاتا ہے۔" چوکیدار نے بتایا۔ "آگے گوردا پورہ ہے۔ یہاں سے چار میل کے لگ بھگ ہو گا۔" اس نے شمال کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "وہاں سے نہر ملے گی۔ سیدھی کادر آباد جاتی ہے اور وڈی نہر' لوئر باری دو آب سے جا کر مل جاتی ہے۔ اب تو رات بہت ہو گئی۔ ویسے نہر کے کنارے کی کسی بستی سے کادر آباد تک جانے کے لیے تانگا بھی مل جائے گا۔ زیادہ پھیر کا رستہ نہیں۔ نہر کے کنارے کی سڑک' ہے تو کچی پر ٹھیک ٹھاک ہے۔ صرف برسات میں کہیں کہیں سے خراب ہو جاتی ہے۔"

لالی ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔ "چاچا! اب میں چلوں گا۔"

"تو اس وکھت جائے گا؟" چوکیدار نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔ "ذرا اپنی گھڑی دیکھ کر بتا' بجا کیا ہے؟"

لالی نے لالٹین کی جانب ہاتھ بڑھا کر گھڑی دیکھی۔ "اڑھائی بجا ہے۔"

"نہیں جی' اتنی رات گئے جانا ٹھیک نہیں۔ گوردا پورے کا رستہ بھی ٹھیک نہیں۔"

"تو فکر نہ کر چاچا! میں بے کھٹکے چلا جاؤں گا۔ ڈرنے شرنے کی کوئی بات نہیں۔"

"ڈرنے کی بات نہیں۔ پر گوردا پورے تک رستہ ذرا پھیر کا ہے۔ اندھیرے میں بھٹک کر جانے کدھر نکل جائے گا۔ ساری رات پریشان ہو گا۔ ایسا کیوں نہیں کرتا' صبح تک یہیں ٹھہر جا۔ پاک نبی رب دیا سامنے رہی۔" چوکیدار نے ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "سویرے سویرے چلا جانا۔ دوپہر تک پہنچ جائے گا۔ اتنی رات کو کہاں بھٹکتا پھرے گا۔"

مگر لالی آمادہ نہ ہوا۔ "نہیں چاچا! میں چلا جاؤں گا۔ مجھے نہ روک۔ صبح ہونے تک تو میں کادر آباد کے نزدیک پہنچ جاؤں گا۔ ۲۰ ہی میل کا تو رستہ ہے۔ ابھی سورج نکلنے میں بہت دیری ہے۔ اتنی دیر میں تو بہت سا رستہ طے ہو جائے گا۔" یہ کہتا ہوا لالی اٹھنے کے لیے کسمسایا۔ اب وہ مزید ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا اور جلد سے جلد رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔

لیکن چوکیدار نے اسے اٹھنے نہیں دیا' اپنی بات پر اڑا رہا۔ لالی کا ہاتھ تھام کر بولا۔ "میرا کہا مان' اس وکھت یہاں سے جانے کا وچار چھوڑ دے۔" اس نے پیار سے لالی کو ڈانٹا۔ "خاما خاضد نہ کر۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں تیرے سونے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

لالی نے چوکیدار کو اس قدر مہربان پایا تو انکار نہ کر سکا۔ ویسے بھی سورج نکلنے سے پہلے قادر آباد پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ دن میں کہیں نہ کہیں ٹھہرنا پڑتا اور نیا خطرہ مول لینا پڑتا۔ "تو کہتا ہے تو میں نہیں جاؤں گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "چاچا! میری فکر نہ کر۔ میں کہیں بھی سو جاؤں گا۔ چند گھنٹے کی تو بات ہے۔" اس نے نظریں گھما پھرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ "مجھے تو تیرے سوا یہاں کوئی دکھائی نہیں پڑتا۔ کیا یہاں اور کوئی نہیں رہتا؟"

"کیوں نہیں رہتا۔ میری گھر والی بھی ساتھ رہتی ہے۔"

"وہ تو کوارٹر میں پڑی سوتی ہو گی۔"

"نہیں' وہ اپنے بھرا کے گھر چک ۶۸ گئی ہے۔ بھتیجے کا ویاہ ہے' اس میں شریک ہونے گئی ہے۔ تین روز ہو گئے گئے ہوئے۔ کوارٹر میں صرف نجیا ہے۔ نجیا میری سب سے چھوٹی دھی ہے۔ بہت کام کاج کرتی ہے جی۔ کوئی افسر آکر ریسٹ ہاؤس میں ٹھیرتا ہے تو وہی چائے بناتی ہے' روٹی شوٹی تیار کرتی ہے۔ خانساماں یہاں رہتا ہی کب ہے۔"

"خانساماں کہاں ہوتا ہے؟"

"ویسے تو ریسٹ ہاؤس ہی کا نوکر ہے پر کام ایس' ڈی' او صاحب کے بنگلے پر کرتا ہے۔ رہتا بھی وہیں ہے۔ کبھی کبھار آجاتا ہے۔ یہاں کام ہی کون سا ہے۔ اسے گئے دو مہینے سے اوپر ہو گئے۔ سنا ہے' اس نے ملتان میں کوئی دھندا شروع کر رکھا ہے۔" چوکیدار پر ایک بار پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔ دونوں ہاتھوں سے سینہ بھینچ کر دیر تک کھانستا رہا' جب ذرا قرار آیا تو گویا ہوا۔

"خانساماں کا کوارٹر خالی ہے' اسی میں سو جا۔"

چوکیدار آگے بڑھا اور اپنے کوارٹر پر پہنچ کر کنڈی کھٹکھٹانے لگا۔ ذرا دیر بعد دروازہ کھل گیا

س کی اوٹ دھندلا سا سایہ نظر آیا۔ یہ چوکیدار کی بیٹی نجیا تھی۔ اس نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز پوچھا۔ "کیا بات ہے بابا؟"

"خانساماں کے کواٹر کی چابی تو لا دے۔"

"کیا خانساماں چاچا آگیا؟"

"نہیں۔" چوکیدار نے جواب دیا۔ "اس کی منجی باہر نکالنی ہے۔"

ذرا دیر خاموشی رہی۔ لالی بھی چپ بیٹھا رہا۔ چوکیدار نے نجیا سے خانساماں کے کوارٹر کی کنجی ڑکر لالی کی جانب دیکھا اور اونچی آواز سے پوچھا۔

"چائے پیئے گا؟"

"چاچا! یہ چائے پینے کا کون سا ٹیم ہے۔"

"یہ سرکاری ریسٹ ہاؤس ہے۔ یہاں ہر وکھت چائے چلتی ہے۔" چوکیدار نے بے تکلفی سے ۔ "اب تو نجیا جاگ ہی گئی۔ فٹافٹ چائے بنا دے گی۔"

مگر لالی چائے پینے پر آمادہ نہ ہوا۔ "نہیں چاچا! میں نے چائے شائے نہیں پینی۔ نیند آرہی ۔"

"جیسی تیری مرضی۔" چوکیدار نے آہستہ سے پھر بیٹی کو مخاطب کیا۔ "دروازہ بند کر لے نجیا۔" نجیا نے خاموشی سے دروازہ بند کر لیا۔ چوکیدار لالی کے پاس آگیا۔ "آ میرے ساتھ۔" دونوں . کر درختوں کے نیچے چلنے لگے۔ چوکیدار کے ہاتھ میں لالٹین لٹک رہی تھی۔ خانساماں کا کوارٹر ب ہی تھا۔ چوکیدار نے تالا کھولا اور دروازے کا ایک پٹ کھول کر بولا۔ "اندر آجا۔" لالی اس ہم راہ کوارٹر میں چلا گیا۔ کوارٹر میں صرف ایک کمرہ تھا۔ کمرے کے آگے برآمدہ تھا۔ برآمدے ساتھ مختصر آنگن تھا۔ کوارٹر کی چار دیواری اونچی تھی۔ برآمدے میں ایک چارپائی بچھی تھی۔ یدار نے چارپائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کمرے میں بستر بھی ہے' بچھا لے۔ جی کرے تو کواٹر سے باہر نکال لے یا آنگن میں ڈال لے۔ سا جی چاہے اور جیسے جی چاہے آرام سے سو۔"

لالی بے نیازی سے بولا۔ "فکر نہ کر۔ میں سو جاؤں گا۔"

چوکیدار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے کے اندر جا کے ایک کھیس اور تکیہ اٹھا لایا۔ "جی میں ئے تو کھیس بچھا لے۔ دری میں نہیں لایا۔ بہت میلی ہو رہی ہے۔"

لالی نے کھیس اور تکیہ چوکیدار سے لیا اور نظریں جھکا کر نرم لہجے میں کہا۔ "چاچا! تو نے خاما خا

اتنی تکلیف اٹھائی۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "اب باتیں چھوڑ اور آرام سے سو۔ رات بہت ہو گئی۔" لالی خاموش رہا۔ چوکیدار کوارٹر سے چلا گیا۔

☆

دھوپ دیوار سے اتر کر کوارٹر کے آنگن میں پھیل گئی تھی۔ لالی نے آنکھیں کھول کر دیکھا چوکیدار چارپائی کے نزدیک کھڑا ہے۔ وہ اس کے لیے ناشتا لایا تھا۔ ناشتے میں چائے کے ساتھ حلوہ تھا' پراٹھے تھے۔

لالی آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور چپ چاپ ناشتا کرنے لگا۔ چوکیدار اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ "لاری سے جانا ہے تو فٹافٹ تیار ہو جا۔ میں سیکل پر ایس 'ڈی' او صاحب کے بنگلے جا رہا ہوں۔ سویرے سویرے صاب کا فون آیا تھا۔ مجھے بلایا ہے۔ میں تجھے لاری کے اڈے تک پہنچا دوں گا۔"

لالی دن میں سفر نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ وہ چوکیدار کے ساتھ جانے پر آمادہ نہیں ہوا۔ "چاچا! مجھے تو سخت نیند آ رہی ہے۔ کچھ دیر اور سو لینے دے۔ دن ڈھلے لاری سے چلا جاؤں گا یا تیرے بتائے ہوئے رستے پر نہر کے کنارے کنارے نکل جاؤں گا۔"

"نیند تو تیری آنکھوں سے صاف ٹپک رہی ہے۔ آرام سے سو لے۔ میں دوپہر تک واپس آجاؤں گا۔ دوپہر کی روٹی دونوں ساتھ ہی کھائیں گے۔"

لالی ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ "نہیں چاچا! مجھے اب اور کچھ نہیں کھانا۔ اپنے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

"جیسی تیری مرضی' اب اطمینان سے سو۔ میں چلا صاحب کے بنگلے کی طرف۔ واپسی پر آرام سے گل بات ہوگی۔"

وہ کوارٹر سے چلا گیا۔ لالی پھر بستر پر لیٹ گیا مگر سویا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد اٹھا۔ کوارٹر کے دروازے پر گیا۔ دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ لالی نے اس کی آڑ سے دیکھا' چوکیدار سائیکل کا ہینڈل سنبھالے ریسٹ ہاؤس سے باہر نکل رہا ہے۔ اس نے سائیکل ایک طرف کھڑی کی۔ گیٹ بند کیا اور سائیکل پر سوار ہو کر چل دیا۔ لالی چند لمحے دروازے کے قریب کھڑا رہا' پھر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ دن خانساماں کے کوارٹر میں گزارہ جائے اور سورج ڈوبنے کے بعد جھٹ پٹے میں گوردا پورہ کے رستے نہر کے کنارے کنارے چلتا ہوا قادر آباد اسٹیشن پہنچ جائے۔ وہ رات بھر سفر

کر کے سویرا ہونے سے پہلے رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ لالی کچھ دیر تو کروٹیں بدلتا رہا' پھر دوبارہ گہری نیند سو گیا۔

دن ڈھلے آنکھ کھلی۔ دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر پہنچ چکی تھی۔ کوارٹر میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا تھا اور چوکیدار اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔ لالی نے چوکیدار کو یکھا تو جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چوکیدار نے مسکرا کر کہا۔ "دو بار پہلے آیا اور تجھے بے خبر سوتا پایا' جوانی کی نیند بھی کیا نیند ہوتی ہے۔" اس نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔ "لے گرم گرم چائے پی۔ بہت سو چکا' اب شام ہو رہی ہے۔"

لالی نے چائے کی پیالی سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ "چاچا! تو کب واپس آیا؟"

"میں تو دوپہری کو آگیا تھا۔" چوکیدار اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ "سیدھا تیرے پاس آیا ھا۔ پر تو تو بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔"

"مجھے جگایا کیوں نہیں؟"

"کیا کرتا جگا کر' لاریوں کی سویرے سے ہڑتال ہے۔ ایک بھی لاری سڑک پر نہیں چل رہی۔ جاتا کیسے؟"

"لاریوں کی ہڑتال کیوں ہے؟"

"پولیس نے کسی لاری کا چالان کیا اور اس کے ڈریور کو پکڑ کر تھانے لے گئی۔ سنا ہے' وہاں س کی دبا کے پٹائی کی گئی اور حوالات میں بند بھی کر دیا۔" چوکیدار نے بتایا۔ "لاری والوں نے ڑتال کر دی۔ ڈاکیا آیا تھا۔ بتاتا تھا' لاریوں کے مالکوں اور پولیس کے افسروں کے درمیان بات یت ہو رہی ہے پر ڈریور بہت بگڑے ہوئے ہیں۔ وہ نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے۔ تھانے والوں کے لاف سخت کارروائی کی جائے۔ ایسا لگتا ہے' ابھی کچھ طے نہیں ہوا۔ سڑک پر کوئی لاری نظر نہیں تی۔"

"میں گوردا پورے کے رستے نہر کے کنارے کنارے پیدل چلا جاؤں گا۔ تانگا مل گیا تو پکڑ لوں ا۔ کچھ رستہ تانگے سے کٹ جائے گا۔" لالی نے نظریں اٹھا کر ڈوبتے ہوئے سورج کی دھوپ یکھی' چائے کی پیالی ختم کر کے ایک طرف رکھی اور چارپائی سے نیچے اترتے ہوئے بولا۔ "مجھے ب چلنا چاہیے۔ شام ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔"

"کیوں خاما خا اس چکر میں پڑتا ہے۔ رات بھر یہاں اور ٹھہر جا۔ سویرے سرکاری گڈی ایس' ی' او صاحب کی ڈاک لے کر لہور جائے گی۔ تو چاہے تو سیدھا اوکاڑے چلا جا یا کادر آباد۔ دونوں

ہی رستے میں پڑیں گے۔ میں نے ڈریور سے بات کرلی ہے۔ وہ کل صبح گڈی لے کر یہاں پہنچ جائے گا۔" چوکیدار زیرِ لب مسکرایا۔ "ڈریور کو چائے پانی کے لیے ۸ آنے دے دینا۔ تیرا بھی کام بن جائے گا، وہ بھی خوش ہوجائے گا۔"

"نہیں چاچا! میں پیدل ہی چلا جاؤں گا۔" لالی رضامند نہ ہوا۔ "فکر نہ کر۔ میں آرام نال کادر آباد پہنچ جاؤں گا۔"

چوکیدار لمحے بھر مشتبہ نظروں سے لالی کو دیکھتا رہا۔ "بچے! کوئی واردات کرکے تو نہیں آیا؟ تیری باتوں سے تو یہی پتہ چلتا ہے۔ سچ سچ بتا، اصل بات کیا ہے؟"

لالی اس کی بات سن کر پہلے تو ذرا پریشان ہوا پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ مسکرا کر بولا۔ "نہیں چاچا! ایسی کوئی گل بات نہیں۔"

"فیر کیا بات ہے جو تو پیدل جانے پر اڑا ہوا ہے؟ ایک دو میل نہیں، ۲۰ میل سے اوپر کا سفر ہے۔ جب سرکاری گڈی میں بیٹھ کر آرام نال کادر آباد پہنچ سکتا ہے تو خامخا اس چکر میں کیوں پڑرہا ہے؟"

لالی نے اس کا شبہ دور کرنے کے لیے جھٹ کہا۔ "تو کہتا ہے تو سرکاری گڈی ہی سے چلا جاؤں گا۔ آج رات بھی تیرے پاس ٹھیر جاؤں گا۔"

"باہر آجا۔ یہاں اندھیرا بھی ہوگیا ہے۔" چوکیدار اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "باہر منجی پر بیٹھ کر گپ شپ ہوگی۔ وہیں بیٹھ کر روٹی ٹکر بھی کھالیں گے۔"

چوکیدار بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ لالی بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں کوارٹر سے نکل کر احاطے میں آگئے۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ شام کا دھندلکا ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ دونوں آہستہ آہستہ اس چارپائی کے نزدیک پہنچے جو چوکیدار کے کوارٹر کے سامنے درختوں تلے بچھی تھی۔ لالی چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مگر چوکیدار نہیں بیٹھا۔ وہ کوارٹر کے اندر گیا۔ ذرا دیر بعد واپس آیا تو جلتی ہوئی لالٹین اس کے ہاتھ میں لٹک رہی تھی۔ مگر لالی کی جانب آنے کے بجائے وہ ریسٹ ہاؤس کی دو منزلہ عمارت کی طرف گیا اور اس میں داخل ہوگیا۔ لالی خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے دیکھا، ریسٹ ہاؤس کی بالائی منزل کے ایک دریچے کے پیچھے روشنی جھلملا رہی ہے۔ چوکیدار نے وہاں لیمپ روشن کردیا تھا۔ عمارت سے نکل کر وہ لالی کے پاس آیا۔ اس نے لالٹین ایک طرف رکھی اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔

اندھیرا اب بڑھ گیا تھا۔ ریسٹ ہاؤس پر گہرا سناٹا چھایا تھا۔ لالی نے سناٹے کی شدت محسوس

کرتے ہوئے پوچھا۔ "چاچا! یہاں تو ابھی سے اتنا سناٹا ہے۔ لگتا ہے جیسے آدھی رات ہوگئی۔ یہاں تیرا جی نہیں گھبراتا؟"

"گھبراتا تو ہے پر نوکری جو کرنی ہوئی۔ اکیلے میں جی نہ گھبراتا تو تجھے اس طرح کیوں روکتا؟ آج کل گھر والی بھی نہیں ہے۔ تیرے ساتھ بات چیت میں ٹیم کٹ جائے گا۔"

لالی نے اندھیرے میں ادھر ادھر نظریں گھما کر کہا۔ "دیکھ تو، یہاں کتنی ویرانی ہے۔ لگتا ہے جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہیں۔"

پت جھڑ کے مارے ہوئے درختوں سے زرد زرد پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ ہوا کا جھونکا آتا۔ گہری خاموشی میں ان کی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوتی۔ یکایک چوکیدار کو کھانسی کا ٹھسکا لگا۔ وہ آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ چند لمحے کھانستا رہا۔ اس نے گہری سانس بھری اور بجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

"ایک زمانہ تھا، جب ریسٹ ہاؤس میں کوئی نہ کوئی ضرور ٹھیرا رہتا، خوب چہل پہل ہوتی۔ ایک جاتا، دوسرا آتا۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا، مجھے بھی صاحب لوگوں کے لیے اپنی منجی دینی پڑتی۔ تب بھی کتنے ہی افسر واپس چلے جاتے۔ دن کا الگ، رات کا الگ، پورا سٹاف تھا۔" وہ افسردہ ہوگیا۔ "پر اب تو یہاں الو بولتا ہے۔"

"ایسا کیوں ہوگیا چاچا؟"

چوکیدار نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش بیٹھا رہا۔ لالی بھی ذرا دیر تک خاموش رہا، پھر اس نے کرید کر پوچھا۔ "کوئی خاص بات ہوگئی؟"

"خاص ہی بات کہہ لو۔" چوکیدار نے آہستہ سے کہا۔ "کہتے ہیں ریسٹ ہاؤس میں رات کو کسی زنانی کی روح بھٹکتی پھرتی ہے۔"

"روح بھٹکتی پھرتی ہے؟ نہیں چاچا! کوئی اور بات ہوگی۔"

"اللہ جانے، کہتے یہی ہیں، آدھی رات کے بعد وہ نظر آتی ہے۔ کبھی زور زور سے چیختی ہے کبھی روتی ہے۔ کبھی ٹھٹھا مار کر ہنستی ہے۔"

"دوسروں کی چھوڑ، اپنی بتا۔ کبھی اسے دیکھا بھی؟"

"نہ جی، نہ میں نے اسے دیکھا نہ اس کی آواز سنی۔ ویسے شبہ تو مجھے کئی بار ہوا پر ایمان لگتی بات یہ ہے، ٹھیک سے کچھ دیکھا نہیں۔ اپنے کو ویسے ہی رات کو کم دکھائی دیتا ہے۔ دوسرے لوگوں نے اسے دیکھا ہے۔ کئی تو اسے دیکھ کر ڈر کے مارے چیخنے چلانے لگے۔ کسی کی گھگھی بندھ گئی۔ کوئی بے ہوش ہوگیا۔ نہر کے محکمے کا ایک افسر ایسا ڈرا کہ بیمار پڑ گیا۔ کتنے ہی دن اسپتال میں رہا۔ بس جی

یہی وجہ ہے لوگ یہاں ٹھیرنے سے گھبراتے ہیں۔ "

لالی نے یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔ "تیری گل سمجھ نہیں آئی۔ " پھر کچھ سوچ کر اس نے دریافت کیا۔

"یہ چکر شروع کب سے ہوا؟"

"یہاں ایک زنانی کا خون ہوگیا تھا۔ اس کے بعد ہی یہ چکر شروع ہوا۔ " چوکیدار آہستہ آہستہ بتانے لگا۔ "اب تو یہ بات پرانی ہوگئی۔ ۳ سال سے بھی اوپر ہوگئے۔ " اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "مجھے اب تک یاد ہے۔ جاڑوں کی رات تھی۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ شام ہی سے بونداباندی ہو رہی تھی۔ ہوا بھی تیز تھی۔ فیر خوب زور کی بارش ہونے لگی۔ ریسٹ ہاؤس اس روز بالکل خالی تھا۔ ایک ذیل دار ٹھیرا ہوا تھا۔ وہ بھی شام ہونے سے پہلے ہی جاچکا تھا۔ کوئی دس بجے رات کو موٹر میں ایک افسر آیا۔ کوئی وڈا افسر لگتا تھا۔ لہور سے آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی گھر والی بھی تھی۔ میں اس روز اکیلا ہی تھا۔ خانساماں بیمار تھا۔ رات والا بیرا بھی ڈیوٹی پر نہیں آیا تھا۔ انچارج بھی غائب تھا۔ "

"چاچا! مجھے تو آج بھی تو اکیلا ہی نظر آرہا ہے۔ خانساماں تو ایس۔ ڈی۔ او کے بنگلے پر کام کرتا ہے۔ ایک بیرا چھٹی پر ہے' دوسرے بیرے اور انچارج کہاں چلے گئے؟"

"جب کوئی آتا ہی نہیں تو دو بیروں کی چھٹی کردی گئی۔ دونوں انچارجوں کا دوسرے محکموں میں تبادلہ کردیا گیا۔ یہاں کام ہی کون سا ہے۔ سمجھو' اب تو میں اکیلا ہی یہاں رہ گیا ہوں۔ " چوکیدار پر ایک بار پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔ دیر تک کھانستا رہا۔ جب کھانس چکا تو بتانے لگا۔ "ہاں' تو میں یہ کہہ رہا تھا۔ اس رات میں اکیلا ہی ڈیوٹی پر تھا۔ صاحب کے آنے کے بعد میں نے نیچے کے کمرے میں اس کے ٹھیرنے کا بندوبست کردیا۔ آتش دان میں کوئلے سلگا کر کمرہ خوب گرم کردیا۔ گیارہ بجے تک میں صاحب کے کمرے کے آس پاس ہی رہا۔ صاحب اور اس کی گھروالی دونوں خوش خوش تھے۔ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ "

لالی چپ بیٹھا چوکیدار کی باتیں سن رہا تھا۔ چوکیدار کہتا رہا۔ "جب صاحب کے کمرے میں خاموشی چھاگئی اور روشنی بھی دھیمی پڑگئی تو میں اپنے کواٹر میں آگیا۔ صاحب کا ڈریور بھی میرے ساتھ آگیا۔ اچھا گبھرو جوان تھا' یہ لمبا چوڑا۔ طبیعت کا بھی بہت بھلا تھا۔ چوی پنجی سال سے زیادہ کا نہ ہوگا۔ میرے ساتھ کواٹر میں بیٹھا آگ تاپتا رہا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے اسے چائے بھی پلائی۔ "

"وہ بنگلے میں نہیں سویا؟"

"چپ کر کے سنتا جا۔ " چوکیدار کو لالی کی مداخلت ناگوار گزری۔ اس نے منہ بگاڑ کر اسے جھڑک دیا۔ "کوئی ایک بجا ہوگا۔ ڈریور میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔ یہ زینہ دیکھ رہا ہے۔ " اس نے لوہے کے اس زینے کی جانب اشارہ کیا جو دو منزلہ عمارت کے عقبی حصے میں باہر سے اوپر کی منزل پر گیا تھا۔ "اس زینے سے میں نے اسے اوپر جاتے دیکھا۔ وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں گیا اور میں نے باہر نکل کر بنگلے کا ایک رونڈ لگایا۔ ابھی تک ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ واپس آکر میں نے کواٹر کا دروازہ بند کیا اور آگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ " چوکیدار چند لمحے خاموش رہا' پھر اس نے لالی کو مخاطب کیا۔

"بیبے! سگریٹ ہو تو پلا دے۔ "

لالی نے ایک سگریٹ سلگا کر اسے دی اور اپنی سگریٹ سلگا کر آہستہ آہستہ کش لگانے لگا۔ چوکیدار نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ "اب آگے کی سن۔ ڈریور کے جانے کے بعد میں دیر تک جاگتا رہا۔ جانے کتنی دیر ہوگئی۔ ذرا سی جھپکی آئی تھی کہ اوپر کی منزل پر ڈز' ڈز دو فیر ہوئے۔ میں نکل کر باہر آیا۔ بارش بند ہوچکی تھی۔ مگر ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ گولی کی آواز سن کر خانساماں بھی گھبرا کر اپنے کواٹر سے نکل آیا۔ اسے بخار تھا' وہ کمبل اوڑھے تھرتھر کانپ رہا تھا۔ ہم دونوں ڈرتے ڈرتے بنگلے کے اندر گئے۔ وہاں بالکل خاموشی تھی۔ اوپر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں' لیمپ کی دھیمی دھیمی روشنی میں ڈریور اور صاحب کی گھروالی دونوں خون میں لت پت پڑے ہیں۔ "

"دونوں ہی مرگئے؟"

"نہیں۔ " چوکیدار نے بتایا۔ "زنانی تو بستر پر پڑی تھی۔ اس کا سر پلنگ سے نیچے جھول رہا تھا۔ وہ مرچکی تھی اور بالکل ننگی تھی۔ میں نے جھیتی نال اس کے بدن پر چدر ڈال دی۔ ڈریور دیوار کے پاس زمین پر پڑا تھا۔ وہ بھی ننگا تھا۔ مگر زندہ تھا۔ دھیرے دھیرے سانس لے رہا تھا۔ گولی اس کے کندھے پر لگی تھی۔ میں نے نیچے سے چدر لا کے اس کا ننگا بدن ڈھک دیا۔ پستول بھی کمرے میں ایک طرف پڑا تھا۔ "

"گولی کس نے چلائی تھی؟"

"صاحب نے چلائی تھی۔ ڈریور یہی کہتا تھا۔ ہوا یوں کہ ذرا ہی دیر بعد اسے ہوش آگیا۔ اس نے پینے کو پانی مانگا۔ میں نے اسے پانی پلایا۔ پوچھا تو اس نے صرف اتنا بتایا کہ صاحب نے کمرے میں گھستے ہی ڈز ڈز فیر کرنے شروع کردیے۔ "

لالی کھسک کر چوکیدار کے قریب ہوگیا۔ "اور صاب کیا کہتا تھا؟"

"ہم دونوں تھوڑی دیر بعد نیچے آئے۔ صاحب کمرے میں تھا۔ پر دروازہ اندر سے بند تھا۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ دروازہ کھٹکھٹایا تب بھی وہ باہر نہ آیا۔ ہم سے اس نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ کمرے کے اندر بیٹھا ٹیلی فون پر کسی سے دھیرے دھیرے باتیں کر رہا تھا۔"

لالی کی سمجھ میں ابھی تک پوری بات نہیں آئی تھی۔ "چاچا' چکر کیا تھا؟"

چوکیدار مسکرا کر بولا۔ "ارے بھئی! گل ایسہ تھی' ڈریور سے صاحب کی گھروالی کی پہلے سے لگ سٹ تھی۔ صاحب تھا پکی عمر کا اور اس کی لگائی تھی جوان پٹھیا۔ میں تو کہتا ہوں دوسری تھی۔ مگر یہ بھی سننے میں آیا کہ گھروالی نہیں تھی' صاحب اسے پھانس کر لایا تھا۔ اسی کے محکمے میں کام کرتی تھی۔ اللہ جانے کون سی بات سچ ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں' پر اتنا ضرور ہے وہ صاحب کے جوڑ کی ہرگز نہیں تھی۔"

"پر وہ اوپر ڈریور کے پاس پہنچی کیسے؟"

"تو بھی کیا بچوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ خود گئی تھی۔ پہلے سے پروگرام بنا رکھا ہوگا۔ ہوا یوں کہ صاحب نے دبا کے شراب پی۔ خانساماں کا کہتا ہے' زنانی نے جان بوجھ کر اسے زیادہ ہی پلا دی۔ خانساماں ٹھیک ہی کہتا ہے۔ تھی بھی وہ بہت فروٹ۔ بانو نام تھا اس کا۔ ایسی آنکھیں مٹکا مٹکا کر باتیں کرتی تھی' میں تجھے کیا بتاؤں۔ بھرپور جوان تھی' اوپر سے رات کو بھی خوب سرخی پوڈر لگائے ہوئے تھی۔"

چوکیدار کو پھر کھانسی کا ٹھسکا لگا۔ تھوڑی دیر کھانستا رہا' پھر بتانے لگا۔ "صاحب جب نشے میں دھت ہو کر سوگیا تو وہ چپکے سے اٹھی اور ڈریور کے پاس چلی گئی۔ ادھر صاحب کی آنکھ کھل گئی' وہ اسے ڈھونڈتا ہوا اوپر پہنچا۔ کچھ شبہ اسے ضرور تھا۔ تبھی تو بھرا ہوا پستول لے کر گیا تھا۔ دونوں کو ایک ہی بستر پر دیکھا تو غصے سے پاگل ہوگیا۔ گولی چلا کر دونوں کو وہیں ڈھیر کر دیا؟"

"پولیس شولیس تو نہیں آئی؟"

"آئی تھی۔" چوکیدار نے جواب دیا۔ "صاحب نے خود ٹیلی فون کر کے پولیس کو بلایا تھا۔ کمرہ بند کر کے پولیس کے ساتھ اس نے جانے کیا کھسر پھسر کی۔ بس جی رات ہی کو پولیس نے ساری تفتیش بھی پوری کر لی۔ لکھا پڑھی کی۔ تفتیشی رپوٹ تیار ہوگئی تو اس پر مجھ سے اور خانساماں سے بھی انگوٹھا لگوالیا۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے لاش بھی چلی گئی' زخمی ڈریور بھی گیا اور صاحب بھی اپنی گڈی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ دن چڑھے تھانے دار دو کانسٹیبلوں کے ساتھ آیا۔ اوپر والے کمرے کا فرش دھلوایا۔ جہاں جہاں خون کے دھبے تھے' تھانے دار نے اپنے سامنے صاف کروائے اور خون میں ڈوبے ہوئے سارے کپڑے اور بستر بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ ریسٹ ہاؤس کے سارے بندوں میں سے کسی کو بھی اندر نہ آنے دیا۔"

چوکیدار خاموش ہوگیا۔

لالی بھی خاموش بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "پھر کیا ہوا چاچا؟"

"ہونا کیا تھا؟" وہ تلخی سے بولا۔ "پولیس نے سارا معاملہ دبا دیا۔ بعد میں سننے میں آیا۔ گولی' پستول صاف کرتے ہوئے اتفاکیہ چل گئی تھی۔ ڈریور بھی اسپتال میں کچھ دنوں رہ کر ٹھیک ہوگیا۔"

چوکیدار نے ایک بار پھر کھنکار کر گلا صاف کیا۔ زیر لب مسکرایا۔ "گل ایسہ ہے جی! وڈے بندوں کی بات بھی وڈی ہوتی ہے۔ پولیس بھی ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔ کنون شنون بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اپنے جیسا کوئی مموئی بندہ ہوتا تو کب کا پھانسی پر لٹک چکا ہوتا۔ ہڈیاں بھی اب تک کبر میں گل سڑ کر برابر ہوگئی ہوتیں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے چاچا۔" لالی نے گہری سانس بھری۔ "کنون بھی تو ایک نہیں۔ وڈوں کا الگ' چھوٹوں کا الگ۔"

چوکیدار لمحے بھر خاموش رہ کر بتانے لگا۔ "۲۵ سال سے اوپر ہوگئے یہاں کام کرتے ہوئے۔ انگریزوں کے زمانے سے ملازم ہوں۔ ان آنکھوں نے یہاں کیا کیا ہوتے نہیں دیکھا۔" اس کے لہجے میں ہلکا ہلکا کرب تھا۔ "پر وہ بھی کیا دن تھے۔ ہر وکھت بھاگ دوڑ مچی رہتی۔ رات کو بھی دن کا سماں ہوتا۔ اب رات آتی ہے تو ریسٹ ہاؤس کبرستان بن جاتا ہے۔ بانو کا خون ہونے کے بعد سے ایسا اجڑا کہ لوگ ادھر آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ نور محمد بیرا ایک پیر بابا کو بھی لایا تھا۔ یہ لمبی داڑھی تھی ان کی۔ انھوں نے گول کمرے میں بیٹھ کر چلہ کھینچا۔ چار کیلیں پڑھ کر دیں۔ ریسٹ ہاؤس کے چاروں کونوں میں وہ کیلیں گاڑی بھی گئیں' پر کچھ بھی نہ ہوا۔"

☆

اندھیرے میں نجیا کی آواز ابھری۔ "بابا! روٹی تیار ہے۔ لے آؤں؟" وہ کوارٹر کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ لالٹین کی دھندلی روشنی میں پرچھائیں کے مانند نظر آ رہی تھی۔ چوکیدار مسکرا کر بولا۔ "لو جی! باتوں میں روٹی کا دھیان ہی نہ رہا۔" اس نے لالی کی جانب دیکھا۔ "تو نے تو دوپہر کی روٹی بھی نہیں کھائی۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے اونچی آواز میں نجیا سے کہا۔

"وہیں ٹھہر۔ میں خود روٹی لینے آ رہا ہوں۔"

وہ اپنے کوارٹر کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا اور اندر داخل ہوگیا۔ ریسٹ ہاؤس پر چھائی ہوئی گہری خاموشی میں صرف خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے۔ رات اب اور سیاہ ہوگئی تھی۔ لالی خاموش بیٹھا رہا۔ البتہ یہ بات ضرور کھٹکی کہ چوکیدار نے نجیا کو آنے نہیں دیا۔ خود ہی کھانا لینے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد چوکیدار لکڑی کی ٹرے میں کھانا لے کر آیا اور چارپائی پر رکھ دیا۔ اس نے لالٹین کی لو اونچی کی اور اسے قریب کے ایک درخت کی شاخ سے لٹکا دیا۔ اس نے لالی کی طرف مڑ کر دیکھا۔ "اب تو سنبھل کر بیٹھ جا۔ میں پانی اور گلاس لے کر آتا ہوں۔" چوکیدار ایک بار پھر کوارٹر میں گیا۔ واپس آیا تو اس کے ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا المونیم کا جگ تھا' دوسرے میں گلاس دبا تھا۔ جگ اور گلاس اس نے چارپائی کے قریب فرش پر رکھ دیا اور خود چارپائی پر بیٹھ گیا۔

دونوں اطمینان سے کھانا کھانے لگے۔ کھانا مزیدار تھا۔ لالی بھوکا بھی زیادہ تھا۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ مگر چوکیدار کھانا کھاتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ ریسٹ ہاؤس کے بارے میں چھوٹے موٹے واقعات سناتا رہا۔ خانساماں اور بیروں کا تذکرہ کرتا رہا۔ دونوں کھانے سے فارغ ہوئے تو چوکیدار نے کھانے پینے کے برتن اٹھا کر کوارٹر میں پہنچائے اور واپس آکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

لالی کے پیکٹ میں ابھی چند سگریٹیں موجود تھیں۔ اس نے اور چوکیدار نے ایک ایک سگریٹ سلگائی اور آہستہ آہستہ کش لگانے لگے۔

دونوں تمباکو نوشی سے لطف اندوز ہو رہے تھے' اسی اثناء میں ایک بار پھر نجیا کی آواز ابھری۔ وہ چوکیدار سے کہہ رہی تھی۔

"بابا! بتی بجھ گئی۔ ماچس دے دے۔"

لالی نے مڑ کر کوارٹر کی جانب دیکھا۔ لالٹین کی ہلکی روشنی میں درختوں کے تلے اسے نجیا نظر آئی۔ وہ اسی طرف آرہی تھی۔ روشنی اتنی کم تھی کہ لالی اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ مگر قد و قامت دیکھ کر اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ بھرے بھرے بدن کی نوجوان لڑکی ہے۔ وہ چند ہی قدم آگے بڑھی ہوگی کہ چوکیدار نے چارپائی پر رکھی ہوئی لالی کی ماچس اٹھائی اور لپک کر نجیا کے پاس پہنچا۔ اسے ماچس دی اور واپس آگیا۔

نجیا کوارٹر میں چلی گئی۔ کچھ دیر لالی اور چوکیدار چپ بیٹھے سگریٹ کے کش لگاتے رہے' آخر چوکیدار نے پوچھا۔

"کیا کادر آباد جانا ضروری ہے؟ میں تو کہتا ہوں سیدھا ڈیوٹی پر اوکاڑے چلے جا۔"

"اوکاڑے بھی جاؤں گا پر کادر آباد دو روز ٹھیر کر جاؤں گا۔ ایک دوست سے ملنا ہے' وہ میرا نتظار کر رہا ہوگا۔"

"سیدھا اوکاڑے جاتا تو میرا ایک کام کر دیتا۔ اوکاڑے کے نزدیک ہی چک ٦۔ بی ہے' وہاں۔"

وکیدار نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ رات کے سناٹے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے اپنی ت ادھوری چھوڑ دی' جھٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ درخت کی شاخ سے لٹکتی ہوئی لالٹین اتار کر ہاتھ میں نبھالی اور عمارت کی جانب تیزی سے بڑھا۔ وہ عمارت کے اندر چلا گیا۔

ذرا دیر بعد چوکیدار کی آواز ابھری۔ مگر اس قدر دھیمی تھی کہ لالی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ موش بیٹھا رہا۔ چند منٹ بعد چوکیدار واپس آیا تو لالی نے پوچھا۔

"کس کا ٹیلیفون تھا؟"

"خانساماں تھا۔" چوکیدار نے لالٹین نیچے رکھی اور چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ایس' ڈی' او حب کے بنگلے سے بول رہا تھا۔"

"کیا کہتا تھا؟"

"وہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں یہاں پہنچ جائے گا۔ پی ڈبلیو ڈی کا کوئی افسر ریسٹ ہاؤس میں ٹھیرنے آرہا ہ۔ خانساماں بھی اس کے ساتھ ہی آئے گا۔ ابھی تو وہ ایس' ڈی' او کے بنگلے پر ہے۔"

لالی یہ سنتے ہی پریشان ہوگیا۔ اس نے خود کو سنبھالا' دبی زبان سے پوچھا۔ "خانساماں تو اپنے ہی ڑ میں ٹھیرے گا نا؟"

"ٹھیرے گا تو وہ اپنے ہی کواٹر میں۔ تو بھی اسی کے ساتھ ٹھیر جانا۔" پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "پر ، کے پاس منجی تو ایک ہی ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "بیرے کا کواٹر بند ہے۔ چابی بھی ۂ ساتھ لے گیا ہے۔" چوکیدار کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

"چاچا! تو خامخا پریشان نہ ہو۔ اب مجھے جانے دے۔ روٹی بھی میں نے کھالی اور رات بھی زیادہ ، گزری۔" لالی نے لالٹین کی جانب ہاتھ بڑھا کر گھڑی دیکھی۔ "ابھی تو نو بھی نہیں بجے۔ یوں کی رات ہے۔ میں......"

ہوکیدار اس کی بات کاٹ کر کسی قدر تیکھے لہجے میں بولا۔ "تو بار بار جانے کی گل کیوں کرتا ہے؟ رات بھر ہی تو یہاں ٹھیرنا ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں کہیں بھی رات گزار سکتا ہے۔"

تو برا مناتا ہے تو نہیں جاؤں گا۔" لالی نے چوکیدار کے لہجے کی تلخی سے مرعوب ہو کر کہا۔ ے میں نے تیری پریشانی کے خیال سے ایسا سوچا تھا۔"

"ایسا کر، تو اس منجی پر سو جا۔ میں ادھر لیٹ جاؤں گا۔" اس نے بنگلے کے عقبی حصے کے برآمدے کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "صاحب کے آنے کے بعد آدھی سے زیادہ رات تو اسی کی اردلی میں کٹ جائے گی۔ ویسے مجھے رات کو نیند ہی کہاں آتی ہے۔ سینکڑوں راتیں جاگتے گزر گئیں۔ ایک رات اور جاگتے گزر جائے گی تو کیا ہو جائے گا۔ ویسے برآمدے کا فرش صاف ستھرا ہے۔ روزانہ سویرے پورے ریسٹ ہاؤس کی صفائی ہوتی ہے۔"

"یہ نہیں ہو گا چاچا! میں منجی پر سوؤں اور تو رات بھر جاگتا رہے یا برآمدے کے فرش پر سوئے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟؟"

چوکیدار چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ "ویسے تو ریسٹ ہاؤس میں کئی کمرے ہیں۔ صاحب کے آنے کے بعد بھی خالی رہیں گے۔ تو کسی میں بھی رات بھر کے لیے ٹھیر سکتا ہے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کو رکا۔ "پر صاحب کو پتہ چل گیا تو جانے وہ کیا سوچے۔ یہ بھی پتہ نہیں، طبیعت کا کیسا ہے۔"

"میرا کہا مان تو مجھے جانے دے۔" لالی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "خاما خا ضد نہ کر۔"

"ضد کی بات نہیں۔ رات کے سفر کے لیے یہ رستہ ٹھیک نہیں۔ ادھر ڈکیتی کی کئی وارداتیں ہو چکی ہیں۔ پچھلے ہی ہفتے ریلوے کراسنگ پر ڈاکوؤں نے لاری لوٹ لی تھی۔ سنا ہے، بعد میں پولیس کا ان سے ٹاکرہ بھی ہوا۔ ایک ڈاکو مارا گیا۔ پولسیے بھی زخمی ہوئے پر ابھی تک پولیس کسی کو پکڑ نہیں سکی۔"

"سنا تو میں نے بھی ہے۔ پر اپنے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ ویسے میں ڈرنے والا نہیں۔" لالی چند لمحے خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ اس نے گردن اونچی کی اور سینہ تان کر مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔ "تو کہے تو میں اوپر والے اس کمرے میں جا کر لیٹ جاؤں جس میں بانو کا خون ہوا تھا؟"

چوکیدار ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔ "کمرہ تو وہ فسٹ کلاس ہے۔ ہوا بھی خوب آتی ہے۔" اسی وقت اوپر کھڑکی کے پیچھے جلتا ہوا لیمپ زور سے بھڑکا اور بجھ گیا۔ اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ درختوں تلے خشک پتے آہستہ آہستہ کھڑکھڑائے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی دبے دبے قدموں چل رہا ہو۔

چوکیدار زور سے کھنکارا۔ اس نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔

"نہیں جی! اس کمرے میں تیرا سونا ٹھیک نہیں۔"

"چاچا! تجھے اس کمرے میں کبھی ڈر لگا؟"

"میری بات چھوڑ۔" چوکیدار بے نیازی سے بولا۔ "میں کیا، میری نجیا تک نہیں ڈرتی۔ آج

شام اس کمرے کی صفائی کر رہی تھی اور میں تو روز اوپر کی منزل پر لیمپ جلانے جاتا ہوں۔ کچھ پہلے تیرے سامنے لیمپ جلانے گیا تھا۔"

"تب تو میں اسی کمرے میں جا کر سوؤں گا۔" لالی کھل کر مسکرایا۔ "ارے چاچا! ڈرنا شرنا کیا۔ ۔ زنانی ہی سے تو نمٹنا ہے اور زنانی کا معاملہ یہ ہے، ذرا ہاتھ لگا اور وہ نئی گھوڑی کی طرح بدک کر باتی ہے۔"

"کہتے ہیں چڑیل سے کبھی ٹاکرا ہو جائے تو اسے کابو کرنے کا ایک ہی گر ہے اور وہ یہ ہے، جھٹ ، کی چوٹی پکڑ لو۔ فیر تو وہ ہاتھ جوڑے گی، پیر پڑے گی۔"

"یہ تو زبردست ترکیب بتائی۔" لالی ہنس کر بولا۔ "اب تو میں اسی کمرے میں رات گزاروں ۔"

"ایک گل اور بھی ہے۔ اس کمرے میں بانو کی واردات کے بعد سے نہ کوئی مہمان جاتا ہے نہ رتا ہے۔ ویسے میں کسی کو ادھر جانے ہی نہ دوں گا اور ادھر جائے گا بھی کون۔ نیچے کی منزل کے ے کمرے خالی ہیں۔ لمبے چوڑے بھی ہیں۔ ان میں فرنیچر بھی زیادہ عمدہ لگا ہے۔"

"تو فیر یہ طے ہو گیا، میں اسی کمرے میں سوؤں گا۔" لالی نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے نیند بھی ، لگ رہی ہے۔"

لالی چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چوکیدار بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے لالٹین اٹھائی۔ دونوں ٹ ہاؤس کے عقبی حصے کی جانب بڑھے۔ لالی نے قریب جا کر دیکھا کہ برآمدے سے ذرا ہی لے آہنی زینہ ہے۔ اس نے گردن اونچی کی۔ زینے کے آخری سرے پر نظر ڈالی۔ کمرے کا بند ازہ دھندلی روشنی میں اس کے سامنے تھا۔ راستہ باہر سے تھا اور کمرے کی کھڑکی کے قریب سے ، کے گھنے درخت کی موٹی سی ڈال اس طرح گزرتی تھی کہ خطرے کے وقت وہ آسانی سے اس ذریعے ریسٹ ہاؤس کی چاردیواری سے باہر جا سکتا تھا۔ اس پہلو سے لالی کو وہ کمرہ زیادہ محفوظ مناسب لگا۔

دونوں آہستہ آہستہ زینے کے پاس پہنچ گئے۔ چوکیدار زینے پر چڑھنے لگا۔ لالی بھی اس کے پیچھے چلا۔

زینہ طے کر کے دونوں اوپر پہنچے۔ چوکیدار نے دروازہ کھولا۔ دونوں اندر گئے۔ کمرہ صاف ستھرا دیواروں پر اجلی قلعی تھی۔ کھڑکی کے برابر پلنگ تھا۔ اس پر اجلا بستر بچھا تھا۔ پلنگ سے ذرا ہٹ یز اور دو کرسیاں تھیں۔ میز پر لیمپ رکھا تھا۔ چوکیدار نے ماچس جلا کر لیمپ روشن کیا اور کھڑکی

کے پٹ کھول دیئے۔ کھڑکی کھلتے ہی کمرے میں ہوا کے نرم نرم جھونکے آنے لگے۔ چوکیدار نے کہا۔

"اب تو سو جا۔ تجھے سویرے اٹھنا بھی ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے فوراً آواز دینا۔ میں تو جاگ ہی رہا ہوں۔ جھٹ آجاؤں گا۔ گھبرانے کی کوئی گل نہیں۔"

"فکر نہ کر چاچا! مجھے ڈر خوف نہیں لگتا۔"

"لگتا تو جی دار اور زور آور ہے۔ صاحب لوگوں کی طرح نہیں۔ وہ تو اپنے سائے سے بھی ڈر جاتے ہیں۔" اس نے نظر بھر کر لالی کا چہرہ دیکھا۔ "سچ پوچھ تو میں خود چاہتا تھا' تیرے جیسا کوئی زور آور جوان اس کمرے میں ٹھہرے۔ یہ بھوت پریت کا چکر ختم ہو اور صاحب لوگوں کا آنا جانا پہلے کی طرح شروع ہو۔"

چوکیدار کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "جب سے یہ چکر شروع ہوا ہے' اپنا تو سمجھو کباڑا ہو گیا۔ صاحب لوگ آتے تھے تو بخشش اور انعام دے کر جاتے تھے۔ مزے سے گزر بسر ہوتی تھی۔ اب تو سوکھی تنخواہ پر گزارہ ہے۔ پیٹ بھرنا مشکل ہے۔ نجیا جوان ہو گئی ہے۔ رشتہ بھی طے ہو چکا ہے۔ پیسہ ہو تو کل اس کا ویاہ کر دوں۔"

لالی نے جیب سے دس دس روپے کے دو نوٹ نکالے اور چوکیدار کی طرف بڑھا کر بولا۔ "لے یہ رکھ لے چاچا!"

چوکیدار نے انکار کیا۔ "تو میری بات کا غلط مطلب سمجھا۔ میں تجھ سے کچھ نہیں لوں گا۔ تو میرے مہمان کی طرح ہے۔"

"دیکھ چاچا! نہ یہ بخشش ہے نہ انعام۔ ویسے بھی میں نہ افسر ہوں نہ صاحب جو تجھے بخشش یا انعام دوں۔ میری خوشی ہے تو اسے رکھ لے۔ انکار نہ کر۔"

چوکیدار نے پھر انکار کیا۔ مگر لالی نے اصرار کر کے اسے نوٹ دے ہی دیئے۔ تھوڑی دیر بعد چوکیدار چلا گیا۔

☆

لالی نے دروازہ بند کیا' لیمپ دھیما کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ مگر سویا نہیں۔ اس کمرے میں وہ سونے کے لیے آیا بھی نہیں تھا۔ وہ جلد از جلد رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اور خالی ہاتھ بھی جانا نہ چاہتا تھا۔ رحیم داد کے لیے اس نے جو کپڑے گٹھری میں باندھ کر رکھے تھے' وہ گٹھری کے ساتھ میاں حیات محمد ٹو کے بنگلے میں رہ گئے تھے۔

اس نے کمرے میں آنے سے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ کچھ نہیں تو ایک چادر ہی اٹھا کر لے جائے گا۔ اس سے رحیم داد کا کچھ تو کام چل ہی جاتا۔ مگر اب اسے ایک جھوڑ' دو چادریں مل گئیں۔ ایک بستر پر بچھی تھی' دوسری اوڑھنے کے لیے تھی۔

لالی بستر پر خاموش لیٹا رحیم داد کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ویران' ٹیلوں اور ٹبوں کے درمیان بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے جسم پر اب تک جیل کی وردی تھی اور جب تک یہ وردی موجود تھی' نہ وہ باہر نکل سکتا تھا' نہ کسی سے مل سکتا تھا اور نہ لاری یا ٹرین سے سفر کر سکتا تھا۔ لالی کو سب سے زیادہ فکر اسی بات کی تھی۔ وہ شرمندہ بھی تھا کہ اس نے تو اپنی جیل کی وردی اتار پھینکی تھی' مگر رحیم داد کو اس سے نجات نہ دلا سکا۔ چلتے وقت رحیم داد نے دبی زبان سے گلہ بھی کیا تھا۔ اس کا گلہ بھی بجا تھا۔ اسے جیل سے فرار ہونے پر لالی ہی نے آمادہ کیا تھا۔ اسے رہ رہ کر یاد آرہا تھا کہ رحیم داد بڑی مشکل سے فرار ہونے پر رضامند ہوا تھا۔ وہ لالی کی طرح عادی مجرم نہیں تھا۔ لہٰذا ڈرتا بھی تھا۔

لالی بستر پر لیٹا یہی سوچ رہا تھا کہ میز پر آہستہ سے آہٹ ہوئی۔ کھڑکی کے باہر درخت کی ڈال زور سے ہلی۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ لیمپ کی لو بھڑکی۔ سامنے دیوار پر پرچھائیں لہرائی۔ لالی چونک پڑا۔ اس نے گردن اونچی کی۔ ادھر ادھر دیکھا' وہاں کوئی نہیں تھا۔ دروازہ بند تھا۔ چٹخنی اس نے اپنے ہاتھ سے لگائی تھی۔ مگر اسے تسلی نہ ہوئی۔ بستر سے اترا' میز دیکھی۔ میز ٹھیک ٹھاک تھی۔ لیمپ بھی اپنی جگہ تھا اور روشن بھی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کے پاس پہنچا اور اس کی چوکھٹ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

رات جاگ رہی تھی۔ آسمان پر ستاروں کے کنول روشن تھے۔ ہوا میں تیزی تھی۔ لالی نے کھڑکی کے برابر سے گزرتی ہوئی پیپل کے درخت کی ڈال دیکھی۔ ہاتھ بڑھا کر اسے مضبوطی سے پکڑا۔ دھیرے دھیرے ہلایا۔ ڈال خوب موٹی اور مضبوط تھی۔ اس پر وہ آسانی سے چڑھ سکتا تھا اور ریسٹ ہاؤس کی چار دیواری سے باہر بھی جا سکتا تھا۔ چار دیواری کے اس پار لاگھا تھا جس میں ریت کے اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان کہیں کہیں کھیت تھے۔ دور تک پھیلا ہوا یہ ریتلا اور ناہموار میدان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔

اس نے کھڑکی کے پاس کھڑے کھڑے ریسٹ ہاؤس سے نکل بھاگنے کا فیصلہ کیا۔ اب وہ زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی پہر رات گزری تھی اور اسٹیشن پہنچنے کا راستہ چوکیدار نے بتا ہی دیا تھا۔ قادر آباد پہنچ کر وہ ریل کی پٹڑی عبور کر کے سورج نکلنے سے پہلے پہلے اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچ

سکتا تھا۔

وہ کھڑکی سے ہٹ کر بستر کے قریب آیا اور بستر کی دونوں چادروں میں جوتے لپیٹ کر گٹھری باندھنے کا ارادہ کرنے لگا۔ اسی اثناء میں باہر سے چوکیدار کے کھانسنے کی آواز ابھری۔ ساتھ ہی زمین پر لاٹھی بجنے کی آہٹ بھی ہوئی۔ آہٹ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ چوکیدار اسی طرف آرہا تھا۔ خشک پتوں پر اس کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ کھڑکی کے عین نیچے پہنچ کر چاپ بند ہو گئی۔ لالٹین کی روشنی لالی کو کھڑکی کے باہر دکھائی دے رہی تھی۔

ذرا ہی دیر بعد چوکیدار زور سے کھنکارا۔ اس نے کھڑکی کے نیچے سے اونچی آواز میں لالی سے پوچھا۔

"بچے! جاگ رہا ہے؟"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بالکل خاموش رہا۔ چوکیدار ذرا دیر ٹھہر کر آگے بڑھ گیا۔ خشک پتوں پر اس کی چاپ رفتہ رفتہ دور ہوتی گئی۔ لالی ایک بار پھر کھڑکی کے قریب پہنچا۔ گردن بڑھا کر دیکھا' درختوں کے نیچے چوکیدار آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین تھی اور دوسرے ہاتھ میں دبی ہوئی لاٹھی زمین سے ٹکرا کر آہٹ پیدا کر رہا تھا۔ اس کے ہم راہ کوئی اور بھی تھا۔ وہ نجیا تھی۔ اس کی کلائیوں میں پڑی ہوئی چوڑیاں چلتے وقت آہستہ آہستہ بج رہی تھیں۔

دونوں مڑ کر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ روشنی کا زرد زرد دھبا کچھ دیر تک نظر آتا رہا اور جب وہ بھی دھندلا پڑ گیا تو لالی بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں' مگر وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چوکیدار کے چارپائی پر لیٹ جانے کا انتظار کر رہا تھا جس کی کھانسی پھاٹک کے پاس بار بار سنائی پڑ رہی تھی۔ کھڑکی کے راستے ہوا کے جھونکے اندر آرہے تھے۔

لالی کی آنکھیں غنودگی سے بار بار بند ہو جاتیں۔ آخر نیند کا ایسا زبردست ریلا آیا کہ اس کی آنکھیں بند ہو کر کھل نہ سکیں۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

☆

کمرے میں تیز خوشبو پھیلی تھی۔ لالی غنودگی کے عالم میں تھا۔ ایسا محسوس ہوا' کوئی سرہانے کھڑا آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہا ہے۔

اب وہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا اور سسکیاں سن رہا تھا۔ سسکیوں کے ساتھ رک رک کر چوڑیاں بھی بجتیں۔ ذرا دیر تک وہ سکتے کے عالم میں چپ لیٹا رہا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اچھل کر بستر پر بیٹھ گیا۔ لیمپ کی دھیمی دھیمی روشنی میں اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ میز سے ذرا ہٹ کر دیوار کے پاس ایک نوجوان عورت کھڑی ہے۔ وہ گردن جھکائے رک رک کر سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کے بال بکھر کر چہرے پر آگئے تھے۔ وہ خوب سنگھار کیے ہوئے تھی۔ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ ہونٹوں پر سرخی تھی۔ لباس بھی بھڑکیلا اور خوب چست تھا۔ اتنا چست کہ اس کی بھرپور جوانی لباس سے بے محابا جھانک رہی تھی۔ وہ تیز خوشبو میں اس طرح بسی ہوئی تھی کہ پورا کمرہ مہک رہا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کے لالی کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ لالی چند لمحے اسے گھورتا رہا' پھر پلنگ سے کود کر نیچے آگیا۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بالکل خاموش کھڑے تھے۔

کھڑکی کے باہر پیپل کی ڈال ہوا کے تیز جھونکوں سے جھول رہی تھی۔ خشک پتے اس طرح کھڑکھڑاتے گویا آہستہ آہستہ تالیاں بجا رہے ہوں۔ لالی چند لمحے چپ چاپ کھڑا رہا پھر دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ عورت نے اسے اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو دیوار سے لگ کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ نہ اس نے نظریں نیچی کیں نہ زبان سے کچھ کہا۔ برابر اسے گہری نظروں سے دیکھتی رہی اور ہولے ہولے کھسکتی رہی۔ وہ مڑ کر دروازے کی جانب لپکی۔ لیکن لالی نے اسے دروازے تک پہنچنے کا موقع نہیں دیا۔

وہ تیزی سے جھپٹا اور ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کی چوٹی پکڑ لی۔ ڈپٹ کر پوچھا۔ "کون ہے توں؟"

وہ بلبلا کر بولی۔ "میری چوٹی تو چھوڑ۔"

لالی نے چوٹی چھوڑنے کے بجائے اور زور سے مروڑ دی۔ عورت نے پلٹ کر بے بسی سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ یکایک تیز جھونکا آیا۔ لیمپ زور سے بھڑکا اور بجھ گیا۔ کمرے میں گہرا اندھیرا چھا گیا۔ باہر درختوں میں الو کے زور زور سے بولنے کی آواز رات کی خاموشی میں ابھری۔ لالی کسی ان جانے خوف سے کپکپا کے رہ گیا۔ مگر وہ اس کی چوٹی مضبوطی سے پکڑے رہا۔ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ آخر لالی نے پوچھا۔

"تو بانو ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

لالی نے اس کی چوٹی کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور ایک بار پھر پوچھا۔ "بولتی کیوں نہیں۔ تو بانو ہے نا؟"

"کون بانو؟" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "میں کسی بانو وانو کو نہیں جانتی۔"

"سچ سچ بتا کون ہے تو؟"

وہ تکلیف سے منہ بگاڑ کر بولی۔ “کہہ تو دیا، میں بانو نہیں ہوں۔”

لالی مخمصے میں پڑ گیا۔ چند لمحے خاموش رہ کر اس نے پوچھا۔ “تو چوکیدار کی بیٹی نجیا تو نہیں ہے؟”

“میں کیوں ہونے لگی چوکیدار کی بیٹی۔”

لالی اور زیادہ الجھن میں پڑ گیا۔ اس دفعہ اس نے غصے سے آنکھیں نکال کر کہا۔ “ٹھیک ٹھیک بتا۔ زیادہ کڑکڑ کی تو لگاؤں گا ایک چپیڑ۔” اس نے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

“بتاتی ہوں، بتاتی ہوں۔”

لالی اس کی چوٹی ہلا کر بولا۔ “تو فیر بتا نا۔”

اس نے منہ بسور کر کہا۔ “میں زرینہ ہوں۔ صفدر علی اور سیر کی بیوی۔” وہ لمحے بھر خاموش رہ کر عاجزی سے بولی۔ “اب تو میری چوٹی چھوڑ دو۔” لالی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے؟ وہ اس کی چوٹی گھوڑے کی لگام کی طرح کھینچے ہوئے چپ کھڑا رہا۔ مگر وہ زیادہ دیر خاموش نہیں رہی۔ اس نے گردن ہلائی اور جھنجلا کر بولی۔

“دیکھو! میری چوٹی چھوڑ دو، نہیں تو میں چیخنے لگوں گی۔”

لالی اس کی دھمکی سے ڈر گیا۔ اس نے چوٹی چھوڑ دی۔ مگر وہ ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ “تو یہاں پہنچی کیسے؟ دروازہ تو بند ہے۔” لالی نے اس دروازے کی جانب اشارہ کیا جو باہر لوہے کے زینے پر کھلتا تھا۔ اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔

“تو کھڑکی کے رستے تو اندر نہیں آئی؟”

“کچھ دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ میں کھڑکی کے رستے کیسے اندر آ سکتی ہوں۔” اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔ “اور یہ دروازہ نہیں ہے۔” زرینہ نے کمرے کے دوسرے دروازے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ “میں اسی دروازے سے سیڑھیاں چڑھ کر نیچے سے آئی ہوں۔ توبہ توبہ، کتنی سیڑھیاں ہیں۔ چڑھتے چڑھتے میرا تو سانس پھول گیا۔” اب وہ کسی قدر اطمینان سے بول رہی تھی۔

لالی نے اس کی بات سن کر کچھ نہیں کہا۔ میز کی جانب بڑھا۔ قریب جا کر اس نے لیمپ روشن کیا۔ زرینہ کمرے سے باہر جانے کے ارادے سے دروازے کی جانب بڑھی۔ لالی نے ٹوکا۔ “ٹھیر جا۔ یہ تو بتا، تو ریسٹ ہاؤس میں آئی کیسے؟”

“سرکاری جیپ میں آئی تھی۔ صفدر علی لے کر یہاں آیا تھا۔ مجھے تو یہاں آئے ہوئے بھی آدھے گھنٹے سے اوپر ہو گیا۔ تم کو خبر ہی نہیں۔”

“تیرا کھسم صفدر علی کہاں ہے؟”

“وہ جیپ میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔”

لالی پھر الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے تیکھی نظروں سے زرینہ کو دیکھا اور ڈپٹ کر بولا۔ “صاف اف بتا۔ تیری باتیں سمجھ نہیں آئیں۔ پہلی بات تو یہ ہے، اس کمرے میں کیوں آئی؟”

“میں تو یہاں چھپنے کے لیے آئی تھی۔” وہ آنکھیں مٹکا کر الھڑپن سے بولی۔ تھی بھی الھڑ۔ اس ں عمر سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ شکل و صورت معمولی تھی مگر اس کی جوانی سمندر کا جوار بھاٹا ی۔ انگ انگ سے ابل رہی تھی۔

اس کی بات سن کر لالی اور چکرایا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ “یہاں چھپنے آئی تھی۔ مگر یوں؟”

“کچھ ہے ایسی بات۔” زرینہ نے گول مول جواب دیا۔

لالی نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا اور ہاتھ بڑھا کر پھر اس کی چوٹی پکڑ لی۔ “ٹھیک ٹھیک ا۔”

“ارے ارے، میری چوٹی تو چھوڑ۔” وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ “وہ، وہ بڑا انجینئر ہے ۔” زرینہ اپنی بات، کہتے کہتے رک گئی۔

لالی نے حیرت سے پوچھا۔ “کون انجینئر؟” اس نے زرینہ کی چوٹی چھوڑ دی۔

“وہی جو یہاں ٹھیرا ہوا ہے۔” زرینہ نے جواب دیا۔ “وہ ہمارے پہنچنے سے پہلے یہاں آ گیا ا۔” اس نے ذرا رک کر بتایا۔ “صفدر کے ساتھ وہ بھی جیپ میں گیا ہے۔ تھوڑی دیر میں واپس جائے گا۔”

“صفدر واپس نہیں آئے گا؟”

وہ نظریں جھکا کر آہستہ سے بولی۔ “صفدر تو گھر گیا ہے۔ سویرے آئے گا۔ مجھ سے یہی کہہ کر گیا ہے۔”

بات اب لالی کی سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگی تھی۔ اس نے غور سے زرینہ کو دیکھا۔ “تیرا کھسم کلا تو نہیں چلاتا؟”

“ایسی بات نہیں ہے جی۔ ہے تو وہ اوور سیر ہی۔” وہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ “بات یہ ہے۔ ا ایک چکر میں آ گیا ہے۔ دو مہینے سے معطل ہے۔ اس کے خلاف انکوائری ہو رہی ہے۔” وہ جکی۔ “سڑک کے ٹھیکے میں صفدر نے ایک ٹھیکیدار سے رشوت لی تھی۔ کسی نے اوپر شکایت لگا

دی۔ اب بڑا انجینئر انکوائری کرنے آیا ہے۔ جو رپورٹ وہ دے گا، اسی پر صفدر کے کیس کا فیصلہ ہوگا۔"

"اب اصلی گل سمجھ آئی۔ صفدر نے تجھے رشوت میں انجینئر کو پیش کیا ہے۔ تیرا کھسم ہے بہت تیز۔ رشوت لینا بھی جانتا ہے اور رشوت دے کر بچ نکلنے کا رستہ بھی جانتا ہے۔" اس نے مسکرا کر زرینہ کو دیکھا۔ "رشوت بھی اس نے تکڑی دی ہے۔ جبھی تو اتنی بن ٹھن کر آئی ہے۔"

"توبہ کرو جی۔" وہ بے باکی سے بولی۔ "انجینئر کو دیکھ کر تو مجھے گھن آگئی۔ وہ کوئی آدمی ہے، بالکل گینڈا لگتا ہے۔ سر بھی گنجا ہے۔ روشنی میں تالموٹ کی طرح چمکتا ہے۔" وہ کھل کھلا کر ہنسی، مگر جلد ہی اس کا شگفتہ چہرہ بجھ گیا۔ "صفدر باہر گیا تو انجینئر کمرے میں میرے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ لگا مجھے دبوچنے۔ زبردستی میرے ہونٹ چوم لیے۔ اس کے منہ سے ایسی کڑدی کڑدی بو نکلی۔ اخ تھو۔" اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔ "انجینئر کے جانے کے بعد مجھے اتنا ڈر لگا کہ رونا آگیا۔ میں روتی ہوئی چھپنے کے لیے یہاں آگئی۔"

لالی نے بے رخی سے کہا۔ "اب روتی کیوں ہے؟ گھر سے تو خوشی خوشی بن ٹھن کر آگئی۔ اب کہتی ہے ڈر لگتا ہے۔" اس نے غصے سے منہ بگاڑا۔ "ایسا ہی ڈر تھا تو گھر سے نکلی ہی کیوں؟"

"کرتی بھی کیا۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "صفدر میرے آگے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ رو رو کر کہنے لگا، زرینہ! مجھے بچالے۔ نوکری بھی جائے گی اور جیل بھی ہوجائے گی۔ تم ہی بتاؤ، جب اپنا آدمی اس طرح رو رو کر گڑگڑائے تو میں کیسے انکار کرتی۔ ابھی تو ہمارے بیاہ کو چھ مہینے بھی نہیں ہوئے، یہ مصیبت پھٹ پڑی۔"

"تو فیر بچالے اپنے کھسم کو اس مصیبت سے۔ نخرا کیوں کرتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں اس کی بات مان لے۔ فیر وہ جیل بھی نہیں جائے گا، نوکری بھی بچ جائے گی اور اب تو چالو ہو ہی گئی۔ اپنے کھسم کو ترقی دلوا کر انجینئر بھی لگوا دے گی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"نا جی نا۔ ایسی بات نہ کرو۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "تم مجھے انجینئر سے بچالو۔"

"میں کوئی تھانیدار لگا ہوں جو تجھے بچالوں۔" لالی نے نہایت بے مروتی سے کہا۔ "جا، جا کر انجینئر کا دل خوش کرا اور اپنے کھسم کو بچا۔ مجھے سونے دے۔"

زرینہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا، منہ لٹکائے کھڑی رہی۔ اس کے چہرے کی چمک دمک ماند پڑ گئی۔ لالی بھی چپ چاپ کھڑا رہا۔ ذرا دیر تک کمرے میں سکوت رہا۔ زرینہ نے نظریں اٹھا کر لالی کو دیکھا اور افسردہ لہجے میں بولی۔

"تم مجھے نہیں بچاسکتے؟"

لالی نے اس دفعہ اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "کچھ تو مغز سے کام لے۔ مان لے کہ آج میں نے تجھے بچالیا۔ کل پھر تیرا کھسم تیرے پیر پکڑ کر رو دے گا۔ تو فیر ایسے ہی بن ٹھن کر چلی آئے گی۔ نہیں آئے گی تو انجینئر تیرے کھسم کے خلاف رپورٹ دے دے گا۔ اسے جیل ہوجائے گی اور نوکری بھی جائے گی۔ میں تجھے کہاں کہاں بچاؤں گا۔ کب تک ہتھیلی لگاؤں گا۔"

"تم مجھے آج بچالو۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" اس نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی، الھڑپن سے بولی۔ "میں تمہارے پلنگ کے نیچے چھپ جاؤں گی۔ انجینئر یہاں آکر تم سے پوچھے تو کہہ دینا، کون زرینہ، کیسی زرینہ؟ یہاں کوئی زرینہ ورینہ نہیں آئی۔ وہ تمہارا کیا بگاڑ لے گا؟"

"نہیں جی، میں ایسے چکروں میں نہیں پڑتا۔" اس نے بیزاری سے کہا۔ "اب یہاں سے جا۔"

لالی چاہتا تھا کہ زرینہ چلی جائے تاکہ وہ چادریں اٹھا کر جلد سے جلد بنگلے سے نکل سکے۔ اب وہاں مزید ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

مگر زرینہ اس کا صاف جواب سن کر بھی کمرے سے نہیں گئی۔ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ ذرا دیر بعد کمرے کی خاموشی میں اس کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔ وہ رو رہی تھی۔ لالی اسے روتا دیکھ کر سخت پریشان ہوا۔ گھبرا کر بولا۔

"ارے ارے تو رونے لگی۔"

زرینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس کی سسکیاں بند ہوگئی تھیں۔ لالی مسکرا کر بولا۔ "معلوم ہوتا ہے، سینما بہت دیکھتی ہے۔ دیکھتی ہے نا؟"

"دیکھتی ہوں، ضرور دیکھتی ہوں۔"

"جبھی تو ایسی ایکٹنگ کرلیتی ہے۔"

زرینہ جلدی جلدی آنسو پونچھ کر گویا ہوئی۔ "تو میں پلنگ تلے چھپ جاؤں۔ انجینئر اب آتا ہی ہوگا۔"

"ایسا کر، بستر پر لیٹ جا۔ میں منجی کے نیچے دبک جاؤں گا۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"اس سے یہ ہوگا۔ جب انجینئر تجھ سے چھیڑ چھاڑ کرے گا تو میں نیچے سے نکل آؤں گا اور تھانے دار بن کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ ٹھیک ہے نا۔"

"نہیں جی، یہ ٹھیک نہیں۔ کچھ اور سوچنا ہوگا۔"

لالی نے چند لمحے خاموش رہ کر سنجیدگی سے پوچھا۔ "سچ مچ انجینئر سے بچنا چاہتی ہے؟"

"کہہ تو رہی ہوں' اور کیسے کہوں۔" زرینہ نے کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا۔ "بس تم مجھے اپنے پلنگ تلے چھپ جانے دو۔"

"کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہے۔" لالی نے اسے ڈانٹا' ذرا دیر خاموش کھڑا سوچتا رہا پھر بولا۔ "چھپنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا کر۔ نیچے جا اور بنگلے سے نکل کر باہر برآمدے میں کھڑی ہو جا۔ جب انجینئر واپس آئے تو رونا شروع کر دینا۔ وہ پوچھے کیوں روتی ہے؟ کہنا مجھے بنگلے میں ڈر لگتا ہے۔ میں یہاں نہیں ٹھیروں گی۔ یہاں ایک چڑیل ہے۔ میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا۔ کبھی روتی تھی' کبھی ٹھٹھا مار کر ہنستی تھی۔ کہتی تھی' میرا نام بانو ہے۔ مجھے اوپر والے کمرے میں کتل کر دیا گیا۔"

"وہ میری بات کا یقین مان لے گا؟"

"کیوں نہیں مانے گا؟ بانو کو اسی کمرے میں کتل کیا گیا تھا۔ اب یہاں اس کی روح بھٹکتی پھرتی ہے۔ اسی لیے تو میں نے تجھ سے پوچھا تھا' کیا تو بانو ہے؟"

"ہائے۔" وہ منہ پھاڑ کر بولی۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

"بالکل سچ ہے۔ چوکیدار تو موجود ہی ہے جس کے سامنے بانو کا کتل ہوا تھا۔ میں نے تجھے بچنے کی ترکیب بتا دی۔ ایکٹنگ تو کر ہی لیتی ہے۔ اس طرح رونا اور چیخنا چلانا کہ انجینئر بھی ڈر جائے۔ سمجھ لے' تیرا کام بن گیا۔ اس طرح تیرے کھسم پر بھی بات نہیں آئے گی۔ اب جا' مجھے سونے دے۔"

وہ بستر کی جانب بڑھا۔

زرینہ نے ٹوکا۔ "میری بات تو سنو۔" لالی رک گیا۔ زرینہ نے سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ "تم نے ایسی بات سنائی کہ مجھے ڈر لگنے لگا۔ میں سیڑھیوں سے نیچے کیسے جاؤں گی۔ زینے میں تو بالکل اندھیرا ہے۔"

"ڈر کیوں رہی ہے؟" لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تو تو خوب تکڑی ہے۔ اندھیرے میں بانو سے مڈبھڑ ہو جائے تو جھٹ اس کی چوٹی پکڑ لینا' جیسے میں نے تیری چوٹی پکڑی تھی۔ چوٹی پکڑتے ہی کیسی میرے کابو آگئی تھی۔ ایسے ہی اسے کابو کر لینا۔"

"نہیں جی' یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔" وہ بدستور خوف زدہ تھی۔ "میں اکیلی نہیں جاؤں گی۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

لالی اب سخت بیزار ہو گیا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ ریسٹ ہاؤس سے جلد از جلد نکل بھاگنا چاہتا ا۔ مگر زرینہ اس کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہو گئی تھی۔ اس نے بگڑ کر کہا۔ "خاماخا نکھرا نہ لیا۔" اس نے غصے سے ہاتھ اٹھایا۔

"جاتی ہے یا لگاؤں ایک چپیڑ۔"

"دیکھو ہاتھ نہ چلانا۔" وہ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "اتنی ہمت تو کبھی صفدر کو بھی نہیں ہوئی۔"

"وہ تو دلا ہے۔ اس کی بات مت کر۔"

اس دفعہ زرینہ نے عاجزی سے کہا۔ "تم مجھے نیچے پہنچا دو۔ پھر میں یہاں نہیں آؤں گی۔ بالکل یں آؤں گی۔"

لالی نے زچ ہو کر کہا۔ "اس طرح میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ چل' میں تیرے ساتھ چلتا ں۔"

لالی آگے بڑھا۔ دروازہ کھولا' کمرے سے نکلا۔ زرینہ بھی اس کے ساتھ ساتھ بڑھی۔ لالی آگے ا۔ زرینہ اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ زرینہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سیڑھیوں پر گھپ اندھیرا تھا۔ نوں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔ لالی نے چلتے چلتے کہا۔

"انجینئر سے تو تجھے اتنا ڈر لگتا ہے' مجھ سے نہیں لگتا؟ مان لے' میں تجھے اندھیرے میں دبوچ ں تو؟"

"میرے ہاتھ نہیں ہیں کیا؟" اس نے نہایت اعتماد سے جواب دیا۔ "منہ نوچ لوں گی' دانتوں ے کاٹوں گی۔ چیخوں گی' چلاؤں گی۔" وہ آہستہ سے ہنسی۔

"مجھ پر ہاتھ ڈالنا ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے۔"

"پھر اس گینڈے سے اتنا کیوں ڈرتی ہے؟ یہ کارروائی اس کے ساتھ کیوں نہیں کرتی؟"

"اس کی بات دوسری ہے۔" زرینہ دھیرے سے بولی۔ "صفدر خفا ہو جائے گا۔ کہتا تھا' انجینئر کے ساتھ کوئی گڑبڑ کی تو سمجھ لینا کھڑے کھڑے طلاق دے دوں گا۔"

لالی جل کر بولا۔ "وہ کنجر یہ بھی کہتا ہے۔ دلاگیری کرتا ہے اوپر سے آنکھیں بھی دکھاتا ہے۔"

زرینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ سیڑھیوں سے نیچے اترتی رہی۔ لالی بھی خاموش ہا۔ اندھیرے میں دونوں ریلنگ کا سہارا لے کر نپے تلے قدم اٹھا رہے تھے۔ ناگاہ زرینہ نے چونک ر پوچھا۔

"کیا تم نے میری چوٹی کھینچی تھی؟"

"تیرا گمر تو نہیں چل گیا۔" لالی نے اس کی جانب گردن موڑے بغیر کہا۔ "میں آگے آگے چل رہا ہوں۔ پیچھے سے تیری چوٹی کیسے کھینچ سکتا ہوں؟"

وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ "سچ' مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میری چوٹی پکڑ کر کھینچی ہے۔"

"بانو ہوگی۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ زرینہ خاموش رہی۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے' تو ہی بانو ہے۔"

لالی نے توقف کے بعد پوچھا۔ "تو بانو تو نہیں ہے؟" زرینہ ہنوز خاموش رہی۔ ذرا دیر تک گہری خاموشی رہی۔ لالی اس خاموشی سے گھبرا گیا۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ زرینہ اندھیرے میں پرچھائیں کی طرح دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھی۔ لالی نے اس دفعہ کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا۔ "بول' بولتی کیوں نہیں؟"

"ہاں' میں بانو ہوں۔" لالی کے عقب سے منمنی آواز ابھری۔ وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے زرینہ کو دیکھا۔

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ "بڑے بہادر بنتے تھے۔ ڈر گئے نا؟"

دونوں زینے سے اتر کر نیچے کوریڈور میں آ گئے تھے۔ سامنے گول کمرہ تھا۔ اس میں لیمپ روشن تھا۔ زرینہ جھٹ لالی کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ابھی تک شوخی سے مسکرا رہی تھی۔ لالی نے جھنجلا کر اسے دیکھا۔ "تو بھی ایک نمبری ہے۔ میں سچ مچ ڈر گیا تھا۔" اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "انجینئر' کس کمرے میں ٹھیرا ہے؟"

"یہ رہا وہ کمرہ۔" زرینہ نے نکڑ والے کمرے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر لیمپ روشن تھا۔ لالی آہستہ آہستہ دروازے پر پہنچا۔ بڑھ کر دیکھا' کمرہ خالی ہے۔ زرینہ بھی اس کے ساتھ ساتھ دروازے تک پہنچ گئی۔ لالی نے دریافت کیا۔

"انجینئر کے ساتھ ڈرائیور بھی ہے؟"

"ہے تو۔" زرینہ نے جواب دیا۔ "وہ آتے ہی ادھر پچھلے کمرے میں سو گیا تھا۔ اسے بخار ہے۔ جبھی تو انجینئر خود صفدر کو چھوڑنے گیا ہے۔ گاڑی چلانا جانتا ہے۔"

لالی نے مزید بات چیت نہیں کی۔ خاموشی سے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ایک طرف کھونٹی پر انجینئر کا دھاری دار سلیپنگ سوٹ لٹکا تھا۔ قریب ہی میز پر چمڑے کا سوٹ کیس رکھا تھا۔ سوٹ کیس بند تھا۔ کمرے میں ایک طرف سنگھار میز تھی۔ اس پر شیو کرنے کا سامان بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ ہی دیر پہلے کسی نے شیو کیا ہے۔

لالی دھیرے دھیرے کھڑکی کے پاس گیا۔ چوکنا نظروں سے باہر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ درختوں کے نیچے گہرا سناٹا تھا۔ البتہ بنگلے کے پچھواڑے بوڑھے چوکیدار کی کھانسی رک رک کر سنائی دے رہی تھی۔

زرینہ بھی لالی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ پوچھنے لگی۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟"

لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "کچھ نہیں۔"

اسی وقت گیٹ پر گاڑی رکنے اور ہارن بجنے کی آواز ابھری۔ زرینہ نے گھبرا کر کہا۔ "انجینئر واپس آ گیا۔ اب کیا ہوگا؟"

لالی بھی گھبرا گیا۔ مگر اس نے اپنی گھبراہٹ ظاہر نہیں کی۔ "ہونا کیا ہے۔ باہر برآمدے میں جا کر کھڑی ہو جا۔ جیسے ہی انجینئر آئے رونا شروع کر دینا۔ وہی کہنا جو میں نے بتایا ہے اور دیکھ' میرے بارے میں بالکل کوئی بات نہ کرنا۔ ورنہ سارا معاملہ بگڑ جائے گا۔" زرینہ گھبرائی ہوئی نظروں سے لالی کو دیکھتی رہی۔ لالی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے ڈانٹا۔

"میرا منہ کیا تک رہی ہے؟ اب جا باہر۔"

زرینہ دروازے کی جانب بڑھی۔ لالی بھی اس کے ساتھ چلا۔ چلتے چلتے اس نے سرگوشی کے انداز میں رسان سے کہا۔ "ذرا اپنے بال وال تو بکھیر لے۔" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھایا اور خود ہی اس کے بال اس طرح بکھیر دیئے کہ وہ بے ترتیب ہو کر چہرے اور شانوں پر پھیل گئے۔ زرینہ چپ کھڑی رہی' پھر بکھری ہوئی لٹیں لہراتی کمرے سے نکلی اور کوریڈور کا بیرونی دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں چلی گئی۔

لالی فوراً انجینئر کے کمرے میں واپس آیا۔ اس نے سوٹ کیس کا تالا ہلا کر دیکھا۔ مگر تالا آسانی سے کھلتا معلوم نہ ہوا۔ ادھر بنگلے کے باہر گیٹ کھلنے اور گاڑی احاطے میں داخل ہونے کی آواز ابھری۔

لالی نے لپک کر فوراً کھونٹی سے سلیپنگ سوٹ کا پاجامہ اتارا۔ قمیص اتاری' بستر سے اجلی چادر کھینچی۔ چادر میں سلیپنگ سوٹ لپیٹا اور اسی میں سنگھار میز سے شیونگ کا سامان اٹھا کر رکھا۔ جھٹ پٹ گٹھری باندھی اور کمرے سے نکل کر زینے کی جانب بڑھا۔

زینے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے سنا' انجینئر باہر برآمدے میں زرینہ سے کہہ رہا تھا۔ "ارے' تم رو رہی ہو؟"

اس کی آواز بھاری تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ "یہاں کیوں کھڑی ہو؟ آؤ اندر چلیں۔"

ذرا دیر خاموشی رہی پھر زرینہ کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ "میں اندر نہیں جاؤں گی۔ وہاں مجھے ڈر لگتا ہے۔"

لالی اس سے زیادہ کچھ نہ سن سکا۔ وہ اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا اوپر پہنچ گیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر اس نے جلدی سے جوتے بھی گٹھری میں باندھ لیے۔ میز کے قریب گیا اور پھونک مار کر لیمپ بجھا دیا۔

نچلی منزل سے ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ لالی نے ان آوازوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے گٹھری کندھے پر لٹکائی۔ بڑھ کر کھڑکی پر پہنچا۔ اس پر چڑھا اور پیپل کی ڈال پر چھلانگ لگا کر پہنچ گیا۔ ڈال اس کے بوجھ سے ہلی۔ لالی ذرا دیر تک ڈال سے چمٹا رہا پھر شاخوں کا سہارا لیتا دھیرے دھیرے نیچے اترنے لگا۔

نیچے پہنچ کر اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اسے ڈر تھا کہیں چوکیدار ادھر نہ آجائے۔ مگر وہ اس وقت برآمدے میں تھا جہاں سے زرینہ کی آواز آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی۔ پیپل کا تنا احاطے کی دیوار سے ملا ہوا تھا۔ وہ دیوار پر پہنچا اور آہستہ سے باہر لا کھے میں اتر گیا۔

* * *

لالی نے ایک سنسان مقام پر ماچس جلا کر گھڑی دیکھی۔ دو بجنے والے تھے۔ لالی پریشان ہو گیا۔ گیارہ بجنے سے پہلے ہی وہ ریسٹ ہاؤس چھوڑ چکا تھا اور اب اسے چلتے چلتے تین گھنٹے سے اوپر ہو چکے تھے۔ اسے بہت پہلے گوردا پورہ پہنچ جانا چاہئے تھا۔ مگر اسے دور دور تک کوئی بستی نظر آئی نہ نہر۔ وہ راستے سے بھٹک گیا تھا۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی وہ پریشان ہو گیا۔ لالی آگے بڑھا' اور تیز تیز قدموں سے ایک سمت چلنے لگا۔

اس نے لگ بھگ تین میل راستہ طے کیا ہو گا کہ قبرستان آگیا۔ قبرستان کے آگے بستی تھی۔ نزدیک پہنچ کر وہ ایک بار پھر ٹھہر گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ قبرستان پر ویرانی چھائی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

قبرستان بہت پرانا تھا۔ جگہ جگہ جنگلی جھاڑیاں اور ببول کے درخت تھے۔ ان کے درمیان ٹوٹی پھوٹی' اونچی نیچی قبریں بکھری ہوئی تھیں۔ قبرستان کے ایک گوشے میں نیم اور سرس کے درختوں کا جھنڈ تھا۔

درختوں کے نیچے مٹی کا بنا ہوا مکان تھا۔ مکان میں چراغ روشن تھا جس کی دھندلی روشنی دور سے زرد دھبے کی طرح نظر آتی تھی۔

لالی اس طرف نہیں گیا۔ آگے بڑھا اور ایک پگڈنڈی پر چلتا ہوا قبرستان کے اندر داخل ہو گیا۔ پگڈنڈی قبروں کے درمیان سے پیچ و خم کھاتی ہوئی گزرتی تھی اور اس کچی سڑک سے مل جاتی تھی جو دھندلی روشنی میں قبرستان کے دوسرے سرے پر نظر آرہی تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا

آگے بڑھتا گیا۔

اس نے قبرستان کا نصف سے زیادہ حصہ طے کر لیا۔ اب کچی سڑک صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ سڑک کی جانب چلا۔ مگر کچھ ہی دور گیا تھا کہ قبرستان کی گہری خاموشی میں قہقہہ بلند ہوا۔ لالی سراسیمہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مگر اس نے ہمت سے کام لیا۔ گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ہر طرف اونچی نیچی قبریں تھیں۔

وہ چوکنا نظروں سے دائیں بائیں دیکھتا ایک بار پھر آگے بڑھا۔ ذرا ہی دیر بعد اسے ملی جلی سرگوشیاں سنائی دیں۔ آوازیں بہت دھیمی تھیں اور داہنے ہاتھ کے ایک گھنے درخت کے نیچے سے ابھر رہی تھیں۔

لالی نے سہمی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھا تو اسے درخت کے نیچے دھندلی دھندلی روشنی بھی نظر آئی۔ وہ گھبرا کر واپس مڑا اور پگڈنڈی چھوڑ کر قبروں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا سڑک کی جانب بڑھنے لگا۔ کئی بار ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ مگر وہ قبروں سے ٹھوکریں کھاتا، جنگلی جھاڑیوں سے الجھتا سڑک سے قریب ہوتا گیا۔ وہ قبرستان کے ڈراؤنے اور آسیبی ماحول سے جلد سے جلد نکل کر کچی سڑک پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

سڑک اب بالکل اس کے سامنے تھی۔ مگر یہ دیکھ کر سخت پریشان ہوا کہ سڑک کے کنارے ایک ٹرک کھڑا ہے۔ وہ خوف سے جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹرک کے پچھلے حصے سے پولیس والے کود کود کر باہر نکلنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبی لمبی لاٹھیاں تھیں۔ چند ہی لمحے بعد تھانے دار بھی اگلی نشست سے اتر کر نیچے آیا۔ اس نے گردن اونچی کی۔ کانسٹیبلوں پر نظر ڈالی اور انھیں حکم دیا۔

”قبرستان چاروں طرف سے گھیرے میں لے لو۔“

لالی بدحواس ہو کر تیزی سے پلٹا اور قبریں پھلانگتا ہوا سرپٹ بھاگا۔ ناگاہ اس نے اندھیرے میں ٹھوکر کھائی اور ایک ٹوٹی قبر میں دھڑام سے منہ کے بل گرا۔ قبر، قد آدم گہری تھی۔ مگر اندر سے کچی تھی۔ چوٹ زیادہ نہیں آئی۔ پھر بھی اس کے دو دانت ہل گئے۔ ایک گھٹنے میں بھی درد ہو رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنا چاہا۔ عین اس وقت قبر کے آس پاس تیز تیز قدموں سے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں ابھریں۔ وہ جس طور گرا تھا، اسی حالت میں چپ پڑا رہا۔

ذرا دیر بعد کوئی دھم سے قبر کے اندر کودا۔ مگر وہ لالی پر نہیں گرا۔ لالی نے بدحواس ہو کر سر اٹھایا۔ وہ پولیس والا نہیں تھا۔ اس کی سفید قمیص اندھیرے میں جھلک رہی تھی۔ وہ کونے میں دبک کر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لالی بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کپڑوں کی سرسراہٹ سن کر اس شخص نے پلٹ کر لالی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں تاریکی میں شیشے کی گولیوں کی مانند چمک رہی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہے۔ اس شخص نے سرگوشی کی۔

”کون ہے تو؟“

”میں کبر کا مردہ ہوں۔“ یہ کہہ کے لالی نے جھپٹ کر ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی اور دیوار سے اڑا کر بے بس کر دیا۔

مگر وہ بھی جاندار اور تگڑا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر جھٹکا دیا اور اپنی گردن لالی کی گرفت سے چھڑا لی۔ ”صاف بتا کون ہے تو؟“

”کہہ تو دیا، میں اس کبر کا مردہ ہوں۔“ لالی نے ناک سے منمنا کر اسے پھر دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی اور بدستور اس پر جھکا بیٹھا رہا۔

وہ نڈر ہو کر بولا۔ ”یار! مسخری نہ کر، ٹھیک ٹھیک بتا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”نہ جانے کتنی ایسی راتیں قبرستانوں میں گزر گئیں۔ مجھے تو آج تک کوئی مردہ شردہ ملا نہیں۔ تو نرالا مردہ ہے۔ بولتا بھی ہے اور کپڑے بھی پہنے ہوئے ہے۔“

وہ شخص قبر کے ایک کونے میں سکڑا سکڑایا بیٹھا تھا اور آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ لالی کو اس کی بے باکی بہت شاق گزری۔ جی چاہا کہ اس کے منہ پر زور سے ایسا تھپڑ مارے کہ ساری ہیکڑی نکل جائے۔ مگر اب دور سے ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور ابھرنے لگا تھا۔ شور سن کر لالی خود خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے سنبھل کر آہستہ سے پوچھا۔ ”یہ تو بتا، یہ شور کیسا ہے؟“ لالی اس کے برابر بیٹھ گیا۔

”پولیس نے چھاپا مارا ہے۔“

”پولیس نے چھاپہ مارا ہے۔“ لالی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”پولیس نے کیوں چھاپا مارا ہے؟“

”ایک قبر میں ادھر جوا ہو رہا تھا۔“ اس شخص نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

”تم بھی جوا کھیل رہے تھے؟“

”میں تو خواہ مخواہ پھنس گیا۔“ وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ ”نوے روپے بھی ہار گیا۔“

”جوا کھیلنے کے لیے چنگی جگہ تلاش کی۔“

"آج ہفتہ ہے نا۔ ہر ہفتے کو یہاں ضرور جوا ہوتا ہے۔ کوٹ سلیم کے علاوہ شہر سے بھی کئی بندے جوا کھیلنے آتے ہیں۔ اونچا کھیل ہوتا ہے۔ پولیس کو بھی پتہ ہے۔"

"پولیس کی مرضی کی بنا تو ایسا دھندا چل ہی نہیں سکتا۔ پر آج چھاپا کیسے پڑ گیا؟ پولیس کا بھتا نہیں پہنچا ہو گا؟"

وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "یار! میں تو بال بال بچ گیا۔ جیسے ہی پتہ چلا کہ دوڑ آ گئی' میں نکل بھاگا۔ سامنے سے ایک کانسٹیبل آ گیا۔ اس نے جھپٹ کر اس طرح دبوچ لیا' میں تو سمجھا' لے بھئی بشیرے آج دھر لیا گیا۔ مگر میں نے زور سے جھٹکا دے کر بیٹھک لگائی۔ داؤ ایسا فٹ بیٹھا کہ اس کے ہاتھ کھل گئے۔ ادھر میں نے زمین پر بیٹھتے ہی پیچھے ہاتھ ڈال کر اس کی ٹانگ پکڑ کر زور سے کھینچی۔ وہ دھڑام سے گرا' فیر میں کہاں ہاتھ آتا۔"

"یار توں تو..." لالی اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اسی وقت قبر کے قریب بھاری بھاری قدموں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ بشیرے نے جھٹ لالی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ لالی خاموش ہو گیا۔ دونوں اندھیرے میں دم سادھے بیٹھے رہے اور دھڑکتے دلوں سے آنے والے خطرے کا انتظار کرتے رہے۔ آہٹیں اور قریب آ گئیں۔ پھر کسی کانسٹیبل کی آواز سنائی دی۔

"وہ آٹھواں جواری کہاں گیا جی؟"

ایک اور آواز ابھری۔ "اب وہ کہاں ہاتھ آتا ہے' اندھیرے میں نکل گیا ہو گا کسی طرف۔"

"اور بھی کئی ہوں گے۔"

"مگر یہ سب تو یہی بتاتے ہیں' کل آٹھ جواری تھے۔"

لالی اور بشیرا سہمے ہوئے ان کی باتیں سنتے رہے۔ وہ قبر کے بہت ہی قریب سے گزر رہے تھے۔ لیکن نہ وہ ٹھہرے نہ انھوں نے قبر کے اندر جھانکا۔

پولیس والوں کے پاس ٹارچیں بھی تھیں اور ٹارچوں کی رک رک کر ابھرتی ہوئی' تیز روشنی دونوں اپنے سروں کی بلندی پر دیکھ رہے تھے۔

ملی جلی آوازیں اور آہٹیں رفتہ رفتہ دور ہوتی گئیں۔ جب آوازیں خاصی دور ہو گئیں تو بشیرا آہستہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ وہ لمبا تڑنگا جوان تھا۔ چھ فٹ سے بھی اونچا قد تھا۔ وہ گردن اٹھا کر باہر دیکھنے لگا۔

لالی بھی کھڑا ہو گیا۔ قبر کی اونچائی اس کی پیشانی تک تھی۔ اس نے پنجوں کے بل اٹھ کر دیکھا۔ ساتوں جواری پولیس والوں کے نرغے میں سڑک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ چلتے چلتے ایک جواری لڑکھڑا کر گرا۔ پولیس والوں نے سہارا دینے کے بجائے اسے اندھا دھند پیٹنا شروع کر دیا۔ چیخ چیخ کر گالیاں بھی دیں۔ وہ بدحواس ہو کر فوراً کھڑا ہو گیا۔

دونوں خوف زدہ نظروں سے یہ منظر دیکھتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد پولیس والے جواریوں کو مویشیوں کی طرح ہنکاتے سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ٹرک کے قریب پہنچ گئے۔ سب اس میں سوار ہو گئے۔ ٹرک اسٹارٹ ہوا اور سڑک پر دوڑنے لگا۔ جب وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا تو لالی نے بشیرے کا کندھا تھپک کر کہا۔

"لے یار! صاف بچ گیا۔"

وہ بے نیازی سے مسکرا کر بولا۔ "ویسے ہوتا ہوا تا کیا تھا۔ سو دو سو روپے دے کر ہر جواری چھوٹ جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ رات بھر حوالات میں بند رہے گا۔ سویرے ضمانت پر رہا ہو جائے گا۔ پر میں اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔" اس نے مڑ کر لالی کی طرف دیکھا۔ "پر تو قبر کے اندر بیٹھا کیا کر رہا تھا؟ میں نے جواریوں کے ساتھ تو تجھے دیکھا نہیں۔"

"نہیں یار! میں جوا شوا نہیں کھیلتا۔" لالی نے حیلہ جوئی سے کام لیا۔ "میں تو اس ٹوٹی کبر میں بیٹھ کر وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ ۴۰ دن کا چلّہ ہے۔"

"پر تجھے یہ پتہ نہیں' یہاں جوا بھی ہوتا ہے؟"

"چلے کا آج پہلا ہی دن تھا۔ تو نے آ کر میرا وظیفہ خراب کر دیا۔"

بشیرے نے آنکھ مار کر بدمعاشی سے کہا۔ "یاری آشنائی کا چکر ہے کچھ؟" وہ ہولے سے ہنسا۔ "کسی سے آنکھ لڑ گئی؟ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ ورنہ تیرے جیسا جوان کہاں قبروں میں بیٹھ کر چلے کشی کرتا ہے۔"

"نہیں جی! میرے ساتھ ایسا کوئی چکر نہیں۔ میں ایسے دھندوں میں نہیں پڑتا۔"

"کسی مقدمے میں پھنس گیا ہو گا۔" اس نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ "یار اب اس قبر سے تو نکل۔"

بشیرے نے دونوں ہاتھ باہر زمین پر ٹکائے' اچھلا اور دونوں ٹانگیں قبر کے اندر کی دیوار سے ٹکا کر دھیرے دھیرے گھسٹتا ہوا اوپر چلا گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں اور کپڑوں پر سے خاک جھاڑی' جھک کر لالی کو دیکھا۔ ہنس کر بولا۔ "یار! تو اتنی گہری قبر سے باہر کیسے نکلتا ہے؟" اس نے اپنا ہاتھ لالی کی طرف بڑھایا۔

"لے میرا ہاتھ پکڑ لے۔"

"رہنے دے۔" لالی نے اس کے ہاتھ کا سہارا لینے سے انکار کر دیا۔ جھک کر اپنی گٹھری اٹھائی۔ اسے کندھے پر لٹکایا۔ دونوں ہاتھ اونچے کیے۔ قبر کے باہر کی زمین تھامی۔ اچھلا اور ایک ہی زقند میں اس صفائی سے باہر آیا کہ بشیرا دنگ رہ گیا۔

"یار توں تو کوئی اونچی چیز لگتا ہے۔"

لالی اس کی بات نظر انداز کر کے بولا۔ "یہ بتا' تیں نوں اب کتھے جانا ہے؟"

"میں نے تو کہیں نہیں جانا۔ یہیں قبرستان میں رہوں گا۔"

"تو گورکن تو نہیں ہے؟"

"یار! تو نے حد کر دی۔" وہ کسی قدر تیکھے لہجے میں بولا۔ "میں تجھے گورکن لگتا ہوں۔"

لالی نے اس کی سفید قمیص اور خاکی پتلون غور سے دیکھی۔ چند لمحے خاموش رہا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "دیکھنے میں تو پولسیا لگتا ہے۔"

وہ ہنس کر بولا۔ "ٹھیک اندازہ لگایا تو نے۔"

لالی گھبرا گیا۔ بشیرے نے اس کی گھبراہٹ بھانپ لی۔ ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "ڈر نہیں' دو سال ہوئے میں نے پولیس کی ملازمت چھوڑ دی۔"

"چھوڑ دی یا نکال دیا گیا۔"

"نکال دیا گیا' یوں ہی سمجھ لے۔ ویسے پولیس کی نوکری مجھے پسند نہیں تھی۔ تنخواہ کم اور ہر وقت کی ذلیل' رشوت نہ بھی لو تب بھی بدنام۔"

لالی خاموش رہا۔ بشیرا بھی چپ ہو گیا۔

اب رات کا چل چلاؤ تھا۔ مشرق میں صبح کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ ذرا دیر بعد دور سے اذان بلند ہوئی۔ لالی پریشان ہو گیا۔ اب قبرستان میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس نے بشیرے سے کہا۔

"تو یہاں ٹھہر۔ میں نوں تو اب جانا ہے۔" وہ چلنے کے لیے مڑا۔ بشیرے نے اسے روک لیا۔

"یار! ایسی بھی کیا جلدی' چائے پی کر جانا۔"

"چائے؟" لالی نے حیرت کا اظہار کیا۔ "چائے یہاں کہاں ملے گی؟"

"کیوں نہیں ملے گی۔" بشیرا ہنس کر بولا۔ "ابھی تجھے چائے پلواتا ہوں۔"

"نہیں جی! میں نے چائے شائے نہیں پینی۔"

"چھوڑ یار! کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔" بشیرا بے تکلفی سے بولا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا

پیکٹ نکالا۔ لالی کی طرف بڑھایا۔ "لے' پہلے ایک سگریٹ پی۔" لالی نے سگریٹ پینے سے بھی انکار کر دیا' مگر بشیرا نہ مانا۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور اصرار کر کے لالی کے ہونٹوں سے لگا دی۔ پھر لالی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "آ میرے ساتھ۔ آرام سے بیٹھ کر چائے پئیں گے' فیر جہاں تیرا جی کرے' چلا جانا۔"

اس نے ایسا مجبور کیا کہ لالی کے لیے مزید انکار کی گنجائش نہیں رہی۔ وہ بشیرا کے ہم راہ چپ چاپ آگے بڑھنے لگا۔ دونوں قبروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے درختوں کے جھنڈ کی جانب چلنے لگے۔ قریب جا کر بشیرا نے مکان کے بند دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ ایک بوڑھے نے جھک کر بشیرے کو دیکھا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اندر' آجاؤ' اندر آجاؤ۔"

اس نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے۔ بشیرا اور لالی خاموشی سے اندر چلے گئے۔ بوڑھے نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ وہ ابھی تک گھبرایا ہوا تھا' بشیرے کو مخاطب کر کے بولا۔ "کہاں چلا گیا تھا؟ پولیس نے چھاپا مار کر کئی جواریوں کو پکڑ لیا۔ پولیس ذرا ہی دیر پہلے یہاں سے گئی ہے۔"

"مجھے سب معلوم ہے۔" بشیرا قریب پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے لالی کو بھی ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا۔ "چاچا! تو تو کہتا تھا' پولیس کل چھاپا مارے گی۔ آج کیسے دوڑ آگئی؟"

"مجھے تو شیر محمد کانسٹیبل نے یہی بتایا تھا۔"

بشیرا شکوہ کرنے لگا۔ "چاچا! تو نے تو آج مروا ہی دیا تھا۔ بال بال بچ گیا۔"

"کیا تو بھی جوا کھیلنے بیٹھ گیا تھا؟"

"میں تو ایسے ہی کھیل دیکھنے گیا تھا۔ انھوں نے زبردستی بٹھا لیا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "چاچا! اب تو فٹافٹ گرم گرم چائے پلوا دے۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"بختاور نے دودھ لی تو ابھی چائے آجائے گی۔"

"سکندر واپس آگیا؟"

"نہیں جی! وہ شام تک شہر سے لوٹے گا۔" بوڑھے نے بشیرا کو بتایا۔ "تم آرام سے بیٹھو۔ میں تمھارے لیے چائے بنوا کر لاتا ہوں۔" اس نے گھر کے اندر جانے والا دروازہ کھولا اور کمرے سے چلا گیا۔

بشیرے نے لالی سے کہا۔ "یہ پیر بخش ہے' قبرستان کا گورکن۔ اپنا پرانا یار ہے۔ سمجھو یہ اپنا ہی

گھر ہے۔" چند لمحے خاموش رہ کر اس نے پوچھا۔

"یار! تو نے اپنا نام نہیں بتایا؟"

لالی نے اس کے سوال کا جواب پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے بتایا۔ "میرا نام روشن ہے جی۔"

مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ دونوں رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ تھکن سے نڈھال تھے۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھا پیر بخش اندر آیا' کہنے لگا۔ "ادھر ڈیرے پر آجاؤ۔ میں نے تیری منجی کے ساتھ ایک کھٹ اور ڈلوا دی ہے۔ ساری رات جاگتے گزر گئی۔ اب تو سو جا۔"

بشیرا کسی قدر تیکھے لہجے میں بولا۔ "سونا سلانا تو بعد کی بات ہے۔ چاچا! پہلے یہ بتا' چائے کا کیا بنا؟"

"خالی چائے سے کیا بنے گا۔ پیٹ میں تھوڑی سی روٹی بھی جانی چاہیے۔" پیر بخش نے مسکرا کر کہا۔ "اب کھڑا ہو جا۔"

بشیرا اور لالی کھڑے ہو گئے۔ پیر بخش کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کمرے سے نکل کر دالان میں آگئے۔ آگے کھلا صحن تھا۔ صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ تینوں صحن میں پہنچ گئے۔ صحن کی ایک دیوار کے ساتھ چھپر پڑا تھا۔ یہ جھلیانی تھی۔ اس میں چولہا تھا جس میں آگ جل رہی تھی۔ چولھے کے قریب ایک نوجوان عورت بیٹھی پراٹھے تیار کر رہی تھی۔ وہ پیر بخش کی بہو بختاور تھی۔ آہٹ سن کر اس نے ان کی طرف دیکھا۔ سر سے ڈوپٹے کا آنچل کھینچا اور بکل مار کر چہرے کو کسی قدر چھپالیا۔

پیر بخش نے اسے مخاطب کیا۔ " بکھتاور! جھیتی ہتھ چلا۔ دونوں رات بھر کے بھوکے ہیں۔"

تینوں نے صحن عبور کیا۔ پیر بخش نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہ باہر آگئے۔ صحن کے دروازے کے سامنے برآمدہ تھا۔ اس کے پیچھے کمرہ تھا۔ درمیان سے پتلی سی گلی گزرتی تھی۔ گلی عبور کر کے تینوں برآمدے میں پہنچے اور کمرے کے کھلے دروازے سے اندر چلے گئے۔ کمرہ صاف ستھرا تھا۔ اس میں دو چارپائیاں تھیں۔ ان پر بستر لگے تھے۔ فرش پر چٹائی بچھی تھی۔ تینوں چٹائی پر بیٹھ گئے۔ پیر بخش زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہرا۔ واپس آنے کا وعدہ کر کے باہر چلا گیا۔ مگر آیا نہیں۔ کچھ دیر بعد بختاور کمرے کے اندر آئی۔ اس نے اس وقت بھی ہلکا سا گھونگٹ نکال رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں المونیم کا تھال تھا جس میں پراٹھوں کے ساتھ ساتھ دو پیالوں میں چائے بھی تھی۔ اس نے نظریں نیچی کیے ہوئے کہا۔

"چاچا باہر کسی سے گل بات کر رہا ہے۔ ادھر بستی میں موت ہو گئی ہے۔ کبر تیار کرنے کی گل ہو

ہی ہے۔"

وہ جھکی اور تھال بشیرا اور لالی کے درمیان رکھ کے واپس چلی گئی۔ مگر ذرا ہی دیر بعد لوٹے میں پانی لے کر آئی۔ کہنے لگی۔ "کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا۔"

وہ باہر چلی گئی۔ بشیرا اور لالی اٹھ کر برآمدے میں گئے اور لوٹے سے پانی لے کر کلیاں کرنے لگے۔ انہوں نے منہ دھویا اور اندر واپس آگئے۔

دونوں چٹائی پر بیٹھ کر پراٹھے کھانے لگے۔ پراٹھے گرم تھے۔ دونوں بھوکے بھی تھے۔ مزے لے لے کر سارے پراٹھے کھا گئے۔

چائے پیتے ہوئے بشیرا نے لالی سے پوچھا۔ "روشن! یہ بتا' تجھے جانا کہاں ہے؟"

"سٹیشن۔" لالی نے مختصر جواب دیا اور جان بوجھ کر اسٹیشن کا نام نہیں لیا۔

"سٹیشن سے کہاں جائے گا؟"

"کراچی کی گڈی پکڑنی ہے۔"

"لے یار! ملا اسی بات پر ہاتھ۔" اس نے گرم جوشی سے لالی کا ہاتھ تھام لیا۔ "کراچی تو مجھے بھی جانا ہے۔ دونوں کل صبح کی ٹرین سے اکٹھے چلیں گے۔ رات کو تھوڑا سا کام کرنا ہے۔ تو بھی ساتھ لگ جا تو کام جلد ہی نمٹ جائے گا۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "سچ پوچھ تو میں نے تجھے اسی کام کے لیے روکا تھا۔"

"کام کیا کرنا ہو گا؟"

"یہ میں تجھے رات ہی کو بتاؤں گا۔"

لالی ذرا دیر خاموش رہا پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "تو کفن چور تو نہیں ہے؟"

"نہیں یار! میں ایسا گھٹیا کام نہیں کرتا۔"

"فیر کیا کام ہے؟"

"کہہ تو دیا' رات کو آرام سے بات ہو گی!"

بشیرا اٹھا اور چارپائی پر جا کر دراز ہو گیا۔ لالی کچھ دیر چٹائی پر گم صم بیٹھا رہا پھر وہ بھی اٹھ کر دوسری چارپائی پر لیٹ گیا۔ بشیرا ذرا ہی دیر بعد خراٹے بھرنے لگا۔ مگر لالی کو نیند نہیں آئی۔ بشیرا کی باتوں نے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ کمرے میں مختصر سی کھڑکی بھی تھی جو کمرے کے پچھواڑے کھلتی تھی۔

لالی کروٹ بدل کر کھڑکی کی جانب دیکھنے لگا۔ باہر املتاس کا اجڑا ہوا درخت تھا۔ درخت کے پتے

گر چکے تھے۔ شاخوں میں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ ہر طرف زرد زرد دھوپ پھیلی تھی۔ لالی کئی منٹ تک چپ لیٹا رہا۔

غنودگی کا غلبہ ہوا تو وہ بھی گہری نیند سو گیا۔

دوپہر کو آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا بختاور دہلیز پر کھڑی ہے۔ وہ لالی کو بیدار کرنے کے لیے دروازے کی کنڈی آہستہ آہستہ بجا رہی تھی۔ کھانا لے کر آئی تھی۔ لالی نے اسے دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔

بختاور نے کھانا چٹائی پر رکھ دیا اور قریب بیٹھ کر کھانے پر بھنبھناتی ہوئی مکھیاں ہاتھ ہلا ہلا کر اڑانے لگی۔ لالی نے بشیرے کی چارپائی پر نظر ڈالی۔ اس کا بستر خالی تھا۔ لالی چارپائی سے اتر کر نیچے آیا۔ اس نے بختاور سے پوچھا۔

"بشیرا کہاں ہے؟"

بختاور نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ "وہ چاچا کے ساتھ کوٹ سلیم گیا ہے۔ دن ڈھلے لوٹے گا۔ اس نے روٹی کھالی ہے۔ توں اس وکھت سو رہا تھا۔"

"کتنی دیر ہوئی دونوں کو گئے ہوئے؟"

"زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ جانا تو انہیں سویرے ہی تھا پر چاچا کو ایک میت دفن کرنی تھی۔ اسی میں دیر ہو گئی۔"

لالی نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ وہ کھانا کھانے لگا۔ کھانے میں روٹی تھی۔ ساگ تھا۔ اچار اور مکھن بھی تھا۔ بختاور چٹائی پر خاموش بیٹھی رہی۔ لالی نے کھانا کھاتے کھاتے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ نہا دھو کر آئی تھی۔

اس کے کپڑے صاف ستھرے تھے۔ بال خشک تھے۔ سانولی رنگت تھی۔ بدن مضبوط اور صحت مند تھا۔ ناک نقشہ سبک تھا۔ عمر بھی بائیس تیئس برس سے زیادہ نہیں تھی، مگر اس کے چہرے پر عجب ویرانی برستی تھی۔ وہ بجھی بجھی دکھائی دے رہی تھی۔ لالی نے اس کے چہرے کی ویرانی محسوس کی اور یہ بھی محسوس کیا کہ قبرستان کی طرح گھر میں بھی گہری خاموشی ہے۔ اس نے بختاور سے پوچھا۔

"تیرے سوا یہاں اور کوئی نہیں؟"

"اس وکھت تو کوئی نہیں ہے۔" اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو گھورا۔ "پر تو یہ کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"نراض کیوں ہوتی ہے۔" لالی مسکرا کر بولا۔ "تیرے بال بچے نہیں ہیں؟"

"نہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔ اس دفعہ اس کا لہجہ نرم تھا۔ "پنج سال پہلے مرا ہوا نکا پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد کوئی نہیں ہوا۔" اس کے سانولے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔

لالی نے اس کی افسردگی کا سبب فوراً تاڑ لیا۔ تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "فکر کیوں کرتی ہے۔ بال بچے بھی ہو جائیں گے۔ ابھی تو بوڑھی تو نہیں ہو گئی۔"

بختاور نے نگاہ اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں ویران اور خالی خالی تھیں۔ وہ نظریں نیچی کیے چند لمحے گم صم بیٹھی رہی۔

اس نے گہری سانس بھری اور آہستہ سے بولی۔ "چاچا کو پوتا پوتی کا بہت چاؤ ہے۔ وہ سکندر کا دوسرا ویاہ کرنا چاہتا ہے۔" دل کی بات بے اختیار بختاور کی زبان پر آ گئی۔

"سکندر تیرا کھصم ہے نا؟ وہ کیا کہتا ہے؟"

"وہ کیا کہے گا۔ جو پیو کہے گا، وہی کرے گا۔ ایک وڈی ننانی ہے، پڑوس کے چک میں ویاہی ہے۔ جب آتی ہے، وہ بھی پیو اور بھائی کو اکساتی ہے۔"

لالی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس مسئلے کا کیا حل بتائے۔ وہ چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔ بختاور خاموش بیٹھی رہی۔ "ایک گل پوچھوں، برا تو نہیں منائے گا؟"

"پوچھ، کیا پوچھنا چاہتی ہے۔"

بختاور ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "یہ گندا کام کرتے تیں نوں برا نہیں لگتا؟"

لالی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "کیسا گندا کام؟"

"یہی جو بشیرا کرتا ہے۔"

"بشیرا کیا کرتا ہے؟" لالی ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

اس بار وہ زیر لب مسکرائی۔ "تیں نوں یہ بھی پتہ نہیں۔"

"مجھے کیا پتہ۔ میں تو بشیرا کو ٹھیک سے جانتا بھی نہیں۔ میرا تو اس سے کل رات ہی میل ملاپ ہوا ہے۔"

بختاور نے تعجب سے کہا۔ "رات توں بھی ادھر ٹوٹی کبر میں جوا کھیل رہا ہو گا؟"

"نہیں جی، میں جوا شوا نہیں کھیلتا۔" وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ "تو نے یہ نہیں بتایا، بشیرا کیا کام کرتا ہے!"

"اسی سے پوچھ لینا۔ چاچا خامخا میرے گلے پڑ جائے گا۔"

لالی اب کھانا کھا چکا تھا۔ بختاور نے برتن اٹھائے اور کمرے سے جانے لگی۔ لالی نے اسے روکا۔ “گل سن بختاور۔”

“کہہ کیا کہنا چاہتا ہے؟” اس نے پلٹ کر لالی کی جانب دیکھا۔

“ڈرتی کیوں ہے؟ میں تیرا نام نہیں بتاؤں گا۔ اب بتا‘ بات کیا ہے؟”

مگر بختاور نہیں رکی۔ “مجھے جانے دے۔ ابھی ڈھیر سارے کام کرنے ہیں۔” وہ کمرے سے چلی گئی۔

☆

لالی سخت مخمصے میں پڑ گیا۔ وہ حیران و پریشان بیٹھا سوچتا رہا کہ بشیرا ایسا کون سا کام کرتا ہے جسے بختاور بہت برا سمجھتی ہے‘ اور بتانے سے بھی ڈرتی ہے۔

بختاور کی باتوں سے اس نے یہ بھی اندازہ لگا لیا کہ پیر بخش گورکن بھی اس دھندے میں بشیرا کے ساتھ شریک ہے۔ لالی کے ذہن میں کرید پیدا ہوئی کہ کسی طرح یہ بھید معلوم کیا جائے۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا‘ مگر قرار نہ آیا۔

اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور برآمدے میں آگیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ برآمدے کے سامنے کی گلی بھی ویران تھی۔ گلی کے دوسری طرف پیر بخش کے گھر کا دروازہ تھا جو صحن میں کھلتا تھا۔

لالی برآمدے میں کھڑا دروازہ تکتا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ شاید بختاور باہر نکلے۔ مگر نہ دروازہ کھلا نہ بختاور نظر آئی۔ آخر لالی خود ہی آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ دروازے پر پہنچا۔ دستک دینے کے لیے اس نے ہاتھ رکھا تو دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ بختاور پڑچھتی کے نیچے چبوترے پر ٹانگیں پسارے بیٹھی تھی‘ چاٹی میں مدھانی ڈالے اطمینان سے دودھ بلو رہی تھی۔ بختاور نے آہٹ سن کر دروازے کی جانب نظریں اٹھائیں۔ لالی کو اس نے وہاں کھڑے دیکھا تو دوپٹے کا پلو کھینچ کر گھونگھٹ نکال لیا‘ آہستہ سے پوچھا۔

“کیسے آیا؟”

“ماچس ہو تو دے دے۔”

بختاور فوراً کھڑی ہو گئی۔ “کمرے میں چل‘ میں ابھی ماچس لے کر آئی۔” وہ پڑچھتی سے نکل کر صحن میں آگئی۔

لالی دروازے سے ہٹ کر کمرے میں پہنچا۔ تھوڑی دیر بعد بختاور بھی کمرے میں آگئی۔ اس نے ماچس لالی کے سامنے ڈال دی۔ لالی نے ماچس اٹھا کر سگریٹ سلگائی اور ایک کش لگا کر بختاور کی جانب دیکھا۔

“کھڑی کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔”

“کوئی اور کام ہو تو بتا دے۔” وہ بدستور کھڑی رہی۔ “میں نوں ابھی دودھ بلونا ہے۔ نی پر چاٹی چھوڑ کر آئی ہوں۔”

لالی اس کی بات نظرانداز کر کے بولا۔ “کبھی سر میں تیل اور آنکھوں میں کاجل تو ڈال لیا کر۔” وہ زیر لب مسکرایا۔ “کبرستان میں رہتے رہتے تو بھی ٹوٹی پھوٹی کبر بن گئی۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھ۔”

“تیں نوں کیہہ پتہ‘ مجھ پر کیا بیتتی ہے۔” بختاور نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ “مرد ایسا ملا ہے‘ نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا اور چاچا تو صرف پیسہ جوڑتا ہے۔ جو آتا ہے‘ سیدھا اس کے گلک میں جاتا ہے۔”

“تیرے ماں پیو نہیں ہیں؟” یہ بات پوچھ کر لالی نے گویا بختاور کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور دہلیز کے پاس فرش پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ “اپنا تو کوئی بھی نہیں۔” وہ لمحے بھر خاموش رہی۔

“ماماں تھا‘ وہ بھی دو سال ہوئے گزر گیا۔”

لالی نے خاموشی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس روپے کا نوٹ نکال کر بختاور کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ “لے‘ یہ رکھ لے۔ اپنے لیے تیل‘ کاجل اور دنداسا شنداسا خرید لے۔”

بختاور نے نوٹ لینے سے انکار کیا۔ مگر لالی نے اصرار کیا تو اس نے نوٹ لے کر دھوتی کی ڈب میں رکھ لیا۔ ذرا دیر دونوں خاموش رہے پھر لالی نے دریافت کیا۔

“تیرا پیو بھی گورکن تھا؟”

“نہ جی‘ میرے تو ناتے داروں میں بھی کسی نے یہ دھندا نہیں کیا۔ کبر کھودنا‘ مردے دفن کرنا‘ یہ بھی کوئی کام ہے۔ شروع شروع میں تو یہاں اتنا جی گھبراتا تھا‘ ایسا ڈر لگتا تھا‘ سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ گھنٹوں رویا کرتی‘ بالکل پیلی پڑ گئی تھی۔ بکھار رہنے لگا تھا۔” وہ بیتے دنوں کی یادوں میں کھو گئی۔ اس کا لہجہ رفتہ رفتہ افسردہ ہوتا گیا۔ “ماماں بے چارہ گریب مزارع تھا۔ اوپر سے مامی ہر وکھت کڑ کڑ کرتی رہتی تھی۔ سو ماماں نے مجھے سکندر کے پلے باندھ دیا اور میں جیتے جی کبرستان میں آگئی۔” وہ بے خیالی میں زمین پر انگلی سے لکیریں بنانے لگی۔

“اب چاچا کہتا ہے‘ سکندر کا دوسرا ویاہ کروں گا۔”

”اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“ لالی نے اظہار ہمدردی کیا۔ ”یہ تو بتا‘ تیرا گھر والا سکندر کیسا بندہ ہے؟ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔“

”تجھے کیا بتاؤں۔“ بختاور نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ دل گرفتہ تھی۔ نہ جانے کب سے ہمدردی کے دو بول سننے کے لیے ترس رہی تھی۔ لالی نے اس کی ذات میں دلچسپی لے کر اظہار ہمدردی کیا تو موم کی طرح پگھل گئی۔ وہ اس وقت اپنے دل کی بھڑاس نکال دینا چاہتی تھی۔ ”جب میرا ویاہ ہوا تو سکندر ۱۴ سال کا چھوہرا تھا اور میں ۱۹ سال سے بھی اوپر کی ہو چکی تھی۔ ویاہ کے وکھت پوری جوان تھی۔“ یہ بتاتے بتاتے اس کے لہجے میں اچانک تلخی آ گئی۔ ”پہلے پیو نے جورو بنا کر رکھا۔ فیر دونوں نے۔ چاچا اتنا بوڑھا ہو گیا پر اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔“

”پیر بخش اتنا نیچ اور بے غیرت ہے‘ یہ تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔“

”ایک دم بے غیرت ہے۔ سکندر بھی بے غیرت ہے۔“ بختاور نے غصے سے منہ بگاڑا۔ ”سب کچھ بنتا ہے پر پیو کے سامنے کتے کی طرح دم ہلاتا ہے۔“

لالی نے چند لمحے خاموش رہ کر دریافت کیا۔ ”بشیرے کا کیا معاملہ ہے؟“

”وہ مجھے کبھی چنگا بندہ نہیں لگا۔“ بختاور نے جواب دیا۔ ”پر اس نے کبھی مجھے بری نظر سے نہیں دیکھا۔“

لالی نے تعجب سے کہا۔ ”سکندر کی طرح بشیرا بھی تیری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ دیکھنے میں تو بری نہیں لگتی۔“ لالی نے نظر بھر کر دیکھا۔ اسے بختاور میں شاداں کی جھلک نظر آئی۔ لالی نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔

”ابھی تو جوان مٹیار ہے۔ ذرا بناؤ سنگھار کر لے تو سوہنی نظر آنے لگے گی۔“

بختاور کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ وہ شرما گئی۔ نظریں جھکا کر بولی۔ ”ایسی گلاں کر کے کیوں مجھے بہکانے کی کوشش کر رہا ہے؟“ یہ کہتی ہوئی وہ اٹھنے کے لیے کسمسائی۔ ”چاچا آتا ہی ہو گا۔“ اس کے چہرے کی شگفتگی فوراً ماند پڑ گئی‘ ہلکا ہلکا خوف منڈلانے لگا۔

مگر لالی نے اسے اٹھ کر جانے نہیں دیا۔ ”میں تجھے کبرستان سے نکال کر باہر لایا‘ تو فیر کبرستان کی طرف چلی۔ زندہ رہنا ہے تو زندہ بن کر رہ۔ نہیں تو جلد ہی مر جائے گی۔“

”یہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔“ وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”سچ کہتی ہوں‘ میں زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گی۔“

”اور اب بھی کہاں زندہ ہے؟“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ وہ اور افسردہ ہو گئی۔ ”کوئی بھی تو کھشی نہیں‘ کچھ بھی نہیں۔ ایسا جینا کس کام کا۔ مر جاؤں گی تو ٹھیک ہی ہو گا۔“

”کیا ٹھیک ہو گا؟“ لالی کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ ”پیر بخش تو خوش ہو گا۔ وہ سکندر کا جھٹ دوسرا ویاہ کر دے گا۔ جو بھی نئی ویاہ کر آئے گی‘ اسے بھی تیری طرح اپنی جورو بنا لے گا۔ سکندر تو کچھ کہے گا نہیں۔ یہ تجھے بھی پتہ ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

بختاور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ وہ زمین پر انگلی سے الٹی سیدھی لکیریں بنا رہی تھی۔ لالی نے قدرے تامل کے بعد پوچھا۔

”میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”بتا‘ میں کیا کروں؟“

”بتاتا ہوں‘ ابھی بتاتا ہوں۔ پہلے مجھے یہ بتا‘ بشیرا کیا دھندا کرتا ہے؟“

بختاور کو لالی کی بات پسند نہیں آئی۔ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ ”مجھے اسی لیے روکا تھا؟ تو فیر سن لے۔ بشیرا کبروں سے مردوں کے پنجر نکالتا ہے۔“

”مردوں کے پنجر نکالتا ہے؟“ لالی نے اس طرح آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے دیکھا جیسے یقین نہ آیا ہو۔ ”مگر وہ انہیں کس لیے نکالتا ہے؟“

”پتہ نہیں۔“ بختاور نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”میں نوں تو اتنا پتہ ہے وہ پنجروں کی ہڈیاں بکسوں میں بند کر کے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔“ وہ چند لمحے چپ بیٹھی رہی۔ ”اس نے چاچا اور سکندر کو بھی اسی رستے پر لگا دیا ہے۔ ذرا سوچ کتنا گندہ کام ہے۔ مردوں کی مٹی کھراب کرتے انہیں ذرا بھی تو ڈر نہیں لگتا۔“

”بشیرا یہیں رہتا ہے؟“

”نہ جی‘ وہ یہاں کیوں رہنے لگا۔ مہینے‘ ڈیڑھ مہینے میں ادھر کا پھیرا کرتا ہے۔ اس دفعہ تو کوئی تین مہینے بعد آیا ہے۔ پر جب بھی آتا ہے‘ تین چار روز ضرور ٹھہرتا ہے۔ اب کے وہ کئی دنوں سے ٹھہرا ہوا ہے۔ جواریوں کو پکڑنے پولیس کی جو دوڑ آئی تھی‘ بشیرا ہی نے چاچا کے ذریعے بلوائی تھی۔ چاچا مکھبری کرنے خود تھانے گیا تھا۔“ لالی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ بختاور کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی پھر اس نے اٹھنے کے لیے پہلو بدلا۔

”اب مجھے جانے دے۔“

”چاچا کا ڈر لگ رہا ہے‘ یہی بات ہے نا؟“

”تیں توں پتہ نہیں، وہ کیسا بندہ ہے۔“

”اس کے بارے میں جاننے کو اب رہ کیا گیا ہے۔ سبھی کچھ تو بتا دیا۔ پر اس سے اتنا ڈرتی کیوں ہے؟“

”ڈروں نہیں تو کیا کروں۔ کتّا اپنے کھونٹے پر اچھلتا ہے۔ میرا کوئی بھی کھونٹا نہیں۔“

”مجھے پتہ ہے۔ پر تو جوان ہے اور جوان مٹیار کو جوان اور سوہنی ہی بن کر رہنا چاہیے۔ جس زنانی کا کوئی نہیں ہوتا، وہ اسی کے سہارے زندہ رہتی ہے۔ میری بات کا مطلب سمجھ رہی ہے؟“

”سمجھ رہی ہوں، سب سمجھ رہی ہوں۔“

دونوں چند لمحے خاموش رہے۔ لالی نے کہا۔ ”جانے سے پہلے ایک بار تیرے پاس ضرور آؤں گا، صرف ایک بات کہنے کے لیے۔ سونا نہیں، رات کو میرا انتظار کرنا۔“

وہ بے چین ہو کر بولی۔ ”ابھی بتا دے۔“

”ابھی نہیں، رات کو بتاؤں گا۔ اب تو ٹر جا۔“

بختاور کمرے سے چلی گئی۔ لالی نے مڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہی شاداں کی چال، وہی گھڑی کے پنڈولم کے مانند ادھر سے ادھر جھولتے ہوئے کولھے، وہی پتھر کی طرح ترشا ہوا ٹھوس بدن۔ لالی اسے دیکھتا رہا۔

جب وہ صحن کا دروازہ کھول کر گھر کے اندر چلی گئی تو لالی اٹھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

☆

لالی بیدار ہوا تو کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا تھا۔ بشیرا چارپائی کے پاس کھڑا اسے آہستہ آہستہ جھنجوڑ رہا تھا۔ لالی نے آنکھیں کھولیں تو وہ ہنس کر بولا۔ ”یار! بہت سو لیا۔ شام ہو رہی ہے۔ اب تو اٹھ جا۔“ لالی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”منہ دھو لے، نیند کا خمار اتر جائے گا۔“

لالی چپ چاپ چارپائی سے نیچے اترا، کمرے سے باہر گیا اور منہ ہاتھ دھو کر واپس آ گیا۔ بشیرے نے مسکرا کر کہا۔ ”ادھر، میرے پاس آ کر بیٹھ۔ اب تجھ سے کچھ کام کی باتیں ہو جائیں۔“

مگر لالی اس کے پاس نہیں گیا۔ جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر اس نے پوچھا۔ ”پہلے یہ بتا، کیا تو کبروں سے مردوں کے پنجر نکالتا ہے؟“

”نکالتا تو ہوں۔“ وہ انکار نہ کر سکا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا، مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ”مگر یہ بات تجھے بتائی کس نے؟“

”کسی نے بھی بتائی، پر میں اس چکر میں نہیں پڑوں گا۔“

بشیرا نے کسی قدر پریشان ہو کر کہا۔ ”بات کیا ہے؟“

”بات یہ ہے کہ یہ بہت گندا کام ہے۔ میں ایسے کام نہیں کرتا۔“

بشیرا لمحے بھر تک لالی کو گھورتا رہا پھر تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ ”زیادہ اڑنے کی کوشش نہ کر۔ مجھے پتہ ہے تو کتنا نیک اور بھلا مانس ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔

”کہتا تھا، میں قبر کے اندر وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ لیکن تیرا ۴۰ دن کا چلہ ایک ہی رات میں ختم ہو گیا اور اب کراچی جانے کو کہتا ہے۔“

لالی نے فوراً بات بنانے کی کوشش کی۔ ”کہنے کو تو میں نے یہ بھی کہا تھا، میں کبر کا مردہ ہوں۔“

بشیرا ذرا متاثر نہ ہوا۔ اسی طرح تیکھے لہجے میں بولا۔ ”زیادہ باتیں نہ بنا۔ کسی مغالطے میں نہ رہنا۔ میری آنکھ پولیس والے کی آنکھ ہے۔ میں نے رات ہی کو تیری باتوں سے تاڑ لیا تھا، کوئی واردات کر کے بھاگا ہے۔ جبھی تو پولیس کے ڈر سے قبر میں چھپا بیٹھا تھا۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

لالی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ پیر بخش لالٹین سنبھالے ہوئے داخل ہوا۔ اس نے لالٹین چھت سے لٹکائی اور بشیرے سے پوچھنے لگا۔ ”تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔ کام کب شروع کرنے کا ارادہ ہے؟“

”ذرا اندھیرا اور بڑھ جائے تو سکندر کے ساتھ کھدائی شروع کر دینا۔ میں آج ہی رات چلا جاؤں گا۔ ٹرک ایک بجے تک پہنچ جائے گا۔ لیکن تب تک سارا کام پورا ہو جانا چاہیے۔“

”فکر نہ کر۔ سارا کام ٹھیک ٹیم پر ہو جائے گا۔“ پیر بخش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پر کام شروع کرنے سے پہلے کچھ کھا پی لے۔“

”مجھے تو بالکل بھوک نہیں۔“ بشیرا نے لالی سے کہا۔ ”اپنے لیے روٹی منگوا لے۔“

”بھوک تو مجھے بھی نہیں ہے۔ میں بعد میں کھا لوں گا۔“ لالی نے پیر بخش کی جانب دیکھا۔ ”چاچا! میرے لیے روٹی یہیں رکھوا دینا۔ جب بھوک لگے گی، کھا لوں گا۔“

”جیسی تم دونوں کی مرضی۔“ پیر بخش کمرے سے چلا گیا۔

لالی اپنی چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ بشیرا نے لالی کو ٹٹولا۔ ”یار! اتنا گھبرا کیوں رہا ہے؟ یہ تو سیدھی سیدھی بزنس ہے۔“ اس دفعہ اس کا لہجہ نرم تھا۔

”تیری بزنس شزنس سمجھ نہیں آئی۔ نہ جانے کیا چکر ہے۔“

"کوئی چکر شکر نہیں۔" بشیرے نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔ "میں تجھے سب کچھ صاف صاف بتائے دیتا ہوں۔ بات صرف اتنی ہے، میں کراچی کی ایک کمپنی کو مردوں کے پنجر سپلائی کرتا ہوں اور بھی کئی بندے یہ دھندا کرتے ہیں۔"

"پر کمپنی پنجر لے کر کرتی کیا ہے؟"

"باہر کے ملکوں کو ایکسپورٹ کرتی ہے۔ آج کل مال یونان اور اٹلی جا رہا ہے۔ پانچ سو ڈھانچوں کا آڈر ہے۔"

لالی بدستور حیرت زدہ تھا۔ "مگر مردوں کے یہ پنجر کس کام آئیں گے؟"

"یار! حد ہو گئی۔" بشیرا ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "یہ میڈیکل کالجوں میں جو لڑکے لڑکیاں ڈاکٹری پڑھتے ہیں، انسانی ڈھانچوں اور پنجروں کے بغیر ان کی پڑھائی کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ ڈھانچے ایسے ہی کالجوں کے لیے سپلائی کئے جاتے ہیں۔ اسپتالوں اور دوا بنانے والی کمپنیوں کو بھی ان کی ضرورت پڑتی ہے اور بھی ایسے ہی دوسرے کاموں میں استعمال ہوتے ہیں۔" وہ لمحے بھر خاموش رہا پھر اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو نے کبھی یہ بھی سوچا، اپنے اسپتالوں اور میڈیکل کالجوں میں جو انسانی ڈھانچے لٹکے نظر آتے ہیں، وہ کہاں سے آتے ہیں؟"

"مجھے کیا پتہ۔" لالی نے جواب دیا۔ "پر مجھے یہ پتہ ہے، ایسا کرنا جرم ہے۔"

"جرم تو ہے۔" بشیرا نے ڈھٹائی سے کہا۔ "اور مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ قبروں کی بے حرمتی کرنے کے الزام میں تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۷ کے تحت ضابطے کی کارروائی بھی ہو سکتی ہے۔"

لالی نے خبردار کیا۔ "کسی دن دھر لیا گیا تو سیدھا جیل جائے گا۔"

"چھوڑ یار! کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔" بشیرا نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔ "حکومت بھی جانتی ہے یہ ڈھانچے کہاں سے آتے ہیں؟ کیا اسے معلوم نہیں کہ انسانی ڈھانچے درختوں میں نہیں اگتے اور مردے قبروں سے نکل کر میڈیکل کالجوں اور اسپتالوں میں نہیں جاتے؟ کسی نہ کسی قبر ہی سے کھود کر نکالے جاتے ہیں۔"

"تیری بات کچھ کچھ سمجھ آتی ہے۔"

"کمپنی کے پاس حکومت کی طرف سے باقاعدہ ایکسپورٹ لائسنس ہے اور کمپنی بھی کوئی ایسی ویسی نہیں، برٹش کمپنی ہے۔ دوائیں تیار کرتی ہے۔ پاکستان میں کمپنی کا سول ایجنٹ اپنا حاجی صالح بھائی لال جی کافور والا ہے۔ بہت وڈا کاروبار ہے اس کا۔ مجھ سے تو پنجر اور ڈھانچے وہی خریدتا

۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "تجھے ایک راز کی بات بتاؤں، ہر وڈا سرکاری اسپتال مردوں کے نچے فروخت کرتا ہے۔"

لالی کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔ "نہیں جی، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں تجھ سے کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔" بشیرا نے نہایت اعتماد سے جواب دیا۔ "یہ جو الوں میں لاوارث لاشیں رہ جاتی ہیں، تیرے خیال میں کیا انہیں کفن میں لپیٹ کر دفن کیا جاتا ، قبر بنائی جاتی ہے؟ یار! کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ایسی لاشیں کچھ عرصے تک اسپتالوں کے مردہ ں میں پڑی رہتی ہیں، بعد میں ڈاکٹری پڑھنے والے لڑکے لڑکیاں ان کی چیر پھاڑ کرتے ہیں۔ فیر وہ بں اسپتال ہی کے ایک حصے میں زمین کھود کر دبا دی جاتی ہیں۔ سال سوا، سال بعد جب کھال اور ت گل سڑ کر مٹی بن جاتے ہیں اور صرف ہڈیوں کا پنجر رہ جاتا ہے تو اسے نکال کر فروخت کر دیا ہے۔"

"حد ہو گئی جی۔" لالی منہ بگاڑ کر نفرت سے بولا۔ "سرکاری اسپتال یہ دھندا بھی کرتے ہیں۔"

"اگر اسپتال یہ دھندا نہ کرتے تو اپنا دھندہ کیسے چلتا؟ یوں سمجھ لے، اسپتالوں کے نام پر اپنا ر ابھی چل رہا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ سرکاری اسپتال سے ۱۰ پنجر خریدے جاتے ہیں تو رجسٹروں میں نا کر دکھائے جاتے ہیں۔ جو کمی رہ جاتی ہے وہ ہماری سپلائی سے پوری کر دی جاتی ہے۔"

لالی ذرا دیر بھونچکا بیٹھا رہا پھر اس نے پوچھا۔ "یار بشیرے! تو اس چکر میں کیسے پڑ گیا؟"

"یہ نہ پوچھ۔ اسی چکر میں تو پولیس کی ملازمت گئی۔" بشیرے نے گہری سانس بھر کر بتایا۔ "چار سال ادھر کی بات ہے۔ میں ان دنوں کراچی میں تعینات تھا۔ ہوا یہ کہ پولیس کو ایک رات ب پر ایک لاش ملی۔ لاش بری طرح کچلی ہوئی تھی۔ بظاہر ایکسیڈنٹ کا کیس لگتا تھا۔ پولیس کی ائی تفتیش کے بعد لاش کئی روز تک اسپتال کے مردہ خانے میں پڑی رہی۔ جب کوئی لینے نہیں ؤ اسپتال والوں نے لاش لاوارث قرار دے کر اسپتال کے اس حصے میں دبا دی جہاں ایسی لاشیں ، کی جاتی ہیں۔ یادداشت کے لیے اس جگہ رجسٹر کے اندراج کے حساب سے تختی پر نمبر بھی لگا ا تا ہے۔"

لالی حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ اطمینان سے بتاتا رہا۔ "فیر ایسا ہوا کہ چار مہینے بعد اوپر والوں کو یہ اطلاع ملی کہ وہ ایکسیڈنٹ کا نہیں قتل کا کیس تھا۔ متوفی سرگودھا کا ے والا تھا، کاروبار کے سلسلے میں کراچی آیا تھا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "ایک مجسٹریٹ کی نی میں عدالتی انکوائری ہوئی۔ جس جگہ لاش دفن تھی اس کی نگرانی کے لیے میری اور عبداللہ

خان کانسٹیبل کی ڈیوٹی لگائی گئی۔ لاش زمین سے کھود کر نکالنے پر بھی ہم دونوں کو لگایا گیا۔ ایک روز ہم دونوں اسپتال میں تھے کہ صالح بھائی لال جی کافور والا بھی وہاں آگیا۔ وہ اسپتال والوں سے ڈھانچوں کا سودا کرنے آیا تھا۔ مگر دراصل وہ ہم دونوں کی تلاش میں تھا۔ اس نے ہم سے راز داری میں بات چیت شروع کی تو پتہ چلا کہ لاش سرے سے وہاں موجود ہی نہیں ہے۔ اس نے تین ہزار رشوت دے کر ہم دونوں کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ اس جگہ کوئی اور لاش دبا دی جائے تاکہ ضابطے کی کارروائی پوری ہو جائے۔"

"مگر صالح بھائی‘ وہ لاش لایا کہاں سے تھا؟"

"اسپتال کے مردہ خانے سے لایا ہوگا یا کسی قبر سے کھود کر نکالی ہوگی۔ یہ لاش اس نے ہمیں دی۔ لاش بری طرح گل سڑ چکی تھی۔ ہم نے رات کے اندھیرے میں دیکھا بھی نہیں۔ فٹافٹ زمین کھود کر اسے دبا دیا۔ اسپتال کے عملے کو صالح بھائی نے کھلا پلا کر پہلے ہی پکا کرلیا تھا۔ اس لیے کام آسانی سے ہوگیا۔ پوسٹ مارٹم ہوا تو پتہ چلا کہ لاش مرد کے بجائے کسی زنانی کی ہے۔ بس اسی سے معاملہ بگڑ گیا۔ ہم دونوں معطل کر دیئے گئے۔ سیدھی سیدھی جیل ہو جاتی مگر حاجی صالح بھائی بہت حوصلے والا بندہ ہے۔ اس نے بھاگ دوڑ کی‘ روپیہ پانی کی طرح بہایا اور ہم دونوں کو صاف بچا لیا۔ لیکن نوکری نہ بچ سکی۔ عبداللہ خان نے تو کوئی اور دھندہ شروع کردیا۔ مجھے صالح بھائی نے اس لائن پر لگا دیا۔"

لالی کے مجرمانہ ذہن میں کھلبلی مچی۔ اس نے کرید کر پوچھا۔ "یہ بتا کتل صالح بھائی نے کرایا تھا؟"

"یہ تو آج تک پتہ نہیں چل سکا‘ قتل کس نے کیا تھا اور کس نے کرایا تھا۔" اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ "میرا خیال ہے صالح بھائی اس میں شریک نہیں تھا۔ وہ کسی اور کے لیے کام کر رہا تھا۔"

"یار بشیرے کوئی اور دھندا کر‘ یہ تو بہت واہیات کام ہے۔"

بشیرا نہایت ڈھٹائی سے بولا۔ "مگر یار‘ اس کام میں فائدہ بہت ہے۔ میں دو ہزار میں حاجی صالح بھائی کو ایک پنجر سپلائی کرتا ہوں۔ چار پانچ سو روپے اس کے نکالنے اور پہنچانے پر خرچ آتا ہے۔ دو سو تو گورکن ہی لے لیتا ہے۔ فیر کرایہ بھاڑا ہے۔ ریلوے اور پولیس کو رشوت بھی دینی پڑتی ہے۔ اس طرح مجھے ایک پنجر پر لگ بھگ ڈیڑھ ہزار مل جاتا ہے۔ میں یہاں سے چار پنجر لے جاؤں گا۔ چھ ہزار سیدھے سیدھے ہاتھ آجائیں گے۔ اب تو ہی بتا‘ کسی اور دھندے میں اتنی کمائی ہو سکتی ہے؟" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔

"اس کام میں مٹی سے سونا بنتا ہے۔ کیا سمجھا؟"

لالی متاثر نہ ہوا۔ "یار! میں تو یہ سمجھتا ہوں‘ پیسہ بنانے کے چکر میں مرنے والوں کی مٹی خراب کر رہا ہے۔ تیرا یہ دھندا چلتا رہا تو کسی دن کبر میں ایک بھی مردہ نہ رہے گا۔ یہ تو سوچ‘ ایک دن تجھے بھی مرنا ہے۔"

"شروع شروع میں ایسی باتیں میں بھی سوچتا تھا۔ ڈرتا بھی تھا‘ پر اب تو اس کام میں مزہ آنے لگا ہے۔ ادھر مال اٹھایا‘ ادھر پہنچایا‘ اپنے پیسے کھرے کیے۔ ایک ہی آرڈر سپلائی کرنے میں ہزاروں کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔"

"کئی سال سے یہ کام کر رہا ہے‘ لاکھوں بنا لیے ہوں گے۔ ابھی تک تیری ہوس پوری نہیں ہوئی۔"

"نہیں یار‘ ایسی کوئی لوٹ پڑی ہے۔ روز روز سپلائی کہاں ہوتی ہے؟ مہینے دو مہینے بعد کام نکلتا ہے۔ یوں سمجھ لے‘ اب تک میں نے زیادہ سے زیادہ ۵۰ ڈھانچے یا پنجر سپلائی کیے ہوں گے۔"

"یہ تعداد کم ہے؟ تیرے ہی حساب سے دیکھا جائے تو اب تک ساٹھ ستر ہزار تو کما ہی چکا ہے۔ اتنے روپے سے کوئی بھی کاروبار شروع کر سکتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں‘ اب یہ کام چھوڑ‘ کوئی اور دھندا کر۔"

بشیرے نے سگریٹ کا لمبا کش لگا کر دھواں اڑایا۔ "کہتا تو ٹھیک ہے۔ اپنا بھی ایسا ہی ارادہ ہے۔ میرا پروگرام یہ ہے کہ سو ڈھانچے سپلائی کرنے کے بعد یہ دھندا ختم کر دوں گا۔"

"یار! یہ سو کی شرط کیوں رکھی ہے؟"

"تب تک اتنی رقم اکٹھی ہو جائے گی کہ میں کاٹن جننگ فیکٹری لگا سکوں گا۔ اس کا سودا بھی ہو چکا ہے۔ ایڈوانس بھی دے چکا ہوں۔ چھ مہینے کے اندر اندر پوری رقم ادا کرنی ہے۔"

"کراچی میں سودا کر رکھا ہے؟"

"لائل پور میں چنیوٹی شیخ برادری کا اپنا ایک یار ہے‘ سیٹھ حمید اللہ گگوں۔ بہت وڈا کاروبار ہے اس کا۔ کئی فیکٹریاں اور کارخانے ہیں۔ اسی کی معرفت سودا طے ہوا ہے۔ اس کے ساتھ میری یاری دوستی بھی عجب طرح سے ہوئی۔ پتہ ہے کیسے ہوئی؟"

لالی خاموش بیٹھا رہا۔

"ہوا یہ کہ سیٹھ حمید گگوں کی بیٹی‘ لاکھ‘ ڈیڑھ لاکھ نقدی اور زیور لے کر ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔ میں ان دنوں لائل پور میں تعینات تھا۔ سیٹھ حمید گگوں خود تھانے آیا۔ رات کا وقت تھا‘ میں

ڈیوٹی پر تھا۔ سیٹھ حمید کو شبہ تھا کہ دونوں ٹرین سے کراچی جانے والے ہیں۔ میں فوراً اشٹیشن پہنچا۔ دیکھا، دونوں ٹرین میں سوار ہونے جا رہے ہیں۔ میں نے وہیں انہیں دھر لیا۔ سارا کام خاموشی سے ہو گیا۔ نہ بدنامی ہوئی، نہ ہنگامہ۔ مگوں بہت خوش ہوا۔ اس نے مجھے ہزار روپے بھی دیئے۔ اسی روز سے اس کے ساتھ میری یاری بھی ہو گئی۔" بشیرا نے لالی کو غور سے دیکھا، ہنس کر بولا۔ "میں تو کہتا ہوں، اپنے ساتھ لگ جا، عیش کرے گا۔ بول، کیا کہتا ہے؟"

لالی نے صاف انکار کر دیا۔ "نہیں جی! میں ایسے دھندے میں نہیں پڑتا۔"

"نہ پڑ، تیری مرضی۔ مگر آج رات تو میرے ساتھ کام کرے گا۔ دیکھ، انکار نہ کرنا۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ذرا دیر سر جھکائے کچھ سوچتا رہا، پھر بولا۔ "یہ بتا، مجھے دے گا کیا؟"

"چار سو روپے۔ مطلب یہ کہ ایک پنجر کے سو روپے۔"

"پورے پانچ سو کر دے۔" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "مگر میرے حصے کا روپیہ تجھے پہلے دینا ہو گا۔"

"منظور ہے۔" بشیرے نے جیب سے پانچ سو روپے نکالے اور لالی کے حوالے کرتے ہوئے خبردار کیا۔ "ایک بات کان کھول کر سن لے، میرے ساتھ کوئی داؤ کیا تو یہ سمجھ لے، میں بہت خطرناک بندہ ہوں۔"

لالی نے روپے جیب میں رکھے اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں نوں پتہ ہے تو کتنا خطرناک بندہ ہے۔ مگر میں بھی ایسا ویسا بندہ نہیں ہوں، اپنی بات کا پکا ہوں۔ وعدہ کروں گا تو پورا کروں گا۔ میدان چھوڑ کر بھاگنے والا نہیں۔ وکھت پڑے تو آزما لینا۔"

بشیرا ہنستا ہوا اٹھا، لالی کے پاس گیا اور اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے بے تکلفی سے بولا۔ "زیادہ باتیں نہ بنا۔ چل اٹھ۔ ابھی بہت کام کرنا ہے۔" لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

دونوں دروازے کی جانب بڑھے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

☆

شام اب تاریک ہو چکی تھی۔ ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ بشیرا اور لالی اندھیرے میں آگے بڑھنے لگے۔ چند ہی قدم چلنے کے بعد بشیرا درختوں کے نیچے بنی ہوئی کوٹھری کے دروازے پر ٹھہر گیا۔ دروازہ بند تھا مگر اندر روشنی تھی۔

اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ کوٹھری میں چراغ جل رہا تھا۔ اس کی دھندلی روشنی میں پیر بخش اور سکندر فرش پر بیٹھے تھے۔ ان کے قریب لمبی لمبی خشک گھاس کا ڈھیر تھا۔ ایک طرف لکڑی کے دو بکسے رکھے تھے۔ ان کے ڈھکنے کھلے ہوئے تھے۔ بکسے چیڑ کی لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر بنائے گئے تھے۔ پیر بخش اور سکندر ان میں گھاس کی تہہ جما رہے تھے۔

بشیرے نے کوٹھری میں داخل ہوتے ہی کہا۔ "تم دونوں نے ابھی تک کھدائی شروع نہیں کی؟"

پیر بخش ہنس کر بولا۔ "میں نے سوچا، جب تک اندھیرا ہو، اتنی دیر میں یہ کام کر لیا جائے۔" اس نے بکسے میں بچھی ہوئی گھاس کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کام بھی تو ضروری ہے۔"

"یہ کتنی دیر کا کام ہے، بعد میں ہو جاتا۔ پہلے کھدائی ہونی چاہیے۔ یہ سمجھ لے، ٹرک زیادہ دیر نہیں ٹھیرے گا۔"

پیر بخش اطمینان سے بولا۔ "فکر نہ کر۔ ادھر کا کام تو ہم نے نمٹا ہی دیا۔ بس اب کھدائی کا نمبر ہے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

سکندر بھی باپ کے ساتھ ہی اٹھ گیا۔ لالی نے سکندر کو غور سے دیکھا۔ وہ اٹھارہ انیس سال کا نوجوان تھا۔ لیکن پیر بخش کا بدن جس قدر گٹھا ہوا اور مضبوط تھا، سکندر اسی قدر دبلا پتلا، مریل سا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں، چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔ وہ تمام وقت خاموش رہا۔ پیر بخش نے کوٹھری کے ایک کونے میں پڑی ہوئی کدالیں اٹھائیں اور سکندر کو دے دیں۔ اس نے چپ چاپ کدالیں کندھے پر رکھ لیں۔

بیلچے پیر بخش نے سنبھال لیے۔ دونوں کوٹھری سے چلے گئے۔ پیر بخش نے جاتے جاتے دروازے پر ٹھٹک کر بشیرے سے کہا۔

"چاروں کبروں پر نشان تو میں نے دن ہی کو لگا دیے تھے۔ ہم دونوں جا کر پہلے پچھم والی کبروں کی کھدائی شروع کرتے ہیں۔ تسیں کتنی دیر میں پہنچو گے؟"

"تم کھدائی شروع کرو، میں بھی ذرا دیر میں پہنچ جاؤں گا۔" بشیرا نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ "روشن میرے ساتھ ہو گا، یہ بھی تمہارے ساتھ کام کرے گا۔"

پیر بخش اور سکندر چلے گئے۔

بشیرے نے لالی سے کہا۔ "اب یہ بھی سمجھ لے سارا کام کیسے ہو گا۔" اس نے دونوں بکسوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "ان پیٹیوں میں ڈھانچے بند کیے جائیں گے۔ ایک پیٹی میں دو ڈھانچے رکھے جائیں گے۔ انہیں گھاس میں اس طرح سنبھال کر رکھا جاتا ہے کہ ہڈیاں سفر میں ٹوٹنے

پھوٹنے نہ پائیں۔"

"انہیں ریل سے لے جائے گا؟"

"میں اس دفعہ ٹرین سے مال نہیں لے جاؤں گا۔"

لالی نے چونک کر پوچھا۔ "فیر کیسے لے جائے گا۔"

"ٹرک سے مال جائے گا۔" بشیرا نے جواب دیا۔ "اپنے جاننے والے ایک پولیس انسپکٹر کا کراچی تبادلہ ہو گیا ہے۔ اس کا سامان ٹرک سے جا رہا ہے۔ میں نے اس سے معاملہ طے کر لیا ہے۔ دوپہر کو اسی کے پاس گیا تھا۔ اس کے سامان کے ساتھ اپنی دونوں بیٹیاں بھی چلی جائیں گی۔ راستے میں کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ شہر سے ایک کانسٹیبل بھی اپنے ساتھ جائے گا۔"

"تب تو تیرا سٹیشن جانا نہیں ہو گا۔"

"اب سٹیشن جا کر کیا کروں گا۔ تجھے بھی تو کراچی ہی جانا ہے نا؟"

"نہیں یار! میں تو ٹرین سے جاؤں گا۔"

بشیرا نے لالی کو مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "پولیس سے ڈر رہا ہے؟" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "پروا نہ کر، اپنے ساتھ رہے گا تو تجھ پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکے گا۔" اس نے رازداری کے انداز میں آہستہ سے پوچھا۔

"یہ تو بتا، بات کیا ہے؟ کوئی اونچا پھڈا ہو گیا؟"

لالی نے صاف انکار کر دیا۔ "نہیں جی! ایسی کوئی بات نہیں۔"

"فیر تو اپنے ساتھ کیوں نہیں چلتا؟ ٹرک میں ٹرین سے زیادہ آرام سے وقت گزرے گا۔ میں تو کہتا ہوں، تو بھی اپنے ساتھ ہی چلا چل۔"

لالی چند لمحے خاموش کھڑا سوچتا رہا، پھر وہ آمادہ ہو گیا۔ "تیرے ہی ساتھ چلوں گا پر کراچی تک نہیں جاؤں گا۔ مجھے شہر پہنچنے سے پہلے اتار دینا۔ میں نے پہلے کادر آباد سٹیشن جانا ہے۔ وہاں ایک دوست میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں اسے ساتھ لیے بنا کراچی نہیں جا سکتا۔"

"یہ بات تو نے پہلے کیوں نہ بتائی؟" بشیرا نے مسکرا کر کہا۔ "اپنی باتوں سے تو خود ہی شبہ پیدا کرتا ہے۔"

لالی نے بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔ "بشیرے! تو اس طرف آتا جاتا ہی رہتا ہے۔ یہ بتا، گورداپورہ کتھے ہے؟"

بشیرا نے ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "وہ تو اس طرف رہا۔"

"یہاں سے کتنی دور ہو گا؟"

"یہاں سے ۱۵ میل تو ہو گا۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی ہو گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "پر تو گورداپورے کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"گل ایسہ ہے، میں گورداپورے ہی جا رہا تھا۔ کل رات اندھیرے میں رستہ بھٹک کر ادھر آ گیا۔"

"بہت دور نکل آیا۔ یہ تو اپنے میاں حیات محمد خاں وٹو کی جاگیر کا علاقہ ہے۔ یہاں سے تو گورداپورے کو کوئی کچا رستہ بھی نہیں جاتا۔"

حیات محمد وٹو کا نام سن کر لالی پریشان ہو گیا۔ "نہیں، اب مجھے گورداپورے نہیں جانا، تیرے ہی ساتھ چلوں گا۔"

بشیرا نے گھاس کے ڈھیر کے پیچھے سے بڑا سا تھیلا نکالا اور اندر ہاتھ ڈال کر دو بڑی بڑی ٹارچیں نکالیں۔ انہیں جلا کر دیکھا۔ اس نے ایک ٹارچ لالی کو دی۔ تھیلا اپنے ہاتھ میں لٹکایا اور لالی کو مخاطب کیا۔

"چل یار! اب کام شروع کیا جائے۔ بہت باتیں ہو گئیں۔"

دونوں کوٹھری سے باہر نکلے۔ بشیرے نے دروازہ بند کیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ درختوں کے نیچے گہرا اندھیرا تھا۔ بشیرے نے ٹارچ روشن کی تو پگڈنڈی نظر آئی۔ یہ پگڈنڈی قبرستان کی طرف جاتی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ قبرستان اندھیرے میں بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔

کچھ دور آگے جا کر انہیں ایک طرف ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ دونوں قبروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے روشنی کی طرف بڑھے۔ قریب جا کر انہوں نے دیکھا، ایک گھنی جھاڑی کی آڑ میں لالٹین رکھی ہے۔ اس کی دھندلی روشنی میں پیر بخش کدال سے ایک قبر کا بالائی حصہ کھود رہا ہے اور سکندر بیلچے سے مٹی اٹھا اٹھا کر ایک طرف ڈالتا جا رہا ہے۔ قبر کچی تھی اور مٹ مٹا کر برابر ہو چکی تھی۔

بشیرے اور لالی کے پہنچنے کے بعد بھی دونوں اپنے کام میں جتے رہے۔ قبر دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کھدائی شروع ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری۔

جب قبر اتنی کھد گئی کہ تختے نظر آنے لگے تو دونوں نے ہاتھ روک دیئے۔ تختے بھی گل سڑ گئے تھے۔ پیر بخش نے کدال اڑا کر ایک تختہ نکالا، فوراً بو کا بھبکا اٹھا۔ لالی کا جی متلانے لگا۔ بشیرے نے

تھیلے سے چادر نکالی اور چہرے پر اس طرح ڈھاٹا باندھ لیا کہ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ اس نے تھیلے سے دوسری چادر نکال کر لالی کو دی۔ اس نے بھی ڈھاٹا باندھ لیا۔ پیر بخش اور سکندر نے بھی اپنے سروں سے پگڑیاں اتار کر ناک اور منہ کے گرد لپیٹ لیں۔ مگر انہوں نے بشیرے اور لالی کی طرح پورے ڈھاٹے نہیں باندھے۔

ایک ایک کر کے تمام تختے نکال کر الگ کر دیئے گئے۔ لالی نے بھی تختے نکالنے میں پیر بخش اور سکندر کی مدد کی۔ البتہ بشیرا الگ کھڑا رہا اور بار بار کہتا رہا۔ "دیکھو' مٹی اندر نہ گرنے پائے۔ کوئی ٹوٹا ہوا تختہ بھی نیچے نہ گرے۔"

پیر بخش اور سکندر تو اپنے کام میں منجھے ہوئے تھے لیکن لالی اناڑی تھا۔ بشیرے کو اسی سے خدشہ تھا۔ مگر لالی نے زیادہ اناڑی پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔

تختے ہٹ گئے تو قبر کا منہ کھل گیا۔ بشیرے نے ٹارچ سے قبر کے اندر روشنی کی۔ لالی نے جھک کر دیکھا تو لرز کر رہ گیا۔ قبر میں مردے کا ڈھانچا پڑا تھا۔ کھال اور گوشت گل سڑ کر مدت ہوئی خاک میں مل چکا تھا۔ اب تو صرف سفید سفید' ہڈیاں رہ گئی تھیں۔ ان پر جگہ جگہ مٹی جمی تھی۔ سرخ سرخ چیونٹے اور دوسرے کیڑے مکوڑے ادھر ادھر رینگ رہے تھے۔ لالی یہ ہولناک منظر زیادہ دیر نہ دیکھ سکا۔

پیر بخش نے ربڑ کے بڑے بڑے سیاہ جوتے پہنے۔ بشیرے سے ربڑ کے دستانے لے کر ہاتھوں پر چڑھائے اور قبر کے اندر اتر گیا۔ بشیرے نے تھیلے سے ایک اور چادر نکالی اور قبر کے قریب بچھا دی۔ پیر بخش قبر کے اندر سے ڈھانچے کی ہڈیاں نکال' نکال کر سکندر کو دینے لگا۔ اس نے سب سے پہلے کھوپڑی نکالی' پھر دوسری ہڈیاں نکالیں۔ سکندر انہیں سنبھال' سنبھال کر چادر پر رکھتا رہا۔

ڈھانچے کی تمام ہڈیاں باہر نکالنے کے بعد پیر بخش قبر سے نکل کر باہر آگیا۔ ہڈیوں کو نہایت احتیاط کے ساتھ چادر میں لپیٹا گیا۔ پیر بخش اور سکندر اسے سنبھال کر اس کوٹھری کی طرف روانہ ہو گئے جہاں بکسے رکھے تھے۔ ادھر بشیرے کی ہدایت پر لالی نے قبر کے منہ پر تختے لگائے اور بیلچے سے مٹی اٹھا اٹھا کر تختوں پر اس طرح ڈھیر بنا دیا کہ قبر ٹھیک ٹھاک نظر آنے لگی۔

دوسری قبر جس کے اندر سے ڈھانچا نکالنا تھا' زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ بشیرے کی نشاندہی پر لالی نے کدال اٹھا کر اسے کھودنا شروع کر دیا۔ وہ کھودتا بھی جاتا اور بیلچے سے مٹی اٹھا اٹھا کر الگ رکھتا جاتا۔ جب پیر بخش اور سکندر واپس آئے تو دوسری قبر کے تختے نظر آ رہے تھے۔ لالی نے ان دونوں کی مدد سے ذرا ہی دیر میں تختے نکال کر علیحدہ رکھ دیئے۔ دوسری قبر سے بھی ڈھانچے کی کھوپڑی اور ہڈیاں باہر نکالی گئیں۔ پیر بخش اور سکندر انہیں چادر میں لپیٹ کر ایک بار پھر کوٹھری کی جانب روانہ ہو گئے۔

بشیرا' لالی کو تیسری قبر پر لے گیا۔ لالی نے اسے بھی کھود ڈالا اور اس دفعہ پیر بخش اور سکندر کے آنے سے پہلے پہلے قبر کے بوسیدہ تختے بھی نکال کر علیحدہ رکھ دیئے۔ جب تیسرے ڈھانچے کی ہڈیاں بھی قبر سے باہر نکال لی گئیں اور پیر بخش اور سکندر اسے لے کر چلے گئے اور لالی نے تختے لگا کر ان پر مٹی بھی ڈال دی تو بشیرے نے منہ سے ڈھاٹا کھول دیا اور لالی سے مخاطب ہوا۔ "یار! تو نے تو کمال کر دیا۔ فافٹ تین پنجر نکال لیے۔ اب تو بھی منڈا سا کھول دے۔"

لالی نے چہرے سے ڈھاٹا کھول کر کہا۔ "یار! میرا تو ارادہ تھا کہ کام ختم کرنے کے بعد ہی منہ کھولوں گا۔"

بشیرے نے محبت سے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ "پیارے! دل خوش کر دیا۔ اب ایسا کر۔ کمرے میں جا کر منہ ہاتھ دھو۔ کچھ کھا پی لے۔ بہت کام کر لیا۔"

لالی چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ تھک گیا تھا' بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اس نے بشیرے کی بات مان لی' اس سے دریافت کیا۔ "تیرا روٹی کھانے کا ارادہ نہیں؟"

"نہیں یار! مجھے بالکل بھوک نہیں۔ میں تو سارا کام ختم کر کے صرف چائے پیوں گا۔ تو اب جا اور تازہ دم ہو کر آ۔ ویسے اب کام زیادہ نہیں رہا۔ ایک ہی پنجر تو نکالنا رہ گیا ہے۔" اس نے ٹارچ روشن کر کے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ "ابھی تو گیارہ بھی نہیں بجے۔ بہت ٹیم ہے اپنے پاس۔"

لالی خاموشی سے درختوں کی جانب چل دیا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ راستے میں پیر بخش اور سکندر مل گئے۔ پیر بخش نے پوچھا۔ "کتھے چلا؟"

"بھوک لگ رہی ہے۔ روٹی کھا کر آؤں گا۔ جب تک تم دونوں بھی آرام کر لو۔"

پیر بخش بولا۔ " بکھتاور نے تیرے لیے روٹی کمرے میں رکھ دی ہے۔ بالٹی میں پانی بھی ہے۔ روٹی کھانے سے پہلے ٹھیک طرح صابن سے ہاتھ اور منہ دھو لینا۔ صابن بالٹی کے پاس ہی رکھا ہے۔"

سکندر اس دفعہ بھی نہ بولا' خاموش کھڑا لالی کو ٹکر ٹکر تکتا رہا۔ ذرا دیر بعد وہ پیر بخش کے ہم راہ آگے بڑھ گیا۔

لالی قبروں کے درمیان سے گزرتا ہوا پیر بخش کے ڈیرے کی جانب چلنے لگا۔ درختوں کے نیچے

پہنچ کر اس نے ٹارچ روشن کی۔ پیر بخش کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ گلی کے اس پار برآمدے میں کوئی اندھیرے میں کھڑا تھا۔

لالی نے ٹارچ بجھا دی' آہستہ آہستہ برآمدے میں داخل ہوا۔ دروازے کے قریب اسے بختاور نظر آئی۔ وہ' آہٹ پر سنبھل کر کھڑی ہوگئی۔ مگر لالی نے کوئی بات نہیں کی۔ خاموشی سے کمرے میں چلا گیا۔ بختاور بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں پہنچی۔

"بہت دیری کردی۔ میں تو گھنٹے بھر سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔"

لالی نے مڑ کر اسے دیکھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ کانوں میں چاندی کے مندرے تھے۔ بال سلیقے سے سنوارے گئے تھے۔ ان میں تیل چمک رہا تھا۔ دنداسا لگانے سے ہونٹ گلابی ہوگئے تھے۔

لالی نے اس کی یہ سج دھج دیکھی تو مسکرا کر بولا۔ "بختاور اب تجھے کسی کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ تیرا انتظار کرنے والے تو خود پیدا ہو جائیں گے۔ ایک دم سوہنی نیار بن گئی۔ ماجھے کی جٹی لگ رہی ہے۔"

بختاور ذرا شرمائی' مسکرا کر بولی۔ "یہ بتا' توں کیا کہنا چاہتا تھا؟"

لالی نے جیب سے پانچ سو روپے نکالے اور بختاور کو دے کر بولا۔ "لے' یہ رکھ لے۔ یہ کمائی میں نے تیرے ہی لیے کی تھی۔ میں مردوں کا مال نہیں کھاتا۔"

وہ تنک کر ناز سے بولی۔ "اور مجھے مردوں کا مال کھلانا چاہتا ہے؟"

"تیری بات دوسری ہے۔ برسوں سے مردوں کا مال کھا رہی ہے۔" یہ کہتا ہوا وہ کمرے سے چلا گیا۔ باہر برآمدے میں جا کر اس نے صابن مل کر اچھی طرح ہاتھ دھوئے' منہ صاف کیا اور تازہ دم ہو کر کمرے کے اندر آگیا۔ بختاور ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ لالی آتے ہی چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ بختاور نے پوچھا۔

"توں نے وہ بات نہیں بتائی؟"

لالی نے ان جان بن کر کہا۔ "کون سی بات؟"

"وہی بات جسے بتانے کا دن کو وعدہ کیا تھا۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"میں تو یہ چاہتا ہوں' اگر تجھے کبرستان ہی میں رہنا ہے تو مردوں کی بجائے زندوں کی طرح رہے۔"

وہ افسردہ ہوگئی۔ "کس کے لیے زندہ رہوں' کیسے زندہ رہوں؟"

لالی نے اسے نظر بھر کر دیکھا اور ایک ٹک دیکھتا رہا۔ بختاور چند لمحے تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے نظریں جھکالیں آہستہ سے بولی۔ "مجھے اس طرح کیوں گھور رہا ہے؟"

لالی نے گہری سانس بھری۔ "اس لیے کہ تو مجھے بہت سوہنی لگ رہی ہے۔ پتہ نہیں' میرے بارے میں تو کیا سوچتی ہے۔"

"توں برا بندہ نہیں ہے۔"

"میں کہوں تو میرے ساتھ بھاگ چلے گی؟ بول' کیا کہتی ہے؟"

"ڈر لگتا ہے۔ پتہ نہیں' توں کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ مجھے تو تیرے بارے میں کچھ بھی نہیں ملوم۔"

"ٹھیک ہی ہے کہ تجھے کچھ نہیں ملوم۔" لالی کسی قدر جذباتی ہوگیا۔ "میرے ہاتھ میں ایسی لکیر ہی نہیں کہ کسی نیار سے پیار کروں اور اسے اپنی گھر والی بناؤں۔"

"تیری باتیں سمجھ نہیں آتیں۔ صاف صاف بتا؟"

لالی کچھ کہنے ہی والا تھا' اچانک دروازہ کھلا۔ سکندر اندر داخل ہوا۔ لیکن جیسے ہی بختاور پر اس کی نظر پڑی' ایک دم بھڑک اٹھا۔ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہے؟"

بختاور کے چہرے پر خوف کا سایہ پھیل گیا۔ وہ گھبرا کر اٹھنے لگی۔ مگر لالی نے اسے اٹھنے نہیں دیا' ڈپٹ کر بولا۔ "بیٹھی رہ۔"

"میں ابھی بابا کو لے کر آتا ہوں۔ وہی اسے پوچھے گا یہاں کیوں آئی؟"

لالی نے مسکرا کر کہا۔ "اس کا خصم تو ہے یا تیرا پیو؟"

سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا' لالی کو گھورتا رہا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر اس نے کہا۔ "توں ہمارے معاملے میں بولنے والا کون ہوتا ہے؟"

"خاما خا گرمی نہ دکھا۔ یہاں آ کر میرے پاس بیٹھ۔ فیر بتاؤں گا' میں اس معاملے میں بولنے والا کون ہوں؟"

سکندر چپ چاپ چٹائی پر بیٹھ گیا۔ لالی نے بختاور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ذرا اس کی طرف دیکھ اور سوچ' تجھے کیسی سوہنی گھر والی ملی ہے۔ تو اس کا مرد ہے۔ کبھی اسے پیار بھری نظروں سے بھی دیکھا؟"

بختاور بیچ میں بول پڑی۔ "یہ کیا دیکھے گا۔ چاچا دیکھنے ہی کب دیتا ہے۔ جو وہ کہتا ہے' وہی یہ کرتا ہے۔ بول' میں کوئی جھوٹ کہہ رہی ہوں؟"

سکندر مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ "مجھے اس سے ڈر جو لگتا ہے۔"

"یوں ہی ڈرتا رہا تو فیر یہ بھی سن لے' یہ کسی دن پھر سے اڑ جائے گی اور یہ سمجھ لے ایسی گھر والی تجھے دوبارہ نہیں ملے گی۔" لالی نے اسے خبردار کیا۔

"پر میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"اس سے پہلے کہ یہ کسی اور کے ساتھ بھاگے' اسے لے کر یہاں سے بھاگ جا۔"

"نہیں جی! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" سکندر خوف زدہ ہو گیا۔ "بابا مجھے جان سے مار دے گا۔ توں جانتا نہیں وہ کیسا بندہ ہے؟"

لالی نے اندازہ لگا لیا کہ سکندر بھی اپنے باپ کے رویئے سے خوش نہیں ہے' مگر اس سے ڈرتا بھی بہت ہے۔ لالی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ "مرد بن۔ وہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھ۔ تجھے اس نے کیا بنا دیا ہے؟ کیسا بیمار اور مریل لگتا ہے۔"

بختاور تیکھے لہجے میں بولی۔ "یہی گل بات میں کہتی ہوں تو مجھ سے لڑتا ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ تو ایک دم بے غیرت ہے۔ چاچا اس کے سامنے مجھے زبردستی اپنی کوٹھری میں لے جاتا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھتا رہتا ہے' کچھ بھی تو نہیں کہتا۔" اس نے ذرا سا تامل کیا۔ "اب اس کا دوسرا ویاہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ آئے گی تو اس کے ساتھ بھی یہی بے غیرتی کرے گا۔"

سکندر ایک دم بھڑک اٹھا۔ "زیادہ کڑ کڑ نہ کر۔ بند کر اپنی بکواس۔"

"ناراض کیوں ہوتا ہے؟ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ اس طرح کب تک کام چلے گا۔"

سکندر زچ ہو کر بولا۔ "تو میں کیا کروں؟"

"وہی جو میں کہہ رہا ہوں۔" لالی نے مشورہ دیا۔ "اسے لے کر شہر چلا جا۔ پنج سو روپے میں نے اسے دے دیئے ہیں۔ کچھ دن اس سے کام چلانا' بعد میں کوئی نہ کوئی دھندا مل جائے گا۔ بول' کیا کہتا ہے؟"

"میں تو تیار ہوں' پر یہ تیار نہیں ہوگا۔" بختاور نے اپنی رضامندی کا کھل کر اظہار کر دیا۔

"ہو جائے گا' ہو جائے گا۔ اسے میں تیار کر لوں گا۔" لالی نے سکندر کی پیٹھ تھپکی۔ "ہمت سے کام لے' سب ٹھیک ہی ہوگا۔"

سکندر پہلے تو جھجکا۔ پھر لالی کے سمجھانے بجھانے پر رضامند ہو گیا اور یہ طے ہوا کہ جس روز

پیر بخش شہر جائے گا' دونوں میاں بیوی چپکے سے نکل بھاگیں گے۔

☆

لالی اور سکندر ڈیرے سے نکل کر بشیرے کے پاس پہنچے۔ اس اثناء میں پیر بخش نے قبر کھود ڈالی تھی اور تختے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پیر بخش نے سکندر کو دیکھ کر غصے سے کہا۔ "اتنی دیر کہاں لگا دی؟"

لالی فوراً بیچ میں بول پڑا۔ "چاچا! ناراض نہ ہو۔ میں نے اسے روک لیا تھا۔ میں روٹی کھا رہا تھا' کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو کس سے منگواتا۔"

پیر بخش خاموش ہو گیا۔ لالی اور سکندر نے چہروں پر ڈھاٹے باندھے اور تختے اکھاڑنے لگے۔ تختے علیحدہ کر کے انھوں نے قبر سے ڈھانچے کی ہڈیاں نکالیں۔ پیر بخش اور سکندر انھیں چادر میں لپیٹ کر لے گئے۔

لالی نے جلدی جلدی قبر کے تختے لگائے اور بیلچے سے مٹی اٹھا اٹھا کر ان پر ڈال دی۔ اب کام کا ایک مرحلہ ختم ہو چکا تھا۔ اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ بشیرے اور لالی نے اپنے چہروں سے ڈھاٹے ہٹا دیئے۔

بشیرے نے تمام سامان تھیلے میں ڈالا' اپنی اور لالی کی سگریٹ سلگائی۔ دونوں کش لگاتے ہوئے کوٹھری کی جانب روانہ ہو گئے۔

جب وہ درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچے تو دھندلی روشنی میں سڑک پر ایک لمبی چوڑی کار کھڑی نظر آئی۔ کار دیکھتے ہی دونوں ٹھٹکے۔ لالی کو شبہ ہوا کہ وہ میاں حیات محمد کی بیوک ہے۔ وہ اسے حیات محمد کے بنگلے کے باہر دیکھ چکا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ حیات محمد وٹو کی بیوک اتنی رات گئے وہاں کیوں آئی ہے؟ کار دیکھ کر بشیرا بھی پریشان ہو گیا۔ دونوں جہاں تھے' وہیں ٹھہر گئے اور کار کی جانب دیکھتے رہے۔

کار کے قریب آہستہ آہستہ باتیں ہو رہی تھیں۔ مگر آوازیں اس قدر دھیمی تھیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بشیرا اور لالی کان لگا کر باتیں سننے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن ان کے پلے کچھ نہ پڑا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ دونوں سہمے ہوئے خاموش کھڑے رہے۔ کچھ دیر بعد کار کی بتیاں روشن ہوئیں' انجن اسٹارٹ ہوا اور کار تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد دھندلی روشنی میں کوئی آتا ہوا نظر آیا۔ قریب آیا تو انھوں نے پہچان لیا۔ وہ پیر بخش تھا' مگر گھبرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

بشیرے نے پوچھا۔ "چاچا! کس سے بات کر رہا تھا؟ یہ کار کس کی تھی؟"

"ذرا صبر کر۔ سب کچھ بتا دوں گا۔"

مگر بشیرا بے چین تھا۔ "بتاتا کیوں نہیں۔ چاچا کے کیوں بات کر رہا ہے؟"

"ارے ارے، توں تو خامخا ناراض ہو گیا۔" پیر بخش نے نرمی سے کہا۔ "میاں حیات محمد کا منیجر آیا تھا۔ سویرے بھی آیا تھا۔"

"کس لیے آیا تھا؟"

پیر بخش لمحے بھر خاموش رہا پھر سرگوشی کے انداز میں رسان سے بولا۔ "تجھ سے کیا چھپانا۔ وہ جو اونچی کبر دیکھ رہا ہے۔" اس نے قبرستان کے شمال کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "وہ میاں حیات محمد کے بھائی میاں ریاض محمد کی کبر ہے۔ میاں حیات چاہتا ہے اس سے مردہ نکال کر دوسرا مردہ رکھ دیا جائے۔"

بشیرے نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "یہ چکر کیا ہے؟"

پیر بخش گردن ہلا کر بولا۔ "اپنے کو تو کچھ پتہ نہیں۔"

لالی فوراً تاڑ گیا کہ حیات محمد نے قبر میں پہلے جو لاش دفن کرائی تھی، اب اس کی جگہ ریاض محمد کی اصل لاش رکھنا چاہتا ہے جسے دھیور نے تہہ خانے میں قتل کر دیا تھا۔

پیر بخش نے بتایا۔ "یہ کام بھی آج ہی ہو گا۔ کام مشکل بھی ہے۔ کبر بہت نیچے سے کھودنی ہو گی اور نیچے ہی نیچے پرانی لاش نکال کر نئی لاش رکھنی ہو گی تاکہ اوپر سے کبر ویسی کی ویسی رہے۔"

بشیرا گھبرا گیا۔ "یہ کام کب شروع ہو گا؟"

"میں نے انھیں دو بجے بلایا ہے۔ وہ تو ابھی شروع کرنے کو کہتے تھے پر میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا مجھے پہلے ایک اور کبر تیار کرنی ہے۔ اب میاں حیات کے کرندے دو بجے سے پہلے پہلے لاش لے کر آجائیں گے۔"

بشیرے نے کہا۔ "تب تو ہمیں اپنا کام جلد سے جلد ختم کرنا ہو گا۔"

پیر بخش بولا۔ "میں تو کہتا ہوں، اپنا کام کل پر چھوڑ دے۔ مان لے ٹرک دیر سے آیا تو کیا ہو گا؟"

بشیرے نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "ٹرک تو ٹھیک ایک بجے پہنچ جائے گا۔" اس نے ٹارچ جلا کر گھڑی دیکھی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ "چاچا! بارہ بجنے والے ہیں، جھیتی کر۔ ابھی تو بہت کام پڑا ہے۔"

تینوں آگے بڑھے اور درختوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے کوٹھری کے دروازے پر پہنچ گئے۔

کوٹھری میں چاروں ڈھانچوں کی ہڈیاں علیحدہ علیحدہ ڈھیریوں میں گھاس پر رکھی تھیں۔ ہر طرف تیز بو پھیلی تھی۔

سکندر ایک بڑے ڈبے سے سفید سفید پاؤڈر نکال کر ہڈیوں پر چھڑک رہا تھا۔ بشیرے نے دونوں بکسوں میں جھک جھک کر دیکھا۔ اندر ہاتھ ڈالا اور ان میں بچھی ہوئی گھاس جگہ جگہ دباتا رہا۔ اس نے پیر بخش سے کہا۔

"چاچا دیری نہ کر۔ ایک ایک پنجر کی ہڈیاں سنبھال سنبھال کر رکھنی شروع کر دے۔"

پیر بخش نے ہدایت کے مطابق ایک ڈھانچے کی ہڈیاں اٹھا کر بکسے میں گھاس کی تہہ پر رکھیں۔ جب وہ ایک ایک ہڈی رکھ چکا، تو اس نے ہڈیوں پر گھاس کی دوسری تہہ جمائی۔ اس نے گھاس کی اس موٹی تہہ پر دوسرے ڈھانچے کی ہڈیاں ترتیب سے جما کر رکھ دیں۔ ایک بار پھر ہڈیوں پر گھاس کی تہہ جمائی گئی۔ یہاں تک کہ بکسا پوری طرح گھاس سے بھر گیا۔ بشیرا نے ہر بکسے کا ڈھکنا بند کیا، تالا لگایا اور کنجی اپنے پاس رکھ لی۔ بقیہ دو ڈھانچے بھی اسی طرح دوسرے بکسے میں بند کر کے تالا لگا دیا گیا۔

جب یہ کام ہو گیا تو بشیرے نے جیب سے آٹھ سو روپے نکالے اور پیر بخش کو دے دیئے۔ اس نے پچاس روپے اور نکالے اور پیر بخش کو دیتے ہوئے بولا۔ "یہ تیرے چائے پانی کے لیے ہیں۔"

وہ مسکرایا۔

"چاچا! اسی بات پر گرما گرم چائے پلوا دے۔"

"روٹی ٹکر کھا لے، توں نے تو کچھ بھی نہیں کھایا۔"

"میں روٹی نہیں کھاؤں گا۔ صرف چائے پلوا دے۔"

پیر بخش کوٹھری سے چلا گیا۔ سکندر وہیں ٹھہرا رہا۔ کچھ دیر بعد تینوں کوٹھری سے نکل کر ڈیرے میں آگئے۔ بشیرے نے چارپائی کے نیچے سے اپنا سوٹ کیس نکالا۔ اسے کھولا۔ اجلی بش شرٹ اور پتلون نکالی اور وہیں کھڑے کھڑے کپڑے تبدیل کیے۔ اس نے میلے کپڑے اور تھیلے کا سارا سامان سوٹ کیس میں رکھا اور اسے بند کر دیا۔ لالی نے اپنی گٹھری اٹھا کر ہاتھ میں لٹکائی۔ مگر پیر بخش ابھی تک چائے لے کر نہیں آیا تھا۔ خاصی دیر ہو گئی۔ بشیرے نے مڑ کر سکندر کو دیکھا۔ قدرے تیکھے لہجے میں بولا۔

"جا کر دیکھ، چائے کا کیا بنا؟"

مگر وہ جانے پر آمادہ نہیں ہوا۔

لالی نے ڈپٹ کر کہا۔ "یار! تو کیسا مرد ہے۔ بختاور تیری گھر والی ہے' تو کہے گا تو فافٹ چائے بنا دے گی۔ جا' کھڑا منہ کیا تک رہا ہے۔"

سکندر چپ چاپ کمرے سے چلا گیا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد صحن سے پیر بخش کے زور زور سے بولنے کی آواز ابھری۔ بشیرا اور لالی خاموش بیٹھے رہے۔ چند منٹ بعد پیر بخش بڑبڑاتا ہوا آیا۔ وہ دو پیالیوں میں چائے بھی لایا تھا۔ بشیرے نے چائے کی پیالی لے کر پوچھا۔

"کیا ہو گیا چاچا؟ بہت ناراض نظر آ رہا ہے۔"

"کلجگ آ گیا ہے جی' کلجگ۔" وہ شکوے کے انداز میں بولا۔ "سکندر مجھ پر آنکھیں نکال کر کھڑا ہو گیا۔ آج تک اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔"

لالی نے چائے کی پیالی لے کر پوچھا۔ "بات کیا ہوئی؟"

"ہونا کیا تھا جی! گھر والی کی حمایت کر رہا تھا۔"

پیر بخش نے اپنا جملہ پورا ہی کیا تھا کہ سکندر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے بختاور بھی تھی۔ سکندر کمرے میں داخل ہوتے ہی بولا۔ "میں اس کی حمایت کر رہا تھا۔ تم دونوں خود دیکھ لو۔ اس نے کیا کیا ہے۔"

سکندر نے بختاور کا ہاتھ پکڑ کر سامنے کر دیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے' جھگے کا گریبان پھٹ گیا تھا اور سینہ عریاں ہو کر جگہ جگہ سے جھلک رہا تھا۔ بختاور کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ آنکھوں کا کاجل پھیل گیا تھا۔

پیر بخش غضب ناک ہو کر چیخا۔ "اوئے سور دے پتر! تیری اب اتنی ہمت ہو گئی؟"

"چاچا! گرمی نہ دکھا۔ یہ بتا اس کے ساتھ مار پیٹ کیوں کی؟" لالی نے بختاور کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ تیری نوہ ہے' گھر والی تو نہیں۔"

پیر بخش نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "بکواس نہ کر۔ توں ہمارے معاملے میں بولنے والا کون ہوتا ہے؟"

بشیرا نے لالی کو سمجھایا۔ "یار! اس معاملے میں نہ پڑ۔"

پیر بخش کو بشیرا کی شہہ ملی تو اس نے لالی کو ڈانٹا۔ "یہ بتا' توں نے ہمارے معاملے میں کیوں ٹانگ اڑائی؟ توں ہوتا کون ہے؟" اس نے لالی کو گندی سی گالی دی جھنجلایا ہوا اس پر جھپٹا۔ اور اس کا گریبان پکڑنا چاہا۔

لالی کے ہاتھ سے پیالی اچھل کر دور گری اور ساری گرم گرم چائے لالی کے منہ پر آ گئی۔ لالی کے

آگ ہی تو لگ گئی۔ اس نے جھپٹ کر پیر بخش کی گردن دبوچی اور اس زور سے دھکا دیا کہ وہ دیوار سے جا کر ٹکرایا۔

پیر بخش نے اٹھنے کی کوشش کی تو لالی نے ایک بار پھر اسے دھکا دیا۔ پیر بخش نے پھر اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ زور زور سے ہانپتا رہا اور خوں خوار نظروں سے لالی کو گھورتا رہا۔

لالی نے کپڑوں سے چائے جھاڑتے ہوئے کہا۔ "تو نے مجھے بھی سکندر سمجھا تھا۔ کچھ اور گرمی رہ گئی ہو تو وہ بھی اتار دوں؟"

سکندر اور بختاور خاموش کھڑے رہے۔ بشیرے نے لالی سے کہا۔ "یار! جانے دے' بہت ہو گیا۔ بیکار کا ٹنٹا نہ کر۔" اس نے پیر بخش کو سمجھایا۔ "چاچا! اب تو بوڑھا ہو گیا۔ اتنا غصہ نہ کیا کر۔" وہ پیر بخش کے پاس گیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ گھڑی دیکھی' ایک بج رہا تھا۔ بشیرا پریشان ہو گیا۔ "ٹرک اب پہنچنے والا ہی ہو گا۔" وہ سکندر کی طرف متوجہ ہوا۔ "باہر جا کر سڑک پر دیکھ' ٹرک تو نہیں آ گیا۔"

بختاور بولی۔ "پہلے ایک بات کا فیصلہ ہو جائے۔ ہم دونوں یہاں نہیں رہیں گے۔ تم ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلو۔"

سکندر نے اس کی تائید کی۔ "ہاں جی! آج فیصلہ ہو جانا چاہیے۔"

"مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا؟ میں نے اسی دن کے لیے تجھے پال پوس کر جوان کیا تھا؟" یہ کہتے کہتے پیر بخش افسردہ ہو گیا۔

بشیرے نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "چاچا! پریشان نہ ہو۔ کوئی نہیں جا رہا۔"

سکندر نے کہا۔ "نہیں بشیرے بھائی! اب ہم دونوں کا گزارہ یہاں نہیں ہو سکتا۔"

"اتنی بگاڑ ٹھیک نہیں۔ چل' میرے کہنے سے اسے ایک موقع اور دے دے۔ یہ اب کے لڑائی جھگڑا کرے تو مجھے بتانا۔ میں مہینے بھر بعد آؤں گا' تم دونوں کو اپنے ساتھ کراچی لے جاؤں گا۔ میرا وعدہ رہا۔" بشیرے نے پیر بخش کو مخاطب کیا۔

"چاچا! اب تو بھی غصہ کرنا چھوڑ دے۔"

سکندر بولا۔ "بات صرف غصے کی نہیں۔ یہ اور ہی بات ہے۔ اب میں تمہیں کس طرح بتاؤں۔"

بشیرا ہنس کر بولا۔ "مجھے سب پتہ ہے' مجھے نہ بتا۔ میں جانتا تھا ایک دن یہی ہو گا۔ اب تو جا کر ٹرک دیکھ۔"

سکندر چپ چاپ کمرے سے چلا گیا۔ بختاور بھی اس کے ساتھ ساتھ گئی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ پیر بخش مجرموں کی طرح سر جھکائے ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ سکندر کئی منٹ تک واپس نہیں آیا۔ بشیرا بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اب سوا بج رہا تھا۔ آخر بشیرا خود باہر نکلا۔ لالی اور پیر بخش بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ تینوں درختوں کے نیچے جا کر ٹھہر گئے۔

سڑک بالکل ویران تھی۔ ٹرک کا دور دور نشان نہ تھا۔ سکندر سڑک پر انتظار کرتے کرتے واپس آگیا تھا۔ کچھ اور وقت گزر گیا۔ اب ڈیڑھ بج رہا تھا۔

پیر بخش نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میاں حیات کے کرندے آتے ہی ہوں گے۔“

بشیرا اور پریشان ہوگیا۔ اسی اثناء میں دور سے تیز روشنی ابھری اور رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ بشیرے نے اس دفعہ پیر بخش کو سڑک پر بھیجا۔ اس کے دل میں دھڑکا تھا کہ اگر یہ میاں حیات محمد کی کار ہوئی تو کیا ہوگا؟

لالی بھی کم پریشان نہ تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ حیات محمد دتو بھی آگیا تو دیکھتے ہی اس پر گولی چلا دے گا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد پیر بخش نے آکر خوش خبری سنائی کہ ٹرک آگیا۔

بشیرا نے جلدی جلدی کوٹھری سے دونوں بکسے نکلوائے اور انھیں ٹرک میں بھرے ہوئے سامان کے نیچے رکھوا دیا۔

ٹرک میں فرنیچر کے علاوہ گھر گرہستی کا دوسرا سامان بھی تھا۔ ٹرنک اور صندوق بھی تھے۔ بشیرا کے بکسے بھی ان کے ساتھ انسپکٹر کے سامان کا حصہ بن گئے۔

بکسے رکھوانے کے بعد بشیرا اور لالی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اسی وقت سامنے سے تیز روشنی ابھری۔

بشیرے نے ڈرائیور کو ٹرک اسٹارٹ کرنے کی ہدایت کی۔ ٹرک اسٹارٹ ہوکر آگے بڑھا تو سامنے سے آنے والی گاڑی کی بتیاں بجھ گئیں۔ ٹرک رفتہ رفتہ آگے بڑھتا گیا۔ لالی دم بخود بیٹھا تھا۔ ٹرک قریب پہنچا تو ایک بار پھر بتیاں روشن ہوگئیں۔ لالی نے دھڑکتے دل سے دیکھا کہ سڑک کے کنارے کار کھڑی ہے۔ اس نے پہلی ہی نظر میں تاڑ لیا کہ وہ میاں حیات محمد کی بیوک ہے۔ مگر نہ کوئی کار سے اترا نہ کسی نے ٹرک روکنے کی کوشش کی۔ ٹرک گرد کے بادل اڑاتا تیزی سے کار کے برابر سے گزر گیا۔

ڈرائیور نے رفتار تیز کردی۔ ہوا کے تیز جھونکے اندر آنے لگے۔ لالی پہلے ہی تھکن سے نڈھال تھا، جھونکے لگے تو اس کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگیں۔ وہ ذرا دیر جھومتا رہا پھر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر سو گیا۔ ٹرک تیزی سے دوڑتا رہا۔ خنک جھونکے اندر آتے رہے۔

لالی بے خبر سوتا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو اس نے گھبرا کر دیکھا کہ ٹرک سڑک کے کنارے کھڑا ہے۔ ٹرک سے تھوڑے فاصلے پر بشیرا دو کانسٹیبلوں سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہا ہے۔ لالی سخت پریشان ہوا۔

فرار کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ کانسٹیبل دروازے کے عین سامنے تھے۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد اس نے دیکھا، کانسٹیبل سائیکلوں پر سوار ہوکر آگے بڑھ گئے۔

بشیرا ٹرک کی جانب واپس آیا۔ وہ دروازے کے قریب پہنچا، مگر اندر نہیں آیا۔ اس نے لالی کو بیدار پایا تو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لالی نیچے اتر کر اس کے پاس گیا۔ بشیرے نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ اسے اپنے ساتھ ٹرک سے ذرا دور لے گیا۔ اس نے رازدارانہ انداز میں آہستہ سے پوچھا۔

”یار! تیرا نام لالی ہے؟ تو جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہے؟“

”کیا یہ بات تجھے کانسٹیبلوں نے بتائی ہے؟“

”ہاں، انھوں نے ٹرک رکوایا اور تارچ کی روشنی ڈال کر اندر جھانکنے لگے۔ میں جھٹ نیچے اترا۔ انہیں بتایا کہ ٹرک میں انسپکٹر شاہنواز کے گھر کا سامان بھرا ہے۔ ان کا کراچی تبادلہ ہوگیا ہے۔ سامان وہیں جا رہا ہے۔ یہ سن کر کانسٹیبلوں نے سامان کی تلاشی نہ لی۔ مگر تیرے بارے میں انھیں شبہ تھا کہ تو مفرور قیدی لالی ہے۔“ وہ آہستہ سے مسکرایا۔ ”پر میں نے تجھے انسپکٹر شاہنواز کا ملازم بتا کر ان کا شبہ دور کردیا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”دونوں چلے گئے، لیکن ایسا لگتا ہے انھوں نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ سچ بتا، اصل بات کیا ہے؟“

لالی انکار نہ کرسکا۔ ”اب تجھ سے کیا چھپانا، بات کچھ ایسی ہی ہے۔“

”یار! یہ بات مجھے پہلے کیوں نہ بتائی؟“

”اب تو میں نے سب کچھ بتا دیا۔“

بشیرے نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے، آگے بھی پولیس والے ملیں گے اور اس دفعہ تجھ سے پوچھ گچھ بھی کریں گے۔ کانسٹیبلوں کی زبانی مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ پولیس نے ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے جگہ جگہ راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔“

”یہ کون سی جگہ ہے؟“

بشیرے نے جواب دیا۔ "یہ پاک پتن روڈ ہے۔ آگے منٹگمری ہے۔" اس نے سامنے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ دور درختوں کے پیچھے شہر کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

"مجھے یہیں چھوڑ دے۔"

"مگر جائے گا کہاں؟"

"میری فکر نہ کر۔" لالی نے اعتماد سے کہا۔ "میں کچے رستے سے کسی طرف نکل جاؤں گا؟"

"جیسی تیری مرضی۔ سوچ لے۔"

"سوچنا کیا ہے۔ اب تم اپنے رستے جاؤ۔ میں اپنے رستے چلا۔"

دونوں سڑک کے کنارے کھڑے [illegible] تھے کہ دور سے تیز روشنی ابھری۔ لالی روشنی دیکھتے ہی ٹرک کی جانب جھپٹا۔ اس نے اگلی سیٹ سے اپنی گٹھری اٹھائی اور تیز تیز قدموں چلتا ہوا قریب کے کھیتوں میں گھس گیا۔

بشیرا ٹرک پر جا کر بیٹھ گیا۔ ٹرک اسٹارٹ ہوا اور آگے بڑھ گیا۔

۹

راستہ ایک ٹیلے کے پاس جا کر ختم ہو گیا تھا۔ اب لالی کے سامنے ٹیلے کی صورت میں اونچا اور ابھرا ہوا ناہموار میدان تھا۔ لالی آہستہ آہستہ ٹیلے پر چڑھنے لگا' اوپر پہنچا' میدان عبور کیا' نیچے آیا تو پختہ سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی اور بالکل ویران تھی۔ سڑک کے دونوں جانب کہیں کہیں گھنے درخت تھے۔ درختوں کے پیچھے نشیب میں جھنگر تھا۔ جھنگر جنگلی پودوں اور جھاڑیوں سے بھرا تھا۔

لالی سڑک پر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے مشکل سے چند فرلانگ راستہ طے کیا تھا کہ کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک کار نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی وہ ٹھٹکا۔ کار کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس طرف دیکھتا رہا۔ ایک لمحہ ایسا بھی آیا' جب اس نے واپسی کا ارادہ کیا۔ مگر وہ لوٹ کر جاتا بھی کہاں؟ لگ بھگ دو منٹ تک وہ گم صم کھڑا رہا۔ کار کوئی سو گز کے فاصلے پر بالکل اس کے سامنے تھی۔ مگر اس جگہ گہری خاموشی چھائی تھی۔

سڑک کے نشیب میں بکھری ہوئی جنگلی جھاڑیاں' تاروں کی مدھم روشنی میں سایوں کے مانند دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ لالی نے ہمت سے کام لیا اور کار کی سمت بڑھنے لگا۔ کار جس قدر قریب آتی گئی' اس کے قدموں کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ لالی چاہتا تھا کہ کار کے سامنے رکے بغیر تیزی سے آگے نکل جائے۔ وہ رفتہ رفتہ کار سے نزدیک ہوتا گیا۔ جب کار کا فاصلہ چند قدم رہ گیا تو کار کے اندر سے آواز آئی۔ "ہے' ٹھہر جاؤ۔" ساتھ ہی ایک شخص دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ لالی اسے دیکھ کر بھی نہیں رکا۔ اس نے چاہا کہ لپک کر نشیب میں اتر جائے اور جھاڑیوں کی آڑ میں چھپتا

چھپا تا کسی طرف نکل جائے' لیکن اس نے رفتار تیز ہی کی تھی کہ وہ شخص جھپاک سے عین اس کے سامنے آگیا۔

"بات تو سنو۔"

لالی نے بے رخی سے کہا۔ "کیہہ گل ہے جی؟"

اس نے گردن موڑ کر اس شخص کو غور سے دیکھا اور ایک ہی نظر میں اندازہ لگالیا کہ وہ اسے آسانی سے زیر کر سکتا ہے۔ اس کا قد لالی کے برابر تھا۔ چھریرا جسم' اجلی سفید قمیص اور پتلون' آنکھوں پر چشمہ' سر پر گھنے بال' ڈاڑھی مونچھ صاف' صورت شکل اور وضع قطع سے وہ کھاتا پیتا معقول آدمی لگتا تھا۔

اس نے لالی کو اپنی جانب گھورتے دیکھا تو مسکرا کر مخاطب ہوا۔ "یار' اس قدر ناراض کیوں ہو رہے ہو؟"

لالی پھر بھی نہ پگھلا' اکھڑپن سے گویا ہوا۔ "کہو' کیا کہنا چاہتے ہو؟"

وہ شخص اور کھل کر مسکرایا۔ بے تکلفی سے بولا۔ "کیا بیوی سے جھگڑا کر کے آئے ہو؟ بات کیا ہے؟"

لالی نے اس دفعہ بھی بے رخی کا مظاہرہ کیا۔ "خاماخا کی باتیں نہ کرو۔ مطلب بتاؤ' فٹافٹ۔ کیا چاہتے ہو تم؟"

"چاہنا واہنا کیا ہے۔ یار! تھوڑی سی تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" وہ نرم لہجے میں بولا۔ "ذرا گاڑی کو دھکا لگا دو۔" اس نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا۔ "لو' یہ رکھ لو۔"

لالی نے صاف انکار کر دیا۔ "نہیں جی! میں دھکا شکا نہیں لگاؤں گا۔ مجھے جلدی ہے۔"

اس شخص نے جیب سے ایک نوٹ اور نکالا۔ "لو' اب تو مان جاؤ۔"

"سو روپے دو گے' تب بھی تمہاری گڈی کو دھکا نہیں لگاؤں گا۔" لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "صاف بات یہ ہے جی! میں اس وکھت رک نہیں سکتا۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔

اس شخص نے ہاتھ بڑھا کر لالی کا بازو تھام لیا۔ "یار ایسی بھی کیا بے مروتی۔ آدمی سے آدمی کا کام پڑتا ہے۔"

لالی نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑایا اور غصے سے تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "پرے ہٹ کے بات کر۔" اس نے آنکھیں نکال کے اسے گھورا۔ "کہہ دیا' میں نہیں رک سکتا۔ اویں گلے پڑا جا رہا ہے۔"

وہ شخص ڈھیٹ بن کر بولا۔ "یار! گالیاں دے لو۔ مگر گاڑی کو دھکا لگا دو۔"

لالی کا سارا طنطنہ جاتا رہا۔ اس نے چاہا بھی کہ غصہ آجائے اور اس شخص سے پیچھا چھوٹ جائے۔ لیکن اس نے تو غصے کا کوئی جواز ہی نہیں چھوڑا تھا۔ لالی چند لمحے خاموش کھڑا رہا پھر کسی قدر نرم لہجے میں اپنی مجبوری بیان کی۔

"دیکھو جی! نراضگی شراضگی کی گل نہیں۔ میں تمہاری مدد ضرور کرتا۔ پر مجھے بہت جلدی ہے۔"

"کہاں جانا ہے تمہیں؟"

"میں نے جی سٹیشن جانا ہے۔ لہور کی گڈی پکڑنی ہے۔"

"اسٹیشن یہاں سے خاصی دور ہے۔ تم پیدل تو صبح تک نہیں پہنچ سکتے۔" وہ شخص سوچنے لگا۔ "چار بجنے والے ہیں۔ ٹرین سوا چار بجے اسٹیشن پہنچے گی۔ ایکسپریس ہے۔ مشکل سے چند منٹ ٹھیرتی ہے۔ تم اسے کیسے پکڑ سکتے ہو؟"

لالی اڑا رہا۔ "نہیں جی! میں سیدھا سٹیشن جاؤں گا۔ اگر پہلی چھوٹ گئی تو دوسری سے چلا جاؤں گا۔"

"دوسری گاڑی دوپہر کو جاتی ہے۔ میں تمہیں اپنی کار سے اسٹیشن پہنچا دوں گا۔" اس نے نرم اور شگفتہ لہجے میں کہا۔ "اس وقت رات کو کہاں بھٹکتے پھرو گے اور ادھر سے تو کوئی راستہ اسٹیشن جاتا بھی نہیں۔ تمہیں ملتان روڈ جانا ہو گا۔"

لالی مخمصے میں پڑ گیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا' پھر اس نے دریافت کیا۔ "تمہیں کتنی دور جانا ہے؟"

"پانچ میل سمجھ لو۔"

"پنج میل؟" لالی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "اتنی دور تک تو میں دھکا نہیں لگا سکتا۔ دھکا لگاتے لگاتے اپنا پلیتھن نکل جائے گا۔"

"تم اکیلے نہیں ہو' میں بھی تمہارے ساتھ دھکا لگاؤں گا۔"

لالی نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ کار کے قریب گیا' اس کا بونٹ چھو کر دیکھا اور اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ سٹارٹ بھی نہیں ہو سکتی؟"

"نہیں یار! یہ اسٹارٹ نہیں ہو سکتی؟" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "پیٹرول ختم ہو گیا ہے۔"

اس کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ وہ چند لمحے خاموشی سے سر کے بال کریدتا رہا۔ پھر بڑبڑانے کے انداز میں آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "سخت حماقت ہو گئی۔ آج ایک جگہ کھانے پر گیا تھا' پھنس گیا

وہاں۔ رات زیادہ ہوگئی۔ ڈرائیور کو پہلے ہی چھٹی دے دی تھی۔ اس کی بیوی بیمار ہے۔ حرام زادے نے یہ بھی نہیں بتایا کہ گاڑی میں پیٹرول کم ہے۔ ورنہ راستے میں کسی پیٹرول پمپ سے ڈلوا لیتا۔ بس ہوگئی حماقت۔ اب اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔

"یار! میل بھر تو میں نے دھکا لگایا' پھر اپنی ہمت نے جواب دے دیا۔"

لالی بے تکلفی سے بولا۔ "بے کار اس چکر میں پڑے۔ مزے سے گڈی کے اندر سوتے۔ سویرے کوئی نہ کوئی دھکا لگانے والا مل جاتا۔"

"سویرے تو دھکا لگانے والے بہت مل جائیں گے۔ دوسری گاڑی بھی آسکتی ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ مجھے صبح چھے بجے کمشنر صاحب کو چھوڑنے اسٹیشن جانا ہے۔ وہ ملتان جا رہے ہیں۔ انھیں کچھ ضروری فائلیں دینی ہیں جو میری گاڑی میں پڑی ہیں۔ ورنہ گاڑی چھوڑ کر پیدل ہی چلا جاتا۔"

لالی کسی قدر مرعوب ہوگیا' پوچھنے لگا۔ "جی! آپ ادھر کوئی افسر لگے ہوئے ہیں؟"

"یہ نہ پوچھو۔" وہ ایک بار پھر ہنسا۔ "تم سے پہلے بھی ایک راہ گیر ملا تھا۔ میں نے اس پر رعب جمانا چاہا۔ اسے بتایا کہ میں کون ہوں۔ میری بات سنتے ہی وہ بگٹٹ بھاگا اور سڑک سے نشیب میں اتر کر جھاڑیوں میں گھس گیا۔ یہ بھی سراغ نہ ملا' کہاں گیا' کدھر گیا؟" اس نے قدرے تامل کیا۔ "مشکل یہ ہے کہ اس سڑک پر نہ کوئی لاری چلتی ہے نہ ادھر سے ٹرک گزرتے ہیں۔ یہ سڑک سیدھی میری کوٹھی تک جاتی ہے۔"

"میں تو کہتا ہوں جی! پیدل ہی چلے جاتے تو ٹھیک تھا۔"

"بھئی مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں۔" اس دفعہ وہ بھنا گیا۔ "لگا سکتے ہو تو گاڑی کو دھکا لگا دو۔ مجھے ہر حال میں صبح چھے بجے سے پہلے پہلے کوٹھی پہنچنا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالا اور دوسرے سے کار آگے ڈھکیلنے لگا۔

لالی چند لمحے خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کر وہ بھی اس کے ساتھ کار کو دھکا لگانے لگا۔ چھوٹی مورس کار تھی' نئی تھی اور ہلکی پھلکی بھی تھی۔ سڑک صاف ستھری تھی اور آگے ڈھلان بھی تھی۔ لالی کو زیادہ زور نہیں لگانا پڑا۔ کچھ دور تک دونوں دھکا دے کر کار آگے بڑھاتے رہے۔ لالی نے چلتے چلتے پوچھا۔

"آپ نے یہ نہیں بتایا جی! آپ یہاں کیا لگے ہوئے ہیں؟"

اس نے لالی کی جانب دیکھے بغیر بے نیازی سے کہا۔ "یار! میں اس ضلعے کا ڈپٹی کمشنر ہمدانی ہوں۔" لالی کے کان کھڑے ہوئے' اس کے قدم رک گئے۔ ہمدانی بھی رک گیا۔ اس نے مڑ کر لالی

نظر ڈالی۔ "تم گھبرا کیوں گئے؟" وہ آہستہ آہستہ ہانپتے ہوئے زیر لب مسکرایا۔ "قتل کر کے بھی آئے ہو تو پروا نہ کرو۔ تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ڈرو نہیں۔ لگاؤ دھکا۔"

لالی نے دھکا نہیں لگایا' آہستہ سے بولا۔ "کتل شتل تو میں نے نہیں کیا۔ بات کچھ اور ہے۔"

"چوری کی ہے؟ ڈاکہ ڈالا ہے؟ عورت وورت بھگائی ہے؟" ہمدانی کھل کر مسکرانے لگا۔ "صاف صاف بتاؤ' بات کیا ہے؟"

لالی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "صاف بات یہ ہے جی! میں جیل سے بھاگا ہوا کیدی لالی ہوں۔ میری گرفتاری پر دو ہزار انعام بھی رکھا گیا ہے۔"

ہمدانی اسی بے نیازی سے بولا۔ "یار! جیل سے تو قیدی بھاگتے ہی رہتے ہیں۔ تم نے ایسا کون سا سنگین جرم کیا ہے۔" وہ خاموش ہوگیا اور چند لمحے سوچتا رہا۔ "یاد آیا۔ تمہارے معاملے میں وہ اپنے وزیر زراعت کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اسی لیے تمہاری گرفتاری پر انعام ونعام بھی رکھا گیا ہے۔ پولیس بھی بھاگ دوڑ کر رہی ہے۔ لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تم اس وقت میرے ساتھ ہو۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "یار تم بالکل پریشان نہ ہو۔ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ڈپٹی کمشنر اپنے ضلعے کا بادشاہ ہوتا ہے۔"

"یہ تو مجھے پتہ چل گیا جی کہ آپ وڈے افسر ہو۔" لالی نے قدرے تامل کیا۔ "میاں حیات محمد نے بھی ایسا ہی وعدہ کیا تھا۔ وہ بھی بہت وڈے زمیں دار ہیں' پر انھوں نے تو جی ایسے چکر میں ڈال دیا تھا میں آپ کو کیا بتاؤں۔"

"حیات محمد تو نہایت واہیات آدمی ہے۔ بیگم اس کی البتہ بڑی آب و تاب کی عورت ہے۔" وہ مسکرانے لگا۔ "ہیرے کی طرح جگمگاتی ہے۔ تم نے اسے دیکھا ہوگا؟"

"کیا بات ہے جی ان کی۔" میاں حیات محمد دتو کی بیوی ناصرہ کے ذکر پر لالی نے بھی لذت محسوس کی' چہک کر بولا۔ "میں نے تو جی انھیں ننگا بھی دیکھا ہے۔"

"نہیں یار!" ہمدانی حیرت سے اچھل پڑا۔ "تو تو بڑا چھپا رستم نکلا۔ وہ تو بہت اونچی چیز ہے۔ کہاں ٹکر گئی تجھ سے؟" اس نے توقف کیا۔ "یار! سچ سچ بتا؟"

"سچ ہی کہہ رہا ہوں!" لالی نے سینہ پھلا کر فخر سے کہا۔ "پچھلے سوموار ہی کی تو بات ہے۔ ہوا یہ کہ میاں حیات محمد نے غصے میں اس کی ساڑی نوچ کر پھینک دی اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ وہ اپنی ننگی ننگی ٹانگیں ہلا رہی تھی۔ میں صوفے کے نیچے زمین پر پڑا تھا' بالکل اس کے سامنے۔" لالی نے گہری سانس بھری۔ "میاں حیات تو اسے جان سے مار دیتا پر میں بیچ میں آگیا۔

اس نے مجھ پر بھی ہاتھ چلایا۔ بس جی! فیر تو میں نے بھی گتّے میں آنا ہی تھا۔ جھٹ میں نے اس کا گلا پکڑ لیا۔ اس نے بہت زور مارا، پر جی اپنے ہاتھ بھی لوہے کے ہیں۔ میں نے دیوار سے اڑا کر ٹھکا ٹھک جو اس کا سر ٹکرایا، تو وہیں ڈھیر ہو گیا۔"

"لگتے تو تم جان دار ہو۔" ہمدانی نے لالی کا ایک بازو انگلیوں سے ٹٹولا۔ "یہ تو بتاؤ، اب میاں حیات محمد کی بیگم کہاں ہے؟ بعد میں اس پر کیا گزری؟"

لالی نے اسی جوش و خروش سے بتایا۔ "میں اسے صاف نکال لایا۔ وہ اپنی بھین کے پاس لال ٹبے کی طرف گئی ہے۔ خود ہی گڈی چلا رہی تھی۔"

"یار! تم تو بڑے کام کے آدمی لگتے ہو۔"

"آپ نے جی مجھ سے جو وعدہ کیا ہے، مرد کا وعدہ ہے؟"

"بالکل مرد کا وعدہ۔ ملاؤ اسی بات پر ہاتھ۔" ہمدانی نے ہاتھ بڑھا کر گرم جوشی سے لالی کا ہاتھ دبایا۔ "اور یہ بھی وعدہ رہا کہ میں خود تمہیں چھوڑنے جاؤں گا۔ مگر آج دوپہر کو نہیں، کل صبح پانچ بجے والی ٹرین پر۔ چلو، اب لگاؤ دھکا۔"

"پر میں نے تو کادر آباد سٹیشن جانا ہے۔"

"قادر آباد؟" ہمدانی نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ تو یہاں سے دور ہے۔ تم وہاں کیوں جانا چاہتے ہو؟ قادر آباد تو لاہور جاتے ہوئے راستے ہی میں پڑے گا۔"

"اب تو جی میں اپنے بارے میں آپ کو صاف صاف بتا ہی چکا ہوں۔" لالی نے ہچکچاتے ہوئے ہمدانی کو بتایا۔ "اب آپ سے کیا چھپانا۔ وہاں میرا ساتھی رحیم داد انتظار کر رہا ہے۔ مجھے اس کے پاس جانا ہے۔"

"چلو، تمہیں قادر آباد ہی پہنچا دوں گا۔ اب تو خوش ہو؟"

لالی واقعی خوش ہو گیا۔ چہک کر بولا۔ "یہ بات ہے جی تو آپ اندر بیٹھ جائیں۔ میں اکیلا ہی دھکا لگاؤں گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ پنج ہی میل کا تو رستہ ہے۔"

"تم اپنی گٹھری تو اندر رکھ دو۔" ہمدانی نے مسکرا کر لالی کے کندھے سے گٹھری اتار کے کار کی پچھلی نشست پر ڈال دی اور خود اگلی نشست پر اسٹیئرنگ سنبھال کر بیٹھ گیا۔ لالی اکیلا کار کو دھکا لگانے میں جٹ گیا۔ وہ بہت جوش میں تھا۔

لالی کار کو دھکا دیتا ہوا آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ تین میل تک کار ڈھکیلتا ہوا لے گیا۔ پھر بری طرح ہانپنے لگا۔ ہمدانی نے کار ٹھہرا کے لالی کو ذرا دیر ستانے کا موقع دیا۔ لالی کار کا سہارا لیے لمبی

سانسیں بھر رہا تھا۔

ہمدانی خاموش بیٹھا رہا، پھر کچھ سوچ کر اس نے کہا۔ "یار! تو ٹھیک ہی کہتا تھا۔ گاڑی یہیں چھوڑتے ہیں۔ دونوں پیدل چلتے ہیں۔ لیکن تم فائلوں اور سرکاری کاغذات سے بھرا ہوا ٹرنک لاد کر چل سکو گے؟"

لالی نے مسکرا کر جواب دیا۔ "اب تو تھوڑا ہی فاصلہ رہ گیا ہے۔ آپ کو جی کار ہی میں بٹھا کر کوٹھی تک لے جاؤں گا۔"

ہمدانی نے کچھ نہیں کہا۔

مشرقی افق پر ہلکا ہلکا اجالا پھوٹنے لگا تھا۔ ستاروں کی چمک دمک ماند پڑتی جا رہی تھی۔ لالی نے تازہ دم ہو کر پھر دھکا لگانا شروع کر دیا۔ دوسرے ہلّے میں وہ ستائے بغیر کار ہمدانی کی کوٹھی تک لے گیا۔ کوٹھی دور سے نظر آنے لگی تھی۔ قریب پہنچ کر لالی نے صبح کی ہلکی ہلکی دودھیا روشنی میں دیکھا۔ کوٹھی کی بلندی پر قومی پرچم لگا تھا۔ پھاٹک پر مسلح پولیس کا پہرا تھا۔ کار پر نظر پڑتے ہی دو پہرے دار بھاگتے ہوئے آئے۔ ہمدانی کار سے باہر آ گیا۔ پہرے داروں نے اٹینشن ہو کر اسے کھٹاک کھٹاک سلیوٹ کیا۔

سلیوٹ کے ساتھ ہی وہ ہمدانی سے ایک دم ڈپٹی کمشنر بن گیا۔ ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ گردن اکڑ گئی، چہرے پر خشونت آ گئی۔ اس نے پہرے داروں کو بڑی رعونت سے مخاطب کیا۔ "گاڑی کی ڈکی کھولو۔" اس نے کار کی کنجی ایک پہرے دار کی جانب اچھال دی۔ پہرے دار نے کنجی سنبھالی اور ڈکی کھولنے لگا۔

ذرا سی تاخیر ہوئی تو ڈپٹی کمشنر زور سے چیخا۔ "کیا کرتا ہے؟ ڈکی تک نہیں کھلتی۔" پہرے دار کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ بار بار کنجی گھماتا رہا مگر ڈکی نہ کھلی۔ ڈپٹی کمشنر نے دوسرے پہرے دار کو ڈانٹا۔ "تم کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟ جاؤ، اس کی مدد کرو۔" دوسرا پہرے دار بھی لپک کر ڈکی کے پاس پہنچ گیا۔

دونوں نے ڈکی کھولی۔ اندر ایک سیاہ ٹرنک رکھا تھا۔ خاصا وزنی بھی تھا۔ دونوں پہرے داروں نے مل کر اسے نکالا۔ ڈپٹی کمشنر نے کہا۔ "میرے کمرے میں پہنچا دو۔" وہ آگے بڑھ گیا۔ چلتے چلتے اس نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ "گاڑی گیرج میں کھڑی کر دو۔ ڈرائیور آئے تو اس حرام زادے کو فوراً میرے سامنے پیش کرو۔" ساتھ ہی اس نے انگلی سے لالی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ لالی گردن جھکا کر سکڑا سکڑایا ڈپٹی کمشنر کے پیچھے چلنے لگا۔

اب ڈپٹی کمشنر کی چال میں تمکنت آگئی تھی۔ وہ پختہ سڑک پر جوتوں سے آہٹ پیدا کرتا پھاٹک کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا تو ایک بار پھر پولیس کے مسلح پہرے داروں نے کھٹاک سے اسے سلیوٹ کیا۔ اس نے گردن کو خفیف سی جنبش دی اور بے نیازی سے آگے بڑھتا ہوا کوٹھی کے اندر داخل ہوگیا۔

ایک اردلی سر پر پگڑی جماتا، وردی کے بٹن لگاتا، کمر پر سنہرا پٹکا درست کرتا کوٹھی کے عقب سے نکلا، برساتی میں پہنچا اور کوٹھی کے اندر جانے کا دروازہ کھول کر ایک طرف ادب سے کھڑا ہوگیا۔ ڈپٹی کمشنر نے سر کی جنبش سے اسے قریب بلایا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا۔

ڈپٹی کمشنر نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر لالی کی جانب دیکھا اور نہایت بے نیازی سے پوچھا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

لالی سٹ پٹا کے رہ گیا۔ وہ گھبرا کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ڈپٹی کمشنر نے لالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اردلی سے کہا۔ "نذیر بیگ! اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اس کے ٹھیرنے کا بندوبست کردو۔ شام کو اس کی پیشی کرنا۔" یہ ہدایات دے کر ہمدانی آگے بڑھ گیا۔

لالی چند ہی قدم گیا تھا کہ دہرے بدن کا ایک ادھیڑ آدمی سامنے باغ میں ایک درخت کے نیچے سے نکلا۔ وہ لمبا گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ ہاتھ میں چھڑی، چہرے پر رعب اور دبدبہ۔ یہ ڈویژنل کمشنر تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر ڈپٹی کمشنر کی جانب دیکھا۔ ڈپٹی کمشنر کی اس سے نظریں ملیں تو افسر سے جھٹ ماتحت بن گیا۔ اکڑی ہوئی گردن ڈھیلی پڑ گئی، ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ چہرے پر خشونت کے بجائے شگفتگی پھیل گئی۔ وہ تیزی سے کمشنر کی جانب لپکا، قریب پہنچا اور اس کے روبہ رو ادب سے گردن جھکا کر گھگیانے لگا۔

لالی نے ہمدانی کو اس طرح گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھا تو سخت حیرت ہوئی۔ مگر نذیر بیگ اردلی نے اسے وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنے دیا۔ وہ لالی کو اپنے ہم راہ لے گیا اور انیکسی کے ایک کمرے میں ٹھہرا دیا۔ کمرہ مختصر تھا مگر ہوادار تھا۔ اس میں چارپائی تھی۔ اس پر بستر لگا تھا۔ کمرے کے قریب ہی غسل خانہ تھا۔ نذیر بیگ نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ رہا غسل خانہ، تم ذرا نہادھولو۔ بہت تھکے ہوئے نظر آرہے ہو۔"

لالی کو سب سے زیادہ اپنی گٹھری کی فکر تھی۔ "میری گٹھڑی ساب کی گڈی میں پڑی ہے۔ وہ مجھے پہنچادو۔"

نذیر بیگ مسکرا کر بولا۔ "پروا نہ کرو۔ تمہاری گٹھری آجائے گی، کہیں جائے گی نہیں۔" وہ

روازے کی جانب بڑھا۔ "میں تھوڑی دیر بعد تمہارے لیے ناشتا بھجوا دوں گا۔ سونا نہیں۔" وہ کمرے سے چلا گیا۔

لالی ذرا دیر تک بستر پر خاموش بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر غسل خانے میں گیا۔ نہا کر غسل خانے سے نکلا تو دن نکل آیا تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ درختوں کی بلندیوں پر جھلملانے لگی تھی۔ اس نے کوٹھی کی طرف دیکھا۔ ایک گہری نیلی شیورلٹ پھاٹک کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس پر کمشنر کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ پچھلی نشست پر ہمدانی بھی کمشنر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ پھاٹک پر سنتری، بندوقیں سنبھالے ایک ہاتھ پیشانی پر رکھے چاق چوبند کھڑے تھے۔ کار پھاٹک سے گزر کے آگے بڑھی۔ لالی اسے دور تک دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں، غسل کرنے کے بعد نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ بستر پر لیٹ کر سونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ناشتا آگیا۔ لالی نے ناشتا کیا اور بستر پر دراز ہوگیا۔ کچھ دیر بعد وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ آنکھ ہی نہیں کھلی۔

دن ڈھلے نذیر بیگ نے اسے جگایا۔ وہ اس کی گٹھری بھی لایا تھا۔ لالی نے گٹھری کھول کر شیو کرنے کا سامان نکالا۔ غسل خانے میں گیا۔ ڈاڑھی مونڈی۔ منہ ہاتھ دھوئے اور تازہ دم ہو کر باہر آگیا۔ نذیر بیگ کمرے میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسے پیشی کے لیے لے گیا۔

☆

ڈپٹی کمشنر ٹینس کورٹ میں ٹینس کھیل رہا تھا۔ لالی درختوں کے نیچے خاموش بیٹھا کھیل دیکھنے میں محو تھا۔ ڈپٹی کمشنر کے مقابل اس کی بیوی کھیل رہی تھی۔ وہ بھی ہمدانی کی طرح سفید نیکر اور آدھی آستینوں کی اسپورٹنگ شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ شرٹ کے بٹن دور تک کھلے ہوئے تھے۔ اس کا گورا گورا سینہ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ حسین اور طرح دار عورت تھی۔ چہرے پر دل کشی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور غزالی تھیں۔ بدن سڈول تھا۔ لالی کو بہت اچھی لگی۔ وہ اسے بھاگتے دوڑتے اور اچھل اچھل کر ریکٹ سے گیند اچھالتے دیکھتا رہا۔

کھیل ختم ہوا تو دونوں ٹینس کورٹ سے باہر آگئے۔ خدمت گاروں نے آگے بڑھ کر دونوں کے ہاتھوں سے ریکٹ لیے۔ اجلے اجلے تولیے پیش کیے۔ انہوں نے تولیے لے کر چہرے اور گردن سے پسینہ پونچھا۔ سفید وردی میں ملبوس ایک بیرے نے دو گلاسوں میں لیمو کا تازہ رس پیش کیا۔ دونوں نے گلاس خالی کیے، بیرے کو دیے۔ اسی اثنا میں ایک آیا، ڈپٹی کمشنر کے دو بچوں کو لے کر آگئی۔ دونوں لڑکے تھے۔ بڑے کی عمر پانچ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ چھوٹا اس سے دو ڈھائی برس کم عمر تھا۔

دونوں بچے تن درست اور خوب صورت تھے۔ نہا دھو کر' ترو تازہ ہو کر آئے تھے۔ ڈپٹی کمشنر نے گال تھپک کر بچوں کو پیار کیا۔ ماں نے جھک کر دونوں کے گلابی رخسار چومے۔ آیا بچوں کو لے کر ایک طرف چلی گئی۔

ڈپٹی کمشنر بیوی کے ہم راہ کوٹھی کی جانب چلا۔ اس نے لالی پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی مگر کوئی توجہ نہیں دی۔ بیوی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ لالی نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ نذیر بیگ نے آنکھ مار کر لالی کو ڈپٹی کمشنر کے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ لیکن لالی آگے نہیں بڑھا۔ نذیر بیگ نے ڈپٹی کمشنر کی نظر بچا کر دوسری بار ہاتھ سے اشارہ کیا۔ لالی نے قدم اٹھائے اور سہما سہما ڈپٹی کمشنر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

دن ختم ہو رہا تھا۔ شام کی آمد آمد تھی۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنیں ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیوی کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ دونوں کے چہرے سنہری دھوپ سے دمک رہے تھے۔ سفید لباس میں دونوں راج ہنس کے جوڑے کے مانند خوبصورت نظر آ رہے تھے۔ ڈپٹی کمشنر بیوی کے ساتھ ہنستا مسکراتا کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ اس نے پلٹ کر لالی کی جانب دیکھا تک نہیں۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ لالی اس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔

نذیر بیگ نے لالی کو کوٹھی کے باہر ہی روک لیا۔ "صاحب تھوڑی دیر میں باہر نکلیں گے۔ تم ان کا یہیں انتظار کرو۔" یہ کہہ کر وہ بھی چلا گیا۔

لالی کوٹھی کے باہر پڑی ہوئی لوہے کی بنچ پر بیٹھ گیا۔ سورج ڈوب گیا۔ شام کا دھندلکا پھیلنے لگا کوٹھی میں جگہ جگہ بجلی کے بلب روشن ہو گئے۔ مگر سناٹا بہت گہرا تھا۔ اردلی اور خدمت گار ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ لیکن سب خاموش تھے۔ وہ صرف اشاروں میں باتیں کرتے یا اس قدر آہستہ بولتے گویا سرگوشی کر رہے ہوں۔ کچھ دیر بعد ڈپٹی کمشنر کوٹھی سے باہر آیا۔ بیوی اس وقت بھی اس کے ساتھ تھی۔ دونوں نہا کر آئے تھے اور زیادہ شگفتہ' زیادہ ترو تازہ لگ رہے تھے۔ ان کے لباس بھی بدلے ہوئے تھے۔

ڈپٹی کمشنر کو دیکھتے ہی لالی جھٹ کھڑا ہو گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے اس دفعہ بھی لالی پر کوئی توجہ نہ دی۔ بیوی سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ لالی پھر بنچ پر بیٹھ گیا۔ اب وہ بہت بیزار اور اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔

ذرا دیر بعد نذیر بیگ اردلی آ گیا اور اسے اپنے ہم راہ باغ میں لے گیا۔ ڈپٹی کمشنر' بیوی کے ساتھ لان میں بچھی ہوئی بید کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ہی لوہے کے

قد آدم کھمبوں پر بجلی کے دودھیا بلب روشن تھے۔ ڈپٹی کمشنر کے سامنے میز پر ٹیلی فون تھا۔ اسی میز پر وسکی سے بھرا ہوا گلاس بھی رکھا تھا۔ ڈپٹی کمشنر گلاس اٹھا کر آہستہ آہستہ چسکی لگا رہا تھا۔ لالی اور نذیر بیگ ذرا ہٹ کر ایک طرف خاموش کھڑے ہو گئے۔

نذیر بیگ چلا گیا۔ لالی اکیلا رہ گیا۔ وہ سر جھکائے خاموش کھڑا انتظار کرتا رہا کہ کب ڈپٹی کمشنر اشارہ کرے اور وہ اس کے قریب جائے۔ جب کئی منٹ تک ڈپٹی کمشنر نے اس کی جانب توجہ نہیں دی تو لالی کا جی چاہا کہ خود ڈپٹی کمشنر کے سامنے پہنچ جائے۔ لالی ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

ڈپٹی کمشنر نے بیوی کو اشارہ کیا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور آہستہ سے کہا۔ "ملا دو۔" چند لمحے وہ ریسیور کان سے لگائے خاموش بیٹھی رہی پھر اونچی آواز سے بولی۔ "ہیلو!" اس نے ٹیلی فون پر کچھ سنا' مسکرائی اور ریسیور ڈپٹی کمشنر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"یاد ہے' آج پولی ٹیسین کلب کی نائٹ آف دی گریٹ سپنس ہے۔ مسٹر سلیمان اسی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے۔"

ڈپٹی کمشنر نے ریسیور سنبھالا۔ "ہیلو سلیمان! مجھے یاد ہے۔ یار! یہ بھی کوئی بھول جانے والی بات ہے۔ کمال کر دیا تم نے۔" وہ مسکراتا رہا اور ریسیور پر سلیمان کی باتیں سنتا رہا۔ اسی اثنا میں اس کا چھوٹا بچہ آ گیا۔ ماں نے اٹھ کر اسے گود میں اٹھا لیا' سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔ ڈپٹی کمشنر نے مڑ کر بیوی کی جانب دیکھا مگر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ بچے کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتی رہی اور اس کے رخسار چومتی ہوئی کوٹھی کی جانب چلی گئی۔ بچے کے ساتھ اس کی والہانہ محبت دیکھ کر لالی بھی بے اختیار مسکرا دیا۔

ڈپٹی کمشنر نے ٹیلی فون پر باتیں سنتے سنتے ایک دفعہ چونک کر حیرت سے کہا۔ "سرا صاحب پر دل کا دورہ پڑا ہے؟ یار! اب کنڈکٹ کون کرے گا۔ ان کا سا امپائر کہاں ملے گا؟" بات کہتے کہتے وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "وہ بوڑھے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ رنڈوے بھی ہیں۔ وہ امپائرنگ کیا کرتے ہیں گویا عمر رفتہ کو آواز دیتے ہیں۔ قسم خدا کی ان پر جوانی آ جاتی ہے۔ کبھی کنڈکٹ کرتے وقت ان کا چہرہ دیکھا ہے۔ بھئی کیا باغ و بہار آدمی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں' کسی طرح انہیں اسپتال سے اٹھا لاؤ۔ ان کا دل بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے پھر قہقہہ لگایا۔ چند لمحوں تک ہوں ہوں کرتا رہا اور ریسور پر سلیمان کی بات سنتا رہا' پھر اس نے کہا۔ "امپائر کا بندوبست کرنا میرے لیے مشکل ہو گا۔ یار' ڈپٹی کمشنر ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میرے حکم پر ہر کام ہو جائے۔ کم از کم بتا

بنایا امپائر تو میرے حکم پر فی الفور مہیا نہیں ہو سکتا۔ ویسے کسی کو بھی امپائر بنا دو‘ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" وہ ریسیور کان سے لگائے چپ بیٹھا رہا‘ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "اچھا‘ میں ہی کچھ کرتا ہوں۔ پروگرام ڈسٹرب نہیں ہو سکتا۔" اس نے ریسیور رکھ دیا اور سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اسی عالم میں اس نے گردن اٹھائی‘ لالی کو دیکھا۔ لالی بائیں طرف کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ ڈپٹی کمشنر اسے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ زیر لب مسکرایا۔ اشارے سے لالی کو اپنے قریب بلایا۔ وہ قریب آگیا تو ڈپٹی کمشنر نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ہنس کر بولا۔

"ٹھیک ہے‘ امپائر بننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

لالی نے سادگی سے پوچھا۔ "وہ کیا ہوتا ہے جی؟"

"پروا نہ کرو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ یہ بتاؤ‘ کچھ انگریزی وںگریزی بھی جانتے ہو؟"

لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔ "ساب! انگریزی تو میں بالکل نہیں جانتا۔ میرے پیو نے تو کبھی مجھے سکول بھیجا نہیں‘ پر جیل میں ضرور پڑھا ہے۔ بات یہ ہے جی۔"

ڈپٹی کمشنر نے اسے آگے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ بات کاٹ کر بولا۔ "اردو میں کم از کم نام تو پڑھ لو گے؟"

لالی نے مستعدی سے جواب دیا۔ "وہ تو جی میں صاف پڑھ لیتا ہوں۔ کبھی انگوٹھا نہیں لگایا۔ ہمیشہ دستخط کرتا ہوں۔"

"بس۔ بس۔" ڈپٹی کمشنر نے ہاتھ اٹھا کر بے زاری کا اظہار کیا۔ "اتنا کافی ہے۔ اب تم امپائر بننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ مگر دیکھو‘ تم کم سے کم بولنا بلکہ سرے سے بات ہی نہ کرنا تو اچھا ہے۔"

ڈپٹی کمشنر نے ریسیور اٹھایا۔

"مہر سلیمان سے ملا دو۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ لالی سر جھکائے کھڑا رہا۔ ڈپٹی کمشنر بے چینی سے اپنا ایک پیر ہلاتا رہا۔ ذرا دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ ڈپٹی کمشنر نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "سلیمان! امپائر کا بندوبست ہو گیا ہے۔ اپنے ساتھ ہی لیتا آؤں گا۔ یار فضول باتیں چھوڑو‘ کام کی بات سنو۔ اس دفعہ ٹوکن انگریزی کے بجائے اردو میں ہوں گے۔ تم ٹوکن تیار کراؤ۔ میں آٹھ بجے تک نوشابہ کے ساتھ پہنچ جاؤں گا۔"

اس نے بات ختم کی۔ رسیور رکھا۔ لالی کو ذرا اور قریب بلایا۔ "پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ تم خاصے تیز آدمی ہو۔ آسانی سے امپائر کا رول ادا کر لو گے۔ اس میں رازداری بنیادی شرط ہے۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "ویسے تو تم خود ہی ایسا راز ہو جسے چھپائے چھپائے پھرتے ہو۔ کسی سے کچھ کہو گے بھی تو وہ تمہیں لپاڑیا سمجھے گا۔"

"اگر لاٹری شاٹری کا معاملہ ہے تب تو جی آپ بالکل پروا نہ کریں۔ میں ڈیڑھ سال تک سرکس میں لاٹری کھلاتا رہا ہوں۔" لالی مسکرایا اور سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بولا۔ "مگر جی وہ تو صاف چار سو بیسی تھی۔ ایسا تو کوئی چکر نہیں؟"

"ہش‘ ایسا کوئی چکر نہیں۔" ڈپٹی کمشنر نے تیوری پر بل ڈال کر اسے گھورا‘ چند لمحے خاموش رہ کر گویا ہوا۔ "چلو یہ بھی اچھا ہے کہ تم جانتے ہو‘ لاٹری کس طرح کھیلی اور کھلائی جاتی ہے‘ مگر یہ ویسی لاٹری نہیں۔ یہ اور قسم کی لاٹری ہے۔ بلکہ اسے قرعہ اندازی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ لاٹری تو سیدھی سیدھی قمار بازی ہوتی ہے۔"

اس نے قرعہ اندازی کا طریقہ اور اس کے قاعدے قوانین پوری تفصیل سے لالی کو سمجھائے۔ ہر بات کئی کئی بار بتائی تاکہ ذہن نشیں ہو جائے اور وہ امپائر کا کردار اچھی طرح ادا کر سکے۔ لالی حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی باتیں سنتا رہا۔ جو بات سمجھ میں نہ آتی‘ اس کے بارے میں سوال بھی کرتا جاتا۔ ڈپٹی کمشنر اسے سمجھاتا جاتا۔ جب لالی ہر تفصیل سمجھ گیا اور اس کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا تو ڈپٹی کمشنر نے سامنے کھڑے ہوئے اردلی کو اشارے سے قریب بلایا۔ اسے کاغذ پنسل لانے کا حکم دیا۔ ذرا دیر بعد وہ کاغذ پنسل لے کر واپس آیا اور ڈپٹی کمشنر کے سامنے میز پر رکھ کر الٹے قدموں چلا گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے پنسل اٹھائی۔ مسکرا کر لالی سے کہا۔ "مسٹر امپائر! اب ذرا تمہارا امتحان بھی ہو جائے۔" اس نے کاغذ پر کچھ لکھا۔ اور لالی کی طرف بڑھا کر بولا۔

"اسے پڑھ کر سناؤ۔"

لالی نے جھٹ پڑھ دیا۔ "امینہ۔" اس نے لمحے بھر تامل کیا پھر ہچکچاتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"یہ بھی وہاں ہوں گی جی؟"

ڈپٹی کمشنر ایک دم ہمدانی بن گیا‘ ہنس کر گویا ہو۔ "ہائے‘ یہی تو شہر میں قاتل بچا ہے۔ تین راؤنڈ ہو چکے ہیں‘ مگر اب تک نہیں جاگا میری قسمت کا ستارہ!" اس نے ٹھنڈی سانس بھری‘ لالی کی طرف ذرا سا جھکا۔ "یار! آج تو تمہاری چودھراہٹ ہے۔ تمہارے ہی ہاتھوں کچھ ایسا ہو جائے کہ میں دروازے پر دستک دے کر کہوں‘ کھل جا سم سم‘ اور کھٹ سے سم سم کھل جائے۔ کیا سمجھے؟" اس نے بے تکلفی سے آنکھ ماری اور کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

لالی خاموش کھڑا رہا۔ ہمدانی بھی کچھ دیر خاموش رہ کر گویا ہوا۔ ”اب تمہارا ایک عدد نام بھی ہو جائے یہ لالی والی نہیں چلے گا۔“ اس نے لالی کو غور سے دیکھا۔ ”تم اپنے ڈیل ڈول اور حلیے سے تو بالکل بکر قصاب لگتے ہو۔ تمہارا نام بھی کچھ ایسا ہی ہونا چاہئے۔“ وہ ذرا دیر سوچتا رہا پھر چٹکی بجا کر بولا۔ ”مل گیا نام۔ سردار نور محمد خاں بزدار کیسا رہے گا؟“ اس نے ذرا سا توقف کیا۔ ”یہی ٹھیک رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی تم مظفر گڑھ کے رئیس اور زمیندار بھی بن گئے۔ تمہارا تعارف اسی طرح کرایا جائے گا۔ مگر اپنی چونچ بند رکھنا۔ نام یاد رکھنا، سردار نور محمد خاں بزدار۔ اب ذرا تم اپنا حلیہ ٹھیک کر لو۔ نہا کر کپڑے بدل لو۔“

”میرے پاس تو جی یہی کپڑے ہیں۔“

”کپڑوں کی تم فکر نہ کرو۔ میرے وارڈروب میں بڑی گنجائش ہے۔“

لالی نے کسی قدر گھبرا کر کہا۔ ”ساب! مجھے ٹائی شائی باندھنی نہیں آتی۔“

”کون کہہ رہا ہے، تم ٹائی باندھو۔ ٹائی باندھ کر اور سوٹ پہن کر تم نہایت عمدہ قسم کے بینڈ ماسٹر لگو گے۔“ وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ ”پتلون اور بش شرٹ چلے گی۔“

دونوں میں مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ ہمدانی گلاس اٹھا کر وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی بیوی نوشابہ آ گئی۔ مگر کچھ سوچ کر فوراً جانے کے لیے مڑی۔ ہمدانی نے اسے ٹوکا۔ ”بات تو سنو جان من! جانان من!“ اس نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے میرے وارڈروب سے بش شرٹ اور پتلون نکال کر دے دو۔ یہ آج کی سپنس نائٹ کا ایمپائر ہے۔ اس کا نام سردار نور محمد خاں بزدار ہے۔“

نوشابہ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ”اور سمرا صاحب؟ کیا انہوں نے امپائر بننے سے انکار کر دیا؟“

”نہیں جان من! وہ سخت بیمار ہیں۔“ ہمدانی نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”تم بھی تیار ہو جاؤ۔ حشر مجسم، فتنہ بداماں۔“

نوشابہ نے ناز سے ہمدانی کو دیکھا۔ پلٹ کر لالی پر نظر ڈالی اور منہ بگاڑ کر بولی۔ ”کیا یہ امپائر کے لیے مناسب رہے گا؟“

”بالکل رہے گا۔ اس سے زیادہ مناسب امپائر فی الحال دست یاب نہیں ہو سکتا۔“

وہ کسی قدر بے زاری سے بولی۔ ”ہمدانی! کبھی کبھی تو تمہاری باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آتیں۔“ اس نے ایک بار پھر لالی کی جانب دیکھا۔ ”یہ تو جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہے۔ تم نے اس کے بارے میں یہی تو بتایا تھا۔“

”بتایا تھا، بالکل بتایا تھا۔ بات بھی یہی ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ ہمدانی نے پھر قہقہہ ”جاناں! یہ صرف امپائر ہے، کھیل کا کھلاڑی نہیں ہے۔ اس دفعہ امپائر کے معاملے میں بھی ں رہے گا۔ ہو جائے یاروں کے ساتھ تھوڑی سی آئی ونٹی۔ کیا خیلل ہے؟“

”اور جو کسی نے اسے پہچان لیا تو؟“

اسی وقت اردلی طشتری میں وزیٹنگ کارڈ رکھے ہوئے آیا۔ اس نے طشتری ہمدانی کے سامنے ہ دی اور نظریں نیچی کر کے ادب سے کھڑا ہو گیا۔ ہمدانی نے کارڈ اٹھا کر دیکھا اور فوراً ہمدانی سے ں کمشنر بن گیا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا، ہونٹ سمٹ کر جڑ گئے۔ اس نے تیوری پر بل ڈال کر اردلی دیکھا اور خفا ہو کر بولا۔ ”میں نے ہدایت کی تھی کہ آج کسی کو ملاقات کا وقت نہ دیا جائے۔ پھر یہ رڈ کیوں آیا؟“

اردلی نے اٹکتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”سرکار! بات یہ ہے....“

ہمدانی نے اسے آگے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ ڈپٹ کر بولا۔ ”مجھے معلوم ہے کیا بات ہے۔“ ں نے قدرے تامل کیا۔ ”جاؤ، جا کر خان بہادر کو بھیج دو، اب اور کوئی ملاقاتی نہیں آئے گا۔ سمجھ لئے۔“

اردلی الٹے قدموں واپس ہوا۔ نوشابہ بھی کوٹھی کی جانب چلی۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا وٹھی کے اندر چلا گیا اور نوشابہ کے ہم راہ ڈپٹی کمشنر کے ڈریسنگ روم میں پہنچ گیا۔ نوشابہ نے ارڈروب کھولا۔ لالی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، وارڈروب قسم قسم کے کپڑوں سے بھرا ہے۔ بڑی تعداد سوٹوں کی تھی۔

نوشابہ نے لالی کے ڈیل ڈول کی مناسبت سے کئی کپڑے نکال کر دیکھے، پھر ایک پتلون اور بش شرٹ لالی کو دے دی۔ دونوں کپڑے نہایت نفیس سلے ہوئے تھے۔ ان پر عمدہ استری بھی کی گئی تھی۔ نوشابہ نے ایک جوڑی جوتے کی بھی لالی کو دی۔ لالی نے کپڑے اور جوتے سنبھال کر حیرت سے پوچھا۔

”یہ واپس تو نہیں کرنے ہوں گے؟“

نوشابہ نے غصے سے اسے ڈانٹا۔ ”احمقانہ باتیں نہ کرو۔ تمہیں آج رات امپائر کا رول ادا کرنا ہے۔“

”وہ تو جی میں بالکل ادا کر لوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ ساب نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔“

”یہ بھی بتا دیا کہ اس کھیل میں رازداری نہایت ضروری ہے؟“

”کیوں نہیں بتایا جی! سارا کھیل تو راز داری ہی کا ہے اور راز داری بھی ایسی ہونی چاہیے کہ ساری زندگی کسی کو پتہ نہ چلے۔ بات تو تب ہوگی۔“

اس دفعہ نوشابہ نے مسکرا کر لالی کو دیکھا۔ ”تم تو کچھ کچھ سمجھ دار بھی معلوم ہوتے ہو۔“

”سمجھ داری کی بات تو یہ ہے جی کہ سب کسمت کا کھیل ہے۔“

”کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ تم کم بولا کرو۔ کم سے کم اسپائر بننے کے بعد تم اپنا منہ بالکل بند رکھنا۔“ اس نے بے رخی سے کہا۔ ”اچھا‘ اب جاؤ اور تیار ہو کر برساتی میں پہنچو۔“

لالی نے ہینگر میں لٹکے ہوئے کپڑے اٹھائے۔ دوسرے ہاتھ میں جوتے سنبھالے۔ خاموشی سے چلتا ہوا انیکسی میں پہنچا۔ اپنے کمرے میں گیا اور فوراً نہانے کے لیے غسل خانے میں گھس گیا۔ اس روز وہ بڑے اہتمام سے نہایا۔ ہمدانی کے دیے ہوئے کپڑے پہنے۔ کپڑے ذرا تنگ تھے مگر انہیں پہن کر وہ خوش تھا۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارے۔ مختلف زاویوں سے گھوم پھر کر اپنی سج دھج دیکھی۔

☆

پونے آٹھ بجے ڈپٹی کمشنر بیوی کے ہم راہ کوٹھی سے برآمد ہوا۔ نوشابہ ہلکے گلابی رنگ کا کرتا شلوار پہنے ہوئے تھی۔ میک اپ بھی اس نے بہت نفاست سے کیا تھا۔ چہرے کے نقش و نگار بلور کی طرح ترشے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں کوہستانی جھیلوں کی تابانی تھی۔ وہ ڈپٹی کمشنر کے بازو کا سہارا لیے نپے تلے قدموں سے چل رہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر بھی خوب بن سنور کر نکلا تھا۔ گہرے نیلے سوٹ میں وہ خاصا اسمارٹ اور وجیہہ لگ رہا تھا۔ اس کے انداز میں تمکنت تھی‘ دبدبہ تھا۔

ڈرائیور نے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ دونوں میاں بیوی خراماں خراماں کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ لالی نظریں جھکائے ایک طرف ادب سے کھڑا رہا۔ ڈپٹی کمشنر نے اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے لالی کو اگلی نشست پر اپنے برابر بٹھالیا۔ کار روانہ ہوئی۔ پھاٹک پر مسلح پہرے داروں نے سلامی دی۔ لالی کی گردن بھی ذرا سی تن گئی۔

کار آگے بڑھی اور ملتان روڈ پر آگئی۔ منٹگمری شہر سے گزری۔ عارف والا روڈ پر مڑی۔ کچھ دور جا کر نہر کا پل عبور کیا۔ نشیب میں اتری اور راجباہ بیروالا کے کنارے کنارے دوڑنے لگی۔ ہوا کے بھیگے بھیگے جھونکے کھلی کھڑکیوں سے کار میں آرہے تھے۔ لالی خاموش بیٹھا قریب بہتی ہوئی نہر کا جھل مل کرتا پانی دیکھتا رہا۔

کار تیزی سے دوڑتی رہی۔ پھر وہ کنکر کی بنی ہوئی پتلی سڑک پر مڑ گئی۔ کار اب مہر سلیمان خاں کی جاگیر میں داخل ہو چکی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف آم اور مالٹے کے باغات تھے۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ آم اور مالٹے کے درختوں کا سلسلہ حد نظر تک پھیلا تھا۔

سوا آٹھ بجے کار مہر سلیمان کے بنگلے پر پہنچی۔ بنگلہ کھیتوں اور باغوں سے الگ تھلگ اونچے ٹیلے پر بنا تھا۔ گرد و نواح میں جنگلی جھاڑیاں تھیں۔ خودرو پودے تھے۔ بنگلے میں بجلی بھی تھی اور اس کی روشنی رات کے اندھیرے میں دور سے نظر آتی تھی۔ نشیب میں ایک طرف رانی واہ بہتی تھی۔ یہ قدرتی نہر تھی۔ کسی زمانے میں اس جگہ برساتی نالا تھا جس میں صرف برسات کے موسم میں پانی ہوتا تھا۔

نہر کے آس پاس کی لگ بھگ چار ہزار ایکڑ زمین سلیمان کے سسر مہر فدا محمد خاں کی ملکیت تھی۔ اس کے انتقال کے بعد تمام زمین اور جائیداد سلیمان کی بیوی راحیلہ کو ترکے میں ملی۔ راحیلہ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس وقت اس زمین کا بیشتر حصہ بنجر اور غیر مزروعہ تھا۔ یہ بنجر اور غیر مزروعہ زمین سلیمان کی تحویل میں آئی تو اس نے آم اور مالٹے کے باغات لگانے کا منصوبہ بنایا اور منصوبہ یہ دیکھ کر بنایا کہ برساتی نالا‘ راجباہ بیروالا کے بہت قریب سے بہتا تھا۔ اس نے اپنے مزارعوں اور کمّیوں کو بیگار پر لگا کر برساتی نالے کی کھدائی کرائی اور اسے بیروالا کی بڑی نہر سے ملا دیا۔ اس طرح برساتی نالا‘ قدرتی نہر میں تبدیل ہوگیا۔ اب یہ نہر بنگلے کے عین نیچے بل کھاتی ہوئی بہتی تھی۔ اس کے قرب و جوار میں اعلیٰ قسم کے تخمی اور پیوندی آموں اور ریڈ بلڈ مالٹوں کے باغات تھے اور دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت تھے۔ لیکن ابھی تک ہزار ڈیڑھ ہزار ایکڑ اراضی بنجر اور غیر مزروعہ تھی۔ اس میں جھاڑیوں سے بھرے ہوئے جھنگر اور چھتّر تھے۔ انھی اجاڑ اور ویران جھنگروں اور چھتّروں کے درمیان مہر سلیمان کا بنگلہ تھا۔

کار بنگلے کے پھاٹک سے گزر کر پورٹیکو میں جا کر ٹھہر گئی۔ سلیمان اور اس کی بیوی راحیلہ نے ہمدانی کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ سلیمان خوب لمبا تڑنگا تھا‘ سر پر گھونگر والے بال تھے۔ ان میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ رنگ کھلتا ہوا تھا۔ راحیلہ کا قد بھی اونچا تھا۔ بدن کسی قدر بھاری‘ اجلی رنگت‘ چہرہ سیب کی طرح سرخ۔ مگر اس کے چہرے پر نسائیت کم تھی۔ آواز بھی بھاری تھی۔ وہ اس وقت ٹھاٹ سے سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کی عمر ۴۵ سال کے لگ بھگ تھی۔

لالی ڈرائیور کے ساتھ کار سے نیچے اتر کر ایک طرف کھڑا ہوگیا تھا۔ ہمدانی نے اس کی جانب

اشارہ کرتے ہوئے سلیمان اور راحیلہ سے کہا۔ ”ان سے ملو۔ یہ آج کی سپنس نائٹ کے امپائر ہیں، سردار نور محمد خاں بزدار۔ مظفر گڑھ کے رئیس اور بڑے زمیں دار ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قابل اعتماد بھی ہیں۔“ سلیمان اور راحیلہ نے باری باری ہاتھ بڑھا کر لالی سے مصافحہ کیا۔ لالی راحیلہ سے ہاتھ ملاتے وقت جھجکا۔ مگر راحیلہ نے جھٹ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا۔ لالی سخت پریشان ہوا۔ لیکن اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ ہمدانی نے لالی کی گھبراہٹ بھانپ لی۔ اس نے فوراً پینترا بدلا۔

”تم نے اتنا اصرار کیا کہ میں مسٹر بزدار کو مجبور کر کے لے آیا۔ بھئی آئندہ مجھے امپائر و مپائر کے چکر میں نہ ڈالنا۔ اس کا بندوبست پہلے سے کر لیا کرو۔“

مہر سلیمان نے معذرت کے انداز میں کہا۔ ”مجھے چھ بجے شام کو اچانک اطلاع ملی کہ سرا صاحب پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ تمھی بتاؤ، اتنے شارٹ نوٹس پر میں کیا کر سکتا تھا۔ تم جانتے ہو، میزبان کی حیثیت سے یہ میری ہی ذمہ داری ہے۔ بہرحال، تمہارا اور مسٹر بزدار دونوں کا بہت بہت شکریہ۔“

سلیمان اور ہمدانی باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھے مگر وہ بنگلے کے اندر نہیں گئے۔ سلیمان سب کو باغ میں لے گیا۔ باغ میں گھاس کے خوبصورت قطعے پر نیم دائرے میں صوفے رکھے تھے۔ روشنی بہت ہلکی تھی۔ صوفوں پر پہلے سے کچھ مہمان بیٹھے تھے، کچھ کھڑے تھے۔ مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں۔ سب ملے جلے تھے۔ دھیمی روشنی میں ان کے چہرے دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔

ہمدانی اور نوشابہ پہنچے تو غلغلہ پڑا۔ دونوں نے مسکرا مسکرا کر سب سے مصافحہ کیا اور درمیان کے صوفوں پر ایک دوسرے سے جدا ہو کر بیٹھ گئے۔ لالی بھی ایک طرف چپ چاپ بیٹھ گیا۔

صوفوں سے خاصے فاصلے پر درختوں کے نیچے باقاعدہ بار تھا۔ کاؤنٹر پر قسم قسم کی بوتلیں رکھیں تھیں۔ درختوں پر ننھے ننھے رنگ برنگے بلب روشن تھے۔ دو بارمین جھلکتی ہوئی سفید وردیاں پہنے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے تھے۔ وہ بوتلیں کھول کھول کر گلاسوں میں شراب انڈیل رہے تھے۔ بیروں کی وردیاں بھی کلف لگی سفید سفید تھیں۔ شراب کے بار سے ذرا ہٹ کر روشنیوں سے جگمگاتے درختوں تلے اسنیک بار بھی تھا۔ کاؤنٹر پر کھانے کے لئے مختلف اسنیکس قرینے سے رکھے تھے۔ اجلی وردیوں میں ملبوس خانساماں کمر پر سنہرے پٹکے لگائے، نہایت مستعدی سے پلیٹوں میں کھانے کی اشیاء سجا کر رکھ رہے تھے۔ بیرے، ٹرے سنبھالے ہوئے آتے اور اپنے اپنے کاؤنٹر سے شراب کے گلاس اور پیالے، سوڈے کی بوتلیں، پانی بھرے جگ اور کھانے کی اشیاء سے سجی سجائی پلیٹیں اٹھا کر لے جاتے۔ وہ علیحدہ علیحدہ ٹرے میں شراب اور اسنیکس اٹھائے مہمانوں کے درمیان گھوم رہے تھے۔

اس وقت اسکاچ وہسکی کا دور چل رہا تھا۔ البتہ عورتیں مارٹنی، شیری اور ہلکی فرانسیسی سرخ اور سفید وائن سے شغل کر رہی تھیں۔ صوفوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی میزیں تھیں۔ ان پر چاندی کی خوبصورت طشتریوں میں ماچس اور سگریٹیں رکھی تھیں۔ بعض عورتیں نہایت دھڑلے سے سگریٹ پی رہی تھیں۔

سب عورتیں اور مرد ایک دوسرے سے شناسا اور بے تکلف معلوم ہوتے تھے۔ وہ قہقہے لگا رہے تھے اور بے تکان باتیں کر رہے تھے۔ محفل میں چھ مرد تھے، چھ عورتیں تھیں۔ ان کی عمریں چالیس اور پچاس کے درمیان تھیں مگر دیکھنے میں اتنی نہیں لگتی تھیں۔ سبھی صحت مند اور زندہ دل تھے۔ سب جوڑے جوڑے تھے۔ صرف لالی لنڈورا تھا۔ وہ سب سے الگ تھلگ ایک صوفے پر خاموش بیٹھا تھا۔

محفل کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر لالی دیر تک حیران و پریشان رہا اور نظریں جھکائے گم صم بیٹھا رہا۔ اس محفل رنگ و بو میں جہاں زبان کے ساتھ ساتھ جسم بھی چہک رہے تھے، وہ خود کو بے حد اجنبی اور تنہا محسوس کر رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اٹھ کر بھاگ جاتا۔ ایک بیرا اس کے پاس بھی شراب کی ٹرے لے کر آیا مگر اس نے انکار کر دیا۔ کئی بار اس نے یہی کیا۔ البتہ اسنیکس کی ٹرے سے کھانے کی چیزیں بار بار اٹھاتا اور پلیٹ میں رکھ کر کھاتا رہا، طشتری سے سگریٹ اٹھا اٹھا کر پھونکتا رہا۔

ایک بیرا، شراب کی ٹرے لے کر آیا۔ تھوڑا سا اصرار بھی کیا، لالی اس دفعہ انکار نہ کر سکا۔ اس نے وہسکی کا گلاس اٹھا لیا۔ بیرے نے اس میں سوڈا ڈال دیا۔ لالی آہستہ آہستہ گھونٹ بھرنے لگا۔ گلاس ختم ہوا تو اس نے ایک بیرے کو اشارے سے قریب بلایا، دوسروں کی دیکھا دیکھی ٹرے میں خالی گلاس رکھا اور بھرا ہوا گلاس اٹھا لیا۔ وہسکی کے دو پیگ لگا کر طبیعت میں سرخوشی آ گئی۔ اجنبیت کا احساس کم ہو گیا۔ وہ اطمینان سے نظریں اٹھا اٹھا کر سب کو دیکھتا رہا۔ محفل میں کوئی شخص لطیفہ سناتا، قہقہے بلند ہوتے۔ لالی بھی بے ساختہ ہنسنے لگتا۔

ہمدانی ادھر ادھر گھومتا پھر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا، جسے وہ ٹھہر ٹھہر کر اٹھاتا، ہونٹوں سے لگاتا، وہسکی کی چسکی لگاتا۔ ہمدانی کبھی بیٹھ جاتا، کبھی کھڑا ہو جاتا اور زور سے قہقہے لگاتا۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتا۔ مگر نوشابہ بہت دیر سے ایک ہی جگہ بیٹھی تھی۔ وہ شیشے کے نازک گوبلٹ سے آہستہ آہستہ گہری سرخ اطالوی وائن پی رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ مارٹنی سے شغل کر چکی تھی۔

اس کا گلابی چہرہ اور نکھر گیا تھا۔ آنکھوں میں چراغ جھل ملا رہے تھے۔ وہ سلیمان کی بیوی راحیلہ سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ نوشابہ نہ زور زور سے قہقہے لگا رہی تھی نہ تتلی کے مانند ادھر ادھر منڈلا رہی تھی۔ لالی کو وہ سب عورتوں سے زیادہ دل ربا اور باوقار نظر آئی۔

نو بجے سے پہلے ایک نیا جوڑا آیا۔ اس کے آتے ہی شور مچا۔ یہ مسعود تھا اور اس کے ساتھ اس کی بیوی امینہ تھی۔ لالی کی نگاہیں دیر سے اسے تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے امینہ کو نظر بھر کر دیکھا۔ وہ سانولی سلونی بنگالن تھی۔ لمبے لمبے بال اور بیچ سے نکلی ہوئی سیدھی مانگ۔ ماتھے پر جگ مگ جگ مگ کرتی بندیا۔ تازہ کنول کی طرح شفاف آنکھیں۔ میانہ قد' چھریرا بدن' پتلی کمر۔ چلتی تو جسم اس طرح لچکتا جیسے نیا دھیرے دھیرے ڈولے۔ وہ زعفرانی ساڑھی باندھے ہوئے تھی مگر بدن پر بلاؤز قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ سینے پر دھجّی کی طرح زرتار چولی تھی۔ ساڑھی ناف سے اس قدر نیچے بندھی تھی کہ کولھے کے دائرے صاف نظر آ رہے تھے۔ پیٹھ بالکل برہنہ تھی اور نشیب میں دور تک کھلتی چلی گئی تھی۔ اس نے اپنی برہنہ پیٹھ کی ستر پوشی لمبے لمبے چمک دار بالوں سے کر رکھی تھی۔ سن دسال چالیس سے تجاوز کر چکا تھا مگر کاٹھی بہت اچھی تھی۔ پہلی نظر میں وہ الھڑ دوشیزہ نظر آتی تھی۔

لالی نے سوچا ہمدانی ٹھیک ہی کہتا ہے۔ بہت زوردار رن ہے۔ لیکن امینہ بھڑکتا شعلہ تھی تو اس کا شوہر مسعود اتنا ہی سنجیدہ اور کم گو تھا۔ وہ اونچے قد کا ادھیڑ آدمی تھا۔ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کا چشمہ تھا۔ رنگ ذرا کھلتا ہوا تھا' سر پر بال کم تھے۔ مگر مانگ نکال کر اچھی طرح جمائے گئے تھے۔ وہ ہونٹوں میں پائپ دبائے ہلکا ہلکا دھواں اڑا رہا تھا۔ ہمدانی نے امینہ کو نظر بھر کر دیکھا اور زور سے قہقہہ لگا کے چیخا۔ "یارو! اب روشنی گل دو۔" امینہ نے گردن کو ذرا سا خم دے کر ہمدانی کی جانب دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم تھا۔ دنبالے کاجل کے حلقوں میں جگمگاتی آنکھیں گنگنا رہی تھیں۔ ہمدانی نے لہک کر شعر پڑھا۔

لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے
اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدر

محفل میں زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ ہمدانی ہاتھ پکڑ کر مسعود کو اپنے ساتھ لے گیا اور ایک صوفے پر بیٹھ کر اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ امینہ آگے بڑھی اور سلیمان کے پاس ٹھہر گئی۔ لالی نے وہسکی کے تین بڑے پیگ لگا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ البتہ اس نے کھانا زیادہ کھایا۔ صبح سے بھوکا بھی تھا۔

پہر رات گزر گئی۔ ستارے زیادہ تاب ناک ہو گئے۔ ہوا میں تیکھا پن آ گیا۔ محفل کا رنگ نکھرتا جا رہا تھا۔ قہقہے تھے۔ آوازوں کا زیروبم تھا۔ چہرے سرخوشی سے دمکتے تھے۔ جسم جل ترنگ تھے' آنکھیں دھواں دھواں تھیں۔ سب آپس میں اس طرح گھل مل گئے تھے کہ ہم اور تم کی تمیز نہ رہی۔ صرف لالی اکیلا اور الگ تھلگ تھا۔ وہ صوفے پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ مگر محفل میں عملی طور پر شریک نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا حصہ بن گیا تھا۔ اسے بہت مزا آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا گویا کوئی سہانا خواب دیکھ رہا ہو۔

ٹھیک دس بجے سلیمان نے کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا۔ "لیڈیز اینڈ جینٹل مین!" سلیمان کی آواز کے ساتھ ہی خاموشی چھا گئی۔ قہقہے سرد پڑ گئے' آوازیں مدھم ہو گئیں۔ سب چپ چاپ صوفوں کی طرف بڑھے۔ ہر بیوی اپنے میاں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اب ان کی تعداد چودہ تھی۔ سات مرد' سات عورتیں۔

بیرے محفل سے چلے گئے۔ صرف سلیمان اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس نے اونچی آواز سے بولنا شروع کیا۔ "لیڈیز اینڈ جینٹلمین! آج کی نائٹ آف دی گریٹ سِنس میں ہمیں تھوڑی سی تبدیلی کرنی پڑی۔ یہ امپائر کی تبدیلی ہے۔ بات یہ ہے' مسٹر کرم علی سمرا اچانک شدید بیمار پڑ گئے۔ اب وہ اسپتال میں ہیں۔ یہ اطلاع بھی آج ہی شام کو ملی۔ ان کی جگہ دوسرے امپائر کا فوری انتخاب خاصا پیچیدہ مسئلہ تھا۔ مسٹر ہمدانی نے میری مدد کی۔ اس طرح یہ مسئلہ حل ہوا۔ ایک ممبر غیر حاضر ہیں۔ میری مراد مسٹر رؤف سے ہے۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ گزشتہ ہفتے کینیڈا چلے گئے۔ انہوں نے روانگی سے پہلے فون پر معذرت کر لی تھی۔"

سلیمان نے اشارے سے لالی کو اپنے قریب بلایا۔ لالی ایک بار پھر گھبرا گیا اور بوجھل قدموں سے سلیمان کے برابر جا کر کھڑا ہو گیا۔ سلیمان نے لالی کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ ہیں سردار نور محمد خاں بزدار۔ مظفر گڑھ کے رئیس اور بڑے زمیں دار ہیں۔ ان پر پورا' پورا اعتماد بھی کیا جا سکتا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "اکثر خاندانی رئیسوں کی طرح ان کے ساتھ بھی یہ حادثہ ہے کہ انگریزی نہیں جانتے۔ کوشش ہی نہیں کی۔ ان سے آپ کو اردو یا پنجابی میں بات کرنی ہو گی۔ یہ بات میں پہلے بتائے دے رہا ہوں تاکہ بعد میں کوئی غلط فہمی نہ ہو۔" اس نے لمحے بھر توقف کیا۔ "آیئے' اب میں آپ کو ان سے ملوا دوں۔ یہ ضروری بھی ہے۔ سمرا صاحب کی بات دوسری تھی۔ سب کے ساتھ ان کی اچھی جان پہچان تھی۔" اس مختصر تقریر کے بعد سلیمان خاموش ہو گیا۔ لالی بھی چپ چاپ کھڑا رہا۔ نہ وہ بولا' نہ کسی نے اس سے بولنے کی فرمائش کی۔

سلیمان اسے اپنے ہم راہ آخری سرے پر لے گیا۔ لالی بدستور گھبرایا ہوا تھا۔ سلیمان نے باری باری ہر شخص کا لالی سے سرسری تعارف کرایا۔ سب سے پہلے وہ شیخ عبدالحمید مگوں سے ملا۔ شیخ حمید چنیوٹ کا رہنے والا تھا۔ لائل پور میں اس کے دو کارخانے تھے۔ شیخ عبدالحمید مگوں کا نام سن کر لالی چونکا۔ اسے یاد آیا کہ پچھلی رات بشیرے نے اس کا تذکرہ کیا تھا۔

اس نے شیخ حمید کو غور سے دیکھا۔ حمید مگوں کے ساتھ اس کی بیوی مہ جبین تھی۔ وہ گداز بدن کی گوری چٹی عورت تھی۔ ناک نقشہ سبک تھا مگر آنکھیں ذرا چھوٹی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے ہلکی ہلکی جھریاں تھیں۔ جھریاں چھپانے کے لیے خاصا میک اپ کیا گیا تھا۔ وہ ہاتھوں اور کانوں میں قیمتی جڑاؤ زیور پہنے ہوئے تھی۔ چشم و ابرو اور غمزہ صاف چغلی کھاتا تھا کہ اس کا تعلق کبھی ارباب نشاط سے رہ چکا ہے۔ شیخ حمید مگوں خاصا تنومند تھا۔ اس کا پیٹ ذرا سا آگے نکلا ہوا تھا۔ رنگ سانولا تھا' بات بھی کم کرتا تھا۔ وہ نہایت نفیس سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی عمر ۴۵ سے اوپر تھی۔ مہ جبین بھی تقریباً اسی عمر کی تھی۔

دوسرے نمبر پر چوہدری محمد نواز بھنڈر تھا۔ وہ پولی لیسین کلب کا بنیادی رکن تھا۔ سپنس نائٹ میں شرکت کے لیے لاہور سے آیا تھا۔ وہ ریلوے میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھا۔ ادھیڑ عمر' مگر خوش رو اور خوش طبع۔ فاخرہ اس کی بیوی تھی۔ دبلی پتلی کامنی سی۔ چمپئی رنگت' چہرہ تر و تازہ اور صراحی دار گردن۔ گردن میں سونے کا جڑاؤ گلوبند تھا۔ سر پر بالوں کی پتلی سی سفید لٹ تھی جس نے اس کے چہرے کی دل کشی میں تنوع پیدا کر دیا تھا۔ وہ خاصی طرح دار عورت تھی۔ بات کرتی تو گردن کو ذرا سا خم دیتی اور نظریں ترچھی رکھتی۔

نواز بھنڈر کے قریب مرزا ابوالحسن بیٹھا تھا۔ وہ ایس پی تھا اور گٹھے ہوئے بدن کا تندرست آدمی تھا۔ سر پر چھوٹے چھوٹے بال تھے۔ رنگت گندمی تھی۔ وہ بات بات پر زور سے قہقہے لگاتا۔ اس کی بیوی سائرہ تھی۔ خوش شکل' رنگ صاف اور قد قدرے چھوٹا۔ چھوٹے قد کے باعث وہ اپنی عمر سے کم نظر آتی تھی۔ بات کرتی تو دانت چنبیلی کی کلیوں کی طرح خوبصورت لگتے۔ وہ سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ہلکے ہلکے نشے سے خمار آلود تھیں۔ لالی نے ایس' پی مرزا کو دیکھا تو سراسیمہ ہو گیا۔ مرزا نے اس کی گھبراہٹ بھانپ لی۔ اس کے چہرے پر پولیس والوں کی مخصوص خشونت جھلکنے لگی۔ اس نے لالی کو بغور دیکھا اور مسکرا کر بہت آہستہ سے بولا۔ "تم نے مونچھیں بھی صاف کرا دیں؟"

لالی لرز کر رہ گیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا' خاموش کھڑا رہا۔ ایس' پی نے تیوری پر ہلکا سا بل ڈال کر سرگوشی کی۔ "تم تو لالی ہو' نور محمد بزدار کب سے بن گئے؟" اس نے ذرا تامل کیا۔ "تمہارا ساتھی رحیم دار کہاں ہے؟" لالی اور پریشان ہو گیا۔

ہمدانی قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے صورت حال کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے فوراً مداخلت کی۔ "مرزا! نو آفیشل بزنس پلیز۔" اس نے پہلو بدلا اور مسکرا کر بولا۔ "پارٹی میں آیا کرو تو اپنا پولیس مین گیٹ کے باہر چھوڑ دیا کرو۔"

مرزا نے گردن موڑ کر ہمدانی کو دیکھا اور سنجیدہ ہو کر بولا۔ "سر! مجھے کچھ شبہ ہوا تھا۔"

ہمدانی ایک دم ڈپٹی کمشنر بن گیا۔ تیکھے لہجے میں بولا۔ "یہاں ہم اپنا شک و شبہ رفع کرنے کے لیے اکٹھا نہیں ہوئے ہیں۔"

ایس پی صفائی پیش کرنے لگا۔ "بات یہ ہے سر! وزیر زراعت نے فون پر فون کر کے اپنی دلیل بلوا دی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ڈپٹی کمشنر لمحے بھر خاموش رہا۔ "یار! تم پکی نوکری والے' ان کچی نوکری والے وزیروں کو گھاس ہی کیوں ڈالتے ہو؟ یہ تو چڑھتی اترتی دھوپ چھاؤں ہیں۔ ان کا تو کام ہی سفارشیں کرنا ہے۔ کسی کو چھڑوا دیا' کسی کو اندر کرا دیا' یا پھر انہیں الاٹ منٹوں اور لائسنسوں کا عارضہ ہے۔ تم نے خواہ مخواہ ان لوگوں سے لمبی چوڑی امیدیں باندھ رکھی ہیں۔ لاکھ کارگزاری دکھاؤ' تم پانچ سال سے پہلے ڈی آئی جی نہیں بن سکتے۔ وزیر زراعت کو مکھن لگانے سے بھی نہیں بن سکتے۔ ون یونٹ تو سمجھو بن ہی چکا ہے۔ چند مہینے کی بات اور ہے۔ پھر نہ یہ صوبہ رہے گا اور نہ اس کا کوئی صوبائی وزیر۔ کیا سمجھے؟"

ہمدانی خاموش ہوا تو مہر سلیمان نے بھی اظہار ناپسندیدگی کیا۔ "مرزا! تم کس کی لیگ پولنگ کر رہے ہو' میری یا ہمدانی کی؟ تم وردی اتار کر بھی وردی میں رہتے ہو۔ خواہ مخواہ کا ایک شوشا چھوڑ دیا۔" اس کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔

بات چیت بہت آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔ لہٰذا دوسرے مہمان ایس پی کی باتوں کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔ پھر بھی کسی نے مرزا کا رویّہ پسند نہ کیا۔ چوہدری نواز بھنڈر نے ہنس کے کہا۔ "بھئی مرزا! اس ویرانے میں مہینے بھر بعد تو ایک خوبصورت رات ملتی ہے۔ تم اس کا بھی سارا حسن اور سارا مزہ کرکرا کر دینا چاہتے ہو۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "یار! ہم غربا و مساکین پر کچھ تو رحم کھایا کرو۔"

کچھ اور احتجاجی آوازیں بھی بلند ہوئیں۔ عورتوں نے سب سے زیادہ ناک بھوں چڑھائی۔ خود

مرزا کی بیوی سائرہ نے اسے ڈانٹا۔ ”مرزا! ڈونٹ بی سلی۔“ ایس پی ان تابڑ توڑ حملوں سے گھبرا گیا۔ شرمندہ ہو کر ہر ایک سے معذرت کرنے لگا۔ اس نے کئی بار اونچی آواز سے کہا۔

”سوری، آئی ایم ویری سوری۔“

لالی نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا، چپ کھڑا سب کی باتیں سنتا رہا۔ ذرا دیر بعد وہ سلیمان کے ہم راہ آگے بڑھا اور ڈاکٹر بٹ کے پاس پہنچا۔ بٹ محکمہ صحت کا ڈائریکٹر تھا اور شام ہی کو ملتان سے سیدھا سلیمان کے بنگلے پہنچا تھا۔ پچاس کے لگ بھگ سن، مگر زندہ دل اور یار باش۔ سر کے بال خشک اور کسی قدر لمبے تھے۔ لباس کے معاملے میں بھی وہ خاصا بے نیاز تھا۔ سرمئی پتلون پر کارڈرائے کا بش شرٹ نما فاختئی کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ٹائی گہری سرخ تھی۔ وہ آنکھوں پر چشمہ لگائے آہستہ آہستہ پائپ پر کش لگا رہا تھا۔ وضع قطع سے اشکیچوئل لگتا تھا اور شکل وصورت کے اعتبار سے جاذب نظر تھا۔

ڈاکٹر بٹ کی بیوی ماہ رخ اس سے بھی زیادہ آشفتہ مزاج تھی۔ وہ سرخ ریشمی شلوار اور نہایت باریک ململ کا کڑھا ہوا سفید کرتا پہنے ہوئے تھی۔ کرتے کے نیچے اور کوئی کپڑا نہیں تھا۔ اندر سے اس کی گوری گوری جلد صاف جھلک رہی تھی۔ ناک ذرا چھوٹی تھی، مگر آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور شبنم کے قطروں کی طرح جھل ملاتی تھیں۔ وہ سن سے اتر چکی تھی۔ لیکن بدن اب تک سڈول تھا اور اسے سڈول رکھنے کے لئے وہ پابندی سے ریاض بھی کرتی تھی۔

سب سے آخر میں لالی مسعود کے پاس پہنچا۔ مسعود محکمہ آبادکاری میں ایڈیشنل کمشنر تھا۔ چند سال تک بنگال میں مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہ چکا تھا۔ اس نے کلکتے میں امینہ سے شادی کی۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی بنگال میں کئی سال گزارے، اب ادھر آگیا تھا۔ اس کی بیوی امینہ کو موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ رقص کرنا بھی جانتی تھی۔ ہنستی تو گلے میں گھنگرو کا چھناکا ہوتا۔ اٹھتی تو بدن پھولوں سے لدی شاخ کی طرح جھومتا۔ چلتی تو بے ساختہ یہ مصرعہ زبان پر آجاتا۔

ساغر کو مرے ہاتھ سے لیناکہ چلا میں!

نئے امپائر سے مہمانوں کے تعارف کی رسم ختم ہوئی تو سب کھڑے ہوگئے۔ روشوں پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے باغ کے ایسے حصے میں پہنچے جو سرس اور شرینہ کے اونچے اونچے گنجان درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ درختوں کے درمیان جدید طرز کی دو منزلہ عمارت تھی جو کلب کے ممبروں میں پلے ژر ہاؤس کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ نہر اس کے نیچے ہی بہتی تھی۔ عمارت کے دریچوں سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ ہمدانی نے چلتے چلتے سلیمان سے کہا۔

”سلیمان! امپائر کو پلے ژر ہاؤس اچھی طرح دکھا دو تاکہ وہ اس کے جغرافیئے سے واقف ہو جائے۔“

مہر سلیمان نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”مجھے اپنی ذمہ داری کا بخوبی احساس ہے۔ امپائر نیا ہے، میں تو نیا نہیں ہوں۔“

☆

سب مہمان پلے ژر ہاؤس میں داخل ہوئے اور کوریڈور سے گزر کر ایک کشادہ ہال میں پہنچ گئے۔ صرف سلیمان اور لالی زینے کی سیڑھیاں طے کرکے اوپر چلے گئے۔ بالائی منزل پر طویل غلام گردش تھی۔ اس کے ایک طرف کمرے تھے۔ کمروں کے دروازے ایک سلسلے سے دور تک چلے گئے تھے۔

پلے ژر ہاؤس کے طرز تعمیر سے مشرقیت جھلکتی تھی۔ غلام گردش کی آرائش میں بھی مشرقیت کا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ جگہ جگہ محرابیں تھیں۔ ان میں پیتل کی منقش قندیلیں آویزاں تھیں۔ کہیں کہیں چھت سے فانوس لٹک رہے تھے۔ مگر روشنی مدھم تھی۔ اتنی مدھم کہ غلام گردش میں چلنے والے پرچھائیوں کے مانند دھندلے دھندلے نظر آتے۔ غلام گردش میں دبیز قالین کا فرش تھا۔ محرابوں کے نیچے ہر کونے میں ذرا اونچائی دے کر لکڑی کے خوش نما تختے لگائے گئے تھے۔ تختوں پر چھوٹے چھوٹے گملوں میں خوب صورت پودے تھے۔ ان کے قریب قد آدم سیاہ اور سفید مجسمے نصب تھے۔ دیواروں پر دل فریب تصاویر آویزاں تھیں۔ ان میں قرون وسطیٰ کے مشرقی شبستانوں کے رومانی مناظر پیش کیے گئے تھے۔ مجسموں کی طرح تصاویر بھی ہیجان انگیز تھیں اور جذبات میں تلاطم برپا کرتی تھیں۔

غلام گردش میں دس کمرے تھے۔ کمروں کے دروازوں کے درمیان خاصا فاصلہ تھا، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کمرے بڑے اور کشادہ ہیں۔ ان کی کھڑکیاں نہر کی طرف کھلتی تھیں۔ ہر کمرے کے دروازے کے مقابل ذرا ہٹ کر غلام گردش میں جگہ جگہ صوفے پڑے تھے۔ دروازوں پر ریشم کے باریک پردے جھول رہے تھے۔ ہر دروازے پر پیتل کی تختی آویزاں تھی۔ تختی پر کمرے کا نمبر درج تھا۔ مگر ہر دروازہ مقفل۔ ہر قفل میں کنجی لگی تھی اور ہر کنجی پر کمرے کا نمبر لکھا تھا۔ سلیمان نے ایک ایک دروازے کا تالا کھول کر لالی کو دکھایا اور کنجی، تالے میں لگی چھوڑ دی۔ مگر وہ لالی کو کمرے کے اندر نہیں لے گیا۔ لالی نے بھی اندر جانے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ تالوں اور کنجیوں کا معائنہ کرکے دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

مہر سلیمان نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمدانی' لالی کو قرعہ اندازی کا طریقہ اور اس کے قاعدے قوانین بتا چکا ہے' ایک بار پھر قرعہ اندازی کے بارے میں تمام تفصیلات دہرائیں۔ اس نے لالی سے پوچھا۔

"مسٹر بزدار! میں نے یہاں کی ہر بات بتا دی۔ اب بھی آپ نے کچھ پوچھنا ہے' تو پوچھ لیجیے۔ میں بعد میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ ہر بات کا فیصلہ آپ ہی نے کرنا ہو گا اور آپ کے فیصلے کو کوئی چیلنج نہیں کرے گا۔"

لالی نے اعتماد سے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے جی! آپ پروا نہ کریں۔ میں نے ہر بات سمجھ لی ہے۔"

اس نے سلیمان سے صرف اتنی ہی گفتگو کی۔ باقی تمام وقت خاموش رہا اور ہر چیز حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس نے کرید کر کوئی بات نہیں پوچھی۔ وہ ہمدانی کی تنبیہہ کے مطابق کم سے کم بلکہ سرے سے بولنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

اوپر کی منزل سے اتر کر دونوں ہال میں آئے۔ سارے مہمان بے چینی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ہال میں داخل ہوتے ہی لالی چپ چاپ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد سلیمان بولنے کے لئے کھڑا ہوا۔ عین اسی وقت اس کا بوڑھا مینیجر ہال کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ چہرے مہرے سے خرانٹ لگتا تھا۔ مینیجر دروازے کے قریب سر جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر مہر سلیمان نے حیرت سے پوچھا۔

"سکھیرا! تم یہاں کیسے آ گئے؟"

اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ "سر! میں جانتا ہوں' مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے۔ مگر بار بار ٹیلی فون آ رہے ہیں۔ بہت ارجنٹ کالز ہیں۔ مجھے مجبوراً آنا پڑا۔ یہاں ٹیلی فون بھی نہیں ہے۔ ورنہ میں فون پر آپ سے کنٹیکٹ کرتا۔"

سلیمان نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔ "کیسے فون آ رہے ہیں؟ کیوں آ رہے ہیں؟"

سکھیرا نے بتایا۔ "سر! کوئی دو گھنٹے پہلے گیمبر سٹیشن کے نزدیک دو ٹرینیں ٹکرا گئی ہیں۔ زبردست حادثہ ہوا ہے۔ ابھی تک گیارہ کے مرنے کی اطلاع ہے۔ زخمی تو بہت سے ہیں۔ ہر طرف ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔"

ہال پر سناٹا طاری ہو گیا۔

سلیمان نے بے رخی سے کہا۔ "تو میں کیا کروں؟"

"نہیں سر!" سکھیرا نے فوراً وضاحت کی۔ "ساری کالیں چوہدری نواز بھنڈر صاحب' ڈپٹی کمشنر صاحب' ایس پی صاحب اور ڈاکٹر بٹ صاحب کے لیے ہیں۔"

"یار سکھیرا! تم اس وقت کہاں کباب میں ہڈی بن کر آ گئے۔" ہمدانی نے ہنس کر کہا۔ "بہرحال' میرا اس معاملے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔" اس نے مڑ کر نواز بھنڈر کی طرف دیکھا۔ "یہ تمہارا دردِ سر ہے۔ معلوم نہیں' مجھے کیوں ان کانٹوں میں گھسیٹ لیا گیا؟"

"ایسا نہیں ہے۔" نواز نے سنجیدگی سے کہا۔ "ذمے داری تو میری بھی ہے' تمہاری بھی' مرزا اور بٹ کی بھی ہے۔"

ایس پی مرزا نے اس کی بات پر احتجاج کیا۔ "مجھے کیوں انوالو کر رہے ہو؟ نواز! تمہاری ریلوے پولیس کس مرض کی دوا ہے؟"

سکھیرا نے ہچکچاتے ہوئے مطلع کیا۔ "مجھے بتایا گیا ہے کہ جہاں حادثہ ہوا ہے' وہاں بہت اندھیرا ہے۔ آس پاس کے پنڈ والوں نے لوٹ مار شروع کر دی ہے۔ سٹیشن پر صرف ایک کانسٹیبل تھا۔ وہ جائے حادثہ کی جانب گیا ہے۔ سر! وہ اکیلا کیا کر سکتا ہے؟ اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر نے مجھ سے خود بات کی ہے۔ وہ بہت پریشان لگتا تھا۔"

مرزا خاموش رہا۔ مگر نواز بھنڈر گویا ہوا۔ "ریلوے ٹریفک کا اتنا سٹاف موجود ہے۔ حادثے کی جگہ کوئی بھی پہنچ سکتا ہے۔ میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟" اس نے کچھ تامل کیا۔ "فون موجود ہوتا تو ئی ایس کو وہاں پہنچنے کا حکم جاری کر دیتا۔ اور میں کیا کر سکتا ہوں؟ اتنی سی بات انہیں سمجھ نہیں آئی۔ بس ٹیلی فون کھڑکھڑانے شروع کر دیئے۔" اس نے جھنجلائی ہوئی نظروں سے سکھیرا کی جانب دیکھا۔ "اور تم انہیں ٹالنے کی بجائے فریاد لیے یہاں آ گئے؟"

ڈاکٹر بٹ نے سکھیرا کو مخاطب کیا۔ "سکھیرا! تم ایسا کرو' اسپتال ٹیلی فون کر کے میری طرف سے ڈیوٹی انچارج سے کہو' جتنی ایمبولینس اسپتال میں موجود ہوں' ڈاکٹروں اور نرسوں کی ایک ٹیم کے ساتھ فوراً جائے حادثہ پر پہنچا دی جائیں۔"

"یار ڈاکٹر! تم کس چکر میں پڑ گئے۔ یہ بتا کر کہ تم یہاں موجود ہو' اخبارات کے لیے خواہ مخواہ ایک اسکینڈل کا میٹریل فراہم کر دو گے۔" ہمدانی نے سکھیرا کی جانب دیکھا۔ "فون پر تمہاری کس کس سے بات ہوئی؟"

سکھیرا نے جواب دیا۔ "منسٹروں کے سیکریٹریوں اور دوسرے افسروں کے فون آ رہے ہیں۔ دستور ساز اسمبلی کے ایک ممبر نے بار بار فون کیا۔ وہ حادثے والی ایک ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔

وہ بھی بہت پریشان لگتے تھے۔“

ڈاکٹر بٹ کی بیوی ماہ رخ نے گھبرا کر کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا‘ آج کا پروگرام کینسل کر دیا جائے؟“

ہمدانی مسکرا کر بولا۔ ”ڈونٹ بی سلی ماہ رخ! پروگرام کیسے کینسل ہو سکتا ہے؟“

وہ بولی۔ ”بھئی دیکھئے نا‘ کتنے بہت سے لوگ مر گئے۔ زخمی بھی بہت ہیں۔ نہ کوئی ریلیف ورک ہے نہ میڈیکل ایڈ۔ بہت سیریس بات ہے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہئے۔ ایمرجنسی جو ٹھہری۔“

مرزا نے اسے پریشان دیکھ کر کہا۔ ”ماہ رخ! تم تو ایسی رقّت کے ساتھ بات کر رہی ہو‘ گویا سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں ہے۔“ ایس پی کے اس جملے پر ہلکا قہقہہ بلند ہوا۔

نواز کی بیوی فاخرہ کسی قدر بے چین ہو کر بولی۔ ”بھئی! آپ لوگ ہم عورتوں کے جذبات کا بالکل لحاظ نہیں کرتے۔“

ہمدانی نے اس کی بات نظرانداز کر کے کہا۔ ”سکھیرا! یہ بتاؤ‘ تم نے جواب کیا دیا؟ کوئی حماقت تو نہیں کر بیٹھے؟ یہ تو نہیں بتا دیا کہ ہم سب یہاں موجود ہیں؟ ویسے اصولی طور پر تمہیں یہ بات معلوم نہیں ہونا چاہئے۔“ اس نے مسکرا کر اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ”یار تم بوڑھے ہو گئے اور ابھی تک تمہیں یہ معلوم نہیں کہ منیجر یا سیکرٹری کیا چیز ہوتا ہے؟“

سکھیرا نے جواب دیا۔ ”سر! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ بنگلے میں ایک پارٹی ہے۔ مجھے نہیں معلوم اس میں کون کون موجود ہے۔ پوچھ کر ہی بتا سکتا ہوں۔ یہ بات بھی میں نے اس لیے کہی کہ فون کرنے والوں کو آپ لوگوں کے بنگلوں سے اطلاعات ملی ہیں کہ آپ لوگ یہاں ہیں۔“

مرزا نے اونچی آواز سے کہا۔ ”لو بھئی‘ سن لو۔ آئندہ یہ پروگرام ٹاپ سیکریٹ رکھنا ہو گا۔ ورنہ ایسی مصیبتیں اکثر نازل ہوتی رہیں گی۔“

”ویسے تو یہ ٹاپ سیکریٹ ہی ہے۔“ نواز نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”مگر حادثے کے سلسلے میں ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“

”یار! پروگرام ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہ کرو۔“ ہمدانی نے کسی قدر سنجیدگی سے کہا۔ اس نے مڑ کر سکھیرا کو دیکھا۔ وہ دروازے کے قریب سہما ہوا کھڑا تھا۔ ”سکھیرا! ایسا کرو‘ لاہور یا کراچی سے کوئی اہم کال آئے تو صاف انکار کر دینا کہ ہم چاروں میں سے کوئی یہاں نہیں آیا۔ اس کے بعد فون ڈیڈ کر دو اور اطمینان سے سو جاؤ۔ آئندہ سے تمہارے لیے یہ قطعی ممنوعہ علاقہ ہو گا۔“

ڈاکٹر بٹ نے ہمدانی سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ ”اس طرح کام نہیں چلے گا۔ ہمیں خانہ پری کے لیے تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“

مہر سلیمان اب تک خاموش کھڑا تھا۔ وہ کسی قدر بیزاری سے بولا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج کا پروگرام کینسل کر دیا جائے؟“

ڈاکٹر بٹ نے فوراً صفائی پیش کی۔ ”میرا ہرگز یہ مطلب نہیں۔“ اپنی بات کہتے کہتے وہ ٹھٹکا۔ ”مگر تم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ معاملہ بہت سیریس ہے اور بات اوپر تک پہنچ چکی ہے۔ میں خود جا کر فون پر اسپتال سے کنٹیکٹ کرتا ہوں اور ڈیوٹی انچارج کو ہدایت دیتا ہوں کہ وہ میڈیکل ٹیم لے کر جائے حادثہ پر پہنچ جائے۔“ اس نے سلیمان کی طرف نظریں اٹھائیں۔ ”سلیمان پروگرام ختم کرنے کی بجائے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اسے تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کر دیا جائے؟“

”پروگرام تو ڈلے کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ سوچ لو‘ تمہاری خانہ پری کی کارروائی سے کوئی پھڈا نہ ہو جائے۔“ ایس پی مرزا نے خبردار کیا۔

”نہیں‘ ایسا نہیں ہو گا۔“ بٹ نے بہت اعتماد سے کہا۔ ”میں پوری احتیاط سے کام لوں گا۔ ڈیوٹی انچارج میرے اعتبار کا ڈاکٹر ہے۔ اس کا ایک کیس بھی میرے پاس دبا ہوا ہے۔“ اس نے چوہدری نواز کی جانب رخ کیا۔ ”نواز! تمہیں بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ تم ٹیلی فون پر فوراً لاہور سے کنٹیکٹ کرو۔ کسی ریلوے افسر کی ڈیوٹی لگاؤ کہ وہ ایک ریلیف ٹرین لے کر فوراً حادثے کی جگہ پہنچ جائے۔ اگر اتنا کام ہو جائے تو سمجھ لو‘ نہ صرف ہم دونوں کی بلکہ سب کی ذمہ داری پوری ہو گئی۔“

نواز بھنڈر نے ڈاکٹر بٹ کی تجویز سے اتفاق کیا۔

ہمدانی بھی رضامند ہو گیا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر پروگرام زیادہ ڈلے نہیں ہو سکتا۔“

سائرہ نے مسکرا کر کہا۔ ”میرا خیال ہے‘ یہ ٹھیک ہے۔“ اس نے ڈاکٹر بٹ اور نواز کی طرف دیکھا۔ ”اب آپ دونوں دیر نہ کیجئے۔ جلدی سے یہ کام نمٹا کر آ جائیے۔“

ڈاکٹر بٹ اور نواز اپنی نشستوں سے اٹھے اور سکھیرا کے ہمراہ ہال سے چلے گئے۔ سلیمان اب تک کھڑا تھا۔ وہ بیٹھ گیا۔ اس کے برابر شیخ حمید نگوں بیٹھا تھا۔ وہ بالکل گم صم تھا۔ ریلوے کا حادثہ سرے سے اس کا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ وہ بار بار دزدیدہ نگاہوں سے سلیمان کی بیوی راحیلہ کو دیکھ رہا تھا۔ راحیلہ کی سفید بنارسی ساڑھی کا پلو ڈھلک کر نیچے گر گیا تھا اور وہ نہایت اشتعال انگیز انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے سگریٹ کے کش لگا رہی تھی۔

ہمدانی خمار آلود نظروں سے امینہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور امینہ کا شوہر مسعود خاموش بیٹھا آہستہ آہستہ پائپ کے کش لے رہا تھا۔ وہ سب سے الگ تھلگ اور قطعی بے نیاز نظر آرہا تھا۔

ماہ رخ نے چند لمحوں بعد خاموشی توڑی اور مسعود کو مخاطب کیا۔ "مسعود صاحب! آپ تو ایسے بے نیاز لگ رہے ہیں، جیسے حادثے کا آپ پر کوئی ری ایکشن نہیں ہوا؟"

مسعود نے ماہ رخ کو نظر بھر کر دیکھا اور ایش ٹرے میں پائپ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا۔ "میں سوچ رہا تھا، کون سی ایسی قیامت آگئی۔ گیارہ افراد ہی تو ہلاک ہوئے ہیں۔ کچھ اسپتال جاتے جاتے یا اسپتال پہنچ کر مر جائیں گے۔"

نوشابہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ آپ کو اتنا کیلس اور بے حس نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کا تعلق تو محکمہ آباد کاری سے ہے۔"

مسعود مسکرا کر بولا۔ "نوشابہ! تم میری نفسیات نہیں سمجھ سکتیں۔ میں برسوں مشرقی بنگال میں رہا ہوں۔ وہاں ہر سال قحط، سیلاب اور سائیکلون سے ہزاروں افراد مر جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جتنے لوگ ہر سال مر جاتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ موت اور زندگی کا کھیل ہے۔ ایک جاتا ہے، دوسرا آجاتا ہے۔" اس کے چہرے پر فلسفیانہ سنجیدگی چھا گئی۔ "اس طرح بنگالیوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ کسی حد تک خودبخود حل ہوتا جا رہا ہے۔"

مہر سلیمان نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "آبادی میں اضافہ صرف مشرقی بنگال کا نہیں، اس صوبے کا بھی مسئلہ ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو یہ انٹرنیشنل مسئلہ ہے۔ میں نے پچھلے دنوں عالمی ادارہ صحت کی ایک رپورٹ دیکھی تھی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ صدی کے آخر تک دنیا کی آبادی اتنی بڑھ جائے گی کہ شدید غذائی بحران پیدا ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ سمندر کی غذا پر بھی انحصار کرنا پڑے گا۔ اس کے لیے ابھی سے کوششیں شروع کر دی گئی ہیں۔"

مسعود نے ہنس کر کہا۔ "سلیمان! تم آج کی بات کر رہے ہو۔ مالتھس نے تو اٹھارویں صدی کے آخر میں دنیا کو اس خطرے سے خبردار کر دیا تھا۔ وہ تھا تو پادری مگر انگریز تھا اور اکنامسٹ بھی تھا۔ اس نے بڑھتی ہوئی انسانی آبادی اور اس کے لیے ناکافی پیداوار کے پیش نظر جنگیں، وبائی امراض اور ناگہانی آفات ناگزیر قرار دی تھیں۔ آبادی ہر قیمت پر کم کرنے پر زور دیا تھا۔ اس کے یہ خیالات مالتھزم کے نام سے مشہور ہوئے اور آج اس نظریے کی بنیاد پر بڑھتی ہوئی آبادی پر کنٹرول

کرنے کے لیے نہایت سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے۔" اس نے پائپ میں تازہ تمباکو بھری اور اسے سلگا کر کش لگایا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ حادثات سے زیادہ ہمیں بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلے پر غور کرنا چاہیے۔ خصوصاً خواتین کو اس مسئلے پر اور زیادہ سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔" مسعود کی باتیں سب خاموشی سے سنتے رہے۔ اس نے بات ختم کی تو ہال پر ایک بار پھر سکوت طاری ہو گیا۔

لالی گم صم بیٹھا، حیرت سے ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کس قسم کی باتیں ہیں؟

☆

ڈاکٹر بٹ اور نواز بھنڈر ہال میں داخل ہوئے۔ دونوں تھکے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ڈاکٹر بٹ نے بیٹھتے ہی کہا۔ "حد ہو گئی ہے بے پروائی کی۔ اسپتال میں ایک بھی ڈاکٹر موجود نہیں۔"

مرزا نے ہنس کر کہا۔ "آج ہفتے کی رات ہے۔ نرسوں کے ساتھ کہیں ٹھرک لگا رہے ہوں گے۔"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" ڈاکٹر بٹ نے جواب دیا۔ "بہت مشکل سے ایک ڈاکٹر کو تلاش کیا۔ اسے میں نے ایک میڈیکل ٹیم جائے حادثہ پر لے جانے کی ہدایت بھی کر دی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ صرف ایک ایمبولینس ہے۔ وہ بھی پرانی اور بوسیدہ۔ ہفتے بھر سے مرمت کے لیے لاہور کے کسی آٹو ورکشاپ میں پڑی ہے۔ میں نے حکم دیا، کوئی ٹرانسپورٹ نہیں ہے تو بس اور ٹرک ہی کا بندوبست کر کے چلے جاؤ۔ بہرحال میں جو کر سکتا تھا، وہ میں نے کر دیا۔"

مسعود نے کہا۔ "تم نے تو خانہ پری کر دی۔ چلو، یہ بھی ٹھیک رہا۔" وہ نواز بھنڈر سے مخاطب ہوا۔ "تم پر کیا بیتی؟"

نواز نے بتایا۔ "لہور کی لائن بے حد خراب تھی۔ فون پر کنیکٹ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح کنیکٹ ہوا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ریلیف ٹرین روانہ کرنے کے انتظامات ہو رہے ہیں۔" اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ "مگر حادثہ بہت سنگین ہے۔ مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ زخمی بھی بہت ہیں۔ نہ معلوم، کتنی لاشیں اور زخمی ٹوٹے پھوٹے ڈبوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور ابھی تک ریلیف کا کوئی کام شروع نہیں ہوا۔" پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ ہر شخص خاموش اور نڈھال نظر آرہا تھا۔ ہال میں سب کے داخل ہوتے وقت فضا میں جو گہما گہمی اور شوریدہ سری تھی، اب غبار آلود ہو چکی تھی۔

مگر یہ بوجھل سکوت زیادہ دیر طاری نہ رہا۔ ہمدانی دیر سے چپ بیٹھا تھا، اس نے اچانک زور کا

قہقہہ لگایا اور اونچی آواز سے بولا۔ ”یارو! یہ یبوست ختم کرو۔ جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے۔“

ہر طرف سے ہلکے ہلکے قہقہے پھوٹنے لگے، جسم لہکنے لگے، لب چہکنے لگے، آنکھیں بولنے لگیں، دھواں دھواں محفل میں چکاچوند پیدا ہو گئی۔ سلیمان نے کھڑے ہو کر اونچی آواز سے نعرہ بلند کیا۔ ”سپنس سپنس۔“

سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور راہداریوں سے گزرتے ہوئے دوسرے ہال میں پہنچ گئے۔ یہ ہال بھی خاصا وسیع تھا۔ مگر روشنی برائے نام تھی۔ ہال کے وسط میں خاصی بڑی میز تھی اس پر چاندی کا خوشنما شمع دان رکھا تھا۔ شمع دان میں شمع روشن تھی۔ ہال میں اس شمع کے سوا کوئی روشنی نہیں تھی۔

نشستوں کی ترتیب اس طرح تھی کہ میز کے دائیں طرف عورتیں اور بائیں طرف مردوں کے لیے صوفے رکھے تھے۔ ہال میں داخل ہو کر عورتیں اور مرد اپنی اپنی نشستوں پر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ہال کے دونوں بازوؤں میں روشنی اس قدر کم تھی کہ چہرے سایوں کی مانند دھندلے دھندلے نظر آتے تھے۔ سلیمان نے لالی کو بڑی میز کے پاس اونچی کرسی پر بٹھا دیا۔

ہال میں چھائے ہوئے گہرے سکوت اور دھیمی روشنی نے ماحول پر اسرار بنا دیا تھا۔ لالی سخت پریشان ہوا۔ وہ گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ اس کے سامنے میز پر اخروٹ کی لکڑی کی تین منقش صندوقچیاں رکھی تھیں۔ بیچ کی صندوقچی ذرا بڑی اور اونچی تھی۔ ہر صندوقچی میں روپے کے برابر گول گول ٹوکن پڑے تھے۔ دائیں صندوقچی میں جو ٹوکن تھے، ان پر عورتوں کے نام اور بائیں صندوقچی کے ٹوکنوں پر مردوں کے نام جلی حروف میں لکھے تھے۔ دونوں صندوقچیوں میں سات سات ٹوکن تھے۔ البتہ درمیان کی صندوقچی میں دس ٹوکن تھے۔ ان پر ایک سے دس تک نمبر درج تھے۔ صندوقچیاں کوئی پون فٹ اونچی اور اسی قدر چوڑی تھیں۔ تینوں صندوقچیاں بند تھیں۔ مگر ہر ایک کے اوپر اتنا بڑا ڈھکنا تھا کہ صرف ایک ہاتھ آسانی سے اندر جا سکتا تھا۔ صندوقچیوں کی قطار کے پیچھے لکڑی کا مختصر ریک تھا۔ اس میں بارہ خانے تھے، چھے اوپر اور چھے نیچے۔ خانوں پر ایک سے دس تک نمبر درج تھے۔ اوپر نیچے دو خانے ایسے بھی تھے جن پر کوئی نمبر نہیں تھا۔ سب خانے بالکل خالی تھے۔ ریک کے خانوں کا رخ لالی کی جانب تھا۔ پچھلا حصہ اس طرح بند تھا کہ خانے صرف سامنے بیٹھا ہوا امپائر دیکھ سکتا تھا۔

لالی نے قاعدے کے مطابق ہر صندوقچی کھولی، ٹوکن گنے، ان پر لکھے ہوئے نام اور نمبر پڑھے

اور جانچ پڑتال کے بعد سب ڈھکنے بند کر دیے۔ اس نے سامنے دیوار پر لگا ہوا کلاک دیکھا۔ گیارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا بار بار کلاک دیکھتا رہا۔ اور بھی بہت سی نگاہیں بے چینی سے کلاک کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

کلاک نے ٹن ٹن گیارہ بجائے۔ دلوں کی دھڑکنیں اچانک تیز ہو گئیں۔ ہال کے سکوت میں گہری سانسوں کی سرسراہٹیں ابھرنے لگیں۔ لالی کا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے قرعہ اندازی کا آغاز کیا۔ کپکپاتے ہاتھ سے دائیں جانب کی صندوقچی کا بالائی ڈھکنا اٹھایا۔ اپنا دایاں ہاتھ اندر ڈال کے ایک ٹوکن نکالا۔ شمع کی روشنی میں اسے پڑھا۔ اس پر ماہ رخ کا نام درج تھا۔ لالی نے اونچی آواز سے پکارا۔ ”ماہ رخ!“ اس نے ٹوکن، ریک کے اوپر والے بے نمبر خانے میں رکھ دیا۔

ماہ رخ اپنی نشست سے اٹھی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لالی کے قریب آئی اور میز کے پاس عین اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ لالی نے درمیان کی صندوقچی کا ڈھکنا کھولا۔ ماہ رخ نے اس کے اندر ہاتھ ڈالا۔ ٹوکن نکال کر لالی کو دیا۔ لالی نے اسے پڑھا۔ اس پر پانچ کا ہندسہ درج تھا۔ لالی نے ٹوکن ماہ رخ کو دکھایا اور اسے ریک کے نچلے بے نمبر خانے میں رکھ دیا۔ وہ اٹھا اور ماہ رخ کے ہمراہ ہال سے چلا گیا۔

دونوں سیڑھیاں طے کر کے بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ لالی آگے چل رہا تھا۔ ماہ رخ اس کے پیچھے تھی۔ دونوں بالکل خاموش تھے۔ لالی کمرہ نمبر۵ پر پہنچا۔ کمرہ بند تھا۔ دروازے میں لگی ہوئی کنجی سے اس نے تالا کھولا اور پلٹ کر دیکھا۔ ماہ رخ اس کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ باریک کرتے کے پیچھے سے اس کا گورا گورا سینہ جھلک رہا تھا۔ لالی نے اپنے جسم میں ہلکی سی جھرجھری محسوس کی۔ اس نے دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔

ماہ رخ نے کمرے میں داخل ہوتے وقت لالی کی جانب دیکھا، مسکرائی اور آہستہ سے کہا۔ ”شکریہ!“ لالی نے دروازہ بند کیا۔ تالا لگایا اور کنجی ہاتھ میں لے کر ہال میں واپس آ گیا۔ اپنی نشست پر بیٹھ کر اس نے کنجی ریک کے نمبر۵ خانے میں رکھ دی۔ دائیں طرف رکھی ہوئی صندوقچی میں اس نے پھر ہاتھ ڈال کے ٹوکن نکالا۔ اس پر مہ جبیں کا نام درج تھا۔ لالی نے مہ جبیں کا نام پکارا۔ وہ میز کے نزدیک پہنچی۔ بیچ میں رکھی ہوئی صندوقچی کے کھلے ہوئے ڈھکنے کے اندر ہاتھ ڈالا۔ ٹوکن پر نمبر۷ درج تھا۔ لالی نے نام اور نمبر کے ٹوکن ریک کے خانوں میں رکھے اور مہ جبیں کو کمرہ نمبر۷ میں پہنچا کر تالا لگا دیا۔ واپسی پر اس نے کنجی، نمبر۷ کے خانے میں رکھ دی۔ ماہ رخ کی طرح مہ

جبیں سے بھی لالی کی کوئی بات نہیں ہوئی۔

قرعہ اندازی میں نوشابہ کا نمبر ۱۰ نکلا۔ لالی اس کے ساتھ ہال سے نکلا۔ دونوں نے زینہ طے کیا اور بالائی منزل پر پہنچ کر غلام گردش میں چلے گئے۔ ایک محراب کے قریب نوشابہ نے رک کر لالی کو خبردار کیا۔ "سنو، کہیں خیر خواہی جتانے کے لیے ہمدانی کو یہ نہ بتا دینا کہ میں کس کمرے میں رہی اور نہ یہ بتانا کہ میرا کمرہ کیسے الاٹ ہوا۔"

لالی کو اس کی یہ بدگمانی ناگوار گزری۔ "کیا سمرا صاحب سے بھی یہی بات کہی تھی؟"

"نہیں۔" نوشابہ نے کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا۔ "تم سمرا صاحب نہیں ہو۔ وہ ذمے دار اور قابل اعتماد شخص ہیں۔ سیشن جج رہ چکے ہیں اور تم جیل سے بھاگے ہوئے قیدی ہو، عادی مجرم ہو۔"

لالی امپائری کی ترنگ میں تھا، وہسکی کے نشے نے بھی اثر دکھایا، بے رخی سے بولا۔ "جب یہ پتہ تھا، میں عادی مجرم ہوں تو......"

نوشابہ نے اس کی بات کاٹ کر ترشی سے کہا۔ "تمہارا اس طرح بات کرنے کا انداز مجھے بالکل پسند نہیں۔"

"بی بی جی! میں نے ہاتھ تو نہیں جوڑے تھے کہ مجھے امپائر بناؤ۔ میں تو خود اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔" لالی کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔

"یہ میرا نہیں، ہمدانی اور سلیمان کا فیصلہ تھا۔"

"خصم کا اتنا ہی ڈر تھا تو یہاں آئی کیوں؟" لالی اور زیادہ بے باک ہوگیا۔ "اس وکھت تو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر خوب بن ٹھن کر چلی آئیں اور اب۔"

نوشابہ نے لالی کو پوری بات نہیں کہنے دی، تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

لالی اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ڈر گیا۔ اسے فوراً احساس ہوا کہ وہ ڈپٹی کمشنر کی بیوی ہے۔ نرم لہجے میں بولا۔ "میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں، ساب کو پتہ چل گیا تو کیا ہوگا؟ وہ سب ہی کچھ جانتے ہیں۔ سب کچھ ان کے سامنے ہی ہو رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" نوشابہ کا لہجہ بھی نرم پڑ گیا۔ "مگر یہاں سے جانے کے بعد ہم ساری باتیں بھول جاتے ہیں۔ کبھی اس کے بارے میں بات نہیں کرتے۔"

دونوں کمرہ نمبر ۱۰ کے قریب کی محراب کے نیچے کھڑے تھے۔ محراب کے کونے میں سیاہ مجسمہ نصب تھا۔ مجسمے میں ایک صحت مند اور جوان عورت کو ایک مرد کی آغوش میں دکھایا گیا تھا۔ عورت مرد کا سہارا لیے لیٹی تھی۔ مرد کی گردن جھکی ہوئی تھی وہ عورت کی جانب دیکھ رہا تھا۔

عورت کی نظریں بھی اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے اور دونوں بالکل برہنہ تھے۔ لالی نے مجسمے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ سب چکر کیا ہے؟"

"کوئی چکر دکر نہیں۔" نوشابہ نے رسان سے کہا۔ "دیکھو نا، یہ کتنا اجاڑ علاقہ ہے۔ ایک زمانے میں تو سرکاری افسر اسے کالا پانی کہتے تھے۔ اب تو ویسے حالات نہیں رہے۔ پھر بھی کوئی سوشل لائف نہیں۔ ویرانے میں الگ تھلگ پڑے ہیں۔ تمہیں کیا پتہ، یہاں دل کتنا گھبراتا ہے۔" وہ زیرِ لب مسکرائی۔ "مہینے میں ایک رات سب کچھ بھول بھال کر ذرا دل بہلا لیتے ہیں۔"

لالی بھی مسکرانے لگا۔ "دل بہلانے کی ترکیب بہت چنگی نکالی ہے۔"

"یہاں کوئی مرد کسی کا شوہر اور کوئی عورت کسی کی بیوی نہیں ہوتی، صرف رات بھر کے لیے۔" نوشابہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "جب ایک سا کھانا کھاتے کھاتے اور ایک سا لباس پہنتے پہنتے طبیعت اکتا سکتی ہے تو ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت کے ساتھ رہتے رہتے بھی طبیعت اکتا سکتی ہے۔" وہ کچھ ٹھہری۔ "چھپ کر گناہ کرنے سے کیا یہ اچھا نہیں کہ گناہ، زندگی کی ایک ضرورت سمجھ کر کیا جائے۔ اس میں کتنا رومانس ہے، کتنا مزا ہے۔"

"وہ تو جی ضرور ہے۔ مجھے بھی بہت مزا آ رہا ہے۔" لالی چند لمحے خاموش رہا۔ "پر ساب یہ بات کیسے برداشت کر لیتے ہیں؟ بعد میں جھگڑا انتا نہیں ہوتا؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔" نوشابہ نے بے نیازی سے کہا۔ "تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔ ہر ایسی رات کے بعد ہمارے درمیان محبت کم ہونے کے بجائے بڑھ جاتی ہے۔ سچ کہتی ہوں، میرا تجربہ یہی ہے۔ کلب کی دوسری ممبر عورتوں کا بھی یہی خیال ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو یہاں آتی کیوں؟ تم نے دیکھا نہیں، خوشی سے کیسی چہک رہی ہیں؟"

"کچھ سمجھ نہیں آتی جی۔" لالی نے رسان سے کہا۔ "دیر ہو رہی ہے۔ چلو، میں تمہیں کمرے تک پہنچا دوں۔" وہ آگے بڑھا۔ کمرے کا تالا کھولا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ نوشابہ کمرے میں داخل ہونے لگی تو لالی بولا۔ "اطمینان رکھو۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ اور ساب کو تو پوچھنے پر بھی ایک لفظ نہیں بتاؤں گا۔ بلکہ کسی کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔" لالی نے بڑا اور جذبے سے اسے یقین دلایا۔ "مرد آدمی ہوں۔ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ جو کہوں گا پورا کروں گا۔"

نوشابہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی اور آہستہ سے بولی۔ "شکریہ۔"

لالی نے دروازہ بند کیا' تالا لگایا اور کنجی ہاتھ میں دبا کر تیز تیز قدموں سے واپس ہوا۔ ہال میں پہنچا تو وہ گھبرایا ہوا تھا۔ سب اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ لالی اپنی کرسی پر بیٹھا' چند لمحے خاموش رہا پھر کسی طرف دیکھے بغیر اس نے صفائی پیش کرنے کے انداز میں اونچی آواز سے کہا۔

"معاف کرنا جی! تالے میں کچھ گڑبڑ تھی' اسے کھولنے میں دیر ہو گئی۔"

اندھیرے میں مہر سلیمان کی آواز ابھری۔ "کوئی بات نہیں' آپ امپائر ہیں جی! آپ کو کوئی معذرت شا زرت کرنے کی ضرورت نہیں۔"

لالی چپ چاپ صندوقچیوں سے عورتوں کے نام اور نمبر نکالنے لگا۔ راحیلہ کا نمبر آٹھ' فاخرہ کا ۶' امینہ کا ۲ اور سائرہ کا ۴ نکلا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ باری باری بالائی منزل پر گیا۔ دروازہ کھولا ہر ایک کو تالا لگا کر کمرے میں بند کیا اور واپس آکر ہر کمرے کی کنجی اسی نمبر کے خانے میں رکھتا گیا۔ راستے میں کسی سے اس کی بات چیت نہیں ہوئی۔ وہ چپ چاپ جاتا اور خاموشی سے لوٹ آتا۔ البتہ امینہ کے ہم راہ جاتے ہوئے کئی بار اس پر وارفتگی طاری ہوئی۔ وہ نہایت ہیجان انگیز خوشبو لگائے ہوئے تھی۔ آنکھوں سے شراب کا نشہ جھلک رہا تھا۔ بدن کا ایک ایک عضو بولتا تھا' چھلکتا تھا۔ وہ تند و تیز شراب سے بھرا ہوا ایسا پیالہ تھی جس میں طوفان اٹھتے تھے۔

لالی' غلام گردش میں کچھ دور تک امینہ کے آگے آگے چلتا رہا پھر خود بخود اس کے قدم ست پڑ گئے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ چلتے چلتے امینہ ایک بار لڑکھڑائی۔ اس کی ساڑی کا آنچل ڈھلک کر نیچے گر گیا۔ دور تک نشیب میں کھلی ہوئی برہنہ پیٹھ لالی کے سامنے آگئی۔ لالی تڑپ اٹھا۔ اس نے جھٹ امینہ کا نرم بازو تھام لیا اور اس وارفتگی سے تھاما گویا اب چھوڑے گا نہیں۔ امینہ نے ٹھہر کر اپنا آنچل درست کیا۔ مدھ ماتی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ مسکرائی اور اپنا بازو چھڑانے کے لیے آہستہ سے کسمسائی۔

لالی نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا' جیسے وہسکی کا نشہ اچانک تیز ہو گیا۔ اس کے قدم بہکنے لگے۔

لالی نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ امینہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے نہ لالی سے کوئی بات کی' نہ اس کا شکریہ ادا کیا۔ صرف خمار آلود نظروں سے لالی کو دیکھا' مسکرائی اور کمرے میں چلی گئی۔ لالی نے گہری سانس بھری' دروازہ بند کیا' تالا لگایا اور پیتل کی تختی پر لکھا ہوا نمبر ذرا دیر تک ٹکٹکی باندھے تکتا رہا۔

کمرے کا نمبر ۲ تھا۔ اس کے بند دروازے کے پیچھے ایک دہکتا ہوا شعلہ فروزاں تھا جس سے لا

اپنی انگلیاں جھلسا چکا تھا۔ امینہ کو کمرے میں مقفل کر کے لالی لوٹا تو اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

☆

قرعہ اندازی کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ لالی نے تین خالی کمروں کے ٹوکن بے نمبر خانے میں رکھ دیئے۔ ان پر نمبر ۱' نمبر ۳ اور نمبر ۹ درج تھے۔ نمبروں کے باقی سات ٹوکن اس نے پھر درمیانی صندوقچی میں ڈال دیئے۔ اب ہال کا وہ حصہ بالکل خالی تھا جس میں خواتین کی نشستیں تھیں۔ ہال کے دوسرے حصے میں بھی خاموشی تھی' صرف گہری گہری سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس حصے میں مردوں کی نشستیں تھیں۔ ان کی بے قراری سوا نیزے پر تھی۔ وہ بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ کھنکار کھنکار کر گلے صاف کر رہے تھے۔ مگر کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ لالی نے نظریں اٹھا کر کلاک دیکھا۔ ساڑھے گیارہ بجنے میں دو منٹ باقی تھے۔ بارہ بجے تک قرعہ اندازی ختم ہو جانا چاہیئے تھی۔ اس کے پاس نصف گھنٹہ تھا۔ اتنے وقت میں پروگرام کے مطابق قرعہ اندازی اطمینان سے نمٹائی جا سکتی تھی۔

لالی خاموش بیٹھا مردوں کی بے چینی اور ذہنی کشمکش سے لطف اٹھاتا رہا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان کی بے قراری کا علاج صرف اس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ایسی لذت تھی جو اس سے پہلے کبھی اس نے محسوس نہیں کی تھی۔

ہال میں صرف ایک شمع روشن تھی۔ اس کی ہلکی ہلکی کافوری روشنی میں سات مرد گم صم بیٹھے تھے۔ ان میں بڑے سرکاری افسر بھی تھے' جو پورے ضلعے کے سیاہ سفید کے مالک تھے۔ ان کے سامنے بڑے بڑوں کے سر جھک جاتے تھے۔ مگر اس وقت وہ لالی کی نگاہ کرم کے منتظر تھے۔ لالی جیل سے بھاگا ہوا قیدی تھا' یہ بات ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو معلوم تھی اور ایس پی بھی جانتا تھا۔ مگر دونوں وقت جیل کی کوٹھریوں کے بجائے پلے ژر ہاؤس کے بند کمروں کے بارے میں سوچ رہے تھے اور یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ ان کی قسمت کی لاٹری میں کیا نکلتا ہے۔

آخر لالی نے بائیں ہاتھ کی صندوقچی کا ڈھکنا کھولا اور مقررہ قاعدے کے مطابق اپنا بایاں ہاتھ ور ڈال کر ایک ٹوکن نکالا۔ اسے پڑھا۔ ٹوکن پر چوہدری نواز بھنڈر کا نام درج تھا۔ لالی نے اونچی واز سے نام پکارا۔

واز اندھیرے سے نکلا اور لالی کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ لالی نے درمیانی صندوقچی کا ڈھکنا ٹھایا۔ مردوں کے لیے جو قاعدہ وضع کیا گیا تھا' اس کے مطابق اس دفعہ لالی نے ہاتھ اندر ڈال کے ن نکالا اور ہاتھ کی آڑ میں اس طرح پڑھا کہ میز کے سامنے کھڑا ہوا شخص اسے نہ دیکھ سکے۔

ٹوکن پر نمبر۷ لکھا تھا۔ لالی نے چوہدری نواز بھنڈر کو ٹوکن کا نمبر دکھایا، نمبر۷ کے خانے سے کنجی اٹھائی اور اسے دے دی۔ کنجی لیتے ہوئے نواز کے ہاتھ میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ لالی نے ٹوکن اسی نمبر کے خانے میں رکھ دیا اور نام کا ٹوکن بے نمبر خانے میں ڈال دیا۔ نواز کنجی لے کر ہال سے چلا گیا۔

لالی نے ایک بار پھر کلاک دیکھا۔ میز پر رکھی ہوئی چاندی کی طشتری سے سگریٹ اٹھا کر سلگائی اور آہستہ آہستہ کش لینے لگا۔ ہال میں سگریٹ پینے کی صرف اسی کو اجازت تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ پر اب چھے مرد بیٹھے تھے۔ وہ نہ بول رہے تھے نہ ہنس رہے تھے۔ لالی بھی خاموش تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ نواز بھنڈر اوپر پہنچ کر اس کی دی ہوئی کنجی سے کمرہ نمبر۷ کھولے اور اندر جا کر دروازہ بند کر لے۔ اس کے لیے تین منٹ مقرر تھے۔

تین منٹ بعد لالی نے دوسرا ٹوکن نکالا اور ڈاکٹر بٹ کو بلایا۔ بٹ آ گیا۔ لالی نے درمیانی صندوقچی سے ٹوکن نکالا اور ڈاکٹر بٹ سے چھپا کر پڑھا۔ اس پر نمبر۵ لکھا تھا۔ لیکن یہ اس کی بیوی ماہ رخ کے کمرے کا نمبر تھا۔ قاعدے کی رو سے یہ کمرہ اسے الاٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ لالی نے ٹوکن پلٹ کر میز پر رکھ دیا۔ ٹوکن کا دوسرا رخ بالکل سادہ تھا۔ لالی نے ڈاکٹر بٹ کی جانب دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میز پر رکھا ہوا ٹوکن کس عورت کے کمرے کا ہے۔ لالی نے پھر درمیانی صندوقچی میں ہاتھ ڈال کر ٹوکن نکالا۔ اس پر نمبر۴ لکھا تھا۔ یہ مرزا ابوالحسن کی بیوی سائرہ کے کمرے کا نمبر تھا۔ لالی نے ٹوکن ڈاکٹر بٹ کو دکھایا اور ریک کے خانے سے کمرہ نمبر۴ کی کنجی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ بٹ اپنی منزل کی جانب چلا گیا۔ لالی نے الٹا رکھا ہوا ٹوکن اٹھا کر پھر درمیانی صندوقچی میں ڈال دیا۔ دوسرے دونوں ٹوکن بھی نام اور نمبر کے خانوں میں رکھ دیے۔

لالی خوش تھا کہ ابھی تک کمرہ نمبر۲ کا ٹوکن نہیں نکلا۔ یہ امینہ کا نمبر تھا۔

ٹھیک تین منٹ بعد سلیمان آیا۔ ٹوکن نمبر۲ اس کے نام بھی نہیں نکلا۔ اس کے لیے نمبر۶ نکلا۔ یہ نواز بھنڈر کی بیوی فاخرہ کا نمبر تھا۔ سلیمان گیا تو ہمدانی آیا۔ اس کے آتے ہی لالی کے ذہن میں ٹوکن نمبر۲ سوالیہ نشان بن کر گردش کرنے لگا۔ لالی نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ڈپٹی کمشنر ہمدانی اس کے روبرو سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹ خشک تھے۔ چہرے کی رنگت اڑی اڑی تھی۔ آنکھوں سے بے قراری جھلک رہی تھی۔ لالی ٹھاٹ سے کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ ڈپٹی کمشنر اس کے سامنے اسی طرح کھڑا تھا جیسے عدالت میں ملزم گردن نیچی کیے بے قراری سے اپنے مقدمے کا فیصلہ سننے کے لیے کھڑا ہو۔ لالی کو معلوم تھا کہ ڈپٹی کمشنر کس کمرے کے الاٹمنٹ

کے لیے بے قرار ہے اور کس نمبر کا ٹوکن چاہتا ہے۔ وہ ٹوکن ابھی تک صندوقچی میں موجود بھی تھا۔

لالی نے درمیانی صندوقچی میں ہاتھ ڈالا۔ اس دفعہ اس کا دل بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ٹوکن نکال کے پڑھا۔ اس کی نظریں دھندلا گئیں۔ قسمت نے ڈپٹی کمشنر کا ساتھ نہیں دیا۔ یہ ٹوکن نمبر۸ تھا۔ یہ امینہ کا نہیں، راحیلہ کا نمبر تھا۔ راحیلہ کے چہرے پر نرمی سے زیادہ سرخی تھی، اس کی آواز بھاری تھی اور اپنی بھاری بھرکم آواز کے باعث وہ گونگوں کی طرح خاموش رہتی تھی۔ مردوں کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے سگریٹ کا دھواں اڑاتی تھی۔ اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں لالی کو دھیور، یاد آتا تھا۔ دھیور جو میاں حیات محمد ٹو کے بنگلے کا تنومند خواجہ سرا تھا اور اس کی زبان کٹی ہوئی تھی۔

لالی کو ایسا محسوس ہوا کہ میز کے سامنے ڈپٹی کمشنر ہمدانی نہیں، صرف ہمدانی کھڑا ہے اور اندھیرا بہت گہرا ہے۔ وہ لمحہ بھر تک ٹوکن تکتا رہا اور سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ آخر اس نے ٹوکن پلٹ کے رکھ دیا۔ اس نے صندوقچی سے نیا ٹوکن نکالا، مگر ہمدانی کی قسمت ہی کھوٹی تھی۔ یہ بھی کمرہ نمبر۲ کا نہیں، نمبر۱۰ کا ٹوکن تھا۔ اس میں امینہ نہیں، نوشابہ تھی۔ لالی الجھن میں پڑ گیا۔ یہ ٹوکن وہ پلٹ کر نہیں رکھ سکتا تھا، نہ قاعدے کی رو سے اس کمرے کی کنجی ہمدانی کو دے سکتا تھا۔ اسے جو کچھ کرنا تھا، فوراً کرنا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ پر تین مرد اندھیرے میں بیٹھے تھے۔ ان کی نظریں لالی کی جانب اٹھی تھیں۔ ان میں مرزا بھی تھا۔ وہ پولیس والا تھا۔ اس کی نگاہیں سب سے زیادہ تیز تھیں۔ لالی کے جرائم پیشہ ذہن نے اس مرحلے پر کام دکھایا۔ اس نے ٹوکن ہمدانی کے سامنے کیا اور کنجی خانے سے نکالنے کے لیے اتنا جھکا کہ اس کا چہرہ اندھیرے میں آ گیا۔ اس نے کنجی خانے سے ٹکرا کر ہولے سے آہٹ پیدا کی اور ساتھ ہی سرگوشی کی۔ "کمرہ نمبر۲۔" اس نے نمبر۲ کی کنجی نکال کے ہمدانی کے حوالے کر دی۔ کنجی لیتے ہوئے ہمدانی کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ اسے مسکراتا دیکھ کے لالی بھی خوش ہوا۔ ہمدانی کی دلی مراد بر آئی۔ وہ کمرہ نمبر۲ کی جانب روانہ ہو گیا۔

اب لالی ایک نئی الجھن میں پڑ گیا۔ کمرہ نمبر۲ کی کنجی ہمدانی کے پاس تھی اور اس نمبر کا ٹوکن صندوقچی میں تھا۔ طرفہ تماشا یہ کہ دو ٹوکن صندوقچی میں تھے اور دو باہر۔ مگر امیدوار صرف تین رہ گئے تھے۔ لالی چند لمحے خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس نے کمرہ نمبر۱۰ کا ٹوکن اسی نمبر کے خانے میں رکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مگر ٹوکن رکھا نہیں انگلیوں کے درمیان دبا لیا۔ اس نے میز پر الٹا رکھا

ہوا کمرہ نمبر ۸ کا ٹوکن نہایت صفائی سے اسی ہاتھ سے اٹھایا اور دونوں ٹوکن درمیانی صندوقچی میں ڈال دیے۔ ہمدانی کے بعد ایس پی مرزا کی باری آئی۔ ایس پی میز کے قریب آکر کھڑا ہوا تو لالی، امپائر سردار نور محمد خاں بزدار سے ایک دم مفرور قیدی بن گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایس پی کی جانب دیکھا۔ ایس پی اسے گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سختی تھی۔ لالی اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ اس نے گردن جھکا کر صندوقچی میں ہاتھ ڈالا۔ ساتھ ہی اسے یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ ٹوکن نمبر ۲ نہ نکل آئے۔

اس نے ٹوکن نکالا اور یہ سوچ کر زیادہ احتیاط سے پڑھا کہ اگر نمبر ۲ ہوا تو اسے پلٹ کر میز پر رکھ دے گا۔ مگر اسے خدشہ تھا کہ بار بار ٹوکن پلٹنے سے ایس پی کو شبہ بھی ہو سکتا ہے۔ لالی نے دھڑکتے دل سے دیکھا۔ ٹوکن نمبر ۲ نہیں، نمبر ۸ تھا۔ ایس پی خاموش کھڑا تھا اور مسلسل لالی کو گھور رہا تھا۔ لالی نے اسے ٹوکن کا نمبر دکھایا اور کمرہ نمبر ۸ کی کنجی اس کے سپرد کر دی۔ ایس پی کنجی لے کر ہال سے جانے لگا۔ لالی کے ہونٹوں پر تبسم آگیا۔ کرخت چہرے والے ایس پی کے حصے میں کمرہ نمبر ۸ آیا تھا۔ اس میں مسٹر سلیمان کی بیوی راحیلہ تھی۔

اب مسعود آیا۔ اس کے نام کمرہ نمبر ۲ کے بجائے نمبر ۵ آیا۔ لالی ایک بار پھر ٹوکن پلٹنے اور دوبارہ قرعہ اندازی کرنے کے جھنجٹ سے بچ گیا۔ سب سے آخر میں شیخ عبدالحمید مگوں آیا۔ وہ لالی کے لیے خاصا ٹیڑھا مسئلہ بن گیا۔ پیچیدگی یہ پیدا ہوئی کہ امیدوار ایک تھا اور صندوقچی میں ایک کے بجائے ٹوکن دو تھے، نمبر ۲ اور نمبر ۱۰۔ اگر نمبر ۱۰ نکل آتا تو کوئی گڑبڑ پیدا نہ ہوتی۔ وہ کمرہ نمبر ۱۰ کی کنجی اسے دے دیتا۔ لیکن ٹوکن نمبر ۲ نکلتا تو وہ اسے الٹا رکھ کر دوبارہ قرعہ اندازی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ نہ ہی وہ ٹوکن نمبر ۲ کی کنجی دے سکتا تھا۔ اس کے پاس تھی ہی نہیں۔ لالی نے جھٹ پینترا بدلا، مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔

"اب لاٹری شاٹری کیا نکالنی ہے جی! اپنے پاس صرف ایک چابی ہے اور اسی کا ٹوکن ڈبے میں پڑا ہے۔"

وہ کنجی خانے سے نکالنے کے لیے جھکا۔ حمید مگوں نے کچھ کہنا چاہا مگر لالی نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ کنجی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لو جی، یہ رہی نمبر ۱۰ کی چابی۔ جا کر تالا کھولو اور دیکھو تمہارے نصیب میں کون سی لگائی آئی ہے۔" وہ ذرا کھل کر مسکرایا۔ "پر اس کمرے کے تالے میں ذرا گڑبڑ ہے۔ ہوشیاری سے کھولنا، بہت دیر میں کھلتا ہے۔ یاد ہے نا، میں اوپر سے دیر میں لوٹا تھا۔ وہ اسی کمرے کے تالے کا چکر تھا۔"

حمید مگوں نے کنجی ہاتھ میں نہیں لی۔ "ایسی بات ہے جی تو یہ چابی اپنے ہی پاس رہنے دو۔ میرے ساتھ اوپر چل کر تالا کھول دو۔ مہربانی ہوگی۔ میں کہاں تالے کے ساتھ مغز ماری کروں گا۔"

کلاک نے ٹن ٹن بارہ بجائے۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ قرعہ اندازی کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ لالی نے حمید مگوں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ وہ حمید کے ساتھ ہال سے نکلا۔ دونوں زینے طے کر کے اوپر پہنچ گئے۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد شیخ حمید مگوں ٹھہر کر آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ لالی نے ہنس کر کہا۔ "سیٹھ حمید! تسیں تو ہانپنے بھی لگے۔ نمبر ۱۰ تو ابھی دور ہے۔" لالی نے کمرہ نمبر ۱۰ کی جانب دیکھا، وہ طویل غلام گردش کے دوسرے سرے پر تھا۔

"میں ادھر کے ۸ چکر لگا چکا ہوں۔ یہ نواں ہے۔"

حمید نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "میں ذرا دیر میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔" اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ لالی کی جانب ذرا سا جھکا، آہستہ سے پوچھا۔ "دس نمبر میں کون ہے جی؟"

"میں تو جی اتنا جانتا ہوں، اس میں تمہاری گھر والی نہیں ہے۔"

"اتنا تو میں نوں بھی پتہ ہے۔"

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ حمید بھی خاموش رہا۔ دونوں غلام گردش میں چلنے لگے۔ لالی نے چلتے چلتے کمرہ نمبر ۲ کو دیکھا۔ اس میں امینہ تھی جس کا انگ انگ چھلکتا تھا۔ مدھاتی آنکھیں شب خون مارتی تھیں۔ پیٹ ناف سے نیچے تک کھلا تھا، پیٹھ نشیب میں دور تک برہنہ تھی۔ امینہ اب ہمدانی کے پہلو میں تھی۔ اس کا شوہر محکمہ آبادکاری کا بڑا افسر تھا اور مالتھزم کے نظریے کی بنیاد پر آبادی کم کرنے کا فلسفہ بگھارتا تھا۔ وہ اس وقت کمرہ نمبر ۵ میں ڈاکٹر بٹ کی بیوی ماہ رخ کے ساتھ تھا۔ لالی نے گہری سانس بھری اور آگے بڑھتا گیا۔ حمید مگوں اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ توند سے پھسلتی ہوئی پتلون بار بار درست کر رہا تھا۔

لالی جس کمرے کے سامنے سے گزرتا، اس کے متعلق سوچتا کہ بند دروازے کے پیچھے کون کس کے ساتھ ہے۔ حمید نے چلتے چلتے ایک بار پھر سرگوشی کی۔

"یار! بتاؤ تو سہی، آج اپنے حصے میں کون آئی ہے؟"

لالی نے اس کی بات نظر انداز کر کے دریافت کیا۔ "سیٹھ حمید! تم بشیرے کو جانتے ہو؟"

"جانتا تو ہوں۔" حمید نے مشتبہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "پر یہ نہیں جانتا کہ وہ دھندا کیا کرتا ہے؟"

"میں جانتا ہوں۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ "وہ ڈریوروں کے ساتھ گھر سے بھاگنے والی کڑیاں برآمد کرنے کا دھندا کرتا ہے۔"

سیٹھ حمید مگوں اس کی بات سن کر بہت سٹ پٹایا۔ "کیا بشیرے نے تم کو یہ بات بھی بتائی تھی؟" اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "لگتا ہے، تم بھی پولیس میں رہ چکے ہو۔" اس نے کچھ رک کے کہا۔ "چلو، یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔" اس نے کوٹ کی جیب سے نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ نکالا اور اسے کھولتے ہوئے آنکھ ماری۔ "کچھ رشوت وشوت لے لو۔ یہ بتادو کہ کمرے میں کون ہے؟"

"ایس ویں گلاں نہ کرو۔ سیٹھ! جو بھی ہوگی، تمہارے جوڑ کی ہوگی۔"

مگر حمید باز نہ آیا، جلدی سے بولا۔ "بات یہ ہے جی۔ آج کی سسپنس نائٹ کے لیے میں بہت شاندار تحفہ لایا ہوں۔ ہوا یوں کہ سویرے ہی سویرے اپنے شاہ جی آگئے۔ بہت وڈے بزرگ ہیں۔ کیا بتاؤں، کیا تاثیر ہے ان کی زبان میں۔ سٹّے کا بھاؤ جب بھی بتایا، ٹھیک ہی نکلا۔ آئے تو دیر تک میرا متھا تکتے رہے۔ کہنے لگے، حمیدے! اج تین نوں کوئی بہت شاندار چیز ملنے والی ہے۔" وہ زیرلب مسکرایا۔ "اب میں یہی خوش خبری تم سے سننا چاہتا ہوں۔" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے چلتا رہا۔ حمید مگوں کو قرار نہ آیا۔

"اتنا تو بتادو راحیلہ چھائیلہ تو نہیں ہے؟"

"پتہ نہیں، وہ بھی ہو سکتی ہے۔" لالی نے اس دفعہ بھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ نمبر ۱۰ میں نوشابہ ہے۔ دل کش و دل آرا نوشابہ، جس کی جوانی کافوری شمع کے مانند دھیرے دھیرے پگھل رہی تھی۔ لالی نے نظریں موڑ کر حمید مگوں کو دیکھا۔ اس کا جسم خاصا بے ڈول تھا۔ ناک نقشہ بھی موٹا موٹا تھا۔ سر پر بال کم تھے۔ اندر سے جلد صاف نظر آتی تھی۔ لالی کو نوشابہ پر بڑا ترس آیا۔ وہ اس کے بارے میں سوچتا رہا اور خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔ آخر کمرہ نمبر ۱۰ آگیا۔ لالی نے کہا۔ "لو جی! تمہارا کمرہ آگیا۔" یہ کہتے ہوئے لالی کمرے کی جانب مڑا۔ لیکن حمید مگوں اس کے ساتھ نہیں بڑھا۔ وہ دروازے کے سامنے رکھے ہوئے نرم نرم صوفے پر بیٹھ گیا۔ لالی نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ حمید نے اشارے سے لالی کو اپنے قریب بلایا۔ لالی اس کے پاس چلا گیا۔ حمید نے کوٹ کی جیب سے چھوٹا سا خوش نما کنٹر نکالا، اس کا ڈھکنا کھولا، مسکرایا۔ آنکھ مار کے رنڈی بازوں کی طرح بولا۔ "ذرا گرم ہوجاؤں جی۔ تم دروازہ کھول کر دیکھو، اندر کون ہے۔" اس نے کنٹر منہ سے لگایا اور چند گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر کنٹر لالی کی طرف بڑھا دیا۔

"بزدار صاحب! تھوڑی سی تم بھی لگالو۔ بہت سپیشل چیز ہے۔"

لالی نے انکار نہیں کیا۔ کنٹر اس کے ہاتھ سے لیا اور غٹاغٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ بہت تیز شراب تھی۔ منہ کانوں تک جھن جھنا اٹھا۔ حلق جلنے لگا۔ لالی نے کنٹر شیخ حمید کو واپس کیا اور آگے بڑھ کے کمرے کے بند دروازے پر پہنچا۔ تالے میں کنجی ڈالی اور چند لمحے تک خواہ مخواہ اسے ادھر ادھر گھماتا رہا۔ آخر اس نے تالا کھول دیا۔ مڑ کر حمید کو دیکھا۔ حمید کھلا ہوا کنٹر ہاتھ میں دبائے اپنی گول گول آنکھوں سے لالی کو تک رہا تھا۔ لالی کو وہ بالکل الو کا پٹھا نظر آیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔ شیخ حمید مگوں نے بیل کی طرح گردن ہلا کر انتظار کرنے کی ہامی بھرلی۔

☆

لالی نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا، اندر گیا اور دروازہ بند کرلیا۔ آگے ایک اور پردہ پڑا تھا۔ لالی نے پردہ سرکا کے اندر جھانکا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں پیڈسٹل لیمپ روشن تھا۔ اس کے سرپوش سے گہری سرخ سرخ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ دروازوں کے پردے بھی سرخ تھے۔ فرش کا قالین بھی سرخ تھا۔ کمرے کی ہر چیز سرخ تھی یا لیمپ کی روشنی میں سرخ نظر آرہی تھی۔ وسط میں جدید طرز کی نہایت نفیس مسہری تھی۔ جھلکتے ہوئے اجلے اجلے بستر پر گلاب کے سرخ سرخ پھول بکھرے تھے۔ مسہری کے سرہانے موتے اور چنبیلی کے ہار جھول رہے تھے۔ کمرے میں ہر طرف بھینی بھینی خوشبو پھیلی تھی۔

لالی پردہ ہٹا کر کمرے کے اندر پہنچ گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے حجلہ عروسی میں آگیا ہو۔ مگر حجلہ عروسی سے دلہن غائب تھی۔ وہ ہکابکا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شیخ حمید مگوں کی "اسپیشل" آہستہ آہستہ رنگ دکھا رہی تھی۔ لالی کی نظروں میں سہانے خوابوں کے دھندلکے منڈلانے لگے۔ چند لمحوں بعد بغلی دروازہ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ نوشابہ دروازے سے مسکراتی ہوئی نکلی۔ اس کے گلے میں تازہ پھولوں کا گجرا تھا۔ ہاتھ میں بھی گجرا لٹک رہا تھا۔ اس کا تاب ناک گلابی چہرہ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ابھی ابھی میک اپ کیا ہے۔ آنکھوں میں گہرا کاجل، ہونٹوں پر سرخی، پشت پر مہکتا جوڑا، جوڑے میں موتے کی کلیوں کا ہار گندھا ہوا اور پیشانی پر قمقمے کے مانند بڑی سی جگمگاتی بندیا۔

وہ جنوبی ہند کے قدیم مندروں میں رقص کرنے والی دیوداسیوں جیسا لباس پہنے ہوئے تھی۔ سینے پر کلابتو کے جھلملاتے دائرے بناتی مختصر چولی تھی۔ ناف سے نیچے بندھی ہوئی زر بفت کی گہری نارنجی ساڑھی۔ ساڑھی کا ایک پلو لانگ لگا کر پیچھے اڑس لیا گیا تھا۔ دوسرا پلو پٹکے کی طرح آگے

جھول رہا تھا۔ اس لباس میں اس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے اوپر تک کھلی ہوئی تھیں۔ چولی کے سوا اوپر کا دھڑ بالکل برہنہ تھا۔ دونوں ہاتھ بھی برہنہ تھے۔ ان پر صرف پھولوں کے بازو بند تھے۔ کانوں میں چمپا کے اجلے اجلے پھول تھے۔ نوشابہ کی یہ سج دھج دیکھ کر لالی کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہوگئی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سانس تیز ہوگئی۔

لالی کو دیکھتے ہی نوشابہ کے ہونٹوں پر بکھری ہوئی مسکراہٹ بجھ گئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم؟ تم یہاں کیسے آگئے؟"

لالی مسکرانے لگا۔ "بس آگیا جی۔"

وہ غصے سے تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "کیا مطلب؟"

لالی مسکراتا رہا۔ "مطلب یہ کہ جی، یہ کمرہ مجھے الاٹ ہوگیا ہے۔"

"ہش؟" وہ جھنجلا کر بولی۔ "تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟"

"اس میں دماغ خراب ہونے کی کون سی بات ہے۔" اس نے نوشابہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈھٹائی سے کہا۔ "یہ امپائر کا فیصلہ ہے اور اتنا تو تمہیں جانتی ہی ہو کہ امپائر کے فیصلے کو کوئی چیلنج نہیں کرسکتا۔"

"بکواس بند کرو اور فوراً کمرے سے نکل جاؤ۔"

لالی ڈھیٹ بنا کھڑا رہا۔ وہ چند لمحوں تک اسے گھورتی رہی پھر اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تم چاہتے کیا ہو۔"

"چاہنا واہنا کیا ہے جی؟" لالی بچوں کی طرح مچل گیا۔ "یہ کمرہ مجھے کیوں الاٹ نہیں ہوسکتا؟" اس نے مسکرا کر نوشابہ کو چھیڑنے کے لیے جھوٹ بولا۔ "اپنی بھی گھر والی ہے، تین بچے ہیں۔ میرا مطلب ہے....."

وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "میں تمہارا مطلب خوب سمجھتی ہوں۔" اس نے سیدھی سیدھی دھمکی دی۔ "جیل جانا چاہتے ہو؟"

لالی مرعوب نہیں ہوا، اڑیل ٹٹو کی طرح اڑا رہا۔ "جیل تو جانا ہی ہے، پہلے بھی تین بار جاچکا ہوں۔ چوتھی بار تم بھجوا دو۔ چلو، اس دفعہ تمہارے نام پر جیل کاٹ لوں گا۔"

نوشابہ چند لمحے خاموش کھڑی رہی، پھر اس نے ذرا نرم لہجے میں لالی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "دیکھو، ضد مت کرو۔ اس کھیل میں تم شریک نہیں ہوسکتے۔ اس کا ایک مقررہ قاعدہ اور مقررہ قانون ہے۔"

لالی نے جل کر طنز کیا۔ "قاعدہ تو میں نے پوری طرح دیکھ لیا۔ رہ گیا کنون تو ساتھ والے کمروں میں کنون کے رکھوالے خود کنون کی ایسی تیسی کر رہے ہیں۔ آج اتفاق سے وہ نہیں ہیں جو کبھی انصاف کی ترازو میں کنون تولا کرتے تھے۔ اندھیرے ہال میں بیٹھ کر کنون کی ایسی تیسی کرنے والوں کے لیے لاٹری نکالتے تھے۔ غلط کہہ رہا ہوں؟"

نوشابہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا، دھیرے دھیرے مسہری کے قریب گئی اور سرہانے کی طرف پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا اور گردن کو ذرا سا خم دے کر بولی۔ "میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تمہیں یہاں آنے کی جرات کیسے ہوئی؟ تم... تم۔" اس نے غصے سے دانت پیسے، آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

لالی اس کا غصہ نظرانداز کرکے بولا۔ "میں اتنا بدصورت تو نہیں ہوں۔ یہاں مجھ سے بھی زیادہ بدصورت بندے موجود ہیں۔ ایک تو باہر ہی بیٹھا ہے۔"

"یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں۔ میں سب کو جانتی ہوں۔ انھیں منتخب کرنے والوں میں کلب کی دوسری ممبر عورتوں کے ساتھ میں بھی شریک تھی۔" اس کے لہجے میں ٹھہراؤ آگیا۔ "اگر سارے مرد اور ساری عورتیں خوبصورت ہی ہوتیں تو پھر قرعہ اندازی کیوں ہوتی؟ اس کھیل میں کوئی رومانس نہ ہوتا۔ کوئی بے قراری، کوئی سسپنس نہ ہوتا۔ مگر تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتے۔"

"سمجھنا چاہتا بھی نہیں۔"

نوشابہ نے اسے قہرآلود نظروں سے گھورا۔ "تم جاؤ گے نہیں یہاں سے؟"

شیخ حمید مگوں کی شراب دو آتشہ کا تند و تیز نشہ کام کرتا رہا۔ لالی اور بے باک ہوگیا۔ "ارادہ تو نہیں ہے۔ یہ لال لال روشنی، یہ مہکتے پھول، یہ بھینی بھینی خوشبو اور تم۔ تمہاری تو بات ہی کیا ہے۔ ایسے لشکارے مارتی البیلی کہاں نظر آتی ہے؟" اس کی آنکھیں اس طرح جھلملانے لگیں جیسے شیشہ ٹوٹ کر بکھر جائے۔ "یہاں آکر بھی کوئی واپس جاسکتا ہے۔" اس نے ہاتھ میں دبی ہوئی کنجی دکھاتے ہوئے کہا۔

"کمرے کی چابی تو اپنے ہی پاس ہے نا۔"

"تم سمجھتے ہو، میں یہاں اکیلی ہوں اور کمرے کا دروازہ بند ہے۔" نوشابہ نے غصے سے آنکھیں نکال کر خبردار کیا۔ "تم نرے احمق ہو، الو ہو۔" اس نے ہاتھ بڑھایا اور مسہری کے سرہانے لگا ہوا سوئچ دکھاتے ہوئے بولی۔ "یہ سوئچ دیکھ رہے ہو۔ اسے دباتے ہی خطرے کا الارم بجنے لگے گا۔ ذرا دیر میں کمرے کا دروازہ بھی ڈپلی کیٹ چابی سے کھل جائے گا۔ اور تم پکڑ لیے جاؤ گے۔ مگر تم جیل

نہیں جاؤ گے۔ یہ جو نیچے نہر بہہ رہی ہے، تمہاری لاش ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کے کنارے دبا دی جائے گی۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوگی کہ ایک مفرور قیدی کا کیا حشر ہوا۔ تم جانتے ہو، اس ضلعے کی حکومت ساتھ والے کمرے میں موجود ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو اس ضلعے کا سب سے بڑا حاکم ڈپٹی کمشنر ہے اور میں اس کی بیوی ہوں۔"

"وہ کیا کرے گا؟" لالی بدستور مسکراتا رہا۔ "وہ تو خود کسی دوسرے کی گھر والی کو لیے بیٹھا ہے۔ پر میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ وہ کون ہے۔"

"میں یہ بات تم سے پوچھنا بھی نہیں چاہتی۔" اس نے سوچ پر انگلی رکھ دی۔ "میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ دبا دوں یہ سوئچ؟ بولو، کیا کہتے ہو؟"

نشے کا زوردار ریلا آیا۔ لالی اس ریلے میں بہہ گیا۔ اس نے نشے سے جھوم کر نوشابہ کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "دبا دو۔ موت اسی طرح آنی ہے تو یوں ہی سہی۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ "پر ایک شرط ہے۔ تم اپنے سوہنے، سوہنے ہاتھوں سے میرے ٹوٹے کرنا۔ ہائے بھی نہیں کروں گا۔"

وہ جل کر بولی۔ "کم بخت! تو میرا عاشق کب سے بن گیا؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی گل ہے۔" لالی نے اس آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "یہ اتنا بہت سا سنگھار تم نے کس کے لیے کیا ہے۔ وہ میں کیوں نہیں ہو سکتا؟"

وہ آہستہ آہستہ نوشابہ کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے، چہرے پر وحشت طاری تھی۔ نوشابہ نے اسے آگے بڑھتے دیکھا تو زور سے ڈانٹا۔ "رک جاؤ۔" لالی اس کی ڈانٹ سن کر چونک پڑا، جھجک کر کھڑا ہو گیا۔ نوشابہ نے تلملا کر کہا۔ "کیا تم یہ چاہتے ہو میں یہ سنگھار نوچ کر پھینک دوں؟" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "لو یہ بھی دیکھ لو۔" اس نے گردن میں پڑا ہوا گجرا پکڑا اور غصے سے جھٹکا دے کر توڑ ڈالا۔ گجرے کے پھول دور تک بکھر گئے۔ نوشابہ نے فرش پر پڑے ہوئے پھول مسلتے ہوئے بازو بند کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

لالی یہ وار جھیل نہ سکا۔ گھبرا کے بولا۔ "نہ، نہ ایسا نہ کرو۔"

نوشابہ کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے خوں خوار نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "اگر تم یہ نہیں چاہتے تو فوراً کمرے سے نکل جاؤ۔"

"ناراض کیوں ہوتی ہو۔" اس دفعہ لالی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم کہتی ہو تو چلا جاؤں گا۔" وہ جھینپ کے مڑا۔ پھر ٹھٹکا۔ "جانے سے پہلے اتنا ضرور پوچھوں گا۔ کیا میں صرف اس لیے تمہارے اس ناٹک میں شریک نہیں ہو سکتا کہ میں چھوٹا اور غریب بندہ ہوں؟" اس کے چہرے پر

دکھ کا ہلکا سا سایہ پھیل گیا۔

"یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔" نوشابہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "مگر اور بھی بہت سی باتیں ہیں جنھیں تم نہیں جانتے۔" وہ ذرا رکی۔ "یوں سمجھ لو کہ یہ چند شادی شدہ مردوں اور عورتوں کا خفیہ کلب ہے۔ اس کا نام پولی نیسین کلب ہے۔"

"یہ کیا نام ہوا جی؟"

وہ بیزاری سے بولی۔ "کیا کرو گے جان کر۔ تم کبھی اس کلب کے ممبر نہیں بن سکتے۔"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں، پر جب بتایا ہے تو یہ گل بھی بتا دو۔"

نوشابہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ "پولی نیسین، جنوبی سمندروں کے علاقے پولی نیسیا کے باشندوں کو کہتے ہیں۔ ان میں مختلف قبائل ہیں۔ تقریباً تین سو پچاس جزیروں میں صدیوں سے آباد ہیں۔ ان جزیروں میں نیوزی لینڈ، ایسٹر آئی لینڈ، ہوائی اور تاہٹی بھی شامل ہیں۔ پولی نیسینوں کے نزدیک عورت اور مرد کے جنسی تعلقات ایسی ہی عام بات ہے جیسے کھانا کھانا، پانی پینا۔ کوئی بھی عورت، جب چاہے کسی بھی مرد سے تعلقات قائم کر سکتی ہے۔ شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی۔ گانے، رقص کرنے، تیراکی اور مچھلی کا شکار کرنے کی طرح وہ اسے بھی تفریح یا کھیل سمجھتے ہیں۔ بلکہ تاڑ اور ناریل کے کنج میں بعض عورتیں گھر بنا کر رہتی ہیں اور جو مرد انھیں پسند آجاتا ہے، اس کے ساتھ جب تک جی چاہتا ہے، رہتی ہیں۔ ایسے گھر پلیے ژر ہاؤس کہلاتے ہیں۔ مگر اب یہ باتیں رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہیں۔"

"وہاں ختم ہو رہی ہیں اور یہاں شروع ہو رہی ہیں۔"

"یہ بات نہیں۔" نوشابہ نے لالی کا طنز نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تم مہر سلیمان سے تو مل ہی چکے ہو۔ دوسری جنگ عظیم میں وہ رائل انڈین نیوی میں افسر تھے۔ جنگ کے دوران ان کا جہاز جاپانی ایئر فورس کے حملوں سے بھاگ کر جزائر مارکوئیس کے ساحلوں پر لنگر انداز ہو گیا تھا۔ یہ جزائر بھی پولینیسیا کا حصہ ہیں۔ سلیمان وہاں دو ہفتے تک پولی نیسین باشندوں کے ساتھ ٹھہرے رہے۔ سچ پوچھو تو یہ کلب انھوں نے ہی قائم کیا، اس کا نام پولی نیسین کلب اور اس عمارت کا نام پلیے ژر ہاؤس رکھا۔ شروع میں چار جوڑے اس کے ممبر تھے۔ اب آٹھ ہیں۔ انھیں سب نے مل کر منتخب کیا ہے۔ سبھی نے مل جل کر اس کلب کے اصول اور قاعدے بنائے ہیں۔ رازداری کا باقاعدہ حلف اٹھایا ہے۔" اس نے چند لمحے توقف کیا۔ "ویسے تو میزبان راحیلہ ہے مگر ہر ممبر پانچ سو روپے ماہوار چندہ دیتا ہے۔ ممبر شپ کی فیس دو ہزار روپے ہے۔ وہ ماہانہ چندے سے الگ ہے۔ یہ جشن

جسے نائٹ آف دی گریٹ سپنس کہا جاتا ہے' مہینے میں صرف ایک رات منایا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ مقرر ہوتی ہے اور پہلے سے باقاعدہ تیاریاں کی جاتی ہیں۔"

لالی خاموش کھڑا نوشابہ کی باتیں سنتا رہا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولتی رہی۔ "اس رات کے لیے ہر عورت اپنی پسند کا لباس منتخب کرتی ہے۔ ایسا لباس ہر کمرے کے ڈریسنگ روم میں موجود رہتا ہے۔ اگر پہلے سے کاسٹیوم اسٹور میں نہیں ہوتا تو مہیا کردیا جاتا ہے۔ ہار پھول اور سنگھار کا سارا سامان بھی یہاں موجود رہتا ہے۔ آج کی رات ہر عورت یہاں نئے سرے سے دلہن بنتی ہے۔" نوشابہ نے ہاتھ اٹھا کر ادھر ادھر لہرایا۔

"دیکھ رہے ہو' یہ سب کیا ہے۔ کیا تمہیں یہ پہلی رات کی دلہن کا کمرہ نہیں نظر آتا۔ ویسے آج کی رات عام طور پر عورتیں پولی نیسین لباس پہنتی ہیں۔ یہ لباس باریک جھالر نما ہوتا ہے اور کمر سے گھٹنوں تک ہوتا ہے۔ سینہ بالکل کھلا ہوتا ہے۔ مگر میں نے اپنے لیے آج مختلف لباس چنا تھا۔" وہ کسی قدر افسردہ ہوگئی' دل گرفتہ ہو کر بولی۔ "تم بڑے سنگدل ہو۔ تم نے آج کی رات کا سارا حسن' سارا سہاگ اجاڑ دیا۔ میری ساری امنگیں' سارے ولولے خاک میں ملا دیے۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میری خوشیاں چھین کر تمہیں کیا ملا؟"

لالی اس کی باتوں سے متاثر ہو کر صفائی پیش کرنے لگا۔ "بات یہ ہے جی! مجھے تم پر بڑا ترس آیا۔ تسیں اتنی سوہنی ہو' اتنی کہ میں کیا بتاؤں اور وہ.....وہ۔"

نوشابہ اس کی بات کاٹ کر بے رخی سے بولی۔ "وہ کوئی بھی ہے' اسے یہاں بھیج دو اور خدا کے لیے مجھ پر مزید ترس نہ کھاؤ۔"

لالی چپ چاپ دروازہ کھول کر کمرے سے چلا گیا۔ شیخ حمید مگوں صوفے پر پریشان بیٹھا تھا۔ لالی کو دیکھتے ہی تیکھے لہجے میں بولا۔ "بہت دیر لگا دی جی؟"

"وہ ڈریسنگ روم میں بناؤ سنگھار کر رہی تھی۔ بہت دیر بعد نکلی۔"

"اوہ' یہ بات ہے۔ ٹھیک کہہ رہے ہو جی تم۔ کبھی کبھی تو سنگھار کرنے میں یہ زنانیاں گھنٹہ گھنٹہ بھر لگا دیتی ہیں۔" حمید مگوں کھڑا ہوگیا اور کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے آنکھ مار کر بولا۔ "بزدار صاحب' اب تو بتا دو' اندر کون ہے؟"

لالی نے نظر بھر کر اس کا چہرہ دیکھا' پھر جذباتی ہوگیا۔ "سیٹھ حمید! تو سچ مچ کسمت کا دھنی ہے۔ مٹی کو ہاتھ لگا دے تو سونا بن جائے۔ تو کیوں گھبراتا ہے۔ تیری کسمت تو جاگ رہی ہے۔ جا' اندر جا کر دیکھ لے۔ دروازہ کھلا ہے۔ تجھے کوئی روکنے والا نہیں۔"

حمید مگوں بدحواس ہوگیا۔ شراب کا خالی کنٹر لالی کے ہاتھ میں تھما کے تیزی سے آگے بڑھا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

لالی خواب ناک نظروں سے چپ چاپ دروازہ تکتا رہا۔ چند لمحوں بعد دروازہ آہستہ سے بند ہوگیا۔ لالی نے گہری سانس بھری اور نڈھال ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ گم صم بیٹھا رہا۔ اس نے خالی کنٹر اپنے ہاتھ میں دیکھا۔ سخت تاؤ آیا۔ جی چاہا کہ شیشے کا کنٹر کمرے کے دروازے پر زور سے دے مارے اور وہ چھناکے کے ساتھ ٹوٹ کر بکھر جائے۔ مگر لالی ایسا نہ کر سکا۔ کنٹر صوفے پر ایک طرف رکھ کے اٹھا اور آہستہ آہستہ زینے کی طرف بڑھنے لگا۔ غلام گردش کا نصف سے زیادہ راستہ طے کیا۔ پھر کچھ سوچ کر لوٹ آیا۔

کمرہ نمبر ۱۰ کی کنجی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے کمرے کے قریب پہنچ کر تالا کھولا اور دروازے کا ایک پٹ آہستہ سے سرکا کر اندر چلا گیا۔ پردہ ہٹا کے سامنے نظر ڈالی' زور کا جھٹکا لگا۔ جسم میں بجلی کا کرنٹ سا دوڑ گیا۔ مسہری پر حمید مگوں بیٹھا تھا۔ نوشابہ کی بانہیں اس کے گلے میں پڑی تھیں۔ وہ اس کے زانو پر لیٹی تھی۔ حمید کے گلے میں پھولوں کا گجرا تھا۔ اور نوشابہ کے گلے میں سفید موتیوں کا قیمتی ست لڑا ہار تھا۔ اس کی چولی اتر چکی تھی۔ سینہ بالکل برہنہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں نہایت والہانہ انداز سے جھانک رہے تھے۔ ٹھیک اس مجسمے کے مانند جو کمرے کے باہر محراب کے نیچے ایک گوشے میں رکھا تھا۔

نوشابہ نے آہٹ سنی۔ پلٹ کر لالی کو دیکھا اور غصے سے پھٹ پڑی۔ "تو اپنے کمینے پن سے باز نہیں آئے گا؟"

لالی گھبرا گیا۔ "میں چابی دینے آیا ہوں۔ چابی میرے ہی پاس رہ گئی تھی۔"

نوشابہ نے ڈپٹ کر کہا۔ "ادھر میز پر ڈال دے اور فوراً کمرے سے نکل جا۔"

لالی نظر جھکائے آہستہ آہستہ میز کے پاس گیا۔ میز پر شیخ حمید کے اترے ہوئے کپڑے رکھے تھے۔ لالی دونوں کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہوگیا۔ اس نے مگوں کے کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں اور نہایت صفائی سے نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ پار کردیا۔ کنجی میز پر رکھ کر وہ دروازے کی جانب چلا۔ پیچھے سے حمید کی آواز ابھری۔

"دروازہ بند کر دینا جی۔"

لالی کو اس کا لہجہ نہایت تحقیر آمیز معلوم ہوا۔ اس نے چلتے چلتے پلٹ کر دونوں کی جانب دیکھا۔ نوشابہ کا ایک ہاتھ ابھی تک حمید کی گردن میں حمائل تھا۔ اس کے عریاں گلابی سینے پر موتیوں کا ہار

جگمگا رہا تھا۔ لالی کے دل کو شدید ٹھیس لگی۔ اس نے مگوں کو مخاطب کیا۔ ”سیٹھ حمید! میں نے تیری جیب سے بٹوا نکال لیا ہے۔ تو مجھے رشوت دے رہا تھا نا‘ یہ رہا تیرا بٹوا۔“ اس نے بٹوہ حمید کو دکھایا۔

حمید مگوں گھبرا گیا۔ ”نہیں‘ نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ بٹوے میں پانچ ہزار سے بھی زیادہ روپے ہیں‘ تم اتنے روپے نہیں لے جا سکتے۔“

لالی نے ہنس کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”حمیدے! تو بنئے کا بنیا ہی رہا۔ تیرے پاس ایسی بانکی سجیلی مٹیار چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ پنج ہزار کیا‘ اس کے لیے پنج لاکھ بھی کم ہیں۔ اگر یہ مانگے تو اس کے لیے سر کاٹ کے ہتھیلی پر رکھ کے پیش کر دوں۔“ اس کی نظریں نوشابہ کے چہرے پر جم گئیں۔ ”آزما لے نوشابہ! فیر کبھی نہیں ملوں گا۔ چاہنے والے تو نے بہت دیکھے ہیں‘ مرنے والا بھی دیکھ نہ لے۔“ وہ نشے سے جھوم رہا تھا۔

نوشابہ کا منہ فق ہو گیا۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے لالی کو دیکھا اور حمید کو مخاطب کرتے ہوئے گھبرا کر بولی۔ ”اسے نہ روکو حمید۔ جانے دو اسے۔“

لالی مڑا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور بوجھل قدموں سے چلنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے غلام گردش میں جلتی ہوئی تمام روشنیاں بجھ گئیں اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ اس نے غلام گردش طے کی‘ زینے سے نیچے اترا اور چند لمحے گم صم کھڑا رہا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا قرعہ اندازی والے ہال میں داخل ہو گیا۔ ہال میں کوئی نہیں تھا۔ تمام نشستیں خالی تھیں۔ شمع دان میں موم بتی ابھی تک روشن تھی اور پگھل پگھل کر چوتھائی سے بھی کم رہ گئی تھی۔

لالی تھکا ہوا امپائر والی اونچی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سامنے دیوار پر لگا ہوا کلاک دیکھا۔ ایک بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ اس نے نمبروں والے خانوں پر نظر ڈالی‘ دو خانے خالی تھے۔ ان میں کوئی ٹوکن نہیں تھا۔ لالی نے درمیانی صندوقچی کا بالائی ڈھکنا کھولا۔ ہاتھ اندر ڈالا۔ دو ٹوکن ابھی صندوقچی میں موجود تھے۔ اس نے ایک اٹھا لیا اور دھندلی روشنی میں ہتھیلی پر رکھ کے دیکھا۔ اس پر ۱۰ کا ہندسہ لکھا تھا۔ یہ نوشابہ کے کمرے کا نمبر تھا۔ نوشابہ جو حمید مگوں کی گردن میں محبت سے بانہیں ڈالے لیٹی تھی۔ لالی بجھی بجھی نظروں سے ٹوکن تکتا رہا۔ اس نے گہری سانس بھری اور آنکھیں بند کر لیں۔

دو گرم گرم آنسو اس کی پلکوں میں الجھ کر رہ گئے۔

اس نے آنکھیں کھولیں۔ ٹوکن نمبر ۱۰ صندوقچی میں ڈال دیا اور دوسرے ٹوکن بھی خانوں سے اٹھا اٹھا کر صندوقچی میں ڈالنے لگا۔ جب وہ سب ٹوکن ڈال چکا تو صندوقچی کا ڈھکنا بند کر دیا۔ اس نے ناموں والے خانے دیکھے۔ ان میں سات ٹوکن موجود تھے۔ اس نے ایک ٹوکن اٹھا لیا‘ اس پر شیخ حمید مگوں لکھا تھا۔ لالی نے نفرت سے ٹوکن دیکھا۔ ہاتھ اٹھایا۔ چاہا کہ اسے دروازے سے باہر پھینک دے‘ مگر کچھ سوچ کر ہاتھ روک لیا۔ دوسرے ہاتھ سے پتلون کی جیب ٹٹولی جیب میں بٹوہ موجود تھا۔ لالی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

☆

ہال میں چاپ ابھری۔ لالی نے چونک کر دیکھا۔ ہمدانی اندھیرے سے نکل کے یکایک اس کے سامنے آ گیا۔ وہ مسکراتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا۔ جھٹ لالی کا ہاتھ پکڑ کے جوش سے چوما۔

”یار! تو تو زبردست کلا کار ہے۔ بہت اونچی چیز ہے۔ مان گئے تجھے۔“

”مجھے تو یہ خوشی ہے جی‘ آپ کا کام بن گیا۔“ لالی احتراماً کھڑا ہو گیا۔ ہمدانی نے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے بٹھا دیا۔ وہ کھلنڈرے موڈ میں تھا۔ ہنس کر گویا ہوا۔ ”یار بیٹھا رہ۔ تکلف وکلف چھوڑ۔“ وہ اچک کر میز پر بے تکلفی سے بیٹھ گیا‘ ہلکا قہقہہ لگا کے بولا۔ ”ایسا ویسا کام بنا ہے۔ نہ پوچھ‘ اپنے ساتھ کیا واردات گزری۔ جیسے ہی کمرے میں پہنچا‘ وہ ڈریسنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ وہ کیا آئی۔ قیامت ہم رکاب آئی۔ امینہ پولی نیسین کے سموا قبیلے کی دوشیزاؤں کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ بال کھلے تھے۔ ایک کان کے اوپر بالوں میں سفید گلاب کا بڑا سا پھول لگا تھا۔ گلے میں چمپا کی کلیوں کا گجرا تھا۔ کمر سے گھٹنوں تک سنہرے ریشمی دھاگے میں پروئے ہوئے گل چاندنی کے پتوں کا لباس۔ یار! لباس کیا تھا‘ چلمن پڑی تھی اور سینہ کچے ناریل کی طرح بالکل عریاں۔“ اس نے وارفتگی کے عالم میں لالی کی پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارا۔ ”اف‘ کیا گدرائی ہوئی عورت ہے امینہ۔ بانکی چتونوں کے کیا بان چلاتی ہے۔ ہائے‘ نہ پوچھو‘ ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے!“ ہمدانی نے گہری سانس بھری اور آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔

جس کو ہو زندگی عزیز‘ اس کی گلی میں جائے کیوں!

”یہ بات ہے جی‘ تو آپ چلے کیوں آئے؟“

”یار! یہ پوچھنے چلا آیا‘ بعد میں کوئی فوپا تو نہیں ہوا؟ میرا مطلب ہے‘ کسی قسم کی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟“

”نہیں جی! سب کام بالکل ٹھیک ٹھاک ہوا۔ اناڑی نہیں ہوں۔ برسوں لاٹری کھلاتا رہا ہوں۔“

”مگر یار تو نے تو کمال کر دیا۔ ایسی ہاتھ کی صفائی دکھائی‘ میں تو دنگ رہ گیا۔“ ہمدانی نے ہنستے

ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے کہ ہم نے ایسا فول پروف سسٹم رکھا ہے کہ کسی ہیر پھر کی گنجائش ہی نہیں۔"

"میں نے تو جی آپ کے لیے دوبار ٹوکن نکالے اور دونوں ہی بار معاملہ الٹا گیا۔"

"دوبار؟" ہمدانی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "کیا پہلا ٹوکن نوشابہ کے کمرے کا نہیں تھا؟"

"پہلا نہیں' دوسرا تھا۔ پہلا تو راحیلہ کے کمرے کا تھا۔"

"ارے مار دیا ظالم!" ہمدانی نے حیرت سے پلکیں پٹ پٹائیں۔ "تب تو یار! تو نے زبردست کام دکھایا۔" وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ "اچھا' اب کام کی بات ہو جائے۔ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ وہ سالا ایس' پی تمہاری گھات میں ہے۔ تمام وقت بیٹھا تمہی کو گھورتا رہا۔ وہ ضرور اپنی کارگزاری دکھانے کی کوشش کرے گا۔ میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ الہ آباد میں میرے ساتھ ہی پڑھتا تھا۔ وہ تو پیدائشی پولیس والا ہے۔ باپ بھی اس کا پولیس انسپکٹر تھا۔" اس نے مڑ کر کلاک کی جانب دیکھا۔ "یہ بتاؤ ایس پی مرزا کے ساتھ کمرے میں ہے کون؟"

لالی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "ساب! یہ بات نہیں بتاؤں گا' چاہے آپ ناراض ہو جائیں۔"

"ناراض واراض ہونے کی بات نہیں۔" ہمدانی نے مسکرا کر کہا۔ "میں تمہارے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں۔ اگر مہ جبین یا راحیلہ اس کے پلے پڑ گئیں' تب تو سالا مارا گیا۔ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے اجازت لے کر باہر آ جائے تو تعجب کی بات نہیں۔ وہ بالکل کاٹھ کا الو ہے۔ البتہ اس کی جورو سائرہ بڑی کانٹے کی عورت ہے۔ اس پر تو کبھی کبھی عاشق ہو جانے کو دل چاہتا ہے۔"

لالی نے بے چین ہو کر کہا۔ "تب تو جی' مجھے اب چلنا چاہیے۔"

"قادر آباد اسٹیشن تو تم اس وقت نہیں پہنچ سکتے۔ وہ تو بہت دور ہے' مگر تمہیں یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہیے۔"

"آپ تو میرے ساتھ سٹیشن جائیں گے نہیں؟"

"یار! یہ ظلم نہ کرو' میں کیسے جا سکتا ہوں۔ آج تو وصل کی رات ہے۔" ہمدانی ہنس کر بولا۔ "تمہیں راستے کا بھی کچھ اتا پتا ہے؟"

"مجھے تو جی کچھ پتہ نہیں۔ یہ بھی نہیں ملوم' یہاں سے کون سا رستہ جاتا ہے۔"

"تم ایسا کرو۔ یہ جو نیچے نہر بہتی ہے' اسے پار کر کے دوسری طرف چلے جاؤ۔ میل سوا میل بعد کچی سڑک آئے گی۔ وہ بڑی نہر تک جاتی ہے۔ نہر عبور کرنے کی ضرورت نہیں۔ کنارے کنارے چلے جاؤ۔ عارف والا روڈ آئے گی' اور آگے بڑھو گے تو پاک پتن روڈ آ جائے گی۔ تم اس پر نہ جانا۔ آگے نکل جانا۔ قادر آباد کے نزدیک ہو جاؤ گے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "اس سڑک سے جاؤ گے جو سلیمان کے بنگلے کے سامنے سے گزرتی ہے تو یہ راستہ بھی لمبا ہے اور اگر ایس پی تمہاری تلاش میں نکل آیا تو راستے ہی میں دھر لے گا۔"

لالی جلدی جلدی ناموں کے ٹوکن خانے سے نکال کر بائیں ہاتھ کی صندوقچی میں ڈالنے لگا۔ اس نے ڈھکنا بند کیا اور کھڑا ہو گیا۔

"چلو میں تمہیں یہاں سے تو اپنی حفاظت میں باہر نکال دوں۔ یہاں سے نکلنا بھی آسان کام نہیں۔ ہر طرف سخت پہرا ہے۔"

اس نے پھونک مار کر موم بتی بجھائی اور لالی کے ساتھ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا ہال سے باہر آ گیا۔ دونوں ایک طویل غلام گردش میں آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ لالی نے چلتے چلتے کہا۔ "ایک بات پوچھوں جی! آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟"

"پوچھو' ضرور پوچھو۔" ہمدانی نے ہلکا قہقہہ لگا کر کہا۔ "اس وقت تو تمہیں سات خون معاف ہیں۔"

"آپ کو جی' اس بات پر ذرا بھی برا نہیں لگتا کہ آپ کی گھر والی ساتھ والے کسی کمرے میں دوسرے مرد کے ساتھ سو رہی ہے؟"

"برا لگتا تو ہے۔" ہمدانی نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "مگر اتنا زیادہ نہیں جتنا تم سمجھتے ہو۔"

"یہ بات سمجھ نہیں آئی جی!"

"یار! سیدھی سادی بات ہے۔ یہ تو تم نے سنا ہی ہو گا کہ پرائی عورت اور پرائی دولت سب کو اچھی لگتی ہے۔ اسے اڑا لینے کو ہر ایک کا دل مچلتا ہے۔ تم نے کبھی سوچا' ایسا کیوں ہے؟" ہمدانی نے لالی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "مگر یہ بات تم نہیں سمجھ سکتے۔ یہ بتاؤ' تمہاری جورو ورو ہے؟"

"وہ تو نہیں ہے جی۔" لالی نے انکار میں گردن ہلائی۔

"پھر تم کیسے سمجھ سکتے ہو۔" ہمدانی ہنسنے لگا۔ "ایک عدد جورو بیاہ کر لے آؤ۔ کبھی نہ کبھی تو تمہارا دل اس سے بھر ہی جائے گا۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ شروع میں عورت محبوبہ ہوتی ہے بیوی بن جاتی ہے۔ پھر ایسا وقت آتا ہے کہ محبوبہ اور بیوی ختم ہو جاتی ہے اور عورت صرف

بچوں کی ماں رہ جاتی ہے۔ جب وہ صرف بچوں کی ماں رہ جائے اور اس میں تمہارے لیے کوئی کشش، کوئی دلچسپی نہ رہے تو اس کا ایک عدد یار پیدا کردو۔ پھر دیکھو، کیا ہوتا ہے؟"

"ساب، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ جب اس کا یار پیدا ہو جائے گا تو وہ جوان اور خوبصورت ہونا شروع ہو جائے گی۔ بچوں کی ماں ایک دم محبوبہ بن جائے گی اور تم اس کے عاشق بن جاؤ گے۔ ہر وقت اس کے یار سے اسے چھین لینے کے چکر میں رہو گے، اور جب وہ واپس ملتی نظر نہ آئے گی تو اس کے عشق میں ایسے پاگل دیوانے ہو جاؤ گے کہ اس کے یار کو قتل کردو گے۔ بلکہ اسے بھی قتل کردو گے اور ٹھنڈے ٹھنڈے جا کر پھانسی کے پھندے سے لٹک جاؤ گے۔"

لالی قائل نہ ہوا۔ "ساب! عزت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"یار! یہ عزت وزت سب بکواس ہے۔" ہمدانی بے تکلفی سے مسکرانے لگا۔ "چلو، تمہاری بات مان لی۔ جب تمہاری جورو صرف بچوں کی ماں رہ جائے اور تمہارا دل اس سے اکتا جائے تو اسے طلاق دے دینا۔ پھر تو عزت کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ طلاق کے بعد وہ کسی اور سے نکاح پڑھا کر بیٹھ جائے گی۔ تم اسے دوسرے کے پہلو میں دیکھو گے تو دل میں کڑھو گے۔ اپنی آگ میں خود جلو گے۔ اس سے چھپ چھپ کر ملنے کی کوشش کرو گے۔ اس کی منت سماجت کرو گے کہ پھر تمہارے قبضے میں آجائے اور اگر وہ راضی نہ ہوئی یا اس کا شوہر آمادہ نہ ہوا تو تم شوہر کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کرو گے اور وہ تمہیں اپنی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرے گا۔"

"ساب! کیا ایسا ہوتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہوتا؟ میرے سامنے روز ایسے مقدمات پیش ہوتے ہیں اور اکثر اس وقت پیش ہوتے ہیں جب کسی کا قتل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے تو فساد کی جڑ زر اور زمین کے ساتھ زن کو بھی قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ کہا تو یہاں تک جاتا ہے کہ ہر قتل کے پیچھے کوئی عورت ہوتی ہے۔" ہمدانی بولتا رہا۔ "یار! بات صرف اتنی ہے کہ ہم نے اپنی جوروؤں کے ایک چھوڑ، چھ سات یار پیدا کردیے ہیں۔ جب سے ان کے یار پیدا ہوئے ہیں، وہ روز بہ روز زیادہ جوان اور زیادہ خوبصورت ہوتی رہی ہیں۔ اُدھر ہم رقابت کی آگ میں اندر ہی اندر سلگتے ہیں اور اپنی اپنی جوروؤں کے عشق میں دیوانے رہتے ہیں۔ کل صبح سے عشق کا شدید دورہ پڑے گا۔ سچ پوچھو تو ابھی سے ہولے ہولے ابھرنے لگا ہے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "اس یاری آشنائی کا فائدہ یہ ہے کہ اپنی جورو بھی ہاتھ سے نہیں جاتی اور پرائی جورو کا ذائقہ بھی چکھنے کو مل جاتا ہے۔ نہ اغوا کرنے یا پھانسنے کا چکر۔ نہ نئی شادی رچانے کا جھنجھٹ۔ اس میں عجب مزہ، عجب نشہ ہے۔ میاں بھی خوش، بیوی بھی خوش۔"

اس نے مسکراتے ہوئے مڑ کر ملے ٹر ہاؤس کی دوسری منزل پر جانے والے زینے کی جانب نظر ڈالی۔ "اوپر کے کسی کمرے میں جا کر دیکھو۔ یہی عورتیں جو چند مہینے پہلے باسی ٹماٹروں کی طرح بھدی اور پلپلی لگتی تھیں، اس وقت ایسے جوبن پر ہیں کہ کوہ قاف کی پریوں کو بھی مات کر رہی ہیں۔"

لالی کسی قدر پریشان ہو گیا۔ "ساب ایسا کہاں ہوتا ہے؟ ہو بھی نہیں سکتا۔"

"ہو کیوں نہیں سکتا۔" ہمدانی نے بے نیازی سے کہا۔ "ٹنڈرا کے رہنے والے اسکیمو، بڑی خوشی سے اپنی بیویوں کا ایک دوسرے سے تبادلہ کرتے ہیں اور جب تک جی چاہتا ہے، ساتھ رہتے ہیں۔ نہ بیوی کو اعتراض ہوتا ہے نہ شوہر کو۔ ان کے نزدیک یہ کوئی عیب نہیں۔ جب جی چاہا، جس وقت جی چاہا، آپس میں بیویاں بدل لیں۔ پولی نیسین قبائل تو نہ صرف بیویوں کا تبادلہ کرتے رہتے ہیں بلکہ گھر میں مہمان آئے تو میزبان خوشی سے اپنی بیوی رات کے وقت مہمان کو پیش کرتا ہے۔ یہی نہیں، جس کا جس وقت جی چاہا، دوسرے کی جورو کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ مگر اس کے لیے ایک دوسرے کی رضامندی ضروری ہے۔"

"ساب! میں نے تو ایسی بات نہ دیکھی، نہ سنی۔"

"تم نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔" ہمدانی کھل کھلا کر ہنسا، چند لمحے خاموش رہا پھر کسی قدر سنجیدہ ہو کر بولا۔ "یار! راز کی بات یہ ہے کہ ڈپٹی کمشنری خوب صورت بیوی کے بغیر نہیں چلتی۔ خصوصاً انگریز کے راج میں تو چل ہی نہیں سکتی تھی۔ انگریزوں نے اپنے آئی سی ایس افسروں کے لیے خوبصورت بیوی رکھنا، خوب صورت انگریزی بولنا اور خوب صورت انگریزی لکھنا بنیادی شرط رکھی تھی اور یہ بنیادی شرط آج بھی نہیں بدلی۔ کیا سمجھے؟"

لالی نے معصومیت سے پوچھا۔ "تو کیا سارے ڈپٹی کمشنر اور وڈے افسر یہی دھندا کرتے ہیں؟"

"نہیں یار!" ہمدانی نے تردید کی۔ "بہت سے تو بالکل ہی صوفی ہیں۔ رؤف اسی لیے اپنی جورو کو لے کر کینڈا چلا گیا۔ جورو بھی ایسی چھانٹ کر لایا ہے، بالکل مرقع چغتائی لگتی ہے، پھولوں کی طرح نازک اور شفاف۔ ایسی اجلی کہ ہاتھ لگاؤ تو میلی ہو جائے۔ پچھلی قرعہ اندازی میں وہ میرے حصے میں آئی تھی۔ عورت کیا ہے، لنسن بلیک لیبل شیمپین ہے۔ جس قدر آہستہ آہستہ پیو، اتنا ہی خمار ہوتا جائے اور رؤف تو ایک دم کاٹھ کا الو ہے۔ صبح جب وہ اسے اپنے ساتھ لے کر گیا تو گاڑی میں بیٹھتے ہی سینے سے چمٹا کر رونے لگا۔ میں نے اسی روز بھانپ لیا تھا، اب یہ دوبارہ سینس نائٹ میں شریک

نہیں ہوگا۔ یہی ہوا چند روز پہلے ہی وہ سرکاری دورہ نکال کر جورو کے ساتھ کینڈا چلا گیا۔"

لالی چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "ساب! برا نہ منایئے گا' میں چھوٹا اور غریب بندہ ہوں۔ میں تو یہ جانتا ہوں میری ماں کے ساتھ لمبردار نے زبردستی منہ کالا کرلیا تھا۔ وہ بہت غریب زنانی تھی۔ میرے پیو نے اس کا یہ گناہ کبھی معاف نہیں کیا۔ روز گالاں نکالتا تھا' مارتا تھا اور مارتے مارتے آخر اس نے اس کا کام تمام کردیا۔ بات یہ ہے جی! دنیا میں سارا کھیل پیسے کا ہے۔ پیسہ آدمی کے سب عیب چھپا دیتا ہے۔" لالی غم زدہ ہوگیا۔ اس کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔

ہمدانی نے مزید بات چیت نہیں کی۔ دونوں چپ چاپ چلتے ہوئے پلے زر ہاؤس کی دو منزلہ عمارت سے نکل کر باغ میں آگئے۔ چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ قریب کے درختوں کے نیچے آہٹ ہوئی' ساتھ ہی آواز آئی۔

"کون ہے۔"

انہوں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ ہمدانی فوراً ڈپٹی کمشنر بن گیا۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ اور شگفتگی غائب ہوگئی' گردن تن گئی۔ اس نے حکم دینے کے انداز میں بلند آواز سے کہا۔ "سامنے آؤ۔" درختوں تلے آہٹ تیز ہوگئی۔ اندھیرے سے ایک مسلح پہرے دار نکل کر سامنے آگیا۔ اس نے ڈپٹی کمشنر کو دیکھتے ہی دونوں جوتے بجا کر کھٹاک سے سیلوٹ کیا اور اٹینشن ہو کر کھڑا ہوگیا۔ ڈپٹی کمشنر نے اس پر اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر بے نیازی سے پوچھا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

پہرے دار نے مستعدی سے جواب دیا۔ "تاج محمد۔ میں جی ساہیوال کا رہنے والا ہوں۔" اس کے لہجے سے گھبراہٹ صاف عیاں تھی۔ "منٹگمری کو جی پہلے ساہیوال ہی کہا جاتا تھا۔"

ڈپٹی کمشنر نے اس کی گھبراہٹ نظر انداز کرتے ہوئے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ "تاج محمد! اسے اپنے ہم راہ لے جاؤ اور جہاں یہ جانا چاہے' اس جگہ کا پتہ معلوم ہو تو بتا دو۔ یہ نہر کے اس پار جائے گا۔ یہ اسی راستے سے جانا چاہتا ہے۔" ہمدانی مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھر عمارت میں داخل ہوگیا۔

ڈپٹی کمشنر چلا گیا تو پہرے دار نے لالی سے پوچھا۔ "تیں نوں کتھے جانا ہے؟"

لالی نے مختصر جواب دیا۔ "کاور آباد سٹیشن۔"

پہرے دار نے کسی قدر حیرت زدہ ہوکر کہا۔ "ٹیشن تو یہاں سے دور ہے۔ توں سویرا ہونے تک

وہاں نہیں پہنچ سکتا۔"

"فکر نہ کر۔ مجھے نہر کے اس پار پہنچا دے۔"

دونوں درختوں کے نیچے ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ کچھ دور جاکر نشیب میں اتر گئے۔ سامنے نہر تھی۔ دونوں نہر کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ اس جگہ روشنی تھی اور یہ جگہ پلے زر ہاؤس کے عین نیچے تھی۔ لالی اور پہرے دار جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ سے نکل کر کھلے میدان میں آگئے تھے۔ لالی نے چلتے چلتے گردن اٹھا کر پلے زر ہاؤس کی دوسری منزل کی طرف دیکھا۔ کھڑکیوں سے گہری سرخ سرخ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ایک کھڑکی پر اس کی نظر پڑی تو وہ دم بخود رہ گیا۔ ایس پی مرزا کھڑکی میں کھڑا تھا اور گردن جھکائے دونوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔ یہ کمرہ نمبر ۸ تھا۔ جس میں اس کے ساتھ راحیلہ تھی۔ لالی نے پہرے دار سے کہا۔

"اب میں چلا جاؤں گا۔"

"نہر یہاں گہری ہے۔ یہاں سے جائے گا تو بھیگ جائے گا۔ کمر تک پانی ہے۔ نہر کا بہاؤ بھی آج کل تیز ہے۔ رات کا ٹیم ہے' کہیں پیر ڈگمگا گئے تو بہتا ہوا نہ جانے کدھر نکل جائے گا۔"

لالی نے پریشان ہوکر پوچھا۔ "فیر نہر کے اس پار کیسے جاؤں؟"

"گھبرا نہیں۔ پوری گل سن لے۔" پہرے دار نے جواب دیا۔ "فرلانگ' سوا فرلانگ آگے جاکر نہر میں پانی بھی کم ہے اور بیچ میں جگہ جگہ اونچے اونچے پتھر ہیں' انھی پتھروں پر چل کر سارے بندے اس پار جاتے ہیں۔ نہر کے پار جانے کے بعد سجے ہاتھ کو مڑ جانا۔ میل بھر آگے کچی سڑک ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چلا جاؤں گا۔ تو فکر نہ کر۔"

"جیسی تیری مرضی۔ میں تو چاہتا تھا' تجھے نہر کے اس پار پہنچا دوں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب کا حکم ہے۔"

لالی نے اصرار نہیں کیا تو پہرہ دار بھی خاموش ہوگیا۔ وہ آہستہ آہستہ مڑا اور کچھ دور جاکر نشیب سے اوپر چڑھنے لگا۔ لالی مڑ مڑ کر اسے دیکھتا رہا۔ جب پہریدار نظروں سے اوجھل ہوگیا تو لالی نے پلے زر ہاؤس کی جانب گردن اونچی کرکے دیکھا' کمرہ نمبر ۸ میں سرخ بتی جل رہی تھی۔ مگر ایس پی کھڑکی پر نہیں تھا۔ لالی پریشان ہوگیا۔ اس نے رفتار تیز کردی۔ آگے گھنی جھاڑیاں تھیں۔ ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے اسے بار بار ٹھہرنا پڑتا۔ مشکل یہ تھی کہ جھاڑیوں کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ لالی کچھ دور تک جھاڑیوں سے الجھتا ہوا چلتا رہا۔ آخر اس نے آگے جانے کا ارادہ ترک کردیا۔ اسے ڈر تھا' کہیں ایس پی نہ پہنچ جائے۔ وہ کھڑکی سے اسے دیکھ ہی چکا تھا۔ لالی جلد سے جلد

نہر کے اس پار پہنچ کر دور نکل جانا چاہتا تھا۔

اس نے جلدی جلدی جوتے اتارے، پتلون کے پائنچے چڑھائے اور نہر میں اتر گیا۔ کنارے پر پانی کم تھا۔ وہ رفتہ رفتہ آگے بڑھتا گیا' پانی اونچا ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ کمر تک آگیا۔ لالی نہر کے بیچوں بیچ پہنچ چکا تھا۔ پہرے دار نے ٹھیک کہا تھا۔ پانی کا دھارا تیز تھا۔ لالی کے قدم بار بار ڈگگا جاتے۔ مگر وہ سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتا گیا۔ اچانک پانی کا زور دار ریلا آیا۔ لالی کے قدم لڑکھڑائے۔ وہ سنبھل نہیں سکا۔ اس کے قدم اکھڑ گئے اور وہ پانی کے تیز ریلے میں بہتا ہوا آگے نکل گیا۔

۹

نہر' نیم دائرہ بناتی ہوئی مغرب کی سمت مڑ گئی تھی۔ موڑ پر بائیں جانب کھال تھا' جو کنارے کاٹ کر آب پاشی کے لیے بنایا گیا تھا۔ کھال تنگ تھا۔ گہرائی بھی کم تھی۔ لالی' پانی کے تیز ریلے کے ساتھ بہتا ہوا کھال میں داخل ہو گیا۔ وہ گردن' پانی سے باہر نکالے آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔

کھال کے ایک طرف گندم اور جو کے کھیت لہلہاتے تھے۔ کھال کی گہرائی اتنی کم تھی کہ کچھ ہی دور جانے کے بعد لالی آسانی سے چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ مگر اس طرف گندم اور جو کے کھیت نہ تھے۔ سرکنڈوں اور جھلی کے اونچے' اونچے گھنے پودوں کی جھاڑیاں تھیں اور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ الی' پانی سے شرابور اور تھکن سے نڈھال تھا۔ وہ کھال کے کنارے ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ کر ستانے لگا۔

ذرا سکون ملا تو اس نے پتلون کی جیب ٹٹولی۔ بٹوہ موجود تھا۔ لالی نے بٹوہ نکالا۔ بٹوہ بھیگا ہوا تھا۔ ں میں رکھے ہوئے نوٹ بھی کسی قدر بھیگ گئے تھے۔ لالی نے مسکرا کر بٹوہ دیکھا اور سنبھال کر پھر یب میں رکھ لیا۔

رات کے آنگن میں ستاروں کے کنول جھلملا رہے تھے۔ ہلکے ہلکے جھونکوں سے پودوں میں رسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ لالی کئی منٹ خاموش بیٹھا گہری گہری سانسیں بھرتا رہا' پھر اٹھ کر کھڑا گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

کھیتوں کے اس پار جوہڑ تھا اور اس کے آگے گاؤں کے مکانات تھے۔ ستاروں کی مدھم روشنی مٹی کے مکانات دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ رات کے پچھلے پہر کی گہری خاموشی میں

گاؤں بالکل سنسان تھا۔ لالی اس طرف نہ گیا۔ وہ کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے پی بے پر چلنے لگا۔

کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو جھنگر شروع ہو گیا۔ جھنگر کے آگے چٹیل میدان تھا۔ وہ جھنگر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ مگر تین میل سے زیادہ نہ چل سکا۔ اس کے برہنہ پیر جنگلی جھاڑیوں کے کانٹوں سے لہولہان تھے۔ اب اس میں آگے جانے کی سکت نہیں تھی۔ وہ بہت تھک چکا تھا اور کہیں ٹھہر کر آرام کرنا چاہتا تھا۔ اسے ایسی جگہ مل بھی گئی۔ یہ فراش کے درختوں کا کنج تھا۔ کنج کی زمین ہموار تھی اور خاردار جھاڑیوں سے صاف تھی۔ وہ کنج میں روپوش ہو کے رات بسر کر سکتا تھا۔

لالی فراش کے درختوں تلے چلا گیا اور نڈھال ہو کے اندھیرے میں زمین پر لیٹ گیا۔ اس کے کپڑے ابھی تک گیلے تھے۔ اسے سردی محسوس ہوئی۔ اس نے کروٹ لے کر جسم سکیڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ذرا دیر بعد اسے نیند آگئی۔

وہ گہری نیند سوتا رہا۔ رات گزری، صبح ہوئی۔ سورج چڑھ کر بیچ آسمان پر آگیا۔ آنکھ کھلی تو چونک کر دیکھا، ایک شخص اس پر جھکا ہوا کلائی سے گھڑی اتارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لالی نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ شخص بھاگنے کے لیے تیزی سے مڑا۔ لیکن لالی نے اسے فرار ہونے کا موقع نہیں دیا۔ جھٹ اس کی ٹانگ پکڑ لی اور زور سے کھینچی۔ وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔

لالی نے چیل کی طرح جھپٹ کے اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ اس شخص کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جسم لمبا اور مضبوط تھا۔ اس نے زور لگایا اور لالی کی گرفت سے خود کو آزاد کرا لیا۔ لالی پھر اس سے لپٹ گیا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے زور آزمائی کرنے لگے۔

دونوں خاک میں لتھڑے ہوئے ہانپ رہے تھے۔ اس شخص نے ایک بار پھر نکل بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر اس کی دھوتی لالی کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے جھٹکا دے کر دھوتی کھینچ لی۔ اس شخص کا نچلا دھڑ برہنہ ہو گیا۔

وہ ٹھٹک کر جہاں تھا وہیں رک گیا۔ لالی نے ہاتھ میں دبی ہوئی دھوتی ایک طرف پھینکی اور اچھ کر اس کی کمر پر زور سے لات ماری۔ وہ گرا اور زمین پر لڑھکتا چلا گیا۔ لالی نے اسے سنبھلنے کا مو نہیں دیا۔ جلدی سے اس کے سینے پر سوار ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ وہ بے

بس ہو کر غیں غیں کرنے لگا۔

لالی نے غصے سے اس کے منہ پر تڑاق سے تھپڑ مارا۔ ڈپٹ کر پوچھا۔ ”ہندکی ہے توں؟“

”نہیں جی، میں چوری چکاری نہیں کرتا۔ میں ڈھڈی راج پوت ہوں۔“ اس نے ہانپتے ہوئے رک رک کر کہا۔ ”میرا ناں اللہ دتا ہے۔“

لالی نے ایک ہاتھ سے پتلون کی جیب ٹٹولی۔ یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ بٹوہ موجود ہے۔

لالی نے اللہ دتا کے گلے پر رکھا ہوا ہاتھ علیحدہ کیا اور اس کے سینے سے اتر کر ایک طرف ہو گیا۔ اللہ دتا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی پگڑی کھل کر نیچے گر گئی تھی۔ دونوں خاموش بیٹھے ہانپتے رہے۔ ذرا دیر بعد اللہ دتا نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے عاجزی سے کہا۔

”میری دھوتی دے دے۔“

”اٹھا لے۔“ لالی نے قریب پڑی ہوئی دھوتی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”پر بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ تو مجھ سے زیادہ تیز نہیں بھاگ سکتا۔ میں تجھے ابھی جانے نہیں دوں گا۔“

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اطمینان رکھ، میں بھاگوں گا نہیں۔“ اس نے دھوتی اٹھا کے باندھی اور لالی کے نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔

لالی نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورا۔ ”سچ سچ بتا، کیا کرتا ہے تو؟“

”میں جی چاک ہوں۔ داؤد پور کے زمیں دار کے چوکھر اور مویشی چراتا ہوں۔“

”یہ داؤد پور کدھر ہوا؟“

”یہاں سے بہت دور ہے۔“ وہ مشرق کی جانب ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”آگے عارف والا روڈ ہے۔ لال ٹبے سے اوپر چلو تو پاک پتن روڈ آجاتی ہے۔ روڈ کے اس پار پنج میل دور داؤد پور ہے۔“

”تب تو بہت دور ہوا۔ تو یہاں کیسے آگیا۔“

”بس جی آ ہی گیا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”جھنگر کے ادھر علی شاہ ہے۔ میں پہلے اس پنڈ مں مزارع تھا۔“

لالی کو یاد آیا کہ پچھلی رات وہ اسی گاؤں کے کھیتوں سے گزرتا ہوا ادھر آیا تھا۔ اس نے اللہ دتا سے دریافت کیا۔ ”تو مزارع تھا۔ کھیتی باڑی چھوڑ کر چاک کیوں بن گیا۔“ وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”مزارع تو زمیں دار بننے کی سوچتا ہے، تو کمی کیسے بن گیا؟“

”گل ایسہ ہے جی، علی شاہ کا زمیں دار نور علی کھوکھر ہے۔ وڈا زمیں دار ہے۔“ اس نے بنجر

میدان کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ہزاروں کلّا زمین اسی کی ہے۔"

"پر یہ بنجر کیوں پڑی ہے؟" لالی نے حیرت سے کہا۔ "پاس ہی نہر بھی بہتی ہے۔"

"یہ نہر شہر کہاں ہے جی، یہ تو رانی واہ ہے۔ اس میں تو جی برسات کا پانی آتا ہے۔ کچھ راجباہ بیروالا سے آجاتا ہے۔ اوپر کرم والا میں مہر سلیمان خاں کے باغ ہیں۔ سینکڑوں کلّے پر کھیتی باڑی بھی ہے۔ سارا پانی تو اس کے باغ اور کھیت کھا جاتے ہیں۔ ویسے بھی جی یہ مہر سلیمان کی اپنی نہر ہے۔ پہلے یہاں سک نالا ہوتا تھا۔ اس میں صرف برکھا کا پانی آتا تھا۔ مہر سلیمان نے سک نالہ بیروالا کی وڈی نہر سے ملا دیا۔ آٹھ نو برس ادھر کی بات ہے۔ میرے سامنے ہی یہ سک نالے سے نہر بنی۔ تیں نوں پتہ ہوگا، پہلے زمیں دار اپنی نہریں بنوا سکتے تھے اور آبیانہ بھی نہیں دیتے تھے۔ اب ادھر پچھلے کئی سال سے سرکار نے یہ کنون بنا دیا ہے، کوئی زمیں دار اپنی نہر نہیں بنوا سکتا۔"

"اس وکت تو نہر میں بہت پانی ہے اور اتنی تیزی سے بہہ رہا ہے کہ میں نے پچھلی رات کرم والا میں نہر کے پار جانا چاہا تو دھارے میں بہہ گیا۔ پانی گہرا بھی ہے۔ تیرنا نہ جانتا تو کب کا ڈوب گیا ہوتا۔ گھبرا بھی اتنا گیا تھا کہ ہاتھ میں دبے ہوئے جوتے چھوٹ گئے۔ رات کے اندھیرے میں بہہ کر جانے کدھر چلے گئے۔" اس نے اپنے برہنہ پیروں کو دیکھا۔

"توں اس طرح یہاں پہنچا۔" اللہ دتا نے حیرت کا اظہار کیا۔ "لگتا ہے مہر سلیمان نے نہر کے افسروں سے مل کر بیروالا کی نہر میں شگاف ڈال دیا۔ اس دفعہ کچھ زیادہ ہی چوڑا شگاف ڈالا ہے۔ جبھی تو اتنا بہت سا پانی یہاں تک آگیا۔ بات یہ ہے جی، گرمیوں میں جب نہر سوکھ جاتی ہے تو مہر سلیمان اپنے باغوں اور کھیتوں میں پانی دینے کے لیے ایسا ہی کرتا ہے۔ اس کے خلاف پانی کی چوری پر نہ پرچہ کٹتا ہے نہ کوئی کارروائی ہوتی ہے۔ وہ تو جی جگیر دار ہے۔ سارے ہی وڈے افسروں سے اس کی یاری ہے۔"

"علی شاہ کا زمین دار نور علی کھوکھر بھی تو جگیردار ہے۔" لالی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "اس کے پاس بھی ہزاروں ایکڑ زمین ہے۔ سرکاری افسروں سے اس کی بھی یاری ہوگی۔ فیر اس نے اپنی زمیں کیوں بنجر اور کلر بنا رکھی ہے؟"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ کھوکھر کی بھی افسروں سے یاری ہے۔ اس کا میرا اسمبلی کا ممبر ہے۔ پر کھوکھر اپنی زمین بنجر اور کلّر ہی رکھنا چاہتا ہے۔" اللہ دتا نے سامنے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہاں سے ڈیڑھ میل آگے کلراٹھی ہے۔ وہاں بھٹیاں لگی ہیں۔ ان میں شورہ بنتا ہے۔ اسے اونٹھوں پر لاد کر ٹیشن پہنچایا جاتا ہے۔ فیر ریل گاڑی سے اوکاڑے بھیجا جاتا ہے۔ وہاں بہت وڈا کارخانہ ہے۔

اس میں مشینوں سے شورہ صاف کیا جاتا ہے اور صاف کر کے قلمی شورہ بنا دیا جاتا ہے۔ میں نے جی وہ کارخانہ دیکھا ہے۔"

"تو کیا ادھر کلراٹھی میں بہت کلّر ہے؟"

"بہت زیادہ ہے جی۔" اللہ دتا نے لالی کو بتایا۔ "کلراٹھی کے آس پاس کی ساری زمین اتنی کلّر ہے، جدھر نظر ڈالو، سب کچھ سفید ہی سفید نظر آتا ہے۔ کلراٹھی کے نزدیک کسی پرانی اور اجاڑ بستی کے کھولے اور کھنڈر ہیں۔ اس کی دیواروں پر، زمین پر ہر جگہ اتنا کھارا چڑھتا ہے کہ سارا ہی کھنڈر دور سے کپاس کی ڈھیری دکھائی پڑتا ہے۔ ہر سال یہ سارا کھرچ کر اتار لیا جاتا ہے۔ بھٹیوں میں اس کا شورہ بنایا جاتا ہے اور جی سال گزرتا بھی نہیں کھنڈر، کھارے سے فیر ایک دم سفید پڑ جاتا ہے۔"

"ادھر بہت زیادہ کلّر ہوگا پر یہاں تو اتنا نہیں ہے۔ یہ تو زیادہ تر بنجر ہی زمین ہے۔ یہ کھیتی باڑی کے کام آسکتی ہے۔"

"پر کھیتی باڑی کے لیے پانی بھی تو چاہیے۔ یہ تو نہر کی پونچھڑی ہے۔ تیں نوں پتہ ہے پونچھڑی میں تو پانی ہمیشہ کم ہی پہنچتا ہے۔ تب ہی تو سوکھی پڑی رہتی ہے۔ سارا پانی تو اوپر ہی اوپر ہضم کر لیا جاتا ہے۔ ادھر تو اتنا ہی پانی ملتا ہے کہ علی شاہ یا ایسے دو چار اور پنڈ اس نہر کے کنارے آباد ہو سکتے ہیں۔ پر بنجر زمین بھی بالکل بیکار نہیں جاتی۔ اس پر لانے کے بوٹے اگتے ہیں اور ادھر تو کاوگان لانا اور پھوگ کے بوٹے ہوتے ہیں۔ آگے جاؤ تو بہت نظر آئیں گے۔ تو نے لانے کا بوٹا دیکھا ہے؟"

"دیکھا تو ہے۔ یہ بھی پتہ ہے، لانا کے بوٹے سے سجّی بنتی ہے اور سجّی سے کپڑے لتے دھو کر صاف کیے جاتے ہیں۔"

"کاوگان لانا سے بہت زیادہ سجّی نکلتی ہے۔" اللہ دتا نے پوچھا۔ "تو نے کبھی سجّی دیکھی ہے؟ میں تجھے بتاتا ہوں، سجّی کیسے بنتی ہے۔ سجّی بنانے کے لیے لانے کے بوٹے جڑ کے پاس سے کاٹ لیے جاتے ہیں۔ زمین میں گڑھا کھود کر کٹے ہوئے بوٹے اس طرح بھر دیے جاتے ہیں کہ اوپر تک ڈھیری بن جاتی ہے، ڈھیری میں آگ لگا دی جاتی ہے۔ پتیاں جل جاتی ہیں اور ڈنٹھلوں سے رس بہہ بہہ کر نیچے گڑھے میں جمع ہو جاتا ہے۔ ٹھنڈا پڑ کر ایسا جم جاتا ہے کہ پتھر کی طرح سخت لگتا ہے۔ سجّی اسی طرح بنتی ہے، پر کلراٹھی کے پاس تو سجّی بنانے کی بھٹیاں لگی ہیں۔ ڈھیروں سجّی روزانہ بنتی ہے۔ کچا شورہ بھی اتنا ہی ڈھیر کا ڈھیر ہر روز تیار ہوتا ہے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کچے شورے اور سجّی سے کھوکھر کو بہت زیادہ آمدنی ہوتی ہوگی۔ جبھی تو اس نے اتنی بہت سی زمین کلّر اور بنجر بنا رکھی ہے۔"

"ایسا ہی ہو گا جی۔ میں نوں ٹھیک سے پتہ نہیں۔"

لالی نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "تو نے علی شاہ کیوں چھوڑ دیا؟ تو مزارع تھا نا؟"

"مزارع ہی تھا پر کچھ ایسا چکر چلا میں نوں پنڈ چھوڑنا پڑا۔"

"کوئی خاص بات ہو گئی؟"

"یہ نہ پوچھ۔ یوں سمجھ کیا نہیں ہوا۔" اللہ دتا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اپنا تو سبھی کچھ تباہ ہو گیا۔ میرے ساتھ چھوٹا بھائی اللہ دینو بھی تھا۔ دو ہل تھے۔ سولاں کلّے سے اوپر زمین پر اپنے کھیت تھے۔" اس کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیلنے لگے۔ "سچ پوچھ تو اس کلراٹھی نے اپنا ناس مار دیا۔ پہلے اس کا مالک سردار سنتوکھ سنگھ ہوتا تھا۔ بہت زور آور جوان تھا۔ رہتا تو ادھر کھوکھراں میں تھا پر روز ہی اپنی سفید گھوڑی پر بیٹھ کر کلراٹھی آتا تھا۔ علی شاہ بھی آتا جاتا رہتا تھا۔ کلراٹھی پر کام کرنے کے لیے ادھر سے مزدور بھی لے جاتا تھا۔ فصل پکنے لگتی تو پنڈ کے مزارعے بھی کمّیوں کے ساتھ کلراٹھی پر کام کرنے آتے۔ سنتوکھا مزدوری بھی چنگی دیتا تھا۔ شام کو جب چھٹّا بٹتا تو خوشی کے ساتھ خود بھی موجود ہوتا تھا۔ اس نے کبھی کسی کی مزدوری نہیں ماری اور نہ مزدوری پر جھگڑا کیا۔"

"تو نے بھی کلراٹھی پر مزدوری کی ہے؟"

"کی تو ہے، پر جی وہاں کام کرنے سے مجھے ایسی کھانسی ہو گئی تھی کہ کھانستے کھانستے رات جاگتے ہوئے کٹتی۔ وہ ایسا ہے جی، کلر کھودتے ہوئے کھارا ایسے اڑتا ہے جیسے دھواں ناک میں گھس کر اندر چلا جاتا ہے۔ اسی لیے منہ پر منڈاسا باندھ کر کلراٹھی پر کام کرنا پڑتا ہے۔ فیر بھی بہت کھانسی آتی ہے۔ کتنے ہی مزدوروں کو دمہ ہو گیا۔" اللہ دتا چند لمحے چپ رہا۔ "پاکستان بنا اور فسادات ہوئے تو سنتوکھ سنگھ بھی بھاگ کر سرحد پار چلا گیا۔ کلراٹھی پر مہینوں کام بند رہا۔ نور علی کھوکھر بھی کھوکھراں ہی میں رہتا ہے۔ وہاں اس کی حویلی ہے۔ سردار سنتوکھ سنگھ کے جانے کے بعد کھوکھر نے افسروں سے مل کر ایسا چکر چلایا کہ کلراٹھی اور سنتوکھ سنگھ کی ساری زمین اس کے قبضے میں چلی گئی۔ یہ بنجر اور کلّر زمین پہلے سنتوکھ سنگھ ہی کی ہوتی تھی۔"

"سنتوکھے نے بھی بنجر زمین پر کھیتی باڑی کی کوشش نہیں کی؟"

"اس کی زمین کئی میل آگے ہے۔ ادھر بالکل پانی نہیں۔ کنواں کھودو تو بہت زیادہ گہرائی میں جا کر پانی ملتا ہے۔ چند ہی برسوں میں سوکھ کر ڈل بن جاتا ہے۔ پر کلراٹھی جب کھوکھر کے قبضے میں آئی تو علی شاہ کے مزارعوں اور کمّیوں کے لیے مصیبت آ گئی۔ کھوکھر نے سب سے وگار لینی شروع کر دی۔ پہلے پہلے تو تھوڑی بہت مزدوری بھی دیتا تھا، فیر وہ بھی بند کر دی۔ پنڈ والوں نے گلہ کیا۔ کئی

نے تو کلراٹھی پر کام کرنے سے انکار بھی کر دیا۔ فیر تو جی کھوکھر ایسا ناراض ہوا، جس جس نے انکار کیا، اسے زمین سے بے دخل کرنا شروع کر دیا۔"

"تو نے بھی کلراٹھی پر کام کرنے سے انکار کر دیا تھا؟"

"ہاں جی، میں نے بھی انکار کر دیا تھا۔ ایک تو وگار کرنی پڑتی تھی۔ اوپر سے مجھے کھانسی بھی ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے بے دخل کرنے کے لیے طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ میرے مویشی اور چوکھر اٹھوا لیے۔ ربیع کی واڈھو فصل بھی کٹوا کر اٹھا لے گیا۔ میں نے تھانے میں اس کے منشی اور کرندوں کے خلاف پرچہ چاک کرایا تو پولیس نے الٹا میرے خلاف مویشی چوری کا مکدمہ بنا دیا اور مجھے جیل میں بند کر دیا۔ چار مہینے سے بھی زیادہ مکدمہ چلا۔ میں چھوٹ گیا۔ پر ہفتہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ کھوکھر نے میری گھر والی کو اٹھوا لیا اور کھوکھراں میں اپنی حویلی کے اندر بند کر دیا۔ اس وقت میرے دو چھوٹے چھوٹے نکّے تھے۔ ماں کے بنا روتے تھے، مچلتے تھے، ضد کرتے تھے۔ اللہ دینو کا ویاہ نہیں ہوا۔ گھر میں کوئی زنانی نہیں تھی جو بچوں کی دیکھ بھال کرتی، روٹی پکا کر کھلاتی، مویشیوں اور چوکھروں کا سویرے پٹھا دتھا کرتی، دوپہر کو کھیت پر بھتّا پہنچاتی۔ میں تو جی گھر والی کے بنا بالکل تباہ ہو گیا۔ وہ تو میرا بازو ہے۔"

"تو نے پولیس میں پرچہ چاک نہیں کرایا؟"

"ایک بار کرایا تھا تو چار مہینے جیل میں بند رہا۔" اللہ دتا کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ "اس دفعہ نہ جانے کتنے جھوٹے مکدمے میرے خلاف بنائے جاتے۔ اس ڈر سے میں نے پرچہ شرچہ تو چاک کرایا نہیں۔ کھوکھر کو سفارشیں پہنچائیں پر اس نے کسی کی نہ مانی۔ اس چکر میں ڈیڑھ سال گزر گیا۔ میری گھر والی کھوکھر کی حویلی میں تھی۔ اس کے ایک بچہ بھی ہو چکا تھا۔ میں ہر طرف سے مایوس ہو کر آخر ایک روز خود اس کے پاس کھوکھراں گیا۔ پگڑی اتار کر اس کے پیروں پر ڈال دی۔ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔ "زمیں دار! میرا بازو مجھے واپس دے دے۔" پہلے تو وہ بہت گرم ہوا۔ دیر تک گالاں نکالتا رہا۔ میں نے منت سماجت کی تو اس نے گھر والی کی واپسی کے تین ہزار روپے مانگے اور ہفتے کی مہلت دی۔ میں پہلے ہی تباہ ہو چکا تھا۔ اتنی زیادہ رکم کہاں سے لاتا۔"

"دوبارہ کھوکھر کے پاس جاتا۔ اس کے فیر پیر پکڑ لیتا۔"

"یہی کیا جی۔ اس دفعہ اس نے گھر والی کو واپس کرنے کی یہ شرط لگائی کہ مجھے اور اللہ دینو کو سال بھر تک کلراٹھی پر وگار کرنی پڑے گی۔ میں نے اللہ دینو سے بات کی۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے، جھٹ تیار ہو گیا۔ میں نے کھوکھر سے وگار کرنے کی ہامی بھر لی۔ اس طرح مجھے اپنا بازو واپس مل

گیا۔"

لالی نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔ "آگے کیا ہوا؟"

"آگے کیا ہونا تھا جی۔ کھوکھر نے کلراٹھی کے پاس اپنی جیل بنا رکھی ہے۔ مجھے اور اللہ دیتو کو اس میں ڈال دیا گیا۔ دن بھر ہم دونوں بھائی کلراٹھی پر کام کرتے اور شام کو دوسرے کیدی مزدوروں کے ساتھ بند کردیے جاتے۔ دیواریں اتنی اونچی ہیں انھیں کوئی پھاند نہیں سکتا۔ صرف ایک دروازہ ہے اور اس پر تالا ڈال دیا جاتا ہے۔ باہر راکھے رفل سنبھالے کڑی نگرانی کرتے ہیں۔ فیر بھی کیدی مزدور جب تک اندر رہتے ہیں، دو کیدیوں کے ایک ایک پیر ملا کر پنڈلیوں میں لوہے کے کڑے ڈال دیے جاتے ہیں۔ درمیان میں ہاتھ بھر لمبی زنجیر ہوتی ہے۔ کڑوں میں تالے پڑے ہوتے ہیں اور ان کی چابیاں راکھوں کے انچارج کے پاس رہتی ہیں۔ ان پر نمبر پڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح جی ایک زنجیر کے دونوں کیدی ایک ساتھ لیٹتے ہیں، ایک ساتھ اٹھتے ہیں، ایک ساتھ سوتے ہیں۔ ایک کروٹ بدلے تو دوسرا جاگ اٹھتا ہے۔ ایک کو ٹٹی پیشاب لگے تو دوسرے کو بھی ساتھ ساتھ جانا پڑتا ہے، ساتھ ساتھ بیٹھنا پڑتا ہے۔ اسی لیے کیدیوں میں روز جھگڑا ہوتا ہے، مارکٹائی ہوتی ہے۔ جب دنگا زیادہ ہوتا ہے تو راکھے اندر آکر دونوں ہی کیدیوں کو ٹھڈے مارتے ہیں۔"

لالی نے تشویش کا اظہار کیا۔ "یہ تو سرکاری جیل سے بھی زیادہ کڑی سزا ہوئی۔"

"نہ پوچھ میں نے اٹھ مہینے کس طرح کلراٹھی پر گزارے۔" اللہ دتا نے گہری سانس بھری۔ "دن بھر مویشیوں اور چوکھروں کی طرح بھٹیوں پر کام کرنا پڑتا۔ کھدائی کرنی ہوتی۔ راکھے چمڑے کے لمبے لمبے چھانٹے اور کوڑے ہاتھوں میں دبائے شکاری کتوں کی طرح مزدوروں کو تاکتے رہتے ہیں۔ کسی نے ذرا سستی سے کام لیا، راکھا جھپٹ کے اس پر سڑاک سڑاک چھانٹے لگاتا ہے۔ میری کمر دیکھ۔"

اس نے کرتا الٹ کر اپنی پیٹھ برہنہ کردی۔ اس کی کمر اور پیٹھ پر اب تک سیاہ اور بھوری لکیریں موجود تھیں۔ "یہ لاسے، چھانٹوں کے نشان ہیں۔ کھارے میں کام کرنے سے مجھے کھوکھری بھی ہوگئی تھی۔ بار بار کھانستا۔ دن کا تو کچھ نہیں تھا پر رات کو کھانستا تو دوسروں کی نیند خراب ہوتی۔ وہ نراض ہو کر گالاں نکالتے۔ میں جب کلراٹھی پر وگار کرتا تھا تو ۵۲ کیدی مزدور تھے۔ شام کو ان کی گنتی ہوتی تھی اور بند کرنے سے پہلے ہی روٹی کھلادی جاتی تھی۔"

"سارے کیدی تیرے ہی پنڈ کے تھے؟"

"نہیں جی، اپنے پنڈ کے تو اس وکھت اٹھ کیدی تھے اور ان میں ہم دونوں بھائی بھی شامل تھے۔ کھوکھر جس مزارعے یا کمّی سے نراض ہوتا ہے اسے کلراٹھی میں وگار پر لگا دیتا ہے۔ کھوکھر بہت وڈا زمیں دار ہے۔ اس کے اور بھی کئی پنڈ ہیں۔ ہزاروں کلا زمیں داری ہے اور اب تو جی ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی زمینوں پر کبضہ کرکے اس نے اپنی زمیں داری بہت بڑھالی ہے۔ اس کی پوری جگیر ہے جی۔ لہور میں کوٹھی بنوا رہا ہے۔ یہ لمّی موٹر خریدی ہے۔ دو پتر ولایت پڑھنے بھیجے ہیں۔ بہت عیش ہیں جی اس کے۔"

"کلراٹھی کی جیل میں تیری گھروالی تجھ سے ملنے نہیں آئی؟"

"کیدی مزدوروں سے کسی کو ملنے کی بالکل اجازت نہیں۔" اللہ دتا نے جواب میں مطلع کیا۔ "کسی کو ان کے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں جاتا۔ انھیں پکڑ کر رات کے اندھیرے میں اونٹھ پر بٹھا کر کلراٹھی میں لایا جاتا ہے اور جیل میں بند کردیا جاتا ہے۔ ان کے گھر والوں کو بالکل پتہ نہیں چلتا وہ کہاں گئے؟ میری گھروالی کو بھی دو ہفتے تک میرے اور اللہ دیتو کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا، ہم دونوں کہاں ہیں؟ وہ نور علی کھوکھر کی حویلی پر گئی، پر وہ اسے نہیں ملا۔ فیر وہ اس کے منشی دلاور لنگاہ کے پاس گئی۔ وہ اسے لارے لپے دیتا اور رات کو اپنے پاس بلا لیتا۔ ایک روز اس نے شراب پی رکھی تھی۔ اس رات میری گھروالی اس کے پاس تھی۔ لنگاہ نے نشے میں مست ہو کر بتادیا کہ مجھے اور اللہ دیتو کو کلراٹھی کی جیل میں رکھا گیا ہے۔ پر وہ ہم دونوں کو چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہ ہوا۔"

"اللہ دتا! تجھے تو کھوکھر نے سال بھر کے لیے وگار پر کید میں ڈالا تھا۔ تو چار مہینے پہلے کیسے باہر نکل آیا؟"

"جب میں نے تجھے سبھی کچھ بتادیا، تو ایہہ گل بھی سن لے۔" اللہ دتا نے جواب دیا۔ "علی شاہ یہاں سے نزدیک ہے۔ کلراٹھی کے راکھے کبھی کبھار وہاں جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک راکھے میران خاں سے میری گھروالی نے میل جول پیدا کرلیا۔"

لالی نے ہنس کر کہا۔ "یاری لگالی ہوگی۔"

"ایسی ہی گل تھی۔" اللہ دتا نے جھینپ کر نظریں جھکالیں۔ "پر میران کے ذریعے وہ چپکے چپکے مجھے گھیور، مرونڈے اور حلوہ پکا کر بھجوا دیتی، میں اور اللہ دیتو چھپ چھپ کر کھا لیتے۔"

"دوسرے بھی ایسا ہی کرتے ہوں گے؟ ایسے ہی جیسے سرکاری جیلوں میں باہر سے چوری چھپے سامان اندر آجاتا ہے۔"

"ایسا ہوتا تو ہوگا پر مجھے پتہ نہیں۔ اب اگے کی سن۔ ایک رات ڈیوٹی پر میران خاں اکیلا رکھوالی پر تھا۔ دوسرے روز عید کی چھٹی تھی۔ کام بند تھا۔ کلراٹھی پر چار راکھے تھے۔ ان میں سے تین شام کو کام بند ہوتے ہی اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ میران خان کا گھر میاں والی میں تھا۔ اس لیے وہ ٹھیر گیا۔ یہ بات اس نے میری گھر والی کو بتا دی تھی اور اسے رات کو کلراٹھی پر اپنے پاس بلایا۔ اندھیرا ہوتے ہی وہ اس کے پاس پہنچ گئی۔ آدھی رات تک اس کے ساتھ رہی۔ پنج سو روپے رشوت بھی دی تاکہ وہ مجھے چھوڑ دے۔"

"لگتا ہے' تیری گھر والی بہت تیز ہے۔ سوہنی بھی ہوگی۔"

اللہ دتا اس کی بات نظرانداز کر کے بولا۔ "فیر ایسا ہوا جی' آدھی رات کے بعد میران خان اندر آیا۔ اس رات اس نے مجھے اور میرے ساتھی کیدی کو کونے والی کوٹھڑی میں سلایا تھا۔ کیدیوں کو راکھے اپنی مرضی کی جگہ سلاتے ہیں اور سونے سے پہلے ان کے معائنے پر بھی آتے ہیں۔ ان کی گنتی بھی کرتے ہیں۔ اس وکھت سارے کیدی بے خبر سو رہے تھے۔ کئی کوٹھڑیوں میں اور کئی کوٹھڑیوں کے باہر دلان میں سو رہے تھے۔ میران خان میری کوٹھڑی میں آیا۔ چپکے سے میرے کڑے کا تالا کھولا' کڑا پیر سے نکال دیا' آہستہ سے جھنجوڑ کر مجھے جگایا۔ میں نے گھبرا کر بولنا چاہا تو اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرا پیر ہلا کر بتایا' کھلا ہوا ہے۔ کوٹھڑی میں اتنا اندھیرا تھا کہ میں میران خان کو پہچان نہیں سکا۔ وہ کوٹھڑی سے باہر چلا گیا اور میں دم سادھے پڑا رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے آہستہ سے کروٹ لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ والا گہری نیند سو رہا تھا۔ میں کوٹھڑی سے باہر آیا۔ دلان سے گزر کر وہڑے میں گیا اور دبے دبے چلتا ہوا دروازے پر پہنچا۔"

"تیں نوں پتہ تھا دروازہ کھلا ہے؟"

"ہاں جی' میں نوں اسی وکت کچھ اندازہ ہو گیا تھا جب میرے پیر کا کڑا کھولا گیا تھا۔" اللہ دتا نے بتایا۔ "میرا وچار ٹھیک نکلا۔ میں نے باہر والے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ کھل گیا۔ میں باہر نکلا۔ گھر والی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میران خاں دروازے کا تالا بند کرنے لگا اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ کلراٹھی سے نکل کر پنڈ پہنچے' بچوں کو ساتھ لیا' ضرورت کا سامان گٹھڑی میں باندھا اور نکل کھڑے ہوئے۔ سویرا ہونے تک ہم پنڈ سے بہت دور نکل جانا چاہتے تھے۔"

"تیری گھر والی نے بتایا' اس نے تجھے کس طرح چھڑایا؟"

"اس نے رستے میں مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں نے میران خاں سے اس کی یاری کی گل سنی تو بہت گرم ہوا۔ وہ بھی گرم ہو گئی' بگڑ کر بولی۔ زمیں دار کے پاس جب میں ڈیڑھ برس سے بھی او

رہی اور حرام کا نکا بھی جن کر ساتھ لائی تب توں نے کچھ نہ کہا۔ اب میں نے تجھے چھڑانے کے لیے میران سے یاری لگالی تو ناراض کیوں ہوتا ہے؟"

"گل تو اس نے ٹھیک ہی کہی تھی۔" لالی ہنس کر بولا۔ "پر تو نے اپنے بھائی اللہ دتو کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس کا کیا بنا؟"

"وہ جی' ابھی تک کلراٹھی کی جیل میں ہے۔ نور بخش کھوکھر نے اسے سال بھر بعد بھی نہیں چھوڑا۔ وہ میرا بدلہ اس سے لے رہا ہے۔" اللہ دتا نے لالی کو مطلع کیا۔ "وہ ایسا ہوا جی کہ اللہ دتو اور میں شروع میں رات کو ایک ہی زنجیر سے پیروں میں کڑے ڈال کر جکڑ دیئے جاتے پر بعد میں ہم دونوں کو الگ الگ کیدیوں کے ساتھ کر دیا گیا۔ میں نے جیل سے باہر آنے کے بعد میران خاں کی بہت منت کی۔ گھر والی نے بھی اس کو منانے کی کوشش کی پر وہ کسی طرح اللہ دتو کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوا۔ بلکہ میرے گڑگڑانے پر ایک دم بھڑک اٹھا۔ ایسا ناراض ہوا کہ مجھ پر بندوک تان کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے اتنا گرم دیکھا تو ڈر گیا۔ بات یہ ہے کلراٹھی کے سارے ہی راکھے بہت ظالم اور خوں خوار ہیں۔ میران خاں تو سب سے زیادہ ظالم اور خونی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' ایک کیدی کو جھگڑا کرنے پر میران خاں نے گولی سے اڑا دیا۔ ڈز ڈز فیر کیے۔ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ وہ گبھرو جوان تھا۔ کچھ دیر اپنے ہی خون میں پڑا تڑپتا رہا۔ فیر اس نے دم توڑ دیا۔ کسی نے ڈر کے مارے اس کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ سب اپنا کام کرتے رہے۔"

"کسی کیدی نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی؟"

"دو نے ایسی کوشش کی تھی۔ ان میں سے ایک تو بھاگتے ہوئے راکھوں کی گولیوں سے مارا گیا۔ دوسرا نکل گیا۔ مگر راکھے بعد میں اسے بھی پکڑ لائے اور گولی مار کر اس کا بھی خون کر دیا۔ جو بھی راکھوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے' اسے کلراٹھی سے کچھ دور گڑھا کھود کر دبا دیتے ہیں۔ نہ اس پر کفن ڈالا جاتا ہے نہ اسے نہلایا جاتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں چپ چاپ زمین میں گاڑ دیتے ہیں۔ میرے سامنے تین کیدی مارے گئے۔"

"اللہ دتو کے بارے میں تیں نوں پتہ ہے' وہ زندہ ہے؟" لالی نے پوچھا۔

"ہن جی' یہ تو پتہ ہے۔ ویسے وہ ہے تو تکڑا جوان' پر اسے گنہ کم ہی آتا ہے۔ ویسے بھی سارے ہی کیدی راکھوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ جیسا راکھے کہتے ہیں' ویسا ہی کرتے ہیں۔ ہر بات چپ کر کے مان لیتے ہیں۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "زمیں دار تو میرے سامنے کبھی کلراٹھی پر نہیں یا' پر اس کا منشی دلاور لنگاہ ہفتے میں ایک بار دورے پر ضرور آتا ہے۔"

”یہ بتا، تو نے اللہ دِتو کو چھڑانے کے لیے کیا کیا؟“

”نہ پوچھ، کیا نہیں کیا۔ میں نے پولیس میں پرچہ چاک کرایا۔ اس پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی تو اوپر درخواستیں لگائیں، چٹھیاں بھیجیں، خود شہر گیا۔ افسروں کے سامنے گڑگڑایا، فریاد کی پر کچھ بھی نہ بنا۔ نور علی کھوکھر کو ان باتوں کا پتہ چل گیا۔ اس نے مجھ پر حملہ کرا دیا۔ میں ان دنوں نیلا ڈوبا میں تھا۔ علی شاہ چھوڑ کر وہیں چلا گیا تھا۔ ادھیارے پر نو کلّا زمیں لے لی تھی۔ اس طرح میں پاہی بن گیا۔ ادھیارے کی پہلی فصل خریف کی تھی۔ میں نے بڑی محنت کی۔ پھٹی اور کماد بہت چنگی رہی۔ فصل تیار کھڑی تھی۔ پھٹی کی چنائی شروع ہونے والی تھی۔ میں نے چنائی کے لیے جوگیوں سے بات بھی کر لی تھی۔ لو جی، ایک رات کھوکھر کے کرندے رائفلوں اور برچھیوں سے مسلح ہو کر نیلا ڈوبا پہنچے۔ سردی تو اس رات زیادہ نہیں تھی۔ پر دھند بہت تھی۔ انھوں نے پنڈ میں گھستے ہی اندھا دھند گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ پر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی میں نے گھر والی کا ہاتھ پکڑا اور گھر سے نکل کر مکئی کے کھیت میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہ دروازہ توڑ کر گھر میں گھس گئے اور توڑ پھوڑ کر کے چلے گئے۔ جاتے جاتے میری واڈھو فصل کو آگ لگا دی، گھر کو نہیں لگائی۔ اس میں تینوں بچے تھے، جل کے راکھ ہو جاتے۔ میں نے تب نیلا ڈوبا چھوڑ دیا اور اپنے ایک شریکے کے پاس داؤد پور چلا گیا۔ نیلا ڈوبا نہ چھوڑتا تو کھوکھر مجھے جان سے مار دیتا۔“

”جب یہ بات ہے تو ادھر کیسے آ گیا؟“

”میں جی اللہ دِتو کو چھڑانے آیا ہوں۔ کل کلراٹھی پر کام بند رہے گا۔ آج رات بھی ایک ہی راکھا ڈیوٹی پر رہے گا۔“

”پر کل تو عید نہیں ہے۔ کلراٹھی پر چھٹی کیسے ہو گئی؟“

”کل رات نور علی کھوکھر کی ماں کی موت ہو گئی۔ اس لیے کلراٹھی پر دو روز کام بند رہے گا۔ یہ بات مجھے کل سویرے کلراٹھی کے ایک راکھے کے ذریعے ملوم ہو گئی۔“

”وہ راکھا میراں خاں ہو گا؟“

”نہیں جی، میراں خاں کو تو کھوکھر نے نوکری سے نکال دیا۔ اسے تو کلراٹھی چھوڑے ہوئے بھی دو مہینے سے اوپر ہو گئے۔ پتہ نہیں کہاں گیا۔ مجھے کلراٹھی کا جو راکھا ملا تھا، اس کا ناں طور محمد لکھیرا ہے۔ آج رات وہ اکیلا کلراٹھی کی رکھوالی کرے گا۔ دوسرے راکھے شام کو اپنے گھروں کو چلے جائیں گے۔“

لالی نے اسے چھیڑا۔ ”آج بھی تو اپنی گھر والی کو ساتھ لایا ہو گا؟“

”نا جی، ایسی کوئی گل نہیں۔“ اللہ دتا نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”طور محمد لکھیرا ایک ہزار روپے لے کر اللہ دِتو کو چھوڑنے پر راضی ہو گیا ہے۔ طور محمد لکھیرا خود بھی کلراٹھی چھوڑ کر بھاگنا چاہتا ہے۔ ہزار روپے مل گئے تو وہ آج ہی بھاگ جائے گا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ ”تو جانتا ہے، میرے پاس اب کچھ بھی نہیں رہا۔ چوکھر چرانے والا غریب چاک ہوں۔ ہزار روپیہ کہاں سے لاتا۔ جب کچھ بن نہ پڑا تو گھر والی کو داؤد پور کے سنار کے پاس سرگانے پر رکھ کر ہزار روپیہ ادھار لیا۔ تیں نوں تو پتہ ہی ہے، جب تک ادھار ادا نہ ہو گا تب تک وہ اس کے گھر میں دیگار کرے گی۔ ہر طرح کا کام کرے گی۔ یوں سمجھو اس کے پاس گروی رہے گی۔ کیا کریں جی، اللہ دِتو کو رہائی دلانی بھی تو ضروری ہے۔ وہ اہری اور محنتی ہے۔ وہ آ گیا تو ہم دونوں بھائی محنت کر کے گھر والی کو سال بھر میں ادھار ادا کر کے سرگانے سے چھڑا کر واپس لے آئیں گے۔“

لالی نے اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔ ”تو کبھی جہانگیرہ گیا ہے؟“

”کیوں نہیں گیا۔ سڑک کے ساتھ ہی ہے۔ وہاں میرا ایک پچھیرا رہتا ہے۔ میں تو جہانگیرہ کے لمبردار ملک اللہ نواز خاں کو بھی جانتا ہوں۔ ویسے تو اس کی کوم کھٹیانہ ہے، پر اس کا پیو خوشاب سے ملکوں کی کڑی ویاہ لایا تو خود ملک بن گیا اور اس کا پت تو بالکل ملک بن گیا۔ یہ لمبے طرے کی پگ لگاتا ہے۔ گھوڑی پر بیٹھ کر ایسی آکڑ کے ساتھ نکلتا ہے جیسے بہت وڈا زمیں دار ہے۔ تیں نوں پتہ نہیں وہ زبردست رساگیر ہے اور جب سے اس کا ایک بھرا تھانے دار لگ گیا ہے، اس وکت سے تو وہ ایسا نڈر ہو گیا کہ کھلم کھلا رساگیری کا دھندا کرتا ہے۔ میں تجھے اس کے بارے میں ایک گل بتاؤں۔“

”نہ بتا تو ٹھیک ہے۔“ لالی جہانگیرہ کے زمیں دار ملک اللہ نواز کے ذکر سے بے زار ہو کر بیچ میں بول پڑا۔ ”یہ بتا، داؤد پور سے جہانگیرہ کتنی دور ہے؟“

”باراں میل سے زیادہ نہیں ہو گا۔ پر تسیں جہانگیرہ کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟ تیں نوں تجھے وہاں جانا ہے؟“

”ہاں میں نوں وہاں جانا ہے۔ مجھے جہانگیرہ پہنچا دینا، میں ہزار روپے رشوت دیے بنا اللہ دِتو کو نکال لاؤں گا۔ اللہ دِتو کو بھی اپنے ساتھ لے جانا اور ہزار روپے سرگانے کے دے کر اپنی گھر والی کو لے آنا۔ وہ سرگانے پر گردی نہیں رہے گی۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ اللہ دتا نے حیرت سے منہ پھاڑ کر کہا۔ ”تیری گل بالکل سمجھ نہیں آئی۔“

”آ بھی نہیں سکتی۔“ لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اسے مجھ پر چھوڑ دے۔“

اللہ دتا نے کچھ نہیں کہا۔ وہ ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

☆

فراش کے گھنے درختوں کے نیچے روشنی دھندلی تھی۔ آس پاس جھنگر تھا جو دور تک چلا گیا تھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ سامنے چٹیل میدان تھا، جس پر تیز دھوپ پھیلی تھی۔ میدان کے آخری سرے پر اونٹوں کی قطار گرد کے بادل اڑاتی گزر رہی تھی۔ اونٹوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی پیتل کی گھنٹیاں آہستہ آہستہ جھنکار رہی تھیں۔

اللہ دتا نے لالی کو مخاطب کیا۔ "یہ اونٹھ دیکھ رہا ہے۔ لگتا ہے، کلراٹھی سے آرہے ہیں۔ ان پر کچا شورہ لاد کر ٹیشن بھیجا جا رہا ہے۔ وہاں کھوکھر کا منشی ہو گا۔ وہ ریل سے اوکاڑے بھیج دے گا۔ وہاں کارخانے میں اسے صاف کیا جائے گا۔"

مگر لالی کو شورے سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے سویرے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اب دوپہر ہو چکی تھی۔ اسے سخت بھوک لگی تھی۔ اس نے اللہ دتا سے پوچھا۔

"تو یہاں کب آیا تھا؟"

"سویرے ہی آگیا تھا۔ میں نے تجھے دیکھا تھا۔ دو تین بار نزدیک سے گزرا، توں بے خبر سو رہا تھا۔ میں سمجھا کوئی تجھے مار کر یہاں ڈال گیا ہے۔ تیرے ہاتھ کی گھڑی دیکھ کر میں نوں لالچ آگیا۔" اس نے شرمندہ ہو کر نظریں جھکالیں۔ "معاف کرنا جی، غلطی ہو گئی۔ میں تو یہاں چھپنے کے لیے آیا تھا۔"

"پر تو نے صبح سے کچھ کھایا نہیں۔ تجھے بھوک نہیں لگی؟"

"لگ تو رہی ہے، گھر سے روٹی لایا تھا۔" اس نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "ادھر جھنگر میں چدر سے باندھ کر رکھ دی ہے۔"

"یہ چنگا کام کیا۔ میں تو تجھے علی شاہ بھیجنے والا تھا، وہاں سے جا کر روٹی شوٹی لے آ۔"

"نہیں جی، علی شاہ جانا ٹھیک نہیں۔ وہاں گیا تو کھوکھر کو پتہ چل جائے گا۔ سارے کمی اور مزارعے اسی کے بندے ہیں۔ کسی نے کھوکھراں جا کر اسے میرے بارے میں بتایا تو وہ چوکنا ہو جائے گا۔ فیر تو اللہ دینو کو نکال لانا مشکل ہو جائے گا۔ وہ ضرور اپنے کسی کرندے کو شام سے پہلے پہلے کلراٹھی پر بھیج دے گا۔ میں تو کہتا ہوں جی، علی شاہ میں کسی کو بالکل پتہ نہیں چلنا چاہیے۔"

"اب باتیں چھوڑ، جا کر روٹی ٹکر لا۔" لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میں نوں سخت بھوک لگی ہے۔ میں بھی تیرے ساتھ کچھ کھالوں گا۔"

"پروا نہ کر۔ روٹی اتنی ہے، دونوں کھا سکتے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "پینے کو ٹین کے ڈبے میں پانی بھی ساتھ لایا ہوں۔ نہر کا تو میں نوں پتہ ہی نہیں تھا اس میں پانی ہو گا۔ آج کل تو بالکل سوکھی رہتی ہے۔"

اللہ دتا اٹھ کر درختوں کے نیچے چلنے لگا۔ کچھ دور جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد اللہ دتا ایک گھنے درخت کی آڑ سے نمودار ہوا۔ قریب آیا تو اس کے ہاتھ میں پوٹلی اور ٹین کا ڈبا لٹک رہا تھا۔

وہ لالی کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے چادر کھولی۔ اندر سے چار موٹی موٹی روٹیاں نکلیں۔ ان کے ساتھ چنے کی نرم کونپلوں کا پکایا ہوا پلی کا ساگ اور پیاز کی دو گٹھیاں تھیں۔ اللہ دتا نے مسکرا کر روٹیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ گوگیاں ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے ہی پکائی تھیں۔ کیا کریں جی، گھر والی تو ہے نہیں۔ خود ہی روٹی پکانی پڑتی ہے۔"

لالی نے کچھ نہیں کہا، لقمہ توڑا اور ساگ ملا کر کھانے لگا۔ اللہ دتا بھی کھانے لگا۔ روٹی باسی تھی۔ سخت بھی تھی، مگر دونوں بہت بھوکے تھے۔ اطمینان سے بیٹھے کھاتے رہے۔ نوالہ حلق میں پھنستا تو ڈبا منہ سے لگا کر پانی پی لیتے۔ چار روٹیوں میں دونوں کا پیٹ بھر گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر اللہ دتا نے پوچھا۔ "یہ تو بتایا نہیں توں طور محمد لکھیرا کو ہزار روپے دیئے بنا اللہ دینو کو کیسے نکال لائے گا؟"

"اندھیرا ہو جانے دے۔ میں تیرے ساتھ کلراٹھی چلوں گا۔" لالی نے جواب دیا۔ "وہاں جا کر آس پاس کا معائنہ کروں گا۔ جیسا تجھ سے کہوں ویسا ہی کرنا۔"

"پر یہ جان لے۔ راکھے کے پاس بھری ہوئی رائفل رہتی ہے۔" اللہ دتا کے چہرے پر خوف کی پرچھائیں منڈلانے لگی۔ "کوئی گڑبڑ ہو گئی تو دونوں مارے جائیں گے۔"

"حوصلے سے کام لے۔" لالی نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ "پروا نہ کر، سب ٹھیک ہی ہو گا۔"

"توں پولسیا تو نہیں ہے؟" اللہ دتا نے لالی کی ملگجی پتلون اور بش شرٹ غور سے دیکھی۔ "لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔"

"نہیں جی، میں پولسیا سٹیا نہیں ہوں۔ خاماخا کی باتیں سوچنا چھوڑ۔ اب توں آرام کر اور اندھیرا پھیلنے کا انتظار کر۔"

اللہ دتا نے زمین پر چادر پھیلا دی۔ دونوں اس پر لیٹ گئے۔ لالی ذرا دیر آنکھیں بند کیے پڑا رہا، پھر اسے نیند آگئی۔

دن ڈھلنے لگا۔ سورج رفتہ رفتہ مغرب میں اترنے لگا۔ دھوپ کی رنگت بدلنے لگی۔ سائے طویل ہوتے گئے۔ فراش کے درختوں کے نیچے اندھیرا پھیلنے لگا۔ جھاڑیوں میں چڑیوں نے شور مچانا شروع کردیا۔

شام کی آمد آمد تھی۔ لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اللہ دتا موجود نہیں تھا۔ لالی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ادھر ادھر نظریں دوڑا کر اللہ دتا کو تلاش کرنے لگا۔ مگر اس کا دور دور پتہ نہ تھا۔ لالی کو تشویش ہوئی۔ وہ حیران و پریشان بیٹھا سوچتا رہا کہ اللہ دتا کہاں چلا گیا۔ دو منٹ گزرے‘ پانچ منٹ گزرے‘ دس منٹ گزر گئے۔

لالی کی تشویش بڑھتی گئی۔ وہ اٹھ کر میدان میں جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ درختوں کے خشک پتوں پر آہٹ ابھری۔ لالی چوکنا نظروں سے اس طرف دیکھنے لگا۔ آہٹ قریب‘ اور قریب آتی گئی۔ ایک درخت کے تنے کے پیچھے سے اللہ دتا نکل کر سامنے آگیا۔

”کہاں چلا گیا تھا؟“

”میں جی‘ ادھر جھنگر میں ٹٹی کرنے گیا تھا۔“

اللہ دتا آگے بڑھا اور لالی کے قریب بیٹھ گیا۔ دونوں خاموش رہے۔ شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھتا گیا۔ سناٹا گہرا ہوگیا۔ جھنگر میں جھینگروں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ اندھیرا گہرا ہوگیا۔ رات ہوگئی۔

جب پہر رات گزر گئی اور ہر طرف ہو کا عالم طاری ہوگیا تو دونوں اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ اللہ دتا نے چادر اٹھا کر کندھے پر ڈالی۔ لالی آگے بڑھا۔ اللہ دتا اس کے ساتھ چلا۔ دونوں درختوں کے نیچے سے نکل کر کھلے میدان میں آگئے۔

آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ نرم نرم جھونکے چل رہے تھے۔ وہ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے احتیاط سے کلراٹھی کی جانب بڑھنے لگے۔ دونوں کچھ دور آگے گئے تو میدان میں جگہ جگہ لانا کے پودوں کے جھنڈ نظر آنے لگے۔ لانا کے پودے کمر کمر تک اونچے تھے۔ وہ کھلے میدان سے ہٹ کر لانا کے پودوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ خطرے کے وقت وہ لانا کے پودوں کی اوٹ میں چھپ سکتے تھے۔ انھوں نے نصف میل سے زیادہ راستہ لانا کے پودوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے طے کیا۔ آگے لق ودق ریتلا میدان تھا۔

میدان کے سرے پر ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں پانی کی وسیع جھیل جھلملا رہی تھی۔ لالی نے اسے حیرت سے دیکھا اور ہاتھ اٹھا کر اس طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”ادھر اتنا پانی کہاں سے آگیا؟“

”تو اسے پانی کی جھیل سمجھ رہا ہے؟“ اللہ دتا ہنس کر بولا۔

”تب تو یہ ڈاہر ہوگا۔ روہی کے علاکے میں ریت کے ٹیلوں کے درمیان میں نے ایسے ڈاہر دیکھے ہیں۔ بہت دن ہوئے‘ میں ایک بار گرمیوں میں ادھر گیا تھا۔“

اللہ دتا نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”نہیں جی! یہ تو باڑہ ہے۔ اس سے بہت دھوکا ہوتا ہے۔ اس وکت تو خشک ہے اور بہت سخت ہے۔ پر جب بارش ہوتی ہے تو باڑھے کی مٹی بھیگ کر اتنی نرم پڑ جاتی ہے کہ دلدل بن جاتی ہے۔ یہ دلدل بہت خطرناک ہوتی ہے۔ پیر رکھتے ہی بدن اندر دھنستا چلا جاتا ہے۔“

لالی نے اس کی باتیں توجہ سے سنیں۔ دونوں آگے بڑھتے رہے۔ اللہ دتا کی بات ٹھیک تھی۔ باڑہ مانند سراب تھا۔ دونوں جس قدر آگے بڑھتے‘ پانی کی جھلملاتی جھیل نظروں سے دور ہوتی جاتی۔ کچھ دیر بعد وہ باڑھے کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ اس کی مٹی سخت‘ چکنی اور چمک دار تھی۔ اس میں نمکیات اور القلی کی آمیزش تھی۔ زمین اتنی سخت تھی کہ چلتے ہوئے قدموں کی آہٹ صاف سنائی دیتی تھی۔

دور دور تک سبزے کا نام ونشان نہ تھا۔ پودوں اور جھاڑیوں کا ذکر کیا‘ جنگلی جڑی بوٹیاں تک نہ تھیں۔ صرف اجلا اجلا سفید چٹیل میدان تھا۔ دونوں نے باڑہ عبور کیا تو ایک مرتبہ پھر لانا اور پھوگ کے جھنڈ نظر آنے لگے۔

وہ آگے بڑھتے گئے۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔ خاموشی بہت گہری تھی۔ انھوں نے لگ بھگ چار میل فاصلہ طے کیا تو دور سے روشنی ٹمٹماتی نظر آئی۔

اب لانا کے پودوں کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں جال کے درخت بھی سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ان کے تنے چھوٹے چھوٹے تھے۔ مگر شاخیں خوب گھنی اور گول دائرے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ جال‘ خودرو صحرائی درخت ہے۔ اس کی شاخوں اور جڑوں کی مسواک بنتی ہے۔ جون کا تپتا ہوا مہینہ ختم ہوتے ہی جب بادل گھر کر آتے ہیں اور رم جھم مینہ برستا ہے تو جال کے درختوں میں پھل لگتے ہیں۔ یہ سرخ سرخ پیلو ہوتے ہیں جنہیں ذوق و شوق سے کھایا جاتا ہے۔ میانوالی کے تھل میں‘ چولستان اور بھاول پور کے ریگستانوں مین جال کے درخت کثرت سے ہوتے ہیں۔ ان میں پیلو لگتے ہیں تو ریگ زاروں کی پروردہ الھڑ دوشیزاؤں کی ٹولیاں پیلو چننے کے لیے صحرا میں نکل جاتی ہیں۔ پیلو

چن چن کر جگہ جگہ اونچی ڈھیریاں لگاتی ہیں۔ جال کے گھنے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر پیلو کے گیت گاتی ہیں۔

آچنوں رل مل یار
پیلو پکیاں نی
پکیاں گل گلنار
پیلوں پکیاں نی
پیلوں چٹروین جیٹھ مہینے
تھل دیاں جٹیاں مارن سینے

وہ پیلو چنتی ہیں۔ قہقہے لگاتی ہیں۔ لہک لہک کر گاتی ہیں اور گیت کے بولوں کے ذریعے آپس میں یوں چھیڑ چھاڑ کرتی ہیں۔ ”آ“ میرے محبوب! مل جل کر پیلو چنیں۔ پیلو پک کر گل گلنار کے مانند سرخ پڑ گئے ہیں۔ جیٹھ کا مہینہ ہے۔ ریگستان میں پلنے والی کنواریں سینہ ابھار کر چلتی ہیں اور پیلو چنتی ہیں۔“

مگر اس سنسان رات میں نہ جال کے درختوں میں پیلو لگے تھے اور نہ صحرائی دوشیزائیں پیلو چنتے ہوئے لہک لہک کر گا رہی تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اللہ دتا اور لالی روشنی کی جانب بڑھتے جا رہے تھے۔ روشنی قریب آ گئی۔ اللہ دتا نے روشنی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مدھم لہجے میں لالی کو بتایا۔

”سامنے کلراٹھی ہے۔ بول آگے کیا کرنا ہے؟“

”سیدھا پہرے دار طور محمد لکھیرا کے پاس چلا جا۔ ہزار روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دینا۔ روپے دیکھ کر وہ مگن ہو جائے گا۔ میں جال کے درختوں کی آڑ لیتا ہوا اس کے نزدیک پہنچ جاؤں گا۔“

اللہ دتا نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”فیر کیا ہو گا؟“

”آگے جو کچھ ہو گا‘ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔“ لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”تو آگے بڑھتا جا۔“

اللہ دتا نے ایک بار پھر خدشہ ظاہر کیا۔ ”سوچ لے‘ کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ راکھے کے پاس بھری ہوئی رائفل ہے۔“ اس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ وہ گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”میں نوں پتہ ہے پہرے دار کے پاس بھری ہوئی رائفل ہے۔“ لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ڈر نہیں‘ حوصلے سے کام لے۔ سب ٹھیک ہو گا‘ پروا نہ کر۔“

ہلکی روشنی میں بیگار کیمپ کے دھندلے دھندلے نشانات نظر آنے لگے تھے۔ آگے بہت وسیع کلّر میدان تھا جس کی تھور زدہ زمین پر کھار کی جمی ہوئی سفید تہہ دور سے اجلی اجلی نظر آ رہی تھی۔ میدان کے آس پاس جال کے گھنے درخت تھے۔ میدان سے ذرا ہٹ کر ایک کچا راستہ بیگار کیمپ تک جاتا تھا۔

لالی نے اللہ دتا کو اس راستے پر چلنے کا اشارہ کیا اور خود علیحدہ ہو کر درختوں کی آڑ میں دبے دبے قدموں چلنے لگا۔

اللہ دتا آگے بڑھا۔ اس کی چاپ ابھری تو دور سے آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

اللہ دتا نے آواز پہچان لی۔ یہ پہرے دار کی آواز تھی۔ اللہ دتا نے جواب دیا۔ ”میں ہوں جی‘ اللہ دتا۔“ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا۔

پہرے دار ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں بندوق سنبھالے اس کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچ کر ٹھٹکا۔ ہاتھ اٹھا کر لالٹین اونچی کی اور اللہ دتا کو پہچاننے کی کوشش کی۔ جب اسے اطمینان ہو گیا تو اس نے کہا۔ ”توں آ گیا؟“

اللہ دتا نے جواب دیا۔ ”توں نے بلایا جو تھا۔“

اللہ دتا اس کے بالکل قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ طور محمد لکھیرا نے مسکرا کر کہا۔ ”بہت دیری کر دی توں نے۔ میں دیر سے تیرا انتظار کر رہا ہوں۔“

اللہ دتا نے معذرت کے انداز میں کہا۔ ”ہاں جی‘ کچھ دیر ہو گئی۔“

”روپے لایا ہے؟“

اللہ دتا نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”بالکل لایا ہوں۔ روپے نہ لاتا تو تیرے کول کیوں آتا۔“

”آ میرے ساتھ‘ ادھر منجی پر بیٹھ کر آرام نال گل بات ہو گی۔“

دونوں کلراٹھی کی اس عمارت کی جانب بڑھنے لگے جس میں بیگار کرنے والے مزدور قیدی رکھے جاتے تھے۔

لالی ایک درخت کی آڑ میں دم سادھے کھڑا تھا۔ عمارت اس کے بالکل سامنے تھی۔ یہ عمارت مٹی کی بنی ہوئی تھی اور کسی پرانے قلعے کے مانند نظر آتی تھی۔ اس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواروں کی فصیل تھی۔ قریب ہی چند نیم پختہ مکانات تھے۔ ان میں پہرے دار اور نوکر چاکر رہتے تھے۔ کلراٹھی میں جگہ جگہ بھٹیاں تھیں۔ ایک بڑی بھٹی بھی تھی جس کی پختہ چمنی بلندی تک چلی

گئی تھی۔

کلرا ٹھی اور اس کے بیگار کیمپ پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ صرف ایک پہرے دار طور محمد لکھیرا ڈیوٹی پر تھا۔ دوسرے پہرے دار اور نوکر چاکر شام کو اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ کلرا ٹھی پر کام بند ہوتا تو وہ اسی طرح چپکے سے کھسک جاتے تھے۔ حالانکہ ان کے لیے یہ حکم تھا کہ منشی کی اجازت کے بغیر بیگار کیمپ چھوڑ کر نہ جائیں۔ مگر رات کو اس ویرانے میں نور علی کھوکھر اور اس کے منشی کے آنے کا کوئی امکان نہیں تھا' لہٰذا وہ چھٹی کے موقعے پر رات کو چلے جاتے اور صبح تڑکے واپس آجاتے۔

پہرے دار اور اللہ دتا آہستہ آہستہ قید خانے کی عمارت کے قریب پہنچ گئے۔ قید خانے میں آمدورفت کے لیے صرف ایک دروازہ تھا اور اس پر تالا پڑا تھا۔ دروازے کے عین سامنے چارپائی بچھی تھی۔ پہرے دار نے لالٹین چارپائی کے قریب رکھ دی۔ البتہ بندوق اس کے ہاتھ میں بدستور دبی ہوئی تھی۔

وہ اللہ دتا کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اپنے ڈیل ڈول کے اعتبار سے برچھا لگتا تھا۔ اس کا قد لمبا' جسم چوڑا چکلا اور مضبوط تھا۔ مونچھیں گھنی تھیں۔ چہرہ ایسا کرخت اور درشت تھا کہ سخت ہیبت ناک نظر آتا تھا۔

لالی درختوں کی آڑ لیتا کھنڈر کے قریب پہنچ گیا۔ یہ کوئی اجڑی ہوئی قدیم بستی تھی۔ اس کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں اس قدر شور زدہ تھیں اور ان پر کھار کی تہہ اس طرح بہتات سے چڑھی تھی کہ وہ برف پوش نظر آتی تھیں۔

شور زدہ کھنڈر سے قید خانے کی عمارت زیادہ دور نہیں تھی۔ لالی وہاں سے پہرے دار اور اللہ دتا کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ وہ شکستہ دیوار کی آڑ میں دبکا ہوا تھا۔ اس کی نظریں پہرے دار اور اللہ دتا کی جانب تھیں۔

لالی سانس روکے چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا۔ اللہ دتا نے دھوتی کے ڈب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور پہرے دار کو تھما دی۔ پہرے دار گردن جھکا کر نہایت انہماک سے نوٹ گننے لگا۔ کھنڈر اور عمارت کے درمیان کھلی جگہ تھی۔ اسے عبور کرنا سخت خطرناک تھا۔ پہرے دار کی نظر لالی پر پڑ سکتی تھی۔ مگر وہ اپنے گردوپیش سے بے خبر نوٹ گننے میں محو تھا۔

لالی نے جھپاک سے درمیانی فاصلہ طے کیا۔ لالٹین کی دھندلی روشنی میں اس کا سایہ لہرایا۔ پہرے دار نے پلٹ کر دیکھا۔ لالی فوراً قید خانے کی دیوار سے چمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ پہرے دار گردن

موڑے دیکھتا رہا۔ اللہ دتا کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ چھا گئی۔ وہ نظریں جھکائے پہرے دار کے برابر خاموش بیٹھا رہا۔ کوئی نظر نہیں آیا تو پہرے دار نے گردن جھکا کر پھر نوٹ گننا شروع کر دیئے۔

لالی دیوار سے لگا دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ اس کے عقب میں پہنچا۔ تیزی سے اچھلا' پہرے دار کے سر پر پہنچا اور ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کی گردن دبوچ کے تیزی سے جھٹکا دیا۔ پہرے دار کے زانو پر رکھی ہوئی بندوق پھسل کر نیچے گر گئی۔ اللہ دتا ہکا بکا ہو کر خوف زدہ نظروں سے لالی کو تکنے لگا۔ لالی نے اسے زور سے ڈانٹا۔

"منہ کیا تک رہا ہے۔ اٹھا لے بندوک۔"

اللہ دتا نے جھک کر بندوق اٹھالی۔ پہرے دار نے گردن نیچی کرتے ہوئے زور آزمائی کی۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر لالی کی کلائی پکڑ لی اور اسے زور سے کھینچا۔ اس طرح لالی کی گرفت سے اس نے اپنی گردن چھڑالی۔

پہرے دار طور محمد لکھیرا بندوق چھیننے کے لیے اللہ دتا پر جھپٹا۔ لالی نے تیزی سے بڑھ کر پھر اس کی گردن دبوچنے کی کوشش کی۔ مگر پہرے دار بہت مضبوط اور طاقت ور تھا۔ اس دفعہ وہ لالی کی گرفت میں نہیں آیا۔ اس نے اٹھ کر اللہ دتا کے ہاتھ پر زور سے تھپکی دی۔ بندوق اللہ دتا کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

پہرے دار اسے اٹھانے کے لیے لپکا۔ لیکن لالی نے اسے اتنی مہلت نہیں دی۔ وہ پیچھے ہٹ کے اچھلا اور سر جھکا کے پہرے دار کے منہ پر پوری قوت سے ٹکر ماری۔ چوٹ کاری آئی۔ پہرے دار سنبھل نہ سکا' چارپائی پر چاروں خانے چت گرا۔ لالی نے اسے کروٹ بھی نہ لینے دی۔ چارپائی اٹھا کر پلٹ دی۔

پہرے دار لڑھک کر نیچے آگیا۔ چارپائی اس کے اوپر گری۔ اس نے چارپائی کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ چارپائی ہٹا کر باہر آتا' لالی نے جھٹ بندوق اٹھالی۔ بندوق ہاتھ میں لیتے ہی لالی کو اندازہ ہو گیا کہ وہ بندوق نہیں رائفل ہے۔ لالی نے رائفل کی نال پہرے دار کی جانب کر دی۔ ڈپٹ کر خبردار کیا۔

"اٹھنے کی کوشش کی تو گولی چلا دوں گا۔"

پہرے دار نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ جس طرح چارپائی کے نیچے فرش پر پڑا تھا' ویسے ہی پڑا رہا۔ اس کا چہرہ اور دھڑ کا اوپری حصہ چارپائی سے باہر نکلا ہوا تھا۔ لالٹین اپنی جگہ رکھی تھی۔

اس کی روشنی میں نوٹ ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ پہرے دار خاموش پڑا لالی کو خوں خوار نظروں سے گھورتا رہا۔

لالی رائفل تانے کھڑا رہا۔ اللہ دتا جلدی جلدی بکھرے ہوئے نوٹ اٹھانے لگا۔ نوٹ اکٹھے کر کے اس نے دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے۔ لالی نے اسے مخاطب کیا۔ "اللہ دتا! پگڑی اتار۔" اس نے پہرے دار طور محمد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے دونوں ہاتھ پگڑی سے باندھ دے۔"

اللہ دتا نے سر سے پگڑی اتاری۔ لکھیرا کے پاس گیا اور اس کے دونوں ہاتھ پگڑی سے کس کر باندھنے لگا۔ پہرے دار غصے سے بولا۔ "توں نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔"

اللہ دتا تو خاموش رہا لیکن لالی نے اسے ڈانٹا۔ "بکواس نہ کر‘ چپ کر کے پڑا رہ۔" پہرے دار نے پھر کچھ نہیں کہا۔

اللہ دتا نے اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر مضبوط گرہ لگادی۔ لالی نے اسے حکم دیا۔ "اب منجی اٹھادے۔" اللہ دتا نے پہرے دار پر پڑی ہوئی چارپائی اٹھادی۔

لالی نے پہرے دار سے پوچھا۔ "اٹھ کر بیٹھ۔ بتا جیل کے دروازے کی چابی اور دوسری چابیاں کہاں ہیں؟"

لکھیرا نے کمر پر کہنی مار کر اشارہ کیا۔ اللہ دتا نے بڑھ کر اس کا کرتا اٹھایا۔ کمر پر کنجیوں کا گچھا لٹک رہا تھا۔ اللہ دتا نے گچھا کھول کر اپنے قبضے میں کرلیا۔ لالی نے کہا۔ "اللہ دتا! دروازہ کھول کے اندر جا اور اللہ دینو کو نکال لا۔"

اللہ دتا آگے بڑھا۔ اس نے لالٹین اٹھائی‘ تالا کھولا اور قید خانے کے اندر چلا گیا۔ لالی رائفل کی نال پہرے دار پر تانے چوکس کھڑا رہا۔ پہرے دار گردن جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

☆

اللہ دتا ہاتھ میں لالٹین لٹکائے دروازے سے نکلا۔ اس کے ہم راہ اللہ دینو بھی تھا۔ اس کی عمر اکیس بائیس سال ہوگی۔ چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ ڈاڑھی اور مونچھیں بڑھ کر بے ترتیب ہوگئی تھیں۔ وہ پھٹی ہوئی بوسیدہ قمیص پہنے تھا۔ دھوتی بھی میلی کچیلی تھی۔ نہ پیروں میں جوتے تھے نہ سر پر پگڑی۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے لالی کو دیکھنے لگا۔

اللہ دتا بولا۔ "یہ اللہ دینو ہے جی۔"

لالی نے اللہ دینو کو قریب بلایا اور ایک ہاتھ سے اس کی پیٹھ تھپک کر دل جوئی کی۔ "اتنا ذرا سا کیوں ہے؟ اب تو اس جیل سے چھوٹ گیا۔" اس نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ "فٹافٹ اس کی ادوائن کھول لے۔"

اللہ دینو خاموشی سے آگے بڑھا اور ادوائن کھولنے لگا۔ اللہ دتا نے بھی اس کی مدد کی۔ دونوں نے ادوائن کھول کر رسی نکال لی۔ لالی نے پہرے دار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ دینو سے کہا۔

"پگڑی کھول۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے رسی سے باندھ دے۔ اللہ دتا! تو بھی لگ جا۔ فٹافٹ باندھ۔ وکھت کم ہے۔"

دونوں بھائیوں نے پگڑی کھول کر چارپائی کی مضبوط ادوائن سے پہرے دار کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ وہ چپ بیٹھا رہا۔ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔

لالی نے لالٹین کی روشنی میں رائفل کا میگزین کھول کے دیکھا اس میں نو کارتوس موجود تھے۔ دسواں چیمبر میں تھا۔ لالی نے ہاتھ بڑھا کر رائفل اللہ دتا کو دی اور کنجیوں کا گچھا اس سے لے لیا۔

اللہ دتا نے پوچھا۔ "ان کا کیا کرے گا؟ اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

"ابھی چلتے ہیں‘ تھوڑا سا کام اور کرنا ہے۔ دوسروں کو بھی تو رہا کرنا ہے۔"

"انھیں چھوڑ‘ ہم نے ان سے کیا لینا؟"

"بیکار کی کڑکڑ نہ کر‘ چپ کر کے کھڑا رہ۔" لالی نے اسے ڈانٹا۔ "انھیں رہا کرنا ضروری ہے۔ اگر سب نہ چھوٹے تو نور علی کھوکھر تجھے اور دینو کو اپنے کرندوں سے کتل کروا دے گا۔ سب چھوٹ گئے تو کس کس کو کتل کرائے گا۔ ویسے وہ بھی تو اللہ دینو کی طرح دیگار کے لیے پکڑ کر بند کیے گئے ہیں۔ انھوں نے کوئی جرم تو نہیں کیا اور یہ بھی تو سوچ‘ ان کے بھی گھر والے پریشان ہوں گے‘ انتظار کرتے ہوں گے۔"

پہرے دار طور محمد بولا۔ "ایسا نہ کر۔ سب نکل گئے تو منشی مجھے جان سے مار دے گا۔"

لالی قریب گیا اور اس کی پیٹھ پر ہولے سے دھپ مار کر بولا۔ "فکر نہ کر لکھیرے۔ تجھے بھی رہا کردوں گا۔ تو بھی بھاگ جانا۔ کوئی اور دھندا کرلینا۔ یہاں رہے گا تو ایک نہ ایک دن مارا جائے گا۔ ویسے بھی یہاں کی پہریداری گندہ کام ہے۔ تجھے ان بے چارے کیدیوں پر ظلم کرتے دکھ نہیں ہوتا؟ انھوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟ اب چپ کر کے بیٹھا رہ۔ گڑبڑ کی کوشش کی تو گولی چلادوں گا۔ اور جیسے تو نے کیدیوں کو کتل کر کے ان کی لاشیں دبائی ہیں‘ ویسے ہی گڑھا کھود کر تجھے بھی دبا دوں گا۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا۔ بول کیا کہتا ہے؟"

پہرے دار نے اسے یقین دلایا۔ “جیسا کہتا ہے‘ ویسا ہی کروں گا۔ پر مجھے بھی رہا کردینا۔” اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔ “میں یہاں بندھا پڑا رہا تو زمیں دار اور اس کا منشی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔”

اس نے اللہ دتا کی طرف اشارہ کیا۔ “میران خاں راکھے نے یہاں سے نکل جانے میں اس کی اور دو کیدیوں کی مدد کی تھی۔ اس پر منشی نے پچھلے دنوں میران خان کو کتل کرادیا اور اس کی لاش جال کے درخت کے نیچے دبا دی۔ مشہور کردیا اسے نوکری سے نکال دیا گیا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی کرے گا۔”

لالی نے اسے باور کرایا۔ “پروا نہ کر‘ تجھ سے جو وعدہ کیا ہے‘ پورا کروں گا۔”

لالی نے اللہ دتا سے رائفل لے کر اپنے ہاتھ میں تھام لی۔ اللہ دتا کو چوکس رہنے کی ہدایت کی۔ اسے پہرے دار کی نگرانی پر مامور کیا اور اللہ ڈنو کے ہم راہ قید خانے کے اندر چلا گیا۔ اللہ ڈنو لالٹین اٹھائے آگے آگے تھا۔ لالی اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

لالی نے عمارت میں داخل ہو کر دیکھا۔ اندر بہت وسیع صحن تھا۔ اس میں دو طرف سلسلے سے تنگ و تاریک کوٹھریاں تھیں۔ نہ کسی کوٹھری میں کھڑکی تھی نہ روشن دان تھا۔ کوٹھریوں کے آگے طویل برآمدہ تھا۔ اس پر پھوس کی خمیدہ چھت تھی۔

قید خانے میں ہر طرف بدبو اور سڑاند پھیلی تھی۔ شام کو جب تمام قیدی ایک بار بند کردیئے جاتے تو کسی کو باہر جانے کی مطلق اجازت نہ ہوتی۔ رات کو وہ صحن ہی کے ایک حصے میں پیشاب اور رفع حاجت کرتے تھے جسے صاف کرنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ قید خانے کی تمام عمارت تھی اور اس کی دیواریں شورزدہ تھیں۔

قید خانے میں اس وقت ۴۳ قیدی تھے۔ وہ برآمدے میں مونج کی بوسیدہ اور کھردری چٹائیوں لیٹے تھے۔ ان کے پاس نہ تکیے تھے اور نہ اوڑھنے کے لیے چادریں تھیں۔ ویسے گرمی شروع ہو تھی۔ چٹائیوں میں کھٹمل تھے۔ قیدی اپنی کمر اور ٹانگیں بار بار کھجاتے۔ وہ خوف زدہ اور گھبرا ہوئے نظر آتے تھے۔

قیدی جوڑیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کے ایک ایک پیر میں لوہے کے کڑے پڑے کڑوں کے درمیان فٹ بھر کی زنجیر تھی اور ان میں تالے لگے تھے۔

لالی ہاتھ میں رائفل سنبھالے ہوئے تمام قیدیوں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا گیا۔ تمام قیدی خاموش بیٹھے رہے۔ انھوں نے کوئی بات نہیں کی۔ لالی ان کا معائنہ کرچکا

نے اونچی آواز سے کہا۔ “میں تالے کھول کر تم سب کو رہا کردوں گا پر کوئی گڑبڑ نہ ہو۔” اس کا لہجہ تیکھا ہوگیا۔ “کسی نے گڑبڑ کی کوشش کی تو گولی سے اڑا دوں گا۔”

چند لمحے وہ خاموش بیٹھے رہے پھر ایک قیدی نے‘ جو دوسروں سے کسی قدر سن رسیدہ تھا‘ سب کی ترجمانی کرنے کے انداز میں کہا۔ “ہمیں جی گڑبڑ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ توں ہمیں رہا کردے گا تو دعا ہی دیں گے۔ گڑبڑ کیوں کریں گے؟ تو جیسا کہے گا‘ ویسا کریں گے۔”

“میں یہی چاہتا ہوں۔” لالی نے نرم لہجے میں کہا۔ اللہ ڈنو کو کنجیوں کا گچھا دیا۔ “ڈنو! باری باری سب کے تالے کھول دے۔”

اللہ ڈنو ہاتھ میں لالٹین سنبھالے آگے بڑھا۔ وہ ایک ایک قیدی کے پاس گیا اور کڑوں کے تالے کھولنے لگا۔ اس نے جلدی جلدی سارے قیدیوں کے تالے کھول دیئے۔ جب سب آزاد ہوگئے تو لالی نے باہر چلنے کی ہدایت کی۔ وہ اٹھے‘ دلان سے نکل کر صحن میں آئے اور دروازے کی جانب بڑھنے لگے۔

آگے آگے لالٹین سنبھالے اللہ ڈنو تھا۔ اس کے پیچھے قیدیوں کا غول تھا۔ سب سے پیچھے رائفل سنبھالے لالی چل رہا تھا۔ قیدی دروازے سے گزر کر باہر آگئے۔

لالی بھی باہر آگیا۔ اس نے انھیں ایک بار پھر مخاطب کیا۔ “سنو‘ اب تم سب آزاد ہو۔ جس کا جہاں جی کرے نکل جائے۔ ابھی تو رات آدھی بھی نہیں ہوئی۔ بھاگنے کے لیے تمہارے پاس بہت وقت ہے۔ پر یہاں سے نکل بھاگنے سے پہلے تم سب کو ایک کام کرنا ہوگا۔” اس نے قدرے تامل کے بعد پوچھا۔

“کلراٹھی پر کھدائی کرنے کے لیے کدالیں تو ہوتی ہیں نا؟”

“ہاں جی‘ کیوں نہیں ہوتیں۔” کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ “بہت ہیں۔”

“کدالیں جہاں رکھی ہیں‘ تم سب جا کر وہاں سے نکال لاؤ۔” لالی نے مٹی اور اینٹوں سے بنی ہوئی بھٹیوں کی جانب ہاتھ لہرایا۔ “یہ ساری بھٹیاں توڑ پھوڑ کر برابر کردو‘ فٹافٹ۔ اس کے بعد یہاں سے بھاگ جاؤ۔”

بیگار کیمپ کے پہرے داروں اور نوکروں کی کوٹھریاں سامنے تھیں۔ ان کے قریب ہی ٹین کا لمبا سائبان تھا۔ اس کے نیچے کھدائی کا ساز و سامان رکھا تھا۔ اس میں کدالیں اور بیلچے بھی تھے۔ سارے قیدی سائبان کے اندر چلے گئے اور کدالیں ہاتھ میں سنبھالے باہر آگئے۔ وہ ادھر ادھر بکھر گئے اور کدالوں سے بھٹیاں کھودنے لگے۔ کھدائی اور توڑ پھوڑ کی آوازیں رات کے سناٹے میں

ابھر رہی تھیں۔

لالی اور اللہ دتو پہریدار کے پاس چلے گئے۔ اس کے ہاتھ اور پیر رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے عین سامنے کچھ فاصلے پر اللہ دتا کھڑا تھا۔

لالی کو دیکھ کر پہرے دار نے حیرت سے پوچھا۔ "توں بھٹیوں دی توڑ پھوڑ کیوں کروا رہا ہے؟"

لالی نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے اللہ دتا اور دتو سے کہا۔ "تم دونوں بھی کدالیں لے کر کھدائی میں لگ جاؤ۔ کام چھیتی نال ہونا چاہئے۔ ابھی بہت دور جانا ہے۔"

اللہ دتا نے کہا۔ "میں تو کہتا ہوں' توں بھٹیوں شٹیوں کے چکر میں نہ پڑ۔ ہم نے اب چھیتی نال یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

"بیچ میں ٹانگ نہ اڑا۔" لالی نے اسے ڈانٹا۔ "جیسا کہتا ہوں' ویسا کر۔"

اللہ دتا خاموش ہوگیا اور اللہ دتو کے ہم راہ کدالیں لینے سائبان کی جانب چلا گیا۔ لالی نے رائفل ایک طرف رکھی' الٹی چارپائی اٹھا کر بچھائی۔ رائفل سنبھالی اور چارپائی پر چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ توڑ پھوڑ کی آوازیں ابھرتی رہیں۔ ملبے سے گرد و غبار اڑ اڑ کر پھیل رہا تھا۔ پہرے دار سر جھکائے لالی کے سامنے فرش پر خاموش بیٹھا تھا۔

رات کا اندھیرا بڑھتا گیا۔ کدالیں چلنے اور ملبہ گرنے کی آوازیں سناٹے میں ابھرتی رہیں۔ آخر آوازیں بند ہو گئیں۔ خاموشی چھاگئی۔ قیدی ٹولیوں میں بکھرے ہوئے لالی کے قریب آئے۔ لالی چارپائی سے اتر کر کھڑا ہوگیا۔ اللہ دتا آگے آگے تھا۔

لالی نے پوچھا۔ "ساری بھٹیاں توڑ ڈالیں؟"

"ہاں جی۔" اللہ دتا نے جواب دیا۔ "جا کر دیکھ لے' سب توڑ کر برابر کر دیں۔"

قیدی اس کے سامنے ہجوم کی صورت میں چپ کھڑے تھے۔ لالی نے لالٹین کی روشنی میں انھیں دیکھا۔ سب کے چہرے اور بال گرد و غبار سے اٹے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کدالیں دبی تھیں۔

لالی نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے ہدایت کی۔ "کدالیں وہیں رکھ دو جہاں سے اٹھا کر لائے تھے اور جدھر تمھارا جی کرے' چلے جاؤ۔"

ان کے چہروں پر مسرت پھیل گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے سائبان کی طرف چلے گئے۔ ذرا دیر بعد سائبان کے نیچے کدالیں رکھنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لالی نے لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی میں دیکھا۔ قیدی سائبان کے نیچے سے ٹولیوں میں باہر نکلے اور تیز تیز قدم اٹھاتے مختلف سمتوں میں چلے گئے۔ کچھ دیر تک وہ دھندلی دھندلی پرچھائیوں کی مانند نظر آتے رہے' پھر رات کے اندھیرے میں گم ہوگئے۔

بیگار کیمپ پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ اللہ دتا اور دتو موجود تھے۔ وہ لالی کے قریب کھڑے تھے۔ لالی نے اللہ دتا کو پہرے دار کی نگرانی پر مقرر کیا اور اللہ دتو کے ساتھ سائبان کی جانب بڑھا۔ ہر طرف ٹوٹی پھوٹی بھٹیوں کا ملبا بکھرا ہوا تھا۔ اللہ دتو ہاتھ میں لالٹین سنبھالے آگے آگے چل رہا تھا۔ سائبان کے قریب پہنچ کر لالی رک گیا۔ اس نے اللہ دتو سے پوچھا۔

"کلراٹھی پر شورہ لے جانے کے لیے اونٹھ بھی رہتے ہیں' ان کا ڈھارا کتھے ہے؟"

"اتھے ہے۔" اللہ دتو نے عمارت کے پچھواڑے کی جانب ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "پر سارے اونٹھ تو آج شورہ لاد کر ٹیشن چلے گئے۔ سویرے واپس آئیں گے۔"

"تیرا مطلب ہے' اب ڈھارے میں کوئی اونٹھ نہیں رہا؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔ آج بہت مال بھیجا گیا تھا۔"

"مجھے ڈھارا تو دکھا۔ شاید کوئی اونٹھ مل جائے ورنہ صبح تک ہم تینوں داؤد پور کیسے پہنچ سکیں گے؟" لالی کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

دونوں عمارت کے عقب میں گئے۔ جال کے ایک درخت کے قریب مٹی کی اونچی اونچی دیواروں پر چھپر کی چھت تھی۔ یہ اونٹوں کا باڑا تھا۔ دونوں اس طرف بڑھے۔ لالٹین کی روشنی میں انھیں دو اونٹ چھپر کے نیچے بیٹھے نظر آئے۔ لالی کے چہرے پر مسرت پھیل گئی۔

"کام بن گیا۔ تجھے اونٹھ کی سواری آتی ہے؟"

"کیوں نہیں آتی جی۔ یہ بھی کوئی مشکل کام ہے۔ میں تو بچپن سے اونٹھ چلا رہا ہوں۔"

"اللہ دتا بھی جانتا ہوگا؟" لالی نے دریافت کیا۔

"بالکل جانتا ہے جی۔ وہ تو کئی مہینے اونٹھ چلانے والا جتوال بھی رہ چکا ہے۔" اللہ دتو نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ "دونوں اونٹھ کھول کر باہر نکال لوں؟ ان پر بیٹھ کر نکل جائیں گے۔ اب زیادہ دیری نہیں کرنی چاہئے۔"

"ابھی نہیں۔ پہلے میرے ساتھ اس طرف چل جہاں کلراٹھی کا سامان رکھا جاتا ہے۔"

اللہ دتو خاموش رہا۔

دونوں ایک بار پھر سائبان کی جانب چلے۔ وہاں کدالیں اور بیلچے رکھے تھے۔ مٹی کے تیل کے دو پیپے بھی تھے۔ پھٹے پرانے کپڑے اور بہت سا کاٹھ کباڑ تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ خالی

بوریوں کا ڈھیر تھا۔ شورے اور سجّی سے بھری ہوئی بوریاں بھی تھیں، مگر زیادہ نہیں تھیں۔

لالی نے اللہ دیتو کی مدد سے مٹی کے تیل کے پیپے سائبان سے نکال کر باہر رکھ دیئے۔ اس کے بعد وہ اللہ دیتو کے ساتھ پہرے دار طور محمد لکھیرا اور اللہ دتا کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے پہریدار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اللہ دتا سے کہا۔ ”اس کے ہاتھ اور پیر کھول دے۔“ اللہ دتا اس کے ہاتھ پیر کھولنے لگا۔ پہرے دار خاموش بیٹھا رہا۔ لالی نے رائفل اس کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

”تو بھی بھاگ جا۔“

پہرے دار چپ چاپ اٹھ کر ایک طرف چل دیا۔ لالی، رائفل سنبھالے اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ کچھ دور جا کر اس نے ڈانٹا۔ ”زنانیوں کی چال نہ چل۔ دوڑ لگا۔“ پہرے دار تیزی سے بھاگا اور اندھیرے میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

لالی نے واپس آ کے اللہ دتا اور اللہ دیتو سے کہا۔ ”ڈھارے میں جا کر دونوں اونٹھ باہر نکال لو۔“ اس نے جال کے ایک درخت کی جانب اشارہ کیا جو بیگار کیمپ سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ ”تم دونوں اونٹھ اتھے لے جاؤ اور میرا انتظار کرو۔ میں نوں ابھی ایک کام اور کرنا ہے۔ میں جھیتی نال تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

دونوں بھائی اونٹوں کے باڑے کی طرف چلے گئے۔ لالی سائبان کی سمت بڑھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے میں لالٹین تھی۔ اس نے رائفل ایک طرف میدان میں رکھ دی۔ سائبان کے نیچے گیا۔ وہاں سے پھٹے پرانے کپڑے اور خالی بوریاں نکالیں۔ انھیں اٹھا کر باہر لایا۔ مٹی کے تیل کے پیپے کھولے۔ تیل پھٹے پرانے کپڑوں اور بوریوں پر چھڑکا۔ لالٹین ہاتھ میں لی اور تیل سے بھیگی ہوئی دو بوریاں اٹھا کر قید خانے کی عمارت میں گیا۔ لالٹین کی چمنی اونچی کی اور اس کی لو سے ایک چیتھڑا جلایا۔ جلتے ہوئے چیتھڑے سے اس نے ایک بوری میں آگ لگائی اور جلتی ہوئی بوری برآمدے کے چھپر کی جانب اچھال دی۔ چھپر جلنے لگا۔ لالی نے دوسری بوری میں بھی آگ لگائی اور دالان میں بچھی ہوئی مونج کی چٹائیوں پر ڈال دی۔ اس نے چمنی نیچے کی اور لالٹین اٹھائے باہر نکل آیا۔

لالی نے تیل سے بھیگے ہوئے کپڑوں اور بوریوں میں لالٹین کے ذریعے آگ لگائی اور انھیں جلدی جلدی کوٹھریوں کی چھتوں پر پھینک دیا۔ کچھ جلتے ہوئے کپڑے سائبان کے نیچے رکھے ہوئے سامان پر ڈال دیئے، کچھ جلتی ہوئی بوریوں سے دروازوں میں آگ لگا دی۔ اس نے رائفل اٹھائی۔ لالٹین ہاتھ میں لٹکائی اور اونٹوں کے باڑے میں پہنچا۔ تیل سے بھیگی ہوئی ایک بوری میں اس نے آگ لگائی اور اسے پھوس کی بنی ہوئی باڑے کی چھت پر پھینک دیا۔ لالٹین اس نے چھت کے نیچے بکھری ہوئی خشک گھاس پر ڈال دی اور تیز تیز قدموں سے جال کے اس درخت کی جانب لپکا جہاں اللہ دتا اور دیتو اونٹوں کے ساتھ کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

اللہ دتا نے لالی کو اپنے ساتھ اونٹ کی پیٹھ پر بٹھایا، دوسرے اونٹ پر اللہ دیتو سوار ہوا۔ دونوں نے اونٹ آگے بڑھائے اور تیز رفتار سے دوڑانے لگے۔ لالی نے مڑ کر دیکھا۔ بیگار کیمپ کے در و دیوار جل رہے تھے۔ سرخ سرخ شعلے بھڑک رہے تھے۔ دیواریں چیخ رہی تھیں، چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ ہر طرف آگ ہی آگ پھیلی تھی۔ دھویں کے سیاہ بادل فضا میں پھیلتے جا رہے تھے۔

☆

دونوں اونٹ داؤد پور میں داخل ہوئے تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اللہ دتا نے اونٹ اپنے گھر کے سامنے ٹھہرائے۔ تینوں نیچے اترے۔ اللہ دتا نے آگے بڑھ کر تالا کھولا۔ وہ اندر داخل ہو گئے۔ اللہ دتا کے تینوں بچے گھر میں نہیں تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے وہ انھیں بیوی کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ یہ مٹی کا بنا ہوا چھوٹا سا گھر تھا۔ اس میں صرف ایک کمرہ اور دو کوٹھریاں تھیں۔ اللہ دیتو نے گھر پہلی بار دیکھا تھا۔ مگر وہ بالکل خاموش تھا۔

اللہ دتا نے کمرے میں داخل ہو کر چارپائی پر بستر بچھا دیا، لالی کے پاس آیا۔ ”تو اب سو جا۔ تھکا ہوا بھی ہے اور رات بھر جاگا ہے۔“ لالی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ کمرے میں گیا اور نڈھال ہو کے بستر پر لیٹ گیا۔ دوپہر کو اللہ دتا نے اسے جگایا۔ لالی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اللہ دتا اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”بہت سو لیا، اب روٹی کھا لے۔“

لالی خاموشی سے نیچے اترا۔ اللہ دتا کے ساتھ صحن میں گیا۔ منہ دھویا، کلی کی اور کمرے میں واپس آ گیا۔ ابھی تک اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک نوجوان عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چنگیری تھی۔ اس میں روٹیاں تھیں۔ دوسرے ہاتھ میں دال سے بھرا ہوا پیالہ تھا۔

اس نے چنگیری اور پیالہ فرش پر بچھی ہوئی چٹائی پر رکھ دیا اور دوپٹے کا پلو سر سے کھینچ کر آگے گرا لیا۔ وہ ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔

اللہ دتا نے کہا۔ ”یہ سرداراں ہے، میری گھر والی۔“

لالی نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ اس کی عمر ٢٥ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ رنگت گیندے کے

پھول کی طرح زردی مائل تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن تھیں‘ چہرہ بیضوی تھا‘ جسم بھرا بھرا گداز اور سڈول تھا۔ وہ خوش شکل عورت تھی مگر اپنے سن سے کچھ زیادہ ہی لگتی تھی۔ سرداراں نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ وہ کسی طور اتنی تیز اور ہوشیار نظر نہیں آتی تھی جیسا اللہ دتا نے بتایا تھا وہ سیدھی سادی عام دیہاتی عورت تھی۔

لالی نے مسکرا کر قریب کھڑے ہوئے اللہ دتا کو دیکھا اور سرداراں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اسے سرگانے سے چھڑا کر کب لایا؟“

”سویرے ہی سویرے سنار کے گھر پہنچا۔ اس کے ہزار روپے واپس کیے اور سرداراں کو لے آیا۔ بچے بھی آگئے‘ باہر کھیل رہے ہیں۔“

لالی نے پوچھا۔ ”تو سویا نہیں؟“

”کیسے سوتا؟ میں نے کئی کام کرنے تھے۔“ وہ کھانے کے سامنے چٹائی پر بیٹھ گیا۔ ”پہلے روٹی کھالے۔ آرام سے باتیں کریں گے۔“ لالی بھی چٹائی پر بیٹھ گیا۔

سرداراں باہر چلی گئی۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد دو کٹوروں میں لسی لے کر واپس آگئی۔ لالی اور اللہ دتا کھانا کھانے لگے۔ لالی نے لسی کا گھونٹ بھرا اور کٹورا رکھتے ہوئے بولا۔ ”داؤد پور تو موضع لگتا ہے۔“

”بالکل موضع ہے جی۔“ اللہ دتا نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”یہاں پٹواری ہے۔ تین زمیں دار رہتے ہیں۔ ان کی اونچی اونچی ماڑیاں ہیں۔ سنار نے بھی اپنی ماڑی بنوالی ہے۔ بچوں کی پڑھائی کا سکول بھی ہے۔ داؤد پور میں دکانیں ہیں۔ بازار ہے۔ اس موضعے کے کئی پنڈ ہیں۔“

”اللہ دتا! تو مجھے بازار سے ایک دھوتی‘ ایک چدّر‘ جوتا‘ سر پر باندھنے کی پگڑی لا دے۔ جہانگیرہ اتنا وڈا نہیں ہے۔ وہاں یہ چیزیں نہیں ملتیں اور ہاں روپے رکھنے کے لیے ہمیانی بھی چاہیے۔ مل جائے گی؟“

”مل جائے گی اور بھی چیزیں مل جائیں گی۔“ یہ کہتے کہتے اس نے سرداراں کی طرف دیکھا۔ ”بازار جا کر یہ چیزیں خرید لا۔“ وہ مسکرایا۔ ”تو سستا ہی خرید کر لائے گی۔ دکان داروں سے مول تول پر جھگڑا بھی کر سکتی ہے۔“

”میں تو کسی سے جھگڑا ٹنٹا نہیں کرتی۔“ سرداراں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”تجھ سے جھگڑا کرتی ہوں؟ ایمان نال بتا‘ جو کہتا ہے‘ وہ کرتی ہوں۔“

”کرماں بھری ناراض کیوں ہوتی ہے؟“ اللہ دتا مسکرا کر بولا۔ ”میں نے تو ایسے ہی گل بات کی تھی۔“

لالی ان دنوں کی نوک جھونک نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”سرداراں! میری بش شرٹ اور پتلون دھو سکتی ہے؟“

”کیوں نہیں دھو سکتی۔“ اس نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ ”توں نے اللہ دتا کی اتنی مدد کی۔ میں تیرے لیے کیا نہیں کر سکتی۔ کپڑے اتار کر چدّر یا دھوتی باندھ لے۔ میں تیرے کپڑے دھو کر دھوپ میں ڈال دوں گی۔ شام تک سوکھ جائیں گے۔ پہن لینا۔“

”اللہ دتا تیرے بارے میں ٹھیک ہی کہتا ہے۔ تو زبردست اہری ہے۔“ لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کوئی چدّر یا اللہ دتا کی دھوتی لا دے۔ میں اپنے کپڑے اتار کر دھونے کے لیے تجھے دے دوں گا۔“

سرداراں باہر چلی۔ لالی اور اللہ دتا کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ لالی نے بٹوہ نہیں نکالا۔ جیب سے تیس روپے کے کھلے ہوئے نوٹ نکالے اور اللہ دتا کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ ”اتنے روپے سے کام چل جائے گا؟“

اللہ دتا نے نوٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”چل تو جانا چاہیے۔“

سرداراں‘ ملگجی سی دھوتی ہاتھ میں دبائے اندر آئی اور لالی کو دے دی۔ اس نے کھانے کے برتن اٹھائے اور کمرے سے چلی گئی۔ لالی نے بش شرٹ اور پتلون اتار کر دھوتی باندھ لی اور اللہ دتا سے کہا۔ ”یہ کپڑے دھونے کے لیے سرداراں کو دے دے۔ بازار جا اور جو کچھ میں نے بتایا ہے‘ خرید لا۔ میں تب تک سوتا ہوں۔ مجھے اونگھ لگ رہی ہے۔“

اللہ دتا نے لالی کے میلے کپڑے اٹھائے اور باہر جانے لگا۔ لالی نے اسے ٹوکا۔ ”اندھیرا ہوتے ہی میں تیرے ساتھ جہانگیرہ چلوں گا۔ لے چلے گا نا؟“

”کیوں نہیں لے چلوں گا؟“ اللہ دتا نے مسکرا کر کہا۔ ”جہانگیرہ کیا‘ جہاں کہے وہاں لے چلوں گا۔ اب تو میرے پاس ایک چھوڑ دو اونٹھ ہیں۔“

لالی نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔ ”دونوں اونٹھ جتنی جلدی ہو سکے‘ بیچ دے۔ انھیں رکھنا ٹھیک نہیں۔ نور علی کھوکھر کے کرندے تیری تلاش میں ہوں گے۔ وہ اونٹھوں سے تیرا پتہ چلا لیں گے۔ اس دفعہ وہ تجھے چھوڑیں گے نہیں۔ تجھے اور اللہ دتو‘ دونوں کو مار کے گھر میں آگ لگا دیں گے۔“

”کہتا تو ٹھیک ہے۔“ اللہ دتا سہما ہوا نظر آرہا تھا۔ ”کھوکھر بہت ظالم ہے۔ وہ ضرور مجھ پر حملہ

کرائے گا۔ پتہ ہے' وہ کتنا ظالم ہے؟”

“داؤد پور بھی چھوڑ دے۔ کسی اور طرف نکل جا۔” لالی نے خبردار کیا۔ “یہاں رہے گا تو تیرے لیے ہر وکھت خطرہ ہی رہے گا۔ کھوکھراں یہاں سے دور تو ہے پر بہت زیادہ دور نہیں' ایک ہی تحصیل ہے۔”

اللہ دتا خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ چند لمحوں بعد اس نے کہا۔ “حاصل پور میں سرداراں کی ایک پھپھی ہے' اس سے پیار بھی کرتی ہے۔ اس کے پاس بھی جا سکتا ہوں۔ حاصل پور تو بھاول نگر میں ہے۔ میں وہاں جاتا رہتا ہوں۔”

“اوٹھ بیچ کر ہل خرید لینا۔ کسی زمیں دار کا مزارع بن جانا۔” لالی نے اللہ دتا کا سہما ہوا چہرہ غور سے دیکھا۔ “آج ہی رات اللہ دتو اور بال بچوں کے ساتھ دونوں اوٹھ لے کر یہاں سے نکل جا۔ رستے میں اوٹھ بیچ دینا۔”

اللہ دتا نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ “ایسا ہی کروں گا۔ تیں نوں جہانگیرہ چھوڑ کر واپسی پر حاصل پور نکل جاؤں گا' سرداراں سے کہتا جاؤں گا' چلنے کی تیاری کر لے۔” اللہ دتا چلا گیا۔ لالی بستر پر لیٹ کے سو گیا۔

شام کو لالی بیدار ہوا۔ کمرے میں چراغ روشن تھا۔ سرداراں دہلیز پر خاموش بیٹھی تھی۔ لالی اٹھ کے بیٹھ گیا۔ سرداراں مسکرا کر بولی۔ “توں سوتا بہت ہے۔ اللہ دتا تو بالکل نہیں سویا۔ تیری ساری چیزیں بازار سے لے آیا۔ میں نے تیرے کپڑے لتے بھی دھو دیئے' سوکھ بھی گئے۔ یہ سامنے پڑے ہیں۔” اس نے ہاتھ اٹھا کے چٹائی کی طرف اشارہ کیا۔

لالی نے دیکھا' چٹائی پر پتلون اور بش شرٹ کے علاوہ دیسی جوتوں کی ایک جوڑی' دھوتی' چادر اور ہمیانی رکھی ہے۔ لالی بستر سے اتر کر نیچے آگیا اور انگڑائی لے کر بولا۔

“سب ہی کچھ آگیا۔ اللہ دتا بہت کام کا بندہ ہے۔”

“پر دوسری کمیض تو تیرے پاس ہے نہیں۔ اللہ دتا کے پاس ایک پرانی کمیض پڑی ہے' پر بہت پھٹ گئی۔ توں اسے پہن نہیں سکتا۔ میں سنارے کے گھر سے ایک کمیض مانگ کر لائی ہوں۔ ہے تو وہ بھی پرانی پر پھٹی ہوئی نہیں ہے۔ یہ رہی۔” اس نے زانو پر پڑی ہوئی قمیص لالی کے سامنے ڈال دی۔

لالی نے قمیص الٹ پلٹ کے دیکھی۔ “ٹھیک ہی ہے۔ یہ تو نے بہت چنگا کام کیا۔” لالی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ “سرداراں! تو بہت کام کی زنانی ہے۔ اللہ دتا نصیبوں والا ہے کہ

اسے تیری ایسی اہری اور سمجھ دار گھر والی ملی۔”

“کیا کریں جی! ہنسی خوشی علی شاہ میں رہتے تھے۔” وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ “کھوکھر کا بیڑا غرک ہو۔ اس نے ہمیں تباہ کر دیا' کچھ بھی نہیں رہا۔ اللہ دتا حاصل پور چلنے کو کہتا ہے' پر اپنے پاس تو کھانے کو بھی نہیں۔ تجھ سے تو کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ تجھے تو سب پتہ ہے۔ اللہ دتا مجھے بتا چکا ہے' تیری اس سے کیا کیا بات ہوئی۔ وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپاتا۔”

لالی نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ جیب سے بٹوا نکالا۔ سو روپے کا ایک نوٹ کھینچ کر انگلیوں میں دبایا۔ سرداراں کی جانب بڑھا کے گویا ہوا۔ “لے یہ رکھ لے۔ اپنا کام چلا۔ اوٹھ بک گئے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے اللہ دتا سے یہی کہا ہے۔”

سرداراں نوٹ لیتے ہوئے بولی۔ “توں نے پہلے ہی ہماری بہت مدد کی ہے۔ اللہ دتا کی مدد نہ کرتا تو جانے میں کب تک سرگانے پر سنار کے گھر میں بندھک رہتی۔” اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ “دن بھر اس کی ماڑی میں کام کاج کرتی تھی۔ سنار کی گھر والی بھلی زنانی نہیں ہے۔ مجھے بالوں سے پکڑ کر مارتی۔ نوچتی کھسوٹتی' چیخ چیخ کر گالاں نکالتی۔” سرداراں کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

“رونا دھونا چھوڑ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تو اب ٹر جا۔ میں ذرا کپڑے بدل کر تیار ہو جاؤں۔ شام ہو گئی' مجھے اللہ دتا کے ساتھ جہانگیرہ جانا ہے۔”

سرداراں چلی گئی۔ لالی نے قمیص پہنی' دھوتی باندھی۔ سر پر پگڑی لپیٹی۔ جوتے پہنے اور وضع قطع سے دیہات کا رہنے والا پینڈو بن گیا۔ اس نے ہمیانی میں بٹوے سے روپے نکال کر رکھے اور اسے کمر کے گرد مضبوطی سے باندھ لیا۔ تھوڑے سے روپے رکھ کر بٹوے کو قمیص کی جیب میں ڈال لیا۔

اس نے کونے میں رکھی ہوئی رائفل اٹھائی۔ اس میں بھرا ہوا کارتوس نکال کر میگزین میں لگا دیا۔ رائفل اپنے کپڑوں میں لپیٹی' چادر پر رکھی اور لمبی سی گٹھری بنا لی۔ یہ تیاری کر کے وہ اللہ دتا کا انتظار کرنے لگا۔

باہر صحن میں شام اتر آئی تھی۔ اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اللہ دتا آگیا۔ اس کے پہنچتے ہی سرداراں کھانا لے کر آگئی۔ کھانے میں پراٹھے اور تلا ہوا مرغ تھا۔ سرداراں نے مرغ کی طرف اشارہ کر کے لالی سے کہا۔

“یہ ککڑ میں نے تیرے ہی لیے تلا ہے۔”

اللہ دتا نے مسکرا کر کہا۔ "میرے لیے نہیں؟"

"توں بھی کھالینا۔" وہ شرما گئی۔ "ویسے یہ تیرا بھی مہمان ہے۔ توں مجھ سے الگ تو نہیں ہے۔" وہ ذرا دیر بعد چلی گئی۔

لالی کو بھوک نہیں تھی۔ اس نے تلے ہوئے مرغ سے تھوڑا گوشت نوچ کر کھایا اور ہاتھ کھینچ لیا۔ اللہ دتا نے اصرار بھی کیا۔ مگر اس نے کھانا نہیں کھایا۔ اللہ دتا کھانا کھاتا رہا۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہوا تو لالی اور اللہ دتا گھر سے باہر چلے گئے۔ دروازے کے قریب ہی اونٹ موجود تھا۔ اللہ دتا نے ساری تیاری پہلے ہی مکمل کرلی تھی۔ اندھیرا خاصا بڑھ گیا تھا۔ دونوں اونٹ پر سوار ہوئے اور جہانگیرہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

اللہ دتا کا اندازہ غلط تھا۔ جہانگیرہ بارہ نہیں' سترہ میل سے بھی زیادہ فاصلے پر تھا۔ جب وہ جہانگیرہ پہنچے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ لالی گاؤں سے دور اتر گیا۔

☆

جہانگیرہ میں داخل ہو کر لالی نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور بستی کی جانب بڑھنے لگا۔ رائفل گٹھری میں بندھی ہوئی اس کی پشت پر لٹک رہی تھی۔ ذرا دیر بعد وہ نیم کے درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑا تھا۔ گاؤں پر گہری خاموشی طاری تھی۔ کہیں کہیں مکانوں میں چراغوں کی روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ جب دیر تک کوئی آہٹ اور آواز نہیں ابھری تو وہ دبے دبے قدموں چلتا ہوا شاداں کے گھر کے قریب پہنچا اور آنگن کی چار دیواری سے لگ کر اندھیرے میں کھڑا ہوگیا۔ اس نے اچھل کر دونوں ہاتھوں سے دیوار پکڑی اور اوپر پہنچ گیا۔ وہ چند لمحوں تک دیوار سے چمٹا ہوا لیٹا رہا۔ آنگن بالکل سنسان تھا۔

لالی دھیرے سے نیچے اترا۔ آنگن میں پہنچ کر سب سے پہلے اس نے دالان کی جانب دیکھا۔ دالان کے ایک کونے میں لالٹین روشن تھی۔ اس کی لو مدھم تھی۔ دالان میں چارپائی بچھی تھی اس پر کوئی سو بھی رہا تھا۔

لالی ہولے ہولے چلتا ہوا دالان میں پہنچا۔ بستر کے قریب گیا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگالیا کہ وہ شاداں ہے۔ شاداں بستر پر بے خبر سو رہی تھی۔ لالی نے پشت پر لٹکتی ہوئی گٹھری اتار کر دالان میں ایک طرف رکھی۔ ایک بار پھر شاداں کے نزدیک گیا اور اسے آہستہ سے جھنجوڑا۔ شاداں نے آنکھیں کھول کر لالی کو دیکھا اور خوف و حیرت کے ملے جلے لہجے میں بولی۔ "لالی!" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

لالی نے کمرے کے بند دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ "اندر تو کوئی نہیں ہے؟"

"نہیں۔" وہ اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹ کر جوڑا باندھتے ہوئے بولی۔ "میرے سوا گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

لالی اس کے قریب ہی چارپائی پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ شاداں نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "اب کس لیے آیا ہے؟"

"تو کہتی ہے تو نہیں آؤں گا۔"

"یہ بات نہیں۔" شاداں نے آہستہ سے بتایا۔ "پولیئے تیری تلاش میں دو بار یہاں آچکے ہیں تھانیدار نے بھی ایک روز مجھے بلایا تھا۔ تیں نوں پتہ ہے' وہ ملک کا بھرا ہے۔ اس نے ڈرایا دھمکایا' الٹے سیدھے سوال کر کر کے میرا مگز خراب کردیا۔"

"تو نے کیا کہا؟"

"کہنا کیا تھا۔" شاداں نے جواب دیا۔ "میں نے ہر بار یہی کہا' وہ بالے کا یار ہے۔ اسی سے ملنے آیا تھا۔"

"بالے کے بارے میں تو کچھ نہیں پوچھا؟"

"کیوں نہیں پوچھا۔ پر میں نے یہی کہا' مجھے کیا پتہ' وہ کہاں ہے؟ وہ تو تین مہینے سے اوپر ہوگئے' میرے پاس آیا نہیں۔ تاجی جانتی ہوگی۔ بالے اسی کے پاس رہتا تھا۔ اس نے ویاہ بھی کرلیا تھا۔"

"تاجی کہاں ہے؟"

"اس کا بھرا کراچی سے آیا ہے۔ وہ اسی کے پاس رہتی ہے۔ کہتی تھی' کراچی جاؤں گی۔ بالے وہیں گیا ہے۔"

چل' یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔ تاجی کا تیرے ساتھ رہنا ٹھیک نہیں تھا۔"

"نہیں' یہ ٹھیک نہیں ہوا۔" شاداں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں چاہتی تھی' وہ میرے ساتھ رہے۔ اس کے بچہ پیدا ہو۔ وہ بالے ہی کا تو ہوگا۔ میں اسے پالتی' اپنے پاس رکھتی۔"

"تجھے اپنے بچے یاد نہیں آتے؟"

"یاد کیوں نہیں آتے۔" شاداں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "پر جس دن میں نے بالے کے سنگ گھر چھوڑا' اسی دن بچوں کو بھی چھوڑ دیا۔ اب وہ میرے پاس کیسے آسکتے ہیں؟"

"کیسے نہیں آسکتے۔" لالی نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "پچھلے دنوں تیرا کھصم آیا تھا' بچے بھی

آئے ہوں گے۔ ان میں سے کسی کو اپنے پاس رکھ لیتی۔ گھر میں اکیلی پڑی رہتی ہے۔ تیرا جی نہیں گھبراتا؟"

شاداں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "جی تو بہت گھبراتا ہے پر میرا گھر والا مانے گا نہیں۔ کہتا تھا' میرے ساتھ چل۔"

"چلی جا اس کے پاس۔ یہاں کب تک اکیلی پڑی رہے گی۔ اب تو بالے بھی نہیں رہا جس کے لیے تو نے گھر بار چھوڑا' بچے چھوڑے۔"

شاداں نے کوئی جواب نہ دیا۔ لالی بھی ذرا دیر خاموش رہا۔ اس نے اصرار کرکے پوچھا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

مگر شاداں نے پھر بھی جواب نہ دیا' بات کا رخ پلٹتے ہوئے بولی۔ "تیں نوں پتہ نہیں' آج کل مجھ پر کیا بیت رہی ہے؟"

لالی نے کسی قدر پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیوں' کیا ہو گیا تجھے؟"

"مجھے تو کچھ نہیں ہوا پر بوری کا دودھ روز بہ روز کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔ وہ گبھن ہے۔" وہ لمحے بھر خاموش رہی۔ "تو ہی بتا' وہ دودھ دینا بالکل بند کر دے گی تو کیا ہوگا۔ اسے کہاں سے کھلاؤں گی اور اپنا گزارہ کیسے کروں گی؟ مجھے ہر دم یہی فکر رہتی ہے۔" شاداں غم زدہ ہو گئی۔

مگر لالی ذرا بھی متاثر نہ ہوا' مسکرا کر بولا۔ "پروا نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلے مجھے روٹی ٹکر دے۔ سخت بھوک لگی ہے۔"

"شام کو تو میں نے کچھ پکایا نہیں۔ دن کی روٹی پڑی ہے' کہے تو لے آؤں؟"

"لے آ' پر جھیتی نال۔"

شاداں خاموشی سے اٹھی' کمرے کا دروازہ کھولا۔ لالٹین کی لو اونچی کی۔ چھت سے لٹکے ہوئے چھینکے سے چنگیری اتاری اور لا کر لالی کے سامنے رکھ دی۔ چنگیری میں دو روٹیاں تھیں۔ لالی نے روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا اور اسے چبانے لگا۔ شاداں نے اسے روکھی روٹی کھاتے دیکھا تو مسکرا کر بولی۔ "بہت بھکھا لگتا ہے۔ روکھی روٹی کیسے کھائے گا۔ ذرا صبر کر۔" وہ دالان سے نکل کر آنگن میں چلی گئی۔

لالی ایک کے بعد دوسرا لقمہ چباتا رہا۔ ذرا دیر بعد شاداں واپس آئی۔ وہ پیالے میں مکھن لے کر آئی۔ دوسرے ہاتھ میں پیاز کی گٹھی تھی۔ اس نے مکھن اور پیاز لالی کے سامنے رکھ دی۔ "گھر میں اور کچھ نہیں تھا۔ یہی ملا' پر اس سے کام چل جائے گا؟" اس نے بے زاری سے منہ بگاڑا۔ "مجھے تو ڈھیر سی نصیحت کرتا ہے۔ کبھی یہ بھی سوچا' تیرا کام اس طرح کب تک چلے گا؟"

لالی نے کھانا کھاتے کھاتے مسکرا کر شاداں کی جانب دیکھا' مگر کوئی بات نہیں کی۔ چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔ دونوں روٹیاں' مکھن اور پیاز سب چٹ کر گیا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے شاداں سے پانی منگوایا اور ایک ہی سانس میں پورا گلاس غٹا غٹ پی گیا۔ وہ شاداں کی جانب متوجہ ہوا۔

"اب بتا' کیا کہہ رہی تھی؟"

"کہنا کیا ہے۔" شاداں نے لالٹین کی لو دھیمی کی۔ اسے کونے میں رکھا اور لالی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ "یہ تو سوچ تیرا کیا بنے گا؟ کب تک پولیس سے چھپتا پھرے گا۔"

"میری فکر نہ کر۔" لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "پہلے اپنے بارے میں سوچ۔"

"وہ تو میں ہر وکت سوچتی رہتی ہوں۔" شاداں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب سے تیری لائی ہوئی بوری کے گبھن ہونے کا پتہ چلا ہے' میرا تو سوچتے سوچتے برا حال ہو گیا۔"

"مجھے پکڑوا دے۔ دو ہزار روپے انعام ملے گا۔"

شاداں نے غصے سے لالی کو دیکھا۔ "تیرے دل میں ابھی تک میل ہے۔ مجھے تیری یہ گل بالکل پسند نہیں۔ تو یہاں نہ آیا کر۔ کسی روز دوڑ آ گئی۔ پولیس نے تجھے پکڑ لیا تو یہی سمجھے گا' میں نے پکڑوا دیا۔" اس نے اپنی بات پر زور دے کر ترش روئی سے کہا۔ "تیری باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے' ضرور یہی سمجھے گا۔ رب سوں....."

لالی نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اب چپ بھی کر' بہت کہہ لیا۔" لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سچ سچ بتا' تو مجھے کیسا بندہ سمجھتی ہے؟"

"تو برا بندہ نہیں' حوصلے والا بھی ہے پر....."

لالی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں نوں پتہ ہے' تو کیا کہنا چاہتی ہے۔"

شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی بھی ذرا دیر چپ رہا۔ اس نے کمر سے بندھی ہوئی ہمیانی ٹولی اور دو ہزار روپے نکال کر شاداں کو دیتے ہوئے بولا۔ "لے' ان سے دوسری گ خرید لینا۔"

شاداں نے روپے ہاتھ میں لے لیے۔ چند لمحے حیرت سے لالی کا منہ تکتی رہی۔ اس نے دریافت یا۔ "اتنے ڈھیر سے روپے کہاں سے لے آیا؟" اس نے تامل کیا۔ "چوری کی ہو گی؟"

"چوری چکاری تو میں نے بہت کی ہے۔ پر اس دفعہ چوری نہیں کی' ایک زنانی کا سودا کیا تھا۔" شاداں کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مگر لالی اس کے تاثرات سے بے نیاز کہتا رہا۔ "نہ پوچھ کیسی

بانکی سجیلی نار تھی۔ ایسی سوہنی کہ تجھے کیا بتاؤں۔"

شاداں نے جھنجلا کر لالی کو دیکھا۔ "تو جانگلی ہے' یہ تو میں جانتی ہوں۔" اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "جانگلی ہو کر چوری چکاری کر سکتا ہے پر تو یہ دھندا بھی کرتا ہے' یہ میں نوں پتہ نہیں تھا۔" وہ لمحے بھر رکی اور ہاتھ میں دبے ہوئے روپے لالی کی جانب پھینک کر بولی۔

"مجھے ایسے روپے نہیں چاہئیں۔ میں تجھے ایسا بندہ نہیں سمجھتی تھی۔" وہ چارپائی سے نیچے اتری اور لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "اب سمجھی' تو کیوں بار بار میرے پاس آتا ہے۔"

لالی نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "گل تو سن۔"

شاداں نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑا لیا۔ "میں نے اب تیری کوئی گل بات نہیں سن نی۔" اس نے غصے سے ڈپٹ کر کہا۔ "اٹھا اپنے روپے اور ابھی میرے گھر سے ٹر جا۔"

"اتنا ناراض کیوں ہوتی ہے؟" لالی بھی چارپائی سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "تو میری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔"

مگر شاداں کی برہمی کم نہ ہوئی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا اور تیکھے لہجے میں کہا۔ "تو مجھے کوم کا باہنی وال لگتا ہے۔"

"تو کوم کی بات کرتی ہے' میں نوں تو یہ بھی پتہ نہیں' میرا پیو کون تھا۔" لالی بے نیازی سے مسکرا کر بولا۔ "ویسے تو کہاں کی لنگریال ہے۔ کون سے تیرے گھر پر لنگر کھلے ہیں۔"

"لنگریال تو نہیں ہوں۔ پر میرا پیو داد فتیانے کا تھا۔" شاداں نے فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔ "میں فتیانوں کی بیٹی ہوں۔"

"ہوگی' ضرور ہوگی۔" لالی نے اسے منانے کی کوشش کی۔ "پہلے میری بات تو سن لے۔"

"میں اب تیری کوئی بات نہیں سنوں گی۔" وہ غصے سے ہانپ رہی تھی۔ "دلا' کنجر' عورتوں کو بھگا کر چکلوں میں بیچتا ہے۔ بے گیرت' آخ تھو۔" اس نے حقارت سے زمین پر تھوک دیا۔

لالی کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے شاداں کو دیکھا۔ "زیادہ کڑ کڑ نہ کر۔ ورنہ......" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ورنہ کیا کرے گا؟" شاداں کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔ "دلا گیری کرتا ہے' اوپر سے آنکھیں دکھاتا ہے۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ غصے سے بے قابو ہو کر بھڑکتا شعلہ بن گیا۔ اس نے ایک ہونٹ دانتوں میں دبا کر شاداں کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ ہاتھ ایسا بے ڈھب پڑا کہ شاداں سنبھل نہ

تی۔ لڑھکتی ہوئی دہلیز پر جا کے گری۔ اس کا سر دروازے کی چوکھٹ سے زور سے ٹکرایا۔ چند نوں تک وہ خاموش پڑی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ غصے سے ہانپتے ہوئے بولی۔

"یہاں سے چلا جا۔ نہیں تو چیخ چیخ کر سارے پنڈ کو اکٹھا کر لوں گی۔"

"سب کو اکٹھا کر لے۔ مجھے پکڑوا دے' پر تو ایسی بات نہیں کہہ سکتی۔ میں ایسی گالی نہیں سن سکا۔" لالی نے اس کی دھمکی سے بے نیاز ہو کر کہا۔ "میں چوری ڈکیتی ضرور کرتا ہوں پر ایسا گندا ھندا نہیں کرتا۔ اور یہ بھی سن لے' میں بالے نہیں ہوں۔ زنانی کی کمائی نہیں کھاتا۔ اسے دینا جانا ہوں' اس سے لینا نہیں جانتا۔"

شاداں دروازے سے پیٹھ ٹکائے خاموش بیٹھی رہی۔ لالی نے لالٹین کی دھندلی روشنی میں یکھا' خون کی ایک پتلی دھار شاداں کے سر سے بہہ کر ماتھے اور کنپٹی پر پھیلتی جا رہی ہے۔ لالی کا سارا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ تڑپ کر شاداں کی جانب بڑھا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے خون پونچھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو شاداں نے غصے سے جھٹک دیا۔ منہ بگاڑ کر بولی۔

"رہنے دے اپنا لاڈ۔ بڑا آیا' میرا سکا بن کر۔"

"پاگل نہ بن۔" اس نے شاداں کا خون پونچھا تو اس کا ہاتھ تر بتر ہو گیا۔ لالی نے گھبرا کر کہا۔ "تیرے تو بہت چوٹ آ گئی۔"

شاداں چپ رہی۔ خون کے سرخ سرخ قطرے ٹپ ٹپ شاداں کے رخساروں پر گرتے رہے الی نے جھٹ اس کا دوپٹا اتارا' جھٹکا دے کر جھر سے پھاڑا اور اس کے ایک ٹکڑے سے خون ماف کرنے لگا۔ مگر خون نہیں رکا۔ چوٹ گہری آئی تھی۔ لالی تیزی سے آنگن میں گیا۔ کٹورے لما پانی بھر کر لایا۔ اس نے دوپٹے کا ایک ٹکڑا اور پھاڑا۔ اسے پانی میں بھگو کر سر اور رخساروں ے خون صاف کرنے لگا۔ خون پونچھنے کے بعد اس نے زخم پر کپڑے کی گدی بنا کر رکھی اور دوپٹے ا جو حصہ باقی بچا تھا' اسے سر سے لپیٹ کر پٹی باندھ دی۔ شاداں نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا۔

لالی نے اس کا بازو تھام کر آہستہ سے کہا۔ "چل' بستر پر لیٹ جا۔"

شاداں نے بے رخی سے کہا۔ "مجھے یہیں بیٹھا رہنے دے' میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" اس کی واز گلوگیر ہو گئی۔ "تو نے اکیلی اور لاوارث جان کر مجھے مار لیا۔" وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ اس نے نوں ہاتھ اٹھا کر اپنے چہرے پر رکھ لیے اور تڑپ کر بولی۔ "ہائے ربا! میں مر گئی۔ میرا کوئی ںکیں۔"

رات کے گہرے سناٹے میں شاداں کی سسکیاں ابھرتی رہیں۔ لالی اس کے قریب چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس نے شاداں کے سر پر ہاتھ رکھ کر اظہار معذرت کیا۔ "شاداں! معاف کر دے۔ میں نوں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے بہت برا کیا۔" شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سسکیاں بھرتی رہی۔ لالی نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر چہرے سے ہٹائے۔ چہرہ اوپر اٹھایا' مگر شاداں نے نظریں نہیں ملائیں۔ لالی نے نرمی سے کہا۔ "نہ رو شاداں!" وہ پھر بھی روتی رہی' آنسو ٹپکتے رہے۔ لالی جذبات سے بے قرار ہو گیا۔ تڑپ کر بولا۔

"تو نے رونا بند نہ کیا تو میں بھی اپنا سر پھوڑ لوں گا۔"

وہ تڑپ کر اٹھا۔ آگے بڑھا اور پاگلوں کی طرح دیوار پر دھم سے ٹکر ماری۔

شاداں نے رونا بند کر دیا۔ پریشان ہو کر لالی کو دیکھا۔ لالی نے ٹکر مارنے کے لیے دوبار سر جھکایا۔ شاداں نے جھٹ اس کا سر تھام لیا۔ گھبرا کر بولی۔ "یہ کیا کر رہا ہے؟ تیرا مگر تو نہیں چل گیا؟"

"ہاں' میرا مگر ہی چل گیا ہے۔" لالی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں تجھے روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔"

شاداں نے آنکھیں مل کر آنسو پونچھے۔ "لے' میں نے رونا بند کر دیا۔ سمجھ نہیں آتی تو کیسا بنا ہے؟"

"بات یہ ہے شاداں! تو لاوارث نہیں' لاوارث تو میں ہوں۔ میرا تو اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔" لالی کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ اس کا لہجہ اور جذباتی ہو گیا۔ "تو نوجوان ہے' سو اور متحیلی ہے۔"

شاداں بات کاٹ کر جھٹ بولی۔ "کہاں رہی جوان اور متحیلی۔ اب تو جل کر راکھ ہو ہوں۔"

لالی نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔ کچھ دیر گم صم بیٹھا رہا' پھر اس نے پوچھا۔ "ایک بات شاداں! تیری کتنی عمر ہو گی؟"

"پتہ نہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "جب میرا ویاہ ہوا تھا تو میں تیراں سال کی تھی۔ تین سال میری پہلی نکّی پیدا ہوئی پر وہ چھ مہینے بعد مر گئی۔ دو سال بعد جیجا پیدا ہوا۔" اس نے قدرے تو کیا۔ "کتنے سال ہوئے یہ؟"

"تیراں اور تن' سولاں' ساڑھے سولاں اور دو اٹھاراں۔" یہ حساب لگا کر اس نے شاداں

پوچھا۔ "جیجا اب کتنے برس کا ہے؟"

"پچھلے جاڑوں میں نویں سال میں لگ گیا۔"

"اس حساب سے تو تیری عمر ۲۷ سال ہو گی۔"

"تو یہ کم عمر ہوئی؟" شاداں مسکرا کر بولی۔

"ارے یہ تو کچھ بھی نہیں ہوئی۔" لالی کھل کر مسکرایا۔ "میں نے تو ۴۵ سے بھی اوپر کی زنانیاں رکھی ہیں۔ ایسی جوان' ایسی بانکی سجیلی۔ دیکھو تو دیکھتے رہ جاؤ۔ بالکل مٹیار لگتی تھیں۔"

"ہٹ' ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔" لالی نے اپنی بات میں وزن پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "کل ہی رات کی تو بات ہے۔ پوری سات زنانیاں تھیں۔ کوئی بھی ۴۰ سال سے کم نہیں تھی پر اتنا زوروں کا سنگھار کیے ہوئے تھیں کہ ہر ایک اتنی سوہنی اور جوان لگتی تھی' میں تجھے بتا نہیں سکتا۔"

شاداں نے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "کسی چکلے میں تو نہیں چلا گیا تھا؟"

"نہیں جی' ایسی کوئی گل بات نہیں۔ بہت وڈے افسروں کی گھر والیاں تھیں۔ ان کے کھسم بھی موجود تھے۔"

"پر تو وہاں کیسے پہنچ گیا؟ تیں نوں ڈر نہیں لگا؟"

"وہ کچھ اور ہی چکر تھا۔" لالی نے مسکرا کر بتایا۔ "سب لاٹری ڈال کر ایک دوسرے سے اپنی گھر والیاں بدلتے تھے' اور میں اس لاٹری کا امپائر تھا۔ امپائر جانتی ہے؟ وہ لاٹری کا جج ہوتا ہے۔ میں باری باری ہر ایک کی لاٹری نکالتا تھا۔ جو زنانی جس مرد کے حصے میں آتی' وہ رات بھر کے لیے اسے ل جاتی۔"

شاداں نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیسی زنانیاں تھیں' انھیں ذرا بھی لاج نہ آئی؟"

"تو زنانیوں کی بات کرتی ہے۔ مرد تو زنانیوں سے بھی زیادہ بے غیرت تھے۔ ہنسی خوشی اپنی گھر والی کو دوسرے مرد کے پاس سونے کے لیے بھیجتے تھے۔ اسی چکر میں تو میں نے نوٹوں سے بھرا ہوا یہ بٹوا اڑا لیا۔" لالی نے جیب سے بٹوا نکال کر دکھایا۔ "چوری کر کے نہیں لایا۔ دکھا کر اور بتا کر لایا اوں۔ بعد میں اس میں سے روپے نکال کر میں نے ہمیانی میں باندھ لیے۔"

شاداں ابھی تک حیرت زدہ تھی۔ "یہ تو نے عجب گل سنائی۔"

"عجب گل تو ہے' پر تیں نوں کیہ پتہ' دنیا میں کیا کیا ہوتا ہے۔"

"میرا پیو ٹھیک ہی کہتا تھا۔ یہ چودھویں صدی ہے۔ کلجگ ہے کلجگ۔ جو کچھ نہ ہو جائے' تھوڑا

ہے۔"

"چھوڑ یہ کلگ جھلگ۔" لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "اب یہاں کب تک بیٹھی رہے گ، چل اٹھ' منجی پر جا کر لیٹ۔ تیں نوں بہت چوٹ آگئی ہے۔ یہ کم بھی بہت حرام دا ہوتا ہے۔" اس نے شاداں کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اٹھایا۔ شاداں خاموشی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور لالی کے جسم کا سہارا لیے ہوئے چارپائی پر جا کر بیٹھ گئی۔ مگر بستر پر لیٹی نہیں۔ لالی کے اصرار پر بھی نہ لیٹی۔

لالی نے بستر پر بکھرے ہوئے دو ہزار کے نوٹ اٹھائے اور شاداں کی طرف بڑھا کر بولا۔ "لے' اب تو انھیں رکھ لے۔ دوسری نج خرید لینا۔"

شاداں نے نوٹ لینے سے انکار کر دیا۔ "انھیں اپنے ہی پاس رہنے دے۔"

"ابھی تک ناراض ہے؟"

"نہیں' یہ بات نہیں۔" شاداں نے آہستہ سے کہا۔ "بوری مرگئی تھی تو تونے مجھے دوسری لادی۔ اب تو مجھے اتنے روپے کیوں دینا چاہتا ہے؟"

"خاماخا کی باتیں نہ کر۔" لالی نے پیار سے ڈانٹا۔ "انھیں یہ سمجھ کر رکھ لے کہ بالے مرگیا۔"

"پر وہ تیرا کون لگتا تھا۔"

"میرا تو کوئی نہ تھا پر تیرا تو تھا۔ جب کسی کا کوئی مرجاتا ہے تو جات برادری والوں کو کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑتا ہے۔" اس نے ذرا سا تامل کیا۔ "میں اس کا نہیں پر تیرا تو کچھ لگتا ہی ہوں۔ نہ مان' بہ بات دوسری ہے۔" شاداں خاموش بیٹھی رہی مگر لالی خاموش نہیں رہا۔ "میرا پیو کوم کا کھرل تھا۔ میں نے سنا ہے' کھرل' ہرل' لکھیرے' اپیرے اور فتیانے' سب ایک ہی کوم کے ہوتے ہیں۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "لے' اب انکار نہ کر۔"

لالی نے اصرار کر کے نوٹ شاداں کو دے دیے۔ اس دفعہ اس نے انکار نہ کیا' خاموشی سے سارے نوٹ لے کر دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے۔ لالی اس کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ذرا دیر بعد خاموشی میں شاداں کی آواز ابھری۔

"لالی! ایک بات پوچھوں' سچ سچ بتائے گا؟"

"پوچھ! ضرور پوچھ۔"

شاداں نے ہچکچاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "یہ بتا' تو اس طرح راتوں کو چھپ لک کر میرے کول کیوں آتا ہے؟ میری ہر طرح مدد بھی کرتا ہے۔ یہ سب کچھ کیوں کرتا ہے؟"

"سچ سچ بتا دوں؟"

"میں سچ سچ ہی سننا چاہتی ہوں۔"

"سچ تو یہ ہے شاداں! میں نوں خود نہیں ملوم' میں تیرے کول کیوں آتا ہوں۔" لالی آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ "مجھے پتہ ہے' تونے زندگی میں صرف بالے سے پیار کیا۔ وہ مرگیا پر تو آج بھی اسی سے پیار کرتی ہے اور اسی کے پیار کی کارن ابھی تک اسی گھر میں رہتی ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"نہیں! تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" شاداں نے اعتراف کیا۔

"اور میں یہ بھی جانتا ہوں' مجھ سے تجھے ذرا بھی پیار نہیں' ہو بھی نہیں سکتا۔ میں چور اچکا جو ہوں۔ جیل سے بھاگا ہوا کیدی ہوں۔ ایسے بندے سے کوئی زنانی' کوئی ٹمیار' پیار نہیں کرسکتی اور تو بالکل نہیں کرسکتی۔" اس نے شاداں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "تو مجھ سے ڈرتی ہے اور اس لیے ڈرتی ہے کہ میں بالے کے کتل کا راز جانتا ہوں۔"

شاداں چپ بیٹھی رہی۔ لالی ذرا دیر خاموش رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "مجھے ایک چدّر دے دے' رحیم داد کو دوں گا۔ ویسے میرے پاس چدّر ہے۔ ایک اور دے دے۔ میں اب سیدھا اسی کے پاس جاؤں گا۔ جانے وہ کس حال میں ہوگا۔"

شاداں خاموشی سے اٹھی۔ کمرے کے اندر گئی اور ایک چادر لے کر واپس آئی۔ چادر دیتے ہوئے اس نے لالی سے کہا۔ "ذرا دیر ٹھیر جا۔ میں تیرے لیے روٹی پکا دوں۔ کل کیا کھائے گا؟"

"تونے پہلے کبھی یہ بات نہیں کہی' آج کیا بات ہے؟"

"میں نے پہلے بھی کہا تھا' میں تجھے برا بندہ نہیں سمجھتی۔ تجھ سے نفرت بھی نہیں کرتی۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکی۔ "لالی! تو چوری چکاری کا دھندا نہیں چھوڑ سکتا؟"

"تو کہتی ہے تو چھوڑ دوں گا' پر ایک شرط ہے۔"

"کیا شرط ہے؟" شاداں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "بتا' وہ بھی بتا۔"

"میرے ساتھ بھاگنے پر تیار ہوجا۔"

"تونے فیر مسکری شروع کردی۔"

"نہیں! میں مسکری بالکل نہیں کر رہا۔" لالی نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں تجھے بھگا کر لے جانا چاہتا ہوں۔ اسی طرح جیسے بالے تجھے بھگا کر یہاں لایا تھا۔"

شاداں چند لمحے خاموش رہی پھر مسکرا کر بولی۔ "مان لے' میں تیرے ساتھ جانے کو تیار بھی ہو جاؤں تو مجھے کہاں لے جائے گا۔ خود بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ پولیسوں کے ڈر سے چھپتا لکتا رہتا

ہے۔"

"میرا انتظار کر سکے گی؟" لالی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں ایک رات آؤں گا اور جیتی آؤں گا۔ تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اس روز میں نئی زندگی شروع کروں گا' تیرے ساتھ لہور یا کراچی چلا جاؤں گا۔ محنت مزدوری کروں گا۔ کوئی بھی دھندہ کرلوں گا پر چوری ڈکیتی ہرگز نہیں کروں گا۔ تجھے خوش رکھوں گا۔" اس نے شاداں کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چراغ جھلملانے لگے۔ "بول' کیا کہتی ہے؟" لالی بہت جذباتی ہوگیا۔ اس نے اپنے بازو پھیلا کر شاداں کو اپنے سینے سے لگایا اور اس کے سر کا زخم چوم لیا۔ "اب تو ہاں کہہ دے۔"

وہ آہستہ سے بولی۔ "مجھ سے دھوکا تو نہیں کرے گا؟"

"یہ مرد کا وعدہ ہے۔ تجھ سے دھوکا کروں تو مجھے بھی بالے کی طرح چھری سے ٹوٹے کر کے زمین میں دبا دینا۔ میں نے تیرا پیار دیکھا ہے' تیری نفرت اور گھن بھی دیکھی ہے۔ میں تجھے پہچان گیا ہوں۔ مجھے پتہ ہے' تو کیسی زنانی ہے۔" شاداں' لالی کے سینے سے لگی خاموش کھڑی رہی۔ رات ساکت اور نڈھال تھی۔ دونوں کونے میں رکھی ہوئی لالٹین کی دھندلی روشنی میں چپ چاپ کھڑے تھے۔ چند لحوں بعد لالی کی آواز ابھری۔ "شاداں! مجھے اپنے پیو کا لاڈ ملا' نہ ماں کی ممتا ملی اور نہ بہین بھائیوں کا پیار۔ مجھے دنیا میں کچھ بھی نہیں ملا۔ تو مجھے سب کچھ دے سکتی ہے۔" اس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ وہ بے قرار ہو کر رو پڑا۔ اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو ٹپک کر شاداں کے سر اور ماتھے پر گرنے لگے۔

شاداں کسمسائی۔ اس نے پریشان ہو کر گردن اٹھائی۔ لالی کو دیکھا۔ "رو رہا ہے؟" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا' روتا رہا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ شاداں نے پیچھے ہٹ کر ہاتھ اٹھایا۔ لالی کے آنسو پونچھے۔ "میں تیرا انتظار کروں گی' یہ شاداں کا وعدہ ہے۔ میں نے کبھی جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔" وہ چند لمحے خاموش کھڑی رہی' پھر تڑپ کر بولی۔ "سمجھ لے' آج بالا میرے لیے مر گیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مر گیا۔"

لالی نے دونوں ہاتھوں سے شاداں کے رخسار تھام کر اس کا چہرہ اوپر کیا' چند لمحے اس کی کنول کے مانند خوبصورت اور شفاف آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ پھر رخسار اور آنکھیں چوم کر بولا۔ "شاداں! اب میں چلوں گا۔"

شاداں نے آہستہ سے کہا۔ "ٹھہر جا' کل چلا جانا۔ میں تیرے لیے روٹی پکا دوں' ساتھ لے جانا۔ جانے اب تو کب آئے۔"

"تو کہتی ہے تو کل ہی چلا جاؤں گا۔"

شاداں چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ لالی دالان میں رکھی ہوئی لالٹین کی جانب بڑھا۔ اسے اٹھایا اور پھونک مار کر بجھا دیا۔ دالان میں اندھیرا چھا گیا۔ باہر صحن میں ستاروں کی روشنی پھیلی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے۔ لالی آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ شاداں اب کروٹ کے بل خاموش لیٹی تھی۔

رات دھیرے دھیرے گزرتی رہی۔

☆

اچانک آہٹ ہوئی۔ لالی نے نظریں گھما کر دیکھا۔ آنگن کی دیوار پر دھندلی روشنی میں ایک سر ابھرا ہوا نظر آیا۔ دیکھتے دیکھتے ایک شخص چڑھ کر دیوار پر آگیا۔ وہ آہستہ سے نیچے اترا اور گردن ادھر ادھر موڑ کر چوکنا نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ دروازے پر گیا اور اس کی کنڈی آہستہ سے کھول دی۔

وہ دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ وہاں سے دبے قدموں چھپر کی جانب بڑھا۔ چھپر کے نیچے شاداں کی بھوری بھینس بندھی تھی۔ لالی چپ رہا۔ چند لمحے گزر گئے۔ وہ شخص چھپر کے نیچے سے نہیں نکلا۔ لالی فوراً تاڑ گیا کہ وہ کس ارادے سے دیوار پھاند کر گھر میں آیا ہے۔

لالی آہستہ سے اٹھا۔ اس نے جوتے اتار دیے۔ دالان سے اتر کر آنگن میں آگیا۔ جھک کر دبے دبے قدموں چھپر کی سمت بڑھا۔ قریب پہنچا تو اس نے دیکھا' دھندلی روشنی میں وہ شخص اکڑوں بیٹھا ہے۔ اس کی پشت لالی کی طرف تھی۔ وہ بھینس کی رسی آہستہ آہستہ کھونٹے سے کھول رہا تھا۔ لالی تیزی سے جھپٹا اور ہاتھ بڑھا کر اس کا منہ مضبوطی سے دبوچ لیا۔ وہ آواز بھی نہ نکال سکا۔ لالی کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ وہ اکہرے بدن کا نوجوان تھا۔ لالی نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کنپٹی پر زناٹے کا تھپڑ مارا۔ وہ سہم کر رہ گیا۔ لالی نے ہاتھ ہٹا لیا۔ ساتھ ہی ایک تھپڑ اور رسید کیا۔ وہ گڑگڑا کر بولا۔

"مارو نہیں۔"

"کون ہے تو؟ بھینس اٹھانے آیا تھا؟"

"ہن جی! آیا تو اسی لیے تھا۔" وہ گھگھیا کر بولا۔ "زمیں دار نے بھیجا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر چار میل ادھر اہر لے جانا تھا۔"

لالی نے عقب میں چاپ سنی' وہ پلٹا۔ دھندلی روشنی میں شاداں کھڑی تھی۔ وہ حیران و پریشان نظر آرہی تھی۔ اس نے لالی سے پوچھا۔ "یہاں چتل کے نیچے کیا کر رہا ہے؟"

لالی نے مویشی چور کی گردن دبوچی اور اسے اٹھا کر شاداں کے سامنے لایا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "ہائے! یہ کہاں سے آگیا؟"

"تیری مج اٹھانے آیا تھا۔ اس سے پوچھ لے۔" اس نے مویشی چور کے منہ پر ایک اور تھپڑ رسید کیا۔ "بتا' اسی لیے آیا تھا نا؟"

وہ گردن ہلا کر مری ہوئی آواز میں بولا۔ "ہن جی! اسی لیے آیا تھا۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "مجھے جانے دے۔ غلطی ہو گئی معافی دے دے۔" وہ لالی کے قدموں پر گر پڑا۔ پیر پکڑ کر گڑگڑانے لگا۔ "اب کبھی اتھے نہیں آوں گا' اگر آوں تو جان سے مار دینا۔"

شاداں نے لالی سے کہا۔ "جانے دے اسے۔"

لالی نے جھک کر ایک بار پھر گردن دبوچی۔ اسے اٹھایا اور کھینچتا ہوا دروازے تک لے گیا۔ دروازہ کھول کے اس نے چور کو زور سے دھکا دیا۔ وہ اندھیرے میں دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ لالی نے دروازہ بند کر لیا۔

پاس پڑوس کے گھروں سے کھانسنے کھنکارنے کی آوازیں ابھرنے لگیں تھیں۔ لالی پریشان ہو گیا۔ لپک کر دالان میں گیا۔ چادر کھول کر رائفل نکالی۔ شاداں بھی اس کے قریب پہنچ گئی۔ رائفل دیکھ کر گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "ہائے تیرے پاس تو بندوک بھی ہے۔" لالی خاموش رہا۔ چیمبر میں کارتوس چڑھا کر رائفل لوڈ کرنے لگا۔ اس نے بھری ہوئی رائفل کندھے پر لٹکائی۔ شاداں کی دی ہوئی چادر' قمیص اور شلوار کے ساتھ رکھ کر گٹھری بنائی اور اسے بھی پیٹھ پر لٹکالیا۔ شاداں حیرت سے دیکھتی رہی۔ بے چین ہو کر پوچھا۔

"یہ سب کیا کر رہا ہے؟"

"مجھے اب جانا ہے۔ یہاں ٹھیرنا میرے لیے خطرناک ہے۔"

شاداں کھسک کر اس کے قریب آگئی۔ "کب آئے گا؟"

"میرا کہا مان' اپنی مج فوراً بیچ دے۔ ملک اللہ نواز اسے اٹھوا لے گا اور یہاں رہی تو تجھے بھی اٹھوا لے گا۔ وہ زبردست رسّا گیر ہے۔ تیں نوں پتہ ہی ہے' اس کا بھائی ادھر تھانے دار لگا ہے۔"

"پر میں جاؤں گی کہاں؟"

"کادر آباد جانتی ہے؟"

"جانتی ہوں۔ ادھر تو سٹیشن بھی ہے۔"

"وہاں تیرا کوئی جاننے والا ہے؟"

وہ سوچنے لگی۔ لالی نے کہا۔ "چھیتی نال بتا۔ میں نوں اب جانا ہے۔"

شاداں نے چند لمحے خاموش رہ کر کہا۔ "ادھر میرا ایک ماماں ہے۔ چھوٹی تھی تو اس کی پاس جا کر رہتی بھی تھی۔ پر یہ بات کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"تو اس کے پاس چلی جا۔ میں تجھے وہیں آ کر ملوں گا۔"

"پر مجھے وہاں کیسے ملے گا؟" شاداں نے دریافت کیا۔ "ویسے میرے ماماں کا نام کرامت ہے۔ وہ دودھی ہے۔ گھروں سے دودھ اکٹھا کر کے دکان داروں کو بیچتا ہے۔"

"بس اتنا کافی ہے۔ میں تیرے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"پر مجھے کادر آباد کیوں بھیجنا چاہتا ہے؟ صاف صاف بتا' مجھ سے چھپا نہیں۔"

"تجھ سے اب کیا چھپانا' اب تو میری بن ہی چکی ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "میں کادر آباد کے اس پار لوئر باری دو آب نہر کے پیچھے ٹبوں پر رسّے کے ساتھ چھپا ہوا ہوں۔ پر جلد ہی وہ ٹھکانا چھوڑ دوں گا۔ شام کو نہر پر آجائے گی تو تجھے آسانی سے مل لوں گا۔ نہر تو کادر آباد سے بالکل نزدیک بہتی ہے۔ بیچ میں صرف سڑک ہے۔"

"وہاں کب تک پہنچے گا؟"

"میں وہیں جا رہا ہوں۔ تو جلد سے جلد وہاں پہنچ جا۔ کادر آباد جا کر جی چاہے تو دوسری مج خرید لینا۔ تیرے پاس روپے ہیں اور تیرا ماما دودھی بھی ہے۔ تجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

لالی آگے بڑھا۔ شاداں اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دروازے پر پہنچ کر بولی۔ "میں تیرے ساتھ رڑی تک چلوں گی۔"

"نہیں' تو گھر ہی میں رہ۔" لالی نے اسے منع کر دیا۔ "آج خطرہ بہت ہے۔ ڈنگر چور مار کھا کر سیدھا اللہ نواز کے پاس گیا ہوگا۔ ویسے اس کے ساتھی بھی باہر ہوں گے۔ تیرا اس وکھت میرے ساتھ جانا ٹھیک نہیں۔"

لالی نے رائفل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لے لی۔ شاداں نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ لالی نے پیار سے اس کا گال تھپ تھپایا۔ "چھیتی نال کادر آباد پہنچ جانا۔" لالی دروازے سے گزر کر باہر گلی میں آگیا۔

وہ رائفل سنبھالے' چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا' گلی سے نکلا۔ رڑ میں پہنچ کر اس نے

نصف سے بھی کم راستہ طے کیا تھا کہ سامنے سے کسی نے اونچی آواز میں ٹوکا۔ "کون ہے جی؟" لالی نے جھٹ راستہ بدل لیا۔ تیزی سے کھیتوں کی جانب لپکا اور گندم کے ایک کھیت میں گھس گیا۔ اسے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ لالی گندم کے پودوں کی اوٹ میں چھپا ہوا کھسک کھسک کر آگے بڑھنے لگا۔

رات ڈھل رہی تھی اور سناٹے میں رڑکی طرف سے بولنے کی ملی جلی مدھم آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ لالی کے لیے پودوں کے درمیان سے گزرنا مشکل تھا۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح کھیت سے نکل کر پگڈنڈی پر آگیا اور گردن جھکا کر راستے کا اندازہ کیے بغیر تیزی سے آگے بڑھا۔

١١

لالی ایک لق دوق میدان کے نشیب میں آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ یہ دریائے بیاس کی قدیم رگاہ سے نکلنے والا بڈہ تھا' جو کسی زمانے میں مشرق سے جنوب کی جانب بہتا تھا۔ بیاس اور ستلج اپنے راستے بدلے تو بیاس' فیروز پور کے قریب' ہری کے پتن پر' دریائے ستلج سے مل گیا۔ ں کی پرانی گزرگاہ خشک اور بنجر ہو گئی۔ اس کا یہ بڈہ بھی خشک ہو کر اجاڑ ہو گیا۔ نہ جانے یہ بڈہ ب سے خشک پڑا تھا۔ اس کی مٹی نرم اور ریتلی تھی۔ جگہ' جگہ ریت کے تودے تھے۔ تودوں کے س پاس کہیں کہیں کیکر' کریل اور لاناکے اکا دکا پودے بکھرے ہوئے تھے۔

دور' دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ رات ختم ہو رہی تھی۔ اجالا رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ لالی مسلسل چلتے چلتے تھک چکا تھا۔ مگر اسے اپنی تھکن کی فکر نہیں تھی۔ ا ایسے ٹھکانے کی تلاش تھی جس میں روپوش ہو کر دن بسر کیا جا سکے۔ ایسا کوئی ٹھکانا نظر نہیں تھا۔ نہ کہیں جھنگر تھا نہ جنگلی پودوں کی کوئی بڑی جھاڑی تھی۔ اس کی تشویش بڑھتی جا رہی ے۔ وہ ادھر ادھر نظریں دوڑاتا ہوا آگے اور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

اجالا اب گہری سرخ روشنی میں بدلتا جا رہا تھا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ لالی کی تشویش اور بڑھ ے۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا۔ خشک اور بنجر بڈہ سے کچھ فاصلے پر ایک اجڑی ہوئی بستی کے کھنڈر نظر ئے۔

وہ نشیب سے نکل کر اوپر آگیا اور کھنڈر کی جانب بڑھنے لگا۔ کھنڈر کی دیواریں مٹی کی تھیں اور [illegible] بے کا ڈھیر بن گئی تھیں۔ نہ کہیں چھت تھی' نہ کوئی دروازہ بچا تھا۔ صرف اونچی

اونچی دیواریں تھیں اور خود رد پودوں کی جھاڑیاں تھیں۔ لالی کو یہ کھنڈر غنیمت نظر آیا۔ وہ اس میں ٹھہر کر دن گزار سکتا تھا۔ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا' آگے بڑھا اور کھنڈر میں داخل ہوگیا۔

یہ کھنڈر کوئی قدیم گاؤں تھا۔ قحط سالی کے باعث اجاڑ اور ویران ہوگیا تھا۔ کھنڈر میں گھس کر اس نے چھپنے کی جگہ تلاش کی اور اسے ایسی جگہ مل بھی گئی۔ یہ قد آدم دیواروں کے درمیان صاف ستھری اور ہموار زمین کا ٹکڑا تھا جو کبھی کمرے یا کوٹھری کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ اس نے کندھے پر لٹکی ہوئی گٹھری اتار دی۔ اسے ایک طرف رکھا۔ رائفل بھی پاس رکھ دی اور زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔

وہ بہت تھکا ہوا اور نڈھال تھا۔ دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ سورج طلوع ہوچکا تھا۔ دھوپ آہستہ آہستہ کھنڈر کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں پر پھیلتی جا رہی تھی۔ دن کا آغاز ہوچکا تھا۔ مگر ابھی تک ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔

لالی رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ جلد ہی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ غنودگی بڑھنے لگی۔ اس نے گٹھری کھولی' اندر سے وہ چادر نکالی جو پچھلی رات شاداں نے دی تھی۔ لالی نے زمین پر بکھرے ہوئے سنگریزے صاف کیے۔ چادر بچھائی۔ گٹھری ایک بار پھر باندھی اور تکیے کے طور پر سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ رائفل بھی اس نے اپنے سرہانے ہی رکھ لی۔ تھوڑی دیر تک وہ آنکھیں بند کیے چپ لیٹا رہا پھر سوگیا۔

دوپہر کو اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔ ہر طرف تیز دھوپ پھیلی تھی۔ سورج ٹھیک اس کے سر کے اوپر تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کہیں سایہ نہیں تھا اور اسے سخت پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ پانی کی تلاش میں نکلا۔ کھنڈر خاصی دور تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اور اونچی نیچی دیواروں کے درمیان سے گزرتا' خود رو پودے روندتا' خاردار جھاڑیوں سے الجھتا' ایک سرے سے دوسرے تک چلا گیا۔ مگر کہیں پانی کا گڑھا تک نہ تھا۔

وہ اپنے ٹھکانے کی جانب لوٹ رہا تھا کہ کچھ دور دو راہ گیر نظر آئے۔ وہ بڈہ کے نشیب سے گزر کر اوپر آئے اور آگے بڑھنے لگے۔ مگر وہ کھنڈر کی جانب نہیں آئے۔ لالی بھی ان کے پاس نہیں گیا اور نہ اس کا کوئی ایسا ارادہ تھا۔ ان سے ملنے میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ لیکن انھیں دیکھ کر اسے یہ اندازہ ہوگیا کہ میل دو میل کے گرد و نواح میں کوئی بستی ہے۔ وہ راہ گیروں کی نظروں سے بچنے کے لیے

یک ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑ میں دبک گیا۔ قریب ہی ملّھا تھا۔ یہ خاردار جھاڑی تھی۔ اس میں ھوٹے کوکن بیر لگے تھے۔

کوکن پک کر پیلے پڑگئے تھے۔ لالی انھیں توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ کوکن کھانے سے پیاس کم ہوگئی۔ ہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ گردن اونچی کی۔ کھنڈر کے باہر دیکھا۔ دونوں راہ گیر بہت دور جا چکے تھے۔

لالی ہاتھ میں دبے ہوئے کوکن کھاتا ہوا اس طرف چلا جہاں کچھ دیر پہلے وہ سو رہا تھا۔ مگر وہاں بھی تک تیز دھوپ پھیلی تھی۔ گٹھری پر ایک کالا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ لالی اسے دیکھ کر ائف ہوا اور کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔

رائفل بھی گٹھری کے پاس ہی رکھی تھی' ورنہ وہ اس کے بٹ سے سانپ کا منہ کچل دیتا۔ ایک ر پھر وہ باہر آیا۔ ببول کے درخت سے موٹی شاخ توڑی' اس کے پتے صاف کیے اور شاخ ہاتھ میں باکر گٹھری کے پاس پہنچا۔ مگر سانپ اب گٹھری سے نیچے اتر رہا تھا۔ لالی نے اسے چھیڑنا مناسب ہیں سمجھا۔

سانپ لگ بھگ دو گز لمبا تھا۔ وہ زمین پر رینگتا ہوا آگے بڑھا اور دیوار میں بنے ہوئے ایک بل یں گھس گیا۔ لالی یہ سوچ کر لرز گیا کہ چادر پر سوتے وقت اس کا ایک پیر بل کے عین منہ پر تھا۔ ب یہ جگہ محفوظ نہیں رہی تھی۔ دھوپ بھی بہت تھی۔ اس نے چادر سمیٹ کر کندھے پر ڈالی۔ رائفل اٹھائی اور سائے کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ اسے ایک ایسی دیوار نظر آئی ں کے قریب ہی ببول کا گھنا درخت تھا۔ درخت زیادہ اونچا نہیں تھا۔ دیوار اور درخت کے رمیان کھلی جگہ تھی۔ اس پر سایہ بھی تھا۔ یہ جگہ صاف ستھری نہیں تھی۔ اس پر گھاس پھوس اور ھوٹے چھوٹے خود رو پودے تھے۔ مگر سایہ ہونے کے باعث اس نے یہی جگہ منتخب کی اور چادر بچھا ر بیٹھ گیا۔

لالی زیادہ دیر نہ بیٹھ سکا۔ ایک بار پھر نیند کا غلبہ ہوا۔ اس نے گٹھری سر کے نیچے رکھی۔ رائفل ھی اس کے ساتھ ہی پڑی تھی۔ وہ ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا اور دوبارہ گہری نیند سوگیا۔

آنکھ کھلی تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب پیاس کے اتھ ساتھ بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چادر تہہ کی اور گٹھری میں رکھ دی۔ شام ہستہ آہستہ کھنڈر کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں سے نیچے اترنے لگی۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ کھنڈر زیادہ ویران ور پرہول نظر آنے لگا۔

اب وہاں ٹھہرنا مناسب نہ تھا۔ ایک سانپ وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ نہ جانے کھنڈر میں اور کتنے

سانپ ہیں۔ وہ کھنڈر سے نکلا مگر زیادہ دور نہیں گیا۔ ٹھہر کر اندھیرا بڑھنے اور پھیلنے کا انتظار کرنے لگا۔ ہر طرف گہرا سناٹا طاری تھا۔

شام تاریک ہو کر رات میں ڈھل گئی۔ لالی نے اپنے سفر کا آغاز کیا اور اس سمت چلنے لگا جدھر اس نے دوپہر کو دو راہ گیر جاتے ہوئے دیکھے تھے۔ وہ بنجر میدان میں آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ اس نے دو ڈھائی میل راستہ طے کیا تھا کہ کھیت نظر آنے لگے۔ جگہ جگہ سرس اور جنڈ کے درخت تھے۔ وہ کھیتوں سے دور درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے ٹھہر گیا۔ اسے کھیتوں کے اس پار گاؤں میں ٹمٹماتے چراغوں کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ اسے یہ آوازیں ختم ہونے اور خاموشی میں ڈوب جانے کا انتظار تھا۔ بھوک اور اس سے بھی زیادہ پیاس اسے پریشان کر رہی تھی۔

مگر اس نے پیاس اور بھوک قابو میں رکھنے اور دبانے کی کوشش کی۔ وہ گاؤں میں جانا چاہتا تھا' مگر سناٹا پھیلنے سے پہلے گاؤں میں داخل ہونا خطرناک تھا۔

پہر رات گزر گئی۔ اندھیرا بڑھ گیا۔ خاموشی اور گہری ہو گئی۔ لالی کے حلق میں شدید پیاس سے کانٹے چبھ رہے تھے۔

گرمیوں کی رات تھی۔ نو بجے کا عمل تھا۔ گاؤں کی طرف ابھی جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ مگر لالی کے لیے پیاس اب ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ گٹھری کندھے پر لٹکائی' رائفل ہاتھ میں سنبھالی اور چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا کھیتوں کی جانب بڑھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔

کھیتوں کے درمیان سے ایک پہا گزرتا تھا۔ لالی دبے دبے قدموں پہے پر چلنے لگا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ گھپ اندھیرے میں اس کا ایک پیر آڈ میں چلا گیا۔ آڈ کے ذریعے کھیتوں میں پانی پہنچایا جا رہا تھا۔ لالی کو اسی کی تلاش تھی۔ اس نے جھٹ اپنا پیر آڈ سے باہر نکالا اور ایک کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کے چلو بھر بھر کے بے صبری سے پانی پینے لگا۔ پانی پی کر ذرا قرار آیا تو بھوک کا غلبہ بڑھا۔ اس نے کھڑے ہو کر نظریں دوڑائیں۔ وہ چنے کے کسی کھیت میں گھس جانا چاہتا تھا' جہاں کچے چنوں سے اپنی بھوک مٹا سکتا۔ مگر چنے کا کوئی کھیت قریب نہیں تھا۔ دونوں طرف کھیتوں میں چری کے پودے کھڑے تھے۔ گندم کے نہیں تھے' ورنہ وہ گندم کے دانے کھا کر بھی کام چلا سکتا تھا۔ لیکن دور دور تک صرف چری کے کھیتوں کا سلسلہ پھیلا تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

چلتے چلتے وہ ایک موڑ پر پہنچا تو خاموشی میں یکایک کہیں قریب ہی زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ ساتھ ہی
ں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ ٹھٹکا' کچھ دیر سہما ہوا چپ چاپ کھڑا رہا' پھر چند قدم آگے بڑھا۔
ں کے پودوں کی آڑ سے اس جانب دیکھا جدھر سے آوازیں ابھر رہی تھیں۔ سامنے کھیتوں کے
یان کچھ فاصلے پر کھلی جگہ تھی۔ وہاں دھیمی دھیمی آگ جل رہی تھی۔ آگ پر لوہے کا لہانڈا
ا تھا۔ قریب ہی دو آدمی لہانڈے میں گھی ڈال کر مرغ تل رہے تھے۔ مرغ تلنے کی تیز خوشبو فضا
پھیلتی جا رہی تھی۔

آگ سے ذرا ہٹ کر آڈ سے کھیتوں کو سیراب کرنے کا نکا تھا۔ نکا اس وقت کھلا تھا۔ نکے پر بھی
ادمی بیٹھے تھے۔

لالی نے آگ کی سرخ روشنی میں انھیں دیکھا۔ وضع قطع سے وہ مزارعے نظر آتے تھے۔ آڈ کے
لے نکے سے اپنے کھیتوں میں پانی پہنچا رہے تھے۔ مرغ تلنے کی مہک نے لالی کی بھوک اور بڑھا
ہے۔

وہ ابھی یہ طے نہ کر سکا تھا کہ کس طرف جائے۔ معاً نکے سے ایک شخص اٹھا اور اس کی جانب
ا۔ بھاگنے کی گنجائش نہیں تھی۔ لالی جھٹ چری کے قریبی کھیت میں دبک گیا۔ اس نے رائفل
دں ہاتھوں میں سنبھالی اور آنے والے خطرے سے نمٹنے کے لیے خود کو تیار کر لیا۔ قدموں کی
ٹ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ لالی چوکس بیٹھا راستہ تکتا رہا۔ آنے والا عین اس کے سامنے
ہا۔

وہ چند فٹ کے فاصلے پر تھا۔ مگر نہ وہ ٹھٹکا نہ جھجکا بلکہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ جب وہ دور چلا
تو لالی کو اپنے ارد گرد منڈلاتے ہوئے خطرے کا شدت سے احساس ہوا۔ اب کھیتوں میں ٹھہرنا
ا طور مناسب نہ تھا۔ لالی پلٹا اور پہے پر چلتا ہوا کھیتوں سے باہر نکل گیا۔ سامنے جوہ تھا۔ اس
رتی چراگاہ میں دن کو گاؤں کے چاک اور چرواہے مویشی چراتے تھے۔ اس وقت جوہ بالکل
مان تھا۔ اس میں جگہ جگہ جنڈ' ٹاہلی اور بیری کے پیڑ تھے۔ جوہ کے اس پار گاؤں تھا۔ لالی جوہ میں
ل ہوا اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا گاؤں کی جانب بڑھا۔ گاؤں پر سناٹا چھایا تھا۔ گلی کوچے ویران
ے۔

لالی ایک گلی میں داخل ہوا مگر آگے نہیں گیا۔ وہ نکڑ کے مکان کی چار دیواری کے قریب جا کر ٹھہر
ے چند لمحے دم سادھے خاموش کھڑا رہا' پھر اس نے زقند بھری اور دونوں ہاتھوں سے دیوار پکڑ کر
پہنچ گیا۔

اس نے گردن جھکا کر اندر جھانکا۔ گھر پر خاموشی چھائی تھی۔ صحن میں ایک طرف جھلیانی تھی۔ یہ مختصر سا باورچی خانہ تھا۔ اس میں چراغ جل رہا تھا۔ لالی دبے دبے قدموں چلتا ہوا جھلیانی کے قریب گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

وہ جھلیانی میں داخل ہوگیا۔ چولھا ابھی گرم تھا۔ انگارے دہک رہے تھے۔ چولھے پر المونیم کی گڑوی رکھی تھی۔ اس میں دودھ گرم ہو رہا تھا۔ لالی چولھے کی جانب بڑھا۔ عین اسی وقت صحن میں آہٹ ہوئی۔ لالی دیوار سے چپک کر کھڑا ہوگیا۔

جھلیانی میں تیکھے نقش و نگار کی ایک سانولی سلونی نوجوان عورت داخل ہوئی۔ وہ اپنے بکھرے ہوئے بالوں کا جوڑا باندھتی ہوئی چولھے کی سمت بڑھی۔ لالی نے جھٹ ہاتھ بڑھا کر اس کا منہ دبوچ لیا۔ عورت کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ مگر لالی نے اس قدر زور سے منہ بھینچا کہ اس کی آواز نہ نکل سکی۔

وہ دہشت زدہ ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے لالی کو دیکھنے لگی۔ لالی ذرا دیر اس کا منہ دبائے خاموش کھڑا رہا' پھر اس نے سرگوشی کی۔ "گھر میں تیرے علاوہ اور کوئی بھی ہے؟" عورت نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر اقرار کیا۔

لالی نے کرید کر پوچھا۔ "تیرا کھسم ہے؟" عورت نے انکار میں صرف گردن ہلا دی۔ لالی نے مسکرا کے استفسار کیا۔ "تیرا یار ہے؟" عورت نے کوئی جواب نہیں دیا' نظریں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

لالی نے دریافت کیا۔ "تیرا گھر والا کہاں ہے؟"

عورت نے دھیرے سے جواب دیا۔ "کھیتوں کو پانی لگانے گیا ہے۔"

"کب تک واپس آئے گا؟"

"وہ تو پوہ پھٹے آئے گا۔ رات بھر کھیتوں پر رہے گا۔" عورت نے لالی کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "پر تو ہے کون؟"

"میں کوئی بھی ہوں' پہلے مجھے روٹی ٹکر کھلا۔ سخت بھوک لگی ہے۔"

عورت نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "تو چور تو نہیں ہے؟"

"بکواس نہ کر۔" لالی نے اسے ڈانٹا۔ "فٹافٹ روٹی دے۔ میں روٹی کھا کر چلا جاؤں گا۔ میں نے تجھ سے اور کچھ نہیں لینا۔" اس نے چولھے پر رکھی ہوئی گڑوی کی طرف اشارہ کیا۔ "پہلے مجھے دودھ دے' ہتھیتی نال۔ ڈرنا شرنا چھوڑ۔ میں نوں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھیرنا۔"

عورت نے کچھ کہے بغیر بڑھ کر گلاس اٹھایا۔ چولھے کے پاس گئی اور گڑوی اٹھا کر گلاس میں دھ انڈیلنے لگی۔ اسی اثناء میں باہر کوئی آہستہ سے کھنکارا۔ ساتھ ہی چاپ بھی ابھری۔ لالی نے ائفل اٹھائی اور نشانہ باندھ کر باہر صحن کی جانب دیکھنے لگا۔ عورت گلاس چھوڑ کر تیزی سے لالی ی طرف لپکی۔ رائفل پر ہاتھ رکھ کر بے قراری سے بولی۔

"وے گولی نہ چلانا۔"

"چپ کر۔" لالی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "میں نے گولی چلا کر سارے پنڈ کو جگانا ہے؟" وہ س کی جانب دیکھے بغیر کھل کر مسکرایا۔ "تو بھی پکڑی جائے گی' تیرا یار بھی پکڑا جائے گا اور میں بھی پکڑا جاؤں گا۔ میں ایسے خطرناک کام نہیں کرتا۔"

عورت چپ چاپ اس کے قریب کھڑی رہی۔ چند لمحوں بعد جھورا نمودار ہوا۔ وہ مضبوط جسم کا چھا خوش شکل جوان تھا اور دھوتی باندھے ہوئے تھا۔ اوپر کا دھڑ بالکل برہنہ تھا۔ اس نے لالی کو یکھا اور اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل دیکھی تو خوف زدہ ہو کر جہاں تھا' وہیں رک گیا۔ چند لمحے سہما کھڑا رہا پھر اس نے عاجزی سے کہا۔ "میرا کرتا ادھر حجرے میں پڑا ہے۔ اس میں جو کچھ ہے' لے لے' اور بھی جو جی چاہے اٹھا لے۔" اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"دھیما بول۔ میں نوں کچھ نہیں لینا۔" لالی نے عورت کو ٹھوکا دیا۔ "اسے اندر لے آ۔"

عورت آگے بڑھی اور جھورا کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "اندر آجا۔" اس نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے چوری چکاری نہیں کرنی' بھکھا ہے۔ روٹی کھا کر چلا جائے گا۔"

جھورا' عورت کے ساتھ جھلیانی کے اندر آگیا۔ لالی نے رائفل نیچے جھکالی۔ جھورا نے عورت ے پوچھا۔ "میداں! یہ ہے کون؟ اور یہاں آیا کیسے؟" میداں نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "میں نوں کیہہ پتہ؟ اے نوں پچھ۔" وہ چولھے کے پاس گئی' گلاس دودھ سے بھرا اور لالی کو دے دیا۔

لالی نے گلاس منہ سے لگایا اور غٹاغٹ پورا گلاس چڑھا گیا۔ اس نے میداں کی طرف مڑ کر دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ "روٹی شوٹی بھی لے آ۔ ابھی پیٹ نہیں بھرا۔"

میداں نے بڑھ کر چبوترے پر رکھی ہوئی چنگیری اٹھائی۔ دوسرے ہاتھ سے قریب رکھا ہوا پیالہ اٹھایا اور لالی کے نزدیک آگئی۔

وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے رائفل اپنے زانو پر رکھ لی۔ میداں نے چنگیری اس کے سامنے رکھ دی۔ سالن بھی رکھ دیا۔ میداں اس کے روبرو بیٹھ گئی۔ لالی نے جھورا سے کہا۔ "کھڑا کیوں ہے؟ تو

بھی بیٹھ جا۔“

وہ دیوار سے ٹیک لگا کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ لالی نے لقمہ توڑ کر منہ میں رکھتے ہوئے مڑ کر جھورا کو دیکھا۔ وہ ابھی تک سہا ہوا نظر آرہا تھا۔ لالی نے لقمہ چبا کر حلق سے نیچے اتارا اور مسکرا کر جھورا سے مخاطب ہوا۔ ”رات کو چھپ کر مشوکا سے ملنے آیا اور دل چڑی کی طرح اتنا چھوٹا سا ہے۔“ لالی نے دوسرا لقمہ توڑا۔

”جھورے! تو رہتا کہاں ہے؟“

”رہتا تو میں ساتھ والے چک میں ہوں۔“ جھورا نے رسان سے پوچھا۔ ”پر تو ہے کون؟“

”کیا کرے گا جان کر۔“ لالی بے تکلفی سے بولا۔ ”میں نوں تو صرف روٹی کھانی ہے۔ میداں سے یاری نہیں لگانی۔“ اس نے مڑ کر میداں کو دیکھا۔ ”ویسے تو ہے سوہنی اور جھورے سے زیادہ حوصلہ رکھتی ہے۔ تو مجھ سے اتنا نہیں ڈری جتنا یہ ڈرا سہا نظر آتا ہے۔“

جھورے نے کچھ نہیں کہا۔ میداں بھی خاموش رہی۔ لالی نے ایک روٹی ختم کرنے کے بعد دوسری روٹی سے لقمہ توڑا اور میداں سے مخاطب ہوا۔ ”پینے کو پانی تو دے۔“ وہ چپ چاپ اٹھی۔ گلاس سنبھالا اور باہر جانے کے لیے مڑی۔

جھورا نے اسے ٹوکا۔ ”گل سن میداں! حجرے سے وہ مٹھائی بھی لیتی آ جو تو نے اپنے گھر والے کے لیے رکھ چھوڑی ہے۔“ اس کے لہجے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ وہ زیر لب مسکرایا اور لالی کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہ تیرا مہمان ہے۔ مہمان کو ٹھیک سے روٹی ٹکر کھلا۔“ میداں خاموشی سے باہر چلی گئی۔

”جھورے! تو میداں سے ملنے روز اسی طرح چھپ کر آتا ہے؟“

”نہیں جی۔ ایسی گل بات نہیں ہے۔ بہت دنوں بعد آج رات موکا ملا تھا۔“ اس نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”میداں کا گھر والا روز روز رات کو پانی نہیں لگاتا۔ آج ہی سے رات کو اس کی پانی لگانے کی باری شروع ہوئی ہے‘ پر تو نے سارا معاملہ گڑبڑ کر دیا۔“

لالی نے بے نیازی سے کہا۔ ”کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ ابھی تو ساری رات پڑی ہے۔“ وہ آہستہ سے ہنسا۔

جھورا نے پریشان ہو کر سرگوشی کی۔ ”دھیما بول۔“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”ساتھ والے مکان میں میداں کے گھر والے کا پیو رہتا ہے۔ اسے نیند بھی کم آتی ہے۔ تیرے آنے سے پہلے وہ دیر تک کھانستا رہا۔“

لالی خاموش رہا۔ جھورا نے بھی کچھ نہیں کہا۔ میداں واپس آ گئی۔ اس نے پانی سے بھرا ہوا س لالی کے سامنے رکھ دیا۔ لالی نے گلاس اٹھا کر پانی پیا۔ جب وہ پانی پی چکا تو میداں نے دوپٹے د کھول کر کاغذ میں لپٹی ہوئی مٹھائی نکالی اور لالی کے سامنے رکھ دی۔ لالی نے دیکھا کہ کاغذ میں ے تین ٹکڑے رکھے ہیں۔ لالی نے ایک ٹکڑا اٹھایا اور دانتوں سے توڑ کر کھانے لگا۔ برفی ں ذائقہ تھی۔ لالی کو پسند آئی۔

جھورا خاموش بیٹھا تھا۔ میداں بھی چپ تھی۔ لالی نے نصف ٹکڑا کھایا تھا‘ ناگاہ جھورا پر اس نظر پڑی۔ اسی وقت جھورا نے میداں کی جانب دیکھ کر آنکھ ماری۔ آنکھ مارنے کا انداز کچھ ایسا ہ لالی کو شبہ ہوا۔ اس نے فوراً ہاتھ روک لیا۔ برفی کا بچا ہوا ٹکڑا کاغذ میں ڈال دیا۔ گلاس اٹھا پانی پیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جھورا نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”کہاں چلا؟ تو نے مٹھائی بھی نہیں کھائی۔ تھوڑی ہی سی تو ہے۔ ے کھالے۔ فیر چلا جانا۔“

”میں نوں اب جانا ہے۔“ لالی نے گٹھری کندھے پر ڈالی‘ رائفل سنبھالی اور چلنے کے لیے تیار یا۔ اس نے جھورا سے پوچھا۔ ”جھورے! تجھے کادر آباد کے رستے کا پتہ ہے؟ میں نے وہیں جانا ہے۔“

”کادر آباد تو یہاں سے بہت دور ہے۔ ایسا کر یوسف والا چلا جا۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ سے کادر آباد چلا جانا۔ یوسف والا ٹیشن ہے۔ تجھے کادر آباد کے لیے گڈی مل جائے گی۔ لاری نی ہے۔ تانگے بھی جاتے ہیں۔“

”یوسف والا کا رستہ بتا دے۔“

”پنڈ سے نکل کر پورب کو جائے گا تو نہر ملے گی۔“ جھورا نے بتایا۔ ”نہر پر پلی آئے گی۔ اس پار جانا۔ سامنے ہی سڑک ہے۔ سڑک پر آگے جائے گا تو نہر ملے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ چلا جانا۔ ف والا پہنچ جائے گا۔“

لالی نے مڑ کر میداں کو دیکھا۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ خاموش تھی۔ اس کے چہرے پر راہٹ اور پریشانی تھی۔

لالی نے مسکرا کر کہا۔ ”میداں! مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تجھے بہت پریشان کیا۔ تو سوہنی ہے ر طبیعت کی بھی چنگی ہے۔“ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا‘ پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور میداں کی رف بڑھا دیا۔ ”یہ روٹی ٹکر کی کیمت نہیں۔ تیری مہمان داری کا وٹّا ہے۔ اسے رکھ لے۔ دیکھ‘

انکار نہ کرنا۔" لالی نے نوٹ میداں کے ہاتھ میں دے دیا۔ میداں کا ہاتھ کپکپایا۔ نوٹ نیچے گر گیا۔ لالی نے جھک کر نوٹ اٹھایا اور میداں کے ہاتھ میں رکھ کر آہستہ سے اس کی مٹھی بھینچ دی۔

لالی نکل کر صحن میں آگیا۔ میداں جھلیانی میں گم صم کھڑی رہی۔ مگر جھورا اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں نے آنگن عبور کیا۔ جھورا نے آگے بڑھ کر آہستہ سے دروازے کی کنڈی کھولی۔ لالی نے اس کی پیٹھ تھپک کر مسکراتے ہوئے سرگوشی کی۔ "جا موجاں کر۔ ابھی سویرا ہونے میں بہت دیر ہے۔"

جھورا نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ لالی دروازے سے گزر کر باہر گلی میں آگیا۔

گلی بالکل سنسان تھی۔ لالی آگے بڑھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گاؤں سے نکل کر ایک بار پھر جوہ میں آگیا۔ اس نے جوہ عبور کیا اور جھورا کے بتائے ہوئے راستے پر پورب کی سمت کھیتوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہوا نرم اور سبک تھی۔ کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوا‘ نہر آگئی۔ لالی نہر کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دور جا کر پلیا آگئی۔ پلیا سے گزر کر وہ نہر کے دوسری جانب چلا گیا۔

نہر کے کنارے کھجور کے درخت تھے۔ وہ ان کے نیچے پہنچا۔ گٹھری کھولی۔ ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل اس میں رکھ کر پھر گٹھری باندھی اور کندھے پر لٹکالی۔ درختوں کے نیچے سے نکل کر وہ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے دو ڈھائی فرلانگ راستہ طے کیا ہوگا کہ ستاروں کی مدھم روشنی میں اسے پاک پتن روڈ چمکتی نظر آئی۔

وہ سڑک کی سمت بڑھا۔ یکایک اسے گھبراہٹ اور بے کلی محسوس ہوئی۔ پیٹ میں سخت مروڑ اٹھی۔ جی متلایا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے سر جھٹک کر خود کو سنبھالا اور سڑک کی جانب بڑھنے لگا۔

سڑک کے کنارے پہنچتے پہنچتے اس کی طبیعت اور بگڑ گئی۔ قدم لڑکھڑانے لگے۔ وہ ہمت کر کے کچھ اور آگے بڑھا۔ مگر سڑک کے کنارے پہنچ کر اس کے قدم ڈگمگائے۔ وہ خود کو سنبھال نہیں سکا۔ نڈھال ہو کر زمین پر گر گیا۔ اسے زور کی ابکائی محسوس ہوئی۔ وہ اٹھا۔ اندھیرے میں قے کی۔ پھر لیٹ گیا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکا۔ نقاہت بڑھ گئی تھی۔ اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ آنکھوں کے آگے سیاہ پردے لہرا رہے تھے۔ وہ زور زور سے ہانپنے لگا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

* * *

لالی سڑک کے کنارے بے سدھ پڑا تھا۔ یکایک تیز روشنی نمودار ہوئی۔ ایک کار سڑک پر تیزی سے دوڑتی نظر آئی۔ لیکن لالی کے قریب پہنچتے پہنچتے کار کی رفتار سست پڑ گئی۔ ڈرائیور نے گردن نکال کر جھانکا‘ نیچے اترا۔ لالی کے نزدیک گیا۔ حیران اور پریشان ہو کر اسے دیکھا اور آہستہ آہستہ جھنجوڑ کر بولا۔ "لالی! لالی!" اس نے لالی کا سر پکڑ کر ادھر ادھر ہلایا۔ لالی نے آنکھیں کھول دیں۔

"کون ہے؟" اس کی آواز میں نقاہت تھی۔

"لالی! میں شادو ہوں۔ تیرا لائل پور والا یار‘ شادو۔"

لالی نے ہمت سے کام لیا۔ اٹھ کر بیٹھا۔ شادو کو دیکھا۔ شادو کار کی تیز روشنی میں اس پر جھکا ہوا تھا۔ لالی نے اسے پہچان لیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا جی متلایا اور اس نے ابکائی کے ساتھ قے کر دی۔

قے میں خون ہی خون نکلا۔ لال لال خون سڑک پر پھیل گیا۔ خون دیکھ کر شادو پریشان ہو گیا۔ لالی پر قے کرتے ہی پھر غشی کا دورہ پڑا۔ وہ بے حال ہو کر ایک طرف لڑھک گیا۔ شادو نے اسے دھیرے دھیرے جھنجوڑا۔ "لالی! لالی! تجھے کیا ہو گیا۔ تو بہت بیمار لگتا ہے۔" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شادو نے بڑھ کر کلر کا دروازہ کھولا۔ لالی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ شادو نے گٹھری اٹھائی۔ اسے بھی لالی کے قریب ہی کار میں رکھ دیا۔ کار نئے ماڈل کی کوئزلر تھی۔ لمبی چوڑی تھی۔ سیٹیں بھی کشادہ اور نرم تھیں۔ لالی کار میں آرام سے لیٹا رہا۔ شادو اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھا۔ کار کا انجن اسٹارٹ تھا۔ اس نے گیئر بدلا۔ ایکسی لیٹر پیر سے دبایا۔ کار سڑک پر دوڑنے لگی۔

رات ڈھلتی گئی۔ کار سڑک پر دوڑتی رہی۔ تیز جھونکے کار کے اندر آتے رہے۔ لالی کی طبیعت قدرے سنبھلی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ذہن پر زور دے کر سوچا۔ اسے شادو یاد آگیا۔ لالی نے نحیف آواز میں کہا۔

"شادو! تو شادو ہی ہے نا؟"

شادو نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ہاں میں شادو ہی ہوں۔ اب تیری طبیعت کیسی ہے؟"

"شادو! تو مجھے کہاں لے جا رہا ہے؟"

"میں تجھے سرکاری اسپتال لے جا رہا ہوں۔ منٹگمری آگے ہی ہے۔"

"تو مجھے دہاں نہ لے جا۔" لالی نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں اسپتال نہیں جاؤں گا۔"

"بکواس نہ کر۔ چپ کر کے پڑا رہ۔" شادو نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ "تیری طبیعت بہت خراب ہے۔ تجھے اسپتال لے جانا ضروری ہے۔"

لالی تھوڑا سا اوپر ہو کر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "شادو! تمں نوں پتہ ہے' میں جیل سے بھاگا ہوا ہوں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "میری گل سن رہا ہے شادو؟"

"سن رہا ہوں۔ میں نوں پتہ ہے' تو جیل سے بھاگا ہوا ہے۔"

"تب بھی تو مجھے اسپتال لے جانا چاہتا ہے؟" لالی نے شکوے کے انداز میں کہا۔ "تو مجھے گرفتار کروانا چاہتا ہے؟"

"بکواس نہ کر۔" شادو نے اسے پھر ڈانٹا۔ "اسپتال میں اس ٹیم رات کو تجھے کون پہچانے گا۔"

لالی آمادہ نہیں ہوا۔ "گڈی روک لے۔ مجھے یہیں اتار دے۔ میں اسپتال نہیں جاؤں گا۔ تو مجھے کادر آباد پہنچا دے۔"

"وہاں جا کر کیا کرے گا؟ ادھر تیرا جاننے والا کوئی ڈاکٹر یا حکیم ہے؟"

"کادر آباد کے نزدیک نہر کے اس پار ٹبّوں میں رحیم داد چھپا ہوا ہے۔ تو اسے نہیں جانتا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی جیل سے بھاگا تھا۔ وہ میرا وہاں انتظار کرتا ہو گا۔ تو مجھے کادر آباد پہنچا دے۔" لالی کے لہجے میں عاجزی آ گئی۔

"شادو تیری مہربانی ہو گی۔"

"پر تیری طبیعت بہت خراب ہے۔ تجھے خون کی الٹی ہوئی تھی۔" شادو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "ٹبّوں پر تیرا علاج کون کرے گا؟ وہاں جنگل اور ویرانہ ہے۔"

"پر میں اسپتال ہرگز نہیں جاؤں گا۔ ویسے میری طبیعت اب ٹھیک ہے۔"

"ہرگز ٹھیک نہیں ہے۔ تو اسپتال جانا نہیں چاہتا تو میں تجھے حکیم چشتی کے پاس لے جاؤں گا۔ منٹگمری سے آگے کمال گڑھ ہے۔ حکیم وہیں رہتا ہے۔ بہت ٹھیک ٹھاک علاج کرتا ہے۔ اس کی دوائی سے تو بالکل چنگا ہو جائے گا۔"

"اسی کے پاس لے چل۔ حکیم سے دوائی لینے کے بعد تو مجھے کادر آباد پہنچا دینا۔ میں نوں رحیم داد کے پاس ضرور جانا ہے۔"

"چلا جانا۔ ضرور چلا جانا۔ پر ابھی اس کے پاس نہیں جا سکتا۔ میں تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ فیر جہاں کہے گا' وہیں پہنچا دوں گا۔"

لالی رک رک کر گہری سانسیں بھرتا رہا۔ شادو اسٹیرنگ وھیل سنبھالے سامنے دیکھتا رہا۔ کار سڑک پر دوڑتی رہی۔ کئی منٹ گزر گئے۔ پھر لالی کی آواز ابھری۔ "شادو! تو یہ کار کہاں سے لے آیا؟"

"یہ میاں عبدالسبحان کی کار ہے۔ میں نے اس کی نوکری کر لی ہے۔ ڈرائیور لگ گیا ہوں۔ میاں سبحان وڈا زمیں دار ہے اور بہت نیک بندہ ہے۔"

لالی خاموش رہا۔ اس کی طبیعت پھر بگڑنے لگی تھی۔ پیٹ میں مروڑ اٹھی۔ ماتھے پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ وہ لیٹ گیا اور رک رک کر سانس لینے لگا۔ اس کی طبیعت بگڑتی گئی۔ ایک بار پھر غشی طاری ہوئی اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ بے حال پڑا رہا۔

کار منٹگمری شہر سے گزری۔ لالیاں والا سے آگے نکلی۔ لالی نے کار رکوائی' ایک بار پھر خون کی قے کی اور بے سدھ ہو کر کار میں لیٹ گیا۔

☆

کار کمال گڑھ کی جانب مڑنے لگی۔ لالی کو کچھ خبر نہ تھی کہ کار کہاں جا رہی ہے۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ کار کمال گڑھ میں داخل ہوئی اور حکیم نذر محمد چشتی کے گھر کے سامنے جا کر رک گئی۔ شادو کار سے نکلا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ کسی نے دروازے کی آڑ سے پوچھا۔ "کون ہے؟" یہ حکیم کی بیوی تھی۔ اس کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

شادو نے پوچھا۔ "حکیم جی ہیں' جی؟"

"وہ تو سو رہے ہیں۔ آج تو ویسے بھی دیر سے سوئے ہیں۔ اب تو نہیں اٹھ سکتے۔"

شادو کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دروازے کے پیچھے سے حکیم چشتی کی آواز ابھری۔ وہ اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ "نیک بخت! میں نے ہزار بار کہا' کوئی مریض آئے تو مجھے فوراً جگا دیا کر۔" حکیم نے دروازہ کھولا۔ باہر آیا اور نرم لہجے میں پوچھا۔

"اس وقت کون آیا ہے؟"

"میں ہوں جی شادو۔"

"اچھا تو ہے۔" حکیم آنکھیں ملنے لگا۔ "میں سویرے بوٹیاں چننے ٹبّوں کی طرف چلا گیا۔ شام کو

لوٹا۔ بہت تھک گیا تھا۔ ایسی گہری نیند سویا کہ تیرے بار بار کھٹ کھٹانے پر بھی آنکھ نہیں کھلی۔" حکیم نے تامل کیا۔ مسکرا کر پوچھا۔ "یہ بتا' کیسے آیا اتنی رات کو؟ تیری گھر والی اور بچے تو خیریت سے ہیں؟"

"رب کا شکر ہے جی۔ وہ سب تو ٹھیک ٹھاک ہیں۔ میں تو جی ایک مریض کو دکھانے لایا تھا۔"

"کہاں ہے مریض؟"

شادو نے کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کار کے اندر پڑا ہے۔ اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

"کار میں تو اندھیرا ہوگا۔ تو اسے اٹھا کر لے آ۔ میں ابھی مطب کھولتا ہوں۔ تو اسے لے کر مطب میں آجا۔" حکیم گھر میں چلا گیا۔

شادو کار کی جانب بڑھا' دروازہ کھولا۔ وہ مضبوط جسم کا لمبا چوڑا جوان تھا۔ لالی کو ایک بار پھر اس نے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ لالی ابھی تک بے حال تھا' اسے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ شادو اسے اٹھائے ہوئے مطب کی جانب بڑھا۔ مطب کا دروازہ کھلا تھا۔ شادو اندر داخل ہوا۔ حکیم چشتی ہاتھ میں لالٹین لٹکائے اس کا منتظر تھا۔ مطب میں دیوار سے لگا ہوا تخت تھا۔ اس پر چٹائی بچھی تھی۔ چٹائی پر سفید چادر کا فرش تھا۔ تخت پر گاؤ تکیہ بھی رکھا تھا۔ تخت کے سامنے کئی موڑھے پڑے تھے۔

حکیم نے اشارہ کیا۔ شادو نے لالی کو تخت پر لٹا دیا۔ وہ آنکھیں بند کیے بے سدھ پڑا رہا۔ حکیم نے شادو سے دریافت کیا۔ "اسے کیا ہو گیا؟"

"یہ تو جی پتہ نہیں۔ یہ میرا پرانا یار ہے۔ میں میاں صاحب کے ایک دوست کو چھوڑ کر حسین والا سے واپس آ رہا تھا۔ مجھے یہ سڑک کے کنارے پڑا ہوا نظر آیا۔ میں نے اسے جھنجوڑا تو اس نے آنکھ کھولی۔ مجھے پہچان لیا۔ اٹھ کر بیٹھ بھی گیا۔ اسے الٹی آئی۔ الٹی کے ساتھ خون ہی خون تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر کار میں ڈالا اور ادھر لے آیا۔ رستے میں اس نے مجھ سے بات چیت بھی کی تھی۔ فیر ایک الٹی اور آئی اور اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ اس کے بعد سے اسے کچھ ہوش نہیں ہے۔"

حکیم نے ہاتھ بڑھایا اور لالی کی نبض دیکھنے لگا۔ نبض دیکھنے کے بعد اس نے شادو سے کہا۔ "اسے کسی نے سنکھیا کھلا دی ہے۔"

شادو نے گھبرا کر پوچھا۔ "حکیم جی! اب اس کا کیا بنے گا؟ سنکھیا کھانے سے تو موت ہو جاتی ہے۔"

گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس کے پیٹ میں سنکھیا کی زیادہ مقدار نہیں گئی ہے۔" حکیم نے کو اطمینان دلایا۔ "دو چار دن میں بھلا چنگا ہو جائے گا۔ کسی سے دشمنی تھی اس کی؟"

نادو نے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے بتایا۔ "پتہ نہیں جی! یہ تو مجھے سڑک پر پڑا ہوا ملا تھا۔"

ی اثناء میں لالی نے آنکھیں کھولیں۔ حکیم کو اپنے قریب بیٹھے دیکھا۔ حکیم نے اسے ہوش ایا تو نرم لہجے میں پوچھا۔ "کیا کھایا تھا؟"

الی نے نحیف آواز میں رک رک کر جواب دیا۔ "روٹی تھی' سرسوں کا ساگ تھا۔" وہ چند لمحے ش رہا اور گہری گہری سانسیں بھرتا رہا۔ "برفی بھی کھائی تھی۔ لگتا ہے' اس میں زہر تھا۔ میں ادھا ہی ٹکڑا کھایا تھا۔"

"جبھی تو بچ گیا۔ برفی میں زہر ہی تھا۔" حکیم نے تسلی دی۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تو ش پڑا رہ۔ زیادہ بات چیت نہ کر۔"

حکیم گھر میں کھلنے والے دروازے تک گیا۔ ایک پٹ کھولا اور جھانک کر اونچی آواز سے کہا۔ نشہ کی ماں! جاگ رہی ہو؟"

ندر سے آواز ابھری۔ "کیا کام ہے جی؟"

"گھر میں دودھ تو ہوگا اور گرم بھی ہوگا۔ پیتل کے بڑے گلاس میں دودھ ڈالو اور اس میں تقریباً ماپاؤ گھی ملا کر مجھے دے دو۔"

حکیم یہ ہدایت دے کر لالی کے پاس آ گیا اور تخت پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ مگر اس نے لالی سے چیت نہیں کی۔ لالی آنکھیں کھولے چت لیٹا تھا اور چپ چاپ چھت تک رہا تھا۔ حکیم نے سے پوچھا۔

"میاں سبحان کا کیا حال چال ہے؟ لائل پور میں ہیں یا رحیم یار خاں گئے ہیں؟"

"رحیم یار خاں تو جی وہ کم ہی جاتے ہیں۔ ادھر کی زمین داری کی دیکھ بھال ان کا چھوٹا پت کرتا ۔ ویسے میاں صاحب ان دنوں ذخیرے کے جھل میں شکار کی تیاریاں کر رہے ہیں۔"

"وہ تو ہر سال کرتے ہیں' سنا ہے۔ بہت شاندار شکار ہوتا ہے۔ دور دور سے بڑے بڑے افسر اور ادار شکار کھیلنے آتے ہیں۔"

حکیم نے بات ختم ہی کی تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ حکیم اٹھ کر گیا۔ اس کی بیوی نے زے کی آڑ سے دودھ کا گلاس دیا۔ حکیم نے گلاس سنبھالا اور لالی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ دو! اسے گاؤ تکیے کے سہارے بٹھا دے۔" شادو بڑھ کر لالی کے پاس گیا۔ کمر اور گردن کے نیچے

ہاتھ ڈال کر اسے اٹھایا اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ لالی خاموش رہا۔ اس کا چہرہ ٹیالا پڑ گیا تھا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ حکیم اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا اور گلاس اس کے منہ سے لگا کر بولا۔

"اسے پی لے۔"

لالی نے چند گھونٹ پیے اور منہ ہٹا لیا۔ حکیم نے دل جوئی کی۔ "حوصلے سے کام لے۔ اسے پینے کے بعد تو بھلا چنگا ہو جائے گا۔" لالی نے گلاس سے منہ لگایا اور آنکھیں بند کر کے دھیرے دھیرے سارا دودھ پی گیا۔

دودھ پیتے ہی اسے ابکائی آئی۔ حکیم آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ سہلانے لگا۔ لالی کو ذرا قرار آیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد بے چین ہو کر ادھر ادھر گردن ہلانے لگا۔ حکیم نے پوچھا۔ "الٹی کرے گا؟" لالی نے گردن ہلا کر اقرار کیا۔ حکیم نے شادو سے کہا۔

"اسے اٹھا کر باہر لے جا۔"

شادو نے لالی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور مطب سے باہر لے گیا۔ لالی اکڑوں بیٹھ گیا اور ابکائیاں لینے لگا۔ پھر اس نے قے کی۔ حکیم نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا۔ قے میں دودھ کے ساتھ خون بھی نکلا۔ قے کرتے ہی لالی نڈھال ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔ شادو نے اسے اٹھانا چاہا۔ مگر حکیم نے منع کر دیا۔

"اسے یوں ہی پڑا رہنے دے۔ یہاں ہوا اور ٹھنڈک ہے' اسے آرام ملے گا۔"

قے کرنے کے بعد لالی کو سکون محسوس ہوا۔ الجھن اور گھبراہٹ کم ہو گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

پچھلی رات کی ہوا کے نرم اور خنک جھونکے جسم کو لگے تو لالی کو نیند آ گئی۔ حکیم نے اسے سوتے دیکھا تو شادو سے کہا۔ "اسے گاڑی میں لٹا دے۔" شادو نے آہستہ سے لالی کو ہاتھوں پر اٹھایا اور کار کی پچھلی نشست پر لٹا دیا۔

شادو واپس حکیم کے پاس آیا۔ حکیم نے کہا۔ "اب اسے لے جا۔ راستے میں الٹی ہو تو کرا دینا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سنکھیا کا سارا زہر الٹی کے ساتھ نکل جائے گا۔ اسے کوئی اور دوائی دینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس کا صحیح علاج کر دیا۔ کل شام تک بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے کل تک صرف دودھ یا لسی پلانا۔ دو ایک روز کمزوری رہے گی پھر ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔

ان ہے اور حوصلے والا بھی ہے۔"

شادو اظہار معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "حکیم جی! میں نے اتنی رات کو تمہیں تکلیف دی۔"

"کوئی بات نہیں۔" حکیم نے مسکرا کر نرم لہجے میں کہا۔ "اپنا تو کام ہی بیماروں کی خدمت کرنا ہے۔ میرے لیے دن رات سب برابر ہیں۔ تو بالکل فکر نہ کر۔"

شادو نے جیب سے دو روپے نکال کر حکیم کو دیے۔ اس نے خاموشی سے روپے لے لیے۔ شادو نے کار میں بیٹھ کے اسے اسٹارٹ کیا۔ کار آگے بڑھی۔ چند میل کچے راستے پر چلنے کے بعد ملتان ڈ پر آ گئی اور تیز رفتار سے سڑک پر دوڑنے لگی۔

☆

کار ضلع لائل پور کی حدود میں داخل ہوئی۔ کمالیہ پہنچی۔ آگے جا کر سمندری کی جانب مڑی۔ ریدوالا کے قریب لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کار رکوا کے قے کی۔ اس دفعہ خون کی مقدار ت کم تھی۔

شادو نے سہارا دے کر لالی کو پھر پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ وہ نڈھال ہو کر دھیرے دھیرے ہانپنے لگا۔ ب دن نکل آیا تھا۔ سورج چڑھ کر اوپر آ گیا۔ ہر طرف دھوپ پھیلی تھی۔ لالی پھر سو گیا۔

کار سمندری تک نہیں گئی۔ راستے ہی میں شادو نے کار موڑی اور اسے سنڈیانوالا جانے والی کی سڑک پر دوڑانے لگا۔ گاؤں سنڈیانوالا سے آگے تھا۔ گاؤں پہنچ کر اس نے پرانی وضع کی ایک یلی کے سامنے کار روک لی۔ حویلی کی دیواروں پر کائی جمی تھی۔ اس نے لالی کو بیدار کیا۔ اب لالی ا طبیعت قدرے سنبھل چکی تھی۔

وہ شادو کے سہارے چلتا ہوا حویلی کے مہمان خانے میں گیا۔ مہمان خانے کے پچھواڑے کروں کے لیے ایک ہی قطار میں سلسلے وار کئی کوٹھریاں تھیں۔ ان کے آگے ٹین کی چھت کا ائبان تھا۔

شادو اسے مہمان خانے کے اسی حصے کی ایک کوٹھری میں لے گیا۔ کوٹھری خاصی کشادہ تھی۔ ں میں چارپائی بچھی تھی۔ چارپائی پر بستر لگا تھا۔ شادو نے لالی کو بستر پر لٹا دیا' باہر گیا۔ کار سے لالی ا گٹھری اٹھا کر لایا اور چارپائی کے سرہانے ایک کونے میں رکھ دی۔ لالی کچھ دیر آنکھیں بند کیے پڑا ہا' پھر سو گیا۔

شام کو اس کی آنکھ کھلی۔ شادو اسی وقت واپس آیا تھا۔ اس نے لالی کو بیدار پایا تو قریب ہی بستر بیٹھ گیا۔ "ا ب طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ " لالی نے نقاہت سے کہا۔ "پر کمزوری بہت ہے۔ "

"فکر نہ کر۔ کمزوری بھی ختم ہو جائے گی۔ تو جلد ہی بھلا چنگا ہو جائے گا۔ " شادو نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی۔ "بھوک تو نہیں لگ رہی ہے؟ "

"بھوک بالکل نہیں ہے۔ "

"ایسا کر، تو گرم دودھ پی لے۔ کمزوری کم ہو جائے گی۔ حکیم جی نے دودھ پینے کو بتایا ہے۔ میں تیرے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکوں گا۔ میں نے جیپ لے کر ٹوبہ ٹیک سنگھ جانا ہے۔ کل دوپہر تک واپسی ہوگی۔ میں خداداد خاں سے کہتا جاؤں گا۔ وہ تجھے دودھ پلا دے گا۔ " اس نے دروازے کی طرف منہ کیا اور اونچی آواز سے پکارا۔ "بابے! ادھر آ۔ " خداداد خاں کوٹھری میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین لٹک رہی تھی۔

کوٹھری میں روشنی ہو گئی۔ خداداد نے لالٹین طاق میں رکھ دی۔ وہ بوڑھا اور لاغر تھا۔ سر اور ڈاڑھی کے بال سفید تھے۔ شادو نے کہا۔ "بابے! اسے دودھ لا دے۔ روٹی نہ دینا۔ ویسے اسے بھوک ہے بھی نہیں۔ " وہ کھڑا ہو گیا۔ "بابے! یہ بیمار ہے۔ اس کی ٹھیک سے دیکھ بھال کرنا۔ میرا پرانا اور گہرا یار ہے۔ "

خداداد نے مسکرا کر اسے اطمینان دلایا۔ "پروا نہ کر۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں نوں پتہ ہے، یہ بیمار ہے۔ آیا تھا تو چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ "

شادو نے لالی سے کہا۔ "اب میں چلوں گا۔ بابا خداداد موجود ہے، بہت بھلا اور نیک بندہ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے تجھے یہاں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی۔ " شادو کوٹھری سے چلا گیا۔ خداداد خاں بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا گیا۔

لالی چپ لیٹا رہا۔ کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی پھیلی تھی۔ باہر صحن میں اندھیرا تھا۔ لالی پچھلی رات کے واقعات یاد کرنے لگا۔ اسی اثناء میں بوڑھا خداداد خاں آہستہ آہستہ کھانستا ہوا آیا۔

اس کے ہاتھ میں دودھ سے بھرا ہوا گلاس تھا۔ لالی تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے خدادا سے دودھ کا گلاس لیا اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔ دودھ گرم اور میٹھا تھا۔ اس نے دودھ پی کر خا گلاس خداداد کو دے دیا۔ وہ گلاس لے کر چلا گیا۔

لالی تنہا رہ گیا۔ وہ کچھ دیر تکیے کے سہارے بیٹھا رہا پھر لیٹ گیا۔ مگر اسے نیند نہیں آئی۔ خدا خاں واپس آ گیا اور کوٹھری کے باہر سائبان کے نیچے برآمدے میں فرش پر

دہلیز کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ مگر لالی نے اس سے بات چیت نہیں کی۔ خاموش لیٹا رہا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے نیند آ گئی۔

دوسرے روز بھی وہ بستر پر لیٹا ہی رہا۔ سویرے اس نے لسّی پی۔ دوپہر کو خداداد نے اسے دودھ میں بھگو کر روٹی کھلائی۔ شادو سورج ڈوبنے سے کچھ دیر پہلے آیا۔ وہ لالی کے لیے تازہ پھل لایا تھا۔ اپنی ایک اجلی قمیص اور شلوار بھی لایا تھا۔

"کل صبح نہا کر کپڑے بدل لینا۔ تیرے کپڑے بہت میلے ہو رہے ہیں۔ "

"یہ تو نے بہت چنگا کام کیا۔ کچھ اور میلے کپڑے بھی ہیں۔ " لالی نے سرہانے رکھی ہوئی گٹھری کی جانب اشارہ کیا۔ "انھیں میں سویرے دھو ڈالوں گا۔ "

"یہ کام تجھے کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کل میاں سبحان کو لے کر لائل پور جا رہا ہوں۔ گھر والی کو تیرے کپڑے دے دوں گا، وہ انھیں دھو ڈالے گی۔ میں نے سویرے گھر والی سے تیری بیماری کا کہا تو وہ گھبرا گئی۔ یہاں آنے کو کہتی تھی پر بچے چھوٹے چھوٹے ہیں۔ انھیں گھر میں چھوڑ کر وہ کیسے آ سکتی ہے۔ اسی لیے میں اسے نہیں لایا۔ "

"ٹھیک ہی کیا۔ خاما خا پریشان ہوتی۔ ویسے میری طبیعت اب ٹھیک ٹھاک ہے۔ " لالی نے مسکرا کر شادو کی طرف دیکھا۔ "بھابی اب تجھ سے جھگڑا انٹنا تو نہیں کرتی؟ "

"جب سے میں نے نوکری کی ہے، بہت راضی خوشی ہے۔ " شادو بھی مسکرانے لگا۔ "ویسے اس کی ناراضی ٹھیک ہی تھی۔ روز پولیس والے گھر پر رات کو آواز لگاتے تھے۔ تھانے بلاتے تھے۔ اسے تکلیف ہوتی تھی۔ پاس پڑوس میں بدنامی ہوتی تھی۔ " اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنا ایک کان پکڑا۔ "یار، اللہ کسی کو ہسٹری شیٹر نہ بنائے۔ پولیسے ایک بار پیچھے لگ جائیں تو جان نہیں چھوڑتے۔ ہزار نیک چلنی کا ثبوت دو، مانتے ہی نہیں۔ "

"تجھے میاں سبحان نے پولیس کے چکر سے نکلوا دیا۔ تو بال بچے والا ہے، تیرے لیے یہ بہت ٹھیک ہوا۔ "

"سوچتا ہوں، تیرا کیا بنے گا؟ " شادو نے تشویش کا اظہار کیا۔ "تو کہہ تو میاں سبحان سے تیرے لیے بات کروں؟ اس کا بہت اثر و رسوخ ہے۔ سارے سرکاری افسر اس کی بات مانتے ہیں، اس کے دوپت بھی وڈے افسر لگے ہوئے ہیں۔ "

"تو میرے بارے میں میاں سبحان سے بالکل بات نہ کرنا۔ جانے کیا گڑبڑ ہو جائے۔ " لالی نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ "تو مجھے جتنی جلدی ہو سکے نال کادر آباد پہنچا دے۔ میں نوں رحیم داد سے ملنا

ہے۔ وہ میرے لیے بہت پریشان ہو گا۔"

"جیسی تیری مرضی۔ میں نوں اب جانا ہے۔ میاں صاحب انتظار کرتے ہوں گے۔"

شادو نے لالی کے سرہانے سے گٹھری اٹھائی۔ اسے کھول کر میلے کپڑے نکالے۔ رائفل الٹ پلٹ کر دیکھی۔ "یہ رائفل تیرے ہاتھ کیسے آگئی؟"

"بس ایک چکر میں مل گئی۔ آگے کام دے گی۔"

شادو نے کچھ نہیں کہا۔ رائفل پھر چادر میں لپیٹ کر رکھ دی۔ وہ لالی کے کپڑے اپنے ساتھ نہیں لے گیا۔ کہنے لگا۔ "کل لائل پور جاتے ہوئے تیرے کپڑے لے جاؤں گا۔" وہ چلا گیا۔

لالی نے رات کا کھانا کھایا اور کوٹھری سے نکل کر کھلے صحن میں ٹہلنے لگا۔ اب اس کے جسم میں دھیرے دھیرے توانائی لوٹ رہی تھی۔ دوسرے روز اس نے غسل کیا۔ اجلے کپڑے پہنے۔ اب کمزوری بھی بہت کم رہ گئی تھی۔ غسل کے بعد وہ تازگی اور سکون محسوس کر رہا تھا۔ مگر مہمان خانے سے باہر نہیں گیا۔

شام کو اس نے چارپائی کوٹھری سے نکال کر باہر صحن میں ڈالی۔ بستر بچھایا اور اس پر لیٹ گیا۔ اسے شادو کا انتظار تھا۔ شادو چراغ جلے آیا مگر ٹھہرا نہیں۔ لالی کے میلے کپڑے لے کر چلا گیا۔

بابا خداداد خاں آگیا۔ وہ کھانا لایا تھا۔ لالی کھانا کھانے لگا۔ خداداد چارپائی کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔

مہمان خانے میں خاموشی طاری تھی۔ لالی نے کھانا کھاتے ہوئے بوڑھے سے پوچھا۔ "بابے! یہاں تیرے سوا کوئی دوسرا نوکر چاکر نہیں ہے؟"

"کئی ہیں جی' پر سارے ہی نوکر ادھر جالی فت یانہ سے آگے جھل کے سامنے میدان میں خیمے لگا رہے ہیں' شکار کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ کل سویرے سے شکار شروع ہو گا۔ نوکروں کے علاوہ چند کے لگ بھگ سو مزارعے اور کمی بھی شکار کے لیے ویگار پر لگائے گئے ہیں۔"

"تیری باتوں سے لگتا ہے' بہت زوروں کا شکار ہوتا ہے۔"

"نہ پوچھ' کیسا زوردار شکار ہوتا ہے۔" خداداد خاں نے بتایا۔ "شکار کھیلنے والے بھی بہت ہوتے ہیں۔ اونچے اونچے افسر' وڈے وڈے زمیں دار' دوسرے ضلعوں تک سے شکار کھیلنے والے آتے ہیں۔ کئی تو اپنی گھر والیوں کو بھی ساتھ لاتے ہیں۔ سارے ہی مہمان چھولداریوں میں ٹھہرتے ہیں۔ دن بھر شکار کھیلا جاتا ہے۔ رات کو زبردست دعوت ہوتی ہے۔ دبا کے شراب پی جاتی ہے' ناچ گانا ہوتا ہے۔ زبردست موج میلا ہوتا ہے۔"

"ہر سال ایسے ہی شکار کھیلا جاتا ہے؟"

"ایک بار نہیں' سال میں دو بار کھیلا جاتا ہے۔ گرمیوں میں پت جھڑ لگنے کے بعد ادھر شکار ہوتا ہے۔ یہ تو سرکاری جھل ہے۔ میاں سبحان کے پاس برسوں سے اس کا ٹھیکا ہے۔ پر اصلی شکار تو برسات کے بعد ادھر رحیم یار خاں میں ہوتا ہے۔ وہاں ریتی میں میاں سبحان کی اپنی شکار گاہ ہے۔ میں تو شکار کے دنوں میں وہاں بھی جاتا ہوں۔ بہت شان دار شکار گاہ ہے۔ میاں سبحان نے شکار کے لیے ادھر طرح طرح کے پرندے' خرگوش اور دوسرے جانور پال رکھے ہیں۔ شکار کا مزہ تو رحیم یار خاں میں آتا ہے۔"

لالی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب تو یہ ہوا۔ میاں سبحان وڈا زمیں دار ہے؟"

"تیں نوں پتہ ہے' وہ کتنا وڈا زمیں دار ہے؟ جگیر دار ہے' جگیر دار۔" خداداد نے جوش و خروش سے اظہار کیا۔ "ادھر لائل پور میں تو اس کے صرف ۳۰ مربعے ہیں' پر رحیم یار خاں میں تو لگ بھگ چار سو مربعے ہوں گے۔ ۲۵ مربعے پر تو اس کی شکار گاہ ہے۔ دو سو مربع زمین پر کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ سو پر آم' امرود اور مالٹے کے باغ ہیں۔ باقی زمین پر جھاڑیاں اور جھنگر ہیں۔ سنا ہے میاں سبحان اسے بھی صاف کرا کے مویشی فارم بنانا چاہتا ہے۔"

"جب ادھر اس کی دس ہزار ایکٹر زمین ہے تو یہاں لائل پور میں کیوں رہتا ہے؟"

"یہاں وہ اپنے تیسرے پت کے لیے کپڑا بنانے کا کارخانہ لگانے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ اس کا پت ابھی لہور میں پڑھ رہا ہے۔ میاں سبحان اسے کاروباری لین میں ڈالنا چاہتا ہے۔ سننے میں تو یہی آیا ہے۔ ویسے جی' اسے کیا پروا۔ اللہ نے بہت دے رکھا ہے۔ اس کے دو پت وڈے افسر لگے ہیں۔ ایک لہور میں ہے۔ دوسرا پنڈی میں لگا ہے۔ فوج میں کرنیل ہے۔" خداداد کو کھانسی کا ٹھسکا لگا۔ چند لمحے وہ کھانستا رہا۔ ذرا قرار آیا تو بتانے لگا۔

"سچ پوچھو تو جی' شکار کا بندوبست تو میاں کا لہور والا پت ہی کرتا ہے۔ میاں سبحان تو آج لائل پور چلا گیا۔ اب نہیں آئے گا۔"

"ویسے شکار کا سلسلہ تو میاں سبحان نے شروع کیا ہو گا؟"

"نہیں جی' یہ بات نہیں ہے۔" خداداد خاں نے بتایا۔ "شکار تو اس کا پیو بھی اسی شان سے کھلاتا تھا۔ یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔ میں پہلے اسی کے پاس نوکر تھا۔ اسی نے رحیم یار خاں میں شکار گاہ کے لیے جنگل لگوایا تھا۔ انگریز افسروں' راجوں اور نوابوں کو شکار کھیلنے کے لیے

بلاتا تھا۔ سردی شروع ہوتے ہی شکار کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ شکاریوں کے ٹھہرنے کے لیے چھولداریاں لگائی جاتیں۔ انگریز افسروں کے ساتھ ان کی میمیں بھی شکار کے پیچھے گھوڑے دوڑاتیں۔ شام کو شکار سے تھک کر آتیں تو ٹبوں میں نہانے کے لیے گرم گرم پانی بھرا ہوتا۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "بالکل ننگی ننگی نہاتیں۔ انھیں ذرا لاج نہ آتی۔ زور زور سے ہنستیں۔ ٹھٹھے لگاتیں۔"

"اب ایسا نہیں ہوتا؟"

"ہوتا تو اب بھی ایسا ہی ہے۔ پر اب وہ بات نہیں رہی۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بات یہ ہے جی! وہ اپنی جوانی کے دن تھے۔ اب بڑھاپے میں کچھ چنگا نہیں لگتا۔ اسی لیے ادھر پڑا رہتا ہوں۔ شکار دیکھنے نہیں جاتا۔"

"میاں سبحان کا دادا بھی وڈا زمیں دار ہوگا؟"

"پہلے تو نہیں تھا' بعد میں وڈا زمیں دار بن گیا۔ میں نے تو اسے دیکھا نہیں' پر سننے میں ایسا ہی آیا ہے۔"

لالی نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ "بابے! وہ اتنا وڈا زمیں دار کیسے بن گیا؟ کہاں سے اس کے پاس اتنی بہت ساری زمین آگئی؟"

"میرا پیو اسے ٹھیک طرح جانتا تھا۔ وہی اس کے بارے میں بتاتا تھا۔ میاں سبحان کے دادا کا نام رحمان تھا۔ وہ ملتان کے انگریز کمشنر برکلے کا سائیس تھا۔"

لالی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "سائیس تھا؟"

"ہاں جی' سائیس ہی تھا۔" خداداد خاں نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "برکلے تھا تو اسسٹنٹ کمشنر' اس نے بہادری میں بہت نام پیدا کیا۔ میراثی اس کی بہادری کے گیت بنا بنا کر گاتے تھے۔ جاگیرداروں' سرکاری افسروں اور انگریزوں سے خوب انعام پاتے تھے۔ کچھ تو ڈھڈے اور سارنگی پر مرزا صاحباں کی دھن پر گاتے تھے۔ کانوں پر ہاتھ رکھ کر لمبی تان سے برکلے کی بہادری کی سد لگاتے تھے۔ کچھ میراثی برکلے کی شان میں وار بھی گاتے تھے۔ میں نے ایسے سد اور وار بہت سنے ہیں۔ اب بھی کوئی بوڑھا میراثی مل جائے تو اسے ایسے گیت یاد ہوں گے۔ اب ان کا رواج نہیں رہا' انگریزوں کے راج میں تو بہت گائے جاتے تھے۔"

"یہ تو نے عجب گل سنائی۔" لالی نے مسکرا کر اپنے ردِعمل کا اظہار کیا۔ "میاں سبحان کا دادا برکلے کا سائیس ہوتا تھا۔ پر سائیسی کرتے کرتے وہ اتنا وڈا زمین دار کیسے بن گیا؟"

"وہ ایسا ہوا جی' جب ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا تو احمد خاں کھرل بھی انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ تو تیں نوں پتہ ہی ہوگا کہ کھرل گوگیرہ اور اس کے آس پاس راوی کے دونوں کناروں پر آج بھی بستے ہیں۔ جڑانوالا' تاندلیانوالا' کھڑیانوالا اور اس سے بھی آگے داربرٹن اور سیدوالا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان دنوں گوگیرہ سرکاری ہیڈ کوارٹر ہوتا تھا۔ برکلے بھی وہیں ہوتا تھا۔"

لالی خود بھی گوگیرہ میں پیدا ہوا تھا اور اس کا باپ بھی کھرل تھا۔ مگر اس نے اس کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا خداداد خاں کی باتیں سنتا رہا۔

"پر احمد خاں کا گھر جھمرے میں تھا۔ وہ کھرل اپیروں کا سردار ہوتا تھا۔ تب ہی تو اسے احمد خاں اپیرا بھی کہا جاتا ہے۔ بہت ہی بہادر اور حوصلے والا بندہ تھا۔ سنا ہے ڈیڑھ ڈیڑھ گز لمبے تو اس کے ہاتھ تھے۔ پہاڑ کی طرح اونچا اور یہ چوڑا سینہ۔" خداداد نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ "بہت لمبا تڑنگا اور زور آور تھا۔ ایسا زور آور تو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ شیر کی طرح جھپٹ' جھپٹ کر حملے کرتا تھا۔"

لالی کھانے سے فارغ ہو چکا تھا' لیکن اس نے مداخلت نہ کی۔ خداداد خاں پرجوش لہجے میں بولتا رہا۔ "گوگیرہ کا سردار رائے ساون خاں اور اس کا پت' سادو خاں بھی احمد خاں کے ساتھ شریک ہوگئے۔ فت یانوں اور وٹوؤں کو بھی احمد خاں نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ سچ پوچھ تو راوی سے ستلج تک سارے ہی سردار لڑائی میں احمد خاں کے ساتھ تھے۔ صرف جویا الگ رہے۔ ستلج کے اس پار جو وٹو تھے وہ بھی اس کے ساتھ نہ آئے بلکہ انگریزوں سے مل گئے۔ اسی وفاداری کے صلے میں ان کو مربعے ملے۔ جائیدادیں اور لمبرداریاں ملیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پاکستان بنا تو وہ پناہ گیر بن کر ادھر آگئے اور جی انگریزوں کی دی ہوئی زمینوں کے بدلے یہاں بھی متروکہ جائیداد کلیم سے اتنی اراضی الاٹ کرائی کہ کئی تو وڈے جگیردار بن گئے۔"

"ایسا تو بہت ہوا۔ متروکہ جائیداد کی الاٹمنٹ کرنے والے افسر تو وہی تھے جو انگریزوں کے وفادار رہ چکے تھے۔" لالی نے تبصرہ کیا۔ "وہی کیا' سارے ہی افسر ایسے تھے۔ کسی کو بھی ہٹایا نہ گیا بلکہ میں نے تو سنا ہے' ان کے عہدے اور بڑھا دیئے گئے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ بالکل ایسا ہی ہوا۔"

"بابے! تو احمد خاں کھرل کے بارے میں بتا رہا تھا۔" لالی نے خداداد کو یاد دلایا۔

"ہاں تو میں یہ بتا رہا تھا' احمد خاں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکانا شروع کرادی۔" خداداد خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "اس نے گوگیرہ میں بھی بغاوت کرادی اور

ایسی بغاوت کرادی کہ کیدیوں نے جیل کا پھاٹک توڑ ڈالا' پر باہر نکلنے نہ پائے۔ تب تک دہلی سے انگریزوں کی مدد پہنچ گئی۔ اس فوج نے نہتے کیدیوں پر فائر کھول دیا۔ کیدیوں کے پاس صرف پتھر اور لوہے کی سلاخیں تھیں۔ اندھا دھند فائرنگ کے سامنے کب تک ٹھیرتے؟ ۵۱ مارے گئے اور زخمی تو بہت ہوئے۔ جیل کی زمین اور دیواریں ان کے خون سے لال ہو گئیں۔"

"احمد خاں کھرل نے ان کی کوئی مدد نہیں کی؟"

"اس کے پاس ان دنوں بہت تھوڑی فوج ہوتی تھی۔ تب تک وہ چھپ چھپ کر انگریزوں کی فوجوں پر حملے کرتا تھا اور اس کے ساتھ' ساتھ اپنی طاکت بھی بڑھاتا جا رہا تھا۔" خداداد نے لالی کو مطلع کیا۔ "میں نے تو سنا ہے تھوڑی فوج ہونے پر بھی احمد خاں نے جیل کے کیدیوں کی مدد کے لیے جم کر لڑائی لڑی۔ پر انگریزوں کے پاس بہت زیادہ فوج تھی۔ احمد خاں کے کتنے ہی ساتھی اس لڑائی میں مارے گئے۔ ان میں رائے ساون خاں بھی شامل تھا۔ ساون خاں بہت بہادر سردار تھا۔ اس کے مرنے پر احمد خاں کھرل کمزور پڑ گیا۔ وہ گوگیرہ سے نکل کر اپنے پنڈ جھمرے کی طرف پلٹا۔ برکلے اپنی فوج لے کر اس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ راوی پار کرنے سے پہلے ہی احمد خاں کو گرفتار کرلینا چاہتا تھا۔ پر وہ گولیوں کی بوچھاڑ میں راوی کے بیچ سے گھوڑا دوڑاتا ہوا صاف نکل گیا۔"

"برکلے نے راوی پار کرنے کی کوشش نہیں کی؟" لالی نے دریافت کیا۔

"نہیں وہ راوی سے آگے نہ بڑھا۔" بوڑھے خداداد خاں نے بتایا۔ "جھمرے پہنچ کر احمد خاں نے دوبارہ اپنی فوج اکٹھی کی اور دلّی کے بادشاہ کے ساتھ کھل کر وفاداری کا اعلان کردیا۔ دوسرے سرداروں نے بھی اس کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف لڑنے کا فیصلہ کیا۔ فیر تو جی چناب سے ستلج تک ہر طرف بغاوت پھیل گئی۔ باغیوں نے کمالیہ پر کبضہ کرلیا۔ کمالیہ کا سردار رائے سرفراز خاں انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ سکھ سردار بیدی بھی شریک تھا۔ دونوں بھاگ کر گوگیرہ چلے گئے۔ احمد خاں کھرل اور اس کے ساتھی سرداروں نے ان کا پیچھا کیا۔ راوی سے گزر کر دوبارہ گوگیرہ پہنچے۔ زبردست معرکہ ہوا۔ احمد خاں اور اس کے ساتھی ایسی بہادری سے لڑے کہ انگریزوں کی فوجیں ٹھہر نہ سکیں۔ ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ میدان جنگ سے بھاگ کھڑی ہوئیں۔ اس فتح نے احمد خاں کھرل کا حوصلہ اور بڑھا دیا۔"

"انگریزوں کا کیا بنا؟" لالی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"انگریز بہت گھبرا گئے۔ انھوں نے مدد کے لیے الفنسٹن کو بھاری فوج دے کر بھیجا۔ اس میں زیادہ تر سکھ فوجی تھے۔ فیر یہ بھی ہوا کہ بھاول پور کے نواب صادک محمد خاں نے بھی

ر ریاستی فوج انگریزوں کی مدد کے لیے دے دی۔" اس نے لحہ بھر توقف کرنے کے بعد کہا۔ دھر احمد خاں کھرل نے سید والا کے نزدیک راوی کے کنارے ایک پنڈ' مہر آباد' میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا انگریزوں کو پنجاب سے نکال دینے کی تیاری کر رہا تھا۔"

"انگریزوں کو اس کی تیاریوں کا پتہ نہیں تھا؟"

"بالکل پتہ تھا۔ اسی لیے تو انھوں نے اپنی فوجی طاکت بڑھانے کے لیے یہ چال چلی کہ اپنے رندوں کے ذریعے ایک رات چپکے سے جھمرے میں آگ لگوا دی۔ ساری بستی جل کر راکھ کا ڈھیر وگئی۔ جھمرے اور آس پاس کے دوسرے سرداروں میں یہ افواہ پھیلا دی' آگ احمد خاں نے لگوائی ہے اور ان کے سیکڑوں مویشی بھی اٹھا کر لے گیا۔ کھرل سردار انگریزوں کے بہکانے میں آگئے اور اتنے ناراض ہوئے کہ احمد خاں کا ساتھ چھوڑ دیا۔"

خداداد خاں کو کھانسی کا ٹھسکا لگا۔ وہ دیر تک کھانستا رہا۔ جب ذرا قرار آیا تو بتانے لگا۔ "ہاں تو جی میں یہ کہہ رہا تھا۔ کھرل سرداروں نے احمد خاں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس طرح وہ بہت کمزور پڑ گیا۔ پریشان بھی ہوا۔ پر اس نے حوصلے سے کام لیا۔ ادھر کے وٹو اور فتیانے تو اس کے ساتھ تھے ہی' ٹبک کے کھرلوں کے سردار سارنگ خاں کو بھی اس نے اپنی ساتھ ملا لیا۔ مہر آباد کو چھوڑا اور اس بار گشکوری کے جنگل میں اپنا ٹھکانا بنایا۔ انگریزوں کی اتنی وڈی فوج سے کھل کر لڑنے کی تو اس کے پاس طاکت نہیں تھی۔ اب اس نے نئی طرح کی لڑائی شروع کی۔ جنگل سے اچانک نکلتا۔ انگریزوں کی فوج پر چھاپے مارتا اور فیر جنگل میں گھس جاتا۔ انگریز اس کے ان اچانک حملوں سے بہت پریشان ہوگئے۔ انھوں نے فوجی مدد منگوائی۔ بہت زبردست فوج اکٹھی کی اور گشکوری کے جنگل کا محاصرہ کرلیا۔ ایسی سخت ناکہ بندی کی کہ احمد خاں کی فوج کو رسد ملنی بالکل بند ہو گئی۔"

"تب تو وہ انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا ہو گا۔" لالی نے قیاس آرائی کی۔

"نہیں جی' اس نے ایسا نہیں کیا۔" بوڑھے خداداد نے کڑک کر کہا۔ "وہ بہادر بندہ تھا۔ بزدلوں کی موت مرنا نہ چاہتا تھا۔ جب حالات بہت خراب ہوگئے تو ایک روز وہ جنگل سے نکل کر انگریزوں کی فوجوں کے سامنے آیا۔ ایسی زبردست لڑائی ہوئی کہ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں دکھائی دیتی تھیں۔ احمد خاں اور سردار سارنگ اس لڑائی میں مارے گئے۔ کہتے ہیں احمد خاں آخر دم تک لڑتا رہا۔ اس کے بدن پر زخم ہی زخم تھے۔ وہ خون میں نہایا ہوا تھا۔ جب وہ زخموں سے نڈھال ہو کر گھوڑے سے گرا تو ایک گورا اس کا سر کاٹنے کے لیے جھپٹا' پر احمد خاں کھرل نے گرتے گرتے بھی تلوار کا ایسا ہاتھ مارا کہ حملہ کرنے والے انگریز فوجی کا سر گردن سے کٹ کر دور جا گرا۔" خداداد

کے چہرے پر دکھ کا سایہ پھیل گیا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "زمین پر آکر احمد خاں کھرل نے سجدے کے لیے سر جھکا دیا اور کلمہ پڑھنے لگا۔ سردار سرفراز خاں اور سردار بیدی گھات میں تھے۔ جھٹ آگے بڑھے اور احمد خاں کھرل کا سر کاٹ دیا۔ اسے لے کر خوشی خوشی انگریز افسر کے سامنے پہنچے۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اس کی سفارش پر سردار سرفراز خاں کو نواب کا خطاب اور کمالیہ کی جگیر ملی۔ سردار بیدی کو پاک پتن میں سیکڑوں مربعے ملے۔ یہ مربعے اب انگریزوں کے وفادار وٹوؤں کو الاٹ کردیے گئے ہیں۔"

خداداد خاں کی آواز بھرا گئی۔ وہ آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ لالی دم بخود بیٹھا رہا۔ چند لمحے خاموشی رہی، پھر خداداد کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "آج احمد خاں کھرل کو کوئی نہیں جانتا۔ کوئی اس کا ذکر نہیں کرتا۔ اس کی بہادری کی شان میں کسی میراثی نے گیت نہیں گایا۔ کوئی سد نہیں لگایا۔ لگاتا تو جیل میں بند کردیا جاتا یا گولی سے اڑا دیا جاتا۔ میں تو کہتا ہوں ایسہ سد بھی کسی نے انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے بنایا ہوگا۔

بونڈیاں دے گیت کوئی نہیں گاوندا
بزدلاں دی سد کوئی نہیں لاوندا

لالی مسکرا کر بولا۔ "بابے! تو سچ مچ بوڑھا ہوگیا ہے۔ اب تیرا بھیجا کام نہیں کرتا۔ میں نے میاں سبحان کے دادا کے بارے میں پوچھا اور تو نے احمد خاں کی گل چھیڑ دی۔"

"تیں نوں کیہ پتہ، میرا دادا بھی احمد خاں کھرل کے ساتھ انگریزوں کے خلاف لڑا تھا۔ اسے پکڑ کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ وہ بھی اپیرا سردار تھا اور بہت جی دار بھی تھا۔" خداداد خاں نے گردن اونچی کرتے ہوئے فخر سے کہا۔ "اب اپنے مطلب کی گل سن۔ احمد خاں کے مارے جانے کے بعد بھی باغیوں نے انگریزوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔ ان میں فت یانوں اور وٹوؤں کے ساتھ ترانے اور سیال بھی شامل تھے۔ کوڑے شاہ کے نزدیک راوی کے کنارے ان کا برکلے سے ٹاکرہ ہوا۔ اس لڑائی میں انگریزوں کی زبردست ہار ہوئی۔ ان کے ۵۰ فوجی مارے گئے۔ برکلے بری طرح زخمی ہوا۔ سبحان کا دادا رحمان اس کے ساتھ تھا۔ اس نے زخمی برکلے کو گھوڑے پر ڈالا اور لڑائی کے میدان سے نکال کر نزدیک کے بیلے میں لے گیا۔ اس نے برکلے کی جان بچانے کی بہت کوشش کی۔ وہ بچ تو نہیں سکا پر رحمان کی وفاداری اور خدمت سے اتنا خوش ہوا کہ مرتے دم اس نے اپنے خون سے کاغذ کے ایک پرزے پر یہ لکھ دیا کہ رحمان انگریزوں کا زبردست وفادار ہے۔ اس نے میری جان بچانے کے لیے اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ اس کی وفاداری اور خدمت کو تسلیم کیا جائے اور

مت کی جانب سے اسے وفاداری کا صلہ دیا جائے۔ لو جی اس کاغذ سے رحمان کا نصیب جاگ ما۔"

لالی نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"ہوا یہ کہ انگریزوں نے جب بغاوت کچل ڈالی اور ان کی فتح ہوئی تو وہ فتح کے نشے میں جگہ جگہ چہریاں لگاتے، باغیوں کو پکڑ کر پھانسی پر لٹکاتے اور انگریزوں کے وفاداروں کو انعام اور بخشش ے۔ کرنیل ہیٹن ادھر کی انگریز فوج کا کمانڈر تھا۔ وہی ہر جگہ جا کر کچہری لگاتا۔" بابا خداداد خاں ہر ٹھہر کرتا تا رہا۔

"رحمان سیدھا کرنیل ہیٹن کے پاس پہنچا۔ کرنیل ان دنوں رحیم یار خاں میں تھا۔ اس نے اپنی کچہری لگا رکھی تھی۔ رحمان کچہری میں گھس گیا۔ کرنیل نے نراض ہو کر اسے گھورا۔ رحمان نے وتی کے ڈپ سے جھٹ برکلے کا خون سے لکھا ہوا پرچہ نکالا اور اس کے سامنے پیش کیا۔ کرنیل ہیٹن نے اسے پڑھا تو اس کی ساری نراضی جاتی رہی۔ چھیتی نال اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سر سے ٹوپی اتار کر رحمان کو سلام کیا، ہاتھ ملایا اور اپنے برابر کرسی پر بٹھا کر بولا۔ ول مسٹر رحمان! کمپنی بہادر کی حکومت تمہاری وفاداری کی پوری پوری کدر کرتی ہے۔ تمہیں اس وفاداری کا صلہ بھی ملے گا۔ تم اصطبل سے ہمارا گھوڑا لو، اس پر بیٹھو، جتنی زمین پر تم گھوڑا دوڑاؤ گے وہ سب تمہاری ہوگی۔ اس نے فوراً حکم بھی جاری کردیا۔"

"رحمان نے فیر کیا کیا؟"

"کرنا کیا تھا جی، اس نے جا کر اصطبل سے گھوڑا نکالا۔ اس پر سوار ہوا۔ اسے دوڑایا اور دوڑاتا چلا گیا۔ جب وہ لوٹا تو گھوڑا تھک کر اتنا نڈھال ہو چکا تھا کہ رکتے ہی لڑکھڑا کر گرا اور مر گیا۔ رحمان کا یہ حال ہوا کہ ہانپتے ہانپتے زمین پر لیٹ گیا۔ کرنیل ہیٹن نے اپنے گھوڑے کی موت کا بالکل برا نہیں منایا۔ اس نے رحمان کو شاباشی دی۔ خوش ہو کر اس کی پیٹھ ٹھونکی اور جتنی زمین پر رحمان نے گھوڑا دوڑایا تھا، ساری کی ساری رحمان کو بخش دی۔"

لالی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "تو اس طرح میاں سبحان کے دادا کو اتنی وڈی زمیں داری ملی۔"

"ہاں جی بالکل اسی طرح۔ میرا پیو یہی بتاتا تھا۔" خداداد خاں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "میاں سبحان کے دادا نے انگریزوں کا ساتھ دیا، وفاداری دکھائی، وہ سائیس سے جگیر دار بن گیا۔ خان بہادری کا خطاب بھی پایا۔" اس کے لہجے میں تلخی پیدا ہو گئی۔ "میرے دادا محمد خاں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی۔ کرنیل ہیٹن ہی کے حکم پر پھانسی پر لٹکایا گیا۔ وہ بھی کھرلوں کا

سردار ہوتا تھا۔ اس کی تمام جائیداد اور زمین ضبط کرلی گئی۔ مویشی بھی سارے کے سارے چھین لیے گئے۔ سب کچھ چلا گیا۔ سرداری بھی گئی۔ انگریز، باغی سرداروں اور ان کی آل اولاد کو جانگلی کہتے تھے، سو میں اور میرا پیو جانگلی کہے جانے لگے۔ سبحان اور اس کا پیو میاں بن گئے۔ اب رحمان سائیں کا پوتا زمیں داری کرتا ہے اور سردار محمد خاں کھرل کا پوتا خداداد خاں اس کی نوکری کرتا ہے۔" اس نے دل گرفتہ ہو کر آہ سرد کھینچی۔ "اپنا اپنا نصیب ہے جی۔"

"بابے! تیرا کوئی پتر نہیں ہے؟"

"دو ہیں جی۔" خداداد نے بے نیازی سے کہا۔ "وڈا پت تو ایک رساگیر زمیں دار کے لیے ڈنگر چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اب جیل کاٹ رہا ہے۔ دوسرا میاں سبحان کے فارم پر رحیم یار خاں میں مزدوری کرتا ہے۔" اس کے لہجے میں درد کی چبھن تھی۔ "جانگلی پیو کے جانگلی پتر اور کر بھی کیا سکتے ہیں جی!"

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ بوڑھا خداداد خاں کھرل بھی خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے کی جھریاں اور نمایاں ہوگئیں۔ آنکھوں سے ویرانی جھلکنے لگی۔ وہ کچھ زیادہ بوڑھا اور کمزور نظر آنے لگا۔ کچھ دیر اسی عالم میں گم صم بیٹھا یادوں کی دھندلی پگڈنڈیوں پر بھٹکتا رہا، پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ لالی کے سامنے سے اس نے کھانے کے برتن اٹھائے اور باورچی خانے کی جانب چلا گیا۔

☆

شادو سویرے آیا اور لالی کو اپنے ہم راہ جیپ میں بٹھا کر شکار دکھانے لے گیا۔ جیپ گلیوں سے گزرتی ہوئی گاؤں سے باہر نکلی اور ایک کچے راستے پر جنگل کی جانب دوڑنے لگی۔ جنگل زیادہ دور نہیں تھا۔ خوب گھنا تھا اور دریائے راوی کے کنارے دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جنگل کے سامنے کھلا میدان تھا۔ میدان میں جگہ جگہ خیمے لگے تھے۔ ہر طرف چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ شکاری رات ہی کو پہنچ گئے تھے۔

جیپ خیموں کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ لالی نیچے اترا۔ شادو بھی اترا اور ایک خیمے میں داخل ہوگیا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ آسمان پر اجالا پھیلتا جا رہا تھا۔ شکاری بیدار ہو چکے تھے۔ خیموں کے اندر ان کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ سور کے شکار کا ہانکا کرنے والے کمّی اور مزارعے لمبی لمبی لاٹھیاں اور برچھے ہاتھوں میں دبائے ایک جگہ جمع تھے۔ ان کے ساتھ شکاری کتے اور ان کے راکھے بھی تھے۔

سورج نکلا۔ زرد زرد دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر جگمگانے لگی۔ ہانکا کرنے والے اور راکھے

ری کتوں کے ساتھ جنگل میں گھس گئے۔ وہ جنگل کے دلدلی حصے کی جانب جا رہے تھے جہاں گھنے ر تھے۔ ان چھتروں کے اندر جنگلی سور دن میں چھپے رہتے ہیں۔ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی ان کے ں کے غول جنگل سے نکلتے ہیں۔ آس پاس کے دیہات کی جانب جاتے ہیں۔ کھیتوں میں گھس تے ہیں۔ ربیع کی فصل ہو تو گندم اور جو کے خوشے اور چنے اور سرسوں کے پودے کھا جاتے ں۔ خریف کی فصل ہو تو مکئی کے بھٹے اور کپاس کے ڈوڈوں سے نکلی ہوئی سفید پھٹی کھا جاتے ہیں۔ ں کھیت میں گھستے ہیں، اسے روند ڈالتے ہیں۔ ان کھیتوں سے ایسی بدبو نکلتی ہے کہ مویشی بھی ان ، پودے نہیں کھاتے۔

دھوپ رفتہ رفتہ ہر طرف پھیل گئی۔ سورج چڑھ کر اوپر آگیا۔ شکاری ناشتے سے فارغ ہو کر وں سے باہر نکلنے لگے۔

وہ تین ٹولیوں میں بٹ گئے۔ ایک ٹولی جیپوں میں بیٹھ کر سور کے شکار کے لیے چھتروں کی جانب انہ ہوگئی۔ اس میں اکثریت زمیں داروں کی تھی۔ دوسری ٹولی کے شکاری جیپوں کے علاوہ وڑوں پر بھی سوار تھے۔ ان کے ساتھ شکاری کتے بھی تھے۔ وہ خرگوش اور ہرن کا شکار کھیلنے جا ہے تھے۔ تیسری ٹولی کے شکاری بھی جیپیں اور گھوڑے دوڑاتے ہوئے جنگل میں گھس گئے۔ وہ ندوں کے شکاری تھے۔

بیشتر شکاری بڑے افسر تھے۔ شکاریوں میں اسمبلیوں کے ممبروں کے علاوہ بڑے زمیندار بھی ے۔ بہت سے شکاریوں کے ساتھ ان کی بیویاں بھی تھیں۔ وہ تیز خوشبوؤں سے مہکتی، بنی سنوری پنے شوہروں کے پہلو سے لگی جیپوں میں بیٹھی تھیں۔ لالی نے حیرت سے دیکھا، کئی پالکیاں بھی یں اور انھیں کمّی اور مزارعے اٹھائے ہوئے چل رہے ہیں۔ پالکیوں میں بھی شکاریوں کی بیویاں ر بیٹیاں سوار تھیں۔ وہ نئے نئے فیشن کے خوب صورت لباس پہنے ہوئے تھیں۔ انھوں نے ایت اہتمام سے میک اپ کیا تھا۔ بال طرح طرح سے سنوارے تھے۔ وہ خوبصورت اور طرح ر نظر آرہی تھیں۔ کھلی پالکیوں میں بیٹھی وہ ہنستی مسکراتی، پرندوں، خرگوشوں اور ہرنوں کا شکار کھیلنے جا رہی تھیں۔

سور کا شکار کھیلنے والی پارٹی میں صرف دو شکاریوں کی بیویاں شریک تھیں۔ وہ نصف آستینوں کی الی قمیص اور پتلونیں پہنے ہوئے تھیں۔ ان کے ہاتھ میں بندوقیں دبی تھیں۔ وہ صرف شکار دیکھنے یں آئی تھیں بلکہ سور کا خطرناک شکار کھیلنے کا حوصلہ بھی رکھتی تھیں۔ لیکن پرندوں، خرگوشوں ر ہرنوں کا شکار کھیلنے والی بیگمات کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں بھی قمیص اور پتلون پہننے والیاں

شامل تھیں۔

شادو نے لالی کو بھی جنگل میں لے جانا چاہا مگر وہ نہیں گیا۔ کچھ دیر بعد شکاری اپنی بیویوں کے ساتھ جنگل میں داخل ہو کر گھنے درختوں کی آڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ لالی خیموں کے اردگرد گھومتا رہا، پھر حویلی کی جانب واپس ہوا۔ مہمان خانے میں پہنچا۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور سو گیا۔

دن ڈھلے وہ سو کر اٹھا۔ اس نے غسل کیا اور ترو تازہ ہو کر شادو کا انتظار کرنے لگا۔ اب اس کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ کمزوری بھی بڑی حد تک ختم ہو گی تھی۔ وہ قادر آباد جانا چاہتا تھا اور اسی روز جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

سورج غروب ہو گیا۔ مگر شادو نہیں آیا۔ لالی اس سے ملنے کے لیے اس میدان کی جانب چل دیا، جس میں شکاریوں کے خیمے تھے۔ شادو وہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے لالی کو یہی تاثر دیا تھا۔ لالی میدان میں پہنچا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جنگل میں منگل کا سماں ہے۔ مٹی کے تیل سے چلنے والے جنریٹر کے ذریعے بجلی پیدا کی جا رہی تھی۔ ابھی شام ہی تھی مگر خیموں کے اندر اور باہر ہر طرف بلب روشن تھے۔

نوکر چاکر نہایت مستعدی سے ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ خیموں سے کچھ فاصلے پر میدان میں بڑے بڑے چولھوں میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ ان پر رکھی ہوئی دیگوں میں طرح طرح کے کھانے پکائے جا رہے تھے۔ کہیں دہکتے ہوئے سرخ سرخ انگاروں پر مرغ تلے جا رہے تھے کہیں کباب بنائے جا رہے تھے۔

شادو کی تلاش میں لالی ادھر ادھر نظریں دوڑاتا خیموں کے درمیان گھومتا پھرتا رہا۔ مگر وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اس نے ایک ملازم کو ٹوکا جو قریب کے خیمے سے نکلا تھا۔

"گل سن! تیں نوں پتہ، شادو کتھے ہے؟"

ملازم نے ایک خیمے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "وہ تو جی، میاں سبحان کے وڈے پت میاں سلیم کے پاس اس خیمے میں ہے۔"

لالی نے مزید بات چیت نہیں کی۔ وہ اس خیمے کی طرف بڑھا، قریب پہنچا، خیمے کا پردہ کھلا تھا۔ میاں سلیم چوڑی چوڑی دھاریوں کی ریشمی قمیص اور ویسا ہی پاجامہ پہنے، آنکھیں بند کیے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ و سفید تھا، سر کے بال آگے سے کسی قدر اڑے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی مونچھ صاف تھی۔ قد اونچا تھا اور جسم خاصا بھاری بھرکم تھا۔ عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ صوبائی حکومت کے محکمہ زراعت و خوراک کا سیکرٹری تھا۔

شادو فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا میاں سلیم کے پیر دبا رہا تھا۔ شادو نے مڑ کر لالی کو دیکھا، رایا اور اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔ لالی خیمے میں چلا گیا۔ شادو نے میاں سلیم کو مخاطب تے ہوئے کہا۔ "صاحب جی! یہ خود یہاں آگیا۔ میں اسی کے پاس جانا چاہتا تھا۔ میرا بہت پرانا ہے۔"

سلیم نے آنکھیں کھول کر لالی کو دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ "تب تو یہ بھی جرائم پیشہ ہو گا؟"

شادو نے جھٹ بات بنائی۔ "نہیں جی، ایسی کوئی گل بات نہیں۔ یہ بہت نیک بندہ ہے۔"

سلیم نے لالی سے کہا۔ "تو میرے کندھے اور بازو دبا دے۔ آج تو میں بہت تھک گیا۔ سارا جسم رہا ہے۔" اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

شادو نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ لالی کرسی کے پیچھے گیا اور چپ چاپ میاں سلیم کے کندھے اور ودبانے لگا۔

خیمے میں خاموشی تھی۔ خیمہ خاصا بڑا اور کشادہ تھا۔ ایک طرف لوہے کا فولڈنگ پلنگ تھا۔ اس ں اسپرنگ لگے ہوئے تھے۔ پلنگ پر موٹا گدا بچھا تھا اور اس پر اجلی چادر اور نرم نرم تکیوں کا بستر ۔

پلنگ کے اوپر مچھردانی تھی۔ قریب ہی میز رکھی تھی۔ اس کے سامنے کرسی تھی۔ میز پر سنگھار کا امان اور ملکی و غیر ملکی عطریات کی چھوٹی بڑی شیشیاں تھیں۔

☆

پینتیس چھتیس سال کی ایک عورت خیمے میں داخل ہوئی۔ وہ سلیم کی بیوی تھی۔ سرو قامت، وری چٹی اور طرح دار۔ اس کا باپ، مخدوم نور علی شاہ گیلانی، خانقاہ عالیہ کا گدی نشین تھا، ملتان کے بڑے جاگیرداروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ بڑے باپ کی بیٹی ہونے کے باعث اس کا ٹھسا بھی ت زیادہ تھا۔

آہٹ سن کر سلیم نے آنکھیں کھول دیں۔ بیوی کو مسکرا کر دیکھا اور نرم لہجے میں گویا۔ فرخندہ! تم نے ابھی غسل نہیں کیا؟"

وہ اٹھلا کر بولی۔ "میں برابر کے ٹینٹ ہی سے ہو کر آرہی ہوں۔ نہانے کا پانی بہت گرم ہے۔ پتہ میں، اس موسم میں اتنا گرم پانی ٹب میں بھرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"مگر یہاں تو ایسی گرمی نہیں ہے۔ ڈارلنگ! ویسے گرم پانی سے نہانے کے بعد ساری تھکن دور وجاتی ہے۔ آج تم نے بھاگ دوڑ بھی بہت کی ہے۔ تھک گئی ہو گی۔"

"تھکن تو بہت معلوم ہوتی ہے۔ مگر میں غسل ابھی نہیں کروں گی۔"

وہ میز کے سامنے جاکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ "میں دائی کا انتظار کر رہی ہوں۔ وہ اب تک آئی کیوں نہیں؟"

"اسے اب تک آجانا چاہئے تھا۔ آتی ہی ہوگی۔" میاں سلیم نے قیاس آرائی کی۔

فرخندہ نے کچھ نہیں کہا۔ کنگھا اٹھا کر اپنے بال سنوارنے لگی۔ اس کے بال گردن تک ترشے ہوئے تھے۔ ان پر خاک کے ذرات چمک رہے تھے۔ سلیم نے آنکھیں بند کرلیں۔ لالی اس کے کندھے اور بازو دباتا رہا اور شادو سامنے فرش پر بیٹھا انگلیوں سے اس کی پنڈلیوں کا مساج کرتا رہا۔ فرخندہ بالوں میں کنگھا پھیرتی رہی اور آئینے میں اپنا چہرہ مختلف زاویوں سے دیکھتی رہی۔

چند ہی منٹ گزرے تھے کہ ایک ایسی عورت خیمے میں داخل ہوئی جو وضع قطع سے حویلی کی خادمہ یا کسی مزارعے کی بیوی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی عمر فرخندہ سے کم تھی۔ رنگت کبھی گوری رہی ہوگی مگر تیز دھوپ میں محنت مشقت کرنے سے اس کا رنگ جھلس کر زردی مائل مٹیالا پڑگیا تھا۔ چہرے پر ابھی سے بڑھاپے کی لکیریں ابھرنے لگیں تھیں۔ اس کا بدن مضبوط اور چھریرا تھا۔ اسے دیکھ کر فرخندہ نے پوچھا۔

"کیا نام ہے تیرا؟"

وہ نظریں جھکا کر بولی۔ "میرا ناں کریماں ہے جی۔"

"ادھر آ میرے نزدیک۔" فرخندہ نے نہایت رعب اور دبدبے سے اسے بلایا۔ وہ چپ چاپ اس کے نزدیک جاکر کھڑی ہوگئی۔ فرخندہ نے اپنی ناک آگے بڑھا کے اس کا لباس سونگھا۔

"نہا دھو کر آئی ہے؟"

"ہاں جی، ٹھیک طرح نہا کر آئی ہوں۔ کپڑے لتے بھی آج ہی دھو کر پہنے ہیں۔ انھیں سوکھنے میں دیر ہوگئی۔ اسی لیے آنے میں دیر ہوگئی جی۔"

فرخندہ نے نظریں اٹھا کر کریماں کے لباس کا جائزہ لیا۔ وہ سفید دھوتی باندھے ہوئے تھی۔ جگی بھی سفید ہی تھی۔ البتہ دوپٹا گہرا نیلا تھا۔ فرخندہ منہ بگاڑ کر بولی۔ "پتہ نہیں، کیسے نہائی تھی۔ ابھی تک پسینے کی سڑی ہوئی بو نکل رہی ہے۔"

فرخندہ نے میز پر سے صندل کے عطر کی شیشی اٹھائی اور کریماں کی جانب مڑی۔ "ہاتھ کھول۔" کریماں نے ہاتھ بڑھا کر کھول دیا۔ فرخندہ نے شیشی کھولی اور کریماں کی ہتھیلی پر عطر کی چند بوندیں ٹپکا دیں۔

"اسے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں چپڑ کر گردن، ناک، ہاتھوں اور کپڑوں پر لگا لے۔"

کریماں اس کی ہدایت کے مطابق عطر لگانے لگی۔ وہ عطر لگا چکی تو فرخندہ نے کہا۔ "یہ شیشی لے ر انگلیوں کے ناخنوں پر بھی خوشبو لگا لے۔" اس نے عطر کی شیشی کریماں کو دے دی اور ایک بار رمنہ بگاڑا۔ "نہ جانے ان جانگلی عورتوں کے ناخنوں سے اتنی بدبو کیوں نکلتی ہے۔ دماغ سڑ جاتا ہے۔" کریماں خاموش رہی۔ اس نے عطر کی شیشی کھولی اور گردن جھکا کر اپنے ناخن خوشبو سے ہانے لگی۔

فرخندہ نے کنگھا میز پر ڈالا۔ اٹھ کر کھڑی ہوئی، پلنگ کے پاس گئی، مچھردانی کا پردہ اٹھا کے اوپر لا اور شلوار کے پائینچے گھٹنوں تک چڑھا کے نرم نرم تکیے پر چہرہ ٹکا کر اوندھی لیٹ گئی۔ کریماں گے بڑھی، مچھردانی میں داخل ہوکر فرخندہ کے قریب بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے اس کی گوری لوری پنڈلیاں اور کمر ہولے ہولے دبانے لگی۔ فرخندہ کچھ دیر خاموش لیٹی رہی پھر اس نے اپنے نوہر کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

"سلیم! تم جا کر غسل کرلو۔ تمہیں اب تیار ہوجانا چاہئے۔ یہ نہ بھولو کہ تم میزبان بھی ہو۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ مجھے اب تیار ہوجانا چاہئے۔" اس نے آنکھیں کھول کر خیمے کے باہر پھیلا ہوا اندھیرا دیکھا اور کھڑا ہوکر شادو کی جانب متوجہ ہوا۔ "تو منیجر انوار خاں کے پاس چلا جا۔ جو کام وہ بتائے کرنا۔ انوار خاں، میرے پی اے ماجد کے خیمے میں ہوگا۔"

شادو خاموشی سے اٹھا اور خیمے سے چلا گیا۔ لالی بھی اس کے ساتھ نکلا۔ خیمے سے دور جا کر اس نے کہا۔ "یہاں تو عیش ہو رہے ہیں جی!"

"تو کیا تو یہ سمجھ رہا تھا، خالی شکار ہی ہوتا ہے؟" شادو نے ہنس کر بتایا۔ "کچھ دیر بعد شراب کا ذور چلے گا۔ فیر زوردار دعوت ہوگی۔ مجرا بھی ہوگا۔ لہور اور ملتان سے کنجریاں بلائی گئی ہیں۔ زوروں کا جشن ہوتا ہے اور برابر تین روز تک ہوتا ہے۔ دیکھے گا تو پھڑک اٹھے گا۔"

"میں تو آج ہی جانا چاہتا ہوں۔ تو مجھے کادر آباد پہنچا دے۔ میں اسی لیے تیرے کول آیا تھا۔"

"چلا جانا، چلا جانا۔" شادو بے نیازی سے بولا۔ "پورا جشن دیکھ کے جانا۔"

"نہیں شادو! میں اب نہیں رک سکتا۔" لالی نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔ "تو مجھے کادر آباد پہنچا دے۔ رحیم داد میرے انتظار میں بہت پریشان ہوگا۔"

شادو آمادہ نہیں ہوا۔ "آج رات تو میرا جانا بہت مشکل ہوگا۔"

"جیسی تیری مرضی۔ میں نے تو آج ہی رات جانا ہے۔ میں اب یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر

سکتا۔"

"تیرا دماغ تو نہیں چل گیا؟" شادو نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ "تو پیدل یہاں سے کادر آباد جائے گا۔ کادر آباد پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ تو ہے کس خیال میں؟"

"اسی لیے تو میں تیرے ساتھ آنا نہیں چاہتا تھا۔" لالی نے گلہ کیا۔ "تو مجھے خامخا یہاں لایا۔"

"تو کیا تجھے سڑک پر مرجانے دیتا؟ حکیم کے پاس نہ لے جاتا تو زندہ بچ سکتا تھا؟ پتہ ہے' تجھے سنکھیا کھلائی گئی تھی۔"

"میں تو آج ہی جاؤں گا۔" لالی اڑا رہا۔ "آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔"

"میرا کہا مان' رحیم داد کا چکر چھوڑ۔ وہ اپنی فکر آپ کرلے گا۔" شادو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "تو میرے ساتھ لائل پور چل۔ ایک بار ضلع منٹگمری سے نکل آیا' دوبارہ وہاں جانے کی غلطی نہ کر۔ ادھر کی پولیس تیری تلاش میں ہے۔ یہاں تیرے لیے زیادہ خطرہ نہیں ہے۔"

"نہیں جی' یہ نہیں ہوگا۔ میں رحیم داد کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ میں نے اس سے جو وعدہ کیا ہے اسے ضرور پورا کروں گا۔ میں تو آج ہی رات جاؤں گا اور ابھی جاؤں گا۔" لالی کا لہجہ تیکھا ہوگیا۔ "تیری بہت بہت مہربانی۔ آگے مجھے تیری مہربانی کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اتنا ناراض کیوں ہوتا ہے۔" شادو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تیری مرضی جانے ہی کی ہے تو رات ہونے کا انتظار کر۔ روٹی کھانے کے بعد ناچ گانا شروع ہوجائے گا تو میں تجھے کادر آباد لے جانے کی کوشش کروں گا۔ میاں سلیم سے اجازت لینی ہوگی۔ امید تو ہے وہ اجازت دے دے گا۔ طبیعت کا بھلا بندہ ہے۔"

لالی نے اور کوئی بات نہیں کی۔ شادو بھی خاموش رہا۔ دونوں خیموں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ کئی خیموں کے پردے کھلے تھے۔ انھوں نے دیکھا' اکثر خیموں میں سرکاری افسروں کی بیگمات اجلے اجلے بستروں پر لیٹی ہیں۔ حویلی کی خادمائیں یا مزارعوں اور کمیّوں کی عورتیں' ہاتھوں کے ناخنوں میں طرح طرح کی بھینی بھینی خوشبوئیں لگائے بیگمات کے نرم و گداز بدن دبا کر ان کی تھکن اتار رہی ہیں۔

شادو چلتے چلتے ایک خیمے کے قریب رکا اور اندر داخل ہوگیا۔ لالی بھی اس کے ہم راہ چلا گیا۔ یہ خیمہ نوکروں کے لیے تھا' مگر اس وقت خالی تھا۔ اس میں مونج کی چٹائیاں بچھی تھیں۔ شادو نے لالی سے کہا۔

"تھوڑی دیر یہاں لیٹ کر آرام کرلیں۔ تو بھی تھکا تھکا نظر آرہا ہے اور میرا تو دن [illegible]

بہ ئے بلیتھن نکل گیا۔"

"انوار خاں کے پاس نہیں جائے گا؟"

"چلا جاؤں گا' ذرا آرام کرلوں۔ تو بھی لیٹ جا۔ حویلی جاکر کیا کرے گا۔ یہیں میرے ساتھ کھالینا۔ اکٹھے چلیں گے۔"

"تو مجھے کادر آباد لے چلے گا نا؟"

"کہہ تو دیا' پکے کاغذ پر لکھ کر دے دوں؟" شادو نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "پر میاں سلیم سے تو ا زت لینی ہی پڑے گی۔"

لالی چٹائی پر شادو کے قریب ہی لیٹ گیا۔ اسے تھکن بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھیں رلیں۔ نیند کا غلبہ ہوا اور وہ سوگیا۔

لالی کی آنکھ کھلی تو شادو موجود نہیں تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ وہ اٹھ بیٹھ گیا۔ ذرا دیر چپ بیٹھا رہا' پھر شادو کی تلاش میں خیمے سے نکلا۔ بیشتر خیموں میں سناٹا تھا۔ وہ ے بڑھا۔

خیموں سے ذرا ہٹ کر کھلے میدان میں ایک جگہ جگمگاتی روشنیوں میں عورتیں اور مرد جمع ،۔ باتیں ہو رہی تھی۔ قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ لالی اس طرف چلا گیا۔ قریب جاکر دیکھا' ایک ف بار بنا ہے۔ کاؤنٹر پر طرح طرح کی شرابیں رکھی ہیں۔ بارمین اجلی اجلی وردیاں پہنے' کمر اور رکے صافے پر سنہری پٹکے لگائے نہایت مستعدی سے بوتلیں کھول کھول کر گلاسوں اور گوبلٹوں ا طرح طرح کی شرابیں انڈیل رہے تھے۔ شیشے کے بڑے بڑے پیالوں میں برف کے ٹکڑے بھر ہے تھے۔ جگوں میں پانی یا سوڈا ڈال رہے تھے۔

کاؤنٹر خاصا لمبا تھا۔ اس کے ایک حصے میں تلے ہوئے مرغ' کباب اور تکے بھی پلیٹوں میں کھے تھے۔ سفید وردیوں میں ملبوس بیرے خالی گلاس' جگ اور پلیٹیں ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے تے۔ انھیں ایک طرف رکھتے اور دوسری ٹرے اٹھاتے۔ ان پر شراب کے گلاس اور گوبلٹ ف سے بھرے ہوئے شیشے کے پیالے' پانی اور سوڈے سے لبریز جگ یا تلے ہوئے مرغ' کباب اور تکّے رکھتے اور مہمانوں کے پاس پہنچ جاتے۔ یہ کاک ٹیل پارٹی تھی۔ مہمان ہاتھوں میں گلاس نبھالے گھونٹ گھونٹ شراب پی رہے تھے۔ بے تکان باتیں کر رہے تھے' ہنس رہے تھے۔ لالی یک طرف کھڑا ہوگیا۔

چھ دیر بعد شادو کاؤنٹر کے پاس آیا۔ لالی لپک کر اس کے نزدیک پہنچا' آہستہ سے پوچھا۔ "تو چپکے

سے اٹھ کر کتھے ٹر گیا تھا؟"

"میں دوا ڑا ہی گھنٹے سو کر ادھر آ گیا۔ تو گہری نیند سو رہا تھا اس لیے تجھے جگایا نہیں۔" وہ ایک بوڑھے بارمین سے مخاطب ہوا۔ "چاچا! دو پیگ وہسکی کے مجھے بھی بنا دے۔" اس نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ "میرا یار لہور سے آیا ہے۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر ذرا شغل کر لوں گا۔" بارمین نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ بوتل کھول کر دو گلاسوں میں وہسکی انڈیلی۔ برف کے ٹکڑے ڈالے اور شادو سے پوچھا۔

"پانی ڈالوں یا سوڈا؟"

شادو نے ہنس کر کہا۔ "سوڈا ہی ڈال دے چاچا!"

بارمین نے بوتل کھول کر گلاس میں سوڈا ڈال دیا۔ شادو نے دونوں گلاس اٹھائے اور کاؤنٹر کے پیچھے چلا گیا۔ لالی بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں ایک درخت کی آڑ میں جا کر بیٹھ گئے۔ اس جگہ روشنی کم تھی۔

شادو نے ایک گلاس لالی کو دیا اور آنکھ مار کر بولا۔ "اسکاچ وہسکی ہے، تھوڑی سی لگا لے، ساری کمزوری اور تھکن دور ہو جائے گی۔" اس نے اپنا گلاس لالی کے گلاس سے ٹکرایا، گلاس ہونٹوں سے لگایا اور کئی گھونٹ چڑھا گیا۔

لالی بھی پینے لگا۔ گلاس ختم ہوئے تو شادو اور لے آیا۔ دونوں نے وہسکی کے دو بڑے پیگ لگائے۔ ان پر سرخوشی طاری ہو گئی۔ لالی اپنے جسم میں حرارت اور توانائی محسوس کرنے لگا۔

کاک ٹیل پارٹی دس بجے ختم ہو گئی۔ مہمان بکھر کر شامیانے کے نیچے چلے گئے۔ شامیانے میں کھانے کا بندوبست تھا۔ شادو اور لالی بھی نوکروں کے خیمے میں چلے گئے۔ خیمہ ابھی تک خالی تھا۔ شادو کھانا وہیں لے آیا۔

دونوں نے کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی شادو کھڑا ہو گیا۔ "میں میاں سلیم کے پاس جا رہا ہوں۔ اس سے اجازت لے کر تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا۔" شادو چلا گیا۔

لالی خیمے میں خاموش بیٹھا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا، مگر وہ ایسا گیا کہ دیر تک نہیں لوٹا۔ لالی بے چین ہو کر خیمے سے نکلا اور شامیانے کی جانب گیا۔ مگر اب وہاں سناٹا تھا۔

☆

میدان کے ایک گوشے میں ایک اور بڑا شامیانہ تھا۔ اس کے چاروں طرف قناتیں لگی تھیں۔ شامیانے میں تیز روشنی تھی۔ اندر سے ناچ گانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ لالی کو اندازہ ہو گیا

شروع ہو چکا ہے۔ شادو بھی وہیں ہو سکتا ہے۔

اسی طرف چل دیا۔ وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ قریب کے خیمے سے ایک شخص نکلا۔ لالی نے بلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ ہمدانی تھا۔

انی نے بھی لالی کو پہچان لیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی ٹھٹکا، مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔ "یار، تو ہی آ گیا؟ مگر یہاں پہنچا کیسے؟" اس کے انداز میں بے تکلفی کے ساتھ حیرت بھی تھی۔

انے نظریں جھکا کر کہا۔ "بس جی پہنچ ہی گیا۔"

ہے بہت تیز۔ اس رات ایس پی کے پھندے سے صاف بچ نکلا۔" ہمدانی نے قہقہہ لگایا۔ نے تجھے گرفتار کرنے کا پورا بندوبست کر لیا تھا۔ تو فرار کس راستے سے ہوا؟"

ہ ایسا ہوا جی، نہر میں پانی زوروں سے بہہ رہا تھا۔ میں نہر میں اترا تو پانی کے تیز بہاؤ میں پیر اکھڑ ر میں دور تک بہتا چلا گیا۔"

اندر خیمے میں آ جا۔" ہمدانی نے اپنے خیمے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے ہمدانی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لالی اس کے سامنے مودب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ذرا دیر خاموشی رہی پھر کی آواز ابھری۔

ہیں لائل پور میں روپوش ہے یا کہیں اور جانے کا ارادہ ہے؟"

صاحب! آپ سے کیا چھپانا۔" لالی نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "میں نے رحیم داد سے ملنے آباد جانا ہے۔ ابھی تک اس کے پاس نہیں پہنچ سکا۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہو گا۔"

وہاں جانا تو تیرے لیے خطرناک ہو گا۔ ایس پی مرزا کو مہر سلیمان خاں کی کوٹھی کے چوکیدار سے رات اطلاع مل گئی تھی کہ تو قادر آباد جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے وہاں پولیس لگا کر ی شروع کر دی ہے۔"

صاحب! آپ نے پہلے بھی میری مدد کی ہے۔" لالی نے عاجزی سے کہا۔ "اس بار اتنی مدد اور سا کہ اپنی موٹر میں مجھے کادر آباد پہنچا دیں۔ آپ کی موٹر دیکھ کر پولیس والے کچھ نہیں بولیں میں نہر پار کر کے رحیم داد کے پاس ٹبوں پر پہنچ جاؤں گا۔"

نہیں یار! میں تیری ایسی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" ہمدانی نے صاف انکار کر دیا۔ "میں تو تجھے یہ روں گا کہ تو خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دے۔ رحیم داد کو پکڑوا دے اور خود سرکاری گواہ جا۔ مقدمہ میری عدالت میں پیش ہو گا۔ میں کوشش کروں گا تو بری ہو جائے، ورنہ تیری سزا کم بت کم ہو جائے گی۔ میں تیری یہی مدد کر سکتا ہوں۔"

"صاحب! یہ نہیں ہو سکتا کہ میں رحیم داد کو گرفتار کروا دوں۔ میں اس کے ساتھ دغا نہیں کر سکتا۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تو اتنا کوڑھ مغز بھی ہو سکتا ہے۔" ہمدانی چند لمحے خاموش رہا پھر مسکرا کر بولا۔ "پولی لیسین کلب کی نائٹ آف دی گریٹ سسپنس میں تو نے بہت ہوشیاری اور اعتماد سے ایمپائرنگ کی تھی۔ میں تو دنگ رہ گیا۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "ٹوکنوں کے الٹ پھیر میں تو کمال کر دیا تھا۔"

"صاحب! صبح شکاریوں کے ساتھ آپ مجھے دکھائی نہیں دیئے' آپ کدھر تھے؟"

"میں آج دوپہر یہاں پہنچا ہوں۔"

"بیگم صاحبہ بھی آپ کے ساتھ آئی ہیں؟"

"نہیں۔" ہمدانی نے بتایا۔ "نوشابہ ان دنوں اپنے بھائی کے پاس پنڈی میں ہے۔ وہ فوج میں میجر ہے۔"

لالی نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ "انھوں نے بعد میں میرے بارے میں تو کچھ نہیں کہا؟"

"کبھی تیرا تذکرہ نہیں کیا۔ یاد ہی نہیں آیا ہوگا۔ البتہ مجھے بعد میں تو بہت یاد آیا۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "اس رات تو ایمپائر نہ ہوتا تو امینہ ہرگز میری پارٹنر نہ بنتی۔ تو نے ہاتھ کی ایسی صفائی دکھائی کہ وہ پکے پھل کی طرح میری جھولی میں آگری۔ یار مزا آگیا۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "آج رات بھی تجھ سے ایک ایسا ہی کام لینا ہے۔"

"کیا یہاں بھی لاٹری شاٹری ڈالی جائے گی؟" لالی نے سادگی سے پوچھا۔ "پر آپ تو آج اکیلے ہی ہیں۔"

"نہیں یار۔ یہ کچھ اور ہی چکر ہے۔ تجھے نواب فخرو کے خیمے جانا ہوگا۔ وہاں سے تو ان کی بیٹی گیتی آرا کو میرے خیمے میں لے آنا۔ وہ نخرا تو بہت کرتی ہے مگر آجائے گی۔ تو اسے لے کر ہی آنا۔"

لالی نے پیچھا چھڑانا چاہا۔ "صاحب! میں تو انھیں جانتا بھی نہیں۔"

"اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ان کے خیمے پر جا کر صرف اتنا کہنا کہ مجھے ہمدانی صاحب نے بھیجا ہے۔ زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ بات پہلے ہی طے ہو چکی ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "میں اپنے ڈرائیور یا اردلی کو ادھر بھیج دیتا' دونوں میرے ساتھ آئے ہیں۔ میاں سلیم کے کسی نوکر چاکر سے بھی کام چل سکتا تھا مگر تو مجھے سب سے موزوں معلوم ہوتا ہے۔ تجھ پر مجھے اعتماد بھی ہے۔ کسی اسکینڈل کا بھی خطرہ نہیں اور ایسے معاملوں میں تو ہوشیار بھی ہے۔"

"نہیں صاحب! میں نے دلالی گیری کا دھندا کبھی نہیں کیا۔" لالی نے دبی زبان سے انکار کر دیا۔

"یار! خواہ مخواہ کا نخرا نہ دکھا۔ مجھے یقین ہے' تو ضرور پکڑا جائے گا اور یہ بھی جان لے' کبھی نہ بھی تو میرے ہی سامنے پیش ہوگا۔ اس وقت تجھے معلوم ہوگا میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں۔" وہ یر لب مسکرایا۔ "تجھے کم سے کم سزا دوں گا۔ میرے فیصلے کے خلاف اپیل نہ کرنا' ورنہ ہو سکتا ہے یادہ ہی لمبی سزا کاٹنی پڑے۔"

لالی اس کی دھمکی سے ڈر گیا۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ نظریں جھکا کر فرش کو تکنے لگا۔ ہمدانی کھڑا وگیا۔ خیمے کے پردے کے قریب پہنچا۔ لالی کو اپنے پاس بلایا اور ایک خیمے کی طرف اشارہ کرتے دے بولا۔

"دوسری لائن میں وہ جو ساتواں خیمہ ہے' وہی ہے نواب فخرو کا خیمہ۔ وہاں جا کر تجھے اتنی ہی ت کہنی ہے جتنی میں نے تجھ سے کہی ہے۔ اب تو ادھر جا۔ میں تیرا انتظار کرتا ہوں۔"

لالی باہر آیا اور ہمدانی کے بتائے ہوئے خیمے کی طرف روانہ ہوگیا۔ خیموں میں خاموشی چھائی تھی۔ دور شامیانے کے نیچے طبلے کی تھاپ اور گھنگروؤں کے چھناکے کے ساتھ رات کے سناٹے یں گانے کی آواز ابھر رہی تھی۔

لالی آہستہ آہستہ چلتا ہوا نواب فخرو کے خیمے پر پہنچا۔ خیمے کا پردہ ذرا سا سرکا ہوا تھا۔ اس نے بڑھ کر دیکھا۔ گیتی آراء کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے میز پر آئینہ رکھا تھا۔ وہ آئینے میں اپنے چہرے کا عکس دیکھ رہی تھی۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک کی ہلکی ہلکی تہہ جما رہی تھی۔ اس کی روشن آنکھوں میں دنبالہ کاجل تھا۔ چہرہ بیضوی تھا' رخسار گلابی تھے اور بلب کی تیز روشنی میں تمتما رہے تھے۔ بدن نرم اور گداز تھا۔ اس میں دائرے تھے' پیچ و خم تھے۔ وہ تیئیس چوبیس سال کی خوبصورت لڑکی تھی۔ سنگھار کے بعد وہ اور زیادہ دل کش نظر آرہی تھی۔

قریب ہی نواب فخرو بھی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے بال کھچڑی ہوگئے تھے۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ چہرے پر وقار اور دبدبہ تھا جسے اس کی چڑھی ہوئی مونچھوں نے اور بارعب بنا دیا تھا۔ وہ دراز قد تھا اور گہرے سرمئی سوٹ میں معزز نظر آرہا تھا۔ نواب فخرو سے ذرا ہٹ کر اس کی بیگم بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔

وہ گوری چٹی عورت تھی۔ چہرے کے اجڑے نقوش بتا رہے تھے کہ جوانی میں وہ بھی گیتی آرا کی طرح حسین اور دل کش ہوگی۔ اس کا جسم خاصا پھیل گیا تھا جس نے اسے بے ڈول اور بدوضع بنا دیا تھا۔ لالی تینوں کو صبح شکاریوں کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ نواب فخرو بندوق سنبھالے جیپ میں بیٹھا

تھا۔ بیٹی اور بیگم پالکی میں سوار تھیں۔

لالی ذرا دیر پردے کے قریب کھڑا رہا پھر آہستہ سے کھنکارا۔ نواب فخرو نے اونچی آواز سے پوچھا۔ ”کون ہے؟“ وہ اٹھ کر پردے کے پاس آ گیا۔

”مجھے جی ہمدانی صاحب نے بھیجا ہے۔“

”اچھا اچھا‘ تم یہیں بیٹھو۔ تمھیں ذرا دیر انتظار کرنا پڑے گا۔“ وہ واپس جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ لالی بھی چپ چاپ خیمے کے پردے سے لگ کر فرش پر بیٹھ گیا۔

نواب فخرو نے اپنی بیگم سے کہا۔ ”ہمدانی صاحب کا ملازم آیا ہے۔“

”سن رہی ہو گیتی آرا۔“ بیگم نے بیٹی کو مخاطب کیا۔ ”ہمدانی صاحب کا ملازم لینے آیا ہے تمھیں۔“ گیتی آراء آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی رہی اور لپ اسٹک سے اپنے ہونٹوں کو سرخ گلاب کی پنکھڑیاں بناتی رہی۔

ماں نے چند لمحے بیٹی کے جواب کا انتظار کیا پھر کسی قدر تیکھے لہجے میں بولی۔ ”اے‘ میں نے کہا‘ گیتی آراء! تم نے سنا نہیں۔ بیٹی‘ میں کیا کہہ رہی ہوں؟“

”امی حضور! میں کسی کے پاس نہیں جاؤں گی۔“ گیتی آرا نے ماں کی جانب دیکھے بغیر بیزاری سے جواب دیا۔ ”میں اسی لیے یہاں نہیں آ رہی تھی۔ آپ اصرار کر کے زبردستی مجھے لے آئیں۔ اب یہ حکم صادر کیے جا رہے ہیں‘ اس سے مل لو‘ اس کے پاس جاؤ۔ واہ‘ یہ خوب رہی۔“

”اے‘ میں نے کہا‘ سن رہے ہو نواب فخرالدولہ‘ تمھاری صاحب زادی کیا فرما رہی ہیں؟“ بیگم نے شکایت کے انداز میں شوہر سے کہا۔ ”اب تمھی اسے سمجھاؤ۔ میری تو یہ سنے گی نہیں۔ تمھی مناؤ‘ تمھی نے سر پر چڑھا کر اس کا دماغ خراب کیا ہے۔“

”سر پر تو ہم نے تمھیں بھی چڑھا رکھا ہے۔“

”اے‘ بڑے آئے مجھے سر پر چڑھانے والے۔“ بیگم تنک کر بولی۔ ”تمھارے سر پر تو دل آرام کا بھوت سوار تھا۔ اس موئی حرافہ کے ہوتے ہوئے تم مجھے کیسے سر پر چڑھاتے۔ تمھیں اتنا ہوش ہی کب تھا۔“

”مگر تمھاری تو ہم نے کبھی حق تلفی نہیں کی۔“ نواب فخرو نے رسان سے کہا۔ ”ہم نے تمھارے ساتھ تو کوئی زیادتی نہیں کی۔“

”اے میں کہتی ہوں کیا نہیں کیا تم نے؟“ بیگم کا لہجہ بدستور تلخ تھا۔ ”لاکھ کا گھر خاک میں ملا دیا۔ ساری جائیداد اور زمیں داری لالہ گردھاری لال رستوگی کے پاس رہن رکھ دی۔ میرا زیور تک نہ چھوڑا۔ اب بیٹھے فرما رہے ہیں‘ ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ ریس اور رنڈی بازی میں سب کچھ تباہ کر دیا۔“

”یہ طعنہ نہ دو۔“ نواب فخرو کا لہجہ بھی تیز ہو گیا۔ ”یہ نہ بھولو کہ تمھیں بھی ہم بالاخانے سے اتار کر گھر میں بیگم بنا کر لائے تھے۔ ہم نے شمع محفل سے تمھیں شمع خانہ بنا دیا۔ نہ خلد آشیانی قبلہ ابا حضور کی برہمی سے خائف ہوئے‘ نہ اماں جان کی پروا کی۔ سارے خاندان سے تمھاری خاطر مخالفت مول لی۔“

”میرا منہ نہ کھلواؤ۔ تمھاری نانی کون سی شریف زادی تھی۔ وہ بھی تو ذات کی ڈومنی تھیں۔ ویسے بھی تم نے کیا احسان کیا مجھ پر۔ گھر میں قیدی بنا کر ڈال دیا۔“ وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ ”ہر وقت تو ایک ایک کے طعنے سنتی تھی۔ تمھارے خاندان والوں نے تو مجھے نکّو بنا دیا تھا۔ تمھیں کیا خبر‘ میں نے کیا کیا ظلم نہ سہے۔ تم تو اس وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ تم نے میری بات ہی کب سنی۔ میرا کہا مان لیتے تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ یہاں آ کر یہ ذلت و خواری نہ دیکھنا پڑتی۔ سفارشوں کے لیے یوں ایک ایک در کی خاک نہ چھاننا پڑتی۔“

”سفارشیں بھی تو کام نہیں آئیں۔“ نواب فخرو نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”برسوں برسوں تک رسائی حاصل کی۔ صاحب زادے کو کسٹمز میں ایسی اچھی ملازمت دلوائی۔ اب وہ کراچی میں بیٹھے اپنے بال بچوں کے ساتھ عیش کرتے ہیں۔ پلٹ کر یہ بھی خبر نہیں لیتے کہ ماں باپ زندہ ہیں یا مر گئے۔“

”اس کا تو تم میرے سامنے نام بھی نہ لو۔“ بیگم بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”وہ تو ہمیشہ کا خود غرض ہے۔ اوپر سے بیوی اس کی ایسی شلّاح ہے۔ ایسا اسے اپنے جال میں پھانسا ہے کہ ہر وقت اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں اسے الّو کا گوشت کھلا دیا ہے۔ دوسرے صاحبزادے ہیں‘ انھیں ایکٹنگ کا شوق چرّایا ہے۔ بمبئی میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں یا آغا جانی کے در پر پڑے رہتے ہیں۔ کتنے خط لکھے کہ لکھنؤ جا کر جائیداد کے کاغذات بھجوا دو۔ ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔“

”کیا جواب دیتا۔“ نواب فخرو نے اپنے چھوٹے بیٹے کی طرف سے صفائی پیش کی۔ ”کون سی جائیداد کے کاغذات بھجواتا۔ ساری جائیداد فروخت ہو چکی ہے یا رہن پڑی ہے۔“

”اے میں کہتی ہوں‘ کس نے ایمانداری سے کلیم حاصل کیا ہے۔“ بیگم نے جھنجلا کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ ”کس نے جعلی دستاویزیں نہیں بنوائیں؟ دور کیوں جاتے ہو‘ وہ تمھارے بٹ

صاحب کہاں کے مہاجر ہیں۔ زندگی بھر سیالکوٹ میں رہے، اب مہاجر بن بیٹھے۔ لاہور میں ایک کوٹھی الاٹ کروالی۔ آج کل کوئی فیکٹری الاٹ کرانے کی کوشش میں لگے ہیں۔ خود ان کی بیوی نے بتایا ہے مجھے۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ متروکہ جائیداد کی تو ایسی لوٹ مار مچی ہے کہ نہ کبھی سنی تھی نہ دیکھی۔ وہ اپنے دلی کے نواب اختر مرزا ہیں، دو کوٹھیاں اور ایک کارخانہ کلیم میں الاٹ کرا چکے ہیں۔" نواب فخرو نے مسکرا کر کہا۔ "خود کو بہادر شاہ کا پوتا بتاتے ہیں۔ انھوں نے تو لال قلعے کے بدلے لاہور کا شاہی قلعہ الاٹ کرنے کا کلیم بھرا ہے۔ کمال ہو گیا بھئی۔ سنا ہے گلی قاسم جان میں کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ دروازے پر ٹاٹ کا پھٹا پردہ پڑا رہتا تھا۔"

بیگم کی نظر اچانک لالی پر پڑ گئی۔ وہ خیمے کے پردے کے پاس بیٹھا ان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ بیگم تلملا کر بولی۔ "اے میں نے کہا، نواب فخرالدولہ! یہ موا جانگلوس یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ کیا دیدے نکالے اجڈپن سے تک رہا ہے۔"

"بیگم تم تو ہر ایک کے سر ہو جاتی ہو۔ اسے ہمدانی نے بھیجا ہے۔ ہم نے اس سے یہاں بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا تھا۔" اس نے مڑ کر گیتی آرا کو دیکھا۔ "بیٹی! اب کھڑی ہو جاؤ۔ ہمدانی صاحب انتظار کرتے ہوں گے۔"

گیتی آرا نے باپ کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "ابا حضور! آپ آخر مجھے کس کس کے پاس بھیجیں گے؟ آپ کے حکم پر میں محکمہ بحالیات کے کمشنر کے بنگلے پر چلی گئی۔ آپ کا اتنا بڑا کلیم منظور کرا دیا۔ تصدیق کے لیے کاغذات ہندوستان بھی نہیں بھیجے گئے۔ سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہو گیا۔ چیچہ وطنی میں ڈھائی سو ایکڑ زمین، عارف والا میں آئس فیکٹری اور لاہور میں رہنے کے لیے کوٹھی، آخر کس طرح آپ کے نام ہوئی۔ سب آپ کی مرضی کے مطابق ہی تو ہوا۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ بیٹے تو دونوں ہی نکمے اور خود غرض نکلے۔" نواب فخرو نے نہایت نرم لہجے میں کہا۔ "واللہ، تم نے بیٹی ہو کر بیٹوں کا حق ادا کر دیا۔" نواب نے آہ سرد کھینچی۔ "کیا کریں بیٹی! اللہ نے ہم پر وقت ہی ایسا ڈالا ہے۔ تم اتنی قربانی نہ دیتیں تو فاقے کرتے کرتے مر جاتے۔ اس عمر میں مجھے کون ملازمت دیتا۔ تعلیم بھی میری صرف انٹرنس تک ہے۔" گیتی آرا خاموش رہی۔ نواب فخرو اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ پیار سے گویا ہوا۔ "بیٹی! چلی جاؤ گی تو کام بن جائے گا۔ اب تو صرف آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ زمین اور فیکٹری کا الاٹمنٹ تو ہو گیا مگر قبضہ ہمدانی کے مدد کے بغیر نہیں مل سکتا۔"

وہ اس کا سر آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ "بیٹی عزت کی زندگی گزارنے کا یہ آخری موقع ملا ہے۔ زمین اور فیکٹری کا قبضہ مل گیا تو آرام و سکون سے گزر بسر ہو گی۔ تمھارے لیے رشتہ بھی اچھا مل جائے گا، بلکہ ایک لڑکا میری نظر میں ہے بھی۔ وہ سی، ایس، پی ہے۔ شکل و صورت کا بھی اچھا ہے۔ خاندان بھی ہماری طرح شرفا کا ہے۔" گیتی آرا گم صم بیٹھی رہی۔ نواب فخرو کے لہجے میں عاجزی اور رقت پیدا ہو گئی۔

"بیٹی! تم اپنے بوڑھے باپ کی مدد نہیں کرو گی؟"

گیتی آرا نے آہستہ سے کہا۔ "ابا حضور! میں نے پہلے بھی کب آپ کا حکم ٹالا ہے۔" وہ کھڑی ہو گئی۔ ماں پلنگ سے اتری۔ گیتی آرا کے نزدیک پہنچی۔ اس کے سر پر ہاتھ لگا کر چٹ چٹ بلائیں لیں۔ مسکرا کر نواب فخرو کی طرف دیکھا۔ "دیکھ رہے ہو نواب فخرالدولہ! میری بچی کتنی فرماں بردار ہے۔ چاند کا ٹکڑا لگ رہی ہے۔ اے، میری نظر نہ لگ جائے۔" اس نے پیار سے تھتکارا۔

گیتی آرا مسکرا کر بولی۔ "امی حضور! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔"

وہ آگے بڑھی، خیمے کے پردے تک پہنچی۔ بیگم فخرو بیٹی کی ساتھ ساتھ چلیں اور اسے رخصت کرتے ہوئے بولیں۔ "بیٹی! اللہ کے سپرد۔"

گیتی آرا ریشمی غرارے کے پائنچے ایک ہاتھ سے سنبھالے بڑے ٹھسّے سے باہر نکلی۔ لالی اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ گیتی آرا کے ہم راہ چلنے لگا۔ دونوں دھندلی روشنی میں خیموں کے درمیان سے سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ لالی نے چلتے چلتے نشے کی ترنگ میں گیتی آرا کو چھیڑا۔

"صاحب ٹھیک ہی کہتے تھے، تمھارا نکھرا بہت زیادہ ہے۔"

گیتی آرا نے جھنجلا کر اسے ڈانٹا۔ "بدتمیز۔"

"میں تو جی بدتمیز ہوں۔ جانگلی جو ٹھیرا بلکہ جانگلوس ہوں۔ تمھاری ماں نے تو یہی کہا تھا نا۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "پر تم تو اس وکھت تمیز کا دھندا کرنے جا رہی ہو۔"

"اجڈ، گنوار کہیں کا۔" وہ تلملا کر بولی۔ "ایسی باتیں کیں تو میں نہیں جاؤں گی۔"

"نہ جاؤ۔" لالی مسکرا کر بے نیازی سے بولا۔ "تم میرے لیے تو جا نہیں رہی ہو۔"

وہ روٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "مجھے مسٹر ہمدانی کا خیمہ بتا دو۔ میں خود چلی جاؤں گی۔"

"چلو چلو، خاماخا کا نکھرا نہ دکھاؤ۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "وہ رہا صاحب کا خیمہ۔"

گیتی آرا خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔ وہ آگے بڑھی اور غرارے کے پائنچے

سنبھالتی، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی، لالی کے ہم راہ چلتی رہی۔ ہمدانی کے خیمے پر پہنچ کر لالی نے آرا سے کہا۔ "تم اندر جا کر عیش کرو۔ میں اب چلا۔" گیتی آرا نے اسے قہر آلود نظروں سے اور پردہ اٹھا کر خیمے میں داخل ہو گئی۔

لالی مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اب اسے شادو کی تلاش تھی۔ وہ پھر اسی خیمے میں پہنچا جس شادو اسے چھوڑ گیا تھا۔ خیمے میں شادو چٹائی پر لیٹا ہوا جاگ رہا تھا۔ لالی کو دیکھتے ہی بولا۔ "کدھر گیا تھا؟ یہاں آ کر تجھے نہ پایا تو میں پریشان ہو گیا۔"

"ایک چکر میں پڑ گیا تھا۔" لالی مسکرا کر بولا۔ "میاں سلیم نے تجھے جانے کی اجازت دے دی؟"

"اجازت تو دے دی، پر صبح تک واپس آنے کو بھی کہا ہے۔"

"تو فیر دیر کیوں کر رہا ہے، کھڑا ہو جا۔ گڈی کتھے ہے؟"

شادو کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "باہر میدان میں ہے۔"

دونوں خیمے سے نکلے۔ کار زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ کار میں سوار ہونے سے پہلے لالی نے کھانا منگوایا۔ شادو دیگچی میں قورمہ بھر کر لے آیا۔ قورمے کے ساتھ آٹھ روٹیاں تھیں۔ تلے ہوئے مرغ تھے۔ کباب تھے اور پلاؤ بھی تھا۔ لالی نے صرف دیگچی میں بھرا ہوا قورمہ اور روٹیاں رکھ لیں، باقی کھانا واپس کر دیا۔

شادو نے لالی کو اپنے پاس بٹھایا۔ کار اسٹارٹ کی اور حویلی پہنچا۔ لالی مہمان خانے میں گیا اور چادر میں لپٹی ہوئی رائفل لے آیا۔ کار میں بیٹھ کر لالی نے چادر کھولی۔ رائفل نکال کر پچھلی نشست پر رکھ دی۔ روٹیاں اور کھانے کی دیگچی چادر میں باندھ کر آگے رکھ لی۔ اس نے شادو سے پوچھا۔ "تو میرے کپڑے لائل پور سے دھلوا کر لے آیا نا؟"

شادو نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تو گھر ہی میں پڑے ہیں۔ لائل پور سے واپسی پر گھر جا ہی نہیں سکا۔ ویسے بھی میرا خیال تھا تو دو تین روز یہاں ٹھیر کر جائے گا۔"

لالی نے پریشان ہو کر کہا۔ "مار دیا ظالم! سارا کام خراب کر دیا۔" وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کار کچی سڑک پر ہچکولے کھاتی ہوئی دوڑنے لگی۔ گاؤں سے نکل کر آگے بڑھی اور پختہ سڑک آ گئی۔

شادو نے رفتار تیز کر دی۔ کار کمالیہ سے آگے بڑھی۔

ملتان روڈ پر پہنچتے ہی اس نے رفتار اور تیز کر دی۔ شادو بڑا ہوشیار ڈرائیور تھا۔ وہ ستر اسی میل کی رفتار سے کار دوڑاتا رہا۔ جب کار منٹگمری کے قریب پہنچی اور دور سے شہر کی روشنیاں نظر آئیں تو لالی کے چہرے پر گھبراہٹ پھیل گئی۔ مگر کار آناً "فاناً" شہر سے گزرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ کار سڑک پر تیزی سے دوڑتی رہی۔ یوسف والہ سے آگے بڑھتے ہی لالی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے شادو سے کہا۔

"گڈی کی سپیڈ کم کر دے۔"

"کیوں، کیا تیں نوں کادر آباد نہیں جانا؟"

"نہیں مجھے کادر آباد نہیں جانا۔ تو مجھے پہلے ہی اتار دینا۔"

شادو نے رفتار کم کر دی۔ لالی نے قادر آباد سے میل، سوا میل پہلے ہی کار رکوالی اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ شادو اس کے پاس آیا۔ دونوں گرم جوشی سے گلے ملے۔ شادو پھر کار میں بیٹھ گیا، اسے موڑا اور تیزی سے دوڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔

☆

رات سنسان اور تاریک تھی۔ دور سڑک کے اس پار اندھیرے میں قادر آباد اسٹیشن کے آؤٹر سگنل کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ قریب ہی نہر لوئر باری دو آب بہہ رہی تھی۔ لالی نہر کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک چلتا رہا۔ وہ مڑا اور جنگلی جھاڑیوں سے بھرے میدان میں گھس گیا۔

اس نے میدان عبور کیا اور اونچے نیچے ٹیلوں پر چڑھنے لگا۔ رات اب ڈھل چکی تھی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔

بلندی پر پہنچ کے وہ رک گیا۔ مڑ کر پیچھے دیکھا۔ نہر کا پانی پچھلے پہر کے روشن ستاروں کی روشنی میں جھل ملا رہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ لالی ٹیلوں کے درمیان راستے سے گزرتا ہوا اپنے ٹھکانے کی جانب بڑھنے لگا۔

وہ ٹھکانے پر پہنچا۔ اس نے صبح کاذب کی دھندلی روشنی میں دیکھا، رحیم داد دو خمیدہ ٹیلوں کے اتصال سے بنی ہوئی محراب کے نیچے ایک کونے میں سکڑا ہوا پڑا ہے۔ وہ کمزور اور لاغر نظر آ رہا تھا۔

اس کے جسم پر ابھی تک جیل کی ملگجی وردی تھی۔ بال بے حد بڑھ گئے تھے۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ لالی نے کھانے کی گٹھری کندھے سے اتار کے ایک طرف رکھی اور رائفل بھی اس کے قریب نکال کر کھڑی کر دی۔

وہ رحیم داد کے نزدیک گیا۔ سرہانے بیٹھ کر اس کا بازو ہلایا۔ رحیم داد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ حیرت

سے آنکھیں پھاڑ کے لالی کو تکنے لگا۔ پھر اس نے بے قرار ہو کر کہا۔ "لالی! تو آگیا؟" اس نے دونوں ہاتھ بڑھائے اور چمٹ گیا۔

لالی نے محسوس کیا کہ رحیم داد اس کے شانے پر سر رکھے آہستہ آہستہ رو رہا ہے۔ لالی نے اس کی پیٹھ محبت سے تھپکتے ہوئے پوچھا۔ "تو رو رہا ہے رحیمے؟"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ گہرے سناٹے میں اس کی سسکیاں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ لالی چپ بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد رحیم داد علیحدہ ہوا اور آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "میں تو سمجھا تھا' اب تو لوٹ کر نہیں آئے گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا تھا۔" لالی نے اعتماد سے کہا۔ "پکڑ لیا جاتا' تب تو گل ہی اور تھی ورنہ میرے واپس نہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بھلا میں تجھے چھوڑ سکتا ہوں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "تو تو میرا یار ہے' میرا جگر ہے۔"

"تو نے لوٹنے میں اتنی دیری کر دی۔ میں سمجھا' مجھے چھوڑ کر کسی طرف نکل گیا یا پکڑا گیا۔" وہ لمحے بھر خاموش رہا۔ "یہ بتا' اتنے دنوں رہا کہاں؟"

"ایک چکر کے بعد دوسرے چکر میں پھنستا گیا۔ تجھے کیا کیا بتاؤں' پر میں جہاں بھی رہا' رب سونہہ تجھے ہردم یاد کرتا رہا۔"

"کیا یاد کرتا رہا۔" رحیم داد نے شکوہ کیا۔ "یہ نہ سوچا ادھر مجھ پر کیا بیتی۔"

"مجھے اس کا اندازہ تھا۔ پر کیا بتاؤں' میں کیسے کیسے چکروں میں الجھا رہا۔"

"شاداں نے پھنسوادیا ہوگا کسی چکر میں۔" رحیم داد نے منہ بگاڑ کر کہا۔ "پتہ ہے' وہ کتنی خطرناک ہے۔"

"اس کی گل نہ کر۔ تو اسے سمجھ ہی نہیں سکا۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ "باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے یہ بتا' روٹی پانی کا کیا بنا؟"

"کیا کرے گا جان کر۔" رحیم داد بیزاری سے بولا۔ "آخر میں تو روٹیاں بالکل سوکھ گئی تھیں' گُڑ اور شہد پہلے ہی مک گیا تھا۔ سوکھی روٹیاں پانی میں بھگو بھگو کر کھاتا رہا۔"

"کب تک ان سے کام چلا؟"

"پچھلے دو روز سے نہ روٹی ملی ہے نہ پانی۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "ادھر ایک ٹبے کے پاس جنڈ کا پیڑ ہے۔ اس میں پھلیاں آگئی ہیں۔ انھیں توڑ توڑ کر کھاتا رہا۔ پر اس سے پیاس نہیں جاتی۔"

"نہر سے پانی لے آتا۔" اس نے قریب پڑے ہوئے مشکیزے کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ بوکی تو تیرے پاس موجود ہی تھی۔ اس میں پانی بھر کر لے آتا۔"

"پانی تو تیرے جانے کے بعد تیسرے ہی دن مک گیا تھا۔ میں شام کو اندھیرا بڑھنے کے بعد نہر پر گیا۔ بوکی میں پانی بھر لایا۔ پانی تو ایسے ہی لاتا رہا' پر پچھلے دنوں نہر سے بوکی میں پانی لا رہا تھا تو سڑک پر پولیسیے نظر آئے۔ میں پریشان ہوگیا۔ دوسرے دن میں نے ٹبوں پر سے چھپ کر دیکھا۔ پولیس کی ایک ٹولی گشت کرتی دکھائی دی۔ ان کے پاس بندوکیں بھی تھیں۔ تیسرے دن بھی مجھے سڑک اور نہر کے آس پاس پولیس والے نظر آئے۔ تب سے میں نہر پر نہیں گیا۔ پانی بوند بوند پی کر کام چلایا۔ آخر وہ کب تک چلتا' مک گیا۔"

"مجھے بھی آج رات پتہ چل گیا تھا' پولیس ہم دونوں کی ادھر نگرانی کر رہی ہے۔"

"تجھے یہاں آتے ہوئے پولیس ملی ہوگی۔ تو اس سے بچ کر کیسے نکل آیا؟"

"میں یہاں آتے ہوئے کچھ دور پہلے ہی کار سے اتر گیا تھا۔ میں لائل پور کے ایک پنڈ میں تھا۔ شادو مجھے وہاں لے گیا تھا۔ وہ آج کل میاں سبحان کا ڈریور لگ گیا ہے۔ وہی کار میں بٹھا کر لایا بھی تھا۔ تیرے لیے کپڑے نہیں لاسکا۔ میلے تھے۔ شادو انھیں دھلوانے اپنے گھر لائل پور لے گیا تھا۔ واپسی میں بھول گیا۔"

رحیم داد نے جل کر کہا۔ "تو مجھے جیل کی وردی سے چھٹکارا دلانا نہیں چاہتا۔"

"ایسی گل بات نہ کر رحیمے! تیں نوں کیہہ پتہ' مجھے یہ جان کر کتنا دکھ ہوا۔ ویسے چدّر تو ہے' اسے اوڑھ کر تو اپنی یہ وردی تو چھپا ہی سکتا ہے۔" لالی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ "اب چدر کھول کر روٹی ٹکر کھا۔" اس نے مشکیزے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بوکی مجھے دے۔ میں نہر سے جا کر اس میں پانی بھر لاؤں۔"

رحیم داد نے خدشے کا اظہار کیا۔ "نہر پر تیرا جانا ٹھیک نہیں' پولیسیے تاک میں لگے ہیں۔"

"ابھی تو وہاں کوئی نہیں ہے۔ میں نے ٹبوں پر چڑھ کر ادھر دیکھا تھا۔ بالکل سناٹا ہے۔" لالی نے پلٹ کر باہر دیکھا۔ اب اندھیرا چھٹنے لگا تھا۔ ہلکا ہلکا اجالا پھوٹ رہا تھا۔ "ابھی زیادہ اجالا نہیں ہوا۔ میں جا کر پانی بھر لاؤں۔"

لالی نے مشکیزہ اٹھایا اور ٹیلوں کے درمیان سے گزرتا ہوا نہر کی جانب چلا۔ میدان میں اترنے سے پہلے اس نے ٹیلوں کی بلندی سے نہر کی سمت دیکھا۔ وہاں ابھی تک گہرا سناٹا چھایا تھا۔ سڑک بھی سنسان تھی۔ وہ نشیب میں اترا اور جھاڑیوں سے بھرے ہوئے میدان کے آخری سرے پر پہنچ

گیا۔ مگر وہ جھنگر سے باہر نہیں نکلا۔

اس نے گردن اٹھا کر چوکنّا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اجالا اور بڑھ گیا تھا۔ اسے دور دور تک کوئی نظر نہیں آیا۔ اسی اثناء میں سڑک پر ایک لاری ملتان کی سمت سے نمودار ہوئی اور تیزی سے گزر گئی۔

لالی آگے بڑھا۔ اس نے مشکیزے میں پانی بھرا اور تیز تیز قدم اٹھاتا پھر جھنگر میں گھس گیا۔ اس نے میدان طے کیا۔ ٹیلوں پر چڑھتے ہوئے بار بار پلٹ کر نہر اور اس سے کچھ فاصلے پر گزرتی ہوئی سڑک دیکھتا رہا۔ مگر اسے کوئی نظر نہیں آیا۔

وہ درختوں اور ٹیلوں کے درمیان سے گزرتا اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ رحیم داد محراب کے باہر کھڑا بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"پولیسے تو نہر پر نہیں ملے؟"

"مجھے تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ سڑک بھی سنسان ہے۔"

رحیم داد نے بے صبری کے ساتھ مشکیزہ اس کے ہاتھ سے لیا اور منہ سے لگا کر غٹاغٹ پانی پینے لگا۔ پانی پی کر اس نے مشکیزے کا منہ چمڑے کی ڈوری سے بند کیا، لالی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"لگتا ہے جیسے دوبارہ زندگی مل گئی۔"

"تو نے روٹی کھالی؟"

"روٹی تو تیرے جاتے ہی کھالی تھی، پر پیاس بہت ستا رہی تھی۔ جی بھی گھبرا رہا تھا۔ سچ، تجھے نہر پر پولیس نہیں ملی؟"

"میں نے تجھے بتایا نہیں، وہاں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ لگتا ہے، پولیس ہٹالی گئی۔"

لالی، مٹی کے ایک تودے پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے مشکیزہ رائفل کے قریب رکھا۔ واپس آکر لالی کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ رائفل کہاں سے لے آیا۔ رائفل ہی ہے نا؟"

"تجھے کیسے پتہ چلا کہ یہ بندوک ہے یا رائفل؟"

"میں نوں بالکل ٹھیک طرح پتہ ہے۔ بندوک اور رائفل دونوں چلانا جانتا ہوں۔ نشانہ بھی میرا بہت سچا ہے۔ احمد کوٹ سے آگے بیلا ہے۔ اس کے چھتروں میں باہر والے بہت ہیں۔"

"تیرا مطلب ہے جنگلی سور؟"

"ہاں، میں نے زمیں داروں کے ساتھ سور کا شکار بہت کھیلا ہے۔ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ سور کی کھال اتنی موٹی ہوتی ہے کہ گولی اس پر بیکار ہو جاتی ہے۔"

"میں نوں بھی اتنا پتہ ہے۔"

"یہ بتا، اب پروگرام کیا ہے؟ کپڑے تو میرے لیے لایا نہیں، پر چدّر سے کام چل جائے گا۔ اب یہاں زیادہ ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی یہ روٹی کتنے دن چلے گی۔"

"میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ میں آج رات کادر آباد جاؤں گا۔ کوشش کروں گا تیرے لیے کمیص اور دھوتی لے آؤں۔ یہ کام ہو جائے تو دونوں اطمینان سے سفر کر سکتے ہیں۔"

رحیم داد نے تعجب سے پوچھا۔ "کادر آباد میں تیرا کون ہے؟"

"شاداں ہے۔" لالی نے آنکھ مار کر کہا۔ "میں نے اس سے کادر آباد آنے کو کہا تھا۔ وہ وہاں ضرور پہنچ گئی ہوگی۔ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔"

"ادھر تیرا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ پولیسے ہمارے پیچھے لگے ہیں۔ میں نے انھیں سڑک اور نہر پر گشت کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تو شاداں کا چکر چھوڑ۔"

"وہ تو اب چھوٹ نہیں سکتا۔" لالی کی آنکھوں سے مسرت جھلکنے لگی۔ "تجھے پتہ نہیں، وہ اب میری بن چکی ہے۔ اب میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔"

رحیم داد نے جل کر کہا۔ "تجھے بھی بالے کی طرح کسی رات سوتے میں چھری سے کاٹ کر ٹوٹے بنا ڈالے گی۔ اتنا سوچ لے۔"

"مجھے پتہ ہے۔ دھوکا کروں گا تو وہ میرا گلا بھی چھری سے کاٹ سکتی ہے۔ پر شاداں اگر جان لے سکتی ہے تو اپنے یار کے لیے جان دے بھی سکتی ہے۔ مجھے ایسی ہی عورت چاہیے تھی۔ تجھے پتہ نہیں، وہ کتنی زور آور اور محبت کرنے والی زنانی ہے۔" لالی کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔

"میں نے اس سے وعدہ کیا ہے۔ میں اس کے پاس ضرور جاؤں گا۔ کادر آباد میں وہ اپنے مامے کے پاس ٹھیری ہوگی۔" لالی نے گہری سانس بھری۔ "رحیمے! مجھے اس سے بہت پیار ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "اس سے ملنے کے بعد میں تجھے لے کر شادو کے پاس لائل پور جاؤں گا۔ شاداں سے کہوں گا وہ بھی لائل پور پہنچ جائے۔ کچھ دن ہم تینوں لائل پور ٹھیریں گے۔ فیر آگے کا پروگرام بنائیں گے۔"

"جانا ہی چاہتا ہے تو شاداں سے ملنے ضرور جا، میں تجھے نہیں روکتا۔ لیکن لائل پور جانے سے پہلے میں اپنی گھر والی نوراں اور بچوں سے ملنے احمد کوٹ جاؤں گا۔ مجھے نوراں اور اپنے بچے بہت یاد آتے ہیں۔" رحیم داد کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ "تیں نوں پتہ نہیں، میں بھی نوراں سے بہت پیار کرتا ہوں۔ تو نے اسے دیکھا ہی ہے۔ کتنی سوہنی ہے اور مجھے کتنا چاہتی ہے۔ جیل میں

جب ملنے آتی تھی پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی۔ تونے تو اپنی آنکھوں سے اسے روتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے' پر یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ اس نے دو مہینے بعد اچانک تیرے پاس جیل آنا چھوڑ دیا تھا۔"

"بیمار پڑ گئی ہوگی اور میرے ہی دکھ میں بیمار پڑی ہوگی۔ ورنہ یہ ہو ہی نہیں سکتا وہ میرے پاس نہ آئے۔ بعد میں ضرور مجھے ملنے جیل گئی ہوگی۔" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "لالی! مجھے نوراں سے بہت پیار ہے۔ میں اسے اور اپنے تینوں بچوں سے ملنے احمد کوٹ ضرور جاؤں گا۔ نہ گیا تو نوراں میرے لیے روتے روتے مرجائے گی۔"

"پر یہ سوچ لے' احمد کوٹ جاتے ہی پولیس تجھے گرفتار کرلے گی یا تیرا خون کردیا جائے گا۔" لالی نے اسے خبردار کیا۔ "میں تجھے یہ بتانا تو بھول ہی گیا' جھگڑے میں جو بندہ تیرے ہاتھوں زخمی ہوگیا تھا' وہ پچھلے دنوں اسپتال میں مرگیا۔"

"تو سیف اللہ کی گل کر رہا ہے؟" رحیم داد نے پریشان ہو کر کہا۔ "پر میں نے تو سنا تھا وہ بالکل چنگا ہوگیا تھا۔ اسپتال سے اسے چھٹی بھی مل گئی تھی۔"

"تونے ٹھیک سنا تھا۔ پر اس کا زخم پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ وہ دوبارہ اسپتال میں داخل ہوا اور اس کی موت ہوگئی۔ اب پولیس گرفتار کرکے تجھ پر کتل کا مکدمہ چلانا چاہتی ہے۔ پہلے تجھے دفعہ ۳۰۷ میں سزا ہوئی تھی' اب ۳۰۲ میں مکدمہ چلے گا۔ جب سے سیف اللہ مرا ہے' اس کے بھائی اور شریکے تجھے کتل کرنے کی تاک میں ہیں۔ سیف اللہ کا ایک شریکا بھی آج کل وزیر لگا ہوا ہے۔ اسی کے حکم پر تو پولیس ہم دونوں کی تلاش میں اتنی بھاگ دوڑ کر رہی ہے۔ ہماری گرفتاری پر اسی لیے دو ہزار کا انعام بھی رکھا گیا ہے۔"

رحیم داد گردن جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحے بعد اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جھگڑا تو سیف اللہ ہی نے کھڑا کیا تھا۔ کھیتوں کی وٹ بندی پر شروع ہوا تھا۔ فیر اس نے میری کنال سے بھی زیادہ زمین دبالی۔ میں نے اس کے خلاف مکدمہ کردیا۔ دو سال تک مکدمے بازی چلی۔ میں عدالت سے مکدمہ جیت گیا تو سیف اللہ اور اس کے بھائیوں نے مجھ پر حملہ کردیا۔ جمال دین اور اللہ ورایو میرے ساتھ نہ ہوتے تو انھوں نے مجھے مار ہی دیا تھا۔"

"رحمے! یہ باتیں تو مجھے جیل میں بھی سنا چکا ہے۔ میں تو تجھے یہ بتانا چاہتا ہوں احمد کوٹ جانا تیرے لیے بہت خطرناک ہے۔ گھر والی اور بچوں سے تجھے ملنا ہی ہے تو پڑوس کے کسی پنڈ میں چلا جا

اور چپکے سے انھیں وہاں بلالے۔"

"یہ تونے ٹھیک کہا۔" رحیم داد نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ "تیری بات سمجھ آتی ہے۔ اس میں زیادہ خطرہ بھی نہیں۔ نوراں اور بچوں سے بھی مل لوں گا اور نوراں سے کہوں گا بچوں کے ساتھ لائل پور آجائے۔"

"انھیں لائل پور بلانا ٹھیک نہیں۔ یہ میں تجھے بعد میں بتاؤں گا' انہیں کہاں بلایا جائے۔" لالی نے اسے مشورہ دیا۔ "ایک گل اور سمجھ آتی ہے۔ تو اپنی گھر والی سے کہتا وہ سیف اللہ کے گھر جائے اور اس کی رانڈ کے سامنے اپنے دوپٹے کا پلو پھیلا کر کھڑی ہوجائے۔ جب کاتل کی گھر والی بھین یا دھی' اس طرح پلو پھیلا کر داد فریاد کرتی ہے تو مکتول کے گھر والے خون معاف کردیتے ہیں۔ یہ پرانی ریت ہے۔ اسے کوئی نہیں توڑ سکتا۔"

"نہیں جی' یہ نہیں ہو سکتا۔" رحیم داد نے ترش روئی سے کہا۔ "میرے پاس ویسے تو اب صرف ۴ کلا زمین رہ گئی ہے' پر ہوں تو میں زمیں دار۔ میری گھر والی اس طرح پلو پھیلا کر فریاد نہیں کرسکتی۔ میں آباد کار ہوں۔ کوم کا آرائیں۔ آباد کاروں میں ایسا نہیں ہوتا۔ تو جانگلی ہے نا' یہ جانگلیوں کی ریت ہے۔"

"تو فیر جو تیرا جی کرے کر۔" لالی نے تلخی سے کہا۔ "میں کچھ نہیں کہتا۔"

"نراض نہ ہو۔" رحیم داد نرم پڑ گیا۔ "بات یہ ہے' آباد کاروں کی زنانیاں خون معاف کرانے کے لیے دہائی نہیں دیتیں۔ یہ عزت آبرو کا سوال ہے۔ یہی تو آباد کاروں اور جانگلیوں میں فرک ہے۔ تو شاداں ہی کو دیکھ۔ گھر والے کو چھوڑ کر بالے کے ساتھ بھاگی۔ فیر اس کا خون کردیا۔ اب اس نے تجھ سے یاری لگالی۔ میری گھر والی ایسا کبھی نہیں کرسکتی۔ وہ مرتے دم تک میرے نام پر بیٹھی رہے گی۔"

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ رحیم داد بھی چپ رہا۔ اب صبح ہو چکی تھی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ دھوپ ٹیلوں کی چوٹیوں اور درختوں کی اونچی اونچی شاخوں پر جھلک رہی تھی۔ لالی نے منہ کھول کر جمائی لی اور کھڑا ہو کر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "مجھے اب نیند لگ رہی ہے۔" وہ محراب کے نیچے گیا اور فرش پر بچھے ہوئے نمدے پر لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد گہری نیند سو گیا۔

☆

شام ہونے سے کچھ دیر قبل رحیم داد نے اسے جھنجوڑ کر جگایا۔ لالی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ

گیا۔ اس نے دیکھا' محراب کے نیچے روشنی دھندلی پڑ چکی ہے۔ دن ختم ہو رہا تھا۔ شام کی آمد آمد تھی۔

رحیم داد نے کہا۔ "ابھی روشنی ہے۔ روٹی کھا لے۔ تو نے تو سویرے سے کچھ بھی نہیں کھایا۔" لالی خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد روٹیاں اور دیگچی اٹھا کر لے آیا۔

لالی نے دیگچی کا ڈھکنا ہٹا کر سونگھا۔ قورمہ سڑ گیا تھا۔ اندر سے کھٹی کھٹی بو اٹھ رہی تھی۔ اس نے دیگچی ایک طرف رکھتے ہوئے منہ بگاڑا۔

"رحیمے! گوشت تو خراب ہو گیا' کھانے کا نہیں رہا۔"

دونوں نے باسی روٹیاں کھائیں۔ مشکیزے سے پانی پیا اور محراب کے نیچے سے نکل کر باہر آ گئے۔ سورج اونچے اونچے ٹیلوں کے پیچھے غروب ہو چکا تھا۔ شام کا دھندلکا ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ لالی نے کہا۔

"رحیمے! میں کادر آباد جا رہا ہوں۔"

رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ "اندھیرا بڑھ جائے تب جانا' ابھی اجالا ہے۔ اس وکھت جانا ٹھیک نہیں۔"

"جھیتی چلا جاؤں گا تو جھیتی لوٹ بھی آؤں گا۔ اب یہاں ٹھیرنا ٹھیک نہیں ہے۔ آج ہی رات ہم دونوں یہاں سے نکل جائیں گے۔ میں شاداں سے تیرے لیے کمیص' دھوتی اور جوتی لے آؤں گا۔ شاداں اپنے ماے ہی کے پاس ٹھیری ہوگی۔ اس نے مجھے یہی بتایا تھا۔"

"جیسی تیری مرضی' سوچ لے۔ میرے احمد کوٹ جانے کے بارے میں تو نے کیا سوچا؟"

"سویرے تجھ سے اس بارے میں بات تو ہوئی تھی۔" لالی نے جواب دیا۔ "یہاں سے چلنے سے پہلے آگے کا پروگرام بنا لیں گے۔"

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ لالی آگے بڑھا۔ ٹیلوں کے درمیان سے گزرتا ہوا نیچے میدان میں اترا اور جھنگر میں داخل ہو گیا۔ وہ جنگلی جھاڑیوں سے الجھتا ہوا نہر کی جانب چلنے لگا۔ جھنگر ختم ہوا تو نہر نظر آنے لگی۔ لالی نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا نہر کے کنارے پہنچ گیا۔

وہ پل کی جانب بڑھنے لگا۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اس کے کانوں میں یہ آواز پڑی۔ "یہ تو جی لالی لگتا ہے۔" لالی ٹھٹکا۔ اس نے گھبرا کر نہر کے اس پار نظر دوڑائی۔ کھجور کے ایک درخت کے نیچے دھندلی روشنی میں دو کانسٹیبل دکھائی دیے۔ وہ بالکل اس کے سامنے تھے۔ درمیان میں نہر تھی۔

کانسٹیبلوں کو دیکھتے ہی وہ سراسیمہ ہو کر پلٹا اور تیزی سے جھنگر کی جانب لپکا۔ اسے اپنے عقب میں نہر کے اس پار سے ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ لالی نے آوازوں پر مطلق دھیان نہیں دیا۔ جھنگر میں گھسا اور تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھنے لگا۔ اس نے جنگلی جھاڑیوں سے بھرا ہوا میدان طے کیا اور ٹیلوں پر چڑھنے لگا۔

بلندی پر پہنچ کر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا' پولیس والوں کا ایک جتھا پل عبور کر کے نہر کے دوسری طرف بڑھ رہا ہے۔ لالی اونچے نیچے ٹیلوں پر چڑھتا اترتا تیزی سے اپنے ٹھکانے کی جانب لپکا۔ محراب کے قریب پہنچا تو وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ رحیم داد نے اسے اس عالم میں دیکھا تو پریشان ہو کر پوچھا۔

"تو اتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے؟"

"نہر پر پہنچا تو پولیسے مل گئے۔" لالی نے پھولی ہوئی سانس قابو میں کرتے ہوئے کہا۔ "انھوں نے مجھے پہچان لیا۔"

"یہ تو خطرناک بات ہو گئی۔"

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ تیزی سے محراب کے نیچے پہنچا۔ رائفل اٹھائی۔ چیمبر میں کارتوس چڑھایا اور قریب کے ٹیلے پر چڑھتا ہوا بلندی پر پہنچ گیا۔ وہ چوکنا نظروں سے سامنے دیکھنے لگا۔ یکایک پتھریلے راستوں پر بھاری بھاری بوٹوں کی آہٹ ابھری اور اس کے ساتھ ساتھ گہری خاموشی میں ملی جلی انسانی آوازیں بھی سنائی دیں۔ لالی نے گھبرا کر اس طرف نظر ڈالی۔ ایک اونچے ٹیلے کے پیچھے سے پولیس والے نکلے' سب مسلح تھے۔ ان کے ساتھ ایک انسپکٹر بھی تھا۔ اس نے لالی کو ٹیلے کی بلندی پر دیکھ لیا۔

لالی جھٹ ایک ابھرے ہوئے پتھر کی آڑ میں رائفل سنبھال کر بیٹھ گیا۔ پولیس والے تعداد میں درجن بھر سے زیادہ تھے۔ وہ ٹیلے کے عقب سے نکل نکل کر اوپر آ رہے تھے۔ جب پولیس کی پوری نفری ٹیلے پر پہنچ گئی تو انسپکٹر نے انھیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔ وہ اس کی ہدایت پر تین ٹولیوں میں بٹ گئے۔

لالی پتھر کی آڑ سے ان کی نقل و حرکت دیکھتا رہا۔ وہ لالی سے دو ڈھائی سو گز کے فاصلے پر عین اس کے سامنے والے ٹیلے پر تھے۔

لالی نے ان پر گولی نہیں چلائی۔ خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد بھی نشیب سے نکل کر لالی کے قریب

آگیا اور اس کے برابر ہی پتھر کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔

دونوں نے دیکھا، پولیس کی ایک ٹولی دھیرے دھیرے ٹیلے سے نیچے اتری۔ مگر آگے آنے کے بجائے دائیں ہاتھ کو مڑی اور ایک ٹیلے کی آڑ لے کر بڑھنے لگی۔ لالی فوراً بھانپ گیا کہ وہ اس کے عقب میں پہنچنا چاہتی ہے۔ یہ دونوں کو گھیرے میں لینے کا منصوبہ تھا۔ لالی نے نشانہ باندھا اور اس ٹولی پر گولی چلا دی۔

گولی شام کے سناٹے میں چیختی ہوئی تیزی سے گزری۔ پولیس والے گھبرا کر جھپاک سے زمین پر لیٹ گئے اور دھیرے دھیرے رینگتے ہوئے پتھروں کے پیچھے دبکنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کی نقل و حرکت میں اس اچانک تبدیلی سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ لالی کے مسلح ہونے سے قطعی بے خبر تھے۔

پولیس کی جو ٹولی ٹیلے پر موجود تھی، گولی کی آواز سنتے ہی نشیب میں اتر گئی۔ پولیس والے بکھر کر ادھر ادھر دبکنے لگے۔ لالی نے اس ٹولی پر ایک اور گولی چلائی جو دھیرے دھیرے اس کے عقب میں جانے کے لیے کوشاں تھی۔ دوسری گولی چلا کر وہ پولیس کی اس ٹولی کو آگے بڑھنے سے روکنے میں کامیاب ہو گیا۔

مگر اب پولیس نے بھی دو طرف سے اس پر جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ گولیاں چیختی ہوئی لالی اور رحیم داد کے سروں پر سے گزرتی رہیں۔ ایک گولی اس پتھر پر لگی جس کے پیچھے دونوں چھپے ہوئے تھے۔ پتھر کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر لالی کے کندھے پر لگا مگر چوٹ خفیف سی آئی۔ لالی اور رحیم داد جھٹ زمین پر لیٹ گئے۔

لالی نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر سرگوشی کی۔ ”رحیے! تو پیچھے سے نکل جا۔ میں نے ادھر بڑھنے والی پولیس پارٹی کو روک دیا ہے۔“ اس نے ایک گولی اور چلائی۔ ”تو ٹیلوں کے اندر اندر ہوتا ہوا ڈھلوان سے اتر کر سکنالے کے اس پار نکل جا۔ آگے اونچائی پر جھل ہے، تو وہاں چھپ کر میرا انتظار کرنا۔“

رحیم داد نے پوچھا۔ ”تو نہیں چلے گا؟“

”میری پروا نہ کر۔“ لالی نے قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر ہمیانی کھولی اور اسے رحیم داد کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لے، اسے رکھ لے۔ اس میں تین ہزار سے اوپر روپے ہیں۔ اور دیکھ، یہاں سے نکلتے ہوئے چدّر ضرور اوڑھ لینا۔“

رحیم داد نے ہمیانی لیتے ہوئے کہا۔ ”تو کتنی دیر میں پہنچے گا؟“ وہ آہستہ آہستہ نیچے کھسکنے لگا۔

”جلد ہی آنے کی کوشش کرنا۔“

”آجاؤں گا، آجاؤں گا۔“ لالی نے اسے ڈانٹا۔ ”تو اب پھوٹ جا۔ جھکیتی ٹال ٹر جا۔ ورنہ تیرا نکلنا مشکل ہو جائے گا۔“ اس نے گولی چلائی۔ ”میگزین میں ابھی چھ کارتوس ہیں۔ میں ان سے پولیس کو روکے رکھوں گا۔ تو فٹافٹ نکل جا۔ دیری نہ کر۔“

رحیم داد کھسکتا ہوا نیچے اترا۔ محراب کے نیچے پہنچا۔ ہمیانی کمر سے باندھی، چادر اٹھا کر اوڑھی۔ باہر نکلا اور ٹیلوں کی آڑ میں دبا دبا پیچھے کی ڈھلان سے نیچے اترا۔ اندھیرے میں اونچے نیچے راستوں پر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے، اور آگے بڑھتا گیا۔

☆

لالی ٹیلے پر پتھر کی آڑ میں مورچا سنبھالے بیٹھا تھا۔ پولیس اس پر دو جانب سے اندھا دھند فائرنگ کرتی رہی۔ اب رات ہو چکی تھی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ اسے پولیس والے دھندلے دھندلے سایوں کے مانند نظر آ رہے تھے۔

وہ رک رک کر گولی چلاتا رہا تاکہ پولیس اس کے عقب میں نہ پہنچ سکے اور اس اثناء میں رحیم داد اس کے بتائے ہوئے ٹھکانے پر پہنچ جائے۔

اندھیرا بڑھتا گیا۔ گولیاں اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان رات کے سناٹے میں چیختی رہیں۔ لالی کی رائفل کے میگزین میں کارتوسوں کا ذخیرہ رفتہ رفتہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ رحیم داد کو گئے ہوئے لگ بھگ پون گھنٹہ ہو چکا تھا۔ لالی کے اندازے کے مطابق اب رحیم داد کو برساتی نالے کے اس پار جنگل میں پہنچ جانا چاہیے تھا۔

لالی نے گولی چلائی۔ اب اس کی رائفل میں آخری کارتوس رہ گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ نشیب میں آیا اور اس ٹیلے کی جانب بڑھا جس کے قریب سے پیچھے کی ڈھلان کی جانب راستہ جاتا تھا۔

لالی ٹیلے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے گولی چلائی اور آخری کارتوس بھی ختم کر دیا۔ وہ تیزی سے ڈھلان کی جانب دوڑا۔ مگر اندھیرے میں اس نے ٹھوکر کھائی۔ لڑکھڑا کر گرا۔ اس کا سر ایک ابھرے ہوئے پتھر سے اس قدر زور سے ٹکرایا کہ آنکھوں کے سامنے ستارے گردش کرنے لگے۔ وہ ذرا دیر بے سدھ پڑا رہا، پھر ہمت کر کے اٹھا اور آگے بڑھا۔ مگر چکرا کر گرا اور ایسا گرا کہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کوشش کے باوجود نہ اٹھ سکا۔ سنکھیا کھانے کے بعد وہ بہت

جھنک گیا تھا، کمزور اور لاغر ہو گیا تھا۔ اس میں پہلے جیسی قوت اور توانائی نہیں رہی تھی۔

وہ ٹیلے کے دامن میں پڑا رہا اور گہری گہری سانسیں بھر کر ہانپتا رہا۔ اب ٹیلوں پر بھاری بھاری بوٹوں کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔

ناگاہ بائیں ہاتھ کے ٹیلے سے ٹارچ کی تیز روشنی ابھری۔ روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ لالی نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسی وقت قریب کے ٹیلے کی بلندی سے ایک کانسٹیبل کود کر نیچے آیا۔ اس نے جھپٹ کر لالی کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ لالی نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

۱۳

رات آدھی ہو گئی، کاجل کی طرح کالی ہو گئی۔ جھل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ رکڑ ویران تھا۔ نچے نیچے ٹیلے اور ٹبے دم بخود تھے۔ ہوا کا تیز جھونکا آتا، خشک پتے کھڑکڑاتے، خاموشی کا طلسم ہم برہم ہو جاتا۔ رحیم داد چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھتا۔ رات ڈھلنے لگی۔ رحیم داد کی نگاہیں رکڑ کے عقب میں ابھرے ہوئے ٹیلوں اور ٹبوں کی سمت اٹھی ہوئی تھیں۔ مگر ٹیلوں پر نہ کوئی چاپ ابھری نہ سایہ نظر آیا۔

رحیم داد تھکن سے مضمحل تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنے جسم کو چادر سے ڈھانپے سکڑا سکڑایا ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ نیند بار بار یلغار کرتی۔ وہ جھومنے لگا اور جھومتے جھومتے لڑھک گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

آنکھ کھلی تو دن چڑھ چکا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سامنے رکڑ پر زرد زرد دھوپ پھیلی تھی۔ مگر لالی اب تک نہیں پہنچا تھا۔ رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ بہت دیر ہو گئی۔ دھوپ درختوں سے چھن چھن کر جھل میں پھیلنے لگی۔

اب جھل میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ رحیم داد کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ ایک طرف چلنے لگا۔ فراش کے گنجان درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آگے جھنگر تھا۔ جھنگر میں گھنی جھاڑیاں تھیں، خودرو جنگلی پودے تھے۔ زمین سخت اور ناہموار تھی۔ جھنگر نشیب میں دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ رحیم داد جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے آگے بڑھتا گیا۔ جھنگر سے نکل کر چٹیل میدان میں پہنچ گیا۔

دھوپ کی تمازت بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے پیاس محسوس ہوئی۔ پانی کی تلاش میں رحیم داد نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ کچھ دور سرس کے ایک گھنے درخت کے نیچے کنویں کی منڈیر نظر آئی۔ وہ اس جگہ پہنچا۔ کنواں پرانا اور بہت بڑا تھا۔ آب پاشی کے لیے بنایا گیا تھا۔ منڈیر کے قریب چوبچے جیسا چلھا تھا۔ اس میں رہٹ کے نسیار سے کنویں کا پانی گرتا تھا۔ چلھے سے کھیتوں میں پانی پہنچانے کے لیے آڈ اور نالیاں نکلتی تھیں۔ مگر اب کنوئیں کی منڈیریں منہدم ہو چکی تھیں۔ چلھا ٹوٹ پھوٹ کر گڑھا بن گیا تھا۔ آڈ اور نالیوں کے نشانات دھندلے پڑ چکے تھے۔ کھیت اجڑ کر بنجر میدان میں تبدیل ہو گئے تھے۔ رحیم داد نے جھک کر کنوئیں میں نظر ڈالی۔ کنواں بالکل خشک تھا، اس کی تہہ میں جھاڑیاں اور خود رو پودوں کے جھنڈ تھے۔ یہ اندھا کنواں تھا۔ اسے ڈل کہا جاتا ہے۔

ڈل سے سو سوا سو گز دور کسی ویران بستی کے ٹوٹے پھوٹے مکانات کے کھولے اور کھنڈر تھے۔ کھنڈر کے عقب میں بھی دور تک پھیلا ہوا لق ودق میدان تھا۔ میدان کے ایک حصے میں مزدور کھدائی کرتے نظر آ رہے تھے۔

وہ مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ کچھ مزدور کدالوں سے سخت اور پتھریلی زمین کھود کر کنکر نکال رہے تھے۔ کچھ بیلچے سنبھالے زمین کے اندر سے نکلنے والے کنکروں کی ڈھیریوں کے چٹّے بنا رہے تھے، کچھ بڑے اور گہرے گڑھے مٹی سے بھر کر ہموار کر رہے تھے۔ ان گڑھوں سے کنکر نکالے جا چکے تھے۔ دو ڈھائی سال بعد مٹی سے بھرے جانے والے ان گڑھوں میں پھر کنکر پیدا ہو جاتے ہیں۔ انھیں کھود کر نکال لیا جاتا ہے۔

مزدور اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ چمکتی دھوپ میں ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔ وہ بار بار پیشانیوں سے پسینہ پونچھتے۔ قریب ہی بوسیدہ چھولداری استادہ تھی۔ چھولداری کے سامنے ٹھیکے دار کا منشی چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ وہ اونچی آواز سے مزدوروں کو ہدایات دیتا اور ڈانٹتا پھٹکارتا۔

رحیم داد منڈیر کی آڑ سے مزدوروں کو کام کرتے دیکھتا رہا۔ منشی کی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ رحیم داد خوف زدہ ہو گیا۔ اسے اپنے سر پر خطرہ منڈلاتا محسوس ہوا۔ وہ پلٹا اور تیز تیز قدم اٹھاتا پھر جھنگر میں گھس گیا اور چلتے چلتے جھل میں پہنچ گیا۔ فراش کے درختوں کے نیچے ٹھنڈک تھی۔

وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اسے ابھی تک لالی کے آنے کی توقع تھی۔ ہر

ٹ پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ چونک کر ادھر ادھر نظریں دوڑاتا، مگر لالی کو نہ پا کر سخت
س ہوتا۔

وقت گزرتا رہا۔ اسے بھوک نے ستایا مگر پیاس کا غلبہ زیادہ تھا۔ وہ بے قرار ہو کے کھڑا ہو گیا اور
ی کی تلاش میں سک نالے کی جانب بڑھا۔ جھل کے بائیں کنارے پہنچ کے اس نے درختوں کی
ے دیکھا۔ سامنے نشیب میں سک نالا ٹیلوں اور ٹبّوں کے درمیان سے بل کھاتا ہوا گزرتا تھا۔
سک نالے کی خشک ریت کے ذرے دوپہر کی زرد، زرد دھوپ میں جھلملا رہے تھے۔ ایک ٹیلے
، دامن میں جگ مگ کرتی چھوٹی سی جھیل تھی۔ یہ ٹوبھا تھا۔ اس میں ابھی تک پچھلی بارش کا پانی
جود تھا۔

ہوا کے جھونکوں سے ٹوبھے میں ہلکی ہلکی لہریں ابھر رہی تھیں۔ ٹوبھا زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ پانی
تے ہی رحیم داد کی آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہوئی۔ وہ دھیرے دھیرے نشیب میں اترنے لگا۔
کچھ ہی نیچے اترا ہو گا کہ نشیب میں اسے جھاڑیوں کے قریب انسانی سایہ نظر آیا۔ رحیم داد
کا۔ گردن بڑھا کر چوکنا نظروں سے دیکھا کہ ایک شخص گردن جھکائے جنگلی پودوں کی پتیاں توڑ توڑ
ہاتھ میں دبے ہوئے تھیلے میں ڈال رہا ہے۔

وہ ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے کی سفید قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھا۔ چہرے پر مٹھی، سوا مٹھی
ل کتروان ڈاڑھی، آنکھوں پر پرانی وضع کی عینک اور سر پر اونچی باڑ کی سیاہ جناح کیپ۔ وہ حکیم
رمحمد چشتی تھا۔ رحیم داد سے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ لیکن پتیاں توڑنے کی محویت میں
سانے رحیم داد کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔

سامنے ٹوبھا تھا۔ اس کا پانی دھوپ میں جگمگا رہا تھا۔ رحیم داد کو بہت شدت کی پیاس لگی تھی۔
سانے ہمت سے کام لیا، چادر سے جیل کی وردی اچھی طرح چھپائی اور حکیم چشتی کی نظروں سے
ابچاتا ٹوبھے کی سمت بڑھنے لگا۔

وہ احتیاط سے نشیب میں اتر رہا تھا۔ پھر بھی پتھر کا ایک ٹکڑا اس کے پیروں سے ٹکرا گیا اور
ملکا ہوا نیچے چلا گیا۔ آہٹ پر حکیم نے گردن موڑی اور رحیم داد کو دیکھ کے سیدھا ہو کر کھڑا
گیا۔ رحیم داد اسے نظر انداز کرتے ہوئے نیچے اترنے لگا۔

حکیم نے اسے ٹوکا۔ "گل سنا جی!"

رحیم داد نہیں رکا۔ وہ ڈھلان سے نیچے اترا اور ٹوبھے کی جانب نظریں اٹھائے آگے بڑھتا گیا۔
وں کے درمیان فاصلہ اور کم ہو گیا۔

اس دفعہ حکیم چشتی نے اسے کسی قدر بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ "میں نے کہا، باشاہو! کدھر بڑھے چلے جا رہے ہو؟ بات تو سنو۔" رحیم داد ٹھٹکا لیکن اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ حکیم چشتی نے مسکرا کر پوچھا۔

"ٹوبھے پر پانی پینے جا رہے ہو؟"

رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں جی! پانی ہی پینے جا رہا ہوں۔ سخت پیاس لگی ہے۔"

"ناں ناں۔" حکیم نے انگلی کے اشارے سے منع کیا۔ "ٹوبھے کے پانی میں جونکیں ہیں۔" وہ آہستہ آہستہ رحیم داد کی جانب بڑھا۔ "تم ادھر کھالے کے پاس کنکر تو نہیں نکالتے؟" اس نے رحیم داد کو غور سے دیکھا۔

"تم مجھے نئے مزدور لگتے ہو۔ پہلی بار، ادھر آئے ہو کیا؟"

رحیم داد نے مختصر جواب دیا۔ "ہاں جی!"

"میں نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "میں یہاں اکثر آتا ہوں۔ کنکر کی کھدائی کرنے والے مزدور بھی کبھی کبھار ٹوبھے پر نہانے یا پانی پینے ادھر آنکلتے ہیں۔" حکیم نے قدرے تامل کیا۔

"ایک بار ایسا ہوا کہ ایک مزدور میرے سامنے ٹوبھے پر آیا۔ اس نے چلو بھر بھر کر پانی پیا۔ بہت زیادہ پیاسا لگتا تھا۔ پانی پی کر سستانے کے لیے ایک جھاڑی کے سائے میں بیٹھ گیا۔ یہی آلی گرمیوں کے دن تھے۔ نہ جانے کتنی دیر بیٹھا رہا۔ میں نے اس کی جانب دھیان نہیں دیا، گردن جھکائے بوٹیاں توڑتا رہا۔ اچانک میں نے ابکائی کی آواز سنی۔ پلٹ کر دیکھا کہ وہ الٹی کر رہا ہے۔ الٹی میں خون ہی خون نکلا۔ الٹی کے بعد وہ نڈھال ہو کے زمین پر لیٹ گیا اور اکھڑی اکھڑی سانسیں بھرنے لگا۔ میں جھٹ اس کے پاس پہنچا اور کلائی تھام کے نبض دیکھنے لگا۔"

"لگتا ہے جی! تسیں حکیم ہو؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"ہاں، میں حکیم ہوں۔" اس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ "میرا نام صوفی حکیم نذر محمد چشتی ہے۔" حکیم نے بات جاری رکھی۔ "ہاں تو جی! میں کہہ رہا تھا، کہ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ مگر اس کی بیماری میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بہت غور کرنے پر اتنا پتہ چلا کہ اس کے پیٹ میں کوئی زہریلی چیز چلی گئی ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ اسے پیٹ سے کیسے نکالا جائے۔ اس وقت اپنے پاس کوئی دوائی بھی نہیں تھی۔ فیر ایسا ہوا کہ مریض نے خون کی قے کی۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑے مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔"

رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔ "اسے بیماری کیا تھی جی؟"

"وہ بیماری کوئی بہت ہوشیار اور تجربہ کار حکیم ہی سمجھ سکتا تھا۔ مریض کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ ر، میں خود پریشان ہو گیا تھا۔ فوری طور پر علاج نہ کیا جاتا تو وہ مر جاتا۔ میں نے مرض کی تشخیص تو لی تھی۔ غور کرتے کرتے علاج بھی سمجھ میں آگیا۔ جھٹ ٹوبھے پر پہنچا۔ پانی پر جگہ جگہ کائی جمع ی۔ میں نے کندھے پر پڑا ہوا پرنا اتارا اور اس میں ڈھیر ساری کائی بھر لی۔ گھڑا بھر کائی ہو گی۔ یض کے پاس پہنچا اور اسے کائی کھلانے لگا۔"

"اس نے کائی کھا لی جی؟"

"نہیں جی! وہ کائی کھانے پر بالکل تیار نہیں تھا۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے، بڑی ضد کی۔ مگر میں نے ی کا منہ کھول کے زبردستی ساری کائی کھلا دی۔"

"ذرا دیر بعد اس نے ابکائیاں لینی شروع کر دیں۔ الٹی کی۔ الٹی میں کائی کے ساتھ خون بھی ۔ میں جو چیز باہر نکالنا چاہتا تھا، وہ الٹی کے ساتھ، پیٹ سے باہر آگئی۔ وہ جونک تھی۔ یہ لمبی۔" ں نے ایک انگلی بڑھا کے رحیم داد کے سامنے کر دی۔ "جونک ٹوبھے کے پانی کے ساتھ اس کے ٹ میں چلی گئی تھی۔ جونک باہر نکلتے ہی مریض کی حالت سنبھلنے لگی۔ الٹی بند ہو گئی۔ بالکل چنگا لیا۔ صرف کمزوری رہ گئی تھی۔"

"یہ کب کی گل ہے جی؟"

"پچھلے ہی سال کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد کنکر کی کھدائی کرنے والوں میں سے کوئی ادھر پانی پینے ں آتا۔ میں نے تو سنا ہے کہ ٹھیکے دار نے پینے کے پانی کا ادھر ہی بندوبست کر دیا ہے۔ تم کیسے ر آگئے پانی پینے؟"

رحیم داد نے خود کو سنبھالا۔ جھٹ بات بنائی۔ "وہ ایسا ہے جی! میں پہلی بار مزدوری کے لیے ر گیا تھا پر کام نہیں ملا۔ میں اس طرف چلا آیا۔ ٹوبھا دیکھ کر پیاس لگی۔" اس نے مڑ کر ٹوبھے کی ب دیکھا جس میں ہلکی ہلکی لہریں اٹھ رہی تھیں، چمکیلی دھوپ میں آئینے کی کرچیوں کے مانند ملا رہی تھیں۔ رحیم داد کو ایک بار پھر شدت سے پیاس محسوس ہوئی۔ بے قرار ہو کر بولا۔

"زبردست پیاس لگی ہے جی! کیا کروں؟"

"پریشان نہ ہو۔" حکیم نے اسے تسلی دی۔ "میرے پاس پینے کا پانی ہے۔ میں جب بھی یہاں ہوں، روٹی پانی ساتھ لاتا ہوں۔"

رحیم داد نے عاجزی سے کہا۔ "حکیم جی! مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔" اس نے خشک ہونٹوں پر

زبان پھیری اور منہ کھول کر آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ حکیم نے اس کی بے قراری محسوس کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ”آؤ' میرے ساتھ۔“ وہ آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ چلا۔

چند ہی قدم پر ایک گھنی جھاڑی تھی۔ جھاڑی کے قریب پہنچ کر حکیم ٹھہر گیا۔ رحیم داد بھی رک گیا۔ جھاڑی کے نیچے مٹی کے تودے پر المونیم کا ناشتے دان رکھا تھا۔ قریب ہی چھوٹا سا سفری تھرماس بھی تھا۔

حکیم نے آگے بڑھ کر ناشتا دان اور تھرماس اٹھایا اور جھاڑی کے نیچے صاف ستھری جگہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ حکیم نے تھرماس کھولا' ڈھکنے میں پانی انڈیلا اور رحیم داد کی جانب بڑھایا۔ ”لو پیاس بجھانے کے لیے تھوڑا سا پی لو۔“ رحیم داد سارا پانی ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔

حکیم نے تھرماس کا خالی ڈھکنا اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”میں تمہیں پینے کے لیے اور پانی نہیں دوں گا۔ اب روٹی کھالو' پھر پانی پینا۔ خالی پیٹ پانی پینا مناسب نہیں ہوتا۔ لگتا ہے' تم نے سویرے سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے؟“

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ حکیم نے ناشتے دان کھولا۔ اس میں بھنا ہوا گوشت تھا اور روٹیاں تھیں۔ حکیم نے ایک روٹی نکالی' رحیم داد کی جانب بڑھائی۔ دوسری اپنے ہاتھ میں دبا کر بولا۔ ”لو جی! بسم اللہ کرو۔“ اس نے لقمہ لیا۔

رحیم داد بھی کھانا کھانے لگا۔

حکیم نے کھانا کھاتے کھاتے کہا۔ ”میں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا تم پہلی بار ادھر آئے ہو۔ اتفاق سے میں آج یہاں موجود تھا ورنہ تم بھی ٹوبھے کا پانی پی کر بیمار پڑ جاتے۔“

”کیا ٹوبھے کا پانی پی کر سبھی بیمار پڑ جاتے ہیں؟“

”نہیں' صرف وہ بیمار پڑتے ہیں جن کے پیٹ میں پانی کے ساتھ جونکیں چلی جاتی ہیں۔ ویسے ٹوبھے کا پانی پینے سے پیٹ کی دوسری بیماریاں بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ ٹھیرا ہوا پانی صحت کے لیے مضر ہوتا ہے۔“

”حکیم جی! تسیں روز ادھر آتے ہو؟“

”نہیں' مجھے اتنی فرصت کہاں کہ روز روز آؤں۔ کبھی تو مہینوں نہیں آتا۔“ وہ مسکرایا۔ ”تم سوچ رہے ہوگے' میں اس ویرانے میں کس لیے آتا ہوں۔ یہی سوچ رہے ہو نا؟“

رحیم داد نے روٹی کا لقمہ توڑتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ ”ہاں جی۔“

”میں یہاں جڑی بوٹیوں کی تلاش میں آتا ہوں۔“ حکیم چشتی نے ہاتھ اٹھا کر ادھر ادھر لہرایا۔

”یہ جھاڑیاں اور بوٹے دیکھ رہے ہو۔ یہ قدرت کا انمول خزانہ ہے۔ ان بوٹوں کی پتیوں' جڑوں ڈنٹھلوں میں نہ جانے کیسی کیسی بیماریوں کا علاج چھپا ہوا ہے۔ مگر اسے ڈھونڈنے اور پہچاننے کے لیے نظر چاہیے۔“ عینک کے شیشوں کے پیچھے حکیم چشتی کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ دلچسپی اور توجہ سے رحیم داد کو بتاتا رہا۔

”یہ خودرو بوٹے ہیں۔ ہر موسم میں اگتے ہیں۔“

”کئی بوٹے تو جی فصلوں کے ساتھ کھیتوں میں نکل آتے ہیں۔“ رحیم داد نے بھی اپنی معلومات کا اظہار کیا۔

”یہ عجب بات ہے۔“ حکیم مسکرا کر بولا۔ ”کھیتوں میں بوائی سے پہلے پوری طرح صفائی کی جاتی ہے تب بیج ڈالے جاتے ہیں۔ مگر فصل کے ساتھ ایسے خودرو بوٹے ضرور نکلتے ہیں جو دوا کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک ہی زمین پر ایک ہی سی کھاد ڈالنے اور ایک ہی طرح پانی لگانے کے باوجود دونوں فصلوں پر مختلف بوٹے اگتے ہیں۔ ربیع کے الگ ہوتے ہیں' خریف کے الگ۔ ان میں السی' سداب' حرمل' کاسنی' کلتھی' منڈی' کچری' سرپھوکہ' شاہترا' بتھوا اور ایسی ہی نہ جانے کتنی جڑی بوٹیاں شامل ہوتی ہیں۔“ حکیم نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”پتہ ہے' یہ کتنی مفید اور کارآمد بوٹیاں ہوتی ہیں؟“

”میں نوں ان کے بارے میں کچھ پتہ نہیں جی؟“

”ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔“ حکیم کھل کر مسکرایا۔ ”تمہاری طرح اور بھی بہت ہیں جن کو یہ پتہ نہیں کہ السی' اخراج بلغم کے لیے نہایت مفید ہے۔ محلل اورام ہے' مسکن ہے۔ تم نے سداب کا بوٹا دیکھا ہوگا۔ گندم کے بوٹوں کے ساتھ ہی اگتا ہے۔ دو گز تک اونچا ہوتا ہے۔ سداب پیٹ کی ئی بیماریوں کے علاوہ تشنج' قولنج اور نفخ شکم رفع کرتا ہے۔ اسی طرح حرمل' جسے اسپند بھی کہتے ہیں' مقوی اعصاب ہے۔ اس کے بیجوں میں تیل وافر مقدار میں ہوتا ہے جو بدن سے رطوبت خارج کرتا ہے۔ کاسنی کی بوٹی جگر کے امراض کے لیے مخصوص دوا ہے۔ اس کے پتے' بیج اور جڑ' سب کام تے ہیں۔ یہ حرارت بجھاتی ہے۔ پیاس کی شدت دور کرتی ہے۔ محلل اور مسکن ہے۔ یرقان کے مریض کو شفا دیتی ہے۔“

حکیم نذر محمد چشتی نہایت سنجیدگی سے علم طب کے اسرار و رموز بیان کرتا رہا۔ ”منڈی اور رپھوکہ' مصفی خون ادویات ہیں۔ کلتھی مشہور بوٹی ہے۔ پتھری توڑتی ہے۔ کچری' پیٹ کے مروڑ ار بلغمی امراض کے لیے نہایت مجرب ہے۔ اسی طرح دوسری جڑی بوٹیوں کے بھی خواص ہیں۔

کہاں تک بیان کروں۔"

"حکیم جی! تسیں انھیں اتنی کام کی بوٹیاں بتاتے ہو پر کھیتوں کی گوڈی اور تلائی کرتے ہوئے ان کو نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔" رحیم داد نے حکیم کو مطلع کیا۔

"یہی تو ظلم ہے۔" حکیم چشتی بے قرار ہو کر بولا۔ "افسوس کہ لاعلمی کے باعث اتنی کار آمد جڑی بوٹیاں کھیتوں سے اکھاڑ کر ضائع کر دی جاتی ہیں۔ جنگل یا ویرانے میں پیدا ہوں تو مویشیوں کی خوراک بن جاتی ہیں۔ موسم کے سرد و گرم کے ہاتھوں تباہ ہو جاتی ہیں۔" رحیم داد سر جھکائے چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔

حکیم نے بات جاری رکھی۔ "میں ان جڑی بوٹیوں سے مختلف دوائیاں تیار کرتا ہوں۔ کمال گڑھ میں میرا مطب ہے۔ دور دور سے مریض آتے ہیں۔"

کھانے سے فارغ ہو کر حکیم نے ناشتے دان میں بچا کھچا کھانا ڈالا اور اسے تھرموس کے ساتھ ایک طرف سنبھال کر رکھ دیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ میں خشک برساتی نالا، ریگ زار جیسا نظر آ رہا تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ مگر جھاڑی کے سائے میں سکون تھا، ٹھنڈک تھی۔ ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے۔ ٹوبے کا پانی جھلملا رہا تھا۔ رحیم داد کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں مگر وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ نیند کا غلبہ بہت بڑھا تو وہ کھڑا ہو گیا۔ حکیم نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"کہاں چلے؟"

"میں نے تو جی اپنے پنڈ واپس جانا ہے۔"

حکیم نے اسے جانے نہیں دیا۔ "اس وقت دوپہر میں جا کر کیا کرو گے؟ میرا کہا مانو تو ٹھیر جاؤ۔ دن ڈھلے دونوں اکٹھے چلیں گے۔ میں کمال گڑھ جاؤں گا۔ تم اپنے پنڈ چلے جانا۔" رحیم داد مخمصے میں پڑ گیا۔ وہ ٹھہرنا بھی نہیں چاہتا تھا اور اسے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ جانا کہاں ہے؟ وہ خاموش کھڑا رہا۔ حکیم مسکرا کر بولا۔

"دھوپ ڈھلنے تک یہاں ٹھیر جاؤ۔ بوٹیاں چننے میں میری مدد کرو۔ تمہیں اور کوئی کام بھی نہیں ہے۔ گھر ہی تو جانا ہے۔ چلے جانا۔"

"میں نوں تو جی یہ بھی پتہ نہیں کون سی بوٹی توڑنی ہے؟"

حکیم بے تکلفی سے ہنسا۔ "تم فکر نہ کرو۔ آسانی سے شناخت کر لو گے۔ آؤ میرے ساتھ۔" دونوں جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ڈھلان کے پاس پہنچے۔ حکیم نے ایک پودے

جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ رہا وہ بوٹا۔"

پودا بالشت سوا بالشت اونچا تھا۔ اس کی پتیاں نوکیلی تھیں۔ شاخوں میں باریک باریک کانٹے تھے اور چند ننھے، ننھے زرد پھول بھی لگے تھے۔

حکیم نے جھک کر پودا اکھاڑا اور رحیم داد کو دکھا کر بولا۔ "اس بوٹے کا نام سنگھرنی ہے۔ یہ ندی نالوں کے کنارے پتھریلی زمین میں اگتا ہے۔ اس کی عجب تاثیر ہے۔ اس کی جڑ ابال کر پیو، خونی یا بادی کیسی بھی بواسیر ہو، فوراً افاقہ ہو گا۔ بچوں کے پیٹ میں کیڑے پڑ جائیں، جڑ پیس کر، ذرا سا شہد ملا کر چٹاؤ، سارے کیڑے فضلے کے ساتھ پیٹ سے نکل جائیں گے۔ کالی کھانسی ہو تو اسے جلا کر ہاون دستے میں کوٹ لو، باریک کپڑے سے چھان کر سفوف بنا لو۔ تھوڑا سا نمک ملاؤ، رات کو سوتے وقت مریض کو ایک چٹکی کھلا کر گرم پانی پلا دو۔ چوتھے روز کالی کھانسی جاتی رہے گی۔ جڑ قوت باہ کے لیے بھی نہایت مفید ہے۔ گھیکوار کے ساتھ پیس کر حلوہ بنا لو۔ اس میں حسب ضرورت پستے، بادام ڈالو۔ جاڑوں میں استعمال کرو۔ نہایت ممسک ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔

"لیکن یہ تو رئیسوں کے چونچلے ہیں، تم کہاں اس چکر میں پڑو گے؟"

"اپنی تو جی ساری گل ہی سمجھ نہیں آئی۔ اس چکر میں کیا پڑنا۔"

"اچھا ہی ہے تم اسے نہ سمجھو۔ تم ابھی تکڑے جوان ہو۔ تمہیں کسی ایسے نسخے کی کیا ضرورت لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ آزمودہ اور مجرب نسخہ ہے۔" حکیم چشتی سنگھرنی کا پودا گھما پھرا کر دیکھنے لگا۔

"جڑ کی اور بھی بہت خوبیاں ہیں، کہاں تک بیان کروں۔"

"پر میں نے تو جی تمہیں اس کی پتیاں توڑ کر تھیلے میں ڈالتے دیکھا تھا۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" حکیم مسکرانے لگا۔ "میں تو تمہیں اس بوٹے کی خصوصیات بتا رہا تھا۔ جڑ کی طرح اس کی شاخیں اور ڈنٹھل بھی بہت سی بیماریوں کا علاج ہیں۔ اسی طرح اس کے پھولوں اور پتیوں کی بھی خصوصیات ہیں۔" وہ پتیاں توڑ توڑ کر ہاتھ میں دبے ہوئے تھیلے میں ڈالنے لگا۔ "مجھے آج کل اس کی پتیوں کی شدید ضرورت ہے۔ میں ان پتیوں سے کئی پیچیدہ امراض کا علاج دریافت کرنے کا تجربہ کر رہا ہوں۔ مجھے اس میں کامیابی بھی ہوئی ہے۔"

حکیم نے تمام پتیاں توڑ کر تھیلے میں ڈالیں اور پودا ایک طرف پھینک دیا۔ رحیم داد چپ کھڑا رہا۔ حکیم آگے بڑھا۔ چند ہی قدم کے فاصلے پر سنگھرنی کے پودوں کا جھرمٹ نظر آیا۔ حکیم کے

چہرے پر مسرت پھیل گئی۔

"لو جی! اپنا کام تو بن گیا۔" اس نے پودوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ سب سنگھرنی کے بوٹے ہیں۔ اب تو تم بھی انھیں پہچان سکتے ہو۔ اچھا' اب ان کی پتیاں توڑ توڑ کر اکٹھی کرو۔" اس نے اپنا تھیلا رحیم داد کو تھما دیا۔

رحیم داد خاموشی سے پتیاں توڑ توڑ کر تھیلے میں ڈالتا رہا۔ حکیم کچھ دور کھڑا تھا۔ رحیم داد کو جھاڑیوں کی الجھی ہوئی شاخوں کی آڑ سے اس کی پیٹھ کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ وہ جھکا ہوا یا تو پتیاں توڑ رہا تھا یا کسی پودے کا معائنہ کر رہا تھا۔

رحیم داد پتیاں توڑ کر تھیلے میں ڈالتا اور متجسّس نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا بھی جاتا۔ اسے ابھی تک لالی کا انتظار تھا۔ ساتھ ہی یہ دھڑکا بھی تھا کہ اگر لالی گرفتار ہو گیا تو پولیس اب سرگرمی سے اس کی تلاش میں ہو گی۔

☆

سائے سمٹتے جا رہے تھے۔ سک نالے کی ریت کے ذرے دھوپ میں جگمگا رہے تھے۔ گرمی بڑھ گئی تھی۔ رحیم داد سائے میں کھڑا تھا۔ مگر موٹی چادر نے اس کا جسم پسینے سے تر کر دیا تھا۔ حکیم کے سامنے وہ چادر اتارنا نہیں چاہتا تھا۔

رحیم داد نے سنگھرنی کے تمام پودوں کی پتیاں تھیلے میں بھر لیں۔ مگر تھیلا ابھی خالی تھا۔ وہ اسے ہاتھ میں دبائے حکیم کی جانب چلا۔ حکیم پتیاں توڑ توڑ کر اپنی ٹوپی میں بھر رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر حکیم نے گردن موڑی اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد کیکر کے ایک گھنے درخت کے نیچے سے گزرتا ہوا آگے بڑھا۔ یکا یک وہ ٹھوکر کھا کے لڑکھڑایا۔ اس کی چادر کیکر کی خار دار شاخوں میں الجھ گئی۔ رحیم داد دھڑام سے زمین پر گرا۔ سب کچھ آناً فاناً ہوا۔ رحیم داد جیل کی وردی میں زمین پر پڑا تھا اور اس کی چادر ایک شاخ سے الجھی ہوئی لٹک رہی تھی۔ حکیم لپک کے اس کے نزدیک پہنچا۔ رحیم داد گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔

حکیم نذر محمد چشتی نے ہمدردی سے کہا۔ "چوٹ تو نہیں آئی؟" اس نے رحیم داد کے جسم پر جیل کی وردی اور اس پر پڑا ہوا دھندلا نمبر مشتبہ نظروں سے دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر ہکلانے لگا۔

"تم...... تم؟"

رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے چادر شاخ سے اتارا کر اوڑھ لی مگر حکیم سے نظریں نہیں ملائیں۔ اس کا تھیلا گرتے وقت ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ تھیلے سے پتیاں بھی نکل کر بکھر گئیں

ہیں۔

رحیم داد اکڑوں بیٹھ کر خاموشی سے پتیاں اٹھا اٹھا کر تھیلے میں ڈالنے لگا۔ حکیم اس کے قریب ہی ڑا تھا۔ رحیم داد نے ساری پتیاں تھیلے میں بھر دیں اور کھڑا ہو گیا۔

چند لمحے دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے رہے' پھر حکیم کی آواز ری۔ "کیا تم جیل سے بھاگے ہوئے قیدی ہو؟"

رحیم داد گردن جھکا کر آہستہ سے بولا۔ "ہاں جی!"

"تمہارا رویّہ اور حلیہ دیکھ کر مجھے پہلے ہی شک گزرا تھا۔" حکیم نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے یہ ا پتہ ہے کہ کل رات نہر کے کنارے ٹبّوں پر پولیس کے ساتھ تمہاری گولی چلی تھی۔ تم فرار نے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر تمہارا ساتھی پکڑا گیا۔"

رحیم داد نے گھبرا کر پوچھا۔ "تیں نوں کیسے پتہ چلا وہ پکڑا گیا؟"

"سویرے جب میں ادھر آ رہا تھا تو شہر سے بس میں تین کانسٹیبل بھی سوار ہوئے۔ وہ قادر آباد ے آئے۔ ان میں سے ایک کانسٹیبل میرا جاننے والا نکل آیا۔ اس کی گھر والی میرے زیر علاج رہ ا ہے۔ بے چاری کو عرق النسا کی بیماری ہے۔ اسی کانسٹیبل سے دوران گفتگو معلوم ہوا کہ تمہارا تھی پکڑا گیا اور اب پولیس کی حراست میں ہے۔" رحیم داد کے چہرے پر پریشانی چھا گئی۔ حکیم دیر خاموش رہ کر نرم لہجے میں بولا۔

"تم کوئی بھی ہو' مجھے تم سے کیا لینا۔ پر میں اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ پولیس تمہاری تلاش ہے۔"

رحیم داد نے گھبرا کر کہا۔ "فیر تے میں نوں یہاں سے جھیتی نال ٹر جانا چاہیئے۔" اس نے خوف نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

"تم اس وقت کہاں جاؤ گے؟" حکیم چشتی نے دریافت کیا۔

"مجھے خود پتہ نہیں جی کہاں جانا ہے۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے تو یہ ہی نہیں تھا۔ لالی جہاں لے جاتا' میں وہیں چلا جاتا۔ وہی مجھے جیل سے نکال کر لایا تھا۔ آگے کا ی کو پتہ تھا۔"

"خطرہ تو تمہارے لیے یہاں بھی ہے۔ مگر اس وقت کہیں جانا اور بھی زیادہ خطرناک ہو گا۔" نے اسے مشورہ دیا۔ "میری مانو تو سورج ڈوبنے تک یہیں رہو۔ شام ہو جائے تو اندھیرے میں تمہارا [illegible] ہے نکل جانا۔ آگے تمہاری مرضی۔"

رحیم داد نے حکیم کا مشورہ قبول کرلیا اور اس کے ساتھ سنگھرنی کے پودوں سے پتیاں توڑتوڑ کر تھیلے میں ڈالنے لگا۔

دونوں جھاڑیوں کے درمیان ادھر ادھر گھومتے رہے۔ رحیم داد ابھی تک اپنا جسم چادر سے چھپائے ہوئے تھا۔

حکیم نہایت انہماک سے پتیاں توڑتوڑ کر اپنی ٹوپی میں ڈالتا جا رہا تھا۔ ٹوپی بھر جاتی تو پتیاں رحیم داد کے ہاتھ میں دبے ہوئے تھیلے میں ڈال دیتا۔ رحیم داد نے پتیاں توڑتے توڑتے حکیم سے دریافت کیا۔

"حکیم جی! تسیں خالی پتیاں کیوں اکٹھی کر رہے ہو؟"

حکیم چشتی اس کی بات سن کر مسکرایا۔ "جڑ اور ڈنٹھلوں کا میرے پاس پہلے ہی وافر ذخیرہ ہے۔ آج کل مجھے صرف پتیوں کی ضرورت ہے۔ میں ان دنوں ایک نئی دوا تیار کر رہا ہوں۔ اس کی تیاری پر بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔" اس نے ٹوپی میں بھری ہوئی پتیاں تھیلے میں ڈال دیں۔ "انھیں بھیگنے کے لیے رات بھر اوس میں رکھوں گا۔ سویرے سورج نکلنے سے پہلے پہلے اٹھا کر کورے گھڑے میں بھر دوں گا۔ پھر گھڑے پر ڈھکنا رکھ کر گیلی مٹی کے لیپ سے اس کا منہ اچھی طرح بند کر دوں گا۔ اس کے بعد زمین میں کمر تک گہرا گڑھا کھودوں گا' اس میں گھڑا رکھوں گا۔ اسے اپلوں سے بھر کر مٹی سے ہموار کروں گا۔ جب برسات گزر جائے گی تو زمین کھود کر گھڑا باہر نکال لوں گا۔ اس وقت تک گھڑے میں خوب خمیر اٹھ آئے گا۔ پتیاں گل سڑ کر گاڑھی گاڑھی لگدی سی بن جائیں گی۔ اس لگدی میں حسب مقدار عود صلیب' زراوند طویل' عاقر قرحا' زیرہ سیاہ' خولنجان' رب السوس اور اسطوخودوس شامل کروں گا۔ پھر اسے کھرل میں پیس کر مٹر کے دانے برابر گولیاں بنالوں گا۔ یہ گولیاں سائے میں سکھائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد سمجھو' دوا تیار ہوگئی۔"

رحیم داد حیرت سے حکیم کی باتیں سنتا رہا۔ "دوائی کی تیاری میں تو جی بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔"

"محنت تو واقعی بہت کرنی پڑتی ہے۔" حکیم نے گردن اٹھائی اور کھل کر مسکرایا۔ "مگر یہ ایسے مرض کی دوا ہے جسے لاعلاج کہا جاتا ہے۔ یہ مرگی کا مرض ہے۔ اسے طب یونانی میں ام الصبیان اور عربی میں صرع کہا جاتا ہے۔ تم نے مرگی کے مریض تو دیکھے ہوں گے؟"

"دیکھے ہیں جی' بالکل دیکھے ہیں۔ میرے پڑوسی کرامت کو یہی روگ ہے۔ بہت علاج کیے پر اب تک اس کی بیماری نہیں گئی۔"

"اس مرض کا سبب وہ سدّہ ہوتا ہے جو دماغ کے بعض بطون اور اعصاب کے بعض حصوں میں پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ وہی اعصاب ہوتے ہیں جو اعضا کو حرکت دیتے ہیں اور قوت حس ان کی طرف پہنچاتے ہیں۔ جب تک اس سدّے کو رفع نہ کیا جائے مرض ختم نہیں ہوتا۔" حکیم چشتی نہایت بلیغ انداز میں مرگی کے مرض کے بارے میں بتاتا رہا۔ رحیم داد خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ حکیم نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"تم اپنے پڑوسی کو میرے پاس لانا۔ میری گولیوں کے استعمال کے بعد اسے یہ بیماری کبھی نہیں ہوگی۔ بالکل چنگا ہوجائے گا۔ کہتے ہیں' مرگی لاعلاج مرض ہے مگر میں نے اس کا علاج دریافت کرلیا ہے۔" وہ ہاتھ اٹھا کر جوش و خروش سے بولا۔ "کتنے ہی مریضوں کو اس دوا سے بھلا چنگا کرچکا ہوں۔ یہ تیر بہدف علاج ہے۔ نہایت مجرّب اور آزمودہ ہے۔ میرا دعویٰ ہے۔" حکیم کی زبان اچانک لڑکھڑانے لگی۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑا اور خاموش ہوگیا۔ آنکھوں کی پتلیاں چڑھ گئیں۔ چہرہ زرد پڑگیا۔ وہ لڑکھڑایا اور دھڑام سے زمین پر گرا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ حکیم پر مرگی کا دورہ پڑا تھا۔

وہ بے ہوش تھا اور رحیم داد اسے حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے جھک کر حکیم کو آہستہ آہستہ جھنجوڑا۔ مگر حکیم بے سدھ پڑا رہا۔ اس کی سانس رک رک کر چل رہی تھی اور حلق سے ہلکے' ہلکے خراٹوں کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ رحیم داد حیران و پریشان کھڑا اسے تکتا رہا۔

☆

ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ دھوپ ریت کے ذروں پر جھلملا رہی تھی۔ رحیم داد کی آنکھوں میں اچانک تیز چمک پیدا ہوئی۔ اس نے چوکس نظروں سے ادھر ادھر دیکھا مگر دور دور تک نہ آدم تھا' نہ آدم زاد۔

رحیم داد نے جھٹ چادر ایک طرف پھینکی۔ جلدی جلدی جیل کی وردی اتاری اور حکیم کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے حکیم کی شلوار اتاری اور اسے پہن کر قمیص بھی اتارنے لگا۔ اس نے حکیم کی قمیص بھی پہن لی۔

حکیم زمین پر ننگا دھڑنگا پڑا تھا۔ اس کے منہ سے سفید سفید جھاگ نکل کر ہونٹوں کے گوشوں پر پھیل گیا تھا۔ حکیم مردے کے مانند بے جان نظر آ رہا تھا۔

رحیم داد نے حکیم کے کپڑے پہننے کے بعد چاہا کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ وہ چند قدم چلا پھر ٹھہر گیا۔ اس نے حکیم کے پیروں سے جوتے نکالے اور انھیں پہننے لگا۔ جوتے ذرا تنگ تھے‘ مگر اس نے کسی نہ کسی طرح پہن ہی لیے۔ حکیم ابھی تک بے حس و حرکت پڑا تھا۔ رحیم داد قریب کھڑا تیکھی نظروں سے اسے گھورتا رہا۔

اس نے جیل کی وردی حکیم کو پہنا دی۔ حکیم نذر محمد چشتی کی ٹوپی اٹھائی‘ آنکھوں سے عینک اتاری‘ ایک بار پھر چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور اس ٹیلے پر چڑھ گیا جس کے نیچے حکیم بے ہوش پڑا تھا۔

ٹیلے پر پہنچ کر اس نے نیچے دیکھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ٹیلے کے نیچے حکیم چشتی نہیں‘ جیل کی وردی میں ملبوس وہ خود بے سدھ پڑا ہے۔ وہ اسے گھورتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس کے چہرے پر وحشت اور سختی چھا گئی۔ اس کی سانس تیز ہو گئی۔

حکیم کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ رحیم داد نے جھٹ قریب پڑا ہوا بھاری پتھر اٹھایا‘ سر سے بلند کیا اور تاک کر حکیم کے چہرے کی جانب پھینکا۔ پتھر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ حکیم کے حلق سے گھٹی ہوئی آواز نکلی اور خاموشی میں ڈوب گئی۔ اس کا چہرہ بھاری پتھر سے کچلنے کے بعد بری طرح مسخ ہو گیا۔ نہ آنکھیں نظر آرہی تھیں‘ نہ ناک اور کان۔ اس کا پورا چہرہ گوشت کا کٹا پھٹا لوتھڑا بن گیا تھا۔ حکیم کا جسم ذرا دیر تک پھڑکتا رہا پھر ٹھنڈا پڑ گیا۔

رحیم داد چٹان سے اتر کے حکیم کی لاش کے قریب گیا۔ اس نے پتھر اٹھا کر حکیم کا چہرہ اور مسخ کردیا۔ اس کے دونوں ہاتھ بھی پتھر سے کچل ڈالے۔ وہ کوئی ایسا نشان چھوڑنا نہیں چاہتا تھا جس سے اس کی شناخت ہو سکے۔

لاش پوری طرح مسخ کرنے کے بعد وہ اس جھاڑی کے نیچے گیا جہاں حکیم کا ناشتے دان اور تھرماس رکھا تھا۔ اس نے ناشتے دان اور تھرماس پتیوں سے بھرے ہوئے تھیلے میں ٹھونسے۔ حکیم کی ٹوپی اوڑھی‘ عینک لگائی۔ اپنی چادر لاش کے قریب ڈالی۔ ٹوبھے پر پہنچا۔ خون سے بھرے ہوئے ہاتھ پانی سے دھوئے۔

ہاتھ دھو کے وہ ٹوبھے کے کنارے کنارے کچھ دور چلتا رہا‘ پھر جھاڑیوں میں گھس گیا اور جھاڑیوں سے گزر کر ایک ٹیلے پر چڑھنے لگا۔

بلندی پر پہنچ کے اس نے دیکھا دور دور تک اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبے ہیں۔ آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور فراش کے ایک گھنے درخت کے سائے میں ٹھہر گیا۔ درخت سے چند قدم دور ایک اونچے ٹیلے کی چوٹی تھی اور اس کے نشیب میں جنگلی جھاڑیوں اور خودرو پودوں کا بہت گھنا جھنڈ تھا۔

رحیم داد نے سوچا‘ ہاتھ میں دبا ہوا تھیلا جھاڑیوں کے پیچھے چھپا دے۔ وہ جھاڑیوں کے قریب پہنچا اور خودرو پودے روندتا ہوا جھنڈ کے اندر چلا گیا۔

جھاڑیوں کے پیچھے اسے غار نظر آیا۔ غار دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ اس نے گردن جھکا کے غار میں جھانکا۔ غار بالکل خالی تھا۔ اور اتنا گہرا اور کشادہ تھا کہ وہ اس میں اطمینان سے روپوش ہو سکتا تھا۔ مگر وہ ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا‘ جلد سے جلد کہیں دور چلا جانا چاہتا تھا۔ اس نے تھیلا غار کے ایک گوشے میں رکھ دیا۔

جھاڑیوں سے باہر نکلتے ہوئے اس نے سک نالے کی جانب دیکھا۔ عینک کے موٹے موٹے شیشوں سے صاف نظر نہیں آیا۔ اس نے عینک اتار کر قمیص کی جیب میں رکھ لی۔ اب اس کے سامنے نشیب میں سک نالا تھا جس کی ریت کے ذرے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ بائیں ہاتھ پر ٹوبھا تھا۔ اس کا پانی بھی جھلملا رہا تھا۔ ٹوبھے کے پار ایک جھاڑی کے قریب حکیم چشتی کی لاش پڑی تھی۔

رحیم داد لگ بھگ نصف فرلانگ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ مگر ٹیلے کی بلندی سے لاش صاف نظر آرہی تھی۔

رحیم داد سہمی ہوئی نگاہوں سے لاش تکنے لگا۔ پھر اس کی نظر نشیب سے بلندی کی جانب گئی۔ وہاں جھل تھا اور اسی جھل سے گزر کر وہ سک نالے میں اترا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جھل کے گھنے درختوں سے نکل کر ایک شخص باہر آرہا ہے۔

رحیم داد گھبرا کے جہاں تھا‘ وہیں دبک گیا۔ مگر چوکنا نظروں سے اسے دیکھتا بھی رہا۔ وہ وضع قطع سے کنکر کی کھدائی کرنے والا مزدور لگتا تھا۔ مزدور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا ڈھلان سے نیچے اترا اور ٹوبھے کی جانب نظریں اٹھائے آگے بڑھنے لگا۔ رحیم داد جھاڑیوں کی آڑ سے بغور اسے دیکھتا رہا۔

چلتے چلتے مزدور نے گردن ذرا جھکا کر حکیم کی لاش کی طرف دیکھا اور جھجک کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے وہ لاش دیکھتا رہا‘ پھر آہستہ آہستہ لاش کے قریب گیا۔ جھک کر اسے دیکھا‘ لیکن فوراً سراسیمہ ہو کر پیچھے ہٹا‘ پلٹا اور تیزی سے چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ بلندی سے اس نے ایک بار پھر لاش دیکھی اور بھاگتا ہوا فراش کے درختوں کے نیچے چلا گیا۔ ذرا دیر میں وہ رحیم داد کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

رحیم داد نے چاہا کہ جھاڑیوں سے نکل کر دور چلا جائے مگر وہ سہا ہوا بیٹھا رہا۔ اس کے آس پاس چٹیل ٹیلے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ٹیلوں پر چلنا خطرے کو دعوت دیتا تھا۔ خوف اور پریشانی سے اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔

وہ جنگلی پودوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا خاموشی سے غار میں داخل ہو گیا۔ اس نے تھیلے سے تھرماس نکالا۔ ڈھکنا کھول کر دیکھا کہ تھرماس میں تھوڑا سا پانی موجود ہے۔ اس نے تھرماس منہ سے لگا کر گھونٹ بھر پانی پیا۔ پانی پینے سے کسی قدر سکون ملا۔ اس نے غار سے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

غار کی زمین خشک اور صاف ستھری تھی۔ رحیم داد سورج غروب ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ غار میں نرم نرم جھونکے آ رہے تھے۔ رحیم داد نے تھیلے سے ناشتے دان نکال کر تھرماس کے ساتھ ایک کونے میں رکھ دیا اور پتیوں سے بھرا ہوا تھیلا سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ مگر غار اتنا طویل نہیں تھا کہ وہ پوری طرح ٹانگیں پھیلا سکے۔ اس نے اپنا جسم کسی قدر سکیڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں لیکن نیند نہیں آئی آسے بار بار حکیم کا خون میں لتھڑا ہوا خوف ناک چہرہ نظر آتا۔ گھبرا کر وہ آنکھیں کھول دیتا۔

وقت گزرتا رہا۔ رحیم داد بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اسی عالم میں اسے نشیب میں ملی جلی انسانی آوازیں سنائی دیں۔

وہ پریشان ہو کر اٹھا اور غار سے نکل کر دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ اس نے جھاڑیوں کی آڑ سے دیکھا کہ حکیم نذر محمد چشتی کی لاش کے قریب کچھ لوگ کھڑے ہیں۔ وہ کنکر کی کھدائی کرنے والے مزدور تھے۔ ان میں وہ مزدور بھی شامل تھا جس نے لاش سب سے پہلے دیکھی تھی۔ وہ گرد و نواح کے ٹیلے اور ٹبے بھی متجسّس انداز سے دیکھ رہے تھے۔ چند مزدور ٹوبھے پر پہنچے۔ انھوں نے ٹوبھے کے پانی سے منہ ہاتھ بھی دھویا۔ وہ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے اور پریشان اور سہمے ہوئے نظر آتے تھے۔

مزدور لگ بھگ نصف گھنٹے تک لاش کے نزدیک کھڑے رہے یا اس کے آس پاس منڈلاتے رہے۔ آخر بلندی پر چڑھ کر جھل کے گھنے درختوں میں داخل ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد ویرانی چھا گئی۔

حکیم کی لاش جھاڑی کے پاس پڑی تھی۔ سورج اب ایسے رخ پر آ گیا تھا کہ دھوپ پوری طرح لاش پر پڑ رہی تھی۔ رحیم داد دوبارہ غار میں چلا گیا۔ مگر اس دفعہ لیٹا نہیں' سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ اب دن ڈھلنے لگا تھا' سائے طویل ہو گئے تھے۔

رحیم داد بے چین ہو کر پھر غار سے نکلا۔ اس نے جھاڑیوں کی الجھی ہوئی شاخوں کے درمیان ے حکیم کی لاش دیکھی۔

دو گدھ لاش کے کچلے ہوئے چہرے سے گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ گدھوں اور چیلوں کا ایک غول اوپر فضا میں منڈلا رہا تھا۔ دھوپ ٹیالی پڑ گئی تھی۔ سورج مغرب میں فراش کے اونچے اونچے درختوں کی چوٹیوں پر پہنچ چکا تھا۔ سک نالے پر گہرا سناٹا چھایا تھا۔ گدھوں کے ساتھ اب چیلیں بھی لاش سے گوشت نوچ نوچ کر کھا رہی تھیں۔

رحیم داد جھاڑیوں کی اوٹ سے حکیم چشتی کے مردہ جسم کی درگت بنتے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دیکھا کہ گدھ بھرا مار کر اڑ گئے۔ چیلیں بھی اڑ کر ادھر ادھر فضا میں بکھر گئیں۔ پولیس کا ایک انسپکٹر چار کانسٹیبلوں کے ہم راہ ڈھلان سے نیچے اتر رہا تھا۔ پولیس کو دیکھتے ہی رحیم داد کے اوسان خطا ہو گئے۔ مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

پولیس والے نشیب میں اترنے کے بعد لاش کی جانب بڑھے اور جھک جھک کر لاش کا معائنہ کرنے لگے۔ گدھوں اور چیلوں کا غول ابھی تک فضا میں منڈلا رہا تھا۔ انسپکٹر نے لاش کے بعد خون سے بھرے ہوئے پتھر کا بھی معائنہ کیا جس سے رحیم داد نے حکیم کا چہرہ اور ہاتھ کچل کر مسخ کر دیئے تھے۔

انسپکٹر نے رحیم داد کی چادر بھی دیکھی۔ چادر لاش کے قریب ہی پڑی تھی۔ انسپکٹر لاش کے آس پاس گھومتا رہا۔ وہ قریب کی جھاڑیوں میں بھی گیا۔ چڑھ کر ٹیلے پر پہنچا۔ بلندی سے جھک جھک کر لاش دیکھتا رہا۔ نیچے اترا اور لاش کے نزدیک کھڑے ہو کر قدموں کے نشانات دیکھنے لگا۔

وہ قدموں کے نشانات دیکھتا ہوا ٹوبھے کی جانب بڑھا اور کنارے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ اس کے ہم راہ ایک کانسٹیبل بھی تھا۔ انسپکٹر ہاتھ اٹھا کر کانسٹیبل کو قدموں کے نشانات دکھا رہا تھا۔

جیل میں جرائم پیشہ قیدیوں کے ساتھ رہنے کے باعث رحیم داد جرائم کے بارے میں بہت سے گر اور حربے جان گیا تھا۔ اس نے حکیم چشتی کو قتل کرتے ہوئے اپنے طور پر پوری کوشش کی تھی کہ پولیس کو مغالطے میں ڈال دے۔ وہ اپنی کامیابی پر مطمئن تھا۔ مگر جب انسپکٹر قدموں کے نشانات دیکھتا ہوا ٹوبھے تک پہنچ گیا تو رحیم داد کو اپنے اناڑی پن کا احساس ہوا۔ لاش کے قریب سے فرار ہوتے وقت اسے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ ریت پر اس کے قدموں کے نشان صاف نظر آ رہے ہیں۔

لیکن یہ سوچ کر اسے کسی قدر ڈھارس ہوئی کہ کنکر کھودنے والے مزدوروں کے قدموں کے نشانات بھی اس کے قدموں کے نشانات کے ساتھ گڈمڈ ہوگئے تھے۔ چند مزدور منہ ہاتھ دھونے ٹوبے پر بھی پہنچے تھے۔

رحیم داد نے غور کیا کہ قدموں کے ملے جلے نشانات نے انسپکٹر کو الجھن میں ڈال دیا۔ انسپکٹر ٹوبھے کے کنارے کھڑا تھا اور مڑمڑ کر نشانات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک متجسّس نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر ٹوبھے کے کنارے کنارے چلتا جھاڑیوں میں داخل ہوا۔

جھاڑیوں سے گزر کر وہ ٹیلوں پر پہنچنے کے لیے چڑھائی کی جانب بڑھا۔ کانسٹیبل اس کے ساتھ تھا۔

رحیم داد جھاڑیوں کی شاخوں کے پیچھے سے دونوں کو چوکنّا نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر جب اس نے انھیں اوپر آتے دیکھا تو سخت پریشان ہوا۔ وہ جنگلی پودوں کے درمیان سے کھسکتا ہوا غار میں داخل ہوگیا۔ غار کے ایک گوشے میں جاکے وہ دم بخود بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد سخت اور چٹیل زمین پر بھاری بھاری بوٹوں کی آواز ابھری، کھٹ کھٹ کھٹ۔ آواز قریب آتی گئی۔ رحیم داد کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ خوف اور ڈر سے اس کا چہرہ پسینے سے بھیگ گیا۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے جھاڑیوں کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

قدموں کی آہٹ عین غار کے سامنے سنائی دی۔ رحیم داد کو الجھی ہوئی شاخوں کے پیچھے انسپکٹر اور کانسٹیبل نظر آئے مگر وہ ان کا صرف نچلا دھڑ دیکھ سکا۔

کانسٹیبل کہہ رہا تھا۔ ”لاش تو جی جیل کی وردی سے رحیم داد ہی کی لگتی ہے۔“

”لیکن اسے اتنی بے دردی سے کیوں قتل کیا گیا؟ لاش ایسی مسخ ہوگئی ہے کہ شناخت کرنا مشکل ہوگیا۔“

”میں تو یہ کہتا ہوں جی....“

رحیم داد کانسٹیبل کی پوری بات نہیں سن سکا۔ دونوں آہستہ آہستہ آگے بڑھ گئے۔ ان کے قدموں کی آہٹیں دھیمی پڑ گئیں تو رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ مگر وہ ہنوز خوف زدہ تھا۔ سہا ہوا چپ چاپ دونوں کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ پانچ منٹ، دس منٹ، پندرہ منٹ، آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ لیکن وہ واپس نہیں آئے۔ پتھریلی زمین پر ان کے بوٹوں کی آواز نہ ابھری۔ ہر طرف گہری خاموشی چھاگئی تھی۔ غار میں اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ سائے پھیل کر اور طویل ہوگئے تھے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔

رحیم داد دیر تک ڈرا سہا بیٹھا رہا۔ نہ کوئی آہٹ ابھری نہ آواز آئی۔

وہ غار سے نکلا۔ جنگلی پودوں میں دبک کر گردن ذرا اونچی کی۔ ڈوبتے ہوئے دن کی ہلکی ہلکی روشنی میں حکیم کی لاش جھاڑی کے قریب پڑی تھی۔ مگر اب اس پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ کچھ فاصلے پر دو کانسٹیبل بیٹھے لاش کی نگرانی کر رہے تھے۔ انسپکٹر دوسرے کانسٹیبلوں کے ہم راہ جائے واردات سے جاچکا تھا۔

رحیم داد بلندی سے لاش کی نگرانی کرنے والے کانسٹیبلوں کو دیکھتا رہا۔ سورج جنگل کے گھنے درختوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ برساتی نالے کے نشیب میں شام آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔ فضا دھواں دھواں تھی۔ سناٹا بڑھتا جا رہا تھا۔

رحیم داد نے غار میں واپس جاکے ناشتے دان کھولا۔ ناشتے دان میں ابھی ایک روٹی باقی تھی۔ تھوڑا سا سالن بھی تھا۔ اس نے آدھی روٹی سالن سے کھائی اور آدھی ناشتے دان میں رکھ کر ڈھکنا بند کردیا۔

رحیم داد نے تھرماس سے پانی کے چند گھونٹ پیے اور غار سے باہر نکلنے کا ارادہ ترک کردیا۔

☆

پہر رات گزر چکی تھی۔ رحیم داد آنکھیں بند کیے چپ لیٹا تھا۔ کہیں قریب ہی گیدڑوں کی آوازیں گہرے سناٹے میں ابھریں۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ عین اسی وقت نشیب میں کانسٹیبل زور سے کھنکارے۔ گیدڑوں کا غول غار کے سامنے سے گزرتا ہوا آگے نکل گیا۔ رحیم داد کو وہ دھندلی پرچھائیوں کے مانند نظر آئے۔ وہ دیر تک بیٹھا رہا۔ بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تو ایک بار پھر لیٹ گیا۔ رات گزرتی گئی، کالی سیاہ ہوگئی۔ سویرا ہونے سے کچھ دیر پہلے رحیم داد کی آنکھ لگ گئی۔ وہ گہری نیند سوگیا۔

آنکھ کھلی تو غار کے باہر دھوپ پھیلی تھی۔ وہ غار سے نکلا۔ پودوں کے درمیان دبک کر اس نے جھاڑیوں کی اوٹ سے نیچے دیکھا۔ چادر سے ڈھکی ہوئی حکیم نذر محمد چشتی کی لاش ابھی تک اپنی جگہ موجود تھی۔

لاش کی نگرانی پر تعینات رات والے دونوں کانسٹیبل جاچکے تھے۔ مگر انسپکٹر موجود تھا۔ اس کے ہم راہ پانچ کانسٹیبل بھی تھے اور لالی بھی تھا۔

رحیم داد نے پہلی ہی نظر میں لالی کو پہچان لیا۔ لالی کا لباس وہی تھا جو لائل پور سے پہن کر آیا تھا۔

اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہ کانسٹیبلوں کے درمیان خاموش کھڑا تھا۔ قریب ہی انسپکٹر مٹی کے تودے پر بیٹھا تھا۔ وہ گردن جھکائے مشیر نامہ لکھنے میں مصروف تھا۔ لکھتے لکھتے اس نے گردن اٹھائی اور ایک کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ کانسٹیبل نے بڑھ کر لاش پر پڑی ہوئی چادر ہٹادی۔ انسپکٹر کی ہدایت پر لالی لاش کے قریب گیا۔ اس نے جھک کر لاش دیکھی، پھر انسپکٹر کی جانب مڑ آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ انسپکٹر اس سے سوالات کرتا رہا۔ لالی جوابات دیتا رہا۔ رحیم داد اتنی دور بیٹھا تھا کہ دونوں کی بات چیت بالکل نہیں سن سکا۔ مگر یہ اندازہ ہوگیا کہ لالی نے لاش اسی کی بتائی ہے۔

لاش پھر ڈھانک دی گئی۔ انسپکٹر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ابھی اس کی تفتیش ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے گھوم پھر کر لاش کے آس پاس کی جھاڑیوں کا معائنہ کیا اور ٹیلے کے نیچے کھڑے ہو کر دیر تک اوپر دیکھتا رہا۔

رحیم داد نے اسی ٹیلے سے حکیم کے چہرے پر بھاری پتھر پھینکا تھا۔

انسپکٹر دو کانسٹیبلوں کے ہم راہ ٹوبھے کی جانب بڑھا۔ اسے اپنی سمت آتا دیکھ کر رحیم داد گھبرا گیا۔ اس نے جھٹ گردن نیچے کی اور دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا غار میں چلا گیا۔ وہ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانس بھرنے لگا۔

خوف اور دہشت سے رحیم داد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے کان بھاری بوٹوں کی آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ رحیم داد پچھتانے لگا کہ رات کے اندھیرے میں اس مقام سے دور کیوں نہ چلا گیا۔ تمازت بڑھتی جا رہی تھی مگر ٹیلوں کی پتھریلی زمین پر بوٹوں کی آہٹ نہیں ابھری۔

رحیم داد سہما ہوا بیٹھا رہا۔ نشیب سے رک رک کر مدھم آوازیں ابھرتی رہیں۔ پھر یہ آوازیں بند ہوگئیں۔ گہرا سناٹا چھا گیا۔ لیکن رحیم داد غار سے باہر نہیں نکلا۔ خطرہ ابھی تک سر پر منڈلا رہا تھا۔

سورج چڑھ کر بیچ آسمان پر آگیا۔ دوپہر ہوگئی، گرمی بڑھ گئی۔ رحیم داد غار سے باہر آیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ٹوبھے کے پار دیکھا۔ مگر اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ لاش بھی نہیں تھی۔ جس جگہ لاش پڑی تھی، وہاں پتھروں سے حصار بنا دیا گیا تھا۔

رحیم داد نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں مگر ہر طرف ویرانی تھی۔ اسے اطمینان ہوا۔ چہرے سے خوف کے سائے مٹنے لگے۔ وہ دیر تک جنگلی پودوں کے درمیان بیٹھا رہا، پھر غار میں چلا گیا۔ اس

نے ناشتے دان میں پڑی ہوئی باسی روٹی نکالی۔ اسے کھا کے تھرماس سے پانی پیا۔ اب ناشتے دان بالکل خالی تھا لیکن تھرماس میں تھوڑا سا پانی موجود تھا۔ وہ پھر لیٹ گیا اور شام کے اندھیرے کا انتظار کرنے لگا۔

دن ڈھلے تک وہ سوتا رہا۔ بیدار ہوا تو پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے تھرماس منہ سے لگایا اور اسے خالی کردیا۔

لالی کا دیا ہوا چاقو اس کے پاس موجود تھا۔ اس نے جیب سے چاقو نکالا اور غار کے دہانے سے ذرا ہٹ کے گڑھا کھودا۔ گڑھے میں تھرماس، ناشتے دان، مقتول کی ٹوپی اور سنگھرنی کی پتیوں سے بھرا ہوا تھیلا رکھ دیا۔

اس نے گڑھا مٹی سے بھر دیا۔ جنگلی پودوں کی شاخیں اور پتھروں کے ٹکڑے اس طرح بکھیر دیے کہ گڑھا بالکل چھپ گیا۔

رحیم داد غار میں نہیں گیا۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھا رہا۔ وہ بار بار اس طرف دیکھتا، جہاں اب لاش کی جگہ صرف پتھروں کا حصار رہ گیا تھا۔

سورج کا دہکتا ہوا الاؤ سرد پڑ گیا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں میں پرندے شور مچا رہے تھے۔ پھیکی پھیکی دھوپ غائب ہوتی گئی۔ اندھیرا دم بدم پھیلتا گیا۔ سناٹا بڑھ گیا تھا۔ جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ فراش کے اونچے، اونچے درخت دم بخود نظر آ رہے تھے۔

رحیم داد جھاڑیوں سے باہر نکلا۔ اس نے چوکنّا نظروں سے گردو پیش کا جائزہ لیا۔ دور دور تک کوئی نہ تھا۔

وہ آگے بڑھا اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا ٹیلوں اور ٹبّوں کے درمیان سے گزرنے لگا۔ اس نے میل، سوا میل راستہ طے کیا۔ برساتی نالے کے نشیب میں اترا اور خشک ریت پر چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

برساتی نالا دائیں ہاتھ کو نیم دائرہ بناتا ہوا کچھ دور جا کر اونچے، اونچے ٹیلوں کی اوٹ میں اوجھل ہوگیا تھا۔ وہ اسی طرف مڑ گیا۔ کچھ دور تک ٹیلوں کے درمیان چلتا رہا، اس نے سک نالا عبور کیا اور دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔

سامنے چڑھائی تھی۔ وہ ناہموار راستوں پر چلتا ہوا بلندی پر پہنچ گیا۔ دور دور تک اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبّے پھیلے ہوئے تھے۔

وہ رکا نہیں بلکہ قدموں کی رفتار کچھ اور تیز کردی اور جھاڑیوں اور خود رو جنگلی پودوں کے

درمیان سے راستہ بناتا ہوا آگے' اور آگے بڑھتا گیا۔

ٹیلوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اس نے ٹھٹک کر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور نشیب میں اترنے لگا۔ سامنے کچا راستہ تھا۔ دن میں اس راستے پر آمد و رفت رہتی ہوگی۔ لیکن اس وقت سنسان تھا۔ وہ اس راستے پر چلنے لگا۔

۱۴

شام کا دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔ رحیم داد چلتے' چلتے ایک دم چونکا۔ اسے کچھ فاصلے پر دھندلی' دھندلی روشنی میں سڑک کنارے ایک سائیکل نظر آئی۔ قریب ہی ایک شخص زمین پر بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی تھی۔ آنکھیں اندر دبی ہوئی تھیں۔ اسے دیکھ کر رحیم داد ٹھٹکا۔ اس نے چاہا کہ آگے نکل جائے مگر یہ سوچ کر ٹھہر گیا کہ آگے جانے سے پہلے اس شخص سے راستے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرلے۔ ڈرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ وہ شخص تنہا تھا اور لاغر بھی تھا۔

رحیم داد اس کی جانب بڑھا۔ "میں نے کہا جی! یہ رستہ کدھر جاتا ہے؟"

"یہ رستہ تو تخت ہزارہ جاتا ہے۔" اس شخص نے گردن اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ "تخت ہزارہ جانا ہے تو سدھا چلا جا۔ تجھے وہیں جانا ہے نا؟"

وہ شخص دھیرے دھیرے ہانپتا رہا۔ رحیم داد نے ہمدردی سے دریافت کیا۔ "تسیں کچھ بیمار ہو؟"

"ہاں جی' بیمار ہی ہوں۔ بخار آتا ہے حکیم' ڈاکٹر ٹی۔ بی بتاتے ہیں۔"

"جب اتنا بیمار ہے تو سیکل نہیں چلانی چاہیے۔"

"کہتا تو ٹھیک ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "حکیم نے بھی سیکل چلانے سے منع کیا ہے پر ایک کام ایسا پڑ گیا کہ سیکل اٹھائی اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ قادر آباد گیا تھا۔ اب واپس جا رہا ہوں۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"چک ۵۸' رستے ہی میں پڑتا ہے۔" اس کے لہجے میں عاجزی آگئی۔ "توں ادھر ہی جا رہا ہے۔ سیکل چلانی جانتا ہو تو مجھے چک تک چھوڑ دے۔ تیری مہربانی ہوگی۔ میرا پنڈ بہت دور نہیں۔ تین، ساڑھے تین میل سے زیادہ نہیں ہوگا۔"

رحیم داد کو سائیکل چلانا آتی تھی۔ وہ جلد سے جلد زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا بھی چاہتا تھا۔ اس نے سائیکل کا ہینڈل تھاما' اس شخص سے کہا۔ "آگے بیٹھ جا۔ مجھے بھی اسی طرف جانا ہے۔ تجھے چک ۵۸ پہنچا دوں گا۔"

وہ اپنی پگڑی درست کرتا ہوا اٹھا اور سائیکل پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد سائیکل پر سوار ہوا اور آہستہ آہستہ چلانے لگا۔ سائیکل چلاتے چلاتے رحیم داد نے پوچھا۔ "گھر میں تیرا اور کوئی نہیں جو بیماری میں سیکل چلانی پڑی۔ کوئی تو ہوگا ہی؟"

"نہیں جی' میرا ادھر کوئی نہیں۔ میں بالکل اکیلا ہوں۔ میرا ناں چوہدری نور الٰہی ہے۔ میں گورداس پور کا مہاجر ہوں۔ پچھلے کئی مہینے سے ادھر چک ۵۸ میں ہوں۔"

"تیرے بال بچے تو ہوں گے؟ وہ کہاں ہیں؟"

"یہ نہ پوچھ۔" چوہدری نور الٰہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پورا ٹبر تھا۔ گھر والی تھی۔ دو بیٹیاں تھیں' تین پتر تھے۔ وڈا پتر تو جوان تھا۔ ۱۷ سال کا رہا ہوگا۔ گورنمنٹ سٹی ہائی اسکول' پٹیالہ میں دسویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ اب وہ ۲۵ سال کا ہوتا۔"

"کدھر ہے وہ؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"وہ تریموں کے پتن پر میرے سامنے شہید ہوا۔" نور الٰہی بجھے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ "پاکستان بنا تو میں نصیرپور میں تھا۔ نصیرپور' ضلع گورداس پور کا موضع ہے۔ میں پہلے تو ریاست پٹیالہ کے ضلع نارنول میں تھا۔ محلّہ لوہاراں میں اپنا مکان بھی تھا۔ جب وہاں گڑبڑ مچی تو مہاراجہ کے حکم پر فوج اور پولیس کے سارے مسلمانوں سے ہتیار رکھوا لیے گئے۔ ان کو غیر مسلح کرکے بہادر گڑھ فورٹ میں بھیج دیا گیا۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ لیکن میں وہاں ہفتہ بھر بھی نہ رہا۔ ایک رات جب بارش ہو رہی تھی میں فورٹ سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ میرے ساتھ ریاست کے دو مسلمان فوجی بھی تھے۔"

"ان دونوں کا کیا بنا؟"

"پتہ نہیں رات کے اندھیرے میں کدھر نکل گئے۔" چوہدری نور الٰہی نے رحیم داد کو بتایا۔ "گھر والی اور بچوں کو میں نے پہلے ہی نصیرپور بھیج دیا تھا۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح نصیرپور پہنچ گیا۔ ویسے میں رہنے والا نصیرپور ہی کا ہوں۔ وہاں اپنی زمیں داری تھی۔ شریکے اور کنبے دار تھے۔ پٹیالے میں میں نوکری کرتا تھا۔ پولیس میں حوالدار تھا۔ اس وقت سب یہی کہتے تھے گورداس پور تو پاکستان کے حصے میں آئے گا۔ مسلمان تھے بھی وہاں زیادہ' پر نصیرپور کے آس پاس دس باراں میل تک سکھوں کی بستیاں تھیں۔ مسلمانوں کو ذرا بھی فکر نہ تھی۔ مسلمان افسر تو اتنے جوش میں تھے کہ انھوں نے سرکاری دفتروں پر پاکستانی جھنڈے لہرا دیے۔ فیر ایسا ہوا جی نصیرپور والے عید کا چاند دیکھ رہے تھے۔ اتیسواں یا تیسواں روزہ تھا۔ ٹھیک سے کچھ یاد نہیں۔ بیماری سے اب تو دماغ بھی کام نہیں کرتا پر اتنا ضرور یاد ہے۔ میں چھت پر ممٹی کے پاس کھڑا چاند دیکھ کر دعا مانگ رہا تھا۔ ابھی میں نے دعا ختم بھی نہیں کی تھی کہ سکھوں کی بستیوں کی طرف سے بہت زور کے دھماکے ابھرے۔"

وہ آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ ذرا قرار آیا تو بتانے لگا۔ "میں نے گھبرا کر دیکھا' سامنے رڑی میں پنڈ کا ایک نوجوان تیزی سے سیکل دوڑاتا چلا آرہا ہے۔ اس کے کپڑوں پر خون ہی خون تھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اور زور زور سے چیخ رہا تھا۔ فساد ہوگیا' فساد ہوگیا۔ شور سن کر پنڈ کے لوگ اس کے اردگرد اکٹھے ہونے لگے۔ میں باہر جانے کے لیے بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں' مغرب کی طرف گرد کے بادل اٹھ رہے ہیں۔ سکھوں کے غول کے غول گھوڑے دوڑاتے ادھر ہی آرہے ہیں۔ سکھوں کی بستیوں سے بھی ڈھول اور سنکھ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔

"میری گل سن رہا ہے؟"

رحیم داد نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر آہستہ سے کہا۔ "سن رہا ہوں۔" اسے نور الٰہی کی باتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ منٹگمری میں مدت تک مہاجر کیمپ قائم رہ چکا تھا۔ ضلع بھر میں مہاجر جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔

رحیم داد ان لٹے پٹے مہاجرین سے مل چکا تھا۔ ان کی زبانی سکھوں اور ہندوؤں کے حملوں کی ایسی ہی ہولناک داستانیں سن چکا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر سائیکل چلاتا رہا۔

"ہاں تو جی' میں یہ کہہ رہا تھا۔" نور الٰہی چند لمحے خاموش رہ کر گویا ہوا۔ "میں چھت سے اتر کر بھاگتا ہوا رڑی میں پہنچا۔ پنڈ کے سارے ہی لوگ بھاگ کر وہاں پہنچ رہے تھے۔ سب پریشان اور گھبرائے ہوئے تھے۔ پورے پنڈ میں کسی کے پاس ایک بھی بندوق نہیں تھی۔ صرف برچھیاں'

کلھاڑیاں اور ڈانگیں تھیں۔ انھی کو لے کر سب نے پنڈ کی حفاظت کے لیے فٹافٹ تمام ناکوں پر مورچے سنبھال لیے۔ سکھ حملہ آور گھوڑے دوڑاتے چلے آ رہے تھے۔ وہ نزدیک آ گئے پر انھوں نے حملہ نہیں کیا۔ وہ پنڈ سے کوئی فرلانگ بھر دور ٹھہر گئے۔ نہ وہ آگے بڑھے نہ نصیرپور والوں نے انھیں للکارا۔ حملہ آور تعداد میں پنج سو سے اوپر رہے ہوں گے۔ ادھر مسلمان تین سو سے بھی کم تھے۔ نہ بندوق تھی نہ کسی کے پاس پستول تھا۔" نورالٰہی نے گہری سانس بھری۔ "حملہ آور چپ کر کے کھڑے تھے۔ ان کے گھوڑے زور زور سے ہنہنا رہے تھے۔ سکھ بستیوں سے ڈھول اور سنکھ کی آوازیں مسلسل ابھر رہی تھیں۔"

"چوہدری' انھوں نے حملہ کیوں نہیں کیا؟"

"وہ جی ڈر گئے تھے۔ اس مغالطے میں رہے کہ نصیرپور کے مسلمانوں کے پاس بہت اسلحہ ہے۔ ان کا خیال غلط بھی نہیں تھا۔ گورداس پور کے مسلمانوں کے لیے اسلحہ پہنچا بھی تھا۔ اس میں زیادہ تعداد میں رائفلیں اور بندوقیں تھیں۔ ضلع کا ایس پی مسلمان تھا۔ پر گورداس پور کے لیگیوں نے یہ اسلحہ مسلمانوں کو دینے کی بجائے ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں بیچ دیا۔ مسلمانوں کے پاس ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلے میں اتنا پیسہ ہی کہاں تھا۔ انھوں نے چندا کر کے جو اسلحہ حاصل کیا' وہ بھی ہندوؤں اور سکھوں کو منہ مانگے دام دے کر خریدا تھا۔ ذرا غور تو کر۔ کیسا ظلم ہوا۔ انھی دنوں مجھے کسی نے بتایا بٹالہ کے ایک سکھ زمیں دار نے کسی مسلم لیگی سے رائفل خریدی اور قیمت اپنے گھر چل کر دینے کے بہانے اسے ایک ویران جگہ لے گیا۔ وہاں اس نے کرپان نکالی اور پیسے دینے کی بجائے اس بے غیرت کے پیٹ میں پوری اتار دی۔ وہ وہیں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ ٹھیک ہی ہوا۔ ایسوں کو ایسی ہی سزا ملنی چاہیے۔"

رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ "چوہدری! توں تو سکھ حملہ آوروں کی گل کر رہا تھا؟"

"ہاں جی' یاد آ گیا۔" نورالٰہی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بتایا۔ "ہوا یہ کہ سکھ حملہ کرنے سے ڈر رہے تھے اور ادھر مسلمان انتظار میں تھے' سکھ حملہ کریں تو وہ بڑھ کر ان کا مقابلہ کریں۔ اس شش و پنج میں بہت دیر ہو گئی۔"

وہ کھانسنے لگا۔ "فیر ایک عجب گل ہوئی۔ نصیرپور میں ایک سائیں جی تھے۔ وہ پنڈ کے قبرستان کی دیکھ بھال کرتے تھے اور اس کے پاس ہی جھگی میں رہتے تھے۔ بالکل اکیلے تھے' نہ گھر والی نہ بچے۔ پنڈ والے جو دیتے' وہی کھا پی کر گزارا کرتے۔ ادھر تو سب ڈرے سہمے ہوئے تھے۔ ادھر کیا دیکھتے ہیں' سائیں جی کندھے پر تلوار رکھے ایک طرف سے نکلے۔ بڑے زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ پنڈ

والوں کی طرف منہ کیا' ڈپٹ کر انھیں للکارا۔ اوئے تسیں' مسلمان ہو کر ڈرتے ہو۔ میں اللہ کا نام لے کر اکیلا ہی حملہ کروں گا۔ میرے رب نے چاہا تو سب حملہ آوروں کو بھگا دوں گا۔ سائیں جی نے دوبارہ نعرہ تکبیر بلند کیا اور تیزی سے حملہ آور سکھوں پر جھپٹے۔ سائیں جی کو اکیلے بڑھتے دیکھا تو پنڈ کے مسلمانوں کی غیرت بھی جاگ اٹھی۔ سو جوانوں کو پنڈ کی حفاظت پر لگا کر سب سائیں کے پیچھے پیچھے چلے' پر سائیں جی پہلے ہی حملہ آور سکھوں کے سروں پر پہنچ چکے تھے۔ گھوڑے زور زور سے ہنہنانے لگے۔ گرد کے بادل اٹھنے لگے۔ نزدیک جا کر دیکھا تو حملہ آور بھاگ چکے تھے۔ تین چار سکھ خون میں لت پت زمین پر پڑے تھے۔ سائیں جی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ذرا دیر بعد دور سے سائیں کی آواز آئی' بڑھے چلے آؤ۔ نکل کر جانے نہ دینا۔ پنڈ والے آگے بڑھے۔ پر حملہ آور اپنے گھوڑے بھگاتے دور جا چکے تھے۔ سائیں جی تلوار سونتے ان کے پیچھے دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ سب نے پکار کر انھیں آگے جانے سے روکا۔ سائیں واپس ہوئے تو جگہ جگہ سے ان کا بدن زخمی تھا۔ زخموں سے لال لال خون بہہ رہا تھا۔ انھوں نے اپنے سر پر بڑی سی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ اس پر بھی خون کے دھبے تھے۔ مگر زخمی ہونے پر بھی سائیں کا حوصلہ ویسا ہی تھا۔ وہ تو یہ چاہتے تھے' پٹیالے کی ملٹری پہنچنے سے پہلے پہلے آس پاس کی سکھ بستیوں پر چڑھائی کر دی جائے تاکہ انھیں دوبارہ حملے کی جرات نہ ہو' پر پنڈ کے دوسرے مسلمان تیار نہیں ہوئے۔"

رحیم داد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "سائیں بہت زور آور تھا۔ اکیلے نے اتنے بہت سے سکھوں کو بھگا دیا۔"

"ہاں جی' بہت زور آور تھا۔" نورالٰہی نے اس کی تائید کی۔ "حملہ آوروں کو بھگانے کے بعد آگے کا حفاظتی پروگرام طے کیا جا رہا تھا کہ دور سے تیز روشنیاں دکھائی دیں۔ یہ روشنیاں اس طرف سے نہیں ابھر رہی تھیں جدھر سکھ حملہ آور بھاگ کر گئے تھے۔ یہ ریاست پٹیالہ کی ملٹری تھی۔ سکھ فوجی جیپوں اور لاریوں پر مشین گنیں لگائے نصیرپور کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جیسے ہی ریاستی ملٹری کے حملے کا پتہ چلا' سب تیزی سے پنڈ کی طرف لوٹے۔ پر مسلح ملٹری کا حملہ کون روک سکتا تھا۔ سمجھ نہیں آتی تھی کیا کریں۔ فوجی جیپوں اور لاریوں کی تیز روشنی دم بہ دم نزدیک آتی جا رہی تھی۔ ملٹری کا نام سن کر بوڑھے' بچے اور زنانیاں' سبھی گھروں سے نکل نکل کر باہر آ گئے۔ موت سروں پر منڈلا رہی تھی۔ سب گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگے۔"

"ریاستی ملٹری آئی بھی کہ نہیں؟"

"آئی تھی' بالکل آئی تھی۔ پر گیانی ہرنام سنگھ نے سب کو بچا لیا۔"

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”ہرنام سنگھ بھی تو سکھ ہی تھا ناں؟“

”ہاں جی۔ وہ سکھ ہی تھا۔“ نور الٰہی نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”وہ بوڑھا سکھ تھا اور نصیرپور ہی میں رہتا تھا۔ ملٹری کو اس نے نصیرپور کی طرف آتے دیکھا تو بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا اور چیخ چیخ کر سب سے کہنے لگا۔ اوئے مسلو! فٹافٹ چھپ جاؤ۔ فصلوں میں گھس کر بیٹھ جاؤ۔ ریاستی ملٹری حملہ کرنے آ رہی ہے۔ جھیتی کرو جھیتی‘ میں منت کر کے سکھ فوجیوں کو واپس بھیج دوں گا۔ اس کے مشورے پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ سب کھیتوں کی جانب دوڑے اور فصلوں میں گھس کر اندھیرے میں چھپ گئے۔ فوجی جیپیں اور لاریاں دھیرے دھیرے نزدیک آتی گئیں۔ پنڈ کے نزدیک پہنچ کر رک گئیں۔ گیانی ہرنام سنگھ اندھیرے سے نکل کر سکھ کمانڈر کی جانب بڑھا۔ ادھر پنڈ کے سارے مسلمان فصلوں میں دبکے سانس روکے بیٹھے تھے۔ ماؤں نے بچوں کے منہ ہاتھوں سے دبا رکھے تھے تاکہ کسی بچے کے رونے اور بولنے کی آواز نہ ابھرے۔ ادھر بوڑھا ہرنام سنگھ فریادیوں کی طرح گلے میں پگڑی ڈالے سکھ فوجی کمانڈر کے آگے ہاتھ جوڑے گڑگڑا رہا تھا۔ سردار جی! پنڈ کے سارے ہی مسلے چلے گئے۔ یہاں سے جاتے ہوئے انھوں نے اپنے سامان کو بھی آگ لگا دی‘ کچھ بھی نہ چھوڑا۔ کمانڈر جیپ سے اترا اور آگے بڑھ کر غصے سے ہرنام سنگھ کے منہ پر دو تین چپیڑیں ماریں۔ چیخ کر بولا۔ بڈھے کھوسٹ‘ تو نے فوراً ہمیں اطلاع کیوں نہیں پہنچائی؟ ہم سارے مسلوں کو ختم کر دیتے‘ انھیں نکل کر نہ جانے دیتے۔ ہرنام سنگھ مار کھا کر بھی گڑگڑاتا رہا‘ معافی مانگتا رہا۔ اس کے سر کے کیس کھل کر بکھر گئے تھے۔ وہ رو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سکھ فوجی گالاں نکالتے ہوئے جدھر سے آئے تھے‘ اسی طرف لوٹ گئے۔“

”ہرنام سنگھ بہت نیک بندہ تھا۔“ رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

”بہت ہی نیک بندہ تھا جی۔ ملٹری کے جاتے ہی زور کی بارش شروع ہو گئی۔ کھیتوں سے باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ سب بھوکے پیاسے بھی تھے۔ بوڑھا ہرنام سنگھ ایک ایک کھیت کے اندر جاتا۔ کھانے کو روٹی پہنچاتا۔ زنانیوں کو تسلی دیتا۔ بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیرتا۔ سب کے حوصلے بڑھاتا۔ کہتا‘ فکر نہ کرو۔ حوصلے سے کام لو۔ واہ گرو کی کرپا سے سب ٹھیک ہی ہو گا۔ روٹی کھلا کر وہ سائیں جی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دونوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔“ نور الٰہی نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”خطرہ ابھی تک سروں پر منڈلا رہا تھا۔ ریاستی ملٹری کو آس پاس کی بستیوں کے سکھوں سے خبر ہو سکتی تھی کہ نصیرپور کے مسلمان ابھی تک پنڈ میں موجود ہیں۔ یہ خبر ملتے ہی سکھ فوراً لوٹتے اور کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑتے۔ یہ خطرہ محسوس کرتے ہوئے سائیں جی اور گیانی ہرنام سنگھ نے اسی

ت پنڈ سے نکل بھاگنے کی سکیم بنائی۔ جو جس حالت میں تھا‘ ویسے ہی چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ب قافلہ بنا کر نصیرپور سے نکلے۔ مڑ مڑ کر گھروں کو دیکھتے اور پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے۔ سائیں ی اور ہرنام سنگھ تلواریں اٹھائے آگے‘ آگے چل رہے تھے۔ بارش اب رک گئی تھی۔ قافلہ رات کے اندھیرے میں آگے بڑھ رہا تھا۔ چلتے چلتے ہم تریموں کے پتن پر پہنچ گئے۔ سامنے راوی بہ رہا تھا اور اس پار پاکستان کی سرحد شروع ہوتی تھی۔“

”چوہدری! تیری گھر والی اور بچے بھی ساتھ ہی تھے؟“

”تریموں کے پتن تک تو ساتھ ہی تھے۔“ نور الٰہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”ہم نے صرف راوی پار کرنا تھا۔ پر راوی پار کرنا آسان نہیں تھا۔ پتن پر صرف چند بیڑیاں اور کشتیاں تھیں۔ ملاح دریا کے اس پار لے جانے کے سو روپے فی سواری مانگتے تھے۔ ادھر مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ بھی لٹے پٹے تھے۔ جیبوں میں چند روپے تھے یا تمباکو اور نسوار کی تھیلیاں تھیں۔ ملاح بھی مسلمان تھے۔ پر وہ تو زیادہ سے زیادہ کمائی پر لگے تھے۔ ایسے ظالم اور بے درد تھے‘ جب مسافر منہ مانگا کرایہ دینے پر جھگڑا ٹنٹا کرتے تو وہ بیڑی بیچ دریا میں کھڑی کر دیتے۔ اوپر سے تیز بارشیں ہو رہی تھیں۔ دریا چڑھا ہوا تھا۔ لہروں کے تیز بہاؤ میں ملاحوں کی ان بدمعاشیوں سے تین بیڑیاں تو میرے سامنے ڈوبیں۔ کہتے ہیں ان میں ۱۹۲ مسافر تھے۔ صرف ۱۴ بچے۔ دوسرے سب دریا کے پیٹ میں چلے گئے۔“ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ڈلہوزی سے بٹالے تک جتنے بھی مسلمان تھے‘ ان کے لیے پاکستان پہنچنے کا یہی رستہ تھا۔ ویسے گرداسپور کے کتنے ہی لٹے پٹے قافلے داؤد کے پتن بھی پہنچے‘ پر وہاں امرتسر سے آنے والے زیادہ تھے۔ ملاح ادھر بھی اسی طرح تنگ کرتے تھے۔ راوی کے پار پہنچانے کے لیے اپنی مرضی کا کرایہ وصول کرتے تھے۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔

”تریموں کے پتن کا ان دنوں حال یہ تھا کہ ندی کنارے ہزاروں مسلمان پڑے تھے۔ روز نئے قافلے پہنچتے تھے۔ میرے پاس اس وقت اچھی خاصی رقم تھی۔ میں ملاحوں کو کرایہ دے کر دریا کے ار اپنے ٹبر کے ساتھ جا سکتا تھا۔ پر سب نے منع کیا اور ناراض ہوئے کہ تم اپنے فائدے کے لیے دوسرے غریب بندوں کا بیڑا غرق کر دینا چاہتے ہو۔ ساتھ ہی یہ خبریں بھی سننے میں آ رہی تھیں کہ حکومت پاکستان نے کشتیاں اور ملٹری کے سٹیمر بھیجے ہیں‘ جو مہاجرین کو مفت دریا پار پہنچا دیں گے۔“

سڑک کے دونوں جانب ربیع کی فصلیں تھیں‘ جن میں ہوا کے جھونکوں سے رک رک کر

سر سراہٹیں ابھر رہی تھیں۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ رحیم داد چپ چاپ سائیکل چلاتا رہا۔ نورالٰہی آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ”روز کشتیوں اور سٹیمروں کا انتظار کیا جاتا۔ پر نہ کشتیاں اور بیڑیاں آتیں نہ سٹیمر۔ دوسری طرف تریموں کے پتن پر لٹ پٹ کر آنے والے مسلمانوں کی تعداد ہر روز بڑھتی جا رہی تھی۔ پتن پر دریا کے کنارے جہاں تک نظر جاتی، بندے ہی بندے نظر آتے۔ ان میں بوڑھے تھے، جوان تھے، زنانیاں تھیں اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ بارش تھم جاتی۔ پھر شروع ہو جاتی اور مسلسل ہوتی رہتی۔ کہیں چھپنے کی جگہ نہیں تھی۔ سب کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے بھیگتے رہے، کشتیوں، سٹیمروں کا انتظار کرتے رہے۔ ملاح پار لے جانے کا کرایہ کم کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھے۔ وہ تو دبا کے کمائی کر رہے تھے۔ تباہ حال مہاجرین کی بے بسی اور پریشانی سے خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ کئی بار مغربی پنجاب کی حکومت کے ہوائی جہاز بھی دریا کے اوپر اڑتے دکھائی دیے۔ کسی نے بتایا، اس میں وزیر سوار ہیں۔ پتن پر پڑے ہوئے مہاجروں کا معائنہ کرنے آئے ہیں۔ جب بھی جہاز نظر آتے ہر طرف یہ خبریں پھیل جاتیں سرکاری بیڑیاں اور کشتیاں آنے والی ہیں۔“

وہ کچھ دیر کے لیے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ آخر نورالٰہی کی آواز ابھری۔ ”اس روز بارش تھمی ہوئی تھی۔ آسمان بالکل صاف اور نیلا نیلا نظر آ رہا تھا۔ سورج ایسے چمک رہا تھا جیسے آگ برسا رہا ہو۔ بہت سخت گرمی تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اچانک دور سے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنائی پڑی۔ ذرا دیر بعد سکھوں کے غول کے غول گھوڑے دوڑاتے نظر آئے۔ دو ہزار سے زیادہ ہی تھے، کم نہیں۔ حملہ آوروں کو دیکھتے ہی جس کا جدھر منہ اٹھا، بھاگا اور نزدیک کے کھیتوں میں گھس گیا۔ میں بھی بھاگ کر فصلوں میں چھپ گیا۔ ہر طرف سے چیخنے چلانے اور زنانیوں اور بچوں کے رونے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ میں کھیت میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ سکھ حملہ آور خون میں ڈوبی ہوئی تلواریں اٹھائے، بندوقوں سے گولیاں چلاتے اپنے گھوڑوں سے کھیت روندتے پھر رہے تھے۔ جو نظر آتا، اسے قتل کر دیتے۔ پتہ نہیں، میں کیسے بچ گیا۔ وہیں مر جاتا تو ٹھیک تھا۔“

چوہدری نورالٰہی کے لہجے میں درد کی چبھن تھی۔ اس نے لمبی سانس لی۔ ”سورج ڈوبا تو میں کھیتوں سے باہر نکلا۔ اب حملہ آور جا چکے تھے۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ زخمی خون میں ڈوبے ہوئے تڑپ رہے تھے، کراہ رہے تھے۔ زنانیوں اور بچوں کے رونے اور سسکیاں بھرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں لاشوں اور زخمیوں کے درمیان ادھر ادھر پاگلوں کی

طرح گھوم رہا تھا۔ اپنے بال بچوں کو تلاش کر رہا تھا۔ پتن کے پاس سائیں جی اور گیانی ہرنام سنگھ زخموں سے چور پڑے تھے۔ دونوں مر چکے تھے۔ وہ آخر دم تک حملہ آوروں کے سامنے ڈٹے رہے۔ نزدیک ہی میرا وڈا پتر کرم الٰہی پڑا تھا۔ وہ تب تک زندہ تھا اور بے چینی سے ادھر ادھر گردن ہلا رہا تھا۔ میں اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا، کراہتے ہوئے بولا۔ وہ، وہ صابرہ کو لے گئے۔ وہ مجھے پکارتی رہی پر میں اسے بچا نہیں سکا۔ وہ اسے لے گئے۔ صابرہ میری ۱۲سال کی جوان بیٹی تھی۔ سکھ حملہ آور اسے اٹھا کر لے گئے۔ کرم الٰہی یہی بتانے کے لیے زندہ تھا۔ اس نے میرے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔“ نورالٰہی گلوگیر ہو گیا۔

رحیم داد ہمدردی کا اظہار بھی نہ کر سکا۔ وہ پھولی ہوئی سانس سے پیڈلوں پر پیر مارتا سائیکل دوڑاتا رہا۔ نورالٰہی نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بتایا۔ ”شام ہو گئی تھی۔ میں کھیتوں کے اندر گھس گیا اور اندھیرے میں اونچی آواز سے گھر والی اور بچوں کو پکارنے لگا، پر گھر والی یا بچوں میں سے کسی کی آواز سنائی نہ دی۔ کچھ ہی دیر بعد پھر شور مچا، سکھ حملہ کرنے آ رہے ہیں۔ دور سے گھوڑوں کے دوڑنے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ پتن پر ایک بیڑی کھڑی تھی۔ ملاح دریا پار لے جانے کے اڑھائی سو روپے مانگتے تھے۔ میں نے ایک بار پھر چیخ چیخ کر گھر والی اور بچوں کے نام لے کر ہانک لگائی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ اب صاف سنائی پڑ رہی تھیں۔ میں نے ملاح کے ہاتھ میں کرائے کے اڑھائی سو روپے رکھے اور بیڑی میں سوار ہو گیا۔ اس طرح میں سب کچھ لٹا کر پاکستان پہنچا۔“ نورالٰہی چپ ہو گیا۔

☆

سائیکل کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے کچے راستے پر دوڑ رہی تھی۔ کچھ دور آگے جا کر گاؤں کے گھروں میں جلنے والے چراغوں کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ روشنیاں دیکھ کر نورالٰہی نے کہا۔

”لو جی، چک ۵۸ آ گیا۔“

رحیم داد سائیکل چلاتا ہوا گاؤں میں داخل ہوا۔ نورالٰہی راستہ بتاتا رہا۔ اس کا گھر گاؤں کے شروع ہی میں تھا اور الگ تھلگ بھی تھا۔ گھر کے آس پاس نیم اور شیشم کے گھنے درخت تھے۔ گھر کے قریب پہنچ کر رحیم داد نے سائیکل ٹھہرالی۔ دونوں نیچے اترے۔ دروازے پر تالا تھا۔ نورالٰہی نے تالا کھولا۔

دونوں اندر داخل ہو گئے۔ چھوٹا سا مکان تھا۔ ایک کمرہ اور اس کے ساتھ کوٹھری تھی۔ کمرے

کے آگے برآمدہ تھا جس پر پھوس کا چھپر تھا۔ البتہ آنگن کشادہ اور کھلا ہوا تھا۔ گھر پر ویرانی چھائی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ نورالٰہی نے سائیکل اپنے ہاتھ میں سنبھالی اور چھپر کے نیچے ایک طرف دیوار سے ٹکا کر کھڑی کردی۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولا' اندر گیا۔ طاق سے ماچس اٹھائی اور لالٹین روشن کردی۔

دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہوکر نورالٰہی نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "باہر کیوں کھڑا ہے۔ اندر آجا۔ ذرا دیر آرام کرلے فیر چلا جانا۔"

رحیم داد چپ چاپ کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں چارپائی بچھی تھی۔ اس پر ملگجا بستر تھا۔ بستر کے قریب کی دیوار میں طاق تھا۔ طاق میں دوا کی دو شیشیاں رکھی تھیں۔ کوٹھری کا دروازہ بھی کمرے ہی میں کھلتا تھا مگر اس وقت بند تھا۔

کوٹھری سے ذرا ہٹ کر روشن دان جیسی کھلی کھڑکی تھی جس پر حفاظت کے لیے درختوں کی سوکھی شاخیں کیلوں سے جڑی ہوئی تھیں۔ کھڑکی کے باہر گہرا اندھیرا تھا۔ کھڑکی سے ہلکے ہلکے جھونکے آرہے تھے۔ پھر بھی کمرے میں گرمی تھی۔ نورالٰہی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہاں گرمی تو ہے پر میں یہیں سوتا ہوں۔ مجھے بخار رہتا ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر ماتھے پر رکھا۔ "اس وقت بھی بخار ہے۔ زیادہ ہی تیز لگتا ہے۔" وہ آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ "ٹی بی بھی بہت موذی روگ ہے۔ ایک بار لگ جائے فیر نہیں جاتا۔"

رحیم داد کو شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے نورالٰہی سے پوچھا۔ "چوہدری! گھر میں پانی تو ہوگا؟"

"ضرور ہوگا۔" اس نے کونے میں رکھے ہوئے گھڑے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ رہا پانی' پوری طرح پیاس بجھالے۔ مجھے بھی پانی پلا دے۔"

رحیم داد گھڑے کے پاس گیا۔ قریب ہی المونیم کا گلاس رکھا تھا۔ اس نے گلاس اٹھا کر پانی سے بھرا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔ گلاس میں دوبارہ پانی انڈیلا اور اسے لے کر نورالٰہی کے قریب پہنچا۔ نورالٰہی نے گلاس لیتے ہوئے رحیم داد کو مشتبہ نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے پوچھا۔ "تیری قمیص کی آستین اور شلوار پر یہ خون کیسا لگا ہے؟" وہ چند لمحے اسے غور سے دیکھتا رہا۔ "مجھے قادر آباد میں پتہ چلا تھا کہ نہر پاری دو آب کے اس پار ادھر نبوں پر ایک مفرور قیدی کو کسی نے قتل کردیا۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی۔ "تیرا تو اس واردات میں کوئی ہاتھ نہیں؟" نورالٰہی کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

رحیم داد کا چہرہ فق ہوگیا۔ مگر اس نے خود کو سنبھال لیا' مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "نہیں چوہدری ایسی کوئی گل نہیں۔" وہ مڑا اور دیوار کے قریب رکھے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

نورالٰہی گلاس منہ سے لگا کر دھیرے دھیرے پانی پینے لگا۔ وہ نظریں اٹھا کر بار بار رحیم داد کو دیکھتا رہا۔ پانی پی کر اس نے گلاس فرش پر رکھ دیا۔ یکایک کھانسی کا ٹھسکا لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام کر دیر تک کھانستا رہا۔ کھانستے کھانستے نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ لمبی لمبی سانس بھر رہا تھا اور خاصا بے چین نظر آرہا تھا۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ نورالٰہی کو قرار آگیا تھا مگر اس نے رحیم داد سے بات نہیں کی۔ خاموش لیٹا رہا اور نظریں اٹھائے چھت تکتا رہا۔ باہر اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ سکوت زیادہ دیر نہیں رہا۔ باہر دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوئی۔ ساتھ ہی آنگن میں کسی کی چاپ سنائی دی۔

نورالٰہی نے کروٹ بدل کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ دھیرے سے بولا۔ "جیناں روٹی لے کر آئی ہے۔" اس نے کوٹھری کے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ "کوٹھری میں چلا جا۔"

رحیم داد نے گھبرا کر اسے دیکھا' اٹھا اور کوٹھری میں داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ وہ خوف زدہ اور سہما ہوا تھا۔ اسے جیناں کی آواز سنائی دی۔ وہ کمرے میں پہنچ کر نورالٰہی سے کہہ رہی تھی۔ "چوہدری! توں نے بہت دیر کردی۔ میں روٹی لے کر پہلے بھی آئی تھی۔"

"ہاں' واپسی میں کچھ زیادہ دیر ہوگئی۔"

"کچھ پتہ چلا؟" جیناں نے پوچھا۔ "توں قادر آباد اپنی گھر والی اور بچوں کا کھوج لگانے ہی تو گیا تھا ناں؟"

"ہاں جیناں! انھی کو دیکھنے گیا تھا۔" نورالٰہی کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔ "پر اس دفعہ بھی کوئی پتہ نہیں چلا۔ اطلاع صحیح نہیں تھی۔"

"تم نوں کس نے بتایا تھا وہ ادھر قادر آباد میں ہیں؟"

"کل دن ڈھلے میں نمبردار کی ماڑی پر گیا تھا۔ وہاں قادر آباد کا سٹیشن ماسٹر بھی موجود تھا۔ وہ بھی مہاجر ہے۔ اسی نے بتایا تھا' گورداس پور کے کچھ مہاجر خاندان ٹرین سے پہنچے ہیں۔ سٹیشن کے یک ہی درختوں کے نیچے انھوں نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ ان میں ایک لاوارث زنانی ہے۔ ساتھ میں بچے بھی ہیں۔ سٹیشن ماسٹر نے کسی کا نام شام تو بتایا نہیں۔ میں نے سوچا کہیں وہ میرے ہی بال بچے نہ ہوں۔" نورالٰہی چند لمحے خاموش رہا۔ "وہ نبی پور کے نکلے۔ میرا پنڈ تو نصیر پور تھا۔"

"چوہدری! توں نے ان سے اپنی گھر والی اور بچوں کے لیے پوچھا تو ہوتا۔"

”پوچھا تھا۔ ان کے بارے میں انہیں کچھ خبر نہیں۔ آٹھ دس میل کا چکر ہو گیا۔ نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”توں اس طرح کب تک انھیں ڈھونڈتا رہے گا؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے‘ وہ تریموں کے پتن پر مارے گئے۔“

”ایسا نہ کہہ جیناں!“ نورالٰہی نے تڑپ کر کہا۔ ”میں انھی سے ملنے کی امید پر زندہ ہوں۔ ہر جگہ انھی کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے‘ ایک نہ ایک روز وہ ضرور مل جائیں گے۔ یہ تو مجھے پتہ ہے گھر والی بچوں کے ساتھ پاکستان پہنچ گئی تھی۔ اسے لہور کے والٹن کیمپ میں میرے گاؤں والوں نے دیکھا بھی تھا۔ میں ان دنوں منٹگمری کے مہاجر کیمپ میں تھا۔“

”توں یہ گل پہلے بھی بتا چکا ہے۔ پر یہ تو سوچ‘ اٹھ برس ہو گئے۔ وہ تجھے اب تک کیوں نہیں ملے؟ ویسے جو تیری مرضی‘ پر بیماری میں سیکل نہ چلایا کر۔ تیری طبیعت اور گڑبڑ ہو جائے گی۔ دیکھ تو کتنا کمزور اور بیمار لگ رہا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہے۔ مجھے سیکل نہیں چلانی چاہئے۔ پر کیا کروں‘ جب سے سٹیشن ماسٹر سے بات ہوئی تھی‘ تب سے بے چین تھا۔ رات بھر نیند نہیں آئی۔ سویرے اٹھتے ہی سیکل اٹھائی اور قادر آباد روانہ ہو گیا پر واپسی میں بہت مشکل پڑی۔ جگہ جگہ ٹھہر کر آرام کرتا رہا۔ تبھی تو اتنی دیر ہو گئی۔“

چوہدری نور الٰہی نے گہری سانس بھری۔ ”اب تو جا۔ میں ذرا دیر بعد روٹی کھاؤں گا۔ ابھی بھوک نہیں ہے۔“

جیناں چلی گئی۔ رحیم داد نے کوٹھری کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ نورالٰہی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلالیا۔ رحیم داد چپ چاپ کوٹھری سے باہر آگیا۔ اس کا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ کوٹھری میں سخت حبس تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی برس رہی تھی۔ وہ قریب آیا تو نورالٰہی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”حوصلے سے کام لے‘ جو ہونا تھا ہو گیا۔ فکر نہ کر‘ میرا گھر بہت محفوظ ٹھکانا ہے۔ پنڈ سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ یہاں کوئی آتا جاتا بھی نہیں۔ صرف جیناں روٹی لے کر آتی ہے۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”میری طرف سے اطمینان رکھ۔ ویسے میں تیرے کپڑوں پر خون کے دھبے دیکھتے ہی تاڑ گیا تھا کوئی واردات کرکے آیا ہے۔ ۱۸ سال سے اوپر پولیس کی نوکری کی۔“ اس نے آہ سرد کھینچی۔ ”پر اب تو بیماری نے کھوکھلا کرکے رکھ دیا ہے۔“ رحیم داد چپ کھڑا رہا۔ نورالٰہی ذرا دیر خاموش رہ کر

دیا ہوا۔ ”یوں کب تک کھڑا رہے گا؟“ اس نے موڑھے پر رکھی ہوئی چنگیری کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ روٹی رکھی ہے۔ تو بھی کھا اور مجھے بھی کھلا دے۔“ اس نے گردن موڑ کر باہر صحن میں دیکھا۔ ”پہلے باہر جا کر دروازے کی زنجیر لگا دے۔ اب دروازہ بند ہی رکھنا پڑے گا۔“

رحیم داد کمرے سے گیا اور باہر کھلنے والے دروازے کی کنڈی لگا دی۔

☆

نورالٰہی بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے چنگیری اٹھائی اور نورالٰہی کے سامنے رکھ دی۔ چنگیری میں تین روٹیاں اور ساگ تھا۔ نورالٰہی نے دو روٹیاں اٹھائیں اور ان پر ساگ رکھ کر رحیم داد کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میرے لیے ایک روٹی کافی ہے۔ بھوک ہی نہیں لگتی۔ منع بھی کرتا ہوں پر جیناں نہیں مانتی۔ کہتی ہے‘ چوہدری! خوب پیٹ بھر کر روٹی کھایا کر۔ بہت کمزور ہو گیا ہے مگر آج تو اس نے ٹھیک ہی کیا‘ تیرا بھی کام بن گیا۔ اب آرام سے بیٹھ کر روٹی کھا۔“ اس نے نوالہ توڑا اور کھانا کھانے لگا۔

رحیم داد بھی موڑھے پر بیٹھ گیا اور ہاتھ میں روٹیاں تھام کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ بھوکا بھی تھا۔ کھانا اسے مزے دار لگا۔

کھانے سے فارغ ہو کر نورالٰہی نے پوچھا۔ ”یہ تو بتا‘ تجھے جانا کہاں ہے؟“

رحیم داد نے گردن جھکا کر جواب دیا۔ ”چوہدری اپنا تو اب کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔“

”جب تک تیرا جی چاہے‘ یہیں رہ۔ میں گھر میں اکیلا پڑا پڑا گھبراتا ہوں۔ تیرے ساتھ بات چیت میں دل بہل جائے گا۔ توں میری کچھ مدد بھی کر سکے گا۔“

”ضرور کروں گا‘ تیرا ہر کام کروں گا۔“ رحیم داد نے اسے یقین دلایا۔ ”تیری مہربانی ہے۔ کچھ دن یہیں ٹھہرا رہوں گا۔“ اس نے قدرے تامل کیا‘ پھر دبی زبان سے بولا۔ ”چوہدری! اب تجھے کیا بتاؤں‘ میں کیسے اس چکر میں پھنس گیا۔ بات یہ ہے جی۔“

نورالٰہی اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”مجھے کچھ نہ بتا۔ میں تیرا نام بھی نہیں پوچھوں گا اور تجھے یہی مشورہ دوں گا‘ آگے بھی کسی سے اپنے بارے میں بات نہ کرنا۔“ وہ مسکرانے لگا۔ ”ویسے بھی ابھی مجھے سچ بات نہیں بتائے گا۔ پر توں ہے حوصلے والا۔ واردات کے بعد ملزم جتنے گھبرائے ہوئے ہوتے ہیں توں اتنا پریشان نہیں لگتا۔“ اس نے طاق کی طرف ہاتھ اٹھا کر ایک شیشی کی جانب اشارہ کیا۔ ”مجھے یہ دوائی پلا دے۔“ رحیم داد نے شیشی اور اس کے ساتھ رکھی ہوئی مٹی کی پیالی اٹھائی اور نورالٰہی کو دے دی۔

دوا پینے کے بعد نورالٰہی بستر پر لیٹ گیا۔ کمرے میں ذرا دیر خاموشی رہی پھر نورالٰہی نے رحیم دا سے دریافت کیا۔ "تجھے نیند تو نہیں لگ رہی؟"

"نہیں، ابھی تو نہیں لگ رہی۔"

"میں تو دیر ہی سے سوتا ہوں۔ نیند بہت کم آتی ہے۔ تجھے نیند لگے تو کوٹھری سے چٹائی نکال لینا باہر برآمدے میں بچھا کر سو جانا۔ یہاں کمرے میں تجھے گرمی لگے گی۔" اس نے رحیم داد کو غور سے دیکھا۔

"سویرے اٹھ کر اپنے کپڑے دھو لینا۔ کپڑوں پر اس طرح خون نہیں لگا رہنا چاہیے۔"

رحیم داد نے جھک کر قمیص اور شلوار پر خون کے دھبے دیکھے۔ "میں نے تو پہلے ان پر دھیان نہیں دیا تھا۔ تو نہ بتاتا تو مجھے پتہ ہی نہ چلتا۔"

"گھبراہٹ اور پریشانی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ویسے دھبے زیادہ نمایاں نہیں ہیں۔ غور سے دیکھنے پر نظر آتے ہیں۔" نورالٰہی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "واردات کے بعد ملزم سے ایسی غلطی اور چوک نہ ہو تو پولیس کو جرم کا سراغ کیسے ملے۔"

"تجھے تو اب پتہ چل ہی گیا۔" رحیم داد نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ "میں تجھے سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔"

"سچ سچ بتا دے گا تو میں تجھے ٹھیک ہی مشورہ دوں گا۔ آگے تیرے کام آئے گا۔ پر مجھے اپنے بارے میں تب بتانا، جب تجھے، مجھ پر بھروسا ہو جائے۔"

"نہیں چوہدری! مجھے، تجھ پر بھروسا ہے۔" رحیم داد نے اعتماد کا اظہار کیا۔ "بات یہ ہے، توں بیمار ہے اور دکھی بھی۔ میں تیرا دکھ ٹھیک طرح سمجھتا ہوں۔ میری بھی گھر والی ہے، بچے ہیں۔ میں نے انھیں بہت دنوں سے نہیں دیکھا۔ میں تیری اور جیناں کی باتیں کوٹھری میں بیٹھا سن رہا تھا۔ مجھے اپنی گھر والی اور بچے اتنے یاد آئے کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔" نورالٰہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ "میرا اور تیرا حال ایک ہی سا ہے۔"

"پر توں مجھ سے زیادہ دکھوں کا مارا ہوا ہے۔" رحیم داد نے اظہار ہمدردی کیا۔ "مجھے تو پتہ ہے میری گھر والی اور بچے کہاں ہیں، پر تجھے تو اپنے بال بچوں کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں۔ پر یہ بات سمجھ نہیں آئی، جب تو پاکستان پہنچ گیا تھا تو لہور میں ٹھیر کر انھیں تلاش کیوں نہیں کیا؟ منٹگمری کے کیمپ نہ جاتا۔"

"میں اپنی مرضی سے تو نہیں گیا تھا۔ کیمپ اتنا بھر گیا تھا کہ حکومت تھوڑے ہی دنوں بعد مہاجروں کو دوسرے شہروں کے کیمپوں میں بھیجنے لگی۔ لیکن میں منٹگمری سے کئی بار لہور گیا۔ فیر کلیم اور الاٹمنٹوں کا چکر شروع ہو گیا۔ میں اس میں پھنس گیا۔"

"تیرے کلیم کا کیا بنا؟ کہیں زمین شمین بھی الاٹ کرائی؟"

"کلیم تو میرا منظور ہو گیا پر یہ نہ پوچھ اسے منظور کرانے کے لیے مجھے کتنی پریشانی اٹھانی پڑی۔ میں نے ۱۹۴۸ء میں تحصیل میلسی، ضلع ملتان سے اپنا کلیم داخل کیا تھا۔ میں نصیرپور میں سات مربعے اور پٹیالے میں اڑھائی مربعے سے زیادہ زرعی اراضی چھوڑ کر آیا تھا۔ نصیرپور میں اپنی پکی ماڑی تھی۔ پٹیالے میں بھی مکان تھا۔ میں اپنے پیو کا اکلوتا پتر تھا۔ وہ بھی پولیس میں تھا۔ اس نے ورثے میں میرے لیے بہت کچھ چھوڑا تھا۔ ویسے میری اپنی آمدنی بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔" چوہدری نورالٰہی نے قدرے توقف کیا۔ "مہینوں پر مہینے گزرتے گئے پر سنٹرل ریکارڈ آفس لہور سے میری اراضی کی تصدیق ہو کر نہیں آئی۔ میں دفتروں کے چکر کاٹتا رہا۔ دو سال بعد معلوم ہوا، کلیم فارم تصدیق کے لیے ریکارڈ آفس پہنچے ہی نہیں، رستے ہی میں کہیں گم ہو گئے۔ دوبارہ کلیم فارم اسی تحصیل سے داخل کیے۔ سات اٹھ مہینے اور گزر گئے۔ ان کا بھی پتہ نہ چلا۔ فیر عذرداری کی، اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔"

رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "پر کہیں زمین پر تو کبضہ کر ہی لیا ہوتا۔ بہت سے پناہ گیروں نے ایسا ہی کیا۔ ہندوؤں اور سکھوں کی لاکھوں ایکڑ زمین پڑی تھی۔ ملتان میں بھی ان کی چھوڑی ہوئی بہت زمین تھی۔"

"میں نے میلسی میں، موضع ٹبل چراغ میں متروکہ اراضی پر قبضہ کر لیا تھا۔ پنج سو روپے رشوت دے کر اس کا عارضی الاٹمنٹ بھی اپنے نام کرا لیا تھا۔ اسی لیے اس تحصیل سے میں نے اپنا کلیم داخل کیا تھا۔" چوہدری نورالٰہی نے بتایا۔ "دس ایکڑ کے لگ بھگ نہری زمین تھی۔ بہت مشکل سے قبضہ ملا تھا۔ ایک ہندو زمیں دار کی زمین تھی۔ قبضہ حاصل کرنے کے بعد میں کلیم کے چکر میں الجھ گیا۔ ایک روز معلوم ہوا، پٹواری یہ زمین اپنے کسی رشتے دار کے نام الاٹ کروانا چاہتا ہے۔ میں اسے ملا۔ منت سماجت کی پر وہ کسی طرح نہ مانا بلکہ مجھے طرح طرح سے تنگ کرنے لگا۔ جب اس نے بہت تنگ کیا اور زمین ہاتھ سے جاتی نظر آئی تو میں نے اس کے خلاف اوپر درخواستیں دیں۔ گورنر، وزیر اعلیٰ، وزیر بحالیات، فنانشل کمشنر، سبھی کو لکھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ پٹواری کے خلاف ضرور کارروائی ہوگی اور معاملے کی پوری پوری تفتیش ہوگی۔ مگر ہوا یہ کہ ایک روز پٹواری

نے مجھے بلایا۔ گندی گندی گالاں نکالیں۔ اپنا بستہ کھول کر ایک مسل نکالی اور میرے منہ پر مار کر غصے سے بولا۔ لے اسے پڑھ۔ میں نے اسے اٹھا کر پڑھا تو میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مسل میں میری درخواست اور اس کی وہ تمام نقلیں موجود تھیں جو میں نے اوپر والوں کو بھیجی تھیں۔" نور الٰہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "مجھے حیرت زدہ دیکھ کر اس نے اور زیادہ ننگی ننگی گالاں نکالیں۔"

"توں خاموش بیٹھا رہا' کچھ نہیں کہا؟"

نور الٰہی خاموشی کے ساتھ چارپائی سے اترا۔ قریب رکھے ہوئے ٹرنک کے اندر سے کپڑے میں لپٹے ہوئے کاغذات کا پلندہ نکالا اور پھر بستر پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے کپڑے کی گرہ کھول کر ایک فائل نکالی اور اس کے اوراق الٹ پلٹ کر ایک کاغذ توجہ سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ میری وہ درخواست ہے جو میں نے اوپر والوں کو بھیجی تھی۔" وہ اونچی آواز سے اسے پڑھنے لگا۔

رحیم داد نے درخواست سن کر کہا۔ "چوہدری! عرضی تو تیری زوردار لگتی ہے۔ پٹواری کا تو بیڑا غرق کر دیا۔"

"اس کا بیڑا تو کیا غرق ہوتا البتہ اس نے میرا بیڑا غرق کر دیا۔ ہوا یہ کہ اوپر والوں نے میری تمام درخواستیں ضروری کارروائی کے لیے ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو بھیج دیں۔" نور الٰہی نظریں جھکائے کاغذات دیکھتا رہا اور رحیم داد کو بتاتا رہا۔ "ڈپٹی کمشنر کے دفتر والوں نے میری درخواست اور اس کی تمام نقلیں نتھی کر کے حسب ضابطہ اس پر نوٹ لکھا' درخواست ہذا بہ طلب رپورٹ بخدمت جناب افسر مال صاحب مرسل ہوں۔ ڈپٹی کمشنر نے نوٹ کے نیچے اپنے دستخط لگا دیے۔ درخواست افسر مال کو بھیج دی گئی۔ افسر مال نے تحصیل دار کو لکھا' درخواست ہذا بہ طلب رپورٹ بخدمت جناب تحصیل دار صاحب مرسل ہوں۔ تحصیل دار نے اس پر اپنا نوٹ لگایا۔ درخواست ہذا طلب رپورٹ بنام قانون گو مرسل ہوں۔ قانون گو کے پاس درخواست پہنچی تو اس نے اپنے حکم میں لکھا۔ درخواست ہذا بہ طلب رپورٹ بجانب پٹواری حلقہ مرسل ہوں۔" نور الٰہی نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔

"اس طرح وہ درخواست جو میں نے گورنر صاحب' وزیر بحالیات اور فنانشل کمشنر کو بھیجی تھی' اوپر سے سیڑھی سیڑھی نیچے اترتی ہوئی آخری کارروائی کے لیے اسی پٹواری کے پاس پہنچی جس کے خلاف میں نے شکایت کی تھی۔"

"تب تو وہ بہت گرم ہوا ہو گا؟"

"بہت زیادہ۔ غصے سے لال پیلی آنکھیں نکال کر مجھ سے بولا۔ اب جا کر گورنر جنرل اور وزیر اعظم کو میرے خلاف شکایت لگا۔ پر جس کو بھی لکھے گا' تیری ہر درخواست آخری کارروائی کے لیے میرے ہی پاس آئے گی۔ فیر اس نے سارے ہی اوپر والوں کی ماؤں اور بھینوں کو ننگی ننگی گالاں نکالیں اور درخواست اٹھا کر اپنے بستے میں رکھ لی۔"

"تبھی تو سب کہتے ہیں۔ اتے باری تھلے پٹواری۔" رحیم داد نے مسکرا کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "توں نے خاماخا اس سے جھگڑا کیا۔ اس کی مٹھی گرم کر دیتا' تیرا سب کام بن جاتا۔"

"مگر چوہدری! وہ پٹواری ہے تو میں بھی پولیس میں حوالدار رہ چکا ہوں۔" نور الٰہی نے کڑک کر کہا۔ "میں نے بھی ہار نہیں مانی۔ تحصیل اور ضلع کے دفتروں کے چکر کاٹتا رہا۔ کئی مہینے بعد ڈپٹی کمشنر کے دفتر کے ایک کلرک نے مجھے اپنی درخواست اور اس کی تمام نقلیں ایک مسل میں دکھائیں۔ پٹواری نے درخواست پر جو رپورٹ لگائی تھی' وہ بھی دکھائی۔ نور الٰہی نے ہاتھ بڑھا کر درخواست رحیم کے داد کے حوالے کر دی۔ رحیم داد نے لالٹین کی روشنی میں پڑھا' پٹواری نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا۔

جناب عالی!

سائل مسمی چوہدری نور الٰہی کی جملہ درخواست ہذا کی مکمل پڑتال کی گئی۔ اس جانچ پڑتال سے ظاہر ہوا کہ سائل فضول درخواست دینے کا عادی ہے۔ اسے متعدد بار سرزنش کی جا چکی ہے کہ اس طرح حکام کا قیمتی وقت ضائع کرنا درست نہیں۔ لیکن سائل اپنی عادت سے مجبور ہے۔ سائل کا چال چلن بھی مشتبہ ہے۔ اس کا اصل ذریعہ معاش فرضی گواہیاں دینا ہے۔ مشرقی پنجاب میں اس کے پاس کوئی اراضی نہیں تھی۔ نہ کسی قسم کی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد تھی۔ اسی وجہ سے اس کے کلیم فارم بھی ابھی تک تصدیق نہیں ہوئے۔ سائل نے دو مرتبہ عذرداری بھی کی لیکن بے سود۔ متعدد مہاجرین اور گواہان کے بیانات قلم بند کیے گئے۔ تحقیق ہوا کہ گورداس پور اور ریاست پٹیالہ میں سائل کی ملکیت میں کوئی زمین نہیں تھی۔ چنانچہ کھیوٹ نمبر ۱۵' مقدمہ نمبر ۲۸' موضع ٹہل چراغ میں دس ایکڑ متروکہ اراضی' جس پر سائل کا ناجائز قبضہ تھا' اس کے نام سے منسوخ ہو کر مسمی فضل دین کے نام بہ رویت قانون رائج باضابطہ کنفرم ہو چکی ہے۔ مسمی فضل دین' ضلع جالندھر کا مہاجر اور سابق سفید پوش ہے۔ اس کے تصدیق شدہ کلیم بھی موصول ہو چکے ہیں۔ لہٰذا موضع ٹہل چراغ میں متروکہ اراضی ہذا الاٹ کر کے اس کی حق رسی کر دی گئی ہے۔

پٹواری کی رپورٹ پر گرداور اور قانون گو نے یہ نوٹ لگایا۔ "رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ بہ

مراد حکم مناسب بخدمت جناب نائب تحصیل دار صاحب پیش ہو۔" نائب تحصیل دار نے بھی اسی طرح درخواست پر اپنا نوٹ لگایا۔ "رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ بہ مراد حکم مناسب بخدمت صاحب مال افسر بہادر پیش ہو۔" افسر مال نے تحریر فرمایا۔ "رپورٹ مفصل ہے۔ بہ مراد حکم مناسب صدر میں پیش ہو۔" صدر کے مسل خواں نے حکم لکھا۔ "رپورٹ مفصل ہے۔ درخواست ہائے مسمی چوہدری نورالٰہی فضول ہیں۔ داخل دفتر کی جائیں۔"

رحیم داد نے درخواست نورالٰہی کو واپس کرتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ "چوہدری! تجھے اپنی درخواست اور اس پر کی گئی کارروائی اور پٹواری کی رپورٹ کہاں سے مل گئی؟"

"ارے یار! یہ کام بھی کوئی کام ہے۔ اڑھائی سو روپے کا خرچا اور ہوا۔" نورالٰہی نے ہنس کر بتایا۔ "اس پر افسر کے دستخط بھی نہیں ہوئے تھے۔ پٹواری نے تو میرا عارضی الاٹمنٹ منسوخ کرانے اور اپنے رشتے دار فضل دین کے نام پکا الاٹمنٹ کرانے کا پورا بندوبست کرا ہی لیا تھا، پر اس کا کسی پولیس والے سے ٹاکرا نہیں ہوا تھا۔"

"پٹواری آخر پٹواری ہوتا ہے۔ اس نے تجھے بعد میں تنگ کیا ہوگا؟"

"میں نے اسے یہ موقع ہی نہیں دیا۔ ہوشیارپور کا ایک مہاجر متروکہ اراضی کی تلاش میں تھا۔ اس کے پاس تصدیق شدہ کلیم بھی تھا۔ میں نے ساڑھے سات ہزار میں اس سے سودا کرلیا اور ٹل چراغ کی دس ایکڑ زمین پر اسے قبضہ دے دیا۔ وہ صوبائی اسمبلی کے ممبر کا کچھ لگتا تھا۔ اس کی سفارش پر زمین کا اس کے نام اوپر ہی اوپر پکا الاٹمنٹ بھی ہوگیا۔" نورالٰہی مسکرانے لگا۔ "جب اس کا الاٹمنٹ پوری طرح ہوگیا تو میں پٹواری کے پاس گیا۔ اسے گریبان سے پکڑا۔ جتنی بھی گندی گندی گالاں معلوم تھیں، ساری ہی خالص پولیسوں کی زبان میں نکالیں اور اس سے کہا۔ توں پٹواری ہے تو میں نے بھی پولیس کی حوالداری کی ہے۔"

"چوہدری! توں نے اسے ٹھیک سبک سکھایا۔" رحیم داد نے ہنس کر کہا۔ "ویسے زمین کے ساڑھے سات ہزار لے کر گھاٹے میں نہیں رہا۔"

"ان ساڑھے سات ہزار کے علاوہ اسی زمین کی بنیاد پر میں مویشی اور بیج کی خریداری، مکان بنانے اور دوسرے اخراجات کے لیے سرکار سے ۵ ہزار روپے کا تقاوی قرضہ پہلے ہی وصول کرچکا تھا۔" نورالٰہی نے فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔ "اس قرضے کی کچھ رقم میرے پاس موجود تھی۔ میں نے بھاول نگر سے نئے کلیم فارم داخل کیے۔ چھے ہزار روپے اوپر سے خرچ ہوئے۔ فیر لہور کے سینٹرل ریکارڈ آفس سے تصدیق بھی ہوگئی۔ دو ہفتے کے اندر اندر کلیم منظور ہوگیا۔ تیں

نوں پتہ ہے کتنا وڈا کلیم منظور ہوا؟"

رحیم داد ہونق کی طرح اس کا چہرہ تکتا رہا۔ نورالٰہی نے بتایا۔ "۶۸ مربع اراضی اور دو حویلیوں کا کلیم منظور ہوکر آیا۔ جب سچا حلف نامہ لگایا تھا اور سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھاک تحریر کیا تھا تو صرف ساڑھے ۵ مربع اراضی اور ایک مکان کا کلیم اڑھائی تین برس کی بھاگ دوڑ اور تمام منت سماجت کے بعد بھی دفتروں کی فائلوں میں دبا رہا۔ عذرداری بھی کی، کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ چھے ہزار کے جادو ے ہر کام اوپر سے نیچے تک ایسے فٹافٹ ہوتا چلا گیا جیسے میرے کلیم کی فائل کو پہیے لگ گئے ہوں۔ لطف یہ کہ جھوٹا کلیم ایک دم سچا بن گیا۔ نہ زیادہ بھاگ دوڑ کرنی پڑی، نہ کسی کے سامنے جاکر فریاد کرنے کی ضرورت پیش آئی۔"

"تجھے کلیم کی منظوری کے ساتھ ساتھ الاٹمنٹ بھی فٹافٹ مل گئی ہوگی؟"

"تیں نوں پتہ نہیں، کلیم منظور کرانا تو ایسا مشکل کام نہیں پر الاٹمنٹ حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔" نورالٰہی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "الاٹمنٹ کے چکر میں فیر پٹواری سے ٹاکرہ ہوا اور اس بار مجھے سچ مچ اندازہ ہوا، پٹواری کتنا طاقت ور ہوتا ہے۔"

"اس بار کیا ہوا؟"

"یہ پوچھ کیا نہیں ہوا؟ تجھے ان کاموں سے واسطہ نہیں پڑا۔ تجھے کیا معلوم، الاٹمنٹ کے چکر میں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ٹل چراغ میں تو ایک ملنے والے کی مدد سے زمین پر قبضے کے ساتھ ہی عارضی الاٹمنٹ بھی مل گئی تھی۔ ویسے اس وقت متروکہ اراضی بھی بہت تھی۔ اب تلاش کرنی پڑتی ہے۔ ساری عمدہ زمینیں تو اوپر ہی اوپر بھائی بھتیجوں، شریکوں اور یاروں دوستوں میں بٹ گئیں۔ ادھر وڈے زمین داروں نے ہندوؤں اور سکھوں کے پرانے مسلمان مزارعوں سے معاملہ کرکے قبضہ کرلیا تھا۔ یہ الاٹمنٹ کا چکر بھی عجب چکر ہے۔" نورالٰہی کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ "اوپر والوں کے پاس جاؤ تو حکم ملتا ہے۔ تحصیل دار کے پاس جاؤ۔ تحصیل دار کے سامنے درخواست پیش کرو تو وہ اس پر لکھتا ہے، نائب تحصیل دار رپوٹ کریں۔ نائب تحصیل دار کے سامنے درخواست جاتی ہے تو وہ اپنا نوٹ لگاتا ہے، گرداور حلقہ رپورٹ کریں، آیا کوئی اراضی برائے الاٹ موجود ہے؟ گرداور حلقہ اپنے حکم میں تحریر کرتا ہے، پٹواری حلقہ رپورٹ کرے آیا کوئی اراضی حلقہ مذکور میں برائے الاٹ پائی جاتی ہے؟ اس طرح اوپر سے جو فائل چلتی ہے، وہ پٹواری ہی کے پاس آکر ٹھہرتی ہے۔"

"یہ تو ویسا ہی چکر ہوا جو پٹواری نے ٹل چراغ کی الاٹمنٹ ختم کرانے کے لیے تیرے خلاف

چلایا تھا۔“

”سچ تو یہ ہے جی، پٹواری الاٹمنٹ منسوخ بھی کرا سکتا ہے اور وہی الاٹمنٹ دلا بھی سکتا ہے۔“ نورالٰہی نے گہری سانس بھری۔ ”الاٹمنٹ کی منظوری یا منسوخی کی پوری عمارت پٹواری کی رپورٹ ہی پر کھڑی ہوتی ہے۔ الاٹمنٹ کی درخواست اوپر سے چلتی ہوئی جب پٹواری کے پاس پہنچتی ہے تو پہلے تو وہ اسے دبا کر بیٹھ جاتا ہے اور درخواست لگانے والے کا انتظار کرتا ہے۔ اگر وہ اس کے پاس نہیں پہنچتا اور اوپر ہی اوپر کارروائی کرانے کی کوشش کرتا ہے تو پٹواری درخواست پر لکھ دیتا ہے حلقہ مذکورہ میں کوئی اراضی برائے الاٹ موجود نہیں ہے۔ اور اگر درخواست لگانے والا صرف منت سماجت سے کام نکالنا چاہتا ہے تو پٹواری اسے ٹرخا دیتا ہے یا بنجر زمین دلا کر اپنا پیچھا چھڑا لیتا ہے۔ درخواست پر اپنی رپورٹ میں لکھ دیتا ہے۔ موضع فلاں فلاں میں کسی قدر بنجر قدیم اراضی برائے الاٹ موجود ہے۔ اگر سائل یہ زمین لینا چاہے تو لے سکتا ہے۔ اب درخواست فیرالٹے پیروں چلتی ہوئی اوپر جاتی ہے۔“

”چوہدری! تو تحصیل دار، نائب تحصیل دار اور گرداور کے چکر میں پڑنے کی بجائے سیدھا پٹواری کے پاس کیوں نہیں پہنچا؟ سب کچھ تو اسی کی رپورٹ پر ہوتا ہے۔“

”ہاں جی، محکمہ مال کا سارا انتظام پٹواری ہی کے بل پر چلتا ہے۔ افسر تو صرف حکم چلاتے ہیں۔ بہت ٹھوکریں کھانے اور دفتروں کے چکر کاٹ کاٹ کر جب مجھے پٹواری کی اہمیت معلوم ہوئی تو میں اوپر والوں کے پاس جانے کی بجائے پٹواری کے پاس پہنچا۔ دو ہزار میں اس سے معاملہ طے کیا اور اسی پٹواری کے پاس عمدہ نہری زمین نکل آئی جسے اپنے حلقے میں بنجر اور کلّر زمین بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے اپنے بستے سے نقشہ نکالا اور رپورٹ لکھ دی۔ لو جی، تحصیل دار تک درخواست فٹ پہنچ گئی اور زمین کی الاٹمنٹ بھی مل گئی۔“

”مجھے متروکہ اراضی کی الاٹمنٹوں کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں، پر اتنا میں نے بھی سنا ہے پٹواریوں نے تو یہاں تک کیا، جس نے ان کی مٹھی گرم کی، اسے الاٹمنٹ دے دی۔ ایک ہی زمین کئی کئی کے نام الاٹ ہوئی۔ بعد میں دنگے فساد ہوئے۔ مکدمہ بازی ہوئی۔ میرے نزدیک کے موضع میں ایک ہی زمین کے چار الاٹی ہیں۔ ان میں پچھلے اڑھائی سال سے زبردست مکدمہ بازی ہو رہی ہے۔“

”میرے ساتھ بھی دوبارہ یہی ہوا۔“ نورالٰہی نے رحیم داد کو بتایا۔ ”تحصیل منچن آباد میں مجھے ۱۷۶ کنال زمین الاٹ ہوئی۔ میں قبضہ لینے پہنچا تو پتہ چلا وہی زمین چھے دعویداروں کو پہلے ہی الاٹ ہو چکی ہے اور ان میں سے چار نے نالش بھی کر دی ہے۔ مہینوں سے عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے۔ اسی تحصیل میں بعد میں میرے نام ۱۳۰ ایکٹر زمین کی الاٹمنٹ ہوئی۔ میں پہلے سے زیادہ زمین ملنے پر خوش تھا پر جلد ہی ساری خوشی جاتی رہی۔ پتہ چلا وہ زمین بھی کئی دعویداروں کو مجھ سے پہلے الاٹ کی جا چکی ہے۔ قبضہ حاصل کرنے کے چکر میں دو فریقوں نے تو بندوقوں اور کلہاڑیوں سے مسلح ہو کر ایک دوسرے پر حملہ کیا۔ پولیس نے دونوں گرہوں کے خلاف مقدمہ قائم کیا۔ کئی کو گرفتار بھی کر لیا۔ زمین کی بجائے انھیں قید کاٹنے کے لیے جیل کی کوٹھری الاٹ ہوئی۔ ان کا انجام دیکھ کر میں نے توبہ کی۔ فوراً اپنی الاٹمنٹ منسوخ کرائی۔ ویسے منچن آباد میں جعلی فرد حقیت اور بوگس کلیم فارموں کے ذریعے زبردست دھاندلی ہوئی۔ میں نے تو جی وہاں زمین الاٹ کرانے کا خیال ہی چھوڑ دیا تھا۔“

”فیر تجھے کہاں الاٹ ہوئی زمین؟“

”مجھے کئی مہینے بھاگ دوڑ کرنے کے بعد بھاول پور کے موضع نذر محمد جھلن میں پورے چار مربعے الاٹ ہو گئے۔“ نورالٰہی کے مرجھائے ہوئے چہرے پر خوشی کی ہلکی سی سرخی پھیل گئی۔ ”جھلن میں ایک سکھ زمیں دار سردار کھڑک سنگھ کی ۷۲ مربع متروکہ اراضی تھی۔ اس پر کھڑک سنگھ کے پرانے مزارعے کاشت کرتے تھے۔ شروع میں انھوں نے ساری زمین پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی لیے اس زمین کی الاٹمنٹ بہت بعد میں ہوئی۔ اس طرح میرے حصے میں بھی ۱۰۰ ایکڑ زمین آ گئی۔“

”۱۰۰ ایکڑ تو بہت ہوئے۔“ رحیم داد نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ ”پر تیرا کلیم بھی تو ۶۸ مربعے کا منظور ہوا تھا۔ وہ زمین ابھی تک تیرے ہی پاس ہے نا؟“

”وہ زمین میرے پاس رہتی تو میں یہاں کیوں پڑا ہوتا۔“ نورالٰہی کا چہرہ لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی میں اور زیادہ زرد نظر آنے لگا۔ اس پر غم کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔ وہ بجھے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔

”موضع نذر محمد جھلن جس علاقے میں ہے اس علاقے کا سب سے وڈا زمیں دار مخدوم رحمان شاہ ہے۔ اس کے پاس بیس ہزار ایکڑ سے بھی زیادہ زمین ہے۔ وہ میران والی میں رہتا ہے جو صادق آباد سے نزدیک ہے۔ ویسے میران والی بھی وڈا قصبہ ہے۔ آبادی اس کی پنج ہزار سے اوپر ہی ہو گی۔ میران والی کے چاروں طرف اونچی اونچی فصیل ہے۔ فصیل کے دو بڑے پھاٹک ہیں۔ رات کو یہ پھاٹک بند کر دیے جاتے ہیں۔ میران والی سمجھو، بہت وڈا قلعہ ہے جہاں صرف مخدوم رحمان شاہ

کی حکومت ہے۔ بسیں اور لاریاں تک اس کی چلتی ہیں۔ ایسی واہیات اور کھٹارا کہ سیٹوں پر گدیاں تک نہیں ہوتیں، مگر میران والی کا رہنے والا کوئی بندہ اس کی لاریوں کے علاوہ کسی اور سے سفر نہیں کر سکتا۔ میران والی میں اس نے اپنی کپڑے کی دو کانیں بھی کھول رکھی ہیں۔ اس کے مزارعوں کو صرف انھی دکانوں سے کپڑا خریدنا پڑتا ہے۔ ورنہ سزا ملتی ہے۔"

نورالٰہی نے قدرے توقف کیا۔ چند لمحے گہری گہری سانسیں بھرتا رہا، پھر گویا ہوا۔ "میران والی کے رہنے والوں کو وہ اپنی رعایا کہتا ہے۔ روزانہ عدالت لگاتا ہے۔ سزائیں دیتا ہے۔ اس کی ذاتی جیل بھی ہے، حویلی کے ساتھ ہی ہے۔ جسے چاہتا ہے، سزا دے کر اپنی جیل میں ڈال دیتا ہے۔ اس نے ۱۰۰ کے لگ بھگ مسلح کرندے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ کرندے رائفلوں اور پستولوں سے مسلح ہو کر پورے علاقے میں گشت کرتے رہتے ہیں۔ معمولی معمولی باتوں پر مزارعوں کو گرفتار کر کے رحمان شاہ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اگر کوئی اس کی کماد کی فصل سے ہاتھ بھر کا ٹوٹا بھی توڑ کر چوپ لے تو جیل میں بند کر دیا جاتا ہے۔"

رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ "چوہدری! تجھے میران والی اور مخدوم رحمان شاہ سے کیا لینا۔ تجھے تو موضع جھلن میں زمین الاٹ ہوئی تھی۔ یہی بتایا تھا نا؟"

"میں نے یہ بھی تو بتایا تھا جھلن اسی علاقے میں ہے۔ میں تجھے یہ بتانا چاہتا تھا مخدوم رحمان شاہ کتنا وڈا اور زور آور زمیں دار ہے۔ وہ جھلن کی متروکہ اراضی پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ نئے زمیں داروں اور الاٹیوں کو طرح طرح سے تنگ کرتا رہتا۔ میرے پاس دوسرے نئے زمیں داروں سے کچھ زیادہ ہی زمین تھی اس لیے وہ مجھے زیادہ ہی تنگ کرتا تھا۔ پہلے تو اس نے میرے مزارعوں کو سرکشی پر اکسایا۔ وہ اپنی مرضی کی فصل بوتے، فصل کی واڈھی پر راہ کی اور بٹائی میں زیادہ حصہ مانگتے۔ خاماخا کا جھگڑا ٹنٹا کھڑا کرتے۔"

"راہ کی میں جھگڑے ٹنٹے کی کون سی بات۔ وہ تو زمیں دار اور مزارع کے درمیان آدھی آدھی ہوتی ہی ہے بلکہ زمیں دار ہی کئی طرح کے ٹیکس لگا کر زیادہ حصہ وصول کرتے ہیں۔ چوہدری توں بالکل نئی گل کر رہا ہے۔ ظلم تو زمیں دار مزارعوں پر کرتے ہیں۔"

"پر جھلن میں مخدوم رحمان شاہ کے کرندوں کے ہشکانے اور شیری دینے پر مزارعے، مہاجر زمیں داروں کو بہت تنگ کرتے تھے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے ہتھکنڈوں سے گھبرا کر کئی الاٹی اپنی زمینیں چھوڑ کر چلے گئے۔ پر میں نے مزارعوں سے جھگڑا ٹنٹا نہیں کیا۔ انھیں راضی خوشی رکھنے کی ہر طرح کوشش کی۔ بات یہ تھی، زمین زرخیز تھی اور پانی بھی بہت تھا۔ میں نے اپنا ۱۰۰ ایکڑ کا مربع ایک

زارے پیر بخش کے ہاتھ ۲۵ ہزار میں بیچ دیا۔ اس رقم سے تیس ایکڑ پر آم اور مالٹے کے باغ ے۔ مزارعوں کے بچوں کے لیے پرائمری اسکول بھی بنانے کی کوشش کی۔ یہ کام میں نے بخش کے پتر، امیر بخش کے کہنے پر کرنا چاہا۔ وہ کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ اس نے مزارعوں کے ساتھ یل جول بنانے میں میری بہت مدد کی تھی۔"

چوہدری نورالٰہی سنبھل، سنبھل کر بولتا رہا۔ تھک جاتا تو دم لینے کو رک جاتا۔ رحیم داد توجہ سے ں کی باتیں سنتا رہا۔ "سکول شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ رحمان شاہ نے ایک روز مجھے میران والی لایا۔ ایسے ہی شروع گرمیوں کے دن تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ شاہ جی اپنی حویلی کے باغ میں تھا۔ وہ جلی شلوار اور قمیص پہنے ہوئے تھا۔ قمیص کے اوپر لمبا کوٹ تھا۔ گلے میں ٹائی بندھی تھی اور سر پر ال رومی ٹوپی تھی۔ وہ کرسی پر شان سے اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ ایک نوکر پیچھے کھڑا دھیرے دھیرے پنکھا جھل رہا تھا۔ اس نے عدالت لگا رکھی تھی۔ باری باری ہر ایک کی پیشی ہو رہی تھی۔ ویسے وہ ازیری مجسٹریٹ بھی ہے۔ میری پیشی ہوئی تو اس وقت اس کے سامنے موضع شیخ بکھر کا ایک دکان ار سر جھکائے ملزموں کی طرح کھڑا تھا۔ مخدوم سید رحمان شاہ نے اس سے پوچھا۔ تو نے مسجد بنائی ہے؟ اس نے گردن ہلا کر ہامی بھری۔ مخدوم رحمان نے غصے سے آنکھیں نکال کر اسے ڈانٹا۔ کیوں سجد بنائی؟ اور اس کے جواب دینے سے پہلے خود بول پڑا۔ تیں نوں پتہ ہے حاکم کی اجازت کے بغیر رعایا کو مسجد بنانے کا حکم نہیں۔ رحمان شاہ نے اسے چھ مہینے کی سزا بھی دے دی۔ اس کے مسلح کرندے دکان دار کو پکڑ کر اسی وقت جیل میں ڈالنے لے گئے۔"

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "مسجد بنانے پر جیل میں بند کر دیا؟"

"مجھے بھی تیری طرح حیرت ہوئی تھی۔" نورالٰہی نے جواب دیا۔ "مخدوم رحمان شاہ نے مجھے یکھتے ہی تیوری پر بل ڈال کر پوچھا، تو پناہ گیرا ہے؟ میں نے کہا۔ ہاں جی، میں گورداس پور کا مہاجر وں۔ موضع جھلن میں میری زمیں داری ہے۔ وہ کڑک کر بولا۔ میں نوں پتہ ہے، میں نوں یہ بھی پتہ ہے تو جھلن میں سکول بنانا چاہتا ہے۔ کیوں سکول بنانا چاہتا ہے؟ مزارعوں کے منڈوں کو بمعاشی سکھانی ہے؟ تیں نوں پتہ ہے، وہ تیری...... کی چاٹی بنا کر اس میں مدھانی ڈالیں گے۔ اور ایسا رڑکا لگائیں گے تیری ساری زمیں داری لسی بن کر نکل جائے گی۔ جا میریاں انکھیاں اگوں دور ہو جا۔ سکول شکول کے چکر میں نہ پڑ۔ اس بار وارننگ دے کر چھوڑے دیتا ہوں۔ اگے ایسی گل نہ سنوں۔ میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا پر یہ ضرور سمجھ گیا اس نے مسجد بنانے پر موضع شیخ بکھر کے کاندار کو میرے سامنے چھ مہینے کی سزا کیوں سنائی تھی۔"

"فیر تو نے کیا کیا؟"

"میں تو سکول بنانے کا خیال چھوڑ دیتا' پر امیر بخش تیار نہیں ہوا۔ چنگا تکڑا جوان تھا اور جوڑے والا بھی۔ رحمان شاہ کو پتہ چلا تو بہت خفا ہوا' اس نے امیر بخش اور اس کے پیو پیر بخش کے خلاف ڈنگر چوری کا جھوٹا مقدمہ بنوا کر دونوں کو بند کروا دیا۔ ان کے گھر والوں اور رشتے داروں کو بھی پولیس نے بہت تنگ کیا۔ پیر بخش اتنا ڈرا کہ اس نے اپنی ۲۵ ایکڑ زمین مخدوم رحمان شاہ کے ہاتھوں صرف ۱۵ ہزار میں بیچ دی اور جھلن چھوڑ کر چلا گیا۔"

"تجھے تو مخدوم نے تنگ نہیں کیا؟"

"اس کے کرندے ایک رات بندوقوں سے مسلح ہو کر آئے۔ انھوں نے مجھے گرفتار کر لیا اور مخدوم رحمان شاہ کی ذاتی جیل میں لے جا کر ڈال دیا۔ جیل میں چھوٹی چھوٹی کئی تنگ و تاریک کوٹھڑیاں تھیں۔ مجھے بھی دوسرے قیدیوں کی طرح ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ اس میں نہ روشندان تھا' نہ ہوا آنے کا کوئی رستہ۔ اتنی گندگی اور بدبو تھی سانس بھی نہ لی جاتی۔ اوپر سے سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ کھٹمل اتنے تھے کہ دیواروں پر' زمین پر' جگہ جگہ رینگتے پھرتے۔ ساری رات بدن کھجاتے کٹتی۔ دو روز تو کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ بعد میں جو روٹی کھانے کو ملتی رہی اس میں آدھی سے زیادہ ریت ہوتی اور دال میں کنکر ہوتے' اوپر مکھیاں تیرتی ہوتیں۔"

رحیم داد نے پوچھا۔ "رحمان شاہ کو سکول سے اتنی نفرت کیوں تھی؟ اس کے بال بچے تو بالکل پڑھتے لکھتے نہیں ہوں گے۔"

"نہیں جی' اس کے خاندان کے صرف منڈے ہی نہیں' کڑیاں تک لندن اور امریکہ میں پڑھ رہی ہیں۔ بالکل میموں کی طرح رہتی ہیں۔ مخدوم رحمان شاہ کو نفرت تو مزارعوں کے بچوں کی پڑھائی سے ہے۔ پڑھ لکھ جائیں گے تو اس کی عمل داری کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔"

"تو کتنے دن جیل میں رہا؟"

"چار مہینے سے اوپر ہی رہا۔" نور الٰہی نے چند لمحے خاموش رہ کر بتایا۔ "وہیں مجھے کھانسی شروع ہوئی۔ فیر بلغم کے ساتھ خون بھی آنے لگا۔ بخار بھی رہنے لگا۔ یہ ٹی بی کی بیماری مجھے وہیں لگی۔ اس شرط پر مجھے رہائی ملی کہ پہلے الاٹمنٹ منسوخ کرانے کی درخواست لگائی۔ تب جیل سے رہائی ملی۔ میری خریف کی واڈھو فصل تھی۔ چھٹی تو چنائی کے لیے بالکل تیار تھی۔ پر رحمان شاہ کے کرندوں نے مجھے نذر محمد جھلن تک جانے بھی نہیں دیا۔"

"لگتا ہے رحمان شاہ بھی ملتان کے مخدوموں کی طرح کسی درگاہ کا گدی نشین [illegible]

وڈی وڈی زمین داریاں اور جگیریں ہیں۔" رحیم داد نے نور الٰہی کی باتیں سن کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "انھوں نے بھی اسی طرح ہزاروں ایکڑ متروکہ اراضی دبا رکھی ہے۔ اپنی' اپنی زمین داریوں میں وہ بھی ایسے ہی حکومت کرتے ہیں۔ موج مستی کرتے ہیں۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہیں ہو سکتا۔"

"ویسے رحمان شاہ نہ گدّی نشین ہے' نہ پیر ہے نہ سائیں' پر مخدوم الملک کہلاتا ہے۔" نور الٰہی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "سنا ہے جب ریاست بھاول پور میں آیا تھا تو اس کا حال یہ تھا کہ رہنے کا ٹھکانا بھی نہ تھا۔ ملتان روڈ پر گدّو مل کی سرائے میں رہنے کو ایک آنہ روز کرائے پر منجی لے رکھی تھی۔ بچوں کو کلام مجید پڑھاتا تھا۔ ان کے گھروں سے روٹی ٹکر کھانے کو مل جاتا۔ کبھی کبھار مردوں کی فاتحہ کا کچھ مل جاتا۔ اسی سے گزر بسر ہوتی تھی۔"

"گھر والی نہیں تھی؟"

"پتہ نہیں۔" نور الٰہی مسکرا کر بولا۔ "ویسے بھی فاتحہ کی روٹی کھانے والے ملاں سے کون اپنی کڑی کا ویاہ کرتا ہے۔"

"تب رحمان شاہ اتنا وڈا زمیں دار کیسے بن گیا؟"

"وہ ایسا ہوا کہ منت سماجت کر کے کسی کی سفارش پر نواب صاحب کو کلام مجید پڑھانے پر لگ گیا۔ فیر تو جی اس کے دن ہی بدل گئے۔ ایسا نصیب بدلا کہ نواب صاحب نے کسی بات پر خوش ہو کر میران والی کی پوری جاگیر ہی بخش دی۔ ساتھ ہی مخدوم الملک کا خطاب بھی دے دیا۔ ریاستوں میں ایسے ہی جاگیریں اور خطاب دیے جاتے تھے۔ میں تو ریاست پٹیالہ میں رہ چکا ہوں۔ ایسی بخششیں ہوتی بہت دیکھی ہیں۔"

"موضع نذر محمد جھلن سے نکل کر تو کہاں گیا؟"

"کئی مہینے تک الاٹمنٹ کے چکر میں ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتا پھرا۔" نور الٰہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ چند لمحے خاموش بیٹھا آہستہ' آہستہ ہانپتا رہا۔ جب ذرا قرار آیا تو دل گرفتہ ہو کر بولا۔ "فیر یہاں آ گیا۔ یہاں الاٹمنٹ شلاٹمنٹ تو ابھی تک ہوئی نہیں۔ جیناں کے گھر والے اکبر نے باراں ایکڑ متروکہ زمین پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ چاہتا ہے' میں یہ زمین اپنے نام الاٹ کروا لوں۔ وہ میرا مزارع بن کر رہے گا بلکہ وہ تو ابھی سے خود کو میرا مزارع سمجھنے لگا ہے۔"

"توں نے یہ زمین الاٹ کرانے کی کوشش نہیں کی؟"

"بیماری نے اس کا قابل نہیں رکھا۔" نور الٰہی نے کلیم کے کاغذات اور دوسری دستاویزات

کپڑے میں احتیاط سے لپیٹ کر گرہ لگائی۔ چارپائی سے اترا اور کاغذات کا بستہ ٹرنک میں رکھ کر تالا ڈال دیا۔ وہ دوبارہ بستر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "توں دل میں کہتا ہو گا' چوہدری باتیں بہت کرتا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "اس طرح دل کا بوجھ ہلکا کرلیتا ہوں۔ توں آگیا تو ذرا جی بہل گیا۔ ورنہ اکیلا پڑا کھانستا رہتا۔ نیند بھی تو کم آتی ہے۔" نورالٰہی بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے رحیم داد سے کہا۔

"لگتا ہے تجھے نیند آرہی ہے۔ چٹائی نکال لے اور باہر جاکر سو جا۔"

رحیم داد نے کوٹھری سے چٹائی نکال کر برآمدے میں بچھائی اور تھکا ہوا سا لیٹ گیا۔

☆

صبح بہت تڑکے رحیم داد بیدار ہوا۔ اس نے نورالٰہی کی دھوتی باندھی اور اپنے کپڑے دھونے بیٹھ گیا۔ اس نے قمیص اور شلوار رگڑ رگڑ کر خون کے دھبے صاف کرنے کی کوشش کی اور گیلے کپڑے دھوپ میں سوکھنے کے لیے آنگن میں ڈال دیے۔

دوپہر کو جیناں کھانا لے کر آئی۔ رحیم داد کمرے کے اندر دروازے کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔ نورالٰہی برآمدے میں تھا۔ جیناں اسے کھانا دے کر چپ چاپ چلی گئی۔ نورالٰہی کھانا لے کر کمرے میں آیا۔ دونوں نے کھانا کھایا۔

نورالٰہی آدھی روٹی سے زیادہ نہ کھا سکا۔ وہ صبح سے مسلسل کھانس رہا تھا۔ کھانسی کے ساتھ خون بھی آیا۔ دن ڈھلے بخار تیز ہوگیا۔ وہ بستر پر لیٹا بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ نقاہت اتنی بڑھ گئی تھی کہ رحیم داد سے زیادہ بات چیت بھی نہیں کرسکا۔

کپڑے سوکھ چکے تھے۔ رحیم داد کپڑے پہن کر نورالٰہی کے قریب موڑھے پر بیٹھا تھا۔ شام کا دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ نورالٰہی آنکھیں بند کیے بستر پر نڈھال پڑا تھا۔ رحیم داد نے لالٹین روشن کی۔ کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی پھیل گئی۔ ذرا دیر بعد بیرونی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ساتھ ہی جیناں کی آواز بھی ابھری۔

وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ رحیم داد مخمصے میں پڑ گیا۔ نورالٰہی نے آنکھیں کھول کر رحیم داد کو دیکھا۔ ہانپنے کے انداز میں سانس بھرتا ہوا اٹھا۔ رحیم داد کو کوٹھری میں جانے کا اشارہ کیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر گیا۔

رحیم داد کوٹھری کے بند دروازے کے پیچھے دم سادھے کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے جیناں کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"چوہدری! آج تیری طبیعت کچھ زیادہ ہی گڑبڑ ہے۔ توں کہے تو اکبر کو تخت ہ، بھیج کر حکیم

ے دوائی منگوالوں؟"

"دوائی تو ہے۔ سویرے اکبر کو میرے پاس بھیج دینا۔ میں اسے حال بتادوں گا۔ وہ حکیم کے پاس پلا جائے گا۔ حکیم دوسری دوائی دے گا تو لے آئے گا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "میں خود کیم کے پاس چلا جاتا مگر کل اٹھ دس میل سیکل چلائی تو طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ بخار بھی کچھ زیادہ ی لگتا ہے۔ آج تو مجھ سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔"

"توں نے دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے؟ اسے کھولنے کے لیے تیں نوں بکھار میں اٹھنا پڑا۔ پہلے ذ ایسا نہیں کرتا تھا۔" جیناں چند لمحے خاموش رہی۔ "کل رات تیرے پاس کوئی آیا تھا؟"

نورالٰہی نے صاف انکار کردیا۔ "میرے پاس تو کوئی نہیں آیا۔ تیں نوں کیسے پتہ چلا؟"

"اکبر رات تیرے پاس آیا تھا۔ وہ شام کو ساتھ کے پنڈ گیا تھا۔ واپسی پر ادھر آیا۔ تیرے بال بچوں کے بارے میں پتہ کرنا چاہتا تھا۔ اکبر کہتا تھا' تیرے کمرے سے دھیرے دھیرے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔"

"رات تو میرے سوا یہاں کوئی نہیں تھا۔ اکبر کو ویسے ہی شبہ ہوا ہو گا۔"

"شبہ تو مجھے بھی ہوا۔ میں دن میں تیرے پاس روٹی لے کر آئی تو باہر کپڑے بھی سوکھ رہے تھے۔ اب وہ کپڑے توں نے پہن بھی نہیں رکھے۔"

"میں نے دھو کر ٹرنک میں رکھ دیئے ہیں۔" نورالٰہی نے فوراً بات بنائی۔ "کپڑے دھونے ہی ے تو آج میری طبیعت اتنی گڑبڑ ہو گئی۔"

"توں نے کپڑے کیوں دھوئے؟ مجھے دے دیتا۔ کیا پہلے دھونے کو نہیں دیتا رہا ہے؟ تیں نوں بیاری میں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اکبر تیرا مزارع بھی تو ہے۔"

"ایسی گل بات نہ کر۔" نورالٰہی نے قدرے اونچی آواز سے کہا۔ "کوئی مزارع شزارع نہیں۔ وہ نیک بندہ ہے۔ اور تو بھی میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ صبح شام روٹی کھلاتی ہے' دوائی منگوا کر دیتی ہے۔ کیا نہیں کرتی؟ تو نہ ہوتی تو میں کب کا ختم ہو گیا ہوتا۔"

"لے میں تیرا کیا کام کرتی ہوں۔ چوہدری! کیسی گلاں کر رہا ہے۔ گھر کے دھندوں سے چھٹی ہی نہیں ملتی۔ چھوہری الگ بیمار ہے۔ اسے حکیم نے کالی کھانسی بتائی ہے۔ اسی لیے تیرے پاس زیادہ نہیں آتی۔"

"اب جا۔ اکبر تیرا انتظار کر رہا ہو گا۔ چھوہری بیمار ہے۔ روتی ہو گی۔"

نورالٰہی آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ جیناں چلی گئی۔

☆

رحیم داد کوٹھری سے باہر آ گیا۔ اس نے آنگن میں جا کر بیرونی دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ واپس کمرے میں آیا تو نور الٰہی نے کہا۔ "سنا' جیناں کیا کہہ رہی تھی؟"

رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔ "لگتا ہے' اسے کچھ شبہ ہو گیا ہے۔"

"میں نے اسے مطمئن تو کر دیا ہے۔ پر اب زیادہ احتیاط کرنی ہو گی۔"

دونوں نے مزید بات چیت نہیں کی۔ خاموشی سے کھانا کھایا۔ نور الٰہی نے اس وقت بھی تھوڑا کھانا کھایا اور کھاتے ہی بستر پر لیٹ گیا۔

لالٹین کی زرد روشنی میں اس کا چہرہ مٹیالا لگ رہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نمایاں ہو گئے تھے۔ ڈاڑھی اور سر کے بال بے ترتیب تھے۔ ان پر ہلکی ہلکی گرد بھی نظر آتی تھی۔ قادر آباد سے آنے کے بعد اس نے اب تک غسل نہیں کیا تھا۔ وہ چت لیٹا تھا اور آنکھیں کھولے چھت کو تک رہا تھا۔

رحیم داد کچھ دیر اس کے قریب مونڈھے پر بیٹھا رہا اس نے اٹھ کر چٹائی نکالی اور برآمدے میں جا کر لیٹ گیا۔ آنکھ ذرا لگی ہی تھی کہ اس نے نور الٰہی کی آواز سنی۔ وہ اسے بلا رہا تھا۔ رحیم داد اس کے پاس گیا۔ نور الٰہی کہنے لگا۔ "ذرا مجھے پانی پلا دے۔ سخت پیاس لگی ہے۔" رحیم داد نے اسے پانی پلایا۔ پانی پی کر وہ بولا۔ "ذرا دیر میرے نزدیک بیٹھ جا۔ جی بہت گھبرا رہا ہے۔ نیند بھی نہیں آ رہی ہے۔"

رحیم داد مونڈھا کھسکا کر اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اس کا ماتھا چھو کر بولا۔ "تجھے تو ابھی تک تیز بخار ہے۔ دوائی پلا دوں؟"

"دوائی تو میں نے شام ہی کو پی لی تھی۔"

رحیم داد ہاتھ بڑھا کر دھیرے دھیرے نور الٰہی کا سر دبانے لگا۔ کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ گاؤں پر سناٹا طاری تھا۔ تھوڑی دیر بعد خاموشی میں نور الٰہی کی آواز ابھری۔ "ایسا محسوس ہوتا ہے' اب میں زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گا۔" اس کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔ اس میں درد کی کسک تھی۔

رحیم داد نے اسے تسلی دی۔ "چوہدری! حوصلے سے کام لے۔ کچھ دنوں میں چنگا ہو جائے گا۔"

"میں نوں پتہ ہے' کیا ہونے والا ہے۔" نور الٰہی نے آہستہ آہستہ ہانپتے ہوئے کہا۔ "یہ بہت موذی بیماری ہے۔ مشکل ہی سے کوئی اس سے بھلا چنگا ہوتا ہے۔ میرے پاس لاکھوں روپے کا کلیم

ہے پر کس کام کا۔ کسی کے بھی کام نہیں آ سکتا۔"

"تیرے بال بچوں کے تو کام آ ہی سکتا ہے۔"

نور الٰہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پتہ نہیں وہ زندہ بھی ہیں کہ تریموں کے پتن ہی پر کرم الٰہی کی ح شہید ہو گئے۔"

"توں بتاتا تھا' وہ پاکستان آ گئے تھے اور لہور کے والٹن کیمپ میں ٹھہرے بھی تھے؟"

"سنا ہی سنا ہے۔ جانے ان کا کیا بنا۔ لگ بھگ ۸ سال ہو گئے انھیں ڈھونڈتے ہوئے۔" وہ وش ہو گیا۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔ "میرا دوسرا پتر ارشاد الٰہی اب ۱۸ برس کا ہو گا۔ وہ میرا ا ابن سکتا تھا۔" اس نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ "پر رب کو یہ منظور ہی نہیں۔"

رحیم داد نے اس کا کندھا ہولے ہولے تھپ تھپایا۔ "چوہدری! حوصلہ رکھ۔ تیرا پتر تجھے ضرور جائے گا۔ رب نے چاہا' تیری گھر والی اور کڑی بھی مل جائے گی۔ پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک جائے گا۔"

"توں مجھے نیک بندہ لگتا ہے۔" نور الٰہی نے رحیم داد کی ہمدردی سے متاثر ہو کر کہا۔ "پر قتل کی دات میں کیسے پھنس گیا؟ مجھے جرائم پیشہ نہیں لگتا۔ تیرا چہرہ اور تیری بات چیت کا انداز یہی بتاتا ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "توں نے اپنے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔ کچھ اپنے بارے گل بات کر' خاموشی میں میرا جی بہت گھبراتا ہے۔ تبھی تو میں تیرے ساتھ کل رات دیر تک یں کرتا رہا۔ دل کا کچھ بوجھ ہلکا ہوا تو تیرے جاتے ہی نیند بھی آ گئی۔"

"چوہدری! میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے کسی کا کتل شتل نہیں کیا۔" رحیم داد نے صاف جھوٹ بولا۔ "میں اس کے ساتھ سک نالے میں ایک جھاڑی کے نیچے کھڑا تھا۔ پاس ہی نچے اونچے ٹبے تھے۔ فیر ایسا ہوا جی' اوپر سے ایک بھاری پتھر لڑھک کر نیچے گرا میں تو بچ گیا۔ پتھر یک اس کے سر پر گرا۔ وہ اسی وکت مر گیا۔ میں بہت ڈر گیا۔ وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ میں برا کر بھاگ کھڑا ہوا۔"

نور الٰہی نے مشتبہ نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "پر ادھر ویرانے میں گیا کس لیے تھا؟ ادھر تو ئی نہیں جاتا۔ میں نے سنا ہے..... " وہ اپنی بات پوری نہیں کر سکا۔ باہر درختوں تلے خشک پتوں چاپ ابھری۔ دونوں نے چونک کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔

رحیم داد جھپاک سے چارپائی کی اوٹ میں دبک گیا۔ ذرا دیر بعد کھڑکی پر ایک سایہ ابھرا۔ نور الٰہی ہستہ سے کھنکارا۔ سایہ فوراً غائب ہو گیا۔ نور الٰہی نے اونچی آواز سے پوچھا۔ "کون ہے؟" کوئی

جواب نہیں ملا۔ نورالٰہی کراہتا ہوا بستر پر بیٹھ گیا۔ نیچے اترا اور لڑکھڑاتے قدموں سے جا کر کھڑکی پر کھڑا ہو گیا۔

وہ واپس آ کر بستر پر بیٹھا تو رحیم داد نے دھیرے سے پوچھا۔ ”کون تھا؟“

اس نے بھی آہستہ سے جواب دیا۔ ”مجھے تو کوئی نظر نہیں آیا۔“ دونوں خاموش رہے۔ چند لمحے بعد نورالٰہی نے رحیم داد سے کہا۔ ”اب جا کر لیٹ جا۔ بتی ذرا دھیمی کر دے۔“

نورالٰہی بستر پر لیٹ گیا۔ رحیم داد نے طاق میں رکھی ہوئی لالٹین کی لو دھیمی کی۔ کمرے سے نکلا اور چٹائی پر جا کے لیٹ گیا۔ مگر وہ سویا نہیں۔ جیناں نے نورالٰہی سے جس طرح شک کا اظہار کیا تھا، اسے سن کر رحیم داد گھبرا گیا تھا۔ بعد میں درختوں کے نیچے آہٹ ابھری اور پراسرار سایہ بھی کھڑکی پر نظر آیا۔ رحیم داد اور خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اپنی صفائی میں اس نے جس حیلے کا سہارا لیا تھا، اس پر نورالٰہی نے یقین نہیں کیا۔ وہ اس سے کرید کر اور بھی بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ رحیم داد نے سوچا، سویرے نورالٰہی اس سے مزید پوچھ گچھ کرے گا۔ وہ پولیس میں رہ چکا ہے، لہٰذا اسے غچا دینا آسان نہیں۔

رحیم داد نے طے کیا کہ سورج نکلنے سے پہلے ہی کہیں اور چلا جائے گا۔ وہ آنکھیں بند کئے خاموش لیٹا رہا۔ کمرے سے رک رک کر نورالٰہی کے کھانسنے اور آہستہ آہستہ کراہنے کی آواز ابھر رہی تھی۔ رات گہری ہوتی گئی۔ سناٹا بڑھ گیا۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ نورالٰہی کی کھانسی بند ہو گئی اور دیر تک سنائی نہیں دی۔ رحیم داد خاموشی سے اٹھا، دبے قدموں دروازے پر پہنچا۔ جھک کر کمرے میں دیکھا، نورالٰہی چارپائی پر سو رہا ہے۔ وہ کمرے میں چلا گیا۔

نورالٰہی آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چارپائی کے قریب ہی ٹرنک رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی رحیم داد کی آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہوئی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ اسے بستر پر ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا کہ نورالٰہی آنکھیں کھولے اس کی جانب دیکھ رہا ہے۔ وہ آہستہ سے کھنکار کر بولا۔ ”ٹرنک میں کچھ نہیں ہے۔ میرے پاس جو تھوڑی بہت رقم تھی وہ ڈاک خانے میں جمع کرا دی۔ صرف کلیم کے کاغذات ہیں، وہ تیرے کسی کام کے نہیں۔“ اس نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر کنجی نکالی۔ ”یہ چابی لے اور ٹرنک کھول کر دیکھ لے۔“ اس نے کنجی رحیم داد کی جانب بڑھائی۔

رحیم داد گم صم کھڑا چوہدری نورالٰہی کا چہرہ تکتا رہا۔ نورالٰہی کھانسنے لگا اور کھانستے کھانستے اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے جھک کر چارپائی کے نیچے رکھی ہوئی مٹی کی کنالی میں تھوکا۔ بلغم کے ساتھ جیتا جیتا بہت سا خون نکلا۔ نورالٰہی لمبی لمبی سانس بھر کر ہانپنے لگا اور نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ کنجی اس کی انگلیوں سے چھوٹ کر بستر پر ایک طرف گر گئی۔

رحیم داد نے کنجی دیکھی پھر نورالٰہی پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ دھندلی روشنی میں اس کے چہرے پر چھائی ہوئی زردی گہری ہو گئی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ رحیم داد آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھا۔ اس کے سرہانے کھڑے ہو کر اس نے دونوں ہاتھ بڑھائے اور نورالٰہی کا گلا دبوچ لیا۔

نورالٰہی نے آنکھیں کھول دیں۔ رحیم داد نے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔ نورالٰہی نے بے بسی سے اپنی گردن ادھر ادھر ہلانے کی کوشش کی۔ اس کے حلق سے بلّی کی طرح غرانے کی سی آوازیں نکلیں۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ منکا ڈھلک گیا۔ رحیم داد خاموش کھڑا اس کا بے جان چہرہ تکتا رہا۔ اس کے ہونٹوں کے ایک گوشے سے گاڑھے گاڑھے خون کی پتلی سی دھار نکل کر نیچے ٹھوڑی تک پھیل گئی تھی۔

اس نے نورالٰہی کی لاش کے قریب پڑی ہوئی کنجی اٹھائی، ٹرنک کا تالا کھولا۔ ٹرنک میں پہننے کے چند کپڑے رکھے تھے۔ اس نے کپڑے الٹ پلٹ کر دیکھے۔ نورالٰہی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ٹرنک میں کوئی رقم نہیں تھی۔

رحیم داد نے کلیم کے کاغذات کا بستہ باہر نکالا۔ شلوار اور قمیص نکالی۔ اپنے کپڑے اتارے اور نورالٰہی کی قمیص اور شلوار پہن لی۔ حکیم چشتی کے جو کپڑے اب تک اس کے جسم پر تھے، اس نے ٹرنک میں نہیں رکھے۔ بستہ کھولا، کپڑے لپیٹ کر کلیم کے کاغذات کے ساتھ رکھے اور ان کی گٹھری بنا لی۔ اس نے ٹرنک کا ڈھکنا بند کیا، تالا لگایا اور کنجی نورالٰہی کی لاش کے سرہانے تکیے کے نیچے رکھ دی۔

وہ کمرے سے باہر گیا، چٹائی اٹھائی اور لپیٹ کر کوٹھری میں رکھ دی۔ اس نے نورالٰہی کی لاش پر گہری نظر ڈالی۔ بے جان آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں کے گوشے سے بہتا ہوا خون جم کر سیاہی مائل سرخ ہو گیا تھا۔

وہ کمرے سے نکل کر آنگن میں گیا۔ اس نے باہر جانے والے دروازے کی کنڈی کھولی مگر کچھ سوچ کر باہر نہیں گیا۔ کنڈی دوبارہ لگائی اور آنگن کی چار دیواری کا جائزہ لیا۔ دیواریں زیادہ اونچی

نہیں تھیں۔

اس نے گٹھری کندھے پر لٹکائی۔ آنگن میں گھوم پھر کر ادھر ادھر دیکھا۔ اسے ایک ٹوٹی ہوئی گھڑونچی مل گئی۔ گھڑونچی اس نے دیوار سے ٹکائی اور اس کے سہارے اوپر پہنچ گیا۔ اس نے ایک پیر نیچے لٹکایا اور آہستہ سے ٹھوکر مار کر گھڑونچی نیچے گرا دی۔

وہ دھیرے سے باہر اتر گیا۔ آگے بڑھا اور درختوں کے نیچے اندھیرے میں دبے دبے قدموں چلنے لگا۔ گاؤں سے نکل کر کچے راستے پر آگیا۔ وہ تخت ہزارہ کی جانب بڑھنے لگا۔ میل' ڈیڑھ میل کے بعد ویران اور بنجر میدان آگیا۔

رحیم داد کچا راستہ چھوڑ کر ببول کی جھاڑیوں کی جانب بڑھا۔ جھاڑیوں کے نیچے اس نے نرم اور پولی زمین تلاش کی' چاقو نکالا اور خاصا گہرا گڑھا کھودا' گٹھری سے مقتول حکیم چشتی کے کپڑے نکالے اور گڑھے میں دبا کر زمین ہموار کر دی۔

رحیم داد نے کلیم کے کاغذات کا بستہ بغل میں دبایا اور کچے راستے پر چلنے لگا۔ تخت ہزارہ قریب آ گیا مگر وہ بستی میں نہیں گیا۔ داہنے ہاتھ کے ایک راستے پر مشرق کی طرف مڑ گیا۔

۱۷

رات کسی قدر گرم تھی' اور ہوا بھی ٹھہری ہوئی تھی۔ دور سے بیلوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد ان آوازوں کو سن کر ٹھٹکا اور گردن اٹھا کر اس سمت دیکھنے لگا جدھر سے گھنٹیوں کی جھنکار رات کے سناٹے میں بلند ہو رہی تھی۔

رحیم داد کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والے سنسان پی ہے پر کھڑا تھا۔ چند لمحے ٹھہر کر وہ آگے بڑھا اور چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا پی ہے پر چلنے لگا۔ پیہا ختم ہوا تو کچی سڑک آگئی۔

اس نے دیکھا' سامنے سڑک پر ایک قطار میں کئی بیل گاڑیاں گزر رہی ہیں۔ رحیم داد نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ بیل گاڑیوں میں لادے سوار ہیں۔ وہ اجرت پر فصل کی کٹائی کرنے والے مزدور تھے۔

چیت کا مہینہ ختم ہو چکا تھا' بیساکھ کے ابتدائی دن تھے۔ ربیع کی کٹائی کہیں کہیں شروع ہو چکی تھی۔ لادے کام کی تلاش میں جا رہے تھے۔

رحیم داد نے ایک درخت کے نیچے رک کر بیل گاڑیوں کو غور سے دیکھا۔ ہمت سے کام لیا۔ آگے بڑھا' ایک بیل گاڑی کے قریب پہنچا اور اس میں بیٹھے ہوئے لادے کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

"گل سن۔" اس نے قدرے تامل کیا۔

"تساں نوں کتھے جانا ہے؟"

لادے نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہم تو جی کریم کوٹ سے آ رہے ہیں اور گمرہوتے

ہیں بوہڑپور جائیں گے۔ اتھے جانا ہو تو گڈے میں بہ جا۔"

"جانا تو میں نے آگے ہے۔ بوہڑپور ہی پہنچا دے۔"

لادے نے بیل گاڑی روک لی۔ رحیم داد اس پر سوار ہوگیا۔ بیل گاڑی ہچکولے کھاتی ہوئی سڑک پر چلنے لگی۔ رحیم داد بہت تھکا ہوا تھا۔ کچھ دیر بیٹھا جھومتا رہا، آخر لڑھک کر سوگیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ بیل گاڑیاں سڑک کے کنارے کھڑی تھیں۔ قریب ہی کوئی بستی تھی۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں رات کے سناٹے میں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد نے آنکھیں ملتے ہوئے لادے سے پوچھا۔

"بوہڑپور آگیا؟"

"ابھی تو کوٹ عالم بھی نہیں آیا۔ بوہڑپور تو بہت آگے ہے۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "ادھر کیسے آگیا؟"

"ادھر فصل کی واڈھی کا کام مل گیا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تیں نوں بوہڑپور نہیں جانا۔"

"ہاں جی، اب تو ادھر کا کام پورا کرنے کے بعد ہی آگے جانا ہوگا۔"

قریب کھڑے ہوئے دوسرے لادے نے کہا۔ "ایسا کر، اس ٹرک میں بہ جا۔" اس نے کچھ دور سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ کھڑا ہے ٹرک۔ بوہڑپور سے بھی آگے جا رہا ہے۔ دو روپے ڈریور کو دینا۔ رستے میں جہاں کہے گا، وہیں پہنچا دے گا۔ چل، میں تیری ڈریور سے گل بات کرا دیتا ہوں، اپنا جاننے والا ہے۔"

رحیم داد بیل گاڑی سے نیچے اترا اور لادے کے ساتھ ٹرک کی جانب بڑھا۔ قریب جا کر لادے نے ٹرک ڈرائیور سے کہا۔ "جیونا! توں بوہڑپور ہی کی طرف جا رہا ہے ناں؟" اس نے رحیم داد کی جانب اشارہ کیا۔ "اسے اپنے ساتھ بٹھالے۔ اسے بھی اتھے ہی جانا ہے، پہنچا دے۔ دو روپے اس سے لے لینا۔"

ڈرائیور نے رحیم داد سے کہا۔ "میں نے تو چک بیدی جانا ہے۔ تجھے ادھر جانا ہو تو اگلی سیٹ پر بیٹھ جا۔"

"ہاں جی، میں نے بھی ادھر ہی جانا ہے۔" رحیم داد نے ڈرائیور کو دو روپے دیے۔ اور ٹرک میں بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد ٹرک اسٹارٹ ہوا اور سڑک پر دوڑنے لگا۔

رحیم داد نے ڈرائیور سے پوچھا۔ "ٹرک ادھر کیوں کھڑا کر رکھا تھا؟"

"انجن گرم ہوگیا تھا۔" ڈرائیور نے بتایا۔ "ریڈیئٹر میں پانی بھی ڈالنا تھا۔" اس کے بعد کوئی بات چیت نہیں ہوئی، ٹرک سڑک پر دوڑتا رہا۔ رحیم داد کی پھر آنکھ لگ گئی۔

وہ بیدار ہوا تو ٹرک پختہ سڑک پر دوڑ رہا تھا۔ رات ختم ہو چکی تھی۔ مغربی افق پر ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا۔ رحیم داد نے صبح کی روشنی دیکھی تو گھبرا گیا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔

"جیونا! ٹرک روک لے۔ میں نوں یہیں اترنا ہے۔"

ڈرائیور نے ٹرک روک لیا۔ رحیم داد نے اپنا بستہ بغل میں دبایا اور ٹرک سے نیچے اتر گیا۔ ٹرک آگے بڑھا اور تیزی سے دوڑتا ہوا کچھ ہی دیر بعد درختوں کی اوٹ میں اوجھل ہوگیا۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ دونوں طرف کھیت تھے، جن کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ اجالا رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔

رحیم داد آہستہ آہستہ سڑک پر چلتا رہا۔ میل ڈیڑھ میل بعد وہ کھیتوں میں گھس گیا اور ایک پگڈنڈی پر چلنے لگا۔

ربیع کی فصلیں تیار کھڑی تھیں۔ اپریل کا سورج شرینہ کے گھنے درخت کے پیچھے سے آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ دھوپ ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ گندم اور جو کے پودے دھوپ سے سنہرے پڑتے جا رہے تھے۔

ہوا چلتی تو کھیتوں میں سرسراہٹیں ابھرتیں، مدھم سروں میں جل ترنگ بجتے۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔ مگر دور سے ڈھول پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

رحیم داد آگے بڑھتا گیا۔ وہ ایسی جگہ پہنچ گیا، جہاں راستے کے ایک طرف کھیتوں میں گندم اور جو کی بالیاں ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہی تھیں۔ دوسری طرف اجاڑ کھیت تھے۔ فصل تازہ تازہ کٹی تھی۔ جگہ جگہ کٹی ہوئی فصل کے ٹرنڈے ابھرے ہوئے تھے۔ گندم کے خوشے اور سلّے بکھرے تھے۔

پگڈنڈی سے ذرا ہٹ کر چھ سات سلّے بار عورتیں زمین پر جھکی ہوئی خوشے اٹھا اٹھا کر دوپٹوں کی جھولیوں میں ڈال رہی تھیں۔ ان کے بوسیدہ اور میلے کچیلے لباس صاف چغلی کھا رہے تھے کہ وہ تیلیوں اور کمیّوں کے گھروں کی عورتیں ہیں۔

اس نے ایک سرسری نگاہ سلّے بار عورتوں پر ڈالی۔ ان میں ایک سانولی سلونی مُیار بھی تھی۔ وہ بھی دھوتی کا ادھڑونچا باندھے ہوئے تھی اور پلو کندھے سے اتار کر اس میں گندم کے خوشے چن چن کر ڈال رہی تھی۔

چاپ سن کر اس نے گردن کو ذرا سا خم دے کر نظریں موڑیں۔ اس کی ناک میں فیروزے کا لونگ تھا۔ آنکھوں سے بھری جوانی کی دھوپ جھلکتی تھی۔

وہ رحیم داد کو دیکھ کر الھڑپن سے مسکرائی۔ وہ چند ہی قدم کے فاصلے پر تھی، اس قدر قریب کہ رحیم داد اس کے بھرے بھرے کولھوں کا ہر دائرہ اور ہر خم دیکھ سکتا تھا۔ رحیم داد لمحے بھر کو ٹھٹکا پھر جھٹ نظریں نیچی کر کے آگے بڑھ گیا۔

ڈھول بجنے کی آوازیں اب قریب آتی جا رہی تھیں۔ آوازیں دائیں ہاتھ کی کھڑی فصلوں کے پیچھے سے آ رہی تھیں۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا۔ لگ بھگ پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر ایک اجاڑ کھیت کے اس پار گندم کی فصل کٹ رہی تھی۔ بھرائی اور ڈھولی زور زور سے ڈھول پر چوٹ لگا رہے تھے۔

فصل کی کٹائی کرنے والے ہاتھوں میں درانتیاں سنبھالے تیزی سے ہاتھ چلاتے، ڈھول کی تھاپ پر رک رک کر اونچی آواز سے بلے بلے کہتے۔ فصل کاٹنے والے لاوے نہیں تھے۔ وہ مزارعے تھے اور مانگی پر فصل کاٹنے آئے تھے۔

☆

دو سال پہلے ربیع کی فصل پر رحیم داد نے بھی انھی دنوں اسی طرح مانگی پر اپنی فصل کٹوائی تھی۔ واڈھی سے پہلے حسب دستور اس نے مانگی کے لیے سیپی کمیوں کے ذریعے گاؤں والوں کو پیغام بھیجا تھا۔ ان دنوں زمین کے مسئلے پر سیف اللہ سے اس کی لاگ ڈانٹ چل رہی تھی۔ معاملہ عدالت تک پہنچ چکا تھا۔

سیف اللہ گاؤں کا کھاتا پیتا زمیں دار تھا اور رحیم داد کے پاس صرف بارہ ایکڑ زمین تھی۔ مگر مقدمہ رحیم داد کے حق میں جا رہا تھا۔ گواہ بھی اس کے پکے تھے۔ پٹواری نے سو روپے اور چار من گندم رشوت میں لے کر رحیم داد کا مقدمہ اور مضبوط بنا دیا تھا۔

سیف اللہ اس کی کھلم کھلا مخالفت پر اتر آیا تھا۔ اس نے اور اس کے بھائیوں نے گاؤں والوں کو ورغلایا کہ رحیم داد کی مانگی پر فصل کاٹنے نہ جائیں۔ مگر صبح جب رحیم داد، بیوی بچوں کے ساتھ اپنے کھیتوں پر پہنچا اور ڈھولیوں نے ڈھولوں پر زور سے چوٹ لگائی تو گاؤں والے گھروں سے نکل نکل کر فصل کی کٹائی کے لیے پہنچنے لگے۔ سیف اللہ اور اس کے بھائیوں کی باتوں پر ان کے اپنے مزارعوں کے سوا کسی نے کان نہ دھرا۔

دھوپ تیز ہوئی اور اوس کی نمی ذرا خشک ہوئی تو سب درانتیاں سنبھال کر کٹائی پر جٹ گئے۔

انھوں نے رحیم داد کو کٹائی میں ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا۔ وہ الگ بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہا۔ ڈھول بجتے رہے، فصل کٹتی رہی۔

فصل کاٹنے والے سب مرد تھے۔ عورت صرف رحیم داد کی بیوی نوراں تھی۔ وہ کٹے ہوئے پودوں کے پولے باندھ باندھ کر ڈھیر لگاتی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ چہرہ پسینے سے تر تھا، تیز دھوپ اور سخت محنت سے گلابی پڑ گیا تھا۔ بچے بھی اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ ننھی زینو ضد کرتی یا روتی تو نوراں غصے سے جھڑک دیتی۔ رحیم داد زینو سے بہت پیار کرتا تھا۔ تھی بھی وہ بہت بھولی بھالی اور ماں کی طرح خوب صورت۔ نوراں، جب اسے جھڑکتی یا غصے سے آنکھیں نکال کر چیختی تو وہ حقے کی نے منہ سے ہٹا کر بیوی کو نرمی سے سمجھاتا، کبھی ڈانٹتا، مگر فوراً ہی بے تکلفی سے مسکرانے بھی لگتا۔

اس روز وہ بہت موج میں تھا۔ عالم وارفتگی میں زور زور سے قہقہے لگاتا۔ بار بار کٹائی کرنے والوں کے پاس جاتا، ان کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا۔ جب ڈھولی، کٹائی کرنے والوں کا حوصلہ بڑھانے کی غرض سے ڈھول کی تھاپ تیز کرتے تو ہر طرف سے بلے بلے کی آوازیں ابھرتیں۔ رحیم داد بھی ان کے جوش و خروش میں شامل ہو کر ہاتھ اٹھا اٹھا کے اونچی آواز سے بلے بلے کی صدا لگاتا۔ کٹائی کرنے والوں کے ہاتھ اور تیزی سے چلتے۔

سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے فصل کٹ گئی۔ کٹائی کرنے والے مویشیوں کو چارہ دینے اور دوسرے کام کاج کرنے گھروں کو چلے گئے۔ مگر فصل کی اجتماعی کٹائی 'مانگی' کے رواج کے مطابق رات کو وہ منگ کے لیے پھر رحیم داد کے گھر پر اکٹھا ہوئے۔ رحیم داد کے گھر پلاؤ کی دیگ چڑھی تھی۔ اس نے ایک ایک کو بڑی محبت اور چاؤ سے کھانا کھلایا۔ اس ضیافت کے لیے اس نے کھانے میں خاص اہتمام کیا تھا۔

اس رات مشعلوں کی روشنی میں ڈھولوں کی تھاپ پر بھنگڑا ڈالا گیا۔ بھنگڑا ڈالنے والوں نے ڈھولیوں کے گرد حلقہ بنا لیا تھا۔ رحیم داد نے اجلے کپڑے پہنے تھے۔ سر میں تیل ڈال کر بیچ سے مانگ نکالی تھی۔ دونوں طرف بالوں کی پٹیاں جمائی تھیں۔ مونچھیں مروڑ کر خوب نکیلی بنائی تھیں۔ اس کے قریب ہی نوراں کھڑی تھی۔

اس نے نہا دھو کر ٹرنک سے راکھواں کپڑے نکال کر پہنے تھے۔ سوتی دھوتی اتار کر ریشمی سلارا باندھا تھا، جس پر تلے کی دھاریاں تھیں اور تیز روشنی میں خوب جھلملا رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر دنداسا ملا تھا۔ آنکھوں میں گہرا کاجل ڈالا تھا۔ تین بچوں کی ماں ہونے کے باوجود وہ جوان اور

دلکش لگ رہی تھی۔

رحیم داد نے بیوی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور سب کی نظریں بچا کر ہولے سے اس کے رخسار کی چٹکی بھری۔

وہ من چلے نوجوانوں کی طرح سینہ تان کر آگے بڑھا۔ ایک ڈھولی سے ڈھول لے کر گلے میں ڈالا۔ ایک ہاتھ سے ڈھول پر تھاپ دی اور دوسرا کان پر رکھ کر اونچے سر میں ڈھولے کا ایک ٹپّا الاپنے لگا۔

وہ اپنے بالوں کے پٹّوں کو جھٹکا دے کر تیزی سے لہراتا اور جھوم جھوم کے ٹپّا الاپتا۔ دوسرے مل کر آخری بول دہراتے اور بانہیں الارالار کر تیز رقص کرتے۔

بھنگڑے کا مزا اس وقت سوا ہوا جب جمال دین بھی بڑھ کر آگے آگیا۔ وہ گبھرو جوان تھا۔ اس کا بدن گٹھا ہوا اور مضبوط تھا۔ اب رحیم داد اور جمال دین ایک دوسرے کو للکارتے اور ڈھول پر دھنگڑ کے ساتھ لہک لہک کر ٹپّا الاپتے۔ رحیم داد مسکرا مسکرا کر نوراں کو دیکھتا۔ وہ کبھی شرماتی' کبھی کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

رحیم داد ڈھول پر زور سے تھاپ دے کر زیادہ اونچی تان لگاتا۔ بول اونچے' اور اونچے ہوتے گئے۔ رقص تیز' اور تیز ہوتا گیا۔

رحیم داد بیتے دنوں کی یادوں میں گمن آگے بڑھتا گیا اور سوچتا رہا کہ اس بار اس کی فصل ابھی کٹی بھی ہوگی یا نہیں۔ وہ خود تو خریف کی فصل کے لیے بھی اپنے کھیتوں میں ہل نہیں چلا سکا تھا۔ حالانکہ ربیع کی فصل کی کٹائی کے کچھ ہی دنوں بعد وہ زمین کا مقدمہ جیت گیا تھا۔ رات کو مقدمہ جیتنے کی خوشی میں اس کے گھر خوب جشن رہا۔ پیٹرومکس کی تیز روشنی میں لڈّی ناچ ہوا۔ بیچ میں ڈھولی تھے اور ان کے گرد رقص کرنے والے باری باری پاؤں اٹھاتے' بانہیں سر کی سیدھ میں لہراتے اور ایک ایڑی پر بیٹھ کر ڈھولیوں کے چاروں طرف تیزی سے گھومتے۔

رقص کرنے والوں میں رحیم داد بھی شامل تھا۔ اس کے سر پر سرخ جیرا تھا جو پاک پتن میں بابا فرید گنج شکر کے مزار پر چادر چڑھانے کے بعد نیک شگون کے طور پر نوراں نے اپنے ہاتھ سے باندھا تھا۔ نوراں اس وقت عورتوں کے جھرمٹ میں سب سے آگے نظر آرہی تھی۔ وہ ریشمی پٹانگل پہنے' بنی سنوری ایسی سج دھج سے کھڑی تھی کہ اس کا حسن اور نکھر گیا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔

ناچتے ناچتے بیوی پر رحیم داد کی نظر پڑتی تو وہ ترنگ میں آکر ایڑی کے بل تیزی سے گھومتا اور

شیفتگی کے عالم میں زور زور سے نعرہ بلند کرتا۔

ہو ہو' علی علی' لڈّی تھم لڈّی

فتح کے اس جشن کے چند ہی روز بعد سیف اللہ اور اس کے بھائیوں نے اپنے حامیوں کے ساتھ' شام کے جھٹپٹے میں رحیم داد پر حملہ کیا۔ حملہ آور آٹھ تھے اور پوری طرح مسلح بھی تھے۔ رحیم داد کے ساتھ صرف جمال دین اور اللہ ورایو تھے۔ مگر وہ بھی نہتے نہیں تھے۔ رحیم داد کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ جمال دین اور اللہ ورایو کے پاس لمبی لمبی ڈانگیں تھیں۔ تینوں نے جم کر مقابلہ کیا' زخمی بھی ہوئے مگر پیچھے نہیں ہٹے۔

رحیم داد کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ رحیم داد نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ہاتھ میں بھرا ہوا اپنا جیتا جیتا خون دیکھا۔ وہ جوش سے تڑپ اٹھا۔ اس نے ہونٹ دانتوں میں بھینچے' بڑھ کے کلہاڑی کا بھرپور وار کیا۔ کلہاڑی سیف اللہ کا کندھا کاٹتی ہوئی پسلیوں تک اتر گئی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔

سیف اللہ کے گرتے ہی اس کے بھائی اور حمایتی بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعد میں سیف اللہ کو زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا۔ اسے تین دن بعد ہوش آیا۔ رحیم داد' جمال دین اور اللہ ورایو گرفتار کرلئے گئے۔

پولیس نے تگڑی رشوت لے کر سیف اللہ اور اس کے بھائیوں کی پوری طرف داری کی۔ رحیم داد اور اس کے ساتھیوں پر تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۷ کے تحت بلوے اور اقدام قتل کا مقدمہ قائم کرکے عدالت میں چالان پیش کردیا۔

تینوں ملزموں کو تفتیش کے لیے کچھ عرصہ ریمانڈ پر حوالات میں رکھا گیا۔ بعد میں منٹگمری جیل میں نقل کردیا گیا۔ نوراں ملاقات کے دن جیل میں ملنے رحیم داد کے پاس آتی اور اس کے لیے میدے اور چینی سے بنا ہوا گھیور ضرور لاتی۔ گھیور رحیم داد بڑی رغبت سے کھاتا تھا۔ جب سے رحیم داد جیل گیا تھا نوراں نے رو رو کر برا حال کرلیا تھا۔ اس کا شگفتہ چہرہ مرجھا گیا تھا۔ وہ بیمار اور لاغر نظر آتی۔

مقدمے کی پیشیاں پڑتی رہیں۔ رحیم داد کی ضمانت بھی نہ ہوسکی۔ مقدمے کا فیصلہ ہوا تو جمال دین اور اللہ دتو بری ہوگئے۔ رحیم داد کو سزا ہوگئی۔ اب نوراں مہینے میں دوبار رحیم داد سے ملنے جیل پہنچتی۔

انھی دنوں رحیم داد کو نوراں کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے زمین' کھیتی باڑی کے لیے

جمال دین کو نصف پیداوار کے عوض ادھیارے پر دے دی۔ کرتی بھی کیا۔ دونوں لڑکے ابھی نو تھے اور کسی طور کھیتی باڑی کا کام سنبھالنے کے قابل نہ تھے۔ ادھیارے پر زمین دینے کا مشورہ بھ رحیم داد ہی نے دیا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ نوراں نے اچانک جیل آنا بند کر دیا۔ جس وقت وہ لالی ساتھ جیل سے فرار ہوا، نوراں مہینے بھر سے نہیں آئی تھی۔ شاید بیمار پڑ گئی ہو۔ رحیم داد نے یہ سوچا تھا۔ لالی نے جب جیل سے فرار ہونے پر اکسایا تو تھوڑی سی حیل و حجت کے بعد اس لیے بھ آمادہ ہو گیا کہ وہ نوراں سے ملنے کے لیے بے قرار تھا اور بچوں کی یاد بھی ہر وقت ستاتی تھی۔

☆

رحیم داد آگے بڑھتا اور سوچتا رہا، نہ جانے نوراں اور بچے کس حال میں ہوں گے۔ نوراں اور بچوں سے ملنے اور انھیں دیکھنے کے لیے اس کا دل تڑپ اٹھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور آگے بڑھتا رہا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہاں جا رہا ہے؟ ڈھولوں کی آواز پیچھے رہ گئی تھی۔

راستے سے کچھ فاصلے پر بکائین کے ایک درخت کے نیچے جوہ میں لڑکے جمع تھے۔ وہ کیڑ کاٹا کھیل رہے تھے۔

رحیم داد نے دیکھا، ایک کھلاڑی لڑکے نے اپنی ٹانگ کے نیچے سے ایک ٹیڑھی سی لکڑی پوری قوت کے ساتھ پھینکی۔ لکڑی سیدھی رحیم داد کی جانب آئی اور بچتے بچتے بھی رحیم داد کی پنڈلی سے ٹکرا گئی۔

وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا مگر رحیم داد کو دیکھ کر سہم گیا اور چند قدم کے فاصلے پر ٹھہر گیا۔ وہ اس وقت کھیل میں چھوتی تھا۔ اسے جلد سے جلد لکڑی اٹھا کر درخت کے نیچے بنے ہوئے دائرے میں رکھنا تھی اور دوسرے کھلاڑیوں کو درخت پر چڑھنے سے پہلے چھونے کی کوشش بھی کرنا تھی۔ مگر لکڑی اٹھانے کے بجائے لڑکا رحیم داد کے روبہ رو سہما ہوا کھڑا تھا۔ وہ سب سے کم عمر بھی نظر آتا تھا۔

اسے دیکھ کر رحیم داد کو اپنا بڑا بیٹا کریما یاد آ گیا۔ وہ لگ بھگ اتنا ہی بڑا تھا اور صورت شکل سے اسی کی طرح معصوم بھی لگتا تھا۔ رحیم داد اسے اس طرح زیادہ دیر پریشان نہ دیکھ سکا۔ اس نے جھک کر لکڑی اٹھائی اور مسکرا کر لڑکے کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”لے پتر! فٹافٹ گھیرے میں جا کر رکھ دے۔“

لڑکے نے چپ چاپ لکڑی رحیم داد کے ہاتھ سے لی اور درخت کی جانب تیزی سے بھاگا۔ لیکن اس وقت تک تمام کھلاڑی درخت پر چڑھ چکے تھے اور شاخوں کے درمیان سے جھانک کر قہقہے لگا رہے تھے۔

جوہ کے اس پار گاؤں کے مکانات نظر آ رہے تھے۔ مگر رحیم داد اس طرف نہیں گیا۔ راستہ ابھی سنسان تھا۔ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ کھیتوں کی منڈیر پھاند کر ایک شخص نکلا اور رحیم داد کے عین سامنے آ گیا۔ اس نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ لیکن رحیم داد نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ وہ پیہا عبور کر کے جوہ کی طرف جانے لگا اور مڑ مڑ کر رحیم داد کو دیکھتا بھی رہا۔ رحیم داد اس کی جانب دیکھے بغیر چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

سو سوا سو گز طے کرنے کے بعد اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ کچھ دور اسے چھوٹی سی مسجد نظر آئی۔ مسجد گاؤں کے آخری سرے پر تھی۔ آس پاس درختوں کا جھنڈ تھا۔ مگر وہاں بالکل خاموشی چھائی تھی۔

پہیے سے نکل کر ایک تنگ پگڈنڈی کانگڑی کی فصلوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی مسجد کی سمت جاتی تھی۔ رحیم داد کہیں ٹھہر کر ستانا چاہتا تھا۔ ٹھہرنے کے لیے مسجد اسے مناسب جگہ معلوم ہوئی۔

وہ مسجد کی جانب بڑھا اور رفتہ رفتہ اس سے قریب ہوتا گیا۔ جب وہ چری کے کھیتوں سے نکل کر باہر آیا تو درختوں کے نیچے ایک ادھیڑ آدمی دکھائی دیا۔ وضع قطع سے وہ مسجد کا ملّا نظر آتا تھا۔ رحیم داد کی جیب میں ابھی تک مقتول حکیم چشتی کی عینک موجود تھی۔ اس نے اپنا حلیہ تبدیل کرنے کی غرض سے جھٹ عینک نکالی اور آنکھوں پر لگالی۔

عینک لگا کر اسے ہر چیز بے ڈول اور دھندلی دھندلی نظر آنے لگی۔ مگر وہ آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ چند ہی قدم آگے گیا تھا کہ درختوں تلے کوئی زور سے کھنکارا۔ کھنکار سن کر رحیم داد کے قدم ڈگمگائے۔ وہ غڑاپ سے پانی سے بھرے ہوئے گڑھے میں گر گیا۔ عینک بھی آنکھوں سے ڈھلک کر پانی میں چلی گئی۔

گڑھا زیادہ گہرا نہیں تھا۔ پانی گھٹنوں سے کچھ اونچا تھا۔ رحیم داد نے گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا، ملّا اس کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ دبلا پتلا اور پستہ قد تھا۔ سر پر ململی پگڑی تھی۔ چہرے پر بالشت بھر سے زیادہ لمبی ڈاڑھی تھی جس میں جگہ جگہ سفید بال جھلک رہے تھے۔ اس کی آنکھوں پر عینک تھی۔

ملّا نے غور سے رحیم داد کو دیکھا، مسکرا کر بولا۔ ”تجھے اتنا بڑا پانی کا گڑھا نظر نہیں آیا؟“

رحیم داد نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملتے ہوئے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔ ”مجھے جی کم نظر

آتا ہے۔ میری عینک بھی پانی میں گر گئی۔" وہ گڑھے سے نکل کر باہر آگیا اور جھک کر اپنی شلوار اور جوتے دیکھنے لگا۔

جوتے پانی اور کیچڑ سے لت پت تھے۔ شلوار بھی گڑھے کے مٹیالے پانی سے شرابور تھی۔ مگر کلیم کے کاغذات کا بستہ حفاظت سے بغل میں دبا ہوا تھا۔

ملّا نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "تیرے تو سارے کپڑے خراب ہوگئے۔ گڑھے کا پانی بھی نجس ہے۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ ملّا نے اسے خاموش پایا تو نرم لہجے میں بولا۔ "اس حالت میں کب تک یہاں کھڑا رہے گا؟ آ' میرے ساتھ۔" اس نے ہاتھ سے اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے بتایا۔ "مسجد کے نزدیک ہی میرا حجرہ ہے۔ اسی میں مدرسہ بھی ہے۔ آنگن ہے۔ آنگن میں کھوئی بھی ہے۔ اس سے پانی نکالنا اور اپنے کپڑے دھوکر دھوپ میں سکھانے کے لیے ڈال دینا۔ میں باندھنے کے لیے تجھے دھوتی دے دوں گا۔"

رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ "بہت مہربانی ہے جی۔" وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

دونوں مسجد کے سامنے سے گزر کر ایک کچے مکان کے بند دروازے کے سامنے ٹھہر گئے۔ ملّا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ "اندر آجا۔" رحیم داد اس کے ہم راہ گھر میں داخل ہوگیا۔

دروازے کے سامنے کشادہ آنگن تھا۔ آنگن میں ایک طرف کنواں تھا۔ قریب ہی پڑچھتی تھی۔ اس کی چھت کے نیچے مٹی کا بڑا سا چبوترا تھا۔ پڑچھتی خالی تھی۔ آنگن کے آگے دالان تھا۔ فرش پر کھجور کی شاخوں کی بنی ہوئی چٹائی بچھی تھی۔ دالان سے ملحق کوٹھری تھی۔ اس کے دروازے پر قفل پڑا تھا۔

ملّا نے آنگن میں پہنچ کر پوچھا۔ "میں نے تجھے یہاں پہلی بار دیکھا ہے۔ پنڈ میں تیرا کوئی شریکا یا عزیز دار ہے؟"

"نہیں جی' میرا یہاں کوئی جان پہچان کا نہیں۔ میں پہلی بار ادھر آیا ہوں۔"

"جبھی تو میں نے کہا کہ تجھے پہلی بار دیکھا ہے۔ تیرا چہرہ میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔" ملّا نے اسے تسلی دی۔ "فکر نہ کر۔" اس نے کنویں کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ رہی کھوئی۔ ڈول سے پانی نکال' کپڑے دھو اور غسل کر۔ میں تیرے لیے دھوتی لاتا ہوں۔"

وہ دالان میں گیا۔ جیب سے کنجی نکال کر قفل کھولا اور کوٹھری کے اندر چلا گیا۔ [illegible] بعد وہ

یک دھوتی ہاتھ میں دبائے کوٹھری سے باہر آیا' رحیم داد کے قریب پہنچا اور دھوتی اس کے حوالے رتے ہوئے بولا۔

"لے! یہ باندھ لے۔"

رحیم داد دھوتی سنبھال کر پڑچھتی کے نیچے گیا۔ شلوار اور قمیص اتاری۔ دھوتی باندھی اور اس کے ڈب میں ہمیانی' چاقو اور کھلے ہوئے روپے اڑس لیے۔ بستہ چبوترے پر سنبھال کر رکھا اور اپنے ندے کپڑے اٹھا کر کنویں پر پہنچ گیا۔

ملّا نے اسے دیکھا' قریب گیا اور اپنے بارے میں بتانے لگا۔ "میرا نام مولوی فضل احمد ہے۔ اس پنڈ میں آئے دو سال سے اوپر ہوگئے۔ میں پہلے ملتان میں ہوتا تھا۔ وہیں مدرسہ قاسم العلوم میں تعلیم پائی اور ایک مسجد میں پیش امام لگ گیا۔ وہاں سے حاجی صاحب مجھے یہاں لے آئے۔ حاجی صاحب پنڈ کے سب سے وڈے زمیں دار ہیں۔ بہت پرہیز گار اور نیک بندے ہیں۔" اس نے دالان کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ جگہ انھوں نے پنڈ کے سارے ہی بچوں کی دینی تعلیم کے لیے بنوائی ہے۔ لیکن اس پنڈ کے بچے سخت نالائق اور پاجی ہیں۔ مدرسے میں آتے ہی نہیں۔ دن بھر ادھر ادھر آوارہ گردی کرتے ہیں۔ کھیل کود میں وقت برباد کرتے ہیں۔ مشکل سے چند بچے پڑھنے کے لیے تیار ہوئے' وہ بھی بدبخت آئے دن ناغہ کرتے ہیں۔ میں خود ان کی تلاش میں جاتا ہوں' پکڑ کر مدرسے میں لاتا ہوں۔"

رحیم داد نے خالی دالان کی جانب دیکھ کر پوچھا۔ "لگتا ہے' آج تو کوئی بھی منڈا پڑھنے نہیں آیا؟؟"

"آج میں نے انھیں چھٹی دے رکھی ہے' کل بھی مدرسہ بند رہے گا۔ بات یہ ہے جی' میں حاجی صاحب کے ہم راہ آج شہر جا رہا ہوں۔ کل عشا کی نماز سے پہلے واپس آجاؤں گا۔" اس نے چند ئے تامل کیا' رحیم داد سے پوچھا۔ "تیرا کیسے ادھر آنا ہوا؟" رحیم داد خاموش کھڑا رہا۔ مولوی فضل مد نے دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے' اتنا چپ چپ کیوں ہے؟"

"کیا بتاؤں ملاں جی۔" رحیم داد لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "یوں سمجھ لو' نصیب کا ہے۔ بستی بستی گھومتا پھرتا ہوں۔ یہاں بھی اسی چکر میں آگیا۔"

رحیم داد کی باتوں میں درد کی کسک تھی۔ مولوی فضل احمد خاصا متاثر ہوا۔ شفقت سے بولا۔

"توں مجھے دکھی اور غم زدہ معلوم ہوتا ہے۔ تیرا گھر بار نہیں؟ بال بچے تو ہوں گے؟"

"گھر بار بھی تھا' بال بچے بھی تھے۔" رحیم داد کو اپنا گھر اور بیوی بچے یاد آگئے۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور تڑپ کر بولا۔ "سب کچھ اجڑ گیا۔ کچھ بھی نہ رہا۔"

"تیری گل سمجھ نہیں آئی۔" مولوی فضل احمد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "یہ جو گیمبر سٹیشن پر پچھلے دنوں ریل کا حادثہ ہوا تھا' تیرے بال بچے اس میں تو کام نہیں آگئے؟"

"نہیں جی' ایسی کوئی گل بات نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے جی۔" مولوی فضل احمد نے کرید کر پوچھا۔ "کسی سے پرانی دشمنی چل رہی تھی جس نے تیرا گھر بار جلا دیا' بیوی بچوں کو اٹھوا لیا؟"

"ایسہ گل بھی نہیں۔" رحیم داد نے جھٹ کہا۔ "بات یہ ہے جی' جب پاکستان بنا تو میں گورداس پور کے موضع نصیر پور میں تھا۔ فسادات ہوئے تو سکھوں نے حملہ کر دیا۔ بہت تباہی مچائی۔ میں تو کسی نہ کسی طرح بچ نکلا اور پاکستان آگیا۔ میرے بعد گھر والی اور بچوں پر کیا گزری' میں نوں کچھ پتہ نہیں۔"

مولوی فضل احمد گویا ہوا۔ "ہاں جی مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر بہت ظلم و ستم ہوا۔" اس نے رحیم داد کے غم زدہ چہرے کی جانب دیکھا۔ "یہ بھی پتہ چلا' تیرے بال بچوں کا کیا بنا؟ زندہ بچے یا سب وہیں شہید ہو گئے؟"

"وڈا پتر تو راوی کے کنارے تریموں کے پتن پر سکھوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔ جوان دھی تھی' سکھ اسے بھی اٹھا لے گئے۔" رحیم داد افسردہ لہجے میں مقتول چوہدری نور الٰہی کی دکھ بھری داستان اپنی ذات سے منسوب کر کے سنانے لگا۔ "گھر والی بچوں کو لے کر کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گئی۔ لہور کے والٹن کیمپ میں کئی جاننے والوں نے اسے دیکھا بھی۔ میں ان دنوں منٹگمری کے مہاجر کیمپ میں تھا۔ یہ خبر ملتے ہی لہور پہنچا۔ والٹن کیمپ گیا مگر نہ گھر والی کا کھوج لگا' نہ بچوں کا۔ اب وہ کہاں ہیں؟ کس کے پاس ہیں؟ میں نوں کچھ نہیں معلوم۔" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"۸ سال سے اوپر ہو گئے انھیں ڈھونڈتے ہوئے۔ جہاں کسی سے پتہ چلتا ہے' وہاں پہنچ جاتا ہوں' اسی چکر میں ادھر آگیا۔"

"میرے خیال میں تو نہ صرف اس پنڈ میں بلکہ پورے موضع میں ایسا کوئی مہاجر کنبہ نہیں ہے۔ میں انھیں جانتا بھی ہوں۔ گورداس پور کا تو کوئی نہیں۔" مولوی فضل احمد کچھ د[illegible] کھڑا

وچتا رہا پھر اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔

"حاجی صاحب سے پوچھوں گا' شاید انھیں کچھ خبر ہو۔ وہ اس موضع کے پرانے زمیں دار ہیں۔ ب کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔"

رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہاں سے بھی خالی ہاتھ چلا جاؤں گا۔ پہلی بار ایسا نہیں ہوا۔ بار بار ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔"

"مایوس نہ ہو۔ میں نے کہا نا' حاجی صاحب سے پوچھ لوں گا بلکہ خود تجھے ان کے ڈیرے پر لے چلوں گا۔"

"ان کے پاس بھی چلا جاؤں گا۔ ویسے تسیں خود ہی پوچھ لینا۔"

"مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ تیری ضرور مدد کرے گا۔" مولوی فضل احمد نے رحیم داد کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ایک بات سمجھ آتی ہے۔ میں جن دنوں ملتان میں تھا تو لدھیانے کے ایک مولوی صاحب ملے تھے۔ وہاں مشتاق گنج میں ہوزری کا کارخانہ چلاتے تھے۔ پاکستان بنا تو وہ بھی لدھیانے سے لٹ لٹا کر لہور آگئے۔ اپنے ساتھ بیس یتیم بچے بھی لائے۔ ان کا نام تو مجھے اس وقت یاد نہیں پر اتنا پتہ ہے کہ سکھر میں اب یتیم خانہ چلاتے ہیں۔ بتاتے تھے کہ وہ اور ان کے ساتھی کئی بار مشرقی پنجاب گئے اور کتنی ہی مسلمان زنانیوں اور بچوں کو سکھوں اور ہندوؤں کے قبضے سے نکال کر لے آئے۔ بہت نیک بندے ہیں۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے۔"

رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ان کے یتیم خانے کا کیا نام ہے ملاں جی؟"

"فیض الاسلام۔" مولوی فضل نے بتایا۔ "یہی نام یاد پڑتا ہے۔ ویسے سکھر میں سب اس یتیم خانے کو جانتے ہیں۔ میرا کہا مان تو سکھر چلا جا۔ امید ہے' وہاں سے تیرے بال بچوں کا سراغ مل جائے گا۔"

"چلا جاؤں گا۔ ضرور چلا جاؤں گا۔ اپنا تو برسوں سے یہی کام ہے۔ جہاں امید نظر آتی ہے' پہنچ جاتا ہوں۔" رحیم داد کا لہجہ اور افسردہ ہو گیا۔ "ملاں جی! میرے لیے دعا کرو' مجھے اپنے بال بچے مل جائیں۔ ان کے بغیر زندگی میں کوئی مزا نہیں۔ کچھ بھی چنگا نہیں لگتا۔"

"میں تیرے لیے ضرور دعا کروں گا۔ تیرے بچھڑے ہوئے بال بچے ضرور ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ تیری مشکل آسان کرے گا۔"

"ہاں ملاں جی۔" اس نے آسمان کی جانب انگلی اٹھا کر کہا۔ "اب تو اوپر والے ہی کا آسرا ہے۔

دیکھو‘ کب میری سنی جاتی ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "لوگ کہتے ہیں‘ کہاں تک انھیں تلاش کرے گا‘ دوسرا دیاہ کرکے گھر بسالے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر انکار میں ہلایا۔ "نہیں‘ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں اپنی گھر والی کے سوا کسی زنانی کو نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے اس سے بہت پیار ہے اور وہ بھی مجھ سے اتنا ہی پیار کرتی ہے۔ بچے تو میرے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ ان سب کو کیسے بھلا دوں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

رحیم داد نے اپنی آواز میں سوز پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر مولوی فضل اس کی باتوں سے زیادہ متاثر نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی نہ بیوی تھی نہ بچے تھے۔ شادی ہی نہیں کی تھی۔ بیوی کے انتظار میں سر اور ڈاڑھی کے بال کھچڑی ہوگئے۔ اسے مردوں کو نہلانے والا اور خیرات کی روٹی کھانے والا کمی قرار دے کر کوئی اس سے اپنی بیٹی بیاہنے کو تیار نہیں ہوا۔

مولوی فضل اس کی باتیں سن کر خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد بھی چپ رہا۔ ذرا دیر بعد مولوی فضل کی آواز ابھری۔ "مجھے اب حاجی صاحب کی حویلی جانا ہے۔ وہاں میرا انتظار ہوتا ہوگا۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "شہر سے کچھ منگوانا ہو تو بتا دے‘ لیتا آؤں گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔

"پر تو کل تک یہاں ٹھیر سکے گا؟"

"ٹھیر جاؤں گا۔ حاجی سے بھی تو ملنا ہے۔ شہر سے میرے لیے ایک کمیص اور شلوار مل جائے تو لے آنا‘ یہ کپڑے بہت گندے ہوگئے ہیں۔ دھونے پر بھی ٹھیک سے صاف نہیں ہوں گے۔ سر پر باندھنے کے لیے پگڑی بھی خرید لینا۔"

مولوی فضل نے نہایت مستعدی سے کہا۔ "قمیص اور شلوار تیار تو نہیں ملے گی۔ جاتے ہی کپڑا خرید کر درزی کو دوں گا۔ کہوں گا‘ واپسی سے پہلے پہلے سی کر تیار کردے۔" اس نے رحیم داد کا قد وقامت غور سے دیکھا۔ بالشت سے قمیص اور شلوار کے لیے اس کے جسم کی ناپ لی۔ "شلوار تو لٹھے کی ٹھیک رہے گی۔ قمیص کس کپڑے کی ہو؟"

"دھاری دار کپڑا مل جائے تو اس کی ٹھیک رہے گی۔ ویسے جو تمیں نوں پسند آئے‘ لے آنا۔ میں پہن لوں گا۔" رحیم داد اپنی بات کہتے کہتے رکا پھر اس نے پوچھا۔ "ملاں جی‘ وہاں عینک بھی مل جائے گی؟"

"مل تو جانی چاہیے۔ لیکن اس کے لیے تیرا موجود ہونا ضروری ہوگا۔"

"میں وہاں کیسے جاسکتا ہوں؟ عینک کے بغیر مجھے ٹھیک سے نظر بھی نہیں آتا۔" اس نے مولوی

کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "ذرا اپنی عینک تو دینا ملاں جی۔"

مولوی فضل نے اپنی عینک اتاری اور رحیم داد کو دیتے ہوئے حیرت سے بولا۔ "اس کا کیا کرے گا؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔" رحیم داد نے عینک اپنی آنکھوں پر لگائی۔ ادھر ادھر نظریں گھما کر دیکھا پھر عینک اتار کر بولا۔ "یہ تو جی اونچے نمبروں کی ہے۔ کوئی بہت کم نمبر کی لے لینا۔ میں اسی سے کام چلا لوں گا۔ میری عینک تو گڑھے میں گرنے کے بعد پیر کے نیچے ایسی آئی کہ بالکل چکنا چور ہوگئی۔ اسے گڑھے سے نکال لیا جائے‘ تب بھی کسی کام کی نہیں۔"

رحیم داد نے عینک مولوی فضل کو دے دی۔ مولوی نے عینک آنکھوں پر لگائی۔ کوٹھری میں گیا‘ اندر سے پرانا رجسٹر اور پنسل نکال کر لایا۔ رحیم داد کے قریب آکر بولا۔ "مجھے ڈر ہے کہیں بھول نہ جاؤں۔ تجھے جو کچھ منگانا ہے‘ لکھ کر اپنے پاس رکھ لوں۔ یہ ٹھیک رہے گا نا؟"

"جیسی تیری مرضی۔"

مولوی فضل نے کچھ نہیں کہا۔ رجسٹر کھولا اور اس کے سادہ ورق پر پنسل سے لکھنے لگا۔ رک رک کر رحیم داد سے پوچھتا بھی جاتا۔ جب وہ رحیم داد کی ہر فرمائش لکھ چکا تو اس نے رجسٹر کا ورق پھاڑا‘ تہ کیا اور قمیص کی جیب میں رکھ لیا۔

رحیم داد نے کہا "پنسل اور کاغذ کی تو مجھے بھی ضرورت ہے۔ اپنا کچھ حساب کتاب لکھنا ہے۔ مجھے یہ پنسل اور کاغذ دے دے۔ تیرے جانے کے بعد اکیلا بیٹھا یہی کام کرتا رہوں گا۔" رحیم داد مسکرایا۔

"ایسا کر۔ اگر تیرے کام کا نہ ہو تو یہ رجسٹر بھی مجھے دے دے۔ شہر سے دو رجسٹر اور دو پنسلیں بھی خرید لینا۔"

"یہ تو بہت پرانا رجسٹر ہے۔ کبھی اس میں مدرسے کے بچوں کی حاضری لگاتا تھا مگر اب تو بیکار پڑا ہے۔ تجھے چاہیے ہے تو لے لے۔" مولوی فضل نے رجسٹر رحیم داد کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پنسل بھی دے دی۔ رحیم داد نے دھوتی کے ڈب میں ہاتھ ڈال کر پچاس روپے کے نوٹ نکالے اور مولوی فضل کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اتنے روپوں سے کام چل جائے گا؟"

مولوی نے روپے لے کر گنے اور سر ہلا کر بولا۔ "ہاں جی‘ ان سے کام چل جائے گا۔" اس نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری! توں کیا کام کرتا ہے؟" وہ لمحے بھر کے لیے ٹھٹکا۔ "توں

چوہدری ہی ہے نا۔"

"بالکل ہوں جی! گوجرانوالہ میں جی اپنا ڈھلائی کا کارخانہ ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے ٹھیک ٹھاک کام چل رہا ہے۔"

"بس جی، اللہ کی مہربانی ہے۔" رحیم داد نے مولوی کی جانب دیکھ کر پوچھا۔ "پنڈ میں نائی تو ہوگا؟ سر اور داڑھی کے بال بڑھ گئے ہیں۔"

مولوی فضل نے اس کے چہرے کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ "بہت بڑھ گئے ہیں جی۔ میں ابھی جاکر نائی کو بھیجتا ہوں۔ تو فکر نہ کر۔"

"میں کپڑے دھولیتا ہوں۔ داڑھی اور سر کے بال بنوا کر نماؤں گا۔"

"جیسی تیری مرضی۔ تو نے صبح سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ رات کی بچی ہوئی روٹی ہے، مرونڈے ہیں۔ ابھی تو اسی سے کام چلا لے۔ دوپہر کی روٹی مدرسے کا کوئی منڈا لے آئے گا تو کھالینا۔"

مولوی فضل ایک بار پھر دالان میں گیا۔ کوٹھری میں داخل ہوا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹی کی پرات دبی تھی۔ اس میں رات کی دو باسی روٹیاں تھیں اور مٹی ہی کی ٹھوٹھی میں مرونڈے تھے۔ مولوی نے کوٹھری کی کنڈی لگائی، قفل ڈالا اور کھانے کی اشیاء دالان میں بچھی ہوئی چٹائی پر رکھ کر بولا۔

"لے، یہ کھالے۔ میں غریب بندہ ہوں۔ تیری اس وقت اور کوئی خاطر نہیں کرسکتا۔" مولوی فضل کے رویئے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ رحیم داد سے اب خاصا مرعوب ہوچکا ہے۔ وہ اپنی ناداری اور پریشان حالی کا اظہار کرنے لگا۔

"چوہدری! اپنی تو ایسے ہی گزر بسر ہوتی ہے۔ حاجی نیک بندہ ہے۔ مدرسے کے نام پر میرے لیے اتنا وڈا حجرہ بنوا دیا۔ رات کی روٹی بھی روز اسی کے گھر سے آتی ہے۔ ویسے بھی مجھے کچھ نہ کچھ دیتا ہی رہتا ہے۔" اس نے تامّل کیا۔ "اب میں چلوں گا۔ دیر ہو رہی ہے۔ چوہدری! شام کو اندھیرا ہوجائے تو چراغ جلالینا۔ دالان میں چراغ رکھا ہے۔ اس میں تیل بھی کافی ہے۔ ماچس بھی موجود ہے۔ نائی بھی تھوڑی دیر میں آجائے گا۔"

مولوی فضل احمد دروازے کی جانب بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ مولوی نے دروازہ عبور کرتے ہوئے کہا۔ "اب تجھ سے کل شام کو ملنا ہوگا۔ پریشان نہ ہونا۔" وہ اسے تسلی دیتا ہوا چلا گیا۔

☆

رحیم داد کنوئیں کے قریب گیا۔ ڈول سے پانی نکالا اور کیچڑ اور گندے پانی سے لتھڑ قیص دھونے بیٹھ گیا۔ کپڑے بار بار رگڑنے کے باوجود صاف نہیں ہوئے۔ صابن تھا نہ تجّی۔ وہ ہاتھ بھر کے ڈنڈے سے پیٹ پیٹ کر کپڑے صاف کرنے کی دیر تک کوشش کرتا رہا۔ اس نے بھیگے ہوئے کپڑے نچوڑے اور کنویں کی پختہ منڈیر پر سوکھنے کے لیے ڈال دیے۔ اس کام سے نمٹ کر دالان میں پہنچا۔

اس نے روٹی کھائی اور مرونڈے بھی کھائے۔ مرونڈے ذائقے میں مزے دار تھے۔ کھانے سے فارغ ہوکر اس نے پانی پیا اور نائی کا انتظار کرنے لگا۔ مگر نائی نہیں آیا۔ دھوپ تیز ہوگئی۔ پہر دن گزر گیا۔

رحیم داد رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ رہ رہ کر غنودگی کا غلبہ ہوتا۔ کچھ دیر وہ جماہیاں لیتا رہا پھر اس نے کلیم کے کاغذات کا بستہ سرہانے رکھا اور چٹائی پر لیٹ گیا۔ وہ بار بار بند دروازے کی جانب دیکھتا۔ دروازے کی کنڈی اس نے نہیں لگائی تھی، مگر نہ دروازہ کھلا نہ کسی نے دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سوگیا۔

رحیم داد کی آنکھ کھلی تو کوئی اسے آہستہ آہستہ جھنجوڑ رہا تھا۔ "میں رجب نائی ہوں۔ بال کاٹنے آیا ہوں۔"

رحیم داد نے نائی کو غور سے دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رجب نے مسکرا کر کہا۔ "توں نے روٹی بھی نہیں کھائی۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ رحیم داد نے حیرت سے اس طرف دیکھا۔ چنگیری میں روٹیاں تھیں اور ان پر چنے کے نرم پتوں کی پکی ہوئی پلی رکھی تھی۔ رحیم داد ایسی گہری نیند سویا کہ اسے مطلق خبر نہ ہوئی، کون کھانا لایا اور کب رکھ کر چلا گیا؟ رجب اسے خاموش دیکھ کر بولا۔ "لگتا ہے، بہت بے خبر ہوکر سویا۔" اس نے چھت کی منڈیر کی طرف اشارہ کیا۔

"بنیرے پر دھوپ پہنچ گئی اور توں پڑا سوتا رہا۔"

رحیم داد نے بات بنائی۔ "رات ریل میں سو نہیں سکا تھا۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "اب دیری نہ کر۔ فٹافٹ سر اور داڑھی کے بال کاٹ دے۔"

"ایسا کر، کنارے آجا۔ چٹائی پر بال گرے تو ملاں ناراض ہوگا۔"

رحیم داد چپ چاپ اٹھا اور رجب کی ہدایت کے مطابق دالان کے ایک کونے میں جاکر بیٹھ گیا۔ رجب نے اس کے بالوں میں انگلیاں ڈال کر پھرائیں۔ "توں نے کب سے بال نہیں کٹوائے؟ نہایا بھی نہیں۔ دیکھ تو بال کیسے میلے ہو رہے ہیں۔" وہ بال کنگھے سے سلجھانے لگا۔ "ریل کے سفر میں تو

بالوں اور کپڑوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ رجب قینچی سے بال کاٹنے لگا۔ رحیم داد ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔

"رجبے، بہت دیر لگا دی۔ کہاں رہا اب تک؟"

"وہ ایسا ہوا جی، میں ہفتے بھر سے احمد کوٹ گیا ہوا تھا۔ آج جیسے ہی واپس ہوا، گھر والی نے بتایا، ملاں جی نے اپنے مہمان کے بال کاٹنے کے لیے بلایا ہے۔ بس جی، میں فافٹ آ گیا۔"

احمد کوٹ کا نام سن کر رحیم داد کسی قدر گھبرا گیا۔ اس نے گردن ذرا سی جھکا لی۔ اسے خدشہ پیدا ہوا کہ رجب کہیں اسے جانتا نہ ہو۔ مگر وہ اس کی گھبراہٹ سے بالکل بے نیاز تھا۔ اطمینان سے رحیم داد کی گدی کے بال مشین سے مونڈ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ بال کاٹتے کاٹتے اس نے کہا۔

"احمد کوٹ میں تو آج کل بہار آئی ہوئی ہے۔" رحیم داد سہا ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ رجب بتاتا رہا۔ "میں تو جی پہلی بار احمد کوٹ گیا تھا۔ ساتھ والے پنڈ کی ایک کڑی ادھر بیاہی ہے۔ میں پہلے اسی پنڈ میں ہوتا تھا۔ اس رشتے سے وہ میری انگ ہوتی ہے۔ اس کے ویاہ پر تو میں جا نہ سکا، بکھار میں پڑا تھا۔ اب اس کے یہاں پتر ہوا ہے۔ اس کی جھنڈ لہائی کے لیے اس نے مجھے بلوایا۔ کہتی تھی، میں اپنے کاکے کے سر کے بال رجبے کے سوا کسی اور سے نہیں اترواؤں گی۔ تو جی اس طرح ادھر جانا ہوا۔ چنگا وکت گزرا۔"

رحیم داد نے اس کی باتیں سن کر قدرے سکون محسوس کیا، آہستہ سے پوچھا۔ "ادھر کتنے روز رہا؟"

"آج نواں دن تھا۔"

رحیم داد کو رہ رہ کر احمد کوٹ یاد آ رہا تھا۔ احمد کوٹ اس کا آبائی گاؤں تھا۔ وہاں اس کی بیوی تھی، بچے تھے۔ وہ مدت سے ان سے مل نہیں سکا تھا۔ ان کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین بھی تھا۔

اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "احمد کوٹ میں اپنا ایک ملنے والا ہے۔ رحیم داد نام ہے اس کا۔ وہ بھی تجھے وہاں ملا؟"

"اس رحیم داد کی بات تو نہیں کر رہا جس نے سیف اللہ کو کتل کر دیا؟"

"یہ تو میں نوں پتہ نہیں۔" رحیم داد نے جھٹ بات بنائی۔ "کئی سال سے میں اسے ملا نہیں۔"

"تب تو یہ بھی پتہ نہ ہو گا، اسے جیل ہو گئی تھی۔ پر وہ جیل سے بھاگ نکلا۔"

"جیل سے بھاگ نکلا۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔ "وہ ایسا لگتا تو نہیں تھا۔ سیدھا سادا نیک بندہ تھا۔ سمجھ نہیں آتی، اس نے یہ سب کیسے کیا؟"

"گل تو جی بہت لمی ہے۔" اس نے حجامت بناتے ہوئے کہا۔ "پر اتنا سن لے، پچھلے دنوں رحیم داد کو بھی کتل کر دیا گیا۔"

"تو سچ کہہ رہا ہے؟"

"میں نوں تجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت۔" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "میں تو اس روز احمد کوٹ ہی میں تھا، جب اس کے کتل ہونے کی خبر وہاں پہنچی تھی۔"

"یہ تو نے بہت بری خبر سنائی۔ اس کے تو بال بچے بھی تھے۔ جانے اس خبر سے ان پر کیا بیتی ہو گی۔"

"پر اب تو اس کا وہاں گھر بار رہا، نہ بال بچے۔"

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔ "وہ گھر بار چھوڑ کر کہاں چلے گئے؟"

"لگتا ہے، تیں نوں کچھ بھی پتہ نہیں۔ سیف اللہ کے مرنے کے بعد اس کے بھائیوں نے بدلہ لینے کے لیے رات کے اندھیرے میں رحیم داد کے گھر پر حملہ کیا اور آگ لگا دی۔ پورا گھر جل کر راکھ ہو گیا۔ سنا ہے سیف اللہ کے بھائی تڑا تڑ گولیاں چلاتے رہے۔ کوئی بھی ڈر کے مارے گھر سے باہر نہیں نکلا۔ انھوں نے رحیم داد کی کھڑی فصلیں بھی جلا دیں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "رحیم داد کے تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ چھوٹا تو آگ میں جل کر مر گیا۔ گھر والی دو کو لے کر کسی نہ کسی طرح پڑوس کے مکان میں جا کر چھپ گئی۔ حملہ آور تو پاگل ہو رہے تھے۔ اسے اور دونوں بچوں کو بھی کتل کر دینا چاہتے تھے۔ پر رحیم داد کی گھر والی ان کے ہاتھ نہیں آئی۔ ایندھن رکھنے کے اوٹے میں بچوں کے ساتھ چھپ کر بیٹھ گئی، سورج نکلنے سے پہلے پہلے اندھیارے میں بچوں کو لے کے احمد کوٹ سے بہت دور نکل گئی۔"

چھوٹے بیٹے کے جل کر ہلاک ہونے اور گھر بار کی تباہی پر رحیم داد کا دل بھر آیا۔ مگر اس نے خود کو کسی نہ کسی طرح سنبھالا اور آنکھوں میں امڈتے آنسو پی گیا۔

اسے خاموش پا کر رجب نائی نے کہا۔ "لگتا ہے تجھے یہ باتیں سن کر بہت دکھ ہوا۔"

"ہاں۔" رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ اس کی آواز گلوگیر ہو رہی تھی۔ آگے نہ بولا گیا۔ رجب بھی چپ رہا۔ وہ سر کے بال تراش چکا تھا۔ رحیم داد کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ "پولیس نے کوئی کارروائی نہیں کی؟؟"

"کچھ بھی نہیں ہوا جی۔ سیف اللہ کے بھائی شان سے بھڑکیں مارتے پھرتے ہیں۔ ان کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے؟ ان کا ایک شریکا وزیر جو لگا ہے۔ ان کی تو سمجھو' آج کل حکومت ہے۔ جب رحیم داد کے کتل کی خبر آئی تو سیف اللہ کے بھائی بہت خوش تھے۔ پنڈ میں اینڈتے پھرتے تھے۔" رحیم داد خاموش رہا۔ رجب سر کے بال تراش کر سامنے آگیا۔ "توں نے کب سے داڑھی کے بال نہیں کٹوائے۔ دیکھ تو بالوں کے کیسے جھجے ہوگئے ہیں۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "لگتا ہے' نئی نئی داڑھی چھوڑی ہے۔" رحیم داد پھر بھی خاموش رہا۔ مگر رجب خاموش نہیں ہوا' پوچھنے لگا۔ "کس سوچ میں پڑگیا۔"

"مجھے رحیم داد یاد آرہا ہے۔ مرنے والا برا بندہ نہیں تھا۔ رجبے تو اسے نہیں جانتا۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے' احمد کوٹ کے دوسرے بندے بھی یہی کہتے تھے۔ میں جس کے گھر جھنڈ لہائی پر گیا تھا' اس کا نام شیداں ہے۔ شیداں کا گھر والا بھی رحیم داد کی بہت تعریف کرتا تھا۔ پر جی' ابھی تو سبھی سیف اللہ کے بھائیوں سے ڈرتے ہیں۔ جسے جی چاہیں پکڑوا دیں' جسے چاہیں مکدمے میں پھنسوا دیں۔ تھانے دار' تحصیل دار سبھی ان کے کہنے پر چلتے ہیں۔ انھوں نے رحیم داد کی زمین پر بھی کبضہ کرلیا۔ کسی نے کچھ نہیں کیا۔ رحیم داد کی گھر والی ہوتی تو کوئی کنونی کارروائی کرتی۔ اب تو رحیم داد کا وہاں کوئی نہیں رہا۔"

رحیم داد نے بے قراری سے پوچھا۔ "رجبے! تجھے یہ بھی خبر ملی' رحیم داد کے بال بچے اب کہاں ہوتے ہیں؟"

"سنا ہے جی' وہ اکال گڑھ میں ہیں۔"

"کس کے پاس رہتے ہیں؟"

"یہ تو میں نوں پتہ نہیں۔" رجب نے داڑھی کے بال تراشتے ہوئے بتایا۔ "کسی شریکے یا رشتے دار ہی کے پاس رہتے ہوں گے۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "توں ان کے پاس جانا چاہتا ہے؟"

"ارادہ تو نہیں' تو کہتا ہے تو چلا جاؤں گا۔ ایک زمانے میں تو رحیم داد سے میری بہت یاری تھی۔"

"تب تو اس کی گھر والی بھی تجھے جانتی ہوگی۔ پر جانے اسے یہ بھی پتہ ہے' رحیم داد مرگیا۔ پچھلے ہی دنوں تو اس کا کتل ہوا ہے۔ اتنے تھوڑے دنوں میں اسے کیسے ملوم ہو جائے گا۔" رجب نے قینچی چلاتے چلاتے ہاتھ روک لیا۔ "ایسا کر' جا کر انھیں خبر کردے۔ اس [illegible] میں بھی

شریک ہوجائے گا۔ تسلی بھی دے دے گا۔"

"پر میں رحیم داد کے بال بچوں کا پتہ کیسے چلاؤں گا؟"

"احمد کوٹ میں مجھے کسی نے بتایا تھا' رحیم داد کی گھر والی اپنے بچوں کے ساتھ اکال گڑھ میں سکول کے پچھواڑے رہتی ہے۔" اس نے اصرار کیا۔ "ضرور وہاں چلا جا۔ رحیم داد تیرا پرانا یار تھا۔ اس کی گھر والی اور بچوں کو اس کے مرنے کی خبر تو ہونی چاہئے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"کہہ تو ٹھیک ہی رہا ہے۔" رحیم داد نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "پر جس نے تجھے اس کا ٹھکانا بتایا' اسی نے یہ خبر بھی اسے پہنچا دی ہوگی۔ میں اب جا کر کیا کروں گا؟ ویسے بھی میں نے جھیتی لوٹنا ہے۔ کچھ دنوں بعد ان کے پاس چلا جاؤں گا۔"

"جیسی تیری مرضی۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ رجب نائی داڑھی کے بال تراشتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے داڑھی گول کتر داں بنا دی۔ جب رجب حجامت بنا چکا تو رحیم داد نے آئینہ لے کر اپنا چہرہ دیکھا۔ داڑھی رکھنے سے اس کا حلیہ خاصا تبدیل ہوگیا تھا۔ اس نے خوش ہو کر دھوتی کے ڈب سے ٹٹول کر ایک روپے کا نوٹ نکالا اور نائی کو دے دیا۔

روپیہ پا کر وہ ایسا نہال ہوا کہ فوراً بولا۔ "لا' تیرے بدن کی مالش بھی کردوں۔" وہ بہت مسرور نظر آرہا تھا۔ بال اور داڑھی بنانے کی اجرت اسے توقع سے بہت زیادہ ملی تھی۔ "یہاں تو مالش کے لیے تیل نہیں۔ میں گھر سے سرسوں کا تیل لے کر آتا ہوں۔ مالش سے ساری تھکن دور ہو جائے گی۔"

مگر رحیم داد مالش کے لیے آمادہ نہیں ہوا۔ "نہیں رجبے! میں نوں اب نہانا ہے۔"

"نہالینا۔ آرام سے نہالینا۔ ایسی جھیتی کیا ہے؟ میرا کہا مان' مالش کے بعد نہا۔ دیکھ تو بدن میں کیسی چستی آجاتی ہے۔ جھڑپا لگانے کو جی کرے گا۔ اپنے پنڈ کے زمیں دار حاجی صاحب تو ہر جمعے کو پہلے مجھ سے مالش کرواتے ہیں' تب نہاتے ہیں۔"

رحیم داد اس کے اصرار کرنے پر بھی راضی نہ ہوا۔ جب سے اپنے چھوٹے بیٹے کی موت اور گھر بار کی تباہی کی خبر سنی تھی' اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ رجب سے جلد سے جلد پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "مجھے اب نہانا ہے' شام ہو رہی ہے۔" وہ کنویں کی جانب بڑھا۔

رجب نے مزید اصرار نہیں کیا' چپ چاپ باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے دروازے کی کنڈی لگائی' دالان میں گیا اور چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل بے اختیار بھر آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

دھوپ اب گہری زرد پڑ گئی تھی۔ دن کا چل چلاؤ تھا' سائے طویل ہوگئے تھے۔ رحیم داد سسکیاں بھرتا رہا۔ کھانا اس کے قریب ہی رکھا تھا۔ لیکن رحیم داد نے اس پر توجہ نہ دی۔ بھوک ہی نہیں تھی۔

جب رو دھو کر دل کی بھڑاس ذرا کم ہوئی تو اس نے طے کیا کہ وہ نوراں اور بچوں سے ملنے اکال گڑھ ضرور جائے گا۔ وہ انھیں دیکھنے اور ان سے ملنے کے لیے بے قرار تھا۔ اس نے آنسو پونچھے۔ اٹھ کر کنویں کے پاس گیا۔ پانی نکالا اور دھوتی اتار کر نہانے لگا۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ رحیم داد کو اپنا جسم سلگتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے نہانے کے بعد قدرے سکون ملا۔ اب اس کے کپڑے سوکھ چکے تھے۔

اس نے کپڑے پہنے اور دالان میں جا کر چٹائی پر بیٹھ گیا۔ وہ دیر تک کھویا کھویا بیٹھا رہا۔ سورج ڈوب گیا۔ شام آنگن کے در و دیوار سے آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔ دن کے ہنگامے سرد پڑ چکے تھے۔

ہر طرف شام کا سناٹا پھیلنے لگا تھا۔ گھروں کو لوٹتے ہوئے کسانوں اور مویشیوں کی آوازیں شام کی بڑھتی ہوئی خاموشی میں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔

جب اندھیرا بڑھ گیا تو رحیم داد اٹھا اور طاق میں رکھا ہوا چراغ روشن کر دیا۔ قریب ہی چٹائی پر کھانا رکھا تھا۔ اس نے ایک روٹی توڑ کر چنے کے ساگ کے ساتھ چند لقمے کھائے۔ روٹی خشک اور ٹھنڈی تھی۔ وہ پوری روٹی نہیں کھا سکا۔

اس نے اٹھ کر مٹی کے پیالے میں قریب رکھے ہوئے گھڑے سے پانی نکالا اور پورا پیالہ خالی کر دیا۔ رحیم داد کچھ دیر جاگتا رہا پھر چٹائی پر لیٹ کر سو گیا۔

سویرے سو کر اٹھا تو اس نے چنگیری میں رکھی ہوئی باسی روٹی کھائی' پانی پیا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا اس بستے کو گھورتا رہا جس میں کلیم کے کاغذات تھے۔

اس نے بستہ کھولا' کاغذات نکالے اور ان کے ورق الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس نے چھٹی جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دو بہنیں تھیں مگر ایک بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ اسی لیے وہ ماں باپ کا بہت لاڈلا تھا۔ باپ معمولی زمیں دار ہونے کے باوجود اسے اچھی تعلیم دلانا چاہتا تھا۔ مگر رحیم داد نے پڑھنے لکھنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ اس واجبی تعلیم کے باوجود سرکاری اور قانونی دستاویزات نہ صرف پڑھ سکتا تھا بلکہ انھیں بخوبی سمجھ بھی سکتا تھا۔ اس کا سبب مقدمے بازی تھی۔ وہ دو سال سے اوپر سیف اللہ کے ساتھ مقدمے بازی کرتا رہا۔ اس سے پہلے بھی وہ پانی کے جھگڑے پر کئی سال تک مقدمہ لڑتا رہا۔ وہ ہر مقدمے کے کاغذات بڑے غور سے پڑھتا۔ جو قانونی نکتہ سمجھ میں نہ آتا' اسے اپنے وکیل سے سمجھنے کی کوشش کرتا۔ مقدمے کے مختلف پہلوؤں پر وکیل سے بحث بھی کرتا اور اسے مشورہ بھی دیتا۔ مقدمے لڑتے لڑتے' اسے مقدمے بازی کا چسکا پڑ گیا تھا۔ وہ خود کو کسی وکیل سے کم ماہر قانون نہیں سمجھتا تھا۔ جیل میں لالی اور دوسرے قیدیوں سے بڑے جوش میں کہتا تھا کہ پولیس سیف اللہ کی کھلم کھلا طرف داری نہ کرتی تو اسے کبھی سزا نہ ہوتی۔ اس کا مقدمہ بہت مضبوط تھا۔ مقدمے کا فیصلہ اسی کے حق میں ہوتا۔

رحیم داد نے غیر ضروری دستاویزات اور درخواستیں علیحدہ کر لیں اور اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق وہ کاغذات اور دستاویزات محفوظ کر لیں جن کی بنیاد پر متروکہ جائیداد کا الاٹمنٹ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس نے ایسے تمام کاغذات اور دستاویزات کپڑے میں دوبارہ لپیٹ کر بستہ بنا لیا اور غیر ضروری کاغذات اور درخواستیں آنگن کے ایک کونے میں رکھ کر ماچس سے آگ لگا دی۔ انھیں جلا کر اس طرح تلف کر دیا کہ صرف راکھ رہ گئی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے وہ رجسٹر نکالا جو اسے مولوی فضل احمد نے دیا تھا۔ اس نے پنسل اٹھائی اور ایک ایسی سرکاری دستاویز سامنے رکھی جس پر چوہدری نور الٰہی کے تصدیق شدہ دستخط تھے۔ وہ پنسل سے رجسٹر کے سادے ورق پر چوہدری نور الٰہی کے دستخط کی ہوبہو نقل اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کوشش میں اس نے کئی ورق سیاہ کر دیے۔ اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ سورج چڑھ کر بیچ آسمان پر آ گیا' دوپہر ہو گئی۔ گرمی بڑھ گئی۔ وہ سر جھکائے اپنے کام میں منہمک تھا کہ اسی اثنا میں دروازے پر آہٹ ہوئی۔

رحیم داد نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا' بستہ کھول کر اس میں دستاویز اور رجسٹر رکھا اور کپڑے میں گرہ لگا کر بستہ بند کر دیا۔ اٹھ کر دروازے پر گیا۔ کنڈی کھولی۔ گاؤں کا ایک لڑکا اس کے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے کھانا لیا' دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ کھانا سنبھالے ہوئے دالان میں گیا۔ کھانے میں روٹیاں تھیں' سرسوں کا ساگ تھا اور پیاز کی گٹھی تھی۔

اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور پانی کا بھرا ہوا پیالہ چڑھا کر لیٹ گیا' مگر سویا نہیں۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اٹھ بیٹھا۔ بستہ کھولا' رجسٹر نکالا' پنسل نکالی' دستاویز سامنے رکھی اور مقتول چوہدری نور الٰہی کے دستخط بنانے کی مشق کرنے لگا۔

☆

شام ہو گئی۔ رحیم داد نے چراغ روشن کیا۔ عین اسی وقت دروازے پر کسی نے دستک دی۔

رحیم داد دروازے پر پہنچا' کنڈی کھولی۔ توقع تھی کہ مولوی فضل احمد ہوگا مگر وہ مولوی فضل احمد نہیں تھا۔ اس کی سامنے ایک اجنبی کھڑا تھا۔ وہ تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کا چہرہ اور کپڑے گرد سے اٹے تھے۔ وہ نوجوان تھا۔ بدن مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ وہ ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے کا کرتا پہنے ہوئے تھا۔ اس کی دھوتی ملگجی تھی۔ سر برہنہ تھا۔ اس کے لمبے لمبے پٹے کانوں سے نیچے تک گئے ہوئے تھے۔ ان پر خاک کے ذرات بکھرے تھے۔ ہاتھ میں لمبی ڈانگ تھی۔ جسم سے پسینے کی بو اٹھ رہی تھی۔ وضع قطع سے وہ کسان لگتا تھا۔ اس نے شام کی دھندلی روشنی میں رحیم داد کو غور سے دیکھا اور حیرت سے بولا۔

"توں مجھے ملاں تو نہیں لگتا۔"

"ہاں' میں ملاں نہیں ہوں۔ ملاں شہر گیا ہے۔"

"ملاں جی کی کب تک واپسی ہوگی؟"

"کہتا تھا' آج عشاء کی نماز سے پہلے لوٹ آئے گا۔"

"ٹھیک ہے' تب تو وہ آتا ہی ہوگا۔ میں اس کا انتظار کرلوں گا۔" وہ آنگن میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "میرا نام نور دین ہے جی۔"

رحیم داد نے خاموشی سے دروازہ بھیڑ دیا۔ دونوں چپ چاپ دالان میں جا کر چٹائی پر بیٹھ گئے۔ نور دین تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ دالان کے کھمّ کا سہارا لیے بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے پوچھا۔

"ملاں جی کے پاس تیرا کیسے آنا ہوا؟"

"کیا بتاؤں جی! ایک چکر میں پڑ گیا ہوں۔" نور دین نے بیزاری سے کہا۔ "اسی کے لیے ملاں کے پاس آیا ہوں۔"

"ملاں سے تعویذ شویز لینا ہے؟ جھاڑ پھونک کرانی ہے؟"

"نہیں جی' ایسی کوئی گل نہیں؟ یہ دوسرا ہی چکر ہے۔"

رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "نورے! تو مجھے پریشان دکھائی دے رہا ہے۔"

نور دین نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "پانی ہو تو پلا دے۔ مجھے تو جیسے بھڑکی لگ گئی ہے۔ جتنا پانی پیتا ہوں' اتنی ہی زیادہ پیاس لگتی ہے۔"

رحیم داد نے نرم لہجے میں کہا۔ "بھوکا بھی لگتا ہے۔ روٹی رکھی ہے' کھا لے۔" اس نے دن کے بچے ہوئے کھانے کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں' مجھے صرف پانی پلا دے۔"

رحیم داد خاموشی سے اٹھا' مٹکے سے پیالے میں پانی نکالا اور نور دین کے پاس گیا۔ پیالہ ہاتھ میں لے کر وہ ایک ہی سانس میں غٹاغٹ سارا پانی پی گیا۔ رحیم داد اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ باہر آنگن میں رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ دونوں چراغ کی دھندلی روشنی میں خاموش بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد نور دین نے پوچھا۔

"ملاں جی نے آج ہی رات آنے کو کہا تھا ناں؟"

"مجھ سے تو یہی کہہ کر گیا تھا۔ فکر نہ کر' ملاں آتا ہی ہوگا۔"

"میں ۱۲ میل سے زیادہ ہی پیدل چل کر آیا ہوں۔ ملاں سے مل کر ہی جاؤں گا۔ رات یہیں ٹھہر جاؤں گا۔ ملاں سے ملنا بہت ضروری ہے۔"

"کوئی بہت ہی ضروری کام ہے؟"

"ہاں جی ضروری ہی کام ہے۔" نور دین نے رحیم داد کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "تیں نوں کیہ پتہ میں کس پریشانی میں ہوں۔" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں' چہرے پر جھنجلاہٹ آگئی۔ "اٹھ مہینے سے اوپر ہوگئے چکر کاٹتے ہوئے۔ اب کے میں دو ٹوک بات کرکے ہی جاؤں گا۔" وہ کندھے پر پڑی ہوئی چادر سے پسینہ پونچھنے لگا۔ اس کے چہرے پر بدستور جھنجلاہٹ تھی۔ وہ بے چین بھی نظر آرہا تھا۔

رحیم داد نے اسے اس قدر پریشان دیکھا تو دل جوئی کرنے کے انداز میں نرمی سے دریافت کیا۔

"نورے! بات کیا ہے؟ تو کہے تو میں ملاں جی سے تیرے لیے بات کروں۔ وہ میرا کہا مان لے گا۔"

رحیم داد کے نرم لہجے اور اظہار ہمدردی پر نور دین کسی قدر متاثر ہوا۔ "گل ایہہ ہے جی۔ میرا باندا اس پنڈ کے زمیں دار حاجی کے پاس ہے۔ یوں سمجھ' حاجی نے اسے دھرو رکھ چھوڑا ہے۔"

"حاجی یہ کام بھی کرتا ہے۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔ "حاجی سے ادھار شدھار لیا ہوگا' ورنہ وہ تیری گھر والی کو کیسے اپنے پاس دھر دیا گروی رکھ سکتا ہے۔"

"نہیں جی' میں نے اس سے کوئی ادھار شدھار نہیں لیا۔" نور دین نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "گل کچھ اور ہی ہے۔"

"گول مول بات نہ کر۔" رحیم داد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "بتانا ہے تو صاف صاف بتا۔"

"گل تو بہت لمّی ہے۔ وہ ایسا ہے جی۔ میرے پیئو کے پاس تین کلّا زمین ہے۔ وہ ہتھ راوہ ہے۔

خود ہی کھیتی باڑی کرتا ہے۔ بہت تنگی میں گزر بسر ہوتی تھی۔ میں جوان ہوا تو لاوی بار بن گیا۔ مزدوری پر دوسروں کی فصل کی واڈھی کرتا تھا۔ میں کئی سال لاوی بار رہا۔ فیر اپنے پنڈ کے لمبردار میاں داد سے ادھلاپی پر ۲۷ کنال زمین لے لی۔ بہت خراب اور پڑیلی زمین تھی۔ اس پر جھنگر تھا۔ میں نے زبردست محنت کی۔ جھاڑیاں کاٹ کے صاف کیں۔ زمین تیار کی۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "نہ پچھ' میں نے کتنی محنت کی۔ ادھار لے کر ہل پنجالی خریدی' بوائی کی۔ ہر فصل بہت چنگی ہوئی۔ انو ہندا کے حساب سے فصل کا آدھا اور اوپر سے اٹھواں حصہ بھی زمیں دار کو دے کر میرے پاس اتنا بچنے لگا کہ میں نے ادھار ادا کردیا۔ تیسرے سال ربیع کی فصل کی واڈھی کے بعد پیو نے میرا ویاہ کردیا۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ نوردین دالان کے تھم سے پیٹھ ٹکائے آہستہ آہستہ بتاتا رہا۔ "راجو میری گھروالی بن کر آئی تو فصل اور چنگی ہونے لگی۔ وہ محنت کرتی' روٹی پکاتی' دوپہر کو میرے لیے کھیت پر بھتّا لے کر آتی۔ مویشیوں اور ڈنگروں کے لیے سویرے ہی سویرے دھتا بھتا کرتی۔ چاٹی میں دودھ بلو کر مکھن نکالتی۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوا۔

"فصل تیار ہونے کے بعد میں راجو کو اس کی دیکھ بھال پر لگا دیتا۔ وہ کھیتوں میں پانی لگاتی اور نگرانی بھی کرتی۔ میں لاوی پر فصلیں کاٹنے نکل جاتا یا شہر میں محنت مزدوری کرتا۔ ہم دونوں مل کر محنت کرتے۔ آرام نال گزر بسر ہو رہی تھی۔ فیر ایسا ہوا جی' ایک رات پنڈ میں دھاڑا پڑا۔ شور مچا تو میں بھی نکل آیا۔ ہاتھ میں ڈانگ بھی تھی۔ ڈاکوؤں کو مار بھگایا۔ انھیں دور تک کھدیڑتا ہوا گیا۔"

رحیم داد نے نوردین کو غور سے دیکھا' مسکرا کر بولا۔ "دیکھنے میں بھی تو زور آور لگتا ہے۔"

نوردین اس کی بات نظرانداز کرکے بتاتا رہا۔ "لو جی' میں نے تو ڈاکوؤں کو بھگا کر اپنے تئیں نیک کام کیا پر یہی نیکی گلے پڑ گئی۔ میاں داد نے دوسرے ہی روز سویرے سویرے مجھے اپنی حویلی بلایا۔ میری پیٹھ ٹھونکی۔ بہت شاباش دی۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "کچھ ہی روز پہلے پنڈ میں میلہ لگا تھا۔ اس میں دنگل بھی ہوا۔ دوسرے پنڈ کے بھی پلوان اس میں کشتی لڑنے آئے تھے۔ میں نے اس دنگل میں اپنے سے تگڑے پلوان کو پچھاڑ دیا۔ بہت واہ واہ ہوئی جی۔ یار بیلیوں نے مجھے کندھے پر بٹھا کر پنڈ کا چکر لگایا۔ ڈھولیوں نے ڈھولوں پر زور زور سے چوٹیں لگائیں۔ میاں داد نے بھی میری جیت کا یہ جشن دیکھا۔ بہت خوش لگتا تھا۔"

"میاں داد کو تو خوش ہونا ہی چاہیے تھا۔ اس کے پنڈ کا نام اونچا ہوا تھا۔"

"اب آگے کی سنو۔ میاں داد مجھ سے کچھ دیر ادھر ادھر کی گپ شپ کرتا رہا۔ فیر الگ لے جاکر

بھ سے ایسا کام کرنے کو کہا کہ میں نے صاف انکار کردیا۔ اس نے مجھے رجھانے کی بہت کوشش کی پر میں تیار نہ ہوا۔ بس جی اس بات پر وہ مجھ سے سخت ناراض ہوگیا۔"

رحیم داد نے بے چینی اور حیرت سے پوچھا۔ "وہ تجھ سے کیا کام کروانا چاہتا تھا؟"

"گل ایہہ ہے جی۔ وہ زبردست رساگیر ہے۔" نوردین نے تیکھے لہجے میں بتایا۔ "وہ مجھ سے ڈنگروں کی چوری کرانا چاہتا تھا۔ میں ایسا گندا دھندہ کیسے کرتا۔ پہلے تو اس نے مجھے تنگ کرنے کے لیے فصل کی بٹائی پر جھگڑا کیا۔ بٹائی کے لیے اپنے ونڈاوے لے کر آیا۔ مجھے کم راہ کی دی اور اپنے حصے سے زیادہ غلہ اٹھوا کر لے گیا۔ میں چپ رہا پر وہ مجھے تنگ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بے دکھل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی کچھ نہ چلنے دی۔ بس مجھ سے ایک غلطی ہوگئی۔ انھی دنوں لاوی کے لیے پنڈ سے باہر چلا گیا۔ میں نے اس دفعہ اپنی فصل کی پہلے ہی واڈھی کرلی تھی۔"

رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔ "غلطی کی اس میں کون سی گل ہے۔ تو ہر فصل کی تیاری کے بعد لاوی پر جاتا ہی تھا۔"

"پر اس دفعہ مجھے پنڈ سے جانا نہیں چاہیے تھا۔ میاں داد سے دشمنی جو ہوگئی تھی۔" نوردین نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں ادھر لاوی پر دوسروں کی فصلوں کی واڈھی کر رہا تھا' ادھر ایک رات زمیں دار نے اپنے بدمعاشوں اور کرندوں کو میرے گھر بھیجا۔ وہ منہ پر منڈاسا باندھ کر آئے اور راجو کو اٹھا کر لے گئے۔ میں ہفتہ بھر بعد واپس آیا۔ راجو کو نہ پایا تو بہت پریشان ہوا۔ پڑوسیوں سے پوچھا۔ کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ میرے پیو کو بھی کچھ پتہ نہ تھا۔ جن کو پتہ تھا وہ زمیں دار کے ڈر سے چپ رہے۔"

"تھانے میں پرچا چاک نہیں کرایا؟"

"خود تھانے گیا تھا۔ پر تھانے دار نے رپٹ نہیں لکھی۔ کئی بار تھانے کے چکر لگائے۔ کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ ایک پولسیا جاننے والا تھا۔ اس سے معلوم ہوا' تھانے دار کی میاں داد سے یاری ہے۔ اس لیے وہ کارروائی کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے اوپر درخواست لگائی۔ بہت بھاگ دوڑ کی پر کچھ بھی نہ ہوا۔" نوردین نے گہری سانس بھری۔

"جب میں راجو سے مایوس ہوچکا تو ایک شام زمیں دار نے مجھے اپنے ڈیرے پر بلایا۔ اس روز مجھے معلوم ہوا' راجو کو میاں داد نے اپنے پنڈ سے دور یہاں دیدارپور میں حاجی حبیب کے پاس پہنچا دیا ہے؟"

"راجو کو اس نے اپنی حویلی میں کیوں نہیں رکھا؟ حاجی کے پاس کیوں پہنچا دیا؟"

"گل اصلی ایہہ ہے جی، دونوں ہی رسا گیر ہیں۔" نوردین نے تلخی سے کہا۔ "دونوں چوری کے ڈھور ڈنگر اٹھوا کر ایک دوسرے کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ مانو پولیس چھاپا مارے بھی تو راجو اس کی حویلی سے برآمد نہ ہو۔" وہ چند لمحے خاموش رہ کر گویا ہوا۔

"میں نے زمیں دار کی بہت منت کی تو اس نے راجو کی واپسی کے لیے یہ شرط لگائی، میں اس کے لیے ڈنگروں کی چوری کروں۔ دس ڈنگروں کی چوری کے بعد اس نے راجو کو واپس کرنے کا وعدہ کیا۔"

"تو نے میاں داد کی یہ شرط مان لی؟"

"ہاں جی، ماننی ہی پڑی۔ پولیس کو اور اوپر والوں کو سبھی کو آزما لیا۔ کسی نے میری کوئی مدد نہیں کی۔"

"تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔"

"سنتا جا۔ کیا کیا ہوا۔" نوردین بتانے لگا۔ "تو جی اس طرح میں مویشی چور بن گیا۔ رات کے اندھیرے میں میاں داد کی حویلی سے نکلتا۔ کبھی اکیلا ہوتا، کبھی دوسرے مویشی چور بھی ساتھ ہوتے۔ دور دور کے پنڈ سے ڈنگر چراتا۔ کھرے کے نشانات مٹانے کے لیے مویشیوں کے پیروں میں کھسّے ڈالتا۔ لادھ ہوتا تو پیچھا کرنے والوں پر پلٹ کر حملہ بھی کرتا۔ کبھی ان کو بھگانے کے لیے گولی چلائی، کبھی غلط رستے پر ڈالنے کے لیے وڑدچ سے بھی کام لیا۔ کئی بار پکڑے جانے سے بال بال بچا۔ چوری کے مویشی چھپانے کے لیے میاں داد نے اپنا اہر دور جھل میں بنایا ہے۔ چوری کے بعد مویشی وہاں پہنچاتا۔ فیر تو جی میں نے کسی نہ کسی طرح دس مویشی میاں داد کے لیے چرائے۔" اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ "مویشیوں کی اس چوری میں سب سے زیادہ دکھ مجھے دوبار ہوا۔ میں نے دو مزارعوں کے ڈھگے چرائے اور اس لیے چرائے کہ میاں داد انھیں بے دخل کرنا چاہتا تھا۔ جب ڈھگے نہ رہے تو وہ ہل کیسے چلاتے۔ دونوں برباد ہو گئے۔ پنڈ چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک کے بارے میں تو سنا ہے ملتان میں بھیک مانگتا ہے۔ گھر والی بھی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ ایک پتر تھا، اسے بھی ساتھ لے گئی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں نے یہ سب کچھ راجو کے لیے کیا۔ وہ تب بھی نہ ملی۔"

"ایسا کیوں ہوا؟" رحیم داد نے چونک کر سوال کیا۔ "تو نے تو زمیں دار کی شرط بھی پوری کر دی تھی۔"

"میں نے یہی بات زمیں دار سے کہی تھی۔ جب میں نے اس کے لیے دس مویشی چرا لیے تو اس نے مجھے کہا، دیدار پور چلا جا اور حاجی حبیب کی ماڑی سے راجو کو واپس لے آ۔ میں اس کے کہنے پر یہاں حاجی کے پاس آیا۔ وہ صاف مکر گیا۔ بگڑ کر بولا، میرے پاس کوئی راجو شاجو نہیں۔ میاں داد نے تجھے بہکا دیا۔ میں ایسا گندا کام نہیں کرتا۔ اس کی باتیں سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ واپس میاں داد کے پاس گیا۔ میں نے اسے ساری بات بتائی۔ وہ شرمندہ ہونے کی بجائے ٹھٹھا مار کر ہنسا، میری پیٹھ ٹھونک کر کہنے لگا۔ مل جائے گی، تیری راجو ضرور مل جائے گی۔ پہلے میرا ایک کام کر دے۔ اس دفعہ اس نے بہت خطرناک کام بتایا۔"

رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ "مویشی چوری سے بھی زیادہ خطرناک؟"

"ہاں جی، اس سے بھی زیادہ خطرناک۔ ہوا یہ کہ ایک کھوجی نے میاں داد کے اہر کا کھوج نکال لیا۔ وہاں سے چوری کے کئی مویشی پکڑے گئے۔ میاں داد جیل جاتے جاتے بچا۔ کئی ہزار روپے رشوت میں دینے پڑے۔ خود میاں داد کے اپنے کرندے، بھولا نے مرخائی کے لالچ میں مخبری کی تھی۔ وہ بھاگ کر کریشیوں کے پاس چلا گیا۔ وہ جی بہت وڈے زمیں دار ہیں۔ ان کی ہزاروں کلاّ زمین ہے۔ اوپر بھی ان کی پہنچ ہے۔ میاں داد کو جب بھولا کی غداری کا علم ہوا تو سخت ناراض ہوا۔ وہ چاہتا تھا میں بھولا کا خون کر دوں۔ میاں داد کی بات سن کر میں چپ رہا۔ دو روز تک سوچتا رہا۔ کریشیوں کے علاقے میں گولی چلانا آسان کام نہیں۔ وہاں تو مانو ان کی حکومت ہے۔ تھانہ، پولیس، سب کچھ ان کا ہے۔"

نوردین لمحے بھر خاموش رہ کر بتانے لگا۔ "ادھر میاں داد کو ملوم ہو گیا، میں بھولا کا خون کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ اس نے رات کو مجھے بلایا۔ بہت ناراض ہوا۔ کاربین میرے ہاتھ میں دے کر بولا۔ بھولا کو ختم کر کے آنا ورنہ مجھے اپنا منہ نہ دکھانا۔ تجھے رات بھر کی مہلت دیتا ہوں۔ کام نہ ہوا تو راجو تو تجھے ملے گی ہی نہیں اور تو بھی اس سے ملنے کے لیے زندہ نہیں رہے گا۔ ہاں، کام پورا کر کے آیا تو راجو کو اپنے ساتھ لے جانا۔ یہ میرا تجھ سے پکا وعدہ رہا۔ اس کے ناراض ہونے سے میں ڈر گیا۔ راجو کو بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں تیار ہو گیا۔ میاں داد کے کرندوں نے اسی رات مجھے کریشیوں کی زمینوں کے نزدیک پہنچا دیا۔"

"کرندے اس کام میں شریک نہیں ہوئے؟"

"توبہ کرو جی۔ وہ مجھے چھوڑ کر فوراً اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ میں آگے گیا اور رات بھر درختوں کے نیچے بھولا کی گھات میں بیٹھا رہا۔ ابھی صبح کا ذرا اجالا ہوا تھا، کیا دیکھتا ہوں، بھولا اپنے

گھر سے نکلا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا سامنے کے نیا ئین کی طرف بڑھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ سویرے سویرے ٹٹی کے لیے نیا ئین ضرور جائے گا۔ میں نیا ئین کے سامنے ہی اندھیرے میں دبکا بیٹھا تھا۔ جیسے ہی وہ دھوتی اٹھا کر بیٹھا' میں نے جھٹ اس پر گولی چلائی۔ نشانہ ٹھیک بیٹھا۔ وہ چیخ مار کر اٹھا۔ میں نے دوسری گولی چلائی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ میں نے اسے زمین پر تڑپتے دیکھا اور کھیتوں کے اندر اندر رستہ بناتا ہوا بھاگا۔ کریشیوں کی مسلح کرندے گولی کی آواز سنتے ہی شور مچاتے پہنچے۔ انھوں نے میرا پیچھا بھی کیا۔ بار بار گولیاں چلائیں' پر میں بچ کر صاف نکل آیا۔"

"تو نے کمال کر دیا۔" رحیم داد نے تعجب کا اظہار کیا۔ "کریشیوں کی زمیں داری سے اس طرح بچ کر نکل آنا معمولی بات نہیں۔"

"پر میرا کام تب بھی نہ بنا۔" نوردین نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میاں داد نے مجھے فیر حاجی حبیب کے پاس بھیجا۔ اس دفعہ حاجی نے یہ تو بتایا' راجو اس کی ماڑی میں ہے پر اس نے راجو کو دیا نہیں۔ کہنے لگا' کچھ دنوں بعد آنا۔ میں نے میاں داد کو بتایا۔ اس نے مجھے اپنے منشی کے ساتھ حاجی کے پاس بھیجا۔ حاجی نے فیر ٹال مٹول سے کام لیا۔" اس نے گہری سانس لی۔ "میں بار بار حاجی کے پاس جاتا' وہ مجھے لارے لپے دیتا۔ پچھلے دنوں اس کے پاس آیا تو اس نے نئی گل بات کہی۔"

"کیا نئی گل کہی؟"

"حاجی نے کہا' جو زنانی اٹھ مہینے تک دور رہی' وہ اب تیرے ساتھ کیسے رہ سکتی ہے۔ یہ شرعی مسئلہ ہے مسجد کے ملاں سے پوچھنا پڑے گا۔"

"اس چکر میں پڑا ہی کیوں؟ میاں داد سے کہتا' وہ خود تیری گھر والی کو حاجی کے پاس سے واپس لائے اور تیرے حوالے کرے۔ تیری تو اس سے یہی بات طے ہوئی تھی نا؟"

"میں نے میاں داد سے پہلے ہی کہا تھا۔ مگر جب میں نے زیادہ زور دیا تو وہ ایک دم گرم ہو گیا۔ دھمکی دینے لگا کہ بھولا کے کتل کے الزام میں مجھے پولیس کے حوالے کر دے گا۔ میں تو جی یہ بات سن کر ہی ڈر گیا۔ ویسے بھی ان دنوں بھولا کے کتل کے سلسلے میں پولیس نے زبردست بھاگ دوڑ مچا رکھی تھی۔ کریشیوں نے بہت زور ڈالا۔ پولیس تو مجھے پکڑ کر لے بھی جاتی پر میاں داد نے بچا رکھا تھا۔ وہ کریشیوں کے اتنا وڈا زمیں دار تو نہیں پر اس کے بھی شریکے اور رشتے ناتے دار وڈے سرکاری افسر لگے ہیں۔"

نوردین سر جھکا کر چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب تو جی' حاجی ہی میرا کام کر سکتا ہے۔ اسی لیے میں ملاں کے پاس آیا ہوں۔ پہلے بھی آیا تھا۔ ملاں کی منت سماجت کی تو

اس نے کہا اسے ملتان جانا ہو گا۔ شرعی مسئلہ ہے' وہاں کے مفتی سے فتویٰ لینا ہو گا۔ اب تک تو وہ فتویٰ لے آیا ہو گا۔"

اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں التجا تھی۔ "توں کہتا تھا' ملاں تیری بات مان لے گا۔ توں بھی ملاں سے کہنا' میرا بازو مجھے مل جائے' تیری بہت مہربانی ہو گی۔" رحیم داد گردن جھکائے اس طرح خاموش بیٹھا رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ نوردین نے اسے گہری سوچ میں غرق دیکھا تو کرید کر دریافت کیا۔

"کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"سوچ رہا ہوں' میاں داد تجھے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔"

"بے دکھل کرنا چاہتا ہے تو کر دے۔" وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ "جب سے راجو گئی ہے' زمین کا ستیاناس ہو گیا۔ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں؟ وہ میرے ساتھ برابر سے کام کرتی تھی۔ وہ میرا بازو ہے۔ اس کے بنا میں کیسے کھیتی باڑی کر سکتا ہوں۔" اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

"غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" رحیم داد نے بھی اس کی تائید کی۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے' میاں داد اور حاجی حبیب' دونوں نے اس معاملے میں مسکوٹ کر رکھی ہے۔ میاں داد تجھے بے دخل کر کے زمین ہتھیانا چاہتا ہے۔ حاجی تیری گھر والی کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ دونوں یہی چاہتے ہیں' رسا گیری کے دھندے میں تجھے استعمال کریں۔ تجھ سے مویشیوں کی چوری کرائیں' خون کرائیں' ڈکیتی کرائیں۔ تیں نوں پتہ نہیں' سارے ہی وڈے زمین دار یہی دھندا کرتے ہیں۔" اس نے انگلی سے سر کھجاتے ہوئے نوردین کی جانب نظریں اٹھائیں۔ "نورے! مجھے تو راجو کا واپس ملنا مشکل ہی نظر آتا ہے۔"

"ایسا نہ کہہ۔" نوردین تڑپ کر بولا۔ اس نے جھٹ دھوتی کے ڈب سے دیسی ساخت کا پستول نکالا۔ "میں حاجی اور میاں داد دونوں کو جان سے مار دوں گا۔"

"ایک تو یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا سمجھتا ہے۔" رحیم داد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "فیر یہ بھی تو سوچ' تو خود بھی پھانسی پر لٹک جائے گا۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "راجو کا خیال اپنے دل سے نکال کیوں نہیں دیتا؟"

"نہیں جی ایسا نہیں ہو سکتا۔ راجو میرا بازو ہے' میں اسے نہیں بھول سکتا۔" نوردین نے بڑے

جوش سے کہا۔ "ویسے مجھے راجو سے پیار بھی ہے۔ اب مجھے ویسی گھر والی کہاں ملے گی؟ وہ زبردست محنتی اور اہری ہے۔"

☆

آنگن کا دروازہ کھلا۔ دونوں نے چونک کر دیکھا' چراغ کی دھندلی روشنی میں ایک عورت سر پر کھانے کی چنگیر رکھے اندر داخل ہوئی۔ رحیم داد نظریں اٹھائے اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ نور دین نے پستول فوراً دھوتی کے ڈب میں رکھ لیا۔

عورت آہستہ آہستہ چلتی ہوئی قریب آ گئی۔ وہ گداز بدن کی نوجوان عورت تھی۔ خوب گھیردار گھگرا پہنے ہوئے تھی۔ اس کے اوپر ملگجا تنگ جھگا تھا۔ گردن میں بھی ملگجا دوپٹا پڑا تھا۔ لباس تو اس کا میلا کچیلا تھا مگر تھی الھڑ اور چلبلی۔ چلتی تو کولھوں کو خم دے کر قدم بڑھاتی۔

وہ دالان میں پہنچی' دوپٹے کے آنچل سے سر ڈھک کر چہرے پر بکل مارا اور جھک کر کھانا رکھتے ہوئے بولی۔ "زمیں دار کے گھر سے ملاں جی کے لیے روٹی ٹکر لائی ہوں۔"

وہ واپس جانے کے لیے مڑی۔ نور دین نے ٹوکا۔ "تیرا ناں کیہ ہے؟"

"ہے کچھ۔" وہ تنک کر بڑے ناز سے بولی۔ "توں میرا ناں کیوں پوچھتا ہے؟"

"اتنا ناراض کیوں ہوتی ہے؟" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "نام ہی تو پوچھا ہے' بتا دے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔"

"میرا ناں پھلّی ہے جی۔ زمیں دار کی ماڑی میں کام کرتی ہوں۔"

نور دین نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "ایک گل پوچھوں' بتا دے گی؟"

اس نے گردن کو خم دے کر نور دین کی جانب دیکھا۔ "بتانے کی ہوگی' بتا دوں گی۔"

"راجو کو جانتی ہے؟ وہ بھی تو حاجی کی ماڑی میں ہوتی ہے۔"

"راجو!" پھلی نے نور دین کو مشتبہ نظروں سے دیکھا' بے رخی سے بولی۔ "میں نوں کچھ پتہ نہیں۔"

رحیم داد نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ "اللہ تعالیٰ نے تجھے ایسی سوہنی شکل صورت دی ہے' بات بھی اسی طرح کیا کر۔"

پھلی کی شکل و صورت ایسی اچھی نہ تھی۔ گہرا سانولا رنگ تھا' ناک نقشہ بھی بھدا تھا۔ رحیم داد کی بات سن کر وہ خوش ہوئی۔ زیر لب مسکرائی۔ رحیم داد کو مخاطب کر کے بولی۔

"تیں نوں کچھ پوچھنا ہے؟"

"پہلے بیٹھ تو جا۔" رحیم داد نے شفقت سے کہا۔ "کھڑی کیوں ہے؟ چلی جانا' ایسی جلدی کیا ہے۔"

پھلی نے اپنا گھگرا سمیٹا اور دونوں سے ذرا ہٹ کر چٹائی پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوئی۔ "بول' تیں نوں کیہ کہنا ہے؟"

"میں نوں تو کچھ نہیں کہنا۔" رحیم داد نے نور دین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ جو کچھ پوچھتا ہے' بتا دے۔ بہت دور سے چل کر آیا ہے۔"

پھلی نے نگاہیں موڑ کر نور دین کو دیکھا۔ مسکرا کر بولی۔ "تو راجو کا گھر والا نور دین تو نہیں ہے؟"

"ہاں' میں نور دین ہی ہوں۔ یہ بتا' راجو کیسی ہے؟ تیری مہربانی ہوگی۔"

"مہربانی کی کون سی گل ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "زمیں دار سے ڈر لگتا ہے۔ ویسے راجو ٹھیک ٹھاک ہے۔"

نور دین نے دریافت کیا۔ "تجھ سے تو ملتی ہی ہوگی؟"

"روز ملتی ہے۔ میرے ساتھ ہی ماڑی میں کام کاج کرتی ہے۔ پر وہ ماڑی سے باہر نہیں نکلتی۔ زمیں دار کا اس کے لیے یہی حکم ہے۔"

"کبھی مجھے بھی یاد کرتی ہے؟"

"کرتی تو ہے۔" پھلّی نے جواب دیا۔ "پر یاد کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تیرے پاس نہیں جا سکتی۔"

اس دفعہ رحیم داد نے سوال کیا۔ "کیا اس کی مرضی اپنے گھر جانے کی نہیں ہے؟"

"اس کی مرضی سے کیا ہوتا ہے جی۔" پھلّی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "مرضی تو اصلی زمیں دار کی ہے۔" اس نے چوکنّا نظروں سے آنگن کے دروازے کی جانب دیکھا اور کھسک کر دونوں کے قریب ہو گئی۔ "زمیں دار اسے رکھیل بنا کر اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ ویسے جی اس کی پہلے ہی دو گھر والیاں ہیں۔ دونوں ہی ماڑی میں رہتی ہیں۔ روز آپس میں لڑتی جھگڑتی ہیں۔ پر راجو سے دونوں ہی کھار کھاتی ہیں۔ اسے بہت تنگ کرتی ہیں۔ زمیں دار کا وڈا پتر کمال بھی راجو کو تنگ کرتا ہے۔ ویسے تو وہ ماڑی میں کام کرنے والی سبھی زنانیوں کو تنگ کرتا ہے۔ ایک نمبر حرام دا ہے۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"ابھی میں روٹی لے کر ماڑی سے نکلی تو وہ بھی کہیں جا رہا تھا۔ اندھیرے میں میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ لگا نوچنے کھسوٹنے۔ روٹی ہاتھ میں نہ ہوتی تو ابھی پکڑ کر کھیتوں میں لے جاتا۔" وہ شرما گئی۔

رحیم داد نے پوچھا۔ ”تیرا گھر والا نہیں ہے؟“

”ہے تو جی۔“ وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”ہم کمّی کمین ہیں جی' ہماری کیا عزت' کیا آبرو۔ زمیں دار کے پتر کے خلاف ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ماڑی میں کام نہ کریں تو گزارہ کیسے ہو۔“

نوردین بے قرار ہو کر بولا۔ ”چھلّی! مجھے راجو سے ملوا دے' تیری بہت مہربانی ہوگی۔“

”ناجی نا' ایسی گل نہ کر۔“ وہ خوف زدہ ہو کر بولی۔ ”زمیں دار کو پتہ چل گیا تو جان سے مار دے گا مجھے۔“

”اسے پتہ ہی کب چلے گا۔“ رحیم داد نے سفارش کی۔ ”تو بھی کسی کی گھر والی ہے' ذرا سوچ تو' اور اسے دیکھ۔“ اس نے نوردین کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”کتنا پریشان اور دکھی ہے۔ اٹھ مہینے سے اوپر ہو گئے' اس نے اپنی گھر والی کو نہیں دیکھا۔“

وہ بے مروّتی سے بولی۔ ”میں کیا کر سکتی ہوں جی؟“

”تو حاجی کی دونوں گھر والیوں کو راضی کرنے کی کوشش کر۔“ رحیم داد نے اسے ترکیب بتائی۔ ”وہ تو راجو کو نورے کے ساتھ بھگانے پر بھی تیار ہو جائیں گی۔ اسے اپنی سوکن جو سمجھتی ہیں۔ اس کام میں وہ ضرور مدد کریں گی۔“

”نہیں جی' تیں نوں کچھ پتہ نہیں۔“ چھلی نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”ویسے تو دونوں ہر دکت کڑ کڑ کرتی رہتی ہیں۔ پر زمیں دار سے بہت ڈرتی ہیں۔ باہر وہ جتنا نیک بندہ نظر آتا ہے' گھر کے اندر اتنا ہی ظلم کرتا ہے۔ تجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔“ وہ اٹھنے کے لیے کسمسائی۔ ”میں نوں اب جانا ہے' کام بھی کرنا ہے۔“

”زمیں دار تو ملاں جی کے ساتھ شہر گیا ہے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”فیر تو اتنا کیوں ڈرتی ہے۔“

وہ بولی۔ ”زمیں دار اب آتا ہی ہوگا۔“

نوردین نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ ”مجھے راجو سے نہیں ملوا سکتی؟ ملوا دے' تیری بہت مہربانی ہوگی۔“ اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔

”نہیں جی' میں ایسا نہیں کر سکتی۔“

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”ناراض کیوں ہوتی ہے۔“ اس نے دھوتی کا ڈب ٹٹولا اور دس روپے کا نوٹ نکال کر چھلّی کی جانب بڑھایا۔ ”لے اسے رکھ لے' نئے کپڑے لتے بنوا لینا۔ دیکھ تو تیرے کپڑے کتنے گندے ہو رہے ہیں۔“

چھلّی نے ہچکچاتے ہوئے نوٹ تو لے لیا مگر خاموش بیٹھی رہی۔ رحیم داد نے کہا۔ ”حوصلے سے کام لے' حوصلے سے۔“ اس نے نوردین کی جانب مڑ کر دیکھا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”نورے! بتا تیرا کیا پروگرام ہے۔ کب اور کیسے راجو سے ملنا چاہتا ہے؟“

”ابھی تو جی جگار ہے۔ میں آدھی رات کو ماڑی کے پاس پہنچ جاؤں گا۔“ اس نے چھلّی کی طرف اشارہ کیا۔ ”آگے یہ جیسا بتائے گی' ویسا کروں گا۔“

”ایسا کر۔“ چھلّی نے نوٹ گھگھرے کے نیفے میں اڑستے ہوئے کہا۔ ”ماڑی کے کھبّے ہتھ پہنچ جانا۔ وہاں ٹاہلی کے پیڑوں کا جھنڈ ہے' اندھیرا بھی ہے۔ ماڑی کا ایک دروازہ ادھر کھلتا ہے۔ میں راجو کو وہیں بھیج دوں گی۔ پر آدھی رات گزرنے کے بعد ہی آنا۔“ اس نے خوف زدہ نظروں سے نوردین اور رحیم داد کو دیکھا۔ ”کوئی گڑبڑ ہو جائے تو میرا ناں نہ لینا' ہرگز نہیں۔ ورنہ زمیں دار مجھے جان سے مار دے گا۔“

”پکا وعدہ۔ تیرا ناں ہرگز نہیں لوں گا۔ چاہے وہ مجھے جان سے مار دے۔“ نوردین نے سینہ تان کر اسے یقین دلایا۔ ”بالکل فکر نہ کر۔“ اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ ”میں آدھی رات کے بعد اس جگہ پہنچ جاؤں گا۔“

”کوئی گڑبڑ نہ ہو۔“ چھلی کھڑی ہو گئی۔ ”میں نوں بہت ڈر لگتا ہے۔“

وہ واقعی خوف سے گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس نے مزید بات چیت نہیں کی۔ دالان سے نکل کر چپ چاپ آنگن میں پہنچی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی باہر چلی گئی۔ نوردین نے اٹھ کر دروازہ بند کیا مگر کنڈی نہیں لگائی۔

نوردین واپس آیا تو خوشی سے چہرہ دمک رہا تھا۔ رحیم داد کے قریب بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔ ”توں نے اس دکت وہ کام کیا میرا کوئی سگا بھی نہ کرتا۔ میں نوں پتہ نہ تھا' توں اتنا بھلا اور نیک بندہ ہے۔“ اس کے انداز میں خوشامد تھی۔

”نورے! مجھے تو تب خوشی ہوگی' جب راجو تجھے مل جائے گی۔“

”میں تو کہتا ہوں جی' بس ایک بار راجو مل جائے' فیر میں اسے اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔“

”ایسا ہو تو سکتا ہے۔ حاجی کی گھر والیاں مدد کرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو کام آسان ہو جائے گا۔“

”میری ایک گل مان لے گا؟“

”کیا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

"میرے ساتھ ماڑی تک چل سکے گا؟" نوردین نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں' توں میرے ساتھ ہوتا۔ جیسے کہے گا' ویسا ہی کروں گا۔ راجو بھی تیری گل بات مان لے گی۔ وہ ضرور تیری گل مان لے گی۔ میں اسے جانتا ہوں۔ وہ میری گھروالی ہے۔"

"مجھے نہ لے جا۔" رحیم داد اس کے ہم راہ جانے پر رضامند نہیں ہوا۔ وہ کوئی ایسا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا جس میں گرفتاری کا خدشہ ہو۔ "اکیلا ہی چلا جا۔"

"جیسی تیری مرضی۔" نوردین نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ویسے ساتھ رہتا تو ٹھیک تھا۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ نوردین بھی چپ تھا۔ دونوں چٹائی پر گم صم بیٹھے تھے۔ طاق میں چراغ روشن تھا مگر اس کی روشنی بہت کم تھی۔ باہر آنگن میں اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔

☆

مولوی فضل احمد دروازے پر نمودار ہوا۔ آگے بڑھا۔ خاموشی میں اس کے قدموں کی آہٹ ابھری۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا دالان میں پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی گٹھری دبی تھی۔ اس نے گٹھری رحیم داد کے سامنے ڈال دی۔

"لے بھئی' تیرا سامان آگیا۔"

مولوی فضل ایک طرف بیٹھ گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے اور لباس پر خاک کے ذرات بکھرے ہوئے تھے۔ رحیم داد نے گٹھری کھولی۔ اندر سے پگڑی' شلوار اور قمیص نکلی۔ شلوار سفید لٹھے کی تھی۔ قمیص پر ہلکی ہلکی سبز دھاریاں تھیں۔ کپڑا بھی چکنا اور نرم تھا۔ ساتھ میں ایک پرنا اور دو رجسٹر تھے' پنسلیں بھی تھیں۔ رحیم داد نے ایک ایک چیز غور سے دیکھی' مسکرا کر بولا۔

"ملاں جی' تم نے تو کمال کر دیا۔ اتنی جلدی کمیض اور شلوار تیار کرالی۔"

"میں نے شہر پہنچتے ہی بازار سے کپڑا خریدا۔ درزی کو دے کر کہا' کل دوپہر بارہ بجے تک تیار کردے۔ مزدوری کی فکر نہ کرنا۔" مولوی فضل آہستہ آہستہ بتاتا رہا۔ "بس جی' اس نے فٹافٹ کپڑے تیار کر دیے۔ میں نے سوچا' کندھے پر ڈالنے کے لیے پرنا بھی چاہیے ہوگا۔ ہر دم منہ ہاتھ پونچھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ سو میں نے ایک پرنا بھی تیرے لیے خرید لیا۔" اس نے اپنے کرتے کی جیب سے عینک نکالی اور رحیم داد کے ہاتھ میں دے دی۔ "لے' یہ تیری عینک بھی آگئی۔ پتہ نہیں' تیری آنکھوں پر ٹھیک بھی لگتی ہے کہ نہیں۔ ویسے میں نے عینک ساز کو بتا دیا تھا کہ کم نمبر کی ہو' جوان بندے کے لیے چاہیے ہے۔"

رحیم داد نے عینک دیکھی۔ اس کا فریم تھا تو استعمال شدہ مگر جدید وضع کا تھا۔ رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا۔ بات یہ تھی کہ حکیم چشتی کی عینک کا فریم چاندی کے پتلے تاروں کا تھا۔ رحیم داد حلیہ بدل کر اب رحیم داد نہیں رہا تھا۔ مگر وہ مقتول حکیم چشتی بھی بننا نہیں چاہتا تھا۔ دونوں صورتوں میں اس کے لیے خطرہ تھا۔

عینک پا کر وہ خوش ہوا۔ عینک کے شیشے ہلکے اور صاف تھے۔ اس نے عینک لگا کر ادھر ادھر نظریں گھمائیں۔ ہر چیز قدرے بڑی اور صاف نظر آئی۔

رحیم داد نے مسکرا کر اپنی پسند کا اظہار کیا۔ "بالکل فٹ بیٹھی ہے جی۔ مجھے ایسی ہی عینک چاہیے تھی۔"

"وہ تو میری طرح کا فریم لگا رہا تھا۔" مولوی فضل نے اپنی عینک کی طرف اشارہ کیا' اس کا فریم پرانی وضع کا تھا۔ "پر میں نے کہا' نہیں جی' یہ نہیں چلے گا۔ کوئی عمدہ فریم لگا۔ اپنا چوہدری جوان بندہ ہے۔ شہر کا رہنے والا ہے۔" وہ اپنی کارگزاری سناتا رہا۔ "خریداری کے معاملے میں' میں کبھی دوکاندار سے مار نہیں کھاتا۔"

اس نے جیب سے تین روپے نکالے اور رحیم داد کی جانب بڑھائے۔ "لے بھئی چوہدری! تیرا سب سامان بھی آگیا اور ۵۰ میں سے یہ روپے بھی بچ گئے۔"

رحیم داد نے روپے نہیں لیے۔ مسکرا کر کہا۔ "ملاں جی! اسے اپنے ہی پاس رکھ لو۔ میری خوشی سمجھ کر رکھ لو۔"

"تیری یہی خوشی ہے تو رکھے لیتا ہوں۔" مولوی فضل نے روپے پھر جیب میں رکھ لیے۔ رحیم داد کی اس فراخدلی پر وہ بہت خوش ہوا۔ "اب پڑچھتی میں جا کر کپڑے بدل لو اور یہ دیکھ لو' ٹھیک سے فٹ آتے ہیں کہ نہیں۔ میں نے قمیص میں چار جیبیں لگوائی ہیں' دو نیچے ایک اوپر اور ایک روپے پیسے رکھنے کے لیے اندر۔ ٹھیک کیا نا میں نے؟" مولوی فضل نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔ رحیم داد نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ تو بہت چنگا کام کیا۔"

رحیم داد کپڑے اٹھا کر دالان سے باہر گیا اور آنگن عبور کر کے پڑچھتی میں پہنچا۔

☆

مولوی فضل احمد نے نوردین کی جانب توجہ دی' کسی قدر تلخ لہجے میں پوچھا۔ "نورے! تو کیسے آیا؟"

"یہ پوچھنے آیا تھا راجو کے معاملے میں توں نے کیا طے کیا؟ اب تک ملتان سے فتویٰ بھی منگوالیا ہوگا۔"

مولوی فضل نے بے رخی سے کہا۔ "میں ملتان گیا ہی کب۔ وہاں جانے پر خرچ آتا ہے۔ مجھے کچھ دے کر گیا تھا جو میں وہاں جاتا۔"

"میری حالت کا تیں نوں پتہ ہی ہے۔" نوردین نے عاجزی سے کہا۔ "میرا تو سب کچھ تباہ ہوگیا۔ نہ زمین پر ہل چلا سکا' نہ بوائی کی' نہ فصل ہوئی۔ زمین بنجر ہوتی جا رہی ہے۔ ادھیارے پر زمین دینی چاہی تو زمیں دار نے منع کردیا۔"

"یہ سب کچھ میں نہیں جانتا۔" مولوی نے بے زاری کا اظہار کیا۔ "یہ تیرا اور تیرے زمیں دار کا معاملہ ہے' میں اس میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"پر راجو کا معاملہ تو طے کرا سکتا ہے۔" نوردین گڑگڑانے لگا۔ "تیری بہت مہربانی ہوگی۔ میں سارے چکروں سے بچ جاؤں گا۔ میں نوں کچھ اور نہیں چاہیے۔"

مولوی فضل چند لمحے خاموش رہا پھر اپنی ڈاڑھی کریدتے ہوئے مشورہ دیا۔ "میرا کہا مان' راجو کو تو اب بھول ہی جا۔ اب وہ تیرے کام کی نہیں رہی۔ مجھے پتہ چلا ہے وہ رات کو دیر تک حاجی صاحب کے کمرے میں اکیلی رہتی ہے۔ سبھی کچھ ہو سکتا ہے' شیطان کے بہکانے میں دیر نہیں لگتی۔"

"نہیں جی' ایسا نہیں ہو سکتا۔" نوردین تڑپ کر بولا۔ "راجو ایسی نہیں ہو سکتی۔ میں اسے ٹھیک طرح جانتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے' تو اسے جان کر بھی نہیں جان سکا۔" مولوی نے عینک کے شیشوں کے پیچھے سے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "میں نے تو یہاں تک سنا ہے' وہ تیرے ساتھ جانے پر بالکل رضا مند نہیں۔"

"نہیں ملاں جی' یہ بالکل غلط ہے۔ راجو ایسا نہیں کر سکتی۔"

"میں کہتا ہوں تو ابھی نادان ہے۔ تجھے کچھ بھی پتہ نہیں۔" مولوی فضل احمد نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ "آٹھ مہینے میں وہ بالکل بدل چکی ہے۔ وہ اب تیری پہلے جیسی راجو نہیں رہی۔ تو میری بات کیوں نہیں مانتا؟" وہ چند لمحے خاموش رہا پھر نرم لہجے میں بولا۔ "میں تیری ایک ہی مدد کر سکتا ہوں۔"

نوردین نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "وہ کیا ہے؟"

"وہ یہ ہے کہ میں راجو کے عوض تجھے حاجی صاحب سے کچھ روپیہ دلوا دوں۔ تو راجو کو طلاق نامہ لکھ دے۔ میں تجھے ہزار روپے تک دلوا دوں گا۔ حاجی صاحب تو پانچ سو سے زیادہ دینے کو تیار نہیں تھے' میں نے منت سماجت کی تو ہزار پر تیار ہوگئے۔" مولوی فضل کھل کر مسکرایا۔ "ویسے تو حاجی کے بارے میں کچھ ہی کہہ' پر وہ دل کا برا نہیں۔ وہ چاہتا تو راجو کو یوں ہی رکھ لیتا' ایسے ہی جیسے دوسرے وڈے زمیں دار داشتہ بنا کر رکھ لیتے ہیں۔ پر وہ نیک اور صالح مسلمان ہے' برائی سے ہمیشہ بچتا ہے۔ وہ باقاعدہ نکاح پڑھوا کر' راجو کو حبالۂ عقد میں لانا چاہتا ہے۔ بات یہ ہے جی' راجو اس کی بہت خدمت کرتی ہے' اس سے پیار کرتی ہے۔ اسی کے پاس رہنا چاہتی ہے۔ اسے ماڑی میں بہت آرام ہے۔ عیش کرتی ہے۔ تیرے گھر میں اسے یہ عیش آرام کہاں ملے گا؟ تو اس سے ڈنگروں کی طرح کام لیتا ہے۔ ہر زنانی عیش آرام چاہتی ہے' راجو بھی ایسا ہی چاہتی ہے۔ اس میں کون سی نئی بات ہے۔ پر تو یہ باتیں نہیں سمجھتا۔"

نوردین نے بیل کی طرح گردن ہلائی۔ "سمجھ نہیں آتی راجو ایسی ہو سکتی ہے۔"

"اب تو الٹی سیدھی باتیں سوچ کر اپنا مغز خراب نہ کر۔ سیدھی سیدھی معاملے کی بات کر۔ ہزار روپے کم نہیں ہوتے۔ اس سے اپنا کام دھندا چلا سکتا ہے' دوسرا دیاہ کر سکتا ہے۔ ساتھ ہی میں تجھے یہ بھی بتا دوں۔ پچھلے دنوں تیرا زمیں دار میاں داد مویشیوں کا سودا کرنے حاجی صاحب کے پاس آیا تھا۔ میں بھی موجود تھا' تیرا ذکر بھی چلا۔ میاں داد تجھے زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ کہتا تھا' تو نے زمین کا ناس مار دیا۔ کھیتی باڑی میں دلچسپی نہیں لیتا۔ زمین بالکل بنجر پڑتی جا رہی ہے۔ وہ اس پر باغ لگانا چاہتا ہے۔ یہ بات اس نے میرے سامنے حاجی صاحب سے کہی تھی۔ ذرا یہ تو سوچ' زمین ہاتھ سے نکل گئی تو کیا ہوگا۔ بھوکا مرے گا یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جرائم پیشہ اور مویشی چور بن جائے گا۔" مولوی فضل احمد نے شفقت کا اظہار کرتے ہوئے اسے رضا مند کرنے کی کوشش کی۔ "میں نہیں چاہتا' تو چور اُچکا بن جائے۔ یہ تباہی کا رستہ ہے۔ عذاب الٰہی سے ڈر۔ ایسے رستے پر نہ چل۔ میرا کہا مان' ہزار روپے لے لے اور راجو کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔ بول کیا کہتا ہے؟"

"کہنا کیا ہے جی۔" نوردین نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "کچھ سمجھ نہیں آتی۔"

"ایسی جلدی نہیں۔ گھر جا کر آرام سے سوچ لے۔ فیر مجھے آ کر جواب دے' پر زیادہ دیر نہ لگانا' ورنہ ہزار روپے بھی نہیں ملیں گے اور راجو تو تجھے مل ہی نہیں سکتی۔"

نوردین منہ لٹکائے چپ بیٹھا رہا۔

رحیم داد دالان میں داخل ہوا۔ وہ سر پر پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ آنکھوں پر سیاہ فریم کا چشمہ تھا۔ نئی قمیص اور شلوار چراغ کی روشنی میں جھلک رہی تھی۔

مولوی فضل نے اس کی یہ سج دھج دیکھی تو مسکرا کر بولا۔ ”چوہدری! اس لباس میں بہت بچ رہا ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا' دیکھنے میں سکول کا ہیڈ ماسٹر لگ رہا ہے۔ بھئی سچ کہہ رہا ہوں' تجھ پر بہت شان آگئی۔“

رحیم داد اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”تیری مہربانی ہے۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”میرے معاملے میں حاجی سے تو بات نہیں کی؟“

”ضرور کی تھی۔“ مولوی نے جواب دیا۔ ”پر اس کا بھی یہی خیال ہے' اس پنڈ میں تیرے بال بچوں کی طرح کا کوئی کنبہ نہیں۔ پورے موضع میں صرف ایک مہاجر کنبہ ہے۔ وہ کرنال کے ہیں اور گھر والا' بیوی بچے' سب کے سب شروع ہی سے ایک کنبے کے چلے آرہے ہیں۔ ویسے صبح حاجی صاحب سے مل لے۔ چاہے تو وہ ان کو اپنے ڈیرے پر بھی بلا لے گا۔ اپنا اطمینان کرلینا۔“

رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”نہیں ملاں جی' اب اس کی ضرورت نہیں۔ سوچتا ہوں' آج ہی چلا جاؤں۔“

”جیسی تیری مرضی' ویسے میں تو چاہتا تھا آج رات یہیں ٹھیر جاتا۔“

”مجھے جانے ہی دے۔ کل کچھ ضروری کام بھی کرنے ہیں۔“

”ایسی گل ہے تو میں تجھے نہیں روک سکتا۔“ مولوی نے کھانے کی طرف اشارہ کیا۔ ”روٹی تو کھالے۔“ اس نے نوردین کو مخاطب کیا۔ ”نورے! تو بھی روٹی کھالے۔ میں نہیں کھاؤں گا۔ شام کو رستے میں حاجی صاحب کے ساتھ کچھ کھا پی لیا تھا۔“

مولوی فضل احمد نے نوردین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”میں نے جو کچھ کہا ہے' اس پر گھر جاکر آرام سے سوچ اور تین چار روز بعد آکر بتا دے۔ ویسے میری بات مان لے گا تو خوش و خرم رہے گا۔ مجھے دل سے دعا ہی دے گا۔“

مولوی فضل کھڑا ہوگیا۔ رحیم داد اور نوردین کو مخاطب کرکے بولا۔ ”تم دونوں روٹی کھاؤ۔ میں نے اب مسجد جانا ہے۔“ وہ آگے بڑھا۔ دالان کے نکڑ پر پہنچ کر رکا۔ ”جاتا تو باہر سے دروازے کی زنجیر چڑھا دینا۔“

☆

رحیم داد نے کھانا کھسکا کر سامنے کیا اور نوردین کے ساتھ کھانے لگا۔

کھانا کھاتے ہوئے رحیم داد نے نوردین سے دریافت کیا۔ ”ملاں سے راجو کے بارے میں بات کی تھی۔“

”ہاں۔“ نوردین نے جواب دیا۔ ”پر وہ دوسرا ہی چکر چلانا چاہتا ہے۔ کہتا ہے' ہزار روپے لے لے اور کاگذ لکھ دے' راجو اب تیرے کام کی نہیں رہی۔“

رحیم داد نے کسی قدر تعجب سے کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا' حاجی نے اسے خراب کردیا۔“

”ملاں کے کہنے کا تو کچھ ایسا ہی مطلب ہے۔ پر مجھے اس کی باتوں پر اعتبار نہیں۔ راجو ایسی نہیں ہو سکتی۔“

”مان لے ملاں نے ٹھیک ہی کہا ہے' تب تو کیا کرے گا۔“

”تب بھی ساتھ لے جاؤں گا۔“ نوردین نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”رہے گی تو میری ہی گھر والی۔“

”پر ایسی گھر والی کو کیسے رکھا جاسکتا ہے جو دوسرے کے ساتھ سو چکی ہو۔“ رحیم داد نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔ ”صاف بات یہ ہے میں تو ایسی رن کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا۔“

”توں مجھے آباد کار لگتا ہے۔“ نوردین نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ”جبھی ایسی گل کر رہا ہے۔“

”یہ تو سوچ عزت آبرو بھی کچھ ہوتی ہے۔“ رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔

”ٹھیک ہے۔ پر گھر والی مرد کا بازو بھی ہوتی ہے' ایسے ہی جیسے ہالی کے لیے ہل۔ توں ٹھیرا پیسے والا اور آباد کار۔ توں جس طرح گھر والی کے بارے میں سوچتا ہے' ہم جانگلی اس طرح نہیں سوچتے۔ یہ عزت آبرو کیا ہوتی ہے' پیٹ بھر کر کھانے کو نہ ملے تو کیسی عزت' کہاں کی آبرو؟ اب کیا دیکھ' راجو تھی تو میری فصل کیسی چنگی ہوتی تھی۔ میں لاوی پر بھی نکل جاتا تھا۔ دوسروں کی فصلوں کی واڈھی کرکے کمائی کرلیتا تھا۔ راجو جب سے گئی ہے' میں نہ ٹھیک سے کھیتی باڑی کرسکا' نہ لاوی پر جاسکا۔ میرے باہر رہنے پر فصل کی دیکھ بھال کون کرتا؟“ کھیتوں کو پانی کون لگاتا۔؟ نوردین نے گہری سانس بھری۔ ”ذرا سوچ تو' راجو میرے لیے کتنی ضروری ہے۔ اس کے بنا تو میرا بازو کٹ گیا۔“

”تو بھی ٹھیک ہی کہتا ہے۔“ رحیم داد نے بحث میں الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ”یہ تو اپنی اپنی سوچ کی بات ہے۔ اب یہ بتا' ملاں کی باتیں سن کر کیا طے کیا؟“

”طے کیا کرنا ہے جی۔“ نوردین نے گردن اونچی کرلی۔ ”راجو سے تو آج رات ملنا ہی ہے۔ پچھلی

نے اسے ملوا دیا تو سمجھ لے کام بن گیا۔"

"پر اتنی دیر رہے گا کہاں؟ اگر آدھی رات کو یہاں سے اٹھ کر گیا تو مجھے ڈر ہے، ملاں کو شبہ نہ ہو جائے۔ ایسا نہ ہو، ادھر تو راجو سے ملنے نکلے، ادھر ملاں جا کر حاجی سے مخبری کر دے۔ تب تو معاملہ بہت گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"میں ایسا کروں گا، روٹی کھا کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ زمیں دار کی ماڑی کے پاس کہیں جھاڑیوں میں چھپ جاؤں گا اور آدھی رات ہونے کا انتظار کروں گا۔"

دونوں میں مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ کھانا کھا کر انھوں نے پیالے سے پانی پیا۔ نوردین کچھ دیر ٹھہر کر جانے لگا۔ رحیم داد نے اسے ٹوکا۔

"نورے! ایک بات تو بتا تا جا۔"

"پوچھ، کیا پوچھنا چاہتا ہے؟"

"میں نے اکال گڑھ جانا ہے۔ تیں نوں ملوم ہے، اکال گڑھ کدھر ہوتا ہے؟"

"کیوں نہیں ملوم۔" نوردین نے مستعدی سے جواب دیا۔ "چک ۵۵ کے رستے میں پڑتا ہے۔ ادھر کچے رستے سے چلا جا۔" اس نے مغرب کی سمت ہاتھ اٹھایا۔ "پہلے چک بیدی آئے گا فیر نظام اولیا۔ اگے نہر ہے۔ نہر کے کنارے کنارے چلا جانا۔ اگے اکال گڑھ آ جائے گا۔ یہاں سے ۹ میل سے زیادہ نہیں ہو گا۔"

"کوئی سڑک وہاں تک جاتی ہے؟"

"سب کچے رستے ہیں۔ نہر کے کنارے کا رستہ سب سے ٹھیک ہے۔"

"اب تو جا۔" رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "راجو مل جائے تو مجھے نہ بھولنا۔"

"کیسی گل کر رہا ہے چوہدری!" نوردین نے بڑے جوش سے کہا۔ "ایسا کیوں نہیں کرتا، میرے ساتھ ہی چل۔ میں نے تو چک ۵۵ جانا ہی جانا ہے۔ اکال گڑھ رستے ہی میں ہے۔ میں تجھے وہاں پہنچا دوں گا۔"

"نہیں، تو اب جا۔" رحیم داد آمادہ نہ ہوا۔ "میں جاؤں گا تو سویرے جاؤں گا اور یہ بھی طے نہیں کہ اکال گڑھ جاؤں بھی یا نہ جاؤں۔ ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔"

نوردین باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے مقتول چوہدری نورالٰہی کی قمیص اور شلوار سمیٹ کر گٹھری بنالی۔ دونوں رجسٹر اور پنسلیں، کلیم کے کاغذات کے بستے میں رکھے۔ مولوی فضل کے رجسٹر سے تین ورق پھاڑ کر علیحدہ کر لیے۔ ان پر اس نے چوہدری نورالٰہی کے جعلی دستخط بنانے کی مشق کی

تھی۔ وہ اٹھا اور تینوں ورق چراغ کی لو سے جلا کر ضائع کر دیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر چٹائی پر لیٹ یا مگر سویا نہیں۔ چپ چاپ لیٹا مولوی کا انتظار کرتا رہا۔ وہ اس سے ملے بغیر جانا نہیں چاہتا تھا۔ بہت دیر ہو گئی، مولوی نہیں آیا۔

ساڑھے گیارہ کا عمل ہو گا، مولوی فضل واپس آیا۔ آہستہ سے کھنکارا۔ "چوہدری! جاگ رہا ہے؟"

"تیرا انتظار کر رہا تھا۔" رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "تجھ سے ملے بنا کیسے جا سکتا تھا۔"

مولوی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے دیر ہو گئی۔ پنڈ کے ایک مزارع کی گھروالی پر آسیب ہے۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر چیختی ہے۔ میں اس کا آسیب اتارنے گیا تھا۔ اسی میں اتنی دیر ہو گئی۔"

رحیم داد نے کپڑوں کی گٹھری سنبھالی، کلیم کے کاغذات کا بستہ بغل میں دبایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "ملاں جی! مجھے اب جانا ہے۔ تیری بہت بہت مہربانی۔"

"نہیں بھئی؟ مہربانی کی کون سی بات ہے۔ میں چاہتا تھا، رات کو یہیں رہتا، سویرے چلا جاتا۔" اس نے رحیم داد کو روکنے کے لیے اصرار کیا۔

"پنڈ کے ساتھ ہی تو سڑک ہے۔ ابھی تو جانے کے لیے لاری بھی مل جائے گی۔" رحیم داد ٹھہرنے پر رضامند نہ ہوا۔ "اس سڑک پر تو آدھی رات کے بعد بھی لاریاں چلتی ہیں۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔

"زندگی رہی تو فیر ملاپ ہو گا۔"

مولوی فضل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد سے بغل گیر ہوا، اسے چھوڑنے بیرونی دروازے تک گیا۔

☆

ہر طرف رات کا اندھیرا پھیلا تھا۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ گاؤں کے گھروں میں کہیں کہیں روشنی جھلملا رہی تھی۔ رحیم داد، جھاڑیوں اور گڑھوں سے بچتا بچاتا کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والی ایک پگڈنڈی پر پہنچ گیا۔ مگر سڑک کی جانب نہیں گیا۔ چپ چاپ پگڈنڈی پر چلتا رہا۔ کچھ دور آگے جا کر پگڈنڈی کے ساتھ ایک جگہ زمین اس قدر پولی تھی کہ رحیم داد کا ایک پیر تھوڑا سا دھنس گیا۔ س پاس خودرو پودوں کے جھرمٹ بھی تھے۔

رحیم داد اندھیرے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے چاقو نکالا اور خاصا گہرا گڑھا کھودا، کپڑوں کی گٹھری گڑھے میں ڈالی اور زمین ہموار کردی۔

وہ آگے بڑھا اور پگڈنڈی سے گزر کر گاؤں میں داخل ہوگیا۔ گاؤں بالکل سنسان تھا۔ وہ ایک گلی میں داخل ہوا۔ گلی کے نکڑ پر گاؤں کے زمیں دار حاجی حبیب کا دو منزلہ پختہ مکان تھا۔ وہ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا اندھیرے میں آگے بڑھنے لگا۔ زمیں دار کی ماڑی کے قریب سے گزرا۔ آگے کچا راستہ تھا۔ راستے کے ارد گرد کھیت اور جھاڑیاں تھیں۔ چلتے چلتے وہ ٹھٹکا اور متجسس نظروں سے کھیت اور جھاڑیاں دیکھنے لگا۔

رحیم داد کو نوردین کی تلاش تھی۔ وہ اسے ڈھونڈنے کے لیے ادھر آیا تھا۔ اس کے ہمراہ نوراں اور بچوں سے ملنے اکال گڑھ جانا چاہتا تھا۔

مگر نوردین کہیں نظر نہیں آیا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ گاؤں کی رڑی سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد کو اپنے ارد گرد خطرہ منڈلاتا محسوس ہوا۔ اس نے رفتار تیز کردی۔

وہ جلد سے جلد گاؤں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ قریب کی جھاڑیوں سے کسی نے ہولے سے سیٹی بجائی۔ رحیم داد نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے اس طرف دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔

ذرا دیر بعد جھاڑیوں میں ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔ ایک سایہ نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھنے لگا۔ رحیم داد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر جھٹ چاقو نکال لیا۔ اسی وقت مدھم سی آواز آئی۔

”گھبرا نہیں، میں ہوں نوردین۔“

رحیم داد نے چاقو جیب میں ڈالا اور جہاں تھا وہیں رک گیا۔ نوردین نزدیک آگیا۔ رحیم داد نے سرگوشی کی۔ ”تو یہاں چھپا تھا، حاجی کی ماڑی تو ادھر ہے۔“ اس نے دو منزلہ مکان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”وہاں میں آدھی رات کے بعد جاؤں گا۔ چوہدری! تیں نوں یاد نہیں، چھلّی نے کیا کہا تھا۔“

”آدھی رات ہونے میں اب دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔“

”اب آ ہی گیا ہے تو میرے ساتھ چل۔“

”تو اکال گڑھ ہی کے رستے اپنے پنڈ جائے گا نا؟“

”ہاں، اسی رستے جاؤں گا۔ اکال گڑھ ہے تو رستے سے ذرا ہٹ کر پر میں تیرے ساتھ وہاں تک چلوں گا، فکر نہ کر۔“ نوردین نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”آ میرے ساتھ۔“ وہ آگے بڑھا۔ ”توں ماڑی سے دور کھڑا رہنا۔“

اس کے لہجے میں جوش و خروش پیدا ہوگیا۔ ”تیں نوں پتہ ہے، میرے ڈب میں بھرا ہوا پستول ہے۔ فیر ڈرتا کیوں ہے؟ مرجاؤں گا پر تجھے پھنسنے نہیں دوں گا۔“

رحیم داد خاموش رہا۔

دونوں دبے دبے قدموں ماڑی کی جانب بڑھے۔ نوردین آگے تھا۔ رحیم داد اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ دونوں اندھیرے میں چلتے ہوئے ماڑی کے بائیں جانب پہنچ گئے۔ قریب ہی شیشم کے درختوں کا جھنڈ تھا۔

چھلّی نے ٹھیک بتایا تھا۔ درختوں کے عین سامنے ماڑی کا چھوٹا دروازہ تھا۔ نوردین نے چاہا کہ رحیم داد دور ہی ٹھہر جائے، مگر وہ اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔

دونوں درختوں کے نیچے اندھیرے میں کھڑے ہوکر دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔ ماڑی پر خاموشی چھائی تھی۔ البتہ بالائی منزل کے کمرے میں روشنی تھی۔ کھڑکی کی شیشوں سے روشنی چھن چھن کر باہر بکھر رہی تھی۔

مویشیوں کا ڈھارا دوسری جانب تھا۔ وہاں کوئی رک رک کر کھانس رہا تھا۔ ہر بار جب کھانسی ابھرتی، دونوں چونک کر اس طرف دیکھتے۔ رحیم داد بہت سہما ہوا تھا۔ نوردین نے پستول نکال لیا تھا اور اسے ہاتھ میں دبائے چوکس کھڑا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی مگر ماڑی کا دروازہ نہیں کھلا۔

رحیم داد نے اکتا کر کہا۔ ”مجھے تو راجو آتی معلوم نہیں ہوتی۔“

مگر نوردین مایوس نہیں ہوا۔ ”اسے آنا تو چاہیئے۔ چھلّی نے پکا وعدہ کیا تھا۔“ اسی وقت دروازہ آہستہ سے کھلا۔ نوردین نے مسکرا کر رحیم داد سے کہا۔

”دیکھ، میں غلط تو نہیں کہہ رہا تھا۔“

دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا، لیکن کوئی باہر نہیں آیا۔ دونوں آنکھیں پھاڑے بے چینی سے ادھر دیکھتے رہے۔ ذرا دیر بعد کوئی باہر آیا۔ کھڑکی کے شیشوں سے پھوٹتی ہوئی دھیمی دھیمی روشنی میں نوردین نے اسے پہچان لیا، آہستہ سے بولا۔ ”راجو ہے، ہاں وہی ہے۔“ اس کی آواز میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی۔

رحیم داد نے راجو کی جانب دیکھا۔ وہ چھریرے بدن کی نوجوان عورت تھی۔ اس کے عقب میں پھلّی بھی تھی۔ دونوں خوف زدہ نظروں سے دائیں بائیں دیکھتی ہوئی آگے بڑھیں اور جھپاک سے درختوں کے نیچے آگئیں۔ نوردین آگے بڑھا' اس نے بے قرار ہو کر راجو کو سینے سے لگا لیا۔ ہیجان انگیز لہجے میں بولا۔

”راجو! میں تیرا نورا ہوں۔“

راجو کچھ نہ بولی۔ اس کے سینے سے لگی کھڑی رہی۔ پھلّی نے قریب آکر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”دیکھ' میں تیری راجو کو لے آئی۔ تجھ سے جھوٹا وعدہ نہیں کیا تھا۔“

عین اس وقت اوپر کی منزل کے کمرے میں مردانہ کھنکار ابھری۔ نوردین اور رحیم داد نے پریشان ہو کر اوپر دیکھا۔ راجو ہٹ کر نوردین کے پیچھے چلی گئی مگر پھلّی اطمینان سے کھڑی رہی۔ اٹھلا کر بولی۔ ”زمیں دار جاگ رہا ہے۔“ وہ مسکرانے لگی۔

”پروا نہ کر' وڈی زمین دارنی اس کے پاس ہے۔ وہ اسے باہر نہیں آنے دے گی۔ زمیں دار نے راجو کو بلوایا تھا پر وہ خود پہنچ گئی۔“

رحیم داد نے دھیرے سے پوچھا۔ ”اسے پتہ ہے' راجو یہاں ہے؟“

”بالکل پتہ ہے۔ تیرے کہنے پر میں نے ڈرتے ڈرتے چھوٹی زمیں دارنی سے بات کی۔ وہ بھی مجھ سے اپنے من کی ہر بات بتاتی ہے۔ پہلے تو وہ ڈری' میں نے اسے رجھانا شروع کیا۔ منت بھی کی۔ وہ تیار ہو گئی۔ وڈی کے پاس گئی۔ دونوں بند کمرے میں دیر تک مسکوٹ کرتی رہیں۔ فیر چھوٹی نے مجھے کہا۔ نورے اپنی گھر والی کو لے جانا چاہے تو خوشی سے لے جائے۔“ پھلّی نے شوخی سے نوردین کو دیکھا۔

”بول کیا کہتا ہے؟“

”تو نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔“ نوردین نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ ”پھلّی! تو اتنی سوہنی ہے' جی کرتا ہے راجو کے ساتھ تجھے بھی اپنے ساتھ لے جاؤں۔“

”میں کیوں تیرے ساتھ جانے لگی۔“ وہ منہ بگاڑ کر تیکھے لہجے میں بولی۔ ”میرا گھر والا نہیں ہے؟“ اس نے راجو کو مخاطب کیا۔

”سن رہی راجو! ابھی سے یہ بڑھکیں مارنے لگا۔“

راجو خاموش کھڑی رہی۔ وہ بہت سہمی ہوئی نظر آرہی تھی۔ رحیم داد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس دس کے دو نوٹ نکالے اور پھلّی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔ ”لے' یہ رکھ لے۔ گھر والے

کو نہ بتانا' پنڑی بنوا کر گلے میں پہننا' سوہنی لگے گی۔“

پھلی نے دونوں نوٹ لے کر اپنے گھگھرے کے نیفے میں اڑس لیے۔ رحیم داد نے نوردین سے کہا۔ ”چلنا ہے تو فٹافٹ نکل چل' کب تک یہاں کھڑا رہے گا؟ حاجی جاگ رہا ہے۔ آگیا تو سمجھ لے' سارا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔“

”نہیں' وہ نہیں آسکتا۔“ پھلّی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”وڈی زمیں دارنی اس کے پاس ہے اور چھوٹی دروازے پر کھڑی چوکی داری کر رہی ہے۔ دونوں نے پہلے ہی سے مسکوٹ کر رکھی ہے۔“

”نہیں جی' اب چلنا چاہیے۔ پھلّی! تیری بہت بہت مہربانی۔“ نورے نے گردن موڑ کر راجو کو دیکھا۔ ”چل راجو!“

تینوں آگے بڑھے۔ نوردین راجو کا ہاتھ تھام کر آگے آگے چل رہا تھا۔ رحیم داد دونوں کے پیچھے تھا۔ پھلّی درختوں کے پیچھے اندھیرے میں چپ چاپ کھڑی انھیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

تینوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دور ہوتے گئے۔ جب وہ ایک موڑ پر پہنچ کر مڑنے لگے تو رحیم داد نے گردن پیچھے کر کے دیکھا' شیشم کے درختوں کے نیچے دھندلی روشنی میں اسے پھلّی نظر نہیں آئی۔ وہ پہلے ہی جا چکی تھی۔ کچھ دور جا کر تینوں کچے راستے پر آگئے۔ راستے کے دونوں جانب تیار فصلیں کھڑی تھیں۔

انھوں نے رفتار تیز کر دی۔ وہ جلد سے جلد گاؤں کی حدود سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔ نوردین پستول ہاتھ میں سنبھالے ہوئے تھا اور چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا جا رہا تھا۔

انھوں نے فرلانگ بھر سے زیادہ راستہ طے کیا ہو گا کہ رات کے سناٹے میں ٹاپیں سنائی دیں۔ آواز سامنے ہی سے آرہی تھی۔

تینوں خوف زدہ ہو گئے۔ گھوڑے کے دوڑنے کی آواز کے ساتھ ساتھ ہنہناہٹ بھی اب قریب آتی جا رہی تھی۔ نوردین نے راجو کو ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور قریب کے ایک کھیت میں گھستے ہوئے رحیم داد سے بولا۔

”چوہدری! اتھے آجا۔“

رحیم داد بھی ان کے ساتھ کھیت میں گھس گیا۔ مگر وہ زیادہ اندر نہ جا سکا۔ دیکھتے دیکھتے کوئی گھوڑا دوڑتا ہوا ان کے سامنے سے گزرا اور اپنے پیچھے گرد کے بادل چھوڑ گیا۔ راجو نے اسے پہچان لیا۔ جب وہ آگے نکل گیا تو اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

“ہائے یہ تو کمال تھا۔”

نور دین نے پوچھا۔ “کون کمال؟”

“حاجی کا وڈا پتر۔” راجو نے جواب دیا۔ “چک بیدی سے آرہا ہوگا۔ وہاں جاکر جوا کھیلتا ہے، شراب پیتا ہے۔ روز رات کو دیر سے آتا ہے۔ کبھی کبھی تو سویرا ہوجاتا ہے۔”

“حاجی کچھ نہیں کہتا؟”

“کیوں نہیں کہتا؟ نراض بھی ہوتا ہے، پر وہ اس کی کب پروا کرتا ہے۔ اب وہ ماڑی میں جائے گا تو جاگ ہوگی۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔”

رحیم داد پودوں میں پھنسا بیٹھا تھا۔ ایک پودے کا ڈنٹھل ٹوٹ کر اس کی کمر میں اڑا ہوا تھا۔ وہ بے چین ہوکر بولا۔ “اب باہر تو نکل، ساری باتیں یہیں بیٹھ کر کرے گا۔” یہ کہتا ہوا وہ کھیت سے باہر نکلا۔

نور دین اور راجو بھی کھیت سے باہر آگئے۔ تینوں خاموش تھے۔ اب انھوں نے اپنی رفتار بھی تیز کردی تھی۔ راجو بہت ڈری ہوئی تھی۔ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتی جاتی۔ مگر عقب سے کوئی آہٹ نہیں ابھری۔

وہ کھیتوں سے نکل کر دور آگئے۔ آگے میدان تھا۔ زمین کھڈّل تھی، جگہ جگہ گڑھے تھے۔ ان میں چوہوں کے بل بھی تھے۔ ایک موٹا چوہا راجو کے پیر کے نیچے آگیا۔ وہ ننگے پیر تھی۔ چوہے سے ڈر کر اس کی چیخ نکلی۔ نور دین نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ڈپٹ کر بولا۔

“چپ کر۔ ایسے ڈرے گی تو کیسے کام چلے گا۔”

اسی وقت رحیم داد کا پیر ایک گڑھے میں پڑا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ بیزار ہوکر بولا۔ “یار، تو نے اندھیارے میں یہ کھڈّل کا رستہ کیوں پکڑا؟”

“چوہدری! یہ چھوٹا رستہ ہے۔ اگے ٹھیک ٹھاک رستہ مل جائے گا۔ اس کے کنارے گھنے پیڑ ہیں۔ ذرا سنبھل کے چل، زیادہ وڈا کھڈّل نہیں ہے۔”

واقعی میدان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ تینوں گڑھوں سے بچتے بچاتے میدان عبور کرکے ایک پٹی پر آگئے۔ یہ خاصا کشادہ تھا۔ کچھ ہی دور آگے جاکر آم کے درختوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ رات سنسان تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

تینوں چپ چاپ چلتے رہے۔ انھوں نے دو ڈھائی میل فاصلہ طے کرلیا۔ وہ اب دیدار پور سے بہت دور آگئے تھے۔

رحیم داد نے نور دین سے پوچھا۔ “کیا راجو کو بھی اپنے ساتھ چک ۵۵ لے جائے گا؟”

“کیوں نہیں لے جاؤں گا۔” نور دین نے جھٹ کہا۔ “اسے لایا کس لیے ہوں۔” رحیم داد چپ رہا۔ نور دین نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دریافت کیا۔

“چوہدری! ایسی بات کیوں کہہ رہا ہے؟”

“میں اس لیے کہہ رہا ہوں، میاں داد فیر راجو کو اٹھوا لے گا اور حاجی کے پاس بھجوا دے گا۔” رحیم داد نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ “وہ حاجی کو نراض نہیں کرسکتا۔ دونوں رسا گیر ہیں اور اس دھندے میں ایک دوسرے کے شریک دار ہیں۔ یہ بات تو بھی جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے حاجی کے مکابلے میں میاں داد کے سامنے تیری کوئی حیثیت نہیں۔ تو اس کا مزارع ہی تو ہے۔”

“یہ بات تو ہے پر اب وہ کیا کرسکتا ہے؟”

“وہ یہ کرسکتا ہے، راجو کو اپنے کرندوں سے اٹھوا کر حاجی حبیب کے پاس دیدار پور پہنچا دے گا۔” رحیم داد نے اس کی سادہ لوحی پر جل کر کہا۔ “تجھے زمین سے بے دخل کرکے بھولا کے کتل یا مویشیوں کی چوری کے الزام میں پکڑوا دے گا۔”

“کہتا تو یہ ٹھیک ہے۔” راجو بیچ میں بول پڑی۔ اس نے رحیم داد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ “یہ بھی ڈنگر چوری کرتا ہے؟”

“تیرا مگز تو نہیں چل گیا۔” نور دین نے اسے ڈانٹا۔ “چوہدری سے میرا آج ہی میل ملاپ ہوا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو پھلّی یہ کام کبھی نہ کرسکتی۔ چوہدری نے پورے دس روپے اسے دیے تب وہ تیار ہوئی۔ میری تو اس نے بات ہی نہیں مانی تھی۔ یہ نہ ہوتا تو تو مجھے کیسے ملتی۔” اس نے مڑ کر راجو کی جانب دیکھا۔

“۲۰ روپے تو چوہدری نے تیرے سامنے ہی پھلّی کو انعام کے دیے۔”

رحیم داد نے کسر نفسی سے کام لیا۔ “میں نے کیا کیا جی، سب اوپر والے کی مرضی تھی۔” اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔ “نورے! تیری گھر والی تو مل گئی، اب آگے کی سوچ۔”

“سمجھ نہیں آتی۔ بتا، اب کیا کروں؟”

رحیم داد ذرا دیر سر جھکائے سوچتا رہا پھر بولا۔ “میں تو یہ کہتا ہوں، اسے اپنے یا اس کے کسی ٹریکے کے گھر چھوڑ دے۔ اکیلا اپنے پنڈ چلا جا۔ میاں داد اگر راجو کے بارے میں پوچھے تو صاف انکار کردینا۔ مگر راجو کے حاجی کی ماڑی سے غائب ہونے کی اطلاع چک ۵۵ پہنچنے سے پہلے پہلے تجھے وہاں پہنچ جانا چاہیے۔ کسی کو شبہ ہی نہ ہوگا۔” وہ لمحے بھر خاموش رہا۔ “ادھر کوئی ایسا پنڈ ہے جہاں

تو راجو کو چھوڑ دے؟"

"آگے تو چک بیدی ہے اور اس سے آگے نظام اولیا۔" راجو نے کہا۔ "وہاں میرا کوئی شریکا یا سگا نہیں‘ نورے کا بھی نہیں۔" وہ خاموش ہو گئی اور گردن جھکا کر سوچنے لگی۔ نوردین بھی سوچ میں غرق تھا۔ ذرا دیر بعد راجو گردن ہلا کر بولی۔

"ہاں کرتارپور میں میری ایک مسیر ویاہی ہے۔ میری سگی ماسی کی دھی ہے۔ ایک بار میں اس کے پاس گئی بھی تھی۔ اس کا گھر والا منصور بہت نیک بندہ ہے۔" اس نے نوردین کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔

"نورے! وہیں چلا چل۔ منصور کو جانتا ہے۔ فصل کی داڑھی پر کئی بار اس کے پاس جا چکا ہے۔ مجھے بھی اس کے پاس لے کر گیا تھا۔ یاد ہے‘ کیسے پیار سے دونوں ملے تھے۔"

"تب تو کرتارپور ہی ٹھیک رہے گا۔" رحیم داد گردن اٹھا کر آسمان دیکھنے لگا۔ "اب تو رات تھوڑی رہ گئی ہے۔ تو سویرا ہونے تک چک ۵۵ پہنچ جائے گا؟"

"مشکل ہے۔ دن نکلنے کے بعد ہی پہنچ سکوں گا۔ اب تو دو بج رہا ہو گا۔ یوں سمجھ لے جتنی دور یہاں سے کرتارپور ہے‘ اس سے کچھ دوری پر میرا پنڈ ہے۔ کرتارپور پہنچتے پہنچتے سویرے کی گیڑ پھیلنے لگے گی۔"

راجو نے کہا۔ "ذرا دم لے کر پنڈ روانہ ہو جانا۔"

رحیم داد نے راجو سے اتفاق نہیں کیا۔ "نہیں‘ اس کا دن میں جانا ٹھیک نہیں۔ ویسے نوردین تو سوچ لے۔"

"نہیں جی‘ دن ہی میں چلا جاؤں گا۔ تب تک حاجی بھی میاں داد کو خبر نہیں بھجوا سکے گا۔ حاجی کسی کو بھیجے گا بھی تو وہ شام ہونے سے پہلے نہیں پہنچ سکے گا۔"

"بات تو تیری بھی ٹھیک ہے۔" رحیم داد نے تائید کی۔ "تو فیر یہی پروگرام بنا۔ یہاں سے سیدھے کرتارپور چلتے ہیں۔"

نوردین اور راجو پہلے ہی تیار تھے۔ تینوں آگے بڑھے۔ کچھ ہی دور چلے تھے کہ چک بیدی نظر آیا۔ مکانوں میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ وہ ادھر نہیں گئے اور پگڈنڈیوں اور بیہوں سے گزرتے ہوئے دور ہی سے نکل گئے۔ مویشی چوری کا دھندا کرنے کے باعث نوردین کو اس علاقے کی ہر بستی اور راستے کا بخوبی علم تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں ان راستوں سے بارہا گزرا تھا۔ لہٰذا اسے راستہ تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔

تینوں نظام اولیاء کی بستی کے قریب پہنچ گئے۔ نظام اولیاء سے نکلتے ہی نہر آ گئی۔ وہ نہر کے کنارے کنارے چلتے رہے۔

رات ڈھل رہی تھی۔ راستے سنسان تھے۔ میل سوا میل راستہ طے کرنے کے بعد ایک پلیا آ گئی۔ تینوں پلیا سے گزر کر نہر کے اس پار چلے گئے۔ مگر نہر کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ چلتے چلتے نوردین نے رحیم داد سے پوچھا۔

"چوہدری! توں کرتا کیا ہے اور رہتا کہاں ہے؟"

"کیا کرے گا جان کر۔" رحیم داد نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "یوں سمجھ لے‘ نہ اپنا کوئی ٹھکانا ہے‘ نہ کوئی اپنا ہے۔"

نوردین نے پریشان ہو کر کہا۔ "تیری گل بات سمجھ نہیں آئی۔"

"سمجھ آ بھی نہیں سکتی۔ میں نے تجھے بتایا تھا میں گورداس پور کا مہاجر ہوں۔"

"کیا ہوا تھا تیرے ساتھ؟"

"یہ پوچھ‘ کیا نہیں ہوا۔" اس نے نوردین کو وہی باتیں بتائیں جو مولوی فضل احمد سے کل صبح بیان کی تھیں اور اس کی ہمدردی حاصل کی تھی۔

نوردین بھی اس کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوا۔ "توں اتنا دکھی ہے یہ میں نوں پتہ نہیں تھا۔ کیا تو اکال گڑھ بھی اپنے بال بچوں کی تلاش میں جا رہا ہے؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے صاف انکار کر دیا۔ "ادھر اپنا ایک پرانا ملنے والا ہے‘ اس کے پاس جا رہا ہوں۔"

راجو نے کہا۔ "اٹھ برس سے اوپر ہو گئے‘ توں نے اب تک اپنا گھر بھی نہیں بسایا۔ اس طرح کب تک کام چلے گا؟"

"بس جیسے چل رہا ہے‘ ایسے ہی چلتا رہے گا۔ میں اپنی گھر والی اور بچوں کو نہیں بھول سکتا۔"

"چوہدری توں ٹھیک کہہ رہا ہے۔" نوردین نے اس کی نائید کی۔ "بچہ تو اپنا کوئی ہے نہیں پر گھر والی کو بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔" اس نے مسکرا کر راجو کا چہرہ دیکھا۔ "جب تک تو نہیں ملی تھی‘ میں تیرے لیے پاگل رہتا تھا۔ پر تیں نوں کیہہ پتہ؟"

راجو شرما کر خاموش ہو گئی۔ رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "ہاں جی‘ جس پر بیتتی ہے‘ وہی جانتا ہے۔ میں کسی کو اپنا دکھ کیسے بتاؤں۔ برسوں ہو گئے اس آگ میں جلتے ہوئے پر اب تک

ٹھنڈی نہیں پڑی۔"

نوردین اور راجو چپ رہے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ رحیم داد سے کس طرح اظہار ہمدردی کریں۔ رحیم داد بھی خاموش ہو گیا۔

۱۵

کرتارپور بڑا موضع تھا۔ اس میں کئی پختہ مکانات تھے اور دو منزلہ بھی تھے۔ چھوٹا سا بازار بھی تھا مگر رات کے پچھلے پہر ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ تینوں سنسان گلیوں اور راستوں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھے۔ کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ قریب کی گلی سے ایک شخص نکلا اور بالکل ان کے سامنے آگیا۔ اس نے راجو کو ایسی نظروں سے گھورا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

راجو کے چہرے پر خوف کا سایہ پھیل گیا' گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "نورے! یہ زمین دار کا کرندہ فیدو لگتا ہے۔ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ ابھی جا کر حاجی سے مکبری کرے گا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

نوردین نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو اندھیرا ہے۔ اس نے تجھے کیسے پہچان لیا۔ اگر پہچان بھی لیا ہے تو پروا نہ کر' منصور کے گھر سے وہ تجھے نہیں اٹھوا سکتا۔"

تینوں آگے بڑھے۔ منصور کے مکان کے سامنے پہنچے۔ منصور کا مکان تھا تو کچا مگر کشادہ اور بڑا تھا۔ نوردین نے ہانک لگائی۔

منصور جھٹ دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ آتے ہی نوردین سے گرم جوشی کے ساتھ بغل گیر ہوا اور جیسے ہی راجو پر نظر پڑی' خوشی سے چیخ پڑا۔ "ارے! تو اسے لے آیا۔" اس نے دروازے کے اندر جھانک کر بیوی کو آواز دی۔ "ساجاں! دیکھ تو کون آیا ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"سب باہر کیوں کھڑے ہو' اندر آجاؤ۔"

تینوں گھر میں داخل ہوئے۔ راجو کی خالہ زاد بہن ساجاں بھاگتی ہوئی آئی اور راجو سے چمٹ گئی۔ "ہائے' تو آگئی۔"

راجو' ساجاں کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ ساجاں اس کا بدن ٹٹولتے ہوئے بولی۔ "کتنی دبلی ہوگئی۔" وہ خود دہرے بدن کی نوجوان عورت تھی۔ عمر میں راجو سے بڑی' رنگ کھلتا ہوا مگر ناک نقشہ کسی قدر بھدّا۔

سب آنگن میں پڑی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ منصور کے دونوں بچے بھی بیدار ہوگئے تھے اور قریب آکر حیرت سے راجو کو دیکھ رہے تھے۔ راجو بار بار دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ اب اجالا خوب پھیل گیا تھا۔

رحیم داد نے اجالے میں راجو کو غور سے دیکھا۔ اس کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ چمپئی رنگت تھی' ناک ستواں تھی' آنکھیں غزالی تھیں۔ وہ خوش شکل عورت تھی۔ ساجاں کے پہلو میں بیٹھی ہوئی وہ اور زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد منصور اٹھا۔ رحیم داد اور نوردین کو ڈیرے میں لے گیا۔ ڈیرا گھر کے برابر ہی تھا' اس میں کھلا صحن تھا۔ صحن کے دو طرف چھپر کی خیدہ چھت کا برآمدہ تھا۔ اس کے پیچھے تین کمرے اور دو کوٹھریاں تھیں۔

تینوں ایک کمرے میں چلے گئے۔ کمرے میں کھڑکی تھی اور ایک دروازہ باہر گلی میں کھلتا تھا۔ کمرے میں چارپائی بچھی تھی۔ اس پر صاف ستھرا بستر لگا تھا۔ منصور صحن میں گیا اور ایک چارپائی اور اٹھا کر کمرے میں لے آیا۔ ایک چارپائی پر رحیم داد اور نوردین بیٹھ گئے۔ دوسری پر منصور بیٹھ گیا۔

منصور نے رحیم داد کے بارے میں پوچھا۔ نوردین کی زبانی جب یہ معلوم ہوا کہ راجو کو حاجی کی قید سے رہائی دلانے میں رحیم داد نے بڑی مدد کی ہے تو منصور بہت خوش ہوا۔ نوردین اسے ایک ایک بات تفصیل سے بتاتا رہا۔

منصور دلچسپی اور انہماک سے سنتا رہا۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ اب ہلکی ہلکی دھوپ دیواروں کی بلندی پر جھلکنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر میں ساجاں پیتل کے تھال میں پراٹھے لے کر آئی۔ اس کے ساتھ کانسی کے گلاسوں میں لبالب بھری ہوئی لسی تھی۔ پراٹھوں پر مکھن کا مٹھرو تھا' تلے ہوئے انڈے اور اچار تھا۔

ساجاں نے تھال نوردین اور رحیم داد کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں ناشتا کرلو۔ رات بھر کے بھوکے اور تھکے ہوئے ہو۔" وہ منصور سے مخاطب ہوئی۔ "راجو نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ انھیں کھانے دے' اٹھ راجو کے پاس آجا۔ تیری تو اس سے کوئی گل بات ہی نہیں ہوئی۔ دیکھ تو اس کا کیا حال ہوگیا ہے۔"

منصور چپ چاپ بیوی کے ساتھ چلا گیا۔ نوردین اور رحیم داد ناشتا کرنے لگے۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی نوردین چلنے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ اس وقت تک منصور واپس آگیا تھا۔ اس نے نوردین کو روکنا چاہا۔ "نورے! تو رات بھر کا جاگا ہوا ہے' لمبا سفر بھی کیا ہے' ذرا آرام کرلے۔ دوپہر کو روٹی ٹکر کھا کر چلا جانا۔ ایسی جلدی کیا ہے؟ میری سیکل لے جا۔" مگر نوردین راضی نہیں ہوا۔

"مجھے اب جانے دے۔ سیکل دے دے تو فٹافٹ پنڈ پہنچ جاؤں گا۔"

رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔ "منصور کی سیکل لے کر نہ جا۔ میاں داد کو شبہ ہوگا' تو پیدل ہی جا۔"

"ہاں' یہ ٹھیک رہے گا۔" نوردین نے اتفاق کیا۔ "آگے تانگا بھی مل جائے گا۔ ویسے میں پیدل بھی جاسکتا ہوں۔ شام تک واپس آجاؤں گا۔"

"شام کو واپس نہ آنا۔" رحیم داد نے منع کیا۔ "کیوں خوامخواہ شبہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ تین چار روز بعد آنا جب معاملہ ذرا دب جائے۔ ابھی تو میاں داد اور حاجی' دونوں تجھ پر شبہ کریں گے۔ تیری نگرانی بھی کریں گے۔ تو دیدار پور حاجی کے پنڈ جاچکا ہے۔ رستے میں حاجی کا کرندہ فیدو ملا تھا' تجھ پر انھیں شبہ ہونا بھی چاہیے۔ راجو یہاں ہر طرح ٹھیک ہے' آرام سے بھی رہے گی۔"

"بالکل آرام سے رہے گی۔" منصور نے رحیم داد کی تائید کی۔ "چوہدری ٹھیک کہہ رہا ہے۔ جیسا کہتا ہے' ویسا ہی کر۔ فکر نہ کر' راجو یہاں ہر طرح ٹھیک ٹھاک رہے گی۔"

نوردین نے کچھ نہیں کہا۔ ڈیرے سے نکل کر اپنے گاؤں' چک ۵۵ کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی منصور بیٹھا رہا۔ مگر جلد ہی کھڑا ہوگیا۔

"چوہدری! تو ساری رات کا جاگا ہوا ہے۔ تھکا ہوا بھی بہت ہے' اب سو جا۔ تجھ سے بعد میں گپ شپ رہے گی۔ میری فصلوں کی واڈھی ہونے والی ہے۔ لاوے آئے ہوئے ہیں' ان سے واڈھی کے بارے میں بات چیت کرنی ہے۔"

رحیم داد بھی یہی چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی' تھکن سے جسم میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ منصور کی باتیں سن کر وہ خاموش رہا۔ منصور باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے آنکھوں سے

عینک اتاری۔ عینک سے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ سر میں ہلکا ہلکا درد بھی تھا۔ وہ خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی سو گیا۔

دوپہر کو منصور نے اسے بیدار کیا اور کھانا کھانے کے لیے کہا۔ مگر رحیم داد کو مطلق بھوک نہیں تھی۔ منصور نے اصرار بھی کیا، وہ کھانا کھانے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ بیدار ہونے کے بعد وہ سویا بھی نہیں۔ باتیں کرنے لگا۔

منصور کی باتوں سے جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ موروثی مزارع ہے۔ اس کے پاس تیس ایکڑ سے اوپر مزروعہ نہری زمین ہے۔ منصور کے ساتھ اس کا منجھلا بھائی خالد بھی رہتا تھا۔ دونوں مل جل کر کھیتی باڑی کرتے تھے۔

مزارع ہونے کے باوجود منصور کھاتا پیتا کسان تھا۔ اس کا ڈھارا بھی بڑا تھا۔ اس میں بیلوں کی دو جوڑیوں کے علاوہ دو بھینسیں اور ایک گائے بھی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی شاکر، کرتارپور ہی میں تھا مگر علیحدہ رہتا تھا۔ ماں زندہ تھی۔ کبھی بڑے کے پاس رہتی، کبھی چھوٹے کے پاس۔ مگر زیادہ وقت شاکر کے پاس گزرتا تھا۔

☆

رحیم داد نے باہر نکل کر گاؤں کا چکر لگایا اور ٹہلتا ہوا کرتارپور کے بازار میں چلا گیا۔ بازار سے اس نے ایک چادر، صابن اور کنگھی خریدی۔ بازار ہی میں پیپل کے ایک درخت کے نیچے موچی بیٹھا تھا۔ اس کے پاس جوتے کا ایک جوڑا تیار رکھا تھا۔ رحیم داد نے پہن کر دیکھا۔ اس کے پیروں میں بالکل فٹ تھا۔

وہ ابھی تک مقتول حکیم چشتی کے جوتے پہنے ہوئے تھا۔ جوتے تنگ تھے اور پرانے ہو کر جگہ جگہ سے پھٹنے لگے تھے۔ ویسے بھی وہ حکیم کی کوئی نشانی اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس میں سراسر خطرہ تھا۔ اس نے جوتا خرید لیا۔

خریدی ہوئی ساری اشیاء اس نے چادر میں لپیٹ لیں مگر منصور کے گھر نہیں گیا۔ نہر کی طرف چلا گیا۔ نہر گاؤں سے نصف میل کے فاصلے پر تھی۔ نہر کی جانب جاتے ہوئے اس نے پرانے جوتے گندے پانی کے ایک گڑھے میں ڈال کے نئے جوتے پہن لیے۔ اب اس کے جسم پر حکیم چشتی اور نورالٰہی کی کوئی نشانی باقی نہیں تھی۔

نہر پر پہنچ کر رحیم داد نے کپڑے اتارے اور صابن سے جسم رگڑ رگڑ کر نہانے لگا۔ گرمی اس روز کچھ بڑھ گئی تھی۔ وہ دیر تک نہر میں نہاتا رہا۔ نہا دھو کر اس نے چادر سے جسم خشک کیا۔ کپڑے پہنے اور گیلی چادر نہر کے کنارے ایک جھاڑی پر سوکھنے کے لیے پھیلا دی۔ کنگھی سے سر کے بال جمائے، ڈاڑھی اور مونچھیں سنواریں اور اس وقت تک نہر کے کنارے بیٹھا رہا جب تک گیلی چادر دھوپ میں سوکھ نہ گئی۔

وہ واپس ڈیرے میں آیا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ منصور کھیتوں پر تھا۔ راجو نے رحیم داد کو گلاس میں لسّی لا کر دی۔ وہ بھی نہا دھو کر، اجلے کپڑے پہن کر آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ بالوں میں تیل چمک رہا تھا۔ اجلے لباس اور ہلکے سنگھار میں وہ خاصی نکھر گئی تھی، زیادہ شگفتہ اور دل ربا نظر آ رہی تھی۔ وہ بھرپور جوان اور دل کش عورت تھی۔

راجو کے جانے کے بعد رحیم داد کو اپنی بیوی نوراں یاد آ گئی۔ بچے بھی یاد آئے۔ وہ بستر پر لیٹ گیا مگر نیند نہیں آئی۔ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اس نے سوچا، نوراں کو اپنے بارے میں ہر بات صاف صاف بتا دے گا۔ وہ اس پر پورا اعتماد کر سکتا تھا۔ وہ اس کی شریک حیات تھی، اس کے بچوں کی ماں تھی، ہمدرد اور غم گسار تھی۔ اس سے ٹوٹ کر محبت بھی کرتی تھی۔ رحیم داد کو کبھی بخار ہو جاتا تو وہ ساری رات اس کے سرہانے بیٹھی رہتی۔ بار بار کہنے پر بھی نہ سوتی۔ اس کا سر، کمر اور پیر دباتی، پیشانی ہولے ہولے سہلاتی، دوا پلاتی، طبیعت کا حال پوچھتی۔ اس کی محبت اور شیفتگی ایک ایک انداز اور ہر رویّے سے صاف جھلکتی تھی۔

رحیم داد نے بستر پر لیٹے لیٹے طے کیا کہ نوراں اور بچوں کو لے کر سندھ چلا جائے گا۔ لالی کی دی ہوئی تین ہزار سے زیادہ رقم اس کے پاس تھی۔ اس رقم سے وہ رشوت دے کر مرحوم چوہدری نورالٰہی کے کلیم کی بنیاد پر خاصی بڑی اور عمدہ زمین الاٹ کرا سکتا تھا۔ گورداس پور کا مہاجر چوہدری نورالٰہی بن کر خوشحال زندگی بسر کر سکتا تھا۔ نوراں سخت محنتی اور سلیقہ مند تھی۔ دونوں مل کر زندگی کا نیا سفر شروع کر سکتے تھے۔ اپنا اجڑا ہوا گھر ایک بار پھر آباد کر سکتے تھے۔

رحیم داد سوچتے سوچتے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے سر پر پگڑی باندھی، عینک لگائی، جوتے پہنے، کلیم کے کاغذات کا بستہ حفاظت سے تکیے کے نیچے رکھا۔ کمرے سے باہر آیا اور دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔

وہ ڈیرے سے ایک بار پھر باہر نکلا اور کرتارپور کے بازار پہنچ گیا۔ اس نے سنار سے نوراں کے لیے جھمکے اور اپنی لاڈلی بیٹی زینو کے لیے چاندی کی بگتیاں خریدیں۔ کریما کے لیے بازار میں کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ چھوٹا سا قصباتی بازار تھا، چند دکانیں تھیں۔ اس نے بازار کے کئی چکر لگائے۔ حلوائی سے آدھ سیر مٹھائی خرید کر کندھے پر پڑے ہوئے پرنے کے ایک پلو میں باندھی اور واپس

آگیا۔

سورج ڈوب گیا تھا۔ شام کے سائے گاؤں کے در و دیوار پر پھیلتے جا رہے تھے۔ کمرے کے اندر بھی اندھیرا ہو گیا۔ رحیم داد بستر پر لیٹا تھا۔ منصور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ البتہ راجو کمرے میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اس نے لالٹین طاق میں رکھی اور ماچس جلا کر اسے روشن کرنے لگی۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ راجو نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

"چوہدری! یہاں گرمی میں کیوں لیٹا ہے۔ باہر دہڑے میں منجی پر جا کر بیٹھ جا۔ میں تیرے لیے روٹی لے کر آتی ہوں۔"

راجو چلی گئی۔ رحیم داد کمرے سے نکل کر صحن میں گیا۔ منہ دھویا اور برآمدے کے سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا' رات کا پہلا پہر تھا۔ راجو کھانا لے آئی اور رحیم داد کے سامنے چارپائی پر رکھ دیا۔ وہ کمرے کے اندر گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں لالٹین لٹک رہی تھی۔

اس نے لالٹین برآمدے کے ایک کھمبے پر لگی ہوئی کیل سے لٹکا دی۔ رحیم داد لالٹین کی روشنی میں کھانا کھانے لگا۔ بھوکا بھی تھا' اس نے رغبت سے کھانا کھایا۔ راجو کچھ دیر ٹھہر کر گھر کے اندر چلی گئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر رحیم داد کمرے میں گیا۔ اس نے کنگھی سے سر کے بال جمائے' ڈاڑھی سنواری' جھمکے اور بگلیاں کاغذ کے ٹکڑے میں لپیٹ کر احتیاط سے قمیص کی اندرونی جیب میں رکھیں۔ مٹھائی پرنے سے نکال کر رومال میں باندھی۔ بغل میں کلیم کے کاغذات کا بستہ دبایا' کمرے سے نکل کر باہر سے دروازے کی کنڈی لگائی اور آہستہ آہستہ ڈیرے سے باہر جانے لگا۔

آنگن میں راجو مل گئی' اس نے پوچھا۔ "چوہدری! اکال گڑھ تو نہیں جا رہا؟"

رحیم داد نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ہاں' میں اکال گڑھ ہی جا رہا ہوں۔"

"کب تک لوٹے گا؟"

"کچھ پتہ نہیں۔ جس سے ملنے جا رہا ہوں' مل گیا تو دیر سے واپسی ہو گی۔ تو منصور کو بتا دینا۔"

راجو خاموش رہی۔ رحیم داد ڈیرے سے باہر چلا گیا۔ گاؤں کی گلیوں سے نکل کر کھیتوں کے درمیان سے گزرتا ہوا نہر کی جانب چل دیا۔

اندھیرا رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ نہر پر پہنچا تو ہر طرف سناٹا پھیل چکا تھا۔ اس نے پلیا عبور کی اور نہر کے اس پار پہنچ گیا۔ کچھ دور تک نہر کے کنارے کنارے چلتا رہا پھر کچا را

خاصا کشادہ تھا۔ بیل گاڑیوں اور ریڑھوں کے پہیوں نے راستے میں جگہ جگہ گڑھے ڈال دیے تھے۔

وہ چپ چاپ کچے راستے پر چلنے لگا۔ آگے بڑھا تو سامنے سے ایک سائیکل سوار آتا نظر آیا۔ رحیم داد نے اسے روک کر اکال گڑھ کا راستہ پوچھا۔ وہ وہیں سے آ رہا تھا' کہنے لگا۔ "یہ سدھا رستہ اکال گڑھ ہی جاتا ہے۔"

رحیم داد نے اکال گڑھ کے پرائمری اسکول کا پتہ دریافت کیا۔ اس نے وہ بھی بتا دیا۔ دونوں میں مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ سائیکل سوار نے پیڈل پر پیر مارا اور آگے بڑھ گیا۔ دیکھتے دیکھتے دور نکل گیا۔

☆

راستہ سنسان تھا۔ دونوں طرف کھیت تھے۔ کہیں فصلیں تیار کھڑی تھیں' کہیں کٹ چکی تھیں۔ جگہ جگہ درختوں کے جھنڈ تھے۔ رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ نوراں اور بچوں کے بارے میں سوچتا رہا اور یادوں کی دھندلی پگڈنڈیوں پر بھٹکتا رہا۔ بیتے دنوں کے خوشگوار لمحات' جو اس نے نوراں اور بچوں کے ساتھ گزارے تھے' روشن چراغوں کی طرح نظروں میں جھلملاتے رہے۔ وہ جتنا آگے بڑھتا گیا بیوی بچوں سے ملنے کا شوق ہیجان انگیز ہوتا گیا۔

رحیم داد اکال گڑھ میں داخل ہوا۔ بستی کی رونق اجڑ چکی تھی۔ گلی کوچے سنسان تھے۔ کہیں کہیں گھروں سے باتیں کرنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ایک گلی سے نکل کر وہ کھلی جگہ پہنچا تو دھندلی روشنی میں کچھ فاصلے پر اسے ایک راہ گیر نظر آیا۔

رحیم داد ٹھٹکا۔ اُسے شبہ ہوا کہ وہ اس کا پرانا یار جمال دین ہے۔ رحیم داد نہ تو اس سے ملنا چاہتا تھا' نہ قطعی طور پر فیصلہ کر سکا کہ وہ کون ہے؟ ویسے جمال دین کے وہاں ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اسے تو احمد کوٹ میں ہونا چاہئے تھا۔

راہ گیر اندھیرے میں اوجھل ہو گیا۔ رحیم داد چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا اسکول کی جانب بڑھا۔ اکال گڑھ بھی بڑا موضع تھا۔ اس میں کئی گاؤں شامل تھے۔ کرتارپور سے بھی زیادہ بڑا تھا۔ آبادی بھی زیادہ تھی۔ پختہ مکانات بھی تعداد میں زیادہ تھے۔ رحیم داد گلی کوچوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ وہ اسکول کی عمارت کے قریب پہنچ گیا۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔ مگر اسکول کا چوکیدار جاگ رہا تھا۔ سامنے کھلا میدان تھا۔ چوکیدار اسکول کی عمارت کے باہر چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ وہ ادھیڑ اور دبلا پتلا تھا۔ بار

بار کھانستا اور کھنکار کر اونچی آواز سے بلغم تھوکتا۔

رحیم داد اس کے قریب پہنچا۔ اس نے چونک کر پوچھا۔ "کون ہے؟" وہ نظریں اٹھا کر رحیم داد کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

رحیم داد نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ "میرا نام چوہدری نور الٰہی ہے۔"

"اتنی رات گئے ادھر کیسے آنا ہوا؟"

رحیم داد ایسے سوالوں کے جواب کے لیے خود کو پہلے ہی سے تیار کر چکا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "چاچا! تجھ سے یہ پوچھنا تھا' تیرے سکول میں چن واٹ کے سکول ماسٹر عبدالشکور کا تبادلہ ہونے والا تھا' وہ آگیا کہ نہیں؟ اگر آگیا تو اس کا مکان کون سا ہے؟"

رحیم داد کی بات سن کر چوکیدار سوچ میں پڑ گیا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔ "نہیں جی' اس نام کا اپنے سکول میں کوئی ماسٹر نہیں اور نہ ادھر کوئی نیا ماسٹر تبدیل ہو کر آیا ہے۔ تبدیلی کا اگر حکم جاری ہو چکا ہے تو اس کا اپنے کو پتہ نہیں۔" وہ آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ ذرا قرار آیا تو اس نے بتایا۔ "اس بات کا پتہ تو ہیڈ ماسٹر ہی سے چلے گا اور وہ یہاں ہے نہیں۔ پاک پتن گیا ہے۔ دو تین روز میں واپسی ہوگی۔ ادھر اس کے کسی شریکے کے گھر میں موت ہو گئی ہے۔" وہ آہستہ آہستہ حقے کے کش لگانے لگا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا تیں نوں عبدالشکور کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔"

"ہاں جی' میں نوں کچھ پتہ نہیں۔" چوکیدار نے نرمی سے کہا۔ "کھڑا کیوں ہے' بیٹھ جا۔ لگتا ہے' دور سے چل کر آیا ہے۔"

رحیم داد اس کے برابر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چوکیدار نے حقہ رحیم داد کی جانب بڑھا دیا۔ حقہ لے کر رحیم داد کش لگانے لگا۔ مگر اسے حقے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے چند کش لگانے کے بعد حقہ چوکیدار کو واپس دے دیا۔

رحیم داد نے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ چوکیدار باتوں میں لگ گیا۔ وہ حقہ گڑگڑاتا رہا اور رک رک کر بولتا رہا۔

رحیم داد اپنے بڑے بیٹے کریما کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا تاکہ اس مکان کا سراغ مل جائے جس میں نوراں بچوں کے ساتھ مقیم تھی۔ مگر یہ پوچھتے ہوئے وہ جھجک رہا تھا۔ اسی اثنا میں ایک عورت' باہر آئی' چوکیدار نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"جیراں! تو ابھی تک جاگ رہی ہے؟"

"تیں نوں تو کچھ پتہ نہیں۔ بیٹھا حقہ پیتا رہتا ہے یا کھانستا رہتا ہے۔" وہ کڑوے لہجے میں بولی۔ "میں ابھی کیسے سو سکتی ہوں۔ حیدر کے ہاتھ میں درد ہے۔ ہائے ہائے کر رہا ہے۔ اس پر تیل مل رہی تھی۔"

چوکیدار نے بیوی سے پوچھا۔ "کیا ہوا حیدر کو؟ اس کے ہاتھ میں درد کیوں ہے؟"

"کریمے نے آج فیر اسے مارا ہے۔ ایسا ہاتھ مروڑا اب تک درد کر رہا ہے۔" اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ غصے سے بولی۔ "میں نے کریمے کی ماں سے آج صاف صاف کہہ دیا' سنبھال کر رکھ اسے۔ اب جو اس نے میرے پت کو مارا تو اس کا ہاتھ پتھر پر رکھ کر توڑ دوں گی۔"

کریمے کا نام سن کر رحیم داد چونکا۔ اسے یقین ہو گیا کہ رجب نائی نے غلط اطلاع نہیں دی۔ مگر وہ بالکل خاموش رہا۔

چوکیدار نے بیوی کو نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔ "جیراں! تیں نوں ایسی گل نہیں نکالنی چاہیے۔ یہ چھوہرے تو لڑتے جھگڑتے ہی رہتے ہیں۔ ساتھ کھیلیں گے تو آپس میں لڑائی جھگڑا بھی کریں گے۔"

جیراں بگڑ کر بولی۔ "تو کچھ ہی کہہ' میں اب نہیں ماننے کی۔ دیکھ لینا' اس کا ہاتھ نہ توڑ دیا تو میرا ناں جیراں نہیں۔"

چوکیدار نے ایک بار پھر نرمی سے بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "اللہ سے ڈر جیراں! یہ تو سوچ کریما بن پیو کا بچہ ہے۔ یتیم مسکین ہے۔"

رحیم داد تڑپ کر بیچ میں بول پڑا۔ "کہاں رہتا ہے کریما؟"

"سکول کے برابر والی گلی میں جاؤ تو پچھواڑے سجے ہتھ کو تیسرا مکان ہے۔" چوکیدار نے بتایا۔ "پر اس کا پتہ کیوں پوچھ رہا ہے۔ اسے جانتا ہے؟"

"نہیں جی! میں اسے نہیں جانتا۔" رحیم داد صاف مکر گیا۔ "میں نے تو یوں ہی پوچھ لیا۔ تیرے تو پڑوس کا چھوہرا ہے۔ پڑھتا بھی تیرے سکول ہی میں ہوگا؟"

"ناجی نا' وہ سکول شکول میں نہیں پڑھتا۔" جیراں نے منہ بگاڑ کر حقارت سے کہا۔ "وہ تو دن بھر شور شرابا کرتا ہے۔ لڑائی جھگڑے کرتا ہے۔ اسے اور کام ہی کیا ہے۔"

چوکیدار نے مسکرا کر کہا۔ "اب تو جا کر سو' رات بہت ہو گئی۔ تیں نوں سویرے پوہ پھٹا لے اٹھنا ہوتا ہے۔"

جیراں نے ایک بار پھر منہ بگاڑا۔ شوہر کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور بڑبڑاتی ہوئی گھر کے اندر

چلی گئی۔

رحیم داد نے کریما کے بارے میں مزید کچھ نہیں پوچھا اور نہ چوکیدار نے اس کا ذکر چھیڑا۔ رحیم داد نے ہیڈ ماسٹر اور اسکول کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ چوکیدار بہت باتونی تھا اور اسے نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ وہ اطمینان سے باتیں کرتا رہا اور حقہ گڑگڑاتا رہا۔ رحیم داد مزید رات گزر جانے کا انتظار کرتا رہا۔

رات اور کالی ہو گئی۔ گاؤں کا سناٹا زیادہ گہرا ہو گیا۔ چوکیدار جماہیاں لینے لگا۔ اسے اب نیند آرہی تھی۔ رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ بوڑھے سے رخصت ہوا اور اندھیرے میں ایک طرف چل دیا۔

میدان سے گزر کر وہ اس گلی میں چلا گیا جو اسکول کے پچھواڑے تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا عین اس جگہ پہنچ گیا جہاں اسکول کے برابر سے گزرنے والی گلی ملتی تھی۔ وہ لحہ بھر کے لیے ٹھٹکا، پھر آہستہ آہستہ تیسرے مکان پر پہنچا۔ خاصی ویران جگہ تھی۔ مکان بھی کم تھے، کچے اور چھوٹے تھے۔

☆

رحیم داد دروازے کے عین سامنے کھڑا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل سے دروازے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے دھکا دیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ چند لمحے گم صم کھڑا رہا۔ اس نے دروازہ آہستہ آہستہ کھٹکھٹایا اور بے قراری سے کنڈی کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

اس نے سوچا کہ دروازے کا ایک پٹ دھیرے سے چرچراتا ہوا کھلے گا۔ اس کی آڑ سے نوراں کا خوبصورت چہرہ نمودار ہو گا۔ وہ نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھے گی۔ "کون ہے؟" وہ جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دے گا۔ اسے چمٹا کر ہولے سے پیار کرے گا۔ اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر سرگوشی کرے گا۔ نوراں! میں ہوں تیرا رحیمے۔ اور جھپاک سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر گھر کے اندر چلا جائے گا۔

مگر اندر سے نہ کوئی آواز ابھری، نہ دروازہ کھلا۔

رحیم داد بے چینی کے عالم میں کھڑا رہا۔ وہ اس ڈر سے دروازہ زور زور سے کھٹکھٹانا نہیں چاہتا تھا مبادا پڑوسیوں کی آنکھ کھل جائے۔ وہ خاموشی سے گھر میں داخل ہونا چاہتا تھا تاکہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، وہ نوراں سے تنہائی میں ملے اور اسے اپنے بارے میں ساری باتیں بتا دے۔ پھر دونوں سر جوڑ کر بیٹھتے اور آئندہ کا منصوبہ بناتے۔

اس نے دروازے پر مزید دستک دینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ گھر کے برابر گلی تھی وہ گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی تنگ تھی، اندھیرا بھی زیادہ تھا۔ اس طرف گھر کا آنگن تھا۔ دیواریں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔

رحیم داد کو جیل میں لالی دیوار پھاندنے اور دیوار پر چڑھنے کے گر بتا چکا تھا۔ جیل سے فرار ہونے سے پہلے تو وہ ہر روز ایسے ہی ہتھکنڈے اور گر بتاتا تھا۔ اس نے لالی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اچھل کر دیوار کا بالائی حصہ پکڑنے اور اسے پکڑ کر اوپر چڑھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

اس کی دونوں ہتھیلیاں دیوار کی رگڑ سے چھل گئیں۔ وہ گھپ اندھیرے میں کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر آگے بڑھا۔

گھر کے آنگن میں شیشم کا درخت تھا۔ درخت کی ایک ڈال دیوار چھوتی ہوئی گلی میں نکل آئی تھی۔ ڈال مضبوط اور خاصی نیچی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گلی کے بچوں نے لٹک لٹک کر اسے نیچے جھکا دیا ہے۔

رحیم داد نے درخت کی جھکی ہوئی شاخ دیکھی اور اس کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اس نے پیروں سے جوتے اتارے اور دیوار کے ساتھ اندھیرے میں اس طرح رکھ دئے کہ صاف نظر نہ آئیں۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ بھی وہیں رکھ دیا۔ مٹھائی کی پوٹلی دانتوں میں دبائی۔ گردن اٹھا کر ڈال دیکھی۔ اچھلا اور دونوں ہاتھوں سے اسے تھام لیا۔ اس نے اپنے پیر دیوار سے ٹکائے اور ڈال کے سہارے کھسکتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ڈال اس کے بوجھ سے آہستہ آہستہ ہلنے لگی۔ مگر رحیم داد دیوار پر چڑھ گیا۔ اس نے آنگن میں نظر ڈالی۔ وہاں سناٹا تھا۔

وہ کچھ دیر دیوار پر بیٹھا درخت کی آڑ سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ وہ دیوار سے لٹک کر دھیرے سے آنگن میں اتر گیا۔

اس نے اندر جا کر دیکھا۔ آنگن خاصا مختصر تھا۔ اس کے ایک طرف دیوار پر چھپر پڑا تھا۔ چھپر کے ساتھ ہی کوٹھری جیسا چھوٹا کمرہ تھا۔ رحیم داد دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔ آنگن میں صرف ایک چارپائی تھی۔ اس پر چادر اوڑھے کوئی سو رہا تھا۔ وہ چارپائی کے قریب پہنچا۔ اس کا بیٹا کریما لیٹا تھا۔ ساتھ ہی اس کی بیٹی زینو سکڑی سکڑائی پڑی تھی۔ رحیم داد نے پہلی ہی نظر میں دونوں کو پہچان لیا۔

دونوں گہری نیند سو رہے تھے۔ مگر نوراں وہاں نہیں تھی۔ اس نے گردن موڑ کر چھپر کے نیچے

دیکھا' وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اس کی ایک جھری سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔

رحیم داد نے سوچا' نوراں کمرے میں ہوگی۔ وہ بچوں کے سرہانے اندھیرے میں بت بنا کھڑا تھا۔ دونوں بچے ستاروں کی روشنی میں آنکھیں بند کئے لیٹے تھے۔ رحیم داد نے غور کیا' کریمے کا قد کچھ لمبا ہوگیا ہے۔ زینو کے چہرے پر وہی پہلی سی معصومیت ہے' وہی بھولپن۔ اس نے دھیرے سے اپنا ایک ہاتھ بڑھایا۔ زینو کے بال چھوئے۔ اس کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ زینو کے بال خاک اور میل سے چیکٹ ہو رہے تھے۔

اسے دکھ ہوا کہ نوراں نے بچوں پر توجہ دینا چھوڑ دی ہے۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری' جھکا اور زینو کے ایک رخسار پر اپنے لرزتے ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ بے خبر سوتی رہی۔ اس نے آہستہ سے کریمے کی پیشانی چومی۔ وہ بے چین ہو کر کلبلایا۔ رحیم داد جھٹ چارپائی کے سرہانے دبک کر بیٹھ گیا۔ کریمے نے کروٹ بدلی اور پھر گہری نیند سو گیا۔

رحیم داد چارپائی کی آڑ میں بیٹھا رہا اور گردن اٹھائے حسرت بھری نظروں سے بچوں کو تکتا رہا۔ اسے بے اختیار اپنا چھوٹا بیٹا یاد آگیا۔ وہ بھی دونوں بچوں کے ساتھ چارپائی پر لیٹا ہوتا۔ مگر اسے تو سیف اللہ کے بھائیوں نے جلا کر ختم کردیا تھا۔ اس کی یاد کے ساتھ ہی رحیم داد کا دل بھر آیا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا روتا رہا اور گھر کی بے سروسامانی دیکھ کر اپنی مجبوری اور بے بسی پر کڑھتا رہا۔

رحیم داد نے آنسو پونچھے۔ اٹھا اور دبے دبے قدموں چلتا ہوا چھپر کے نیچے پہنچ گیا۔ وہ چپ چاپ کھڑا کمرے کا بند دروازہ تکتا رہا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ اس نے قمیص کی اندرونی جیب کے اندر ہاتھ ڈال کر کاغذ میں لپٹے ہوئے جھمکے انگلیوں سے ٹٹولے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ نوراں کو جھمکے بہت پسند ہیں۔ اس کے پاس کانوں میں پہننے کے لیے مندرے تھے۔ مگر وہ ہر فصل کی کٹائی کے بعد رحیم داد سے جھمکوں کی فرمائش کرتی۔ وہ اس کے لیے جھمکے نہیں بنوا سکا تھا۔ اس نے سوچا' جھمکے دیکھ کر نوراں کا چہرہ پھول کی طرح کھل جائے گا۔ وہ اپنے ہاتھ سے اس کے کانوں میں جھمکے پہنائے گا۔ اس کا دل کش چہرہ نظر بھر کر دیکھے گا اور بے اختیار اسے گلے لگا لے گا۔ وہ ہانپنے کے سے انداز میں رک رک کر گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔

وہ آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا۔ دروازے میں خاصی چوڑی جھری تھی۔ اس نے جھری سے ایک آنکھ لگا کر اندر نظر دوڑائی۔ مگر اندر جھانکتے ہی اس کے [illegible] جھٹکا لگا۔ وہ لرز کر رہ گیا۔

اس نے دیکھا' کمرے کے اندر چارپائی پر نوراں لیٹی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی مرد تھا جس کے سینے پر ایک ہاتھ پھیلائے وہ کروٹ کے بل سو رہی تھی۔ مرد کا چہرہ وہ نہیں دیکھ سکا۔ اس کا صرف ماتھا اور سر کے بال نظر آرہے تھے۔ چہرہ نوراں کے بازو کی آڑ میں چھپا ہوا تھا۔ یہ ہولناک منظر وہ زیادہ دیر نہیں دیکھ سکا' الگ ہٹ گیا۔ غصے سے اس کا خون کھول رہا تھا۔ وہ ذرا دیر چپ چاپ کھڑا رہا۔

اس نے جھری سے پھر اندر دیکھا۔ اس کا غصہ اور شدید ہوگیا۔ اس نے نظریں ہٹالیں۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکالا۔ اسے آہستہ سے کھولا۔

وہ دونوں کو سوتے ہی میں قتل کردینا چاہتا تھا۔ دل میں یہ ٹھان کر اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ دروازہ چرچراتا ہوا ذرا سا کھل گیا۔ مگر دروازے کی چرچراہٹ کے ساتھ ہی نوراں کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ رحیم داد دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں خوں خوار ہو رہی تھیں۔ چہرے پر دہشت برس رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ نوراں نے پہلے تو اسے حیرت سے دیکھا' پھر اس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

رحیم داد جھٹ دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ چھپر سے باہر نکلا۔ قریب ہی گھاس پھوس کا مٹھا تھا اور خاصا بڑا تھا۔

فرار ہونے کی گنجائش نہیں تھی۔ رحیم داد مٹھے کی آڑ میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس نے چاقو مضبوطی سے ہاتھ میں تھام لیا۔ ذرا دیر بعد کوئی دھوتی باندھتا ہوا دروازے سے نکل کر چھپر کے نیچے آگیا۔

رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ وہ جمال دین تھا۔ ہاں وہی تھا۔ وہ کمرے کے اندر سے نکلتی ہوئی چراغ کی روشنی میں کھڑا دھوتی باندھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے نوراں تھی' دروازے کی دہلیز سے ذرا آگے بڑھ کر سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ رحیم داد دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

جمال دین نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ "یہاں تو کوئی نہیں۔ جانے تو کیا دیکھ کر ڈر گئی۔"

وہ آہستہ سے بولی۔ "میں نے اسے خود دیکھا تھا۔"

"ہمارے پاس دھرا ہی کیا ہے جو کوئی چوری کرنے آئے۔"

"وہ چور تو نہیں لگتا تھا۔"

"فیر کیا لگتا تھا؟"

"اس کی داڑھی تھی۔ مونچھیں تھیں۔ اجلا کرتا اور شلوار پہنے ہوئے تھا۔"

"چور تو وہ نہیں ہو سکتا۔" جمال دین نے قیاس آرائی کی۔ "چور تو منہ پر منڈاسا باندھ کر آتے ہیں۔ ان کی تو صرف آنکھیں نظر آتی ہیں۔ جانے تو نے کیا دیکھا۔ تیری بات سمجھ نہیں آئی۔"

"نہیں دینے، میں نے اسے ٹھیک طرح دیکھا ہے۔ بیچ دروازے میں کھڑا مجھے لال لال آنکھوں سے گھور رہا تھا۔" اس نے ذرا رک کر کہا۔ "ہائے کیسی ڈراؤنی آنکھیں تھیں۔ ڈر کے مارے میری تو چیخ بھی نہ نکل سکی۔"

جمال دین جھٹ اندر گیا اور لمبی لاٹھی نکال کر لایا۔ وہ زور زور سے کھنکارتا ہوا آنگن میں آیا۔ شیشم کے درخت کی طرف گیا۔ بچوں کی چارپائی کے پاس پہنچا۔ وہ ابھی تک بے خبر سو رہے تھے، جب وہ گھاس پھوس کے ڈھیر کی طرف بڑھا تو رحیم داد سکڑ کر اور دبک گیا۔ اس نے چاقو مضبوطی سے انگلیوں میں بھینچ لیا۔

جمال دین قریب آگیا۔ جب تک وہاں کھڑا رہا رحیم داد سانس روکے رہا۔ جمال دین چند لمحے ٹھہرا۔ اسے جمال دین کے صرف پیر نظر آ رہے تھے۔ جمال دین مڑا اور بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ قریب جا کر اس نے دروازہ کھولا اور گھر سے باہر چلا گیا۔

نوراں چھپر کے نیچے دھندلی روشنی میں تنہا کھڑی تھی۔ رحیم داد دکھ اور نفرت کے ملے جلے احساسات کے ساتھ ٹکٹکی باندھے اسے تکتا رہا۔ وہ گردن اٹھائے دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اسے جمال دین کا بے چینی سے انتظار تھا۔ اس کی خوش نما لمبی گردن میں اس وقت بھی وہی خم تھا جسے دیکھ کر وہ وارفتہ ہو جاتا تھا۔ اس کے لمبے چمکیلے بال پیٹھ پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے کا نصف حصہ روشنی میں تھا جو خوب صورت بھی تھا اور دل آویز بھی۔ اس کے ہونٹ ذرا سے کھلے تھے اور ہولے ہولے کپکپا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جمال دین واپس آگیا۔ اس نے دروازے کی کنڈی لگائی اور لاٹھی اٹھائے سیدھا نوراں کی جانب بڑھا۔ قریب گیا اور سینہ تان کر بولا۔ "کوئی بھی تو نہیں۔ میں نے ہر طرف دیکھا۔ کوئی نظر نہیں آیا۔ تو ایں ویں ڈر گئی۔"

"تجھے کیسے بتاؤں، میں نے اسے دیکھا تھا۔" نوراں کی آنکھوں سے خوف صاف جھلک رہا تھا۔

"مجھے تو ایسا لگا جیسے وہ رحیمے ہو۔"

"حد کر دی تو نے۔ رحیما اب کیسے آ سکتا ہے۔" نور دین نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "اسے تو کتل کر دیا گیا۔ تجھے کتنی بار بتاؤں۔ میں احمد کوٹ میں سیف اللہ کے چھوٹے بھائی بلّے سے خود ملا تھا۔ بلّے نے اپنی آنکھوں سے رحیمے کی لاش دیکھی تھی۔ جیل کی وردی اس کے بدن پر تھی۔" اس نے اپنی لاٹھی دیوار سے ٹکا دی۔ "اب تو رحیمے کی لاش بھی دفن کر دی گئی۔ وہ کبر سے اٹھ کر تو یہاں آنے سے رہا۔" وہ ایک بار پھر بے نیازی سے ہنسا۔

"تو نے سفنہ دیکھا ہو گا۔"

"میں تجھے کیسے بتاؤں۔" نوراں نے دروازے کی دہلیز کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ اس جگہ آنکھیں نکالے مجھے گھور رہا تھا۔" وہ چند لمحے خاموش کھڑی سوچتی رہی، پھر بڑبڑانے کے سے انداز میں دھیرے دھیرے بولنے لگی۔ "رحیمے کے داڑھی نہیں تھی پر لگتا وہی تھا۔"

"اس کا بھوت آیا ہو گا۔" جمال دین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے تو اسے بھولی نہیں!" نوراں نے کچھ نہیں کہا۔ جمال دین نے اسے خاموش پا کر چھیڑنے کی کوشش کی۔ "لگتا ہے ابھی تک اسی کے چکر میں رہتی ہے۔ یاد تو آتا ہو گا؟"

"یاد تو آتا ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "سات برس اس کا ساتھ رہا ہے۔ ذرا سوچ، سات برس تھوڑے نہیں ہوتے، فیر یہ بچے موجود ہیں۔" اس نے آنگن میں پڑی ہوئی چارپائی کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ اسی کے تو ہیں۔ وہ میرے بچوں کا پیو تھا۔"

"فضول باتیں چھوڑ۔" جمال دین نے کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا۔ "اب تو رحیما آنے سے رہا۔ ٹھیک ہی ہوا۔ جب تک زندہ تھا، ہر دم اس کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔" وہ انگلی سے سر کے بال کریدنے لگا۔ "میں نے اپنی مسجد کے ملّا سے بات کی تھی۔ کہتا تھا، عدّت کے چار مہینے دس دن پورے کر لینے دے۔ اس سے پہلے نکاح حرام ہے۔ عدّت ختم ہونے کے بعد تیرا نکاح پڑھا دوں گا۔ فیر تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری ہو جائے گی۔ نہ کسی کا ڈر، نہ کسی کا خوف۔"

"یہ تو ٹھیک ہے پر تو کوئی ٹھیک ٹھاک دھندا تو کر۔" نوراں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دیکھ تو گھر کی کیا حالت ہو رہی ہے۔"

"کر لوں گا، کر لوں گا۔ اب تو ضرور کوئی ٹھیک سا دھندا کرنا پڑے گا۔"

"ہمیشہ ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔" نوراں نے گلہ کیا۔ "تیری انھی باتوں میں آ کر میں نے اپنا خانہ خراب کر لیا۔"

"کرماں بھری! بیکار میں اپنا گلہ خراب نہ کر۔" جمال دین نے نرم لہجے میں اسے منانے کی کوشش کی۔ "پروا نہ کر، سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"ایسا کر، احمد کوٹ والی زمین واپس لینے کی کوشش کر۔ اب تو سیف اللہ کے بھائیوں کا غصہ ختم ہوگیا ہوگا۔ رحیمے بھی نہیں رہا جس سے ان کی دشمنی تھی۔ اب انھیں ہم سے کیا لینا۔ انھوں نے تو زبردستی ہماری زمین دبا رکھی ہے۔"

"کہتی تو ٹھیک ہے۔" جمال دین نے اتفاق کیا۔ "میں تجھے اور دونوں بچوں کو احمد کوٹ لے جاؤں گا۔ تو سیف اللہ کی ماں کے پاس جانا۔ اس کے سامنے رونا پیٹنا۔ سنا ہے غصہ تو اس کا تیز ہے پر دل کی بری نہیں۔ تجھ پر اور بچوں پہ ترس کھا کے زمین واپس کردے تو کوئی تعجب کی گل نہیں۔"

"ویسے بھی تو ان کا کبضہ غیرکنونی ہے۔ ان کے خلاف تو مکدمہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"مکدمے سکدمے کے چکر میں نہ پڑ۔ ان کی اوپر تک پہنچ ہے۔ مکدمہ سے کچھ نہیں بنے گا۔ بہت لمّا چکر ہے۔" جمال دین اسے سمجھانے لگا۔ "اور سب سے زیادہ مشکل یہ کہ مکدمہ لڑنے کے لیے، روپیہ بھی چاہیے۔ یہ تو سوچ۔"

"پکی باراں کلّا زمین ہے۔ باراں کلّا زمین کم نہیں ہوتی۔"

"میں کب کہتا ہوں، کم ہوتی ہے۔" جمال دین نے مسکرا کر کہا۔ "پر جیسا میں کہتا ہوں، ویسا کر۔ اس طرح کام آسان ہوجائے گا۔ بول کیا کہتی ہے؟"

"جیسا تو کہتا ہے، وہی کروں گی۔ پہلے بھی تیری بات میں نے کب نہیں مانی۔" اس نے ایک خاص ادا سے جمال دین کو دیکھا اور زیرِلب مسکرانے لگی۔ "رحیمے جیل میں تھا تبھی تیری بن گئی تھی۔ تو نے مجھ پر جادو کردیا تھا۔"

"میں نے جادو کردیا تھا یا تو نے؟ ذرا اپنی موٹی موٹی آنکھیں دیکھ۔" جمال دین ہنس کر بولا۔ "میں نے تیرے لیے، پنڈ چھوڑا۔ گھر والوں سے جھگڑا کیا۔ سب کو چھوڑ دیا، تیرا بن گیا۔"

"اور بھی باتیں ہیں۔" نوراں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اس رات مجھے احمد کوٹ سے نکال کر یہاں نہ لاتا تو سیف اللہ کے بھائی مجھے اور میرے ان دو بچوں کو بھی ختم کردیتے۔"

"تجھے کیا پتہ، تیرے لیے، تو میں جان کی بازی لگا سکتا ہوں۔" جمال دین نے بڑے جوش سے کہا۔ "تجھ میں بات ہی ایسی ہے۔"

"کیا بات ہے مجھ میں، کچھ بھی تو نہیں۔" وہ بڑے ناز سے مسکرائی۔ اس کے [illegible] لگاوٹ

تھی۔ "پر اتنا ضرور ہے، میں اب تیری ہوگئی۔ تجھے نہیں چھوڑوں گی۔ کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ تو مجھے چھوڑ دے، یہ دوسری بات ہے۔"

"میں تجھے چھوڑ دوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس نے سینے پر داہنا ہاتھ رکھا اور گہری سانس بھر کر بولا۔ "ہائے میں کربان! تجھے پانے کے بعد بھی کوئی چھوڑ سکتا ہے، ایسی چاندنی کی طرح لشکارے مارتی ہوئی سوہنی کو۔" اس نے شوخی سے نوراں کی کمر میں چٹکی بھری۔ وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ اس کی کمر بل کھا کر دہری ہوگئی۔ جمال دین نے جھپاک سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھالیا۔ نوراں نے پیار سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور سینے سے چمٹ گئی۔ رحیم داد اندھیرے میں بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہا۔

جمال دین آگے بڑھا۔ وہ نوراں کے چہرے پر جھکا ہوا پیار سے کہہ رہا تھا۔ "دل جانی! منجی پر لیٹ کر آرام نال گلاں ہوں گی۔" جمال دین اسے اٹھائے ہوئے کمرے میں چلا گیا اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

نوراں کمرے کے اندر تھی۔ اس کے بچے آنگن میں کھلے آسمان کے نیچے چارپائی پر بے خبر سو رہے تھے اور رحیم داد گھاس کے ڈھیر کی آڑ میں دبکا بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ کمرے سے نوراں اور جمال دین کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے اور ہنسنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد کے دل پر آرے چل رہے تھے۔ کمرے میں زوردار قہقہہ ابھرا۔ غصے اور نفرت سے رحیم داد کا خون کھول اٹھا۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ اس نے چاقو مضبوطی سے تھام لیا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ چاقو ہاتھ میں سنبھالے دھیرے دھیرے چھپر کی جانب بڑھا۔ اس کی نظریں کمرے کے دروازے کی جانب تھیں۔

یکایک کمرے میں جلتا ہوا چراغ بجھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی گہری خاموشی چھاگئی۔ رحیم داد کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ جسم کا تناؤ ڈھیلا پڑگیا۔ اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ واپس مڑا اور ڈگمگاتے قدموں سے چلتا ہوا آنگن میں آگیا۔ سامنے چارپائی پر اس کے دونوں بچے بے خبر سو رہے تھے مگر وہ اس طرف نہ گیا۔

اس نے کھلا ہوا چاقو بند کرکے احتیاط سے جیب میں رکھا۔ شیشم کے درخت کے نیچے پہنچ کر ڈال پر چڑھا، دیوار پار کرکے باہر گلی میں آگیا۔ دیوار کے قریب اندھیرے میں رکھے ہوئے جوتے پہنے۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ اٹھا کے بغل میں دبایا اور دبے دبے قدموں چلتا ہوا اندھیری گلی سے نکل کر اسکول کے پچھواڑے پہنچا۔ میدان عبور کیا اور سنسان گلی کوچوں سے گزرتا ہوا اکال گڑھ

کی حدود سے باہر نکل گیا۔

☆

رحیم داد دل گرفتہ اور نڈھال تھا۔ نوراں کی بے وفائی نے اس کے وجود میں غم و غصے کا جوالاؤ بھڑکایا تھا' اس آگ میں سلگتے سلگتے اب وہ راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا' سب کچھ لٹا چکا تھا۔

رات دم بخود کھڑی تھی۔ ہوا درختوں میں سسکیاں بھر رہی تھی۔ رحیم داد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ اپنے ماضی کا لاشہ اٹھائے بوجھل قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ آگے جا کے اس نے نہر کی پلیا عبور کی۔ سامنے کرتار پور کی بستی اندھیرے میں لپٹی اونگھ رہی تھی۔

اس نے نظر بھر کر اس طرف دیکھا۔ ٹھٹکا اور دوسری طرف مڑ گیا۔ کرتار پور نہ گیا۔ اب اسے کرتار پور سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اکال گڑھ جانے سے پہلے اس نے بیوی بچوں کے ساتھ ایک نئی زندگی بسر کرنے کے جو منصوبے باندھے تھے' سب ملیا میٹ ہو چکے تھے۔ اس کے ذہن پر ابھی تک نوراں اور جمال دین بھیانک خواب بن کر چھائے ہوئے تھے۔ اس نے اندرونی جیب سے کاغذ میں لپٹے ہوئے جھمکے نکالے۔ ان پر نظریں جمائے دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں غصے سے دہکنے لگیں۔ چہرے پر دحشت برسنے لگی۔ اس نے جھمکے نہر میں پھینک دیے۔ پرنا کھول کر مٹھائی نکالی اور اسے بھی حقارت سے پھینک دیا۔ وہ نوراں اور بچوں سے اب کوئی رشتہ کوئی واسطہ رکھنا نہ چاہتا تھا۔

وہ نہر کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ رات تاریک اور بوجھل تھی۔ رحیم داد تھکن اور ذہنی کرب سے نڈھال تھا۔ دل ڈوب رہا تھا۔ آگے جانے کی سکت رفتہ رفتہ کم ہو رہی تھی۔ کھیتوں کا سلسلہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔

نہر سے ہٹ کر جھنگر تھا' ویران اور جنگلی جھاڑیوں سے بھرا ہوا۔ وہ جھنگر میں داخل ہوا۔ لیکن زیادہ دور نہ گیا۔ مٹی کے ایک تودے کے قریب بے حال ہو کر بیٹھ گیا اور گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔

رات اس نے جھنگر میں بسر کی۔ تاروں کی چھاؤں میں اٹھا۔ نہر پر جا کے منہ ہاتھ دھویا۔ نسیم سحر کے نرم نرم جھونکوں میں فرحت اور تازگی تھی۔ زندگی کی ہلچل تھی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ میں ریت کے ذرے جگمگا رہے تھے۔

رحیم داد راہ گیروں کی نظروں سے بچتا بچاتا ویران اور سنسان راستوں سے گزرتا ڈھولا امیر خاں کی جانب گامزن تھا۔ دھوپ کی تمازت میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے

ے جھلملا رہے تھے۔

جمال دین خطرہ بن کے اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ اسی کے خوف سے رحیم داد نے کرتار پور کو باد کہا تھا۔ وہاں سے چلتے وقت اسے ایک ہی محفوظ ٹھکانا نظر آیا تھا' اور وہ تھا ڈھولا امیر خان' ں اس کی چھوٹی بہن بیگماں کا گھر تھا۔ ماں باپ بہت پہلے مر چکے تھے۔ بیگماں کے سوا رحیم داد کی وئی بہن تھی' نہ بھائی۔

بیگماں کی شادی چچا زاد بھائی مولا داد سے ہوئی تھی۔ رحیم داد کا چچا ابھی زندہ تھا۔ وہ ڈھولا امیر ں میں رہتا تھا۔ خاصا کھاتا پیتا زمیں دار تھا۔ اس کے پاس چالیس ایکڑ سے اوپر نہری زمین تھی ں پر وہ اپنے دو بیٹوں کے ساتھ کاشت کرتا تھا۔

بیگماں کی شادی کے کچھ ہی عرصے بعد چچا سے رحیم داد کے تعلقات خراب ہو گئے۔ سبب یہ تھا لہ بیگماں کی شادی کے وقت رحیم داد کنوارا تھا۔ جب رحیم داد کی شادی کا سلسلہ چھڑا تو چچا نے چاہا ۔ رحیم داد کا بیاہ اس کی منجھلی بیٹی بیدی سے ہو جائے۔ مگر رحیم داد دونے بیٹے کی شادی پر رضامند ہیں ہوا۔

اس نے نوراں سے بیاہ کر لیا۔ نوراں پر وہ بہت پہلے سے فریفتہ تھا۔ یہ بات بیگماں کو معلوم تھی ور مولا داد کو بھی۔ چچا اس قدر ناراض ہوا کہ نہ تو شادی میں خود شریک ہوا' نہ بیٹے اور بہو کو ثریک ہونے دیا۔ تعلقات اس قدر کشیدہ ہو گئے کہ شادی کے بعد بیگماں اور اس کی سسرال سے کوئی بھی رحیم داد کے گھر نہیں آیا۔

رحیم داد بھی نہیں گیا۔ سالہا سال گزر گئے۔ مگر جن دنوں رحیم داد منٹگمری جیل میں تھا' ایک روز بیگماں سسر اور شوہر سے چھپ کر اس سے ملنے آئی۔ اسے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کے روئی۔ وہ بے قرار ہو کے سلاخوں سے سر ٹکراتی تھی اور تڑپ تڑپ کر کہتی تھی۔ "ہائے ویر! تو نے یہ کیا کر لیا؟" رحیم داد اسے تسلی دیتے دیتے خود بھی رونے لگتا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ بیگماں اس سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔ لیکن بیگماں اس سے ملنے دوبارہ جیل نہیں آئی۔ آنے کا موقع ہی نہیں ملا ہو گا۔

رحیم داد کو یقین تھا کہ اس کے مرنے کی خبر سن کر بیگماں احمد کوٹ ضرور پہنچی ہو گی اور اب تک اسے یاد کر کے آنسو بہاتی ہو گی۔ وہ اگر اس کے پاس پہنچ جائے تو وہ بھائی کو زندہ دیکھ کر خوشی سے دیوانی ہو جائے گی۔ اسے اپنے گھر میں ضرور پناہ دے گی۔ مولا داد بھی نیک اور بھلا مانس تھا۔ بیوی کو چاہتا بھی بہت تھا۔ لہٰذا رحیم داد سے خلوص اور ہمدردی رکھتا۔ خفگی صرف چچا کی تھی۔

شام کا دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ رحیم داد خاموش کھڑا سوچ رہا تھا کہ آیا اسے فوراً بیگماں کے پاس

پہنچ جانا چاہئے یا نہیں۔ اس تذبذب کی وجہ اس کا چچا تھا۔ وہ بڑا ضدی اور سخت گیر تھا۔ رحیم داد کو خدشہ تھا کہ اسے دیکھ کر کہیں وہ بھڑک نہ اٹھے‘ ایسا ہنگامہ نہ برپا کردے کہ اس کا راز فاش ہوجائے‘ گاؤں والوں کو پتہ چل جائے کہ وہ کون ہے۔

وہ ایسا کوئی خطرہ ہرگز مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اب وہ رحیم داد کے بجائے چوہدری نورالٰہی کے روپ میں زندہ رہنا چاہتا تھا جس کے کلیم کے کاغذات کا بستہ وہ نہایت احتیاط سے سنبھالے ہوئے تھا۔

رحیم داد نے بہت سوچ بچار کے بعد طے کیا کہ گھر جانے کے بجائے اسے پہلے کسی نہ کسی طرح بگماں سے ملنا چاہئے اور اس کے مشورے سے ڈھولا امیرخاں میں ٹھہرنے کا فیصلہ کرنا چاہئے۔ وہ ہر خطرے سے بچنا چاہتا تھا۔

۱۶

ڈھولا امیرخاں پرانا گاؤں تھا۔ عام رواج کے مطابق گاؤں کے شروع میں قبرستان تھا۔ جھٹ پٹے میں قبرستان بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اونچی نیچی قبریں خود رو جنگلی جھاڑیوں کے درمیان دھندلے دھندلے دھبّوں کے مانند نظر آرہی تھیں۔

رحیم داد ٹھٹکا اور قبرستان سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گیا۔ وہ مخمصے میں پڑگیا۔ سوچنے لگا کہ اسے ڈھولا امیرخاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ فی الحال کرتارپور ہی میں ٹھہرنا چاہئے تھا۔ مگر کرتارپور اب اس کے لیے‘ محفوظ ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ اکال گڑھ نزدیک ہی تھا اور وہاں جمال دین موجود تھا جو کسی بھی وقت کرتارپور پہنچ سکتا تھا۔ اگر جمال دین نے اسے پہچان لیا تو ذرا بھی مروت نہیں کرے گا‘ جھٹ پولیس سے مخبری کردے گا۔ اب وہ اس کا جگری دوست نہیں‘ رقیب بن چکا تھا۔ نوراں ان کی دوستی کے درمیان دیوار بن کے حائل ہوگئی تھی۔

رحیم داد نے گاؤں کی طرف جانے کا ارادہ ترک کردیا‘ مڑا اور کھیتوں کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ پہلے بھی کئی بار ڈھولا امیرخاں آچکا تھا۔ لہٰذا راستوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد چاپ سنائی دی۔ رحیم داد نے رفتار سست کرلی اور چوکنا نظروں سے چاپ کی سمت دیکھنے لگا۔ اندھیرا دھیرے دھیرے نیچے اتر رہا تھا۔ گاؤں کے گھروں سے مویشیوں اور انسانوں کی ملی جلی آوازیں شام کے بڑھتے ہوئے سناٹے میں آہستہ آہستہ ابھر رہی تھیں۔

ایک شخص اچانک جھاڑیوں کے عقب سے نکل کر رحیم داد کے سامنے آگیا۔ اسے دیکھ کر رحیم داد لمحے بھر کے لیے‘ پریشان ہوا مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ قریب آیا تو رحیم داد نے

پوچھا۔ "میں نے کہا جی! ڈھولا امیر خاں یہی ہے نا؟"

"ہاں جی۔" اس نے جواب دیا۔ "تیں نوں کسے ملنا ہے؟"

رحیم داد اس کا سوال صاف نظر انداز کر گیا۔ لہجے میں کسی قدر رقّت پیدا کر کے بولا۔ "سخت پیاس لگی ہے۔ پانی ہو تو پلا دے۔"

"فکر نہ کر' تجھے ابھی پینے کو پانی مل جائے گا۔" اس نے رحیم داد کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "پر میں نے تجھے اس پنڈ میں پہلے نہیں دیکھا۔" اس نے رحیم داد کا گرد سے اٹا ہوا چہرہ اور لباس غور سے دیکھا۔ "بہت تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لگتا ہے' سویرے سے روٹی بھی نہیں کھائی۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "پانی بھی پی لینا۔ روٹی ٹکر بھی کھا لیں۔ آ میرے ساتھ۔"

وہ آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ رحیم داد کچھ دور تک چپ چاپ چلتا رہا پھر اس نے کسی قدر حیرت سے دریافت کیا۔

"تو مجھے آڈے پانی پلائے گا؟"

"نا جی' ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔ "ادھر محنا ہے۔" اس نے ایک طرف ہاتھ اٹھایا۔ "وہاں پانی ہے' روٹی ٹکر بھی ہے۔" اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ "دوپہر سے مروڑ ہو رہی ہے۔ میں اسی لیے' ادھر آیا تھا۔ روٹی نہیں کھاؤں گا' توں کھا لینا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کھلی جگہ پہنچے۔ سامنے مٹی کا بنا ہوا کسی قدر اونچا چبوترا تھا جس پر چڑھ کر کھیتوں کی رکھوالی کی جاتی ہے۔ یہ محنا تھا۔ اس کے اردگرد تیار فصلیں کھڑی تھیں۔ رحیم داد نے فصلیں دیکھ کر کہا۔

"فصلیں تو پک کر بالکل تیار ہو چکی ہیں۔ ابھی ان کی واڈھی نہیں ہوئی؟"

"بس جی ہونے ہی والی ہے۔" وہ چبوترے کی جانب بڑھا جس پر ایک طرف پانی کا گھڑا رکھا تھا۔ اس کے ڈھکنے پر کپڑے میں لپٹا ہوا کھانا دھرا تھا۔ وہ چبوترے پر چڑھ کر اوپر گیا۔ رحیم داد بھی اوپر چلا گیا۔ اس شخص نے کھانا اٹھایا اور رحیم داد کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لے' یہ روٹی پکڑ۔" کھانا رحیم داد کے سپرد کر کے اس نے قریب رکھا ہوا مٹی کا پیالہ اٹھایا۔ اس میں گھڑے سے پانی ڈالا اور رحیم داد کے حوالے کیا۔ "پہلے پیاس بجھا لے۔ پر زیادہ پانی نہ پینا۔ الٹی ہو جائے گی۔ روٹی بھی ٹھیک سے نہیں کھا سکے گا۔"

رحیم داد نے بھرا ہوا پیالہ ہاتھ میں سنبھالا۔ اسے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے

پیالہ ہونٹوں سے لگایا اور آدھا خالی کر دیا۔ پانی پی کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھانا سامنے رکھ لیا۔ وہ شخص بھی قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس نے کپڑا کھول کے روٹیاں نکالیں۔ روٹیوں کے ساتھ پلی کی چٹنی تھی۔ ایک گٹھی پیاز کی بھی تھی۔ رحیم داد نے روٹی توڑ کر لقمہ بناتے ہوئے کہا۔

"دو روٹیاں ہیں۔ میں دونوں نہیں کھا سکوں گا' تو بھی تھوڑی سی روٹی کھا لے۔"

"مجھے نہ کھلا' میری طبیعت کچھ گڑبڑ ہے۔"

"رات بھر بھوکا رہے گا؟"

"ایسا کر' آدھی روٹی میرے لیے' چھوڑ دے۔" اس نے پیاز کی گٹھی اٹھا کر رحیم داد کے سامنے کی۔ "یہ گنڈا ابھی جی چاہے تو چھوڑ دے۔ تو پلّی سے روٹی کھا لے۔ رات کو بھوک لگی تو آدھی روٹی گنڈے کے ساتھ کھا لوں گا۔ اپنا کام چل جائے گا۔ ویسے تو میری فکر نہ کر۔ مجھے بالکل بھوک نہیں۔"

رحیم داد دھندلی روشنی میں چپ چاپ کھانا کھانے لگا۔ صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ روٹی اور پلی کی چٹنی مزے دار لگی۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے کھاتا رہا پھر اس نے پوچھا۔

"تو راکھا ہے؟"

"ہاں جی' راکھا ہی ہوں۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

رحیم داد نے اس کے لہجے کی کسک محسوس کی۔ "کتنے دنوں سے یہ کام کر رہا ہے؟"

"دو برس تو ہو گئے ہوں گے۔ پر ڈھولا امیر خاں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ پہلے میں چک ۲۲ میں ہوتا تھا۔"

"ادھر کیا کرتا تھا؟"

"کرنا کرانا کیا ہے جی!" وہ بیزاری سے بولا۔ "کبھی مویشی چرانے لگ گیا تو چاک بن گیا۔ کبھی گڑ بنانے والا گڑالا۔ کبھی راکھا۔ جو کام مل گیا' کرنے لگا۔"

"کسی زمیں دار کا مزارع کیوں نہیں بن جاتا؟"

"مزارع بھی رہ چکا ہوں۔"

"زمیں دار نے بے دخل کر دیا؟"

"ہاں جی' پہلے میں بھی زمیں دار ہوتا تھا۔"

"اسی ضلع میں تیری زمیں داری تھی؟"

"نہیں جی۔" اس نے انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "ملتان کی تحصیل وہاڑی میں اپنا پنڈ

کوڑا نجیب تھا۔ مستاجری پر ۲۵ کلا زمین لے رکھی تھی۔ نہری زمین تھی۔ پانی بھی پورا پورا ملتا تھا۔ ساتھ میں گھر والی کے بھائی ادریس کو بھی لگا رکھا تھا۔ آرام سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ پنڈ کا وڈا زمیں دار عارف سلدیرا تھا۔ وہ میری زمین ہتھیانا چاہتا تھا۔ طرح طرح سے تنگ کرتا۔ کبھی مویشی اٹھوا لیے، کبھی پانی کاٹ دیا۔ فیر ایسا ہوا جی، ایک دن اس نے مجھے اپنی حویلی میں بلوایا۔ ادریس میرے ساتھ تھا۔ سلدیرے نے مجھ سے صاف صاف کہا۔ دلدار اپنی زمین میرے حوالے کردے، ورنہ پچھتائے گا۔“

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”تیرا نام دلدار ہے؟“

”ہاں جی، کبھی میرا یہی نام ہوتا تھا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”اب تو سب دارا کہتے ہیں، کمّی کمین سمجھتے ہیں۔“ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ ”ہاں تو جی، میں بتا رہا تھا۔ عارف سلدیرا نے مجھے سیدھی سیدھی دھمکی دی۔ میں تو چپ رہا پر ادریس گرمی میں آگیا۔ وہ تھا بھی تکڑا اور زور آور جوان۔ سلدیرے سے ذرا نہ ڈرا۔ جب زیادہ گرما گرمی ہوئی تو میں نے ادریس کو منع کیا اور اپنے ساتھ لے آیا۔ کچھ دنوں بعد سلدیرے کے پتر کا ویاہ ہوا۔ اس نے پورے پنڈ پر ٹیکس لگایا کہ ہر گھر سے دو بھیڑ بکریاں دی جائیں۔ اس کے کرندے زبردستی بھیڑ بکریاں وصول کرتے۔ وہ میرے گھر آئے تو ادریس نے صاف انکار کردیا۔ کرندے چپ کر کے چلے گئے، پر رات کو انھوں نے میری چار بھیڑیں اٹھانے کی کوشش کی۔ ادریس پہلے ہی چوکس تھا۔ اس کے ساتھ کئی یار دوست بھی تھے۔ اس نے کرندوں کو ٹوکا تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ادریس اور اس کے ساتھیوں نے پیچھا کیا اور دو کرندوں کو پکڑ لیا۔ ان میں سے ایک نے بھیڑ بھی کندھے پر اٹھا رکھی تھی۔“

رحیم داد نے لقمہ چباتے ہوئے پوچھا۔ ”دونوں کو پولیس کے حوالے کردیا ہوگا؟“

”ہاں جی، ارادہ تو یہی تھا۔“ دارا نے بتایا۔ ”پر سویرے سویرے سلدیرے نے پنچایت بھیجی۔ منت سماجت کی۔ ادریس پنچایت پر تیار نہیں تھا، پر میں نے معافی دے دی۔ کرندوں کو چھوڑ دیا۔ گل ایسہ ہے جی، میں سلدیرے سے جھگڑا بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بہت وڈا زمیں دار ہے۔ اور جی، ادھر سلدیروں کا زور بھی بہت ہے۔ خاکوانیوں، صاحب زادوں، دولتانوں اور گدّی نشینوں سے سلدیروں کا بہت میل جول ہے۔ وہ اتنے طاکت ور ہیں، سمجھو حکومت ہی ان کی ہے۔ تھانیدار ہو یا تحصیل دار، کوئی ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ سارے سرکاری افسر اور حاکم ان کے بندے ہیں۔“

رحیم داد نے مٹی کا پیالہ دارا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تھوٹھے میں گھڑے دے۔“

دارا نے پیالے میں پانی انڈیل کر رحیم داد کو دے دیا۔ رحیم داد نے پانی پیا، گیلی مونچھیں ہاتھ سے پونچھیں، مسکرا کر بولا۔ ”ہاں، اب آگے کی بتا۔“

”بتانا کیا ہے جی، سلدیرے نے وہی کیا جو چاہتا تھا۔“

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”کیا کیا اس نے؟“

”سلدیرے نے گرداور اور پٹواری کے ساتھ جوڑ توڑ کر کے بندوبست اراضی کے کاغذات میں انکلات منسوخ کرا دیے۔ شاملات دیہہ کی شکل بدلوا کر میری زمین کی مستاجری اپنے نام کرالی۔ ویسے مستاجری میں میرے لگ بھگ تین سال رہتے تھے۔“

”مستاجری تو سرکاری ٹھیکا ہوتا ہے۔ ٹھیکے کی مدت ختم ہونے سے پہلے مستاجری سلدیرے کے نام کیسے ہوگئی؟“

”اب کیا بتاؤں، یہ سب کیسے ہوگیا۔“ دارا نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”ویسے میری ربیع کی فصلیں واڈھی کے لیے، تیار کھڑی تھیں۔ فصلوں کی واڈھی سے پہلے تو مزارعے کی بھی بے دخلی نہیں ہوتی۔ مستاجری ختم ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تو نے عدالتی چارہ جوئی نہیں کی؟“

”میرا تو ایسا ارادہ نہیں تھا پر ادریس نے مکدمہ دائر کردیا۔“

”مکدمے کا کیا بنا؟“

”مکدمہ شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ سلدیرا ایک روز اپنے کرندوں کو لے کر پہنچا۔ پولیس بھی اس کی ساتھ تھی۔ اس نے میری زمین اور اس پر کھڑی ہوئی فصلوں پر کبضہ کرلیا۔ میرے وکیل نے سلدیرا کا کبضہ رکوانے کے لیے، عدالت سے حکم امتناعی بھی لے لیا تھا۔ میں اور ادریس عدالت سے خوش خوش لوٹ رہے تھے۔ ادھر سلدیرے نے دوسرا ہی منصوبہ بنایا۔ تمام سڑکیں جو عدالت سے لاریوں کے اڈے کی طرف جاتی تھیں، ان کی ناکابندی کی جاچکی تھی۔ ایک سڑک کے ناکے پر سلدیرے اور دین دار، زمین دار بیٹھے تھے۔ دوسری پر منگھیرے اور دولتانے تھے اور تیسری پر خاکوانی اور گھٹانے رسا گیر مورچا لگائے ہوئے تھے۔“ دارا نے لمبی سانس بھری۔ ”ادھر تو پوری تیاری تھی ادھر کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ ادریس آگے آگے چل رہا تھا۔ مجھ سے کوئی تیس چالیس گز کے فاصلے پر تھا۔ اچانک شفیع سلدیرا، سکندر کھنڈ اور نادر دین دار ایک گلی سے نکلے اور ادریس پر کلہاڑیوں اور گنڈاسوں سے حملہ کردیا۔ ادریس خون میں لت پت پڑا تھا اور کاتل ہوائی فیر کرتے،

کلہاڑیاں لہراتے صاف نکل گئے۔"

"ادریس کا کیا بنا؟" رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"اس نے وہیں سڑک پر دم توڑ دیا۔" دارا نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ "اس کی لاش لے کر پنڈ پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ سلدیرے کے کرندے میرے گھر کے سامنے موجود تھے۔ انھوں نے مجھ پر ڈانگیں برسانی شروع کر دیں۔ میں چوٹ کھا کر نزدیک کے کھیتوں میں گھس کر دبک گیا۔ وہ ادریس کی لاش اٹھا کر لے گئے۔ سلدیرے کے حکم پر اسے پنڈ کے بیچوں بیچ ایک درخت سے لٹکا دیا گیا۔"

"تھانے جا کر تو نے پرچہ چاک کرایا ہوتا۔"

"وہ تو جی' میں پہلے ہی کرا چکا تھا۔ پر تھانے دار تو اس رات عارف سلدیرا کے ساتھ حویلی میں بیٹھا شراب پی رہا تھا اور ادریس کی لاش درخت سے لٹک رہی تھی۔ اس کے کاتل بھی نشہ کر کے پنڈ میں بڑھکیں مارتے پھر رہے تھے۔ خوشی سے بانہیں الار الار کے بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ بے الاپ رہے تھے۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "میں آدھی رات کے بعد اندھیرے میں چھپتا لکتا کسی طرح اپنے گھر میں گیا۔ پر سویرا ہوتے ہی کرندے مجھے پکڑ کر سلدیرے کے سامنے لے گئے۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی ننگی ننگی گالاں نکالیں۔"

رحیم داد کھانا کھا چکا تھا۔ اس نے بچی ہوئی روٹی اور پیاز کپڑے میں لپیٹ کر ایک طرف رکھی۔ مٹی کے پیالے سے پانی پیا۔ دارا سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔"

"سلدیرے نے پہلے تو اپنے کرندوں سے پٹوایا۔" دارا نے آہ سرد بھر کر بتایا۔ "میرا چہرہ کالا کروایا' منہ میں جوتا دیا اور پورے پنڈ میں گھمایا۔ ایک ڈھولی میرے پیچھے پیچھے ڈھول بجاتا تھا۔ میری کمر میں رسی کا پھندا پڑا تھا جسے ایک کرندے نے پکڑ رکھا تھا۔ منہ میں جوتا دبائے' گردن جھکائے میں پنڈ کے ایک ایک گھر کے سامنے سے گزرتا تھا۔"

"ادریس کی لاش کا کیا بنا؟"

"لاش ساری رات اور سارا دن درخت سے لٹکی رہی۔" دارا نے جواب دیا۔ "ایسے ہی گرمی کے دن تھے۔ لاش سے سخت بدبو نکلنے لگی۔ پنڈ کے کچھ بوڑھے سلدیرے کے پاس پہنچے اس کی منت سماجت کی۔ سارے پنڈ میں بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ سلدیرے کی حویلی میں بھی بدبو پہنچ رہی تھی۔ اس لیے' اس نے لاش دفن کرنے کی اجازت دے دی۔"

"تو نے پنڈ چھوڑ دیا ہو گا؟"

"نہیں' ادریس کو دفن کرنے کے بعد میں گھر میں جا کر بیٹھ گیا۔ کسی کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ ویسے بھی سلدیرے نے پورے پنڈ میں ایسا خوف بٹھا دیا تھا کہ اس کی ناراضی کے ڈر سے کوئی میرے گھر کے سامنے سے بھی نہ گزرتا۔ اپنا حال یہ تھا کہ گھر والی بھائی کی موت پر ہر دم روتی رہتی۔ میں چپ بیٹھا اسے دیکھتا رہتا۔ کئی دن ایسے ہی گزر گئے۔ ادھر سلدیرے کے منشی نے میری فصل کی واڈھی کرالی۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا؟ تو تو گھر میں بند بیٹھا تھا۔"

"گھر والی نے فصلوں کی واڈھی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ وہ ادریس کی کبر پر گئی تھی۔ واپس آئی تو رو رو کر مجھے یہ بات بتائی۔"

"تو نے کوئی کارروائی نہیں کی؟"

"تو بھی کیسی گلاں کرتا ہے۔ کارروائی میں نے کیا کرنی تھی۔" دارا کے ہونٹوں پر زہر خندہ تھا۔ "میں نے صرف یہ کیا' ایک رات چدّر سے منہ چھپا کر سلدیرے کی حویلی پر گیا۔ پگڑی اتار کر سامنے ڈالی اور اس کے پیر پکڑ لیے۔ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ سلدیرا ایک دم بھڑک اٹھا۔ ٹھوکر مار کر چیخا۔ یہاں کیوں آیا ہے؟ تھانے جا کر میرے خلاف پرچہ کرا۔ عدالت میں کیس چلا۔ حکم امتناعی نکلوا۔ میں نے اس کی ناراضی کا ذرا برا نہ منایا۔ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ نمبردار معافی دے دے۔ غلطی ہو گئی۔ جو تو کہے گا وہی کروں گا۔ مکدمہ مکدمہ بھی واپس لے لوں گا۔ زمین بھی تیری' فصلیں بھی تیری۔ میں تیرا مزارع بن کر کام کروں گا۔"

"تب تو وہ راضی ہو گیا ہو گا۔ وہ یہی تو چاہتا تھا۔"

"میں نوں پتہ تھا' وہ یہی چاہتا ہے۔ تبھی تو میں اس کے پاس گیا تھا۔ میری منت سماجت پر وہ تھوڑی دیر چپ کر کے بیٹھا سوچتا رہا۔ فیر بولا۔ "تجھے سٹامپ پیپر پر راضی نامہ کرنا ہو گا۔ میں اپنے وکیل سے کاغذ تیار کروا لوں گا۔ تجھے اس پر انگوٹھا لگانا ہو گا۔ اب تو جا' میں بعد میں بلوا لوں گا۔ میں چپ کر کے چلا آیا۔"

"بعد میں اس نے تجھے بلایا؟"

"ہاں جی' اس نے مجھے بلایا۔" دارا نے رحیم داد کو بتایا۔ "وہ اونچی رنگیل کھٹ پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ اپنے پاس بٹھایا۔ محبت سے پوچھا۔ حال سنا اوا! میں خیر صلا ہے سئیں کہتا ہوا اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے نوکر سے لسّی کا گلاس منگوا کر پینے کو دیا۔ حقہ تازہ کر کے سامنے رکھوایا۔ تھوڑی دیر بعد سلدیرے نے اپنے منشی کو بلایا۔ اس نے سٹامپ پیپر

میرے سامنے نکال کر رکھ دیا۔ سلدیرے نے ہنس کر کہا۔ یہ راضی نامہ وہی ہے جو اس روز تیرے ساتھ طے ہوا تھا۔ اس نے میری پیٹھ تھپکی اور بولا۔ دیکھ کیا رہا ہے۔ انگوٹھا لگا دے۔ منشی نے میرے انگوٹھے پر فافٹ روشنائی لگائی اور دو کاغذوں پر مجھ سے انگوٹھا لگوالیا۔"

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "دوسرا کاغذ کس لیے تھا؟"

"وہ راضی نامے کی نقل تھی۔ منشی تو نقل دینے کو تیار نہیں تھا پر میرے مانگنے پر سلدیرا ہنس کر بولا۔ کوئی گل نہیں' دے دے اسے نقل۔ منشی نے مجھے نقل دے دی۔" دارا نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ "راضی نامے پر انگوٹھا لگوانے کے ذرا ہی دیر بعد سلدیرے کے ہونٹوں سے مسکراہٹ اڑ گئی۔ مونچھ پر ہاتھ پھیر کر کڑک دار آواز سے بولا۔ دارا! اب تو نیچے زمین پر بیٹھ۔ آج سے تو میرا مزارع بن گیا۔ تیں نوں پتہ ہے مزارع' زمیں دار کے برابر نہیں بیٹھ سکتا۔ میں چپ کر کے اٹھا اور سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔"

"مزارع بننے کی گل تو نے ہی کہی تھی نا؟"

"کیا کرتا' کوئی اور راستہ بھی نہ تھا۔ وہ پہلے ہی مجھے ذلیل کر چکا تھا۔" دارا کے لہجے میں درد کی چبھن تھی۔ "پر وہ مجھے ابھی اور ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ کہنے لگا' کل شام میرے پتر کی جنج چڑھے گی۔ تیری گھر والی جنج کے آگے آگے جھومر ڈالے گی۔ میں نے سنا ہے' وہ بہت زبردست ناچتی ہے اور ہاں' یہ بھی سن لے' میں جیسا کہتا ہوں' ویسا ہی کرنا ہو گا۔ میں انکار شکار سننا نہیں چاہتا۔ اب تو ٹر جا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور گھر واپس آگیا۔ پر گھر والی کو کچھ نہیں بتایا۔ دوسرے روز بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ پر جب دن ڈھلنے لگا تو میں نے گھر والی کو ہمت کر کے پوری بات بتائی۔ مجھے جو ڈر تھا وہی ہوا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ بگڑ کر بولی۔ سلدیرے نے پہلے ہی جنج کے آگے ناچنے کے لیے' کنجریاں بلا رکھی ہیں۔ اس نے کیا مجھے بھی کنجری سمجھا ہے جو مجھ سے جھومر ڈلوانا چاہتا ہے؟ پر جب میں نے اس کی بہت منت سماجت کی تو وہ رونے لگی۔ چپ چاپ اٹھی' نہائی' کپڑے بدلے اور شام ہونے سے پہلے پہلے سلدیرے کی حویلی پر پہنچ گئی۔"

"واپسی پر ناراض تو نہیں ہوئی؟" رحیم داد نے اس کی روداد میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"یہ نہ پوچھ' جب وہ واپس آئی تو کیا ہوا۔" دارا نے تڑپ کر بتایا۔ "تیسرے روز وہ لوٹی تو اس کا منہ لال ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی زور زور سے چیخنے لگی' میں نے تیرے ایسے بے غیرت کے ساتھ نہیں رہنا۔ توں نے سلدیرے کے پت کی جنج میں مجھے کنجریوں کے ساتھ نچوایا۔ اب [illegible] ہی بن کے رہنا ہے۔ اس نے میرے منہ پر تھوکا' نکے کو گود میں دبایا اور گھر سے چلی گئی۔"

"اسے روکا نہیں؟"

"روکتا بھی تو نہ رکتی۔ غصّے سے پاگل ہو رہی تھی۔ گھر والی کے اس طرح چلے جانے پر مجھے بہت شرم آئی۔ سلدیرے پر سخت غصّہ آیا۔ جی چاہا حویلی میں جا کر اسے کتل کر دوں۔ پر میں سلدیرے کی حویلی نہیں گیا۔ گھر سے نکلا اور سیدھا اپنے وکیل کے پاس پہنچا۔ اسے راضی نامے کی نقل دکھائی۔ اس نے کئی بار اسے پڑھا۔ متّھے پر ہاتھ مار کر بولا' یہ کیا کیا۔ راضی نامہ کرنے سے پہلے مجھ سے تو صلاح مشورہ کر لیا ہوتا۔ سلدیرے نے تیری زمین بھی اپنے کبضے میں کر لی اور تجھے اس طرح باندھ دیا ہے کہ اس کے خلاف کچھ بھی کارروائی نہیں کر سکتا۔ وہ جب چاہے گا تجھے بے دخل کر دے گا۔ مزارع بن کر بھی زیادہ دن نہیں رہ سکتا۔ راضی نامے میں اس نے ایسی ہی شرطیں ڈالی ہیں۔ اس کی باتیں سن کر میں بہت پریشان ہوا۔"

"وکیل ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ کچے کاغذ پر انگوٹھا لگانے سے پہلے تجھے وکیل سے ضرور گل کر لینی چاہئے تھی۔"

"گل ایہہ ہے جی' میں سلدیرے سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ ادریس کے کتل کے بعد میں بالکل بے سہارا ہو گیا تھا۔ پنڈ میں ہر بندہ مجھ سے بات کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔" دارا نے صفائی پیش کی۔ "اب آگے کی سن۔ وکیل نے میرا حوصلہ بڑھایا تو میں سلدیرے کے خلاف ایک بار فیر عدالتی چارہ جوئی کرنے پر تیار ہو گیا۔ میں نے وکیل کے ساتھ تھانے جا کر رپٹ لکھائی کہ سلدیرے نے ڈرا دھمکا کر زبردستی مجھ سے راضی نامے کے سٹامپ پر انگوٹھا لگوالیا۔ اس کے بعد وکیل نے میری طرف سے عدالت میں نئی عرضی لگائی۔ یہ توہین عدالت کا مکدمہ تھا جس میں کہا گیا تھا کہ سلدیرے نے حکم امتناعی نہیں مانا اور میری زمین پر ابھی تک کبضہ کیے ہوئے ہے۔ فصلوں کی واڈھی کرائی اور اسے اٹھا کر بھی لے گیا۔ وکیل نے زوردار مکدمہ بنایا تھا۔ عدالت نے فوراً سلدیرے کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیے۔"

"لگتا ہے' تکڑا وکیل کیا تھا۔ وارنٹ دیکھ کر سلدیرے کے بھی ہوش اڑ گئے ہوں گے۔ حوالات میں بھی بند رہا ہو گا۔"

"سلدیرا گرفتار کر لیا گیا تھا پر ضمانت پر اسی روز چھوٹ گیا۔ نہ حوالات میں رہا' نہ جیل گیا۔" دارا نے بتایا۔ "وکیل نے مجھے اپنے ایک ملنے والے کے پاس ٹھہرا دیا تھا۔ اس کا پنڈ کوڑا نجیب کے نزدیک ہی تھا۔ چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک رات پولیے مجھے گرفتار کر کے تھانے لے گئے۔

بہت مارا پیٹا اور حوالات میں بند کر دیا۔ پولیس نے سلدیرے کے ایک کرندے کی رپٹ پر میرے خلاف مج کی چوری کا مکدمہ بنایا تھا۔ وکیل نے ضمانت کی درخواست لگائی پر وہ منظور نہ ہوئی۔ مجھے حوالات سے جیل بھیج دیا گیا۔"

" سلدیرے کی ضمانت ہو گئی اور تیری نہ ہو سکی؟ یہ عجب گل سنائی۔" رحیم داد نے تعجب کا اظہار کیا۔

" سلدیرا وڈا زمیں دار ہے۔ صاحب زادوں اور مخدوموں سے اس کی یاری بھی ہے۔" دارا گہری سانس بھر کر بولا۔ "اس کی ضمانت کیسے نہ ہوتی۔ میں مستاجر زمیں دار سے گھٹ کر مزارع رہ گیا تھا۔ مجھے حوالاتی بنا کر پولیسیے جیل لے گئے۔ وہاں پہنچا تو حکم دیا گیا، گھنٹی گھر جاؤ۔ گھنٹی گھر گیا تو حکم ہوا، سکول جاؤ۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، سکول شکول تو کہیں تھا نہیں، بہت سے کیدی مونج کی رسیاں بٹتے تھے۔ مجھے بھی ان کے ساتھ مشقّت پر لگا دیا گیا۔ میں نے انکار کیا تو سڑاک سڑاک چھتر لگائے گئے۔ گندی گندی گالاں نکالی گئیں۔ میں جھٹ مونج بٹنے لگا۔ روز ایسی مشقّت کرنی پڑتی۔ میں نے یہ بھی دیکھا جو حوالاتی کھاتا پیتا ہوتا، جیل کے حکام کو خوش رکھتا، اسے ذرا مشقّت نہ کرنی پڑتی۔ ادھر میں مشقّت کرتے کرتے آدھا رہ گیا۔ ڈاکٹری کے لیے بھیجا گیا۔ گھنٹوں کڑی دھوپ میں بیٹھا رہا، تب ڈاکٹری ہوئی۔ وزن لیا گیا تو مشین نے اتنا ہی وزن بتایا جتنا جیل میں داخل ہوتے وکت تھا۔ مشین میں کچھ ایسا بگاڑ پیدا کیا گیا تھا، جب چاہو وزن بڑھا دو جب چاہے گھٹا دو۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے لیے، یہ انوکھی باتیں نہیں تھیں۔ وہ بھی حوالاتی کے طور پر مہینوں ایسی مصیبتیں اسی جیل میں بھگت چکا تھا۔ دارا بتاتا رہا۔ "حوالاتیوں کو چکیوں اور بارکوں سے باہر نکال کر ہر روز سویرے سویرے گنتی کی جاتی۔ مشقّت پر لے جانے کے لیے، ان کی چھانٹی کی جاتی۔ وہ اس طرح ہوتی۔ گھر خوراکی الگ کر دیئے جاتے۔ صاحب بہادر کے علیحدہ کر دیئے جاتے۔ دوسرے افسروں کے سفارشی الگ کر دیئے جاتے۔ جن حوالاتیوں نے مشقّت سے بچنے کے لیے ماہانہ بھتّا باندھ رکھا تھا، وہ بھی الگ کر دیئے جاتے۔ صرف میرے ایسے بے سہارا حوالاتیوں کو مشقّت خانوں میں لے جایا جاتا اور دبا کے کام لیا جاتا۔ نہ پوچھ، جیل میں کیسی زبردست رشوت چلتی ہے۔ آزادی سے چلنے پھرنے تک کے لیے مٹھی گرم کرنی پڑتی۔ پر وڈے لوگاں کے عیش ہوتے۔ اول تو ایسا کوئی بندہ جیل جاتا نہیں اور جاتا بھی ہے تو سرداری کرتا ہے۔ حکم ماننے کی بجائے الٹا حکم چلاتا ہے۔ تجھ سے کیا کیا بتاؤں۔"

اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "ہر ۸ روز بعد وڈے جیلر کا دورہ ہوتا۔ اس روز اور مصیبت پڑتی۔ حوالاتیوں کو کمبل پریڈ لگا کر تین تین گھنٹے سخت دھوپ میں بٹھایا جاتا۔ دورہ شروع ہوتے ہی حوالاتیوں کو بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلانے پڑتے ہیں۔ اگر کوئی حوالاتی نظریں اٹھا کر اوپر دیکھتا یا حاکم اعلیٰ کے سامنے فریاد کرنے کی کوشش کرتا تو سڑاک سے چھتر پڑتا۔ دورہ ختم ہونے کے بعد بھی ایسے حوالاتی کی زبردست پٹائی ہوتی۔"

رحیم داد نے ان جان بن کر تبصرہ کیا۔ "جیل میں بہت ظلم ہوتا ہے جی۔"

"یوں سمجھ لے، کون سا ظلم نہیں ہوتا۔ بیمار پڑ جاؤ تو خطرناک بیماریوں تک کا کوئی علاج نہیں۔ اوپر سے سخت مشقّت کرنی پڑتی ہے۔ گندی روٹی کھانی پڑتی ہے۔ بات بات پر پٹائی ہوتی ہے۔ ایک تکلیف ہو تو بتائی جائے۔" دارا نے قدرے تامّل کیا۔ "بارک کے اندر سب حوالاتی بند کر دیئے جاتے ہیں۔ ٹٹی کرنے کے لیے، صرف ایک ٹٹی خانہ ہے جس میں دو بندے بیٹھ سکتے ہیں۔ ایک بارک میں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ حوالاتی اور کیدی ہوتے ہیں۔ انھیں بارک کے ٹٹی خانے کا پانی ڈولوں سے نکالنا پڑتا ہے۔ کچی جیل ہے، اسی گندے پانی سے روز حوالاتیوں سے ہر جگہ لیپا پوتی کا کام بھی کرایا جاتا ہے۔ میں نے تجھے بتایا تھا ناکہ رشوت تو ہر معاملے میں چلتی ہے۔ مٹھی گرم کر دو تو گندے بدبودار پانی سے لیپنا پوتنا نہ پڑے۔ رشوت کی خاطر ملاکاتیوں کو طرح طرح سے تنگ کیا جاتا۔ دو دو منٹ بعد حوالاتیوں اور کیدیوں کو ملاکاتیوں سے بات چیت ختم کرنے کو کہا جاتا۔ ملاکاتی تھوڑی تھوڑی دیر بعد روپے دو روپے دیتے تو بات کر سکتے تھے۔" اس نے بڑی ٹھنڈی سانس بھری۔ "پر اپنا تو کوئی ملاکاتی ہی نہیں تھا۔"

"تیری گھر والی ملاکات کے لیے، نہیں آئی؟"

دارا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے چپ چاپ زمین پر انگلیوں سے آڑی ترچھی لکیریں بناتا رہا۔

رحیم داد نے چند لمحے خاموش رہ کر دریافت کیا۔ "تیری گھر والی کیا دوبارہ نہیں آئی؟"

"ہاں جی۔" دارا نے مختصر جواب دیا۔

"پتہ کیا، اب وہ کہاں ہے؟"

دارا نے رحیم داد کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "جب میں نے تجھ سے ساری ہی باتیں بتا دیں تو یہ بھی سن لے۔ وہ جیسا کہہ کر گھر سے نکلی تھی، اس نے وہی کیا۔"

"کیا وہ سچ مچ کنجری بن گئی؟" رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہاں جی' وہ کنجری بن گئی ہے۔ " دارا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے اسے پچھلے سال ملتان کے حرم گیٹ میں دیکھا تھا۔ خوب بناؤ سنگھار کیے چکلے میں بیٹھی تھی۔ میں دوبارہ ادھر نہیں گیا اور نہ کبھی اسے دیکھا۔ پتہ نہیں اب کہاں ہے۔ کس کے پاس ہے؟ نکّے کا بھی کچھ پتہ نہیں' زندہ ہے یا مرگیا؟"

"تیری زمین کا کیا بنا؟"

"اس پر تو سلدیرے کا پہلے ہی کبضہ تھا۔ جیل میں حوالاتی کے طور پر تین مہینے سے زیادہ گزرے تو ایک روز پنڈ کا لوہار مجھے ملنے جیل آیا۔ اس کے ذریعے میں نے ایک بار فیر سلدیرے کی منت سماجت کی۔ لگتا ہے' اسے سلدیرے ہی نے بھیجا تھا۔ پر سلدیرے نے مجھے اس شرط پر معافی دے دی کہ میں اس کے خلاف سارے مکدمے واپس لے لوں۔ میں نے اس کی شرط مان لی۔ سلدیرے کا وکیل جیل میں آیا۔ اس نے جس کاغذ پر کہا' میں نے انگوٹھا لگا دیا۔ اس کے بعد پولیس نے میرے خلاف مج کی چوری کا مکدمہ ختم کردیا۔ میں جیل سے نکلا تو کوڑا نجیب کی طرف جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ سلدیرے نے کہلوا دیا تھا' اگر پنڈ میں گیا تو مجھے گولی سے اڑا دے گا' میری لاش بھی ادریس کی طرح درخت سے لٹکا دے گا۔ " اس نے گردن اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ "میں نے تبھی سے ملتان چھوڑ دیا' ادھر آگیا۔"

"تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ تو تو بالکل تباہ ہوگیا۔"

دارا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رحیم داد بھی چپ رہا۔ سناٹا بڑھ گیا تھا۔

☆

شام تاریک ہوکر رات کے اولین مرحلے میں داخل ہو رہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے گندم اور جو کی تیار فصلوں میں سرسراہٹ ابھر رہی تھی۔ دارا اور رحیم داد گم صم بیٹھے تھے اور اپنی اپنی سوچ میں مگن تھے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔

دارا نے پہلو بدلا اور رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "ادھر کیسے آیا؟ بتایا نہیں' تیں نوں کس سے ملنا ہے؟"

رحیم داد نے آہستہ سے پوچھا۔ "مولا داد کو جانتا ہے؟"

"کیوں نہیں جانتا۔ " وہ مستعدی سے بولا۔ "اسے جانتا ہوں۔ اس کے بھائی اللہ داد کو جانتا ہوں۔ دونوں کے پیئو کو بھی جانتا ہوں۔ " اس نے قدرے توقف کیا۔ "تجھے مولا داد سے ملنا ہے؟"

"مولا داد اور اللہ داد اپنے پیو کے ساتھ ہی رہتے ہیں نا؟"

"سمجھو' ساتھ ہی ساتھ رہتے ہیں۔ " دارا نے جواب دیا۔ "مکان تو ایک ہی ہے پر وہڑے کے بیچ میں دیوار اٹھا کر دو گھر بنالیے ہیں۔ اللہ داد اور اس کا پیو ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ "

رحیم داد کو اس اطلاع سے کسی قدر تقویت ملی۔ اس نے دبی زبان سے پوچھا۔ "تب تو مولا داد کی گھر والی بیگماں کو بھی تو جانتا ہوگا؟"

"بالکل جانتا ہوں۔ تجھے بیگماں سے ملنا ہے؟"

"ہاں' میں نے اسی سے ملنا ہے۔"

"تیں نوں پہلے مولا داد سے ملنا چاہیے۔ " دارا نے مشورہ دیا۔ "یہ ٹھیک رہے گا۔"

"اسے بھی ملوں گا۔ پر مجھے پہلے بیگماں ہی سے ملنا ہے۔"

"کوئی ایسی ویسی گل تو نہیں۔ " دارا نے رحیم داد کو مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "بیگماں سے یاری تو نہیں لگا رکھی؟ مجھے سچ سچ بتا دے۔"

"رب سونہہ' ایسی کوئی گل بات نہیں۔ " رحیم داد نے قبلے کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر قسم کھائی۔

دارا نے اس کی بات پر یقین کرتے ہوئے کہا۔ "پر یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ پہلے بیگماں سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔"

"گل ہی کچھ ایسی ہے۔ مجھے پہلے بیگماں سے ملنا ہوگا اور اس طرح ملنا ہوگا' کسی کو پتہ نہ چلے۔ تو میرا یہ کام کرسکتا ہے۔"

"تیری گل ابھی تک سمجھ نہیں آئی۔ " اس نے ایک بار پھر رحیم داد کو شبے سے دیکھا۔

"میں تجھے بعد میں سب کچھ بتا دوں گا۔ " رحیم داد نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

دارا نے پھر شک ظاہر کیا۔ "یہ تو سوچ' میں ایسی بات بیگماں سے کیسے کہہ سکتا ہوں؟ وہ برا نہیں منائے گی؟ تیرے بارے میں پوچھے گی تو میں کیا بتاؤں گا؟ اس طرح تو وہ میرے کہنے پر ہرگز تجھے ملنے نہیں آئے گی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔ " رحیم داد نے سخن سازی سے کام لیا۔ "پر تو نے میری پوری گل کہاں سنی۔ وہ ایسا ہے جی' بیگماں کا ایک بھائی تھا' رحیم داد۔ احمد کوٹ میں رہتا تھا۔ پچھلے دنوں اس کا کتل ہوگیا۔ وہ میرا گہرا یار تھا۔ اسے ایک جھگڑے میں سزا ہوگئی تھی۔ میں اسے جیل ملنے گیا تھا۔ اس نے مجھ سے ایک بات کہی تھی' وہ میں نے بیگماں کو بتانی ہے۔ اس نے مجھے سونہہ دی تھی کہ میں یہ بات بیگماں کے سوا کسی کو ہرگز نہ بتاؤں۔ " رحیم داد نے نظر بھر کر دارا کو دیکھا۔ "اب مرنے والے

کی گل کا تو مجھے لحاظ کرنا ہی پڑے گا۔"

"تیری گل کچھ کچھ سمجھ تو آتی ہے۔" دارا نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "ویسے مجھے بیگماں کے بھائی رحیم داد کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ میں نے تجھے کہا تھا نا' مجھے اس پنڈ میں آئے زیادہ مدت نہیں ہوئی۔"

"بیگماں سے ملنا تو اسے بتانا' تیرے مرحوم بھائی کا بہت پرانا یار احمد کوٹ سے آیا ہے اور تجھ اس کی ضروری گل بتانا چاہتا ہے۔"

دارا تذبذب میں پڑ گیا۔ "ایسا کر' مولا داد سے مل لے۔ اگر وہ تجھے مہمان بنا کر ٹھیرا لے تو جب وہ گھر پر نہ ہو' بیگماں کو اس کے بھائی کی بتائی ہوئی گل بتا دینا۔"

رحیم داد رضامند نہ ہوا۔ "میں چاہتا ہوں بیگماں سے ملنے سے پہلے' مولا داد' اس کے بھائی یا پیو کو بالکل پتہ نہ چلے' میں ڈھولا امیر خاں میں ہوں۔ گل ہی کچھ ایسی ہے' جسے تو نہیں سمجھ سکتا اور میں تجھے بتا بھی نہیں سکتا۔" رحیم داد نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا۔ "دارا! میرا یہ کام کر دے' تیری مہربانی ہوگی۔" اس نے نوٹ دارا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "لے' اسے رکھ لے' نئی کمیص اور دھوتی لے آنا۔ تیرے کپڑے بہت گندے ہوگئے ہیں۔" اس نے دارا کا بوسیدہ لباس گہری نظروں سے دیکھا۔

دارا نے چپ چاپ نوٹ لے کر دھوتی کے ڈب میں رکھ لیا۔ اس کا رویّہ اب بدل گیا تھا۔ مسکرا کر بولا۔ "میں بیگماں کے پاس چلا جاؤں گا۔ پر تو نے مجھے اب تک اپنا نام نہیں بتایا۔ بیگماں پوچھے گی تو کیا بتاؤں گا۔"

"کیا کرے گا جان کر۔" رحیم داد نے مسکرا کر بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔ "بیگماں پوچھے تو اسے کہہ دینا مجھے نام یاد نہیں رہا۔ بس اتنا کہہ دینا احمد کوٹ سے تیرے بھائی رحیم داد کا پرانا یار آیا ہے اور تجھے اکیلے میں کوئی ضروری گل بتانا چاہتا ہے۔ اسے منع کر دینا وہ کسی کو اس بارے میں کچھ نہ بتائے۔ مولا داد کو بھی نہیں۔"

"کام تو ٹیڑھا لگتا ہے۔ پر اب تو کرنا ہی پڑے گا۔ تجھ سے وعدہ جو کر لیا۔"

رحیم داد نے گرم جوشی سے دارا کا ہاتھ پکڑ کر بھینچ لیا۔ "تو بہت نیک بندہ ہے۔ میرا یہ کام کرا دے تو میں تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ آرام سے رہے گا۔ پروا نہ کر' یہاں سے زیادہ آرام سے رہے گا۔"

دارا پر رحیم داد کی باتوں کا خوش گوار اثر پڑا۔ جوش سے بولا۔ "فکر نہ کر' میں بیگماں سے تجھے

ضرور ملواؤں گا۔" وہ چند لمحے خاموش رہا اور گردن جھکا کر سوچنے لگا' پھر اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ "تیرا اب یہاں ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔ کوئی اتے آگیا تو معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔ جیسا تو نے کہا' میں ویسا ہی چاہتا ہوں۔ کسی کو تیرے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلنا چاہیے۔"

"مجھے کہاں لے جائے گا۔" رحیم داد نے پوچھا۔ "پنڈ میں جانا تو ٹھیک نہیں۔ بیگماں کو یہاں بلا کر نہیں لا سکتا؟"

"اس ٹیم تو مولا داد گھر پر ہو سکتا ہے۔" دارا نے قیاس آرائی کی۔ "بیگماں سے ایسی بات میں کیسے کر سکتا ہوں اور اسے یہاں کیسے لا سکتا ہوں؟ میرے گھر چل۔ میرا ٹھکانا ادھر پنڈ سے الگ جنگر کے پاس ہے۔ ادھر کوئی نہیں جاتا۔ میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ وہیں ٹھیر جانا۔ میں موکع لگتے ہی بیگماں سے بات کر لوں گا اور اسے تیرے پاس لے آؤں گا۔ یہ سب کیسے ہوگا؟ یہ مجھ پر چھوڑ دے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "آ میرے ساتھ۔"

رحیم داد خاموشی سے اس کے ہم راہ چلا گیا۔

☆

ہر طرف سناٹا تھا۔ دارا اور رحیم داد نے جوہ عبور کیا اور ویرانے کی طرف بڑھنے لگے۔ گاؤں کے گھروں میں ٹمٹماتے چراغ دور ہوتے گئے۔ جنگر نظر آنے لگا۔ وہ اس سے قریب ہوتے گئے۔ مگر جنگر میں داخل نہیں ہوئے۔ جنگر سے پہلے ہی درختوں تلے دھندلی دھندلی روشنی میں ایک مکان نظر آیا۔

دارا آگے بڑھ کر مکان کے دروازے پر پہنچا۔ باہر سے کنڈی لگی تھی۔ دارا نے کنڈی کھولی۔ دروازے کا ایک پٹ سرکایا اور رحیم داد کے ساتھ اندر چلا گیا۔ سامنے مختصر صحن تھا۔ ایک طرف مٹی سے بنی ہوئی کوٹھری تھی۔ اس کے ساتھ ہی چھپر تھا۔ اس کے نیچے کھانا پکانے کے لیے چولھا تھا۔

مکان کی دیواریں بھی کچی تھیں اور زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ مکان پر ویرانی برس رہی تھی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا تھا۔ دارا نے صحن میں ایک بوسیدہ چارپائی ڈال دی۔ کوٹھری کے اندر گیا' گندا سا کھیس نکال کر لایا۔ اسے چارپائی پر بچھایا اور رحیم داد سے گویا ہوا۔

"اب آرام کر۔ میں مولا داد کی طرف جاتا ہوں۔ اگر وہ گھر پر نہ ہوا اور بیگماں اکیلی ہوئی تو ابھی تیرے بارے میں بات کروں گا۔ تیار ہو گئی تو ساتھ لیتا آؤں گا۔ ویسے رات کو مشکل ہی لگتا ہے۔ دن کو تو اس سے گل بات کرنے کا ضرور کوئی بہانہ مل جائے گا۔"

"میں تیری واپسی کا انتظار کروں گا۔"

"نہیں، میرا انتظار نہ کرنا۔ میں نے کہا نا، اس ٹیم مشکل ہی ہوگا۔ اگر بیگماں سے تیرے بارے میں بات نہ ہوئی تو میں ادھر نہیں آؤں گا، مولا داد کے گھر سے سیدھا منھا چلا جاؤں گا۔ مجھے فصلوں کی رکھوالی کرنی ہے۔"

"بیگماں سے بات کرنے کا موکع مل جائے تو ادھر ادھر دیکھ لینا۔ بہت ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ کسی کو میرے بارے میں بالکل پتہ نہ چلے۔" رحیم داد نے اسے ایک بار پھر خبردار کیا۔

"فکر نہ کر۔ میں کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔" وہ دروازے کی جانب بڑھا۔ "اب میں چلوں گا۔ دروازہ بند کرلے اور منجی پر آرام کر۔"

دارا باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ سرہانے رکھا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک دارا کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہیں آیا۔ رحیم داد سوگیا۔

سویرے بہت تڑکے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ باہر سے دارا کی آواز ابھری۔ رحیم داد نے دروازہ کھول دیا۔ دارا اندر آگیا۔ وہ اکیلا تھا۔

"رات مولا داد کے گھر گیا تھا؟"

"یہاں سے نکل کر اسی طرف گیا تھا۔" دارا نے جواب دیا۔ "مولا داد گھر پر ہی تھا۔ بیگماں بھی جاگ رہی تھی۔ میں نے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور وہاں سے منھا کی طرف چلا گیا۔ وہیں سے آرہا ہوں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے، کام نہیں بنا۔" رحیم داد نے دل برداشتہ ہوکر کہا۔

"اب یہ مجھ پہ چھوڑ دے۔" دارا نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "یہاں آرام سے رہ۔ میں آج کسی نہ کسی طرح بیگماں سے ضرور تیرے بارے میں بات کرلوں گا۔"

رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔ "آج اس سے ملاکات ہوجائے گی؟"

"ٹھیک سے نہیں بتا سکتا۔ وہ مان گئی تو خود تیرے پاس پہنچ جائے گی۔ میں اسے بتا دوں گا تو میرے گھر ٹھیرا ہے۔"

رحیم داد اب پوری طرح بیدار ہوچکا تھا۔ صحن کے ایک گوشے میں کنواں تھا۔ رحیم داد نے پانی نکالا۔ غسل کیا۔ اپنے گرد آلود کپڑے دھوئے اور سوکھنے کے لیے پھیلا دیے۔ وہ دارا کی دھوتی باندھے ہوئے تھا۔

رحیم داد نہا دھوکر کوٹھری میں گیا۔ وہاں مونج کی چٹائی بچھی تھی۔ دارا نے اس عرصے میں روٹی پکالی تھی۔ گاؤں کے کسی گھر سے لسی بھی لے آیا تھا۔ اس نے روٹی اور لسی رحیم داد کے سامنے چٹائی پر رکھ دی۔ دونوں نے ناشتا کیا۔ دارا ناشتے کے بعد لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ ذرا دیر بعد گہری نیند سوگیا۔ رحیم داد کو نیند نہیں آئی، وہ لیٹا بھی نہیں۔ صحن میں بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ پہر دن گزرا تو اس نے باہر کھلنے والے دروازے کی کنڈی لگائی اور چٹائی پر لیٹ کر کروٹیں بدلتا رہا، پھر وہ بھی سوگیا۔

دوپہر کو دارا نے رحیم داد کو بیدار کیا۔ کھانے کے لیے اصرار کیا۔ مگر رحیم داد کو مطلق بھوک نہ تھی۔ دارا نے اکیلے ہی کھانا کھایا۔ بچی ہوئی روٹی چنگیری میں رکھ کر چھت سے لٹکے ہوئے چھینکے میں رکھ دی۔

دارا نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ "میں مولا داد کے گھر جا رہا ہوں۔ اس ٹیم بیگماں اکیلی ہوگی۔ اس سے تیرے بارے میں بات کروں گا۔"

"واپسی پر ادھر ہی آئے گا نا؟"

"ہاں جی، ادھر ہی آؤں گا۔" دارا نے جواب دیا۔ "پر تو آرام کر۔ بھوک لگے تو روٹی کھالینا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر چھینکے کی طرف اشارہ کیا۔ "روٹی کے ساتھ سرسوں کا ساگ بھی ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "میں باہر سے دروازے کی کنڈی چڑھا دوں گا۔"

دن ڈھلے دارا واپس آیا۔ اس کے قدموں کی آہٹ سے رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دارا بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ دھوپ میں چل کر آیا تھا، پسینے سے اس کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "بیگماں سے تیری بات ہوئی؟"

"ہاں جی، ہوئی تھی۔" دارا نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے بتایا۔ "مولا داد گھر پر نہیں تھا۔ وہ فصل کی واڈھی کی تیاری میں لگا ہے۔ بیگماں اکیلی تھی۔"

"تب تو آرام سے گل بات کرنے کا موکع ملا ہوگا۔"

"ہاں، بات تو اس سے آرام ہی سے ہوئی۔" دارا کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔

رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ "تیری بات سن کر وہ کیا بولی؟ لگتا ہے، کام بنا نہیں؟"

"بات تو اس نے میری پوری سنی پر وہ تجھے پہچان نہیں سکی۔ کچھ دیر سوچتی رہی فیر کہنے لگی، مجھے کچھ پتہ نہیں۔ جانے کون ہے۔ میں اس کے پاس کیسے جا سکتی ہوں۔"

"لگتا ہے اسے پوری طرح سمجھا نہیں سکا۔"

"تجھے کیا پتہ' میں نے اسے کس کس طرح سمجھانے کی کوشش کی۔ " دارا نے اپنی کارگزاری سنائی۔ "وہ تو اپنے بھرا کو یاد کرتی رہی اور روتی رہی۔ "

"اسے یہاں لانے کی کوشش نہیں کی؟"

"میں نے تو بار بار کہا۔ " دارا نے صفائی پیش کی۔ "یہاں تک کہا' ایک بار چل کر مل تو لے۔ اس نے کوئی ضروری گل بتانی ہے۔ پر اس نے صاف انکار کر دیا۔ کسی طرح یہاں آنے پر راضی نہیں ہوئی۔ "

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیگماں سے ملنا نہیں ہو سکتا۔ " رحیم داد کے لہجے میں مایوسی اور افسردگی تھی۔

"کیوں پریشان ہوتا ہے۔ " دارا نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ "تو اس کے بھلے ہی کی کوئی گل بتانا چاہتا ہوگا۔ وہ نہیں سننا چاہتی تو چھوڑ اسے۔ خاماخاہ جی خراب کرنے سے کیا فائدہ۔ "

"بات اس طرح نہیں ہے جیسے تو سوچ رہا ہے۔ " رحیم داد نے بیگماں سے ملاقات کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "مرنے والے سے میں نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنا چاہتا تھا۔ بیگماں سے گل بات ہو جاتی تو میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ "

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ " دارا نے اس کی تائید کی۔ "اب میں تجھے اصلی گل بتاتا ہوں۔ ہوا یوں کہ پہلے تو وہ یہاں آنے کو کچھ کچھ تیار تھی۔ اچانک اس نے تیرا نام پوچھا۔ میں نے وہی کہا جو تو نے بتایا تھا۔ بس جی تیرا نام نہ بتانے پر وہ ایک دم اکھڑ گئی۔ کہنے لگی' جانے کون ہے۔ میں اس کے پاس نہیں جاتی۔ اس نے انکار کر دیا اور مجھے شک بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ "

چند لمحے بعد رحیم داد نے بیزاری سے کہا۔ "اب اس کا ذکر چھوڑ۔ آگے کی سوچ۔ "

"آگے کی تو تجھے سوچنا ہے۔ مجھے کیا سوچنا۔ کہہ تو دوبارہ بیگماں سے بات کر لوں؟ شاید مان جائے۔ "

"تیرا خیال ہے وہ مان جائے گی؟"

"مشکل ہی لگتا ہے۔ " دارا نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ویسے کوشش کر کے تو دیکھنا ہی چاہیے۔ بول کیا کہتا ہے؟"

"ایک بار اور کوشش کر لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ " رحیم داد نے اس سے اتفاق کیا۔ "میں یہاں ایک روز اور ٹھہر جاؤں گا۔ "

"آج تو اس کے پاس جانا ٹھیک نہیں۔ کل دوپہر کو جاؤں گا۔ دوپہر کو وہ گھر میں اکیلی ہ[illegible]۔ "

رحیم داد نے ایک بار پھر دارا کو سمجھایا کہ وہ بیگماں سے کس ڈھب سے بات کرے۔ دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ رحیم داد نے کھانا کھایا۔ کپڑے اب سوکھ گئے تھے۔ رحیم داد نے لباس تبدیل کیا۔

شام ہو گئی۔ دارا فصلوں کی رکھوالی پر چلا گیا۔ رحیم داد اکیلا رہ گیا۔

☆

دوسرے روز دوپہر کو دارا ایک بار پھر بیگماں کے گھر گیا۔ رحیم داد بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر دارا جب واپس آیا تو سورج ڈوب چکا تھا۔ شام دھیرے دھیرے نیچے اتر رہی تھی۔ دارا کا لٹکا ہوا چہرہ دیکھ کر رحیم داد کو اندازہ ہو گیا کہ اس دفعہ بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ دارا تھکا ہوا سا رحیم داد کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے بات چیت نہیں کی۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اندھیرا بڑھتا رہا۔

کچھ دیر بعد رحیم داد کی آواز خاموشی میں ابھری۔

"لگتا ہے' بیگماں نے آج بھی تیری بات نہیں مانی۔ "

"ہاں جی' بالکل نہیں مانی۔ " دارا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کہتی تھی' اسے مجھ سے کوئی بات کہنی ہے تو وہ میرے پاس کیوں نہیں آتا۔ تجھے بار بار کیوں بھیجتا ہے؟"

"تو نے کیا کہا؟"

"مجھے کیا کہنا تھا جی! اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ "

"لگتا ہے ٹھیک سے سمجھا نہیں سکا۔ " رحیم داد گلہ کرنے کے انداز میں بولا۔

"ایسا نہ کہہ۔ " اس دفعہ دارا کے لہجے میں قدرے تیکھا پن تھا۔ "تجھے کیا پتہ' میں نے اسے کس کس طرح سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ "

"پر ایسی کیا بات ہے کہ وہ یہاں آنے پر تیار نہیں ہوئی؟"

"مجھے تو ایسا لگا وہ مجھ پر شبہ کرنے لگی ہے۔ "

"تو برا بندہ تو نہیں لگتا۔ اس نے تیرے بارے میں ایسا کیوں سوچا؟"

"ویسے تو پنڈ میں سبھی مجھے نیک بندہ سمجھتے ہیں۔ " دارا نے صفائی پیش کی۔ "اسے کیوں شبہ ہوا؟ یہ تو وہی جانتی ہوگی۔ "

"اب تک بیگماں کے پاس بیٹھا تھا؟"

"نا جی! اس نے زیادہ بات ہی نہیں کی۔ میں نے کئی بار اپنی بات دہرائی تو ایک دم بھڑک اٹھی۔ ناراض ہو کر بولی' تو نے منع کیا تھا اس لیے میں نے گھر والے سے تیرے بارے میں بات نہیں کی۔

پر اب ایسی بات کہنے میرے پاس آیا تو اسے صاف صاف کہہ دوں گی۔ تجھے پتہ ہے اس کا غصّہ کتنا خراب ہے۔ ویسے وہ دیکھنے میں سیدھا سادہ لگتا ہے پر جب غصّہ آجائے تو پاگل ہو جاتا ہے۔ میں یہ بات سن کر گھبرا گیا۔ چپ کر کے اپنے زمیں دار کے پاس چلا گیا۔ وہیں سے آرہا ہوں۔ تیرے لیے روٹی بھی وہیں سے لایا ہوں۔”

دارا نے کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیاں نکال کر رحیم داد کے سامنے رکھ دیں۔ اٹھا اور ماچس جلا کر چراغ روشن کردیا۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ وہ اس قدر دل گرفتہ تھا کہ آدھی روٹی کھانے کے بعد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ دارا کے اصرار کے باوجود اس نے اور کھانا نہیں کھایا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔

“جس کام کے لیے آیا تھا' وہ تو بنا نہیں۔ مجھے اب واپس جانا ہے۔”

“اب تو اندھیرا ہو گیا۔ جانا ہے تو سویرے چلا جانا۔”

“تو کہتا ہے تو سویرے چلا جاؤں گا۔”

دارا کھانے سے فارغ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ “اب آرام سے سو' میں نوں جانا ہے۔”

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ دارا چلا گیا۔ رحیم داد اٹھ کر آنگن میں گیا۔ چارپائی پر کھیس بچھایا۔ چراغ بجھایا اور لیٹ گیا۔

وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور رات کے تاریک ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اسے رات ہی کو دارا کے گھر سے جانا تھا۔ دن کے اجالے میں نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا' مگر سوال یہ درپیش تھا کہ وہ ڈھولا امیر خاں سے جاتا کہاں؟ صرف بیگماں کا گھر ہی محفوظ ٹھکانا تھا جہاں وہ روپوش رہ سکتا تھا۔ حالات نے ایسے دھارے پر ڈال دیا تھا کہ وہ اپنی اکلوتی بہن سے بھی نہیں مل سکتا تھا۔ اپنی مجبوری اور بے بسی پر اس کا دل بھر آیا۔ بے قرار ہو کر وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کے سینے سے غم کا غبار دھواں بن کر اٹھا' آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور رخساروں پر ٹپکنے لگے۔

وہ سسکیاں بھرتا رہا۔ رات کا اندھیرا بڑھ کر پھیلنے لگا۔ رحیم داد نے قمیص کے دامن سے آنسو پونچھے' چارپائی سے نیچے اترا۔ گھڑے سے پیالے میں پانی انڈیلا اور ہونٹوں سے لگا کر غٹاغٹ چڑھا گیا۔

اس کے دل کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو چکا تھا۔ وہ صحن میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے اس نے سوچا کہ دارا کے بجائے اسے خود بیگماں کے پاس جانا چاہیے تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوتا کہ مولا داد سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔ مولا داد اپنے باپ کی طرح نہ ضدی ہے نہ اس سے شدید نفرت کرتا ہے۔

بری کے ساتھ شادی نہ کرنے کا مولا داد کو ملال ضرور تھا۔ رحیم داد سے اس کا اظہار بھی کر چکا تھا رده پولیس سے مخبری کر کے اس کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس کا بڑا سبب بیگماں ی جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔

رحیم داد نے طے کیا کہ اسے بیگماں کے پاس جانا چاہیے۔ مولا داد مل جائے تو اسے اپنے بارے ں صاف صاف بتا دینا چاہیے۔ رحیم داد کو امید تھی کہ وہ اس کی ضرور مدد کرے گا۔ باپ کے ڈر ے اگر اپنے پاس نہ ٹھہرا سکے گا تو کسی قابل اعتماد دوست کے پاس بندوبست کردے گا۔ اسے مولا ادے خیر کی توقع تھی' شر کی نہیں۔ رحیم داد نے بہت غور و فکر کے بعد اسی وقت بیگماں کے گھر انے کا منصوبہ بنایا۔ آگے بڑھا اور دروازے پر پہنچ گیا۔

اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر باہر سے کنڈی چڑھی تھی۔ رحیم داد چند لمحے جھنجلایا ہوا کھڑا رہا پھر اس نے چارپائی اٹھا کر دیوار سے ٹکائی۔ اس کے سہارے دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف اتر گیا۔ قریب ہی جھنگر تھا۔ جھاڑیوں میں جھینگر بول رہے تھے۔ رات جاگ رہی تھی۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے چل رہے تھے۔

☆

رحیم داد بستی کی جانب بڑھا۔ وہ راستوں سے بخوبی واقف تھا۔ بارہا ڈھولا امیر خاں آچکا تھا' کئی کئی روز قیام کر چکا تھا۔ سنسان گلیوں سے گزرتا ہوا وہ بیگماں کے گھر کے دروازے پر بے کھٹکے پہنچ گیا۔ گلی ویران تھی۔ قریب ہی کسی گھر میں کوئی بچہ رو رہا تھا۔ لیکن بیگماں کے گھر پر گہری خاموشی طاری تھی۔

رحیم داد دم بخود اور سہما ہوا تھا۔ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور دستک دینے کی غرض سے ایک ہاتھ بڑھا کر دروازے پر رکھا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ ہاتھ رکھتے ہی دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ اسی وقت گلی میں چاپ ابھری۔ رحیم داد نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ جھٹ اندر داخل ہو گیا اور دروازہ بھیڑ دیا۔ سامنے کشادہ صحن تھا۔ دو چارپائیاں پڑی تھیں۔ ایک چارپائی پر دو بچے گہری نیند سو رہے تھے۔ دوسری خالی تھی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ رحیم داد نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

باورچی خانے میں چراغ روشن تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی صحن تک پھیلی ہوئی تھی۔ باورچی خانے سے ملا ہوا برآمدہ تھا۔ باورچی خانے اور برآمدے کے درمیان دیوار کے ساتھ کھرا تھا۔ یہ پختہ چبوترا تھا۔

رحیم داد نے دیکھا' بیگماں سر جھکائے کھرے پر بیٹھی برتن دھو رہی ہے۔ اس کی پیٹھ رحیم داد کی جانب تھی۔ وہ دبے دبے قدموں بیگماں کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا تو اس کا سایہ دیوار پر لہرایا۔ بیگماں نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں استعجاب تھا۔ وہ کھڑی ہوگئی۔

"کون ہے؟"

اس کے لہجے میں گھبراہٹ اور سراسیمگی تھی۔ رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیگماں کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔ بیگماں نے دھندلی روشنی میں رحیم داد کا چہرہ دیکھا اور ایک دم پریشان ہو کر بولی۔ "توں' توں..... " اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چہرے پر خوف چھایا تھا۔

رحیم داد نے رسان سے کہا۔ "میں رحیے ہوں' تیرا دیر۔"

"نہیں' نہیں۔" اس نے انکار کرنے کے انداز میں جلدی جلدی گردن ہلائی۔ "توں رحیے کیسے ہو سکتا ہے۔ میرا دیر تو مر چکا ہے۔ توں.... " اس کے چہرے سے اور زیادہ وحشت برسنے لگی۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ پھاڑا۔ رحیم داد نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "ڈر نہیں' میں رحیے ہی ہوں۔ میں مرا نہیں' زندہ ہوں۔ تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "بیگماں! تو بھی مجھے نہیں پہچان سکی۔ میرے منہ کی طرف دیکھ۔ میں تجھے رحیے نہیں لگتا؟" اس نے بیگماں کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا۔ اس کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔

وہ بدستور خوف زدہ تھی۔ الجھے ہوئے لہجے میں اٹک اٹک کر بولی۔ "لگتا تو رحیے ہی ہے پر..... "

رحیم داد نے اس کی بات کاٹ دی۔ "پہلے یہ بتا' مولا داد کہاں ہے؟"

"وہ چک ۱۹ گیا ہے۔" اس دفعہ بیگماں کا لہجہ قدرے سنبھلا ہوا تھا۔ "مجھے یکین نہیں آتا تو رحیے ہے۔"

رحیم داد نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "تیرے سر کی سونہہ' میں رحیے ہی ہوں۔ تیرا ماں جایا' تیرا دیر۔ میری آواز نہیں پہچانتی؟ میں مرا نہیں۔ جو مرا ہے' وہ کوئی اور تھا۔ وہ کسی اور کی لاش تھی۔ ایسا ہوا تھا کہ..... " اچانک گلی سے آواز ابھری۔

"بھابو! او بھابو۔"

بیگماں نے رحیم داد کو آہستہ سے دھکا دیا اور کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی جانب اشارہ کر کے بولی۔ "اندر چلا جا۔" رحیم داد تیزی سے لپکا اور کمرے میں چلا گیا۔

بیدی دروازہ کھول کر صحن میں داخل ہوئی۔ اس کی نگاہیں بیگماں کی طرف تھیں۔ بیگماں اسے دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بیدی اس وکت کیسے آ گئی۔ سوئی نہیں ابھی؟"

اس نے بیگماں کی بات نظر انداز کرتے ہوئے مولا داد کے بارے میں پوچھا۔ "کیا ویر لوٹ آیا؟"

"نہیں۔" بیگماں نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "وہ تو سویرے لوٹے گا۔ یہی کہہ کر گیا تھا۔"

بیدی اس کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔ "فیر تو کس سے گل کر رہی تھی؟"

"لے' میں نے کس سے گل کرنی تھی۔" بیگماں نے اپنی گھبراہٹ کی پردہ پوشی کے لیے مسکرانے کی کوشش کی۔ "وہم تو نہیں ہوگیا؟"

"میں تو سو گئی تھی۔ ایسا لگا' تو کسی سے گل بات کر رہی ہے۔" بیدی نے وضاحت کی۔ "میں نے سوچا' ویر ن آگیا ہے۔ اس سے کہنا تھا' سویرے مجھے کوٹ بہادر پہنچا دے۔ گھر والے کی طبیعت گڑ بڑ ہے۔ میں نوں کل واپس جانا ہے۔"

"تیرا بھرا تو اب سویرے ہی آئے گا۔ تیں نوں تو پتہ ہی ہے۔ اللہ داد بھی اس کے ساتھ ہی گیا ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی کل تیرے گھر پہنچا دے گا۔ اب تو جا کر آرام سے سو۔ ویسے میں مولا داد کو بتا دوں گی۔ تیں نوں واپس گھر جانا ہے۔"

بیدی خاموش رہی۔ اس نے نظریں اٹھا کر برآمدے میں کھلنے والے دروازے کی جانب دیکھا جس کے پیچھے رحیم داد اندھیرے میں سہما ہوا کھڑا تھا۔ وہ چند لمحے چپ چاپ کھڑی رہی پھر مڑی اور آہستہ آہستہ بیرونی دروازے کی جانب بڑھی۔

بیگماں نے اُسے روکنے کی کوشش کی نہ کوئی بات کی۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی گھبراہٹ چھائی تھی۔ بیدی باہر چلی گئی۔ بیگماں نے ہاتھ دھوئے اور اپنی دھوتی سے پونچھے' چبوترے سے اتری۔ اس نے گلی میں کھلنے والا دروازہ بند کیا۔ باورچی خانے میں گئی' لالٹین روشن کی اور اسے ایک ہاتھ میں لٹکائے ہوئے کمرے میں گئی۔ رحیم داد دروازے کے قریب خاموش کھڑا تھا۔ بیگماں نے لالٹین اٹھا کر رحیم داد کا چہرہ غور سے دیکھا۔

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تجھے اب تک شبہ ہے میں تیرا دیر رحیے نہیں ہوں؟"

"دیکھنے میں تو رحیے ہی لگتا ہے۔" بیگماں نے دبی زبان سے بے یقینی اور تذبذب کا اظہار کیا۔ "میں مولا داد کے ساتھ احمد کوٹ گئی تھی۔ لاش تو دیکھی نہیں پر سب تیرا ہی نام لیتے تھے۔ پولیسے بھی یہی کہتے تھے رحیم داد کو کتل کر دیا گیا۔ بھابی تو وہاں تھی نہیں۔ جانے کہاں چلی گئی۔ پنڈ والوں

نے لاش دفن کی' کبر بنائی۔ میں کبر پر گئی' اسے دیکھا اور چیخیں مار کر روئی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"توں نہیں تھا تو وہ کس کی لاش تھی؟ کسے دفن کیا گیا تھا؟"

"میں تجھے یہی بتا رہا تھا کہ بیدی آگئی۔ وہی تھی نا؟"

"ہاں وہی تھی۔ وہ کئی روز سے یہیں ہے۔"

"وہ کسی اور بندے کی لاش تھی۔" رحیم داد نے بیگماں کو مطلع کیا۔ "وہ ادھر نہر باری دو آب کے پاس ٹبوں میں مرگیا تھا۔ میں نے اس کے کپڑے اتار کر پہن لیے' اپنی جیل کی وردی اسے پہنا دی۔ تجھے یہ تو پتہ ہی ہوگا' میں جیل سے فرار ہوگیا تھا۔ پولیس سے چھپتا لکتا پھرتا تھا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "میں نے لاش کا منہ پتھر سے اس طرح کچل دیا تھا کوئی پہچان نہ سکے۔ جیل کی وردی سے سب کو یہی دھوکا ہوا وہ میری لاش ہے۔"

"سچ کہہ رہا ہے؟" بیگماں نے تڑپ کر پوچھا۔ "ہاں' تو رحیے ہی ہے۔ وہی آنکھیں' ویسی ہی آواز' ہائے ربّا' میرا ویر زندہ ہے۔" وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر بے اختیار رونے لگی۔ رحیم داد کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ اس کے سر پر شفقت سے آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ دونوں سسکیاں بھرتے رہے۔

کچھ دیر بعد رحیم داد نے آنسو پونچھے۔ آہستہ سے بولا۔ "رونا دھونا بند کر بیگماں! مجھے تجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

بیگماں نے علیحدہ ہوتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا دارا کو توں نے ہی میرے پاس بھیجا تھا؟"

"ہاں' میں نے ہی بھیجا تھا۔"

"ہائے' میں مرگئی۔" بیگماں نے پشیمانی کا اظہار کیا۔ "میں نے سوچا' جانے کون ہے؟ کیوں بلاتا ہے؟ تیرا یار بیلی بتا کر اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ میں تو واپسی پر مولا داد کو بھی بتانا چاہتی تھی۔"

"یہ ٹھیک کیا کہ مولا داد کو نہیں بتایا۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "بات یہ ہے' میں ابھی تک پولیس سے چھپتا پھر رہا ہوں۔ اگر پولیس نے مجھے پہچان لیا تو میں فیر جیل میں بند کردیا جاؤں گا۔ اس بار میرے خلاف جیل سے فرار ہونے کے علاوہ کتل کا مکدمہ بھی چلے گا۔"

"جس کی لاش کو توں نے اپنی جیل کی وردی پہنائی تھی۔" بیگماں نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا اسے توں نے کتل بھی کیا تھا؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے حکیم نذر محمد چشتی کے قتل کا اعتراف نہیں کیا۔ "پر سیف اللہ' جس کے ساتھ جھگڑے میں مجھے جیل ہوئی تھی' تجھے پتہ ہے' بعد میں اسپتال میں مرگیا۔ پولیس اسے کتل کتی ہے۔ اس نے میرے خلاف کتل کا مکدمہ بھی بنالیا ہے۔"

"اب کیا ہوگا؟" بیگماں کی آنکھوں میں خوف تھا۔

"میں تیرے گھر چھپنے آیا ہوں۔ مولا داد تو مان جائے گا پر چاچا سے ڈر لگتا ہے۔ وہ مجھ سے بہت زاض ہے۔"

"چاچا سے بھی زیادہ بیدی نراض ہے۔ ہمیشہ تجھے برا بھلا کہتی ہے۔ میرا کتنی بار اس سے جھگڑا ہوا۔ وہ سمجھتی ہے' توں نے ویاہ نہ کرکے اس کی بے عزتی کی۔ تیرا ذکر آتا ہے تو اس کا منہ لال ہوجاتا ہے۔"

"میں نے اس سے ویاہ نہ کرکے برا کیا۔" رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ "نوراں کے لیے میں نے بیدی اور چاچا کو اتنا نراض کیا پر وہ میری نہ بن سکی۔ بے وفا اور دھوکے باز نکلی۔"

بیگماں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر استفسار کیا۔ "کیا بھابی کے پاس گیا تھا؟"

"ہاں' پہلے میں اسی کے پاس گیا تھا۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ جمال دین کے ساتھ رہتی ہے۔ جب میں جیل میں تھا' تبھی سے اس نے جمال دین سے یاری لگالی تھی۔"

"تب تو وہ پولیس سے تیرے خلاف مخبری کرسکتی ہے۔"

"نہیں' میں رات کے اندھیرے میں چھپ کر اس کے پاس گیا تھا۔ نہ میں اسے ملا' نہ بات کی۔ اس نے مجھے دیکھا بھی نہیں۔"

"اب وہ کہاں رہتی ہے؟"

"اکال گڑھ میں جمال دین کے ساتھ رہتی ہے۔" رحیم داد کے لہجے میں تلخی پیدا ہوگئی۔ "اس کنجری کو پتہ چل گیا تو مجھے پکڑوا دے گی۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "تیرے گھر کے علاوہ مجھے چھپنے کا کوئی ٹھکانا نظر نہیں آتا۔ چھپا چھپا پھرتا ہوں۔ ہر دم خطرہ سر پر منڈلاتا ہے۔ جب ہر طرف سے یوس ہوگیا تو تیرے پاس آگیا۔"

قریب کے گھر سے رات کے سناٹے میں کوئی رک' رک کر کھانسنے لگا۔ بیگماں نے پریشان ہوکر کہا۔ "لگتا ہے' چاچا جاگ رہا ہے۔ وہ ادھر بھی آسکتا ہے۔"

"تب تو مجھے چلا جانا چاہیے؟"

"دارا ہی کے گھر جائے گا ناں؟" بیگماں نے دریافت کیا۔ "وہ بتاتا تھا' توں اس کے گھر میں ٹھیرا ہے؟"

"ہاں' میں اسی کے گھر میں ہوں۔"

"وہاں جاکر سو۔ میں سویرے مولا داد سے تیرے بارے میں بات کروں گی۔ وہ میرا کہنا نہ ٹالے گا۔ اللہ داد بھی مان جائے گا۔ وہ برا بندہ نہیں ہے صرف چاچا کو منانا پڑے گا۔ بیدی کا ہے' وہ تو کل اپنے گھر جا رہی ہے۔ مہینوں بعد آتی ہے۔"

"میں کل رات کو آجاؤں گا۔"

"نہیں' تیرا آنا ٹھیک نہیں۔" بیگماں نے منع کردیا۔ "میں مولا داد کو تیرے پاس بھیجوں گی۔ ویسے وہ آج کل فصل کی واڈھی کی فکر میں لگا ہے۔ وہ واڈھی کے لیے لاوے لانے اللہ داد کے ساتھ چک ۱۹ گیا ہے۔"

"میں دارا کے گھر میں مولاداد کا انتظار کروں گا۔"

بیگماں خاموش رہی۔ رحیم داد آگے بڑھا۔ بیگماں اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دونوں کمرے سے نکل کر صحن میں پہنچے۔ بیگماں نے آگے بڑھ کر کنڈی کھولی' گردن باہر نکال کر گلی میں جھانکا اور رحیم داد کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

رحیم داد گلی میں آگیا۔ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

رات گہری ہوگئی تھی۔ گاؤں سنسان تھا۔ دور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد اس سمت نہیں گیا۔ گلیوں سے گزرتا ہوا کھیتوں کی طرف نکل گیا مگر دارا کے پاس جانے کے بجائے اس کے گھر پہنچا۔ کنڈی باہر سے لگی ہوئی تھی۔ رحیم داد اندر گیا' دروازہ بند کیا اور زنجیر چڑھا دی۔

سویرے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دارا سامنے کھڑا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ دروازے کی کنڈی لگائی۔ وہ حیرت زدہ اور پریشان نظر آ تھا۔ اس نے رحیم داد سے پوچھا۔

"رات تیرے پاس کوئی آیا تھا؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے انکار میں گردن ہلائی۔

"باہر سے دروازے کی کنڈی کیسے کھل گئی؟ میں شام کو کنڈی چڑھا کر گیا تھا۔ مجھے صاف صا بتا۔"

"میں رات بیگماں کے گھر گیا تھا۔ باہر سے دروازہ بند تھا۔ مجھے دیوار پھاند کر باہر جانا پڑا۔"

"توں دیوار بھی پھاند سکتا ہے؟" دارا نے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

رحیم داد نے اس کا شبہ دور کرنے کی غرض سے وضاحت کی۔ "میں نے منجی دیوار سے لگائی۔ پر چڑھا اور باہر کود گیا۔ واپسی پر میں کنڈی کھول کر اندر آیا تھا۔ پر مجھ سے ایسی باتیں کیوں پوچھ ہے؟"

دارا نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "بیگماں کے گھر گیا تھا' کوئی گڑبڑ تو ں ہوئی؟"

"نہیں۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ میں نے جو کچھ کہنا تھا' کہہ دیا۔"

"یہ تو بہت ہی ٹھیک ہوا۔ بیگماں نے تجھے ملنے سے انکار کیا تو مجھے بڑا دکھ ہوا تھا۔" دارا نے یم داد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ "اب تیرا کیا ارادہ ہے؟"

"میں ابھی یہیں ٹھیروں گا۔" رحیم داد نے اسے آگاہ کیا۔ "مولا داد میرے پاس آئے گا۔"

"مولاداد تیرے پاس آئے گا۔" دارا کے لہجے میں تعجب تھا۔ "وہ کیوں آرہا ہے؟ تجھے اس سے لینا؟" وہ لمحے بھر خاموش رہا۔ "تیرے پاس تو بیگماں کو آنا چاہئے۔ تجھے تو اسی سے ملنا ہے۔" ا نے شوخی سے آنکھ ماری۔ "تو مجھ سے چھپا رہا ہے۔ پہلے کچھ اور ہی گل کی تھی۔"

"تجھے ابھی تک میرے بارے میں شبہ ہے؟" رحیم داد نے اسے ایک بار پھر مطمئن کرنے کی شش کی۔ "میں نے تجھ سے کچھ نہیں چھپایا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا دیا' تجھے میری باتوں پر بار نہیں آتا؟ اگر کوئی ایسی ویسی گل ہوتی تو مولا داد میرے پاس کیوں آتا؟ اپنے دل سے شبہ نکال ے۔"

"تو ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔" دارا نے مطمئن ہونے کے انداز میں کہا۔ "میں نوں کیہ لینا ہے۔ مجھے خوشی ہے تیرا کام بن گیا۔ توں جو چاہتا تھا وہ ہوگیا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ دارا روٹی پکانے جھلیانی میں چلا گیا۔

دونوں نے ناشتا کیا۔ دارا رات بھر کا جاگا ہوا تھا ناشتے سے فارغ ہوتے ہی سوگیا۔ رحیم داد نے اسے کاغذات کا بستہ کھولا۔ ایک سادہ کاغذ نکالا۔ چوہدری نورالٰہی مرحوم کے دستخط سامنے رکھے ان کی نقل بنانے کی مشق کرنے لگا۔ فرصت کے لمحات میں وہ چوہدری نورالٰہی کے جعلی دستخط نے کی کوشش کرتا تھا۔ جب سے نورالٰہی کے کلیم کے دستاویزات اس کے قبضے میں آئی تھیں' نہ کاٹنے کے لیے یہ اس کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔

دارا سہ پہر کو بیدار ہوا۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر جانے کے لیے تیار ا۔ رحیم داد سے اس نے کہا۔ "تجھے روٹی کھانی ہو تو چھینکے سے اتار لینا۔ سویرے کی بچی ہوئی

روٹی اس میں رکھی ہے۔"

"تجھے روٹی نہیں کھانی؟"

"نہیں' میں زمیں دار کی حویلی جاؤں گا۔ اس نے مجھے بلایا ہے۔ وہیں روٹی کھالوں گا۔"

"شام کو تو واپس آئے گا نا؟"

"اب کل سویرے ہی تجھ سے ملنا ہوگا۔ مجھے زمیں دار کے یہاں کچھ کام کرنا ہے۔ حویلی سے سیدھا رکھوالی کے لیے کھیتوں کی طرف چلا جاؤں گا۔" دارا نے توقف کیا۔ "تجھے رات کو تو یہاں سے جانا نہیں۔ جائے گا تو سویرے ہی جائے گا نا؟"

"رات کو جاؤں یا سویرے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تجھے مل کر ہی جاؤں گا۔"

دارا بھی مسکرایا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے کنڈی لگائی' بستے سے کاغذات نکالے اور ایک بار پھر چوہدری نورالٰہی مرحوم کے جعلی دستخط بنانے کی مشق کرنے لگا۔

دن ڈھلا' سائے طویل ہوگئے۔ اپریل کے صاف ستھرے نیلے آسمان کی رنگت دھندلی ہوتی گئی۔ رحیم داد بار بار نظریں اٹھا کر دروازے کی جانب دیکھتا۔ اس کے کان آہٹ پر لگے تھے۔ دن ختم ہوا۔ شام نیچے اترنے لگی۔ مگر دروازے پر کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ گھر میں اندھیرا پھیل گیا۔ رحیم داد نے چراغ روشن نہیں کیا۔ روشنی دور سے نظر آتی تھی جو صاف چغلی کھاتی کہ گھر میں کوئی موجود ہے۔ رحیم داد یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بیگماں سے ملنے کے بعد اسے خوشی حاصل تھی' اطمینان ملا تھا۔ مگر ساتھ ہی خطرہ بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ ہر خطرے سے بچنے کے لیے پوری پوری احتیاط برتنا چاہتا تھا۔

☆

شام تاریک ہوگئی۔ رات آگئی۔ رحیم داد اندھیرے گھر میں خاموش بیٹھا رہا۔ یکایک دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ رحیم داد نے چونک کر اس طرف دیکھا' اٹھا اور آہستہ آہستہ دروازے پر پہنچا۔ آہٹ رک رک کر ابھرتی رہی۔

اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "کون ہے؟" کوئی جواب نہ ملا۔ چند لمحے تک خاموش رہی۔ رحیم داد نے پگڑی کھولی۔ چہرہ چھپانے کے لیے ڈھاٹا باندھا۔ جیب سے چاقو نکالا' کھول کر ہاتھ میں ہوشیاری سے سنبھالا۔ کنڈی آہستہ سے کھولی اور پوری طرح چوکس ہو کر کھڑا ہوگیا۔

دروازہ کھلا مگر وہ مولا داد نہیں تھا۔ بیگماں دہلیز پر کھڑی تھی۔ وہ اندر آگئی۔ رحیم داد نے پھر کنڈی لگا دی۔ بیگماں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہاں تو بہت اندھیرا ہے۔ توں نے روشنی بھی نہیں کی؟"

"یہ بتا' تو کیسے آگئی؟ مولا داد کیوں نہیں آیا؟"

"وہ آج بھی لاوے لینے چک ۱۹ گیا ہے۔ پر توں نے منہ پر منڈاسا کیوں باندھ رکھا ہے؟ ہاتھ میں چاکو بھی دبا ہے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"

"تجھے کیا پتہ' مجھے ہر دم کتنا ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔" وہ مسکرایا اور ڈھاٹا کھولتے ہوئے بولا۔ "اتھے منجی پر بیٹھ جا۔"

دونوں چارپائی کے پاس گئے اور ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ بیگماں کے ہاتھ میں پوٹلی دبی تھی۔ رحیم داد نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"تیرے لیے روٹی لائی ہوں۔" اس نے پوٹلی کھول کر کھانا نکالا۔ "تیز خوشبو ابھری۔ بیگماں نے گرم گرم پراٹھے اور تلا ہوا مرغ رحیم داد کے آگے رکھ دیا۔ پیار بھرے لہجے میں بولی۔ "پہلے روٹی کھالے' بعد میں گل بات ہوگی۔"

رحیم داد آلتی پالتی مار کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بھوکا بھی تھا۔ کئی روز بعد اتنا اچھا کھانا ملا تھا۔ پراٹھے کے لقمے توڑ توڑ کر جلدی جلدی کھانے لگا۔ بیگماں ہنس کر بولی۔

"بہت بھوکا لگتا ہے۔"

رحیم داد نے مرغ کی ٹانگ سے گوشت نوچتے ہوئے کہا۔ "پرونٹھے بہت مزے دار ہیں' ککڑ بھی زوردار تلا ہے۔" اس نے گھڑے کی طرف اشارہ کیا۔ "پینے کو پانی دے دے۔"

بیگماں اٹھی' اس نے پیالے میں پانی انڈیلا۔ پیالہ لا کر رحیم داد کو دیا۔ اس نے چند گھونٹ پیئے اور پیالہ سامنے رکھ دیا۔

رحیم داد نے بیگماں کی جانب دیکھا۔ وہ زمیں داروں کی عورتوں کی طرح ریشمی قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹا بھی ریشمی تھا۔ بالوں میں خوشبو دار تیل پڑا تھا' آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ وہ غسل کر کے عمدہ لباس پہن کر آئی تھی۔ بیگماں نے پوچھا۔

"کیا دیکھ رہا ہے؟"

"تو نے بہت بناؤ سنگھار کر رکھا ہے۔"

"تجھے کیا پتہ' میں رات سے کتنی خوش ہوں۔ یہ جان کر' توں زندہ ہے' مجھے اتنی خوشی ہوئی' اتنی خوشی ہوئی' بس کیا بتاؤں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "میرا ایک ہی ویر ہے۔ تیرے سوا میرا اور کون

ہے؟ میں نہ خوش ہوں گی تو کون ہو گا؟" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

"لے' تو نے تو رونا بھی شروع کر دیا۔" رحیم داد نے گفتگو کا رخ بدلا۔ "یہ بتا' مولا داد کیوں نہیں آیا؟ میرے بارے میں اس سے بات کی تھی؟"

"نہیں۔" بیگماں نے جواب دیا۔ "تیرے بارے میں ابھی تک اس سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ سویرے وہ آیا تو اللہ داد بھی اس کے ساتھ تھا۔ اللہ داد کے سامنے تو ایسی بات کر نہیں سکتی تھی۔"

"بعد میں کر لیتی۔"

"دونوں ساتھ ساتھ آئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ چلے گئے۔ مولا داد دوپہر کو روٹی کھانے آیا تھا پر تھوڑی دیر ٹھیرا۔ روٹی کھاتے ہی باہر چلا گیا۔ وہ اپنے پیو کے پاس گیا تھا۔ دن ڈھلے تک وہیں بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ سب فصلوں کی واڈھی کی تیاری میں لگے ہیں۔ کل سویرے نہیں تو پرسوں سے واڈھی شروع ہو جائے گی۔ اب زیادہ دیر نہیں کی جا سکتی۔ بیساکھی شروع ہو چکی ہے۔ ہر طرف فصلوں کی واڈھی ہو رہی ہے' جبھی تو واڈھی کرنے والے لاوے مل نہیں رہے۔ مولا اور اللہ داد اسی لیے تو روز روز لاووں کو بلانے کے لیے ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔"

"جب مولا داد روٹی کھانے آیا تھا' تب تو وہ اکیلا تھا۔ میرے بارے میں بات چھیڑ کر تو دیکھی ہوتی۔"

"نہیں ابھی نہیں۔ میں نے جان کر اس سے کوئی بات نہیں کی۔" بیگماں نے وضاحت کی۔ "بیدی کو آج سویرے اپنے گھر والے کے پاس کوٹ بہادر جانا تھا پر وہ گئی نہیں۔ جب تک وہ موجود ہے' میں تیرے بارے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے بیدی سے ڈر لگتا ہے۔ تجھے پتہ نہیں' وہ کتنی کمینی اور چنڈال ہے۔ تیرے تو نام ہی سے اسے آگ لگ جاتی ہے۔ ذرا بھی پتہ چل گیا تو وہ ضرور اپنا کمینہ پن دکھائے گی۔"

"وہ کب تک اور ٹھیرے گی؟"

"کل سویرے جانے کو کہتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد ہی مولا داد سے تیرے بارے میں بات کرنا ٹھیک رہے گا۔"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "بیدی کو میرے بارے میں کوئی شبہ تو نہیں ہوا؟"

"پتہ نہیں۔ کل تو بالکل اچانک گھس آئی تھی۔ دروازہ بھی تو کھلا رہ گیا تھا' پر میں نے اسے اپنے طور پر سمجھا بجھا دیا تھا۔ ویسے وہ ہے بہت مکّار۔"

"ٹھیک ہے' اس کے جانے کے بعد ہی مولا داد سے بات کرنا۔ میں دو ایک روز اد [illegible] ٹھیرا

وں گا۔ ویسے یہ گھر چھپنے کے لیے ٹھیک ہے۔ پنڈ سے الگ ہے اور جھنگر کے پاس ویرانے میں ۔ ادھر دن میں بھی کوئی نہیں آتا۔"

"پر دیوا تو جلا لیا ہوتا۔ تجھے اندھیرے سے گھبراہٹ نہیں ہوتی؟"

"میں نے جان کے دیوا نہیں جلایا۔ اس سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں' کوئی دیکھے تو سمجھے گھر بالکل خالی ہے۔"

"اور جو کوئی چور شور آگیا؟"

"یہاں دھرا ہی کیا ہے جو کوئی چوری کرنے آئے گا۔"

رحیم داد نے کٹورا اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا کر پانی پینے لگا۔ بیگماں نے کہا۔ "میں تو تجھے یاد کر کے رات روتی تھی۔ کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ پر توں نے بھی کبھی مجھے یاد کیا؟"

"کیوں نہیں یاد کیا؟ تجھے یاد نہ کرتا تو تیرے پاس آتا کیوں؟ کسی اور طرف نکل جاتا۔" رحم داد نے پانی کا خالی کٹورا رکھتے ہوئے اس کی دل جوئی کی۔ "تجھے پتہ ہی ہے۔ ماں اور پیو کا مرن ہوا تب تو ت چھوٹی تھی۔ میں نے تجھے اولاد کی طرح پالا ہے۔ ویسے میں بھی چھوٹا ہی تھا۔ چاچا تجھے اپنے اتھ لے جانا چاہتا تھا پر میرا جی نہ چاہا تجھے اپنے سے دور رکھوں۔ جب تیرا ویاہ ہوا تو میں کتنا رویا ا۔ تجھے یاد ہے نا؟"

"ہاں' مجھے یاد ہے۔ بار بار روتا تھا۔ سب تجھے سمجھاتے تھے۔ پر میں بھی تو بہت روئی تھی۔"

"میں برابر تیرے گھر آتا تھا۔ تجھے اپنے ساتھ لے آتا تھا۔ تیرے آنے سے ایسا لگتا جیسے میرے دمیرے گھر میں اجالا ہو گیا۔" رحیم داد بیتے دنوں کی راکھ کریدنے لگا۔ "پر نوراں سے ویاہ کے بعد اجانے مجھے تجھ سے جدا کر دیا۔ میں ان دنوں چھپ چھپ کر روتا تھا۔" رحیم داد کی آنکھوں میں نسو آگئے۔ اس نے قمیص کی آستین سے آنسو پونچھے۔ بیگماں بھی رونے لگی۔ دونوں خاموش بیٹھے دوں کی پگڈنڈیوں پر بھٹکتے رہے۔

کچھ دیر بعد بیگماں کی آواز ابھری۔ "پر نوراں بھابی تو تجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔ اس نے تجھ سے دھوکا کیوں کیا؟ وہ ایسی تو نہیں تھی اور جمال دین تو تیرا بہت گہرا یار تھا۔ ہر دم تیرے ساتھ اتھ رہتا تھا۔ سیف اللہ اور اس کے بھائیوں سے جھگڑا ہوا تو وہ تیرے ساتھ جم کر لڑا۔ زخمی ہوا۔ بل میں بھی بند رہا۔ چھوٹ گیا تب بھی جیل میں تجھے ملنے جاتا تھا۔ جب میں تجھے ملنے جیل گئی تھی' ں روز وہ بھی موجود تھا۔ بعد میں اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"یہی تو مجھے دکھ ہے۔ نوراں نے میرے ساتھ ایسا دھوکا کیا کہ مجھے بچوں سے بھی گھن آنے

گئی۔ میں نے سب کو بھلا دیا۔ نوراں کو بھی' بچوں کو بھی۔ اب تیرے سوا میرا دنیا میں کوئی نہیں رہا۔"

رحیم داد کی آواز بھرا گئی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ دونوں اندھیرے میں چپ بیٹھے رہے۔ ذرا دیر بعد بیگماں نے کہا۔ "روٹی تو کھا' توں نے روٹی بھی چھوڑ دی۔"

"نہیں' اب میں نہیں کھاؤں گا۔"

"اب میں تجھے جانے نہیں دوں گی۔ اپنے ساتھ ہی رکھوں گی۔"

"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں پر چاچا بھی راضی ہو جائے گا؟"

"مولاداد اسے راضی کر لے گا۔" بیگماں نے اسے تسلی دی۔ "فکر نہ کر۔ مولاداد میری بات ضرور مان لے گا۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ کہے گا تو چاچا بھی ضرور مان جائے گا۔ ویسے بھی اب وہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ چاچی کے مرنے کے بعد تو زیادہ ہی کمزور ہو گیا۔ طبیعت میں پہلی جیسی گرمی بھی نہیں رہی۔"

"پر بیدی جو موجود ہے۔ وہ ضرور رولا ڈالے گی۔" رحیم داد نے خدشہ ظاہر کیا۔

"وہ روز روز تھوڑا ہی آتی ہے' مہینوں بعد آتی ہے۔ اب اس کا پورا ٹبر ہو گیا۔ گھر والا ہے' چار بچے ہیں۔ انھیں چھوڑ کر کیسے آسکتی ہے؟ سب کو ساتھ لانا بھی آسان نہیں۔ ویسے بھی اس کا گھر والا روز ہی بیمار رہتا ہے۔" بیگماں نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "کل سویرے وہ جا رہی ہے۔ کئی مہینے بعد آئے گی۔ تب تک کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔ اتنے دنوں میں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

رحیم داد نے اس کی تائید کی۔ "کہتی تو ٹھیک ہے۔ تین چار مہینے مل جائیں' تب تک میں کہیں زمین بھی الاٹ کرا لوں گا۔"

"زمین الاٹ کرا لے گا؟ کیسے؟ توں پناہ گیر تو ہے نہیں۔" بیگماں نے حیرت ظاہر کی۔

"دیکھ لینا' میں کیسے زمین الاٹ کراتا ہوں۔" اس نے سرہانے رکھے ہوئے بستے کی جانب اشارہ کیا۔ "اس میں کلیم کے کاغذ ہیں۔ بہت وڈا کلیم ہے' ہزاروں کلّا زمین کا۔"

"کیسی باتیں کر رہا ہے؟" وہ اور زیادہ حیرت زدہ ہو گئی۔ "تیری باتیں سمجھ نہیں آئیں۔"

"ابھی تیری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ پر جب میں زمین الاٹ کرا لوں گا تب خود دیکھ لے گی۔ میں تجھے اور مولاداد کو بھی اپنے پاس بلا لوں گا۔"

"ایسا ہو جائے تو بیدی کا بیچ سے کانٹا ہی نکل جائے۔" وہ خوش ہو کر بولی۔ "پر سب کچھ ہو گا کیسے؟"

"میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا پر ابھی نہیں۔ مجھے چند مہینے اطمینان سے رہنے کا ٹھکانا مل جائے' پر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔"

"بھابی نے برا کیا ورنہ وہ تیرے ساتھ عیش کرتی۔"

"اس کی گل نہ کر۔" رحیم داد نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اب اس کا نام بھی نہیں سننا چاہتا۔ یوں سمجھ لے' میرے لیے وہ مر گئی۔ اس کے ساتھ بچے بھی مر گئے۔"

"ویرا ایسا نہ کہہ۔" بیگماں تڑپ کر بولی۔ "بچے تیرے ہی ہیں۔ ان کا تو کوئی کسور نہیں۔"

"پتہ نہیں وہ میرے بچے ہیں یا جمال دین کے۔" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں نے اپنے کانوں سے نوراں کو یہ کہتے سنا' جمال دین سے اس کی بہت پرانی یاری تھی۔"

"یہ گل اس نے تجھ سے کہی تھی؟"

"مجھے کہتی تو میں اسے زندہ کب چھوڑتا۔ مجھے اتنا بے غیرت سمجھتی ہے؟" رحیم داد نے تلخ لہجے میں بتایا۔ "میں رات کو اس کے گھر چھپ کر گیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا نہیں۔ وہ تو جمال دین سے باتیں کر رہی تھی۔"

"سمجھ نہیں آتی۔ وہ ایسی لگتی تو نہیں تھی۔"

"میں بھی تیری طرح دھوکے میں رہا۔ وہ کیسی ہے؟ تو سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس رات کی باتیں یاد کرتا ہوں تو سینے میں آگ جل اٹھتی ہے۔" رحیم داد کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔

بیگماں نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔ "تیری احمد کوٹ کی زمین کا کیا بنے گا؟"

"گولی مار اس زمین کو۔ تھی ہی کتنی۔" رحیم داد نے جوش سے کہا۔ "اب تو میں مربعے الاٹ کراؤں گا اور بہت عمدہ زمین دیکھ بھال کر لوں گا۔ الاٹمنٹ ہو جانے دے۔ تب تو دیکھنا' زمیں داری کیا ہوتی ہے۔ باراں چوداں کلّا زمین کی بھی کوئی زمیں داری ہوئی۔"

رحیم داد نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔ رحیم داد نے جھٹ ایک بار پھر منہ پر ڈھاٹا باندھا۔ دروازے کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا تو باہر سے آواز آئی۔

"دروازہ کھول' میں ہوں دارا۔"

رحیم داد نے کنڈی کھولی' دارا اندر داخل ہوا۔ رحیم داد نے تعجب سے کہا۔ "تو نے تو سویرے آنے کا کہا تھا' اب کیسے آگیا؟"

"میں تیرے لیے روٹی لایا تھا۔" اس نے کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیاں اس کی طرف بڑھائیں۔ رحیم داد نے کھانا نہیں لیا۔ "میں تو روٹی کھا چکا۔ اسے اپنے ساتھ ہی لے جا۔ مجھے اب کچھ نہیں کھانا۔"

دارا نے دھندلی روشنی میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی بیگماں کو غور سے دیکھا اور پہچان بھی لیا۔ مگر کچھ بولا نہیں۔ چند لمحے گم صم کھڑا رہا پھر رحیم داد سے باہر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"میرے ساتھ باہر آ۔ تجھ سے بات کرنی ہے۔"

رحیم داد اس کے ہم راہ چلا گیا۔ باہر گھرا سناٹا تھا۔ اندھیرا ہر طرف پھیلا تھا۔ دارا نے رازداری کے انداز میں دبی زبان سے کہا۔

"توں نے تو کہا تھا' مولا داد تیرے پاس آئے گا۔ پر یہ تو بیگماں ہے' وہی ہے نا؟"

"ہاں' وہی ہے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "میرے لیے روٹی لے کر آئی تھی۔ پر دو تھے' تلا ہوا ککڑ تھا۔ میں نے ساری روٹی نہیں کھائی۔ تیرے لیے رکھ چھوڑی ہے۔ جی چاہے تو ابھی کھالے نہیں تو سویرے کھالینا۔"

"میں روٹی کھا کر آیا ہوں۔ اب بالکل بھوک نہیں ہے پر مولا داد تیرے پاس کیوں نہیں آیا؟"

"وہ دن ڈھلے اپنی فصلوں کی واڈھی کے لیے لاوے لینے چک ۱۹ چلا گیا۔ رات دیر سے لوٹے گا اس لیے نہیں آیا۔"

"تجھے کس نے بتایا' مولا داد چک ۱۹ گیا ہے۔" دارا نے حیرت کا اظہار کیا۔ "میں نے تھوڑی دیر پہلے اسے اپنے زمیں دار کی حویلی میں دیکھا تھا۔ توں کہتا ہے' وہ دن ڈھلے چک ۱۹ چلا گیا۔"

"مجھے تو یہی معلوم ہوا تھا۔" رحیم داد بھی حیرت زدہ ہو گیا۔ "تیری اس سے کوئی گل بات تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔" دارا نے انکار میں گردن ہلائی' دبی زبان سے بولا۔ "مجھے سچ سچ بتا دے' اصل معاملہ کیا ہے؟ بیگماں سے تیری یاری ہے' تب بھی میں نے کیا لینا۔"

"ہر بار ایسی گل کیوں کرتا ہے۔" رحیم داد جھنجلا گیا۔ "میری بات کا اعتبار کیوں نہیں کرتا؟ تو کیسا بندہ ہے؟"

"نراض نہ ہو۔" دارا نرم پڑ گیا۔ "میں تو تیرے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں۔ اگر کوئی ایسی گل ہے تو میں تیری مدد ہی کروں گا۔" اس نے تامل کیا۔ "مجھے تو یہ ڈر ہے کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے' توں کسی مشکل میں نہ پڑ جائے۔"

"دارا! میں نے تجھے اپنا یار کہا ہے' تجھ سے کچھ چھپاؤں گا نہیں۔ سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا پر جو تو سوچ رہا ہے' ایسا بالکل نہیں ہے۔" رحیم داد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"توں ٹھیک ہی کہتا ہو گا۔" اس نے رحیم داد سے الجھنے کی کوشش نہیں۔ "اب میں چلوں گا سویرے آؤں گا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ دارا آگے بڑھ گیا۔ رحیم داد گھر میں واپس آ گیا۔ اس نے کنڈی لگائی اور بیگماں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا۔

"دارا باہر گلی میں تجھے کیا کہتا تھا؟"

"اس نے عجب گل بتائی۔ تو کہتی ہے' مولا داد چک ۱۹ چلا گیا۔ دارا کہتا ہے وہ اسے زمین دار کی حویلی میں تھوڑی ہی دیر پہلے ملا تھا۔"

بیگماں بھونچکا ہو کر بولی۔ "مجھ سے تو وہ یہی کہہ کر گیا تھا۔ تب تک سورج بھی نہیں ڈوبا تھا۔ میں نے تیرے لیے روٹی تیار کی' نہائی' کپڑے بدلے اور اندھیرا ہوتے ہی یہاں آ گئی۔"

"مولا داد نے تجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟"

"پتہ نہیں۔" وہ بدستور حیرت زدہ تھی۔ "وہ مجھ سے جھوٹ تو نہیں بولتا۔ ہو سکتا ہے' چک ۱۹ جاتے ہوئے کوئی کام یاد آ گیا اور وہ زمیں دار کے پاس چلا گیا۔"

"ایسا ہی ہو گا۔ اب تجھے جانا چاہیے۔ مولا داد گھر پہنچا اور تجھے وہاں نہ پایا تو جانے کیا سوچے۔"

"ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔" بیگماں بھی جانے پر آمادہ ہو گئی۔ "میں آج ہی رات مولے سے گل بات کروں گی۔ فکر نہ کر' وہ میری بات مان جائے گا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی ہو گا۔"

☆

رحیم داد نے بچا ہوا کھانا کپڑے میں لپیٹا اور اسے چنگیری میں رکھ کر چھینکے پر لٹکا دیا۔ واپس آیا تو بیگماں کھڑی ہو چکی تھی۔ رحیم داد نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔

"مولا داد اور چاچا کو راضی کر لیا تو میں تیرے ساتھ ہی رہنے کو آ جاؤں گا۔"

"ایسا ہی ہو گا۔" بیگماں نے اسے یقین دلایا۔ "آگے جو کچھ کرنا ہے' وہ مجھ پر چھوڑ دے۔"

"ہاں تجھے یہ کام کرنا ہے۔"

"میں تو ہر طرح کوشش کروں گی میرا بچھڑا ہوا ویر میرے پاس آ جائے۔" بیگماں نے مسکرا کر کہا۔ "میں کتنی خوش ہوں' تجھے بتا نہیں سکتی۔ بچے بھی اپنے ماماں کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔

کبھی کبھی تو تجھے بہت یاد کرتے ہیں۔ تیرے آنے سے میرے گھر میں جیسے روشنی آجائے گی۔ ہائے کتنا چنگا لگے گا۔"

دونوں دروازے کی جانب بڑھے۔ رحیم داد نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ مگر دروازہ کھولتے ہی وہ سٹپٹا کے رہ گیا۔ سامنے مولاداد کھڑا تھا۔ دھندلی روشنی میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہاتھ میں لمبی کلہاڑی دبی تھی۔ وہ جھپاک سے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے اللہ داد بھی اندر آگیا۔ مولاداد ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانس بھر رہا تھا۔ اس نے بیگماں کو خوں خوار نظروں سے دیکھا۔

بیگماں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں مولاداد سے پوچھا۔ "یہاں کیسے آگیا؟"

مولاداد نے چند لمحے خاموش رہ کر تیکھے لہجے میں کہا۔ "مجھے پتہ چل گیا تھا تو یہاں اپنے یار سے ملنے آئی ہے۔" اس نے رحیم داد کی جانب قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ "یہ کل رات بھی میرے جانے کے بعد چھپ کر تیرے پاس آیا تھا۔"

بیگماں نے مڑ کر اللہ داد کو دیکھا پھر اٹکتے ہوئے مولاداد سے کہا۔ "کیسی گل کر رہا ہے؟ مولے تجھے پتہ ہے، یہ کون ہے؟"

"مجھے سب پتہ ہے۔ بیدی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس نے تیرے یار کو کل رات ہی دیکھ لیا تھا۔" مولاداد نے ترش روئی سے کہا۔ "تو نے اسے کمرے میں چھپا دیا تھا۔"

"وہ جھوٹ بولتی ہے۔" بیگماں نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "آرام سے بیٹھ، میں تجھے سب کچھ بتا دوں گی۔"

"بیدی جھوٹ بولتی ہے، دارا بھی جھوٹ بولتا ہے، سب جھوٹ بولتے ہیں۔ صرف تو سچی ہے۔" وہ غصے سے چیخنے لگا۔

رحیم داد نے کہا۔ "مولے! تجھے کچھ پتہ نہیں۔"

اللہ داد نے اسے ڈانٹا۔ "بکواس نہ کر۔"

مولاداد تیزی سے جھپٹا۔ اس نے بیگماں کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اس زور سے دھکا دیا کہ وہ چارپائی پر جا کر گری۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی، گڑگڑا کر بولی۔ "میری گل تو سن مولے۔" اس نے رحیم داد کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہ، یہ۔" مگر مولاداد نے اسے پوری بات نہیں کہنے دی۔ غضب ناک ہو کر کلہاڑی چلائی۔ ہاتھ بھرپور پڑا۔ کلہاڑی بیگماں کی گردن کاٹتی ہوئی اندر اتر گئی۔ بیگماں کے منہ سے دل دوز چیخ نکلی۔

مولاداد ایک کے بعد دوسرا وار کرتا رہا۔ کلہاڑی نے بیگماں کے جسم کے ٹکڑے کر دیئے۔ رحیم داد ہکا بکا کھڑا رہا۔ پھر تیزی سے لپکا اور مولاداد کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ مولاداد اس کی جانب پلٹا۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ اس نے رحیم داد پر بھی کلہاڑی سے وار کیا۔ مگر رحیم داد جھکائی دے کر صاف بچ گیا۔ مولاداد نے دوسرا وار کرنے کے لیے کلہاڑی اٹھائی۔ رحیم داد نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"مولے! تو نے بہت برا کیا۔ میری گل سن۔"

مگر مولاداد نے ایک نہ سنی۔ اس نے کلہاڑی سے وار کرنا چاہا۔ رحیم داد نے جھپٹ کر کلہاڑی پکڑلی، جھٹکا دیا اور کلہاڑی چھین لی۔ اسی وقت اللہ داد نے اس پر ڈانگ سے وار کیا۔ رحیم داد نے سر اس طرح جھکایا کہ وار خالی گیا۔ مگر مولاداد نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے تڑاق سے رحیم داد کے منہ پر تھپڑ مارا اور کلہاڑی چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔

اب رحیم داد بھی غصے سے بے قابو ہو چکا تھا۔ وہ پیچھے ہٹا۔ کلہاڑی سنبھالی، مولاداد پر وار کیا۔ کلہاڑی کندھا کاٹتی ہوئی اندر اتر کر پھنس گئی۔ مولاداد کے منہ سے ہائے کی آواز نکلی۔ وہ خون میں لت پت ہو کر زمین پر تڑپنے لگا۔

رحیم داد اس کی جانب متوجہ ہوا تو اللہ داد نے پھر ڈانگ سے وار کیا۔ رحیم داد نے بچنے کی کوشش کی مگر بچتے بچتے بھی ڈانگ اس کے بائیں بازو پر لگی۔ رحیم داد تلملا کے رہ گیا۔ اس نے اچھل کر اللہ داد کے سینے پر لات ماری۔ وہ دور جا گرا۔ ڈانگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ رحیم داد نے اسے جھپٹ کر اٹھا لیا۔

اللہ داد اٹھ کر رحیم داد پر جھپٹا مگر رحیم داد نے اسے قریب نہیں آنے دیا۔ گھما کر ڈانگ کا ہاتھ چلایا۔ ڈانگ اللہ داد کے سر پر لگی۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ خون بہہ کر چہرے پر آگیا، وہ زمین پر گر گیا۔

رحیم داد بڑھ کر بیگماں کے پاس گیا مگر وہ دم توڑ چکی تھی۔ مولاداد زمین پر پڑا سسک رہا تھا اور اللہ داد بے ہوش تھا۔ رحیم داد خاموش کھڑا زور زور سے ہانپتا رہا، تینوں کو جلتی بجھتی نظروں سے دیکھتا رہا۔

مگر اب وہاں ٹھہرنا خطرناک تھا۔ رحیم داد نے کلیم کے کاغذات کا بستہ اٹھایا۔ بیگماں کی لاش کے پاس گیا۔ جھک کر اس کی پیشانی چومی۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو امل پڑے۔ وہ ہاتھ سے آنسو پونچھتا ہوا گھر سے باہر آیا۔

رحیم داد تیزی سے ایک طرف بڑھا مگر اس سمت سے آہٹ سنائی دی۔ اس نے راستہ بدل

دیا۔ اندھیرے میں اسے دارا کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"ٹھہر جا۔ میری گل سن لے۔"

مگر رحیم داد نہیں ٹھہرا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا جھنگر کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا کہ اسے، اپنی پشت پر چاپ سنائی دی۔ کوئی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر راستہ بدلا، کھیتوں کی جانب بڑھا اور ان میں گھس کر ایک پگڈنڈی پر دوڑنے لگا۔

ڈھولا امیر خاں کی حدود سے نکل کر باہر آیا تو وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ لیکن وہ رکا نہیں، آگے، اور آگے بڑھتا گیا۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے نیم پختہ سڑک پر چل رہا تھا۔ سڑک سنسان تھی اور رات کے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کدھر جا رہا ہے، کہاں جا رہا ہے؟ نہ اس کی کوئی منزل تھی، نہ ٹھکانہ۔

کراچی، ستمبر ۱۹۷۸ء

شوکت صدّیقی

جانگلوس

کھا

دیپال پور روڈ پر نیلی بار ٹرانسپورٹ کی ایک لاری شور مچاتی پاک پتن کی سمت جا رہی تھی۔ رحیم داد لاری کو دور تک دیکھتا رہا۔ آخر وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس نے سڑک عبور کی' نشیب میں اترا اور آگے بڑھنے لگا۔

شام کا دھندلکا پھیلنے لگا۔ رحیم داد کہیں ٹھہرے بغیر چلتا رہا۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ وہ حویلی روڈ سے گزر کر دیپال پور تحصیل کی حدود میں داخل ہوا تو رات ہو چکی تھی۔ رحیم داد تھکن سے بے حال ہو رہا تھا۔ راستہ صاف ستھرا اور کشادہ تھا۔ پیاس لگتی تو پینے کو نہر کا پانی مل جاتا۔

ہر سمت اندھیرا چھایا تھا۔ اس کے پیر بوجھل ہو گئے تھے۔ اب اس میں زیادہ دور جانے کی سکت نہ تھی۔ وہ کہیں ٹھہر کر رات بسر کرنا چاہتا تھا۔ مگر کوئی مناسب اور محفوظ ٹھکانا نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہر کے کنارے کہیں کہیں کھجور کے درخت تھے' کیکر کی جھاڑیاں تھیں جن کی شاخیں پیلے پیلے پھولوں سے لدی جھوم رہی تھیں۔ گندم اور جو کی تیار فصلیں بھی کھڑی تھیں۔ جہاں فصلیں کٹ چکی تھیں وہاں اجاڑ کھیت دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

رحیم داد ٹھکانے کی تلاش میں تھکے ہارے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ یکایک عقب میں ٹاپیں سنائی دیں۔ کوئی گھوڑا دوڑاتا اسی طرف آ رہا تھا۔ آواز رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ رحیم داد راستے سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا۔ قریب ہی کھیت تھے۔ وہ ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ گھڑسوار بالکل نزدیک آ گیا۔ اس کا گھوڑا زور سے ہنہنایا' ٹھوکر کھائی اور راستے سے اتر کر رحیم داد کی جانب بڑھا۔

رحیم داد سراسیمہ ہو کر پیچھے ہٹا اور کھیت کی مینڈ سے ٹکرا کر گر پڑا۔ گرتے ہی اندھیرے میں گھوڑے کا سم کچھ اس طرح اس کے چہرے پر پڑا کہ سر چکرا گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ سانس رک رک کر چلنے لگی۔

ذرا دیر بعد اس نے سنا' کوئی اس پر جھکا ہوا معذرت کے انداز میں کہہ رہا ہے۔ "معاف کرنا جی! گھوڑی ذرا چمک گئی تھی۔ میں نے بہت روکا پر کابو سے نکل گئی۔ رستے سے اتر کر ادھر آ گئی۔" اس نے سہارا دے کر رحیم داد کو اٹھایا۔ رحیم داد کراہتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

گھڑسوار نے نرمی سے پوچھا۔ "کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟؟"

رحیم داد سے تکلیف کے مارے بولا نہ گیا۔ اس نے اپنے گال پر ہاتھ پھیرا تو ہاتھ خون سے تربتر ہو گیا۔ رحیم داد نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اپنا خون آلود ہاتھ سامنے کر دیا۔ دھندلی روشنی میں اس نے خون سے بھرا ہاتھ دیکھا۔ رحیم داد کے چہرے کا زخم دیکھا' پریشان ہو کر بولا۔

"لگتا ہے' تیرے تو بہت چوٹ آئی ہے۔"

چوٹ واقعی سخت آئی تھی۔ گھوڑے کی پوری ٹاپ رحیم داد کے چہرے پر بیٹھ گئی تھی اور لوہے کی نئی نعل رخسار کی جلد کاٹتی چار انچ تک چلی گئی تھی۔ رحیم داد نے خون بند کرنے کے لیے زخم پر بایاں ہاتھ رکھ لیا تھا۔ وہ ٹیس برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

گھڑسوار لمبا چوڑا جوان تھا۔ سفید قمیص اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھا۔ سر پر اونچے طرے کی پگ تھی۔ وضع قطع سے بڑا زمیں دار لگتا تھا۔ اس نے جھٹ اپنی پگ اتاری۔ شملہ جھر سے پھاڑا اور پھٹا ہوا ٹکڑا لے کر تیزی سے نہر کی جانب گیا۔ اسے پانی سے تر کیا۔ واپس آیا۔ رحیم داد کا ہاتھ ہٹایا۔ گیلے کپڑے کے ایک کونے سے خون صاف کیا' پھر کپڑا تہہ کیا' گدی بنائی اور زخم پر رکھ دی۔ اس نے پگ کا ایک حصہ اور پھاڑا اور اسے سر سے ٹھوڑی تک چہرے کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر گرہ لگا دی۔

رحیم داد خاموش بیٹھا رک رک کر کراہتا رہا۔ زخم پر پٹی باندھ کر اس شخص نے پوچھا۔ "تیرا ناں کیہہ ہے؟؟"

رحیم داد نے بولنے کے لیے منہ کھولا اور صرف "چوہدری" کہہ سکا۔

وہ شخص بولا۔ "چوہدری! میرا نام اللہ وسایا ہے۔ ادھر کوٹلہ ہرکشن میں اپنی زمیں داری ہے۔" اس نے رحیم داد کی پیٹھ تھپک کر دل جوئی کی۔ "چوہدری! حوصلے سے کام لے۔ تھوڑی دیر میں درد کم ہو جائے گا۔" وہ رحیم داد کے قریب ہی زمین پر بیٹھا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر اس کی مشکی گھوڑی کھڑی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اللہ وسایا نے کہا۔ "تیری طبیعت سنبھل گئی ہو تو میرے ساتھ گھوڑی پر بیٹھ جا۔ کوٹلہ ہرکشن یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ وہاں پہنچ کر ٹھیک سے مرہم پٹی ہو جائے گی اور تو آرام سے لیٹ جائے گا۔"

اللہ وسایا نے سہارا دیا' رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کلیم کے کاغذات کا بستہ مضبوطی سے ہاتھ میں دبا لیا۔ اللہ وسایا گھوڑی کے پاس گیا۔ اس کی راس پکڑ کر نہر کے کنارے لے گیا۔ رحیم داد آہستہ آہستہ اس کے قریب چلا گیا۔ اللہ وسایا گھوڑی پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے رحیم داد کا ہاتھ تھام کر سہارا دیا اور وہ بھی اللہ وسایا کے پیچھے گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اللہ وسایا کی کمر تھامی اور جم کر بیٹھ گیا۔

اللہ وسایا نے گھوڑی کو ایڑھ لگائی اور آہستہ آہستہ دوڑانے لگا۔ نصف گھنٹے سے بھی کم عرصے میں دونوں کوٹلہ ہرکشن پہنچ گئے۔ اللہ وسایا نے حویلی کے سامنے پہنچ کر گھوڑی ٹھہرا لی۔ نیچے اترا۔ اس کے نوکر چاکر قریب پہنچ چکے تھے۔ اللہ وسایا کی ہدایت پر انھوں نے سہارا دے کر رحیم داد کو گھوڑی کی پشت سے نیچے اتارا۔ گھوڑی کی لگام ایک ملازم نے تھام لی۔

اللہ وسایا نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری! میرے ساتھ آ۔"

رحیم داد خاموشی سے اللہ وسایا کے ہم راہ حویلی کے مہمان خانے میں چلا گیا۔ دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ کشادہ اور ہوا دار تھا۔ طاق میں لیمپ روشن تھا۔ ایک طرف خوب چوڑا چکلا پلنگ تھا۔ اس پر اجلا بستر لگا تھا۔

اللہ وسایا نے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "چوہدری! اب تو منجی پر آرام کر۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گا۔" وہ کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد خاموش لیٹا رہا۔ کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ نوکرانی کانسی کے بڑے سے گلاس میں دودھ لے کر آئی۔ رحیم داد تکیے کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے گلاس نوکرانی سے لے لیا اور دونوں ہاتھوں سے تھام کر دھیرے دھیرے دودھ کے گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے لگا۔ دودھ گاڑھا اور نیم گرم تھا۔

رحیم داد دودھ پیتا رہا۔ نوکرانی نے کمرے کی دونوں کھڑکیاں کھول دیں۔ کمرے کی پشت پر باغیچہ تھا۔ اس میں لیموں کی درخت بھی تھے اور کھڑکیوں کے قریب ہی تھے۔ لیموں کے درختوں میں پھول آ گئے تھے۔ ان کی مہک ہلکے ہلکے جھونکوں میں رچی ہوئی کمرے کے اندر آ رہی تھی۔ دودھ پی کر رحیم داد نے گلاس نوکرانی کو دے دیا۔ وہ اسے لے کر خاموشی سے چلی گئی۔

دودھ پینے کے بعد رحیم داد کو خاصا سکون مل گیا تھا۔ نقاہت بھی کم ہو گئی تھی۔ وہ تکیے پر سر رکھ کر چت لیٹ گیا اور خاموشی سے چھت تکنے لگا۔ چند منٹ بعد اللہ وسایا واپس آ گیا۔ اس کے ہم راہ ایک بوڑھا بھی آیا۔ اس کی لمبی سفید ڈاڑھی تھی۔ سر پر پگڑی تھی۔ لباس بوسیدہ اور ملگجا تھا۔ دونوں آہستہ آہستہ رحیم داد کے نزدیک آئے۔ بوڑھے کے جسم سے پسینے کی تیز بو اٹھ رہی تھی۔ اس نے جھک کر رحیم داد کا چہرہ دیکھا اور پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"بکھار تو نہیں لگتا۔ چوٹ زیادہ گہری نہیں آئی۔"

اسی وقت ایک سرو قامت نوجوان عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ تازہ پھول کے مانند نرم اور گلابی تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں پچھلی رات کے ستارے جھلملاتے تھے۔ نقش و نگار بھی سبک اور تیکھے تھے۔ وہ ہلکے آسمانی رنگ کا ریشمی کرتا اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹا بھی آسمانی تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لکڑی کا چھوٹا سا بکس لٹک رہا تھا، جس پر صلیب احمر کا بڑا سا نشان بنا تھا۔

رحیم داد نے اسے دیکھا تو مبہوت ہو کر رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ کمرے میں رنگ و بو کا سیلاب امڈ آیا ہے۔ رحیم داد کی سانس لمحے بھر کو ٹھہر گئی، آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔

اللہ وسایا نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری!" اس نے ہاتھ اٹھا کر عورت کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ جمیلہ ہے، میرے گھر والی۔" جمیلہ کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے دوپٹے کا آنچل سر پر ڈال لیا۔

بوڑھے نے رحیم داد کی پیشانی سے ہاتھ ہٹا کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ "فکر کی کوئی گل نہیں۔ پاتھی کی گرم گرم راکھ چوٹ پر باندھ دے۔ دو تین دن میں چنگا ہو جائے گا۔ ویسے نیم کے پتے کچل کر باندھنے سے بھی آرام آ جائے گا۔"

جمیلہ بڑھ کر دونوں کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے مسکرا کر بوڑھے کو دیکھا، بے نیازی سے بولی۔

"بابے! تو اپنا کچا علاج رہنے دے۔ میں نے پہلے گھاؤ دیکھنا ہے۔ اسے دیکھے بنا کیسے علاج ہو سکتا ہے۔"

اللہ وسایا نے نظر بھر کر بیوی کو دیکھا، ہنس کر بولا۔ "جی لے! تیں نوں پتہ ہے، اپنا بابا بھی بہت سیانا اور تجربہ کار ہے۔" اس نے بوڑھے کی دل جوئی کی۔ "دور دور سے بیمار اور روگی اس کے پاس علاج کرانے آتے ہیں، چنگے ہو کر جاتے ہیں۔"

"تیری گھر والی ڈاکٹرنی بن گئی ہے۔ اسے ہی علاج کرنے دے۔" بوڑھے کے لہجے میں تلخی تھی۔

وہ روٹھنے کے انداز میں جانے کے لیے مڑا۔

اللہ وسایا نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ "بابے! کدھر چلا۔ میری گل تو سن۔"

بوڑھا منہ بگاڑ کر بولا۔ "جب کام نہ بنے تو مجھے بلا لینا۔ ابھی تجھے میری ضرورت نہیں ہے۔" اس نے مڑ کر اللہ وسایا کی طرف نہیں دیکھا۔ کمرے سے نکل گیا۔ جمیلہ نے بوڑھے کی بات پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس نے کمرے میں رکھی ہوئی چھوٹی سی میز گھسیٹ کر پلنگ کے قریب کی اور اس پر اپنا فرسٹ ایڈ بکس رکھ دیا۔

اللہ وسایا نے اظہار تاسف کیا۔ "جی لے! تو نے بابے کو نراض کر دیا۔" جمیلہ خاموش رہی۔

اللہ وسایا بتانے لگا۔ "میں نے اپنی پگ پھاڑ کر چوٹ پر لپیٹ دی تھی تاکہ خون بند ہو جائے۔ زخم گہرا آیا ہے۔ بہت خون نکل رہا تھا۔ بابا تو چلا گیا، اب تو ٹھیک سے چوہدری کی مرہم پٹی کر دے۔"

جمیلہ بدستور خاموش تھی۔ اس نے رحیم داد کی پٹی آہستہ آہستہ کھولی۔ "پٹی خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ جمیلہ نے اسے میز پر ڈال دیا۔ جھک کر دیکھا۔ زخم آنکھ سے ڈیڑھ انچ نیچے ہلال کی شکل بناتا ہوا رخسار کے نشیب میں پھیلتا چلا گیا تھا۔ خون ابھی تک رس رہا تھا۔ اللہ وسایا نے لیمپ کی روشنی میں رحیم داد کا زخم غور سے دیکھا۔ پریشان ہو کر بولا۔ "لگتا ہے گھوڑی کا کھرا سیدھا گال پر لگا۔ خیریت گزری کہ آنکھ بچ گئی۔" رحیم داد آنکھیں کھولے چپ پڑا رہا۔

جمیلہ نے اس کے رخسار پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ اس کے نرم نرم ہاتھ کے لمس سے رحیم داد کو بڑا سکون ملا۔ جمیلہ نے رخسار کی ہڈی ہولے سے دبا کر پوچھا۔

"چوہدری! ہڈی میں درد تو نہیں ہوتا؟"

رحیم داد نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی، مدھم لہجے میں بولا۔ "تھوڑا تھوڑا ہوتا ہے۔"

جمیلہ کے چہرے سے پریشانی کا غبار چھٹ گیا۔ وہ زیر لب مسکرائی۔ "لگتا ہے، ہڈی میں زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ مجھے اسی کا ڈر تھا۔ گھوڑی کے کھرے سے صرف کھال کٹی ہے۔" اس نے بکس کھول کے روئی کا گالا نکالا، اسپرٹ سے اسے تر کیا اور دھیرے دھیرے زخم صاف کرنے لگی۔ زخم پر اسپرٹ لگی تو رحیم داد تکلیف سے بلبلایا۔ اس نے کراہتے ہوئے اپنے دانت سختی سے بھینچ لیے۔ جمیلہ نے اس کی تکلیف محسوس کی۔ تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "چوہدری! حوصلے سے کام لے۔ تھوڑی دیر میں آرام آ جائے گا۔" وہ اسپرٹ میں بھیگا ہوا گالا زخم پر ہولے ہولے رگڑتی رہی۔ رحیم داد بے چین ہو کر گردن ادھر ادھر ہلانے لگا۔ جمیلہ نے اپنا نرم و گداز ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔

رحیم داد نے اپنے چہرے پر جھکی ہوئی جمیلہ کو دیکھا۔ وہ اس قدر قریب تھی کہ رحیم داد اس کے دل کش خدو خال کا ایک ایک خم اور ایک ایک زاویہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ حسین اور طرح دار عورت تھی۔ اسے نزدیک اور مہربان پاکر رحیم داد کو بڑی فرحت محسوس ہوئی۔ بار بار اٹھتی ہوئی ٹیس کا احساس بھی کم ہوگیا۔

جمیلہ نے بکس سے ایک شیشی نکالی۔ اس میں مرکیور کروم بھرا تھا۔ جمیلہ نے اسے روئی پر ڈالا اور روئی آہستہ سے زخم پر رکھ دی۔ پھر اس پر احتیاط سے پٹی باندھ دی۔ مرکیور کروم لگانے کے بعد جمیلہ نے مسکرا کر کہا۔ ”چوہدری! میں نے تیرے گھاؤ پر لال دوائی لگا دی ہے۔“ اس نے ہولے سے اس کا سر تھپکا۔ ”چنتا نہ کر۔ جلد آرام آجائے گا۔“ رحیم داد چپ پڑا جمیلہ کا مسکراتا ہوا شگفتہ چہرہ تکتا رہا۔

اللہ وسایا نے دبی زبان سے اندیشہ ظاہر کیا۔ ”جمی لے! گڑبڑ کی تو کوئی گل نہیں؟ تیری مرضی ہو تو سویرے پاک پتن سے ڈاکٹر بلوالوں یا چوہدری کو اس کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ ٹھیک طرح دوا دارو کردے گا۔“

”ویسے تو چنتا کرنے کی کوئی گل نہیں لگتی۔ گھاؤ زیادہ گہرا نہیں۔ ہڈی پر بھی چوٹ نہیں آئی۔ فوری طور پر جو علاج ہو سکتا تھا، وہ میں نے کردیا۔ رات آرام سے گزرے گی۔ صبح تک دیکھتے ہیں، طبیعت گڑبڑ ہوئی تو ڈاکٹر کو بلوا لینا یا سرکاری اسپتال لے جانا۔“

جمیلہ نے بکس بند کیا، ہینڈل تھام کر اسے ہاتھ میں لٹکایا اور باہر جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ اللہ وسایا نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ آہستہ سے بولا۔ ”گیارہ بجنے والے ہیں۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد پر نظر ڈالی، اس کا بازو تھپ تھپایا۔

”چوہدری! تو اب آرام سے سوجا۔ گھبرانے کی کوئی گل نہیں۔ صبح تک چنگا ہوجائے گا۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”تو تگڑا جوان ہے۔ ایسی چوٹیں تو روز آتی رہتی ہیں۔“

رحیم داد نے بھی مسکرانے کی کوشش کی۔

اللہ وسایا اپنی بیوی کے ہم راہ کمرے سے چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک نوکر اندر آیا۔ اور میز پر پڑی ہوئی پٹی اور روئی کے خون آلود ٹکڑے اٹھا کر لے گیا۔ کمرے میں خاموشی ہوگئی۔ رحیم داد نے آنکھیں بند کرلیں۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ چاپ سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ نوکر کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس تھا۔

وہ آگے بڑھا اور میز پر جگ اور گلاس رکھ دیا۔ اس نے لیمپ کی لو مدھم کی۔ رحیم داد کی جانب مڑا، آہستہ سے بولا۔ ”میرا نام احمد ہے جی۔ میں رات کو یہیں رہوں گا۔ باہر میری منجی پڑی ہے۔ کوئی کام ہو تو بلا لینا۔ میں آجاؤں گا۔“ وہ دروازے کی جانب بڑھا اور کمرے سے چلا گیا۔

☆

رحیم داد خاموش لیٹا رہا۔ اس کے رخسار میں رک رک کر ٹیس اٹھ رہی تھی۔ مگر اس میں پہلی سی شدت نہیں تھی۔ البتہ اس کا جسم جگہ جگہ سے دکھ رہا تھا۔ کمر اور پنڈلیوں میں سخت اینٹھن تھی۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کرلیں۔ مگر بے چین رہا، نیند نہیں آئی۔ اسے اپنی تکلیف کے ساتھ ساتھ اللہ وسایا کا خیال آرہا تھا۔ وہ اسے بہت بھلا مانس لگا۔ کوئی اور بڑا زمیں دار ہوتا تو اسے روندتا ہوا گزر جاتا، پلٹ کر بھی نہ دیکھتا۔ مگر اللہ وسایا نے نہ صرف پگ پھاڑ کر اس کے زخم پر پٹی باندھی بلکہ علاج معالجے کے لیے اپنی حویلی میں بھی لے آیا۔ اس کی بیوی رحیم داد کو اور بھی زیادہ بھلی معلوم ہوئی۔ وہ جس قدر خوب صورت اور دل ربا تھی، اتنی ہی زیادہ نیک دل اور ہمدرد تھی۔ اس نے رحیم داد کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اسے ایسا لگا جیسے زخم سے اٹھتی ہوئی ٹیس گھٹ کر آدھی رہ گئی ہو۔ اس کے لمس کی لذت رحیم داد اب تک محسوس کر رہا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ رحیم داد نے ایک بار اٹھ کر پانی بھی پیا۔ پچھلے پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔

سورج طلوع ہونے کے کچھ ہی دیر بعد اللہ وسایا کمرے میں آیا۔ جمیلہ بھی اس کے ہم راہ تھی۔ رحیم داد جاگ رہا تھا۔ مگر اس کا جسم تیز بخار سے بُھن رہا تھا۔ اس کے زخمی رخسار پر سوجن تھی اور اس قدر زیادہ تھی کہ ایک آنکھ پوری طرح نہیں کھلتی تھی۔ جمیلہ نے قریب جاکر اس کی یہ کیفیت دیکھی تو اس کے تر و تازہ اور دمکتے چہرے پر پریشانی چھاگئی۔ اس نے جھک کر رحیم داد کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ گھبرا کر اللہ وسایا کی طرف دیکھا۔ آہستہ سے بولی۔ ”اسے تو تیز بخار ہے۔“ اس نے رحیم داد کا جسم کھیس ڈال کر سینے تک ڈھک دیا۔

اللہ وسایا نے پوچھا۔ ”طبیعت کچھ زیادہ گڑبڑ ہے؟“ اس نے رحیم داد کا سوجا ہوا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”منہ پر ورم بھی آگیا ہے۔“

”ہاں۔“ جمیلہ بولی۔ ”پاک پتن سے ڈاکٹر خان کو بلوا لے۔“ اس نے رحیم داد کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”ڈاکٹر کے پاس اسے لے جانے میں بہت تکلیف ہوگی۔“

ان کے جانے کے بعد رحیم داد کراہتا ہوا اٹھا اور پیشاب کرنے کمرے سے باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ اسے لیٹے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ احمد دودھ سے بھرا ہوا گلاس لے کر آیا مگر رحیم داد سے دودھ نہ پیا گیا۔ اس نے بے دلی کے

ساتھ نصف سے بھی زیادہ دودھ چھوڑ دیا۔ گلاس میز پر رکھ دیا۔ وہ بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی۔ سورج چڑھ کر بلندی پر پہنچ گیا۔

دوپہر کو ڈاکٹر آیا۔ اس کے ساتھ صرف جمیلہ تھی۔ اللہ وسایا نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے رحیم داد کے رخسار ہولے ہولے ایک انگلی سے دبائے۔ جمیلہ اسے بتانے لگی۔ "ڈاکٹر! میں نے فرسٹ ایڈ کے طور پر گھاؤ اسپرٹ سے صاف کر کے لال دوائی لگا دی تھی۔ رات بہت بیت چکی تھی۔ اس سے میں اور کر بھی کیا سکتی تھی۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔" ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔ "سیپٹک ہونے کا ڈر نہیں رہا۔ ویسے زخم خاصا گہرا آیا ہے۔"

"وہ ہوا یہ جی کہ اندھیرے میں اللہ وسایا کی گھوڑی چمک گئی۔ چوہدری ایک دم سامنے آگیا۔ گھوڑی کا کھر اس کے منہ پر پڑا۔ گھاؤ تو فیر آنا ہی تھا پر آنکھ بچ گئی۔ بالکل آنکھ کے نیچے چوٹ آئی ہے۔"

ڈاکٹر اس کی باتیں سنتا رہا اور خاموشی سے رحیم داد کا ہاتھ تھام کر انگلیوں سے اس کی نبض دیکھتا رہا۔ رحیم داد چپ چاپ لیٹا سامنے کی دیوار تکتا رہا۔ نبض دیکھنے کے بعد ڈاکٹر نے اپنا چرمی بیگ کھولا' سرنج نکالی۔ اس میں دوا بھری اور رحیم داد کے بازو میں انجیکشن لگا دیا۔ اس نے پٹی کھولی۔ اسپرٹ سے بھیگی ہوئی روئی سے از سر نو زخم صاف کیا۔ رحیم داد نے تکلیف سے منہ بگاڑا۔ جب زخم اچھی طرح صاف ہو گیا تو ڈاکٹر نے اس پر مرہم لگایا۔ روئی کا گالا رکھا اور اسے اسٹکنگ پلاسٹر کی پتلی پتلی پٹیوں سے اچھی طرح رخسار پر چپکا دیا۔

ڈاکٹر نے تسلی دینے کی غرض سے آہستہ آہستہ رحیم داد کا بازو تھپکا۔ مسکرا کر بولا۔ "چوہدری! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تھوڑی دیر میں آرام آجائے گا' شام تک چہرے کی سوجن بھی ختم ہو جائے گی۔ تین چار روز میں طبیعت بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گی۔" اس نے اپنا بیگ بند کیا۔ دروازے میں کھڑے ہوئے نوکر نے آگے بڑھ کر بیگ سنبھال لیا۔

ڈاکٹر کمرے سے چلا گیا۔ جمیلہ بھی اس کے ہم راہ چلی گئی۔ رحیم داد انھیں نظریں اٹھائے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ جمیلہ اس وقت ہلکا گلابی لباس پہنے ہوئے تھی اور کچھ زیادہ ہی حسین نظر آرہی تھی۔ اس کے بال سیاہ اور گھنے تھے۔ ہلکے ہلکے گھونگریالے بھی تھے۔ چوٹی لمبی تھی اور کمر سے نیچے جھول رہی تھی۔ کمر پتلی تھی مگر کولھے قدرے بھاری تھے۔ وہ اپنے کولھوں کو آہستہ آہستہ خم دیتی ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

رحیم داد ٹکٹکی باندھے جمیلہ کو دیکھتا رہا اور اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ مہمان خانے کا آنگن عبور کر کے بیرونی دروازے سے باہر نہ چلی گئی۔ رحیم داد کو ایسا محسوس ہوا کہ روشنی دھندلی پڑ گئی ہے' ہوا ٹھہر گئی ہے۔ کمرے میں حبس اتنا بڑھ گیا کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے گہری سانس بھری اور چھت تکنے لگا۔

رات کو جمیلہ پھر رحیم داد کے پاس آئی۔ اللہ وسایا بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں کمرے میں پڑی ہوئی بید کی کرسیاں کھسکا کر رحیم داد کے بستر کے قریب بیٹھ گئے۔ رحیم داد کو اب خاصا افاقہ تھا۔ رخسار کا ورم کم ہو گیا تھا' بخار بھی اتر گیا تھا۔

اللہ وسایا نے ہاتھ بڑھایا۔ رحیم داد کا ماتھا چھو کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "چوہدری! اب تو تجھے بخار نہیں ہے۔"

رحیم داد نے نحیف آواز میں اس کی تائید کی۔ "لگتا تو ایسا ہی ہے۔ چوٹ میں تکلیف بھی پہلے سے کم ہے۔"

"اب تو تیری طبیعت کچھ ٹھیک ہے۔ بول بھی سکتا ہے۔" اللہ وسایا نے پوچھا۔ "یہ بتا تیرا پنڈ کدھر ہے؟ میں چاہتا ہوں' تیرے گھر والوں کو خبر بھیج دوں۔ تیرے گھر نہ پہنچنے پر وہ پریشان ہوں گے' تیرا انتظار کرتے ہوں گے۔ تجھے ڈھونڈتے ہوں گے۔ ان کو ضرور پتہ چلنا چاہیے کہ تو یہاں ہے۔"

رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بتاتا بھی کیا۔ اب اس کا نہ گھر بار تھا نہ ٹھکانا۔ کوئی اس کا نہیں تھا۔ بیوی بچے پرائے ہو چکے تھے۔ اکلوتی بہن اس کی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر دم توڑ چکی تھی۔ سارے رشتے' سارے بندھن ٹوٹ پھوٹ کر اس طرح بکھر چکے تھے کہ وہ ملبے کا ڈھیر رہ گیا تھا۔ رحیم داد کے چہرے پر دکھ کے سائے منڈلانے لگے۔ آنکھیں گویا منجمد ہو گئی تھیں۔

اللہ وسایا نے اسے خاموش پایا تو اصرار کر کے دریافت کیا۔ "چوہدری! تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

رحیم داد نے مڑ کر اللہ وسایا کی جانب دیکھا اور ایک ٹک دیکھتا رہا۔ اس نے گہری سانس بھری۔ غم کے بوجھ سے دبے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اپنا جی نہ کوئی گھر ہے نہ گھر والے ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" جمیلہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "کوئی تو تیرا کہیں گھر بھی ہوگا۔"

"کبھی گھر تھا' گھر والے بھی تھے۔" رحیم داد دل گرفتہ ہو گیا۔

جمیلہ نے دلچسپی سے پوچھا۔ "سب کہاں گئے؟ کیا ہوگیا؟"

رحیم داد رک' رک کر بولنے لگا۔ "میں جی گورداس پور کا مہاجر ہوں۔ فسادات میں مشرکی پنجاب کے مسلمانوں پر جو بیتی' وہ تو تمیں نوں پتہ ہی ہوگا۔ ادھر اپنی زمینداری تھی۔ رہنے کو ماڑی تھی۔ گھروالی تھی' چار بچے تھے۔ بیٹی سب سے وڈی تھی۔ اسے بلوائی اٹھا کر لے گئے۔ اس سے چھوٹا پتر تھا۔ وہ میرے سامنے مارا گیا۔ میں بلوائیوں سے بچ بچا کر کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گیا۔" اس نے چوہدری نورالٰہی کی الم ناک داستان اپنی بنا کر سنائی دی۔

رحیم داد آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔ اس کا بیمار چہرہ اور مرجھا گیا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ کے چہروں پر بھی غم کا ہلکا ہلکا غبار بکھرتا جا رہا تھا۔ جمیلہ کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آتی تھی۔ اس نے رحیم داد کا سوگوار چہرہ نظر بھر کر دیکھا۔ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے بولی۔ "چوہدری! تو بہت نراش اور دکھی لگتا ہے۔ تو نے بہت کٹھنائیاں جھیلی ہیں۔" اس کے لہجے میں دبا دبا کرب تھا۔

"یہ تو بتا' تیری گھروالی اور دو بچوں کا کیا بنا؟"

"بعد میں پتہ چلا' گھروالی دونوں بچوں کے ساتھ پاکستان آگئی تھی۔" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ لہجہ اور دل دوز ہوگیا۔ "وہ کہاں ہے' کس کے پاس ہے؟ بچوں کا کیا بنا؟ یہ اب تک پتہ نہیں چلا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "۸ سال سے انھیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ ادھر بھی انھیں ڈھونڈنے ہی آیا تھا۔ اندھیرے میں گھوڑی سامنے آگئی۔" اس کے لہجے میں سسکیوں کی سرسراہٹ تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ تڑپ کر بولا۔ "مرجاتا تو ٹھیک تھا۔" رحیم داد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

جمیلہ کی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ سر جھکا کر رونے لگی۔ اس کا چہرہ بجھ گیا۔ اللہ وسایا نے اسے روتے دیکھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس کا سر آہستہ آہستہ تھپکا' دل جوئی کی۔ "لے' تو بھی رونے بیٹھ گئی۔" وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "چوہدری! اس کا دل بہت کمزور ہے۔ کسی کو دکھی دیکھتی ہے تو اس کی آنکھوں میں ایسے ہی آنسو آجاتے ہیں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "ویسے جی فسادات میں بہت ظلم ہوا۔" اس نے رحیم داد کو تسلی دی۔

"چوہدری! رب نے چاہا' تیری گھروالی اور بچے ایک نہ ایک دن تجھے ضرور مل جائیں گے۔"

خاموش رہا۔ اللہ وسایا اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے جمیلہ کا بازو تھاما۔ "چل چوہدری کو ۔ بہت رات ہوگئی۔" جمیلہ نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے اور خاموشی سے ں آگے بڑھے اور آہستہ آہستہ کمرے سے نکل کر آنگن میں پہنچ گئے۔

آرہی

نیچے جھول رہی

دیتی ڈاکٹر کے ساتھ

رحیم داد کچھ دیر خاموش لیٹا رہا پھر اٹھا۔ میز پر رکھے ہوئے جگ سے اس نے گلاس میں پانی انڈیل کر پیا۔ دروازے سے جھانکا۔ احمد اس وقت موجود نہیں تھا۔ اس کی چارپائی خالی تھی۔ رحیم داد پلنگ سے نیچے اترا۔ لیمپ کی لو دھیمی کی اور بستر پر آکر لیٹ گیا۔

☆

سویرے سویرے اللہ وسایا آیا مگر جمیلہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔ رحیم داد کی طبیعت اب خاصی سنبھل گئی تھی۔ چہرے پر سوجن بھی نہیں رہی تھی۔ لیکن وہ کمزور ہوگیا تھا۔ رنگت زرد پڑگئی تھی۔ اللہ وسایا اسے اپنے ہم راہ مہمان خانے سے باہر لے گیا۔ سورج شیشم کے درختوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا۔ سنہری دھوپ گاؤں کے مکانوں کی منڈیروں پر جھلملا رہی تھی۔ کوٹلہ ہرکشن اب پوری طرح بیدار ہوچکا تھا۔ گھروں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

دونوں بستی کی جانب نہیں گئے' کھیتوں کی طرف نکل گئے۔ فصلوں کی کٹائی ہوچکی تھی۔ کھیتوں میں کہیں کٹی ہوئی فصل کے ترنڈے دور سے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں خریف کی کاشت کے لیے تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ کہیں واہن کھیت تھے' جن میں ہل چلایا جاچکا تھا۔ مگر نہ سہاگا پھرا تھا نہ فصل کی بوائی کے لیے زمین تیار ہوئی تھی۔ رحیم داد کو اپنا گاؤں' احمد کوٹ یاد آگیا۔ اور اس کی یاد کے ساتھ ساتھ اپنے کھیت کھلیان یاد آگئے۔ وہ اللہ وسایا کے ہم راہ چلتا رہا۔ دونوں خاموش تھے۔ صبح کی ہوا کے نرم نرم جھونکے خوش گوار تھے۔ ان میں تازگی اور فرحت تھی۔

چلتے چلتے اللہ وسایا نے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! جب تک تیری طبیعت پوری طرح ٹھیک ٹھاک نہ ہوجائے' یہیں رہ۔ ویسے اپنا گھر سمجھ کر جب تک جی چاہے' ٹھیرا رہ۔ مہمان گھر میں ہو تو ذرا بہار رہتی ہے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"تیری مہربانی ہے۔" رحیم داد نے انکار نہیں کیا۔ "پر میں اس طرح کب تک یہاں رہ سکتا ہوں؟"

"چلا جانا' چلا جانا۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو تیری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہوئی۔"

دونوں حویلی کے سامنے کے وسیع میدان سے گزر رہے تھے۔ قریب ہی ایک نیم پختہ عمارت تھی۔ اس کی دیواریں اینٹوں سے چنی ہوئی تھیں۔ البتہ پختہ چھت کے بجائے چھپر پڑا تھا۔ اندر سے بچوں کی ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

رحیم داد نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "لگتا ہے' یہ تو سکول ہے؟"

اللہ وسایا نے تائید میں گردن ہلائی۔ "ہاں جی! سکول ہی ہے۔"

”سرکاری سکول ہوگا؟“

”نہیں۔“ اللہ وسایا نے بتایا۔ ”سرکاری سکول تو یہاں سے دس میل ادھر تاری والا میں ہے۔ یہ سکول تو جمیلہ نے کھولا ہے۔ خود بھی پڑھاتی ہے۔ دو ماسٹر بھی رکھ لیے ہیں۔ اب تو سکول کو چلتے لگ بھگ تین سال ہوگئے۔“

”تیری گھر والی پڑھی لکھی بھی ہے؟“ رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

”بہت پڑھی لکھی ہے جی۔“ اللہ وسایا نے بتایا۔ ”لہور میں پڑھتی تھی۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”جب اس کے ساتھ میرا ویاہ ہوا تو میں بالکل ان پڑھ تھا۔ اس نے سب سے پہلے تو مجھے پڑھنا لکھنا سکھایا۔ ویسے وہ تھوڑی بہت ڈاکٹری بھی کرلیتی ہے۔ تو نے تو دیکھا ہی ہے۔“

”ہاں جی‘ بالکل دیکھا ہے۔ اس رات وہ میری مرہم پٹی نہ کرتی تو زخم سڑ جاتا۔ پتہ نہیں کیا ہوتا۔“ رحیم داد نے اللہ وسایا کی تائید کی۔ ”میں تو اسے ڈاکٹرنی ہی سمجھا تھا۔ وہ سب کچھ ڈاکٹروں ہی کی طرح کر رہی تھی۔“

”اب تو اس پر پنڈ میں ڈسپنسری بنانے کی دھن سوار ہے۔ پر کوئی ہوشیار ڈاکٹر ہی نہیں ملتا۔ چھوٹا موٹا علاج تو وہ خود کرلیتی ہے۔ وہ حویلی میں ٹھیرتی ہی کب ہے۔ سکول سے بچوں کو پڑھا کر نکلتی ہے تو مزارعوں کے گھروں میں گھس جاتی ہے۔ کمیوں کے پاس بھی بے دھڑک چلی جاتی ہے۔ ان کے ساتھ گھل مل کر گپ شپ کرتی ہے۔ منع کرتا ہوں تب بھی نہیں مانتی۔“

”ویسے تو جی یہ بری عادت نہیں۔ پر تیرے جیسے وڈے زمیں داروں کی گھر والیاں اور زنانیاں ایسا کرتی نہیں۔ وہ تو حویلیوں اور ماڑیوں سے باہر ہی نہیں نکلتیں۔ ایسا کریں تو ان کے کھصم طلاک کا کاغذ ہاتھ میں تھما دیں۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ زمیں داروں میں یہی ہوتا ہے۔ تبھی تو آس پاس کے وڈے زمیں دار جمیلہ سے نراض ہیں۔ کہتے ہیں‘ اس نے زمیں داروں کی ساری ٹشک پشک اور عزت خاک میں ملا دی۔ ان کی پگ کے اونچے طرے نیچے کردیے۔“ اللہ وسایا کا لہجہ بوجھل ہوگیا۔ ”کیا بتاؤں جی! سبھی مجھ سے خار کھاتے ہیں۔“

”وہ بھی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ زمیں دار میں اکڑ اور آن بان نہ ہو تو کام کیسے چلے۔“ رحیم داد نے زمینداروں کی نفسیات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ ”مزارعے فصل سے کچھ بھی نہ دیں۔ اپنی را کی کے ساتھ زمیں دار کا حصہ بھی دبالیں۔ ویسے تیں نوں ایہہ تو پتہ ہی ہوگا کہ فصل کی واڈھی ہوتے ہی مزارعے اس میں سے چوری شروع کردیتے ہیں۔ زمیں دار اور اس کے کرندے کڑی نظر

نہ رکھیں اور چوری چکاری کرنے والے مزارعوں کو الٹا لٹکا کر پٹائی نہ کریں تو ساری فصل واڈھی سے پہلے ہی پہلے غائب ہوجائے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”پر اپنی زمیں داری میں ایسا نہیں ہوتا۔“ اللہ وسایا نے فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔ ”ادھر نہ فصلوں کی چوری ہوتی ہے‘ نہ پانی کی۔ نہ بٹائی دینے میں مزارعے رولا کرتے ہیں۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”جب پاکستان بنا تو شروع شروع میں میری زمیں داری میں بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ تو جی عجب زمانہ تھا۔ مزارعے تو ان دنوں زمین دبا کر بیٹھ گئے تھے۔ بٹائی دینے سے صاف انکار کرتے تھے۔ انھوں نے تو گنڈاسے اور ڈانگیں اٹھا کر حویلی پر ہلا بولنے کی بھی کوشش کی تھی۔“

”پولیس کو خبر نہیں کی؟ پرچہ چاک کرایا ہوتا۔ پولیس سب کو الٹا لٹکا دیتی۔ حوالات میں بند کرکے چمڑی ادھیڑ دیتی۔ سب بالکل ٹھیک ہوجاتے۔ پولیس کو ساتھ ملائے بنا تو زمینداری چل ہی نہیں سکتی۔“

”پر مجھے پولیس تھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ جمیلہ نے سب ٹھیک کرلیا۔“ اللہ وسایا بے تکلفی سے کھلکھلا کر ہنسا۔ ”سچ پوچھ چوہدری‘ زمیں داری تو وہی چلاتی ہے۔ نہ اس نے منشی رکھا‘ نہ کاردار‘ نہ مینجر۔ خود ہی ساری لکھا پڑھی کرتی ہے۔ فصل کی بٹائی بھی اپنے سامنے کراتی ہے۔ بٹائی کے لیے ونڈولے بھی نہیں بلاتی۔ مزارعوں ہی سے ونڈائی کراتی ہے۔ بٹائی کے بعد کمیوں کے لیے اٹگی کی صورت میں زیادہ سے زیادہ دانے کھلواڑے پر چھوڑ دیتی ہے۔ تبھی تو پنڈ کے سارے مزارعے اور کمی اسے بہت پیار کرتے ہیں۔ عزت اور محبت سے بھین جی کہتے ہیں۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”یہ لمی‘ لمی سفید داڑھی والے بھی اسے بھین جی کہتے ہیں۔ جمیلہ بھی ذرا برا نہیں مناتی۔ بلکہ بہت خوش ہوتی ہے۔“

اللہ وسایا اور رحیم داد باتیں کرتے ہوئے اسکول کے نزدیک پہنچ گئے۔ رحیم داد نے کھلے ہوئے دروازے سے دیکھا‘ باقاعدہ کلاس لگی ہے۔ لکڑی کی بینچوں پر بچے قطاروں میں بیٹھے ہیں۔ جمیلہ پیٹھ موڑے بلیک بورڈ پر چاک سے کچھ لکھ رہی تھی۔ دونوں اندر نہیں گئے۔ حویلی کی جانب واپس ہوئے۔

دھوپ اب ہر طرف پھیل گئی تھی۔ گرمی بھی بڑھ گئی تھی۔ رحیم داد تھکا ہوا اور نڈھال نظر آرہا تھا۔ مگر دونوں مہمان خانے میں نہیں گئے۔ باغ میں چلے گئے۔ جامن کے ایک گھنے درخت کے نیچے چند کرسیاں پڑی تھیں۔ سامنے چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ اللہ وسایا اور رحیم داد کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ دھوپ میں چلنے سے پسینہ آگیا تھا۔ سائے میں بیٹھ کر پسینے پر ہوا کے جھونکے لگے تو

تازگی اور فرحت محسوس ہوئی۔

رحیم داد نے شیشم کے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "تیرے پنڈ میں ٹاہلی کے پیڑ کچھ زیادہ ہی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟"

"جمیلہ نے خاص طور پر ٹاہلی کے پیڑ لگوائے ہیں۔ کہتی ہے جب سکول وڈا ہوجائے گا اور ڈسپنسری بھی بن جائے گی تو ان میں ٹاہلی کا فرنیچر بنوا کر لگواؤں گی۔"

"اور حویلی کے لیے فرنیچر نہیں بنے گا؟ ٹاہلی کی لکڑی تو بہت مہنگی ہوتی ہے۔"

اللہ وسایا نے مسکرا کر جواب دیا۔ "چوہدری! اس کی باتیں وہی جانے۔ میں نے یہی گل کہی تو بولی۔ "حویلی میں پہلے ہی بہت فرنیچر ہے۔ ہمیں اور زیادہ فرنیچر بنوا کر کیا لینا۔ چھوٹا سا تو اپنا ٹبّر ہے۔ ہم دونوں کے علاوہ صرف دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

"تیرے ساتھ اور کوئی نہیں رہتا؟"

"نہیں جی، اپنا بس اتنا ہی ٹبّر ہے۔"

نوکروں نے ناشتے کا سامان میز پر رکھ دیا۔ ناشتے میں لسی تھی، ساگ تھا، تلا ہوا مرغ تھا، پراٹھے تھے اور گرم گرم حلوہ تھا۔ رحیم داد نے مرغ اور پراٹھے نہیں کھائے۔ اس نے پراٹھے کا ایک لقمہ بنا کر منہ میں رکھا، چبایا تو زخم میں کسک ہونے لگی۔ اس نے لسی کے گھونٹ پی کر لقمہ حلق سے نیچے اتارا۔

اللہ وسایا نے رحیم داد کے چہرے پر کرب اور بے چینی دیکھ کر ٹوکا۔ "چوہدری! تو پردھانہ کھا، حلوہ کھا۔ یہ تیرے ہی لیے بنایا گیا ہے۔ میں ناشتے میں حلوہ نہیں کھاتا۔ عام طور پر شام کی چائے کے ساتھ حلوہ کھاتا ہوں۔"

ناشتے سے فارغ ہو کر اللہ وسایا کھڑا ہوگیا۔ "چوہدری! میں نے کچھ ضروری کام کرنا ہے۔ اب میں چلوں گا۔ تو یہیں بیٹھا رہ۔ دل بہلے گا۔ دھوپ بڑھ جائے تو اندر چلا جانا۔"

☆

ہوا کے نرم اور خنک جھونکے چل رہے تھے۔ رحیم داد نے میز پر دونوں ٹانگیں پھیلا دیں اور آنکھیں بند کرلیں۔ ذرا دیر بعد وہ خراٹے بھرنے لگا۔

اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ کی تمازت بڑھ چکی تھی۔ مگر درختوں تلے بدستور ٹھنڈک تھی۔ ایک شخص گھاس پر اکڑوں بیٹھا ہولے ہولے رحیم داد کی پنڈلیاں دبا رہا تھا۔ وہ وضع قطع سے مزارع لگتا تھا۔ رحیم داد آنکھیں کھولے لمحے بھر تک حیرت سے اسے تکتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"کون ہے تو؟"

"میرا ناں ماکھا ہے جی۔"

"مزارع ہے یا حویلی کا نوکر ہے؟"

"میں تو جی پرلے پنڈ، پیراں والہ میں رہتا ہوں۔" اس نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "یہاں سے چار پنج میل ہوگا۔"

"یہاں کس لیے آیا ہے؟"

"ایک کام تھا جی۔" وہ عاجزی سے بولا۔ "تیری بہت مہربانی ہوگی۔ میں تیرے پیر پکڑتا ہوں۔" اس نے پنڈلیاں چھوڑ کر رحیم داد کے پیر پکڑ لیے۔ رحیم داد نے پریشان ہو کر جھٹ اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں۔

"کیا کام ہے تیرا؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا۔

"میرا بازو واپس دلوا دے۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

"میں کیسے واپس دلوا سکتا ہوں۔" رحیم داد ہنوز حیرت زدہ تھا۔ "تیری گھر والی کس کے پاس ہے؟"

وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ "وہ جی بہت وڈا زمیں دار ہے۔ اسے شاہ جی کہتے ہیں۔ اس نے میری گھر والی کو اٹھوا کر اپنی حویلی میں رکھ چھوڑا ہے۔ پنج سال سے اوپر ہوگئے۔ سال بھر کا اس سے ایک نکا بھی تھا۔ ماں کے لیے بلکتا ہوا مرگیا۔ زمیں دار سے بہت منت کی۔ پیروں پر پگڑی رکھ دی پر وہ میری ایک نہیں سنتا۔ توں اپنے زمیں دار سے شاہ جی کے نام چھٹی لکھوا دے۔ اس کی گل وہ ضرور مان لے گا۔" ماکھا ہاتھ جوڑ کر بے بسی سے گویا ہوا۔ "تین بچے ہوچکے ہیں اس کے۔ اب تو شاہ جی کے کام کی بھی نہیں رہی۔"

"اور تیرے کام کی کب رہ گئی۔" رحیم داد نے تیکھے لہجے میں اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"کیوں نہیں رہی جی۔" اس نے بے جھجک کہا۔ "وہ میرا بازو ہے۔ تجھے کیا پتہ، اس کے جانے کے بعد میں تباہ ہوگیا۔ گھر میں بوڑھی ماں ہے۔ اسے بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ تو ذرا یہ تو سوچ۔ سویرے ڈھور ڈنگروں کا پٹھا دتھا کون کرے؟ روٹی پکا کر دوپہر کو کھیت میں مجھے بھتا کون پہنچائے؟ چاٹی میں دودھ بلو کر مکھن کون نکالے؟" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "وہ کپڑے لتے دھوتی تھی، صفائی اور جھاڑ پونچھ کرتی تھی۔ فیر یہ بھی تو ہے جی، خریف کی فصل پر پھٹی چنتی۔ چوگی میں جو روئی ملتی، اس کا چرخے پر سوت کاتتی تھی۔ چولھا جلانے کے لیے جھنگر سے لکڑیاں اور کماد کی کھوری چن

کرلاتی تھی۔ اور جی....."

رحیم داد نے اکتا کر بیزاری سے کہا۔ "یار! اب بس کر۔ کام کی گل کر۔"

"وہی تو کر رہا تھا جی۔" ماکھا نے سادگی سے اظہار خیال کیا۔ "اب یہی دیکھ' پچھلی برکھا میں آدھے سے زیادہ گھر ڈھے گیا۔ اپنا بازو ہوتا تو دونوں کب کے اسے ٹھیک ٹھاک کر چکے ہوتے۔" اس نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میرا یہ کام کردے۔ جنم جنم تجھے دعائیں دوں گا۔ تیری بہت مہربانی ہوگی۔"

"ایسا کیوں نہیں کرتا' دوسرا ویاہ کرلے۔ نیا اور زیادہ کام کا بازو مل جائے گا۔" رحیم داد نے مسکرا کر مشورہ دیا۔

"حد کردی توں نے۔" ماکھا منہ بگاڑ کر بولا۔ "ویاہ کرنا کوئی مخول ہے۔ پہلے جب ویاہ کیا تھا' نوسو ادھار لیا تھا۔ اب تک وہی نہیں چکا سکا۔ ہاں' اپنا بازو ہوتا تو کب کا ادا ہوجاتا۔"

"میں آج یا کل سویرے زمیں دار سے بات کروں گا۔" رحیم داد نے ٹالنے کی غرض سے وعدہ کیا۔

"بس' توں مجھے اس سے چٹھی لکھوا دے' میرا کام بن جائے گا۔" اس نے اصرار کیا۔ "تیری مہربانی ہوگی۔"

"کہہ تو دیا تجھ سے۔" رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ مہمان خانے کی جانب بڑھا۔ ماکھا اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے گھگیاتا رہا۔ "تو جی' میں سمجھ لوں' میرا کام بن جائے گا؟ کب آوں تیرے کول؟"

"چار روز بعد آنا۔" رحیم داد نے اس کی جانب دیکھے بغیر بے نیازی سے کہا۔

ماکھا مستعدی سے بولا۔ "آجاؤں گا جی' بالکل آجاؤں گا۔"

رحیم داد چپ چاپ آگے بڑھتا ہوا مہمان خانے میں داخل ہوگیا۔ اس نے پلٹ کر ماکھے کو دیکھا بھی نہیں۔ اسے ماکھا اور اس کے بازو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے راجو کو حاجی کی قید سے آزاد کرانے میں نوردین کی صرف اس لیے مدد کی تھی کہ اس وقت اسے نوردین کی ہمدردی حاصل کرنا تھی۔ ماکھا کی ہمدردی کی اسے کیا ضرورت تھی۔ خود اس کے بازو' نوراں' کو جمال دین لے اڑا تھا۔ وہ اسے نہ واپس لاسکتا تھا نہ ماکھا کی طرح کسی سے فریاد کرسکتا تھا۔

رحیم داد کا دل بوجھل ہوگیا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے کمرے میں گیا اور خاموشی سے بستر پر دراز ہوگیا۔ وہ مضمحل اور دل گرفتہ تھا۔ اپنی بے مصرف زندگی پر دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔ وہ پر کٹا

کبوتر بن گیا تھا' جو نہ اڑ سکتا تھا' نہ کہیں جا سکتا تھا۔ بیکار دن تھے اور بیکار راتیں۔ وقت زخمی چھپکلی کے مانند آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ حویلی پر سناٹا چھایا تھا۔ مہمان خانہ سنسان تھا۔

دوپہر ہونے سے کچھ دیر پہلے جمیلہ کمرے میں داخل ہوئی۔ رحیم داد کو ایسا محسوس ہوا جیسے کمرہ اچانک روشن ہوگیا' فضا میں رنگ بکھر گیا' خوشبو بس گئی۔ جمیلہ گہرا بسنتی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کا حسن اور نکھر گیا تھا۔ گلابی چہرے پر شگفتگی اور رعنائی تھی۔ ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں نئے سلے ہوئے کپڑے تھے اور دوسرے میں سرخ گلاب کا گلدستہ تھا۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔

جمیلہ نے مسکرا کر پوچھا۔ "اب طبیعت کیسی ہے چوہدری؟"

"ٹھیک ہی ہے جی۔" رحیم داد نے جواب دیا۔ "میں تو سویرے ٹہلتا ہوا سکول کی طرف بھی گیا تھا۔"

"تو نے سکول دیکھا؟" جمیلہ کا چہرہ اور شگفتہ ہوگیا۔ "ابھی تو چھوٹا سا سکول ہے۔ میں اسے بہت وڈا بناوں گی۔ اس میں آس پاس کی بستیوں کے بچوں اور بچیوں کو بھی پڑھانے کا انتظام ہوگا۔ بچوں کا الگ اور بچیوں کا الگ۔" وہ زیر لب تبسم کے ساتھ بتاتی رہی۔ "میں نے تو دوا علاج کے لیے ڈسپنسری اور زنانیوں کے لیے زچہ گھر بنانے کی سکیم بھی تیار کر رکھی ہے۔ وہ بھی بن جائیں گے جی! کام کرنے کے لیے من میں لگن اور شکتی بھی ہونی چاہئے۔"

"پیسہ بھی تو چاہئے۔" رحیم داد ہنس کر بولا۔

"ہونا تو چاہئے۔" وہ بدستور مسکراتی رہی۔ "پر خالی پیسے سے کچھ نہیں بنتا۔"

جمیلہ نے کپڑے میز پر رکھ دیئے۔ گل دستہ رحیم داد کو دیا۔ بے تکلفی سے بولی۔ "چوہدری! اپنے باغ میں گلاب کے بہت بوٹے ہیں۔ گوجرانوالہ سے منگوا کر لگائے ہیں۔ دیکھ تو کتنے سندر پھول ہیں۔ تھوڑے ہی سے پہلے میں نے انھیں توڑ کر تیرے لیے گل دستہ بنایا تھا۔"

رحیم داد کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ پھول سونگھ کر بولا۔ "خوشبو بھی بہت چنگی ہے۔ سونگھ تو لہر آتی ہے۔"

جمیلہ نے کپڑے اٹھا کر رحیم داد کو دکھائے۔ "چوہدری! تیرے لیے یہ کپڑے بھی لائی ہوں۔ تیرے اپنے کپڑے تو بہت گندے ہوگئے ہیں۔ کل دوپہر تک ڈاکٹر آئے گا۔ اس نے اجازت دی تو نہا کر کپڑے بدل لینا۔ دو جوڑے ہیں۔ ایک تو ابھی بدل لے۔"

رحیم داد نے کپڑے دیکھے۔ دو قمیصیں' دو شلواریں اور دو دھوتیاں تھیں۔ خوش ہو کر بولا۔

"کپڑے تو بہت چنگے ہیں زمیں دارنی! تو نے اتنی تکلیف کیوں کی۔"

"لے، اس میں تکلیف کی کون سی گل ہے۔" جمیلہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ کپڑے میز پر رکھ دیئے اور معذرت کے انداز میں بولی۔ "اللہ وسایا کی گھوڑی سے تجھے جو چوٹ لگی ہے، چوہدری سچ مان، ہم دونوں کو اس کا بہت دکھ ہے۔" اس کا لہجہ قدرے دل گرفتہ ہو گیا۔ "اور تو تو ویسے بھی بہت دکھیارا ہے۔ گھربار، بال بچے، سب کچھ لٹا کر آیا ہے۔" اس کا شگفتہ چہرہ مرجھا گیا۔ رخساروں کی دھوپ پر بدلی چھا گئی۔

رحیم داد نے جمیلہ کے چہرے پر افسردگی دیکھی تو اسے تسلی دینے کی فوراً کوشش کی۔ "وہ تو جی گھوڑی چمک کر بے کابو ہو گئی تھی۔ زمیں دار کی اس میں کون سی غلطی تھی۔ وہ تو جی ہونے والی گل تھی، ہو کے رہی۔"

"چوہدری! میں تیرے لیے روٹی کے ساتھ دودھ بھجوا دوں گی۔ روٹی دودھ میں بھگو کر کھالیتا پر دودھ زیادہ پینا۔ خون بھی تو کتنا نکل گیا۔ گھاؤ گہرا لگا تھا۔ ابھی روٹی چبانے میں تجھے تکلیف ہوتی ہوگی۔ ڈاکٹر نے چاول کھانے سے منع کیا ہے ورنہ چاول کی کھچڑی تیرے لیے ٹھیک رہتی۔" جمیلہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "چنتا نہ کر چوہدری! جلد ہی تو سب کچھ کھانے پینے لگے گا۔" وہ دروازے کی جانب مڑی۔ "اب میں نوں جانا ہے۔ روٹی کھانی ہے۔ سکول سے سیدھی تیرے پاس آ گئی تھی۔"

جمیلہ چلی گئی۔ رحیم داد کو ایسا محسوس ہوا کہ کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی دھوپ دھندلی پڑ گئی۔ کمرہ سنسان ہو گیا۔

وہ خاموش لیٹا رہا۔ دوپہر ہو گئی۔ احمد نے کھانا لا کر رکھا۔ کھانے میں دودھ اور نرم نرم تنوری پراٹھے تھے۔ رحیم داد نے جمیلہ کی ہدایت کے مطابق پراٹھے دودھ میں بھگو کر کھائے۔

☆

باہر تیز دھوپ پھیلی تھی۔ ہوا بھی گرم تھی۔ رحیم داد کمرے میں لیٹا رہا۔ شام ہو گئی۔ احمد نے کرسی باہر صحن میں ڈال دی۔ رحیم داد کی بے چین نگاہیں بار بار اس دروازے کی جانب اٹھ جاتیں جو حویلی میں کھلتا تھا۔ اسے جمیلہ کا انتظار تھا، جس کا مسکراتا ہوا شگفتہ چہرہ دیکھ کر وہ خود بھی شگفتہ ہو جاتا تھا۔

اندھیرا بڑھتا گیا۔ رات ہو گئی مگر جمیلہ نہیں آئی۔ اللہ وسایا بھی نہیں آیا۔ وہ صبح آیا۔ رحیم داد کو اپنے ہم راہ باغ میں لے گیا۔ دونوں آم کے درختوں کے ایک کنج میں پڑی ہوئی کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ دھوپ ابھی بہت ہلکی تھی۔ ہوا کے نرم جھونکے چل رہے تھے۔ فضا خوش گوار تھی۔

نوکروں نے ناشتا لگا دیا۔

رحیم داد نے لسی کا گھونٹ بھرتے ہوئے ماکھے کا ذکر چھیڑ دیا۔ "کل جی، دور کے پنڈ کا ایک مزارع آیا تھا۔ ماکھا نام بتاتا تھا۔ بہت پریشان نظر آتا تھا۔ اس کا ایک کام ہے تجھ سے۔"

"کیا کام ہے اس کا؟" اللہ وسایا نے دریافت کیا۔

"اس کی گھروالی کو زمیں دار نے اٹھوا کر اپنی حویلی میں رکھ لیا ہے۔ وہ اپنا بازو واپس لینے کے لیے بہت بے چین اور پریشان ہے۔"

اللہ وسایا نے بے نیازی سے کہا۔ "چوہدری! تو کس چکر میں پڑ گیا۔ وہ کوئی وڈا ہی زمیں دار ہو گا اور ایسے زمیں داروں کو دوسرے کے ڈھور ڈنگر چوری کروا کے ادھر سے ادھر کرنے اور مزارعوں اور کمیوں کی جوان گھروالیوں اور کڑیوں کو اٹھوا کر اپنی رکھیل بنانے کا چسکا ہے۔ پوچھو تو کہیں گے ایسا کیے بنا زمیں داری نہیں چل سکتی۔ مزارعوں اور کمیوں پر زمیں داروں کا رعب اور دبدبہ نہیں بیٹھ سکتا۔ ایسا نہ کیا جائے تو وہ سر اونچا کر کے چلیں گے۔ بدمعاشی اور سرکشی کریں گے۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا، لہجہ کسی قدر تیکھا ہو گیا۔ "چوہدری! تو کس کس کا بازو واپس دلوائے گا۔ میرا کہا مان، اس چکر میں نہ پڑ۔"

"پر ماکھا بہت دکھیارا ہے۔" رحیم داد نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سفارش کی۔ "پنج سال سے اس کی گھروالی زمیں دار کی حویلی میں کید ہے۔ تین بچے اس سے پیدا کرا چکا ہے۔ تب بھی نہیں چھوڑتا۔ ادھر ماکھے کا حال یہ ہے کہ گھر میں صرف بوڑھی ماں ہے۔ پچھلی برکھا میں اس کا مکان بھی ڈھے گیا۔ بے چارا پیر پکڑ کر روتا تھا، گڑگڑاتا تھا۔ تو اس کے زمیں دار کے نام چھٹی لکھ دے، میرے کہنے سے لکھ دے۔ ماکھے کا کام بن جائے گا۔"

"زمیں دار کون ہے؟" اللہ وسایا نے رحیم داد کی سفارش سے متاثر ہو کر نیم رضامندی ظاہر کی۔ "اس کا کچھ اتا پتہ ماکھے نے بتایا تھا؟"

"ادھر اتر میں اس کا پنڈ ہے۔ پیراں والہ نام ہے۔" رحیم داد نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "زمیں دار کوم کا سید ہے۔ شاہ جی کہلاتا ہے۔ اس کا پورا نام مجھے ملوم نہیں۔"

"ضرورت بھی نہیں۔ میں سمجھ گیا، وہ کون ہے۔" اللہ وسایا بولا۔ "اس کا نام احسان شاہ ہے۔ ادھر کا وڈا زمیں دار ہے، بلکہ بہت وڈا جگیردار ہے۔ اس کی حویلی نہیں، وڈا کوٹ ہے۔ ایسی اونچی اونچی دیواریں ہیں کہ پرانے زمانے کے کسی قلعے کی فصیلیں لگتی ہیں۔ ان فصیلوں کے پیچھے بہت سی کوٹھڑیاں ہیں۔ ہر زنانی کو اٹھوانے کے بعد انھی کوٹھڑیوں میں سے کسی میں رکھا جاتا ہے۔ کوٹ

کے دروازے پر مسلح راکھے دن رات پہرا دیتے ہیں۔ کوئی زنانی دروازے تک نہیں پہنچ سکتی۔ باہر نکلنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اتنی زنانیاں اٹھوا کر اس نے کیوں رکھ چھوڑی ہیں؟"

"رات کو نشے میں ڈون ہو کر شاہ جی کوٹھڑیوں کے معائنے پر نکلتا ہے۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "جس زنانی پر طبیعت آجاتی ہے، اسے اپنے کمرے میں بلوا لیتا ہے۔ سنا ہے کبھی کبھی تو ایک رات میں کئی کئی بلواتا ہے۔ دلی کے دو حکیم اس نے نوکر رکھ چھوڑے ہیں۔ وہ اسے تگڑا جوان رکھنے کے لیے نئے نئے کشتے اور معجون بناتے ہیں۔ شاہ جی ادھکڑ ہو چکا ہے پر مونچھوں اور سر کے بالوں پر خضاب لگا کر جوان گبھرو کی طرح گھوڑی پر اکڑ کر بیٹھتا ہے۔"

"وہ جیسا بھی ہے، ہم نے اس سے کیا لینا۔ تو صرف اس کے نام چٹھی لکھ دے۔ ماکھا یہی چاہتا ہے۔ کہتا تھا، تیری چٹھی سے اس کا کام بن جائے گا۔"

"بننے کی بجائے اور بگڑ جائے گا۔" اللہ وسایا نے سنجیدگی سے کہا۔ "میری چٹھی دیکھ کر تو اتنا ناراض ہو گا کہ ماکھے کو ہرگز اس کی گھر والی واپس نہیں کرے گا۔"

"گل سمجھ نہیں آئی۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"گل ایسہ ہے جی۔ میری اس کے ساتھ لگتی ہے۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "وہ مجھ سے سخت خار کھاتا ہے۔ میرے خلاف اوپر طرح طرح کی شکاتیں پہنچاتا ہے۔ کتنی بار اس نے میرے چوکھر اٹھوا لیے۔ کھڑی فصلیں جلوا دیں۔ جھوٹے کیس بنوائے۔ چوہدری، تو نہیں جانتا، وہ کتنا برا اور خطرناک بندہ ہے۔"

"مطلب یہ ہوا کہ ماکھے کے لیے تو کچھ نہیں کر سکتا۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بتا، میں کیا کر سکتا ہوں۔" اللہ وسایا نے رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "شاہ جی کی حویلی میں اس کی مرضی کے بنا کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ چاروں طرف مسلح پہرا رہتا ہے۔ پولیس اور حکومت بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ سارے ہی وڈے افسروں سے اس کی یاری دوستی ہے۔ ایم ایل اے، ایم سی اے اور وزیر اس کی حویلی میں آکر ٹھیرتے ہیں۔ وہ انھیں ولایتی شرابیں پلاتا ہے۔ جوان اور سوہنی مٹیاریں پیش کرتا ہے۔" اللہ وسایا زیر لب مسکرایا۔ "وہ شاہ جی کی مدد کرتے ہیں، شاہ جی ان کی مدد کرتا ہے۔ وہ اس کی سفارشوں پر کام کر دیتے ہیں۔ شاہ جی ان کے لیے اوپر سفارشیں پہنچاتا ہے۔ تبھی تو تھانے دار، تحصیل دار اور دوسرے افسر اس کی مرضی کے لگائے جاتے ہیں۔ ذرا اس کے خلاف کوئی کام کریں، جھٹ پٹ ان کا تبادلہ کرا دیتا ہے۔"

"یہ تو جی اندھیر گردی ہے۔"

"ہے تو۔" اللہ وسایا نے اتفاق رائے کیا۔ "پر ایک احسان شاہ کیا، سارے ہی وڈے زمیں دار اور جگیر دار ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس دوڑ میں کوئی بہت آگے ہے، کوئی ذرا پیچھے۔ کوئی کشتے اور انجکشن آزمانے کے لیے مزارعوں اور کمیوں کی گھر والیاں اور کڑیاں اٹھواتا ہے، کوئی انھیں صرف ڈرانے، دھمکانے کے لیے ایسا کرتا ہے۔ چوہدری تو یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا۔ مزارعے یا کمی کی گھر والی کا جوان اور خوبصورت ہونا، اس کی بدنصیبی بھی ہوتی ہے۔ وہ ایسے وڈے زمیں داروں کے چنگل سے نہیں بچ سکتی۔"

"تو بھی تو وڈا زمیں دار ہے پر تیری حویلی میں تو مجھے ایسا کوئی چکر نظر نہیں آیا۔"

"میری گل چھوڑ۔" اللہ وسایا مسکرایا۔ "میں کب زمیں داری کرتا ہوں، زمین داری تو جیلہ کرتی ہے۔" بات کرتے کرتے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چہرے سے تشویش جھلکنے لگی۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "کس فکر میں پڑ گیا؟"

اللہ وسایا نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔ "چوہدری! سچ پوچھ تو مجھے جیلہ کی طرف سے بھی دھڑکا لگا رہتا ہے۔ منع بھی کرتا ہوں پر وہ نہیں مانتی۔ دن ہو یا رات، پنڈ میں ادھر ادھر گھومتی پھرتی ہے۔ ذرا پروا نہیں کرتی۔ ڈرتا ہوں، کوئی وڈا زمیں دار اسے بھی نہ اٹھوا لے۔ ویسے ہی سب مجھ سے خار کھاتے ہیں۔ حالانکہ سچی گل ایسہ ہے چوہدری، وہ مجھ سے سال دو سال ہی چھوٹی ہو گی۔ ۳۰ سال سے کم نہیں۔ کچھ اوپر ہی ہو گی۔ دو بچے بھی ہو چکے ہیں۔"

"پر تیری گھر والی اتنی لگتی نہیں، جتنی تو اس کی عمر بتا رہا ہے۔"

"بات یہ ہے جی! وہ سخت محنتی اور اہری ہے۔ ہر وکت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے۔ ادھر وڈے زمیں داروں کی گھر والیوں کا حال یہ ہے، حویلیوں اور بنگلوں میں بند رہتی ہیں۔ بھر بھر گلاس دودھ اور لسی چڑھاتی ہیں۔ دبا کے گھی اور مکھن کھاتی ہیں۔ کچھ کرنا دھرنا تو ہوتا نہیں۔ کام کاج کے لیے نوکرانیوں کی پوری بٹالین ہوتی ہے۔ ان کا کام تو منجیاں توڑنا اور کھٹا کھٹ بچے جننا ہوتا ہے۔ اس طرح چند ہی سال میں پھیل کر نیلی بار کی مُجّ بن جاتی ہیں۔" وہ شوخی سے ہنسا۔ "مُجّ تو جی! مُجّ ہی ہوتی ہے۔ سو وڈے زمیں دار کچھ ہی مدت بعد اپنی گھر والیوں کو مُجّ سمجھ کر حویلی کے کسی ڈھارے شاڑھے میں ڈال دیتے ہیں۔ اور دوسروں کی جوان اور سوہنی گھر والیوں کو اڑانے کی تاک میں رہتے ہیں۔ مزارعوں اور کمیوں کی گھر والیاں تو اس طرح اٹھوا لیتے ہیں جیسے شیر کٹا منہ میں دبا کر لے جاتا ہے۔"

اللہ دسایا کو کچھ یاد آگیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "چوہدری! میں نوں اب جانا ہے۔ شام کو تیرے پاس آؤں گا۔"

اللہ دسایا چلا گیا۔ رحیم داد باغ میں دیر تک بیٹھا رہا۔ جب دھوپ میں شدت آگئی اور درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر اس پر بھی پڑنے لگی تو وہ بھی اٹھ کر مہمان خانے میں چلا گیا۔ دوپہر کو ڈاکٹر خان آیا۔ اس کے ساتھ جمیلہ بھی تھی۔ ڈاکٹر نے اسٹکنگ پلاسٹر اور روئی ہٹا کر زخم دیکھا۔ زخم اب بھر گیا تھا۔

ڈاکٹر نے رحیم داد کے بازو میں انجکشن لگایا اور ایک شیشی میں مرہم دے کر بولا۔ "اسے صبح شام لگاتے رہنا۔ اب پٹی شٹی کی ضرورت نہیں۔ لیکن زخم پر مکھی نہ بیٹھنے پائے۔ ویسے تو یہ صاف ستھری جگہ ہے پر احتیاط کرنا بہت ضروری ہے۔" ڈاکٹر نے اسے غسل کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی کہ گرم پانی سے نہا ئے اور زخم پر مرہم لگانے سے پہلے نہالے۔

ڈاکٹر چلا گیا۔ جمیلہ بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔

رحیم داد نے نائی بلوایا۔ حجامت بنوائی اور مہمان خانے کے غسل خانے میں گرم پانی سے دیر تک صابن مل مل کر نہاتا رہا۔ غسل سے فارغ ہو کر اس نے اجلے کپڑے پہنے، بالوں میں کنگھی کی اور زخم پر مرہم لگایا۔

دوپہر کو کھانا کھایا مگر بستر پر آرام کرنے کے بجائے اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ اندر سے کنڈی لگائی۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ کھولا، سادہ کاغذ نکالا اور اس پر مقتول چوہدری نوراِلٰہی کے جعلی دستخط بنانے کی پوری توجہ سے مشق کرنے لگا۔

دن ڈھلے تک وہ مسلسل مشق کرتا رہا۔ جب کمرے میں روشنی دھندلی پڑ گئی تو اس نے کاغذ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ کمرے سے باہر نکلا۔ احمد مہمان خانے میں نہیں تھا۔ رحیم داد نے کاغذ کے ٹکڑے ایک کونے میں ڈال کر ماچس سے آگ لگا دی اور ان کی راکھ مٹی میں ملا دی۔

☆

دھوپ گھروں کے منڈیروں پر پہنچ چکی تھی۔ سائے طویل ہو کر دور دور تک پھیل گئے تھے۔ رحیم داد مہمان خانے سے نکل کر باغ میں پہنچا۔ جمیلہ پہلے سے وہاں موجود تھی۔ وہ گلاب کے پودوں کے تختے کے پاس کرسی پر بیٹھی تھی۔ قریب ہی اس کے دونوں بچے کھیل رہے تھے۔ ایک بیٹا اور دوسری بیٹی۔ بیٹا پانچ سال کے لگ بھگ تھا۔ بیٹی اس سے سال سوا سال چھوٹی تھی۔ دونوں بچے تن درست اور خوب صورت تھے۔ پھولوں کے مانند شگفتہ اور تر و تازہ۔ جمیلہ گردن جھکائے ایک

بوڑھے کے پیر کے زخم پر دوا لگا کر پٹی باندھ رہی تھی۔ آہٹ سن کر جمیلہ نے گردن کو ہلکا سا خم دیا، رحیم داد کو دیکھا، مسکرا کر بولی۔

"آ چوہدری! ادھر بیٹھ جا۔" اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ رحیم داد خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

جمیلہ نے زخم پر اچھی طرح پٹی باندھ کر بوڑھے سے کہا "چاچا! جب تک چوٹ ٹھیک نہ ہو جائے، منجی پر پڑا رہ۔ دو تین روز میں چنگا ہو جائے گا۔" بوڑھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"جمیلہ نے اسے ٹوکا۔ "یہ تو بتا، تیری گھر والی کا کیا حال چال ہے؟"

"بھین جی! اس کا بکھار نہیں جاتا۔ ہر تیسرے روز اسے زور سے ٹھنڈ چڑھتی ہے۔ جانے کیسا بکھار ہے، جاتا ہی نہیں۔" بوڑھے نے تشویش کا اظہار کیا۔

"اسے ملیریا ہے۔ میں رات کو اس کے لیے دوائی لے کر تیرے گھر آؤں گی۔ چنتا نہ کر، اس کا بخار جاتا رہے گا۔" جمیلہ نے اسے تسلی دی۔ "دعا کر اپنی ڈسپنسری بن جائے تو سارے پنڈ کا دوا دارو یہیں ہو گا۔ دیپال پور یا پاک پتن نہیں جانا پڑے گا۔"

بوڑھا اسے دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

جمیلہ کے سامنے گھاس پر تین عورتیں بیٹھی تھیں۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک عورت سے پوچھا۔ "بشیراں! زمیں دار کدھر ہے؟ حویلی میں تو ہے نہیں۔"

جمیلہ کرسی سے اتر کر عورتوں کے ساتھ گھاس پر بیٹھ گئی، مسکرا کر بولی۔ "وہ اس طرح بیٹھنے پر برا مناتا ہے۔ زمیں دار جو ٹھیرا۔" وہ ایک اور عورت کی جانب متوجہ ہوئی۔ "تو کیسے آئی پھاتاں! ٹھیک ٹھاک تو ہے؟"

"ٹھیک ٹھاک ہی ہوں جی۔" پھاتاں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "جٹیاں فصل کی واڈھی کی آس لگاتی ہیں۔ واڈھی ہو تو ان کا ویاہ ہو۔ اپنی تو زمین ہے، نہ فصل۔ گھر والا بھی نہ رہا۔ دھی جوان ہو گئی۔ اس کا ویاہ کیسے کروں؟ بے ساکھی کے بعد پنڈ کی کئی جٹیوں کا ویاہ ہو رہا ہے۔" اس کا چہرہ سوگوار ہو گیا۔ "مجھے تو کوئی ادھار بھی نہیں دے گا۔ میں کیا کروں بھین جی؟"

"تو اپنی تاجاں کی گل کر رہی ہے؟" جمیلہ نے مسکرا کر دریافت کیا۔ "تو نے اس کے لیے ور بھی ڈھونڈا؟"

"ور تو کب کا دیکھ بھال لیا، پرایا نہیں، اپنی ہی برادری کا ہے۔ سکے دیر کا پت ہے۔ اس کے گھر والے تو بالکل تیار ہیں۔ تاجاں انھیں پسند بھی ہے۔ پر اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں۔"

"چنتا نہ کر پھاتاں!" جمیلہ نے چہک کر کہا۔ "تاجاں اپنے پنڈ کی دھی ہے' میری دھی ہے۔ میں اس کی سگائی کروں گی۔ یہیں حویلی سے اس کا ویاہ ہوگا۔ تو اپنی بھرجائی سے کہہ دے' تیاری کرے۔"

"بھین جی! میری دھی بھی جوان ہوگئی۔" بشیراں نے جھٹ اپنا مسئلہ پیش کردیا۔ "مجھے کچھ اور نہیں چاہیے' ادھار مل جاتا تو میں ویاہ کرکے اسے اس کے گھربار کا کردیتی۔"

"تو گلو کی گل کر رہی ہے؟" جمیلہ نے حیرت سے پوچھا۔ "ارے وہ تو ذرا سی چھوہری ہے۔ تو اس کی سگائی کرنا چاہتی ہے۔ حد کردی تونے۔"

"بیٹی کا بوجھ جتنی جھیتی سر سے اتر جائے' اتنا ہی چنگا ہے جی۔" بشیراں نے اپنی دلیل کا سہارا لیا۔

"اس پر کار نہ سوچ' ابھی تو وہ بہت نرل ہے۔ مشکل سے باراں برس کی ہوگی۔ اسے کچھ دن تو کھیل کود لینے دے۔ جوان ہوجائے تو ویاہ کرنا۔ کم سے کم چار سال بعد اس کام کے لیے میرے پاس آنا۔ میں تیری ضرور سہایتا کروں گی۔"

جمیلہ نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ دور سے اللہ وسایا آتا نظر آیا۔ جمیلہ اٹھ کر جھٹ کرسی پر بیٹھ گئی۔ تینوں عورتیں چلی گئیں۔ اللہ وسایا تھکا ہوا ایک کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ نڈھال اور بجھا بجھا نظر آرہا تھا۔

جمیلہ نے تشویش سے دریافت کیا۔ "کیا بات ہے۔ اللہ وسای! تو کچھ پریشان اور نراش نظر آرہا ہے؟"

"پریشانی کی گل ہی ہے۔" وہ ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔ "پڑ میں گاھی ہوئی کنک پڑی ہے۔ دھڑ کو پچھوڑنے اور پھٹکنے کے لیے مسلّی نہیں مل رہے۔" اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ "بارش یا آندھی آجائے تو سب کچھ برباد ہوجائے گا۔"

آسمان پر بادلوں کا ہلکا ہلکا غبار چھایا تھا۔ ہوا میں بھی قدرے تیکھا پن تھا۔ جمیلہ نے بھی آسمان کو دیکھا۔ وہ بھی متفکر نظر آنے لگی۔ "چنتا کرنے کی تو گل ہے پر تونے کیا اپائے سوچا؟" اس نے بیٹے کو گود میں بٹھالیا اور اس کے بالوں میں انگلیوں سے آہستہ آہستہ کنگھی کرنے لگی۔

"پرسوں سویرے سے پہلے مسلّی نہیں آسکتے۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "آج کی رات اور کل کے دن رات ٹھیک سے گزر جائیں تو سمجھو کام بن گیا۔"

"میں کہتی ہوں' مزارعے اور زمیں دار یہ کام کیوں نہیں کرسکتے؟"

"نہیں جی! وہ ایسا نچ کام کیسے کرسکتے ہیں۔" رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔ "ایسا کام تو مسلّی اور کمّی ہی کرسکتے ہیں۔"

جمیلہ بولی۔ "اور جو برکھا آجائے' آندھی آجائے؟" اس کا لہجہ تیکھا اور تلخ تھا۔ رحیم داد نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ "یہ تو رب کی مرضی ہے' اس کی مرضی میں کون دخل دے سکتا ہے۔"

"چوہدری یہ باتیں جمی لے نہیں سمجھتی۔" اللہ وسایا نے رحیم داد کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "شہر میں برسوں رہ چکی ہے نا' پڑھ لکھ بھی بہت گئی ہے۔ اسے کیا پتہ' زمیں داری کیا ہوتی ہے۔" وہ بازو سے لگی ہوئی بیٹی کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔

"پر میں تو گڈو کو پہلے ڈاکٹر بناؤں گی۔" اس نے بیٹے کو سینے سے چمٹا کر پوچھا۔ "گڈو! تو ڈاکٹر بنے گا نا؟"

گڈو نے نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھا اور اپنا گول مٹول سر آہستہ آہستہ ہلایا۔

جمیلہ نے بیٹی کو دیکھا' ہنس کر بولی۔ "ڈاکٹر تو نینا بھی بنے گی۔ دونوں مل کر میری ڈسپنسری کو بہت وڈا اسپتال بنا دیں گے۔ اپنے ہی پنڈ کا نہیں' دور دور کے پنڈ والوں کا علاج کریں گے۔"

"جمی لے! تو سفنا تو نہیں دیکھ رہی؟" اللہ وسایا ہنسنے لگا۔ "تیری ڈسپنسری بنی بھی نہیں اور تونے خواب دیکھنے شروع کردیے ابھی سے۔"

"منش پہلے سپنے ہی دیکھتا ہے۔" جمیلہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "من میں لگن ہو تو سپنا ایک روز سچ بن کر سامنے آجاتا ہے۔ سدا ایسا ہی ہوتا ہے۔"

شام دھیرے دھیرے باغ میں تاریکی کے ڈیرے ڈال رہی تھی۔ اللہ وسایا نے اٹھتے ہوئے جمیلہ سے کہا۔ "اندھیرا پھیل رہا ہے' کب تک یہاں بیٹھنے کا ارادہ ہے؟" جمیلہ بھی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا مہمان خانے میں چلا گیا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ حویلی کی سمت بڑھے۔ دونوں گردن اٹھا کر بار بار آسمان پر چھایا ہوا غبار دیکھتے تھے۔ وہ بارش اور طوفان کے خطرے سے فکر مند نظر آتے تھے۔ اسی خدشے سے سہمے ہوئے دونوں بچوں کے ہم راہ حویلی میں داخل ہوگئے۔

رات گزری' دن گزرا' دوسری رات بھی گزر گئی مگر نہ بارش ہوئی' نہ طوفان آیا۔ سویرے سویرے مسلّی آگئے اور گاہی ہوئی گندم پچھوڑ کر بھوسا اور دانے الگ کرنے لگے۔ پچھوڑنے کے بعد جگہ جگہ مزارعوں کے کھلیانوں میں گندم اور چنے کی ڈھیریاں نظر آنے لگیں۔ کہیں کہیں ڈھیریوں پر مٹی اور راکھ کا لیپ لگا کر ہلکا سا پلستر چڑھا دیا گیا تاکہ چوری چکاری کا امکان نہ رہے۔

اسی طرح بھوسے کی بھی ڈھیریاں بنا کر اوپر سے مٹی کا گاڑھا گاڑھا لیپ چڑھا دیا گیا۔

جمعے کے مبارک دن سے بٹائی کا آغاز ہوا۔ اس روز کوٹ ہر کشن میں بڑی چہل پہل اور رونق تھی۔ مزارعوں اور کمیوں نے نہا دھو کر اجلے کپڑے پہنے۔ نوجوان عورتیں رنگ برنگے راکھواں لباس میں ہنستی مسکراتی ادھر ادھر پھر رہی تھیں۔ وہ کنواریاں جن کی بٹائی کے بعد شادی ہونے والی تھی‘ شرمائی شرمائی نظر آتیں‘ سہیلیاں ان سے چھیڑ چھاڑ کرتیں۔ اس روز گاؤں میں میلے کا سماں تھا۔

پہر دن گزرا تو اللہ وسایا اپنے مزارعے کمال کے کھلیان پر جمیلہ اور رحیم داد کے ہم راہ پہنچا۔ فصل کی بٹائی کا آغاز وہیں سے ہوا۔ کمال کے گھر والے اور سیپی کمی پہلے سے وہاں موجود تھے۔ مسجد کا ملاّ بھی ایک طرف بیٹھا تھا۔ سب اللہ وسایا کے منتظر تھے۔ مٹی سے لیپے پتے کھلواڑ پر گندم اور چنے کی ڈھیریاں موجود تھیں۔ اللہ وسایا کے پہنچتے ہی غلغلہ پڑا۔ گندم اور چنوں کی ڈھیریوں پر چڑھا ہوا پلستر اتارا گیا۔ کھلواڑ ایک بار پھر جھاڑو سے صاف کی گئی۔ عود و لوبان سلگایا گیا۔ دھواں لہراتا ہوا فضا میں خوشبو بکھیرنے لگا

ہر ڈھیری اس اندازے سے بنائی گئی تھی کہ اس میں لگ بھگ آٹھ من غلہ ہو۔ اللہ وسایا اور کمال نے جوتے اتارے اور کھلواڑے کے چبوترے پر برہنہ پیر چڑھ گئے۔ دونوں ڈھیریوں کے قریب خاموش کھڑے ہو گئے۔ ملا نے کلام پاک کی تلاوت شروع کی۔ کھلواڑ کے اردگرد کھڑی ہوئی عورتوں اور لڑکیوں نے دوپٹوں کے آنچل سے سر ڈھک لیے۔ سب ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کر ادب سے خاموش کھڑے رہے۔

تلاوت ختم کرکے ملا نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ سب نے اس کے ساتھ ساتھ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ دعا کے بعد بٹائی شروع ہوئی۔ بٹائی کی ذمے داری پیشہ ور ونڈاوے کے بجائے گاؤں کے ایک بوڑھے کے سپرد کی گئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹوپا دبا تھا۔ ٹوپے میں تقریبا ڈھائی سیر غلہ آتا تھا۔ بٹائی شروع ہونے سے پہلے جمیلہ نے بوڑھے سے اونچی آواز میں کہا۔ "چاچا! پتہ ہے‘ یہ ڈھیریاں زمیں دار اور مزارعے کا مشترکہ کھاتا ہے۔ انھیں دونوں کے درمیان آدھا آدھا بانٹنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے کانونی حکوک بھی پوری طرح دھیان میں رکھنے ہوں گے۔ سرکاری کاغذات میں انھیں اس پرکار بتایا گیا ہے۔" اس نے لمبا کاغذ نکالا اور سنبھل سنبھل کر پڑھنے لگی۔ "ڈھیری جنس بحصہ نصف نصف مابین مالک و مزارع بعد وضع خرچ ہائے ذیل :

خرچ کمیاں :

ترکھان	ساڑھے چار پائی فی ہل
لوہار	ساڑھے چار پائی فی ہل
چھاجی	٩ پائی فی ڈھیری
موچی	٩ پائی فی ڈھیری
نائی	٩ پائی فی ڈھیری

جنس یافتنی مالک از ڈھیری مشترکہ

منعلی (ملازم مالک)	ایک پائی فی ڈھیری
محاصل	ایک ٹوپا فی ڈھیری
مالک کا پٹواری	٣ ٹوپے فی ڈھیری
منشی ڈیرے دار	٢ پائی فی ڈھیری
داد (میراثی)	ایک پائی فی ہل
دھواں دار (برائے تکیہ فقیراں)	ایک پائی فی ڈھیری
خرچ گھوڑا کاہیاں	دو پائی گندم فی ڈھیری

یہ تفصیلات سنانے کے بعد جمیلہ نے بوڑھے کی طرف دیکھا‘ مسکرا کر بولی۔ "چاچا! تیں نوں تو پتہ ہی ہوگا ایک پائی چار ٹوپے کے برابر ہوتی ہے۔ ویسے سرکاری کاغذات میں خرچ وڈاک بنگلہ برائے افسران دورہ گشتی کے لیے دو پائی فی ڈھیری بھی درج ہے۔ پٹواری کا فصلانہ اور تھانے دار کا نذرانہ الگ ہوتا ہے۔ پر ہم نے یہ سب کچھ نہیں دینا اور اپنا پٹواری شواری تو ہے ہی نہیں۔ اسے کچھ بھیجنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

بوڑھے نے جمیلہ کی تمام باتیں سنیں‘ مسکرا کر گویا ہوا۔ "فکر نہ کر‘ میں نوں سب پتہ ہے۔ تیں نوں یاد نہیں‘ پچھلے سال ربیع پر بھی میں نے ہی بٹائی شروع کی تھی اور توں نے مجھے سب کچھ ایسے ہی پڑھ کر سنایا تھا۔ میں اسے بھولا نہیں ہوں۔"

"پر چاچا‘ کانونی کارروائی تو پوری ہونی ہی چاہیے۔ جس کا جتنا حصہ بنتا ہے‘ اسے پورا پورا ملنا چاہیے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر بوڑھے نے ٹوپے میں پہلے گندم کی ڈھیری سے دانے بھرے اور دو بوریوں میں ایک ایک ٹوپا ڈالنے لگا۔ ایک بوری زمیں دار کی اور دوسری مزارعے کی تھی۔ بوڑھا بوریاں غلے سے بھرتا رہا۔ جمیلہ اپنے مزارعے کمال کی بیوی کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ بیچ بیچ میں بولتی جاتی۔ اونچی آواز سے بٹائی کرنے والے بوڑھے کو ٹوکتی' ہنس ہنس کر کہتی۔

"چاچا! تو زمیں دار کی بوری میں زیادہ کنک ڈال رہا ہے۔"

"اوپر والا دیکھ رہا ہے چاچا۔"

"ڈنڈی نہ مار۔ کمال کی را کی کا ٹوپا پورا بھر۔"

جمیلہ کی باتوں پر بار بار قہقہہ بلند ہوتا۔ زمیں دار اور مزارعے کے نصف نصف حصے کی بٹائی کے بعد مقررہ مقدار کے مطابق کمیوں اور دوسرے حق داروں کو بھی فصل کی پیداوار میں ان کا حصہ مل گیا تو جمیلہ نے ضد کرکے خاصی مقدار میں اگنی کا گندم فقیروں اور دوسرے حاجت مندوں کے لیے پڑا رہنے دیا۔

شام تک یہ سلسلہ چلتا رہا' دوسرے دن بھی جاری رہا اور مسلسل کئی روز تک جاری رہا۔ آخر بٹائی ختم ہوگئی۔

رحیم داد حیرت زدہ تھا۔ اس نے کسی بڑے زمیں دار کو اس طرح بٹائی میں شریک ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ یہ کام منشی یا کاردار انجام دیتے۔ وہ اپنے ساتھ بٹائی کرانے والے دیڑاوے بھی لاتے' جو ہر طرح یہ کوشش کرتے کہ مزارعے کے مقابلے میں زمین دار کو فصل کا زیادہ حصہ ملے۔ مزارع یا اس کے کنبے کا کوئی فرد احتجاج کرتا تو اسے ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کردیا جاتا۔ زمیں دار فصل کا نصف نہ لیتے' ہمیشہ زیادہ لیتے۔ اکثر دبیشتر دو تہائی کے لگ بھگ وصول کرتے۔

جب بٹائی کے حصے کا غلہ بند بوریوں کی صورت میں حویلی کے گودام میں پہنچ گیا تو پاک پتن کی غلہ منڈی کے آڑھتی اللہ وسایا کی حویلی کے چکر کاٹنے لگے۔ سال بھر کی ضرورت کا غلہ رکھ کر بقیہ فروخت کردیا گیا۔ یہ گویا آخری مرحلہ تھا۔ پھر دیگیں چڑھیں' طرح طرح کے پکوان پکے۔ سب نے کھانا کھایا۔

حویلی کے سامنے میدان میں مردوں نے بھنگڑا ڈالا۔ ڈھولیوں نے جھوم جھوم کر ڈھول پر چوٹ لگائی۔ من چلے نوجوانوں نے ان کے گرد حلقہ بنا کر رقص کیا۔ ایک دوسرے کو للکار کر ٹپے کے بول اٹھائے۔

اللہ وسایا اونچی چارپائی پر بیٹھا تھا اور رقص کرنے والوں کا حوصلہ بڑھ رہا تھا۔ ان کی آواز میں آواز ملا کر بلے بلے کے نعرے بلند کر رہا تھا۔

بھنگڑا ختم ہوگیا تھا۔ اللہ وسایا حویلی میں داخل ہوا۔ رحیم داد بھی اس کے ہم راہ تھا۔ حویلی کے وسیع صحن میں ابھی تک ڈھول بج رہا تھا۔ وسط میں جازم کا فرش تھا۔ اس پر گاؤں کی عورتیں بیٹھی تھیں۔ چاروں طرف مشعلیں روشن تھیں۔ عورتیں ڈھولک کی تھاپ پر لہک لہک کر گا رہی تھیں۔

اساں ڈھولکی وجانی' ساڈی ریت اے پرانی

اللہ وسایا اور رحیم داد ایک گوشے میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ رحیم داد نے دیکھا کہ گانے والی عورتوں میں جمیلہ بھی شامل ہے۔ اس کی آواز سریلی اور خوب صورت تھی۔ وہ گردن کو بار بار خم دے کر گا رہی تھی' اونچی تان سے گیت کے بول اٹھا رہی تھی۔ وہ اس وقت سنہری طلّے کا لاچا باندھے ہوئے تھی۔ لاچے کا رنگ زعفرانی تھا' کرتا بھی اسی رنگ کا تھا' گریبان پر سبز اور سیاہ دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ دوپٹا سبز تھا۔ پیروں میں چاندی کی پازیب تھی۔ ماتھے پر جڑاؤ ٹیکا جھلک رہا تھا۔ آنکھوں میں دنبالہ کاجل تھا۔ مشعلوں کی لہراتی روشنی میں وہ بہت دل کش اور دل آرا نظر آرہی تھی۔

گانا ختم ہوا تو جمیلہ نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ "ہوجائے جی' ہوجائے۔ گدھا ہوجائے۔"

چٹکیاں بجنے لگیں اور کچھ دیر بجتی رہیں۔ جمیلہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے ساتھ نوجوان عورتیں اور مٹیاریں بھی کھڑی ہوگئیں۔ جمیلہ تالیاں بجاتی ہوئی آگے آگئی۔ عورتیں اور مٹیاریں اس کے گرد حلقہ بنا کر ساتھ ساتھ تالیوں کی تھاپ دینے لگیں۔ رفتہ رفتہ تالیوں میں ہم آہنگی پیدا ہوتی گئی۔ تالیوں کی تھاپ کے ساتھ ساتھ پاؤں گردش کرنے لگے۔ جمیلہ نے ایک ہاتھ اٹھا کر اونچے سروں میں گدھے کی مناسبت سے گیت چھیڑا۔

کڑیاں سد کے گدھے پایئے
ستیاں گلاں جگایئے!!

گیت کے دوسرے بول ہم نوا عورتوں نے اٹھائے۔ تالیوں کی مسلسل تھاپ پر بول اونچے' اور اونچے ہوتے گئے۔ تھرکتے' لہکتے جسموں کی گردش تیز ہوتی گئی۔ ناچ تیز ہوا تو عورتوں نے رک رک کر دائرے میں جمیلہ کے گرد پھیریاں لینا شروع کردیں۔ ان کے پاؤں ایک ہی انداز میں زمین پر پڑ رہے تھے اور اسی ترتیب اور تواتر سے ہاتھ اوپر اٹھ اٹھ کر تالیوں کی تھاپ پر ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ ایک نوجوان لڑکی کے پیر غلط پڑے تو سامنے بیٹھی ہوئی عورتوں میں زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ وہ اس قدر خجل ہوئی کہ سر جھکا کر رقص کرنے والیوں کے حلقے سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔

جمیلہ کی اس پر نظر پڑی، اس نے آگے بڑھ کر جھٹ اس کا ہاتھ پکڑا اور حلقے سے علیحدہ نہ ہونے دیا۔

مشعلوں کے بھڑکتے شعلوں کی مچلتی روشنی میں جوان اور صحت مند جسم پھڑکتے رہے، لہراتے رہے۔ پازیب اور پائلیں جھنکارتی رہیں۔ گیت کے سریلے بول فضا میں بکھرتے رہے۔ ناچ تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ رقص کرنے والیوں کے چہرے خون کی گردش سے گلابی پڑ گئے۔ دہکنے لگے، دمکنے لگے۔

جمیلہ کا دل نواز چہرہ ان کے حلقے میں طلوع ہوتے ہوئے سورج کے مانند جگمگا رہا تھا۔ اس کی لمبی چوٹی ناگن کی طرح لہرا رہی تھی۔ چوٹی میں بندھا ہوا روپہلا پراندا جھلملا رہا تھا۔ وہ اس قدر حسین اور دل کش نظر آ رہی تھی کہ رحیم داد مبہوت ہو گیا۔ ٹکٹکی باندھے اس کا تابندہ اور رخشندہ چہرہ تکتا رہا۔ پھولوں سے لدی ہوئی شاخ کی طرح اس کے لچکتے بل کھاتے جسم کے پیچ و خم دیکھتا رہا۔

ناچ ختم ہوا تو رحیم داد کو ایسا لگا جیسے کوئی سہانا خواب دیکھتے دیکھتے اچانک بیدار ہو گیا ہو۔ جمیلہ اس کے ذہن پر برسات کی گھنی گھٹاؤں کی طرح چھائی ہوئی تھی۔

آدھی رات کے بعد رحیم داد مہمان خانے میں گیا۔ بستر پر لیٹا تو ناچ کے آہنگ اور گیت کی نغمگی سے مسحور تھا۔ وہ خاموش لیٹا دیر تک لطف اندوز ہوتا رہا۔

صبح وہ دیر سے بیدار ہوا۔ آنکھ کھلی تو مہمان خانے کے صحن کی دیواروں سے دھوپ نیچے اتر رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر غسل خانے میں گیا۔ واپس آیا تو میز پر ناشتا لگایا جا چکا تھا۔ احمد اجلے لباس میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔

“حمدے! آج تو بہت لشکارے مار رہا ہے؟”

وہ کسی قدر شرما کر بولا۔ “زمیں دارنی نے نئے کپڑے سلوا کر دیے ہیں۔ ہر فصل پر وہ حویلی کے سارے نوکروں اور نوکرانیوں کو نئے کپڑے دیتی ہے۔”

“تب تو تیرے عیش ہو گئے۔” رحیم داد بے تکلفی سے مسکراتا رہا۔

احمد نے دبی زبان سے کہا۔ “وہ ہے تو جی ہندنی پر دل کی بہت بھلی ہے۔”

رحیم داد چونک پڑا، پراٹھے کا لقمہ ہاتھ میں رہ گیا۔ “زمیں دارنی ہندنی ہے۔ تو سچ کہہ رہا ہے؟”

“چوہدری! میں تجھ سے کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔ پر اب وہ ہندنی نہیں رہی۔ زمیں دار سے نکاح پڑھانے سے پہلے مسلمان ہو گئی تھی۔ اپنی مسجد کے ملاں نے اسے کلمہ پڑھا کر مسلمان بنایا تھا۔” احمد نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ “میں تو جی اس پنڈ کا پرانا رہنے والا ہوں۔ اس زمانے سے رہتا ہوں جب پاکستان نہیں بنا تھا۔ تب یہ ساری زمین، زمیں دارنی کے پیو کی تھی۔ یہ حویلی بھی اسی کی تھی۔ بہت وڈا زمیں دار ہوتا تھا وہ۔”

رحیم داد ششدر رہ گیا۔ گومگو کے عالم میں بولا۔ “تیری باتیں سمجھ نہیں آئیں۔”

“چوہدری! میں نے غلط گل نہیں کی۔” احمد نے بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ “یہ تو سارا پنڈ جانتا ہے۔ تجھے اب تک پتہ نہیں چلا؟” وہ زیر لب مسکرایا۔ “پر زمیں دارنی اتنی بھلی ہے کوئی بھی اس کے بارے میں ایسی گل نہیں کرتا۔ سب اس سے پیار کرتے ہیں۔ بھین جی کہتے ہیں۔ سچ مان، میں نے یہ گل برائی سے نہیں کی۔ بس ایسے ہی زبان سے نکل گئی۔” اس نے ایک ہاتھ سے دونوں کان باری باری چھو کر گردن ہلائی۔ “توبہ جی توبہ۔ ربّا جانے، زمیں دارنی کا تو میں کبھی برا سوچ بھی نہیں سکتا۔”

رحیم داد نے خاموشی سے ناشتا ختم کیا۔ احمد خالی برتن لے گیا۔ وہ دیر تک احمد کی باتوں پر غور کرتا رہا پھر اٹھ کر باغ میں گیا۔ وہاں بھی وہ احمد کی باتوں کی روشنی میں جمیلہ اور اللہ وسایا کے بارے میں سوچتا رہا۔

رحیم داد نے جمیلہ کے بارے میں نہ کسی سے کرید کر پوچھا، نہ احمد کی باتوں کی تصدیق چاہی۔ اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اسے کچھ عرصے کے لیے محفوظ ٹھکانے کی ضرورت تھی، وہ اسے مل گیا تھا۔ اس کے پاس کوئی کام کاج تو تھا نہیں، کمرے کا دروازہ بند کرتا اور اطمینان سے چوہدری نور الٰہی کے دستخط کی مشق کرتا رہتا۔

رفتہ رفتہ رحیم داد کو اتنی مہارت ہو گئی کہ وہ نور الٰہی کے دستخط کی ہو بہو نقل کرنے لگا۔ اس کامیابی پر وہ خوش بھی تھا، مطمئن بھی۔

ایک شام رحیم داد اللہ وسایا کے ساتھ باغ میں بیٹھا تھا۔ اس نے دبی زبان سے رخصت ہونے کی خواہش ظاہر کی، مگر اللہ وسایا نے اصرار کیا تو اس نے مزید زور نہیں دیا۔ وہ فی الحال وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ صرف یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ اللہ وسایا اس سے اکتا تو نہیں گیا۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ ہر طرح اس کی دل جوئی کرتے، پورا خیال رکھتے کہ کسی طرح اسے تکلیف نہ ہو، اس کے دل کو ٹھیس نہ پہنچے۔

رحیم داد کا وقت اچھا کٹ رہا تھا۔ مہمان خانے میں اسے ہر طرح کا آرام اور سکون میسر تھا البتہ ماکھا بری طرح کھلتا۔ بار بار کے انکار کے باوجود وہ رحیم داد کے پاس آتا، گڑگڑاتا، اپنی بپتا سناتا۔ احسان شاہ نے ابھی تک اس کی بیوی واپس نہیں کی تھی۔ اس کے پیٹ میں چوتھا بچہ بھی آ چکا تھا۔

یہ بات بھی اسے ماکھا نے بتائی تھی۔ مگر رحیم داد اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اللہ وسایا بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ نہایت صاف گوئی سے اپنی مجبوری بتا چکا تھا۔

۱۸

گرمی خوب بڑھ چکی تھی۔ در و دیوار سے چنگاریاں نکلتیں۔ لو کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ اللہ وسایا کی زمینوں پر خریف کی فصل کے لیے مکئی، کماد، کپاس اور باجرے کی بوائی ہو رہی تھی۔ وہ کھیتوں میں کھڑے ہو کر اپنے سامنے بیج ڈلواتا، طرح طرح کی ہدایتیں دیتا۔ دن دن بھر چلچلاتی دھوپ اور لو میں کھڑے رہنے سے اس کا چہرہ جھلس کر سانولا پڑ گیا تھا۔

جمیلہ نے سرکاری اسکولوں کی طرح اپنے اسکول میں بھی موسم گرما کی تعطیل کر دی تھی۔ اسکول بند تھا۔ وہ اکثر اللہ وسایا کے ساتھ کھیتوں پر نکل جاتی اور ادھر ادھر گھومتی پھرتی۔ رحیم داد نے دونوں کو جب بھی کھیتوں سے آتے دیکھا، پسینے سے شرابور اور دھول سے اٹا ہوا پایا۔

ان دنوں اللہ وسایا سے رحیم داد کی ملاقات عام طور پر شام کو ہوتی۔ اللہ وسایا کبھی کبھی رات کا کھانا رحیم داد کے ساتھ مہمان خانے کے صحن میں بیٹھ کر کھاتا۔ زیادہ گرمی ہوتی تو کھانا باغ میں بھی کھایا جاتا۔ گھاس پر دری بچھا دی جاتی، وسط میں چھوٹے پایوں کی لمبی میز رکھ دی جاتی۔ اس پر کھانا چنا جاتا۔ سب دری پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ جمیلہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ موجود ہوتی۔ جس روز باغ میں کھانا کھایا جاتا، رحیم داد بہت خوش ہوتا۔ خود کو اللہ وسایا کے کنبے کا فرد سمجھتا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ کے رویئے سے بھی رحیم داد کو بیگانگی مطلق محسوس نہ ہوتی۔

ایک صبح اللہ وسایا مہمان خانے میں رحیم داد کے پاس آیا۔ رحیم داد ذرا ہی دیر پہلے ناشتے سے فارغ ہوا تھا۔ خلاف معمول اللہ وسایا کے ہاتھ میں دونالی بندوق تھی۔ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔

”سویرے سویرے بندوک لے کر کیسے نکل آیا؟ شکار پر جانے کا ارادہ ہے؟“

اللہ وسایا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ "محکمہ آباد کاری میں میری زمین اور جائیداد کا مکدمہ چل رہا ہے۔ اس سلسلے میں ملتان جا رہا ہوں۔ کل صبح پیشی ہے۔"

"کب تک واپسی ہوگی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"دو تین روز تو لگ ہی جائیں گے۔ اگر تاریخ پڑ گئی اور لمی پیشی نہ لگی تو ہفتہ بھر ٹھیرنا پڑے گا۔ وکیل یہی بتاتا تھا۔ میں دوپہر کو روٹی کھا کر ملتان کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔"

"بندوک اپنی حفاظت کے لیے لے جا رہا ہے؟ مکدمہ بازی چل رہی ہو تو حفاظت کے لیے اسلحہ رکھنا ہی پڑتا ہے۔"

"میرا مکدمہ ایسا نہیں جس میں کسی جھگڑے کا ڈر ہو۔ مکدمہ سرکار کے ساتھ چل رہا ہے۔" اللہ وسایا نے مطلع کیا۔ "ویسے سفر میں اپنے ساتھ میں بھرا ہوا پستول رکھتا ہوں۔ دو نوکر بھی ساتھ جا رہے ہیں۔ وہ بھی مسلح ہوں گے۔ بندوک تو میں تیرے لیے لایا تھا۔ آج کل ڈکیتیاں بہت ہو رہی ہیں۔ فصل کی واڈھی کے بعد عام طور پر ڈکیتی کی وارداتیں بڑھ بھی جاتی ہیں۔ سنا ہے' لائل پور سے ڈکیتوں کی ایک دھاڑ ادھر آئی ہوئی ہے۔ اس نے بڑا رولا کر رکھا ہے۔ روز ہی کہیں نہ کہیں سے ڈکیتی کی خبر سننے میں آتی ہے۔ ایک نیا چکر بھی چل رہا ہے وہ بھی کم خطرناک نہیں۔"

"وہ کیسا چکر ہے؟ کسی سے تیرا جھگڑا ٹنٹا ہو گیا؟"

"میرا تو نہیں پر میرے مزارے کادو اور اس کے پتر صابر کے ساتھ جھگڑا چل رہا ہے۔ ہے تو پرانی دشمنی پر اب زیادہ سنگین ہو گئی ہے۔"

رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے کرید کر پوچھا۔ "جھگڑا ہوا کس بات پر؟"

"میں نے بتایا نا' پرانی دشمنی ہے۔ لمی کہانی ہے۔ ڈیڑھ' پونے دو سال ادھر کی بات ہے' کادو کی دھی مجیداں کو پڑوس کے چک کا ایک نوجوان طاہر اٹھا کر لے گیا۔"

"زبردستی اٹھا لے گیا یا آپس میں یاری آشنائی تھی؟"

"یاری آشنائی ہی تھی۔" اللہ وسایا ہنسا۔ "میں نے تو یہی سنا تھا پر کادو اور اس کا پتر نہیں مانتا۔ مجیداں کی واپسی کے لیے میں نے صلح صفائی کی بھی کوشش کی۔ مگر طاہر اور اس کا پیؤ راضی نہیں ہوئے۔ کہتے تھے' مجیداں اپنی مرضی سے آئی ہے' یہاں راضی خوشی ہے۔"

"ایسی گل تھی تو کادو اور اس کے پتر کو چاہیے تھا کہ طاہر سے مجیداں کا ویاہ کر دیتا۔"

"پر کادو اس کا ویاہ اپنے بھانجے سے کرنا چاہتا تھا۔ طاہر اسے بالکل پسند نہیں۔ ویسے اصلی گل ایسہ تھی کہ مجیداں کے بھاگ جانے سے کادو کی بہت بدنامی ہوئی۔ کئی روز تو شرم کے مارے گھر

سے نہیں نکلا۔"

"عزت بھی تو آخر کوئی چیز ہوتی ہے کادو اور اس کے گھر والوں کی زبردست بے عزتی ہوئی' اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

"یہی عزت کا معاملہ تو سارے جھگڑے کی جڑ تھا۔" اللہ وسایا نے رحیم داد کی تائید کی۔ "کادو کو رہ رہ کر اسی پر غصہ آتا تھا۔ بات کرتا تو منہ سے جھاگ نکلتے' آنکھیں لال انگارا ہو جاتیں۔ بات ختم ہونے کی بجائے بڑھتی گئی۔ کادو اور اس کا پتر مجیداں کو کسی نہ کسی طرح واپس لانا چاہتے تھے تاکہ طاہر اور اس کے پیؤ کو نیچا دکھا سکیں۔ پاس پڑوس اور برادری میں ان کا سر اونچا ہو جائے اسی چکر میں دو مہینے سے اوپر ہو گئے۔"

"کادو نے تھانے میں پرچہ چاک نہیں کرایا؟"

"نہیں۔ وہ کہتا تھا' تھانے دار کچھ نہیں کرے گا۔ طاہر نے اس کی مٹھی گرم کر دی ہے۔"

اللہ وسایا بتاتا رہا۔ "پر کادو چپ کر کے نہ بیٹھا۔ وہ اور اس کا پتر تاک میں لگے رہے۔ طاہر ایک روز پاک پتن بابا فرید کی درگاہ پر گیا۔ مجیداں اس کے ساتھ تھی۔ دونوں منت ماننے گئے تھے۔ کادو کو پتہ چل گیا۔ وہ اپنے پتر کے ساتھ نکلا۔ ادھر طاہر اور مجیداں کو واپسی میں دیر ہو گئی۔ لاری سے اتر کر دونوں پنڈ کی طرف چلے تو کافی رات ہو گئی۔ کادو اور اس کا پتر ایک سنسان جگہ جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی وہ نزدیک پہنچے' طاہر کو دونوں نے گھیر لیا۔ وہ نہتا بھی تھا۔ ٹکوے کے پہلے ہی وار میں گر پڑا۔ کادو اور صابر غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔ انھوں نے طاہر کے ہاتھ کاٹے' پیر کاٹے اور آنکھیں بھی نکال لیں۔ اس کی لاش جھاڑیوں میں ڈالی اور مجیداں کو اپنے ساتھ لے آئے۔"

"پولیس نہیں آئی؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"کیوں نہیں آئی۔" اللہ وسایا نے جواب دیا۔ "کادو اور اس کے پتر صابر کو گرفتار کر کے لے گئی۔ دونوں پر طاہر کے کتل کا کیس چلایا۔ بعد میں سیشن سے دونوں کی ضمانت ہو گئی۔ ضمانت میں نے ہی دی تھی۔ دونوں میرے مزارعے جو تھے۔ دوسرے یہ کہ کادو کی گھر والی صبح شام جمیلہ کے سامنے آ کر روتی۔ تیں نوں پتہ ہے' جمیلہ کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتی۔ وہ مجھ سے کہتی اور اس کا کہا میں ٹال نہیں سکتا۔ مجھے کادو کے کیس کے لیے وکیل بھی کرنا پڑا۔ دوسری طرف طاہر کے پنڈ کا زمیں دار بھی مددگار بن کر سامنے آ گیا۔ سال بھر سے اوپر مکدمہ چلا۔ عینی گواہ تو کوئی تھا نہیں۔ شک کا فائدہ ملزموں کو ملا۔ عدالت نے کادو اور صابر کو پچھلے ہفتے بری کر دیا۔ جب دونوں گھر پہنچے تو جھگڑا

ڈالا گیا۔ جشن منایا گیا۔ تجھے بھی پتہ چلا ہو گا۔"

"نہیں، میں کسی سے ملتا جلتا ہی کب ہوں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پر ادھر تو خوشیاں منائی جا رہی ہیں، ادھر طاہر کے گھر والوں کے سینوں میں آگ بھڑک رہی ہے۔ وہ طاہر کے خون کا بدلہ لینے کے لیے تاک میں ہیں۔ کادو اور اس کا پتر تو ہر وکت چوکس رہتے ہیں۔" اللہ وسایا کے چہرے سے پریشانی ٹپکنے لگی۔ "میں جب تک باہر رہوں، تو بھی چوکس رہنا، خاص طور پر رات کو۔ ویسے بندوک چلانا تو جانتا ہی ہو گا؟ تو نے بھی زمیں داری کی ہے۔"

"برسوں شکار کھیلتا رہا ہوں۔" رحیم داد نے مستعدی سے کہا۔ "تیں نوں پتہ نہیں، میں نے کیسی زمیں داری کی ہے۔" اس نے اپنے بستے کی طرف اشارہ کیا۔ "تو نے میرا کلیم نہیں دیکھا۔ سو مربعے سے اوپر اپنا کلیم ہے۔"

"سو مربعے سے اوپر؟" اللہ وسایا نے حیرت سے چونک کر پوچھا۔

"یہ کاغذ رکھے ہیں، دیکھ لے۔" رحیم داد نے فخر سے گردن اونچی کی۔

"میں نوں بالکل پتہ نہ تھا، تو اتنا وڈا زمیں دار ہوتا تھا۔" اللہ وسایا نے بندوق رحیم داد کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "اسے اپنے پاس رکھ لے۔ اور یہ رہی کارتوسوں کی تھیلی۔" اس نے چمڑے کی تھیلی بھی رحیم داد کو دے دی۔ "ویسے بندوک استعمال کرنے کی تجھے ضرورت نہیں پڑے گی۔ پر خطرہ ہو تو ہمیشہ ہوشیار اور چوکس رہنا چاہئے اور دیکھ، یہ خیال رکھنا، بندوک بھری ہوئی ہے۔ ویسے رات کو حویلی کی اگواڑے پہرا رہتا ہے۔ یوں بھی بہت نوکر چاکر ہیں۔ تیری ایک ہانک پر وہ کیا، پورا پنڈ نکل آئے گا۔ گھبرانے کی کوئی گل بات نہیں۔"

"فکر نہ کر میں ڈرنے والا بندہ نہیں۔" رحیم داد نے بڑے اعتماد سے اللہ وسایا کو یقین دلایا۔ "کتنی بار گولی چل چکی ہے۔ کبھی پیچھے نہیں ہٹا۔ ہمیشہ جم کر لڑا۔"

"ویسے دیکھنے میں بھی تو جی دار لگتا ہے۔ اچھا تکڑا جوان ہے۔"

اللہ وسایا نے غلط نہیں کہا تھا۔ حویلی میں رہ کر رحیم داد کا رنگ بھی نکھر گیا تھا۔ جسم پر خوب گوشت چڑھ گیا تھا۔ وہ خاصا ہٹا کٹا لگتا تھا۔ ناشتے کے علاوہ دونوں وقت لذیذ اور مرغن غذا کھانے کو ملتی۔ کوئی کام کاج نہ کرنا پڑتا۔ تمام دن کمرے میں بستر پر لیٹا رہتا یا مقتول چوہدری نورالٰہی کے جعلی دستخط بنانے کی مشق کرتا۔ صبح شام باغ میں گھنٹے دو گھنٹے بیٹھتا۔ زندگی نہایت عیش اور آرام سے بسر ہو رہی تھی۔

اللہ وسایا اٹھ کر حویلی میں چلا گیا۔ رحیم داد نے بندوق کھونٹی پر دیوار کے ساتھ ٹکا دی مگر کارتوس نکال کر تھیلی میں ڈال دیئے اور تھیلی سرہانے بستر کے نیچے رکھ دی۔ پچھلی رات سے احمد کو بخار تھا۔ اس کی غیر حاضری میں حویلی کی ایک بوڑھی نوکرانی کھانا لائی تھی۔ دوسرے کام بھی اسی نے کیے۔

اللہ وسایا پروگرام کے مطابق اسی روز ملتان چلا گیا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں رہا۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ بڑا حبس تھا۔ آسمان پر گہرا غبار چھایا تھا۔

رحیم داد نے دن ڈھلے غسل کیا۔ اجلے کپڑے پہنے اور باغ میں بچھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جمیلہ بھی آ گئی۔ گڈو اور نینا، دونوں بچے اس کے ہم راہ تھے۔ جمیلہ ململ کا کڑھا ہوا سفید کرتا اور فیروزی شلوار پہنے ہوئے تھی، دوپٹا بھی فیروزی تھا۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو تڑپ کر رہ گیا۔

جمیلہ دور سے چل کر آئی تھی۔ پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلملا رہے تھے۔ رخساروں پر سرخی بکھری ہوئی تھی۔ کرتا بدن سے چپکا ہوا تھا۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں وہ خوب صورت اور دل آرا نظر آ رہی تھی۔

"زمیں دارنی! تھکی ہوئی دکھائی پڑ رہی ہے۔ کہاں گئی تھی؟"

"میں کادو کی دھی مجیداں کو دوائی دینے گئی تھی، اسے بخار ہے۔ لگتا ہے لو لگ گئی۔"

"یہ مجیداں وہی تو نہیں ہے جس کے لیے طاہر کا کتل ہوا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"ہاں وہی ہے۔" جمیلہ نے بتایا۔ "تیں نوں کیسے پتہ چلا؟"

"اللہ وسایا نے سویرے بتایا تھا۔ لگتا ہے، مجیداں بہت سوہنی ہو گی۔ جبھی تو اس کے لیے خون خرابہ ہوا۔"

"ایسی تو اس کی سندرتا نہیں کہ خون خرابہ ہو۔" وہ مسکرا کر بولی۔

رحیم داد نے بے ساختہ کہا۔ "وہ تیری طرح تو سوہنی نہیں ہو گی۔ تیری تو بات ہی اور ہے۔ اس پنڈ میں کیا، دور دور تک کوئی اتنی سوہنی زنانی نہ ہو گی۔" دل کی بات زبان پر آ گئی۔

"میں اب کیا رہ گئی۔" اس نے شرما کر آنچل سر پر ڈال لیا۔ "میری سندرتا تو نینا اور گڈو ہیں۔ عورت جب ماں بن جاتی ہے تو اس کی سندرتا اس کے بچے چوری چوری لے جاتے ہیں۔ سدا ایسا ہی ہوتا ہے۔"

رحیم داد نے گفتگو کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ "پر مجیداں کے بارے میں جو کچھ ہوا برا ہوا۔"

"بہت برا ہوا۔" جمیلہ نے اظہار تاسف کیا۔ "جب طاہر کے ساتھ چلی گئی تو میں نے کادو کو بہت سمجھایا' جو ہوتا تھا' ہوگیا۔ طاہر کو اپنا بنالے۔ پر وہ اسے جنوائی ماننے کو کسی طرح تیار نہ ہوا۔ عجب اکھڑ بندہ ہے اسے کچھ سمجھ نہ آیا۔ طاہر کا خون کیا اور پیو پتر دونوں پھانسی پر لٹکنے سے بال بال بچ نکلے۔ ضمانت سے پہلے مہینوں جیل میں بند رہے۔ آگے دیکھو' کیا ہوتا ہے۔ دشمنی نے جڑ تو پکڑ ہی لی۔ ایک بار ایسی دشمنی پڑ جائے تو پیڑھیوں تک خون خرابے کا سلسلہ چلتا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہے۔ کادو اور اس کے پتر کی جان کو ہر دم خطرہ ہے۔ دوسری پارٹی بدلہ لینے کی تاک میں لگی ہوگی۔"

"بالکل ایسا ہی ہے۔" جمیلہ نے اس کی تائید کی۔ "اور یہ خون خرابہ کرکے ملا کیا۔ جان بھی خطرے میں اور ادھر مجیداں رو رو کر آدھی بھی نہیں رہی۔ طاہر کا خون اسی کے کارن ہوا تھا۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ وہ یہ بات کیسے بھول سکتی ہے۔ میں نے اسے دیکھا تھا۔ چنگا گبھرو جوان تھا۔"

"بات یہ ہے جی! جب غیرت کا سوال سامنے آجاتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ بس ایک ہی چکر سر پر سوار رہتا ہے۔"

جمیلہ خاموش رہی۔ رحیم داد بھی چپ بیٹھا رہا۔

وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہری۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی اٹھ کر حویلی میں چلی گئی۔ بچے بھی اس کے ساتھ چلے گئے۔ رحیم داد مہمان خانے میں گیا۔ کھانا کھایا اور چھت پر چلا گیا۔ جب سے گرمی بڑھی تھی' اس نے چھت پر چارپائی ڈلوادی تھی اور اسی پر سوتا تھا۔ شام ہوتے ہی احمد یا کوئی دوسرا نوکر چھت پر چھڑکاؤ کرتا اور صاف ستھرا بستر لگا دیتا۔ رات ہوتے ہوتے چھت اتنی ٹھنڈی ہوجاتی تھی کہ گرم گرم بھبکے نہیں نکلتے تھے۔

☆

اس رات امس کچھ زیادہ تھی۔ رحیم داد بستر پر لیٹا دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ بھری ہوئی بندوق اس کے سرہانے رکھی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ غنودگی میں رحیم داد کو کھٹکا محسوس ہوا۔ چارپائی کا سرہانا آنگن کی طرف تھا۔ کھٹکا اسی طرف ہوا تھا۔ رحیم داد کی نیند اچاٹ گئی۔ وہ چند لمحے خاموش لیٹا رہا۔ آسمان پر ابھی تک گاڑھا گاڑھا غبار چھایا تھا۔ ہوا دھیمی تھی اور رک رک کر چل رہی تھی۔

حویلی کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں مدھم روشنی جھلملا رہی تھی۔ مہمان خانے کا اگلا حصہ صاف نظر آرہا تھا۔ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے گردن ذرا سی اٹھائی' جھک کر نیچے دیکھا۔ وہ سراسیمہ ہوگیا۔ اسے ایک آدمی چاردیواری کی بلندی سے چمٹا ہوا نظر آیا۔ وہ ہولے سے پھسل کر نیچے آنگن میں اترا۔ دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔ بیرونی دروازے پر پہنچا اور آہستہ سے کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی چار آدمی اندر داخل ہوئے۔

رحیم داد نے جھٹ گردن جھکالی۔ چند لمحے دم بخود پڑا رہا۔ اس نے خوف اور پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ایک بار پھر گردن اٹھائی اور منڈیر کی آڑ لے کر چوکنا نظروں سے پانچوں کو دیکھنے لگا۔ ان کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے تھے۔ تین آدمی دھوتیاں اور لمبے لمبے کرتے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں قرابین اور بندوقیں دبی تھیں۔ دو قمیصیں اور شلواریں پہنے ہوئے تھے۔ ان کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ مگر جو مسلح تھے' ان میں دو سکھ بھی تھے۔ ان کے بڑے بڑے کیس ڈھاٹوں سے صاف نظر آرہے تھے۔ دھندلی روشنی میں وہ ان کے بارے میں اس سے زیادہ کوئی اندازہ نہ لگا سکا۔ سکھوں کو دیکھ کر اسے سخت حیرت ہوئی۔ اس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا کہ وہ کیوں آئے ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟

پانچوں کچھ دیر آنگن میں خاموش کھڑے رہے۔ جب آس پاس کوئی کھٹکا نہیں ہوا تو ایک مسلح شخص آگے بڑھا اور بندر کی طرح اچھل کر قد آدم دیوار پر چڑھ گیا۔ یہ دیوار مہمان خانے کو حویلی سے جدا کرتی تھی۔ اس کا دروازہ حویلی کی جانب سے بند تھا۔

آنگن میں اب صرف چار افراد رہ گئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد درمیانی دیوار کا بند دروازہ کھلا اور وہ شخص باہر آگیا جو دیوار سے حویلی کے اندر کودا تھا۔ اس کے نکلتے ہی ان دونوں نے' جو بظاہر غیر مسلح تھے' قمیصوں کے اندر ہاتھ ڈال کر کمر سے لٹکتے ہوئے پستول نکالے اور تینوں کو بیرونی دروازے کی جانب جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلے گئے تو دونوں حویلی کے اندر داخل ہوگئے۔

رحیم داد کے پاس بھری ہوئی بندوق موجود تھی۔ مگر وہ اکیلا تھا اور پانچوں نووارد پوری طرح مسلح تھے۔ تین دروازے پر پہرا دے رہے تھے' دو اندر جاچکے تھے۔ حویلی پر گہرا سکوت طاری تھا۔ رات تاریک اور بوجھل تھی۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ سناٹے میں حویلی کی بالائی منزل سے گھٹی ہوئی نسوانی چیخ بلند ہوئی۔ رحیم داد بے قرار ہوگیا۔ بالائی منزل پر صرف دو کمرے تھے۔ گرمی کے موسم میں اللہ وسایا' بیوی بچوں کے ساتھ رات کو کمروں کے سامنے کھلی چھت پر سوتا تھا مگر وہ ملتان میں تھا۔ بالائی منزل پر صرف بچے تھے اور جمیلہ تھی۔ چیخ جمیلہ ہی کی ہوسکتی تھی۔

رحیم داد کو خطرے کا شدت سے احساس ہوا۔ اس نے سرہانے سے بھری ہوئی بندوق اٹھائی۔

آہستہ سے اتر کر نیچے آیا۔ چند لمحے دم سادھے پڑا رہا۔ پھر زمین پر دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا چھت کی منڈیر کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے گردن قدرے بلند کی۔ آنگن میں نظریں دوڑائیں۔ بیرونی دروازہ کھلا تھا۔ مہمان خانہ بالکل خالی تھا۔ البتہ دھندلی روشنی میں ایک شخص باہر اس طرح کھڑا تھا کہ اس کی پشت نظر آرہی تھی۔ رحیم داد ٹکٹکی باندھے اسے تکتا رہا مگر اس شخص نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

رحیم داد کھسکتا ہوا زینے کے قریب پہنچا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بندوق دبی تھی۔ نظریں مسلح شخص کی جانب اٹھی ہوئی تھیں جو دروازے کی جانب پیٹھ موڑے کھڑا تھا۔ رحیم داد نے ہولے ہولے قدم رکھتے ہوئے سیڑھیاں طے کیں۔ نیچے اترا۔ آنگن میں پہنچ کر وہ دیوار سے لگ گیا۔ اس جگہ اندھیرا بہت گہرا تھا۔

وہ دم سادھے دیوار سے چپکا ہوا دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ حویلی کے اندر کھلنے والے دروازے پر پہنچا۔ قریب پہنچ کر اس نے حویلی کے اندر نظر ڈالی۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ اس نے مڑ کر چوکس نظروں سے بیرونی دروازے پر کھڑے ہوئے مسلح آدمی کو دیکھا اور جھپاک سے حویلی میں داخل ہوگیا۔ حویلی کا اندرونی حصہ وہ پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس نے کسی اور سمت جانے کے بجائے دالان کا رخ کیا جہاں اوپر جانے کا زینہ تھا۔

دالان بالکل خالی تھا۔ سامنے وسیع صحن تھا۔ اس میں دور دور تک چارپائیاں پڑی تھیں جن پر نوکرانیاں سو رہی تھیں۔ گرمی کی راتوں میں ان کے شوہر اور جوان بیٹے باہر میدان میں چارپائیاں ڈال کر سوتے تھے۔ رحیم داد نے صحن میں پڑی ہوئی چارپائیوں پر مطلق توجہ نہیں دی۔ نوکرانیاں بے خبر سو رہی تھیں۔ رحیم داد سنبھل سنبھل کر زینے سے اوپر پہنچا۔ سامنے کھلی چھت تھی۔ دو پلنگوں پر دونوں بچے گہری نیند سو رہے تھے۔ لیکن جمیلہ کا پلنگ خالی تھا۔ وہ اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ پلنگوں کے قریب ہی کمرہ تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔

رحیم داد نے بندوق پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کی۔ زینے کی ممٹی سے باہر نکلا۔ جھکا جھکا آگے بڑھا۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ چرچراتا ہوا کھلا۔ رحیم داد جھٹ ایک پلنگ کی آڑ میں دبک گیا۔ دروازہ پھر بند ہوگیا۔ رحیم داد دم بخود بیٹھا چوکنا نظروں سے دروازہ تکتا رہا۔

☆

گرم اور غبار آلود رات دم بخود کھڑی تھی۔ حویلی پر گہرا سکوت طاری تھا۔ دونوں بچے پلنگوں پر بے خبر سو رہے تھے۔ جمیلہ کمرے کے اندر تھی۔ رحیم داد ایک پلنگ کی آڑ میں دبکا بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں کمرے کے دروازے پر لگی تھیں۔

دروازے کے پیچھے سے بہت مدھم لہجے میں باتوں کی مبہم آوازیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ مگر کچھ پلے نہ پڑا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے جمیلہ کسی مصیبت میں مبتلا ہے۔

اس نے بندوق سنبھال کر کمرے کے دروازے کا نشانہ لیا اور کبڑوں کی طرح جھکا جھکا کمرے کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچ کر اس نے دروازے پر زور سے ٹھوکر ماری۔ دروازہ کھل گیا۔ کمرے میں دو آدمی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے عین سامنے پلنگ پر پیر لٹکائے جمیلہ بیٹھی تھی۔ رحیم داد نے نشانہ باندھ کر دونوں کو بندوق کی زد پر رکھ لیا۔ وہ بھونچکا رہ گئے۔ ان کے چہروں پر دہشت اور پریشانی طاری ہوگئی۔ رحیم داد ان کے سروں پر ملک الموت بنا کھڑا تھا اور انھیں قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔

جمیلہ نے گردن کو خم دے کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر نہ خوف تھا' نہ گھبراہٹ تھی۔ اس نے سنبھلے ہوئے لہجے میں رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری! بندوک ہٹا لے۔“

رحیم داد نے بندوق نیچے کرلی۔ کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ مگر اس کی لو مدھم تھی۔ رحیم داد نے دونوں اجنبیوں کا جائزہ لیا۔ انھوں نے ڈھاٹے ہٹا دیئے تھے۔ اب ان کے چہرے صاف نظر آرہے تھے۔ ان میں سے ایک گورا چٹا جوان تھا۔ اس کی ڈاڑھی مونچھیں بالکل صاف تھیں۔ سر کے بال آڑی مانگ نکال کر جمائے گئے تھے۔ قد اونچا' جسم مضبوط اور بھرا بھرا تھا۔ وہ ڈبل گھوڑا بوسکی کی قمیص اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں سونے کی زنجیر پڑی تھی۔ ہاتھ کی ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی جس میں جڑا ہوا پکھراج جگمگا رہا تھا۔ دوسرا شخص ادھیڑ تھا۔ اس کے سر کے بال کھچڑی تھے۔ مونچھیں گھنی تھیں' ان میں کہیں کہیں سفید بال جھلک رہے تھے۔ چہرے پر عمر رفتہ کی دھندلی پرچھائیاں تھیں۔ وضع قطع سے وہ بھی کھاتا پیتا آدمی لگتا تھا۔ جمیلہ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد کو بتایا۔ ”یہ میرا چاچا ہے اور یہ میرا ویر ہردیال ہے۔“ اس نے دوسرے کی سمت نظریں گھمائیں۔ ”دونوں مجھے لینے آئے ہیں۔“ رحیم داد نے محسوس کیا کہ ہردیال کے چہرے سے جمیلہ کی شباہت صاف جھلک رہی ہے۔

جمیلہ کے چچا نے رحیم داد کو بغور دیکھا اور پوچھا۔ ”یہ حویلی کا چوکیدار ہے؟“

”نہیں چاچا!“ جمیلہ نے تردید کی۔ ”ایسی گل نہ کر۔ چوہدری' ہمارا مہمان ہے۔ سمجھو گھر ہی کا بندہ ہے۔“ اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چوہدری! کھڑا کیوں ہے' بیٹھ جا۔“

رحیم داد نے دیوار کے قریب رکھے ہوئے سرکنڈوں کے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے جمیلہ کو دیکھا اور بڑے جوش سے بولا۔ “جب تک اللہ وسایا نہیں آئے گا' میں تجھے یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔” اس نے بندوق زانو پر رکھ لی۔ “یہ تجھے یہاں سے مجھے ختم کرکے ہی لے جاسکتے ہیں۔”

کمرے میں پراسرار سکوت چھاگیا۔ ہردیال اور اس کا چچا چپ بیٹھے رہے مگر جمیلہ خاموش نہیں رہی۔ اس نے رحیم داد سے کہا۔ “چوہدری! تو چپ کر۔” اس کا لہجہ تیکھا تھا۔ “اس معاملے میں نہ بول۔ تجھے چنتا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ میرا اپنا معاملہ ہے۔ اس میں تو اللہ وسایا بھی نہیں بول سکتا۔”

چچا نے بھتیجے کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر ہردیال نے کھنکار کر جمیلہ کو مخاطب کیا۔ “پارو! کیا سوچا تو نے؟ ہم یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔” اس کا لہجہ تیکھا اور تلخ ہوگیا۔

“آج ہم تجھے لے کر ہی جائیں گے۔”

“بھاجی! دھیرے بول۔ جاگ ہوگئی تو پورا پنڈ اکٹھا ہوجائے گا۔” جمیلہ نے نرم لہجے میں اسے خبردار کیا۔ “دھیرج سے گل کر' دھیرج سے۔”

چچا بولا۔ “تیرا پتا تیرے لیے تڑپتا ہوا پچھلے برس سورگ باشی ہوگیا۔ آخری سے اس کی زبان پر تیرا ہی نام تھا۔ مڑ مڑ کر ادھر ادھر دیکھتا تھا۔ تجھے ڈھونڈتا تھا۔ ایک ایک سے پوچھتا تھا' میری پارو کہاں ہے؟ کیسے بتاؤں تیرے لیے وہ کیسا بیکل تھا۔ میں تو کہتا ہوں' مر کر بھی اس کی آتما کو شانتی نہیں ملی ہوگی۔” اس کے لہجے میں دبا دبا کرب تھا۔ “پاروتی! تو بہت کٹھور ہے۔ تیرے سینے میں ہردے نہیں' پتھر ہے۔ تو نے میرے بھائی کو مار ڈالا۔”

“ماتا جی کا بھی سمجھ لے' چل چلاؤ ہے۔” بھائی نے دل گرفتہ ہوکر کہا۔ “تیرے لیے روتے روتے اس کی آنکھوں کی روشنی اتنی کم ہوگئی ہے کہ ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں سکتی۔ اتنی کمزور اور بیمار لگتی ہے' دیکھے گی تو پہچان نہیں پائے گی۔ اس کا تو کب کا دیہانت ہوگیا ہوتا پر اس کا دم تو تجھ میں اٹکا ہے۔” ہردیال کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ “پارو! چل کر ماتا جی کو بچالے۔ پتا چھوٹا' ماتا بھی چھوٹ جائے گی۔” اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

جمیلہ سر جھکا کر رونے لگی۔ بوجھل فضا کرب ناک ہوگئی۔ کمرہ مرگھٹ کی طرح ویران نظر آنے لگا۔ ہردیال نے گہری سانس بھری' آنسو پونچھے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ “پارو! میری بہن!” وہ پھر رونے لگا۔

جمیلہ نے ہردیال کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ “بھاجی! تیری بہن پاروتی تو اسی روز مرگئی تھی جب تو اسے بصیرپور سٹیشن پر بلوائیوں کے ہاتھوں میں اکیلا چھوڑ کر ستلج پار چلا گیا تھا۔”

“تجھے پتہ ہے' وہ کیسا کڑا سمے تھا۔” ہردیال نے صفائی پیش کی۔ “میں بالکل مجبور تھا۔ یہ تو سوچ' کوئی بھائی اپنی بہن کو اس پرکار چھوڑ سکتا ہے۔ یہ گل میں نے تجھے پہلے بھی بتائی ہے۔ اندھیرے میں مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ ستلج پار کرنے سے پہلے میں نے تجھے بار بار پکارا تھا۔” اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔ “پارو! اٹھ سال سے تو ہم سب کو سزا دے رہی ہے۔ اب تو چھما کردے۔”

“بھاجی! تو تین بار پہلے بھی آچکا ہے۔” جمیلہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ “دو بار پولیس اور سرکاری افسروں کو لے کر آیا۔ تجھے ٹھیک طرح پتہ ہے' میں نے اب یہاں سے نہیں جانا۔ میں اب تیری پارو نہیں رہی۔ اب میں جمیلہ ہوں۔ اللہ وسایا کی گھر والی اور نینا اور گڈو کی ماں۔” اس کا لہجہ سنبھلا ہوا تھا۔ “میں ۲۲ برس تک پاروتی رہی۔ ۱۹۴۷ء میں پاروتی کا مرن ہوگیا۔ اور میں نے جمیلہ کے روپ میں دوسرا جنم لیا۔ اب تو مجھے یہاں سے لے جائے گا۔ ہردوار یا کاشی میں پنڈتوں اور پروہتوں کے ہاتھوں میری شدھی کرائے گا۔ جمیلہ کو کتل کرکے ایک بار فیر پاروتی بنائے گا۔” اس کی آواز میں تلخی تھی۔ “بھاجی! میں کتنی بار کتل ہوں گی' کتنی بار مروں گی۔ یہ تو سوچ' مجھے وہاں کون چھما دے گا۔ ایسی نار کو کون چھما دے سکتا ہے جو اٹھ برس تک ایک مسلمان کی گھر والی رہ چکی ہو اور اس کے دو بچوں کی ماں بھی ہو۔”

“تو چنتا نہ کر پارو! سب ٹھیک ہوجائے گا۔” چچا نے تسلی دینے کی کوشش کی۔ “ہم نے تیرے سنجوگ کے لیے ور بھی ڈھونڈ لیا ہے۔ اپنی ہی جات برادری کا ہے' بہت بھلا....”

جمیلہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ “چاچا! توں میرے ساتھ میرے بچوں کو بھی تباہ کرنا چاہتا ہے۔ اتنا تو سوچ' ان دونوں کا اس معاملے میں کیا دوش ہے؟”

“صاف گل ایہہ ہے پاور! ہم سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ہمارے جیتے جی تو ایک مسلے کے گھر میں رہے۔” چچا کا لہجہ تند اور تیز تھا۔ “اور وہ بھی ہمارے ایک مزارعے کی پتنی بن کر۔ کچھ تو اپنے دھرم کا' اپنے اونچے خاندان کا دھیان کر۔” اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ “ہا' کیسا کلجگ ہے۔”

“چاچا! تو بھی ٹھیک کہتا ہے۔” جمیلہ نے دکھ سے کہا۔ “جب بیٹیوں اور بہنوں کو ننگا کردیا جائے اور بازاروں سے ان کا جلوس نکال کر دھرم کا نام اونچا کیا جائے۔ دھرم کے نام پر کنیاؤں اور مہلاؤں کی آبرو لوٹی جائے۔ کتوں کی طرح ان کو بھنبھوڑا جائے۔ ان کی ہڈیاں چچوڑی جائیں تو یہ

کلجگ ہی ہوا۔" اس نے چچا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "اللہ دسایا اگر ہمارا مزارع تھا تو کیا ہوا!؟ اس نے میرے ساتھ وہ سب کچھ نہیں کیا جو ادھر اور ادھر دونوں طرف دھرم کے نام پر ہوا۔ اس کے اندر کا پرش اس سے بھی زندہ تھا اور آج بھی زندہ ہے۔"

"یہ باتیں تو بار بار کہتی ہے۔ تیری ضد اور ہٹ دھرمی اب تک نہیں گئی۔" ہردیال کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ "دیکھ پارو! میں اس بار ماتا جی کو وچن دے کر آیا ہوں۔ آج خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔" اس نے جھپاک سے پستول نکال لیا۔ "تو میرے ساتھ چلے گی۔ میرا رستہ کوئی نہیں روک سکتا۔" اس نے جھپٹ کر جمیلہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "چل اٹھ۔ اگر تو چاہتی ہے، دو چار لاشیں یہاں گر جائیں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہو کے آیا ہوں۔" اس کا لہجہ تیز ہو تا گیا۔

"میرے بندے کاربینیں اور بندوکیں سنبھالے پنڈ کے نکڑ پر چوکس کھڑے ہیں۔ تین جیپیں، ہتھیار بند بندوں سے بھر کر لایا ہوں۔ اس بار ہر طرح تیار ہو کر آیا ہوں۔ میرا رستہ تو پولیس بھی نہیں روک سکتی۔"

"بھاجی! میرا ہاتھ چھوڑ دے۔" جمیلہ نے نرم لہجے میں کہا۔ "میں نوں پتہ ہے، توں بہت زور آور اور دیر ہے۔ مجھے مان ہے کہ تو میرا ویر ہے۔"

ہردیال نے بہن کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ جمیلہ اٹھی اور تن کر بھائی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ "بھاجی! دوسروں کی لاشیں کیوں گرانا چاہتا ہے، ایسا کر، میرے سینے میں اپنے پستول کی ساری گولیاں اتار دے اور میری لاش ماتا جی کے پاس لے جا۔ وہاں میری ارتھی کو شمشان میں اپنے ہاتھوں سے آگ لگا دینا۔ تیرے دھرم کا پراشچت ہو جائے گا۔ میری مکتی اسی میں ہے۔" اس نے بھائی کو للکارا۔ "چلا گولی۔"

بھائی خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ چچا بھی چپ تھا۔ رحیم داد دم بخود تھا۔ کمرے میں ایک بار پھر گہرا سکوت چھا گیا۔ ذرا دیر بعد ہردیال کھڑا ہو گیا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے جمیلہ کو دیکھا۔

"تو نہیں چلے گی میرے سنگ؟"

"تو کس کی بات کر رہا ہے؟ میری؟ میں تو اٹھ برس پہلے ہی مر گئی تھی۔ جمیلہ تو ایک ملا کا نام ہے۔ اس کا کوئی بھی نام ہو سکتا ہے۔ وہ تو دوسروں کو خوش دیکھنے کے لیے ہنستی ہے، بولتی ہے، چلتی پھرتی ہے۔ میں تو مانو، اب ایک لاش ہوں۔ تو لاش اٹھا کر لے جانا چاہتا ہے تو ضرور لے جا۔ پر اس طرح نہیں، خون سے نہلا کر۔" وہ آگے بڑھی اور بھائی کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ہردیال پیار سے اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ جمیلہ سسکیوں کے ساتھ رک رک کر کہتی رہی۔ "ویر! میرے سینے میں ہردے نہیں رہا۔ میں زخموں سے چور چور ہو چکی ہوں۔ مجھے اور دکھ نہ پہنچا۔ میرے سارے زخم کھل جائیں گے۔" وہ ہانپنے لگی۔ "مجھ مری ہوئی کو ایک بار پھر مارنا چاہتا ہے تو مار دے۔ میں تجھے کچھ نہیں کہوں گی، کچھ بھی نہیں۔"

وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ بھائی بھی بے قرار ہو کے رو پڑا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے رہے۔ کمرے میں سسکیاں ابھرتی رہیں۔ چچا بھی خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں۔ وہ روتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ بھتیجے کے قریب گیا اور اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔

"ہردیال! تو کب تک روتا رہے گا۔ یہ نہیں جائے گی۔"

"ہاں چاچا! یہ نہیں جائے گی۔" ہردیال نے مایوسی سے کہا۔ "اس کی مرضی یہیں رہنے کی ہے تو یہ یہیں رہے گی۔ اس کی خوشی میں میری خوشی ہے۔ میں اسے دکھی نہیں دیکھ سکتا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جمیلہ کی سسکیاں اور تیز ہو گئیں۔

مہمان خانے کی جانب سے سناٹے میں ہلکی سیٹی ابھری۔ چچا پریشان ہو کر بولا۔ "ہردیال! اب یہاں سے چلنا چاہیے۔"

ہردیال نے بہن کا سر چوما اور اسے علیحدہ کر دیا۔ پھر ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اٹھایا اور بھیگے ہوئے رخسار تھپ تھپائے۔ "آنسو پونچھ لے۔ میں تجھے نہیں لے جاؤں گا۔ تو جیت گئی۔ میرا مان ایک بار پھر ٹوٹ گیا۔ تو پاروتی بن کر زندہ رہے یا جمیلہ بن کر، میں تجھے زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "تو جس حال میں بھی رہے، میری لاڈلی بھین پارو ہی رہے گی۔ میرے گھر کے دروازے سدا تیرے لیے کھلے رہیں گے۔ جب چاہے چلی آنا۔ میں انتم بار نہیں آیا ہوں۔ جب چاہے مجھے بلا لینا۔ سمگلر مجھے حفاظت سے تیرے پاس پہنچا دیں گے۔ وہ نہ ہندو ہوتے ہیں، نہ سکھ، نہ مسلمان۔ وہ صرف سمگلر ہوتے ہیں۔" وہ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔

کمرے کی فضا آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ ملگجی غبار آلود رات نڈھال ہو گئی تھی۔ سناٹا راکھ بن کر بکھرتا جا رہا تھا۔ ہوا دم بخود تھی۔ "چاچا! اب یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ بہت دیر ہو گئی۔" ہردیال کی آواز ابھری۔

وہ چچا کے ہم راہ دروازے کی جانب بڑھا۔ جمیلہ چپ چاپ ان کے پیچھے پیچھے دروازے تک گئی۔ تیزی سے بڑھ کر دہلیز پر پہنچی، ہاتھ اٹھا کر ہردیال سے بولی۔ "ٹھہر جا ویر! تو بھین کے گھر سے ایسے نہیں جائے گا۔ میں تجھے یوں بدا نہیں ہونے دوں گی۔" وہ کمرے کے اندر گئی، ٹرنک سے ایک

ڈبیا نکال کے لائی۔ ڈبیا کھول کر بھائی اور چچا کی پیشانیوں پر سیندور کا تلک لگایا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر بھائی اور چچا کو پرنام کیا۔

دونوں آگے بڑھے۔ جمیلہ دہلیز پر رک گئی۔ انھوں نے چھت عبور کی' زینے کی ممٹی پر پہنچے۔ ہردیال نے مڑکر جمیلہ کی جانب دیکھا' لمحے بھر کو ٹھٹکا اور پھر اندھیرے میں چچا کے ساتھ گم ہو گیا۔

رات زخمی پرندے کے مانند پھڑپھڑانے لگی۔ جمیلہ واپس آکر کرسی پر تھکی ہوئی سی بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ مٹیالا پڑ گیا تھا۔ رحیم داد گم صم بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد کہیں دور رات کے سناٹے میں جیپوں کے انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز ابھری۔ رحیم داد نے گردن کو ذرا سا خم دیا اور جیپوں کی آوازیں توجہ سے سننے لگا۔ آوازیں رفتہ رفتہ گہری خاموشی میں تحلیل ہو کر ختم ہو گئیں۔

اس نے جمیلہ کو مخاطب کیا۔ "زمیں دارنی! وہ چلے گئے۔"

وہ رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر بولی۔ "ہاں چوہدری' وہ چلے گئے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپایا اور بے اختیار رونے لگی۔

رحیم داد نے جمیلہ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ "زمیں دارنی! اب رونے سے کیا ہوگا' جو ہونا تھا' ہو گیا۔"

"چوہدری! تو جا۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "مجھے اکیلا چھوڑ دے۔ مجھے جی بھر کے رو لینے دے۔"

کمرے کی خاموشی میں جمیلہ کی سسکیاں رک رک کر ابھرتی رہیں۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ مگر زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ اس نے بندوق سنبھالی اور کمرے سے چلا گیا۔ جمیلہ نے نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور سسکیاں بھرتی رہی۔

رحیم داد سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ دالان میں پہنچا۔ سامنے وسیع صحن تھا جس میں کچھ ہی عرصہ پہلے اس نے مشعلوں کی لہراتی روشنی میں جمیلہ کو الھڑ مٹیاروں کے ساتھ گدھا ناچتے دیکھا تھا۔ اب اسی صحن میں چارپائیوں پر نوکرانیاں بے خبر سو رہی تھیں اور جمیلہ اوپر کمرے میں بلک بلک کر رو رہی تھی۔

رحیم داد حویلی سے نکل کر مہمان خانے میں گیا۔ بیرونی دروازہ ابھی تک پاٹوں پاٹ کھلا تھا۔ اس نے دروازہ بھیڑ کر زنجیر چڑھائی۔ چھت پر گیا' بندوق احتیاط سے سرہانے رکھی اور نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ چت لیٹا اجڑی ہوئی رات کو گزرتے دیکھتا رہا۔

صبح رحیم داد کی طبیعت بوجھل تھی۔ ایسا محسوس ہوا گویا رات کو کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ حویلی کا ملازم' احمد ابھی تک بیمار تھا۔ ناشتا اور دوپہر کا کھانا ایک نوکرانی لے کر آئی۔ دن ڈھلے رحیم داد باغ میں گیا۔ آسمان ہنوز غبار آلود تھا۔ امس تھی' گرمی تھی۔ فضا بے کیف اور دھواں دھواں تھی۔ اللہ وسایا واپس نہیں آیا۔ دوسرے روز بھی نہیں آیا۔ ان دو دنوں میں جمیلہ بھی اسے نظر نہیں آئی۔

☆

رات کو بارش کا ہلکا سا چھینٹا پڑا۔ آسمان سے غبار چھٹ گیا مگر گرمی بڑھ گئی۔ زمین سے گرم گرم بھبکے نکلتے تھے۔ رحیم داد کی وہ رات بھی بے چینی میں کٹی۔ سویرے ناشتے سے فارغ ہو کر وہ باغ میں گیا۔ دن ڈھلے بھی گیا۔ اب موسم قدرے خوش گوار تھا۔ جمیلہ باغ کے ایک گوشے میں چپ بیٹھی تھی۔ رحیم داد اس کی جانب بڑھا۔

جمیلہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ "آ چوہدری!"

رحیم داد خاموشی سے اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جمیلہ کے چہرے پر ابھی تک غم کی پرچھائیاں چھائی ہوئی تھیں۔ وہ بجھی بجھی اور اجڑی اجڑی نظر آ رہی تھی۔ دونوں اپنی اپنی سوچ میں ڈوبے رہے۔ کچھ دیر بعد جمیلہ نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ زیرِ لب مسکرائی' یہ مسکراہٹ نہیں تھی۔ کلی سی کھل گئی تھی۔

"چوہدری! توں نے بہت دنوں تک جمیلہ ہی کو دیکھا تھا۔ اس رات پاگلی کو بھی دیکھ لیا۔"

"حمدے نے یہ بات مجھے بتائی تھی۔ پر مجھے یقین نہیں آیا تھا۔"

"یہ گل خالی حمدا ہی نہیں جانتا' سارا پنڈ جانتا ہے۔" جمیلہ نے بتایا۔ "اور میں اسے چھپاتی بھی نہیں۔ سچ بات کبھی نہیں چھپتی۔ اسے چھپانا' اپنے کو دھوکا دینا ہے۔"

"پر یہ بات اب تک سمجھ نہیں آئی۔" رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا یہ سچ ہے' اللہ وسایا تیرے پیو کا مزارع تھا؟"

"تھا' بالکل تھا۔" جمیلہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "پر وہ مزارعے سے زمیں دار بن کر بھی زمیں دار نہیں بن سکا۔ وہ عجیب بندہ ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے کوئی نہیں جانتا۔" وہ بات کرتے کرتے گہری سوچ میں کھو گئی۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ پھر جمیلہ ہی نے خاموشی توڑی۔ "میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو ڈر گئی تھی۔ اس سے وہ بہت زور آور اور کڑا تھا۔ بات بات پر شعلے کی طرح بھڑک اٹھتا تھا۔"

”دیکھنے میں تو بالکل کڑوا نہیں لگتا۔“

”اب تو گنّو بن گیا ہے۔“ جمیلہ نے وضاحت کی۔ ”اٹھ برس ادھر کی گل ہے۔ جب فسادات کی آگ بھڑکی، ہر طرف خون خرابہ ہونے لگا۔ میں ان دنوں لہور میں ہوتی تھی۔ وہاں میں پڑھتی تھی۔ میرا بی اے کا آخری سال تھا۔ پر فسادات شروع ہونے کے بعد کالج بند کردیا گیا تھا۔ میں ماڈل ٹاؤن میں اپنے ماما کی کوٹھی میں ٹھیری تھی۔ فیر ایسا ہوا کہ فسادات کم ہونے کی بجائے بڑھتے چلے گئے۔ لہور کے ہندو گھربار چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ تب میرا یہ دیر ہردیال مجھے لہور سے دیپال پور لے آیا۔“

”پر یہ حویلی تو تیرے پیو کی تھی۔ تیرے گھر والے یہاں نہیں رہتے تھے؟“

”نہیں! یہاں ہمارا مینجر بنسی لال رہتا تھا۔ وہ اور اس کے بال بچے اسی مہمان خانے میں رہتے تھے جس میں آج کل توں ٹھیرا ہے۔ حویلی عام طور پر خالی رہتی تھی۔ ہم بھائی بھین تو یہاں گرمیوں کی چھٹیوں میں کبھی کبھار آجاتے تھے۔ پتا جی بھی بہت کم آتے تھے۔ ان کا نام لالہ کرشن دیال تھا۔“ جمیلہ آہستہ آہستہ بتاتی رہی۔ ”یہ جو دیپال پور میں کپاس بیلنے کی کرشنا کاٹن فیکٹری ہے، یہ میرے پتا نے ۱۹۳۳ء میں لگائی تھی۔ ان کا اور بھی بہت کاروبار تھا۔ کئی دکانیں تھیں، ساہوکارہ تھا، کئی کمپنیوں اور ایک بینک کے وہ ڈائریکٹر بھی تھے۔ کاروبار میں اتنے الجھے رہتے تھے کہ کئی کئی سال ادھر نہ آتے۔ زمیں داری کی دیکھ بھال ہردیال کرتا تھا یا بنسی لال۔“

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”توں اتنے وڈے گھرانے کی دھی ہے، توں نے اپنے مزارعے سے کیسے ویاہ کرلیا؟ بہت عجیب گل ہے۔“

”یہی تو میں تجھے بتا رہی تھی۔“ جمیلہ نے جواب دیا۔ ”جب فسادات کی آگ منٹگمری میں بھی پھیل گئی تو آس پاس کے دیہات کے ہندو دیپال پور آگئے۔ وہاں پہلے ہی ہندو بہت تھے۔ پر زیادہ تر کھتری ہیں۔ ہماری گوت کھنّہ ہے۔ دیپال پور میں کھتریوں کی مشہور تیرتھ بھی ہے۔ یہ بابا لالہ جس راج رائے کی سمادھی ہے۔ سمادھی کے ساتھ مندر ہے، دھرم شالہ ہے۔ ایک دھرم سبھا بھی ہوتی تھی۔ جانے اس کا کیا بنا۔“ وہ لمحے بھر کے لیے رکی۔ ”۵ برس ادھر کی بات ہے۔ میں اللہ وسایا کے ساتھ دیپال پور گئی تھی۔ سمادھی، مندر، دھرم شالہ، ہر جگہ مہاجروں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ کبھی اس جگہ زبردست میلہ لگتا تھا۔ ماگھ کے مہینے میں کھتری دور دور سے تیرتھ یاترا کے لیے آتے تھے۔ جب کھتریوں کا کوئی منڈا دس برس کا ہو جاتا تو بابا جس راج کی سمادھی کے سامنے اس کا مونڈن ہوتا۔ سر کے بال صاف کردیئے جاتے۔ کیول بودھی چھوڑ دی جاتی۔ وہ کبھی نہیں کاٹی جاتی تھی۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی منوہر دیال کا مونڈن ہوتے دیکھا تھا۔ اس دن گھر میں زبردست جشن ہوا۔ مہمانوں کے لیے پکوان پکے۔ طرح طرح سے بھوجن پروسے گئے، کیرتن ہوا، بھجن ہوا۔ ہمارا گھر بہت شان دار تھا۔ دو منزل کا تھا۔ اس روز دیوے جلا کر گھر پر خوب روشنی کی گئی تھی۔ بالکل دیوالی کا سماں تھا۔“

”جب تسیں دیپال پور گئی تھیں تو اپنا گھر بھی دیکھا ہوگا۔ کیا حال ہے اس کا؟“

”یہ نہ پوچھ۔“ جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میں نے اسے دیکھا تو بے کل ہو کر بن سوچے ایک دم اندر گھس گئی۔ اس میں مہاجر کنبے ٹھیرے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ چولھے تھے۔ دھوئیں سے ساری دیواریں کالی پڑ گئی تھیں۔ ماتا جی جہاں پوجا پاٹ کرتی تھیں، وہاں پکا چبوترا تھا۔ اوپر آلا تھا۔ اس میں کرشن جی کی مورتی رکھی رہتی تھی۔ چبوترے کے پاس ہی تلسی کے بوٹے ہوتے تھے۔ ماتا جی ہر روز سورج نکلنے سے پہلے ان میں پانی دیتی تھیں۔ چبوترے کے پاس کوئی آشنان کیے بنا نہیں جا سکتا تھا۔ پر اب چبوترے پر بھی چولھا بن گیا تھا۔ آلے سے مورتی اٹھا کر پھینک دی گئی تھی۔ اب اس میں چراغ جلتا تھا۔ تلسی کے بوٹے سوکھ کر کب کے ختم ہو چکے تھے۔“

وہ پھر کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ رحیم داد آہستہ سے کھنکارا تو وہ چونکی۔ ”پتا جی نے بہت چاؤ سے گھر کے لیے ساگوان کا شان دار فرنیچر بنوایا تھا۔ کچھ تو توڑ پھوڑ کر روٹی پکانے کے لیے چولھوں میں جلا دیا گیا۔ جو بچ گیا تھا، وہ بھی ٹوٹ پھوٹ کر کاٹھ کباڑ بن گیا تھا۔ ہر طرف گندگی ہی گندگی تھی۔ بندے بھی بھلے نہیں تھے۔ زنانیاں مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگیں، میں ڈر گئی۔ میرا کمرہ اوپر تھا۔ میں اسے دیکھنا چاہتی تھی پر حوصلہ نہ ہوا۔ میں جلد ہی گھر سے باہر چلی گئی۔ چوہدری! ذرا سوچ، کیسی عجیب گل ہے۔ اپنا گھر پرایا ہوا سو ہوا، اس سے ڈر بھی لگنے لگا تھا۔ دوبارہ میں کبھی ادھر نہیں گئی۔ جا کے کرتی بھی کیا، دکھ ہی ہوتا۔“

زمیں دارنی! تجھے اپنے گھر والے تو یاد آتے ہوں گے؟“

”تجھے اپنی گھر والی اور بچے یاد نہیں آتے؟“

”کیوں نہیں آتے۔“ رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”تبھی تو تجھ سے پوچھ رہا ہوں۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میرا دکھ تو سمجھ سکتا ہے۔ میری طرح توں بھی گھائل ہے۔“ جمیلہ نے رحیم داد کی جانب افسردہ نظروں سے دیکھا۔ ”چوہدری! ہم ۵ بھائی بھین ہوتے تھے۔ میں چار بھائیوں کی اکلوتی بھین تھی۔ پر اب تین رہ گئے ہیں۔ چوتھا بل بیر دیال تھا۔ وہ ہردیال سے چھوٹا اور مجھ سے بڑا

تھا۔ بلوائیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ہردیال بتاتا تھا' پتا جی نے اس کی لاش دیکھی تھی۔ بعد میں جانے اس کا کیا بنا۔ چیلیں اور گدھ ماس نوچ نوچ کر کھا گئے ہوں گے' پنجر کہیں دبا دیا گیا ہوگا۔ چوہدری! توں نے اسے نہیں دیکھا۔ ہائے کیسا سندر اور سوہنا تھا۔" اس نے لمبی سانس بھری۔ "سنا ہے' تینوں بھائیوں کا ویاہ ہوگیا ہے۔ بچے بھی ہیں۔ میں نے نہ کسی بھرجائی کو دیکھا نہ بچوں کو۔ سب کو دیکھنے کے لیے من تو بہت مچلتا ہے' پر اب میں ان کے پاس نہیں جاسکتی۔ میں نے سوچ لیا ہے' وہ سب مرگئے۔"

جمیلہ اس المیے کے ورق پلٹتی رہی جس میں بنیادی کردار خود اس نے ادا کیا تھا۔ رحیم داد ہمہ تن گوش رہا۔ وہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا تاکہ اس کے زیادہ سے زیادہ قریب ہوجائے۔ وہ خاموش ہوجاتی تو رحیم داد کرید کر پوچھتا۔ اس دفعہ بھی جمیلہ بات کرتے کرتے رکی' مگر رحیم داد نے اسے خاموش نہیں رہنے دیا۔

"تیرے گھر والے تو سرحد پار نکل گئے تھے' توں کیسے ادھر رہ گئی؟"

"اب تو تجھے پتہ چل ہی گیا۔ جو نہیں پتہ' وہ بھی سن لے۔ تجھ سے اب کیا چھپانا۔ ویسے چھپانے کو رہ ہی کیا گیا ہے۔ سب کو پتہ ہے۔" جمیلہ نے درد میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ بہت ڈراؤنی رات تھی جب میں اور میرے گھر والے ٹرک میں سوار ہوکر دیپال پور سے نکل کر بھاگے۔ اب وہ رات یاد کرتی ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بھیانک سپنا دیکھ رہی ہوں۔ رستے میں دو بار بلوائیوں نے ٹرک پر ہلّا بولا' پر ڈرائیور بہت ہوشیار تھا۔ صاف بچا کر نکال لے گیا۔ آدھی رات کے بعد سب بصیر پور سٹیشن پر پہنچ گئے۔ وہاں پہلے ہی دور دور سے بھاگ کر آئے ہوئے ہندو اور سکھ پڑے تھے اور قصور کے راستے ٹرین سے کھیم کرن اور امرتسر نکل جانا چاہتے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی منوہردیال پہلے ہی امرتسر پہنچ چکا تھا اور ہم سب کا انتظار کر رہا تھا۔ ادھر ہم ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ ٹرین تو نہیں آئی' بلوائی آگئے۔ اندھیری رات تھی۔ تڑتڑ گولیاں چلتی تھیں۔ بچے روتے تھے۔ ماؤں چیختی تھیں۔ ہر طرف ہاہاکار مچی تھی۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔"

"تریموں کے پتن پر راوی کے کنارے میں نے بھی یہی سماں دیکھا۔" رحیم داد نے بھی جمیلہ کی طرح خود کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے مقتول چوہدری نور الٰہی سے سنی ہوئی باتیں دہرائیں۔ جمیلہ خاموشی سے سنتی رہی۔ رحیم داد نے گہری سانس بھری اور افسردہ لہجے میں بولا۔ "اس طرح جی! میں راوی پار کرکے اکیلا پاکستان پہنچا۔" اس نے قدرے توقف سے کہا۔ "ہاں اب تو بتا' آگے کیا ہوا؟"

"آگے کیا ہونا تھا۔ بس اتنا یاد ہے' بلوائی شور مچاتے آگے بڑھتے آرہے تھے۔ میں ڈر کر ایک طرف بھاگی اور کسی سے ٹکرا کر زور سے گری۔ پر زمین تک نہیں پہنچی۔ ایسا لگا جیسے کوئی مجھے اپنی پیٹھ پر لادے بھاگا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں' کون تھا۔ پوچھا بھی تو نہیں بولا۔ تب میں نے اس کے ہاتھوں کی پکڑ سے نکلنے کی کوشش کی' منت سماجت کی' گڑگڑائی اور روئی بھی۔ پر اس نے نہیں چھوڑا۔ ڈیڑھ میل آگے نہر تھی۔ اس نے نہر کے نزدیک جنڈ اور کیکر کی گھنی جھاڑیوں میں بنی ہوئی ایک سنسان ڈھڑ میں مجھے اپنی پیٹھ سے ایسے پھینکا جیسے اناج تولنے والا دھڑوائی کنک کی بوری ایک جگہ سے دوسری جگہ ڈالتا ہے۔"

"بہت ظالم تھا۔" رحیم داد نے نفرت سے منہ بگاڑا۔

"وہ تیری سوچ سے بھی زیادہ ظالم اور کٹھور تھا۔" جمیلہ کی آواز میں درد کی چبھن تھی۔ "وہ اکیلا بھی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ چھ اور کتے تھے۔" جمیلہ کی نظریں جھک گئیں۔ افسردہ چہرے پر ہلکی ہلکی سرخی بکھر گئی۔ "وہ سب تین روز تک باری باری میری ہڈیاں چچوڑتے رہے۔ نہ کھانے کو روٹی دی' نہ پینے کو پانی۔ نہ میں رو سکتی تھی نہ بول سکتی تھی۔ میں تو مانو لاش تھی' ٹھنڈی اور بے جان۔ مجھے سب کچھ ڈراؤنا سپنا لگا۔ آنکھیں بند تھیں اور میں بے سدھ پڑی تھی۔ چوتھے روز دوپہر کو مجھے ہوش آیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو ڈھڑ خالی تھی۔ اس ڈھڑ کو چاروں اور باڑ لگا کر جھنگر میں بنایا گیا تھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ لگتا تھا' مجھے مردہ جان کر وہ چھوڑ گئے تھے۔ مجھے خود اچنبھا تھا کیسے بچ گئی۔ وشواس ہی نہیں آتا تھا کہ زندہ ہوں۔"

چند لمحے رک کے اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میں کئی گھنٹے آنکھیں کھولے بے حال پڑی رہی۔ اٹھا ہی نہیں جاتا تھا۔ دن ڈھلے نزدیک رکھی ہوئی کھرلی کا سہارا لے کر اٹھی۔ ڈھڑ میں ہر طرف گوبر ہی گوبر تھا۔ میرے کپڑے' پیٹھ' ہاتھ پیر اور سر کے بال گوبر سے لتھڑے ہوئے تھے۔ کھرلی میں جھانکا تو اس میں مویشیوں کے لیے گتاوا پڑا ہوا نظر آیا۔ توڑی کے ساتھ ونڈ ملا کر بنایا گیا تھا۔ میں نے چن چن کر ونڈ کھانے شروع کردیئے۔ چھولے کے یہ دلے ہوئے دانے کھا کر بدن میں تھوڑی سی جان آئی پر پیاس بہت لگی۔ ڈھڑ کی باڑ کے اس پار نہر نظر آتی تھی۔ سوچا نہر پر جا کر پانی پی لوں لیکن کھڑے ہوتے ہی لڑکھڑا کر گر پڑی۔ دیر تک پڑی ہانپتی رہی۔ ذرا جی سنبھلا تو ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ ایک کونے میں تور کا ڈھیر نظر آیا۔ کھسکتی کھسکتی اس طرف بڑھی' پاس جا کر اٹھی اور تور کے ٹوٹے چوپنے لگی۔ اس کے رس میں مٹھاس تھی۔ نہ پوچھ کیسا سواد آیا۔"

"تور ویسے تو چری ہے پر چوپو تو کماد کی طرح میٹھی لگتی ہے۔" رحیم داد نے جمیلہ کی تائید کی۔

"میں نے تو اپنے جیون میں پہلی بار اسے چوپا تھا۔ پر اس سے ایسا سواد ملا جیسے لہور میں گرمی کے دنوں میں ٹھنڈی گنڈیریاں چوپنے پر آتا تھا۔ ونڈ کھا کر اور تور کا رس چوپ کر اتنا آنند ملا کہ میں پڑ کر سوگئی۔ رات کو کوئی نہیں آیا' دن کو بھی نہیں آیا۔ میں چن چن کر ونڈ کھاتی رہی اور تور کی ٹوٹے دانتوں میں دبا کر چوپتی رہی۔ وہنڑ سے باہر نہیں گئی۔ دوسری رات دو بندے ایک مُ لے کر آئے۔ تب مجھے پتہ چلا وہ وہنڑ نہیں' کسی رساگیر کی اہر تھی جس میں چوری کے مویشی اور چوکھر چھپا کر رکھے جاتے تھے۔"

"تجھے پتہ ہی نہ چلا وہ رساگیروں کی اہر ہے۔ گوبر اور کھرلی میں گتاوا پڑا دیکھ کر بھی تجھے پتہ نہ چلا؟" رحیم داد کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی۔

"لے' مجھے کیا پتہ اہر ایسی ہوتی ہے۔ میں نے کوئی رساگیری یا مویشی چوری تو کی نہیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا رساگیری کیا ہوتی ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہے۔" رحیم داد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "ہاں' تو جی فیر کیا ہوا؟"

"دونوں نے مجھے اہر میں دیکھا۔ پہلے تو وہ گھبرائے۔ تھوڑی دیر آپس میں کھسر پھسر کی۔ ایک وہیں ٹھیر گیا۔ دوسرے نے مجھے اپنے گڈّے میں بٹھالیا۔ وہ اسی گڈّے کے پیچھے چوری کی مُ باندھ کر لایا تھا۔ یہ بھی مجھے بعد میں پتہ چلا۔ وہ مجھے صاجے والا لے گیا۔ اس کی گھر والی تھی۔ بچے تھے۔ مجھے کچھ اطمینان ہوا۔"

جمیلہ کا لہجہ اچانک تلخ ہوگیا۔ "پر وہ بھی کتا نکلا۔ مجھے گھسیٹ کر زبردستی کوٹھری میں لے گیا۔ اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ میں نے اس کی منت سماجت کی۔ ہاتھ جوڑے۔ گڑگڑا کے اسے پچھلے تین روز کی ساری بپتا سنائی۔ پر اس نے ایک نہ سنی۔ رات بھر میری ہڈیاں چچوڑتا رہا۔" جمیلہ روہانسی ہوگئی۔ اس نے آنسو پونچھے اور دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "سویرے اس کی گھر والی نے زبردست رولا کیا۔ روئی پیٹی' شور مچایا۔ اس کا گھر والا ڈھیٹ بنا ہنستا رہا۔ کچھ دیر بعد ہل پنجالی سنبھال کر کھیتوں پر چلا گیا۔ گھر والی نے اس کے جانے کے بعد میرے بال کھسوٹے' منہ نوچا۔ دونوں ہاتھوں سے خوب مارا پیٹا۔ میں نے مجبوری بتائی۔ پر اس نے میری ایک نہ مانی' بس مارتی چلی گئی۔ مارتے مارتے تھک گئی تو رونے بیٹھ گئی۔ میں بھی روتی رہی اور روتے روتے بے ہوش ہوگئی۔ تب اسے کچھ ترس آیا۔ اس نے مجھے پانی پلایا۔ دوپہر ہوئی تو کھانے کو روٹی بھی دی۔ شام کو اس کا گھر والا لوٹا۔ اس کا نام گاما تھا۔ رات کو فیر اس نے مجھے گھسیٹ کر کوٹھری میں بند کرلیا۔ چار روز تک یہی ہوتا رہا۔ اس کی گھر والی روز جھگڑا کرتی پر وہ باز نہ آیا۔"

"گاما تو اور بھی زیادہ گندہ اور کمینہ نکلا۔" رحیم داد نے جل کر کہا۔

"ہاں' وہ بہت گندہ اور کمینہ تھا۔" جمیلہ خلا میں گھورتی رہی اور بولتی رہی۔ "جب گامے کی گھر والی نے ایک روز بہت شور شرابا کیا اور دروازے کی دہلیز پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پیٹنے لگی تو پاس پڑوس والے گاما کے گھر اکٹھے ہوگئے۔ انھوں نے گاما پر دباؤ ڈالا کہ وہ مجھے اپنے گھر سے نکال دے۔ اس نے سب کے سامنے وعدہ کیا اور وعدہ پورا بھی کیا۔ پر اس نے مجھے اپنے گھر سے اس طرح نکالا کہ تین سو روپے میں ولیا کے ہاتھ چپکے سے بیچ دیا۔"

رحیم داد نے استفسار کیا۔ "ولیا بھی صاجے والے میں رہتا تھا؟"

"نہیں! وہ مجھے بھوماں شاہ لے گیا۔ اس کی گھر والی اسے چھوڑ کر تیلی کے منڈے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔" جمیلہ نے مطلع کیا۔ "ولیا کا بوڑھا پیو تھا۔ چھوٹا بھائی تھا اور چھوٹے بھائی کی گھر والی بھی تھی۔ بچے بھی تھے۔ سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔" جمیلہ نے بڑی گہری سانس بھری۔ "ولیا کے ساتھ میں دو مہینے سے اوپر رہی۔ ولیا ادھکڑ تھا۔ پر اس کا بھائی جوان تھا۔ مجھے اس کے گھر میں پہنچے تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ولیا کا بھائی مجھے بری نظروں سے گھورنے لگا۔ اکیلے میں پاتا تو نوچتا کھسوٹتا۔ ایک روز اس کی گھر والی نے دیکھ لیا۔ اس نے رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھالیا۔ ولیا کے پیو کو پتہ چلا تو وہ الٹا مجھ پر ناراض ہوا۔ سسر اور نوہ دونوں مجھے گالاں نکالتے اور مارتے پیٹتے۔"

"انھیں اصل گل نہیں بتائی؟"

"کیا بتاتی۔ میرے پاس بتانے کو رہ کیا گیا تھا۔" جمیلہ نے اداسی سے کہا۔ "گالاں سنتی تھی' مار کھاتی تھی اور چپ کرکے بیٹھی رہتی تھی۔ فیر سسر اور نوہ نے مل کر مسکوٹ کی۔ مجھے گھر سے نکالنے کی سکیم بنائی۔ ایک روز ولیا کا پیو ایک موٹی سی زنانی کو لے کر آیا۔ اس کے بدن کا ماس تھل تھل کرتا تھا۔ وہ سگریٹ پیتی تھی اور پان چبا کر جگہ جگہ لال لال پیک تھوکتی تھی۔ بات کرتی تو ہاتھ بھی چلاتی اور آنکھیں بھی مٹکاتی۔ لہور سے آئی تھی۔ ہیرامنڈی کی کنجری تھی۔"

"کنجری تھی؟" رحیم داد نے پوچھا۔ "کس لیے آئی تھی؟"

"وہ فسادات میں اٹھائی جانے والی ان نوجوان مسلاؤں اور کنیاؤں کو خریدنے کا دھندا کرتی تھی جنھیں مغویہ کہا جاتا ہے۔ ولیا کے پیو نے ۵ سو روپے میں میرا سودا کردیا۔"

"تیں نوں اس سودے کا پتہ تھا؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"بالکل تھا۔ میرے سامنے ہی تو طے ہوا تھا۔ اس سے ولیا اور اس کے بھائی نہیں تھے۔ اللہ دسایا کی ولیا کے چھوٹے بھائی سے جان پہچان تھی۔ اتفاق سے اسی شام اللہ دسایا اس سے ملنے

آیا۔ وہ آنگن میں منجی پر بیٹھا ولیا کے بھائی سے باتیں کر رہا تھا۔ میں آنگن سے گزری تو اللہ وسایا نے مجھے دیکھ لیا اور فوراً پہچان لیا۔ اس نے مجھے اپنے پاس بلایا' پوچھا' تو یہاں کیسی آئی؟ میں تو چپ رہی پر ولیا کا بھائی بولا ولیا اسے خرید کر لایا ہے۔ اللہ وسایا نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ یہ میرے زمیں دار کی دھی ہے' یہاں نہیں رہ سکتی۔ میں اسے اپنے پنڈ لے جاؤں گا۔ ولیا کا بھائی تو کچھ نہیں بولا پر اس کے پیو نے بگڑ کر کہا۔ یہ اس گھر سے نہیں جاسکتی۔ اس کی نوہ بھی کڑ کڑ کرنے لگی۔ دونوں مجھے کنجری کے ہاتھ بیچ کر رات کو ۵ سو روپے وصول کرنا چاہتے تھے۔ وہ مجھے کیسے جانے دیتے۔"

"اللہ وسایا ان کی باتیں سن کر کیا بولا۔؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"وہ آنکھیں نکال کر کھڑا ہوگیا۔" جمیلہ کے چہرے پر چھائی ہوئی افسردگی میں ہلکی ہلکی سرخی جھلکنے لگی۔ "اس نے کرتے کی دونوں آستینیں چڑھائیں اور اپنی لمبی ڈانگ اٹھا کر جوش سے بولا۔ بابے! میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور ابھی لے جاؤں گا۔ بلالے اپنے پنڈ کے جوانوں کو' دیکھتا ہوں کون میرا رستہ روکتا ہے؟ یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ تھاما اور اونچی آواز سے بولا۔ 'چل پاروتی۔ ولیا جھٹ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پر اللہ وسایا کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ڈر گیا۔ ویسے بھی وہ جھگڑالو بندہ نہیں تھا۔ کہنے لگا' اللہ وسایا تو اسے ضرور لے جا پر میرے تین سو روپے دیتا جا۔ میں نے اسے اتنے ہی میں خریدا ہے۔ میری بات کا تجھے وشواس نہ ہو تو صابے والے کے گامے سے پوچھ لے جس سے میں نے اسے خریدا ہے۔ اللہ وسایا نے جھٹ دھوتی کے ڈب سے ۵۰ روپے نکالے اور ولیا کے سامنے ڈال کر کہا۔ یہ ۵۰ رکھ لے۔ اڑھائی سو کل شام اپنے بھائی کو بھیج کر منگوالینا۔ ویسے تجھے میرا اعتبار ہو تو کل میں خود تیری رکم تیرے گھر پہنچا دوں گا۔ اللہ وسایا وہاں ذرا دیر بھی نہیں ٹھیرا۔ مجھے گھر لے آیا۔ سب چپ کر کے بیٹھے رہے۔ کسی نے اس کا رستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔"

"اپنا زمیں دار اتنا زور آور اور جی دار ہے' یہ تو میں نوں پتہ ہی نہیں تھا۔"

"چوہدری! وہ بہت جی دار ہے۔ ان دنوں تو خوب تکڑا جوان تھا۔ اس کے شریر میں بڑی شکتی تھی۔" اللہ وسایا کا ذکر کرتے وقت جمیلہ کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ "بھومان شاہ سے اپنے پنڈ تک دس میل سے کم فاصلہ نہیں ہوگا۔ میں فرلانگ دو فرلانگ چل کر بیٹھ گئی۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ بہت کمزور ہوگئی تھی۔ پر اللہ وسایا ذرا بھی نراش نہ ہوا۔ اس نے مجھے اٹھا کر پیٹھ پر لاد لیا۔ دس میل تک وہ مجھے اسی طرح اٹھائے اٹھائے چلتا رہا' کہیں دم نہ لیا۔ اپنے گھر پہنچ کر ہی رکا۔ میں

آنے کو تو اس کے ساتھ آگئی پر بعد میں مجھے بہت ڈر لگا۔ بات یہ تھی جنسی لال نے اللہ وسایا اور اس کے پیو کو نراض ہو کر بے دخل کر دیا تھا اور ایسے سمے بے دخلی کی تھی جب اس کی فصلیں تیار کھڑی تھیں۔"

"فصل واڈھو ہو تو مزارعے کو بے دخل نہیں کیا جاسکتا' ایسا کبھی نہیں ہوتا۔" رحیم داد نے جنسی لال کی کارروائی کی مذمت کی۔

"پر جنسی لال نے ایسا ہی کیا۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔ "اللہ وسایا کے پیو نے دیپال پور جا کر ہرویال سے فریاد کی' پر اس نے جنسی لال ہی کی بات مانی۔ اللہ وسایا اور اس کے گھر والے پنڈ سے نکل کر ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ اس کا پیو اسی دکھ سے مر گیا۔ چھوٹا بھائی شیخوپورہ جا کر اینٹوں کے بھٹے پر مزدوری کرنے لگا۔ جب فسادات بھڑکے تو جنسی لال حویلی چھوڑ کر سرحد پار چلا گیا۔ اللہ وسایا اپنی ماں کے ساتھ واپس پنڈ آگیا۔ اس نے جنسی لال کے نئے مزارعے سے اپنی زمین خالی کرالی۔ اس پر کھیتی باڑی بھی شروع کر دی۔ پر مجھے جس بات کا ڈر تھا' وہ سامنے آئی۔ اللہ وسایا کی ماں کو پتہ چلا' میں پنڈ کے زمیں دار لالہ ہرکشن کی دھی ہوں تو وہ آگ بگولا ہوگئی' بہت چیخی چلائی۔ مجھے دوش دینے لگی' تیرے پیو نے میرے گھر والے کو بے دخل کر کے مار ڈالا۔ اس کی نراضی پر میں نے سوچا کہ اللہ وسایا بھی مجھ سے اپنے پیو کا بدلہ ضرور لے گا۔ وہ تھا بھی ان دنوں بہت کڑوا اور غصے والا۔ دور دور تک اس کی ٹکر کا جوان نہیں تھا۔ ہر سمے مونچھیں مروڑتا رہتا اور شیر کی طرح چھاتی تان کر چلتا تھا۔"

رحیم داد مسکرا کر بولا۔ "پر اب تو اس کی مونچھیں سیدھی سادی رہتی ہیں۔ کبھی نہیں مروڑتا شروڑتا۔"

"ان دنوں توں نے اسے نہیں دیکھا۔ بہت زور آور ہوتا تھا۔" جمیلہ نے فخر سے گردن اونچی کی۔ "میں اتنی ڈری کہ رات بھر جاگتی رہی۔ پر وہ میرے پاس آیا ہی نہیں۔ دوسری رات بھی نہیں آیا۔ نہ اس نے مجھ سے بات کی' نہ کسی طرح کی چھیڑ چھاڑ کی۔ کئی راتیں گزر گئیں۔ البتہ اس کی ماں روز نراض ہوتی۔ ہر سمے غصے سے کڑ کڑ کرتی رہتی۔ ایک روز اس نے مجھے مارا بھی۔ ٹھیک اسی سمے اللہ وسایا آگیا۔ حویلی خالی پڑی تھی۔ اللہ وسایا نے ماں سے تو کچھ نہیں کہا' مجھے حویلی میں لے آیا۔ حویلی پہنچ کر مجھے اور ڈر لگا۔ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ میں کمرے میں سوتی اور وہ کمرے کے باہر منجی ڈال کر لیٹ جاتا۔ رات کو وہ کبھی کمرے میں نہیں آیا۔ دوپہر اور شام کو میرے لیے روٹی لے کر آتا مگر بات چیت بہت کم کرتا۔"

"مہاجرین نے تو اس پنڈ میں گڑبڑ نہیں کی؟"

"کیوں نہیں کی' بہت گڑبڑ کی۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "مہاجرین کا کیمپ لہور کی طرح منٹگمری میں بھی کھل گیا تھا۔ انھیں جہاں بھی ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی زمیں یا مکان نظر آتا' اس پر جھٹ کبضہ کرلیتے۔ ویسے ادھر کے وڈے زمیں داروں نے پہلے ہی ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی زمین اور جائیداد طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے دبا رکھی تھی۔ مہاجرین کے لیے بچا ہی کیا تھا۔ کسی طرح انھیں پتہ چل گیا کہ حویلی کسی ہندو زمیں دار کی ہے۔ وہ تو چلا گیا' اس میں اس کی ہندو پتری رہتی ہے۔ فیر تو جی' انھوں نے حویلی پر کبضہ کرنے کی سوچی۔ غول کے غول پنڈ میں آگئے اور حویلی چھین نے کی کوشش کرنے لگے۔ اللہ وسایا اور اس کے ساتھیوں نے ان کی کوئی کوشش سپھل نہ ہونے دی۔ حویلی میں ایک بندوک موجود تھی' یہی جو تیرے پاس ہے۔ کارتوس بھی تھے۔ اللہ وسایا کے ساتھیوں میں سے کئی کے پاس دیسی کاربینیں تھیں۔ سب نے جم کر مکابلہ کیا۔ حملہ آوروں کو پنڈ سے باہر نکال دیا۔ دوسرے تو کسی اور طرف نکل گئے' پر جلندھر کے پٹھان مہاجر نہ گئے۔ انھوں نے پنڈ کے باہر پڑاو ڈال دیا۔"

"ان کے بارے میں تو مشہور ہے' اراضی کیسے بھی ہو۔ کہیں بھی ملے' ہرگز نہیں چھوڑتے۔" رحیم داد نے مسکرا کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "کہتے ہیں کہ ایک بار دوزخیوں نے دیکھا' جلندھری پٹھانوں کے غول کے غول دوزخ میں چلے آرہے ہیں۔ گھبرا کر ان سے پوچھا' بادشاہو! اتھے کہاں چلے آئے؟ یہ تو دوزخ ہے۔ وہ بولے' یہ تو ہم نے بھی پتہ ہے' پر سنا ہے' ادھر زمینوں کی الاٹمنٹ ہو رہی ہے۔"

"چوہدری! توں' تو مخول کر رہا ہے۔" جمیلہ نے بھی مسکرانے کی کوشش کی۔ "پر میں ان کے بارے میں اتنا ضرور کہوں گی' انھوں نے بہت تنگ کیا۔ روز اکٹھے ہو کر ہلّا بولتے تھے۔ اتنا شور شرابہ کرتے تھے' میں تجھے کیا بتاؤں۔" جمیلہ نے لمبی سانس بھری۔ اس کے چہرے پر دکھ کے سائے ایک بار پھر پھیل گئے۔ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "رات کو حملے کا بہت ڈر رہتا تھا۔ اللہ وسایا بندوک تھامے اپنے دس باراں تگڑے ساتھیوں کے ساتھ رات بھر رکھوالی کرتا۔ میں نے روز روز کے خطرے سے گھبرا کر ایک بار اسے صاف صاف کہہ دیا۔ دیکھ اللہ وسایا! سارا جھگڑا میرے کارن ہے۔ مجھے ان کے حوالے کردے یا گولی مار دے۔ میرے ختم ہوتے ہی سارا ٹنٹا مٹ جائے گا۔ اللہ وسایا آنکھیں نکال کر بولا۔ بیکار کی کڑ کڑ نہ کر' چپ کرکے بیٹھی رہ۔ جب تک میری جان میں جان ہے' کوئی یہاں نہیں آسکتا۔ میری لاش پر سے گزر کر ہی کوئی حویلی میں داخل ہو سکتا ہے۔ فیر جو تیرا

جی کرے' کرنا۔ دن اسی ڈر اور خوف میں گزرتے رہے۔ ایک اندھیری رات انھوں نے اکٹھے ہو کر حویلی پر ہلا بول دیا۔ اللہ وسایا اور اس کے ساتھیوں نے بھی مورچے سنبھال لیے۔ زبردست ٹاکرہ ہوا۔ دونوں طرف سے تڑ تڑ گولیاں چلیں۔ میں نے جی میں ٹھانی اگر بلوائی حویلی میں آئے تو میں ان کے پہنچنے سے پہلے ہی خودکشی کرلوں گی۔ میری آشا تھی کہ انھیں میں نہ ملوں' میری لاش ملے۔"

"توں نے کیا کیا؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

"میں نے دیوار میں لگی ہوئی ایک اونچی کھونٹی میں اپنی اوڑھنی کا ایک پلو مضبوطی سے باندھا' دوسرے پلو کا پھندا بنایا۔ کھونٹی کے نیچے لکڑی کا سٹول رکھا' اس پر چڑھ کر پھندا اپنی گردن میں ڈال لیا۔" جمیلہ ایک ایک تفصیل بتاتی رہی۔ "حویلی کے باہر شور ہوتا رہا' گولیاں تڑتڑاتی رہیں۔ بہت دیر بعد شور بند ہوا۔ گولیاں بھی رک گئیں' تھوڑی دیر بعد حویلی کے آنگن میں بول برالا ہوا۔ ملی جلی آوازوں کے ساتھ زور زور سے چلنے کی آہٹ ہوئی۔ مجھے ایسا لگا' بلوائی حویلی میں گھس آئے ہیں۔ میں نے جھٹ اپنا ایک پیر اٹھایا' دوسرے پیر کے بوجھ سے سٹول ڈگمگا کر گر گیا۔ ساتھ ہی میں بھی گری اور اوڑھنی کے ساتھ لٹکنے لگی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ مجھے کچھ پتہ نہ چلا' فیر کیا ہوا۔"

رحیم داد نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "تسیں پھندے سے لٹکی رہی تھیں؟"

"بالکل لٹکی رہی تھی۔" جمیلہ نے سکون سے جواب دیا۔ "رات گئے مجھے ایسا لگا میں زندہ ہوں۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مجھے دکھ ہوا کہ کیوں بچ گئی؟ میں اس نرک میں دوبارہ نہیں جانا چاہتی تھی جس سے نکل کر آئی تھی۔ ڈرتے ڈرتے آنکھیں گھما کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اللہ وسایا میرے سرہانے بت بنا بیٹھا تھا۔ اس نے میری آنکھیں کھلی دیکھیں تو بھاگا بھاگا گیا' گلاس میں پانی لے کر آیا۔ ایک ہاتھ سے میرا سر اونچا کیا اور میرے منہ میں پانی ڈالا۔ مجھے بہت پیاس لگی تھی۔ سارا پانی پی گئی۔ مانو میں تو مر ہی چکی تھی۔ یہ اللہ وسایا تھا جس نے مجھے مرنے سے بچالیا۔"

"ہاں! وہ نہ ہوتا تو ہرگز نہ بچتی۔" رحیم داد نے اس کی تائید کی۔

"پانی پی کر ذرا جان آئی تو میں نے اللہ وسایا سے پوچھا' بلوائیوں کا کیا بنا؟ وہ ہنس کر بولا' بننا کیا تھا۔ سب بھاگ گئے۔ میں نے کچھ دیر چپ رہ کے کہا۔ پر وہ کل نہیں تو پرسوں ضرور ہلّا بولیں گے۔ اللہ وسایا ذرا بھی نہ گھبرایا' مسکراتا رہا۔ میں نے دیکھا' اس کے کرتے کی آستین خون سے لال ہو رہی ہے۔ کپڑوں پر بھی جگہ جگہ خون کے دھبے تھے۔ میں گھبرا گئی۔ وہ ہنس کر بولا' گولی بازو میں لگی تھی۔ پر اندر نہیں اتری۔ گولی چلتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں تکیے کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ اللہ وسایا نے بار بار منع کیا پر میں نے جھٹ اپنی اوڑھنی پھاڑ کر اس کے

گھاؤ پر پٹی باندھ دی۔"

"بلوائیوں نے دوبارہ حملہ کیا ہوگا۔ اللہ وسایا تو زخمی تھا۔ اس نے کیسے ان کا سامنا کیا؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"اس رات کے بعد حملہ نہیں ہوا۔" جمیلہ نے رحیم داد کو وضاحت سے بتایا۔ "میں نے اسی رات فیصلہ کرلیا تھا' مجھے اللہ وسایا سے فوراً ویاہ کرلینا چاہئے۔ ورنہ وہ مجھے بچانے کی کوشش میں مارا جائے گا۔ میں نے جب اسے یہ بات کہی تو وہ تیار نہیں ہوا' کہنے لگا۔ میں ٹھیرا جانگلی اور تو اتنے وڈے زمیں دار کی دھی۔ مزارعے کا زمیں دار کی دھی سے کیسے رشتہ ہوسکتا ہے؟ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ میں نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تب اللہ وسایا نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے آنسو پونچھے۔ اسی صبح میں اللہ وسایا کے ساتھ پنڈ کی مسجد میں گئی۔ ملاں جی نے سب کے سامنے مجھے کلمہ پڑھایا۔ میں مسلمان ہوگئی۔ میرا نام جمیلہ رکھا گیا۔ اسی روز ملاں نے اللہ وسایا کے ساتھ میرا نکاح پڑھا دیا۔ بس جی اس طرح ہمارا ویاہ ہوا۔ میں پاروتی نہ رہی' اللہ وسایا کی جمیلہ بن گئی۔ یہ میرا نیا جیون تھا اور یہ نیا جیون مجھے اللہ وسایا ہی نے دیا تھا۔"

"اللہ وسایا کی ماں بھی نکاح میں شامل ہوئی تھی؟"

"نہیں جی' وہ تو اتنی ناراض ہوئی' اسی روز پنڈ چھوڑ کر اپنے چھوٹے پتر کے پاس شیخوپورہ چلی گئی۔ اللہ وسایا اسے واپس لانے کئی بار شیخوپورے گیا پر وہ نہ آئی۔ بہت ضدی اور ہٹیلی تھی۔ دو برس ہوئے اس کا مرن ہوگیا۔ اللہ وسایا کا بھائی بھی کبھی یہاں نہیں آیا۔ سنا ہے وہ کراچی چلا گیا۔ اس کے بارے میں کچھ اور پتہ نہیں چل سکا۔"

☆

سورج غروب ہو رہا تھا۔ دھوپ بلندیوں پر پہنچ چکی تھی۔ مزارعے اور کسان مویشیوں کو ہنکاتے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ رحیم داد اور جمیلہ خاموش بیٹھے تھے۔ نوکر نے لسی سے بھرے ہوئے گلاس دونوں کے سامنے میز پر رکھ دیے۔ جمیلہ نے لسی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "برسوں بعد میں نے اپنے بارے میں کسی کو اتنی باتیں بتائی ہیں۔ لگتا ہے' بہت ہلکی پھلکی ہوگئی ہوں۔ اس رات سے میں بہت بے کل تھی جب ہردیال اور چاچا مجھے لینے یہاں آئے تھے۔ کچھ بھی چنگا نہیں لگتا تھا۔ بار بار رونے کو جی کرتا' رات کو نیند بھی نہ آتی۔ آج میں آرام نال سو سکوں گی۔ مانو میرے من کا بوجھ اتر گیا۔"

رحیم داد فوری ردعمل کا اظہار نہ کرسکا۔ وہ جمیلہ کی بپتا کے ہوش ربا اور حیرت انگیز تانے بانے میں الجھ کر رہ گیا۔ اسی اثناء میں حویلی کے اندر سے جمیلہ کی بیٹی بینا کے زور زور سے رونے کی آواز ابھری۔ جمیلہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی۔ "لگتا ہے بہن بھائی میں جھگڑا ہوگیا۔ کھیلتے کھیلتے لڑنے لگتے ہیں۔" وہ تیز قدم اٹھاتی حویلی کی جانب روانہ ہوگئی۔ رحیم داد اسے دور تک دیکھتا رہا اور اس کے جانے کے بعد گم صم بیٹھا رہا۔

شام ہوگئی۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ رحیم داد اٹھا اور بوجھل قدموں سے مہمان خانے کی سمت بڑھا۔ وہ نڈھال نظر آرہا تھا۔

تیسرے روز اللہ وسایا واپس آگیا۔ شام کو وہ باغ میں رحیم داد سے ملا۔ خلاف معمول وہ بجھا بجھا لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں خالی خالی اور ویران تھیں رحیم داد نے چاہا' اس کی پریشانی کا سبب معلوم کرے۔ مگر اللہ وسایا زیادہ دیر نہیں بیٹھا' معذرت کے انداز میں بولا۔ "معاف کرنا چوہدری' میری طبیعت آج کچھ گڑبڑ ہے۔ کل تجھ سے آرام سے گل بات کروں گا۔" وہ چلا گیا۔

جمیلہ کے بھائی ہردیال اور چچا کے بارے میں نہ اللہ وسایا نے کچھ کہا نہ رحیم داد نے ان کا ذکر چھیڑا۔

اللہ وسایا اب ہروقت چپ چپ رہتا۔ بہت کم بات کرتا اور بات کرتے کرتے کھو جاتا۔ جب بھی ملتا کچھ سوچتا نظر آتا۔ کئی روز گزر گئے۔ مگر اللہ وسایا کے چہرے پر پہلی سی تازگی اور شگفتگی دکھائی نہ دی۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ اندر ہی اندر سلگ رہا ہو۔ اسے کوئی بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ رحیم داد نے کئی بار ہمت کرکے پوچھا بھی مگر وہ ٹال گیا۔

انھی دنوں ایک شام جمیلہ باغ میں آئی۔ رحیم داد پہلے سے بیٹھا تھا۔ وہ بھی ایک طرف بیٹھ گئی۔ اللہ وسایا گاؤں میں نہیں تھا۔ کہیں گیا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پھاتاں آگئی۔ وہ جمیلہ کے پیروں کے پاس گھاس پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "بہن جی! تاجاں کی سسرال والے اگلے مہینے کے پہلے جمعے کو آرہے ہیں۔" اس نے انگلیوں پر حساب لگایا۔ "آج کے چھبیں دیں دن ویاہ کی تاریخ مانگنے آرہے ہیں۔"

"کب تک ویاہ کرنا چاہتے ہیں۔" جمیلہ نے پوچھا۔

"ان کا ارادہ تو جھٹیتی نال کرنے کا ہے۔" پھاتاں نے جواب دیا۔ "پر اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں۔"

"تو کیوں چنتا کرتی ہے۔ تجھے مجھ پر وشواس نہیں؟ تجھ سے کہہ تو چکی ہوں' میں تاجاں کا ویاہ

خوب دھوم دھڑکے سے کروں گی۔ تاجاں تیری نہیں، میری بھی دھی ہے۔“

چھاتاں کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”تو جی میں کہلوادوں، وہ ساھے کے لیے آجائیں۔“

”بالکل کہلوا دے۔ ان کو یہیں حویلی میں لانا۔ پر یہ تو سوچ، جلدی کیسے ویاہ ہو سکتا ہے اتنی گرمی میں؟“ اس نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا، چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”ساون ٹھیک رہے گا۔“ مگر فوراً اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ”پر ساون میں تو زبردست برکھا ہوتی ہے۔ سگائی کا کیا مزا آئے گا۔ یہ کیا گل ہوئی، جنج چڑھے اور اوپر بادل گرجتے ہوں۔ بجلی چمکتی ہو، چاروں طرف پانی ہی پانی ہو۔ نہ ٹھیک سے ملنی ہو نہ سٹھنیاں۔ ماگھ کیسا رہے گا؟“

”نا بھین جی! ماگھ تو بہت دور ہے۔“ چھاتاں رضا مند نہیں ہوئی۔ ”وہ لوگ ویاہ میں اتنی دیری نہیں چاہتے۔“

”سوچ لے۔ جب کہے گی، تیاری ہو جائے گی۔“ جمیلہ نے اڑنے کی مطلق کوشش نہیں کی۔

”تیری تاجاں تو بہت سندر مٹیار ہے۔ اس کا ویاہ بھی سندر ہونا چاہیے۔ سے بھی ویسا ہی ہونا چاہیے۔ آگے تیری مرضی۔ میں نے کیا لینا۔“

”میرا کیا ہے جی! تسیں سسرال والوں کو تیار کر لینا۔“ چھاتاں نے مسکرا کر کہا۔

”ایہہ گل ہے تو ساھے کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دے۔ میں انھیں راضی کر لوں گی۔ کوئی شبھ گھڑی ہونی چاہیے۔ اس کے بارے میں مل جل کر طے کر لیں گے۔“

چھاتاں اٹھتے ہوئے بولی۔ ”بھین جی ساھے کا دن یاد رہے گا ناں؟“

”بالکل یاد رہے گا۔“ جمیلہ بھی کھڑی ہو گئی اور چھاتاں کے ساتھ ساتھ باغ سے چلی گئی۔

رحیم داد کو حیرت ہوئی، اللہ وسایا کے برعکس جمیلہ کے چہرے پر پہلی سی تازگی تھی اور ویسا ہی نکھار تھا۔ اس کے رویے میں بھی وہی شگفتگی تھی جو مسکراہٹ بن کر اس کے ہونٹوں پر ہر وقت رقصاں رہتی تھی۔

اللہ وسایا نہ باغ میں آیا نہ رات کو مہمان خانے میں۔ وہ دوسرے روز، دن چڑھے رحیم داد کے پاس آیا۔ اس کا چہرہ اب بھی اترا ہوا تھا۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”چوہدری میں دو گھنٹے بعد لہور جا رہا ہوں۔ جمیلہ اور دونوں بچے میرے ساتھ جائیں گے۔“

”کوئی خاص کام ہے لہور میں؟“ رحیم داد کے استفسار میں حیرت تھی۔

”خاص ہی کام ہے۔“ اللہ وسایا نے کام کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ”تجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں نے نوکروں کو بول دیا ہے۔ آرام سے رہ، یہ تیرا ہی گھر ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو منگوا لینا۔“

”کب تک واپسی ہوگی؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”تین چار روز تو لگ ہی جائیں گے۔ زیادہ دن بھی ہو سکتے ہیں۔“

رحیم داد دریافت کرنا چاہتا تھا، وہ ملتان سے واپسی کے چند ہی روز بعد لاہور کیوں جا رہا ہے اور جمیلہ کو کس لیے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے؟ اس کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ مگر اللہ وسایا نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ فوراً باہر چلا گیا۔

اللہ وسایا اسی روز بیوی بچوں کے ہم راہ لاہور روانہ ہو گیا۔ رحیم داد بالکل تنہا رہ گیا۔ وہ بار بار اللہ وسایا کے بشرے سے ٹپکتی ہوئی پریشانی کے بارے میں غور کرتا۔ جتنا وہ غور کرتا، اللہ وسایا کا رویہ اسے پراسرار نظر آتا۔ وہ دن دن بھر کمرے میں بند ہو کے حسب معمول چوہدری نور الٰہی مرحوم کے جعلی دستخط بنانے کی مشق کرتا رہتا۔ شام کو نہا دھو کر ٹہلتا ہوا باغ کی جانب نکل جاتا۔ رات کا کھانا مہمان خانے یا باغ میں کھاتا۔ مہمان خانے کی چھت پر بندوق سرہانے رکھ کر سوتا اور بہت چوکنا سوتا۔ ذرا کھٹکا ہوتا، وہ بندوق پر ہاتھ رکھ کر اٹھ بیٹھتا۔ احمد صحت یاب ہو گیا تھا۔ وہ رات کو آنگن میں سوتا۔ اس کے آنے سے رحیم داد کو خاصی ڈھارس ہو گئی۔

اللہ وسایا نویں روز بیوی بچوں کے ساتھ صبح صبح واپس آگیا۔ مگر رحیم داد سے نہیں ملا۔ شام کو رحیم داد باغ میں بیٹھا تھا، اللہ وسایا آیا۔ جمیلہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس دفعہ نہ صرف اللہ وسایا کے چہرے پر بلکہ جمیلہ کے چہرے پر بھی پریشانی برس رہی تھی۔ دونوں کچھ دیر گم صم بیٹھے رہے پھر اللہ وسایا نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

”چوہدری! یہ حویلی ہم نے جلد ہی خالی کرنی ہوگی۔“

رحیم داد ششدر رہ گیا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کیوں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ہم مکدمہ ہار گئے۔ پہلے ملتان میں ہارے، فیر لہور میں ایڈیشنل کمشنر بحالیات کے پاس اپیل کی۔ اس نے اپیل نامنظور کر دی۔ حویلی اور ہماری ساری اراضی متروکہ جائیداد کرار دے دی گئی۔“ اللہ وسایا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”یہ حویلی اور زمین جمیلہ کے پیو کی ملکیت تھی۔ اس کی دھی ہونے کے ناتے جمیلہ کے نام پر یہ میرے پاس تھی۔ پر سرکار نے جمیلہ کو وارث ماننے سے انکار کر دیا۔“

”چوہدری! یہ تو دیکھ، میرے پیو کی تو بہت اراضی تھی۔ اس کی دو ہزار ایکڑ سے اوپر زمین احسان علی شاہ نے دبالی۔ پر اس کا قبضہ مان لیا گیا۔“ جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر گلہ کیا۔ ”ویسے اس کے پاس

پہلے ہی دو سو مربعے کے لگ بھگ اراضی تھی۔ یہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی مدد کرنے اور وفاداری دکھانے پر اس کے پرکھوں کو ملی تھی۔" اس کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ "انگریز کا راج تھا، تب اس کی چلتی تھی۔ اب انگریز کا راج نہیں رہا تب بھی اس کی چلتی ہے۔ اس نے ہمارے خلاف درخواست لگائی تھی۔ ہم نے اپنی زمین کی واپسی کے لیے اس کے خلاف درخواست لگائی تو کوئی انکوائری شنکوائری نہ ہوئی کیول اس کی درخواست پر فاسٹ انکوائری کا حکم جاری کردیا گیا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اللہ وسایا ہار گیا۔ احسان شاہ جیت گیا۔"

"اسے تو جیتنا ہی تھا۔ اس کی اوپر تک پہنچ ہے۔ وزیروں اور افسروں سے یاری ہے۔ اس کے پتر اور جنوائی بھی وڈے افسر ہیں۔ وہ نہ جیتے گا تو کیا میں جیتوں گا۔" اللہ وسایا نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

"ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" جمیلہ کا لہجہ تیکھا اور مزید تلخ ہوگیا۔ "احسان شاہ نے تو جیتنا ہی جیتنا تھا۔ احسان شاہ کے پرکھے بھی تیرے پرکھوں سے جیتے تھے، جنھوں نے اپنی دھرتی کو انگریزوں کی غلامی سے بچانے کے لیے جنگ لڑی تھی، بغاوت کی تھی۔ وہ باہنی وال تھے۔ ہار گئے تو ان سے زمین، مویشی، عزت آبرو، سب کچھ چھین لیا گیا۔ انھیں تباہ و برباد کرکے جانگلی بنا دیا گیا۔ احسان علی شاہ کے پرکھوں نے انگریزوں کے کارن غداری کی، آزادی کا سودا کیا، ان کے ساتھ مل کر باہنی وال باغیوں اور ودردھیوں کو کچل دیا۔ انگریزوں نے خوش ہوکر انھیں عزت دی، شان دی۔ سید اور شاہ جی کہا اور سید اور شاہ جی بنا بھی دیا۔"

"ایسی باتیں کیوں کرتی ہے۔" اللہ وسایا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں نے جھوٹ تو نہیں کہا۔" جمیلہ اسی تلخی سے بولی۔ "میں نے تاریخ کی کتابوں میں جو پڑھا ہے، وہ بتا رہی ہوں۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "سر ڈنزل ایبٹ سن بہت وڈا انگریز افسر ہوتا تھا۔ اس نے پنجاب کی کوموں اور جات برادریوں کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کا نام ہے ‘پنجاب کاسٹس۔ ایبٹ سن نے اس میں لکھا ہے ‘۱۸۵۷ء کے غدر میں باہنی وال ودردھیوں نے انگریز فوجوں کو بہت تنگ کیا۔ وہ لٹیرے اور جانگلی تھے۔ سو باہنی وال آج تک جانگلی کہلاتے ہیں۔ تو خود سوچ، انگریز کی مونچھ کا بال خاندانی جگیر دار سید احسان علی شاہ، ایک باہنی وال جانگلی اور معمولی مزارعے اللہ وسایا کو کیسے زمیں دار دیکھ سکتا ہے۔ تب ہی تو اس نے اللہ وسایا سے زمیں داری چھین لی۔ اس کی پگ کا طرہ اور اونچا ہوگیا۔"

"احسان شاہ میری زمیں داری ہی سے نہیں، تیرے سکول سے بھی خار کھاتا ہے۔"

"سکول سے کیوں خار کھاتا ہے؟ سکول نے احسان شاہ کا کیا بگاڑا ہے؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر اللہ وسایا سے دریافت کیا۔

"وہ میرے سکول سے سخت نراض ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا، جانگلیوں اور کمیوں کے بچے پڑھ لکھ کر یہ جان لیں کہ وہ جانگلی اور کمی کیوں ہیں اور احسان شاہ کیسے جگیر دار بن گیا؟ انھیں پتہ چل جائے گا کہ اس کے پرکھے اپنے انگریز حاکموں کے جوتے چاٹتے تھے۔ ان کے سامنے کتوں کی طرح دم ہلاتے تھے۔" جمیلہ کے ہونٹوں پر زہرخند نمودار ہوا۔ "یہ ہے احسان علی شاہ کی اصلیت جس کے بل پر وہ شاہ جی بنا پھرتا ہے، اپنے کو خاندانی جگیر دار اور رئیس بتاتا ہے۔"

اللہ وسایا اور رحیم داد خاموش بیٹھے رہے۔ جمیلہ کے چہرے پر جھنجلاہٹ اور نفرت سرخی بن کر پھیل گئی۔ وہ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہی تھی۔

"اب کیا ہوگا؟" رحیم داد نے سکوت توڑا۔

"ہونا کیا ہے، وہی جو میں نے کہا ہے۔" اللہ وسایا نے جواب دیا۔

"کب تک حویلی خالی کرنی ہوگی؟"

"دس روز کے اندر اندر حویلی خالی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

اللہ وسایا کھڑا ہوگیا، جمیلہ اور رحیم داد بھی کھڑے ہوگئے۔ تینوں باغ سے نکلے اور مہمان خانے میں پہنچے۔ مگر اللہ وسایا ٹھہرا نہیں، حویلی میں کھلنے والے دروازے کی جانب بڑھا۔ جمیلہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ رحیم داد نے شام کی دھندلی روشنی میں دیکھا، جمیلہ تھکی ہوئی اور نڈھال نظر آرہی ہے۔ اس کے قدم ڈگمگائے۔ اللہ وسایا نے اسے سنبھال لیا۔ جمیلہ نے اس کے بازو پر اپنا سر ٹکا دیا۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ رحیم داد اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ صرف یہ دیکھ سکا، اللہ وسایا اس کا کندھا بڑے پیار سے تھپک رہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے سہارے سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے حویلی میں داخل ہوگئے۔

رحیم داد مہمان خانے میں تنہا رہ گیا۔ احمد بھی نہیں تھا۔ وہ آنگن میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ ویران اور اداس شام تھی اور اس سے بھی زیادہ اداس رحیم داد تھا۔ اب کیا ہوگا؟ وہ کس کے پاس جائے گا؟ کہاں جائے گا؟ کیسے جائے گا؟ ان سوالات کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ زندگی ایک بار پھر اسے بوجھ نظر آنے لگی۔

وہ بے چین اور مضطرب تھا۔ احمد کھانا لایا مگر وہ آدھی روٹی بھی نہ کھا سکا۔ بستر پر لیٹا تو آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ رات کروٹیں بدلتے کسی نہ کسی طور کٹی۔ سویرے اٹھا تو وہی الجھن اور پریشانی

دامن گیر تھی۔ دوپہر ہوئی' رات ہوئی۔ نہ اللہ وسایا نظر آیا نہ جمیلہ۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ رحیم داد نے سوچا' دونوں گاؤں چھوڑنے کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے۔ زمیں داری کا بہت بڑا بکھیڑا ہے۔ انھیں جانے سے پہلے ہر کام نمٹانا ہے۔

رحیم داد کو بھی اب کوٹلہ ہرکشن سے کہیں نہ کہیں جانا تھا۔ اللہ وسایا اسے پہلے ہی صورت احوال سے خبردار کرچکا تھا۔ اس نے سویرے سویرے نائی بلوایا' بال کٹوائے' ڈاڑھی کی تراش خراش کرائی۔ حجامت بنوانے کے بعد غسل خانے میں گیا۔ نہا دھو کر اجلے کپڑے پہنے۔ کنگھی سے سر اور ڈاڑھی کے بال سنوارے۔ آنکھوں پر عینک لگائی اور دیوار میں لگے ہوئے آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے چہرے کا زخم کب کا مندمل ہوچکا تھا۔ مگر اس کے بائیں رخسار پر لگ بھگ چار انچ لمبا نشان ہلال کی شکل میں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے گردن ادھر ادھر گھما کر اپنے چہرے پر مختلف زاویوں سے نظر ڈالی' زیر لب مسکرایا۔ اب اس کی شکل و شباہت میں اتنا فرق آچکا تھا کہ اسے شناخت کرنا آسان نہیں تھا۔ چہرے مہرے سے وہ اس قدر مختلف بن چکا تھا۔ لاری یا ٹرین سے بھی سفر کرسکتا تھا۔

آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے اس نے طے کیا' وہ کوٹلہ ہرکشن' شام ہونے سے پہلے چھوڑ دے گا۔ منٹگمری اسٹیشن جانے کے بجائے لاری سے پاک پتن جائے گا اور رات کی ٹرین سے لودھراں پہنچ کر بہاول پور کے راستے سندھ کی طرف نکل جائے گا۔ سکھر' شکار پور نواب شاہ یا سندھ کے کسی بھی علاقے میں چلا جائے گا۔ چوہدری نور الٰہی کے کلیم کی بنیاد پر زرعی زمین اور مکان الاٹ کرانے کی کوشش کرے گا۔ جب تک الاٹمنٹ نہیں ملے گا' کہیں دکان کھول لے گا یا کوئی اور کاروبار شروع کردے گا۔ لالی کی دی ہوئی تین ہزار سے اوپر رقم اس کے پاس موجود تھی۔ اس رقم سے وہ بہت کچھ کرسکتا تھا۔ سندھ میں کسی جان پہچان والے کے ملنے کا امکان بھی کم تھا۔ وہ چوہدری نور الٰہی کے روپ میں اطمینان سے نئی زندگی کا آغاز کرسکتا تھا۔

وہ اب چوہدری نور الٰہی بن کر ہی زندہ رہنا چاہتا تھا۔ رحیم داد کو وہ بہت پہلے ختم کرچکا تھا۔ بیگماں کے قتل کے بعد رحیم داد سے اس کے سماجی وجود کا آخری رشتہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ یہ پھانسی کا خطرہ مول لے کر رحیم داد کو زندہ رکھنے کی آخری کوشش تھی جس میں وہ اپنی اکلوتی بہن کو بھی داؤ پر لگا چکا تھا۔ وہ کس کے لیے رحیم داد بن کر زندہ رہتا؟ نوراں کے لیے؟ بچوں کے لیے؟ اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ نوراں مرگئی۔ اس کے ساتھ بچے بھی مرگئے۔ اب اس کا کوئی رشتہ نہیں رہا تھا۔ رحیم داد اس کے لیے ماضی کے کباڑ خانے کا حصہ بن چکا تھا۔ زنگ خوردہ' بوسیدہ' بیکار اور فضول۔

☆

احمد ناشتا لے کر کمرے میں آیا۔ اس کا چہرہ بھی مرجھایا ہوا تھا۔ وہ اداس اور مضمحل لگ رہا تھا۔ رحیم داد نے لسی کا گھونٹ بھر کر اظہار ہمدردی کے طور پر پوچھا۔ ”احمدے! تو پریشان لگ رہا ہے۔ بات کیا ہے؟“

”پریشانی کی تو جی گل ہی ہے۔“ وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تیں نوں تو پتہ ہی ہے' زمیں دار مکدمہ ہار گیا۔ وہ زمیں دارنی کے ساتھ پنڈ چھوڑ کر جا رہا ہے۔“

”تیں نوں کیسے پتہ چلا؟“

”میں نوں تو جی پتہ چل ہی جاتا۔ میں تو حویلی کا نوکر ٹھیرا۔ پر اب تو یہ بات سب جانتے ہیں۔ زمیں دار ہی نے سب کو بتایا ہے۔ پنڈ میں ہر جگہ اسی کا چرچا ہے۔ سب دکھی ہیں۔ کیا مزادعے' کیا کمی۔ سبھی زمیں دار اور زمیں دارنی سے بہت پیار کرتے ہیں۔ میں نے تو جی کتنوں ہی کو روتے دیکھا۔“

”دکھ کی تو گل ہی ہے۔“ رحیم داد نے احمد کی تائید کی۔ ”پنڈ والوں کو ایسا زمیں دار نہیں ملے گا۔“

”توبہ کرو جی! وہ زمیں دار ہی کب تھا۔ وہ اور زمیں دارنی تو سب سے اس طرح گھل مل کر رہتے تھے جیسے اس کے اپنے شریکے اور گھر والے ہوں۔“ احمد آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ ”وڈے زمیں دار تو جی! ویاہ ہو یا موت' ہر مزارعے سے بھیڑ بکری' بھاڑو یا پھندر لیتے ہیں۔ بیماری ہو یا مہمان آئے' جتنے ککڑ چاہے منگوا لیتے ہیں۔ مزارعے کی دودھ دینے والی مجھ ہو یا ڈھگی' جب تک جی چاہے اپنے پاس رکھتے ہیں۔ گاہ کے وکھت ایک جوڑا ڈنگر اور جتنے بندے چاہتے ہیں بلا لیتے ہیں۔ ماڑی یا حویلی کی لپائی' کنک کی پسائی' سب مفت کراتے ہیں۔ ایسی ہی جانے کتنی طرح کی مزارعوں سے ویگار لیتے ہیں۔ مویشی اور چوکھر تو اٹھواتے ہی ہیں نوجوان گھر والیوں اور کڑیوں تک کو اٹھوا لیتے ہیں۔ واپس کرنے کی تکڑی رکم مانگتے ہیں یا بیچ دیتے ہیں۔ کیا کیا بتاؤں جی' وڈے زمیں دار کتنا ظلم کرتے ہیں۔ پر اپنا زمیں دار تو نیک بندہ ہے۔ اس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ جبھی تو سب اس کے لیے رو رہے ہیں۔“

”اس کے جانے کے بعد تو کیا کرے گا؟“

”میں تو جی اس کے ساتھ ہی جاؤں گا۔“ احمد نے جواب دیا۔

"اگر وہ تجھے اپنے ساتھ نہ لے گیا تو کیا کرے گا؟"

"تب تو جی میں یہ پنڈ ہی چھوڑ دوں گا۔ اس کے جانے کے بعد میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ پنڈ کے جانے کتنے لوگ سوچ رہے ہیں، زمیں دار اور زمیں داری کے جاتے ہی کسی اور پنڈ کو چلے جائیں گے۔ جانے نیا زمیں دار کون ہو؟ کیسا ہو؟ اور جی کوئی بھی ہو۔ ہو گا تو وڈا ہی زمیں دار اور ایسے سب زمیں دار ایک ہی سے ہوتے ہیں۔" اس کی آواز بھر آگئی۔ آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ "یہ تو جی بہت برا ہوا۔ بہت ہی برا ہوا۔"

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ احمد سامنے فرش پر خاموش بیٹھا بار بار آنسو پونچھتا رہا۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہوا تو وہ برتن اٹھا کر باہر چلا گیا۔

پہر دن گزر گیا۔ گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ لو کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ مہمان خانے پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ فضا بوجھل اور غبار آلود تھی۔ رحیم داد بستر پر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھ لگ گئی۔

دوپہر کو قدموں کی آہٹ سے رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا، اللہ وسایا کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ جمیلہ بھی تھی۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

رحیم داد نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ "باہر زبردست گرمی ہے۔"

"ہاں جی! آج گرمی کچھ زیادہ ہی ہے۔" اللہ وسایا بولا۔ "سویرے سے لو چلنی شروع ہو گئی۔"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ "میرا تو آج شام سے پہلے یہاں سے جانے کا ارادہ ہے۔ سوچا تھا، روٹی کھا کر تیرے پاس آؤں گا۔ تم دونوں سے مل کر چلا جاؤں گا۔"

جمیلہ چپ بیٹھی رہی۔ اللہ وسایا نے کہا۔ "چلا جانا، ایسی کیا جلدی ہے۔ دو چار روز ٹھہر جا۔ ہم نے بھی یہاں کب تک رہنا ہے۔ حویلی تو خالی ہی کرنی ہے۔"

"آگے کے لیے تو نے کیا سوچا؟"

"ابھی تو کچھ نہیں سوچا۔" اللہ وسایا نے سادگی سے جواب دیا۔

"سوچنا کیا ہے۔" جمیلہ نے کرسی پر پہلو بدلا اور اللہ وسایا کی جانب مڑ کر دیکھا۔ "تیرے پاس ۱۵ کلا زمین تو رہے گی۔ مزارع بن کر تو ہم اس پنڈ میں رہ ہی سکتے ہیں۔"

"لو جی، اس کی سنو۔" اللہ وسایا نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "جس پنڈ میں اٹھ سال تک زمیں داری کی، اب تو اسی میں مجھے مزارع بنا کر ٹھہرانا چاہتی ہے۔ ذرا سوچ تو، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"نہیں جی، یہ نہیں ہو سکتا۔" رحیم داد نے بھی اللہ وسایا کی تائید کی۔ "زمیں دار اپنے ہی پنڈ میں مزارع بن کر نہیں رہ سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ عزت اور آبرو بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"چھوڑ چوہدری کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔" جمیلہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اور جی سب سے وڈی گل ایہہ ہے، میں نے اپنا سکول نہیں چھوڑنا۔ اللہ وسایا! تو زمیں داری بھول جا۔ اپنے تئیں مزارع سمجھنے کی کوشش کر۔ ویسے بھی زمیں دار بن کر تو کب زمیں دار رہا۔ نہ وہ تیری ٹور تھی، نہ وڈے زمیں داروں والی آن بان تھی۔ مجھے تیری یہی سادگی چنگی لگتی تھی۔"

"چل، تیری گل میں نے مان لی۔ میں تو مزارع بن جاؤں گا۔ پہلے بھی مزارع ہی تھا۔ میرا پیو بھی مزارع تھا۔ زمیں دار تو مجھے تو نے بنایا۔" اللہ وسایا کھل کر مسکرایا۔ "پر تو مزارعے کی گھر والی بن سکے گی؟"

"بالکل بن سکتی ہوں۔" جمیلہ نے جوش سے سینے پر ہاتھ مارا۔ "آزما کے دیکھ لے۔" وہ اور زیادہ جوش میں آگئی۔ کرتے کی دونوں آستینیں چڑھا لیں۔ اس کے گورے گورے ہاتھ دور تک عریاں ہو گئے۔ "تو نے مجھے سمجھا کیا ہے؟ سویرے سویرے اٹھ کر مویشیوں کے لیے پٹھا دتا کروں گی۔ چاٹی میں مدھانی ڈال کر دودھ بلوؤں گی۔ تو کھیتوں پر جائے گا اور میں بچوں کو لے کر سکول چلی جاؤں گی۔ دوپہر کو روٹی پکاؤں گی اور سر پر چنگیری میں رکھ کر تیرے لیے بھتا لے کر کھیتوں پر جاؤں گی۔ تیرے کپڑے دھوؤں گی۔ چرخے پر سوت کاتوں گی۔ چکی میں دانا پیسوں گی۔ میں کیا نہیں کر سکتی؟"

"چوہدری! سن رہا ہے، اس کی باتیں۔" اللہ وسایا نے رحیم داد کو مخاطب کیا پھر مڑ کر جمیلہ کی جانب دیکھا۔ "تجھ سے یہ سب کچھ ہو سکے گا؟ جمیلہ! ایسا کرنا تیرے بس میں نہیں۔ تیرا یہ سارا رنگ روپ مٹ جائے گا۔ آئینہ دیکھے گی تو خود کو پہچان بھی نہ سکے گی۔ کہے گی، ہائے ربّا! میں تو برباد ہو گئی۔ یہ کیا ہو گیا؟ تو نے یہ بھی سوچا؟"

"اللہ وسایا! روپ رنگ کا کیا ہے۔ یہ تو دھوپ چھاؤں ہے۔ آج نہیں تو کل اسے مٹنا ہے۔" وہ سنجیدگی سے اپنی بات پر اڑی رہی۔ "میں نے تھوڑا جیون گزار کر ہی بہت کچھ دیکھ لیا ہے۔ کبھی اپنے کو اس پاروتی کے روپ میں دیکھا جو لہور میں پڑھتی تھی۔ ایک سے ایک عمدہ کپڑے پہنتی تھی۔ کالج کے ڈراموں میں سوانگ بھر کر ایکٹنگ کرتی تھی، ہنستی تھی، ہنساتی تھی۔ سکھیوں کے ساتھ ناچتی گاتی تھی۔ پکنک مناتی تھی۔ شام کو راوی پر کشتی چلاتی تھی۔ کار میں سواری کرتی تھی۔ شان دار کوٹھی میں رہتی تھی۔" اس کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔ "میں نے اس پاروتی کو بھی دیکھا جسے ستمبر

۱۹۴۷ء کی رات بصیرپور سٹیشن سے بلوائی اٹھا لے گئے۔ فیر وہ پاروتی نہ رہی۔ بھوکے کتوں کے لیے ہڈی بن گئی۔ کبھی تین سو میں بکی کبھی پنج سو میں۔“ اس کا چہرہ مرجھا گیا، لہجہ تلخ ہو گیا۔ “تو مجھے ولیا کے گھر سے نکال کر نہ لاتا تو آج میں ہیرامنڈی کی کسی کنجری کے کوٹھے پر اپنا روپ رنگ اور جوانی بیچ رہی ہوتی۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ “تجھے پتہ ہی ہے، میں پاروتی سے کیسے جمیلہ بنی اور زمیں دارنی کہلانے لگی۔ اب زمیں داری کے ساتھ زمیں دارنی بھی نہ رہی۔ جس طرح پاروتی مرگئی، ویسے ہی زمیں دارنی بھی مرگئی۔ اب میں اللہ وسایا مزارعے کی گھروالی بن جاؤں گی۔ بول میں مزارعے کی گھرولی کیوں نہیں بن سکتی؟ یہ کیوں نہیں کہتا، تو زمیں داری کی شان میں مزارع بننا نہیں چاہتا۔”

“چل، تو ہی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں نے تیری بات مان لی۔“ اللہ وسایا نے جمیلہ کے جوش و خروش کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ “پر یہ تو سوچ، اگر نئے زمیں دار نے مجھے بے دخل کردیا۔ ایسے ہی جیسے بنسی لال نے میرے پیو کو اور مجھے بے دخل کردیا تھا۔ تب کیا بنے گا؟”

“بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔“ رحیم داد نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ “کوئی زمیں دار یہ نہیں چاہے گا کہ ایسے بندے کو اپنا مزارع بنا کر رکھے جو اسی پنڈ کا اٹھ سال تک زمیں دار رہ چکا ہو۔ مزارعوں پر اپنا رعب جمانے کے لیے وہ سب سے پہلے اللہ وسایا کو بے دخل کرے گا۔ زمیں داری جو چلانی ہوئی۔”

“چوہدری! توں یہ کہنا چاہتا ہے، ہم یہ پنڈ چھوڑ دیں۔“ جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ “پر میرے سکول کا کیا بنے گا؟”

“سکول کو تو اب بھول ہی جا۔“ اللہ وسایا بولا۔ “کوئی بھی وڈا زمیں دار اپنی زمیں داری میں سکول شکول نہیں دیکھ سکتا۔ سرکار نے کتنے ہی زمیں داروں کے پنڈ میں سکول کھولنے چاہے پر انھوں نے نہ صرف زبردست مخالفت کی بلکہ تکڑی رشوت دے کر رکوا دیا۔”

“اللہ وسایا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ رحیم داد نے تائید کی۔ “میں تجھے ایک واردات کا حال سناتا ہوں۔ ملتان کی تحصیل میلسی میں دو وڈے زمیں داروں میں زبردست جھگڑا چل رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ ان میں سے ایک میرا جاننے والا تھا۔ اس سے ڈپٹی کمشنر نے سکول کھولنے کے لیے چندا مانگا۔ چندا تو اس نے دگنا دے دیا پر ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھی، سکول اس کے پنڈ کی بجائے، مخالف زمیں دار کے پنڈ میں کھول دیا جائے۔ ڈپٹی کمشنر نے اس کی شرط مان لی اور حکم جاری کردیا۔ بعد میں سنا، زمیں دار گالاں نکالتا تھا۔ کہتا تھا، میرے ساتھ دھوکا کیا گیا۔”

“ہاں جی، ایسا ہی ہوتا ہے۔“ اللہ وسایا نے رحیم داد سے اتفاق رائے کیا۔ “یہ پنڈ چھوڑنا ہی ہوگا۔ اب تو کچھ اور سوچنا ہوگا۔”

جمیلہ خاموش رہی۔ اس کے چہرے سے افسردگی ٹپک رہی تھی۔

“اب اس پنڈ میں تم دونوں کا رہنا کسی طرح ٹھیک نہیں۔ کوئی اور ہی رستہ دیکھنا ہوگا۔“ رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔

اللہ وسایا بیزاری سے بولا۔ “کچھ سمجھ نہیں آتی۔ میں نے تو ملتان میں کیس ہارنے کے بعد ہی سوچنا شروع کردیا تھا۔”

“چنتا نہ کر، تو مزارع بننا نہیں چاہتا تو نہ بن۔“ جمیلہ نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔

اللہ وسایا اس کی بات کاٹ کر گویا ہوا۔ “میں مزارع بننے کو تیار ہوں پر اس پنڈ میں نہیں۔ کسی اور زمیں داری میں مزارع بن کر رہ سکتا ہوں۔”

“یہ بات دل سے نکال دے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ “اللہ وسایا! اب تو مزارع نہیں بن سکتا۔ کوئی زمیں دار تجھے مزارع بنائے گا بھی نہیں۔ تو اسے جتنا آسان سمجھتا ہے، ایسا ہے نہیں۔ اب تیں نوں کچھ اور سوچنا ہوگا۔”

“یہی میں کہہ رہی تھی۔ مگر اس نے مجھے یہ بات کہنے ہی نہیں دی۔”

“کہہ، کیا کہنا چاہتی ہے؟“ اللہ وسایا بولا۔

“اگر اس پنڈ میں نہیں رہنا تو ایسا کرتے ہیں، لہور چلتے ہیں۔”

“وہاں جا کر کیا کریں گے؟“ اللہ وسایا نے حیرت سے پوچھا۔

“میں وہاں کسی سکول میں پڑھانے پر لگ جاؤں گی۔ مجھے کسی نہ کسی سکول میں نوکری ضرور مل جائے گی۔”

“یہ کہنا چاہتی ہے تو نوکری کرے اور میں ہڈحرام بن کر تیری کمائی کھاؤں؟“ اللہ وسایا نے منہ بگاڑا۔ “یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ رحیم داد سے مخاطب ہوا۔ “چوہدری! اس کی گل سن رہا ہے؟”

“اتنا برا کیوں مناتا ہے۔“ جمیلہ نے روٹھے ہوئے اللہ وسایا کو منانے کی کوشش کی۔ “میں نے اپنی طرف سے ایک اپائے بتایا تھا۔ تو اس کے لیے تیار نہیں تو کچھ اور وچار کرتے ہیں۔”

رحیم داد نے کہا۔ “ہاں، کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔”

اللہ وسایا کھڑا ہوگیا۔ “چوہدری! تو ابھی نہ جا۔ چند روز بعد چلا جانا۔ ویسے اس پنڈ سے تو اب

جاتا ہی ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ اللہ وسایا کھڑا ہوا تو جمیلہ بھی کھڑی ہوگئی۔ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ رحیم داد نے کوٹلہ ہرکشن چھوڑنے کا ارادہ فی الحال ترک کردیا۔ وہ اللہ وسایا اور جمیلہ کی دل آزاری نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی اسے جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔

اس نے دروازہ بند کرکے کنڈی لگائی۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ نکال کے کھولا۔ چوہدری نورالٰہی کے دستخط بغور دیکھے' سادہ کاغذ پر جعلی دستخط بنائے۔ دونوں کو برابر رکھا۔ ان پر تنقیدی نظر ڈالی۔ دستخط بالکل ہوبہو تھے۔ کسی نقطے' شوشے' یہاں تک کہ اعراب میں بھی سرمو فرق نہ تھا۔ رحیم داد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ مہینوں کی مسلسل مشق کا نتیجہ آج اس کے سامنے تھا۔ وہ دیر تک دستخط دیکھتا اور خوش ہوتا رہا۔

رحیم داد نے کاغذات الٹ پلٹ کے دیکھے۔ جو کاغذ اردو میں تھے' وہ اس نے پڑھ لیے۔ انگریزی میں لکھی ہوئی درخواستیں اور ان پر متعلقہ محکموں کے افسران کے احکام پڑھنے سے وہ قاصر تھا۔ ان کا مفہوم وہ مطلق نہ سمجھ سکا۔ ویسے بھی متروکہ جائیداد اور اس کے الاٹمنٹ کے بارے میں اس کی معلومات نہایت محدود تھی۔ تجربہ بھی نہیں تھا۔ وہ مہاجر نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے کبھی یہ باتیں جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ نورالٰہی نے مرنے سے پہلے اپنے کلیم کے متعلق جو کچھ بتایا تھا' وہی اس کی کل معلومات تھیں اور انھی کی بنیاد پر وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ کلیم منظور شدہ ہے اور اس کے عوض وہ زرعی اراضی اور املاک کا الاٹمنٹ حاصل کرسکتا ہے۔

کاغذات دیکھتے دیکھتے اس کے ذہن میں یکایک خیال آیا کہ جمیلہ کی زمین اور حویلی مقدمہ ہارنے کے بعد متروکہ جائیداد قرار دی جاچکی ہے۔ چوہدری نورالٰہی کے کلیم کی بنیاد پر وہ یہی زمین الاٹ کراسکتا ہے۔ اس طرح وہ اللہ وسایا اور جمیلہ کو پریشانی اور اضطراب سے بچا سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے کوٹلہ ہرکشن چھوڑ کر کہیں جانے کا خطرہ مول نہیں لینا پڑے گا۔ کوٹلہ ہرکشن اس کے لیے محفوظ ٹھکانا تھا۔ یہاں وہ کئی ماہ سے مقیم تھا۔ اس ماحول سے وہ پوری طرح مانوس ہوچکا تھا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ اس پر مہربان تھے اور اس کے آرام کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ اس کی دل جوئی کرتے تھے۔ مہمان کے بجائے اسے اپنے ہی کنبے کا فرد تصور کرتے تھے۔

اسے اللہ وسایا اور جمیلہ کا احسان چکانے کا نہایت عمدہ موقع ملا تھا۔ اس میں اس کا اپنا فائدہ بھی تھا۔ وہ راتوں رات مہمان سے مالک و مختار بن جاتا' زمیں دار بن جاتا۔ وہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ مگر اس کے ساتھ اندیشوں نے بھی سر ابھارا

اور ان کی نوعیت یہ تھی کہ پنجاب کے کسی دور دراز علاقے میں اگر وہ الاٹمنٹ حاصل کرتا تو خطرہ بہت کم تھا۔ سندھ میں بہت ہی کم تھا۔ ضلع منٹگمری میں خطرہ زیادہ اور بہت زیادہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس ضلعے میں اراضی اور املاک الاٹ کرانے کے لیے چوہدری نورالٰہی مرحوم طویل عرصے تک کوشش کرتا رہا تھا۔ دفتروں کے چکر کاٹتا رہا تھا۔ افسروں اور ماتحت عملے سے ملتا رہا تھا۔ ان میں اس کے جاننے والے بھی ہوسکتے تھے۔

کوٹلہ ہرکشن کی حویلی اور اراضی کے الاٹمنٹ کو جب اس نے اس پہلو سے دیکھا تو گھبرا گیا' خوف زدہ ہوگیا۔ جعلی دستخط سے حاصل کیا ہوا الاٹمنٹ اگر کسی وقت پکڑلیا جاتا تو اس میں صرف جیل جانے کا خطرہ نہیں تھا بلکہ اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ہوتا۔ وہ چوہدری نورالٰہی کا قاتل تھا اور ایک بار جب راز افشا ہوجاتا تو سارے دوسرے راز پیاز کے چھلکوں کی طرح اترتے چلے جاتے۔ وہ حکیم چشتی کا قاتل تھا' سیف اللہ کا قاتل تھا اور جیل کا مفرور قیدی بھی تھا۔ رحیم داد لرز کر رہ گیا۔ اس نے کلیم کے کاغذات کپڑے میں لپیٹ کر گرہ لگائی اور حفاظت سے تکیے کے نیچے رکھ دیے۔

شام کو اس نے اللہ وسایا اور جمیلہ کے ساتھ کھانا کھایا۔ دونوں شش و پنج میں مبتلا تھے اور آیندہ کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکے تھے۔ ان کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے اور آنکھیں ویران ویران نظر آتی تھیں۔ نہ اللہ وسایا نے اس کے کلیم کے بارے میں تذکرہ کیا نہ ہی رحیم داد نے ایسی کوئی بات کی۔ وہ دوپہر ہی کو طے کرچکا تھا کہ نہ صرف کوٹلہ ہرکشن کی متروکہ املاک بلکہ ضلع منٹگمری میں کہیں بھی الاٹمنٹ حاصل کرنے کی مطلق کوشش نہیں کرے گا۔ وہ کوئی خطرہ مول لینے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

صبح جمیلہ مہمان خانے میں آئی۔ وہ اس وقت تنہا تھی۔ رحیم داد ناشتا کر رہا تھا۔ وہ اس کے قریب ہی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے پوچھا۔ "توں نے اور اللہ وسایا نے آگے کے لیے کیا سوچا؟"

"میں تیرے پاس اسی بارے میں بات کرنے آئی ہوں۔" جمیلہ نے جواب دیا۔

"کیا بات کرنی ہے؟ کیا توں نے کچھ سوچ لیا؟"

"ہاں! ایک ہی گل سمجھ آتی ہے۔ میں برابر اسی پر سوچ بچار کر رہی ہوں۔ اور تو کچھ مجھے نظر نہیں آتا۔"

"اللہ وسایا کو نہیں بتایا؟"

"اسے میں نے بتایا تو تھا۔ تیرے سامنے ہی تو بات کی تھی پر وہ کہاں راضی ہوا۔ ایک دم ناراض ہو گیا۔"

"وہی لہور جانے کی گل؟"

"ہاں۔" جمیلہ نے آہستہ سے گردن ہلائی۔ "تو خود ہی سوچ ہم اور کہاں جا سکتے ہیں؟ لہور میں مجھے آسانی سے کسی سکول میں پڑھانے کی نوکری مل سکتی ہے۔"

"پر یہ بات تو وہ ہرگز نہیں مانے گا کہ تو کمائے اور وہ بیٹھ کر کھائے۔"

"بات اس پرکار نہیں ہے۔ جاتے ہی تو نوکری نہیں مل جائے گی۔ پر لہور وڈا شہر ہے۔ وہاں مجھے نوکری ملنے میں زیادہ مشکل نہیں پڑے گی۔ جب تک نوکری نہیں ملے گی' تب تک گزارے کے لیے اپنے پاس کچھ نہ کچھ تو ہے۔ زیور کس دن کے لیے ہیں۔ انھیں بیچ کر بھی کام چلایا جا سکتا ہے۔"

"اللہ وسایا تو اس روز صاف انکار کر چکا ہے۔"

"تو اسے سمجھائے گا تو وہ مان جائے گا۔ میں اسی لیے تیرے پاس آئی ہوں۔"

"کیا تو سمجھتی ہے کہ وہ میری بات مان لے گا؟"

"مجھے پورا وشواس ہے۔" جمیلہ نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "وہ تیری بات نہیں ٹالے گا۔ کہہ کے تو دیکھ۔ اس میں برائی کیا ہے۔"

"تو کہتی ہے تو میں اسے ضرور کہوں گا۔ اسے راضی کرنے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔" رحیم داد نے جمیلہ کو یقین دلایا۔

"چوہدری! تو بھی ہمارے ساتھ لہور چلنا۔" وہ خوش ہو کر بولی۔

مگر رحیم داد رضامند نہیں ہوا۔ وہ لاہور جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ منٹگمری سے نزدیک ہونے کے باعث کوئی نہ کوئی ایسا جان پہچان کا وہاں کسی بھی وقت پہنچ سکتا تھا جو اسے شناخت کر لیتا۔ حالانکہ وہ اپنا حلیہ بڑی حد تک تبدیل کر چکا تھا۔ مگر کسی ایسے خطرے سے دوچار ہونے کے لیے تیار نہ تھا جو اسے پھانسی گھاٹ تک لے جاتا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ "نہیں' میں نے لہور نہیں جانا۔ میں اپنی گھر والی اور بچوں کو تلاش کرنے رحیم یار خاں جاؤں گا۔ وہاں بھی بہت مہاجر ہیں۔ کسی سے گھر والی اور بچوں کا اتا پتہ مل سکتا ہے۔ ویسے تو اور اللہ وسایا پہلے ہی پریشان ہیں۔ اب میں تم دونوں کے لیے اور بوجھ بننا نہیں چاہتا۔" رحیم داد لمحے بھر خاموش رہا۔

"میری فکر نہ کر۔ اپنے اور اللہ وسایا کے بارے میں سوچ۔"

"وہ تو میں دن رات سوچتی رہتی ہوں۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ جمیلہ گردن جھکائے کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے پوچھا۔ "چوہدری! تجھے ہم دونوں کے چھوٹنے کا کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ میری بات کا وشواس کر' مجھے تو بہت دکھ ہوگا۔ سدا یاد آئے گا۔"

جمیلہ کے انداز میں لگاوٹ تھی' دبی دبی چاہت تھی۔ رحیم داد نے یہی محسوس کیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر جمیلہ کو دیکھا۔ وہی ستاروں کی مانند روشن آنکھیں' وہی پھول سا شگفتہ چہرہ' وہی دلکشی' وہی رعنائی' جسے دیکھ کر اس پر خود فراموشی طاری ہو جاتی تھی۔ وہ اس کے اس قدر قریب بیٹھی تھی کہ رحیم داد اس کے خوب صورت بدن کی مہک سونگھ سکتا تھا۔ وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے اب تک سوچا ہی نہیں تھا کہ جمیلہ سے دور ہونے کے بعد اس پر کیا بیتے گی۔ نہیں' وہ اس سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ اس پر گویا وارفتگی طاری ہو گئی۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"تو یہ پنڈ چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ میرے کلیم سے حویلی اور زمین کا الاٹمنٹ ہو سکتا ہے۔"

"تیرا کلیم ہے؟" جمیلہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "ضرور ہوگا۔ تو مہاجر ہے نا۔ تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

عین اسی وقت اللہ وسایا کمرے میں داخل ہوا۔ جمیلہ نے اسے دیکھا تو مسکرا کر بولی۔ "اللہ وسایا! تجھے پتہ ہے' اپنے چوہدری کا کلیم موجود ہے۔ اس نے مجھے ابھی بتایا ہے۔"

"بتایا تو اس نے مجھے بھی تھا۔" اللہ وسایا نے کہا۔ "پر ایسی پریشانی رہی کہ یاد ہی نہیں آیا۔ یہ تو کہتا تھا' بہت وڈا کلیم ہے۔"

"وڈا کلیم ہے تو حویلی اور ساری اراضی کا الاٹمنٹ ہو سکتا ہے۔" جمیلہ نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "اب تو سب کچھ متروکہ جائیداد ڈیکلیئر کر دیا گیا ہے۔"

جمیلہ اور اللہ وسایا کے چہروں پر سرخی دوڑ گئی۔ انھیں مسرور دیکھ کر رحیم داد بھی جذبات کے سیلاب میں بہہ گیا۔ نہ اسے اندیشے یاد آئے' نہ خطرات نے لرزہ براندام کیا۔ اس نے تکیے کے نیچے سے بستہ نکالا اور اللہ وسایا کو دے کر بولا۔

"یہ رہے! میرے کلیم کے کاغذات۔"

اللہ وسایا نے بستہ جمیلہ کی طرف بڑھا دیا۔ "جمی لے! لے چوہدری کے کلیم کے کاغذات تو دیکھ۔ تو انگریزی بھی پڑھ سکتی ہے۔ سب کچھ سمجھ لے گی۔"

جمیلہ نے بستہ کھولا۔ کاغذات نکالے اور الٹ پلٹ کر پوری توجہ سے پڑھنے لگی۔ ذرا دیر بعد اس نے حیرت زدہ ہو کر اونچی آواز سے کہا۔ ”اللہ وسایا! اپنے چوہدری کا تو بہت وڈا کلیم ہے۔ منظور شدہ بھی ہے۔ اس میں زرعی اراضی اور املاک سبھی شامل ہے۔“

”تب تو زمین کے ساتھ حویلی کی الاٹمنٹ بھی ہو سکتی ہے۔“

”بالکل ہو سکتی ہے۔“ جمیلہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”چوہدری نے تو پہلے ہی یہ گل کی تھی۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”چوہدری زمیں دار بن جائے گا‘ تب تو مزارع بن کر بھی تو اس پنڈ میں رہ سکتا ہے۔ میرا سکول بھی رہے گا۔ نہ کہیں جانا پڑے گا نہ اس بارے میں سوچ سوچ کے بھیجا خراب کرنا پڑے گا۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا اور مسکرائی۔ ”چوہدری! تو اللہ وسایا کو اپنا مزارع بنا لے گا نا؟“

”ایسی باتیں نہ کر۔“ رحیم داد نے ناراض ہونے کے انداز میں کہا۔ ”تو مجھے اتنا کمینہ اور نیچ سمجھتی ہے کہ میں اللہ وسایا کو اپنا مزارع بنا کر رکھوں گا؟ اللہ وسایا زمیں دار تھا‘ الاٹمنٹ کے بعد بھی زمیں دار ہی رہے گا۔ تو آگے ایسی بات نہ کہنا۔ مجھے بہت دکھ ہو گا۔“

اللہ وسایا بولا۔ ”یہ باتیں چھوڑ۔ سب سے پہلے تو وکیل کو کلیم کے کاغذات دکھانے ہوں گے۔ وہی بتا سکتا ہے آگے کیا کرنا ہے۔“

”وکیل کو آج ہی بلوا لے۔“ جمیلہ نے اللہ وسایا سے کہا۔

”میں خود اس کے پاس چلا جاؤں گا۔ اب دیر بالکل نہیں ہونی چاہیے۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”پہلی لاری سے شہر چلا جاؤں گا۔“

اللہ وسایا اور جمیلہ کے مرجھائے ہوئے چہرے روشن ہو گئے۔ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ رحیم داد انھیں دور تک دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو ایک بار پھر طرح طرح کے اندیشوں نے اس پر یلغار کی۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ سامنے میز پر رکھا تھا۔ وہ اسے خوف زدہ نظروں سے گھور رہا تھا۔

۱۹

دن ڈھل رہا تھا۔ ہوا رکی ہوئی تھی۔ فضا دھندلی دھندلی تھی۔ شدید گرمی تھی۔ حبس تھا۔ رحیم داد خوف زدہ اور پریشان تھا۔ اس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ اب وہ کمرے میں خاموش بیٹھا سورج غروب ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ اللہ وسایا رات گئے لوٹے گا۔ رحیم داد اس کی واپسی سے پہلے ہی کوٹلہ ہرکشن چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اس نے جذبات کی رو میں بہہ کر چوہدری نور الٰہی مرحوم کے کلیم کی بنیاد پر حویلی اور زمین الاٹ کرانے کا وعدہ تو کر لیا تھا مگر اب پچھتا رہا تھا۔ اسے طرح طرح کے اندیشے ستا رہے تھے۔ جیل اور پھانسی کا پھندا رہ رہ کر ڈرا رہا تھا۔

اللہ وسایا اور جمیلہ کے رخصت ہوتے ہی وہ اس ذہنی اذیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ضلع منٹگمری میں جہاں ہر طرف مشرقی پنجاب کے مہاجرین بکھرے ہوئے تھے‘ الاٹمنٹ حاصل کرنے میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ وہ اپنے پچھلے منصوبے کے مطابق کسی ایسے علاقے کی جانب نکل جانا چاہتا تھا جہاں اس کے جعلی کلیم کے پکڑے جانے کا امکان بہت کم ہو اور کسی جان پہچان والے کے ملنے کا بھی خوف نہ ہو۔ وہ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی کلیم کے کاغذات کا بستہ سنبھال کر خاموشی سے نکل جانے کا تہیہ کر چکا تھا۔

وہ اسی ادھیڑبن میں الجھا ہوا تھا کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ جمیلہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہم راہ اللہ وسایا نہیں تھا‘ وکیل تھا۔ وہ دوہرے بدن کا سنجیدہ اور بردبار شخص تھا۔ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک تھی۔ سر کے بال اڑے ہوئے تھے۔ اس کا نام محمد عثمان رندھاوا تھا۔ جمیلہ نے رحیم داد کا اس سے تعارف کرایا۔

رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ مگر اسے نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا اور اللہ وسایا کے بارے میں پوچھا۔ ”زمیں دار نہیں آیا۔ وہ تو تمہارے ہی پاس گیا تھا وکیل صاحب؟“

”جمیلہ نے بھی مجھے یہی بتایا تھا۔“ وکیل نے جواب دیا۔ ”میں منچن آباد گیا تھا۔ واپسی پر سوچا‘ اللہ وسایا سے ملتا چلوں۔ وہ میرے دفتر منٹگمری پہنچ گیا ہوگا۔ اسے وہاں پتہ چل گیا ہوگا‘ واپس آتا ہوگا۔“

”جب سے کیس کا فیصلہ ہمارے خلاف ہوا ہے‘ وہ بہت پریشان ہے۔“ جمیلہ نے بتایا۔ ”پریشان تو میں بھی ہوں‘ پر وہ کچھ زیادہ ہی ہے۔ سمجھ نہیں آتی‘ کیا کیا جائے؟ پنڈ چھوڑ کر کہاں جائیں؟ اب تو یہاں زیادہ ٹھیر بھی نہیں سکتے۔“

”پریشانی کی تو ویسے بات ہی ہے‘ پر ابھی پنڈ چھوڑنے کی ایسی جلدی کیا ہے۔“ وکیل نے تسلی دینے کی کوشش کی۔

”تیں نوں پتہ ہی ہے۔ دس دن میں حویلی خالی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔“ وکیل بدستور مطمئن نظر آتا تھا۔ ”ابھی کمشنر بحالیات سے اپیل کرنے کی گنجائش ہے۔ اس کے بعد اور اوپر جا سکتے ہیں۔ زمیندارنی‘ تو فکر نہ کر۔“

”کیسے فکر نہ کروں۔“ جمیلہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”کسٹوڈین والے تاک میں ہیں۔ دس روز گزرتے ہی حویلی اور زمین خالی کرانے سرکاری کرندے پولیس کے ساتھ پہنچ جائیں گے۔ متروکہ جائیداد ڈیکلیئر ہونے کے بعد پہلے سب کچھ کسٹوڈین ہی کی تحویل میں جاتا ہے ناں۔“

”کسٹوڈین کے پاس جانے سے پہلے میں ہائی کورٹ سے حکم امتناعی حاصل کر لوں گا۔“ وکیل نے جمیلہ کو آگاہ کیا۔ ”میں کل ہی لہور پہنچ کر حکم امتناعی کے لیے درخواست لگا دوں گا۔ درخواست میں نے تیار کر لی ہے۔ اس پر تجھ سے دستخط کرانے ہیں۔“

”کدھر ہے درخواست؟“ جمیلہ نے دریافت کیا۔

”یہ رہی۔“ وکیل نے اپنا بریف کیس کھولا۔ اندر سے ایک فائل نکالی۔ ”یہ تیرے کیس کی فائل ہے۔“ وکیل نے فائل کے کاغذات الٹ پلٹ کر ایک ٹائپ شدہ درخواست نکال کر جمیلہ کو دی۔ ”میں اسے اپنے ساتھ لے کر چلا تھا۔ میں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا‘ آگے کیا کرنا ہے۔“

جمیلہ نے درخواست توجہ سے پڑھی‘ اس پر دستخط بھی کر دیئے۔ مگر اس کے خدشات کم نہ ہوئے۔ ”مان لیا‘ حکم امتناع مل گیا‘ پر آگے کیا ہوگا؟ ویسے یہ بھی تو ہو سکتا ہے درخواست منظور نہ ہو اور حکم امتناعی نہ ملے۔“

”اتنا تو مجھے بھروسا ہے کہ حکم امتناعی مل جائے گا۔ تو فکر نہ کر۔“ وکیل نے جمیلہ کو اطمینان دلایا۔

جمیلہ تو خاموش رہی مگر رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”پر اس سے حویلی اور زمین واپس تو نہیں مل جائے گی۔“

”چوہدری! اصل میں تو یہ کیس وراثت کا ہے۔“ وکیل محمد عثمان رندھاوا نے مقدمے کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رحیم داد کو سمجھایا۔ ”اس کا فیصلہ محکمہ بحالیات سے نہیں‘ عدالت دیوانی سے ہوتا ہے پر یہ ہے پیچیدہ کیس۔ ہندو ہونے کے ناتے اس پر جمیلہ کا حق نہیں بنتا۔ یہ جائیداد کے مالک لالہ کرشن دیال کی بیٹی جو ہوئی۔ ہندوؤں میں بیٹی کا جائیداد پر حق نہیں بنتا۔ اس کے مسلمان ہو جانے کے بعد کیس کی نوعیت بدل گئی۔ مسلم قانون میں بیٹی کا حق بنتا ہے۔ اب پیچیدگی یہ پیدا ہو گئی کہ جائیداد تو ہوئی ہندو کی اور بیٹی مسلمان ہے۔ اس کا فیصلہ آسان نہیں۔ بڑی قانونی پیچیدگیاں ہیں۔“

”رندھاوا جی! بحالیات والوں نے تو اس کا فیصلہ کر ہی دیا۔“ جمیلہ نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ ”آگے کیس لے بھی گئے تب بھی کیا اس فیصلے کا اثر نہیں پڑے گا؟“

”پڑ تو سکتا ہے۔ پر یہ کوئی نظیر نہیں بنتی۔“ وکیل نے جمیلہ کا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی۔ ”زمیں دارنی! تو فکر نہ کر۔ میں ہائی کورٹ بلکہ فیڈرل کورٹ تک کیس لے جاؤں گا۔ صرف یہ زمین اور حویلی نہیں بلکہ وہ زمین بھی دلواؤں گا جو احسان شاہ نے دبا رکھی ہے۔“

”وہ تو بعد کی گل ہے۔ یہ بتا‘ اب کیا ہوگا؟“

”ویسے کیس تو تیرا اب تک مضبوط ہے۔ اسے لڑنے کی بہت گنجائش ہے۔“ وکیل نے جمیلہ کو سمجھایا۔ ”تیرے حق میں سب سے اہم بات یہ جاتی ہے کہ حویلی اور زمین پر تیرا قبضہ ہے۔ متروکہ جائیداد کے معاملے میں قبضے کی زبردست اہمیت ہے۔“

رحیم داد کی پریشانی رفتہ رفتہ زائل ہوتی جا رہی تھی۔ اسے اپنے سر پر منڈلاتا ہوا خطرہ ٹلتا نظر آ رہا تھا۔ بات عدالت اور مقدمے بازی کی ہو رہی تھی۔ جس میں نہ وہ کسی طور فریق تھا‘ نہ اس کے لیے کوئی کردار ادا کرنے کی گنجائش تھی۔ مگر خطرہ ٹل کر بھی ٹلا نہیں۔

جمیلہ نے وکیل سے کہا۔ ”میں تو کہتی ہوں مکدمے بازی کے بکھیڑے میں پڑا ہی کیوں جائے۔ میں نے تو ایک اور اپائے سوچا ہے۔ اسی کے بارے میں بات کرنے اور تجھے یہاں لانے کے لیے اللہ وسایا تیرے پاس گیا تھا۔“

”وہ کیا اپائے ہے؟ تو نے اور اللہ وسایا نے مسئلے کا کیا حل سوچا ہے؟“ وکیل نے کسی قدر حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔

”اپنے چوہدری کے پاس منظور شدہ کلیم موجود ہے۔“ اس نے رحیم داد کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ضلع گورداس پور کا مہاجر ہے۔ اس کے کلیم سے حویلی اور زمین کی الاٹمنٹ لی جا سکتی ہے۔ چوہدری پرایا بندہ بھی نہیں۔ بہت سے چکروں میں پڑنے سے یہ کہیں سیدھا سا راستہ ہے کہ الاٹمنٹ ہی کرالی جائے۔ اب تو یہ متروکہ جائیداد بنا ہی دی گئی۔“

”اگر ایسا ہے تو کیس پر اس پہلو سے بھی غور کیا جا سکتا ہے۔“

جمیلہ نے رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری! اپنے کلیم کے کاغذات رندھاوا جی کو تو دکھا۔“

رحیم داد سناٹے میں آ گیا۔ پریشانی اور گھبراہٹ نے اچانک اس کے ذہن پر شب خوں مارا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ بددلی سے ہاتھ بڑھایا۔ تکیے کے نیچے سے بستہ نکالا اور کلیم کے کاغذات وکیل کی طرف بڑھا دیے۔

وکیل نے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے۔ کچھ دیر ان کا مطالعہ کرتا رہا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ جمیلہ بھی کچھ نہ بولی۔ کاغذات سرسری طور پر دیکھنے کے بعد وکیل نے کہا۔

”کلیم تو پکا ہے۔ منظور شدہ ہے اور بڑا بھی ہے۔“

اس سے کام بن سکتا ہے ناں؟“ جمیلہ نے دریافت کیا۔

”کیوں نہیں بن سکتا۔“ وکیل مسکرا کر بولا۔ ”میں یہ کاغذات اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ دفتر میں اطمینان سے انھیں پڑھوں گا۔ اس کے بعد اگلی کارروائی کی جائے گی۔ فی الحال یہی ہو سکتا ہے۔ میں اس بارے میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”ویسے کلیم تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے ناں؟“ رحیم داد کے دل کا چور بول پڑا۔

”بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں نے بھی اسے پڑھا تھا۔“ جمیلہ نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”منظور شدہ پکا کلیم ہے۔ کیوں رندھاوا جی! میں نے غلط بات تو نہیں کہی؟“

”تو نے ٹھیک ہی کہا۔ بالکل یہی بات ہے۔“ وکیل مسکرا کر بولا۔ ”لیکن سب سے پہلے مجھے ہائی کورٹ سے حکم امتناعی حاصل کرنا ہو گا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ ایک بار جائیداد قبضے سے نکل جائے اور کسٹوڈین کی تحویل میں چلی جائے تو اسے دوبارہ حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جتنے کلیم منظور ہوئے ہیں، متروکہ جائیداد اس سے بہت کم ہے۔ تبھی تو یہ صورت ہے کہ متروکہ جائیداد کا پتہ چلتے ہی کلیم ہولڈر ایسے جھپٹتے ہیں جیسے چیل گوشت پر گرتی ہے۔ سفارش، رشتے داری، رشوت، سبھی ہتھ کنڈے الاٹمنٹ کے لیے چلائے جاتے ہیں۔“ اس نے جمیلہ کی جانب دیکھا۔ ”میں تجھے کیا بتاؤں، متروکہ جائیداد کی کیسی لوٹ مار مچی ہے۔ جسے کچھ نہیں ملا، وہ تو بھاگ دوڑ کرتا ہی ہے۔ مگر جسے مل چکا ہے، وہ اور زیادہ لینے کے چکر میں رہتا ہے۔“

”تب تو جی سب سے پہلے حکم امتناعی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“ جمیلہ نے پریشانی کا اظہار کیا۔ ”کلیم ہولڈروں کو پتہ چل گیا تو وہ ابھی سے الاٹمنٹ کی درخواستیں لگانی شروع کر دیں گے۔“

”پتہ چلنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔“ وکیل ہنس کر گویا ہوا۔ ”محکمہ بحالیات والوں نے تو اب تک کتنے ہی کلیم ہولڈروں کو بتا بھی دیا ہو گا۔ ایسی بات چھپی کہاں رہتی ہے؟“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اب میں چلتا ہوں۔“ اس نے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ ”چوہدری! جلد ہی ملاقات ہو گی۔ میں کلیم کے کاغذات اطمینان سے دیکھوں گا۔ ابھی تو مجھے حکم امتناعی لینے کی تیاری کرنی ہے۔“

وکیل نے جمیلہ کے مقدمے کی فائل کے ساتھ کلیم کے کاغذات بھی اپنے بریف کیس میں رکھ لیے۔ رحیم داد پریشان تو ہوا مگر خاموش رہا۔ کہہ بھی کیا سکتا تھا؟ کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ وکیل دروازے کی جانب بڑھا۔ جمیلہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ رحیم داد حیران و پریشان بیٹھا رہا۔ دونوں کے جانے کے بعد اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ کلیم کے کاغذات اب وکیل کی تحویل میں تھے۔ وہ پوری طرح پھنس چکا تھا۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ اس نے کوٹلہ ہرکشن چھوڑ کر کہیں اور جانے کا جو منصوبہ بنایا تھا، وہ خاک میں مل چکا تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ نہ وہ کسی کو اپنی پریشانی بتا سکتا تھا نہ کوئی مشورہ کر سکتا تھا۔ اس کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

رات کو اللہ وسایا واپس آ گیا۔ مگر رحیم داد سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔

رحیم داد کے دن رات الجھن اور طرح طرح کے وسوسوں میں کٹ رہے تھے۔ وہ ہر وقت گم صم رہتا۔

☆

موسم بدل رہا تھا۔ لو کے جھلسا دینے والے گرم گرم جھکڑ چلنا بند ہو گئے تھے۔ پچھلی رات ہلکی ہلکی بارش بھی ہوئی تھی۔ دن میں بھی ابر چھایا رہا۔ ہوا کے نرم اور خنک جھونکوں میں تازگی اور فرحت تھی۔ زمین سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ درختوں کے پتے رات کی بارش سے

دھل کر نکھر گئے تھے۔ جدھر نظر اٹھ جاتی' ہریالی نظر آتی۔

یہ ایک خوش گوار سہ پہر تھی۔ رحیم داد کچھ ہی دیر پہلے سو کر اٹھا تھا۔ وہ نہانے کے لیے غسل خانے جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اللہ وسایا نے اسے باغ میں بلوایا۔

رحیم داد باغ میں پہنچا۔ اس نے اللہ وسایا اور جمیلہ کے ساتھ وکیل کو دیکھا۔ اس پر گھبراہٹ کا دورہ پڑا مگر وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا قریب پہنچا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اللہ وسایا مسکرا کر بولا۔ "چوہدری! تجھے خوش خبری سنانے کے لیے بلایا ہے۔"

"حکم امتناعی مل گیا ہے۔" جمیلہ نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی مطلع کیا۔ اس کے چہرے پر خوشی' سرخی بن کر بکھری ہوئی تھی۔ اس نے وکیل کی جانب دیکھا۔ "وکیل صاحب یہی بتانے آئے ہیں۔"

"یہ تو بہت چنگا کام ہوا۔" رحیم داد نے سکون کی سانس لی۔

اللہ وسایا گویا ہوا۔ "ہاں جی یہ بہت زبردست کام ہوا۔ اب حویلی خالی کرنے اور پنڈ چھوڑنے کی ایسی جلدی نہیں رہی۔"

رحیم داد نے موقعے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ کلیم کے چکر سے اپنی جان چھڑانے کے لیے وکیل کو مشورہ دیا۔ "اب تو جی آگے یہی ہونا چاہیے کہ زمیں دارنی کی طرف سے مکدمہ کردیا جائے۔ جیسا اس روز بتایا تھا' وہی ٹھیک لگتا ہے۔"

"میں نے بعد میں اس پر سوچا تھا پر کیس بہت کمزور ہے۔" اس نے اللہ وسایا کی جانب دیکھا۔ "زمیں دار! ویسے تیری مرضی ہو تو میں کیس کی تیاری کروں؟"

"جب کیس ہی مضبوط نہیں تو اس چکر میں کیوں پڑا جائے۔" جمیلہ بولی۔ "چوہدری کے کلیم کے کاغذات تو دیکھ ہی لیے ہوں گے۔ الاٹمنٹ کی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ اس بارے میں کیا سوچا؟"

"کلیم تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں نے سارے کاغذات اچھی طرح دیکھ لیے ہیں۔" وکیل نے آگاہ کیا۔ "اس کی بنیاد پر الاٹمنٹ حاصل کرنے میں مشکل بھی نہیں پڑے گی۔"

"میں نے سنا ہے کانون تو یہ ہے کہ حویلی کے علاوہ اڑھائی سو ایکڑ سے زیادہ زمین کی الاٹمنٹ نہیں مل سکتی۔" جمیلہ نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ "اس طرح تو صرف دس مربعے کی الاٹمنٹ ملے گی۔ میرے تو ۲۲ مربعے ہیں۔ ۱۲ مربعے کا کیا بنے گا؟"

"زمیں دارنی! تو نے ٹھیک ہی سنا ہے۔" وکیل نے اس کی تائید کی۔ "چوہدری کو ایک جگہ اڑھائی سو ایکڑ ہی کی الاٹمنٹ ہو سکتی ہے۔ ویسے کلیم تو بہت بڑا ہے۔ دوسرے کسی بھی علاقے میں مزید الاٹمنٹ لی جا سکتی ہے۔"

"یہ تو ٹھیک نہیں ہو گا۔" اللہ وسایا پریشان ہو کر بولا۔

"زمیں دار! ایسا کر بارہ مربعے کا کلیم کسی کلیم ہولڈر سے خرید لے اور اپنی وہ زمین الاٹ کرا لے جو چوہدری کے الاٹمنٹ کی بعد رہ جائے۔" وکیل نے تجویز پیش کی۔ "میرا ایک مہاجر موکل ہے۔ اس کے پاس پکا کلیم ہے۔ بیچنا بھی چاہتا ہے۔ ضرورت مند بھی ہے' سستے داموں میں دے دے گا۔ تو تیار ہو تو میں اس سے بات کروں۔"

"اپنے پاس تو سمجھو' کچھ بھی نہیں۔" اللہ وسایا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"سوچ لے۔ ابھی تو تیرا قبضہ ہے۔ آسانی سے الاٹمنٹ مل سکتی ہے۔" وکیل نے کہا۔ "ورنہ حال یہ ہے کہ ہزاروں مہاجر کلیم کے کاغذات دبائے پھر رہے ہیں۔ الاٹمنٹ ہی نہیں ملتی۔ تبھی تو سستے داموں کلیم مل رہا ہے۔ اب یہی دیکھ' چوہدری کا اتنا بڑا کلیم ہے پر اب تک کہیں الاٹمنٹ نہیں ملی۔"

"ہاں جی' کلیم اتنا مشکل نہیں' جتنا الاٹمنٹ لینا۔" رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ "دفتروں کے چکر کاٹتے کاٹتے ہی جوتے ٹوٹ گئے۔ منت سماجت اور رشوت الگ' پر کام کہیں نہیں بنا۔ کلر زمین تک نہ ملی۔ تبھی تو میں نے مکدمہ کرنے کی بات کی تھی۔"

"پر اب آسانی سے تیرے کلیم پر الاٹمنٹ مل جائے گی۔ قبضہ جو اپنے پاس ہے۔" وکیل نے وضاحت کی۔ وہ اللہ وسایا کی طرف متوجہ ہوا۔ "زمیں دار! تو نے اپنے بارہ مربعوں کے لیے کلیم خریدنے کے بارے میں کیا سوچا؟"

اللہ وسایا نے وکیل کی بات کا جواب نہیں دیا' جمیلہ سے مخاطب ہوا۔ "تو نے کچھ جمع جوڑ کر رکھا ہی نہیں۔ کچھ ہوتا تو آج کام آتا۔"

جمیلہ نے سر اٹھا کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ "چنتا نہ کر۔ میرے پاس سکول اور ڈسپنسری بنانے کا فنڈ ہے۔ اسے میں الگ رکھتی تھی۔" وہ زیر لب مسکرائی۔ "پر یہ روپیہ ایک شرط پر دوں گی۔ ادھار رہے گا' تیں نوں لوٹانا ہو گا۔"

"منظور ہے' تیری یہ شرط بالکل منظور ہے۔" اللہ وسایا خوش ہو کر بولا۔ "میں تیرے ادھار کا ایک ایک پیسہ ادا کر دوں گا۔"

"یہ دونوں گواہ موجود ہیں۔ تو ان کے سامنے وعدہ کر رہا ہے۔" جمیلہ نے ہنس کر وکیل محمد عثمان

رندھاوا اور رحیم داد کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "بعد میں پلٹ نہ جانا۔"

وکیل نے جمیلہ کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تو گویا یہ طے ہو گیا کہ حویلی اور زمین کی الاٹمنٹ ہی کرانی ہے۔ اب اس کام میں کوئی تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ اس کے لیے جلد سے جلد کام شروع کرنا ہو گا۔"

"جب تیرے پاس روپیہ موجود ہے تو اپنے پورے ۲۲ مربعے کا کلیم کیوں نہیں خرید لیتی؟" رحیم داد نے ایک بار پھر اپنا دامن بچانے کی کوشش کی۔

"نہیں چوہدری، اتنا روپیہ میرے پاس نہیں ہے۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔ "زیور بیچ کر بھی مشکل سے ۱۲ مربعے کا بندوبست ہو سکے گا۔"

وکیل نے مسکرا کر کہا۔ "زمیں دارنی! تجھے اللہ وسایا کو ادھار نہیں دینا پڑے گا۔ کلیم تو تیرے ہی نام سے خریدا جائے گا۔ قبضہ تو تیرے ہی نام سے ہے۔ تجھے آسانی سے الاٹمنٹ مل جائے گی۔ اللہ وسایا کے نام سے کلیم خرید کر الاٹمنٹ لینے میں کوئی رخنہ پڑ سکتا ہے۔"

"میرے نام سے ہو یا اللہ وسایا کے نام سے۔ بات تو ایک ہی ہے۔" جمیلہ ہنس کر بولی۔ "میں اور اللہ وسایا الگ تھوڑا ہی ہیں۔ زمیں دار تو اسی کو رہنا ہے، میں نے زمیں داری سے کیا لینا۔"

"لو جی، اس کی سنو۔" اللہ وسایا بھی ہنسنے لگا۔ "میں کب زمیں دار رہا۔ ساری زمیں داری تو یہی چلاتی رہی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"تو بھی ٹھیک کہہ رہا ہے اور یہ بھی۔" وکیل سنجیدہ ہو گیا۔ "اب کام کی بات ہونی چاہیے۔ میں اپنے ایک موکل زمیں دار کی کار میں آیا ہوں، ادھر حویلی کے اگواڑے کھڑی ہے۔ اللہ وسایا! تو ابھی میرے ساتھ چل۔ رات میرے ساتھ ٹھہرنا۔ سویرے کلیم کا سودا ہو جائے گا۔ سودا طے ہوتے ہی فٹافٹ الاٹمنٹ کے لیے کام شروع کر دیں گے۔" وہ رحیم داد کی طرف متوجہ ہوا۔ "تجھے بھی ساتھ ہی چلنا ہو گا۔ الاٹمنٹ کے لیے تجھے بھی موجود رہنا ہو گا۔"

"مجھے لے جا کر کیا کرنا ہے۔ اللہ وسایا تو موجود ہی ہو گا۔" رحیم داد نے پیچھا چھڑانا چاہا۔ وہ شہر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے کسی ان جانے خطرے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

"چوہدری! تجھے تو چلنا ہی پڑے گا۔ ایسے کس طرح کام چلے گا۔" وکیل نے اصرار کیا۔

"بات یہ ہے جی، وکیل صاحب! میں نے کلیم شلیم سے کچھ نہیں لینا۔" اس نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "گھر والی اور بچے ہوتے تو اس طرف دھیان دیتا۔ انھیں ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ لگ بھگ اٹھ سال ہو گئے۔"

"اللہ وسایا نے مجھے تیرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ مجھے پتہ ہے، تو بہت مصیبت زدہ ہے۔ پر درخواستوں پر دستخط کرنے اور افسروں کے سامنے پیشی کے لیے تیری ضرورت تو پڑے گی۔"

"صاف گل ایہہ ہے جی، میں پہلے بھی الاٹمنٹ شلاٹمنٹ کے چکر میں نہیں پڑا۔ تبھی تو مجھے اب تک کہیں الاٹمنٹ نہیں ملی۔ تسیں کاغذات دیکھ ہی چکے ہو۔" وہ آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ "میں تو جی اللہ وسایا کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا مجھ پر بہت احسان ہے۔ اس نے مجھے اپنے پاس ٹھیرایا۔ ہر طرح کا آرام پہنچایا۔ ایسا پیار دیا کہ میرا غم ہلکا ہو گیا۔ لگتا ہے، میں اپنے سگوں کے ساتھ ہوں۔" اس نے وکیل کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔ "مجھ سے تو جی، جس کاغذ پر اور جس درخواست پر چاہو، دستخط کرا لو۔ آگے جو کچھ کرنا ہے، اللہ وسایا ہی کو کرنا ہے۔ پہلے بھی یہ زمیں داری چلاتا رہا ہے۔ آگے بھی یہی چلائے گا۔ مجھے زمیں داری شمینداری سے کچھ نہیں لینا۔ سچ پوچھو تو مجھے زندگی ہی سے کچھ دلچسپی نہیں۔" رحیم داد نے کچھ ایسے درد بھرے لہجے میں بات کی کہ فضا سوگوار ہو گئی۔ سب خاموش بیٹھے رہے۔

وکیل سر جھکائے سوچتا رہا۔ پھر اس نے رحیم داد کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔ "چوہدری! اگر تو پیش ہونا نہیں چاہتا تو ایسی صورت میں تجھے اللہ وسایا کو مختار نامہ دینا ہو گا۔"

"بالکل دے دوں گا جی!" رحیم داد نے مستعدی سے کہا۔ "مجھے اللہ وسایا پر پورا بھروسا ہے۔"

"اچھا جی! یہ مسئلہ بھی طے ہو گیا۔" وکیل نے اطمینان کا اظہار کیا۔ "میں کل مختار نامہ تیار کروا لوں گا۔" وہ مسکرایا۔ "ایک نہیں، دو تیار کرنے ہوں گے۔ ایک چوہدری کی طرف سے اور دوسرا زمیں دارنی کی طرف سے۔" اس نے جمیلہ کو مخاطب کیا۔ "تو بھی دفتروں کے چکر کاٹنے اور پیشیوں سے بچ جائے گی۔"

"بالکل ٹھیک ہے جی!" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ "ایک مختار نامہ تو اسے نکاح کے سمے پہلے ہی دے چکی ہوں۔ دوسرا بھی دے دوں گی۔ میں کہاں افسروں کے سامنے پیش ہوتی پھروں گی۔ میرے دونوں بچے چھوٹے ہیں۔ انھیں یہاں چھوڑ بھی نہیں سکتی۔ ان کی دیکھ بھال کروں گی۔ اللہ وسایا سب کام کر لے گا۔ پہلے بھی کرتا رہا ہے۔ مکدمے بازی کر کے اب تو تجربہ کار بھی بن گیا ہے۔"

"ایسا ویسا تجربہ کار بن گیا۔" وکیل بھی ہنسنے لگا۔ "اب تو یہ مجھے بھی قانونی نکتے سمجھانے لگا ہے۔"

"ایسی گل نہ کریں جی۔" اللہ وسایا نے مسکرا کر وکیل کی جانب دیکھا۔ "اب آگے کی

سوچیں۔” اس نے تجویز پیش کی “ایسا کریں‘ آج یہیں ٹھہر جائیں۔ سویرے سویرے نکل کھڑے ہوں گے۔ جمیلہ اور چوہدری کو بھی ساتھ لے لیں گے۔ یہ مختار ناموں پر دستخط کردیں گے۔ کسی اور درخواست پر دستخط کرانے ہوں تو اس پر بھی کردیں گے۔ میں تیرے ساتھ الاٹمنٹ کے لیے ٹھہر جاؤں گا۔ یہ دونوں واپس آجائیں گے۔”

مگر رحیم داد رضا مند نہ ہوا۔ وہ ان کے ہم راہ جانے سے کترا رہا تھا۔ اس نے فوراً عذر پیش کیا۔ “مجھے نہ لے جا۔ میری طبیعت آج کچھ گڑبڑ ہے۔ مختار نامہ بھجوا دینا۔ میں دستخط کردوں گا۔”

“تو چلا جائے گا تو کام جلدی نمٹ جائے گا۔ ممکن ہے دستخط کی توثیق کے لیے تجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت پڑے۔ ویسے اس کا امکان کم ہی ہے۔ پھر بھی تیرا موجود ہونا مناسب رہے گا۔”

وکیل نے صورت حال کی وضاحت کی۔ “سویرے تک تیری طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ پروا نہ کر‘ طبیعت بگڑی تو شہر میں بہت ہوشیار ڈاکٹر موجود ہیں۔ یہاں سے بہتر ہی علاج معالجہ ہو جائے گا۔”

اللہ وسایا نے کہا۔ “تو یہ طے ہوگیا کہ چاروں صبح چلیں گے۔”

رحیم داد خاموش رہا۔ وکیل نے تائید کی۔ “ہاں جی‘ یہی ٹھیک رہے گا۔ میں رات یہیں گزار لوں گا۔”

سورج غروب ہو چکا تھا۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کے باعث روشنی پہلے ہی کم تھی۔ شام جلد ہی ہوگئی۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ نوکروں نے لیمپ روشن کیا اور ایک اسٹول پر رکھ دیا۔ جمیلہ نے کھانا لگانے کی ہدایت کی۔ گھاس پر دری بچھائی گئی۔ لمبی میز لا کر رکھی گئی اور اس پر کھانا چن دیا گیا۔

سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ لیکن گھوم پھر کر ایک بار پھر کلیم اور الاٹمنٹ کا موضوع چھڑ گیا۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ رحیم داد نے بات چیت میں کم ہی حصہ لیا۔ مگر اسے بہت سی ایسی باتوں کا علم ہوگیا جن سے وہ اب تک بے خبر تھا۔

رات کا ایک پہر گزرا تو سب اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ اللہ وسایا اور جمیلہ نے حویلی کا رخ کیا۔ رحیم داد اور وکیل محمد عثمان رندھاوا مہمان خانے میں پہنچے۔ آنگن میں پہلے سے دو پلنگ بچھے تھے۔ ان پر اجلے اجلے بستر لگے تھے۔ دونوں میں مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ وہ اپنے اپنے بستروں پر لیٹے

اور سو گئے۔

☆

سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی احمد نے رحیم داد اور رندھاوا کو جگا دیا۔ دونوں نے غسل کیا۔ ناشتا میز پر لگ چکا تھا۔ وہ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ اللہ وسایا پہنچ گیا۔ جمیلہ اس کے ساتھ تھی۔ اللہ وسایا کرسی پر بھی نہیں بیٹھا۔ وہ سفر کے لیے تیار ہو کر آیا تھا۔ جمیلہ بھی پوری طرح تیار تھی۔ ذرا دیر بعد وکیل رندھاوا اور رحیم داد اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ مہمان خانے سے باہر نکلے۔

کار حویلی کے سامنے پیپل کے گھنے درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ ڈرائیور بھی قریب ہی موجود تھا۔ نوکروں نے ضرورت کا سفری سامان پہلے ہی کار میں رکھ دیا تھا۔ چاروں کار میں سوار ہوئے۔ روانگی سے پہلے اللہ وسایا نے دو نوکروں کو لاری کے ذریعے پہنچنے کی ہدایت کی۔ کار آگے بڑھی اور نہر کے کنارے کنارے دوڑنے لگی۔

صبح کا سہانا وقت تھا۔ ہوا میں تازگی اور فرحت تھی۔ اللہ وسایا‘ جمیلہ اور وکیل عثمان رندھاوا کے چہروں پر شگفتگی تھی۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ مگر رحیم داد خاموش اور سہما ہوا تھا۔

دوپہر ہونے سے پہلے ہی کار شہر کی حدود میں داخل ہوئی اور وکیل کے دفتر کے سامنے جا کے ٹھہر گئی۔ چاروں کار سے اتر کے دفتر میں چلے گئے۔ دفتر اور گھر علیحدہ علیحدہ نہیں تھے۔ مگر جس کمرے میں دفتر تھا‘ وہ خوب کشادہ اور ہوا دار تھا۔ کسی زمانے میں بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ پچھلے حصے میں وکیل اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔

مکان پختہ تھا۔ بالائی منزل پر آگے کے رخ کمرہ تھا۔ دفتر کی دیواروں میں لگے ہوئے خوش رنگ ٹائل‘ قیمتی فرنیچر اور الماریوں میں آویزاں قد آدم آئینے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مکان کسی کھاتے پیتے سکھ یا ہندو کی ملکیت رہ چکا ہے۔

اتفاق سے وکیل کا وہ موکل بھی دفتر میں پہلے سے موجود تھا جس سے کلیم کا سودا کرنا تھا۔ وکیل نے اسے دیکھتے ہی مسکرا کر اللہ وسایا کو مخاطب کیا۔ “لو جی‘ اپنے شیخ عنایت اللہ بھی موجود ہیں۔ یہ ہوشیار پور کے مہاجر ہیں۔ انھی سے کلیم کا سودا کرنا ہے۔” اس نے شیخ عنایت اللہ سے اللہ وسایا کا تعارف کرایا۔ “اور شیخ صاحب! یہ کوٹلہ ہرکشن کا زمیں دار اللہ وسایا ہے۔” شیخ عنایت اللہ کرسی پر بیٹھا تھا‘ جھٹ کھڑا ہوگیا۔

اللہ وسایا نے بڑھ کر گرم جوشی سے مصافحہ کیا‘ مڑ کر جمیلہ کی سمت دیکھا‘ مسکرا کر شیخ عنایت کو بتایا۔ “یہ میری گھر والی ہے جی۔ سودا تو دراصل اس نے کرنا ہے۔” اللہ وسایا نے رحیم داد کو بھی

شیخ عنایت سے ملایا۔ چاروں کرسیاں سنبھال کر بیٹھ گئے۔

اللہ وسایا ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد جلد ہی حرف مطلب پر آگیا۔ اس نے گفتگو کلیم اور متروکہ جائیداد کے الاٹمنٹ کی جانب موڑ دی۔ شیخ عنایت کے پاس کلیم کے کاغذات موجود تھے۔ اس نے اللہ وسایا کے استفسار پر زیادہ تفصیل میں جانے کی کوشش نہیں کی۔ کلیم کے کاغذات نکالے اور اللہ وسایا کی جانب بڑھا دیے۔ اللہ وسایا نے کاغذات الٹ پلٹ کر سرسری مطالعہ کیا۔ رحیم داد قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے بھی کاغذات پر نظر ڈالی مگر جمیلہ نے پوری توجہ سے ضروری دستاویزات اور کاغذات پڑھے۔

وکیل نے اس عرصے میں اللہ وسایا کے لیے اسٹامپ پیپروں پر دو مختار نامے تیار کرائے' ان پر جمیلہ اور رحیم داد سے دستخط کرائے۔ دستخط کرتے وقت رحیم داد کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا اور مختار نامے پر چوہدری نورالٰہی مرحوم کے جعلی دستخط بنا دیے۔ وکیل دستخطوں کی توثیق کے لیے اپنے منشی کے ساتھ کچہری چلا گیا۔ وہ بارسوخ اور منجھا ہوا وکیل تھا۔ رحیم داد اور جمیلہ کو اپنے ہم راہ نہیں لے گیا۔ واپس آیا تو دونوں مختار نامے مکمل تھے۔ ان کی تصدیق بھی ہو چکی تھی اور توثیق بھی۔

مختار ناموں سے فارغ ہو کر وکیل نے نہایت خوش اسلوبی سے کلیم کا سودا بھی طے کرا دیا۔ شیخ عنایت کے رویئے سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ مالی طور پر بہت زیادہ پریشان اور ضرورت مند ہے۔ وکیل نے اس کے بارے میں بالکل صحیح بتایا تھا۔ سودا اتنی سستی قیمت پر ہو گیا کہ جمیلہ کو اپنے زیورات فروخت کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ حالانکہ وہ زیور اپنے ساتھ ایک پوٹلی میں باندھ کر لائی تھی کہ اگر نقد رقم سے کام نہ بنا تو زیورات بیچ کر کمی پوری کردے گی۔

ہر کام توقع سے زیادہ اطمینان بخش طور پر ہو گیا۔ مگر جب وہ تمام لکھت پڑھت سے فارغ ہوئے تو دن ختم ہو رہا تھا۔ شام کی آمد آمد تھی۔ دونوں نوکر بھی پہنچ چکے تھے۔ جمیلہ واپس جانے پر مصر تھی۔ وہ اپنے بچوں کو نوکرانیوں کی نگرانی میں چھوڑ کر آئی تھی۔ اب ان کی یاد ستا رہی تھی۔ رحیم داد نے بھی جمیلہ کی تائید کی۔ وہ بھی فوری واپسی کے حق میں تھا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ اسے ہر طرف خطرہ نظر آتا تھا۔

وکیل کے دفتر میں وہ جتنی دیر رہا' خوف زدہ اور پریشان رہا۔ لمحے بھر کے لیے بھی باہر نہیں گیا۔ تمام وقت کرسی پر گم صم بیٹھا رہا۔ اسے دن ختم ہونے اور شام کا دھندلکا پھیلنے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ وہ شہر سے جلد از جلد دور چلا جانا چاہتا تھا اور خطرات سے بچنے کی خاطر رات کے اندھیرے میں سفر کرنا چاہتا تھا۔

لیکن وکیل نے جمیلہ اور رحیم داد کو جانے نہیں دیا۔ اس کے خیال میں اس وقت سفر کرنا مناسب نہیں تھا۔ وہ صبح سے پہلے کوٹلہ ہرکشن نہیں پہنچ سکتے تھے۔ راستہ طویل تھا۔ ویران اور اجاڑ علاقوں سے گزرتا تھا۔ رات کے سفر کے لیے محفوظ نہیں تھا۔ کچھ ہی عرصے قبل اسی راستے پر دن ڈھلے ایک لاری لٹ چکی تھی۔ کوٹلہ ہرکشن سڑک سے دور بھی تھا۔ کچا راستہ تھا اور خاصے پھیر کا تھا۔ دونوں کو' خصوصیت کے ساتھ جمیلہ کو' سفر میں طرح طرح کی مشکلات اور پریشانیوں سے سابقہ پڑتا۔

شیخ عنایت کلیم کا سودا مکمل ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد چلا گیا۔ اللہ وسایا' جمیلہ اور رحیم داد نے وکیل کے ساتھ کھانا کھایا اور اسی کے مکان پر رات بسر کی۔ صبح ہوئی تو اللہ وسایا طے شدہ پروگرام کے مطابق وکیل کے پاس ٹھہر گیا۔ اس نے ایک نوکر کو اپنے کام کاج کے لیے روک لیا' دوسرے کو جمیلہ اور رحیم داد کے ہم راہ کر دیا۔

راوی ٹرانسپورٹ کی ایک لاری سے تینوں واپس ہوئے۔ جمیلہ کو ڈرائیور کے ساتھ والی اگلی نشست پر جگہ مل گئی۔ اس کے برابر دو عورتیں اور بیٹھی تھیں۔ دونوں برقع اوڑھے ہوئے تھیں۔ رحیم داد اور ملازم' عالم' پچھلی نشست پر تھے۔

رحیم داد خوف زدہ اور سہما ہوا تھا۔ اسے طرح طرح کے خدشات اور وسوسے پریشان کر رہے تھے۔ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی اسے پہچان نہ لے۔ لاری جس قدر آگے بڑھتی گئی' رحیم داد کی پریشانی میں اسی قدر اضافہ ہوتا گیا۔ سویرا رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا۔ زندگی کی چہل پہل اور گہما گہمی بیدار ہو رہی تھی۔

لاریوں کے اڈے پر رحیم داد کو کوئی پولیس والا نظر آتا تو وہ لرز جاتا' سراسیمہ ہو جاتا' عینک قمیض کے دامن سے صاف کر کے دوبارہ آنکھوں پر لگاتا اور گردن جھکا کر اخبار پڑھنے لگتا۔ اخبار اس نے شہر میں ایک ہاکر سے خریدا تھا۔ دھوپ کی تمازت میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ ہوا گرم ہو گئی گو لو کے تیز جھکڑ نہیں چل رہے تھے' لیکن رحیم داد نے لو سے بچاؤ کی آڑ میں گردن اور کانوں کے گرد چادر لپیٹ رکھی تھی۔ اس طرح اس کا چہرہ خاصا چھپ گیا تھا۔ لو تیز ہوتی تو وہ ڈھاٹے سے چہرہ پوری طرح چھپانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ اسے سب سے زیادہ خطرہ پولیس کی جانب سے تھا۔ لیکن اتفاق سے اس روز کوئی پولس والا لاری میں سوار ہی نہ ہوا۔

سہ پہر کو...اک پتن پہنچے۔ مگر وہاں رکے نہیں۔ نیلی ٹرانسپورٹ کی پہلی لاری سے دیپال پور کی

جانب روانہ ہوگئے۔

☆

چک بیدی کے اڈے پر اللہ وسایا کا مزارع قادر اور اس کا بیٹا صابر لاری میں سوار ہوئے۔ دونوں نے رحیم داد کو پہچان لیا۔ ادب سے سلام کیا اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ وہ بھی کوٹلہ ہرکشن جا رہے تھے۔ اللہ وسایا کے ملازم عالم کو، جو شہر سے جمیلہ اور رحیم داد کے ہم رہ سفر کر رہا تھا، انھوں نے یہی بتایا تھا۔ دونوں مسلح تھے۔ قادر کے پاس مضبوط اور اونچی ڈانگ تھی۔ اس کے دونوں کناروں پر لوہے کی شام چڑھی تھی۔ ایک طرف کی شام میں سیسہ بھرا تھا۔ صابر کے پاس بھی مضبوط اور لمبے ہتھے کی تیز کلہاڑی تھی جس کا چوڑا پھل تیز اور چمک دار تھا۔

لاری مسافروں سے بھری ہوئی تھی اور ہچکولے کھاتی پختہ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ دن کا چل چلاؤ تھا۔ آسمان پر چھائے ہوئے گرد کے مٹیالے غبار کے پیچھے ڈوبتا سورج الاؤ کی مانند دہک رہا تھا۔ مغرب میں سرمئی مائل سرخ روشنی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ لاری بھی اسی سمت جا رہی تھی۔ سڑک ویران تھی۔ دونوں طرف کیکر کے درختوں اور گھنی جھاڑیوں کا جھنگر تھا۔ کہیں کہیں اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبے بھی تھے۔

لاری دو ٹبوں کے درمیان سے ڈھلان پر اترتے ہوئے دائیں ہاتھ کو مڑی تو اس کی رفتار سست پڑ گئی اور کچھ ہی دور جانے کے بعد ٹھہر گئی۔

ڈرائیور لاری سے نیچے اترا۔ باہر کچھ ملی جلی مدھم آوازیں ابھریں۔ رحیم دار کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے گردن باہر نکال کر نظریں دوڑائیں۔ اگلے دروازے کے عین سامنے دو آدمی نہایت مشتبہ حالت میں کھڑے تھے۔ ایک وضع قطع سے کسان نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی لاٹھی تھی جس پر گنڈاسا لگا تھا۔ لاٹھی کندھے پر رکھی تھی اور پشت کی جانب اس میں ایک گٹھری اس طرح جھول رہی تھی کہ گنڈاسے کا تیز پھل دور سے صاف نظر نہیں آتا تھا۔ دوسرے کے چہرے پر ڈھاٹا بندھا تھا۔ اس کے پاس پرانی وضع کی دیسی بندوق تھی۔ یہ مسکٹ تھی جو عام پیدل سپاہیوں کے پاس ہوتی ہے۔

ڈرائیور ان کے نرغے میں خاموش کھڑا تھا۔ دیکھتے دیکھتے قریب کی جھاڑیوں سے تین آدمی نکلے اور ڈرائیور کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے چہروں پر بھی ڈھاٹے بندھے تھے۔ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں جو تیزی سے ادھر ادھر گردش کر رہی تھیں۔ تینوں نیزوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ رحیم داد خوف زدہ ہوگیا۔ لاری کے دوسرے مسافر بھی دم بخود اور سہمے ہوئے تھے۔ ان میں مرد تھے، عورتیں تھیں، بچے تھے۔ مگر نہ کوئی بولا نہ اپنی جگہ سے اٹھا۔

مسلح افراد نے مسافروں کو مزید دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی۔ جس شخص کے ہاتھ میں مسکٹ تھی، اس نے نال آسمان کی سمت بلند کی اور ٹھائیں ٹھائیں دو ہوائی فیر کیے۔ ان میں سے جو اونچے قد کا تھا، ڈپٹ کر زور سے چیخا۔

"سارے بندے باہر آجائیں۔ اپنا سامان اندر ہی رہنے دیں۔"

رحیم داد کے پیچھے بیٹھے ہوئے بوڑھے نے ساتھ والے مسافر سے کھسر پھسر کی۔ "ڈکیت جان پڑتے ہیں۔ دھاڑا پڑا ہے۔"

لباس کی سرسراہٹیں ابھریں۔ مسافر نشستوں سے اٹھنے لگے۔ ایک عورت کی بغل میں دبا ہوا بچہ منہ پھاڑ کر رویا۔ عورت نے ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کا منہ بند کر دیا۔ بچہ سہمی ہوئی نظروں سے ماں کا جھنجلایا ہوا چہرہ تکنے لگا۔

کنڈکٹر جو کلینر بھی تھا، سب سے پہلے دروازے کی جانب بڑھا۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرے مسافر لاری سے اترنے لگے۔ رحیم داد بھی اترا۔ وہ ابھی تک پریشان اور ڈرا ہوا تھا۔ وہ سڑک پر ایک طرف خاموش کھڑا ہوگیا۔ اس نے دیکھا کہ قادر اور صابر بھی مسافروں کے ساتھ باہر نکل رہے تھے۔

ان دونوں کو دیکھ کر مسلح افراد میں سے ایک غصے سے دہاڑا۔ "یہ رہا کادو اور اس کا پتر۔"

قادر اور صابر نے جھٹ اپنی ڈانگ اور کلہاڑی اٹھائی اور اچھل کر مسلح افراد پر جھپٹے۔ انھوں نے پینترا بدل کر تیزی سے حملہ کیا۔ پانچوں حملہ آور بدحواس ہوگئے۔ ایک تو پہلے ہی ہلے میں تیورا کر گرا۔ اس کی کنپٹی سے لال لال خون نکل کر گردن اور کپڑوں پر پھیلنے لگا۔ بقیہ چاروں مسلح افراد سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر تتر بتر ہوگئے۔ ان کے بکھرتے ہی مسافروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا، ادھر بھاگا اور درختوں کے نیچے گھس گیا۔

رحیم داد بھی ایک گھنی جھاڑی کی آڑ میں حیران و پریشان کھڑا تھا۔ جب وہ ذرا سنبھلا تو اسے جمیلہ کا خیال آیا۔ اس نے نظریں گھما پھرا کر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ کچھ فاصلے پر چھتری جیسے ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑی تھی اور نگاہیں اٹھائے بے چینی سے لاری کی جانب دیکھ رہی تھی۔

قادر اور اس کا بیٹا تیزی سے اپنی ڈانگ اور کلہاڑی گھما رہے تھے۔ جھپٹ جھپٹ کر وار کر رہے تھے۔ صورت حال اب رحیم داد پر واضح ہوتی جا رہی تھی۔ مسلح افراد جو ڈاکو سمجھے جا رہے

تھے دراصل مقتول طاہر کے شریکے اور بھائی بند تھے۔ انھوں نے طاہر کے قتل کا انتقام لینے کے لیے لاری رکوائی تھی۔ انھیں قادر اور صابر کی تلاش تھی جو ان سے مقابلہ کرنے کے لیے سامنے آچکے تھے۔

قادر کی عمر ۴۵ سے تجاوز کر چکی تھی مگر اس کا جسم مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ اس میں توانائی کے ساتھ ساتھ پھرتی بھی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں دبی ہوئی ڈانگ بجلی کے مانند لہرا رہی تھی۔ صابر بیس بائیس سال کا قد آور نوجوان تھا۔ اس میں بھی باپ کی طرح پھرتی اور حوصلہ تھا۔ حملہ آور اب سنبھل چکے تھے۔ وہ بھی گھوم پھر کر وار کر رہے تھے اور قادر اور اس کے بیٹے کو نرغے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر دونوں ہر بار ان کا گھیرا توڑ کر نکل جاتے۔ وہ جھک کر، سمٹ کر، پلٹ کر ہر طرح اپنا سر بچانے کے لیے کوشاں تھے۔ جھکائی دے کر اور پینترے بدل بدل کر حملے بھی کر رہے تھے۔

دونوں فریق لڑائی میں اس طرح گتھے ہوئے تھے کہ جس کے پاس مسکٹ تھی، وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ فاصلہ اس قدر کم تھا اور فریقین اس طرح جلدی جلدی اپنی جگہ بدل رہے تھے کہ گولی چلانے کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں مسکٹ سنبھالے ادھر ادھر گھومتا پھر رہا تھا۔ آخر اس نے ایک بار ٹریگر دبا ہی دیا۔ گولی چیختی ہوئی نکلی مگر کسی کے جسم میں نہیں لگی۔ گولی کی آواز سن کر مسافر اور بدحواس ہو گئے۔ بھاگے اور درختوں اور جھاڑیوں کے نیچے دور دور تک بکھر کر دبکنے اور روپوش ہونے کی کوشش کرنے لگے۔

قادر اور اس کے بیٹے کے مقابلے پر دراصل تین ہی مسلح افراد تھے۔ دونوں اس بے جگری سے جم کر لڑ رہے تھے کہ تینوں حملہ آوروں میں سے ہر ایک چوٹ کھا چکا تھا۔ کسی کے ہونٹ سے، کسی کے کندھے سے اور کسی کی ٹانگ سے خون رس رس کر پھیلتا جا رہا تھا۔ مگر کسی کو کاری زخم نہیں آیا تھا۔

قادر اور صابر بھی گھائل ہو چکے تھے۔ زخموں سے بے نیاز ہنوز بڑھ بڑھ کر تیزی سے وار کر رہے تھے۔ تینوں حملہ آوروں کو اپنے بچاؤ کے لیے زیادہ کوشاں ہونا پڑا۔ اب ان میں پہلی سی پھرتی اور حوصلہ نہیں رہا تھا۔ وہ کسی قدر پریشان اور تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور رفتہ رفتہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔

وہ حملہ آور جسے قادر اور صابر نے پہلے ہی ہلّے میں شدید زخمی کر دیا تھا، سڑک پر چت لیٹا تھا۔ قریب ہی اس کا نیزہ پڑا تھا۔ وہ کچھ دیر بے حال پڑا رک رک کر سانس بھرتا رہا، پھر اس نے کروٹ بدلی۔ قادر اور صابر چند گز کے فاصلے پر تھے اور بھر بھر کر حملے کر رہے تھے۔ وہ دونوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ وہ ان کے عقب میں تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نیزہ مضبوطی سے تھام لیا۔ اٹھا اور دونوں ہاتھوں میں نیزہ دبائے ہوئے تیزی سے قادر پر جھپٹا، وار کیا، نیزے کا نصف سے زیادہ پھل قادر کی پیٹھ میں اتر گیا۔ وہ تلملا کر پلٹا۔ اسی وقت سامنے سے کلہاڑی کا وار ہوا، ہاتھ بھرپور پڑا۔ قادر کا ایک بازو جھول گیا۔ ڈانگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ لڑکھڑایا اور سنبھلنے کی کوشش کی مگر نیزے کے تازہ وار نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس دفعہ نیزے کا پھل اس کے پہلو میں گوشت چیرتا ہو پسلیوں تک اتر گیا۔

قادر ڈگمگایا۔ گہری سانس بھری، دونوں ہاتھوں سے نیزہ پکڑا اور سڑک پر گر پڑا۔ نیزہ بدستور اس کی پسلیوں میں پھنسا ہوا تھا۔

قادر نے زور لگا کر نیزہ کھینچا۔ نیزہ تو باہر نکل آیا، مگر ساتھ ہی پہلو سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ قادر نے ایک ہاتھ زخم پر رکھا، اٹھنے کی کوشش کی مگر جس کے پاس مسکٹ تھی، وہ قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے اچھل کر پوری قوت سے قادر کے منہ پر لات ماری۔ وہ اس حملے کی تاب نہ لا سکا۔ بے سدھ ہو کر گر گیا۔ حملہ آور نے مسکٹ ایک طرف رکھی، دھوتی کے ڈب سے چھری نکالی اور قادر کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس کا گلا ایک ہاتھ سے دبا کر بولا۔ ”میں طاہر کا پیو عطا محمد ہوں۔“ اس نے غصے سے قادر کے منہ پر تڑاق سے تھپڑ مارا۔

قادر کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے لڑکھڑاتی نظروں سے عطا محمد کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ عطا محمد نے چھری ایک آنکھ میں بھونک دی اور اسے نکالنے کے لیے بے دردی سے گھمانے لگا۔

قادر تڑپ کر بے بسی سے گردن ادھر ادھر ہلانے لگا۔ صابر پلٹ کر باپ کی جانب دیکھ بھی نہ سکا۔ حملہ آوروں نے اسے نرغے میں لے لیا تھا اور ہر طرف سے تابڑتوڑ حملے کر رہے تھے۔ صابر کے جسم پر جگہ جگہ زخم تھے لیکن وہ ڈٹا رہا اور ہر وار کلہاڑی کے ڈنڈے پر روکتا رہا۔ موقع ملتا تو پینترا بدل کر حملہ کرنے سے بھی نہ چوکتا۔

چار افراد کے مقابلے میں صابر زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ اس کے زخموں سے برابر خون بہہ رہا تھا۔ قدم بار بار ڈگمگاتے۔ کلہاڑی پر انگلیوں کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ کلہاڑی کا لمبا ڈنڈا بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اب وہ اپنا موثر دفاع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ حملہ آوروں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ وہ گھیر کے ہر طرف سے پے در پے وار کر رہے تھے۔ صابر

بھی گر پڑا۔

☆

سورج ڈوب چکا تھا۔ مغربی افق پر ابھی تک لہو رنگ روشنی بکھری ہوئی تھی۔ شام بلندی سے نیچے اترنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ رحیم داد نے دیکھا کہ جمیلہ درخت کے نیچے سے نکل کر سڑک کے اس جانب بڑھی جدھر قادر اور صابر زخموں سے نڈھال پڑے تھے۔ عطا محمد ابھی تک قادر کے سینے پر سوار تھا۔ جمیلہ زور سے چیخی۔ ”بہت ہوگیا۔ اب بند کر دیہ ہتیا چار۔“ اس کے لہجے میں بے قراری اور جھنجلاہٹ تھی۔

رحیم داد گھبرا گیا۔ اس نے چاہا کہ جمیلہ کو آگے جانے سے روکے۔ وہ ایک ہاتھ اٹھا کر اونچی آواز سے بولا۔ ”ٹھیر جا زمیں دارنی! ادھر نہ جا۔“ جمیلہ نے پلٹ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اسی وقت ہارن کی آواز ابھری۔ سڑک کی مخالف سمت سے ایک لاری آتی نظر آئی۔ سب ادھر دیکھنے لگے۔ عطا محمد نے بے سدھ پڑے ہوئے قادر کو چھوڑ دیا۔ اس کے سینے پر سے نیچے اترا۔ مسکٹ سنبھالی اور اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے اونچی آواز سے بولا۔ ”کام ہوگیا۔ اب نکل چلو۔“

سب نے جلدی جلدی اپنے اسلحہ سنبھال لیے۔ عطا محمد نے مسکٹ کی نال اونچی کی۔ خوف اور دہشت پھیلانے کے لیے تڑتڑ ہوائی فائر کیے۔ وہ فائر کرتا ہوا اپنے ساتھیوں کے ہم راہ سڑک پر دوڑنے لگا۔ فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ راستہ طے کرنے کے بعد سڑک سے اتر کر نشیب میں چلا گیا اور گھنے درختوں اور جنگلی جھاڑیوں کے اندر داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

سامنے سے آنے والی لاری قریب آکر ٹھہر گئی۔ اس میں بھی مسافر سوار تھے اور کھڑکیوں سے گردنیں نکال کر قادر اور صابر کو دیکھ رہے تھے جو خون میں لت پت سڑک کے بیچوں بیچ پڑے تھے۔ جمیلہ بڑھ کر زخمیوں کے پاس پہنچی۔ رحیم داد، ڈرائیور، کلینز اور مسافر بھی درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ سے باہر نکلے اور سہمے ہوئے قادر اور صابر کی جانب بڑھے۔ دوسری لاری کا ڈرائیور بھی اپنے مسافروں کے ساتھ نیچے اترا۔

جمیلہ نے دیکھا کہ عطا محمد نے قادر کی دونوں آنکھیں نکال دیں ہیں۔ وہ گردن پر بھی چھری چلا چکا تھا مگر صرف اوپر کی ذرا سی کھال کاٹ سکا تھا۔ جمیلہ نے کلائی تھام کر قادر اور صابر کی باری باری نبض دیکھی پھر گردن ہلا کر بولی۔ ”ابھی زندہ ہیں، پر بری طرح گھائل ہوئے ہیں۔“ اس نے مڑ کر دوسری لاری کے ڈرائیور کی جانب دیکھا۔ ”تیں نوں پاک پتن جانا ہے؟“

”جانا تو ہے جی۔“ اس نے زخمیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ جھگڑے میں زخمی ہوئے ہیں؟“

”ہاں جھگڑا ہی ہوا تھا۔“ جمیلہ نے آہستہ سے جواب دیا۔

ڈرائیور نے پوچھا۔ ”دوسری پارٹی کدھر گئی؟“

”انھوں نے جی لاری رکوائی، سارے مسافروں کو باہر بلایا۔“ ایک بوڑھا مسافر بتانے لگا۔ ”وہ ان دونوں کی کھوج میں آئے تھے۔ دیکھتے ہی حملہ کر دیا۔ پر جی یہ دونوں بھی زبردست حوصلے والے نکلے۔ وہ پنج تھے اور یہ صرف دو۔ انھوں نے ڈٹ کر ٹاکرہ لیا۔“

بوڑھے نے اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ جو جس کے جی میں آرہا تھا، کہہ رہا تھا، اپنی سوجھ بوجھ کے اعتبار سے اظہار خیال کر رہا تھا۔ مگر جمیلہ بہت پریشان تھی۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ”بے کار کی باتیں چھوڑ۔ ان دونوں کو پاک پتن کے سرکاری اسپتال لے جا۔ اگر ان کی جلد ہی مرہم پٹی کر دی گئی تو بچ جائیں گے۔ ویسے خون بہت بہہ گیا۔“ وہ دونوں زخمیوں کے قریب بیٹھ گئی اور خون بند کرنے کے لیے انھی کی پگڑیاں پھاڑ پھاڑ کر زخموں کے گرد لپیٹنے لگی۔

ڈرائیور زخمیوں کو اسپتال کے جانے پر آمادہ نہیں ہوا۔ ”میں جی انھیں نہیں لے جاؤں گا۔“

”کیوں نہیں لے جائے گا؟“ جمیلہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ”تو چاہتا ہے، یہ دونوں یہیں سڑک پر مر جائیں۔ تو اتنا بے رحم اور کٹھور کیوں ہے؟“

”گل ایسہ ہے جی۔“ ڈرائیور نے صفائی پیش کی۔ ”بعد میں پولیسے بہت ستاتے ہیں۔ روز روز گواہی کے لیے بلاتے ہیں۔ اوپر سے وکیل الٹے سیدھے سوال کر کے بھیجا خراب کر دیتے ہیں۔ دوسری پارٹی کا بھی ڈر رہتا ہے۔ گواہی خلاف دو تو عدالت سے نکلتے ہی حملہ ہوتا ہے۔“

”تو گواہی شواہی نہ دینا۔“ جمیلہ نے اسے سمجھایا۔ ”میں اپنے نوکر کو زخمیوں کے ساتھ بھیج رہی ہوں۔ وہی تھانے میں پرچہ چاک کرائے گا۔ اسپتال میں بھی لے جائے گا۔ تیں نوں تو انھیں صرف اسپتال تک پہنچانا ہے۔ گھبرانے کی کوئی گل نہیں۔“

ڈرائیور نے پھر بھی کترانے کی کوشش کی۔ جمیلہ نے جھٹ اس کے ہاتھ پر دس روپے کا نوٹ رکھا۔ مسافروں نے بھی اصرار کیا، سمجھایا بجھایا۔ آخر وہ زخمی قادر اور صابر کو پاک پتن لے جانے پر رضامند ہوگیا۔ جمیلہ کا ملازم، عالم زخمیوں کے ساتھ پاک پتن جانے والی لاری میں سوار ہوگیا۔ جمیلہ نے اسے ضروری ہدایات دیں، پچیس روپے بھی دیے۔ لاری پاک پتن کی سمت روانہ ہوگئی۔

دیپال پور جانے والی لاری کے مسافر بھی سوار ہوگئے۔ ان میں قادر اور صابر نہیں تھے جن کا لال لال خون سڑک پر جگہ جگہ پھیلا ہوا تھا۔ جمیلہ اپنی نشست پر بیٹھی ان دونوں کے بارے میں

سوچ رہی تھی۔ اس کا خوب صورت چہرہ افسردہ اور مرجھایا ہوا نظر آرہا تھا۔ باہر شام کا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ مغرب میں دہکتا ہوا الاؤ بجھ چکا تھا۔ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔ لاری سڑک پر دوڑنے لگی۔

تبّی رحمان کے اڈے پر لاری ٹھہری۔ جمیلہ اور رحیم داد نے لاری سے اتر کر تانگا لیا۔ دونوں اس میں سوار ہوگئے۔ تانگا نہر کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ جب تانگا کوٹلہ ہرکشن میں داخل ہوا تو پہر رات گزر چکی تھی۔ جمیلہ حویلی میں نہیں گئی، سیدھی قادر اور صابر کے گھر پہنچی۔ رحیم داد اس کے ہم راہ تھا۔ اطلاع ملتے ہی قادر کی بیوی ایک ہاتھ میں لالٹین سنبھالے باہر آئی۔ اس کے ساتھ بہو بھی تھی۔ دونوں کے پیچھے مجیداں تھی۔ وہ کمزور اور بیمار نظر آرہی تھی۔

قادر کی بیوی نے جمیلہ کو دیکھتے ہی کہا۔ "بھین جی! تو اس دکھت کیسے آگئی؟" وہ مسکرائی۔ "آ اندر آجا۔ منجی پر آرام سے بیٹھ۔"

"نہیں، میں نے اندر نہیں جانا۔ تجھے یہ بتانا ہے کہ کادو اور صابر کا طاہر کے پیو عطا محمد اور اس کے شریکوں سے جھگڑا ہوگیا۔"

"ہائے ربّا۔" وہ اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "زمیں دارنی! ٹھیک ٹھیک بتا۔"

"میں لاری میں چوہدری اور عالم کے ساتھ شہر سے آرہی تھی۔ چک بیدی کے اڈے پر کادو اور صابر بھی لاری میں سوار ہوگئے۔ رستے میں عطا محمد اور اس کے ساتھیوں نے کسی بہانے سے لاری رکوائی، مسافروں کو نیچے اتروایا۔ وہ ۵ تھے اور سب مسلح تھے۔ انھوں نے کادو اور صابر پر ہلّا بول دیا۔" جمیلہ نے مطلع کیا۔

"ہائے میں مرگئی۔" قادر کی بیوی بے قرار ہو کر چیخی۔ "صابر اور اس کا پیو کہاں ہے؟ دونوں کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لائی؟"

"وہ گھائل ہوگئے ہیں۔ میں نے عالم کے ساتھ دونوں کو لاری میں ڈال کر پاک پتن کے سرکاری اسپتال بھجوایا ہے۔"

قادر کی بیوی یہ سنتے ہی دروازے کی دہلیز پر بیٹھ کر بین کرنے لگی۔ بہو بھی سینہ پیٹتے ہوئے ساس کے ساتھ رونے لگی۔ مجیداں بت بنی گم صم کھڑی تھی۔ نہ وہ بولی، نہ روئی۔ لالٹین کی زرد روشنی میں اس کا مرجھایا ہوا چہرہ مٹی کی طرح مٹیالا پڑگیا تھا۔ وہ لڑکھڑائی اور ماں کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ ماں نے پلٹ کر اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ زور سے اس کی پیٹھ پر دوہتڑ مار کر چیخی۔ "کرماں ماری! تو مر کیوں نہ گئی؟ تیرے یار کے پیو نے اس کے خون کا بدلہ چکا لیا ناں!" مجیداں پھر بھی کچھ نہ بولی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

قادر کی بیوی اور بہو کے رونے اور چیخنے کی آوازیں رات کے سناٹے میں ابھریں تو گاؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ گھروں کے دروازے کھلنے لگے۔ سب قادر کے گھر پہنچنے لگے۔ آن کی آن میں خاصا بڑا ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ ان میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں۔ سبھی پریشان تھے، تشویش میں مبتلا تھے۔ قادر اور صابر کی بیویاں بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

جمیلہ نے دونوں کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ "چنتا نہ کرو۔ سب ٹھیک ہی ہوگا۔" ساتھ ہی انہیں ڈانٹا بھی۔ "تم نے تو خاما خا کی ڈنڈی شروع کردی۔ یہ برا شگون ہے۔ ٹسوے بہانا بند کرو۔ دونوں کی دیکھ بھال کے لیے کسی کو اسپتال بھیجو۔ ابھی تو لاری مل جائے گی۔"

"مجیداں کے دونوں ماما جائیں گے۔" قادر کی بیوی نے رونا بند کردیا۔ "میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گی۔"

"چاچا اکبر کو بھی ساتھ لیتی جا۔" بہو نے مشورہ دیا۔

اکبر وہاں موجود تھا، مستعدی سے بولا۔ "ہاں جی، میں بھی چلوں گا۔" اس نے قادر کی بیوی کی طرف دیکھا۔ "بھابی تو فٹافٹ چلنے کو تیار ہو جا۔"

قادر کی بیوی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے دونوں بھائی اور بھاوجیں بھی موجود تھیں۔ روانگی کا پروگرام فوراً بن گیا۔ جمیلہ اور رحیم داد جس تانگے سے پہنچے تھے، وہ ابھی تک کھڑا تھا۔ قادر کی بیوی اپنے بھائیوں اور دیور کے ساتھ تانگے میں سوار ہوگئی۔ جمیلہ نے ایک بار پھر اسے تسلی دی۔ "مجیداں کی ماں! حوصلے سے کام لے۔ کوئی پریشانی کی گل ہو تو مجھے فوراً اطلاع بھیجنا۔ عالم تو وہاں موجود ہی ہوگا، میں بھی تیرے پاس پہنچ جاؤں گی۔ ویسے تو سویرے سویرے عالم کو واپس بھیج دینا تاکہ پتہ چل جائے، دونوں کیسے ہیں۔"

قادر کی بیوی نے جمیلہ کی ہر ہدایت پوری توجہ سے سنی اور عالم کے ذریعے اطلاع دینے کا وعدہ کیا۔ تانگا آگے بڑھا اور گاؤں سے دور نکل گیا۔

بھیڑ اب چھٹ چکی تھی۔ جانے والے واپس گھروں کو جا چکے تھے۔ مگر جمیلہ نہیں گئی۔ اس کے دونوں بچے سو چکے تھے۔ نوکرانیوں سے اسے یہ اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ قادر کے گھر کے دروازے پر صابر کی بیوی ابھی تک مضمحل اور نڈھال کھڑی تھی۔ اس کی اوٹ میں مجیداں تھی۔ وہ پتھر کی مانند ساکت تھی۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ جمیلہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب گئی

شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔

وہ جمیلہ کے سینے پر سر رکھ کر جیسے پھٹ پڑی۔ "بھین جی! میں بہت پاپی ہوں۔ مجھ بختاں ماری کو موت کیوں نہیں آجاتی؟" اس کی سسکیاں خاموشی میں ابھرنے لگیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ جمیلہ اس کا سر آہستہ آہستہ تھپکنے لگی۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا' البتہ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ آنسو ڈھلک ڈھلک کر اس کے رخساروں پر ٹپکنے لگے۔

رحیم داد خاموش کھڑا مجیداں اور جمیلہ کو روتے ہوئے دیکھتا رہا۔ مگر وہ یہ رقت انگیز منظر زیادہ دیر نہ دیکھ سکا۔ اسے مجیداں کے باپ قادر کی آنکھیں یاد آگئیں جنھیں مقتول طاہر کے باپ نے چھری ڈال کر نکال دیا تھا۔ وہ خون سے لتھڑے ہوئے دو بھیانک غار بن کر رہ گئی تھیں۔ انھیں دیکھ کر خوف اور کراہیت محسوس ہوتی تھی۔ رحیم داد سے وہاں نہ ٹھیرا گیا۔ وہ خاموشی سے مہمان خانے کی جانب روانہ ہوگیا۔

☆

بستر پر لیٹ کر رحیم داد دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ بوجھل رات بھی زخمی تھی اور رحیم داد کی نیند بھی زخمی تھی۔ ہوا سسکیاں بھر رہی تھی۔

دن چڑھے جمیلہ مہمان خانے میں آئی۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہوچکا تھا۔ جمیلہ کو دیکھتے ہی اس نے بے چینی سے پوچھا۔ "کادو اور صابر کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟"

"ہاں' عالم آیا تھا۔ بتاتا تھا۔ صابر کی حالت تو زیادہ خراب نہیں' پر کادو کو ابھی تک ہوش نہیں آیا۔"

"کادو کو زخم بھی زیادہ آئے تھے۔ توں نے تو دیکھا ہی تھا۔ سارا بدن خون سے لت پت تھا۔ طاہر کے پیوٗ نے اس کی آنکھیں تو نکال ہی لیں' وہ تو اس کی گردن بھی کاٹ دینا چاہتا تھا۔ بہت ظالم ہے۔"

"یہ غصہ ہتیارا ہوتا ہے۔ اندھا بنا دیتا ہے۔" جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب طاہر کا کتل ہوا تھا' تبھی میں نے کہا تھا' یہ جھگڑا اب کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ویسے کادو اور صابر کتل کے مکدے سے صاف چھوٹ گئے تھے۔ پر طاہر کے پیوٗ' بھائیوں اور شریکوں نے تو بدلہ لینے کا ارادہ نہیں چھوڑا تھا۔ آخر انھوں نے بدلہ لے لیا۔ کادو مرگیا تو صابر اور اس کے چاچے' مامے بدلہ چکائیں گے۔ یہ جھگڑا ایسا ہی چلتا رہے گا۔ جانے کب تک چلے۔" جمیلہ کا چہرہ افسردہ ہوگیا' آنکھیں ویران ہوگئیں۔ وہ پریشان اور مضمحل ہوگئی۔

رحیم داد نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ "زمین دارنی! توں نے اپنے کو کیوں پریشانی میں ڈال لیا؟ ایسے جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کس کس کا دکھ اٹھائے گی۔" اس نے گفتگو کا رخ بدلا۔ "یہ بتا' عالم کدھر ہے؟"

"تو اس سے کادو اور صابر کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے؟"

"نہیں' ان کے بارے میں توں نے بتا ہی دیا۔" رحیم داد نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "میں تو عالم سے اپنی دھوپ کی عینک کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ شہر میں اسے اپنی عینک فریم بدلوانے کے لیے دی تھی۔ پچھلے دنوں فریم کی ایک کمانی ٹوٹ گئی تھی۔ پتہ نہیں' عینک کا کیا بنا۔ اس نے مجھے بعد میں کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"اب تو شام سے پہلے پتہ نہیں چلے گا۔ میں نے عالم کو اللہ وسایا کے پاس بھیجا ہے۔ وہ اسے کادو اور صابر کے بارے میں بتا دے گا۔"

"اللہ وسایا کو اس جھگڑے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ یہ ٹھیک نہیں کیا۔" رحیم داد کو جمیلہ کا اقدام پسند نہیں آیا۔ وہ قادر اور صابر کے معاملے کو اتنی زیادہ اہمیت دینے کے حق میں نہیں تھا۔

"اس میں غلط بات کیا ہوئی؟" جمیلہ کا لہجہ تیکھا تھا۔ رحیم داد کے رویئے سے اس کے احساسات کو ٹھیس پہنچی تھی۔ "کادو کیول مزارع ہی نہیں' اس پنڈ کا رہنے والا بھی ہے۔ مزارع بھی ہوا تو اس سے کیا فرک پڑتا ہے۔ کادو فصل پیدا کرے تو اللہ وسایا زمیں دار بن کر اپنا حصہ لینے تو پہنچ جائے' پر وہ گھائل ہو کر موت کے منہ میں پڑا ہو تو اللہ وسایا اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ نہ اس کی خبر گیری کرے' نہ اس کی مدد کرے' نہ اسے حوصلہ دے۔ تو خود ہی سوچ' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

رحیم داد نے خاموشی سے جمیلہ کی باتیں سنیں۔ لہجے کی تلخی بھی محسوس کی۔ مگر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ جمیلہ بھی کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ وہ اٹھی اور باہر چلی گئی۔ وہ مضطرب اور بے چین نظر آرہی تھی۔

اللہ وسایا رات گئے واپس آیا۔ رحیم داد اس وقت جاگ رہا تھا۔ حویلی کی چھت پر اسے اللہ وسایا کی آواز بھی سنائی دی مگر وہ رحیم داد کے پاس نہیں آیا۔ زیادہ دیر ٹھہرا بھی نہیں۔

وہ کیوں آیا تھا اور کیوں چلا گیا؟ رحیم داد کو دو روز تک کچھ پتہ نہ چلا۔ نہ جمیلہ آئی اور نہ احمد نے کچھ بتایا۔ چوتھے روز اللہ وسایا آیا تو رحیم داد سے اس کی ملاقات ہوئی۔ رحیم داد اپنی بے قراری کی زیادہ دیر پردہ پوشی نہ کر سکا۔ اس نے کرید کر پوچھا۔

"تو منگل وار کی رات کو بھی آیا تھا؟"

”ہاں آیا تو تھا۔“ اللہ وسایا نے بے نیازی سے کہا۔

”میں اس وکت جاگ رہا تھا۔ پر تو ٹھیرا نہیں، تھوڑی ہی دیر بعد چلا گیا تھا۔ کیوں آیا اور کیوں اتی جھیتی چلا گیا، یہ بھید نہ کھلا۔“

”تجھے جمیلہ نے نہیں بتایا؟“

”وہ آج کل نظر ہی نہیں آتی۔ جانے کہاں رہتی ہے۔“ رحیم داد نے جواب دیا۔ ”ویسے یہ تو میں نوں پتہ ہے، وہ تیرے ساتھ نہیں گئی تھی۔“

”سمجھ گیا، وہ تجھے کیوں نظر نہیں آتی۔“ اللہ وسایا نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ ان دنوں کادو کے گھر میں زیادہ رہتی ہے۔ مجیداں اور صابر کی گھر والی کو تسلی دیتی رہتی ہے۔ چوہدری! اسے تو ایسے کاموں کے لیے جیلہ چاہیے۔ وہ کسی کو دکھی دیکھ نہیں سکتی۔“

”اس نے دکھ بھی تو بہت سہے ہیں۔“ رحیم داد نے جمیلہ کی حمایت کی، چند لمحے خاموش رہا پھر دریافت کیا۔ ”یہ تو بتا کادو اب کیسا ہے؟ جمیلہ بتاتی تھی، ایک رات تو اسے ہوش ہی نہیں آیا۔ اسے زخم بھی تو بہت آئے تھے۔ میں نے تو سارا خون خرابہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔“

”کادو کو دوسرے روز بھی ہوش نہیں آیا تھا۔“ اللہ وسایا نے بتایا۔ ”مجھے جیسے ہی پتہ چلا، سیدھا اسپتال پہنچا۔ کادو چپ پڑا تھا۔ صرف سانس لے رہا تھا۔ وہ بھی بہت دھیرے دھیرے۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا، اسے لہور لے جاؤ، شاید بچ جائے۔ ویسے امید کم ہی لگتی ہے۔ میرے پاس وکیل کے زمین دار دوست کی کار تھی۔ میں نے کادو اور صابر دونوں کو اس میں ڈالا۔ جمیلہ بھی اسپتال پہنچی ہوئی تھی۔“

”یہ مجھے پتہ نہیں تھا۔“ رحیم داد نے حیرت سے کہا۔

”میں جمیلہ ہی کو چھوڑنے منگل وار کی رات یہاں آیا تھا۔“ اللہ وسایا نے بتایا۔ ”وہ تو لہور جانے کو بھی کہتی تھی پر میں نے سمجھا بجھا کر اسے روکا۔ دونوں زخمیوں کو لہور لے گیا۔ اسپتال میں داخل کرایا۔ کادو کو تو شام کو ہوش آیا۔ مرتے مرتے بچا ہے۔ اب تو کچھ ٹھیک ہے پر اندھا ہو گیا ہے۔“

”طاہر کے پیئو نے کادو کے سینے پر چڑھ کر میرے سامنے چھری ڈال کر آنکھیں نکالی تھیں۔ کادو ایسا زور زور سے چیخا اور اس کی آنکھوں سے ایسے خون نکلا کہ مجھے متلی ہونے لگی۔ مجھ سے ادھر دیکھا نہ گیا۔“

”عالم نے مجھے بتایا، جمیلہ تو رو پڑی تھی۔“

”صابر تو اب بالکل چنگا ہو گیا ہو گا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”بالکل چنگا تو نہیں ہوا پر اٹھ دس روز بعد اسے اسپتال سے چھٹی مل جائے گی۔ البتہ کادو کو زیادہ دن اسپتال میں رہنا پڑے گا۔“

”حملہ کرنے والوں کے خلاف پولیس نے بھی کوئی کارروائی کی؟“

”تین ملزم تو دوسرے ہی روز گرفتار کر لیے گئے تھے۔ طاہر کا پیئو عطا محمد اور چاچا سلطان محمد ایک روز مفرور رہے، بعد میں وہ بھی پکڑ لیے گئے۔ پانچوں ابھی تک پولیس کی حراست میں ہیں۔ کیس رجسٹر کر کے پولیس نے ابھی عدالت میں چالان پیش نہیں کیا۔“

”ملزموں کے خلاف پرچہ تو نے چاک کرایا تھا؟“

”نہیں! عالم تھانے گیا تھا، اسی نے رپٹ لکھوائی تھی۔ عینی گواہ بھی وہی ہے۔ بعد میں وکیل کے ساتھ میں بھی تھانے گیا تھا۔“

”وکیل نے الاٹمنٹ کے لیے کیا کیا؟“

”ابھی تو کچھ نہیں ہوا۔“ اللہ وسایا نے بتایا۔ ”ادھر تو میں کادو اور صابر کے معاملے میں پھنسا رہا۔“

”اس میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔“ رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نوں اب اسی طرف دھیان دینا ہے۔“ اللہ وسایا نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔

جمیلہ بھی آ گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اللہ وسایا سے پوچھا۔ ”تیں نوں شہر نہیں جانا؟ وکیل انتظار کرتا ہو گا۔“

اللہ وسایا مسکرا کر بولا۔ ”چوہدری سے اسی بارے میں بات کر رہا تھا۔ فکر نہ کر، الاٹمنٹ شاٹمنٹ کا سارا کام کر کے ہی لوٹوں گا۔“

رحیم داد نے جمیلہ سے کہا۔ ”زمین دارنی! کھڑی کیوں ہے؟ آرام سے بیٹھ کے بات کر لے۔“

”چوہدری! اب اسے نہ روک۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اللہ وسایا کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے آج ہی شہر جانا ہے۔“

”پر ابھی تو بہت گرمی ہے۔ ایسے میں یہ کیسے سفر کر سکتا ہے؟“

”جانا تو اسے دن ڈھلے ہے پر کچھ دیر آرام تو کرنا ہو گا۔ سفر بھی لما ہے۔ رات دیر سے پہنچے گا۔“

ایا کھڑا ہو گیا۔ اس نے مسکرا کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ ”چوہدری! یہ زمیں دارنی نہیں

تھانے دارنی ہے۔ اس کی بات تو ماننی ہی پڑے گی۔ اب تجھ سے واپسی پر ملوں گا۔ جیتی نال لوٹنے کی کوشش کروں گا۔" اللہ وسایا دروازے کی جانب بڑھا۔ رحیم داد بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اللہ وسایا باہر گیا۔ جمیلہ بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔

☆

شام کو رحیم داد نہا دھو کر باغ میں گیا۔ خلاف معمول باغ میں خوب چہل پہل تھی۔ گھاس پر قالین بچھا تھا۔ جمیلہ بڑی سج دھج سے قالین پر بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت ہلکا گلابی کرتا اور گلابی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹا بھی اسی رنگ کا تھا۔ اس کا سر دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ کرتے کے گریبان اور آستینوں پر کلابتو کی کشیدہ کاری تھی۔ پیشانی پر جڑاؤ داؤنی جھلملا رہی تھی۔ کانوں میں سونے کے مندرے، گلے میں نگینوں کا ہار اور ہاتھوں میں جڑاؤ کنگن تھے۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔ وہ باوقار اور حسین نظر آرہی تھی۔

جمیلہ کے قریب ہی پھاتاں سیاہ پھلکاری سے سر اور چہرے کا کچھ حصہ چھپائے بکل مارے بیٹھی تھی۔ اس نے بھی غسل کیا تھا۔ اجلی دھوتی باندھی تھی اور اس کے اوپر بوٹی دار سفید جھگا پہنا تھا۔ دونوں کے روبرو کچھ فاصلے پر نیم دائرے میں سات مرد بیٹھے تھے۔ وہ سفید کرتے پہنے ہوئے تھے۔ ان کی دھوتیاں اور پگڑیاں بھی سفید اور اجلی تھیں۔ درمیان میں ایک بوڑھا بیٹھا آہستہ آہستہ حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس کی لمبی سفید ڈاڑھی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور بوڑھا تھا۔ پانچ ادھیڑ تھے۔ ان کی ڈاڑھیوں اور سروں کے بال کھچڑی تھے۔

جمیلہ نے رحیم داد کو آتے ہوئے دیکھا تو مسکرا کر اونچی آواز سے کہا۔ "چوہدری! ادھر ہی آجا۔"

رحیم داد آگے بڑھا اور جمیلہ اور پھاتاں سے ذرا ہٹ کر قالین پر بیٹھ گیا۔ اسے اللہ وسایا نظر نہیں آیا۔ بیٹھتے ہی دریافت کیا۔ "زمیں دار دکھائی نہیں دے رہا کدھر ہے؟"

"وہ تو سہ پہر ہی کو شہر چلا گیا۔" جمیلہ نے رحیم داد کو یاد دلایا۔ "تیرے سامنے ہی تو پروگرام بنا تھا۔"

رحیم داد خفیف ہو کر بولا۔ "مجھے بالکل یاد نہیں رہا۔"

"ویسے اللہ وسایا نے وعدہ کیا تھا، پر تجھے تو پتہ ہی ہے، اسے ضروری کام سے جانا پڑا۔ میں تجھے بلوانے ہی والی تھی۔" جمیلہ نے سامنے بیٹھے ہوئے مردوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تاجاں کے سگن کے لیے دن متھنے آئے ہیں۔ اب کوئی شبھ گھڑی سوچ کر ویاہ کی تاریخ طے کرنی ہے۔"

"یہ ساہے کے لیے آئے ہیں۔" رحیم داد نے مسکرا کر روبرو بیٹھے ہوئے مردوں کو دیکھا۔ "یہ تو نیک کام ہے۔ اس میں دیری کیا کرنی۔"

"لے زمیں دارنی! چوہدری بھی وہی گل کہہ رہا ہے، جو ہم اتنی دیر سے کہہ رہے ہیں۔" سامنے بیٹھے ہوئے سفید ڈاڑھی والے بوڑھے نے حقے کی نے منہ سے ہٹائی اور بے تکلفی سے جمیلہ کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"دیکھ بابے! جلدی نہ کر۔ تاجاں اب پھاتاں کی نہیں، میری دھی ہے۔ میں اس کا ویاہ دھوم دھام سے کروں گی۔ اس کا پیو نہ ہوا تو کیا ہوا، میں تو ہوں۔" جمیلہ نے اپنے سینے پر ہولے سے ہاتھ مارا۔ "تو اس بات کی ذرا چنتا نہ کر۔ میں چاہتی ہوں، تو اپنے پتر کی جنج لے کر آئے تو ذرا موسم اچھا ہو۔ ساری ہی رسمیں رتیاں ہوں۔ ملنی ہو، سٹھنیاں ہوں، چھانتی وکھاونی ہو۔" وہ گردن کو ہلکا سا خم دے کر مسکرائی۔ "چلچلاتی گرمی یا بھری برکھا میں کیا مزا آئے گا۔ جنج چڑھے اور دھوم دھڑکا نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

بوڑھا ہنس کر بولا۔ "ہم نے اڑنا نہیں ہے۔ زمیں دارنی! چل تیری ہی بات اچی۔ توں ہی ویاہ کے لیے دن تاریکھ بتا دے۔ ویسے بھی تاریکھ تو دھی کے گھر والے ہی دیتے ہیں۔"

"ماگھ کیسا رہے گا؟ تین ہی مہینے تو بیچ میں ہیں۔" جمیلہ نے تجویز پیش کی۔ "اس سے تک خریف کی فصل کی واڈھی بھی ہو جائے گی۔ پھٹی کی چنائی ہو چکی ہوگی۔ بہت سہانا موسم ہوگا۔ گلابی سردی ہوگی۔"

"چلو جی ماگھ ہی رہا۔" بوڑھے نے رضامندی کا اظہار کیا۔ "اب تاریکھ طے کرنی ہوگی۔"

"وہ تو زنانیاں ہی بیٹھ کر طے کریں گی۔" جمیلہ نے نظریں جھکا کر قدرے آہستہ سے کہا۔

"تو نے اپنی جٹھرجائی سے اس بارے میں گل بات تو کی تھی۔" ایک ادھیڑ شخص بولا۔ وہ پھاتاں کا بڑا بھائی اور ہونے والا سمدھی 'اللہ یار' تھا۔ "گھر والی کہتی تھی، ماگھ کی سات تاریکھ کی گل ہوئی تھی۔"

"ایسی گل ہوئی تو تھی۔" پھاتاں نے ہچکچاتے ہوئے اعتراف کیا۔ "دن کون سا ہوگا؟" وہ گردن اٹھا کر سوچنے لگی۔

"جمعرات یا جمعے کا دن ہوگا۔ چاند کی ۱۶ یا ۱۷ ہوگی۔" بوڑھے نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور زیر لب مسکرا کر گویا ہوا۔ "ہم نے پہلے ہی حساب لگا لیا تھا۔"

جمیلہ ہنس کر بولی۔ "بابے! ایہہ گل تھی تو پہلے ہی بتا دی ہوتی۔ اتنی دیر جھک جھک کیوں کی؟"

”زمیں دارنی! شادی ویاہ میں تھوڑی جھک جھک بک بک نہ ہو تو مزا نہیں آتا۔“ بوڑھا بدستور مسکراتا رہا۔

”مجھے تو ٹھیک ہی لگتا ہے۔ سمجھو پورن ماشی ہی ہوگی۔ دو دن میں چندرما زیادہ نہیں گھٹتا۔ بھری چاندنی رات ہوگی۔“ جمیلہ نے مڑ کر پھاتاں کی جانب دیکھا۔ ”ٹھیک ہی رہے گا ناں؟“

پھاتاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انگلیوں پر خاموشی سے حساب لگاتی رہی پھر مسکرا کر بولی۔ ”ٹھیک ہے جی! ٹھیک ہے۔ ویسے جو دن ویاہ کا سب نے طے کیا‘ میں نے اس میں کیا بولنا۔“

”تو فیر جی دن تار کھ تو طے ہوگیا۔“ بوڑھے نے یہ کہہ کر ذرا دور بیٹھے ہوئے نائی کی جانب دیکھا جوان کے ساتھ ہی آیا تھا۔ اس نے اونچی آواز سے کہا۔ ”دینے! ٹوکرا لے آ۔“

نائی نے قریب رکھا ہوا مٹھائی کا ٹوکرا سنبھالا اور آگے بڑھ کر بوڑھے کے سامنے رکھ دیا۔ بوڑھے نے ٹوکرے کے اوپر رکھا ہوا رنگ برنگے سوت کا کلاوا اٹھایا۔ اس میں دو گرہیں لگائیں اور ٹوکرے پر رکھ دیا۔ نائی نے جھک کر مٹھائی کا ٹوکرا پھر اٹھایا اور جمیلہ کے آگے رکھ دیا۔ جمیلہ نے اسے پانچ روپے لاگی کے دیئے۔ لاگی لے کر وہ اونچی آواز سے دعائیں دیتا ہوا اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔

جمیلہ نے پیچھے کھڑے ہوئے ملازم کو شربت لانے کا اشارہ کیا۔ شام کا دھندلکا پھیل گیا تھا۔ باغ میں گیس بتی روشن کردی گئی تھی۔ اس کی تیز روشنی میں بوڑھے نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو دوسروں نے بھی ہاتھ اٹھادیئے۔ دعا کے بعد سب کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ذرا دیر میں دودھ کا شربت آگیا۔ جمیلہ نے اپنے ہاتھ سے شربت کا گلاس بوڑھے کو پیش کیا۔ اس نے گلاس لیتے ہوئے بڑی شفقت سے کہا۔

”زمیں دارنی! تو جتنی سوہنی ہے‘ اتنی ہی بھلی اور نیک بھی ہے۔ ربّا تیں نوں زمیں دارنی سے رانی بنائے۔ تیرے لیے تو اندر سے دعا ہی دعا نکلتی ہے۔“

پھاتاں کے بھائی نے بھی جمیلہ کو کلمہ خیر سے یاد کیا۔ ”تیری ایسی زمیں دارنی تو نہ دیکھی‘ نہ سنی۔ کون وڈا زمیں دار مزارعوں کے ساتھ ایسا میل جول رکھتا ہے۔ انھیں اس طرح اپنے ساتھ بٹھاتا ہے۔ ان کی آؤ بھگت کرتا ہے۔“

جمیلہ نے کچھ نہ کہا۔ مسکرا مسکرا کر سب کے سامنے خود ہی گلاس بھر بھر کر شربت رکھا۔ پھاتاں نے اس کا ہاتھ بٹانا چاہا تو جمیلہ نے اسے پیار سے ڈانٹ دیا۔ ”چپ کر کے بیٹھی رہ۔ ابھی تیں نوں بہت کام کرنے ہیں۔“

سب مہمانوں نے شربت پیا۔ رحیم داد نے بھی پیا۔ شربت پینے کے کچھ دیر بعد گھاس پر دری ڈالی گئی۔ اس پر دستر خوان بچھایا گیا۔ نوکروں نے نہایت مستعدی سے کھانا چنا۔ سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر مہمانوں نے واپس جانے کی خواہش کا اظہار کیا مگر جمیلہ نے اصرار کر کے انھیں روک لیا۔

حویلی کے سامنے کے میدان میں خوب چھڑکاؤ کیا گیا۔ چارپائیاں بچھا کر اجلے بستر لگا دیے گئے اور یہ طے ہوا کہ مہمان رات بسر کرنے کے بعد سویرے تاروں کی چھاؤں میں اپنے گاؤں واپس چلے جائیں گے۔

پھاتاں‘ بیٹی کا رشتہ اس شان سے طے ہو جانے پر بہت خوش تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ مسرت جمیلہ کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔ وہ بات بات پر ہنستی‘ مہمانوں کی دل جوئی کرتی۔ رات گئے تک محفل جمی۔ پھر سب سونے چلے گئے۔ رحیم داد بھی ساہے کی رسم میں شریک ہو کر بہت خوش تھا۔ اس رات وہ بستر پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا۔

دوسرے روز مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد جمیلہ پھاتاں کے گھر گئی اور تاجاں کو اپنے ہم راہ حویلی میں لے آئی۔ اب وہ ساہے بندھی لڑکی تھی اور ایسی لڑکی گھر کی لاج اور عزت ہوتی ہے۔ نہ وہ کھیتوں پر جاسکتی ہے نہ پانی بھرنے کنوئیں یا پنگھٹ پر۔ اسے گھر کی دہلیز سے آگے قدم نکالنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ تاجاں حویلی میں آنے کے بعد جمیلہ کے لیے امانت بن چکی تھی۔ وہ حویلی کی چار دیواری سے باہر صرف اپنے دولہا کے ساتھ ہی رخصت ہو کر جاسکتی تھی۔

☆

گرمی کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گئی تھی۔ صبح ہی سے لو چلنے لگتی۔ دوپہر ہوتے ہوتے ہر طرف سناٹا چھا جاتا۔ گاؤں کا جوہڑ دن بھر بھینسوں سے بھرا رہتا۔ وہ کیچڑ اور پانی میں لیٹی جگالی کرتی رہتیں۔ اللہ وسایا ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ ایک شام جمیلہ باغ میں بیٹھی تھی۔ رحیم داد بھی موجود تھا۔ فضا بوجھل اور مٹیالی تھی۔ جمیلہ مسکرا مسکرا کر رحیم داد کو تاجاں کی شادی کی تیاریوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مسرت کی ایسی لہریں مچل رہی تھیں جیسے وہ اپنی سگی بیٹی بیاہنے جا رہی ہو۔ اسی اثنا میں قادر کی بیوی آگئی۔ اس کا چھوٹا بھائی سردار بھی ہم راہ تھا۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کا مضبوط اور توانا جوان تھا۔ مونچھیں نوکیلی اور گھنی تھیں‘ چہرہ کسی قدر کرخت تھا۔

جمیلہ نے قادر کی بیوی سے پوچھا۔ ”تو لہور ہی سے آرہی ہے ناں؟ کادو اور صابر اب کیسے ہیں؟“

”اب تو دونوں ٹھیک ہی ہیں۔ صابر کو جلد ہی اسپتال سے چھٹی مل جائے گی۔“ قادر کی بیوی نے

جواب دیا اور مڑکر سردار کی جانب دیکھا۔ ”بھین جی! یہ نئی کھبر لایا ہے۔ میں اسی کے بارے میں تجھے بتانے آئی ہوں۔“

جمیلہ نے قادر کی بیوی کو نظرانداز کرتے ہوئے براہ راست سردار سے دریافت کیا۔ ”کیا نئی خبر لایا ہے؟ کوئی پریشانی کی گل تو نہیں؟“

”پریشانی ہی کی گل ہے جی!“ سردار نے بتایا۔ ”عطا محمد اور اس کے ساتھ کے چاروں دوسرے ملزم ضمانت پر چھوٹ گئے ہیں۔“

”ضمانت پر تو انھیں چھوٹنا ہی تھا۔ اس میں پریشانی کی کون سی گل ہوئی؟“

”تیرے لیے یہ پریشانی کی گل ہی نہیں ہے۔“ سردار کا لہجہ قدرے تیکھا تھا۔ ”تیں نوں تو پتہ ہی ہے‘ انھوں نے کادو کی آنکھیں نکال لی ہیں۔ یہ معمولی جرم نہیں۔ اس پر تو ان کی ضمانت ہی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ عطا محمد کی تو بالکل نہیں ہونی چاہیے تھی۔ مگر پانچوں کی نہ صرف ضمانت ہو گئی بلکہ اتنی جھیتی ہو گئی کہ ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔ ہر طرف بڑھکیں مارتے پھر رہے ہیں۔“

”اب کیا کرسکتے ہیں وہ؟“ جمیلہ نے دریافت کیا۔

”میں نے سنا ہے جی! وہ کادو اور صابر پر دوبارہ حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہی پریشانی کی گل ہے۔“

”ان کی طرف سے ایسا خطرہ ہو تو سکتا ہے۔“ رحیم داد نے بھی سردار کے خدشات کی تائید کی۔

”پر کادو اور صابر تو سرکاری اسپتال میں ہیں۔“ جمیلہ نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ ”وہ اسپتال میں گھس کر کیسے حملہ کرسکتے ہیں؟“

”بالکل کرسکتے ہیں۔“ سردار نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ”تیں نوں ان کے بارے میں اندازہ نہیں‘ وہ کتنے خطرناک ہیں۔ کہتے ہیں‘ طاہر کے خون کا تو ابھی بدلہ لینا ہے۔ وہ تو کادو اور صابر کا خون کرنے کے بعد ہی پورا ہو گا۔“

”تو اب کیا کرنا ہو گا؟“ جمیلہ کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ ”اللہ وسایا بھی موجود نہیں۔ میں کل ہی صبح اس کی طرف کسی نوکر کو بھیج دوں گی۔ وہ اسے سب کچھ بتا دے گا۔ کیوں نہ تم دونوں نوکر کے ساتھ اللہ وسایا کے پاس چلے جاؤ۔ اسے خطرے سے آگاہ کردو۔“

”زمیں دارنی! تو فکر نہ کر۔“ سردار نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ ”میں اور میرا بھائی ابھی موجود ہیں۔ صابر کا چاچا اکبر بھی ہے۔ اور بھی اپنے شریکے ہیں۔ ڈٹ کر سامنا کریں گے۔ ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔ دیکھیں وہ کادو اور صابر پر کیسے حملہ کرتے ہیں۔ اس بار ایک بھی ان میں سے بچ کر نہیں جائے گا۔“

”یہ تو ٹھیک نہیں ہو گا۔“ جمیلہ اور پریشان ہو گئی۔ اس نے جھگڑا ختم کرنے کی غرض سے تجویز پیش کی۔ ”پنچایت بھیج کر صلح صفائی نہیں ہو سکتی؟“

”میں نوں پتہ ہے‘ وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ وہ خون خرابہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔“ قادر کی بیوی نے خدشہ ظاہر کیا۔

رحیم داد نے جمیلہ کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”پر کوشش تو کرنی چاہیے۔“

”اس میں برائی کیا ہے؟“ جمیلہ بولی۔ ”پنچایت تو میں اپنی طرف سے بھیجوں گی۔ تمھاری آن پر کوئی آنچ نہیں آئے گی؟“

”آئے گی تو۔ وہ یہی کہیں گے‘ کادو اور اس کے شریکے ڈر گئے۔“ سردار بولا۔ ”پر تیری بات بھی ماننی ہے۔ یہی چاہتی ہے تو کوشش کرکے دیکھ لے۔“

”یہ تو ہوتا رہے گا۔ پر تم کو چوکس رہنا پڑے گا۔“ رحیم داد نے سردار کو خبردار کیا۔

”میں اسی لیے تو یہاں آئی ہوں۔“ قادر کی بیوی نے کہا۔ ”ضمانت کی خبر ملتے ہی میں سردار کے ساتھ لہور سے چل کھڑی ہوئی۔ آج ہی شام تیاری کرکے سب کے ساتھ واپس جانے کا ارادہ ہے۔ تجھے تو بتانے آئے تھے۔ ویسے صابر کے چاچا اور اپنے ویر کو لہور چھوڑ کے آئی ہوں۔“

”اب تو اندھیرا ہو گیا۔ کل سویرے جانا۔“ جمیلہ نے کہا۔

”نہیں‘ بھین جی! ہم نے آج ہی جانا ہے اور ابھی جانا ہے۔“ قادر کی بیوی آمادہ نہیں ہوئی۔ ”لہور ہم نے جھیتی نال پہنچ جانا چاہیے۔“

رحیم داد نے بھی اس کی تائید کی۔ ”زمیں دارنی! انہیں نہ روک‘ جانے دے۔ تیں نوں پنچایت بھیجنی ہے تو کل یا پرسوں تک بھیج دینا۔“

”نہیں۔“ جمیلہ نے کہا۔ ”پنچایت تو میں کل سویرے ہی بھیجنے کی کوشش کروں گی۔ اس معاملے میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔“

”جیسی تیری مرضی۔“ قادر کی بیوی نے کہا۔ ”ہم نے اب جانا ہے۔“

جمیلہ اور رحیم داد خاموش رہے۔ قادر کی بیوی اپنے چھوٹے بھائی کے ہم راہ چلی گئی۔ شام کا دھندلکا گہرا ہو گیا تھا۔ جمیلہ بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہری۔ وہ حویلی کی جانب روانہ ہو گئی۔ مگر رحیم داد باغ ہی میں بیٹھا رہا۔ اس نے کھانا بھی وہیں کھایا۔ رات گئے وہ مہمان خانے کی چھت پر جاکر سو گیا۔

”مجیداں کے مامے چاچے کو پتہ چلے گا تو غصے سے پاگل ہو جائیں گے۔ یہ ان کی عزت اور آن کا معاملہ ہے۔ وہ پہلے ہی جوش میں تھے‘ اب تو ان کے آگ ہی لگ جائے گی۔“ رحیم داد نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ”وہ مجیداں کو واپس لانے کی ضرور کوشش کریں گے۔“

”مجیداں کو واپس لانا اب آسان نہیں رہا۔“

”یہ تو مجھے بھی اندازہ ہے۔ پر مجیداں کے گھر والے اور شریکے چپ کر کے تو نہیں بیٹھیں گے۔ کسی نہ کسی طور ضرور بدلہ لینے کی کوشش کریں گے۔ پہلے اتنا خون خرابہ نہیں ہوا‘ جتنا اس دفعہ ہو گا۔ دونوں ہی پارٹیاں ایک دوسرے کو ختم کرنے کے لیے تیار ہیں۔“

”سویرے سے اب تک میں اسی بارے میں سوچتی رہی۔“

”تو نے کوئی فیصلہ بھی نہیں کیا؟ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ زمیں دار کو بھی کچھ بتانا نہیں چاہتی اور خود بھی کچھ کرنا نہیں چاہتی۔ اب بنے گا کیا؟“

”ایک ہی گل سمجھ آتی ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“ رحیم داد نے مضطرب ہو کر دریافت کیا۔

”طاہر کے پیو عطا محمد کے پاس پنچایت بھیجی جائے۔“

”تو سمجھتی ہے وہ پنچایت کی بات مان لے گا؟“ رحیم داد نے اپنے شک و شبہ کا اظہار کیا۔ ”اب تو مشکل ہی لگتا ہے‘ مجیداں جو ان کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اسے ہرگز واپس نہیں کریں گے۔ سارا جھگڑا تو اسی کا ہے۔“

”میں خود پنچایت لے کر جاؤں گی۔ تو بھی میرے ساتھ چلنا۔“

”زمیں دارنی تو پنچایت لے کر کیسے جا سکتی ہے۔“ رحیم داد کا لہجہ قدرے تیکھا تھا۔ ”وہ مزارعے ہیں۔ تیرے نہ سہی کسی اور کے تو ہیں۔ سمجھے تو مزارعے ہی جائیں گے۔ اور تو ٹھہری زمین دارنی۔ تیرا جانا بالکل ٹھیک نہیں۔ یہ بات تو اپنے دل سے نکال دے۔“

”تجھے زمیں داری کی ایسی ہی شان ہے تو نہ جا‘ پر میں تو جاؤں گی۔“

”یہ شان اور گھمنڈ کی گل نہیں۔ پر عزت کا بھی تو کچھ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو مزارعے اور زمیں دار میں فرک ہی کیا رہا۔“

”تیرا مطلب ہے‘ عزت اور مان کے کارن میں چپ کر کے خون خرابہ ہوتے دیکھتی رہوں۔“ جمیلہ نے رحیم داد کی دلیل سختی سے مسترد کر دی۔ ”میں چلی جاؤں گی تو ہو سکتا ہے‘ عطا محمد اور اس کے شریکے صلح صفائی پر راضی ہو جائیں اور مجیداں کو واپس بھیج دیں۔ میں انھیں سمجھانے بجھانے کی کوشش کروں گی۔ میں نے سنا ہے‘ عطا محمد کا پیو بہت نیک بندہ ہے۔ کلا نور خاں موضع ہے۔ اس کے سارے ہی مزارعے اور زمیں دار عطا محمد کے پیو کی بہت عزت کرتے ہیں۔ وہ میری بات ضرور مان لے گا۔“

”اور جو تیری پنچایت کی بات نہ مانی گئی تو؟“

”تو کیا ہو گا؟ آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔ کوشش تو کر کے دیکھ ہی لینا چاہیے۔“ جمیلہ بے نیازی سے بولی۔ ”میری عزت اور آن ایسے نہیں جاتی۔ تیں نوں کیہہ پتہ‘ میں نے عزت اور لاج کو برباد ہوتے کیسے کیسے دیکھا ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”چوہدری! یہ عزت اور شان کا بھی عجب چکر دیکھا۔ جب سے یہ سب کچھ دیکھا ہے‘ میرا تو عزت اور آن پر سے وشواس ہی اٹھ گیا۔“

”تیری یہی مرضی ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ رحیم داد نے جمیلہ کے عزم کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ”یہ بتا‘ کب تک پنچایت لے جانے کا ارادہ ہے؟“

”یہ کام تو جھیتی نال ہونا چاہیے۔ کل سویرے ہی چلیں گے۔ روانگی سے پہلے کسی بندے کو بھیج کر عطا محمد کو اطلاع کرا دیں گے۔“ جمیلہ نے اپنا پروگرام بتایا۔ ”اور ہاں‘ تو نے اپنے جانے کے بارے میں کیا سوچا؟“

”جب تو جا رہی ہے تو میں بھی تیرے ساتھ چلا جاؤں گا۔“ رحیم داد نے اظہار رضامندی کیا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد جمیلہ نے رحیم داد کے ساتھ ہی باغ میں کھانا کھایا۔

کھانے سے فارغ ہو کر جمیلہ نے گاؤں کے ان بڑے بوڑھوں کو بلایا‘ جنھیں پنچایت میں شریک کر کے اپنے ہم را موضع کلا نور خاں لے جانا چاہتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ رات گئے تک صلاح مشورہ کرتی رہی۔

سویرے سویرے اس نے اپنے ایک ملازم کو عطا محمد کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ پنچایت کی آمد سے اسے مطلع کر دے۔ دن چڑھے اس نے تین تانگے بلوائے۔ سب اس میں سوار ہوئے۔ پنچایت اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔ کلا نور خاں لگ بھگ نو میل تھا۔

جمیلہ کی سربراہی میں پنچایت جب عطا محمد کے گاؤں میں داخل ہوئی تو سورج آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ چکا تھا۔ گرمی شباب پر تھی‘ البتہ لو نہیں چل رہی تھی۔ حبس اور امس سے سب پسینے میں شرابور تھے۔

تانگے گاؤں کے گلی کوچوں سے گزرتے ہوئے عطا محمد کے گھر پہنچے۔ جمیلہ نے دیکھا‘ گھر کے

سامنے ایک درخت کے نیچے گاؤں کے کچھ بوڑھے اور جوان جمع ہیں۔ ان میں عطامحمد بھی شامل تھا۔ سب خاموش تھے۔ ان کے چہروں پر افسردگی تھی، سنجیدگی تھی۔ ایک کانسٹیبل بھی موجود تھا۔ اسے دیکھ کر رحیم داد پریشان اور خوف زدہ ہوگیا۔

جمیلہ تانگے سے نیچے اتری۔ رحیم داد اور دوسرے لوگ بھی اترے۔ عطامحمد نے جمیلہ کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا، آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا۔ سرجھکا کر بجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ "زمیں دارنی! تو جسے لینے آئی تھی، اس نے تیرا انتظار بھی نہیں کیا۔ وہ چلی گئی۔"

جمیلہ نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ "تیرا مطلب مجیداں سے ہے؟ وہ کہاں چلی گئی؟ کس کے پاس چلی گئی؟"

ایک بوڑھے نے اپنی لمبی سفید ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بتایا۔ "وہ اپنے رب کے پاس چلی گئی۔ جس کی امانت تھی، اسی کے پاس پہنچ گئی۔ ایک دن سب کو وہیں جانا ہے۔" وہ کلا نور خاں کی مسجد کا ملا تھا۔

جمیلہ اور زیادہ پریشان ہوگئی۔ اس نے عطامحمد سے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے؟" اس نے قدرے تامل کیا۔ "لگتا ہے، تونے اس کا خون کردیا۔ طاہر کا بدلہ مجیداں سے لے کر تونے ٹھیک نہیں کیا۔ وہ تو پہلے ہی بہت دکھی تھی۔ وہ ابھاگن تو خود اپنی آگ میں اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔" اس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ "کہاں ہے وہ؟ کدھر ہے اس کی لاش؟"

"اندر منجی پر پڑی ہے۔" عطامحمد دل گرفتہ ہو کر بولا۔ "زمیں دارنی! تو بھی پولیس کی طرح مجھ پر شبہ کر رہی ہے؟ میں نے اس کا خون نہیں کیا۔ اس نے رات کو اپنے کپڑوں پر لالٹین سے تیل چھڑک کر آگ لگالی اور جل کر مرگئی۔ اس کا کسی نے خون نہیں کیا۔ جا اندر جا کر دیکھ لے۔"

جمیلہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ گھر کے اندر چلی گئی۔ آنگن کے ایک طرف چھپر کے نیچے چارپائی پر سیاہ چادر بچھی تھی۔ اس کے نیچے مجیداں کی لاش تھی۔ چارپائی کے قریب چٹائی پر دو بوڑھی عورتیں سرجھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔ ہر طرف جلے ہوئے گوشت کی بو پھیلی تھی۔ جمیلہ آگے بڑھی اور چارپائی کے سرہانے کھڑے ہو کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

☆

آسمان دھواں دھواں تھا۔ فضا نڈھال اور بوجھل تھی۔ باغ میں جمیلہ خاموش بیٹھی تھی۔ رحیم داد بھی موجود تھا۔ جمیلہ کا شگفتہ اور حسین چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ وہ دیر تک نظریں جھکائے کچھ سوچتی رہی پھر اس نے گردن اونچی کر کے رحیم داد کو دیکھا اور بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"چوہدری! سمجھ نہیں آتی، اللہ وسایا اب تک کیوں نہیں لوٹا؟ اسے گئے ہوئے دس بارہ روز ہوگئے۔"

"کام میں پھنسا ہوگا۔ الاٹمنٹ کرانی آسان نہیں۔ لما چکر ہوتا ہے۔"

"پر اس نے کوئی اطلاع نہیں بھیجی؟ پہلے تو اس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔" جمیلہ کے چہرے پر غم کا ہلکا ہلکا سایہ پھیلنے لگا۔ "سویرے سے جانے کیوں میرا من بے کل ہے۔ بار بار رونے کو جی چاہتا ہے۔"

"زمیں دارنی! تو بہت جلد گھبرا جاتی ہے۔ پریشان نہ ہو، وہ دو چار دن میں آجائے گا۔" رحیم داد بے تکلفی سے مسکرایا۔ "لگتا ہے، تجھے اللہ وسایا سے بہت پیار ہے۔"

"ہے تو۔" جمیلہ نے سر دوپٹے کے آنچل سے ڈھانکا اور شرما کر نگاہیں نیچی کرلیں۔ "وہ میرے بچوں کا پیو ہے۔ اٹھ سال سے میرا اس کا ساتھ ہے۔ مجھے ذرا زراش دیکھتا ہے تو گھبرا جاتا ہے۔ پوچھتا ہے، جی لے! تجھے کیا ہوگیا؟ تو اتنی پریشان کیوں ہے؟ جب وہ میرے لیے اتنا بے کل ہو جاتا ہے تو میں اس کے لیے کیوں نہ چنتا کروں؟ چوہدری، تالی تو دونوں ہاتھ سے بجتی ہے نا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے پر تجھے خاماخا اتنا پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ چند روز انتظار کرلے۔ وہ واپس آتا ہی ہوگا۔ حوصلے سے کام لے۔"

"میں اس کا کل تک اور انتظار کروں گی۔" جمیلہ نے اپنا عندیہ بتایا۔ "اگر وہ چراغ جلے تک نہ پلٹا تو میں شام کو حویلی سٹیشن چلی جاؤں گی۔ یہاں سے حویلی سٹیشن نزدیک ہی ہے۔ دونوں بچوں اور ایک نوکر کو ساتھ لیتی جاؤں گی۔ رات کی ٹرین سے کھسور کے رستے رائے ونڈ ہوتی ہوئی لہور پہنچ جاؤں گی۔"

"تیں نوں پتہ ہے، وہ لہور ہی میں ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ "وہ ملتان میں بھی ہو سکتا ہے۔"

"مجیداں کا ماما، سردار پرسوں آیا تھا۔ بتاتا تھا، اللہ وسایا کو اس نے لہور میں دیکھا تھا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ جمیلہ کھڑی ہوئی، آگے بڑھی اور جھٹ پٹے میں درختوں کے نیچے اوجھل ہوگئی۔ وہ بڑی بے قرار نظر آرہی تھی۔ اسے اس طرح پریشان دیکھ کر رحیم داد کو بھی اللہ وسایا کے بارے میں تشویش ہوئی۔

دوسرے روز سہ پہر کو رحیم داد ٹہلتا ہوا کھیتوں کی جانب چلا گیا۔ کماد اور کپاس کے پودے ہاتھ ہاتھ بھر اونچے ہوگئے تھے۔ ان کے پتوں سے خاک کے ذرے چمٹے ہوئے تھے۔ مکئی کے پودوں پر پھل

چلا کر ڈنٹھل توڑے جا رہے تھے تاکہ زیادہ شاخیں پھوٹیں اور زیادہ بٹے لگیں۔ جیٹھ کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ چلچلاتی گرمی کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ فضا ہنوز غبار آلود تھی۔ سانس لیتے ہوئے گھٹن محسوس ہوتی۔ دھوپ میلی اور مٹیالی تھی۔ سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔

رحیم داد باغ میں پہنچا۔ جمیلہ پہلے سے وہاں تھی۔ موسم گرما کی سلگتی شام کے دھندلکے میں جمیلہ کا چہرہ مٹیالے آسمان کے مانند اجڑا اجڑا لگ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جمیلہ نے بتایا کہ وہ گھنٹے سوا گھنٹے میں لاہور روانہ ہو جائے گی۔ اتنا بتا کر وہ پھر چپ ہو گئی۔

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ شام دھیرے دھیرے نیچے اتر رہی تھی۔ سناٹا بڑھتا جا رہا تھا۔ یکایک قریب بیٹھے ہوئے نوکروں میں سے ایک کی آواز ابھری۔

"لو جی' زمیں دار تو آ گیا۔"

جمیلہ بے چین ہو کر کھڑی ہو گئی۔ ذرا دیر بعد اللہ وسایا درختوں کے ایک جھنڈ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ جمیلہ نے اسے دیکھا تو جہاں تھی' وہیں کھڑی رہ گئی۔ اللہ وسایا آہستہ آہستہ نزدیک آ گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چہرہ اور کپڑے خاک سے اٹے ہوئے تھے۔ جمیلہ کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ "مجھے پتہ تھا' تو ادھر ہی ہو گی۔ سامان نوکروں کے حوالے کیا اور سیدھا تیرے پاس چلا آیا۔" جمیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بت بنی کھڑی رہی۔

اللہ وسایا نے اس کا سنجیدہ اور سپاٹ چہرہ دیکھا اور بے تکلفی سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "کیا بات ہے جمی لے! بہت ناراض لگ رہی ہے۔" اس کے لہجے میں پیار کی مٹھاس تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تجھے میری ناراضی کی کیوں چنتا ہونے لگی۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے تیکھے لہجے میں بولی۔ "توں' تو لہور میں عیش کر رہا تھا۔"

"لے چوہدری' اس کی گل سن۔" اللہ وسایا نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "کہتی ہے' میں لہور میں عیش کر رہا تھا۔ یہ تو پوچھا نہیں' میں اتنے دنوں کیسے کیسے چکروں میں پھنسا رہا۔"

"تو نے بتایا تھا؟" جمیلہ نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر ترچھی نگاہوں سے اللہ وسایا کو دیکھا۔ "کسی نوکر ہی کو بھیج کر اپنی خیر خبر بھجوا دیتا۔ میں نے تو تیرے پاس پہلے ہی ایک نوکر اور بھجوا دیا تھا۔"

"ہاں جی' اپنے سے یہ غلطی ہو گئی۔" اس نے آہستہ آہستہ سر ہلا کر نہایت معصومیت سے اعتراف کیا۔ "لے اب غصہ تھوک دے۔ لسی شربت پلا' سخت پیاس لگی ہے۔"

جمیلہ نے سامنے کھڑے ہوئے ایک ملازم کو لسی لانے کی ہدایت کی اور اللہ وسایا سے پوچھا۔ "یہ تو بتا' جس کام سے تو لہور گیا تھا' اس کا کیا بنا؟"

اللہ وسایا نے ہنس کر جواب دیا۔ "فکر نہ کر۔ تیں نوں خوش خبری ہی سناؤں گا۔"

جمیلہ نے کرسی کھسکا کر اللہ وسایا کے قریب کر لی۔ "کیا خوش خبری سنانا چاہتا ہے؟"

"سارا ہی کام ٹھیک ہو گیا۔"

"کیا کیا ہو گیا؟" جمیلہ نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

"چوہدری کے نام حویلی اور اڑھائی سو ایکڑ زمین کی الاٹمنٹ ہو گئی۔ خریدے ہوئے کلیم کی بنیاد پر اپنی ۱۲ مربع زمین کی بھی تیرے نام الاٹمنٹ ہو گئی۔" اللہ وسایا نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "لے بھئی چوہدری تجھے حویلی اور دس مربع زمین کی الاٹمنٹ مبارک ہو۔"

"میرا کیا ہے اللہ وسایا! سب تیرا ہی ہے۔ تیری ہی کوششوں سے اور تیرے ہی خرچے سے سب کچھ ہوا ہے۔" رحیم داد نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اب یہ میرا تیرا چھوڑ۔ مجھے تیری یہ گل چنگی نہیں لگی۔ آگے ایسی گل نہ سوچنا۔ مجھے دکھ ہو گا۔"

"تو برا مناتا ہے تو نہیں کہوں گا۔" اللہ وسایا نے بے نیازی سے قہقہہ لگایا۔ "پر یہ ضرور سن لے' احسان شاہ تڑپ کر رہ گیا۔ اس کے تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔ وہ بھی لہور پہنچا ہوا تھا۔ بہت بڑھکیں مار رہا تھا۔ اس نے تو اپنے تئیں حویلی اور زمین کو اپنی ہی ملکیت سمجھ لیا تھا۔ پر ہائی کورٹ کے حکم امتناعی نے اس کا سارا کھیل بگاڑ دیا۔ ویسے جی اپنا وکیل بھی بہت زوروار ہے۔ اس نے ادھر حکم امتناعی لیا اور دوسری طرف فٹافٹ الاٹمنٹ کی درخواست بھی لگا دی۔ کبضہ تو اپنا تھا ہی' اس نے بہت کام کیا۔ احسان شاہ نے بہت زور لگایا' الاٹمنٹ نہ ہو پر اس کی ایک نہ چلی۔" اللہ وسایا نے مڑ کر جمیلہ کو دیکھا' محبت سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ "اب تو تیں نوں پتہ چل گیا۔ اتنی دیر کیوں ہوئی؟ الاٹمنٹ کے چکر میں دن رات پھنسا رہا' اتنا بھی ہوش نہ رہا کہ اپنی خیر خبر بھجوا دیتا۔ ویسے یہ بات بھی تھی' میں الاٹمنٹ ملنے کی خوش خبری تجھے خود سنانا چاہتا تھا۔ تو سن کر خوش تو ہو جاتی پر یہ مزا نہ آتا جواب آ رہا ہے۔"

"تجھے کیا پتہ' تیرا انتظار کرتے کرتے میں کتنی بے کل رہی۔ ہر سے تیرا دھیان رہتا۔ بار بار من گھبراتا۔ رات کو سوتے سوتے گھبرا کر اٹھ بیٹھتی۔ پر تو یہ باتیں کیوں سوچنے لگا۔" جمیلہ نے گلہ کیا۔ "میں تو آج ہی شام بچوں کے ساتھ تیرے پاس لہور پہنچنے والی تھی۔ چوہدری سے پوچھ لے۔ اسے سب پتہ ہے۔ ساری تیاری کر لی تھی۔" وہ گردن کو خم دے کر ایک خاص ادا سے مسکرائی۔ "اللہ

وسایا! تو نے اس بار مجھے بہت تنگ کیا۔"

"روئی تو نہیں تھی؟" اللہ وسایا نے ہنس کر پوچھا۔

"روئی بھی تھی پر مجیداں کے لیے۔" جمیلہ کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "تجھے تو پتہ چل گیا ہوگا۔ اس نے کپڑوں میں آگ لگا کر خود کشی کر لی۔"

"مجھے تو یہ بھی ملوم ہوگیا کہ پولیس نے مجیداں کی موت پر عطا محمد اور اس کے بھائی کو کتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ مجھے الاٹمنٹوں کے چکر سے جب بھی فرصت ملتی، کادو اور صابر کو دیکھنے اسپتال چلا جاتا۔ وہیں مجھے مجیداں کے چاچا، اکبر نے یہ خبر دی۔ میں تو پنڈ واپس آنا چاہتا تھا پر ان دنوں روز ہی پیشی لگ رہی تھی۔ حاضر نہ ہوتا تو کام بگڑنے کا ڈر تھا۔ احسان شاہ ضرور گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔"

"خیر تو ٹھیک ہی ہوا، جو تو نہیں آیا۔ تجھے دکھ ہی ہوتا۔" جمیلہ کی آواز بھرا گئی۔ "پوسٹ مارٹم کے بعد لاش پنڈ میں آئی تو سبھی رو پڑے۔ سنا ہے، جب اسے قبر میں اتارا گیا تو کہرام مچ گیا۔ ہائے، کیسی ابھاگن تھی مجیداں۔" اس نے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو پونچھے۔

"اس کا جیون تو دکھ جھیلتے ہی کٹا۔ کیسا کیسا اس پر اپراده ہوا۔ زندہ رہنے کو اس کے پاس رہ ہی کیا گیا تھا۔ سب کچھ تو ملیا میٹ ہوگیا تھا۔"

"بہت ظلم ہوا جی اس کے ساتھ۔" رحیم داد نے جمیلہ کی تائید کی۔

"ویسے مر کر اس کی مکتی ہوگئی۔ سارا جھگڑا تو اسی کے کارن تھا۔" جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔

"وہ تو جان سے گئی پر جھگڑا تو جہاں تھا، ابھی تک وہیں ہے۔" اللہ وسایا نے کہا۔

"اب تو اسے ختم ہوجانا چاہیے۔" جمیلہ نے مشورہ دیا۔ "اللہ وسایا! جھگڑا چکانے کے لیے صلح صفائی کرا دے۔ جھگڑا ختم نہ ہوا تو آگے نہ جانے کتنے اور خون ہوں گے۔"

"یہ تو پنچایت لے کر مجیداں کو واپس لانے کے لیے طاہر کے پیو کے پاس گئی بھی تھی۔" رحیم داد نے اللہ وسایا کو مطلع کیا۔

"کیا بنا پنچایت کا؟" اللہ وسایا نے دریافت کیا۔

"بننا کیا تھا۔ جسے لینے گئی تھی وہی نہ رہی۔ پر جھگڑا ختم کرنے کے لیے تیں نوں کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔"

"تو کہتی ہے تو ضرور کوشش کروں گا۔" اللہ وسایا نے جمیلہ کو اطمینان دلایا۔

"کادو اور صابر کا کیا حال ہے؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"صابر کو تو اسپتال سے چھٹی مل گئی۔ میرے ساتھ ہی واپس آیا ہے۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "کادو ابھی کچھ دن اسپتال ہی میں رہے گا۔ اس کی گھر والی اور چھوٹا بھائی دیکھ بھال کے لیے لہور ہی میں ہیں۔"

نوکر لسی لے کر آگیا۔ اللہ وسایا نے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور خالی کر دیا۔ نوکر گلاس اٹھا کر چلا گیا۔ جمیلہ نے کہا۔ "اللہ وسایا! اب تو نہا لے۔ دیکھ تو تیرے بدن اور کپڑوں پر کتنی گرد جمی ہے۔"

وہ خاموشی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ جمیلہ بھی کھڑی ہوگئی۔

دونوں حویلی کی جانب روانہ ہوگئے۔ رحیم داد بیٹھا رہا۔ اندھیرا بڑھ گیا۔ نوکروں نے لیمپ جلا کر اسٹول پر رکھ دیا۔

اللہ وسایا نہا دھو کر اجلے کپڑے پہنے ہوئے جمیلہ اور دونوں بچوں کے ہم راہ واپس آگیا۔ اس کے پہنچتے ہی کھانا چن دیا گیا۔ سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اللہ وسایا کھانے کے بعد زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا، جلد ہی سونے چلا گیا۔

چند روز بعد اللہ وسایا نے مقدمہ جیتنے کی خوشی میں جشن منایا۔ حویلی کے سامنے کھلے میدان میں چھڑکاؤ کیا گیا۔ شام ہوتے ہی گیس بتیاں روشن کی گئیں، دیگیں چڑھیں، طرح طرح کے پکوان پکے۔ گاؤں کے تمام مزارعوں اور کمیوں نے کھانا کھایا۔ رحیم داد محفل میں اللہ وسایا کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اس روز وہ اجلے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ سر پر اونچے طرے کی پگ تھی جو اللہ وسایا اس کے لیے خاص طور پر لاہور سے لایا تھا۔ اللہ وسایا نے رحیم داد کا ایک ایک مزارعے اور کمی سے تعارف کرایا۔ انھیں صاف صاف بتایا کہ حویلی اور گاؤں کی زیر کاشت ڈھائی سو ایکڑ زمین رحیم داد کے نام الاٹ ہوچکی ہے۔ اب وہ گاؤں کا دوسرا زمیں دار بن گیا ہے۔

مگر رحیم داد نے بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے ہر ایک سے یہی کہا کہ اللہ وسایا اس کے بھائی کی مانند ہے۔ پہلے کی طرح سب کچھ اسی کا ہے اور وہی پورے گاؤں کا زمیں دار ہے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اونچی آواز سے اعلان کیا۔ "گل ایہہ ہے جی! اللہ وسایا کی کوششوں ہی سے میرے نام الاٹمنٹ ہوئی ہے۔ زمیں داری اسی نے چلانی ہے اور وہی چلائے گا۔" اس نے اپنی پگ اتاری اور اللہ وسایا کے سر پر رکھ دی اور اس کی پگ اپنے سر پر رکھ لی۔ سب نے خوش ہو کر قہقہے لگائے۔

پہر رات گزری تو نوجوانوں نے لڈّی ناچ شروع کیا۔ ڈھولیوں نے جھوم جھوم کر ڈھولکوں پر چوٹ لگائی۔ رقص کرنے والے نوجوان باری باری پاؤں اوپر اٹھاتے، بانہیں سر کی سیدھ میں

لہراتے آگے بڑھتے۔ انھوں نے ڈھولیوں کے گرد حلقہ بنالیا اور ایک ایڑی کے بل بیٹھ کر دائرے میں رقص کرنے لگے۔ وہ چٹکیاں بجاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھاتے۔ کبھی سینے کے سامنے اور کبھی گھٹنوں کے قریب لاکر ہاتھوں کی جنبش کے ساتھ ساتھ جسم کو اس طرح حرکت دیتے کہ کمر اور کولھوں کے ساتھ ساتھ ایک ایک عضو لچکتا اور لہراتا نظر آتا۔ رقص رفتہ رفتہ تیز ہوتا گیا۔ ڈھولیوں نے گردنیں جھٹک جھٹک کر ڈھولکوں پر تیزی سے چوٹ لگانا شروع کردی۔ رقص تیز' اور تیز ہوتا گیا۔ اور جب شباب پر پہنچا تو سرخوشی کے عالم میں ناچنے والوں کے منہ سے اونچے سروں میں گیت کے بول نکل نکل کر فضا میں گونجنے لگے۔ وہ اونچی آواز میں الاپتے۔

ہو' ہو' علی علی' لڈھی تھم ملڈی

آدھی رات تک رقص و موسیقی کا سلسلہ جاری رہا۔ رقص کرنے والے اور ڈھولی پسینے میں شرابور ہوگئے۔ رقص ختم ہوا تو ستاروں کے کنول روشن ہوچکے تھے۔ ہوا گنگنا رہی تھی۔ رات نشے سے مدہوش تھی۔

بارہ

رحیم داد بھی اب بڑے زمیں داروں کی طرح اونچے طرے کی پگ سر پر رکھ کر باہر نکلتا۔ مگر اس کا بیشتر وقت مہمان خانے میں گزرتا۔ البتہ وہ اکثر گھوڑی پر سوار ہوکر دن ڈھلے اللہ وسایا کے ہم راہ نہر کی طرف چلا جاتا۔ نہر گاؤں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ دونوں' گھوڑیاں آہستہ آہستہ دوڑاتے ہوئے نہر کے کنارے کنارے دور تک چلے جاتے' باغ میں واپس آتے اور عام طور پر وہیں ساتھ بیٹھ کر رات کا کھانا کھاتے۔ جمیلہ اور اس کے دونوں بچے بھی کھانے میں شریک ہوتے۔

اساڑھ کا مہینہ لگ چکا تھا۔ لیکن گرمی کم نہیں ہوئی تھی۔ موسم میں صرف اس قدر تبدیلی ہوئی تھی کہ لو کے جھکڑوں کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ ہوا ٹھہری ہوئی ہوتی تو حبس بڑھ جاتا۔ آسمان پر سفید سفید بادلوں کے ٹکڑے بگلوں کی ڈار کی مانند منڈلاتے۔ کبھی کبھار بادل سرمئی غبار بن کر چھا جاتے۔ مگر بارش نہیں ہوئی۔

ایک روز سخت گرمی اور حبس کے بعد شام کو بارش کا پہلا چھینٹا پڑا۔ گرد و غبار بیٹھ گیا۔ فضا نکھر کر اجلی ہوگئی۔ ہوا خوش گوار اور بھیگی ہوئی تھی۔ زمین سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھتی تھی۔ دن ڈھلے اللہ وسایا اپنے دونوں بچوں اور جمیلہ کے ہم راہ ٹہلتا ہوا نہر کی طرف پیدل ہی چلا گیا۔ رحیم داد باغ میں تنہا بیٹھا تھا۔ شام سہانی اور فرحت افزا تھی۔ رحیم داد نے آنکھیں بند کیں اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ اس نے دونوں ٹانگیں سامنے رکھی ہوئی میز پر پھیلا دیں اور موسم کی شگفتگی سے لطف اٹھانے لگا۔ یکایک اسے محسوس ہوا کہ کسی نے اس کے پیروں پر ہاتھ رکھا اور ہولے ہولے دبانے لگا۔ رحیم داد نے جھٹ آنکھیں کھول دیں۔ اس کے پیروں میں ماکھا بیٹھا تھا۔

رحیم داد نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "تو فیر آگیا؟"

"فیر کس کے پاس جاؤں جی۔" اس نے رحیم داد کے پیر دباتے ہوئے عاجزی سے کہا۔ "پیاسا تو جی دوڑ کر کھوئی پر ہی جاتا ہے۔"

"میں کتنی بار تجھے کہہ چکا ہوں' اللہ وسایا تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔" رحیم داد نے بیزاری سے کہا۔

"میں نوں پتہ ہے' وہ کچھ نہیں کرے گا۔ پر چوہدری! اب تو میرا کام توں بھی کر سکتا ہے۔" ماکھا مسکین سی شکل بنا کر بولا۔ "اب توں بھی وڈا زمیں دار بن گیا ہے۔ توں چاہے تو میرا باز و شاہ جی سے واپس دلا سکتا ہے۔ شاہ جی تیری گل ضرور مان لے گا۔"

"میری گل وہ کیسے مان سکتا ہے۔ تیں نوں پتہ ہے اللہ وسایا کی احسان شاہ سے لگتی ہے۔" رحیم داد نے ماکھا سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔

ماکھا گڑگڑا کر بولا۔ "شاہ جی کی اللہ وسایا سے لگتی ہے پر تجھ سے تو نہیں لگتی۔ سچ جان' وہ بہت خوش ہے کہ اللہ وسایا اب اس پنڈ کا زمیں دار نہیں رہا اور تو وڈا زمیں دار بن گیا ہے' حویلی بھی اب تیری ہی ہے۔ اللہ وسایا کے پاس تو خالی پٹی رہ گئی۔ سب کچھ تیرا ہی ہے۔"

رحیم داد نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تیں نوں کیسے پتہ چلا' احسان شاہ اس طرح سوچتا ہے؟ وہ اللہ وسایا کا دشمن ہے تو میرا بھی ہے۔"

"چوہدری! تیں نوں کچھ پتہ نہیں۔" ماکھا مسکرا کر بولا۔ "اللہ وسایا سے تو شاہ جی اس لیے خار کھاتا ہے' وہ مزارعے سے وڈا زمیں دار بن گیا۔ اس کے برابر پہنچ گیا۔ اسے تو اللہ وسایا سے خار کھانا ہی چاہیے۔ تجھے تو وہ خاندانی زمیں دار جانتا ہے۔ رب سوہنہ' میں نے اپنے کانوں سے سنا' شاہ جی کہہ رہا تھا' چلو جی' یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔ پتہ چلا ہے' چوہدری ویسے جات کا ہے تو جاٹ پر خاندانی زمیں دار ہے۔ اللہ وسایا کی طرح مزارع یا جانگلی نہیں رہا۔"

"وہ میرے بارے میں کچھ ہی کہے' میں اس کے پاس نہیں جا سکتا۔ اللہ وسایا یہ بات پسند نہیں کرے گا اور میں اسے ناراض نہیں کر سکتا۔"

"چوہدری! میرے لیے ایک بار چپکے سے شاہ جی سے مل لے۔" اس نے رحیم داد کے پیر ایک بار پھر پکڑ لیے۔ "اللہ وسایا کو پتہ ہی نہیں چلے گا۔ شاہ جی تیری گل مان لے گا۔ میرا باز و مجھے مل جائے گا۔ پنج سال ہوگئے اسے دیکھے ہوئے۔" اس نے آسمان کی سمت نظریں اٹھا کر ٹھنڈی سانس بھری۔ "جب سے وہ گئی ہے' میرا گھر بار بالکل تباہ ہوگیا۔"

رحیم داد نے اپنے دونوں پیر سمیٹ لیے اور بے رخی سے بولا۔ "صاف صاف سن لے۔ احسان شاہ اگر اللہ وسایا سے خار کھاتا ہے تو وہ میرا بھی دشمن ہے۔ میں اس کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گا۔ تو کوئی اور رستہ ڈھونڈ۔ میں تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔" رحیم داد کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ "اور دیکھ' آگے بھی تو میرے پاس نہ آنا۔ مجھے تیرا یہاں آنا بالکل پسند نہیں۔ اب تو ٹر جا۔" رحیم داد کا لہجہ تیکھا اور تلخ ہوگیا۔

ماکھا سر جھکائے کچھ دیر بت بنا بیٹھا رہا۔ اس نے گہری سانس بھری' اٹھا اور چپ چاپ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی طبیعت مکدّر ہوگئی تھی۔ وہ بیزار ہو کر اٹھنے ہی والا تھا کہ احمد آگیا۔ اس کے ہاتھ میں لیمپ تھا۔ اس نے لیمپ اسٹول پر رکھا' اسے روشن کیا اور رحیم داد کی جانب مڑ کر دیکھا۔ "زمیں دار حویلی میں ہے۔ اس نے کہا ہے۔ چوہدری سے کہنا باغ میں ٹھیرے۔ میں بھی ذرا دیر میں پہنچ جاؤں گا۔ روٹی اس کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔"

رحیم داد کو احمد کی زبانی اللہ وسایا کا پیغام ملا تو اس نے مہمان خانے میں جانے کا ارادہ ترک کردیا' باغ میں بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اللہ وسایا آگیا۔ اس کے ساتھ جمیلہ بھی تھی۔ ان کے پہنچتے ہی نوکروں نے کھانا لگایا۔ تینوں نے کھانا کھایا۔

کھانے سے فارغ ہو کر اللہ وسایا بولا۔ "آج تو بہت چنگا موسم ہے۔ بارش کا ایک ہی چھینٹا پڑا۔ نہ حبس رہا' نہ گرمی۔ ہوا بھی ٹھنڈی چل رہی ہے۔"

جمیلہ نے مسکرا کر کہا۔ "موسم کو تو بدلنا ہی تھا۔ جولائی کا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔"

رحیم داد نے گردن اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ "ابھی تو آسمان بالکل صاف ہے۔ پر پتہ نہیں' کب برکھا شروع ہو جائے۔"

"کوئی پتہ نہیں' کب بادل گھر کر آجائیں۔" جمیلہ بولی۔ "چوہدری! توں ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس مہینے ایسا ہی ہوتا ہے۔ یاد آتا ہے' جب کالج میں چھٹیاں ہوتیں تو ہم بہن بھائی' ماں جی کے ساتھ عام طور پر ڈلہوزی چلے جاتے۔ مجھے تو ڈلہوزی ہمیشہ مری سے بہتر لگا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "دین کنڈ اور دھولدھر کی صنوبر کے درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں اور ان کی برف پوش سفید چوٹیاں' بہت سندر دکھائی پڑتی تھیں۔ بارش ہوتی تو اور مزا آتا۔ ادھر برکھا ہوئی' ادھر ذرا ہی دیر میں سڑکیں اور رستے ایسے صاف ستھرے' مانو پانی برسا ہی نہیں۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری' تو ڈلہوزی تو گیا ہوگا؟ ضلع گورداس پور ہی میں تو ہے؟"

رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ اس نے نہ گورداس پور دیکھا تھا' نہ کبھی ڈلہوزی گیا تھا۔ وہ سوچ ہی

رہا تھا کہ کیا جواب دے، اتنے میں اللہ وسایا بول پڑا۔ "جی لے! ڈلہوزی اور گورداس پور کو چھوڑ، یہ بتا کیمبل پور جانے کے بارے میں تو نے کیا سوچا؟ اگلے جمعے کو چلنا ہے۔"

"چنتا نہ کر۔ میں نے سفر کی پوری تیاری کرلی ہے۔" جمیلہ نے اعتماد سے کہا۔

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "اللہ وسایا! کیا تو کیمبل پور جا رہا ہے؟"

"جانا ہی پڑے گا جی!" اللہ وسایا نے جواب دیا۔ "میری بھتیجی شریفاں کا ویاہ ہے۔ اس میں شرکت ضروری ہے۔ جمیلہ اور بچے بھی ساتھ جائیں گے۔" اس کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔ ٹھنڈی سانس لے کر اس نے بتایا۔ "بات یہ ہے چوہدری! اس کا نہ پیو ہے، نہ ماں۔ بھین بھائی بھی سگے نہیں۔ میرا پھوپھا فوج میں تھا۔ پچھلی جنگ میں جاپانیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ سرکار نے اس کے مرنے کے بعد کیمبل پور میں تھوڑی سی زمین گزارے کے لیے دے دی تھی۔ تب سے پھوپھی وہیں رہنے لگی تھی۔ پر بے چاری زیادہ دن زندہ نہیں رہی۔ اس کے مرنے کے بعد سرکاری پنشن بھی بند ہو گئی۔ اب پھوپھی کی نشانی شرفاں ہی رہ گئی ہے۔ چاچے نے اسے پالا ہے۔ وہ بھی کیمبل پور میں ہوتا ہے۔ میں نے تو شرفاں کو برسوں سے نہیں دیکھا اور جمیلہ نے تو اسے صرف ایک بار دیکھا ہے۔ گڈّو کے موونڈن پر میں نے اسے یہاں بلایا تھا۔"

"اس سے تو وہ بارہ تیرہ برس کی چھوہری تھی۔ پر اب تو جوان مٹیار ہوگی۔ پر بہت سیدھی سادی تھی۔ سدا چپ، چپ رہتی۔" جمیلہ کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ "جس کے سب مر جائیں، اس کا یہی حال ہوتا ہے۔"

"پر تجھ سے تو وہ بہت پیار کرتی تھی۔ ہر دکت تیرے ہی ساتھ لگی رہتی تھی۔"

"ایسے ہی پیار نہیں کرتی تھی۔" جمیلہ کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔ "تیں نوں کیہہ پتہ، میں کتنی بار اسے چھاتی سے لگا کر روئی ہوں۔"

"ضرور روئی ہوگی۔" اللہ وسایا بولا۔ "کسی کڑی کا پیو یا ماں گزر جائے تو سب سے بڑھ کر تو ہی جا کر سیاپا کرتی ہے۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری! اس کا دل بہت کمزور ہے۔ ذرا سی بات پر اسے رونا آ جاتا ہے۔ ویسے گلاں بہت کرتی ہے۔"

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیمبل پور سے واپسی کب تک ہوگی؟"

"ہفتہ بھر تو لگ ہی جائے گا۔ زیادہ دن بھی لگ جائیں تو کوئی تعجب نہیں۔"

"ایک روز تو لہور ٹھہرنا پڑے گا۔ میں نے شرفاں کو تا ئی چھک دینے کے لیے کپڑے لتے اور زیور بھی انار کلی سے خریدنے ہیں۔ دو ریشمی پٹانگل تو میں نے پہلے ہی تیار کر لیے ہیں۔" جمیلہ نے مسکرا کر بتایا۔

اللہ وسایا حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ "وہ تو نے کب تیار کیے؟ میں نوں پتہ ہی نہ چلا۔"

"لے یہ بھی کوئی بتانے کی گل ہے۔" جمیلہ نے شوخی سے کہا۔ "یہ تو سوچ ننھیال میں تیرے علاوہ شرفاں کا اور کون ہے۔ ویسے تو وڈا زمیں دار بھی کہلاتا ہے۔ میں کنبے برادری میں تیرا سر نیچے نہیں ہونے دوں گی۔" جمیلہ نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "چنتا نہ کر، شرفاں کی ماں نہیں، میں تو موجود ہوں۔ دیکھ لینا، کیسی دھوم دھام سے سگائی ہوگی۔ ویاہ کی ساری ریتاں رسماں ہوں گی۔ شرفاں کے سسرال والوں کے سامنے میں نے ناک نہیں کٹوانی۔"

"میں نوں پتہ ہے، تو سب کچھ کرے گی۔" اللہ وسایا نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "ڈھولکی بجائی گی، گھوڑیاں اور سہاگ کے گیت گائے گی۔ جھمریا گھما ناچے گی اور سلامی میں سب سے بڑھ چڑھ کر روپیہ بھی دے گی۔ اسی لیے تو اپنے پاس کچھ بچتا بچاتا نہیں۔"

"کیا کرے گا پیسہ جوڑ کر۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اس کے لابھ میں پڑ کر مورکھ نہ بن۔ اس میں کچھ نہیں رکھا۔ جتنا جوڑو جمع کرو، اتنا ہی لالچ بڑھتا ہے۔ منش خود غرض اور کٹھور بن جاتا ہے۔ دن رات اسی چکر میں رہتا ہے۔"

اسی وقت ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ اسٹول پر رکھا ہوا لیمپ بھڑکا اور بجھ گیا۔ روشنی نہیں رہی تو اندھیرا چھا گیا۔ تینوں ذرا دیر گھور اندھیرے میں خاموش بیٹھے رہے، پھر محفل برخاست ہو گئی۔ اللہ وسایا اور جمیلہ حویلی کی سمت چلے گئے۔ رحیم داد مہمان خانے میں پہنچا۔

اللہ وسایا اور جمیلہ سفر کی تیاریوں میں الجھے ہوئے تھے۔ رحیم داد سے شام کو ان کی سرسری ملاقات ہوتی۔ ایک صبح تاروں کی چھاؤں میں دو تانگے حویلی کے سامنے نظر آئے۔ ایک میں جمیلہ اور دونوں بچے اور دوسرے میں دونوں نوکر سامان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ رحیم داد بیدار ہو چکا تھا۔ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے وہ اللہ وسایا سے ملا۔ اللہ وسایا نے رخصت ہوتے وقت رحیم داد کو گلے سے لگایا اور پیٹھ محبت سے تھپک کر بولا۔

"چوہدری! میں جلد ہی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ تو زمیں داری کی دیکھ بھال کرتا رہنا۔ ویسے بھی اب تجھے زمیں داری کے معاملات میں پوری دلچسپی لینی چاہیے۔ تو بھی اس پنڈ کا زمیں دار بن چکا ہے۔"

"ایسی گل نہ کر اللہ وسایا!" رحیم داد نے جھٹ اسے ٹوکا۔ "اس پنڈ کا زمیں دار تو ہی ہے اور تو

ہی رہے گا۔"

"یہ تو تیری محبت ہے چوہدری۔ میں نوں پتہ نہیں تھا' تیرا دل اتنا وڈا ہے۔"

"میرا دل کتنا وڈا ہے' یہ تو تیں نوں آگے پتہ چلے گا۔" رحیم داد نے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "جو کہہ رہا ہوں' وہی کروں گا اور ثابت کر کے دکھاؤں گا۔" اس کا چہرہ مضمحل ہو گیا۔ "یہ تو سوچ' تیرے سوا دنیا میں اب میرا کون ہے۔ میرے لیے تو سب کچھ تو ہی ہے۔"

جمیلہ ہنس کر بولی۔ "تم دونوں ساری گلاں اسی سے کر لوگے۔ کچھ واپسی کے لیے بھی چھوڑ دو۔"

رحیم داد نے جمیلہ کی بات سن کر اللہ وسایا سے کہا۔ "اب تو جا۔ دیر ہو رہی ہے۔ دیکھ' جلد آنے کی کوشش کرنا۔"

اللہ وسایا خاموشی سے تانگے کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ جمیلہ اور بچے بھی اسی تانگے میں تھے۔ دونوں تانگے آگے پیچھے روانہ ہوئے۔ رحیم داد حویلی کے نوکروں اور نوکرانیوں کے ساتھ خاموش کھڑا تانگوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ تانگے دھول اڑاتے رفتہ رفتہ دور ہوتے گئے۔ آخر ایک موڑ پر درختوں کی آڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

رحیم داد بوجھل قدموں سے چلتا ہوا مہمان خانے میں واپس آگیا اور اپنے کمرے میں جا کر تھکا ہوا سا کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ مضمحل نظر آ رہا تھا۔ اس نے ناشتا بھی رغبت سے نہیں کیا۔ دن بھر کمرے میں رہا۔ شام کو باغ میں گیا مگر وہاں بھی دل نہ لگا۔ اسے تنہائی کا شدید احساس تھا۔ وہ جلد ہی اٹھ کر مہمان خانے میں چلا گیا اور کھانا کھا کے بستر پر لیٹ گیا۔

دوسرے روز بھی اس کی طبیعت اچاٹ رہی۔ موسم بھی دھندلا دھندلا اور بے کیف تھا۔ آسمان پر بادلوں کا غبار چھایا تھا۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ بارش بھی نہیں ہوئی۔ فضا میں حبس تھا' گھٹن تھی۔ رحیم داد مہمان خانے سے نکلا۔ کھیتوں کی طرف گیا۔ مزارعوں سے فصل کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ واپس آیا تو جسم پسینے پسینے تھا۔ اس نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا۔

☆

دن ڈھلے رحیم داد کا دل اور بوجھل ہو گیا۔ اس روز وہ باغ میں نہیں گیا۔ گھوڑی نکلوائی۔ اس پر سوار ہوا اور دل بہلانے کے لیے نہر کی طرف چلا گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور بادلوں کے ایک ٹکڑے کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ اس کی نارنجی روشنی سے نہر کا پانی جھلملا رہا تھا۔ رحیم داد گھوڑی دوڑاتا دور نکل گیا۔ ہلکے ہلکے جھونکے اس کے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ ان میں تازگی اور فرحت تھی۔ فضا میں جنگلی پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ رحیم داد کو قدرے سکون ملا۔ وہ گھوڑی دوڑاتا چلا گیا۔ سورج ڈوب گیا۔ شام نے اپنے بازو پھیلا دیئے۔ فضا میں تاریکی گھلنے لگی۔

رحیم داد نے واپسی کے ارادے سے گھوڑی کی رفتار سست کی۔ گھوڑی پیاسی بھی تھی۔ وہ نیچے اترا اور اسے پانی پلانے کے لیے نہر کے قریب لے گیا۔ گھوڑی پانی پی چکی تو رحیم داد نے اسے کچھ دیر سستانے کا موقع دیا۔ اس کا جسم پسینے سے بھیگ کر سیاہ پڑ گیا تھا۔ رحیم داد نہر کے قریب ریت کے ایک تودے پر بیٹھ گیا۔ اس کی قمیض پسینے سے شرابور تھی۔ نہر کی سمت سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔

واپسی کے لیے وہ گھوڑی پر سوار ہوا۔ عین اسی وقت جھلجھی کے اونچے اونچے پودوں کے گھنے جھنڈ کے پیچھے سے ماکھا نکل کر سامنے آگیا۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔

"اوئے ماکھے! تو ادھر کیسے آگیا؟"

"چوہدری! تیں نوں یہ بھی پتہ نہیں۔ وہ ادھر درختوں کے اس پار اپنا پنڈ پیراں والہ ہے۔" ماکھا نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر بتایا۔

رحیم داد مزید بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے نظر انداز کرتے ہوئے اس نے گھوڑی موڑی مگر ماکھا جھپاک سے گھوڑی کے سامنے آگیا۔ گڑگڑا کر بولا۔ "چوہدری! میری ایک گل سن لے۔"

رحیم داد نے گھوڑی ٹھہراتے ہوئے دریافت کیا۔ "تجھے کیا کہنا ہے؟" اس نے تیکھی نظروں سے ماکھا کو دیکھا۔ "میں تجھے پہلے ہی صاف صاف کہہ چکا ہوں' میں تیرا کام نہیں کر سکتا۔ میرا پیچھا چھوڑ دے۔"

"میری گل تو سن لے۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ "شاہ جی اپنی گھوڑی پر آگے گیا ہے۔ واپس آتا ہی ہوگا۔"

"میں نوں اس سے کیا لینا۔ سامنے سے ہٹ۔" رحیم داد نے ڈپٹ کر بے رخی سے کہا۔ ماکھا ڈھیٹ بن کر بولا۔ "تو اسے میرے بازو کے بارے میں کہے گا تو وہ ضرور مان لے گا۔"

"پر میں نے اس سے کوئی گل شل نہیں کرنی۔" رحیم داد کے لہجے میں بدستور بیزاری تھی۔ "الگ ہٹ۔ میرا رستہ چھوڑ۔"

ماکھا گھوڑی کے سامنے سے تو ہٹ گیا مگر اس نے جھٹ رکاب میں پڑا ہوا رحیم داد کا پیر تھام لیا۔ "چوہدری! تیری ایک گل سے مجھے اپنا بازو مل جائے گا۔ مجھے تباہی سے بچا لے۔ تیری مہربانی ہوگی۔" اس نے رحیم داد کے پیر پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ رحیم داد تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ وہ گھوڑی پر گم صم بیٹھا رہا۔ شام کے سناٹے میں ماکھا کی دبی دبی سسکیاں ابھر رہی تھیں

اور اس کی پیشانی رحیم داد کے پیروں پر ٹکی ہوئی تھی۔ اسی اثنا میں دور سے ٹاپیں ابھریں۔ ماکھا نے گردن اٹھا کر رحم طلب نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ گلوگیر آواز میں بولا۔

"چوہدری! وہ آرہا ہے۔ بس ذرا دیر ٹھہر جا۔ وہ یہیں سے گزرے گا۔ تو شاہ جی سے گل کر کے تو دیکھ۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ ٹاپیں رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ ماکھا گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "شاہ جی پہنچنے ہی والا ہے۔ مجھے تیرے پاس دیکھے گا تو ناراض ہوگا۔" یہ کہتا ہوا وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ ساتھ ہی گڑگڑاتا رہا۔ "چوہدری! اس سے میرے بارے میں گل کر لے۔ تو کہے گا تو میرا کام بن جائے گا۔ زندگی بھر تجھے دعائیں دوں گا۔" ماکھا آنسو پونچھتا ہوا لپک کر کیکر کی ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے چلا گیا۔

رحیم داد پس و پیش میں جہاں تھا' وہیں کھڑا رہا۔ ٹاپیں بالکل قریب سنائی دینے لگیں۔ رحیم داد نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ شام کے دھندلکے میں احسان شاہ اپنی گھوڑی دوڑاتا' گرد کے بادل اڑاتا' ایک موڑ سے نمودار ہوا۔ وہ رحیم داد ہی کی طرف آرہا تھا۔ آن کی آن میں وہ نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے گھوڑی کی راسیں زور سے کھینچیں۔ گھوڑی اونچی آواز سے ہنہنائی اور ٹھہر گئی۔ احسان شاہ نے رحیم داد کو غور سے دیکھا۔ رحیم داد نے سلام کیا۔

احسان شاہ نے سلام کا جواب دیا اور گردن اٹھا کر پوچھا۔ "میں نے تجھے پہچانا نہیں۔ پہلی بار ادھر دیکھ رہا ہوں۔"

رحیم داد نے بتایا۔ "میرا نام جی' چوہدری نور الٰہی ہے۔ کوٹلہ ہرکشن میں اپنی زمیں داری ہے۔"

"تو ہے چوہدری نور الٰہی!" احسان شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ "نام تو تیرا سنا تھا' آج تجھے دیکھ بھی لیا۔" اس کے چہرے کا تناؤ کم ہوگیا۔ مسکرا کر بولا۔ "پر آج تو ادھر کیسے نکل آیا؟"

رحیم داد نے نظر بھر کر احسان شاہ کو دیکھا۔ سن و سال کے اعتبار سے وہ چھپن ستاون سال کے پیٹے میں تھا مگر جسم مضبوط اور بھاری بھرکم تھا۔ چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ پگ کا اونچا طرہ ہوا سے آہستہ آہستہ لہرا رہا تھا۔ وہ اپنے ڈیل ڈول اور وضع قطع سے بہت بارعب لگتا تھا۔

رحیم داد اس کی شخصیت سے خاصا مرعوب ہوا' ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "شاہ جی! تجھ سے ایک گل کرنی تھی۔"

"ضرور کر۔" احسان شاہ نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "پر یہاں کھڑے کھڑے کیا گل ہو سکتی ہے۔ اپنی حویلی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ موسم بھی سہانا ہے' وہیں آرام سے بیٹھ کر بات چیت ہوگی۔"

رحیم داد اس کی حویلی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کترانے کی کوشش کی۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "کوئی لمبی چوڑی گل نہیں کرنی۔"

"چھوٹی ہو یا لمبی' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "پر یہ تو کوئی بات کرنے کی جگہ نہیں۔"

احسان شاہ نے بات ختم ہی کی تھی کہ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ وہ بے تکلفی سے قہقہہ مار کر بولا۔ "لے چوہدری! اب تو بوندا باندی بھی شروع ہوگئی۔ آ میرے ساتھ۔ اب حویلی میں بیٹھ کر آرام سے گل بات ہوگی۔"

بارش اور تیز ہوگئی۔ رحیم داد کے لیے انکار کرنے کی گنجائش نہ رہی۔ احسان شاہ نے ایڑ لگا کر گھوڑی آگے بڑھائی۔ رحیم داد بھی چپ چاپ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دونوں گھوڑیاں دوڑاتے ہوئے پیراں والہ کی جانب روانہ ہوئے۔

بارش بتدریج تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ پیراں والہ میں داخل ہوئے تو بارش خاصی تیز ہو چکی تھی۔ دونوں جلدی جلدی اترے۔ گھوڑیاں ملازموں کے حوالے کیں اور حویلی کے اندر چلے گئے۔ حویلی نہایت شاندار تھی۔ اس کے چاروں طرف فصیل نما اونچی اونچی دیواریں تھیں۔ اللہ دسایا نے رحیم داد کو ٹھیک ہی بتایا تھا کہ احسان شاہ کی حویلی دور سے پرانے زمانے کا قلعہ لگتی ہے۔ اس کا پھاٹک اس قدر اونچا تھا کہ ہاتھی گزر سکتا تھا۔ دروازے بھاری اور مضبوط لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ پھاٹک پر مسلح پہرا تھا۔

حویلی کے تین حصے تھے۔ ایک حصے میں احسان شاہ کی منکوحہ بیویاں اور بچے رہتے تھے۔ یہ حویلی کا عقبی حصہ تھا۔ سامنے کے رخ پر ڈیرا تھا جو دیوان خانہ کہلاتا تھا۔ حویلی کے نوکر چاکر اسے مہمان گھر بھی کہتے تھے۔ دیوان خانہ پھاٹک سے اندر داخل ہوتے ہی نظر آتا تھا۔ احسان شاہ اس دیوان خانے میں صبح شام کچہری لگاتا تھا۔ منیجر' منشیوں اور کارندوں کے ساتھ بیٹھ کر زمیں داری کے معاملات طے کرتا تھا۔ مزارعوں کے خلاف شکایات پیش ہوتیں تو ان کے مقدمات کا فیصلہ بھی دیوان خانے ہی میں کرتا تھا۔

دیوان خانے کے آگے وسیع پائیں باغ تھا۔ دیوان خانے سے متصل اونچی اونچی دیواروں سے گھرا ہوا حصہ کوٹ کہلاتا تھا۔ کوٹ میں احسان شاہ کی داشتائیں اور مزارعوں کی وہ نوجوان عورتیں قید رکھی جاتی تھیں جنہیں اغوا کر کے لایا جاتا تھا۔ کوٹ میں آمد و رفت کا صرف ایک دروازہ تھا اور

اس پر چوبیس گھنٹے مسلح پہرا رہتا تھا۔

دیوان خانے میں کشادہ ہال تھا جس پر دبیز قالین کا فرش تھا۔ جگہ جگہ صوفے اور دیوان قرینے سے رکھے تھے۔ صوفے پرانی وضع کے مگر قیمتی اور آرام دہ تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر ہلکے ریشمی پردے پڑے تھے۔ احسان شاہ دیوان خانے میں داخل ہوتے ہی ہال کی جانب بڑھا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ تھا۔ دونوں ہال میں پہنچے تو نوکروں نے نہایت مستعدی سے پردے ہٹا دیئے اور کھڑکیوں کے پٹ کھول دیئے۔ ہال کے آگے طویل برآمدہ تھا۔ اس میں بید کی کرسیاں پڑی تھیں۔

احسان شاہ نے ہال میں پہنچ کر گرمی محسوس کی۔ اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری! یہاں تو حبس ہے۔ باہر برآمدے میں بیٹھا جائے۔" اس نے قریب کھڑے ہوئے ملازم کی جانب دیکھا۔ "شیدے! دروازہ کھول دے۔ کرسیاں اور میز برآمدے میں ٹھیک سے لگا دے۔ یہاں گرمی ہے۔ ہم نے برآمدے میں بیٹھنا ہے۔"

"شیدا آگے بڑھا۔ اس نے فوراً دروازہ کھولا۔ باہر گیا‘ کرسیاں قرینے سے لگائیں اور درمیان میں میز رکھ دی۔ احسان شاہ اور رحیم داد ہال سے نکل کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ برآمدے کے آگے دور تک پھیلا ہوا نرم نرم گھاس کا لان تھا۔ اونچے اور گھنے درخت تھے۔ ان کے درمیان جگہ جگہ روشیں اور کیاریاں تھیں۔ پھولوں سے مہکتی ہوئی بھیگی بھیگی شاخیں تیز جھونکوں سے جھوم رہی تھیں۔

باغ میں رم جھم بارش ہو رہی تھی۔ بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بارش کے چھینٹے کبھی کبھار برآمدے میں بھی آجاتے۔ رحیم داد حویلی کی شان و شوکت اور احسان شاہ کی آن بان سے بڑا مرعوب نظر آتا تھا۔ وہ گم صم بیٹھا تھا۔ احسان شاہ کی پشت پر شیدا سر جھکائے مودب کھڑا تھا۔

احسان شاہ نے اپنی پگ اتار کر شیدے کو دی‘ ہنس کر بولا۔ "کچھ پینے پلانے کو لا۔ دیکھ تو کیا ظالم موسم ہے۔"

شیدے نے پگ سنبھالی اور ہال کے اندر چلا گیا۔ رحیم داد ہنوز خاموش تھا۔ احسان شاہ نے اس کی جانب دیکھا‘ مسکرا کر پوچھا۔ "ہاں چوہدری‘ اب بتا‘ تو کیا کہنا چاہتا تھا؟"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے ماکھا کا ذکر چھیڑا۔ "شاہ جی! میں نے جو گل کرنی ہے‘ وہ ایہہ ہے۔"

"کوئی خاص گل ہے؟" احسان شاہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"خاص ہی گل ہے۔" رحیم داد نے آہستہ آہستہ اثبات میں گردن ہلائی۔

"تب تو آرام سے گل ہوگی۔ ایسی جلدی کیا ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "اس بارش میں تو واپس جانے سے رہا۔ کوٹلہ ہرکشن دور ہے اور رستہ بھی کچا اور بیچ کا ہے۔ بارش تھم جائے تو روٹی کھا کر چلا جانا ورنہ رات یہیں ٹھیر جانا۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "میں نے سنا ہے‘ اللہ وسایا تو گھروالی اور بچوں کے ساتھ پنڈ سے باہر گیا ہے۔"

"وہ اپنی بھتیجی کے ویاہ میں شرکت کے لیے کیمبل پور گیا ہے۔"

"جب ہی تو ادھر نکل آیا۔" احسان شاہ نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "وہ پنڈ میں ہوتا تو تجھے ادھر آنے نہ دیتا۔"

رحیم داد نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا‘ خاموش بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد شیدا ایک ٹرے میں وہسکی کی بوتل‘ دو گلاس اور پانی سے بھرا ہوا جگ لے کر آگیا۔ اس نے بوتل‘ جگ اور گلاس میز پر رکھ دیئے۔ رحیم داد نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو بہت گھبرایا۔ اس نے پہلے کبھی شراب نہیں پی تھی۔ البتہ میلوں ٹھیلوں میں بھنگ اور ساوی بارہا پی چکا تھا۔ جن دنوں منٹگمری جیل میں تھا‘ لالی اور دوسرے قیدیوں کے اصرار پر چرس بھری سگرٹیں بھی پی لیتا تھا۔ مگر چرس پینے کی لت نہیں لگی تھی۔

شیدے نے پہلے احسان شاہ کے لیے وہسکی کا پیگ بنایا اور گلاس اس کے سامنے رکھ دیا۔ مگر جب وہ دوسرا پیگ بنانے لگا تو رحیم داد کسی قدر پریشان ہو کر بولا۔ "میرے لیے نہ بنا۔" شیدے نے ہاتھ روک لیا۔

"کیسی گل کر رہا ہے چوہدری! ایسے کافر موسم میں تو وڈے وڈے زاہدوں اور پرہیزگاروں کی توبہ ٹوٹ جاتی ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ شیدا کی جانب متوجہ ہوا۔ "منہ کیا تک رہا ہے؟ اپنا کام کر۔"

اس نے نہایت مستعدی سے پیگ تیار کیا اور رحیم داد کے سامنے رکھ دیا۔ احسان شاہ نے اشارہ کیا۔ شیدا فوراً چلا گیا۔ احسان شاہ نے گلاس اٹھایا۔ رحیم داد کو مخاطب کیا۔

"چوہدری! اٹھا اپنا گلاس۔"

لیکن رحیم داد نے گلاس نہیں اٹھایا‘ حیران و پریشان بیٹھا رہا۔ احسان شاہ نے اصرار کیا۔ "اب تکلف شکلف چھوڑ۔ گلاس اٹھا۔"

"شاہ جی‘ گل ایہہ ہے۔ میں نے آج تک نہیں پی‘ مجھے نہ پلا۔"

"نہیں پی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آج سے شروع کر دے۔" احسان شاہ کا اصرار جاری

رہا۔ ”اللہ وسایا کے رستے پر نہ چل۔ وہ تو مزارع تھا‘ زمیں دار بن کر بھی مزارع ہی رہا۔ وہ تجھے بھی زمیں دار نہیں بننے دے گا۔“ احسان شاہ نے گلاس اٹھا کر رحیم داد کے ہاتھ میں تھما دیا‘ اپنا گلاس اس کے گلاس سے ٹکرایا۔ ”چل‘ شروع ہو جا۔ میں نے آج تک کسی مہمان کی اس طرح ناز برداری نہیں کی۔“ اس نے ایک ہاتھ مونچھ پر پھیرا۔ ”میں متروکہ جائیداد کی لوٹ مار سے زمیں دار نہیں بنا‘ خاندانی جگیر دار ہوں۔ یہ حویلی میرے دادے نے بنوائی تھی۔ وہ بہت وڈا زمیں دار ہوتا تھا۔ لاٹ گورنر کے دربار میں اسے کرسی ملتی تھی۔ کیا سمجھا؟“

احسان شاہ نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ رحیم داد اس کی باتوں سے ایسا مرعوب ہوا کہ گلاس اس کے ہونٹوں تک پہنچ گیا۔ اس نے بھی گھونٹ بھرا اور منہ ذرا سا بگاڑ کر بولا۔

”شاہ جی‘ توں نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔“

”بچوں جیسی گلاں نہ کر۔“ احسان شاہ نے ہنس کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”تیں نوں ابھی پتہ نہیں۔ زندگی کا اس کے بناں کیا مزا۔ تھوڑی سی اور لگا۔ تیں نوں خود ہی اندازہ ہو جائے گا‘ یہ کیا بہار دکھاتی ہے۔“

اسی وقت بادل زور سے گرجا۔ رحیم داد نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا‘ خاموشی سے ایک گھونٹ اور بھرا اور بھیگی ہوئی مونچھیں ہاتھ سے پونچھنے لگا۔ بارش تیز ہو گئی۔ ہوا کے نم آلود جھونکے برآمدے کے اندر آنے لگے۔ فضا میں خنکی رچ گئی۔

شیدا دو پلیٹوں میں تلے ہوئے مرغ اور تکے لے آیا۔ احسان شاہ اور رحیم داد پیتے رہے‘ مرغ اور تکے کھاتے رہے۔ باہر موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔

احسان شاہ بولا۔ ”ہاں چوہدری‘ اب سنا اپنی گل‘ تیں نوں کیہ کہنا ہے؟ بار بار ذکر کرتا تھا۔ ایسی کیا خاص گل ہے؟“

”گل شل کیا ہے جی! وہ تیرا ایک مزارع ہے نا۔ ماکھا نام ہے اس کا۔“ رحیم داد نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ احسان شاہ کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔

مگر احسان شاہ پر کوئی خاص رد عمل نہیں ہوا۔ بے نیازی سے بولا۔ ”یاد تو پڑتا ہے‘ اپنا ایک مزارع ماکھا بھی ہے‘ پر چوہدری‘ تجھے اس سے کیا لینا۔“

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”اس کی گھر والی تیری حویلی میں ہے۔“

”ہو گی۔“ احسان شاہ نے ایک تکا اٹھا کر چباتے ہوئے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ ”تجھے کیسے اس کی یاد آ گئی؟“

”ماکھا کئی بار میرے پاس آ چکا ہے۔“ رحیم داد نے وضاحت کی۔ ”وہ اپنی گھر والی واپس لے جانا چاہتا ہے۔“

”اس کی بات نہ کر۔ وہ تو ایسے ہی سب کے پاس پہنچتا رہتا ہے۔ تیرے پاس بھی جا کر گڑگڑایا ہو گا۔ یہی گل ہے نا؟“

”ہے تو جی یہی گل۔“ رحیم داد نے وہسکی کی چسکی لگا کر کہا۔ ”ماکھا اپنے بازو کے لیے بہت پریشان ہے۔ کہتا تھا‘ اس کے بغیر وہ تباہ ہو گیا۔“ رحیم داد پر اب وہسکی اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ وہ پہلی بار کھل کر مسکرایا۔ ”شاہ جی‘ وہ ۵ سال سے تیری حویلی میں ہے۔ کئی بچے بھی جن چکی ہے۔ اب وہ تیرے کس کام کی رہ گئی؟“

”کام کی تو وہ اب بھی ہے۔ چوہدری! تو نے اسے دیکھا نہیں۔“ احسان شاہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”بچہ جننے کے بعد وہ اور رسیلی ہو جاتی ہے۔ تب ہی تو میں نے اس کا نام رسیلی رکھ چھوڑا ہے۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں پہلے اس کا کیا نام ہوتا تھا۔ اب تو میں اسے رسیلی ہی کے طور پر پہچانتا ہوں۔ سچ کہتا ہوں‘ وہ ہے بھی رسیلی۔“

”اب تو وہ بوڑھی ہو گئی ہو گی؟“

”لگتی تو وہ ابھی تک جوان ہے۔“ احسان شاہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

”تیری گل سمجھ نہیں آئی۔“ رحیم داد نے چہرے کے تاثرات سے حیرت کا اظہار کیا۔ ”میں نے تو جی یہ دیکھا ہے‘ دو تین بچوں کے بعد تو مزارعوں اور کمیوں کی گھر والیاں ایسی مریل اور بوڑھی لگتی ہیں کہ دیکھنے کو جی نہیں کرتا۔“

”چوہدری تو بھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ احسان شاہ نے اس کی تائید کی۔ ”بات یہ ہے جی! مزارعے اور کمی ان سے دن رات سخت محنت کراتے ہیں۔ پر روٹی ٹکر دینے کو ان کے پاس اتنا ہوتا نہیں کہ انھیں ٹھیک ٹھاک رکھیں۔ وہ بوڑھی اور مریل نہیں لگیں گی تو اور کیا لگیں گی۔“

”پر یہ بھی تو ہے جی‘ ادھر کڑی تیراں چوداں کی ہوئی‘ ادھر جھٹ اس کا ویاہ ہو جاتا ہے۔ پوری طرح جوان بھی نہیں ہوتی کہ ٹھکا ٹھک بچے پیدا ہونے لگتے ہیں۔“

”جبھی تو مزارعوں اور کمیوں کے گھروں میں جوان اور خوب صورت زنانیاں نظر نہیں آتیں۔“ احسان شاہ نے منہ بگاڑا۔ ”میں جسے بھی اٹھواتا ہوں‘ پہلے اسے مکھن دودھ کھلا پلا کر تیار کراتا ہوں۔ تب اس پر جوبن آتا ہے۔ وہ نکھرتی ہے۔ چہرے پر رنگ روپ آ جاتا ہے۔ بدن بھی گداز اور کسا ہوا ہو جاتا ہے۔“

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ چپ بیٹھا مرغ کی ٹانگ چباتا رہا۔ بارش کا زور اب ٹوٹ گیا تھا البتہ ہوا کی شوریدہ سری کم نہیں ہوئی تھی۔ دونوں کی آنکھوں میں نشے سے ستارے جھلملا رہے تھے۔

احسان شاہ زیادہ دیر خاموش نہیں رہا۔ اس نے ہنس کر پوچھا۔ "چوہدری! کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"سوچ رہا تھا، تیری تن درستی بہت شان دار ہے۔ اب بھی جوان گبھرو لگتا ہے۔" رحیم داد نے اسے خوش کرنے کی کوشش کی۔

"اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ دو سال ادھر میرا جگر خراب ہو گیا تھا۔ تب سے صحت ذرا گر گئی۔ تو نے اس زمانے میں مجھے نہیں دیکھا۔"

"برا نہ منا تو ایک گل پوچھوں۔" رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔ "شاہ جی! تو مزارعوں کی گھر والیاں کیوں اٹھواتا ہے؟؟"

"مزارعوں کی زنانیاں تب اٹھواتا ہوں جب وہ سرکشی کرتے ہیں۔ دیگار سے جی چراتے ہیں۔ حرام خوری اور بدمعاشی کرتے ہیں۔" احسان شاہ تیکھے لہجے میں بولا۔

"ایسے مزارعوں کو بے دخل کیوں نہیں کر دیتا؟؟"

"بے دخل کرنے کا سب سے آسان اور مجرّب نسخہ یہ ہے، جس مزارعے کو بے دخل کرنا ہو، اس کی گھر والی اٹھوالو۔ سمجھو اس کا ایک بازو کٹ گیا۔ وہ بالکل بے بس ہو جاتا ہے۔" احسان شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "ویسے کبھی کبھی مزارعوں اور کمیوں پر رعب اور وحشت بٹھانے کے لیے بھی ایسا کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ تیں نوں تو پتہ ہی ہے، مزارعوں میں ایک سے ایک نمبری، نکما اور ہڈحرام پڑا ہے۔ ذرا ڈھیل دو، جھٹ کانون چھانٹا ہے، اوپر درخواستیں پہنچاتا ہے۔ خود بدمعاشی کرتا ہے دوسروں کو بھی اکساتا ہے۔ زمیں داری کرنا ہنسی ٹھٹھا نہیں۔ زمیں دار کا رعب اٹھ جائے تو سمجھ لے، گئی زمیں داری۔ اسے چلانے کے لیے ضروری ہے، ایسا وار کرو کہ مزارع سر ہی نہ اٹھا سکے۔ عورت تو مرد کی عزت ہوتی ہے نا۔ بس اس سے وہی چھین لو۔ ہمیشہ کے لیے اس کا سر جھک جاتا ہے۔"

"پر شاہ جی! تو نے تو بہت زنانیاں رکھ چھوڑی ہیں۔ میں نے تو سنا ہے، ان کے لیے بہت وڈا کوٹ بنوا رکھا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"تو نے ٹھیک ہی سنا۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "کوٹ ساتھ ہی ہے۔ دیکھنا چاہے تو ابھی دیکھ لے۔ بول کیا کہتا ہے؟؟"

"دیکھ لوں گا، پر آج نہیں۔" رحیم داد رضامند نہ ہوا۔ "ویسے بارش بھی ہو رہی ہے۔"

"اب میں تجھے راز کی گل بتاتا ہوں۔ ان رکھیلوں سے بہت کام نکلتا ہے۔ میں تو ان کو اپنے کمرے میں رات کو کم ہی بلاتا ہوں۔" اس نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ "تھانے دار، تحصیل دار، اور کبھی کبھی تو ان سے بھی وڈے افسر، بلکہ اسمبلی کے ممبر بھی میری حویلی میں آکر ٹھیرتے ہیں۔ تیرے ایسے یار دوست بھی آتے ہی رہتے ہیں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ نشے کی جھونک میں لہرا کر بولا۔ "شراب کا دور بھی چلتا ہے۔ مہمانوں کی خاطر مدارت تو کرنی ہی پڑتی ہے۔" اس نے بے تکلفی سے آنکھ ماری۔ "ان میں رنگین مزاج بھی ہوتے ہیں۔ ان کا دل بہلانے کے لیے یہ زنانیاں بہت کام آتی ہیں۔ نہ کسی کو بلوانے کی ضرورت نہ ڈھونڈنے شونڈنے کا چکر۔ کوٹ میں ہر طرح کی رن موجود ہے۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔

نشے کا ریلا آیا۔ احسان شاہ کے ہاتھ میں دبا ہوا گلاس چھلک اٹھا۔ اس نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ ہنس کر گویا ہوا۔ "چوہدری اک گل اور بھی ہے۔ پتر جوان ہو گئے ہیں۔ تیں نوں پتہ ہے، جوانی تو دیوانی ہوتی ہے نا۔ چھپ چھپ کر کنجریوں کے پاس جائیں گے۔ لہور جا کر ہیرا منڈی کے چکر کاٹیں گے۔ روپیہ پیسہ برباد کریں گے۔ بدنامی الگ ہوتی ہے۔ فیر ایسا بھی تو ہے۔ کنجریوں کے پاس جائیں گے تو پوشیدہ اور خطرناک بیماریاں لگا کر لائیں گے۔" اس نے زور کا قہقہہ بلند کیا۔ "کوٹ کی یہ رکھیلیں ان کے کام بھی آتی ہیں۔"

"پر شاہ جی! تجھے یہ بات بری نہیں لگتی؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"چوہدری! تو برائی کی گل کر رہا ہے۔ میں پوری طرح جوان بھی نہ ہوا تھا کہ پنڈ کی ایک چھوہری پر دل آگیا۔ میں نے اسے اٹھا کر زبردستی گھوڑی پر ڈالا اور حویلی میں لے آیا۔ میں نے ایک فلم میں ہیرو کو اسی طرح ہیروئن کو اٹھا کر لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔" احسان شاہ بتاتا رہا۔ "وہ جی کمہاروں کی چھوہری تھی۔ وہ اکٹھے ہو کر پیچھے پیچھے آئے۔ بہت رولا گولا کیا۔ اسی دیوان خانے میں میرے پیو کے سامنے مکدمہ پیش ہوا۔ میں بہت ڈرا۔ میرا پیو بہت رعب داب والا زمیں دار تھا۔ کمہاروں کی شکایات سنتے ہی بھڑک اٹھا۔ سب کو الٹا لٹکا کر جوتے لگوائے۔ اسی روز ان کی کئی کڑیاں اور جوان زنانیاں اٹھوالیں۔ کئی روز سب کو جیل میں بند رکھا۔ اس کی اپنی جیل ہوتی تھی۔ اسی حویلی میں ایک تہہ خانہ ہے۔ پہلے وہ جیل کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ جو مزارع یا کمی سرکشی یا نافرمانی کرتا، اس میں ڈال دیا جاتا۔"

"تو بھی اسے جیل کی طرح کام میں لاتا ہے؟"

"نہیں میں نے اسے ختم کردیا۔ دو کیدی مرگئے تو پنڈ کے مزارعوں اور کیوں نے بہت شور مچایا۔ آس پاس کے مزارعے اور کسان بھی ان کے ساتھ لگ گئے۔ انھیں دبانے کے لیے پولیس کو بلانا پڑا۔ معاملہ تو دب گیا پر میں نے اس کے ساتھ ہی جیل بھی ختم کردی۔ تہ خانے میں اب تو غلہ رکھا جاتا ہے۔"

"کمہاروں کی چھوہری اٹھالایا تو تیرے پیئو نے تجھے کچھ نہیں کہا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ "کچھ تو نراض ہوا ہوگا؟"

"بالکل نراض نہیں ہوا۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ ماں جی کے پاس جاکر ہنستے ہوئے بولا' لے نیک بخت' تیرا پتر جوان ہوگیا۔ زور آور بھی ہے۔ تکڑا زمیں دار بنے گا۔" احسان شاہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "میں اپنے پیئو کا اکلوتا پتر تھا۔ لاڈلا بھی بہت تھا۔" اس نے نظر بھر کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ "بعد میں تو جی اس کی رکھیلیں اپنے کام میں آنے لگیں۔ اس نے ایک سے ایک زبردست دانا چھانٹ کر رکھ چھوڑا تھا۔ میرا پیئو بھی یوں سمجھ لے بادشاہ ہوتا تھا۔ رعب ایسا زبردست تھا کہ مزارعے اور کی اس کے نام سے کانپتے تھے۔ سر اٹھا کر اس کے روبہ رو بات نہیں کرسکتے تھے۔"

"ایک گل سمجھ نہیں آئی۔ تو جن زنانیوں کو اٹھواتا ہے' کوٹ میں رکھتا ہے' ان کے گھر والے انھیں واپس لے جاتے ہیں۔ وہ برا نہیں مناتے؟" رحیم داد نے پوچھا۔ "ان کی غیرت ذرا نہیں جاگتی؟"

"تو غیرت کی گل کر رہا ہے۔ وہ تو انھیں واپس لینے کے لیے منت کرتے ہیں' پیر پکڑتے ہیں۔ کئی تو ایسے ہوتے ہیں' منہ مانگی کیمت ادا کرکے لے جاتے ہیں۔"

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔ ایسا کیوں ہے؟"

"یہ سوال تو اسمبلی میں بھی اٹھایا گیا تھا۔ ہوا یہ کہ بیگم شاہنواز نے زنانیوں کے حکوک کے لیے اسمبلی میں بہت زبردست تکریر کی۔ گلہ کیا کہ انھیں کوئی حکوک حاصل نہیں۔ مردوں نے ان کے سارے حکوک دبا رکھے ہیں۔ اپنا غلام بنا کر رکھ چھوڑا ہے۔ ملک فیروز خاں نون بھی ان دنوں اسمبلی کا ممبر ہوتا تھا۔ وہ جھٹ کھڑا ہوگیا۔ ایسا مسکت جواب دیا کہ بیگم شاہنواز چپ کرکے رہ گئی۔"

"کیا جواب تھا اس کا؟ میں بھی سنوں۔"

"اس نے گرج کر کہا' بیگم شاہنواز کو پتہ نہیں' پاکستان میں زنانیوں کو کتنے حکوک حاصل ہیں۔

میں اس سلسلے میں اپنے ایک مزارعے کا ذکر مثال کے طور پر ایوان کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں' جس سے پوری طرح اندازہ ہوجائے گا' مردوں کے مکابلے میں عورتوں کو کتنے زیادہ حکوک ملے ہوئے ہیں۔ میرے مزارعے کا نام کرم دین ہے۔ اس کے بارے میں میرے پاس شکائتیں پہنچیں کہ اسے اپنی عزت آبرو کا ذرا لحاظ نہیں۔ میں نے اسے بلا کر ایک روز پوچھا' کرمے! میں نے سنا ہے تیری گھر والی نے کسی سے یاری لگا رکھی ہے۔ تو اسے کچھ نہیں کہتا۔ تیری غیرت نہیں جاگتی؟ وہ بولا' ملک صاحب! ہے تو یہ بالکل سچی گل۔ میری گھر والی نے پنڈ کے لوہار سے یاری لگا رکھی ہے۔ وہ ہر رات اس کے پاس چلی جاتی ہے۔ میں نے اسے بہت منع کیا۔ جھگڑا کیا' پر وہ نہیں مانتی۔ میں اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا۔ گل ایسہ ہے جی۔ وہ سویرے ہی سویرے واپس آجاتی ہے۔ ڈھور ڈنگروں کو چارہ پانی دیتی ہے۔ میرے لیے روٹی تیار کرتی ہے۔ شام تک سارے ہی کام کرتی رہتی ہے۔ بچوں کو روٹی کھلا کر سلاتی ہے۔ میرے پاس آکر پوچھتی ہے اور کوئی کام تو نہیں کرنا؟ میں جب تک روکتا ہوں' رک جاتی ہے' فیر لوہار کے پاس چلی جاتی ہے۔ ملک صاحب! میں نے اس سے اور کیا لینا۔ دن بھر تو وہ میری گھر والی ہی رہتی ہے نا۔ ویسے کبھی کبھار رات کو میرے پاس ٹھیر بھی جاتی ہے۔ پر یہ اس کی مرضی پر ہے۔" احسان شاہ نے نشے کی ترنگ میں زور کا قہقہہ لگایا۔ "تو ہی بتا فیروز خاں نے کیسی زبردست دلیل پیش کی۔ اور سچ پوچھ تو بالکل صحیح پیش کی۔"

"تو نے جو کچھ بتایا' کیا یہ سچ ہے؟"

"بالکل سچ ہے۔" احسان شاہ نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "ملک فیروز خاں نون کی یہ تکریر تو دستور ساز اسمبلی کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ سارے ہی اخباروں میں چھپ چکی ہے۔ میں نے بھی اسے اخبار ہی میں پڑھا تھا۔ میں کب اسمبلی میں بیٹھا تھا۔"

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ بارش اب رک چکی تھی۔ رحیم داد نے گردن اٹھا کر باہر دیکھا اور برآمدے میں چھائی ہوئی خاموشی توڑی۔ "پانی تو اب تھم چکا ہے۔" اس نے احسان شاہ کا چہرہ نظر بھر کر دیکھا۔

"شاہ جی! میری گل کا اب تک کوئی جواب نہیں ملا؟"

"کون سی گل؟" احسان شاہ نے دریافت کیا۔

"وہی ماکھے کے بازو کی واپسی کی گل۔" رحیم داد نے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "شاہ جی! میری خوشی ہے کہ تو اس کی گھر والی واپس دے دے۔"

"چوہدری' تو کہتا ہے تو دے دوں گا۔" احسان شاہ رضامند ہوگیا۔ "پر ماکھا اس کا ناس مار دے

گا۔ تو نے اسے دیکھا نہیں۔ بہت زور دار جٹی ہے۔ ایک نمبر دانا ہے۔"

"وہ جیسی بھی ہے، میں چاہتا ہوں تو اسے ماکھے کے حوالے کردے۔" رحیم داد بے تکلفی سے مسکرایا۔ "شاہ جی! تیں نوں یہ بات مانی ہوگی۔"

"میں نے کب انکار کیا۔ تیری گل ضرور مانوں گا۔ اب تو تجھ سے یاری ہوگئی ہے۔" احسان شاہ نے سرخوشی کے عالم میں کہا۔ "پر ایک شرط پر واپس کروں گا۔"

"کیا شرط ہے؟ وہ بھی بتادے۔"

"تو آج رات یہیں ٹھیرے گا۔ ویسے بھی رستہ خراب ہے۔ بارش کیچڑ میں اتنی رات گئے کیسے واپس جائے گا؟"

"شاہ جی! تیری یہی شرط ہے تو ٹھیر جاؤں گا۔" رحیم داد ہنس کر بولا۔ وہ واپسی کے متعلق پہلے ہی تذبذب میں مبتلا تھا۔ احسان شاہ نے زور دیا تو وہ بلا جھجک ٹھہرنے پر راضی ہوگیا۔

"پر چوہدری تو نے میری پوری گل نہیں سنی۔"

"وہ بھی بتادے۔" رحیم داد بدستور مسکراتا رہا۔

"شرط ورط کیا ہے، یوں سمجھ لے، یہ میری خوشی ہے۔ رسیلی آج تیرے کمرے میں رہے گی تاکہ تجھے بھی پتہ چل جائے، میں نے ۵ سال سے اسے اپنے پاس کیوں رکھ چھوڑا ہے۔"

"نہیں شاہ جی! ایسا نہیں ہوگا۔" رحیم داد نے صاف انکار کردیا۔

"تو جوان بندہ ہے۔" احسان شاہ نے تیوری پر بل ڈال کر تیکھے لہجے میں کہا۔ "جانے تو نے کیسی زمیں داری کی ہے۔ اللہ وسایا کی طرح تو بھی پہلے مزارع تو نہیں رہ چکا ہے؟"

رحیم داد سراسیمہ ہوگیا۔ اس نے جھٹ صفائی پیش کی۔ "ایسی گل نہیں۔ میں کتنا وڈا زمیں دار تھا، یہ تو میرا کلیم دیکھ کر تو اندازہ لگا سکتا ہے۔" اس نے بات بنائی۔ "گل ایہہ ہے جی! میرا پیو تھا تو وڈا زمیں دار پر بہت نیک بندہ تھا۔ اس نے میری ماں کے سوا زندگی بھر کسی دوسری زنانی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔"

"پر تو اپنے پیو کے رستے پر چل کر ادھر زمیں داری نہیں چلا سکتا۔ مزارعے تیرے بس میں نہیں آئیں گے۔ ان کو دبا کر رکھنے کے لیے ایسا کرنا ہی پڑے گا۔" احسان شان نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے اصرار کیا۔ "تجھے میری یہ گل تو ماننی ہی پڑے گی۔ دیکھ، ضد نہ کر۔ میں نے تیری گل مانی ہے تو تجھے بھی میری گل ماننی ہوگی۔" وہ نشے سے جھوم کر ہنسا۔ "اب یاری کی ہے تو اسے نباہنا بھی پڑے گا۔ میں تو یاروں کا یار ہوں۔"

احسان شاہ نے گلاس ختم کیا۔ شیدا کو بلایا۔ وہ آیا تو اسے کھانا چننے کی ہدایت کی۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔

کھانے کا کمرہ برابر ہی تھا۔ دونوں نے وہاں جاکر کھانا کھایا۔ کھانا مرغن اور خوش ذائقہ تھا مگر رحیم داد زیادہ نہ کھاسکا۔ کھانے سے فارغ ہوکر احسان شاہ حویلی کے زنان خانے کی جانب چلا گیا۔

☆

دیوان خانے کا ایک دروازہ ایک طویل راہداری میں کھلتا تھا۔ آگے مختصر باغیچہ تھا۔ باغیچے کے ایک طرف برآمدہ تھا۔ اس میں ایک سلسلے سے کئی کمرے تھے جو مہمانوں کے قیام کے لیے تھے۔

شیدا نے ایک کمرے میں رحیم داد کو پہنچا دیا۔ کمرہ خوب ہوا دار تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے۔ کمرے کے ایک طرف مسہری بچھی تھی۔ اس پر اجلا بستر تھا۔ قریب ہی میز رکھی تھی۔ اس پر لیمپ روشن تھا۔ شیدا اسے کمرے میں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے لیمپ کی لو مدھم کردی۔ بارش پھر شروع ہوگئی تھی۔ بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ بجلی بھی کڑک رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکی باغ کی جانب کھلتی تھی۔ ہوا کے بھیگے ہوئے جھونکے اندر آرہے تھے۔ رحیم داد نے آنکھیں بند کرلیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد دروازہ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول دیں۔ مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا کہ دھندلی روشنی میں ایک عورت دہلیز کے پاس کھڑی دروازہ بند کر رہی ہے۔ اس کی پشت رحیم داد کی جانب تھی۔ وہ سبز کنارے کا سرخ ریشمی لاچا باندھے ہوئے تھی۔

دروازہ بند کرنے کے بعد وہ مڑی۔ اس کا رنگ چمپئی تھا۔ صورت شکل گوارا تھی۔ البتہ آنکھیں روشن اور خوب صورت تھیں۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنی ناک کا کوکا درست کیا اور آہستہ آہستہ رحیم داد کی جانب بڑھنے لگی۔ وہ پچیس چھبیس سال کی جوان اور صحت مند عورت تھی۔

رحیم داد خاموش لیٹا رہا۔

عورت چپ چاپ آکر پائنتی کی جانب بستر پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ بادل ایک بار زور سے گرجے۔ بارش تیز ہوگئی۔ رحیم داد تکیے کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ عورت کو ایک ٹک دیکھتا رہا، پھر اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"تو ماکھے کی گھر والی ہے؟"

"ہاں جی! میں اس کی گھر والی ہوں۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

"تیرا نام کیا ہے؟" رحیم داد نے بات چیت آگے بڑھائی۔

"نام تو جی میرا سگراں ہے پر شاہ جی مجھے رسیلی کہتا ہے۔ اب سب اسی نام سے پکارتے ہیں۔" وہ آہستہ آہستہ بولتی رہی۔ "تو نے ماکھے کا نام لیا' تو اسے جانتا ہے؟"

"ہاں۔" رحیم داد نے گردن ہلا کر اقرار کیا۔ "یہ بتا' تجھے کبھی وہ یاد بھی آتا ہے؟"

"آتا تو ہے۔ پر اس سے کیا ہوتا ہے جی۔" رسیلی کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔ "پنج سال سے اوپر ہو گئے۔ میں نے اسے نہیں دیکھا۔"

"اگر شاہ جی تجھے واپس بھیج دے' تو اس کے پاس چلی جائے گی؟"

"کیوں نہیں چلی جاؤں گی۔ وہ میرا گھر والا ہے۔"

"وہ تجھ سے دن رات محنت کرائے گا' نہ کھانے کو ٹھیک طرح روٹی دے گا۔ نہ ایسے عمدہ کپڑے لتے پہننے کو دے گا اور نہ تجھے ایسا آرام ملے گا' جو یہاں حویلی میں مل رہا ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تو یہ سب کچھ چھوڑ کر اس کے پاس چلی جائے گی؟"

"یہ بھی کوئی زندگی ہے جی۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی' دبا دبا کرب تھا۔ "کبھی شاہ جی کے ساتھ سوتی ہوں' کبھی اس کے پتروں کے ساتھ۔ تیرے ایسے مہمان ادھر آ کر ٹھیرتے ہیں' تو ان کے ساتھ بھی سونا پڑتا ہے۔" اس کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔ "کئی تو ایسے مہمان آتے ہیں کہ پوری روشنی میں سارے کپڑے لتے اترا دیتے ہیں۔ شراب کے نشے میں جانے کیسی گندی گندی حرکتیں کرتے ہیں۔ میں تجھے کیا کیا بتاؤں؟ کیسے بتاؤں مجھ پر کیا کیا بیتتی ہے؟" اس نے گہری سانس بھری' چہرہ غم زدہ ہو گیا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ رحیم داد' دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ ٹھیک سے نہ دیکھ سکا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ رسیلی بھی خاموش رہی۔ باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ ہوا کے بھیگے ہوئے جھونکے کمرے کے اندر آتے' لیمپ کی لو بار بار بھڑکتی' دونوں کے سائے دیوار پر لہرا کر گڈمڈ ہو جاتے۔ پھر رسیلی کی آواز خاموشی میں ابھری۔ "مجھے جھونک آ رہی ہے' تو نہیں سوئے گا؟" اس نے انگڑائی لی۔

"تو کہہ تو لیمپ بجھا کر کپڑے اتار دوں۔"

اس نے یہ باتیں ایسی بے باکی اور دھڑلے سے کہیں کہ رحیم داد حیرت سے چونک پڑا۔ نظریں اٹھا کر رسیلی کو دیکھا' منہ بگاڑ کر کسی قدر حقارت سے گویا ہوا۔ "تجھے اس طرح گل کرتے لاج بھی نہیں آتی؟"

"کیسی لاج' اور کیسی عزت۔" اس نے تیکھی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "پنج سال سے اوپر ہو گئے' اور تو مجھ میں لاج ڈھونڈتا ہے۔ وہ میرے پاس رہی کہاں۔ مزارعوں اور کمیوں کی کڑیوں اور گھر والیوں کی عزت اور آبرو ہوتی ہی کب ہے؟ عزت شجت تو زمیں دارنیوں کے پاس ہوتی ہے۔ وہ تو اپنے شریکوں کے سامنے بھی اوڑھنی کا بکل مار کر' منہ چھپا کے بیٹھتی ہیں۔ تانگے اور موٹر میں سوار ہو کر کہیں جاتی ہیں تو چاروں طرف چدر باندھ دی جاتی ہے۔" اس کے چہرے پر دکھ کے سائے منڈلانے لگے۔ "اپنا حال ایہہ ہے۔ دو برس ہوئے۔ اسی کمرے میں ایک وڈا افسر آ کر ٹھیرا۔ اس نے ایک نہیں' دو لیمپ جلوائے اور سویرے تک ننگا نچوایا۔"

"وہ تجھ سے اتنا ناراض کیوں ہو گیا تھا؟"

"میں نے جی اس سے صرف اتنی گل کی تھی کہ جب اس نے پوری روشنی میں میرے کپڑے اتروانے چاہے تو میں نے انکار کر دیا۔ صاف' صاف کہہ دیا' میں کنجری نہیں ہوں۔ فیر تو جی' وہ اتنا ناراض ہوا کہ خود تو آرام سے بیٹھا شراب پیتا رہا' اور مجھے ننگا نچواتا رہا۔ تھک جاتی تو گالاں نکالتا۔ کبھے سے گلاس میں بھری ہوئی شراب اچھالتا۔ گر پڑتی تو اپنی چمڑے کی پیٹی سے مار لگاتا۔ منہ میں پیشاب کرنے کی دھمکی دیتا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"تو نے منت سماجت نہیں کی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"بہت کی جی۔ پر وہ تو جی نشے میں دھت ہو رہا تھا۔" رسیلی نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "اب تو یہ بات پرانی ہو گئی۔ اس کے بعد تو جو جیسا کہتا ہے' ویسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ مہمان ناراض ہو جائے اور شاہ جی سے شکایت لگا دے تو وہ گندی' گندی گالاں نکالتا ہے۔ زور زور سے ٹھڈے مارتا ہے۔"

"شاہ جی' جن دوسری زنانیوں کو اٹھوا کر یہاں لاتا ہے' وہ سب ایسا ہی کرتی ہیں؟"

"کرنا ہی پڑتا ہے جی۔ ایسا نہ کریں تو شاہ جی چمڑی ادھیڑ ڈالے۔" اس کے چہرے پر خوف کا سایہ پھیل گیا۔ "روٹی ٹکر بند کر دیتا ہے۔ کئی کئی روز بھوکا رکھتا ہے۔"

"میں بھی شاہ جی کا مہمان ہوں۔" رحیم داد نے مسکرا کر دریافت کیا۔ "میرے بارے میں تو نے کیا سوچ رکھا ہے؟"

"میں نوں کیہہ پتہ تو کیسا بندہ ہے۔' اس نے دبی زبان سے کہا۔ "جب تو نے مجھے اپنے کول بلوا ہی لیا تو میں نوں تیرے بارے میں کیہہ سوچنا۔"

"میں نے تجھے نہیں بلوایا۔ تو واپس چلی جا۔"

"کیسے جا سکتی ہوں۔ دروازے پر شیدے کی ڈیوٹی لگی ہے۔ اس نے شکایت لگا دی تو شاہ جی

میرے گلے پڑ جائے گا۔ تو اسے نہیں جانتا۔ وہ بہت ظالم ہے۔ روٹی تو ٹھیک ٹھاک کھلاتا ہے، کپڑے لتے بھی بنوا کر دیتا ہے پر ظلم بھی ایسے ہی کرتا ہے۔"

"ایسا کر رسیلی!" رحیم داد نے کمرے میں پڑے ہوئے قالین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تو اس پر سو جا۔ میں نوں تجھ سے کچھ نہیں لینا۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔ "تو سچ کہہ رہا ہے۔" مگر فوراً ہی اس کا چہرہ مرجھا گیا۔ "لگتا ہے، میں تجھے پسند نہیں آئی۔"

"ایسی کوئی گل بات نہیں۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ چند لمحے خاموش رہا، پھر اس نے کرید کر پوچھا۔ "یہ بتا، تیرے پیٹ میں تو بچہ تھا نا؟ ماکھا ہی بتا تا تھا۔"

"تھا تو، پر حکیم جی نے پرانے چھپر کا پھوس اور گڑ ملا کر کھلایا۔ دوائی بھی دی۔ حمل گر گیا۔ سب ٹھیک ہو گیا۔ پر بہت تکلیف ہوئی جی۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ دبی زبان سے پوچھا۔ "ماکھا تجھے کہاں ملا تھا؟"

"وہ مجھے کئی بار مل چکا ہے۔ تیرے لیے بہت پریشان رہتا ہے۔"

"پریشان تو جی رہتا ہی ہو گا۔" وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ "میں اس کے لیے کم پریشان رہتی ہوں۔ شروع شروع میں تو بہت یاد آتا تھا۔ چھپ چھپ کر روتی تھی۔ شاہ جی کو پتہ چل جاتا تو گالاں نکالتا، روٹی بند کر دیتا۔ وہ تو جی رونے بھی نہیں دیتا۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ رحیم داد نے پوچھا۔ "کیا سوچنے لگی؟"

"ماکھے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔" اس کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔ "کیسا ہے وہ؟"

"لگتا ہے، تو اسے ابھی تک بہت یاد کرتی ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "پر اب تو اس کے لیے پریشان نہیں رہے گی۔ کل سویرے وہ یہاں آ کر تجھے اپنے ساتھ لے جائے گا۔"

"نہیں جی! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ شاہ جی کے پاس بار بار آتا رہا، منت سماجت کی، پیروں پر سر رکھ دیا پر شاہ جی نہ مانا۔ اب وہ کیسے مان جائے گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "کوٹ کی جس زنانی سے اس کا جی بھر جاتا ہے، اسے بیچ دیتا ہے۔ واپس بھی کر دیتا ہے پر اس کے لیے لمی رکم مانگتا ہے۔ ماکھا مجھے واپس لینے کے لیے کہاں سے اتنا روپیہ لائے گا؟ تیری گل سمجھ نہیں آئی۔"

"کل سویرے تجھے سمجھ آ جائے گی۔" رحیم داد نشے سے جھوم کر بولا۔ رسیلی نے رحیم داد کو

گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات صاف چغلی کھا رہے تھے کہ اسے رحیم داد کی بات پر یقین نہیں آیا۔ مگر اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ رحیم داد کسی قدر بیزاری سے بولا۔

"اب میں نوں سونے دے اور خود بھی سو جا۔ کل تیرا ماکھا، تجھے آ کر لے جائے گا۔" وہ ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔

رسیلی خاموشی سے اٹھی اور قالین پر جا کر بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے کروٹ بدلی، پھونک مار کر لیمپ بجھا دیا۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ باہر ابھی تک بارش ہو رہی تھی۔ تیز ہوا درختوں کی شاخوں سے الجھ کر پھڑپھڑا رہی تھی۔ رحیم داد پر نیند کا غلبہ ہوا۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

سویرے اس کی آنکھ کھلی تو کمرہ خالی تھا۔ رسیلی جا چکی تھی۔ بارش بھی بند ہو چکی تھی۔ کمرے کے باہر صبح کا اجالا پھیلا تھا۔ رحیم داد اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد شیدا آ گیا۔ کمرے سے متصل غسل خانہ تھا۔ شیدا نے رحیم داد کو غسل خانے میں پہنچا دیا۔

رحیم داد نہا دھو کر غسل خانے سے نکلا تو برآمدے کے سامنے باغیچے میں ہلکی ہلکی دھوپ پھیلی تھی۔ درخت رات کی بارش سے ابھی تک بھیگے ہوئے تھے۔ وہ شیدا کے ہم راہ کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔ میز پر ناشتا لگایا جا چکا تھا۔ رحیم داد کے پہنچنے کے چند ہی منٹ بعد احسان شاہ بھی آ گیا۔ وہ اس وقت بوسکی کا لمبا کرتا اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھا۔ کرتے میں سونے کے بٹن لگے تھے جن پر جڑے ہوئے پکھراج کے نگینے جھل ملا رہے تھے۔

رحیم داد کو دیکھتے ہی احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "چوہدری! آرام نال نیند آئی؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟" وہ کرسی کھسکا کر رحیم داد کے مقابل بیٹھ گیا۔ اس نے لسی کا گلاس اٹھایا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔ مونچھیں ہاتھ سے صاف کیں، کھل کر مسکرایا۔ رحیم داد کی جانب ذرا سا جھکا۔ "رن کیسی تھی؟"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "شاہ جی! میں نوں اپنے پنڈ واپس جانا ہے۔ ادھر سب پریشان ہوں گے۔ کسی کو پتہ نہیں، میں رات تیری حویلی میں رہا۔"

"کسی کو پتہ نہ چلے تو ٹھیک ہی ہے۔" احسان شاہ نے مشورہ دیا۔ "اور اللہ وسایا کو تو بالکل پتہ نہیں چلنا چاہیے۔"

"یہ تو میں بھی چاہتا ہوں، اسے پتہ نہ چلے۔" رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "میں نوں پتہ ہے، تیری اس کے ساتھ پرانی لگتی ہے۔ اسے معلوم ہو گیا تو برا منائے گا۔"

"اس بارے میں تو میں تجھ سے آگے آرام سے گل بات کروں گا۔ تجھے کئی باتیں بتانی ہیں۔ تو

ابھی کچھ نہیں جانتا۔"

رحیم داد نے گفتگو کا موضوع بدلا اور مطلب پر آگیا۔ "شاہ جی! تونے ماکھے کے بارے میں کیا سوچا؟"

"سوچنا کیا ہے۔ تجھ سے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کروں گا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "ویسے بھی اب تیری گل تو ماننی ہی پڑے گی۔ یارانہ جو ہوگیا۔ ساتھ بیٹھ کر چینے کے بعد تو سمجھ لے' یاری پکی ہوگئی' اس پر مہر لگ گئی۔ ایسی یاری دوستی کبھی نہیں ٹوٹتی' زندگی بھر چلتی ہے۔ ابھی نہیں' آگے تجھے اس کا ٹھیک سے اندازہ ہوجائے گا۔"

رحیم داد مسکرایا اور احسان شاہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گرم جوشی سے بھینچ لیا۔ رحیم داد کا قیاس غلط نہیں نکلا۔ احسان شاہ کے چہرے پر مسرت کی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے شیدا کو بلایا۔ اسے ہدایت کی کہ ماکھا کو اس کے گھر سے بلا لائے۔ پھر وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "چوہدری! تیں نوں اتنا بتا دوں کہ ماکھا' رسیلی کا ناس مار دے گا۔ دو چار مہینے بعد ہی دیکھ لینا' وہ کھانگڑ اور مریل بن کر رہ جائے گی۔"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "میں نوں تو یہ خوشی ہے' شاہ جی' تونے میری بات مان لی۔"

احسان شاہ مسکرا کر خاموش ہوگیا۔

دونوں ناشتے سے فارغ ہو کر برآمدے میں گئے اور اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سامنے لان پر ہلکی زرد دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ بھیگی ہوئی گھاس پر بارش کے قطرے جھل ملا رہے تھے۔ آسمان بارش کے بعد گہرا نیلا نظر آرہا تھا۔ بادلوں کے ہلکے پھلکے ٹکڑے بلندی پر ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ ہوا دھیمی تھی۔ حویلی کی دیواریں ابھی تک گیلی تھیں۔ احسان شاہ خوش گوار موڈ میں تھا۔ چہرے پر تازگی اور ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔

مگر جیسے ہی ماکھا سر جھکائے شیدا کے ہم راہ سامنے آیا' احسان شاہ کے چہرے سے تازگی اڑ گئی' تیوری پر بل پڑگئے۔ آنکھوں سے جھنجلاہٹ جھلکنے لگی۔ ماکھا چند لمحے خاموش کھڑا رہا' پھر وہ جھکا اور تیزی سے آگے بڑھ کر احسان شاہ کے قدموں پر گر پڑا' پیر پکڑے اور زار و قطار رونے لگا۔

احسان شاہ اور برہم ہوگیا۔ اس نے غصے سے ماکھا کی کمر پر ٹھوکر لگائی۔ گرج کر بولا۔ "سدھا کھڑا ہو۔ زنانیوں کی طرح میرے سامنے ٹسوے نہ بہا۔"

احسان شاہ خاموش بیٹھا غصے سے پیچ و تاب کھاتا رہا۔ ماکھا اٹھ کر سیدھا ہوگیا تھا اور ایک

گوشے میں ذرا سہما نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ احسان شاہ نے مڑ کر قریب کھڑے ہوئے شیدا کو دیکھا' تیکھے لہجے میں گویا ہوا۔

"شیدے! رسیلی اور اس کے بچوں کو یہاں لے آ۔"

رحیم داد نے احسان شاہ کو اس طرح جلال کے عالم میں دیکھا تو پریشان ہوگیا۔ اس نے کچھ کہا نہیں۔ چپ بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد شیدا کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی رسیلی بھی آگئی۔ اس کے ہم راہ چار چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ رسیلی کا لباس بدلا ہوا تھا۔ وہ نہا دھو کر آئی تھی اور نکھری نکھری نظر آرہی تھی۔ مگر اس کے بچے اتنے ہی گندے تھے۔ لباس بھی ان کے جسم پر میلے اور بوسیدہ تھے۔

احسان شاہ نے نظر بھر کر رسیلی کو دیکھا اور حاکمانہ انداز میں پوچھا۔ "ماکھا تجھے لینے آیا ہے' تو اس کے ساتھ جائے گی؟" رسیلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے گھبرائی ہوئی خاموش کھڑی رہی۔ ماکھا ہونق کی طرح منہ اٹھائے اسے بے چینی سے دیکھتا رہا۔ رحیم داد بھی رسیلی کی خاموشی پر حیرت زدہ تھا۔

احسان شاہ نے رسیلی کی جانب ایک بار پھر دیکھا' اونچی آواز سے بولا۔ "چپ کر کے کیوں کھڑی ہے؟ صاف صاف بتا' تونے ماکھے کے ساتھ جانا ہے کہ نہیں۔ اپنی مرضی بتا' کیا چاہتی ہے؟"

"میری کیا مرضی ہے جی!" رسیلی نے سر اٹھائے بغیر رسان سے کہا۔ "جو حکم کرے گا ویسا ہی کروں گی۔"

"میرے حکم کو چھوڑ' اپنی گل کر۔"

"چلی جاؤں گی جی اس کے ساتھ۔" رسیلی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا گھر والا ہے' ویاہ کر لایا ہے۔"

"لے سنبھال اپنا بازو اور اس کے چھوہرے' چھوہریاں۔" احسان شاہ نے ماکھا سے کہا۔ پھر رحیم داد کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "چوہدری کی خاطر واپس دے رہا ہوں۔ اس کی گل تو میں نے ماننی ہی تھی۔"

ماکھا ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ "تیری مہربانی ہے شاہ جی۔"

احسان شاہ خاموش بیٹھا رہا۔ ماکھا نے چھوٹے بچے کو گود میں اٹھالیا' رسیلی کا ہاتھ تھاما' احسان شاہ کی جانب خوف زدہ نظروں سے دیکھا۔ اس سے اجازت چاہی۔

"اسے لے جاؤں جی؟"

"لے جا۔ دفع ہو یہاں سے۔" احسان شاہ نے بے زاری سے کہا۔

ماکھا آگے بڑھا' ریلی اس کے ساتھ چلی۔ بچے بھی اس کے ہم راہ تھے۔ وہ سب آہستہ آہستہ برآمدے سے نکل گئے۔

رحیم داد نے احسان شاہ کا شکریہ ادا کرنے کے انداز میں کہا۔ "شاہ جی! تیری بہت بہت مہربانی۔ تونے میری بات کی لاج رکھ لی۔" اس کے لہجے سے خوشامد آشکارہ تھی۔

"چوہدری میں یاروں کا یار ہوں۔" احسان شاہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "آگے بھی آزما لینا۔ احسان شاہ کو اپنی بات کا ہمیشہ دھنی پائے گا۔ ایک بار وعدہ کرلوں گا تو اسے ضرور پورا کروں گا۔"

رحیم داد نے کچھ دیر ٹھیر کر جانا چاہا تو احسان شاہ مسکرا کر بولا۔ "اب تجھ سے آئندہ بھی ملنا جلنا رہنا چاہیے۔ تو اپنا پڑوسی زمیں دار ٹھیرا۔ آپس میں میل ملاپ بہت ضروری ہے۔ ایک دوسرے سے کام پڑتا ہی رہتا ہے۔" وہ بے تکلفی سے ہنسا۔ "دیکھ یہ آخری ملاقات نہیں ہونی چاہیے۔ یہاں آتا جاتا رہے گا تو میرا بھی چنگا وکت کٹے گا۔ تیرا دل بھی بہل جائے گا۔"

رحیم داد نے ایک بار پھر احسان شاہ کا شکریہ ادا کیا۔ احسان شاہ اسے رخصت کرنے حویلی کے پھاٹک تک آیا۔ گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ پیٹھ تھپک کر بولا۔ "تجھ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" رحیم داد نے علیحدہ ہوتے ہوئے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا۔ اپنی گھوڑی پر سوار ہوا اور کوٹلہ ہرکشن کی سمت روانہ ہوگیا۔

رات بھر کی بارش کے بعد پانی اور کیچڑ سے راستہ بہت خراب ہوگیا تھا۔ رحیم داد گھوڑی سنبھال سنبھال کر دوڑا رہا تھا۔ وہ گاؤں میں داخل ہوا تو پہر دن گزر چکا تھا۔ مہمان خانے کا ملازم' احمد اس کے انتظار میں پریشان بیٹھا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی اس نے جلدی سے پوچھا۔

"چوہدری! تو اب تک کہاں رہا؟ رات زبردست بارش ہوئی۔"

رحیم داد نے حیلے سے کام لیا۔ "گھوڑی دوڑاتا نہر کے پار دور تک نکل گیا۔ واپسی پر بارش شروع ہوگئی۔ عالم پور نزدیک ہی تھا' ادھر چلا گیا۔ وہاں کے ایک زمیں دار سے اپنی جان پہچان ہے۔ بارش بہت تیز تھی۔ رات اسی کے پاس ٹھیر گیا۔"

"ہاں جی! اتنی زور کی برکھا میں واپسی کیسے ہو سکتی تھی؟" احمد نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔ "ناشتا لے آؤں تیرے لیے؟"

"نہیں' ناشتا میں نے ادھر ہی کرلیا تھا۔ بہت تھک گیا ہوں' اب آرام کروں گا۔ تو ٹر جا۔"

احمد چلا گیا۔ رحیم داد بستر پر لیٹ کر سو گیا۔ اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا۔ دن ڈھلے تک پڑا سوتا رہا۔ بیدار ہوا تو جسم ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے غسل کیا' لباس تبدیل کیا اور باغ میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ شام تک تنہا بیٹھا رہا۔ رات کا کھانا کھا کر وہ مہمان خانے میں واپس چلا گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ اللہ وسایا ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اس کے بغیر رحیم داد کو شدید احساس تنہائی ہوا۔ گاؤں میں کسی اور سے اس کا میل جول نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی ایسا تھا جس سے میل جول پیدا کیا جاتا۔ سارے ہی مزارعے اور کمی تھے۔ مگر تنہائی سے اکتانے کے باوجود نہ اس نے گھڑسواری کی' نہ نہر کی جانب گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ احسان شاہ سے دوبارہ مڈبھیڑ نہ ہو جائے اور وہ اصرار کرکے اپنے ہم راہ پیراں والہ نہ لے جائے۔ وہ اب احسان شاہ سے ملنا اور اس کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا۔

☆

اس شام موسم بڑا سہانا تھا۔ دوپہر تک بارش ہوتی رہی۔ دن ڈھلے بادل چھٹ گئے' مطلع صاف ہوگیا۔ گرد و غبار سے اٹے ہوئے درختوں اور پودوں کے پتے بارش سے دھل کر خوب صاف ستھرے ہوگئے تھے' ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنوں میں دمک رہے تھے۔ ہوا سنسناتی ہوئی چل رہی تھی۔ اس میں فرحت اور تازگی تھی۔ رحیم داد باغ میں خاموش بیٹھا نکھری نکھری خوش گوار فضا سے لطف اٹھا رہا تھا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ ماکھا کب اس کے پہلو میں آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ آہستہ سے کھنکارا تو رحیم داد نے پلٹ کر دیکھا۔ ماکھا اپنے گندے دانت نکال کر مسکرانے لگا۔

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "تو کب آیا اور کیسے آیا؟"

"بس جی آ ہی گیا۔" اس کے لہجے میں خوشامد تھی۔ "چوہدری! تونے میرا بازو واپس دلا دیا' میں تجھے کیسے بھول سکتا ہوں۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "ریلی ٹھیک ٹھاک ہے؟"

"کیوں نہیں ٹھیک ٹھاک ہوگی جی!" ماکھا خوشی سے چہک کر بولا۔ "اپنے گھر میں لوٹ آئی ہے۔ بہت خوش ہے۔ اپنا گھر جی اپنا ہی ہوتا ہے۔ وہ بھی تیرے پاس آنا چاہتی تھی پر میں اسے نہیں لایا۔ سوچا' پہلے تجھ سے پوچھ لوں۔"

"تو اسے نہیں لایا۔ یہ ٹھیک کیا۔ بلکہ تو بھی نہ آیا کر۔ تو احسان شاہ کا مزارع ہے۔ اللہ دسایا کو تیرا اس طرح بار بار آنا برا لگے گا۔ تیرا کام بن گیا۔ جا موجاں کر۔ اب یہاں نہ آنا۔" اس نے ماکھا کو تنبیہہ بھی کی۔ "اور دیکھ' کسی کو پتہ نہ چلے' میں شاہ جی کی حویلی میں ٹھیرا تھا۔"

"اطمینان رکھ، میں کسی سے ایسی گل نہیں کروں گا۔ پر میں آج تیرے پاس ایک ضروری کام سے آیا تھا۔" اس نے سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ "شاہ جی نے تجھے بلایا ہے۔ کوئی ضروری گل کرنی ہے۔ کہا ہے، آج ہی شام آجا۔"

"نہیں جی! میں اب اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں صرف تیری خاطر گیا تھا۔ تیرا کام بن گیا، اس کے ساتھ ہی میرا آنا جانا بھی بند ہو گیا۔"

"پر وہ کوئی بہت ضروری گل کرنا چاہتا ہے۔" ماکھا نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ "سن لینے میں کیا جاتا ہے۔ وہاں دیر تک نہ ٹھیرنا۔ نہیں جائے گا تو مجھ پر نراض ہو گا۔"

"تیں نوں پتہ ہے، وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟" رحیم داد کے لہجے میں پہلی سی بیزاری اور بے رخی نہیں تھی۔

ماکھا نے اس کے رویے میں لچک پائی تو مسکرا کر بولا۔ "یہ تو میں نوں پتہ نہیں۔ پر اتنا ضرور لگتا ہے، گل کچھ تیرے کام ہی کی ہو گی۔ شاہ جی کہتا بھی یہی تھا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ سر جھکا کر سوچنے لگا کہ احسان شاہ کون سی ایسی اہم بات کہنا چاہتا ہے جس کے لیے ماکھا کو بھیج کر اسے بلایا ہے۔ ماکھا نے رحیم داد کو خاموش پایا تو قدرے عاجزی سے بولا۔ "تو چلا جائے گا تو شاہ جی مجھ سے خوش ہو جائے گا۔ تیں نوں تو ذرا دیر گل بات کرنی ہے۔ جب جی چاہے، لوٹ آنا۔ ہو سکتا ہے، کوئی بہت کام ہی کی گل ہو۔"

رحیم داد نے احسان شاہ کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ماکھا سے کہا۔ "تو جا، میں آج ہی شاہ جی کی حویلی پر پہنچ جاؤں گا۔ اسے بتا دینا۔"

ماکھا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا باغ سے چلا گیا۔ رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ گھاس پر ٹہلتا رہا اور سوچتا رہ کہ احسان شاہ اس سے کیا کہنا چاہتا ہے؟ اس کے ذہن میں کرید پیدا ہوئی، جس نے دھیرے دھیرے تجسس پھر بے چینی کی کیفیت اختیار کر لی۔

رحیم داد نے گھوڑی اصطبل سے نکلوائی۔ اس پر سوار ہوا اور احسان شاہ کی حویلی کی جانب روانہ ہو گیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا مگر شفق کی سرخی نے فضا کو لالہ رنگ بنا دیا تھا۔ وہ گھوڑی دوڑاتا ہوا کوٹلہ ہر کشن سے نکلا، نہر کی طرف بڑھا۔

شفق کی گہری سرخ روشنی میں اسے نہر کے کنارے ایک شخص نظر آیا جسے دیکھتے ہی وہ سراسیمہ ہو گیا۔ وہ دارا تھا۔ رحیم داد نے اسے غور سے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ رحیم داد نے اسے اچھی طرح پہچان لیا، ہاں وہ دارا ہی تھا۔

رحیم داد نے ایڑ لگا کر گھوڑی کی رفتار میں اضافہ کیا اور تیزی سے دارا کے قریب سے گزرتا ہوا آگے نکل گیا۔ اسے گمان گزرا کہ دارا نے اسے روکنے کے لیے ہاتھ بھی اٹھایا تھا۔ مگر رحیم داد نے اس کی جانب مطلق توجہ نہ دی، پلٹ کر دیکھا بھی نہیں، گھوڑی سرپٹ دوڑاتا رہا۔ وہ پیراں والہ کی جانب بڑھ رہا تھا اور دارا خطرہ بن کر اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ وہ رہ رہ کر سوچ رہا تھا کہ دارا، اس کی منقول بہن بیگماں کے گاؤں ڈھولہ امیر خان سے ادھر کیوں آگیا؟ کیسے آگیا؟ یہ سوالات اس کے ذہن میں منڈلاتے رہے اور وہ آگے بڑھتا گیا۔ دارا بہت پیچھے رہ گیا۔

☆

احسان شاہ اپنی حویلی کے سبزہ زار پر تنہا بیٹھا تھا۔ اس کے ارد گرد کئی خالی کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر اسکاچ کی بوتل، گلاس اور ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا جگ رکھا تھا۔ رات نکھری نکھری تھی، آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے، ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ قریب ہی برآمدہ تھا۔ اس میں لیمپ روشن تھا۔ لیمپ کی روشنی میں احسان شاہ کا چہرہ نشے سے تمتا رہا تھا۔ وہ رک رک کر وہسکی کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ اس کی نظریں بار بار برآمدے کی جانب اٹھ جاتیں۔ وہ بے چینی سے رحیم داد کا انتظار کر رہا تھا۔

رحیم داد برآمدے سے گزر کر لان میں پہنچا۔ احسان شاہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "چوہدری! بہت انتظار دکھایا۔ کہاں لگا دی اتنی دیر؟" اس نے گرم جوشی سے رحیم داد کا ہاتھ تھاما اور اپنے برابر ہی ایک کرسی پر بیٹھا لیا۔

رحیم داد نے صفائی پیش کرنے کے انداز میں کہا۔ "میں تو ماکھے سے تیرا پیغام ملتے ہی چل کھڑا ہوا تھا، پر تیں نوں پتہ ہے، برسات کے دن ہیں۔ ہر طرف پانی اور کیچڑ ہے، رستہ کچا ہے۔ یہاں پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ گھوڑی کو سنبھال سنبھال کر دوڑانا پڑا۔"

"ایسے موسم میں تو ان راستوں پر جیپ بہت کام دیتی ہے۔"

"وہ تو اپنے پاس ہے نہیں۔"

"اللہ وسایا نے تو تانگا بھی نہیں رکھا۔ وہ تو کسی طور زمیں دار ہی نہیں لگتا۔" احسان شاہ نے اللہ وسایا کے خلاف اپنی کدورت کا اظہار کیا۔ "بنسی لال، تھا تو بنیا، پر اس کے زمانے میں ایک چھوڑ دو تانگے ہوتے تھے اور ہر دیال تو ہمیشہ جیپ ہی میں کوٹلہ ہر کشن آتا جاتا تھا۔ اس میں زمیں داروں کی شان تھی۔ تھا بھی وڈے زمیں دار کا پتر۔"

"میں نے تو جی، ایک بھی تانگا نہیں دیکھا۔"

“فسادات شروع ہوئے تو بنسی لال بھاگ گیا۔” احسان شاہ نے رحیم داد کو بتایا۔ “کوچوانوں نے لوٹ مار سے فائدہ اٹھایا۔ دونوں ہی تانگے لے کر نکل گئے۔” احسان شاہ نے خالی گلاس میں بوتل سے اسکاچ وہسکی انڈیلی‘ پانی ڈالا اور پیگ بنا کر رحیم داد کی جانب بڑھا دیا۔ “لے‘ پہلے تھوڑی سی لگا لے۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔”

رحیم داد نے گلاس تو لے لیا مگر دبی زبان سے بچنے کی کوشش بھی کی۔ “شاہ جی! آج رہنے دے۔ میں نوں پنڈ واپس بھی جانا ہے‘ زیادہ دیر نہیں ٹھیرنا۔ تو نے بلایا‘ میں چلا آیا۔”

“چوہدری! خاما خا کی بات نہ کر۔” احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ “بس اب شروع ہو جا۔ واپسی کی بعد میں دیکھی جائے گی۔”

احسان شاہ نے رحیم داد کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرا کر ہاتھ اونچا کیا‘ ہلکا قہقہہ لگایا اور گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ رحیم داد نے بھی گھونٹ بھرا‘ بھیگی ہوئی مونچھیں ہاتھ سے صاف کیں اور گلاس میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ “شاہ جی! ایسی کون سی خاص گل تھی جس کے لیے تو نے مجھے بلوایا؟”

احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ “بس تجھ سے ذرا گپ شپ کرنے کو جی کرتا تھا۔ سوچا تو ادھر اکیلا ہے‘ آ جائے گا تو تیرے ساتھ اپنا دل بھی بہل جائے گا۔”

“پر ماکھا تو کہتا تھا‘ کوئی خاص گل کرنی ہے‘ فوراً آنے کو کہا ہے۔”

“ماکھا ٹھیک ہی کہتا تھا۔” احسان شاہ نے خمار آلود نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ “خاص گل شل کیا ہے۔ تجھ سے کچھ پوچھنا تھا۔ تیرے ہی مطلب کی گل ہے۔” وہ کھل کر مسکرایا۔ “ہاتھ کیوں روک لیا؟ سارا گلاس ویسا ہی رکھا ہے۔ اسے آدھا تو کر۔ تجھے کچھ سرور شرور ہو جائے تو گل کرنے میں مزا بھی آئے۔”

رحیم داد نے بڑا گھونٹ بھرا اور ایک تہائی گلاس خالی کر دیا۔ اس نے منہ بگاڑا۔ احسان شاہ نے تکوں کی پلیٹ سامنے کر دی۔ رحیم داد ایک تکا اٹھا کر چبانے لگا۔ چٹ پٹا تھا۔ رحیم داد کے منہ کی کڑواہٹ کم ہو گئی۔ تھوڑا سا سرور بھی ہوا مگر وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ احسان شاہ کیا پوچھنا چاہتا ہے۔ اس کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ تجسس کے ساتھ ساتھ خدشات اور وسوسے بھی تھے۔

احسان شاہ نے رحیم داد کو زیادہ دیر ذہنی خلفشار میں مبتلا نہیں رکھا۔ اس نے قدرے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ “چوہدری! تو نے اپنی زمیں داری کا مختار تو اللہ وسایا کو بنا دیا‘ پر یہ بھی پتہ ہے کہ مختار نامے میں لکھا کیا تھا؟”

“یہ تو جی پتہ نہیں۔ میں نوں انگریزی نہیں آتی۔ مختار نامہ انگریزی میں تھا۔” رحیم داد نے سادگی سے کہا۔ “وکیل نے جہاں جہاں بتایا‘ میں نے دستخط لگا دیئے۔” اس کے لہجے میں تجسس پیدا ہو گیا۔ “پر یہ گل تو کیوں پوچھ رہا ہے؟”

“لگتا ہے تو اپنی زمیں داری کے بارے میں لکھا پڑھی کے سارے کام منشی یا کاردار کے ذریعے کراتا رہا ہے۔ تجھے اس پر پورا پورا بھروسہ بھی ہو گا۔” احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ “میں نے غلط تو نہیں کہا؟”

“تو نے ٹھیک ہی سوچا‘ بالکل یہی بات ہے۔” رحیم داد نے احسان شاہ سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی لاعلمی کی پردہ پوشی کی۔

“تبھی تو نے آنکھ بند کر کے ایسی پکی دستاویز پر دستخط کر دیئے۔ مختار نامہ تو شامپ پیپر ہی پر ہو گا؟”

“ہاں جی‘ شامپ پیپر ہی پر تھا۔” رحیم داد کے چہرے سے ہلکی ہلکی پریشانی جھلکنے لگی۔ “پر تو اس کے بارے میں کیا بتانا چاہتا ہے؟”

“یہ بتانا ہے‘ تو نے یہ غلط کام کیا۔ اس طرح دستخط نہیں کیے جاتے۔”

“وہ تو ہو گئے۔ اب اس کے بارے میں کیا کہنا چاہتا ہے؟”

“اللہ وسایا نے اگر مختار نامے کی بجائے بیع نامے پر تجھ سے دستخط کروا لیے تو؟” احسان شاہ نے رحیم داد کے ذہن میں شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر رحیم داد نے تذبذب میں مبتلا ہونے کے باوجود اس کا اظہار نہیں کیا۔ “نہیں شاہ جی! میں نوں پتہ نہیں‘ اللہ وسایا میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔”

“یہ جائیداد اور ملکیت بہت ظالم ہوتی ہے۔” احسان شاہ نے وہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے کہا۔ “بھائی کو بھائی کے خلاف‘ پیئو کے خلاف پتر کو مدعی اور مدعالیہ بنا کر عدالت تک پہنچا دیتی ہے۔ ایسی دشمنی ڈالتی ہے کہ خون ہو جاتے ہیں۔ تو نے بھی ایسے کتنے ہی جھگڑے دیکھے ہوں گے۔ اللہ وسایا سے تیرا سگا رشتہ بھی نہیں۔ فیر وہ ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟”

“یہ تو ٹھیک ہے جائیداد اور زمین کی ملکیت پر سگے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ مکدمے بازی بھی ہوتی ہے۔ خون بھی ہو جاتے ہیں‘ پر میں نوں اتنا پتہ ہے‘ اللہ وسایا ایسا نہیں ہو سکتا۔” رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔ “یہ بتا‘ ایسی گل تو نے اللہ وسایا کے بارے میں کیوں سوچی؟”

“ٹھیک ٹھیک سننا چاہتا ہے تو سن لے۔” احسان شاہ کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔ “میں

نوں پتہ چلا ہے، اللہ وسایا نے تجھ سے بیع نامے ہی پر دستخط کرائے ہیں۔ وہ زمیں اور حویلی کی ملکیت اپنے نام کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرا منیجر مہربان علی ایک کیس کی پیروی کے سلسلے میں کل شہر گیا تھا۔ وہیں صدر دفتر کے ایک محرر نے اسے یہ گل بتائی۔ اللہ وسایا بھی وہاں موجود تھا۔ اس کا وکیل کوشش کر رہا ہے کہ کام جھیتی نال پورا ہو جائے۔“

”تیرے منیجر نے غلط بتایا۔“ رحیم داد نے احسان شاہ کی اطلاع درست تسلیم نہیں کی۔ ”اللہ وسایا تو کیمبل پور میں ہے اور میں نوں پتہ ہے، اس کا شہر میں رکنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ وہ تو ابھی تک کیمبل پور ہی میں ہوگا۔ وہاں سے سیدھا اپنے پنڈ آئے گا۔“

”تو بھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ احسان شاہ نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ”اللہ وسایا نے یہی بتایا ہوگا۔ پر میرا منیجر مجھ سے غلط بات نہیں کہہ سکتا۔“ اس نے پہلو بدلا۔ ”یہ بتا، تو جسے مختار نامہ بتاتا ہے، اس کی تیرے پاس کوئی نقل شکل بھی ہے؟“

”نہ تو جی میرے پاس نہیں ہے۔ نہ میں نے مانگی اور نہ وکیل نے مجھے دی۔ میں نے اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ برا نہ منانا شاہ جی! تیری گل سمجھ نہیں آتی۔ اگر اللہ وسایا کے دل میں کھوٹ ہوتی تو وہ حویلی اور زمین کی الاٹمنٹ کے بعد پنڈ کے سارے مزارعوں اور کمیوں کو اکٹھا کر کے یہ بات سب کو صاف صاف نہ بتاتا۔ تیں نوں پتہ نہیں، اس نے ایسا ہی کیا تھا۔“

”تیرا مطلب ہے، میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“ احسان شاہ بھڑک اٹھا۔ ”چوہدری! تیں نوں معلوم نہیں، تو کس سے بات کر رہا ہے۔ پہلے میں آنریری مجسٹریٹ ہوتا تھا۔ عدالت لگاتا تھا۔ مکدموں کے فیصلے سناتا تھا، پر میں نے خود ہی مجسٹریٹی چھوڑ دی۔ زمیں داری کے بکھیڑے کیا تھوڑے تھے جو اس بکھیڑے میں پڑا رہتا۔ بہت اصرار کیا پر میں راضی نہ ہوا۔ دوسرے اس کے لیے جانے کیسی کیسی کوشش کرتے ہیں۔ منتیں کرتے ہیں۔ سفارشیں پہنچاتے ہیں۔“ اس نے جھنجلا کر منہ بگاڑا۔ ”میں نوں تیری جائیداد اور ملکیت سے کیا لینا۔ میرے پاس کچھ کم مربعے ہیں۔“

رحیم داد اس کی برہمی سے سخت مرعوب ہوا۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”شاہ جی! تو میری بات کا غلط مطلب سمجھا۔“

”تیرا مطلب کچھ ہی ہو۔ گل اصلی ایہہ ہے، میں یاری کرتا ہوں تو اسے نباہتا بھی ہوں۔ اب یہی دیکھ، مجھے جیسے ہی مہربان علی سے معلوم ہوا، فوراً تجھے بلایا اور سب کچھ بتا دیا تاکہ تو ہوشیار ہو جائے۔ آگے تیری مرضی۔“

”شاہ جی! یہ تیری مہربانی ہے۔“ رحیم داد کے لہجے سے خوشامد صاف جھلک رہی تھی۔ احسان شاہ یہی سننا بھی چاہتا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی خشونت مٹنے لگی۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ویسے یہ بتا دوں، مہربان علی پٹواری سے ملا تھا۔ اس نے رجسٹر خسرہ گرداوری دیکھا ہے۔ ابھی تک انتقالات تیرے ہی نام ہیں۔“ احسان شاہ نے وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا، شیدا کو بلایا اور کھانا لگانے کی ہدایت کی۔

کھانے سے فارغ ہو کر احسان شاہ نے رحیم داد کو روکنا چاہا مگر رحیم داد رضامند نہیں ہوا۔ اسے خدشہ تھا کہ صبح واپس گیا تو دارا پھر نہ مل جائے۔ رحیم داد نے جب سے دارا کو دیکھا تھا، سخت پریشان تھا۔ دارا خطرہ بن کر اس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ہو سکتا ہے، دارا اسے پہچان نہ سکا ہو۔ وہ منہ موڑ کر تیزی سے گھوڑا دوڑاتا اس کے پاس سے نکل گیا تھا۔ اب وہ دوبارہ ایسا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ احسان شاہ کے اصرار کے باوجود نہیں ٹھہرا۔

جب وہ گھوڑی پر سوار ہو کر واپس ہوا تو آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی۔ صاف شفاف آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ ہر طرف اجلی اجلی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ رحیم داد نہر کے ساتھ ساتھ گھوڑی دوڑانے لگا۔ اور رفتار بتدریج تیز کرتا گیا۔

وہ کوٹلہ ہرکشن میں داخل ہوا تو رات ڈھل رہی تھی۔ مہمان خانے میں پہنچا تو احمد نے دروازہ کھول کر رحیم داد کو پہلی خبر یہ سنائی کہ اللہ وسایا سرِشام ہی واپس آگیا۔

رحیم داد پریشان ہوگیا۔ وہ شراب کے نشے میں چور تھا اور سیدھا احسان شاہ کے پاس سے آرہا تھا۔ اس نے سوچا، اگر اس وقت اللہ وسایا کی آنکھ کھل گئی اور وہ اس سے ملنے مہمان خانے میں آگیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی، لہٰذا اس نے احمد سے بات چیت نہیں کی، جو کچھ اس نے کہا خاموشی سے سن لیا۔ کپڑے تبدیل کیے۔ شلوار اتار کر دھوتی باندھی اور چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا۔ مگر اسے جلد نیند نہیں آئی۔ وہ دیر تک احسان شاہ کی بات پر غور کرتا رہا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہو رہے تھے۔ وہ برابر یہ کوشش کرتا رہا کہ اللہ وسایا کے بارے میں کوئی بدگمانی دل میں نہ آنے دے۔ مگر شبہات بار بار سر اٹھاتے اور دماغ میں کھلبلی مچا دیتے۔ اسی ذہنی انتشار میں وہ سو گیا۔

سویرے سویرے اللہ وسایا مہمان خانے میں آگیا۔ اس نے دروازے سے داخل ہوتے ہی پوچھا۔ ”چوہدری! رات کہاں رہا؟ میں تو تیرے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد پہنچ گیا تھا۔ پتہ چلا تو

گھوڑی پر بیٹھ کر نہر کی طرف گیا ہے۔ میں دیر تک انتظار کرتا رہا۔"

رحیم داد اس سوال کے لیے خود کو پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولا۔ "تو چلا گیا تو اکیلے میں جی بہت گھبرایا۔ تیں نوں پتہ ہے' اپنا یہاں اور کوئی میل جول کا نہیں۔ کل شام گھوڑی پر بیٹھ کر دل بہلانے نہر کی طرف نکل گیا۔ رستے میں ایک پرانا جاننے والا مل گیا۔ ضد کرکے اپنے گھر لے گیا۔ عالم پور کے نزدیک اس کا پنڈ ہے۔ ڈیڑھ سو کلا کے لگ بھگ زمیں داری ہے۔ مزے سے گزر بسر ہو رہی ہے۔ رات کی روٹی بھی میں نے اس کے ساتھ کھائی۔ بعد میں گپ شپ لگی تو آدھی رات ہو گئی۔ وہ تو روکتا تھا پر میں نہ رکا۔"

"تو پہلے بھی تو ایک رات اسی کے ہاں ٹھیرا تھا۔" اللہ وسایا نے کرسی پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کوئی پرانا یار لگتا ہے۔ پر تو نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا۔"

رحیم داد نے یہ سنا تو حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا کہ احمد نے اللہ وسایا کو اس کے بارے میں ایک ایک بات کی رپورٹ پہنچا دی ہے۔ اس نے اپنی جھنجلاہٹ دبا کے جھٹ بات بنائی۔ "مجھے تو پہلی بار پتہ چلا کہ وہ ادھر ہے' برسوں بعد ملا تھا۔ شکور نام ہے اس کا۔ پٹیالہ کا مہاجر ہے۔ جن دنوں میں خوشاب میں ہوتا تھا' وہ ساتھ ہی کے مکان میں رہتا تھا۔" وہ اطمینان سے جھوٹ پر جھوٹ بولتا رہا۔ "پچھلی بار تو اس لیے اس کے پاس ٹھیرنا پڑا کہ اچانک برکھا شروع ہو گئی' ساری رات ہوتی رہی۔ ایسے میں کیسے واپس آسکتا تھا۔"

"تو نے ٹھیک کیا جو ادھر ہی ٹھیر گیا۔ بارش میں تو سارے ہی رستے خراب ہو جاتے ہیں۔ برسات کی اندھیری راتوں میں تو ان کچے رستوں پر ہرگز سفر نہیں کرنا چاہیے۔"

رحیم داد نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ "گھر والی اور بچے بھی تیرے ساتھ ہی واپس آگئے یا ابھی کیمبل پور ہی میں ہیں؟" اس نے قدرے توقف کیا۔ "تو کچھ جلدی نہیں آگیا؟"

"ہاں جی' میں جلد ہی آگیا۔ کیمبل پور میں گرمی بہت تھی۔ ادھر اب تک بارش نہیں ہوئی۔ میں تو بہت گھبرا گیا تھا۔ پر جمیلہ جلد آنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ تو جاتے ہی ویاہ کی ریتاں رسماں میں ایسی الجھی کہ اس سے ملنا ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ تو ویاہ کے بعد بھی وہاں کچھ روز ٹھیرنا چاہتی تھی۔ پر میں ضد کرکے اسے اور بچوں کو اپنے ساتھ ہی لے آیا۔"

"ویاہ تو ٹھیک ٹھاک ہو گیا؟"

"ہاں جی' سب ٹھیک ٹھاک رہا۔" اللہ وسایا نے جواب دیا۔ "جمیلہ نے سارے کام کاج ایسی شان سے کیے کہ شرفاں کے سسرال والے خوش ہو گئے۔ اتنے خوش کہ چوہدری' میں تجھے کیا بتاؤں۔ انھوں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی دھوم دھام سے ویاہ ہو گا۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "ادھر جمیلہ بھی بہت خوش تھی۔ جب ملی' ہنستی مسکراتی ملی۔ اسے تو مزا آرہا تھا۔ پر اپنا جی اکتا گیا۔ کچھ ضروری کام بھی کرنے تھے۔"

آخری جملہ سن کر رحیم داد چونکا۔ معاً اسے وہ بات یاد آگئی جو گزشتہ شب احسان شاہ نے اللہ وسایا کے بارے میں بتائی تھی۔ اس نے اللہ وسایا کو ٹٹولنے کی غرض سے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"تو پرسوں شہر میں تھا؟ واپسی میں وہاں بھی ٹھیرا تھا؟"

اللہ وسایا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ "ٹھیرا تو تھا پر تیں نوں کیسے پتہ چلا؟"

"شکور ہی نے بتایا تھا۔ وہ بھی اس روز شہر میں تھا۔" رحیم داد نے بات نباہنے کی کوشش کی۔

"پر میں تو اسے بالکل نہیں جانتا۔" اللہ وسایا بدستور حیرت زدہ تھا۔

"تو اسے نہیں جانتا پر وہ تو تجھے جانتا ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا' اس کے لہجے سے خوشامد عیاں تھی۔ "تو اتنا وڈا زمیں دار ہے' تجھے ادھر کا کون بندہ نہیں جانتا۔ زمیں دار تو سب ہی جانتے ہیں۔" اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "وہ تجھ سے بہت ملنا چاہتا ہے۔ تو کہہ تو اسے کسی روز بلوا لوں؟"

"ضرور بلوا لے۔ تیرا پرانا ملنے والا ہے۔ بھلا ہی بندہ ہو گا۔" اللہ وسایا نے اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔

"میں کسی روز اس کی طرف جاؤں گا اور اپنے ساتھ ہی لیتا آؤں گا۔ اس سے مل کر تو خوش ہو گا۔"

اللہ وسایا نے شکور کے ذکر میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ بات کا رخ شرفاں کی شادی کی جانب موڑ دیا اور اس میں جمیلہ کی سرگرمی اور انہماک مسکرا مسکرا کر بیان کرتا رہا۔ اس کے طرز اظہار سے بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ جمیلہ نے اس کی پھوپھی زاد بہن کے بیاہ میں جوش و خروش کا جو مظاہرہ کیا تھا' وہ اس سے بہت خوش ہے۔ وہ کچھ دیر تک بیٹھا شرفاں کی شادی کے ہنگاموں کا ذکر کرتا رہا پھر کھڑا ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد رحیم داد فکر مند ہو گیا۔ سوچنے لگا' احسان شاہ نے گزشتہ شب جو کچھ بتایا تھا' وہ درست تھا؟ کیا اللہ وسایا نے وکیل کے ساتھ سازباز کرکے مختارنامے کے بجائے اس سے بیع نامے پر دستخط کرائے ہیں؟ کیا وہ حویلی اور زمیں دوبارہ اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟

واپسی میں اس نے شہر میں ایک روز کیوں قیام کیا تھا؟ اور وکیل کے ہمراہ صدر دفتر کس لیے گیا تھا؟ یہ اور ایسے کتنے ہی سوالات اس کے ذہن میں ابھرتے رہے' ڈوبتے رہے رحیم داد مخمصے میں پڑگیا اور تمام وقت اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہا۔

☆

برسات کی سہانی شام تھی۔ گہرا نیلا آسمان آئینے کی مانند جھلک رہا تھا۔ بھیگی بھیگی ہوا میں سرسراہٹ تھی۔ درخت اور پودے جھوم رہے تھے۔ گھاس میں لہریں اٹھ رہی تھیں۔ باغ میں رحیم داد کے ساتھ اللہ وسایا بیٹھا تھا۔ جمیلہ بھی موجود تھی۔ وہ نہا دھو کر آئی تھی۔ شگفتہ اور نکھری نکھری نظر آرہی تھی۔ موسم کی مناسبت سے وہ دھانی کرتا اور اسی رنگ کی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ البتہ چندری رنگ برنگی تھی مگر اس پر سبز دھاریں بہت نمایاں تھیں۔ ہر طرف پھیلی ہوئی ہریالی کے پس منظر میں اس کی خوبصورتی میں تابندگی تھی' نئی سج دھج تھی۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو سینے میں دھواں سا اٹھتا محسوس کیا۔ وہ مبہوت ہو کر ایک ٹک اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

جمیلہ کا ہر انداز صاف چغلی کھا رہا تھا کہ اسے اپنی دل کشی اور رعنائی کا پورا پورا احساس ہے۔ رحیم داد کی بہکی بہکی نظریں دیکھ کر وہ مسکرائی۔ اس کے گلابی ہونٹ تازہ پھول کی پنکھڑیاں بن گئے۔ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر پوچھا۔

"چوہدری! کل رات تو کدھر رہا؟"

اللہ وسایا نے رحیم داد کے جواب دینے سے پہلے ہی ہنس کر کہا۔ "جی لے! اصلی گل ایہہ ہے' اکیلے اس کا جی گھبراتا ہے۔" اس نے مڑکر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری! اب تو ویاہ کر لے۔ اس طرح کب تک گزارا ہو گا۔ اٹھ سال تو ہو گئے گھر والی اور بچوں کو ڈھونڈتے ہوئے۔ جانے وہ پاکستان پہنچے بھی کہ نہیں۔"

"ہاں جی' لاکھوں ہی خاندان اور پروار بکھر کے ایسے اجڑے کہ کسی کو کسی کا کچھ پتہ نہیں۔" جمیلہ بولی۔ اس کا دبا ہوا غم ابھرا اور سورج کی مانند دمکتے چہرے پر بادل کا ٹکڑا بن کر پھیل گیا۔ "ہر ایک کو نئے سرے سے اپنا جیون شروع کرنا پڑا۔"

"کہتی تو ٹھیک ہی ہے۔" رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ "پر اب تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی سفنہ دیکھ رہا ہوں۔"

"کب تک ایسے سفنے دیکھتا رہے گا۔" اللہ وسایا نے مسکرا کر کہا۔ "ابھی تو جوان ہے۔ تیں نوں اب آگے کی فکر کرنی چاہیے۔"

"یہ کام تو تجھے ہی کرنا ہو گا اللہ وسایا۔" جمیلہ نے مشورہ دیا۔

"میں تو اس بارے میں اسی روز سے سوچ رہا ہوں' جب سے چوہدری کے نام حویلی اور زمین کی الاٹمنٹ ہوئی ہے۔"

"ہاں' اب تو اسے یہیں رہنا ہے۔ گھر بھی بسانا ہو گا۔" جمیلہ نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری! تو برسوں ادھر ادھر بھٹکتا رہا' اب وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ سمے آگیا ہے کہ تو آگے کے لیے سوچ۔"

"سچ پوچھ' میں نے تو اس بارے میں ابھی تک سوچا ہی نہیں۔"

"تو نے نہیں سوچا تو کیا ہوا' اللہ وسایا کو تو سوچنا چاہیے۔" جمیلہ نے اللہ وسایا کی جانب دیکھا۔ وہ سر جھکائے کسی گہری سوچ میں الجھا ہوا نظر آرہا تھا۔ جمیلہ نے اسے اس عالم میں پایا تو مسکرا کر پوچھا۔ "اللہ وسایا! تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"چوہدری کے لیے رشتے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"کوئی ہے رشتہ تیرے سامنے؟" جمیلہ نے دریافت کیا۔

"چوہدری کے لیے رشتے تو کئی تلاش کرنے پر مل سکتے ہیں۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "پر ایک رشتہ ٹھیک لگتا ہے۔ اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"اللہ وسایا! تیری گل سن کر مجھے ڈر لگتا ہے۔"

اللہ وسایا حیرت سے رحیم داد کا منہ تکنے لگا۔ "ڈر کیوں لگتا ہے؟"

"تیری گل مجھے بھی سمجھ نہیں آئی۔" جمیلہ بھی حیرت زدہ نظر آرہی تھی۔

"صاف صاف بتا' تو کہنا کیا چاہتا ہے؟" اللہ وسایا نے پوچھا۔

"دیکھ' ابھی تو میرے اور تیرے درمیان بہت پیار ہے۔ تیرا گھر مجھے اپنا ہی گھر لگتا ہے۔ برسوں بعد مجھے ایسا لگا کہ میرا بھی کوئی ایسا ٹھکانا ہے جہاں میں آرام سے رہ سکتا ہوں۔" رحیم داد ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ "سوچتا ہوں' بعد میں شاید تیرے ساتھ یہ پیار محبت نہ رہے۔ پتہ نہیں' کیسی وہٹی' میری گھر والی بن کر آئے۔ ہمارے اتنے اچھے میل جول کا ناس مار دے۔ ایک دوسرے سے دور کر دے۔" اس نے اللہ وسایا کو بغور دیکھا۔ "ایسا بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"چنتا نہ کر چوہدری!" جمیلہ نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "اپنا من اجلا ہے اور وڈا بھی ہے۔ ایسے ہی مل جل کر رہیں گے تو آگے بھی گزارا ہو جائے گا۔" وہ کھل کر مسکرائی' مڑ کر اللہ وسایا کی جانب دیکھا۔ "یہ تو بتا اللہ وسایا! تو نے چوہدری کے لیے کہاں رشتہ سوچا ہے؟ پہلے تو کبھی اس بارے میں

گل نہیں کی؟"

"وہ ایسا ہوا جی لے! کیمبل پور سے واپسی میں تو زنانیوں کے ڈبے میں تھی۔ میرے ساتھ ملتان کا ایک زمیں دار' چوہدری اکرم' سفر کر رہا تھا۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "وہ پشاور سے آ رہا تھا۔ ۶۰ برس سے اوپر ہو گا۔ نیک اور بھلا بندہ ہے۔ تحصیل کبیر والا کے احمد پور پنڈ میں اس کی زمیں داری ہے۔"

"جات برادری کے بارے میں کچھ اتا پتہ ہے۔" جمیلہ نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" اللہ وسایا نے مسکرا کر بتایا۔ "اسے پہلے بار نہیں ملا' پرانی جان پہچان ہے۔ اپنے وکیل محمد عثمان رندھاوا نے ملوایا تھا۔ اکرم اس کا بھی موکل رہ چکا ہے۔ کئی بار اس سے وکیل کے دفتر میں ملنا ہوا۔ وہ بھی جاٹ ہے اور ساہو ہے۔ لگتا ہے' اس کے وڈیرے اور بزرگ پہلے منٹگمری میں رہے ہوں گے۔ ملتانی اور جھنگی سے زیادہ وہ اپنی طرح پنجابی بولتا ہے۔ اسی سے میں نے اندازہ لگایا۔"

"ویسے تجھے پتہ نہیں' کبیر والا اور پوربی میلسی میں جھنگی اور ملتانی سے زیادہ پنجابی کا رواج ہے۔ پر ادھر جلال پور اور لودھراں میں ملتانی ہی چلتی ہے۔ کوئی اسے جھنگی کہتا ہے' کوئی اچی۔" جمیلہ نے بات کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ "تو نے یہ بھی معلوم کیا' کڑی کی عمر کتنی ہے۔ بھائی بھین کتنے ہیں؟"

"نہ اس کا کوئی بھائی ہے نہ بھین۔ یوں سمجھ لے' اپنی شرفاں کی طرح ہے۔ فرک صرف اتنا ہے کہ اس کا پیو زندہ ہے۔" اللہ وسایا نے جواب دیا۔ "پر ایک گل ذرا سوچنے کی ہے۔"

"وہ بھی بتا دے۔ تو چبا چبا کر کیوں بول رہا ہے؟" جمیلہ نے ہنس کر کہا۔

"گل صاف صاف ایسہ ہے کہ اس کا پہلے بھی ایک ویاہ ہو چکا ہے پر کوئی بال بچہ نہیں۔ وہ چھے مہینے بھی سسرال میں نہیں رہی۔" اللہ وسایا نے کسی قدر اٹکتے ہوئے بتایا۔ "اس کا گھر والا ٹھیک بندہ نہیں تھا' مار پیٹ کرتا تھا' اوپر سے ایک کنجری سے بھی یاری لگا رکھی تھی۔ جب اس نے بہت تنگ کیا تو اکرم نے کاغذ لکھوا لیا' دھی کو اپنے گھر لے آیا۔"

"ضرور تنگ کرتا ہو گا اس کا گھر والا۔" رحیم داد بولا۔ "ملتانیوں میں نن کھلا مشہور ہے۔ مطلب یہ کہ جیسے گھوڑی کے لیے گھاس ضروری ہے' ویسے ہی زال یا گھر والی کے لیے جتی سے پٹائی۔"

"فضول باتیں نہ کر۔" جمیلہ نے تڑپ کر تیکھے لہجے میں اسے ٹوکا۔ "پتہ نہیں' تو نے کہاں سے یہ کہاوت سن رکھی ہے۔ میری چھوٹی ماسی ملتان شہر میں رہتی تھی' وہاں کھتریوں کے وڑے وڑے کنبے اور پردار آباد تھے۔ میرا موسا' رائے زادہ رام چند' کھنہ گھرانے کا تھا۔ مشہور خاندان ہوتا تھا۔ رائے زادہ کو تو میں نے دیکھا نہیں' اس کا تو میرے پیدا ہونے سے پہلے دیہانت ہو چکا تھا۔ وہ اپنے زمانے کا بہت مشہور رئیس تھا۔ آنریری مجسٹریٹ بھی تھا۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تجھے تو میں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ میں موسی کے گھر ملتان اکثر جاتی تھی۔ ہفتوں اس کے پاس رہتی۔ میرا موسا اتنا بھلا تھا کہ چوہدری' تجھ سے کیا بتاؤں۔ موسی سے تو بہت ہی زیادہ پیار کرتا تھا۔ وہ تھی بھی بہت سندر۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اب تو ملتان کے سارے ہی کھتری محلے اجڑ گئے۔ میری موسی کا گھر بھی برباد ہو گیا۔ سنا ہے' اب وہ بمبئی میں ہے۔ اس بات کو ہوئے بھی ایک جگ بیت گیا۔ جانے زندہ ہے یا وہ بھی سورگ باشی ہو گئی۔"

جمیلہ کے دل کش چہرے پر دکھ کے سائے منڈلانے لگے۔ رحیم داد نے اسے اس طرح افسردہ پایا تو صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولا۔ زمیں دارنی! تو برا نہ منا۔ میں نے تو ملتانیوں کے بارے میں صرف سنا ہی سنا ہے۔ اس ضلعے میں تھوڑے ہی دن رہا ہوں۔ وہاں کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں۔"

"ویسے جی ایسی باتیں اور کہاوتیں ہر شہر اور ضلعے کے بارے میں مشہور ہیں۔" اللہ وسایا نے بیوی کی جانب پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ "جی لے! میں تو یہ جانتا ہوں کہ چوہدری اکرم بہت بھلا مانس ہے۔ وہ چاہتا ہے اس کی زندگی ہی میں دھی کے لیے کوئی نیک ور مل جائے۔ ٹرین میں مجھ سے یہی گل کرتا تھا۔ بے چارہ بیمار بھی رہتا ہے۔ دھی کی طرف سے بہت پریشان ہے۔ کہتا تھا مجھے تو یہ فکر کھائے جاتی ہے' میرے مرنے کے بعد اس کا کیا بنے گا۔ برادری اور کنبے والے بھلے بندے نہیں ہیں۔ زمیں داری پر کبضہ کرنے کے لیے بعد میں جانے کیا کریں۔"

"پر میں پہلے کڑی کو دیکھوں گی۔ اس کے بناں کیسے فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ خود کبیر والا جاؤں گی۔" جمیلہ نے اپنا عندیہ بیان کیا۔

"تو ضرور کبیر والا چل۔ میں بھی چلوں گا۔ چوہدری بھی ساتھ ہو گا۔" اللہ وسایا نے جمیلہ کی تائید کی۔

"مجھے لے جا کر کیا کرے گا۔ تو اور جمیلہ جو بھی طے کریں گے' مجھے منظور ہو گا۔" رحیم داد نے کبیر والا جانے سے انکار کر دیا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" جمیلہ نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ "چوہدری! تجھے تو چلنا ہی پڑے گا۔ اکرم سے تیری ملاقات ہونی ضروری ہے تاکہ وہ بھی تجھ سے مل کر اپنا اطمینان کر لے۔ وہ

پہلے ہی چوٹ کھایا ہوا ہے۔ اس بار پوری طرح سوچ بچار کرنے کے بعد رشتہ طے کرے گا۔"

"چوہدری! اگر رشتہ ٹھیک ٹھاک ہو تو میں تجھے یہی کہوں گا ضرور ویاہ کرلے۔" اللہ وسایا نے اصرار کیا۔

رحیم داد خاموش رہا لیکن جمیلہ خاموش نہیں رہی، مسکرا کر بولی۔ "پہلے کبیروالا چلنے کا پروگرام بنا۔ اس کے بعد کچھ طے ہوگا۔ "بول، کب کا ارادہ ہے؟"

"ابھی تو کیمبل پور سے لوٹی ہے، ذرا دم تو لینے دے۔"

"کیمبل پور کی بات دوسری تھی۔" وہ پچھم کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "کبیروالا تو یہ رہا۔ منٹگمری سے خانیوال کے لیے ٹرین پکڑیں گے اور خانیوال سے کبیروالا دور ہی کتنا ہے۔ پکی سڑک جاتی ہے۔ ویسے تو یہاں سے بھی سڑک کے رستے جاسکتے ہیں۔ پر برکھا میں لاریوں کا سفر کٹھن ہوتا ہے۔ تجھے پتہ نہیں، میں پہلے بھی ایک بار کبیروالا جا چکی ہوں۔ پر اب تو اس بات کو برسوں ہوگئے۔"

"تو کہاں نہیں گئی۔" اللہ وسایا نے ہنس کر کہا۔ "یہ بتا، کب چلنا ہے؟"

"آج سوم وار ہے۔" جمیلہ چند لمحے سوچتی رہی۔ "جمعرات کی صبح روانہ ہوجائیں گے۔ جمعے کو کبیروالا ٹھیریں گے۔ سینچر کی رات لوٹ آئیں گے۔ ٹھیک رہے گا پروگرام؟"

"مجھے نہ لے جا تو اچھا ہے۔" رحیم داد نے ایک بار پھر کترانے کی کوشش کی۔

"ویاہ تجھے ہی کرنا ہے نا؟ تو نہیں جائے گا تو کیسے کام بنے گا۔ اکرم نے تجھے بھی دیکھنا ہوگا۔ تو موجود رہے گا تو جلد ہی رشتہ طے ہوجائے گا۔ بار بار چکر نہیں کاٹنا پڑے گا۔" جمیلہ کھل کھلا کر ہنسی۔ "دوبارہ جائے گا تو وہٹی کو بدا کرا کے ساتھ ہی لائے گا۔" رحیم داد نے کچھ کہنا چاہا۔ جمیلہ نے اسے روک دیا۔ "اب تو چپ کرکے بیٹھا رہ۔ مجھ پر وشواس رکھ۔ تیرے لیے چنگی ہی گھر والی لاؤں گی۔ تجھے اس بارے میں چنتا کرنے کی ضرورت نہیں۔"

رحیم داد چپ رہا۔ جمعرات کی روانگی طے ہوگئی۔ نوکروں نے کھانا چن دیا۔ کھانے پر بھی رحیم داد کی شادی کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی۔ اللہ وسایا سے زیادہ جمیلہ نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی۔ رحیم داد چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔ وہ شادی کرنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆

جمعرات کو تاروں کی چھاؤں میں اللہ وسایا، جمیلہ اور رحیم داد کبیروالا کے لیے روانہ ہوگئے۔ جمیلہ نے اس دفعہ دونوں بچوں کو ساتھ نہیں لیا۔ انہیں نوکرانیوں کی نگرانی میں چھوڑ دیا۔ اللہ وسایا

نے ایک روز پیشتر اپنا ایک ملازم چوہدری اکرم کے گاؤں احمد پور بھیج دیا تھا تاکہ تینوں کی آمد سے اسے مطلع کردے۔

رحیم داد سفر پر روانہ تو ہوگیا مگر کسی قدر گھبرایا ہوا تھا۔ وہ طرح طرح کے خدشات اور وسوسوں میں مبتلا تھا۔ پاک پتن روڈ پر پہنچ کر وہ لاری میں سوار ہوا تو اور زیادہ سہما ہوا نظر آنے لگا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ نے بار بار ادھر ادھر کی باتیں چھیڑیں مگر وہ مختصر جواب دے کر خاموش ہوجاتا۔

منٹگمری اسٹیشن پہنچنے پر معلوم ہوا کہ گاڑی آنے میں دو گھنٹے کی دیر ہے۔ اللہ وسایا اور جمیلہ کے ہم راہ رحیم داد بھی ویٹنگ روم میں چلا گیا۔ وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھا تھا کہ ایک انسپکٹر دو کانسٹیبلوں کے ہم راہ داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی رحیم داد کے اوسان خطا ہوگئے۔ وہ کچھ دیر سہما ہوا بیٹھا رہا پھر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

ویٹنگ روم سے نکل کر وہ پلیٹ فارم پر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ بار بار خوف زدہ نظروں سے ویٹنگ روم کی طرف دیکھتا جاتا۔ پولیس والے ویٹنگ روم کے اندر ہی تھے۔ رحیم داد ٹہلتے ٹہلتے پلیٹ فارم کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ گرمی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ رحیم داد کو پیاس محسوس ہوئی۔ پانی پینے کے لیے وہ نلکے کی جانب چلا۔ سامنے سے ایک نوجوان عورت آتی نظر آئی۔ وہ سفید دھوتی باندھے ہوئے تھی۔ نیلی قمیص کے اوپر سیاہ دوپٹہ تھا۔ عورت نے رحیم داد کو بغور دیکھا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔

رحیم داد نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ شاداں تھی۔ اس کے سر پر گٹھری تھی۔ اس کی چال میں وہی پہلی سی آن بان تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ جسم بدستور مضبوط اور کسا ہوا تھا لیکن اب وہ کسی قدر دبلی ہوگئی تھی۔ چہرے کی رنگت بھی خاصی ماند پڑ گئی تھی۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو سراسیمہ ہوگیا۔ وہ عین اس کے سامنے تھی۔ رحیم داد نے چاہا کہ کترا کر قریب سے گزر جائے مگر وہ ٹھٹکی اور اس طرح کھڑی ہوگئی کہ رحیم داد کو بھی قدموں کی رفتار روکنی پڑی۔

"گل سن۔" شاداں نے اسے ٹوکا۔ "لگتا ہے، میں نے تجھے پہلے بھی دیکھا ہے؟"

"پر میں نے تو تجھے کبھی نہیں دیکھا۔" رحیم داد نے بے رخی سے کہا۔

"ناراض نہ ہو۔" وہ مسکرائی۔ "میں نوں سوچنے دے۔"

رحیم داد نے خود کو سنبھالا۔ یہ سوچ کر گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی کہ اس نے لالی کے ہم راہ شاداں کے گھر میں ایک دن اور دو راتوں سے بھی کم وقت کے لیے پناہ لی تھی اور اس وقت اس کی وضع قطع بھی قطعی مختلف تھی۔ عالم یہ تھا کہ جسم پر جیل کی میلی کچیلی وردی تھی۔ حجامت بڑی

ہوئی تھی۔ وہ اس کے سامنے بھی کم ہی رہا تھا۔ بیشتر وقت اس نے کوٹھری میں زمین کھود کر بالے کی لاش دبانے میں گزارا تھا۔ بالے کو قتل کرنے کے باعث شاداں کے حواس بھی بجا نہیں تھے۔ بہکی بہکی باتیں کرتی تھی۔ اب طویل مدت گزرنے کے بعد دوبارہ ملی تھی۔ اس عرصے میں رحیم داد بہت سی تبدیلیوں سے گزر چکا تھا۔ حلیہ اس قدر بدل چکا تھا کہ اسے شناخت کرنا آسان نہیں تھا۔

"لگتا ہے، میرے بارے میں تیں نوں دھوکا ہوا۔" رحیم داد نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے مسکرانے کی کوشش کی۔

"تو رحیم داد تو نہیں ہے؟" شاداں اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "ہو بھی نہیں سکتا۔ اسے تو مرے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے۔ پتہ نہیں، اسے کس نے کتل کر دیا۔" وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ "تو اس کا بھائی تو نہیں ہے؟ دیکھنے میں ایسا ہی لگتا ہے۔"

"جانے تو کس کی گل کر رہی ہے۔" رحیم داد نے منہ بگاڑ کر چہرے پر جھنجلاہٹ طاری کی۔ مگر وہ اس کی جھنجلاہٹ سے متاثر نہیں ہوئی۔ اپنی حسین آنکھوں کو گردش دیتے ہوئے بولی۔ "میں کسی کو ایک بار دیکھ لوں تو بھولتی نہیں۔ سچ مان، میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔"

رحیم داد ایک بار پھر گھبرا گیا اور اپنی گھبراہٹ پر پردہ ڈالنے کے لیے بگڑ کر گویا ہوا۔ "پر تو نے مجھے پہلے کب دیکھا؟" اس نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا۔

شاداں نے اسے روکا، نرم لہجے میں بولی۔ "ناراض نہ ہو۔ آرام سے گل کر۔" وہ بے تکلفی سے مسکرائی۔ "تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے، میں نوں دھوکا ہوا۔ یہ تو بتا دے، تیرا نام کیا ہے؟"

"چوہدری نورالٰہی۔" رحیم داد نے جواب دیا۔

"تب تو ٹھیک ہی سوچا تو نے۔ میں نوں دھوکا ہی ہوا۔" شاداں نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "پر تو کچھ کچھ رحیم داد سے ملتا ہے۔ میں نوں ایسا ہی لگا تھا۔"

"کون تھا رحیم داد؟" رحیم داد نے بے نیازی سے پوچھا۔ اس کے لہجے سے اطمینان جھلک رہا تھا، گھبراہٹ رفع ہو چکی تھی۔

"وہ لالی کا ساتھی تھا۔ دونوں جیل میں اکٹھے ہوتے تھے اور جیل سے بھاگے بھی اکٹھے تھے۔ لالی اسے اب تک یاد کرتا ہے۔"

رحیم داد کے ذہن میں لالی کے لیے کرید پیدا ہوئی۔ اس نے دریافت کیا۔ "یہ لالی کون ہے؟ اور اب کہاں ہے؟"

"جیل میں ہے۔ پہلے منٹگمری جیل میں ہوتا تھا، اب ملتان جیل بھیج دیا گیا ہے۔ میں اسی سے ملنے ملتان جا رہی ہوں۔ کل ملاقات کا دن ہے۔"

"تیرا کون لگتا ہے؟" رحیم داد نے چندرا کر پوچھا۔

"یہ نہ پوچھ۔" شاداں نے گہری سانس بھری۔ "کچھ تو لگتا ہی ہے۔ تبھی تو اسے ملنے جا رہی ہوں۔" شاداں نے گٹھری اتار کر فرش پر رکھ دی۔ پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ اس کے لہجے سے تھکن کے ساتھ ساتھ افسردگی بھی جھلکنے لگی۔ "ویسے اس کا میرے سوا کوئی بھی نہیں۔"

رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "تو اس کے لیے بہت دکھی معلوم ہوتی ہے۔"

شاداں نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ کچھ دیر خاموش رہی پھر شاداں نے جھک کر گٹھری اٹھائی۔ ایک بار پھر سر پر رکھی اور چپ چاپ ایک طرف چل دی۔ رحیم داد جہاں تھا، وہیں کھڑا رہا۔ وہ شاداں کی جانب دیکھتا رہا۔ شاداں پہلے ہی کی طرح خوب صورت اور طرح دار نظر آ رہی تھی۔ اس کے گھنے بالوں کی لمبی چوٹی کمر کے نیچے تک لٹک رہی تھی۔

رحیم داد کو لالی یاد آ گیا۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے دن رات یاد آ گئے۔ وہ عہد و پیمان یاد آ گئے جو دونوں نے ایک دوسرے سے کیے تھے۔ یادوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو دور تک پھیلتا چلا گیا۔

ٹرین آ گئی مگر وہ لاہور جا رہی تھی۔ رحیم داد نے دور سے دیکھا۔ انسپکٹر ویٹنگ روم سے نکلا۔ دونوں کانسٹیبل اس کا سامان اٹھائے عقب سے نمودار ہوئے۔ انسپکٹر اور کانسٹیبل ٹرین میں سوار ہوئے۔ ٹرین لاہور کے لیے روانہ ہو گئی۔

رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ویٹنگ روم کی جانب بڑھا۔ اندر پہنچا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ اس کے لیے بے چین نظر آ رہے تھے۔ جمیلہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "چوہدری! تو کدھر چلا گیا تھا؟"

"بیٹھے بیٹھے جی گھبرایا تو پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔" رحیم داد نے بات بنائی۔

"پر تو بالکل اچانک اٹھ کر چلا گیا، بتایا بھی نہیں، کہاں جا رہا ہے؟" جمیلہ نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔

رحیم داد کے بولنے سے پہلے اللہ وسایا بول پڑا۔ "تو ہر بات پوچھتی ہے۔ اس نے بتا تو دیا، پلیٹ فارم پر ٹہلنے کے لیے نکل گیا تھا۔" اللہ وسایا بے تکلفی سے مسکرایا۔ "تو کوئی تھانے دارنی لگی ہے کہ ہر کام تجھ سے پوچھ کر کرے۔ آگے بھی تو نے ایسا کیا تو اس کی گھر والی تجھ سے خار کھانے لگے

گی۔ یہ سوچ لے۔"

"لے تونے مجھے ابھی سے دوش دینا شروع کردیا۔" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

رحیم داد دونوں کی نوک جھونک پر چپ رہا۔ مسکراتا ہوا خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹرین آئی تو قلی نے سامان اٹھایا اور تینوں سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں جا کر بیٹھ گئے۔ رحیم داد نے کھڑکی سے جھک کر دیکھا۔ شاداں بھی تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں سوار ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ ذرا دیر میں ٹرین روانہ ہوگئی۔

خانیوال کا اسٹیشن آیا تو اللہ وسایا اور جمیلہ کے ساتھ رحیم داد بھی اتر گیا۔ اسٹیشن سے نکلتے ہی انہیں کبیر والا جانے والی لاری مل گئی۔ وہ اس میں سوار ہوگئے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ بھیگی ہوئی سڑک پر لاری زیادہ تیز رفتار سے نہیں دوڑ رہی تھی۔ مگر جب تینوں کبیر والا کے اڈے پر پہنچے تو بارش رک چکی تھی۔ انھوں نے تانگا کرائے پر لیا اور اس میں بیٹھ کر احمد پور کی جانب روانہ ہوگئے۔

وہ احمد پور پہنچے تو جھٹ پٹا ہو چکا تھا۔ چوہدری اکرم اپنے دو منزلہ مکان کے باہر ان کا منتظر تھا۔ وہ اللہ وسایا اور رحیم داد سے بڑی گرم جوشی سے ملا۔ جمیلہ تو گھر کے اندر چلی گئی' اللہ وسایا اور رحیم داد کو چوہدری اکرم ڈیرے پر لے گیا۔ ڈیرا گھر کے ساتھ ہی تھا۔ اس میں دو کشادہ کمرے تھے۔ آگے کھلا صحن تھا۔ کمروں میں پلنگ بچھے تھے۔ ان پر صاف ستھرے بستر لگے تھے۔ بیٹھنے کے لیے کرسیاں اور مونڈھے تھے۔

دونوں کے ڈیرے میں پہنچتے ہی مالیشا آگیا۔ اس کے ہاتھ میں تیل کی شیشی دبی ہوئی تھی' وہ تیل کی مالش اور مساج کے ذریعے سفر کی تکان اتارنے کے لیے نہایت مستعد نظر آتا تھا۔ مگر اللہ وسایا اور رحیم داد نے مالش کرانے سے انکار کردیا۔ انھوں نے نہا دھو کر لباس تبدیل کیا اور صحن میں قرینے سے لگی ہوئی کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ غسل کرنے سے اللہ وسایا اور رحیم داد ترو تازہ ہوگئے تھے۔ ذرا ہی دیر میں نوکر لسی لے کر آگیا۔ دونوں نے ٹھنڈی ٹھنڈی لسی پی۔ بڑا سکون ملا۔

رات کے کھانے پر بات چیت شروع ہوئی۔ اللہ وسایا نے چوہدری اکرم سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ صرف ایک روز ٹھہرے گا اور ہفتے کے روز علی الصباح چلا جائے گا' جو کچھ طے کرنا ہے' جمعے ہی کو طے ہو جانا چاہیے۔ رحیم داد کو چوہدری اکرم نیک اور بھلا مانس لگا۔ وہ کم گو اور حلیم الطبع تھا۔ مزاج میں نرمی اور رکھ رکھاؤ تھا۔

چوہدری اکرم نے مہمانوں کی خاطر مدارت میں سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ ہر طرح ان کی دل داری کی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بھی باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر شادی بیاہ کے بارے میں کھل کر گفتگو نہ ہوئی۔ چوہدری اکرم کے ساتھ رشتے کا ایک چچا زاد بھائی بھی تھا۔ وہ اکرم سے عمر میں بڑا تھا۔ اس نے کئی بار شادی کے سلسلے میں بات چھیڑی مگر اللہ وسایا نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ وہ جمیلہ سے مشورہ کیے بغیر اس مسئلے پر کوئی بات چیت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ رات گئے محفل برخاست ہوئی۔

سویرے سویرے جمیلہ ڈیرے پر آگئی۔ اللہ وسایا اور رحیم داد کمرے میں ناشتا کر رہے تھے۔ چوہدری اکرم بھی موجود تھا مگر ناشتے میں شریک نہیں تھا۔ جمیلہ کے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

اللہ وسایا نے جمیلہ سے پوچھا۔ "جمی لے! کڑی دیکھی تونے' کیسی ہے؟"

"سندر ہے اور سیدھی سادھی بھی ہے۔ عمر بھی چوی پنچھی سے زیادہ نہیں ہوگی۔ چوہدری کے لیے بالکل ٹھیک رہے گی۔" جمیلہ مسکرا مسکرا کر بتاتی رہی۔ "دیکھنے میں تو ایسی شرمیلی اور کومل لگتی ہے' جیسے اس کا کبھی ویاہ ہی نہیں ہوا۔ پتہ نہیں' اس کے پہلے گھر والے نے ایسی بھولی بھالی کڑی کو کیوں تنگ کیا۔" اس نے منہ بگاڑا۔ "گل ایسہ ہے' بعضے مرد ہوتے ہی خراب ہیں۔ انھیں اپنی گھر والیوں کو تنگ کرنے میں سواد ملتا ہے۔ لگتا ہے' اس کا گھر والا ایسا ہی خراب بندہ تھا۔"

"تیری باتوں سے لگتا ہے کڑی تجھے پسند آگئی۔ ویسے چوہدری اکرم کو تو میں بھی ٹھیک طرح جانتا ہوں۔ نیک بندہ ہے۔" اللہ وسایا نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا جی' آج اکرم سے بات چیت شروع کی جائے۔"

"تونے ابھی تک اس بارے میں گل بات ہی نہیں چھیڑی؟" جمیلہ نے حیرت سے پوچھا۔

"تجھ سے صلاح مشورہ کیے بناں کیسے شروع کرتا۔" اللہ وسایا ہنس کر بولا۔

جمیلہ نے کہا۔ "اکرم کا چچیرا ابھی تو آیا ہے۔ لگتا ہے' اکرم نے اسے بات چیت ہی کے لیے بلایا ہے۔ اس کی گھر والی بھی آئی ہے۔ میری تو اس سے کھل کر گل بات ہوئی۔ اس نے اپنے چوہدری کے بارے میں کرید کرید کر ایک ایک بات پوچھی۔ میں نے اسے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ لگتا ہے' اس نے اکرم اور اپنے گھر والوں کو بھی یہ باتیں بتا دیں۔ ان دونوں سے میری زیادہ بات چیت نہیں ہوئی۔ شام کو وہ میرے پاس آئے تھے۔ اکرم تو چپ رہا پر اس کے چچیرے نے کئی باتیں پوچھیں۔ میں نے اسے بھی ہر بات صفائی سے بتا دی۔"

"ان کے رویئے سے تونے کیا اندازہ لگایا؟" اللہ وسایا نے دریافت کیا۔

"مجھے تو دونوں خوش اور مطمئن نظر آئے۔ اکرم کی بھرجائی تو بہت مطمئن لگتی ہے۔ سمجھ لے، وہ لوگ تو تیار ہیں۔"

"تو فیر بات پکی کرلی جائے؟" اللہ وسایا نے استفسار کیا۔

"ضرور کرلے۔ مجھے تو یہ رشتہ ہر طرح پسند ہے۔" جمیلہ نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ لمحے بھر خاموش رہی پھر اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا اور اس کی رائے معلوم کرنے کے لیے براہ راست سوال کیا۔ "بول چوہدری، تجھے کیا کہنا ہے۔ تو اپنی مرضی بتا؟"

"میں نوں اپنی مرضی کیہہ بتانا؟" رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ "میری مرضی تو وہی جان جو تیری اور اللہ وسایا کی ہے۔ تیں نوں پتہ ہے، میں نے اللہ وسایا کو بھائی کہا ہے، پگڑی بدلی ہے۔ وہ بھائی ہے۔ اور تو بھرجائی۔ تم دونوں جو بھی طے کروگے، مجھے منظور ہوگا۔"

"تب تو آج ہی ساہا ہوجائے۔" جمیلہ خوشی سے چہک کر بولی۔ "میرا من کہتا تھا، یہ رشتہ طے ہوجائے گا۔ اللہ وسایا! تجھے پتہ نہیں، میں نے تو مٹھائی اور میوے کا بھی بندوبست کرلیا ہے۔ ادھر آنے سے پہلے نوکر کو ضروری سامان لانے خانیوال بھیج دیا ہے۔ دوپہر تک آجائے گا۔ شام کو سگائی کے لیے کوئی شبھ دن سوچ کر تاریخ طے کرلی جائے۔"

"ساری تیاری تو کرلی، اب میری اور چوہدری کی مرضی پوچھنے آئی ہے۔" اللہ وسایا نے ہنس کر بیوی کی جانب دیکھا۔

"ایسے فیصلے زنانیاں ہی کرتی ہیں۔" جمیلہ بھی اللہ وسایا کے ساتھ ہنسنے لگی۔ "بات پکی کرنے سے پہلے اکرم سے کہہ دینا، ساہے کے لیے شریکے برادری کے کسی اور کو بلانا چاہے تو بلالے۔ یہ بات تو اسے دوپہر کو روٹی کھاتے ہوئے بتا دینا۔ یوں سمجھ لے، آج ویاہ کی تاریخ طے کرکے ہی جانا ہے۔"

جمیلہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ کمرے سے باہر گئی تو کچھ ہی دیر بعد چوہدری اکرم آگیا۔ اس سے ادھر ادھر کی باتیں شروع ہوگئیں۔ دوپہر ہوگئی۔ نوکروں نے کھانا چن دیا۔ کھانے پر اللہ وسایا اور رحیم داد کے ساتھ چوہدری اکرم اور اس کا چچا زاد بھائی بھی شریک ہوگئے۔ رحیم داد تو خاموش بیٹھا رہا مگر اللہ وسایا نے بات چھیڑی اور چوہدری اکرم کو اپنی مرضی سے مطلع کردیا۔ صاف صاف بتادیا کہ اسے اور رحیم داد کو رشتہ منظور ہے۔ اگر وہ بھی اس کے لیے رضامند ہو تو شام کو ساہے کی رسم ادا کرلی جائے۔ دن تاریخ مقرر کرکے شادی کی تیاری شروع کردی جائے۔ اکرم اور اس کے چچازاد بھائی نے اللہ وسایا کی تجویز سے اتفاق کیا۔ ان کی بات چیت سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ذہنی طور پر پہلے سے تیار ہو کر آئے تھے۔

دن ڈھلے صحن میں خوب چھڑکاؤ ہوا۔ کرسیاں نکال کر ترتیب سے لگائی گئیں۔ لیمپ کے بجائے پیٹرومیکس روشن کیا گیا۔ جب سب کرسیوں اور چارپائیوں پر بیٹھ گئے تو شادی کی باقاعدہ بات چیت شروع ہوئی۔ یہ ساہا تھا۔ اس میں چوہدری اکرم کی طرف سے اس کا چچا زاد بھائی شریک ہوا۔ پڑوس کے گاؤں کے ایک زمیں دار کو بھی اکرم نے بلالیا تھا۔ وہ اکرم کا ہم عمر ہی تھا۔ اس کے انداز میں معاملہ فہمی اور رکھ رکھاؤ تھا، بات چیت بھی سلجھی ہوئی کرتا تھا۔

گفتگو کے دوران کسی بھی مرحلے پر الجھن یا تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ ہر بات خوش اسلوبی سے طے ہوگئی۔ چوہدری اکرم نے بات چیت کے آغاز ہی میں اپنی اس خواہش کا صاف گوئی سے اظہار کردیا تھا کہ نکاح سادگی سے ہوگا اور رخصتی بھی خاموشی سے ہوگی۔ نہ کوئی دھوم دھڑکا ہوگا، نہ شادی کی دوسری رسمیں ہوں گی۔ براتیوں کی تعداد بھی مختصر ہوگی۔ بات معقول تھی لہٰذا اللہ وسایا نے مطلق حجت نہیں کی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ دیہات میں، خاص طور پر جاٹوں میں بیوہ یا طلاقن کا عقد ثانی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ دھوم دھڑکا کرنے کی صورت میں خوشی کے بجائے ذات برادری والوں کے طعنے سننا پڑتے۔

بات چیت جاری تھی کہ اللہ وسایا اٹھ کر کمرے میں گیا۔ جمیلہ کو وہاں بلایا۔ اس سے مشورہ کیا اور اس کی روشنی میں شادی کی تاریخ طے کی، جو ۱۲ اگست مقرر ہوئی۔ مہمانوں کی دودھ کے شربت سے تواضع کی گئی۔ جمیلہ واپس زنان خانے میں جاچکی تھی۔ تاریخ مقرر ہونے کی اطلاع پہنچی تو اس نے اپنے نوکر کے ذریعے چوہدری اکرم کے پاس سگن کی مٹھائی کے ساتھ خشک میوہ بھیجا۔ ساہے کی خوشی میں نائی اور لاگیوں کو نقد انعام کے علاوہ ایک ایک لنگی بھی دی۔

رات کے کھانے میں چوہدری اکرم نے خاص اہتمام کیا۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ بات بات پر مسکراتا۔ پلیٹیں اٹھا اٹھا کر رحیم داد اور اللہ وسایا کے سامنے رکھتا۔ کھانے پر اصرار کرتا، دل جوئی کرتا۔ شفقت اور محبت کا اظہار کرتا۔ کھانا ختم ہونے کے بعد بھی وہ دیر تک دونوں کے پاس بیٹھا رہا۔

صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی اللہ وسایا اور رحیم داد تیار ہوگئے۔ جمیلہ بھی تاروں کی چھاؤں میں بیدار ہوگئی تھی اور اللہ وسایا اور رحیم داد کے ساتھ سفر کے لیے تیار تھی۔ گھر کے باہر دو تانگے موجود تھے۔ تینوں ان میں سوار ہوئے۔ نوکر بھی ہم راہ تھے۔ چوہدری اکرم ان کے ساتھ کبیروالا تک آیا۔ اس نے اللہ وسایا اور رحیم داد کو گلے لگا کر گرم جوشی سے رخصت کیا۔

رات گئے تینوں واپس کوٹلہ ہرکشن پہنچ گئے۔ صبح ہوئی۔ دن گزرا۔ شام کو معمول کے مطابق باغ میں محفل جمی۔ جمیلہ اور اللہ وسایا کے رویے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ چوہدری اکرم کی بیٹی سے رحیم داد کا رشتہ طے ہو جانے پر دونوں بہت خوش ہیں۔ جمیلہ مسکرا مسکرا کر ساہے کی رسم کی ایک ایک تفصیل بیان کر رہی تھی۔ اکرم کے حسن سلوک اور مہمان نوازی کی تعریف کر رہی تھی۔

رات کا کھانا انھوں نے ساتھ ہی کھایا۔ کھانے پر بھی شادی کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ رحیم داد کم بلکہ بہت کم بول رہا تھا۔ جمیلہ نے اس کی جانب دیکھا اور ہنس کر بولی۔ "تو ابھی سے دتّا بن گیا۔ شرما اور لجا تو اس طرح رہا ہے جیسے آج ہی تیری جنج چڑھنے والی ہے۔" وہ اللہ وسایا کی طرف متوجہ ہوئی۔ "اللہ وسایا! تو دیکھ رہا ہے۔ چوہدری کیسے شرما شرما کر بول رہا ہے۔" وہ لمحے بھر تک گردن جھکا کر سوچتی رہی۔ "آج جولائی کی ۱۷ تاریخ ہے۔ یہ ۳۱ دن کا مہینہ ہے۔ ویاہ میں کل سولاں دن رہ گئے ہیں۔"

"تیاری ہی کون سی کرنی ہے۔" اللہ وسایا بولا۔ "جنج شنج تو دھوم دھام سے جانی نہیں۔ بس ایک رسم ادا کرنی ہے۔" وہ مسکرایا۔ "ویسے اپنا ویاہ تو بالکل ہی خاموشی سے ہوا تھا۔ پر بہت نیک گھڑی تھی۔ اب تو سب کچھ سفنہ لگتا ہے۔"

جمیلہ نے کچھ نہیں کہا، رحیم داد بھی چپ رہا مگر اللہ وسایا خاموش نہ رہا۔ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "چلو جی، یہ بہت چنگا ہو گیا۔ چوہدری کا دل اکیلے میں بہت گھبراتا ہے۔ اب نہیں گھبرائے گا۔" اس نے رحیم داد کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ "اکرم کی پوری زمیں داری ورثے میں تیری ہونے والی گھر والی ہی کو ملے گی۔ وہ تو یہاں تک کہتا تھا، ویاہ کے بعد ہی زمیں داری تیرے حوالے کر دے گا۔ اٹھ مربعے سے اوپر زمین ہے اور بہت زرخیز زمین ہے۔ پانی کی بھی کمی نہیں۔"

"تب تو اپنا چوہدری اور وڈا زمیں دار بن جائے گا۔" جمیلہ بولی۔

"اب تو اس کا ہرگز جی نہ گھبرائے گا۔ وڈی زمیں داری ہو اور بھلی گھر والی تو کس کا جی گھبرا سکتا ہے۔" اللہ وسایا نے کہا۔ "میں تو کہوں گا تو احمد پور کی زمیں داری سنبھال لینا۔ ادھر کی دیکھ بھال تو میں کر ہی رہا ہوں۔ اس کی تو بالکل فکر نہ کر۔"

رحیم داد نے چونک کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ اسے فی الفور احسان شاہ کی باتیں یاد آ گئیں۔ اس کے ذہن میں شبہات اور وسوسے کلبلانے لگے۔ مگر اس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ مسکرانے کی کوشش کی اور نرم لہجے میں گویا ہوا۔

"یہ زمیں داری بھی تیری اور وہ بھی تیری۔ میں تیرے لیے پرایا نہیں ہوں۔

"میرا مطلب ہے دونوں مل جل کر ہی زمیں داری چلائیں گے۔" اللہ وسایا نے زیر لب مسکرا کر وضاحت کی۔

* * *

رحیم داد مطمئن نہ ہوا۔ اللہ وسایا کی وضاحت کے باوجود اس کا شبہ رفع نہ ہوا۔ رات کو دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

دوسرے روز ایک اور واقعہ پیش آیا۔ رحیم داد زیادہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ہوا یہ کہ اللہ وسایا اچانک اپنے وکیل کے ساتھ رحیم داد کے پاس آیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے پوچھا۔ "چوہدری تیرے کلیم کے کاغذات کہاں ہیں؟" اس نے وکیل کی طرف اشارہ کیا۔ "وکیل صاحب کو کاغذات دیکھنے ہیں۔"

رحیم داد خاموشی سے اٹھا۔ ملحقہ کوٹھری کا دروازہ کھول کر اندر گیا۔ اپنے ٹرنک کا تالا کھولا۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ نکالا اور کاغذات وکیل کے حوالے کر دیے۔ وہ کچھ دیر تک پوری توجہ سے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ "یہ کاغذات میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا، ان کی ضرورت پڑ گئی ہے۔"

رحیم داد تو چپ رہا مگر اللہ وسایا بول پڑا۔ "ضرورت ہے تو جی، ضرور لے جاؤ۔"

وکیل نے کاغذات اپنے بریف کیس میں رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک درخواست بھی لگانی ہے۔" اس نے انگریزی میں ٹائپ کی ہوئی ایک درخواست نکالی اور رحیم داد کے سامنے رکھی۔ "چوہدری! اس جگہ اپنے دستخط لگا دے۔" اس نے درخواست کے آخر میں ایک جگہ انگلی رکھ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔

رحیم داد دستخط کرتے ہوئے جھجکا۔ ہمت کر کے پوچھا۔ "وکیل صاحب! یہ درخواست کیوں لگانی ہے؟ میں نوں بھی تو کچھ پتہ چلنا چاہیے۔"

"یہ میں بعد میں آرام سے بتاؤں گا۔ اگر ابھی بتاؤں بھی تو تیری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔" وکیل ہنس کر بولا۔ "یہ قانونی نکات ہیں۔ یوں سمجھ لے یہ درخواست لگانی بہت ضروری ہے اور جلد سے جلد لگانی ہے۔"

رحیم داد نے درخواست پر دستخط نہیں کیے۔ خاموش بیٹھا رہا۔ وکیل نے اللہ وسایا کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ اللہ وسایا اٹھ کر رحیم داد کے نزدیک گیا، اس کا شانہ تھپک کر نرم لہجے میں بولا۔ "لگا دے دستخط۔ تیری جانب سے یہ درخواست لگانی بہت ضروری ہے۔ اس میں دیر

نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ آگے گڑبڑ پڑ سکتی ہے۔" اس طرح اصرار کرنے پر رحیم داد نے نظریں اٹھا کر اللہ وسایا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تذبذب اور بے اطمینانی کے تاثرات تھے۔ اللہ وسایا نے مسکرا کر کہا۔

"چوہدری! تیں نوں مجھ پر بھروسا نہیں؟"

"ایسی گل نہ کر۔" رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا اور درخواست پر دستخط کر دیے۔

وکیل نے درخواست رحیم داد کے ہاتھ سے لے کر اپنے بریف کیس میں رکھی اور فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کمرے سے نکلا تو اللہ وسایا بھی اس کے ہم راہ تھا۔

دونوں کے جانے کے بعد رحیم داد بستر پر لیٹ گیا۔ اللہ وسایا کے رویے نے اس کے شبہات میں اضافہ کر دیا تھا۔ دن ڈھلے تک وہ اسی الجھن میں مبتلا رہا۔ اسی عالم میں اس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا اور باغ کی جانب روانہ ہوا۔ مہمان خانے کے دروازے پر احمد مل گیا۔ احمد نے بتایا کہ اللہ وسایا بھی وکیل کے ساتھ شہر گیا ہے۔ رحیم داد اور پریشان ہو گیا۔

اس نے دور سے دیکھا کہ جمیلہ باغ میں بیٹھی ہے۔ قریب ہی اسکول ماسٹر بیٹھا تھا۔ جمیلہ اس کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھی۔ رحیم داد باغ کی طرف نہیں گیا، اصطبل پہنچا۔ گھوڑی نکلوائی اس پر سوار ہوا اور جمیلہ کو اطلاع دیے بغیر گھوڑی دوڑاتا نہر کی طرف نکل گیا۔

۲۱

احسان شاہ کا خاص ملازم شیدا حویلی کے پھاٹک ہی پر رحیم داد کو مل گیا۔ اس کی زبانی رحیم داد کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ احسان شاہ حویلی میں موجود ہے۔ شیدا نے رحیم داد کی گھوڑی ایک ملازم کے سپرد کی اور رحیم داد کو دیوان خانے میں لے گیا۔ مگر باغ کی سمت نہیں گیا۔ دیوان خانے کے پچھواڑے کی باڑی میں پہنچا۔ اس نے جھپاک جھپاک کرسیاں نکال کر باہر رکھ دیں اور ایک طرف ادب سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "شاہ جی، کتھے ہے؟"

"وہ تو جی باغ میں ہے۔ شہر سے کئی وڈے افسر آئے ہوئے ہیں، وہ ان کے ساتھ بیٹھا ہے۔ میں اسے تیرے آنے کی اطلاع کرتا ہوں۔ اتنی دیر تو آرام سے بیٹھ، تھکا ہوا بھی ہے۔ میں جھیتی نال واپس آتا ہوں۔"

رحیم داد خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ شیدا چلا گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ درختوں کی بلند شاخوں پر سنہری دھوپ دھندلی پڑتی جا رہی تھی۔ شام دھیرے دھیرے اپنے بازو پھیلا رہی تھی۔ باڑی میں دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ رحیم داد نے باڑی پہلی بار دیکھی تھی۔ یہ درختوں سے گھرا ہوا ہرا بھرا گوشہ تھا۔ وسط میں گھاس کا قطعہ تھا۔ پھولوں کی چند کیاریاں بھی تھیں۔ دائیں طرف نیم کے ایک گھنے درخت کے پہلو میں مختصر سی عمارت تھی جو ایک کمرے اور غسل خانے پر مشتمل تھی۔ کمرے کے آگے برآمدہ تھا، اس پر کھپریل کی خمیدہ چھت تھی۔ کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ کھلی کھڑکی سے لیمپ کی روشنی باہر جھانک رہی تھی۔ باڑی ہرچند کہ حویلی کی چاردیواری کے اندر تھی مگر الگ تھلگ تھی۔

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ شام گہری ہوتی گئی۔ خاموشی اور بڑھ گئی۔ احسان شاہ نہیں آیا۔ کچھ دیر بعد شیدا واپس آیا۔ اس نے رحیم داد کے آگے میز رکھی۔ اس پر وہسکی کی بوتل، پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس سلیقے سے رکھ دیے۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”شیدے! شاہ جی نہیں آیا؟“ اس کے لہجے سے بے چینی جھلک رہی تھی۔

”شاہ جی نے کہا ہے، میں تھوڑی دیر بعد آؤں گا۔ چوہدری سے کہنا، روٹی ساتھ ہی کھانی ہے۔ آرام سے گپ شپ ہوگی۔ ابھی میں سرکاری افسروں سے کچھ ضروری باتیں کر رہا ہوں۔“ شیدا نے احسان شاہ کا پیغام رحیم داد کو پہنچا کر وہسکی کا پیگ تیار کیا اور رحیم داد کے سامنے رکھ کر بولا۔ ”تو شروع کر، شاہ جی ادھر بیٹھا لگا رہا ہے۔ جھیتی تیرے پاس آئے گا۔“

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ شیدا چلا گیا۔ گلاس سامنے رکھا رہا۔ اس میں وہسکی کا رنگ جھلکتا رہا مگر رحیم داد نے گلاس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ چپ بیٹھا احسان شاہ کا انتظار کرتا رہا۔ اندھیرا گہرا ہوگیا تھا۔ باڑی پر پراسرار سکوت طاری تھا۔ آس پاس نہ کوئی آواز تھی نہ آہٹ۔ رحیم داد بالکل تنہا تھا۔ رات باڑی میں اتر کا کالی پڑتی جا رہی تھی۔ کھڑکی سے جھانکتی ہوئی لیمپ کی روشنی زرد دھبا بن کر رہ گئی تھی۔

لگ بھگ گھنٹے بھر بعد احسان شاہ آیا اور معذرت کے انداز میں بولا۔ ”معاف کرنا چوہدری، مجھے دیر ہوگئی، پر تو آج اچانک کیسے آگیا؟“ وہ قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے رحیم داد کے سامنے رکھا ہوا گلاس دیکھا۔ ”اوئے! یہ گلاس ایسے ہی پڑا ہے۔ لگتا ہے تونے ایک گھونٹ بھی نہیں لیا۔“ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

”نہیں شاہ جی! میں نے آج نہیں پی۔“ رحیم داد نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”واپسی میں جمیلہ مل گئی تو گڑبڑ ہوجائے گی۔ میں اس کے یا اللہ وسایا کے سامنے پی کر جانا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی میں نے یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا۔ صرف تیرے ساتھ روٹی ٹکر کھالوں گا۔“

احسان شاہ نے اصرار کیا۔ مگر رحیم داد آمادہ نہیں ہوا۔ احسان شاہ نے زچ ہوکر کہا۔ ”جیسی تیری مرضی۔“ اس نے گلاس اٹھایا، بڑا گھونٹ بھرا۔ چڑھی ہوئی آنکھیں اور تمتماتا ہوا چہرہ صاف ظاہر کر رہا تھا کہ وہ پہلے ہی خوب چڑھا چکا ہے۔

”یہ بتا، ادھر کیسے آنا ہوا؟“

”تجھ سے کچھ ضروری گل کرنی تھی۔“ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”کوئی خاص گل ہے؟“

”خاص ہی گل سمجھ لے۔ آج دوپہر اللہ وسایا اپنے وکیل کے ساتھ میرے پاس آیا اور مجھ سے ایک درخواست پر دستخط لگوالیے۔“

”کیسی درخواست تھی؟“ احسان شاہ نے پوچھا۔

”انگریزی میں تھی۔ تیں نوں پتہ ہے میں نوں انگریزی نہیں آتی۔ میں نے اس کے بارے میں وکیل سے پوچھا بھی، پر اس نے کہا یہ کنون کی باتیں ہیں، تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ میں بعد میں تجھے سب کچھ بتادوں گا۔ ابھی تو جلدی میں ہوں۔ درخواست فوراً لگانی ہے۔“

”حد کردی تونے۔“ احسان شاہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”جب اس نے درخواست کی نوعیت اور اس کا سبب ہی نہ بتایا تو آنکھ بند کرکے تونے اس پر دستخط کیوں کردیئے؟“

”کیا کرتا جی!“ رحیم داد نے مسکین سی شکل بنا کر کہا۔ ”اللہ وسایا میرے گلے پڑ گیا۔ بار بار دستخط کرنے کو کہا۔ پہلے تو میں چپ کرکے بیٹھا رہا۔ جب وہ ضد کرنے لگا تو دستخط لگانے ہی پڑے۔ میں اسے ناراض بھی تو نہیں کرسکتا۔“

”تونے بہت برا کیا۔“ احسان شاہ کے چہرے پر جھنجلاہٹ طاری ہوگئی۔ ”لگتا ہے، اللہ وسایا نے اپنا کام پکا کرلیا۔ میں نے پہلے ہی خبردار کیا تھا۔ پر تونے میری بات پر بھروسہ نہیں کیا۔“ اس کے لہجے میں تلخی کا اضافہ ہوگیا۔ ”کبھی یہ بھی سوچا اس نے دو تین ہزار روپے خرچ کرکے حویلی اور زرعی اراضی تیرے نام کیوں الاٹ کرادی؟ تو اس کا کون سا سگا لگتا ہے۔ آخر اس نے الاٹمنٹ کے لیے اتنا پیسہ کیوں خرچ کیا؟ کیوں اتنی بھاگ دوڑ کی؟ تو ہی بتا، اس نے ایسا کیوں کیا؟ کوئی تو بات ہوگی، کچھ تو اسے فائدہ ہوگا۔ اتنا تو کوئی اپنے بھائی کے لیے بھی نہیں کرتا۔ تو اس کا کچھ بھی تو نہیں لگتا۔ پرانی یاری بھی نہیں۔ اپنی سمجھ میں تو یہ چکر آتا نہیں۔ اس میں ضرور کچھ ہیر پھیر ہے۔“

”شاہ جی! تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اپنا مغز بھی کام نہیں کرتا۔“ رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وکیل نے درخواست پر دستخط کرانے کے ساتھ میرے کلیم کے سارے کاغذات بھی اپنے پاس رکھ لیے ہیں۔“

”کیا کہا! کلیم کے کاغذات بھی اس نے اپنے کبضے میں کرلیے؟“ احسان شاہ نے حیران و پریشان ہوکر پوچھا۔ ”اس نے تجھے بالکل ہی ختم کردیا۔ تو اندھے اعتماد میں مارا گیا۔ اب تو تیرے پاس دستاویزی ثبوت بھی نہیں رہا۔ مختار نامہ اسے پہلے ہی دے چکا ہے۔ اس نے اپنی مرضی کی درخواست پر تجھ سے دستخط بھی لگوالیے۔ پہلے جو کمی رہ گئی تھی، اب پوری کرلی۔ اب تو وہ جو جی چاہے کرسکتا ہے۔ جب مرضی ہوگی، تجھے بے دخل کردے گا۔ اب تو اسے صرف پٹواری کے رجسٹر

ملکیت میں اپنے نام کا اندراج کرانے کے بعد تحصیل دار کے پاس جاتا ہے۔ ہزار دو ہزار میں یہ کام بھی ہو سکتا ہے۔" اس نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ "اب تو وہ ساری جائیداد پر اپنا ہی قبضہ رکھے گا۔ ویسے بھی اس کے قبضے میں ہے۔ لگتا ہے وہ اپنی کارروائی پوری کرنے کے لیے جلد ہی شہر جائے گا۔"

"وہ تو آج ہی وکیل کے ساتھ شہر چلا گیا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا، وہ اپنی کارروائی مکمل کر کے جلد سے جلد تیرا پتا کاٹ دینا چاہتا ہے۔"

رحیم داد نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

"کس سوچ میں پڑ گیا چوہدری؟" احسان شاہ نے رحیم داد کو خاموش دیکھ کر دریافت کیا۔

"شاہ جی! سچ پوچھ تو مجھے یقین نہیں آتا اللہ وسایا میرے خلاف ایسا بھی کر سکتا ہے۔ میں یہی سوچ رہا تھا۔" رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ "سمجھ نہیں آتی، وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟ تجھے پتہ نہیں، پچھلے دنوں وہ مجھے کبیروالا کے ایک زمیں دار کے گھر لے گیا۔ جمیلہ بھی ساتھ تھی۔ دونوں اس کی دھی سے میرا ویاہ کرانا چاہتے ہیں۔ اب تجھ سے کیا چھپانا۔ ویاہ کے لیے اگلے مہینے کی ۲ تاریخ طے بھی ہو چکی ہے۔" رحیم داد نے نظر بھر کر احسان شاہ کی طرف دیکھا۔ "ان کے دل میں اگر میرے خلاف کوئی بدی ہوتی تو وہ ایسا کیوں کرتے؟ مجھے بے دخل ہی کرنا ہوتا تو اللہ وسایا اور جمیلہ میرا گھر بسانے کی کوشش کیوں کرتے؟"

"یہ کب کی گل ہے؟" احسان شاہ کے لہجے میں تحیّر تھا۔

"پچھلے جمعے کی۔" رحیم داد نے بتایا۔ "زمیں دار کا نام چوہدری اکرم ہے۔ تحصیل کبیروالا کے پنڈ احمد پور میں اس کی زمیں داری ہے۔ اٹھ مربعے سے اوپر زمین ہے۔ پکی ماڑی ہے اور جس کڑی کے ساتھ وہ میرا ویاہ کرنا چاہتا ہے، اس کے سوا اس کا کوئی نہیں۔ وہی اس کی ساری جائیداد کی وارث ہے۔ بلکہ اللہ وسایا تو یہ بھی کہتا تھا کہ اکرم ویاہ کے بعد اپنی ساری زمیں داری میرے سپرد کر دے گا۔"

"مجھے تو یہ بھی کوئی اونچا چکر لگتا ہے۔" احسان شاہ نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "اپنی سمجھ میں تو یہ گل آتی نہیں۔ جس کی اکلوتی اولاد صرف ایک دھی ہو اور اچھی خاصی زمیں داری بھی ہو، کیا اسے اپنی جات برادری میں رشتہ نہیں مل سکتا تھا جو وہ تجھے اپنا جنوائی بنانے پر اتنی جلدی تیار ہو گیا؟"

"پر ایک گل اور بھی ہے۔ اس کی دھی کا پہلے بھی ویاہ ہو چکا ہے۔ جنوائی چنگا بندہ نہیں تھا۔ اس لیے اکرم کاغذ لکھوا کر دھی کو اپنے گھر لے آیا۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "اکرم بوڑھا ہے اور بیمار بھی رہتا ہے۔ چاہتا ہے اپنی زندگی میں دھی کا ویاہ کر دے تاکہ اس کے بعد وہ بے سہارا نہ رہ جائے۔ شریکے اور برادری والے جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے اسے تنگ نہ کریں۔"

"چوہدری، مجھے تو یہ شادی ویاہ سب ڈھونگ لگتا ہے۔ پتہ نہیں، اکرم کون ہے، کیسا بندہ ہے؟" سید احسان علی نے نشے کی جھونک میں قہقہہ بلند کیا۔ "چوہدری تو ٹھہرا مہاجر۔ تو ان ملتانیوں کو نہیں جانتا۔ ان کے لیے تو مشہور ہے کہ صورت ملاں کی اور آنکھیں چور کی۔ پورے پنجاب میں ملتانی زمینداروں سے بڑا رسہ گیر نہیں ملے گا۔ جتنا وڈا زمیں دار ہو گا، اتنا ہی وڈا رسہ گیر ہو گا۔ ویسے نام کو کوئی سید ہے۔ کوئی قریشی، کوئی گردیزی ہے۔ کوئی گیلانی ہے۔ کوئی نواب اور کوئی مخدوم ہے۔" اس نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ "وہ کوئی بھی ہو پر رسہ گیری کو جرم اور برائی نہیں سمجھتا۔ رسہ گیری تو ان کے لیے دل بہلانے کا مشغلہ اور تفریح ہے۔"

"پر چوہدری اکرم ایسا نہیں ہے۔ دیکھنے میں نیک بندہ لگتا ہے۔"

"کسی کی صورت پر تو اندر کا حال لکھا نہیں ہوتا۔" احسان شاہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ "چوہدری تجھے ملتانی زمیں داروں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ پنجاب گزیٹئر میں تو ان کا ذکر کرتے ہوئے یہاں تک بتایا گیا ہے کہ وہ رسہ گیری کو بالکل چوری چکاری نہیں سمجھتے۔ زور آور اور کامیاب نمبردار وہی سمجھا جاتا ہے جو دن میں حکومت کرے اور رات کو چوری اور رسہ گیری۔ ان کے بارے میں تو جانے کتنی کہاوتیں مشہور ہیں۔ کہتے ہیں چاچا چور بھتیجا کاضی۔ ملاں چور موذن گواہ۔ کہاں تک تجھے بتاؤں۔" اس نے وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا اور گلاس خالی کر دیا۔ "نوجوان زنانیوں اور مٹیاروں کو اٹھوا لینا اور ان کی عزت لوٹنا ملتانی زمیں داروں میں بالکل عام بات ہے۔ چاہے وہ نواب زادہ ہو یا گدی نشین۔"

رحیم داد نے حیرت سے احسان شاہ کو دیکھا۔ وہ نشے میں بالکل بھول گیا تھا کہ جتنی بھی برائیاں نفرت سے منہ بگاڑ بگاڑ کر وہ ملتانی زمیں داروں کی گنوا رہا ہے، وہی حرکتیں اور وہی جرائم وہ خود کرتا ہے اور نہایت دھڑلے سے کرتا ہے۔ زمیں داری چلانے کے لیے انھیں ناگزیر قرار دیتا ہے۔

مگر احسان شاہ اس کے احساسات سے بے نیاز کہتا رہا۔ "تو کس چکر میں پڑ گیا۔ ہرگز ہرگز ادھر ویاہ نہ کرنا۔ بعد میں بہت پچھتائے گا۔ ویسے مجھے تو یہ ویاہ شیاہ ہوتا نظر نہیں آتا۔ اللہ وسایا اس بہانے تجھ سے پیار جتانا چاہتا ہے، پر اس کے ارادے کچھ اور ہی ہیں۔ یوں سمجھ لے، وہ ایک ہاتھ سے حویلی اور زمین تجھے دے کر دوسرے ہاتھ سے چھین لینا چاہتا ہے۔ میرا کام تجھے خبردار کرنا ہے،

آگے تیری مرضی۔"

رحیم داد کو فوراً یاد آگیا' اللہ وسایا نے باتوں باتوں میں یہ بھی کہا تھا کہ چوہدری تو احمد پور کی زمیں داری سنبھال لینا' ادھر کی دیکھ بھال میں کر ہی رہا ہوں۔ رحیم داد ایک بار پھر ذہنی الجھن میں مبتلا ہوگیا۔ اس نے پوچھا۔ "شاہ جی! یہ بتا' اب میں نوں کیہ کرنا ہے؟ میں تیرے کول اسی لیے آیا تھا۔" اس کے لہجے سے بے چارگی اور پریشانی جھلک رہی تھی۔

"تونے تو خود اپنے ہاتھ کٹوا لیے۔" احسان شاہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اللہ وسایا نے تجھ سے سب کچھ تو لے لیا۔ اب میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

"میں اللہ وسایا کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پر یہ تو جانتا ہی ہے کہ اللہ وسایا صرف مزارع ہی نہیں رہا' کوم کا جانگی بھی ہے اور وہ جانگی ہی کیا جو چوری' ڈکیتی اور لوٹ مار نہ کرے۔ جانگی تو ماں کے پیٹ ہی سے جرائم پیشہ پیدا ہوتا ہے۔" احسان شاہ کے چہرے سے سخت برہمی جھلکنے لگی۔ "مجھے اس سے اتنی سخت نفرت ہی اس لیے ہے کہ ایک جانگی میرے ضلعے' بلکہ میری ہی تحصیل میں زمیں دار بنا بیٹھا ہے۔ شان سے حویلی میں رہتا ہے' اونچے طرے کی پگ لگا کر نکلتا ہے۔ تجھے پتہ نہیں' اس کی یہ آن بان دیکھ کر میرا خون کس طرح کھولتا ہے۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ احسان شاہ وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور سنبھل سنبھل کر بولنے لگا۔ "مشکل یہ ہے کہ یہ بھی تو پتہ نہیں' تونے اللہ وسایا کے لیے مختار نامے پر دستخط کیے ہیں یا بیع نامے پر۔ کلیم کے کاغذات بھی اس نے تجھ سے ہتھیا لیے۔ اب تو معاملہ بہت آگے نکل چکا ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا؟"

"اب تیرے سامنے صرف دو رستے ہیں۔"

"وہ رستے کیا ہیں؟" رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔

"اگر تو کانونی چارہ جوئی کرنا چاہے تو میں تیرا کیس اپنے وکیل سے لڑواؤں گا۔ حالانکہ تونے اپنا کیس خود اپنے ہاتھوں کمزور کر دیا ہے۔" احسان شاہ نے رحیم داد کی جانب بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "بول' کیا کہتا ہے؟"

"نہیں شاہ جی!" رحیم داد نے اتفاق نہیں کیا۔ "میں مکدمے بازی کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ یہ دیوانی مکدمہ ہے۔ برسوں عدالتوں کے چکر کاٹنے پڑیں گے۔ کہتے ہیں دیوانی کیس تو دیوانہ بنا دیتا ہے۔"

انکار کے باوجود احسان شاہ نے مقدمہ لڑنے پر زور دیا مگر رحیم داد تیار نہیں ہوا۔ وہ اس کے لیے تیار ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس پر تو پولیس کو صرف دیکھ کر گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی۔ عدالت میں پیش ہونے اور بیان دینے کی اس میں جرات ہی نہیں تھی۔ اسے سراسر خطرہ نظر آتا تھا۔ جائیداد اور املاک حاصل کرنے کی کوشش میں اگر اسے شناخت کر لیا جاتا تو صرف جیل ہی نہ جانا پڑتا' حکیم نذر محمد چشتی اور چوہدری نور الٰہی کے قتل کے جرم میں پھانسی بھی ہو سکتی تھی۔ اسی کمزوری کے باعث اس نے اللہ وسایا کو مختار نامہ دیا تھا تاکہ اسے عدالتوں میں اور سرکاری افسروں کے سامنے پیش نہ ہونا پڑے۔ وہ ہرگز کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

"مکدمہ لڑنا نہیں چاہتا تو صرف ایک ہی رستہ رہ جاتا ہے۔" احسان شاہ نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"وہ کون سا رستہ ہے؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"وہ یہ کہ اللہ وسایا کو رستے سے صاف کر دیا جائے۔" اس کی خمار آلود آنکھوں میں مجرمانہ چمک پیدا ہو گئی۔

"تیرا مطلب ہے' اللہ وسایا کا صفایا کر دیا جائے؟" رحیم داد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"بالکل یہی مطلب ہے۔" احسان شاہ کی آنکھوں کی چمک اور تیز ہو گئی۔ "اللہ وسایا کا صفایا کرنے کے بعد حویلی اور زمین پوری طرح تیرے کبضے میں آجائے گی۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا اور ایک آنکھ دبا کر بولا۔ "تجھے کبیر والا میں ویاہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ جمیلہ تو موجود ہی ہے۔ وہ سوہنی ہے اور جوان بھی۔ اس سے نکاح پڑھا لینا۔ اس کے دس مربعے بھی تیری تحویل میں آجائیں گے۔ تو پورے کوٹلہ ہرکشن کا زمیں دار بن جائے گا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "پر تجھ میں اتنی ہمت بھی ہے؟"

"نہیں شاہ جی! یہ ٹھیک نہیں۔" رحیم داد کے ذہن کو زور کا جھٹکا لگا۔ اس کے چہرے سے پریشانی برسنے لگی۔

"تو یہ بھی سن لے۔" احسان شاہ کا لہجہ گمبھیر ہو گیا۔ "اگر تونے اللہ وسایا کا صفایا نہ کیا تو وہ جلد ہی تجھے اپنے رستے سے صاف کر دے گا۔"

"تو یہ کہنا چاہتا ہے' اللہ وسایا مجھے کتل کرا دے گا؟"

"بالکل کرا سکتا ہے۔ مت بھول کہ اللہ وسایا جانگی بھی ہے۔" احسان شاہ کے لہجے میں تلخی

تھی۔ "جانگلی تو نہ صرف لوٹ مار کے لیے خون کرتا ہے' بلکہ پیسے لے کر دوسروں کے لیے بھی کتل کرتا ہے۔ وہ تو پیشہ ور کاتل ہوتا ہے۔ اگر اس نے تجھے کتل نہ بھی کیا تو کسی کیس میں پھنسوا کر جیل بھجوا سکتا ہے۔ اس کا وکیل بہت تیز ہے۔ مجھے پتہ ہے' وہ کتنا تیز ہے۔"

رحیم داد نے سراسیمہ ہو کر احسان شاہ کی طرف دیکھا۔ "شاہ جی! تیری باتیں بالکل سمجھ نہیں آئیں نے۔"

"سوچ لے' ٹھنڈے دل سے سوچ لے۔" احسان شاہ اس کی سراسیمگی اور گھبراہٹ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے تیری پریشانی کا پتہ ہے' تبھی میں نے تجھے ہر پہلو دکھا دیا۔ اب تو اپنے طور پر سوچ بچار کر لے۔ مگر تجھے جلد ہی فیصلہ کرنا ہوگا۔ وکت بہت کم ہے۔"

"میں تیرے پاس چند روز بعد آؤں گا۔ اب میں نوں چلنا ہے۔" رحیم داد کھڑا ہو گیا۔

احسان شاہ نے اسے جانے نہیں دیا۔ "ایسی کیا جلدی ہے؟ روٹی کھا کر جانا۔" احسان شاہ بھی کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد ٹھہر گیا۔ دونوں نے کھانا کھایا۔ رحیم داد کھانے کے دوران خاموش رہا۔ احسان شاہ نے بھی کم بات چیت کی۔ لیکن اس نے اللہ وسایا کی جانب سے رحیم داد کو برگشتہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ کھانے سے فارغ ہو کر رحیم داد اپنی گھوڑی پر سوار ہو کے واپس ہوا۔

☆

رحیم داد مہمان خانے میں پہنچا تو احمد سو رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا مگر بات چیت نہیں کی۔ گہری نیند سے اٹھا تھا' آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ لیکن رحیم داد کو اس کی زبانی یہ اطلاع مل گئی کہ اللہ وسایا شہر سے لوٹا نہیں ہے۔

اللہ وسایا دوسرے روز شام کو واپس آیا۔ رحیم داد باغ میں تنہا بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ اس کے پاس نہیں آیا۔ واپسی کے کچھ ہی دیر بعد وہ قادر کے گھر چلا گیا۔ جمیلہ بھی اس کے ہم راہ تھی۔ یہ اطلاع بھی احمد ہی نے دی تھی۔ رحیم داد کے دریافت کرنے پہ اس نے بتایا۔

"زمیں دار اور زمیں دارنی کادو کے پاس گئے ہیں۔ وہ آج دوپہر کو لمور سے لوٹا ہے۔"

"کادو اب کیسا ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"بالکل کمزور پڑ گیا ہے جی! آنکھیں تو اس کی دونوں ہی جاتی رہیں۔ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اندھا ہو گیا ہے۔"

کئی روز گزر گئے۔ نہ اللہ وسایا اس کے پاس آیا نہ جمیلہ۔ دونوں قادر اور عطا محمد کا جھگڑا ختم کرانے کے لیے صلح صفائی کی کوشش کر رہے تھے۔ عطا محمد تو تیار تھا۔ وہ اور اس کا بھائی گرفتار ہونے کے بعد ضمانت پر رہا ہو چکے تھے۔ پولیس نے دونوں کو مجیداں کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ دوسری طرف قادر صلح کرنے پر رضامند نہیں تھا۔ وہ ایسی شرائط پیش کرتا جو عطا محمد کے لیے قابل قبول نہ ہوتیں۔

ہر روز دونوں فریقوں کے نمائندے اکٹھا ہوتے۔ پنچایت بیٹھتی' لیکن قادر کے بگڑے ہوئے رویے کے باعث کچھ نہ طے ہوتا۔ بار بار تلخ کلامی کی نوبت آجاتی' بات بنتے بنتے بگڑ جاتی۔ لیکن جمیلہ نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے قادر اور اس کے بیٹے صابر کو سمجھا بجھا کر کسی نہ کسی طور راضی کر ہی لیا۔

رحیم داد پنچایت میں شریک نہیں ہوا۔ اس کا وقت تنہائی میں کٹتا رہا۔ احمد یا دوسرے نوکروں سے اسے اللہ وسایا اور جمیلہ کی سرگرمیوں کا پتہ چلتا رہا۔

☆

اللہ وسایا مہمان خانے میں رحیم داد کے پاس آیا مگر وہ کمرے میں نہیں بیٹھا۔ رحیم داد کو باہر لے گیا۔ دونوں ٹہلتے ہوئے کھیتوں کی طرف چلے گئے۔ دن کے ساڑھے بارہ بجے تھے' لیکن دھوپ نہیں تھی۔ آسمان پر سرمئی بادل چھائے تھے۔ بارش کے بعد ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ ہوا قدرے بھری ہوئی تھی۔ درختوں کی شاخیں اور پودے جھونکوں سے جھوم رہے تھے۔

فضا خوشگوار اور سہانی تھی۔ لیکن اللہ وسایا کے چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ وہ چپ چپ تھا۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ کچھ دیر تک دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ آخر رحیم داد نے خاموشی توڑی۔

"تو شہر گیا تھا' درخواست کا کیا بنا؟"

"وکیل نے دوسرے ہی روز درخواست لگا دی تھی۔"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے استفسار کی۔ "یہ نئی درخواست کیسی ہے؟ نہ تو نے کچھ بتایا نہ وکیل نے۔"

"تو درخواست کے بارے میں بار بار اس طرح کیوں پوچھ رہا ہے؟" اللہ وسایا کا لہجہ تیکھا تھا۔

رحیم داد نرم پڑ گیا۔ "برا منا رہا ہے تو نہیں پوچھوں گا۔" اس نے لمحے بھر خاموش رہ کر پوچھا۔

"میں تو یہ پتہ کرنا چاہتا تھا' الاٹمنٹ میں کوئی گڑبڑ تو نہیں پڑ گئی؟"

"گڑبڑ ہو سکتی تھی' اگر فوراً درخواست نہ لگائی جاتی۔"

"پریشانی کی تو کوئی گل نہیں؟" رحیم داد نے بے چینی کا اظہار کیا۔

"ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" اللہ وسایا نے بے نیازی سے جواب دیا۔

رحیم داد نے محسوس کیا کہ اللہ وسایا خلاف توقع کچھ اکھڑا اکھڑا ہے۔ وہ ہر بات کا مختصر اور ادھورا جواب دیتا۔ رحیم داد نے دبی زبان سے پوچھا۔ "تو نے یہ نہیں بتایا' یہ درخواست لگانے کی ضرورت کیوں پڑی؟"

"یہ تو وکیل سے پوچھنا' وہی بتائے گا۔"

"تیں نوں کچھ پتہ ہو تو بتا دے۔" رحیم داد کا لہجہ بہت نرم تھا۔ "وکیل تو کانونی نکات بتائے گا' وہ سمجھ نہیں آئیں گے۔"

"جب کانونی نکات تجھے سمجھ نہیں آتے تو چپ کر کے بیٹھا رہ۔ آگے تجھے سب کچھ خود ہی پتہ چل جائے گا۔" اللہ وسایا کے انداز میں ہلکی ہلکی تلخی تھی۔ وہ چند لمحے خاموشی سے چلتا رہا۔ رحیم داد نے بھی خاموشی توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ آخر اللہ وسایا نے خود ہی گفتگو شروع کی۔ "تجھ سے ایک ضروری گل پوچھنی ہے۔"

"کیسی گل؟" رحیم داد نے مضطرب ہو کر دریافت کیا۔

اللہ وسایا کا چہرہ اور گمبھیر ہو گیا۔ اس نے مڑ کر تیکھی نظروں سے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تو یہاں آنے سے پہلے ڈھولہ امیر خاں میں ہوتا تھا؟"

رحیم داد کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ لرز کر رہ گیا۔ زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ نظریں جھکائے چپ چاپ چلتا رہا۔ اس کے چہرے پر اچانک سراسیمگی چھا گئی تھی اور صاف نظر بھی آ رہی تھی۔

اللہ وسایا گردن اٹھائے چلتا رہا۔ اس کا چہرہ اور سنجیدہ ہو گیا۔ چند قدم خاموشی سے آگے بڑھنے کے بعد اللہ وسایا کی آواز ابھری۔ "تو نے ادھر دو کتل بھی کیے ہیں؟" رحیم داد کے قدم ڈگمگانے لگے۔ اس پر سکتہ طاری تھا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اس کا ذہن ستار کے تاروں کی مانند جھن جھنا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرے کے جال پھیلنے لگے۔

"چپ کیوں ہے' بولتا کیوں نہیں؟" اللہ وسایا کا لہجہ تیکھا اور قدرے اونچا تھا۔

رحیم داد شدید مخمصے میں پڑ گیا۔ نہ وہ اعتراف کر سکتا تھا' نہ صاف انکار۔ دونوں صورتوں میں اس کے لیے پریشانی تھی۔ اس نے صاف جواب دینے سے گریز کیا۔ ذہنی خلفشار پر قابو پانے کی

پوری پوری کوشش کی' ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

"دارا تجھ سے ملا تھا؟"

"ہاں!" اللہ وسایا نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "پچھلے دنوں وہ تجھے ڈھونڈتا ہوا میرے پاس آیا تھا۔ دیر تک باتیں کرتا رہا۔"

"کیا کہتا تھا؟" رحیم داد کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

"وہی جو میں نے تجھے بتایا۔"

رحیم داد نے فوراً پینترا بدلا۔ "میں نے تجھے بھائی کہا ہے' تجھ سے ہرگز جھوٹ نہیں بولوں گا۔ سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا۔" اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔

اللہ وسایا پر خاطر خواہ ردعمل ہوا۔ اس کے انداز میں قدرے نرمی پیدا ہوئی۔ وہ گلہ کرنے کے انداز میں بولا۔ "چوہدری! میں تجھے اتنا خطرناک بندہ نہیں سمجھتا تھا۔"

"تو پہلے میری پوری گل سن لے۔" رحیم داد نے اللہ وسایا کو رام کرنے کی کوشش کی۔

"تجھے پتہ نہیں۔ میں نے ان باتوں کا ابھی تک کسی سے بالکل تذکرہ نہیں کیا۔ جمیلہ تک کو نہیں بتایا۔ حالانکہ میں اس سے کبھی کوئی بات نہیں چھپاتا۔" اللہ وسایا نے لمبی سانس بھری۔ "چوہدری! تو نے مجھے سخت الجھن میں ڈال دیا ہے۔ تو خود سوچ' اگر یہ باتیں سچ ہیں تو آگے کیا بنے گا۔"

"تو میری بات پوری طرح سن لے گا تو سب کچھ تیری سمجھ میں آ جائے گا۔" رحیم داد نے صفائی پیش کرنا چاہی۔ "تو جس طرح سوچ رہا ہے' بات اس طرح نہیں ہے۔"

اللہ وسایا اس کی صفائی سننے پر رضامند نہ ہوا۔ "تجھے اس معاملے میں جو کچھ کہنا ہے' دارا ہی کے سامنے کہنا تاکہ ہر بات کھل کر سامنے آ جائے۔ وہ جلد ہی میرے پاس آئے گا۔"

رحیم داد نے اصرار کیا۔ "اس کے سامنے بھی بات ہو جائے گی۔ مگر تو اس سے پہلے میری گل بھی سن لے۔"

"تو کہتا ہے تو ضرور سنوں گا۔" اللہ وسایا نے اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔ "اس بارے میں آرام سے بیٹھ کر تجھ سے گل بات ہو گی۔ آج تو میں نوں وکیل کے پاس شہر جانا ہے۔"

"درخواست ہی کے سلسلے میں جا رہا ہے؟"

"ہاں' تجھ سے مختار نامہ لینے کے بعد اب تو مجھی کو ہر افسر کے سامنے پیش ہونا پڑتا ہے۔"

"کب جائے گا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

”دوپہر کی روٹی کھا کر روانہ ہو جاؤں گا۔“

”واپسی کتنے روز میں ہوگی؟“

”کچھ پتہ نہیں۔ تین چار روز تو لگ ہی جائیں گے۔“

دونوں باتیں کرتے ہوئے کھیتوں سے گزر کر اسکول کی جانب نکل آئے۔ رحیم داد نے نظریں اٹھا کر دیکھا، جمیلہ اسکول سے باہر آرہی ہے۔ اس کے ہم راہ دونوں بچے بھی تھے۔ اللہ وسایا نے بھی اسے دیکھ لیا۔ رحیم داد نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”لگتا ہے، سکول کی چھٹی ہوگئی۔ زمیں دارنی آرہی ہے۔“

اللہ وسایا نے آہستہ سے کہا۔ ”میرے جانے کے بعد اس معاملے میں جمیلہ سے کوئی گل بات نہ کرنا۔ میں تجھے بتا ہی چکا ہوں، میں نے اسے ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔ جب تک تجھ سے پوری طرح بات چیت نہ ہو جائے گی، اس سے کچھ نہیں کہوں گا۔ وہ ایسی باتوں سے جلد گھبرا جاتی ہے۔“

”نہیں، میں اس سے کچھ نہیں کہوں گا۔ تو فکر نہ کر۔“ رحیم داد نے اللہ وسایا کو یقین دلایا۔

جمیلہ قریب آگئی۔ اللہ وسایا اور رحیم داد اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے حویلی کی جانب چل دیے۔

رحیم داد مہمان خانے میں پہنچا تو سخت پریشان اور خوف زدہ تھا۔ پریشانی کے عالم میں اس سے دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ وہ شام تک کمرے میں بستر پر لیٹا بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے اپنے سر پر خطرہ منڈلاتا نظر آرہا تھا۔ اندھیرا پھیلنے لگا تو وہ مہمان خانے سے نکلا۔ باغ میں گیا اور تنہا بیٹھا رہا۔ اللہ وسایا شہر جا چکا تھا۔ جمیلہ بھی باغ میں نہیں آئی۔

☆

بادل چھائے تھے مگر بارش نہیں ہوئی۔ رحیم داد نے باغ ہی میں کھانا کھایا اور کھانے سے فارغ ہو کر دیر تک بیٹھا رہا۔ اندھیرا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ رحیم داد اٹھا اور مہمان خانے کی جانب چلا۔ وہ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ ایک جھنڈ کے نیچے سے دارا نکلا اور رحیم داد کے سامنے آگیا۔ رحیم داد سراسیمہ ہو کر کھڑا ہوگیا۔ دارا کو دیکھ کر خوف اور پریشانی کے ساتھ ساتھ اس پر غصہ بھی طاری ہوا۔ مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

”تو نے مجھے پہچان لیا؟“ دارا نے آہستہ سے پوچھا۔

”ہاں۔“ رحیم داد آگے بڑھنے لگا۔ ”میرے ساتھ آ۔“

رحیم داد نے مہمان خانے کی جانب جانے کا ارادہ ترک کر دیا، مڑا اور دارا کے ہم راہ نہر کی سمت بڑھنے لگا۔ عقب میں گاؤں تھا۔ مکانوں میں چراغوں کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ آسمان پر ہلکا ابر چھایا تھا۔ درختوں کے نیچے اندھیرا تھا۔ دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔

کچھ دور جا کے رحیم داد نے پوچھا۔ ”تو یہاں کیسے آیا؟“ اس کا لہجہ تیکھا تھا۔

”میں نے تجھے اس روز نہر کے کنارے دیکھا تھا۔ یاد ہے نا جب تو اپنی گھوڑی دوڑاتا جا رہا تھا۔“ دارا آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ”تبھی سے میں تیرے پاس آنا چاہتا تھا، پر تو اتنا بدل گیا ہے کہ بالکل پہچانا نہیں جاتا۔ تیرے منہ پر یہ چوٹ کا نشان بھی نہیں تھا۔ تو گھوڑی پر بیٹھا بھی بہت شان سے تھا۔ سچ کہتا ہوں، میں تجھے پہچان نہیں سکا تھا۔“

”ایسا تھا تو ادھر کیوں آیا؟“

”گل ایہہ ہے جی! تیرے بارے میں کچھ شبہ سا ہوا۔“ دارا نے وضاحت کی۔ ”میں نے تجھے ادھر سے گھوڑی پر نکلتے دیکھا تھا۔ اب تجھ سے صاف صاف بتا دوں۔ میں دو بار پہلے بھی یہاں آیا اور چھپ کر تجھے خوب غور سے دیکھتا رہا۔“

”پر تو ادھر کیسے آگیا؟ تو ڈھولہ امیر خاں میں ہوتا تھا نا؟ میں نے تجھے وہیں چھوڑا تھا۔“

”تیں نوں پتہ ہی نہ ہوگا، تیرے آنے کے بعد مجھ پر کیا بیتی۔“ دارا نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”جب تو بگھاں اور اس کے گھر والے مولا داد کا خون کر کے بھاگا۔“

”تیں نوں کیسے پتہ چلا، میں نے بگھاں اور مولا داد کا خون کیا؟“ رحیم داد نے اس کی بات کاٹ کر دریافت کیا۔ اس کی آواز سے جھنجلاہٹ صاف جھلک رہی تھی۔

”ناراض نہ ہو۔ تیں نوں پتہ ہی ہے، میں موجود نہیں تھا۔“ دارا سہم کر نرم پڑ گیا۔ ”میں جب پہنچا تو بگھاں مر چکی تھی، مولا داد دم توڑ رہا تھا۔ اس کا بھائی اللہ داد زخمی تھا، پر زندہ تھا۔ اسی نے بتایا بگھاں اور مولا داد کا خون تو نے کیا۔“

”بکواس کرتا ہے وہ۔“ رحیم داد برافروختہ ہو کر بولا۔ ”اسے پتہ ہے، بگھاں کو میں نے نہیں، مولا داد نے کلہاڑی سے قتل کیا۔ میں نے اسے روکنا چاہا تو اس نے مجھ پر بھی وار کیا۔ میں برابر بچنے کی کوشش کرتا رہا، پر جب میں نے دیکھا، وہ بگھاں کی طرح مجھے بھی ختم کرنے پر تلا ہوا ہے تو میں نے اپنے بچاؤ کے لیے وار کیا اور اسی کی کلہاڑی چھین کر کیا۔ کرتا بھی کیا۔ وہ بالکل پاگل ہو رہا تھا۔ اللہ داد بھی اسی لیے زخمی ہوا کہ وہ بھی مجھے قتل کرنا چاہتا تھا۔“

”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔“ دارا نے جھٹ اس کی تائید کی۔ ”پر تیں نوں یاد ہوگا، جب تو میرے گھر سے نکل کر کھیتوں کی طرف بھاگا، تو میں نے تجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔ تو رک کر اصلی گل

بتا دیتا تو میں اللہ داد کی بات ہرگز نہ مانتا۔" وہ صفائی پیش کرتے کرتے شکوہ کرنے لگا۔ "میں نے تو تجھ سے پہلے ہی پوچھا تھا، اگر تو نے بیگماں سے یاری لگا رکھی ہے۔"

رحیم داد نے اسے آگے نہیں بولنے دیا۔ غصے سے آگ بگولا ہو کر ڈانٹا۔ "چپ کر۔ تو نے فیر وہی بکواس شروع کر دی۔"

"اللہ داد بھی ایسی ہی گل کرتا تھا۔ دوسرے بھی یہی کہتے تھے۔" دارا نے گڑگڑانے کے انداز میں آہستہ آہستہ کہا۔ "اللہ داد نے پولیس کو بھی یہی بتایا۔"

"پولیس نے تجھ سے بھی پوچھ تاچھ کی تھی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"کیوں نہیں کی۔ میرے گھر ہی میں دونوں کا خون ہوا تھا۔ پولیس مجھے کیسے چھوڑ دیتی۔ تھانے دار سویرے پہنچا تھا اور مجھے پکڑ کر تھانے لے گیا۔"

"تو نے کیا بیان دیا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"میں نے کیا بیان دینا تھا جی! میں نوں تو کچھ پتہ نہیں تھا۔ پولیسوں نے چھتر مار مار کر چمڑی ادھیڑ ڈالی۔ پیٹھ اور کمر پر لمبے لمبے لاس پڑ گئے۔ انھوں نے مجھے ننگا کیا اور الٹا لٹکا دیا۔ ایک پولیسا میرے دونوں ہاتھ اپنے بوٹ سے دبا کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرا زور زور سے ٹھڈے مارتا تھا۔ میں درد سے چیخنے چلانے لگا پر اس نے ترس نہ کھایا۔ وہ مارتے مارتے تھک گیا تو تھانے دار کے حکم پر ایک اور پولسیا لگایا گیا۔ وہ خوب تگڑا تھا۔ اس نے سڑاک سڑاک پانی میں بھیگے ہوئے چمڑے کے چھترے مارے۔ میں نے ڈر کے وہی بیان دے دیا جو اللہ داد نے دیا تھا۔"

"پر تو وہاں موجود ہی کب تھا، جب مولا داد نے بیگماں کو کتل کیا اور مجھے کتل کرنے کے ارادے سے کلہاڑی اٹھا کر حملہ آور ہوا۔ تو تو پہلے ہی گھر سے نکل کر جا چکا تھا۔ اللہ داد اور مولا داد تو تیرے جانے کے بہت بعد پہنچے تھے۔"

"تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پر میں کب تک مار کھاتا۔" دارا نے اپنی صفائی پیش کی۔ "میں نے تو مار سے بچنے کے لیے ایسا بیان دیا تھا۔"

"تب تو پولیس نے تجھے چھوڑ دیا ہوگا۔"

"کہاں چھوڑا جی! وہ تیرے بارے میں بار بار پوچھتے تھے۔ تیں نوں پتہ ہی ہے، میں نوں تیرے بارے میں کچھ بھی ملوم نہ تھا۔ نام تک کا پتہ نہ تھا۔ پر تھانے دار نے میری ایک نہ سنی۔ گندی گندی گالاں نکالتا تھا۔ چیخ چیخ کر کہتا تھا، تیرے گھر میں واردات ہوئی۔ کاتل تیرے ساتھ کئی روز ٹھیرا رہا اور تیں نوں اس کے بارے میں کچھ اتا پتہ نہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں جتنی اپنی صفائی پیش کرتا، اتنی ہی زیادہ دبا کے وہ میری پٹائی کرواتا۔"

رحیم داد اس کی روداد سن کر متاثر ہوا۔ اظہار ہمدردی کے طور پر بولا۔ "پولیس نے تجھ پر بہت ظلم کیا۔"

"نہ پوچھ کتنا ظلم کیا۔" دارا نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "تھانے لے جانے کے بعد پولیس نے کئی راتوں تک بالکل نہیں سونے دیا۔ کھانے کو بھی نہیں دیا۔ پیاس لگتی، پانی مانگتا تو تھانے دار پیچھے ہٹا لیتا، پانی نہ پلاتا۔ میں ہتھ جوڑتا، منتیں کرتا پر پانی دینے کی بجائے پولیسے اور پٹائی کرتے۔ کئی بار میں بے ہوش ہوا۔ ہر بار وہ پانی کے چھینٹے میرے منہ پر مار مار کر ہوش میں لاتے اور تیرے بارے میں پوچھتے۔ کبھی نرمی دکھاتے، پیار سے گل بات کرتے۔ کبھی گرمی دکھاتے اور گالاں نکالتے۔ تھانے دار چلا جاتا تو ہیڈ کانسٹیبل کی ڈیوٹی لگ جاتی ہے۔ وہ اپنی کارگزاری ڈالنے کے لیے اور زیادہ ظلم کرتا۔"

"تو پولیسوں کے پنجے سے چھوٹا کیسے؟"

"وہ ایسا ہے جی! میرا زمیں دار بہت نیک بندہ ہے۔ تھانے دار سے اس کی یاری بھی ہے۔" دارا نے رحیم داد کو بتایا۔ "وہ ایک روز تھانے آیا۔ میری حالت دیکھ کر اسے رحم آگیا۔ وہ اپنی ضمانت پر مجھے اپنے ساتھ لے آیا۔ تھانے دار سے اس نے وعدہ کیا، جب ضرورت پڑے گی، مجھے پیش کر دے گا۔"

"پر تو وہاں سے نکل کر ادھر کیسے پہنچ گیا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"ویسے تو جی زمیں دار کے پاس جب تک رہا، میری کڑی نگرانی ہوتی رہی۔" دارا نے رحیم داد کو بتایا۔ "مجھے باہر جانے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔ رات کو تو کوٹھری میں بند کر دیا جاتا۔ فیر ایسا ہوا، ایک صبح میں ٹٹی کرنے نیائیں کی طرف گیا۔ ایک راکھا میرے ساتھ ساتھ تھا، وہ بھی ٹٹی کرنے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ میں نے رات ہی کو بھاگنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ اٹھ کر اچانک اس پر جھپٹا اور اسے نیچے گرا کر اس کا منہ دبایا، پگڑی سے اس کے ہاتھ اور پیر باندھے اور پگڑی کا ایک سرا اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ ہر طرف ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ میں جھٹ کھیتوں میں گھس گیا، چھپتا لکتا پنڈ سے باہر نکلا اور تیزی سے دوڑ لگائی۔ میں سورج نکلنے سے پہلے ڈھولہ امیر خاں سے بہت دور نکل جانا چاہتا تھا۔" دارا نے گہری سانس بھری۔ "کئی روز تک برابر چلتا رہا۔ دن کو کسی جھنگر یا ویران بستی کے کھنڈر میں چھپ جاتا۔ رات کو سفر کرتا۔ بھوکا بھی رہا، پیاسا بھی۔ کسی نہ کسی طرح ادھر آگیا۔"

"اب تو کہاں رہتا ہے؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔ "لگتا ہے' نزدیک ہی کے کسی پنڈ میں ٹھیرا ہوا ہے۔"

"ہاں جی! میں چک ۴۸ میں رہتا ہوں۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں' ۵ میل کے لگ بھگ ہو گا۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے نہر کے قریب پہنچ گئے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ برسات کی اندھیری رات تھی۔ جگنوؤں کا غول ہوا کے جھونکے کے ساتھ ایک سمت سے نمودار ہوا اور اپنی جلتی بجھتی روشنیوں کا غبار فضا میں بکھیرتا ہوا درختوں کے گھنے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ رحیم داد نے جگنوؤں کا قافلہ گزرتے دیکھا' ٹھٹکا اور دارا کی طرف متوجہ ہوا۔

"تو کس کے پاس ٹھیرا ہے؟"

"میں تو جی ریاست بھاول پور کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ رستے میں کامل مل گیا۔ میں نے تو چاہا تھا' اس کی نظروں سے بچ کر نکل جاؤں پر اس نے دیکھتے ہی دور سے ہانک لگائی۔ پاس آ کر چمٹ گیا۔ بہت دنوں بعد ملا تھا۔ میرا پرانا یار ہے۔ وہ میرے گلے پڑ گیا' ضد کر کے اپنے گھر لے گیا۔ وہ اپنے پیئو کے ساتھ چک ۴۸ میں رہتا ہے۔"

"کامل زمیں دار ہے یا مزارع؟"

"وہ نہ زمیں دار ہے' نہ مزارع۔" دارا نے جواب دیا۔ "وہ تو جی پاکستان سے باہر کوئی جگہ ہے بحرین' ادھر ہوتا ہے۔ وہاں بحرین پٹرولیم کمپنی میں کام کرتا ہے۔ آج کل چھٹی پر آیا ہوا ہے۔ لگتا ہے' کمائی چنگی ہے۔ شان سے رہتا ہے۔"

"اس کی چھٹی ختم ہو جائے گی تو واپس چلا جائے گا۔" رحیم داد نے کریدا۔ "تب تو کیا کرے گا؟ کس کے پاس ٹھیرے گا؟"

"یہی تو جی فکر ہے۔ سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔" دارا نے تشویش کا اظہار کیا۔ "تیں نوں پتہ ہی ہے' پولیس میری تلاش میں ہے۔ کامل کے گھر میں آرام سے چھپا بیٹھا ہوں۔ کامل کے بحرین جانے کے بعد وہاں کیسے ٹھیر سکوں گا۔ اس کا پیئو مجھے نہیں ٹھیرائے گا۔ وہ ٹھیک بندہ نہیں ہے۔ ویسے ہی میرے ٹھیرنے پر اکثر کڑ کڑ کرتا رہتا ہے۔ وہ تو کامل ہے جس نے روک رکھا ہے۔"

"کامل جانتا ہے' پولیس تیری تلاش میں ہے؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"ہاں جی! اسے پتہ ہے۔ پر اپنے پیئو اور چاچا کو اس نے کچھ نہیں بتایا۔ چاچا بھی ساتھ ہی رہتا ہے۔ ۱۸ کلا سے اوپر ہتھ رادھ زمین ہے۔ کامل کا پیئو اور چاچا مل جل کر اس پر کاشت کرتے ہیں۔" دارا اطمینان سے بتاتا رہا۔ "کامل کمائی کر کے لایا ہے۔ اس سے اور زمین خریدنے کی

کوشش ہو رہی ہے۔ ویسے وڈا ٹبر نہیں۔ آرام نال گزر بسر ہو رہی ہے۔ کامل کی ایک ہی بھین ہے۔ اس کا ویاہ بھی پچھلے دنوں ہو گیا۔ کامل اس میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ وہ....."

رحیم داد کو کامل اور اس کی بہن کی شادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بات کاٹ کر بولا۔ "یہ بتا' تو نے آگے کے لیے کیا سوچا؟"

"کامل کہتا ہے تو میرے ساتھ بحرین چل۔ تیں نوں بھی ادھر پٹرولیم کمپنی میں لگوا دوں گا۔ آج کل کمپنی میں بھرتی بھی ہو رہی ہے۔ مزدوری چنگی ملے گی' عیش کرے گا۔ وہ جی! میرا بہت ہی گہرا یار ہے۔ میری مدد بھی کرنا چاہتا ہے۔"

"اس میں سوچنا کیا۔ چلا جا اس کے ساتھ۔" رحیم داد نے مشورہ دیا۔

"کیسے چلا جاؤں جی!" دارا نے مجبوری ظاہر کی۔ "پہلے کراچی جانا ہو گا۔ وہاں کمپنی کے لیے بھرتی کا دفتر ہے۔ بھرتی کرنے والے افسروں کی مٹھی گرم کرنی پڑتی ہے۔ اس کے بناں کام نہیں بنتا۔ کامل بتاتا تھا' ۵ سو روپے کی ضرورت ہو گی۔ تیں نوں پتہ ہے' میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ اکٹھے ۵ سو روپے تو کامل بھی نہیں دے سکتا۔ ویسے اس کے پاس اتنے روپے ہیں بھی نہیں۔ میں نے تو اسے کہا تھا' روپے ادھار دے دے تو بحرین میں مزدوری کر کے ادا کر دوں گا۔ پر وہ جو کچھ کما کر لایا تھا' سب اپنے پیئو کو دے چکا ہے۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ دونوں چپ چاپ چلتے رہے اور نہر سے ہٹ کر کھجور کے ایک درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑے ہو گئے۔

دارا زیادہ دیر چپ نہ رہا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میں تیرے پاس اسی لیے آیا تھا۔" اس کے لہجے میں خوشامد اور عاجزی تھی۔ "تیری بہت مہربانی ہو گی۔ تو نے مجھے ۵ سو روپے دے دیئے تو میں کامل کے ساتھ نکل جاؤں گا۔" اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تو وڈا زمیں دار ہے' میری اتنی مدد کر سکتا ہے۔ میرا بھی پولیس سے پنڈ چھوٹ جائے گا اور تیں نوں بھی آگے خطرہ نہیں رہے گا۔" اس نے دبی زبان سے رحیم داد کو خبردار کیا۔ "تیں نوں پتہ ہے' پولیس نے پکڑ لیا تو مار مار کر تیرے بارے میں سب کچھ اگلوا لے گی۔"

رحیم داد نے چونک کر دارا کو دیکھا۔ وہ دیکھنے میں جتنا سادہ لوح نظر آتا تھا' اتنا تھا نہیں۔ اندر سے گھاگ نکلا۔ وہ رحیم داد کو بلیک میل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ رحیم داد نے صورت حال کی نزاکت محسوس کی۔ دارا اس کے لیے اتنا سنگین خطرہ بن گیا تھا کہ سرکاری گواہ بن کر اسے پھانسی کے پھندے پر لٹکوا سکتا تھا۔ مگر رحیم داد نے دارا پر کمزوری ظاہر نہیں ہونے دی' تیوری پر بل ڈال کر

تیکھے لہجے میں بولا۔ ”مجھے کوئی خطرہ شطرہ نہیں۔ اپنے دل سے یہ خیال نکال دے۔ خالی تیرے بیان دینے سے کیا ہوتا ہے۔ تیرے سوا ڈھولہ امیر خاں میں کسی اور نے مجھے نہیں دیکھا۔ ایک بیگماں ہی تھی، وہ بھی اب نہیں رہی۔ اللہ داد بھی مجھے پہچان نہیں سکا۔ میں اس کے سامنے منہ پر منڈاسا باندھے ہوئے تھا۔ تیری اکیلی گواہی سے کیا بنتا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ دارا نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ”ویسے بھی تو وڈا زمیں دار ہے۔ پولیسیے تجھ پر آسانی سے ہتھ نہیں ڈال سکتے۔“ اس نے اپنے لہجے میں اور زیادہ نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”پر پولیسیے مجھے تنگ کرسکتے ہیں۔ تجھے بھی کچھ نہ کچھ پریشانی ہو سکتی ہے۔“

”تو میری فکر نہ کر۔“ رحیم داد نے اپنے رویے سے خوف کی پردہ پوشی کی۔ چند لمحے خاموش کھڑا سوچتا رہا پھر اس نے اپنے تند و تیز لہجے میں اعتدال پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تو یہ سوچ رہا ہوں، پولیس نے تجھے دوبارہ پکڑ لیا تو زبردست مار لگائے گی۔ تیری جان بھی جا سکتی ہے۔ پہلے تھانے میں تجھ پر جو ظلم کیا گیا، اسے سن کر تو ایسا سوچنا غلط نہیں۔“

دارا ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ ”تو نے ٹھیک ہی کہا۔ اس بار تو پولیسیے مجھے جان سے مار دیں گے۔“ اس نے جھک کر رحیم داد کے پیر پکڑ لیے۔ ”تو میری اتنی مدد کردے کہ میں کامل کے ساتھ ادھر سے نکل کر بحرین چلا جاؤں۔ تیرا بہت احسان ہوگا۔ زندگی بھر دعائیں دوں گا۔“

”سیدھا کھڑا ہو۔“ رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔

دارا اٹھا اور نظریں جھکا کر رحیم داد کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے جان بوجھ کر اللہ وسایا کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ ملزموں کی مانند سہمے ہوئے دارا کو نظر بھر کے دیکھا اور بھاری بھرکم لہجے میں بولا۔ ”دارا تو پریشان نہ ہو۔ تو نے بھی میری مدد کی ہے۔ میں اسے بھولا نہیں ہوں۔“ دارا نے نگاہیں اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا مگر زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ رحیم داد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”فکر نہ کر۔ میں تیری ضرور مدد کروں گا۔ تو کل سورج ڈوبنے کے بعد اسی جگہ پہنچ جانا۔ میرے پاس پنڈ میں آنے کی ہرگز کوشش نہ کرنا۔ میں تیرے پاس خود ہی پہنچ جاؤں گا۔ دیر ہو جائے تو انتظار کرلینا۔ میں ضرور آؤں گا۔“

”جیسا تو نے کہا ہے، ویسا ہی کروں گا۔ تیری بہت بہت مہربانی۔“

”اب تو ٹر جا۔ میں کل شام تجھ سے یہیں ملوں گا۔“

دارا خاموشی سے چلا گیا۔ رحیم داد کھجور کے درخت تلے چپ کھڑا، اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ اندھیرے میں گم ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو رحیم داد مڑا اور گاؤں کی سمت بڑھنے لگا۔ اندھیرا بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ مہمان خانے میں پہنچا تو پہر رات گزر چکی تھی۔ رحیم داد کو دیر تک نیند نہیں آئی۔ آدھی رات سے بارش شروع ہوگئی مگر صبح مطلع صاف تھا۔ سورج چمک رہا تھا۔ بھیگے ہوئے درختوں اور ہرے بھرے پودوں پر سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔

رحیم داد کمرے سے باہر نکلا۔ تمام وقت دارا کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے دیوار پر کھونٹی سے لٹکی ہوئی بندوق کی جانب نظریں اٹھا کر کئی بار دیکھا اور ہر بار سوچا کہ شام کو جب دارا نہر کے کنارے ملے تو اسے اندھیرے میں گولی مار کر ٹھکانے لگا دے۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی اسے خوف زدہ کرتا رہا کہ گولی کی آواز سن کر گاؤں والے اکٹھے ہوسکتے ہیں اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو وہ اکیلا لاش کیسے چھپائے گا اور کہاں چھپائے گا؟ لاش سارا بھانڈا پھوڑ سکتی تھی۔ پولیس آتی، تفتیش ہوتی، اللہ وسایا کو خبر پہنچتی۔ وہ لاش دیکھتے ہی دارا کو پہچان لیتا اور فوراً سمجھ جاتا کہ اسے کس نے اور کیوں قتل کیا؟ اللہ وسایا اس کے لیے دارا سے کم خطرناک نہیں تھا۔ وہ بیگماں اور مولا داد کے کتل کے بارے میں دارا کی زبانی پہلے ہی بہت کچھ سن چکا تھا۔

کیا وہ اللہ وسایا کو بھی قتل کردے؟ لیکن وہ کتنے قتل کرے گا؟ خود کو بچانے کے لیے کس کس کی جان لے گا؟ بیگماں کو اسی پردہ پوشی کی کوشش میں مولا داد کے ہاتھوں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مولا داد کا قتل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ بیگماں اس کی اکلوتی بہن تھی، اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی۔ اس کا شوہر مولا داد بھی باپ کی خفگی کے باوجود اس سے محبت اور خلوص سے ملتا۔ حالات نے اسے ایسے خطرناک راستے پر ڈال دیا کہ وہ اتنی چاہنے والی بہن کے قتل کا سبب بنا۔ بیگماں کی یاد کے ساتھ سینے میں دھواں سا اٹھا اور آنکھوں میں آنسو بن کر منڈلانے لگا۔ وہ منہ بسور کر رونے لگا۔

دن ڈھلے تک وہ شدید الجھن میں رہا، کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔ اسے دارا کے ساتھ ساتھ اللہ وسایا کے بارے میں بھی فیصلہ کرنا تھا۔ اور جلد سے جلد کرنا تھا۔ وہ دارا کو پانچ سو روپے دے کر بحرین جانے میں مدد دے سکتا تھا۔ اس طرح اس کی طرف سے جو خطرہ تھا، خود بخود ٹل جاتا۔ مگر اللہ وسایا بھی اس کے سر پر تلوار بن کر لٹک رہا تھا۔ بہت غور و فکر کے بعد رحیم داد نے طے کیا کہ اس معاملے میں احسان شاہ سے رجوع کرنا چاہیے۔ وہ ان خطرات سے نمٹنے میں اس کی رہنمائی کرسکتا ہے۔

سورج غروب ہونے سے پہلے اس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ دھوپ، شام کے پھیلتے اور بڑھتے دھندلکے میں تحلیل ہو کر ختم ہوگئی۔ رحیم داد نے گھوڑی نکالی اور نہر کی جانب روانہ ہوگیا۔

اس نے دارا کو دور ہی سے دیکھ کر پہچان لیا۔ وہ کھجور کے درخت تلے سائے کی مانند نظر آرہا تھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ بارش سے نہر کی سطح بلند ہو گئی تھی۔ پانی گنگناتا ہوا تیزی سے بہہ رہا تھا۔

رحیم داد نے قریب پہنچ کر کہا۔ "تو آگیا؟"

"کیسے نہ آتا، تو نے بلایا جو تھا۔" دارا نے مستعدی سے جواب دیا۔

رحیم داد گھوڑی سے نیچے نہیں اترا۔ اس نے گھوڑی پر بیٹھے بیٹھے طے کیا کہ دارا کو بھی پیراں والہ لے جانا چاہیے۔ اس نے دارا سے کہا۔ "آ، میرے پیچھے گھوڑی پر بیٹھ جا۔"

دارا اس کے ہاتھ کا سہارا لے کر گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ رحیم داد نے گھوڑی کو ایڑ لگائی، وہ آگے بڑھی۔

دارا حیرت زدہ تھا۔ "مجھے کہاں لے جا رہا ہے؟" اس نے بے چینی کا اظہار کیا۔

"تو نے پیراں والہ دیکھا ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"نہیں جی! میں ادھر کبھی نہیں گیا۔" دارا نے جواب دیا۔ "میں نے اسے نہیں دیکھا۔"

"آج دیکھ لینا۔"

"ادھر جا کر کیا لینا ہے؟" دارا ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

"تیں نوں بحرین جانا ہے کہ نہیں؟" رحیم داد نے اسے جھڑک دیا۔

دارا سہم کر رہ گیا۔ رحیم داد گھوڑی سنبھال سنبھال کر دوڑاتا رہا۔ بارش سے کچے راستے پر جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ اندھیرا بھی تھا۔ رحیم داد گھوڑی پر چوکس بیٹھا تھا۔ دارا دم بخود تھا۔ مگر رحیم داد کسی قدر پریشان تھا۔ وہ دارا کے ہم راہ پیراں والہ جا تو رہا تھا مگر کچھ دور جانے کے بعد اس کے ذہن میں یہ خدشہ بھی پیدا ہوا کہ دارا نے اگر اللہ وسایا کی طرح احسان شاہ یا اس کے کسی ملازم کو بھی بیگماں اور مولاداد کی ہلاکت کے بارے میں بتا دیا تو اس کے لیے نئی الجھن پیدا ہو جائے گی۔ وہ احسان شاہ کو بھی اس معاملے میں اعتماد میں لینا نہیں چاہتا تھا۔

رحیم داد نے دارا کو تنبیہہ کی۔ "تجھے پیراں والہ لے تو جا رہا ہوں پر وہاں بیگماں اور مولاداد کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا۔ اپنے بارے میں بھی کچھ نہ بتانا۔ ہر ایک سے یہی کہنا، تو میرا پرانا نوکر رہ چکا ہے۔ بیچ میں کسی اور زمیں دار کی نوکری کر لی تھی، اب میرے پاس واپس آگیا ہے۔ میری بات سن رہا ہے نا؟"

"بالکل سن رہا ہوں جی!" دارا نے اونچی آواز میں کہا۔ "جیسا تو کہہ رہا ہے، ویسا ہی کروں گا۔ کسی کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تو بالکل فکر نہ کر۔ میں نے ایسی باتیں بتا کر اپنے تئیں مصیبت میں نہیں ڈالنا۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تیرے لیے تو اب یہی ٹھیک ہے، کسی کو بھی اپنے بارے میں کچھ نہ بتا۔ جلد سے جلد پاکستان سے نکل کر بحرین پہنچ جا۔ کراچی جا کر اپنا نام بدل لینا بلکہ ابھی سے بدل لے۔"

"میں نے جی، یہ پہلے ہی سوچ رکھا ہے۔ کامل کہتا ہے، بحرین جانے کے لیے کمپنی کی طرف سے وہ کیا ہوتا ہے جی، ہاں یاد آیا، پاسپورٹ بنایا جائے گا۔ اس پر میری تصویر بھی لگے گی۔" دارا رک رک کر بولتا رہا۔ "داڑھی بڑھالوں گا۔ تب تصویر اترا دوں گا۔ ویسے بھی جی میرے لیے یہ ضروری ہے۔ پولیس میری تلاش میں ہے۔"

"تو نے نیا نام کیا سوچا؟ مجھے بتا دے تاکہ پیراں والہ میں تیرا وہی نام بتاؤں۔"

"ہاشم۔ میں نے اور کامل نے یہی نام سوچا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔ تو یہ طے رہا کہ پیراں والہ میں تجھے میں ہاشم کے نام سے پکاروں گا اور سب کو تیرا یہی نام بتاؤں گا۔ یاد رکھنا۔ بھول نہ جانا۔"

"بالکل نہیں بھولوں گا۔ فکر نہ کر۔"

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ رحیم داد گھوڑی بہت احتیاط سے دوڑا رہا تھا۔ ایک موڑ پر کیچڑ میں گھوڑی کا پیر رپٹا، وہ لڑکھڑائی۔ دارا بھی ایک طرف جھکا۔ اس نے رحیم داد کی کمر مضبوطی سے تھام لی اور گرنے سے بال بال بچ گیا۔ رحیم داد نے بھی نہایت ہوشیاری سے گھوڑی کو سنبھال لیا۔ اسے بے قابو نہیں ہونے دیا۔ زیادہ محتاط ہو کر گھوڑی دوڑانے لگا۔

وہ دارا کے ہم راہ پیراں والہ پہنچا تو رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ شیدے نے دونوں کو دیوان خانے میں پہنچا دیا۔ رحیم داد نے برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے احسان شاہ کے بارے میں دریافت کیا۔

"شاہ جی کدھر ہے؟"

"وہ تو جی حویلی میں ہے۔" شیدا نے جواب دیا۔ "میں اسے تیرے آنے کی اطلاع کیے دیتا ہوں۔ تو آرام نال بیٹھ۔"

وہ جانے کے لیے مڑا۔ رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ "گل سن شیدے۔" اس نے قریب کھڑے ہوئے دارا کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میرا نوکر ہاشم ہے۔ اسے بھی یہیں ٹھہرنا ہے۔ اسے روٹی کھلا دے۔"

شیدا نے دارا کو مخاطب کیا۔ "ہاشم! ادھر آ میرے ساتھ۔" دارا اس کے ساتھ چپ چاپ

برآمدے سے چلا گیا۔

رحیم داد کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد احسان شاہ آگیا اور کرسی کھسکا کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”معاف کرنا چوہدری، میں روٹی کھا رہا تھا۔“

”آج اتنی جلدی روٹی کھالی؟“ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

احسان شاہ نے بے تکلفی سے ہنس کر کہا۔ ”آج سورج ڈوبنے سے پہلے ہی پینے پلانے کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ دو پرانے یار آگئے تھے۔ موسم بھی سہانا ہے۔ میں نے خاصی لگالی ہے۔ ویسے آج رات اوکاڑے بھی جانا ہے۔“

”تیں نوں اوکاڑے جانا ہے تب تو میں نوں چلنا چاہیے۔“ رحیم داد نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ ”میں کل شام تیرے پاس آنے کی کوشش کروں گا۔“ اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ”پر یہ بھی تو پتہ نہیں، تو کب تک لوٹے گا۔“ اس نے قدرے تامل کیا، مسکرا کر پوچھا۔ ”تو کل واپس آجائے گا نا؟“

”کل تو نہیں، پرسوں شام تک ضرور آجاؤں گا۔ پر تو اتنی جلدی واپس کیوں جانا چاہتا ہے؟ اب تو آہی گیا ہے میں گھنٹے سوا گھنٹے بعد چلا جاؤں گا۔ ایسی جلدی بھی نہیں۔ اوکاڑہ دور ہی کتنا ہے۔ بارش کی وجہ سے سڑکیں خراب ہو رہی ہیں۔ ورنہ کار سے لگ بھگ گھنٹے بھر کا سفر بنتا ہے۔“ احسان علی شاہ نے مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”میں تو روٹی کھا چکا پر تو نے ابھی تک نہیں کھائی ہوگی۔ تھوڑی سی وہسکی لگالے۔ ساری تھکن دور ہوجائے گی۔ ایک دم تازہ اور چاک چوبند ہوجائے گا۔“

رحیم داد نے انکار کردیا۔ ”میں کچھ لگاؤں گا نہیں۔ روٹی بھی بعد میں کھاؤں گا۔ آج تو میں تجھ سے بہت ضروری گل بات کرنے آیا ہوں۔“

”اللہ وسایا نے کچھ زیادہ گڑبڑ شروع کردی؟“

”ہاں۔“ رحیم داد نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”تو نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ اس کی نیت میں برائی لگتی ہے۔“

”میں نے تجھے غلط نہیں بتایا تھا۔ میرا منیجر غلط اطلاع دے ہی نہیں سکتا۔ وہ بہت ہوشیار بندہ ہے، وفادار بھی ہے۔“ احسان شاہ گردن اونچی کرکے بول رہا تھا۔ ”یہ بتا نئی گل کیا ہوئی؟“

”میں نے درخواست کے بارے میں پوچھا تو اس نے پہلے کی طرح اس بار بھی گول مول جواب دیا۔ کچھ بتانے کی بجائے آنکھیں نکال کر بولا۔ تو بار بار درخواست کے بارے میں کیوں پوچھتا ہے؟

ساتھ ہی اس نے ایسی باتیں شروع کردیں جن سے لگتا ہے، وہ مجھے ڈرانا دھمکانا چاہتا ہے۔ کسی کیس میں پھنسانا چاہتا ہے۔“

”اس کے ان ارادوں کے بارے میں مجھے بہت پہلے اندازہ ہوگیا تھا۔ تجھ سے بتا بھی چکا ہوں۔“ احسان شاہ نے لہجے میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھ، اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ فی الحال تو اس نے حویلی اور زمین اپنے کبضے میں لینے کا چکر چلایا ہے۔“ اس نے گہری نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”مجھے تو ایسا نظر آرہا ہے، وہ حویلی اور زمین لینے کے بعد تیرا پورا کلیم ہی ہتھیانے کی کوشش کرے گا۔ جس طرح اس نے پہلے دستاویزوں پر دستخط لگوالیے، کسی نئے بہانے سے ایسے سٹامپ پیپر بھی دستخط لگوالے گا کہ تو اپنے کلیم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ ایک روز اچانک پتہ چلے گا تو اپنا کلیم اللہ وسایا کے ہاتھ کب کا بیچ چکا ہے۔“

رحیم داد نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔ ”کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا؟ اس نے دس مربعے زمین پر دوبارہ جو کبضہ کیا ہے، وہ جمیلہ کے نام سے کلیم خرید کر ہی تو کیا ہے نا؟ تجھے تو ٹھیک طرح پتہ ہے۔ تیرے سامنے ہی تو کلیم کا سودا ہوا تھا۔ فرک صرف اتنا ہوگا کہ تیرے کلیم کا سودا بھی ہوجائے گا، اللہ وسایا کے نام منتقل بھی ہوجائے گا اور تجھے پتہ بھی نہ چلے گا۔ کاغذات اور دستاویزات میں جعل سازی اسی طرح ہوتی ہے۔ اللہ وسایا تو وکیل کے مشورے پر ہر کام پکا کر رہا ہے۔ سچی بات یہ ہے، وہ تجھے اپنے جال میں پوری طرح جکڑ چکا ہے۔“

رحیم داد نے بے بسی سے کہا۔ ”صاف گل ایہہ جی! میرے ساتھ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اپنا تو بالکل مغز کام نہیں کرتا۔“ اس کے چہرے پر پریشانی برسنے لگی۔

”میں نے تو تجھے پہلے ہی کہا تھا پر تو نے میری بات مانی ہی کب۔“

”تیرا مطلب ہے، اللہ وسایا کو ختم کردیا جائے؟“ رحیم داد ہچکچاتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔

”بالکل یہی مطلب ہے۔ اس کے سوا اللہ وسایا کے پھیلائے ہوئے جال سے بچنے کا تیرے سامنے اور کوئی راستہ نہیں۔“

”پر یہ کام میں کیسے کر سکتا ہوں۔“ رحیم داد نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں نے تو پہلے کبھی ایسا نہیں کیا۔ ویسے بھی سارے نوکر اور مزارعے اللہ وسایا کے بندے ہیں۔ میرا تو پنڈ میں کوئی بھی نہیں ہے۔“

"میں تو ہوں۔ تو کیوں فکر کرتا ہے؟" احسان شاہ نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "ایک بار تجھ سے یاری کرلی تو پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ ہر مشکل میں تیرا پورا ساتھ دوں گا۔ آگے تجھے خود پتہ چل جائے گا۔"

"یہ کام تو خود کرے گا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"نہیں۔" احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ "ایسے کاموں کے لیے میرے پاس کئی بندے ہیں۔" وہ لمحے بھر خاموش رہا۔ "اللہ وسایا پر تو میں دینے کو لگا دوں گا۔ وہ بہت ہوشیار اور زور آور ہے۔ تو ڈرتا ہے تو میں خود بھی موجود رہوں گا۔ تیری یاری میں ایسا بھی کرلوں گا۔"

احسان شاہ کی بات سن کر رحیم داد کو فوراً دارا یاد آگیا۔ اللہ وسایا کے قتل میں اسے بھی شریک کیا جاسکتا ہے۔ رحیم داد نے اس کے بارے میں اس پہلو سے بھی غور کیا تھا اور اسی مقصد سے وہ اسے اپنے ہم راہ پیراں والہ لایا بھی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اللہ وسایا کے قتل میں دارا ملوث ہوجائے گا تو وہ بیگماں اور مولاداد کے قتل کی بنیاد پر اسے خوف زدہ اور بلیک میل نہیں کرسکے گا۔ پولیس سے بچنے کے لیے سیدھا بحرین جانے کی کوشش کرے گا۔ قاتل بننے کے بعد وہ اس کے لیے اتنا بڑا خطرہ نہیں رہے گا۔ رحیم داد کو دارا اور اللہ وسایا دونوں سے شدید خطرہ تھا۔ وہ دونوں ہی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دارا کے ہاتھوں اللہ وسایا کا قتل نہایت کارگر حربہ تھا۔ مگر دارا سے ایسا خطرناک کام لینے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ احسان شاہ کے مشورے کے بغیر ایسا کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ ایسے کاموں کے لیے احسان شاہ نہایت تجربہ کار اور پرانا گھاگ ہے۔ اللہ وسایا کے قتل کے لیے اسی نے رحیم داد کو اکسایا بھی تھا۔

رحیم داد کو گہری سوچ میں دیکھ کر احسان شاہ نے پوچھا۔ "چوہدری! تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"میں سوچ رہا تھا جی' میرے پاس بھی ایک ایسا ہی بندہ ہے۔" رحیم داد نے کھل کر بات کرنے کی کوشش کی۔ "پہلے وہ میرا نوکر ہوتا تھا۔ برسوں میرے پاس رہا۔ سال سوا سال سے اس نے ایک اور زمیں دار کی نوکری کرلی تھی۔ اب وہ کوئی سنگین جرم کرکے آیا ہے اور میرے ہی پاس چھپا ہوا ہے۔ وہ اپنے کسی یار کے ساتھ بحرین کی طرف نکل جانا چاہتا ہے۔ وہ اس کے لیے مجھ سے ۵ سو روپے مانگ رہا ہے۔ اس کا نام ہاشم ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لایا ہوں۔"

"یہ تو نے چنگا کام کیا کہ اسے ادھر لے آیا۔ وہ تو بہت کام کا بندہ ہے۔" احسان شاہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "سچ پوچھ تو سنگین واردات کرانے کے لیے ایسے ہی بندوں کو استعمال کرنا چاہیے۔ تو نے

ٹھیک ہی سوچا' اسے دینے کے ساتھ لگا دوں گا۔ وہ اللہ وسایا کو ٹھکانے لگا دے گا۔"

احسان شاہ نے شیدا کو بلایا۔ وہ آیا تو احسان شاہ نے حکم دیا۔ "دینا ابھی سویا تو نہیں ہوگا۔ سو بھی گیا ہو تو اسے جگا کر لے آ۔" شیدا چلا گیا۔

احسان شاہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "چوہدری! تو اس کی فکر نہ کر' اللہ وسایا کو کس طرح صاف کیا جائے؟ کیسے اس کا کتل ہوگا؟ یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے ٹھٹکا۔ "تو نے وہ بیلا تو آتے جاتے ہوئے دیکھا ہوگا جو نہر کی پلی سے آگے پنڈ کی طرف مڑتے ہوئے رستے میں پڑتا ہے۔"

رحیم داد کو وہ مختصر جنگل یاد آگیا جس کے درمیان سے ایک راستہ پیراں والہ کو جاتا تھا۔ وہ اس راستے سے کئی بار گزرا بھی تھا۔ اس نے احسان شاہ سے کہا۔ "بیلا میں نے دیکھا تو ہے۔"

"تیرا کام صرف اتنا ہے' کسی طرح اللہ وسایا کو شام کا اندھیرا ہونے کے بعد ادھر اپنے ساتھ لے کر آجا۔ آگے کی مجھ پر چھوڑ دے۔ تو فوراً واپس چلا جانا تاکہ تجھ پر شبہ نہ ہو۔ ویسے بھی تو ایسے کام کے لیے کچا ہے۔ اللہ وسایا کا خون ہوتے دیکھ کر نہ جانے تیرا کیا حال بنے۔ تجھے تو جائے واردات پر موجود ہونا ہی نہیں چاہیے۔"

"میں اسے ادھر کسی نہ کسی بہانے لے تو آؤں گا پر تجھے اطلاع کیسے پہنچاؤں گا۔ میرے پاس تو ایسا کوئی بندہ نہیں۔ ہاشم اب ادھر ہی تیرے پاس رہے گا۔ ویسے میں اب اسے اپنے ساتھ رکھنا بھی نہیں چاہتا۔"

احسان شاہ نے دریافت کیا۔ "یہ بتا' اللہ وسایا کہاں ہے؟"

"وہ وکیل کے پاس شہر گیا ہے۔"

"تب تو اس کی واپسی کے فوراً بعد یہ کام ہونا چاہیے۔" احسان شاہ کے لہجے میں تشویش تھی۔ "اس بار وہ کام پکا کرکے لوٹے گا۔ تجھے بے دخل کرنے کی کوشش کرے گا یا کوئی نیا چکر چلائے گا؟"

"تو نے اس کا جواب نہیں دیا' میں اللہ وسایا کو بیلے میں لے آیا تو تجھے کیسے پتہ چلے گا؟"

"اللہ وسایا دو تین روز سے پہلے تو نہیں لوٹے گا' اس لیے تو اسے جلدی نہیں لاسکے گا۔ کل تو دینا بیلے میں جاکر دیکھے گا' کس جگہ اور کہاں گھات لگا کر بیٹھا جائے؟ پرسوں سے میں اس کی ڈیوٹی لگا دوں گا۔ وہ ہر شام اندھیرا ہوتے ہی اپنے بندوں کے ساتھ ادھر موجود رہے گا اور اللہ وسایا کا انتظار کرے گا۔ تو جب بھی آئے گا' دینے کو بیلے میں پائے گا۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" رحیم داد نے اتفاق کیا۔

احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ ”اطمینان رکھ‘ اللہ وسایا کا کانٹا جلد ہی نکل جائے گا۔ پر جمیلہ ہاتھ سے نہ نکلنے پائے۔ نرمی اور پیار سے اسے جلد سے جلد کابو کرنے کی کوشش کرنا۔“ اس نے بدمعاشی سے آنکھ دبائی۔ ”جمیلہ ایسی سوہنی اور پھڑک دار رن مل گئی تو زندگی کا لطف آجائے گا۔ تو ابھی سے اسے اپنی گھر والی کے روپ میں دیکھنا شروع کردے۔“ وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ ”جمیلہ کے ساتھ اس کے دس مربعے بھی تو تجھے دہیج میں ملیں گے۔“ رحیم داد مسکرا کر رہ گیا۔

شیدا آگیا۔ اس کے ساتھ دینا بھی تھ۔ اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کچی نیند سے بیدار ہوا ہے۔ مگر احسان شاہ پر نظر پڑتے ہی مستعدی سے ایک طرف سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

احسان شاہ نے دینا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری! یہ رہا دینا۔“ وہ دینا کی طرف متوجہ ہوا۔ ”دینے! کل بیلے میں جاکر موکع شوکع دیکھ لینا۔ تجھے ادھر کاروائی کرنی ہے۔ کیسے کرنی ہے اور کیا کرنی ہے‘ یہ میں اوکاڑے سے واپسی پر بتاؤں گا۔“

”اسے ہاشم سے بھی ملانا ہے۔“ رحیم داد نے احسان شاہ کو یاد دلایا۔

”سویرے ملا دینا! جی چاہے تو ابھی ملا دے۔“

”سویرے ہی ملا دوں گا۔“

”جیسے تیری مرضی۔“ احسان شاہ نے شیدا کی جانب دیکھا۔ ”شیدے! تو چوہدری کے لیے روٹی ٹکر کا بندوبست کر دینا۔“ اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چوہدری! تجھے اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف شیدے کو بتا دینا۔ آرام سے رات بسر کرنا۔“ وہ مسکرایا۔ مڑ کر شیدا اور دینا پر نظر ڈالی۔ ”اب تم دونوں جاؤ۔“

دونوں خاموشی سے چلے گئے۔

رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔ ”شاہ جی! ایک گل اور ہے۔“

”کیا؟ وہ بھی بتا دے۔ صاف صاف بات کر۔“

”میں سوچ رہا تھا‘ آگے کیا ہو گا۔“ رحیم داد نے کھل کر کہا۔ ”پولیس بعد میں تفتیش کو آئے گی۔ مجھ سے بھی پوچھ تاچھ کرے گی۔ میں نوں ڈر لگتا ہے‘ جانے کیا بات زبان سے نکل جائے۔“

”میں نوں پتہ ہے‘ تو بہت کچا ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ ہنسنے لگا۔ ”پروا نہ کر‘ کوئی پولسیا تیرے پاس تفتیش کے لیے نہیں آئے گا۔ ادھر کا تھانیدار اپنا بندہ ہے۔ سب کام ٹھیک ٹھاک ہو گا۔ تو اطمینان رکھ۔ میں کبھی کچا کام نہیں کرتا۔“ اس نے پہلو بدلا۔ ”اب تو روٹی کھا‘ آرام سے سو۔ برسات کی بھیگی رات ہے۔ اکیلے کیسے سوئے گا۔ کسی رن کو بلا لینا۔ شیدا پہنچا دے گا۔“ احسان شاہ کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ احسان شاہ کے ساتھ ساتھ دیوان خانے کے دروازے تک گیا۔

احسان شاہ کو رخصت کرنے کے بعد رحیم داد نے کھانا کھایا۔

☆

کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ پلنگ پر صاف ستھرا بستر لگا تھا۔ باغ میں کھلنے والی کھڑکی سے بھیگے بھیگے جھونکے آرہے تھے۔ شیدا دہلیز پر چند لمحے خاموش کھڑا رہا پھر اس نے پوچھا۔ ”اور کوئی حکم جی؟“ رحیم داد اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ مگر اس نے کوئی فرمائش نہیں کی۔ وہ اکیلا ہی سونا چاہتا تھا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ وہ اللہ وسایا اور دارا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے شیدا کی حوصلہ افزائی نہیں کی‘ بے نیازی سے بولا۔ ”نہیں‘ میں نوں اب کچھ نہیں چاہیے۔ اب صرف سونا ہے۔“ شیدا مڑا اور برآمدے کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ رحیم داد بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

سویرے ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے دارا کو بلوایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ شیدا کے ہم راہ آیا۔ شیدا چلا گیا تو رحیم داد نے کہا۔ ”دروازہ بند کر دے۔“ دارا نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ رحیم داد کرسی پر بیٹھا تھا۔ دارا اس کے روبرو فرش پر بیٹھ گیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ ”رات آرام نال سویا؟“

”بہت آرام نال سویا‘ روٹی بھی چنگی کھانے کو ملی۔ شاہ جی تو بہت وڈا زمین دار ہے۔ بہت شان ہے اس کی۔ حویلی بھی بہت شان دار ہے۔ نوکروں چاکروں کی پوری پلٹن موجود ہے۔ پر جی اس کے نام سے سب کی جان نکلتی ہے۔ بہت رعب ہے اس کا۔“

”تو نے اپنے بارے میں کچھ بتایا تو نہیں؟“

”وہی بتایا جو تو نے کہا تھا۔“ دارا نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”شیدے اور دوسرے نوکروں کو یہی پتہ ہے‘ میرا نام ہاشم ہے اور میں تیرا پرانا نوکر ہوں۔“

رحیم داد نے دارا کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ لمحے بھر تک گھورتا رہا۔ ”تو زمیں دار اللہ وسایا سے بھی ملا تھا؟“

دارا کچھ نہ بولا۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ چھا گئی۔

رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔ ”چپ کیوں ہے؟ صاف صاف بتا؟“

”ملا تو تھا۔“ اس کی آواز میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ تھی۔ ”میں نوں تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔“

”تو نے اپنے اور میرے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا‘ یہ ٹھیک ہے نا؟“ رحیم داد کی تیوری پر

بل پڑ گئے۔

“میں تو جی اسے کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو تجھے ڈھونڈتا ہوا پنڈ میں گیا تھا۔” دارا نے گڑگڑا کر کہا۔ “اس نے ایسے الٹے سیدھے سوال کیے کہ میں تو جی چکرا گیا۔ ویسے اس نے یہ بھی کہا تھا، وہ تجھے اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ تب میں نے اسے بتایا، ڈھولہ امیر خاں میں میرے گھر کے اندر بیگماں اور مولا داد کا کیسے خون ہوا۔”

“تو نے اور کس کس سے یہ باتیں میرے بارے میں بتائیں؟”

“اور کسی سے بھی ایسی گل بات نہیں ہوئی۔ میں تجھ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔” دارا نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

“غلط مت بول۔ کامل سے بھی تو نے ایسی ہی باتیں کی ہیں، تو نے مجھے خود بتایا تھا۔” رحیم داد کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ “اب کہتا ہے، میں نے اور کسی کو ایسی باتیں نہیں بتائیں۔”

“میں نے غلط نہیں کہا۔” دارا نے عاجزی سے کہا۔ “میری کامل سے جب تیرے بارے میں گل بات ہوئی تب تک تو مجھے تیرا نام بھی ملوم نہیں تھا۔ یہ بھی پتہ نہ تھا تو چوہدری ہے یا میاں، جاٹ ہے یا آرائیں۔” وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے حلق تر کرنے کی کوشش کی۔ “زمیں دار اللہ وسایا سے ملنے کے بعد میری کامل سے تیرے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔” اس نے مغرب کی سمت مڑ کر دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ “رب دی سونہہ، ان دو کے سوا تیرے بارے میں کسی سے بھی میں نے کچھ نہیں بتایا۔”

“پر اللہ وسایا سے تو نے سب کچھ بتا دیا۔”

“ہاں جی، یہ غلطی ہو گئی۔” اس نے جھک کر رحیم داد کے پیر پکڑ لیے۔ “معافی دے دے، اب ایسی غلطی کبھی نہیں ہو گی۔”

“سیدھا بیٹھ۔” رحیم داد نے اسے ڈانٹا۔ دارا نے اس کے پیر چھوڑ دیے اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ بہت ڈرا سہا دکھائی دے رہا تھا۔ رحیم داد گردن جھکائے سوچتا رہا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ رحیم داد نے گہری سانس بھری، گردن اٹھا کر دارا کو دیکھا۔ “تو نے اللہ وسایا کو میرے بارے میں بتا کر بہت خطرناک کام کیا۔ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ مجھے کوئی بھائی شائی نہیں سمجھتا۔ میری اس کے ساتھ سخت لگتی ہے۔ حویلی میری ہے۔ میرے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ وہ اس میں پہلے سے رہتا تھا۔ وہ اسے خالی نہیں کرنا چاہتا۔ تیں نوں کیہ پتہ، میرا اس کے ساتھ کیسا زبردست جھگڑا چل رہا ہے۔”

“تب تو جی، مجھ سے سخت غلطی ہو گئی۔” دارا نے تاسف سے کہا۔ “اب تو غلطی ہو گئی ہے، میں کیا کر سکتا ہوں۔”

“جو غلطی ہو ہی گئی، اسے ٹھیک بھی کیا جا سکتا ہے۔”

“کیسے جی؟” دارا نے حیرت سے منہ پھاڑا۔

“اللہ وسایا میرے ہی لیے نہیں، تیرے لیے بھی خطرناک بن گیا ہے۔ وہ پولیس سے مخبری کر کے دونوں کو پکڑوا سکتا ہے۔” رحیم داد نے اسے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی۔ “اب تو ایک ہی رستہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ وسایا کو کتل کر کے خطرہ ہی مٹا دیا جائے۔”

“پر اسے کیسے کتل کیا جا سکتا ہے۔ اسے کون کتل کرے گا؟”

“تیں نوں اسے کتل کرنا ہو گا۔” رحیم داد نے لہجے میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔ “تو نے غلطی کی ہے، اب تو ہی اسے مٹا بھی سکتا ہے۔”

“میں نے تو جی ایسا کام کبھی نہیں کیا۔” دارا کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ “ویسے میں اکیلا اسے کیسے کتل کر سکتا ہوں۔ وہ تو مجھ سے بہت تگڑا اور زور آور ہے۔”

“فکر نہ کر، تو اکیلا نہیں ہو گا۔” رحیم داد نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ “تیرے ساتھ دینا ہو گا۔ اور بھی کئی بندے ہوں گے۔”

“تو جی یہ کام تو انھی سے کیوں نہیں کرا لیتا؟” دارا نے ہاتھ جوڑ دیے۔ “مجھ سے یہ کام نہیں ہو گا۔”

“تجھے بحرین جانا ہے یا نہیں؟”

“جانا تو ہے اور ضرور جانا ہے۔ نہ گیا تو پولیس پکڑ کر اس دفعہ بالکل میری چمڑی ادھیڑ ڈالے گی۔ پتہ نہیں، کیا کیا ظلم کرے۔” دارا کا چہرہ خوف اور دہشت سے مٹیالا پڑ گیا۔

“حوصلے سے کام لے۔ تو پولیس کے چکر سے بھی بچ جائے گا اور بحرین جا کر کام سے بھی لگ جائے گا۔” رحیم داد نے اسے پھسلایا۔ “تو پنج سو مانگتا ہے، میں تجھے ہزار روپے دوں گا۔”

دارا گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا مگر رحیم داد نے اسے زیادہ دیر سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ “بول کیا کہتا ہے؟”

دارا نے گردن اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ “میں نے کرنا کیا ہو گا؟”

رحیم داد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ “یہ دینا بتائے گا۔ میں تجھے اس سے ملا دوں گا۔ سمجھ لے، اب تو اس کے ساتھ ہی رہے گا۔”

"روپیہ کب ملے گا؟" دارا خوف اور دہشت کے حصار سے کسی قدر نکل چکا تھا۔ ہزار روپے کی چکاچوند نے اسے گھبراہٹ اور پریشانی سے خاصا بے نیاز کر دیا تھا۔

رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔ "واردات کے بعد سیدھا میرے پاس حویلی کے مہمان خانے میں آنا۔ ہزار روپے لینا اور رات کے اندھیرے میں چک ۴۸ پہنچ جانا۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔" رحیم داد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے جی!" دارا کے لہجے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔

"دروازہ کھول اور شیدے کو میرے پاس بلا لا۔"

دارا نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو شیدا اس کے ساتھ تھا۔ رحیم داد اسے دیکھتے ہی بولا۔ "شیدے! جا کر دینے کو ادھر لے آ۔"

تھوڑی دیر بعد شیدا کے ہم راہ دینا آ گیا' ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "کیا حکم ہے جی؟"

رحیم داد نے دارا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہاشم ہے' میرا پرانا نوکر۔ جو کام شاہ جی کل شام تمہیں بتائے گا' اس میں یہ بھی تیرے ساتھ شریک رہے گا۔"

"ٹھیک ہے جی۔" دینا نے مستعدی سے جواب دیا۔

"تو اسے لے جا۔ اب یہ تیرے ساتھ ہی رہے گا۔" رحیم داد نے کہا۔

دینا' دارا اور شیدا کمرے سے چلے گئے۔ رحیم داد بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ سورج چڑھ کر اوپر آ گیا تھا۔ ہر طرف چمکیلی دھوپ پھیلی تھی۔ رحیم داد کمرے سے نکل کر برآمدے میں آیا۔ شیدا اس کا منتظر تھا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ حویلی کے پھاٹک پر پہنچا۔ اس کی گھوڑی تیار کھڑی تھی۔ رحیم داد سوار ہوا اور گھوڑی کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ گیا۔

نہر سے پہلے جنگل تھا۔ جنگل میں شیشم اور سرس کے گنجان درخت تھے۔ جنگل زیادہ وسیع نہیں تھا مگر خوب گھنا تھا۔ جنگل کے درمیان سے ایک راستہ گزرتا تھا۔ رحیم داد نے گھوڑی جنگل کے اندر داخل کی اور اس کی رفتار سست کر دی۔ درختوں کے نیچے خاصا اندھیرا تھا۔ احسان شاہ کی ہدایت کے مطابق اللہ وسایا کو یہیں لانا تھا۔ رحیم داد نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ درختوں میں پرندے چہچہا رہے تھے۔ مگر تنہائی اتنی شدید تھی کہ گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ اس نے گھوڑی کی رفتار تیز کی اور جنگل سے نکل گیا۔ آگے کھلا میدان تھا۔ چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

وہ نہر کے قریب پہنچا۔ آگے پلیا تھی۔ رحیم داد نہر کے کنارے کنارے گھوڑی دوڑاتا کوٹلہ

ہرکشن پہنچ گیا۔ مہمان خانے میں داخل ہوا۔ احمد اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی بولا۔

"آج واپسی میں بہت دیری کر دی۔ بتا کر بھی نہیں جاتا۔"

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اللہ وسایا آ گیا؟"

"نہیں جی' ابھی نہیں آیا۔"

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ تیز دھوپ میں سفر کرنے سے اس کا جسم شرابور ہو رہا تھا۔ وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ نہا دھو کر نکلا تو تازگی اور فرحت محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت وہ دھوتی باندھے ہوئے تھا اور اس کے اوپر صرف بنیان تھی۔ وہ تھکا ہوا سا بستر پر دراز ہو گیا۔

دوپہر کو وہ کھانا کھانے بیٹھا تو دھوپ غائب ہو چکی تھی۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ شام کو بارش قدرے تیز ہو گئی۔ رحیم داد کمرے سے باہر نہ جا سکا۔ رات کا کھانا بھی اس نے کمرے میں کھایا۔ پہر رات گزری تو بارش بند ہو گئی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے لیکن ہوا بند تھی۔ کمرے میں حبس تھا۔ رحیم داد کی ہدایت پر احمد نے پلنگ اٹھا کر صحن میں بچھا دیا۔ اس پر بستر بھی لگا دیا۔

رحیم داد بستر پر نہیں لیٹا۔ تمام دن کمرے میں پڑے رہنے سے اکتا گیا تھا۔ وہ مہمان خانے سے باہر نکلا۔ اس کا ارادہ کچھ دیر چہل قدمی کرنے کا تھا مگر دور تک نہ جا سکا۔ راستوں میں جگہ جگہ بارش کا پانی کھڑا تھا۔ کیچڑ بھی تھی اور ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ واپس مہمان خانے میں آیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ رات گئے تک اسے نیند نہیں آئی۔ وہ خاموش لیٹا اس خطرناک منصوبے کے بارے میں سوچتا رہا جو اللہ وسایا کے قتل کے لیے احسان شاہ نے تیار کیا تھا۔ اس میں اسے اہم کردار ادا کرنا تھا۔

اس کے تصور میں بار بار اللہ وسایا سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کے دو واضح روپ تھے۔ ایک اللہ وسایا وہ تھا' جس نے اسے سہارا دیا تھا' پناہ دی تھی۔ اگر اللہ وسایا پناہ نہ دیتا تو عین ممکن تھا کہ وہ پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا۔ گرفتاری کے بعد اس کے خلاف جیل سے فرار ہونے اور سیف اللہ' حکیم نذر محمد چشتی' چوہدری نور الٰہی اور مولا داد کے قتل کے الزام میں مقدمہ چلتا اور پھانسی کے پھندے پر لٹکا کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ یہ اللہ وسایا' مہربان اور شفیق تھا۔ اس نے نہ صرف اسے سزائے موت سے بچا رکھا تھا بلکہ اپنی کوششوں سے اس کے نام حویلی کے ساتھ ساتھ دس مربعے بھی الاٹ کروائے تھے' اسے بڑا زمیں دار بنا دیا تھا۔ دوسرا اللہ وسایا وہ تھا جو دارا سے ملنے [illegible] نہایت خطرناک بن گیا تھا۔ وہ کسی بھی وقت پولیس سے مخبری کر کے اسے تختہ دار تک

پہنچا سکتا تھا۔ وہ مختلف ہتھکنڈوں سے حویلی اور زمین دوبارہ اپنے قبضے میں کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ رحیم داد ایک بار بڑا زمیں دار بن جانے کے بعد‘ دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اللہ وسایا کے ساتھ جمیلہ بھی تھی۔ اس کی دل کشی اور رعنائی سے وہ پہلے ہی روز سخت متاثر ہوا تھا۔ اسے اپنانے کی خواہش سینے میں کبھی کبھی ہوک بن کر اٹھتی‘ وہ بے قرار ہو جاتا۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ دوراہے پر کھڑا ہے اور یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہے کہ کون سا راستہ اختیار کرے؟ اللہ وسایا کے قتل کا خیال دل سے نکال دے‘ کوٹلہ ہرکشن چھوڑ دے اور رات کے اندھیرے میں چھپتا چھپاتا کسی طرف نکل جائے یا احسان شاہ سے ساز باز کرکے اللہ وسایا کو راستے سے ہٹا دے‘ اس خطرے سے خود کو محفوظ کر لے جو اللہ وسایا کی جانب سے اسے لاحق تھا۔ اپنی زمیں داری برقرار رکھے اور جمیلہ سے نکاح پڑھوا کے اس کے بارہ مربعے بھی اپنے قبضے میں کر لے۔ عیش و آرام سے زندگی بسر کرے؟ یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی مگر صبح ہونے سے پہلے پھر بارش شروع ہو گئی۔ احمد نے اس کا پلنگ اٹھا کر کمرے میں ڈال دیا۔ رحیم داد کچھ دیر بعد سو گیا۔

☆

برسات کی بھیگی‘ بھیگی صبح تھی۔

رحیم داد‘ کمرے سے باہر نکل کر صحن میں گیا۔ احمد موجود نہیں تھا۔ آسمان پر اودی اودی گھٹائیں تھیں۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی۔ بار بار کوئی تیز جھونکا آتا اور سرسراتا ہوا گزر جاتا۔

موسم بڑا سہانا تھا۔ فضا میں فرحت اور شگفتگی رچی ہوئی تھی۔ حویلی کا باورچی خانہ زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ ادھر سے ملی جلی آوازوں کے ساتھ پکوان کی تیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ غسل خانے میں گیا‘ باہر آیا اور کمرے میں پہنچ کر اس نے لباس تبدیل کیا۔ اسے باغ کی جانب سے نسوانی قہقہوں کے ساتھ ساتھ ڈھولک کی تھاپ پر گانے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔

وہ اس کھڑکی پر پہنچا‘ جو باغ کے ایک گوشے میں کھلتی تھی مگر اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ کچھ فاصلے پر آم اور جامن کے اونچے اونچے درخت تھے۔ رحیم داد ذرا ترچھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ درختوں میں جھولے پڑے ہیں۔ گاؤں کی نوجوان مٹیاریں اونچے سروں میں لہک لہک کر گا رہی ہیں۔ ان کی سریلی آوازوں میں جمیلہ کی آواز بھی شامل تھی۔ رحیم داد نے اس کی آواز پہچان لی اور جھک کر دیکھا۔ درختوں کے جھنڈ کے نیچے اسے جمیلہ کی ایک جھلک نظر آئی۔ وہ جھولے پر لمبے لمبے پینگ لے رہی تھی‘ گا رہی تھی اور رک رک کر قہقہے بھی بلند کر رہی تھی۔

بادل ایک بار زور سے گرجے اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ بارش سے بھیگے ہوئے جھونکے کھڑکی کی راہ سے کمرے کے اندر آنے لگے۔ رحیم داد کھڑکی سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد احمد آگیا مگر ناشتے میں صرف لسی کا ایک گلاس لایا۔

رحیم داد نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ”تو سویرے سے اب تک کہاں تھا؟“

وہ دانت نکال کر ہنستے ہوئے بولا۔ ”زمیں دارنی نے آج ساونی منائی ہے۔“ اس نے باورچی خانے کی جانب ہاتھ اٹھایا۔ ”ادھر پکوان پک رہا ہے۔ تو ابھی صرف لسی پی لے ورنہ پکوان کھانے کا مزا نہیں آئے گا۔“

رحیم داد نے لسی کا گھونٹ بھر کر دریافت کیا۔ ”زمیں دار ابھی تک نہیں لوٹا؟“

”نہیں جی! وہ ابھی تک تو آیا نہیں پر زمین دارنی ادھر باغ میں ساونی منا رہی ہے۔ درختوں میں جھولے ڈالے ہیں۔ گانے ہو رہے ہیں۔ آج تو جی زبردست جشن رہے گا۔“

”تو ادھر نہیں گیا؟“ رحیم داد نے مسکرا کر استفسار کیا۔

”میں نوں اتھے جا کر کیہ لینا؟ ادھر تو جی سب زنانیاں ہی ہیں۔“

رحیم داد نے لسی پی کر گلاس خالی کر دیا۔ احمد نے گلاس اٹھایا اور باہر چلا گیا۔

باغ کی سمت سے گانے اور قہقہوں کی آوازیں مسلسل بلند ہو رہی تھیں۔ باورچی خانے سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے ساتھ پکوان کی تیز خوشبو فضا میں بکھرتی جا رہی تھی۔ بارش رفتہ رفتہ تیز ہو گئی۔ اب موٹی موٹی بوندیں گر رہی تھیں۔ ان کی آواز کمرے کی چھت پر صاف سنائی دے رہی تھی۔ بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ بارش بڑھتی جا رہی تھی۔

کہیں قریب ہی زور کے قہقہے بلند ہوئے۔ رحیم داد اٹھ کر ایک بار پھر کھڑکی پر پہنچ گیا۔ اس نے باغ میں جھک کر دیکھا۔ دائیں ہاتھ کو گل چاندنی کی گھنی جھاڑی کے پیچھے جمیلہ دبک کر چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ منہ پر رکھ لیا تھا تاکہ اس کی ہنسی نہ ابھرے۔ مگر اس کے چہرے پر شوخی اور مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ انگ انگ تازہ مچھلی کے مانند پھڑک رہا تھا۔ جھاڑی سے کچھ ہی فاصلے پر درختوں تلے گانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ گانے والیاں اونچے سروں میں بار بار گیت کا یہ بول الاپ رہی تھیں۔

گدھے دے پیریے نی!
تیرے روپ نے پائیاں دھاماں!

گیت کے اس بول کے ذریعے گانے والیاں جمیلہ سے براہ راست مخاطب تھیں۔ ”اے رقص

کرنے والی حسینہ! تیرے حسن اور رعنائی نے دھاک بٹھا دی ہے۔" رحیم داد نے جمیلہ کی جانب دیکھ کر سوچا' گانے والیاں ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ جمیلہ اس وقت گہرا سبز لاچا باندھے ہوئے تھی۔ اس کے اوپر نصف آستینوں کی اودی کرتی تھی۔ گورے گورے سڈول بازوؤں پر ہاتھی دانت کا چوڑا تھا۔ پیروں میں چاندی کی پازیب تھی۔ بالوں میں طلے کا سرخ اور سنہرا پراندہ تھا جس سے اس کی چوٹی کی لمبائی بڑھ گئی تھی اور کمر کے نیچے جھول رہی تھی۔ اوڑھنی بھاگ دوڑ میں کہیں گر گئی تھی۔ رم جھم بارش میں اس کا پورا بدن پانی سے اس طرح شرابور تھا کہ لباس جسم کے ساتھ پیوست ہو گیا تھا۔ اس کے شفاف اور گلابی بدن کے پیچ و خم سنگ مرمر کے ترشے ہوئے مجسمے کے مانند ابھر کر نمایاں ہو گئے تھے۔

رحیم داد نے جمیلہ کو اس عالم میں دیکھا تو تڑپ اٹھا۔ اس نے بے قرار ہو کر سوچا' احسان شاہ ٹھیک ہی کہتا ہے' جمیلہ کو اس کے قبضے میں ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر نہ وہ زمیں دار بن سکتا ہے نہ ہی زمیں داری کا مزا آئے گا۔

رحیم داد نے تصور میں پہلی بار اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے دیکھا۔ اس کی سانس تیز ہو گئی' دل کی دھڑکن بڑھ گئی اور وارفتگی سی طاری ہو گئی۔ وہ مبہوت ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ اس کے نرم اور گداز جسم کی حرارت اور خوشبو اس نے اپنے قریب' بہت قریب پائی۔ یہ لذت اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

مگر جمیلہ اس کی بے قراری اور احساسات سے بے نیاز الھڑ دوشیزہ کی طرح شوخی سے مسکراتی گل چاندنی کے پودوں کے ساتھ چمٹی کھڑی تھی۔ اس کے دل آویز چہرے پر بکھرا ہوا تبسم دم بدم بڑھتا گیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی کی جھنکار سنتے ہی گانے والیاں قہقہے بلند کرتی ہر طرف سے اس کی جانب بڑھیں۔ سب ہی نوجوان' تن درست اور چنچل تھیں اور بارش کے پانی سے شرابور تھیں۔ قریب پہنچ کر وہ ٹھٹھا مار کر ہنسیں۔ انھوں نے بڑھ کر جمیلہ کا بازو پکڑا' اسے آگے کھینچا۔

وہ تلملائی اور شرما کر سر جھکا لیا۔ وہ سب اس کے گرد حلقہ بنا کر پہلے چٹکیاں بجاتی رہیں پھر دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کر تالیاں بجانے لگیں۔ رفتہ رفتہ تالیوں میں ہم آہنگی پیدا ہوتی گئی۔ ساتھ ساتھ ان کے جسم ڈولنے اور گردش کرنے لگے۔ وہ اپنے بازو اور گردن لچکاتی' کمر کو خم دیتی اسے گھیرے میں لے کر رقص کرنے لگیں۔ رقص کرتے کرتے انھوں نے تالیوں کی تھاپ پر ایک گیت چھیڑ دیا۔

گدھا پالے نی
سون کد کد اونْدا!

اس دفعہ بھی' وہ جمیلہ سے مخاطب تھیں اور اسے خاموش پا کر شوخی سے چھیڑ رہی تھیں۔ "سکھی گدھا ناچ لے' ساون روز روز نہیں آتا۔" جمیلہ گیت کے بول سن کر ذرا دیر تو چپ چاپ کھڑی رہی' پھر وہ بھی ہاتھ اٹھا کر تالیاں بجانے لگی۔ اس نے اپنے جسم کو جھٹکے کے ساتھ لہرایا اور تالیوں کے تال پر رقص کرنے لگی۔ مینہ چھما چھم برس رہا تھا۔ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ بادل گرجتے رہے۔ رقص تیز اور تیز ہوتا گیا۔

رحیم داد کھڑکی سے لگا' دم بخود کھڑا تھا۔ اس کی بے تاب نگاہیں جمیلہ پر جمی ہوئی تھیں جس کا ترشا ہوا بدن تیز بارش سے بھیگ کر اور نمایاں ہو گیا تھا۔ وہ نوجوان مٹیاروں کے حلقے میں سب سے زیادہ حسین اور دل کش نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد اسے تیکھی اور بھوکی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس پر محویت طاری تھی۔ یکایک اس نے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کی حرارت محسوس کی۔ چونک کر پلٹا۔ سامنے اللہ وسایا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ رحیم داد نے سراسیمہ ہو کر اسے دیکھا پھر سراسیمگی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ "کب واپس آیا اللہ وسایا؟"

"تھوڑی ہی دیر پہلے لوٹا ہوں۔ سیدھا تیرے پاس چلا آیا۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "تجھے دیر سے کھڑا دیکھ رہا تھا پر تو کھڑکی سے لگا ایسا ہکا بکا کھڑا تھا کہ تجھے پتہ نہ چلا۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "زنانیوں کو ساونی مناتے دیکھ رہا تھا۔"

رحیم داد نے اللہ وسایا کے لہجے میں ہلکا ہلکا طنز محسوس کیا۔ اس نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "اکیلے بیٹھے گھبرا رہا تھا۔ اٹھ کر کھڑکی پر چلا گیا۔"

اللہ وسایا نے کھڑکی سے لگ کر دیکھا۔ باغ میں جمیلہ نوجوان عورتوں کے ساتھ تالیاں بجا رہی تھی' ناچ رہی تھی' گا رہی تھی۔ قہقہے لگا رہی تھی' بارش میں بھیگ رہی تھی۔ ساون کا لطف اٹھا رہی تھی۔ اللہ وسایا نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا اور ہنس کر بولا۔ "جمیلہ کو دیکھ رہا ہے۔ اسے تو ایسے ہی کھیل تماشوں میں مزا آتا ہے۔ کس طرح خوشی خوشی ناچ رہی ہے۔" اس کے چہرے پر یکایک سنجیدگی چھا گئی۔ "مزارعوں کے گھروں کی زنانیاں اور مٹیاریں ہوں' تب بھی ٹھیک ہے۔ پر کمیوں اور لاگیوں کی زنانیوں کے ساتھ ناچتے گاتے' ذرا بھی تو نہیں سوچتی کہ وہ زمیں دارنی ہے۔ اس کی انھی حرکتوں پر آس پاس کے سارے زمیں دار مجھ سے خار کھاتے ہیں۔"

"ویسے برا منانے کی تو گل ہے جی! زمیں دارنی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ کچھ تو زمیں داری کی شان رکھنا چاہیے۔"

“منع کرتا ہوں پر وہ کہاں سنتی ہے۔ ہر بار یہی کہتی ہے، تو زمیں دار ہے تو زمیں داری اور اس کی ٹور اپنے ساتھ رکھ، میں نوں اس سے کچھ نہیں لینا۔ چوہدری! ذرا سوچ یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں اور وہ کوئی الگ تو نہیں ہیں۔”

اللہ وسایا کھڑکی سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد بھی اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ باغ میں شوخ اور چنچل قہقہوں اور تالیوں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ مینہ رم جھم رم جھم برس رہا تھا۔ بادل زور زور سے گرج رہے تھے۔ احمد دو نوکروں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے میز اٹھا کر اللہ وسایا اور رحیم داد کے درمیان رکھی اور اس پر طرح طرح کے پکوان چن دیے۔ ان میں بھلے اور پکوڑے تھے۔ پوریاں تھیں۔ باجرے اور مکئی کی میٹھی روٹیاں تھیں۔ ڈوڈا تھا۔ سوجی کا حلوہ تھا۔ طرح طرح کے ساگ تھے۔ بھاجی تھی۔ اچار، رائتا، چٹنی، سبھی کچھ تھا۔ پکوان چٹ پٹا بھی تھا، نمکین بھی تھا، میٹھا بھی تھا۔ ساونی کی خاص سوغات، دودھ اور خربوزے کی کھیر بھی تھی۔ باہر سے اونچے سروں میں گانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

ساون کھیر نہ کھاری نا،
کیوں لی جمیوں اپرادھیا!

اللہ وسایا نے رحیم داد کی جانب دیکھا، مسکرا کر بولا۔ “سن رہا ہے چوہدری! باہر زنانیاں کیا گا رہی ہیں؟” اس نے کھیر کی طرف اشارہ کیا۔ “پہلے اسے کھا۔” باغ میں لہک لہک کر گانے والیاں بھی گیت کے بولوں میں کہہ رہی تھیں۔ “ساون میں بھی تو نے کھیر نہیں کھائی۔ ایسی زندگی کا کیا مزا۔” دونوں کھلکھلا کر بے تکلفی سے ہنسے۔ انھوں نے پہلے کھیر کھانا شروع کی۔ پکوان ڈھیر سارا تھا۔ ساتھ ہی پیتل کی بڑی بالٹی تھی جس میں اوپر تک آم بھرے تھے۔

اللہ وسایا نے کھیر کھاتے ہوئے رحیم داد سے پوچھا۔ “میرے پیچھے ادھر دارا تو نہیں آیا؟”

رحیم داد پریشان ہو گیا۔ مگر اس نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا۔ “میں نے تو اسے دیکھا نہیں۔ آیا بھی ہوگا تو زمیں دارنی کو پتہ ہوگا۔ میرے پاس نہیں آیا۔ آئے گا بھی نہیں۔” اس کے لہجے میں تلخی کا عنصر غالب تھا۔

اللہ وسایا چند لمحے خاموش رہا۔ باغ میں قہقہے اور گانے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اللہ وسایا نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ قدرے نرم لہجے میں دریافت کیا۔ “سچ سچ بتا، تو نے جس زنانی کو ڈھولا امیر خاں میں کتل کیا تھا، اس سے تیری یاری تھی؟”

“میں نے کسی کو کتل شتل نہیں کیا۔” رحیم داد نے اللہ وسایا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈھٹائی سے کہا۔ “میں تیرے ساتھ اتنے دنوں سے ٹھیرا ہوں۔ تیں نوں پتہ ہے، میں نے ادھر کتنی زنانیوں سے یاری لگا رکھی ہے۔”

“ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نوں پتہ ہے، تو ایسا بندہ نہیں۔ برائی زیادہ دن نہیں چھپتی، سامنے آ ہی جاتی ہے۔” اللہ وسایا نے اظہار اطمینان کرتے ہوئے کہا۔ “پر دارا نے تیرے بارے میں ایسی گل بات کیوں کہی؟” اس نے لسی کا بڑا گھونٹ بھرا۔ “میں نوں ٹھیک ٹھیک بتا، اصلی گل کیہہ ہے؟”

رحیم داد کو پورا پورا یقین تھا کہ اب اللہ وسایا سے دارا کی ملاقات کا کوئی امکان نہیں لہٰذا وہ شیر ہو کر بولا۔ “ٹھیک ٹھیک گل تو دارا کو سامنے بٹھا کر ہی ہوگی۔ تو نے بھی پہلے یہی کہا تھا نا۔ اسے آنے دے، تبھی میں اس معاملے میں گل بات کروں گا۔ تجھے بھی پوری طرح پتہ چل جائے گا، میرے بارے میں اس نے تجھ سے جو کچھ کہا ہے، اس میں کتنی سچائی ہے۔”

“ٹھیک ہے، اس کے آنے ہی پر گل بات ہوگی۔” اللہ وسایا نے بات آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے رویے میں کسی قسم کی تلخی یا کدورت نہیں تھی۔

دونوں اطمینان سے پکوان کھاتے رہے۔ اللہ وسایا سے زیادہ نہیں کھایا گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بالٹی سے چھانٹ کر اس نے ایک آم نکالا اور چوسنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کھڑکی کی سلاخوں کے پیچھے جمیلہ کا چہرہ ابھرا۔ بھیگے ہوئے بالوں سے پانی کے قطرے اس کے شفاف گلابی رخساروں پر ٹپک کر بکھرتے جا رہے تھے۔

جمیلہ نے شوخ نظروں سے اللہ وسایا کو دیکھا، مسکرا کر پوچھا۔ “تو آ گیا اللہ وسایا؟”

اللہ وسایا نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا، اس کا پانی سے شرابور جسم دیکھا۔ قدرے تیکھے لہجے میں بولا۔ “میں تو کب کا آ گیا، پر تو کب تک ساونی مناتی رہے گی؟ دیکھ تو پانی سے کتنی بھیگ گئی ہے۔ ختم کر یہ رنگ رنگلیاں۔ جا کر کپڑے بدل۔ بیمار پڑ جائے گی۔”

“ارے ارے۔” وہ ہنس کر بولی۔ “تو اپدیشک کب سے بن گیا۔” اس نے شوخی سے آنکھوں کو گردش دی۔ “ساون روز روز نہیں آتا۔ ایک روز تو جی بھر کر ساونی منا لینے دے۔”

“میں تو تیرے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں۔” اللہ وسایا نے پیار سے کہا۔

“میرے بھلے کی چھوڑ۔” وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ “لا مجھے ایک آم تو دے دے۔”

اللہ وسایا نے جھٹ بالٹی میں ہاتھ ڈالا۔ ایک آم نکالا، کھڑکی کے نزدیک گیا۔ آم جمیلہ کی طرف بڑھایا۔ جمیلہ نے انکار میں گردن ہلائی۔ “یہ نہیں۔” اس نے ہاتھ آگے کیا اور اللہ وسایا کے ہاتھ سے وہ آم اچک لیا جو وہ چوس رہا تھا۔ جمیلہ نے آم چوستے ہوئے محبت سے اللہ وسایا کو دیکھا اور

آنکھیں نچا کر بولی۔ "بہت مزے دار ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی اور آم چوستی ہوئی دور چلی گئی۔ رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے چہرے پر نفرت اور دکھ کے ملے جلے تاثرات تھے۔

اس نے تیکھی نظروں سے اللہ وسایا کو دیکھا' جو رحیم داد کے احساسات سے بے نیاز کھڑکی کے نزدیک کھڑا جمیلہ ہی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ وہ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ رحیم داد آہستہ سے کھنکارا۔ اللہ وسایا نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا' زیر لب مسکرایا' بالٹی سے ایک آم نکال کر چوستے ہوئے بولا۔ "تو نے آم نہیں کھانے؟"

اللہ وسایا آہستہ آہستہ قریب آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں بالٹی سے آم نکال نکال کر چوسنے لگے۔ آم میٹھے اور خوش ذائقہ تھے۔ انھوں نے خوب سیر ہو کر کھائے۔ آموں سے فارغ ہو کر دونوں نے گلاس بھر بھر کر دودھ پیا۔ نوکر بچا ہوا پکوان اور کھانے پینے کی دوسری اشیا اٹھا کر لے گئے۔ اللہ وسایا پر سفر کی تھکن کا غلبہ ہوا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو گئیں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "چوہدری میں نوں اب آرام کرنا ہے' بہت تھک گیا ہوں۔" وہ کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد بھی کرسی سے اٹھا اور بستر پر لیٹ گیا۔ باغ میں رم جھم برستی ہوئی بوندوں کے مدھم آہنگ کے ساتھ ساتھ نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کے جھنکارتے قہقہے اور سریلے گیتوں کے بول ابھر رہے تھے' ڈوب رہے تھے۔ کبھی شور' کبھی خاموشی۔ شور اور خاموشی کے درمیان رحیم داد کا ذہن ڈولتا رہا' جمیلہ کی آواز ٹٹولتا رہا' پہچانتا رہا۔ پھر وہ سو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ بارش ابھی بند نہیں ہوئی تھی۔ احمد نے کمرے میں لیمپ روشن کر دیا تھا۔ دوپہر کو اتنا کھا چکا تھا کہ رات کے کھانے کی اسے کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس نے صرف لسی کا گلاس پیا اور کمرے سے نکل کر برآمدے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ صحن میں گرتی ہوئی بارش کی بوندوں کی جھالر ہوا کے تیز جھونکوں سے لہرا رہی تھی۔

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ مینہ کی ایسی جھڑی لگی کہ دو روز تک آسمان پر بادلوں کی سرمئی چادر پھیلی رہی۔ تیسرے روز سہ پہر کو بادل ذرا چھٹے۔ ان کے درمیان سے شیشے کی طرح جھلکتا ہوا نیلا نیلا آسمان نظر آنے لگا۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بادلوں سے دھوپ جھانکنے لگی۔

☆

رحیم داد مسلسل بارش کے باعث کہیں جا نہیں سکا تھا۔ تمام وقت کمرے ہی میں رہا۔ اس عرصے میں اللہ وسایا سے بھی اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ جمیلہ سے تو اور بھی زیادہ عرصے سے نہیں مل سکا تھا۔ وہ سویرے سویرے اسکول چلی جاتی۔ دوپہر کو اپنے دونوں بچوں کے ساتھ لوٹتی تو بہت

تھکی ہوئی ہوتی۔ شام کو وہ عام طور پر اسکول یا ڈسپنسری کے سلسلے میں کسی نہ کسی سے بات چیت میں مصروف ہوتی۔ کبیر والا سے واپسی کے بعد اس نے جمیلہ کو جس وقت بھی دیکھا' وہ مصروف نظر آئی۔ ان دنوں اس پر ڈسپنسری قائم کرنے کی دھن سوار تھی۔ ڈسپنسری کی تعمیر کا کام اس نے شروع کر دیا تھا مگر بارش کے باعث ملتوی کرنا پڑا۔ رحیم داد بھی اس عرصے میں دارا کے باعث ذہنی طور پر بہت پریشان رہا۔

وہ مہمان خانے سے نکلا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا اور دھوپ بہت تیز تھی۔ وہ کیچڑ اور پانی سے بچتا بچاتا کچھ دور گیا پھر واپس آگیا۔

شام کو رحیم داد باغ میں پہنچا۔ ہرے بھرے درخت اور پودے بارش کے پانی سے دھل کر نکھر گئے تھے۔ جدھر نظر اٹھتی' ہریالی ہی ہریالی نظر آتی۔ بادل چھٹ چکے تھے۔ شام کے ہلکے ہلکے دھندلکے میں گہرے نیلے آسمان پر کہیں کہیں تارے ٹمٹمانے لگے تھے۔ رحیم داد کو باغ میں بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اللہ وسایا آگیا۔

اللہ وسایا کے چہرے سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔ وہ ایک کرسی پر نڈھال ہو کر بیٹھ گیا۔

رحیم داد بولا۔ "اللہ وسایا تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ پریشان پریشان نظر آرہا ہے۔"

"میری طبیعت تو ٹھیک ٹھاک ہے۔" اللہ وسایا نے بتایا۔ "پر جمیلہ کو سخت بخار ہے۔ ویسے طبیعت تو اس کی سویرے سے گڑبڑ تھی۔ خود ہی دوا دارو کرتی رہی۔"

"اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟"

"بہت تیز بخار ہے۔ اس روز ساونی مناتی رہی اور بارش میں بھیگتی رہی۔ تیرے سامنے ہی میں نے منع بھی کیا تھا' پر وہ میری سنتی ہی کب ہے۔ اب بخار میں بھن رہی ہے۔ سر میں درد اتنا ہے کہ بار بار سر ادھر ادھر پٹکتی ہے۔"

"اب تو شام ہو گئی۔ برکھا سے رستے بھی خراب ہو گئے ہیں۔ پاک پتن جانا اور ڈاکٹر خاں کو لانا تو بہت مشکل ہو گا۔"

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔" اللہ وسایا بولا۔ "پر کسی ڈاکٹر حکیم کو تو لانا ہی پڑے گا۔ جمیلہ کی طبیعت بہت گڑبڑ ہو رہی ہے۔" اس کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ "سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔"

"لگتا ہے' زمیں دارنی کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔"

"ہاں جی' بالکل پیلی پڑ گئی ہے۔ بخار سے سارا بدن جل رہا ہے۔ ہائے ہائے کر رہی ہے۔"

اللہ وسایا گردن جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کے بشرے سے شدید پریشانی جھلک رہی تھی۔ رحیم داد بھی خاموش بیٹھا رہا۔ برسات کی بھیگی بھیگی شام سرمئی پڑ گئی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے درختوں کے درمیان سے گزرتے۔ سرسراہٹیں ابھرتیں، ہلکی ہلکی سیٹیاں بجتیں۔ سانولی سلونی شام گنگنا رہی تھی۔

رحیم داد نے نظریں اٹھا کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ چند لمحے اس کا چہرہ تکتا رہا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اللہ وسایا کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ "اللہ وسایا! ادھر عالم پور کے نزدیک ایک پنڈ میں حکیم ہے۔ شکور، اس کی بہت تعریف کرتا ہے۔ ایک بار مجھے بھی اس کے پاس لے گیا تھا۔ پیٹ میں کچھ گڑبڑ تھی۔ بار بار سخت مروڑا اٹھتی تھی۔ رات بھی زیادہ ہو چکی تھی، درد سے نیند ہی نہیں آتی تھی۔ یہ ان دنوں کی گل ہے، جب تو شریفاں کے ویاہ میں شرکت کرنے کیمبل پور گیا تھا۔ حکیم کی دوائی سے میں فوراً چنگا ہو گیا تھا۔ ایسا آرام ملا کہ سویرے دیر تک سوتا رہا۔"

"کتنی دور ہے وہ پنڈ جہاں حکیم رہتا ہے؟"

"پنج چھے میل سے زیادہ دور نہ ہوگا۔"

"فاصلہ تو کوئی زیادہ نہیں۔" اللہ وسایا نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ "پر حکیم رات کو یہاں آ بھی جائے گا؟"

"ضرور آ جائے گا۔ ابھی تو شام ہے، ویسے وہ بہت نیک بندہ ہے۔ میں تو اس کے پاس آدھی رات کو گیا تھا۔ اس نے نکھرا شکرا نہیں کیا۔ شکور نے ہانک لگائی تو جھٹ باہر آ گیا۔ بہت پیار سے حال پوچھا، نبض دیکھی اور دوائی دے دی۔"

"تو کہتا ہے تو اسی کو لے آتے ہیں ورنہ رات میں جمیلہ کی طبیعت اور زیادہ گڑبڑ ہو جائے گی۔ تمیں نوں پتہ نہیں، میں اس کی حالت دیکھ کر کتنا پریشان ہوں۔"

"وہ تو تیرا منہ دیکھ کر ہی پتہ چل رہا ہے فکر نہ کر۔ حکیم کی دوائی سے تیری گھر والی بالکل چنگی ہو جائے گی۔"

"حکیم کے پاس ہی چلتے ہیں۔" اللہ وسایا کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ اللہ وسایا نے کہا۔ "چوہدری! تو میرا انتظار کر۔ میں ذرا جمیلہ کا حال معلوم کر لوں۔ حکیم پوچھے گا تو کیا بتاؤں گا۔"

رحیم داد نے چونک کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جمیلہ کو یا کسی کو بھی یہ پتہ نہ چلے کہ وہ اس کے ساتھ گیا ہے۔ اس نے فوراً اللہ وسایا کو منع کیا۔ "زمیں دارنی کو نہ بتانا کہ تو میرے ساتھ

حکیم کو لینے جا رہا ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں، وہ حکیم سے علاج کرانے پر راضی نہیں ہوگی۔ وہ تو ڈاکٹری علاج ہی کو مانتی ہے۔"

"کہہ تو ٹھیک ہی رہا ہے تو۔" اللہ وسایا نے اتفاق کیا۔

رحیم داد نے مشورہ دیا۔ "اسے تو یہی کہنا ہے، پاک پتن سے ڈاکٹر خان کو لینے جا رہا ہے۔"

"پر جب ڈاکٹر کی بجائے میں حکیم کو لے کر پہنچوں گا تو کیا ہوگا؟ یہ بھی تو سوچنا پڑے گا۔"

"تب کی تب دیکھی جائے گی۔" رحیم داد نے اسے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ "ابھی سے کیوں پریشان ہو رہا ہے؟ کہہ دینا، ڈاکٹر نہیں ملا۔ حکیم کو لے آیا ہوں۔ تو ابھی اس کی دوائی پی لے۔ سویرے ڈاکٹر کو بلوالوں گا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے، حکیم حال سن کر ہی دوائی دے دے اور اسے لانا نہ پڑے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ حکیم دوائی دے دے تو ٹھیک ہے۔ اسے یہاں لانے میں تو دوائی لینے اس کے ساتھ دوبارہ جانا پڑے گا۔ ڈاکٹروں کی طرح حکیم اپنے ساتھ دوائیاں تو رکھتے نہیں۔ حکیم کو تو لانے کی بجائے حال بتا کر دوائی لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آگے اس کی مرضی۔ جیسا وہ کہے گا، کیا جائے گا۔"

اللہ وسایا حویلی کی جانب بڑھا۔ "میں جلد ہی واپس آتا ہوں۔"

"میں نہر پر تیرا انتظار کروں گا۔" رحیم داد بہت محتاط تھا۔ "میں گھوڑی لے کر اسی طرف جا رہا ہوں۔"

"ذرا دیر صبر کر لے، میں جلد ہی آ جاؤں گا۔" اللہ وسایا نے اصرار کیا۔

"میں کب کہہ رہا ہوں تو جلدی نہیں آئے گا۔" رحیم داد نے ہنس کر کہا۔ "ادھر ہی آ جائے گا تو کیا حرج ہوگا۔ یہاں اکیلے بیٹھے بیٹھے جی گھبرائے گا۔ پہلے ہی بارش کی وجہ سے کئی روز سے کمرے میں اکیلا پڑا ہوں۔"

"جیسی تیری مرضی۔" اللہ وسایا نے ضد سے کام نہیں لیا۔ آگے بڑھ گیا۔

رحیم داد اصطبل کی جانب بڑھا، گھوڑی نکالی۔ اس پر سوار ہوا اور تیزی سے دوڑاتا ہوا نہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ نہر میں پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ شام کا سرمئی دھندلکا ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔

رحیم داد نے نہر کے قریب پہنچ کر گھوڑی روک لی اور اللہ وسایا کا انتظار کرنے لگا۔

مگر اللہ وسایا جلدی نہیں آیا۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ اللہ وسایا کے آنے میں دیر ہوئی تو رحیم داد کو تشویش ہوئی۔ پندرہ سولہ منٹ گزرے ہوں گے کہ دور سے گھوڑا دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ ٹاپیں

رفتہ رفتہ نزدیک آتی گئیں۔ اللہ وسایا ایک جھنڈ کی آڑ سے گھوڑی دوڑاتا ہوا نکلا۔ قریب پہنچ کر اس نے معذرت کے انداز میں کہا۔

"معاف کرنا چوہدری، مجھے کچھ دیر ہو گئی۔"

"میں نوں پتہ تھا تو جلدی نہیں آئے گا۔ زمیں دارنی نے روک لیا ہو گا۔"

"تو نے ٹھیک سوچا۔" اللہ وسایا ہنسنے لگا۔ "جمیلہ نے روکے رکھا۔ بار بار کہتی تھی 'اندھیرا ہو گیا' اس سمے نہ جا۔ سویرے ڈاکٹر کو لے آنا۔ میں دیر تک اسے سمجھاتا رہا، تب اس نے آنے دیا۔"

رحیم داد نے دیکھا اللہ وسایا کے آگے بندوق رکھی ہے۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ "تو بندوک کس لیے لے آیا؟"

"اندھیرا بھی بڑھ گیا ہے اور آگے احسان شاہ کا پنڈ ہے۔ تمیں نوں پتہ ہے، اس سے میری پرانی لگتی ہے۔ اس طرف رات کو مسلح ہو کر ہی چلنا چاہیے۔" اللہ وسایا نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"زمیں دارنی نے بندوک لے جانے کو کہا ہو گا؟" رحیم داد نے اللہ وسایا کو ٹٹولا۔

"اسے تو میں نے بتایا ہی نہیں کہ اس طرف جانا ہے۔" اللہ وسایا نے وضاحت کی۔ "اسے تو میں نے یہی بتایا، ڈاکٹر خاں کو لینے پاک پتن جا رہا ہوں۔"

"تو ادھر آنے کو کہتا تو وہ تجھے ضرور روک لیتی۔"

"بالکل۔" اللہ وسایا نے تائید کی۔ "رات کو تو وہ مجھے ہرگز اس طرف نہ جانے دیتی۔"

دونوں نے اپنی اپنی گھوڑی کو ایڑ لگائی اور نہر کے کنارے کنارے گھوڑیاں دوڑانے لگے۔ کیچڑ اور اندھیرے کے باعث وہ بہت محتاط نظر آ رہے تھے۔ جھٹ پٹے میں دونوں آگے اور آگے بڑھتے گئے۔ سناٹا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی گاؤں قریب آتا تو گھروں کی روشنیاں دور سے ٹمٹماتی نظر آتیں۔ مویشیوں اور انسانوں کی ملی جلی مدھم آوازیں بھی سنائی دیتیں۔ ابھی گاؤں جاگ رہے تھے۔ نہر کا پانی گنگنا رہا تھا۔ آس پاس کے جھنگروں میں مینڈک زور زور سے ٹرا رہے تھے۔

دونوں نہر کی پلیا سے آگے بڑھے تو اللہ وسایا نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر دیکھا۔ وہ رحیم داد کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کی جانب گردن بڑھا کر بولا۔ "چوہدری! اب چوکس رہنا ہو گا۔ یہ رستہ خطرناک ہے۔ یہاں سے احسان شاہ کا علاکہ لگتا ہے۔"

"میں تو اس رستے سے کئی بار گزرا ہوں۔ میں نے کبھی کھٹکا محسوس نہیں کیا۔" رحیم داد نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"تیری بات اور ہے۔ شاہ جی تو مجھ سے خار کھاتا ہے۔"

"حوصلے سے کام لے۔ تیرے پاس تو بندوک ہے اور بھری ہوئی بھی ہو گی؟"

"بھری ہوئی تو ہے، پر ہم دو ہی ہیں اور بندوک صرف ایک ہے۔" اللہ وسایا نے صورت حال رحیم داد پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ "احسان شاہ کے پاس تو مسلح غنڈوں کی پوری پلٹن ہے۔"

"ایسا ہے تو بندوک مجھے دے دے۔ میں آگے آگے چلتا ہوں۔" رحیم داد نے ہاتھ بڑھا کر بندوق مانگی۔ اللہ وسایا نے سادگی سے دے بھی دی، ہنس کر بولا۔ "تیری مرضی ہے تو رکھ لے۔ ویسے میں ڈرنے مرنے والا بندہ نہیں۔ پہلے بھی احسان شاہ کئی بار مجھ پر قاتلانہ حملے کرا چکا ہے پر کبھی سامنے نہیں آیا۔"

رحیم داد نے بندوق سنبھال کر آگے رکھ لی۔ گھوڑی کو ایڑ لگائی اور اللہ وسایا سے کچھ دور آگے نکل گیا۔ اللہ وسایا اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ دونوں آگے بڑھے تو شیشم اور سرس کے درختوں کے جھنڈ نظر آنے لگے۔ یہی وہ جنگل تھا جس میں احسان شاہ کے منصوبے کے مطابق دینا کو دارا اور دوسرے مسلح افراد کے ہم راہ موجود ہونا چاہیے تھا۔ رحیم داد نے اس راہ پر گھوڑی ڈال دی جو جنگل کے درمیان سے گزرتی تھی۔ اللہ وسایا نے گھوڑی بڑھائی۔ رفتار کسی قدر تیز کی۔ رحیم داد کے قریب پہنچا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

دونوں گھنے درختوں کے نیچے تھے۔ شام کا مدھم اجالا شاخوں کے درمیان سے کہیں کہیں جھانک رہا تھا مگر ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ وہ چند ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ دبی دبی آہٹیں ابھریں مگر کوئی نظر نہیں آیا۔

اللہ وسایا نے خطرے کی بو محسوس کی۔ اس نے رحیم داد سے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "چوہدری! تو نے ٹھیک راستہ نہیں پکڑا۔ یہ بہت ہی خطرناک بیلا ہے۔"

رحیم داد زور سے کھنکارا اور گھوڑی آگے بڑھاتے ہوئے اونچی آواز سے بولا۔ "اللہ وسایا حوصلے سے کام لے۔ رستہ ہی کتنا ہے۔ ذرا دیر میں بیلے سے دونوں باہر ہوں گے۔ گھوڑی تیز کر۔"

رحیم داد گھوڑی تیزی سے دوڑاتا آگے نکل گیا۔ اللہ وسایا نے بھی رفتار تیز کی مگر چند ہی قدم چلنے کے بعد گھوڑی زور سے ہنہنائی۔ اللہ وسایا نے دھندلی روشنی میں دیکھا کہ راستے میں موٹی رسی تنی ہے۔ اس نے رکابیں سنبھال کر گھوڑی روکنے کی کوشش کی مگر اس کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ وہ رک نہ سکی۔ رسی سے الجھی اور لڑکھڑا کر گر پڑی۔ اللہ وسایا بھی اس کے ساتھ ہی لڑھک کر نیچے آ گیا۔ وہ زمین پر آتے ہی زور سے چیخا۔

"چوہدری! بندوک مجھے دے۔"

اسی وقت ایک طرف سے ٹارچ کی تیز روشنی ابھری۔ رحیم داد نے گھوڑی روک لی۔ پلٹ کر دیکھا کہ ٹارچ کی تیز روشنی میں اللہ وسایا زمین پر پڑا ہے اور ادھر ادھر نظریں دوڑا کر بے بسی سے پکار رہا ہے۔ "چوہدری! چوہدری! تو کدھر چلا گیا؟" اللہ وسایا نے اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ درختوں کے نیچے سے سات آٹھ آدمی نکلے اور اللہ وسایا کی جانب تیزی سے بڑھے۔ ان کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے۔ وہ بندوقوں، کلہاڑیوں، گنڈاسوں اور دوسرے خطرناک اسلحہ سے لیس تھے۔

انھیں دیکھ کر اللہ وسایا تڑپ کر چیخا۔ "چوہدری!" مگر وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ ڈھاٹے باندھے ہوئے افراد چاروں طرف سے جھپٹے اور اللہ وسایا کو دبوچ لیا۔ ایک بار وہ زور لگا کر ان کی گرفت سے نکل گیا، تیزی سے پلٹا اور دوڑ کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر پیچھے سے کسی نے گنڈاسے کا ایسا بھرپور وار کیا کہ اس کا تیز پھل کئی انچ اللہ وسایا کے سر کے اندر اتر گیا۔

اللہ وسایا کے حلق سے ہائے کی دل دوز چیخ نکلی۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کا چہرہ خون سے لت پت ہوگیا تھا۔ حملہ آوروں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اللہ وسایا کی مشکیں کس لیں۔ ٹارچ کی روشنی بجھ گئی۔ ہر طرف گہرا اندھیرا چھا گیا۔

رحیم داد نے اللہ وسایا کی بندوق وہیں پھینک دی۔ گھوڑی کی باگ موڑی۔ رفتار تیز کی اور جنگل سے باہر نکل گیا۔

۲۲

گاؤں کی چہل پہل اجڑ چکی تھی۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ گھروں سے کہیں کہیں روشنی جھلک رہی تھی۔ رات کالی کاجل بن چکی تھی۔ بادل گھر گھر کر آرہے تھے۔ آسمان تاریک ہوگیا تھا۔ ہوا تیز اور بھیگی ہوئی تھی۔ رحیم داد گھوڑی دوڑاتا حویلی کے باڑے پر پہنچا۔ باڑے کے مویشیوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی پیتل کی گھنٹیوں اور گھنگرالوں کی جھنکار سناٹے میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔ باڑے کا رکھوالا دروازے پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی جھٹ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ رحیم داد گھوڑی سے نیچے اترا۔ رکھوالے نے بڑھ کر راسیں سنبھال لیں۔

رحیم داد آگے بڑھا تو رکھوالے نے ٹوکا۔ "زمیں دار تیرے ساتھ نہیں لوٹا؟"

"زمیں دار؟" رحیم داد پہلے تو گھبرایا پھر سنبھل کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "وہ تو میرے ساتھ نہیں گیا تھا۔ کدھر ہے وہ؟"

"یہ تو جی میں نوں پتہ نہیں۔ تیرے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی گھوڑی لے کر نکلا تھا۔ میں سمجھا آگے تجھے مل گیا ہوگا۔ وہ بھی سوئے کی طرف گیا تھا۔"

"سوا تو سامنے ہی ہے۔" رحیم داد نے نہر کی سمت ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "وہ ادھر تو نہیں پہنچا۔ کہیں اور گیا ہوگا۔ آتا ہوگا۔"

رحیم داد مہمان خانے کی جانب روانہ ہوا۔ رکھوالا گھوڑی کی راسیں سنبھالے اصطبل کی جانب بڑھا۔ رحیم داد مہمان خانے میں گیا۔ دروازہ کھلا تھا مگر احمد موجود نہیں تھا۔ رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ اس وقت احمد سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ احمد مہمان خانے میں ہوتا تو ضرور

بات کرتا۔ عین ممکن تھا کہ اللہ وسایا کے بارے میں پوچھتا۔ رحیم داد پر گھبراہٹ اور پریشانی نے یلغار کر رکھی تھی۔ اس عالم میں نہ جانے کیا بات زبان سے نکل جاتی۔

رحیم داد نے صحن عبور کیا۔ کمرے کے آگے برآمدے میں اس کا پلنگ بچھا تھا۔ بستر بھی لگا ہوا تھا۔ اندر کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ رحیم داد کمرے میں گیا' کپڑے اتارے دھوتی باندھی۔ لیمپ کی لو مدھم کی اور نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہوگیا۔ اس نے رات کا کھانا کھانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بھوک ہی نہیں تھی۔ وہ دم بخود لیٹا رہا۔ دور دور تک نیند کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہ شدید ذہنی الجھن میں مبتلا تھا۔ اسے رہ رہ کر اللہ وسایا یاد آرہا تھا' اس کا خون میں لتھڑا ہوا چہرہ یاد آرہا تھا' اس کا تڑپ تڑپ کر بار بار "چوہدری! چوہدری!" پکارنا یاد آرہا تھا۔

اس پر خوف اور دکھ کے ملے جلے احساسات کا غلبہ تھا۔ وہ بے چین ہو کر ادھر ادھر کروٹ بدلتا مگر کسی پہلو قرار نہ آتا۔ آنکھیں بند کرتا۔ نیند کو بلانے کی کوشش کرتا مگر نیند روٹھی ہوئی تھی۔ اندھیرا کچھ اور گاڑھا ہوگیا۔ سناٹا زیادہ گہرا ہوگیا۔ رات دم بخود کھڑی تھی۔ یکایک گہری خاموشی میں مہمان خانے کے باہر کتوں کے زور زور سے رونے کی آواز ابھری۔ رحیم داد نے بدحواس ہو کر آنکھیں کھول دیں' کروٹ بدلی اور اس دروازے کی جانب دیکھنے لگا جو مہمان خانے کے باہر میدان میں کھلتا تھا۔ کتوں کے رونے کی ڈراؤنی آوازیں سناٹے میں رک رک کر ابھرتی رہیں۔

رحیم داد چپ لیٹا تھا۔ ذرا دیر بعد حویلی سے مہمان خانے میں داخلے کا دروازہ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ صحن میں قدموں کی آہٹ ابھری۔ رحیم داد کو گمان گزرا کہ احمد آیا ہوگا۔ اس وقت وہ اس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور مسٹ مارے اس طرح خاموش پڑا رہا گویا بے خبر سو رہا ہو۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی اور اس کے پلنگ کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ رحیم داد نے آنکھیں کھولیں نہ کروٹ بدلی۔ چند لمحے خاموشی سے گزرے پھر اسے اپنے سرہانے چوڑیوں کی ہلکی ہلکی کھنک سنائی دی' ساتھ ہی آواز ابھری۔

"چوہدری! سو گیا؟"

رحیم داد نے آواز پہچان لی۔ یہ احمد کی بیوی تھی۔ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر سوچا کہ اتنی رات گئے وہ اس کے پاس کیوں آئی ہے؟ معاً اسے خیال آیا' کہیں جمیلہ کی طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہوگئی؟ رحیم داد خاموش پڑا رہا۔ احمد کی بیوی زیادہ دیر چپ نہیں رہی۔ اس نے رحیم داد کا بازو پکڑ کر آہستہ سے جھنجوڑا اور کسی قدر اونچی آواز سے بولی۔

"چوہدری! چوہدری!"

اب رحیم داد کے لیے چپ رہنا ممکن نہ رہا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور دونوں ہاتھوں سے انہیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ احمد کی نوجوان بیوی اس کے سرہانے کھڑی تھی۔ لیمپ کی مدھم روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا مگر نقش و نگار تیکھے تھے۔ جسم سڈول اور صحت مند تھا۔

"میں حمدے کی گھر والی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "میرا نام تاراں ہے جی۔"

اس کی مسکراہٹ سے رحیم داد کو اندازہ ہوگیا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ وہ حیرت کے انداز میں بولا۔ "یہ میں نوں بھی پتہ ہے کہ تو حمدے کی گھر والی ہے' پر اتنی رات کو تو یہاں کیوں آئی ہے؟"

"وہ ایسا ہی جی' حمدے کو شام سے بکھار ہے۔ اسی نے تیرے پاس بھیجا ہے۔ تو نے روٹی نہیں کھائی' بھوکا ہی سو گیا۔" تاراں ایک بار پھر الھڑپن سے مسکرائی۔ "تیرے لیے روٹی لے آؤں۔ روٹی کھالے' فیر آرام نال سو جانا۔"

رحیم داد منہ بگاڑ کر بولا۔ "میرے پیٹ میں گڑبڑ ہے' روٹی نہیں کھاؤں گا۔"

تاراں خاموش کھڑی رہی۔ رحیم داد کا جی چاہا کہ وہ اس سے جمیلہ کی طبیعت کا حال معلوم کرے لیکن صورت حال کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ایسی بات نہ پوچھے اور زیادہ سے زیادہ محتاط رویّہ اختیار کرے۔ وہ چپ رہا لیکن جو بات معلوم کرنا چاہتا تھا' خود بخود تاراں کی زبان پر آگئی۔ "آج کل جی موسم بھی بہت گڑبڑ ہے۔ حمدے کو بکھار ہے۔ زمیں دارنی کو بھی بکھار ہے۔ پر اب تو اس کی طبیعت ٹھیک لگتی ہے۔ آرام نال سو رہی ہے۔ میں تھوڑی دیر پہلے اس کے پاس گئی تھی۔" اس کے چہرے پر ہلکی سی پریشانی چھاگئی' لہجے سے بھی تشویش جھلکنے لگی۔ "پر زمیں دار اب تک نہیں لوٹا۔ ڈاکٹر لینے گیا تھا۔"

رحیم داد نے اس کی تشویش نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "زمیں دارنی کو کب بخار ہوا؟"

"وہ جی ایسا ہے' اس نے پچھلے دنوں ساوݨی منائی تھی۔ برکھا میں سارا دن بھیگتی رہی' ادھر ادھر بھاگ دوڑ کرتی رہی۔ جھولا جھولتی رہی۔ فیر بکھار تو آنا ہی آنا تھا۔" اس نے شوخی سے آنکھوں کو گردش دی۔ "میں نے بھی جی اس کے ساتھ ساوݨی منائی تھی۔ بھیگی بھی بہت تھی' پر اپنے کو تو کچھ ہوا نہیں۔"

"تو زمیں دارنی سے بھی زیادہ جوان ہے۔" رحیم داد نے اسے چھیڑا۔

"پر اپنی زمیں دارنی ہے بہت سندر۔"

"ویسے تو بھی کم سوہنی نہیں۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "حمدے کا نصیب تگڑا ہے‘ اسے تیری ایسی چنگی گھر والی ملی۔"

"پر وہ میری کب پروا کرتا ہے۔" تاراں نے گلہ کیا۔ "وہ تو جی پنڈ کی ایک مٹیار کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ اس کا نام شدّو ہے۔ ویسے اس نے اور بھی کیسوں سے یاری لگا رکھی ہے۔ زبردست ٹھرکیا ہے۔" اس کا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا۔ "میں نے کتنی بار اسے منع کیا‘ منت سماجت کی‘ جھگڑا انٹا کیا‘ پر اسے تو جب موقع ملتا ہے‘ شدو کے گھر کی طرف نکل جاتا ہے۔ ایک بار تو اس کے سامنے ہی مل نے حمدے سے جھگڑا کیا پر وہ باز نہیں آتا۔ اب بکھار میں پڑا ہائے ہائے کر رہا ہے۔ مجھ پر حکم چلاتا ہے۔ سر دبا دے‘ دودھ گرم کر کے پلا دے۔ یہ کر دے‘ وہ کر دے۔" اس کی زبان کترنی کی طرح چل رہی تھی۔ "اب تیرے پاس بھیجا ہے‘ روٹی کھلا دوں۔"

تاراں سے باتیں کر کے رحیم داد کو قدرے سکون ملا۔ اس کا ذہنی کرب دب گیا۔ رحیم داد نے ذہنی خلفشار سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کی جوانی نے انگڑائی لی۔ موسم بھی فتنہ انگیز تھا۔ بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ بوندا باندی شروع ہو گئی۔ رات اندھیری اور سنسان تھی اور تاراں اس کے قریب کھڑی تھی۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ اسے کسی لمحے قرار نہ تھا۔

رحیم داد تیکھی نظروں سے اسے ٹٹولنے لگا۔ اب اسے اللہ وسایا کا ڈر بھی نہیں تھا۔ اب وہی گاؤں کا زمیں دار تھا۔ زمیں داری کا ٹھاٹ باٹ اور دبدبہ وہ احسان شاہ کی حویلی میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور یہ بھی جان چکا تھا کہ زمین کے ساتھ ساتھ مزارعوں اور کمیوں کی نوجوان بیویاں اور بیٹیاں بھی بڑے زمیں داروں کی ملکیت ہوتی ہیں۔ زمیں دار جب چاہے اور جسے چاہے اٹھوا لے‘ اپنی حویلی میں ڈال لے۔ جب تک جی چاہے‘ داشتہ یا رکھیل بنا کر اپنے پاس رکھے اور جب جی چاہے‘ کسی دوسرے زمیں دار کے ہاتھ فروخت کر دے‘ قیمت لے کر یا بلا قیمت واپس کر دے۔ مزارع اور کمی نہ اس کے خلاف احتجاج کر سکتا ہے‘ نہ قانون اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔

رحیم داد نے تاراں کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ مسکرا کر گویا ہوا۔ "لے‘ اب برکھا شروع ہو گئی۔ کہاں بھیگتی ہوئی جائے گی۔ تو بھی بیمار پڑ جائے گی۔ یہیں ٹھہر جا۔ سویرے چلی جانا۔"

تاراں اس کی بھوکی نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ اس نے شرما کر اوڑھنی کے پلو سے اپنا سر ڈھکا اور آہستہ سے بولی۔ "نہیں جی‘ میں نوں جانا ہے۔ حمدا بکھار میں بھن رہا ہے۔ نہ گئی تو بہت نراض ہو گا۔"

"چلی جانا‘ ایسی جلدی کیا ہے۔" رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ "حمدے سے تو کیوں ڈرتی ہے؟ وہ تیرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔"

"ایسی گل نہیں۔" وہ آنکھیں نچا کر بولی۔ "نراض ہوتا ہے تو مارنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ تیں نوں پتہ نہیں‘ وہ کیسا زور آور ہے۔"

"زور آور!" رحیم داد حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر ہنسا۔ "تو نے بھی حد کر دی۔ دیکھنے میں تو وہ مُڈا لگتا ہے۔" رحیم داد نے مڑ کر صحن کی طرف دیکھا۔ بارش کسی قدر تیز ہو گئی تھی۔ ہوا کے بپھرے ہوئے جھونکوں کے ساتھ مینہ کی ہلکی ہلکی پھوار برآمدے میں آ رہی تھی۔ تاراں قریب کھڑی تھی‘ اتنے قریب کہ اس کے بوسیدہ لباس سے اٹھتی ہوئی پسینے کی تیز بو اس کے نتھنوں میں داخل ہو رہی تھی۔ رحیم داد نے تاراں کو نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ "نہا دھو کر کپڑے تو اجلے پہنا کر۔"

"حمدا مجھے کپڑے لتے لا کر دیتا ہی کب ہے۔" اس نے منہ بگاڑ کر شکوہ کیا۔ "اسے میری ذرا پروا نہیں۔"

رحیم داد نے بے تکلفی سے مسکرا کر کہا۔ "تو بھی اس کی پروا کرنا چھوڑ دے۔ میں تیرے لیے اتنے ڈھیر سے کپڑے لتے بنوا دوں گا‘ روز نئے نئے پہننا۔ فکر نہ کر‘ حمدا تجھ پر اب نراض نہیں ہو گا۔" اس نے لہجے میں دبدبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "میں نوں بھی دیکھنا ہے‘ وہ کیسے نراض ہوتا ہے۔ میں اس کی چمڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔" رحیم داد نے گردن اونچی کی‘ مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور تاراں کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔

وہ خاموش رہی۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے حویلی میں کھلنے والے دروازے کی جانب دیکھا۔ دبی زبان سے کہا۔ "حمدا میرا انتظار کرتا ہو گا۔ وہ ابھی سویا نہیں۔" وہ آگے بڑھی۔

رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ "کہاں چلی؟" اس نے مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا۔ "میں نوں اب جانے دے۔ حمدا سو جائے گا تو تیرے پاس آ جاؤں گی۔" وہ تیز قدموں سے صحن میں پہنچی اور بارش سے بچتی بچاتی حویلی کی سمت بڑھی‘ ذرا دیر بعد اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

رحیم داد بستر پر لیٹ گیا اور مڑ مڑ کر بے چین نگاہوں سے وہ دروازہ تکنے لگا‘ جس سے گزر کر تاراں نظروں سے اوجھل ہوئی تھی۔ رم جھم ہوتی رہی۔ رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کرتی رہی مگر تاراں نہیں آئی۔ رحیم داد انتظار کرتے کرتے سو گیا۔

☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ رحیم داد کی آنکھ آہٹ سے کھل گئی۔ مہمان خانے کے

بیرونی دروازے پر آہستہ آہستہ آہٹ ہو رہی تھی۔ بارش اب تھم گئی تھی۔ رحیم داد خاموش لیٹا رہا اور چوکنا نظروں سے دروازہ تکتا رہا۔ دروازے پر کوئی رک رک کر ہولے ہولے دستک دے رہا تھا۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ زور سے کھنکارا، پلنگ سے نیچے اترا۔ آگے بڑھا۔ صحن کا کچا فرش بارش سے تربتر تھا۔ ہر طرف پانی تھا، کیچڑ تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا دروازے پر پہنچا اور چند لمحے حیران و پریشان کھڑا رہا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھولی اور ایک پٹ آہستہ سے کھینچا۔ اندھیرے میں کوئی سائے کی مانند کھڑا تھا۔ اس نے فوراً سرگوشی کی۔

"چوہدری! میں دارا ہوں۔"

رحیم داد نے اسے پہچان لیا۔ دھیمے لہجے میں بولا۔ "اندر آجا۔"

دارا اندر آگیا۔ رحیم داد نے جھٹ زنجیر چڑھا دی۔ برآمدے کی سمت ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ادھر چل۔" دارا برآمدے کی طرف چلا۔ رحیم داد آہستہ آہستہ حویلی کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا، دروازے کی کنڈی لگائی اور واپس برآمدے میں آیا۔ لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں دارا خاموش کھڑا تھا۔ اس کے پیر کیچڑ میں لت پت تھے۔ لباس بھی بھیگا ہوا تھا۔ رحیم داد بستر پر پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"اللہ وسایا کا کیا بنا؟"

"اسے تو تیرے جاتے ہی ختم کردیا گیا تھا۔" دارا نے بتایا۔

رحیم داد لرز کر رہ گیا۔ اس کے ذہن میں غبار منڈلانے لگا۔ سینے سے دھواں اٹھا۔ وہ خاموش بیٹھا خود پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

"اسے کس نے ختم کیا؟"

"میں نے کیا۔" دارا نے سینے پر ہاتھ مارا اور تن کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے سرخی جھلک رہی تھی۔ چہرے پر وحشت طاری تھی۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

"چوہدری! پانی پلا دے۔ میں نوں تو جیسے بھڑکی لگ گئی۔ رستے بھر نہر سے پانی پیتا رہا۔ پر پیاس نہیں بجھی۔"

رحیم داد نے کمرے کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اندر چلا جا۔ میز پر جگ میں پانی بھرا ہے۔ گلاس بھی پاس رکھا ہے۔ جتنا جی چاہے، پی لے۔"

دارا کمرے میں چلا گیا۔ وہ پانی پی کر آیا تو کسی قدر پرسکون نظر آرہا تھا۔ وہ رحیم داد کے سامنے فرش پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ "گولی چلائی تھی یا کلہاڑی سے کتل کیا تھا؟"

"ایک نہیں، دو گولیاں چلائی تھیں۔" دارا نے بتایا۔ "دونوں ٹھیک نشانے پر بیٹھیں۔ پہلی سینے میں لگی، دوسری سر میں۔ تیں نوں پتہ ہے، میں بھی زمیندار رہ چکا ہوں۔ بہت شکار کھیلا ہے۔ نشانہ بہت سچا ہے۔ پہلی گولی کھا کر، وہ زور سے تڑپا پر دوسری پر نہ سنبھل سکا۔ اس نے دم توڑ دیا، چند منٹ میں سارا کھیل ختم ہوگیا۔"

"دینے نے گولی نہیں چلائی؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"نہیں جی۔ جب اللہ وسایا نے نکل بھاگنے کی کوشش کی تو اس پر دینے نے ہی گنڈاسا چلایا تھا، سر پر لگا تھا۔ اس چوٹ کے ساتھ ہی وہ گر پڑا۔ تو اس وکھت تو موجود ہی تھا۔"

"دینے نے گولی نہیں چلائی، یہ تو اچنبھے کی گل ہے۔"

"شاہ جی سے پوچھ لے۔ وہ تو موجود ہی تھا۔" دارا نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "دونوں بار گولی میں نے ہی چلائی تھی۔"

"شاہ جی وہاں کب پہنچا تھا؟"

"لگتا ہے تیں نوں کچھ پتہ نہیں۔" دارا نے تفصیل بیان کی۔ "ہوا یہ کہ سورج ڈوبتے ہی دینا، میں اور دوسرے بندے بیلے میں پہنچ گئے۔ ساری سکیم تو پہلے ہی سے تیار تھی۔ دو بندے نہر کی پلی سے کچھ آگے لگا دیئے گئے تھے۔ انھوں نے جیسے ہی تم دونوں کی گھوڑیاں دوڑنے کی آواز سنی، فوراً بھاگتے ہوئے آئے اور اطلاع دی۔ اطلاع ملتے ہی سب گھات لگا کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ شاہ جی بھی اسی وکت پہنچا تھا۔ ویسے اس کا ادھر آنے کا بالکل پروگرام نہیں تھا۔ دینے نے یہی بتایا تھا۔ جانے وہ کیوں آگیا؟ اسی نے سب کی ڈیوٹی لگائی۔" دارا نے رحیم داد کا پریشان چہرہ غور سے دیکھا۔

"شاہ جی تو جی، ایک نمبر خرانٹ لگتا ہے۔ سارا کام اس طرح کرایا کہ ذرا بھی گڑبڑ نہیں ہوئی۔"

"پر یہ سارا کام ہوا کیسے؟" رحیم داد نے مزید تفصیل معلوم کرنے کی غرض سے استفسار کیا۔ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ باخبر رکھنا چاہتا تھا۔ "میں جب وہاں سے چلا تھا، اللہ وسایا چوٹ کھا کر زمین پر پڑا تھا۔"

"تیرے جانے کے بعد وہی رسی کام میں لائی گئی جسے رستے میں تان کر اس کی گھوڑی کو گرایا گیا تھا۔" دارا نے بتایا۔ "وہ ایسے ہوا جی، اللہ وسایا کو زمین سے اٹھایا گیا اور ایک درخت کے ساتھ رسی سے باندھ دیا گیا۔ شاہ جی نے بندوک مجھے دے دی۔ اس نے رسی سے بندھے ہوئے اللہ وسایا پر ٹارچ سے روشنی ڈالی۔ میں نے دیکھا اس کے کپڑے لتے کیچڑ سے گندے ہوگئے تھے۔ پگ اک طرف پڑی تھی۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ سر کے بال بکھر کر منہ پر پھیل گئے تھے۔ ان

میں بھی کیچڑ اور مٹی لگی ہوئی تھی۔" اس نے لمبی سانس بھری۔ "اللہ وسایا نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کا منہ خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا۔" دارا کے چہرے پر دکھ کا ہلکا ہلکا غبار پھیل گیا۔

"سچی گل ایسہ ہے جی' مجھے اس پر اتنا ترس آیا کہ میں بندوک تان کر نشانہ باندھے کھڑا رہا۔ مجھ سے گولی نہیں چلائی گئی۔ تب شاہ جی نے ناراض ہو کر زور سے ڈانٹا 'گولی چلا۔ اس کی ڈانٹ کے ساتھ ہی میں نے گولی چلا دی۔ دوسری بھی اس کے کہنے پر چلائی۔"

"اللہ وسایا کی لاش کا کیا بنا؟"

"وہ دینے نے ٹھکانے لگا دی ہوگی۔ جیسا شاہ جی نے کہا ہوگا' اس نے ویسا ہی کیا ہوگا۔" دارا نے جواب دیا۔ "گولی مارنے کے بعد شاہ جی نے مجھ سے کہا' تیرا کام ختم ہوگیا۔ اب تو نس جا۔ میں فوراً ادھر آنے کے لیے بیلے سے باہر آگیا۔ آگے کیا ہوا' میں نوں کچھ پتہ نہیں۔"

"اللہ وسایا کی گھوڑی کہاں گئی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"میں نے تو سنا ہے جی! شاہ جی زبردست رسہ گیر ہے۔ اللہ وسایا کی گھوڑی کو چھپانے کے لیے اس نے اپنے بندوں کے ذریعے فوراً اہر میں پہنچا دیا ہوگا۔" وہ بے ڈھنگے پن سے مسکرایا۔ "وہ اتنی زبردست گھوڑی کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ میرا تو جی ایسا ہی خیال ہے۔"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا ہے۔" رحیم داد نے اس کے خیال سے اتفاق کیا۔ "پر تو یہاں اتنی دیر میں کیسے پہنچا؟ اب تیرا کیا ارادہ ہے؟"

"تیں نوں تو سب کچھ پتہ ہی ہے۔ میں نے تیرا کام ٹھیک ٹھاک طرح سے کر دیا۔ شاہ جی تجھے خود بتا دے گا۔ اب اپنا وعدہ پورا کر۔ مجھے ہزار روپے دے دے۔ میں کامل کے پاس جاؤں۔ کئی روز ہوگئے چک ۴۸ سے آئے ہوئے۔ کامل پریشان ہوگا۔ میں نوں اس کے پاس اب پہنچ جانا چاہیے۔"

"میں نے جو وعدہ کیا ہے' پورا کر دوں گا۔ ویسے سچی گل پوچھ تو مجھے شاہ جی سے ملنے کے بعد ہی تجھے روپیہ دینا چاہیے۔ ایسے معاملوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

دارا بے چین ہو کر بیچ میں بول اٹھا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا' تیں نوں میری بات کا اعتبار نہیں۔"

"تو نے پوری گل بات ہی نہیں سنی۔ میں نے کب کہا' مجھے تجھ پر اعتبار نہیں۔ میں تجھے ابھی اور اسی وکت ہزار روپے دے دوں گا۔" رحیم داد نے کہا۔ دارا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ لمحے بھر

پہلے اس کے چہرہ پر جو کدورت نظر آ رہی تھی' مٹ گئی۔ "تو مجھے یہ بتا' ادھر سے نکل کر بحرین جانے کے لیے تو کراچی جائے گا کیسے؟ یہ سمجھ لے' پولیس تیری تاک میں ہے۔ جو کچھ کرنا ہے' بہت ہی سوچ سمجھ کر کرنا ہے۔" رحیم داد نے اسے خبردار کیا۔ "اب تو پہلے سے زیادہ سنگین جرم کر چکا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے چوہدری!" دارا کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ شاید اسے پہلی بار اپنے جرم کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اس نے رحیم داد کو بتایا۔ "اپنا تو جی یہ ارادہ تھا کامل کے ساتھ اونٹوں پر بیٹھ کر بھاول پور کی طرف نکل جاؤں۔ ریاستی بولی اچھی طرح بول سکتا ہوں۔ برسوں بولتا رہا ہوں۔ کپڑے لتے بھی بھاول پوری پہن لوں گا۔ کسی کو ذرا شبہ نہ ہوگا۔ ریاست میں پہنچ کر کسی چھوٹے سٹیشن سے کراچی کی گڈی پکڑ لوں گا۔" اس نے رحیم داد کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "یہ ٹھیک نہ ہو تو جیسا تو بتا' ویسے کروں؟"

"پروگرام تو تیرا ٹھیک ہی لگتا ہے۔" رحیم داد نے اختلاف نہیں کیا۔ "یہ بتا کامل تیری اتنی مدد کرنے کو تیار ہو جائے گا؟"

"وہ تو جی پہلے ہی سے تیار ہے بلکہ ساری سکیم ہی میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کر تیار کی ہے۔" دارا نے رحیم داد کو یقین دلایا۔ "چوہدری! وہ میرا بہت گہرا یار ہے۔ سچ پوچھ' میں نوں تو صرف روپے کا بندوبست کرنا تھا۔ اسی کی فکر تھی۔ ورنہ پروگرام تو بہت دنوں سے بنا رکھا تھا۔ روپیہ پاس ہو تو کیا نہیں ہو سکتا۔ کوئی مصیبت بھی پڑ جائے تو کچھ دے دلا کر جان چھڑائی جا سکتی ہے۔"

رحیم داد اس کی باتوں سے خاصا مطمئن ہوگیا۔ وہ اٹھا' کمرے میں گیا۔ لیمپ کی لو اونچی کی۔ اسے ہاتھ میں سنبھالے کوٹھری کے دروازے پر پہنچا۔ اس پر تالا لگا تھا۔ رحیم داد نے کنجی سے تالا کھولا۔ لیمپ اٹھائے کوٹھری میں گیا۔ دروازہ اندر سے بند کیا۔ ٹرنک کھولا۔ ہزار روپے کے نوٹ نکال کر گنے۔ انھیں دھوتی کے ڈب میں رکھا' باہر آ کر کوٹھری کے دروازے میں پھر تالا ڈالا۔

وہ برآمدے میں واپس پہنچا۔ دارا بے چین بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے ڈب سے ہزار روپے نکال کر بڑھائے۔ نوٹ لیتے ہوئے دارا کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے نوٹ گنے اور نہایت احتیاط سے اپنی دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے۔

رحیم داد نے کہا۔ "تو ابھی چک ۵۸ جائے گا نا؟"

"ہاں جی ابھی چلا جاؤں تو ٹھیک رہے گا۔" وہ کھڑا ہوگیا۔ "میرا یہاں ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔ ویسے میرا چک یہاں سے بہت زیادہ دور بھی نہیں۔ فکر نہ کر۔ میں آرام کے ساتھ سویرا ہونے سے پہلے

وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"اب تیرا چک ۴۸ میں زیادہ ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔" رحیم داد نے مشورہ دیا۔ "ہوسکے تو کل اندھیرا ہوتے ہی نکل جانا اور راتوں رات ریاست کی سرحد میں داخل ہو جانا۔"

"بالکل ایسا ہی کروں گا جی۔ روپیہ پاس ہوتا تو میں پہلے ہی نکل جاتا۔"

رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ آگے بڑھا۔ دارا اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں نے صحن عبور کیا، دروازے پر پہنچے۔ رحیم داد نے دروازہ کھولا۔ دارا نے جھک کر رحیم داد کے گھٹنے کو ہاتھ لگایا اور چپ چاپ باہر چلا گیا۔

رحیم داد نے دروازے کی کنڈی ایک بار پھر چڑھا دی۔ آگے بڑھا، حویلی میں کھلنے والے دروازے پر پہنچا اور اس کی کنڈی کھول دی۔ برآمدے میں واپس پہنچ کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔

☆

یہ ایک گرم صبح تھی۔ زرد زرد چمکیلی دھوپ دیواروں سے نیچے اتر رہی تھی۔ فضا میں حبس تھا۔ رحیم داد نہا دھو کر اجلا لباس پہن چکا تھا۔

تاراں ناشتا لے کر آئی تو رحیم داد کرسی پر بیٹھا تھا۔ تاراں نے جھک کر ناشتا میز پر لگا دیا۔

رحیم داد نے کوئی بات نہیں کی، نہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔ خاموشی سے ناشتا کرنے لگا۔ تاراں اس کے سامنے خاموش کھڑی رہی۔ ذرا دیر بعد اس نے خود ہی خاموشی توڑی، معذرت کے انداز میں بولی۔ "معاف کرنا جی! رات حمدے نے آنے ہی نہیں دیا۔ اسے بہت زور کا بکھار ہے۔ رات بھر نہیں سویا۔ ہائے ہائے کرتا رہا۔"

رحیم داد نے اس کی جانب دیکھے بغیر پوچھا۔ "اب کیسی ہے اس کی طبیعت؟"

"اب تو جی ٹھیک ہی لگتی ہے۔ کہتا تھا، زمیں دارنی سے دوائی لے کر کھاؤں گا۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "زمیں دارنی اب کیسی ہے؟"

"میں سویرے سویرے اس کے پاس گئی تھی۔" تاراں نے بتایا۔ "اب تو وہ بالکل چنگی لگتی ہے پر بکھار سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔ ویسے وہ پریشان بھی ہے۔ زمیں دار شام کا گیا، اب تک نہیں لوٹا۔"

"آتا ہی ہوگا۔" رحیم داد نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ "رات بھر بارش ہوتی رہی، آتا کیسے۔ پڑوس کے کسی زمیں دار کے پاس ٹھہر گیا ہوگا۔"

"پر اب تو سویرا ہوئے بہت دیر ہو گئی، اسے اب تک آجانا چاہیے تھا۔ زمیں دارنی تو اداس

بیٹھی ہے۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ تاراں نے برتن اٹھائے اور کمرے سے چلی گئی۔ رحیم داد کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ باغ میں گھاس اور پودوں پر بارش کی بوندیں جھلملا رہی تھیں۔ ایک کیاری کے پاس بوڑھا مالی سر جھکائے کھرپی سے جنگلی بوٹیاں اور گھاس پھوس کھود کھود کر نکال رہا تھا۔ آسمان پر بکھرے ہوئے بادلوں کے سفید سفید گالے تیزی سے دوڑ رہے تھے۔ ان کے پیچھے گہرا نیلا آسمان کہیں کہیں سے جھانک رہا تھا۔ بادل کا ٹکڑا گزرا تو سورج بھی چمکتا نظر آیا۔ بھیگے ہوئے درختوں پر دھوپ پھیل گئی۔ دھوپ کی تیزی اور چمک دمک دیکھ کر رحیم داد نے اندازہ لگایا کہ پہر دن گزر چکا ہے۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اسے اللہ وسایا یاد آگیا۔ وہ سوچنے لگا، احسان شاہ نے اللہ وسایا کی لاش نہ معلوم کس طرح ٹھکانے لگائی۔

اس کے چہرے پر پریشانی بکھر گئی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ مہمان خانے میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ تاراں بھی دوبارہ نہیں آئی۔ وہ خوف اور تشویش میں مبتلا چپ بیٹھا تھا۔ اسی اثنا میں حویلی کے اندر سے رونے اور بین کرنے کی آوازیں ابھریں اور رفتہ رفتہ اونچی ہوتی گئیں۔

رحیم داد فوراً تاڑ گیا کہ اللہ وسایا کی ہلاکت کی خبر حویلی میں پہنچ گئی ہے۔

رحیم داد کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اسی وقت تاراں صحن میں داخل ہوئی اور سینے پر دوہتڑ مار کر زور سے چیخی۔ "ہائے ربّا میں مر گئی۔ زمیں دار کو کتل کر دیا گیا۔"

رحیم داد تیزی سے آگے بڑھا۔ قریب پہنچا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "تیں نوں کیسے پتہ چلا، زمیں دار کو کتل کر دیا گیا؟"

"اس کی لاش نہر میں پڑی ہوئی ملی ہے۔" وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔ "پڑوس کے چک کے دو مزارعوں نے لاش پہچان لی۔ وہی ادھر آئے تھے۔ بتاتے تھے، زمیں دار کتل کر دیا گیا۔"

رحیم داد گھبرایا ہوا حویلی کی جانب بڑھا۔ تاراں اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دونوں دروازے سے گزر کر حویلی کے اندر پہنچے۔ وہاں ہر طرف کہرام برپا تھا۔ رحیم داد نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر جمیلہ کو تلاش کیا مگر وہ کہیں نظر نہ آئی۔ البتہ اس کے دونوں معصوم بچے طویل دالان کے ایک گوشے میں چپ کھڑے تھے۔ وہ حیرت سے ایک ایک کا منہ تک رہے تھے۔ رحیم داد کی ان پر نظر پڑی تو تڑپ اٹھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب گیا۔ دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ نہ نینا نے کچھ کہا، نہ گڈو بولا۔ دونوں بچے گم صم رحیم داد کو منہ اٹھائے دیکھ رہے تھے۔

دالان اور صحن میں گاؤں کی عورتیں اور حویلی کی خادمائیں اداس اور غم زدہ کھڑی تھیں۔ نوکر چاکر حیران و پریشان ادھر ادھر آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ ایک کونے میں احمد دیوار سے ٹیک لگائے، منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے نزدیک جاکر دریافت کیا۔

"ممدے! زمیں دارنی کدھر ہے؟"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ تو جی لاش دیکھنے نہر کی طرف گئی ہے۔"

"اسے گئے کتنی دیر ہوگئی؟" رحیم داد نے پوچھا۔ "اکیلی ہی چلی گئی؟"

"وہ اکیلی کیسے جاسکتی ہے۔ اسے تو کئی روز سے بکھار بھی ہے۔" احمد کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "وہ تانگے میں گئی ہے۔ نوکر بھی ساتھ گئے ہیں۔ اسے گئے ہوئے دیر ہوگئی۔ اب تو وہاں پہنچ بھی گئی ہوگی۔"

"لاش نہر میں کہاں پائی گئی؟"

"یہاں سے چھ سات میل ادھر حویلی روڈ پر ڈیرا میراں کے پاس ملی ہے۔" احمد نے مشرق کی سمت ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "لاش نہر کی پلی کے ساتھ پڑی ہے۔"

رحیم داد خاموشی سے حویلی کے پھاٹک کی جانب بڑھا۔ احمد کی باتوں سے اسے یہ سراغ مل گیا تھا کہ احسان شاہ نے قتل کے بعد لاش راتوں رات اپنے علاقے سے میلوں دور نہر میں ڈلوادی۔ اس کا گاؤں، پیراں والہ تحصیل دیپالپور میں واقع تھا اور مغرب کی سمت تھا۔ لاش تحصیل دیپال پور کی حدود سے باہر تحصیل پاک پتن کی سرحد پر ڈلوائی تھی تاکہ پولیس کو مغالطے میں ڈال دیا جائے اور قتل کا مقدمہ درج کرنے کے معاملے میں دونوں تحصیلوں کے تھانوں میں تنازع پیدا ہوجائے اور ابتدائی مرحلے ہی میں تفتیش التوا میں پڑجائے۔

رحیم داد حویلی سے نکل کر باہر گیا۔ پھاٹک کے سامنے میدان میں درختوں تلے گاؤں کے بہت سے بوڑھے اور جوان جمع تھے۔ جواب تک نہیں پہنچ سکے تھے، وہ کھیتوں اور گھروں سے نکل نکل کر حویلی کی سمت آرہے تھے۔ مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں۔ سب کے چہرے سوگوار اور آنکھیں ویران تھیں۔ کچھ زاروقطار رو رہے تھے، کچھ سر جھکائے غم سے نڈھال کھڑے تھے۔ عورتیں اونچی آواز سے بین کر رہی تھیں۔ رحیم داد کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہوا کہ گاؤں کے سبھی رہنے والے اللہ وسایا سے پرستش کی حد تک محبت کرتے ہیں۔ ان کی گریہ وزاری اور بے قراری یہی بتاتی تھی۔

رحیم داد کو دیکھ کر پھاٹک کے سامنے کھڑے ہوئے لوگوں نے اونچی آواز سے سلام کیا۔ رحیم داد آگے بڑھا اور سر جھکا کر ان کے قریب ہی کھڑا ہوگیا۔ حویلی کے ایک نوکر نے جھٹ چارپائی لاکر ڈال دی۔

رحیم داد بیٹھ گیا۔ بادلوں کے درمیان سے جھانکتا ہوا سورج اب بہت بلندی پر پہنچ گیا تھا۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ رحیم داد سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ آیا وہ گھوڑی پر بیٹھ کر وہاں جائے جہاں لاش پڑی ہے یا حویلی کے باہر پرسے کے لیے آنے والوں کے درمیان بیٹھا رہے اور لاش آنے کا انتظار کرے؟ وہ اسی تذبذب میں افسردہ بیٹھا تھا کہ نہر کی جانب سے ایک نوجوان سائیکل دوڑاتا ہوا درختوں کی آڑ سے نکلا۔ رحیم داد نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ اللہ وسایا کا ملازم نام دار تھا۔ تمام نظریں اس کی جانب اٹھ گئیں۔ وہ اطلاع ملتے ہی سائیکل پر لاش دیکھنے چلا گیا تھا، اب واپسی ہوئی تھی۔

نام دار قریب آیا تو سب اس کے چاروں طرف حلقہ بنا کر کھڑے ہوگئے۔ ہر طرف سے سوالات کی بوچھار شروع ہوگئی۔ رحیم داد نے اسے اپنے پاس بلایا۔

"نام دار کیا خبر لایا۔ پتہ چلا، لاش کس کی ہے؟"

اس نے منہ بسور کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "لاش تو جی اپنے زمیں دار ہی کی ہے۔ زمیں دارنی بھی پہنچ گئی ہے۔ اس نے بھی لاش پہچان لی ہے۔"

یہ سنتے ہی امید کی ہلکی سی رمق بھی مٹ گئی۔ مجمع میں کہرام مچ گیا۔ کچھ لوگ تو اس قدر دل گرفتہ ہوئے کہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ سوگوار چہرے اور دھندلے پڑگئے۔ ویران آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ آہوں اور سسکیوں سے فضا دھواں دھواں ہوگئی۔

آہ وزاری کا طوفان ذرا تھما تو رحیم داد نے نام دار سے دریافت کیا۔ "زمیں دارنی کب تک آئے گی؟"

"پتہ نہیں جی لگتا ہے، وہ تو دیر ہی سے لوٹے گی۔"

"پولیسے بھی پہنچے کہ نہیں؟"

"کیوں نہیں پہنچے جی۔" نام دار نے مستعدی سے جواب دیا۔ "تھانے دار دو کانشیبلوں کے ساتھ سویرے سویرے پہنچ گیا تھا۔ اسی نے لاش نہر سے باہر نکلوائی۔ میں پہنچا تو لاش نہر کے پاس ریت پر چادر سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ تھانے دار ان بندوں سے پوچھ تاچھ کر رہا تھا جنہوں نے سب سے پہلے لاش نہر کی پلی کے نیچے پڑی دیکھی تھی۔ وہ پاس کے پنڈ کے رہنے والے ہیں۔"

"تیں نوں پتہ ہے، لاش کب تک آئے گی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"میں کیا بتا سکتا ہوں جی!" نام دار نے سادگی سے کہا۔ "ابھی تو جی تھانے دار بیانات شیانات لکھ رہا ہے۔ بعد میں اپنی کارروائی ڈالے گا۔" اس نے رحیم داد کی جانب غور سے دیکھا۔ "تسں نوں پتہ ہی ہوگا۔ کارروائی ختم ہونے کے بعد تھانے دار لاش کو، وہ کیا کہتے ہیں جی!" وہ بولتے بولتے اٹکا۔ "یاد آیا، پوسٹ مارٹم کے لیے شہر لے جائے گا۔ زمیں دارنی کہتی تھی، وہ بھی لاش کے ساتھ شہر جائے گی اور اسے اپنے ساتھ ہی لے کر آئے گی۔" رحیم داد نے اور کچھ نہیں پوچھا۔ نام دار آگے بڑھا اور تعزیت کے لیے آنے والوں کے ہجوم میں مل گیا۔

رحیم داد چارپائی پر خاموش بیٹھا تھا۔ کتنے ہی مزارعے اور کمی اس کی چارپائی کے اردگرد فرش پر بیٹھے تھے۔ سب اللہ وسایا کی موت پر رنج والم کا اظہار کر رہے تھے۔ سرگوشیوں میں قتل کے بارے میں قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ رحیم داد نے نہ کسی کو ٹوکا، نہ کسی کے سامنے اپنی رائے ظاہر کی۔ وہ غم زدہ بھی تھا اور خوف زدہ بھی۔

آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ کبھی دھوپ نکل آتی، کبھی سایہ ہو جاتا۔ وقت گزرتا رہا۔ دوپہر ہو گئی، سہ پہر ہو گئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ نہ کوئی اپنے گھر گیا نہ کھیتوں پر۔ کسی نے بھی اللہ وسایا کے سوگ میں کچھ نہیں کھایا۔ پیاس لگتی تو وہ ایک درخت کے نیچے رکھے ہوئے مٹی کے بڑے مٹکے سے پیالے میں پانی نکال کر پی لیتے۔ رحیم داد بھی ان کے ساتھ بھوکا بیٹھا رہا۔ البتہ پانی بار بار پیتا رہا۔

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے سرکاری اسپتال کی ایمبولنس گاؤں میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی ہلچل مچ گئی۔ ایمبولنس حویلی کے پھاٹک کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ دروازہ کھلا۔ جمیلہ ایک نوکر کے ہم راہ اتری۔ اس کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں۔ بال بکھر کر پریشان ہو گئے تھے۔ پھول کی مانند شگفتہ چہرہ مرجھا کر مٹیالا پڑ گیا تھا۔ اللہ وسایا کی لاش اسٹریچر پر ڈال کر نیچے اتاری گئی۔ مرد بے قرار ہو کر لاش کی طرف بڑھے۔ عورتیں بھی حویلی سے باہر آ گئیں۔ زبردست ماتم ہونے لگا۔ رحیم داد لرز کر رہ گیا۔

لاش اسٹریچر سے اٹھا کر اس چارپائی پر لٹا دی گئی جس پر کچھ دیر پہلے رحیم داد بیٹھا تھا۔ لاش پر اسپتال کی سفید چادر پڑی تھی، اسے جلد ہی ہٹا کر دوسری چادر ڈال دی گئی۔ ڈرائیور اور اسپتال کے دوسرے ملازمین نے، جو لاش کے ساتھ ہی آئے تھے، چادر اور اسٹریچر اٹھا کر ایمبولنس میں رکھا۔ اس میں دوبارہ سوار ہوئے۔ ایمبولنس کا انجن اسٹارٹ ہوا۔ ذرا دیر بعد ایمبولنس گاؤں کی حدود سے نکل گئی۔ لاش کچھ دیر پھاٹک کے سامنے میدان میں رکھی رہی، پھر حویلی کے اندر پہنچا دی گئی۔ جمیلہ پہلے ہی اندر جا چکی تھی۔

رحیم داد مزارعوں اور کمیوں کے درمیان باہر کھڑا رہا۔ لاش پہنچنے کی اطلاع ملتے ہی آس پاس کے گاؤں اور چکوں کے لوگ بھی پرے کو پہنچنے لگے۔ مجمع بہت بڑھ گیا تھا۔ حویلی سے عورتوں کے بین کرنے اور زور زور سے رونے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ برسات کی ملگجی شام آہستہ آہستہ در و دیوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ دھندلکا پھیل کر تاریک ہو گیا۔ گاؤں کی مسجد سے اذان بلند ہوئی۔ رحیم داد دوسرے لوگوں کے ساتھ مسجد کی جانب روانہ ہوا۔

حویلی کی بیرونی دیوار کے ساتھ ٹین کی چھت کا طویل سائبان تھا۔ اس میں کبھی حویلی کے تانگے کھڑے ہوتے تھے۔ مگر فرقہ وارانہ فسادات کے دنوں میں جب تانگے بان دونوں تانگے لے کر چمپت ہو گئے تو سائبان عرصے تک اجاڑ پڑا رہا۔ پھر اللہ وسایا نے اسے صاف کرایا۔ وہ اکثر شام کو وہاں کچہری لگاتا اور چارپائی پر بیٹھ کر مزارعوں کے ساتھ بات چیت کرتا۔ زمین داری کے مسائل طے کرتا۔ اب اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ ایک پیٹرومیکس روشن کر کے سائبان کے نیچے اسٹول پر رکھ دیا گیا تھا۔

سائبان کے نیچے اور سامنے کے میدان میں دریاں اور چٹائیاں بچھا دی گئی تھیں۔ پرسے کے لیے آنے والے چٹائیوں او دریوں پر بیٹھتے جا رہے تھے۔ سائبان کے قریب ہی ایک درخت کے نیچے گاؤں کا درزی چٹائی پر بیٹھا کفن تیار کر رہا تھا۔ رحیم داد نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے سیدھا سائبان کے نیچے پہنچا اور دیر تک پرسا دینے والوں کے درمیان دری پر بیٹھا رہا۔

رات اداس اور تاریک تھی۔ ہوا سسکیاں بھر رہی تھی۔ رحیم داد سائبان کے نیچے سے نکلا اور حویلی میں چلا گیا۔ دالان میں بھی پیٹرومیکس روشن تھا۔ اس کی تیز روشنی میں چارپائی پر اللہ وسایا کی میّت رکھی تھی۔ اس پر چادر پڑی تھی۔ جمیلہ چارپائی کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ تڑپ کر زور سے چیخی۔ "چوہدری! میں لٹ گئی۔ ہائے ربّا میں کیا کروں۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ چارپائی کی پٹی پر زور سے مارے۔ کلائیوں میں پڑی ہوئی شیشے کی چوڑیاں چھناکے سے ٹوٹ کر دور تک بکھر گئیں۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کے دونوں بچے قریب ہی بیٹھے تھے۔ ماں کی آہ وزاری دیکھ کر گڈّو سہمی سہمی نظروں سے اس کا منہ تکنے لگا۔ نینا نے رونے کے لیے منہ بسورا۔ چارپائی کے اردگرد بیٹھی ہوئی عورتیں بھی اونچی آواز سے رونے لگیں۔

رحیم داد کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ وہ سر جھکائے جمیلہ کے قریب چپ کھڑا رہا اور آہستہ آہستہ سسکیاں بھرتا رہا۔ اس نے آنسو پونچھے اور جمیلہ کو تسلی دینے لگا۔ "زمیں دارنی! صبر کر۔ اللہ کی یہی مرضی تھی۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ آنکھوں میں دوبارہ آنسو امڈ آئے۔ وہ مڑا اور جمیلہ

سے کچھ فاصلے پر ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔

عورتیں مسلسل پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ جمیلہ نے ایک بار پھر بے قرار ہو کر چیخ ماری۔ "ہائے وے شیر جوانا۔" اس نے اپنا سر چارپائی کی پٹی پر رکھ دیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔ یکایک گریہ وزاری کی دردناک آوازوں کے درمیان ایک اونچی آواز ابھری۔ یہ حویلی کی میراثن کی آواز تھی۔ اس نے جواں مرگ اللہ وسایا کی پٹی پر الاہنی شروع کی۔ اس کی آواز کے ساتھ ہی ساری آوازیں دھیمی پڑ گئیں۔ میراثن سوز کے انداز میں بین کرنے لگی۔

موت چھیندی آئی بیٹھی پا داتل 'ہائے وے شیر جوانا!!
گھنن نہ ویندی ساہ 'کرن نہ دیندی گل 'ہائے ے شیر جوانا

الاہنی کے بول پر عورتیں سینے پر دوہتڑ مارتیں۔ اونچی آواز سے تڑپ کر کہتیں۔ "ہائے ہا 'ہائے ہا۔"

لیکن جمیلہ پٹی پر اپنی پیشانی ٹکائے صرف سسکیاں بھر رہی تھی۔ میّت کے سرہانے عود دلوبان سلگ رہا تھا۔ اس کے بل کھاتے 'لہراتے مرغولوں میں سارے سوگوار چہرے دھواں دھواں نظر آرہے تھے۔ فضا پر موت کا سایہ منڈلا رہا تھا۔ میراثن درد بھری آواز میں نوحہ کر رہی تھی۔

پانی تتا کرایا شرطاں نال نہوایو!!
کھپن منگوایو زری دا 'لاڑے نو پوایو!
چونہ جنیاں رل چکیو 'منزلو منزل پچایو!
جنگل آئی رات 'اوس ہنیر کدی نہ مایو
ہائے وے شیر جوانا 'ہائے وے شیر جوانا!

ساون کی کالی کلوٹی رات دم بخود تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا کے جھونکے سوز کی لے میں گھل مل کر میراثن کے ساتھ بین کر رہے تھے۔

پانی گرم کرایا گیا
میت کو رواج کے مطابق غسل دیا گیا
زری کا کفن منگوایا گیا 'دولہا کو پہنایا گیا
چار آدمیوں نے مل کر جنازے کو کندھا دیا
اسے آخری منزل تک پہنچایا گیا
آج اس کی زندگی کی شام ہے

جنگل کی رات ہے اور تاریکی نے ڈیرا ڈال رکھا ہے
اس اندھیری قبر میں کوئی نہ جائے
ہائے جواں مرگ شیر 'ہائے جواں مرگ شیر!

میراثن دھیمے سر میں الاہنی کے بول الاپتی رہی 'بین کرتی رہی۔ ہوا کی سسکیاں ابھرتی رہیں۔ جنازے کے پاس بیٹھی ہوئی عورتیں سینہ کوبی کرتی رہیں۔ بے قرار ہو کر ہائے ہا 'ہائے ہا کی دل دوز صدائیں بلند کرتی رہیں۔ عود دلوبان کا دھواں لہراتا اور پھیلتا رہا 'دکھ کا سایہ بن کر فضا میں منڈلاتا رہا۔ ساری آوازیں سو گئی تھیں۔ صرف ایک آواز جاگ رہی تھی۔ یہ الاہنی کے بولوں کی شکل میں موت کی آواز تھی۔

رات گزرتی جا رہی تھی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ رحیم داد خاموشی سے اٹھا اور حویلی سے باہر آگیا۔ سائبان کے نیچے پہنچ کر اس نے گاؤں کے بڑے بوڑھوں سے مشورہ کیا اور یہ طے کیا گیا کہ لاش اب زیادہ دیر رکھنا ٹھیک نہیں۔ اسے عشاء کے بعد دفنا دیا جائے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد رحیم داد نے مسجد کے ملاّ کو بلایا اور اس کے ہم راہ دوبارہ حویلی میں گیا۔ جمیلہ ابھی تک چارپائی کی پٹی پر سر رکھے سسکیاں بھر رہی تھی۔ دو عورتوں نے اسے سنبھالا۔ ہولے سے کھینچ کر چارپائی کے قریب سے اٹھایا۔ چارپائی میت کے ساتھ اٹھا کر صحن کی پڑچھتی میں پہنچا دی گئی۔ ملا نے میّت کو غسل دیا۔ درزی نے کفن تیار کر دیا تھا۔ میت کفنا کر اس پر سیاہ چادر ڈال دی گئی اور چارپائی پر رکھ کے آخری دیدار کے لیے ایک بار پھر اسے دالان میں رکھ دیا گیا۔ دالان میں ہر سو کافور کی تیز بو پھیل گئی۔

کچھ دیر بعد جنازہ حویلی سے باہر لے جایا گیا۔ جمیلہ چیخ چیخ کر روتی ہوئی پھاٹک تک گئی۔ کئی عورتیں اسے سنبھالے ہوئے تھیں۔ مردوں نے بڑھ کر جنازہ اٹھایا۔ ایک بار پھر زبردست کہرام مچ گیا۔ رونے کی آوازیں رات کے سناٹے میں گونجنے لگیں۔ جنازہ مسجد کے دروازے تک پہنچایا گیا۔ نماز عشاء کے بعد نماز جنازہ ہوئی۔ جنازہ دوبارہ کندھوں پر اٹھایا گیا اور گاؤں کے قبرستان میں پہنچا دیا گیا۔ قبر پہلے ہی سے تیار تھی۔ میت قبر میں اتاری گئی۔ مٹی ڈال کر قبر بھر دی گئی۔ مسجد کے ملاّ نے فاتحہ خوانی کی۔ ہاتھ اٹھا کر اللہ وسایا کے لیے مغفرت کی دعا کی۔ سب لوگ واپس حویلی پہنچ گئے۔

کوڑا وٹایا کڑوی روٹی مزارعے لائے تھے۔ اللہ وسایا یا جمیلہ کا کوئی ایسا رشتہ دار یا شریکا نہ تھا جو ٹالاتا۔ مزارعے یہ جانتے بھی نہیں تھے۔ وہ اللہ وسایا کے غم میں بری طرح دل گرفتہ تھے۔

اس روز گاؤں کے کسی گھر میں کھانا نہیں پکا۔ کسی باورچی خانے سے دھواں نہ اٹھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ البتہ گاؤں کی کئی عورتیں حویلی میں موجود رہیں۔

رحیم داد نے بھی سب کی ساتھ ہی کھانا کھایا تھا۔ کھانے کے بعد وہ حویلی میں گیا۔ مہمان خانے پہنچا۔ احمد کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں تھی۔ مگر وہ بھی مہمان خانے میں تھا۔

☆

صبح رحیم داد نہا دھو کر بیٹھا ہی تھا کہ احمد نے آکر اطلاع دی کہ تھانے دار ایک کانسٹیبل کے ہم رہ آیا ہے۔ رحیم داد کا چہرہ فق ہو گیا۔ احمد اطلاع دے کر چلا گیا۔ رحیم داد کی پریشانی اور گھبراہٹ اس قدر بڑھی کہ اس نے گھوڑی پر سوار ہو کر احسان شاہ کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ مگر اس ڈر سے نہیں گیا کہ گاؤں سے باہر جانے پر شک و شبہ پیدا نہ ہو۔ اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی اور تھانے دار کا انتظار کرنے لگا۔

رحیم داد کی نظریں ہر آہٹ پر بیرونی دروازے کی جانب اٹھ جاتی تھیں۔

پہر دن گزر گیا۔ سورج چڑھ کر اوپر آگیا۔ مگر تھانے دار مہمان خانے میں نہیں آیا، صرف احمد آیا۔ رحیم داد نے پرسے کے لیے آنے والوں کے بارے میں ادھر ادھر کی بات کی پھرا نکتے ہوئے دریافت کیا۔

"پولیسیے ابھی تک حویلی میں ہیں؟"

"وہ تو جی کب کے چلے گئے۔ انھوں نے صرف زمیں دارنی سے پوچھ تاچھ کی تھی۔"

"کیا پوچھتے تھے؟"

"پتہ نہیں۔" احمد نے جواب دیا۔ "زمیں دارنی ہی کو ملوم ہوگا، پر جی وہ کیا گل بات کر سکتی ہے۔ اس سے تو بولا بھی نہیں جاتا۔ چپ بیٹھی رہتی ہے یا رونے لگتی ہے۔ اس کا تو جی بہت برا حال ہے۔ کئی بار تو بے ہوش ہو چکی ہے۔"

رحیم داد مہمان خانے سے نکلا، سائبان کے نیچے پہنچا۔ وہاں سویرے سویرے پھوہڑی بچھا دی گئی تھی۔ پرسے کے لیے آنے والے اس پر بیٹھے تھے۔ رحیم داد بھی دیوار سے ٹیک لگا کر پھوہڑی پر بیٹھ گیا۔

مردوں سے زیادہ عورتیں تھیں۔ عورتیں حویلی کے اندر چلی جاتیں۔ دالان میں بھی پھوہڑی بچھی تھی۔ یہ دریوں کا فرش تھا، جن پر چھپی ہوئی چادریں پڑی تھیں۔ جمیلہ دالان کے ایک ستون کے سہارے پھوہڑی پر نڈھال بیٹھی تھی۔ ہر ایسی عورت جو پہلی بار پاس پڑوس کے کسی گاؤں سے آتی یا اللہ وسایا کے کنبے برادری سے اس کا کوئی رشتہ ناتا ہوتا، وہ جمیلہ کے گلے سے لگ کر زور زور سے روتی۔ جمیلہ کے گرد نیم دائرے میں بیٹھی دوسری عورتیں بھی رونے لگتیں۔ سینے پر دوہتڑ مارتیں اور ہائے ہا! کے نعرے بلند کرتیں۔

حویلی کے اندر سے عورتوں کی آہ و زاری سن کر باہر پھوہڑی پر بیٹھے ہوئے مرد اونچی آواز سے کلمہ پڑھتے۔ دوپہر کو تعزیت کرنے والوں کی تعداد گھٹ کر بہت کم رہ گئی۔ وہ کھانا کھانے یا اپنے ضروری کام کاج کرنے کے لیے چلے گئے تھے۔ مگر شام ہوتے ہوتے تعزیت کرنے والوں کی تعداد میں پھر اضافہ ہو گیا۔ اندھیرا بڑھا تو پیٹرومیکس روشن کر دیا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد تاراں خوان پوش سے ڈھکا ہوا تھال سر پر رکھے حویلی سے نکلی اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی ہوئی مسجد کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ ملّا کے لیے فاتحہ کا توشہ لے کر جا رہی تھی۔ یہ بج کڑ کا تھا۔

تیسرے روز تیجا تھا۔ اس روز بھی گاؤں کے سارے مرد اور عورتیں حویلی پہنچے۔ مسجد کے ملّا نے فاتحہ خوانی کی۔ سب نے کھانا کھایا۔ کھانے کے ساتھ گیہوں کی گھنگنیاں بھی تھیں۔ رحیم داد ڈرا سہما ہوا تھا۔ اس کی نظریں بار بار اس راستے کی طرف اٹھ جاتیں جو نہر کی سمت جاتا تھا۔ اسے پولیس کے آنے کا دھڑکا تھا۔ وہ رات گئے تک پریشان رہا مگر کوئی پولیس والا نہیں آیا۔

تیجے کے چند روز بعد ایک پولیس انسپکٹر دو کانسٹیبلوں کے ہم راہ آیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ رحیم داد مہمان خانے میں کھانا کھا رہا تھا۔ اسے احمد سے پولیس کے آنے کی اطلاع ملی۔ وہ ایک بار پھر سراسیمہ ہو گیا۔ اس کے لیے کھانا دوبھر ہو گیا۔ لیکن اس روز بھی کوئی پولیس والا اس کے پاس نہیں آیا۔ مگر جب تک انسپکٹر اور کانسٹیبل حویلی میں موجود رہے، اس پر خوف طاری رہا۔ بعد میں اسے احمد کی زبانی معلوم ہوا کہ پولیس نے جمیلہ کا بیان لیا، حویلی کے بعض نوکروں سے پوچھ گچھ کی۔ دن ڈھلے پولیس والے ضابطے کی کارروائی مکمل کر کے چلے گئے۔

دن گزرتے رہے۔ سات روز تک مسجد میں ہر شام ملّا کے لیے بج کڑ کا بھیجا گیا۔ خیرات دی گئی۔ فاتحہ خوانی ہوئی۔ پرسے کے لیے اکٹھا ہونے والوں نے بھی فاتحہ کے بعد کھانا کھایا۔

تیرہ روز تک حویلی کے اندر اور باہر پھوہڑی بچھی رہی۔ صبح سے شام تک پرسا دینے والے آتے رہے۔ رحیم داد سائبان میں ان کے ساتھ بیٹھتا۔ بات چیت کرتا۔ اس تمام عرصے میں نہ اس نے جمیلہ کو دیکھا، نہ اس سے ملاقات ہوئی۔ عورتیں ہر وقت حویلی میں جمیلہ کے گرد اکٹھا رہتیں۔ رات گئے تک اس کے ساتھ بیٹھی رہتیں۔ اس کی دل جوئی کرتیں، تسلی دیتیں۔

رحیم داد نہ حویلی میں گیا نہ اس نے جمیلہ سے ملنے کی کوشش کی۔ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتا تھا۔ جمیلہ عدت میں تھی۔ وہ حویلی کی چار دیواری سے باہر نہیں جاسکتی تھی نہ کسی نامحرم کے سامنے آسکتی تھی۔ مسجد کے ملاّ نے یہی بتایا تھا۔ رحیم داد بھی نامحرم تھا لہٰذا وہ جمیلہ سے نہیں ملا۔ نہ احسان شاہ کی حویلی گیا اور نہ اس سے کوئی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔

تیرھویں روز شام کو پھوہڑی اٹھا دی گئی اور رسمی طور پر اللہ وسایا کا سوگ ختم کردیا گیا۔ البتہ عورتوں کی حد تک تعزیت کرنے کا سلسلہ چلتا رہا۔ گاؤں کی عورتیں جمیلہ کی دل جوئی کے لیے آتی رہیں۔ جمیلہ بات بات پر رونے لگتی۔ اللہ وسایا کی موت سے جو رنج و غم مسلط ہوا تھا، وہ اس سے ہنوز نہیں سنبھلی تھی۔

رحیم داد پھوہڑی اٹھنے کے بعد مہمان خانے ہی میں رہتا۔ بارش نہ ہوتی تو شام کو باغ میں جاکر بیٹھ جاتا۔ ایک شام وہ تنہا بیٹھا تھا کہ جمیلہ نے اسے حویلی میں بلوایا۔ رحیم داد گیا۔ جمیلہ دالان کے ایک گوشے میں پیڑھ موڑے کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ سفید چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اس نے پلو سے بکل مار کر اپنا پورا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ قریب ہی فرش پر پھاتاں بیٹھی تھی۔ رحیم داد دونوں سے ذرا ہٹ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جھٹ پٹے میں حویلی پر ویرانی برس رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ کچھ دیر بعد جمیلہ کی آواز ابھری۔

"چوہدری! میں نے تجھے اس لیے بلایا ہے، کل کبیر والا سے چوہدری اکرم کا چچیرا اور بھرجائی آئے تھے۔ ویسے تو اللہ وسایا کے پرسے کو آئے تھے پر چلتے چلتے انھوں نے بتایا کہ اکرم نے اپنی دھی کا رشتہ تیرے ساتھ توڑ دیا۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں تو رانڈ ہوگئی چوہدری، پر میرے رانڈ ہونے سے تیرا گھر کیوں نہ بس سکا؟ لگتا ہے، اللہ وسایا کی موت کو اکرم نے بدشگونی سمجھا اور رشتہ ختم کردیا۔"

"زمیں دارنی! تیرے رانڈ ہونے سے میرے ویاہ کا کیا ناتا۔ تو خاما خا اپنا دل میلا نہ کر۔ میرا تو پہلے بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تیں نوں پتہ ہی ہے، رشتہ جوڑنے والا تو اللہ وسایا ہی تھا۔ اس کے ساتھ ہی رشتہ بھی ختم ہوگیا۔ اب چوہدری اکرم کچھ ہی کہے، سچ پوچھ تو میں خود اسے توڑنے والا تھا۔ ذرا سوچ، ابھی اللہ وسایا کو گزرے دو ہی ہفتے ہوئے ہیں۔ میں کیسے ویاہ شیاہ کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔" رحیم داد نے جمیلہ کی دل جوئی کرنے کی کوشش کی۔ "زمیں دارنی! میری فکر نہ کر۔ اللہ وسایا کے بعد مجھے کچھ چنگا نہیں لگتا۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے چوہدری!" جمیلہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "اللہ وسایا کے بنا ایسا لگتا ہے جیسے حویلی اجڑ گئی، کچھ بھی نہ رہا۔ مجھ ابھاگن کو وہ اس حویلی میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔"

جمیلہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ پھاتاں نے جمیلہ کو روتے دیکھا تو خود بھی رونے لگی۔ چند لمحے فضا بے حد سوگوار رہی پھر پھاتاں نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے دل گرفتہ آواز میں کہا۔ "بھین جی! اس طرح کب تک روتی رہے گی۔ مجھے دیکھ، سات سال پہلے میرا گھر والا بھی ایسے ہی چھوڑ کر اپنے رب کے پاس چلا گیا۔ تاجاں تو ان دنوں ذرا سی چھوہری تھی۔"

"پھاتاں!" جمیلہ کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ "اب تاجاں حویلی میں نہیں رہ سکتی۔ تو اسے اپنے گھر لے جا، میں ٹھہری رانڈ۔ میرا تو اس پر سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ اب تو سہاگنیں مجھ سے دور بھاگیں گی۔ تاجاں تو ساہا بندھی کڑی ہے۔ مہینے دو مہینے بعد وہ بھی سہاگن بن جائے گی۔ اسے اب میرے ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔"

"بھین جی! تو کیسی گل کر رہی ہے۔" پھاتاں نے کہا۔ "تو رانڈ ہے تو میں کون سی سہاگن ہوں، میں بھی تو رانڈ ہوں۔ تاجاں اسی رانڈ کے سائے میں پل کر جوان ہوئی ہے۔ یہ تو سوچ، وہ تیرے پاس نہیں رہ سکتی تو میرے پاس کیسے رہے گی؟"

"تیری بات دوسری ہے۔ تو اس کی ماں ہے۔ یہ سوچ تیرے کنبے برادری والے کیا کہیں گے؟ رانڈ بیوہ کو تو بدشگونی سمجھا جاتا ہے۔ ویسے میں تو چاہتی تھی تاجاں میرے ساتھ رہے اور یہیں سے ویاہ کرا کے اپنے گھر والے کے سنگ جائے پر کیا کیا جائے، رانڈ کو برا سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کی یہی ریت ہے۔"

پھاتاں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "بھین جی! میں نوں کسی کی پروا نہیں کرنی۔ سات سال سے ساری بدشگونیاں دیکھ رہی ہوں اور سن رہی ہوں۔ میرے لیے یہ نئی گل نہیں۔ تو کچھ ہی کہے، تاجاں یہیں رہے گی اور تیرے ہی نال رہے گی۔ اس کا ویاہ بھی تو کرے گی اور جب چاہے تب کرے گی۔"

"سوچ لے۔" جمیلہ آہستہ سے بولی۔ "کنبے برادری والوں کے طعنے سننے پڑیں گے۔"

"پہلے بھی بہت سن چکی ہوں اور سن لوں گی۔ میں نوں کنبے برادری سے کیہہ لینا۔" پھاتاں اپنی بات پر اڑی رہی۔ "ویسے دوسروں کے منہ میں زبان ہے تو میں بھی گونگی نہیں۔ تو بالکل فکر نہ کر۔ تاجاں حویلی سے جائے گی تو ویاہ کر ہی جائے گی، ایسے نہیں۔ اب وہ میری نہیں، تیری امانت ہے۔ میں نے تو اسے تیرے حوالے کردیا۔ اب تو جانے اور تیری تاجاں جانے۔ ساہے کے بعد تو نے بھی

تو یہی گل کہی تھی۔ اپنی ہی گل اور اپنا ہی وعدہ بھول گئی۔"

رحیم داد آہستہ سے کھنکارا اور جمیلہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "زمیں دارنی! سنا ہے' پولیس تفتیش کو آئی تھی۔ تجھ سے پوچھ تاچھ بھی کی تھی۔ اللہ وسایا کے کتل کے بارے میں بھی پولیس سے کچھ پتہ چلا؟"

"پولیس نے کیا بتانا۔ اس نے تو اب تک کچھ نہیں کیا۔" جمیلہ کے لہجے میں تلخی تھی۔ "پہلے وہ تھانے دار آیا جس نے رپورٹ درج کی تھی۔ تفتیشی ٹیم کے ساتھ جائے واردات کا معائنہ کیا تھا۔ نہر سے لاش نکلوائی تھی۔ مشیرنامہ تیار کیا تھا۔ ضروری لکھا پڑھی کی تھی اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے پولیس سرجن کے پاس بجوائی تھی۔ وہ دیر تک مجھ سے الٹے سیدھے سوال کرتا رہا۔ اس کی باتوں سے تو ایسا لگتا تھا مانو اللہ وسایا کو میں نے ہی کتل کرایا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔ "تیں نوں کیسے پتہ چلا' اسے تجھ پر شبہ ہے؟"

"کہتا تھا' ہر کتل کے پیچھے کسی رن کا ہاتھ ہوتا ہے اور اگر مکتول کے گھر میں مطویہ رن ہو' تب تو کتل کا سبب عام طور پر وہی ہوتی ہے۔" جمیلہ نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "اس کے بعد وہ مجھ سے ایسی گلاں کرنے لگا کہ میرا جی چاہا' اس کا منہ نوچ لوں۔ پر میں نے دھیرج سے کام لیا۔ رو کر صرف اتنا کہا' کتل کی وجہ پرانی دشمنی بھی ہو سکتی ہے۔ زمیں داروں کے کتل تو عام طور پر پرانی دشمنی ہی کے کارن ہوتے ہیں۔ میں نے تو یہی سنا ہے۔ اخباروں میں پڑھا بھی ہے۔"

"یہ بات سن کر وہ کیا بولا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"پہلے تو اس نے کہا کہ اب تک کی کارروائی سے تو کوئی ایسا سراغ ملا نہیں۔ فیر اس نے پوچھا' مجھے کس کس پر شبہ ہے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا' اللہ وسایا کی صرف احسان شاہ سے دشمنی تھی۔ میں نے اسے دشمنی کی ساری وجہ بھی بتا دی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "مجھ سے گل بات کرنے کے بعد اس نے حویلی کے نوکروں سے بھی پوچھ تاچھ کی۔ فیر دوبارہ آنے کا کہہ کر چلا گیا۔"

"وہ دوبارہ پوچھ تاچھ کرنے آیا تھا؟"

"وہ تو نہیں آیا۔ آنا بھی نہیں چاہیے تھا اسے۔ میں نے اپنے وکیل عثمان رندھاوا کو بلوایا۔ اسے ساری بپتا سنائی۔ وہ فوراً تھانیدار سے ملا اور جب اسے بھی اندازہ ہو گیا کہ تھانیدار کیس دبا دینا چاہتا ہے تو اس نے اعلیٰ حکام کو درخواستیں بھیجیں۔ اس کی دوڑ بھاگ اور کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک نئے انسپکٹر کو تفتیش کے لیے لگایا گیا۔ اس نے نئے سرے سے تفتیش شروع کی۔"

جمیلہ آہستہ آہستہ بولتی رہی۔ "وہ پچھلے دنوں میرے پاس آیا تھا پر اس نے پہلے تھانے دار کی طرح الٹے سیدھے سوال نہیں کیے۔ میرا بیان لکھا' مجھے تسلی دی کہ کاتلوں کو جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس نے بھی حویلی کے نوکروں سے پوچھ تاچھ کی۔ وہ تیرے بارے میں بھی پوچھتا تھا۔"

"میرے بارے میں؟" رحیم داد نے حیران و پریشان ہو کر کہا۔ "میرے بارے میں کیوں پوچھتا تھا؟"

"پولیس کے بندوں کو تو جانتا ہی ہے وہ ہر ایک پر شبہ کرتے ہیں۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔ "پر میں نے جھٹ اس کا شبہ دور کر دیا۔ اسے صاف صاف کہہ دیا' چوہدری تو میرے بھائی سمان ہے۔ اس کے بارے میں تو کسی شک و شبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری باتوں سے وہ ایسا مطمئن ہوا کہ تیرے پاس پوچھ تاچھ کے لیے بھی نہ گیا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "اس کے جانے کے بعد اب تک کوئی تفتیش کو نہیں آیا۔"

"تیں نوں تو یہ بھی پتہ نہیں ہو گا کہ دونوں تھانے داروں کی تفتیش کا کیا نتیجہ نکلا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"جب کوئی آیا ہی نہیں تو کیسے پتہ چلتا۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میں نے وکیل کو فیر بلوایا ہے۔ وہ پتہ لگا کر بتائے گا' پولیس نے اب تک ضابطے کی کیا کارروائی کی ہے۔"

وکیل کے آنے کی اطلاع سے رحیم داد پریشان ہو گیا۔ مگر اس نے خود کو سنبھالا۔ جمیلہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے بولا۔ "لگتا ہے' پولیس کیس میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہی اور جب پولیس ہی دلچسپی نہ لے تو مجرموں کو کیسے پکڑا جا سکتا ہے۔ پر یہ تو بالکل طے ہے اللہ وسایا کو کتل کیا گیا ہے۔"

"یہ تو سبھی کو پتہ ہے۔ پولیس بھی مانتی ہے۔ تھانے دار کہتا تھا' پوسٹ مارٹم رپورٹ مل گئی ہے' اس میں بتایا گیا ہے اللہ وسایا کو گولی مار کر کتل کیا گیا۔ ایک گولی اس کی چھاتی میں لگی' دوسری سر میں۔ پر کس نے کتل کیا' کیوں کیا؟ اس کا اب تک کوئی سراغ نہیں ملا۔" جمیلہ نے گہری سانس بھری۔ "وہ جو بھی ہو اس نے مجھے برباد کر دیا۔ ہائے ربا یہ کیا ہو گیا۔" جمیلہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رحیم داد اسے تسلی دیتا رہا۔ صبر کی تلقین کرتا رہا۔

کچھ دیر بعد رحیم داد حویلی سے اٹھ کر مہمان خانے میں آ گیا۔ احمد موجود نہیں تھا لیکن کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ رحیم داد مہمان خانے میں نہیں ٹھہرا۔ جمیلہ سے ملنے کے بعد وہ شدید ذہنی الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسی عالم میں وہ باغ میں پہنچا۔ وہاں گہرا سناٹا تھا۔ رحیم داد وہاں بھی نہیں

رکا۔ باغ سے نکل کر نہر کی سمت چلنے لگا۔ کچھ ہی دور گیا ہو گا کہ ماکھا اندھیرے سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ رحیم داد ششدر رہ گیا۔ اس نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے پوچھا۔

"ماکھے! تو اس طرح اندھیرے میں کیوں چھپا کھڑا ہے؟"

"میں تو شام سے تیرا انتظار کر رہا تھا۔" ماکھا گڑگڑا کر بولا۔ "کئی بار باغ کی طرف بھی گیا پر تو نظر نہیں آیا۔ تجھ سے ملے بناں واپس بھی نہیں جا سکتا تھا۔"

"مجھ سے ملنا کیوں ضروری تھا؟"

"نراض نہ ہو۔" ماکھا عاجزی سے بولا۔ "شاہ جی نے کہلوایا ہے' تو کل شام تک اسے ضرور مل لے۔ کوئی ضروری گل کرنی ہو گی۔"

"ابھی تو میں اس کے پاس نہیں جا سکتا۔" رحیم داد تذبذب میں پڑ گیا۔ "شاہ جی سے کہنا' موقع ملا تو آجاؤں گا۔"

"میں نے تو جی' جو بتانا تھا' بتا دیا۔ آگے تیری مرضی۔"

"اب تو ٹر جا۔" رحیم داد نے بیزاری سے کہا۔

ماکھا چپ چاپ چلا گیا مگر رحیم داد کے ذہن میں تلاطم برپا کر گیا۔ وہ احسان شاہ سے ملنا تو چاہتا تھا مگر کچھ عرصے بعد۔ فی الحال وہ اس سے ملنے جلنے میں پوری احتیاط سے کام لینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے کانوں سے سن چکا تھا کہ جمیلہ کو احسان شاہ پر شبہ ہے۔ وہ پولیس سے بھی اس کا برملا اظہار کر چکی تھی۔ گاؤں میں ہر طرف ابھی تک اللہ وسایا کے قتل کا چرچا تھا۔ ایسی صورت میں اس کا گاؤں سے باہر جانا خواہ مخواہ بدگمانی پیدا کر سکتا تھا۔ دوسری طرف اسے یہ خیال بھی رہ رہ کر پریشان کر رہا تھا کہ احسان شاہ نے کوئی اہم اور ضروری ہی بات بتانے کے لیے اسے بلایا ہو گا' ورنہ وہ ماکھا کو اس کے پاس ہرگز نہ بھیجتا۔

رحیم داد کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس نے آگے جانے کا فیصلہ ملتوی کر دیا' مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا مہمان خانے میں پہنچ گیا۔ احمد اس کا انتظار کر رہا تھا۔ رحیم داد کے پہنچتے ہی وہ کھانا لے آیا اور میز پر چن کر خاموشی سے قریب ہی فرش پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔

احمد نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "چوہدری! کچھ پتہ چلا' زمیں دار کو کس نے کتل کیا؟"

"میں کیا بتا سکتا ہوں۔" رحیم داد بے نیازی سے بولا۔ "ابھی تو کوئی گرفتاری بھی نہیں ہوئی۔ میں نے یہی سنا ہے۔"

"کاتل تو جی پکڑے جا بھی نہیں سکتے۔"

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں؟"

احمد نے ادھر ادھر چوکنا نظروں سے دیکھا اور سرگوشی کرنے کے انداز میں آہستہ سے بولا۔ "میں نوں تو جی ایسا لگتا ہے۔ اللہ وسایا کو زمیں دارنی کے بھائیوں نے کتل کرایا ہے۔ وہ تو جی کتل کر کے کب کے سرحد پار نکل گئے ہوں گے۔ اب انہیں کون پکڑ سکتا ہے۔"

رحیم داد نے چونک کر احمد کو دیکھا۔ دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "تجھے کیسے پتہ چلا اللہ وسایا کو زمیں دارنی کے بھائیوں نے کتل کیا ہے؟"

"میں نے تو جی' یہ بات لوہار کے منڈے بابر سے سنی ہے اور اسے پٹواری کے چھوٹے بھائی نے بتائی تھی۔ وہ برابر کے پنڈ میں رہتا ہے۔ بابر سے اس کی پرانی یاری ہے۔" احمد دھیرے دھیرے بولتا رہا۔ "ویسے دیکھا جائے تو بات ٹھیک ہی لگتی ہے۔ زمیں دارنی کے بھائی اسے اپنے ساتھ سرحد پار لے جانے کے لیے سمگلروں کے ساتھ کئی بار آ چکے ہیں پر وہ نہیں گئی۔ انھوں نے سوچا ہو گا' اللہ وسایا کا کنڈا ہی ختم کر دو' تب تو وہ ان کے ساتھ چلی ہی جائے گی۔ اپنی سمجھ میں تو جی یہی آتا ہے۔"

"صرف بابر ایسی گل کرتا ہے یا پنڈ کے دوسرے بندے بھی ایسے ہی سوچتے ہیں؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"سچی گل تو ایہہ ہے جی' جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے' کوئی کچھ۔" احمد نے رحیم داد کی جانب نظریں اٹھائیں۔ "تیرا اپنا کیا وچار ہے چوہدری؟"

"تیری اور بابر کی گل سمجھ تو آتی ہے۔" رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "ایسا بالکل ہو سکتا ہے پر زمیں دارنی کو پتہ نہ چلے۔ وہ بہت نراض ہو گی۔ اپنے بھائیوں کے بارے میں وہ ایسی گل کیسے سن سکتی ہے۔"

"توبہ کرو جی! اسے تو بالکل پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ ایک دم بھڑک جائے گی۔"

رحیم داد کھانے سے فارغ ہوا۔ احمد برتن اٹھا کر جانے لگا۔ مگر جاتے جاتے ٹھٹکا اور الجھتے ہوئے بولا۔ "میں جی دیر سے لوٹوں گا۔"

"ویسے بھی رات کی روٹی کھلا کر تو کب جھیتی لوٹتا ہے۔ کبھی کبھی تو ساری رات نہیں آتا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تو نے شندو کے پاس جانا ہو گا؟"

"تاراں نے تجھے شکایت لگائی ہو گی۔" احمد نے مسکین سی شکل بنا کر کہا۔ "وہ تو جی ایسے ہی الٹی سیدھی باتیں سوچتی رہتی ہے۔"

"تو اسے ایسی باتیں سوچنے ہی کیوں دیتا ہے؟" رحیم داد نے کسی قدر سختی سے کہا۔ "وہ تیری گھر

والی ہے' تیرے بچوں کی ماں ہے۔ تجھے چاہیے کہ اسے خوش رکھے۔"

"میں تو جی اسے خوش رکھنے کی اپنے طور پر بہت کوشش کرتا ہوں' پر وہ تو بیکار کا جھگڑا کھڑا کر دیتی ہے۔"

رحیم داد نے تاراں کا ذکر جان بوجھ کر چھیڑا تھا۔ وہ اسے احمد کے ذریعے بلانا چاہتا تھا' مگر ہمت نہ پڑی۔ احمد چلا گیا۔

رحیم داد صحن میں پڑی ہوئی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ ہوا نرم اور خنک تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل بکھرے ہوئے تھے۔ بارش کا کوئی امکان نہیں تھا۔ رحیم داد زیادہ دیر خاموش نہ بیٹھ سکا' بے چین ہو کر اٹھا اور آہستہ آہستہ صحن میں ٹہلنے لگا۔ وہ ادھیڑبن میں مبتلا تھا۔ باربار سوچ رہا تھا کہ احمد نے اللہ وسایا کے قتل کے بارے میں جس خیال کا اظہار کیا ہے' اگر اسے گاؤں میں پھیلا دیا جائے اور پولیس کے کانوں میں بھی ڈال دیا جائے تو نہ صرف تفتیش کی نوعیت بدل جائے گی بلکہ قتل کی واردات دبانا بھی آسان ہو جائے گا۔ مگر پولیس کو اس انداز سے سوچنے پر صرف احسان شاہ تیار کر سکتا ہے۔

اس نے بستر پر لیٹتے ہوئے طے کیا کہ اسے فوری طور پر احسان شاہ سے ملنا چاہیے۔ رحیم داد کو اس نے بلایا بھی تھا۔

احمد رات بھر نہیں آیا۔ مگر صبح وہ مہمان خانے میں موجود تھا۔ اس نے نہایت مستعدی سے ناشتا میز پر چنا۔ رحیم داد ناشتا کرنے لگا۔ احمد نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے رات کو پتہ کیا' پنڈ کے کئی مزارعوں کا بھی یہی خیال ہے' اللہ وسایا کو زمیں دارنی کے بھائیوں نے کتل کیا ہے۔"

"بابر ہی نے ان سے بھی کہا ہو گا۔"

"پتہ نہیں جی! ویسے گل سمجھ بھی آتی ہے۔ وہ ایسا ہے جی' زمیں دارنی کا پیو ادھر کا بہت وڈا زمیں دار ہوتا تھا۔ اللہ وسایا اور اس کا پیو تو اس کے بہت معمولی مزارعے تھے۔ میں تو جی ان دنوں بھی اسی پنڈ میں تھا۔ بنسی لال مینجر ہوتا تھا۔ ساری زمیں داری کی دیکھ بھال' سچ تو یہ ہے' وہی کرتا تھا۔ اس نے نراض ہو کر اللہ وسایا اور اس کے پیو کو بے دخل کر دیا تھا۔"

رحیم داد درمیان میں بول پڑا۔ "یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔"

احمد نے اس کے ٹوکنے پر مطلق توجہ نہ دی۔ "یہ تو سوچ' زمیں دارنی کے بھائی یہ کیسے دیکھ سکتے ہیں' ان کی بہین انھی کے معمولی مزارعے اور وہ بھی مسلمان کی گھر والی بن کر رہے۔ عزت اور شان بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں نے تو جی زمیں دارنی کے بھائی ہرویال کو دیکھا ہے۔ کیا اکڑ اور آن بان تھی اس کی۔ جب پنڈ میں آتا تھا تو مزارعے اس کے سامنے چپ کر کے کھڑے رہتے تھے۔ اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔"

رحیم داد نے اسے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ کس طرح احسان شاہ کے پاس پہنچے۔ گھوڑی پر بیٹھ کر وہ اس کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا۔ شک و شبہ پیدا ہونے کا خدشہ تھا۔ اس نے احسان شاہ کے پاس جانے کے لیے سڑک کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ طویل اور خاصے چکر کا راستہ تھا مگر محفوظ تھا۔

رحیم داد نے ناشتے کے بعد احمد سے کہا۔ "دوپہر کی روٹی کے بعد تانگا لے آنا۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"میں نے چک بیدی جانا ہے۔ وہاں سے لاری پکڑوں گا۔ پاک پتن جاؤں گا۔"

احمد نے دریافت کیا۔ "ادھر کوئی کام ہے؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے جواب دیا۔ "پاک پتن میں بابا شاہ فرید گنج شکر کے مزار پر حاضری دوں گا۔"

"وہاں جانے کا مزا تو جی عرس پر آتا ہے۔ پنج محرم کو عرس ہوتا ہے۔ دور دور سے بندے آتے ہیں۔ زبردست میلہ لگتا ہے۔"

"عرس پر بھی چلا جاؤں گا۔ پہلے بھی عرس پر جا چکا ہوں۔" رحیم داد نے لہجے میں افسردگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "سچی گل پوچھ تو اللہ وسایا کے بعد دل بہت گھبراتا ہے۔ مزار پر حاضری دینے سے دل کو آرام ملے گا۔ اسی لیے جانا چاہتا ہوں۔"

"کب تک واپسی ہو گی؟" احمد نے پوچھا۔

"ارادہ تو رات ہی کو لوٹنے کا ہے پر مشکل لگتا ہے۔ بارشوں نے رستے خراب کر دیئے ہیں۔ رات کو سفر کرنا ٹھیک نہیں۔ کل شام تک واپس آجاؤں گا۔ زمیں دارنی پوچھے تو بتا دینا۔"

"وہ تو جی کچھ نہیں پوچھے گی۔ وہ تو روتی رہتی ہے۔ نہ بولتی ہے نہ بات کرتی ہے۔ اسے تو جی زمیں دار کی موت کا بہت دکھ ہے۔ میں نوں نہیں پتہ تھا' وہ اس سے اتنا زیادہ پیار کرتی ہے۔"

رحیم داد نے بات کا رخ موڑا۔ "تاراں بھی تجھ سے اتنا ہی پیار کرتی ہے۔"

"توبہ کرو جی! وہ میری ذرا پروا نہیں کرتی۔" احمد نے گلہ کیا۔ "تیں نوں کیہ پتہ' وہ مجھ سے کتنا جھگڑا کرتی ہے۔ ذرا ذرا سی گل بات پر رولا گولا کرتی ہے۔"

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ احمد چلا گیا۔

رحیم داد مہمان خانے سے نکلا اور کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ مزارعوں سے ملا، خریف کی فصل کے بارے میں ان سے ادھر ادھر کی بات چیت کی۔ اللہ وسایا کے بعد اب زمیں داری کی دیکھ بھا اسی کو کرنا تھی۔ وہ رفتہ رفتہ خود کو اس کے لیے تیار بھی کرنے لگا تھا۔ اس نے زمیں داری کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کر دیا تھا۔

وہ مہمان خانے میں واپس آیا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ رحیم داد منہ ہاتھ دھو کر بیٹھا تھا کہ احمد کھانا لے کر آ گیا۔ کھانا چن کر اس نے بتایا۔ ”زمیں دارنی کے پاس وکیل آیا بیٹھا ہے۔“

رحیم داد پریشان ہو گیا۔ اس نے جھٹ گلاس اٹھا کر پانی پیا اور احمد سے پوچھا۔ ”وکیل کب آیا؟“

”اسے آئے تو دیر ہو گئی۔“

”تیں نوں پتہ ہے، زمیں دارنی سے کیا گل بات کر رہا تھا؟“

”میں تو جی زمیں دارنی کے پاس گیا ہی نہیں۔“

”ایسی گل ہے تو تیں نوں وکیل کے بارے میں کیسے پتہ چلا؟“

”تاراں نے بتایا۔ وہ زمیں دارنی کے پاس بیٹھی تھی۔“

”ادھر تو وکیل کا آنے کا ارادہ نہیں؟“

”ہاں جی، تاراں کہتی تھی، وہ تیرے پاس آنے کو بھی کہتا تھا۔“

رحیم داد پر ایک بار پھر گھبراہٹ نے حملہ کیا۔ اس نے روٹی کا لقمہ منہ میں رکھ لیا۔ گھبراہٹ پ ذرا قابو پایا تو اس نے احمد سے کہا۔ ”تو میرے لیے تانگہ نہ لانا۔“

”کیوں، پاک پتن نہیں جانا؟“

”وکیل سے بات چیت میں نہ جانے کتنی دیر لگ جائے۔“ رحیم داد نے بات بنائی۔ ”فیر کسی ر چلا جاؤں گا۔“

رحیم داد کھانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ وکیل محمد عثمان رندھاوا آ گیا۔ اس نے کرسی پر بیٹھے ہوئے رسمی انداز میں پوچھا۔ ”چوہدری! کیا حال چال ہے؟“

رحیم داد نے اپنی گھبراہٹ اور پریشانی پر قابو پانے کے لیے چہرے پر افسردگی طاری کرنے کی کوشش کی۔ لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”اب کیا حال چال رہ گیا جی!“ اس نے ٹھنڈ سانس بھری۔ ”اللہ وسایا کے بعد کچھ بھی چنگا نہیں لگتا۔ وہ اپنے ساتھ حویلی کی ساری خوشیاں او ساری چہل پہل لے گیا۔“

”بہت نیک بندہ تھا۔ اس کا قتل بہت الم ناک حادثہ ہے۔“ وکیل نے بھی غم زدہ لہجے میں اظہار خیال کیا۔

”زمیں دارنی کیا کہتی ہے؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”وہ بے چاری کیا کہے گی۔ اسے تو کچھ پتہ نہیں۔ وہ تو حویلی کی چار دیواری کے اندر عدت میں بیٹھی ہے۔“

”ایک چھوڑ دو تھانے دار تفتیش کے لیے آئے۔ لگتا ہے، کسی نے کچھ نہیں کیا۔ زمیں دارنی تو یہی بتاتی تھی۔“

”بتاتی تو مجھ سے بھی یہی تھی۔ پر میں نے کہا ناں، اسے کچھ پتہ نہیں۔“

رحیم داد نے چوکنا ہو کر وکیل کو دیکھا۔ اس نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔ ”قاتلوں کا بھی کچھ سراغ ملا؟ کوئی گرفتاری شرفتاری ہوئی؟“

”ابھی تک تو کوئی گرفتاری نہیں ہوئی۔ میں یہاں آنے سے پہلے اس سب انسپکٹر سے ملا تھا، جسے اب تفتیش پر لگایا گیا ہے۔ پہلے جو انسپکٹر تفتیش کرتا رہا تھا، اس نے نامعلوم ملزمان کے خلاف صرف کیس رجسٹر کیا تھا اور کیس بگاڑنے کے لیے ایف آئی آر میں توڑ مروڑ کر غلط حالات اور واقعات درج کر دیے۔ زمیں دارنی نے جو ابتدائی رپورٹ لکھوائی تھی، اس میں اس طرح رد و بدل کر دیا جس سے ملزمان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔“

”یہ تو اس نے بہت گندی حرکت کی۔“ رحیم داد نے منہ بگاڑ کر جھنجلاہٹ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ”اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی؟“

”ہو تو سکتی ہے۔“ وکیل نے توجیہہ پیش کی۔ ”دفعہ ۱۵۴ ضابطہ فوجداری کی رو سے متعلقہ پولیس افسر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ابتدائی رپورٹ میں کسی بھی قسم کی ترمیم یا تبدیلی نہ کی جائے۔ اگر وہ خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے خلاف تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۱۸ کے تحت کارروائی ہو سکتی ہے اور جرم ثابت ہونے پر ایسے پولیس افسر کو تین سال کی قید اور جرمانے کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔“ وکیل نے قدرے توقف کیا پھر گویا ہوا۔ ”مگر میں نے اس سلسلے میں قانونی چارہ جوئی کرنے سے گریز کیا۔ سوچا اس مرحلہ پر پولیس سے بگاڑنا مناسب نہیں، البتہ انسپکٹر جنرل پولیس کو میں نے جو درخواست پیش کی تھی اس میں اس قانونی پہلو پر روشنی ڈالی تھی۔ آئی جی نے اس کا ضرور نوٹس لیا ہو گا۔ چنانچہ اس کے حکم پر ایس پی نے اس کی بجائے ایک اور انسپکٹر کو شی افسر مقرر کر دیا۔ لگتا ہے، وہ کیس میں پوری دلچسپی لے رہا ہے۔“

"وہ کیا بتا تا تھا؟" رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"اس کا خیال ہے' اللہ وسایا کا قتل پرانی دشمنی کا نتیجہ ہے۔ اللہ وسایا کی صرف ایک ہی شخص سے دشمنی تھی۔ اور وہ احسان علی شاہ ہے۔ زمیں دارنی نے بھی اپنے بیان میں اسی پر شبہ ظاہر کیا ہے۔"

"میں نے تو جی احسان شاہ کو دیکھا بھی نہیں۔ سنا ہے بھلا بندہ نہیں ہے۔" رحیم داد نے صفائی پیش کی اور وکیل کو گمراہ کرنے کے لیے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "پر میں نے ایک گل اور بھی سنی ہے۔"

وکیل رندھاوا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ "وہ کیا گل ہے؟"

"سنا ہے' اللہ وسایا کو زمیں دارنی کے بھائیوں نے کتل کیا اور رات ہی کو سرحد پار لوٹ بھی گئے۔" رحیم داد نے مسکین سی شکل بنا کر کہا۔ "ایک بار تو آدھی رات کو زمیں دارنی کا بھائی اور چاچا اسے لینے آئے تھے۔ ان کے ساتھ مسلح بندے بھی تھے' خود ان کے پاس بھی بھرے ہوئے پستول تھے۔ پر زمیں دارنی نے ان کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اللہ وسایا تو اس رات شہر گیا ہوا تھا پر میں پہنچ گیا۔ ساری گل بات میرے سامنے ہوئی تھی۔"

"چوہدری! تو نے یہ بات کس سے سنی؟"

"مجھے تو حویلی کے نوکر حمے نے سنائی تھی اور اسے لوہار کے منڈے نے بتائی تھی۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔

"ویسے زمیں دارنی کے کانوں تک یہ گل پہنچ چکی ہے۔"

"اس نے کیا کہا؟" رحیم داد نے دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔

"وہ کہتی ہے' یہ بالکل جھوٹ ہے۔ اس کے بھائی اور چاچا ہرگز ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ اللہ وسایا کو کیوں کتل کرتے؟ وہ کبھی ان کے راستے میں نہیں آیا۔ اس کا فیصلہ تو اس نے زمیں دارنی ہی پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ خود ہی اپنے بھائیوں کے ساتھ جانا نہیں چاہتی۔" وکیل نے جمیلہ کا موقف بیان کیا۔ "زمیں دارنی کا خیال ہے کہ تفتیش کو غلط راستے پر ڈالنے کے لیے یہ افواہ جان بوجھ کر پھیلائی گئی ہے۔"

"اور وکیل صاحب' تمہارا کیا خیال ہے جی؟" رحیم داد نے زور زور سے دھڑکتا ہوا دل قابو میں کرنے کی کوشش کی۔

"چوہدری! میرا بھی یہی خیال ہے۔" رندھاوا نے نہایت اعتماد سے کہا۔ رحیم داد پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ اسے وکیل سے اس ردعمل کی توقع نہ تھی۔ وہ دم بخود بیٹھا رہا۔ وکیل نے بتایا۔ "میں نے تفتیش کرنے والے پولیس انسپکٹر جنجوعہ سے جو کچھ معلوم کیا ہے' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اللہ وسایا کے قتل کا کچھ سراغ نکال لیا ہے۔ اس نے نئے سرے سے تحقیقات شروع کی ہے۔ وہ تو بہت پرامید نظر آتا ہے۔ کہتا تھا' جلد ہی گرفتاریاں شروع ہو جائیں گی۔"

رحیم داد نے بڑی مشکل سے اپنی سراسیمگی چھپائی اور سینے پر ہاتھ مار کے جوش و خروش سے بولا۔ "اگر یہ پتہ چل جائے کہ اللہ وسایا کا خون احسان شاہ نے کرایا ہے تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے جان جائے یا پھانسی ہو۔ میں اللہ وسایا کا بدلہ اس سے ضرور لوں گا۔" اس نے وکیل کی جانب تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "برا نہ منانا' مجھے تو پولیس کچھ کرتی شرتی لگتی نہیں۔ تھانے دار تو خالی پیلی باتیں کرتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں کریں گے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" وکیل نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "پولیس میں سارے افسر برے نہیں ہیں۔ ایسے فرض شناس بھی ہیں' جن کو اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس ہے۔ جو تھانے دار اب تفتیش کر رہا ہے' وہ بھی ایسا ہی پولیس افسر ہے۔ وہ تیرے پاس بھی آئے گا اور جلدی آئے گا۔ پوچھ گچھ کرے گا' تیرا بیان بھی لے گا۔ تجھے جو کچھ معلوم ہو' صاف صاف بتا دینا۔"

"مان لو' کاتل اگر زمیں دارنی کے بھائی ہوئے' تب تھانے دار کیا کرے گا؟" رحیم داد نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کی غرض سے ایک بار پھر وکیل کو ورغلانے کی کوشش کی۔ "وہ تو اب ہاتھ آنے سے رہے' راتوں رات سرحد پار چلے گئے ہوں گے۔ وہاں سے انھیں کیسے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔"

"اگر ایسا ہے' تب تو قاتلوں کو گرفتار کرنا ممکن نہیں۔ مگر میرا خیال ہے' اللہ وسایا کو انھوں نے قتل نہیں کیا۔ زمیں دارنی کا بھی یہی خیال ہے اور انسپکٹر جنجوعہ کی باتوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔"

"ایسا ہی ہو گا جی!" رحیم داد نے ہتھیار ڈال دیے۔

وکیل نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "چوہدری! میں تیرے پاس یہ بتانے آیا تھا کہ میں تیرے کلیم کے کاغذات جلد ہی لوٹا دوں گا۔ ابھی مجھے ان کی ضرورت پڑے گی۔"

"جب تک جی چاہے' اپنے پاس رکھیں۔ میں نوں واپس لینے کی جلدی نہیں۔ ان کے بارے میں مجھے کوئی فکر نہیں۔"

اس درخواست کے بارے میں نہ رحیم داد نے کچھ کہا نہ وکیل نے بتایا' جس پر رحیم داد نے

دستخط کیے تھے۔ جلد ہی وکیل کھڑا ہوگیا، مسکرا کر بولا۔ "مجھے اب جانا ہے۔" رحیم داد اس کے ہم راہ بیرونی دروازے تک گیا۔

وکیل سے گفتگو کے بعد رحیم داد سخت پریشان ہوگیا۔ اسے سب سے زیادہ تشویش اس بات کی تھی کہ اگر پولیس انسپکٹر جنجوعہ تفتیش کے لیے آیا تو اسے تمام وقت یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ کہیں وہ اسے پہچان نہ لے۔ اسی خطرے کے پیش نظر وہ کسی پولیس والے کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا۔ وہ تفتیشی کارروائی میں کسی طور شریک ہونا نہیں چاہتا تھا۔ یہ بات وہ احسان شاہ سے بھی کہہ چکا تھا۔ احسان شاہ نے اسے یقین دلایا تھا کہ اللہ وسایا کے قتل کے معاملے میں اس سے مطلق پوچھ گچھ نہیں کی جائے گی۔ رحیم داد مطمئن بھی ہوگیا تھا اور یہ معلوم ہونے کے بعد اسے مزید اطمینان ہوگیا تھا کہ دونوں پولیس انسپکٹروں میں سے کوئی بھی اب تک اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ مگر اب وکیل سے ملنے کے بعد اس کا اطمینان اور سکون درہم برہم ہوگیا تھا۔

دن اسی الجھن میں گزرا۔ شام بھی پریشانی میں کٹی۔ غروب آفتاب کے وقت ہلکی سی بارش ہوئی مگر اب آسمان صاف تھا۔ کہیں کہیں بادلوں کے ہلکے پھلکے ٹکڑے تیزی سے دوڑتے نظر آرہے تھے۔ رحیم داد کا پلنگ برآمدے میں بچھا تھا۔ وہ بستر پر خاموش لیٹا تھا۔ احمد بھی موجود تھا۔ رات گزرتی رہی۔ احمد اپنے بستر سے اٹھا۔ آہستہ سے کھنکارا۔ رحیم داد جاگ رہا تھا مگر خاموش لیٹا رہا۔ اس نے دیکھا کہ احمد دبے پاؤں دروازے پر پہنچا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

☆

آدھی رات کے بعد بیرونی دروازہ دھیرے سے کھلا۔ رحیم داد ابھی تک جاگ رہا تھا اور کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ نظریں دروازے ہی کی جانب تھیں۔ دروازہ کھلا تو اس نے سوچا کہ احمد آیا ہوگا۔ آنے والا دروازے میں داخل ہوکر آگے بڑھا تو تاروں کی دھندلی روشنی میں رحیم داد نے اس کی وضع قطع سے اندازہ لگایا کہ وہ احمد نہیں ہے۔ رحیم داد گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ غور سے دیکھا تو وہ دارا تھا۔ رحیم داد سخت گھبرایا۔

دارا قریب آیا تو رحیم داد نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "دارا! تو کیسے آیا؟" وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ رحیم داد نے اسے روک دیا، دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ "پہلے کنڈی چڑھا دے۔"

دارا نے کنڈی لگائی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا رحیم داد کے روبرو آکر کھڑا ہوگیا۔ رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔ "تو نے تو مجھے سخت پریشان کردیا۔ اب تک کہاں رہا؟ تیں نوں تو ریاست بہاول پور کی طرف نکل جانا تھا؟" دارا فرش پر بیٹھتے ہوئے عاجزی سے بولا۔ "بالکل یہی ارادہ تھا۔ آج آدھی رات کے حد میں اور کامل بہاول پور جانے کے لیے بالکل تیار تھے۔"

"پر تو ادھر کیسے آیا؟" رحیم داد جھنجلا گیا۔

"وہ ایسا ہوا جی میں روٹی کھا کر جلد ہی سو گیا۔" دارا نے بتایا۔ "آنکھ کھلی تو کامل سامنے کھڑا جھنجوڑ رہا تھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا لگتا تھا۔ اس نے بتایا پولیسے تیری تلاش میں آئے ہیں۔ تو فوراً پیچھے سے نکل جا۔" دارا نے دھیرے سے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "میں نے جی ایسا ہی کیا۔ دیوار پھاند کر پچھواڑے گیا۔ ادھر مکئی کے کھیت تھے۔ میں ان میں گھس گیا اور چھپتا لکتا چک سے باہر نکل گیا۔"

"کامل نے تجھے یہ نہیں بتایا پولیسے تیری تلاش میں کیوں آئے تھے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"یہ تو جی اس نے نہیں بتایا، وہ تو بہت ڈرا ہوا تھا۔ لگتا ہے، پولیس نے اللہ وسایا کے کتل کا سراغ لگالیا ہے۔"

رحیم داد کو فوراً وکیل کی بات یاد آگئی۔ وہ خوف زدہ ہوکے دارا کو دیکھنے لگا۔ دارا نے اسے اس طرح گھورتے دیکھا تو پریشان ہوکر بولا۔ "تو مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے؟"

"تجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ پولیسے پہلے ہی ادھر کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ روز ہی تفتیش کے لیے آتے ہیں۔"

"پر جاتا کہاں۔" دارا نے مجبوری کا اظہار کیا۔ "چھپنے کا یہی ٹھکانا نظر آیا۔ تیں نوں پتہ ہے، کتنی مشکلوں سے پہنچا ہوں۔" دارا کے لہجے میں عاجزی تھی۔

رحیم داد کو غصہ تو بہت آیا مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔ "آگے کے لیے تو نے کیا سوچا؟"

"تو مجھے کسی طرح ادھر سے نکال کر ریاست میں پہنچا دے۔ آگے کی فکر نہ کر۔ کامل رحیم یار خاں پہنچ کر میرا انتظار کرے گا۔ وہ اپنے ایک یار کے ساتھ ٹھیرے گا۔ میں نوں اس کا پتہ ملوم ہے۔ کامل کل کسی وکھت ادھر نکل جائے گا۔ میں پہلے پہنچ گیا تو رحیم یار خاں میں اس کے یار کے پاس رک کر انتظار کروں گا۔ یہ پروگرام ہم دونوں پہلے ہی بنا چکے ہیں۔ رحیم یار خاں سے ہم گڈی پکڑیں گے اور کراچی نکل جائیں گے۔"

رحیم داد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے بہاول پور کیسے پہنچائے۔ کوٹلہ ہرکشن میں اس کے اعتماد کا کوئی ایسا شخص نہیں تھا۔ لیکن اس نے اپنی مجبوری ظاہر نہیں کی۔ دارا کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "تو اب سو جا۔ فکر نہ کر۔ میں کل تجھے ادھر پہنچانے کا بندوبست کردوں گا۔" اس نے دارا کو اوڑھنے کے لیے ایک چادر دے دی۔

دارا چادر لے کر برآمدے کے ایک گوشے میں فرش پر خاموشی سے لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ

خراٹے بھر رہا تھا۔ مگر رحیم داد نہیں سویا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ دارا خطرہ بن کر بالکل اس کے قریب آگیا تھا۔ وہ خاموش لیٹا اس خطرے سے چھٹکارا پانے کی تدابیر سوچتا رہا۔ نہ وہ اسے بھاول پور پہنچا سکتا تھا نہ اپنے پاس روپوش رہنے کی اجازت دے سکتا تھا۔ وہ شدید ذہنی الجھن میں تھا۔

تھکا ہارا دارا اطمینان سے چادر اوڑھے سو رہا تھا اور رحیم داد بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ احمد کی طرف سے وہ مطمئن تھا کہ صبح سے پہلے اس کی واپسی ممکن نہیں۔ وہ اکثر رات گئے چپ چاپ نکل جاتا تھا اور صبح تک غائب رہتا تھا۔ رحیم داد نے سوچا' رات تو کسی نہ کسی طرح گزر جائے گی۔ صبح دارا کو کوٹھری میں چھپا کر باہر سے تالا ڈال دے گا۔

مگر وہ اسے اس طرح کب تک چھپا کر رکھ سکتا ہے؟ وہ اسے سویرا ہونے سے پہلے گاؤں سے نکل جانے کے لیے بھی کہہ سکتا تھا یا دن کوٹھری میں گزارنے کے بعد رات کو چلے جانے کے لیے کہتا۔ گاؤں کی حدود کے باہر نہر کے کنارے تک جا کر اسے چھوڑ بھی آتا۔ مگر اس میں خطرہ یہ تھا کہ اگر وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو کیا ہوگا؟ رحیم داد لرز کر رہ گیا۔ اسے پھانسی کا پھندا سامنے لہراتا نظر آنے لگا۔

بہت غور و فکر کے بعد اسے دارا سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ نظر آیا اور وہ یہ تھا کہ دارا کا خطرہ سرے سے مٹا دیا جائے۔ اس سلسلے میں اس نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ دن بھر دارا کو نہایت رازداری سے کوٹھری میں چھپائے رکھے گا۔ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی احمد کو چھٹی دے دے گا۔ احمد خوشی سے چلا جائے گا۔ اس کے جانے کے بعد دارا سے کہے گا کہ وہ نہر کے کنارے پہنچ جائے اور اس کا انتظار کرے۔ بعد میں وہ بندوق لے کر جائے گا۔ دارا کو گھوڑی پر بٹھا کر دور ویرانے میں لے جائے گا۔ اور اسے گولی مار دے گا۔ لاش نہر میں ڈال دے گا۔ بارش کی وجہ سے نہر کا بہاؤ بہت تیز ہے۔ لاش بہتی ہوئی دور نکل جائے گی۔

یہ منصوبہ باندھ کر اسے کسی قدر سکون ملا۔ وہ گہری نیند سو گیا۔ صبح ہونے سے بہت پہلے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے پریشان ہو کر دیکھا کہ دارا غائب ہے اور مہمان خانے کا دروازہ کھلا ہے۔

[illegible]

تانگا ہچکولے کھاتا ہوا نہر کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ بارش کے باعث راستہ خراب تھا۔ جگہ' جگہ کیچڑ تھی' گڑھے تھے۔ کوچوان بہت احتیاط سے تانگا چلا رہا تھا۔ مگر جب کوئی پہیہ گڑھے میں چلا جاتا تو تانگا ایک طرف جھک جاتا یا الار ہو جاتا۔ رحیم داد کو بار بار پہلو بدلنا پڑتا۔ وہ بہت چوکس اور محتاط بیٹھا تھا۔

آسمان پر ابر چھایا تھا۔ نہر کی جانب سے بھیگے ہوئے جھونکے آ رہے تھے۔ فضا سہانی اور خوشگوار تھی۔ مگر رحیم داد گم صم بیٹھا تھا۔ چہرے سے تشویش جھلکتی تھی۔ تانگا چک بیدی کی سمت جا رہا تھا۔ رحیم داد سویرے سویرے کوٹلہ ہر کشن سے روانہ ہوا تھا۔ اب پہر دن گزر چکا تھا۔ تانگا نشیب سے نکل کر پلیا کی چڑھائی طے کرنے لگا تو معاً" رحیم داد کو اللہ وسایا یاد آگیا۔ اسی پلیا کے نیچے اس کی لاش نہر میں تیرتی ہوئی ملی تھی۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا تو چہرے پر خوف اور پریشانی طاری ہو گئی۔ کوچوان اس کے احساسات سے بے نیاز گھوڑے کی پیٹھ پر سڑاک سڑاک چابکیں مار رہا تھا۔ چڑھائی پر اس کی رفتار بہت سست پڑ گئی تھی۔ چابکیں پڑیں تو گھوڑے نے تیز قدم اٹھائے۔ تانگا اوپر پہنچ گیا اور پختہ سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگا۔

رحیم داد چک بیدی نہ گیا۔ اسے دراصل وہاں جانا بھی نہ تھا۔ چک بیدی سے پہلے فاضل پورہ کا اڈہ تھا۔ وہاں سے اسے لاری میں سوار ہونا تھا اور پاک پتن کے بجائے حویلی اسٹیشن پہنچنا تھا۔ لیکن اسے فاضل پورہ بھی نہ جانا پڑا۔ نظیر والی کے قریب حویلی اسٹیشن جانے کے لیے نیلی ٹرانسپورٹ کی لاری مل گئی۔ لاری روانہ ہونے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

رحیم داد جھٹ تانگے سے اترا۔ کرایہ ادا کیا۔ اور لاری میں جا کر بیٹھ گیا۔ دوپہر کو وہ حویلی اسٹیشن پہنچ گیا۔ وہاں سے اسے احسان شاہ کے گاؤں' پیراں والہ جانا تھا۔ اسٹیشن سے متن والہ تک کنکر کی بنی ہوئی سڑک تھی۔ سڑک بہت دور تک آگے بھی جاتی تھی۔ اسی سڑک سے ایک پختہ سڑک پیراں والہ کو جاتی تھی۔ یہ سڑک احسان شاہ کی جاگیر میں واقع تھی۔ اسی نے بنوائی تھی اور اسی کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ متن والہ کی سمت جانے والی کنکر کی سڑک شدید بارشوں سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ لہٰذا ان دنوں اس پر بہت کم لاریاں چلتی تھیں۔

رحیم داد نے لاری کا انتظار کرنے کے بجائے تانگا لیا اور اس میں بیٹھ کر پیراں والہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ سڑک خراب ہونے کے باوجود تانگا سورج غروب ہونے سے پہلے ہی احسان شاہ کی حویلی پر پہنچ گیا۔ احسان شاہ گھوڑی پر سوار ہو کر ہوا خوری کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔ حویلی کے پھاٹک پر رحیم داد سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ دیکھتے ہی جھٹ گھوڑی سے نیچے اترا۔ بڑھ کر گرم جوشی سے رحیم داد کو گلے لگایا۔ ہوا خوری کا ارادہ ترک کیا۔ رحیم داد کو اپنے ہم راہ دیوان خانے میں لے گیا۔

احسان شاہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد کو بھی قریب بٹھایا۔ مسکرا کر پوچھا۔ "چوہدری تو تانگے میں کہاں سے آ رہا ہے؟"

"آ تو میں کوٹلہ ہر کشن ہی سے رہا ہوں۔ آگے بھی اسی رستے سے آتا رہوں گا۔"

"پر یہ تو بہت لمبا اور چکر کا راستہ ہے۔" احسان شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ "تو نے یہ راستہ کیوں پکڑا؟"

"نہر کے کنارے کا رستہ چھوٹا ہے۔ میں گھوڑی پر بیٹھ کر آرام سے آ جا بھی سکتا ہوں۔ پر اس رستے کو استعمال کرنے سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے یہ چکر کا رستہ پکڑا۔"

"جیسی تیری مرضی۔" احسان شاہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "اب تجھے کس کی پروا کرنی ہے؟ میں نے تیرا راستہ بالکل صاف کر دیا ہے۔ اللہ وسایا سے ڈرتا تھا' وہ تو اب رہا نہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے' پر مجھے بہت خوف لگ رہا ہے۔ ہر طرف خطرہ ہی خطرہ نظر آتا ہے۔" رحیم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"پروا نہ کر چوہدری۔ کوئی خطرے شطرے کی گل نہیں۔" احسان علی شاہ نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "یہ بتا تیرے پاس کوئی پولسا تو پوچھ گچھ کے لیے نہیں آیا؟"

"ابھی تک تو کوئی نہیں آیا۔ دو تھانے دار تفتیش کے لیے آئے۔ پہلے اس تحصیل کا پنچا۔ پر اب تفتیش پاک پتن تحصیل کے تھانے دار کے حوالے کر دی گئی ہے۔ وہ بھی جمیلہ اور حویلی کے نوکروں سے پوچھ تاچھ کر کے اور ان کے بیانات لے کر چلا گیا۔"

"مجھے اس کا پتہ ہے۔" احسان شاہ بیچ میں بول پڑا۔ "پر تجھ سے تو کسی نے بیان شیان نہیں لیا۔ نہ تیرے پاس آیا؟"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ پر پچھلے دنوں وکیل آیا تھا۔ بتاتا تھا اس نے زمیں دارنی کی طرف سے اوپر درخواست لگائی تھی۔ اسی درخواست پر تفتیش کا کام دوسرے تھانے دار کو دیا گیا۔ وکیل اس تھانیدار سے ملا تھا۔ کہتا تھا اس نے سراغ نکال لیا ہے۔ جلد ہی گرفتاریاں بھی ہونے والی ہیں۔" رحیم داد کے چہرے پر سراسیمگی اور پریشانی چھا گئی۔ "وکیل نے یہ بھی بتایا' تھانے دار جلد ہی میرے پاس بھی پوچھ تاچھ کرنے آئے گا۔"

"تو گویا گل اس طرح ہے۔" احسان شاہ نے بڑبڑانے کے انداز میں آہستہ سے کہا اور گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ "تجھے یہ اطلاع ملتے ہی فوراً میرے پاس آنا چاہیے تھا۔" احسان شاہ کے لہجے سے تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔ "میں نے ماکھے کو تجھے بلانے کے لیے بھیجا بھی تھا۔"

"میں تو جی وکیل سے بات کرنے کے بعد دوسرے ہی روز آنا چاہتا تھا پر کئی روز تک ایسی زبردست برکھا ہوئی کہ رکی ہی نہیں۔ رستے بھی خراب ہیں۔ میں ایسے میں کیسے آتا۔ رات کو مینہ رکا تو میں سویرے سویرے تیرے پاس آنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔" رحیم داد نے صفائی پیش کی۔

"اچھا کیا تو آ گیا اور ساری باتیں مجھے بتا دیں۔" احسان شاہ نے اسے اطمینان دلایا۔ "فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ تھانے دار جو اب تفتیش کر رہا ہے' اس کا نام اسلم حیات جنجوعہ ہے نا؟"

"وکیل نے اس کا یہی نام بتایا تھا۔"

"لگتا ہے جمیلہ کی درخواست پر ہی اسے ڈی۔ ایس۔ پی نے لگایا ہے۔ جنجوعہ کارگزاری دکھانے پر تلا ہوا ہے۔" احسان شاہ مسکرایا۔ "تو اس کی پروا نہ کر۔ اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔"

"میں نوں تو اس سے خوف آنے لگا ہے۔ میرے پاس پوچھ تاچھ کے لیے آیا اور اس نے الٹے سیدھے سوال کیے تو ڈر ہے نہ جانے کیا زبان سے نکل جائے۔ سچ پوچھ تو میں کبھی کتل شتل کے معاملوں میں پڑا نہیں۔ اسی لیے تجھ سے میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ایسا بندوبست کر دے کہ میں نوں پولیس کے چکروں میں نہ پڑنا پڑے۔"

احسان شاہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "ابھی بہت کچا ہے۔ جلدی گھبرا جاتا ہے۔ ڈرتا بھی ہے۔ چوہدری! زمیں داری کرنی ہے تو وڈا دل رکھ۔ حوصلے سے کام لے۔" اس کا لہجہ بھاری بھرکم ہو گیا۔ "ایسے

خطرے تو آگے روز ہی آتے رہیں گے۔ کب تک ڈرتا رہے گا؟" اس نے رحیم داد کو گہری نظروں سے دیکھا۔ "پریشان نہ ہو۔ ایسا بھی وکت آئے گا اور جلد ہی آئے گا جب تجھے خطرہ' خطرہ نہ لگے گا بلکہ خطرہ مول لینے میں مزا آئے گا۔"

"میں نوں ڈر اس لیے بھی لگ رہا ہے کہ وکیل کہتا تھا' تھانے دار نے اللہ وسایا کے کتل کا پتہ چلالیا ہے۔ لگتا ہے وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ تیں نوں پتہ نہیں پولیس نے دارا کے ٹھکانے پر پچھلے دنوں رات کو چھاپہ مارا۔ وہ کسی نہ کسی طرح بچ کر نکل بھاگا۔ سیدھا میرے پاس آیا۔ میں حویلی کے مہمان خانے میں اس رات اکیلا ہی تھا۔ اسے اپنے ساتھ ٹھیرالیا۔ پر وہ صبح ہونے سے پہلے ہی چپکے سے اٹھ کر بھاگ گیا۔ جانے کہاں ہے؟ پولیسوں کے ہاتھ لگ گیا تب تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ اس کے اس طرح فرار ہونے نے مجھے اور بھی زیادہ خوف میں ڈال دیا۔" رحیم داد کے بشرے سے پریشانی ٹپکنے لگی۔ "شاہ جی! یہ تو سوچ' وہ گرفتار کرلیا گیا تو پولیس کو پکا ثبوت مل جائے گا۔"

"تجھے اب تک یہ بھی پتہ نہیں کہ دارا کہاں ہے؟"

"میں نوں کیہہ پتہ جی۔" رحیم داد نے حیرت سے کہا۔ "اس رات کے بعد سے وہ ملا ہی کب۔"

"میں تجھے بتاتا ہوں' دارا کہاں ہے۔" احسان شاہ نے بے نیازی سے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "تیرے پاس سے وہ سیدھا ادھر آیا۔ اور یہ اس نے ٹھیک ہی کیا۔ شیدا اسے میرے پاس لایا۔ میری اطلاع یہ ہے کہ پولیس نے اللہ وسایا کے کتل کے سلسلے میں چھاپہ نہیں مارا تھا۔ وہ اسے کسی دوسرے ہی کیس میں گرفتار کرنا چاہتی تھی۔"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ "یہ بات تجھے دارا نے بتائی؟" رحیم داد کا دل خوف سے زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"نہیں۔" احسان شاہ نے جواب دیا۔ "نہ میں نے اس بارے میں اس سے پوچھا نہ اس نے بتایا۔ ویسے مجھے اس وکت تک کچھ پتہ بھی نہیں تھا۔ بعد میں معلوم کرنے پر یہ اطلاع ملی کہ پولیس کسی اور کیس میں اسے تلاش کر رہی ہے۔"

اب شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ دیوان خانے اور اس سے متصل برآمدے میں لیمپ روشن کردیئے گئے تھے۔ نوکروں نے برآمدے کے آگے لان میں میز اور کرسیاں لگا دی تھیں۔ شیدا آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ احسان شاہ نے پوچھا۔ "شیدے! تو نے اب تک کچھ بندوبست نہیں کیا؟" وہ مسکرایا۔ "برسات کی یہ سوہنی شام ایسے ہی گزرتی جا رہی ہے۔

چوہدری بھی آیا ہوا ہے۔"

شیدا نظریں جھکا کر بولا۔ "کرسیاں اور میز تو لگا دی ہیں جی۔ بوتل اور گلاس بھی لیے آتا ہوں۔"

احسان شاہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "چوہدری' باہر آجا۔ وہیں گل بات ہوگی۔"

رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں لان میں پہنچے اور کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ شیدا اسکاچ کی بوتل' گلاس اور جگ میں پانی لے آیا۔ اس نے نہایت مستعدی سے دو پیگ بنائے اور گلاس احسان شاہ اور رحیم داد کے آگے رکھ دیئے۔ دونوں نے گلاس اٹھا کر وہسکی کے گھونٹ بھرے۔

رحیم داد نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "تو نے یہ نہیں بتایا دارا اب کہاں ہے؟ اس کا کیا بنا؟"

"وہ ریاست بہاول پور کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے اسی رات اسے ریاست کی حدود میں پہنچا دیا۔"

"تیں نوں ٹھیک طرح پتہ ہے' وہ ادھر پہنچ گیا؟"

"میرے کرندے ساتھ گئے تھے۔ اسے ادھر پہنچا کر مجھے انہوں نے اطلاع بھی پہنچا دی تھی۔" احسان شاہ نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "میرا تو خیال ہے اب تک وہ کراچی پہنچ چکا ہوگا تو اس کی طرف سے بالکل فکر نہ کر۔ ویسے وہ بہت ہوشیار بندہ ہے۔ وہ جلد ہی کراچی سے بحرین کی طرف نکل جائے گا۔ مجھے تو وہیں جانے کے لیے کہتا تھا۔"

رحیم داد وہسکی کی ہلکی ہلکی چسکی لگاتا رہا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ "شاہ جی! تجھ سے ایک گل پوچھنی تھی؟"

"ضرور پوچھ۔" احسان ہنس کر بولا۔

"اللہ وسایا کے کتل کے موکع پر تو بھی موجود تھا؟"

"ہاں!" احسان شاہ نے اعتراف کیا۔ "ویسے میں عام طور پر ایسے موکعوں پر موجود نہیں رہتا۔ ایسے کام کے لیے میرے بندے بہت ہوشیار ہیں۔ پر اللہ وسایا ادھر کا وڈا زمیں دار تھا۔ ہوشیاری سے سوچ سمجھ کر کام کرنا تھا۔ آگے کا بھی تو دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے میں خود پہنچ گیا۔ تجھے پتہ ہے' بیلا میری حویلی سے بہت زیادہ دور نہیں۔ نزدیک کا معاملہ تھا۔ سوچا' اپنے سامنے ہی یہ کام کرادوں۔ بات یہ ہے' پہلے بھی کئی بار میرے بندوں نے اسے کتل کرنے کی کوشش کی۔ پر وہ بچ کر صاف نکل گیا۔ میں چاہتا تھا اس بار بچ کر نکلنے نہ پائے۔" اس نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ "پر یہ بات تجھے دارا نے بتائی ہوگی۔"

بھی بتاتا تھا کہ اسی نے دونوں بار گولیاں چلائیں اور انھیں کے لگنے سے وہ مرا۔" رحیم

دادنے پوچھا۔ ”کیا یہ سچ ہے؟“

”دارا نے ٹھیک ہی بتایا۔ میں نے جان بوجھ کر اسی سے گولیاں چلوائیں۔“ احسان شاہ ایک آنکھ دبا کر عیاری سے مسکرایا۔ ”میں نے تیری باتوں سے اندازہ لگالیا تھا کہ تو اسے کسی سنگین جرم میں پھنسا کر اپنے کابو میں رکھنا چاہتا ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”میں نے غلط تو نہیں سوچا۔“

”تو نے ٹھیک ہی سوچا۔“ رحیم داد انکار نہ کرسکا۔ مگر وہ پریشان ہوگیا۔ اس نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کے لیے وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا۔ مسکرانے کی کوشش کی۔ ”شاہ جی! تیرا بھی جواب نہیں۔ حد کردی تو نے۔“

”تجھے پتہ نہیں‘ مجھے روز ہی طرح طرح کے بندوں سے ملنا پڑتا ہے۔“ احسان شاہ نے فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے بتایا۔ ”اگر اتنی سمجھ نہ رکھتا تو کوئی میرے پاس مشورے کے لیے کیوں آنے لگا؟ ساتھ رہے گا تو تجھے خود پتہ چل جائے گا۔ ابھی تو تیرے ساتھ میرا نیا نیا ملنا جلنا ہوا ہے۔“

”یہ تو بتا شاہ جی‘ تھانے دار جنجوعہ کا کیا بندوبست کرنے والا ہے۔“ رحیم داد نے اپنی تشویش ظاہر کی۔ ”جلد ہی کچھ ہونا چاہیے۔ ورنہ وہ کسی روز میرے پاس پہنچ جائے گا۔“

”فکر نہ کر۔ وہ تیرے پاس کبھی نہیں پہنچے گا۔“ احسان شاہ نے اسے اطمینان دلایا۔ ”ادھر کا ایس پی فتح علی مرزا ہے۔ وہ ڈی۔ آئی۔ جی بن نے کے چکر میں لگا ہے۔ ویسے ہے بھی سینئر افسر۔ میرے پاس کئی بار آچکا ہے۔ تجھے پتہ نہیں‘ میرا ایک پتر کراچی میں مرکزی حکومت میں وڈا افسر لگا ہے۔ دوسرا لہور میں ہوتا ہے۔ تیسرا پنڈی میں۔ وہ دونوں بھی وڈے افسر ہیں۔ ویسے دوسرے افسروں اور اسمبلیوں کے ممبروں سے بھی یاری دوستی ہے۔ ان کے کام کراتا ہوں تو ان سے کام لیتا بھی ہوں۔“ وہ نشے سے جھوم کر مسکرایا۔ ”اطمینان رکھ۔ ایس۔ پی سے کہہ کر جنجوعہ کا تبادلہ کرادوں گا۔ اور جلد ہی کرادوں گا۔“

”ایسا ہو جائے تو بہت ٹھیک رہے گا۔ وکیل کی باتیں سن کر میں نوں خوف آنے لگا تھا۔“

”تیرے کہنے سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا‘ تھانے دار جنجوعہ کارگزاری دکھانے کے لیے کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور کرے گا۔ میں نے اس کے تبادلے کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔ کل ہی مرزا سے بات کروں گا۔“

شیدا پلیٹوں میں تلے ہوئے مرغ اور کباب لے کر آیا اور میز پر رکھ کر چپ چاپ چلا گیا۔ رحیم دادنے کباب اٹھا کر کھاتے ہوئے کہا۔ ”شاہ جی‘ اس بار کسی ایسے تھانے دار کو لگوا جو کیس کو دبا دے۔“

”پروا نہ کر۔ بالکل ایسا ہی ہوگا۔“

”ویسے میں تجھے یہ بتا دوں‘ جمیلہ اپنے وکیل کے ذریعے معاملہ اوپر تک لے جائے گی۔“ رحیم دادنے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”لے جانے دے۔ جتنا چاہے اوپر لے جائے۔“ احسان شاہ نے پلیٹ سے تلا ہوا مرغ اٹھایا اور اس کی ایک ٹانگ نوچ کر علیحدہ کرنے لگا۔ ”پر کچھ ہونے کا نہیں۔“

”باتوں میں ایسا پھنسا کہ تیں نوں ایک گل بتانا بھول ہی گیا۔ اور وہ بہت کام کی گل ہے۔“

”کیا گل ہے‘ صاف صاف بتا۔“

”تھانے دار کا خیال ہے اللہ وسایا کا کتل پرانی دشمنی کی وجہ سے ہوا۔“ رحیم داد نے احسان کو آگاہ کیا۔ ”یہ گل جمیلہ نے اسے سمجھائی۔ جمیلہ نے پچھلے دنوں مجھے بلایا تھا۔ کہتی تھی اس نے تھانے دار سے یہی کہا ہے۔ پہلا تھانے دار تو نہ مانا۔ پر اب جو تفتیش کر رہا ہے‘ وہ اسے مانتا ہے۔ جمیلہ نے تیرے بارے میں تھانے دار سے شبہ ظاہر کیا ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا۔“

”یہ تو بہت پہلے ہی مجھے پتہ چل گیا تھا۔“ احسان شاہ کا لہجہ تیکھا تھا۔ ”تو نے یہ کوئی نئی گل نہیں بتائی۔ جمیلہ کو تو یہ کہنا ہی تھا۔“

”تو نے میری پوری گل نہیں سنی۔“ رحیم داد نشے کی ترنگ میں مسکرایا۔ ”میں نوں تجھے یہ بتانا ہے‘ اللہ وسایا کی پرانی دشمنی تو جمیلہ کے بھائیوں سے بھی تھی اور تجھ سے زیادہ تھی۔ اللہ وسایا ان کا مزارع تھا۔ اپنے معمولی مزارعے‘ اور وہ بھی مسلمان مزارعے کے گھر میں اپنی بہن کو اس کی گھر والی کے طور پر کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ وہ بھی تو اسے کتل کرسکتے ہیں۔“

”یہ بات تو نے سوچی ہے؟“ احسان شاہ نے پوچھا۔

”نہیں مجھے حویلی کے ایک نوکر نے بتائی ہے۔“ رحیم داد نے کھل کر اظہار خیال کیا۔ ”وہ کہتا تھا کو ٹلہ ہرکشن میں اس کا بہت چرچا ہے کہ اللہ وسایا کو جمیلہ کے بھائیوں نے کتل کیا اور رات ہی کو واردات کے بعد سرحد پار چلے گئے۔“

”نکتہ تو یہ بہت زوردار ہے۔“ احسان شاہ نے اظہار پسندیدگی کیا۔ ”ان پر بالکل شبہ کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح تفتیش کو ایسے رخ پر ڈالا جاسکتا ہے کہ آگے بڑھنے ہی نہ پائے۔“

”میں چاہتا ہوں تو اوپر کے پولس افسروں کے کان میں یہ بات ڈال دے۔“ رحیم داد نے تجویز پیش کی۔ ”نیا تھانے دار تفتیش پر لگایا جائے تو وہ اس طرح آسانی سے کیس یہ کہہ کر دبا سکتا ہے کہ

کاتل جمیلہ کے بھائی تھے جو سرحد پار جا چکے ہیں۔ ان کے خلاف کارروائی نہیں ہو سکتی۔ ” اس نے داد طلب نظروں سے احسان شاہ کی جانب دیکھا۔ “ویسے یہ بات پنڈ میں سب ہی جانتے ہیں کہ جمیلہ کے بھائی کئی بار اسے لینے آئے۔ ایک بار تو میرے سامنے آئے تھے پر وہ نہیں گئی۔ ”

“تو نے ٹھیک سوچا چوہدری۔ ” احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ “یہ نکتہ پیدا کر کے تو نے دل خوش کر دیا۔ تو اندر سے اتنا گہرا ہے یہ مجھے پتہ نہ تھا۔ ”

احسان شاہ کھلکھلا کر ہنسا اور چند لمحے تک ہنستا رہا۔ وہ بہت خوش اور مگن نظر آ رہا تھا۔ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ “ویسے یہ بات جمیلہ تک بھی پہنچ چکی ہے۔ وکیل کہتا تھا، وہ یہ سن کر بہت ناراض ہوئی۔ ”

“اسے تو ناراض ہونا ہی تھا۔ وہ کیسے چاہے گی، اللہ وسایا کے کتل کا الزام اس کے بھائیوں پر لگے۔ ” احسان شاہ نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ “وہ تو اسے کبھی نہیں مانے گی۔ پر اس کے ماننے نہ ماننے سے کیا فرک پڑتا ہے۔ ”

اس نے نشے کی جھونک میں لہرا کر رحیم داد کو خمار آلود نظروں سے دیکھا۔ “چوہدری تو نے بہت چنگا نکتہ نکالا، بہت چنگا نکتہ نکالا۔ اس بنیاد پر آسانی سے کیس دبایا جا سکتا ہے۔ شبہ بھی نہ ہو گا۔ سننے والے اسے مان بھی لیں گے۔ جمیلہ کے مغویہ ہونے سے یہ فائدہ تو اٹھایا ہی جا سکتا ہے۔ یہ بات تو آس پاس کے علاکے میں بھی پھیلائی جا سکتی ہے۔ جلد ہی پھیل بھی جائے گی۔ یہاں سے سرحد ۳۰ میل سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔ حویلی سٹیشن سے سرحد تک پکی سڑک جاتی ہے۔ اس سڑک پر رات تو رات، دن کو بھی سمگلروں کے اونٹھ اور ٹرک دوڑتے پھرتے ہیں۔ کاتل آسانی سے واردات کے بعد فرار ہو سکتے ہیں۔ ”

“ایک گل تجھے اور بتانی تھی۔ ”

“بتا بتا، ضرور بتا۔ ” وہ خوش ہو کر ہنسا۔ “آج تو بہت چنگی باتیں کر رہا ہے۔ ”

“گل ایسہ ہے جی، کبیر والا کے جس زمیں دار کی کڑی سے میرا ویاہ ہونے والا تھا، وہ رشتہ اس نے خود ہی توڑ دیا۔ ” رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ “جمیلہ نے یہی بتانے کے لیے مجھے بلایا تھا۔ اس کے پاس چوہدری اکرم کا چچیرا اور بھرجائی آئے تھے۔ ”

“یہ تو بہت ٹھیک ہوا۔ ویسے میں تجھے پہلے ہی خبردار کر چکا تھا کہ یہ بھی اللہ وسایا کا چکر ہے۔ اب تو نے خود ہی دیکھ لیا، اس کے مرتے ہی رشتہ ٹوٹ گیا۔ چوہدری! سچی گل تو ایسہ ہے، تجھ سے حویلی اور اراضی ہتھیانے کے لیے اللہ وسایا کی یہ بھی چال تھی۔ ” اس نے قہقہہ بلند کیا۔ “تجھے اب کہیں اور ویاہ کرنے کی کیا ضرورت۔ جمیلہ موجود ہی ہے۔ اس سے نکاح پڑھا لینا۔ ”

“مشکل ہی معلوم ہوتا ہے۔ ” رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ “لگتا ہے، وہ تو اب کسی سے نکاح شکاح نہیں کرنے کی۔ تو نے اس کا سیاپا نہیں دیکھا۔ ہر دم روتی ہی رہتی ہے۔ ”

“رانڈ ہونے کے بعد ہر زنانی ایسے ہی سیاپا کرتی ہے۔ بعد میں سب کچھ بھول جاتی ہے۔ جمیلہ نرالی زنانی نہیں۔ ابھی تو وہ بھرپور جوان ہے۔ ” احسان شاہ نے رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ نہ مانا۔ “شاہ جی، وہ اور ہی طرح کی زنانی ہے۔ تیں نوں اس کے بارے میں ٹھیک سے پتہ نہیں۔ ”

“مجھے سب پتہ ہے۔ ” احسان علی شاہ ہنس کر بولا۔ “تو دیکھتا جا۔ جیسا کہوں ویسا کر۔ جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ ابھی تو چوٹ تازہ ہے۔ اس سے ہمدردی جتا۔ اسے تسلی دے۔ اس کا دل بہلانے کی کوشش کر۔ اس کے بچوں سے پیار کر۔ ہر طرح اس کا غم بھلانے اور اس کے دل میں اپنی جگہ پیدا کرنے کی کوشش کر۔ فیر دیکھ وہ کیسے کابو آتی ہے۔ پکے پھل کی طرح تیری جھولی میں گرے گی۔ ”

“پر ابھی تو وہ عدّت میں ہے۔ مجھ سے گل بات کی تو منہ بکل مار کر چھپا لیا تھا۔ پیٹھ موڑ کر بیٹھی تھی۔ ابھی تو وہ میرے سامنے آتی بھی نہیں۔ نہ ہی میں اس کے پاس جا سکتا ہوں۔ ملّا کہتا ہے عدّت کے دنوں میں وہ نامحرم کے سامنے نہیں آ سکتی۔ میں اس کے لیے نامحرم ہی تو ہوں۔ میں اس کا کون سا سگا یا شریکا لگتا ہوں۔ ”

“اور وہ کون سی پکی مسلمان ہے۔ مجھے پتہ ہے وہ کیسے مسلمان ہوئی اور کیوں ہوئی؟” احسان شاہ کا لہجہ قدرے تیکھا تھا۔ “نہ کبھی اس نے پردہ شردہ کیا نہ وڈے زمینداروں کی زنانیوں کی طرح گھر کے اندر بیٹھی۔ اس کا رہن سہن تو ہمیشہ ہندنیوں جیسا رہا۔ تو نے اسے بہت نزدیک سے دیکھا ہے۔ خوب بن سنور کر ادھر سے ادھر تتلی کی طرح اڑی اڑی پھرتی تھی۔ وہ زیادہ دن ایسے بند ہو کر نہیں بیٹھے گی۔ زیادہ سے زیادہ عدّت کے دنوں میں حویلی سے باہر نہیں جائے گی۔ ”

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر احسان شاہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ وہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے بولا۔ “چوہدری۔ آج رات ادھر ہی ٹھہر جا۔ ”

“آیا تو اسی ارادے سے تھا۔ واپسی کے لیے گھوڑی بھی میرے پاس نہیں۔ ”

“گھوڑی تو تجھے مل جائے گی پر اس سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ بلکہ آگے بھی تو گھوڑی کی بجائے اسی رستے سے آیا کر جس سے آج آیا ہے۔ جمیلہ کو ہرگز پتہ نہیں چلنا چاہیے میرا تیرا میل ملاپ

ہے' ورنہ بھڑک جائے گی۔“

”میں نے یہی سوچ کر یہ رستہ پکڑا ہے۔“

”اللہ وسایا تو مزارع ہی رہا۔ اپنا تانگا بھی نہ رکھا۔ پر تو ایسا نہ کرنا۔ تانگا ضرور رکھنا۔ زمیں داری کے چکر میں روز ہی ادھر ادھر جانا پڑتا ہے۔ میرے پاس تو کار بھی تھی۔ پر اب تو پرانی ہو کر بے کار پڑی ہے۔ ویسے پچھلے دنوں میں نے ایک جیپ خرید لی ہے۔ لہور میں ہے۔ جلد ہی پہنچ جائے گی۔ اس کی مجھے سخت ضرورت تھی۔“

”شاہ جی تو ٹھیرا وڈا زمیں دار بلکہ جگیردار۔ سواری کے لیے چاہے تو نئی موٹر بھی خرید سکتا ہے۔ پر میرے پاس اتنی رکم کہاں۔“ رحیم داد نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ ”اللہ وسایا کے پاس بھی کچھ نہیں تھا۔ جو کچھ تھا اس سے ۱۲ مربع کلیم خرید لیا تھا۔ وہ بھی جمیلہ نے سکول اور ڈسپنسری بنانے کے لیے بچا کر رکھا تھا۔“

”سب بکواس ہے۔“ احسان شاہ نے تلخی سے کہا۔ ”اس کے پاس بہت پیسہ تھا۔ یہ تو اس نے تجھ سے چھپانے کے لیے سب کچھ کیا تھا۔ اسے زمیں داری اپنے کنبے میں ہی رکھنی تھی۔ یہ دکھاوا کر وہ زمیں داری میں سے تجھے کچھ دینا نہیں چاہتا تھا۔“ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

”اب تجھے زمیں داری سنبھالنی ہے اور اس طرح نہیں چلانی جیسے اب تک چلتی رہی۔ اللہ وسایا نے تو مزارعوں کے اتنے دماغ خراب کر دیئے تھے کہ سارے ہی اپنے تئیں زمیں دار بن گئے۔ سنا ہے' دیگار وہ نہیں کرتے۔ بٹائی میں بھی پورا پورا نصف حصہ لیتے ہیں۔ ایک گل ہو تو بتاؤں' تیرے پنڈ اور تیری زمیں داری کی ہر گل نرالی ہے۔“ اس نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ ”سمجھ نہیں آتی تو ان بگڑے ہوئے مزارعوں اور کمیوں کے ساتھ کیسے کام چلائے گا۔“

”شاہ جی! تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ پنڈ میں بالکل ایسا ہی ہوتا رہا۔ جب تک اللہ وسایا زندہ تھا میں نے زمیں داری کے معاملے میں کبھی نہ کچھ پوچھا اور نہ ہی اس میں حصہ لینے کی کوشش کی۔ ویسے میں نے جمیلہ سے بھی ابھی تک زمیں داری کے بارے میں کوئی گل بات نہیں کی۔“

”ابھی اس سے ایسی گل بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔“ احسان شاہ نے مشورہ دیا۔ ”پر آگے کے لیے تجھے ابھی سے سوچنا ہو گا۔ اور ویسے ہی زمیں داری چلانی ہو گی جیسے زمیں داری چلائی جاتی ہے۔“

”جیسا تو کہتا ہے' ویسا ہی کروں گا۔“ رحیم داد نے مشورہ قبول کرتے ہوئے اسے صورت حال سے بھی آگاہ کیا۔ ”شاہ جی! ویسے تو زمیندار اللہ وسایا ہی تھا۔ پر زمیں داری کے سارے معاملات عام طور پر جمیلہ ہی طے کرتی رہی ہے۔ حساب کتاب تو سارا ہی اسی کے پاس رہتا ہے۔ کسی مزارعے کو ادھار دینا ہو یا وصولی کرنی ہو' ایسا ہر کام وہی کرتی ہے۔ مزارعے اس سے خوش بھی بہت ہیں۔ اسے پیار سے بھین جی کہتے ہیں۔“ اس کے لہجے سے مجبوری جھلکنے لگی۔ ”تو خود سوچ' میں زمیں داری کا کام اپنی مرضی سے کیسے چلا سکوں گا۔“

”پر جمیلہ تو اب حویلی سے باہر نہیں جا سکتی۔ اسے تو عدت کے چار مہینے دس دن پورے کرنے ہیں۔ اس عرصے میں تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔“ اس کا لہجہ قدرے تیکھا ہو گیا۔ ”لگتا ہے تو زمین داری سنبھالنے کو تیار ہی نہیں۔“

”ایسی گل نہیں۔ میں تو بالکل تیار ہوں۔“ اس نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ ”ایسا ارادہ نہ ہوتا تو اللہ وسایا کو اپنے رستے سے کیوں ہٹانے پر آمادہ ہوتا۔ مشکل یہ ہے زمیں داری کو کیسے اپنے ہاتھ میں لیا جائے۔ جمیلہ سے اس معاملے میں ابھی گل بات کرنی ٹھیک نہیں۔ ڈرتا ہوں اسے شبہ نہ ہو جائے۔“

”نہیں' تو جمیلہ سے ایسی بات نہ کرنا۔ میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔“

رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ”وہ کیا ہے جی؟“

”تو زمیں داری کی دیکھ بھال کے لیے مینجر اور منشی رکھ لے۔ اسی کے ذریعے زمیں داری کا کام چلانے کی کوشش کر۔ وہ تیرا تنخواہ دار بندہ ہو گا۔ جیسا تو کہے گا ویسا ہی کرے گا۔ یوں سمجھ لے اس کے ذریعے ساری زمیں داری تیرے ہاتھ میں آ جائے گی۔“

”گل سمجھ تو آتی ہے۔“ رحیم داد نے آہستہ آہستہ سر ہلایا۔ ”پر ایسا بندہ میں لاؤں گا کہاں سے؟“

”فکر نہ کر۔ اس کا بندوبست میں کر دوں گا۔ بلکہ میری نظر میں اس کام کے لیے پہلے ہی سے ایک بندہ ہے۔“ احسان شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس کا نام نادر خاں ہے۔ محکمہ مال میں رہ چکا ہے۔ ڈیرہ غازی خاں کے ایک تمن دار کا کاردار بھی رہ چکا ہے۔ بہت تجربہ کار اور کام کا بندہ ہے۔ آج کل خالی ہے۔ پچھلے دنوں میرے پاس آیا تھا۔ ادھر رحمت والی میں اس کی سسرال ہے۔ فی الحال وہیں ٹھیرا ہے۔“

”تنخواہ کیا لے گا؟“

”تنخواہ کی فکر نہ کر۔ وہ مجھ پر چھوڑ دے۔ وہ اتنا کام کا بندہ ہے کہ جتنی تنخواہ لے گا اس سے کہیں زیادہ تجھے فائدہ پہنچائے گا۔“ احسان شاہ بے تکلفی سے کھلکھلا کر ہنسا۔ ”وہ تجھے پکا زمیں

دار بنا دے گا۔ تو مہاجر ہے' ادھر کی زمیں داری کے رنگ ڈھنگ کا تجھے زیادہ پتہ نہیں۔ ایسا بندہ تجھے دوں گا کہ زمیں داری کا لطف آجائے گا۔"

رحیم داد کچھ کہنے ہی والا تھا کہ یکایک موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ بجلی زور سے کڑکی۔ آسمان میں روشنی کی تیز لکیر دور تک پھیل گئی۔ ساتھ ہی تیز بارش شروع ہو گئی۔ دونوں لان سے اٹھ کر برآمدے میں پہنچ گئے۔ شیدا اور دوسرے نوکروں نے بھاگم بھاگ میز اور کرسیاں اٹھا کر برآمدے میں لگا دیں۔

احسان شاہ اور رحیم داد پھر وہسکی سے شغل کرنے لگے۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بادل زور زور سے گرجتے۔ برآمدے میں تیز ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کبھی کبھی ہلکی سی بوچھاڑ بھی آجاتی۔ دونوں بارش سے لطف اٹھاتے رہے اور وہسکی کے نشے کو دو آتشہ بناتے رہے۔ احسان شاہ تو غٹاغٹ چڑھاتا رہا۔ مگر رحیم داد بھی اس رات حد سے تجاوز کر گیا۔ احتیاط کے باوجود کچھ زیادہ ہی پی گیا۔ وہ بے تکلفی سے قہقہے لگاتا۔ بات کرتا تو زبان کسی قدر لڑکھڑاتی۔ بہک کر کہیں سے کہیں نکل جاتا۔ احسان شاہ بھی نشے کے ریلے میں بار بار بہہ جاتا۔ دونوں ہی سرخوشی کے عالم میں تھے۔

دس بجے سے کچھ دیر پہلے دونوں اٹھے اور ڈگمگاتے قدموں سے کھانے کی میز پر پہنچے۔ کھانا پر تکلف اور خوش ذائقہ تھا۔ رحیم داد مزا لے لے کر خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ مگر احسان شاہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے ایک طرف ادب سے کھڑے ہوئے شیدا کو دیکھا۔ اشارے سے قریب بلایا۔

شیدا نزدیک آیا تو احسان شاہ نے کہا۔ "چوہدری' آج رات یہیں ٹھیرے گا۔ کمرہ ٹھیک ٹھاک کرا دے۔" اس نے اپنی مخمور آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحے اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ اس نے آنکھیں کھول کر شیدا کی جانب دیکھا۔ "تاجو کو چوہدری کے کمرے میں پہنچا دے۔"

شیدا خاموش رہا۔ کچھ نہ بولا۔ احسان شاہ نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ڈپٹ کر پوچھا۔ "چپ کر کے کیوں کھڑا ہے؟"

شیدا نے دبی زبان سے کہا۔ "تاجو تو جی۔" وہ بات کہتے کہتے رک گیا۔

احسان شاہ نے اونچی آواز سے کہا۔ "کیا ہو گیا تاجو کو؟ صاف صاف بتا۔ کوٹ سے نکل کر بھاگ تو نہیں گئی؟"

"نہیں جی ایسی کوئی گل نہیں۔" شیدا بدستور خوف زدہ تھا۔

"فیر کیہ۔ گل ہے؟ ٹھیک ٹھیک بتا۔ کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"وہ ایسا ہے جی۔" وہ ایک بار پھر اٹکا۔ لمحہ بھر خاموش رہ کر آہستہ سے بولا۔ "اسے تو جی۔ چھوٹے شاہ جی نے اپنے کمرے میں بلا رکھا ہے۔"

"اس کھوتی کے جنے نے یہ بھی نہ سوچا تاجو عمر میں اس سے کتنی بڑی ہے۔" وہ غصہ سے آنکھیں نکال کر بولا۔ مگر جلد ہی نرم پڑ گیا۔ آہستہ سے ہنسا۔ رحیم داد کی جانب مڑ کر دیکھا۔ "یہ جوانی بھی بہت ظالم ہوتی ہے۔ نہ جوڑ دیکھے نہ بے جوڑ۔ اندھا بنا دیتی ہے۔" اس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ "چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ جاڑے میں اس کا ویاہ کرنے والا ہوں۔ تاجو اسے سارے گر بتا دے گی۔ بہت زوروں کی رن ہے۔"

رحیم داد بے نیازی سے بریانی کی پلیٹ سے لقمے اٹھا اٹھا کر کھاتا رہا۔ شیدا سر جھکائے چپ کھڑا رہا۔ احسان شاہ آنکھیں بند کر کے ایک بار پھر مراقبے میں چلا گیا۔ چند لمحوں بعد گردن اٹھا کر شیدا کی جانب متوجہ ہوا۔ "شیدے!" وہ بات کہتے کہتے بھٹکا۔ "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ بلو کیسی رہے گی؟ بالکل ٹھیک۔ اسے پہنچا دے۔ وہ نکھرا سنکھرا بھی نہیں کرے گی۔ چوہدری کو تو ایسی ہی رن چاہیے۔" اس نے رحیم داد کی سمت دیکھا۔ "کیوں چوہدری کیا خیال ہے تیرا؟ اگر تجھے تیز اور گرم چاہیے تو بتا دے۔"

"میں نوں تو جی نہ گرم چاہیے نہ ٹھنڈی۔ میں تو ایسے ہی سو جاؤں گا۔ میری فکر نہ کر۔"

"چوہدری تو زنانیوں کی طرح شرما کیوں رہا ہے؟ داڑھی رکھ کر تو بالکل ملاں بن گیا۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "ملاں بن کر زمین داری نہیں چل سکتی۔ اور ملاں بے چارے کو تو زنانی ملتی ہی کہاں ہے؟ وہ تو صرف اس کے خواب دیکھتا ہے۔ اور تو' تو۔" وہ ایک بار پھر بہکا اور دوسری طرف نکل گیا۔ "جمیلہ بھی بہت زوروں کی رن ہے۔ جب اللہ وسایا اسے اٹھا کر لایا۔ یہ کوئی اٹھ سال ادھر کی گل ہے۔ میں اسے دو ہزار دیتا رہا کہ میری حویلی میں بھیج دے۔ پر وہ نہ مانا۔" اس نے پلٹ کر شیدا کی جانب دیکھا جو سر جھکائے بت بنا کھڑا تھا۔ "تو ابھی گیا نہیں۔ جا' جا کر چوہدری کے ٹھیرنے کا بندوبست کر۔ بلو کو پہنچا دے۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو پھر چھیڑا۔ "چوہدری! ساون کی یہ گرجتی برستی کالی راتیں روز روز نہیں آتیں۔ کیا سمجھا؟"

شیدا جانے کے لیے مڑا۔ احسان شاہ نے اسے ٹوکا۔ "ٹھیر! میں آج باڑی والے کمرے میں رہوں گا۔ رانی اور دلاراں' دونوں کو بھیج دے۔ جو ٹھیک لگے گی اسے روک لوں گا۔ اب تو ٹر جا اور فٹافٹ سارا بندوبست کروے۔"

شیدا چلا گیا۔ رحیم داد اطمینان سے کھانا کھانے میں جٹا تھا۔ احسان شاہ نے اسے مخاطب کیا۔

"چوہدری! یہ اپنا شیدا، بہت کام کا بندہ ہے۔ تجھے بھی ایسے ہی بندے کی ضرورت پڑے گی۔ فکر نہ کر۔ نادر خاں تیرا مینجر لگ گیا تو تیرے لیے کسی ایسے ہی بندے کا انتظام کردے گا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" رحیم داد نے بے نیازی سے کہا۔ پانی کا گلاس اٹھایا۔ اس کا ہاتھ ڈگمگایا۔ گلاس چھوٹ کر میز پر گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔ پانی میز پر دور تک پھیل گیا۔ رحیم داد نے چونک کر احسان شاہ کی جانب دیکھا۔ خفیف ہو کر بولا۔ "معاف کرنا شاہ جی۔"

"کوئی گل نہیں۔" احسان شاہ نے اسے احساس ندامت میں مبتلا نہ ہونے دیا۔ "پانی کے بجائے تو لسی پی لے۔ نشے کی تیزی ذرا کم ہو جائے گی۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "آج تو نے بھی جم کر لگائی ہے۔" احسان شاہ نے میز پر رکھے ہوئے جگ سے لسی ایک گلاس میں انڈیلی اور گلاس رحیم داد کی جانب بڑھایا۔

رحیم داد نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ لسی سے بھرا ہوا گلاس سنبھالا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔

☆

بارش کا زور اب ٹوٹ چکا تھا۔ بپھری ہوئی ہوا بھی مدھم پڑھ گئی تھی۔ مگر بوندا باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ کچھ دیر بعد شیدا آگیا۔ اس کے پہنچتے ہی رحیم داد اور احسان شاہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ احسان شاہ باڑی کی طرف چلا گیا۔ رحیم داد نے شیدا کی رہنمائی میں آگے قدم بڑھائے۔ اس کے قدم بہکے بہکے تھے۔ نظریں کسی قدر دھندلی پڑ گئیں تھیں۔ دونوں راہداری سے گزر کر برآمدے میں پہنچ گئے۔

شیدا آگے آگے تھا۔ رحیم داد اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

شیدا ایک کمرے کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔ اس نے کمرے کا بند دروازہ کھول دیا۔ اندر لیمپ روشن تھا۔ برآمدے کے آگے باغیچے میں سرس کے دو اونچے اور گھنے درخت تھے۔ درختوں تلے اندھیرا تھا۔ اندھیرا میں کوئی دھندلے سائے کی مانند چپ چاپ کھڑا تھا۔ شیدا نے مڑ کر ادھر دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

"اتھے آجا۔"

درختوں کے نیچے آہٹ ابھری۔ ذرا دیر بعد برآمدے کی سیڑھیاں طے کر کے ایک نوجوان عورت اندھیرے سے نکل کر سامنے آگئی۔ رحیم داد نے دیکھا، کمرے کے اندر سے پھوٹتی ہوئی لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں وہ شیدا کے قریب گم صم کھڑی ہے۔ اس کی عمر تیئس چوبیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ چھینٹ کی گھگریل پہنے تھی۔ سر پر لہریا دوپٹہ تھا۔ اس کا جسم قدرے پھ

تھا۔ چہرہ بھی چوڑا چکلا تھا۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ اسے دیکھ کر پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ ذرا ہی دیر پہلے اس نے تیل ڈال کر سر کے بال سنورے ہیں، آنکھوں میں کاجل لگایا ہے۔ اس کا لباس شوخ اور اجلا تھا۔ مگر وہ خود سہمی ہوئی نظر آرہی تھی۔

شیدا نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ "یہ بلو ہے جی۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے کمرے کے اندر چلا گیا۔ شیدا نے بلو کا بازو پکڑ کر ہولے سے گھسیٹا اور اس کے ہم راہ کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دہلیز کے پاس رک کر کہا۔ "چوہدری! دروازہ اندر سے بند کرلینا۔ میں نوں شاہ جی کے پاس جانا ہے۔" وہ دروازے کے دونوں پٹ بھیڑ کر چلا گیا۔

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ برآمدے میں گہرا سناٹا چھایا تھا۔ رات کالی اور بھیگی ہوئی تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے نرم اور خنک جھونکے اندر آرہے تھے۔ باغ میں بارش کی بوندیں پتوں پر جل ترنگ بجا رہی تھیں۔ رحیم داد نے بلو کو گہری نظروں سے دیکھا۔ نشے کا ایک زوردار ریلا آیا۔ بلو ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی، دھندلی پڑ گئی۔ ریلا گزر گیا تو وہ اور نکھر کر سامنے آگئی۔ رحیم داد کی آنکھوں میں چراغ جل رہے تھے، بجھ رہے تھے۔ بلو اوجھل ہو جاتی، نئی چھب دکھا کر سامنے آجاتی۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا اور لیمپ بجھ گیا۔

سویرے سویرے جب رحیم داد کمرے سے نکلا تو بلو موجود نہ تھی۔ اس وقت بھی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ رحیم داد نے نہا دھو کر ناشتا کیا۔ ناشتے پر اس کے ساتھ احسان شاہ بھی موجود تھا۔ اس کی آنکھیں نشے کے خمار سے اب تک سرخ تھیں۔ ناشتے پر وہ خاموش رہا۔

رحیم داد نے ناشتے سے فارغ ہو کر واپس جانے کا اظہار کیا۔

احسان شاہ نے پوچھا۔ "چوہدری! اب تو کب آئے گا؟"

"میں خود ہی آجاؤں گا۔" رحیم داد نے دبی زبان سی کہا۔ "پر تو ماکھے کو میرے پاس نہ بھیجنا۔ اس کے آنے جانے سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔" اس نے اپنا خدشہ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"تو کہتا ہے تو اسے تیرے پاس نہیں بھیجوں گا۔ پر تجھ سے ملاقات ہوتی رہنی چاہیے۔"

رحیم داد نے کہا۔ "میں جلد ہی تیرے پاس آنے کی کوشش کروں گا۔ ویسے بھی ادھر اکیلے میں بہت جی گھبراتا ہے۔" وہ بے تکلفی سے ہنسا۔

"پر تو جلدی نہ آنا۔" احسان شاہ نے کہا۔ "میں ہفتہ بھر کے لیے لہور جا رہا ہوں۔ کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔ دس باراں روز بعد آنا۔ میں اس بیچ میں نادر خاں کو بھی بلوالوں گا۔ کام کا بندہ

ہے۔ کہیں اور لگ گیا تو ایسا مینجر ملے گا نہیں۔ تیرے لیے تو وہ بہت ضروری ہے۔ تجھے ادھر کی زمیں داری کا کچھ اتا پتا نہیں۔ نادر تیرے ساتھ لگ گیا تو زمیں داری ایسی چکا دے گا کہ تیرا بالکل جی نہ گھبرائے گا۔" اس نے قہقہہ بلند کیا۔ "حد ہو گئی جی' زمیں دار کا اپنی ہی زمیں داری میں دل گھبرائے۔"

رحیم داد نے اس کی باتیں سنیں اور صرف مسکرا کر رہ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ احسان شاہ سے رخصت ہوا۔ اسی کے ذاتی تانگے سے حویلی اسٹیشن پہنچا۔ جس راستے سے آیا تھا اسی راستے سے کوٹلہ ہرکشن واپس گیا۔ پچھلی رات کی موسلا دار بارش نے سڑکیں اور راستے اس قدر خراب کردیئے تھے کہ جب وہ مہمان خانے میں داخل ہوا تو شام ہو چکی تھی۔ احمد اس کا بے چینی سے منتظر تھا۔ دیکھتے ہی بولا۔

"چوہدری! تو نے بہت دیر لگا دی۔ میں تو رات سے تیرا انتظار کر رہا تھا۔"

"تیرا مغز تو نہیں چل گیا۔" رحیم داد نے جھنجلائے ہوئے انداز میں اسے ڈانٹا۔ "رات بھر بارش ہوتی رہی۔ میں ایسے میں کیسے سفر کر سکتا تھا۔"

احمد اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ جلدی سے صحن میں کرسی لا کر ڈال دی۔ رحیم داد اس پر بیٹھ گیا۔ احمد کمرے کے اندر سے دھوتی اور سلیپر نکال کر لایا۔ اس نے رحیم داد کے جوتے اتارے' پگڑی سنبھالی اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے کپڑے اتار کر دھوتی باندھی اور غسل خانے میں چلا گیا۔ نہا کر آیا۔ اجلا لباس پہنا۔ مہمان خانے سے نکل کر باغ میں چلا گیا۔ ہوا رکی ہوئی تھی۔ فضا میں حبس تھا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔

رحیم داد دن بھر کا بھوکا تھا۔ احسان شاہ کی حویلی میں ناشتا کرنے کے بعد اس نے راستے میں کچھ نہیں کھایا تھا۔ باغ میں پہنچتے ہی اس نے احمد سے کھانا لانے کو کہا۔ کھانا آیا تو اس نے سیر ہو کر کھایا۔ رات گئے تک باغ میں بیٹھا رہا۔ جب سناٹا گہرا ہو گیا تو وہ مہمان خانے میں گیا۔ دن بھر کر تھکا ہوا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔

☆

ساون بھادوں مل رہے تھے۔ کالے کالے بادل گھر گھر کر امڈتے رہے۔ زور زور سے گرجتے رہے' برستے رہے۔ پانچ روز تک مینہ کی جھڑی لگی رہی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا' بادل اب برس کر نہ رکیں گے۔ آسمان سرمئی چادر بن گیا تھا۔ چھلنی کی مانند پانی برستا تھا۔ خدا خدا کر کے مینہ برسنا بند ہوا۔ ہر طرف جل تھل ہو گیا تھا۔ جدھر نظر اٹھتی پانی ہی پانی نظر آتا۔ گاؤں کے گلی کوچوں میں جگہ جگہ پانی کھڑا تھا یا کیچڑ تھی۔

پہر دن گزر چکا تھا۔ رحیم داد کمرے میں تھا۔ وہ باہر نکلنے کا اردہ کر ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور وکیل محمد عثمان رندھاوا اندر داخل ہوا۔

آسمان پر بادلوں کا ہلکا ہلکا غبار چھایا تھا۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی۔ موسم خوش گوار تھا۔ مگر وکیل کا چہرہ خلاف معمول زیادہ ہی سنجیدہ نظر آتا تھا۔ وہ بجھا بجھا لگتا تھا۔ جمیلہ سے وہ پہلے ہی مل چکا تھا۔

رحیم داد نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو اظہار ہمدردی کے طور پر پوچھا۔ "وکیل صاحب! کیا بات ہے جی۔ بہت پریشان نظر آ رہے ہو؟"

"پریشانی کی بات ہی ہے۔ اندھیر ہے' سراسر اندھیر ہے۔" وکیل نے شکوہ کیا۔

"کیا ہو گیا جی؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہونا کیا تھا' پولیس' اللہ وسایا کے قتل کو دبانے کی ہر طرح کوشش کر رہی ہے۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

"پچھلی بار تو کہا تھا تھانے دار نے کتل کا پتہ چلا لیا ہے۔ جلد ہی ملزموں کی گرفتاریاں شروع ہو جائیں گی۔ اب کیا ہو گیا؟"

"اب کچھ بھی نہیں ہو گا۔" وکیل نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "انسپکٹر محمد حیات جنجوعہ پوری تن دہی اور دلچسپی سے تفتیش کر رہا تھا۔ اچانک اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔"

"اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔ کیوں؟ کوئی تو وجہ ہو گی۔"

"یہ تو افسران بالا ہی کو علم ہو گا۔ میں تو یہ جانتا ہوں پچھلے دنوں اس کا تبادلہ کر کے دوسرا تفتیشی افسر لگا دیا گیا۔" وکیل محمد عثمان رندھاوا نے بتایا۔ "یہاں آنے سے پہلے میں اس سے ملا تھا۔ کہتا تھا اللہ وسایا کو اس کی گھر والی کے بھائیوں نے رات کے اندھیرے میں قتل کیا اور سرحد پار نکل گئے۔ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ پولیس نے اپنی تفتیش ختم کر دی۔ آگے کوئی کارروائی نہیں ہو گی۔"

"ایسا ہی لگتا ہے۔" رندھاوا نے کہا۔ "چوہدری! تجھے تو پتہ ہے۔ ایسی افواہ تو پہلے ہی سن نے میں آ رہی تھی۔ تو نے بھی مجھ سے یہی بات بتائی تھی۔ زمیں دارنی کو بھی اس کا پتہ چلا تھا۔ وہ اسے سن کر خفا بھی ہوئی تھی۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "میں تو کہتا ہوں ایسی افواہ جان بوجھ کر پھیلائی گئی تاکہ کیس دبانے میں آسانی ہو۔ اسی لیے انسپکٹر جنجوعہ کا تبادلہ ہوا۔ مجھے تو اللہ وسایا کے کتل کے پیچھے گہری سازش نظر آتی ہے۔"

"آگے کچھ نہیں ہو سکتا؟" رحیم داد نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔

"زمیں دارنی گورنر، وزیراعلیٰ اور آئی۔ جی پولس کو درخواستیں بھیجنے کو کہتی تھی۔ درخواستیں تو میں اس کے کہنے پر لگا دوں گا پر اب کچھ ہوتا نظر نہیں آتا۔ کیس تفتیش کے ابتدائی مرحلے پر خراب کردیا جائے تو اس کے بعد کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے یہی دیکھا ہے۔"

"اس کا مطلب تو صاف یہ ہوا تفتیش آگے نہیں چلے گی۔"

"فی الحال تو تفتیش کا کام ختم کرکے کیس دبا دیا گیا۔ حالانکہ پولیس کے پاس زمیں دارنی کے بھائیوں کو ملزم ٹھیرانے کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔ تھانے دار نے خانہ پری کے لیے اپنے لگے بندھے گرگوں کی شہادت کا سہارا لیا ہے اور یہ پولس کا پرانا حربہ ہے۔ کوئی نئی گل نہیں۔" وکیل نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کچھ دنوں بعد سن لینا پولس نے کیس داخل دفتر کردیا۔"

"یہ تو جی بہت اندھیر گردی ہے۔"

"ہے تو۔" وکیل نے موضوع بدلتے ہوئے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری! میں تیرے پاس اس لیے آیا تھا کہ اللہ وسایا کے مرنے کے بعد مختارنامہ تو خود بخود ختم ہوگیا۔ اب کلیم کے ہر معاملے سے تجھے خود نمٹنا پڑے گا۔"

"میں نوں کیہہ نمٹنا نمٹنا جی۔" رحیم داد نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "جیسا کہو گے ویسا کروں گا۔ پر ابھی تو کچھ نہیں کرنا۔"

"بات یہ ہے چوہدری! تیرے کلیم میں کچھ گڑبڑ ہے۔ اللہ وسایا نے اس کے بارے میں تجھے بتایا بھی ہوگا۔"

"اس نے تو جی مجھے کچھ نہیں بتایا۔" رحیم داد نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ "گھبرانے کی تو کوئی گل نہیں؟"

"معاملہ ویسے تو پیچیدہ ہے۔ پر میں کوشش کر رہا ہوں کہ ٹھیک ہوجائے۔" وکیل نے اسے آگاہ کیا۔ "مگر اس کے لیے پیسے کی ضرورت ہے۔ میں نے زمیں دارنی سے ذکر کیا تو اس نے ہزار روپے خرچ کے لیے دیئے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "ویسے اس کے پاس پیسہ بالکل نہیں۔ سب کچھ تو ١٢ مربع اراضی کے کلیم کی خریداری میں دے دیا۔ ابھی اسے اللہ وسایا کا چالیسواں بھی کرنا ہے۔"

"تمہارا مطلب چالیا کرنے سے ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"ہاں میرا یہی مطلب ہے۔" وکیل نے جواب دیا۔ "زمیں دارنی اسے اپنی حیثیت کے مطابق ہی کرے گی۔ ایسا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں ابھی تو ہزار روپے سے کام چلانے کی کوشش کروں گا۔" اس نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ "اگر معاملہ زیادہ الجھ گیا تو تگڑی رقم کھلائے بغیر کام نہیں بنے گا۔ مہینے، دو مہینے کے اندر کم از کم چار ہزار کا بندوبست کرنا ہوگا۔ ویسے یہ بات میں نے زمیں دارنی سے نہیں کہی۔ وہ اور پریشان ہوجاتی۔ پر اب تم کو ہی زمیں داری کی دیکھ بھال کرنی ہے اور اس کلیم کا تو براہ راست تعلق اس جائیداد سے ہے جو تم کو الاٹ ہوئی ہے۔"

رحیم داد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پر وکیل صاحب میں تو ابھی کچھ نہیں کرسکتا۔ زمین کا الاٹمنٹ ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ خریف کی فصل تیار ہو تو کچھ رکم ہاتھ آئے۔ تیں نوں پتہ ہی ہے، پہلے بھی سب کچھ اللہ وسایا اور اس کی گھر والی ہی نے خرچ کیا تھا۔ زمیں داری کی اب تک دیکھ بھال بھی وہی دونوں کر رہے تھے۔ میں نے تو اس بارے میں ابھی کچھ سوچا بھی نہیں۔"

"اسی لیے میں نے تم کو دو مہینے دیئے ہیں۔ اس عرصہ میں رقم کا بندوبست کرنا ہوگا۔ جی چاہے تو زمیں دارنی سے بات کرلو۔ میں نے پہلے سے آگاہ کردیا۔"

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ وکیل اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ چلتے چلتے اس نے خبردار کیا۔ "چوہدری! رقم کا انتظام کرنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ الاٹمنٹ منسوخ ہونے کا بھی امکان ہوسکتا ہے۔" وکیل مڑا اور کمرے سے چلا گیا۔

وکیل محمد عثمان رندھاوا سے گفتگو کے بعد رحیم داد کو یہ تو اطمینان ہوگیا کہ تھانے دار جنجوعہ کا تبادلہ کردیا گیا ہے اور نئے تھانے دار نے ملزموں کو مفرور قرار دے کر تحقیقات ختم کردی ہے۔ اللہ وسایا کا قتل اب اس کے لیے باعث تشویش نہ رہا تھا۔ احسان شاہ نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا تھا بالکل ویسا ہی ہوا۔ رحیم داد اس کے اثر و رسوخ سے بہت متاثر ہوا۔ مگر اس تشویش سے نجات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک نئی پریشانی میں مبتلا ہوگیا۔ یہ کلیم اور اس کی بنیاد پر الاٹ ہونے والی اراضی اور جائیداد کا مسئلہ تھا۔ وکیل کی باتوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کلیم میں کوئی گڑبڑ ہے۔ ہرچند کہ وہ بہت معمولی زمین دار رہ چکا تھا مگر ہر زمیں دار کی طرح زمین اور جائیداد اس کی بھی بہت بڑی کمزوری تھی۔ وہ ہر قیمت پر کوٹلہ ہرکشن کے دس مربعے اور حویلی اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا۔ بلکہ جمیلہ کے بارہ مربعوں پر بھی اس کی نظر تھی۔ اللہ وسایا کے قتل میں احسان شاہ کا آلہ کار بننے کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی۔

رحیم داد مہمان خانے سے نکل کر کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ اس نے فصلوں کو دیکھا۔ مزارعوں ان کے بارے میں بات چیت کی۔ وہ بہت دیر تک مزارعوں کے ساتھ ہی رہا۔

اب اس کا یہ معمول ہو گیا کہ دن میں کسی وقت کھیتوں کی طرف چلا جاتا اور مزارعوں کے ساتھ کچھ وقت گزارتا۔ وہ زمیں داری کے کاموں میں ذاتی طور پر دلچسپی لینے لگا تھا۔ شام کو وہ باغ میں بیٹھتا۔ وہاں بھی مزارعوں کو بلا لیتا۔ ان کے ساتھ موسم اور فصلوں کے علاوہ بیماری اور شادی بیاہ کے بارے میں بھی باتیں ہوتیں۔ مگر گھوم پھر کر اللہ وسایا کا ذکر ضرور ہوتا۔ اور ایک بار اس کا ذکر چھڑ جاتا تو دیر تک چلتا رہتا۔ رحیم داد کو ان کے روّیے سے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ اللہ وسایا اور جمیلہ' دونوں سے بہت محبت کرتے ہیں اور اس حد تک کرتے ہیں کہ اللہ وسایا مرحوم کے بارے میں گفتگو کرتے کرتے ان کے چہرے اداس اور غم زدہ ہو جاتے۔ وہ دل گرفتہ ہو کر رو پڑتے۔ کبھی کبھی رحیم داد کو ان کا یہ روّیہ بڑا شاق گزرتا۔

اللہ وسایا مر کر بھی زندہ تھا۔ اور جب تک وہ کسی نہ کسی روپ میں زندہ تھا' رحیم داد کو زمیں داری کے معاملات میں اپنا سکہ بٹھانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اسے ایک ایسے تجربہ کار اور قابل اعتماد آدمی کی ضرورت تھی جو مزارعوں کے ذہنوں میں جھلملاتا ہوا اللہ وسایا کی یادوں کا چراغ بجھا کر رحیم داد کی شخصیت کا چراغ روشن کر سکے۔ ایسا آدمی احسان شاہ نے مہیا کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ اب تک پہنچا نہیں تھا۔ رحیم داد بھی احسان شاہ کے پاس جا نہ سکا تھا۔ موقع ہی نہ ملا۔

☆

کئی روز سے بارش نہ ہوئی تھی۔ ہوا بھی بند تھی۔ آسمان پر بادل چھائے رہتے۔ مگر کھل کر نہ برستے۔ کبھی کبھار ہلکا سا چھینٹا پڑتا۔ اس کے بعد حبس اور بڑھ جاتا۔ دن بھر سخت تپش رہتی۔ جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا۔ سورج کبھی بادلوں کے پیچھے روپوش ہو جاتا کبھی نکل کر سامنے آ جاتا۔ اس کی چمک دمک بہت تیز ہوتی۔ دھوپ میں اس قدر تمازت اور چبھن ہوتی کہ بدن پگھلتا ہوا محسوس ہوتا۔

انھی دنوں اللہ وسایا کا چالیسواں ہوا۔ جمیلہ نے اس سلسلے میں رحیم داد سے کوئی مشورہ نہ کیا۔ صرف اتنا کیا کہ ایک شام جب وہ مہمان خانے سے باغ میں جانے کا ارادہ کر رہا تھا تو احمد حویلی کے دروازے سے نکل کر آیا اور اسے مطلع کیا۔

"چوہدری! زمیں دارنی نے کہا ہے' اللہ وسایا کا چالھیا ہونے والا ہے۔"

"کب ہو رہا ہے چالھیا؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

"کل ہے جی۔" احمد نے بتایا۔

"اللہ وسایا تو ایسا نیک اور چنگا بندہ تھا کہ اس کا چالھیا تو اکٹھ کہلانا چاہیے۔" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ چہرے کو افسردہ بنانے کی کوشش کی۔ "وکھت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔ کل اللہ وسایا کی موت کو ۴۰ دن ہو جائیں گے۔ اس کا چالھیا اور اکٹھ ہو گا۔ سال بھر بعد وڈا اکٹھ ہو گا۔ دوسرے سال دورھیا' تیسرے سال تورھیا اور چوتھے سال چورھیا ہو گا۔ وکھت دھیرے دھیرے ایسے دھوپ چھاؤں کی طرح گزر جاتا ہے' کچھ پتہ نہیں چلتا۔"

احمد کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے رحیم داد کا چہرہ ٹکر ٹکر تکتا رہا۔ رحیم داد کچھ دیر گم صم کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا مہمان خانے سے باہر چلا گیا۔ اس کے چہرے پر افسردگی کے ہلکے ہلکے سائے پھیلے تھے۔ آنکھیں بجھی بجھی تھیں۔

جمیلہ نے چالیسویں کے لیے بڑے اہتمام سے کھانا پکوایا۔ گاؤں کے تمام ہی مزارعے اور کمی' مرد اور عورتیں حویلی کے باہر اور اندر جمع ہوئے۔ پاس پڑوس کے گاؤں اور چکوں سے بھی لوگ آئے۔ مسجد کے ملّا نے فاتحہ خوانی کی۔ وہ نیا لباس پہنے ہوئے تھا جو جمیلہ نے اللہ وسایا کے نام پر اسے خیرات میں دیا تھا۔ فاتحہ کے بعد سب نے کھانا کھایا اور اللہ وسایا کے لیے دعائے مغفرت کی۔ رحیم داد اس روز بہت مصروف رہا۔ رات گئے تک حویلی کے باہر سائبان کے نیچے چالیسویں کی فاتحہ میں شریک ہونے والوں کی ساتھ رہا۔

حویلی کے اندر اور باہر خاصی چہل پہل رہی۔ مگر چالیسویں کے بعد حویلی اور زیادہ اجاڑ اور سنسان نظر آنے لگی۔ رحیم داد کی بیشتر شامیں تنہا گزرتیں۔ جمیلہ سے بھی اس کی ملاقات نہ ہوئی۔ نہ اس نے بلایا اور نہ ہی بلائے بغیر وہ اس کے پاس جا سکتا تھا۔ شام کو وہ باغ میں مزارعوں سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا یا اکیلا بیٹھا رہتا۔

☆

یہ ایک اداس اور بے کیف شام تھی۔ رحیم داد باغ میں خاموش بیٹھا تھا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ شام کا دھندلکا دھیرے دھیرے فضا میں گھل رہا تھا۔

شام کی اس خاموشی میں دفعتہ درختوں تلے قدموں کی آہٹ ابھری۔ رحیم داد نے گردن کو خم دے کر اس طرف دیکھا' درختوں کے نیچے سے ایک شخص نکل کر آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھ رہا ہے۔ رحیم داد نے اسے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ وہ نظریں جھکائے آگے بڑھ رہا تھا۔ رحیم داد کے سامنے پہنچ کر وہ ٹھہر گیا۔ اس کی عمر بچپن سے تجاوز کر چکی تھی۔ مگر

جسم ابھی تک مضبوط اور صحت مند تھا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ سر پر پگڑی بھی ڈھیلی ڈھالی تھی۔ آنکھوں پر عینک تھی۔ وہ قمیض اور شلوار پہنے تھا۔ گرمی اور حبس کے باوجود کوٹ بھی پہنے ہوئے تھا۔

رحیم داد نے اسے غور سے دیکھا۔ پہچاننے کی کوشش کی۔ مگر پہچان نہ سکا۔ اجنبی نے نظریں جھکالیں۔ ادب سے خاموش کھڑا رہا۔ رحیم داد نے پوچھا۔ "تیں نوں کسے ملنا ہے؟"

"میں نے جی چوہدری نورالٰہی سے ملنا ہے۔" اس کا لہجہ نرم اور محتاط تھا۔ "میرا نام نادر خاں ہے۔ مجھے سید احسان علی شاہ نے بھیجا ہے۔"

"تجھے شاہ جی نے بھیجا ہے۔" رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یاد آیا' شاہ جی نے تیرے بارے میں مجھ سے پچھلے دنوں بات کی تھی۔"

نادر خاں نے' جواب تک رحیم داد کے روبرو کھڑا تھا' نہایت ادب سے کرسی پر بیٹھنے کی اجازت چاہی۔ "بیٹھ سکتا ہوں جی؟"

"بیٹھ جا' ضرور بیٹھ جا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "شاہ جی آج کل پیراں والہ ہی میں ہوتا ہے نا؟ لہور سے تو لوٹ آیا ہوگا۔"

"یہ تو جی میں نوں پتہ نہیں۔" نادر خاں کرسی پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔ "شاہ جی نے پرسوں مجھے بلوایا تھا۔ دیر تک تیرے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ سمجھاتا رہا مجھے کیا کیا کام یہاں کرنے ہوں گے۔ شام ہونے سے پہلے پہلے وہ اپنی جیپ لے کر ادھر آیا تھا اور نہر کے پاس مجھے چھوڑ کر آگے چلا گیا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاہ جی لہور سے جیپ بھی لے آیا۔"

"اس کے لیے ضروری بھی تھی۔ زمیں داری چلانے کے لیے جیپ یا کم از کم اپنی سواری بہت ضروری ہے۔ اب خالی گھوڑی سے کام نہیں چلتا۔ ویسے گھوڑی اور سیکل تو اب ہر چھوٹے موٹے زمیندار کے پاس بھی ہے۔"

رحیم داد نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "کب سے کام شروع کرنے کا ارادہ ہے؟"

"حکم کریں جی۔ میں کل ہی سے کام شروع کردوں گا۔ میں تو آیا ہی اسی ارادے سے ہوں۔" نادر نے مستعدی سے جواب دیا۔

رحیم داد نے نادر کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا جو اس کے سامنے کرسی پر سکڑا سکڑایا' قدرے آگے جھکا ہوا ادب سے بیٹھا تھا۔ رحیم داد کی گردن کچھ اور تن گئی۔ اس نے لہجے میں رعب داب پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

"تیرے بال بچے بھی ہیں؟"

"ہیں تو جی۔" نادر نے مسکین سی شکل بنا کر جواب دیا۔ "میں جی انھیں بعد میں لے آؤں گا۔ ابھی ایسی جلدی بھی نہیں۔" اس نے اپنی مستعدی اور فرض شناسی سے رحیم داد کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔ "میں نے تو جی سب سے پہلے گھوم پھر کر پنڈ کا جائزہ لینا ہوگا۔ فصلوں کو دیکھنا ہوگا۔ مزارعوں سے ملنا ہوگا۔ پٹواری کے پاس جانا ہوگا۔ اس کے بعد میں رپورٹ پیش کروں گا۔ فیر جو فیصلہ آپ نے کرنا ہے اسے سامنے رکھ کر کام کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" رحیم داد کی آواز گونج دار تھی۔ "آج رات ادھر ہی ٹھیر جا۔ سویرے سے کام شروع کردے۔ تیری تنخواہ وغیرہ کا معاملہ شاہ جی سے ملنے کے بعد طے ہوگا۔ میں اسے جلد ہی ملنے کی کوشش کروں گا۔"

"جیسی مرضی جی۔" نادر نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "شاہ جی نے بھی مجھ سے ایسی ہی گل بات کی تھی۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ نادر گردن جھکائے ادب سے بیٹھا رہا۔ شام کا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ نوکر نے لیمپ روشن کیا اور احتیاط سے اسٹول پر رکھ دیا۔ نادر نے لیمپ کی روشنی میں رحیم داد کے چہرے پر نظر ڈالی۔ زیرِ لب مسکرایا۔ "چوہدری! تسیں دیکھنے میں بلوچ سردار یا تمن دار لگتے ہو۔ ڈیرے جات میں تو پہلے نہیں رہے۔" اس کے انداز میں خوشامد کا پہلو نمایاں تھا۔

رحیم داد اس کے رویئے سے خوش بھی ہوا۔ اس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور مونچھوں کی نوکوں کو مروڑتے ہوئے بولا۔ "نہیں جی' میں ادھر نہیں گیا۔"

"حیرت کی گل ہے۔" نادر نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "میں تو پہلی نظر میں یہ سمجھا تسیں کھوسہ تمن دار ہو؟"

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر نادر زیادہ چپ نہ بیٹھ سکا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر اپنی پچھلی ملازمتوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اس نے رحیم داد کو بتایا کہ محکمہ مال کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد وہ ڈیرہ غازی خاں کے ایک دریشک تمن دار کی جاگیر کا کاردار مقرر ہوگیا تھا۔ اس ملازمت کے دوران اس نے کیا کیا کارگزاری دکھائی اور کیسے کیسے کارنامے انجام دیئے؟ انھیں وہ تفصیل سے سناتا رہا۔ اس نے تمن داروں اور سرداروں کے رعب ودبدبے کے ساتھ ان کی

دہشت گردی کی ہولناک داستانیں بھی سنائیں۔ مزاریوں اور لغاریوں کی رقابتوں اور ان کے مسلح تصادم کی واردات بیان کیں۔ باتوں باتوں میں وہ مزارعوں کو قابو میں رکھنے اور زمیں داری پھیلانے اور بڑھانے کے ہتھکنڈے اور گر بھی بتاتا رہا۔ سرکاری افسروں سے تعلقات پیدا کرنے، ان سے کام نکالنے اور انہیں خوش رکھنے کے طور طریقے بھی بتاتا رہا۔

نادر خاں کا لہجہ شہری تھا۔ سرکاری نوکری کے سلسلے میں وہ برسوں لاہور اور دوسرے شہروں میں رہ چکا تھا۔ جاگیرداروں اور رئیسوں کی ملازمت میں رہنے کے باعث خاصا مزاج شناس بھی بن گیا تھا۔ نادر خاں نے اپنی دلچسپ اور لچھے دار باتوں سے جلد ہی رحیم داد کے دل میں جگہ پیدا کرلی۔ وہ نادر خاں کے تجربے اور سوجھ بوجھ سے بہت متاثر ہوا۔ وہ اسے کام کا آدمی نظر آیا۔ دیر تک خاموش بیٹھا توجہ اور انہماک سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

جب وہ خاموش ہوا تو رحیم داد نے پوچھا۔ ”نادر! تو نے تمن داروں کی نوکری کیوں چھوڑی؟“

”وہ ہوا یہ جی کہ میری پہلی گھروالی گزر گئی۔“ نادر نے بتایا۔ ”کچھ عرصے بعد ادھر رحمت والی میں دوسرا ویاہ کرلیا۔ چھ سات مہینے تو وہ میرے ساتھ ڈیرہ غازی خاں میں رہی۔ فیر اس کا دل ایسا اچاٹ ہوا کہ کسی طور وہاں رہنے کو تیار نہ ہوئی۔ مجبوراً مجھے ملازمت چھوڑنی پڑی۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”ملازمت نہ چھوڑتا تو گھروالی کو چھوڑنا پڑتا۔ اس طرح میں نوکری چھوڑ چھاڑ ادھر آگیا۔ کچھ مدت تک آڑھت کا کاروبار کیا۔ وہ چل نہ سکا تو اسسٹنٹ کمشنر کے دفتر میں عرائض نویسی کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ کلیم بنوانے اور الاٹمنٹ کروانے کا دھندا بھی کرتا رہا۔ مگر اس دھندے میں اب پہلی سی بات نہیں رہی۔ ایسی اندھیر گردی مچی ہے کیا بتاؤں۔ اوپر سے نیچے تک ہر جگہ رشوت کا بازار گرم ہے۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”چار پانچ مہینے ہوئے عرائض نویسی کا کام ختم کرکے رحمت والی آگیا۔ اس دوران سردار عزیز اللہ دریشک نے راجن پور بلوایا بھی پر گھر والی کسی طور راضی نہیں ہوئی۔“

”شاہ جی سے تیری کب سے جان پہچان ہے؟“ رحیم داد نے استفسار کیا۔

نادر خاں نے بتایا۔ ”ویسے تو جی کوئی سال بھر سے اوپر ہوا لہور میں پہلی بار شاہ جی سے ملا تھا۔ لیکن جب میں رحمت والی آگیا تو ان سے اکثر ملتا رہا۔“

رحیم داد نے سلسلہ گفتگو منقطع کردیا۔ نوکر سے کھانا لانے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں کھانا چن دیا گیا۔ رحیم داد نے نادر خاں کو بھی کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ مگر اس نے انکساری اور حفظ مراتب کا مظاہرہ کرتے ہوئے انکار کردیا۔ ”میری یہ حیثیت نہیں جی کہ آپ کے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھاؤں۔ میں نے تو صرف یہ معلوم کرنا ہے، مجھے کہاں ٹھیرنا ہوگا۔ اس کا انتظام کون کرے گا؟ آگے میرے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

رحیم داد نے احمد کو بلوایا۔ وہ آیا تو رحیم داد نے نادر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ مہمان خانے میں ٹھیرے گا۔ اسے اپنے ساتھ لے جا۔ اس کے ٹھیرنے اور روٹی ٹکر کا بندوبست کردے۔“

نادر خاں نے احمد کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر اس کے ہم راہ چلا گیا۔ رحیم داد نے کھانا کھایا مگر فوراً مہمان خانے میں نہ گیا۔ باغ میں بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ رات گئے وہ مہمان خانے میں گیا۔ دیکھا صحن کے ایک گوشے میں نادر خاں چارپائی پر گہری نیند سو رہا ہے۔ البتہ احمد جاگ رہا تھا۔ رحیم داد نے اس سے کوئی بات چیت نہ کی۔ کمرے میں گیا۔ کپڑے تبدیل کیے۔ رات گرم تھی۔ آسمان صاف تھا۔ مگر حبس تھا۔ احمد نے رحیم داد کا بستر چھت پر پلنگ بچھا کر لگا دیا تھا۔ رحیم داد نے دھوتی باندھی۔ بندوق اٹھائی اور چھت پر چلا گیا۔ اس نے بندوق سرہانے رکھی اور بستر پر لیٹ گیا۔

سویرے وہ چھت سے اتر کر صحن میں آیا۔ نادر خاں کا بستر خالی تھا۔ احمد نے بتایا کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے ناشتا کیا مگر نادر خاں ابھی واپس نہ آیا تھا۔ وہ دن بھر نظر نہ آیا۔ غروب آفتاب کے وقت جب رحیم داد باغ میں بیٹھا تھا نادر خاں اسکول کی سمت سے باغ کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ قریب آتا گیا۔ اس کا لباس گرد و غبار سے اٹا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔

وہ سامنے آکر کھڑا ہوا تو رحیم داد نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نادر خاں بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”سویرے سویرے کہاں چلا گیا تھا؟ دوپہر کی روٹی بھی نہیں کھائی۔“

”کیا، کیا جائے جی، کام جو کرنا ہوا۔ ایک نہیں، کئی کام کرنے ہیں اور جلد سے جلد کرنے ہیں۔“ اس نے اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

رحیم داد اس کی کارکردگی اور فرض شناسی سے متاثر بھی ہوا۔ مسکرا کر بولا۔ ”شاہ جی ٹھیک ہی کہتا تھا۔ تو لگتا تو محنتی بندہ ہے۔ کیا کر آیا آج؟“

”یہ میں بعد میں بتاؤں گا جی۔“ اس نے ہاتھ باندھ کر انکساری سے کہا۔ ”مجھے چند روز کی مہلت دیں۔ ہر معاملے کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد ہی میں اپنی رپورٹ پیش کروں گا۔“ اس نے اٹھنے کے لیے پہلو بدلا۔ ”اس وکھت تو جی مجھے اجازت دی جائے۔ میں نے ابھی جاکر نہانا ہے۔

روٹی کھانی ہے۔ جلد ہی سو بھی جاؤں گا۔ کل بھی میں نے سویرے سے پنڈ کا راونڈ لگانا ہے۔ مزارعوں سے ملنا ہے۔ فصل کے بارے میں گل بات کرنی ہے۔ اور بھی کئی ضروری کام کرنے ہیں۔"

وہ اٹھا اور مہمان خانے کی سمت روانہ ہوگیا۔ اس کے بعد کئی روز تک رحیم داد سے نادر خاں کی ملاقات نہ ہوئی۔ رحیم داد جب سو کر اٹھتا تو نادر خاں کا بستر خالی ہوتا۔ پہر رات گئے وہ باغ سے واپس آتا تو نادر خاں گہری نیند سویا ہوتا۔ وہ کھانا کھا کر جلد ہی سو جاتا اور فجر کی اذان سے پہلے ہی بیدار ہوجاتا۔

☆

دوپہر کو بارش کا چھینٹا پڑا تھا۔ دن ڈھلے موسم خوشگوار تھا۔ آسمان پر سرمئی بادل چھائے تھے۔ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ رحیم داد باغ میں اجلا لباس پہنے' زمیں دارانہ طمطراق کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا نادر خاں پہلے روز کی طرح خاک دھول سے اٹا اس کی جانب آرہا ہے۔ وہ قریب آیا تو رحیم داد نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گیا تو اس کا بگڑا ہوا حلیہ دیکھ کر رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "نادر! تو نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

"کام کرنا جو ہوا جی۔" نادر خاں نے بے نیازی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ "ہر چیز کو جب تک اپنی نظر سے دیکھا نہ جائے تب تک نہ کوئی مسئلہ سمجھ آتا ہے اور نہ اس کا حل۔"

"یہ بتا' اتنے دنوں میں تو نے کیا کیا دیکھا' کیا معلوم کیا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ اس کے رویے سے صاف جھلکتا تھا کہ وہ زمیں داری کے معاملات جاننے کے لیے بہت بے چین ہے۔

"ایسا لگتا ہے جی' جیسے یہاں کا کوئی زمیں دار ہی نہیں۔ ہر مزارع خود کو زمیں دار سمجھتا ہے۔ کمیوں تک کے دماغ آسمان پر ہیں۔" نادر خاں کا لہجہ قدرے نرم پڑگیا۔ "اللہ وسایا مرگیا۔ اب اس کی کیا برائی کرنی جی۔ خدا اسے جنت نصیب کرے۔ پر اسے زمیں داری چلانے کا ذرا تجربہ نہ تھا۔ مزارعوں کے مزاج ایسے بگاڑ دیئے کہ وہ تو جی سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے۔ جو جس کا جی کرتا ہے' کر رہا ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔"

"ویسے فصل تو ٹھیک لگتی ہے۔ پچھلے دنوں میں بھی کھیتوں پر جاتا رہا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" نادر خاں نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔ "خاص طور پر کماد اور مکئی کی فصل بہت چنگی جا رہی ہے۔ پھٹی بھی ٹھیک ٹھاک جان پڑتی ہے۔ پر پھٹی کی کاشت کا رکبہ بڑھانے

کی ضرورت ہے۔ اصلی کمائی تو آج کل کپاس کی فصل سے ہے۔ ادھر اب تک کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ کوریا کی جنگ کی وجہ سے باہر کے ملکوں میں پاکستانی کپاس کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے۔ کپاس کے اکسپورٹرز کے تو وارے نیارے ہوگئے۔ انھوں نے دبا کے کمائی کی۔"

نادر خاں نے اپنی معلومات سے رحیم داد کو مرعوب کرنے کی کوشش کی اور وہ مرعوب بھی ہوگیا۔ "تو جن باتوں کو سمجھتا ہے اللہ وسایا نہیں جانتا تھا۔ تب ہی تو اس نے پھٹی کا نہ رکبہ بڑھایا نہ کمائی کرسکا۔ اب تو بتا پھٹی کی فصل کا رکبہ کیسے بڑھایا جائے؟"

"بہت سی زمین پڑیلی پڑی ہے۔ جگہ جگہ ڈھنڈل اور جھلن ہیں۔ نہر کے نزدیک کا اپنا بہت سا رکبہ جھنگر بن گیا ہے۔ اتنی بہت سی زمین ادھلاپی پر آسانی سے کابل کاشت بنائی جاسکتی ہے۔" نادر خاں سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ "اپنی زمین پر آم اور مالٹے کے باغ لگائے جاسکتے ہیں۔ فارم بنائے جاسکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے جی' اتنی بہت ساری زمین بیکار دیکھ کر مجھے بہت دکھ پہنچا۔"

"پر اس میں بہت سی تو شاملات کی زمین ہے۔" رحیم داد نے نادر خاں کو آگاہ کیا۔

"چوہدری تسیں کیسی باتیں کر رہے ہو۔" نادر نے مسکرا کر کہا۔ "تحصیل دار اور پٹواری کس لیے ہیں۔ ان کی مٹھی گرم کی جائے تو ساری زمین آسانی سے اپنے کھاتے میں منتقل ہوجائے گی۔ ویسے بھی جی شاملات واملات کی کون پروا کرتا ہے۔ زمیں دار کا رعب اور دبدبہ ہو تو کوئی چوں بھی نہیں کرسکتا۔"

رحیم داد نے دبی زبان سے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ "پر تحصیل دار اور پٹواری شٹواری کی مٹھی گرم کرنے کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا؟ اب تک ساری زمیں داری کی دیکھ بھال تو اللہ وسایا کرتا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ جمیلہ کے پاس جو کچھ تھا وہ اس نے اللہ وسایا کی فاتحہ اور چالیہا پر خرچ کردیا۔"

نادر نے چند لمحے خاموش رہ کر کہا۔ "جو کچھ ہونا تھا جی وہ ہوچکا۔ اب تو آگے کی سوچنا ہے۔ میں نے پتہ کیا ہے۔ مزارعوں پر اللہ وسایا مرحوم بہت ادھار چھوڑ گیا ہے۔ اس کی فوری وصولی ہونی چاہیے۔ کچھ تو ابھی مل ہی جائے گا۔ ورنہ کماد کی فصل سے کرضہ وصول کیا جاسکتا ہے۔"

"کماد کی فصل ہی سے کیسے کرضہ وصول کیا جاسکتا ہے؟" رحیم داد نے حیرت سے دریافت کیا۔

"وہ اس طرح جی کہ کٹائی کے بعد کماد کو شکر مل پہنچانے اور وزن کروانے کی پوری ذمہ داری تو زمیں دار ہی کی ہوتی ہے نا۔ ویسے تو تول ہی میں خاصی گنجائش نکل سکتی ہے۔" وہ عیاری سے مسکرایا۔ "میرا مطلب تسیں سمجھ گئے نا؟"

"بالکل سمجھ گیا۔ آگے بتا۔" رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"اس کے علاوہ کماد کی سپلائی بھی زمیں دار ہی کرتا ہے۔" نادر خاں نے بتایا۔ "اس میں سے کماد سپلائی کرنے کا نصف کرایہ بھاڑا مزارعے کے حصے سے کٹتا ہے۔ آبیانہ اور چری کی فصل کی کیمت مجرا کر کے ہر مزارعے کو رسید دے دی جاتی ہے۔ کانون تو یہی ہے پر کون زمیں دار اس پر عمل کرتا ہے۔" اس نے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "معاف کرنا جی۔ شاہ جی ٹھیک ہی بتاتا تھا۔ اللہ وسایا تو زمیں دار تھا ہی نہیں اور نہ اس نے کبھی زمیں دار بننے کی کوشش کی۔ وہ تو پیدائشی مزارع تھا۔ مرتے دم تک مزارع ہی رہا۔"

"اس نے کون سی غلطی کی؟"

"ایک غلطی ہو تو بتاؤں۔" نادر خاں نے مستعدی سے جواب دیا۔ "شکر مل کو کماد کی سپلائی کا معاملہ ہی لے لیں۔ اللہ وسایا ہر مزارعے کو پابندی سے رسید دیتا تھا۔ اسے ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تب ہی تو وہ مزارعوں سے اپنا کرض وصول نہ کر سکا۔"

"رسید دینے سے کرض کی وصولی کا کیا واسطہ؟"

"بہت اہم واسطہ ہے اور وہ اس طرح ہے کہ مزارعوں کو کماد کی سپلائی میں سے ان کی پیداوار کی رکم کا جو بھی حصہ دیا جائے' پہلے اس میں سے کرض کی رکم کاٹ لی جائے۔ اس کے بغیر کرض ادھار آسانی سے وصول نہیں ہوتا۔ سارے ہوشیار زمیں دار ایسا ہی کرتے ہیں۔ مزارعوں کو رسید دینے کی صورت میں ادھار کی رکم نہیں کاٹی جا سکتی۔ رسید کو سامنے رکھ کر ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔"

"بات تو تیری سمجھ آتی ہے۔" رحیم داد نے اظہار پسندیدگی کیا۔

"آگے یہ رسید کا چکر ختم کرنا ہوگا۔"

"پر اس میں ایک خطرہ ہے۔" رحیم داد نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"وہ کیا ہے جی؟" نادر نے حیرت سے دریافت کیا۔

"اب تک ایسا ہوا نہیں۔ مزارعے ناراض ہوں گے۔ کوئی گڑبڑ پیدا نہ ہو۔"

"فکر نہ کریں جی' کوئی گڑبڑ شڑبڑ نہیں ہوگی۔"

"مان لے انھوں نے کوئی گڑبڑ نہیں ڈالی' پر وہ جمیلہ کے پاس جا کر فریاد کریں گے۔ وہ ان کی بات ضرور مان لے گی۔ میں نوں پتہ ہے وہ ضرور ایسا کرے گی۔"

"اس کا تو مجھے بھی چند ہی دنوں میں اندازہ ہو گیا۔" نادر نے رحیم داد سے اتفاق کیا۔

"مزارعوں کا تو جی یہ حال ہے وہ ہر معاملے میں اللہ وسایا کا حوالہ دیتے ہیں۔ بار بار اس کا ذکر

کرتے ہیں یا جمیلہ کا۔" اس نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے بات کہتے کہتے ٹھٹکا۔ "سچی گل تو ایسہ ہے جی۔ اللہ وسایا کے بعد پوری زمیں داری جمیلہ ہی کی سمجھتے ہیں۔ تجھے تو وہ زمیں دار مانتے ہی نہیں۔ ان کی باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے۔"

"یہ تو میں نوں بھی پتہ ہے۔" رحیم داد نے اعتراف کیا۔ "اسی لیے تو تجھے لگایا ہے۔"

"شاہ جی نے بھی مجھ سے یہ گل بتائی تھی۔ پر فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ وسایا تو اب رہا نہیں۔ جمیلہ بھی ان دنوں عدت میں بیٹھی ہے۔ نہ وہ حویلی کی چار دیواری سے باہر جا سکتی ہے نہ مزارعوں سے مل سکتی ہے۔ یہ اچھا موکع ہے۔ اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔"

"کیا کرے گا تو؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"جمیلہ کا اثر ختم کر کے مزارعوں پر تیری دھاک بٹھانی ہوگی۔ اس کے لیے زمیں داروں کا آزمودہ حربہ استعمال کرنا ہوگا۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟" رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔

"وہ یہ ہوتا ہے کہ مزارعوں کے درمیان پھوٹ پیدا کرنی ہوگی۔ ہر زمیں داری میں مزارعوں کے درمیان چھوٹے موٹے جھگڑے تو ہوتے ہی ہیں۔ اس پنڈ کے مزارعوں میں بھی ہیں۔ ایسے جھگڑوں کو بڑھانا ہوگا۔ کچھ کی طرف داری کرنی ہوگی اور انھیں رعائتیں دے کر اپنے ساتھ ملانا ہوگا۔" نادر زیر لب مسکرایا۔ "جو اپنے ساتھ نہ آئیں ان پر طرح طرح کے دباؤ ڈال کر تنگ کرنا ہوگا۔ فیر ایسا وکھت بھی آئے گا جب سارے ہی مزارع تیرے بندے ہوں گے۔ جو کہے گا وہی کریں گے۔ تجھے ہی پنڈ کا اصلی زمیں دار مانیں گے۔"

"تیری گل ویسے تو ٹھیک ہی لگتی ہے۔ میں نوں پسند بھی آئی پر اتنا دھیان رکھنا جب اللہ وسایا زندہ تھا تب بھی جمیلہ زمیں داری کے معاملوں میں برابر حصہ لیتی تھی۔ بلکہ سچ پوچھ تو زمیں داری وہی چلاتی تھی۔" رحیم داد نے نادر خاں کو خبردار کیا۔ "تو نے یہ بھی اندازہ کر لیا ہوگا سارے ہی مزارعے اس کی بہت عزت کرتے ہیں۔ پیار سے اسے بھین جی کہتے ہیں۔ وہی ضرورت پڑنے پر انھیں ادھار دیتی ہے۔ سارا حساب کتاب اسی کے پاس رہتا ہے۔ مجھے ڈر ہے مزارعوں کو اپنا طرف دار بنانے میں جمیلہ ناراض نہ ہو جائے۔ تیں نوں پتہ ہے اس کے تو زمیں داری میں یاراں مرنے ہیں۔"

"میں نوں اس کا پتہ ہے جی۔"

"مزارعوں سے کرض ادھار کی وصولی میں سختی کی گئی یا انھیں تنگ کیا گیا تو جمیلہ میرے گلے پڑ

جائے گی۔ بہت نراض ہوگی۔ میں اسے نراض نہیں کرنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں آگے بھی زمیں داری اس طرح چلائی جائے' نہ جمیلہ نراض ہو اور نہ ہی کسی طرح ایسا ظاہر ہو کہ اس کی اور میری زمیں داری الگ الگ ہے۔" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ "زمیں داری تو پوری پوری ساتھ ساتھ ہی چلانی ہوگی۔ تیں نوں اسے سامنے رکھ کر کام کرنا ہوگا۔"

"ایسا ہی ہوگا جی۔ فکر نہ کریں۔" نادر نے اسے اطمینان دلایا۔ "میں نے سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ آگے ہر معاملے میں احتیاط سے کام لوں گا۔ جمیلہ کو شکایت کا موکع نہ دوں گا۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ وہ نظریں جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ نادر خاں نے چند لمحے خاموش رہ کر دریافت کیا۔ "کس سوچ میں پڑ گئے جی؟"

"سوچ رہا تھا تو نے زمیں داری بڑھانے اور پھیلانے کے بارے میں کہا ہے۔ ہونا تو ایسا چاہیے پر اس کے لیے روپے کی ضرورت ہوگی۔" رحیم داد نے اپنی مالی مشکلات کا ایک بار پھر اظہار کیا۔ "خریف کی فصل کی واڈھی میں تو ابھی کئی مہینے رہتے ہیں۔ مزارعوں سے کماد کی پیداوار میں کرض کی وصولی بھی تب ہی ہوگی۔ اب کیسے کام چلایا جائے۔"

"مزارعوں سے کچھ نہ کچھ وصولی تو ابھی ہو سکتی ہے۔" نادر نے تجویز پیش کی۔

رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ "جمیلہ سے پہلے مشورہ کرنا ہوگا۔ اس سے بات کیے بنا اس معاملے میں کچھ نہ کرنا۔ تو نہیں سمجھتا یہ بہت ضروری ہے۔"

"ایک تجویز اس سلسلے میں سمجھ آتی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر پوچھا۔ اسے دراصل اس رقم کی فکر تھی جس کے بارے میں وکیل نے سختی سے تاکید کی تھی۔ اس کے پاس لالی کی رقم میں سے دارا کو ایک ہزار دے کر اب دو ہزار سے کچھ اوپر روپے رہ گئے تھے۔ مگر وکیل زیادہ رقم مانگتا تھا۔ رحیم داد اس سلسلے میں نادر کو ابھی اعتماد میں لینا نہ چاہتا تھا۔

نادر نے گردن آگے بڑھا کر رازداری کے انداز میں کہا۔ "شاہ جی سے بھی کرض ادھار مل سکتا ہے۔ مجھے یکین ہے وہ ضرور مدد کرے گا۔ وہ تیری بہت تعریف کرتا ہے اور مانتا بھی بہت ہے۔ وہ اتنا وڈا زمیں دار ہے چار پانچ ہزار روپے ادھار دینا اس کے لیے معمولی بات ہے۔"

"امید تو ہے وہ میری مدد کرے گا۔" رحیم داد نے نادر کی تائید کی۔ "پر میں چاہتا ہوں تو پہلے اس سلسلے میں گل بات کر۔"

"کرلوں گا جی۔ مجھے اسے ملنا بھی ہے۔"

"اور دیکھ کسی سے، ہرگز یہ نہ بتانا تجھے شاہ جی نے ادھر بھیجا ہے اور نہ ہی کسی کو یہ پتہ چلے تیرا اس کے پاس آنا جانا ہے۔" رحیم داد نے تنبیہہ کی۔ "اور نہ کسی کو یہ بتانا میرا اس کے ساتھ میل جول ہے۔" اس کا لہجہ اور مدھم پڑ گیا۔ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ "کسی کو ادھر بالکل پتہ نہیں میں اس کے پاس آتا جاتا ہوں۔"

"شاہ جی نے مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی اس بارے میں خبردار کردیا تھا۔ تب ہی تو میں نے کسی سے یہاں ایسی بات نہیں کی۔ اشارہ تک نہ دیا۔" نادر خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "پر تیں نوں بھی سخت احتیاط کرنی چاہیے۔"

"وہ تو میں کرتا ہی ہوں۔"

"مجھے تو مہمان خانے کا نوکر احمد بھی اعتبار کا بندہ نہیں لگتا۔ وہ باتیں بہت کرتا ہے اور پیٹ کا بھی ہلکا ہے۔ اس پر بالکل بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسے ہٹا کر اپنے بھروسے کا بندہ رکھنا ہوگا۔ ویسے بھی جی نوکر تو اعتبار ہی کا ہونا چاہیے جیسے شاہ جی کے پاس شیدا ہے۔ مجھے تیرے لیے بھی ایسا بندہ تلاش کرنا ہوگا جس پر پورا پورا بھروسہ ہو اور جس سے ہر طرح کا کام لیا جاسکے۔"

"مجھے بھی احمد ایسا بندہ نہیں لگتا جس پر بھروسہ کیا جاسکے۔ اسی لیے میں نے کبھی اس سے کوئی ایسی گل بات نہیں کی۔ شاہ جی کے پاس بھی جاتا ہوں تو اسے اشارہ تک نہیں دیتا۔ اسے پتہ لگ جائے تو جھٹ جا کر جمیلہ سے بتا دے گا۔ وہ ایسا ہی بندہ ہے۔"

"تب تو اسے جلد سے جلد ہٹانا چاہیے۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں جلد ہی ایسا اعتبار کا بندہ تلاش کرلوں گا۔ یہاں نہ ملا تو اپنے پنڈ سے لیتا آوں گا۔"

"ٹھیک ہے' اب نہا کر کپڑے بدل لے۔" رحیم داد نے نادر خاں کا میلا کچیلا لباس غور سے دیکھا۔ "تیرے کپڑے لتے بہت گندے ہوگئے ہیں۔"

"کپڑے لتے تو جی میں اپنے ساتھ لایا نہیں۔ اپنے پاس تو یہی کپڑے ہیں۔ دوبار انھیں دھو بھی چکا ہوں۔" نادر نے بتایا۔ "بات یہ ہے جی' میں یہاں ٹھہرنے کے ارادے سے تو آیا نہیں تھا۔ ورنہ کپڑے لتے لے کر تیاری سے آتا۔ برا نہ منائیں تو جی میں آج ہی اپنے پنڈ چلا جاوں۔ کل شام نہیں تو پرسوں ضرور واپس آجاوں گا۔"

"اس وکت کیسے جائے گا۔" رحیم داد نے گردن گھما پھرا کر بڑھتے ہوئے اندھیرے کو دیکھا۔ "پہلے ہی بہت تھکا ہوا ہے۔ کس طرح جاسکے گا؟"

"فکر نہ کریں جی۔" نادر نے مسکرا کر بتایا۔ "سورج ڈوبے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ میں آرام سے

چلا جاؤں گا۔"

"تو پیدل جائے گا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"حویلی میں نوکروں کے لیے دو سیکلیں ہیں۔ ایک مل جائے تو اس پر چلا جاؤں گا۔ جلد ہی اپنے پنڈ پہنچ جاؤں گا۔ ورنہ رات بہت دیر سے پہنچوں گا۔"

رحیم داد نے ایک نوکر کو بلایا اور اس سے سائیکل منگوائی۔ وہ سائیکل لینے چلا گیا۔ رحیم داد نے کہا۔ "نادر! تو جلد ہی آجانا۔ ویسے میرا ارادہ بھی شاہ جی کی طرف کل جانے کا ہے۔ تیں نوں پتہ ہے وہ اپنے پنڈ میں ہے؟"

"ہاں جی! وہ پیراں والہ ہی میں ہے۔" نادر نے جواب دیا۔ "جہاں تک میرا خیال ہے اس کا فی الحال پنڈ سے باہر جانے کا کوئی پروگرام بھی نہیں۔"

نوکر سائیکل لے کر آگیا۔ رحیم داد کی ہدایت پر اس نے سائیکل نادر خاں کے حوالے کردی۔ سائیکل سنبھال کر وہ کھڑا ہوگیا۔ آہستہ سے بولا۔ "مہمان خانے میں جا کر روٹی کھالوں۔ اس کے بعد رحمت والی چلا جاؤں گا۔ اب واپسی ہی پر حاضر ہوسکوں گا۔"

نادر خاں چلا گیا۔ رحیم داد نے باغ ہی میں کھانا کھایا اور دیر تک بیٹھا ان باتوں پر غور کرتا رہا جو نادر خاں نے پچھلے چند روز کی بھاگ دوڑ کے بعد رپورٹ کی صورت میں اس کے سامنے پیش کی تھیں۔ یہ باتیں رحیم داد کے لیے قطعی نئی تھیں اور معلومات افزا بھی تھیں۔ اسے کوٹلہ ہرکشن کے متعلق بحیثیت زمیں دار بہت کم بلکہ کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ پہلے بھی وہ نام کا زمیں دار رہ چکا تھا۔ صرف گیارہ ایکڑ زمین اس کی ملکیت تھی۔ بنیادی طور پر وہ کاشت کار تھا۔ اس کا شمار چھوٹے کھاتے داروں میں ہوتا تھا۔ بڑے زمیں داروں کے ہتھکنڈوں اور طور طریقوں سے وہ بڑی حد تک ناواقف تھا۔ نادر خاں نے اس کے سامنے جو تجاویز رکھیں تھیں وہ اسے پسند آئیں اور اس قدر زیادہ پسند آئیں کہ انھیں عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔

رات کو بستر پر لیٹا تو نادر خاں اس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ وہ اسے بے حد ہوشیار اور تجربہ کار آدمی نظر آیا۔ اسے زمیں داری چلانے کے لیے ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ نادر خاں سے ملنے سے پہلے وہ بالکل اندھیرے میں تھا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ مزارعے کس انداز سے سوچ رہے ہیں؟ کتنے خود سر اور بے لگام ہوگئے ہیں؟ انھیں قابو میں لانے کے لیے کیا کیا جائے اور کیسا رویہ اختیار کیا جائے؟ یہ کام وہ نادر خاں کی مدد ہی سے کر سکتا تھا۔

۴۷

رحیم داد نے نائی بلوایا۔ حجامت بنوائی۔ غسل کیا۔ صاف ستھرا لباس پہنا۔ وہ احسان شاہ کے پاس جا رہا تھا۔ احمد اس وقت مہمان خانے میں موجود تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "چوہدری آج جمعہ تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے حیرت سے کہا۔ "تیں نوں پتہ نہیں آج تو منگل وار ہے۔"

"لگتا ہے تو کہیں جا رہا ہے۔"

"میں نوں تو کہیں نہیں جانا۔" رحیم داد نے صاف انکار کردیا۔ وہ اسے کچھ بتانا نہ چاہتا تھا۔ اس نے اس روز تانگا بھی نہ بلوایا۔

احمد خاموش ہوگیا۔ رحیم داد کچھ دیر بعد مہمان خانے سے نکلا اور اس راستے پر چل دیا جو کرمان پورہ جاتا تھا۔ کرمان پورہ تین میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں سے ایک نیم پختہ سڑک گزرتی تھی۔ کرماں پورہ موضع تھا۔ وہاں تانگوں کا اڈا بھی تھا۔ گاؤں سے کہیں دور جانا ہوتا تو کرمان پورہ ہی سے تانگا بلوایا جاتا تھا۔

راستے کے دونوں جانب سائے دار درخت تھے۔ کسی زمانہ میں یہ کنکر کی بنی ہوئی پختہ سڑک تھی جسے جمیلہ کے باپ لالہ کرشن دیال نے بنوایا تھا۔ وہ جب گاؤں آتا تو ہمیشہ کار میں آتا اور اسی سڑک سے آتا تھا۔ ہردیال اور جمیلہ کے دوسرے بھائی بھی جیپ یا کار سے اسی سڑک سے آتے جاتے تھے۔ مگر اب یہ سڑک ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ بارش نے جگہ جگہ گڑھے ڈال دیئے تھے جن میں پانی بھرا تھا۔

سڑک کے نشان دھندلے پڑ چکے تھے۔ وہ کچا راستہ بن کر رہ گئی تھی۔ رحیم داد اس پر چلتا رہا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ہوا بھی چل رہی تھی۔ سہ پہر گزرا تو رحیم داد کسان پورہ پہنچ چکا تھا۔ اس نے تانگا لیا اور اس میں سوار ہو کر حویلی روڈ کی جانب روانہ ہو گیا۔

حویلی روڈ پر اسے زیادہ دور نہ جانا پڑا۔ پہلے ہی اڈے پر لاری مل گئی۔ اس نے تانگا چھوڑا، کوچوان کو کرایہ ادا کیا اور لاری کے اندر داخل ہو گیا۔ لاری مسافروں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ رحیم داد کو کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑا۔ مگر لاری نے میل سوا میل فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک بستی آگئی۔ کئی مسافر اتر گئے۔ رحیم داد کو بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔

رحیم داد اطمینان سے بیٹھ گیا۔ لاری سڑک پر ہچکولے کھاتی ہوئی دوڑتی رہی۔ باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ موسم سہانا ہو گیا تھا۔ رحیم داد نے مسافروں پر ایک نظر ڈالی۔ مگر ایک مسافر پر نظر پڑتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ جمال دین تھا اور آنکھیں بند کئے اونگھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی نوراں بیٹھی تھی۔

دونوں بچے' کریما اور زینو' بھی ماں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ رحیم داد نے اپنی بیوی' بیٹے اور بیٹی کو دیکھا۔ وہ خوف زدہ بھی ہو گیا اور اسے دکھ بھی ہوا۔ نوراں کا رنگ روپ دھندلا گیا تھا۔ لباس بوسیدہ اور میلا کچیلا تھا۔ بچوں کا لباس اس سے بھی زیادہ پھٹا پرانا تھا۔ نوراں' بچوں کے ساتھ داہنے ہاتھ کی اگلی نشست پر بیٹھی تھی۔

رحیم داد دم بخود بیٹھا نوراں اور بچوں کو دیکھتا رہا۔ یکایک نوراں نے گردن موڑی۔ رحیم داد کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے ہچکچاتے ہوئے نوراں کی طرف جھجکتی ہوئی نظر ڈالی۔ وہ بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ رحیم داد نے فوراً نظریں موڑ لیں اور خود بھی اس قدر مڑا کہ اس کا چہرہ دوسری طرف ہو گیا۔

رحیم داد بہت پریشان تھا۔ وہ خود کو خطرے میں گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ جمال دین یا نوراں اسے پہچان لیتے تو وہ سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاتا۔ اگلا اڈا آنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے باہر نکلتے ہوئے سرسری نظروں سے دیکھا۔ جمال دین ابھی تک آنکھیں بند کئے اونگھ رہا تھا۔

نوراں خاموش بیٹھی تھی۔ وہ بدحال اور اجڑی اجڑی نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا نکھار میلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں بجھی بجھی تھیں۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ دل میں کسک اور چبھن محسوس کی۔ نوراں نے ایک بار پھر گردن موڑی۔ اسی لمحے لاری ٹھہر گئی۔ رحیم داد لاری سے اتر کر باہر چلا گیا۔

باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ رحیم داد لاری کی جانب پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ لاری سے کچھ اور مسافر اترے کچھ سوار ہوئے۔ انجن اسٹارٹ ہی تھا۔ ذرا دیر میں لاری پھر سڑک پر مڑی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

رحیم داد کے سینے میں دھواں سا اٹھا۔ آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ اس نے احسان شاہ کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ اس وقت بہت غم زدہ اور دل گرفتہ تھا۔ کچھ دیر بعد مخالف سمت سے ایک لاری آگئی۔ وہ اس میں داخل ہو گیا۔

☆

رحیم داد کوٹلہ ہرکشن واپس پہنچا۔ مہمان خانے میں گیا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ بوندا باندی جاری تھی۔ رحیم داد کے کپڑے بارش سے بھیگ گئے تھے۔ اس نے گیلے کپڑے اتار کر دھوتی باندھی۔ غسل خانے میں جا کر نہایا۔ اجلا لباس پہنا۔ دوپہر کا کھانا تاخیر سے کھایا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ بستر پر لیٹ کر سفر کی تکان دور کرنے لگا۔

نوراں' کریما اور زینو ابھی تک اس کے ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ کریما اس کا پہلوٹی کا بیٹا تھا اور زینو لاڈلی بیٹی تھی۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب کریما یا زینو میں سے کوئی بیمار پڑتا یا کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا تو وہ تڑپ اٹھتا' بے قرار ہو جاتا۔

آج اس نے دونوں کو طویل مدت کے بعد دیکھا تھا۔ ان کے چہروں پر برستی ہوئی محرومی دیکھی تھی۔ ان کے لاغر اور گندے جسم دیکھے تھے۔ ان کا پھٹا پرانا لباس دیکھا تھا۔ مگر وہ ان کے سر پر شفقت سے ہاتھ بھی نہ پھیر سکا۔ ان کے رخسار چومنے اور انھیں سینے سے لگانے کے بجائے انھیں دیکھ کر ڈر گیا تھا' سہم گیا تھا۔ ایسا محسوس ہوا گویا بھیانک خواب دیکھ رہا ہے۔ حالات نے اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا؟

نوراں' جس کی محبت سے سرشار ہو کر اس نے اپنے حقیقی چچا کو دشمن بنا لیا تھا۔ اس کی بیٹی' بیدی' کا رشتہ ٹھکرا کر نوراں کو بیاہ کر اپنے گھر لے آیا تھا اور اکلوتی بہن' بیگماں سے اس طرح جدا ہو گیا تھا کہ اس کے گھر کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس پر بند ہو گئے تھے اور جب وہ چھپ کر اس کے گاؤں ڈھولہ امیر خاں پہنچا اور اس سے ملا تو چوری چھپے کی یہ ملاقات بیگماں اور اس کے شوہر' مولا داد کی ہلاکت کا سبب بن گئی۔ اسے دونوں کو خون میں لت پت تڑپتے اور دم توڑتے دیکھنا پڑا۔

چند ہی گھنٹے پہلے وہی چہیتی نوراں اسے نظر آئی تو وہ خوف اور وحشت سے لرز کر رہ گیا تھا۔ اس کے لیے شدید خطرہ بن گئی تھی۔ جب تک وہ لاری میں رہا' اسے رہ رہ کر یہ اندیشہ ستا کہیں وہ اسے پہچان نہ لے۔

اسے نوراں کا اجڑا ہوا چہرہ اور اس پر پھیلی ہوئی ویرانی دیکھ کر دکھ بھی ہوا اور سخت نفرت ہوئی۔ وہ اپنے آشنا' جمال دین کے ساتھ بیٹھی تھی جو کبھی اس کا گہرا دوست تھا۔ ہر وقت کا سا اور رفیق تھا۔ نوراں کی بے وفائی یاد کر کے وہ غصے سے تلملا اٹھا۔ اس نے بے چین ہو کر کر بدلی اور ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔

وہ اسی بے چینی کے عالم لیٹا تھا کہ تاراں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ طرح اس وقت بھی ہلکی ہلکی شوخ مسکراہٹ تھی۔ رحیم داد نے بستر پر لیٹے لیٹے بے نیازی پوچھا۔

”حمدا کدھر ہے؟“

”میں نوں پتہ نہیں جی وہ کدھر ہے۔“ اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ ”شندو کے چکر میں ہو گا۔“

”تو کیسے آئی؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”زمیں دارنی نے تجھے بلایا ہے۔ وہ حویلی میں تیرا انتظار کر رہی ہے۔“

رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پلنگ سے نیچے اترا۔ سر پر پگ رکھی۔ پیروں میں جوتے پہنے اور تار کے ہم راہ بوندا باندی سے بچتا بچاتا حویلی کے اندر چلا گیا۔ جمیلہ اس وقت گول کمرے میں پ وضع کے چوڑے چکلے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اسی کمرے میں کبھی جمیلہ کا بڑا بھائی' لالہ ہردیال کچ لگاتا تھا۔ زمیں داری کے معاملات طے کرتا تھا۔ سرکاری افسروں' بڑے زمیں داروں جاگیرداروں سے ملاقات کرتا تھا۔

کمرے میں دبیز قالین کا فرش تھا جس کے نقش و نگار قدرے دھندلے پڑ گئے تھے۔ دروازوں پڑے ہوئے پردوں کے رنگ بھی اڑ گئے تھے۔ کمرے کا فرنیچر پرانا تھا مگر قیمتی تھا۔ کمرے کی آرا سے جاگیردارانہ آن بان ابھی تک جھلکتی تھی۔

جمیلہ اس وقت سفید ململ کا کرتا اور لٹھے کی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹہ بھی سفید ہی تھا۔ اس کے اوپر سیاہ چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اس نے چادر سے سر اور چہرے کو بکل مار کر بڑی تک چھپا رکھا تھا۔ اس کی گوری گوری کلائیاں بالکل خالی تھیں۔ چہرہ جو کبھی تازہ پھولوں کی

فتہ اور دل کش نظر آتا تھا' اب پچھلی رات کا زرد اور مٹیالا چاند بن گیا تھا۔

حیم داد کمرے میں داخل ہوا۔ جمیلہ نے ہاتھ کے اشارے سے قریبی صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ یا اور اپنا چہرہ دیوار کی جانب موڑ لیا۔ تاراں اس کے قدموں کے قریب قالین پر بیٹھ گئی۔ اب جیلہ کا چہرہ نظر نہ آتا تھا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ چند لمحے بعد جمیلہ کی آواز ابھری۔ اس نے رحیم داد سے دریافت کیا۔

”چودھری! میں نے سنا ہے' تو نے زمیں داری کی دیکھ بھال کے لیے مینجر رکھ لیا ہے۔“ اپنی بات کہتے کہتے وہ ٹھٹکی۔ ”کیا یہ سچ ہے؟“

”ہاں جی۔“ رحیم داد کے لہجے سے صاف جھلکتا تھا کہ وہ اس سوال کے لیے پہلے سے ذہنی طور پر تیار ہے۔ اس نے بلا جھجک جواب دیا۔ ”تو نے ٹھیک ہی سنا۔“

جمیلہ چند لمحے تک گم صم بیٹھی رہی۔ اس نے گہری سانس بھری۔ شکوہ کرنے کے انداز میں بولی۔ ”تو نے اتنا وڈا فیصلہ کر لیا اور مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔“

”کیسے پوچھتا۔ تجھ سے ملنا ہی کب ہوا؟“ رحیم داد نے بات بنائی۔ ”فیر یہ بھی تو ہے' تو اللہ وسایا کے سیاپے میں اتنی کھوئی ہوئی ہے کہ ایسے میں تجھ سے کیا گل بات کی جائے۔“

جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پر تو نے یہ تو سوچا ہوتا' ہمارے پاس کل ۲۲ مربع زمین ہے۔ جب میرے پتا کے پاس ۲۲ سو مربعے سے اوپر اراضی تھی تب اس کے پاس مینجر ہوتا تھا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”پاکستان بنا تو سو سے بھی زیادہ مربعے احسان علی شاہ نے دبا لیے۔ کچھ پر دوسرے زمیں داروں کے ساتھ مزارعوں نے بھی قبضہ کر لیا۔ ۲۲ مربعے بھی اللہ وسایا نے زورا زوری دکھا کر بچا لیے۔ اب اتنی سی زمیں داری کے لیے مینجر یا کاردار کی کیا ضرورت ہے؟“ جمیلہ کے لہجے میں تلخی تھی۔

رحیم داد اس کے لہجے میں رچی ہوئی تلخی نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”ضرورت تو ہے اور بہت زیادہ ہے۔ تو عدّت میں بیٹھی ہے۔ حویلی کی چار دیواری سے باہر نہیں جا سکتی۔ اور مجھے یہاں کے معاملات کا کچھ اتا پتا نہیں۔ زمیں داری کی دیکھ بھال کے لیے کوئی تو ہونا چاہیے۔ اس طرح کب تک کام چلے گا؟“

”جیسے پہلے چل رہا تھا۔“ جمیلہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ ”ہمارے مزارعے جان لڑا کر محنت کرتے ہیں۔ جب ہی تو فصل چنگی ہوتی ہے۔ تو نے ربیع کی فصل دیکھی تھی۔ اب خریف کی فصل تیرے سامنے ہے۔ ایمان نال بتا کیسی فصل ہے؟“

"فصل تو ویسے چنگی اور ٹھیک ٹھاک ہی لگتی ہے۔" رحیم داد نے اعتراف کیا۔ "پر تو نے کچھ بھی سوچا کتنی زمیں پڑیلی ہے۔ کہیں ڈھڈل اور جھلن ہے کہیں جھنگر۔ یہ ساری غیر مزروعہ زمین کاشت لائی جا سکتی ہے۔ اس طرح زمین کے ساتھ ساتھ پیداوار میں بھی اضافہ ہوگا۔ زمیں دار کو بھی بڑھایا جا سکتا ہے۔"

"مگر اس میں سے بہت سی زمین تو شاملات کی ہے۔ وہ تو سارے پنڈ کی مشترکہ ملکیت ہے۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے' ہماری ایسی پڑیلی اور بنجر زمیں بھی ہے جسے کھیتی باڑی لیے ٹھیک ٹھاک کیا جا سکتا ہے۔ پر میں اور اللہ وسایا' دونوں غافل نہیں تھے۔ احسان شاہ نے ایک کے بعد دوسرا کیس چلا کر مکدمہ بازی میں ایسا پھنسایا اللہ وسایا کو اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ وہ اس کار اور بنجر زمین کی طرف دھیان دیتا۔" اس کا لہجہ پھر تلخ ہوگیا۔ "تجھے پتہ ہے احسان شاہ نے یہ کچی زمین بلکہ حویلی تک ہمارے کبضے سے نکلوا دی تھی۔ وہ تو ہم کو بالکل تباہ کر دینا چاہتا تھا۔"

اسی وقت کمرے کے باہر تاراں کی بچی کے زور زور سے رونے کی آواز ابھری۔ تاراں نے چینی سے فوراً پہلو بدلا۔ جمیلہ نے کہا۔ "تاراں! دیکھ تو تیری چھوہری کیوں بلک بلک کر رو رہی ہے؟" تاراں خاموشی سے اٹھی اور تیز قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

رحیم داد نے چند لمحے خاموش رہ کر کہا۔ "جو ہونا تھا جی وہ تو ہوگیا۔" اس کے لہجے میں قدرے اکھڑپن تھا۔ "صاف بات یہ ہے جی' اب تو میں نے نادر خاں کو مینجر لگا ہی دیا۔ وہ جلد ہی کام شروع کر دے گا۔" رحیم داد کے رویئے سے صاف ظاہر تھا کہ نادر خاں کے سلسلے میں وہ اپنی رائے بدلنے پر آمادہ نہیں۔

"جب تو نے فیصلہ کر ہی لیا تو اب بات کرنے سے کیا فائدہ۔ تجھے خرچ ہی بڑھانا ہے تو ضرور بڑھا۔ جو مرضی میں آئے کر۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں؟" جمیلہ کے انداز میں جھنجلاہٹ تھی۔

رحیم داد نے بھی اس جھنجلاہٹ کو محسوس کیا۔ فوراً نرم پڑگیا' اپنا رویّہ بدلا۔ "تو فکر نہ کر۔ جتنا خرچہ بڑھے گا' اس سے زیادہ ہی فائدہ ہوگا۔ اپنی سمجھ میں تو یہی آتا ہے۔ یہی سوچ کر نادر خاں کو لگانے کا بھی فیصلہ کیا تھا۔ میرا مطلب تو صرف اتنا ہے کہ زمیں داری کو بڑھایا جائے۔ ٹھیک ٹھاک طور پر چلایا جائے۔"

"مجھے اس معاملے میں تجھ سے زیادہ پتہ ہے۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ہمارا مینجر بنسی لال تھا۔ تنخواہ تو کیول اس کی اسّی روپے تھی۔ وہ بھی سولاں' ستاراں برس کی نوکری کے بعد ہوئی تھی۔ پر ہیرا پھیری اور گڑبڑ کر کے اس نے لودھراں میں اپنے پتر کے نام سے اتنی زمین خرید لی

کہ اس کا شمار تحصیل کے وڈے زمیں داروں میں کیا جاتا تھا۔ زمیں داری کی دیکھ بھال کے لیے اس نے اپنا منشی بھی لگا رکھا تھا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "ایسا بھی نہیں تھا کہ پتاجی یا ہردیال کو پتہ نہ تھا۔"

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا۔ "جب انھیں ملوم تھا تو انھوں نے بنسی لال کو کیوں رکھ چھوڑا تھا؟"

"اسے ہٹانا آسان نہ تھا۔ اصلی جگیر دار تو سمجھو بنسی لال ہی تھا۔" جمیلہ نے بتایا۔ "سب کچھ وہی کرتا تھا۔ ہر کام اسی کی مرضی سے ہوتا تھا۔ وہ تو ہر فصل پر ایک مکرّرہ رکم دے دیتا تھا۔ پتاجی اور ہردیال ہر بکھیڑے سے بچے رہتے۔ نہ بھاگ دوڑ کی ضرورت' نہ مزارعوں کے ساتھ بک بک جھک جھک۔ انھیں برس کے برس اتنی رکم مل جاتی جتنی وہ چاہتے تھے۔ بنسی لال خوشامد اور چاپلوسی الگ کرتا تھا۔ جب بھی دیپال پور ہمارے گھر آتا' ماتاجی کے لیے طرح طرح کی سوغات اور تحفے لے کر ضرور آتا۔"

"پر یہ تو زمیں داری نہ ہوئی' ٹھیکیداری ہوئی۔"

"عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔" جمیلہ نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ "جب مینجر زمیں داری پر پوری طرح چھا جاتا ہے تو وہ ایک طرح سے ٹھیکے ہی پر زمیں داری چلانے لگتا ہے۔"

"تیری گل سمجھ نہیں آئی۔" رحیم داد نے مزید وضاحت چاہی۔

"بات یہ ہے چوہدری! زیادہ تر وڈے زمیں دار یا جگیردار شہر میں کوٹھیاں بنگلے بنوا کر رہتے ہیں۔ وہاں عیش کرتے ہیں اور زمیں داری مینجر' کاردار اور منشی چلاتے ہیں۔ ایسے ہی زمیں داروں کو انگریزی میں ابسن ٹیز لینڈلارڈز کہا جاتا ہے۔"

"ایسا تو بہت ہوتا ہے۔ میں کئی زمیں داروں کو جانتا ہوں' وہ لہور میں کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ ان کے مینجر اور کاردار زمیں داری چلاتے ہیں۔ اس میں برائی کیا ہے۔ زمینداروں کا تو کوئی نکسان نہیں ہوتا۔ انھیں فصل سے جتنا ملنا چاہیے وہ تو مل ہی جاتا ہے۔"

"پر اس طرح کی زمیں داری میں بے چارے مزارعے بالکل تباہ ہو جاتے ہیں۔" جمیلہ نے رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "انھیں زمیں دار کے ساتھ ساتھ فصل میں سے مینجر کا حصہ بھی دینا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہ کریں تو انھیں بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ بے دخل کرنے کے لیے انھیں جھوٹے مکدموں میں پھنسایا جاتا ہے۔ ڈھور ڈنگر اٹھوا لیے جاتے ہیں۔ جوان گھر والیوں اور کڑیوں کو اٹھوا لیا جاتا ہے۔ گھربار جلوا دیا جاتا ہے۔ واڈھو فصلیں کاٹ لی جاتی ہیں۔ ان پر ہر ظلم اور

اپرادھ ہوتا ہے۔ انھیں طرح طرح سے تنگ کیا جاتا ہے۔ بنسی لال نے اللہ وسایا اور اس کے پتر کو اسی طرح بے دخل کیا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "اللہ وسایا اور میں نے اس پنڈ میں کبھی ایسا نہیں کیا۔ کسی مزارعے کو نہ تنگ کیا نہ بے دخل۔ مجھے ڈر ہے' آگے چل کر یہاں بھی ایسا ہی ہونے لگے گا۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔" رحیم داد نے جمیلہ کو یقین دلایا۔ "زمیں دارنی! جو تو کہے گی وہی ہوگا۔ تیری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔ اپنے دل سے ایسا شبہ بالکل نکال دے۔ پہلے بھی تو نے زمیں داری چلائی ہے۔ آگے بھی تیں نوں ہی چلانی ہے۔"

"میرا کیا ہے۔ میں تو اب کچھ بھی نہیں رہی۔" جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "اللہ وسایا کے ساتھ میرا سب کچھ چلا گیا۔ سب کچھ اجڑ گیا۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ آگے نہ بول سکی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنسو پلکوں سے ڈھلک ڈھلک بکھرنے لگے۔ کمرے میں گہرا سکوت پھیل گیا۔ جمیلہ سر جھکائے خاموشی سے روتی رہی۔

☆

بوندا باندی کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ کمرے میں بھیگے ہوئے جھونکے آ رہے تھے۔ ہوا کی سرسراہٹ خاموشی میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔ تاراں ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔

رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے رقّت آمیز لہجے میں کہا۔ "زمیں دارنی! میں نوں پتہ نہیں تھا' تجھے اللہ وسایا سے اتنا زیادہ پیار ہے۔"

"پیار!" جمیلہ نے چادر کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "نہیں چوہدری! مجھے کسی سے پیار نہیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پیار تو وہ کرتا ہے جسے اپنے سے پیار ہو۔ مجھے اپنے جیون سے' اپنی ذات سے کوئی پیار نہیں۔ ہو بھی نہیں سکتا۔ تو اس گل کو نہیں سمجھ سکتا۔"

رحیم داد واقعی اس کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ ہونق کی طرح آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد خاموشی میں گہری سانس بھرنے کی مدھم آواز ابھری۔ جمیلہ بڑبڑانے کے انداز میں آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ "کبھی ایسا بھی تھا جب مجھے اپنے سے پیار تھا۔ یہ بیتے دنوں کی گل ہے۔ پر اب تو اسے ایک جگ بیت گیا۔ اس سمے میں پاروتی تھی اور کالج میں پڑھتی تھی۔ تب میں نے کسی سے پیار کیا تھا۔ اب تو وہ ساری ہی باتیں ایسی لگتی ہیں جیسے کوئی سہانا سپنا دیکھا ہو۔" اس کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔ "ہاں وہ سپنا ہی تھا۔ ایک سندر کلپنا۔"

"کون تھا وہ؟" رحیم داد نے نہایت بھونڈے پن سے پوچھا۔

جمیلہ نے چونک کر گردن موڑی۔ رحیم داد کو دیکھا۔ حیرت سے اس کے چہرے کو تکتی رہی پھر اس نے سر جھکا لیا۔ اس کا افسردہ چہرہ اور مرجھا گیا۔

رحیم داد نے گھبرا کر کہا۔ "لگتا ہے تو نے میری گل کا برا منایا۔"

"ایسی گل نہیں۔" وہ مدھم لہجے میں بولی۔ "چوہدری! تجھے سب ہی کچھ پتہ ہے۔ تجھ سے اب کیا چھپا رہ گیا۔ تو اس کے بارے میں نہیں جانتا' وہ بھی جان لے۔" جمیلہ کی آواز میں درد گھلا ہوا تھا۔ "اس کا نام ویریندر تھا۔ وہ لہور کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔"

"تیرا اس سے میل جول کیسے ہوا۔ تو بھی اسی کالج میں پڑھتی تھی؟"

"نہیں' میں تو کینئرڈ کالج میں پڑھتی تھی۔" جمیلہ نے بتایا۔ "جب تک مجھے ہوسٹل میں رہنے کو جگہ نہ ملی میں ویریندر کے پتا کی کوٹھی میں ٹھیری رہی۔ وہ میرے پتا جی کے بہت پرانے دوست تھے۔ جات کے کھتری تھے اور کھنہ بھی تھے۔ ویسے تو میں ویریندر کو پہلے سے جانتی تھی۔ پر جب ایک ہی کوٹھی میں ساتھ ساتھ رہنا ہوا تو میل ملاپ بڑھ گیا۔ میں ہوسٹل چلی گئی۔ تب بھی اسے ملتی رہی۔ جب ہمارا میل جول زیادہ بڑھا تو بات بڑوں تک پہنچی۔"

"تب تو گڑبڑ پیدا ہوئی ہوگی؟" رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"نہیں' ویریندر کے پتا مجھے اپنی نوہ بنانا چاہتے تھے۔ پر ماں جی نے صاف انکار کر دیا۔"

"ماں جی نے ایسا کیوں کیا؟" رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔

"بات یہ تھی کہ ماں جی نے ہردیال کا رشتہ ویریندر کی بہن سے بہت پہلے دیا تھا۔ پر ویریندر کی ماتا جی نے انکار کر دیا۔ اس کا کارن یہ تھا ہردیال ان دنوں شراب پی کر گانا سننے اور ناچ دیکھنے کنجروں کے چوباروں پر جاتا تھا۔" جمیلہ دھیمے لہجے میں بتاتی رہی۔ "ماں جی کو آشا تھی ہردیال کا دیاہ ہو جائے تو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ کنجروں کے پاس جانا چھوڑ دے گا۔ پر ویریندر کی بہن کا ہردیال سے دیاہ نہ ہو سکا۔"

"یہ تو ٹوٹے سٹے کا دیاہ ہوا۔"

"ہاں کچھ ایسا ہی تھا۔" جمیلہ بولی۔ "ویریندر کی بہن کے ساتھ ہردیال کا رشتہ نہ ہو سکا۔ اسی لیے ویریندر کے ساتھ میرے دیاہ کا معاملہ بھی کھنڈت میں پڑ گیا۔ ہم دونوں کو بہت دکھ ہوا۔ ہردیال

کو کسی طرح اس کا پتہ چل گیا۔ ہوا یہ کہ ایک روز اس نے مجھے روتے ہوئے دیکھ لیا۔ ان دنوں میں دیپال پور میں اپنے گھر ہی پر تھی۔ اس نے کوشش کر کے ماں جی کو راضی کر لیا۔ پا جی تو پہلے ہی تیار تھے۔ کچھ سے بعد شبھ گھڑی دیکھ کر سگن ہو گئی۔ اور یہ طے ہوا کہ اگلی پورن ماشی کو ویریندر کے ساتھ میری سگائی ہو جائے گی۔ میڈیکل کالج میں ویریندر کا آخری سال تھا اور اس کے بعد ہی ہمارا ویاہ ہونے والا تھا۔"

جمیلہ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ یادوں کی اونچی نیچی لہروں پر ڈولتی نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گئی۔ وہ گم صم بیٹھی تھی اور سامنے کی دیوار تک رہی تھی۔

بارش کا سلسلہ ابھی تک ختم نہ ہوا تھا۔ بھیگی ہوا مدھم سروں میں گنگنا رہی تھی۔ کمرے میں روشنی کم تھی اور سکوت گہرا تھا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "فیر کیا ہوا؟"

"فیر پاکستان بن گیا۔" جمیلہ بدستور دیوار کو تکتی رہی۔ "اس کے بعد مجھ پر جو کچھ بیتی وہ تجھے پتہ ہی ہے۔ مجھے اللہ وسایا کسی نہ کسی طرح ولیا کے گھر سے نکال کر حویلی میں لے آیا۔" جمیلہ نے صوفے پر پہلو بدلا۔

"ادھر ویریندر لہور سے بچ بچا کر اوکاڑے پہنچ گیا۔ وہاں اس کے چاچا کا گھر تھا۔ میں دیپال پور ہی میں تھی تو مجھے اس کے اوکاڑے پہنچنے کی خبر ملی تھی۔ بعد میں اس پر کیا بیتی مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ پر اسے پتہ چل گیا میں کوٹلہ ہر کشن میں ہوں۔"

"اسے کیسے پتہ چل گیا تو یہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" جمیلہ نے نہایت سادگی سے کہا۔ "مجھے تو یہ بھی پتہ نہ تھا وہ زندہ ہے یا فسادات میں اوروں کی طرح مارا گیا۔ وہ ایسا سمے تھا' کسی کو کسی کا کچھ پتہ نہ تھا۔ چاروں اور ہاہاکار مچی تھی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں اسے بھول چکی تھی۔ سب ہی کچھ بھول چکی تھی۔ یہ بھی بھول چکی تھی کہ میں کبھی پاروتی تھی۔ جیون مانو ڈراؤنا سپنا بن گیا تھا۔"

"تیری فیر ملاکات نہیں ہوئی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"بہت دنوں بعد کی گل ہے۔" جمیلہ نے بتایا۔ "ان دنوں مردولا سارابائی' مغویہ اور ادھل زنانیوں کا کھوج لگانے اور ان کی واپسی کے لیے پنجاب کا دورہ کر رہی تھیں۔ ایک روز وہ ادھر بھی آ گئیں۔ ان کے ساتھ ویریندر بھی تھا۔ وہ لوگ فوجی گاڑیوں میں آئے تھے۔ دونوں طرف کے سرکاری افسر بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس روز اللہ وسایا بھی موجود نہ تھا۔ وہ ملتان گیا تھا۔ مجھے جیسے ہی ان لوگوں کے پنڈ میں پہنچنے کی خبر ملی' میں جھٹ حویلی سے نکلی اور کھیتوں میں گھس گئی۔ خریف کی فصل تیار کھڑی تھی۔ میں کماد کی اونچی اونچی فصلوں کے اندر چھپ کر بیٹھ گئی۔"

جمیلہ خاموش ہو گئی۔ رحیم داد بھی چپ بیٹھا رہا۔ جمیلہ نے مڑ کر دروازے کی سمت دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ دالان خالی تھا اور صحن میں مینہ کی ہلکی ہلکی بوندیں آہستہ آہستہ گر رہی تھیں۔ کمرے کی خاموشی میں جمیلہ کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "کماد کے بوٹوں کی اوٹ میں سے ویریندر کو بہت دنوں بعد پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ بالکل پہلے ہی جیسا تھا۔ وہی ہلکے گھونگھریالے بال۔ وہی آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ اور ان کے پیچھے چمکتی ہوئی اس کی موٹی موٹی کالی آنکھیں۔ رنگ روپ بھی پہلے ہی جیسا تھا۔ بلکہ دھوپ میں اس کا چہرہ اور گلابی ہو گیا تھا۔ پر اب وہ کچھ دبلا ہو گیا تھا۔ سوٹ کی بجائے کھادی کا سفید کرتا' پائجامہ اور نہرو کٹ اونی جیکٹ پہنے تھا۔" جمیلہ نے ایک بار پھر گہری سانس بھری۔ "وہ سب سویرے سویرے آئے تھے پر دوپہر تک میرا کھوج نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ حویلی تو انھوں نے پوری طرح چھان ہی ڈالی ہاؤر پنڈ کے بھی ایک ایک گھر کی تلاشی لی۔"

"کماد کی فصل میں تلاشی نہیں لی؟"

"اس میں بھی بار بار جھانکا۔ پر میں ایسی دبکی بیٹھی تھی کسی کو نظر ہی نہ آئی۔ اس سے میں دبلی بھی تھی۔ میں نے دیکھا ویریندر بہت بے کل تھا۔ کبھی ادھر جاتا کبھی ادھر۔ نومبر کا مہینہ تھا۔ پر بھاگ دوڑ سے اس کا سارا بدن پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ وہ بار بار ماتھے سے پسینہ پونچھتا۔ فیر میں نے یہ بھی دیکھا' جب مردولا سارابائی اور ان کے ساتھ کے تمام بندے واپس جا رہے تھے تو ویریندر کا چہرہ بیماروں کی طرح مرجھایا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ دور تک پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا اور میں کماد کی فصل کے اندر بیٹھی اسے چپ چاپ تکتی رہی۔ میرا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ ایسا لگا میں اسے بھول کر بھی بھول نہ سکی تھی۔"

"جب ایسی گل تھی تو کماد کی فصل میں کیوں چھپ کر بیٹھ گئی تھی؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "اس کے ساتھ چلی کیوں نہ گئی؟"

"کیسے چلی جاتی۔" جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "ان دنوں تینا میرے پیٹ میں تھی۔ وہ میرے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر جانے کیا سوچتا۔ اسے دکھ ہی ہوتا۔ میں نے سوچا ایسی حالت میں وہ مجھے کیسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ ویسے بھی لاج کے مارے میں اس کے سامنے جانے کے لیے کہاں سے حوصلہ لاتی؟ میں تو ان میں سے کسی کے بھی سامنے جانا نہ چاہتی تھی۔ میں نے بار بار اٹھ کر باہر نکلنا چاہا پر ایسا لگا مانو پیروں میں اٹھنے کی شکتی نہ رہی۔"

”اس کے بعد وہ دوبارہ نہیں آیا؟“ رحیم داد نے ویرندر کے ذکر میں دلچسپی کا اظہار کیا۔

”آیا تھا اور بالکل اکیلا آیا تھا۔“ جمیلہ نے بتایا۔ ”جاڑے کی ٹھنڈی رات تھی۔ اور میں کمرے میں بالکل اکیلی تھی۔ ان دنوں میں اور اللہ وسایا نیچے ہی کے کمروں میں رہتے تھے۔ اس روز بھی اللہ وسایا موجود نہ تھا۔ دوپہر کو عارف والا گیا تھا اور واپس نہ آیا تھا۔ میں اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ اچانک دروازہ کھلا۔ میں نے دیکھا' ویرندر دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا ہے۔ اس کے کندھے پر اسٹین گن لٹک رہی تھی۔ اب وہ زیادہ ہی دبلا ہوگیا تھا۔ گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ رنگ بھی کم پڑ گیا تھا۔ سر کے بال خشک اور بکھرے ہوئے تھے۔ لیمپ کی پیلی پیلی روشنی میں وہ بیمار بیمار لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گئی۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔“

”وہ تیرے کمرے تک پہنچا کیسے۔ حویلی کے راکھے اور نوکر چاکر اسے نہ دیکھ سکے۔ کسی نے اسے نہ روکا۔“

”پتہ نہیں وہ کیسے آیا۔ نہ میں نے پوچھا نہ اس نے بتایا۔ پر اتنا ضرور ہے۔ اس رات کہر بہت زیادہ تھی۔ چاروں اور گہری دھند کی چادر تنی تھی۔ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لگتا ہے وہ مہمان خانے کی اور سے آیا تھا جو ان دنوں بالکل خالی تھا۔“ جمیلہ نے آہستہ آہستہ بتایا۔ ”ہم دونوں ذرا دیر چپ چاپ ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ فیر وہ آگے بڑھا۔ نزدیک آیا۔ مسکرا کر بولا۔ پارو! میں تجھے لینے آیا ہوں۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور بستر پر سوتی ہوئی نینا کو ایک ہاتھ سے ہولے ہولے تھپکنے لگی۔ وہ اس سے سال بھر سے کچھ اوپر تھی۔“

”نینا کو دیکھ کر تو وہ پریشان ہوگیا ہوگا؟“

”نہیں! وہ میرے پاس آکر کھڑا ہوگیا اور نینا کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے پوچھا۔ پارو' یہ تیری بچی ہے؟ میں نے گردن ہلا کر ہاں کی۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ آہستہ سے میرے نزدیک بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے نینا کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ مسکرا کر بولا۔ کتنی سوہنی ہے' بالکل تیری طرح۔ وہ جھکا اور نینا کا گال چوم لیا۔“

”حد کردی جی اس نے۔“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر فوری ردعمل کا اظہار کیا۔ ”عجب بندہ تھا۔“

”ہاں وہ عجب ہی بندہ تھا۔“ جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں نے چاہا وہ چلا جائے پر میں اسے یہ بات کہہ نہ سکی۔ خاموش بیٹھی رہی۔ وہ چپ نہ رہا۔ میرے منہ کی اور دیکھ کر بولا۔ تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ میں نے نظریں جھکالیں۔ اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے

پوچھا۔ تو اب تک کہاں تھا؟ کہنے لگا کیا کرے گی جان کر۔ ویسے میں ایک بار پہلے بھی تیری کھوج میں ادھر آیا تھا پر تو نہیں ملی۔ لگتا ہے اللہ وسایا تجھے اپنے ساتھ کہیں اور لے گیا تھا۔ کسی نے پہلے ہی مخبری کردی ہوگی۔ میں نے کچھ نہ کہا۔ چپ کر کے بیٹھی رہی۔“

”اس نے اپنے بارے میں تجھے کچھ نہیں بتایا؟“

”بتایا تھا۔ کہتا تھا جب فسادات کی آگ بھڑکی تو اس کے ماتا پتا اور ایک بھائی لہور ہی میں مارے گئے۔ وہ دو بہنوں کے ساتھ نکل کر کسی نہ کسی طرح چاچا کے پاس اوکاڑے پہنچ گیا۔ لیکن اس کے پہنچنے کے چند ہی روز بعد بلوائیوں نے ہلّا بول دیا۔ ویرندر کے چاچا کا نام نریندر ناتھ تھا۔ اس کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے صرف ایک شاٹ گن تھی اور دو درجن کے لگ بھگ کارتوس تھے۔ وہ اپنی ماڑی کی چھت پر چڑھ گیا اور بلوائیوں کو گولی چلا کر روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ ویرندر اس کی مدد کرتا رہا۔ دوسری اور گھر کی زنانیوں نے دیکھا کہ بلوائیوں نے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور لوہے کا دروازہ توڑ ڈالا تو جن کے بچے تھے انھوں نے بچوں کو چھاتی سے لگا کر دودھ پلایا۔ گھر میں مٹی کے تیل کے دو کنستر موجود تھے۔ چاچی نے سب پر تیل چھڑکا اور اپنے اوپر بھی ڈالا اور آگ لگائی۔ آگ کے شعلے بھڑکے تو چاچا نیچے بھاگا۔ اس کی بندوک میں صرف ایک کارتوس رہ گیا تھا۔ ویرندر دیوار پھاند کر برابر والے مکان کی چھت پر چلا گیا اور اس پر جھکے ہوئے ایک پیڑ پر چڑھ کر شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ چاچا کے گھر سے گوشت کے جلنے کی تیز بو ابھر رہی تھی۔ بلوائی لوٹ مار کرنے کے بعد چلے گئے تو رات کے اندھیرے میں وہ درخت سے اتر کر گھر میں گیا۔ دیکھا ساری زنانیاں جل کر مر چکی ہیں۔ ان کی لاشوں کے نزدیک ہی چاچا خوں میں ڈوبا ہوا پڑا تھا۔ اس نے گولی چلا کر خودکشی کرلی تھی۔“

”ویرندر وہاں سے کیسے نکلا؟“ رحیم داد نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”وہ سویرا ہونے سے پہلے نکل کر اپنے پتا کے ایک دوست سردار جسونت سنگھ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اپنے ٹبّر کے ساتھ سرحد پار جانے والے تھے۔ انھوں نے ایک ٹرک کا بندوبست بھی کرلیا تھا۔“ جمیلہ دھیمے لہجے میں بتاتی رہی۔ ”ویرندر بھی ان کے ٹبّر کے ساتھ ٹرک میں بیٹھ گیا۔ سردار جسونت سنگھ کے ساتھ اس کے دو پتر بھی تھے۔ ان کے علاوہ گھر والی تھی۔ جوان بہو بیٹیاں تھیں۔ رات کا اندھیرا ہوتے ہی ٹرک روانہ ہوا۔ دیپال پور ہی کے رستے سے گزرا تھا۔“

”ویرندر تیرے گھر نہیں پہنچا۔ تو بھی تو ان دنوں دیپال پور میں تھی؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

"اس نے کوشش تو کی تھی' پر ڈرائیور تیار نہ ہوا۔ میرا گھر رستے سے تین میل دور تھا۔ ادھر گڑبڑ بھی بہت تھی۔ فیر ویرندر کو یہ بھی پتہ نہ تھا میں دیپال پور ہی میں ہوں۔ ان دنوں کچھ پتہ نہ تھا کون کہاں ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "ٹرک دیپال پور سے گزرتا ہوا چک بیدی کے رستے حویلی روڈ پر بڑھا۔ یہی سڑک سرحد پار جاتی تھی۔ پر نانک پورہ سے آگے درختوں کو کاٹ کر سڑک پر رکاوٹ کھڑی کردی گئی تھی۔ اس سے ڈرائیور آرام کر رہا تھا اور ٹرک سردار جسونت سنگھ کا پتر چلا رہا تھا۔ اس نے سڑک پر دور سے رکاوٹ دیکھ لی۔ جھٹ ٹرک کو کچے راستے پر ڈال دیا پر چند ہی میل جانے کے بعد پٹرول ختم ہوگیا۔ سب نے دھکا لگا کر ٹرک ایک جھنگر میں چھپا کر کھڑا کردیا۔ پروگرام یہ تھا کہ دن جھنگر میں گزار کر رات کو پیدل سفر کیا جائے۔ دن ٹھیک ٹھاک گزر گیا۔ شام ہوئی تو آگے جانے کے لیے اندھیرا ہونے کا انتظار ہونے لگا۔ نہ جانے کدھر سے ایک بوڑھا مسلمان اپنی مج ہنکاتا ہوا ادھر سے گزرا۔ اس نے سب کو دیکھا تو مج چھوڑ کر بھاگا۔ اس کا پنڈ نزدیک ہی تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے پنڈ بلکہ آس پاس جتنے بھی پنڈ تھے' سب کو خبر کردی۔ اندھیرا بڑھنے کے ساتھ دور سے شور سنائی دینے لگا۔ مشعلوں کی روشنی بھی دکھائی دی۔ بلوائی حملہ کرنے کے لیے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔"

"سردار اور اس کے پتروں کے پاس کوئی ہتیار شتیار نہیں تھا؟"

"ویرندر بتاتا تھا ان کے پاس ریوالور کے علاوہ ایک تھری ناٹ تھری رائفل اور ایک سٹین گن بھی تھی؟"

"تب تو ان کے پاس اتنا اسلحہ تھا کہ بلوائیوں کو بھگایا جاسکتا تھا۔" رحیم داد نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"پر بلوائی بہت زیادہ تھے۔ ان کے پاس بھی اسلحہ تھا۔ وہ ہوائی فیر چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ سردار جسونت سنگھ کے دونوں پتر رائفل اور سٹین گن کے ساتھ مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ ادھر سردار جسونت سنگھ نے اپنے ٹبر کی زنانیوں کو تین لائینوں میں پاس پاس بٹھا دیا۔ ہر ایک کی آنکھ پر اس کی اوڑھنی سے پٹی باندھ دی۔ سردار کی ایک نوہ اپنے ننھے کاکے کو چھاتی سے لگا کر دودھ پلانے لگی۔ بیچ میں وڈی سردارنی تھی۔ اس کے دائیں بائیں جوان کڑیاں تھیں۔ تینوں آگے کی لائن میں تھیں۔ ان کے پیچھے پتروں کی گھروالیاں اور پوتیاں تھیں۔ سردار جی نے ہولسٹر سے بھرا ہوا ریوالور نکالا اور گورو گرنتھ صاحب کے وارلمبار اشوک کے ان شبدوں کا اونچی آواز سے جاپ شروع کردیا۔

چلمل بسیار دنیا پھانی
کالو بے اکل من گور نہ مانی
من کمین کمترین تو دریاؤ کھدایا
ایک چیج مجھے دے اور جہر چیج نہ بھایا

سردار جی کی زبان پر گورو گرنتھ صاحب کا جاپ تھا اور آنکھوں سے آنسو ٹپکتے تھے۔"

رحیم داد نے جمیلہ کی بات کاٹ کر کہا۔ "زمیں دارنی تجھے گورو گرنتھ صاحب کے شبد کیسے یاد رہ گئے؟" اس کے لہجے میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔

"میں بچپن میں خالصہ سکول میں پڑھتی تھی۔ وہاں گورو گرنتھ صاحب کے اشلوکوں کا ہر صبح جاپ کرایا جاتا تھا۔ مجھے ان اشلوکوں کے اب تک بہت شبد یاد ہیں۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔

"میں نے تو یہ بات ایسے ہی پوچھ لی تھی۔ تو سردار جسونت کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس کا کیا بنا؟"

"میں بتا رہی تھی' سردار جی گورو گرنتھ صاحب کے شبدوں کا جاپ کر رہے تھے۔ ریوالور ان کے ہاتھ میں تھا اور سامنے زمیں پر ان کے گھر کی مہلائیں تین لائینوں میں زمین پر بیٹھی تھیں۔ بلوائیوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا' نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔"

"سردار نے یہ سب کیوں کیا تھا؟" رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔

"سیدھی سی گل ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا اس کے گھر کی زنانیوں اور کڑیوں کو بلوائی اٹھا کر لے جائیں۔ ان کی عزت آبرو لوٹیں۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "پر بلوائیوں کا شور جب بالکل نزدیک آگیا اور روشنی درختوں کی اوٹ سے صاف نظر آنے لگی تو سردار جسونت سنگھ نے ریوالور ویرندر کے ہاتھ میں دے دیا۔ جیب سے سفید رومال نکالا اور ویرندر سے کہا۔ میں رومال ہلا کر تین تک گنتی گنوں گا۔ جب میں تین کہوں تو ریوالور سے سامنے بیٹھی ہوئی زنانیوں پر گولیاں چلنی شروع ہوجائیں۔"

"یہ کام تو سردار خود بھی کرسکتا تھا؟"

"کر تو سکتا تھا پر اس لیے کرنا نہ چاہتا تھا کہ آخری سمے شاید اس سے گولی نہ چلائی جائے۔ کوئی بھی اتنا کٹھور نہیں ہوسکتا کہ اپنے ہی بال بچوں کو اپنے ہی ہاتھوں کتل کردے۔ سردار اسی لیے یہ کام ویرندر سے کرانا چاہتا تھا۔ شور بہت نزدیک آگیا تو سردار جی نے رومال ہلا کر ایک کہا۔ ذرا دیر بعد دوسری بار رومال ہلایا اور دو کہا۔ اس نے رومال ہلانے کے لیے تیسری بار ہاتھ اٹھایا تو دور

سڑک پر تیز روشنی ابھری۔"

"یہ بھی مشالوں کی روشنی تھی؟"

"نہیں، ٹرک کی روشنی تھی اور تیزی سے نزدیک آتی جا رہی تھی۔ ویرندر نے روشنی دیکھی تو مدد کے لیے اس طرف بڑھا۔ سردار جی نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اونچی آواز سے کہا۔ اگر وہ مسلے ہوئے تو کیا ہو گا؟ پر ویرندر نہ رکا۔ اس نے سردار جسونت سنگھ کو سمجھایا۔ بلوائی بھی تو مسلے ہی ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ آنے والے ہندو یا سکھ ہوں۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا سڑک پر پہنچ گیا۔ دیکھا سامنے سے ایک ٹرک آ رہا ہے۔ ویرندر نے ہاتھ ہلا کر اسے روکا۔ ٹرک رک گیا۔"

"اس میں کون سوار تھا؟" رحیم داد نے سراپا استجاب بن کر دریافت کیا۔

"وہ مسلمان فوجی تھے۔"

"مسلمان فوجی تھے۔" رحیم دا حیرت سے چونک کر بولا۔ "تب تو بہت مشکل پڑی ہو گی۔"

"کوئی مشکل پڑی نہ کٹھنائی۔" جمیلہ نے نرم لہجے میں کہا۔ "ویرندر نے ان کی منت کی۔ وہ نیک اور بھلے بندے تھے۔ فوراً مدد کرنے پر تیار ہو گئے۔ انھوں نے ویرندر کے ساتھ سردار جسونت سنگھ کے پورے ٹبر کو اپنے فوجی ٹرک میں بٹھا لیا۔ بلوائی شور مچاتے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ پر جب انھوں نے فوجیوں کو برین گنیں اور رائیفلیں سنبھالے دیکھا تو لوٹ گئے۔ فوجیوں نے ویرندر اور جسونت سنگھ کے بال بچوں کو آرام سے سرحد پار پہنچا دیا۔"

"یہ تو نے عجب گل سنائی۔" رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "ویرندر سرحد پار جا کر کیا کرتا رہا؟"

"بتاتا تھا، اس نے آگرہ جا کر میڈیکل کالج میں کسی نہ کسی طرح اپنی پڑھائی پوری کی اور ڈاکٹر بن گیا۔ اس سنسار میں اس کا کوئی نہ رہا تھا۔ سب مارے جا چکے تھے۔ وہ اکیلا بچا تھا۔ وہ غریبوں اور ضرورت مندوں کے مفت علاج کے لیے اسپتال بنانا چاہتا تھا۔ اس کی آشا تھی کہ اس نیک کام میں، میں اس کی مدد کروں۔ دونوں مل جل کر اسپتال چلائیں۔"

"تو نے اس کی گل سن کر کیا جواب دیا؟"

"میں چپ بیٹھی رہی۔ وہ بولتا رہا۔ میں سنتی رہی۔ سر جھکائے پاس لیٹی ہوئی نینا کو ہولے، ہولے تھپکتی رہی۔ ویرندر نہ جانے اور کیا کیا کہتا۔ اچانک کمرے کے باہر چاپ ابھری۔ میں نے پریشان ہو کر دروازے کی اور دیکھا، اللہ وسایا کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ اس نے ویرندر کو میرے برابر بستر پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو ٹھٹک کر دہلیز پر رہ گیا۔"

"اللہ وسایا اسے تیرے ساتھ اس طرح بیٹھے دیکھ کر غصے سے پاگل ہو گیا ہو گا۔" رحیم داد کے لہجے میں استجاب تھا۔

"نہیں، وہ چپ کر کے کھڑا ہم دونوں کو دیکھتا رہا۔" جمیلہ نے نہایت اطمینان سے بتایا۔ "ذرا دیر چپ رہنے کے بعد اس نے ویرندر کی اور ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔ یہ کون ہے؟ کس لیے آیا ہے؟ تیرا بھائی بھی نہیں لگتا۔ میں تو خاموش بیٹھی رہی پر ویرندر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بتایا۔ میرا نام ڈاکٹر ویرندر ناتھ کنہ ہے۔ میرا اس کا کیا ناتا ہے؟ یوں سمجھ لے، میں اس کا منگیتر ہوں اور اسے لینے آیا ہوں۔ یہ کہتے کہتے اس نے جھٹ کندھے سے سٹین گن اتاری۔ اسے اللہ وسایا کی سمت تان کر بولا۔ میں اسے آج اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میرا رستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ اللہ وسایا تو مرنا نہیں چاہتا تو میرے رستے سے ہٹ جا۔ اس کی آنکھیں غصے سے لال ہو رہی تھیں۔"

"اللہ وسایا تو نہتا تھا۔ ڈر کر اس کے سامنے سے ہٹ گیا ہو گا۔" رحیم داد نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"نہیں! وہ بالکل نہیں ڈرا۔ اسی طرح ویرندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ وہ بہت نڈر اور حوصلے والا تھا۔" جمیلہ فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے بولی۔ "کچھ دیر تو وہ چپ رہا فیر اس نے میری اور ہاتھ اٹھا کر ویرندر سے کہا۔ یہ تیرے ساتھ جانا چاہتی ہے تو خوشی سے جا سکتی ہے۔ اسے پوری طرح پتہ ہے، میں نے کبھی اس کا رستہ نہیں روکا اور اگر یہ نہیں جانا چاہتی تو ڈاکٹر ویرندر تو اسے صرف میری لاش کے اوپر سے گزر کر ہی لے جا سکتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اگے بڑھا۔ ویرندر کی سٹین گن کی نالی ایک ہاتھ سے کھسکا کر بولا۔ اسے ہٹا۔ اس نے مڑ کر میری اور دیکھا، پوچھا۔ جمی لے! تو کیا کہتی ہے؟ وہ تن کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔"

"تو نے کیا جواب دیا؟ اللہ وسایا نے تجھے کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "مجھے سمجھ نہیں آئی، کیا کہوں؟ میں خاموش بیٹھی رہی پر ویرندر خاموش نہ رہا۔ کہنے لگا۔ اس نے کیا کہنا ہے۔ یہ میرے ساتھ جائے گی۔ یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھایا اور میرا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔ تب اللہ وسایا نے اسے گھور کر دیکھا۔ غصے سے بولا۔ ڈاکٹر اس کا بازو چھوڑ دے۔ تو اسے اس طرح یہاں سے نہیں لے جا سکتا۔ اللہ وسایا اس سے بالکل سٹین گن کی نالی کے سامنے کھڑا تھا۔"

"ویرندر نے تیرا بازو چھوڑ دیا؟"

"نہیں! اس نے میرا بازو اسی طرح پکڑے رکھا۔ اس نے اللہ وسایا کی اور نہیں دیکھا۔ میرا بازو

ہولے ہولے جھنجوڑ کر بولا۔ تجھے میرے ساتھ چلنا ہے؟ صاف صاف بتا دے۔ مجھے پورا دشواس ہے تو انکار نہیں کر سکتی۔ اس کی آواز میں منت تھی۔ آنکھوں میں جیسے آنسو جھلملا رہے تھے۔ میں الجھن میں پڑ گئی۔ ایسا لگا میں جمیلہ سے فیر پاروتی بن گئی ہوں۔ بھولے بسرے سپنے جاگ اٹھے تھے اور ان سپنوں میں بسنے والا ویریندر میرے سامنے کھڑا تھا۔ ہاں وہی تھا۔ وہی الجھے ہوئے بال‘ وہی سنہری چشمے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی موٹی موٹی کالی آنکھیں۔ وہ سرحد پار سے مجھے لینے آیا تھا۔“ جمیلہ خود فراموشی کے عالم میں ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ “میں بالکل چپ تھی۔ کھوئی کھوئی بیٹھی رہی۔”

“اللہ وسایا بھی چپ کر کے کھڑا رہا۔ وہ کچھ نہ بولا؟”

“نہیں اس نے اونچی آواز سے کہا تھا۔ بول‘ بولتی کیوں نہیں؟ تیں نوں اس کے ساتھ جانا ہے؟ اس کی آواز سے نینا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔ نینا کو روتا دیکھ کر میں چونک پڑی۔ مڑ کر نینا کو دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے یاد آ گیا‘ میں پاروتی نہیں جمیلہ ہوں۔ اللہ وسایا کی گھر والی اور اس کی دھی‘ نینا کی ماں ہوں۔ میں بے کل ہو گئی۔ تڑپ کر میں نے نینا کو اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔” جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ “میں نے آنسو بہاتے ہوئے ویریندر کی اور دیکھا‘ اسے کہا۔ ڈاکٹر ویریندر تو جس پاروتی کو لینے آیا تھا وہ تو کب کی مر چکی ہے۔ میں جمیلہ ہوں اور جمیلہ تیرے ساتھ نہیں جا سکتی۔ تو جا۔ میرا تیرا کوئی سنبدھ نہیں۔”

“تیری یہ بات سن کر ویریندر کیا بولا؟” رحیم داد نے پوچھا۔

“وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔” جمیلہ نے جواب دیا۔ “اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ کہنے لگا تو جمیلہ ہو یا شمیلہ‘ میرے لیے تو پارو ہی ہے۔ میں آج یہ طے کر کے آیا ہوں کہ اکیلا واپس نہیں جاؤں گا۔ تجھے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ اس نے سٹین گن کی نالی کا رخ اللہ وسایا کی اور کر دیا اور میری طرف مڑ کر تیزی سے بولا۔ میں نے یہ سوچ کر ہی سرحد پار کی تھی کہ تجھے اپنے ساتھ لے کر ہی لوٹوں گا۔ جو میرا رستہ روکے گا اسے ختم کر دوں گا یا خود ختم ہو جاؤں گا۔ میں آج سردھڑ کی بازی لگانے آیا ہوں۔ بول تجھے کیا کہنا ہے۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔”

“تو نے کیا کیا؟” رحیم داد نے دریافت کیا۔ “تو ڈر گئی ہوگی۔ ویریندر تو صاف صاف کہہ چکا تھا وہ تیرے بنا نہیں جائے گا۔”

“میں بالکل نہیں ڈری۔ میں نے بھی اسے صاف صاف کہہ دیا۔ تیری پارو مر گئی۔ وہ زندہ نہیں ہو سکتی۔ میں اب صرف جمیلہ ہوں۔ تو جمیلہ کو کتل کر کے اس کی لاش اپنے ساتھ لے جا۔ میں زندہ تیرے ساتھ نہیں جا سکتی‘ ہرگز نہیں جا سکتی۔ یہ کہہ کر میں نینا کو چھاتی سے لگا کر رونے لگی۔ ویریندر خاموش کھڑا رہا۔”

“تیری گل سن کر تو اسے چلا جانا چاہیے تھا۔” رحیم داد نے تبصرہ کیا۔

“نہیں۔” جمیلہ نے بتایا۔ “اس نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں مجھے کہا۔ ایک بار فیر سوچ لے۔ میں دوبارہ کبھی نہیں آؤں گا۔ وہ ٹکٹکی باندھے مجھے تکتا رہا۔” جمیلہ نے لمبی سانس بھری۔ “میں نے سسکیاں بھرتے ہوئے اسے کہا۔ میں چاہتی بھی یہی ہوں تو دوبارہ یہاں نہ آئے۔ اس کے بعد وہ کچھ نہ بولا۔ سٹین گن کندھے پر لٹکائی اور میری اور دیکھے بنا دروازے کی طرف بڑھا۔ اللہ وسایا بھی اس کے ساتھ ہی مڑا‘ آگے بڑھا۔ دونوں چپ چاپ کمرے سے باہر چلے گئے۔”

“تو نے اللہ وسایا کو اس کے ساتھ جانے دیا۔ روکا کیوں نہیں؟”

“میرا جی تو یہی چاہتا تھا‘ اللہ وسایا کو اس کے ساتھ جانے نہ دوں پر مجھ سے یہ بات کہی نہ گئی۔ ہونٹوں پر جیسے تالا لگ گیا۔ میں نینا کو چھاتی سے چمٹائے خاموش بیٹھی روتی رہی۔” جمیلہ نے بتایا۔

“اللہ وسایا دیر تک نہ لوٹا۔ میں اس کا انتظار کرتی رہی۔ وہ صبح تک نہ آیا۔”

“اللہ وسایا کہاں چلا گیا تھا؟”

“وہ ویریندر کے ساتھ سرحدی پنڈ شامار کے گیا تھا۔ دوپہر کو واپس آیا تو بہت تھکا ہوا اور اداس تھا۔ اس نے مجھے بتایا‘ ویریندر جیپ میں بیٹھ کر یہاں آیا تھا۔ اس کے ساتھ دو سمگلر تھے۔ وہ بھی پوری طرح مسلح تھے۔ ویریندر اصرار کر کے اللہ وسایا کو اپنے ساتھ سرحد تک لے گیا تھا۔”

“اور اللہ وسایا اس کے ساتھ چلا بھی گیا۔” رحیم داد حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ “اسے ویریندر اور اس کے ساتھ آنے والے مسلح سمگلروں سے ڈر بھی نہ لگا۔”

“وہ ڈرنے والا بندہ نہیں تھا۔ سدا کا نڈر اور جیالا تھا۔” جمیلہ نے اپنے لہجے میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔ “تب ہی تو وہ بے دھڑک ویریندر کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ رات انھوں نے شامار کے میں گزاری۔ سویرے بہت تڑکے پہلے ویریندر اٹھا۔ وہ رات بھر سویا نہیں تھا۔ اس نے اللہ وسایا کو جگایا اور اس کے ساتھ ستلج کی اور چلا۔” جمیلہ نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر اسے مخاطب کیا۔ “چوہدری! تجھے پتہ ہے ستلج پار فیروز پور کی سرحد لگتی ہے اور فیروز پور اب ہندوستان میں ہے۔” جمیلہ نے لحہ بھر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھری۔ “جب دونوں ستلج پر پہنچے تو ویریندر نے اللہ وسایا کو گرم جوشی کے ساتھ گلے لگا لیا۔ اس کے ماتھے کو چوما اور چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔”

"سرحد پار چلا گیا ہو گا؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر استفسار کیا۔

"نہیں وہ ستلج کے اس پار نہ گیا۔ جہاں دونوں ملکوں کی سرحدیں ملتی تھیں وہاں ٹھیر گیا۔ اس نے اچانک کندھے پر لٹکی ہوئی سٹین گن اتاری اور کنپٹی پر رکھ کر چلا دی۔"

"تب تو وہ مر گیا ہو گا؟" رحیم داد کے لہجے میں کپکپاہٹ تھی۔

"ہاں! اسی سے اس کی مرتی ہو گئی۔ اس کی لاش سرحد کے بیچوں بیچ پڑی تھی۔ ادھر پاکستان تھا اودھر ہندوستان۔" جمیلہ نے رسان سے کہا۔ اس کی آواز میں درد کی کسک تھی۔ "مرنے سے پہلے اس نے اللہ وسایا کو سونے کی ایک انگوٹھی دی۔ اسے بتایا' وہ انگوٹھی' کڑمائی پر مجھے پہنانا چاہتا تھا' پر وہ دن ہی نہ آیا' کڑمائی ہوتی اور وہ اپنی منگ کے طور پر مجھے انگوٹھی پہناتا۔ اس کی آشا تھی میں اس کی نشانی سمجھ کر اسے پہن لوں۔ ویرندر اس رات مجھے لینے اور کڑمائی کی انگوٹھی پہنانے ہی کے لیے آیا تھا۔"

"اس انگوٹھی کا کیا بنا؟"

"یہ رہی وہ انگوٹھی۔" جمیلہ نے اپنا ہاتھ رحیم داد کے سامنے کر دیا۔ اس کی ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی جس میں جڑا ہوا ہیرے کا سرخ نگینہ جھلملا رہا تھا۔ "میں نے انگوٹھی اسی سے پہن لی تھی۔ اور آج تک نہیں اتاری۔"

"اللہ وسایا نے اس کا برا نہیں منایا؟"

"نہیں!" جمیلہ نے آہستہ آہستہ انکار میں گردن ہلائی۔ "انگوٹھی اس نے خود اپنے ہاتھ سے پہنائی تھی۔ اس سے اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ رہے تھے۔ انگوٹھی پہنا کر وہ رونے لگا تھا۔"

"اللہ وسایا بھی عجب بندہ تھا۔"

"ہاں! وہ بہت عجب بندہ تھا۔" جمیلہ کے لہجے میں دکھ کی چبھن تھی۔ "اسے تو یہ بھی پتہ تھا' میں ڈسپنسری' ڈاکٹر ویرندر ہی کی یادگار کے طور پر بنانا چاہتی ہوں۔ میں نے اسے جب اپنی اس آشا سے آگاہ کیا تو اس نے ذرا بھی برا نہ منایا۔ صرف مسکرا کر رہ گیا۔ چوہدری! سچ پوچھ تو ویرندر کی موت پر اللہ وسایا بھی نراش اور دکھی تھا۔ بار بار کہتا تھا' تو اس کے ساتھ چلی جاتی تو وہ کبھی خودکشی نہ کرتا۔"

"اللہ وسایا ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ تو چلی جاتی تو وہ یوں جان نہ دیتا۔"

"پر میں اس کے ساتھ کیسے جا سکتی تھی۔" جمیلہ نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ "میں ویرندر کے ساتھ سرحد پار چلی جاتی تو زمیں داری اللہ وسایا کے ہاتھ سے نکل جاتی۔ وہ زمیں وار سے غیر مزارع بن جاتا۔ جانے کیا ہوتا۔ میری نینا کا کیا بنتا۔ پتہ نہیں ادھر والے اس کے ساتھ کیسا سلوک کرتے؟ ایک نہیں' کتنی باتیں تھیں جو زنجیر بن کر میرے پیروں سے چمٹ گئی تھیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اللہ وسایا کو چھوڑ کر ویرندر کے ساتھ جانا آسان نہ تھا۔ میرے تو بھاگ اچھے تھے' مجھے اللہ وسایا کے روپ میں ایسا نیک بندہ مل گیا تھا۔ اس کا من بہت اجلا تھا۔ وہ بہت ہی بھلا بندہ تھا۔"

رحیم داد نے جمیلہ سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "پر زمیں دارنی تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔"

"میں اکیلی اس ظلم اور اپرادھ کا نشانہ نہیں بنی۔" جمیلہ نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ "تجھے بھی پوری طرح پتہ ہے' ادھر اور ادھر' دونوں طرف لاکھوں مٹیاریں اور زنانیاں اٹھائی گئیں اور اپنا سب کچھ لٹا کر مغویہ کہلائیں۔ میری طرح انھوں نے بھی آئندہ کے لیے جانے کیسے کیسے سانے سپنے دیکھے ہوں گے۔ ان میں خوشیاں تھیں۔ چمکتی دمکتی آشائیں تھیں۔ زندہ رہنے اور سندر جیون بنانے کی امنگیں تھیں۔" اس کا لہجہ اور غم زدہ ہو گیا۔ "فیر ایک روز اچانک سب کچھ ملیا میٹ ہو گیا۔ جیون ڈراؤنا سپنا بن گیا۔ تجھے کیا پتہ ان پر کیا کیا نہ بیتی اور اب تک بیت رہی ہے۔"

رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری مگر خاموش رہا۔

☆

آسمان پر گہرا ابر چھایا تھا۔ ہوا تیز نہ تھی مگر بوندا باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ حویلی پر سناٹا چھایا تھا۔ کمرے میں رحیم داد اور جمیلہ صوفوں پر بیٹھے تھے۔ دونوں خاموش تھے اور دل گرفتہ نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر دکھ کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ رحیم داد زیادہ دیر خاموش نہ رہا۔ بجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

"زمیں دارنی تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ فسادات میں زنانیوں کے ساتھ بہت ہی ظلم ہوا۔"

"نہ پوچھ' کیا کیا ظلم نہیں ہوا۔" جمیلہ نے تڑپ کر کہا۔ "کالج میں میری ایک کلاس فیلو ہوتی تھی۔ اس کا نام چترا کپور تھا۔ لگتی بھی سندر چتر کی طرح تھی۔ اسے اپنی سندرتا پر مان بھی تھا۔ تھی بھی چترکار۔ میں نے اس کی بنائی ہوئی کئی پینٹنگ دیکھیں۔ اچھی خاصی سندر تصویریں بنا لیتی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں پتلی پتلی تھیں اور لمبی لمبی' بہت کومل اور بہت سوہنی تھی۔ میرے ساتھ اس کی بہت گہری دوستی تھی۔ وہ بی۔ اے کرنے کے بعد پینٹنگ سیکھنے بمبئی جانا چاہتی تھی۔ جے۔ جے سکول آف آرٹس میں داخلہ لینے کا ارادہ تھا۔ اسے پینٹنگ سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔

ویسے بھی بات چیت، کپڑے لتے، رہن سہن، ہر انداز سے آرٹسٹ لگتی تھی۔"

"کسی اچھے ہی گھر کی کڑی ہوگی؟"

"ہاں!" جمیلہ نے بتایا۔ "اس کا پتا انجینئر ہوتا تھا۔ میں اس کے پتا سے کئی بار ملی بھی تھی۔ اس میں ذرا بھی اکڑفوں نہ تھی۔ پر چترا میں ایسی اکڑ تھی، سب اسے گھمنڈی کہتے تھے۔ پر پیار بھی بہت کرتے تھے۔ اس میں بات ہی ایسی تھی۔ بادام کی سی لمبی کالی کالی آنکھیں۔ اور رنگت ایسی اجلی جیسے صبح کی ہنستی ہوئی دھوپ۔ جب وہ اپنی سوہنی گردن، راج ہنس کی طرح اٹھائے، ماتھے پر بکھری ہوئی بالوں کی لٹوں کو بار بار جھٹکتی ہوئی گزرتی تو دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے۔ مجھے اب تک یاد ہے ان دنوں وہ کتنی سوہنی اور شاندار لگتی تھی۔"

"پر اس کا بنا کیا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"یہ نہ پوچھ چوہدری۔" جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "دو اڑھائی برس ادھر کی گل ہے۔ میں پڑوس کے ایک زمیں دار کے پتر کی جنج کے ساتھ پکھیالہ گئی۔ اللہ وسایا، نینا اور گڈو بھی ساتھ تھے۔ جنج کئی روز پکھیالہ میں ٹھیری۔ ستمبر کا مہینہ تھا۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ ورکھا ختم ہو چکی تھی۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ خریف کی فصلیں سمجھو تیار ہی کھڑی تھیں۔ کپاس کے کھیتوں میں سفید سفید تونبے پھوٹنے لگے تھے۔ ایک روز میں نینا کی انگلی تھامے ٹہلتی ہوئی پنڈ کی ایک گلی میں چلی گئی۔"

"یہ پکھیالہ کہاں ہوا جی؟"

"پکھیالہ، ضلع شیخوپورہ کی تحصیل فیروز والا میں ہے۔ اچھا وڈا موضع ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ گلی سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا ایک زنانی دونوں ہاتھوں میں گوبر اٹھا اٹھا کر دیوار پر پاتھیاں تھاپ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سدھے ہوئے تھے اور تیز تیز چل رہے تھے۔ دیوار پر تھپ تھپ پاتھیاں بنتی جا رہی تھیں۔ گوبر کے ڈھیر کے پاس دو گندے اور مریل سے بالک بیٹھے تھے۔ ان کے کپڑے میلے کچیلے تھے۔ وہ ٹانگوں سے بالکل ننگے تھے۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ لمحہ بھر کے لیے رکی۔

"مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ اس میں مجھے چترا کی جھلک نظر آئی۔ پر مجھے اپنی آنکھوں پر وشواس نہ آیا۔ اسے اچنبھے سے دیکھتی دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔ وہ بالکل بے خبر، اپنی دھن میں مگن پاتھیوں کی تھپائی میں لگی تھی۔"

"دیکھنے میں کیسی نظر آتی تھی؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"وہ بالکل بدل چکی تھی۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اس کے گندے اور الجھے ہوئے بال بار بار بکھر کر منہ پر پھیل جاتے اور وہ ہاتھوں کو چلاتے ہوئے بار بار ایک خاص انداز سے گردن جھٹک کر بالوں کو پیچھے لے جاتی۔ یہ انداز چترا کپور ہی کا تھا۔ میں اس کے نزدیک پہنچ گئی۔ غور سے دیکھا تو وہ چترا ہی تھی۔ نہ اب اس کا پہلا سا رنگ روپ رہا تھا نہ سندرتا ہی رہی تھی۔ کالی کالی جگمگ جگمگ کرتی آنکھیں بجھ کر دھندلی پڑ گئی تھیں۔ کپڑے لتے پھٹے پرانے تھے۔ ان پر گوبر اور کیچڑ کے جگہ جگہ داغ دھبے تھے۔ اس کے بدن سے جو کبھی چنبیلی کی سندر کلیوں کی مانند لہکتا تھا، مہکتا تھا، اس سے گوبر اور پسینے کی تیز بو کے بھبکے اٹھتے تھے۔ صورت سے وہ ادھیڑ اور بیمار لگتی تھی۔ میں دکھ اور خوف سے کپکپا کے رہ گئی۔"

"کیا وہ سچ مچ چترا کپور ہی تھی؟" رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں جمیلہ سے دریافت کیا۔

"ہاں وہی تھی۔" جمیلہ نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "پر اب وہ چترا سے سکینہ بن چکی تھی۔ میں نے پاس جا کر پوچھا، تو چترا کپور ہے نا؟ اس نے چونک کر میری اور دیکھا۔ پر کچھ نہ بولی۔ اس کی آنکھوں میں گھڑی بھر کے لیے دیوے جگمگائے اور بجھ گئے۔ میں نے غور کیا، اس کے ہاتھوں کی لمبی لمبی اور کومل انگلیاں بھدی اور کھردری پڑ گئی تھیں۔ اسے ان کی ذرا چنتا نہیں تھی۔ اسے تو اپنی بھی کوئی چنتا نہ تھی۔ وہ مڑی اور اس کی انگلیاں ہاتھوں کے ساتھ ساتھ تیزی سے چلنے لگیں۔ وہ برابر تھپائی کرتی رہی۔"

"اس نے تجھے پہچان لیا تھا؟"

"ہاں، اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ پر مجھے مل کر وہ ذرا خوش نہ ہوئی۔ اس کے اجڑے ہوئے چہرے پر بکھری ہوئی جھنجلاہٹ اور نفرت صاف نظر آ رہی تھی۔ ہونٹ اس طرح سکڑ گئے تھے مانو کڑوے پڑ گئے ہوں۔ وہ پیٹھ موڑے جھک جھک کر گوبر اٹھا رہی تھی۔"

"تو نے اس سے گل بات نہیں کی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"کی تھی۔" جمیلہ نے بتایا۔ "میں نے اپنی آواز میں نرمی اور مٹھاس پیدا کرتے ہوئے اس سے کہا۔ چترا رانی! میں اسے پیار سے چترا رانی ہی کہتی تھی۔ وہ تب بھی خوش نہ ہوئی۔ بگڑ کر بولی۔ کون چترا، کیسی چترا؟ میں کسی چترا شترا کو نہیں جانتی۔ میرا نام سکینہ ہے۔ میں نے اس کے ناراض ہونے کا ذرا برا نہ منایا۔ خاموش کھڑی رہی۔"

"بس اتنی ہی گل بات ہوئی؟"

"نہیں! میں نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد آہستہ سے پوچھا۔ یہ تجھے کیا ہو گیا۔ تیری اندر کی

آرٹسٹ اور اس کا آرٹ کہاں چلا گیا؟ اس نے میری طرف دیکھے بنا گوبر کی تھاپی دیوار پر مارتے ہوئے جواب دیا۔ یہ آرٹ دیکھ رہی ہے؟ اس نے دیوار پر تھپی ہوئی پاتھیوں کی سمت اشارہ کیا۔ یہ بھی تو آرٹ ہی ہے نا۔ دیوار کو کینوس سمجھ لے۔ اور پاتھیوں کو گل بوٹے۔ دیکھ کیسا شاندار لینڈ سکیپ بن گیا۔ وہ پلٹی، مجھے تیز اور تیکھی نگاہوں سے دیکھا اور گوبر کے ڈھیر کے پاس بیٹھے ہوئے بالکوں کی اور ایک ہاتھ اٹھا کر بتایا، یہ میرے آرٹ کے زندہ شاہکار ہیں۔ وہ ٹھٹھا مار کر پاگلوں کی طرح ہنسی۔ تجھے میرا یہ آرٹ پسند آیا؟ اس نے گوبر پر تیزی سے ہاتھ مارا۔ گوبر کے ڈھیر پر بیٹھی ہوئی مکھیاں اڑیں اور بھنبھناتی ہوئی ادھر ادھر بکھر گئیں۔ میں ہاتھ ہلا کر انھیں منہ پر سے اڑانے لگی پر چترا نے ان پر کوئی دھیان نہ دیا۔ وہ آرام سے دیوار پر پاتھیاں تھوپتی رہی۔ وہ بیمار اور مریل دکھائی دینے کے ساتھ ساتھ پگلی بھی لگ رہی تھی۔ عجیب بہکی بہکی باتیں کرتی تھی۔"

"اسے واپس لینے کوئی نہ آیا؟ اس کا بھی کوئی نہ کوئی تو ہوگا۔"

"پتہ نہیں۔ نہ میں نے اس بارے میں پوچھا نہ اس نے بتایا۔ اس کے ساتھ زیادہ بات چیت کا موکع ہی نہ ملا۔" جمیلہ نے وضاحت کی۔ "میرے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد گھر کا دروازہ کھلا۔ اندر سے ایک بوڑھی بڑبڑاتی ہوئی نکلی اور چترا کو چیخ چیخ کر کوسنے لگی۔"

"وہ اس سے اتنی ناراض کیوں تھی۔ کوئی تو وجہ ہوگی؟"

"وہ اس لیے اتنے غصے میں تھی کہ چترا نے پاتھیاں تھوپنے میں دیر لگا دی تھی اور گھر والے کے لیے کھیت پر بھتّا نہ پہنچا سکی تھی۔ بوڑھی اصل میں چترا کی ساس تھی۔ بہت کڑوی اور کٹھور لگتی تھی۔"

"چترا نے اس کے رولا گولا کرنے پر کچھ نہ کہا؟"

"نہیں، وہ خاموشی سے دیوار پر پاتھیاں تھوپتی رہی۔ اس کے ہاتھ اور تیزی سے چلنے لگے۔ بوڑھی کھڑی چیخ ہی رہی تھی کہ گلی میں ایک ادھکڑ بندا داخل ہوا۔ اس نے چترا کو دیکھتے ہی ننگی ننگی گالاں نکالنی شروع کر دیں۔ وہ سخت غصے میں تھا۔"

"چترا کا گھر والا ہوگا۔" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

"ہاں جی، وہ اس کا گھر والا ہی تھا۔ وہ چھوٹے کد کا بھدا اور بے ڈول بندہ تھا۔ یہ لمبے لمبے تو اس کے دانت تھے۔ پیلے پیلے اور گندے۔" جمیلہ نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "ساس اونچی آواز سے کوستی رہی۔ چترا ساس کے کوسنے اور گھر والے کی گالیاں آرام سے سنتی رہی۔ زبان سے کچھ نہ بولی۔ پر اس شور شرابے سے گھبرا کر اس کے دونوں بالک منہ پھاڑ کر زور زور سے رونے لگے۔ چترا

جلی ہوئی تو پہلے ہی تھی۔ بالکوں کے رونے پر اور جھلا گئی۔ تیزی سے ایک پر جھپٹی اور اس کی پٹائی شروع کر دی۔ وہ بلبلا کر زیادہ زور سے رونے لگا۔ یہ دیکھ کر چترا کا گھر والا اور بھڑک اٹھا۔ وہ گالاں نکالتا ہوا اس کی اور تیزی سے بڑھا۔ اسے بالوں سے پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ وہ دور جا کر گری۔ سنبھلنے بھی نہ پائی تھی، گھر والا اس کے سر پر پہنچ گیا اور لگا لاتیں اور ٹھڈے مارنے۔ چترا کی دھوتی پلٹ گئی۔ ٹانگیں ننگی ہو گئیں۔ تب بھی وہ چپ کر کے پڑی رہی۔ نہ روئی، نہ چیخی۔ آنکھیں کھولے گھر والے کو گھورتی رہی۔" جمیلہ نے گہری سانس بھری۔ "لگتا تھا لاج کے ساتھ ساتھ اس کے اندر کی نار بھی مر گئی تھی۔"

"تو بھی چپ کھڑی رہی۔ کچھ نہ بولی؟" رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں تبصرہ کیا۔

جمیلہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے گویا ہوئی۔ "اس کا گھر والا مارتے مارتے تھک گیا۔ ہانپنے لگا اور چپ کر کے کھڑا ہو گیا۔ چترا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے پونچھا بھی نہیں۔ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کا گھر والا آنکھیں نکال کر چیخا۔ اٹھ اندر چل، پر نہ وہ اٹھی اور نہ ہی زبان سے کچھ کہا۔ جیسے بیٹھی تھی ویسے ہی بیٹھی رہی۔ اس بار گھر والے نے چترا کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا۔ دروازے کی اور بڑھا۔ میں اب چپ نہ رہ سکی۔ اس کے سامنے گئی۔ اسے غیرت دلائی۔ غصے سے کہا، تیں نوں ایک کمزور زنانی پر ایسے ظلم کرتے شرم نہیں آتی۔ تو کیسا بندہ ہے؟ اس نے پلٹ کر مجھے لال لال آنکھوں سے گھورا۔"

"تجھ پر بھی وہ ناراض ہوا ہوگا۔"

"بالکل ناراض ہوا۔ غصے سے بولا۔ تو ہمارے بیچ میں بولنے والی کون ہوتی ہے؟ یہ میرا اور میری گھر والی کا معاملہ ہے۔ چل اپنا رستہ پکڑ۔ وہ چترا کو بالوں سے فیر گھسیٹنے لگا۔ میں کچھ بولنے ہی والی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی۔ کیہہ گل اے جی لے؟ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے اللہ وسایا کھڑا ہے۔ وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا۔ میں نے چترا کی اور اشارہ کیا۔ یہ چترا کپور ہے۔ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ فیر میں نے گنّے کی اور ہاتھ اٹھا کر کہا۔ یہ اس کا گھر والا لگتا ہے۔ چترا کو مارتا تھا۔ میں نے روکا تو میرے گلے پڑ گیا۔ مجھے اس سے بہت غصہ تھا۔"

"تیری باتیں سن کر اللہ وسایا کیا بولا؟" رحیم داد نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"وہ چپ رہا۔ پر چترا کا گھر والا تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ ہاں، میں نے اسے مارا ہے۔ ابھی اور ماروں گا۔ یہ کہہ کر اس نے بالوں سے پکڑ کر چترا کو اٹھایا اور اس کے منہ پر زور زور سے چپیڑ، مارنے لگا۔ اللہ وسایا نے اسے روکا۔ بس کر۔ وہ ناراض ہو کر اللہ وسایا پر چیخا۔ اوئے تو کون ہے؟

تیں نوں کیہ لینا؟ تو تھانے دار لگا ہے؟ اس نے اور زور سے چتڑا کے گال پر ایک چپڑ مارا۔ جمیلہ کا لہجہ تیکھا ہوگیا۔

"اللہ وسایا ایک دم ویسا ہی بن گیا' جیسے میں نے برسوں پہلے اسے ولیا کے گھر میں دیکھا تھا۔ بہت عرصے بعد وہ مجھے اتنا غصے میں نظر آیا۔ زور سے چیخا۔ بکواس بند کر۔ ساتھ ہی تیزی سے چھڑا گئے کی کمر پر اس زور سے لات ماری' وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ پر اللہ وسایا کا غصہ کم نہ ہوا۔ وہ نزدیک پہنچا اور اسے گردن سے پکڑ کر اوپر اٹھالیا۔ وہ اس کے ہاتھ میں جھولنے لگا۔ اس کی آنکھیں ابل پڑیں۔ منہ پھاڑ کر ہائے ہائے کرنے لگا۔"

"لگتا ہے اللہ وسایا کو بہت ہی زیادہ غصہ آگیا تھا۔"

"ہاں' وہ بہت غصے میں تھا۔ چتڑا پہلے تو چپ کر کے کھڑی رہی فیر گڑگڑا کر اللہ وسایا کی منت کرنے لگی' اسے چھوڑ دے۔ اللہ وسایا نے اسے چھوڑ دیا۔ چتڑا بہت سہمی ہوئی تھی۔ اس کا گھر والا منہ پھاڑ کر زور زور سے سانس بھر رہا تھا۔ چتڑا کی بوڑھی ساس نے چیخ چیخ کر سارا پنڈ اکٹھا کرلیا۔ نمبردار بھی آگیا۔"

رحیم داد نے پوچھا۔ "نمبردار کیا بولا؟"

"اس نے بھی چتڑا کے گھر والے کو شرم دلائی۔ ناراض بھی ہوا۔ اللہ وسایا کو سمجھا بجھا کر اپنی حویلی میں لے گیا۔ رستے میں اس نے بتایا' چتڑا کے گھر والے کا نام کرم دین ہے۔ وہ معمولی زمیں دار تھا۔ اس کے پاس ۷ اکلا خود کاشت زمین تھی۔ اس نے چتڑا کو جو پہلے ہی سکینہ بن چکی تھی' ایک کانسٹیبل کے ذریعے چھے سو روپے میں خریدا تھا۔ وہ پہلے ایک جواری کے پاس تھی۔ وہ شیخوپورہ میں جوئے کا اڈہ چلاتا تھا۔ چرسیا بھی تھا۔ اس نے چتڑا کو بھی اپنے رستے پر لگا دیا تھا۔ وہ چرس اور گانجا پینے لگی تھی۔ جواریوں کی سنگت میں کنجریوں کا سا جیون گزارتی تھی۔ فیر ایسا ہوا اس کا جواری گھر والا جوا خانہ چلانے کے جرم میں پکڑا گیا۔ اسے جیل ہوگئی۔ چتڑا بالکل اکیلی رہ گئی اور ایک کانسٹیبل کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس نے رکھیل بنا کر اپنے پاس رکھا۔ جب اس کا جی چتڑا کی طرف سے بھر گیا تو اس نے کرم دین کے ہاتھ اسے بیچ دیا۔"

"تجھے جب وہ ملی تب بھی چرس پیتی تھی؟"

"مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں۔" جمیلہ نے بے نیازی سے کہا۔ "نمبردار سے نہ میں نے پوچھا اور نہ ہی اس بارے میں اس نے بتایا۔ پر میرا وچار ہے ان دنوں وہ چرس شرس نہیں پیتی تھی۔ ملتی ہی نہ ہوگی۔ کرم دین ظالم اور کٹھور ہونے کے ساتھ ساتھ چتڑا کی کڑی نگرانی بھی کرتا تھا۔ نمبردار کہ

بتاتا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا' چتڑا کو بخار رہتا ہے۔ منہ سے خون آتا ہے۔ اسے ٹی۔ بی ہوگئی تھی۔"

رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ وہ چتڑا کے بارے میں جمیلہ سے مزید بات چیت کرنا چاہتا تھا اسی اثناء میں احمد ٹرے میں چائے لے کر آگیا۔ چائے کے ساتھ سوجی کا گرم گرم حلوہ بھی تھا۔ احمد نے چائے کی پالیاں اور حلوے کی پلیٹیں جمیلہ اور رحیم داد کے سامنے میز پر رکھ دیں۔

جمیلہ نے احمد سے پوچھا۔ "تو اب تک کدھر رہا؟"

"میں تو جی باہر دروازے پر دیر سے بیٹھا ہوں۔" احمد نے جواب دیا۔

جمیلہ مسکرا کر خاموش ہوگئی۔ احمد فوراً ہی واپس چلا گیا۔

رحیم داد نے حلوہ کھاتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "زمین دارنی تو نے بہت دردناک بات سنائی۔"

"ایسی تو ان گنت دردناک اور دکھ بھری کہانیاں ہیں۔" جمیلہ کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔ "ہر مغویہ اپنی جگہ ایک دکھ بھری کہانی ہے۔"

"چتڑا سے تیرا دوبارہ ملنا نہیں ہوا؟" رحیم داد نے پوچھا۔ ابھی تک اس کے ذہن پر چتڑا چھائی ہوئی تھی۔

"نہیں! وہ مجھے بعد میں کبھی نہیں ملی۔ میں دوبارہ پکھیالہ نہیں گئی۔ کسی سے اس کے بارے میں بات بھی نہیں ہوئی۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "جانے اب تک زندہ بھی ہے کہ مرگئی۔"

☆

یکایک بادل زور سے گرجے۔ بارش تیز ہوگئی۔ کمرے میں خاموشی پھیلی تھی۔ دونوں ہی خاموش تھے اور اپنی اپنی جگہ سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ رحیم داد نے چائے کی پیالی ختم کی۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ہچکچاتے ہوئے جمیلہ سے پوچھا۔ "زمیں دارنی' تیری باتوں سے لگتا ہے۔ تیں نوں اللہ وسایا سے پیار نہ تھا۔ تو اس سے پیار کرنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ حالات ہی ایسے ہوگئے تھے۔ میں نے غلط تو نہیں سوچا؟" رحیم داد نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ مگر وہ منہ موڑے دیوار کی سمت دیکھ رہی تھی۔

"تو نے اپنے تئیں ٹھیک ہی سوچا۔" جمیلہ نے چند لمحے خاموشی اختیار کرنے کے بعد جواب دیا۔ "اور یہ بھی ٹھیک ہے مجھے اللہ وسایا سے ویسا پیار نہ تھا جیسا ویرندر سے تھا۔ یہ بات اللہ وسایا بھی

پوری طرح جانتا تھا۔ پر اس نے اتنا بہت سا پیار دیا کہ اگر وہ مجھے اتنا پیار نہ دیتا تو جانے کب کی مر کھپ چکی ہوتی۔ اس نے اپنے پیار سے میرا من جیت لیا۔"

"اس کا نصیب بھی تو چنگا تھا' تیری ایسی سوہنی اور بھاگ بھری گھر والی ملی جس نے مزارعے سے وڈا زمیں دار بنا دیا۔" رحیم داد نے جمیلہ کی خوش نودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

مگر وہ متاثر نہ ہوئی۔ بے نیازی سے بولی۔ "چوہدری! تجھے پتہ نہیں' شروع شروع میں تو مجھے اپنے سے گھن آتی تھی۔ جی چاہتا تھا موت آجائے۔ ان دنوں تو میں کئی کئی روز بے حال پڑی رہتی۔ نہ نہاتی' نہ کپڑے بدلتی' نہ روٹی کھانے کو جی کرتا نہ بات کرنے کو۔ پر اللہ وسایا نے کبھی برا نہ منایا۔ جو میں نے کہا' اس نے وہی کیا۔ وہ مجھے خوش دیکھتا تو خوش ہو جاتا۔ نراش پاتا تو خود بھی نراش ہو جاتا۔"

"تو بھی تو اس کی ہر بات مانتی تھی۔ اس کے لیے تو نے اپنے بھائی اور چاچا کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے' پر اللہ وسایا نے اپنی بات منوانے کے لیے کبھی ضد نہ کی۔ زمیں دار بن کر بھی وہ کبھی زمیں دار نہ بنا۔ جیون بھر اپنے تئیں مزارع اور مجھے اپنے زمیں دار کی پتری سمجھتا رہا۔ بلکہ مجھے ہی زمیں دار سمجھتا رہا۔ میں نے بہت چاہا' پر وہ زمیں دار نہ بنا۔ بہت لاڈ آتا تو مجھے زمیں دارنی کہہ کر پکارتا۔ یہی اس کا پیار تھا۔" جمیلہ کو اللہ وسایا کی خوبیاں بیان کرنے میں لذت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ روانی سے بولتی رہی۔ "ایسا پیار کرتا تھا' مجھے پریشان یا بیمار دیکھتا تو گھبرا جاتا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"تجھے شاید پتہ نہیں' آخری بار جب وہ مجھ سے بدا ہوا تو مجھے تیز بخار تھا۔ سرہانے بیٹھ کر دیر تک میرا سر دباتا رہا۔ فیر یہ کہہ کر چلنے کے لیے کھڑا ہو گیا' جی لے! میں تیرے لیے ڈاکٹر بلا کر لاتا ہوں۔ میں نے روکا بھی۔ پر وہ نہ رکا۔ ایسا گیا کہ لاش ہی واپس آئی۔"

جمیلہ کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ آنکھیں چھلک پڑیں۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ باہر مینہ کی بوندیں جل ترنگ بجاتی رہیں۔ ہوا چلتی تو ایسا محسوس ہوتا سسکیاں بھر رہی ہے۔ بادل رک رک کر گرجتے بارش تیز اور تیز ہوتی گئی۔

رحیم داد نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "اس طرح کب تک روتی رہے گی۔" اس نے لمبی سانس بھری۔ "اللہ کی یہی مرضی تھی' جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب تو اگے کی سوچ۔"

"کیا سوچوں۔ میرا تو مغز بھی کام نہیں کرتا۔"

رحیم داد ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ جمیلہ سر جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد نے اس عالم میں دیکھا تو ٹوہ لگانے کی غرض سے دریافت کیا۔ "کیا سوچ رہی ہے؟"

جمیلہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

رحیم داد نے چند لمحے چپ رہنے کے بعد اٹکتے ہوئے کہا۔ "ایک بات پوچھوں۔ برا تو نہیں منائے گی؟"

"کیا کہنا چاہتا ہے؟" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

رحیم داد نے اس کے لہجے کی کاٹ محسوس کی۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ جو کہنا چاہتا تھا' کہہ نہ سکا۔ اتنی جرات ہی نہ ہوئی۔ صرف اتنا کہا۔ "تو نے اللہ وسایا کے قتل کے بارے میں اب تک کچھ نہیں کیا۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں؟ حویلی کی چار دیواری سے باہر بھی نہیں نکل سکتی۔" جمیلہ نے اپنی مجبوری بیان کرنے کے ساتھ ساتھ شکوہ بھی کیا۔ "پر چوہدری' تو نے اس بارے میں کیا کیا؟"

رحیم داد خفیف ہو کر صفائی پیش کرنے لگا۔ "تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ پر تیں نوں یہ بھی پتہ ہے میں تو ادھر کسی کو جانتا بھی نہیں۔ نہ میرا کبھی قتل شل کے کسی کیس سے کوئی واسطہ پڑا۔ وکیل جب بھی آیا میں نے اس سے گل بات کی۔ پولیس کی تفتیش کے بارے میں پوچھا۔ تھانے دار کو میں بالکل نہیں جانتا۔ تیں نوں پتہ ہی ہے کبھی اس سے ملا ہی نہیں۔ تو کہہ تو وکیل کے پاس چلا جاؤں۔ اس کے ساتھ تھانے دار سے مل کر پتہ کروں اس نے اب تک کیا کیا؟ کوئی گرفتاری شرفتاری بھی کی کہ نہیں؟"

"میں نے تو ویسے ہی ایک بات کہی تھی۔" جمیلہ نے اس کی صفائی سے متاثر ہو کر کہا۔ "مجھے پتہ ہے تیری ادھر کسی سے جان پہچان نہیں۔ ایسے میں تو کیا کر سکتا ہے؟" اس کا لہجہ دل گرفتہ ہو گیا۔ "ویسے اب کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ جس تھانے دار نے کیس میں دلچسپی لی اور تفتیش کا کام آگے بڑھایا' اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔ دوسرے نے کیس دبا دیا۔ تفتیش ختم کر دی۔ اسے لگایا ہی اس لیے گیا تھا۔"

"وکیل نے مجھے یہ باتیں بتائی تھیں۔ وہ بھی پریشان تھا۔" رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔ "وہ بتاتا تھا' تفتیش کے لیے جو نیا تھانے دار لگایا گیا ہے' اس نے قتل کا الزام تیرے بھائیوں اور

شریکوں پر لگایا ہے۔"

"تفتیش ختم کرنے اور کیس داخل دفتر کرنے کے لیے وہ یہی کر سکتا تھا۔" جمیلہ نے گہری سانس بھری۔ "یہ اصلی ملزموں کو چھپانے کی کوشش ہے۔ اسی لیے پہلے ہی سے ایسی افواہیں پھیلا دی گئیں تھیں۔ میرے بھائی آخر اللہ وسایا کا قتل کیوں کرتے؟ اس نے مجھے ان کے ساتھ جانے سے کب روکا؟ تجھے پتہ ہے میں خود ہی نہیں گئی۔"

"اوپر درخواست نہیں لگائی جاسکتی؟" رحیم داد نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔

"اوپر درخواست لگانے سے بھی کیا ہوگا۔ درخواست بھی دبا دی جائے گی۔"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" رحیم داد نے مزید زور نہ دیا۔ وہ چاہتا بھی یہی تھا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا' اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اللہ وسایا کے قاتل کبھی نہیں پکڑے جائیں گے۔"

"نظر تو یہی آرہا ہے۔ لگتا ہے اللہ وسایا کو پہلے سے سوچی سمجھی سکیم کے تحت قتل کیا گیا۔ وکیل کا بھی یہی وچار ہے۔" جمیلہ کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈا۔ وہ منہ پھیر کر چادر کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔

رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "بہت ظلم ہوا جی۔"

جمیلہ نے کچھ نہ کہا۔

رحیم داد چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے لہجے میں اور نرمی پیدا کی۔ "پر تو اس طرح کب تک اللہ وسایا کے لیے روتی رہے گی؟"

"جب تک آنکھوں میں رونے کے لیے آنسو ہیں۔" جمیلہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

رحیم داد ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ بارش اب تھم گئی تھی مگر ہوا تیز تھی۔ رحیم داد نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ رسان سے بولا۔ "اب آگے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔"

"کیا سوچوں۔ کچھ سمجھ نہیں آتی۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہی پڑے گا۔ تیرے دونوں بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں۔" رحیم داد آہستہ سے بولا۔ "تو ابھی جوان ہے۔ ایسے کس طرح کام چلے گا۔"

"تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ میں تیری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔" اس کا لہجہ تیکھا تھا۔

رحیم داد نے اس کے لہجے کی تیزی اور کاٹ محسوس کی۔ مگر اس نے خاموشی اختیار کرنے کے بجائے جرات سے کام لیا۔ بہت سنبھلے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں یہ کہنا چاہتا ہوں جس طرح تو ویرندر کو بھول گئی' تجھے اللہ وسایا کو بھی اسی طرح بھولنا ہوگا۔ حوصلے سے کام لے۔ تو بہت حوصلے والی ہے۔ پہلے تجھ پر کم ظلم نہیں ہوا۔ پر تو نے اسے جھیل لیا۔ بھول بھی گئی۔" رحیم داد کے لہجہ میں خوشامد کا پہلو نمایاں تھا۔ "تیرا دل بہت وڈا ہے۔ تو' تو یہ بھی بھول گئی کہ کبھی تو پاروتی ہوتی تھی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"نہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" جمیلہ کے رویئے سے اندازہ ہوتا تھا' رحیم داد کی باتوں نے اسے متاثر کیا تھا۔

"تیری طرح مجھ پر بھی ظلم ہوا۔ سب کچھ تباہ ہوگیا۔ بال بچے' گھربار' کچھ بھی نہ رہا۔ فیر بھی زندہ ہوں۔" اس نے جمیلہ کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی' آواز میں رقّت پیدا کی۔ "کیا کیا جائے جب زندگی ملی ہے تو زندہ رہنا ہی پڑتا ہے۔ پر میرا جو دکھ ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "تو میرے دکھ کو سمجھ سکتی ہے تو بھی تو ایسے ہی دکھوں کی ماری ہوئی ہے۔"

"ہاں چوہدری! تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔" جمیلہ کے رویئے سے ہمدردی کا پہلو عیاں تھا۔ رحیم داد کی حوصلہ افزائی ہوئی تو اس نے کھل کر کسی قدر اپنا مدعا بیان کرنے کی کوشش کی۔ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"تو چاہے تو ہم دونوں ایک دوسرے کا دکھ بانٹ سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے۔"

جمیلہ نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ اسے آگے نہ بولنے دیا۔ "میں تیرا مطلب سمجھتی ہوں۔"

اس کا لہجہ تیز اور تیکھا تھا۔ مگر رحیم داد خاموش نہ رہا۔ لہجے میں زیادہ نرمی اور حلاوت پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "اس میں ہم دونوں کا بھلا ہے۔ پوری زمیں داری بھی اپنے پاس رہے گی۔ اسے پھیلانے اور بڑھانے میں دونوں مل جل کر کام کریں گے۔ تو پہلے ہی کی طرح پورے پنڈ کی زمیں دارنی رہے گی۔ ہر کام تیری مرضی سے ہوگا۔"

جمیلہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ آنکھوں سے آنسو ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر گرنے لگے۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ وہ جمیلہ کا رد عمل جاننا چاہتا تھا۔ مگر وہ نہ بولی۔ رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "میں نوں اب چلنا ہے۔" وہ آگے بڑھا' ٹھٹکا۔ مڑ کر جمیلہ جی جانب دیکھا۔ آہستہ سے بولا۔

"میں نے جو گل کی ہے' اس پر آرام نال سوچ لے۔ ابھی سوچنے کے لیے بہت وکت پڑا ہے۔ مجھے جلدی بھی نہیں۔ پر یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں' میں نے یہ بات بہت سوچ بچار کر اور اپنے اور تیرے فائدے کو سامنے رکھ کر کی ہے۔"

جمیلہ نے کچھ نہ کہا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر چہرے پر رکھ لیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رحیم داد دروازے کی سمت بڑھا۔ اسے اپنے عقب میں جمیلہ کی سسکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

☆

رحیم داد کمرے سے نکل کر دالان میں پہنچا۔ صحن میں پانی تھا۔ کیچڑ تھی۔ بارش رکی ہوئی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ رحیم داد سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا مہمان خانے میں پہنچ گیا۔ وہ برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

اندھیرا گہرا ہوتا گیا۔ برسات کی بھیگی ہوئی شام نے تاریکی کا ڈیرا ڈال دیا تھا۔ احمد نے لیمپ روشن کر دیا اور رحیم داد کے پاس خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ اس نے احمد کی جانب مطلق توجہ نہ دی۔ احمد آہستہ سے صحن میں اترا اور حویلی میں چلا گیا۔

رحیم داد خاموش بیٹھا ان باتوں پر غور کرتا رہا جو اس نے کچھ دیر پہلے جمیلہ سے کہی تھیں۔ وہ پہلے سے کوئی منصوبہ بنا کر نہیں گیا تھا۔ گفتگو کچھ اس ڈھب سے چلی کہ دل کی بات زبان تک آگئی۔ اب رہ رہ کر یہ خیال پریشان کر رہا تھا' اس نے جلد بازی سے کام لیا۔ نہ جانے جمیلہ نے اس کے بارے میں کیا سوچا؟ اس نے جمیلہ کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھے تھے اور اس کی سسکیاں بھی سنی تھیں۔

اس کے ذہن میں کھلبلی مچی تھی۔ الجھن اور خلفشار سے گھبرا کر وہ کھڑا ہو گیا اور برآمدے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ احمد واپس آیا۔ اس نے کمرے میں میز پر کھانا چن دیا۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے رحیم داد سے کہا۔

"چوہدری' روٹی کھا لے۔"

رحیم داد نے ہاتھ دھوئے اور کمرے میں جا کر چپ چاپ کھانا کھانے لگا۔ احمد دہلیز کے پاس فرش پر بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے کھانا کھاتے کھاتے نظریں اٹھا کر احمد کو دیکھا۔ آہستہ سے پوچھا۔

"آج حویلی میں کچھ زیادہ ہی سناٹا لگ رہا ہے۔"

"ہاں جی' اب تو حویلی میں سناٹا ہی رہتا ہے۔" احمد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "زمیں دار اللہ وسایا کے بعد تو حویلی بالکل اجڑ گئی۔" اس نے مڑ کر حویلی کی جانب دیکھا۔ "دیکھ کیسی ویرانی برس رہی ہے۔"

"برسات میں رات کو ویسے بھی سناٹا کچھ زیادہ ہی لگتا ہے۔" رحیم داد نے بے نیازی سے کہا۔

"کچھ یہ بات بھی ہے۔" احمد نے اس کی تائید کی۔

رحیم داد اپنی بے چینی پر زیادہ دیر قابو نہ رکھ سکا۔ دبی زبان سے پوچھا۔ "زمیں دارنی کا کیا حال احوال ہے؟"

"اس کا حال احوال کیا ہوتا ہے جی۔" احمد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "وہ تو جی گپ چپ رہتی ہے یا روتی رہتی ہے۔" اس نے رحیم داد کی جانب نظریں اٹھا کر غور سے دیکھا۔ "تجھ سے تو آج دیر تک باتیں کرتی رہی۔"

"ابھی تک کمرے میں بیٹھی ہے؟"

"نا جی' وہ تو تیرے جانے کے بعد ہی اٹھ گئی تھی۔"

رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ "اب کیا کر رہی ہے؟"

"میں تو جی اس کے پاس گیا نہیں۔ تاراں روٹی لے کر گئی تھی۔ کہتی تھی اس نے روٹی بھی نہیں کھائی' نہ بات کی۔ وہ تو چادر سے منہ ڈھانکے رو رہی تھی۔ تاراں دیر تک بیٹھی رہی۔ پر اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔"

رحیم داد گھبرا گیا۔ اس نے گلاس اٹھا کر پانی پیا اور مونچھوں اور ڈاڑھی پر سے پانی کے قطرے پونچھتے ہوئے بولا۔ "مجھ سے بھی بات کرتے کرتے کئی بار روئی۔"

اسی اثنا میں تاراں آگئی۔ اس نے تیکھی نظروں سے احمد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔ مگر اس نے احمد سے کچھ نہ کہا۔ رحیم داد سے مخاطب ہوئی۔

"یہ مجھے بہت تنگ کرتا ہے جی۔"

رحیم داد نے احمد کو ڈانٹا۔ "تو اسے کیوں تنگ کرتا ہے؟"

"میں نے تو جی کچھ نہیں کیا۔ یہ تو ایسے ہی میرے گلے پڑ جاتی ہے۔" احمد مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

"بتاؤں تو کیا کرتا ہے؟" تاراں نے دھمکی دی۔

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "تو زمیں دارنی کے پاس سے آ رہی ہے نا۔ کیسی طبیعت ہے اس کی؟"

"تیرے جانے کے بعد کمرے سے نکلی تو رو رہی تھی۔ اب تک اس کے آنسو نہیں تھمے۔ آج تو بہت زیادہ اداس لگتی ہے۔"

رحیم داد تو خاموش رہا۔ مگر احمد بول پڑا۔ "جب سے زمیں دار کی موت ہوئی ہے تب سے اس کے آنسو ہی کہاں رکے ہیں۔ جب دیکھو روتی ہی رہتی ہے۔"

"بات تو یہی ہے۔" تاراں نے اتفاق رائے کیا۔ "دونوں میں بہت پیار تھا۔ وہ بھی تو زمیں دارنی کو کتنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ڈاکٹر لانے ہی تو نکلا تھا' نہ جانے کس نے اسے کتل کر دیا۔"

رحیم داد کھانے سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس نے دونوں کو مزید بات چیت کا موقع نہ دیا۔ احمد سے مخاطب ہو کر کہا۔ "حمدے! برتن اٹھا اور واپسی میں دیر نہ کرنا۔"

احمد نے برتن اٹھائے اور تاراں کے ساتھ چلا گیا۔ رحیم داد کمرے سے نکل کر برآمدے میں پہنچا۔ صحن میں ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ باہر نہ جا سکا۔ برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر پھر بیٹھ گیا۔

وہ اس وقت بھی جمیلہ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے پہلے ہی خدشہ تھا' جمیلہ نے اس کی بات پسند نہیں کی۔ اسے شدید صدمہ پہنچا تھا۔ تاراں کی باتوں سے نہ صرف اس کی تصدیق ہو گئی تھی بلکہ اس کے اندیشے اور وسوسے سوا ہو گئے۔ وہ اپنی جلد بازی پر پشیماں تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا' اس نے جو بے موقع قدم اٹھایا ہے اس کی تلافی کس طرح کرے؟ جمیلہ کے دل سے کدورت کیوں کر اور کیسے رفع کرے؟

وہ بستر پر لیٹ کر بھی اسی مسئلہ پر غور کرتا رہا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے طے کیا کہ جمیلہ سے جلد سے جلد ملنے کی کوشش کرے گا۔ معذرت کرے گا اور ایسا رویّہ اختیار کرے گا' کہ جمیلہ کی خفگی اور آزردگی کسی نہ کسی طرح دور ہو جائے۔

صبح اٹھ کر اس نے احمد کے ذریعے جمیلہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مگر وہ شام تک واپس نہ آیا۔ دوپہر کا کھانا حویلی کا ایک اور نوکر لے کر آیا۔

رحیم داد نے اس سے احمد کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ وہ احمد کا انتظار کرتا رہا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد احمد آیا۔

رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں پوچھا۔ "حمدے! تو دن بھر کہاں رہا؟"

"مجھے جی' زمیں دارنی نے ایک ضروری کام سے پڑوس کے چک بھیجا تھا۔"

"تو نے زمیں دارنی سے میرے بارے میں بات کی تھی؟" رحیم داد کے انداز سے بے چینی جھلک رہی تھی۔

"تو نے جو کہا تھا وہ میں نے اسے کہہ دیا۔ پر وہ کچھ نہ بولی۔ چپ کر کے بیٹھی رہی۔"

"لگتا ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" رحیم داد نے بات بنائی۔ "میں بھی اس کی طبیعت ہی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ کل شام تاراں کی باتیں سن کر میں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔"

"ہاں جی اس کی طبیعت گڑبڑ ہی لگتی ہے۔"

"تو میری طرف سے اس کی طبیعت پوچھنا۔ کہنا میں نے زمیں داری کے بارے میں کچھ ضروری گل کرنی ہے۔" رحیم داد نے جمیلہ سے ملاقات کرنے کا بہانہ تلاش کیا۔

"اب تو جی کل ہی اس سے گل ہو گی۔"

"کوئی حرج نہیں' کل ہی گل کر لینا۔"

دوسرے روز رحیم داد بے چینی سے احمد کا انتظار کرتا رہا۔ صبح کے ناشتے کے بعد وہ دوپہر کا کھانا لے کر آیا تو رحیم داد نے دریافت کیا۔ "حمدے! تو نے زمیں دارنی سے بات کی تھی؟"

"ہاں جی! میں نے تیری بات اسے پہنچا دی تھی۔"

"کیا کہا اس نے؟" رحیم داد اپنی بے چینی چھپا نہ سکا۔ احمد بھی بھانپ گیا۔ "تو اس سے ملنا چاہتا ہے۔ کوئی ضروری کام ہو گا۔ پر ایسا لگتا ہے وہ تجھ سے ملنا نہیں چاہتی۔"

"تو نے کیسے سمجھا وہ ملنا نہیں چاہتی؟"

"میری گل سن کر وہ پہلے کی طرح چپ کر کے بیٹھی رہی۔" میں نے دوبارہ کہا تو منہ بگاڑ کر بولی۔ "مجھے زمیں داری سے کیا لینا؟ چوہدری سے کہنا جو اس کا جی چاہے کرے۔ بس جی اس نے اتنا ہی کہا۔"

رحیم داد نے احمد سے مزید استفسار نہ کیا۔ خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔ مگر رغبت سے کھانا نہ کھا سکا۔ اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ دن ڈھلا' شام ہوئی' رات ہو گئی۔ مگر رحیم داد کی ذہنی الجھن کم نہ ہوئی۔ اسی عالم میں وہ سو گیا۔

☆

رحیم داد سویرے بیدار ہوا تو اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ ہاتھ پیروں میں اینٹھن کے ساتھ ساتھ سر میں درد تھا۔ ہلکا ہلکا بخار بھی تھا۔ دوپہر کو دو چار لقمے کھانے کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ کھانا کھایا ہی نہ گیا۔ طبیعت اس قدر مضمحل اور گری گری تھی کہ وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں بھی نہ گیا۔ صحن میں چھما چھم بارش ہو رہی تھی۔

رحیم داد بستر پر لیٹا بوندوں کا جل ترنگ سنتا رہا۔

شام ہوتے اسے جوڑی چڑھی۔ جسم کپکپانے لگا۔ اس نے کھیس اچھی طرح لپیٹی اور بدن سکیڑ کر گٹھری بن گیا۔ اب بخار تیز ہو گیا تھا۔ احمد کھانا لے کر آیا تو رحیم داد نے جوڑی سے کپکپاتے ہوئے کہا۔ "حمدے کمبل لا کر مجھ پر ڈال دے۔" احمد نے اس کی پیشانی چھو کر بخار کی شدت کا

اندازہ لگایا اور خاموشی سے چلا گیا۔

رحیم داد کا جسم بخار کی تپش سے بھن رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے سکڑا سکڑایا بے سدھ پڑا رہا۔ اسے کچھ خبر نہ ہوئی کہ احمد کب واپس آیا۔ کب اس کے تھرتھراتے بدن پر اس نے کمبل ڈالا اور کب کمرے سے باہر گیا۔

رحیم داد پر گہری غنودگی طاری تھی۔ آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ وہ رک رک کر سانس لے رہا تھا اور آہستہ آہستہ کراہ بھی رہا تھا۔

رات نہ معلوم کتنی گزر چکی تھی۔ باہر چھاجوں پانی برس رہا تھا۔ یکایک رحیم داد نے اپنی تپتی ہوئی پیشانی پر ٹھنڈک محسوس کی۔ یہ کسی کا نرم اور گداز ہاتھ تھا۔ اس نے لمبی سانس بھری اور آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا' جمیلہ اس پر جھکی ہوئی ہے۔ اس کا ایک ہاتھ رحیم داد کی پیشانی پر تھا۔

رحیم داد کو یقین نہ آیا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ ہاں وہ جمیلہ ہی تھی۔ وہی ستاروں کی مانند روشن آنکھیں' وہی گلابی ہونٹ' وہی تابندہ پیشانی۔ لیمپ کی زرد زرد روشنی میں اس کا چہرہ سوگوار اور بجھا بجھا ہونے کے باوجود دلکش نظر آ رہا تھا۔

وہ آنکھیں کھولے حیران و پریشان نظروں سے جمیلہ کے خوب صورت چہرے کو تکتا رہا۔ اس کے خشک ہونٹ آہستہ آہستہ لرز رہے تھے۔ وہ بولنا چاہتا تھا مگر بول نہ سکا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا خواب دیکھ رہا ہے۔

جمیلہ بستر کے قریب پڑے ہوئے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئی بولی۔ "چوہدری تجھے تو بہت تیز بخار ہے۔ ملیریا لگتا ہے۔ جوڑی چڑھی تھی؟"

"ہاں!" رحیم داد نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرتے ہوئے کہا۔ "طبیعت تو سویرے ہی سے گڑبڑ تھی۔ شام کو جوڑی چڑھی' فیر ایسا تیز بخار ہو گیا کہ میں نوں بالکل سدھ بدھ نہ رہی۔"

"چنتا نہ کر۔ کل پرسوں تک چنگا ہو جائے گا۔ تجھے ملیریا ہو گیا ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد کو تشفی دی۔ مڑ کر دروازے کے پاس کھڑے ہوئے احمد کی جانب دیکھا۔ ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ احمد نے بڑھ کر میز پر رکھا ہوا لکڑی کا بکس اٹھایا اور جمیلہ کو دے دیا۔ جمیلہ نے بکس کھولا۔ تھرمامیٹر نکالا۔ اسے ہاتھ میں دبا کر جھٹکا دیا۔ رحیم داد سے کہا۔

"چوہدری! منہ کھول۔"

رحیم داد نے چپ چاپ منہ کھول دیا۔ جمیلہ نے تھرمامیٹر اس کے منہ میں لگا دیا اور کلائی پر

بندھی ہوئی گھڑی جھک کر توجہ سے دیکھنے لگی۔

جمیلہ نے تھرمامیٹر رحیم داد کے منہ سے نکالا۔ لیمپ کی روشنی میں ہاتھ اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ آہستہ سے بولی۔ "تجھے تو ۱۰۴ ٹمپریچر ہے۔" اس نے تھرمامیٹر دھو کر حفاظت سے بکس میں رکھ دیا۔ احمد سے گلاس میں پانی منگوایا۔ بکس کے اندر سے کونین کی ٹکیہ نکالی۔ احمد نے جمیلہ کی ہدایت پر رحیم داد کو تکیے کے سہارے بٹھا دیا۔ رحیم داد گہری گہری سانس بھر کر آہستہ آہستہ ہانپتا رہا۔

جمیلہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ رحیم داد کو مخاطب کرتے ہوئے نرم لہجے میں بولی۔ "چوہدری! یہ دوائی کھا لے۔ آرام آ جائے گا۔" رحیم داد نے ایک بار پھر منہ کھولا۔ جمیلہ نے جھک کر کونین کی ٹکیہ اس کے حلق میں ڈال دی۔ گلاس اٹھا کر رحیم داد کے ہونٹوں سے لگایا۔ رحیم داد پانی کے ساتھ ٹکیہ نگل گیا۔ دوا کھلانے کے بعد جمیلہ بولی۔

"اب تو آرام سے لیٹ جا۔"

رحیم داد چپ چاپ ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ جمیلہ نے ایکبار پھر اس کی پیشانی چھو کر دیکھی۔ احمد سے کٹورے میں ٹھنڈا پانی منگوایا۔ احمد کمرے سے چلا گیا۔

کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ جمیلہ کرسی پر گم صم بیٹھی تھی۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ رحیم داد آنکھیں بند کیے نڈھال لیٹا رہا۔ وہ چند لمحے اسی حالت میں پڑا رہا۔ پھر اس نے کراہتے ہوئے گردن موڑی۔ جمیلہ کی جانب دیکھا۔ رک رک کر کہنے لگا۔

"زمیں دارنی! میں نے پچھلے دنوں تجھ سے ایسی بات کہی تھی' جس پر تو نے برا منایا۔ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ مجھے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ زمیں دارنی تو۔"

جمیلہ نے اسے مزید بولنے کا موقع نہ دیا۔ بات کاٹ کر بولی۔ "چپ کر کے لیٹا رہ۔ تجھے بہت تیز بخار ہے۔ سویرے سے تیری طبیعت اتنی گڑبڑ ہے۔ تو نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟ احمد تو یہیں تھا۔ مجھے پتہ چل جاتا تو اسی سمے دوائی کھلا دیتی۔ اتنا تیز بخار نہ چڑھتا۔"

"میں نے تجھے اس لیے خبر نہ کی تو عدّت میں ہے۔ سوچا تو یہاں کیسے آ سکتی ہے؟" رحیم داد نے جمیلہ کی جانب دیکھے بغیر ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

"ایسے ہی آ سکتی تھی جیسے اب آئی ہوں۔ دکھی بیماری کی تو بات ہی الگ ہے۔" جمیلہ نے بتایا۔ "میں نے مسجد کے ملّا کو بلا کر پوچھ لیا تھا۔"

احمد کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا بڑا کٹورہ تھا۔ احمد نے کٹورہ میز پر

رکھ دیا اور میز اٹھا کر جمیلہ کے سامنے رکھ دی۔ جمیلہ نے پانی میں انگلیاں ڈبوئیں۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ اس نے بکس کھولا۔ اندر سے ململ کا اجلا ٹکڑا نکالا۔ اسے پانی میں ڈال کر تر کیا۔ تہہ کر کے اس کی چار انگل چوڑی پٹی بنائی اور بھیگی ہوئی پٹی رحیم داد کی تپتی ہوئی پیشانی پر رکھ دی۔ رحیم داد کو اس کی ٹھنڈک سے بڑا سکون ملا۔

رحیم داد نے ایک بار پھر آنکھیں کھولیں۔ آہستہ سے بولا۔ ”زمیں دارنی، سچ تیرا دل بہت وڈا ہے۔ تو۔“

جمیلہ نے اسے ٹوکا۔ ”چوہدری چپ کر کے پڑا رہ۔ تجھے آرام کی ضرورت ہے۔“

رحیم داد نے آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ سانس بھرنے لگا۔

جمیلہ اس کی پیشانی پر پٹی رکھتی رہی۔ گرم ہو جاتی تو دوبارہ کٹورے کے ٹھنڈے پانی میں تر کرتی اور پیشانی پر رکھ دیتی۔ بخار کی تیزی دھیرے دھیرے کم ہوتی گئی۔ رحیم داد کو ایسا سکون ملا کہ وہ سو گیا۔ اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ جمیلہ کتنی دیر اس کے سرہانے بیٹھی رہی اور کب اٹھ کر چلی گئی۔

۳۵

دن ڈھلے ایک تانگا حویلی کے مہمان خانے کے دروازے پر رکا۔ نادر خاں تانگے سے نیچے اترا۔ اس بار وہ اپنے ساتھ بستر اور ٹرنک لے کر آیا تھا۔ وہ سائیکل بھی تانگے میں رکھی تھی، جس پر وہ رحمت والی گیا تھا۔ اس نے تانگے والے کو کرایہ ادا کیا۔ سامان احمد کے سپرد کیا اور سیدھا رحیم داد کے پاس پہنچا۔

رحیم داد اس وقت کمرے کے باہر برآمدے میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ صحن میں دھوپ پھیلی تھی۔ مگر اس کی تمازت میں تیزی نہ تھی۔ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ درخت جھوم رہے تھے۔ آسمان پر بکھرے ہوئے بادلوں کے سفید سفید ٹکڑے سرپٹ بھاگتے نظر آتے تھے۔

نادر خاں کو دیکھتے ہی رحیم داد نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ”تو نے تو دوسرے روز آنے کا وعدہ کیا تھا، اتنے دن کہاں غائب رہا؟ بیمار تو نہیں پڑ گیا تھا؟“ اس نے نادر خاں کا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”ویسے تو بیمار شمار لگتا نہیں۔“

”نہیں جی، بیمار تو نہیں رہا۔“ نادر خاں سر جھکا کر معذرت کرنے لگا۔ ”معاف کرنا جی، وہ ایسا ہوا کہ مجھے ملتان جانا پڑا۔“

”ملتان کیوں گیا تھا؟ تیں نوں یہاں پہنچنا تھا۔“

”آنا تو جی میں نے یہیں تھا، پر کچھ ایسی مجبوری ہوئی کہ اچانک ملتان جانا پڑ گیا۔“ نادر خاں کے لہجے میں عاجزی تھی۔

”کیا مجبوری ہوئی؟ تو کچھ پریشان دکھائی پڑ رہا ہے۔“ رحیم داد نرمی سے بولا۔ ”کھڑا کیوں

ہے؟ بیٹھ جا۔ آرام سے بتا' بات کیا ہے؟"

نادر خاں نے قریب پڑے ہوئے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ "وہ ایسا ہے جی' میری گھروالی کا چھوٹا بھائی ملتان ڈسٹرکٹ جیل میں ہے۔"

"جیل میں ہے؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ جیل کیسے چلا گیا؟"

"کتل کے ایک مکدمے میں پھنس گیا تھا۔ سال بھر سے اوپر ہو گیا جیل کاٹتے ہوئے۔" نادر خاں نے رحیم داد کو آگاہ کیا۔ "میں یہاں سے رحمت والی گیا۔ دیکھا' گھروالی بہت پریشان ہے۔ کسی نے اطلاع دی کہ اس کا بھائی سخت بیمار ہے۔ ایک ہی بھائی ہے اس کا۔ روتے روتے برا حال کرلیا تھا اس نے۔ اس کی حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ اسے تسلی دی اور فوراً ملتان چلا گیا۔"

"اب وہ کیسا ہے؟ ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

"اسے تو جی میں مل ہی نہ سکا۔" نادر خاں نے جواب دیا۔ "بات یہ ہے جی۔ اس بار تو اوپر سخت بارش ہوئی ہے۔ چناب میں زبردست سیلاب آگیا۔ بستیاں کی بستیاں اجڑ گئیں۔ خریف کی فصلیں تباہ ہو گئیں۔ بھکری سے آگے لوپ بند ٹوٹ گیا۔ جلال آباد اور شیر شاہ کو شدید خطرہ ہے۔ نہروں میں شگاف پڑ گئے ہیں۔ ریلوے لائن پانی کے تیز ریلے سے بہہ گئی ہے۔ جگہ جگہ سے اکھڑ گئی ہے۔ جدھر نظر جاتی ہے پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔"

"اس بار تو بہت تباہی مچا دی سیلاب نے۔" رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔ "پر یہ تو بتا تیری گھروالی کے بھائی کا کیا بنا؟"

"ہوا یہ جی کہ لوپ بند کی مرمت کے لیے ڈسٹرکٹ جیل کے کیدیوں کو بھی لگا دیا گیا۔ ان میں میرا سالا بھی ہے۔ میں ملتان پہنچا تو پتہ چلا کیدی بند کی مرمت کا کام ختم کر کے جلد ہی واپس آجائیں گے۔ میں انتظار کرنے لگا۔ دو ہفتے سے اوپر ہو گئے پر کیدی واپس جیل نہ آئے۔ بند کی مرمت کا کام ختم ہی نہ ہوا تھا۔"

"پر تیری گھروالی نے تو کہا تھا اس کا بھائی سخت بیمار ہے۔ تو اور ہی گل سنا رہا ہے۔ یہ کیا چکر ہے؟" رحیم داد نے مسکرا کر نادر خاں سے پوچھا۔

"اطلاع ٹھیک نہیں ملی تھی جی۔" نادر خاں نے وضاحت کی۔ "بات سچی یہ ہے جی بند کی مرمت کرنے والے کئی کیدیوں نے رات کے اندھیرے میں فرار ہونے کی کوشش کی۔ بلکہ کچھ تو فرار بھی ہو گئے۔" نادر نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "پر جب وہ فرار ہونے لگے تو ان کی نگرانی کرنے والے پہرے داروں کو پتہ چل گی۔ انھوں نے بھاگتے ہوئے کیدیوں کا پیچھا کیا۔ گولی بھی چلائی۔

"کئی تو جان سے مارے بھی گئے ہوں گے۔" رحیم داد نے لقمہ دیا۔

"نہیں جی مرا تو کوئی بھی نہیں۔ پر چار زخمی ضرور ہوئے۔ زخمی کیدیوں کو سرکاری ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ میری گھروالی کو اطلاع ملی تھی کہ ان میں اس کا بھائی بھی شامل ہے۔ پر وہ ان میں نہیں تھا۔ میں نے اسپتال جا کر خود معلوم کیا تھا۔ جیل کے افسروں سے پوچھ گچھ کرنے پر پتہ چلا' میرے سالے نے فرار ہونے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ دوسرے کیدیوں کے ساتھ بند کی ابھی تک مرمت کر رہا ہے۔"

قیدیوں کے فرار ہونے کی اطلاع سے رحیم داد قدرے پریشان ہو گیا۔ اسے فوراً لالی کا خیال آیا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد آیا کہ اللہ وسایا اور جمیلہ کے ہم راہ کبیروالا جاتے ہوئے منٹگمری اسٹیشن پر اچانک شاداں سے اس کی مڈھ بھیڑ ہو گئی تھی۔ وہ اسے پہچان تو نہ سکی' لیکن اس کی زبانی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ لالی بھی ڈسٹرکٹ جیل' ملتان میں ہے۔ وہ اس سے ملنے ملتان جا رہی تھی۔ رحیم داد سوچنے لگا' اگر لالی بھی بند کی مرمت کرنے والے قیدیوں میں شامل ہو گا تو اس نے ضرور نکل بھاگنے کی کوشش کی ہو گی اور کامیاب بھی ہو گیا ہو گا۔ وہ ایسے معاملات میں بڑا ہوشیار اور منجھا ہوا تھا۔ وہ ضرور فرار ہو گیا ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کسی روز کوٹلہ ہرکشن بھی پہنچ سکتا ہے۔ یہ سوال ذہن میں ابھرتے ہی رحیم داد کو تشویش ہوئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے خدشات اور وسوسوں پر قابو پالیا۔

رحیم داد کو معاً خیال آیا کہ لالی' کوٹلہ ہرکشن کیسے پہنچ سکتا ہے؟ اسے تو یہی معلوم تھا کہ رحیم داد مر چکا ہے۔ پولس پارٹی کے ساتھ لاش کی شناخت بھی اسی نے کی تھی۔ اسے تو یہ بھی خبر نہ تھی کہ رحیم داد نام بدل کر چودھری نور الٰہی کی حیثیت سے کوٹلہ ہرکشن میں مقیم ہے۔ ویسے بھی رحیم داد کی وضع قطع اور حلیہ اس قدر تبدیل ہو چکا تھا کہ لالی اسے اب پہچان بھی نہ سکتا۔

وہ خاموش بیٹھا لالی کے بارے میں سوچتا رہا۔ نادر نے اسے خاموش پایا تو دریافت کیا۔

"چودھری! تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

رحیم داد نے جھٹ بات بنائی۔ "میں شاہ جی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بہت دنوں سے اس کے پاس گیا نہیں۔ ایک تو مینہ کی جھڑی لگی رہی۔ اوپر سے میں بیمار بھی پڑ گیا۔"

"اوہو' تسیں پچھلے دنوں بیمار بھی رہے۔" نادر نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "جب ہی تو کچھ کمزور' کمزور دکھائی دے رہے ہو۔ چہرہ بھی مرجھایا ہوا لگتا ہے۔ کس ڈاکٹر سے علاج کرایا تھا؟"

"ایسی زبردست برسات میں ڈاکٹر کہاں سے آتا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ رستے بند تھے۔ جمیلہ

نے دوائی دی تھی۔ اسی سے چنگا ہوگیا۔"

"زمیں دارنی ویسے تو بہت پڑھی لکھی ہے پر مجھے یہ پتہ نہ تھا وہ ڈاکٹری بھی کرلیتی ہے۔"

رحیم داد نے مسکرا کر بتایا۔ "ڈاکٹری شاکٹری تو اس نے نہیں پڑھی۔ پر چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج کرلیتی ہے۔ چوٹ یا زخم آجائے تو مرہم پٹی بھی کرلیتی ہے۔ اس کے پاس دوائیوں سے بھرا ہوا بکسا ہے۔ اس میں دوا دارو کا ہر طرح کا سامان رہتا ہے۔ پنڈ میں کوئی بھی بیمار پڑے۔ چاہے مزارع ہو یا کمی، وہ جھٹ دوائیوں کا بکسا سنبھال، اس کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اس معاملے میں اس کا دل بہت نرم ہے۔ آس پاس کے کسی پنڈ یا چک میں بھی کوئی بیمار پڑ جائے تو پتہ لگتے ہی وہاں پہنچ جاتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے دوائی کھلاتی ہے۔ خود ہی مرہم پٹی کرتی ہے۔" رحیم داد کو جمیلہ کی دردمندی اور خوبیاں بیان کرنے میں لذت محسوس ہو رہی تھی۔

نادر خاں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "پر آج کل تو جی وہ عدت میں ہے۔ حویلی سے باہر نہیں جاسکتی۔ تیں نوں دوائی دینے ادھر کیسے چلی آئی؟ ویسے تو اسے تیرے سامنے بھی نہیں آنا چاہیے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ بات تو ایسی ہی ہے۔" رحیم داد نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے بتایا تھا ناکہ اس کا دل بہت نرم ہے۔ وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ جیسے ہی اسے پتہ چلا، مجھے بہت تیز بخار ہے، فوراً دوائیوں کا بکسا لے کر آگئی۔ ویسے یہ مہمان خانہ بھی حویلی سے الگ کہاں ہے۔" اس نے وضاحت کی۔ "وہ میرے سامنے کب آتی ہے۔ چدر کے پلو سے بکل مار کر منہ اس طرح چھپالیتی ہے کہ آنکھیں بھی مشکل سے دکھائی پڑتی ہیں۔ عام طور پر تو منہ موڑ کر دوسری طرف کرلیتی ہے۔ اس معاملے میں اس نے پنڈ کے ملاّ سے بات کر رکھی ہے۔"

رحیم داد نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ احمد کھانا لے کر آگیا۔ اس نے کھانا میز پر لگا دیا۔ رحیم داد نے نادر خاں کی طرف دیکھا۔ "تو نے روٹی کھالی؟"

"کھالوں گا جی۔ میں نے تو ابھی نہا دھو کر کپڑے بدلنے ہیں۔"

نادر خاں اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور احمد کے ہم راہ کمرے سے چلا گیا۔ رحیم داد اطمینان سے کھانا کھانے لگا۔ کھانے سے فارغ ہو کر حسب معمول وہ بستر پر لیٹ کر آرام کرنے لگا۔

دن ڈھلے رحیم داد کمرے سے باہر گیا۔ غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ رحیم داد مہمان خانے سے نکل کر باغ میں پہنچا۔ نوکروں نے پہلے ہی کرسیاں لگادی تھیں۔ رحیم داد ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ برسات کی سہانی شام تھی۔ مشرق میں شفق کا الاؤ دہک رہا تھا۔ فضا گل

رنگ تھی۔ ہوا مہکی ہوئی تھی۔ رحیم داد تنہا بیٹھا موسم کی رنگینی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر تاجاں پر پڑی۔ وہ مہمان خانے کے عقب سے نکل کر مویشیوں کے باڑے کی جانب جا رہی تھی۔

تاجاں کی عمر سولہ سترہ برس کے لگ بھگ تھی۔ مگر وہ صحت منداور بھرپور جوان تھی۔ حویلی ہی میں رہتی تھی۔ مگر اس کی حیثیت نوکرانیوں اور خادماؤں سے قدرے مختلف تھی۔ جمیلہ اس پر بہت مہربان تھی۔ ہمیشہ محبت اور شفقت سے پیش آتی تھی۔ اسے اپنے پاس ہی رکھتی تھی۔ تاجاں کا باپ مرچکا تھا۔ پھاتاں اس کی بیوہ ماں تھی۔ اس نے تاجاں کو جمیلہ کی سپردگی میں دے دیا تھا۔ پچھلے چھے سال سے وہ حویلی میں تھی۔ وہیں پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ کھانے کو اچھی غذا اور رہنے کو بہتر ماحول ملا تو اس کا رنگ روپ نکھر گیا۔ صحت بھی اچھی رہی۔ کام کاج اور محنت سے جسم بھی سڈول اور خوبصورت ہوگیا۔ جمیلہ اسے اس قدر عزیز رکھتی تھی کہ اس نے خود تاجاں کا رشتہ طے کیا تھا۔ شادی کی تاریخ بھی مقرر ہوچکی تھی۔

رحیم داد نے تاجاں کو حویلی میں پہلے بھی دیکھا تھا۔ مگر اس وقت وہ اسے زیادہ ہی خوب صورت اور پرکشش نظر آئی۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کی شلوار اور اسی رنگ کا کرتا پہنے ہوئے تھی۔ سر پر گہرا دھانی دوپٹہ تھا۔ یہی لباس ایک بار رحیم داد نے جمیلہ کے جسم پر بھی دیکھا تھا۔ مگر اللہ دسایا کی موت کے بعد جمیلہ صرف سفید لباس پہنتی تھی۔ اس نے اپنے رنگین کپڑے لتے نوکرانیوں کو دے دیئے تھے۔ مگر سب سے زیادہ تاجاں کے حصے میں آئے۔ گلابی لباس میں رحیم داد کو تاجاں میں جمیلہ کی جھلک نظر آئی۔

شفق کی گہری نارنجی روشنی میں تاجاں کا چہرہ نکھر کر زیادہ ہی شگفتہ اور زیادہ ہی گلابی ہوگیا تھا۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ تاجاں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ رحیم داد چپ چاپ بیٹھا دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ تاجاں قریب، اور قریب آتی گئی۔ چلتے چلتے اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ ہاتھ اٹھا کر خاموشی سے سلام کیا۔ رحیم داد مسکرایا۔ انگلی کے اشارے سے اسے بلایا۔ وہ ٹھٹکی۔ چند لمحے خاموش کھڑی رہی پھر سر کو دوپٹے سے ڈھکتی، شرماتی، لجاتی آگے بڑھی اور رحیم داد کے روبرو نظر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔

رحیم داد نے نرم لہجے میں پوچھا۔ "تو پھاتاں کی دھی ہے نا؟"

"ہاں جی!" اس نے رحیم داد سے نظریں ملائے بغیر رسان سے جواب دیا۔ "میرا ناں تاجاں ہے جی۔"

"تو' تاجاں ہے!" رحیم داد نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ "پر تو اس وکت کہاں جا رہی ہے؟ تو ساہے بندھی ٹیار ہے۔ حویلی سے باہر کیسے آگئی؟ میں تو تیرے سگن میں بھی شریک ہوا تھا۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ لہجے سے بے تکلفی جھلکنے لگی۔ "تیری سسرال سے آئی ہوئی مٹھائی بھی میں نے کھائی تھی۔ یہیں باغ میں تو سگن کی ساری رسماں ریتاں ہوئی تھیں۔ پر تیں نوں ان کے بارے میں کیہہ پتہ؟"

تاجاں اور شرما گئی۔ اس کے چہرے کے گلاب اور دہکنے لگے۔ آنکھوں میں چراغ جل اٹھے۔ وہ نظریں جھکا کر دوپٹے کا آنچل انگلی میں لپیٹتے ہوئے بولی۔ "وہ ایسا ہے جی۔ بھین جی نے حمدے کو بلایا ہے۔ کوئی کام ہے۔ حویلی میں کوئی بھی نہ تھا۔ مجھے بھیج دیا۔ پر حمدا تو مہمان خانے میں نہیں ہے ڈھارے پر ہوگا۔ ادھر ہی جا رہی تھی۔" اس نے نگاہیں اٹھا کر رحیم داد کی جانب نہ دیکھا۔

"ایسے ادھر ادھر نہ گھوما کر۔" رحیم داد نے لہجے میں دبدبہ پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "تیری سسرال والوں کو پتہ چل گیا تو برا منائیں گے۔" یہ کہتے کہتے وہ زیر لب مسکرایا۔ "پنڈ کے کسی گبھرو کی نظر پڑ گئی تو تجھے اٹھا لے جائے گا۔"

"نہیں جی' میں ایسی نہیں ہوں۔" وہ گھبرا کر الھڑپن سے بولی۔ "میں تو جی حویلی سے کبھی باہر نہیں جاتی۔"

"ٹھیک ہی کرتی ہے۔" رحیم داد نے دبی زبان سے اسے ٹٹولا۔ "تو ہے بھی تو سوہنی ٹیار۔ ان ریشمی کپڑے لتوں میں تو زیادہ ہی سوہنی لگتی ہے۔"

"پر جی یہ تو مجھے بھین جی نے دیئے ہیں۔"

"میں نوں پتہ ہے۔" رحیم داد آہستہ سے ہنسا۔ "یہ کپڑے لتے تجھے زمیں دارنی ہی نے دیئے ہیں۔ پر انھیں پہن کر تو رانڈ پھاتاں کی دھی نظر نہیں آتی۔ زمیں دارنی لگتی ہے۔"

تاجاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ نظریں نیچی کیے چپ چاپ کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ بکھری تھی۔ شفق کی سرخی کا الاؤ ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا۔ شام کا دھندلکا فضا میں گھلنے لگا تھا۔ رحیم داد کچھ دیر اور تاجاں سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی اثناء میں نادر خاں جامن کے ایک پیڑ کی آڑ سے نکل کر سامنے آگیا۔ رحیم داد نے چاپ سن کر اس کی جانب دیکھا۔

نادر اس کی طرف بڑھا۔ رحیم داد تاجاں کی سمت مڑا۔ اسے مخاطب کیا۔ "تاجاں! حویلی میں جا۔ اندھیرا بڑھ گیا ہے۔ میں حمدے کو زمیں دارنی کے پاس بھیج دوں گا۔ تو اسے بتا دینا۔"

تاجاں نے اس کی جانب دیکھے بغیر دھیمے لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے۔" وہ مڑی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی حویلی کی جانب چل دی۔

نادر خاں قریب پہنچا۔ اس نے گردن کو خم دے کر تاجاں کی سمت دیکھا اور رحیم داد کے روبرو نظریں جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے سر کو خفیف سی جنبش دی بے نیازی سے بولا۔

"بیٹھ جا نادر۔"

نادر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ایک بار پھر تاجاں کی جانب دیکھا۔ وہ درختوں کے نیچے پھیلتے ہوئے شام کے دھندلکے میں گم ہوتی جا رہی تھی۔ نادر خاں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ دبی زبان سے بولا۔

"سوہنی ٹیار ہے۔ کون ہے جی یہ؟"

"تاجاں نام ہے اس کا۔ حویلی ہی میں رہتی ہے۔ حمدے کو بلانے ادھر آئی تھی۔"

نادر خاں نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔ "میں نے تو جی حویلی کو اب تک دیکھا ہی نہیں۔"

"دیکھ لینا' ضرور دیکھ لینا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تجھے جمیلہ سے بھی ملانا ہے۔ وہ حویلی کے اندر ہی ملے گی۔" اس نے نظر بھر کر نادر کو دیکھا۔ "پر وہ تجھ سے خوش نہیں ہے۔ یہ سوچ لے۔"

"مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ پر ایک بار میں اس سے مل لوں۔ فیر وہ مجھ سے ناراض نہیں رہے گی۔"

رحیم داد نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "تو اسے جانتا نہیں۔ وہ اور ہی طرح کی زنانی ہے۔ بہت تیز اور ہوشیار ہے۔"

"میں نے بھی یہی سنا ہے جی۔" نادر خاں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "پر ہے تو وہ وڈے جگیردار کی دھی۔ ویسے خود بھی چھوٹی موٹی جگیردارنی ہی ہے۔ میں جگیرداروں کے مزاج بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ برسوں ان کی ملازمت میں رہا ہوں۔ کتنے ہی ٹیڑے اور اونچے طرّوں والے جگیرداروں اور وڈے زمیں داروں سے اپنا واسطہ رہا ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر انگلیوں سے کان چھوا۔ "اللہ کے فضل سے کوئی مجھ سے زراض نہیں رہا۔"

"تو کہتا ہے تو جلد ہی تجھے اس سے ملوا دوں گا۔"

"میں نے اس سے کئی کام لینے ہیں۔" نادر خاں نے ذرا آگے جھک کر آہستہ سے کہا۔ "اور وہ کام میں ہی کرا سکتا ہوں جی۔ میں نے اس سے زمیں داری کے کاغذات لینے ہیں۔ مزارعوں سے کرض ادھار کی وصولی کے لیے رجسٹر اور بہی کھاتے لینے ہیں۔ اور بھی ایسی ہی کئی دستاویزات ہیں جو اس کے پاس ہیں۔ ان کا اب تیری تحویل میں ہونا بہت ضروری ہے۔"

"کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔" رحیم داد نے اس کا مشورہ قبول کرتے ہوئے کہا۔ "پر اتنا دھیان رکھنا، وہ نراض ہو تو چپ کر جانا۔ بات یہ ہے میں اسے نراض کرنا نہیں چاہتا۔" اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "ویسے وہ دل کی بری نہیں۔ اب یہی دیکھ۔ میں بیمار پڑا تو عدّت میں ہوتے ہوئے بھی گھبرا کر جھٹ چلی آئی۔ دوائی کھلائی۔ صبح تک میرے بستر کے پاس بیٹھی رہی۔ جب تک میں چنگا نہیں ہو گیا روز ہی آتی رہی۔ وہ جتنی خوب صورت اور سوہنی ہے اتنی ہی دل کی چنگی بھی ہے۔"

"سنا تو میں نے بھی یہی ہے کہ زمیں دارنی بہت حسین اور خوب صورت ہے۔"

"اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔ ویسے اللہ وسایا کی موت کے بعد سے وہ مرجھا کر رہ گئی ہے۔ پر اب بھی بہت شاندار لگتی ہے۔"

"ویسے تو جی تاجاں بھی بہت زوردار مٹیار ہے۔" نادر خان نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔

مگر رحیم داد نے حوصلہ افزائی نہ کی۔ اس کی بات صاف نظرانداز کر گیا۔ کہنے لگا۔ "نادر! تو دو چار روز آرام کر۔ مزارعوں کے پاس تیرا ابھی جانا ٹھیک نہیں۔ پرسوں جمعرات ہے۔ جمیلہ، جمعرات کو اللہ وسایا کی نذر نیاز میں لگی رہتی ہے۔ جمعے یا ہفتے کو تجھے اس کے پاس لے چلوں گا۔" وہ گردن اٹھا کر سوچنے لگا۔ پھر نادر خاں کی جانب متوجہ ہوا۔ "ہفتہ ہی ٹھیک رہے گا۔"

نادر خاں نے رحیم داد کی تجویز سے اتفاق کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد نوکروں نے کھانا لگا دیا۔ نادر بھی کھانا کھانے مہمان خانے کی جانب روانہ ہو گیا۔ رحیم داد کھانے سے فارغ ہوا تو دو مزارعے آ گئے۔ وہ ان کے ساتھ دیر تک بیٹھا سیلاب اور شدید بارش کی تباہ کاریوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔

☆

ہفتے کی صبح ناشتا کرتے ہوئے رحیم داد نے احمد کو جمیلہ کے پاس بھیجا اور اس کی خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد احمد نے واپس آ کر بتایا کہ جمیلہ اس کا انتظار کر رہی ہے۔ رحیم داد نے نادر خاں کو بھی بلوا لیا۔ دونوں احمد کے ہم راہ حویلی میں گئے۔ جمیلہ بڑے کمرے میں صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت بھی سفید لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے بکل مار کر چادر سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ دونوں نے اونچی آواز سے سلام کیا۔ جمیلہ نے پہلو بدلا اور ترچھی ہو کر اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کا منہ دیوار کی طرف ہو گیا۔ رحیم داد قریب پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ مگر نادر خان نہ بیٹھا۔ نظریں نیچی کیے خاموش کھڑا رہا۔

جمیلہ نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر سرسری نگاہ سے نادر کی جانب دیکھا۔ رحیم داد کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ 'چوہدری! یہ نادر خاں تو نہیں ہے؟"

"ہاں جی' یہ نادر ہی ہے۔" رحیم داد نے یہ کہتے ہوئے نادر خاں کو دیکھا۔ "بیٹھ جا نادر۔"

نادر خاں دونوں سے ذرا ہٹ کر صوفے کے بجائے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے جمیلہ کی جانب دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ جمیلہ نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دریافت کیا۔ "چوہدری! تو اسے میرے پاس کیوں لایا ہے؟" اس کے لہجے سے خفگی صاف عیاں تھی۔

رحیم داد نے جمیلہ کے لہجے کی ترشی محسوس کی۔ نرمی سے بولا۔ "زمیں دارنی! میں نے سوچا اسے بھی تجھ سے ملوا دوں۔ اسے کام تو تیری ہی مرضی سے کرنا ہے۔"

"میری مرضی کیا ہے۔" جمیلہ نے بے رخی سے کہا۔ "تیرا مینجر ہے۔ تو جانے اور یہ جانے۔ مجھے اس سے کیا لینا۔" اس کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ "تو نے اسے مجھ سے پوچھ کر رکھا ہے؟"

"تیری مرضی نہیں تو میں اسے نہیں رکھتا۔ نراض کیوں ہوتی ہے؟" رحیم داد نے ایک بار پھر مڑ کر نادر کی جانب دیکھا۔ "سن لے بھئی نادر۔"

نادر خاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ بیٹھا رہا۔

"چوہدری! تو کیا چاہتا ہے؟" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "میرے سامنے ایسی بات کیوں کر رہا ہے؟ تجھے پتہ ہے' اس کے بارے میں تجھ سے میں پہلے ہی گل بات کر چکی ہوں۔"

"تب ہی تو میں اسے تیرے پاس لایا ہوں۔" رحیم داد کے لہجے میں عاجزی تھی۔ "زمین دارنی جو تو کہے گی وہی ہو گا۔ یہ بات میں اسے صاف صاف کہہ چکا ہوں۔" رحیم داد نے پہلو بدلا۔ نادر خاں کی طرف متوجہ ہوا۔ "یہی گل ہے نا' نادر؟ خاموش کیوں بیٹھا ہے۔ بولتا کیوں نہیں؟"

"میں نے کیا بولنا جی۔" نادر خاں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "چوہدری! تو مجھے یہ بات نہ بھی بتاتا تب بھی میں نوں پتہ تھا کہ جو زمیں دارنی کی مرضی ہو گی وہی ہو گا۔ یہ بات تو اس پنڈ ہی کی نہیں' پورے موضعے کو معلوم ہے۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ خوشامد پر اتر آیا۔ "میں نوں پتہ ہے یہ بہت وڈے زمیں دار کی دھی ہے اور میں نے یہ بھی سنا ہے جی کہ اس کا دل بھی وڈا ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "میں تو جی بال بچے دار ہوں۔ پریشان ہوں۔ سوچتا تھا زندگی کے جو دن رہ گئے ہیں' اس حویلی کی خدمت کرتے گزار دوں گا۔ زمیں دارنی کی مرضی نہیں تو میں یہی سمجھوں گا' میرا نصیبہ ہی خراب ہے۔"

"مجھے کیوں دوش دیتا ہے۔" مگر اس دفعہ جمیلہ کا لہجہ قدرے نرم تھا۔

"تجھے کیوں دوش دینے لگا۔ میں تو اپنی بد نصیبی کی گل کر رہا ہوں۔" نادر خاں نے خوشامد کے ساتھ ساتھ لہجے میں رقّت پیدا کرنے کی بھی کوشش کی۔

جمیلہ پر اس کوشش کا خاطر خواہ اثر بھی ہوا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "تیرا کوئی پتر نہیں؟"

"نہیں زمیں دارنی' اب کوئی نہیں رہا۔ وڈا پتر پچھلی جنگ عظیم کے دوران فوج میں بھرتی ہو کر ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ افریکہ میں الامین کے محاذ پر تھا۔ واپس نہ آیا۔ صرف مرنے کی اطلاع ملی۔" نادر نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "دوسرا سال ہی بھر بعد ایک جھگڑے میں مارا گیا۔ یہی دو پتر تھے۔ دونوں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی موت سے میری کمر ٹوٹ گئی۔ گھر والی تو ان کے غم کو برداشت ہی نہ کر سکی۔ روتے ہی روتے ایک روز چل بسی۔" اس کی آواز گلو گیر ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اپنی بات کہتے کہتے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں گی۔

"تب تو' تو بالکل اکیلا رہ گیا۔" جمیلہ نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے پوچھا۔ "کوئی بھی نہ رہا؟"

"نہیں زمیں دارنی' ایسا نہیں ہے۔" نادر خاں نے بتایا۔ "پاکستان بن نے کے کچھ ہی دنوں بعد میں نے ادھر رحمت والی میں دوسرا ویاہ کر لیا تھا۔ اس سے تین اولادیں ہیں۔ پر ان میں پتر کوئی نہیں۔ تینوں ہی چھوہریاں ہیں۔ لگ بھگ سال بھر سے بے روز گار ہوں۔ زندگی بھر نوکری کی۔ وہی کر سکتا ہوں۔ اور کوئی کام نہ آتا ہے نہ کر سکتا ہوں۔"

تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ جمیلہ اس کی پریشان حالی سے بہت متاثر ہوئی۔ تڑپ کر بولی۔ "نادر خاں! تو بہت دکھی ہے۔ تیری باتوں سے ایسا ہی لگتا ہے۔ تجھے دکھ پہنچا کر مجھے کیا لینا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "میں تو خود دکھ جھیلتے جھیلتے راکھ ہو گئی۔ اللہ وسایا تھا' وہ بھی مجھے دکھ سہنے کے لیے اکیلا چھوڑ گیا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں کے آبگینے چھلک پڑے۔ فضا میں غم کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ سب چپ بیٹھے تھے۔ باہر ملگجی دھوپ پھیلی تھی۔ آسمان پر بادلوں کا غبار تھا۔

جمیلہ نے چادر کے پلو سے آنسو پونچھے اور رحیم دا کی جانب متوجہ ہوئی۔ "چوہدری! اب تو نے اسے رکھ ہی لیا ہے تو لگا رہنے دے۔ اپنی مرضی میں میری مرضی بھی شامل کر لے۔"

"ایسا نہ کہہ۔ مرضی تو تیری ہی چلے گی زمیں دارنی۔" رحیم داد نے جمیلہ کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے چاپلوسی سے کام لیا۔ "تیں نوں ٹھیک طرح پتہ ہے۔ نہ میں نے پہلے کبھی اپنی مرضی چلائی نہ آگے چلاؤں گا۔ نادر خاں کے معاملے میں یہ بھول ہو گئی کہ جو گل بات آج تیرے سامنے ہوئی ہے' پہلے ہو جاتی تو ٹھیک تھا۔"

جمیلہ نے رحیم داد کو نظر انداز کیا۔ نادر خاں کو مخاطب کیا۔ "نادر! سچی بات یہ ہے کہ ہمیں مینجر شیجر کی ضرورت نہیں۔ اپنی اتنی زمیں داری نہیں۔ اور نہ ہی ہمیں مزارعوں کی چمڑی اتارنی ہے۔ یہ بات چوہدری جانتا ہے۔ میں چاہتی ہوں تو بھی جان لے۔"

"میں نے کیا کرنا ہے جی' جیسا حکم ہو گا ویسا ہی کروں گا۔" نادر نے نہایت مستعدی سے اسے یقین دلایا۔ "پر ایک گل میں نوں ضرور کہنی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" جمیلہ نے دریافت کیا۔

"اگر پڑیلی' جھنگر یا غیر مزروعہ زمین کو کابل کاشت بنانے کی کوشش کی جائے' اس میں تو کوئی حرج نہیں؟ میرا مطلب یہ ہے جی' تنخواہ لوں تو اس کے بدلے کچھ کارگزاری بھی دکھاؤں۔ میں نے تجھ سے خیرات تو لینی نہیں۔" نادر نے نظریں اٹھا کر جمیلہ کی جانب دیکھا۔ "پچھلے دنوں میں نے گھوم پھر کر زمیں داری کا جائزہ لیا تھا۔ مجھے بہت سی زمین غیر مزروعہ اور بے کار پڑی نظر آئی۔"

جمیلہ نے بتایا۔ "ایسی غیر مزروعہ زمین کو اللہ وسایا بھی کابل کاشت بنانا چاہتا تھا پر مکدے بازی نے اس طرف دھیان دینے کی اسے مہلت ہی نہ دی۔ کئی بار پروگرام بنایا اور ہر بار کوئی نہ کوئی اڑچن کھڑی ہو گئی۔"

"ایک گل اور بھی تجھ سے پوچھنی ہے۔"

"وہ بھی پوچھ لے۔"

"کتنے ہی مزارعوں پر برسوں سے ادھار چلا آ رہا ہے۔ ان کی وصولی کی ٹھیک طرح کبھی کوشش نہیں کی گئی۔" نادر خاں نے تجویز پیش کی۔ "یہ ادھار فصل کی واڈھی پر' خاص طور پر کماد کی پیداوار سے آسانی کے ساتھ وصول کیا جا سکتا ہے۔"

"ایسے نہیں۔" جمیلہ نے اس کی تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ "تو روز ناشتے کے بعد میرے پاس آجا۔ میں سارے رجسٹر اور کاغذات تیرے سامنے رکھ دوں گی۔ تجھے بتاتی جاؤں گی' کس سے اگلی فصل کی واڈھی پر کتنا ادھار وصول کیا جا سکتا ہے۔ مجھے سب کا پتہ ہے۔ جو ادھار ادا کر ہی نہ سکتا ہو اس سے زبردستی تو وصولی نہیں کی جا سکتی۔"

نادر خاں انگلی سے گدی کے بال کھجاتے ہوئے بولا۔ "زمیں دارنی! اس طرح تو ادھار وصول کرنا مشکل ہو گا۔"

"ہوا کرے۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میں نے اپنے کسی مزارعے کو بھوکا نہیں مارنا اور نہ ہی بے دخل کرنا ہے۔ یہ بات میں تجھے صاف صاف کہہ دینا چاہتی ہوں۔ تو نے اپنی کارگزاری

دکھانے کے چکر میں مزارعوں کو تنگ کرنے کی کوشش کی تو یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ تو خود پریشان ہے ویسے ہی دوسروں کی پریشانیوں کا وچار کر۔"

"نہیں جی' جیسا کہے گی زمیں دارنی ویسا ہی ہوگا۔ میں نوں تیرے حکم کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنی۔" نادر خاں نے جھٹ پینترا بدلا۔ "ویسے بھی میں روز کے روز تجھے کام کی رپورٹ پیش کرتا رہوں گا۔ جو بھی اگلی کارروائی کرنی ہوگی تجھ سے اس کے بارے میں مشورہ کرلوں گا۔"

"زمیں داری کا سارا بوجھ مجھ پر ڈالنے کی بجائے تو چوہدری کو کیوں نہیں ذمہ داری میں شریک کرتا؟ یہ کب تک زمیں داری کے کاموں سے دور دور اور الگ الگ رہے گا۔" جمیلہ نے بات کہتے کہتے مڑکر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اسے براہ راست مخاطب کیا۔ "چوہدری! ایسے کام نہیں چلے گا۔ تجھے بھی اب کچھ نہ کچھ ذمہ داری سنبھالنی ہی ہوگی۔ بلکہ ساری ہی سنبھال لے۔"

"جلدی نہ کر۔ تو جو کہے گی ویسا ہی کروں۔" رحیم داد نے اسے باور کرانے کی کوشش کی۔ "پہلے نادر کو زمیں داری کے معاملات سمجھ لینے دے۔ تو کہہ تو میں بھی اس کے ساتھ آجایا کروں' ابھی تو مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

"ضرور آجایا کر۔ تجھے یہاں آنے سے کس نے روکا ہے۔" جمیلہ نے اس کی حوصلہ شکنی نہ کی۔ "چوہدری! جب تو نے اپنی مدد کے لیے نادر کو مینجر رکھ ہی لیا ہے تو زمیں داری کی دیکھ بھال بھی تجھے ہی کرنی چاہیے۔ میں کہاں تحصیل دار اور گرداور کے دفتروں اور کچہریوں کے چکر کاٹتی پھروں گی۔ زمیں داری تو سچ پوچھ اسی کا نام ہے۔ ورنہ زمیں دار کون سا ہل چلاتے ہیں۔ نہ بوائی کرتے ہیں نہ فصل کی واڈھی۔ پر نتو پیداوار سے آدھا حصہ وصول کرلیتے ہیں۔ عام طور پر تو اس سے بھی زیادہ لیتے ہیں۔ ویسے بھی پیداگیری کے لیے زمیں داروں کے اور بھی نہ جانے کتنے دھندے اور ہتھکنڈے ہیں۔ طرح طرح کے ٹیکس اور ابواب ہیں۔"

نادر خاں نے دبی زبان سے اختلاف کیا۔ "زمیں داری میں تو جی ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ورنہ زمیں دار کا کام کیسے چلے۔ میں تجھ سے کیا بتاؤں زمیں دارنی' ان آنکھوں سے میں نے کیا کیا دیکھا ہے۔"

"ضرور دیکھا ہوگا۔" جمیلہ نے بے زاری سے کہا۔ "مجھے بھی تھوڑا بہت پتہ ہے۔ تب ہی تو میں ہیرا پھیری کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتی۔ میں تو سچ پوچھ' اب سکول اور ڈسپنسری پر پوری طرح دھیان دینا چاہتی ہوں۔ عدت میں ہونے کے کارن سکول بھی نہیں جاسکتی۔ ڈسپنسری کا کام بھی ٹھیک سے شروع نہ ہوسکا۔" اس کا لہجہ قدرے تیکھا ہوگیا۔ "پر میں سکول میں پڑھائی بند نہیں کرسکتی۔ اب تو ایک ہی ٹیچر رہ گیا ہے۔ وہ بھی روز روز بیمار رہتا ہے۔ چھٹی بھی مانگ رہا تھا۔ تب ہی تو بالکوں نے سکول جانا چھوڑ دیا۔ پہلے تو دور دور کے پنڈ سے بچے بالک پڑھنے آتے تھے۔" اس کے رویئے سے جھنجلاہٹ جھلکنے لگی۔ "میں سکول بند نہیں ہونے دوں گی۔ میں زیادہ دنوں تک اس طرح حویلی میں بند نہیں رہ سکتی۔"

"ملاں جی سے پوچھ لے۔" رحیم داد نے مشورہ دیا۔

"اس سے بھی پوچھ لوں گی۔" جمیلہ کا لہجہ بدستور تیز اور تیکھا تھا۔ "ویسے سکول' حویلی کے سامنے ہی تو ہے۔ سو' سوا سو گز دور ہوگا۔ اور اس میں کیول بالک ہی تو ہوتے ہیں۔"

کمرے میں خاموشی چھاگئی۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ مگر نادر خاں زیادہ دیر چپ نہ رہ سکا۔ اس نے کہا۔ "اچھا جی یہ تو طے ہوگیا' میں کل سویرے سے زمیں دارنی کے پاس پابندی سے آتا رہوں گا۔ زمیں داری کے معاملات سمجھوں گا۔ آگے جو کرنا ہوگا وہ زمیں دارنی ہی کے حکم اور مشورے سے کروں گا۔"

رحیم داد نے کہا۔ "میں بھی تیرے ساتھ آتا رہوں گا۔ مہمان خانے میں خالی پڑے پڑے دل تنگ آگیا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو کرتے ہی رہنا چاہیے۔"

"چوہدری! تجھے تو اب بہت کچھ کرنا ہے۔" جمیلہ بولی۔ "تو نے بہت دن آرام کرلیا۔ تو ضرور نادر کے ساتھ آنا۔ میں تو پہلے ہی یہ کہہ چکی ہوں۔"

بات چیت کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ محفل برخاست ہوگئی۔ دونوں جمیلہ سے رخصت ہوکر باہر نکلے۔ واپسی پر وہ بہت مطمئن اور خوش نظر آتے تھے۔ وہ جو کچھ چاہتے تھے اور جیسا چاہتے تھے وہی ہوا۔ جمیلہ ان کی راہ میں حائل نہ ہوئی۔ وہ بغیر کسی تلخی اور جھک جھک کے سب کچھ ان کے حوالے کرنے پر رضامند ہوگئی تھی۔

☆

مہمان خانہ خالی تھا۔ احمد موجود نہ تھا۔ رحیم داد اور نادر خاں کمرے میں جاکر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نادر خاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تو جی ڈر رہا تھا' زمیں دارنی گڑبڑ کرے گی۔ آسانی سے نہ مانے گی۔ جھگڑا کھڑا کرے گی۔ پر اس نے تو کچھ بھی نہ کہا۔ شروع میں ذرا اکڑی اکڑی تھی۔ بعد میں تو بالکل پٹڑی پر آگئی۔"

"میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا' وہ دل کی بری نہیں۔ پر ایک بات ہے۔ تو ہے بہت ہوشیار۔ ایسے دکھ بھرے انداز میں اپنے بارے میں اسے بتایا کہ میرا دل بھی ڈوبنے لگا۔ جمیلہ تو اس معاملے میں ویسے ہی بہت کمزور اور نرم دل ہے۔ وہ کسی کو تکلیف اور دکھ میں تو دیکھ ہی نہیں سکتی۔"

"پر چوہدری، میں نے اسے جو کچھ کہا، ٹھیک ہی کہا تھا۔" نادر خاں نے صفائی پیش کی۔ "یہ اہم بات ہے، میں نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا، اسے اس طرح بیان کیا کہ وہ موم کی طرح پگھل گئی۔ تیرا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ وہ دل کی بری نہیں۔ اور جی یہ بھی سچی گل ہے وہ دل کی جتنی بھلی ہے اتنی ہی خوبصورت اور سوہنی بھی ہے۔ رانڈ ہونے کے بعد بھی اس کا چہرہ اب بھی ایسا دمکتا ہے کہ نظر نہیں ٹھہرتی۔ جب رنگین ریشمی کپڑے پہن کر، سنگھار کیے ہوتی ہوگی تب تو اس کی اور ہی شان ہوتی ہوگی۔"

"تو نے جمیلہ کو ان دنوں نہیں دیکھا۔" رحیم داد نے اتنا ہی کہا تھا کہ باہر صحن میں قدموں کی آہٹ ابھری۔ رحیم داد خاموش ہوگیا۔ گردن بڑھا کر کمرے سے باہر دیکھا۔ وکیل، مہمان خانے کے ملازم احمد کے ہم راہ صحن عبور کرکے برآمدے میں داخل ہو رہا تھا۔

وکیل محمد عثمان رندھاوا کمرے کے اندر آگیا۔ احمد واپس چلا گیا۔ رحیم داد نے اٹھ کر وکیل سے مصافحہ کیا۔ کرسی پر بٹھایا۔ خیریت پوچھی۔ ہنس کر آنے کا مقصد معلوم کیا۔

"آج کیسے ادھر آنا ہوا؟"

"چوہدری! میں تیرے کلیم کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔" وکیل بات کہتے کہتے ٹھٹکا۔ پلٹ کر نادر خاں کو مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

رحیم داد فوراً بھانپ گیا۔ مسکرا کر بولا۔ "یہ نادر خاں ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر نادر خاں کی طرف اشارہ کیا۔ "میں نے اسے زمیں داری کے لیے مینجر لگایا ہے۔ اپنا ہی بندہ ہے۔ بے فکر ہو کر گل بات کرو جی۔"

"یہ تیرا مینجر ہے۔" وکیل نے نادر خاں کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "ویسے میں نے اسے کئی بار یہاں دیکھا ہے۔"

"اسے زیادہ دن نہیں ہوئے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "کچھ ہی دیر پہلے اسے زمیں دارنی کے پاس بھی لے گیا تھا۔ اس نے بھی اسے پہلی ہی بار دیکھا تھا۔" اس نے بات کا رخ بدلا۔ "تسیں زمیں دارنی سے نہیں ملے؟"

"نہیں، میں اس کے پاس نہیں گیا۔ اس معاملے میں تجھ سے ہی بات کرنی ہے۔ زمیں دارنی عدت میں ہے۔ ویسے بھی وہ کیا کر سکتی ہے۔"

"میں تو جی ابھی تک یہی نہیں سمجھ سکا، چکر کیا ہے۔ مجھے تو اس بارے میں کسی نے بھی کچھ نہیں بتایا۔" رحیم داد نے اللہ دسایا کے قتل کی تفتیش کے بارے میں بھی پوچھا۔ "اور جی اللہ دسایا کے

لے کا کیا بنا؟ کوئی گرفتاری شرفتاری ہوئی؟"

وکیل نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "اب تک کچھ نہیں ہوا۔ لگتا ہے پولس نے کیس بالکل دبا دیا۔ میں نے جب بھی پوچھا، یہی جواب ملا، قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں لگا۔ پولس کا خیال ہے، اللہ دسایا کا قتل زمیں دارنی کے بھائیوں نے کرایا ہے۔ قاتل سرحد پار سے آئے اور واردات کے فوراً ہی بعد رات کے اندھیرے میں نکل گئے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر نادر خاں بول پڑا۔ "وکیل صاحب! یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ زمیندار اللہ دسایا کے کتل کو اڑھائی مہینے سے اوپر ہی ہوگئے ہوں گے۔ اگر زمیں دارنی کے بھائیوں نے اس کو کتل کرایا ہوتا تو وہ اب تک زمیں دارنی کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتے۔"

"میں نے بھی پولس سے یہی سوال کیا تھا۔" وکیل نے بتایا۔

"کیا جواب ملا؟" نادر خاں نے دریافت کیا۔

"پولیس کا کہنا ہے، واردات کے بعد سے اس علاقے کی کڑی نگرانی شروع کردی گئی۔ زمیں دارنی کے بھائیوں کو کسی نے یہ اطلاع پہنچا دی ہے۔ اس لیے انھوں نے ابھی ادھر آنے کی کوشش نہیں کی۔"

"میں تو کہتا ہوں جی، زمیں دارنی ان کے ساتھ جائے گی بھی نہیں۔" رحیم داد نے اپنی رائے ظاہر کی۔ "وہ جانا چاہتی تو اللہ دسایا کی زندگی ہی میں جا سکتی تھی۔ پر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ تو یہیں رہنا چاہتی ہے۔ سچی بات یہ ہے جی، وہ جمیلہ سے دوبارہ پاروتی بننا نہیں چاہتی۔ ایک بار مسلمان ہونے کے بعد وہ کیسے ہندنی بن سکتی ہے۔"

"میں نے بھی اس کی باتوں سے یہی اندازہ لگایا ہے۔" وکیل نے رحیم داد کی تائید کی۔ "وہ یہاں سے ہرگز نہیں جائے گی۔"

رحیم داد نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ "اچھا جی، اب یہ تو ملوم ہونا چاہیے کہ اپنے کلیم میں کیا گڑبڑ ہے؟"

"اللہ دسایا تو یہ بات بتانا نہیں چاہتا تھا پر میں تجھے بتاتا ہوں۔" وکیل نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔ "بات یہ ہے چوہدری، کسی نے اوپر درخواست لگائی ہے کہ تیرا کلیم جعلی ہے۔ لہٰذا اس کلیم کی بنیاد پر تجھے جو اراضی اور جائیداد الاٹ ہوئی ہے، منسوخ کی جائے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "اللہ دسایا تجھے اسی لیے کچھ بتانا نہ چاہتا تھا کہ تو پریشان ہوگا۔"

"پریشانی کی تو بات ہی ہے۔ پر درخواست لگانے والا ہے کون؟"

"اس کا نام محمد بشیر ہے۔ وہ بھی خود کو ضلع گورداسپور کا مہاجر بتاتا ہے۔" وکیل نے رحیم داد مطلع کیا۔

"میں تو کسی محمد بشیر کو نہیں جانتا۔" رحیم داد بدستور پریشان تھا۔ "پر اسے میرے خلاف درخواست لگانے سے کیا ملے گا؟"

"اگر درخواست درست ثابت ہوئی تو اسے انعام مل سکتا ہے۔" وکیل نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "حکومت نے جعلی کلیموں کا سراغ بتانے والوں کے لیے انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ بات تو تجھے بھی معلوم ہوگی۔"

"میں نوں تو جی کچھ پتہ نہیں۔" رحیم داد نے سادگی سے اپنی بے خبری کا اعتراف کیا۔ "پر اس درخواست کا بنا کیا؟"

"اس پر انکوائری کا حکم دیا جا چکا ہے۔" وکیل نے کھل کر بتایا۔ "کلیم دوبارہ تصدیق کے لیے بھیجا جا سکتا ہے۔ اور اس وقت تک کے لیے تیری الاٹمنٹ بھی معطل ہو سکتی ہے۔"

"تو فیر اپنی طرف سے کیا کارروائی کی گئی؟ میں نوں تو کچھ بھی معلوم نہیں۔" رحیم داد کے چہرے سے پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ وکیل کو باور کرانے کے لیے زور دے کر کہا۔ "ویسے جی' یہ درخواست بالکل جھوٹی ہے۔ میرے کلیم میں ذرا بھی گڑ نہیں۔"

"چوہدری! تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" وکیل نے اسے تسلی دی۔ "لیکن جعلی کلیموں کا کاروبار آج کل اتنا بڑھ گیا ہے کہ سرکار کو ذرا بھی شبہ ہوتا ہے تو فوراً کارروائی کی جاتی ہے۔ محکمہ کاری بہت چوکنا اور چوکس ہے۔ ہر درخواست پر جھٹ انکوائری کا حکم جاری کر دیا جاتا ہے۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "کیا بنا انکوائری شنکوائری کا؟"

"اللہ وسایا کے مشورے پر میں نے انکوائری رکوا دی تھی۔ اس طرح اس وقت معاملہ دب تھا۔ پر اب اطلاع ملی ہے دوبارہ انکوائری شروع ہونے والی ہے۔ اس سے بچنے کی یہی صورت کہ فائل ایک بار پھر دبوا دی جائے۔ پہلے ہزار روپے دیئے تھے' اب دو ہزار دینے پڑیں گے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دو ہزار روپے دے کر ایک بار فیر معاملہ دبا بھی دیا گیا تب بھی کسی وقت اٹھ سکتا ہے۔"

"بالکل اٹھ سکتا ہے۔" وکیل نے اعتراف کیا۔ "اور یہ بھی سمجھ لے کہ انکوائری اگر شروع ہو گئی تو تیری الاٹمنٹ بھی منسوخ ہو جائے گی۔ یہی سب سے بڑا خطرہ ہے ے لیے پہلے بھی معاملے کو دبا دیا گیا تھا۔"

"یہ تو بہت پریشانی کی گل ہے۔" رحیم داد کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے جھلکنے لگے جن کو وہ بار بار پونچھتا۔

"اس خطرے سے مکمل طور پر بچنے کی ایک ہی صورت ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"جو کلیم افسر انکوائری کر رہا ہے۔" وکیل نے بتایا۔ "وہ پانچ ہزار روپے مانگتا ہے۔ کہتا ہے کہ درخواست کے ساتھ پوری فائل ہی تیرے سامنے پھاڑ کر جلا دے گا۔"

"ایسا ہو جائے تو سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔" رحیم داد کے چہرے سے قدرے اطمینان جھلکنے لگا۔ مگر جلد ہی پھر پریشانی چھا گئی۔ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "پر سوال تو یہ ہے کہ پنج ہزار روپے آئیں گے کہاں سے؟ اتنا روپیہ نہ میرے پاس ہے نہ زمیں دارنی کے۔"

"سوچ لے چوہدری! اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ افسر تحقیقات سے کچھ دنوں کی مہلت لے لوں۔"

"کتنے دنوں کی مہلت مل جائے گی؟" رحیم داد نے وکیل سے پوچھا۔

"میرے کہنے پر وہ مہینہ بھر انتظار کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔" وکیل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "مجھے اب جانا ہے۔ چوہدری! تو جلد سے جلد روپے کا بندوبست کر لے ورنہ الاٹمنٹ ایک بار معطل یا منسوخ ہو گئی تو دوبارہ حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ بات اصلی یہ ہے جی کلیم ہولڈر بہت زیادہ تعداد میں ہیں اور متروکہ جائیداد اب اتنی کم رہ گئی ہے کہ کلیم ہولڈر چھپی ہوئی متروکہ جائیداد کا پتہ لگانے کے لیے روپیہ بھی خرچ کر رہے ہیں اور بھاگ دوڑ میں بھی مصروف ہیں' تاکہ حالیہ سرکاری احکامات کی رو سے اس خدمت کے صلے میں انھیں اس کی الاٹ منٹ مل جائے۔"

"تمیں نوں زمیں دارنی سے نہیں ملنا؟" رحیم داد نے اسے ٹوکا۔

"میں دوبارہ آؤں گا۔ اس سے بھی ملوں گا اور تجھے صحیح صورت حال بتاؤں گا۔ اس عرصے میں رقم کا بندوبست کرنے کی کوشش کر۔"

وکیل عثمان رندھاوا چلا گیا۔ کمرے میں سکوت پھیل گیا۔ رحیم داد کے چہرے پر پریشانی چھائی تھی۔ نادر خاں نے اسے اس قدر پریشان پایا تو دل جوئی کی کوشش کی۔

"چوہدری! فکر کرنے کی کوئی گل نہیں۔ ویسے تو شاہ جی سے مل کر پانچ ہزار روپے کا بندوبست بھی کیا جا سکتا ہے۔ مجھے پورا پورا بھروسہ ہے وہ انکار نہیں کرے گا۔ تیری ہر طرح مدد کرے گا۔"

اس نے نظر بھر کر رحیم داد کے چہرے کو دیکھا۔ "پر میں سمجھتا ہوں اس سے کم میں بھی کام ہو سکتا ہے۔ آباد کاری کے محکمے میں اپنی بہت جان پہچان ہے۔ آئندہ وکیل آئے تو اس سے کلیم کے کاغذات واپس لے لینا۔ آگے کی تو مجھ پر چھوڑ دے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "ایک فائل ہی تو غائب کرانی ہے۔ اس کے لیے پانچ ہزار کی رکم بہت زیادہ ہے۔ میں بہت کم میں کام کرادوں گا۔ ہو سکتا ہے ہزار روپے میں کام ہو جائے۔ میری تو یہی کوشش ہوگی۔"

"صرف ہزار روپے میں!" رحیم داد حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "نہیں جی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

نادر نے گردن اونچی کی۔ مستعدی سے بولا۔ "چوہدری! تو نے مجھے مینجر لگایا ہے۔ اب مجھے اپنی کارگزاری دکھانے کا موکع بھی تو دے۔ یہ تو کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ وکت آنے پر تو خود دیکھ لے گا میں کتنے کام کا بندہ ہوں اور کیسی کیسی خدمت انجام دے سکتا ہوں؟ تو مجھ پر پورا پورا اعتبار کر سکتا ہے۔" اس نے ایک بار پھر رحیم داد کو تسلی دی۔ "فکر کرنے یا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

دونوں کچھ دیر اس مسئلہ پر بات کرتے رہے۔ رحیم داد اپنے کلیم کے بارے میں بہت پریشان اور گھبرایا ہوا تھا۔ اسے اپنی زمیں داری نکل جانے کا خطرہ رہ رہ کر ڈرا رہا تھا۔ لیکن نادر خاں نے اس طرح تسلی دی اور اس اعتماد کے ساتھ حوصلہ بڑھایا کہ وہ بہت حد تک مطمئن ہو گیا۔ نادر اب اس کی ایک اہم ضرورت بن گیا تھا۔

☆

رحیم داد اور نادر خاں پروگرام کے مطابق جمیلہ کے پاس پہنچے۔ وہ گول کمرے میں دونوں کا انتظار کر رہی تھی۔ ان کے پہنچتے ہی اس نے زمیں داری کے کاغذات اور رجسٹر منگوائے۔ وہ انھیں دیکھتی رہی اور ضروری تفصیلات بتاتی رہی۔ نادر خاں بیچ بیچ میں سوالات کرتا جاتا۔ جمیلہ ان کے جواب دیتی' وضاحت کرتی۔ جو بات نادر خاں کی سمجھ میں نہ آتی اسے دوبارہ بیان کرتی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا اور زمیں داری کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کرتا رہا۔

کئی روز تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نادر خاں ایک ایک دستاویز اور کاغذ دیکھتا۔ رجسٹروں کے اوراق الٹتا پلٹتا۔ ہر تحریر کو توجہ سے پڑھتا۔ جو پوچھنا ہوتا بے دھڑک پوچھتا۔ کہیں کہیں اپنی رائے کا بھی اظہار کرتا۔ مشورہ بھی دیتا جاتا۔ تبصرہ بھی کرتا۔ اس طرح وہ جمیلہ پر اپنے تجربے اور معلومات کی دھاک بٹھانا چاہتا تھا۔ اور اس میں وہ کامیاب بھی رہا۔ جمیلہ اس کی باتوں سے خاصی متاثر نظر آتی تھی۔

انھی دنوں کا ذکر ہے۔ ایک شام رحیم داد باغ میں بیٹھا تھا۔ نادر بھی موجود تھا۔ ان کے سروں پر صاف شفاف نیلا آسمان جھلک رہا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ہوا میں نرمی اور شگفتگی تھی۔ برسات کے آخری ایام کی یہ دم بہ دم رنگ بدلتی شام بڑی سہانی اور خوشگوار تھی۔ رحیم داد فضا کی رنگینی سے کچھ اس قدر متاثر ہوا کہ اس کا چہل قدمی کو جی چاہا۔ وہ اٹھا تو نادر خاں بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں ٹہلتے ہوئے نہر کی طرف نکل گئے۔

سورج کی الوداعی کرنیں درختوں کی بلندیوں پر سونا بکھیر رہی تھیں۔ شام کا دھندلکا ہولے ہولے فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ روشنی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ رحیم داد اور نادر خاں واپسی کا ارادہ کر رہے تھے کہ دور سے شیدا آتا نظر آیا۔ نادر خاں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ کہنے لگا۔ "چوہدری! یہ تو شاہ جی کا ملازم' شیدا نظر آتا ہے۔ لگتا ہے اسے شاہ جی نے تیرے پاس بھیجا ہے۔" دونوں ٹھہر گئے۔ ذرا دیر میں شیدا قریب آگیا۔

رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔ "شیدے! تو آج ادھر کیسے آگیا؟"

"شاہ جی نے تجھے بلوایا ہے۔ کہا ہے کل شام اس کی جیپ یہاں پہنچ جائے گی۔ وہ تیرا انتظار کرے گا۔"

"شاہ جی سے بولنا' جیپ ادھر نہ بھیجے۔" رحیم داد نے تاکید کی۔ "میں کل نہیں' پرسوں شام تک اس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔" وہ لحہ بھر کے لیے خاموش رہا۔ پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔ "کوئی بہت ضروری کام تو نہیں؟"

"پتہ نہیں جی۔" شیدے نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ "کوئی کام ہی ہوگا۔ تب ہی تو بلوایا ہے۔"

رحیم داد نے مزید بات نہ کی۔ صرف اس قدر کہا۔ "اب تو جا۔ شاہ جی سے کہنا' میں ضرور آؤں گا۔"

شیدا چلا گیا۔ رحیم داد اور نادر گاؤں کی طرف واپس ہوئے۔ رحیم داد نے چلتے چلتے نادر سے کہا۔ "میں شاہ جی سے خود بھی ملنا چاہتا تھا۔ ضروری بات چیت کرنی تھی۔ اب تو اس نے خود ہی لوایا ہے۔ جانا ہی پڑے گا۔"

"شاہ جی' تیں نوں بہت مانتا ہے۔ جب بھی میرے سامنے ذکر آیا اس نے ہمیشہ محبت اور پیار سے یاد کیا۔ کہنے کو تو وہ ادھر کا بہت وڈا جگیر دار ہے پر یاروں کا یار ہے۔ وکت پر کام آنے والا۔ یک بار جو وعدہ کرے گا اسے پورا کرنے کی ہر طرح کوشش کرے گا۔ بڑے لوگوں کی یہی تو خوبی رتی ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ اس نے نادر خاں کی باتوں پر کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ کچھ دور تک خاموش چلتا رہا، پھر اس نے مڑ کر نادر خاں کی جانب دیکھا۔

"نادر! تو جمیلہ سے زمیں داری کے معاملات جلد سے جلد سمجھنے کی کوشش کر۔"

"وہ تو جی میں کر ہی رہا ہوں۔"

"یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ پر اب میں تیرے ساتھ جمیلہ کے پاس نہ جا سکوں گا۔ شاہ جی کے پاس جانا ضروری ہے۔ اس نے بلایا بھی ہے۔ مہمان خانے میں خالی پڑے پڑے دل بھی گھبرا ہے۔ شاہ جی کے ساتھ اچھا وکھت گزرے گا۔"

"چوہدری! میں تو کہتا ہوں اس دفعہ شاہ جی کے ساتھ ہفتہ دس روز گزار۔ ذرا طبیعت بہل جائے گی۔" نادر نے مشورہ دیا۔ "ادھر کی فکر نہ کر۔ میں زمیں دارنی سے سارا حساب کتاب سمجھ لوں گا۔ اگر اس نے کاغذات اور رجسٹر دے دیئے تو انہیں اپنی تحویل میں لے لوں گا۔ شاہ جی کے ساتھ آرام سے وکت گزار۔ ادھر مجھے جس کام پر لگایا ہے اسے جھٹیتی نال پورا کر لوں گا۔"

"کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔" رحیم داد نے اس کا مشورہ قبول کرنے کا عندیہ دیا۔ "جمیلہ کے پاس جا کر میں کرتا بھی کیا ہوں۔ چپ کر کے بیٹھا ہی رہتا ہوں۔ تم دونوں کی باتیں سنتا رہتا ہوں۔ زمینداری کے بارے میں میں نوں جو کچھ سمجھنا تھا سمجھ لیا۔ اب تو تیرے سمجھنے اور جاننے کی باتیں ہیں۔ تو انھیں سمجھ ہی لے گا۔ کاغذات اور رجسٹر جمیلہ آسانی سے دے سکے تو انھیں ضرور اپنی تحویل میں لینے کی کوشش کرنا۔"

"وہ تو جی میں کر ہی لوں گا۔ امید تو ہے وہ کاغذات اور رجسٹر میرے حوالے کر دے گی۔" نادر خاں نے اپنے اعتماد کا اظہار کیا۔ "پر ایک گل سمجھ نہیں آ رہی۔"

"وہ کیا ہے؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"چوہدری! تسیں اتنے دن پنڈ سے غیر حاضر رہنے کا زمیں دارنی سے کیا بہانہ بناؤ گے؟" نادر خاں نے اپنی الجھن بیان کی۔

"یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔" رحیم داد نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے باغ میں واپس پہنچ گئے۔ شام کا اندھیرا اب ہر طرف پھیل گیا تھا۔ گاؤں کے گھروں سے چولہوں کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ جگہ جگہ چراغ جھلملاتے نظر آتے تھے۔ باغ کے ایک گوشے میں نوکروں نے لیمپ روشن کر دیا تھا۔ رحیم داد تھکا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا مگر نادر خاں نہ ٹھہرا۔ وہ رحیم داد سے اجازت لے کر مہمان خانے کی سمت چلا گیا۔

صبح ناشتے کے بعد معمول کے مطابق دونوں جمیلہ کے پاس پہنچے۔ نادر دیر تک جمیلہ سے زمیں داری کے بارے میں تبادلہ خیالات کرتا رہا۔ ضروری باتیں پوچھتا رہا۔ وہ اسے بتاتی رہی۔ ہر بات سمجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ لگ بھگ سات سال کا حساب تھا۔ کچھ رجسٹروں میں درج تھا، کچھ رسیدوں اور کاغذ کے پرزوں پر متفرق شکل میں تھا۔ دستاویزات بھی اسی طرح منتشر اور بے ترتیب تھیں۔ نادر خاں ہر بات اور ہر تفصیل سمجھنا چاہتا تھا۔

جمیلہ حافظے اور یادداشت سے کام لیتی۔ بار بار الجھتی اور جب کسی معاملے میں زیادہ الجھن میں پڑ جاتی تو بات ادھوری چھوڑ کر دوسرے روز بتانے کا وعدہ کرتی۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ نادر ایک پرانے بیع نامے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ جمیلہ کو صحیح طور پر اس کی نوعیت کا علم نہ تھا۔ اس نے بار بار ذہن پر زور دیا مگر کچھ یاد نہ آیا۔ آخر اس نے زچ ہو کر بے زاری سے کہا۔

"نادر! میں اس کے بارے میں کل سوچ کر بتاؤں گی۔ آج مجھے یاد نہیں آ رہا۔ اللہ وسایا کے مرنے کے بعد مجھے بھولنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ پہلے ایسی نہ تھی۔ دماغ پر ذرا زور دیا فوراً یاد آ جاتا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "جانے مجھے کیا ہو گیا۔" اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے نادر کو دیکھا۔ "اب تو جا۔ تجھ سے کل سویرے گل بات ہو گی۔"

نادر خاں نے کسی قسم کا اصرار نہ کیا۔ مودب ہو کر بولا۔ "ٹھیک ہے زمیں دارنی! جیسی تیری مرضی۔ کل بات ہو جائے گی۔" اس نے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات سمیٹے۔ مسلیں اکٹھا کیں انھیں تہہ کر کے رجسٹروں پر رکھا اور بستہ باندھ کر جمیلہ کے سامنے بڑھا دیا۔ وہ رخصت ہونے کے لیے اٹھا۔ جمیلہ سے پوچھا۔

"مجھے اجازت ہے جی۔ میں کل صبح آ جاؤں گا۔"

رحیم داد، جو دیر سے چپ بیٹھا تھا۔ نادر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "نادر! تو جا۔ میں نوں زمیں دارنی سے کچھ ضروری گل بات کرنی ہے۔"

نادر خاں خاموشی سے چلا گیا۔

جمیلہ نے رحیم داد سے دریافت کیا۔ "چوہدری! تجھے ایسی کیا ضروری گل بات کرنی ہے۔ کوئی خاص بات ہے؟"

"خاص بات تو نہیں۔" رحیم داد نے رسان سے کہا۔ "تیں نوں یہ بتانا تھا، میں کل بھاول نگر جا رہا ہوں۔ اب تجھ سے واپسی پر ہی مل سکوں گا۔"

جمیلہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دریافت کیا۔ "چوہدری! تو بھاول نگر جا رہا ہے؟"

والی ہے' تیرے بچوں کی ماں ہے۔ تجھے چاہیے کہ اسے خوش رکھے۔"

"میں تو جی اسے خوش رکھنے کی اپنے طور پر بہت کوشش کرتا ہوں' پر وہ تو بیکار کا جھگڑا کھڑا کر دیتی ہے۔"

رحیم داد نے تاراں کا ذکر جان بوجھ کر چھیڑا تھا۔ وہ اسے احمد کے ذریعے بلانا چاہتا تھا' مگر ہمت نہ پڑی۔ احمد چلا گیا۔

رحیم داد صحن میں پڑی ہوئی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ ہوا نرم اور خنک تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل بکھرے ہوئے تھے۔ بارش کا کوئی امکان نہیں تھا۔ رحیم داد زیادہ دیر خاموش نہ بیٹھ سکا' بے چین ہو کر اٹھا اور آہستہ آہستہ صحن میں ٹہلنے لگا۔ وہ ادھیڑبن میں مبتلا تھا۔ بار بار سوچ رہا تھا کہ احمد نے اللہ وسایا کے قتل کے بارے میں جس خیال کا اظہار کیا ہے' اگر اسے گاؤں میں پھیلا دیا جائے اور پولیس کے کانوں میں بھی ڈال دیا جائے تو نہ صرف تفتیش کی نوعیت بدل جائے گی بلکہ قتل کی واردات دبانا بھی آسان ہو جائے گا۔ مگر پولیس کو اس انداز سے سوچنے پر صرف احسان شاہ تیار کر سکتا ہے۔

اس نے بستر پر لیٹتے ہوئے طے کیا کہ اسے فوری طور پر احسان شاہ سے ملنا چاہیے۔ رحیم داد کو اس نے بلایا بھی تھا۔

احمد رات بھر نہیں آیا۔ مگر صبح وہ مہمان خانے میں موجود تھا۔ اس نے نہایت مستعدی سے ناشتا میز پر چنا۔ رحیم داد ناشتا کرنے لگا۔ احمد نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے رات کو پتہ کیا' پنڈ کے کئی مزارعوں کا بھی یہی خیال ہے' اللہ وسایا کو زمیں دارنی کے بھائیوں نے کتل کیا ہے۔"

"بابر ہی نے ان سے بھی کہا ہوگا۔"

"پتہ نہیں جی! ویسے گل سمجھ بھی آتی ہے۔ وہ ایسا ہے جی' زمیں دارنی کا پیو ادھر کا بہت وڈا زمیں دار ہوتا تھا۔ اللہ وسایا اور اس کا پیو تو اس کے بہت معمولی مزارعے تھے۔ میں تو جی ان دنوں بھی اسی پنڈ میں تھا۔ جنسی لال مینجر ہوتا تھا۔ ساری زمیں داری کی دیکھ بھال' سچ تو یہ ہے' وہی کرتا تھا۔ اس نے ناراض ہو کر اللہ وسایا اور اس کے پیو کو بے دخل کر دیا تھا۔"

رحیم داد درمیان میں بول پڑا۔ "یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔"

احمد نے اس کے ٹوکنے پر مطلق توجہ نہ دی۔ "یہ تو سوچ' زمیں دارنی کے بھائی یہ کیسے دیکھ سکتے ہیں' ان کی بھین انھی کے معمولی مزارعے اور وہ بھی مسلمان کی گھر والی بن کر رہے۔ عزت اور شان بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں نے تو جی زمیں دارنی کے بھائی ہردیال کو دیکھا ہے۔ کیا اکڑ اور

بان تھی اس کی۔ جب پنڈ میں آتا تھا تو مزارعے اس کے سامنے چپ کر کے کھڑے رہتے تھے۔ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔"

رحیم داد نے اسے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ کس طرح احسان کے پاس پہنچے۔ گھوڑی پر بیٹھ کر وہ اس کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا۔ شک و شبہ پیدا ہونے کا بشہ تھا۔ اس نے احسان شاہ کے پاس جانے کے لیے سڑک کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ یل اور خاصے چکر کا راستہ تھا مگر محفوظ تھا۔

رحیم داد نے ناشتے کے بعد احمد سے کہا۔ "دوپہر کی روٹی کے بعد تانگا لے آنا۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"میں نے چک بیدی جانا ہے۔ وہاں سے لاری پکڑوں گا۔ پاک پتن جاؤں گا۔"

احمد نے دریافت کیا۔ "ادھر کوئی کام ہے؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے جواب دیا۔ "پاک پتن میں بابا شاہ فرید گنج شکر کے مزار پر حاضری دوں گا۔"

"وہاں جانے کا مزا تو جی عرس پر آتا ہے۔ پنج محرم کو عرس ہوتا ہے۔ دور دور سے بندے آتے ہیں۔ زبردست میلہ لگتا ہے۔"

"عرس پر بھی چلا جاؤں گا۔ پہلے بھی عرس پر جا چکا ہوں۔" رحیم داد نے لہجے میں افسردگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "سچی گل پوچھ تو اللہ وسایا کے بعد دل بہت گھبراتا ہے۔ مزار پر حاضری دینے سے دل کو آرام ملے گا۔ اسی لیے جانا چاہتا ہوں۔"

"کب تک واپسی ہوگی؟" احمد نے پوچھا۔

"ارادہ تو رات ہی کو لوٹنے کا ہے پر مشکل لگتا ہے۔ بارشوں نے رستے خراب کر دیے ہیں۔ رات کو سفر کرنا ٹھیک نہیں۔ کل شام تک واپس آجاؤں گا۔ زمیں دارنی پوچھے تو بتا دینا۔"

"وہ تو جی کچھ نہیں پوچھے گی۔ وہ تو روتی رہتی ہے۔ نہ بولتی ہے نہ بات کرتی ہے۔ اسے تو جی زمیں دار کی موت کا بہت دکھ ہے۔ میں نوں نہیں پتہ تھا' وہ اس سے اتنا زیادہ پیار کرتی ہے۔"

رحیم داد نے بات کا رخ موڑا۔ "تاراں بھی تجھ سے اتنا ہی پیار کرتی ہے۔"

"توبہ کرو جی! وہ میری ذرا پروا نہیں کرتی۔" احمد نے گلہ کیا۔ "تیں نوں کیہ پتہ' وہ مجھ سے کتنا جھگڑا کرتی ہے۔ ذرا ذرا سی گل بات پر رولا گولا کرتی ہے۔"

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ احمد چلا گیا۔

یہیں ٹھہرے گا۔"

"اس بار تو میں تیرے ساتھ زیادہ ہی دن ٹھہرنے کے ارادے سے آیا ہوں۔ کپڑے لتے بھی لایا ہوں۔ مہمان خانے میں خالی پڑے پڑے دل بہت گھبراتا تھا۔"

"تیرا ہی گھر ہے۔ چوہدری! جب تک جی چاہے ٹھہر۔" احسان شاہ نے قہقہہ بلند کیا۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے کی گل ہے۔ مجھے تو خوشی ہوگی۔ تیرے ساتھ اچھا وقت کٹ جائے گا۔ اب تو غسل خانے میں جا کر فٹافٹ نہا لے۔ شام کو تیرے ساتھ محفل جمے گی۔"

احسان شاہ نے شیدا کو بلایا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ چلا گیا۔ شیدا نے اس کے ٹھہرنے کے لیے پہلے ہی ایک کمرے میں بندوبست کر دیا تھا۔ رحیم داد نے غسل کیا۔ کمرے میں آیا۔ ٹرنک سے اجلے کپڑے نکال کر پہنے۔ تر و تازہ ہو کر دوبارہ باغ میں پہنچا۔ شام دبے قدموں درختوں کی بلندی سے نیچے اتر رہی تھی۔ احسان شاہ باغ کے ایک گوشے میں بیٹھا تھا۔ سامنے میز پر اسکاچ وہسکی کی بوتل اور دو گلاس رکھے تھے۔

رحیم داد بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مسکرا کر بولا۔ "شاہ جی! تو شام ہونے سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے۔" احسان شاہ نے وہسکی کا گھونٹ بھر کر گلاس میز پر رکھا۔ بھیگی ہوئی مونچھوں کو ہاتھ سے صاف کیا۔ ہنس کر گویا ہوا۔ "چوہدری! اس کے بغیر زندگی میں کوئی لطف نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے سو رہا ہوں، تھک گیا ہوں۔ طبیعت بجھی بجھی رہتی ہے۔ پر دو ڈبل لگاتے ہی نہ سستی رہتی ہے نہ تھکن۔ انگ انگ چہکنے لگتا ہے۔ ایمان لگتی گل اسے اے چوہدری۔" اس نے بوتل کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بھی کیا زوردار چیز ہے۔ وہ کیا کہا ہے، کسی شاعر نے۔

ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

اس مصرعے کو اپنی بھونڈی آواز میں گنگناتے ہوئے اس نے میز پر رکھے ہوئے دوسرے گلاس میں وہسکی انڈیلی۔ پانی ڈالا اور ایک بڑا پیگ بنا کر بولا۔ "چوہدری! اب تو بھی شروع ہو جا۔"

رحیم داد نے گلاس اٹھایا۔ گھونٹ بھرا۔ چند لمحے خاموش رہا۔ وہسکی کی تلخی کا احساس کم ہوا تو بولا۔ "پچھلے دنوں بہت گڑبڑ معاملہ ہو گیا تھا۔"

"کیا ہو گیا۔ کوئی خاص گل بات؟"

"خاص ہی گل بات کہہ لے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "وہ ایسا ہوا جی میں ایک روز جمیلہ کے پاس گیا۔ اس نے باتوں باتوں میں اپنے بارے میں پچھلی باتیں سنائیں۔ سب ہی کچھ بتا دیا۔ کچھ بھی نہ چھپایا۔ اس کی باتیں سن کر طبیعت میں ایسی ایل اٹھی کہ میں نے دل کی بات کہہ دی۔"

"دل کی بات کہہ دی؟" احسان شاہ نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔ "صاف صاف بتا۔"

"پہلے تو میں نے گول مول بات کی۔ فیر دلی زبان سے کہا کہ وہ میری گھر والی بن جائے۔" رحیم دنے بڑا گھونٹ بھرا۔

"کیا بولی وہ؟" احسان شاہ نے دریافت کیا۔

"بولی تو وہ کچھ نہیں۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خوب ٹسوے بہائے۔ اس نے میری بات کو نہ نہیں کیا۔ اس کے اس طرح رونے پر میں نے یہی اندازہ لگایا۔"

"تو نے جلدی کی چوہدری۔" احسان شاہ کے لہجے میں تشویش کا پہلو نمایاں تھا۔ "ابھی ایسی بات لینے کا وقت نہیں آیا۔ تجھے صبر سے کام لینا تھا۔ ایسی باتیں اس طرح نہیں کی جاتیں۔ تیں نوں سے یہ بات کہنی ہی تھی تو کسی اور کے ذریعے کہلواتا۔ یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ یرے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے؟" وہ لمحہ بھر سر جھکائے سوچتا رہا۔ پھر گردن اٹھا کر قدرے یکھے لہجے میں بولا۔ "تو نے سارا معاملہ گڑبڑ کر دیا۔ اب...."

"گڑبڑ تو ہو گیا تھا۔" رحیم داد اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "پر بعد میں سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔"

"وہ کیسے؟" احسان شاہ نے تعجب سے پوچھا۔

"بس ہو گیا۔ شاہ جی تو فکر نہ کر۔" رحیم داد نے احسان شاہ کو اطمینان دلایا۔ "اب اس کے دل ں میری طرف سے کوئی شک و شبہ نہیں رہا۔"

"تجھے یکین ہے؟" احسان شاہ نے استفسار کیا۔

"بالکل یکین ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر جواب دیا۔ "واپس جاؤں گا تو مہمان خانے کی جائے حویلی کے اندر ہی ٹھہروں گا۔ وہ اوپر کی منزل پر رہے گی اور میں نیچے کے حصے میں۔ اس نے ود ہی کہا۔ بلکہ زور دے کر کہا۔ میں تو انکار کرتا رہا۔"

"چوہدری! تو نے کیا چکر چلایا۔ حویلی میں اس کے ساتھ رہا تو وہ آسانی سے تیرے ہاتھ آ جائے گی۔" احسان شاہ کھلکھلا کر ہنسا۔ "پر اب جلد بازی نہ کرنا ورنہ کام خراب ہو جائے گا۔"

رحیم داد نے مزید تفصیل نہ بتائی۔ یہ بھی نہ بتایا کہ وہ تخت محل جا کر اپنے بچھڑے ہوئے بیوی چوں کو لانے کا بہانہ کر کے پیراں والہ آیا ہے۔ وہ خاموشی سے وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔

احسان شاہ نے پوچھا۔ "نادر کیسا چل رہا ہے؟"

"وہ تو جی بہت کام کا بندہ ہے۔" رحیم داد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اس نے جمیلہ کو ایسا رام کیا کہ وہ ساری زمیں داری اور اس کی دستاویزات میرے حوالے کرنے پر خود ہی راضی ہو گئی۔

آج کل وہ نادر کو زمیں داری کے بارے میں ایک ایک بات سمجھا رہی ہے۔ ہر کاغذ اور ہر دستاویز کے بارے میں بتا رہی ہے۔ ویسے شاہ جی وہ دیکھنے میں جتنی ہوشیار اور تیز لگتی ہے اتنی ہے نہیں۔ اس کا دل بہت نرم ہے۔ پہلے تو وہ نادر سے بہت نراض تھی۔ اسے مینجر لگانے کے بہت خلاف تھی۔ پر جب نادر نے اپنی پریشانی اور بے روزگاری کا حال سنایا تو ایک دم موم کی طرح پگھل گئی۔ اسے رکھنے پر فوراً تیار ہو گئی۔ سچی گل تو ایسہ اے وہ کسی کو تکلیف اور پریشانی میں نہیں دیکھ سکتی۔"

"مجھے جمیلہ کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں۔ سنا ہی سنا ہے۔ پر نادر بہت اونچی چیز ہے۔ وہ تیرے لیے بہت کار آمد ثابت ہو گا۔ اب تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ زمیں داری ایسے چلائے گا کہ تجھے بھی زمیں داری کا مزا آجائے گا۔ ابھی تک تو کوٹلہ ہرکشن میں مزارعوں کی چل رہی تھی۔ تجھے پتہ ہے اللہ وسایا تو مزارع تھا اور مزارع ہی رہا۔ اس نے مزارعوں کا ناس مار دیا تھا۔ ان کا دماغ خراب کر دیا تھا۔"

"ان کا دماغ تو اب تک خراب ہی ہے۔" رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اس کا اثر آس پاس کے زمیں داروں پر بھی پڑا۔ وڈے زمیں دار، جن کے پاس مزارعوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، بہت پریشان رہتے تھے۔" احسان شاہ نے اللہ وسایا مرحوم کے خلاف اپنی نفرت اور کدورت کا اظہار کیا۔ "تجھے معلوم نہیں اللہ وسایا کے کتل پر ادھر کے سارے ہی وڈے زمیں دار کتنے خوش ہوئے۔ سب اس سے خار کھاتے تھے۔"

"خطرہ تو اس کی طرف سے مجھے بھی تھا۔"

"بالکل تھا۔" احسان شاہ نے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! تیرے رستے کا کانٹا صاف ہو گیا۔ سچ کہتا ہوں اگر اللہ وسایا کا صفایا نہ ہوتا تو وہ کب کا تجھے صاف کر چکا ہوتا۔ وہ تیری جائیداد پر کبضہ کرنے کی پوری تیاری کر چکا تھا۔ اس کے ارادے بہت خطرناک تھے۔"

رحیم داد نے اس کی باتیں سنیں۔ مگر کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ چپ بیٹھا وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ احسان شاہ کو اس کی خاموشی ناگوار گزری۔ تیکھے لہجے میں بولا۔

"چوہدری، تجھے میری باتوں کا یکین نہیں؟"

رحیم داد ہڑبڑا کر بولا۔ "ہے، بالکل ہے۔" اس نے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے بات بنائی۔ "وہ ایسا ہے جی۔ میں جمیلہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شاہ جی وہ بری زنانی نہیں ہے۔"

"میں نے کب کہا کہ وہ بری ہے۔ وہ تو ایسی زوردار چیز ہے کہ تیرے تو عیش ہو جائیں گے۔

پہلے جو غلطی کر چکا ہے اب اسے نہ دھرانا۔ اسے دھیرے دھیرے رستے پر لانا ہو گا، سمجھا؟"

"سمجھ گیا، بالکل سمجھ گیا۔" رحیم داد گردن ہلا کر بولا۔

احسان شاہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ رحیم داد بھی ہنسنے لگا۔ احسان شاہ نے ترنگ میں آکر رحیم داد کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا۔ وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا۔

"شاہ جی، میں نے ایک خوش خبری تو سنائی نہیں۔"

"سنا، ضرور سنا۔" احسان شاہ لہرا کر بولا۔

"یہ تو تیں نوں پہلے ہی بتا چکا ہوں، جمیلہ تھوڑے دنوں بعد زمیں داری کے سارے کاغذات اور دستاویزات نادر کے حوالے کر دے گی۔" رحیم داد نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "وہ تو زمیں داری سے بالکل الگ ہونا چاہتی ہے۔ کہتی تھی، میں نے زمیں داری سے کیا لینا۔ تو پوری ذمہ داری سنبھال لے میں نے تو اب سکول چلانا اور ڈسپنسری بنانا ہے۔"

احسان شاہ کے چہرے پر مسرت کے بجائے جھنجلاہٹ بکھر گئی۔ نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ "یہ سکول شکول کا چکر ختم کر۔ اسے تو اللہ وسایا کے ساتھ ہی ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ مزارعوں اور کمیوں کے بچے پڑھ لکھ کر ہمارے بچوں کی برابری کریں؟ کانون اور انصاف کی باتیں کریں؟ زمیں داروں کو طرح طرح سے تنگ کریں۔ ان کے خلاف گڑبڑ پھیلائیں؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے شاہ جی، پر جمیلہ اس کے لیے تیار نہیں ہو گی۔" رحیم داد نے احسان شاہ کی خفگی رفع کرنے کی غرض سے اپنی مجبوری بھی بیان کی۔ "تیں نوں پتہ ہے، میں ابھی اسے نراض نہیں کر سکتا۔ ورنہ سارا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"میں فوری طور پر سکول بند کرانے کو نہیں کہہ رہا۔ پر تجھے آگے چل کر ایسا کرنا پڑے گا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کی مجبوری محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "پر تجھے یہ بات ضرور دھیان میں رکھنا چاہیے کہ زمیں داری شان سے چلانی ہے تو مزارعوں کو ان پڑھ رکھنا ہو گا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ ہر وڈا زمیں دار اور جگیردار اس معاملے میں چوکس رہتا ہے۔ میں اس سلسلے میں تجھے سردار سر امام بخش مزاری کا واکعہ بطور مثال سناتا ہوں۔"

"کون تھا وہ؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"وہ ڈیرہ غازی خاں کی تحصیل راجن پور میں روجہاں کے مزاریوں کا تمن دار تھا۔ بہت وڈا جگیردار ہوتا تھا۔ میرے پیو کا گہرا یار تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں جب بلوچوں نے بغاوت کی تو اسے دبانے میں سردار امام بخش نے بھی انگریزوں کی بہت مدد کی۔" احسان شاہ نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔

سرخوشی کے عالم میں قہقہہ بلند کیا۔ "انگریزوں کی بھی کیا بات تھی۔ اپنے دشمنوں کو کچلنے میں جتنے سخت تھے، دوستوں کے لیے اتنا ہی وڈا دل رکھتے تھے۔ سردار امام بخش نے ان کی بھرپور مدد کی تو اس کے صلے میں انھوں نے اسے آنریری مجسٹریٹ بنا دیا۔ جب رابرٹ سنڈیمن ڈپٹی کمشنر لگا تو سردار امام بخش نے انگریزوں کی ہر طرح خدمت کی۔"

"یہ فورٹ سنڈیمن اسی رابرٹ سنڈیمن کے نام پر رکھا گیا؟"

"ہاں جی، یہ وہی سنڈیمن تھا۔ اپنے زمانے کا بہت نامور افسر ہوتا تھا۔ بلوچوں نے بار بار بغاوت کی۔ ان میں بگٹیوں کے علاوہ مزاری بلوچ بھی شامل تھے۔ پر سردار امام بخش کی مدد نے ان کی بغاوتوں کو دبانے میں زبردست کام کیا۔" احسان شاہ ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ "اس خدمت پر انگریز بہت خوش ہوئے۔ پہلے اسے نواب، فیر سر اور فیر صوبائی درباری بنا دیا۔ خطابات کے ساتھ بہت وڈی جگیر بھی دی۔ انگریز اس پر ایسے مہربان ہوئے کہ پنجاب اسمبلی کا ممبر بھی بنا دیا۔ ویسے سردار سر امام بخش ان کا بہت وفادار بندہ تھا۔ بہت ہوشیار اور سمجھ دار بھی تھا۔"

تسیں اس کے بارے میں کوئی واکعہ سنانا چاہتے تھے۔" رحیم داد نے احسان شاہ کو یاد دلایا۔

"ہاں، میں تجھے یہ بتانا چاہتا تھا کہ سردار امام بخش مزاری کتنا ہوشیار تھا۔ ہمیشہ آگے کی سوچتا تھا۔ سچ پوچھ تو دریشکوں نے مزاریوں کو کب کا مٹا دیا ہوتا۔ ان کے ساتھ مزاریوں کی مسلسل لڑائیاں ہوتی رہیں۔ دونوں کبیلوں کے درمیان زبردست دشمنی رہی ہے۔"

"دشمنی ہوئی کس بات پر؟" رحیم داد نے جھوم کر پوچھا۔

"ان دنوں مزاری، خانہ بدوش گلے بان اور چرواہے ہوتے تھے۔ اپنی بھیڑ بکریاں اور چوکھر گنڈاری کی پہاڑیوں پر چرایا کرتے تھے۔ دریشک بھی خانہ بدوش ہوتے تھے۔ وہ مزاریوں کے چوکھر اور مویشی اٹھا کر لے جاتے۔ تب جمال خاں مزاریوں کا سردار ہوتا تھا۔ اس نے دریشکوں پر چڑھائی کر دی اور کوئی پندرہ دریشک مار ڈالے۔ اس کے بعد دونوں کبیلوں نے ایک دوسرے پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ دریشکوں کے ایک حملے میں سردار جمال خاں کی گھر والی بھی ماری گئی اور سردار کی ماں بھی زخمی ہو گئی۔ مزاریوں کے لیے یہ بہت بے عزتی کی بات تھی۔ اس بے عزتی کو وہ برسوں نہ بھولے۔ اس کا بدلہ لینے کے لیے دریشکوں سے لڑائیاں لڑتے رہے۔" احسان شاہ نے اچانک قہقہہ بلند کیا۔ "پر اب مزاری اور دریشک تمن داروں نے مل کر لغاریوں، لنڈ اور کھتران تمن داروں کے خلاف مورچہ لگا رکھا ہے۔"

"تیرا مطلب ہے مزاریوں اور دریشکوں کی پرانی دشمنی ختم ہو گئی؟"

"ختم ہی ہو گئی۔ پر جب تک دونوں میں دشمنی رہی بہت خون خرابہ ہوا۔" احسان شاہ نے جواب دیا۔ "ویسے رنجیت سنگھ کے زمانے میں سکھوں نے بھی مزاریوں کو بہت تنگ کیا۔ دیوان ساون مل کا نام تو سنا ہی ہو گا تو نے۔ وہ رنجیت سنگھ کی طرف سے حاکم لگا ہوا تھا۔ اس نے مزاریوں پر سات ہزار فوج کے ساتھ چڑھائی کر دی۔ ان کے مال مویشی چھین لیے۔ انھیں بھاگ کر پہاڑیوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ آخر لغاریوں کے سردار رحیم خاں نے سکھوں کے ساتھ مزاریوں کی صلح کرا دی۔ ساون مل نے ملتان میں دربار لگایا جس میں مزاریوں کا سردار بہرام خاں خود حاضر ہوا۔ ساون مل نے اسے جگیر کے ساتھ خلعت بھی دی۔"

"یہ عجب گل سنائی۔ لغاری پہلے مزاریوں کے دوست ہوتے تھے اور اب دشمن ہیں۔" رحیم داد آہستہ آہستہ ہنسنے لگا۔ "یہ سردا بہرام خاں کیا سردار امام بخش کا پیو ہوتا تھا؟"

"ہاں، پر بہرام خاں کا پتر دوست علی خاں بھی تھا۔ بہرام خاں کے مرنے پر وہی مزاریوں کا سردار بنا۔ اس کے زمانے میں مزاریوں کا سکھوں سے دوبارہ جھگڑا شروع ہوا۔ سکھوں نے مزاریوں کی بغاوت کو کچل دیا۔ انھیں سندھ کی جانب بھگا دیا۔ ادھر دیوان ساون مل بھی کچھ عرصہ بعد ایک لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے پتر مول راج نے اس کی جگہ سنبھالی اور مزاریوں سے صلح کر لی۔ پر سردار دوست علی خاں بری عادتوں میں پڑ گیا تھا۔ اس لیے اسے ہٹا کر اس کے چھوٹے بھائی امام بخش خاں کو مزاریوں کے سردار کی حیثیت سے جرگے میں منتخب کر لیا گیا۔"

احسان شاہ نشے کی جھونک میں بہک کر اصل موضوع سے ہٹ کر دوسری طرف نکل گیا۔ رحیم داد بھی نشے کی دھن میں بھول چکا تھا کہ بات کہاں سے شروع ہوئی؟ سردار امام بخش کا نام دوبارہ سن کر وہ چونکا۔ اس نے احسان شاہ کو ٹوکا۔

"شاہ جی! اس واکعہ کا کیا بنا؟ وہی سردار امام بخش والا جسے تو سنانا چاہتا تھا۔"

"یاد آ گیا، بالکل یاد آ گیا۔" احسان شاہ خجل ہو کر بولا۔ "بات کدھر سے نکل کر کدھر چلی گئی۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "وہ ایسا ہوا کہ جن دنوں سردار امام بخش اسمبلی کا ممبر ہوتا تھا اسے کسی کام سے کراچی جانا پڑا۔ سٹیشن سے باہر نکل رہا تھا تو ریلوے کا ایک بابو دوڑ کر آگے بڑھا۔ جھک کر سردار کے پیروں کو چھوا اور ہاتھ باندھ کر ادب سے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سردار اسے پہچان نہ سکا۔"

"وہ بندہ تھا کون؟" رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہ سردار امام بخش مزاری کے ایک مزارعے کا پتر تھا۔ بچپن میں گھر سے بھاگ کر کراچی پہنچ گیا

تھا۔ وہاں کسی پارسی کا نوکر لگ گیا۔ اس نے اسے اتنا پڑھا لکھا دیا کہ جوان ہو کر ریلوے میں لگ گیا۔ ویاہ بھی کرلیا تھا۔ بچے بھی تھے۔ اس نے خود ہی سردار کو بتایا۔ سردار میں تیرے بانے کا باز ہوں۔ فیر اس نے اپنا اور اپنے پیو کا نام بتایا۔"

"کیا نام تھا اس کا؟" رحیم داد نے نشے سے لہرا کر پوچھا۔

"یہ تو مجھے پتہ نہیں۔" احسان شاہ نے جواب دیا۔ "سردار امام بخش خاں نے اسے غور سے دیکھا۔ کچھ سوچا اور سوچ کر پوچھا۔ ادھر تجھے کتنی تنخواہ ملتی ہے؟ اس نے بتایا اسے ریلوے سے ۵۰ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ سردار بولا۔ میں تجھے سو روپے تنخواہ دوں گا۔ ادھر کی نوکری چھوڑ اور میرے ساتھ روجھاں چل۔ وہ تیار ہو گیا۔ سردار امام بخش مزاری اسے اپنے ساتھ روجھاں لے آیا۔"

رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دریافت کیا۔ "شاہ جی' بات سمجھ نہیں آئی۔ سردار امام بخش مزاری اسے دگنی تنخواہ پر کراچی سے اپنے ساتھ کیوں لے آیا؟"

"یہی تو اصلی گل ہے جو میں تجھے بتانا چاہتا ہوں۔" احسان شاہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "سردار کے مینجر کو اس کے بارے میں پتہ چلا تو وہ بھی تیری طرح بہت حیران ہوا۔ اسے یہ بات پسند بھی نہ آئی۔ ایک روز باتوں باتوں میں اس نے سردار سے اس کے بارے میں گلہ کیا۔ سردار ایسا بندہ تو ۵۰ روپے سے بھی کم میں مل جائے گا۔ تو اسے سو روپے تنخواہ دے رہا ہے۔ مینجر نے اسے بالکل بیکار اور بہت مہنگا ثابت کرکے نوکری سے نکلوانے کی کوشش کی۔ مگر سردار تیار نہ ہوا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ "چوہدری! تجھے پتہ ہے۔ سردار نے مینجر کا سارا گلہ شکوہ سن کر کیا جواب دیا؟"

"کیا جواب دیا اس نے؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"سردار نے اپنے مینجر سے ہنس کر کہا۔ تو اس راز کو نہیں سمجھ سکتا۔ وہ سو روپے مہینے میں بھی بہت سستا ہے۔ اور اس لیے سستا ہے کہ وہ کراچی میں رہتا تو اس کے بال بچے بھی پڑھتے لکھتے ادھر روجھاں میں اپنے رشتے دار مزارعوں کو ملنے آتے تو ان کے دماغ خراب کرتے۔ انھیں طرح طرح سے بھڑکاتے۔ میں نے وہ رستہ ہی بند کردیا۔ یہاں رہ کر وہ ان پڑھ کے ان پڑھ ہی رہیں گے۔ کبھی خطرہ بن کر سامنے نہیں آئیں گے۔ یہ بات سردار امام بخش مزاری نے میرے پیو کو سنائی تھی۔ اور میں نے اپنے پیو سے سنی۔" احسان شاہ نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ "چوہدری! غور کر سردار امام بخش مزاری کتنا ہوشیار اور سمجھ دار تھا۔ تب ہی تو مزاریوں کا تمن دار اور اتنا وڈا سردار تھا۔ اسے خطابات ملے' جگیر ملی۔ بہت عزت ملی۔ انگریز اسے بہت مانتے تھے۔ اپنا دوست وفادار بندہ سمجھتے تھے۔"

"سردار امام بخش نے اپنے بال بچوں کو تو بالکل پڑھایا لکھایا نہیں ہوگا؟"

"چوہدری! تو بھی کیسی بچوں کی سی گل کرتا ہے۔" احسان شاہ ٹھٹھا مار کر زور سے ہنسا۔ "امام بخش خاں اپنے کبیلے کا سردار تھا۔ بہت وڈا جگیر دار تھا۔ اس کے بال بچے بھی سردار اور جگیردار کے بال بچے تھے۔ کسی مزارعے کے تو نہیں تھے۔ وہ کیوں نہ پڑھتے؟ انہیں تو تعلیم دلانے کے لیے اس نے لندن بھیجا' امریکہ بھیجا۔ بہت پڑھایا لکھایا۔ وہ اور ان کے پتر بھی وڈے وڈے سرکاری افسر لگے۔ انگریزی راج نہ رہا جی تو کیا فرک پڑتا ہے۔ وہ آج بھی وڈے جگیر دار ہیں' سردار اور تمن دار ہیں اور سرکاری افسر بھی لگے ہوئے ہیں۔ یہ سب سردار سرامام بخش کی زبردست خدمات کا صلہ ہے۔" اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ "سردار امام بخش مزاری کی طرح کے دور اندیش اور سمجھ دار جگیردار نہ ہوتے تو اب تک کتنی ہی جاگیریں کب کی ختم ہو چکی ہوتیں۔ بلکہ جگیرداری اور زمین داری ہی سرے سے ختم ہو جاتی۔ ایسے ہی جیسے ہندوستان میں ہوا اور مشرقی بنگال میں ہو رہا ہے۔"

☆

شیدا اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا اور ادب سے سر جھکا کھڑا ہو گیا۔" احسان شاہ نے پوچھا۔ "شیدے' تو نے کچھ کہنا ہے؟"

"ہاں جی' میں نے یہ بتانا ہے' سردار مراد خاں شاہانی آیا ہے۔"

"وہ اپنا بھکروالا شاہانی؟" احسان شاہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "کدھر ہے وہ؟ کب آیا؟" وہ اٹھ کھڑا ہو گیا اور شیدے کے ہم راہ چلا گیا۔

رحیم داد خاموش بیٹھا وہسکی سے شغل کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد احسان علی شاہ واپس آیا۔ رحیم داد نے برآمدے میں رکھے ہوئے لیمپ کی روشنی میں دیکھا' مراد خاں شاہانی اس کے ہم راہ ہے۔ شاہانی کا قد اونچا تھا۔ جسم مضبوط اور صحت مند تھا۔ خوب گھیردار بڑی سی شلوار اور ڈھیلی ڈھالی ڈبل گھوڑا بوسکی کی قمیص میں وہ کچھ زیادہ ہی قوی ہیکل لگ رہا تھا۔ رنگت گندمی تھی۔ ڈاڑھی صاف تھی۔ مونچھیں زیادہ گھنی نہ تھیں۔ مگر چہرے پر رعب اور دبدبہ تھا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ عمر میں وہ احسان شاہ سے بہت چھوٹا تھا۔ رحیم داد اس کی بھاری بھرکم شخصیت سے خاصا مرعوب ہوا۔ وہ احسان شاہ کے ساتھ بے تکلفی سے ہنستا' قہقہے لگاتا آگے بڑھا اور رحیم داد کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ احسان شاہ نے رحیم داد کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے شاہانی سے تعارف کرایا۔

”یہ اپنا یار چوہدری نور الٰہی ہے۔ کوٹلہ ہرکشن میں اس کی زمین داری ہے۔ گورداسپور کا ر ہے۔ میں پہلے بھی تجھ سے اس کا ذکر کر چکا ہوں۔“

مراد خاں شاہانی نے مسکراتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ ”سئیں چوہدری! تو ہے تو جاٹ پر تو ایسا بنا رکھا ہے کہ پہلی نظر میں بلوچ سردار لگتا ہے۔“ اس نے احسان شاہ کی جانب دیکھا۔ ”شاہ میں نے غلط تو نہیں سوچا؟“

”پتہ نہیں چوہدری نے یہ داڑھی کیوں رکھ چھوڑی ہے۔“ احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ ”ا بھی نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتا۔ ورنہ مسجد کا حجرہ چھوڑ کر یہاں کیوں بیٹھا ہوتا؟“

”شاہ جی، تو نے چوہدری کو میرے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔“

”تجھے کون نہیں جانتا۔“ احسان شاہ بولا۔ اس نے مسکراتے ہوئے رحیم داد کی طرف دیکھ ”چوہدری! یہ بھکر میں بیٹ کے علاقے کا وڈا زمیں دار ہے۔ بیٹ میں تین ہی تو زمیندار خاندا ہیں۔ شاہانی، نوانی اور ڈھانڈلے۔“ اس نے گلاس میں وہسکی ڈالی۔ ”زمیں داری کیا ان کی تو اپنی حکمرانی ہے۔ جو چاہیں کریں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ان سے تو پولس اور حکومت بھی ڈ ہے۔“ احسان شاہ نے پیگ بنا کر شاہانی کی جانب بڑھایا۔ ”لے میں نے تیرے لیے ڈبل پ بنایا ہے۔ آیا بھی تو دیر سے ہے۔ ہمارا ساتھ کیسے دے گا۔ ہم دونوں تو شام سے لگے ہوئے ہیں“

شاہانی نے گلاس سنبھالا۔ ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں غٹاغٹ آدھا گلاس خ گیا۔ احسان شاہ نے دریافت کیا۔ ”شاہانی! تو اچانک کیسے آگیا؟“

”سئیں، بال بچوں کے ساتھ لہور آیا تھا۔“ شاہانی نے بتایا تھا۔ ”لہور آکر تیرے پاس نہ آ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے بال بچوں کو واپس بھکر بھیجا اور خود تیرے پاس آگیا۔ لہور سے ایک کی گاڑی مل گئی تھی۔ اچھا سفر گزرا۔“ اس نے گلاس اٹھایا۔ ”پر ادھر تو بارشوں کا کوئی خا دکھائی نہیں دیتا۔“

”سنا ہے بیٹ کے علاقے میں سیلاب نے بہت تباہی مچائی۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”بہت جھوک اور پنڈ سیلاب کی زد میں آگئے۔ بستیاں کی بستیاں ویران ہو گئیں۔“

”شاہ جی، وستیاں تو اجڑتی ہی رہتی ہیں۔“ شاہانی نے بے نیازی سے کہا۔ ”برکھا میں بیٹ چڑھتا ہے اور سال کے سال اپنا بھینٹ اور صدکہ بھی لیتا ہے۔ پر منجی کی فصلوں کو خوب کرتا ہے۔ اگر دریا نہ چڑھے تو بیٹ کے علاقے میں منجی کے بوٹے سوکھ کر زرد ہو جائیں۔

اپنا تو ناس مار دے۔“ رحیم داد خاموش نہ رہ سکا۔ ”پر سیلاب سے کسان اور مزارعے تو برباد ہو جاتے ہوں گے۔ کتنے تو مر بھی جاتے ہوں گے۔“

”مرتے بھی رہتے ہیں۔ بے گھر بھی ہوتے ہیں۔“ مراد خاں کی بے نیازی میں فرق نہ آیا۔ ”سیلاب کا ریلا وستیوں میں داخل ہوتا ہے تو مال مویشی سب بہا کر لے جاتا ہے۔ جس کا جدھر منہ اٹھتا ہے نکل بھاگتا ہے۔ پر سیلاب کے اترتے ہی سب واپس آجاتے ہیں اور راضی باضی ہو کر اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”چوہدری! تو میری طرف کے مزارعوں کو نہیں جانتا۔ بہت صابر و شاکر بندے ہیں۔ کئی تو ایسے سیدھے سادھے ہیں کہ ہوائی جہاز اڑتا ہوا اوپر گزرتا ہے تو ڈر کر کھٹ کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔ آج بھی بہت سے ایسے بندے تجھے ملیں گے جنھوں نے ریل تک نہیں دیکھی۔“

”اچھا جی، تیرے علاقے میں ایسے بندے بھی ہیں؟“ رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”یہ تو بہت انوکھی گل سنائی تو نے۔“

شاہانی نے اس دفعہ احسان شاہ کو مخاطب کیا۔ ”شاہ جی، ایسا کر۔ تو میرے ساتھ چل۔ چوہدری کو بھی لے لے۔ یہ اپنا علاقہ دیکھ لے گا۔ تیرا اچھا وکت کٹے گا۔“

”تیری طرف جانے کا یہ زمانہ نہیں۔ ابھی تک ادھر سیلاب کی تباہی مچی ہوگی۔“ احسان شاہ رضامند نہ ہوا۔ شاہانی نے مطلع کیا۔ ”شاہ جی، تجھے پتہ نہیں۔ سیلاب تو کب کا اتر گیا۔ اب تو بہت عمدہ موسم ہے۔“

”جاڑے میں تیرے پاس آؤں گا۔ چوہدری کو بھی ساتھ لیتا آؤں گا۔“ احسان شاہ نے یہ کہہ کر قہقہہ لگایا۔ ”ویسے تیرے علاقے میں چنگی رن نہیں ملتی۔“

”میری جگیر میں رن نہیں ملتی۔ ایسی گالہہ نہ کر شاہ جی۔“ مراد خاں شاہانی نے گردن اونچی کی۔ سگریٹ کا لمبا کش لگایا۔ ”بیٹ میں تو مزارع، سردار کی اجازت کے بغیر دھی کا پرنا بھی نہیں کر سکتا۔“ وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ ”تو کہہ تو شاہ جی ریل کی ویگن بھر کر رناں بھیج دوں۔“

”ویگن سے اپنا کیا بنے گا۔ پوری سپیشل ٹرین بھیجنی ہوگی۔“ احسان شاہ بھی ہنسنے لگا۔ ”ویسے تیرے علاقے کی رن ٹھنڈی ہوتی ہے۔ گوشت تو اس کے بدن پر ہوتا ہی نہیں۔ تو انھیں کھانے کو روٹی نہیں دیتا۔“

”یہ بات نہیں شاہ جی۔ تیرا علاقہ ماجھے کی سرحد پر ہے، بلکہ ماجھے ہی میں ہوتا ہے۔“ شاہانی نے وضاحت کی۔ ”تجھے تو ماجھے کی جٹیاں مل جاتی ہیں۔ مکھن کی طرح چکنی اور ملائم۔ ہاتھ رکھو تو پھسل

جائے۔"

"کھلا پلا کر تیار کرتا ہوں انھیں۔ ایسے ہی چکنی اور ملائم نہیں بن جاتیں۔" احسان شاہ نے بڑے فخر سے کہا۔ "جب انھیں اٹھواتا ہوں تو کئی تو کسائی کے کھونٹے پر باندھنے والی بز کی مانند کمزور اور مریل ہوتی ہیں۔ دو چار ہفتے یہاں رہنے کے بعد ان کا رنگ روپ نکھرتا ہے۔ ایسی جوانی چڑھتی ہے کہ روکھی سوکھی روٹی سے ایک دم گرما گرم پکوان بن جاتی ہیں۔ کیا سمجھا؟"

"سب سمجھتا ہوں' خوب سمجھتا ہوں۔" شاہانی نے گھونٹ بھرا۔ "تیرے پاس تو باقاعدہ حرم ہے۔ ایک سے ایک فسٹ کلاس دانا چھانٹ کر رکھا ہے۔" وہ بے تکلفی سے ہنسا۔ "اپنا حرم تو دکھا۔ میرا مطلب تیرے کوٹ سے ہے۔ بہت عرصہ ہوا اسے دیکھے ہوئے۔ کچھ نیا تازہ مال آیا؟ کوئی نئی رن' کوئی نئی ذال؟"

"وہ تو آتی ہی رہتی ہیں۔" احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ "تو تھوڑی سی اور لگا لے' فیر تجھے کوٹ میں لے چلوں گا۔" اس نے شیدا کو بلایا۔ وہ آیا تو احسان شاہ نے اسے مطلع کیا۔ "میں کوٹ میں آ رہا ہوں۔ شاہانی اور چوہدری بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ تو اندر خبر کر دے۔ میں پہنچوں تو سب ٹھیک ٹھاک ہونا چاہیے۔ سمجھ گیا؟"

شیدے نے سر کو ذرا سا جھکا کر نہایت ادب سے کہا۔ "سب ٹھیک ہی ٹھاک ملے گا جی۔"

شیدا چلا گیا۔ احسان شاہ' سردار مراد خاں شاہانی اور رحیم داد وہسکی سے شغل کرتے رہے۔ ہنس ہنس کر بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ تینوں نشے میں جھومتے جھامتے کوٹ کی جانب بڑھے۔ شیدا ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ حویلی کے پچھواڑے مختصر سا کھلا میدان تھا۔ اس میں ببول اور بیری کی جھاڑیاں تھیں۔ میدان کی دوسری طرف کوٹ تھا۔ یہ حویلی کی فصیل نما چار دیواری کے اندر اونچی اونچی دیواروں کا ایک اور حصار تھا۔ دونوں میں فرق صرف اس قدر تھا کہ حویلی کی فصیل پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی تھی اور کوٹ کی دیواریں بلندی میں تو اتنی ہی تھیں مگر کچی تھیں۔ کوٹ کا دروازہ خاصا اونچا اور مضبوط تھا۔

کوٹ کی ڈیوڑھی میں لالٹین روشن تھی۔ اس کی روشنی میں مسلح پہریدار دروازے کے سامنے فرش پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ قریب ہی دیوار کے سہارے ان کی بندوقیں رکھی تھیں۔ شیدا بڑھ کر جھٹ ان کے سامنے پہنچا۔ پہریداروں نے جھپاک جھپاک اپنی بندوقیں سنبھالیں اور نظریں جھکا کر ادب سے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

۲۶

ڈیوڑھی کے آگے دور تک پھیلا ہوا وسیع آنگن تھا۔ آنگن کے تین طرف سلسلے وار کوٹھریاں تھیں۔ کوٹ کی فصیل نما اونچی چار دیواری کی طرح کوٹھریوں کی دیواریں بھی کچی اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں۔ کسی کوٹھری میں نہ کھڑکی تھی نہ روشن دان۔ آمد و رفت کے لیے صرف ایک دروازہ تھا۔ کوٹھریوں کے آگے پھوس کی چھت کا طویل برآمدہ تھا۔ برآمدہ آنگن کی سطح سے ڈیڑھ دو فٹ اونچا تھا اور اتنا کشادہ تھا کہ چارپائی بچھانے کے بعد بھی اتنی جگہ بچ جاتی تھی کہ برآمدے میں گزرنے والوں کے لیے کوئی دشواری پیدا نہ ہوتی۔ آنگن کا فرش بھی کچا تھا۔ اس میں کہیں کہیں نیم اور جنڈ کے گھنے درخت تھے۔ برآمدے میں کوٹھریوں کے آگے جگہ جگہ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہر کوٹھری میں چراغ روشن تھا۔

احسان شاہ' رحیم داد اور سردار مراد خاں شاہانی کے ہم راہ کوٹ کے صدر دروازے سے ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ شیدا تیزی سے آگے بڑھا اور اس دروازے کو کھولا جو آنگن میں کھلتا تھا۔ کوٹ میں عورتوں اور بچوں کی ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور ابھر رہا تھا۔ مگر احسان شاہ کے داخل ہوتے ہی کوٹ کے صدر دروازے پر لٹکے ہوئے پیتل کے گھنٹے پر گھڑیالی نے چوٹ لگائی۔ رات کے سناٹے میں گھڑیال کی آواز گونجی۔ کوٹ کے اندر تمام آوازیں اچانک اس طرح گہری خاموشی میں ڈوب کر گم ہو گئیں جیسے سوئچ دبانے سے بجلی کی روشنی بجھ جاتی ہے۔

احسان علی شاہ گردن اٹھائے نہایت رعب اور دبدبے کے ساتھ ڈیوڑھی سے نکل کر آنگن میں پہنچا۔ آگے بڑھا۔ شاہانی اور رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ شیدا' تینوں سے چند قدم

آگے تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین لٹک رہی تھی۔

آنگن سے گزرتے ہوئے وہ برآمدے میں پہنچے۔ شیدا ایک کوٹھری کے دروازے پر رکا۔ اندر چراغ روشن تھا۔ سامنے مونج کی چٹائی پر ایک نوجوان عورت پھسکڑا مارے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کاجل تھا۔ بالوں میں خوشبودار تیل چمک رہا تھا۔ وہ بھڑک دار لباس پہنے ہوئے تھی۔ چراغ کی ہلکی زرد روشنی میں اس کا چہرہ اجلا اجلا نظر آرہا تھا۔ احسان شاہ کو دیکھتے ہی وہ اپنا ریشمی لاچا سنبھالتی ہوئی جھٹ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

شیدا نے لالٹین اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ احسان شاہ نے اسے غور سے دیکھا۔ شیدا سے پوچھا۔ "کیا نام ہے اس کا؟"

مگر شیدا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ خود بول پڑی۔ "میرا نام جیداں ہے جی۔"

جیداں کا جسم چھریرا تھا۔ ناک نقشہ تیکھا اور سبک تھا۔ عمر بیس سال سے کچھ ہی اوپر تھی۔ اس کی شادی کو تین سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ صرف ایک بچی تھی اور وہ بھی اس کے ساتھ نہ تھی۔ جیداں سہمی ہوئی چپ چاپ کھڑی تھی۔ نظریں جھکی تھیں۔ سردار مراد خاں خمار آلود نظروں سے قصائی کی طرح جیداں کے بدن کا انگ انگ ٹٹول رہا تھا' پرکھ رہا تھا۔

احسان شاہ نے شاہانی کی بھوکی نظروں پر توجہ نہ دی۔ مڑ کر شیدا کو دیکھا۔ "شیدے! یہ اتنی دبلی پتلی کیوں ہے؟ تو اسے کھانے کو روٹی نہیں دیتا۔"

شیدا نے دبی زبان سے بتایا۔ "اسے آئے ہوئے جی' دو ہی مہینے ہوئے ہیں۔ میں رحمتے سے کہوں گا' اسے کھانے کو ٹھیک طرح روٹی ٹکر دے۔ وہی ان کی انچارج ہوتی ہے جی۔"

"رحمتے کہاں ہے؟" احسان شاہ نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "وہ کیوں نہیں آئی۔ کدھر ہے وہ؟"

"شاہ جی!" شیدا گڑگڑانے لگا۔ "اس کے سر میں شام ہی سے سخت درد ہے۔ اوپر چوبارے میں پڑی ہائے ہائے کر رہی ہے۔" شیدا نے زینے کے اوپر بنی ہوئی ممٹی کی طرف اشارہ کیا۔ "میں پہلے اسی کے پاس گیا تھا۔ پر اسے تو بکھار بھی ہے۔"

احسان شاہ نے رحمتے کے بارے میں مزید پوچھ گچھ نہ کی۔ وہ آگے بڑھنے لگا۔ لیکن شاہانی اپنی جگہ جما کھڑا رہا۔ احسان شاہ کو آگے بڑھتے دیکھ کر اس نے ٹوکا۔ "شاہ جی! ذرا اسے ٹھیک سے دیکھ لینے دے۔" وہ جیداں کو چبھتی ہوئی نظروں سے گھور رہا تھا۔ مسکرا کر احسان علی شاہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"سئیں شاہ جی! میں تو کہتا ہوں' آج رات یہی چلے گی۔"

تو یہیں پسر گیا۔ اسی کو بلوا لینا۔ پر آگے چل کر تو دیکھ۔ تو کوٹ میں میرا حرم دیکھنے آیا ہے ناں؟ بہت مدت کے بعد ادھر آیا ہے۔ پوری طرح دیکھ بھال لے۔ فیر طے کرنا۔"

شاہانی نے اصرار نہ کیا۔ تینوں آگے بڑھ کر دوسری کوٹھری پر پہنچے۔ اس کوٹھری میں بھی ایک جوان عورت خوب سنگھار کیے بیٹھی تھی۔ وہ انھیں دیکھ کر کھڑی ہوئی تو اس کا پھولا ہوا پیٹ ناف نظر آنے لگا۔

مراد خاں شاہانی ہنس کر بولا۔ "سئیں! یہ تو پہلے ہی گبھن ہے۔ اس سے کیا لینا۔ آگے بڑھ شاہ جی۔"

احسان شاہ آگے بڑھا۔ شاہانی اور رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلے۔ شیدا بھی ان کے ہم راہ لٹین سنبھالے آگے آگے چل رہا تھا۔ تیسری کوٹھری میں جو عورت تھی' وہ دلکش اور طرح دار تھی۔ رنگت تو سانولی تھی مگر آنکھیں ایسی خوبصورت تھیں کہ ان میں ستارے جھلملاتے تھے۔ شاہانی اسے دیکھ کر پھڑک اٹھا۔ اس نے گرسنہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ مگر فوراً ہی اس نے بیزاری سے منہ بگاڑا۔

"یہ تو دھرلی ہوئی لگتی ہے۔"

عورت کی ابھری ہوئی چھاتیوں سے دودھ بہہ بہہ کر اس کے کرتے کے گریبان اور بالائی حصے کو گیلا کر رہا تھا۔ وہ سر جھکائے کبوتری کی مانند سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ کوٹھری کے عین سامنے برآمدے میں بچھی ہوئی چارپائی پر دو کم سن بچے سو رہے تھے۔ چھوٹا بار بار کلبلاتا۔ بے چین ہو کر ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا۔ وہ ماں کو تلاش کر رہا تھا اور اس کی ماں چراغ کی پیلی پیلی روشنی میں اس طرح چپ چاپ کھڑی تھی کہ نگاہیں زمین میں گڑی تھیں اور دل زور زور سے دھڑکتا تھا۔

رحیم داد بدستور خاموش رہا۔ شاہانی بولا۔ "شاہ جی! آگے بڑھ۔"

تینوں آگے بڑھے۔ اگلی کوٹھری میں جو عورت تھی' وہ بھی بھرپور جوان تھی مگر اس کے چہرے پر زردی چھائی تھی۔ وہ بیمار تھی۔ ماتھے کے گرد دوپٹہ لپیٹے ہوئے تھی۔ اس کے سر میں شدید درد تھا جس کا اظہار آنکھوں میں منڈلاتی ہوئی بے چینی اور اضمحلال سے ہوتا تھا۔

احسان شاہ کے چہرے سے جھنجلاہٹ برسنے لگی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے شیدا کو دیکھا۔ تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "نوری کدھر ہے؟"

"وہ آگے ہے جی۔" شیدا نے خوف زدہ ہو کر آہستہ سے بولا۔

"اور رانو کہاں ہے؟"

شیدا نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”وہ بھی آگے ہے جی۔“

مردار خاں شاہانی نے ہنس کر کہا۔ ”سیں شاہ جی! جلدی کیا ہے۔ انھیں بھی دیکھ لیں گے۔“

احسان شاہ کچھ نہ بولا۔ اس کا چہرہ غصے اور جھنجلاہٹ سے تمتمایا ہوا تھا۔ تینوں آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور ہر کوٹھری پر رکتے رہے۔ انھوں نے آٹھ کوٹھریاں دیکھیں مگر کوئی عورت احسان شاہ کی نظروں میں نہ جچی۔ اس کی آنکھوں سے بے قراری جھلک رہی تھی۔ شاہانی کی نگاہوں میں ابھی تک جیداں گھوم رہی تھی۔ کسی اور میں اس نے دلچسپی اور رغبت کا اظہار نہ کیا۔

انھوں نے مزید کوٹھریاں دیکھیں۔ مگر احسان شاہ کی چہرے پر چھائی ہوئی خشونت کم نہ ہوئی۔ وہ بے چینی سے کسی نوجوان عورت کو تلاش کر رہا تھا۔ اور وہ ہنوز نظر نہ آئی تھی۔ ایک کے بعد دوسری کوٹھری کا دروازہ آتا اور ہر دروازے کی دہلیز کے پاس بناؤ سنگھار کیے ہوئے کوئی نوجوان عورت نظر آتی۔

احسان شاہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا ایک دروازے پر ٹھٹکا اور جم کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ ہونٹوں پر تبسم بکھر گیا۔ سامنے چراغ کی روشنی میں ایک عورت پتھر کے ترشے ہوئے مجسمے کی مانند استادہ تھی۔ کھلتی ہوئی سرمئی رنگت، آنکھیں روشن، بال گھنے اور چمکیلے، کولہے چوڑے۔ وہ بھرپور جوان تھی۔ جسم بھرا بھرا اور گداز تھا۔ ناک میں فیروزے کا کوکا تھا۔ ہونٹ قدرے موٹے تھے اور ان کے بالائی حصے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلملا رہے تھے۔

احسان شاہ نے نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں مراد خاں شاہانی سے کہا۔ ”لے بھئی شاہانی! یہ رہی رانو۔“ وہ کوٹھری کے اندر داخل ہوگیا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے رانو کے پاس گیا۔ ہولے سے اس کے رخسار میں چٹکی بھری۔ رانو نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر مسکراتے ہوئے احسان شاہ کو ایک خاص ادا سے دیکھا۔

احسان شاہ نے اونچی آواز سے شاہانی کو مخاطب کیا۔ ”شاہانی! بول کیا کہتا ہے؟“

”کہنا کیا ہے، ایک دم فسٹ کلاس ہے۔“ شاہانی نے قہقہہ لگایا۔

احسان شاہ کوٹھری سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔ ”آگے بھی دیکھ لے۔“

تینوں آگے کی کوٹھریوں کی جانب بڑھے۔ وہ ہر کوٹھری میں بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھتے، پرکھتے آگے بڑھتے گئے۔ ایک کوٹھری کے دروازے پر رک کر احسان شاہ نے شیدا سے پوچھا۔

”شیدے! یہ نوراں ہے ناں؟“

نوراں کا نام سن کر رحیم داد ٹھٹکا۔ اسے اپنی بیوی نوراں یاد آگئی۔ اس نے دھڑکتے دل اور

نظروں سے کوٹھری میں مونج کی چٹائی پر بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھا۔ وہ فوراً اپنا لاچا سنبھالتی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ مگر وہ رحیم داد کی نوراں نہ تھی۔ اس کی بیوی کی طرح خوبصورت اور طرح بھی نہ تھی۔ مگر یہ نوراں بھی بری نہ تھی۔ رنگت اجلی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور گہری سیاہ لیکن رحیم داد کو اس کا کسا ہوا سڈول جسم زیادہ پسند آیا۔

رحیم داد نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ خاموش کھڑا نوراں کو دیکھتا رہا۔ جب تینوں اس کوٹھری کے ازے سے آگے بڑھے تو رحیم داد نے چلتے چلتے مڑ کر نوراں کو ایک بار پھر دیکھا۔ اس کے نٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ نشے میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں چراغ جھلملا رہے تھے۔

احسان شاہ نوری کی کوٹھری پر رکا۔ اندر گیا۔ نوری کے رخسار میں اس نے پیار سے چٹکی بھری۔ رایا اور باہر آگیا۔ آگے بڑھا۔ اس نے نوری کے بجائے اپنے لیے ریشماں کو پسند کیا۔ اسے سال قبل اٹھوا کر کوٹ میں لایا گیا تھا۔ یہیں اس کے دو بچے بھی ہوئے۔ دو پہلے بھی تھے جو اس شوہر کے پاس تھے۔ لیکن ریشماں پر چار بچوں کی ماں ہونے کے باوجود جوبن تھا۔ اس کا لاچا ہلکا تھا اور قمیص گہری سرخ تھی۔ ہونٹوں پر سرخی تھی اور آنکھوں میں کاجل تھا۔ احسان شاہ کو تے ہی اس نے اپنا لاچا اشتعال انگیز انداز میں ایک ہاتھ سے سنبھالا اور گردن کو ذرا سا خم دے کر ی ہوگئی۔ اس نے ترچھی نظروں سے احسان شاہ کو دیکھا۔ مسکرا کر اس طرح شرمائی کہ احسان تڑپ اٹھا۔ جھومتا جھومتا اس کی جانب جھپٹا۔ قریب گیا اور ریشماں کو سینے سے لگا کر شیدا کی ب دیکھا۔

”شیدے! اسے میرے کمرے میں پہنچا دے۔“

تینوں نے ۲۱ عورتیں دیکھیں۔ کچھ کوٹھریوں کے دروازے بند تھے۔ کچھ خالی تھیں۔ ان میں نے والی عورتیں حویلی میں کام کاج کر رہی تھیں یا اس حالت میں نہیں تھیں کہ نہا دھو کر اور بن ور کر احسان شاہ اور اس کے مہمانوں کے سامنے آسکیں اور ان کے خلوت کدوں کی زینت بن یں۔

کوٹ کی کوٹھریوں کا معائنہ کرنے کے بعد احسان شاہ نے چلتے چلتے رحیم داد سے دریافت کیا۔ چوہدری! تو نے اپنے لیے کوئی رن پسند نہیں کی؟“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ خاموش رہا۔

احسان شاہ مسکرایا، اصرار کیا۔ ”چوہدری! ایسے کام نہیں چلے گا۔ کھل کر بتا۔ کسے اپنے پاس نا چاہتا ہے؟“

رحیم داد اب چپ نہ رہ سکا۔ نشے سے جھوم کر بولا۔ "نوراں میرے لیے ٹھیک رہے گی۔"

"نوراں!" احسان شاہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ "وہ کون سی تھی؟" نشے کی جھونک میں نوراں کا نام احسان شاہ کے ذہن سے نکل گیا تھا۔

"شاہ جی! تجھے تو سب کے نام بھی یاد نہیں۔" شاہانی ہنس کر بولا۔ "یاد پڑتا ہے ان میں نوراں بھی تھی اور تو نے ہی اسے پہچانا بھی تھا۔"

"ہوگی، ضرور ہوگی۔" احسان شاہ کھلکھلا کر زور سے ہنسا۔ "کس کس کے نام یاد رکھوں۔ سوچتا ہوں، ان کے لیے رجسٹر رکھنا پڑے گا۔" اس نے قہقہہ بلند کیا۔ شیدا کی جانب متوجہ ہوا۔ "نوراں کو چوہدری کے کمرے میں پہنچا دینا۔" اس نے مڑ کر مراد خاں شاہانی کی طرف دیکھا۔ "تو نے تو رانو کو پسند کیا ہے نا؟"

"پر جیداں کو ایک بار اور دیکھ لینے دے۔" شاہانی نے نشے کی ترنگ میں لہرا کر کہا۔

مراد خاں شاہانی آگے بڑھا۔ احسان شاہ نے اسے ٹوکا۔ "گل سن۔" مگر شاہانی سنی ان سنی کرتے ہوئے جیداں کی کوٹھری کی جانب بڑھنے لگا۔ احسان شاہ نے شیدا کو اشارہ کیا۔ وہ ہاتھ میں لالٹین سنبھالے شاہانی کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں جیداں کے پاس پہنچے۔ وہ دروازے کی جانب پیٹھ موڑے چراغ کی دھندلی روشنی میں مونج کی چٹائی پر گم صم بیٹھی تھی۔

قدموں کی آہٹ سن کر جیداں نے مڑ کر دیکھا۔ دہلیز پر شاہانی کھڑا تھا۔ اس کے ہم راہ شیدا بھی تھا۔ جیداں ہڑبڑا کر اپنا چالا سنبھالتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور آنکھوں کا کاجل پھیل گیا تھا۔

شاہانی نے حیرت سے کہا۔ "لگتا ہے تو رو رہی ہے۔"

جیداں خاموش کھڑی رہی۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے اور پلکیں صاف بھیگی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ شاہانی نے اسے خمار آلود نظروں سے دیکھا۔ جھوم کر بولا۔ "تو ضرور رو رہی تھی۔ صاف صاف بتا۔ تو رو رہی تھی نا؟"

"ہاں جی۔" جیداں نے آہستہ آہستہ سر ہلایا۔ "مجھے اپنی نکی یاد آ رہی ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو امڈے اور چھلک پڑے۔

شاہانی بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ پوچھا۔ "کہاں ہے تیری نکی""؟"

"میرے گھر والے کے پاس ہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے میری نکی سے ملوا دے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر رخساروں پر بکھرنے لگے۔ شاہانی نے اس کی پیٹھ تھپکتے

کہا۔ "ضرور ملوا دوں گا بلکہ اسے تیرے ہی پاس منگوا دوں گا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔

"اب تو ہنس دے۔"

داں مسکرائی اور جلدی جلدی آنسو پونچھنے لگی۔

سان شاہ بھی رحیم داد کے ہم راہ جیداں کی کوٹھری کے دروازے پر پہنچ گیا۔ شاہانی کو جیداں یب کھڑے ہوئے دیکھا۔ ہنس کر بے تکلفی سے بولا۔ "لگتا ہے، تجھے یہ زیادہ ہی پسند آ گئی۔"

ییں شاہ جی! اسی کو میرے پاس بھجوا دے۔" اس نے احسان شاہ کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

ن شاہ نے مڑ کر شیدا کی جانب دیکھا۔ جیداں کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا نام ہے اس کا؟"

بدا نے مستعدی سے جواب دیا۔ "جیداں۔"

جیداں، جیداں۔" احسان شاہ نشے کی ترنگ میں جیداں کے نام کی گردان کرنے لگا۔ پھر وہ یا۔ شیدا کو مخاطب کیا۔ "شیدے! اسے شاہانی کے کمرے میں پہنچا دینا۔"

پہنچا دوں گا جی، بالکل پہنچا دوں گا۔" شیدا نے احسان شاہ کو یقین دلایا۔

سان شاہ خاموش رہا۔ اس نے نہ جیداں کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھا اور نہ ہی اس کی ں کے پھیلے ہوئے کاجل کی جانب توجہ دی۔ اس نے شاہانی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ آہستہ تھپتھپایا اور اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ رحیم داد بھی آگے بڑھا۔

نوں برآمدے سے اتر کر آنگن میں پہنچے۔ اسے عبور کیا۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ کوٹ کی اونچی فصیلوں سے باہر نکلے۔ پہریدار صدر دروازے پر سر جھکائے ادب سے کھڑے تھے۔ انے پہریداروں کی جانب مطلق توجہ نہ دی۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آہستہ آہستہ دیوان ہ کی جانب بڑھنے لگے۔

☆

یدا، ڈیوڑھی کے دروازے ہی پر ٹھہر گیا۔ اسے ابھی کئی اہم کام انجام دینا تھے۔ ریشماں، ں اور نوراں کو علیحدہ کوٹھری میں اکٹھا کرنا تھا اور وہاں سے انھیں احسان شاہ، مراد خاں شاہانی رحیم داد کے کمروں میں پہنچانا تھا۔ ان کی اس وقت تک کڑی نگرانی بھی کرنا تھی جب تک وہ ہ ٹھکانوں پر نہ پہنچ جائیں۔ اسے ڈر تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ تینوں عورتوں میں سے کسی کو احسان کا کوئی بیٹا پہلے ہی اچک لے جائے۔ احسان شاہ کے ایک دو نہیں پورے دس بیٹے تھے۔ کاری ملازمتوں میں تھے اور اعلیٰ افسر تھے۔ ایک انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہا اس سے چھوٹا لاہور میں پڑھ رہا تھا۔ حویلی میں چھ بیٹے تھے مگر تین جوان ہو چکے تھے اور سن و

سال کے اعتبار سے کچھ پہلے ہی جوان ہو گئے تھے۔

احسان شاہ کے یہ تمام بیٹے صرف دو نکاحی بیویوں سے تھے۔ ویسے اس نے چار عورتوں سے باقاعدہ نکاح کیا۔ پہلی ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئی۔ اس سے احسان شاہ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ تیسری سے چار بیٹیاں ہوئیں۔ وہ اولاد نرینہ کے لیے سخت پریشان رہتی تھی۔ چھپ چھپ کر درگاہوں اور مزاروں پر حاضری دیتی۔ منتیں مانتی۔ گڑگڑا کر دعائیں مانگتی۔ بیٹے کے ارمان میں ہر وقت سرگرداں رہتی۔ اسی ارمان میں وہ ایک پیر کے چکر میں آگئی۔ پیر کے حجرے میں جاتی تو گھنٹوں اس کے ساتھ خلوت میں رہتی۔ حویلی کی ایک خادمہ 'فیروزہ اس کی محرم راز تھی۔ مگر وہ احسان شاہ کی بھی منظور نظر تھی۔ اس نے احسان شاہ کو ایک روز تنہائی میں سب کچھ بتا دیا۔

اسے بیوی کی ان حرکتوں کا علم ہوا تو غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ یہ اس کی عزت و ناموس کا سوال تھا۔ اس نے ایک رات برافروختہ ہو کر بیوی کا اس طرح گلا گھونٹا کہ وہ مر گئی۔ احسان شاہ نے رازداری سے لاش ٹھکانے بھی لگا دی۔ لیکن پیر سے بازپرس کرنے یا انتقام لینے کی اسے جرات نہ ہوئی۔

اب اس کی دو منکوحہ بیویاں رہ گئیں تھیں۔ ان کے تین جوان بیٹے حویلی ہی میں رہتے تھے۔ مزارعوں اور کمیوں کی لڑکیوں اور بیویوں کے بارے میں ان کا رویہ اپنے باپ سے مختلف نہ تھا۔ احسان شاہ جن عورتوں کو اٹھوا کر کوٹ میں قید رکھتا' وہ اس کے تصرّف میں بھی رہتیں اور اس کے نوجوان بیٹوں کے شبستانوں کی بھی زینت بنتیں۔

شیدا حویلی کے ہر راز سے واقف تھا۔ وہ احسان شاہ کا نہایت قابل اعتماد اور منہ چڑھا ملازم تھا۔ مگر اس کے غصے اور خونخوار مزاج سے خائف بھی رہتا۔ کوشش کرتا کہ ہر کام احسان شاہ کی مرضی کے مطابق ہو۔ اگر اس رات احسان شاہ کا کوئی بیٹا ر-شماں' جیداں یا نوراں میں سے کسی کو بھی اپنے کمرے میں لے جاتا تو احسان شاہ بیٹے سے تو کچھ نہ کہتا مگر شیدا کی شامت آجاتی۔ لہٰذا شیدا پوری طرح چوکنا اور چوکس تھا۔ اس نے کوٹ سے باہر قدم ہی نہ نکالا۔ وہ ر-شماں' جیداں اور نوراں کو جلد سے جلد احسان شاہ' مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کے کمروں میں پہنچانے کے بندوبست میں لگا رہا۔

☆

احسان علی شاہ کوٹ سے نکل کر شاہانی اور رحیم داد کے ہم راہ ایک بار پھر دیوان خانے میں پہنچا۔ تینوں باغ میں نہ بیٹھے۔ اب وہاں خنکی تھی۔ اوس بھی پڑ رہی تھی۔ وہ باغ سے ملحقہ

برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ رات کسی قدر گہری ہو چکی تھی۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے سرسراتے ہوئے چلتے تھے۔ انھوں نے کچھ دیر وہسکی سے اور شغل کیا۔ اس عرصے میں نوکروں نے کھانا لگا دیا۔ تینوں شراب نوشی سے فارغ ہوئے تو کھانے پر جٹ گئے۔ کھانا کھا کر وہ اپنے اپنے کمروں کی جانب چلے گئے۔

رحیم داد نے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ دیکھا نوراں وہاں موجود ہے۔ وہ بستر کے ایک کونے پر پیر نیچے لٹکائے خاموش بیٹھی تھی۔ رحیم داد نے خمار آلود نگاہوں سے اسے دیکھا اور لمحہ بھر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی بیوی 'نوراں' اپنے آشنا' جمال دین 'کو چھوڑ کر واپس آگئی ہے۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھا۔ اور نوراں کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

وہ کچھ نہ بولی۔ نہ پہلو بدلا نہ کسمسائی۔

رحیم داد بھی خاموش رہا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ کمرے میں گہرا سکوت چھایا تھا۔

آخر رحیم داد نے خاموشی سے اکتا کر بات چھیڑی۔ "تیرا نام نوراں ہے ناں؟"

"اخو جی!" اس نے مختصر جواب دیا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ ایک بار پھر رحیم داد نے خاموشی کو توڑا' دریافت کیا۔ "تیرا گھر والا ہے؟"

وہ رحیم داد کی جانب نظریں اٹھائے بغیر بولی۔ "ہے تو جی۔"

"بچے بھی ہیں؟"

"دو ہیں جی۔" نوراں نے بتایا۔

رحیم داد نے اجنبیت کا احساس زائل کرنے کی غرض سے بات آگے بڑھائی۔ "تو اسی پنڈ کی رہنے والی ہے؟"

"نہیں جی' میرا پنڈ تو ادھر ماڑی کمبوہ کے پاس ہے۔" اس نے مغرب کی سمت ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "میرا زمیں دار تو میاں رحمان وٹو ہے۔"

"تو شاہ جی کے کوٹ میں کیسے آئی؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "شاہ جی تو تیرا زمیں دار بھی نہیں۔ فیر تو کیسے ادھر پہنچی؟"

"یہ تو میں نوں بھی پتہ نہیں۔" نوراں نے سادگی سے بتایا۔ "میں نوں تو جی اتنا یاد ہے۔ سویرے بہت تڑکے ٹٹی کرنے نیائیں گئی تھی۔ زمین پر بیٹھنے کے لیے جھکی تو کسی نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر میرا منہ دبا لیا۔ وہ ۵ تھے۔ منہ پر منڈاسے باندھے ہوئے تھے۔ مجھے اٹھا کر زمیں دار کی ماڑی میں لے گئے۔ کئی مہینے میں وٹو کی ماڑی میں رہی۔ فیر ایک رات اس نے مجھے شاہ جی کے پنڈ پہنچا دیا۔ تب

سے جی میں یہاں ہوں۔"

"کتنے دن ہو گئے تیں نوں یہاں آئے ہوئے؟"

"اگلے جاڑوں میں جی پورے دو سال ہو جائیں گے۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میرے گھر والے کو تو سال بھر بعد پتہ چلا' میں ادھر پیراں والہ میں ہوں۔ وہ ایک بار یہاں آیا بھی تھا۔"

"تجھے ملا تھا؟" رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"نا جی ناں۔ شاہ جی نے مجھے اس سے بالکل ملنے نہ دیا۔ اسے چار روز حویلی میں کیدی بنا کر رکھا۔ چھت سے الٹا لٹکا کر بہت پٹائی کی۔ فیر پتہ نہیں دوبارہ آیا' میں نوں تو یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے' کیسا ہے؟ بچوں کے بارے میں بھی کچھ پتہ نہیں۔"

"یاد تو آتے ہوں گے۔" رحیم داد نے غیر شعوری طور پر اس کے زخموں کو چھیڑ دیا۔

نوراں تڑپ کر بولی۔ "کیوں نہیں یاد آتے۔ جب بہت یاد آتے ہیں تو چپکے چپکے رو لیتی ہوں۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلملانے لگے۔ رحیم داد نے اس کی جانب نہ دیکھا۔ بستر پر خاموش بیٹھا رہا۔

باغ میں کھلنے والی کھڑکی سے ہوا کے بے قرار جھونکے اندر آ رہے تھے۔ رحیم داد اٹھا اور کھڑکی کے ایک پٹ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ باغ میں گہرا سناٹا تھا۔ قریب ہی پھولوں سے لدی رات کی رانی مہک رہی تھی۔

گیارہ بجے کا عمل تھا۔ سونے والے سو رہے تھے' رات جاگ رہی تھی۔ خوشبو میں بسے ہوئے جھونکے بار بار امنڈتی لہروں کی مانند آتے۔ رحیم داد گہری سانس بھرتا۔ نشے کا ریلا رک رک کر آتا۔ رحیم داد کا سر ہر ریلے کے ساتھ جھومتا۔ قدم ڈگمگاتے۔ آنکھوں میں چراغ جلتے بجھتے۔ سیاہ پردے لہراتے۔ وہ دیر تک کھڑکی کا سہارا لیے جھومتا رہا۔ کھڑکی کا پٹ ساتھ نہ دے سکا تو اس نے چوکھٹ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

رحیم داد نے پلٹ کر نوراں کو دیکھا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ نوراں نے بھی نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔

"تو نوراں ہی ہے ناں؟"

وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگی۔ رحیم داد کا چہرہ دہکنے لگا۔ آنکھیں نشے سے مدہوش ہو گئیں۔ وہ وارفتگی کے عالم میں جھومتا جھامتا نوراں کی طرف بڑھا۔ اب وہ تند اور تیز بگولہ تھا جو امڈنے اور امڈ کر بکھرنے کے لیے بے تاب تھا۔

سویرے رحیم داد کی آنکھ کھلی تو نوراں موجود نہ تھی۔

☆

سردار مراد خاں شاہانی اب جا چکا تھا۔

وہ پیراں والہ میں پانچ روز قیام کرنے کے بعد لاہور چلا گیا۔ مگر پانچ ہی روز میں وہ رحیم داد سے بہت گھل مل گیا تھا۔ وہ بیٹ کے علاقے کا خاندانی جاگیردار تھا۔ لیکن رحیم داد نے اس میں خاندانی جاگیرداروں والا طنطنہ اور طمطراق نہ پایا۔ وہ یاروں کا یار تھا۔ ہنس مکھ اور فراخ دل تھا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے زور دے کر رحیم داد کو اپنی جاگیر میں آنے اور چند روز قیام کرنے کی دعوت دی۔

مراد خاں شاہانی کے جانے کے بعد رات کی محفلیں قدرے سونی پڑ گئیں۔ بات یہ تھی کہ شاہانی بڑا زندہ دل اور یار باش تھا۔ بات بات پر قہقہے لگاتا۔ دبا کے شراب پیتا مگر مطلق نہ بہکتا جاگیرداروں اور بڑے زمیں داروں کی عام روایت کے مطابق عورت اس کی بھی کمزوری تھی اور اس حد تک تھی کہ اسے ہر عورت گوارہ تھی۔ اپنی اس کمزوری کو وہ چھپاتا بھی نہ تھا۔ نہایت دھڑلے سے بتاتا تھا۔ لاہور روانہ ہونے سے ایک روز قبل رات کو معمول کے مطابق وہسکی کا دور چل رہا تھا۔ شاہانی عورتوں کے بارے میں اپنے تجربات ہنس ہنس کر سنا رہا تھا۔ بات کہتے کہتے اس نے زور کا قہقہہ بلند کیا اور ایک آنکھ دبا کر بولا۔

"مرد کے بڑھاپے کی پہچان تو یہ ہے سئیں' جب وہ بڈھی اور جوان' خوبصورت اور بدصورت رن میں فرک محسوس کرنے لگے تو سمجھو وہ بڈھا ہو گیا۔"

رحیم داد اس کی یہ منطق سن کر چونکا۔ حیرت سے بولا۔ "نہیں جی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ بھی اس وقت نشے کی ترنگ میں تھا۔ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "ایہہ گل اے تو یہ بتا تو رحمتے کے ساتھ سو سکتا ہے؟"

"سو سکتا ہوں' ضرور سو سکتا ہوں۔" مراد خاں شاہانی اپنی بات پر اڑا رہا۔ "آزما کے دیکھ لے۔"

احسان شاہ نے مداخلت کی۔ وہ سردار شاہانی کے مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ مدت سے شناسائی تھی۔ اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری! اس سے اڑی نہ کر۔" وہ کھلکھلا کر زور سے ہنسا۔ "یہ بہت خنزیر ہے۔" اس نے بے تکلفی سے شاہانی کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "تو اسے نہیں جانتا۔ یہ رحمتے کے ساتھ بھی سو جائے گا۔"

رحیم داد کو پھر بھی یقین نہ آیا۔ کہنے لگا۔ "نہیں شاہ جی! ایسا نہیں ہو سکتا۔" اس نے شاہانی کی طرف مڑ کر دیکھا۔ "شاہانی! تو نے رحمتے کو دیکھا ہے؟" یہ کہہ کر وہ احسان شاہ کی جانب متوجہ ہوا۔

"شاہ جی! رحمتے کو بلوا لے۔ تب دیکھوں گا یہ اس کے ساتھ سو سکتا ہے کہ نہیں۔"

"شاہ جی' بلوا لے' اسے ابھی بلوا لے۔" شاہانی کے رویئے میں مطلق فرق نہ آیا۔ وہ زندہ دلی سے مسکراتا رہا۔

احسان شاہ نے منع بھی کیا۔ مگر شاہانی باز نہ آیا۔ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اس نے اصرار کیا۔ "سیں شاہ جی! تو رحمتے کو بلوا لے۔ میری خاطر بلوا لے۔"

احسان شاہ نے شیدا کو بلایا۔ اس سے کہا۔ "رحمتے کو یہاں لے آ۔"

شیدا خاموشی سے مڑا اور برآمدے سے چلا گیا۔ واپس آیا تو رحمتے اس کے ساتھ تھی۔ وہ ڈھلتی عمر کی پستہ قد عورت تھی۔ جسم پھیلا ہوا تھا۔ رنگت گہری سانولی تھی۔ چہرہ چوڑا چکلا اور گوشت سے بھرا ہوا تھا۔ ناک بھونڈی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ایک رخسار پر بڑا سا مسا تھا۔ بال خوب گھنے اور سیاہ تھے۔ جن میں کہیں کہیں سے سفیدی جھلکتی تھی۔ وہ کم رو بھی تھی اور سن بھی چالیس سے اوپر ہی تھا۔ وہ اس وقت میلے کچیلے کپڑے پہنے تھی جن سے پسینے کی تیز بو اٹھتی تھی۔

سردار شاہانی نے نظر بھر کر رحمتے کو دیکھا۔ قہقہہ مار کر ہنسا۔ احسان شاہ کو مخاطب کیا۔ "شاہ جی! تو نے یہ سانول دانا کہاں چھپا رکھا تھا۔" یہ کہتا ہوا وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہسکی سے بھرا ہوا گلاس ہونٹوں سے لگایا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔ اس نے خالی گلاس میز پر رکھا۔ رحمتے کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا اور اس کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر رحمتے کے پھولے پھولے گالوں کو انگلیوں سے پکڑ کر ہولے ہولے ہلایا۔ بے تکلفی سے ہنسا۔

"میں صدکے ونجاں۔" اور رحمتے کے بازو میں بازو ڈال کر بولا۔ "ادھر آ دل جانی۔"

رحمتے اس کے پہلو میں کسمسائی۔ شاہانی نے قہقہہ بلند کیا۔ "نخرا شکرا چھوڑ۔ رناں دے چالے نہ کر۔ سدھی سدھی چل۔" شاہانی نے ہولے سے ٹھوکا دیا اور رحمتے کے سہارے ڈگمگاتے قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔

رحیم داد حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا رہا۔ احسان شاہ بے نیازی سے بیٹھا وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔

اس واقعے کے دوسرے ہی روز شاہانی چلا گیا۔ مگر رحیم داد ٹھہرا رہا۔ تیسرے روز تحصیل دار آ گیا۔ وہ سرکاری دورے پر نکلا تھا۔ لیکن اس کا قیام احسان شاہ کی حویلی میں رہا۔ تحصیل دار جب پہنچا تو شام گہری ہو چکی تھی۔ احسان شاہ اور رحیم داد باغ کے ایک گوشے میں بیٹھے تھے۔ وہسکی کا دور چل رہا تھا۔ احسان شاہ تحصیل دار کو دیکھتے ہی اٹھا اور بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔

دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ احسان شاہ نے تحصیل دار کی طرف ہاتھ اٹھا کر رحیم داد سے کہا۔ "یہ اپنی تحصیل کے تحصیل دار' منور خاں ہیں۔" تحصیل دار کو اپنے روبرو بیٹھے دیکھ کر رحیم داد کا گھبرایا بھی۔ لیکن احسان شاہ اس کی گھبراہٹ اور پریشانی سے بے نیاز کہتا رہا۔

"اور جی یہ کوٹلہ ہر کشن کا زمیں دار' اپنا یار' نور الٰہی ہے۔"

شیدا نے جھٹ گلاس میز پر رکھا۔ احسان شاہ نے گلاس میں وہسکی ڈالی۔ ہلکا قہقہہ لگایا۔ "جان پہچان کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" اس نے باری باری تحصیل دار اور رحیم داد کو دیکھا۔ "جو کمی رہ گئی ہے وہ تم دونوں ابھی خود ہی پوری کر لو گے۔" اس نے پیگ بنا کر تحصیل دار کے سامنے رکھا اور بے تکلفی سے بولا۔ "یار منور خاں! اب تو شروع ہو جا۔" تحصیل دار نے گلاس اٹھا کر ہاتھ بلند کیا۔ مسکرایا' گلاس ہونٹوں سے لگایا اور فوراً شروع ہو گیا۔

تحصیل دار بھی بڑا یار باش اور زندہ دل تھا۔ رحیم داد کا ہم عمر بھی تھا۔ اس نے سردار مراد خاں شاہانی کی کمی پوری کر دی۔ ایک ہی رات میں وہ رحیم داد سے اس قدر مانوس اور بے تکلف ہو گیا کہ عورت کا انتخاب بھی اس نے رحیم داد کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ رحیم دا نے گریز کیا تو وہ سر ہو گیا۔ نشے میں جھوم کر بار بار شیدا سے کہتا۔ "شیدے! میرے لیے تو وہی آئے گی جسے چوہدری کہے گا۔" احسان شاہ بے نیازی سے گھونٹ گھونٹ وہسکی پیتا رہا۔

اس کی ضد کے سامنے رحیم دا کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔ شیدا سے کہا۔ "تحصیل دار کے لیے رانو کو لے آ۔"

شیدا تھوڑی دیر بعد رانو کو لے آیا۔ اسے دیکھ کر تحصیل دار منور خاں بہت خوش ہوا اور اس قدر خوش ہوا کہ رانو کے بجائے بڑھ کر رحیم داد کا منہ چوم لیا۔ اس وقت وہ نشے میں دھت تھا۔ چڑھا بھی زیادہ گیا تھا۔

تحصیل دار سویرے ہی سویرے دورے پر نکل گیا اور شام تک نہ لوٹا۔ احسان شاہ اور رحیم داد حسب معمول وہسکی سے شغل کر رہے تھے۔ شام کی رنگت کالی ہوئی اور اندھیرا بڑھا تو تحصیل دار بھی آ گیا۔ سیدھا باغ کے اس گوشے میں پہنچا جہاں احسان شاہ اور رحیم داد بیٹھے تھے۔ تحصیل دار منور خاں کے ہمراہ علاقے کا تھانے دار بھی تھا۔ وہ اس وقت وردی میں تھا۔

تھانے دار کو دیکھتے ہی رحیم داد کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کا ہاتھ لرز کر رہ گیا۔ گلاس بھرا ہوا

نہ تھا ورنہ جھلک پڑتا۔ لیکن تھانے دار نے رحیم داد پر کوئی توجہ نہ دی۔ بیٹھتے ہی ڈکیتی کی ایک واردات کا ذکر چھیڑ دیا جس میں گاؤں والوں نے جم کر ڈاکوؤں سے مقابلہ کیا تھا۔ اور انھیں فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر گاؤں کا ایک نوجوان ڈاکوؤں کی اندھا دھند فائرنگ سے ہلاک بھی ہو گیا تھا۔ تھانے دار اسی واردات کی تفتیش کے بعد لوٹا تھا۔

تھانے دار ڈاکے کی واردات کے بارے میں ایک ایک تفصیل احسان شاہ کو سناتا رہا اور رحیم داد سہا ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ احسان شاہ نے تحصیل دار اور تھانے دار کے سامنے بوتل کے ساتھ دو گلاس بھی رکھ دیئے۔ دونوں نے خود ہی اپنے لیے پیگ تیار کیے اور گلاس ہونٹوں سے لگا کر ایک ایک گھونٹ بھرا۔

وہسکی کا دور چلتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی باتیں بھی ہونے لگیں۔ حجابات اٹھنے لگے۔ تکلفات مٹتے گئے۔ قہقہے بلند ہونے لگے۔ نشہ چڑھا اور تیز ہوا تو سب ایک ہی رنگ میں رنگ گئے۔ فاصلے قربتوں میں بدل گئے۔ رحیم داد کے ذہن پر چھایا ہوا خوف اور خطرے کا احساس رفتہ رفتہ زائل ہوتا گیا۔ وہ بھی گفتگو میں حصہ لینے لگا اور پھر ایسا مرحلہ آگیا کہ احسان شاہ اور تحصیل دار منور خاں کی طرح وہ تھانے دار سے بھی مانوس اور بے تکلف ہو گیا۔

شغل بادہ نوشی سے جب چاروں فارغ ہوئے تو رات بھیگ چکی تھی۔ رحیم داد اور تھانیدار ایک دوسرے کے اس قدر زیادہ قریب آچکے تھے کہ ہنس ہنس کر بے دھڑک باتیں کرتے تھے۔ مگر رحیم داد نے نشے میں چور ہونے کے باوجود تھانے دار سے اللہ وسایا کے قتل کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ احسان شاہ نے بھی اس سلسلے میں اجتناب برتا اور تھانے دار نے بھی اس کا ذکر نہ چھیڑا۔

☆

تھانے دار نے صرف رات بھر حویلی میں قیام کیا۔ وہ سویرے اٹھ کر چلا گیا۔ البتہ تحصیل دار منور خاں چار روز ٹھہرا۔

رحیم داد نے دو ہفتے سے بھی زیادہ عرصے تک قیام کیا۔

دن کا بیشتر حصہ وہ سو کر گزارتا۔ شام ہوتے ہی احسان شاہ کے ساتھ مے نوشی کرتا۔ ہر رات نوراں کو اپنے کمرے میں بلوالیتا۔ وہ رحیم داد سے خوش بھی تھی۔ ہر رات خوب بن سنور کے اس کے پاس آتی۔ رحیم داد نشے سے جھومتا جھومتا کمرے میں داخل ہوتا تو وہ ہنستی مسکراتی اٹھ کر کھڑی ہو جاتی۔ آگے بڑھتی اور جھٹ رحیم داد کا بازو تھام لیتی۔ اسے سہارا دے کر بستر پر لاتی اور اس کے پہلو میں سمٹ کر بیٹھ جاتی۔

رحیم داد کبھی اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتا۔ کبھی ہولے سے رخسار میں چٹکی بھرتا۔ کبھی پیار سے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیتا' چھیڑ چھاڑ کرتا۔ ہنستا' قہقہے لگاتا اور ہر رات نوراں کو پانچ روپے دیتا۔ کبھی وہ روٹھ جاتی تو مناتا۔ مضمحل اور پریشان نظر آتی تو اس کی دل جوئی کرتا۔

نوراں میں رحیم داد کی بڑھتی ہوئی دلچسپی دیکھ کر ایک شام وہسکی کا گھونٹ بھرتے ہوئے احسان شاہ نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔

"چوہدری! تجھے نوراں بہت پسند ہے تو اسے ساتھ لے جا۔"

مگر رحیم داد آمادہ نہ ہوا۔ "شاہ جی! میں تو یہ بھی نہیں چاہتا کہ جمیلہ کو یہ پتہ چلے' میں تیرے پاس ٹھیرا تھا۔ نوراں پہنچ گئی تو جمیلہ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ تیں نوں پتہ ہی ہے' میں ہمیشہ اس سے چھپ کر تیرے پاس آتا ہوں۔"

"جیسی تیری مرضی۔" احسان شاہ بے نیازی سے بولا۔ "پر جمیلہ سے تو اس طرح کب تک ڈرتا رہے گا؟"

"شاہ جی! تو نے ہی تو مشورہ دیا تھا کہ جلد بازی سے کام نہ لے۔" رحیم داد نے ہنس کر کہا۔ "اب خود ہی کہہ رہا ہے کہ ڈرنے سے کام نہیں چلے گا۔ میں تیری کون سی گل ٹھیک سمجھوں۔"

"میرا کہا مان' تو یہاں سے جاتے ہی جمیلہ کو کابو کرنے کی کوشش کر۔" احسان شاہ نے آنکھ مار کر کہا۔ "وہ رن ہے اور جوان بھی ہے۔ میں نے تو نہ جانے کتنی ٹیڑھی زنانیوں کو سیدھا کر دیا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "جمیلہ تیرے کابو نہ آئے تو میرے پاس بھیج دے۔ منہ زور اور اڑیل گھوڑی کو جیسے سدھایا جاتا ہے' ویسے ہی اسے بھی ٹھیک ٹھاک کر دوں گا۔ ایک دم لائن پر آجائے گی۔ کیا سمجھا؟"

مگر رحیم داد نے اس کی بات سمجھ کر بھی سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ اس کی حوصلہ افزائی سے گریز کیا۔ نہایت سنجیدگی سے بولا۔ "فکر نہ کر شاہ جی' وہ کابو آجائے گی اور تو دیکھ لینا جلد ہی آجائے گی۔ میں نے اسے رکھیل بنا کر نہیں رکھنا۔ گھر والی بنا کر رکھوں گا۔ ملاں کو بلا کر باقاعدہ نکاح پڑھواؤں گا۔"

"یہ ضروری بھی ہے۔" احسان شاہ نے رحیم داد کی تائید کی۔ ساتھ ہی مشورہ بھی دیا۔ "پوری زمین داری اب تیرے ہی پاس ہونی چاہیے۔ ویسے بھی تو جوان ہے۔ تجھے ایک زنانی کی ضرورت بھی ہے۔ جمیلہ ہتھے چڑھ گئی تو عیش ہو جائیں گے تیرے۔" احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ رحیم داد بھی بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔

اسی طرح ہنستے‘ قہقہے لگاتے اور وہسکی کی چسکی لگاتے سترہ روز گزر گئے۔

☆

رحیم داد حویلی اسٹیشن کے راستے واپس کوٹلہ ہرکشن پہنچا۔ وہ اسی راستے سے احسان شاہ کے پاس پیراں والہ آیا تھا۔ گاؤں میں پہنچ کر اس نے تانگا حویلی کے پھاٹک پر رکوایا۔ نوکروں سے سامان اتروایا اور سیدھا حویلی کے اندر چلا گیا۔ احمد اسے ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرہ صاف ستھرا تھا اور کشادہ بھی تھا۔ کمرے میں دو پلنگ بچھے تھے۔ ان پر اجلے بستر لگے تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر ہلکے سبز رنگ کے پردے لہرا رہے تھے۔ وسط میں بڑی سی گول میز تھی۔ اس پر رکھے ہوئے گل دان میں تازہ پھول مہک رہے تھے۔

احمد نے بتایا کہ کمرے کی صفائی اور اس کی آرائش جمیلہ نے اپنی نگرانی میں کرائی ہے۔ اسی کی ہدایت پر ہر صبح گل دان میں تازہ پھول لگائے جاتے۔ جھاڑ پونچھ کی جاتی۔ وہ ہر روز بے چینی سے رحیم داد کی واپسی کا انتظار کرتی۔ مگر وہ اس وقت اسکول میں تھی۔ رحیم داد کے جانے کے چند ہی روز بعد اس نے اسکول میں بچوں کو پڑھانا شروع کردیا تھا۔

مہمان خانے کی طرح اس کمرے کے ساتھ بھی کوٹھری تھی۔ رحیم داد نے کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ دیکھا‘ اس کا سامان مہمان خانے سے لاکر کوٹھری میں حفاظت کے ساتھ رکھ دیا گیا ہے۔ کمرے کا ایک دروازہ ملحقہ کمرے میں کھلتا تھا۔ رحیم داد اس کمرے میں گیا۔ اس میں بھی دو پلنگ بچھے تھے۔ ان پر بھی بستر لگے تھے۔ دروازے اور کھڑکیوں پر پردے بھی پڑے تھے۔ یہ کمرہ دیکھتے ہی رحیم داد سمجھ گیا کہ وہ بچوں کے قیام کے لیے ہے۔ اس کی صفائی اور آرائش بھی جمیلہ کی نگرانی ہی میں کی گئی تھی۔

رحیم داد کمرے میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ رحیم داد سفر کی تکان سے نڈھال ہو رہا تھا۔ کپڑے گرد آلود تھے۔ چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ مگر اس نے غسل نہ کیا۔ چپ چاپ بیٹھا جمیلہ کا انتظار کرنے لگا۔

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی جمیلہ کمرے میں داخل ہوئی۔ لیکن دہلیز ہی پر رک گئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ”چوہدری! تو بھابی کو نہیں لایا۔ بچے کدھر ہیں؟“

حیم داد نے پہلے سے سوچے منصوبے کے تحت کوئی جواب نہ دیا۔ منہ لٹکائے خاموش بیٹھا رہا۔ جمیلہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی رحیم داد کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ حیران و پریشان نظر آر تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے دبی زبان سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”کیا اس بار بھی تیری گھروالی اور بچے نہیں ملے۔ سلامت نے تجھے غلط اطلاع دی تھی؟“

”نہیں‘ اس نے ٹھیک ہی اطلاع دی تھی۔“ رحیم داد نے چہرے پر افسردگی طاری کرنے کے اتھ لہجے میں بھی رقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”میری گھروالی‘ رابعہ‘ تخت محل ہی میں ے بچے بھی اس کی ساتھ ہیں۔“

”پر وہ تیرے ساتھ آئی کیوں نہیں؟“

رحیم داد کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ ”وہ اب میرے پاس نہیں آسکتی۔“

”وہ تیرے پاس کیوں نہیں آسکتی؟“ جمیلہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ ”ایسا کیوں ہے؟ صاف صاف بتا۔“

”صاف گل سننا چاہتی ہے تو وہ بھی سن لے۔“ رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ چند لمحے لریں اٹھائے چپ چاپ دیوار کو تکتا رہا۔ اس نے جمیلہ کی طرف نہ دیکھا۔ کھوئے کھوئے انداز ں آہستہ سے کہا۔ ”وہ اب کسی اور کی ہوچکی ہے۔ اس نے ایک پٹواری سے ویاہ کرلیا ہے اور ں بات کو بھی تین سال سے اوپر ہوچکے ہیں۔ پٹواری سے اس کے دو بچے بھی ہیں۔“ اس نے مڑ ر افسردہ نگاہوں سے جمیلہ کو دیکھا۔ ”زمیں دارنی! تو ہی بتا‘ اب وہ میرے ساتھ کیسے رہ سکتی ہے۔“

”پر اس نے ایسا کیوں کیا؟ تیرا انتظار بھی نہ کیا۔“ جمیلہ کا لہجہ بھی دکھ بھرا تھا۔

”پانچ سال تک رابعہ میرا انتظار کرتی رہی۔“ رحیم داد نے بوجھل لہجے میں رک رک کر بتایا۔ وہ بچوں کو ساتھ لیے جگہ جگہ مجھے ڈھونڈتی رہی۔ زیور بیچ کر اور گھروں میں کام کاج کرکے کسی کی طرح اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتی رہی۔“ رحیم داد ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہا ا۔ ”جب بہت پریشان ہوگئی اور میرے ملنے کی کوئی آس نہ رہی‘ تب یہ سوچ کر کہ میں بھی رے مسلمانوں کی طرح فسادات میں مارا گیا‘ اس نے مجبور ہوکر پٹواری سے نکاح پڑھوالیا۔ وہ ن کی دوسری گھروالی ہے۔ پہلی مدت ہوئی مرگئی۔“

”تجھے یہ ساری گل بات کیسے معلوم ہوئی؟“

رحیم داد نے بتایا۔ ”میں دو ہفتے تک تخت محل میں سلامت کے ایک یار کے ساتھ ٹھہرا رہا۔ ابعہ سے کسی نہ کسی طرح ملنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک رات جب پٹواری بھاول نگر گیا تھا میں پکے سے اس کے گھر میں گھس گیا۔ رابعہ نے مجھے یکھا تو حیران رہ گئی۔ دیر تک اسے یقین ہی نہ ا کہ میں زندہ ہوں۔“

”جب اسے وشواس ہوگیا تواس کا گھروالا چوہدری نورالٰہی ہے‘ تب اس نے کیا کیا؟“ جمیلہ نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

”وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دیر تک آنسو بہاتی رہی۔“ رحیم داد نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ہولے سے آہ بھری۔ ”اس نے رو رو کر مجھے اپنی بپتا سنائی۔“ اپنی بات کہتے کہتے وہ ٹھٹکا۔ ”کیا‘ کیا جائے اپنے نصیب ہی میں اس طرح مل کر بچھڑنا لکھا تھا۔ مگر گھر ایسا اجڑا کہ اب اس کے دوبارہ بسنے کی کوئی امید نہیں۔“

”ہاں تیری طرح نہ جانے کتنوں کے گھر اسی طرح اجڑ گئے۔“ جمیلہ کی آواز بھرا گئی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ جمیلہ بھی چپ ہوگئی۔ اس نے آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی۔ دل گرفتہ ہوکر بولی۔ ”تو اپنے بچوں سے بھی ملا؟“

”نہیں۔“ رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”انھیں صرف نزدیک سے دیکھا تھا۔ وہ اس دکت سو رہے تھے۔ میں نے انھیں جگانے کی کوشش نہیں کی۔ اب تو اتنے دن بیت گئے کہ وہ مجھے پہچان بھی نہ پاتے۔“ اس نے جمیلہ کی طرف غم زدہ نظروں سے دیکھا۔ ”زمیں دارنی! ویسے انھیں تو یہی پتہ ہے ان کا پیو مرچکا ہے۔ ماں نے ان کو یہی بتا رکھا ہے۔“ رحیم داد نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اٹھ سال میں سب کچھ بدل گیا۔ بچے بڑے ہوگئے۔ ایک بیٹی تو جوان ہو چکی ہے۔“

”چوہدری! تو ایسا کر جوان دھی کو یہاں لے آ۔“ جمیلہ نے مشورہ دیا۔ ”یہاں رہے گی تو تجھے بھی آرام ملے گا۔ ٹھیک ٹھاک ور مل جائے تو اس کا ویاہ کر دینا۔“

”رابعہ اس کے لیے تیار نہ ہوگی۔“ رحیم داد نے فوراً بات بنائی۔

”کیوں نہیں تیار ہوگی؟“ جمیلہ نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔

”میں تو صرف ایک بیٹی کو نہیں‘ سب بچوں کو اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”میری یہ بات سن کر رابعہ رونے لگی۔ سسکیاں بھر کر بولی۔ انھیں مجھ سے الگ نہ کر۔ میں نے بہت دکھ جھیل کر انھیں پالا پوسا ہے۔ انھی کے سہارے تو میں اب تک زندہ رہی۔ تیں نوں ان سے کیا لینا۔ تو انھیں بھی میری طرح مرا ہوا سمجھ کر صبر کر چکا تھا۔ آگے بھی صبر کر لے۔ اس کی باتیں سن کر میں چپ ہوگیا۔ کر بھی کیا سکتا تھا۔ چوری سے چھپ کر تو اس کے گھر میں گیا تھا۔“

”پر یہ تو کوئی گل بات نہ ہوئی۔“ جمیلہ اپنی بات پر بدستور اڑی رہی۔ ”سب نہیں‘ وڈی کڑی کو تو وہ دے ہی سکتی ہے۔ اس میں اس کا بھی لابھ ہے۔ کبھی نہ کبھی تو رابعہ کو بیٹی کا ویاہ کرنا ہی ہوگا۔ وہ ہر طرح کی چنتا سے بچ جائے گی۔“

”وہ یہ بات نہیں سمجھتی۔“

”تو مجھے رابعہ کے پاس لے چل۔ میں اسے راضی کرلوں گی۔“

”نہیں زمیں دارنی‘ تیرا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی تو عدت میں ہے۔ تو کیسے تخت محل کتی ہے؟“ رحیم داد نے ٹالنے کی کوشش کی۔ ”میں نے تیرے بارے میں رابعہ کو کچھ نہیں یا۔ تجھے دیکھ کر جانے وہ کیا سوچے۔“

”سوچنے دے۔ اس کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔“ جمیلہ نے بے نیازی سے کہا۔ ”تو اپنی بتا۔ ری کیا مرضی ہے؟“

”پہلے مجھے کوشش کر لینے دے۔ فیر تو کوشش کرنا۔“ رحیم داد نے جمیلہ کو دلاسا دیا۔ ”میں کچھ دں بعد دوبارہ تخت محل جاؤں گا۔“

”جیسی تیری مرضی۔“ جمیلہ نے مزید اصرار نہ کیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ رحیم داد سے مخاطب کر بولی۔ ”چوہدری! اب تو اشنان کر لے۔ تھکا ہوا بھی ہے۔ روٹی کھا کر آرام سے سوجا۔“

جمیلہ چلی گئی۔ رحیم داد بہت خوش اور مطمئن تھا کہ جمیلہ نے اس کی ہر بات پر یقین کرلیا۔ کسی ی حیلے بہانے پر اس نے مطلق شک وشبہ کا اظہار نہ کیا۔ وہ جمیلہ کی ہمدردی حاصل کرنے میں ری طرح کامیاب رہا تھا۔ ساتھ ہی احسان شاہ کے پاس جانے اور اس کی حویلی میں گل چھرے ڑانے کا موثر بہانہ بھی ہاتھ آگیا تھا۔

سویرے رحیم داد نے حویلی کے نائی کو بلوایا۔ ویسے اسے نائی کو بلوانے کی ضرورت پیش نہ آتی ی۔ ہر جمعہ کی صبح‘ وہ نہایت باقاعدگی سے رحیم داد کی حجامت بنانے پہنچ جاتا۔ مگر پچھلے سترہ روز کی ر حاضری نے اس معمول میں خلل پیدا کردیا تھا۔ نائی آیا اس نے رحیم داد کی ڈاڑھی اور سر کے ں تراشے۔ تیل ڈال کر دیر تک سر کی مالش کی۔ رحیم داد نے اس روز بالوں کی تراش خراش اس رح کرائی کہ ڈاڑھی ہلکی اور قدرے مختصر ہوگئی۔

حجامت سے فارغ ہونے کے بعد اس نے غسل کیا۔ اجلے کپڑے پہنے۔ ڈاڑھی اور سر کے بالوں ں کنگھی کی۔ اور جب بن سنور کر حویلی کے بڑے کمرے میں پہنچا تو نادر خاں وہاں پہلے سے موجود ا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی وہ ادب سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ رحیم داد کو غور سے دیکھا‘ مسکرا کر بولا۔ چوہدری! سچی بات یہ ہے کہ اب تو تجھ پر بہت شان آگئی ہے۔“ اس نے رحیم داد کی خوش نودی کے لیے خوشامد سے کام لیا۔ مگر اس خوشامد میں بڑی حد تک صداقت بھی تھی۔ رحیم دا اس وقت اساوجیہ اور باوقار نظر آرہا تھا۔ اس کی رنگت نکھر کر اجلی ہوگئی تھی۔ رخساروں سے سرخی جھلکتی

تھی۔ وہ قدر آور جوان تھا۔ دبلے پتلے لمبے جسم پر گوشت چڑھنے اور بڑھنے سے زیادہ ہی جچنے لگا تھا۔

رحیم داد نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے نادر خاں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خاموشی سے اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی اور دبدبہ تھا۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھیں سوچتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ احسان شاہ کی صحبت میں رہ کر وہ جاگیرداروں اور رئیسوں کے طور طریق کسی قدر سیکھ گیا تھا اور انھیں اپنا بھی چکا تھا۔

نادر خاں زیادہ دیر خاموش نہ رہا۔ دبی زبان سے بولا۔ ”اجازت ہو تو جی ایک بات کہوں؟“

”کہہ کیا کہنا چاہتا ہے؟“ رحیم داد ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے بولا۔

”چشمے کا یہ فریم ٹھیک نہیں لگتا جی۔“ نادر نے رحیم داد کی آنکھوں پر لگی ہوئی عینک کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے تو بدل دینا چاہیے۔“

”اس میں تیں نوں کیہہ خرابی نظر آئی ہے؟ ویسے تیرے خیال میں کیسا فریم ہونا چاہیے؟“

”چوہدری! یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔ ویسے تو یہ کپڑے بھی تیری شان کے مطابک نہیں لگتے۔ لہور سے میرا ایک بھتیجا آیا ہے۔ شام کو واپس جا رہا ہے۔ وہاں ایک راشن ڈپو پر نوکری کرتا ہے۔ وہ لہور سے تیرے لیے عمدہ فریم کا چشمہ بنوا کر اور نئے کپڑے سلوار کر لے آئے گا۔ مجھے اپنا چشمہ اور ناپ کے لیے ایک جوڑا کمیص اور شلوار دے دینا۔ وہ جلدی واپس آجائے گا۔ دیر نہیں لگے گی۔“

”اس پر خرچ کتنا آئے گا؟“

”اس کی فکر نہ کر‘ تیری غیر حاضری میں مزارعوں سے میں نے کچھ وصولی کی ہے۔ وہ میرے پاس موجود ہے۔ چوہدری! تیرا حکم ہو تو میں نئے چشمے اور کپڑوں کے لیے کچھ روپے اپنے بھتیجے کو دے دوں؟“

”دیدے پر یہ بتا مزارعوں سے وصولی کیسے ہوئی اور کتنی ہوئی؟“ رحیم داد نے قدرے تیکھی نظروں سے نادر خاں کو دیکھا۔ ”تو پہلے تو کہتا تھا مزارعے ادھار ادا کرنے کو تیار نہیں۔“

”ویسے تو جی کوئی خاص وصولی نہیں ہوئی۔ باراں سو کے لگ بھگ روپیہ ہے۔ ادھار تو زیادہ ہی وصول ہو جاتا۔ پر زمیں دارنی بار بار اڑچن ڈال دیتی تھی۔ جو مزارع اس کے پاس پہنچ کر فریاد کرتا اسے معاف کر دیتی۔ میں نے اسے کہا بھی یہ طریکہ ٹھیک نہیں۔ وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔ میں اس کی ناراضی سے ڈر گیا۔ تو نے بھی یہی حکم دیا تھا کہ اسے ناراض نہ کیا جائے۔“

”ٹھیک ہی کیا تو نے۔“ رحیم داد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جتنی بھی وصولی ہو گئی ٹھیک ہے۔ خریف کی فصل تو اب تیار ہی ہونے والی ہے۔ اس کی واڈھی پر اپنی سکیم کے مطابک ادھار وصول

رلینا۔“

”مجھے ڈر ہے‘ فصل کی واڈی پر بھی زمیں دارنی اڑینگا ڈالے گی۔“

”تو فکر نہ کر۔ میں اسے سمجھا بجھا لوں گا۔ پیسے کی تو چ پوچھ اسے بھی ضرورت ہے۔ وصولی کی رکم کے بارے میں تو نے زمیں دارنی کو بتا دیا تھا؟“

”بالکل بتا دیا تھا جی۔“ نادر خاں نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”ایک ایک پیسے کا اسے حساب بے دیا تھا۔“

”اس نے وصولی کی رکم تجھ سے مانگی تو نہیں؟“

”میں نے اسے کہا بھی تھا۔ پر اس نے رکم نہ لی۔ کہنے لگی اپنے ہی پاس رکھ۔ چوہدری کو بتا دینا۔ رجسٹر میں اسے وصولی کی مد میں لکھ لے۔ جو خرچ ہو وہ بھی روز کے روز رجسٹر میں لکھ لیا کر۔“

”جیسا اس نے بتایا تو ویسا ہی کر رہا ہے ناں؟“

”بالکل ویسا ہی کر رہا ہوں جی۔ ویسے میں نے کاغذات دیکھ کر اور مزارعوں سے ملنے جلنے کے بعد زمیں داری چلانے کے لیے آگے کا ایک پروگرام بنایا ہے۔ اس کے مطابک ہی کام کرنا ہوگا جی۔ ایسے تو زمیں داری نہیں چل سکتی۔“

”تو نے زمیں دارنی کو بھی اپنا پروگرام بتایا؟“

”نہیں جی۔“ نادر خاں نے جواب دیا۔ ”میں تیری واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ تو جب موجود ہوگا تو تیرے سامنے ہی زمیں دارنی سے اس کے بارے میں گل بات کروں گا۔ مجھے اس کی ناراضی سے خوف آتا ہے۔“

رحیم داد نے نادر سے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی اس سلسلے میں جمیلہ سے ملنے اور بات کرنے کی کوشش کرے گا۔

کئی روز گزر گئے مگر جمیلہ سے رحیم داد کی ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ منہ اندھیرے چادر سے اپنے جسم کو پوری طرح چھپائے ہوئے اسکول چلی جاتی۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں منگوا لیتی۔ اور جب شام کا دھندلکا ہر سو پھیل جاتا تو دوسروں بچوں کے ہم راہ اسکول سے واپس آتی۔ ان دنوں وہ اسکول کی ترقی اور ڈسپنسری کی تعمیر کے کاموں میں الجھی ہوئی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ خریف کی فصل کی کٹائی سے رقم حاصل ہو تو تعمیر کا کام پوری سرگرمی سے شروع کیا جائے۔

☆

اتوار کو اسکول میں چھٹی تھی۔ جمیلہ حویلی کی بالائی منزل پر تھی۔ اس کا تمام وقت اب اسکول یا

اوپر کی منزل کے کمروں کے ہی میں گزرتا تھا۔ وہیں وہ گاؤں کی عورتوں سے ملتی جلتی تھی۔ جب سے رحیم داد کا قیام حویلی میں شروع ہوا تھا‘ اس نے یہی معمول بنالیا تھا۔

اس روز رحیم داد نے تاراں کے ذریعے جمیلہ کو حویلی کے بڑے کمرے میں بلوایا اور نادر خاں کے ہم راہ اس سے بات چیت کرنے کی غرض سے پہنچا۔ کچھ دیر تک اسکول اور ڈسپنسری کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ جمیلہ نہایت جوش و خروش سے اپنا منصوبہ بتاتی رہی۔ رحیم داد اور نادر خاموشی سے سنتے رہے۔ رحیم داد کوئی بات پوچھتا۔ جمیلہ اس کا جواب دیتی۔ اپنے منصوبے کی تفصیل سے آگاہ کرتی۔

جمیلہ نے اسکول اور ڈسپنسری کا ذکر ختم کیا تو رحیم داد نے نادر خاں کی طرف دیکھا۔ اسے مخاطب کیا۔ ”نادر! تو آگے کے لیے زمیں داری چلانے کی گل بات کرنا چاہتا تھا۔ اب زمیں دارنی کے سامنے اسے بتا۔“

نادر خاں نے رحیم داد کے بجائے جمیلہ ہی کو مخاطب کیا۔ ”زمیں دارنی! میں نے کاغذات اور حسابات کے رجسٹر ایک بار نہیں‘ کئی بار دیکھے۔ انھیں دیکھ کر میں تو جی اسے نتیجے پر پہنچا کہ زمینداری اسی طرح چلتی رہی تو حویلی کا خرچ بھی پورا نہیں ہوسکے گا۔ تسیں سکول کو بڑھانا اور ترکی دینا چاہتی ہو۔ ڈسپنسری لگانا چاہتی ہے۔ یہ سب کچھ کیسے ہوگا؟ کل باوی مربعے کی تو زمیں داری ہے۔ اسے بھی اب تک ٹھیک سے نہیں چلایا گیا۔“

”تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف گل کر۔“ جمیلہ نے تیکھے لہجے میں نادر خاں سے کہا۔

”برا نہ منائے زمیں دارنی تو میں نے صاف ہی صاف گل بات کرنی ہے۔“ نادر خاں نے لہجے میں نرمی اور عاجزی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ سہما ہوا نظر آرہا تھا۔

”میں ہر بات صاف ہی صاف سننا چاہتی ہوں۔“

”اپنی زمیں داری کا حال تو یہ ہے جی‘ نہ مزارعوں سے ویگار لی جاتی ہے‘ نہ خرچہ‘ نہ منشیانا اور نہ کمیالہ ہی وصول کیا جاتا ہے۔“ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”دوسرے سارے ہی وڈے زمیں دار تو مزارعوں سے گھر میں نیا دروازہ یا کھڑکی بنانے پر بھی دروازہ ٹیکس اور کھڑکی ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ مزارع نئی بج خریدے تو بج ٹیکس‘ گنڈ پالے تو گنڈ ٹیکس تک وصول کرتے ہیں۔ زمیں دار کے یہاں موت ہوجائے یا زچگی ہو‘ مونڈن ہو یا ختنہ‘ سب ہی کا ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔“

”کہہ تو ٹھیک ہی رہا تو۔“ رحیم داد نے نادر خاں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”سارے ہی وڈے زمیں دار یہی کرتے ہیں اور جی سدا سے کر رہے ہیں۔“

”پر اپنی زمیں داری میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔“ نادر خاں نے لہجے میں افسردگی پیدا کرنے کی وشش کی۔ ”اپنے زمیں دار اللہ وسایا کا انتقال ہوا۔“ اس نے جمیلہ کو مخاطب کیا۔ ”زمیں دارنی! س کا کفن دفن‘ تیجا‘ چالیسواں‘ سب تونے اپنے ہی ڈب سے کیا۔ مزارعوں نے کچھ بھی نہ دیا۔ اپنی یں داری میں تو مزارعوں کو بٹائی کا حصہ بھی نصفا نصف دیا جاتا ہے جب کہ دوسرے زمیں دار ۷۵ ا ۸۰ فی صد سے بھی اوپر حصہ وصول کرتے ہیں۔“

”نادر خاں تو کیسی گل کر رہا ہے؟ جب ۱۹۵۲ء کے کانون میں زمیں دار کا حصہ پیداوار میں ۴۰ فی مد مکرر کیا گیا ہے تو ہم اس سے زیادہ کیسے وصول کرسکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ نصفا نصف بٹائی بھی لم ہی ہے۔ پتہ نہیں اب تک مزارعوں نے چپ کیوں سادھ رکھی ہے۔“

”زمیں دارنی! تو تو آدھی سے بھی زیادہ بٹائی دینے کی گل کر رہی ہے۔ لگتا ہے‘ میری باتوں کا تو لٹا ہی اثر ہوا۔“ نادر نے جمیلہ کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ”میں تو جی ان ٹیکسوں کی گل بات کر ہا تھا جو وصول نہیں کیے جاتے۔ میرا مطلب ہے۔“

”میں تیرا مطلب ٹھیک طرح سمجھتی ہوں۔“ جمیلہ اس کی بات کاٹ کر تیکھے لہجے میں بولی۔ ‘تیری یہ طرح طرح کے ٹیکسوں والی گل سمجھ نہیں آتی۔ تجھے پتہ نہیں‘ میں نے تو اللہ وسایا کو بردار بھی بننے نہ دیا۔ اسے بار بار نمبرداری پیش کی گئی۔ پر میں نے ہر بار اس کی نندا کی۔“

”تونے یہ ٹھیک نہیں کیا زمیں دارنی۔ نمبرداری سے زمیں داری کی شان اونچی ہوجاتی ہے۔ ے حاصل کرنے کے لیے تو تگڑی رشوت چلتی ہے۔ سفارشیں پہنچائی جاتی ہیں۔ افسروں کی منت ماجت کی جاتی ہے۔“ نادر خاں نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔ ”برا نہ منانا زمیں دارنی‘ جب ہی تو پنی زمیں داری بڑھنے کی بجائے سکڑتی جارہی ہے۔“

”میں نے زمیں داری بڑھائی بھی نہیں۔“ جمیلہ نے تیکھی نظروں سے نادر خاں کو دیکھا۔ ‘میرے پتا کی پانچ ہزار ایکڑ سے بھی اوپر زمیں داری تھی۔ اسے اپنے پیو کی طرف سے ترکے میں تنی وڈی زمیں داری نہیں ملی تھی۔ میرا پتا جات کا کراڑ تو نہیں تھا پر اس کا ساہوکارے کا بھی کاروبار تھا۔ اور بہت پھیلا ہوا تھا۔ سچ پوچھ تو اس نے اپنے ساہوکارے ہی سے اتنی وڈی زمیں اری بنائی تھی۔“

”وہ کیسے؟“ رحیم داد نے حیرت سے دریافت کیا۔

”وہ زمین اور جائیداد رہن رکھتا تھا۔ اگاہی پر زمیں داروں اور کسانوں کو ادھار دیتا تھا۔ جب دھار بیاج کے ساتھ بہت بڑھ جاتا تو وہ وصولی کے لیے عدالت میں نالش کرتا۔ زمیں دار اور

کرضائی کے خلاف ڈگری نکلواتا۔ ان کے گھربار، ڈھور ڈنگر، زمیں کرک کراتا۔ انھیں بے دخل کرکے زمین ہتھیاتا۔ اس طرح وہ اپنی زمیں داری بڑھاتا رہا۔" جمیلہ کا لہجہ تلخ ہوتا گیا۔ "تجھے یہ پتہ، اس کے منیم اور کرندے زمیں سے بے دخلی کے لیے کیسا کیسا ظلم اور اپرادہ کرتے۔ گھروں پر کرکی بٹھاتے۔ فصلیں اٹھوالے جاتے۔ پولیس کو رشوت دے کر گرفتاریاں کراتے۔" اس کی آواز رفتہ رفتہ تیز اور اونچی ہوتی گئی۔ "زمیں داری کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے کارن جو ظلم ڈھایا گیا۔ اس کا کیا نتیجہ نکلا؟"

جمیلہ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ رحیم داد اور نادر کی جانب دیکھا۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ جمیلہ نے گہری سانس بھری۔ "یہ فسادات اور بلوے کیا تھے؟ کراڑوں اور ساہوکاروں کے اپرادہ اور لوٹ مار کے خلاف کرض ادھار میں جکڑے ہوئے مسلمان کسانوں اور زمیں داروں کی نفرت ہی تو تھی۔ میں نے تو کتابوں میں پڑھا ہے۔ ۱۹۱۶ء میں بھی ملتان، مظفر گڑھ، جھنگ اور دوسرے ضلعوں میں اسی طرح کراڑوں اور ساہوکاروں کے خلاف مسلمان کسان اور زمین دار اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کسان وودرہیوں نے ہندو ساہوکاروں کے گھروں پر ہلہ بول دیا۔ ان کے گھر لوٹ لیے۔ آگ لگائی۔ بہت خون خرابہ کیا۔ اتنی گڑبڑ مچائی کہ وودرہی کسانوں پر کابو پانے کے لیے انگریزوں کو فوج لگانی پڑی۔ جگہ جگہ وودرہیوں اور فوج کے درمیان زبردست لڑائیاں ہوئیں۔ یہ گڑبڑ تھوڑے دنوں نہیں، سال ڈیڑھ سال تک چلتی رہی۔"

"پر زمیں دارنی ۴۷ء کے فسادات اور بلووں میں تو ہزاروں کتل ہوئے۔ پورے پورے پنڈ اجڑ گئے۔ بستیاں کی بستیاں لوٹ لی گئیں۔ بہت زبردست تباہی ہوئی۔ بہت خون خرابہ ہوا۔" نادر نے جمیلہ کی طرف دیکھا اور اس کی خوش نودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ "تو نے ٹھیک ہی کہا، فسادات اور بلوے ہندو بنیوں اور ساہوکاروں کے ظلم و ستم اور ان کی دھاندلیوں کے خلاف مسلمان کسانوں اور دوسرے کرض داروں کی نفرت کا اظہار تھا۔ مگر فسادات کی صرف یہی ایک وجہ تو نہیں تھی۔"

"اور بھی وجہ تھی۔ کئی طرح کی باتیں تھیں۔" رحیم داد نے نادر خاں کی تائید کی۔

"پنڈی، ملتان، منٹگمری، لہور اور نہ جانے کتنی جگہ تو یہ بھی ہوا کہ ہندوؤں اور سکھوں کا مال اسباب لوٹنے، ان کی زمینوں اور املاک پر کبضہ کرنے کی غرض سے سیاسی لیڈروں اور وڈے زمیں داروں نے باکاعدہ منصوبے کے تحت مسلمانوں کو طرح طرح سے اشتعال دلایا۔ اپنے بندوں کے ذریعہ فسادات اور بلوے کرائے۔ لوٹ مار اور خون خرابہ کرایا۔" نادر خاں نے اپنی بات کہتے کہتے

ایک بار پھر نظریں اٹھا کر جمیلہ کی جانب دیکھا۔ "زمیں دارنی! یہ تو تمیں نوں پتہ ہی ہے، ایک بار جب نفرت اور غصے کی آگ سلگ جاتی ہے تو فیر ہر طرف پھیلنے لگتی ہے۔ سوال صرف چنگاری لگانے کا ہے۔ میں نے ان گنہگار آنکھوں سے دیکھا ہے کہ لہور میں کس طرح لیڈروں اور وڈے لوگوں نے مختلف ہتھکنڈوں سے فسادات کی آگ بھڑکائی۔"

جمیلہ تو خاموش رہی، مگر رحیم داد خاموش نہ رہا۔ اس نے پوچھا۔ "فسادات کے دنوں میں تو ادھر ہی ہوتا تھا؟"

"میں ان دنوں لہور میں تھا۔ پر مجھے امرتسر بھی جانا پڑا تھا۔"

"مسلمان بھاگ کر ادھر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تو کیوں امرتسر چلا گیا؟ وہاں تو اس وکت ہر طرف مسلمانوں کا خون بہایا جا رہا تھا۔ گھربار لوٹے جا رہے تھے۔ تجھے اس جلتی آگ میں جانے کی کیا سوجھی؟"

"وہ ایسا ہوا جی، میرا وڈا بھرا، منظور خاں، امرتسر کی ایک کپڑا مل میں سپروائزر لگا تھا۔" نادر خاں نے بتایا۔ "جب اس نے حالات بگڑتے دیکھے اور آنے والے خطرے کی بو محسوس کی تو گھر والی کو بچوں کے ساتھ لہور بھیج دیا۔ خود نوکری کی خاطر امرتسر میں رہا۔ جب امرتسر اور مشرکی پنجاب کے دوسرے حصوں سے مسلمانوں کے خون خرابے اور لوٹ مار کی خبریں ادھر پہنچنے لگیں تو میری بھابی نے گھر والے کے لیے رو رو کر برا حال کر لیا۔ گڑگڑا کر میری منت کی۔ مجھ سے اس کا یہ دکھ دیکھا نہ گیا۔ ویسے بھی منظور میرا سگا بھرا تھا۔ آخر اسے لینے مجھے امرتسر جانا ہی پڑا۔ یہ نہ پوچھ کیسے وہاں پہنچا۔"

"حد کر دی تو نے۔" رحیم داد کے لہجے میں استعجاب تھا۔ "تو وہاں سے نکل کر ادھر پہنچا کیسے؟ منظور تجھے مل گیا تھا؟"

"ہاں جی! وہ مجھے مل گیا تھا۔ وہ کٹڑا کنہیاں میں اپنے ایک ہندو جاننے والے، گینش پرشاد، کے گھر میں چھپا ہوا تھا۔ میں امرتسر پہنچنے کے بعد مسجد غزنویہ میں ٹھہر گیا۔ مسجد کے ساتھ مدرسہ بھی تھا۔ اس کے مہتمم سے میری جان پہچان تھی۔ تب ہی تو میں وہاں ٹھہر سکا تھا۔ دوسرے محلوں اور علاکوں کے مسلمان بھی بھاگ بھاگ کر شریف پورہ یا مسجد غزنویہ پہنچ رہے تھے۔ میں نے منظور کو کسی نہ کسی طرح اپنے پہنچنے کی اطلاع بھجوائی اور اسے کہا کہ وہ بھی کوشش کر کے مسجد غزنویہ پہنچ جائے۔ مسجد غزنویہ ان دنوں بہت محفوظ جگہ تھی۔ فیر جی ایسا ہوا کہ ایک رات منظور مسجد غزنویہ پہنچ ہی گیا۔ اس نے ایسا بھیس بنایا تھا کہ پہلی نظر میں تو میں اسے ہندو سمجھا۔ دوسرے بھی یہی سمجھے

اور اسے پکڑ کر میرے پاس لائے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی گلے سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔" نادر خاں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "وہ تو جی سمجھو موت کے منہ سے نکل کر آیا تھا۔ ان دنوں مسجد میں اور اس کے آس پاس بہت مسلمان اکٹھے تھے اور روز بروز ان کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔"

"میں نے تو سنا ہے امرتسر کی مسجد غزنویہ میں مسلمانوں کا بہت خون بہا۔ بہت تباہی ہوئی۔" رحیم داد نے دریافت کیا۔ "میں نے غلط تو نہیں سنا؟"

"تو نے ٹھیک ہی سنا چوہدری۔" نادر خاں نے جواب دیا۔ "میں نوں اب تک وہ بھیانک رات یاد ہے۔" اس کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیلنے لگے۔ "میں بھولا نہیں۔ ایک ایک بات یاد ہے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ مسجد میں دن رات کلام پاک کی تلاوت ہوتی' وعظ ہوتا۔ دعائیں مانگی جاتیں۔ ۱۴ اگست کو جب پاکستان بننے کا اعلان ہوا تو ہم دونوں بھائی مسجد غزنویہ ہی میں تھے۔ رمضان کی ۲۷ تاریخ تھی۔ نہ پوچھ کیسی خوشی منائی گئی۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے تھے۔ گرم جوشی سے گلے ملتے تھے۔"

"اس وکت تک مسجد محفوظ رہی ہوگی؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"ہاں جی۔ پر تباہی بھی اس روز ساتھ ہی آئی۔" نادر خاں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "عید سے تین روز پہلے کا ذکر ہے۔ مجھے ٹھیک طرح یاد ہے۔ مسجد کے صحن میں اور اس کے آس پاس پڑے ہوئے مسلمان رات کو بھی جاگ ہی رہے تھے۔ ہر طرف سے تلاوت کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اچانک آدھی رات کو زبردست شور اٹھا۔ پتہ چلا' ریاستی اور گورکھا فوج نے مسجد پر دھاوا بول دیا۔"

"فیر کیا ہوا جی؟" رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"ہونا کیا تھا۔ نہتے مسلمان فوج کے مسلح سپاہیوں کا کس طرح مقابلہ کر سکتے تھے۔ ڈر کے ادھر ادھر چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم دونوں بھائی بھی مدرسے کے ایک حجرے میں چھپ گئے۔ رات کے اندھیرے میں ہر طرف چیخ پکار مچی تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کیا ہو رہا ہے۔ بہت دیر بعد جب شور شرابہ رکا اور یہ اطلاع ملی کہ حملہ آور فوجی کتل غارت گری کر کے چلے گئے تو منظور کے ساتھ میں حجرے سے نکل کر مسجد میں پہنچا۔ دیکھا صحن میں ہر طرف لاشیں بکھری ہیں کچھ سسک رہے تھے۔ کچھ دم توڑ رہے تھے۔ کچھ زخموں سے تڑپ رہے تھے۔ کوئی مرہم پٹی کرنے والا بھی نہ تھا۔ مسجد میں جدھر نظر جاتی' خون ہی خون نظر آتا۔"

"زنانیاں اور مٹیاریں نہیں تھیں؟" جمیلہ بہت دیر بعد بولی۔

"بہت تھیں جی۔" نادر خاں نے بتایا۔ "کچھ کی تو ننگی لاشیں مسجد کے صحن میں خون میں لتھڑی ڈی تھیں۔ کسی کا پیٹ چاک تھا کسی کی چھاتیاں کٹی ہوئی تھیں۔ کچھ کو حملہ آور فوجی اور بلوائی اٹھا ر لے گئے۔ کچھ نے اپنی آبرو بچانے کے لیے مسجد کے کنوئیں میں چھلانگیں لگائیں اور ڈوب کر رگئیں۔ ان کی لاشیں پانی پر تیرتی دکھائی دے رہیں تھیں۔"

"بہت ظلم اور اپراده ہوا۔" جمیلہ نے دکھ بھرے لہجے میں اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

رحیم داد نے نادر خاں سے دریافت کیا۔ "تو اور منظور اس خون خرابے کے بعد مسجد ہی میں ھیرے رہے؟"

"نہیں جی' بلوچ رجمنٹ کی نگرانی میں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ہم دونوں کو بھی شریف پورہ کے ریلیف کیمپ میں پہنچا دیا گیا تھا۔" نادر نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "ایک روز ایسا ہوا کہ علاکہ مجسٹریٹ میجر پورن سنگھ' شریف پورہ کیمپ کے مسلمان پناہ گزینوں کا حال احوال معلوم کرنے آیا۔ ں سے فریاد کی گئی۔ ظلم و ستم کا حال بتایا گیا۔ میجر پورن سنگھ بہت متاثر ہوا۔ اس نے شہر کے عائنے کا ارادہ کیا۔ ساتھ ہی کئی مسلمانوں کو بھی لیا۔ ان میں 'میں بھی شامل تھا۔"

"تو بھی معائنے پر مجسٹریٹ کے ساتھ گیا تھا۔" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "کیا حال تھا شہر ا؟"

"حال کی کیا پوچھتے ہو جی۔" نادر نے رقت انگیز آواز میں کہا۔ "مسلمان محلوں میں تو ہر طرف اہی نظر آتی تھی۔ جدھر نظر اٹھتی جلے ہوئے مکانات اور کھنڈر دکھائی دیتے۔ شہر کے گلی کوچوں ل رستوں اور سڑکوں پر خون نظر آتا۔ لاشیں پڑی سڑتی تھیں۔ کسی کا سر کٹا ہوا' ہاتھ اور کسی کے ر۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "کوچہ رنگریزاں سے معائنہ ٹیم میجر پورن سنگھ کے ساتھ باہر نکلی ایک مکان کے پرنالے سے لال لال اور تازہ خون بہہ رہا تھا۔ میجر کے ساتھ مکان کی چھت پر جا کر یکھا کہ ایک نوجوان زنانی اور اس کا ننھا سا نکا خون میں ڈوبے پڑے ہیں۔ زنانی کے بدن کے ڑے ہوگئے تھے۔ پر نکا اس نے چھاتی سے لگا رکھا تھا۔ دونوں ہی مر چکے تھے اور انھیں مرے ئے زیادہ دیر بھی نہ گزری تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک جلتے ہوئے مکان کی چھت کے جنگلے کی لاخوں سے ایک زنانی کی جلی ہوئی بے جان ٹانگیں نیچے جھول رہیں تھیں۔ ہر طرف گوشت کے لے کی بو پھیلی تھی اور مردہ زنانی کی جھولتی ہوئی ٹانگوں سے چربی پگھل پگھل کر نیچے گر رہی تھی۔"

"بس کر نادر۔" جمیلہ نے پریشان ہو کر نادر خاں کو منع کیا۔ "تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بہت ظلم اور

اپرادہ ہوا۔ کہتے ہیں سب پاگل ہوگئے تھے۔ پر سوال یہ ہے' وہ پاگل کیوں ہوگئے تھے؟ اس کا کوئی نہ کوئی کارن تو ضرور ہی ہوگا؟ ایسے ہی تو کوئی پاگل نہیں ہوجاتا۔ میں تجھے یہی بتانا چاہتی تھی کہ یہ پاگل پن کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟"

نادر خاں نے کہا۔ "ایک گل اور بھی ہے۔ فسادات اور بلوؤں کے بعد ہندو بنئے اور ساہوکار چلے گئے۔ پر ان کی جگہ مسلمان سناریوں اور زمیں داروں نے لے لی۔ وہ بھی اگاہی پر کرض ادھار دیتے ہیں۔ سود اور بیاج کھاتے ہیں۔ فرک کیا پڑا جی۔"

"تیرا مطلب ہے مزارعوں سے دیگار لی جائے۔ منشیانا اور کمالیہ لیا جائے۔ زبردستی طرح طرح کے ٹیکس وصول کیے جائیں۔" جمیلہ کے چہرے پر جھنجلاہٹ بکھر گئی' لہجہ تلخ ہوگیا۔ "تو یہی کہنا چاہتا ہے ناں؟" اس نے صاف انکار کردیا۔ "مجھے اس طرح زمیں داری نہیں بڑھانی۔"

"برا نہ منا۔" نادر خاں کے لہجے میں عاجزی تھی۔ "زمیں دارنی! تو اپنا سکول وڈا بنانا چاہتی ہے۔ ڈسپنسری بھی لگانی چاہتی ہے۔ میں کہتا ہوں ضرور ایسا کر۔ مزارعوں سے کوئی اور ٹیکس وصول نہ کر۔ پر سکول اور ڈسپنسری ٹیکس تو فصل کی واڈھی پر وصول کرنا ہی چاہیے۔"

"کیوں وصول کرنا چاہیے؟" وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

"اس لیے کہ سکول اور ڈسپنسری تو انھیں کے لیے ہوں گے نا؟" نادر خاں نے جمیلہ کی خفگی نظر انداز کرتے ہوئے اپنے مشورے پر زور دیا۔

"نہیں نادر! مجھے سکول اور ڈسپنسری کے لیے کوئی ٹیکس ٹیکس نہیں لینے۔" جمیلہ کا لہجہ بدستور تیکھا تھا۔ "مجھے ٹیکس کے چکروں میں نہ ڈال۔ ایک بار ٹیکسوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تو نت نئے لگنے شروع ہوجائیں گے۔ ہیر پھیر بے دخلیاں ہوں گی۔ ظلم ہوگا' اپرادہ ہوگا۔ مجھے اس سے خوف آتا ہے۔" اس نے انکار میں ہاتھ ہلایا۔ "میں نے تجھے بتایا نا کہ میرے پتا کی بہت وڈی زمیں داری تھی۔ میں نے وہ زمیں داری دیکھی ہے۔ مزارعوں سے طرح طرح کے ٹیکس وصول ہوتے ہوئے بھی دیکھے ہیں اور ان کے بل بوتے پر زمیں داری کے ٹھاٹھ باٹ بھی دیکھے ہیں۔ میں نے بہت کچھ دیکھا۔" اس نے بڑے جوش سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ "فسادات اور بلوے دیکھے۔ بھلے چنگے بندوں کو پاگل اور وحشی ہوتے دیکھا۔ اور اس پاگل پن کا شکار بھی ہوئی۔ تجھے کیا پتہ وہ پاگل پن کیسا بھیانک تھا۔ ایک ڈراؤنا سپنا۔ ہاں' اب تو سپنا ہی لگتا ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "مجھے اس بھینکر کلپنا کی یاد نہ دلا۔"

رحیم داد اور نادر خاں دم بخود بیٹھے رہے۔ جمیلہ نے چادر کے پلو سے قطرہ قطرہ ٹپکتے ہوئے آنسو پونچھے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ نادر خاں بھی کھڑا ہوگیا۔ جمیلہ نے مڑ کر اس کی سمت دیکھا۔ "نادر! میں بہت ابھاگن اور دکھی ہوں۔ ایسا نہ کر کہ مجھے اور دکھ پہنچے۔" اس کی آواز میں زخمی دل کی فریاد پنہاں تھی۔

"نہیں زمیں دارنی' تو ایسا نہ سوچ۔" نادر خاں نے مستعدی سے جواب دیا۔

رحیم داد بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے جمیلہ کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ "تو جیسا کہے گی بالکل ویسا ہی ہوگا۔ فکر نہ کر۔ تیری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔"

"چوہدری! مجھے تجھ سے یہی امید تھی۔" جمیلہ مطمئن ہو کر بولی۔ "تو بھی تو کم دکھی نہیں۔ تو نے بھی بہت ظلم اور اپرادہ اٹھایا ہے۔ تو جانتا ہے اور ٹھیک طرح جانتا ہے کہ ظلم اور اپرادہ کیا ہوتا ہے؟"

جمیلہ آگے بڑھی۔ کمرے سے نکل کر دالان میں گئی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اوپر کی منزل کے زینے پر پہنچی اور سیڑھیاں طے کرنے لگی۔

اس ملاقات کے بعد جمیلہ سے پھر بات چیت نہ ہوئی۔ نہ رحیم داد نے کوشش کی اور نہ ہی جمیلہ نے۔

☆

رحیم داد نے زمیں داری کے معاملات میں پوری توجہ کے ساتھ دلچسپی لینا شروع کردی تھی۔ وہ روزانہ نادر خاں کے ساتھ کھیتوں کی طرف نکل جاتا۔ فصلوں کو دیکھتا۔ کپاس کے پودوں میں ڈوڈے پھوٹنے لگے تھے۔ مکئی کے لمبے لمبے پتوں کے درمیان گڈیاں اور بھٹے ہوا کے جھونکوں سے ہولے ہولے جھومتے اور کماد کے اونچے اونچے پودوں پر پاندے پھیلتے جا رہے تھے۔

رحیم داد مزاروں سے ملتا۔ بات چیت کرتا۔ فصلوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے نجی معاملات میں بھی دلچسپی کا اظہار کرتا۔ ان سے نرمی اور ہمدردی کا اظہار کرتا۔ دوپہر تک اس کا وقت عام طور پر کھیتوں کے درمیان گھومتے پھرتے اور مزاروں سے باتیں کرتے ہوئے گزرتا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر وہ سو جاتا۔ شام کو پابندی سے باغ میں جا کر بیٹھ جاتا۔ وہاں بھی مزارعوں سے ملتا۔ مگر حویلی کے باہر کے اس سائبان کے نیچے وہ کسی روز نہیں بیٹھا جہاں اللہ بابا مزارعوں سے اکثر و بیشتر ملتا تھا اور گھنٹوں بیٹھا ان کے ساتھ بات چیت کرتا رہتا تھا۔ رحیم داد کبھی کبھی ٹہلتا ہوا گاؤں میں چلا جاتا یا نہر کی طرف نکل جاتا۔ نادر ہمیشہ اس کے ہم راہ ہوتا۔

زمیں داری کی مصروفیات سے اکتا جاتا تو وہ دل بہلانے کے لیے احسان شاہ کے پاس چلا جاتا۔

دو تین روز ٹھیرتا۔ شام کو وہسکی کی چسکی لگاتا۔ رات کو کبھی نوراں اور کبھی کسی اور نوجوان عورت کو کوٹ سے بلوالیتا۔ مگر احسان شاہ کی حویلی میں اس کا قیام اب طویل نہ ہوتا۔ چند ہی روز ٹھیرنے کے بعد واپس کوٹلہ ہرکشن آجاتا۔

احسان شاہ کی حویلی میں قیام کرنے اور اس کے ساتھ وقت گزارنے کا رحیم داد کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سرکاری افسروں اور بڑے زمیں داروں سے ملنے اور تعلقات پیدا کرنے کا پورا پورا موقع ملا۔ اس کے ذہن میں پولیس کے افسروں کی طرف سے جو خوف و خطرے کا احساس تھا وہ بھی رفتہ رفتہ زائل ہوچکا تھا۔ وہ سب سے بے دھڑک ملتا۔ لیکن وہ احسان شاہ کے پاس ہمیشہ چوری چھپے جاتا اور تخت محل جانے کا بہانہ کرتا۔

موسم دھیرے دھیرے بدلتا جا رہا تھا۔ دوپہر کو کسی قدر گرمی ہوجاتی مگر صبح خوش گوار اور سہانی ہوتی۔ شام کو ہلکی ہلکی خنکی ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ رحیم داد نے اب شام کو باغ میں بیٹھنے کا سلسلہ بند کردیا تھا۔

☆

جمیلہ سے پچھلے کئی ہفتوں سے رحیم داد کی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ وہ ان دنوں رحیم داد کو نظر ہی نہ آتی۔ عدّت میں ہونے کے باعث اس نے پھاتاں کے مشورے سے تاجاں کی شادی کی تاریخ بڑھا دی تھی۔ سسرال والوں نے بھی اس عذر کو قبول کرلیا تھا۔ جمیلہ نے جیسا کہا انھوں نے ویسا ہی کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ نہ حجت کی نہ اصرار کیا۔

عدّت ختم ہونے میں اب تھوڑی ہی مدت رہ گئی تھی۔ خریف کی فصل تیار ہوچکی تھی۔ جمیلہ فصل کی کٹائی کے بعد ہی تاجاں کی شادی کردینا چاہتی تھی۔ دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ جمیلہ اسکول کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ شادی کی تیاریوں میں الجھی ہوئی تھی۔

نادر خاں نے بھی اب اپنی بیوی کو بلالیا تھا۔ بیوی اور تینوں بچیوں کے ساتھ وہ مہمان خانے ہی کے ایک حصے میں مقیم تھا۔ مگر وہاں مستقل رہنا نہ چاہتا تھا۔ رحیم داد بھی یہی چاہتا تھا۔ نادر کا ارادہ تھا کہ فصل کی کٹائی کے بعد ڈسپنسری کی تعمیر شروع ہو تو بھٹے سے آنے والی اینٹوں سے مہمان خانے کے قریب ہی اپنی رہائش کے لیے مکان بنوالے۔ اپنی اس خواہش کا اظہار وہ رحیم داد سے کرچکا تھا۔ اور رحیم داد نے اسے مکان بنانے کی اجازت بھی دے دی تھی۔

نادر کی بیوی کا نام جنت بی بی تھا۔ وہ خوب صورت تو نہ تھی مگر رنگ صاف تھا۔ جسم گداز اور بھرا بھرا تھا۔ عمر ۳۵ برس کے لگ بھگ تھی۔ نادر خاں بھی اس کا دوسرا شوہر تھا۔ پہلے شوہر سے اس نے طلاق لے لی تھی۔ اس سے دو بچے بھی تھے جو باپ کے ساتھ ہی قصور میں رہتے تھے۔

جنت گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر روزانہ جمیلہ کے پاس چلی جاتی۔ شام کو تو اس کا بیشتر وقت جمیلہ ہی کے پاس گزرتا۔ وہ رفتہ رفتہ جمیلہ سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ جمیلہ کا رویہ بھی اس کے ساتھ خوش گوار اور مشفقانہ تھا۔ تاجاں کی شادی کی تیاریوں میں اس نے جنت کو بھی شریک کرلیا تھا۔ اس طرح وہ جمیلہ سے اور قریب ہوگئی۔ شادی بیاہ کی رسم و رواج کے سلسلے میں وہ جمیلہ کو مشورے بھی دیتی۔ جمیلہ ان کو مان بھی لیتی۔ وہ ہندو گھرانے میں پیدا ہوئی تھی اور اسی ماحول میں پروان چڑھ کر جوان ہوئی تھی۔ لہٰذا مسلمانوں کی رسوم اور روایات سے پوری طرح اسے واقفیت نہ تھی۔ جنت اس سلسلے میں اس کی اچھی مشیر ثابت ہوئی۔

جنت بی بی ایک بار عدّت کی مدت بھی گزار چکی تھی۔ اس معاملے میں وہ تجربہ کار بھی تھی۔ جمیلہ کی عدّت ختم ہونے کو آئی تو اس نے نادر کو بتایا کہ عدّت کے خاتمہ پر کیا کیا ہونا چاہیے۔ وہ چاہتی تھی کہ عدّت جس روز ختم ہو رحیم داد کی جانب سے جمیلہ کو نیا جوڑا اور چوڑیاں بھیجی جائیں۔ ویسے جوڑا اور چوڑیاں میکے سے آنا چاہیے تھیں۔ مگر جمیلہ کا کوٹلہ ہرکشن میں بیٹھا ہی کون تھا جو اس فرض کو ادا کرتا۔

نادر خاں نے رحیم داد سے اس سلسلے میں بات کی۔ وہ اس وقت رحیم داد کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ نادر کی بات سن کر رحیم داد بولا۔ "ایسا کر نادر تو جمیلہ سے بھی پوچھ لے۔"

"اس سے کیا پوچھنا ہے جی۔" نادر نے مستعدی سے جواب دیا۔ "ویسے تو یہ زمیں دارنی کے کسی رشتے ناتے دار کی طرف سے ہونا چاہیے تھا۔ لیکن تمیں نوں پتہ ہی ہے ادھر اس کا کوئی بھی نہیں۔ اب تیری ہی طرف سے اس کا بندوبست ہونا چاہیے۔ اس معاملے میں جمیلہ سے بات کرنا مناسب نہیں لگتا۔ یہ رسم اسی طرح ہوتی ہے۔"

رحیم داد نے کوئی حجت نہ کی۔ صرف اتنا کہا۔ "کسی کو آج ہی لہور بھیج کر کپڑا منگوالے۔ مگر کپڑا ریشمی ہو۔" وہ چند لمحے نظریں جھکائے سوچتا رہا۔ "رنگ گلابی ہونا چاہیے۔ جمیلہ کو یہ رنگ بہت پسند ہے۔ چوڑیاں بھی عمدہ ہوں۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "میں تو کہتا ہوں تو خود ہی چلا جا۔ کپڑا لا کر اپنا گھر والی کو دے دینا۔ وہ ناپ لے کر خود ہی تیار کروالے گی۔ یہ زنانیوں کا کام ہے۔ اس کا نہ تجھے پتہ ہے اور نہ مجھے۔ ایسے سارے ہی کام ہمیشہ زنانیوں ہی کے لیے چھوڑ دینے چاہئیں۔" وہ بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔

دوسرے ہی روز نادر خاں لاہور چلا گیا۔ دوپہر کو رحیم داد بھی احسان شاہ کے گاؤں ' پیراں والہ

چلا گیا۔ مگر رحیم داد نے وہاں صرف رات بھر کے لیے قیام کیا۔ سویرے اٹھ کر حویلی اسٹیشن کے راستے پاک پتن پہنچا۔ بازار گیا۔ بھاول پوری چوڑی گردوں کے بنائے ہوئے ہاتھی دانت کے چوڑے خریدے۔ باہوں میں پہننے کے لیے باہیں خریدیں۔ بھاول پوری لہریا ریشمی لنگی، سرخ گل بوٹوں کا کڑھا ہوا دوشالہ، چاندی کے کرن پھول، مندریاں اور چھلوں کے علاوہ ناک میں پہننے کا قیمتی بھاول پوری پوپا اور سونے کے کنگن خریدے۔ وہ اسی شام واپس آگیا۔ نادر خاں دو روز بعد لاہور سے لوٹا۔

عدّت کی مدت کے چار مہینے دس دن پورے ہونے سے پہلے ہی جنت نے ریشمی جوڑا سلوا لیا تھا۔ جس روز عدّت ختم ہوئی۔ جمیلہ نے صبح اٹھ کر غسل کیا۔ جنت نے اصرار کیا تو اس نے گلابی ریشمی جوڑا پہن لیا۔ کلائی میں چوڑیاں بھی ڈال لیں۔ مگر اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اللہ وسایا اسے بار بار یاد آتا۔ اس نے آنسو پونچھے۔ کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا۔ جنت نے کنگھی سے جمیلہ کے بال سنوارے۔ آنکھوں میں کاجل لگایا۔ پھر وہ حویلی کی چند خادماؤں کے ہم راہ جمیلہ کو مسجد لے گئی۔ مسجد کے دروازے پر پہنچ کر جمیلہ نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ جنت نے جمیلہ ہی کے ہاتھ سے مسجد کے ملا کو پانچ روپے دلوائے۔

اب جمیلہ پر حویلی سے بے دھڑک باہر جانے اور کسی نامحرم کے سامنے آنے کی پابندی اٹھ چکی تھی۔ مگر جمیلہ مسجد سے واپس آنے کے بعد سیدھی اوپر کی منزل پر گئی اور اپنے کمرے میں تنہا لیٹی رہی۔ رحیم داد بڑے کمرے میں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نیچے نہ اتری۔

دن ڈھلنے لگا۔ رحیم داد غسل خانے میں گیا۔ نہا دھو کر ڈبل گھوڑا بوسکی کی نئی قمیص اور شلوار پہنی۔ آنکھوں پر سنہری فریم کا نیا چشمہ لگایا۔ یہ لباس اور چشمہ نادر خاں کا بھتیجا لاہور سے خرید کر لایا تھا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد رحیم داد نے سر کے بال خوشبو دار تیل ڈال کر جمائے۔ داڑھی کو کنگھی سے سنوارا۔ آنکھوں میں سرمہ ڈالا۔ عطر لگایا۔ اور آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر دیر تک اپنی سج دھج دیکھتا رہا۔ وہ اس وقت وجیہہ اور باوقار لگ رہا تھا۔ چہرے پر تازگی تھی۔ رخساروں پر سرخی جھلکتی تھی۔ آنکھوں میں طراوٹ اور تابندگی تھی۔

اس نے احمد کی بیوی تاراں کو بلوایا اور وہ تمام ساز و سامان، جو اس نے چند روز قبل پاک پتن سے خریدا تھا ایک طشت میں رکھ کر جمیلہ کے پاس بھجوایا۔ وہ کچھ دیر اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔ پھر حویلی سے باہر جانے کے ارادے سے نکلا تو تاراں کی زبانی یہ پیغام ملا کہ جمیلہ نے اسے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔

☆

یہ گلابی جھاڑوں کی ہنستی مسکراتی شام تھی۔ فضا میں خنکی تھی۔ کہر کا ہلکا نیلگوں دھندلکا ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعوں میں گھلتا جا رہا تھا۔ رحیم داد کی آنکھوں میں سنہرے خواب جاگ رہے تھے۔ اس نے دھڑکتے دل سے سیڑھیاں طے کیں۔ اوپر پہنچا۔ زینے کی ممٹی کے سامنے کھلی چھت تھی۔ چھت کے ایک سرے پر تین کمرے تھے۔ دو کمروں کے آگے برآمدہ تھا۔ تیسرے کی صرف کھڑکیاں چھت کی جانب کھلتی تھیں۔ اس میں آمد رفت کے لیے دروازہ ملحقہ کمرے ہی میں کھلتا تھا۔

رحیم داد نے دیکھا، بائیں ہاتھ کے کمرے کا دروازہ کھلا ہے۔ اس کمرے میں وہ ایک بار پہلے بھی آچکا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے کمرے کے اندر نظر دوڑائی۔ لیمپ کی گہری زرد روشنی میں جمیلہ مونڈھے پر بیٹھی تھی۔ وہ گلابی لباس میں پھول کی مانند شگفتہ اور دل کش نظر آرہی تھی۔ سامنے میز پر طشت میں وہ تمام اشیاء اسی طرح رکھی تھیں جس طرح رحیم داد نے تاراں کے ہاتھ بھجوائی تھیں۔

رحیم داد کو دیکھ کر جمیلہ نے کہا۔ ”چوہدری! اندر آجا۔“ اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”بیٹھ جا۔“

وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ جمیلہ نے سامنے رکھے ہوئے طشت کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

”تو نے یہ سب کچھ کس لیے بھیجا ہے؟“

”تیرے ہی لیے بھیجا ہے۔“ رحیم داد نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”سوچا تیری عدّت تو ختم ہو چکی ہے۔ تجھے ان کی ضرورت ہوگی۔ اب تو انھیں پہن سکتی ہے۔“ وہ بے تکلفی سے کھل کر مسکرایا۔ ”میں نے غلط تو نہیں سوچا؟“

”ہاں، اب میں انھیں پہن سکتی ہوں۔ تو نے ٹھیک ہی سوچا۔“

”ہوا یہ کہ تخت محل سے واپسی پر میں بھاول نگر گیا تھا۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”بازار گیا تو تیرے لیے یہ چیزیں خرید لیں۔ پہلے بھی خرید لیتا۔ پر تب تو انھیں پہن نہیں سکتی تھی۔“

”لایا تو بہت شاندار چیزیں ہے۔“ جمیلہ نے طشت سے کنگن اٹھائے۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں ں ہاتھی دانت کے چوڑے دبائے۔ ”بھاول پوری چوڑی گردوں کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں ناں؟ ت سندر رہیں۔“

”تیری کلائیوں اور باہوں پر بہت شان دار لگیں گے۔“ رحیم داد خوش ہو کر بولا۔ ”انھیں پہن

لے۔"

"نہیں! میرے پہن نے کا سمے بیت گیا۔" وہ اچانک سنجیدہ ہو گئی۔ "یہ داجلو گہنے پاتے ہیں۔ تاجاں کے دسیج کے لیے ٹھیک رہیں گے۔ وہ ڈیڑھ دو مہینے بعد مائیاں بیٹھ جائے گی۔"

"اس کی دسیج کے لیے اور لے آؤں گا۔" رحیم داد نے اصرار کیا۔ "میری خوشی ہے تو انھیں ابھی میرے سامنے پہن لے۔" اس نے جمیلہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "تو تاجاں کی فکر نہ کر۔"

"نہیں۔ میں انھیں نہیں پہنوں گی۔" جمیلہ نے صاف انکار کر دیا۔

مگر رحیم داد نا امید نہ ہوا۔ ہنس کر پوچھا۔ "کیوں نہیں پہنے گی؟"

"میرا من نہیں چاہتا۔" جمیلہ کے چہرے پر دکھ کا غبار بکھرنے لگا۔ "مجھے مجبور نہ کر۔"

رحیم داد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھرپور نظروں سے دیکھا۔ اور ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

جمیلہ نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ رحیم داد نے آہ بھرنے کے انداز میں گہری سانس بھری۔ آہستہ سے کہا۔

"جمی لے!"

جمیلہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ رحیم داد نے پہلی بار اللہ وسایا کے پیار بھرے انداز سے اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ تڑپ کر بولی۔ "کہہ کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"برا نہ منا۔" رحیم داد موم کی طرح پگھل گیا۔ اس کے لہجے میں عاجزی کے ساتھ ساتھ لگاوٹ بھی تھی۔ "تیں نوں پتہ نہیں تو کتنی سوہنی ہے۔ اور جوان بھی ہے۔ کب تک اللہ وسایا کو یاد کرتی رہے گی۔ وہ اب واپس آنے سے تو رہا۔"

"میں نوں پتہ ہے وہ واپس نہیں آ سکتا۔" جمیلہ نے بہت سنبھلے ہوئے انداز میں کہا۔ "سچ پوچھ تو اب مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں۔ بہت دن بیتے جب مجھے ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ اللہ وسایا کے روپ میں مجھے وہ سہارا مل بھی گیا تھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اب میرا سہار نینا اور گڈو ہیں۔ مجھے کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔ میں کیول ان دونوں کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہوں۔"

"تو ضرور ان کے لیے زندہ رہ پر کچھ اپنا بھی تو خیال کر۔" رحیم داد نے لہجے میں رقت پیدا کی "تیں نوں کسی کے سہارے کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ پر مجھے تیرے سہارے کی ضرورت ہے۔

چاہتا ہوں۔"

"میں نوں پتہ ہے تو کیا چاہتا ہے؟" جمیلہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "پر جو تو چاہتا ہے وہ نہیں ہو سکتا۔ اس وچار کو اپنے من سے نکال دے۔ اسے بھول جا۔"

"کیسے بھول جاؤں۔" رحیم داد نے چہرے پر افسردگی طاری کرنے کی کوشش کی۔ عاجزی سے بولا۔ "میں بھی تیری طرح دکھی ہوں۔ اجڑا ہوا ہوں۔ برباد ہوا ہوں۔" اس نے بجھی بجھی نظروں سے جمیلہ کو دیکھا۔ "اجڑ کر ایک بار فیر سنبھلنے کا موکع ملا تھا۔ تیں نوں پتہ ہے اب وہ بھی نہ رہا۔ ب کچھ ختم ہو گیا۔ رابعہ دوسرے کی ہو چکی ہے۔ اس نے منت کرنے پر بھی بیٹی کو میرے ساتھ نہ نے دیا۔"

جمیلہ نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ چپ بیٹھی رہی۔

رحیم داد چند لمحے خاموش رہنے کے بعد غم زدہ لہجے میں گویا ہوا۔ "مجھے سمجھنے کی کوشش کر۔ میرا ھ تو جانتی ہے۔"

"میں تجھے اور تیرے دکھ کو ٹھیک طرح جان چکی ہوں۔" جمیلہ کے لہجے میں تلوار کی کاٹ تھی۔ صاف صاف سن نا چاہتا ہے تو سن لے۔" وہ ہانپنے کے انداز میں تیز تیز سانسیں بھرنے لگی۔ "تو ہ سے بہانہ کر کے احسان شاہ کے پاس جاتا رہا۔ اس کی حویلی میں ٹھہرتا اور ہر بار مجھ سے جھوٹ تا رہا۔"

رحیم داد سخت سٹ پٹایا۔ بدحواس ہو کر بولا۔

"تجھے یہ کس نے بتایا؟ یہ بالکل غلط ہے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے الجھا۔ "کسی نے تجھے بہکا ۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"چوہدری! چپ کر۔ زیادہ بکواس نہ کر۔" جمیلہ نے اسے غصے سے ڈانٹا۔ "احسان شاہ کا پنڈ ان والہ یہاں سے دور ہی کتنا ہے۔ چند میل کا تو فاصلہ ہی ہے۔ تو نے یہ نہ سوچا یہ بات کب تک ی رہے گی۔ کسی پنڈ میں کوئی نیا بندہ آ جائے تو آس پاس کے ہر پنڈ میں اس کی خبر پھیل جاتی ہے۔ و بہت دنوں سے احسان شاہ کے پاس جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ کئی کئی روز ٹھہرتا رہا ہے۔"

جمیلہ ابھی کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ اسی اثنا میں تاراں دروازے پر نمودار ہوئی۔ وہ کھانا لے کر تھی۔ جمیلہ نے تاراں کو دیکھتے ہی کہا۔

"چوہدری، اب تو جا۔"

رحیم داد خاموشی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ کمرے سے باہر آیا۔ رات درو دیوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ سناٹا گہرا ہوگیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھایا تھا۔ کہر کی دھند میں لپٹی ہوئی حویلی اونگھ رہی تھی۔

۳۶

حویلی کے شمال میں گاؤں کا رڑ تھا۔ رڑ کے اس پار دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ خریف کی فصل تیار ہو چکی تھی۔ مکئی اور کماد کے پودے خوب اونچے ہوگئے تھے۔ ان کے لمبے لمبے پتے کہیں کہیں سے زرد پڑ گئے تھے۔ مکئی کے سٹوں سے ادھر ادھر نکلے ہوئے مبلوں کے سفید اور باریک سوت بکھرے ہوتے تو جھالر بن کر لہراتے۔ سمٹ کر گتھ جاتے تو پھندنے معلوم ہوتے۔ کماد کے بعض پودے اتنے زیادہ پک گئے تھے کہ پتوں پر آگری نکل آئی تھی۔

کپاس کے پودے گھنے اور چھوٹے تھے۔ ان کے ڈوڈوں سے روئی کے سفید سفید تونبے پھوٹ کر باہر نکل آئے تھے۔ یہ چھٹی تھی۔ مکئی، چری اور کماد کے پودوں کی کٹائی کے ساتھ چھٹی کی چنائی بھی شروع ہونے والی تھی۔

رحیم داد ناشتا کر چکا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے رڑ کے اس پار کھیتوں کو دیکھ رہا تھا۔ کھیتوں پر ابھی تک پالا پڑ رہا تھا۔ دھند کی ہلکی ہلکی سرمئی تہہ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ پچھلے کئی روز سے وہ کھیتوں کی طرف نہیں گیا تھا۔ اس کا بیشتر وقت کمرے کے اندر ہی گزرتا۔ دن ڈھلے کبھی کبھار نہر کی طرف نکل جاتا۔ مگر نہ احسان شاہ کے گاؤں پیراں والہ گیا نہ اس کا ایسا ارادہ تھا۔

نادر خاں سے اس کی ملاقات ان دنوں عام طور پر صبح کے وقت ہوتی۔ نادر نے اس کی خلاف معمول بڑھی ہوئی عزلت پسندی اور خاموشی محسوس کی۔ ایک روز کرید کر سبب معلوم کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن رحیم داد نے اس کی مطلق حوصلہ افزائی نہ کی۔ نہ کچھ بتایا نہ اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ اس نے جمیلہ سے اپنی ملاقات تک کا اس سے ذکر نہیں کیا۔ البتہ زمیں داری کے

بارے میں وہ ہر روز نادر خاں سے بات چیت کرتا اور اکثر دیر تک کرتا۔

رحیم داد خاموش بیٹھا نادر خاں کا انتظار کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ رحیم داد نے اندازہ لگالیا کہ جمیلہ اوپر کی منزل سے نیچے آرہی ہے۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ پچھلے سات آٹھ روز سے جمیلہ سے اس کی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ نہ رحیم داد نے کوئی کوشش کی اور نہ ہی جمیلہ نے اس کی جانب کوئی توجہ دی۔ جمیلہ ہر صبح اوپر سے نیچے آتی۔ رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے چپ چاپ گزرتی اور اپنے دونوں بچوں کے ہم راہ اسکول چلی جاتی۔ واپسی پر بھی وہ بے نیازی سے اوپر چلی جاتی۔ اسکول کے علاوہ اس کا زیادہ وقت اوپر کی منزل پر گزرتا۔ کوئی ملنے آتا تو اسے بھی وہ اوپر ہی بلوالیتی۔

جمیلہ ذرا دیر بعد رحیم داد کے سامنے پہنچ گئی۔ گڈّو اس کی انگلی پکڑے ہوئے تھا۔ اور نینا ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ان کے پیچھے تاجاں تھی۔ وہ بچوں کے بستے' سرخ اون کا بڑا سا گولا اور اس میں پھنسی ہوئی بنائی کی سلائیاں اٹھائے ہوئے تھی۔ جمیلہ کا لباس سفید اور صاف ستھرا تھا۔ وہ ہلکی اونی شال اوڑھے ہوئے تھی۔ سیاہ شال پر سنہری بوٹیوں کی کشیدہ کاری تھی۔ زری کے کام کے ساتھ سبز اور سرخ ریشمی دھاگوں کی کڑھائی بھی تھی۔ وہ گردن اونچی کیے چل رہی تھی۔ رحیم داد اسے بجھی بجھی نظروں سے دیکھتا رہا۔

جمیلہ چلتے چلتے ٹھٹکی' دہلیز پر رکی۔ گردن کو خم دے کر اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ رحیم داد جھٹ کھڑا ہوگیا۔ جمیلہ نے اسے مخاطب کیا۔ "چوہدری! تو آج کل کھیتوں کی اور نہیں جاتا۔ خریف کی فصل تیار ہے۔ اس کی واڈھی کا بھی بندوبست کرنا ہے۔"

"زمیں دارنی! میری طبیعت پچھلے کئی روز سے گڑبڑ رہتی ہے۔" رحیم داد نے معذرت کے انداز میں رسان سے کہا۔ "فکر نہ کر۔ نادر خاں ہر کام کی پوری طرح دیکھ بھال کر رہا ہے۔"

"کیا دیکھ بھال کر رہا ہے؟" جمیلہ کا لہجہ تیز اور تیکھا تھا۔ "اسے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ پھٹی میں لال سونڈی لگ گئی ہے۔ کئی بوٹوں پر چست تیلا اور سفید مکھی بھی نظر آئی۔ ڈوڈے سکڑ کر رہ گئے ہیں۔ کئی کھیتوں میں تو ڈوڈوں سے توبے پھوٹے ہی نہیں۔ مجھے کل ہی رحمان نے بتایا۔ میں خود دیکھنے گئی تھی۔ اپنی آنکھوں سے پھٹی کے بوٹوں میں سونڈی اور دوسرے کیڑے دیکھے۔" اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی جھنجلاہٹ ابھرنے لگی۔ "اس طرح کیسے کام چلے گا؟ کپاس کی ساری فصل تباہ ہوجائے گی۔"

"ابھی نادر آتا ہوگا۔ میں اس سے بات کروں گا۔" رحیم داد نے کرسی کی جانب اشارہ کیا اور لہجے میں عاجزی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "ذرا دیر یہاں ٹھیر جا۔ نادر سے بات کرلے۔ جو کچھ کرنا ہے اسے سمجھادے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کے لیے رکا اور سر کے بال انگلی سے کریدنے لگا۔

"سمجھ نہیں آتی پھٹی میں سونڈی کیسے لگ گئی اور نادر نے اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟ روز سویرے میرے پاس آتا ہے۔ پہلے مجھ سے گل بات کرتا ہے۔ بعد میں کھیتوں کی طرف جاتا ہے۔"

"مجھے کیا پتہ' وہ کیا کرتا ہے اور تجھے کیا بتاتا ہے؟" وہ بے زاری سے بولی۔

"تو ذرا دیر کے لیے بیٹھ تو جا۔" رحیم داد نے نرمی سے اصرار کیا۔ "نادر آنے ہی والا ہے۔ میں چاہتا ہوں تیرے سامنے ہی اس سے گل بات ہو۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں تو خود پوچھ تاچھ کر۔ تنخواہ لیتا ہے مفت تو کام نہیں کرتا۔"

"میں نے تو اب سکول جانا ہے۔" جمیلہ نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ "پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ تو خود ہی نادر سے گل کرنا۔ ویسے بھی زمیں داری تجھے ہی سنبھالنی ہے۔ میں نے اس سے کیا لینا؟"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے جمیلہ کی سمت دیکھا۔ لہجے میں اور زیادہ نرمی پیدا کی۔ "زمیں دارنی! ایسی بات نہ کر۔ یہ بتا' میں نوں نادر سے کیا کہنا ہے؟"

"کیا کہنا ہے؟" اس دفعہ جمیلہ کے رویئے میں جھنجلاہٹ کے بجائے سنجیدگی کا پہلو نمایاں تھا۔ "اس سے کہہ کہ پھٹی کے بوٹوں پر فوراً کیڑے مار دوا کا سپرے کرائے۔ ورنہ کپاس کی فصل کا ستیاناس ہوجائے گا۔"

ننھے گڈّو نے ماں کے کرتے کا دامن کھینچا اور مچلنے کے انداز میں بولا۔ "ماں جی! سکول نہیں جانا۔ میں نے پڑھائی کرنی ہے۔"

"چلتی ہوں' ابھی چلتی ہوں۔" جمیلہ نے پیار سے گڈّو کا رخسار تھپ تھپایا پھر رحیم داد کی جانب متوجہ ہوئی۔ "چوہدری! میں تو سکول جارہی ہوں۔ تو نادر سے بات کرلینا۔ بات کیا کرنی ہے۔ یہ کام تو تجھی کو کرنا ہوگا اور ترنت کرنا ہوگا۔ آج ہی بوٹوں پر دوائی چھڑکنے کا بندوبست کر۔ پہلے ہی بہت خرابی ہوچکی ہے۔" جمیلہ آگے بڑھی۔

"ٹھیک ہے' جیسا تو کہتی ہے وہی کروں گا۔" رحیم داد رسان سے بولا۔ "نینا اور گڈّو کو سکول جانے دے' تو تھوڑی دیر ٹھیر جا۔"

"اب مجھے ٹھیر کر کیا کرنا ہے؟ جو گل بات نادر سے کرنی تھی وہ میں نے تجھے سمجھا ہی دی۔ اب مجھے کیوں روک رہا ہے؟"

"میں نوں تجھ سے کچھ اور ضروری گل کرنی ہے۔" رحیم داد کے لہجے میں التجا تھی۔

جمیلہ کچھ نہ بولی۔ آگے بھی نہ بڑھی۔ وہ گردن اٹھائے کچھ سوچتی رہی۔ پھر اس کی آواز ابھری۔ "میں دوپہر کو واپسی پر تیرے پاس آؤں گی۔" اس نے رحیم داد کی جانب نہ دیکھا، خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ دونوں بچے بھی اس کے ساتھ چلے۔ تاجاں بھی ان کے پیچھے پیچھے بڑھی۔

رحیم داد نظریں اٹھائے جمیلہ کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی چال میں وہی پہلی سی تمکنت تھی۔ وہی بانک پن تھا۔ سادگی کے باوجود اس کے گلابی چہرے کے تیکھے نقش و نگار دل کش اور حسین نظر آرہے تھے۔ جمیلہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ رحیم داد مضمحل ہوگیا۔ اس نے گہری سانس بھری، پلٹا اور کرسی پر جاکر بیٹھ گیا۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

رحیم داد کمرے سے باہر نہیں گیا۔

پہر دن گزر گیا۔ سورج چڑھ کر بلندی پر پہنچ گیا۔ مگر نادر نہیں آیا۔ رحیم داد نے حویلی کے ملازم نام دار کو بلایا۔ اسے نادر خاں کی تلاش میں بھیجا۔ وہ جلد ہی واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ نادر کسی ضروری کام سے نزدیک کے چک میں گیا ہے۔ وہ سویرے سویرے نکل گیا تھا۔ دوپہر تک لوٹے گا۔ یہ اطلاع نادر کی بیوی جنت بی بی نے دی تھی۔ رحیم داد نے نام دار سے مزید بات نہیں کی۔ وہ چلا گیا۔

رحیم داد بے قراری سے جمیلہ کا انتظار کرنے لگا۔

☆

وقت زخمی سانپ بن گیا۔ آہستہ آہستہ رینگتا رہا۔ رحیم داد کی بے قراری بڑھتی گئی۔ سورج آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا۔ حویلی کے وسیع صحن میں دور تک پھیلی ہوئی چمکیلی دھوپ کی تمازت بڑھ گئی۔ دوپہر ہوگئی۔ جمیلہ واپس ہوئی۔ دونوں بچے اس کے ہم راہ تھے۔ اس دفعہ ان کی کتابیں احمد اٹھائے ہوئے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر رحیم داد کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

جمیلہ کمرے کے سامنے پہنچی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔ اس نے رحیم داد کے کمرے کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ رحیم داد کا دل ایک بار زور سے دھڑکا۔ پھر ٹھہر کر گویا سرد پڑ گیا۔ وہ بجھ کر رہ گیا۔ اس نے کرسی کی پشت سے گردن ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔

اس عالم میں وہ نہ جانے کتنی دیر بیٹھا رہا۔ یکایک چاپ ابھری۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول

دیں۔ دیکھا، دہلیز پر جمیلہ کھڑی ہے۔ رحیم داد چند لمحے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا پھر ہڑبڑا کر کھڑا ہوگیا۔ الجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ "میں تو سمجھا تھا، آج تو نہیں آئے گی۔"

جمیلہ نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک فائل دبی تھی۔

رحیم داد بھی چپ چاپ قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

جمیلہ نے چند لمحوں کے سکوت کے بعد پوچھا۔ "بتا، تو نے کون سی ضروری گل بات کہنے کے لیے مجھے بلایا ہے؟" اس کے لہجے سے بے زاری صاف ظاہر تھی۔

"تجھ سے کسی نے غلط بتایا میں احسان شاہ کے پاس جاتا ہوں۔" رحیم داد نے صفائی پیش کرنے کی ایک بار پھر کوشش کی۔ "اس روز بہت ناراض تھی۔ اس لیے میں تجھے ٹھیک سے سمجھا نہ سکا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے پتہ ہے تو کیا کہنا چاہتا ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد کو آگے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ "چوہدری! مجھے بہت پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ تو احسان شاہ کے پنڈ پیراں والہ جاتا ہے۔ اس کی حویلی میں کئی کئی روز ٹھیرتا ہے۔ پر میں نے وشواس نہ کیا۔ ہر بار یہی سوچ کر من کو سمجھا لیا کہ تو ایسا نہیں ہوسکتا۔"

"اب تو نے کیسے وشواس کرلیا؟" رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

"یہ بھی سننا چاہتا ہے تو سن لے۔" جمیلہ کا لہجہ تیکھا ہوگیا۔ "پچھلے دنوں اپنا وکیل محمد عثمان رندھاوا آیا تھا۔ تو اس روز احسان شاہ کے پاس گیا تھا۔" جمیلہ نے رحیم داد کی جانب تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تجھے پتہ نہیں، رندھاوا نے لہور میں پریکٹس شروع کردی ہے۔ آج کل وہ تیرے اور احسان شاہ کے یار، سردار مراد خاں شاہانی کے ایک کیس میں پیروی کر رہا ہے۔ شاہانی نے احسان شاہ کے ساتھ تیرے میل ملاپ کے بارے میں جو کچھ بتایا، اس کے بعد میرے وشواس نہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔" جمیلہ نے ہاتھ میں دبی ہوئی فائل رحیم داد کی جانب بڑھا دی۔ "یہ تیرے کلیم کے کاغذات ہیں۔ وکیل انھیں واپس دے گیا ہے۔ کلیم میں جو گڑبڑ ہے وہ تجھے خود ٹھیک کرانی ہوگی۔ وکیل اب یہ کام نہیں کرے گا۔"

رحیم داد نے گھبرا کر کہا۔ "میں کلیم شلیم کو کہاں ٹھیک کراتا پھروں گا؟" اس نے کاغذات کی فائل سنبھال لی۔

"یہ مجھے نہیں پتہ تو نے کیا کرنا ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔ "میں تو کیول یہی کاغذات واپس کرنے ئی تھی۔ ورنہ میں نوں پتہ تھا، تو نے مجھ سے کیا کہنا ہے۔"

رحیم داد نظریں جھکائے پریشان بیٹھا رہا۔ کمرے پر سکوت طاری ہوگیا۔ جمیلہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ رحیم داد نے اس کی بے چینی شدت سے محسوس کی۔ دبی زبان سے پوچھا۔

”وکیل کب آیا تھا؟“

جمیلہ نے تیکھے لہجے میں بتایا۔ ”جن دنوں تو تخت محل جانے کا بہانہ کرکے احسان شاہ کی حویلی میں ٹھہرا ہوا تھا۔“

”تیرا مطلب ہے‘ میں تخت محل نہیں گیا تھا؟“ رحیم داد نے ہڑبڑا کر تردید کی کوشش کی۔ ”پتہ نہیں میرے بارے میں تونے ایسی باتیں کہاں سے سن رکھی ہیں؟“

”چوہدری! خاما خاہٹ دھری نہ کر۔“ جمیلہ نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ ”مجھے ایک ایک بات کا پتہ ہے۔ میں نوں پتہ ہے تو کبھی تخت محل نہیں گیا اور نہ تخت محل میں تیرے بال بچے ہیں۔ میں نے کھوج لگایا تو معلوم ہوا تخت محل کے پٹواری کی گھر والی کا نام رابعہ نہیں‘ نسیم بی بی ہے۔ وہ اس کی پہلی گھر والی ہے۔ پچھلے سولاں سال سے اس کے ساتھ ہے۔ وہ بھاول نگر ہی کی رہنے والی ہے۔ کبھی گورداس پور نہیں گئی۔ اس کی کوئی جوان دھی نہیں۔ پتر سب سے وڈا تھا‘ پچھلے سال مرگیا۔ اور کچھ جاننا چاہتا ہے‘ وہ بھی بتادوں؟“

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جمیلہ نے گہری سانس بھری۔ اس کے لہجے کی تلخی افسردگی میں بدل گئی۔ ”میں نے تو یہ بھی سنا ہے‘ اللہ دسایا کے کتل میں تو بھی احسان شاہ کے ساتھ شریک تھا۔“

اب رحیم داد خاموش نہ رہ سکا‘ اس نے احتجاج کیا۔ ”یہ بالکل جھوٹ ہے۔“ رحیم داد نے تلملاتے ہوئے کہا۔ ”میں نوں تو یہ بھی پتہ نہیں‘ اللہ دسایا کو کس نے کتل کیا اور کیسے کیا؟ تو مجھے اتنا نیچ اور کمینہ سمجھتی ہے۔ میں تو کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”شاید تو ٹھیک کہہ رہا ہو۔“ جمیلہ نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات ظاہر کر رہے تھے کہ رحیم داد نے اپنی باتوں سے اسے خاصا متاثر کیا ہے۔ جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ”میں تجھے دوش نہیں دیتی‘ کسی کو بھی نہیں دیتی۔ میرے بھاگ ہی میں یہ دکھ جھیلنا لکھا تھا۔ اب ان باتوں میں الجھنے سے کیا ملے گا۔ جو ہونا تھا ہوگیا۔“

اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو امڈے اور پلکوں پر لرزنے لگے۔ رحیم داد نے لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ ”زمیں دارنی! تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ میں نوں پتہ ہے تو بہت دکھی ہے۔ اس طرح نہ رو۔“ اس نے جمیلہ کی دل جوئی کے ساتھ ساتھ اپنی صفائی پیش

کرنے کی بھی کوشش کی۔ ”میرے بارے میں تونے جو کچھ سنا ہے‘ اس میں کتنا سچ ہے کتنا جھوٹ میں نوں اب کچھ نہیں کہنا۔“ اس نے آواز میں مزید افسردگی پیدا کی اور آخری حربے کے طور پر جمیلہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ ”اب تو میرے لیے ایک ہی رستہ رہ گیا ہے۔ کہہ تو میں یہاں سے چلا جاؤں۔“

”نہیں چوہدری! تجھے یہاں سے جانے کی ضرورت نہیں۔“ جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں اپنے دونوں بچوں کو لے کر خود یہاں سے چلی جاؤں گی۔ اب یہ حویلی میری نہیں رہی‘ یہ پنڈ میرا نہیں رہا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”میں نے بہت پہلے یہ بات سوچ لی تھی۔ تجھے چنتا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”یہ نہیں ہوسکتا۔“ رحیم داد منت سماجت پر اتر آیا۔ عاجزی سے بولا۔ ”مجھے معاف کردے زمیں دارنی! جو کہے گی ویسا ہی ہوگا۔ سچ کہتا ہوں‘ ویسا ہی ہوگا۔ تو مجھے آزما لے۔“

”دیکھ چوہدری! میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ یہ ہم دونوں کے لیے بہتر ہے۔“ جمیلہ نے رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں نے تو اب یہاں سے چلا ہی جانا ہے۔“

”سرحد پار اپنے گھر والوں کے پاس جائے گی؟“ رحیم داد نے الجھتے ہوئے اپنے شبے کا اظہار کیا۔

”نہیں۔“ جمیلہ نے سختی سے انکار کیا۔ اس کے چہرے پر جھلاہٹ آگئی۔ ”ان کے پاس جانا ہوتا تو پہلے کس نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا؟ اب تو میرے وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تو کہیں بھی جا۔ پر یہاں سے جا کر کیا کرے گی؟“ رحیم داد نے نرمی سے کہا۔ ”ایسا خیال دل سے نکال دے۔ یہ تو سوچ‘ تو یہاں سے جا کر کہاں رہے گی؟ کیا کرے گی‘ کس کے پاس رہے گی؟“

”چنتا نہ کر چوہدری!“ جمیلہ نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”میں اتنی پڑھی لکھی ہوں‘ آرام سے کسی سکول میں لگ جاؤں گی۔ رہ گئی زمیں داری‘ تو مجھے نہ پہلے اس سے کوئی دلچسپی تھی نہ اب ہے۔ میں تو اپنے گڈو کو بھی زمیں دار نہیں بنانا چاہتی۔ میں نے اسے ڈاکٹر بنانا ہے۔ تجھے پتہ ہے میں اسے کیوں ڈاکٹر بنانا چاہتی ہوں۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”ایسا کرکے میں ویریندر کی آتما کو آنند پہنچانا چاہتی ہوں۔“

”تو یہاں رہ کر بھی گڈو کو ڈاکٹری پڑھا سکتی ہے۔“

”چوہدری! مجھے روکنے کی کوشش نہ کر۔ میں یہاں زیادہ دن نہیں رہوں گی۔“ جمیلہ نے دوٹوک جواب دیا۔ ”میں تو پہلے ہی یہاں سے چلی جاتی پر اب تک اس کارن نہیں گئی کہ میری آشا ہے کہ نجاں کا دیاہ کروں۔ اسے گلے لگا کر بدا کروں۔ میں نے اس کی ماں پھاتاں کو جو وچن دیا ہے اسے

پورا کرنا چاہتی ہوں۔" اس کا لہجہ دل گرفتہ ہوگیا۔ "چوہدری! تو اگر مجھے سکھ پہنچانا چاہتا ہے۔ مجھے سکھی دیکھنا چاہتا ہے تو اس کام میں میری مدد کر۔ میرا ارادہ ہے فصل کٹنے کے بعد تاجاں کا ویاہ کردوں۔ اس کے بعد نینا اور گڈو کے ساتھ لہور چلی جاؤں گی۔"

"مجھ سے ناراض ہوکر جارہی ہے' یہ میں برداشت نہیں کرسکتا۔ ایسا نہیں ہوگا۔" رحیم داد نے جوش و خروش سے کہا۔

اسی وقت نادر خاں کمرے میں داخل ہوا۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی رحیم داد نے جمیلہ کی جانب دیکھا۔ "لے زمیں دارنی! اب تو نادر آہی گیا۔ تیں نوں پھٹی کے بارے میں جو کچھ کہنا ہے' خود اس سے کہہ دے۔"

"میں نے اسے کچھ نہیں کہنا۔ سب کچھ تجھے بتا چکی ہوں۔ تو اسے بتا دینا۔" وہ کھڑی ہوگئی۔ "میں نے جاکر اب روٹی کھانی ہے۔"

رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کمرے سے چلی گئی۔ نادر نے اس کے جانے کے بعد پوچھا۔ "زمیں دارنی کو مجھ سے کیا گل بات کہنی تھی؟" وہ پریشان اور گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔

"بیٹھ جا۔ آرام سے بات ہوگی۔" رحیم داد نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

نادر خاں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر چپ رہ کر بولا۔ "پریشانی کی تو کوئی گل بات نہیں؟"

"پریشانی ہی کی گل ہے۔" رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "پھٹی میں سونڈی لگ گئی اور تیں نوں پتہ ہی نہ چلا؟ میں پوچھتا ہوں تو کرتا کیا ہے؟" رحیم داد کے چہرے سے جھنجلاہٹ ٹپکنے لگی۔ "گلاں تو وڈی وڈی کرتا ہے۔ یہ کروں گا جی وہ کروں گا جی۔ اور کیا کرایا کچھ نہیں۔" اس نے قہر آلود نظروں سے نادر کو دیکھا۔ "اس طرح تو نے مینجری کی تو اپنی زمیں داری کا تو بیڑا ہی گرک ہوجائے گا۔ میں نوں پتہ ہے' خریف کی فصل کی تو اصل کمائی کپاس سے ہوتی ہے۔ اور تو نے اسی پر دھیان نہیں دیا۔"

نادر نے گردن جھکا کر نرم لہجے میں کہا۔ "چوہدری! ٹھیک کہہ رہا ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ پھٹی میں سونڈی لگ گئی ہے۔ پر بہت تھوڑے سے بوٹوں میں لگی ہے۔ جیسے ہی مجھے پتہ چلا خود جاکر وہ بوٹے دیکھے۔"

"پر تو نے مجھے کچھ نہیں بتایا جب کہ تو روز میرے پاس آتا رہا۔"

"میں نے تجھے اس لیے نہیں بتایا کہ خاما خا پریشان ہوگا۔" نادر خاں نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "فکر کی کوئی گل نہیں۔ میں نے سونڈی لگے بوٹوں پر کرم کش دوائی چھڑکنے کا بندوبست کرلیا ہے۔ اسی سلسلے میں سویرے سویرے نکل گیا تھا۔ آج ہی بوٹوں پر سپرے کردیا جائے گا۔ پریشانی کی کوئی گل بات نہیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہوجائے گا۔ پروا نہ کر۔ کپاس کی پیداوار اس دفعہ پہلے سے کم نہیں زیادہ ہوگی۔"

"تیرے آنے سے پہلے زمیں دارنی سے بات ہوئی تھی۔" رحیم داد کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ وہ نادر خاں کی باتوں سے مطمئن ہوگیا تھا۔ "وہ پھٹی میں سونڈی لگنے سے بہت پریشان نظر آتی ہے۔ تو اسے بھی سمجھا دینا۔"

"اطمینان رکھیں جی۔ میں اسے آج ہی سب کچھ بتادوں گا۔ تو کہہ تو ابھی اس کے پاس چلا جاؤں؟"

"ابھی جانے کی ضرورت نہیں۔" رحیم داد نے اسے منع کردیا۔ "بوٹوں پر کیڑے مار دوائی چھڑک جائے تب جمیلہ سے بات کرنا۔" اس نے اپنی بات پر زور دے کر پوچھا۔ "سپرے آج ہی ہوجائے گا ناں؟ اس میں بالکل دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

"آج ہی سپرے ہوجائے گا۔ بالکل ہوجائے گا۔ فکر نہ کریں جی۔" نادر خاں نے اعتماد کا اظہار کیا۔ "میں فصل کی واڈھی کی تیاری میں پھنسا رہا۔ پھٹی کی طرف پوری طرح دھیان ہی نہ دے سکا ورنہ سونڈی لگتے ہی دوائی چھڑکنے کا کب کا بندوبست ہوچکا ہوتا۔ تیں نوں پتہ نہیں چوہدری' میں نے تو پھٹی کی چنائی کے لیے چوگیوں سے بات چیت بھی کرلی ہے۔"

"پر ابھی تو اپنی فصل پوری طرح تیار نہیں ہوئی۔ تین چار ہفتے تو لگ ہی جائیں گے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے پر کہیں کہیں خریف کی واڈھی شروع بھی ہوچکی ہے۔ اپنی فصل کچھ دیر میں تیار ہوئی۔ پر واڈھی کی تیاری تو پہلے ہی کرلینی چاہیے۔ یہ تو تیں نوں بھی پتہ ہے۔"

رحیم داد نے وہ فائل نادر خاں کی طرف بڑھائی جو جمیلہ نے اسے دے گئی تھی۔ نادر خاں نے فائل سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟" وہ حیرت زدہ نظر آرہا تھا۔

"یہ میرے کلیم کے کاغذات ہیں۔ جمیلہ واپس دے گئی ہے۔ آگے جو کچھ کرنا ہے تیں نوں ہی کرنا ہوگا۔ وکیل کا ٹنٹا بیچ سے نکل گیا۔"

"یہ تو ٹھیک ہی ہوا جی۔ فکر نہ کریں جلد ہی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوجائے گا۔ آباد کاری کے محکمے میں اپنی جان پہچان کے بہت بندے ہیں۔ خوشی سے اپنا کام کردیں گے اور تھوڑی رشوت لے کر کردیں گے۔"

”ویسے تو کام جلد ہی کرانے کا ہے۔ پر تو ابھی کہیں نہ جانا۔ میری طبیعت ادھر ٹھیک نہیں رہتی۔ سوچتا ہوں کچھ دنوں کے لیے شاہ جی کے پاس چلا جاؤں۔“

”ضرور چلا جا۔“ نادر نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”میں نے غور کیا ہے‘ چوہدری تو کچھ عرصے سے پریشان پریشان نظر آتا ہے۔ لگتا ہے جیسے بیمار ہو۔ شاہ جی کے پاس چلا جائے گا تو وہاں طبیعت بالکل چنگی ہو جائے گی۔“ وہ زیرِ لب مسکرایا۔ ”ادھر کی فکر نہ کر۔ ہر کام بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ پھٹی پر سپرے تو آج ہی ہو جائے گا۔ آبادکاری کے محکمے میں کچھ روز بعد چلا جاؤں گا۔“ اس نے رحیم داد کا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”شاہ جی کے پاس کب تک جانے کا ارادہ ہے؟“

”آہستہ بول۔“ رحیم داد نے چوکنا نظروں سے کمرے کے باہر دیکھا۔ ”ارادہ تو آج ہی جانے کا تھا پر اب تو دیر ہو گئی۔ کل چلا جاؤں گا۔ تو جمیلہ سے آج ہی ملنے کی کوشش کرنا۔ وہ آج نہ ملے تو کل میرے جانے کے بعد ضرور ملنا۔ بلکہ کل ہی تیرا ملنا ٹھیک رہے گا۔ اس کو پھٹی کے بوٹوں پر سپرے اور فصل کی واڈھی کے بارے میں ہر بات اس طرح بتا دینا کہ وہ بالکل مطمئن ہو جائے۔ سمجھ گیا نا؟“

”بالکل سمجھ گیا۔“ نادر نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ ”پروا نہ کر۔ میں زمیں دارنی کو پوری طرح مطمئن کر دوں گا۔ پر تیرے بارے میں اگر وہ پوچھے تو کیا کہوں؟“

”ویسے تو ہو سکتا ہے وہ یہ بات پوچھے ہی نہ۔ پر تو خود اس کے کان میں ڈال دینا کہ میں کلیم کے چکر میں ملتان گیا ہوں۔“ رحیم داد نے نادر خاں کو سمجھایا۔

نادر خاں نے اسے باور کرایا۔ ”جیسا کہتا ہے وہی کروں گا۔ بالکل بے فکر ہو کر شاہ جی کے پاس جا۔ واپسی پر تجھے ہر کام ٹھیک ٹھاک ملے گا۔“ اس نے پہلو بدلا۔ ”اجازت ہو تو جی گھر جا کر روٹی کھا لوں؟“

”ضرور روٹی کھا۔“

نادر خاں چلا گیا۔ رحیم داد نے کھانا منگوایا۔ کھانا کھانے کے بعد آرام کرنے لیٹ گیا۔ شام کو کچھ دیر کے لیے ٹہلتا ہوا نہر کی طرف چلا گیا۔ واپسی پر وہ جمیلہ کا انتظار کرنے لگا۔

جمیلہ کچھ ہی دیر قبل پھاتاں کے ہم راہ حویلی سے باہر گئی تھی۔ رحیم داد نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

☆

رحیم داد چاہتا تھا کہ احسان شاہ کے پاس جانے سے قبل جمیلہ سے ایک بار اور مل لے۔ اس کی

کدورت دور کرنے کی کوشش کرے۔

جمیلہ واپس آئی تو خاموشی سے رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزر گئی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ رحیم داد بے چین بیٹھا انتظار کرتا رہا کہ وہ اس کی طرف دیکھے تو بات کرنے کی کوشش کی جائے۔ مگر جمیلہ نے یہ موقع ہی نہیں دیا۔ رحیم داد دل برداشتہ ہو کر دیر تک کرسی پر بیٹھا رہا پھر بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

سویرے جمیلہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ سکول چلی گئی۔ اس وقت بھی رحیم داد کی جانب اس نے مطلق توجہ نہ دی۔ گردن اٹھائے بے نیازی سے اس کے کمرے کے سامنے سے گزر گئی۔

پہر دن گزر گیا۔ رحیم داد نے تانگا منگوایا۔ اس میں ضرورت کا سفری ساز و سامان رکھوایا اور احسان شاہ کے گاؤں کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس دفعہ بھی وہ ہفتے بھر سے زیادہ ٹھیرنے کے ارادے سے چلا تھا۔ سہ پہر کو وہ احسان شاہ کی حویلی پر پہنچ گیا۔ شیدا پھاٹک ہی پر مل گیا۔ اس کی زبانی اطلاع ملی کہ احسان شاہ گاؤں سے باہر گیا ہے۔ رحیم داد کو سخت کوفت ہوئی۔

رحیم داد واپسی کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ شیدا بولا۔ ”چوہدری! تو سردار مراد خاں شاہانی سے تو مل لے۔ وہ کئی روز سے ادھر ہی ٹھیرا ہے۔“

رحیم داد نے واپس کوٹلہ ہرکشن جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ شیدا کے ہم راہ حویلی کے دیوان خانے میں پہنچا۔ شاہانی کچھ ہی دیر پہلے سو کر اٹھا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی اس نے زور کا قہقہہ بلند کیا۔ بڑھ کر گرم جوشی سے گلے لگایا۔ ”سیں چوہدری! تو بہت موکعے سے آیا۔ میں اکیلا یہاں گھبرا رہا تھا۔ تیرے ساتھ چنگی شام گزرے گی۔ سویرے میں لہور چلا جاؤں گا۔“

”چند روز ٹھیر نہیں سکتا؟ چلا جائے گا تو میرا کیا بنے گا۔ میں تو یہاں ہفتے دو ہفتے ٹھیرنے کے ارادے سے آیا تھا۔“

”چوہدری‘ ٹھیک ٹھیک بتا تو یہاں کب تک ٹھیرنا چاہتا ہے؟“

”شاہ جی سے مل کر ہی جاؤں گا۔ آیا تو یہی سوچ کر ہوں۔ اس سے ملنا ضروری بھی ہے۔“

”پر شاہ جی کا تو جلد لوٹنے کا کوئی پروگرام نہیں۔ پتہ نہیں کب تک آئے۔ تو کہاں تک انتظار کرے گا؟“ شاہانی نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ ”ایسا کر‘ پہلے نہا دھو کر کپڑے بدل۔ جانے کا رستے سے آیا ہے۔ ذرا اپنا حلیہ تو دیکھ‘ کپڑوں پر کتنی خاک دھول ہے۔ تھکا ہوا بھی نظر آ رہا ہے۔ میں بھی نہانے ہی جا رہا ہوں۔ تو بھی تیار ہو جا۔ فیر محفل جمے گی۔“

سردار شاہانی غسل کرنے چلا گیا۔ رحیم داد بھی اس کمرے میں پہنچا جس میں شیدا نے اس کے

قیام کا بندوبست کیا تھا۔ رحیم داد نے کمرے میں پہنچتے ہی ٹرنک سے اجلے کپڑے نکالے اور نہانے کے لیے غسل خانے میں گھس گیا۔ پانی گرم تھا۔ رحیم داد کو غسل کرنے میں لطف آیا۔ وہ دیر تک نہاتا رہا۔ غسل کرنے کے بعد طبیعت تر و تازہ ہو گئی۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور بن سنور کر بال میں پہنچ گیا۔ مراد خاں شاہانی پہلے ہی سے موجود تھا۔ وہ رحیم داد کا انتظار کر رہا تھا۔

شام دبے قدموں حویلی کی اونچی اونچی فصیل نما دیواروں سے نیچے اتر رہی تھی۔ اندھیرا آہستہ آہستہ فضا میں گھلتا جا رہا تھا۔ شیدا نے لیپ روشن کیا اور کونے میں رکھے ہوئے اونچے اسٹول پر رکھ دیا۔ کمرے کے باہر برآمدے میں پیٹرومکس بھی جل رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی باغ میں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ باغ سنسان تھا۔ درختوں پر پالا پڑ رہا تھا۔

شیدا نے وہسکی کی بوتل مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کے سامنے پڑی ہوئی میز پر رکھ دی۔ اس کے ساتھ طشت میں گلاس تھے اور پانی سے بھرا ہوا جگ تھا۔ وہسکی کے دو پیگ پہلے شیدا ہی نے بنائے۔ شاہانی اور رحیم داد کو پیش کیے۔ وہ چند لمحے ان کے قریب ادب سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا دور چلا گیا۔

مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا۔ ہاتھ اونچا کیا اور مسکرا کر وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ رحیم داد نے بھی گھونٹ بھرا۔ ذرا دیر تک دونوں چپ بیٹھے مے نوشی کرتے رہے۔ پھر شاہانی کی آواز ابھری۔ اس نے پوچھا۔ ”چوہدری! تیں نوں یہاں کتنے روز ٹھیرنا ہے؟“

”اب یہاں ٹھیر کر کیا کروں گا۔ تو نے ہی تو بتایا تھا‘ شاہ جی کی واپسی کا کچھ ٹھیک سے پتہ نہیں۔ جانے کب آئے۔ میں کب تک اس کا یہاں انتظار کروں گا۔“

”تو کیا تو بھی کل صبح یہاں سے چلا جائے گا؟“

”کل صبح نہیں۔“ رحیم داد کھل کر مسکرایا۔ ”دو تین روز ٹھیر کر ہی جاؤں گا۔“

”نوراں کے لیے ٹھیرنا چاہتا ہے؟“ مراد خاں شاہانی نے آنکھ مار کر قہقہہ بلند کیا۔ ”پر نوراں تو اب یہاں ہے نہیں۔ پچھلے دنوں جہان آباد سے ملک منصور خاں ٹوانہ ادھر آیا تھا۔ نوراں اسے اتنی پسند آئی کہ وہ اسے لے گیا۔ شاہ جی بھی منصور خاں کے ہم راہ گیا ہے۔“

”تجھے یہ اطلاع کیسے ملی؟“ رحیم داد کا چہرہ اتر گیا۔ نوراں کے جانے کی خبر سن کر اسے ملال ہوا۔

”شاہ جی اور ملک منصور ٹوانہ کل ہی دوپہر کو یہاں سے گئے ہیں۔ مجھے حویلی میں ٹھیرے ہوئے ۵ روز ہو گئے۔“

”شاہ جی نے بتایا نہیں کب تک لوٹے گا؟“

”اس کالا ہی پروگرام ہے۔ جہاں آباد سے وہ کچھ دنوں کے لیے ملک خضر حیات خاں ٹوانہ کے
کالرا اسٹیٹ جائے گا۔“ شاہانی نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ ”ویسے اس کا ارادہ ٹوانوں کے علاوہ
ں سے بھی ملنے کا ہے۔ وہ سردار پور نون‘ نور پور اور بھلوال شہر جانے کو کہتا تھا۔“ اس نے ہلکا
ے لگایا۔ ”سیں! مجھے تو یہ اس کا سیاسی دورہ لگتا ہے۔ تیں نوں پتہ ہے۔ شاہ جی سیاست بھی تو
ا ہے اور بہت اونچی سیاست لڑاتا ہے۔“

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”تو اس کے ساتھ ہی لہور کیوں
ں چلا گیا؟“

”چلا تو جاتا۔ ارادہ بھی یہی تھا۔ پر زینت کے لیے ایک رات اور رک گیا۔“

”زینت کون؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”بہت زوردار رن ہے۔ ایک دم پوپٹ۔ دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے گا۔“ شاہانی نے ہنس کر
یا۔ ”پچھلے ہی ہفتے شاہ جی اسے اٹھوا کر کوٹ میں لایا ہے۔“ اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔
یک بات اور بھی ہے اس میں۔“ سردار شاہانی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”وہ کیا بات ہے؟“ رحیم داد نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

”پہلے وہ ہندنی ہوتی تھی۔ فسادات کے دنوں میں ایک مسلمان کمہار کے ہتھ چڑھ گئی۔“ شاہانی
نے وہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے بتایا۔ ”میں اس بار یہاں آیا تو شاہ جی نے زینت کا ذکر اس طرح کیا
ہ میں نے زور دے کر اسی رات اسے اپنے کمرے میں بلوایا۔ مجھے اتنی پسند آئی کہ روز ہی اسے
الیتا ہوں۔ دو روز تو چپ چپ رہی۔ پوچھنے پر بھی نہ بولی۔ بعد میں اس نے اپنے بارے میں سب
کچھ بتا دیا۔“

”کیا کیا بتاتی تھی؟“ رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

”کہتی تھی پہلے اس کا نام شکنتلا ہوتا تھا۔ پیو ملتان میں ڈاکٹری کرتا تھا۔“ مراد خاں شاہانی ٹھہر
ٹھہر کر بتاتا رہا۔ ”فسادات اور بلووں میں اس کا سارا ہی ٹبر تتر بتر ہو گیا۔ وہ اکیلی رہ گئی تو ہندوؤں کے
ساتھ سرحد پار جانے کے ارادے سے چیچہ وطنی پہنچی۔ وہیں ان کے کارواں پر رات کے
اندھیرے میں حملہ ہوا۔ بلوائیوں میں ایک کمہار بھی تھا۔ وہ اسے اٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ اسی نے
اسے مسلمان بنایا۔ شکنتلا سے اس کا نام زینت بی بی رکھا۔“

”اب تک وہ کمہار ہی کے گھر میں تھی؟“

”نہیں!“ شاہانی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”وہ کمہار کے گھر میں لگ بھگ تین سال رہی۔ ایک

نکا بھی پیدا ہوا۔ بعد میں کمہار نے اسے بیچ دیا۔ اس بار اسے رکن پور کے ایک سکول ماسٹر کی گھر والی بننا پڑا۔ زینت مجھے بتاتی تھی۔ ماسٹر بہت نیک بندہ تھا اس کے پاس وہ بہت آرام سے تھی۔ ماسٹر سے بھی ایک بچہ ہوا۔ دوبارہ حاملہ تھی کہ مغویہ عورتوں کی بازیابی کرنے والی ایک فوجی پارٹی نے اس کا کھوج نکال لیا اور اپنے ساتھ فیروز پور لے گئی۔" شاہانی نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "فیروز پور میں اس کا ایک چاچا ہوتا تھا۔ زینت کو اس کے سپرد کر دیا گیا۔ وہ زینت بی بی سے ایک بار پھر شکنتلا بن گئی۔"

"پر وہ واپس کیسے آ گئی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

شاہانی ہنس کر بولا۔ "جو ذال تین سال سے بھی اوپر مسلمانوں کے پاس رہ چکی ہو۔ دو بچے بھی جن چکی ہو اور تیسرا پیٹ میں ہو' اسے ہندو کیسے کبول کر لیتے؟ کہتی تھی خود اس کا چاچا اور چاچی اس کے ساتھ اچھوتوں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ اپنے کھانے پینے کے برتن تک اسے چھونے نہ دیتے تھے۔ زینت کے دو چچیرے بھی تھے۔ وہ اس کے دونوں بچوں کو مار ڈالنے کی گھات میں تھے۔ زینت کو اس کا پتہ چل گیا۔ بہت پریشان ہوئی۔ آخر ایک رات وہ گھر سے چھپتی چھپاتی نکلی۔ دونوں بچے ساتھ تھے۔ سرحد کے نزدیک ایک مسلمان سمگلر مل گیا۔ اس نے اپنے سارے زیور اور روپیہ سمگلر کو دے دیا۔ اس نے زینت اور اس کے بچوں کو کسی نہ کسی طرح سرحد پار پہنچا دیا۔ وہ دوبارہ رکن پور گئی۔"

"وہاں تو اسے اپنا گھر والا سکول ماسٹر مل ہی گیا ہو گا؟"

"سیں اس کا نصیبہ ہی خراب تھا۔ سکول ماسٹر کا رکن پور سے دیپال پور تبادلہ ہو گیا تھا۔" مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کو بتایا۔ "وہ اس کی تلاش میں دیپال پور جا رہی تھی کہ رستے میں شاہ جی کا ایک مزارع' سلامو' اسے مل گیا۔ اس نے زینت کو اکیلا پایا تو ڈرا دھمکا کر زبردستی اپنے گھر لے گیا۔"

"اور سلامو کے گھر سے اسے شاہ جی نے اٹھوا لیا۔" رحیم داد نے ہنس کر اپنے فوری ردعمل کا اظہار کیا۔ "لگتا ہے زینت بہت سوہنی زنانی ہو گی۔"

"سوہنی ہے۔ بھرپور جوان ہے اور پڑھی لکھی بھی ہے۔ گھر والے نے اسے ایک سکول میں پڑھانے پر بھی لگوا دیا تھا۔ پر دوسری مسلمان استانیاں ہندنی کہہ کر اتنا تنگ کرتی تھیں کہ اس نے سکول کی نوکری چھوڑ دی۔" شاہانی نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "میں کہتا ہوں زینت اتنی سوہنی ہے کہ سب اس سے جلتی ہوں گی۔ خار کھاتی ہوں گی۔"

"پر تجھے تو سوہنی اور جوان رن پسند نہیں۔" رحیم داد نے مراد خاں شاہانی کو مسکرا کر چھیڑا۔ "تیں نوں تو رحمتے پسند ہے۔"

"چوہدری! تو اس رمز کو نہیں سمجھ سکتا۔ اناڑی جو ٹھیرا۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ "کبھی کبھی تو رحمتے بھی مزا دے جاتی ہے۔ پر روز روز نہیں۔" اس نے گلاس اٹھا کر وہسکی کی چسکی لگائی۔ "تو نے زینت کو دیکھا نہیں۔ تین شوہروں کے پاس رہ چکی ہے۔ بچے بھی جن چکی ہے پر اب تک اس کا بدن ریشم کی طرح ہے۔ نرم اور ملائم۔ چہرہ تو ایسے دمکتا ہے جیسے صبح کی اجلی دھوپ۔"

"لگتا ہے زینت تجھے کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی ہے۔" رحیم داد نے شوخی سے کہا۔ "ساتھ لے جانے کا تو ارادہ نہیں؟"

"شاہ جی راضی ہو جائے تو ضرور لے جاؤں گا۔" شاہانی نے نشے میں جھوم کر کہا۔ "پر وہ زینت کو ابھی اپنے کوٹ سے کہیں جانے نہ دے گا۔ زینت اسے بھی پسند ہے۔"

اس دفعہ رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ شاہانی بھی چپ رہا۔ دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے اور رک رک کر وہسکی کے گھونٹ بھرتے رہے۔ آخر رحیم داد نے خاموشی ختم کی۔

"شاہانی! میں نوں ایک گلہ ہے تجھ سے۔"

"مجھ سے گلہ ہے؟" شاہانی نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ "کس بات کا گلہ؟"

"محمد عثمان رندھاوا تیرا وکیل ہوتا ہے ناں؟"

"بالکل ہوتا ہے۔" مراد خاں شاہانی ہنوز حیرت زدہ تھا۔ "پر تجھے اس سے کیا لینا؟"

"تیں نوں پتہ ہے' وہ اللہ وسایا کا بھی وکیل ہوتا تھا۔"

"یہ تو رندھاوا ہی نے مجھے بتایا تھا۔" شاہانی نے وضاحت کی۔ "میں تو کبھی اللہ وسایا سے نہیں ملا۔ شاہ جی سے کبھی کبھار اس کا ذکر ضرور سنا تھا۔ رندھاوا نے اللہ وسایا کے بارے میں بات کرتے کرتے تیرا بھی تذکرہ کیا تھا۔ ویسے صاف گل بات یہ ہے چوہدری' میں رندھاوا کو زیادہ عرصے سے نہیں جانتا۔ میں نے پہلی بار اپنے کیس کی پیروی کے لیے اسے کھڑا کیا ہے۔"

"پر تو اتنے جلدی اس پر ایسا مہربان ہو گیا کہ میرے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ میں شاہ جی سے برابر ملتا جلتا رہتا ہوں۔ اس کے ساتھ گہری یاری ہے اور اس کی حویلی میں کئی کئی روز ٹھیرتا بھی ہوں۔"

"میں نے جھوٹ تو نہیں کہا۔" مراد خاں شاہانی نہایت سادگی سے بولا۔ "اس میں برا منانے کی کون سی گالہ ہے۔"

رحیم داد جل کر بولا۔ "بیڑا گرک کر دیا اپنا۔ اوپر سے پوچھتا ہے اس میں برا منانے کی کون سی گل ہے؟" نشے کی ایک تیز لہر اٹھی۔ رحیم داد غصے سے بھڑک اٹھا۔ مگر اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔ وہ شاہانی سے خواہ مخواہ الجھنا نہ چاہتا تھا۔ صرف اتنا شکوہ کرنے پر اکتفا کیا۔ "رندھاوا سے گل بات کرنے سے پہلے مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔"

"صاف صاف بتا۔ گالہہ کیہہ اے؟" شاہانی نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ "تیری باتیں اب تک بالکل سمجھ نہیں آئیں۔ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

"صاف بات یہ ہے جی! میں یہ نہیں چاہتا جمیلہ کو یہ معلوم ہو کہ میں شاہ جی سے ملتا ہوں۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "میں اس سے چھپ کر یہاں آتا ہوں۔"

"یہ جمیلہ تو اللہ وسایا کی رانڈ ہے نا؟"

"ہاں وہی ہے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "اور تجھے یہ بھی پتہ ہے۔ زمیں داری میں وہ میرے ساتھ ساجھے دار بھی ہے۔"

شاہانی نے کسی قدر بے نیازی سے کہا۔ "پر میں جمیلہ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ تو نے بھی نہیں بتایا۔" اس نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "مجھے کیا پتہ تو اس سے چھپ کر یہاں آتا ہے۔ میں نے تو ایسے ہی باتوں باتوں میں وکیل سے تیرا ذکر کیا تھا۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "جمیلہ کو اس کا پتہ چل گیا تو کیا ہوگا۔ وہ تیرا کیا بگاڑ سکتی ہے؟"

"تجھے کیا پتہ، اپنا تو سارا کھیل بگڑ گیا۔ جمیلہ مجھ سے سخت ناراض ہے۔"

"اسے گھر والی بنانے کا تو ارادہ نہیں تیرا؟" شاہانی نے مسکرا کر بے تکلفی کا اظہار کیا۔ "سنا ہے جمیلہ بہت سوہنڑی ہے۔ مجھ سے دل کی صاف صاف بات بتا؟"

"دل کی بات پوچھتا ہے تو سن لے۔ جمیلہ مجھے نہ صرف پسند بلکہ بہت پسند ہے۔ میں اس سے ویاہ کرنا چاہتا ہوں۔ شاہ جی کی بھی یہی رائے ہے۔" رحیم داد نے کھل کر بات کی۔ "پر تو نے وکیل سے میرے اور شاہ جی کے میل ملاپ کے بارے میں بات کر کے سارا معاملہ گڑبڑ کر دیا۔ جب سے اسے اس کا پتہ چلا ہے، بہت روٹھی ہوئی ہے۔ سمجھ نہیں آتی اب کیا کروں؟" رحیم داد نے جلدی سے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "سچ پوچھ تو میں اسی سلسلے میں شاہ جی کے پاس مشورہ کرنے آیا تھا۔ وہ یہاں ہے نہیں۔ یہ بھی پتہ نہیں کب تک لوٹے گا۔"

"معاف کرنا چوہدری، مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ ورنہ میں وکیل سے کیوں ایسی گالہہ کرتا۔" شاہانی نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "ایسا کر، تو میرے ساتھ لہور چل۔ وہاں سے دونوں

بھکر چلیں گے۔ تو کچھ روز میرے ساتھ بھکر میں رہ کر یہاں آجانا۔ تب تک شاہ جی بھی واپس آجائے گا۔" شاہانی نے اصرار کیا۔ "اب تو میرے ساتھ تجھے ضرور چلنا ہوگا۔ بھکر میں تیرا دل بہل جائے گا۔ یہاں اکیلا پڑا پڑا کیا کرے گا۔ اپنے پنڈ جائے گا تو وہاں بھی پریشان ہی رہے گا۔" اس نے پیار سے رحیم داد کو ڈانٹا۔ "دیکھ چوہدری، انکار نہ کرنا۔ جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کر۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔" اس نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ "شاہ جی سے ضرور مل لے۔ وہ بہتر ہی مشورہ دے گا۔ فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

رحیم داد نے شاہانی کی بات مان لی۔ اس کے ہم راہ جانے پر رضامند ہو گیا۔

دونوں نے کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

رحیم داد کمرے میں داخل ہوا تو میداں پہلے سے موجود تھی۔ وہ چھریرے بدن کی خوش شکل عورت تھی۔ عمر بھی زیادہ نہیں تھی وہ اسے احسان شاہ اور مراد خاں شاہانی کے ساتھ کوٹ کی ایک کوٹھری میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ وہ اسے اچھی بھی لگی تھی۔ میداں کو دیکھ کر اس کی ساری کدورت رفع ہو گئی۔

☆

سہ پہر دن چڑھے رحیم داد اور شاہانی لاہور چلے گئے۔ سہ پہر تک دونوں لاہور پہنچ گئے۔ رات انہوں نے لارنس روڈ پر واقع ایک کوٹھی میں بسر کی۔ دوسرے روز دوپہر کی ٹرین سے سرگودھا کے راستے بھکر روانہ ہو گئے۔

سرگودھا شہر سے گزر کر ٹرین خوشاب کی حدود میں داخل ہوئی۔ ہڈالی سے آگے مٹھاٹوانہ ریلوے اسٹیشن تھا۔ ٹرین مٹھاٹوانہ پہنچی تو رحیم داد نے وہاں اترنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ جہان آباد جا کر احسان شاہ سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے بھکر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر مراد خاں شاہانی آمادہ نہیں ہوا۔ اس نے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

"چوہدری! یہ بھی تو ٹھیک سے پتہ نہیں کہ شاہ جی جہان آباد میں ہے یا کالرا اسٹیٹ میں۔"

رحیم داد نے اصرار کیا۔ "جہان آباد سے یہ تو معلوم ہو جائے گا، شاہ جی کہاں ہے۔ اس کے سارے پروگرام کا پتہ چل جائے گا۔"

سردار مراد خاں نے رحیم داد سے اتفاق نہیں کیا۔ "خامخا پریشان ہوگا۔ اول تو شاہ جی سے ملنا ہی مشکل ہے۔ مل بھی گیا تو ٹھیک سے بات نہیں ہوگی۔ اسے تو واپسی پر ملنا۔ اس کی حویلی ہی میں ٹھیک سے بات ہو سکتی ہے۔"

رحیم داد نے کوشش بھی کی مگر شاہانی کو آمادہ نہ کر سکا۔ مراد خاں شاہانی سیدھا کندیاں پہنچنا چاہتا تھا۔ وہاں اسے ضروری کام تھا جو فوری طور پر نمٹانا تھا۔ چنانچہ سفر جاری رہا۔ کندیاں پہنچ کر دونوں اشٹیشن سے نکلے۔ انھوں نے میاں شاہ علی کی حویلی میں قیام کیا۔ شاہ علی بڑا زمیں دار اور شاہانی کا گہرا یار تھا۔ مگر کندیاں میں دونوں صرف ایک روز ٹھہرے۔

کندیاں سے وہ بھکر کی جانب ٹرین میں چلے۔ تھل سے گزرے۔ راستے میں دور دور تک بنجر اور ریتلے ٹیلے نظر آتے تھے۔ اس قدر خاک دھول اڑی کہ بھکر پہنچتے پہنچتے دونوں گرد سے اٹ گئے۔

بھکر میں شاہانی کی خاندانی حویلی تھی۔ اس کے آس پاس بھی شاہانیوں کے مکانات اور حویلیاں تھیں۔ مگر مراد خاں دوسرے محلے میں رہتا تھا۔ اس کی یہ حویلی دو منزلہ تھی اور کسی زمانے میں دیوان لڈّا مل کے خاندان کے ایک ہندو رئیس دیوان کرم چند کی ملکیت تھی۔ فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکی تو بھکر بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ کرم چند کے کنبے کو بھی شہر کے دوسرے ہندوؤں کے ساتھ بھکر چھوڑنا پڑا۔ مراد خاں نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ صرف تیرہ ہزار میں کرم چند کی عالی شان حویلی خریدلی اور اسی میں مستقل رہائش اختیار کرلی۔

مراد خاں شاہانی اور رحیم داد نے لمبا سفر کیا تھا۔ دونوں تھکن سے نڈھال تھے۔ جوڑ جوڑ دکھتا تھا۔ مراد خاں شاہانی ذرا دیر ٹھہر کر زنان خانے میں چلا گیا۔ رحیم داد کے قیام کا بندوبست مہمان خانے کے ایک کمرے میں کردیا گیا۔ یہ مہمان خانہ ڈیرا کہلاتا تھا۔

رحیم داد کے کمرے میں پہنچتے ہی فوراً نائی آگیا۔ اس نے رحیم داد کی ڈاڑھی اور سر کے بال تراشے۔ نائی کے جاتے ہی حویلی کا ماشیا آگیا۔ اس نے رحیم داد کے سر میں موتیے کے پھولوں میں بسا ہوا کرنے کا تیل ڈالا جس کی دور دور تک شہرت ہے۔ بھکر کی خاص سوغات ہے۔ ماشیے نے ایسی چابک دستی اور مہارت سے چمپی کی کہ رحیم داد کی آنکھیں غنودگی سے بند ہونے لگیں۔ سر کی چمپی کے بعد ماشیے نے بدن کی مالش کی۔ ایک ایک جوڑا اور ایک ایک پٹھے کی اینٹھن اور تشنج، انگلیوں اور ہاتھوں کے مساج سے رفع کیا۔ رحیم داد کو بہت سکون ملا۔ ساری تھکن کافور ہوگئی۔ مالش سے فارغ ہو کر اس نے غسل کیا۔ کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ کر گہری نیند سوگیا۔

شام ہوئی اور اندھیرا پھیلا تو شاہانی کمرے میں آیا۔ رحیم داد بیدار ہوچکا تھا۔ مراد خاں شاہانی اسے قریب کے کمرے میں لے گیا۔ ذرا ہی دیر میں بوتل آگئی۔ گلاس آگئے۔ پانی آگیا۔ دونوں شغل کرنے لگے۔ شاہانی بہت مسرور اور تر و تازہ نظر آرہا تھا۔ بات بات پر قہقہے لگاتا۔ مگر رحیم داد چپ چپ تھا۔ اس کا چہرہ مضمحل تھا اور آنکھوں کی چمک دھندلی اور دھواں دھواں تھی۔

رادخاں نے اسے، افسردہ اور پریشان دیکھا تو سرگوشی کے عالم میں ہنس کر بولا۔ "چوہدری! تیری دیکھ کر تو صاف پتہ چلتا ہے، تجھے جمیلہ سے پیار ہوگیا ہے۔" اس نے قہقہہ بلند کیا۔ "یہی ہے ناں؟"

حیم داد دل کی بات چھپا نہ سکا۔ گہری سانس بھر کر بولا۔ "جب سے جمیلہ نے مجھ سے یہ کہا ہے ہ چھوڑ کر لہور چلی جائے گی، اس وکت سے جی پریشان رہتا ہے۔" اس کے لہجے میں کسک تھی۔ کتا ہوں کچھ بھی بھلا نہیں لگتا۔"

"پریشانی کی ایک بات یہ بھی تو ہے کہ جمیلہ کے ساتھ اس کے مربعے بھی چلے جائیں گے۔" الی نے رحیم داد پر چوٹ کی۔ "تجھے مربعوں کی فکر زیادہ ہوگی۔" وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ "نکاح ملے۔ جمیلہ کے ساتھ اس کی زمین اور جائیداد سب تیرے ہتھ میں آجائے گی۔ میں نے غلط تو ں کہا؟"

"مجھے مربعوں کے نکل جانے کی فکر تو ہے پر جمیلہ چلی جائے یہ میں کسی طرح برداشت نہیں رسکتا۔ ویسے اس کی باتوں سے لگتا ہے اپنی زمین تو شاید مجھی کو دے جائے۔ وہ بہت حوصلے والی ے۔ دل بھی اتنا وڈا رکھتی ہے۔" اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ "سمجھ نہیں آتی' وہ چلی گئی تو ر کیا بنے گا؟" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ گلاس ہونٹوں سے لگایا اور آہستہ آہستہ گھونٹ رنے لگا۔ اس کے چہرے پر غم کا سایہ پھیلتا جا رہا تھا۔

سردار مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھا اور چند لمحے ٹکٹکی باندھے تکتا رہا۔ راس نے نشہ کی ترنگ میں لہرا کر کہا۔ "چوہدری! پروا نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پریشان نہ ہ۔ میں تجھے کل شام تک کھے پیر کی زیارت پر لے چلوں گا۔ تک کھے پیر کے مزار پر دور دور سے ے آتے ہیں۔ منت مانتے ہیں اور ان کی مراد پوری ہوتی ہے۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "تو بالکل رنہ کر۔ اٹھا گلاس۔ تو نے تو ابھی کچھ پی ہی نہیں۔ جم کر لگا لے۔ طبیعت بالکل چنگی ہو جائے گا۔" اس نے گلاس اٹھایا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔

دونوں رات گئے تک شغل بادہ نوشی کرتے رہے۔

☆

دن ڈھلے مراد خاں شاہانی نے گیرج سے اپنی لمبی چوڑی پیکارڈ نکالی۔ رحیم داد کو ساتھ بٹھایا اور تک کھے پیر کی درگاہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ کار مراد خاں خود چلا رہا تھا۔ وہ بہت تیز رفتار سے دوڑاتا رہا۔ اچھا اور ماہر ڈرائیور تھا۔ اس نے کئی موڑ خطرناک تیزی سے کاٹے۔ رحیم داد کا

چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا۔ مگر شاہانی اطمینان سے اسٹرنگ سنبھالے بیٹھا رہا۔ ہنس ہنس کر رحیم داد سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔

مراد خاں نے روانگی سے قبل دودھ اور گھی میں گندھی ہوئی میدے کی پانچ بڑی بڑی میٹھی گوگیاں تیار کرائیں۔ منوتی کی یہ گوگیاں حویلی کے تنوریئے نے غسل کر کے اور اجلے کپڑے پہن کر تنور میں لگائی تھیں۔ صاف ستھرے کپڑے میں لپیٹ کر ان کو مٹی کے کورے کونڈے میں رکھا تھا۔ گوگیاں اب کار کی پچھلی سیٹ پر احتیاط سے رکھی تھیں۔ منڈی ہیلہ کے بڑے بازار سے گزرتے ہوئے مراد خاں شاہانی نے چاندی کا ایک چراغ بھی خریدا۔

سڑک کے دونوں کناروں پر خوانچے والے بیٹھے تھے اور طرح طرح کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ انگور بیچنے والا جھوم جھوم کر صدا لگاتا۔

"موتی' سچے موتی۔ آبھی مو تے دیاں لڑیاں کھا۔ چمن دے میوے کھا۔"

اسی طرح گنڈیریاں بیچنے والا لہک لہک کر گاہکوں کو اس طور بلاتا۔ "مکھن پیڑے' کھا یار آکھن پیڑے کھا۔"

خوانچے والوں' دکانداروں اور گاہکوں کی ملی جلی آوازیں ابھرتی رہیں۔ رحیم داد سنتا رہا۔ مراد خاں شاہانی چراغ خرید کر دکان سے باہر آیا۔

کار آن کی آن میں تیزی سے دوڑتی بازار سے نکل گئی۔ بازار میں ابھرتی ہوئی آوازوں کا شور رفتہ رفتہ دھیما پڑ گیا۔

دونوں بھکر اسٹیشن پہنچے۔ یہ نیچی چھت کا مختصر سا ریلوے اسٹیشن تھا۔ مگر اس کا احاطہ خاصا وسیع تھا۔ احاطے کے ایک حصے میں تک کھے پیر کا مزار تھا۔ مراد خاں شاہانی نے کار اسٹیشن کے باہر ایک طرف کھڑی کی اور رحیم داد کے ہم راہ تک کھے پیر کی زیارت کی جانب چلا۔

مزار پر زائرین اور منت مرادیں ماننے والوں کا ہجوم تھا۔ عورتیں بڑی تعداد میں تھیں۔ شاہانی کو دیکھتے ہی مجاوروں نے آگے بڑھ کر گرم جوشی اور تپاک سے اس کا اور رحیم داد کا خیر مقدم کیا۔ رحیم داد نے مجاوروں کی ہدایت کے مطابق مزار پر میٹھی گوگیاں چڑھائیں۔

وہ جھکا ہوا گوگیاں چڑھا رہا تھا تو قریب کھڑی ہوئی ایک نوجوان عورت اولاد نرینہ کے لیے گڑگڑا کر منت مان رہی تھی۔ "سوہناں چنڑ پیرا' خدا کنوں میکوں پتر گھن ڈے۔ میں وجدی واجھی آوساں تے تیڈی خنگاتے اٹا گھنا ڈیساں۔"

میٹھی روٹی اور گوگیاں مزار پر چڑھانے کے بعد ایک مجاور کی ہدایت پر رحیم داد نے اپنے ہاتھ سے چاندی کا چراغ روشن کیا' آگے بڑھا اور نہایت عقیدت اور احترام سے اسے قبر کے سرہانے رکھ دیا۔ سر سے پگڑی اتاری۔ شملے میں گرہ لگائی۔ پگڑی دوبارہ سر پر رکھی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر زیر لب یہ دعا مانگی۔

"پیر سئیں' جمیلہ میری بن جائے۔ مجھ سے ویاہ کرنے پر راضی ہو جائے۔ جب تک میری منت پوری نہیں ہو گی پگ کی گرہ نہیں کھولوں گا۔ میری مراد پوری ہو جائے گی تو میں تیری خنگاہ پر دوبارہ حاضری دوں گا۔ میٹھی روٹیاں چڑھاؤں گا اور نیا چراغ روشن کروں گا۔"

منت ماننے کے بعد رحیم داد اور مراد خاں شاہانی واپس ہوئے۔ باہر جاتے ہوئے شاہانی نے مجاوروں کو دس دس روپے دیئے۔ دونوں اسٹیشن کے احاطے سے نکلے تو شام کا دھندلکا رفتہ رفتہ فضا میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ مراد خاں نے کار اسٹارٹ کی اور واپس گھر جانے کے بجائے بھکر کی معروف تفریح گاہ' باغ دل کشا کی جانب روانہ ہوا۔ دونوں وہاں پہنچے تو اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ باغ سنسان پڑا تھا۔

حویلی کی سمت لوٹتے ہوئے کار ایک ٹیلے کے قریب سے گزری۔ ٹیلے پر پیلو کے درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے مسلیوں اور کٹانوں کا جمگھٹا تھا۔ جھوم جھوم کر بھنگ گھوٹی جا رہی تھی' مٹی کے کوزوں اور المونیم کے گلاسوں میں بھر بھر کر پی جا رہی تھی۔ ایک طرف مشعل روشن تھی۔ اس کی تیز روشنی میں ہیجڑے ڈھولک کی تھاپ پر کولہے مٹکا کر ناچ رہے تھے۔ لہک لہک کر جھمر کا مقبول مقامی گیت گا رہے تھے۔

نائیں ہے یاری تولہ پرانا
میں مٹاری تردی نہ جاناں
دوی بگیندی لانگھے
دل پٹے تانگے
رکھاں میں امید ماہی دے پلٹن دی

ناچنے والوں کے اردگرد بیٹھے ہوئے بھنگڑ' مسلی اور کٹانے گہرے نیلے نیلے تہبند اور دھوتیاں باندھے اور میلے کچیلے کرتے پہنے زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے' تالیاں بجا کر تھاپ دے رہے تھے۔ نشے کی ترنگ میں کوئی من چلا اٹھ کر ہیجڑوں کے ساتھ ناچنے لگتا تو قہقہوں کا زبردست شور بلند ہوتا۔ ڈھولک پر زور سے چوٹ لگائی جاتی۔ ناچ اور تیز ہو جاتا۔ مراد خاں شاہانی نے کار ٹیلے سے ذرا ہٹ کر ایک طرف کھڑی کر دی۔

دونوں کار سے اتر کر باہر نکلے اور کار کے مڈگارڈ سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ مراد خاں شاہانی نے ٹیلے کی سمت ہاتھ اٹھا کر رحیم داد کو بتایا۔ ”چوہدری! اس ٹبے پر اکثر ایسی ہی میل لگتی ہے۔ ساوی پی جاتی ہے اور اس کے نشے میں مست ہو کر عیش ہوتے ہیں۔ ہیجڑوں اور مسخروں کے علاوہ ناچ گانے کے لیے کنجریاں بھی آتی ہیں۔ زبردست رونق رہتی ہے۔“ اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”یہ غریب کمی ہیں۔ ان کی یہی تفریح ہے۔ دن بھر ڈٹ کر محنت مزدوری کرتے ہیں۔ شام کو میل لگا کر ساوی سے شغل کرتے ہیں، تھکن اتارتے ہیں۔ اپنے دل خوش کرتے ہیں۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”لگتا ہے ادھر بھی ساوی کا زیادہ ہی رواج ہے۔“ رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

”بہت زیادہ“ مراد خاں شاہانی گویا ہوا۔ ”تجھے بھی ساوی پلواؤں گا۔ میرے پاس ایک مظفر گڑھیا ملنگیرا ہے۔ بہت محنت سے گھٹائی کر کے ساوی تیار کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ کی تیار کی ہوئی ساوی پیئے گا تو لطف آجائے گا۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”تو نے کبھی ساوی پی ہے؟“

”ملتان میں تھا تو کبھی کبھی پی لیتا تھا۔“ رحیم داد نے جواب دیا۔ ”پر ادھر ایک مدت سے بالکل نہیں پی۔ ملی ہی نہیں۔ جمیلہ کسی طرح کا نشہ پسند نہیں کرتی۔ اس لیے میں نے اپنی حویلی میں کبھی نشہ پانی نہیں کیا۔ اللہ وسایا بھی نہیں کرتا تھا۔“

”تب تو تجھے ضرور ساوی پلواؤں گا۔“ شاہانی نے مسکرا کر رحیم داد کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارا۔ ”تک کھے پیر کی زیارت پر تو نے منت مانی ہے۔ تیری منت ضرور پوری ہوگی۔ جمیلہ بھی تجھے ملے گی اور اس کے مربعے بھی۔ تک کھے پیر کی زیارت پر مانی ہوئی منت خالی نہیں جاتی۔“ اس نے حسب معمول قہقہہ بلند کیا۔ ”اسی خوشی میں ایک جشن ہو جائے۔ اپنی حویلی میں میل لگے۔ اس میں تجھے بلوچوں کا جھمر دکھاؤں گا۔“ اس نے ٹیلے پر ناچتے ہوئے ہیجڑوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”ناچ تو یہ بھی جھمر ہی ہے پر یہ کوئی جھمر ہے۔“ اس نے ناپسندیدگی کے طور پر منہ بگاڑا۔

”میں واپسی پر میل کا بندوبست کراتا ہوں۔“

رحیم داد خاموشی سے شاہانی کی باتیں سنتا رہا۔ تک کھے پیر کے مزار پر منت ماننے کے بعد وہ سکون محسوس کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی کا غبار کسی قدر چھٹ چکا تھا۔ مگر مراد خاں شاہانی نے اسے خاموش دیکھا تو سمجھا کہ منت کے بعد بھی اس کی پریشانی رفع نہیں ہوئی۔ مراد خاں نے رحیم داد کی پیٹھ آہستہ سے تھپ تھپائی۔

”اب تو پریشان کیوں نظر آ رہا ہے؟“

”ایسی تو کوئی گل نہیں۔“

”کچھ ہی کہہ، پر تو پریشان ضرور ہے۔“ مراد خاں نے اس کی دل جوئی کی۔ ”پریشان نہ ہو۔ تجھے
ں والا پیر کے مزار پر بھی لے چلوں گا۔ وہاں بھی منت ماننا۔ ضرور پوری ہوگی۔ زبردست
رت ہے۔ بلیاں والا پیر کی خنگاہ پر بھی دور دور سے منتیں ماننے والے آتے ہیں۔ تیری منت
ی ہو جائے تو بلیوں کو دودھ پلا دینا۔ منوتی پیر کی زیارت پر تجھے بہت بلیاں نظر آئیں گی۔ وہ منت
ا دودھ پیتی ہیں۔“

اس نے ایک بار پھر محبت سے رحیم داد کی پیٹھ تھپ تھپائی۔ ”چوہدری! پروا نہ کر۔ زیارتیں اور
ربت ہیں۔ ان کے بارے میں زبردست کرامتیں اور معجزے مشہور ہیں۔ ویسے زیارتوں کے
ہ پیر بھی ہیں۔ یہ میاں والی کا علاکہ ہے۔ اسے بھی ایک پیر میاں علی نے بسایا تھا۔ اسی کے نام
ں کا نام میاں والی پڑ گیا۔“

”اس ضلعے کا نام میاں والی اس لیے پڑ گیا؟“ رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

”یہ پیروں اور پہنچے ہوئے بزرگوں کی سرزمین ہے۔“ مراد خاں شاہانی نے بتایا۔ ”یہاں ہر
نع، ہر ڈھوک بلکہ ہر خاندان کا اپنا پیر ہوتا ہے۔“

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”تب تو تیرا بھی پیر ہوگا۔“

”ہاں سئیں، میرا بھی ایک پیر ہے۔ بہت اللہ والا بزرگ ہے۔ چہرہ ایسا نورانی، دیکھو تو دیکھتے ہی رہ
۔ میرا پیر خریف کی واڈھی کے بعد آئے گا۔ دو سال میں ایک بار دورے پر نکلتا ہے۔ اپنے
ں خاص مریدوں کے پاس چند روز کے لیے ٹھیرتا بھی ہے۔“

رحیم داد چپ رہا۔ اس نے شاہانی کے پیر میں دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ مراد خاں نے چند لمحے
وش رہ کر پوچھا۔ ”کیا ارادہ ہے تیرا؟ بلیاں والا پیر کی زیارت پر چلے گا؟ وہاں بھی منت مان
۔“

”نہیں جی، ایک ہی منت کافی ہے۔ میرا دل کہتا ہے تک کھے پیر کی منت کا ضرور اثر ہوگا۔“

شاہانی نے مزید اصرار نہیں کیا۔ دونوں کچھ دیر ٹیلے کے پاس ٹھہرے رہے۔ ڈھولک کی تھاپ پر
ے ناچتے گاتے رہے۔ کٹانے اور مسلی بھنگ چڑھا کر قہقہے لگاتے رہے، شور مچاتے رہے۔ اب
ہرا ہو گیا تھا۔ مشعل کی روشنی میں وہ سایوں کی مانند لہراتے نظر آ رہے تھے۔
شاہانی اور رحیم داد کار میں سوار ہوئے اور حویلی میں پہنچ گئے۔

☆

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کو اپنا ڈاگ ہاؤس دکھایا۔ ڈاگ

ہاؤس حویلی سے متصل ہی تھا۔ ڈاگ ہاؤس کیا تھا' اچھا خاصا بڑا مکان تھا۔ طرز تعمیر کے اعتبار سے کسی سرکاری افسر کا بنگلہ لگتا تھا۔

اس میں کتوں کے رہنے اور آرام کرنے کے لیے کمرے تھے' کوٹھریاں تھیں۔ کتوں کو نہلانے کے لیے غسل خانے تھے' چہل قدمی کے لیے برآمدے تھے۔

ڈاگ ہاؤس میں دو درجن سے زیادہ کتے تھے۔ ان میں بیشتر نایاب اور اعلیٰ نسل کے کتے تھے۔ کتوں کو نہلانے دھلانے' راتب دینے' چہل قدمی کرانے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے پندرہ ملازم تھے۔ وہ کوتی کہلاتے تھے اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ڈاگ ہاؤس کے وسیع احاطے کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ کتوں کے علاج معالجے کے لیے ایک سلوتری بھی مقرر تھا۔ وہ صبح شام باقاعدگی سے کتوں کا معائنہ کرتا تھا۔

شاہانی کو کتے پالنے کا دیوانگی کی حد تک شوق تھا۔ وہ بھکر میں ہوتا تو ہر صبح کتوں کو دیکھنے ڈاگ ہاؤس ضرور جاتا۔ انھیں بڑے لاڈ پیار سے پچکارتا۔ ان کے منہ سہلاتا۔ پیٹھ اور گردن پر پیارے ہاتھ پھیرتا۔ کوتیوں سے ان کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرتا۔ کسی کتے کو سست پاتا تو تشویش کا اظہار کرتا۔ فوراً سلوتری کو بلواتا۔ کتے کو دکھاتا اور اس کی بیماری اور تکلیف کے بارے میں تحقیقات کراتا۔ پوری دلچسپی کے ساتھ اس کا علاج کراتا۔ روز اس کے متعلق پوچھ گچھ کرتا۔

کتوں کو سویرے سویرے غسل دیا جاتا تھا۔ دو بکرے روزانہ ذبح ہوتے تھے۔ ان کے گوشت سے کتوں کے لیے راتب تیار کیا جاتا۔ راتب دیتے وقت مراد خاں شاہانی عام طور پر خود موجود ہوتا۔ کرسی ڈال کر سامنے بیٹھ جاتا اور کتوں کو گوشت کھاتے دیکھتا رہتا۔

مراد خاں شاہانی کو اپنے کتوں پر بڑا ناز تھا۔ وہ بڑے فخر سے مہمانوں کو اپنا ڈاگ ہاؤس اور اس میں رہنے والے کتے دکھاتا۔ ہر کتے کے بارے میں ایک ایک تفصیل نہایت وضاحت سے بیان کرتا۔ کسی سرکاری افسر یا جاگیردار کے پاس اعلیٰ نسل کا کتا دیکھتا تو اس کے بچے حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ یہاں تک کہ انھیں چوری چھپے اٹھوا لینے میں مطلق عار محسوس نہ کرتا اور بڑے دھڑلے سے ہنس کر ایسے کتوں کے بارے میں بتاتا کہ انھیں اس نے کس طرح حاصل کیا۔

کتے اس کی جاگیردارانہ شان و شوکت کی علامت تھے اور شکار کے لیے بھی کام آتے تھے۔ وہ اکثر کتوں کی دوڑ کراتا۔ کبھی کبھی انھیں ریچھوں سے بھی لڑاتا۔ اور ان پر لمبی لمبی شرطیں لگاتا۔ کتوں کی دوڑ کرانا اور انھیں لڑانا' علاقے کے دوسرے بلوچ سرداروں اور جاگیرداروں کی طرح مراد خاں شاہانی کا بھی محبوب مشغلہ تھا۔

ڈاگ ہاؤس حویلی کے پچھواڑے تھا۔ مویشیوں کا باڑا اور گھوڑوں کا اصطبل بھی قریب ہی تھا۔ راد خاں کے پاس اچھی نسل کے گھوڑے بھی تھے۔ مگر اسے کتوں سے زیادہ دلچسپی اور انسیت ھی۔ جب سے اس نے نئی کار اور جیپ خریدی تھی گھوڑے کی سواری چھوڑ دی تھی۔ ایک زمانہ ا جب وہ صبح تڑکے اٹھ کر اصطبل میں جاتا۔ کوئی گھوڑا نکالتا اور اس پر سوار ہو کر دور تک دوڑاتا لا جاتا۔ مگر اب اس نے گھوڑوں پر توجہ دینا کم کر دیا تھا۔ کتوں ہی میں اس کی دلچسپی روز بروز بڑھتی ا رہی تھی۔

مراد خاں نے چلتے چلتے رحیم داد کو مخاطب کیا اور فخر سے کہا۔ "چوہدری! اپنے کو تو صرف دو ڑوں کا چسکا ہے۔ کتے اور رناں۔ پر کتا اونچی نسل کا ہو۔ رن تو جیسی بھی مل جائے کام چل جاتا ہے۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "مطلب یہ ہے کہ رن ہونی چاہیے اور نئی سے نئی ہونی ہیے۔"

رحیم داد صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اس نے نہ کوئی تبصرہ کیا نہ کسی خاص ردعمل کا اظہار کیا۔ وں ڈاگ ہاؤس میں داخل ہوئے تو سورج چڑھ کر آسمان کے اوپر پہنچ چکا تھا۔ رحیم داد نے اندر کر دیکھا۔ سامنے وسیع احاطہ تھا۔ احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ سلسلے وار کچے مکانات تھے۔ کانوں کے سامنے جال اور کھگل کے درخت تھے۔ درختوں کے نیچے کہیں کہیں چارپائیاں پڑی یں۔ چارپائیوں کے پائے اونچے اونچے تھے۔ کئی چارپائیوں کے ساتھ چادروں کے بنے ہوئے لوڑے لٹک رہے تھے۔ ان میں شیر خوار بچے لیٹے تھے۔ قریب ہی عورتیں بیٹھی چاٹی میں دودھ بلو ہی تھیں۔ ٹوکریاں بن رہی تھیں یا کسی اور کام کاج میں مصروف تھیں۔ وہ اپنا کام بھی کرتی تیں اور رک رک کر پنگوڑا بھی ہلاتی جاتیں۔ دھیمے سروں میں کوئی لوری بھی گنگناتیں۔

کوتیوں اور کمیوں کے کچے اور بوسیدہ مکانات سے ہٹ کر احاطے کے مشرقی گوشے میں پختہ ارت تھی۔ اس پر کھپریل کی خمیدہ چھت تھی۔ سامنے کے رخ پر طویل برآمدہ تھا۔ برآمدہ خوب شادہ تھا۔ درمیان سے تنگ راستہ گزرتا تھا جس کے دوسرے سرے پر دروازہ تھا۔ وہ ایک بڑے رے میں کھلتا تھا۔ راستے کے دونوں طرف لوہے کی سلاخوں کا مضبوط جنگلا تھا۔ جنگلے کے اندر ہرے تھے اور اس وقت راتب کھا رہے تھے۔

ڈاگ ہاؤس میں ہر طرف کچے گوشت کی بساند پھیلی ہوئی تھی۔ جنگلے کے قریب ہی ایک گھنے خت کے نیچے چند کوتی زمین پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے میں جوار اور باجرے کی روٹیاں ں۔ ایسی روٹیوں کو ڈوڈھا کہا جاتا ہے۔ کوتی شلجم کے پتوں کے ساگ اور لہسن کے ساتھ

ڈوڈھے کھانے میں مشغول تھے۔ مٹی کے ایک پیالے میں مکھن اور دوسرے میں جنڈ کی پھلیوں کا اچار بھی کھانے کے لیے موجود تھا۔

مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کو دیکھتے ہی وہ کھانا چھوڑ کر کھڑے ہوگئے۔ ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ عورتیں بھی کام کاج چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہر گوشے اور ہر سمت سے صدائیں بلند ہونے لگیں۔

"سیں، صدا جیویں، سکھی صحت ہودیں۔"

دو کوتی بھاگم بھاگ کرسیاں اٹھا کر لائے اور لوہے کے جنگلے کے عین سامنے درخت کے سائے میں رکھ دیں۔ مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کوتی کرسیوں کے پیچھے نظریں جھکا کر ادب سے کھڑے ہوگئے۔

شاہانی نے کچھ دیر بعد پلیٹ کران کی جانب سرسری سی نظر ڈالی۔ ہاتھ سے اشارہ کیا، اونچی آواز سے کہا۔ "جاؤ روٹی کھاؤ۔" اس کے لہجے میں رعونت تھی۔

وہ چپ چاپ چلے گئے اور فرش پر بیٹھ کر ساگ دوڈھا کھانے میں جٹ گئے۔ مراد خاں کتوں کو گوشت کا راتب کھاتے دیکھتا رہا اور ہر کتے کی جانب انگلی اٹھا کر رحیم داد کو بتاتا رہا۔ "یہ کالے کالے دھبوں والا فاکس ہاونڈ ہے۔ یہ کوکر سپنیل ہے، یہ السیشن ہے۔ وہ گرے ہاونڈ ہے، اس کے ساتھ والا مٹیف ہے، یہ بل ٹیریر ہے، یہ پوڈل ہے، وہ کونے والا برنارڈ ہے۔ یہ باکسر ہے، یہ لیبراڈور ریٹریور ہے، یہ نیوفاؤنڈ لینڈ ہے۔ وہ دیوار کی ساتھ ابرڈین ٹیریر ہے۔ یہ کولی ہے۔" وہ جس کتے کی جانب انگلی اٹھاتا اس کی نسل اور خصوصیات کے بارے میں بھی نہایت ذوق و شوق سے بتاتا جاتا۔

رحیم داد کو کتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ مگر مراد خاں شاہانی کی خوش نودی کی خاطر اس کی بات توجہ سے سنتا رہا۔ ویسے وہ شاہانی کا ڈاگ ہاوس دیکھ کر خاصا مرعوب ہوا تھا۔ حیرت سے نظریں اٹھا کر ایک ایک طرف دیکھتا اور شاہانی کی باتیں سنتا۔

اسی حیرت اور استعجاب کے عالم میں اس نے شاہانی سے پوچھا۔ "شاہانی! اتنا شان دار ڈاگ ہاوس رکھنے پر تو بہت خرچ آتا ہوگا؟"

"ہا سیں! کوئی دس بارھاں ہزار روپے مہینہ تو خرچ ہوتا ہی ہوگا۔" سردار شاہانی نے بے نیازی سے کہا۔

رحیم داد کی حیرت میں اور اضافہ ہوگیا۔ "یہ تو بہت ہوا جی۔"

"کہاں بہت ہوا۔" شاہانی بے تکلفی سے قہقہہ لگا کر بولا۔ "چوہدری! یہ تو اپنے اپنے شوق کی

بات ہے۔ میں نے تو کتوں کے ایسے شوکین اور ان سے گہری دلچسپی رکھنے والے دیکھے ہیں جو ایک کتے کے صرف دوادارو پر ۵ ہزار خرچ کر دیتے ہیں۔"

"نہیں جی! یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔

"میں نے تجھ سے غلط نہیں کہا۔" شاہانی نے اپنی بات پر زور دیا۔ "میرا ایک یار دشت خاں بگٹی ہے۔ وڈا بلوچ سردار ہے۔ زیادہ تر کوئٹہ میں ملتا ہے۔ اسے بھی کتے رکھنے کا زبردست شوک ہے۔ بہت اعلیٰ نسل کے کتے اس کے پاس ہیں۔ میں کبھی کبھی گرمیوں میں اس کے پاس چلا جاتا ہوں۔ سچ پوچھ تو اس کے کتے ہی دیکھنے جاتا ہوں۔"

"اس کے پاس بھی ڈاگ ہاوس ہوگا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"بالکل ہے اور بہت شاندار ہے۔ میں تجھے اس کے ایک کتے کی دوادارو کے بارے میں بتا رہا تھا جس پر ۵ ہزار روپے خرچ آیا تھا۔"

"پنج ہزار تو بہت ہوا، اور وہ بھی ایک کتے کے علاج پر۔"

"بالکل اتنا ہی روپیہ خرچ ہوا تھا۔" مراد خاں شاہانی نے زور دے کر کہا۔ "میں ان دنوں کوئٹہ ہی میں تھا جب سردار دشت خاں بگٹی کا ایک سپنیل بیمار ہوا تھا۔ تین ہفتے کے لگ بھگ اس کی دوادارو ہوتی رہی۔ پہلے اسے گھوڑا ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ وہاں اس کی بیماری کم نہیں ہوئی تو بروری روڈ کے ریسرچ سنٹر میں علاج کے لیے بھیجا گیا۔ سینٹر میں چار ونٹری ڈاکٹروں نے تین مرتبہ آپریشن کیا۔ تین انجیکشن روزانہ صبح، دوپہر اور شام کو پابندی سے لگائے جاتے تھے۔ ایک انجیکشن ۳۰ روپے میں آتا تھا۔"

"تیں روپے کا انجیکشن!" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہا سیں! اتنے ہی میں آتا تھا۔ میں تو وہاں موجود تھا۔ کئی بار تو انجیکشن میرے سامنے منگوائے گئے۔" مراد خاں شاہانی تفصیل سے بتاتا رہا۔ "ان انجیکشنوں کے علاوہ آپریشن کے دوران کتے کو گلوکوز چڑھایا گیا اور طاکت کے انجیکشن بھی ساتھ ساتھ لگائے جاتے۔ اسے روزانہ ریسرچ سینٹر کار میں بھیجا جاتا۔ سینٹر شہر سے چھے میل دور ہے۔ جب تک کتا بیمار رہا دو نرسیں دن رات اس کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔" سردار شاہانی نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "ململ کا پورا ایک تھان تو کتے کے زخموں کی مرہم پٹی پر لگا۔"

"تب تو ۵ ہزار سے اوپر ہی خرچ آیا ہوگا۔" رحیم داد نے شاہانی کی باتوں سے متاثر ہو کر کہا۔ "پر اتنے مہنگے علاج کے بعد کتا بالکل چنگا ہوگیا ہوگا۔"

”نہیں! وہ تمام دوا دارو کے بعد بھی نہ بچ سکا۔“ سردار شاہانی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بیماری ایسی خطرناک تھی کہ اس کی جان ہی لے کر ٹلی۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”چوہدری! بہت شاندار کتا تھا۔ ایسے شاندار اور خالص نسل کے کتے کم دیکھنے میں آتے ہیں۔“ اس نے قدرے تامل کے بعد بتایا۔ ”سردار دشت خاں بگٹی اس کے غم میں پاگل ہوگیا تھا۔ سارے کوتیوں کی مار مار کر چمڑی ادھیڑ ڈالی۔ دو کو تو جیل میں ڈال دیا۔ دوسرے وڈے بلوچ سرداروں کی طرح اس کی بھی اپنی جیل ہے۔“

رحیم داد نے مزید تبصرے سے گریز کیا۔ سردار شاہانی بھی خاموش رہا۔

سامنے جنگلے کے اندر کتے گوشت کھا رہے تھے اور ان کے نزدیک ہی زمین پر بیٹھے ہوئے کوتی شلجم کے پتوں کے ساتھ جوار باجرے کا ڈوڈھا کھا رہے تھے۔ خشک ڈوڈھا حلق میں پھنستا تو وہ جلدی جلدی لسی پیتے یا مٹی کے پیالے میں انگلی ڈال کر ذرا سا مکھن نکالتے اور منہ میں رکھنے سے پہلے ڈوڈھے پر لگاتے تاکہ آسانی سے حلق کے نیچے اتر جائے۔

سردار مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کتوں کی جانب توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک نوجوان عورت آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دونوں کے قریب آئی۔ وہ اجلی منجھلی باندھے ہوئے تھی۔ اس کے اوپر چھینٹ کا کرتا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں نوزائد بچہ دبا تھا۔ بچے کے جسم کے گرد سفید کپڑا اس طرح کس کر لپیٹا گیا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر رہ گئے تھے۔ صرف گردن کا کچھ حصہ اور چہرہ نظر آتا تھا۔ بچے کا رنگ کھلتا ہوا تھا۔ پیشانی پر کاجل کا سیاہ ٹیکہ لگا تھا۔ وہ آنکھیں کھولے ماں کا چہرہ تک رہا تھا۔

عورت نے ایک ہاتھ سے بچے کو سنبھالا اور دوسرے سے دوپٹے کا آنچل کھینچ کر سر اس طرح ڈھکا کہ اس کے چہرے کا بیشتر حصہ بھی چھپ گیا۔ وہ آگے بڑھی اور جھک کر بچے کو مراد خاں شاہانی کے سامنے کر دیا۔ شاہانی نے پہلے بچے کو دیکھا پھر مڑ کر عورت پر نظر ڈالی۔ مسکرایا اور رحیم داد کو مخاطب کیا۔

”چوہدری! یہ کچھ کمزور لگتا ہے۔“

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے تعجب سے دریافت کیا۔ ”اس کے بدن پر ا کپڑا کیوں لپیٹا ہوا ہے؟ یہ تو ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتا۔“

”ایسا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔“ سردار شاہانی نے مسکرا کر کہا۔ ”ایسا نہ کیا جائے تو یہ زور آور او تکڑا کیسے ہوگا۔ بال بھولے کو زور آور بنانے کے لیے اپنی طرف کا یہی دستور ہے۔ ہم تو پیدا ہو

ے مکھن کھلاتے ہیں۔ تب ہی تو ادھر تکڑے اور جڑیا جوان نظر آتے ہیں۔“ اس نے نگاہیں ر عورت کی جانب دیکھا۔ بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اسے مکھن کھلاتی ہے ؟“

ہا سیں!“ عورت نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”کھلاتی ہوں، روز کھلاتی ہوں۔“

سردار مراد خاں شاہانی نے بچے کا رخسار ہولے سے تھپ تھپایا۔ اس کا چہرہ غور سے دیکھا اور ت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دریافت کیا۔ ”اس کی شکل تو تیرے خاوند جیسی لگتی ہے۔“

”خاوند سے شکل نہیں ملے گی تو کس سے ملے گی؟“ رحیم داد بے تکلفی سے مسکرا کر بولا۔ ردار شاہانی! تو بھی کمال کرتا ہے۔“

”چوہدری! تو یہ گالہ نہیں سمجھ سکتا۔ ایسی چٹی اور پوپٹ رن میں چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ اس کا ا ہے۔ کس کا ہے؟ اس بھید کو یہ ٹھیک طرح جانتی ہے۔“ شاہانی نے گردن کو خم دے کر تیکھی دل سے دیکھا۔ مسکرایا اور نہایت ڈھٹائی سے پوچھا۔ ”جانتی ہے ناں؟“

عورت نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ البتہ اقرار کرنے کے انداز میں ہولے ہولے گردن ا۔ اس کا چہرہ شرم سے سرخ پڑ گیا۔ رحیم داد گم صم بیٹھا دونوں کو حیرت سے دیکھتا رہا۔

شاہانی نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اونچی آواز سے کہا۔ ”بختاور ہووے۔ بھاگیں بھریا ے۔“

یہ دعائیہ کلمات سردار کی زبان سے سن کر عورت کا چہرہ خوشی اور وفور جذبات سے دمک اٹھا۔ ہانے بچے کو سینے سے لگایا اور چپ چاپ چلی گئی۔

☆

کتے نہایت انہماک سے راتب کھا رہے تھے۔ کتوں کے چپڑ چپڑ گوشت کھانے اور ہڈیاں چبانے کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ یکایک کسی بچے کی چیخ ابھری۔ شاہانی اور رحیم داد نے ڈکر اس طرف دیکھا کہ ڈاگ ہاؤس کے پھاٹک کے نزدیک ایک بچہ کھڑا ہے۔ اس کے منہ میں ہوئے گوشت کی بوٹی دبی تھی۔ ایک عورت اس پر جھکی ہوئی منہ سے گوشت کی بوٹی نکالنے کی ش کر رہی تھی۔ وہ اس کی ماں تھی۔ بچہ ضد کر رہا تھا۔ تلملا کر چیخ رہا تھا۔ شاہانی لمحے بھر تک نا کو دیکھتا رہا۔ پھر دیکھتے دیکھتے اس کا چہرہ غصے سے خونخوار ہوگیا۔ تیوری پر بل پڑ گئے۔ رحیم داد نی کے چہرے سے ٹپکتی ہوئی جھنجلاہٹ دیکھ کر پریشان ہوگیا۔

شاہانی نے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈپٹ کر عورت سے کہا۔ ”اسے ادھر لا۔“

عورت نے گردن اٹھا کر سہمی ہوئی نظروں سے شاہانی کو دیکھا۔

بچہ بھی خاموش ہوگیا۔ اس کے چہرے پر خوف کا سایہ پھیل گیا۔ جنگلے کے قریب کھانا کھانے والے کوتیوں کے ہاتھ رک گئے۔ احاطے کی دوسری عورتوں کے چہرے بھی خوف اور دہشت سے زرد پڑ گئے۔ ڈاگ ہاؤس پر گہری خاموشی چھا گئی۔

سردار مراد خاں شاہانی کی آواز دوبارہ ابھری۔ اس نے ڈپٹ کر عورت سے کہا۔ "تونے نہیں۔ اسے لے کر میرے پاس آ۔"

عورت نے بچے کا بازو پکڑا اور ڈری سہمی ہوئی مراد خاں شاہانی کی جانب بڑھی۔ قریب پہنچ اس نے گڑگڑا کر کہا۔ "سئیں سردار! یہ باہر سے گوشت لایا ہے۔ یہاں تو پکتا ہی نہیں۔ اجازت نہیں۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ "اس سے بھول ہوگئی' معافی دے دے۔ تیرا لا جیوے۔ رب راضی ہووے۔"

"بکواس نہ کر۔" مراد خاں شاہانی زور سے دھاڑا۔ "خانہ خراب تجھے پتہ ہے یہاں گوشت نہ پک سکتا اور نہ اندر آسکتا ہے۔"

"پتہ ہے سئیں' بالکل پتہ ہے۔" عورت نے جلدی جلدی گردن ہلا کر اس کی تائید کی۔

سردار شاہانی نے اسے نظر انداز کر کے جنگلے کے نزدیک بیٹھے ہوئے کوتیوں کی جانب دیکھا او بلند آواز سے کہا۔ "رمضے! ادھر آ۔" فوراً ایک کوتی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ تیزی سے مراد خاں ک جانب لپکا' نزدیک آیا اور خاموش کھڑا ہوگیا۔ وہ اونچے قد کا قوی ہیکل جوان تھا۔ عورت اس ک عقب میں خوف اور دہشت سے آنکھیں پھاڑے خاموش کھڑی تھی۔ بچہ اس کے پہلو سے حیران اور ششدر کھڑا تھا۔ اس کی عمر پانچ سال سے زیادہ نہیں تھی۔

سردار شاہانی نے رمضے سے پوچھا۔ "تجھے پتہ ہے' ڈاگ ہاؤس میں گوشت پکانے یا لانے کی کیا ہے؟"

"خیر ہو سئیں سردار! میں کوں سب پتہ ہے۔" رمضے نے سینہ تان کر نہایت مستعدی سے جوا دیا۔

"تو جیسا ہمیشہ اس معاملے میں ہوتا ہے ویسا ہی کر۔" سردار شاہانی نے تحکمانہ انداز میں کہا "دروازہ کھول۔" اس نے لوہے کے جنگلے کی جانب اشارہ کیا۔ جس میں کتے بند تھے۔ اس نے مڑ بچے کو دیکھا۔ "اسے بھیلے کے سامنے ڈال دے۔"

"سردار سئیں! ایسا نہ کر۔" عورت نے تڑپ کر کہا۔ "اسے معافی دے دے۔"

"چپ کر۔" شاہانی نے اسے زور سے ڈانٹا۔

مگر وہ چپ نہ رہی۔ "سزا ہی دینی ہے تو مجھے کتوں کے سامنے ڈال دے۔" یہ کہتی ہوئی وہ مراد ماں کے قدموں پر جھکی۔ مراد خاں شاہانی نے اس کے پیٹ پر زور سے لات ماری۔

"ہٹ جا سامنے سے۔"

عورت لات کھا کر گری اور زمین پر دور تک گیند کی مانند لڑھکتی چلی گئی۔ مراد خاں نے رمضے کو کم دیا۔ "منہ کیا تک رہا ہے؟ دروازہ کھول۔" اس نے بچے کی طرف ہاتھ اٹھایا۔

"اسے اندر ڈال دے۔"

رمضے نے آگے بڑھ کر جنگلے کے دروازے کا قفل کھولا' واپس آیا اور بچے کا ہاتھ پکڑ کر جنگلے کی مت بڑھا۔ بچے نے تلملا کر اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ رمضے نے جھٹکا دے کر اسے زور سے کھینچا۔ بچہ سہم کر دم بخود رہ گیا۔ رمضا اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا' دروازہ کھولا اور دھکا دے کر بچے کو جنگلے کے اندر پھینک دیا۔ بچے کے اندر پہنچتے ہی کئی کتے غرا کر زور زور سے بھونکنے لگے۔

بچے کی ماں اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑے ہوئے تھی۔ اس کے بال کھر کر منہ پر آگئے تھے۔ ان پر خاک جمی تھی۔ چہرہ خوف اور دہشت سے ڈراؤنا نظر آرہا تھا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ بے قرار ہو کر بار بار پہلو بدل رہی تھی اور مراد خاں شاہانی کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

شاہانی نے اس کی جانب مطلق توجہ نہیں دی۔ اس نے جنگلے کے اندر گوشت کھاتے ہوئے ایک خونخوار بل ٹیریر کو للکارا۔ "بھیلے!" کتے نے گردن اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ سردار شاہانی نے بچے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بل ٹیریر کو شہ کارا۔ کتے نے غرا کر بچے کو خوف ناک نظروں سے دیکھا۔ بچے نے اسے غراتے دیکھا تو سہم کر پیچھے ہٹنے لگا۔

اس کی ماں اٹھ کر تیزی سے آگے بڑھی اور رحیم داد کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ ادھر جنگلے کے اندر بل ٹیریر زور سے بھونکا اور غراتا ہوا بچے پر جھپٹا۔ اس نے دانت نکال کر بچے کی گردن دبوچ لی۔ بچہ بلبلا کر زور سے چیخا۔ اس کی دل سوز چیخ سن کر ماں رحیم داد کے پیروں سے چمٹ کر پھڑکنے لگا اور رو رو کر فریادی ہوئی۔

"سئیں! میرے نکے کو بچا لے۔" وہ تڑپ کی چیخی۔ "سئیں! میری زاری سن لے' اسے بچا لے۔ رب راضی ہووے۔ تیرا لال جیوے' میرے نکے کو چھڑا لے۔"

اس کی آہ و زاری پر رحیم داد تڑپ اٹھا۔ بے قرار ہو کر اس نے مراد خاں کو مخاطب کیا۔

"شاہانی! اسے معافی دے دے۔"

"چوہدری! چپ کر کے بیٹھا رہ۔" مراد خاں نے اسے غصے سے جھڑک دیا۔ "اس معاملے میں نہ بول۔"

بچے کی ماں رحیم داد کے پیروں سے چمٹی گڑگڑاتی رہی۔ بچہ بار بار تلملا کر چیختا رہا۔ بل ٹیریر نے اسے فرش پر گرا دیا تھا اور دانت نکال کر اس کا بدن جھنجھوڑ رہا تھا۔ بچہ تکلیف سے بے چین ہو کر چیخا۔ "اماں!"

اس کی آواز کے ساتھ ہی ماں نے رحیم داد کے پیروں پر زور سے سر مارا اور مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔ وہ بار بار دہائی دیتی۔ "میں صدکے تھیواں' سئیں! میں کوں معافی دلا دے' سردار تیری سن لے گا۔"

وہ بلبلا کر چیخی۔ "بچا لے میرے بچے کو۔ سئیں بچا لے اسے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

عورت کی بے قراری دیکھ کر رحیم داد کا دل پسیج گیا۔ ماں کی ممتا اس کے قدموں پر تڑپ رہی تھی' گریہ وزاری کر رہی تھی۔ اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سردار مراد خاں شاہانی کی جانب دیکھا' اس کی طرف جھکا' ایک ہاتھ آگے بڑھایا' ٹھوڑی چھو کر عاجزی سے بولا۔

"سردار شاہانی! اسے معافی دے دے۔ میری خاطر معاف کر دے۔"

مراد شاہانی نے رحیم داد کی جانب مڑ کر دیکھا۔ اس کا چہرہ خونخوار نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ وہ چند لمحے رحیم داد کی جانب گھورتا رہا پھر اس نے مڑ کر اپنے بل ٹیریر پر نظر ڈالی۔

" بگھیلے! چھوڑ دے اسے۔"

کتے نے دھیان نہیں دیا' بدستور بچے کو جھنجھوڑتا رہا۔ سردار شاہانی نے اسے زور سے ڈانٹا۔ "ہٹ جا بگھیلے۔" کتا اس قدر سدھا ہوا تھا کہ ڈانٹ سنتے ہی اس نے بچے کو چھوڑ دیا۔ گردن اٹھا کر شاہانی کو دیکھا' اپنی جگہ واپس گیا اور گردن جھکا کر راتب کھانے لگا۔

شاہانی نے رمضے کو حکم دیا۔ "رمضے! اسے باہر نکال لے۔" اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ "چوہدری! میرا مہمان ہے اور مہمان کی بات ماننی ہی پڑتی ہے۔"

رمضا جنگلے کے اندر گیا اور بچے کو اٹھا کر باہر لے آیا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ بل ٹیریر کے دانتوں اور پنجوں کے کھرونچے تھے' خراشیں تھیں۔ ان سے خون رس رہا تھا۔ بچہ خوف اور دہشت

ے نیم جان ہو رہا تھا۔ بچے کے باہر آتے ہی ماں دیوانہ وار دوڑی' بچے کو اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ ں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

رحیم داد نے کہا۔ "اسے فوراً ڈاکٹر کے پاس لے جا یا اسپتال چلی جا۔"

عورت نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ اس کے دل میں رحیم داد کے لیے جو جذبہ عقیدت تھا' وہ پلکوں آنسوؤں کے قطرے بن کر جھلملا رہا تھا۔ وہ بچے کو اپنے بازوؤں میں دبوچے ہوئے چپ چاپ نسو بہاتی کچے اور بوسیدہ مکانات کی طرف چلی گئی۔ شاہانی گم صم بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ہنوز عونت طاری تھی۔

سردار مراد خاں شاہانی خاموش بیٹھا کتوں کو راتب کھاتے دیکھتا رہا۔ مگر زیادہ دیر نہیں ٹھیرا' اٹھ ر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ اٹھ گیا۔

رحیم داد اور سردار شاہانی ڈاگ ہاؤس سے باہر نکلے۔ خاموشی سے آگے بڑھے۔ حویلی کے صدر دروازے پر پہنچے۔ دروازہ خوب کشادہ ہونے کے ساتھ اس قدر اونچا بھی تھا کہ اونٹ کجاوے کے ساتھ اس کے نیچے سے بہ آسانی گزر سکتا تھا۔ حویلی کے دروازے پر بیٹھے ہوئے ملازم ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔

شاہانی نے ان پر توجہ نہیں دی' اندر چلا گیا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ تھا۔ دروازے کے سامنے کھلی جگہ تھی۔

یہ حویلی کا چوک تھا۔ چوک کے وسط میں طویل پختہ چبوترا تھا۔ گرمیوں میں اسے شہ نشین کے طور پر استعمال کیا جاتا۔ دن ڈھلتے ہی اس پر چھڑکاؤ کر دیا جاتا۔ کرسیاں ڈال دی جاتیں۔ بیچ میں سردار شاہانی کی کرسی ہوتی۔ وہ اس پر بیٹھ کر ملنے جلنے والوں اور سرکاری افسروں سے ملاقات کرتا تھا۔ کبھی کبھی کچہری بھی لگاتا۔ اس میں جاگیر کے معاملات طے کیے جاتے۔ یہیں جاگیر سے آنے والوں کی پیشی ہوتی۔ وہ اس کے روبرو فرش پر بیٹھتے۔ شاہانی ان کے بارے میں شکایات سنتا اور فیصلے صادر کرتا۔

چبوترے کے آخری کنارے سے کچھ ہی فاصلے پر پاکھر کا گھنا درخت تھا۔ اس کے نیچے باورچی خانہ تھا۔ قریب ہی پانی کھینچنے کا ہینڈ پمپ تھا۔ چبوترے کے دونوں طرف برآمدے جیسی طویل راہ داری تھی۔

راہداری کے عقب میں کمرے تھے۔ ان کے دروازے برآمدے میں کھلتے تھے۔ البتہ کمروں کی کھڑکیاں پچھواڑے گلی میں کھلتی تھیں۔ گلی حویلی ہی کا ایک حصہ تھی۔ اس کی دیواریں قد آدم

اونچی تھیں۔

چوک حویلی کا مردانہ حصہ تھا۔ اسی میں ڈیرہ تھا۔ باہر سے آنے والے مہمان ڈیرے کی دومنزلہ عمارت میں نیچے یا اوپر کی منزل کے کمروں میں ٹھہرتے تھے۔ مگر حویلی کا دیوان خانہ نیچے ہی تھا۔ اسے بیٹھک کہا جاتا تھا۔ یہ کشادہ ہال تھا۔ اس میں قیمتی قالین کا فرش تھا۔ بڑے بڑے دبیز صوفے تھے۔ کرسیاں اور میزیں تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے۔ ہال کے بیچوں بیچ چھت سے بلوریں جھاڑ لٹک رہا تھا۔ دیواروں پر شاہانی کے بزرگوں اور معروف بلوچ سرداروں کی بڑی بڑی روغنی تصویروں کے علاوہ پرانی وضع کی بندوقیں، قرابینیں’ ڈھالیں اور تلواریں سلیقے سے آویزاں تھیں۔ کمرے کی آرائش سے مراد خاں شاہانی کی جاگیردارانہ سطوت اور شان و شوکت جھلکتی تھی۔

مراد خاں بیٹھک میں داخل ہوا اور ایک صوفے پر تھکا ہوا سا چپ چاپ بیٹھ گیا۔ رحیم داد بھی قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

مراد خاں کے چہرے پر خلاف معمول سنجیدگی کی گہری چھاپ تھی۔ رحیم داد نے اسے اس طرح خاموش اور سنجیدہ پایا تو اسے شاہانی کی خفگی کا شدت سے احساس ہوا۔

رحیم داد نے سردار مراد خاں شاہانی کو منانے کی کوشش کی۔ ”تو ابھی تک مجھ سے ناراض معلوم ہوتا ہے۔“ اس کے لہجے میں نرمی اور معذرت کرنے کا انداز تھا۔

”سئیں! یہ گالہہ نہیں۔ تو ان کمیوں اور ہڈحراموں کو نہیں جانتا۔ ان کے ساتھ ذرا بھی نرمی یا رحم دلی دکھائی جائے تو یہ میرے کتوں کو بھوکا مار دیں۔ ان کا سارا راتب چرا کر کھا جائیں۔ بلکہ میری جگیر تک کھا جائیں۔“ شاہانی کا لہجہ رفتہ رفتہ تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ چہرے پر جھنجلاہٹ ابھر رہی تھی۔

”یہ سارے ہی بے ایمان اور حرام کے تخم ہیں۔ انھیں تو بے رحم اور سخت بن کر ہی قابو رکھا جاسکتا ہے۔ ہمارے وڈے اور جدی پشتی ان کے ساتھ ایسا سخت سلوک نہ کرتے تو یہ زمیں داری اور جگیر کب کی ختم ہوچکی ہوتی۔ اس علاکے میں زمیں داری چلانا مخول نہیں ہے۔ دل کی جگہ پتھر رکھنا پڑتا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ رحیم داد نے خوش نودی حاصل کرنے کے لیے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”پر یہ بھی تو ہوسکتا تھا تیرا کتا چھوہرے کو چیرپھاڑ کر ختم کردیتا۔ لگتا تو ایسا ہی تھا۔ تب کیا ہوتا؟؟“

”کچھ بھی نہ ہوتا۔“ شاہانی نے نہایت بے نیازی سے کہا۔ ”پہلے بھی کئی بار ایسا ہوچکا ہے۔ کچھ

ہیں۔ پہلے یہ کتوں کے راتب کا گوشت نہ صرف چرا کر کھا جاتے تھے بلکہ بازار میں بیچ بھی دیتے میں نے منع کیا’ ڈانٹا’ پٹائی بھی کی پر چوری کی عادت ختم نہیں ہوئی تب میں نے ڈاگ ہاؤس رہنے والے کوتیوں اور دوسرے ملازموں کے لیے گوشت کھانے پر سخت پابندی لگادی۔“

”پر ایسا تو نہیں کیا ہوگا کہ سزا ہی میں کتے چیر پھاڑ کر کھا جائیں۔“

ہیں نے کہا نا’ کئی بار ایسا بھی ہوا۔“ شاہانی نے بتایا۔ ”دو کوتیوں کو تو کتوں نے نہ صرف گرا دیا ن کا گوشت بھی نوچ نوچ کر کھا گئے۔ ان میں سے ایک نے تو میرا بہت اعلیٰ الیشن چوری کیا اور ہاڑی خاں کے ایک کھوسہ سردار کے پاس پہنچا دیا اور خود تھل کلاں کی ایک جھگی میں روپوش یا۔ پر میرے کرندے اور کامے تلاش کرکے اسے پکڑ ہی لائے۔ میں نے سویرے سویرے اسے ں کے سامنے ڈال دیا۔ وہ رات بھر کے بھوکے بھی تھے۔ ایسے جھپٹے کہ ذرا ہی دیر بعد بدن سے ت غائب تھا۔ صرف ہڈیوں کا پنجر پڑا تھا۔ دوسرے نے راتب چوری کیا تھا۔ اس کا بھی یہی نجام ہوا۔“

”تو سچ کہہ رہا ہے؟“ رحیم داد نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔ ”کسی نے تیرے خلاف تھانے میں چاک نہیں کرایا؟ صاف ۳۰۲ کیس بن سکتا تھا۔“

”سئیں چوہدری! تو کیسی گل کر رہا ہے۔“ شاہانی نے ناگواری سے گھور کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”تو ڈیرا ہے’ تجھے ادھر کا کچھ پتہ نہیں۔ کوئی میرے خلاف پرچہ چاک کرانے جاتا تو الٹا اس کے ف چوری کا مکدمہ بن جاتا۔ حوالات میں بند کرکے چھتر سے ایسی پٹائی ہوتی کہ چمڑی ادھڑ [illegible]“

اس نے گردن اونچی کی اور نہایت رعونت سے بولا۔ ”چوہدری! یہ ہماری جدی جگیر ہے۔ ہمیشہ ہماری عمل داری رہی ہے۔ انگریز کے راج میں بھی اور آج بھی۔ ادھری ہمارا ہی کنون ہے۔“

”اور پولیس کیا کرتی ہے؟“ رحیم داد بدستور حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔

”پلسے اور تھانے دار بھی ہمارے ہی بندے ہیں۔ ہماری مرضی کے بغیر کوئی بھی سرکاری افسر ہیں ٹھہر سکتا۔“

بے تکلفی سے ٹھٹھا مار کر پہلی بار ہنسا۔ ”سئیں’ تو ابھی اس علاکے کو ٹھیک سے نہیں سمجھ چھ روز اپنے ساتھ رہے گا تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ وہ سردار مراد خاں کی باتوں سے بہت مرعوب نظر آرہا تھا۔ مراد خاں زیادہ

دیر نہیں ٹھہرا۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "چوہدری! مجھے اب جانا ہے۔ تو روٹی کھالینا۔ مجھے بالکل بھوک نہیں۔"

مراد خاں آہستہ آہستہ زنان خانے کی جانب چلا گیا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔

۲۹

شام ہو گئی۔ ایک دن اور ختم ہوا۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ فضا دھواں دھواں ہو گئی۔ سردار مراد خاں شاہانی اور رحیم داد پھر مل بیٹھے۔ شراب کا دور چلا۔ شاہانی نے شیواز ریگل کی بوتل منگوائی تھی۔ قیمتی اور عمدہ اسکاچ وہسکی تھی۔ اس کے ساتھ ویسا ہی اہتمام بھی کیا تھا۔ پانی کی بجائے میز پر سوڈے کی بوتلیں تھیں۔ تلے ہوئے مرغ مسلم تھے۔ تکے اور کباب تھے۔

مراد خاں نے وہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! کل شام میل ہے۔ حویلی کے چوک میں محفل جمے گی۔ ساوی کا دور چلے گا۔ ناچ گانا ہو گا۔ راگ رنگ ہو گا۔ کچھ اور مہمانوں کو بھی بلایا ہے۔ اچھا زوردار میل ہو گا۔"

"کون کون آرہا ہے۔" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"یہ تو کل ہی تجھے پتہ چلے گا۔" مراد خان شاہانی نے ہنس کر بتایا۔ "رات بھر جشن رہے گا۔ سب سے تیری جان پہچان ہو جائے گی۔ ویسے سارے ہی اپنے بے تکلف یار ہوں گے۔" اس نے مسکرا کر آنکھ ماری۔ "لہور سے بھی میں نے ایک کنجری بلائی ہے۔ ایسی پوبٹ اور پھڑک دار ہے کہ بدن میں جیسے بجلی بھری ہو۔ مجرا تو اس کا ایسا زوردار ہوتا ہے کہ محفل میں آگ لگا دیتی ہے۔ اپنی پرانی یاری ہے اس سے۔"

رحیم داد نے پوچھا۔ "تیری رکھیل ہے؟"

"نہیں۔" شاہانی نے صاف گوئی سے بتایا۔ "پر جب بھی لہور جاتا ہوں' گانا سننے کے لیے اس کے کوٹھے کا ضرور چکر لگاتا ہوں۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "سچ پوچھ تو کبھی کبھی

صرف اس کے مجرے کی خاطر لہور جاتا ہوں۔ اس میں بات ہی کچھ ایسی ہے۔ تجھ سے زیادہ کیا بتاؤں۔ کل خود دیکھ لینا۔"

رحیم داد طوائف کا نام پوچھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ حویلی کے زنان خانے سے نسوانی چیخیں ابھریں۔ کوئی عورت پاگلوں کی مانند زور زور سے چیخ چلا رہی تھی' آہ وزاری کر رہی تھی۔ چیخوں کے ابھرنے کے ساتھ ہی مراد خاں شاہانی کی آنکھوں میں ڈولتا ہوا نشے کا تلاطم غائب ہوگیا۔ دمکتا ہوا چہرہ بجھ گیا۔ اس پر رفتہ رفتہ پریشانی چھانے لگی۔

رحیم داد نے نہ تو پراسرار چیخوں کے بارے میں پوچھا نہ شاہانی سے پریشانی کا سبب معلوم کیا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ شاہانی بھی گم صم تھا۔ اس کی آنکھوں سے بے چینی جھلک رہی تھی۔ وہ اس عالم میں زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ گلاس میز پر رکھا' گھبرایا ہوا اٹھا' کمرے سے نکلا' دہلیز پر ٹھٹک کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ الجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ "چوہدری! میں تھوڑی دیر بعد آتا ہوں۔" اس نے رحیم داد کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا۔ تیزی سے قدم اٹھاتا راہ داری میں داخل ہوا اور اس سے گزر کر زنان خانے کی جانب چلا گیا۔

☆

زنان خانہ دیرے سے ملحق ہی تھا مگر بیچ میں کشادہ گلی تھی۔ زنان خانے کے گرد اونچی چاردیواری تھی۔ چاردیواری کے پیچھے وسیع صحن تھا۔ اس میں تین طرف کمرے تھے' دالان تھے۔ صحن چیاں اور کوٹھریاں تھیں۔ کمروں میں شاہانی کی بیوی کے علاوہ بیوہ ماں اور بہنیں رہتی تھیں۔ کوٹھریاں خادماؤں اور باندیوں کے رہنے کے لیے تھیں اور صحن کے ایک گوشے میں کمروں اور صحن چیوں سے ذرا ہٹ کر الگ تھلگ تھیں۔ یہ ساری تفصیلات حویلی کا ماشیا باتوں باتوں میں رحیم داد کو بتا چکا تھا۔ وہ حویلی کا پرانا ملازم تھا۔ اس کا بچپن حویلی ہی میں گزار تھا۔ اب وہ پورا جوان ہوچکا تھا۔ سخت باتونی بھی تھا۔ مالش کرنے کے ساتھ ساتھ مسلسل بولتا رہتا تھا۔

رحیم داد وہسکی کی چسکی لگاتا رہا اور شاہانی کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ زنان خانے سے رک رک کر چیخیں ابھرتی رہیں۔ کبھی دھیمی پڑجاتیں' کبھی تیز ہوجاتیں۔ اب رات گہری ہوکر کاجل ہوچکی تھی۔ زنان خانے سے بلند ہوتی ہوئی چیخیں بڑی پراسرار معلوم ہورہی تھیں۔

پہر رات گزر گئی مگر شاہانی واپس نہیں آیا۔ رحیم داد تنہائی سے اکتا گیا۔ اٹھا اور باہر چوک میں چلا گیا۔ نوکر چاکر معمول کے مطابق ادھر ادھر آجا رہے تھے' باتیں کررہے تھے۔ رحیم داد نے غور کیا' نہ وہ پریشان تھے نہ گھبرائے ہوئے۔ حالانکہ زنان خانے کی طرف سے چیخیں بار بار ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد واپس ہوا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ملازم کھانا لے کر آیا۔ اس کے چہرے سے بھی کوئی تشویش ظاہر نہ ہوتی تھی۔ اس نے نہایت اطمینان سے میز پر کھانا لگا دیا۔

رحیم داد اس سے ان پراسرار چیخوں کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا مگر جرات نہ ہوئی۔ ملازم چلا گیا۔ رحیم داد خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

چیخیں اب بند ہوچکی تھیں۔ رحیم داد بھی کھانے سے فارغ ہوچکا تھا۔ نوکر برتن اٹھا کر لے گیا مگر مراد خاں شاہانی نہ آیا۔

رحیم داد خاموش بیٹھا نسوانی چیخوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ حیرت زدہ بھی تھا اور کسی قدر پریشان بھی۔ رات کالی ہوکر گونگی ہوگئی۔

رحیم داد کے قیاس کے مطابق گیارہ بجنے والے تھے۔ رات سرد اور کہر آلود تھی۔ سناٹا گہرا ہوگیا تھا۔ ناگاہ گہرے سناٹے میں گیرج سے جیپ نکلنے اور انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز ابھری۔ ساتھ ہی زنان خانے میں گانے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ان کے لہجے سے رحیم دا نے اندازہ لگایا کہ وہ حویلی کی مراثنیں اور خادمائیں ہیں۔ وہ دھیمے سروں میں گا رہی تھیں۔

تیری ڈاچی دے ٹلیاں
میں پیر مناون چلیاں
ڈاچی والیاں موڑ مہاراں

گیت کے بولوں سے صاف عیاں تھا کہ وہ کسی پیر کی زیارت یا خانقاہ کی جانب جا رہی ہیں۔ مگر اونٹ یا ڈاچی کے کجاووں میں بیٹھنے کے بجائے وہ جیپ میں سوار ہوکر سفر کررہی تھیں۔ جیپ آگے بڑھ گئی۔ گیت کے بول دھیمے ہوکر رات کی خاموشی میں تحلیل ہوگئے۔

رحیم داد بستر پر لیٹ گیا اور مراد خاں شاہانی کا انتظار کرتے کرتے سو گیا۔

دوسرے روز دوپہر کو شاہانی آیا۔ لیکن رات کے واقعے کے بارے میں نہ اس نے کوئی تذکرہ کیا نہ رحیم داد پوچھ سکا۔ شاہانی نے اس سلسلے میں بات کرنے کا موقع بھی نہ دیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی گویا ہوا۔

"سن چوہدری! رات کو میل ہے۔ تجھے یاد ہے نا؟"

"یاد ہے' بالکل یاد ہے۔" رحیم داد نے بلند آواز سے کہا۔ "پر تو کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔"

"نہیں' میں نے بیٹھنا نہیں ہے۔" اس نے کلائی اٹھا کر گھڑی دیکھی۔ "مجھے فوراً سٹیشن جانا

ہے۔ شام کو تجھ سے ملوں گا۔" شاہانی مڑا اور باہر چلا گیا۔

☆

شام در و دیوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ حویلی کے چوک میں خوب گہما گہمی تھی۔ باورچی خانے کے سامنے مرغیاں کٹ رہی تھیں۔ پاکھر کے پیڑ تلے ایک تنومند آدمی بہت بڑے کونڈے میں بھنگ گھوٹ رہا تھا۔ اس کا بھن گھنا شیشم کی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ وزنی بھی تھا۔ اس میں ریشم کے دھاگوں کے رنگ برنگے پھندنے اور گھنگرو بندھے تھے۔ گھنگرو چھنا چھن بج رہے تھے۔ ان کی چھنا کے کے ساتھ وہ جھوم جھوم کر گنگنا رہا تھا۔

سوہنا لال دے پکاراں دھمی دیاں
ڈے خوشیاں غم ٹال دے پکاراں دھمی دیاں

بھنگ گھوٹنے والا بھنگیرا، مظفر گڑھیا تھا۔ مظفر گڑھ ہی میں لال عیسن کی درگاہ ہے اس کی زیارت کے لیے مظفر گڑھ کے علاوہ ملتان، جھنگ، میاں والی اور دوسرے اضلاع سے ہر سال ہزاروں عقیدت مند آتے ہیں۔ بھادوں کی چودہ تاریخ کو مزار پر بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ میلے میں شرکت کے لیے دور دور سے زائرین آتے ہیں۔ چیت کی ہر جمعرات کو بھی صبح سے عقیدت مندوں کے قافلے پہنچنا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ میلوں کا طویل سفر پیدل طے کرتے ہیں۔ رات بھر درگاہ پر جاگتے رہتے ہیں۔ پورے تھل کے علاقے میں لال عیسن کے مزار کی زبردست دھوم ہے۔ یہاں آسیب زدہ عورتوں کا علاج معالجہ ہوتا ہے۔ بھوت پریت اور جن اتارے جاتے ہیں۔ زائرین اور عقیدت مند چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ منتیں مانتے ہیں۔ لہک لہک کر یہی گیت گاتے ہیں جو حویلی کا بھنگیرا اس وقت گنگنا رہا تھا۔

رحیم داد نے غسل کیا، اجلا لباس پہنا اور بن سنور کر کمرے سے باہر نکلا۔ سامنے بیٹھک تھی۔ بیٹھک سے باتوں اور قہقہوں کی ملی جلی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ اسی طرف چلا گیا۔ اندر داخل ہوا تو سردار مراد خاں شاہانی وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس کے ساتھ مہمان بھی بیٹھے تھے۔ رحیم داد نے انھیں پہلی بار دیکھا تھا۔ ان میں محکمہ نہر کا ایک انجینئر تھا۔ بھکر کا تحصیل دار تھا۔ بیٹ کے علاقے کا جاگیردار، سردار عبد الرحمان خاں نوانی تھا۔ تھانے دار عطا محمد تھا۔ کندیاں کا میاں شاہ علی تھا۔ بھکر آتے ہوئے رحیم داد اس سے مل چکا تھا۔ اس کے پاس شاہانی کے ہم راہ ایک روز ٹھہرا بھی تھا۔

میاں شاہ علی کے علاوہ ملک نیاز محمد خاں اعوان تھا۔ اس کا تعلق کالا باغ کے نواب زادگان سے

نہ راجن پور کا سردار سطوت خاں مزاری تھا۔ مظفر گڑھ کا علی نواز گورمانی اور لیہ کا عمر دراز خاں جکانی بھی تھا۔ سارے ہی مہمان سردار مراد خاں شاہانی کے بے تکلف دوست تھے اور ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

رحیم داد کو دیکھتے ہی شاہانی نے ہنستے ہوئے نعرہ بلند کیا۔ "سئیں چوہدری، تو کدھر تھا؟" اس نے کمرے میں بیٹھے ہوئے مہمانوں پر ایک نظر ڈالی۔

ہو جی، اپنا چوہدری نور الٰہی بھی آگیا۔"

تمام نگاہیں رحیم داد کی جانب اٹھ گئیں۔ مراد خاں شاہانی نے مسکرا مسکرا کر سب سے اس کا تعارف کرایا۔ سرکاری افسروں کو چھوڑ کر سب ہی جاگیردار اور بڑے زمیں دار تھے۔ شاہانی نے اسے اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔ رحیم داد اجنبیت محسوس کر رہا تھا۔ وہ خاموش اور کسی قدر گھبرایا ہوا تھا۔

کمرے میں بھنگ کے ساتھ ساتھ وہسکی کا دور بھی چل رہا تھا۔ حویلی کے دو ملازم اجلے لباس پہنے، سروں پر کلف دار پگڑیاں باندھے، ٹرے میں وہسکی کی بوتل، گلاس اور سوڈے کی بوتلیں اور پانی سے بھرے ہوئے جگ رکھے صدر دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑے تھے۔ صوفوں کے آگے چھوٹی چھوٹی میزیں تھیں۔ ان پر مہمانوں کے گلاس رکھے تھے۔ کسی کا گلاس خالی ہوتا، ملازم فوراً قریب پہنچتا، خالی گلاس اٹھا کر ٹرے میں رکھتا اور وہسکی کا گلاس جھک کر میز پر رکھ دیتا۔ مہمان کی مرضی کے مطابق جگ سے سوڈا یا پانی گلاس میں ڈال دیتا۔

کچھ ایسے دھاکڑ پینے والے بھی تھے جنھوں نے تکلفات سے بے نیاز ہو کر وہسکی کی بوتل اور پانی سے بھرے ہوئے جگ سامنے میز پر رکھ لیے تھے۔ خود ہی بوتل سے وہسکی انڈیلتے اور پانی یا سوڈا ملا کر پیگ بناتے اور غٹا غٹ چڑھاتے یا آہستہ آہستہ چسکی لگاتے۔

مراد خان شاہانی کے سامنے خاصی لمبی میز تھی۔ اس پر وہسکی کی بوتل نہیں تھی۔ بھنگ سے بھرا بڑا سا شیشے کا قرابہ رکھا تھا۔ شاہانی کے ساتھ کچھ دوسرے بھی نہایت ذوق شوق سے بھنگ پی رہے تھے۔

شاہانی نے رحیم داد کے لیے گلاس منگوایا اس میں دودھ کی مانند سفید سفید بھنگ انڈیل کر بولا۔ "چوہدری! تو نے ساوی پہلے بھی پی ہے۔ آج اپنی حویلی کی پی کر دیکھ، اسے پینے کو تو دور دور سے لوگ آتے ہیں۔"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے بھنگ سے بھرا ہوا گلاس اٹھایا، ہونٹوں سے لگایا اور ہلکا سا گھونٹ

بھرا۔ بھنگ خوش ذائقہ تھی۔ اس میں بادام، پستے، خشخاش اور چاروں مغز گھٹے ہوئے تھے۔ بڑا خاصی گاڑھی تھی اور اس میں زعفران کی ہلکی ہلکی مہک بھی تھی۔ رحیم داد نے بھنگ کے چند گھونٹ بھر کر گلاس میز پر رکھ دیا۔

شاہانی نے داد طلب نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”چوہدری! کیسی ہے ساوی؟ سچ سچ بتا۔“

”مزا آگیا جی۔ بہت زوردار ساوی ہے۔“ رحیم داد نے مونچھوں اور ڈاڑھی کے بھیگے ہوئے بال ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے پسندیدگی کا اظہار کیا۔

مراد خاں شاہانی اس کے جواب پر بہت خوش ہوا۔ ہنس ہنس کر بتانے لگا کہ بھنگ کے ساتھ کیا کیا ملا کر گھوٹا جاتا ہے۔ جو ملنگ گھٹائی کرتا ہے اسے مظفر گڑھ سے خاص طور پر بلوا کر ملازم رکھا گیا ہے۔ وہ بھنگ گھوٹنے کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ اس کا ذکر کرتے کرتے شاہانی نے زور کا قہقہہ لگایا اور اونچی اواز سے بولا۔

”وہ ساوی گھوٹتا ہے، ساوی پیتا ہے اور پی کر سوتا رہتا ہے۔ اس بندے کو اور کوئی کام نہیں۔“

وہسکی اور بھنگ کا دور چلتا رہا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ قہقہے بلند ہوتے رہے۔ رات تاریک ہوگئی۔ اس عرصے میں کچھ اور مہمان بھی محفل میں شریک ہوگئے۔ پہر رات گزرنے کے بعد سب نے کھانا کھایا۔ کھانے میں خاص اہتمام اور تکلف کیا گیا تھا۔ کھانا مرغن اور خوش ذائقہ تھا۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہی مراد خاں شاہانی مہمانوں کے ہم راہ چوک میں پہنچا۔ پختہ چبوترے پر شام ہی سے شامیانہ لگا کر قناتیں کھڑی کردی گئی تھیں۔ پختہ زمین پر اجلی چاندنی کا فرش تھا۔ اس کے ایک حصے پر قالین بچھا کر گاؤ تکیے لگا دیئے گئے تھے۔ نوکروں نے حقے تازہ کرکے مہمانوں کے لیے رکھ دیئے۔ حقوں کے علاوہ چاندی کی منقش طشتریوں میں ماچس اور سگریٹیں تھیں اور ایش ٹرے بھی تھے۔

سردار مراد خاں اور مہمانوں کے بیٹھنے کے کچھ ہی دیر بعد بیس بائیس بلوچوں کا طائفہ قناتوں کے عقب سے نکل کر سامنے آیا۔ ان کے قد اونچے تھے۔ جسم مضبوط اور سڈول تھے۔ چہروں پر گھنی ڈاڑھیاں تھیں۔ سروں پر گردن اور کانوں تک لٹکے ہوئے لمبے لمبے پٹے تھے۔ وہ ململ کے لمبے چغے پہنے ہوئے تھے۔ کمر کے گرد دو پلوؤں والی چادریں لپیٹے ہوئے تھے۔ ان کی شلواریں خوب گھیر دار تھیں۔ وہ نیم دائرے میں آکر کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے جھک کر مہمانوں کو سلام کیا۔

مراد خاں شاہانی نے رقص شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ اشارہ ملتے ہی ایک بلوچ گلے میں ڈھول ڈالے ہوئے آگے بڑھ کر بیچ میں آگیا۔ وہ ڈھولی تھا۔ دوسرے اس کے گرد دائرے میں کھڑے

ہوگئے۔ ڈھول پر چوٹ پڑی اور ناچ شروع ہوگیا۔ ناچنے والے ڈھولی کے گرد کچھ دیر دائرے میں رقص کرتے رہے۔ ان کے ہاتھ اور پیر نہایت متوازن انداز میں لہراتے رہے، حرکت کرتے رہے۔ رقص کرتے کرتے ایک ناچنے والے نے کان پر ہاتھ رکھ کر تان لگائی۔ اس کی آواز سریلی اور پاٹ دار تھی۔ ڈھول پر زور سے چوٹ پڑی۔ اس نے جھمر کا سرائیکی گیت چھیڑا۔

انہاں سوہنیاں کوں دل ڈے بیٹھڑے!
دل دے کے ہجاں ارماں تھینڈے!!

گیت کے بول رفتہ رفتہ اونچے ہوتے گئے۔ رقص کرنے والے لہک لہک کر کورس میں گاتے رہے۔ ”ان حسینوں کو ہم بھولے بھالے لوگ دل دے بیٹھے۔ مگر دل دے کے اب پچھتانا پڑتا ہے۔“ گیت کے بول جتنے اونچے ہوتے گئے، ڈھول پر اتنی ہی تیزی سے چوٹ پڑتی رہی۔ گانے کے ساتھ ساتھ ناچ کی رفتار بھی تیز ہوتی گئی۔ رقص کرنے والوں کے ہاتھ اور پیر بھی گردش کرتے رہے۔ وہ ڈھولی کے گرد دائرے میں گھوم گھوم کر رقص کی رفتار تیز کرتے رہے۔

رحیم داد نہایت محویت سے رقص دیکھ رہا تھا۔ اس کے خون کی گردش تیز ہوگئی تھی۔ سر، ناچ کی تیزی کے ساتھ ساتھ ہولے ہولے جھوم رہا تھا۔ مراد خاں شاہانی اس کے برابر ہی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے مسند پر بیٹھا تھا۔ ناچ دیکھتے دیکھتے اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا اور جھک کر آہستہ سے کہا۔

”چوہدری! اصلی جھمر تو یہ ہے۔ یہ اپنے علاقے کے بلوچوں کا خاص جھمر ہے۔ کیسا ہے؟“

”زوردار ہے جی، بہت زوردار ہے۔“ رحیم داد نے بے ساختہ داد دی۔

ناچ تیز ہوتا گیا۔ گیت کے بول اونچے ہوتے گئے۔ ڈھولی جھوم جھوم کر ڈھول پر چوٹ لگانے لگا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے چلتا رہا۔ ڈھول کی تھاپ میں تیزی سے رقص میں بھی تیزی اور گرمی پیدا ہوگئی۔ ناچنے والوں کے سروں کے لمبے لمبے بال لہرا رہے تھے، گردش کر رہے تھے۔ رقص اس قدر تیز ہوگیا کہ دائرے میں ناچنے والے بلوچ بگولے کی مانند نظر آنے لگے۔

رقص اپنے عروج پر پہنچ کر ختم ہوگیا۔ ہر طرف سے ”شاباش، واہ وا“ کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ رقص مہمانوں کو بہت پسند آیا اور انھوں نے دل کھول کر داد بھی دی۔ رات اب خاصی گہری ہو چکی تھی۔ مگر ناچنے والے پسینے پسینے ہو رہے تھے۔ وہ ذرا دیر خاموش کھڑے رہے پھر اپنی پیشانیوں سے پسینہ پونچھتے ہوئے رخصت ہوگئے۔ رخصت ہونے سے پہلے سردار شاہانی نے اشارے سے ڈھول بجانے والے کو قریب بلوایا۔ جیب سے سو سو کے دو نوٹ نکالے اور ڈھولی کو

کر اونچی تان لگاتا اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے سامعین کے جذبات میں ہلچل پیدا کر دیتا۔

اس نے ایک مزاحیہ مقبول گیت "منڈی گھوڑی" بھی خوب لہک لہک کر گایا۔ یہ حکایت کے از میں ایک لنگڑی گھوڑی کی ہجو تھی۔ اسے گیت کے بولوں میں اس طرح بیان کیا گیا تھا کہ پیر ی نامی ایک رئیس نے خوش ہو کر شاعر کو ایک گھوڑی بطور انعام عطا کی۔ مگر وہ ذرا لنگڑی تھی۔ اعر نے گھوڑی تو قبول کر لی لیکن قصیدہ گوئی کے طرز پر ایک تند اور تیکھی ہجو لکھی۔

اس مزاحیہ گیت نے محفل زعفران زار بنا دی۔ سامعین ہنستے تھے، قہقہے لگاتے تھے۔ گیت کے ض بند بار بار گانے کی فرمائش کرتے تھے۔ گانے والے کو انعام بھی ملا۔

گویا گیا تو محفل کا جمود اور پھیکا پن دور ہو چکا تھا۔ بے تکلفی اور غیر سنجیدگی کا رنگ غالب آچکا اسی عالم کیف و سرور میں ایک نئی طوائف آئی۔ وہ شوخ اور طرح دار تھی۔ رنگ کھلتا ہوا چہرے کے خدوخال بھی سبک تھے۔ جسم چنبیلی کی شاخ کی مانند لچکتا تھا۔ اس کے پیروں میں ر بندے تھے۔ جیسے ہی وہ آئی، گھنگرو کا چھناکا ہوا۔ اسے مراد خاں شاہانی نے اپنے کاردار کریم رادھانی کے ذریعہ لاہور کی ہیرامنڈی سے بلوایا تھا۔ وہ ابھی نوخیز تھی۔ بیس سال سے زیادہ عمر ی۔ اس کا نام شہناز تھا۔ نائکہ بھی لاہور سے ساتھ آئی تھی۔ وہ منجھی ہوئی گھاگ طوائف آگرے کی رہنے والی تھی۔ شہناز اس کی نوچی تھی۔ اس نے شہناز کو رقص و موسیقی کی تعلیم استادوں سے دلوائی تھی۔ وہ اسے بڑی گلوکارہ بنانا چاہتی تھی۔ اس کے مستقبل کا سہارا بھی آگرے میں کاروبار نہ جما تو وہ شہناز کو بمبئی لے گئی اور یہ کوشش کرتی رہی کہ اسے فلموں ام کرنے کا موقع مل جائے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ پاکستان بنا تو مہاجر بن کر لاہور پہنچ گئی۔ ہیرا امیں اسے ٹھکانہ بھی مل گیا تھا۔ یہیں شہناز سے مراد خاں شاہانی کے مراسم پیدا ہوئے۔ وہ کے پاس آنے جانے لگا۔ اس نے شہناز کو آج کی تقریب کے لیے خاص طور پر بلوایا تھا۔

ئکہ کو محفل کے رنگ ڈھنگ کا پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کے اشارے پر شہناز نے رقص اتھ ایک تند و تیز عامیانہ گیت بھی چھیڑا۔

بچھی تیریاں گول پنیاں!

ل کی گائیکی بھی اچھی تھی۔ رقص و موسیقی کے امتزاج نے محفل کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ گیت یجان انگیز بولوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ شہناز پر نوٹوں کی بارش ہونے لگی۔ ہر سمت واہ واہ کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ حوصلہ افزائی ہوئی تو اس نے اور جذبے سے اپنے فن کا کیا۔

دیدیے۔ اس نے ادب سے جھک کر نوٹ لیے، اونچی آواز سے دعائیں دیں۔

"سئیں سردار، نی امان اللہ۔ بالیں بچیں، یاریں دوستیں، سب کوں خیر سلا ہووے۔"

ڈھولی الٹے قدموں واپس چلا گیا۔

رقص کے کچھ دیر بعد ایک نوجوان طوائف اپنے سازندوں کے ساتھ آئی۔ سازندوں نے ساز چھیڑے۔ طوائف نے دوھڑا گایا۔ مگر چلا نہیں۔ خواجہ غلام فرید کی کافیاں بھی نہیں چلیں۔ محفل کا رنگ پھیکا دیکھ کر اس نے سمیں چھیڑی۔ سمیں سے محفل کا رنگ کچھ بدلا مگر جلد ہی پھیکا اور سونا پڑ گیا۔ حالانکہ سمیں تھل کے علاقے کا بے حد مقبول عوامی گانا ہے۔ سمیں گیتوں میں عام طور پر یاس و حرماں کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اور شاید اس لیے ہوتا ہے کہ اس کے پس منظر میں ایک المیہ داستان کارفرما ہے۔

اس داستان کی نوعیت کچھ اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ کسی زمانے میں تونسہ میں ایک بیوہ موچن رہتی تھی۔ اس کا کوئی والی وارث نہ تھا۔ صرف ایک بیٹی تھی۔ اس کا نام سمیں تھا۔ وہ بہت حسین اور دل ربا تھی۔ ماں کی زندگی کا سہارا اور آنکھوں کا تارا تھی۔ سمیں جوان ہوئی تو اس کے حسن اور رعنائی کا ہر طرف شہرہ ہوا۔ شیرل نامی ایک نوجوان ایسا فریفتہ ہوا کہ اسے اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ کبھی واپس نہیں آیا۔ سمیں بھی نہیں لوٹی۔ اس کی بیوہ اور لاوارث ماں جب تک زندہ رہی بیٹی کی جدائی میں تڑپتی رہی اور ایسے حزنیہ گیت گاتی رہی۔

آ سمیں اساں آڈ چلوں

تھل لہوں وچ چھک

سارا ساتھ سولڑا

میں پردیسن ہک

طوائف خوش شکل تھی۔ خوش گلو بھی تھی مگر محفل کے مزاج کا صحیح اندازہ نہ لگا سکی۔ اس کا رنگ جما نہیں۔ وہ گئی تو دوسری طوائف آئی۔ وہ بھی نہ چل سکی، محفل میں ہلچل اور گرمی پیدا نہ کر سکی۔ صورت شکل واجبی تھی۔ آواز البتہ خوب صورت اور رسیلی تھی مگر ہٹس تھی۔ ناز و ادا میں شوخی اور لگاوٹ نہ تھی۔ محفل کا مطالبہ کچھ اور ہی تھا۔ وہ بھی اس کیفیت کو سمجھ نہ سکی۔

وہ محفل سے رخصت ہوئی تو ایک گویا آیا۔ اس نے ماہیا چھیڑا جس میں بعض مقامات ایسے آئے جن میں شوخی کے ساتھ ساتھ عریانی کا پہلو نمایاں تھا۔ گانے والے کی آواز میں شیرینی اور جلادت بھی تھی۔ اس نے سونی محفل میں کسی قدر گرمی اور حرارت پیدا کی۔ وہ ماہیا کے ہر ٹپے کے آغاز

گیت ختم ہوگیا مگر وہ بیٹھی نہیں۔ اس نے ایک دادرا شروع کردیا۔ نائیکہ چونکی۔ چاہا کہ شہناز کو باز رکھے مگر وہ گاتی رہی۔ ایک ایک بول ایسے ناز و ادا سے ادا کیا کہ محفل کی گرمی بڑھ گئی۔ وہ رقص کرتی رہی اور لہک لہک کر دادرے کے بول ادا کرتی رہی۔ جسم کو گردش دے کر، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ دادرے کے بول اٹھاتی۔

اندھیریا ہے رات سجن رہیو کہ جیئو!
پلنگ لچک دار سجن رہیو کہ جیئو!!

دادرے کے بول ٹھیٹ پوربی تھے۔ مگر ہندوستانی فلموں کی مقبولیت کی بدولت محفل کے سامعین کے لیے زیادہ نامانوس نہیں تھے۔ وہ جسم کے پیچ و خم، ہاتھوں کی گردش اور آنکھوں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ بول اس طرح پیش کرتی کہ وہ گیت کے پیکر سے نکل کر شہناز کا روپ اختیار کرلیتے۔ طبلچی بھی آگرے کا تھا اور شہناز اور اس کی ماں کے ساتھ ہجرت کرکے پاکستان آیا تھا۔ وہ ہر بول پر جھوم جھوم کر طبلے پر تھاپ دیتا، ٹھیکا لگاتا، گانے میں شدت اور حرارت بڑھاتا۔

اس نے ایسا سماں باندھا، محفل کو اس طرح زیر و زبر کیا کہ مراد خاں شاہانی نے لہرا کر اپنے کاردار رادھانی کو شراب لانے کا اشارہ کیا۔ آن کی آن میں بوتلیں کھلنے لگیں۔ جام گردش میں آئے اور مے نوشی کا ازسرنو دور شروع ہوگیا۔

نائیکہ، سازندوں کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ سامنے پاندان رکھا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر پان بناتی اور گلوری منہ میں رکھتی۔ اگالدان بھی پاس ہی فرش پر رکھا تھا۔ اسے اٹھاتی اور بار بار پیک تھوکتی۔ اس کی خرانٹ اور تیکھی نظریں محفل میں بیٹھے ہوئے ایک ایک فرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دادرے نے رنگ جمایا تو اس کا اعتماد بحال ہوا۔ سازندوں کو اشارہ کیا، سارنگی نواز بھی پرانا اور جہاں دیدہ تھا۔ اور طبلچی کی طرح آگرے سے بائی جی کے ساتھ آیا تھا۔ نائیکہ نے جھک کر سارنگی نواز کے کان میں سرگوشی کی۔ دادرا ختم ہوتے ہی سارنگی نواز نے ٹھمری کی ایک دھن چھیڑی۔ ٹھمری بھی اچھی چلی۔

رات گزرتی رہی، بھیگتی رہی، سرد ہوتی گئی۔ محفل میں وہسکی کا دور چلتا رہا۔ شہناز نے محفل کے رنگ کی مناسبت سے اور سامعین کی فرمائش پر ایسے مقبول فلمی گیت گانے شروع کردیئے جو تیکھے اور ہیجان انگیز تھے۔ وہ گاتی رہی، ناچتی رہی۔ محفل کی شوریدگی بڑھتی گئی۔ بار بار قہقہے بلند ہوتے۔ طوائف سے چھیڑ چھاڑ ہوتی۔ بازاری اور عامیانہ فقرے چست کیے جاتے۔ نشے میں ڈوبی ہوئی صدائیں بلند ہوتیں۔

بھلے، بھلے!
ہائے! میں صدکے ونجاں

رات ڈھلنے لگی۔ شہناز نوعمر اور صحت مند طوائف تھی۔ آواز کے ساتھ بدن میں بھی جان تھی مگر جس تیزی سے وہ رقص کر رہی تھی اور ایک کے بعد دوسرا گیت چھیڑ رہی تھی، اس عمل نے اس کے چہکتے بولتے جسم میں تھکن پیدا کردی۔ وہ نڈھال نظر آرہی تھی۔ کئی بار اس نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ لیکن اسے اصرار کرکے روک لیا جاتا اور ہر بار نئی فرمائش ہوتی۔ نوٹوں کی ہر طرف سے ایسی بارش ہو رہی تھی کہ تھکنے کے باوجود اس کا حوصلہ پست نہیں ہوا۔ وہ ہر بار نئے جوش اور جذبے سے نئے گانے کے بول چھیڑتی۔ البتہ اس نے رقص بند کردیا تھا۔ مگر بول ادا کرتے وقت بھاؤ اس طرح بتاتی کہ محفل کی ہل چل اور گرمی کم ہونے کے بجائے سوا ہوگئی۔

بوتلوں پر بوتلیں کھلتی رہیں، خالی ہوتی گئیں۔ سردار مراد خاں شاہانی اور اس کے مہمان غٹاغٹ پیتے رہے۔ گلاس پر گلاس چڑھاتے رہے۔ نشے سے مدہوش ہوتے گئے۔ ان میں رحیم داد بھی شامل تھا۔ بھنگ کا نشہ ہی کیا کم تھا۔ وہسکی کے چند پیگ لگائے تو نگاہیں بھٹکنے لگیں، زبان لڑکھڑانے لگی۔ مگر محفل میں رقص و سرود نے ایسی فضا پیدا کردی تھی کہ وہ بھی مبہوت ہوگیا۔ گلاس پر گلاس خالی کرتا گیا۔ بہت دیر بعد جب طوائف کا پیکر اسے دھندلا دھندلا نظر آنے لگا اور اس کے ساتھ ہر شے گردش کرتی، جھومتی اور لہراتی محسوس ہونے لگی تو وہ چونکا۔ اس نے گلاس ایک طرف رکھ دیا اور گاؤ تکیے کے سہارے بے تکلفی سے پھیل کر بیٹھ گیا۔

رات اور ڈھل گئی۔ اب تکلفات کے پردے اٹھ چکے تھے۔ ہر شخص اپنے انداز سے بیٹھا تھا۔ پینے والوں کا یہ عالم تھا کہ جس طرح جس کا جی چاہتا، پیتا تھا، بہک جاتا تھا۔ پھر پینا شروع کردیتا۔ محفل میں رفتہ رفتہ بے ترتیبی اور افراتفری پیدا ہونے لگی۔ میاں شاہ علی پیتے پیتے مدہوش ہوکر سوگیا اور زور زور سے خراٹے لینے لگا۔ کچھ اور مہمان بھی سو رہے تھے یا اونگھ رہے تھے۔

عبدالرحمان خان نوانی جھومتے جھومتے ایک طرف لڑھک گیا۔ وہ پھر نہیں اٹھا۔ سردار سطوت خاں مزاری اور علی نواز گورمانی ایک دوسرے کے گلوں میں بانہیں ڈالے لہرا رہے تھے۔ وہ گیت کے کسی بول یا کسی تان سے بہت زیادہ متاثر ہوتے تو تڑپ کر ایک دوسرے کا منہ چوم لیتے۔ وہ الجھے ہوئے تماش بینوں کی طرح طوائف سے اشارے کنائے کرتے۔ کبھی سر پر رکھ کر، کبھی کان سے لگا کر، کبھی انگلیوں میں دبا کر طوائف کو نوٹ پیش کرتے۔ علی نواز گورمانی بدتمیزی سے ٹانگیں پسارے نیم دراز تھا۔ وہ بار بار ایک آنکھ دبا کر ٹکٹکی باندھے طوائف کو تکنے لگتا۔

مراد خاں شاہانی بھی اپنے آپے میں نہ تھا۔ دو بار اس کے ہاتھ سے بھرا ہوا گلاس چھوٹا۔ اس کی شلوار اور قمیص جگہ جگہ سے بھیگ گئی۔ نشے سے چور آنکھیں بار بار بند ہو جاتیں۔ اچانک وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مہمانوں سے نظر بچا کر محفل سے نکل جانا چاہا۔ سطوت خاں مزاری نے زور کا قہقہہ بلند کیا۔ شاہانی کو ٹوکا۔ "سیں شاہانی! میل تو اب جوبن پر آیا ہے اور تو اسے چھوڑ کر جا رہا ہے۔" مزاری کے ساتھ ساتھ گورمانی نے بھی قہقہہ لگایا۔

"نہیں' تو ابھی نہیں جا سکتا۔"

مراد خاں شاہانی نے مسکرا کر مزاری اور گورمانی کو دیکھا اور جھوم کر بولا۔ "سیں عیش کر، عیش۔" مگر وہ ٹھیرا نہیں۔ لڑکھڑاتے قدموں سے ایک طرف بڑھا۔ کریم بخش رادھانی نے قریب پہنچ کر اسے سہارا دیا۔ شاہانی آہستہ آہستہ چلتا ہوا محفل سے چلا گیا۔ کچھ دور جا کر اس نے اپنے کاردار کو ہدایت کی۔ "رادھانی! مجرا ختم کرا۔ میاں والی سے جو کنجری آئی ہے اسے میرے کمرے میں پہنچا دے۔" یہ کہتا ہوا وہ بالائی منزل پر جانے والے زینے کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ رادھانی بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر شاہانی نے رادھانی کو ڈانٹا۔

"میری فکر نہ کر۔ میں آرام سے پہنچ جاؤں گا۔ تو اب جا۔"

کریم بخش رادھانی خاموشی سے واپس ہوا۔ شامیانے کے نیچے پہنچا۔ محفل میں شوریدگی اور افراتفری تھی۔ رادھانی سیدھا نائکہ کے پاس پہنچا۔ سرگوشی میں مجرا ختم کرنے کی ہدایت کی۔ نائکہ چاہتی بھی یہی تھی۔ بلکہ مجرا ختم کرنے کے لیے بے چین تھی۔ اس کی نوچی شہناز بھی اب بہت تھک چکی تھی۔ بار بار بے بسی سے نائکہ کی جانب دیکھتی تھی۔

کسی رسمی اعلان کے بغیر مجرا خاموشی سے ختم کر دیا گیا۔ شہناز نے گانا بند کر دیا۔ گانا ختم ہوا تو مہمان اٹھنے لگے۔ ملازم سہارا دے کر انہیں ڈیرے کے کمروں میں پہنچانے لگے۔ جن کی حالت نشے سے ابتر ہوتی انہیں بستروں پر لیٹنے میں بھی مدد دیتے۔

نوابزادہ ملک نیاز محمد اعوان نے قالین پر قے کر دی تھی اور اس میں لت پت پڑا بے چینی سے ادھر ادھر گردن ہلا رہا تھا۔ اس کے قریب ہی سردار عبدالرحمان خاں نوانی بے سدھ پڑا تھا۔ ذرا ہٹ کر بارڈر ملٹری پولیس کا کمانڈر شیر خاں نیازی آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا۔ اور رک رک کر بڑبڑا رہا تھا۔

"گاؤ' گاؤ' جان من گاؤ' گاتی جاؤ' ناچتی جاؤ۔"

ایک ملازم نے بڑھ کر نواب زادہ نیاز محمد خاں اعوان کا چہرہ تولیے سے صاف کیا۔ دو ملازموں

دکے لیے بلایا اور تنومند نواب زادے کو ہاتھوں پر اٹھا کر لے گئے۔ وہ نشے میں مدہوش تھا۔ اسے ن بدن کا ہوش نہ تھا۔

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہوا تو ڈگمگا کر گرتے گرتے بچا۔ محکمہ نہر کے انجینئر نے زور سے قہقہہ بلند کیا ور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مگر خود لڑکھڑا کر دھڑام سے فرش پر گرا۔ رحیم داد مسکراتا ہوا اس کے قریب یا۔ اسے اٹھانے کی کوشش کی تو اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ لڑکھڑایا اور ایک طرف لڑھک گیا۔ رحیم داد بھی بے حال ہو رہا تھا۔ ایک ملازم نے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور کمرے میں پہنچا دیا۔ ہ بستر پر لیٹا تو ہر شے گردش کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بے سدھ پڑا رہا۔ اس کا جسم نشے سے اس طرح ڈول رہا تھا جیسے ہنڈولے میں بیٹھا ہو۔ کبھی اوپر چلا جاتا۔ کبھی نیچے آ جاتا۔ آخر اسی عالم میں وہ سو گیا۔

☆

کچھ مہمان صبح ہی چلے گئے۔ البتہ نواب زادہ ملک نیاز محمد خاں اعوان' علی نواز گورمانی اور عمرداز خاں جسکانی موجود تھے۔ رحیم داد رات کی محفل رقص و سرود میں ان سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔ دوپہر کے کھانے پر بھی ان سے بات چیت ہوتی رہی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سارے مہمان رخصت ہو گئے۔ مراد خاں شاہانی بھی عمرداز خاں جسکانی کے ہم راہ لیہ چلا گیا۔

شاہانی لیہ جانے سے قبل رحیم داد کے کمرے میں آیا' معذرت کے انداز میں بولا۔ "سیں چوہدری! برا نہ منانا عمرداز میرے گلے پڑ گیا ہے۔ ویسے لیہ میں مجھے ایک کام بھی ہے۔ میں اس کے ساتھ لیہ جا رہا ہوں۔"

"کب تک واپسی ہو گی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

کل شام تک آ جاؤں گا۔ ارادہ تو یہی ہے پر جسکانی مجھے جلد نہیں آنے دے گا۔ اس نے مجھے روک لیا تو پرسوں ضرور پہنچ جاؤں گا۔"

"تو آرام سے لوٹنا۔ ایسا کر اب مجھے بھی جانے دے۔ میں زیادہ دن نہیں ٹھیر سکتا۔ میں نوں شاہ جی سے ضرور ملنا ہے۔" رحیم داد نے قدرے تامل کے بعد پوچھا۔ "یہ بتا لہور کے لیے ٹرین کب چھوٹتی ہے؟"

"وہ تو رات کے نو بجے جائے گی۔" شاہانی نے مطلع کیا۔

"بس میں اسی سے چلا جاؤں گا۔ تو فکر نہ کر۔ اپنے کاردار رادھانی سے کہتا جا کہ مجھے رات کو سٹیشن پہنچا دے۔"

مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کو لاہور جانے کی اجازت نہیں دی۔ زور دے کر بولا۔ "نہیں! تو اس طرح نہیں جا سکتا۔ میرے آنے کے بعد ہی جانا۔ ابھی تو شاہ جی بھی نہیں لوٹا ہوگا۔ دونوں اکٹھے اس کے پاس چلیں گے۔ مجھے بھی اسے ملنا ہے۔"

شاہانی کے اصرار پر رحیم داد کو رکنا پڑا۔ ویسے بھی اس کا جلد واپس جانے کا پختہ ارادہ نہیں تھا۔ وہ چند روز شاہانی کے پاس اور رکنا چاہتا تھا تاکہ احسان علی شاہ اس وقت تک اپنے گاؤں پیراں والا واپس پہنچ جائے۔ وہ اس سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد ہی کوٹلہ ہرکشن جانا چاہتا تھا۔ مراد خاں شاہانی تیسرے روز ضرور واپس آنے کا وعدہ کر کے عمردار خاں جسکانی کے ہم راہ لیے چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر لیٹ کر سو گیا۔ جاگا تو کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر گیا۔ حویلی کے چوک میں پہنچا۔ دن کا چل چلاؤ تھا۔ ملگجی دھوپ کہیں کہیں بلندی پر جھلک رہی تھی۔ ڈیرا بالکل خالی تھا۔ گزشتہ شب جو رونق اور چہل پہل تھی وہ یکسر اجڑ چکی تھی۔ نہ شامیانہ تھا نہ قناتیں تھیں۔ چبوترا ویران تھا۔ حویلی میں ٹھہرے ہوئے تمام مہمان جا چکے تھے۔ صرف نوکر چاکر رہ گئے تھے۔ مراد خاں کے جاتے ہی بیشتر نوکر بھی حویلی سے چلے گئے۔

چوک میں ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ صرف باورچی خانے کی سمت بولنے اور باتیں کرنے کی دھیمی دھیمی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ شام کا دھندلکا فضا میں گھلتا جا رہا تھا۔ یہ نومبر کی آخری تاریخوں کی سنسان شام تھی۔ رحیم داد حویلی سے باہر نہیں گیا۔ چبوترے پر گیا اور آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ کہرے میں لپٹی ہوئی شام جلد ہی کالی پڑ گئی۔ اندھیرا بڑھ گیا۔ پاکھر کے نیچے تنور دہک رہا تھا۔ اندھیرا پھیلتے ہی تنور سے نکلتی ہوئی چنگاریاں زیادہ روشن اور چمک دار نظر آنے لگیں۔

خنکی میں بھی اب اضافہ ہو گیا تھا۔ رحیم داد نے بدن میں ہلکی ہلکی تھرتھری محسوس کی۔ سردی پچھلی رات سے زیادہ تھی۔ رحیم داد نے ایسا ہی محسوس کیا اور اس نے ٹھیک ہی محسوس کیا تھا۔ سردی اچانک بڑھ گئی تھی۔ ہوا بھی تنکی ہوئی تھی۔ رحیم داد نے نظریں اٹھا کر باورچی خانے کی جانب دیکھا۔ تنور کے گرد نوکروں کی بھیڑ بڑھ گئی تھی۔ وہ دور سے سایوں کی مانند دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ رحیم داد چبوترے سے نیچے اترا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں واپس پہنچا۔

کھانا کھانے کے بعد اس نے بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کی۔ دن بھر سوتا رہا تھا لہٰذا نیند نہیں آئی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔ پہر رات گزر گئی۔ باہر چوک میں ملازموں کی آوازیں دھیمی پڑتے پڑتے اب خاموشی میں تحلیل ہو کر ختم ہو چکی تھیں۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور باہر گہرا

ٹا چھایا تھا۔

وہ آنکھیں بند کیے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی عالم میں اس نے دروازہ کھلنے کی آہٹ وس کی۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول کر دیکھا' ایک ملازم کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ وہ ادھیڑ تھا۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ چہرے پر چھدری ڈاڑھی تھی اور چیچک کے داغ نمایاں تھے۔ رحیم داد ے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ ملازم نے رحیم داد کو بیدار پایا تو خاموشی سے آگے بڑھا اور بستر کے ائنتی بیٹھ کر ہولے ہولے اس کے پیر دبانے لگا۔ رحیم داد نے کوئی بات نہیں کی۔ ذرا دیر بعد ملازم ے خود ہی بات چھیڑی۔

"سئیں! میرا ناں کرامت ہے۔ میں تحصیل علی پور کا رہنے والا ہوں۔ ویسے سب مجھے کرما کہتے ہیں۔"

"کرمے! تو مظفر گڑھ سے ادھر کیسے آ گیا؟"

"سئیں' وہ ایسا ہوا کہ برکھا میں دریا چڑھا تو اپنا سب کچھ اجڑ گیا۔ تجھے تو پتہ ہی ہوگا' سیلاب آتا ہے تو علی پور تحصیل کا سب کچھ بہا لے جاتا ہے۔ اپنے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ پنڈ چھوڑ کر میں ادھر آگیا۔ تب سے یہیں نوکر ہوں۔" رحیم داد خاموش رہا۔ مگر کرامت خاموش نہ رہا۔ اس نے دبی زبان سے پوچھا۔ "سئیں' تو سردار کے ساتھ نہیں گیا؟"

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "کرمے! یہ بتا' باہر چوک میں آج اتنا سناٹا کیوں ہے؟ سب کہاں چلے گئے؟"

"وہ ایسا ہی جی' جب سردار نہیں ہوتا اور ڈیرے میں مہمان بھی ٹھہرے نہیں ہوتے تو نوکر اور کامے کام کاج کر کے اپنے سکوں اور شریکوں سے ملنے جلنے چلے جاتے ہیں اور آج تو کمدار بھی چلا گیا۔ وہ نہیں ہوتا تو سب ہی کھسک جاتے ہیں۔" کرامت اپنے گندے دانت نکال کر بھونڈے پن ے ہنسنے لگا۔ "باورچی تک چلا گیا جی۔ اب تو ڈیرے میں کوئی نہیں رہا۔"

"سردار کے جانے کے بعد ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے؟"

"نا سئیں نا! ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ کچھ کامے چلے جاتے ہیں پر کل رات میل تھا ناں۔ سب ویرے تک جاگتے رہے۔ اب ادھر ادھر نکل گئے پر کل صبح ہوتے ہی پہنچ جائیں گے۔ اندر پتہ کا نہ چلے گا۔"

"تو کیوں نہیں چلا گیا؟"

"ہم کیسے جا سکتا ہوں؟ سئیں! تو بھی تو مہمان ہے۔ کسی کو تو ڈیرے میں رہنا ہی چاہیے۔ ویسے

جی ادھر میرا کوئی نہیں۔ میں تو ڈیرے کی کوٹھڑی ہی میں رہتا ہوں۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ اسے کرامت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر نیند کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ وہ بار بار بے چین ہوکر کروٹ بدلتا۔ کرامت ابھی تک پائنتی بیٹھا تھا اور سدھے ہوئے ہاتھوں سے رحیم داد کے پاؤں دبا رہا تھا۔ اسے بے چین دیکھ کر کرامت نے ہمدردی کا اظہار کیا۔

"سیں لگتا ہے تجھے نیند نہیں آرہی۔"

"میں دوپہر بعد سوگیا تھا اور شام تک سوتا رہا۔" رحیم داد نے نیند نہ آنے کا جواز پیش کیا۔

"سیں! سچی گالیہ ایہہ ہے' تو جوان ہے۔ جوان بندے کو اکیلے نیند نہیں آتی۔" وہ شوخی سے مسکرایا۔ رحیم داد نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ اسے خاموش پاکر کرامت کی حوصلہ افزائی ہوئی وہ زیادہ بے باک ہوگیا۔ اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور ایک آنکھ دبا کر گویا ہوا۔ "سیں! تو کہہ تو آلس دور کرنے کو کسی کو تیرے پاس بھیج دوں؟"

رحیم داد اس کی بات سمجھ کر بھی سمجھ نہ سکا۔ اسے معلوم تھا کہ احسان علی شاہ کی طرح سردار مراد خاں شاہانی کی حویلی میں کوئی ایسا کوٹ نہیں ہے جس میں مزارعوں اور کمیوں کی نوجوان عورتوں کو اٹھوا کر قید رکھا جاتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو شاہانی اس کا اظہار ضرور کرتا۔ وہ اس سلسلے میں کرید کر پوچھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ کرامت اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب نہیں دیکھا۔ چپ چاپ کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد الجھن میں پڑگیا۔ نیند پہلے ہی آنکھوں میں نہیں تھی۔ اب بالکل اڑگئی۔ اس نے بند دروازے کی جانب بے قرار نظروں سے دیکھا۔ کچھ دیر کروٹ کے بل لیٹا رہا اور دروازے کو تکتا رہا۔ مگر نہ دروازہ کھلا نہ کوئی اندر آیا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ سناٹا گہرا ہوگیا۔ رحیم داد نے کروٹ بدلی' آنکھیں بند کیں اور ایک بار پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے کرامت کا خیال جھٹک کر ذہن سے نکال دیا۔

نیند دھیرے دھیرے رحیم داد کی آنکھوں میں اترنے لگی۔ رات خاصی گزر چکی تھی۔ حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ یکایک گہری خاموشی میں کمرے کا دروازہ ہولے سے چرچرایا۔ رحیم داد کی نیند اچاٹ ہوگئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں سامنے دیوار پر ایک پرچھائیں لہرائی۔ رحیم داد نے جھٹ گردن موڑ کر دروازے کی جانب دیکھا کہ دروازے کے قریب کرامت کے بجائے ایک عورت کھڑی ہے۔ اس کی پیٹھ رحیم داد کی جانب تھی۔ اس نے کمرے کا دروازہ آہستہ سے بند کیا اور پلٹی۔ رحیم داد نے دیکھا' وہ سرمئی رنگ کی اونی دوہر اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کا چہرہ دوہر سے اس طرح چھپا تھا کہ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ سرو قامت تھی۔ جسم گداز اور قدرے بھاری تھا۔ کولھے چوڑے تھے اور نچلا دھڑ خاصا پھیلا ہوا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے رحیم داد کی جانب بڑھی۔

رحیم داد اٹھ کر تکیے کے سہارے بیٹھ گیا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ خوب گھیردار ریشمی گھگرا پہنے ہوئے تھی۔ وہ نظریں جھکائے خاموشی سے قریب آئی اور اپنا گھگرا سمیٹ کر رحیم داد کے قریب بستر پر بیٹھ گئی۔

وہ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہی تھی۔ اس کی سانسیں کمرے کے سکوت میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

رحیم داد نے بے قرار ہوکر پہلو بدلا' ہاتھ بڑھایا اور اس کے چہرے سے دوہر ہٹا دی۔ اس کا چہرہ اب رحیم داد کے سامنے عیاں تھا۔ اس کا رنگ صبح کی دھوپ کی مانند اجلا تھا۔ رخساروں پر شفق کی سرخی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور کالی تھیں۔ سر کے بال لمبے اور گھنے تھے۔ وہ سرخ اور نیلے دھاگوں سے کڑھا ہوا جوگیا چولا پہنے ہوئے تھی۔ وہ خوبصورت اور طرح دار عورت تھی۔ آنکھوں میں کاجل لگا کر اور بال سنوار کر بن ٹھن کر آئی تھی۔ مگر اس کا سن چالیس برس سے کم نہیں تھا۔ اس کی جوانی کا سورج ہرچند کہ ڈھل چکا تھا لیکن ابھی تک اس میں غضب کی دل کشی اور رعنائی تھی۔

رحیم داد کو وہ بہت اچھی لگی۔ اس نے مسکرا کر بات چیت شروع کی۔ "تیرا نام کیا ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ چہرہ اور سرخ ہوگیا تھا۔

رحیم داد نے دوبارہ اس کا نام پوچھا وہ پھر بھی نہ بولی۔ رحیم دا نے زچ ہوکر تیکھے لہجے میں کہا۔ "بولتی کیوں نہیں۔ تو گونگی تو نہیں ہے؟"

اس دفعہ اس نے اپنی نظریں اٹھائیں۔ اس کی سیاہ اور روشن آنکھیں جھلملائیں۔ لمحے بھر کے لیے دونوں کی نظریں ملیں مگر اس نے جھٹ نظریں ایک بار پھر نیچی کرلیں۔ رسان سے بولی۔ "میں تجھ سے باتیں کرنے نہیں آئی ہوں۔"

رحیم داد نے کچھ اور کہنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ بڑھا کر رحیم داد کے منہ پر رکھ دیا۔ رحیم داد نے بے ساختہ اس کا نرم و گداز ہاتھ تھام لیا۔ اس کی کلائی میں پڑی ہوئی چوڑیاں آہستہ سے جھن جھنائیں۔ اس کے لب تھر تھرا رہے تھے۔ رحیم داد گومگو کے عالم میں اسے تکتا رہا۔

☆

کمرے میں سکوت چھایا تھا۔ رات کا قافلہ دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کرتا رہا۔ رات کے پچھلے پہر وہ اٹھ کر جانے لگی تو رحیم داد نے اس کی کلائی تھام کر نرم لہجے میں کہا۔ "چلی جانا۔ ابھی بہت رات رہتی ہے۔"

وہ مزید ٹھہرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ "سئیں! میکوں اب جانا ہے۔" اس نے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔ "میری تلی چھوڑ دے۔ میں اب نہیں رک سکتی۔"

"تونے تو کوئی گل بات ہی نہیں کی۔" رحیم داد نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا۔ "اپنا نام تو بتا دے۔"

وہ قدرے تیکھے لہجے میں بولی۔ "یہ نہ پوچھ۔" اس نے جھٹکا دے کر اپنی کلائی رحیم داد کی گرفت سے آزاد کرالی۔ بستر پر پڑی ہوئی اونی دوہر اٹھائی' اسے اس طرح اوڑھا کہ ایک بار پھر اس کا چہرہ چھپ گیا۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ آہستہ سے ایک پٹ کھولا۔ جاتے جاتے دہلیز پر ٹھٹکی۔ مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ آہستہ سے بولی۔ "سردار سے میرے بارے میں گالہ نہ کرنا۔ ہرگز ہرگز نہ کرنا۔" اس نے سختی سے تاکید کی۔

"کسم کھا۔ اس سے کچھ کہے گا تو نہیں۔"

"جیسی چاہے کسم لے لے۔" رحیم داد نے اسے یقین دلایا۔ "رب سوہنہ' میں نوں اسے ایک لفظ نہیں کہنا۔ تو بالکل فکر نہ کر۔ مجھ پر بھروسہ کر۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "کل بھی آئے گی ناں؟ سردار تو کل رات بھی واپس نہیں آئے گا۔ وہ پرسوں شام سے پہلے نہیں آئے گا۔ مجھے یہی بتا کر گیا ہے۔" اس نے زور دے کر پوچھا۔

"بول' کیا کہتی ہے؟"

اس نے رحیم داد کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دھیرے سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ رحیم داد گم صم بیٹھا رہا اور نظریں اٹھائے دروازے کو تکتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ پلنگ سے نیچے اترا۔ دروازہ بند کیا اور بستر پر واپس جا کر لیٹ گیا۔

وہ دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ عورت نے اپنے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہاں تک کہ نام بتانے سے بھی گریز کیا تھا۔ وہ کون تھی' کہاں سے آئی تھی اور کیسے آئی تھی؟ رحیم داد کو کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ نہ جانے کب تک اس پراسرار عورت کے بارے میں غلطاں و پیچاں رہا۔ آخر اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح آنکھ کھلی تو رحیم داد نے دیکھا کہ بستر پر ایک طرف چادر کی سلوٹوں میں دبا ہوا سونے کے

ڑے موٹے منکوں کا ایک کنٹھا پڑا ہے۔ کنٹھا خاصا وزنی اور قیمتی تھا۔ اسے فوراً رات والی عورت آئی۔ اس نے کنٹھا اٹھا کر تکیے کے نیچے رکھ دیا اور خاموش بیٹھا عورت کے بارے میں اندازے ا رہا۔ مگر بہت سوچ بچار کے باوجود وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔

رحیم داد نے نہا دھو کر ناشتا کیا۔ لیکن تمام عرصے وہ اس عورت کے متعلق سوچتا رہا جو ہنوز اس ے لیے ایک معمہ تھی۔ کرامت بھی نہیں آیا۔ اس کی تلاش میں رحیم داد کمرے سے نکل کر وک میں گیا۔ وہ تمام نوکر چاکر واپس آگئے تھے جو رات کو حویلی سے غائب ہو گئے تھے۔ وہ اپنے کام کاج میں مصروف تھے۔ رحیم داد نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ مگر نوکروں میں اسے کرامت نظر ہ آیا۔

یرا ابھی تک خالی تھا۔ شام ہو گئی۔ لیکن نہ کوئی مہمان آکر ٹھہرا نہ سردار مراد خان شاہانی واپس یا۔ چوک میں کمرے کا نیل گوں غبار گاڑھا پڑتا جا رہا تھا۔ فضا دھواں دھواں تھی۔ خاموشی بڑھتی جاری تھی۔ رحیم داد کو رات کا انتظار تھا اور رات جیسے رینگ رینگ کر بڑھ رہی تھی۔

رحیم داد اول شب ہی اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا باہر سے ابھرنے والی آوازیں سنتا رہا۔ بے قراری کا یہ عالم تھا کہ ٹھیک سے کھانا بھی نہ کھا سکا۔ کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا کبھی دروازے پر باہر چوک کی طرف دیکھتا۔ چوک رفتہ رفتہ سنسان پڑ گیا۔ نوکر چاکر اپنی اپنی کوٹھریوں میں جا کر لیٹ چکے تھے۔ رحیم داد کو توقع تھی کہ وہ ضرور آئے گی۔ اس کا سونے کا کنٹھا رحیم داد کے پاس تھا۔ کنٹھا اپس لینے اسے آنا چاہیے تھا۔

وہ بے چینی سے اس کی راہ تکتا رہا۔ باہر گونگی رات ساکت کھڑی تھی۔ ہر طرف پالا پڑ رہا تھا۔ فضا پر گہری خاموشی چھائی تھی۔

آدھی رات سے کچھ پہلے دروازہ آہستہ سے کھلا۔ رحیم داد بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے روازے کی جانب اشتیاق سے دیکھا۔ مگر دروازے پر وہ نہیں تھی کرامت تھا۔ وہ چپ چاپ چند لمحے تک دروازے کے قریب کھڑا رہا۔ پھر نظریں اٹھا کر رحیم داد کی طرف دیکھا' دھیرے دھیرے گے بڑھا۔

رحیم داد نے گلہ کیا۔ "کرے! تو دن بھر کہاں رہا؟ نظر ہی نہیں آیا۔"

"سئیں' میں سویرے سویرے دریا خاں چلا گیا تھا۔ اندھارا ہونے کے بعد لوٹا ہوں۔"

رحیم داد نے اس کا چہرہ دیکھا۔ چہرے پر گرد جمی ہوئی تھی۔ وہ سفر کی تکان سے نڈھال نظر آ رہا تو رحیم داد نے ہمدردی کے طور پر کہا۔ "کرے! میں نوں پیر نہیں دلوانے۔ تو بہت تھکا ہوا لگتا

ہے۔ جا کر آرام کر۔"

"سئیں' جیسی تیری مرضی۔" کرامت نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ "تجھ سے ایک ضروری گالہہ پوچھنی تھی۔"

"ضرور پوچھ۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتا ہے۔ کرامت نے دبی زبان سے پوچھا۔ "سئیں! تو نے سونے کی ایک مالھان تو نہیں دیکھی؟"

"کیسی مالھان؟" رحیم داد نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"سئیں' رات اس کے گلے سے مالھان اتر کر یہاں گر گئی تھی۔ وہ اس کے لیے بہت پریشان ہے۔ میں اس کی مالھان لینے آیا ہوں۔"

رحیم داد نے ہاتھ بڑھا کر تکیے کے نیچے سے کنٹھا نکالا' کرامت کے سامنے کیا اور زیرلب مسکرا کر بولا۔ "یہ رہی اس کی مالھان۔ اسے لینے تو کیوں آیا؟ وہ خود کیوں نہیں آئی؟"

"یہ تو جی وہی بتا سکتی ہے' میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" کرامت نے گول مول جواب دیا۔

"ٹھیک ٹھیک بات کر۔" رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔

"سئیں' میکوں کیہہ کہنا اے؟" کرامت مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ "اس کی مرضی ہے۔ آنا چاہے تو آجائے گی۔"

"پر کل رات تو اسے تو یہاں لایا تھا نا؟"

"نا سئیں' ایسی گالہہ نہیں۔" کرامت نے انکار میں گردن ہلائی۔ "اس کی مرضی نہ ہوتی تو میں اسے کیسے لاتا۔"

"تو اس کے ساتھ ساتھ آیا تھا؟ پر وہ کمرے میں بالکل اکیلی آئی تھی۔"

"میں تو اسے تیرے کمرے تک چھوڑ کر چلا گیا تھا۔" کرامت نے وضاحت کی۔

"جب وہ واپس گئی تب تو کہاں تھا؟"

"سئیں! میں اس کا انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔ میکوں پتہ تھا وہ دیر سے لوٹے گی۔" اس نے مسکرا کر رحیم داد کو بتایا۔ "اس نے واپسی پر مجھے جگایا تھا۔"

"آج بھی وہ آئے گی؟" رحیم داد نے بے قرار نظروں سے کرامت کو دیکھا۔

"پتہ نہیں جی۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "ویسے سچی گالہہ پوچھ تو مجھے لگتا نہیں وہ آج بھی آئے گی۔"

"تو نے کیسے اندازہ لگایا' وہ نہیں آئے گی؟"

"سئیں! اسے آنا ہوتا تو مالھان لینے خود آتی۔ میکوں تیرے پاس نہ بھیجتی۔"

"اچھا یہ بتا' وہ ہے کون؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"سئیں' یہ تو میں ہرگز ہرگز نہیں بتاؤں گا۔ کرامت نے صاف انکار کردیا۔ "میں اس کے بارے میں تیکوں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"کیوں نہیں بتا سکتا؟" رحیم داد نے جھلا کر سوال کیا۔

کرامت نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ بت بنا خاموش کھڑا رہا۔

"بولتا کیوں نہیں؟" رحیم داد نے اسے ڈانٹا۔ "صاف صاف بتا۔" اس کی آواز قدرے اونچی تھی۔

"سئیں' دھیرے بول۔" کرامت نے مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ "تیکوں پتہ نہیں' یہ عزت اور لاج کی گالہہ ہے۔" اس کا لہجہ تیکھا ہوگیا۔ "میں تجھے کیسے بتا سکتا ہوں؟" اس کے چہرے پر خوف کی جگہ جھنجلاہٹ آگئی۔ "میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا اس کے بارے میں نہ پوچھ۔ میکوں کچھ نہیں جاتا۔"

رحیم داد نے اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو رام کرنے کی کوشش کی۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "نہ بتا' تیری مرضی۔ پر اتنا بتا دے اس کا نام کیا ہے؟"

رحیم داد کو توقع تھی کہ کرامت اس کا نام بتا دے گا مگر اس کی توقع پوری نہ ہوئی۔ کرامت آمادہ نہ ہوا۔ "نا سئیں نا' میں یہ بھی نہیں بتا سکتا۔ اس کے بارے میں تو میں تجھے کچھ نہیں بتا سکتا۔"

عورت کی شخصیت کا معمہ کرامت نے اپنی باتوں سے اور پیچیدہ بنا دیا۔ رحیم داد کا اشتیاق بڑھا۔ "تو عجب گل کر رہا ہے۔" رحیم داد کے لہجے میں اس دفعہ کسی قدر تلخی تھی۔

"ہا سئیں' یہ عجب ہی گالہہ ہے۔ اس میں بدنامی اور لک کا ڈر ہے۔" وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ "تو ہزار پوچھ۔ میکوں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔ میں ہرگز کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"تو فیر یہ بھی صاف صاف سن لے' میں نے مالھان تجھے نہیں دینی۔" رحیم داد جل کر بولا۔ اس نے کنٹھا ایک بار پھر تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ "اسے کہہ دے' مالھان لینی ہے تو خود آکر لے جائے۔ میں تجھے نہیں دوں گا۔"

"سئیں ناراض نہ ہو۔" کرامت نرم پڑ گیا۔ اس کے لہجے میں عاجزی پیدا ہوگئی۔ "مالھان دے دے' تیری مہربانی ہوگی۔ رب راضی ہووے' تو سدا راضی ہو' خوش ہو۔"

"تو کچھ ہی کہہ مالھان میں نے تجھی نہیں دینی۔" رحیم داد اپنی بات پر جما رہا۔ "مالھان صرف

اور صرف اسی کو دے سکتا ہوں۔" کرامت سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔ "کھڑا کیوں ہے؟ جو میں نے کہا ہے اسے جا کر بتا دے۔ وہ کوئی بھی ہو مالھان لیتی ہے تو اسے خود چل کر یہاں آنا پڑے گا۔" رحیم داد بستر پر دراز ہو گیا۔ "اب تو یہاں سے پھوٹ جا۔ میں نوں سونا ہے۔ اونگھ آ رہی ہے۔ رات بھی بہت ہو گئی۔"

کرامت مڑا اور ہولے ہولے کولہے مٹکاتا باہر چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر لیٹا انتظار کرتا رہا۔ رات گزرتی گئی۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ رات آدھی ہو گئی۔ گہری ہو کر ڈھلنے لگی۔ لیکن نہ کرامت آیا‘ نہ وہ آئی۔ رحیم داد انتظار کرتے کرتے سو گیا۔ صبح اٹھ کر کمرے سے باہر آیا تو ملازموں کی زبانی معلوم ہوا کہ مراد خاں شاہانی واپس آ گیا ہے۔

ناشتے پر شاہانی بھی پہنچ گیا۔ اس نے رحیم داد کے ساتھ ہی ناشتا کیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر مراد خاں نے جیپ نکالنے کا حکم دیا اور خود بھی گیرج کی طرف چلا گیا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ ہوں والی جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے دروازے پر آہٹ سنی‘ مڑ کر دیکھا کہ کرامت سامنے کھڑا ہے۔ رحیم داد نے پوچھا۔

"تو پچھلی رات کیوں نہیں آیا؟ اب کس لیے آیا ہے؟"

"سئیں! تو نے صاف انکار کر دیا تھا۔ میکوں آکر کیہہ لینا تھا؟"

"اسے اپنے ساتھ لاتا۔ وہ کیوں نہیں آئی؟"

"سئیں‘ آہستہ بول۔" اس نے سراسیمہ نظروں سے باہر چوک میں دیکھا۔ "تیکوں پتہ ہے‘ سردار واپس آگیا ہے۔"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "میں نوں یہ بتا‘ وہ کیوں نہیں آئی؟" رحیم داد کا لہجہ اس دفعہ دھیما تھا۔

"سئیں‘ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" کرامت نے سرگوشی کی۔ "اس کی مرضی‘ نہیں آئی۔ تو نے جو کہا تھا‘ میں نے اسے کہہ دیا۔"

"کیا بولی وہ؟"

"اس نے میری گالہہ سنی پر کچھ بولی نہیں۔ سئیں! اس کی مالھان ویدے۔" وہ گڑگڑانے لگا۔ "تیری بہت مہربانی ہوگی۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "وہ بہت پریشان ہے۔ اسے تنگ کرے گا تو وہ تجھ سے ناراض ہو جائے گی۔"

"اسے کہنا ناراض نہ ہو۔ میں چند روز بعد واپس آجاؤں گا۔ اس کی مالھان تب ہی دوں گا۔

آکر خود لے جائے گی۔ فکر نہ کر مالھان میرے پاس حفاظت سے رہے گی۔"

کرامت کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مراد خاں شاہانی مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن کرامت پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے سے مسکراہٹ اڑ گئی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے کرامت کو دیکھا۔ "ارے! تو ادھر کیا کر رہا ہے؟" اس کا لہجہ تند اور کڑوا تھا۔

رحیم داد نے جھٹ بات بنائی۔ "شاہانی! میں نے اسے بلایا تھا۔" اس نے مڑ کر کرامت کی جانب دیکھا۔ "مجھے فوراً ایک گلاس پانی لا دے۔ تجھے اسی لیے بلایا تھا۔"

کرامت کمرے سے چلا گیا۔ مراد خاں شاہانی کھڑا رہا۔ رحیم داد نے اس کے بشرے سے اندازہ لگایا کہ کرامت کا وہاں آنا اسے ناگوار گزرا ہے۔ رحیم داد نے غور کیا کہ کرامت اس کے لیے پانی نہیں لایا بلکہ حویلی کا ایک اور ملازم پانی سے بھرا ہوا گلاس لے کر اندر آیا۔ رحیم داد نے اس سے کرامت کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ گلاس لیا اور اس طرح ہونٹوں سے لگا کر غٹاغٹ پی گیا گویا بہت پیاسا ہو۔

☆

جیپ حویلی کے صدر دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ رحیم داد اور سردار مراد خاں جیپ میں بیٹھ گئے۔ جیپ نے حرکت کی اور آگے بڑھ گئی۔ اسے ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اس کے برابر شاہانی کا ایک نوجوان ملازم ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق سنبھالے بیٹھا تھا۔ مراد خاں شاہانی پچھلی نشست پر رحیم داد کے ساتھ بیٹھا تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ جیپ گرد کے بادل اڑاتی تیزی سے پر پیچ راستوں پر دوڑ رہی تھی۔

بھکر شہر سے نکل کر جیپ اس سڑک پر پہنچ گئی جو ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ وہ بھل اسٹیشن کی سمت تیز رفتار سے جا رہی تھی۔ سڑک کے بائیں طرف ریلوے لائن تھی اور دائیں طرف کھیتوں سے گھری ہوئی بستیاں تھیں۔ جھر اور جنگل تھے جو حد نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ دریائے سندھ کا ساحلی علاقہ ہے جو بیٹ کہلاتا ہے۔ یہ بھکر سے بھل تک پندرہ میل لمبی اور پانچ میل چوڑی سرسبز و شاداب پٹی ہے اور اپنی زرخیزی کے لیے مشہور ہے۔ جدھر آنکھ اٹھتی ہے۔ ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے۔

بیٹ کا علاقہ شاہانیوں‘ ڈھانڈلوں اور نوانیوں کی جاگیروں میں بٹا ہوا ہے۔ مگر ڈھانڈلوں کی زمیں داری شاہانیوں اور نوانیوں کے مقابلے میں زیادہ بڑی ہے۔

بیٹ نشیب میں واقع ہے۔ سامنے دریائے سندھ بہتا ہے جس کا پاٹ میلوں تک پھیلا ہے۔ دریا

کے درمیان جگہ جگہ خشکی کے دوآبے نظر آتے ہیں جنھوں نے جزیروں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ان جزیروں کو کچے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ کچے غیر آباد اور ویران نہیں ہیں۔ ان میں بستیاں آباد ہیں۔ زمین نہایت زرخیز ہے اور ان کے باشندے سخت محنتی اور جفاکش ہیں۔ کھیتی باڑی کرنا اور مویشی پالنا ان کا پیشہ ہے اور یہی ان کا ذریعہ معاش ہے۔ ان کا رہن سہن بہت سیدھا سادا ہے۔

مکانات مٹی کے بنے ہوئے ہیں اور ان کی چھتیں عام طور پر پھوس اور پتوار کی ہوتی ہیں۔ گھروں کی چار دیواری کے اندر کشادہ آنگن ہیں جن میں گھنے اور سایہ دار درخت ہوتے ہیں۔ آنگنوں میں چارپائیاں بچھی ہوتی ہیں۔ مرد فرصت کے اوقات میں چارپائیوں پر بیٹھ کر حقے گڑگڑاتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔ دل بہلاتے ہیں۔ آنگنوں میں درختوں اور کھونٹوں سے بندھے ہوئے مویشی جگالی کرتے رہتے ہیں۔ مرغیاں کڑکڑاتی ہوئی ادھر ادھر گھومتی پھرتی ہیں۔ مرد سورج طلوع ہوتے ہی جب ہل پنجالی سنبھال کر کھیتوں پر کام کرنے نکل جاتے ہیں تو عورتیں گھروں میں مشین پر چارہ کاٹتی ہیں۔ گائے بھینسوں اور بکریوں کے لیے غذا مہیا کرتی ہیں۔ گائے بھینسوں کے تھنوں سے بالٹیاں بھر بھر کر دودھ نکالتی ہیں جس سے مکھن اور کھوئے کے علاوہ طرح طرح کے لذیذ مٹھائیاں تیار کی جاتی ہیں۔

مرد دودھ، کھویا اور مٹھائیاں لے کر دریا عبور کرتے ہیں اور گردو نواح کے بازاروں میں فروخت کرتے ہیں۔ دریا عبور کرنا بھی ان کا ایک فن ہے۔ وہ دودھ سے بھری ہوئی گاگریں اور مٹکے، مٹھائیوں اور سبزیوں کے ٹوکرے کمر اور ٹانگوں سے باندھ کر یا سر پر رکھ کر اس مہارت اور ہوشیاری سے دریا سے گزرتے ہیں کہ کوئی بھی شے پانی سے خراب نہیں ہوتی۔ دریا پار کرنے کے لیے وہ اپنے سینے سے چمڑے کی چھوٹی سی مشک باندھ لیتے ہیں جسے سندھاری کہا جاتا ہے۔ ان کا یہ سفر بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سندھاری کا چمڑا کہیں سے کھل جاتا ہے یا پانی میں بہتی ہوئی درختوں کی شاخوں کی کوئی نوک یا کانٹا چبھ جاتا ہے تو وہ سخت مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ ایسے خطرات سے نمٹنا جانتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ دریا کی لہریں ان کو نگل جاتی ہیں۔

مگر عورتیں، بوڑھے اور بچے ملاحوں کو کرایہ دے کر کشتیوں سے دریا عبور کرتے ہیں اور ایسا سفر وہ شادی بیاہ، میلوں ٹھیلوں اور کسی خاص تقریب کے موقع ہی پر کرتے ہیں۔ مرد بھی کشتیوں سے سفر کر سکتے ہیں لیکن وہ اپنا اور اپنے ساز و سامان کا بھاری کرایہ ملاحوں کو ادا کرنے کے متحمل نہیں

کچے کا علاقہ اس کے باسیوں کے لیے اس وقت میدان حشر بن جاتا ہے جب دریا میں سیلاب ے جسے مقامی بولی میں ڈھا کہا جاتا ہے۔ ڈھا آتا ہے اور دریا کا پانی چڑھتا ہے تو ہر چیز کو اپنے اتھ بہالے جاتا ہے۔ بستیاں پانی میں ڈوب جاتی ہیں۔ کچے مکانات گر جاتے ہیں۔ ہر طرف تباہی جاتی ہے۔ نشیب میں ہونے کے باعث بیٹ بھی ڈھا سے محفوظ نہیں رہتا۔ وہ بھی تباہی اور بادی کا شکار ہوتا ہے۔ ڈھا بالکل اچانک آتا ہے اور اگر رات کے اندھیرے میں آتا ہے تو لوگوں لیے جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ جس کا جدھر منہ اٹھتا ہے ادھر بھاگتا ہے۔ جسے بھاگنے کا قع نہیں ملتا وہ جان بچانے کے لیے درختوں پر چڑھ جاتا ہے۔ ڈھا کی تباہی اور بربادی کے باوجود چے کے رہنے والے اسے چھوڑ کر کہیں اور نہیں جاتے۔ وہ ہر تباہی و بربادی کے بعد از سر نو اپنی بادکاری کرتے ہیں۔ منہدم مکانوں کی تعمیر کرتے ہیں اور زندگی کا سفر نئے عزم سے شروع کرتے ہیں

ڈھا اگر زحمت ہے تو باعث رحمت بھی ہے۔ سیلاب کا زور جب ٹوٹتا ہے اور پانی اترتا ہے تو ڈھا ے ساتھ جو مٹی لاتا ہے اس سے کچے کی زمین خوب زرخیز ہو جاتی ہے، جس پر گندم، چنے، جوار، جرے، کماد، تارہ میرا اور گوار کے ساتھ ساتھ سبزیاں بھی کاشت کی جاتی ہیں۔ یہاں خربوزے ر تربوز بھی پیدا ہوتے ہیں جو نہایت خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ دریا کی رفتار جن دنوں سست پڑ جاتی ہے اور اس میں ٹھہراؤ آجاتا ہے تو دوسرے خودرو پودوں کی طرح پیڑا بھی اگتا ہے۔ اسے کوندر بھی ہا جاتا ہے۔ اس کے ریشوں سے بان تیار کیے جاتے ہیں اور پتلی پتلی شاخوں سے جو جھاؤ کہلاتی ہے، جھاڑو اور ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں۔ جھاڑو اور ٹوکریاں تیار کرنا کچے کی گھریلو صنعت میں شامل ہے، جن کی بازار میں ہمیشہ مانگ رہتی ہے۔

کچے کے جزیروں کا علاقہ بھی بیٹ کے ساتھ شاہانیوں، ڈھانڈلوں اور نوانیوں کی جاگیر میں بٹا ہوا ہے۔

☆

جیپ بھل سے پہلے ہی کچے راستے پر مڑ گئی اور ہچکولے کھاتی ہوئی موضع ہموں والی کی جانب ھنے لگی۔ ہموں والی ہی میں مراد خاں کی جاگیر تھی جو کم و بیش تین ہزار مربع ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی۔ جیپ گاؤں میں داخل ہوئی تو ہر طرف مراد خاں کی آمد کا غلغلہ مچ گیا۔ ڈرائیور نے جیپ اس قیام گاہ کے سامنے روکی۔ یہ قدیم وضع کی حویلی تھی۔ اس کی بوسیدہ چاردیواری جگہ جگہ سے

ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔

سردار شاہانی کا کار دار رحیم بخش راودھانی پہلے ہی سے موجود تھا۔ مراد خاں شاہانی اور رحیم جیپ سے اتر کر اندر چلے گئے۔ حویلی بہت بڑی تھی۔ اس کا احاطہ کشادہ اور وسیع تھا۔ کہیں کہیں گھنے اور سایہ دار درخت تھے۔ احاطے کے ایک حصے میں مہمانوں کے قیام کے لیے ڈیرا تھا۔ حویلی کی عمارت سے الگ تھلگ کچھ فاصلے پر تھا۔ ڈیرے کے ایک کمرے میں رحیم داد کے ٹھہر کا بندوبست کیا گیا۔

شام کو سردار مراد خاں شاہانی نے کچہری لگائی۔ وہ ایک کرسی پر گردن اونچی کیے نہایت آن بان اور دبدبے سے بیٹھا تھا۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ ہی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ کمرے کے باہر دالان میں دور تک گاؤں کے مزارے اور کمی جمع تھے۔ وہ باری باری سردار کے روبرو حاضر ہوتے دروازے سے داخل ہوتے ہی اونچی آواز سے کہتے۔

"سیں سردار! سلام ولادن' خوش ہو' راضی ہو' بالیں بچیں' جان' مال' ڈھگی خیر اے۔ ہئی تہ سب خیر اے۔"

سردار مراد خاں شاہانی ہولے ہولے نخوت سے گردن ہلا کر جواب دیتا۔ "شکر اے' شکر اے۔"

آنے والے نظریں نیچی کیے سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتے۔ قریب پہنچ کر مراد خاں شاہانی کے پیر چھوتے اور ہاتھ جوڑ کر بلند آواز سے دعائیں دیتے۔

"سیں سدا جیوے۔ سکھی صحت ہووے۔ حیاتی والا ہونویں۔"

دو گھنٹے بعد کچہری برخاست ہو گئی۔ باہر بیٹھے ہوئے جن لوگوں کو سردار کے روبرو حاضر ہونے کا موقع نہیں ملا تھا' وہ دوسرے روز آنے کا ارمان دلوں میں لیے واپس چلے گئے۔ ان میں مرد بھی تھے عورتیں بھی تھیں۔ بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی۔

سردار مراد خاں نے دوسرے روز صبح کچہری لگائی۔ شام کو بھی کچہری لگائی۔ ہر روز ایسا ہی ہوا۔ مزارے اور جاگیر میں بسنے والے دوسرے لوگ سردار کے سامنے حاضری دیتے' اپنے تنازعات اور مسائل' مقدمات کی صورت میں اس کے سامنے پیش کرتے۔ سردار شاہانی منصف کی صورت ہر ایک کا مقدمہ سنتا۔ ان پر غور کرتا۔ ضروری سمجھتا تو اپنے کار دار راودھانی سے بھی مشورہ کر لیتا۔ راودھانی اس کے قریب ہی ذرا پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھا تھا۔ سردار شاہانی کسی مقدمے کو آئندہ پیشی کے لیے ملتوی کر دیتا۔ کسی کا فوری فیصلہ سناتا۔ اس کا ہر فیصلہ قطعی اور آخری ہوتا۔ اس

ی بھی فیصلہ عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔

چار روز تک صبح شام' دونوں وقت یہ سلسلہ چلتا رہا۔ کسی بھی روز کچہری دو گھنٹے سے پہلے ختم نہ ی۔ بھی کبھی صبح سے دوپہر ہو جاتی۔ مگر سردار مراد خاں شام کی کچہری زیادہ طویل نہ ہونے دیتا۔ ھیرا بڑھتے ہی اس کے معمولات کا وقت شروع ہو جاتا' بدن ٹوٹنے لگتا اور ذہن بوجھل ہو جاتا۔ گویا بادہ نوشی کا تقاضا ہوتا اور اس میں تاخیر رفتہ رفتہ اذیت ناک بنتی جاتی۔ اس کی قوت فیصلہ اب دینے لگتی۔ وہ اکتا کر اچانک کھڑا ہو جاتا۔ راودھانی اس کا مزاج شناس تھا۔ وہ اٹھنے سے پہلے سردار شاہانی کی کیفیت بھانپ جاتا اور کچہری برخاست ہونے کا اعلان کر دیتا۔

کچہری کا سلسلہ ختم ہوا تو مراد خاں بستی چانڈیہ کے ایک بڑے زمیں دار اور بارڈر ملٹری پولیس ے ایک کمانڈر کے ہم راہ شکار کھیلنے چلا گیا۔ اس کے ساتھ شکاری کتے تھے اور شکار کا ہانکا کرنے لے ملازم اور مزارے بھی تھے۔ ان کے پاس لمبی لمبی لاٹھیاں' ڈھول اور ٹین کے پیپے تھے۔ کریم ئی راودھانی بھی سردار شاہانی کے ساتھ چلا گیا۔ مگر رحیم داد نہ جا سکا۔ اسے پچھلی رات سے ہلکا ہلکا ار تھا۔ سر میں درد بھی تھا۔ گاؤں کے حکیم نے اسے دوا دی تھی اور آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ یے بھی جب سردار مراد خاں شاہانی شکاریوں کے ہم راہ روانہ ہو رہا تھا تو رحیم داد اس قدر ھال اور مضمحل تھا کہ اس میں شکار پر جانے کی نہ سکت تھی اور نہ کوئی خواہش۔ وہ اپنے کمرے ں بستر پر لیٹا رہا۔ سردار شاہانی شکار پر جانے سے پہلے دیر تک اس کے پاس بیٹھا تسلی اور دل جوئی ی باتیں کرتا رہا۔

مراد خاں دن چڑھے شکار کے لیے روانہ ہوا اور رحیم داد سے دوسرے روز صبح واپس آنے کا دہ کر گیا۔ رحیم داد نے اس روز کھانے کے بجائے صرف گرم دودھ پر گزارہ کیا۔ شام کو بھی وہ پنے کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ مگر اس کی طبیعت میں افاقہ تھا۔ بخار اتر چکا تھا۔ صرف کمزوری باقی تھی۔

وہ بستر پر خاموش لیٹا تھا۔ رات کہر آلود اور سرد تھی۔ گاؤں دھند میں لپٹا خاموش نظر آ رہا تھا۔ کوت لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ دور سے رک رک کر کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آوازیں بھر رہی تھیں۔ رحیم داد ابھی سویا نہیں تھا۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی غنودگی تھی۔ اسی عالم میں اس نے کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ سنی۔ آہٹ قریب آتی گئی' پھر دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔

رحیم داد نے آنکھیں کھول دیں۔ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ رحیم داد نے حیرت سے دیکھا کہ

کرامت کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ اس نے دروازہ بند کیا اور رحیم داد کے روبرو نظریں جھکا
ادب سے کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "کرمے! تو کیسے آیا؟"

"تیکوں پتہ ہی ہے سئیں میں کیوں آیا ہوں۔" اس نے رسان سے کہا۔

رحیم داد خاموش رہا۔ اس نے ہولے سے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی۔ کرامت نے چہرے پر پریشانی کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے اظہار ہمدردی کے طور پر پوچھا۔ "سئیں! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ خیر و عافیت اے؟"

"سر میں درد ہے۔ بخار بھی تھا۔ پر اب نہیں لگتا۔ حکیم نے دوائی دی ہے۔" رحیم داد نے ٹھ
ٹھہر کر بتایا۔

کرامت آگے بڑھا اور سرھانے بیٹھ کر آہستہ آہستہ رحیم داد کا سر دبانے لگا۔ رحیم داد چپ لیٹا رہا۔ سر دباتے دباتے کرامت نے دبی زبان سے پوچھا۔ "سئیں! تو نے مالھان کے بارے میں کیا سوچا؟"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "تو آیا کب؟"

"میں تو جی کل ہی آگیا تھا۔ پر مجھے مالھان لے کر ضرور جانا ہے۔ دے دے تو سویرے سویرے بھکر چلا جاؤں گا۔"

"سردار کو پتہ ہے' تو یہاں ہے؟"

"نہیں سئیں! اسے بالکل پتہ نہیں۔ اسے میرے آنے کا پتہ بھی نہ لگے۔ میں چاہتا ہوں اس کی واپسی سے پہلے ہی یہاں سے چلا جاؤں۔ تو نے دیکھ ہی لیا' اس روز تیرے کمرے میں مجھے دیکھ کر وہ کتنا ناراض ہوا تھا۔ اسے پتہ چل گیا تو سئیں وہ بہت ظلم کرے گا۔ اس کا کھ بہت خطرناک ہے۔"

رحیم داد چند لمحے ٹکٹکی باندھے سامنے کی دیوار تکتا رہا۔ دیوار پر کرامت کا سایہ لیمپ کی روشنی میں دھیرے دھیرے ہل رہا تھا۔ رحیم داد نے لمبی سانس بھری۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری۔

"کرمے! سچ سچ بتا' وہ تیری بھین تو نہیں ہے؟"

"توبہ کرو جی۔" وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "سئیں! تو نے تو حد کر دی۔ وہ میری بھین کیسے ہو سکتی ہے؟ میں تو حویلی کا بہت معمولی نوکر ہوں۔"

"سردار کی رکھیل ہے؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"سئیں! تو کیسی گالہ کر رہا ہے؟" کرامت کے لہجے میں ناگواری کا پہلو نمایاں تھا۔ "تیکوں ایسا ہیں سوچنا چاہیے۔"

"پھر کون ہے وہ؟" رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تو بتاتا کیوں نہیں۔ صاف صاف بات ر۔"

"سئیں! میں صاف صاف بات نہیں کر سکتا۔" وہ عاجزی سے بولا۔

"نہیں بتاتا تو نہ بتا۔" رحیم داد جھنجلا کر بولا۔ "میں تجھے مالھان نہیں دوں گا۔ ہرگز نہیں دوں گا۔" اس نے نظریں اٹھا کر کرامت کے چہرے کی جانب دیکھا اور سیدھی سدھی دھمکی دی۔

"تو نہیں بتائے گا تو مالھان سردار کو دے دوں گا۔"

"سئیں! ایسا نہ کرنا۔" کرامت کا پورا جسم لرز اٹھا۔ رحیم داد نے بھی اس کی شدید پریشانی محسوس کی۔ کرامت نے رحیم داد کا سر دبانا بند کر دیا۔ چند لمحے بت بنا بیٹھا رہا۔ پھر اس کی مدھم آواز ابھری۔ "سئیں! کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔" اس نے مڑ کر دروازے کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کے لہجے میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ پیدا ہو گئی۔ "سئیں! سچی گالہ یہ ہے کہ وہ ملوک زادی ہے۔" کرامت بات کہتے کہتے لحہ بھر کے لیے ٹھٹکا۔ "وہ سردار کی بھین ہے سئیں۔"

رحیم داد نے حیرت سے کہا۔ "تیرا مطلب ہے وہ مراد خاں کی بھین ہے۔" وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ "کرمے! تو سچ کہہ رہا ہے؟"

"ہا سئیں! بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ نہایت اعتماد سے بولا۔ "وہ سردار کی سگی وڈی بھین ہے۔ اس کا ناں حمیدہ ہے۔"

رحیم داد مخمصے میں پڑ گیا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا' رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "تو نے میرے پاس اس کے آنے سے پہلے ہی یہ بات کیوں نہیں بتائی؟"

"سئیں! اس نے منع کر دیا تھا۔ میں اس کے حکم کے خلاف کیسے بول سکتا تھا۔" وہ صفائی پیش کرنے لگا۔ "میں مصیبت دا ماریا غریب نوکر ہوں۔" وہ گڑگڑانے لگا۔ "سردار کو بالکل پتہ نہ چلے۔ ڈی بہت ظالم ہے۔ اسے پتہ چل گیا تو مجھے جان سے مار دے گا۔ تجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔" اس نے گہری سانس بھری۔

"اسی بھین کے چکر میں پہلے بھی دو خون کر چکا ہے۔"

"کون تھے وہ؟" رحیم داد نے سراسیمہ ہو کر پوچھا۔

"ایک تو کوندراں والی کا وڈا زمیں دار ہوتا تھا۔ تیری ہی طرح وہ بھی سردار کا یار تھا۔ حویلی کے

دیرے میں کچھ روز کے لیے مہمان کے طور پر ٹھیرا تھا۔ ایسا ڈاڈھا چنگا جوان تھا، تجھے کیا بتاؤں۔" کرامت رک رک کر بتاتا رہا۔ "دوسرا سردار کا کمدار تھا۔ یہ کریم بخش رادھانی تو پچھلے ہی سال ہوا ہے۔ اس سے پہلے جو کمدار ہوتا تھا، اس کا ناں اکبر خاں نیازی تھا۔ میانوالی کا رہنے والا تھا۔ چٹا روپ رنگ تھا۔ جڑیا جوان تھا۔"

"پولیس شولیس نہیں آئی؟"

"پولیس کیسے آتی سئیں!" کرامت نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پولیسے بھی ادھر آتے ڈرتے ہیں۔" اس کے لہجے سے خوف اور گھبراہٹ کا عنصر ختم ہوتا جارہا تھا۔ "سارے وڈے افسروں سے سردار کی یاری ہے۔ اس کی ساتھ بیٹھ کر روز ہی رات کو پیتے پلاتے ہیں۔"

رحیم داد اس کی باتیں سن کر گہری خاموشی میں ڈوب گیا۔ کرامت نے اسے اس طرح گم صم پایا تو کرید کے پوچھا۔ "سئیں تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"حمیدہ کا گھر والا نہیں ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"گھر والا کیسے ہوسکتا ہے اس کا پرنا ہی کب ہوا۔" اس نے چوکنا نظروں سے ایک بار پھر دروازے کی جانب دیکھا۔ "سردار اس کا پرنا کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

رحیم داد کو یہ سن کر سخت تعجب ہوا کہ حمیدہ کا اب تک بیاہ نہیں ہوا اور شاہانی اس کا بیاہ کرنا ہی نہیں چاہتا۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے یہ راز معلوم کرنے کی غرض سے دریافت کیا۔ "کرے! یہ تو بتا، سردار نے اب تک حمیدہ کا پرنا یا ویاہ کیوں نہیں کیا؟"

"گالھ یہ ہے سئیں۔" کرامت نے بتایا۔ "حمیدہ کا پرنا ہوگیا تو اس کے ساتھ زمیں داری کا حصہ بھی دینا ہوگا۔ اب تو جی اس کی عمر بھی زیادہ ہوگئی۔ اس سے چھوٹی بھین رشیدہ ہے۔ اس کا بھی پرنا نہیں ہوا۔ اس کی عمر بھی پکی ہوتی جارہی ہے۔ وہ بھی سردار سے وڈی ہے۔ سردار سب سے چھوٹا ہے۔ اس کا کوئی بھائی نہیں۔ صرف دو بھینیں ہیں۔ تب ہی تو وہ نہیں چاہتا کہ زمیں داری کم ہوجائے۔ وہ تو زمیں داری بڑھانا چاہتا ہے۔" اس کے ہونٹوں پر زہرخند ہویدا ہوا۔ "ادھر کے تو سارے ہی جگیردار اور وڈے زمیں دار ایسا ہی کرتے ہیں۔ ان کی بھینیں اور بیٹیاں بنا پرنے کے حویلیوں کے کمروں میں بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہوجاتی ہیں اور جی ان کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔"

"نگرانی کی جاتی ہے تو حمیدہ اس طرح رات کو کیسے میرے کمرے میں چلی آئی؟ اسے بلا کر تو ہی لایا تھا نا؟"

"اس کی مرضی جو تھی۔ مجھے اس نے بخشش میں پنج روپے بھی دیئے تھے۔" کرامت نے رحیم

و مطلع کیا۔ "وہ شام کو تجھے حویلی کے چوک میں ٹہلتے دیکھ چکی تھی۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ دیرا ا ہے۔ تیرے سوا نہ کوئی مہمان ہے، نہ نوکر۔" اس کا لہجہ مدھم ہوگیا۔ اس پر سنجیدگی غالب ی۔ "جوانی تو جی بری ہوتی ہے۔ بس وہ چلی آئی۔" اس نے قدرے توقف کیا، پھر مسکرا کر گویا ۔ "ابھی تو جی وہ جوان ہی ہے۔ سوہنڑی بھی ہے۔ ویسے سئیں، ایک گالھ اور بھی ہے۔ اس کا ز ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔ کبھی کبھی تو اتنی چیخیں چلاتی ہے کہ دور دور تک اس کی آواز جاتی ہے۔"

چند ہی روز پہلے حویلی کے زنان خانے سے نسوانی چیخیں رحیم داد نے بھی سنی تھیں اور سردار ار خاں شاہانی انھیں سنتے ہی گھبرایا ہوا اٹھ کر زنان خانے میں چلا گیا تھا۔ ذہن میں اس پس منظر ے ساتھ رحیم داد نے کہا۔ "ایک رات تو میں نے بھی چیخیں سنی تھیں۔ حمیدہ ہی چیخیں چلاتی ہوگی پر ایسا کیوں کرتی ہے؟"

"اس کے تو سئیں چیختے چیختے ہاتھ پیر بھی اکڑ جاتے ہیں۔ منہ سے سفید سفید جھاگ نکلتا ہے۔"

"مرگی تو نہیں ہے اسے؟" رحیم داد کے چہرے پر پریشانی کا غبار بکھر گیا۔ اسے معاً حکیم نذر محمد ئی یاد آگیا جسے مرگی کا دورہ پڑنے کے دوران اس نے شہاری دوآب کے پار ویران ٹیلوں کے رمیان بے دردی سے قتل کردیا تھا۔

"مرگی شرگی بالکل نہیں ہے۔" کرامت نے رحیم داد کی غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کی۔ "اسے تو جی جن تھیون ہے۔ آسیب بتاتے ہیں۔ جب اس پر جن آتا ہے تو اس کی آنکھیں لال نگارا ہوجاتی ہیں۔ ایسی لال لال کہ دیکھ کر خوف آتا ہے۔ اس وکھت تو سئیں اس کی آواز بھی بدل ر ایک دم بھاری ہوجاتی ہے۔ کسی ذال یا رن کی آواز ہی نہیں رہتی۔ لگتا ہے کوئی مرد بول رہا ہے۔ ماں آسیب اتارنے کے لیے کتنے ہی پیروں، فکیروں اور اللہ والوں کو بلا چکی ہے۔ اس کا اپنا اندانی پیر بھی ہے۔" کرامت دھیمے لہجے میں حمیدہ کے بارے میں بتاتا رہا۔ "کسی نے تعویذ دیا، کسی نے جھاڑ پھونک کی۔ ماں اسے زیارتوں اور خنگاہوں پر بھی لے گئی۔ منت بھی مانی۔ پر سئیں! کچھ ہیں ہوا۔ جن اب تک اس پر آتا ہے۔ تب ہی تو سردار بھی اس سے ڈرتا ہے۔" وہ زیر لب سکرایا۔ "ڈرتا تو جی سچ پوچھو وہ اس کے آسیب سے ہے۔ اسے تو کبھی کچھ نہیں کہتا پر اس کے اروں کو ضرور کتل کرادیتا ہے۔ دو تو میرے سامنے ہوئے۔ پہلے بھی ہوچکے ہوں گے۔"

رحیم داد کی سٹی گم ہوگئی۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ آہستہ سے پلنگ سے اترا۔ کونے میں رکھے ہوئے ٹرنک کے پاس گیا۔ اسے کھولا، اندر سے سونے کا کنٹھا نکالا، کرامت کے پاس پہنچا۔ کنٹھا

کرامت کے حوالے کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ”لے‘ یہ حمیدہ کو دے دینا۔“ اس نے تیکھی نظروں سے کرامت کو دیکھا۔ ”کرمے! دیکھ آگے نہ تو میرے پاس کبھی آنا اور نہ حمیدہ کو لانا۔“ اس کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ ”ورنہ سردار مجھے بھی کتل کرادے گا اور تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ رحیم داد کے چہرے پر خوف کا سایہ منڈلانے لگا۔ ”میں نوں اچھی طرح پتہ ہے سردار کتنا ظالم اور خوں خوار ہے۔“

”سیں! تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ایک گالہہ تو تیکوں بتانا بھول ہی گیا۔“ کرامت نے ہاتھ میں دبا ہوا کنٹھا رحیم داد کے سامنے کردیا۔ ”یہ مالھان حمیدہ کی نہیں‘ اس کی بھرجائی کی ہے۔ وہ سرداری ذال ہے۔ تب ہی تو حمیدہ اس مالھان کے لیے اتنی پریشان اور گھبرائی ہوئی ہے۔ اسے لینے تو وہ تیرے پاس ضرور اجاتی۔ لگتا ہے اسے موکع نہیں ملا۔ ویسے اس کی بھرجائی کو مالھان کے بارے میں ابھی تک کچھ پتہ نہیں۔“

رحیم داد نے جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکالے اور کرامت کو دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ رکھ لے اور اب تو ٹر جا۔ سویرے سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے نکل جانا۔ تیرا اس پنڈ میں زیادہ ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں۔“

کرامت نے نوٹ لے کر کنٹھے کے ساتھ ہی اپنے منجھلے کے ڈب میں احتیاط سے رکھے اور رحیم داد سے رخصت ہوتے ہوئے گویا ہوا۔ ”سئیں‘ تو راضی سکھی ہو۔“ وہ آگے بڑھا اور دروازہ کھول کر کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر بت بنا بیٹھا رہا۔ ذرا ہی دیر بعد اس نے سنا‘ کتے زور زور سے بھونک رہے ہیں۔ وہ خوف زدہ ہوگیا۔ جلدی سے دروازے پر پہنچا۔ ایک پٹ کھول کر باہر دیکھا۔ کہرے کی دھند اس قدر گاڑھی تھی کہ اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ حویلی کے احاطے کے باہر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔

رحیم داد نے دروازہ بند کیا اور نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہوگیا۔ وہ خود کو تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ کتے اب حویلی سے کہیں دور بھونک رہے تھے۔ ان کی آوازیں رفتہ رفتہ رات کی خاموشی میں ڈوب کر ختم ہوگئیں مگر رحیم داد دیر تک جاگتا رہا اور مراد خاں کی بہن حمیدہ کے بارے میں سوچتا رہا۔

☆

مراد خاں شاہانی سہ پہر کو شکار سے واپس آگیا۔ وہ کئی خرگوش اور بہت سی مرغابیاں مار کر

تھا۔ واپسی پر وہ سیدھا رحیم داد کے پاس پہنچا۔ اس کا حال معلوم کیا۔ رحیم داد کی طبیعت اب ٹھیک تھی۔ بخار اتر چکا تھا۔ سر میں درد بھی نہیں تھا۔ سردار شاہانی اس کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ کچھ دیر شکار کے بارے میں باتیں کرتا رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔

شام کو سردار مراد خاں نے رحیم داد کو اس کمرے میں بلوایا جسے دربار ہال کہا جاتا تھا۔ ہال میں روشنی بھی زیادہ تھی اور فرش پر قالین بچھا تھا۔ مراد خاں اونچی کرسی پر بیٹھا تھا۔ کرسی پر زربفت کا غلاف چڑھا تھا۔ غلاف کا رنگ اڑ کر پھیکا پڑ گیا تھا۔ مگر اس کے سنہری گل بوٹے تیز روشنی میں جھلملا رہے تھے۔ دو نوکر مستعدی سے کرسی کے پیچھے کھڑے تھے۔

سردار مراد خاں نے اس شام دربار لگایا تھا۔ وہ بارہ کلیوں والا ریشمی پیرہن پہنے ہوئے تھا۔ اس میں سامنے کے رخ پر دوہرے تسمے لگے تھے جنہیں تیاں کہا جاتا ہے۔ پیراہن کے تین تسمے چاندی کے تھے۔ گریبان اور گلے پر کلابتو لگا تھا۔ تکمہ بھی کلابتو کا تھا۔ سر پر بڑی سی ریشمی پگڑی تھی۔ کمر پر سنہرا پٹکا تھا۔ یہ وہ خلعت تھی جو اس کے باپ سردار نجیب خاں شاہانی کو انگریزوں کی خدمات کے صلے میں لاٹ گورنر کی جانب سے عطا کی گئی تھی۔ نوانی اور ڈھانڈلہ سرداروں کو بھی ان کی وفاداری اور خدمات کے صلے میں ایسی ہی خلعتیں دی گئی تھیں۔ یہ خلعتیں جب علاقے کے خیر خواہ اور جاں نثار بلوچ سرداروں کو پیش کی گئی تھیں تو انگریز ڈپٹی کمشنر نے باقاعدہ دربار لگایا تھا۔ وفادار سرداروں کی اعلیٰ خدمات کو سراہا تھا۔ ان کی کارگزاری کی تعریف اور توصیف کی تھی۔ ہر خلعت کے ساتھ ایک قیمتی پیش قبض بھی دیا گیا تھا۔ اس کا دستہ سونے اور چاندی سے مرصع تھا۔

انگریز افسروں کی تقلید میں بلوچ سردار بھی دربار لگاتے تھے‘ خاص طور پر ہر فصل کی کٹائی کے بعد جب وہ اپنے مزارعوں سے طرح طرح کے ٹیکس اور نذرانے وصول کرتے۔ انھوں نے اپنی شان دار حویلیوں میں دربار لگانے کے لیے باقاعدہ ہال تعمیر کرائے تھے۔ یہ دربار ہال کہلاتے تھے۔ مراد خاں کا باپ سردار نجیب خاں بھی اسی ہال میں دربار لگاتا تھا۔ اس موقعے پر وہ لاٹ گورنر کی عطا کی ہوئی خلعت پہنتا تھا۔ پٹکے کے ساتھ پیش قبض لگاتا تھا۔ اس کرسی پر بیٹھتا تھا جس پر اس وقت مراد خاں شاہانی نہایت آن بان اور کروفر سے بیٹھا تھا۔ وہ بھی سنہرے پٹکے کے ساتھ مرصع دستے کا پیش قبض لگائے ہوئے تھا۔ اس کی مونچھیں موم لگا کر حویلی کے نائی نے بڑی مہارت سے چڑھائی تھیں‘ نوکیلی اور سخت بنائی تھیں۔

سردار مراد خاں شاہانی کے کندھوں پر کشمیری شال پڑی تھی۔ وہ بہت وجیہہ اور باوقار نظر آرہا تھا۔ چہرے سے رعب اور دبدبہ ٹپک رہا تھا۔

دربار ہال کے باہر گاؤں کے مزارعے ٹھنڈے فرش پر جگہ جگہ ٹولیوں میں بٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ وہ سرگوشیوں میں آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ ان میں اکثریت بوڑھوں کی تھی۔ وہ خریف کی فصل کی کٹائی کے بعد اپنے بیٹوں' بیٹیوں' بھائیوں اور بہنوں کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ مگر شادی سے پہلے سردار کی اجازت حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شادی بیاہ نہیں ہو سکتا تھا۔ شادی کی اجازت کے لیے انھیں سردار کو نذرانہ پیش کرنا پڑتا جسے ڈالی کہا جاتا ہے۔ یہ پرنا ٹیکس تھا۔ اس ٹیکس کی شرح فی مربع ایکڑ زیر کاشت رقبے پر تیس روپے مقرر تھی۔ دوسرے ٹیکسوں کے برعکس پرنا ٹیکس کی وصولی غلے کے بجائے نقدی کی صورت میں کی جاتی ہے۔ البتہ کاردار فصل کی کیفیت کے مطابق ٹیکس یا ڈالی کی مقررہ رقم میں کمی بیشی کی سفارش کر سکتا ہے۔ ایسی سفارش سردار عام طور پر منظور کر لیتا ہے۔ علاقے کا ہر جاگیردار اور بڑا زمیں دار پرنا ٹیکس وصول کرنا اپنا حق سمجھتا ہے۔

کریم بخش رادھانی ایک کرسی پر سردار مراد خاں شاہانی کے بائیں طرف بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے چھوٹی سی میز تھی۔ میز پر رجسٹر رکھا تھا۔ پہلے ایک بوڑھا ہال میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ بیوی بھی تھی۔ دونوں کے درمیان ان کی نوجوان بیٹی تھی۔ وہ دوپٹے سے اپنا چہرہ ناک تک چھپائے ہوئے تھی۔ تینوں سہمے ہوئے آگے بڑھے۔ انھوں نے پیشانی تک ہاتھ اٹھا کر سردار کو سلام کیا۔ بیٹی چند قدم آگے بڑھنے کے بعد سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ بوڑھا باپ بھی اس کے ساتھ ہی رک گیا۔ البتہ ماں آگے بڑھتی گئی۔ اس نے سردار مراد خاں شاہانی کی درازی عمر اور ترقی درجات کے لیے گڑگڑا کر روایتی دعائیہ جملے کہے' جھک کر اس کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور الٹے قدموں واپس بیٹی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے واپس آنے کے بعد لڑکی کا باپ آگے بڑھا۔ اس نے بھی سردار کے قدم چھوئے۔ بیوی کی طرح اونچی آواز سے دعائیں دیں۔

"سیں سدا جیوے۔ سکھی صحت ہووے۔ رب راضی ہووے!"

بوڑھے نے جیب سے نوٹ نکالے اور دونوں ہاتھوں پر رکھ کر سردار مراد خاں شاہانی کو ڈالی پیش کی۔ سردار نے نوٹوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر ہٹا لیا۔ بوڑھے نے ٹیکس کی رقم کریم بخش رادھانی کو دے دی۔ اس نے رقم لے کر رجسٹر میں اندراج کر لیا۔ بوڑھا ہاتھ باندھ کر بیوی اور بیٹی کے ساتھ سردار کے روبرو نظریں جھکائے کھڑا رہا۔

سردار مراد خاں شاہانی نے مسکرا کر کہا۔ "راضی باضی ہو۔ دھی کا پرنجن کر۔ بختاور ہووے۔"

یہ سردار کی جانب سے شادی کی اجازت تھی۔

بوڑھے نے خوش ہو کر دونوں ہاتھ اٹھائے اور بلند آواز سے بولا۔ "رب راکھا' اللہ بیلی۔" وہ پیچھے ہٹا اور بیوی اور بیٹی کے ساتھ ہال سے چلا گیا۔

دوسرا آیا۔ وہ ادھیڑ تھا۔ بیٹے کے بیاہ کا طلب گار تھا۔ وہ بھی بیوی اور نوجوان بیٹے کو حسب دستور ساتھ لایا تھا۔ اس نے پرنا ٹیکس ادا کیا۔ اجازت حاصل کی اور سردار کی جان و مال کو دعائیں دیتا رخصت ہو گیا۔

اسی طرح دوسرے بھی بیٹی یا بیٹے کو اور اگر بیوی حیات ہوتی تو اسے بھی ساتھ لاتے۔ سردار شاہانی کی اجازت حاصل کرتے اور خوش و خرم دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوتے۔ چار ایسی عورتیں بھی بیٹی یا بیٹے کے ہم راہ سردار کے روبرو حاضر ہوئیں جن کے شوہر انتقال کر گئے تھے یا بیمار اور معذور تھے یا طلاق دے کر چھوڑ چکے تھے۔ ایسے نوجوان بھی آئے جن کے ماں باپ مر چکے تھے اور وہی اپنے کنبے کے کفیل تھے۔ وہ بہن یا بھائی کے بیاہ کی اجازت لینے سردار کے دربار میں حاضر ہوئے۔ پرنا ٹیکس نذرانے کی صورت میں پیش کیا اور مسکراتے چہروں کے ساتھ دعائیں دیتے واپس گئے۔

رحیم داد خاموش بیٹھا سردار مراد خاں کا طنطنہ اور جاگیردارانہ جاہ و جلال دیکھتا رہا۔ اس نے اس نوجوان کو بھی دربار میں حاضر ہوتے دیکھا جس کا لباس بہت میلا کچیلا اور بوسیدہ تھا۔ دبلا پتلا مریل بدن' ڈاڑھی بڑھی ہوئی' چہرے پر ویرانی برستی ہوئی۔ اس کے ساتھ نوجوان لڑکی تھی۔ وہ ملگجے دوپٹے سے اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھی۔

دونوں ڈرے سہمے لرزتے قدموں سے آگے بڑھے۔ لڑکی چند قدم چل کر دستور کے مطابق رک گئی۔ نوجوان آگے بڑھا' سردار کے قریب پہنچا۔ اس کے قدموں کو ہاتھ لگا کر پیریں پودن کیا۔ سر سے پگڑی اتاری اور سردار کے قدموں پر ڈال دی۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور ہاتھ باندھ کر سردار کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے دوسروں کی طرح سردار کو ڈالی کی رقم پیش نہیں کی تھی۔

سردار مراد خاں نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا' رعب دار لہجے میں ڈپٹ کر بولا۔ "کیا چاہتا ہے؟"

وہ عاجزی سے گویا ہوا۔ "سیں سردار! میں تیرا راجی رعیت ہوں۔ شامت دا مارا ہوں۔ میرے کھیت کھارے دریا کنارے ہیں۔ پچھلی برکھا میں دریا چڑھا۔ ایک رات اچانک زبردست ڈھا آیا۔ گنّا ساری رڑھ فصل' چھل میں بہہ گئی۔ پانی کا ریلا گھر بار' جمع جتھا' سب کچھ بہا لے گیا۔ میرے

پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ رات کے اندھارے میں ڈھا کا پانی تیزی سے داخل ہوا' سب جان بچانے کے لیے جدھر منہ اٹھا ادھر بھاگے۔ جن کو بھاگنے کا رستہ نہ ملا وہ درختوں پر چڑھ گئے۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میری بھین ہے۔ یہ میرے ساتھ کسی نہ طرح نکل آئی۔ اماں اندھی تھی' وہ نہیں آسکی۔" اس نے دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ "بعد میں اس کی لاش دو میل آگے دریا کنارے ملی۔" وہ گڑگڑانے لگا۔ "سئیں! میں مصیبت دا ماریا بالکل تباہ ہو گیا۔"

سردار مراد خاں نے مڑ کر رادھانی کی جانب دیکھا۔ "ٹھیک کہہ رہا ہے یہ؟"

"سئیں! ابھی بتاتا ہوں۔" رادھانی نے سردار سے مہلت مانگی اور نوجوان کی جانب متوجہ ہوا۔ "تیرا ناں کیہ ہے؟"

وہ لکنت سے بولا۔ "سئیں! میرا ناں فرید خاں شاہانی ہے۔"

"یوں کہہ تو فریدا ہے۔" کریم بخش رادھانی نے درشت لہجے میں اس کے نام کی تصحیح کی۔ فریدا نے جھٹ اپنی غلطی تسلیم کرلی' عاجزی سے بولا۔ "ہا سئیں! میں فریدا ہی ہوں۔ میں تو تیرے پاس پہلے بھی آتا رہا ہوں۔"

رادھانی نے فریدا کی بات نظرانداز کرتے ہوئے سردار مراد خاں شاہانی کو مخاطب کیا۔ "سئیں سردار! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کی فصل اور گھربار سیلاب میں برباد ہو گئے۔"

مراد خاں نے سرسری نظر سے فریدا کو دیکھا' بے زاری سے پوچھا۔ "جب تجھے ڈالی نہیں دینی تو یہاں آیا کیوں ہے؟"

"سئیں سردار! میرے کولہ ڈالی دینے کے لیے کچھ نہیں۔ میں سوالی ہوں' اللہ راسی ہوں' تو فیاضی اے۔" فریدا ہاتھ جوڑ کر فریادی ہوا۔ "سئیں میں ابھی ڈالی نہیں دے سکتا۔ ربیع کی واڈھی پر ڈالی کی رکم ادا کر دوں گا۔"

"اس کے پرنے کی تیکوں اتنی جلدی کیوں ہے؟" سردار نے لڑکی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ "پہلے ربیع کی بوائی کر۔ فصل کی واڈی کے بعد ڈالی دینا' تب ہی اس کا پرنا کرنا۔"

"سئیں! تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تیرا کہا سر آنکھوں تے' سرماتھے تے۔" وہ گڑگڑانے لگا۔ "پر میں ربیع کی بوائی کیسے کروں گا۔ میرے تو ڈنگر مویشی بھی چھل کا تیز پانی اپنے ساتھ لے گیا۔" اس نے مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ "سئیں اس کا پرنا کر دوں گا تو اس کا گھوٹ خاوند بوائی کر سکتا ہے۔ اس کے کولہ ایک جوڑی ہل بھی ہے۔ وہ میرا شریکا ہے اور یہ اس کی منگ ہے۔" اس نے نگاہیں نیچی کرلیں۔ "میں نے اس کا منگڑاں کر دیا پر ڈالی نہ دے سکا۔ سئیں! میکوں معافی دے دے۔"

سردار مراد خاں نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

فریدا قدرے تامل کے بعد عاجزی سے گویا ہوا۔ "سئیں اس کا پرنا ہو جائے تو میں لائل پور چلا جاؤں گا۔ وہاں کسی کارخانے میں لگ جاؤں گا۔ میرا ایک سکا ملیر وہاں مزدوری کرتا ہے۔ اس نے مجھے لائل پور آنے کو کہا ہے۔"

"فریدے! تو اتنی غریبی میں اس کا پرنا کیسے کرے گا؟ اس کے لیے کچھ نہ کچھ رکم تو چاہیے ہو گی۔" مراد خاں شاہانی نے بے نیازی سے کہا۔

"خرچ ہی کیا کرنا ہے سئیں۔ میں نے تو جی فرض ادا کرنا ہے۔" فریدا نے وضاحت کی۔ "دو سو روپے وستی کے سنارے نے ادھار دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اتنی رکم سے کام چل جائے گا۔" وہ ہاتھ جوڑ کر ایک بار پھر گڑگڑانے لگا۔ "سئیں سردار! معافی دے دے۔ میں بہت غریب مسکین ہوں۔" اس نے مڑ کر لڑکی کی جانب دیکھا۔ "اس کا پرنا ہو گیا تو ربیع کی بوائی بھی ہو جائے گی۔ میں بھی محنت مزدوری سے کچھ کمائی کرلوں گا۔ یہ ابھی کنواری ہے' بکر ہے۔ میں اسے گھر پر اکیلا چھوڑ کر کیسے لائل پور جا سکتا ہوں۔ اب تو اماں بھی نہیں رہی۔ میری کھیتی باڑی سب تباہ ہو جائے گی۔" اس نے تڑپ کر دھائی دی۔ "میکوں بچالے سئیں! تو سدا جیوے' رب راضی ہووے۔" وہ فریاد کرتا رہا۔

سردار مراد خاں شاہانی خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ اس کا کاردار کریم بخش رادھانی بھی خاموش تھا۔ مراد خاں نے نگاہیں اٹھا کر لڑکی کی سمت دیکھا۔ وہ دوپٹے کے آنچل سے اپنا چہرہ چھپائے بت بنی کھڑی تھی۔ مراد خاں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہوئی۔ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر پشت پر کھڑے ہوئے ملازم کو مخاطب کیا۔

"جوڑے!" اس نے لڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ "اس کے منہ پر سے ما نجھل بکل تو ہٹا۔"

اللہ بخش جوڑا حکم ملتے ہی لڑکی کے قریب پہنچا۔ لڑکی بے چین ہو کر کسمسائی۔ جوڑا نے اس کی بے چینی اور گھبراہٹ پر مطلق توجہ نہیں دی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور آنچل ہٹا دیا مگر لڑکی کا سر اور سینہ ہنوز دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ لڑکی نے اسے اور ڈھانپ لیا۔

سردار کو لڑکی کی یہ ادا ناگوار گزری۔ اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس نے جوڑا کو ڈانٹا۔ "جوڑے! بوچھن بالکل ہٹا دے۔"

اللہ بخش جوڑا نے حکم کی تعمیل میں مستعدی دکھائی۔ پلو پکڑ کر اس قدر زور سے جھٹکا دیا کہ دوپٹہ لڑکی کے سر سے اتر گیا۔ اس نے دوپٹہ ایک طرف پھینک دیا۔ لڑکی شرم سے سمٹ کر دوہری ہوگئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ چھپالیا۔ گردن اور زیادہ جھکالی۔ اس کی عمر سولہ برس کے لگ بھگ تھی۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ چہرہ بیضوی تھا۔ ناک ستواں' ہونٹ گلابی اور بھرے بھرے تھے۔ دہانا کسی قدر چوڑا' بدن چھریرا اور سڈول تھا۔ میلے کچیلے بوسیدہ لباس کے باوجود دربار ہال کی تیز روشنی میں اس کا نوخیز سراپا دمک رہا تھا۔ وہ خاصی کشش انگیز نظر آرہی تھی۔ اس کا بڑا بھائی فریدا سہا ہوا چپ چاپ کھڑا تھا۔

مراد خاں کو لڑکی کا شرمانا لجانا نہایت شاق گزرا۔ اس نے غصے سے ڈپٹ کر کہا۔ "اکھ اوپر اٹھا۔" مگر لڑکی نے نظریں اونچی نہ کیں۔ گردن جھکائے دم بخود کھڑی رہی۔ سردار مراد خاں شاہانی کے چہرے پر جھنجلاہٹ طاری ہوگئی۔ وہ زور سے دھاڑا۔ "سر اونچا کر۔ ٹھیک سے کھڑی ہو۔" اس دفعہ لڑکی نے ہچکچاتے ہوئے گردن اٹھائی۔ مراد خاں کی جانب بے بسی سے دیکھا اور نظریں جھکالیں۔

مراد خاں نے دیکھا' لڑکی کی آنکھیں بھی خوبصورت اور دل کش ہیں۔ وہ زیر لب مسکرایا۔ چہرے پر چھائی ہوئی خشونت اور برہمی زائل ہوگئی۔ "رنگ روپ سے تو یہ انگوری لگتی ہے۔" اس نے فریدا کی جانب رخ کیا۔ "فریدے! اس کا ناں کیہہ ہے؟"

"سئیں! اس کا ناں حمیدہ ہے۔" فریدا نے سردار کو بتایا۔

رحیم داد نے چونک کر لڑکی کو دیکھا۔ وہ سردار مراد خاں شاہانی کی نہیں' فرید خاں شاہانی کی بہن تھی جو فرید خاں شاہانی نہیں صرف فریدا رہ گیا تھا۔ مراد خاں کا چہرہ بھی متغیر ہوگیا۔ مگر فریدا نے بھی شاید اپنی غلطی محسوس کی۔ وہ ہکلانے لگا۔

"سس سس سئیں! یہ میدہ ہے' میدہ۔ اسے سب میدہ ہی کہتے ہیں۔"

سردار مراد خاں کے چہرے پر چھایا ہوا غبار چھٹ گیا۔ وہ زیر لب مسکراتا رہا۔ اس نے اللہ بخش جوڑا کو مخاطب کیا۔ "جوڑے! میدہ کو اس کا بوچھن دے دے۔"

جوڑا نے فرش پر پڑا ہوا دوپٹہ اٹھایا اور لڑکی کے سر پر ڈال دیا لیکن دوپٹہ پھسل کر نیچے گر گیا۔ میدہ خاموش کھڑی رہی۔ اس نے دوپٹے کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی حیا پر رفتہ رفتہ جھنجلاہٹ حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ ہال میں گہری خاموشی تھی۔ چند لمحے بعد سردار مراد خاں کی گرج دار آواز خاموشی میں ابھری۔

"جوڑے! میدہ کو اندر پہنچا دے۔"

رحیم داد نے دیکھا' فریدا کی بہن میدہ لمحے بھر تک ہونٹ بھینچے خاموش کھڑی رہی۔ پھر اس نے جھک کر اپنا دوپٹہ اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں ستارے جھل ملانے لگے۔ پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے ابھرے اور ٹپ ٹپ رخساروں پر ٹپکنے لگے۔ اس نے میلے کچیلے دوپٹے کے آنچل سے بلکل کر ایک بار پھر اپنا چہرہ چھپالیا۔ جوڑا نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے اس دروازے کی سمت بڑھی جو مراد خاں شاہانی کی خواب گاہ میں کھلتا تھا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹکی' مڑ کر فریدا کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں مگر فریدا نے نظریں موڑ کر سر نیچا کرلیا۔

میدہ آگے بڑھی اور سردار مراد خاں کی خواب گاہ میں داخل ہوگئی۔ مراد خاں نے پلٹ کر کریم بخش رادھانی کی جانب دیکھا۔ نرم لہجے میں گویا ہوا۔ "فریدا نے منگتاں کرن سے پہلے ڈالی نہ دینے کی معافی چاہی تھی' اسے معافی دے دی گئی۔ پر میدہ اب ادھر ہی رہے گی۔ یہ فیصلہ بعد میں ہوگا کہ میدہ کو کب فریدا کے حوالے کیا جائے۔"

"جیسی سئیں کی مرضی۔" رادھانی نے مستعدی سے جواب دیا اور جھک کر رجسٹر میں سردار کے حکم کا اندراج کرلیا۔

سردار مراد خاں نے فریدا کو مخاطب کیا۔ "فریدے!" وہ کھل کر مسکرایا۔ "اب تو راضی باضی ہے۔ اپنے حالات ٹھیک کرلے۔ فیر جب چاہے میدہ کا پرنا کرنا' مکلاوا کرنا' اسے اپنے گھر سے بدا کر کے سسرال ساہورے بھیجنا۔ ڈالی کی رکم فصل کی واڈھی پر ادا کردینا۔" سردار نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"فریدے! جا عیش کر' ماجاں اڑا۔ میری طرف سے تجھے میدہ کے پرنے کی اجازت ہے۔"

فرید خاں شاہانی عرف فریدا چند لمحے بت بنا جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ پھر اس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ وہ آگے بڑھا۔ سردار کے قدموں پر پڑی ہوئی اپنی پگڑی اٹھائی۔ چار پانچ پیچ دے کر اسے سر پر باندھا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر دعائیں دیں۔ "سئیں سردار! تو سدا جیوے' سکھی صحت ہووے' رب راضی ہووے۔"

اس نے نظریں گھما کر اس دروازے کی جانب دیکھا جس میں اس کی بہن اللہ بخش جوڑا کے ساتھ داخل ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند ہوچکا تھا اور جوڑا واپس آکر سردار مراد خاں شاہانی کی پشت پر مستعدی سے کھڑا ہوگیا تھا۔

فریدا ذرا دیر ٹھہر کر الٹے قدموں پیچھے ہٹا' مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا دربار ہال کے صدر

دروازے پر پہنچا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے پشت پر پڑا ہوا پگڑی کا شملہ ایک ہاتھ بڑھا کر پکڑا' چہرے پر لے گیا اور اس سے رک رک کر آنکھوں کو ملنے لگا۔ رحیم داد نے محسوس کیا کہ وہ رو رہا ہے۔

سردار مراد خاں شاہانی اونچی کرسی پر لباس فاخرہ زیب تن کیے نہایت آن بان سے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ جاہ و جلال سے دمک رہا تھا۔ فریدا کا چہرہ مرجھا کر زرد پڑ گیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے بڑھا' دروازہ عبور کیا اور باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

۲۹

ہوں والی میں رحیم داد کے قیام کا نواں روز تھا کہ سویرے سویرے نادر خاں پہنچا۔ رحیم داد رے میں ناشتا کر رہا تھا۔ نادر خاں کو اچانک اپنے روبرو پا کر وہ گھبرا گیا۔ اس نے حیران و پریشان ر پوچھا۔ "نادر! تو یہاں کیسے پہنچ گیا۔ کوئی پریشانی کی گل بات تو نہیں؟" اس کے چہرے سے ثانی ہویدا تھی۔

"نہیں جی! گھبرانے کی کوئی گل نہیں۔" نادر خاں نے مسکرا کر رحیم داد کو مطمئن کرنے کی شش کی۔ "میں تو یہ بتانے آیا تھا کہ کلیم کا معاملہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ میں نے محکمہ دکاری کے دفتر جا کر اپنے سامنے وہ درخواست ہی پھڑوا دی جو تیرے خلاف لگائی گئی تھی اور جس برے کلیم کے بارے میں انکوائری کرنے کے احکامات جاری ہوئے تھے۔ میں نے درخواست ساتھ متعلقہ کاغذات بھی ضائع کروا دیئے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

وہ اپنی کارگزاری پر مسرور نظر آ رہا تھا۔

"یہ تو نے بہت زوردار کام کیا۔" رحیم داد نے بھی مسرت کا اظہار کیا۔ "اس پر خرچ کتنا آیا؟"

"صرف چار سو روپے۔" نادر خاں نے فخر سے گردن اونچی کی۔ "وکیل اسی کام کے دو ہزار مانگتا چوہدری' یہ وکیل تو ایسے ہی چکر چلا کر جیب کاٹتے ہیں۔ میرا تو ان سے بہت معاملہ رہا ہے۔"

ادر خاں ابھی تک رحیم داد کے سامنے کھڑا تھا اور نہایت مستعدی سے اپنی کارگزاری سنا رہا رحیم داد اس کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوا۔ ہنس کر بولا۔ "کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔ آرام سے نہ۔"

نادر خاں کرسی پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔ "محکمہ آبادکاری میں جانے سے کئی عجیب باتوں کا پتہ چلا۔" اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "ایک تو بالکل تعجب انگیز بات کا پتہ چلا۔"

"کون سی ایسی عجیب گل تھی جس پر تجھے اتنا تعجب ہوا؟؟"

"تیں نوں پتہ ہے۔ تیرے خلاف کس نے درخواست لگوائی تھی؟" نادر خاں نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

"وکیل بتاتا تھا' گورداس پور ہی کا کوئی مہاجر ہے جس نے میرا کلیم ختم کرا کے اپنے نام کو ند ہرکشن کی اراضی اور حویلی الاٹ کرانے کے لالچ میں درخواست لگائی تھی۔" رحیم داد نے نادر خاں کو مطلع کیا۔ "یاد پڑتا ہے' وکیل نے اس کا نام محمد بشیر بتایا تھا۔"

"اس کا تو جی صرف نام ہی نام تھا۔" نادر خاں نے ہنس کر کہا۔ "چوہدری! تجھے یہ سن کر بہت اچنبھا ہوگا کہ تیرے خلاف احسان شاہ نے درخواست لگوائی تھی۔"

"تیرا مطلب ہے اپنے شاہ جی نے؟" رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔ "نادر! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ شاہ جی ایسا نہیں کر سکتا۔" اس نے نادر خاں کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "تیں نوں پکا یکین ہے؟؟"

"پہلے تو جی مجھے بھی یکین نہیں آیا۔" نادر نے اسے باور کرایا۔ "پر میں نے درخواست خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ اس پر محمد شفیع گیلانی کا پتہ لکھا تھا۔ دستخط البتہ محمد بشیر کے تھے۔ تیں نوں پتہ ہے محمد شفیع گیلانی کون ہے؟؟"

"میں نے تو اس کا نام پہلی بار سنا ہے۔" رحیم داد نے استفسار کیا۔ "کون ہے یہ محمد شفیع گیلانی؟؟"

"وہ شاہ جی کے پتر حسن شاہ کا سگا سالا ہے۔ لہور میں رہتا ہے۔ اس کی بسیں اور لاریاں چلتی ہیں۔ وڈا ٹرانسپورٹر ہے۔ شاہ جی کا پتر بھی اس کے کاروبار میں ساجھے دار ہے۔"

"سمجھ نہیں آتی' شاہ جی نے ایسا کیوں کیا؟" رحیم داد بدستور تذبذب میں مبتلا تھا۔ اس کے رویئے سے صاف جھلکتا تھا کہ اسے نادر کے بیان پر ابھی تک شبہ ہے۔ رحیم داد نے اس کا برملا اظہار بھی کیا۔ "نادر! تو سچ بول رہا ہے؟"

"بالکل سچ بول رہا ہوں جی! مجھے تو محکمہ آبادکاری والوں نے یہاں تک بتایا کہ اس معاملے میں شاہ جی محکمہ آبادکاری کے افسروں سے کئی بار ملا بھی۔ اسی کے زور دینے پر انکوائری کرانے

آرڈر ہوئے تھے۔"

رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پر شاہ جی نے میرے خلاف یہ کارروائی کیوں کی؟ وہ تو مجھے اپنا یار بیلی کہتا ہے۔ تیں نوں بھی پتہ ہے' وہ مجھ سے کتنا پیار کرتا ہے۔"

"تو نے ٹھیک ہی کہا چوہدری! اس نے ہمیشہ میرے سامنے تیری تعریف کی۔ محبت ہی کا اظہار کیا۔"

ایسا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے اس نے یہ کارروائی میرے خلاف کیوں کی؟ تو نے اس بارے میں کچھ سوچا؟"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے' شاہ جی نے تیرے خلاف یہ کارروائی اللہ وسایا کی دشمنی میں کی ہوگی۔" نادر نے اظہار خیال کیا۔ "اللہ وسایا کا تو نام سنتے ہی آج بھی شاہ جی کے منہ پر جھنجلاہٹ چھا جاتی ہے۔ حالانکہ اب وہ زندہ بھی نہیں ہے۔ اسے مرے ہوئے مدت ہوگئی پر شاہ جی کی نفرت کم نہیں ہوئی۔ وہ اس سے سخت نفرت کرتا ہے۔" نادر نے سوالیہ نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "مجھے تو جی یہی وجہ سمجھ آتی ہے۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے تجھ سے تو اسے کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ جب بھی تیرے بارے میں اس سے بات چھڑی' اس نے ہر بار تجھے اچھے لفظوں سے یاد کیا۔"

"تیرا خیال ٹھیک لگتا ہے۔" رحیم داد نے نادر خاں سے اتفاق کیا۔ "یہی وجہ ہو سکتی ہے۔ اللہ وسایا سے شاہ جی بہت زیادہ خار کھاتا ہے۔" رحیم داد اب کسی قدر مطمئن نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر بکھرا ہوا غبار صاف ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ احسان شاہ کے بارے میں اس کے ذہن میں جو شبہات اور خدشات پیدا ہوئے تھے اب زائل ہو چکے ہیں۔ اس نے سوچا احسان شاہ نے اللہ وسایا سے عداوت کے باعث ہی اس کا کلیم اور الاٹمنٹ منسوخ کرانے کی کوشش کی ہوگی۔ اسے یاد آیا کہ درخواست اس زمانے میں داخل کی گئی تھی جب اللہ وسایا زندہ تھا اور تمام زمیں داری کی دیکھ بھال وہی کرتا تھا۔

رحیم داد اسی سوچ میں غرق تھا۔ نادر خاں نے اسے اس قدر محویت سے سوچتے دیکھا تو خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے دریافت کیا۔ "چوہدری! کس سوچ میں پڑ گیا؟"

رحیم داد نے چونک کر نادر کو دیکھا اور بات کا رخ موڑتے ہوئے دبی زبان سے پوچھا۔ "جمیلہ کا کیا حال چال ہے؟ تو نے چھٹی پر کیڑے مار دوائی چھڑکوا دی تھی اور جمیلہ کو اس کے بارے میں بتا بھی دیا تھا؟"

"وہ تو جی اب پرانی گل ہوگئی۔" نادر خاں نے مسکرا کر بتایا۔ "دوائی تو اسی روز سپرے کرا دی

گئی تھی اور شام ہی کو میں نے اس کے بارے میں زمیں دارنی کو بتا بھی دیا تھا۔"

"اب تو پھٹی پر سونڈی نہیں رہی؟"

"نہیں جی' بالکل نہیں رہی۔ سپرے کے بعد ہی ختم ہو گئی۔" نادر خاں نے جواب دیا۔ "زمیں دارنی نے پھٹی کے بوٹے خود جا کر دیکھے تھے۔"

"تو اس سے ملتا جلتا رہتا ہے؟"

"روز تو جی وہ ملتی نہیں۔ اسے تو سکول ہی سے فرصت نہیں۔ پر مجھے جب بھی موکع ملا' اسے خریف کی واڈھی اور ربیع کی بوائی کے بارے میں ایک ایک بات بتا تا رہا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا وہ زمیں داری میں دلچسپی لے رہی ہے۔"

"نہیں چوہدری! اس پر تو آج کل تاجاں کے ویاہ کی فکر زیادہ سوار نظر آتی ہے۔"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "میرے بارے میں بھی اس نے کوئی گل بات کی۔"

"مجھ سے تو نہیں کی پر میری گھر والی سے اس نے تیرے بارے میں بہت سی باتیں کیں۔" نادر خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔

"کیا کہتی تھی میرے بارے میں؟" رحیم داد نے بے قرار ہو کر دریافت کیا۔ "تیری گھر والی نے تجھے بتایا تو ہو گا۔"

نادر خاں کی تیز نظروں نے رحیم داد کی بے قراری فوراً بھانپ لی۔ اس نے شکوے کے انداز میں کہا۔ "اس نے مجھے ساری ہی باتیں بتائیں پر چوہدری! تو نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔ میں تو تیرا ہی بندہ ہوں۔ مجھے زمیں دارنی سے کیا لینا؟"

رحیم داد پریشان ہو کر بولا۔ "پہلے یہ بتا' جمیلہ نے میرے بارے میں تیری گھر والی کو کیا کیا بتایا؟"

"وہ تجھ سے بہت نراض تھی۔ چوہدری! تو نے اپنی گھر والی اور بچوں کے بارے میں جو جھوٹ بولا تھا اس کا اس نے بہت برا منایا۔"

رحیم داد بلبلا کر رہ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ نادر خاں جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ اگر جمیلہ اس کی بیوی کو یہ بات نہ بتاتی تو اسے ہرگز علم نہ ہوتا۔ اس نے نادر کی جانب نظر اٹھا کر نہیں دیکھا' خاموش بیٹھا رہا۔ نادر بتا تا رہا۔ "اسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ تو چھپ چھپ کر شاہ جی کے پاس جاتا ہے۔ اس کی حویلی میں کئی کئی روز ٹھیرتا ہے۔ وہ شاہ جی سے سخت نفرت کرتی ہے۔ کہتی ہے اللہ وسایا کو احسان شاہ ہی نے کتل کرایا ہے۔"

رحیم داد نے دبی زبان سے پوچھا۔ "اس نے تیری گھر والی سے ایسی بات بھی کہی؟" وہ نادر خاں سے یہ بھی دریافت کرنا چاہتا تھا کہ اس کے بارے میں تو جمیلہ نے کوئی ایسی بات نہیں کہی کہ وہ بھی احسان شاہ کے ساتھ اللہ وسایا کے قتل میں شریک تھا۔ مگر یہ بات اس کی زبان پر آتے آتے رہ گئی۔ اس نے فوراً خود کو سنبھالا' لہجے میں تیکھا پن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "اسے شاہ جی کے بارے میں ایسی بات نہیں سوچنی چاہیے۔ شاہ جی ایسا نہیں کر سکتا۔ پتہ نہیں اسے کیسے ایسا شبہ ہوا۔" احسان شاہ کی حمایت دراصل وہ خود اپنے دفاع میں کر رہا تھا۔

"مجھے تو جی جب اپنی گھر والی سے ان باتوں کا پتہ چلا تو میں بہت پریشان ہوا۔" نادر خاں نے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے کہا۔ "سچی گل پوچھ تو میں نے شاہ جی کے بارے میں زمیں دارنی سے کوئی بات نہیں کی۔ ورنہ وہ مجھ سے بھی نراض ہو جاتی۔ نراض نہ ہوتی تب بھی اس کے دل میں نہ جانے کیسے کیسے شبہات پیدا ہو سکتے تھے۔" اس نے رحیم داد کو مرعوب کرنے کا سیدھا سادا حربہ استعمال کیا۔ "میں نے تو جی صرف تیرے بارے میں اس سے گل بات کی۔ اس کے دل میں تیری طرف سے جو نراضی اور غصہ تھا اسے دور کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔"

"تو نے اس کی نراضی ختم کرا دی؟" رحیم داد نے بے اختیار پوچھا۔

"چوہدری! ایسے معاملے میں نے بہت نمٹائے ہیں۔" نادر خاں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "زمیں دارنی تو زنانی ہی ہے نا۔ میں نے تو جگیرداروں اور وڈے وڈے زمینداروں کے نہ جانے کیسے کیسے الجھے ہوئے جھگڑے نبٹے طے کرائے ہیں۔" بات کہتے کہتے وہ ٹھٹکا۔ رحیم داد کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "چوہدری! میں تجھ سے ایک گل پوچھوں' صاف صاف بتائے گا؟"

"پوچھ' کیا پوچھنا چاہتا ہے؟"

"تو زمیں دارنی سے ویاہ کرنا چاہتا ہے؟" نادر نے رحیم داد کو اور زیادہ مرعوب کرنے کے لیے ہیر پھیر کے بجائے براہ راست سوال کیا۔

رحیم داد انکار نہ کر سکا۔ "میں نے ایسا سوچا تو تھا۔" رحیم داد نے دھیمے لہجے میں بتایا۔ نادر خاں کی توقع کے مطابق وہ خاصا مرعوب نظر آ رہا تھا۔

"نہ بھی بتاتا تب بھی مجھے یہ بات پہلے ہی معلوم ہو گئی تھی۔" نادر خاں اب اس کی شخصیت پر پوری طرح چھا چکا تھا۔

"جمیلہ نے تیری گھر والی کو یہ گل بتائی ہو گی؟" رحیم داد نے دبی زبان سے پوچھا۔

"ہاں جی!" نادر خاں گویا ہوا۔ "ساتھ ہی زمیں دارنی نے یہ بھی بتایا کہ اس نے صاف انکار

کردیا۔" نادر نے اپنا سکہ اچھی طرح جمانے کے لیے سوال کیا۔ "یہی گل ہے نا؟"

رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "نادر! تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" اس کے چہرے پر افسردگی پھیلنے لگی۔

نادر خاں نے اس کی افسردگی کا فوراً اندازہ کرلیا اور اس کی ہم دردی حاصل کرنے کی غرض سے گویا ہوا۔ "چوہدری! پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تو دیکھنا‘ سب ٹھیک ٹھاک ہوجائے گا۔ جو چاہے گا وہی ہوگا۔"

رحیم داد نے مڑ کر کھونٹی پر لٹکی ہوئی اپنی پگڑی دیکھی اور وہ گرہ تلاش کی جو اس نے بھکر میں تک کھے پیر کے مزار پر منت ماننے کے بعد پگڑی کے شملے میں لگائی تھی۔ گرہ ابھی تک موجود تھی۔ رحیم داد اپنی بے چینی چھپانے کی کوشش کے باوجود چھپا نہ سکا۔

"نادر! تو جو کچھ کہہ رہا ہے‘ وہ کیسے ہوگا؟"

نادر خاں اس کی دل جوئی کرتے ہوئے شگفتہ لہجے میں بولا۔ "چوہدری! فکر نہ کر۔ جب تو نے اپنا سمجھ کر مجھے دل کی بات بتا ہی دی تو یہ بھی سن لے‘ زمیں دارنی لہور شہور نہیں جائے گی۔ حویلی ہی میں رہے گی اور تیری بن کر رہے گی۔" اس نے مسکرا کر رحیم داد کا چہرہ دیکھا اور اس کا ردعمل چہرے کے تاثرات سے معلوم کرنے کی کوشش کی۔

رحیم داد خود کو سنبھال نہ سکا۔ جذبات کی رو میں بہہ گیا‘ تڑپ کر بولا۔ "یقین نہیں آتا نادر؟"

"آجائے گا‘ آجائے گا۔" نادر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "پہلے آرام سے میری گل سن لے۔"

"سنا‘ ضرور سنا۔" رحیم داد کی بے قراری بڑھتی گئی۔ "میں یہی تو سننا چاہتا ہوں۔ یہ بتا‘ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ صاف صاف بتا۔"

"سب کچھ بتادوں گا‘ آرام سے سن۔" نادر خاں بے تکلفی سے مسکرایا۔ اسے رحیم داد کو اپنے قابو میں کرنے کا نہایت مناسب موقع ملا تھا۔ اس نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی غرض سے کہا۔ "مجھے گھر والی کے ذریعے ان باتوں کا پتہ چلا تو میں نے اس کی ڈیوٹی لگائی۔ اسے سمجھا بجھا کر تیار کیا کہ تیری طرف سے زمیں دارنی کے دل میں جو میل پیدا ہوگیا ہے اسے دور کرنے کی کوشش کرے۔" نادر خاں نے اپنے کارگزاری کی روداد ٹھہر ٹھہر کر سنانا شروع کی۔ "میں نے اسے کہا کہ زمیں دارنی کو سمجھائے کہ چوہدری سیدھا سادا نیک بندہ ہے۔ احسان شاہ کے بہکانے اور پھسلانے میں آگیا۔ میں نے گھر والی سے یہ بھی کہا کہ زمیں دارنی کے سامنے تیری تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ شاہ جی کو برا بھلا بھی کہتی رہے‘ اس کے بارے میں کڑوی گلاں کرے۔"

"یہ تو نے ٹھیک نہیں کیا۔" رحیم داد کو اس کی بات پسند نہیں آئی۔ "شاہ جی کو پتہ چل گیا تو بہت راض ہوگا۔ میں اس سے بگاڑ کرنا نہیں چاہتا۔"

"چوہدری! تو کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہا ہے۔ شاہ جی کو پتہ ہی کیسے چلے گا۔ زمیں دارنی تو اسے تانے سے رہی۔" نادر نے رحیم داد کو بزرگوں کے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔ "یہ تو تجھے بھی پتہ ہے زمیں دارنی کو شاہ جی سے کتنی نفرت اور گھن ہے۔ جب کسی سے سخت نفرت اور گھن ہوتی ہے تو اس کی برائی سن کر خوشی ہوتی ہے‘ مزا آتا ہے۔ شاہ جی کو برا بھلا کہہ کر ہی میری گھر والی زمیں دارنی کی ہم دردی اور اعتماد حاصل کرسکتی ہے اور تیرے بارے میں اس کی بدگمانی دور کرا سکتی ہے۔" نادر خاں کھل کر مسکرایا۔ "نتیجہ وہی نکلا جو میں نے سوچا تھا۔"

"کیا نتیجہ نکلا؟" رحیم داد نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"ہوا یہ کہ پہلے جب میری گھر والی تیری تعریف کرتی تو زمیں دارنی کے ماتھے پر بل پڑ جاتے۔ منہ بگاڑ کر اسے کہتی۔ جنت! تو چوہدری کو نہیں جانتی۔ وہ بھلا بندہ نہیں ہے۔ یہ بات میری گھر والی نے مجھے کئی بار بتائی۔"

"پر تو کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔" رحیم داد نے مداخلت کی۔

"آرام سے پہلے پوری گل سن لے۔" نادر خاں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ "ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ تیری تعریف سن کر پہلے تو زمیں دارنی خوش نہیں ہوئی تھی۔ پر جب گھر والی نے میری ہدایت پر شاہ جی کو برا بھلا کہنا شروع کیا تو وہ رفتہ رفتہ بدلنے لگی۔ تیرے بارے میں تعریف کے بول سن کر چپ ہوجاتی۔ اس کے ماتھے پر بل پڑتے نہ منہ بگاڑتی۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "پر اس کے دل کا میل پوری طرح صاف نہیں ہوا تھا۔"

"کیا ابھی تک صاف نہیں ہوا؟" رحیم داد نے بے صبری سے پوچھا۔

"اب تو صاف ہوچکا ہے۔ دراصل اسے شبہ تھا‘ تو شاہ جی کی حویلی میں ٹھیرا ہے۔ اپنے شبے کا اظہار اس نے مجھ سے بھی کیا تھا۔"

"کیا پوچھا تھا اس نے؟"

"ایک روز باتوں باتوں میں اس نے مجھ سے پوچھا۔ سنا ہے چوہدری آج کل احسان شاہ کے پاس ہوتا ہے۔ تجھے پتہ ہے؟ میں اس کی بات سن کر الجھن میں پڑ گیا۔"

"تو نے کیا بتایا؟" رحیم داد نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"میں کیا بتاتا جی۔" نادر خاں نے جواب دیا۔ "وہی کہا جو یہاں آنے سے پہلے تو نے مجھے ہدایت

کی تھی۔ میں نے زمیں دارنی سے کہا چوہدری تو اپنے کلیم کے سلسلے میں ملتان گیا ہے۔ تو نے مجھے یہی تو کہا تھا؟“ نادر نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔

”جمیلہ نے تیری بات مان لی تھی؟“

”نہیں۔“ نادر خاں نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”میری گل سن کر وہ چپ ہو گئی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا اس نے میری بات پر اعتبار نہیں کیا بلکہ برکت دودھی کے ذریعے کھوج لگایا کہ تو شاہ جی کے پنڈ پیراں والہ میں تو نہیں ہے؟“

”پر میں تو پیراں والہ میں تھا ہی نہیں۔ دوسرے ہی روز لہور چلا گیا تھا۔“

”ٹھیک ہی ہوا تو وہاں نہیں تھا۔ ورنہ بہت گڑبڑ ہوتی۔ وہ مجھے بھی جھوٹا فریبی سمجھتی۔“ نادر خاں زیر لب مسکرایا۔ ”میری گل سچی نکلی اور اسے معلوم ہو گیا تو شاہ جی کی حویلی میں نہیں ہے۔ فیر تو میرے ساتھ ٹھیک طرح پیش آنے لگی اور میری گھر والی پر تو اتنی مہربان ہو گئی کہ شام کو گھنٹوں بیٹھ کر اس کے ساتھ باتیں کرتی۔ گھر والی کی طبیعت گڑبڑ ہوتی‘ وہ نہ جاتی تو خود اسے دیکھنے آتی‘ دوائی کھلاتی۔ دیر تک اس کے پاس بیٹھی تسلی دیتی رہتی۔“

رحیم داد نے نادر خاں کی باتوں سے متاثر ہو کر کہا۔ ”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بیمار کوئی بھی پڑے۔ جمیلہ دوائیوں کا بکسا اٹھائے فوراً پہنچ جاتی ہے‘ دوائی دیتی ہے‘ دیکھ بھال کرتی ہے۔ اس معاملے میں اس کا دل بہت کھلا ہوا ہے۔“

”بالکل ایسا ہی ہے۔ میرا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے۔“ اس نے رحیم داد کی تائید کی۔ ”سچ تو یہ ہے چوہدری! وہ جتنی سوہنی ہے‘ من کی بھی اتنی ہی سوہنی ہے۔“ اس نے رحیم داد کا چہرہ دیکھا جو خوشی سے سرخ ہو رہا تھا۔ ”اب یہی دیکھ‘ جب ہفتے بھر سے اوپر ہو گیا اور تو واپس نہیں پہنچا تو وہ پریشان ہو گئی۔“

”تیں نوں کیسے پتہ چلا وہ پریشان ہو گئی؟“

”ہوا یہ کہ ایک روز وہ مجھ سے کہنے لگی۔ نادر! لگتا ہے چوہدری نراض ہو کر یہاں سے چلا گیا۔ اس کا ادھر کوئی بھی تو نہیں۔ کہاں جائے گا؟ کس کے پاس جائے گا؟ فیر یہ زمیں داری بھی تو اسی کی ہے۔ مجھے اس سے کیا لینا؟ یہ باتیں جب اس نے مجھ سے کہیں تو اس کے منہ پر پریشانی صاف نظر آ رہی تھی۔“

”تو سچ کہہ رہا ہے نادر؟“ رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔

”اب میں تجھے صاف صاف ہی بتا دوں۔“

”میں صاف صاف ہی سننا بھی چاہتا ہوں۔“ اس کی بے قراری سارے بندھن توڑ کر سامنے ئی۔

”چوہدری! سچ تو یہ ہے میں اسی کے کہنے پر ادھر آیا ہوں۔“

”تو اس کے کہنے پر ادھر آیا ہے؟“

”ہاں جی‘ بالکل یہی گل ہے۔“ نادر خاں نے رحیم داد کو باور کرایا۔ ”زمیں دارنی نے مجھے کہا کہ ں تجھے منا کر کوٹلہ ہرکشن واپس لے آؤں۔“

”اسے پتہ تھا میں یہاں ہوں؟“ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”اسے کیسے پتہ چلا؟“

”نہیں چوہدری! ایسی کوئی گل نہیں۔“ نادر خاں نے اس کی غلط فہمی رفع کی۔ ”اس کا خیال تھا لتان میں ہو گا اور محکمہ آبادکاری سے تیرا پتہ معلوم ہو جائے گا۔ میں نے کیا بھی ایسا ہی۔ سیدھا ان پہنچا۔ وہاں دو روز ٹھہر کر تیرے کلیم کا معاملہ طے کرایا اور کوٹلہ ہرکشن لوٹنے کی بجائے سیدھا اہ جی کی حویلی پہنچا۔ وہاں شیدا سے پتہ چلا تو مراد خاں شاہانی کے ساتھ بھکر گیا ہے۔ بھکر گیا تو علوم ہوا تو ادھر ہموں والی میں ہے۔ سو میں یہاں آ گیا۔“

”ٹھیک ہی ہوا تو یہاں آ گیا۔ تیرے آنے سے بہت سی باتوں کا پتہ چل گیا ورنہ میں تو پریشان ا۔ سوچ رہا تھا شاہ جی کے پاس جاؤں۔ اس سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد کوٹلہ ہرکشن لوٹنے کا ملہ کروں۔ مجھے جمیلہ کی نراضی نے بہت تنگ کر رکھا تھا۔“

”پر اب تو وہ تجھ سے زرا بھی نراض نہیں۔ جی چاہے تو اور گھوم لے۔ پنڈ پہنچ کر خود دیکھ لینا میں دارنی تجھ سے کس طرح پیش آتی ہے۔ اب وہ بہت بدل چکی ہے۔ تیری طرف سے اس کا دل الکل صاف ہو چکا ہے۔“

”یہ سب تو نے ہی کیا ہے۔“ رحیم داد نے نادر خاں کی کارگزاری سے خوش ہو کر اپنے ردعمل کا ظہار کیا۔ ”سچ پوچھ‘ میں تو سمجھتا تھا‘ جمیلہ کی خفگی اب کبھی ختم نہ ہو گی۔ بات ہی اس طرح بگڑی ی کہ میں چاہتا بھی تو اس کے دل کا میل صاف نہ ہوتا۔“ وہ بے ساختہ مسکرانے لگا۔ ”پر نادر! نے تو کمال ہی کر دیا۔ شاہ جی سچ کہتا ہے‘ نادر تو بہت کام کا بندہ ہے۔“

نادر خاں کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی مگر اس نے انکسار سے کام لیا۔ ”چوہدری! یہ تو کوئی ایسا یچیدہ معاملہ نہیں تھا۔ تیری مہربانی چاہیے۔ آگے اس سے بھی زبردست کام کر کے دکھاؤں گا۔ ھی تیری ملازمت کرتے مجھے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔“

”فکر نہ کر‘ اب تو ہمیشہ میرے پاس رہے گا۔ مجھے تیرے ہی جیسے وفادار اور ہوشیار بندے کی

ضرورت تھی۔" رحیم داد نے نادر خاں کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ "یہ بتا' کیا مجھے تیرے ساتھ واپس چلنا چاہیے؟ ویسے مراد خاں مجھے ابھی جانے نہیں دے گا۔" اس نے اچانک بات کا رخ موڑ دیا۔ "اور ہاں' یہ تو بتا' شاہ جی اپنے پنڈ واپس پہنچ گیا کہ نہیں؟"

"جب میں پیراں والہ میں تھا تب تک وہ نہیں لوٹا تھا۔ شیدا کہتا تھا شاہ جی پیراں والہ واپس آنے سے پہلے کراچی جائے گا۔ وہاں اسے کچھ ضروری کام ہے۔ مجھے تو اس کا لمبا ہی پروگرام لگتا ہے۔"

"ویسے اب شاہ جی سے ملنے اور مشورہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔" رحیم داد نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ "تونے سب کچھ ٹھیک ٹھاک کرادیا۔ اب شاہ جی سے مل کر کیا لینا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے نادر خاں کو دیکھا۔ "سچ پوچھ تو مجھے اب شاہ جی کے پاس جانا بھی نہیں چاہیے۔ جمیلہ کو پتہ چل گیا تو فیر ناراض ہوجائی گی۔ تیری کیا رائے ہے؟"

"چوہدری! تونے ٹھیک ہی سوچا۔ تجھے اب شاہ جی سے ملنے جلنے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔" نادر خاں نے اس کی تائید کرنے کے ساتھ مشورہ بھی دیا۔ "بہتر تو یہی ہے کچھ عرصے کے لیے تو شاہ جی سے دور ہی رہ۔ بلکہ میں بھی اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ دراصل زمیں دارنی کو شاہ جی سے اتنی سخت نفرت ہے کہ میں تجھے کیا بتاؤں۔"

"میں نوں پتہ ہے وہ شاہ جی سے کتنی زبردست نفرت کرتی ہے۔" رحیم داد نے نادر کی رائے سے اتفاق کیا۔ "یہ بتا میں نوں اب کیہہ کرنا ہے۔ تو کہہ تو آج ہی تیرے ساتھ چل سکتا ہوں۔ مراد خاں نے مجھے کید تو کر نہیں رکھا۔ صرف اتنا خیال آتا ہے اس نے بہت محبت سے روکا ہے۔ کل اس نے شکار کا پروگرام بنایا ہے اور میری ہی خاطر بنایا ہے۔ پچھلی بار وہ شکار پر گیا تو میں اچانک بیمار پڑگیا تھا۔ اس دفعہ بھی نہ گیا تو اسے دکھ ہوگا۔"

"ایسی گل ہے تو چوہدری تو ٹھیر جا۔ فکر نہ کر' میں زمیں دارنی کو سمجھا دوں گا۔" نادر خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "ویسے بھی تجھے ابھی واپس نہیں جانا چاہیے۔"

"کیوں نہیں جانا چاہیے؟" رحیم داد بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔

"ابھی نہیں جائے گا تو زمیں دارنی پر تیرا رعب پڑے گا۔ اسے بھی تو پتہ چلنا چاہیے' تو بھی خفا ہوسکتا ہے۔"

"سوچ لے' کہیں معاملہ گڑبڑ نہ ہوجائے۔" رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"پروا نہ کر چوہدری!" نادر خاں نے اسے یقین دلایا۔ "میں تیرے بارے میں زمیں دارنی سے

ہب سے بات کروں گا کہ معاملہ بگڑنے نہ پائے اور تیری آن بھی رہے۔"

ھیک ہے' میں نے ابھی واپس نہیں جانا۔" رحیم داد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں فصل واڈھی سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔"

چوہدری! تو فصل کی واڈھی کی بالکل فکر نہ کر۔ میں نے پوری تیاری کرلی ہے۔ جاتے ہی ع کرادوں گا۔ ویسے تیری مرضی جب چاہے واپس آجانا۔ زمیں داری کا کام تو چل ہی رہا ہے۔ ایسا ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے دیکھے گا تو بہت خوش ہوگا۔"

"میں نوں پتہ ہے' تیری مینجری میں کام بالکل ٹھیک ٹھاک چل رہا ہوگا۔"

نادر خاں نے رحیم داد کو اس قدر مہربان پایا تو خوش ہوا' اپنی کارگزاری اور زیادہ جوش و خروش سنانے لگا۔ ربیع کی بوائی' خریف کی کٹائی اور کپاس کی چنائی کے بارے میں ایک ایک تفصیل نے لگا۔ دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ سورج چڑھ کر آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا۔ نادر ں سے باتیں کرنے کے بعد رحیم داد اتنا مسرور اور مطمئن ہوا کہ دوپہر کا کھانا اس نے نادر کو اپنے تھ بٹھا کر کھلایا۔

نادر خاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ اس نے رحیم داد سے اجازت لی اور کوٹلہ ہرکشن جانے کے لیے ں والی سے بھکر کی جانب روانہ ہوگیا۔

☆

رحیم داد بستر پر لیٹ گیا مگر سویا نہیں۔ گھنٹے سوا گھنٹے بعد وہ کمرے سے نکلا اور ڈیرے سے حویلی پھاٹک کی جانب چلا۔ اس نے دیکھا' دالان کی سیڑھیوں پر دھوپ میں حمیدہ بیٹھی ہے جسے سب بہ کہتے تھے۔ وہ اس وقت چھینٹ کا گھگرا اور چست آستینوں والا سرخ رنگ کا لنڈا چولا پہنے ا۔ چولے کے گلے پر سیاہ اور سبز دھاگے کی خوش نما کشیدہ کاری تھی۔ شانوں پر لہریا چندری پڑی ا۔ اس کا لباس نیا اور خوش رنگ تھا۔

حمیدہ کے گیلے بال دیکھ کر رحیم داد کو اندازہ ہوگیا کہ اس نے کچھ ہی دیر پہلے غسل کیا ہے۔ اس ے چہرے پر نکھار تھا۔ دھوپ سے رخسار سرخ پڑگئے تھے۔ وہ خوب رو اور دل کش نظر آرہی ا۔ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی پشت پر سلمڑی تھی۔ وہ لکڑی کی کنگھی سے میدہ کے یلے بال آہستہ آہستہ سلجھا رہی تھی' سنوار رہی تھی۔

سلمڑی کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ رنگ سانولا تھا مگر نقش و نگار تیکھے اور سبک تھے۔ آنکھیں بڑی اور خوب صورت تھیں۔ ان میں کاجل لگا تھا۔ پوپٹ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ہر وقت

خوب بنی ٹھنی رہتی تھی۔ مزاج میں ابھی تک شوخی تھی، لگاوٹ اور عشوہ طرازی تھی۔ چلتی تو بدن کا ایک ایک عضو بولتا تھا، چھلکتا تھا۔ اسے اپنی دل کشی اور رعنائی کا پورا پورا احساس تھا۔ وہ خود کو ہر پہلو سے کشش انگیز بنا کر رکھتی بھی تھی۔ اپنے تین بچوں کے ساتھ حویلی کے عقبی حصے میں رہتی تھی۔ وہ مراد خاں شاہانی کی منہ چڑھی خادمہ تھی۔ حویلی میں مزارعوں اور کمیوں کی جو نوجوان لڑکیاں اور بیویاں، سردار مراد خاں شاہانی کا عشرت کدہ آباد کرنے کے لیے اٹھا کر لائی جاتیں سلھڑی ان کی دیکھ بھال کرتی اور کڑی نگرانی کا فرض انجام دیتی۔ انھیں بنا سنوار کر سردار کی خواب گاہ میں پہنچانا بھی اسی کے ذمے تھا۔

رحیم داد نے اپنے قیام کے دوران سلھڑی کے شوہر کو کبھی حویلی میں نہیں دیکھا۔ نہ معلوم وہ کون تھا؟ رحیم داد کو اس کے بارے میں مطلق علم نہ تھا۔ اس نے حویلی کے کسی ملازم سے سلھڑی کے بارے میں اور نہ ہی اس کے شوہر کے متعلق پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کی۔ البتہ وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ مراد خاں اس پر بہت زیادہ مہربان ہے اور مکمل اعتماد بھی کرتا ہے۔

قدموں کی آہٹ سن کر میدہ نے نظریں اٹھائیں۔ رحیم داد کو دیکھا مگر جھٹ گردن جھکالی۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ سلھڑی نے بھی مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ایک خاص ادا سے مسکرائی اور اونچی آواز سے سلام کیا۔ ”سئیں چوہدری! سلام ولادن۔ سب خیر اے، تکڑا اے، راضی اے، خوش اے!!“

رحیم داد نے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔ ”شکر اے!“

میدہ نے ایک بار پھر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ ”اس کی آنکھیں بجھی بجھی تھیں۔ ان میں ویرانی تھی۔ رحیم داد نے اس کی افسردگی محسوس کی۔ مگر چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔ نہ رکا نہ بات کی۔ مراد خاں شاہانی سویرے سویرے جھوک مٹھو بندہ چلا گیا تھا۔ کریم بخش رادھانی بھی اس کے ہم راہ تھا۔ دونوں ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔

رحیم داد حویلی سے باہر نکلا۔ پھاٹک پر خانن بندوق سنبھالے بیٹھا تھا۔ وہ حویلی کا پرانا پہرے دار تھا۔ خانن نے رحیم داد کو دیکھا تو جھٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے رحیم داد کو سلام کیا۔ رحیم داد نے گردن ہلا کر جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

وہ ٹہلتا ہوا گاؤں کی جانب بڑھا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ اس نے دیکھا، حویلی کے احاطے کی اونچی چار دیواری سے کچھ فاصلے پر نیم کے ایک گھنے درخت کے نیچے میدہ کا بڑا بھائی فریدا خاموش اور دکھی ہوا کھڑا ہے۔ اس کی حجامت اور بڑھ گئی تھی۔ سر کے بال خشک اور میلے چیکٹ ہو گئے تھے۔ [illegible] بڑی تھی، چہرہ اجاڑ اور بے رونق تھا۔

رحیم داد آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھا۔ اسے فریدا سے ہم دردی تھی۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ حال احوال معلوم کرنا چاہتا تھا۔ فریدا نے اسے اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا تو فوراً ہاتھ اٹھا کر سلام کیا، دعائیں دیں۔ ”سئیں سدا جیویں، سئیں سکھی صحت ہو ویں۔“

رحیم داد نے نزدیک پہنچ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”فریدے، تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟“

”میدہ سے ملنے آیا تھا۔“ اس کے لہجے میں نرمی اور حلاوت تھی۔

”اسے مل لیا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”میدہ ادھر حویلی میں سلھڑی کے ساتھ دھوپ میں بیٹھی ہے۔ میں ادھر ہی سے آ رہا ہوں۔“

”نہیں سئیں! میں میدہ سے نہیں مل سکتا۔“ اس نے حویلی کے پھاٹک کی سمت ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”ادھر راکھا بیٹھا ہے۔ اس نے نہیں ملنے دیا۔“

رحیم داد نے مڑ کر دیکھا، خانن بندوق سنبھالے پھاٹک کے باہر اللہ بخش جوڑا کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ فریدا نے بھی دونوں کو دیکھا اور رحیم داد کو بتانے لگا۔ ”میں نے راکھے سے منت زاری کی پر وہ نہ مانا۔“ اس کا لہجہ رقت انگیز ہو گیا۔ ”پہلے بھی آیا تھا۔ میدہ سے نہیں مل سکا۔ سئیں! سردار کی اجازت نہیں۔ راکھا یہی بولتا تھا۔“

رحیم داد اس معاملے میں اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ خانن ہرگز مراد خاں کی حکم عدولی نہیں کرے گا۔ رحیم داد کے کہنے پر بھی نہیں۔ وہ بہت سخت گیر تھا اور مراد خاں کے اعتماد کا آدمی تھا۔ ویسے بھی سردار مراد خاں شاہانی کے سامنے سارے نوکر چاکر مجبور اور بے بس تھے، اس کے غیظ و غضب سے ڈرتے تھے۔ اسے اپنے کسی ملازم یا مزارع کی کوئی بات بری لگتی تو غصے میں اس قدر دیوانہ ہو جاتا کہ اپنے شکاری کتے جھنجھوڑنے اور نوچنے کھسوٹنے کے لیے ان پر چھوڑ دیتا۔ ماہوں والی میں اپنے قیام کے دوران وہ کئی بار ایسے ہولناک مناظر دیکھ چکا تھا۔ یہ مظالم دیکھ کر خود بھی سردار شاہانی سے خائف رہتا تھا۔ لہٰذا رحیم داد نے فریدا کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”فریدے! یہ بتا میدہ کب تک حویلی میں رہے گی؟“

”سردار کی مرضی ہے سئیں۔“ فریدا افسردہ لہجے میں بولا۔ ”وہ جب چاہے گا تب ہی میدہ حویلی سے باہر نکلے گی۔ ویسے پرنا ٹیکس کی ڈالی نہ ملنے تک وہ اسے اپنے پاس رکھ ہی سکتا ہے۔ ریت اور [illegible] ہے۔“

"پر سردار نے تو تجھے معافی دے دی تھی۔ میرے سامنے دی تھی۔"

"سیں! تو سمجھا نہیں' معافی تو اس نے میدہ کا منگڑاں کرنے سے پہلے ڈالی نہ دینے کے جرم دی تھی۔" فریدا نے وضاحت کی۔

یہ بتا' سردار چاہے تو ڈالی بالکل معاف کر سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں معاف کر سکتا' بالکل کر سکتا ہے۔" فریدا نے مستعدی سے جواب دیا۔

"وہ سردار ہے' بادشاہ ہے' سب کچھ کر سکتا ہے۔"

"ایسا کر' تو سردار سے مل لے۔" رحیم داد نے فریدا کو مشورہ دیا۔ "منت سماجت کرے گا تو مان جائے گا۔ ڈالی معاف کردے گا اور میدہ کو بھی واپس کردے گا۔"

"ناں سئیں! میں ایسا نہیں کر سکتا۔" فریدا کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ "میں اس کا رعیت ہوں' اس کا مزارع ہوں۔ میں سردار سے کچھ نہیں بول سکتا۔ وہ ناراض ہو جائے گا۔ ناراض ہو گیا تو ڈالی دینے پر بھی میدہ کو واپس نہیں کرے گا۔ کسی اور سردار کے پاس بھیج دے گا اپنے ہی پاس رکھے گا۔ ٹھکا ٹھک بچے جنوائے گا۔ اس کے بعد بھی زاری کرنے پر' منت کرنے اگر واپس کرے گا تو جرمانہ لگا کر زیادہ ہی رقم مانگے گا۔"

"یہ تو نے بالکل نرالی گل سنائی۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"سیں! لگتا ہے تو ادھر پہلی بار آیا ہے۔ تیکوں یہاں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ یہ ہے۔" فریدا کا دبا ہوا غم یکایک ابل پڑا۔ اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ "یہاں اوپر رب دی خدائی ہے اور نیچے سرداروں کی۔" اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "سیں! غریب ہوں' حلیم ہوں' شامت دا ماریا ہوں۔"

رحیم داد اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ چند لمحے سر جھکائے خاموش کھڑا سوچتا رہا' پھر فریدا کا کندھا تھپک کر تسلی دی۔ "فریدے! پریشان نہ ہو۔ میں سردار سے میدہ کے بارے میں بات کرو گا۔ شاید وہ میری بات مان لے اور ڈالی بالکل معاف کر دے۔ تب میدہ جلد ہی تیرے پاس جائے گی۔ تو اس کا ویاہ کرنا۔ میرا مطلب ہے۔" وہ بات کہتے کہتے الجھا۔ "کیا کہتے ہیں اسے 'پرنا ہاں' پرنا کر دینا۔ اس کی منگنی یا منگڑا تو پہلے ہی کر چکا ہے۔"

فریدا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ گڑگڑا کر رحیم داد کو دعائیں دینے لگا۔ "سیں! تو حیاتی ہونویں' رب راضی ہووے' میں صدقے تھیواں۔" وہ گلے میں پڑی ہوئی پگڑی ایک ہاتھ سے کر آنسو پونچھنے لگا۔ "سیں! سردار تیری گالہہ ضرور مان لے گا۔ تو اس کا مہمان

ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ بادشاہ ہے۔"

"فکر نہ کر۔" رحیم داد نے ایک بار پھر اس کا کندھا تھپکا۔ "اب تو ٹر جا۔"

فریدا نے جھک کر رحیم داد کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور چپ چاپ چلا گیا۔ رحیم داد آگے نہ گیا۔ اپس حویلی میں آ گیا۔ ڈیرے میں پہنچا اور کمرے کے سامنے کرسی کھسکا کر دھوپ میں بیٹھ گیا۔

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے مراد خاں آ گیا۔ شام کا اندھیرا پھیلا۔ سردی بڑھی۔ سردار ناہانی اور رحیم داد کمرے میں کرسیوں پر بیٹھے۔ شغل بادہ نوشی شروع ہوا۔ ہموں والی کے قیام کے دران عام طور پر دیسی شراب چلتی جسے مقامی کلال گڑ' آلو یا کھجور سے کشید کرتے تھے۔ اس شام ہی میز پر دیسی شراب کی بوتل تھی مگر کچھ زیادہ ہی تند اور تیز تھی۔ ذائقہ بھی مختلف تھا۔ یہ شراب ھوک مٹھو بندہ میں اسے ایک نوانی زمیں دار نے تحفے کے طور پر پیش کی تھی۔

سردار شاہانی نے گلاس خالی کیا۔ اس میں دوبارہ شراب انڈیلتے ہوئے گویا ہوا۔ "عبداللہ خاں رانی ٹھیک ہی کہتا تھا۔ زوردار چیز ہے' کک مارتی ہے۔"

رحیم داد نے گھونٹ بھرا۔ "ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بہت زوردار لگتی ہے۔"

"تجھے پتہ ہے یہ کیسے تیار کی جاتی ہے؟"

"میں نوں اس بارے میں کیہہ پتہ؟" رحیم داد سادگی سے بولا۔

"تیکوں کچھ بھی پتہ نہیں۔" سردار شاہانی نے ہنس کر کہا۔ "یہ لاہن سے بنتی ہے۔ اسے بنانے کے لیے' بیری' پیپل اور بوہڑ کے درختوں کی چھال مٹی کے کورے گھڑوں میں ڈال کر کچی زمین کھود کے دبا دی جاتی ہے۔ جتنے زیادہ دنوں بعد گھڑا باہر نکالا جاتا ہے' اتنا ہی عمدہ خمیرا اٹھتا ہے۔ اسی کو لاہن کہتے ہیں۔ جس سے بعد میں یہ کشید کی جاتی ہے۔" اس نے گلاس اٹھا کر چسکی لگائی۔ "میں نے تو دس بارھاں سال پرانے لاہن سے کشید کی ہوئی شراب پی ہے۔ بہت زوردار ہوتی ہے۔ یہ بھی پرانے لاہن کی لگتی ہے۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تجھے کیسی لگی؟"

"زبردست ہے۔ ابھی سے چڑھنے لگی۔" رحیم داد نے بڑا گھونٹ بھرا اور گلاس میز پر رکھ دیا۔

"پر لاہن کی تیز دارو کے ساتھ رن بھی تیز اور گرم ہونی چاہیے۔ اس کے بغیر اسے پینے کا مزا نہیں۔" شاہانی نے ہلکا قہقہہ لگایا۔

رحیم داد بھی ہنسنے لگا۔ شاہانی کی بات نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ "شاہانی! تو نے میدہ کو واپس نہیں بھیجا۔ کب تک رکھنے کا ارادہ ہے۔"

"چلی جائے گی' چلی جائے گی۔" مراد خاں نے بے نیازی سے کہا۔ "جلدی کیا ہے۔"

"اب تو اسے اپنے گھر جانے دے۔" رحیم داد نے نرم لہجے میں سفارش کی۔

"کیوں؟" مراد خاں شاہانی نے تیکھی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "تجھے اس سے کیا لینا؟"

رحیم داد نے فریدا سے اپنی ملاقات کا ذکر نہ کیا' چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے آج دوپہرا سے دیکھا تھا۔ بیمار بیمار لگتی ہے۔ ویسے بھی وہ کمزور اور دبلی پتلی ہے۔"

"چوہدری! تو اسے نہیں جانتا۔" سردار نشے کی ترنگ میں جھوم کر بولا۔ "وہ انگوری ہے انگوری۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "انگور کے پکے دانے کی طرح رس بھری۔ تو نے اس کا رنگ روپ دیکھا ہے' سچ بتا' تجھے وہ انگوری نہیں لگتی؟"

"مجھے تو وہ کسی طرف سے انگوری شنگوری نہیں لگتی۔" رحیم داد نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ لہجے میں اور نرمی پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "میں چاہتا ہوں تو اسے واپس بھیج دے۔ اس کی سگائی پہلے ہی ہو چکی ہے۔ میدہ کا منگیدڑ اس کا انتظار کرتا ہو گا۔ اس کا بھرا' فریدا بھی اس کا ویاہ کرنے کو تیار ہے۔"

"تو میدہ کی اس طرح سفارش کیوں کر رہا ہے؟" سردار نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ "بات کیا ہے؟"

"کوئی خاص گل بات نہیں۔" رحیم داد نے فوراً بات بنائی۔ "میدہ کو دیکھا تو سوچا تجھ سے کہوں گا' اسے اپنے گھر جانے دے۔" اس نے لہجے میں عاجزی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "میں تو چاہتا ہوں تو اس کی ڈالی بھی معاف کر دے۔" رحیم داد نے اصرار کیا۔ "معاف کر دے گا ناں؟"

"تو کہتا ہے تو اسے واپس بھیج دوں گا۔ ڈالی بھی معاف کر دوں گا۔" سردار مراد خاں خلاف توقع فوراً رضامند ہو گیا۔ شاید نشہ کچھ زیادہ چڑھ گیا تھا۔ "پر گھر جانے سے پہلے وہ ایک رات تیرے پاس رہے گی اور آج ہی رات رہے گی۔"

"نہیں! تو آج رات بھی اسے اپنے ہی پاس رکھ۔" رحیم داد رضامند نہ ہوا۔

"میری فکر نہ کر چوہدری!" شاہانی لہرا کر بولا۔ "میں نے اپنے لیے آج رات ایک پولانی اٹھوالی ہے۔ بہت گرم رن ہے۔ دن میں سوت سے کپڑا بنتے ہوئے اس کے ہاتھ فافٹ چلتے ہیں پر رات کی نہ پوچھ۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "وہ پہلے بھی ایک بار میرے پاس رہ چکی ہے۔"

"ایسا ہے تو میدہ کو آج ہی رات جانے دے۔" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ "ابھی تو رات زیادہ نہیں گزری۔"

"نہیں' یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ آج رات نہیں جائے گی۔ تیرے پاس رہے گی۔ دیکھ انکار نہ

کرنا۔" وہ نشے کی جھونک میں بڑبڑانے لگا۔ "تو میرا مہمان ہے' میرا یار بیلی ہے۔ میدہ آج رات تیرے پاس نہ رہے' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ذرا سوچ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ نہیں ہو گا۔ ہرگز' ہرگز نہیں ہو گا۔"

رحیم داد نے سردار کی برہمی سے خائف ہو کر خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ سردار مراد خاں شاہانی نے اسی دم سلھڑی کو بلوایا۔ وہ فوراً آ گئی' جیسے شاہانی کے بلاوے کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ اس وقت وہ کچھ زیادہ ہی بن سنور کر آئی تھی۔ آنکھوں میں دنبالہ کاجل تھا' ہونٹوں پر سرخی تھی۔ بال موتے کے پھولوں میں بسے ہوئے کرنے کے تیل سے جگمگا رہے تھے۔ سر پر بسنتی دوپٹہ تھا۔ وہ ریشم کی بسنتی منجھلی بھی باندھے ہوئے تھی' دل ربا اور عشوہ طراز نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد کو بھی وہ بہت اچھی لگی۔ اس کے لیے دھڑکن اور بے قراری بھی محسوس کی۔

سلھڑی کو دیکھتے ہی مراد خاں کی آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے۔ لمحے بھر تک ٹکٹکی باندھے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گلاس اٹھا کر بڑا گھونٹ بھرا اور جھوم کر گویا ہو۔

"جند جانی! آج تو بھری ہوئی بند دک لگ رہی ہے۔ ادھر آ میرے پاس۔"

سلھڑی نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر ترچھی نظروں سے مراد خاں کو دیکھا۔ اس کے انداز میں لگاوٹ تھی۔ بڑی چاہت سے بولی۔ "سئیں! میں صدکے تھیواں۔" وہ آگے بڑی اور مراد خاں کے پہلوے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

شاہانی نے اسے مخاطب کیا۔ "سلھڑی! انگوری کو' کیا نام ہے اس کا؟" نشے کی جھونک میں اسے میدہ کا نام یاد نہیں آیا۔

سلھڑی نے جھٹ بتایا۔ "سئیں! تو میدہ کو تو نہیں پوچھ رہا؟"

"ہاں' ہاں! وہی' بالکل وہی' میدہ' میدہ۔ وہ انگوری ہے نا؟" شاہانی نے سلھڑی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "میدہ کو چوہدری کے کمرے میں پہنچا دے۔ وہ آج رات چوہدری کے پاس رہے گی۔ صبح اسے اپنے گھر بھیج دینا۔ رادھانی سے کہنا۔ اس کی ڈالی بھی میں نے معاف کر دی۔ سن لیا تو نے؟"

"جی سئیں!" سلھڑی نے سردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور ٹھسے سے بولی۔ "پولانی کو تیرے کوٹھے وچہ پہنچا دوں؟"

"پولانی کو گولی مار۔ آج تو ہی میرے پاس رہے گی۔" سردار شاہانی نے سلھڑی کے لیے حکم صادر کیا۔ "اب تو جا' میدہ کو چوہدری کے کمرے میں لے جا۔" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔

”یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ میرا انتظار کر۔ میں جلد ہی تیرے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

سلحڑی کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ آنکھیں مسکرانے لگیں۔ وہ گردن اٹھائے ہولے ہولے قدم بڑھاتی چلی گئی۔ سردار شاہانی نگاہیں اٹھائے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ بائیں بازو مڑ کر اوجھل ہوگئی تو سردار نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چوہدری! اپنی سلحڑی کا بھی جواب نہیں سدا بہار ہے۔ برسوں سے میرے پاس ہے پر اب تک پرانی نہیں ہوئی۔ ہر بار کچھ زیادہ ہی نئی ہو ہے۔ کیا خیال ہے تیرا؟“

رحیم داد صرف مسکرا کر رہ گیا۔ سردار شاہانی نے بھی مزید بات نہیں کی۔ دونوں شراب سے شغل کرتے رہے۔ مراد خاں زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اٹھا اور ڈگمگاتے قدموں سے جھومتا جھامتا آگے بڑھ گیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہوگیا اور شاہانی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

سلحڑی خواب گاہ کے دروازے پر مراد خاں کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی آگے بڑھی اور ہاتھ تھام کر مسکراتے ہوئے سہارا دیا۔ دونوں کھلے دروازے سے اندر چلے گئے۔ رحیم داد ڈیرے کی جانب چل دیا۔ کمرے کے قریب پہنچا۔ دروازہ کھول کر کمرے میں قدم رکھا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ میدہ بستر پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ رحیم داد نے دروازہ بند کیا۔ آگے بڑھا اور اس کے قریب پہنچا۔ میدہ کسمسا کر سکڑنے لگی۔ اس نے نہ گردن اٹھائی نہ رحیم داد کی جانب دیکھا۔ چپ بیٹھی رہی۔

رحیم داد نے اسے مخاطب کیا۔ ”میدہ!“ مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بہت سہمی ہوئی اور مضمحل نظر آرہی تھی۔ رحیم داد نے اس کی پریشانی محسوس کی۔ اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی غرض سے بولا۔ ”فریدا تیرا بھائی ہے نا؟ وہ آج دوپہر حویلی سے باہر مجھے ملا تھا۔“

تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ میدہ نے فوراً نظریں اٹھائیں اور بے قرار ہو کر پوچھا۔ ”فریدا یہاں آیا تھا؟“

”ہاں!“ رحیم داد نے بتایا۔ ”وہ تجھے ملنے آیا تھا۔“

”پر میں نے تو اسے نہیں دیکھا۔ سئیں! وہ کب آیا تھا؟“ اس کی آنکھوں سے بے قراری کے ساتھ ساتھ حیرت بھی جھلک رہی تھی۔

”میں نے کہا نا‘ وہ آج دوپہر کو آیا تھا۔ تو سلحڑی کے ساتھ دھوپ میں بیٹھی تھی۔ تمیں نوں ہے نا۔ میں تیرے اور سلحڑی کے سامنے سے گزرا تھا۔ باہر گیا تو وہ مجھے مل گیا۔“ رحیم داد نے تفصیل بتائی۔ ”پر راکھے نے فریدا کو اندر نہیں آنے دیا۔ وہ حویلی کے اندر نہ آسکا۔ باہر ہی

اسے کیسے دیکھتی؟ وہ تجھے ملے بنا چلا گیا۔“

”ہا سئیں! وہ میکوں کیسے مل سکتا ہے؟“ میدہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”سردار کی اجازت نہیں۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”فریدا کیا کہتا تھا؟ وہ تجھے ملا تھا نا؟“

”تیرے لیے وہ بہت پریشان ہے۔“

”پر اس کے پریشان ہونے سے کیا ہوتا ہے؟“ میدہ کے چہرے پر غم کی بدلی چھا گئی۔ ”سئیں! وہ غریبی مٹھی میں کیا کرسکتا ہے۔ پرنا ٹیکس کی ڈالی دے سکتا تو مجھے مل لیتا۔ اپنے ساتھ بھی لے جاتا۔“

”تیرے سوا یہاں اور بھی نیاریں ہوں گی؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”ہا سئیں!“ میدہ رفتہ رفتہ رحیم داد سے مانوس ہوتی جا رہی تھی۔ ”میری طرح یہاں تین اور بکرکید ہیں۔ ان کا پرنا ماپیئو نے سردار کی اجازت کے بنا چوری سے کردیا تھا۔ ڈالی دینے کو رکم نہیں تھی۔ وہ میرے آنے سے پہلے حویلی میں تھیں۔ انھیں تو پنج چھے مہینے سے بھی اوپر ہوگئے۔ کنڑک دے موسم توں ادھر ہیں۔ اب تک سئیں نہ ان کی ڈالی سردار کو پہنچی اور نہ وہ جا سکیں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”میں بھی نہیں جاسکتی۔ فریدا ڈالی کی رکم کہاں سے لائے گا؟“

”تو فکر نہ کر فریدا کو اب ڈالی نہیں دینی پڑے گی۔“ رحیم داد نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔

”سئیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اسے رحیم داد کی بات پر یقین نہ آیا۔

”ایسے ہی‘ جیسے میں کہہ رہا ہوں۔ تیرا پرنا ٹیکس سردار نے معاف کردیا۔ تو کل سویرے اپنے گھر چلی جائے گی۔“

میدہ کی آنکھوں میں روشنی کے ستارے جگ مگائے مگر جلد ہی ان کا چکا چوند ماند پڑ گئی۔ وہ دل گرفتہ ہو کر بولی۔ ”سردار ایسا نہیں کرسکتا۔ وہ مجھے جانے نہیں دے گا۔ کل رات ہی اس نے مجھے کہا تھا۔“

”کل کی بات چھوڑ۔ سردار نے آج مجھ سے وعدہ کیا ہے۔“

”سئیں! تو سچ بول رہا ہے؟“ میدہ کا چہرہ فرط مسرت سے پھول کی مانند کھل گیا۔ ”سردار نے تجھے خود کہا تھا؟“

”ہاں‘ آج ہی تھوڑی دیر پہلے کہا تھا۔ میں اس کا مہمان ہوں۔ میں نے تیرے بارے میں اسے کہا تو وہ راضی ہوگیا۔“ رحیم داد کھسک کر اور قریب ہوگیا۔ ”اس نے سلحڑی کو بلا کر میرے سامنے

ہی کہہ دیا کہ وہ کل تجھے فریدا کے پاس پہنچا دے۔"

"پر سلھڑی نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔" وہ ہنوز تذبذب میں تھی۔ "سئیں! تو اجازت دے تو میں سلھڑی کے پاس جا کر ابھی پوچھ لوں؟ ذرا دیر بعد لوٹ آؤں گی۔"

"سلھڑی تجھے نہیں ملے گی۔ وہ اس وکت سردار کے کمرے میں ہے۔ وہ تجھے صبح ملے گی اور تجھے تیرے گھر پہنچا دے گی۔"

"فریدے کو بھی اس کا پتہ ہے؟"

"وہ ابھی تو نہیں جانتا۔ کل جب تو اس کے پاس جائے گی تو جان جائے گا۔" رحیم داد نے میدہ کو بتایا۔ "ویسے میں نے اسے دلاسا دے دیا تھا۔"

"سئیں! تیرے ہی کہنے پر سردار نے ایسا کیا ہے؟" میدہ نے پوچھا۔ "تیری باتوں سے ایسا ہی لگتا ہے۔"

رحیم داد نے خوش ہو کر اسے اور مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ "ہاں' میں نے ہی اسے کہا تھا۔ وہ میرا یار ہے' میری بات کیسے نہ مانتا؟"

"سئیں! تو سدا جیویں۔ رب راضی ہووے۔" اس کا چہرہ مسرت سے شگفتہ ہو گیا۔ "سئیں تو کتنا چنگا ہے۔"

"میں تو چنگا ہوں۔" رحیم داد نشے سے جھوم کر بولا۔ "اب تو بھی چنگی بن جا۔" رحیم داد ہنسنے لگا۔ میدہ نے کچھ نہیں کہا۔ اس کا چہرہ شرم سے گلابی پڑ گیا' نظریں جھک گئیں' لانبی لانبی پلکوں کے سائے پھیل گئے۔

رحیم داد سویرے بیدار ہوا۔ میدہ نہ جانے کب کمرے سے جا چکی تھی۔ رحیم داد اٹھا' نہا دھو کر شاہانی کے پاس چلا گیا۔ وہ ناشتے پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں نے ناشتا کیا۔ اسی اثنا میں کریم بخش رادھانی آگیا۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہو کر کمرے سے چلا گیا۔ اب صبح کی کہر کا دھند لکا چھٹ چکا تھا۔ ہر طرف چمکیلی بسنتی دھوپ پھیلی تھی۔

حویلی کے پچھواڑے سے سلھڑی نمودار ہوئی۔ اس کے ہم راہ میدہ تھی۔ اللہ بخش جوڑا دونوں کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ پھاٹک کے قریب پہنچ کر سلھڑی کی آواز سنائی دی۔ "جوڑے!" اس نے میدہ کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے فریدا کے گھر پہنچا دے۔ واپسی پر مجھے بتا دینا۔ دیری نہ کرنا۔"

"جوڑا آگے بڑھا۔ میدہ اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ پھاٹک سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹکی' مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوشی کا اجالا تھا۔ ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔

جیم داد بھی مسکرا دیا۔ میدہ پھاٹک سے باہر چلی گئی۔ رحیم داد اسے دور تک دیکھتا رہا۔

سلھڑی پھاٹک سے واپسی پر رحیم داد کے قریب سے گزری۔ رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ "میدہ اپنے گھر چلی گئی؟"

"ہاں سئیں! بہت راضی باضی تھی۔" سلھڑی نے ٹھٹک کر زیر لب تبسم کے ساتھ کہا۔ "تجھ سے بہت خوش تھی۔ بار بار کہتی تھی' سئیں چوہدری بہت چنگا بندہ ہے۔" اس نے گردن کو خم دے کر ایک خاص ادا سے رحیم داد کو دیکھا۔ "سئیں! تو نے اسے کیوں جانے دیا؟ کچھ دن تو اپنے پاس رکھتا۔ میدہ سوہنڑی ہے اور بھرپور جوان ہے۔"

"پر تو اس سے بھی زیادہ سوہنی اور چنگی ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر شوخی سے اسے چھیڑا۔ "میرا تو جی کرتا تھا۔ رات تو میرے پاس ہوتی۔"

سلھڑی نے رحیم داد کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔ نظریں جھکا کر آہستہ سے بولی۔ "سئیں! تو سردار سے پوچھ لے۔" اس نے دوپٹہ کھینچ کر ہلکا سا گھونگھٹ نکال لیا۔

رحیم داد اس کی اس ادا پر بے قرار ہو گیا۔ وہ کچھ بولنے ہی والا تھا کہ مراد خاں کمرے سے نکلا۔ اس کے پیچھے رادھانی تھا۔ دونوں رحیم داد ہی کی جانب آ رہے تھے۔ سلھڑی نے سردار کو دیکھا تو فوراً آگے بڑھی اور چپ چاپ حویلی کے پچھواڑے چلی گئی۔

مراد خاں قریب آگیا۔ اس نے رحیم داد سے پوچھا۔ "چوہدری! تو تیار ہے نا؟" شکار پر چلنا ہے۔" اس نے مڑ کر رادھانی کی جانب دیکھا۔ "رادھانی جیپ باہر نکال۔ شکار پر چلنے کا بندوبست کر۔" رادھانی حکم ملتے ہی چلا گیا۔

مراد خاں شاہانی دھوپ میں رحیم داد کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس نے مسکرا کر رحیم داد سے وہی بات کہی جو ذرا دیر پہلے سلھڑی کہہ چکی تھی۔ "چوہدری تو نے میدہ کو کیوں جانے دیا؟ میں نے تو سلھڑی سے کہہ دیا تھا' چوہدری کی مرضی ہو تو میدہ کو روک لینا۔"

رادھانی واپس آگیا۔ اس نے مراد خاں کو اطلاع دی کہ شکار پر چلنے کی تیاری مکمل ہو چکی ہے۔ مراد خاں اور رحیم داد آگے بڑھے' پھاٹک سے باہر نکلے اور سامنے کھڑی ہوئی جیپ میں جا کر بیٹھ گئے۔

☆

مراد خاں خود جیپ چلا رہا تھا۔ رحیم داد اس کے برابر بیٹھا تھا۔ پچھلی نشست پر کریم بخش رادھانی اور دو ملازم بیٹھے تھے۔ جیپ میں کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ بندوقیں تھیں۔ کارتوس

اور شکار کا دوسرا ساز و سامان بھی موجود تھا۔ راستہ کچا تھا' جگہ جگہ گڑھے تھے۔ جیپ ہچکولے کھاتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ مراد خاں اسے بہت سنبھال کر چلا رہا تھا۔

جیپ چار میل سے زیادہ فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک بستی کے باہر جا کر ٹھہر گئی۔ یہ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ رادھانی نے شکاری کتوں اور ان کی دیکھ بھال کرنے والے کوتیوں کو شکار کا ہانکا کرنے والوں کے ساتھ رات ہی کو بھیج دیا تھا۔ وہ سب راستے کے کنارے ایک سالے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ ایسی جھونپڑی تھی جس کی دیواروں پر پھوس اور سرکنڈوں کا چھپر تھا۔ چھپر کے نیچے شہتیر کے بجائے اڑیاں جڑی تھیں۔ اڑیاں مثلث کی شکل کی مضبوط لکڑیاں تھیں۔ سالے میں کئی اڑیاں تھیں جن کے درمیان ٹیڑھی ترچھی کڑیاں اور لڑے تھے۔ ان پر بڑا سا چھپر تھا۔ گاؤں میں عام طور پر ایسے ہی سالے نظر آرہے تھے۔

گاؤں سے چند فرلانگ پر دریائے سندھ بہتا تھا۔ دریا کے کنارے دور دور تک جھاڑیاں تھیں۔ جنگل اور اوجھڑ تھے۔ گھنے درختوں کے گنجان جھنجھر بھی تھے۔ انھی جھنجھروں میں جنگلی سور رہتے تھے۔ وہ دن میں جھنجھروں کے اندر دور تک پھیلی ہوئی دلدل اور کیچڑ میں روپوش رہتے۔ رات کی تاریکی پھیلتے ہی ان کے غول کے غول نکلتے اور کھڑی فصلیں تباہ کرتے۔ اس حیثیت سے سور کا شکار زمیں داروں کے لیے مشغلے اور کھیل سے زیادہ ایک بڑی ضرورت بھی تھی۔ یہ فصلوں کی تباہی سے بچانے کی ضرورت تھی۔ سور کا شکار عام طور پر فصلوں کی تیاری کے دنوں میں کثرت سے ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہی دن تھے۔ خریف کی فصل کہیں کٹ چکی تھی' کہیں کٹائی کے لیے تیار کھڑی تھی۔

مراد خاں کی ہدایت پر رادھانی نے شکاری کتوں اور ہانکا کرنے والوں کو جھنجھروں کی جانب پہلے ہی روانہ کردیا تھا۔ آگے آگے کوتی تھے۔ وہ کتوں کی زنجیریں مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے ہانکا کرنے والے گردنوں میں ڈھول ڈالے' ہاتھوں میں ٹین کے پیپے' نیزے اور برچھے سنبھالے چل رہے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے نڈر اور بے باک تھے جن کے پاس صرف لمبے شکاری چاقو یا خنجر تھے۔

اس شکار میں ایسے کتے بڑی تعداد میں تھے جو بل ٹیریر اور ربونی نسل کے کتوں کے باہمی ملاپ کی پیداوار تھے۔ نسلی طور پر یہ دوغلے کتے سور کے شکار میں بہت موثر اور کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔ مراد خاں شاہانی نے سور کے شکار کے لیے ایسے کتوں کی خاص طور پر افزائش نسل کی تھی۔ ان کے دانت اور جبڑے اس قدر مضبوط تھے کہ ایک بار گردن منہ میں آجانے کے بعد سور کے لیے ان کی گرفت سے آزاد ہونا ممکن نہیں تھا۔ یہ کتے دوڑتے بھی تیز تھے' خونخوار اور نڈر بھی تھے۔

مراد خاں اور رحیم داد جیپ کے اندر ہی بیٹھے رہے۔ رادھانی نے تھرماس سے چائے انڈیلی۔ دونوں کو ایک ایک پیالی پیش کی۔ دونوں آہستہ آہستہ چائے پینے لگے۔

جب کوتی اور ہانکا کرنے والے جنگلی درختوں سے ڈھکے ہوئے گنجان جھنجھروں میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہوگئے تو کچھ ہی دیر بعد مراد خاں شاہانی نے دوبارہ جیپ اسٹارٹ کی۔ اب پچھلی نشست پر صرف رادھانی بیٹھا تھا۔ دونوں ملازم بھی ہانکا کرنے والوں کے ساتھ چلے گئے تھے۔ دونوں منجھے ہوئے شکاری تھے۔ وہ اپنے ساتھ اپنی بندوقیں اور کارتوس بھی لے گئے تھے۔ سردار مراد خاں اور رحیم داد کے زانوؤں پر بھی بھری ہوئی بندوقیں رکھی تھیں۔ دونوں جھنجھروں کی جانب دیکھ رہے تھے۔ شکاری کتوں کے بھونکنے کی آوازیں رک رک کر جھنجھروں میں گونج رہی تھیں۔

رادھانی پچھلی نشست پر بندوق سنبھالے بیٹھا تھا۔ سردار مراد خاں اسے شکار پر ضرور ساتھ لے جاتا تھا۔ اس کا نشانہ بہت اچھا تھا۔ ویسے مراد خاں بھی بہت اچھا نشانے باز تھا۔ اس نے کم عمری ہی سے شکار کھیلنا شروع کردیا تھا اور اب تو وہ ماہر شکاری ہوگیا تھا۔ البتہ رحیم داد نے سور کا شکار بہت کم کھیلا تھا۔ لیکن اس کا نشانہ بھی برا نہیں تھا۔

جیپ ہچکولے کھاتی ہوئی ایک اوجھڑ پر آہستہ آہستہ دوڑ رہی تھی۔ یہ اوجھڑ خود رو جنگلی پودوں سے بھرا ہوا دشوار گزار اور دلدلی راستہ تھا۔ جیپ سنبھل سنبھل کر آگے اور آگے بڑھتی گئی۔ آخر ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں اس قدر بہتات سے گھنی جھاڑیاں تھیں کہ ان کے درمیان سے جیپ نہیں گزر سکتی تھی۔ شاہانی نے جیپ روک لی۔ بندوق سنبھالے ہوئے نیچے اترا۔ رحیم داد اور کریم بخش رادھانی بھی باہر آگئے۔ ہر طرف پرہول سناٹا تھا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد سناٹے میں ایک طرف سے ڈھولوں اور پیپوں کی تیز آوازیں ابھریں۔

تینوں جھاڑیوں کے درمیان سے راستہ بناتے ڈھولوں اور پیپوں کی آوازوں کی سمت بڑھے۔ وہ شاخوں سے الجھتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ اب کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آوازیں ابھرنے لگی تھیں۔ مراد خاں شاہانی آگے آگے تھا۔ ایک مقام پر وہ ٹھہر گیا۔ ہاتھ اٹھا کر اس نے رحیم داد اور رادھانی کو بھی ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔

سامنے جھاڑی میں ایک سور دبکا کھڑا تھا۔ مراد خاں نے اپنی چھوٹی رائفل اٹھا کر نشانہ باندھا اور گولی چلا دی۔ گولی سور کی ٹانگ میں لگی۔ وہ زخمی ہو کر جھاڑیاں چیرتا تیزی سے ایک طرف بھاگا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد ایک گھنے درخت کے تنے کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ چوٹ کھا کر وہ زیادہ خونخوار ہوگیا تھا۔ وہ غراتا ہوا اپنے تیز اور نوکیلے دانت نکالے تینوں پر بگولے کی مانند اچانک جھپٹا۔

رادھانی نے فوراً گولی چلائی۔ لیکن نشانہ خطا کر گیا۔ مراد خاں نے جھٹ رائفل اٹھائی۔ مگر وہ اس کی انگلیوں سے پھسل کر نیچے گر گئی۔ سور منہ پھاڑے دانت نکالے بالکل سامنے تھا اور چھ گز کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا۔ مراد خان آگے تھا۔ وہ نہتا بھی تھا اور بالکل اس کی زد پر تھا۔ رحیم داد کے پاس ۱۲ بور کی بندوق تھی۔ اس نے نہایت پھرتی سے بندوق اٹھائی، نشانہ لیا اور جھٹ گولی چلا دی۔ نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھا۔ گولی سور کا ماتھا چیرتی پھاڑتی اندر اتر گئی۔ سور فوراً وہیں ڈھیر ہو گیا۔ لیکن پلک جھپکتے ہی سور کی مادہ نکلی۔ وہ بھی غراتی چیختی دانت نکالے تیزی سے جھپٹی۔ رحیم داد نے اس پر بھی گولی چلا دی۔ اس دفعہ بھی نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھا۔ وہ بھی گولی کھاتے ہی گر کر تڑپنے لگی۔

سور اور اس کی مادہ چند گز دور کیچڑ میں پڑے دم توڑ رہے تھے۔ تینوں چند لمحے انھیں سسکتے اور تڑپتے دیکھتے رہے پھر مراد خاں ہنستا ہوا آگے بڑھا اور نہایت گرم جوشی سے رحیم داد کو اپنے دونوں بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اس کی پیٹھ تھپک کر بولا۔

”چوہدری! تو نے تو آج کمال کر دیا۔ ایسا سچا نشانہ لگایا کہ دل خوش کر دیا۔ مجھے پتہ نہیں تھا تو اتنا زبردست شکاری ہے۔“

رحیم داد کچھ نہیں بولا۔ صرف مسکرا کر رہ گیا۔ لیکن مراد خاں بہت مسرور تھا۔ رادھانی نے بھی رحیم داد کے نشانے کی تعریف کی۔ اسی اثناء میں ہانکا کرنے والے اور دوسرے شکاری بھی گولیوں کی آوازیں سن کر پہنچ گئے۔ مگر شاہانی وہاں نہیں ٹھہرا۔ اس نے جھک کر اپنی رائفل اٹھائی۔ رحیم داد اور رادھانی کے ہم راہ اس طرف بڑھا جس طرف سے کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

تینوں نے چونک کر دیکھا، کچھ فاصلے پر سوروں کا ایک غول جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہا ہے۔ وہ کتوں کے نرغے سے نکل کر بھاگے تھے۔ تینوں نے بھاگتے ہوئے سوروں پر تابڑ توڑ گولیاں چلائیں۔ دو سور فوراً گر کر تڑپنے لگے۔ غول کے بقیہ سور گھنی جھاڑیوں میں گھس کر ان کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ جھک جھک کر ادھر ادھر دیکھنے پر بھی نظر نہیں آئے۔

مراد خاں، رحیم داد اور رادھانی آگے بڑھے۔ گھنی جھاڑیوں سے گزر کر کھلی جگہ پہنچے تو خوف ناک منظر سامنے تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ہانکا کرنے والا ایک شکاری کٹانا خون میں لت پت پڑا تھا۔ تینوں نے جھپاک سے اس کے قریب پہنچے۔ وہ تکلیف سے گردن ادھر ادھر ہلا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک شکاری چاقو دبا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک سور بھی خون میں ڈوبا بے جان پڑا تھا۔ اس کا پیٹ پھٹا ہوا تھا، آنتیں باہر نکل آئی تھیں۔

زخمی کٹانے کا ایک پیر پنڈلی سے ران تک جنگلی سور نے اپنے تیز اور خونخوار دانتوں سے چیر ڈالا تھا۔ زخم نہایت گہرا آیا تھا۔ ٹانگ کی چربی اور ہڈی تک نظر آ رہی تھی۔ خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا۔ اس کے جسم کے نیچے خون ہی خون تھا۔ رحیم داد اسے دیکھ کر لرز گیا۔

مراد خاں نے زخمی کو فوراً پہچان لیا۔ وہ رادھانی سے مخاطب ہوا۔ ”رادھانی! یہ تو سینا ہے۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”بہت دلیر اور زبردست شکاری ہے۔ ایسا زبردست کہ سور تیزی سے دوڑ کر حملہ کرنے کے لیے جھپٹے تو یہ بھاگنے کی بجائے اس سے ٹاکرہ لینے کے لیے دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو جاتا۔ سور عام طور پر ٹانگوں ہی میں گھس کر حملہ کرتا ہے۔ سینا کا یہ کمال ہے کہ جیسے ہی سور ٹانگوں کے بیچ میں گھستا، یہ نہایت پھرتی سے اس کا پچھلا حصہ ٹانگوں سے دبا کر سوار ہو جاتا اور تیزی سے چاقو پیٹ میں گھسیڑ کر اسے چیر پھاڑ ڈالتا۔“

رحیم داد نے حیرت سے کہا۔ ”بہت زور آور اور جی دار لگتا ہے۔“

”میں نے اپنی آنکھوں سے کئی بار اسے اسی دلیری سے سور کا شکار کرتے دیکھا ہے۔“ مراد خاں نے بتایا۔ ”بہت خطرناک انداز میں شکار کرتا ہے۔ میں نے کئی بار منع بھی کیا ہے مگر یہ نہیں مانتا۔“ اس نے مردہ سور کی طرف اشارہ کیا۔ ”لگتا ہے، اس کا شکار بھی سینا ہی نے کیا ہے۔ پر اس بار کچھ چوک ہو گئی۔ سور نے بپھر کر اپنے دانتوں سے پوری ٹانگ چیر ڈالی۔“ اس کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ اس نے رادھانی سے کہا۔ ”رادھانی! خون بہت بہہ گیا۔ اس کی مرہم پٹی کے لیے کسی کو فوراً بلا ورنہ یہ مر جائے گا۔“

رادھانی نے حکم ملتے ہی اونچی اواز سے چیخ چیخ کر ہانکا کرنے والوں کو پکارا۔ ذرا دیر میں کئی مصلی اور کٹانے وہاں پہنچ گئے۔ ایک نے جھٹ پگڑی اتاری اور خون بند کرنے کی غرض سے اسے جلدی جلدی زخم پر لپیٹنے لگا۔ دوسرے بھی زخمی سینا کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ انھوں نے کئی اور پگڑیاں لیں اور زخمی ٹانگ پر لپیٹ دیں۔ خون بند ہو گیا۔ سب نے زخمی کٹانے کو ہاتھوں پر اٹھایا اور ایک طرف بڑھنے لگے۔ سینا اب بے سدھ ہو چکا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ جھولتے ہوئے ہاتھ بے جان نظر آ رہے تھے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔

اس خوفناک حادثے کے باوجود شکار کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر جب دن ڈھلے جھجروں کے گھنے درختوں کے نیچے اندھیرا پھیلنے لگا تو شکار ختم کر دیا گیا۔ مراد خاں جیپ کی جانب بڑھا۔ رحیم داد اور رادھانی اس کے ساتھ تھے۔ ہانکا کرنے والے مراد خاں کے مزارعے اور کمی ہی تھے۔ وہ بیگار پر

لگائے گئے تھے۔ کوتیوں اور ان کے شکاری کتوں کے ساتھ وہ بستی کی طرف چلے گئے۔ جیپ کے قریب پہنچ کر رادھانی نے مراد خاں اور رحیم داد کو تھرماس سے ایک بار پھر چائے پلائی۔ اس دفعہ چائے کے ساتھ پلیٹوں میں بھنا ہوا گوشت اور بسکٹ بھی تھے۔

تینوں جیپ میں سوار ہوئے۔ شاہانی نے جیپ اسٹارٹ کی۔ جیپ اوجھڑ سے نکل کر بستی میں پہنچی۔ مگر شاہانی وہاں نہیں ٹھہرا۔ وہ اس سالمہ کے پاس بھی نہیں رکا جس میں ہانکا کرنے والوں اور کوتیوں کے علاوہ زخمی سینا بھی پڑا تھا۔ شاہانی نے نہ زخمی کا حال پوچھا اور نہ ہی اس کے بارے میں رحیم داد اور رادھانی سے کوئی بات کی۔ ویسے اس کے لیے یہ کوئی نیا یا انوکھا حادثہ نہیں تھا۔ سور کے شکار میں پہلے بھی ایسے کئی واقعات پیش آچکے تھے۔ ان حادثات کے نتیجے میں دو ہانکا کرنے والے زخمی ہو کر ہلاک بھی ہو چکے تھے۔

☆

جیپ ہچکولے کھاتی کچے راستے پر دوڑتی رہی اور جب ہموں والی میں داخل ہوئی تو سورج مغرب کے اندھیرے غار میں اتر چکا تھا۔ اس کی الوداعی کرنیں درختوں کی اونچی اونچی شاخوں پر دھندلی پڑتی جا رہی تھیں۔ کہر میں لپٹی ہوئی سرد شام آہستہ آہستہ فضا میں پھیلتی جا رہی تھی۔ شاہانی اور رحیم داد جیپ سے اتر کر حویلی کے اندر چلے گئے۔ رادھانی باہر ہی ٹھہرا رہا۔

رحیم داد بہت تھک گیا تھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور کرسی پر نڈھال ہو کر نیم دراز ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ملازم نے غسل خانے میں گرم پانی کی بالٹی رکھ دی۔ رحیم داد نے گرم پانی سے غسل کیا۔ اجلے کپڑے پہنے اور حویلی کی بیٹھک میں پہنچ گیا۔ مراد خاں شاہانی ابھی تک نہیں پہنچا تھا مگر رحیم داد کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ شاہانی نہا دھو کر اور صاف ستھرا لباس پہنے چند ہی منٹ بعد آگیا۔ اس کے پہنچتے ہی بوتل اور گلاس بھی آگئے۔ دو بڑی بڑی تھالیوں میں تلے ہوئے مرغ بھی میز پر رکھ دیئے گئے۔ فوراً پینے پلانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

شاہانی نے دو گلاس چڑھانے کے بعد تیسری بار گلاس بھرا اور رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! میں آج زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا۔ بہت تھک گیا ہوں۔" اس نے ہلکا۔ قہقہہ بلند کیا۔ "پولانی میرا انتظار کر رہی ہے۔ ادھر آتے ہوئے میں نے اسے دیکھا تھا۔ ایسی بوڑا اور پوپٹ لگ رہی تھی کہ طبیعت ایک دم پھڑک اٹھی۔ جواب نہیں اس کا۔"

"یہی گل تو کل رات سلھڑی کے بارے میں کہہ رہا تھا۔"

"وہ کچھ اور چیز ہے۔" شاہانی ہنس کر بولا۔ "سچ بتا، ہے کہ نہیں؟"

حیم داد نے نشے میں جھوم کر بے ساختہ کہا۔ "دل کی بات پوچھ تو سلھڑی مجھے بھی پسند ہے۔"

جب ہی آج صبح تو اسے مٹھارنے کی کوشش کر رہا تھا۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "میں تاڑ گیا تھا کہ طبیعت سلھڑی پر آگئی ہے۔ وہ رن ہی ایسی پھڑک دار ہے۔"

تیرے پاس تو پولانی رہے گی۔" دل کی بات رحیم داد کی زبان پر آگئی۔ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ مری تو آج رات خالی ہے۔"

کیا مطلب؟" شاہانی نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ "صاف گالہہ کر۔ تو چاہتا کیا ہے؟"

تیری مرضی جاننا چاہتا ہوں۔" رحیم داد نے شاہانی سے نظریں نہیں ملائیں۔ قاب سے مرغ انگ اٹھا کر گوشت دانتوں سے نوچنے لگا۔

چوہدری! سلھڑی کی گالہہ نہ کر۔" شاہانی اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ "سلھڑی کے معاملے میں ے کئی یار مجھ سے ناراض ہو گئے۔ ڈیرہ غازی خاں کے تمن دار سربلند خاں دریشک سے تو ایسا پیدا ہوا کہ اب تک اس سے بول چال بند ہے۔" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "وہ میری ہے۔ ایسی جند جانی ہے کہ میں اسے کسی کے پاس نہیں جانے دیتا۔ تیکوں پتہ نہیں سولہ سال اوپر ہو گئے، وہ میرے پاس ہے۔ پر اس سے کبھی میرا دل نہیں بھرتا۔ سچ پوچھ تو میں اسی کے ہموں والی آتا ہوں۔ وہ اس حویلی کی جان ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ شاہانی نے ایک اور بڑا گھونٹ بھرا۔ رحیم داد کی جانب مسکرا کر دیکھا۔ ہدری! میں تیرے پاس کسی دوسری پھڑک دار اور پوپٹ رن کو بھجوا دوں گا۔ حویلی میں کئی زور اور سوہنڑی رنان موجود ہیں۔ تیرا جی خوش ہو جائے گا۔" اس نے نشے میں لہرا کر قہقہہ لگایا۔ لر نہ کر۔ اپنی پسند تو مجھ پر چھوڑ دے۔"

"پہلے بھی میں نے کب تجھ سے اپنی پسند کی گل کی۔ سلھڑی کی بات تو ایسے ہی نکل آئی۔" رحیم کا لہجہ دھیما اور بجھا ہوا تھا۔ "تو میری بالکل فکر نہ کر۔ کسی کو میرے پاس بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ا اپنی حویلی میں اکیلا ہی سوتا ہوں۔ مدت ہو گئی اس طرح سوتے ہوئے۔"

"لگتا ہے تو بھی ناراض ہو گیا۔" شاہانی نے رحیم داد کی افسردگی اور دبا دبا احتجاج محسوس کرتے ے کہا۔ "یہ سلھڑی بہت ظالم رن ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیشہ یار دوستوں سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔"

"پر اس معاملے میں مجھ سے تیرا کوئی بگاڑ پیدا نہیں ہو گا۔" رحیم داد نے اسے یقین دلانے کی شش کی۔ "تو میرا یار ہے اور سدا یار رہے گا۔ اول تو میں کسی سے یاری کرتا نہیں اور جب کرتا

ہوں تو جی جان سے کرتا ہوں۔ ابھی تو میرا اور تیرا نیا نیا معاملہ ہے۔" اس کے لہجے میں جوش و خروش پیدا ہوگیا۔ "آگے تو خود دیکھ لے گا۔ میں خالی پیلی گلاں نہیں کرتا۔"

"میرے دل کی بات جاننا چاہتا ہے تو سن لے۔" مراد خاں شاہانی نے ایک ہاتھ سے اپنا سینہ تھپکتے ہوئے کسی قدر جوشیلے لہجے میں کہا۔ "میرا رب جانتا ہے، میں تجھے کتنا چاہتا ہوں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "چوہدری! میرا کوئی بھائی نہیں۔ سچ کہتا ہوں، تجھے اپنے چھوٹے بھائی سماں پیار کرتا ہوں۔ ویسے بھی تو بہت چنگا بندہ ہے۔" اس نے شراب کی چسکی لگائی۔ "اور آج تو تونے کمال ہی کردیا۔" مراد خاں نے حملہ آور سور کا حوالہ دیا۔ "باہر والا مجھ پر کیسا دانت نکال کر جھپٹا تھا۔ تونے دیکھا نہیں، میری رائفل ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھی اور میں بالکل اس کے سامنے تھا۔ تیرے گولی چلانے سے میں بال بال بچ گیا ورنہ میں بھی سینا کی طرح زخمی پڑا ہوتا۔"

"ایسی گل نہ کر۔" رحیم داد نے انکسار سے کام لیا۔ "میں نے کیا کمال دکھایا۔ شکار میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ تو تو پرانا شکاری ہے۔ ایسے حادثے تو نے شکار میں بہت دیکھے ہوں گے۔"

مراد خاں شاہانی نے کچھ نہیں کہا۔ چپ بیٹھا دانتوں سے تلے ہوئے مرغ کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا رہا۔ اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔ خالی گلاس میز پر رکھا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "چوہدری! اب میں چلوں گا۔ تو بھی اپنا گلاس ختم کر۔"

رحیم داد نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور خالی کردیا۔

"چوہدری! تو اپنے کمرے میں جا۔" مراد خاں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "سلھڑی تیرے پاس پہنچ جائے گی۔"

"رہنے دے شاہانی۔" رحیم داد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "سلھڑی کی گل تو پہلے ہی ختم ہوگئی۔"

"بکواس نہ کر۔" سردار شاہانی نے مسکرا کر رحیم داد کو پیار سے ڈانٹا۔ "سلھڑی آج رات تیرے ہی پاس رہے گی۔" وہ نشے سے جھوم کر ڈگمگایا۔ "یوں سمجھ یہ تیرے سچے نشانے کا انعام ہے۔ اب تو جا۔" شاہانی لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رحیم داد بھی بیٹھک سے نکلا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ تھکا ہوا سا کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں بار بار دروازے کی جانب اٹھ جاتیں۔

چند منٹ بعد دروازہ کھلا۔ رحیم داد نے بے تاب ہو کر پہلو بدلا۔ مگر وہ سلھڑی نہیں تھی، ملازم کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے کھانا میز پر رکھ دیا اور دبے قدموں واپس چلا گیا۔ رحیم داد نے کھانا نہیں کھایا۔ اشتہا ہی نہیں تھی۔ اس نے اپنی پگ اتار کر کھونٹی پر لٹکائی۔ جوتے اتارے اور بستر

گیا۔ اس نے رضائی اٹھا کر سینے پر ڈال لی۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ لیکن نہ کوئی آہٹ ئی نہ آواز۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ رحیم داد جاگ رہا تھا اور بستر پر خاموش لیٹا تھا۔ مگر وہ زیادہ ک چین سے نہ لیٹ سکا۔ اس نے کروٹ لی، بے قرار ہو کر اٹھا اور تکیے کے سہارے اونچا ہو کر گیا۔ وقت گزرتا رہا۔ پانچ منٹ گزرے، دس منٹ گزرے، آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ کمرے میں لیمپ ن تھا۔ اس کی زرد زرد روشنی در و دیوار پر پھیلی تھی۔

رحیم داد نے کئی بار بے چینی سے پہلو بدلا پھر پلنگ سے اترا، سلیپر پہنے، لیمپ کی طرف بڑھا، ب گیا، ہاتھ بڑھایا، ٹھٹکا اور ہاتھ کھینچ لیا۔ لیمپ کی لو مدھم نہیں کی، واپس آیا اور بستر کے بجائے پ چاپ ایک بار پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ رات اور سنسان ہوگئی۔

گھنٹہ بھر سے زیادہ وقت گزر گیا۔ دروازہ بدستور بھڑا ہوا تھا۔ رحیم داد نے گہری سانس بھری، اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں مگر سویا نہیں۔ اسی عالم میں اس نے کمرے باہر چاپ سنی۔ چاپ دھیرے دھیرے قریب آ گئی۔ دروازہ چرچرایا۔ رحیم داد نے آنکھیں ل دیں۔ دیکھا، سلھڑی دہلیز پر کھڑی ہے۔ اس نے زیرِ لب مسکرا کر رحیم داد پر ایک نظر ڈالی، دروازہ بند کیا اور کنڈی چڑھا دی۔ وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی ہوئی رحیم داد کی جانب بڑھی اس کے روبرو تیر کے مانند تن کر کھڑی ہوگئی۔ وہ سرخ دوشالہ اوڑھے ہوئے تھی۔ چولا ڈھیلا الا اور سفید تھا مگر منجھلی کے بجائے وہ گھگھرا پہنے ہوئے تھی جس پر سرخ اور سیاہ گل بوٹے ۔ آنکھوں میں دنبالہ کاجل تھا۔ ناک میں بڑا سا کوکا تھا۔ ہونٹ گہرے گلابی تھے۔ چہرے پر نکھار شگفتگی تھی۔ وہ خوب سج دھج کے ساتھ آئی تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ابھی ابھی مار کیا ہے۔ رحیم داد نے اسے بے قرار نظروں سے دیکھا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ وہ اٹھ کر گیا، مسکرا کر بولا۔ "کھڑی کیوں ہے؟ بیٹھ جا سلھڑی۔"

"تونے مجھے بلا ہی لیا۔" سلھڑی نے گردن ترچھی کی اور مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ "سئیں ہدری! تو بہت تکھا اور زور آور ہے۔" اس نے ایک ہاتھ سے اپنے گھگھرے کا گھیر سنبھالا۔ لچکتی کھاتی آگے بڑھی اور پاؤں لٹکا کر بستر پر بیٹھ گئی۔ چند لمحے خاموش رہی پھر مسکراتے ہوئے بڑے ے بولی۔ "سردار مجھے کسی کے پاس جانے نہیں دیتا۔ تیری گالہہ اس نے کیسے مان لی۔ یہ بھید نہیں آیا۔"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بتا، تونے دیر کیوں لگا دی؟" اس نے ی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "سردار نے روک لیا ہوگا؟"

"نا سئیں!" وہ گردن ہلا کر بولی۔ "وہ تو پولانی کے پاس ہے۔"

"پر وہ تجھے چاہتا بہت ہے۔" رحیم داد نے اسے چھیڑا۔ "تجھ میں ایسی کیا بات ہے جو وہ تجھ اتنا چاہتا ہے؟"

"پتہ نہیں سئیں!" سلھڑی نے نظریں جھکا کر شرمانے کی کوشش کی۔ "پر میں بھی اسے اتنا پیار کرتی ہوں۔ برسوں سے اس کے ساتھ ہوں۔" اس نے گردن اونچی کی۔ "اس حویلی میں مجھے بیس سال تو ہو گئے ہوں گے۔"

"بیس سال۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔ "جب تو یہاں آئی ہو گی شاہانی تب چھوہرا رہا ہو گا۔ تو اس سے عمر میں زیادہ تو نہیں لگتی۔"

"نا سئیں! میں اس سے کچھ زیادہ ہی ہوں گی۔" سلھڑی انکار نہ کر سکی۔ "سردار کو بھی اس کا پتہ ہے۔" رحیم داد کا تجسس اور بڑھا۔ اس نے کرید کر پوچھا۔ "صاف بتا۔ تیری گل سمجھ نہیں آئی۔"

"تو سمجھ بھی نہیں سکتا۔" وہ شوخی سے مسکرائی۔ "تب وڈا سردار نجیب خاں زندہ تھا۔" سلھڑی نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "میں پہلے اسی کے پاس ہوتی تھی۔ وہ بہت ڈاڈھا اور زور آور سردار تھا۔ کھرا بلوچ۔ یہ وڈی اس کی داڑھی تھی۔" سلھڑی نے ہاتھ پھیلا کر بتایا۔ "تیری داڑھی اس کے آگے کچھ نہیں۔ وہ بہت رن رسیا تھا۔ جو سوہنڑی اور پوپٹ رن نظر آتی اٹھوا کر حویلی میں ڈال لیتا۔ روز ہی نئی نویلی رن اٹھواتا تھا۔"

"تجھے بھی اس نے اٹھوایا تھا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ "میرا مطلب ہے، مراد خاں کے پیو سردار نجیب خاں نے تجھے اٹھوا کر اپنے پاس رکھا ہوا تھا؟"

"نا سئیں!" سلھڑی نے فوراً وضاحت کی۔ "اس کا مرن ہو گیا۔ مجھے اس کے پیچھے جھوٹ نہیں بولنا۔ مجھے تو منصور خاں ڈھانڈلے نے اٹھوایا تھا۔ وہ بھی بیٹ کا بہت وڈا سردار تھا۔ میں ان دنوں بہل میں ہوتی تھی۔ میرا پرنا ہو چکا تھا۔ میرا گھر والا تھا۔ اس کا ناں ہاتو تھا۔ وہ جتوال تھا۔ اپنے اٹھ پر مال اسباب لاد کر دور دور لے جاتا تھا۔ اس کے پاس دو اٹھ تھے۔ ٹھیک ٹھاک گزر بسر ہوتی تھی۔ اس سے میرا ایک پتر بھی ہوا۔"

"پر تجھے تو ڈھانڈلہ سردار نے اٹھوالیا تھا۔" رحیم داد کے لہجے میں استعجاب تھا۔ "تو یہی بتا رہی تھی نا؟ فیر تو مراد خاں کے پیو کے پاس کیسے پہنچ گئی؟"

"وہ ایسا ہوا سئیں! سردار منصور نے جب مجھے اٹھوالیا تو میں اس کی حویلی میں لگ بھگ سال بھر رہی۔ ویسے وہ بھی مجھے بہت پیار کرتا تھا۔ پر بہت ظالم اور خونی تھا۔ اس نے بہت خون کیے۔ پر

بھی اسی نے خون کیا۔" سلھڑی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے تابندہ چہرے پر دکھ کا ہلکا ہلکا غبار بکھر گیا۔ "ہوا یہ کہ ہاتو ایک اندھیاری رات کو اٹھ پر بیٹھ کر بہل سے ادھر آیا۔ اس نے اٹھ ڈھانڈلے کی حویلی کی دیوار سے لگایا، کود کر اندر پہنچا۔ وہ مجھے لینے آیا تھا۔ بہت جی دار اور دلیر تھا، ذرا بھی نہ ڈرا۔ وہ مجھے بہت پیار کرتا تھا۔"

"سب ہی تجھے پیار کرتے ہیں۔" رحیم داد نشے میں لہرا کر بولا۔ "تو ہے بھی تو کتنی سوہنی۔" وہ بہکا مگر فوراً سنبھل گیا۔ اس نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ "اب آگے کی سنا۔"

"ہاتو حویلی کے اندر پہنچا تو سردار منصور ڈھانڈلے کو کسی طرح اس کے آنے کا پتہ چل گیا۔" سلھڑی نے رحیم داد کی مداخلت نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "ہاتو پڑچھتی میں میرے پاس کھڑا تھا اور مجھے اپنے سنگ لے جانے کے لیے گھات میں تھا۔ پر جیسے ہی ہم دونوں حویلی سے نکلے، دیکھا، سامنے ڈھانڈلہ کھڑا ہے۔ اس کے کئی کرندے بھی موجود تھے۔ انھوں نے جھپٹ کر ہاتو کو دبوچ لیا۔ مجھے بھی پکڑ لیا۔ سردار نے مجھے تو ایک کوٹھڑی میں بند کر کے باہر سے تالا ڈال دیا اور ہاتو کو اپنے سنگ لے گیا۔ وہ اتنا گسے میں تھا کہ صبح بھی نہ ہونے دی۔ رات ہی کو ہاتو پر اپنے شکاری کتے چھوڑ دیے۔ کتوں نے چیر پھاڑ کے اسے ختم کر دیا۔ اس کی کٹی پھٹی لاش میرے پاس کوٹھری میں بھجوا دی۔"

"اس کی لاش دیکھ کر تینوں بہت دکھ ہوا ہو گا۔"

"سئیں! یہ بھی بتانے کی گل ہے؟" سلھڑی کا چہرہ اور افسردہ ہو گیا۔ "ہاتو کے ساتھ میرا پرنا ہوا تھا۔ وہ پیو کے گھر سے میکوں ودا کر کے لایا تھا۔ میرے پتر کا پیو تھا، بہت جڑیا اور گبھرو جوان تھا۔"

"ایسی بات تھی تو سوتے میں کسی رات چھری سے ڈھانڈلے کا گلا کاٹ دیتی۔" رحیم داد نے سردار منصور خاں کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

"تو کیسی گالہہ کر رہا ہے سئیں!" وہ حیران و پریشان ہو کر بولی۔ "میں ایسا کیسے کر سکتی تھی؟ سردار منصور بہت جڑیا اور زور آور تھا۔" اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ "ظالم اور خونی اتنا زبردست تھا کہ ایک بار تو اپنے سگے بھائی کا اس نے خون کر دیا تھا۔ ویسے اس کا بھائی بھی سردار تھا اور زور آور بھی تھا۔ اس کا ناں محمود خاں ڈھانڈلہ تھا۔ وہ بھی بہت ٹھرکی اور رن رسیا تھا۔"

"وہ بھی تجھے پیار کرنے لگا تھا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"ایسی ہی گالہہ تھی سئیں!" سلھڑی نے گردن ہلا کر اعتراف کیا۔ "وہ بھی مجھے پیار کرتا تھا۔ رات کے اندھیارے میں چھپ چھپ کر میرے پاس آتا۔ ایک رات وہ میری کوٹھری میں تھا۔

منصور کو پتہ چل گیا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ اسے میرے ساتھ دیکھ کر غصے سے پاگل ہوگیا۔ بھری ہوئی رائفل اس کے ہاتھ میں دبی تھی۔ اس نے ہم دونوں پر گولی چلا دی۔ میں تو صاف بچ گئی پر ایک گولی محمود خاں کے کندھے میں اتر گئی۔ منصور نے تو اپنے تئیں اس کا خون کر ہی دیا تھا پر وہ مرا نہیں۔ گھاؤ زیادہ گہرا نہیں تھا۔"

بہت ہنگامہ اور رولا پڑا ہوگا؟"

"مجھے تو سئیں اتنا پتا ہے کہ جھگڑا دونوں بھائیوں کا تھا پر میں شامت دی ماریا ڈھانڈلوں کی نظروں میں بھوت بلا بن گئی۔" سلھڑی نے بجھے ہوئے لہجے میں آگاہ کیا۔ انھوں نے مجھے بالوں سے پکڑ کر زمین پر گھسیٹا۔ بہت مارا پیٹا۔ بدن پر ہر جگہ چوٹ آئی پر میں نے کچھ نہیں کہا۔ کوٹھڑی میں اکیلی پڑی درد سے بلکتی رہی، روتی رہی۔ ادھر ڈھانڈلوں نے طے کیا کہ مجھے حویلی سے نکال دیا جائے۔"

"اس طرح تجھے اپنے گھر جانے کا موکع تو مل ہی گیا ہوگا؟"

"ایسا نہیں ہوا سئیں! سردار منصور مجھے چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ تب ڈھانڈلہ تمن نے جرگہ بلایا۔ جرگے میں خاندان والے ہی بیٹھے۔ کوئی مکّدم یا معتبر نہیں بیٹھا۔ جرگے نے مجھے حویلی سے نکالنے کا فیصلہ کیا پر منصور نے مجھے ماپیؤ کے پاس نہیں جانے دیا۔ وہ تب تک زندہ تھے۔ اس نے مجھے دو ہزار میں سردار نجیب خاں کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس طرح میں اس حویلی میں آگئی۔"

"تو اس حویلی میں تو اس طرح آگئی۔" رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔ "پر مراد خاں تیرے ساتھ کیسے لگ گیا؟"

"سئیں! اب تجھ سے کیا چھپانا۔ اس کے پیؤ سردار نجیب ہی نے لگایا تھا۔" سلھڑی نے تیکھے لہجے میں بتایا۔

"سردار نجیب نے لگایا تھا؟" رحیم داد نے حیرت سے چونک کر سوال کیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"بس ایسے ہی جیسے کہہ رہی ہوں۔" سلھڑی نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "میں سردار نجیب کے پاس لگ بھگ تین سال رہی۔ ان دنوں مراد خان لہور میں پڑھتا تھا۔ رہتا بھی وہیں تھا۔ چھٹیوں میں صرف بھکر آتا تھا۔ ہموں والی کبھی نہیں آیا تھا۔ کم سے کم میں نے تو اسے ان دنوں نہیں دیکھا۔ فیر ایسا ہوا سئیں کہ مراد کے پرنے کی بات چلی۔ تب وہ ستارھا اٹھارہ برس کا رہا ہوگا۔" اس نے رحیم داد کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔ "انھی دنوں وہ پہلی بار میرے سامنے ہموں والی آیا۔ سردار نجیب بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔ حویلی میں مراد خان کے رہنے کے لیے علیحدہ کمرے میں بندوبست کیا گیا۔"

"یہی کمرہ ہوگا جس میں وہ آج کل ٹھہرا ہوا ہے؟"

"جی سئیں! وہ سدا اسی کمرے میں ٹھہرتا ہے۔" وہ رحیم داد کو صاف گوئی سے سب کچھ بتاتی رہی۔ "مراد خان کو ہموں والی میں آئے ہوئے دوسرا یا تیسرا روز تھا کہ ایک شام سردار نجیب نے بلایا کہنے لگا، 'سلھڑی! تیکوں پتہ ہی ہے۔ مراد کا پرنا ہونے والا ہے پر وہ بالکل بھولا بلا ہے۔ رن بارے میں اسے کچھ اتا پتا نہیں۔ تو آج رات اس کے ساتھ سو اور اسے سب کچھ سمجھا دے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے شرما گئی۔ دھیمے لہجے میں بولی۔ "وڈے سردار کے حکم پر میں رات کو مراد خان کے کمرے میں گئی اور اس کے ساتھ سوئی۔"

"تو یہ گل ہے۔" رحیم داد کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ "یہ کیوں نہیں کہتی اس لائن پر تو نے مراد خان کو لگایا ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"نا سئیں! ایسی گالھ بالکل نہیں۔" سلھڑی نے فوراً انکار میں گردن ہلائی۔ "وہ ایسا بھولا بلا نہیں جیسا اس کا پیؤ سمجھتا تھا۔ وہ پہلے ہی سے سب کچھ جانتا تھا۔ لہور میں کنجریوں کے پاس جاتا رہتا تھا۔" وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ "ہیرا منڈی کی کنجریوں نے اسے ایک دم فردٹ بنا دیا تھا۔ یہ گالھ اس نے مجھے خود بتائی تھی۔"

"یہ بتا اس رات کے بعد مراد خان بعد میں بھی تیرے پاس آیا؟" رحیم داد نے دلچسپی سے دریافت کیا۔

"بالکل آتا رہا۔ پرنا ہوگیا تب بھی آتا رہا۔" سلھڑی نے رسان سے کہا۔ "وڈے سردار سے چھپ چھپ کر میرے پاس آتا تھا۔"

"سردار نجیب خاں کو بالکل پتہ نہ چلا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"کچھ ہی دنوں بعد اسے پتہ چل گیا تھا۔" سلھڑی نے انکشاف کیا۔ "مجھ پر وہ بہت ناراض ہوا پر مراد خان سے کچھ نہیں بولا۔ وہ اس کا اکلوتا پتر تھا۔ بہت لاڈلا بھی تھا۔ پہلے تو اس نے غصے میں کئی بار میری مار کٹائی بھی کی۔ فیر ایک روز اپنے یار سردار سکندر خان کھوسہ کے پاس راجن پور بھیج دیا۔ مجھے اس کے حوالے کرکے اسے دکھ بھی ہوا۔ وہ مجھے بہت چاہتا تھا۔ اس سے میری ایک بچی پیدا ہوئی پر وہ کچھ ہی مہینوں بعد مر گئی۔ سردار نجیب خان بھی زیادہ دن زندہ نہ رہا۔ میرے راجن پور جانے کے سال ہی بھر کے اندر اندر اس کا مرن ہوگیا۔"

"تو کھوسہ سردار کے پاس راجن پور میں ہوتی تھی دوبارہ یہاں کیسے آگئی؟" رحیم داد نے مسکرا کر ایک بار پھر چھیڑا۔ "کھوسے کے گھر میں بھی تیری وجہ سے جھگڑا کھڑا ہو گیا ہوگا۔"

"ایسا جھگڑا کھڑا تو ہوا تھا۔ سردار سکندر خان کا ایک چاچا بھی مجھ سے چپکے چپکے پیار جتانے لگا تھا۔ وہ تو زبردست ٹھرکیا تھا۔ ادھکڑ تھا پر ایسا رن ریسا کہ تجھے کیا بتاؤں۔ وہ مجھے اٹھوا کر اپنی حویلی میں لے جانا چاہتا تھا۔" سلھڑی مسکرا مسکرا کر بتاتی رہی۔ "پر چاچا بھتیجے کا جھگڑا زیادہ بڑھنے نہیں پایا۔ ہوا یہ کہ سردار نجیب کے مرن کے کچھ ہی مہینے بعد مراد خان مجھے واپس لینے سردار سکندر خاں کھوسہ کے پاس پہنچا اور تین ہزار روپے دے کر مجھے راجن پور سے لے آیا۔ تب سے میں مراد خاں کے پاس ہوں۔ اس حویلی سے اب تک کہیں نہیں گئی۔"

سلھڑی کے چہرے پر باتیں کرتے ہوئے بار بار مختلف تاثرا ہویدا ہوتے۔ کبھی اس کا چہرہ بجھ جاتا کبھی دمکنے لگتا۔ اسے ماضی کے ہنگامے بیان کرنے میں یکسوئی حاصل ہو رہی تھی۔ رحیم داد پر اپنی اہمیت جتانے کا بہانہ مل گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ صاف گوئی سے ایک ایک تفصیل بتاتی رہی۔ رحیم داد نے گفتگو بدلتے ہوئے پوچھا۔ "ایک گل تو بتا۔ تیرا نام سلھڑی کیوں ہے؟ سلھڑی تو سیدھی سادھی گئو کو کہتے ہیں۔" رحیم داد نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تو کسی طرف سے سیدھی سادھی نہیں لگتی۔"

"میں جب چھوٹی سی نکی تھی تو بہت بھولی بلی تھی۔" وہ نظریں جھکا کر شرماتے ہوئے بولی۔ "اماں نے اسی لیے میرا نام سلھڑی رکھ دیا۔ وہ مجھے یہی بتاتی تھی۔"

"تو کچھ ہی کہے پر تو سلھڑی تو ہرگز نہیں لگتی۔" رحیم داد بدستور ہنستا رہا۔ "تو' تو امر بیل ہے۔ ایک بار جس سے لگ جائے فیر وہ تیرے پیچ سے نہیں نکل سکتا۔ تجھ میں بات ہی ایسی ہے۔" اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے سلھڑی کو دیکھا۔ "تو نے کبھی یہ بھی سوچا' تیرے اتنے چاہنے والے کیوں ہیں؟"

"میکوں کیہہ پتہ؟" وہ بڑے ناز سے بولی۔

رحیم داد نے گہری سانس بھری اور سلھڑی کا چہرہ تکنے لگا۔ سلھڑی کا چہرہ ہلکی ہلکی مسکراہٹ سے نکھر کر اور شگفتہ ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں کہکشاں اتر آئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لی۔ سرخ دوشالہ ڈھلک کر نیچے گر گیا۔ اس کے سینے پر لہریں اٹھنے لگیں۔ رحیم داد کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو گئی۔ وہ بے قرار ہو گیا۔

صبح تاروں کی چھاؤں میں سلھڑی اٹھ کر جانے لگی تو رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رسان سے بولا۔ "سلھڑی تو جا رہی ہے!" سلھڑی نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر گویا ہوئی۔ "جی سیں!" وہ آگے بڑھی۔ دروازہ کھولا اور باہر چلی گئی۔

[illegible]

شام کہرے کی چادر اوڑھ کر روز بہ روز دھندل ہوتی جا رہی تھی۔ تیز اور چمکیلی دھوپ کی
زت کم ہو گئی۔ راتیں طویل اور سرد ہو گئیں۔ رحیم داد ہوں والی میں ٹھہرا رہا۔ سردار مراد خاں
نے اسے واپس کوٹلہ ہرکشن جانے نہ دیا۔

سلھڑی دوبارہ رحیم داد کے کمرے میں نہ آئی۔ تنہائی میں بھی مڈھ بھیڑ نہیں ہوئی۔ نہ بات چیت
نوبت آئی۔ نظر بھی آتی تو اپنے مچلتے اچھلتے جسم کو لہراتی ہوئی بے نیازی سے گزر جاتی۔ رحیم داد
جانب مطلق توجہ نہ دیتی۔ مگر وہ جتنا نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی رحیم داد اس کے لیے اتنا ہی
قرار ہوتا جا رہا تھا۔ ان دنوں اس کے ذہن پر سلھڑی ساون کی گھٹا بن کر چھائی ہوئی تھی۔

رحیم داد نے مراد خاں کو ٹٹولا۔ باتوں باتوں میں سلھڑی کا ذکر کئی بار چھیڑا۔ لیکن اس نے حوصلہ
زائی نہ کی' صاف ٹال گیا۔ ویسے وہ اپنی زمیں داری کے بکھیڑوں میں کچھ زیادہ ہی الجھا ہوا تھا۔
ں والی میں اس کے قیام میں اسی باعث اضافہ بھی ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ربیع کی فصل پر بہت توجہ
ے رہا تھا۔ اس دفعہ وہ زیادہ بڑے رقبے پر گندم کی بوائی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے جھنگر
ر جھجر بھی صاف کرانے شروع کر دیئے تھے۔ یہ زمین وہ قابل کاشت بنانا چاہتا تھا' کھیتی باڑی
کے ساتھ ساتھ اس پر آم کے باغات بھی لگانا چاہتا تھا۔

مراد خاں نے اپنی ان سرگرمیوں میں رحیم داد کو بھی شریک کر لیا تھا۔ وہ اسے اپنے ہم راہ ناشتے
کے بعد لے جاتا۔ دن کھیتوں کے درمیان ادھر ادھر گھومنے' مزارعوں کو ڈانٹنے ڈپٹنے' فصل کی آب
شی کے لیے آڈ' مینڈھے اور نکے درست کرانے اور ایسی ہی دوسری مصروفیات میں گزر جاتا۔ سورج

غروب ہوتا تو مراد خاں اور رحیم داد طلوع ہوتے۔ نہا دھو کر تازہ ہوتے، صاف ستھرے لباس پہنتے اور شغل بادہ نوشی کرتے۔

حویلی میں نئی نئی نوجوان عورتیں اور لڑکیاں اٹھا کر لائی جاتیں۔ کسی کو رکھ لیا جاتا، کسی کی قیمت وصول کر کے واپس کر دیا جاتا۔ کسی کو بلا معاوضہ چھوڑ دیا جاتا۔ کسی کو تحفے کے طور پر شناسا زمین داروں کو بخش دیا جاتا۔ اس معاملے میں فیصلے کا انحصار سردار مراد خاں کی مرضی اور موڈ پر تھا۔

عام طور پر ان مزارعوں کی نوجوان عورتیں اٹھوائی جاتیں جو جھنگر اور جھجھر صاف کرنے کی بیگار سے کتراتے، احتجاج کرتے اور دوسرے مزارعوں کو اکسانے کی کوشش کرتے۔ مراد خاں زیادہ خفا ہوتا تو عورتوں کے ساتھ مویشی بھی اٹھوا لیتا، مزارعوں کو بے دخل کر دیتا۔ ان کے گھروں میں اپنے کارندوں کے ذریعے آگ لگوا دیتا۔ پولیس سے سازباز کر کے جھوٹے مقدمے بنواتا۔ جب سے ہموں والی آیا تھا اس کی وسیع زمین داری کے ہر مزارعے اور ہر فرد پر خوف طاری تھا۔

انھی دنوں بیٹ کے ایک جاگیردار، قرط خاں ڈھانڈلہ، کے بچے کے مونڈن کی تقریب ہوئی۔ پہلوٹی کا بیٹا تھا اور بڑی منت مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ لہٰذا دھوم دھام سے جشن منایا گیا۔ تقریب کا آغاز حسب دستور پیر کی درگاہ پر حاضری دینے اور منت کے مطابق منوتی چڑھانے سے ہوا۔ سرداروں اور بڑے زمیں دار ڈھانڈلوں کے گھرانوں کی عورتیں اور لڑکیاں تو سہ پہر کو اپنی جیپوں اور کاروں میں بیٹھ کر درگاہ کی جانب روانہ ہوئیں جن کے گرد چادریں بندھی تھیں تاکہ ملوک زادیوں کی کسی طور بے پردگی نہ ہو اور ان پر کسی نامحرم کی نظر نہ پڑے۔

لیکن مزارعوں کی عورتیں اپنے جاگیردار کی خوشی میں شرکت کے لیے بچوں کے ساتھ سویرے سویرے اونٹوں کے کجاووں میں بیٹھ کر نکل کھڑی ہوئیں۔ وہ منوتی پیر کی زیارت کی جانب جا رہی تھیں، خوب بن سنور کر نکلی تھیں۔ آنکھوں میں دنبالہ کاجل تھا، مانگ بھر کر دھڑی گوندھی تھی، ہونٹوں پر سرخی لگائی تھی، شوخ اور بھڑک دار لباس پہنے تھے۔ ریشمی گھگھروں پر سنہرے لچے کی چوڑی چوڑی گوٹ لگی تھی۔ چولوں اور کرتیوں کے گریبانوں اور آستینوں پر موتیوں، شیشوں اور رنگین دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ سروں پر پچ رنگی چنریاں تھیں۔ دوپٹے اور بوچھن تھے جن پر ستارے ٹکے تھے۔ گلوں میں چاندی یا گلٹ کے کنٹھالے اور مالھان تھے۔ ناک میں فیروزہ جڑے تولے اور پوپے جھل ملا رہے تھے۔ ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں اور بازوؤں پر چوڑے اور پہنوٹے تھے جن کے خوش رنگ دھاگوں کے پھندنے ہولے ہولے جھولتے تھے۔ کانوں میں بالیوں کے گچھے لٹکتے تھے۔

ہ قافلے کی صورت میں گاؤں سے نکلیں۔ ایک اونٹ پر نقاروں کی جوڑی سمیت میراثی سوار اس کا اونٹ سب سے آگے تھا جس کی مہار ایک جتوال سنبھالے ہوئے تھا۔ دوسرے تمام ٹ اور اونٹیاں پیچھے پیچھے تھیں۔ ان کے گھٹنوں پر پہنوٹے بندھے تھے جن کے گھنگھرو ٹخنوں میں ی جھانجروں کے ساتھ بجتے تھے، جھنکارتے تھے۔ گلوں میں گانیاں تھیں اور سروں پر بندھے ے موروں کے پھندنوں کے ساتھ ساتھ موتیوں اور کوڑیوں کی جھالریں ادھر ادھر جھول رہی یں، لہرا رہی تھیں۔ عورتوں اور بچوں کے مانند اونٹ اور اونٹنیاں بھی خوب سجی ہوئی تھیں۔ چند ٹوں پر جتوالوں اور ساربانوں کے ساتھ بین بجانے والے بھی بیٹھے تھے۔

قافلہ روانہ ہوا تو میراثی نے نقارے پر چوٹ لگائی۔ بین باجے والوں نے نقارے کی گت پر ایک بول دھن چھیڑی۔ میراثی کے اونٹ سے بھی آگے نوجوانوں کی ٹولی تھی۔ وہ ریشمی کرتے پہنے ئے تھے۔ سروں پر پگڑیاں بندھی تھیں۔ ان کے تہبند بھی ریشمی اور رنگین تھے۔ قافلے کی وانگی سے پہلے انھوں نے بھنگ اور ساوی دبا کے پی تھی۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ ئے جھوم جھوم کر اپنے مضبوط اور کسے ہوئے جسموں کی نمائش کر رہے تھے اور بلوچوں کا ایک یم جھمر ناچ رہے تھے۔

رقص کرنے والے نوجوانوں کے درمیان ڈھولیا تھا۔ وہ گلے میں پڑے ہوئے ڈھول پر زور زور ے چوٹ لگا کر ناچنے والوں کو للکار رہا تھا جو اس کے چاروں طرف دائرے میں ہاتھوں اور پیروں کی ردش کے ساتھ لہک لہک کر رقص کر رہے تھے۔

اونٹ ایک قطار میں کچے راستے پر ہچکولے کھاتے، گرد و غبار کے بادل اڑاتے قافلے کی صورت ل دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے گلوں میں لٹکتی گھنٹیاں اور گھنگھرو اور پیروں میں ڑی ہوئی جھانجھریں نوجوانوں کے رقص کے ساتھ بج رہی تھیں، جھنکار رہی تھیں۔ عورتیں اور بچے خوشی سے قہقہے لگا رہے تھے، چہک رہے تھے، اونچی آوازوں سے بول رہے تھے۔ رقص کرتے کرتے ایک نوجوان نے کان پر ہاتھ رکھ کر لمبی اور اونچی تان لگائی۔ اور اپنے علاقے کا ایک عوامی ھمر گیت چھیڑا۔

رکھاں میں امید ماہی دے ملّن دی
مکہ وی دور ہے
ونجناں ضرور ہے
حسن حسین دے مانگے

دل پئی تانگے
رکھاں میں امید ماہی دے ملّن دی

گیت کے بول جھمر ناچنے والے نوجوانوں اور کجاووں میں بیٹھی ہوئی عورتوں اور کنواریوں نے اٹھائے۔ سب آواز سے آواز ملا کر گانے لگے۔ ڈھولیے نے ڈھول پر اور زور سے چوٹ لگائی۔ میراثی اور بین والوں نے جھمر کی لے کے ساتھ ساتھ نقارے اور بین کے تال سر کو ہم آہنگ کیا۔ گیت کے بول اونچے ہوتے گئے۔ آوازوں کے ساتھ ساتھ ساز بھی تیز ہوتے گئے۔ ساز و آواز کے زیر و بم کے ساتھ رقص کی گردش کبھی تیز ہو جاتی کبھی دھیمی پڑ جاتی۔ اسی طرح منوتی کے لیے چلنے والا یہ قافلہ گاؤں سے نکل کر آگے بڑھا۔ دور' اور دور ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ گرد کے ابھرتے اور پھیلتے ہوئے بادلوں میں گم ہو گیا۔

دن گزرا' شام ہوئی۔ رات کو کھانے کی دعوت کے ساتھ ساتھ مہمانوں کے لیے پینے پلانے اور ناچ گانے کا بھی پروگرام تھا۔ تقریب کی دھوم دھام دوبالا کرنے کی غرض سے ملتان اور لاہور سے طوائفوں کو بھی بلایا گیا تھا۔ رات بھر کا پروگرام تھا اور اس میں شرکت کے لیے سردار مراد خاں شاہانی خاص طور پر مدعو تھا۔ ہموں والی میں اس کے قیام میں اضافے کا سبب موذن کی اس تقریب میں شریک ہونا بھی تھا۔

سورج ڈوبتے ہی مراد خاں شاہانی نے سردار فرط خاں ڈھانڈلہ کی حویلی جانے کی تیاری کی۔ اس نے غسل کیا' بوسکی کی لمبی قمیص اور لٹھے کی خوب گھیردار اجلی شلوار پہنی۔ قیمتی اونی شال اوڑھی' کپڑوں پر خوشبو لگائی۔ اسی سج دھج کے ساتھ کمرے سے نکلا تو زیادہ وجیہہ اور باوقار لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھبن تھی۔ آنکھوں میں ستارے جگ مگا رہے تھے۔ اس کے ہم راہ سلہڑی بھی تھی۔ وہ بھی پورا سنگھار کیے ہوئے تھی۔ شاہانی آگے آگے تھا۔ سلہڑی اس سے ایک قدم پیچھے تھی۔

رحیم داد کمرے کے باہر دالان میں موجود تھا۔ مراد خاں شاہانی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "چوہدری' تجھے ڈھانڈلے کی حویلی نہیں چلنا؟" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "زبردست میل ہے۔ ڈھانڈلے نے شراب بھی عمدہ منگوائی ہے۔ کنجریاں بھی پوپٹ اور زوردار ہیں۔"

رحیم دادا نے حیلہ سازی سے کام لیا۔ منہ بگاڑ کر رسان سے بولا۔ "میرے سر میں بہت درد ہے۔ میں نوں نہیں جانا۔ تسیں نوں یہی بتانے آیا تھا۔" وہ اونی دوہر اوڑھے ہوئے تھا' بال پریشان تھے اور چہرہ بھی اجڑا اجڑا نظر آرہا تھا۔

شاہانی نے اصرار لیا۔ "فٹافٹ تیار ہو جا۔ اسکاچ وہسکی کے دو پیگ لگاتے ہی سارا درد شرد رہے گا۔ ایک دم چنگا ہو جائے گا۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے نہ لے جا۔ طبیعت اور گڑبڑ ہو جائے گی۔" رحیم داد رضامند نہ ہوا۔

"چلا تو اچھا ہی تھا۔" شاہانی نے زور دے کر کہا۔ "بہت لطف آئے گا۔ طبیعت اگر نہ لگے تو ب تیرا جی کرے اٹھ کر چلا آنا۔ پروگرام تو ویسے رات بھر کا ہے۔"

"ہیں چوہدری! چلا جا۔" سلہڑی نے بھی شاہانی کی تائید کی۔

رحیم داد نے اسے نظر بھر کر دیکھا' اس کا مسکراتا چہرہ نکھرا ہوا تھا۔ جسم پھڑک رہا تھا۔ آنکھیں جادو جگا رہی تھیں۔ رحیم داد تڑپ کر رہ گیا۔

مراد خاں شاہانی نے ایک بار پھر رحیم داد پر زور دیا۔ "نکھرا نہ کر۔" وہ مسکرایا۔ "تھوڑی ہی دیر کے لیے میل میں شریک ہو جا۔ ڈھاندلے کا دل خوش ہو جائے گا۔ تجھے ساتھ لانے کے لیے اس نے مجھے بار بار کہا تھا۔" مگر رحیم داد کسی طور آمادہ نہ ہوا۔ طبیعت ناساز ہونے کا عذر تراشتا رہا۔

شاہانی چلا گیا۔ سلہڑی اس کے پیچھے پیچھے حویلی کے پھاٹک تک گئی۔ رحیم داد نظریں اٹھائے مراد خاں شاہانی کے بجائے سلہڑی کو دیکھتا رہا۔ اس نے گہری سانس بھری' اٹھا اور آہستہ آہستہ ڈیرے میں پہنچا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆

رحیم داد بستر پر چپ لیٹا تھا۔ نہ اس نے کھانا کھایا نہ سویا۔ پہر رات گزر گئی۔ حویلی سنسان ہو گئی۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ ہوا میں تیزی آ گئی تھی۔ سرما کی اندھیری رات ساکت کھڑی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔

رحیم داد پلنگ سے نیچے اترا' اونی دوہر اوڑھی' سلیپر پہنے' لیمپ کی لو دھیمی کی' آہستہ سے دروازہ کھولا' کمرے سے نکل کر برآمدے میں آیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ وہ اندھیرے میں دم سادھے کھڑا تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ حویلی کے تمام نوکر اپنی اپنی کوٹھریوں کے دروازے بند کیے گہری نیند سو رہے تھے۔ رحیم داد کی طرح حویلی کے ہر فرد کو معلوم تھا کہ مراد خاں شاہانی سویرے سے پہلے نہیں لوٹے گا۔ وہ ناچ گانے کا زبردست شوقین تھا۔ ایسی محفل چھوڑ کر نہیں آسکتا تھا۔

رحیم داد احاطے میں پہنچا اور دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ مڑا اور حویلی کے عقبی حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ خاموشی بہت گہری تھی اور کہرے کی دھند بھی اس قدر تھی

کہ وہ سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا۔ وہ سلھڑی کی کوٹھری پر پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ مگر دروازے کی جھریوں سے اندر جلتے ہوئے چراغ کی روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ وہ دروازے کے نزدیک سانس روکے کھڑا رہا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ سناٹا اور بڑھ گیا تھا۔ رحیم داد نے آہستہ سے دروازے پر ہاتھ رکھا' ہولے سے دھکا دیا' دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ وہ آہستہ سے اندر داخل ہوگیا۔ سامنے پلنگ کی پٹی سے ٹیک لگائے سلھڑی فرش پر بیٹھی تھی۔ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ رحیم داد نے مڑ کر نہایت احتیاط سے کوٹھری کا دروازہ بند کردیا۔

آہٹ سن کر سلھڑی نے پلٹ کر دیکھا۔ رحیم داد کو اپنے سامنے پاکر وہ سخت حیرت زدہ ہوئی اور سٹ پٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "سئیں چوہدری!" اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورنے لگی۔ "توں یہاں کیسے آگیا؟"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بھی حیرت زدہ تھا۔ یہ وہ سلھڑی نہیں تھی جس کی چھب دیکھ کر وہ بے قرار ہوجاتا تھا' جس کے بدن کے پیچ و خم کے ڈولنے اور گردش کرنے سے اس کا دل ڈولنے لگتا تھا۔ وہ اسی سلھڑی کے لیے بے قرار ہوکر چوروں کی طرح چھپ کر رات کے سناٹے میں آیا تھا۔ مگر اس کے سامنے جو سلھڑی کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ ویران اور اجاڑ تھا۔ آنکھوں کے ہردم جل ملانے والے کنول بجھے بجھے تھے' بال خشک اور الجھے ہوئے تھے۔ وہ میلا کچیلا لباس پہنے ہوئے تھی اور اس کی آنکھوں کا کاجل پھیلا ہوا تھا' جوانی پگھلتی اور ڈھلتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

رحیم داد کو گم صم اور حیرت زدہ دیکھ کر سلھڑی نے ایک بار پھر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سئیں چوہدری! تو یہاں کیوں آیا؟ کیسے آیا؟ تیکوں اس طرح میرے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔" اس کا لہجہ قدرے تیکھا ہوگیا وہ بدستور پریشان اور سراسیمہ نظر آرہی تھی۔

رحیم داد ہکا بکا کھڑا رہا۔ سلھڑی بھی خاموش رہی۔ مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا۔ کندھوں پر پڑا ہوا دوپٹہ سر کے پیچھے سے کھینچ کر اس طرح اوڑھا کہ اس کا چہرہ کسی قدر چھپ گیا۔ اس نے نظریں جھکالیں۔

رحیم داد ٹکٹکی باندھے حیران و پریشان سلھڑی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے دوپٹے سے چہرہ چھپانے کی کوشش کی تو رحیم داد چونکا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دائیں طرف کی دیوار کی کھونٹیوں پر شوخ اور بھڑک دار دوپٹے' چولے اور گھگھرے لٹک رہے تھے۔ ان کے ساتھ ریشمی منجھلیاں اور کرتیاں بھی جھول رہی تھیں۔ سامنے کی دیوار کے طاق میں سرخی' کاجل' کنگھی اور سنگھار کا دوسرا

سازوسامان رکھا تھا۔ طاق کے قریب ہی دیوار پر آئینہ آویزاں تھا۔

سلھڑی کی آواز خاموشی میں ابھری۔ "سئیں! تو یہاں کیوں آگیا؟ میری گالہہ کا جواب کیوں نہیں دیتا؟" اس کے لہجے میں پریشانی اور گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ عاجزی بھی تھی۔ رحیم داد اب خاموش نہ رہ سکا' آہستہ سے بولا۔ "تو میرے آنے پر اتنی پریشان کیوں ہوگئی؟"

"پریشانی کی بات ہی ہے۔" وہ بے زاری سے بولی۔ "سئیں تیکوں پتہ نہیں' سردار کو ملوم ہوگیا تو بہت گڑبڑ ہوگی۔ تو جانتا ہے' اس کا سہ کتنا خراب ہے۔ غصے میں وہ پاگل بن جاتا ہے۔"

"یہ تو بتا تو میرے پاس بعد میں کیوں نہیں آئی؟" رحیم داد نے سلھڑی کی سراسیمگی نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"سئیں! میں سردار کی مرضی بنا تیرے پاس کیسے آسکتی ہوں۔" اس نے صاف گوئی سے بتایا۔ "اس رات اس نے مجھے تیرے پاس بھیج تو دیا پر بعد میں مجھ پر بہت نراض ہوا۔ غصے سے بار بار گالاں نکالتا تھا۔"

"تب ہی تو مجھ سے دور دور اور کٹی کٹی رہتی ہے؟"

"ہا سئیں!" اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "سردار یہ دیکھ ہی نہیں سکتا کہ میں اس کے سوا کسی اور کے ساتھ میل جول پیدا کروں۔ یاری لگانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" اس نے خوف زدہ نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا۔ "سئیں! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ سردار بہت غصے والا ہے' ظالم بھی ہے۔ اس کا مزاج بہت گرم ہے۔"

"اس کی پروا نہ کر۔" رحیم داد نے سلھڑی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "وہ صبح سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔" اس نے نظر بھر کر سلھڑی کو دیکھا۔ "ویسے تو کہتی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔"

"ہا سئیں! اب تو جا۔" وہ بے رخی سے بولی۔ "مجھے کچھ بھلا نہیں لگتا۔ میں بہت موجھی ماندی اور پریشان ہوں۔"

"سلھڑی! تو کچھ زیادہ ہی پریشان اور اداس لگ رہی۔ صاف صاف بتا' بات کیا ہے؟" رحیم داد نے سلھڑی کے چہرے پر چھائی ہوئی افسردگی شدت سے محسوس کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"تیکوں کیہ پتہ' میرا پتر کتنا بیمار ہے؟" سلھڑی نے پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔ "دیکھ کیسا چپ کرکے پڑا ہے۔ اسے بہت زور کی تپ چڑھی ہے۔" اس نے رحیم داد کی طرف افسردہ نظروں سے دیکھا۔ "یہ میرا مندوں ہے۔ تینوں بچوں میں سب سے وڈا ہے۔"

رحیم داد نے توجہ سے دیکھا۔ پلنگ پر بوسیدہ اور میلی رضائی میں لپٹا لپٹایا مندوں بے سدھ پڑا

تھا۔ اس کی عمر گیارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر رحیم داد کو دیکھا۔ اس کے چہرے کے نقوش سے مراد خاں شاہانی کی شباہت صاف جھلک رہی تھی۔ ناک اور آنکھیں تو ہو بہو مراد خاں سے ملتی تھیں۔

مندوں نے بے چینی سے پہلو بدلا اور گردن ادھر ادھر ہلانے لگا۔ آہستہ سے بولا۔ "اماں!" وہ رک رک کر سانس بھر رہا تھا۔ حلق سے خر خر کی آواز نکل رہی تھی۔

سلھڑی جھپاک سے مندوں کے قریب پہنچی' جھک کر اس کی پیشانی چومی اور سرھانے بیٹھ کر ہولے ہولے سر دبانے لگی۔ اس نے پیار بھری نظروں سے مندوں کو دیکھا اور تڑپ کر بولی۔

"جیوے میرا لعل۔ میں صدکے ونجاں' تو حیاتی والا ہونویں۔"

رحیم داد بھی نزدیک چلا گیا۔ چراغ کی ہلکی زرد زرد روشنی میں مندوں کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ رحیم داد نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی پر رکھا۔ وہ آگ کے مانند دہک رہی تھی۔ اسے تیز بخار تھا۔ رحیم داد پریشان ہو گیا۔ تشویش کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"اسے تو بہت تیز تپ ہے۔ تو نے اس کا دوا دارو بھی کیا؟"

"تیرے آنے سے تھوڑی ہی دیر پہلے دوائی کھلائی تھی۔" سلھڑی نے رحیم داد کو بتایا۔ "حکیم سے خود جا کر سویرے لائی تھی۔ مندوں تو پچھلے چار روز سے بیمار ہے پر تپ کم نہیں ہوتی۔ کھانسی بھی آتی ہے۔ کل رات تک اتنا بیمار نہ تھا۔ میں نے گرم دودھ پلایا تو پی لیا تھا۔ پر آج صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا پیا۔ ایسے ہی آنکھیں بند کیے پڑا ہے۔ بار بار پانی مانگتا ہے۔"

"بخار بھی بہت تیز ہے۔" رحیم داد نے پوچھا۔ "تو نے حکیم سے پتہ کیا' اسے روگ کیا ہے؟"

"کہتا تھا' نمونیا ہو گیا ہے۔ اسی کی دوائی دی ہے۔ ساتھ میں یہ بھی کہا ہے کہ تین تین گھنٹے بعد دوائی پلانا۔ سویرے آکر حال بتانا۔"

"تیرے پاس تو گھڑی بھی نہیں۔ تین تین گھنٹے بعد کیسے دوائی پلائے گی۔" اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی اتار دی اور سلھڑی کو دیتے ہوئے کہا۔ "لے اسے رکھ لے۔"

"نہیں' اسے تو اپنے ہی پاس رکھ۔" اس نے گھڑی لینے سے صاف انکار کر دیا۔ "سردار نے گھڑی میرے پاس دیکھ لی تو اسے پتہ چل جائے گا' تو میرے پاس آیا تھا۔ بہت ناراض ہو گا۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ "سئیں! برا نہ منانا۔ میں اسے دوائی ٹھیک وکھت ہی پر پلاتی رہوں گی۔"

رحیم داد نے گھڑی اس کے حوالے کرنے پر اصرار نہیں کیا۔ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے بولا۔ "پر دوائی پلانے کے لیے تیں نوں رات بھر جاگنا پڑے گا۔"

"جاگ لوں گی۔" وہ مستعدی سے بولی۔ "سئیں! دعا کر۔ میرا لال چنگا ہو جائے۔ یہ میرا آگے کا سہارا ہے۔" اس کا لہجہ دکھ بھرا ہو گیا۔ "میں کب تک جوان رہوں گی۔ ایک دن تو بوڑھا ہونا ہی ہے۔ بوڑھی ہو گئی تو سردار مجھے حویلی میں کیوں رکھے گا؟ منجھ بوڑھی ہو جاتی ہے تو اسے کسائی کو دے دیتے ہیں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ اس کے چہرے کی افسردگی اور بڑھ گئی۔

"ہاں تیرے بھی تو تیرا ایک پتر تھا۔ اس کا کیا بنا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"وہ تو میرا پلوٹھا ہے۔ پر وہ کس کام کا۔" سلھڑی کا لہجہ پھر غمگین ہو گیا۔ "ایک بار اس کے پاس بھل گئی تھی۔ وہ وہیں رہتا ہے۔ اس نے پرنا کر لیا ہے۔ ذال ہے۔ اس سے ایک نکی بھی ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اس نے مجھے دیکھا تو نوہ کے سامنے ننگی ننگی گالاں اور مندا نکالیں۔" اس کی آواز بھر آئی۔ "دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔" سلھڑی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ "سئیں! میرا لال چنگا ہو جائے۔ یہ میرا بازو ہے' بڑھاپے کا سہارا ہے۔ میرا اور کوئی بھی تو نہیں۔" وہ سسکیاں بھر کر بے بسی سے رونے لگی۔

رحیم داد مبہوت کھڑا تھا اور ہر دم ہنستی مسکراتی سلھڑی کو پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس پر پہلی بار یہ راز آشکار ہوا کہ سلھڑی اندر سے کس قدر غم زدہ اور شکستہ ہے۔ اس نے سلھڑی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تو فکر نہ کر' تیرا مندوں ضرور چنگا ہو جائے گا۔ حوصلے سے کام لے۔" رحیم داد نے اس کی جانب دیکھا' دل گرفتہ ہو کر بولا۔ "سلھڑی! تو سچ مچ سلھڑی ہے۔ میں نوں پتہ ہی نہیں تھا تو اتنی دکھی ہے۔" اس نے آہستہ آہستہ اس کا بازو تھپکا۔ "اس طرح نہ رو سلھڑی! تو کہہ تو میں خود جا کر حکیم کو بلا لاؤں۔ پھاٹک پر راکھا خانن بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ حکیم کے گھر چلا جاؤں گا۔"

"نا سئیں! تو ایسا نہ کرنا۔" وہ نرم لہجے میں بولی۔ "میں خود چلی جاتی پر حکیم نہیں آئے گا۔ میں تو اسے سویرے ہی لانا چاہتی تھی۔ پر اس نے صاف انکار کر دیا۔ دوائی دے کر بولا۔ "یہ کھلاتی رہنا' چنگا ہو جائے گا۔ وہ تب نہ آیا تو اب اتنی رات کو کیسے آجائے گا۔"

"میں جاؤں گا تو ضرور آجائے گا۔"

"پر تیرا اس کے پاس جانا ٹھیک نہیں۔" وہ پریشان ہو کر بولی۔ "سردار تجھے تو کچھ نہیں بولے گا پر میرے گلے پڑ جائے گا۔ سخت ناراض ہو گا۔"

"تو ایسا کر مندوں کے متھے پر کپڑا گیلا کر کے رکھ۔" رحیم داد نے اسے مشورہ دیا۔ "مجھے بھی ایک بار ایسی ہی زوروں کی تپ چڑھی تھی۔ گیلا کپڑا رکھنے سے کم ہو گئی تھی۔" اس نے کوٹھری میں

ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ”مجھے کوئی اجلا کپڑا دے دے۔ میں بھگو کر فوراً اس کے متھے پر رکھوں گا۔“ اس نے تیکھی نظروں سے سلطری کو دیکھا۔

”میرا منہ کیا تک رہی ہے۔ جا کپڑا لے کر آ۔“

وہ اٹھی اور ٹرنک کھول کر کپڑا تلاش کرنے لگی۔ رحیم داد نے انتظار نہ کیا۔ بڑھ کر کھونٹی پر لٹکا ہوا اجلا دوپٹہ اتارا اور کونے میں رکھے ہوئے گھڑے سے پانی نکال کر پلّو بھگونے لگا۔

سلطری نے اس کی جانب دیکھا تو گھبرا کر بولی۔ ”سیں! تو نے یہ کیا کر دیا۔ یہ بوچھن تجھے اس طرح خراب نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

رحیم داد نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے دوپٹے کا گیلا پلّو تہہ کر کے چار انگل کی ویسی ہی پٹی بنائی جیسی جمیلہ نے ایک بار تیز بخار کی حالت میں اس کے لیے بنائی تھی۔ اس نے گیلی پٹی مندوں کی پیشانی پر رکھی اور سلطری کو مخاطب کیا۔

”سلطری! فکر نہ کر۔ تھوڑی دیر میں اس کی تپ کم ہو جائے گی۔“

سلطری بھی اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ رحیم داد کے پاس پلنگ کے سرھانے بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے اس سے کٹورے میں پانی منگوایا۔ پانی سرد تھا۔ رحیم داد بار بار دوپٹے کا پلو پانی میں تر کرتا اور اسے مندوں کی پیشانی پر رکھتا۔ سلطری چپ بیٹھی رحیم داد کو دیکھتی رہی۔ اس نے مندوں کی گردن کو ہاتھ لگایا۔ اس کے چہرے سے قدرے اطمینان جھلکنے لگا۔

”لگتا ہے تپ تو کم ہو گئی۔“ سلطری نے رحیم داد سے کہا۔ ”سیں! تو بہت چنگا اور نیک بندہ ہے۔“ وہ اسے دعائیں دینے لگی۔ ”سیں! تو سدا جیویں‘ رب رضی ہووے۔“ اس کے لہجے میں عاجزی پیدا ہو گئی۔ ”سیں! بوچھن اب مجھے دے دے۔“ اس نے خوف زدہ نظروں سے دروازے کی جانب مڑ کر دیکھا۔

”اب تو جا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تیرا اس طرح یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔“

رحیم داد نے اس کی پریشانی اور سراسیمگی محسوس کرتے ہوئے دوپٹہ سلطری کو دے دیا۔ خاموشی سے اٹھا‘ کوٹھری سے نکلا‘ باہر سے دروازہ بند کیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ مگر وہ اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ دل ہی نہ چاہا۔ آنکھوں میں دور دور تک نیند نہیں تھی۔ ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔ عجیب سا اضطراب تھا۔ اضطراب دور کرنے کی غرض سے اس نے اللہ بخش جوڑا کو آواز دے کر بلایا۔

اس سے شراب اور گلاس لانے کو کہا اور بیٹھک میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جوڑا نے

تھوڑی ہی دیر بعد بوتل‘ گلاس اور جگ میں پانی لا کر میز پر رکھ دیا۔ رحیم داد نے پیگ بنایا اور ایک بڑا گھونٹ بھرا۔

☆

حویلی کے پھاٹک پر جیپ ٹھہرنے کی آواز رات کے پرہول سناٹے میں ابھری۔ ذرا ہی دیر بعد قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ رحیم داد نے چونک کر دروازے کے باہر دیکھا‘ اندھیرے میں ایک سایہ لہرایا اور مراد خاں شاہانی ڈگمگاتے قدموں سے کمرے میں داخل ہوا۔ رحیم داد کو دیکھ کر وہ زور سے ہنسا۔

”چوہدری! پینی ہی تھی تو میرے ساتھ چلتا۔ ادھر بہت عمدہ وہسکی تھی۔“

وہ آگے بڑھا اور کرسی کھسکا کر رحیم داد کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔

”میں نے سوچا‘ پینے سے سر کا درد کچھ کم ہو جائے گا۔ ویسے میرا بالکل ارادہ نہیں تھا۔“ رحیم داد نے صفائی پیش کی۔ مگر فوراً بات پلٹتے ہوئے دریافت کیا۔ ”تو نے تو سویرے آنے کو کہا تھا۔ ابھی سے اٹھ کر کیسے واپس آ گیا؟ لگتا ہے‘ مجرا زوردار نہیں تھا۔“

”سیں! ایسی گل نہیں۔“ شاہانی نشے میں جھوم کر بولا۔ ”وہاں ایک کنجری بہت پھڑک دار تھی‘ خانہ خراب نے ایسی طبیعت گرمائی کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔“ اس نے قہقہہ بلند کیا۔ ”لا مجھے بھی ایک ڈبل بنا کر دے۔ اکیلا ہی پیتا رہے گا؟“

رحیم داد نے مسکرا کر اپنا گلاس مراد خاں شاہانی کے سامنے رکھ دیا۔ دوسرا گلاس ہی نہ تھا۔ شاہانی نے رحیم داد کے گلاس سے ایک گھونٹ بھرا اور گلاس میز پر رکھتے ہوئے اللہ بخش جوڑا کو آواز دی۔

جوڑا گھبرایا ہوا آیا۔ شاہانی نے حکم دیا۔ ”جوڑے! گلاس لے کر آ۔“ جوڑا چلنے کے لیے مڑا تو شاہانی نے اسے ٹوکا۔ ”اور دیکھ‘ سلطری کو بھی یہاں بھیج دے۔“

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اسے فوراً بیمار مندوں یاد آ گیا۔ اس نے چاہا کہ شاہانی اس وقت سلطری کو نہ بلائے۔ اس وقت اپنے بیمار بیٹے کے پاس اس کا موجود ہونا ضروری تھا۔ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”سلطری کو بلا کر کیا کرے گا؟ اس نے کسی رن کو پہلے ہی تیرے کمرے میں پہنچا دیا ہو گا۔ سلطری تو اب سوتی ہو گی۔“ رحیم داد مسکرایا۔ ”بہت کام کرتی ہے۔ صبح سے رات گئے تک ادھر سے ادھر بھاگ دوڑ کرتی رہتی ہے۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ کرتی نظر آتی ہے۔ بہت ہی محنتی رن ہے۔“

"پر وہ ابھی سو نہیں سکتی اور سو بھی گئی ہو تو جاگ سکتی ہے۔" سردار مراد خاں شاہانی نے نہایت بے نیازی سے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "سئیں چوہدری! تو اسے نہیں جانتا۔ وہ میرے لیے ہر دم تیار رہتی ہے۔"

اللہ بخش جوڑا گلاس لے کر آگیا۔ رحیم داد نے خالی گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے ایک بار پھر مراد خاں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "سلھڑی کو چھوڑ' پولانی ٹھیک رہے گی۔" وہ زیر لب مسکرایا۔

"میں نے کل ہی اسے دیکھا تھا۔ ابھی تو بیبیں ہے۔ سوہنی ہے اور تکڑی جوان ہے۔"

"نہیں! آج سلھڑی ہی چلے گی۔" مراد خاں نشے میں لہرا کر بولا۔ وہ خوب چڑھا کر آیا تھا۔ بات کرتا تو زبان لڑکھڑاتی۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس نے بہکی بہکی نظروں سے جوڑا کو گھور کر دیکھا۔

"سور دے پتر' تو ابھی تک کھڑا ہے۔ سلھڑی کو لانے نہیں گیا۔"

"سئیں! سر اکھوں تے۔" جوڑا سراسیمہ ہو کر گڑگڑانے لگا۔ "ابھی جا کر اسے بولتا ہوں۔ وہ ضرور آئے گی۔"

اللہ بخش جوڑا تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔ مراد خاں اور رحیم داد شراب سے شغل کرنے لگے۔ اندھیرا گہرا ہوتا گیا۔ رات بھیگتی گئی۔ مراد خاں نے بے چینی سے دروازے کی جانب دیکھا۔ "سلھڑی ابھی تک نہیں آئی۔ وہ کیوں نہیں آئی؟" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے گلاس ہونٹوں سے لگا کر آہستہ آہستہ چسکی لگانے لگا۔

وقت کچھ اور گزر گیا۔ مراد خاں شاہانی کے چہرے پر جھنجلاہٹ پھیلنے لگی۔ وہ غصے سے بڑبڑانے لگا۔ "لگتا ہے' اس کا نخرا بہت بڑھ گیا ہے۔ سمجھتی ہے' میں اسے بہت چاہتا ہوں۔" اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ عین اسی وقت کمرے کے باہر چاپ ابھری۔ سلھڑی اندھیرے سے نکل کر اندر داخل ہوئی۔ دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔ رحیم داد نے حیرت سے دیکھا۔ سلھڑی گوٹا کناری لگا گلابی دوپٹہ اوڑھے اور گلابی ہی منجھلی باندھے ہوئے تھی۔ بالوں میں چمک دمک تھی۔ ماتھے پر ٹیکا سجا تھا۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔ چہرے پر ملاحت تھی' نکھار تھا۔ اس کا جسم ہولے ہولے لہرا رہا تھا' مچل رہا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی آئی اور ایک خاص ادا سے مراد خاں کے روبرو کھڑی ہو گئی۔

مراد خاں شاہانی نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "بہت دیر لگا دی تو نے۔ لگتا ہے تیرا نخرا کچھ زیادہ

ھ گیا ہے۔"

"سئیں سردار!! ایسا نہ سوچ۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "میں صدکے تھیواں' تو بلائے اور میں نہ وں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

شاہانی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سلھڑی کی جانب جھومتا ہوا بڑھا۔ بے قرار ہو کر گویا ہوا۔ "میرے گلے سے تو لگ جا جند جانی۔" اس نے سلھڑی کو بازوؤں میں دبوچ لیا' مڑ کر رحیم داد کی طرف یکھا۔ "چوہدری! میں تو اب چلا۔ میں تو اسی کے لیے ڈھانڈلے کی میل سے اٹھ کر آیا تھا۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھایا۔ ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

رحیم داد نے بھی گلاس ختم کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

مراد خاں مسکرا کر بولا۔ "چوہدری! آج یہ گل چاندنی میرے پاس رہے گی۔ پولانی تیرے پاس ہنچ جائے گی۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "تجھے وہ پسند بھی ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا' حیرت سے سلھڑی کو دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے بیمار بیٹے مندوں کے بارے میں مراد خاں شاہانی سے کچھ نہیں کہا جس کے لیے وہ کچھ ہی دیر پہلے اپنی کوٹھری میں رو رہی تھی' گریہ وزاری کر رہی تھی۔

مراد خاں جھومتا جھامتا کمرے سے چلا گیا۔ سلھڑی سہمی ہوئی تھی۔ وہ چہرے پر ابھرتی ہوئی افسردگی چھپانے کے لیے بار بار مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ رحیم داد بھی کمرے سے نکلا' کچھ دور تک مراد خاں اور سلھڑی کے پیچھے اندھیرے میں چلتا رہا۔ حویلی سنسان تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

رحیم داد مڑا' ڈیرے کی جانب بڑھا' اپنے کمرے میں پہنچا اور چپ چاپ بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ وہ سلھڑی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی مجبوری اور بے بسی پر مضطرب تھا۔ اسے رہ رہ کر سلھڑی کا بیٹا یاد آ رہا تھا جسے حکیم نے نمونیا بتایا تھا۔ وہ بخار سے بھن رہا تھا اور اس کی ماں سردار مراد خاں شاہانی کے بپھرے ہوئے جذبات کے گرداب میں تھی۔

کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ رحیم داد نے چونک کر دیکھا۔ پولانی اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کا قد نکلتا ہوا تھا۔ رنگ گورا اور زردی مائل تھا۔ جسم مضبوط اور چھریرا تھا۔ وہ گاؤں کے نوجوان جولاہے کی بیوی تھی۔ رحیم داد کی تیز نظروں نے تاڑ لیا کہ بناؤ سنگھار کے باوجود اس کے چہرے پر خوف کے سائے منڈلا رہے ہیں۔ آنکھوں میں کچی نیند سے بیدار ہونے کا خمار ہے۔ اس نے دروازہ بند کیا' مسکرانے کی کوشش کی' آگے بڑھی اور بستر پر سمٹ [illegible] یک طرف بیٹھ گئی۔

☆

رحیم داد غسل کرنے کے بعد تولیا سے بدن پونچھ رہا تھا کہ حویلی کے پچھواڑے سے عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے گھبرا کر تولیا ایک طرف پھینکا۔ جلدی جلدی کپڑے پہنے، باہر نکلا۔ ابھی تک پالا پڑ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی دھند فضا پر چھائی ہوئی تھی۔ سورج طلوع ہو چکا تھا مگر دھند میں لپٹی ہوئی دھوپ مٹیالی اور پھیکی پھیکی تھی۔

رحیم داد حویلی کے پچھواڑے بڑھا جدھر سے رونے کی آوازیں صبح کی گہری خاموشی میں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ وہ آگے گیا تو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ رونا پیٹنا سلطری کی کوٹھری کے اندر ہو رہا ہے۔

رحیم داد کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بڑھ کر کوٹھری کے دروازے پر پہنچا، اندر داخل ہوا۔ سامنے چارپائی پر سلطری کا بیٹا مندوں بے جان پڑا تھا۔ اس کے مردہ جسم پر میلی سی چادر پڑی تھی۔ سلطری اس کے سرہانے چارپائی کی پٹی سے سر ٹکائے بین کر رہی تھی۔ چارپائی کے اردگرد چند عورتیں بھی بیٹھی تھیں۔ وہ بھی رو رہی تھیں۔ رک رک کر سینے پر ہاتھ مارتیں اور دل گرفتہ ہو کر "ہائے ہا، ہائے ہا!" کی صدائیں بلند کرتیں۔ کوٹھری میں عود و لوبان کا دھواں لہرا رہا تھا۔ فضا دھندلی اور افسردہ تھی۔

سلطری نے گردن اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ چہرا اجڑا اجڑا تھا۔ بال بکھر کر منہ پر آ گئے تھے۔ بدن پر وہی لباس تھا جسے پہن کر وہ پچھلی رات سردار مراد خاں شاہانی کے پاس آئی تھی۔ البتہ اس کا گلابی دوپٹہ ایک طرف پڑا تھا۔ سر برہنہ تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے، کھوئی کھوئی نظروں سے رحیم داد کو دیکھتی رہی۔ پھر سینے پر دوہتڑ مار کر بین کرنے لگی۔

"سئیں! میں لٹ گئی، میرا مندوں گزر گیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ ڈائن موت اسے رات ہی کو اپنے ساتھ لے گئی۔ میں سویرے لوٹی تو وہ مرا پڑا تھا۔ سئیں! میں شامت دی ماریا، آخری گھڑی اس سے مل بھی نہ سکی۔ میں اس کے لیے کچھ نہ کر سکی۔" اس نے بے بسی سے گردن ادھر ادھر ہلائی۔ "وہ یہاں اکیلا تھا۔ کوئی پانی پلانے والا بھی نہ تھا۔"

سلطری رک رک کر بین کر رہی تھی۔ قریب بیٹھی ہوئی عورتیں اس کے ساتھ ساتھ بین کرتیں۔ سینے پر بار بار ہاتھ مار کر "ہائے ہا!" کی صدا بلند کرتیں۔ سلطری بین کرتے کرتے بے قرار ہو کر چیختی۔ "ہائے ربا! میں کیہ کراں۔ میں لٹ گئی۔ میرا سہارا ختم ہو گیا۔" اس نے تڑپ کر اپنا سر چارپائی پر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

حیم داد قریب گیا اور سلطری کا سر آہستہ آہستہ تھپک کر بولا۔ "صبر کر سلطری! صبر کر، رب کی رضی تھی۔" اس کا دل بھر آیا، آنکھیں چھلک پڑیں، آنسو پلکوں سے بہہ کر رخساروں پر ٹپکنے وہ کچھ دیر میت کے نزدیک خاموش کھڑا آنسو بہاتا رہا۔ پھر اس نے آنسو پونچھے مڑا اور کوٹھری نکل گیا۔

ہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مراد خاں شاہانی کے کمرے میں پہنچا۔ مراد خاں نہایت اطمینان سے ناشتا ہا تھا۔ رحیم داد کرسی کھسکا کر قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ "شاہانی! تیری سلطری کا پتر مر گیا۔"

"مجھے پتہ ہے۔" وہ تلے ہوئے مرغ کا گوشت نوچتے ہوئے بولا۔ "چوہدری! تو سلطری کی کوٹھری کیوں گیا تھا؟" اس کا لہجہ تیکھا تھا اور چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔ "تجھے وہاں نہیں جانا چاہیے تجھے پتہ ہونا چاہیے ہم سردار کمیوں کے پاس اس طرح نہیں جاتے۔" مراد خاں کے رویئے اور تلخی پیدا ہو گئی۔ "تو میرا مہمان ہے تجھے اس طرح میری آن اور رتبہ نہیں بگاڑنا چاہیے یہ عزت اور دبدبہ کائم رکھنے کا معاملہ ہے۔ اس کے لیے خود کو بہت اونچا رکھنا پڑتا ہے۔ ارعوں اور کمیوں کو جتی کے نیچے دبا کر رکھنا پڑتا ہے۔"

رحیم داد حیران و پریشان بیٹھا رہا۔ سردار مراد خاں تیزی سے بولتا رہا۔ "وڈے اور بزرگ کہہ تے ہیں۔ سور اور گیدڑ کو گولی مار دو تاکہ وہ فصل خراب نہ کریں۔ مزارعوں اور کمیوں کی گردن سدا ہی رکھنے کے لیے ان کی رن کو اپنا بستر سمجھو تاکہ وہ فصل پر حک نہ جتائیں۔" اس نے رحیم داد کو رپور نظروں سے دیکھا۔ "اسی لیے ہمیں ان کی نوجوان رناں اور پالڑیاں اٹھوانی پڑتی ہیں تاکہ ان کی آنکھ اونچی نہ ہو۔ ان سے الگ اور دور رہنا پڑتا ہے تاکہ وہ سر نہ چڑھیں۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" رحیم داد اس کے غصے سے مرعوب ہو کر معذرت کے انداز میں بولا۔ "سچی بات یہ ہے، تو سردار ہے، وڈا جگیردار ہے۔ میں تیرے سامنے معمولی زمیں دار ہوں، مہاجر بھی ہوں۔ میں نوں ان باتوں کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" مراد خاں بھی نرم پڑ گیا۔ اس نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تجھے پتہ نہیں، مجھے بھی سلطری کے پتر کے مرن کا رنج ہوا۔ پر کیا کیا جائے۔ رب کی یہی مرضی تھی۔" اس نے تولیا اٹھا کر ہاتھ پونچھے۔ "میں نے آدھ گھنٹہ پہلے سلطری کو بلایا تھا، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ دلاسا دیا تھا، حوصلہ بڑھایا تھا۔ سو روپے بھی دیئے۔"

رحیم داد اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے نہ مداخلت کی نہ کسی فوری ردعمل کا اظہار کیا۔ مراد خاں نے ہاتھ پونچھ کر رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری! تو بھی فٹافٹ ناشتا کر لے بھکر واپس جانا

ہے۔ تجھے بھی ساتھ ہی چلنا ہے۔"

"کیا آج بھکر جانا ضروری ہے؟" رحیم داد نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

"بہت ضروری ہے۔ ملتان سے میرا یار مرشد علی گردیزی آیا ہے۔ وہ کل رات ہی بھکر پہنچا اور میرا انتظار کر رہا ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ملتان لے جائے گا۔ اس کی بھین کا پرنا ہے۔ اس م مجھے شرکت کرنا بہت ضروری ہے۔"

"کیوں بہت ضروری ہے؟" رحیم داد نے بے خیالی میں پوچھ لیا۔

سردار مراد خاں شاہانی بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ "سئیں چوہدری! تجھے پتہ نہیں۔ مرشد کا پڑ ملتان کے گدی نشینوں میں سے ہے۔ اس کا ایک شریکا بھی وزیر لگا ہے' وہ بھی آئے گا۔ اس ک ساتھ دوسرے وزیر اور وڈے سرکاری افسر بھی آئیں گے۔ ان سب سے وہاں ملنا جلنا ہوگا۔ وزیرں اور افسروں سے میل ملاپ رکھنا چاہیے۔ زمیں داری چلانے میں ان سے بہت کام نکا ہے۔" اس نے رحیم داد کا ہاتھ تھام کر ہولے سے دبایا۔ "تجھے بھی ملتان لے چلوں گا۔ سب س تجھے ملواؤں گا۔ چوہدری! ایسا موکع روز روز نہیں ملتا۔"

"تیرے ساتھ میں ضرور ملتان چلوں گا۔" رحیم داد نے نرم لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "یہ تو سوچ' سلھری کا پتر آج ہی مرا ہے۔ وہ نری بہت چیتی اور پرانی رکھیل ہے۔ تیرے اس طرح چلے جانے پر اسے بہت دکھ ہوگا۔ تیرے بارے میں وہ کیا سوچے گی؟"

"تو اس کی فکر نہ کر۔" مراد خاں شاہانی نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ "چند روز میں وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گی۔ پہلے کی طرح مسکراتی' لچکتی' بل کھاتی رات کو میرے پاس آئے گی۔ ت اسے نہیں جانتا۔ میکوں پتہ ہے' وہ میری کسی گالہہ کا ذرا برا نہیں مناتی۔ وہ مجھ سے کبھی روٹھ نہیں سکتی۔" اس نے ہلکا قہقہہ بلند کیا۔ "بس ذرا کمر پر ہاتھ پھیرا' گلے لگا کر پیار سے کہا' ہائے جد جانی! و ایک دم موم کی طرح پگھل جاتی ہے۔ خوشی سے ایسی مست ہو جاتی ہے جیسے پھول کھلتا ہے۔ مگر اسے بہت ٹھیک طرح جانتا ہوں۔ برسوں سے میرے پاس ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے کون جان سک ہے۔"

"ویسے جیسی تیری مرضی۔ میں چاہتا تھا تو ایک روز یہاں ٹھہر جاتا تو ٹھیک تھا۔" رحیم داد نے اسے روکنے کے لیے دبی زبان سے اصرار کیا۔

"چوہدری! میرے یہاں ٹھہرنے سے کیا ہوگا۔" مراد خاں شاہانی رضامند نہ ہوا۔ "رادھانی موجود ہی رہے گا۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے' گور کفن کا بندوبست کردے۔ وہ سارا کام ٹھیک ٹھاک طور سے کرادے گا۔ تجھے پتہ ہے وہ کتنا ہوشیار بندہ ہے۔" اس نے گردن اونچی کی اور ذرا پھیل کر بیٹھ گیا۔ "چوہدری! اطمینان رکھ۔ سلھری کے پتر کا کفن دفن پوری شان سے ہوگا۔ غریب غربا کو روٹی کھلائی جائے گی۔ مندر جھوڑدے چاول ہوں گے' کل ہوگا' فاتحہ ہوگی۔ جمعراتیں ہوں گی۔ ب ہی کچھ ہوگا اور میری طرف سے ہوگا۔" اس نے مسکرا کر رحیم داد کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "چوہدری! تجھے پتہ ہے' میں سلھری کو کتنا پیار کرتا ہوں۔ وہ میری چیتی ذال ہے۔"

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد ناشتا آگیا۔ رحیم داد نے بے دلی سے ناشتا کیا اور جلد ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ خاصا افسردہ اور دل گرفتہ تھا۔ لیکن شاہانی اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر افسردگی کا نام و نشان نہ تھا۔

پہر دن گزرا۔ سورج چڑھ کر آسمان کی بلندی پر پہنچا۔ مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا اور اس کے ہم راہ حویلی کے پھاٹک پر پہنچا۔ دونوں جیپ میں سوار ہوگئے۔ حویلی کے پچھواڑے سلھری کی کوٹھری میں پٹنی ہو رہی تھی۔ رونے اور بین کرنے کی دل دوز آوازیں ابھر رہی تھیں۔

جیپ آگے بڑھی۔ رحیم داد اور سردار مراد خاں رونے اور بین کرنے کی دل دوز آوازیں دور تک سنتے رہے۔ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ جیپ ہچکولے کھاتی' گرد کے بادل اڑاتی گاؤں کے کچے راستے پر دوڑتی رہی۔ رونے پیٹنے کی آوازیں پیچھے رہ گئیں۔ جیپ پختہ سڑک پر آگئی اور تیز رفتار سے بھکر شہر کی جانب دوڑنے لگی۔

☆

مرشد علی گردیزی حویلی کے چوک ہی میں مل گیا۔ مراد خاں شاہانی کو دیکھتے ہی دوڑ کر گلے سے پٹ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لگے ہوئے خاصی دیر تک جوش و مسرت سے قہقہے اتے رہے' گلے شکوے کرتے رہے۔ پھر ہنستے مسکراتے بیٹھک کی جانب بڑھے۔ رحیم داد بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ مراد خاں نے مرشد علی کا تعارف کراتے ہوئے رحیم داد کو مخاطب کیا۔

"چوہدری! یہ مرشد گردیزی میرا بہت پرانا یار ہے۔ جب میں لہور میں پڑھتا تھا۔ یہ میرا کلاس لو ہوتا تھا۔ ہم اکٹھے ہوسٹل میں رہتے تھے۔"

"اور اکٹھے ہی چھپ چھپ کر کنجریوں کے پاس ہیرا منڈی بھی جاتے تھے۔" گردیزی نے زور کا قہہ لگایا۔ "پر اس نے پرنا پہلے کرلیا اور مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔"

مراد خاں نے بھی زور کا قہقہہ بلند کیا۔ رحیم داد کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”مرشد! یہ چوہدری نور الٰہی ہے۔ منٹگمری کا وڈا زمیں دار ہے۔ احسان شاہ کی حویلی میں، پہلی بار اس سے ملا تھا۔ تب سے ایسی یاری ہو گئی کہ اب تو یہ میرا جگری یار ہے۔“

مرشد علی نے مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا، گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبا کر بولا۔ ”چوہدری! تو مراد کا یار ہے تو آج سے میرا بھی یار بن گیا۔“ اس نے بات کا رخ موڑ کر اچانک مراد خاں کو مخاطب کیا۔ ”یار شاہانی! آج تک احسان شاہ سے تیری یاری کا راز سمجھ نہیں آیا۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ ”خدا جھوٹ نہ بلوائے، وہ عمر میں لگ بھگ تیرے پیئو کے برابر ہو گا۔ تیری اس کے ساتھ کیسے یاری ہو سکتی ہے؟“

”تو اس راز کو نہیں جانتا۔“ مراد خاں نے صاف گوئی سے بتایا۔ ”وہ عمدہ اسکاچ وہسکی پلاتا ہے اور سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس کے کوٹ میں ایک سے ایک زور دار اور پوپٹ رن ہے۔ خود تو عیش کرتا ہی ہے پر یاروں کو کرا کے زیادہ خوش ہوتا ہے۔“

”تو اس سے کہاں ٹکر گیا؟“ مرشد علی شاہ گردیزی نے پوچھا۔ ”پہلے تو تیری اس سے یاری نہیں تھی۔ سال سوا سال سے سن رہا ہوں تو اس کے پاس بہت جانے لگا ہے۔ کئی کئی روز اس کی حویلی میں ٹھیرتا ہے۔ یہ چکر کیا ہے؟“

”بات دراصل یہ ہے سئیں! شاہ جی کا ایک جنوائی سی ایس پی افسر ہے۔ وہ ضلع میانوالی میں ڈپٹی کمشنر لگا ہے اور میرا ایک کام اس سے اٹکا ہے۔ اس چکر میں شاہ جی سے ملنا پڑا۔ نواب زادہ نیاز محمد خاں کو تو جانتا ہی ہے۔ وہی اپنا کالا باغ والا۔ اسی نے شاہ جی سے مجھے ملایا تھا۔“ اس نے ہنس کر مرشد علی گردیزی کے زانو پر ہاتھ مارا۔ ”پر یہ باتیں میں تجھے پہلے بھی بتا چکا ہوں۔“

”کہاں بتا چکا ہے؟“ مرشد علی شاہ نے شکوہ کیا۔ ”تجھ سے پچھلے دنوں میرا ملنا جلنا ہی کتنا رہا۔ دو تین بار ملا بھی تو کبھی ٹھیک سے بات نہیں ہوئی۔ تو نے ہر بار ملتان آنے اور میرے ساتھ کچھ دن گزارنے کا وعدہ بھی کیا پر کبھی آیا نہیں۔“

”اب تو تیرے ساتھ ملتان چل ہی رہا ہوں۔ روز ہی مل بیٹھیں گے، جی کھول کر باتیں ہوں گی۔ پرانی یادیں تازہ ہوں گی۔“

نوکروں نے بیٹھک ہی میں کھانا لا کر میز پر چن دیا۔ تینوں نے کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر مراد خاں اور مرشد علی شہر چلے گئے۔ رحیم داد زینہ طے کر کے اوپر کی منزل کے اس کمرے میں چلا گیا جس میں اس کے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مرشد علی گردیزی کا کمرہ برابر ہی تھا۔

شام کو پینے پلانے کا دور چلا۔ مرشد علی گردیزی اور رحیم داد کے درمیان جو حجاب اور تکلف تھا

چند ہی پیگ لگانے کے بعد دور ہو گیا۔ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے ھے۔ مراد خاں زیادہ دیر ان کے ساتھ نہ بیٹھ سکا۔ ساڑھے آٹھ بجے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے ٹوکا۔ ”کہاں چلا شاہانی؟“

”چوہدری! میں نے اب اندر جانا ہے۔“ مراد خاں شاہانی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”گردیزی تو برے ساتھ بیٹھا ہی ہے۔“

”کچھ دیر اور ٹھیر جاتا تو ٹھیک تھا۔“ رحیم داد نے اصرار کیا۔ ”چلا جانا، ابھی تو بہت رات پڑی ہے۔“

”نہیں! اب میں نہیں ٹھیر سکتا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”اپنی ذال انتظار کر رہی ہے۔ ۲۵ روز بعد دتا ہوں۔ کچھ اس کا بھی تو حق ہے۔“

”جا یار جا۔“ مرشد علی نے ہنس کر بے تکلفی سے کہا۔ ”چوہدری! اسے جانے دے۔ اس نے ب نہیں رکنا۔“

مراد خاں شاہانی چلا گیا۔

ذرا دیر خاموشی رہی۔ مرشد علی نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا اور مسکرا کر بولا۔ ”چوہدری! تجھے پتہ نہیں، شاہانی اپنی گھر والی سے بہت ڈرتا ہے۔“

”میں تو سمجھتا ہوں جی، وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔“ رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ ”اور کسی زنانی ے تو وہ ڈر ہی نہیں سکتا۔ گھر والی تو صرف بچوں کی ماں ہوتی ہے۔ اس سے کیا ڈرنا شرنا۔“

”پر شاہانی کی گھر والی کی بات ہی دوسری ہے۔“ مرشد علی گردیزی نے نشے میں لہرا کر رحیم داد کو گہری نظروں سے دیکھا۔ ”وہ وڈی جگیردارنی بھی ہے۔ اسے ترکے میں بہت وڈی جائیداد ملی ہے۔“ وہ کچھ زیادہ ہی چڑھا گیا تھا۔ قہقہہ لگا کر بولا۔ ”ایسی گھر والی سے تو ڈرنا ہی پڑتا ہے۔“

”یہ تو میں نوں پتہ نہیں تھا۔“ رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

”تجھے تو یہ بھی پتہ نہ ہو گا کہ شاہانی اس کا دوسرا کھصم ہے۔ دھیج میں ایک اگوایا بھی ساتھ لائی ہے۔“ مرشد علی پر نشہ تیزی سے چڑھا تھا۔ بار بار زور کا ریلا آتا۔ اس کی جھونک میں وہ رحیم داد سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا۔ شاہانی کی نجی زندگی کے بارے میں کھل کر بات کرنے لگا۔ ”اس کا پہلا کھصم بہت وڈا جگیردار ہوتا تھا۔ وہ گھوڑی سے گر کر مر گیا۔ اس کے مرن کے بعد ساری جائیداد اور زمیں داری گھر والی اور اس کے اکلوتے پتر کو ملی۔“

”اس کی زمیں داری بھی بیٹ میں ہے؟“ رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے

دریافت کیا۔

"نہیں!" مرشد علی گردیزی نے جواب دیا۔ "نواں کوٹ میں اس کے مربعے ہیں۔ باغات ہیں۔ ان کی دیکھ بھال شاہانی کا سالا کرتا ہے۔ پر اب تو اس جائیداد اور اراضی کا مالک بھی مراد ہی ہے۔"

مرشد علی گردیزی نے نشے میں جھوم کر قہقہہ لگایا۔ "اسی جگیر کے چکر میں تو مراد کے پیوٗ نے اس سے پرنا کردیا حالانکہ عمر میں بھی وہ وڈی تھی اور ایک پتر کی ماں بھی تھی۔ یہ جائیداد اور جگیر بھی بہت ظالم ہوتی ہے۔"

"یہ باتیں تو شاہانی نے مجھے کبھی بتائی ہی نہیں۔" رحیم داد بدستور حیرت زدہ تھا۔

"ایسی باتیں کہیں بتانے والی ہوتی ہیں۔ سئیں چوہدری! تو نے بھی حد کردی۔" وہ رحیم داد کی سادہ لوحی پر ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "مجھے تو اس لیے معلوم ہیں کہ مراد کے پرنے میں شریک ہوا تھا۔ ویسے میں اس کی ذال کے پہلے کھسم کو بھی جانتا تھا۔" مرشد علی نے گردن بڑھا کر سرگوشی کی۔ "تجھے راز کی ایک گالہہ بتاؤں۔ شاہانی سے اب تک اس کی کوئی نرینہ اولاد نہیں۔ ایک کڑی ہوئی تھی۔ بچپن ہی میں مرگئی۔ اب تو پہلے ہی کھسم کا پتر رہ گیا ہے۔ اسے کا نام محمد سلمان خاں ہے۔ اچھا گبھرو جوان ہے۔ بالکل اپنے پیوٗ پر گیا ہے۔ وہ جڑیا اور تکڑا جوان ہوتا تھا۔"

رحیم داد نے ہنس کر تبصرہ کیا۔ "تب ہی تو شاہانی نت نئی زنانیوں کے چکر میں رہتا ہے۔"

"چوہدری! ویسے یہ انوکھی گالہہ نہیں۔ سارے ہی وڈے زمیں دار اور جگیر دار اسی چکر میں رہتے ہیں۔ گھر والیاں بھی سب کچھ جانتی ہیں پر انھیں پتہ ہوتا ہے کہ جائیداد کی اصلی مالکن وہی ہوتی ہیں۔ انھی کی اولادیں جائیداد کی وارث بنتی ہیں۔ یہ حق ان سے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

مرشد بہکنے کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔ "یار چوہدری! اپنے بادشاہ اور شہنشاہ بھی تو حرم رکھتے تھے۔ ان میں چھانٹ چھانٹ کر ایک سے ایک خوبصورت اور پوپٹ کنیزیں رکھتے تھے۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "عیش کرتے تھے جی۔ جب چاہتے تھے اور جسے چاہتے تھے اس کے ساتھ سوتے تھے۔ انھیں کوئی روکنے والا یا منع کرنے والا تو ہوتا نہیں تھا۔ پر ملکہ 'ملکہ ہی ہوتی تھی۔ تخت و تاج اسی کے پتر سنبھالتے تھے۔ اسی سے ان کی نسل چلتی تھی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بالکل ٹھیک کہہ رہا۔" رحیم داد بھی نشے کے ایک زوردار ریلے میں بہہ گیا۔ "اس معاملے میں اپنا مراد خاں بھی کسی بادشاہ سے کم نہیں۔ اسے تو روز نئی رن چاہیے۔"

"پر شاہانی کچھ زیادہ ہی رنّاں کے چکر میں رہتا ہے۔ میں نے اوروں سے بھی سنا ہے' اب وہ بہت رن رسیا ہوگیا ہے۔"

رات گزرتی رہی۔ مے نوشی کا دور چلتا رہا۔ بات سے بات نکلتی رہی۔ شاہانی سے ہٹ کر بات سیاست پر آگئی۔ رحیم داد کو سیاست کے بارے میں کوئی شدبد نہیں تھی۔ مگر مرشد علی شاہ سیاسی جوڑتوڑ سے خاصا باخبر تھا۔ وہ ملک کے سیاسی حالات کے بارے میں ایسی باتیں سناتا رہا جو رحیم داد کے لیے نئی تھیں اور حیرت انگیز بھی۔

دونوں نے جم کر پی۔ کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں جاکر بستر پر لیٹ گئے۔

دوسرے روز دوپہر کو ملتان جانے کا پروگرام تھا۔ مگر صبح کی ٹرین سے اچانک مراد خاں کی بیوی کا پھلک یا اگوایا محمد سلمان خاں آگیا۔ وہ انیس بیس سال کا خوش شکل اور صحت مند نوجوان تھا۔ گورڈن کالج' راولپنڈی میں پڑھتا تھا اور ہوسٹل میں رہتا تھا۔ دو ہفتے کی چھٹی پر بھکر آیا تھا۔ اس کے پہنچنے کے بعد مراد خاں کا پروگرام درہم برہم ہوگیا۔ وہ ملتان نہیں جاسکا۔ اس نے مرشد علی گردیزی کو بھی روک لیا۔ مراد خاں کا بیشتر وقت سلمان کے ساتھ گزرتا۔ وہ اسے بہت چاہتا تھا۔ اس کی بڑی ناز برداری کرتا۔ اس کے آرام و آسائش کا ہر طرح خیال رکھتا۔

مرشد علی اور رحیم داد ایک دوسرے کے زیادہ قریب آگئے۔ دونوں شام کو دیر تک بیٹھتے' شغل بادہ نوشی کرتے اور ہنس ہنس کر بے تکلفی سے باتیں کرتے۔ شاہانی ان کی صحبت میں کم ہی وقت گزارتا۔ پہر رات گزرتے ہی اٹھ کر کھڑا ہوجاتا۔ چار روز گزر گئے۔ مرشد علی کے لیے بہن کی شادی کے باعث زیادہ قیام کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے بار بار اپنی مجبوری کا مراد خاں سے اظہار کیا۔ اس کے زور دینے پر پانچویں روز مراد خاں اور رحیم داد شام کی ٹرین سے مرشد علی گردیزی کے ہم راہ ملتان روانہ ہوگئے۔

☆

ملتان میں دو روز ٹھہرنے کے بعد مرشد علی سویرے سویرے مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کو قاسم بیلہ لے گیا۔ وہاں اس کی زمینیں تھیں۔ آم اور مالٹے کے باغات تھے۔ چند میل کے فاصلے پر دریائے چناب بہتا تھا۔ اس کے کنارے گھنے جنگل تھے جن میں مرشد علی کی اپنی شکارگاہ بھی تھی۔ قاسم بیلہ میں اس کی ایک حویلی بھی تھی۔ اسی میں تینوں کے قیام کا بندوبست کیا گیا۔

رات گزری' صبح ہوئی۔ مراد خاں اور مرشد علی شکار کھیلنے نکل گئے۔ رحیم داد نہیں گیا۔ اسے شکار سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ طبیعت بھی کچھ مضمحل تھی۔ پچھلی رات بہت زیادہ شراب پی گیا تھا۔ اس کا خمار ابھی تک باقی تھا۔ سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ اس نے گرم پانی سے غسل کیا۔ لسی کے کئی گلاس چڑھائے لیکن خمار اور ہینگ اوور میں کمی نہ آئی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر رحیم داد باغ میں چلا گیا۔ باغ حویلی کی چار دیواری کے اندر ہی تھا۔ خاصا وسیع بھی تھا۔ اس میں پھلوں کے درخت تھے۔ رات کی رانی اور چنبیلی کے بیلوں سے مہکتے ہوئے فرحت افزا کنج تھے۔ گلاب کے پودے کثرت سے تھے اور قسم قسم کے تھے۔ ان کی چمن بندی سلیقے اور نفاست سے کی گئی تھی۔ سرما کی ہلکی ہلکی دھوپ میں گلاب کے شگفتہ پھول مہک رہے تھے۔ ان کی پنکھڑیوں پر شبنم کے قطرے جھل ملا رہے تھے۔

رحیم داد کو باغ بہت پسند آیا۔ وہ سبزہ زار میں پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا اور دھوپ سے لطف اندوز ہونے لگا مگر وہ زیادہ دیر باغ میں نہ بیٹھ سکا۔ طبیعت بے مزہ ہو رہی تھی۔ سر چکرا رہا تھا اور آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ وہ کمرے میں گیا اور بستر پر سو گیا۔

دوپہر کو وہ سو کر اٹھا۔ ایک بار پھر خوب گرم پانی سے غسل کیا۔ اب اسے کچھ قرار آیا۔ وہ فرحت اور تازگی محسوس کرنے لگا۔ اس نے کھانا کھایا اور مرشد علی کے مینجر خادم علی جویا کے ہم راہ کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ خریف کی فصل کی کٹائی ہو چکی تھی۔ کھیتوں میں جگہ جگہ مکئی اور کماد کے کٹے ہوئے پودوں کے مہارے اور ڈھیر لگے تھے۔

دونوں پگڈنڈیوں اور پہیوں سے گزرتے ہوئے کپاس کے کھیتوں میں چلے گئے۔ کپاس کی فصل بہت اچھی تھی۔ اس کی کاشت بہت بڑے رقبے پر کی گئی تھی۔ سورج بیچ آسمان سے گزر کر تھوڑا سا مغرب کی طرف ڈھلک گیا تھا۔ دھوپ میں تمازت آ گئی تھی۔ کپاس کے پودوں میں روئی کے سفید سفید گالے ڈوڈوں سے پھوٹ کر باہر جھانک رہے تھے۔ یہ پھٹی تھی۔ سرائیکی میں اسے ونواڑ بھی کہا جاتا ہے۔ اجلی اجلی ونواڑ کھیتوں میں حد نظر تک پھیلی ہوئی تھی، سورج کی چمکیلی اور ترچھی کرنوں میں جھلکتی نظر آ رہی تھی۔ کپاس کے پودے دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ ونواڑ کی چنائی بہت پہلے شروع ہو چکی ہے۔

اس وقت بھی نوجوان چوگی عورتیں اور لڑکیاں ٹولیاں بنائے کھیتوں میں جگہ جگہ بکھری ہوئی تھیں۔ وہ ونواڑ کی چنائی کر رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے دوپٹے پیشانی سے سر تک لپیٹ کر پیچھے کر لیے تھے اور ان کے دو پلو کمر کے گرد باندھ رکھے تھے۔ وہ انگلیوں سے ونواڑ چنتیں اور دائیں بائیں کمر کے پیچھے ڈالتی جاتیں۔ ان کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے، چہروں پر پسینے کے قطرے جھل ملا رہے تھے۔ وہ قہقہے لگا رہی تھیں اور ونواڑ کی چنائی کے گیت گا رہی تھیں۔ رحیم داد جب خادم علی جویا کے ہم راہ چوگیوں کے قریب سے گزرا تو انھوں نے نظریں اٹھا کر دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ ونواڑ چن چن کر دائیں بائیں تیزی سے اڑس رہی تھیں اور ہنس ہنس کر گا رہی تھیں۔

ملک تاں تیڈا یار ہے، تو کیوں میرندئیں بولیاں
موسم آئی ونواڑ دی چڑیاں کملیاں بھولیاں

خادم علی جویا گیت کے بول سن کر مسکرایا۔ اس نے رحیم داد سے پوچھا۔ "سئیں چوہدری! تو ملتانی سمجھتا ہے؟"

"کچھ زیادہ نہیں جانتا جی!"

جویا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ چوگیاں تجھے دیکھ کر آپس میں چھیڑ چھاڑ کر رہی ہیں۔ ایک دوسرے سے کہہ رہی ہیں، زمیں دار تیرا یار ہے۔ تو مجھے کیوں طعنے دیتی ہے۔ کپاس چن نے کا موسم آ گیا ہے۔ بھولی بھالی مٹیاریں کپاس چن رہی ہیں۔ ان بولوں کا یہی مطلب ہے۔" اس بے تکلفی سے قہقہ لگایا۔

رحیم داد مسکرایا، اس نے چوگیوں کی جانب دیکھا۔ وہ گا رہی تھیں، ہنس رہی تھیں اور ونواڑ چن نے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دونوں کپاس کے کھیتوں کے درمیان گزرتی ہوئی ایک پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ کچھ دور جانے کے بعد رحیم داد کپاس کی چنائی کرنے والی ایک چوگی کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی۔ رحیم داد نے اسے پہچان نے کی کوشش کی۔ وہ شاداں تھی۔ ہاں وہی تھی۔ وہی کسا ہوا سڈول جسم، وہی ململ جھگے سے جھانکتا ہوا ابھرا ابھرا سینہ۔ وہی بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ وہ ذرا بھی نہیں بدلی تھی۔

شاداں کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ اور دھوپ میں اجلے تانبے کی طرح دمک رہا تھا۔ اس کے بالوں میں پھٹی کے ریشے الجھے ہوئے تھے۔ لمبی لمبی پلکوں پر خاک کے ذروں کی تہہ نظر آ رہی تھی۔ وہ انگلیوں سے پھٹی چنتی، چوگیوں کے غول سے نکل کر کبھی اس پودے پر جاتی کبھی اس پر۔ اس کے چہرے پر نہ شوخی تھی نہ اس کے انداز میں چلبلا پن تھا۔ وہ نظریں جھکائے محویت سے چوگیوں کے ساتھ آواز میں آواز ملا کر گا رہی تھی۔

روزی دے کھاطر وطن سیٹو سے
ملک بگانے ان ولیوں سے
غربت دی مانگ
دلبر دی تانگ
تیراں دی وانگ
دیس دیس وچ پیٹ دی کھاطر در در عزتاں رولیاں

خادم علی جویا نے شاداں کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد کو بتایا۔ ”سیں! اس کا ناں شاداں ہے۔ یہ گا نہیں رہی۔ گیت کے بولوں میں اپنے دل کا حال بیان کر رہی ہے۔ یہ کہہ رہی ہے۔

میں نے روزی کے لیے وطن چھوڑا
اب پرائے دیس میں ماری ماری پھرتی ہوں
غربت کی برچھی ہے
دل بر کا انتظار ہے
دونوں ہی تیر کی طرح چھیدتے ہیں
پیٹ کی خاطر دیس بدیس ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔ عزت اور لاج خاک میں ملا دی ہے۔

رحیم داد نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ خادم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”سیں! یہ بھی تیرے ہی ضلعے کی رہنے والی ہے۔ پچھلے کئی مہینوں سے ادھر آگئی ہے۔ بہت محنتی اور جفاکش چوگی ہے پر اتنی ہی کڑوی اور سرکش بھی ہے۔“ وہ ایک آنکھ دبا کر شوخی سے مسکرایا۔ ”سونہڑی اور پوہٹ رن ہے پر جنگلی گھوڑی کی طرح بدکتی ہے۔“ رحیم داد نے خادم علی جویا کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ چپ چاپ چلتا رہا۔

شاداں نے ناگاہ نظریں اٹھا کر رحیم داد کی طرف دیکھا اور ایک ٹک دیکھتی رہی۔ وہ بالکل رحیم داد کے سامنے تھی۔ دونوں کے درمیان صرف کپاس کے چند پودے حائل تھے۔ رحیم داد نے جھٹ نظریں گھمائیں اور گردن اٹھائے جویا کے ہم راہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ شاداں کو دیکھ کر اسے لالی یاد آگیا اور وہ دن یاد آگئے جب وہ جیل میں اس کے ساتھ تھا۔ پھر اس کے ساتھ ہی جیل سے فرار ہوا تھا۔ گرفتاری کے ڈر سے ویرانوں اور جنگلوں میں چھپتا پھرتا تھا۔ ان یادوں کی یلغار نے اس کے ذہن میں کھلبلی مچا دی۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا۔ حویلی میں واپس آگیا۔

شام کا دھندلکا پھیلنے لگا مگر مرشد علی شاہ اور مراد خاں نہیں آئے۔ ڈیرے کے ایک دالان میں چوگیاں پھٹی کی گٹھریاں سنبھالے بیٹھی تھیں۔ رحیم داد بھی ایک کرسی پر الگ تھلگ بیٹھا تھا۔ تین چار کارندے فرش پر بیٹھے تھے۔ وہ خادم علی جویا کی ہدایت کے مطابق چوگیوں کو ان کی چگائی کے حصے کی پھٹی دے رہے تھے۔

چنائی شروع ہوئے کچھ عرصہ گزر چکا تھا۔ مگر ہر چوگی نے اچھی مقدار میں پھٹی چنی تھی۔ قاعدے کے مطابق چنائی کے ابتدائی دنوں میں ہر چوگی کو اس کی چنی ہوئی پھٹی یا ونواڑ کا سولہ اں

حصہ دیا جاتا ہے۔ بعد میں گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ کپاس کے کھیتوں میں جوں جوں ونواڑ کم ہوتی جاتی ہے چگائی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ چوگیوں کو چنی ہوئی ونواڑ میں سے آٹھواں، یہاں تک کہ چھٹا حصہ ملنے لگتا ہے۔

ہر چوگی باری باری آتی، اپنی گٹھری کھول کر ونواڑ سامنے ڈالتی۔ کارندے بارہ حصے کرتے اور ایک حصہ چوگی کو چگائی کے طور پر دے دیتے۔ چنائی کے اس مرحلے پر چگائی کی تقسیم اسی طرح مقرر کی گئی تھی۔ حصہ کرتے وقت چوگیاں عام طور پر جھگڑتیں، کارندوں کے خلاف احتجاج کرتیں، جو ڈھیری سب سے بڑی سمجھتیں، اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتیں۔ مگر یہ فیصلہ خادم علی جویا کرتا کہ کس چوگی کو چگائی میں کون سی ڈھیری دی جائے۔ وہ چاہتا تو کسی کو چگائی میں زیادہ ونواڑ دے دیتا کسی کو کم۔

دالان میں چوگیاں چائیں چائیں کر رہی تھیں۔ اونچی آواز سے بول رہی تھیں۔ لڑنے جھگڑنے کے ساتھ قہقہے بھی لگا رہی تھیں۔ جویا انہیں بار بار ڈانٹتا۔ وہ چند لحوں کے لیے خاموش بھی ہو جاتیں لیکن پھر شور مچانا شروع کر دیتیں۔ چوگیوں میں شاداں بھی تھی۔ ابھی اس کی باری نہیں آئی تھی۔ وہ ایک کونے میں دیوار سے پیٹھ ٹکائے چپ بیٹھی تھی۔ قریب ہی اس کی ونواڑ سے بھری ہوئی گٹھری رکھی تھی۔ وہ نڈھال اور تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد اکتا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مہمان سرا کی طرف بڑھا جو ڈیرے ہی کے ایک حصے میں تھی۔ ڈیرے میں بھی مہمان ٹھہرتے تھے مگر مہمان سرا میں سرکاری افسر اور بڑے زمیں دار ٹھہرائے جاتے تھے۔ اس کے کمرے کشادہ تھے۔ بستر اور فرنیچر بھی عمدہ تھا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں گیا اور تھکا ہوا سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مرشد علی اور مراد خاں ہنوز شکار سے نہیں لوٹے تھے۔

کمرے کے باہر کہرے کا دھندلکا پھیلا تھا۔ رات دبے قدموں درو دیوار سے اتر رہی تھی۔ ڈیرے کے جس حصے میں چوگیوں کو چگائی ادا کی جا رہی تھی، وہاں سے ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور ابھر رہا تھا۔ رحیم داد کو کمرے میں آئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ شاداں دفعتاً اندھیرے سے نکل کر کمرے میں داخل ہوئی اور دہلیز کے پاس پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ وہ احاطے میں لگے ہوئے ہینڈ پمپ پر منہ دھو کر آئی تھی۔ اس کے چہرے پر پانی کے قطرے جھل ملا رہے تھے۔ کانوں پر پڑی ہوئی لٹیں بھیگی ہوئی تھیں۔

شاداں نے بیٹھتے ہی دوپٹے کے پلو سے منہ پونچھا، مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”لگتا ہے، میں نے تجھے پہلے بھی دیکھا ہے۔“

رحیم داد نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کا چہرہ اب تر و تازہ اور نکھرا نکھرا دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھوں میں ستارے جگ مگا رہے تھے۔ ناک سبک اور ستواں تھی' ہونٹ بھرے بھرے تھے۔ اس کی گول گول سڈول پنڈلیاں سبز لاچے سے جھانک رہی تھیں۔ شاداں اسے دل کش اور طرح دار لگی۔ وہ اس کی نظروں میں اسی روز سما گئی تھی جب اس نے پہلی بار اسے جہانگیرہ میں دیکھا تھا۔

شاداں نے اپنا سر دوپٹے سے ڈھکتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تو مجھے اس طرح گھور کیوں رہا ہے؟"

"پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔" رحیم داد نے مسکرا کر بات بنائی۔ "یاد تو میں نوں بھی آتا ہے کہ تیں نوں پہلے کہیں دیکھا ہے۔" وہ سوچنے کے انداز میں گردن جھکا کر چند لمحے خاموش بیٹھا رہا' پھر اس نے نگاہیں اٹھا کر شاداں کی جانب دیکھا۔ "یاد آیا' تو مجھے منٹگمری سٹیشن پر ملی تھی۔ کسی کیدی سے ملنے جا رہی تھی۔" اس نے قدرے توقف سے کہا۔

"میں نے غلط تو نہیں سوچا؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں لالی سے ملنے جا رہی تھی۔ تو منٹگمری سٹیشن پر ملا تھا پر یہ تو بہت پرانی گل ہے۔ میں تو بھول بھی گئی تھی۔"

"تیں نوں ایک بار دیکھ کر کوئی بھول سکتا ہے۔" رحیم داد نے اسے چھیڑا۔

شاداں کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ وہ شرمانے کے انداز میں فرش پر انگلی سے آڑی ترچھی لکیریں بناتے ہوئے بولی۔ "لالی بھی جب بہت خوش ہوتا ہے تو یہی کہتا ہے۔"

"یہ لالی کون ہے؟" رحیم داد نے ان جان بننے کی کوشش کی۔

"وہی ہے جسے اس روز ملنے جا رہی تھی۔ ادھر ڈسٹرکٹ جیل میں کید کاٹ رہا ہے۔"

"لالی تیرا کیا لگتا ہے؟"

"کچھ لگتا ہی ہے۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔ "اسی کے لیے میں کادر آباد چھوڑ کر یہاں آ گئی۔" اس نے رفتہ رفتہ نظریں بلند کیں' رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "اس سے پہلے میں جہانگیرہ میں ہوتی تھی۔ کادر آباد سے ملتان آنے میں جی بہت چکر تھا۔"

"لالی کو جیل کیوں ہو گئی؟" رحیم داد نے بے نیازی سے پوچھا۔

"وہ جی ایسا ہے' پہلے تو اسے چوری چکاری میں سزا ہوئی' فیر جیل سے بھاگا۔ اس کے ساتھ ایک کیدی اور بھی فرار ہوا تھا۔ اس کا ناں رحیم داد تھا۔" وہ بات کہتے کہتے بے تکلفی سے ہنسنے لگی۔

"تجھ سے کچھ ملتا جلتا تھا۔"

رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ مگر شاداں نے فوراً صفائی پیش کی۔ "وہ تو جی کب کا مر گیا۔ کسی نے اسے کتل کر دیا تھا۔ سنا ہے پرانی دشمنی تھی۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "ادھر لالی کی پولیس کے ساتھ گولی چلی۔ زخمی ہوا' پکڑا گیا۔"

"تب تو اسے لمی سزا ہوئی ہو گی۔"

"زیادہ لمی نہیں ہوئی۔" شاداں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "منٹگمری کا مجسٹریٹ لالی کو جانتا تھا۔ اس نے بہت کم سزا دی۔ ویسے میں نے اس کے مکدمے میں وکیل بھی تگڑا کھڑا کیا تھا۔ ہر پیشی پر خود عدالت میں جاتی تھی۔"

"ایک گل پوچھوں شاداں!" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ "سچ سچ بتانا۔"

"پوچھ' کیا پوچھنا چاہتا ہے؟"

"یہ بتا لالی چور اچکا ہے' نمبری بدمعاش ہے' جیل بھی کاٹ رہا ہے۔ تب بھی تو اس سے اتنا پیار کرتی ہے کہ اس کے لیے گھر بار چھوڑ کر یہاں آ گئی۔"

"پہلے تو جی وہ بالکل چنگا نہیں لگتا تھا۔" شاداں نے صاف گوئی سے بتایا۔ "فیر جانے کیوں اس سے اتنا پیار ہو گیا۔" اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "پر اب تو اس نے مجھ سے پکا وعدہ کر لیا ہے کہ بالکل چوری چکاری نہیں کرے گا۔ لگتا بھی ہے کہ اب وہ ایسا نہیں کرے گا۔"

"تیں نوں کیسے اندازہ ہوا وہ چوری چکاری کی پرانی عادت چھوڑ دے گا؟ یہ بات بالکل سمجھ نہیں آئی۔"

"سمجھ آ بھی نہیں سکتی' پر میں اسے سمجھتی ہوں۔" شاداں نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "اب یہی دیکھ' پچھلے دنوں چناب میں زبردست سیلاب آیا۔ بھکری سے آگے لوپ بند ٹوٹ گیا۔ بہت تباہی ہوئی۔ کئی پنڈ بالکل پانی میں ڈوب گئے۔ جیل سے کیدی بند کی مرمت کرنے بھیجے گئے۔" اس نے رحیم داد کی جانب مسکرا کر دیکھا۔ "میں نے کیدیوں کو بند پر کام کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ دن رات زبردست کام ہوتا تھا۔ کئی کیدی رات کے اندھیرے میں نکل بھاگے۔"

"لالی بھی بھاگنے والوں کے ساتھ نکل گیا ہو گا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"نہیں۔" شاداں نے انکار میں گردن ہلائی۔ "بھاگنے والے کیدیوں نے لالی سے اپنے ساتھ چلنے کو بہت کہا پر وہ اس چکر میں نہیں پڑا' بند پر محنت سے کام کرتا رہا۔" اس نے فخر سے گر

اونچی کی۔ "جیل کا وڈا افسر اتنا خوش ہوا کہ اس نے لالی کی سزا میں کمی کر دی اور اب تو اسے بیٹی بھی مل گئی ہے۔ میں ہر ملاقات کے دن اسے ملنے سویرے سویرے جیل کے پھاٹک پر پہنچ جاتی ہوں۔"

"لگتا ہے تجھے لالی سے بہت زیادہ پیار ہے۔"

"وہ بھی تو جی مجھے اتنا ہی پیار کرتا ہے۔" شاداں نے نظریں جھکا کر بتایا۔ "مجھے دیکھتے ہی خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھتا ہے۔ تجھ سے بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔"

"کب تک تیرا لالی چھوٹ جائے گا؟" رحیم داد نے دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔ اس کے چہرے پر خوف اور پریشانی کے سائے پھیلنے لگے۔

"سال بھر سے کچھ اوپر رہتا ہے۔" شاداں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "وہ بھی گزر ہی جائے گا جی۔ سزا میں کمی بھی ہو سکتی ہے۔ لالی یہی بتاتا ہے۔"

رحیم داد اس اطلاع سے زیادہ پریشان نہیں ہوا۔ لالی کے فوری طور پر رہا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مگر وہ لالی سے خائف ضرور تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ لالی اس کے ساتھ جیل میں اور جیل سے فرار ہونے کے بعد بھی اتنی زیادہ مدت تک رہا ہے کہ اس کی تیز نظریں اسے پہچان سکتی ہیں۔ لالی اس حیثیت سے اب اس کے لیے سنگین خطرہ بن گیا تھا۔ رحیم داد لالی کے بارے میں سوچنے لگا۔

"تو کس سوچ میں پڑ گیا؟" شاداں نے اسے ٹوکا۔

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "یہ بتا تو میرے پاس کیسے آئی؟ تو نے پھٹی چننے کی چگائی لے لی؟"

"اسی کے لیے تو تیرے پاس آئی ہوں۔"

"میرے پاس کیوں آئی ہے؟" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔ "میں نوں تیری چگائی سے کیا لینا؟"

"تو خادم علی جویا کو تو جانتا ہی ہے۔ میں نوں اسی کے بارے میں تجھ سے گل کرنی ہے۔"

"کیا گل کرنی ہے؟"

"جویا میرے حصے کی پوری چگائی نہیں دیتا۔" شاداں نے شکوہ کیا۔ "وہ جس چوگی سے راضی باضی ہوتا ہے اسے زیادہ پھٹی حصے میں دیتا ہے۔ کیوں کو تو وہ دو ڈھیریاں تک دے دیتا ہے۔"

"پر تجھ سے جویا کیوں نراض ہے؟"

"گل ایہہ ہے جی!" وہ منہ بگاڑ کر بولی۔ "وہ رات کو اپنے ڈیرے پر چوگیوں کو بلاتا ہے۔ جو چلی جاتیں ہیں، ان سے خوش رہتا ہے، جو نہیں جاتی انھیں پریشان کرتا ہے، طرح طرح سے تنگ کرتا ہے، ڈانٹتا ڈپٹتا ہے، چگائی بھی کم دیتا ہے۔"

"تو بھی کسی رات اس کے ڈیرے پر چلی جا۔" رحیم داد نے ہنس کر شاداں کو چھیڑا۔ "تب خادم علی جویا تجھ سے بھی خوش رہے گا۔ زیادہ ہی چگائی دے گا۔" اس نے شاداں کا ردعمل معلوم کرنے کے لیے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"ویسے خادم علی چاہے تو تجھے اٹھوا بھی سکتا ہے۔"

"مجھے اٹھوا لینا کوئی مخول ہے۔" شاداں نے تند و تیز لہجے میں گھور کر رحیم داد کو دیکھا۔ اسے رحیم داد کی بات سخت ناگوار گزری تھی۔ "تو کیسی گل کر رہا ہے۔" وہ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "میں کوئی کنجری ہوں، چھنال ہوں۔ کیوں جاؤں اس کے ڈیرے پر؟" اس کی جھنجلاہٹ سوا ہو گئی۔ "مجھے اٹھوا کر ڈیرے پر بلوایا تو اس کی گردن مروڑ دوں گی۔" اس نے اپنا مضبوط اور ٹھوس ہاتھ رحیم داد کے سامنے کر دیا۔ "اس میں بہت زور ہے۔ میں ہوں تو زنانی پر بہت زور آور بھی ہوں۔ تو مجھے ٹھیک سے نہیں جانتا۔"

"اتنا نراض کیوں ہوتی ہے؟" رحیم داد نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ لہجے میں سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "یہ بتا تو یہاں بھی اکیلی رہتی ہے؟"

"میری ایک ممیری ادھر دیا ہی ہے۔ اسی کے ساتھ رہتی ہوں۔ پر میں نوں اس سے کچھ نہیں لینا۔ میرے پاس دو مج ہیں، اصلی نیلی بار کی ہیں۔"

رحیم داد نے مداخلت کی۔ "ویسے تو میں گورداس پور کا مہاجر ہوں پر اب میری زمین داری نیلی بار ہی میں ہے۔ تیں نوں پتہ ہے ستلج کو پاک پتن میں نیلی کہتے ہیں اور اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں اس کا پانی نیلا نیلا دکھائی پڑتا ہے۔ پر دیپال پور میں ہے۔ اسے ستلج ہی کہا جاتا ہے۔ میرا پنڈ ہے تو تحصیل دیپال پور میں اور دیپال پور بیاس بار میں ہے۔ میرا پنڈ دیپال پور سے دور اور اس علاکے سے بالکل ملتا ہے جو پاک پتن تحصیل کہلاتا ہے۔ پاک پتن تحصیل نیلی بار ہی میں ہے۔"

"وے تیرا پنڈ نیلی بار میں ہے۔" شاداں نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ مگر رحیم داد کی بات کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ اپنی بھینسوں کی تعریف و توصیف کرتی رہی۔ "تیں نوں پتہ ہے، میری دونوں مج کتنا دودھ دیتی ہیں؟" اس نے فخر سے گردن اونچی کی۔ "من بھر تو روزانہ دودھی لے جاتا ہے۔ جو بچتا ہے اس کا مکھن نکال لیتی ہوں۔ چنگی آمدنی ہو جاتی ہے۔"

"لگتا ہے تو مکھن بہت کھاتی ہے۔" رحیم داد نے اسے ایک بار پھر چھیڑا۔ "جبھی تو ایسی سوہنی

مٹیار دکھائی دیتی ہے۔"

"لے، میں مٹیار لگتی ہوں؟ تو کیسی گل بات کرتا ہے۔" اس نے رحیم داد کی چھیڑ چھاڑ پر ناراضگی کا اظہار نہ کیا، شرما کر بولی۔ "اب تو کچھ بھی نہیں رہی، جل کر راکھ ہو گئی۔ تو نے مجھے پہلے نہیں دیکھا۔"

"اب بھی تو کیا کم ہے۔ تب ہی تو خادم علی جویا کا تجھ پر دل آ گیا۔"

"نہیں جی، وہ بندہ ہی برا ہے۔ تو اسے نہیں جانتا۔" شاداں نے ایک بار پھر جویا کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

رحیم داد نے اس کی شکایت نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "تیرے پاس جب نیلی بار کی دو ئ ہیں اور ان کے دودھ سے آمدنی بھی چنگی ہو جاتی ہے فیر تو پھٹی کی چنائی کیوں کرتی ہے؟" اس نے قدرے تامل کے بعد وضاحت کی۔ "میرا مطلب ہے تو چوگی کیسے بن گئی؟"

"کیا کیا جائے جی! آگے کے لیے بھی تو سوچنا چاہیے۔ لالی جیل سے نکلے گا تو کیا کرے گا؟ اب اس نے چوری چکاری تو کرنی نہیں۔ کوئی نہ کوئی دھندا کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے لیے روپے کی ضرورت ہوگی۔ روپے کے بنا تیں نوں پتہ ہے، کچھ نہیں ہو سکتا۔"

شاداں نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ خادم علی جویا کمرے میں داخل ہوا۔ شاداں کو دیکھ کر تیکھے لہجے میں بولا۔ "تو ادھر بیٹھی ہے، تیری چگائی کون لے گا؟"

"میں لوں گی اور کون لے گا۔" وہ خادم علی جویا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے باکی سے بولی۔ "چنائی میں نے کی ہے اور سب سے زیادہ ہی کی ہے۔"

"تو روز ایسی ہی بڑھکیں مارتی ہے۔" جویا نے ڈپٹ کر تیکھے لہجے میں کہا۔ "بکواس نہ کر، چل اپنی ونواڑ کی ڈھیریاں بنوا اور اپنی چگائی کی ڈھیری اٹھا کر لے جا۔ دیری کی تو کوئی چگائی شگائی نہیں ملے گی۔"

رحیم داد خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے مداخلت کی۔ "خاما خا ناراض کیوں ہوتا ہے۔ تو نے ہی تو مجھے بتایا تھا یہ بہت محنتی اور اہری چوگی ہے۔ سب سے زیادہ ونواڑ چنتی ہے۔ تو نے مجھے یہی کہا تھا نا؟" رحیم داد کا لہجہ تیکھا تھا۔

"محنتی تو جی یہ ہے۔ پر جھگڑا ٹنٹا بہت کرتی ہے۔" خادم علی جویا نے جھٹ پینترا بدلا، دبی زبان سے شکوہ کیا۔ "چوہدری، میں تجھے کیسے بتاؤں یہ کتنا جھگڑا کرتی ہے۔"

"لے، میں تجھ سے کیا جھگڑا کرتی ہوں۔ جتنی محنت کرتی ہوں، اتنی ہی چگائی مانگتی ہوں۔ تو ایر

بر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"

خادم علی کے چہرے پر جھنجلاہٹ نمودار ہوئی۔ رحیم داد نے اس کی خفگی بھانپ لی۔ اس نے مکرا کر نرمی سے کہا۔ "جویا! اسے ٹھیک ٹھیک چگائی دے دے۔"

"جویا فوراً نرم پڑ گیا، گردن جھکا کر ادب سے بولا۔ "سیں چوہدری! تو حکم کر، ایک چھوڑ میں سے چگائی میں ونواڑ کی دو ڈھیریاں دے دوں گا۔"

"میں نوں تیری دو ڈھیریاں نہیں لینی۔" شاداں نے تیکھی نظروں سے جویا کو دیکھا۔ "محنت کی ہے، اس کی چگائی لوں گی، کھیرات نہیں لینی۔"

"چپ کر شاداں۔ خاما خا کی کڑ کڑ نہ کر۔" رحیم داد نے اسے پیار سے ڈانٹا اور خادم علی جویا کو طب کیا۔ "خادم! اسے دو ہی ڈھیریاں دے دے۔ تیں نوں پتہ ہے۔ یہ اپنے ضلعے کی ہے اور یشان بھی ہے۔ برائی اس میں یہ ہے بول کڑوا بولتی ہے۔"

"سیں! تیرا حکم، سر اکھیں تے، سر ماتھے تے!" خادم علی جویا نے خوشامد کے انداز میں کہا۔ میں اسے دو ڈھیری ہی چگائی دوں گا۔"

"اگے بھی اس کا خیال رکھنا۔ اسے تنگ نہ کر۔" رحیم داد نے شاداں کی سفارش کی۔

"سیں چوہدری! تو بالکل فکر نہ کر۔" جویا نے رحیم داد کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ "جیسا نے کہا ہے، ویسا ہی ہوگا۔"

رحیم داد نے شاداں سے کہا۔ "جا اپنی چگائی لے۔ خادم علی بہت نیک بندہ ہے۔ آگے تجھ سے راض نہیں ہوگا۔"

شاداں خاموشی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر رحیم داد کو دیکھا۔ س کے چہرے پر شگفتگی تھی، آنکھوں میں کنول کھل رہے تھے۔ اس نے رحیم داد سے پوچھا۔ چوہدری! تیں نوں ادھر کب تک ٹھہرنا ہے؟"

رحیم داد کے بولنے سے پہلے ہی خادم علی جویا نے شاداں سے سوقیانہ مذاق کیا۔ "تو نے رات کو دھر آنا ہے؟"

شاداں ایک دم شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔ "چپ کر۔ تو نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ میں کنجری دں، پاپی ہوں، کیا ہوں، بتا؟"

رحیم داد نے فوراً مداخلت کی۔ "خادم! تو اس طرح اس سے چھیڑ چھاڑ نہ کیا کر۔ یہ بہت کڑوی بانی ہے۔ خاما خا جھگڑا ٹنٹا نہ کر۔"

جویا جھینپ کر بولا۔ ”سیں! یہ تو مخول بھی نہیں سمجھتی۔ تیکوں پتہ ہے‘ میں نے کسی برے ارادے سے گالہہ نہیں کی تھی۔“

شاداں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”میں تیری گل بات کا مطلب ٹھیک طرح جانتی ہوں۔“

”بے کار کی گلاں نہ کر۔“ رحیم داد نے شاداں کو ایک بار پھر ڈانٹا۔ ”میں نے جویا کو سمجھا دیا ہے۔ اب وہ تجھے تنگ نہیں کرے گا۔ اب جا اور اپنی چگائی کی چھٹی لے۔ تیری میری گھر میں انتظار کرتی ہوگی۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”اتنا نراض نہ ہوا کر۔“

شاداں خاموشی سے خادم علی جویا کے ہم راہ چلی گئی۔

☆

مرشد علی اور مراد خاں رات گئے واپس آئے تو رحیم داد سو چکا تھا۔ دونوں نے اس کی نیند خراب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ علیحدہ کمرے میں بیٹھے۔ آدھی رات تک باتیں کرتے رہے‘ قہقہے لگاتے رہے۔

رحیم داد قاسم بیلہ میں مراد خاں اور مرشد علی گردیزی کے ساتھ ٹھہرا رہا۔ شاداں اسے کئی بار نظر آئی۔ مڈبھیڑ بھی ہوئی مگر بات چیت کرنے کی نوبت نہ آئی۔ رحیم داد نے مراد خاں شاہانی سے شاداں کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ خادم علی جویا نے شاہانی کی سامنے شاداں کی بات بھی چھیڑی مگر رحیم داد صاف نظر انداز کر گیا۔

قاسم بیلہ میں چار روز قیام کے بعد تینوں ملتان روانہ ہوگئے۔ شام کو پہنچے۔ مگر ملتان پہنچتے ہی مراد خاں کو بھکر سے تار ملا۔ لکھا تھا‘ محمد سلمان خاں کار کے حادثے میں زخمی ہوگیا ہے۔ تار دیکھتے ہی مراد خاں سخت پریشان ہوگیا۔ وہ رات گئے تک سلمان کی خیرت معلوم کرنے کے لیے بھکر ٹیلی فون کرتا رہا۔ مگر لائن میں ایسی گڑبڑ تھی کہ بار بار کوشش کے باوجود بات نہ ہو سکی۔

مراد خاں شاہانی کو جب سے سلمان کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی تھی‘ اسے کسی پہلو قرار نہ تھا۔ ادھر مرشد علی گردیزی کی بہن کی شادی کی تیاریاں مکمل تھیں۔ رات کو صادق آباد سے برات آرہی تھی اور دوسرے روز شام کو پہنچنے والی تھی۔

مرشد علی گردیزی کا اصرار تھا کہ مراد خاں دو روز ٹھہر کر بھکر چلا جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ شادی کی تقریب میں مراد خاں شاہانی ضرور شریک ہو۔ شادی کا نہایت دھوم دھام سے اہتمام کیا گیا تھا اور اس میں شریک کرنے کے لیے مرشد علی شاہ خود بھکر جا کر مراد خاں شاہانی کو اپنے ہم راہ لایا تھا۔

رحیم داد نے تنہائی میں مراد خاں پر زور دیا۔ ”شاہانی! ویاہ کے لیے ٹھہر جاتا تو ٹھیک تھا۔ ایک

روز کی تو بات ہی ہے۔ رات کو نکاح میں شریک ہو کر چلا جانا۔ مرشد علی خوش ہو جائے گا۔“ مگر مراد خاں رضامند نہ ہوا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

”چوہدری! مجھے نہ روک۔ مجھے کچھ چنگا نہیں لگ رہا ہے۔“ اس کے چہرے پر دحشت برس رہی تھی۔ ”تیکوں پتہ ہے‘ سلمان میرا اکلوتا پتر ہے۔“

رحیم داد نے چونک کر مراد خاں کو دیکھا۔ اسے مرشد علی کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ سلمان اس کا نہیں‘ اس کی بیوی کے پہلے شوہر کا بیٹا ہے۔

رحیم داد کو سلطڑی کا مندو یاد آگیا۔ وہ مراد خاں کا سگا بیٹا تھا مگر اس کے مرنے پر نہ وہ پریشان ہوا‘ نہ آنسو بہائے‘ نہ کسی قسم کا سیاپا کیا۔ یہاں تک کہ آخری بار اس کا دیدار بھی نہ کیا۔ اس کے جنازے میں بھی شریک نہ ہوا۔ رحیم داد کے اصرار کے باوجود شریک نہ ہوا۔ اس نے ہموں والی میں ٹھہرنا تک گوارا نہ کیا۔

رحیم داد کو مراد خاں شاہانی کے اس رویے پر سخت حیرت تھی مگر مراد خاں اس کی حیرت سے بالکل بے نیاز تھا۔ وہ اس قدر پریشانی اور گھبراہٹ میں مبتلا تھا کہ کھانا بھی نہ کھا سکا۔ رات بھر بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ بار بار اٹھتا اور بے قراری کے عالم میں ٹہلنے لگتا۔ رحیم داد کی آنکھ کئی بار کھلی۔ اس نے مراد خاں کو پریشانی کے عالم میں دیکھا مگر بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ خاموش لیٹا رہا۔

صبح بہت تڑکے کہرے کی گہری دھند کے باوجود مراد خاں شاہانی نے گیرج سے مرشد علی کی کار نکلوائی اور شیر شاہ کی جانب روانہ ہوگیا۔ شیر شاہ کا فاصلہ دس میل سے بھی کم تھا اور وہاں سے بھکر جانے والی ٹرین گیارہ بجے جاتی تھی۔

مراد خاں شاہانی نے ناشتا بھی نہ کیا۔ وہ جلد سے جلد شیر شاہ پہنچ کر بھکر جانے والی ٹرین میں سوار ہو جانا چاہتا تھا۔

رحیم داد بھی کار میں مراد خاں کے ہم راہ تھا۔ وہ تمام راستے اسے تسلی دیتا رہا‘ مگر شاہانی کی بے چینی کم نہ ہوئی۔ وہ بے قرار ہو کر رحیم داد سے بار بار کہتا۔

”چوہدری! اگر میرے سلمان کو خدانخواستہ کچھ ہوگیا تو میں یہ غم برداشت نہ کر سکوں گا۔ میرا تو دماغ کام نہیں کرتا۔“

لیکن رحیم داد کو علم تھا کہ اسے سب سے زیادہ فکر اس بات کی ہے کہ اگر سلمان مرگیا تو نواں کوٹ کی جاگیر‘ جو اس کے قبضے میں ہے‘ خطرے میں پڑ جائے گی۔ سلمان کے حقیقی چچا اور چچازاد

بھائی فوراً تنازعہ کھڑا کردیں گے۔ جائیداد اور جاگیر حاصل کرنے کے لیے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیں گے۔

کار ملتان اسٹیشن پہنچی تو رحیم داد اتر گیا۔ وہ بھکر نہیں گیا' مراد خاں شاہانی نے بھی اصرار نہ کیا۔ ساڑھے آٹھ بجے صبح لاہور جانے والی ریل گاڑی پہنچی۔ وہ اس میں سوار ہو کر چلا گیا۔ وہ کوٹلہ ہرکشن واپس جا رہا تھا۔

سردار مراد خاں شاہانی تنہا رہ گیا۔ وہ سخت بے چینی کے عالم میں پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بہت پریشان اور دل گرفتہ نظر آ رہا تھا۔

۳۱

ہوا سرد تھی۔ ہر طرف کہرے کا نیل گوں دھند لکا چھایا تھا۔ کوٹلہ ہرکشن پر سرشام ہی سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ رحیم داد گھنٹہ' سوا گھنٹہ پہلے واپس پہنچا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ لباس تبدیل کیا اور اب اپنے کمرے میں سفر کی تکان دور کرنے کی غرض سے بستر پر ٹانگیں پسارے خاموش لیٹا تھا۔ حویلی پر خاموشی چھائی تھی۔ نادر خاں اور جمیلہ سے اس کی اب تک ملاقات نہ ہو سکی تھی۔

حویلی کا صحن بہت کشادہ تھا۔ اس کے آخری سرے پر درختوں کا جھنڈ تھا۔ درختوں کے آس پاس نوکر چاکروں کی کوٹھریاں تھیں۔ باورچی خانہ کوٹھریوں کے عین مقابل تھا۔ اس کی چھت چار ستونوں پر قائم تھی۔ کوئی دروازہ یا کھڑکی نہ تھی۔ ہر طرف سے بالکل کھلا ہوا تھا۔ باورچی خانے میں تنور روشن تھا۔

تنور کے اندر سے نکلتی ہوئی آنچ کے ابھرتے لپکتے شعلے کہرے کی دھند میں دور سے سرخ دھبوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ یہ روشن دھبے کبھی نمایاں ہو جاتے' کبھی اندھیرے میں گھل مل کر غائب ہو جاتے۔

باورچی خانے سے ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور رک رک کر ابھر رہا تھا اور ہر طرف چھائے ہوئے سکوت میں ارتعاش اور ہلچل پیدا کر رہا تھا۔

ایک نوکر اندھیرے سے نکل کر کمرے میں داخل ہوا۔ رحیم داد نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ نامدار تھا۔ رحیم داد کے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے میز پر کھانا لگا دیا۔ رحیم داد بھوکا بھی تھا۔ وہ بستر سے نیچے اترا اور میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

نامدار ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ رحیم داد نے اسے مخاطب کیا۔ "نامدار! یہ تو بتا۔ زمیندارنی اوپر اپنے کمرے ہی میں ہے ناں؟"

"نہیں جی' زمیں دارنی تو پھاتاں کے گھر گئی ہے۔"

"پھاتاں کے گھر گئی ہے؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا۔ "پھاتاں بیمار ہے کیا؟"

"بیمار شیمار تو نہیں ہے جی۔" نامدار نے جواب دیا۔ "وہ ایسا ہے جی' پرسوں تاجاں کے سسرال سے بچولیا آیا تھا۔ سگائی کی انگوٹھی اور دوسرا سامان لوٹا گیا۔ بہت برا ہوا۔"

رحیم داد کی حیرت میں اضافہ ہوگیا۔ "پر تاجاں کی سگائی ہوئی کب؟"

"پچھلے ہی دنوں تو یہیں حویلی میں اس کی سگائی ہوئی تھی۔ ان دنوں تسیں ادھر نہیں تھے۔ بہت رونک لگی تھی۔ ڈھولک بجی تھی۔ گانا ہوا۔ زمیں دارنی نے اپنے ہاتھ سے تاجاں کو انگوٹھی پہنائی تھی۔ پر اب تو سگائی ٹوٹ ہی گئی۔"

"کیوں توڑ دی انہوں نے کڑمائی' میرا مطلب ہے سگائی؟ ویسے بات ایک ہی ہے۔ کڑمائی کہو یا سگائی۔ پر ایک بار سگائی ہونے کے بعد ٹوٹ کیسے گئی؟ یہ تو ٹھیک نہیں ہوا۔ کوئی نہ کوئی تو اس کی وجہ ہوگی۔ ایسے ہی تو نہیں ٹوٹی ہوگی۔"

"کسی نے جی بھانجی ماردی۔ میں تو کہتا ہوں جی' یہ شیرا کا کام ہے۔ اس کے سوا اور کوئی ایسا کر ہی نہیں سکتا۔"

"یہ شیرا کون ہے' اور اس نے کیوں بھانجی ماری؟" رحیم داد نے کرید کر دریافت کیا۔

"وہ تاجاں سے ویاہ کرنا چاہتا ہے۔" نامدار کا لہجہ تیکھا اور قدرے تلخ تھا۔ "کرتا دھرتا کچھ نہیں۔ بھومان شاہ کے زمیں دار محمد حنیف وٹو کے لیے مویشی اور چوکر چوری کرتا ہے۔ محمد حنیف وٹو بہت وڈا رسہ گیر ہے جی۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "چوہدری! تو ہی سوچ۔ پھاتاں کیسے اپنی دھی شیرے کو ویاہ دیتی۔ اس نے صاف انکار کردیا۔ شیرے کے ساتھ اس کے گھر والے بھی ناراض ہوگئے۔ بس اس کا بدلہ لینے کے لیے ایسا چکر چلایا گیا کہ سگائی ٹوٹ گئی۔"

"پر تاجاں کے سسرال والوں نے شیرے کی بات کیسے مان لی۔ انھوں نے کیوں سگائی توڑ دی؟" رحیم داد نے روٹی کا لقمہ توڑتے ہوئے استفسار کیا۔ "تاجاں کا ساہا تو میرے سامنے ہی ہوا تھا۔ تب تو سسرال والے بہت خوش تھے۔ انھوں نے سگائی پر بھی خوشی منائی ہوگی؟"

"ہاں جی' بہت خوش تھے۔"

"یہ بتا' نامدار' کیا شیرا کسی طرح تاجاں کے سسرال والوں کا شریکا لگتا ہے؟"

"نہیں جی' ایسی کوئی گل بات نہیں۔ اس نے کسی ملا سیانے کے ذریعے تاجاں کے سسرال والوں کو بھکا دیا۔ وہ اس کے بھکانے میں آبھی گئے۔ کہتے ہیں جنج اس حویلی میں نہیں اترے گی۔ نہ یہاں ویاہ ہوگا نہ زمیں دارنی ویاہ میں بیٹھے گی۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ زمیں دارنی سے انہیں کیا بیر ہے؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہوکر دریافت کیا۔ "اس نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟"

"گل ایہہ ہے جی' وہ کہتے ہیں زمیں دارنی رنڈ بیوہ ہے۔ اس کے بیٹھنے سے ویاہ میں بدشگونی اور نحوست ہوگی۔" نامدار نے ناگواری سے منہ بگاڑا۔ "زمیں دارنی نے یہ سنا تو اس نے تاجاں کے سسرال والوں کی بات مان لی پر تاجاں کی ماں پھاتاں نہ مانی۔ وہ اڑ گئی۔ صاف صاف کہہ دیا' ویاہ ہوگا تو حویلی ہی سے ہوگا اور بھین جی اس میں ضرور بیٹھے گی۔ اس کے بناں تو ویاہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"گل تو اس نے ٹھیک ہی کہی۔ پھاتاں ہے حوصلے والی۔"

"سنا ہے جی' وہ تو ان سے لڑ پڑی۔ بولی' رنڈ بیوہ تو میں بھی ہوں۔ میرا گھر والا تو مدت ہوئی گزر گیا۔ فیر میں کیسے ویاہ میں بیٹھ سکتی ہوں۔ میرے گھر تاجاں کی جنج کیسے چڑھ سکتی ہے؟" نامدار تفصیل سے ایک ایک بات بتا تا رہا۔ "کہتی تو جی وہ بالکل ٹھیک ہی ہے۔ اگر حویلی سے تاجاں کا ویاہ نہیں ہوسکتا تو پھاتاں کے گھر سے کیسے ہوسکتا ہے؟ گل تو ایک ہی سی ہوئی ناں۔"

"جب سگائی ٹوٹ ہی گئی تو اب زمیں دارنی پھاتاں کے گھر کیوں گئی ہے؟" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"زمیں دارنی سگائی تو ڑنا نہیں چاہتی۔" نامدار نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "اس نے تاجاں کی ہونے والی سسرال کے وڈوں کو پھاتاں کے گھر بلوایا ہے۔ تاجاں کا سسر اس کا ماما بھی تو ہوتا ہے۔ پھاتاں کا سگا بھرا ہے۔ لگتا ہے آج زمیں دارنی انہیں سے گل بات کرنے گئی ہے۔"

"کب تک واپس آئے گی؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"پتہ نہیں جی۔ دیر ہی سے لوٹے گی۔ لمی گل ہوگی۔ ایک بار سگائی ٹوٹ جائے تو مشکل سے رشتہ جڑتا ہے۔ میں نے تو یہی دیکھا ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ نامدار نے بھی بات آگے بڑھانے کی کوشش نہ کی۔ رحیم داد کھانے سے فارغ ہوا تو نامدار نے جھوٹے برتن اٹھائے۔ دروازے کی جانب بڑھا۔ رحیم داد نے ٹوکا۔

"حمدا کہاں ہے نامدار؟ وہ مجھے نظر ہی نہیں آیا۔"

“اس کا کیا ہے جی۔ کسی چکر میں گیا ہوگا۔ شام ہوتے ہی غائب ہو جاتا ہے۔ شدّو کے گھر کے آس پاس منڈلاتا ہوگا۔” نامدار نے مسکرا کر کہا۔ “اور آج تو اس کی گھر والی تاراں بھی زمیں دارنی کے ساتھ گئی ہے۔ پر حمدا اس کی کب پروا کرتا ہے۔ ویسے تجھ سے کیا چھپانا۔ تاراں بھی کم نہیں۔ حمدا نہیں ہوتا تو وہ بھی اصطبل کے راکھے کے پاس چلی جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو ساری رات اسی کے ساتھ رہتی ہے۔”

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کر کے بولا۔ “اور ہاں تو نے یہ تو بتایا ہی نہیں‘ نادر خاں کدھر ہے؟ وہ بھی نظر نہیں آیا۔”

“وہ تو جی دوپہر کو تانگے میں بیٹھ کر کہیں گیا ہے۔”

“کچھ پتہ ہے‘ کہاں گیا ہے؟” رحیم داد نے نادر خاں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔

“یہ تو جی‘ میں نوں پتہ نہیں۔ میں نے تو اسے صرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ زمین دارنی ہی نے کسی کام سے بھیجا ہوگا۔” نامدار نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

رحیم داد نے مزید بات چیت نہ کی۔ نامدار باہر چلا گیا۔

☆

رات سنسان ہوتی گئی۔ دھند گاڑھی اور بوجھل ہوتی گئی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ نادر خاں اس طرح اچانک کہاں چلا گیا؟ اسے احسان شاہ کا خیال آیا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد آیا کہ نادر نے وعدہ کیا تھا کہ احسان شاہ کے پاس نہیں جائے گا۔ بلکہ اس نے رحیم داد کو بھی مشورہ دیا تھا کہ احسان شاہ سے ملنے جلنے میں احتیاط سے کام لے۔ پھر وہ کہاں گیا؟ کس کے پاس گیا‘ کس لیے گیا؟ رحیم داد تنہا بیٹھا نادر کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتا رہا۔ اسے جمیلہ کی واپسی کا بھی بے چینی سے انتظار تھا۔ وہ جلد سے جلد اس کا ردعمل معلوم کرنا چاہتا تھا۔

پہر رات گزر گئی۔ جمیلہ ہنوز لوٹی نہ تھی۔ رحیم داد کو نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ کچھ عرصے سے رات گئے تک جاگنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے قرار تھا کہ اس کی غیر حاضری میں کیا کیا ہوتا رہا؟ کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں؟ اسے الجھن ہو رہی تھی۔ آخر اکتا کر وہ کھڑا ہو گیا۔

اس نے اونی دھسّا اوڑھا۔ سر اور کانوں کو اچھی طرح دھسّے سے ڈھک کر کمرے سے باہر نکلا۔ سردی چمک گئی تھی۔ حویلی خاموشی میں ڈوبی اونگھ رہی تھی۔ سارے ہی نوکر چاکر اپنی اپنی کوٹھریوں میں چلے گئے تھے۔ حویلی کے پھاٹک پر پہریدار کے رک رک کر کھانسنے اور کھنکارنے کی آواز رات کے سناٹے میں ابھر رہی تھی۔

رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس دروازے کی جانب بڑھا جو مہمان خانے میں کھلتا تھا اس نے دروازے کو دھیرے سے کھولا اور مہمان خانے کے صحن میں پہنچ گیا۔ خیال تھا کہ احمد اب تک واپس آگیا ہوگا۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ مہمان خانہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ مہمان خانے کے باہر کہیں قریب ہی گیدڑ بول رہے تھے۔

اس نے مہمان خانے کو خالی پایا تو رک گیا۔ چند لمحے خاموش کھڑا رہا‘ سوچتا رہا۔ مہمان خانے سے ملحق دو بڑی بڑی اور کشادہ کوٹھریاں تھیں۔ ان میں کبھی مہمان خانے کے نوکر چاکر رہتے تھے۔ مگر بعد میں انھیں کاٹ کباڑ رکھنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا تھا۔ نادر خاں نے اپنی رہائش کے لیے انھیں خالی کرایا تھا۔ کوٹھریوں میں کھڑکیاں نکال کر انھیں کمروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ کمروں کے آگے برآمدہ تھا۔ سامنے کھلا صحن تھا۔ صحن کے تین طرف قد آدم چار دیواری تھی۔ اس گھر میں نادر خاں بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ رحیم داد اس طرف بڑھنے لگا۔

مہمان خانے کا ایک بیرونی دروازہ نادر خاں کے گھر کے عین سامنے کھلتا تھا۔ اسے نادر خاں نے اپنی سہولت کے لیے کچھ ہی عرصہ قبل لگوایا تھا۔ رحیم داد نے دروازہ کھولا اور مہمان خانے سے باہر چلا گیا۔ قریب ہی نادر خاں کے گھر کا ایک دروازہ تھا۔ لیکن عام آمد و رفت کا دروازہ صحن میں تھا۔ رحیم داد اس طرف نہ گیا۔ کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ کچھ دیر چپ چاپ کھڑا رہا‘ پھر ہاتھ بڑھا کر دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

دروازہ دھیرے سے کھلا۔ رحیم داد نے دیکھا‘ لالٹین کی مدھم روشنی میں نادر خاں کی بیوی جنت سامنے کھڑی ہے۔ وہ کچی نیند سے بیدار ہوئی تھی۔ سردی سے کپکپا بھی رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے آنکھیں ملیں۔ غور سے رحیم داد کو دیکھا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ “چوہدری! تو اتنی رات کو کیسے آیا؟ واپس کب پہنچا؟” اس کے چہرے پر گھبراہٹ بکھر گئی۔

“تو گھبرا کیوں گئی؟” رحیم داد نے مسکرا کر اسے اطمینان دلایا۔ “میں آج ہی شام واپس آیا ہوں۔”

“باہر اتنی سردی میں کیوں کھڑا ہے؟” اس نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے۔ “اندر آجا۔”

رحیم داد چپ چاپ اندر چلا گیا۔ جنت نے دروازہ بند کیا مگر کنڈی نہ لگائی۔ جھٹ ایک مونڈھا

اٹھا کر لائی اور رحیم داد کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ ”بیٹھ جا چوہدری۔“

وہ سردی سے بدستور کپکپا رہی تھی۔ ”آج سردی کچھ زیادہ ہی ہے۔“

”ہاں‘ سردی آج زیادہ ہی ہے۔“ رحیم داد نے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

جنت نے لالٹین کی مدھم لو اونچی کی۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”آج سردی زیادہ تھی اس لیے میں تو چراغ جلنے کے بعد گھر سے باہر ہی نہیں گئی۔“ اس نے اپنا سر دوپٹے سے ڈھک لیا۔

”کوئی دوہرا کمبل اوڑھ لے۔ سردی سے تیرے ہونٹ نیلے پڑتے جا رہے ہیں۔“

جنت نے کھونٹی پر لٹکی ہوئی موٹی کھیس اتاری۔ اسے اوڑھا اور رحیم داد کے سامنے پلنگ پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کی گوری چٹی عورت تھی۔ چہرہ گول اور بھرا بھرا تھا۔ ناک میں بڑا سا فیروزہ تھا۔ آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ کئی بچوں کی ماں تھی۔ تین تو نادر خاں ہی سے تھے۔ ایک شوہر چھوڑ چکی تھی۔ مگر اس کی کاٹھی بہت اچھی تھی۔ نہ اس کا جسم بے ڈھنگے پن سے پھیل کر بگڑا تھا نہ چہرے کے نقش و نگار دھندلے پڑے تھے۔ وہ نادر ماں کے مقابلے میں زیادہ جوان اور تندرست نظر آتی تھی۔ ویسے بھی وہ نادر خاں سے پندرہ سولہ برس کم سن تھی۔

وہ پھول دار قمیص پہنے ہوئے تھی۔ شلوار سفید لٹھے کی تھی۔ دوپٹہ ہلکے نیلے رنگ کا تھا۔ اس کے لباس پر شکنیں اور سلوٹیں پڑی تھیں‘ مگر میلا نہیں تھا۔ وہ نظریں جھکائے رحیم داد کے روبرو خاموش بیٹھی تھی۔

”نادر کہاں ہے؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”وہ تو جی دیپال پور گیا ہے۔ زمیں دارنی نے کسی ضروری کام سے بھیجا ہے۔“

”نادر‘ دیپال پور گیا ہے!“ رحیم داد حیرت سے چونک کر بولا۔ ”تیں نوں پتہ ہے کس کام سے گیا ہے؟“

”یہ تو جی اس نے مجھے بتایا نہیں۔ بس چلتے چلتے اتنا کہہ گیا تھا کہ کل شام لوٹے گا۔ دیر بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے پوچھا بھی۔ تب بھی اس نے آگے کچھ نہ بتایا۔“

”کام کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”میں نے بتایا ناں کہ اس نے زیادہ گل بات ہی نہیں کی۔ جلدی میں لگتا تھا۔ میرے بار بار پوچھنے پر صرف اتنا کہا زمیں دارنی کے ایک ضروری کام سے دیپال پور جا رہا ہوں۔“

”جمیلہ کا کیا حال چال ہے؟“ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔“ جنت مسکرا کر بولی۔ ”تو اسے نہیں ملا؟“

”نہیں؟“ رحیم داد نے جنت کو آگاہ کیا۔ ”وہ پھاتاں کے گھر گئی ہے۔ ابھی تک لوٹی نہیں۔ نادر بتاتا تھا دیر سے لوٹے گی۔“

”سمجھ گئی۔“ جنت نے آہستہ آہستہ سر ہلایا۔ ”وہ پھاتاں کے گھر تاجاں کے سسرال والوں سے بات چیت کرنے گئی ہے۔ وہ ایسا ہے جی‘ تاجاں کے رشتے میں کچھ گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے؟“

”میں نے تو سنا ہے پچھلے دنوں تاجاں کی سگائی ہوئی تھی۔ وہ ٹوٹ گئی۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟“

”ہاں‘ ایسا ہی ہوا ہے۔“

”جمیلہ سے میرے بارے میں بھی تیری بات چیت ہوئی؟“ رحیم داد نے جنت کو ٹٹولا۔

”کئی بار ہوئی۔ اور دیر تک ہوتی رہی۔ نادر نے تجھے بتایا ہی ہو گا۔“

”کچھ بتایا تو تھا‘ پر نادر سے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے۔“ رحیم داد نے کھل کر بات کی۔ ”یہ بتا۔ اب وہ میرے بارے میں کیا کہتی ہے؟ ناراض شراض تو نہیں ہے؟“

”پہلے تو سخت ناراض تھی۔“ جنت کھل کر مسکرائی۔ ”پر میں نے اس کی ساری ناراضگی ختم کرا دی۔ اب اس کے دل میں تیری طرف سے بالکل میل نہیں۔ اس کی باتوں سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔“

”تجھے یہ تو پتہ ہی ہو گا‘ وہ پنڈ چھوڑ کر لہور جانا چاہتی تھی۔“ رحیم داد نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ”اب اس کا کیا ارادہ ہے؟ اس بارے میں بھی تیری اس سے بات ہوئی؟“

”اس بارے میں پہلے بہت بات کرتی تھی۔ پر اب بالکل نہیں کرتی۔“ جنت نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ وہ شوخی سے مسکرائی۔ اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”چوہدری! برا نہ مناتا۔ تو اسے سمجھ نہ سکا۔ زمیں دارنی جتنی سوہنی ہے‘ اتنا ہی سوہنا اس کا دل بھی ہے۔ وہ کسی سے بھی زیادہ دنوں تک ناراض نہیں رہ سکتی۔ اسے منانا تو بہت آسان ہے۔“ اس نے پہلو بدلا۔ ”ویسے بھی جی وہ کسی کو پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ بلکہ خود پریشان ہو جاتی ہے۔“ اس نے آنکھوں کو گردش دے کر ہونٹوں پر تبسم پیدا کیا۔ ”تیرے بارے میں اس نے مجھے ساری ہی باتیں بتا دیں۔“

”میرے بارے میں کوئی خاص گل بات ہوئی؟“ رحیم داد نے بے قرار ہو کر دریافت کیا۔ ”میرا مطلب ہے۔“

"میں تیرا مطلب سمجھ گئی۔" جنت اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "نادر مجھے بتا چکا ہے تو کیا چاہتا ہے۔" جنت سنجیدہ ہو گئی۔ "پر تو جو کچھ چاہتا ہے‘ ابھی اس سلسلے میں زمیں دارنی سے بات کرنا ٹھیک نہیں۔ آج کل تو وہ تاجاں کے ویاہ میں بری طرح الجھی ہوئی ہے۔ اسے کسی اور طرف دھیان دینے کا ہوش ہی نہیں۔ ہر گھڑی اسی کے بارے میں باتیں کرتی رہتی ہے۔" اس کا لہجہ نرم اور شگفتہ ہو گیا۔ "چوہدری! ایسی لگن اور چاہ سے ویاہ کی تیاریاں کر رہی ہے جیسے تاجاں اس کی اپنی دھی ہو۔" اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ "وہ بہت دھوم دھڑکے سے ویاہ کرنا چاہتی ہے پر اب تو تاجاں کی سگائی ٹوٹ گئی۔ بہت برا ہوا۔ زمیں دارنی کو اس کا بہت دکھ ہے۔ جب سے یہ ہوا ہے بہت گھبرائی ہوئی اور پریشان رہتی ہے۔"

رحیم داد نے بات کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ "جنت! تیری تینوں چھوریاں کدھر ہیں؟"

"برابر کے کمرے میں سو رہی ہیں۔" اس نے مڑ کر اس طرف دیکھا۔ "میں بھی وہیں سوتی ہوں۔"

رحیم داد نے جنت کے جسم کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ اس نے کسمسا کر پہلو بدلا اور ایک ٹانگ پر دوسری رکھ کر ذرا ترچھی ہو کر بیٹھ گئی۔

رحیم داد کو اس کا یہ انداز اچھا لگا۔ مسکرا کر بولا۔ "جنت تو لاچا کیوں نہیں باندھتی؟"

"نہیں جی‘ میرے میکے میں زنانیاں دھوتی اور لاچا نہیں باندھتیں۔" اس نے گردن اونچی کرتے ہوئے ٹھسے سے کہا۔ "میرا پیو زمیں دار ہے۔. اس کی ۳۰ کلا سے اوپر زمیں ہے۔ ویسے بھی جی ہم آباد کار ہیں۔ ادھر کے جانگلی شانگلی نہیں ہیں۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے ٹھٹکی۔ زیر لب مسکرائی۔ "پر چوہدری تیرے دھیان میں یہ بات کیسے آئی کہ مجھے لاچا باندھنا چاہیے۔ شلوار مجھے بری لگتی ہے۔"

رحیم داد نے ہیجان انگیز نظروں سے جنت کو دیکھا۔ وہ احسان شاہ اور سردار مراد خاں شاہانی کی صحبت میں خاصا اوباش اور بد نظر ہو گیا تھا۔ جنت اس وقت اسے اچھی لگی۔ لالٹین کی زرد زرد روشنی میں اس کا گورا چٹا چہرہ دمک رہا تھا۔

جنت اس کی چبھتی ہوئی نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔ اس کے رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی پھیل گئی۔

"جنت! تو لاچا باندھے تو زیادہ سوہنی لگے گی۔" رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہاں سوہنی ہوں جی۔" وہ بڑے ناز سے بولی۔ "سوہنی تو سچ پوچھ اپنی زمیں دارنی ہے۔ اسے تو جو بھی دیکھتا ہے‘ دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اس کا رنگ روپ ہی ایسا ہے۔"

جمیلہ کا ذکر سن کر رحیم داد کے سارے ابلتے‘ مچلتے ولولے جھاگ کی مانند بیٹھ گئے۔ وہ کچھ نہ بولا۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جنت نے ٹوکا۔ "کہاں چلا چوہدری؟"

"نیند لگ رہی ہے۔ جا کر سوؤں گا۔"

"چلا جانا۔ ایک گلاس گرم دودھ تو پی لے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ اس کے انداز میں لگاوٹ تھی۔ "تو پہلی بار میرے گھر آیا ہے۔ میں تجھے ایسے ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ میں ابھی دودھ لائی۔ گرم ہی ہو گا۔ میں رات کو بھڑولی پر دودھ رکھ دیتی ہوں۔ صبح تک گرم رہتا ہے۔"

رحیم داد بیٹھ گیا۔ جنت کمرے سے نکل کر صحن میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ہاتھوں میں بھڑولی اٹھائے ہوئے آئی۔ یہ پیالے کی شکل کی کھلے منہ اور چوڑے پیندے کی انگیٹھی تھی۔ اس کے بالائی کناروں میں چاروں طرف چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ اسے چکنی مٹی میں توڑی شامل کر کے اس طرح بنایا گیا تھا کہ پہلے مٹی کو اچھی طرح گوندھا گیا۔ پھر اسے ہاتھوں کی مدد سے تیار کر کے دھوپ میں سکھایا گیا تھا۔ اس میں اوپلے سلگا کر رکھ دیئے جاتے جن کی ہلکی ہلکی آنچ رات بھر دہکتی رہتی۔

بھڑولی کے اوپر پیتل کی گڑوی میں دودھ بھرا تھا۔ جنت نے بھڑولی کمرے میں لا کر رکھ دی۔ وہ دوبارہ باہر گئی اور کانسی کا لمبا گلاس لے کر آئی۔ گلاس میں اس نے گڑوی سے گرم گرم دودھ انڈیلا۔ شکر ملائی اور گلاس رحیم داد کی طرف بڑھا کر بولی۔

"چوہدری! لے اسے پی لے۔ زیادہ گرم نہیں ہے۔"

رحیم داد نے گلاس ہاتھ میں لیا۔ ہونٹوں سے لگایا اور گھونٹ گھونٹ گرم دودھ پینے لگا۔ جنت نے بھڑولی اپنے سامنے رکھ لی اور اس میں سلگتے ہوئے اپلوں کی آنچ پر دونوں ہاتھ پھیلا کر سینکنے لگی۔ رحیم داد نے دودھ پی کر گلاس جنت کو دے دیا۔ اس نے گلاس ایک طرف رکھ دیا اور بھڑولی پر جھک کر ایک بار پھر دونوں ہاتھ سینکنے لگی۔

رحیم داد نے دیکھا‘ بھڑولی کی سرخ سرخ آنچ سے جنت کا چہرہ دمک رہا ہے۔ اس پر پھبن آ گئی ہے۔ رحیم داد اسے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ مسکرایا۔ اس نے جنت کو ٹٹولنے کے لیے چھیڑا۔ "جنت! صرف دودھ ہی پلائے گی؟"

"اور تجھے کیا چاہیے؟" وہ بدستور بھڑولی پر جھکی ہوئی بیٹھی رہی۔

"یہ تو تجھے بھی پتہ ہے۔" رحیم داد دھیرے دھیرے کھلنے لگا۔

"مجھے کیا پتہ جی۔" اس نے رحیم داد کی جانب پھر بھی نہ دیکھا۔

"تو سوہنی تو ہے پر اتنی بھولی نہیں کہ تجھے کچھ پتہ نہیں۔" وہ ہولے ہولے ہنسنے لگا۔

جنت نے زبان سے تو کچھ نہ کہا۔ نظریں اٹھا کر دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ وہ مسکرائی اور پھر گردن جھکالی۔ اس کے رخسار بھڑولی کی آنچ سے لال بھبھوکا ہو رہے تھے۔ لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں چراغ جھل ملا رہے تھے۔ رحیم داد ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔

جنت نے گردن اونچی کی۔ رحیم داد کی جانب دیکھا۔ آہستہ سے بولی۔ "چوہدری! تجھے سردی نہیں لگ رہی؟"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ اٹھ کر جنت کے پاس جانے کے لیے کسمسایا۔ اسی وقت دروازہ چرچرایا۔ رحیم داد نے پلٹ کر دیکھا کہ جمیلہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو رہی ہے۔ وہ اندر آگئی۔ اس کے پیچھے تاراں بھی تھی۔

"چوہدری! تو ادھر بیٹھا ہے۔" جمیلہ نے کہا۔ "میں تیرا کھوج لگاتی پھر رہی ہوں۔" وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ "مجھے تو پھاتاں کے گھر سے واپسی پر پتہ چلا' تو آگیا ہے۔ کب آیا؟"

"میں تو شام ہونے سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ کمرے میں بیٹھا تیرا انتظار کرتا رہا۔ جب تو دیر تک نہ آئی تو نادر سے ملنے ادھر آگیا۔ یہاں جنت سے پتہ چلا' وہ دیپال پور گیا ہے۔" رحیم داد بولتے بولتے ٹھٹکا۔ "زمیں دارنی! تو اس طرح کھڑی کیوں ہے؟ بیٹھ جا؟"

"ادھر آجا زمیں دارنی۔" جنت نے بھی رحیم داد کی تائید کی۔ اور کھڑے ہو کر پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہیں بیٹھ جا۔" اس نے اٹھ کر جھپاک جھپاک بستر کی شکنیں درست کرنا شروع کردیں۔

جمیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جنت! میں نے یہاں بیٹھنا نہیں ہے۔" اس نے رحیم داد کی جانب مڑ کر دیکھا۔ "چوہدری! میرے ساتھ چل۔ تجھ سے کچھ ضروری گل بات کرنی ہے۔ میں تو تیرا کئی روز سے سخت انتظار کر رہی تھی۔"

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جمیلہ دروازے کی جانب بڑھی۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ ساتھ بڑھا۔ تاراں دونوں کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ تینوں باہر نکلے اور مہمان خانے میں داخل ہو گئے۔ تاراں نے مہمان خانے کا دروازہ بند کر دیا۔

☆

رحیم داد اپنے کمرے میں گیا۔ جمیلہ بھی اس کے ہم راہ تھی۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جمیلہ

سنہری کنارے کی سفید شال اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کا لباس بھی سفید ہی تھا۔ اس سادگی میں بھی اس کا دلکش چہرہ کندن کی مانند دمک رہا تھا۔ رخساروں پر گلاب کھل رہے تھے۔ غزالی آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے تھے۔

دونوں کے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد نامدار نے انگیٹھی لا کر کمرے میں رکھ دی۔ انگیٹھی میں انگارے دہک رہے تھے۔ انگیٹھی رحیم داد اور جمیلہ کے درمیان رکھی تھی۔ دونوں جھک کر ہاتھ تاپنے لگے۔ انگاروں کی آنچ سے جمیلہ کا گلابی چہرہ اور سرخ ہو گیا' خوبصورت اور تابندہ ہو گیا۔

رحیم داد انگیٹھی پر ہاتھ پھیلا کر جسم میں حرارت اور گرمی پہنچاتا رہا۔ وہ گم صم بیٹھا تھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے اور خدشے منڈلا رہے تھے۔ ہرچند وہ جنت کی زبانی سن چکا تھا کہ جمیلہ اب اس سے خفا نہیں ہے' مگر اس کے دل میں چونکہ چور تھا لہٰذا سہما ہوا تھا۔ بار بار یہ خیال اسے پریشان کرتا کہ جمیلہ اتنی رات گئے کون سی اہم بات کرنا چاہتی ہے جس کے لیے اس نے نہ صرف پھاتاں کے گھر سے لوٹتے ہی اس کی تلاش شروع کردی تھی بلکہ کئی روز سے اس کا بے چینی سے انتظار بھی کر رہی ہے۔

اس نے نظریں اٹھا کر جمیلہ کے دل آویز دمکتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ لمحہ بھر تک بے قراری سے دیکھتا رہا' پھر اس نے ہولے سے گہری سانس بھری اور نظریں جھکالیں۔

جمیلہ نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر خاموشی کو توڑا۔ "چوہدری! اتنے دن کہاں رہا؟" وہ زیر لب مسکرائی۔ "خریف کی واڈھی پر تیرا بہت انتظار رہا۔ تجھے واڈھی پر تو یہاں ہونا ہی چاہیے تھا۔"

"خریف کی واڈھی ہو گئی۔ بہت ٹھیک ہوا۔"

"واڈھی تو کرانا ہی تھی۔ جب تو نہیں آیا تو شروع کرانی پڑی۔ بلکہ دیر سے شروع ہوئی۔ ایسا تیرا لمبا انتظار کرنے کے کارن کرنا پڑا۔ میں پوچھتی ہوں تو واڈھی پر پہنچا کیوں نہیں؟"

"میں ہوتا بھی تو کیا کرتا؟" رحیم داد نے مسکرا کر جواب دیا۔ "تو موجود ہی تھی۔"

"کمال کرتا ہے۔ یہ بھی کوئی گل بات ہوئی۔" اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کا لہجہ تیکھا تھا مگر اس کی آنکھوں میں خفگی یا کدورت کا غبار مطلق نہ تھا۔ "میرا کیا ہے۔ واڈھی پر تو تیرا موجود ہونا ضروری تھا۔ میں نے کون سی زمیں داری چلانی ہے۔" جمیلہ کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "یہ بتا تو اب تک رہا کہاں؟"

"میں کلیم کے چکر میں پہلے منٹگمری گیا۔ فیر ملتان جانا پڑا۔"

"وہ تو میں نوں پتہ ہے۔ نادر مجھے بتا بھی چکا ہے اور یہ بھی بتا چکا ہے تیرے کلیم کے بارے میں جو گڑبڑ پیدا ہو گئی تھی، وہ بھی بالکل دور ہو گئی۔ یہ بہت ٹھیک ہوا۔ مجھے تیرے کلیم کے کارن بہت چنتا تھی۔" جمیلہ نے اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا۔ "پر اس کے بعد تو رہا کہاں، واپس کیوں نہ آیا؟"

"کیا کرتا واپس آکر۔" رحیم داد نے چہرے پر افسردگی کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "میں نوں اس زمیں اور حویلی کی الاٹمنٹ سے کیا لینا۔ تو نے ہی دلائی تھی اور تیری ہی زمین اور حویلی تھی بھی۔" اس نے نظریں اٹھا کر جمیلہ کے شگفتہ اور دمکتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ "میں تو برسوں محکمہ آبادکاری کے دفتروں کے چکر کاٹ کاٹ کر اور گرداوروں اور پٹواریوں کی خوشامد کرتے کرتے مایوس ہو کر اپنے کلیم کو بھول ہی چکا تھا۔"

"پر یہ گلاں تو اب پرانی ہو چکی ہیں۔" جمیلہ نے اسے ٹوکا۔

"میں تو یہ سوچ کر یہاں سے گیا تھا کہ اب میں نے واپس نہیں آنا۔" اس نے لہجے میں رقّت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "پہلے ملتان میں کوشش کی۔ وہاں کام نہ بنا تو بھکر چلا گیا۔ سنا تھا وہاں الاٹمنٹ مل رہی ہیں۔ پر ساری زرخیز زمینیں وڈے زمیں داروں نے اپنے مزارعے لگا کر دبا لیں یا فیر بوگس اور جعلی کلیموں کے ذریعے اپنے کبضے میں کر لیں۔ محکمہ آبادکاری والوں نے وہاں بھی زبردست دھاندلی مچا رکھی ہے۔ چھانٹ چھانٹ کر عمدہ زمینیں اپنے ناتے داروں، شریکوں اور جاننے والوں کے نام الاٹ کرا دیں۔" رحیم داد کے لبوں پر زہرخند نمودار ہوا۔ "اب تو وہاں بنجر اور کلّر زمین رہ گئی ہے۔ اس کے لیے بھی درخواستوں کے ڈھیر لگے ہیں۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "زبردست اندھیر گردی ہے جی۔ دبا کے رشوت لی جا رہی ہے۔ اس کے بنا تو کوئی بات سننے کو بھی تیار نہیں۔"

"اس دھاندلی میں تو چھوٹے بڑے سرکاری افسروں اور اہل کاروں سے لے کر صوبائی اور مرکزی وزیر تک سب ہی شامل ہیں۔ رشوت کے ساتھ ساتھ سفارش بھی چل رہی ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد سے اتفاق رائے کیا۔ "پر چوہدری، تو الاٹمنٹ کے چکر میں پڑا ہی کیوں؟ یہاں کی اراضی کچھ کم ہے۔ تو کیوں الاٹمنٹوں کی لوٹ مار میں شامل ہو گیا؟ تیرے لیے تو یہی زمین بہت ہے۔"

"سوچا تھا، تھوڑی سی زمین کہیں اور مل جائے تو زمیں داری شروع کر دوں گا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اس زمین اور جائیداد کو تو کبھی میں نے اپنا سمجھا ہی نہیں۔ یہ تو بھی ٹھیک طرح جانتی ہے۔" رحیم داد نے آواز میں اور زیادہ رقت پیدا کی۔ "جب تو مجھ سے ناراض ہو گئی تو میں نے یہاں رہ کر کیا کرنا؟" اس نے بجھی بجھی نظروں سے جمیلہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "زمیں دارنی! تجھے لہور شہور جانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ سنا ہے سندھ میں آسانی سے الاٹمنٹ مل جاتی ہے۔ ادھر بہت متروکہ زمین اور جائیداد ہے۔ اب وہیں چلا جاؤں گا۔"

"ایسا ہی ارادہ تھا تو ادھر واپس ہی کیوں آیا؟" جمیلہ کے لہجے میں طنز کا پہلو نمایاں تھا۔ رحیم داد نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ لہجے میں اور زیادہ غم گھول کر بولا۔ "میں تو اس لیے آیا تھا کہ تیرے دل میں میری طرف سے میل نہ رہے۔ جو کچھ ہو گیا اسے بھول جا۔ ہاں، تیرا اور اللہ وسایا کا مجھ پر جو احسان ہے وہ میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ تو نے اور اس نے مجھے ایسے وکت سہارا دیا، جب میرا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، کوئی اپنا نہ تھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اب تیری زمین اور حویلی تیرے پاس رہے گی۔ وکیل کو بلا لے۔ میں زمین اور حویلی کا بیع نامہ تیرے نام کر دوں۔ میرا کیا ہے۔ جب ایک بار گھر سے بے گھر ہو گیا، اجڑ گیا، تباہ ہو گیا، تو کہیں بھی پڑاؤ ڈال لوں گا۔ جیسے تیسے زندگی گزر ہی جائے گی۔"

جمیلہ اس کے دکھ بھرے لہجے اور غم زدہ باتوں سے بہت متاثر ہوئی۔ پیار سے ڈانٹ کر بولی۔ "فضول باتیں نہ کر۔" جمیلہ مسکرائی۔ "چوہدری! تو نے مجھے سمجھا ہی نہیں۔ میں تو کسی سے بھی ناراض نہیں رہ سکتی اور تو تو میری ہی طرح فسادات کی بھڑکتی آگ کا جھلسا ہوا ہے۔ خون کا دریا تیر کر نکلا ہے۔ میں تیرا دکھ جانتی ہوں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ اس میں تڑپ تھی، درد کی چبھن تھی۔ "میں نے آگ اور خون کا یہ خوف ناک کھیل دیکھا ہے۔ اس دکھ اور اپرادھ کو جھیلا ہے، بھگتا ہے۔ یہ بھیانک کلپنا ہے۔ رات کو کبھی اس کی یاد آجاتی ہے تو آج بھی ساری ساری رات نیند نہیں آتی۔" اس کے خوبصورت اور تابناک چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ "چوہدری! ایسی باتیں کر کے میرے گھاؤ نہ چھیڑ۔ تیں نوں پتہ نہیں، میں کتنی ابھاگن اور دکھی ہوں۔"

"تو پنڈ چھوڑ کر لہور تو نہیں جا رہی ہے؟" رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔ "پہلے مجھے یہ بتا، تو نے اس بارے میں کیا سوچا؟"

"میں تو آج کل، تاجاں کے ویاہ کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔"

"سنا ہے تاجاں کی تو نے سگائی بھی کر دی۔" رحیم داد نے پوچھا۔

"میری تو آشا تھی تو اس کی سگائی پر یہاں ہوتا۔ پر تیرا تو کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ کہاں ہے اور کب لوٹے گا؟ لوٹے گا بھی یا نہیں۔" جمیلہ کا لہجہ اچانک غم ناک ہوگیا۔ "پر اب تو تاجاں کے سسرال والوں نے سگائی توڑ دی۔"

"سنا تو میں نے بھی یہی ہے۔ نادر بتاتا تھا' تو آج اسی معاملے میں پھاتاں کے گھر گئی تھی۔ کیا بنا بات چیت کا؟"

"سگائی کے ساتھ رشتہ تو سمجھو ٹوٹ ہی چکا ہے۔ پر تاجاں کا ہونے والا سسر نیک بندہ ہے۔ ویسے تاجاں کا سگا ماما بھی ہوتا ہے۔ اس نے سب کو سمجھا بجھا کر راضی تو کرلیا ہے۔ بہت بک بک' جھک جھک کے بعد فیصلہ ہوا۔"

"کیا فیصلہ ہوا؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

"ویاہ نہ حویلی سے ہوگا نہ پھاتاں کے گھر سے۔" جمیلہ نے بتایا۔ "نادر خاں' جس گھر میں رہتا ہے' وہاں سے تو ویاہ ہوگا۔ جنج سکول میں اترے گی۔"

"یہ تو ٹھیک ہی فیصلہ ہوا۔ ویسے حویلی سے ویاہ ہوتا تو ٹھیک تھا۔ تو ویاہ میں بیٹھے گی نا؟ میں نے سنا تھا تاجاں کے سسرال والوں کو تیرے ویاہ میں بیٹھنے پر بھی اعتراض تھا۔ یہ تو انھوں نے بہت خراب شرط لگائی تھی۔ ویاہ کے لیے سب کچھ تو کرے اور تجھے ہی ویاہ میں نہ بیٹھنے دیا جائے' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اب یہ طے ہوا ہے کہ میں ویاہ میں بیٹھوں گی۔ ویسے میں تو خود بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔" اس کی آواز میں دبا دبا کرب تھا۔

"تو کیوں نہیں ویاہ میں بیٹھنا چاہتی تھی؟"

"رنڈودھوا جو ہوئی۔" جمیلہ کا لہجہ اور افسردہ ہوگیا۔ "رنڈ کا تو ویاہی جانے والی کڑی پر سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ اسے برا شگون سمجھا جاتا ہے۔ کیا کیا جائے' ریتاں رسماں ہی ایسی ہیں۔"

رحیم داد نے جمیلہ کو غم زدہ اور دل گرفتہ پایا تو گفتگو کا رخ بدل دیا' پوچھا۔ "زمیں دارنی! تو نے نادر کو دیپال پور کس لیے بھیجا ہے؟ کوئی خاص کام ہے؟"

"خاص ہی کام ہے تجھ سے اسی کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ بلکہ اس معاملے میں تو مجھے تیرا سخت انتظار تھا۔ نہ آتا تو میں نادر خاں کو دوبارہ تیرے پاس بھیجتی۔"

"گل کیہہ اے۔ خیر اے ناں؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"خیر ہی ہے۔ تو احسان شاہ کو تو جانتا ہے۔"

رحیم داد گھبرا گیا۔ لہجے میں عاجزی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "تجھے سب کچھ پتہ ہے۔ فیر ایسی گل بات کیوں پوچھتی ہے؟" اس نے لہجے میں تلخی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "پر اب میرے سامنے اس کا نام نہ لے۔ اسی کی جہ سے تجھ سے ساری نراضگی ہوئی۔" اس نے چہرے پر غصے اور ناگواری کے تاثرات پیدا کیے' تیوری پر بل پڑ گئے۔ "تجھے پتہ نہیں وہ کتنا کمینہ ہے۔ اسی نے میرا کلیم منسوخ کرانے کے لیے درخواست لگوائی تھی۔ تفتیش کروانے کا حکم نکلوایا تھا۔"

"میں نوں سب پتہ ہے۔ نادر مجھے اس بارے میں پہلے ہی سب کچھ بتا چکا ہے۔ احسان شاہ کتنا کمینہ اور گندہ ہے۔ یہ مجھے ٹھیک طرح پتہ ہے۔"

"جب ایسی بات ہے تو اس کا ذکر تو نے میرے سامنے کیوں چھیڑا؟" رحیم داد نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔ "مجھے تنگ کرنا چاہتی ہے' ذلیل کرنا چاہتی ہے؟"

"ایسی گل نہیں۔" جمیلہ مسکرا کر نرم لہجے میں بولی۔ "نراض نہ ہو۔" اس نے رحیم داد کے چہرے کی جانب نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں پچھلی رات کے چاند کی چاندنی اتر آئی تھی۔ "مجھے احسان شاہ سے ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔"

"احسان شاہ سے ضروری کام پڑ گیا ہے! اور تجھے؟" رحیم داد حیران و پریشان ہو کر گویا ہوا۔

"ہاں' ایسی ہی گل ہے اور تجھے اس کام کے سلسلے میں احسان شاہ کے پاس جانا ہوگا۔"

"زمیں دارنی تو کیسی گل کر رہی ہے؟" رحیم داد نے چہرے پر جھنجلاہٹ پیدا کرتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ "میں نے اس کے پاس نہیں جانا۔ مجھے تو اب اس کے نام سے بھی گھن آتی ہے۔"

"میری گل تو سن۔" جمیلہ نرمی سے بولی۔

"سنا' کیا سنانا چاہتی ہے۔" رحیم داد کے چہرے پر بدستور تناؤ تھا۔

"بات یہ ہے۔" جمیلہ نے سنبھل سنبھل کر اپنا مقصد بیان کیا۔ "یہ تو تجھے پتہ ہی ہوگا' احسان شاہ اپنے مزارعوں اور کمیوں کی نوجوان گھر والیوں اور کڑیوں کو اٹھوا کر کید کر لیتا ہے۔ سنا ہے ان کو رکھنے کے لیے اس نے بہت وڈا کوٹ بنوا رکھا ہے۔ سمجھو ایک طرح کی جیل ہے وہ۔ اس کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔"

"سنا تو میں نے بھی ہے۔ پر کبھی دیکھا نہیں۔" رحیم داد نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

"ان ہی کیدی زنانیوں میں سے ایک نے کسی نہ کسی طرح کوٹ کی جیل سے بھاگنے کی کوشش کی اور اس کی کوشش سپھل بھی ہوگئی۔"

"جب جیل ہوگی تو زنانیاں اس سے نکل کر بھاگنے کی کوشش بھی کرتی ہوں گی اور کوئی کوئی تو کامیاب بھی ہو جاتی ہوگی۔" رحیم داد نے اپنے فوری ردعمل کا اظہار کیا۔ "پر تو نے ان سے کیا لینا؟"

"ہوا یہ کہ ایک ایسی ہی زنانی چند روز ہوئے یہاں پہنچ گئی۔" جمیلہ نے رحیم داد کو اپنی بات وضاحت سے سمجھانے کی کوشش کی۔ "ایسی کڑاکے کی سردی میں وہ رات بھر جھاڑیوں میں چھپی رہی۔ میں سویرے سکول پہنچی تو وہ جھاڑیوں سے نکل کر میرے پیروں پر گر پڑی۔ سردی سے اس کا بدن مانو برف ہو رہا تھا۔"

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اسے خدشہ لاحق ہوا کہ کوئی ایسی عورت نہ ہو جو احسان شاہ کی حویلی میں اس کے ساتھ رات بسر کر چکی ہو۔ وہ اسے فوراً پہچان لیتی۔ اور اس کے لیے خطرہ بن جاتی۔ جمیلہ ایک بار پھر اس سے ناراض ہو جاتی اور اب اسے منانا بھی مشکل ہوتا۔

وہ سخت الجھن میں پڑ گیا۔ ہچکچاتے ہوئے گویا ہوا۔ "اب وہ کہاں ہے؟"

"میرے کمرے میں ہے۔" جمیلہ نے بتایا۔

رحیم داد کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ اور اس قدر بڑھ گئی کہ وہ اس کے بارے میں پوچھ گچھ بھی نہ کر سکا۔ دم بخود بیٹھا رہا۔ جمیلہ بولتی رہی۔ "میری طرح وہ بھی مغویہ ہے۔ پہلے ہندو ہوتی تھی۔ اب مسلمان ہو چکی ہے۔ اس کا نام زینت بی بی ہے۔ میری ہی طرح ابھاگن ہے۔" جمیلہ کا چہرہ ذہنی کرب سے مرجھا گیا۔

رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ اسے فوراً یاد آ گیا کہ پچھلی بار جب وہ احسان شاہ کی حویلی میں تھا تو مراد خاں شاہانی نے مزا لے لے کر زینت کا ذکر کیا تھا۔ وہ کوٹ میں ان دنوں نئی نئی اٹھا کر لائی گئی تھی۔ رحیم داد نے اس کے بارے میں مراد خاں سے بہت کچھ سنا تھا۔ مگر زینت سے اس کا آمنا سامنا نہ ہوا تھا۔ نہ اس نے رحیم داد کو دیکھا تھا اور نہ ہی رحیم داد نے اسے دیکھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی اور انجان تھے۔

رحیم داد نے زینت کے بارے میں کسی تبصرے سے گریز کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اس پر بھی بہت اپرادھ ہوا۔ جس کے ہاتھوں میں پڑ گئی اس نے نوچا کھسوٹا۔ ذرا بھی ترس نہ کھایا۔ آخر اسے ایک نیک بندہ مل گیا۔ وہ سکول ماسٹر تھا۔ اس نے زینت سے باقاعدہ ویاہ کر لیا۔ اب وہ اسی کے پاس جانا چاہتی ہے۔"

"وہ کہاں ہوتا ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"وہ آج کل دیپال پور کے پرائمری سکول میں ماسٹر لگا ہے۔ اس کا نام جلیل ہے۔"

"تو نے اسی کو بلانے کے لیے نادر کو دیپال پور بھیجا ہے؟"

"ہاں جی، میں نے نادر خاں کو اسی لیے دیپال پور بھیجا ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "وہ آکر زینت کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔"

"جب ایسی گل بات ہے تو احسان شاہ کے پاس میرے جانے کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے استفہامیہ نظروں سے جمیلہ کی جانب دیکھا۔ "میں تو کہتا ہوں زمیں دارنی، احسان شاہ کو تو اس کا بالکل پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ تیں نوں پتہ نہیں وہ کتنا خطرناک اور کمینہ ہے۔" اس کے چہرے سے خوف اور پریشانی صاف عیاں تھی۔

"میں نوں پتہ ہے، وہ کتنا خطرناک ہے۔" جمیلہ نے رحیم داد سے اتفاق کیا۔ "اس کا اثر و رسوخ بھی بہت ہے۔ وڈے سرکاری افسروں بلکہ اسمبلی کے ممبروں اور وزیروں تک سے اس کی یاری ہے۔ اس کی پہنچ تو بہت اوپر تک ہے۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ چہرے کی شگفتگی اور رعنائی دھندلی پڑ گئی۔ "سچ پوچھ تو حکومت ہی ایسے بندوں کی ہے۔ اس کے دو پتر تو وڈے سرکاری افسر لگے ہیں۔ جنوائی اور بھتیجے بھی اونچے عہدوں پر ہیں۔"

"تو بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ پر سمجھ نہیں آتی مجھے اس کے پاس کیوں بھیجنا چاہتی ہے؟"

"یہی تو تجھے بتانا ہے۔" جمیلہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "زینت کے دو بچے ہیں۔ دونوں احسان شاہ کے مزارعے سلامو کے پاس ہیں۔ سلامو ہی اسے اغوا کر کے پیراں والہ لایا تھا۔ اور اس کے گھر سے احسان شاہ نے اپنے کرندوں کے ذریعے زینت کو اٹھوا لیا۔"

"زینت کو اپنے بچے تو یاد آتے ہی ہوں گے۔"

"کیوں نہیں یاد آتے۔ زینت کے سینے میں بھی ماں کا ہردے دھڑکتا ہے۔" جمیلہ نے تڑپ کر کہا۔ "ان کے لیے وہ بلک بلک کر روتی ہے۔ اسے روتا دیکھتی ہوں تو میری آنکھوں میں بھی آنسو آ جاتے ہیں۔ میں بھی تو ماں ہوں۔" اس کے چہرے پر دکھ برسات کے بادلوں کی مانند منڈلانے لگا۔

"چوہدری! تجھے ماں کی ممتا کا پتہ نہیں۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ چپ بیٹھا رہا۔

"تو احسان شاہ کے پاس چلا جا۔" اس دفعہ جمیلہ کے لہجے میں التجا کا پہلو نمایاں تھا۔ "اس کی منت سماجت کر لینا۔ میری خاطر کر لینا۔" اس کے رویئے میں عاجزی اور بڑھ گئی۔ "چوہدری! تو زینت کے بچے دلوا دے۔ تیری بہت مہربانی ہوگی۔ مجھے وشواس ہے احسان شاہ تیری گل ضرور مان

لے گا۔"

"بالکل نہیں مانے گا۔ تونے بالکل غلط اندازہ لگا رکھا ہے۔" رحیم داد نے جھٹ صفائی پیش کی۔ "میری اس کے ساتھ ایسی یاری نہیں کہ وہ میری ہر گل بات مان لے۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں وہ تیرا دشمن نہ ہو جائے۔"

"ہو جائے' کون سا فرک پڑتا ہے۔ پہلے ہی وہ کون سا مجھ پر مہربان رہا ہے۔" جمیلہ کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ "وہ تو مجھے اپنی رکھیل بنانے کے لیے خریدنا چاہتا تھا۔ دو ہزار بولی لگائی تھی۔ پر اللہ وسایا نے صاف انکار کر دیا۔" جمیلہ نے اپنی بات کا رخ بدل دیا' ایک بار پھر حرف مطلب پر آ گئی۔ "چوہدری! تو زینت کے بچوں کے لیے احسان شاہ سے بات کر کے تو دیکھ۔"

"تو بھی کمال کرتی ہے زمیں دارنی۔" رحیم داد کسی قدر جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اس سے بات کرنے کا تو یہ مطلب ہو گا کہ اسے پتہ چل جائے گا زینت یہاں ہے۔"

اس نے جمیلہ کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تو نے یہ نہیں سوچا' اگر احسان شاہ نے میری بات نہ مانی تو کیا ہو گا؟ میں تو کہتا ہوں اسے پتہ چل گیا تو زینت اپنے گھر والے کے پاس بھی نہ جا سکے گی۔ احسان شاہ اسے رستے ہی سے اٹھوا لے گا۔ وہ ایسا ہی خطرناک بندہ ہے۔"

جمیلہ تذبذب میں پڑ گئی۔ رحیم داد نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا' ان کی اہمیت کو اس نے بھی محسوس کیا۔

☆

رات کالی کاجل ہو گئی۔ سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ حویلی پر سناٹا چھایا تھا۔ اسی اثنا میں رات کے گہرے سناٹے میں کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ ابھری۔ چاپ ہولے ہولے قریب آ گئی۔ دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا۔ جمیلہ اور رحیم داد نے گردن موڑ کر اس طرف دیکھا۔

زینت دروازے پر کھڑی تھی۔ مگر وہ اندر نہ آئی۔ جمیلہ نے نرمی سے کہا۔ "اندر آ جا۔ باہر سردی میں کیوں کھڑی ہے؟"

وہ سہمی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور دہلیز کے پاس فرش پر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ اس کا رنگ ہلکا گلابی تھا۔ بال سنہری مائل تھے۔ آنکھیں بھوری تھیں مگر بڑی بڑی اور کشش انگیز تھیں۔ ناک نقشہ سبک اور کھڑا کھڑا تھا۔ جسم نرم اور گداز تھا۔ عمر ۲۴ سال سے زیادہ نہ تھی۔ مگر وہ اتنی ہی عمر میں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن چکی تھی۔ آنکھیں ویران اور دھواں دھواں تھیں۔ چہرہ مرجھائے ہوئے پھول کی طرح شگفتگی سے عاری تھا۔ جلد کھردری پڑ گئی تھی۔ وہ گہری نیلی دھوتی باندھے ہوئے تھی اور ملگجی کھیس اوڑھے سکڑی سکڑائی حسرت کا مرقع اور عبرت کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

جمیلہ نے پوچھا۔ "زینت! کیسے آ گئی؟"

"بھین جی' نیند نہیں آ رہی تھی۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "مجھے پتہ چلا' تو یہاں ہے۔ من گھبرایا تو ادھر آ گئی۔ تو نے برا تو نہیں منایا؟"

"ایسی گل نہ سوچ۔" جمیلہ نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ "وہاں کیوں بیٹھی ہے۔ ادھر میرے پاس کرسی پر آ کر بیٹھ جا۔"

اس نے گردن ہلا کر آہستہ سے کہا۔ "نہیں بھین جی' میں یہیں ٹھیک ہوں۔" وہ اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔

جمیلہ نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ "چوہدری! اس نے دسویں تک پڑھا ہے۔ پتا ڈاکٹر تھا۔ پنڈ توں کا کھاتا پیتا گھرانہ تھا۔ سے بدلا تو سب کچھ بدل گیا۔ اب یہ اپنی ہی نظروں میں اتنی گر گئی ہے کہ خود کو کمی سمجھتی ہے۔ میرے ساتھ کرسی پر بیٹھتے ہوئے ڈرتی ہے۔"

رحیم داد نے جمیلہ کی بات نظر انداز کرتے ہوئے زینت سے پوچھا۔ "تو احسان شاہ کے کوٹ سے کیسے نکل آئی؟ سنا ہے ادھر بہت کڑی نگرانی ہوتی ہے۔ ہر دکت مسلح راکھے پہرہ دیتے ہیں۔ میں نے غلط تو نہیں سنا؟" رحیم داد نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"تو نے ٹھیک ہی سنا۔" اس نے رحیم داد کی تائید کی۔ "وہ ایسا ہوا جی' میں اس رات کوٹ میں نہیں تھی۔ مجھے شاہ جی کے نوکر' شیدا نے ان کمروں میں سے ایک میں پہنچا دیا تھا جن میں مہمان ٹھیرتے ہیں۔ وہ جی بہت گندی اور خراب جگہ ہے۔" اس کا لہجہ دھیما اور افسردہ پڑ گیا۔ "پہلے بھی ان کمروں میں کئی بار جا چکی تھی۔ اس رات محکمہ آبادکاری کا کوئی وڈا افسر ٹھیرا تھا۔ اس نے دانتوں سے ایسے زور زور سے کاٹا کہ مجھے رونا آ گیا۔ پر وہ ہنستا رہا' مخول کرتا رہا۔ نشے سے بالکل پاگل ہو رہا تھا۔"

رحیم داد نے مسکرا کر جمیلہ کی جانب دیکھا۔ "سن لے' زمیں دارنی۔ اس طرح ہو رہی ہے آبادکاری۔" جمیلہ کچھ نہ بولی۔ نگاہیں نیچی کیے خاموش بیٹھی رہی۔ رحیم داد نے نگاہیں گھمائیں۔ زینت کو دیکھا' پوچھا۔ "یہ بتا زینت' تو وہاں سے نکلی کیسے؟ راکھوں نے تجھے نہیں روکا؟" اس کی آنکھوں میں حیرت اور استعجاب تھا۔

"بات سچی یہ ہے جی۔" زینت نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر بتایا۔ "نشے میں تو وہ تھا ہی۔ ایسا

بے خبر ہو کر سویا کہ اسے بالکل سدھ بدھ نہ رہی۔ مجھے نیند نہیں آئی۔ اس نے ایسے کٹھور پن سے بدن میں جگہ، جگہ کاٹا تھا کہ بار بار ٹیس اٹھتی تھی۔" اس نے سردی سے بچنے کے لیے کھیس ٹانگوں تک پھیلا دی۔

"فیر کیا ہوا؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"جب وہ بے سدھ ہو کر سو گیا تو میں اٹھی۔ چپکے سے دروازہ کھولا۔" زینت آہستہ آہستہ بتاتی رہی۔ "کمرے کے باہر برآمدہ تھا۔ اس میں راکھا بیٹھا تھا۔ اس کے پاس بندوک تھی۔ پر وہ بھی دیوار سے پیٹھ ٹکائے اس سے اونگھ گیا تھا۔ میں چوری چوری چلتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیوں سے نیچے اتری۔ سامنے گھنے پیڑ تھے۔ اندھیرا ابھی بہت تھا۔ میں درختوں تلے پہنچ گئی۔ اگے بڑھی اور ایک پیڑ پر چڑھ گئی۔"

"تو پیڑ پر بھی چڑھ لیتی ہے؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں جی مجھے بچپن سے پیڑوں پر چڑھنے کی خوب پریکٹس ہے۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "پیڑ دیوار کے ساتھ ہی تھا۔ میں ایک ڈالی سے لٹک کر جھولتی رہی اور ایک بار جی کڑا کر کے باہر کود گئی۔"

"پر حویلی کی دیوار تو بہت اونچی ہے۔" رحیم داد نے پوچھا۔ "تجھے چوٹ نہیں آئی۔"

"آئی تھی۔ پر زیادہ نہیں آئی۔ اس سے تو بالکل پتہ نہ چلا۔ میں پیراں والہ سے بھاگتی ہوئی رات کے اندھیرے میں نکلی اور نہر کے ساتھ ساتھ چلتی ادھر آ گئی۔ پر بعد میں ایک ٹانگ درد کرنے لگی۔ اب بھی کرتی ہے۔" اس نے نظریں اٹھا کر جمیلہ کو دیکھا۔ "بھین جی کو میں نے بتایا۔ اس نے تاراں سے مالش کرائی۔ اس سے درد کم ہو گیا۔"

جمیلہ زیادہ دیر خاموش نہ رہی۔ اس نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "زینت! تیرا اصلی درد تو تیرے بالک ہیں۔ جن کو تو ہر سمے یاد کرتی رہتی ہے، روتی رہتی ہے، آنسو بہاتی ہے۔" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "یہی گل ہے نا؟"

"میرا اصلی درد تو بھین جی یہی ہے۔ ان کے لیے تو میں شاہ جی کی حویلی میں بھی روتی رہتی تھی۔" زینت نے دکھ بھرے لہجے میں جمیلہ کی بات کی تائید کی۔ "کوٹ کی کیدی زنانیوں کی انچارج رجتے ہے۔ مجھے روتا ہوا دیکھ کر وہ ڈانٹتی ڈپٹتی تھی۔ بالوں سے پکڑ کر مارتی تھی۔ وہ جی بہت کٹھور ہے۔ اس کے ڈر سے میں چھپ چھپ کر روتی تھی۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی، آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ کھیس کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔

جمیلہ نے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! یہ بھی ٹھیک ہی ہوا زینت اس سے یہاں آ گئی۔ تو نے بھی اس کا دکھ جان لیا۔ یہ اپنے بچوں کے لیے بہت دکھی ہے۔ اسے کچھ چنگا نہیں لگتا۔ روٹی بھی ٹھیک سے نہیں کھاتی۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "یہ بتا اس کے بچوں کو لانے کے لیے کیا رستہ نکالا جائے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"میں تو کہتا ہوں جی، پہلے اس کے گھر والے کا انتظار کر لیا جائے۔ وہ کل شام تک نادر خاں کے ساتھ پہنچ ہی جائے گا۔ جنت نے مجھے یہی بتایا ہے۔" رحیم داد نے اپنے خدشات کا دبی زبان سے اظہار کیا۔ "پہلے اس کے گھر والے سے گل بات کرنی ضروری ہے۔ مان لے وہ اسے لے جانے پر تیار نہ ہوا، تب کیا ہو گا؟ مجھے یا تجھے اس کے دل کا کیا پتہ؟"

"چوہدری! تو کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔ ایسا سے لگا ہے، کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کبھی کبھی تو میں بھی اس پرکار سوچتی ہوں۔" جمیلہ نے بھی رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔ "سال بھر سے اوپر ہو گیا۔ پتہ نہیں گھر والے کے من میں اس کے بارے میں کیا ہو؟ اس نے کیا سوچ رکھا ہو؟"

"بھین جی، ایسا نہ کہہ۔" زینت تڑپ کر بولی۔ "وہ مجھے بہت پیار کرتا ہے۔ بہت نیک اور بھلا بندہ ہے۔ وہ مجھے اتنا پیار نہ کرتا تو میں اپنے کنبے والوں کو چھوڑ کر فیروزپور سے ادھر واپس ہی کیوں آتی؟ تجھے تو ساری باتوں کا پتہ ہی ہے۔ سب کچھ بتا چکی ہوں تجھ سے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" رحیم داد نے اس کی دل شکنی نہ کی۔ "پر پہلے اس سے مل کر بات کر لینی ضروری ہے۔" اس نے جمیلہ کو مخاطب کیا۔ "زمیں دارنی! میں تو ایسا ہی سوچتا ہوں۔ تو کیا کہتی ہے؟"

"وہی جو تیرا وچار ہے۔" جمیلہ نے اس کی تائید کی۔ "زینت کے گھر والے کا پہلے انتظار کر لینا چاہیے۔ اس سے بات چیت کرنے پر صاف پتہ چل جائے گا، وہ کیا چاہتا ہے؟" اس نے زینت کی جانب مڑ کر دیکھا۔ "مان لے، وہ تجھے اپنے ساتھ لے جانے پر تیار نہ ہوا۔" اپنے اس شک و شبہ کے اظہار کے ساتھ ہی اس نے زینت کو یقین بھی دلایا۔ "چنتا نہ کر زینت۔ میں تجھے اور تیرے بچوں کو اپنے پاس رکھوں گی۔ ویسے تیرا گھر والا جلیل چاہے تو اسے بھی یہاں ٹھیرا لوں گی۔"

"بھین جی! وہ یہاں کیسے رہ سکتا ہے؟ دیپال پور میں تو وہ نوکری کرتا ہے۔ سکول میں پڑھاتا ہے۔"

"یہاں بھی سکول میں پڑھائے گا۔" جمیلہ نے مسکرا کر زینت کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”تونے تو میرا سکول دیکھا ہے۔ وہیں تو مجھے پہلی بار ملی تھی۔ بھول گئی؟؟“

”زینت نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ”پر جلیل تو سرکاری سکول کا ماسٹر ہے۔ وہ کیسے سرکاری نوکری چھوڑ دے گا؟؟“

”یہ بھی سرکاری سکول بن جائے گا۔“ جمیلہ نے اسے یقین دلایا۔ ”میں تو یہی چاہوں گی جلیل ادھر ہی ٹھہر جائے اور یہ سکول چلائے۔ مجھے تو ویسے بھی تجربے کار سکول ماسٹروں کی ضرورت ہے۔“ اپنی بات کہتے کہتے وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوئی۔ ”چوہدری! میں تجھے یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ اپنے سکول کے بارے میں بات چیت کرنے شہر گئی تھی۔ محکمہ تعلیم والوں نے تو ٹال مٹول سے کام لیا۔ میں ڈپٹی کمشنر سے ملی۔ بہت اچھی طرح پیش آیا۔ چنگا بندہ لگتا ہے۔ اس نے مدد کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ مجھے وشواس دلایا کہ میرے سکول کو سرکاری پرائمری سکول بنا دیا جائے گا۔“

”کب تک ایسا ہو جائے گا؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”یہ تو بتانا مشکل ہے۔“ جمیلہ نے جواب دیا۔ ”ڈپٹی کمشنر نے کہا ہے' اگر فوری طور پر ایسا نہ ہوا تو سکول کو منظور شدہ تو ضرور بنا دیا جائے گا۔ سرکار کی طرف سے مالی مدد بھی ملے گی۔ اس کی ویسے مجھے چنتا نہیں۔ پر ریکگنائزڈ یا منظور شدہ ہو جانے کے بعد سکول کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ ابھی تو وہ کچھ بھی نہیں۔“

”یہ تو بہت زبردست کام ہوگا۔“ رحیم داد نے جمیلہ کی خوشنودی کے لیے کہا۔ ویسے اسے سکول سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ احسان شاہ سے سکول کے بارے میں تفصیلی بات چیت کرنے کے بعد وہ اس کے قیام کے حق میں نہ رہا تھا۔

مگر جمیلہ اس کے احساسات سے بے نیاز بڑے جوش و خروش سے بتاتی رہی۔ ”ڈپٹی کمشنر نے تو مجھے یہاں تک وشواش دلایا کہ وہ ڈسٹرکٹ بورڈ والوں سے بات چیت کرے گا اور انسپکٹر آف سکولز کو جلد ہی معائنے کے لیے بھجوانے کی کوشش کرے گا۔ خود بھی ادھر آنے کو کہتا تھا۔“

”بہین جی' تیرا سکول سرکاری بن گیا' تب تو جلیل ضرور یہاں آ جائے گا۔“ زینت خوش ہو کر بولی۔ ”میں بھی اسے کہوں گی۔ وہ میری بات مان لے گا۔ پر اسے ادھر اپنا تبادلہ کرانا پڑے گا۔“

”پر ابھی اسے آنے تو دے۔ تونے تو ابھی سے اونچی اونچی گلاں سوچنی شروع کر دیں۔“ رحیم داد نے ہنس کر زینت سے کہا۔ ”پہلے تو اس سے مل کر یہ معلوم کرنا ہوگا' اس کا ارادہ کیا ہے؟ بناں اس سے ملے اور بات کیے تو کچھ بھی نہیں طے کیا جا سکتا۔“

”چوہدری! تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پہلے جلیل کا انتظار کرنا ہوگا۔“ جمیلہ نے رحیم داد کی رائے سے پورا پورا اتفاق کیا۔ ”اسے کل شام تک نادر کے ساتھ یہاں پہنچ جانا چاہئے۔“ اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ”ساڑھے بارہ بج گئے۔ آدھی رات ہوگئی' باتوں میں سے کا پتہ نہ چلا۔ بہت دیر ہو گئی۔ اب چلنا چاہیے۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”پر تونے طے کیا کیا؟“ رحیم داد نے جمیلہ کو ٹوکا۔

”طے کیا کرنا ہے۔“ جمیلہ نے جواب دیا۔ ”پہلے جلیل سے مل کر بات کرنی ضروری ہے۔ ہونا بھی یہی چاہیے۔ اس کے آنے کے بعد ہی آگے کے لیے سوچ وچار کیا جائے گا۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ جمیلہ آگے بڑھی۔ زینت بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں کمرے سے چلی گئیں۔

☆

زینت کے شوہر' جلیل کا صبح ہوتے ہی انتظار شروع ہو گیا۔ دن ڈھلنے لگا۔ سورج غروب ہو گیا۔ شام ہو گئی۔ مگر جلیل نہ آیا۔ نادر خاں بھی نہ لوٹا۔ پھر رات ہو گئی۔ حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ رحیم داد جاگ رہا تھا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ویسے بھی کچھ عرصے سے اسے دیر سے سونے کی عادت پڑ گئی تھی۔

رات گئے بالائی منزل پر جانے والے زینے پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ رحیم داد پوری طرح بیدار تھا۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی اور کمرے کے پاس پہنچ کر ختم ہو گئی۔ رحیم داد نے بے چین نظروں سے بند دروازے کی جانب دیکھا۔

دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ رحیم داد نے اٹھ کر لیمپ کی لو اونچی کی۔ آگے بڑھا۔ دروازہ کھولا۔ سامنے جمیلہ کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دواؤں کا تھیلا لٹک رہا تھا۔ اس کے قریب حویلی کی نوکرانی ناجو کھڑی تھی۔ وہ ایک ہاتھ میں جلتی ہوئی لالٹین سنبھالے ہوئے تھی۔

جمیلہ نے رحیم داد کو دیکھتے ہی دریافت کیا۔ ”چوہدری! تو ابھی سویا نہیں؟“

”نہیں جی' میں جاگ رہا تھا۔ دن میں دیر تک سوتا رہا۔ اب نیند نہیں آ رہی تھی۔“ رحیم داد نے وضاحت کی' پوچھا۔ ”پر زمیں دارنی تو اتنی رات کو کہاں جا رہی ہے؟؟“

”پنڈ کے موچی کی طبیعت بہت گڑبڑ ہے۔“ جمیلہ نے قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”شام سے اسے الٹیاں ہو رہی ہیں۔ حکیم سے دوائی بھی لایا تھا۔ پر طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر پہلے حمزا کے ساتھ اس کا پتر آیا تھا۔ بہت پریشان لگتا تھا۔ اسے تو میں نے جھٹ واپس بھیج دیا۔ اب موچی کے گھر جا رہی ہوں۔“

"پر اب تو بہت رات ہو گئی۔" رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔

جمیلہ کچھ نہ بولی۔ دواؤں کا بکسا فرش پر رکھا۔ شال دوبارہ اس طرح سنبھال کر اوڑھی کہ کان اور چہرے کا بیشتر حصہ ڈھک گیا۔

"زمیں دارنی! سردی بہت ہے۔ تو نے خالی شال اوڑھ رکھی ہے۔"

"نہیں، میں نے موٹا اونی سویٹر بھی پہن رکھا ہے۔ تو چنتا نہ کر۔" جمیلہ نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔ "ویسے مجھ سے کمبل یا دھسا اوڑھ کر چلا نہیں جاتا۔ نہ جانے کیسا لگتا ہے۔" بات کہتے کہتے اس کے چہرے سے گھبراہٹ جھلکنے لگی۔ "چوہدری! میں تیرے پاس اس کارن آئی تھی کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ احسان شاہ کا ایک کرندہ شام کو ادھر آیا تھا۔ تجھ سے تو نہیں ملا۔"

"مجھے تو نہیں ملا۔ پر وہ آیا کیوں؟" رحیم داد بھی گھبرا گیا۔ "زینت تو تیرے ہی ساتھ ہے نا؟"

"وہ تو میرے ہی کمرے میں ہے۔ اسے نینا اور گڈّو کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں۔ جاگ رہی ہے۔"

"جلیل کا انتظار کر رہی ہوگی۔ پر نہ وہ آیا اور نہ ہی نادر لوٹا۔"

"پتہ نہیں کیوں نہیں آیا۔ لگتا ہے نادر اسے لے کر ہی آئے گا۔ کل تک دونوں کو آجانا چاہیے۔"

"زمیں دارنی! اندر آجا۔ باہر کیوں کھڑی ہے؟"

"میں نے ٹھہرنا نہیں ہے۔ تجھے احسان شاہ کے کرندے کے بارے میں بتانے آئی تھی۔ مجھے اب موچی کے گھر جانا ہے۔"

"ٹھہر جا، میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔ تیرا اتنی رات گزرے اس طرح جانا ٹھیک نہیں۔"

جمیلہ نے منع بھی کیا، مگر رحیم داد باز نہ آیا۔ اس نے جلدی جلدی جوتے پہنے، سر پر پگڑی رکھی، اونی دھسا اوڑھا، باہر نکلا، دروازہ بند کیا اور جمیلہ کے انکار کے باوجود اصرار کر کے دواؤں کا بکسا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

رحیم داد بکسا سنبھالے جمیلہ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ناجو لالٹین لیے آگے آگے تھی۔ تینوں حویلی سے باہر نکلے۔ پھاٹک پر پہریدار موجود تھا۔ رحیم داد نے اسے چوکنا اور محتاط رہنے کی ہدایت کی۔ حویلی کے باہر پالا پڑ رہا تھا۔ ہر طرف نیل گوں دھندلکا پھیلا تھا۔ اس کی تہہ اس قدر گاڑھی اور دبیز تھی کہ لالٹین کی روشنی ہلکا سا دھبا نظر آتی تھی۔

گاؤں پالے میں لپٹا سو رہا تھا۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ یہ جاڑے کی سرد اور خون منجمد کردینے والی رات تھی۔ رحیم داد کا بدن موٹے دھسے میں بھی کپکپا رہا تھا۔ ناجو بھی سکڑی سکڑائی نظر آتی تھی۔ مگر جمیلہ گردن اٹھائے نہایت سکون سے چل رہی تھی۔ تینوں نے رڑ عبور کیا اور گاؤں کی جانب بڑھے۔

ابھی تینوں گاؤں کے مکانات سے دور ہی تھے کہ رات کے پرہول سناٹے میں عقب سے تیز ٹاپیں سنائی دیں۔ کوئی گھوڑا سرپٹ دوڑاتا اسی طرف آرہا تھا۔ جمیلہ، رحیم داد اور ناجو نے ٹاپیں سنیں تو ٹھٹک کر رہ گئے۔ ان کی آنکھوں میں خوف تھا، چہروں پر پریشانی تھی۔ وہ اس سمت دھڑکتے دل سے دیکھنے لگے جدھر سے آہٹ ابھر رہی تھی اور دم بدم قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے گھڑ سوار ان کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے گھوڑا ٹھہرایا۔ نیچے اترا اور رکابیں سنبھالے ہوئے ان کی طرف بڑھا۔ تینوں دم بخود تھے۔ پالے کا دھندلکا اتنا دبیز تھا کہ آنے والا سائے کی مانند نظر آرہا تھا۔ رحیم داد گومگو کے عالم میں حیران و پریشان کھڑا رہا۔ مگر جمیلہ نے جرات سے کام لیا۔ آگے بڑھی۔ ناجو کے ہاتھ سے لالٹین لی۔ اسے اٹھا کر اونچا کیا۔ اور آنے والے کو آنکھیں پھاڑ کر غور سے دیکھا۔ وہ اب ٹھہر گیا تھا اور دھندلکے میں لپٹا ہوا چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ اندھیرے میں اونی دوہرے اس طرح چہرہ چھپائے ہوئے تھا کہ صرف تیز چمکتی ہوئی آنکھیں لالٹین کی دھندلی روشنی میں نظر آرہی تھیں۔

جمیلہ نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہے تو؟" اس کی آواز میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ تھی۔ وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہی۔

وہ کچھ نہ بولا۔ اس نے خاموشی سے قدم اٹھایا اور آگے بڑھنے لگا۔ اب رحیم داد کو بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا۔ اس نے ڈپٹ کر کہا۔ "بولتا کیوں نہیں۔ صاف صاف بتا۔ تو کون ہے؟ کیا چاہتا ہے؟"

وہ تینوں کے مقابل پہنچ کر پھر رک گیا، مگر کچھ بولا نہیں۔ چہرے پر سے دوہر ہٹائی اور جمیلہ کو مخاطب کیا۔ "بھین جی، گھبرا نہیں۔ میں جیرا ہوں۔"

جمیلہ نے لالٹین اٹھا کر اس کے چہرے کے سامنے کر دی۔ وہ جیرا ہی تھا۔ اس کے مزارعے دین محمد کا بڑا بیٹا۔ جمیلہ نے لالٹین نیچے کر لی۔ اطمینان کی سانس لی، مسکرا کر بولی۔

"جیرے! تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

جیرا نے کچھ نہ کہا۔ گم صم کھڑا رہا۔ جمیلہ نے زور دے کر پوچھا۔ "جیرے! اس سمے کہاں سے آرہا ہے؟"

"میں اپنی گھر والی لاڈو کو لینے سلیمان پورے گیا تھا۔"

"تو اسے اپنے ساتھ نہیں لایا؟" جمیلہ نے دریافت کیا۔ "کہاں ہے وہ؟"

"بھین جی تیں نوں پتہ ہی ہے۔ وہ دونوں بچے چھوڑ کر اسلم کے ساتھ چلی گئی۔" جیرا نے دبی زبان سے بتایا۔

"میں نوں پتہ ہے‘ بالکل پتہ ہے۔ تیرا پیئو میرے پاس آیا تھا۔ اس سے دیر تک گل بات ہوئی تھی۔ وہ اسے لینے سلیمان پورہ بھی گیا تھا۔ آگے کا مجھے پتہ نہیں۔ نہ دین محمد نے کچھ بتایا اور نہ تیری ماں نے۔ دونوں میں سے کوئی بھی میرے پاس نہ آیا۔"

"آکر کرتے بھی کیا۔" جیرا تیکھے لہجے میں بولا۔ "اس نے واپس آنے سے صاف انکار کر دیا۔"

"پر تیرے پیئو دین محمد کو بتانا تو چاہیے تھا۔" جمیلہ نے نرم لہجے میں کہا۔ "وہ میرے پاس آتا تو آگے کی سوچی جاتی۔ لاڈو کو واپس لانے کے لیے کوئی اپائے کیا جاتا۔ وہ تیری گھر والی ہے۔ تیرا اس پر ادھیکار ہے۔ اسے تیرے پاس آنا چاہیے۔ بچے بھی اس کے بناں بہت پریشان ہوں گے۔"

"بہت تنگ کرتے ہیں جی۔ چھوٹے چھوٹے نکے ہی تو ہیں۔ بہت ضد کرتے ہیں جی۔ ہر دم روتے رہتے ہیں۔ بھین جی! تجھ سے اب کیا بتاؤں۔"

"میں نوں پتہ ہے۔ ضرور تنگ کرتے ہوں گے۔" جمیلہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "پر لاڈو کیسی ماں ہے؟ اسے اپنے بچے بھی یاد نہیں آتے۔ اس کی ممتا بھی نہیں جاگی۔"

"اسے تو جی کسی کی یاد نہیں آتی۔ تین مہینے سے اوپر ہو گئے۔ سب نے مشورہ دیا۔ تھانے میں پرچہ چاک کرا دو۔ پر میرے پیو نے منع کر دیا۔ خود اسلم کے گھر گیا۔ لاڈو سے ملا۔ سمجھانے بجھانے کی کوشش کی پر وہ آنے پر راضی نہیں ہوئی۔ دوبارہ چاچا کو لے کر گیا۔ اس نے ملنے اور گل بات کرنے سے بھی انکار کر دیا۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ "آج دوپہر مجھے پتہ چلا‘ وہ کل سویرے کی گڈی سے اسلم کے ساتھ کراچی جا رہی ہے۔ اپنے پنڈ سے بھاگنے کی تیاری اسلم چپکے چپکے کر رہا تھا۔ پر مجھے کسی نہ کسی طرح معلوم ہو گیا۔" اس نے قدرے تامل کیا پھر جمیلہ کو بتایا۔ "میں آج طے کر کے سلیمان پورہ گیا تھا‘ لاڈو کو اپنے ساتھ لے کر ہی آؤں گا۔" بولتے بولتے اچانک اس کا لہجہ تند اور تیکھا ہو گیا۔ "پر اب وہ کبھی نہیں آئے گی۔"

"کیوں نہیں آئے گی؟" جمیلہ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "تو نے ایسا کیسے سوچا؟"

جیرا کا چہرہ کرخت ہو گیا‘ آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکلنے لگیں‘ منہ بگاڑ کر بولا۔ "میں اسلم کے گھر اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ گیا۔ یار دوستوں کو پہرے پر لگایا۔ گھوڑی بڑھا کر آنگن کی دیوار

ے ساتھ کھڑی کی۔ دیوار پر پہنچا اور دھیرے سے کود کر اندر چلا گیا۔" اس کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ "لاڈو اپنے یار اسلم کے ساتھ لیٹی تھی۔ دونوں کو دیکھتے ہی میں پاگل ہو گیا۔" جیرا نے دوہرے اندر ے ہاتھ نکالا۔ اس میں خون سے لتھڑی ہوئی چھری دبی تھی۔

لال لال خون دیکھ کر جمیلہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ رحیم داد بھی دہشت زدہ ہو گیا۔ باجو نے چیخنے کے لیے منہ پھاڑا مگر آواز نہ نکلی۔ جیرا خون آلود چھری ہاتھ میں دبائے تینوں کے عین سامنے گز‘ سوا گز کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ اس وقت بہت خونخوار نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر چھری سامنے کر دی۔ "میں نے جی دونوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اس وکھت تک وار کرتا رہا جب تک بالکل ختم نہ ہو گئے۔" جیرا نے گہری سانس بھری اور جمیلہ کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا۔

"جیرے! تو نے بہت برا کیا۔" جمیلہ اب سنبھل چکی تھی۔ اس نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ایسا کر کے تجھے کیا ملا؟"

"جو ہونا تھا جی‘ وہ ہو گیا۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

"یہ کب کی گل ہے؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"سدھا سلیمان پورے سے آ رہا ہوں میں اپنے گھر جا رہا تھا۔ اب نہیں جاؤں گا۔ بھین جی‘ تو میرے پیو کو بتا دینا تیرے پتر نے اپنی بے عزتی کا حساب چکا دیا۔ اب وہ پنڈ میں گردن اونچی کر کے چلے گا۔"

جمیلہ کا چہرہ بدستور پریشان تھا۔ "تو کچھ ہی کہہ‘ جیرے تو نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔"

جیرا نے کچھ نہ کہا۔ آگے بڑھا‘ جھکا۔ جمیلہ کے پیروں کو چھو کر عاجزی سے بولا۔ "بھین مجھے معاف کر دینا۔" وہ چند لمحے گردن جھکائے جمیلہ کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر اس نے دوہرے سے اپنے چہرے کو ڈھاٹا باندھ کر چھپایا۔ گھوڑے کی طرف بڑھا اور اچھل کر اس پر سوار ہو گیا۔

جمیلہ نے گھبرا کر ٹوکا۔ "جیرے اب تو کہاں جا رہا ہے؟"

"سوئے کے کنارے میرا یار ملکان انتظار کر رہا ہے۔ میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ بھی میرے ساتھ سلیمان پورے گیا تھا۔"

"پر تو اس کے ساتھ کہاں جائے گا؟"

"ملکان کو اس کے گھر بھیج دوں گا۔" جیرا نے جمیلہ کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "میں تھانے چلا جاؤں گا۔"

جمیلہ نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ چیخ کر بولی۔ "جیرے ٹھہر جا۔ میری گل تو سن۔"

مگر جیرا نے کچھ نہ سنا۔ اس نے گھوڑے کو موڑا‘ ایڑ لگائی اور جس طرف سے آیا تھا اسی طرف گھوڑا تیزی سے دوڑاتا ہوا آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ رحیم داد‘ جمیلہ اور ناجو سکتے کے سے عالم میں کھڑے رہے۔ رات کے سناٹے میں دور ہوتی ہوئی ٹاپیں سنتے رہے۔ آخر وہ بھی گہری خاموشی میں تحلیل ہو کر ختم ہو گئیں۔

جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیسا گبھرو جوان ہے۔ غصے میں پاگل ہو کر ہتیا کر بیٹھا۔"

"اور کیا کرتا؟" رحیم داد نے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ عزت اور آن بھی تو کچھ ہوتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں‘ جیرا حوصلے والا اور جی دار جوان ہے۔"

"چوہدری‘ چھوڑ جی داری شی داری کو۔ اس میں کیا دھرا ہے۔" جمیلہ نے جل کر تیکھے لہجے میں کہا۔ "کوئی جگیردار اور وڈا زمیں دار کسی بھی زنانی کو اٹھوالے۔ اسے رکھیل بنا کر رکھے۔ بچے جنوائے‘ تب نہ عزت یاد آتی ہے نہ غیرت اور آبرو۔ ساری جی داری دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ اس کے تو پیر پکڑتے ہیں۔ منتیں کرتے ہیں‘ گڑگڑاتے ہیں‘ میرا بازو واپس دے دے۔" اس کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ چہرے پر جھنجلاہٹ بکھر گئی۔ "دھتکارے جاتے ہیں‘ گالاں سنتے ہیں۔ بار بار جا کر ہاتھ جوڑتے ہیں‘ پیروں پر پگڑی ڈال دیتے ہیں اور عام طور پر رقم ادا کر کے واپس لاتے ہیں۔" اس نے منہ بگاڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔

"ایک طرف تو غیرت اور آن کا یہ حال ہے اور دوسری طرف اپنی ہی طرح کا مزارع یا کی بھگا لے جائے تو جھٹ غیرت اور آبرو جاگ اٹھتی ہے۔ تب جی داری بھی دکھاتے ہیں۔ کتل کرتے ہیں اور پھانسی کے پھندے پر لٹک جاتے ہیں۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ وہ جمیلہ کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر مرعوب ہو گیا تھا۔ جمیلہ نے لالٹین ناجو کو دے دی‘ آگے بڑھی۔

رحیم داد اور ناجو نے بھی قدم بڑھائے۔ تینوں گاؤں میں پہنچے اور گلیوں سے گزرتے ہوئے موچی کے دروازے پر جا کر ٹھہر گئے۔

جمیلہ نے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! اب تو جا۔ میں یہاں سے جیرا کے پیو دین محمد کے گھر جاؤں گی۔ اسے ساری گل بات بتاؤں گی۔"

"میں بھی تیرے ساتھ دین محمد کے گھر چلا جاؤں گا۔ تو اکیلی کیسے اتنی رات کو واپس آئے گی؟"

"مجھے دیر لگ جائے گی۔ تو واپس حویلی میں جا۔ میری چنتا نہ کر۔ میں موچی کے پتر کے ساتھ آجاؤں گی۔ ویسے چوہدری‘ یہ میرا اپنا پنڈ ہے۔ مجھے یہاں ڈر نہیں لگتا۔ میرے لیے ادھر دن رات

سب برابر ہے۔"

رحیم داد نے مزید اصرار نہ کیا۔ خاموشی سے پلٹا اور اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ حویلی پر پہنچا۔

پہریدار جاگ رہا تھا۔ اس نے پھاٹک کھولا۔ رحیم داد اندر داخل ہوا اور اپنے کمرے میں جا کر بستر پر ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا تھا۔ اس کے ذہن پر جیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ جب تک جاگتا رہا اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔

☆

نادر خاں دوسرے روز بھی واپس نہ آیا۔ تیسرا روز گزرا‘ چوتھا گزرا۔ کئی روز گزر گئے۔ مگر وہ نہ آیا۔ جلیل کی بھی کوئی خیر خبر نہ ملی۔ جمیلہ پریشان تھی۔ زینت اس سے بھی زیادہ پریشان تھی۔ وہ ہر وقت روتی رہتی۔ جمیلہ اسے تسلی دیتے دیتے خود بھی رونے لگتی۔ جنت موجود ہوتی تو تینوں مل کر روتیں۔

رحیم داد بھی پریشان تھا۔ مگر زینت اور جمیلہ کی پریشانی نے اسے اور پریشان کر دیا تھا۔ جمعے کو دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے نامدار کے ہم راہ دیپال پور جانے کا منصوبہ بنایا۔ تانگا آ چکا تھا۔ رحیم داد حویلی سے نکل کر اس میں سوار ہونے جا رہا تھا کہ منصب داد بھاگتا ہوا آیا۔ وہ بھی حویلی کا ملازم تھا۔ اس نے نادر خاں کے واپس آنے کی اطلاع دی۔ رحیم داد واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

نادر خاں کے ہم راہ جلیل بھی تھا۔ دونوں رحیم داد کے کمرے میں پہنچے۔ رحیم داد ان کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ اس نے جلیل کو دیکھا۔ وہ چھریرے بدن کا جوان تھا۔ عمر تیس سال سے نکلتی ہوئی تھی۔ رنگ گندی تھا۔ قد اونچا تھا۔ صورت شکل بھی گوارہ تھی۔ مگر بیمار اور پریشان حال نظر آتا تھا۔ کم گو بھی تھا۔

جمیلہ اس وقت اسکول میں تھی اور زینت کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

"نادر! تو نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟" رحیم داد نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔ "ادھر تیری گھر والی نے تو رو رو کے برا حال کر ہی لیا تھا‘ جمیلہ اور زینت بھی اس کے ساتھ رونے پیٹنے میں شریک ہو جاتیں۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "نادر‘ تو نے بہت پریشان کیا۔ میں تیری تلاش میں نکلنے ہی والا تھا۔ دیپال پور جا رہا تھا۔ تو نے حویلی کے پھاٹک پر تانگا بھی دیکھا ہو گا۔"

"مجھے پتہ تھا‘ ادھر سب پریشان ہوں گے۔" نادر خاں نے دبی زبان سے کہا۔

"جب تیں نوں پتہ تھا' سب پریشان ہوں گے' تب بھی تو نے اتنی دیر کردی۔ کیا کرتا رہا؟" رحیم داد نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تو نے ٹھیک نہیں کیا۔ ایک روز کے لیے کہہ کر گیا اور ہفتہ بھر بعد لوٹا۔"

"کیا کرتا جی۔ یہ لہور گیا تھا۔" نادر خاں نے جلیل کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "مجھے اس کا انتظار کرنا پڑا۔ سوچا' اب آیا ہوں تو اسے مل تو لوں۔ دیپال پور میں میرا ایک پرانا یار ہے' عبدالصمد۔ اسی کے ساتھ ٹھیرا تھا۔"

رحیم داد نے جلیل کو نظر بھر کر دیکھا۔ پھر مڑ کر نادر کی طرف متوجہ ہوا۔ "یہ کب لہور سے واپس آیا؟"

"کل رات ہی آیا تھا جی۔ میں نے اسے کہا تو یہ چلنے کو تیار بھی ہوگیا۔ ہم دونوں سویرے ہی سویرے روانہ ہوگئے تھے۔" نادر خاں نے لمحہ بھر کے لیے تامل کیا' پھر دریافت کیا۔ "چوہدری! تو کب واپس آیا؟"

"جس روز تو دیپال پور گیا' میں اسی شام لوٹا تھا۔"

نادر خاں بہت تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کی بیوی جنت کو اس کی واپسی کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ دو بار تاراں کو اور اپنی بچی کو بھیج چکی تھی۔ ہر بار نادر سے گھر پہنچنے کا تقاضا کیا جاتا۔ آخر رحیم داد نے زچ ہو کر نادر خاں سے کہا۔

"نادر تو جا۔ تیری گھر والی تیرے لیے بہت بے چین ہے۔"

نادر خاموشی سے اٹھا اور کمرے سے چلا گیا۔ جلیل کرسی پر گم صم بیٹھا رہا۔ اس کی نگاہیں بار بار دروازے کی جانب اٹھ جاتیں۔ رحیم داد اس کی بے قراری کا سبب فوراً بھانپ گیا۔ مسکرا کر بولا۔ "جلیل! لگتا ہے تو زینت کے لیے بہت بے چین ہے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "یہ بتا۔ تو اسے اپنے ساتھ لے جائے گا؟"

"آیا تو جی بالکل اسی ارادے سے ہوں۔" جلیل نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ "مگر زینت ہے کہاں؟"

"وہ بھی آجائے گی۔" رحیم داد زیر لب مسکراتا رہا۔ اسے جلیل کی بے قراری میں لذت محسوس ہو رہی تھی۔ "اب تو اتنا بے تاب ہو رہا ہے۔ پہلے اس کی یاد نہ آئی۔"

"میں تو جی یہ سمجھے ہوئے تھا' وہ ابھی تک اپنے خاندان والوں کے پاس فیروز پور میں ہوگی۔ اس کی واپسی کی امید تو بالکل ختم ہوچکی تھی۔ ایک بار سرحد پار جانے کے بعد کون مغویہ واپس آسکتی

ہے۔ یہ تو بالکل انہونی بات ہے۔" جلیل نے وضاحت کی۔ "نادر خاں نے مجھے زینت کے بارے میں بتایا تو پہلے مجھے یقین ہی نہ آیا۔"

"تجھے یہ بھی پتہ ہے' سرحد پار سے واپسی کے بعد وہ سال بھر تک کسی اور کے پاس تھی؟ بلکہ اس کے بچے بھی ابھی تک اس کے پاس ہیں۔" رحیم داد نے اس کا عندیہ معلوم کرنے کے لیے صاف گوئی سے کام لیا۔ "تجھے یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ پیراں والہ کے زمیں دار سید احسان علی شاہ نے زینت کو اٹھوا کر اپنی حویلی کے کوٹ میں رکھیل بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔ وہ وہاں سے کسی نہ کسی طرح بھاگ کر ادھر پہنچی ہے۔"

"نادر خاں' کل رات زینت کے بارے میں مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔" جلیل نے پرسکون لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر نہ جھنجلاہٹ تھی اور نہ ہی کسی قسم کی کدورت نظر آتی تھی۔ "نادر نے کوئی بھی بات مجھ سے بالکل نہیں چھپائی۔ سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔"

"ٹھیک ہی کیا اس نے۔" رحیم داد نے مطمئن ہو کر کہا۔ "لگتا ہے تو نے پوری طرح سوچ سمجھ کر زینت کو لے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"بات یہ ہے جی' مجھے زینت سے تب شکایت ہوتی جب اس کا اپنا کوئی قصور ہوتا۔" جلیل بڑے اعتماد سے گویا ہوا۔ "وہ تو حالات کا شکار رہوئی۔ گیند کی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے میں جاتی رہی۔" اس کے لہجے میں دبا دبا کرب تھا۔ "زینت پر جو کچھ بیتی اسے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

"تو مہاجر تو نہیں ہے؟" رحیم داد نے اس کی بات سن کر معاً سوال کیا۔

"ویسے تو جی میں شیخوپورہ کا رہنے والا ہوں' لیکن جب فسادات کی آگ بھڑکی تو میں ملازمت کے سلسلے میں کرنال میں تھا۔ گھر والے بھی ساتھ تھے۔" جلیل نے سنبھل سنبھل کر بتایا۔ "ماں تھی' چھوٹا بھائی تھا' دو جوان بہنیں تھیں۔ میرا پیو پہلے ہی مر چکا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "ستمبر ۱۹۴۷ء کا مہینہ تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے۔ سکھوں اور ہندوؤں کے حملوں سے تنگ آکر میں گھر والوں کے ساتھ بچ بچا کر حصار پہنچ گیا۔ وہاں بھی حالات خراب تھے اور روز بروز بگڑتے ہی جا رہے تھے۔ حملے ہوتے' آگ لگائی جاتی۔ خون خرابہ ہوتا۔ آخر کسی نہ کسی طرح میں ریلیف کیمپ پہنچ گیا۔ گھر سے نکلتے ہی بلوائیوں نے اس میں آگ لگا دی۔ میں نے دور سے اپنے گھر کو شعلوں میں جلتے ہوئے دیکھا۔ کیا بتاؤں وہ کتنی بھیانک رات تھی۔"

"کیمپ میں پہنچ کر تو سب بچ گئے ہوں گے۔" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

"میں صرف اکیلا کیمپ میں پہنچ سکا تھا۔" جلیل کا چہرہ مرجھا گیا' آواز میں رقت پیدا ہوگئی۔

”راستے میں بلوائیوں نے حملہ کردیا۔ ماں اور چھوٹا بھائی میرے سامنے مارے گئے۔ ان کی لاشوں کے درمیان میں خون میں ڈوبا ہوا پڑا تھا۔ بلوائی دونوں بہنوں کو اٹھا کر لے جانے لگے تو وہ مجھے مدد کے لیے پکارنے لگیں۔ ان کی آہ وزاری سنتا رہا۔ انھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ لیکن مجھ میں تو اٹھنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ زخموں سے چور چور ہو رہا تھا۔“ اس کا لہجہ اور رقّت آمیز ہوگیا۔

”مرجاتا تو اچھا ہی تھا۔ پر اللہ کو یہ منظور نہ تھا۔“ وہ لحہ بھر تک گردن جھکائے خاموش بیٹھا رہا‘ پھر اس نے بتایا۔ ”بعد میں دوسرے زخمیوں کے ساتھ نہ جانے کس طرح کیمپ میں پہنچا۔ وہیں مرہم پٹی ہوئی۔ میں نومبر تک ریلیف کیمپ میں رہا۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ کیمپ محفوظ رہا۔“

”روز ہی اس پر حملے کی خبریں ملتی تھیں‘ پر حملہ نہ ہوسکا۔“ جلیل نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”ویسے کئی دوسرے مسلمان افسروں کے علاوہ حصار کا ڈپٹی کمشنر بھی مسلمان تھا۔“

”اسی نے مسلمانوں کو حملہ کرنے والوں سے بچائے رکھا ہوگا۔“ رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

”توبہ کرو جی۔“ جلیل کے چہرے پر جھنجلاہٹ بکھر گئی۔ ”مسلمان وفد بنا کر اس کے پاس گئے۔ میں بھی اس میں شامل تھا۔ ڈپٹی کمشنر کو سکھوں اور ہندوؤں کے ظلم و ستم بتائے۔ پولیس کے بارے میں آگاہ کیا کہ ہندو اور سکھ پولیس والے کس طرح کھلم کھلا ہندوؤں اور سکھوں کی حمایت کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو اندھا دھند گولیاں چلا کر ہلاک کر رہے ہیں۔ اس کے دفتر میں کانگریس اور جن سنگھ کے کئی نیتا بھی بیٹھے تھے۔ ان کے سروں پر یہ لمبی لمبی بودیاں تھیں۔ ماتھے پر تلک تھے۔ وہ بھی اس سے ملنے آئے تھے۔“ جلیل کا لہجہ اور تلخ ہوگیا۔ ”انھیں خوش کرنے کے لیے ڈپٹی کمشنر نے مسلمانوں کے وفد کو غصے سے گھورا‘ منہ بگاڑ کر بولا۔ تم نے پاکستان مانگا تھا۔ اس کی خاطر مسلم لیگ کو الیکشن میں ووٹ دے کر کامیاب بنایا تھا۔ اب پاکستان بن گیا۔ جاؤ اپنے پاکستان۔ یہاں کیوں ٹھیرے ہو؟ اس نے تو مدد کیا کرنی تھی۔ الٹی مسلمانوں کو دھمکیاں دیں۔ سخت ناراض ہوا۔“

”وہ کیسا بندہ تھا۔“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر اپنے فوری ردعمل کا اظہار کیا۔ ”اسے اپنے مسلمان بھائیوں کا ذرا بھی خیال نہ آیا۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”ہندوؤں کے سامنے نمبر بڑھانے کے لیے اس نے ایسا کیا ہوگا۔“

”ایسا ہی ہوگا جی۔“ جلیل نے رحیم داد سے اختلاف رائے نہ کیا۔ اس کے ہونٹوں پر زہرخند نمودار ہوا۔ ”لیکن ہندوؤں اور سکھوں کی چاپلوسی اور خوشامد کے بعد بھی وہ وہاں ٹک نہ سکا۔ وہ آئی سی ایس تھا اور جلندھر کا رہنے والا تھا۔“

”کہاں گیا وہ؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”حصار سے وہ دہلی گیا۔ وہاں سے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر بال بچوں اور مال اسباب کے ساتھ آرام سے پاکستان پہنچ گیا۔ وہاں ڈپٹی کمشنر تھا۔ یہاں پہنچ کر زیادہ بڑا افسر لگ گیا۔“

”کبھی تجھے ملا بھی؟“

”نہیں۔“ جلیل نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”سنا ہے پہلے سیشن جج ہوتا تھا۔ اب ترقی کرکے ہائی کورٹ کا جج بن گیا ہے۔“

”حد ہوگئی جی۔“ رحیم داد نے اس کی باتوں سے متاثر ہو کر کہا۔ ”پر جلیل‘ تو نے بہت دکھ سہے۔ تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔“

”سب کچھ ختم ہوگیا۔ گھربار۔ ماں‘ بھائی‘ بہنیں‘ سب بچھڑ گئے۔ کوئی بھی تو نہ رہا۔“

”تیری بہنوں کا کیا بنا؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ ”ان کا پتہ چلانے کی تو نے کوشش نہیں کی؟“

”چوہدری! یہ نہ پوچھ۔“ جلیل بے زاری سے بولا۔ ”تجھے کیا کیا بتاؤں۔“

”جلیل! میں بھی تیری ہی طرح مہاجر ہوں۔“ رحیم داد نے جلیل کی ہم دردی حاصل کرنے کے لیے متوفی چوہدری نور الٰہی کی الم ناک داستان اپنی آپ بیتی بنا کر سنائی۔ ”فسادات اور بلوے ہوئے تو میں ضلع گورداس پور کے موضع نصیر پور میں ہوتا تھا۔ پٹیالہ کی ریاستی فوج نے سکھوں اور ہندوؤں کے ساتھ نصیر پور پر حملہ کیا تو رات کے اندھیرے میں کسی نہ کسی طرح سارے ہی مسلمان نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ کافلہ بنا کر تریموں کے پتن پر پہنچے۔ وہاں بھی حملہ ہوا۔ میرا پتر میری آنکھوں کے سامنے مارا گیا۔ جوان دھی کو حملہ آور اٹھا کر لے گئے۔ میں نے بیڑی میں بیٹھ کر راوی پار کیا اور پاکستان کی سرحد میں داخل ہوگیا۔ گھروالی اور بچے پیچھے رہ گئے۔ وہ بعد میں پہنچے۔ بس سنا ہی ہے۔ انھیں بہت تلاش کیا پر اب تک نہ ملے۔“ اس نے جلیل کے افسردہ چہرے کو دیکھا۔ ”تو کیسے ادھر پہنچا؟“

”میں جی ٹرین سے آیا تھا۔ کیمپ سے دوسرے پناہ گزینوں کے قافلے کے ساتھ نکلا اور ٹرین میں سوار ہوگیا۔ راستے بھر بلوائیوں کے حملے کا خطرہ منڈلاتا رہا۔ پر پورا قافلہ خیریت سے لہور پہنچ گیا۔“

”تو نے بعد میں اپنی بہنوں کا کھوج نکالنے کی کوشش نہیں کی؟“

”کی تھی۔ دو بار فوجیوں اور رضاکاروں کے ساتھ سرحد پار گیا۔ مردولا سارا بھائی سے ملا۔ اسی کے رضاکاروں کی کوشش سے دونوں کا سراغ بھی لگالیا تھا۔“

"اپنے ساتھ نہیں لایا انھیں؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"کیسے لاتا انھیں۔" جلیل نے دل گرفتہ ہو کر لمبی سانس بھری۔ "بڑی' حصار ہی میں ہے۔ سٹیشن کے ساتھ موتی پورہ کی بستی ہے۔ وہاں ایک سکھ کانسٹیبل کے گھر میں ہے۔ اس کا نام منگل سنگھ ہے۔ وہ اس کا تیسرا گھر والا ہے۔ اس نے ملنے ہی نہ دیا۔ ہر بار جب میں مغویہ زنانیوں کی بازیابی کرنے والی پارٹی کے ساتھ اس کے گھر پر جاتا تو وہ اسے پڑوس کے کسی مکان میں چھپا دیتا۔ ایک رات جب منگل سنگھ ڈیوٹی پر تھانے میں تعینات تھا۔ میں اکیلا چھپتا چھپاتا اس کے گھر پر پہنچا۔ وہ مل گئی۔ گھر میں اکیلی ہی تھی۔ پر وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی نہ ہوئی۔ منگل سنگھ سے اس کے ایک بچہ بھی ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بچے کو دکھا کر بولی۔ اسے لے کر میں کس منہ سے وہاں جاؤں گی۔ میرے ساتھ جو ہونا تھا ہو گیا۔ تجھے خاما خا بدنامی مول لینی ہوگی۔ میں نے اسے سمجھایا۔ فکر نہ کر میں تیری خاطر سب کچھ برداشت کر لوں گا پر وہ نہ مانی۔ سمجھانے بجھانے کے ساتھ ساتھ منت سماجت بھی کی۔ وہ سر جھکائے کچھ دیر چپ کر کے بیٹھی رہی فیر اپنے بچے کو بغل میں دبا کر ایسی تیزی سے باہر چلی گئی کہ میں دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں رک رک کر ایک ایک تفصیل بتاتا رہا۔ "بعد میں کئی بار کوشش کی مگر وہ مجھے ملی ہی نہیں۔"

"چھوٹی کا کیا بنا؟"

"اب تجھے کیا بتاؤں چوہدری' اس کا کیا بنا۔ بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔" جلیل نے نظریں نیچی کر کے دبی زبان سے بتایا۔ "وہ کنجری بن گئی ہے۔ چکلے میں بیٹھتی ہے۔ ان دنوں تو جلندھر میں ہوتی تھی۔ جانے اب کہاں ہے؟ میں اسے ملنے ہی نہ گیا۔ کیا کرتا اسے مل کر۔" اس کی آواز میں درد کی کسک تھی۔ "ماں اور بھائی کی طرح دونوں بہنیں بھی مر جاتیں تو اچھا تھا۔ میں نے ہی ان کو مار دیا ہوتا تو ٹھیک تھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ویسے بھی میرے لیے دونوں مر چکی ہیں۔ کبھی یاد بھی نہیں کرتا۔"

"بہت ظلم ہوا جی۔" رحیم داد بھی افسردہ ہو گیا۔ "تو نے ظلم دیکھا ہے اور اسے جھیلا بھی ہے۔ تب ہی تو نے زینت کو معاف کر دیا اور اسے لینے چلا بھی آیا۔"

"معاف تو جی میں نے اسے تب ہی کر دیا تھا جب وہ منّا کمہار کے گھر سے بھاگ کر میرے پاس آ گئی تھی۔ میں اس زمانے میں چیچہ وطنی کے نزدیک سکھاں والا کے پرائمری سکول میں ماسٹر تھا۔ منّا میرے گھر کے پاس ہی رہتا تھا۔ ہر رات شراب پی کر نشے میں دھت ہو جاتا اور گندی گندی گالاں نکال کر زینت کو بہت بے رحمی سے مارتا پیٹتا۔ میں نے اور پاس پڑوس کے دوسرے رہنے والوں

نے منع بھی کیا۔ سمجھایا بجھایا پر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔" جلیل آہستہ آہستہ بولتا رہا اور رحیم داد توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ "پھر ایسا ہوا جی' ایک رات زینت منّا کی مار کھاتے کھاتے ایسی بدحواس ہو گئی کہ پناہ لینے کے لیے بھاگ کر میرے گھر آ گئی۔ میں نے اسے واپس منّا کے گھر بھیجنا چاہا تو میرے پیر پکڑ کر رونے لگی۔ مجھے بھی اس پر ترس آ گیا۔ اس رات کے بعد وہ دوبارہ منّا کمہار کے گھر نہیں گئی۔"

"منّا نے جھگڑا ٹنٹا تو نہیں کیا؟" رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"وہ صبح میرے پاس آیا۔ ساتھ میں اس کے شریکے اور برادری والے بھی تھے۔" جلیل نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "لیکن زینت نے سب کے سامنے منّا کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ رو رو کے منّا کا ظلم و ستم بیان کیا۔ اس روز تو وہ چلے گئے پر دوسرے روز فیر آئے۔ کئی روز تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ زینت کسی طرح منّا کے گھر جانے کے لیے تیار نہ تھی۔"

"کمہار نے تیرے خلاف تھانے میں اغوا کا پرچہ چاک نہیں کرایا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"زینت اس کی گھر والی تھی۔ تو اس کی مرضی کے خلاف زینت کو کیسے اپنے پاس رکھ سکتا تھا؟"

"وہ پولیس کے پاس کیسے جاتا؟ ان دنوں مغویہ عورتوں کی بازیابی کرنے والی سرکاری جماعتیں ہر طرف گھوم رہی تھیں۔ ہر طرح ان کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہی تھیں۔" جلیل نے وضاحت کی۔ "جیسے ہی کسی مغویہ کا پتہ چلتا فوراً چھاپہ مار کر اسے برآمد کیا جاتا اور سرکاری تحویل میں لے لیا جاتا۔ یہ بات منّا بھی جانتا تھا اور میں نے اسے خبردار بھی کر دیا تھا۔ اسی لیے اس نے زیادہ شور شرابا نہیں کیا۔ وہ بات چیت کے ذریعے زینت کو واپس لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن جب وہ کسی طرح اس کے ساتھ جانے پر آمادہ نہ ہوئی تو ایک شام وہ اکیلا میرے پاس آیا۔" جلیل نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔ "اس نے زینت کے عوض مجھ سے پانچ سو روپے مانگے۔ میرے پاس اتنے روپے نہیں تھے۔ میں نے تین سو ادھار لے کر کسی نہ کسی طرح اکٹھے کیے اور منّا سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اس سے زیادہ کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ وہ اسی پر راضی ہو گیا۔ اس نے روپے لے کر زینت کو طلاق دے دی۔ ایک بچہ تھا وہ بھی دے دیا۔"

"بعد میں تو اس نے تجھے تنگ نہیں کیا؟"

"وہ بہت کمینہ اور گندہ بندہ تھا۔" جلیل نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "زینت کبھی گھر سے باہر نکلتی تو راستے میں اسے چھیڑتا۔ اٹھا لینے کی دھمکی دیتا۔ میں نے جب یہ صورت دیکھی تو کوشش کر کے سکھاں والا سے اپنا تبادلہ رکن پور کرا لیا۔ وہیں عدّت کی مدت پوری ہونے کے بعد میں نے زینت

سے نکاح کرلیا۔ ہم دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ ایک پتر بھی ہوا۔" اپنی بات کہتے کہتے دفعتاً" اس کا چہرہ مرجھا کر راکھ ہوگیا۔ "زینت حاملہ تھی کہ انھی دنوں کسی نے مخبری کردی۔ بازیابی کرنے والی سرکاری جماعت نے رات کو میرے گھر پر چھاپا مارا۔ زینت کو بچوں کے ساتھ اپنی نگرانی میں سرحد پار پہنچا دیا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ اپنے چاچا کے پاس فیروزپور گئی ہے۔ فیر مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ لیکن میں کبھی اسے بھول نہ سکا۔"

"ویسے میں تجھے یہ بتادوں کہ وہ بھی تجھے بالکل نہیں بھولی۔" رحیم داد نے ہنس کر جلیل کو بتایا۔ "تجھ سے اتنا پیار کرتی ہے کہ تیرے ہی لیے چھپتی چھپاتی کسی نہ کسی طرح فیروزپور سے بھاگ کر پاکستان پہنچ گئی۔"

"سچی بات یہ ہے چوہدری ادھر اس کا کوئی سگا ہے بھی نہیں۔ سارا ہی ٹبر بلوائیوں کے ہاتھوں فسادات میں مارا گیا۔ ماں باپ' بھائی بھین' کوئی نہیں بچا۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ جلیل بھی چپ رہا۔ وہ مڑ مڑ کر بے چینی سے دروازے کی سمت دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد باہر دالان میں آہٹ ابھری۔ رحیم داد نے دروازے کی جانب دیکھا کہ جمیلہ کمرے میں داخل ہو رہی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے زینت بھی تھی۔ جلیل اسے دیکھتے ہی بے قرار ہو کر کھڑا ہوگیا۔ زینت آنکھیں پھاڑے خوشی اور حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ آگے بڑھی اور جلیل کے بازو پر سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

جلیل اس کا سر ایک ہاتھ سے ہولے ہولے تھپکتے ہوئے تسلی دینے لگا۔ "اس طرح نہ رو زینت۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھی جھلک پڑیں' پلکیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔

جمیلہ اور رحیم داد گم صم تھے اور دونوں کو تک رہے تھے۔ لیکن جمیلہ زیادہ دیر خاموش نہ رہی۔ رحیم داد کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "لے چوہدری! دیکھ لے۔ زینت ٹھیک ہی کہتی تھی ناں۔" وہ زیر لب مسکراتی ہوئی زینت کے پاس گئی۔ اس کا بازو تھاما' اپنے قریب کیا اور سینے سے لگا کر دل جوئی کرنے لگی۔ "رونا دھونا چھوڑ۔ اوپر کمرے میں جا۔ منہ ہاتھ دھو۔ کپڑے لتے تبدیل کر۔ جلیل یہیں رہے گا۔ مہمان خانے میں ٹھیرے گا۔ تو بھی اس کے ساتھ ہی رہنا۔ جی بھر کے باتیں کرنا۔"

زینت کچھ نہ بولی۔ مڑی اور آنسو پونچھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

۴۳

دن ڈھل رہا تھا۔ دھوپ پھیکی پڑ گئی تھی۔

رحیم داد اور جلیل کمرے میں خاموش بیٹھے تھے۔ قریب ہی جمیلہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ جلیل کے چہرے سے اطمینان اور سکون نمایاں تھا۔

جمیلہ نے نظریں اٹھا کر جلیل کو دیکھا۔ آہستہ سے پوچھا۔ "جلیل! اب تیرا کیا ارادہ ہے؟"

"میں تو جی زینت کو لینے آیا ہوں۔" اس نے نہایت اعتماد سے اپنے ارادے کا اظہار کیا۔

"ضرور لے جا زینت کو۔ تجھے بلایا ہی اسی لیے ہے۔" جمیلہ نے مسکرا کر کہا۔ "پر بچوں کے بارے میں تو نے کیا سوچا؟ وہ تو احسان شاہ کے مزارعے سلامو کے پاس ہیں۔"

"نادر خاں اس بارے میں مجھے پہلے ہی بتا چکا ہے۔ اور یہ بھی بتا چکا ہے کہ زینت بچوں کے لیے کتنی پریشان اور غم زدہ ہے۔"

جمیلہ نے مڑ کر رحیم داد کی جانب نظریں گھمائیں۔ "چوہدری! تو نے احسان شاہ کے پاس جانے کے بارے میں کیا سوچا؟ مجھے آشا ہے' تیرے کہنے پر وہ سلامو سے زینت کے بچے واپس دلا دے گا۔"

"مجھے اس کے پاس نہ بھیج۔" رحیم داد نے انکار کردیا۔ "مجھے ڈر ہے' کوئی گڑبڑ نہ پڑ جائے۔" اس نے جلیل کو مخاطب کیا۔ "جلیل تو بتا' بچوں کو کیسے واپس لائے گا۔ تو احسان شاہ کے پاس جا سکتا ہے؟"

جلیل کے بولنے سے پہلے ہی جمیلہ نے کہا۔ "چوہدری! اسے احسان شاہ کے پاس نہ بھیج۔ اسے

دیکھ کر تو وہ سخت نراض ہو گا۔ غصے سے بھڑک اٹھے گا۔ فیر تو وہ ضرور گڑ بڑ ڈالے گا۔ مجھے پتہ ہے' وہ کتنا خطرناک بندہ ہے۔"

"میں تو جی احسان شاہ کو بالکل ہی نہیں جانتا۔ نہ کبھی اس کے پنڈ گیا اور نہ ہی کبھی اس سے ملا۔" جلیل نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ چپ بیٹھا رہا۔ وہ احسان شاہ کے پاس جانے اور زینت اور اس کے بچوں کے بارے میں بات کرنے سے کترا رہا تھا۔ مراد خاں شاہانی کی زبانی رحیم داد پہلے ہی سن چکا تھا کہ زینت احسان شاہ کو بہت پسند ہے۔ اسے خدشہ تھا کہ کوٹ سے زینت کے فرار ہونے پر وہ سخت برہم ہو گا۔ عین ممکن ہے رحیم داد سے بھی خفا ہو جاتا کہ اس نے اپنی حویلی میں زینت کو پناہ کیوں دی؟ وہ احسان شاہ سے کسی طور بگاڑ پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

جمیلہ نے رحیم داد کو خاموش پایا تو اسے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "چوہدری! ایسے تو کام نہیں چلے گا۔ زینت کے بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ وہ ان کے بنا کیسے شانت رہ سکتی ہے۔ انہیں یاد کرکے ہر سمے روتی رہتی ہے۔"

"اپنی سمجھ میں تو ایک بات آتی ہے۔" جلیل نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "دیپال پور کا تھانے دار' زماں خاں' مجھ پر بہت مہربان ہے۔ میں اس کے بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ وہ ہمیشہ مجھ سے محبت اور پیار سے پیش آتا ہے۔" اس نے جمیلہ کی جانب دیکھا۔ "زمیں دارنی! تیرا مشورہ ہو تو میں تھانے دار زماں خاں سے بچوں کی واپسی کے لیے بات کروں۔ امید تو یہی ہے کہ وہ میری ضرور مدد کرے گا۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" رحیم داد نے اپنا پیچھا چھڑانے کی غرض سے جھٹ جلیل کی تائید کی۔ "احسان شاہ سے اگر تھانے دار نے کہا تو وہ اس کی بات ٹالے گا نہیں۔ میں نے تو اس کے بارے میں یہی اندازہ لگایا ہے کہ وہ تھانے دار اور دوسرے سرکاری افسروں کو ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔" اس نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ "ویسے زمیں دارنی آگے تیری مرضی۔"

جمیلہ نے رحیم داد کو نظرانداز کرتے ہوئے جلیل کو مخاطب کیا۔ "جلیل اگر تجھے وشواس ہے کہ تھانے دار زماں خاں تیری ضرور مدد کرے گا تو بچوں کی واپسی کے لیے اس سے ضرور بات کر۔"

"میں کل ہی دیپال پور چلا جاؤں گا اور تھانے دار سے بچوں کی واپسی کے لیے بات کروں گا۔" جلیل نے اپنے ارادے سے جمیلہ کو آگاہ کیا۔ "ویسے بھی میں نے کل ہی واپس جانا ہے۔ پرسوں انسپکٹر آف سکولز معائنے کے لیے آ رہا ہے۔ ہیڈ ماسٹر نے تاکید سے کہا ہے کہ معائنے پر میں ضرور

حاضر رہوں۔ بعد میں لمبی چھٹی لے کر آ جاؤں گا۔"

رحیم داد نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "تو کل صبح ضرور چلا جا۔ تھانے دار کی منت سماجت کرکے راضی کر لینا۔ اس نے تیرے بارے میں احسان شاہ سے کہا تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ مجھے اتنا تو پتہ ہے احسان شاہ تھانے دار کی بات آسانی سے ٹال نہیں سکتا۔"

نادر خاں بھی آ گیا۔ وہ نہا دھو کر اور اجلے کپڑے پہن کر آیا تھا۔ جمیلہ نے اسے دیکھتے ہی جلیل کی جانب اشارہ کیا۔ "نادر! اسے مہمان خانے میں لے جا۔ یہ وہیں ٹھہرے گا۔" وہ جلیل کی طرف متوجہ ہوئی۔ "اب تو جا۔ بہت تھکا ہوا لگ رہا ہے۔ زینت کچھ دیر بعد تیرے پاس پہنچ جائے گی۔"

جلیل خاموشی سے اٹھا اور نادر خاں کے ہم راہ مہمان خانے کی جانب چلا گیا۔

جمیلہ نے رحیم داد سے کہا۔ "تھانے دار زماں خاں نے جلیل کی مدد کرنے کی حامی بھر لی تو ضرور کام بن جائے گا۔"

"جلیل تو کہتا ہے تھانے دار اس کی ضرور مدد کرے گا۔ ویسے سچی بات یہ ہے زمیں دارنی۔ اب میں احسان شاہ کے پاس جانا اور اس سے ملنا نہیں چاہتا۔ وہ گندہ اور خطرناک بندہ ہے۔"

"بہت خطرناک اور گندہ ہے۔" جمیلہ نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "میرا من تو یہی کہتا ہے' اللہ وسایا کا کتل اسی نے کرایا۔ اس کے سوا اللہ وسایا کا کوئی دشمن تھا ہی نہیں۔"

"میں اسے اتنا ظالم نہیں سمجھتا تھا۔" رحیم داد نے اپنی صفائی پیش کی۔ "مجھے ذرا بھی شبہ ہوتا کہ اللہ وسایا کے کتل میں احسان شاہ کا ہاتھ ہے تو کبھی اس سے نہ ملتا۔ ویسے تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ زمیں دارنی' احسان شاہ نے کبھی میرے سامنے اللہ وسایا کی برائی نہیں کی۔"

"چوہدری' تجھے پتہ نہیں' احسان شاہ اس سے کتنا خار کھاتا تھا۔ اس کی جان کا دشمن تھا۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اپنے کرندوں اور بدمعاشوں کے ذریعے پہلے تو پرانے مزارعوں کو بے دخل کرکے میرے پتا کی بہت سی اراضی پر کبضہ کر لیا۔ میرے اور اللہ وسایا کے خلاف جھوٹے کیس بنوائے۔ وہ تو یہ حویلی اور ساری ہی اراضی ہتیا لینا چاہتا تھا۔"

رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں نوں تو پہلے ان باتوں کا کچھ پتہ ہی نہ تھا۔"

"تو اس کے پاس پہنچ کیسے گیا؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"مجھے تو ماکھا خوشامد کرکے اس کے پاس لے گیا تھا۔" رحیم داد نے اپنی صفائی پیش کی۔ "میں نے اسے بہت ٹالا پر وہ میرے گلے پڑ گیا۔"

”وہ تجھے احسان شاہ کے پاس کیوں لے جانا چاہتا تھا؟“

”ماکھے کی گھر والی‘ سگراں‘ کو اٹھوا کر احسان شاہ نے اپنے کوٹ میں ڈال رکھا تھا۔ ٥ سال سے وہ اس کی کید میں تھی۔ پتہ نہیں کس نے ماکھا کو میرے پیچھے لگا دیا۔ وہ میرے پیر پکڑ کر منت کرنے لگا‘ چوہدری‘ میرا بازو دلا دے۔ میں نے اس کے بارے میں اللہ وسایا سے بھی ذکر کیا تھا پر اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا احسان شاہ اس کی بات ماننے کی بجائے ماکھے کا اور دشمن ہو جائے گا۔ اس پر اور اس کی گھر والی دونوں پر بہت ظلم کرے گا۔ میں نے یہ بات ماکھا کو صاف صاف بتا دی تھی۔“

”تب تو اس نے تیرا پیچھا چھوڑ دیا ہو گا؟“

”نہیں جی‘ وہ فیر بھی لگا رہا۔ میں اسے ڈانٹتا‘ پر وہ اتنا ڈھیٹ نکلا کہ چھپتا چھپاتا میرے پاس پہنچ ہی جاتا۔ میں ہر بار انکار ہی کرتا رہا۔ جب تو کیمبل پور‘ اللہ وسایا اور بچوں کے ساتھ شرفاں کے ویاہ میں شریک ہونے گئی تھی‘ انھی دنوں ایک شام میں گھوڑی پر بیٹھ کر نہر کی طرف نکل گیا۔ نہ جانے کدھر سے ماکھا آ گیا۔ اس نے میرے پیروں پر پگڑی ڈال کر منت کی کہ میں احسان شاہ سے مل لوں اور اس کے بازو کو دلانے کی سفارش کروں۔ اسی وکھت احسان شاہ بھی اپنی گھوڑی پر آ گیا۔ ماکھا تو اسے دیکھتے ہی درختوں کے پیچھے چھپ گیا۔ پر ماکھا کی خاطر مجھے احسان شاہ سے ملنا پڑا۔ وہ مجھے اپنی حویلی لے گیا۔ “رحیم داد نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ ”زمیں دارنی‘ اس طرح میں احسان شاہ سے ملا۔“

”تیرے کہنے پر احسان شاہ نے ماکھے کی گھر والی واپس کر دی تھی؟“

”ہاں جی۔ اس نے میرے کہنے پر دوسرے ہی روز ماکھے کی گھر والی کو اس کے بچوں کے ساتھ واپس کر دیا تھا۔“

”تب تو مجھے وشواس ہے‘ تیرے کہنے پر وہ زینت کے بچوں کو بھی سلاموسے واپس دلا دے گا۔“

”تو کہتی ہے تو احسان شاہ کے پاس چلا جاؤں گا۔ اس سے زینت کے بچوں کی واپسی کے لیے بات کر لوں گا۔ آگے اس کی مرضی۔“ رحیم داد نے اس دفعہ جمیلہ کی بات مسترد نہ کی مگر ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا۔ ”پہلے جلیل کو تھانے دار زماں خاں کے ذریعے کوشش کر لینے دے۔ اگر اس طرح کام نہ بنا تو میں احسان شاہ کے پاس چلا جاؤں گا۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”زمیں دارنی تیری بات ٹالی بھی تو نہیں جا سکتی۔“

جمیلہ نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔ ”یہ ٹھیک رہے گا۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”مجھے

اب جانا ہے۔ زینت کو لے کر جلیل کے پاس جاؤں گی۔“

رحیم داد چپ رہا۔ جمیلہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے نکل کر دالان میں چلی گئی۔

☆

شام گہری ہو چکی تھی۔ دھندلکا ہر طرف پھیل چکا تھا۔ رحیم داد نے کھانا کھایا۔ دیر تک کرسی پر چپ بیٹھا رہا۔ نہ جمیلہ آئی اور نہ ہی نادر خاں۔ پہر رات گزری تو رحیم داد نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا۔ لیمپ کی لو دھیمی کی اور بستر پر لیٹ گیا۔

صبح دیپال پور جانے سے قبل جلیل اس کے کمرے میں پہنچا۔ کچھ دیر رحیم داد کے پاس بیٹھا رہا۔ جمیلہ بھی پہنچ گئی۔ زینت اس کے ہم راہ تھی۔ جلیل سب سے رخصت ہوا۔ تانگے میں سوار ہوا اور دیپال پور کی جانب روانہ ہو گیا۔

جلیل کو گئے ہوئے نو روز ہو گئے۔ دسویں روز وہ واپس آ گیا۔ بچوں کو اپنے ساتھ لایا۔ رحیم داد اس وقت کھیتوں پر گیا تھا۔ بوائی کے بعد وہ ربیع کی فصل کی دیکھ بھال سرگرمی اور لگن سے کر رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا جب اسے جلیل کے پہنچنے کی اطلاع ملی۔ وہ بے چین ہو کر حویلی کی طرف واپس ہوا۔ مہمان خانے میں پہنچا۔ زینت اپنے بچوں کے ساتھ جمیلہ کے پاس بالائی منزل پر جا چکی تھی۔ جلیل مہمان خانے کے صحن میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ بیٹھنے کے لیے بڑی انکساری اور احترام سے کرسی پیش کی۔ رحیم داد مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔

اس نے پوچھا۔ ”سنا ہے تو بچوں کو لے آیا ہے؟“

”ہاں جی‘ لے ہی آیا۔“ جلیل نے بتایا۔ ”زینت بچوں کو لے کر اوپر زمیں دارنی کے پاس گئی ہے۔“

”پر تو نے بہت دیر لگا دی۔ کہاں رہا اب تک؟“

”وہ ایسا ہوا جی‘ میں یہاں سے جاتے ہی تھانے دار زماں خاں سے ملا۔“ جلیل نے اپنی روداد سنائی۔ ”وہ حسب معمول مہربانی سے ملا۔ میں نے اسے زینت اور بچوں کے بارے میں بتایا۔ زینت کی واپسی کی اطلاع پر بہت خوش ہوا۔“ اس نے نظریں جھکا لیں۔ لہجہ دھیما پڑ گیا۔ ”زینت کے بارے میں اسے پتہ تھا اور یہ بھی جانتا تھا مجھے اس کے ساتھ اتنا پیار ہے کہ میں نے ویاہ کرنے کا ارادہ ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا میں فوراً زینت کو دیپال پور اپنے گھر میں لے آؤں۔ لیکن میں نے زور دیا‘ بچوں کی واپسی کے بعد اسے لانا مناسب رہے گا۔“

رحیم داد طویل تفصیل سے جلد ہی اکتا گیا۔ "یہ بتا بچے کیسے ملے؟"

"تھانے دار نے اپنے ایک پرچے کے ساتھ مجھے احسان شاہ کے پاس بھیجا۔ میں پیراں والہ گیا۔ احسان شاہ سے ملا۔ تھانے دار کا پرچہ دیا۔ پہلے تو وہ زینت کا نام سنتے ہی ایک دم مجھ پر گرم ہوگیا۔ زینت کو گندی گندی گالاں نکالنے لگا۔ دھمکی دی کہ اسے دوبارہ اٹھوا لوں گا۔ پر جب اس نے زماں خاں کا پرچہ پورا پڑھ لیا تو ذرا نرم پڑ گیا۔ اس نے سلامو کو بلوایا جس کے پاس بچے تھے۔ مگر وہ آیا نہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا سلامو' مزارع ہو کر احسان شاہ کے بلانے پر نہ آئے۔" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"سلامو اب احسان شاہ کا مزارع نہیں رہا۔ اسے احسان شاہ نے بے دخل کر دیا ہے۔ پر ابھی رہتا پیراں والہ ہی میں ہے۔ احسان شاہ کا کرندہ پیغام لے کر سلامو کے پاس پہنچا۔ اس نے آنے کا بہانہ کیا اور بچوں کو لے کر چک ۱۷۲ میں اپنے چچیرے کے پاس چلا گیا۔"

"تب تو بہت مشکل پڑی ہوگی؟"

"ہاں جی' بہت مشکل پڑی۔ احسان شاہ کا مینجر کوشش کرتا رہا۔ پر نہ سلامو آیا اور نہ ہی اس نے بچے بھیجے۔ میں ٹھیرا رہا۔ سوچا اب آیا ہوں تو بچوں کو لے کر ہی جاؤں گا۔ اسی میں دیر ہوگئی۔ پانچ روز پیراں والہ میں ٹھیرا رہا مگر کام نہ بنا۔ احسان شاہ لہور جا چکا تھا۔" جلیل نے بجھی بجھی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "جب کام نہ بنا اور بچوں کے ملنے کی کوئی امید نظر نہ آئی تو میں واپس دیپال پور چلا گیا۔"

"تھانے دار سے ملا تھا؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"سیدھا اس کے پاس پہنچا۔ اسے سب حال بتایا۔"

جلیل نے اپنی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ کمرے سے ایک شخص نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی رحیم داد کا چہرہ فق ہوگیا۔ وہ احسان شاہ کا کرندہ' دینا تھا جس کے ذریعے رحیم داد نے احسان شاہ سے ساز باز کر کے اللہ وسایا کو دارا کے ہاتھوں قتل کرایا تھا۔ دینا اس سے احسان شاہ کی حویلی میں مل بھی چکا تھا۔

دینا کمرے سے نکل کر دونوں کی جانب بڑھا۔ جلیل نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ "یہ دینا ہے چوہدری' سچی بات یہ ہے جی' اسی کی کوششوں سے بچے ملے ہیں۔ یہی ان کو لے کر آیا بھی۔ تھانے دار نے بچوں کو سلامو کے قبضے سے نکالنے کے لیے اسی کو لگایا تھا۔"

دینا نے بھی فوراً رحیم داد کو پہچان لیا۔ مسکرا کر بولا۔ "جلیل! میں چوہدری کو پہلے سے جانتا ہوں۔" رحیم داد اور پریشان ہوگیا۔ دینا براہ راست رحیم داد سے مخاطب ہوا۔ "چوہدری! تو ٹھیک ٹھاک تو رہا۔ بہت دنوں بعد میں نے آج تجھے دیکھا ہے۔"

رحیم داد نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ پوچھا۔ "شاہ جی کا کیا حال احوال ہے؟"

"ٹھیک ہی ہے جی۔" دینا نے بے نیازی سے کہا۔ "ویسے جی میں نے اس کی نوکری بہت دن ہوئے چھوڑ دی۔"

"اب کہاں ہے۔ کیا کر رہا ہے؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"آج کل دیپال پور میں ہوں جی۔ مویشی چوری کے ایک کیس میں پھنس گیا تھا۔" دینا نے بتایا۔ "اپنے تھانے دار زماں خاں نے بچا لیا۔ تب سے جی ان ہی کے ساتھ لگا ہوں۔ مخبری مکبری کرتا ہوں۔ اکیلا ہوں۔ اسی میں گزارہ ہو جاتا ہے۔ دو تین ڈکیتیوں اور چوریوں کا کھوج لگایا۔ سمگلروں کے ایک وڈے گروہ کو بھی پکڑوایا۔ اس پر انعام بھی ملا۔" وہ بے تکلفی سے کھل کر مسکرایا۔ "بس جی ایسے ہی کام چل رہا ہے۔"

"پر تو نے زینت کے بچوں کو واپس دلا کر بہت زبردست کام کیا۔" رحیم داد نے اسے خوش کرنے کے لیے اچھے الفاظ سے یاد کیا۔ "دینے! ویسے تو ہے بھی بہت حوصلے والا۔ بہت کام کا بندہ ہے۔ تو نہ ہوتا تو میں کہتا ہوں' جلیل کو بچے ہرگز سلامو سے واپس نہ ملتے۔" رحیم داد نے مڑ کر جلیل کو دیکھا۔ "یہی گل ہے نا جی؟"

"ہاں جی' دینا نہ ہوتا تو بچے نہ آتے۔ پتہ نہیں کتنی دشواری پڑتی۔" جلیل نے رحیم داد کی تائید کی۔

"زینت نے تو بچوں کے لیے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا۔ روٹی تو اس سے کھائی نہیں جاتی تھی۔" رحیم داد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس دس کے تین نوٹ نکالے۔ دینا کی طرف بڑھائے' ہنس کر بولا۔ "لے رکھ لے۔ یہ میری طرف سے تیرا انعام ہے۔ ویسے تو نے ایسا کام کیا ہے کہ زینت کو تو دوسری زندگی مل گئی۔" رحیم داد نے گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ "دینے تو نے رات یہیں ٹھیرنا ہے؟"

"نہیں جی' میں نوں واپس دیپال پور جانا ہے۔"

رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا کہ دینا جلد سے جلد چلا جائے۔ اس نے جلیل سے کہا۔ "اسے اب جانے دے ورنہ یہ رات گئے دیپال پور پہنچے گا۔ سردی بھی زوروں پر ہے۔ رستے میں اسے بہت

تنگ کرے گی۔"

جلیل تو خاموش رہا، مگر دینا چپ نہ رہا۔ اس نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔ "مجھے تو جی اب روانہ ہو جانا چاہیے۔ دیر ہو گئی تو بہت مشکل پڑے گی۔ میرے پاس تو صرف ایک کھیس ہے۔ کمبل یا دھسا بھی نہیں لایا۔ ادھر سردی بھی بڑھ گئی ہے۔"

دینا نے مزید بات چیت نہ کی۔ کمرے میں جا کر کھیس اوڑھی۔ لمبی ڈانگ ہاتھ میں دبائی۔ جلیل کے پاس آیا، بولا۔ "ماسٹر جی! میں تو اب چلا۔ دیپال پور میں ملوں گا۔ تسیں تو بعد میں آؤ گے۔ تھانے دار سے بتا دوں گا۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ جلیل اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دینا کے ساتھ ساتھ مہمان خانے کے بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ عین اس وقت جمیلہ مہمان خانے میں داخل ہوئی۔ جلیل نے اسے دیکھا تو ٹھہر گیا۔ دینا بھی رک گیا۔ جمیلہ قریب پہنچ گئی۔ جلیل نے اسے سلام کیا۔

جمیلہ نے ہاتھ اٹھا کر دینا کی طرف اشارہ کیا۔ "دینا یہی ہے جو بچوں کو سلامو کی کید سے نکال کر لایا ہے؟"

جلیل کے بولنے سے پہلے ہی دینا بول پڑا۔ "یہ تو جی ایسا مشکل کام نہ تھا۔ ماسٹر جی جانتے ہیں، میں نے کیسے کیسے مشکل کام کیے ہیں۔"

رحیم داد کی پریشانی جمیلہ کو دیکھتے ہی سوا ہو گئی۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ "زمیں دارنی! اب دینے کو جانے دے۔ کڑاکے کی سردی ہے اور اسے دور جانا ہے۔" وہ چاہتا تھا کہ دینا کو جمیلہ سے مزید گفتگو کرنے کا موقع نہ ملے اور وہ جلد سے جلد چلا جائے۔

جمیلہ نے رحیم داد کو نظر انداز کرتے ہوئے نرم لہجے میں دینا سے کہا۔ "دینے، تو بہت نیک بندہ ہے۔ زینت کے بچے واپس دلا کر تو نے ایسا بھلا کام کیا ہے، نہ صرف زینت اور جلیل بلکہ میرے من سے بھی تیرے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے سو سو کے دو نوٹ نکالے اور دینا کو دے دیئے۔ "یہ تیرا انعام ہے۔ ویسے تیری اتنی وڈی نیکی کا یہ کچھ بھی انعام نہیں۔"

رحیم داد کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

دینا نے دو سو روپے لے کر دھوتی کے ڈب میں اڑس لیے۔ روپے پا کر اتنا خوش ہوا کہ بول بھی نہ سکا۔ دانت نکال کر ہنسنے کی کوشش کرنے لگا۔ رحیم داد نے موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ دینا سے کہا۔ "اب تو ٹر جا۔ دیر کرنا تیرے لیے ٹھیک نہیں۔ سردی آج بہت زیادہ ہے۔"

مگر جمیلہ نے دینا کو جانے نہ دیا، بولی۔ "جلدی کیا ہے۔ رات کی روٹی کھا کر جائے گا۔"

رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "زمیں دارنی تو نے بھی حد کر دی۔ اسے روٹی کھلانے کے لیے سردی میں تنگ کرنا چاہتی ہے۔ رات کو یہ کیسے دیپال پور جا سکے گا؟"

"آج ہی اس کا جانا کوئی ضروری ہے؟" جمیلہ کا لہجہ بھی تیکھا تھا۔ "رات کو حویلی میں ٹھیر جائے گا۔ کل دن چڑھے چلا جائے گا۔"

رحیم داد دم بخود ہو کر رہ گیا۔ مگر دینا رکنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ "زمیں دارنی! مجھے تو اب جانے ہی دے۔ چک بیدی سے دیپال پور کے لیے لاری پکڑ لوں گا۔ میں ادھر ٹھیر نہیں سکتا۔ تھانے دار سے مجھے جھیتی ملنا ہے۔ پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ اب اور دیری نہ کرا۔" اس نے عاجزی کا مظاہرہ کیا۔ "مجھے نہ روک۔ اب جانے ہی دے۔ تیری بہت بہت مہربانی۔"

جمیلہ نے مزید اصرار نہ کیا۔ دینا آگے بڑھا۔ جلیل اس کے ہم راہ چلا۔ دونوں مہمان خانے سے باہر چلے گئے۔

دینا کے جانے کے بعد رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کی گھبراہٹ اور پریشانی رفع ہو گئی۔ جب تک دینا موجود رہا، خطرہ اس کے سر پر منڈلاتا رہا۔ مگر جمیلہ اس کے احساسات سے بے نیاز قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔

جلیل واپس آ گیا اور دونوں کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ دھوپ کی رنگت بدلنے لگی تھی۔ دن ڈھل رہا تھا۔

جمیلہ بچوں کے واپس آنے پر بہت مسرور تھی، جلیل سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اسے اپنے سکول کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ لمبی چھٹی لے کر کوٹلہ ہرکشن آ جائے اور اسکول کا انتظام درست کرنے میں اس کی مدد کرے تاکہ وہ نہ صرف منظور شدہ اسکول بن جائے بلکہ بعد میں ڈسٹرکٹ بورڈ اسے اپنی تحویل میں لے کر باقاعدہ سرکاری پرائمری اسکول بنا دے۔ جمیلہ یہ بھی چاہتی تھی کہ زینت اور جلیل اپنے بچوں کے ساتھ اس کے پاس ہی رہیں۔ لیکن یہ صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ اسکول سرکاری بن جائے اور جلیل دیپال پور سے تبادلہ کرانے کے بعد کوٹلہ ہرکشن آ جائے۔

جلیل ہر طرح جمیلہ کی مدد کرنے کو تیار تھا۔ وہ اس کی دردمندی اور ہنس مکھ طبیعت سے بہت متاثر تھا۔ اس کا احسان مند بھی تھا۔ اس کے وسیلے سے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیوی بچے مل گئے تھے۔ ویسے بھی زینت اور جلیل کے ساتھ جمیلہ کا رویہ بڑا مشفقانہ تھا۔ جلیل دیر تک جمیلہ سے باتیں کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

جلیل اور زینت اپنے بچوں کے ساتھ مہمان خانے میں ٹھیرے رہے۔ جلیل روزانہ جمیلہ کے ہم راہ اسکول جاتا۔ تمام وقت وہیں رہتا اور جمیلہ کے ساتھ ہی واپس آتا۔ رحیم داد ہر صبح جلیل اور جمیلہ کو جاتے ہوئے دیکھتا۔ وہ اس کے کمرے کے سامنے سے گزرتے تھے۔ لیکن پورا ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ زینت اور بچوں کے ساتھ دیپال پور چلا گیا۔ حالانکہ جلیل دو ہفتے کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ اس نے رحیم داد کو یہی بتایا تھا۔ رحیم داد کو اس کے اچانک چلے جانے پر حیرت ہوئی اور اس سے بھی زیادہ حیرت اور تکلیف ان کے اس رویے پر ہوئی کہ وہ اس سے مل کر بھی نہ گئے۔

سہ پہر کو جمیلہ اسکول سے واپس لوٹی تو رحیم داد نے روک کر اس سے اپنی بے چینی اور حیرت کا اظہار کیا۔ ”زمیں دارنی! میں نے سنا ہے جلیل اور زینت دیپال پور چلے گئے۔ جلیل تو لمبی چھٹی پر آیا تھا۔ میں تو ان سے مل بھی نہ سکا۔ جب وہ گئے تو میں کھیتوں کی طرف تھا۔ وہ اس طرح اچانک کیسے چلے گئے؟“

”وہ ایسا ہے چوہدری۔“ جمیلہ نے وضاحت کی۔ ”تاجاں کا ویاہ تو نادر خاں کے گھر ہی سے ہونا ہے نا۔ تاجاں اسی کے گھر میں مائیاں بیٹھے گی۔ نادر خاں بیوی بچوں کے ساتھ تب تک مہمان خانے میں ٹھیرے گا۔ اور کہاں جائے گا؟“

”سکول کا کیا بنے گا؟“ رحیم داد نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔ ”تو مائیاں میں لگ جائے گی۔“

”سکول بھی بند رہے گا۔ جنج بھی تو سکول ہی میں اترے گی۔ اور وہیں ٹھیرے گی۔“ جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ ”یہی طے ہوا ہے۔ ایسی صورت میں جلیل یہاں کیسے ٹھیر سکتا تھا۔“

رحیم داد سے جمیلہ نے مزید بات چیت نہ کی۔ وہ اسکول سے تھکی ہوئی آئی تھی۔ جلد سے جلد اپنے کمرے میں پہنچ کر آرام کرنا چاہتی تھی۔

☆

رحیم داد دوپہر کا کھانا کھا کر کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ نادر خاں اس کے ہم راہ تھا۔ اسکول سامنے ہی تھا۔ رحیم داد کی نظر اسکول کی طرف گئی۔ اس نے ایک شخص کو اسکول سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ سردی سے بچنے کے لیے چادر اس طرح سر اور کانوں کے گرد لپیٹے ہوئے تھا کہ چہرہ دور سے نظر نہ آتا تھا۔ رحیم داد کو شبہ ہوا کہ وہ دینا ہے۔ فوراً اس کا ماتھا ٹھنکا۔ طرح طرح کے وسوسوں نے اس کے ذہن میں کھلبلی پیدا کی۔ وہ حیران و پریشان ہو کر سوچنے لگا کہ دینا خلاف توقع جمیلہ سے ملنے اسکول میں کیوں آیا ہے؟

رحیم داد نے دیکھا، دینا اسکول سے نکل کر درختوں کے نیچے چلا گیا۔ وہ نہر کی طرف جا رہا تھا۔

رحیم داد نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نادر سے کہا۔ ”نادر! مجھے یہ دینا لگتا ہے۔“

”وہی ہوگا جی۔ میں نے اسے ٹھیک سے دیکھا نہیں۔“ نادر خاں بے نیازی سے بولا۔

اب دینا کی پشت نظر آرہی تھی۔ رحیم داد کو تشویش لاحق ہوئی۔ اس نے نادر سے کہا۔ ”نادر خاں، تو جا کر پتہ کر یہ دینا ہی ہے نا؟ ہوسکے تو یہ بھی معلوم کرنا، وہ زمیں دارنی کے پاس کیسے آیا تھا۔“ رحیم داد نے کھیتوں کی طرف جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ”میں واپس اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ نادر تو وہیں آجا۔ میں تیرا انتظار کروں گا۔“

رحیم داد حویلی کی جانب واپس ہوا۔ نادر قدم بڑھاتا ہوا اس طرف چلا جدھر دینا گیا تھا۔

رحیم داد کمرے میں پہنچا اور بے چینی سے نادر خاں کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ گھنٹہ، سوا گھنٹہ بعد نادر خاں لوٹا۔ وہ تھکا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تیز رفتار سے چل کر آیا ہے۔

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ جب نادر خاں کو ذرا قرار آیا تو رحیم داد نے پوچھا۔ ”وہ دینا ہی تھا نا؟“ اس کے لہجے سے بے قراری صاف عیاں تھی۔

”ہاں جی، دینا ہی تھا۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”میں نے اسے بہت آگے جا کے پکڑا۔“

”تو نے اس سے بات چیت کی تھی؟“

”بالکل کی تھی۔“

”تو نے پوچھا، وہ ادھر کس لیے آیا تھا؟“

”کہتا تھا زمیں دارنی نے بلایا تھا۔“ نادر خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”جلیل نے دیپال پور جا کر اسے زمیں دارنی کے پاس بھیجا تھا۔“

”تو نے دینے سے پوچھا کہ زمیں دارنی نے اسے کس لیے بلایا تھا؟“ رحیم داد نے کرید کر دریافت کیا۔

”کہتا تھا زمیں دارنی نے ایک ضروری کام کے لیے اسے بلایا تھا۔“

”اس سے تو نے پوچھا نہیں کہ وہ ضروری کام کیا تھا؟“

”میں نے اس سے پوچھا بھی۔ گھما پھرا کر بات کی پر اس نے کچھ نہ بتایا۔ میں نے تو اس کی باتوں سے یہ اندازہ لگایا کہ وہ خود ہی زمیں دارنی کے پاس آیا تھا۔ زمیں دارنی نے اسے بلایا نہیں تھا۔“

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ ”پر یہ سمجھ نہیں آئی، اگر وہ جمیلہ کے پاس آیا تھا تو کیوں آیا تھا؟“

"میں تو سمجھتا ہوں جی، وہ زمیں دارنی سے سلامو کے نام پر کچھ اینٹھنے کے لیے آیا ہوگا۔ اور تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔" نادر خاں نے رحیم داد کو بے چین اور پریشان پایا تو زور دے کر پوچھا۔ "پر اس کے زمیں دارنی کے پاس آنے سے تو کیوں پریشان ہے؟"

"پریشانی کی گل ہی ہے۔ دینا بہت عرصہ تک احسان شاہ کے پاس ملازم رہ چکا ہے۔ میں نہیں چاہتا وہ میرے اور شاہ جی کے میل ملاپ کے بارے میں جمیلہ کو بتائے۔ اس نے مجھے احسان شاہ کی حویلی میں کتنی ہی بار دیکھا ہے۔"

"پر دینا کے بتانے سے بھی کیا ہوگا۔" نادر خاں نے دینا کی آمد کو خاص اہمیت نہ دی۔ "اب تو زمیں دارنی کو پتہ چل ہی چکا ہے، تسیں شاہ جی کے پاس جاتے رہے ہو۔ زمیں دارنی کے سامنے اسے مان بھی چکے ہو۔ اب دینا یا کسی اور کے زمیں دارنی سے ملنے سے کیا فرک پڑتا ہے۔"

رحیم داد اپنی پریشانی کی اصل وجہ نادر خاں کو بتانا نہ چاہتا تھا۔ اس نے اللہ وسایا کے قتل کے سلسلے میں نادر خاں کو اعتماد میں نہ لیا تھا اور نہ ہی اس سلسلے میں کبھی تفصیل سے بات ہی کی تھی۔ رحیم داد نے پردہ پوشی کے لیے بات بنائی "نادر! تیں نوں پتہ ہے ادھر شاہ جی کی حویلی میں پینا پلانا بھی ہوتا تھا۔ میں چاہتا ہوں جمیلہ کو اس کا پتہ نہ چلے۔ وہ شراب بلکہ کسی بھی نشہ بازی کو برا سمجھتی ہے۔"

"چوہدری، میں تو سمجھتا ہوں دینا نے زمیں دارنی سے تیرے بارے میں کوئی ایسی گل بات نہیں کی ہوگی۔" نادر خاں نے رحیم داد کی تشویش رفع کرنے کی کوشش کی۔ "اسے تجھ سے کوئی گلہ شکوہ بھی نہیں۔ وہ خاما خا زمیں دارنی سے کیوں تیری برائی کرنے لگا؟ وہ تو اپنے ہی کسی کام سے آیا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے جلیل اور اس کے بال بچوں کے بارے میں بتانے آیا ہو۔ جلیل کو چھٹی نہ ملی ہوگی۔ اس نے دینا کو زمیں دارنی کے پاس بھیج دیا ہوگا۔"

نادر نے اپنے طور پر رحیم داد کو ہر طرح مطمئن کرنے اور اس کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر رحیم داد کے ذہن میں وسوسے اور خدشات منڈلاتے رہے۔ نادر خاں اجازت لے کر کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

رحیم داد کمرے میں خاموش بیٹھا رہا۔

سہ پہر ہوگئی۔ جمیلہ اسکول سے واپس ہوئی۔ رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزری تو مسکرا کر بولی۔ "چوہدری، کمرے میں خالی پڑے پڑے تیرا من نہیں گھبراتا۔" مگر وہ رکی نہیں آگے بڑھ گئی۔

اس کے خوشگوار رویّے سے رحیم داد کی پریشانی بڑی حد تک زائل ہوگئی۔ اس نے ذہنی سکون محسوس کیا۔

☆

اس روز اتوار تھا۔ جمیلہ حویلی ہی میں تھی اور اوپر کی منزل پر اپنے کمرے میں تھی۔ وہ صبح سے نیچے نہیں آئی تھی۔ دوپہر کو محمد عثمان رندھاوا وکیل آیا۔ وہ رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزرا مگر اس سے نہ ملا۔ سیدھا جمیلہ کے پاس اوپر کی منزل پر گیا۔ وہ گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ تک جمیلہ کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ کھانا بھی اس نے جمیلہ کے ساتھ ہی کھایا۔ یہ ساری اطلاعات اسے حویلی کے ملازم نامدار سے ملتی رہیں جو بار بار جمیلہ کے پاس آجا رہا تھا۔

سہ پہر کو وکیل واپس چلا گیا۔ رحیم داد نے نہ اسے ٹوکا اور نہ ہی اس نے رحیم داد کی جانب کوئی توجہ دی۔ وہ سر جھکائے لمبے لمبے قدم اٹھاتا کمرے کے سامنے سے گزر گیا۔ رحیم داد خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ وکیل کو دیکھ کر وہ ایک بار پھر پریشانی میں مبتلا ہوگیا تھا۔ رات ہوگئی مگر جمیلہ نیچے نہ آئی۔

سویرے وکیل پھر آیا۔ رحیم داد نے اسے زینے پر چڑھتے اور سیڑھیاں طے کرکے اوپر جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس وقت کرسی پر صحن میں بیٹھا تھا۔ ہر طرف گہری بسنتی دھوپ پھیلی تھی۔ رحیم داد کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

نصف گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ جمیلہ اور وکیل دو نوکروں کے ہم راہ نیچے آئے۔ نہ جمیلہ نے اور نہ ہی وکیل نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ وہ حویلی کا پھاٹک عبور کرکے باہر گئے۔ تانگوں میں سوار ہوئے اور گاؤں سے باہر چلے گئے۔ رحیم داد کو تشویش لاحق ہوئی۔ وہ دینا کی اچانک آمد ہی سے گھبرا گیا تھا۔ مگر جمیلہ سے بات چیت کرنے کے بعد مطمئن بھی ہوگیا تھا۔ وکیل کی آمد و رفت نے اسے ایک بار پھر طرح طرح کے وسوسوں میں مبتلا کردیا۔

رحیم داد نے اپنی پریشانی اور خدشات کا نادر خاں سے کوئی ذکر نہ کیا۔ وہ جمیلہ کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ شام کو جمیلہ نوکروں کے ساتھ واپس آئی۔ رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزری۔

وہ کمرے سے نکل کر دالان میں آگیا۔ بڑھ کر جمیلہ کے قریب پہنچا۔ مسکرا کر دریافت کیا۔ "زمیں دارنی تو سویرے ہی سویرے وکیل کے ساتھ کہاں گئی تھی۔ کوئی خاص گل بات تھی؟"

"نہیں کوئی خاص گل نہیں۔" جمیلہ نے بے نیازی سے بتایا۔ "میں نے وکیل سے لہور میں

مکان کا بندوبست کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اسی کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔"

"تو کیا تو لہور جا رہی ہے؟" رحیم داد نے پریشانی کا اظہار کیا۔

"ابھی تو نہیں جا رہی۔"

"زمیں دارنی' تو لہور جانے کا خیال دل سے نکال دے۔ تیں نوں تو ابھی اپنے سکول کو منظور شدہ بنوانا ہے۔ اس روز یہی کہتی تھی۔"

"ارادہ تو ایسا ہی ہے۔"

"جب تیرا یہ ارادہ ہے تو لہور کیوں جا رہی ہے؟" رحیم داد نے اس کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا' مشورہ دیا۔ "نادر کو لگا دے' وہ تیرے سکول کو منظور شدہ بنوا دے گا۔ فکر نہ کر۔ وہ یہ کام ضرور کر دے گا۔ تو جانتی نہیں' وہ ایسے معاملوں میں بہت ہوشیار ہے۔"

جمیلہ خاموش رہی۔ مگر رحیم داد خاموش نہ رہا۔ گلہ کرنے کے انداز میں بولا۔ "تجھے لہور ہی جانا تھا تو مجھے یہاں کیوں بلوایا؟" اس نے جمیلہ کے چہرے کی جانب دیکھا جس پر تھکن کے اثرات ہویدا تھے۔ "اس دفعہ پھٹی اور کماد کی فصل بہت چنگی گئی ہے۔ اس کی آمدنی سے شاندار سکول بنا' ڈسپنسری بنا۔ تجھے روکنے والا کون ہے؟ سب ہی کچھ تیرا ہے۔ میں نے کیا لینا۔" اس نے لہجے میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "تو لہور جانے کا خیال بالکل دل سے نکال دے۔"

"پر میں لہور جا کب رہی ہوں۔" جمیلہ مسکرا کر بولی۔ "وکیل تو یہ بتانے آیا تھا کہ لہور میں اس نے میرے لیے جس مکان کا بندوبست کیا تھا' اس کا معاہدہ ختم کر دیا ہے۔ کل وہ اس سلسلے میں مجھے پوچھنے آیا تھا کہ آگے کے لیے میرا کیا ارادہ ہے؟ جب میں نے اسے بتایا لہور جانے کا وچار چھوڑ دیا ہے تو آج وہ معاہدہ ختم ہونے کی بات بتانے آیا تھا۔"

"تو اس کے ساتھ کہاں گئی تھی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"وہ واپس جا رہا تھا۔ میں نے بھی شہر میں تاجاں کے ویاہ کے لیے خریداری کرنی تھی۔ سو میں اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔" وہ بے تکلفی سے مسکرائی۔ "تو کیا سمجھا؟"

رحیم داد کچھ نہ کہہ سکا۔ جمیلہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "تجھ سے کل بات ہوگی۔ اس سمے تو میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔" وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی زینے کی جانب بڑھی۔

رحیم داد ایک بار پھر پریشانی میں مبتلا ہوگیا اور جمیلہ سے گفتگو کرنے کے بعد مطمئن بھی ہوگیا۔ اس کے ذہن میں جو وسوسے اور شبہات کل سہ پہر سے بار بار ابھر رہے تھے' رفع ہو چکے تھے۔ رحیم داد اپنے کمرے میں گیا۔ رات کا کھانا کھایا اور سکون سے گہری نیند سو گیا۔

دن چڑھے نادر خاں اس کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فہرست تھی جو اسے جمیلہ نے دی تھی۔ اس میں تاجاں کے جہیز اور شادی بیاہ کے سازو سامان کی ضروری اشیاء درج تھیں۔ وہ فہرست کے مطابق خریداری کرنے لاہور جا رہا تھا۔ مگر لاہور جانے سے پہلے وہ رحیم داد کے ساتھ کپاس کی فروخت کے بارے میں بھی بات کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے رحیم داد کو ضروری اطلاعات فراہم کیں۔

وہ اٹھا اور لاہور کے سفر کے لیے روانہ ہوگیا۔

شام ہوئی۔ اندھیرا بڑھا۔ رات ہوگئی' مگر نہ جمیلہ آئی اور نہ رحیم داد اس کے پاس گیا۔ دوسرے روز شام کا اندھیرا بڑھتے ہی اس نے جمیلہ سے ملنے کا ارادہ کیا۔ نادر خاں ابھی تک واپس نہیں آیا تھا اور اس کا فوری طور پر لوٹنے کا امکان بھی نہ تھا۔ اسے خریداری کے لیے وقت درکار تھا۔ لاہور میں اس کا بھتیجا موجود تھا۔ لہٰذا ٹھہرنے کا بھی مسئلہ نہ تھا۔

رحیم داد اس وقت جمیلہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اسکول کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے ساتھ وہ کمرے سے نکل کر دالان میں آیا۔ حویلی میں ابھی تک کسی قدر چہل پہل تھی۔ وہ اوپر کی منزل پر جانے والے زینے کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا تو سیڑھیوں پر جنت مل گئی۔ وہ اوپر سے اتر کر نیچے آ رہی تھی۔

رحیم داد نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "کہاں چلی جنت؟"

"گھر جا رہی ہوں جی۔" وہ سر کو دوپٹے سے ڈھکتے ہوئے بولی۔ "چھوہریاں گھر میں اکیلی ڈرتی ہیں۔"

"نادر خاں' کب تک واپس آ رہا ہے؟"

"ٹھیک سے جی پتہ نہیں۔ آج تو آتا ہوا نہیں لگتا۔"

"پوری خریداری کر کے ہی لوٹے گا۔" رحیم داد نے جنت کو نظر بھر کر دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ اس نے جنت سے پوچھا۔ "تو رات کو جلدی تو نہیں سوتی؟"

"نہیں جی' میں تو دیر ہی سے سوتی ہوں۔"

"پر اس رات تو جلد ہی سو گئی تھی۔" رحیم داد نے اسے چھیڑا۔ "تو نے جو گرم گرم دودھ پلایا تھا۔ بہت مزا دیا تھا اس نے۔"

"تجھے پسند آیا؟" وہ خوش ہو کر بولی۔ "ابھی چل کر پی لے۔ گرم ہوگا۔"

"ابھی تو میں زمیں دارنی کے پاس جا رہا ہوں۔ اس کے ساتھ کچھ ضروری گل بات کرنی ہے۔

بعد میں....“ رحیم داد اپنی بات پوری نہ کرسکا۔ اسی وقت کمرے کے دھندلکے میں سیڑھیوں پر آہٹ ابھری۔ کوئی اوپر سے نیچے آرہا تھا۔ آہٹ سنتے ہی جنت مہمان خانے میں کھلنے والے دروازے کی جانب بڑھی اور دروازے سے گزر کر چلی گئی۔

رحیم داد اوپر جانے کے بجائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس اپنے کمرے میں پہنچا۔ اس نے جمیلہ کے پاس جانے کا ارادہ ترک کردیا۔ وہ رات کے تاریک اور سنسان ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

☆

حویلی پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ رحیم داد باہر نکلا۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند کیا۔ دالان میں آیا۔ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ سردی زیادہ تھی۔ نوکر چاکر اپنی اپنی کوٹھریوں کے اندر جا چکے تھے۔ صحن میں کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی آہٹ تھی' نہ آواز۔

رحیم داد مہمان خانے میں پہنچا۔ احمد حسب معمول غائب تھا۔ مہمان خانہ خالی تھا۔ رحیم داد مہمان خانے سے گزر کر نادر خاں کے گھر پر پہنچا۔ اس نے دروازے پر ہولے سے دستک دینے کے لیے ہاتھ رکھا تو وہ کھل گیا۔ کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ رحیم داد اندر داخل ہوگیا۔

اس نے دیکھا' سامنے پلنگ پر جنت لہریا چندری اوڑ [illegible]ے۔ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ ہونٹوں پر سرخی کی دھڑی تھی۔ سر کے بال تیل سے چمک رہے تھے۔ پلنگ کے نیچے انگیٹھی میں انگارے دہک رہے تھے۔ ان کی تیز روشنی میں جنت کے گورے چٹے چہرے پر تازگی اور نکھار نظر آرہا تھا۔ اس کی سج دھج صاف چغلی کھا رہی تھی کہ وہ رحیم داد ہی کا انتظار کررہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ پلنگ سے اتر کر کھڑی ہوگئی۔ اس وقت شلوار کے بجائے لاچا باندھے ہوئے تھی۔ لاچا نارنجی رنگ کا تھا۔ اس کا ریشم بھی نرم تھا۔ اور نچلا کنارہ سنہری کلابتو کا تھا۔

رحیم داد نے مسکرا کر شوخی سے پوچھا۔ ”تو نے تو آج لاچا باندھ رکھا ہے؟“

”تو نے ہی تو مجھے لاچا باندھنے کو کہا تھا۔“ وہ آنکھوں کو ترچھا کرکے بے باکی سے مسکرائی۔ ”میں نے نادر سے کہا مجھے لاچا لا دے۔ میں لاچا باندھوں گی۔ وہ پچھلے دنوں لہور گیا تو یہ لاچا لیتا آیا۔“

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ غور سے لاچا دیکھتے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

جنت اس کے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔ اٹھلا کر بولی۔ ”کیسا لگ رہا ہے لاچا؟“

”لشکارے مار رہی ہے۔ اسے پہن کر تو سچ مچ بہت سوہنی لگ رہی ہے۔“

”اب کہاں رہی سوہنی۔ تو نے مجھے پہلے نہیں دیکھا۔“ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔

”بھڑولی پر تیرے لیے گرم دودھ رکھا ہے۔ لے آؤں؟“

”دودھ بعد میں پی لوں گا۔ پہلے تو دروازے کی زنجیر چڑھا دے۔“ رحیم داد اٹھا اور پلنگ پر جا کر بیٹھ گیا۔

جنت اپنے کولھوں کو ہولے ہولے خم دیتی دروازے کی جانب بڑھی۔ کنڈی لگائی اور نظریں نیچی کیے شرماتی' لجاتی رحیم داد کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔

رات اپنا سفر طے کرتی رہی۔ نصف گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں پریشان ہوگئے۔ جنت نے جھٹ رحیم داد کا ہاتھ پکڑا اور برابر والے کمرے میں لے گئی۔ اس نے الگنی پر چادر ڈال دی اور رحیم داد کو اس کے پیچھے چھپا دیا۔

جنت نے رنگین چنری اتار کر سوتی کھیس اوڑھی جلدی جلدی لاچا اتار کر ایک طرف ڈالا۔ شلوار پہنی۔ باہر نادر کی آواز ابھری۔ ”جنت دروازہ کھول۔ میرے ساتھ زمیں دارنی بھی ہے۔“

رحیم داد نے یہ سنا تو سخت سراسیمہ ہوا۔ اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ سہما ہوا پردے کی آڑ میں دبکا ہوا کھڑا رہا۔ جنت لالٹین سنبھالے ہوئے باہر چلی گئی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ رحیم داد اندھیرے میں لمبی لمبی سانس بھرنے لگا اور اپنی گھبراہٹ اور پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

جنت برابر والے کمرے میں پہنچی۔ آگے بڑھی' دروازہ کھولا۔ دیکھا' نادر سامنے کھڑا ہے۔ جمیلہ اس کے ہم راہ تھی۔ دونوں کے عقب میں تاراں تھی۔ نادر نے جنت کو مخاطب کیا۔ ”جنت اتنی گہری نیند نہ سویا کر۔ جا زمیں دارنی کے لیے فٹافٹ گرم دودھ لے کر آ۔“ اس نے مڑ کر جمیلہ کی طرف دیکھا' مونڈھا اٹھایا اور اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ ”زمیں دارنی اسی پر بیٹھ جا۔ اپنے پاس کرسی تو ہے نہیں۔“

جمیلہ سنجیدگی سے بولی۔ ”میں نے بیٹھنا نہیں ہے۔ میں تو یہ دیکھنے آئی ہوں کہ ویاہ کے لیے تیرا گھر ٹھیک رہے گا ناں؟“ اس نے ملحقہ کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”تاجاں اس میں مائیاں بیٹھ سکتی ہے۔“

”بالکل بیٹھ سکتی ہے جی۔“ جنت نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

جمیلہ نے نادر سے کہا۔ ”نادر' لالٹین اٹھا' میں ساتھ والا کمرہ دیکھوں گی۔“

جنت نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ ”کیا کرے گی اسے دیکھ کر۔ زمیں دارنی! وہ کمرہ بھی اتنا ہی وڈا ہے۔“

”نہیں میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔“ جمیلہ نے اصرار کیا۔

”دیکھنا ہی ہے تو دن میں آرام سے دیکھ لینا۔“ جنت نے ایک بار پھر جمیلہ کو کمرے میں جانے سے روکنے کی کوشش کی۔ ”کل میں اسے صاف کر دوں گی۔“

مگر جمیلہ نہ مانی۔ اس نے نادر خاں سے کہا۔ ”نادر لالٹین اٹھا۔ اب آئی ہوں تو اس کمرے کو بھی دیکھ کر ہی جاؤں گی۔ کل مجھے اور بھی بہت کام کرنے ہیں۔“

نادر خاں نے لالٹین اٹھالی۔ جنت کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس پر خوف اور پریشانی کا غبار چھا گیا۔ مگر جمیلہ اس کی گھبراہٹ اور سراسیمگی سے بے نیاز، نادر خاں کے ساتھ برابر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ جنت نہ گئی۔ جمیلہ نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا، کمرے میں دو چارپائیوں پر نادر خاں کی تینوں بیٹیاں بے خبر سو رہی ہیں۔ ایک گوشے میں جنت کا نارنجی لاچا بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ قریب ہی لہریا چنری پڑی تھی۔

جمیلہ نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ رحیم داد دم بخود کھڑا تھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے سنا جمیلہ کہہ رہی تھی۔ ”مجھے تو یہ کمرہ برابر کے کمرے سے کچھ وڈا ہی لگتا ہے۔“ وہ الگنی پر پڑی ہوئی چادر کے بالکل برابر پہنچ چکی تھی۔ اتنی قریب کہ رحیم داد اس کے خوبصورت جسم کی مہک سونگھ سکتا تھا۔ مگر اس کا خوف سے برا حال تھا۔ اس نے سانس روک لی اور آنے والے خطرے کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرنے لگا۔

اسے خدشہ تھا کہ الگنی پر پڑا ہوا پردہ ایک طرف کھسک جائے گا اور جمیلہ اس کے سامنے ہوگی۔ اس تصور ہی سے وہ کانپ اٹھا۔ اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔ مگر پردہ بدستور لٹکتا رہا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔

جمیلہ کی آواز ابھری۔ ”نادر! مائیاں بیٹھنے کے لیے یہ کمرہ ٹھیک رہے گا۔ اس کا ایک دروازہ باہر بھی کھلتا ہے ناں؟؟“

”ہاں جی، بالکل کھلتا ہے۔“ نادر خاں نے الگنی پر لٹکی ہوئی چادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”زمیں دارنی اسی کے پیچھے دروازہ ہے۔ پر اس میں تالا پڑا ہے۔ کنجی جنت کے پاس ہوگی۔ اسے دیکھنا چاہتی ہے تو جنت سے چابی لے لے۔“

”نہیں، میں نے اسے نہیں دیکھنا۔“

رحیم داد کی پیشانی پر سخت سردی کے باوجود پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔ اس کی نظریں سامنے لٹکتی ہوئی چادر پر ٹکی تھیں اور کان قدموں کی آہٹ پر لگے تھے۔ جمیلہ نہ آگے بڑھی اور نہ ہی اس نے چادر ہٹائی۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ نادر خان بھی لالٹین اٹھائے اس کے ہم راہ چلا گیا۔

جمیلہ مونڈھے پر بیٹھی نہیں۔ پلنگ کے نیچے رحیم داد کے جوتے پڑے تھے۔ جمیلہ کی ان پر نظر ڑی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری، نادر خاں سے مخاطب ہوئی۔

”نادر! تو نے بھی چوہدری کی طرح کے بوٹ پہن نے شروع کر دیئے؟؟“

نادر خاں نے جوتوں کو دیکھا تو اس کے چہرے پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ مگر اس نے جھٹ اپنی یشانی پر قابو پالیا۔ آہستہ سے بولا۔ ”وہ ایسا ہے زمیں دارنی، لہور سے پچھلے دنوں میرا بھتیجا آیا تھا۔ ہی میرے لیے یہ بوٹ لیتا آیا تھا۔“

جنت دودھ سے بھرا ہوا گلاس لے کر صحن سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے گلاس جمیلہ کی رف بڑھایا۔ ”زمیں دارنی دودھ پی لے۔ گرم گرم ہے۔ کوسا ہے۔“

”میں رات کے سمے دودھ نہیں پیتی۔“ جمیلہ نے صاف انکار کر دیا۔ لالٹین کی روشنی میں اس نے جنت کے چہرے کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ جنت کی نظریں جھک گئیں۔ ”جنت! لگتا ہے۔ تو ونے سے پہلے رات کو سنگھار بھی کرتی ہے۔“

”نہیں بھین جی۔ ایسی کوئی گل نہیں۔“ جنت گھبرا کر بولی۔ ”سنگھار سنگھار کیہہ کرنا۔ بس ذرا ہ ہاتھ دھو لیا تھا۔ میں تو تیرے ہی پاس آنے والی تھی۔“

جمیلہ نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے نادر سے کہا۔ ”نادر، کل تو یہ گھر خالی کر کے مہمان انے میں چلا جانا۔ یہاں کی ٹھیک طرح صفائی بھی کرا دینا۔ ویاہ تو یہیں سے ہو گا ناں۔“ وہ مڑی۔ ب میں چلوں گی۔“ جمیلہ دروازے کی جانب بڑھی۔

دلیز کے پاس تاراں بیٹھی تھی۔ جمیلہ اس کے ہم راہ باہر نکلی اور مہمان خانے سے گزر کر حویلی لہ چلی گئی۔

دونوں کے جانے کے بعد نادر نے دروازہ بند کیا۔ جنت سے کہا۔ ”دودھ واپس لے جا۔“

وہ چپ چاپ صحن میں چلی گئی۔ نادر خاں نے لالٹین اٹھائی۔ برابر کے کمرے میں گیا۔ الگنی پر ٹی ہوئی چادر کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا۔ اس نے ایک ہاتھ بڑھا کر چادر ایک طرف کر دی۔ ٹین کی زرد زرد روشنی میں رحیم داد اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور پر خوف اور دہشت کے سائے پھیلے تھے۔ کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سامنے چپ چاپ کھڑے تھے۔

رحیم داد نے دھڑکتے دل سے نظریں اٹھائیں۔ نادر اس کے روبرو کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر

ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر رحیم داد کا بازو پکڑا۔ آہستہ سے کہا۔

"چوہدری باہر آجا۔ زمیں دارنی چلی گئی۔"

رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر نادر خاں کو دیکھا اور خاموشی سے آگے بڑھا۔ نادر خاں کے ہم راہ ملحقہ کمرے میں گیا۔ جنت ابھی تک کمرے میں واپس نہیں آئی۔

"چوہدری تو نے اپنے جوتے بھی یہیں چھوڑ دیئے تھے۔ زمیں دارنی نے انھیں دیکھ لیا۔ پوچھا بھی۔ پر میں نے جھٹ بات بنادی۔"

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ پلنگ پر جاکر بیٹھا اور سر جھکا کر اپنے جوتے پہن نے لگا۔

"چوہدری! میں نے تجھ سے کچھ ضروری گل کرنی ہے۔"

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اس کی چہرے پر کچھ دیر کے لیے جو سکون نمودار ہوا تھا، غائب ہوگیا۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ جلدی جلدی جوتے پہنے اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے نادر کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

"ابھی گل کرنی ہے؟"

"توں چاہتا ہے تو سویرے کرلوں گا۔" نادر خاں نے اصرار نہ کیا۔ "پر گل ہے بہت ضروری۔"

رحیم داد اس قدر خفیف ہو رہا تھا کہ اس نے مڑ کر نادر خاں کی طرف نہ دیکھا۔ آگے بڑھا، دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔ مہمان خانے میں احمد موجود تھا مگر بے خبر سو رہا تھا۔ رحیم داد مہمان خانے سے گزر کر حویلی میں پہنچا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ گیارہ کا عمل تھا۔ سردی بپھری ہوئی تھی، جسم تھر تھراتا تھا۔ رحیم داد دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆

دوسرے روز رحیم داد دن چڑھے تک سوتا رہا۔ رات کو اسے دیر تک نیند نہیں آئی۔ وہ شد انتشار اور خلفشار میں مبتلا رہا۔

نادر خاں حسب وعدہ رحیم داد کے پاس نہ آیا۔ اس نے نوکروں اور کمیوں کی مدد سے اپنا کم خالی کیا۔ گھر گرہستی کا سامان مہمان خانے کے ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ جنت اور اس کی بچیاں بھی مہمان خانے میں منتقل ہو گئیں۔ خالی مکان خوب اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر صاف کیا جمیلہ نے خود جاکر اس کا معائنہ کیا۔ اپنی نگرانی میں سجا کر اسے شادی کا گھر بنایا۔ کمروں میں در بچھی تھیں، ان پر جازم اور چاندنی کا فرش تھا۔ کمروں کے باہر دالان میں بھی دریاں اور چٹ بچھائی گئی تھیں۔

سہ پہر تک سارے انتظامات مکمل ہوگئے۔ تاجاں کو گھر کے پچھلے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ سرخ سالو باندھے ہوئے تھی۔ سر پر ہلدی میں رنگا ہوا زرد دوپٹہ تھا۔ کرتا بھی زرد ہی تھا۔ سورج ڈوبنے سے کچھ دیر پہلے تاجاں کی سسرال سے کچھ عورتیں اور نوجوان لڑکیاں آئیں۔ کمروں اور باہر دالان میں پیٹرومیکس روشن تھے۔ ان کی تیز روشنی دور تک پھیلی تھی۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ قہقہے تھے اور ملی جلی آوازوں کا شور تھا۔ مسرت و شادمانی تھی۔ بڑا خوشگوار ہنگامہ تھا۔ ہر چہرہ چمکتا تھا، دمکتا تھا۔

سسرال سے آنے والی عورتیں اور لڑکیاں جب تاجاں کے پاس پہنچیں تو آوازوں اور قہقہوں کا شور اور بھی سوا ہوگیا۔ تاجاں کے چھوٹے ماموں نے، جو دولہا کا چچا بھی تھا، قریب جاکر اپنا ہاتھ بڑھایا، شفقت سے تاجاں کے سر پر پھیرا۔ بازو پکڑ کر اسے اٹھایا اور سہارا دے کر تیل چڑھانے کی چوکی پر لے گیا۔ وہ سر جھکا کر چوکی پر شرماتی لجاتی سمٹی سمٹائی بیٹھ گئی۔

سات نوجوان عورتیں آگے بڑھیں اور تاجاں کے ارد گرد بیٹھ گئیں۔ ساتوں سہاگنیں تھیں۔ وہ تاجاں کے گندھے ہوئے بال آہستہ آہستہ کھولنے لگیں۔ لیکن بال کھولنے سے قبل ایک عورت نے تاجاں کی ہتھیلی پر ناریل اور گھی ملی ہوئی تھوڑی سی مہندی رکھ دی۔ اس کا ہاتھ پکڑا اور دیوار کے پاس لے گئی۔ تاجاں نے اس کی ہدایت کے مطابق شرم سے جھجکتے ہوئے ہتھیلی کی مہندی دیوار پر مل دی۔

وہ عورت پیچھے ہٹی تو دوسری سہاگن نے بڑھ کر تاجاں کی ہتھیلی پر پھر مہندی رکھ دی اور تاجاں نے اس کے ہاتھ کی مدد سے اس دفعہ بھی مہندی دیوار پر مل دی۔ ساتوں سہاگنوں نے باری باری تاجاں کے ہاتھ سے دیوار پر مہندی لگوائی۔ لیکن ہر بار جب تاجاں دیوار پر مہندی لگاتی، تو ساتوں میں سے ایک سہاگن سرسوں کے تیل میں انگلی ڈبو کر اس کے سر میں لگاتی اور بالوں کی مینڈھی کھول دیتی۔

یہ تیل چڑھانے کی رسم تھی۔ اس رسم کے دوران میں تاجاں کی سہلیاں اور دوسری نوجوان لڑکیاں اس کے چاروں طرف گھیرا ڈال کر کھڑی ہو گئیں۔ تاجاں اب سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ میراثنوں میں سے ایک نے ڈھولک پر تھاپ دی اور اونچی آواز سے یہ گیت چھیڑا۔

میری میڈھی نہ کھولو، میری میڈھی نہ کھولو، سہلیو!
میرے بابل توں پچھو سہلیو، جس میرا داج بنایا!
میرے چاچے توں پچھو، جس میرا کاج رچایا!

میرے ویر توں پچھو، جس مینو بوچھین دوایا!

گیت شروع ہوتے ہی دوسری میراثنیں بھی ڈھولک کی تھاپ پر گانے لگیں۔ تاجاں کے گر حلقہ بنا کر کھڑی ہوئی لڑکیاں بھی ان کی آواز سے آواز ملا کر گانے لگیں۔ وہ گیت کے بول اٹھاتیں خوشی سے کھلکھلا کر قہقہے بلند کرتیں۔ آپس میں چھیڑ چھاڑ کرتیں، مگر تاجاں حیا سے کسی سمٹی چپ بیٹھی تھی۔ گیتوں کے بول سن رہی تھی جن میں اس کی آرزوؤں اور خواہشوں کا اظہار اس طرح کیا جا رہا تھا۔

پیاری سیلیو! میرے بال نہ کھولو، میرے بال پریشان نہ کرو
میرے بابل سے تو پوچھو سیلیو جس نے میرا جہیز بنایا!!
میرے چاچا سے تو پوچھو جس نے میرا بیاہ رچایا!!
میرے بھائی سے تو پوچھو سیلیو جس نے مجھے دوپٹہ اوڑھایا

مگر نہ اس کا باپ تھا، نہ چچا تھا، نہ کوئی بھائی تھا۔ اس کی آنکھوں سے اپنی بے بسی پر ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اور جمیلہ جس نے سارا جہیز تیار کیا، شادی کا اہتمام کیا، لباس عروسی تیار کرایا وہاں موجود نہ تھی۔ وہ سہاگن نہ تھی، رانڈ بیوہ تھی اور کسی بیوہ کا سایہ مائیوں بیٹھنے والی لڑکی پر بڑا نحوست اور بدشگونی سمجھا جاتا ہے۔

جمیلہ مہمان خانے میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ گیت کے فضا میں بکھرتے ہوئے بولوں کو سن رہی تھی۔ مہمان خانے کے صحن میں بھی گیس بتی جل رہی تھی۔ اس کی ہر سو بکھری ہوئی روشنی میں بڑے بڑے چولہوں پر دیگچے چڑھے تھے۔ کڑاہیاں رکھی تھیں۔ دیگچوں میں گھنگھنیاں ابل رہی تھیں۔ کڑاہیوں میں گلگلے تلے جا رہے تھے۔ گلگلے تلے جانے کے بعد ٹوکروں میں ڈالے جا رہے تھے۔ قریب ہی پیتل کے بڑے بڑے تھالوں میں سوجی کی چوری اور ملیدہ تیار کیا جا رہا تھا۔ جمیلہ پکوان اپنی نگرانی میں تیار کرا رہی تھی۔

مائیوں کی رسم پر جمیلہ نے کوٹلہ ہرکشن کی تمام عورتوں اور لڑکیوں کو مدعو کیا تھا۔ ہر عورت تاجاں کے پاس جانے سے قبل مہمان خانے میں پہنچتی۔ اس کے ہاتھوں میں گندم سے بھری ہوئی تھالی ہوتی۔ وہ جمیلہ کے سامنے جاتی۔ اونچی آواز سے کہتی۔ "سلام بھین جی۔" اور تھالی میں بھری ہوئی گندم دالان میں رکھے ہوئے مٹی کے بڑے بڑے کونڈوں میں انڈیل دیتی۔ پھر وہ دیگچوں کے پاس جاتی۔ ڈونگے کا دستہ پکڑ کر اندر سے گھنگھنیاں نکالتی، ٹوکروں سے گلگلے اٹھاتی، پیتل کے تھالوں سے چوری اور ملیدہ لیتی اور اپنی تھالی میں رکھتی جاتی، پھر ہنستی مسکراتی اس طرف چلی جاتی جہا

تیل چڑھانے کی رسم ادا کی جا رہی تھی۔

تیل چڑھانے کی رسم ختم ہوئی تو تاجاں کے ماموں نے ایک بار پھر اس کا بازو تھاما۔ اسے اٹھایا اور سہارا دے کر اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ اس نے تاجاں کو پردے کے پیچھے بیٹھا دیا۔ تاجاں اب باقاعدہ مائیوں بیٹھ چکی تھی۔

پھاتاں بھاگی بھاگی جمیلہ کے پاس آئی، گڑگڑا کر بولی۔ "بھین جی، تیری تاجاں مائیاں بیٹھ گئی ہے۔ اب تو بھی چل۔"

وہ تیل چڑھانے کی رسم کے موقع پر بھی جمیلہ کے پاس آئی تھی اور اس میں شرکت کرنے پر اصرار بھی کیا تھا۔ مگر جمیلہ نے انکار کر دیا تھا۔ اس دفعہ بھی اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔ "پھاتاں، تو جا، میں تھوڑی دیر بعد آجاؤں گی۔ مجھے ادھر کئی ضروری کام نمٹانے ہیں۔ دیکھ رہی ہے ادھر کتنا کام ہو رہا ہے۔"

"وہ تو تیرے بناں بھی ہوتا رہے گا۔" پھاتاں نہ مانی، اپنی بات پر اڑ گئی۔ اس نے اپنا دوپٹہ اتار کر جمیلہ کے قدموں پر ڈال دیا۔ "بھین جی، میری لاج رکھ لے۔ تو نہ گئی تو میں بھی اب تاجاں کے پاس نہیں جاؤں گی۔"

رحیم داد، جو شام ہی سے مہمان خانے میں پہنچ کر جمیلہ کے قریب ہی بیٹھا تھا اور بہت دیر سے خاموش تھا، پھاتاں کے گڑگڑانے سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے جمیلہ کی جانب دیکھا اور نرم لہجے میں مخاطب کیا۔ "زمیں دارنی، اب تو چلی جا۔" اس کے لہجے میں بھی عاجزی تھی۔

جمیلہ نے کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھی رہی۔ اس کا لباس اس وقت بھی حسب معمول سفید ہی تھا۔ البتہ وہ دوشالہ سبز رنگ کا اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کے کنارے سنہری تھے۔ آنکھوں میں دنبالہ کاجل تھا۔ چہرے پر سردی سے گلاب کھل رہے تھے۔ کانوں میں سونے کے مندرے پڑے تھے۔ پیٹرومیکس کی تیز روشنی میں وہ جگمگا رہی تھی، دل کش اور دل آرا نظر آ رہی تھی۔

جمیلہ راج ہنس کی مانند اپنی صراحی دار گردن اونچی اٹھائے گم صم بیٹھی سوچتی رہی۔ پھاتاں اس کے روبہ رو مجسم التجا بنی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر بے چینی اور اضطراب کے سائے منڈلا رہے تھے۔ رحیم داد نے ایک بار پھر نرم لہجے میں جمیلہ سے درخواست کی۔ "زمیں دارنی، اب چلی بھی جا۔ تاجاں تو پھاتاں سے زیادہ تیری دھی ہے۔ تو اس کے مائیاں بیٹھنے پر نہیں جائے گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ذرا سوچ تو یہ کیسا لگے گا؟"

جمیلہ نے اس دفعہ بھی کچھ نہ کہا۔ جھک کر پیروں پر پڑا ہوا دوپٹہ اٹھایا۔ پھاتاں کے سر پر ڈالا اور

اٹھ کر کھڑی ہو گئی، آگے بڑھی۔ پھاتاں اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ رحیم داد دونوں کو جاتے ہوئے بڑے اشتیاق سے دیکھتا رہا۔ جب وہ مہمان خانے کا دروازہ کھول کر باہر چلی گئیں تو رحیم داد نے گہری سانس بھری اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کمرے کے سامنے سے گزرا جس میں نادر خاں بیوی بچوں کے ساتھ عارضی طور پر مقیم تھا۔ جنت اس وقت کمرے میں موجود نہ تھی۔ وہ اپنی تینوں بچیوں کے ہم راہ مائیوں کی تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ نادر خاں بھی کمرے میں نہیں تھا۔ رحیم داد نے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور آگے نکل گیا۔ وہ پھر واپس مہمان خانے میں آیا۔

☆

تاجاں کو مائیوں بیٹھے ہوئے چار روز گزر چکے تھے اور ابھی اسے مزید سات روز مائیوں بیٹھنا تھا۔ اس عرصے میں رحیم داد کو نادر خاں کم ہی نظر آیا۔ وہ ان دنوں جمیلہ کی اردلی میں تھا اور تاجاں کی شادی کی تیاری میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ مگر رحیم داد کو تاجاں کے بیاہ کی سرگرمیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ ہر وقت اکتایا ہوا سا رہتا۔ خود کو تنہا محسوس کرتا، بے چین اور مضطرب رہتا۔

انھی دنوں ایک سہ پہر کو رحیم داد نے وکیل عثمان رندھاوا کو ایک بار پھر حویلی میں دیکھا۔ وہ سیدھا جمیلہ کے پاس اوپر چلا گیا۔ جب وہ جمیلہ سے طویل بات چیت کے بعد نیچے آیا تو کہرے کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ شام مشرقی افق سے زینہ زینہ نیچے اتر رہی تھی۔ وکیل اپنے کسی زمیں دار موکل کی کار میں آیا تھا۔ وہ اس میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔

وکیل کی اچانک آمد رحیم داد کو بہت پراسرار معلوم ہوئی۔ وہ ایک بار پھر تشویش اور بے چینی میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے ذہن میں دبے دبے وسوسوں اور شبہات نے از سر نو سر ابھارا۔ وہ پریشانی اور اضطراب کے عالم میں تنہا بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔

ملازم کھانا لایا تو رحیم داد ذہنی انتشار کے باعث رغبت سے نہ کھا سکا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ مہمان خانے میں چلا گیا۔ مگر نہ وہاں نادر خاں تھا نہ جنت تھی۔ نادر خاں کے کمرے کا دروازہ اس وقت بھی کھلا تھا۔ چارپائیاں خالی تھیں۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ جمیلہ بھی اسے مہمان خانے میں کہیں نظر نہ آئی۔ صرف نوکر چاکر ادھر ادھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بہت مصروف اور سرگرم معلوم ہو رہے تھے۔

تاجاں جہاں مائیوں بیٹھی تھی، وہاں ڈھولک ٹھنک رہی تھی۔ لڑکیوں کے گانے کی ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ اس وقت تاجاں کے بدن پر بٹنا ملا جا رہا تھا۔ گیت کے بولوں سے رحیم داد نے یہی اندازہ لگایا۔ لڑکیاں بٹنا مل رہی تھیں اور تالیوں کی تھاپ پر لہک لہک کر گا رہی تھیں۔ تاجاں سے یوں چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔

تیں نوں مائیں پاون آئیاں بی بی
کچھ بھیناں تے کچھ تائیاں بی بی
کچھ چاچیاں، تے کچھ تائیاں بی بی
تے کچھ چاچے تائے دیاں جائیاں بی بی

رحیم داد ذرا دیر خاموشی سے گیت سنتا رہا، پھر اکتا گیا اور حویلی میں واپس چلا گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اوپر کی منزل پر جائے اور باتوں باتوں میں جمیلہ سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ وکیل اس کے پاس کیوں آیا تھا، کس مقصد سے آیا تھا؟

وہ کمرے سے نکل کر زینے پر پہنچا تو سیڑھیوں پر حویلی کی ملازمہ تاجو نظر آئی۔ وہ اوپر ہی سے آ رہی تھی۔ رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ ”گل سن تاجو۔ یہ بتا، زمیں دارنی اوپر ہی ہے ناں؟“

”نہیں جی، وہ تو شام ہی سے تاجاں کے پاس ہے۔“

”کب تک واپس آئے گی؟“

”دیر ہی سے آئے گی جی۔“ تاجو نے رحیم داد کو بتایا۔ ”روز ہی وہاں سے دیر کو لوٹتی ہے۔“

رحیم داد نے تاجو سے مزید بات چیت غیر ضروری سمجھی۔ واپس اپنے کمرے میں چلا گیا اور بستر پر لیٹ کر سو گیا۔ نہ جانے کتنی رات گزری تھی۔ اس کی آنکھ آہٹ سے کھل گئی۔ اس نے سنا دروازے پر آہستہ آہستہ دستک ہو رہی ہے۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ پلنگ سے نیچے اترا۔ آگے بڑھا، دروازہ کھولا۔ دیکھا، سامنے جنت کھڑی ہے۔ وہ سردی سے تھر تھرا رہی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی جھٹ اندر داخل ہو گئی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ سارے نوکر چاکر تھک کر بستروں میں دبکے گہری نیند سو رہے تھے۔

رحیم داد نے دروازہ بند کرتے ہوئے جنت سے پوچھا۔ ”تو اتنی رات گزرے کیسے آ گئی؟ نادر کہاں ہے؟“

”وہ تو جی لہور گیا ہے۔“ جنت نے جواب دیا۔ ”زمیں دارنی نے اسے شام ہی کو بھیجا ہے۔ اب تو وہ کل ہی واپس آئے گا۔“

جنت رحیم داد کے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کا بدن سردی سے ہنوز کپکپا رہا تھا۔ اس نے لحاف اٹھا کر

پیروں پر ڈال لیا۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”اس رات جب میں تیرے پاس گیا تھا‘ نادر خفا تو نہیں ہوا؟ کیا کہتا تھا وہ؟“

”اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ تیرے بارے میں کوئی گل بات ہی نہیں ہوئی۔“

”بعد میں بھی کوئی گل بات نہیں ہوئی؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”بس اتنا کہا تھا‘ تاجاں کے ویاہ کے بعد اپنے پیو کے پاس رحمت والی چلی جا۔“ جنت نے بتایا۔ ”چوہدری! اس نے تجھ سے تو کچھ نہیں پوچھا؟“

”اس رات کے بعد وہ میرے پاس آیا ہی نہیں۔“ رحیم داد نے جنت کو مطلع کیا۔ ”ہاں‘ مجھ سے یہ کہتا تھا کچھ ضروری گل کرنی ہے۔ پتہ نہیں کیا کہنا چاہتا تھا؟“

جنت اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ ”میں تو تیرے پاس پہلے ہی آتی پر زمیں دارنی نے مجھے تاجاں کے ساتھ لگا دیا ہے۔ رات کو میں اسی کے پاس ہوتی ہوں۔“

”آج کیسے ادھر نکل آئی؟“

”وہ ایسا ہوا جی‘ نادر لہور گیا ہے۔ چھوہریوں کے پاس کوئی نہیں۔ اکیلے میں ڈرتی ہیں۔ زمیں دارنی نے آج رات پھاتاں کو تاجاں کے پاس لگا دیا ہے۔ میں مہمان خانے کے کمرے میں رہی۔ رات گزری تو تیرے پاس آگئی۔“

”زمیں دارنی نے تو تجھ سے اس رات کے بارے میں پوچھ تاچھ نہیں کی؟“

”وہ ایسا کیوں کرتی؟ اس نے کیہہ پتہ؟“ جنت نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

”نادر خاں نے اسی رات مجھے بتایا تھا کہ زمیں دارنی کو میرے جوتے منجی کے نیچے پڑے دیکھ کر شبہ ہو گیا تھا۔“

”مجھ سے تو اس نے کچھ پوچھا نہیں۔“ جنت نے بے نیازی سے کہا۔ ”پر تو اتنا گھبرا گیا تھا کہ جوتے پہن نے بھی بھول گیا۔ حد کر دی تو نے۔“

”لگتا ہے نادر مجھ سے کچھ ناراض ہے۔“ رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”جب ہی تو میرے پاس اب تک نہیں آیا۔“

”مجھے تو ایسا لگتا نہیں۔“ جنت نے اطمینان سے کہا۔ ”ویسے آج کل تاجاں کے ویاہ کی تیاری میں نادر بری طرح الجھا ہوا ہے۔ زمیں دارنی نے ویاہ کا سارا ہی بوجھ اس پر ڈال رکھا ہے۔“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ جنت بھی خاموش رہی۔

علی الصباح رحیم داد کی آنکھ کھلی تو جنت اٹھ کر جا رہی تھی۔ رحیم داد نے اسے دیکھا مگر خاموش رہا۔ جنت کمرے سے باہر نکلی تو ہوا کا سرد جھونکا اندر آیا۔ باہر ہلکی ہلکی دودھیا دھند کی چادر ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جنت نے دہلیز عبور کرنے کے بعد آہستہ سے دروازہ بھیڑ دیا۔ ابھی بہت تڑکا تھا۔ ہر سو گہری خاموشی طاری تھی۔ سردی بھی شدید تھی۔ رحیم داد لحاف میں دبکا ہوا بستر پر لیٹا رہا۔

☆

پہر رات گزر چکی تھی۔ رحیم داد کھانا کھا رہا تھا کہ نادر خاں اچانک کمرے میں داخل ہوا۔ رحیم داد اسے دیکھ کر قدرے پریشان ہو گیا۔ اس نے نادر کی جانب دیکھے بغیر نرم لہجے میں دریافت کیا۔

”نادر‘ تو اتنے روز کہاں رہا؟ میرے پاس آیا ہی نہیں۔“

”زمیں دارنی نے ویاہ کے کاموں میں ایسا الجھا دیا ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی۔“ نادر خاں نے صفائی پیش کی۔ ”لہور گیا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے واپس آیا ہوں۔“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھا کھانا کھاتا رہا۔ نادر خاں بھی خاموش رہا۔

کمرے میں سکوت چھایا تھا۔ ذرا دیر بعد نادر خاں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ سنبھلے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ ”چوہدری‘ تجھ سے بہت ضروری گل کرنی تھی۔“

”اس رات کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہے؟“ رحیم داد نے اس کی جانب دیکھے بغیر ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

”اسے چھوڑ۔ چوہدری‘ یہ اور ہی گل ہے اور بہت پریشانی کی گل ہے۔“ نادر خاں نے اپنی بات کی اہمیت جتانے کی کوشش کی۔

رحیم داد نے اس دفعہ مڑ کر اس کی طرف حیرت زدہ نظروں سے دیکھا۔ مگر چپ رہا۔

”میں تجھ سے اس بارے میں بہت پہلے بات کرنا چاہتا تھا۔“ نادر خاں نے کہا۔ ”پر موقع ہی نہ ملا۔“

”ایسی کیا پریشانی کی گل بات ہے؟“ رحیم داد کے لہجے سے تشویش آشکارہ تھی۔

”تو سنے گا تو دنگ رہ جائے گا۔“ نادر خاں نے کھل کر بات نہ کی۔

”تو فیر بتا نا۔ اس طرح چبا چبا کر کیوں بات کر رہا ہے؟“ رحیم داد نے بے چین ہو کر کہا۔

”شبہ تو جی مجھے پہلے ہی تھا پر اب تو تصدیق بھی ہو گئی۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”اسی لیے میں نے تجھ سے اب تک اس معاملے میں بات نہیں کی۔ سوچا پہلے تصدیق کر لوں تب تجھے آگاہ کروں کہ کیا ہو رہا ہے۔“

”کیا ہو رہا ہے؟“ رحیم داد کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ اس نے بے قرار ہو کر پہلو بدلا۔ ”صاف صاف

گل کر۔ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟؟"

"لگتا ہے تجھے کچھ پتہ نہیں۔" نادر خاں نے گردن آگے بڑھا کر رازداری کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ "تیں نوں پتہ نہیں۔ زمیں دارنی اپنی ساری اراضی بیچ رہی ہے۔"

رحیم داد ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے گھبرا کر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ بھوک اڑ گئی۔ حیران و پریشان ہو کر بولا۔ "پر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نادر! تجھے کس نے بتایا کہ زمیں دارنی اپنی اراضی بیچ رہی ہے؟"

"یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا۔" نادر خاں گویا ہوا۔ "پر تیری باتوں سے لگتا ہے تجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ زمیں دارنی نے وکیل عثمان رندھاوا کی معرفت لہور میں کرائے پر مکان بھی لے لیا ہے۔"

"مجھے شبہ تو ہوا تھا اور میں نے اپنے شبے کا جمیلہ سے اظہار بھی کیا تھا۔ پر اس نے صاف انکار کر دیا کہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔" رحیم داد نے قدرے توقف کیا۔ "لیکن وکیل کا روز روز آنا یہ ظاہر کرتا ہے' تیری بات میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے۔"

"چوہدری! یہ چکر تو بہت دن سے چل رہا ہے۔"

"وکیل' کل بھی جمیلہ کے پاس آیا تھا اور شام تک اوپر بیٹھا جمیلہ سے باتیں کرتا رہا۔" رحیم داد نے شکوہ کیا۔ "میرے دروازے کے سامنے سے گزرتا ہے پر مجھ سے ایک بار بھی اس نے ملنے اور بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح گزر جاتا ہے جیسے مجھ سے کبھی ملا نہ ہو' کوئی جان پہچان نہ ہو۔" اس نے لمحہ بھر کے لیے تامل کیا پھر گویا ہوا۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے دینے نے بھی جمیلہ سے کچھ الٹی سیدھی گل بات کی ہے۔"

"دینا کیا الٹی سیدھی بات کر سکتا ہے؟" نادر خاں کے لہجے میں استعجاب تھا۔

وہ نادر خاں کو اعتماد میں لینا نہ چاہتا تھا۔ اس نے فوراً بات کا رخ بدل دیا۔ "یہ بتا' تجھے ان باتوں کا کیسے پتہ چلا؟"

"مجھے تو جی اس طرح پتہ چلا کہ پچھلی بار جب میں لہور گیا تھا تو وکیل کے دفتر بھی گیا۔ یہ تو تجھے پتہ ہی ہو گا اس نے اب لہور میں پریکٹس شروع کر دی ہے۔"

"میں نوں اس کا پتہ ہے۔ جمیلہ ہی نے بتایا تھا۔"

"وہ ایسا ہوا جی' میں نے وکیل کا بورڈ دیکھا تو اس کے دفتر میں چلا گیا۔ کام تو اس سے کچھ تھا نہیں۔ سوچا سلام دعا کر لوں۔ اس سے میل ملاپ رکھنا چاہیے۔ زمیں داری میں تو وکیل کی کبھی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔" نادر خاں سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ "وکیل تو دفتر میں موجود نہ تھا' پر اس کا منشی مل گیا۔ اس نے مجھے چائے بھی پلائی۔ باتوں باتوں میں اس سے پتہ چلا کہ زمیں دارنی نے وکیل سے بیع نامہ تیار کرایا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "منشی سمجھا میں بیع نامے کے بارے میں معلوم کرنے آیا ہوں۔ اس نے یہ تو بتا دیا کہ بیع نامہ تیار ہو گیا ہے پر اس کے بارے میں اور کچھ نہ بتایا۔ میں نے بہت کوشش کی پر وہ کچھ بتانے پر آمادہ نہ ہوا۔"

"ایسی بات تھی تو مجھے فوراً بتانا چاہیے تھا۔"

"میں نے سوچا جی' پہلے تصدیق ہو جائے تب ہی اس معاملے میں تجھ سے بات کروں۔" نادر خاں نے وضاحت کی۔ "مان لے' میرا شبہ غلط ہوتا اور تو اس بارے میں زمیں دارنی سے بات کر لیتا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ میں بیچ میں مارا جاتا۔ زمیں دارنی مجھ سے ناراض ہو جاتی۔ وڈے لوکاں کے جھگڑے میں ہمیشہ چھوٹا ہی مارا جاتا ہے۔ برا نہ منانا چوہدری' میں اسی وجہ سے تجھ سے بات کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا' تجھ سے بات کروں تو پکی ہو۔ اس میں کوئی اگر مگر نہ ہو۔"

"تو نے تصدیق کیسے کی؟"

"اس بار جب میں لہور گیا تو وکیل کے دفتر بھی گیا۔" نادر خاں نے رحیم داد کو بتایا۔ "اتفاق سے اس بار بھی وکیل اپنے دفتر میں موجود نہ تھا۔ میں سیدھا منشی کے پاس پہنچا۔ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ گھما پھرا کر بیع نامے کے بارے میں پوچھا۔ پر وہ کھلا نہیں۔ شاید وکیل نے منع کر دیا ہو گا۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "تب میں نے جی سدھی سدھی ترکیب نمبر ۱۳ استعمال کی۔ دس دس کے دو نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھے۔ فیر تو جی اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ بیع نامہ بھی دکھا دیا۔"

رحیم داد نے پریشان ہو کر بولا۔ "اب تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔"

"ہاں جی' اب تو سب کچھ کھل کر سامنے آگیا ہے۔ ۲۰ روپے میں نے زمیں دارنی کی رکم میں سے دیئے ہیں۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کے ٹین کے ٹرنک کی جانب دیکھا۔ "چوہدری! تو وڈا زمیں دار ہے۔ تیں نوں یہ ٹرنک لے کر سفر نہیں کرنا چاہئے۔ یہ تجھے زیب نہیں دیتا۔ میں تیرے لیے چمڑے کا ایک سوٹ کیس بھی خرید کر لایا ہوں۔ بہت عمدہ ہے۔ ۵۰ روپے میں ملا ہے۔ اب سفر پر اسے ہی لے جانا۔ ٹین کا ٹرنک تیری شان کے خلاف لگتا ہے۔"

رحیم داد خاموشی سے اٹھا۔ ٹرنک کا تالا کھولا۔ سو روپے نکالے۔ اٹھ کر نادر خاں کے پاس گیا اور روپے اس کے ہاتھ پر رکھ کر بولا۔ "لے' یہ روپے رکھ لے۔"

"سوٹ کیس میرے پاس ہے۔ بعد میں تجھے پہنچا دوں گا۔"

"جب جی چاہے پہنچا دینا۔" رحیم داد نے بے نیازی سے کہا۔ "تو مجھے ٹھیک بتا۔ وکیل کے

منشی سے تیری کیا کیا گل بات ہوئی؟ تونے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔"

"پریشانی کی تو جی بات ہی ہے۔" نادر نے نوٹ کوٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "منشی نے مجھے بتایا کہ کوٹلہ ہر کشن میں زمیں دارنی کی جو اراضی ہے‘ اس کا سودا پکا ہو چکا ہے۔ وکیل نے بیع نامہ اور دوسری ضروری دستاویزات بھی تیار کرلی ہیں۔ اس نے مجھے سارے ہی کاغذات دکھا دیئے۔"

"یہ تونے بہت بری خبر سنائی۔" رحیم داد نے کرسی کھسکا کر نادر کے قریب کرلی۔ "یہ بتا‘ اب کیا کیا جائے۔ اپنا تو مغز بالکل کام نہیں کرتا۔ سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔"

"فکر نہ کر چوہدری‘ ابھی بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔" نادر خاں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "تیرا حکم ہونا چاہیے‘ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ میں تیرا بندہ ہوں۔ سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

"مجھے‘ تجھ سے ایسی ہی امید ہے۔" رحیم داد دفعتاً جذباتی ہوگیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں نادر خاں کا ہاتھ پکڑ کر گرم جوشی سے دبایا۔ "تیرا دل بہت وڈا ہے۔ نادر! میں نے سوچا بھی نہ تھا تو میرا اتنا وفادار ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "سچ کہتا ہوں‘ میں نے تجھے اب تک اتنا چنگا اور وفادار بندہ نہیں سمجھا تھا۔"

"چوہدری! جب تونے مجھے اپنا وفادار بندہ کہا ہے تو اب میرا بھی فرض ہے کہ تجھے یہ بتا دوں کہ زمیں دارنی سے نکاح کرنے کا خیال دل سے نکال دے۔ وہ کبھی تیری نہیں بن سکتی۔" نادر خاں نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "وہ لہور جاتی ہے تو جانے دے۔ پر اس کی اراضی نہیں جانی چاہئے۔"

"جب تک جمیلہ سے نکاح نہ ہو اور دونوں بچے میرے پاس نہ ہوں تب تک اراضی کیسے مل سکتی ہے۔" رحیم داد نے اپنی سمجھ کے مطابق مسئلہ کا قانونی پہلو پیش کیا۔ "تو ٹھیک کہتا ہے۔ اراضی کسی طرح نہیں جانی چاہیے۔ نکاح کے بعد وہ میرے کبضے میں آجائے گی۔ شاہ جی کا بھی یہی خیال ہے۔"

"شاہ جی بھی ٹھیک ہی کہتا ہے۔ ہونا تو یہی چاہئے۔"

"میں تو کہتا ہوں نادر‘ ساری گل بات شاہ جی کو فوراً بتا دینی چاہئے۔" رحیم داد نے نادر کا عندیہ معلوم کرنے کی غرض سے کہا۔ "تو کیا کہتا ہے؟ میرا تو خیال ہے وہ بالکل ٹھیک مشورہ دے سکتا ہے۔ ایسے معاملات کو وہ ٹھیک طرح سمجھتا ہے۔ وہ بہت ہوشیار اور تجربہ کار بندہ ہے۔"

"تب تو شاہ جی سے جلد ہی ملنے اور بات کرنے کی ضرورت ہے۔" نادر خاں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ "اب تو فوری کارروائی کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔"

"نادر! ایسا کر۔ تو کل سویرے شاہ جی کے پاس چلا جا۔"

"چوہدری‘ مجھے اس وکت شاہ جی کے پاس نہ بھیج۔ زمیں دارنی کو فوراً میرے بارے میں شبہ ہو جائے گا۔ ابھی تک اسے پتہ نہیں کہ میرا شاہ جی سے میل ملاپ ہے۔ تجھے تو خود ہی شاہ جی کے پاس جانا ہوگا۔"

"جمیلہ کو شبہ تو میرے بارے میں بھی ہو سکتا ہے۔" رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"میں اسے کہہ دوں گا‘ چوہدری کا ویاہ کے شور شرابے سے دل گھبرا رہا تھا۔ وہ اپنے کسی یار دوست سے ملنے ملتان گیا ہے۔" نادر خاں نے مشورہ دیا۔ "ویسے اسے شبہ ہو بھی جائے تو کیا ہوگا۔ وہ تو اپنی کارروائی سمجھو پوری کر ہی چکی ہے۔ اب تو تیں نوں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا اور جھیتی نال کرنا ہوگا۔ میں تو کہتا ہوں تو کل ہی صبح شاہ جی کے پاس چلا جا۔"

نادر خاں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "کہاں چلا نادر؟"

"چوہدری‘ مجھے اب جانے دے۔ زمیں دارنی میرا انتظار کرتی ہوگی۔"

نادر خان چلا گیا۔ رحیم داد سخت ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا۔ وہ بے چینی کے عالم میں آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس رات بھی وہ دیر تک جاگتا رہا۔

☆

جنوری کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ مگر سردی میں کمی نہ آئی تھی بلکہ کچھ بڑھ ہی گئی تھی۔ دن چڑھ چکا تھا۔ سرما کی ہلکی ہلکی دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ رحیم داد ناشتا کرنے کے بعد صحن میں آگیا تھا اور کرسی پر دھوپ میں بیٹھا تھا۔ وہ پریشانی میں مبتلا تھا۔ اسے رہ رہ کر نادر کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ وہ احسان علی شاہ کے پاس جانے اور اس سے ملنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

رحیم داد کو صحن میں پہنچے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ جمیلہ زینے سے اتری۔ اس نے رحیم داد کو دھوپ میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ تاجاں کے پاس جانے کے لیے نکلی تھی۔ مگر کچھ سوچ کر اس نے تاجاں کے پاس جانے کا ارادہ ترک کردیا۔ مڑی اور رحیم داد کی جانب بڑھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ نوکر نے فوراً اس کے لیے کرسی لا کر رکھ دی۔

جمیلہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "چوہدری‘ تو کچھ پریشان پریشان دکھائی دے رہا ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" جمیلہ کے رویئے میں پہلی سی ہم دردی اور لگاؤ تھا۔ رحیم داد نے اسے محسوس کیا‘ نرم لہجے میں گویا ہوا۔ "زمین دارنی طبیعت ویسے ٹھیک ہی ٹھاک ہے۔ پر خالی بیٹھے بیٹھے

دل گھبراتا ہے۔ کوئی کام کاج تو کرنے کو ہے نہیں۔"

"وڈا زمین دار بن نے میں یہی تو کھٹنائی ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "تو نے اوپر سے منیجر بھی لگا رکھا ہے۔ تیرے لیے اب کرنے کو رہ کیا گیا ہے۔ اسی کارن تو جاگیردار اور وڈے زمین دار رسہ گیری کا دھندا کرتے ہیں۔ مزاروں کی جوان گھروالیوں اور کڑیوں کو اٹھوا لیتے ہیں۔" وہ بے تکلفی سے کھلکھلا کر ہنسی۔ "پنڈ میں من نہیں لگتا تو لہور یا کسی دوسرے شہر میں کوٹھیاں اور بنگلے بنواتے ہیں۔ منیجر اور منشی زمین داری چلاتے ہیں اور وہ عیش کرتے ہیں۔ شراب اور دارو پیتے ہیں۔ نت نئے ویاہ رچاتے ہیں۔ ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر سیاست لڑاتے ہیں۔ من بہلانے کے لیے کوئی تو شغل ہونا چاہیے۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "اور سیاست کے مشغلے میں تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ جاگیر اور زمین داری کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عیش کرنے کے لیے آمدنی بھی بڑھتی جاتی ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تو بھی تو لہور جانا چاہتی ہے۔"

"میں نے کون سی سیاست لڑانی ہے۔" جمیلہ نے فوراً صفائی پیش کی۔ "میں تو گڈو اور نینا کی پڑھائی کے لیے لہور جانا چاہتی تھی۔ سوچا تھا وہاں کسی اسکول میں نوکری کرلوں گی۔ میری آشا ایم۔ اے کرنے کی ہے۔"

"زمین دارنی اتنا تو نے پڑھ لیا' اب اور پڑھ کر کیا کرے گی؟" رحیم داد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "تو اپنے اسکول کو سرکاری بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ چلی گئی تو کیا بنے گا؟"

"یہی سوچ کر تو میں نے لہور جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔ تجھے تو پہلے ہی بتا چکی ہوں۔" جمیلہ کا لہجہ سنجیدہ ہوگیا۔ "اسکول کا معاملہ ٹھیک ہو جائے تو میں ڈسپنسری بنانے کا کام شروع کردوں گی۔ تجھے تو پتہ ہی ہے میں ڈسپنسری کیوں بنانا چاہتی ہوں۔"

"وہی ڈاکٹر ویریندر والی گل ہے ناں؟" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔ "لگتا ہے تو ابھی تک اسے بھولی نہیں۔"

"بہت سی یادیں ایسی ہوتی ہیں جو کبھی بھولنے والی نہیں ہوتیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے چہرے پر دکھ کا سایہ پھیل گیا۔ "اس کی تو بات ہی اور ہے۔ میں تو اللہ وسایا کو بھی نہیں بھول سکی۔ جب تک اس کے دونوں بچے موجود ہیں' میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں؟"

"کیا کیا جائے زمین دارنی رب کی یہی مرضی تھی۔" رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے نصیب میں یہی لکھا تھا۔"

"اللہ وسایا نے تو کسی کی ہتیا نہیں کی تھی پر اسے کتل کردیا گیا۔" جمیلہ نے رقّت انگیز لہجے میں

کہا۔ "جیرا نے اپنی گھروالی لاڈو کے ساتھ اس کے یار سلیم کا بھی خون کردیا۔ اب پولیس ریمانڈ پر حوالات میں پڑا ہے۔ منتیں کرتا ہے' پچھتاتا ہے۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا جیرا پچھتاتا ہے۔" رحیم داد نے استفسار کیا۔ "وہ تو خود ہی تھانے گیا تھا۔ تو نے روکا تو تیری بات بھی نہ سنی۔"

"اس سے تو اس کے سر پر خون سوار تھا۔ وہ اپنے ہوش ہی میں کب تھا۔" جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "پچھلے دنوں اس کا پیو دین محمد آیا تھا۔ روتا تھا' جیرا کا حال بتاتا تھا۔ جوان پتر ہے۔ اسے تو دکھی ہونا ہی چاہیے۔ اس کی تو جیون بھر کی کمائی ہے۔" اس نے اپنی شال اتار کر زانو پر رکھ لی۔ اس کا گلابی چہرہ دھوپ کی تمازت سے تمتما رہا تھا۔ پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلملا رہے تھے۔

"دین محمد اب کیا چاہتا ہے؟"

"جیرا کی ضمانت کرانا چاہتا ہے۔ وکیل کھڑا کرکے کیس لڑانا چاہتا ہے۔ اسی کارن میرے پاس آیا تھا۔ اسی کے لیے میں نے اپنے وکیل عثمان اندھاوا کو بلایا تھا۔"

رحیم داد اس کی بات سن کر مخمصے میں پڑگیا۔ جمیلہ کی باتوں سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا لاہور جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس نے وکیل کو بھی کسی بیع نامے کی تیاری کے لیے نہیں بلکہ جیرا کے مقدمے کی پیروی کی خاطر بلایا تھا۔ مگر نادر خاں کا بیان قطعی مختلف تھا۔ اس نے وکیل کے منشی سے جو کچھ سنا تھا اور جو دستاویزات اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں وہ ساری ہی تفصیلات نہ صرف بے حد پریشان کن تھیں بلکہ اس سلسلے میں جلد سے جلد قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ جمیلہ اور نادر خان میں سے کون سچا تھا اور کون جھوٹا' کس کا بیان درست تھا اور کس کا غلط؟ رحیم داد کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ اس معاملے میں احسان شاہ ہی اس کی رہنمائی کرسکتا تھا۔ وہ پرانا گھاگ اور جہاں دیدہ تھا۔ وہ رحیم داد کی رہنمائی اور مدد کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔

رحیم داد کو گم صم دیکھ کر جمیلہ نے پوچھا۔ "چوہدری! کس سوچ میں پڑگیا؟"

"سوچ رہا تھا کچھ دنوں کے لیے ملتان چلا جاؤں۔" رحیم داد نے جواب دیا۔ "ادھر میرا ایک پرانا ملنے والا ہے۔ اس کے ساتھ اچھا وکت گزر جاتا ہے۔"

"تجھ پر کسی نئی الاٹمنٹ کی دھن تو سوار نہیں ہوگئی؟" وہ ہنس کر بولی۔

"نہیں' زمین دارنی ایسی کوئی گل بات نہیں۔" اس نے جمیلہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "یہاں دل گھبراتا ہے۔ اس کے پاس گیا تو شکار کھیلوں گا۔ تیں نوں تو پتہ نہیں' پہلے میں شکار کا بہت رسیا تھا۔ پچھلے دنوں جب ملتان اور بھکر میں تھا تو زیادہ دن شکار کھیلنے ہی میں گزرے۔"

”میری آشا ہے کہ تاجاں کی جنج چڑھے تو اس کے سسرال والوں کا تو سواگت کرے۔ تیرے سوا ادھر کون ایسا ہے؟“ جمیلہ نے نرمی سے کہا۔ ”مکلاوے کے سمے تو تیرا موجود ہونا بہت ضروری ہے۔ تو تاجاں کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرے گا‘ اسے بدا کرے گا۔ وہ تو اپنے پنڈ ہی کی نہیں اس گھر کی بیٹی ہے۔“ اس کا لہجہ معاً غم ناک ہو گیا۔ ”اس بے چاری کا تو نہ پیو ہے نہ بھرا۔ ایسے میں تیرا ادھر ہونا بہت ضروری ہے۔ آگے تیری مرضی۔“ اس نے گلہ کیا۔ ”جو من کرے ویسا کر۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“

”فکر نہ کر زمین دارنی‘ میں جنج پہنچنے سے پہلے ہی واپس آجاؤں گا۔“ رحیم داد نے جمیلہ کو باور کرانے کی کوشش کی۔ ”ویسے جنج کے آنے میں تو ابھی ہفتے بھر سے زیادہ رہتا ہے۔ ابھی تو زنانیوں کی شورا شوری ہے۔ میں تو ادھر رہ کر ابھی کچھ نہیں کر سکتا۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”ویسے تو جو موجود ہے پھر فکر کاہے کی۔“

”جانا چاہتا ہے تو چلا جا۔“ جمیلہ نے اسے روکنے پر زیادہ اصرار نہ کیا۔ ”پر جنج آنے سے پہلے ضرور آجانا۔ ورنہ مجھے دکھ ہو گا۔“

”کیسی گل بات کر رہی ہے زمین دارنی۔ تجھے دکھ پہنچانے کی تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“ اس نے کسی قدر جوش و خروش کا اظہار کیا۔ ”جیسا تو کہہ رہی ہے بالکل ویسا ہی کروں گا۔ تو بالکل فکر نہ کر۔“ رحیم داد نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ جنت آگئی۔

جنت نے قریب پہنچ کر رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری! تو نے زمین دارنی کو ادھر باتوں میں لگا رکھا ہے۔ ادھر سب ہی اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ تاجاں تو بار بار پوچھ رہی ہے۔“ رحیم داد خاموش رہا۔ جمیلہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے شال اوڑھی اور جنت کے ہم راہ چلی گئی۔

رحیم داد بھی زیادہ دیر صحن میں نہ ٹھہرا۔ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نادر خان کے لائے ہوئے سوٹ کیس میں اس نے کپڑے اور سفر کا ضروری سامان رکھا۔ تانگا بلوایا‘ حویلی سے باہر نکلا۔ تانگے میں سوار ہوا اور احسان شاہ کے گاؤں پیراں والہ جانے کے لیے لاری اسٹینڈ کی جانب روانہ ہو گیا۔ مگر جب وہ کوٹلہ ہرکشن کی حدود سے باہر نکل رہا تھا تو اس نے دیکھا‘ دینا سامنے سے آرہا ہے۔ اسے دیکھتے ہی رحیم داد گھبرا گیا۔ لیکن دینا اسے دیکھ نہ سکا۔

۳۳

آتش دان میں انگارے دہک رہے تھے۔ ان کی گہری سرخ روشنی کمرے میں پھیلی تھی۔ باہر سرد ہوا درختوں میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ رات ٹھنڈی اور سنسان تھی۔ رحیم داد اور احسان شاہ آتش دان کے قریب آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بیچ میں میز تھی۔ میز پر گلاس تھے‘ وہسکی کی بوتل تھی اور پانی سے بھرا ہوا شیشے کا جگ تھا۔

احسان شاہ کے بشرے سے غور و فکر کے تاثرات عیاں تھے۔ اس نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور وہسکی کا گھونٹ بھر کے رحیم داد سے مخاطب ہوا۔ ”چوہدری! اس کا مطلب یہ ہوا کہ جمیلہ ساری تیاریاں کر چکی ہے۔ اس نے اپنی زمین کا سودا کیا۔ وکیل سے بیع نامہ بھی کرا لیا۔ وہ لہور جا رہی ہے۔ اور وکیل کی معرفت اس نے وہاں مکان بھی کرائے پر لے لیا ہے۔ نادر خاں نے تجھے یہی بتایا ہے نا؟“ اس نے رحیم داد کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ”تو نے جمیلہ سے بھی ٹوہ لگانے کی کوشش کی تھی۔ وہ کیا کہتی ہے؟“

”جمیلہ سے میری بات چیت ہوئی تھی۔“ رحیم داد نے جواب دیا۔ ”اس کی باتوں سے تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ نہ تو وہ زمین بیچنے کا کوئی ارادہ رکھتی ہے اور نہ ہی لہور جا رہی ہے۔“

”تو نے کیسے یہ اندازہ لگایا؟“

”بات یہ ہے شاہ جی‘ وہ تو اپنے سکول کو سرکاری بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کام کے لیے وہ پچھلے دنوں منٹگمری میں ڈپٹی کمشنر سے بھی ملی تھی۔ کہتی تھی اس نے مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔“

رحیم داد مزید بتانا چاہتا تھا مگر احسان شاہ نے اسے آگے بولنے نہ دیا۔ ”سکول تو سرکاری بنتا بنانا

نہیں۔" اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ اور تلخی تھی۔ "اور نہ ہی تو بننے دینا۔ اس چکر میں ہرگز ہرگز نہ پڑنا۔ تو نے یہ بھی سوچا۔ مزارعوں اور کمیوں کے منڈے پڑھ لکھ گئے تو میرے اور تیرے پتر کیا کریں گے؟ میں اس بارے میں پہلے بھی تجھ سے کہہ چکا ہوں۔ لگتا ہے تو نے میری بات پر پوری توجہ ہی نہیں دی۔"

"ایسی گل بات نہیں۔ میں تو تجھے یہ بتا رہا تھا جمیلہ آج کل کیا کر رہی ہے اور کس انداز سے سوچ رہی ہے؟" رحیم داد نے احسان شاہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے اور جیسا تو کہہ رہا ہے، میں ویسا ہی کروں گا۔" اس نے بات کا رخ بدلا۔ "شاہ جی! سکول کا چکر تو آگے کی گل ہے۔ یہ بتا میں نے اب کیا کرنا چاہیے؟ اپنی سمجھ کام نہیں کرتی۔ نادر کچھ بتاتا ہے۔ جمیلہ کی باتوں سے کچھ اور ہی پتہ چلتا ہے۔ میں تو تیرے پاس آیا ہی اس لیے ہوں کہ تو ٹھیک ٹھیک بتا۔"

"نادر خاں تجھ سے غلط بات نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو مجھے پکا یکین ہے۔"

"میں یہ نہیں کہتا نادر نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ پر یہ بھی تو ہو سکتا ہے وکیل کے منشی ہی نے نادر سے غلط بات کہی ہو۔ یہ میں نے اس لیے سوچا کہ جمیلہ کو زمین بیچ کر لہور جانا ہوتا تو وہ اپنے سکول کو سرکاری بنانے کے چکر میں کیوں پڑتی؟ جب اسے کوٹلہ ہرکشن میں رہنا ہی نہیں تو سکول سرکاری بنے یا نہ بنے، رہے نہ رہے، اسے کیا لینا۔" رحیم داد نے اپنے موقف کی تائید میں دلیل پیش کی۔ "پچھلے دنوں جمیلہ نے لہور جانا تھا۔ تب اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا تھا اور میں اسے سنتے ہی گھبرا کر سیدھا تیرے پاس آیا تھا۔ پر تو ان دنوں یہاں موجود نہیں تھا۔ اپنا مراد خاں شاہانی ادھر ہی مل گیا تھا۔ میں اس کے ساتھ بھکر چلا گیا۔ اس کے بعد سے اب تجھ سے مل رہا ہوں۔"

احسان شاہ مخمصے میں پڑ گیا۔ ذرا دیر تک نظریں جھکائے سوچتا رہا۔ پھر اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری، یہ بتا جمیلہ کا تیرے ساتھ برتاؤ کیسا ہے؟"

"ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔" رحیم داد نے جواب دیا۔ "پہلے تو سخت ناراض تھی اور اتنی ناراض تھی کہ پنڈ چھوڑ کر اپنے بچوں کے ساتھ لہور جانے کو کہتی تھی۔" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "تجھے تو پتہ ہی ہے کہ جمیلہ سے چھپ کر تیرے پاس آتا ہوں اور ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر آتا ہوں، پر اسے پتہ چل گیا۔ جیسے ہی اسے پتہ چلا، یک دم بپھر گئی۔ بات چیت کرنی چھوڑ دی۔ پر جب میں بھکر چلا گیا تو اس کا غصہ ختم ہو گیا۔ ویسے سچ پوچھ تو نادر اور اس کی گھر والی جنت نے جمیلہ کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں زبردست کام کیا۔"

"نادر بہت ہوشیار بندہ ہے۔ میں نے خوب سوچ سمجھ کر اسے تیرے پاس لگایا ہے۔ آگے بھی تیرے بہت کام آئے گا۔ وہ بہت وفادار ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں، نادر تجھ سے غلط گل نہیں کہہ سکتا۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "چوہدری! تو نے یہ بھی تو کہا تھا، زمیں کی بیع کے کاغذات اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔"

"کہتا تو وہ یہی تھا۔" رحیم داد نے اعتراف کیا۔

"تب تو کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے۔" احسان شاہ آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگا۔ "تجھے جمیلہ کی باتوں پر اعتبار ہو تو ہو پر مجھے بالکل نہیں۔ وہ پڑھی لکھی ہے۔ بہت تیز اور چالاک ہے۔ اپنے دل کی بات تجھے ہرگز نہیں بتائے گی۔"

رحیم داد نے احسان شاہ سے اختلاف نہیں کیا۔ "تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ اس کے بارے میں شبہ تو مجھے بھی ہے، تبھی تو تیرے پاس مشورہ کرنے آیا ہوں۔ یہ بتا اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"میں کل سویرے لہور جا رہا ہوں۔ میرا مینجر، مہربان علی بھی ساتھ ہی ہو گا۔ وہ نادر سے بھی زیادہ ہوشیار بندہ ہے۔ میں اسے لگا دوں گا۔ وہ اپنے طور پر سب پتہ چلا لے گا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ "تجھے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں شام ہی کو لوٹ آؤں گا۔ تب تک تو صبر کر۔ جمیلہ نے آگے کے لیے جو بھی منصوبے بنا رکھے ہیں، سب کا سراغ مل جائے گا۔"

"یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔" رحیم داد مطمئن ہو کے بولا۔

احسان شاہ خاموش ہو گیا اور گلاس اٹھا کر وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ چپ دیکھ کے رحیم داد اپنی بے چینی کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ "شاہ جی، کیا سوچ رہا ہے۔ کوئی خاص گل ہے؟"

"خاص گل تو نہیں۔ پر مجھے، تجھ سے سخت گلہ ہے۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"مجھ سے گلہ ہے؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

"تو نے زینت کو اپنی حویلی میں کیوں چھپا کر رکھا؟" احسان شاہ نے تلخی سے کہا۔ "تیں نوں پتہ ہے، وہ میرے کوٹ سے فرار ہو کر تیرے پنڈ پہنچی تھی۔ تو نے اسے میرے پاس پہنچانے کی بجائے پناہ دے کر اپنے پاس ٹھیرا لیا۔"

"وہ تو ان دنوں حویلی میں پہنچی جب میں پنڈ میں تھا ہی نہیں۔ مراد خاں شاہانی کے پاس بھکر میں تھا۔ شاہانی سے پوچھ لے۔ زینت کو تو جمیلہ نے پناہ دی تھی۔ مجھے تو واپسی پر اس کے بارے میں پتہ

چلا۔" رحیم داد نے باور کرانے کی کوشش کی۔ "شاہ جی میں تجھ سے غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ ویسے بھی میں نے زینت سے کیا لینا ہے۔"

احسان شاہ نے پوچھا۔ "اب زینت کہاں ہے؟" اس کے رویئے سے صاف عیاں تھا کہ وہ رحیم داد کی صفائی سے مطمئن ہو گیا ہے۔

"وہ جلیل کے ساتھ دیپال پور چلی گئی۔ یہ تو تجھے پتہ ہی ہو گا جلیل اس کا گھر والا ہے۔ تیرے پاس تو وہ آیا بھی تھا۔"

"آیا تو تھا۔ تھانے دار زماں خاں کا خط لے کر آیا تھا۔ زینت اپنے گھر والے کے ساتھ چلی گئی۔ چلو یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔ تھی بھی ایک دم ٹھنڈی۔ پتھر کی طرح بے جان۔ ہر دم روتی ہی رہتی تھی۔"

"شاہ جی' میرا کہا مان' ایسی زنانی اپنے کوٹ میں نہ رکھا کر۔"

"ویسے تو عام طور پر ہر زنانی جب نئی نئی آتی ہے تو ایسے ہی ٹسوے بہاتی ہے۔ بعد میں سب راضی خوشی ہو جاتی ہیں۔" احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ "پر اب تو میں نے کوٹ کا بہت سا کوڑا کرکٹ صاف کر دیا۔ جو بھی مزارع اپنی گھر والی لینے آیا اس سے سودا طے کیا' رقم وصول کی اور اس کا بازو اسے واپس دے دیا۔"

"تو سچ کہہ رہا ہے شاہ جی؟" رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں حیرت سے کہا۔ "پر تو نے ایسا کیوں کیا؟"

"چوہدری' بات سچی یہ ہے۔ کئی کئی سال سے کوٹ میں پڑی تھیں۔ ان پر خرچ بھی بہت آ تھا۔ ادھر مجھے روپے کی سخت ضرورت بھی پڑ گئی۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "زمین خریدنے کا ارادہ ہے؟"

"زمین تو اپنے پاس پہلے ہی بہت ہے۔ لہور میں کوٹھی خریدی ہے۔ اگلے مہینے لندن سے میرا پتر رحمان شاہ آ رہا ہے۔" اس کے چہرے پر خوشی سے سرخی بکھر گئی' آنکھیں جگ مگانے لگیں۔ "بیرسٹر بن گیا ہے۔ لہور ہی میں رہے گا۔"

"ادھر کیوں رہے گا؟" رحیم داد کے انداز میں استعجاب تھا۔

"اسے وہاں پریکٹس جو کرنی ہے۔ اب مجھے اپنے مکدموں کے لیے وکیلوں کے نخرے نہیں اٹھانے پڑیں گے۔" احسان شاہ مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔ "ویسے میں اسے سیاست میں بھی لا چاہتا ہوں۔ اس کا بھی ایسا ہی ارادہ ہے۔ چوہدری! سچ پوچھ تو سارے ہی سیاسی لیڈر عام طور پ وکیل یا بیرسٹر ہی ہوتے ہیں۔ انہیں کسی کی نوکری چاکری تو کرنی نہیں ہوتی' اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ وکالت اور بیرسٹری بھی بہت آزاد پیشہ ہے۔"

رحیم داد کو نہ سیاست سے دلچسپی تھی' نہ وکالت سے اور نہ ہی وکالت کے پیشے کی آزادی سے۔ اس نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا اور وہسکی سے شغل کرتا رہا۔ دونوں ہی خاموش تھے۔

کچھ دیر بعد احسان شاہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "معاف کرنا چوہدری' میں آج تیرے ساتھ زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا۔"

"کیوں شاہ جی؟" رحیم داد تجسس سے بولا۔ "بات کیا ہے؟ ابھی رات تو اتنی زیادہ نہیں ہوئی۔"

"گل ایہہ اے جی۔" احسان شاہ مسکرا کے بولا۔ "میں نے آج اندر حویلی میں اپنی چھوٹی گھر والی کے ساتھ روٹی کھانی ہے۔ وہ تین مہینے سے اوپر میکے میں رہ کر ملتان سے سویرے ہی آئی ہے۔"

"چلا جانا۔ ابھی تو رات شروع ہوئی ہے۔"

"نہیں' اب مجھے جانے دے۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ "شام ہی کو اس نے مجھے کہہ دیا تھا' انتظار کر رہی ہو گی۔ وڈے گھر کی ہے۔ نخرے بھی اس کے اتنے ہی وڈے اور اونچے ہیں۔"

"جیسی تیری مرضی۔" رحیم داد نے مزید اصرار نہ کیا۔ اس نے اپنا گلاس اٹھایا' ہونٹوں سے لگایا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔

☆

رحیم داد گرم کمرے میں تنہا بیٹھا تھا۔ قاب سے تلے ہوئے مرغ کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا رہا۔ کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ باہر ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ پہر رات گزر گئی۔ رحیم داد ترنگ میں تھا اور اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ آہستہ سے دروازہ کھلا۔ رحیم داد نے مڑ کے دیکھا' رجتے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہی ہے۔ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی آتش دان کے قریب پہنچی اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دھسّا اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کے باوجود سردی سے کپکپا رہی تھی۔ اس نے اپنا بدن قدرے ترچھا کیا اور دونوں ہاتھ دہکتے ہوئے انگاروں پر پھیلا دیئے۔

"آج سردی بہت زبردست ہے۔" خاموشی میں رجتے کی آواز ابھری۔

رحیم داد نے نظریں اٹھا کے رجتے کو دیکھا۔ اس کا سانولا چہرہ انگاروں کی سرخ روشنی میں تانبے کے مانند دمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کاجل تھا۔ تیل سے سر کے بال چمک رہے تھے۔ وہ سرخ

کنارے کا سبز لاچا باندھے ہوئے تھی اور نیچی نظروں سے آتش دان میں دہکتے ہوئے لال لال انگارے دیکھ رہی تھی۔ رحیم داد مسکرا کر بولا۔ ”رحمتے کیہہ حال اے؟ آج بہت سست لگ رہی ہے۔“

رحیم داد کی جانب نظریں اٹھائے بغیر وہ بولی۔ ”آج میرا جی ٹھیک نہیں ہے۔“

”فیر کیوں چلی آئی؟“ رحیم داد جھوم کر ہنسا۔ ”رحمتے! لگتا ہے‘ اب تو بوڑھی ہو گئی ہے۔“

رحمتے نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”شاہ جی بھی یہی کہتا ہے۔“

رحیم داد نے رحمتے کو دیکھا۔ ”مجھ سے بھی یہی کہہ رہا تھا۔“

”اب تو وہ ایسی ہی گلاں کرے گا۔“ رحمتے تلملا گئی۔ ”آٹھ سال پہلے جب میں اس حویلی میں آئی تھی تب ایسی نہیں تھی۔“ اس کا چہرہ راکھ بن گیا۔ ”ان دنوں تو شاہ جی بہت پیار جتاتا تھا۔ کہتا تھا‘ میں تیرے بناں نہیں رہ سکتا۔ تجھ سے ویاہ کرلوں گا۔ زمیں دارنی بنا کر رکھوں گا۔“

”ایسا ارادہ تھا تو اس نے تجھ سے ویاہ کیوں نہیں کیا؟ اسے کون روک سکتا تھا؟“

”روک تو نہ جب اسے کوئی سکتا تھا‘ نہ اب۔“ رحمتے کے لہجے میں زیادہ تلخی پیدا ہو گئی۔ ”چوہدری! سچی بات تو یہ ہے۔ وہ مجھ سے کیسے ویاہ کر سکتا تھا؟ میں کسی وڈے زمیں دار یا جگیردار کی تو دھی ہوں نہیں۔ شاہ جی وڈا زمیں دار ہے اور وڈے زمیں دار کا ویاہ وڈے زمیں دار ہی کی دھی سے ہو سکتا ہے۔“ وہ نظریں جھکا کے سرخ سرخ شعلے تکنے لگی۔ ”میرا پیو تو کمی تھا۔ وہ کنوئیں سے ریت مٹی نکالنے والا ٹوبھا تھا۔ ٹوبھے کی کڑی وڈے زمیں دار کی گھروالی کیسے بن سکتی ہے؟ وہ تو صرف اس کا بستر ہی گرم کرنے کے کام آ سکتی ہے۔“

رحیم داد کو پہلی بار اس حقیقت کا اندازہ ہوا کہ کوٹ کی قیدی عورتوں میں رحمتے جس قدر سفاک اور سخت گیر مشہور ہے‘ اندر سے ایسی ہے نہیں۔ یہ بھی غم زدہ اور زخم خوردہ ہے۔ رحیم داد نے رحمتے سے دریافت کیا۔

”شاہ جی نے تجھے بھی اٹھوایا ہو گا؟“

”نہیں جی! میں تو منٹگمری کے مہاجر کیمپ میں تھی۔“ رحمتے نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”بالکل اکیلی اور بے سہارا۔“

”تیرا ادھر کوئی نہیں تھا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔ ”تو مہاجر ہے ناں‘ پر تو پاکستان پہنچی کیسے؟“

”کیا کرے گا سن کر۔ اب تو یہ بہت پرانی گل ہو گئی۔“ رحمتے آتش دان کے قریب فرش پر بیٹھ گئی۔ ”میں توں اب تک یاد ہے۔ وہ جمعے کا دن تھا۔ شاہ جی رضا کاروں کے ساتھ کیمپ میں آیا۔ وہ مہاجرین میں لنگر بانٹنے کے لیے دیگیں بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔“ رحمتے کے لبوں پر زہرخند نمودار ہوا۔ ”رضا کار لنگر بانٹتے تھے اور شاہ جی لٹے پٹے بے سہارا اور بے گھر مہاجروں کے حوصلے بڑھاتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو لا کر بہت ہم دردی جتاتا تھا۔ میں اب تک اس کی وہ باتیں نہیں بھولی۔ کیسا نیک اور بھلا بندہ لگتا تھا۔“

”پر تو کیسے شاہ جی کے ہتھے چڑھ گئی؟“

”وہ ایسا ہوا جی۔ کیمپ سے واپسی پر شاہ جی اپنی حویلی میں کام کاج کے لیے تین پناہ گیر زنانیوں کو بھی ساتھ لے گیا۔ دو کو تو اس نے خراب کر کے اپنے مزارعوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔ شاہ جی پیار جتاتا تو مست ہو کر کہتا تو ماجھے دی جٹی ہے۔“ رحمتے نے شرم سے نظریں جھکا لیں۔ ”ویسے جی! میں ماجھے ہی کی ہوں۔ فسادات ہوئے اور میرے پنڈ پر رات کے اندھیرے میں حملہ ہوا تو میں گھر سے نکل کر فصلوں میں چھپ گئی۔ بعد میں ایک کافلے کے ساتھ کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گئی۔“ اس نے گردن کو خم دے کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”شاہ جی بتاتا تھا‘ تو بھی گورداس پور کا مہاجر ہے۔ اس نے تیرے بارے میں ٹھیک ہی بتایا ناں؟“

”شاہ جی نے ٹھیک کہا۔ میں بھی مہاجر ہوں۔“ رحیم داد نے آہستہ سے گردن ہلائی۔ چند لمحے خاموش رہا‘ پھر اس نے اچانک بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔ ”تب تک تیرا ویاہ نہیں ہوا تھا؟“

”کیوں نہیں ہوا تھا۔ دو بچے بھی تھے۔“ وہ نہایت اطمینان سے بولی۔ ”میرا گھروالا لوہار تھا۔ اس کا ٹھیک ٹھاک کام چلتا تھا۔“

”وہ بھی پاکستان آیا یا دوسرے مسلمانوں کی طرح ادھر ہی شہید کر دیا گیا؟“

”وہ بھی بچ بچا کر پاکستان آ گیا تھا۔“ رحمتے نے گہری سانس بھری۔ ”مجھے ڈھونڈتا ہوا شاہ جی کے پاس آیا تھا۔ بچے بھی اس کے ساتھ ہی تھے‘ پر شاہ جی نے مجھے اس سے نہیں ملنے دیا اور نہ جانے دیا۔ وہ مجھے لینے ہی کے لیے یہاں آیا تھا۔“

”پر تو نے تو اس کے ساتھ جانے کی کوشش کی ہو گی۔“ رحیم داد نے رحمتے کی آنکھوں میں جھانک کر ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔ ”وہ تیرا گھروالا تھا‘ تیرے بچوں کا پیو تھا اور انھیں اپنے ساتھ بھی لایا تھا۔“

”چوہدری! اب تجھ سے جھوٹ کیا بولنا۔“ رحمتے کے لہجے میں رقت پیدا ہو گئی‘ آنکھوں کے چراغ دھندلے پڑ گئے۔ ”میں خود اس کے ساتھ جانے پر تیار نہیں ہوئی۔ ان دنوں شاہ جی مجھے اتنا پیار کرتا تھا جیسے میرے لیے دیوانہ ہو گیا ہو۔ اس کے پیار نے مجھے اندھا کر دیا تھا‘ نہ بچے یاد آئے‘

نہ گھر والا۔ نہ ماں جائی' نہ آگے کی سوجھی۔ لگتا ہے جیسے شاہ جی نے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "بہت برا کیا۔ میں نے بہت برا کیا۔"

"ایسا نہ سوچ۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔" رحیم داد نے ہمدردی سے کہا۔ "تجھے شاہ جی سے ناراض نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے تو لگتا ہے شاہ جی اب تک تجھ سے پیار کرتا ہے۔ تجھے کوٹ کا انچارج لگا رکھا ہے۔ یہ معمولی گل ہے؟"

"چوہدری! تیں نوں کچھ پتہ نہیں۔" رحمتے کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔ "ناراض ہوتا ہے تو غصے میں ٹھڈے مارتا ہے۔ زمین پر گرا دیتا ہے' بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہے۔" اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر کولھے پر رکھا۔ "میری کمر میں ایسے ہی درد نہیں ہوتا۔ شاہ جی نے ایک بار غصے میں زور زور سے ٹھڈے مارے۔ اس کے بوٹ سے میری پسلیاں دب گئیں تھیں۔ ہفتے بھر تک بستر پر پڑی رہی' اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔"

"شاہ جی تجھ سے اتنا ناراض کیوں ہو گیا تھا۔" رحیم داد نے کریدا۔ "کوئی نہ کوئی تو اتنے زبردست غصے کی وجہ ہو گی؟"

"وہ جی ہوا یہ کہ کوٹ سے ایک زنانی بھاگ گئی۔ ان دنوں کوٹ کے دروازے پر ایک ہی راکھا ہوتا تھا۔ رات کو اسے اونگھ آ گئی۔ میں بھی سو گئی تھی۔ وہ چپکے سے نہ جانے کب نکل گئی۔"

"پر تیرا اس میں کیا قصور ہوا؟ تو رات بھر تو جاگنے سے رہی۔ تجھے تو سونا ہی تھا۔ اس میں کون سی غلط بات ہوئی؟"

"شاہ جی تو یہ نہیں سمجھتا۔ سویرے اسے پتہ چلا تو ایسا گرم ہوا کہ بالکل پاگل ہو گیا۔ راکھے کو تو اس نے الٹا لٹکا کر کرندوں سے پٹوایا۔" رحمتے کا چہرہ مرجھا گیا۔ "مجھے اس نے کمرے میں بند کیا اور ٹھوکروں سے مار لگائی۔ غصے سے اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔"

"پچھلے دنوں زینت بھی تو یہاں سے بھاگ گئی تھی۔ تب بھی شاہ جی نے تجھے اس طرح مار لگائی ہو گی؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"وہ کوٹ سے نہیں' مہمانوں کے کمرے سے بھاگی تھی۔" رحمتے نے وضاحت کی۔ "شاہ جی نے اس کے بھاگنے پر شیدے کو ایسی دبا کے مار لگائی کہ اب تک منجی سے نہیں اٹھا۔ ایک ہاتھ ٹوٹ گیا۔ اس پر پٹی بندھی ہے۔ ہر دم پڑا ہائے ہائے کرتا ہے۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تبھی تو شاہ جی نے ادھر میری ڈیوٹی لگائی ہے۔ مجھے تو کوٹ کے اندر زنانیوں کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنی ہوتی ہے۔"

"جبھی شیدا نظر نہیں آیا۔ ایک دوسرا ہی بندہ اس کی جگہ ہر کام کرتا رہا۔" رحیم داد نے قدرے تامل کے بعد رحمتے سے دریافت کیا۔ "تجھ سے تو شاہ جی نے کچھ نہیں کہا؟" مگر سوال کا جواب ملنے سے پہلے اس نے خود ہی صفائی پیش کی۔ "ویسے تیری تو غلطی بھی نہیں تھی۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے جی۔" رحمتے کے چہرے پر خوف کی پرچھائیں منڈلانے لگی۔ "وہ مجھ سے بھی سخت ناراض ہوا۔ مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ غصے سے آنکھیں نکال کر ایسے زور سے ٹھڈا مارا کہ میں گر پڑی۔ پر اس کے بعد کچھ نہ بولا۔"

"پر شیدے کی تو اس نے زبردست پٹائی کی۔ تجھے تو صرف ایک ٹھڈا مار کر چھوڑ دیا۔"

"بعد میں اس نے جو چوٹ لگائی' وہ ٹھڈے سے بھی زیادہ سخت تھی۔"

"کیا کیا اس نے؟" رحیم داد کے لہجے میں تجسس تھا۔

"تیں نوں پتہ ہے' اس نے مجھے کیا کہا۔" رحمتے آتش دان میں دہکتے ہوئے انگارے تکنے لگی۔ "پہلے تو وہ ننگی ننگی گالاں نکالتا رہا۔ فیر غصے سے چیخا' تو اب بڈھی ہو گئی ہے' بالکل بڈھی کھوسٹ۔ میں نوں ایسی رن کی ضرورت نہیں۔ تو یہاں سے چلی جا۔ میں تیرا اور تیرے بچوں کا خرچا اب نہیں اٹھا سکتا۔ سن لیا تو نے چوہدری۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ قریب رکھا ہوا پوکر اٹھایا اور لکڑی کا دستہ پکڑ کر لوہے کے آنکڑے سے راکھ کی تہہ کے نیچے دبے ہوئے انگارے کریدنے لگی۔ آتش دان میں آنچ تیز ہو گئی۔ کوئلے دہکنے لگے۔ کمرے میں بکھری ہوئی سرخی گہری ہو گئی۔ "تو ہی انصاف سے بتا۔ بچے میں اپنے ساتھ تو نہیں لائی تھی۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ مگر رحمتے زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکی۔ "چوہدری' تو کیا سوچنے لگا؟"

"سوچ رہا تھا' شاہ جی نے اگر تجھے نکال دیا تو کہاں جائے گی؟"

"یہی تو میں سوچتی رہتی ہوں۔" اس کی آواز میں کسک تھی۔

"یہ بتا رحمتے! تیرا گھر والا اب کہاں ہے؟"

"میں نوں تو جی اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ جانے زندہ ہے کہ مر گیا۔" رحمتے نے بتایا۔ "تیں نوں ملوم ہے' میں تو حویلی سے باہر جاتی ہی نہیں۔ شاہ جی کی بالکل اجازت نہیں۔"

"شاہ جی تجھے تنخواہ شنخواہ بھی دیتا ہے؟"

"توبہ کرو جی! وہ کیا تنخواہ دے گا۔ کبھی ایک پیسہ بھی نہیں دیتا۔" وہ لمحے بھر خاموش رہی۔ "پر اتنا ضرور ہے' مہمانوں سے کبھی کبھار کچھ مل جاتا ہے۔ سردار مراد خاں شاہانی وڈے دل والا ہے۔" اس کے بجھے ہوئے چہرے پر اجالے کی رمق ابھری۔ "ایک بار تو اس نے مجھے اکٹھے تیسہ

روپے دیئے۔"

رحیم داد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس دس کے تین نوٹ نکالے اور رحمتے کی طرف بڑھاتے ہوئے مسکرایا۔ "لے یہ بھی تیس روپے ہیں۔ اب تو راضی خوشی ہے۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "انہیں رکھ لے اور اب جا کے آرام کر۔"

رحمتے نے نوٹ لے کر لاچے کے ڈب میں نہایت احتیاط سے رکھے۔ اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ "تو ابھی جاگ رہا ہے ناں؟" وہ رازدرانہ لہجے میں بولی۔

رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔ "کیوں کیا بات ہے؟"

رحمتے کچھ نہیں بولی۔ مڑی اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔

☆

رحیم داد خاموش بیٹھا وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ آتش دان میں انگارے دہک رہے تھے۔ ان کی سرخ سرخ روشنی در و دیوار پر بکھری ہوئی تھی۔ کمرہ خوب گرم تھا اور رحیم داد نشے سے جھوم رہا تھا۔

دروازہ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ رحیم داد نے چونک کر دیکھا ہے۔ سامنے رحمتے کھڑی ہے۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "چوہدری! آ میرے ساتھ۔"

رحیم داد اٹھا مگر لڑکھڑا کر پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ "مجھے کہیں نہیں جانا۔" اس نے بے زاری سے کہا۔

"چوہدری' تو نے آج بہت پی رکھی ہے۔" رحمتے نے مسکرا کر کہا۔ "تجھے اب اپنے کمرے میں چل کر آرام کرنا چاہیے۔" وہ آگے بڑھی اور رحیم داد کے قریب پہنچ گئی۔ "چوہدری اب کھڑا ہو جا۔"

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحمتے نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو تھام لیا۔ دونوں سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے اور برآمدے میں آ گئے۔

ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ شدید سردی تھی۔ ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ دونوں سردی سے کپکپاتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کے قدموں کی آہٹ گہرے سناٹے میں رک رک کر ابھری رہی تھی۔

برآمدے کے آگے باغیچہ تھا۔ باغیچے کی بیرونی چار دیواری کے پاس سرس کے ایک گھنے درخت کے نیچے کوٹھری تھی۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا۔ دہلیز کے پاس پہرے دار چادر اوڑھے خاموش بیٹھا

آگ تاپ رہا تھا۔ آہٹ سن کر وہ زور سے کھنکارا۔ نظریں اٹھا کر اس نے برآمدے کی سمت دیکھا اور قریب رکھی ہوئی لالٹین اٹھائی۔

"کون ہے؟"

رحمتے بڑھتی ہوئی برآمدے کے آخری سرے پر پہنچ گئی۔ ایک کمرے کے دروازے کے سامنے ٹھہر کے اس نے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری' میں نے اب کوٹ میں جانا ہے۔" اس نے پہرے دار کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "نواز موجود ہے۔ تیرے کمرے کے دروازے پر کوئی راکھا نہیں رہے گا۔ آج سردی بہت زیادہ ہے۔" اس نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ "نواز رات بھر جاگتا رہے گا۔ کوئی ضرورت ہو تو اسے کہہ دینا۔ میں اب سویرے تیرے پاس آؤں گی۔ تیں نوں پتہ ہے۔ شیدا بیمار ہے' تیری دیکھ بھال میں نے ہی کرنی ہے۔" رحمتے نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کا ایک پٹ کھولا۔ "اب تو اندر جا۔" رحیم داد کمرے میں چلا گیا۔

رحمتے باہر رہ گئی۔ رحیم داد نے دروازہ بند کر لیا۔ کمرہ خاصا کشادہ تھا۔ اس کے دو حصے تھے۔ آگے کے حصے میں پرانی وضع کا بھدا سا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ میز تھی' کرسیاں تھیں۔ پچھلے حصے میں خواب گاہ تھی۔ دونوں حصوں کے درمیان پردہ پڑا ہوا تھا۔ رحیم داد نے پردہ ہٹایا اور خواب گاہ میں چلا گیا۔ ایک کونے میں اونچا اسٹول تھا۔ اس پر لیمپ روشن تھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں مسہری تھی۔ مسہری کے سرہانے کھڑکی تھی' وہ بند تھی۔ مسہری سے ذرا ہٹ کر پختہ چبوترا تھا۔ چبوترے کے اوپر دیوار میں مختصر روشن دان تھا۔ چبوترے پر رکھی ہوئی انگیٹھی میں انگارے دہک رہے تھے۔

رحیم داد نے لیمپ کی روشنی میں دیکھا' انگیٹھی کے پاس فرش پر ایک نوجوان عورت سر جھکائے بیٹھی ہے۔ وہ کھیس اوڑھے تھی۔ انگاروں کی گہری سرخ روشنی میں اس کا چہرہ گلابی نظر آ رہا تھا۔ رحیم داد انگیٹھی کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ عورت سکڑی سمٹی چپ بیٹھی رہی۔ رحیم داد نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"تیرا ناں کیہ ہے؟"

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میرا ناں جی ہاجراں ہے۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا نہیں۔ اس کی آنکھوں میں دنبالہ کاجل اور بالوں میں تیل تھا۔ رحیم داد نے ہاتھ بڑھایا اور ہاجرہ کے سر سے جھٹ کھیس ہٹا دی۔ اس کا پورا چہرہ سامنے آ گیا۔ وہ بری طرح گھبرا گئی۔ اس کا بدن اور سمٹ گیا۔ اس کے چہرے سے اضطراب عیاں تھا۔ رحیم داد مسکرا کر بولا۔ "ذرا گردن تو اونچی

کر۔" مگر اس نے گردن نہ اٹھائی بلکہ کچھ اور سکڑ گئی۔

رحیم داد نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر کیا۔ ہاجراں کی پلکیں جھکیں ہوئی تھیں۔ آنسوؤں کے دو قطرے ڈھلک کر اس کے رخساروں پر بکھر گئے۔

"ارے' تو رو رہی ہے۔" رحیم داد بجھے ہوئے انداز میں بولا۔ "لگتا ہے نئی نئی یہاں آئی ہے۔"

وہ چپ بیٹھی رہی۔ رحیم داد کی کیفیت لحہ بہ لحہ بدل رہی تھی۔ نشے کا ایسا تیز ریلا آیا کہ اس پر وحشت طاری ہو گئی۔ اس نے جھنجلا کر ہاجراں کی کھیس کھینچ کر ایک طرف پھینک دی۔ ہاجراں دوپٹہ نہیں اوڑھے ہوئے تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے آپ کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ پھول دار جھگی پہنے ہوئے تھی۔ لاچا ہلکا نیلا تھا۔ پنڈلیوں میں چاندی کی پڑیاں پڑی تھیں۔

رحیم داد ڈگمگا کر کرسی سے گرتے گرتے بچا۔ اس نے خود کو سنبھالا اور جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکال کے ہاجراں کی طرف بڑھائے۔ "لے یہ رکھ لے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "رکھ لے۔"

ہاجراں نے نوٹوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا' عاجزی سے بولی۔

"میں کنجری نہیں ہوں۔"

"تو کوئی بھی ہو' اب تو یہاں آہی گئی۔"

"میں اپنی مرضی سے تو نہیں آئی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں تو اپنے گھر میں منجی پر بیٹھی تھی۔ گھر والا فصلوں کو پانی لگانے کے لیے آڈ کا نکا کھولنے گیا تھا۔ پانی لگانے کی اس کی باری رات ہی کو آتی ہے۔"

ہاجراں کی عاجزی سے رحیم داد متاثر نہ ہوا۔ اس نے مسکرا کر بے نیازی سے پوچھا۔ "تو گھر میں بالکل اکیلی تھی؟"

"ہاں جی اکیلی تھی' یہی سمجھ لو۔ دونوں بچے بہت چھوٹے ہیں۔"

"فیر کیا ہوا؟" رحیم داد نخوت سے بولا۔

"مجھے تین بندے دہڑے کی دیوار پر نظر آئے۔" ہاجراں سہمے ہوئے انداز میں بولی۔ "اس وکھت میری آنکھ کھلی ہوئی تھی۔ ان کے منہ پر منڈاسے بندھے تھے۔ وہ دیوار سے اتر کر نیچے آ گئے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر جھٹ میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔"

"فیر تو نے کیا کیا؟"

"وہ مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے۔" ہاجراں ٹھنڈی سانس بھر کے بولی۔ "میرا گھر والا جانے کیا سوچتا ہو گا' بچوں کا کیا حال ہو گا۔"

"گھر والے کو پتہ نہیں' تو یہاں ہے؟"

"لگتا ہے' اسے پتہ نہیں۔ اسے پتہ ہوتا تو مجھے لینے ضرور آتا۔"

"ہاجراں! تیرے گھر والے کا کیا نام ہے؟"

"اس کا نام عالم ہے۔ کیا تو اسے جانتا ہے؟"

"نہیں! رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور چند لمحوں تک خمار آلود نظروں سے گھورتا رہا' پھر اس نے جھک کر اچانک ہاجراں کا بازو پکڑا۔ "باتیں بند کر۔ رات بہت ہو گئی ہے۔"

ہاجراں نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر رحیم داد کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ رحیم داد گہری نیند سو رہا تھا۔ یکایک کمرے میں آہٹ ہوئی۔ رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ گہری خاموشی میں ایسی آواز سنائی دی جیسے بلی آہستہ آہستہ غرا رہی ہو۔ رحیم داد نے دوبارہ سونا چاہا لیکن اس کی نیند اچاٹ ہو چکی تھی۔ اس نے کروٹ بدلی تو محسوس ہوا کہ ہاجراں کمرے میں نہیں ہے۔ رحیم داد نے سوچا' سویرا ہو گیا ہے۔ مگر باہر گہرا سکوت تھا۔ وہ کچھ دیر لیٹا غور کرتا رہا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لیمپ اسٹول کے بجائے فرش پر رکھا تھا اور اسٹول غائب تھا۔

رحیم داد نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ایک بجنے والا تھا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا۔ مگر ہاجراں کہیں نظر نہیں آئی۔ البتہ انگیٹھی کے پاس اس کی کھیس پڑی تھی۔ رحیم داد گھبرا کر بستر سے نیچے اترا' جوتے پہنے اور فوراً کمرے کے دوسرے حصے کی جانب بڑھا۔ پردہ سرکا ہوا تھا۔ رحیم داد نے آگے بڑھ کر دیکھا' خوف اور دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

رحیم داد کی آنکھوں کے سامنے نہایت ہول ناک منظر تھا۔ ہاجراں چھت سے لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے پیروں کے نیچے اسٹول پڑا تھا۔ ہاجراں کے نیلے لاچے کا ایک پلو چھت کی کڑیوں میں ایک کنڈے سے بندھا تھا اور دوسرے پلو کا پھندا بنا کر اس نے اپنی گردن میں ڈال لیا تھا۔ ہاجراں کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ زبان ہونٹوں کے بائیں گوشے سے لٹک رہی تھی۔ اس کا گلابی چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا اور گردن کھنچ کر لمبی ہو گئی تھی۔

رحیم داد بدحواس ہو کر کمرے سے باہر نکلا اور برآمدے میں پہنچ گیا۔ سرد ہوا کا تیز جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ مگر اس نے سردی کی پروا نہیں کی' تیزی سے پہرے دار نواز کی کوٹھری کی

جانب بڑھا۔ نواز سلگتی آگ کے سامنے بیٹھا تھا۔ رحیم داد قریب پہنچا' تو وہ پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"چوہدری! توں اتنی رات کو ادھر کیسے آگیا؟ بہت گھبرایا ہوا نظر آرہا ہے۔ گل کیہہ اے؟"

"شیدا کدھر ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"وہ تو جی بیمار پڑا ہے۔ کئی روز سے نہیں آیا۔"

رحیم داد کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "میں نوں پتہ ہے' وہ بیمار ہے۔ میرا مطلب ہے' رحمتے کہاں ہے؟ تو جا کر اسے فٹافٹ بلا لا۔"

"کوئی خاص گل ہے جی؟" نواز نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔

"خاص ہی گل ہے۔ بعد میں بتاؤں گا۔ تو پہلے رحمتے کو یہاں بلا کر لا۔"

نواز نے مستعدی سے اپنی ملگجی چادر سر اور کانوں کے گرد لپٹی' سردی سے کپکپا کر بولا۔

"چوہدری! تو نے چدر بھی نہیں اوڑھ رکھی۔" رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ گم صم کھڑا رہا۔ نواز آگے بڑھا اور درختوں کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

رحیم داد کوٹھری میں چلا گیا۔ دہلیز کے پاس اپلے سلگ رہے تھے۔ رحیم داد نے دونوں ہاتھ جھٹ آگ پر پھیلا دیئے۔ ہوا درختوں میں سرسراہٹ پیدا کر رہی تھی۔ ہر طرف ویرانی تھی' سناٹا تھا۔ رحیم داد خوف زدہ نظروں سے بار بار کمرے کی جانب دیکھتا۔ کمرے کے دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔

درختوں تلے آہٹ ابھری۔ رحیم داد نے قریب رکھی ہوئی لالٹین کی دھندلی روشنی میں دیکھا' رحمتے اونی دھسا اوڑھے تیز تیز قدم اٹھاتی حیران و پریشان کوٹھری کی طرف آ رہی ہے۔ نواز بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں کپکپا رہے تھے۔ رحمتے نے قریب پہنچ کر پوچھا۔

"چوہدری! تو نے مجھے بلایا ہے؟" اس کی آنکھیں کچی نیند سے جاگنے کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے رحیم داد کو غور سے دیکھا۔ "چوہدری' تو یہاں کیوں بیٹھا ہے؟ تجھے تو کمرے میں ہونا چاہیے تھا۔ ہاجراں کدھر ہے؟"

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کوٹھری سے نکلتے ہوئے اس نے رحمتے سے کہا۔ "میرے ساتھ کمرے میں آ۔" وہ آگے بڑھا۔ رحمتے اس کے پیچھے پیچھے چلی۔ نواز بھی ان کے ساتھ تھا۔ تینوں نے باغیچہ طے کیا اور سیڑھیوں پر چڑھ کر برآمدے میں پہنچے۔

رحیم داد کمرے کے دروازے پر ٹھٹک گیا۔ رحمتے کو مخاطب کر کے اس نے کہا۔ "اندر جا کر دیکھ۔"

رحمتے اور نواز کمرے میں چلے گئے۔ رحیم داد بھی سہما ہوا ان کے پیچھے پیچھے بڑھا مگر دہلیز کے قریب رک گیا۔ سامنے چھت سے ہاجراں کی برہنہ لاش لٹکی ہوئی تھی۔ رحمتے کے چہرے سے وحشت برسنے لگی۔ "ہائے ربا' یہ کیا ہوا؟" رحمتے نے سراسیمہ ہو کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔

"چوہدری! یہ کیا ہو گیا؟"

"میں تو سو رہا تھا۔" رحیم داد نے بے چارگی اور بے بسی سے کہا۔ "کھٹ پٹ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔" اس نے فرش پر پڑے ہوئے اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔ "لگتا ہے یہ گرا تھا۔"

رحمتے پردہ سرکا کر خواب گاہ میں گئی۔ بستر سے چادر اٹھا کر لائی' میز پر چڑھی۔ اس نے جلدی جلدی ہاجراں کی برہنہ لاش کے گرد چادر لپیٹ دی۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ رحمتے جلد ہی کمرے سے باہر چلی گئی۔ نواز بھی اس کے ساتھ نکل کر برآمدے میں آگیا۔ رحمتے نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ کچھ دیر برآمدے میں سہمی ہوئی کھڑی رہی۔ رحیم داد اور نواز کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

رحمتے نے دھسا ایک بار پھر اچھی طرح اپنے بدن پر لپیٹا اور رحیم داد سے بولی۔ "چوہدری میں شاہ جی کو جا کر خبر کرتی ہوں۔" اس کے لہجے میں تھرتھراہٹ تھی۔ "پر وہ ایک دم گرم ہو جائے گا۔ ننگی ننگی گالاں نکالے گا۔"

"تیری اس میں کیا غلطی۔" رحیم داد نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "کسی کی بھی غلطی نہیں ہے' یہ تو ہاجراں نے خود کیا ہے۔"

رحمتے نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ "پر شاہ جی کیسے جانے گا۔ نیند سے اٹھنے پر اور سردی میں باہر آنے پر ویسے ہی اسے غصہ چڑھا ہو گا۔ میری ایک نہیں سنے گا۔ بتا چوہدری' میں کیا کروں؟ اس معاملے میں میرا کیا دوش؟"

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "پر ہاجراں نے ایسا کیوں کیا؟"

رحمتے نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ اس کے اودے اودے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ "چوہدری' یہ گلاں چھوڑ' تو نواز کے پاس جا کر بیٹھ۔ میں شاہ جی کے پاس جاتی ہوں۔ فوراً اسے بتانا ہو گا۔ دیر نہیں ہونی چاہئے۔" وہ آگے بڑھی اور تیز قدموں سے چلنے لگی۔

رحیم داد اور نواز کوٹھری میں رہ گئے اور آگ تاپنے لگے۔ دونوں گم صم اور سہمے ہوئے تھے۔ نواز نے آہستہ سے کہا۔ "چوہدری! تو بہت ڈرا ہوا لگ رہا ہے۔ فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

پہلے بھی ایک رن ایسے ہی خودکشی کر چکی ہے۔ پر اس نے گردن میں پھندا نہیں ڈالا تھا۔“

”وہ کون تھی‘ اس نے کیا کیا؟“ رحیم داد نے ہاتھ ملتے ہوئے پوچھا۔

”اس نے تو جی لیمپ سے تیل نکال کر کپڑوں پر چھڑکا‘ کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں آگئی۔“ نواز نے رحیم داد کو بتایا۔ ”برسات کی اندھیری رات تھی۔ اوپر بادل گھرے ہوئے تھے۔ اس نے کپڑوں پر آگ لگالی۔ میں پہنچا تو وہ بہت جل چکی تھی۔ بھوسک رہی تھی۔“

نواز تھا تو ادھیڑ مگر اس کا جسم ابھی تک مضبوط اور کسا ہوا تھا۔ نڈر اور حوصلہ مند بھی تھا۔

رحیم داد نے دہشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

”اس کی لاش شاہ جی نے نہر کے کنارے کئی میل دور ادھر جھنگر میں پھکوا دی تھی۔ رات ہی کو جانوروں نے گوشت نوچ نوچ کر لاش اتنی بگاڑ دی کہ پہچان میں نہیں آتی تھی۔“

”کیا اس بار بھی وہ ایسا ہی کرے گا؟“ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

”پتہ نہیں جی‘ اس دفعہ لاش کا کیا بنے؟“ نواز نے آگ کریدتے ہوئے کہا۔ ”ویسے باغیچے کے اس طرف درختوں کے نیچے پہلے بھی دو لاشیں دبائی گئی تھیں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔ ”ایک کو تو جی نشے میں شاہ جی کے یار نواب امتیاز خاں اعوان نے گلا دبا کر مار ڈالا تھا۔ وہ لہور میں ہوتا ہے۔ پہلے اس کا ادھر بہت آنا جانا تھا۔ پر اب اس کا آنا جانا کم ہو گیا ہے۔ بہت دنوں سے تو آیا ہی نہیں۔ ویسے اس کے پتر سے شاہ جی کی ایک دھی ویاہی ہوئی ہے۔“

رحیم داد سخت پریشان تھا۔ گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”نواز تو یہاں کب سے لگا ہے؟“

”پندرہ سال سے اوپر تو ہو گئے ہوں گے۔“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کے بولا۔ ”ہاں جی اتنا ہی عرصہ ہوا ہو گا۔ پاکستان بننے سے بہت پہلے میں شاہ جی کے پاس لگ گیا تھا۔ ان دنوں تو جی تگڑا جوان ہوتا تھا۔ ساری جوانی یہاں ختم کر دی۔ میں نے کیا کیا نہیں دیکھا؟ رحمتے بھی میرے سامنے ہی آئی تھی۔“

”تو نے رحمتے سے ویاہ کیوں نہ کر لیا؟ تیرے ٹکر کی ہے۔“ رحیم داد نے ذہن کا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے اسے چھیڑا۔

”نہیں جی‘ اب بھی اس کا نکھرا بہت ہے۔ ویسے جی‘ میری اپنی گھر والی ہے۔ حویلی کے اندر نوکرانی ہے۔ وہ رحمتے سے بہت خار کھاتی ہے۔ حویلی کی ساری ہی زنانیاں اور زمیں دارنیاں رحمتے سے خار کھاتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ رحمتے بھی بہت تیز ہے۔ تیں نوں پتہ نہیں‘ بہت کڑوی اور جھگڑالو ہے۔“

☆

برآمدے کے پختہ فرش پر رات کے پرہول سناٹے میں آہٹ ابھری۔ رحیم داد نے دھندلی روشنی میں دیکھا۔ احسان شاہ اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا۔ وہ کمبل اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے پیچھے رحمتے سر جھکائے چپ چاپ چل رہی تھی۔ رحیم داد اور نواز اٹھ کر تیز قدموں سے احسان شاہ اور رحمتے کے قریب پہنچ گئے۔

احسان شاہ نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ مگر خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ کمرے کے دروازے پر جا کر ٹھہر گیا۔ رحیم داد‘ رحمتے اور نواز جہاں تھے‘ وہیں رک گئے۔

احسان شاہ کے اشارے پر نواز نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ احسان شاہ اندر داخل ہوا۔ نواز اور رحمتے نے بھی اس کے ساتھ کمرے کی دہلیز عبور کی۔ رحیم داد دروازے کے باہر ہی کھڑا رہا۔ احسان شاہ نے ہاجراں کی لاش دیکھی اور فوراً کمرے سے باہر آگیا۔ رحمتے بھی باہر آگئی‘ نواز بھی رحمتے نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کر دیا۔

احسان شاہ نے نواز سے کہا۔ ”تو جا کر مہربان علی کو بلا لا۔“

نواز نے لالٹین رحمتے کے حوالے کی اور برآمدے کی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ احسان شاہ نے اسے ٹوکا۔ ”ٹھہر جا۔“ نواز رک گیا۔ احسان شاہ نے کہا۔ ”مہربان کے آنے تک میں دیوان خانے کے پچھلے کمرے میں رہوں گا۔“ اس نے برآمدے میں کھلنے والے دروازے کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”تو مہربان کو پہلے ادھر ہی لانا۔ جب وہ لاش دیکھ لے تب اسے میرے پاس بھیج دینا۔“

نواز چلا گیا۔ احسان شاہ نے رحمتے سے کہا۔ ”رحمتے! تو جا کر کمرے کے آتش دان میں کوئلے سلگا دے۔ میں چوہدری کے ساتھ وہیں آ رہا ہوں۔“

رحمتے نے خاموشی سے لالٹین دیوار کے پاس رکھ دی۔ رحیم داد گم صم تھا۔ رات ڈھلنے لگی تھی‘ سردی بڑھ گئی تھی۔ ہوا میں تیزی اور کاٹ تھی۔ احسان شاہ نے کمرے کے دروازے کی باہر سے کنڈی چڑھا دی اور رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چوہدری‘ میرے ساتھ آ۔“ رحیم داد خاموشی سے اس کے ہم راہ چلنے لگا۔

دونوں کے قدموں کی آہٹ فرش پر آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی۔ رحیم داد سردی سے تھر تھرا رہا تھا۔ دونوں نے برآمدہ عبور کیا‘ کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئے۔ آتش دان میں آگ

روشن تھی۔ رحمتے سر جھکائے پوکرے کوئلے اور لکڑی کے ٹکڑے الٹ پلٹ کر آنچ تیز کر رہی تھی۔

احسان شاہ اور رحیم داد آتش دان کے قریب ہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ رحمتے دونوں سے ذرا ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ احسان شاہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ ابھری اور تیوری پر بل پڑ گئے۔ وہ زور سے دہاڑا۔ "کتّی۔" شدید غصے سے اس کی گھنی مونچھیں ابابیل کے پروں کے مانند پھڑپھڑانے لگیں، آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

رحمتے نگاہیں جھکائے دم بخود کھڑی تھی۔

احسان شاہ برسنے لگا۔ "یہ سب کچھ تیری وجہ سے ہوا۔ توں نے اسی کنجری کو چوہدری کے پاس پہنچانا تھا۔ کوٹ میں کوئی اور رن نہیں تھی؟؟"

رحمتے نے دبی زبان سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "میں نے تو جی یہ سوچا۔۔۔۔"

احسان شاہ نے رحمتے کو پوری بات کہنے کا موقع نہ دیا۔ نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ "بکواس نہ کر۔ تیرا مغز ہی کام نہیں کرتا۔" وہ غصے سے آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ "اب تو بڈھی ہوگئی۔ تجھ سے یہ کام نہیں چل سکتا۔ کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔" وہ غیظ و غضب کے عالم میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ پھر ڈپٹ کر رحمتے سے بولا۔ "تو اب یہاں کیوں کھڑی ہے؟ ادھر جا جدھر لاش لٹک رہی ہے۔ نواز کی کوٹھری میں بیٹھ کر مہران علی کے پہنچنے کا انتظار کر۔"

رحمتے نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا، گردن جھکائے چپ چاپ چلی گئی۔ رحیم داد ہنوز منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ احسان شاہ نے مڑ کر دیکھا اور اس کی دل جوئی کرتے ہوئے بولا۔ "چوہدری، پریشان نہ ہو، سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"شاہ جی! مجھے کیا پتہ تھا، وہ ایسا کرے گی۔" رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔

احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ "لگتا ہے، تو بہت گہری نیند سو رہا تھا۔"

"وہ ایسا ہوا کہ تیرے جانے کے بعد بھی پیتا رہا۔" رحیم داد نے صفائی پیش کی۔ "آج کچھ زیادہ ہی ہوگئی۔ تب ہی تو ایسا بے خبر ہو کر سویا۔ پتہ ہی نہ چلا، وہ کب کمرے سے گئی اور کب اس نے یہ کارروائی کی؟ میری آنکھ تو سٹول کے گرنے سے کھلی جس پر چڑھ کر اس نے اپنی گردن میں پھندا ڈالا تھا۔" رحیم داد نے احسان شاہ کے چہرے کی جانب دیکھا۔ "شاہ جی، ویسے دیکھنے میں تو بہت سیدھی سادی لگتی تھی۔"

"تو ابھی بالکل اناڑی ہے۔" احسان شاہ نے اپنی مونچھ کو انگلیوں سے آہستہ آہستہ مروڑا۔ "ہر زنانی ایک سی نہیں ہوتی۔ کوئی ایک دم ڈھرے پر آجاتی ہے۔ کوئی بہت دھیرے دھیرے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "لگتا ہے یہ بھی ایسی ہی تھی۔ ابھی کچی تھی۔ رحمتے اسے جلد ہی نکال لائی۔ مہینے دو مہینہ کوٹ میں رہتی۔ دوسری زنانیوں سے ملتی جلتی۔ انھیں دیکھتی تو خود ہی ایک دم لائن پر لگ جاتی۔ میں تجھے ایک واقعہ سناتا ہوں۔"

لیکن احسان شان وہ واقعہ نہ سنا سکا۔ مہران علی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا دونوں کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ رحیم داد نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ وہ پستہ قد اور تنومند تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں مگر ان میں تیز چمک تھی۔ ہلکی ہلکی مونچھوں میں سفید بال زیادہ تھے۔ رنگت سرخی مائل گندمی تھی۔ وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھا مگر کاٹھی اچھی تھی۔ وہ اس وقت اونی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔

"لاش تو نے دیکھ لی؟" احسان شاہ نے مہران علی سے پوچھا۔

"دیکھ لی جی۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اسے اتار بھی لیا ہے۔ میں رانا اور علیا کو اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا۔ ویسے راکھا نواز بھی موجود ہے۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟" احسان شاہ نے مہران علی کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ "رات ہی کو سب کچھ کرنا ہے۔" احسان شاہ نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ "چوہدری ٹائم کیا ہوگیا؟"

رحیم داد نے گھڑی دیکھ کر بتایا۔ "اڑھائی بجنے والا ہے۔"

"ٹائم تو اب زیادہ نہیں رہا۔ جو کچھ کرنا ہے، جھٹ پٹ کرنا ہوگا۔" مہران علی نے رسان سے کہا۔ "میں نے تو جی یہ سوچا ہے، سر کاٹ کر کسی جنگل میں دبا دیا جائے اور صرف دھڑ چار پانچ میل آگے نہر میں ڈال دیا جائے۔" وہ نہایت سکون سے سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ اس کا چہرہ جذبات سے خالی تھا۔ "ایسا کرنے سے لاش کے بارے میں سراغ ہی نہ لگ پائے گا۔ ویسے آگے شاہ جی، جیسی تیری مرضی۔"

"کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔" احسان شاہ نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر کہا۔ "پر یہ بھی سوچ لے پولیس آخر پولیس ہی ہوتی ہے۔ اپنے ہی موضعے کی رن ہے۔ پولیس تفتیش کرتی ادھر بھی آسکتی ہے۔ اسے یہ پتہ تو چل ہی جائے گا، کس کی گھر والی ادھر غائب ہوئی ہے۔" اس نے نظریں اٹھا کر غور سے مہران علی کا چہرہ دیکھا۔ "اسے پچھلے ہی ہفتے تو اٹھوایا ہے۔ تازہ تازہ معاملہ ہے گڑبڑ نہ ہوجائے۔ ویسے ہونا ہوانا کیا ہے۔ خاما خا ہزار دو ہزار خرچ ہوجائیں گے۔ مہران کچھ اور ہی ادھر۔"

“سوچنا کیا ہے جی۔” مہربان علی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ “یہیں باغیچے میں گڑھا کھود کر دبا دیتے ہیں۔”

“یہی ٹھیک رہے گا۔ ٹائم بھی زیادہ نہیں۔ تو بھی سارے چکروں سے بچ جائے گا۔” احسان شاہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

“تو فیر جی میں رانا اور علیا کو گڑھا کھودنے پر لگائے دیتا ہوں۔ ابھی تو رات رہتی ہے۔ سناٹا بھی ہے۔ گڑھا کھودنے کی آہٹ بھی نہ ابھرے گی۔”

“ٹھیک ہے ایسا ہی کر۔” احسان شاہ نے سرہلا کر کہا۔ “اب دیر نہ کر۔ یہاں سے جا۔”

مہربان علی خاموشی سے مڑا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

آتش دان میں انگارے خوب دہک رہے تھے۔ کمرے میں بکھری ہوئی روشنی زیادہ گہری سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ احسان شاہ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اس نے منہ پھاڑ کر جماہی لی اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ “کہاں چلا شاہ جی؟”

“چوہدری! میں نوں اب جانا ہے۔ نیند لگ رہی ہے اور میں نے سویرے لہور بھی جانا ہے۔ تو آرام سے یہیں بیٹھا رہ۔ تیرا سامان دوسرے کمرے میں پہنچتے ہی تجھے لینے کوئی نہ کوئی آہی جائے گا۔ چوہدری فکر نہ کر سب ٹھیک ہوجائے گا۔”

احسان علی شاہ دروازے کی جانب بڑھا اور باہر چلا گیا۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ کمرہ اب خوب گرم ہوچکا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہیں سوجائے لیکن کچھ ہی دیر بعد رحمتے کمرے میں داخل ہوئی۔

“چوہدری، میں نے تیرا سامان دوسرے کمرے میں پہنچا دیا ہے۔ چل میں تجھے بھی وہیں پہنچا دوں۔”

کمرے سے باہر نکل کر رحیم داد سردی کی اچانک یلغار سے کپکپانے لگا۔ چند قدموں کے فاصلے پر اس نے دیکھا، برآمدے کی نکڑ پر نواز لالٹین لیے کھڑا ہے۔ اس کی زرد زرد روشنی میں رانا اور علیا ہاتھوں پر ہاجراں کی لاش اٹھائے کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔ مہربان علی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ دور سے تینوں سایوں کی مانند دھندلے نظر آرہے تھے۔ انھوں نے برآمدہ طے کیا۔ باغیچے میں پہنچے اور درختوں کے جھنڈ کی جانب بڑھنے لگے۔

رحیم داد انھیں دیکھتے ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے ان کی سمت دیکھ رہا تھا۔ نواز لالٹین سنبھالے آگے آگے چل رہا تھا۔ رحمتے بھی ٹھہر گئی۔ اس کی نظریں بھی ادھر ہی اٹھی تھیں۔ رانا اور علیا لاش سنبھالے درختوں کی آڑ میں نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ مہربان علی،

اب نظر نہ آتے تھے۔ درختوں کے نیچے لالٹین کی روشنی، دھندلا زرد دھبا بن کر چمک رہی تھی۔ رحمتے زیادہ دور نہ گئی۔ قریب کے ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا۔ رحیم داد اندر چلا گیا۔ رحمتے بھی اندر داخل ہوگئی۔ اس نے دروازہ بند کردیا۔

رحیم داد کو رہ رہ کر ہاجراں کا خیال آرہا تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں، خوف ناک سیاہ چہرہ، ہونٹوں سے باہر نکلی ہوئی زبان اور کھنچی ہوئی لمبی گردن۔ وہ سخت بے چین اور پریشان تھا، بے زاری سے بولا۔

“رحمتے تو جا۔ میں سوجاؤں گا، فکر نہ کر۔”

“سوچ لے۔ تو اکیلا گھبرائے گا تو نہیں۔ ہاجراں کا خیال تجھے زیادہ ہی تنگ کرے گا۔” اس کے لہجے میں ہم دردی تھی، چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ “گھبرا نہیں، تو بول تو ادھر ہی رہ جاتی ہوں۔ تو اپنے بستر پر سو۔ میں دھسّا اوڑھ کر دری پر پڑجاؤں گی۔” اس نے ہاتھ اٹھا کر انگیٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ “یہ تو سلگ ہی رہی ہے۔ کمرہ گرم ہے، مجھے سردی نہیں لگے گی۔”

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ جوتے اتار کر بستر پر لیٹ گیا۔ رحمتے بھی انگیٹھی کے نزدیک ہی اپنا دھسّا اوڑھ کر فرش پر بچھی ہوئی دری پر لیٹ گئی۔ دونوں خاموش تھے۔ باہر تیز ہوا درختوں میں سسکیاں بھر رہی تھی۔ ہوا کے شور کے درمیان رک رک کر کدال سے زمین کھودنے کی آواز رات کے سناٹے میں ابھر رہی تھی۔ کئی منٹ تک یہ آواز ابھرتی رہی۔ پھر بیلچے سے مٹی اٹھانے اور ڈالنے کی آواز سنائی دی۔ آخر یہ آواز بھی بند ہوگئی۔

پچھلا پہر تھا۔ سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ رات کی گہری خاموشی میں باہر برآمدے میں قدموں کی آہٹ ابھری۔ یہ ایک سے زیادہ افراد کی چاپ تھی۔ چاپ رفتہ رفتہ دور ہوتی گئی۔ سناٹے میں ڈوب کر ختم ہوگئی۔

☆

نہ معلوم رات کتنی گزر چکی تھی۔ رحیم داد کی آنکھوں میں دور دور تک نیند نہ تھی۔ وہ کچھ دیر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا، پھر اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ انگیٹھی میں انگارے راکھ کی تہہ کے نیچے دھندلے پڑچکے تھے۔ انگیٹھی کے نزدیک رحمتے کروٹ کے بل سو رہی تھی۔ رحیم داد کا اندازہ یہی تھا۔ وہ ٹانگیں پسارے، تکیے کے سہارے کمر ٹکائے چپ چاپ بیٹھا رہا۔

اس نے سامنے دری پر لیٹی ہوئی رحمتے کو گردن موڑ کر ایک بار پھر دیکھا۔ بستر سے نیچے اترا اور

دبے دبے قدموں چلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ رحمتے کی پشت اس کی جانب تھی۔ رحیم داد نے رسان سے پکارا۔ "رحمتے!" مگر اس نے نہ کروٹ بدلی نہ کچھ بولی۔ خاموش لیٹی رہی۔ رحیم داد نے جھک کر اسے آہستہ سے جھنجوڑا۔ وہ اس وقت گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔

اس بار رحمتے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لیکن سر جھکائے فرش کو تکتی رہی۔

"انگیٹھی بجھ گئی ہے۔" رحیم داد نے اظہار ہمدردی کیا۔ "تجھے سردی تو نہیں لگ رہی؟"

رحمتے نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ بیٹھی رہی۔

رحیم داد نے اس دفعہ بھی نرمی سے کہا۔ "لگتا ہے تجھے نیند نہیں آ رہی۔"

وہ پھر بھی نہ بولی۔ خاموشی سے گردن کو خم دے کر اپنا چہرہ رحیم داد کے سامنے کر دیا۔ لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں رحیم داد نے دیکھا' رحمتے کی پلکیں بھیگی ہوئی ہیں۔ رخساروں پر ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

"رحمتے! تو رو رہی ہے۔" رحیم داد اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھ گیا۔

"ہاں چوہدری' مجھے نیند نہیں آ رہی۔" رحمتے دل گرفتہ ہو کر بولی۔ "سمجھ نہیں آتی یہ کیا ہو گیا؟"

"جو ہونا تھا ہو گیا۔" رحیم داد نے اس کی دل جوئی کرنے کی کوشش کی۔ "اتنا نہ سوچ۔ کچھ دیر آرام کر لے۔"

"کیا کروں' نیند ہی نہیں آ رہی۔" اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "غلطی تیری نہیں۔ سارا قصور میرا ہی ہے۔ شاہ جی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں ہاجراں کو تیرے کمرے میں نہ لاتی تو وہ اس طرح گلے میں پھندا ڈال کر نہ مرتی۔ اس کی لاش اس طرح چوری چوری رات کے اندھیرے میں درختوں تلے گڑھا کھود کر نہ دبائی جاتی۔" رحمتے بات کہتے کہتے سسکیاں بھرنے لگی۔ رحیم داد بھی افسردہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر غم کے سائے منڈلانے لگے۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ چند لمحوں بعد خاموشی میں رحمتے کی بوجھل آواز ابھری۔ "چوہدری! میں نے بہت برا کیا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ہاجراں کے دو ننھے ننھے بچے ہیں۔ گھر والا بھی ہے۔ انھیں کچھ پتہ نہیں کہ ہاجراں کا کیا بنا۔ وہ تو اس کا انتظار کرتے ہوں گے۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ رحمتے نے آنسو پونچھے اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں بت بنے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ رک رک کر سانس بھرتے رہے۔ کمرے میں گہرا سکوت تھا اور باہر درختوں میں سرما کی بپھری ہوئی ہوا فراٹے بھر رہی تھی۔

رحیم داد نے نظر بھر کر رحمتے کو دیکھا۔ اس کا بدن قدرے پھیل گیا تھا مگر ابھی تک گداز اور کسا ہوا تھا۔ رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ بے قرار ہو کر ایک ہاتھ بڑھایا۔ رحمتے کی کمر کو آہستہ سے تھپکا۔ نرم لہجے میں بولا۔ "تو نے کوئی غلطی نہیں کی۔ اب ہاجراں کو بھول جا۔" اس نے رحمتے کو ہولے سے اپنے قریب لانے کی کوشش کی۔ "چل' ذرا دیر منجی پر آرام کر لے۔"

رحمتے کسمسائی۔ اس نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے علیحدہ کر دیا۔ عاجزی سے بولی۔ "نہیں چوہدری' میں نے اب آرام نہیں کرنا۔" وہ ہٹ کر ذرا دور چلی گئی اور آہستہ آہستہ دروازے کی جانب بڑھی۔

"کہاں جا رہی ہے؟" رحیم داد نے اسے ٹوکا۔

"مجھے اپنے بچوں کے پاس جانا ہے' وہ اکیلے ہیں۔" رحمتے ٹھہرنے پر رضامند نہیں ہوئی۔

"ایسا ہی تھا تو ادھر آئی کیوں تھی؟" رحیم داد نے ناگواری سے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

"ناراض نہ ہو۔" رحمتے نے عاجزی سے کہا۔ "تو بہت ڈرا ہوا تھا' اکیلا بھی تھا۔ اب تو نہ ڈرا ہوا ہے' نہ اکیلا ہے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ لہجے میں اور زیادہ نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "چوہدری' مجھے اب جانے دے۔ راکھا اپنی کوٹھری میں موجود ہے۔ جاگ بھی رہا ہے۔ کوئی کام ہو تو اسے بتا دینا۔"

اسی وقت باہر پہرے دار نواز زور سے کھنکارا۔

رحمتے نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور باہر چلی گئی۔ رحیم داد کو دوبارہ اسے روکنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ برآمدے میں رحمتے کے قدموں کی آہٹ چند لمحوں تک سنائی دیتی رہی۔

صبح رحیم داد نے احسان شاہ کے ساتھ ناشتا کیا۔ احسان شاہ نہا دھو کر آیا تھا۔ وہ تر و تازہ اور ہشاس بشاش نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہاجراں کی خودکشی اور اس کی لاش ٹھکانے لگانے کے سلسلے میں کسی قسم کا تذکرہ نہ کیا۔ رحیم داد نے بھی ایسی کوئی بات نہ چھیڑی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر احسان شاہ حویلی سے باہر نکلا۔ رحیم داد بھی اس کے ہم راہ تھا۔ حویلی کے پھاٹک کے عین سامنے احسان شاہ کی لمبی چوڑی امپالا صبح کی ہنستی دھوپ میں جھل ملا رہی تھی۔ حسان شاہ نے یہ کار پچھلے ہی دنوں خریدی تھی۔ وہ رحیم داد کو اسے دکھانے ہی کے لیے حویلی سے اہر لایا تھا۔ رحیم داد چمکتی دمکتی امپالا دیکھ کر بہت مرعوب ہوا۔

احسان شاہ اپنے مینجر مہربان علی اور ایک خدمت گار کے ہم راہ کار میں سوار ہوا۔ کار کا انجن وسلے سے اسٹارٹ ہوا۔ کار آگے بڑھی۔ رحیم داد خاموش کھڑا لاہور کی سمت دوڑتی ہوئی امپالا کو

دیکھتا رہا۔

* * *

سہ پہر ڈھل چکا تھا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ رحیم داد کو چمکتی ہوئی اجلی اجلی دھوپ خوش گوار معلوم ہوئی۔ وہ حویلی میں واپس نہ گیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھیتوں کی جانب نکل گیا۔ ربیع کی بوائی ہو چکی تھی۔ گندم کے نازک پودے بیجوں سے پھوٹ کر ہاتھ بھر اونچے ہو گئے تھے۔ سرسوں اور مٹر کے پودے بھی ہوا کے نرم جھونکوں سے گندم کے ساتھ جھوم رہے تھے۔ کھیتوں میں سبزے کی اونچی نیچی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ رحیم داد لوئی اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے نیچے گرم کوٹ بھی تھا۔ سرد ہوا سے محفوظ رہنے کے لیے گردن اور کانوں کے گرد اونی مفلر لپیٹے ہوئے تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ کی حرارت اور گرمی سے لطف اندوز ہوتا وہ آگے بڑھتا گیا۔

کھیتوں کے ایک طرف جوہ تھا۔ جوہ میں نوعمر لڑکے کوکلا چھپاکی کھیل رہے تھے، شور مچا رہے تھے۔ ہر طرف پھیلی ہوئی دھوپ اور بھاگ دوڑ سے جسموں میں حرارت اور چستی پیدا کر رہے تھے۔ ان کے آس پاس مویشی اور چوکھر گردنیں جھکائے، جگہ جگہ چرائی میں مصروف تھے۔ ان کے گلوں میں پڑی ہوئی پیتل کی گھنٹیاں رک رک کر بج رہی تھیں۔ جوہ کے اختتام پر مٹی سے لپے پتے مکانات دھوپ میں کچھ اور نکھر گئے تھے۔

رحیم داد پہیے پر چلتا ہوا ایک موڑ پر مڑا تو سامنے سے ماکھا آتا ہوا نظر آیا۔ رحیم داد نے اسے دور ہی سے پہچان لیا۔ مگر ماکھا نے اسے نہیں پہچانا تھا۔ وہ قریب پہنچا تو رحیم داد کو اپنے روبہ رو دیکھ کر حیرت سے بولا۔ "چوہدری جی! تو ادھر ہے! میں نوں بالکل پتہ نہ تھا تو یہاں بھی ہو سکتا ہے۔ میں تو تیرے پنڈ آنے والا تھا۔" خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

رحیم داد نے مسکرا کے پوچھا۔ "تیری گھر والی رسیلی۔" وہ ٹھٹکا اور بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ "میرا مطلب ہے سگراں تو ٹھیک ٹھاک ہے، راضی خوشی ہے۔"

"بالکل راضی خوشی ہے جی۔ تیرے بارے میں تو اکثر پوچھتی رہتی ہے۔ تو میرے ساتھ گھر چل۔ تجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہو گی۔"

رحیم داد اس کے ہم راہ چلنے پر رضامند نہ ہوا، سنجیدہ چہرہ بنا کر بولا۔ "ماکھے مجھے حویلی واپس جانا ہے۔ وہاں کئی ضروری کام کرنے ہیں۔"

"حویلی تو تیں نوں واپس جانا ہی ہے۔" ماکھا گڑگڑا کر عاجزی سے بولا۔ "میں معمولی مزارع ہوں۔ تو میرے گھر چلا جائے گا تو میری عزت بڑھ جائے گی۔ مجھے اور سگراں دونوں کو بہت خوشی ہوگی۔" اس کے لہجے میں رقت پیدا ہو گئی۔ "چوہدری! تو نے میرا اجڑا ہوا گھر آباد کرا دیا۔ میرا بازو واپس دلا کے مجھے بربادی سے بچا لیا۔ تیرے لیے میرے دل سے کتنی دعا نکلتی ہے، میں تجھے بتا نہیں سکتا۔"

رحیم داد پھر بھی ماکھا کے گھر جانے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ مگر اس کے بار بار انکار کے باوجود ماکھا نہ مانا۔ وہ منت سماجت پر اتر آیا۔ اصرار کر کے رحیم داد کو اپنے گھر لے ہی گیا۔ ماکھا اس کے ساتھ گھر کے صحن میں داخل ہوا۔ اس نے جھپاک سے دھوپ میں چارپائی لا کر ڈالی، کھیس بچھائی۔ رحیم داد سے چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔ ماکھا خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ اس نے اونچی آواز سے پکارا۔

"سگراں ادھر تو آ، دیکھ آج اپنے گھر کون آیا ہے۔"

صغراں، اوٹے کے عقب سے نکل کر سامنے آ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ گوبر سے لتھڑے ہوئے تھے۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ رفتہ رفتہ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی حیرت مسرت میں بدل گئی۔ اس نے رحیم داد کو سلام کیا اور معذرت کی۔ "چوہدری، معاف کرنا۔ میں ابھی تیرے پاس آتی ہوں۔" صغراں کچھ ہی دیر بعد دھوتی کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی واپس آ گئی۔

ماکھا نے بیوی سے کہا۔ "سگراں! تو چوہدری کو لسی پلا۔ آرام سے گل بات کر۔ میں باہر جا رہا ہوں، فافٹ لوٹ آؤں گا۔"

رحیم داد نے ماکھا کو روکنا چاہا مگر وہ تیزی سے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ رحیم داد دھوپ میں چارپائی پر بیٹھا رہا۔ صغراں بھی جا چکی تھی۔ رحیم داد تنہا رہ گیا تھا۔ دھوپ میں حرارت بڑھتی جا رہی تھی۔ رحیم داد نے گردن اور کانوں کے گرد لپٹا ہوا مفلر اتار دیا۔ لوئی بھی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔

صغراں لسی سے بھرا ہوا گلاس لائی اور رحیم داد کے سامنے جھک کر پیش کیا۔ صغراں نے چہرے کو سوتی دوہرے سے ڈھک لیا اور رحیم داد کے سامنے فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے لسی کا گھونٹ بھرتے ہوئے صغراں کو غور سے دیکھا۔ یہ وہ صغراں نہ تھی جس کے گلابی چہرے پر ہر لمحے بکھرتی ہوئی مسکراہٹ کے باعث احسان شاہ چاہت اور پیار سے رسیلی کہتا تھا۔ وہ ایک مرتبہ رحیم داد کے پاس بھی آئی تھی۔ مگر اب اس کا نرم و گداز بدن درخت کی خشک شاخ کی مانند مرجھا گیا تھا۔ جھلمل کرتی سیاہ آنکھوں کے چمکتے دمکتے ستارے بجھ گئے تھے۔ چہرہ زرد اور مٹیالا پڑ گیا تھا۔ وہ ملگجی دوہرا اوڑھے تھی۔ اس کی بوسیدہ نیلی جگی کمر کے پاس سے ادھڑی ہوئی تھی۔ وہ میلی سفید

دھوتی باندھے ہوئے تھی۔ دھوتی پر جگہ جگہ دھبے تھے۔ وہ اجڑی اجڑی نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "سگراں' یہ تجھے کیا ہو گیا؟"

"میں نوں تو جی کچھ نہیں ہوا۔" وہ سادگی سے بولی۔

"تو پہلی سی سگراں ہی نہیں رہی۔" رحیم داد کے لہجے میں ہمدردی نمایاں تھی۔ "سچ کہہ رہا ہوں۔ بالکل ہی بدل گئی۔ جب تک شاہ جی کے کوٹ میں تھی' سوہنی اور جوان ہوتی تھی۔ لگتا ہے تو یہاں راضی خوشی نہیں۔" رحیم داد نے تیکھی نگاہوں سے دیکھا۔ "تو نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ ماکھا نے تیرا ناس مار دیا۔"

"چوہدری! ایسا نہ کہہ۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "ماکھا تو مجھے بہت پیار کرتا ہے۔ سر میں ذرا درد بھی ہو جائے تو گھبرا جاتا ہے۔ بھاگا بھاگا حکیم کے پاس جاتا ہے۔ میرا سر دباتا ہے' اپنے ہاتھ سے دوائی کھلاتا ہے۔" وہ لہک لہک کر بتا رہی تھی۔

"میں جی اپنے گھر میں بہت خوش ہوں۔"

"مجھے تو خوش نہیں لگتی۔ حویلی میں تو تیری اور ہی بات تھی۔ برا نہ مناتا۔ اب تو جیسے لال لال انگارے سے بجھ کر راکھ رہ گئی ہے۔"

"چوہدری' ایسی باتیں نہ کر۔ وہ بھی کوئی زندگی تھی۔" اس دفعہ صغراں کا لہجہ تند اور تیکھا تھا۔ "کنجریوں سے بھی خراب زندگی تھی وہ۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "ویسے کھانے پینے کو تو ادھر کوٹ میں بہت چنگا ملتا تھا۔ کام کاج بھی کرنا نہیں پڑتا تھا۔ پر ہر روز شام کو بناؤ سنگھار کرنا پڑتا۔ کب شاہ جی کا بلاوا آ جائے اور کب اس کا کوئی مہمان آ جائے؟ ایک سے بڑھ کے ایک شرابی کبابی مہمان۔ ایک سے ایک گندا کتا۔ تو ہی بتا' یہ کیا زندگی ہوئی؟"

"پر دیکھنے میں تو وہاں بہت خوش نظر آتی تھی۔"

"تجھے کیا پتہ چوہدری۔ توں نیک بندہ ہے۔ میں تیرے پاس پوری ایک رات رہی تو توں مجھ سے الگ رہا۔" اس کے چہرے پر یاسیت چھا گئی۔ "پر شاہ جی! میں تجھ کو کیا بتاؤں کیسا گندہ ہے وہ' شراب پی کے تو وہ آدمی ہی نہیں رہتا۔ اور اس کے یار' وہ بھی اتنے گندے اور خراب ہیں کہ ان کے بارے میں جب سوچتی ہوں تو اپنے سے بھی گھن آتی ہے۔ میں پانچ سال تک اس کنجر خانے میں رہی۔ اس میں جا کر زنانی' زنانی نہیں رہتی کنجری بن جاتی ہے۔"

رحیم داد نے محسوس کیا کہ احسان شاہ کی حویلی کے ذکر نے صغراں کو اداس کر دیا ہے۔ اس کا روکھا اور مرجھایا ہوا چہرہ کھنڈر نظر آنے لگا۔ رحیم داد نے فوراً گفتگو کا رخ موڑ دیا' ادھر ادھر گردن گھما کر پوچھا۔

"یہ ماکھا کہاں چلا گیا؟"

"آتا ہی ہو گا جی۔ چوہدری' توں آرام نال بیٹھ۔ اب آیا ہے تو روٹی کھا کر ہی جانا۔"

"میں اتنی دیر یہاں نہیں ٹھیر سکتا۔" رحیم داد نے اپنی مجبوری ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ "حویلی میں میرا انتظار ہوتا ہو گا۔"

"پر شاہ جی تو اپنی موٹر میں بیٹھ کر لہور گیا ہے۔ ماکھا مجھے بتاتا تھا۔" صغراں نے دبی زبان سے کہا۔ "ویسے میرا کہا مان توں شاہ جی کی حویلی میں نہ ٹھیرا کر۔ گندی جگہ ہے۔ میں تو تجھے کہتی ہوں' اس کی یاری بھی چھوڑ دے۔ وہ بہت خطرناک بندہ ہے' توں اسے نہیں جانتا۔"

"میں تو اس کے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ کسی کام کے بغیر میں اس کے پاس نہیں آتا۔"

"یہ تو مجھے بھی لگتا ہے۔" صغراں آزردگی سے بولی۔ "میں تجھے ٹھیک طرح جانتی ہوں' سمجھتی ہوں۔ توں بہت نیک بندہ ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ صغراں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "چوہدری! میں ابھی آتی ہوں۔" جواب کا انتظار کیے بغیر وہ گھر سے باہر چلی گئی۔

رحیم داد اکیلا صحن میں چارپائی پر بیٹھا رہا۔ پانچ منٹ گزرے' دس منٹ گزرے' پندرہ منٹ گزر گئے۔ رحیم داد اکتا گیا۔ صغراں واپس نہ آئی' البتہ ماکھا آ گیا۔ اس کے ہم راہ ایک اجنبی تھا۔ وضع قطع سے وہ بھی مزارع ہی لگتا تھا۔

وہ سانولی رنگت کا دراز قد' مضبوط اور چھریرا آدمی تھا۔ سر اور کانوں کو میلی کچیلی چادر کے کونے سے چھپائے ہوئے تھا۔ اس نے رحیم داد کو اونچی آواز سے سلام کیا۔ ماکھا کی ساتھ وہ بھی رحیم داد کے سامنے صحن کے کچے فرش پر بیٹھ گیا۔

ماکھا بولا۔ "چوہدری' میں اسی کے بارے میں بات کرنے تیرے پاس آنے والا تھا۔" اس نے ڑکر قریب بیٹھے ہوئے دراز قد شخص کی جانب دیکھا۔ "اس کی گھر والی کو شاہ جی نے اٹھوا لیا ہے۔ ں بارہ روز ہو گئے۔"

ماکھا کے لہجے میں التجا تھی۔ "چوہدری' جیسے تو نے میری مدد کی' ایسے ہی اس کی بھی مدد کر دے۔ ں کا بازو واپس دلا دے۔ شاہ جی تیری گل ضرور مان لے گا۔" ماکھا نے اس شخص کی جانب اشارہ لیا۔ "اس کا ناں عالم ہے جی۔"

عالم کا نام سنتے ہی رحیم داد سخت پریشان ہوگیا۔ وہ باجراں کا شوہر تھا۔ رحیم داد کو فوراً کمرے کی چھت سے لٹکتی ہوئی برہنہ لاش کا خوف ناک چہرہ یاد آگیا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ کھنکار کر گلا صاف کیا' ماکھا کو بے چینی سے دیکھا۔

"ماکھے! تجھے کیسے پتہ چلا شاہ جی نے عالم کی گھر والی کو اٹھوالیا؟"

ماکھا کے بجائے عالم بولا۔ "وہ ایسا ہے چوہدری' شاہ جی مجھے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔"

"شاہ جی' تجھے کیوں بے دخل کرنا چاہتا ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"بہت پرانا جھگڑا ہے جی۔" عالم نے بتایا۔ "میرا پنڈ پہلے لالہ کرشن دیال کی زمیں داری میں ہوتا تھا۔" اس نے رحیم داد کا چہرہ نظر بھر کے دیکھا۔ "لالہ کرشن دیال تیرے پنڈ کی زمیں دارنی جمیلہ کا پیو تھا۔ سنا ہے اب تو وہ مرگیا۔"

عالم کے چہرے پر جھنجلاہٹ ابھرنے لگی۔ "پر جی وہ اور اس کا مینجر بنسی لال مزارعوں پر بہت ظلم کرتے تھے۔ میں بھی اس کا مزارع تھا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے عالم۔" رحیم داد نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "میرا پنڈ کوٹلہ ہرکشن بھی اس کی زمیں داری میں ہوتا تھا۔ میرے مزارعے بھی لالہ کرشن دیال اور بنسی لال کے بارے میں یہی بتاتے ہیں۔"

"چوہدری! اصل بات یہ ہے۔" عالم نے بتایا۔ "ادھار دے دے کر اس کُنے بیاج کے پھندے میں مزارعوں کو ایسا باندھ رکھا تھا کہ واڈھی کے بعد ساری کی ساری فصل اس کے گوداموں میں چلی جاتی۔ ادھار تب بھی ختم نہ ہوتا۔ اس کے منیم اور منشی اپنے ہی کھاتے میں جو چاہتے لکھ لیتے اور مزارعوں سے انگوٹھا لگوالیتے۔ تیں نوں پتہ ہے چوہدری' مزارعے پڑھے لکھے تو ہوتے نہیں۔" اس کی آواز میں غم گھلا ہوا تھا۔

"منیم' ادھار کی رکم جتنی چاہتا بڑھا کر لکھ دیتا۔ کسی بھی مزارعے کو ادھار لے کر انگوٹھا لگاتے ہوئے کچھ بھی ملوم نہ ہوتا۔"

رحیم داد نے بے زاری سے کہا۔ "تجھے تو شاہ جی سے گلہ ہے۔ یہ لالہ کرشن دیال کی بات کہاں لے بیٹھا؟"

"میں شاہ جی ہی کی گل بتانے لگا ہوں۔" عالم نے جھٹ وضاحت کی۔ "گل ایہہ اے جی' جب ۱۹۴۶ء میں الیکشن ہو رہا تھا تو شہر سے روز ہی مسلم لیگی لیڈر آتے۔ کہتے پاکستان بن گیا تو ہر مزارع اپنی زمین کا مالک بن جائے گا۔ مزارعوں اور کمیوں کو بنیوں اور لالوں کی کرض ادھار کے چکر سے چھٹکارا مل جائے گا۔ زمین اس کی ہوگی جو اس پر ہل چلائے گا۔"

"شاہ جی بھی لیگی لیڈروں میں شامل تھا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"نہیں جی' وہ تو سدا کا یونینسٹ ہے۔" عالم نے زہرخند سے کہا۔ "وہ تب بھی یونینسٹ پارٹی میں تھا۔ اس نے پاکستان کی سخت مخالفت کی۔ طرح طرح سے بہکایا' ڈرایا' دھمکایا' دباؤ بھی ڈالا۔ پر جب الیکشن ہوا تو جی سارے ہی مسلمانوں نے مسلم لیگ ہی کے بکسوں میں پرچی ڈالی اور میں نے تو جی' لیگ کو ووٹ دلوانے کے لیے بہت بھاگ دوڑ بھی کی۔ کسانوں کے جتھے بنا کر دور دور کے پنڈ جاتا تھا۔ ہر مسلمان بندے کو پاکستان کا حامی بناتا تھا۔" اس نے قدرے تامل کے بعد بتایا۔ "میں تو جی شاہ جی اور پولسیوں کی بار بار کی دھمکیوں سے بھی نہ ڈرا۔ ان دنوں جی بہت جوش بھرا ہوا تھا۔" عالم کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ "پاکستان آخر بن ہی گیا۔ پر پاکستان بنتے ہی تیں نوں پتہ ہے شاہ جی نے کیا کیا؟"

"کیا کیا اس نے؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ جھٹ مسلم لیگی بن گیا۔ اس نے اپنی حویلی پر لیگ کا ہرا جھنڈا لگایا اور پورے پیراں والہ میں مٹھائی بٹوائی۔ اس نے لالہ کرشن دیال کے مزارعوں کو اکسایا۔ کہا' اس کی زمین پر زبردستی کبضہ کرلو۔ وہ تو جی مزارعوں کو کرنا ہی تھا۔ یہ تو پہلے ہی طے تھا۔ لالہ کرشن دیال اور اس کا مینجر بنسی لال سب کچھ چھوڑ چھاڑ بال بچوں کے ساتھ سرحد پار چلے گئے۔"

ماکھا نے عالم کو ٹوکا۔ "گل چھوٹی کر' تو نے تو لمی کہانی شروع کردی۔"

"ٹھیک ہے جی' چھوٹی ہی گل کروں گا۔" عالم سنبھل کر بولا۔ "فیر ایسا ہوا جی' شاہ جی نے لالہ کرشن دیال کی چھوڑی ہوئی زمینوں پر خود کبضہ کرنے کا چکر چلایا۔ وہ محکمہ بحالیات کے افسروں سے ملا' ان کو اپنے ساتھ لایا۔ افسروں نے مزارعوں سے کہا' اپنی اپنی زمیں میں سے مہاجروں کو حصہ دو۔ ان دنوں منٹگمری میں مہاجرین کا بہت وڈا کیمپ لگا تھا۔ سرکاری افسروں کے ساتھ مہاجروں کے بھی جتھے کے جتھے آنے لگے۔"

اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "ادھر مزارعے اپنی زمین میں سے کوئی حصہ دینے کو تیار نہ تھے۔ روز مہاجروں اور مزارعوں کے درمیان جھگڑے ہوتے۔ خون خرابہ تک ہوتا۔ پولیس آتی۔ جسے جی چاہتا پکڑ کر لے جاتی۔" عالم نے دھوپ کی تپش محسوس کرتے ہوئے چادر سر اور کانوں پر سے ہٹادی۔

"وہی تھانے دار جو پاکستان کو گندی گندی گالاں نکالتا تھا اور یونینسٹوں اور ان کی حکومت کو

طرح طرح سے خوش کرنے کی کوشش کرتا تھا' اب ہر گھڑی پاکستان' پاکستان کی رٹ لگاتا تھا۔ اور جن مزارعوں اور کسانوں نے پاکستان کے لیے اپنی پرچی ڈالی تھی ان کو حوالات میں الٹا لٹکا کر زبردست مار لگاتا تھا۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "اب وہ تھانے دار کہاں ہے؟"

"وہ تو جی بہت وڈا پولس افسر بن گیا۔ اس کے کندھے پر زیادہ ہی پھول نظر آتے ہیں۔ آج کل لہور میں ہوتا ہے۔" عالم کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ "ادھر تو مہاجروں اور غیر مہاجروں میں دنگے فساد ہوتے تھے اور دونوں ہی کی پولیس کے ہاتھوں پٹائی ہوتی تھی' دوسری طرف شاہ جی نے اپنے مینجر مہران علی اور کرندوں کے ذریعے مزارعوں کو بہلایا پھسلایا کہ وہ اپنی اپنی زمین کا شاہ جی کے ساتھ بیع کرلیں ورنہ سرکار سارے ہی کابض مزارعوں کو بے دخل کرکے زمین مہاجروں میں بانٹ دے گی۔ پولیس نے پہلے ہی بہت تنگ کر رکھا تھا۔ بعد میں پتہ چلا' پولیس بھی شاہ جی کے اشارے پر مزارعوں اور کسانوں کو تنگ کرتی تھی۔ شاہ جی کیمپ میں اپنے بندے بھیج کر مہاجروں کو بھی جھگڑا کرنے پر اکساتا تھا۔ آخر ایک ایک کرکے سبھی نے شاہ جی کے ہاتھ بیع کرکے اسے تین ہزار ایکڑ سے بھی اوپر زمین کا مالک بنادیا۔"

اس نے گردن اٹھا کر ٹھنڈی سانس بھری۔ "مزارعے مزارعے ہی رہ گئے۔ زمین کا مالک بننے کا سفنا' سفنا ہی رہ گیا۔" عالم نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ "اس طرح جی میں بھی شاہ جی کا مزارع بن گیا۔ جب لالہ کرشن دیال کی زمینیں شاہ جی کے پاس چلی گئیں تو مجھے بھی فیر اس کا مزارع تو بننا ہی بننا تھا۔"

ماکھا نے اسے پھر ٹوکا۔ "عالم تو گل چھوٹی نہیں کرسکتا۔ تیری ایسی ہی گلاں سے تو شاہ جی خار کھاتا ہے۔ تجھے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔"

"تو بھی ٹھیک ہی کہہ رہا ہے ماکھے۔" عالم نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پر چوہدری یہ تو بتا' ہندو بنئے اور وڈے زمیں دار جب کسی مزارعے کو بے دخل کرنا چاہتے تو اس کے خلاف عدالت میں نالش کرتے' ڈگری نکلواتے' کرکی لاتے۔ زمین کرک کراتے۔ مال مویشی کرک کراکے اٹھالے جاتے۔"

اس کی آنکھوں کی چمک تیز ہوگئی۔ "پر شاہ جی کسی کو بے دخل کرنا چاہتا ہے تو اس کی گھر والی اور جوان دھی تک کو اٹھوالیتا ہے۔" عالم کی آواز بجھنے لگی۔ "سکھ اور ہندو ادھر سے گئے تو مسلمان کسان اور مزارعے بہت خوش تھے کہ بنیوں کے ظلم وستم اور بیاج کے چکر سے چھٹکارا مل جائے گا۔ پر یہ پتہ نہ تھا کہ اس سے بھی زیادہ ظلم ہوگا۔ عزت اور آبرو بھی جاتی رہے گی۔"

"چوہدری' یہ تو ایسی ہی گلاں کرتا ہے۔" ماکھے نے مداخلت کی۔ "تو شاہ جی سے اس کا بازو دلا دے۔ اس کی گھر والی کا نام ہاجراں ہے۔"

"شاہ جی مجھے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ چوہدری' میں اس کے لیے تیار ہوں۔ وہ میرا بازو مجھے واپس دے دے۔ میں پنڈ چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" عالم کے لہجے میں درد کی کسک پیدا ہوئی۔ "کیا کیا جائے جی' اپنے نصیب میں یہی لکھا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ماں کے لیے ہر دم روتے ہیں۔ انھیں روتا دیکھتا ہوں تو میری آنکھیں بھی بھیگ جاتی ہیں۔ کہتے ہیں زمین کسان کی ماں ہوتی ہے۔ وہ اس سے ویسا ہی پیار کرتا ہے۔ مجھے بھی اپنی زمین سے ایسا ہی پیار ہے۔ میں اسی پر پیدا ہوا۔ پلا بڑھا' جوان ہوا۔ پر مجھے اپنی گھر والی سے پیار ہے۔ وہ میرا بازو ہے۔ اس کے بناں یہ زمین کس کام کی۔ ہاجراں کے جانے کے بعد میں کچھ نہیں کرسکتا۔ کھیتوں کو دیکھوں یا گھر کو۔ دونوں ہی برباد ہو رہے ہیں۔ ویسے بھی جی' شاہ جی مجھے رہنے نہیں دے گا۔" اس نے بے بسی سے رحیم داد کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"چوہدری! مجھے بے دخلی منظور ہے۔ میں ہار گیا' شاہ جی جیت گیا۔"

رحیم داد گم بیٹھا تھا۔ تاہم اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔ اس نے نرم لہجے میں مشورہ دیا۔ "عالم تو ایسا کر۔ شاہ جی سے مل لے' خود جا کے اس سے منت سماجت کر۔ شاہ جی سے نہ ملنا چاہے تو مہران علی سے گل بات کر۔ جب تو بے دخل ہونے کو تیار ہی ہے تو شاہ جی تیری گھر والی کو ضرور واپس کردے گا۔ اس نے تجھے بے دخل کرنے ہی کے لیے تو تیری گھر والی کو اٹھوایا ہے۔ یہی گل ہے ناں؟"

ماکھا بولا۔ "سچی بات تو یہی ہے جی۔" اس نے مڑ کر عالم کی جانب دیکھا۔ "عالم تو ایسا کر مہران علی سے ضرور مل لے۔ شاہ جی تو تجھے ملے گا نہیں۔"

ماکھا کھسک کر رحیم داد کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے پیروں کو پکڑ کر ہولے ہولے دبانے لگا۔ "چوہدری' یہ تو مہران علی سے مل ہی لے گا پر تو بھی شاہ جی سے اس کا بازو دلانے کے لیے کہنا۔ وہ تیری گل ضرور مان لے گا۔"

رحیم داد کے پاس احسان شاہ سے بات کرنے کا وعدہ کرلینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ ان سے کیا کہتا کہ ہاجراں اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔ وہ پیوند خاک ہو چکی ہے۔ اس نے عالم اور ماکھا کو تسلی دی اور کھڑا ہوگیا۔

اسی وقت صغراں بھاگی بھاگی آئی۔ وہ رحیم داد کے لیے مرغ تل رہی تھی۔ مسالوں کی تیز خوشبو گھر بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔

صغراں کو جب یہ معلوم ہوا کہ رحیم داد جا رہا ہے تو وہ اسے روکنے کے لیے اصرار کرنے لگی۔ بار بار عاجزی سے روکا مگر رحیم داد نہ رکا۔

چونسٹھ

سورج درختوں کی بلندیوں سے اوپر نکل گیا تھا۔ سائے سمٹتے جا رہے تھے۔ جاڑے کی چمکیلی اور شفاف دھوپ میں خوش گوار تمازت تھی۔ رحیم داد واپس احسان شاہ کی حویلی میں پہنچا۔ اس نے حیران و پریشان ہو کر دیکھا' نادر خاں باغ میں کرسی پر بیٹھا ہے۔ رحیم داد تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھا۔

نادر اسے دیکھتے ہی احتراماً کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔ "تو کیسے ادھر آگیا؟" اس کے لہجے میں حیرت سے زیادہ تشویش غالب تھی۔

"ایک نئی بات کا پتہ چلا ہے' سوچا تجھے بتا دوں۔" نادر نے جواب دیا۔ "ویسے مجھے زمیں دارنی نے سامان کی خریداری کے لیے پاک پتن بھیجا ہے۔ پر میں نے تجھ سے ملنا ضروری سمجھا۔ بعد میں پاک پتن چلا جاؤں گا۔"

"تو ابھی تک کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔" رحیم داد نے نرمی سے کہا۔ "آرام سے بتا کون سی نئی گل کا پتہ چلا ہے؟"

"تیرے یہاں آنے کے بعد جلیل اور زینت شام کو اپنے بچوں کے ساتھ پہنچ گئے۔" نادر کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

"حویلی ہی میں ٹھیرے ہیں ناں؟"

"ہاں جی' زمیں دارنی نے انھیں حویلی ہی میں ٹھیرایا ہے۔ تیرے برابر والے خالی کمرے میں تاجاں کے ویاہ تک ٹھہرے رہیں گے۔"

”پر یہ کون سی ایسی بات ہے جسے بتانے تو سویرے ہی سویرے آ گیا۔“ رحیم داد نے قدرے بے زاری سے کہا۔ ”جلیل اور زینت کو تو تاجاں کے دیاہ میں شریک ہونے کے لیے آنا ہی تھا۔“

”بات تو جی اصل میں وہ ہے جو کل رات جنت کی زینت سے ہوئی۔ میں تجھے وہی بتانے آیا ہوں۔“ نادر خاں کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ ”ہوا یہ کہ زینت نے باتوں باتوں میں جنت کو بتایا کہ وہ دینا تھا نا' وہی جو سلاموے زینت کے بچے لے کر آیا تھا' بعد میں زمیں دارنی سے ملا۔ تیرے اور شاہ جی کے بارے میں اس نے بہت خطرناک باتیں بتائیں۔“

”وہ تو جمیلہ کے پاس کئی بار آ چکا ہے۔“ رحیم داد تذبذب سے بولا۔ ”ایک بار تو تیرے سامنے بھی آیا تھا۔ میں جب یہاں آ رہا تھا تب بھی وہ مجھے نظر آیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ جمیلہ ہی کے پاس جا رہا تھا۔ ورنہ وہ کوٹلہ ہرکشن کیوں آنے لگا؟ ادھر تو اس کا کوئی میل جول کا بھی نہیں۔ جلیل اور زینت بھی تب تک نہیں پہنچے تھے۔“

رحیم داد کے چہرے سے دہشت صاف عیاں تھی۔ ”یہ بتا' دینے نے کیا خطرناک باتیں میرے اور شاہ جی کے بارے میں جمیلہ کو بتائیں؟“

نادر خاں نے کرسی رحیم داد کے اور قریب کر لی' گردن اٹھا کے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ”زینت کہتی تھی' دینے نے زمیں دارنی کو بتایا کہ تو نے شاہ جی کے ساتھ مل کر اللہ وسایا کو کہاں اور کیسے کتل کرایا؟“ وہ کہتے کہتے ٹھٹکا۔ ”اس نے تو یہاں تک کہا کہ اللہ وسایا کا کتل اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔“

”بکواس کرتا ہے وہ۔“ رحیم داد نے جھنجلا کر کہا۔

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ نادر خاں نے اس کی تائید کی اور فوراً صفائی پیش کی۔ ”میں نے تو جو سنا وہ بتا دیا۔ یہ میرا فرض تھا۔ پر یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ اس نے زمیں دارنی سے تیرے اور شاہ جی کے بارے میں ایسی باتیں کیوں کہیں؟ تیرے ساتھ تو اس کا جھگڑا ٹنٹا بھی نہیں۔“

”جھگڑا ٹنٹا تو تب ہوتا جب میری اس کے ساتھ جان پہچان ہوتی۔ پتہ نہیں اس نے جمیلہ سے میرے خلاف ایسی الٹی سیدھی باتیں کیوں کہیں؟“ رحیم داد کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ گردن جھکائے چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر اس نے سوالیہ نظروں سے نادر خاں کو دیکھا۔ ”نادر! یہ بھی پتہ کیا۔ دینے نے یہ باتیں جمیلہ کو کب بتائیں؟ یاد پڑتا ہے' پہلی بار جب وہ جلیل کے ساتھ آیا تھا تو میرے سامنے ہی دیپال پور واپس چلا گیا تھا۔ جمیلہ سے اس کی کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی اور نہ ہی اس نے دوبارہ آنے کو کہا تھا۔“

”پر وہ دوسرے روز آیا اور زمیں دارنی سے سکول میں دیر تک باتیں کرتا رہا۔ جلیل بھی موجود تھا۔ جلیل نے اس کی باتیں سنیں تو اپنی گھر والی زینت کو بھی بتائیں۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دینا خود ہی جمیلہ کے پاس آیا تھا۔ یہ تو میں نوں بھی پتہ ہے وہ جمیلہ کے پاس دوسرے روز آیا تھا۔ میں نے اسے سکول سے نکلتے دیکھا تھا۔“ رحیم داد سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ وہ اللہ وسایا کے قتل کے سلسلے میں نادر خاں کو اعتماد میں لینا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا اس کا رویّہ بہت محتاط تھا۔ مگر وہ اپنی بڑھتی ہوئی سراسیمگی زیادہ دیر نہ چھپا سکا۔ اس نے کرید کر پوچھا۔ ”زینت نے جنت کو اور کیا کیا بتایا؟“

”زینت کہتی تھی' زمیں دارنی لہور جانے کا پروگرام بنا رہی ہے۔ وہاں اللہ وسایا کے کیس کی نئے سرے سے تفتیش کرانے کے لیے حکام بالا سے ملے گی۔ وکیل محمد عثمان رندھاوا کو اس نے اسی سلسلے میں صلاح مشورہ کرنے کی غرض سے بلایا تھا۔ اسے بلانے جلیل گیا تھا۔ وہ تو جی زمیں دارنی کے بہت بھروسے کا بندہ ہے۔“

”وکیل تو جمیلہ کے پاس کئی بار آیا اور ایک بار بھی مجھ سے نہ ملا۔ میرا تو تب ہی ماتھا ٹھنکا تھا' کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ میں نے اس کی آمد و رفت کے بارے میں جمیلہ سے پوچھا تو اس نے مجھے کچھ اور ہی گل بتائی۔“

”کیا کہا اس نے؟“ نادر خاں نے پوچھا۔

”کہنے لگی' وکیل کو تو میں نے جیرے کے کیس کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے بلایا تھا۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا زمیں دارنی نے تجھے مغالطے میں رکھنے کی کوشش کی۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ زینت کی باتوں سے صاف اندازہ ہوتا ہے' اس نے جنت سے جھوٹ نہیں بولا۔ اس نے جو کچھ بتایا' بار بار تاکید کی کہ ان باتوں کا تجھے کسی طور پتہ نہ چلے۔“

”تیرا خیال ٹھیک ہی ہے۔ زینت کیوں جھوٹ بولنے لگی؟“

”جنت نے زینت سے یہ باتیں سنیں تو وہ بہت گھبرا گئی۔ سچ تو یہ ہے جی' میں خود بہت گھبرا گیا۔ رات بھر بے چین رہا اور سویرے اٹھتے ہی تیرے پاس چلا آیا تاکہ تجھے پتہ چل جائے زمیں دارنی کے ارادے کتنے خطرناک ہیں۔“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا' خاموش بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ بکھری ہوئی تھی۔ آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس نے غصے پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر جب تند و تیز جذبات نے شدت سے یلغار کی تو وہ پھٹ پڑا۔ ”پر اس سور دے پتر دینے نے جمیلہ کو یہ

باتیں بتانے کی ہمت کیسے کی؟" رحیم داد نے تیکھی نظروں سے نادر کو دیکھا۔ "تفتیش دوبارہ شروع ہوئی تو وہ سب سے پہلے پھنسے گا۔"

نہ بتانے کی کوشش کے باوجود رحیم داد نے جذبات کی رو میں نادر خاں کو بہت کچھ بتا دیا۔ نادر پرانا گھاگ تھا۔ فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اس نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے رحیم داد کو خطرے سے خبردار کیا۔

"وہ تو وعدہ معاف گواہ بن کر صاف بچ سکتا ہے۔ میرا تو خیال ہے یہ نکتہ اسے کسی نے بتایا نہ ہو گا' اسے خود پتہ ہو گا۔ وہ پولس کا مخبر ہے۔ گواہیاں پیش کرنا اور سرکاری گواہ مہیا کرنا اس کا روز کا کام ہے۔" اس نے قیاس آرائی کی۔ "میرا تو یہ بھی اندازہ ہے جی' زمین دارنی نے دینے کو رشوت کے طور پر کچھ روپے بھی دیے ہیں۔ آگے بھی دینے کا وعدہ کیا ہو گا۔"

"دو سو روپے تو اسے جمیلہ نے زینت کے بچوں کو لانے کے انعام کے طور پر میرے سامنے ہی دیئے تھے۔" رحیم داد نے سر ہلا کے کہا۔ "میرا تو خیال ہے اسی سے اس کا حوصلہ بڑھا۔ جمیلہ سے زیادہ روپیہ اینٹھنے کے چکر میں وہ خود ہی اس کے پاس آیا ہو گا۔" ایک بار پھر اس کا لہجہ تلخ ہو گیا' چہرے پر خشونت برسنے لگی۔ "یہ ساری بکواس اس نے اسی لیے کی ہے۔"

"ایسا ہی لگتا ہے جی۔" نادر نے رحیم داد کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اب وہ زیادہ دیر رکنا نہ چاہتا تھا۔ "میں نوں پاک پتن جانا ہے۔ شام تک واپس پنڈ بھی پہنچنا ہے۔ زمین دارنی انتظار کرے گی۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ "ایسی باتیں سننے کے بعد تجھے بتانا نہ صرف ضروری تھا بلکہ یہ میرا فرض بنتا تھا۔"

"تو نے بالکل ٹھیک کیا' یہ باتیں مجھے بتا دیں۔" رحیم داد نے نرمی سے کہا۔ "آگے بھی ایسی کوئی گل بات معلوم ہو تو فوراً مجھے بتانا۔ میرا تو خیال ہے' آگے جنت کو لگا دے۔ وہ زینت کے ذریعے یہ معلوم کرتی رہے جمیلہ آگے کیا کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے؟"

"وہ تو میں نے جنت سے پہلے سے ہی کہہ رکھا ہے۔ کوئی حرج نہ ہو تو اس بارے میں شاہ جی سے بھی مشورہ کر لیا جائے۔ ویسے دینے نے اس کے خلاف بھی بہت سنگین الزام لگایا ہے۔ حالانکہ وہ برسوں اس کا ملازم رہ چکا ہے۔ شاہ جی تو اس کو ایسا فٹ کر دے گا کہ ساری بکواس بھول جائے گا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں شاہ جی سے ضرور مشورہ کروں گا۔ ایسا کرنا بہت ضروری ہے۔" رحیم داد نے اس کی رائے سے اختلاف نہ کیا۔ "اب تو جا۔ تجھے زیادہ دیر نہیں کرنی چاہئے۔"

نادر خاں چلا گیا۔ رحیم داد دھوپ میں کرسی پر بیٹھا رہا۔ نادر سے گفتگو کرنے کے بعد وہ سخت الجھن میں مبتلا تھا۔ وہ مسلسل دینا کے بارے میں سوچتا رہا جو سنگین خطرہ بن کر اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔

☆

شام کو احسان شاہ حسب وعدہ واپس آگیا۔ واپسی کے کوئی دو گھنٹے بعد اس نے رحیم داد کو اپنے پاس بلایا۔ کمرہ خوب گرم تھا۔ آتش دان میں دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخ سرخ روشنی نے فضا کو رنگین بنا دیا تھا۔

رحیم داد میز کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے خشک میوے' مٹھائی اور پھلوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "شاہ جی' آج یہ تبدیلی کیوں؟" اس نے مسکرا کے پوچھا۔

"لہور سے میرے ساتھ میاں عبدالسبحان بھی آیا ہے۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "چوہدری' تو میاں سبحان کو نہیں جانتا۔ بہت وڈا زمیں دار ہے۔ تیرے سامنے یہاں کبھی نہیں آیا۔ ویسے بھی بہت ہی کم آتا ہے۔"

"لگتا ہے بالکل ہی صوفی ہے؟"

احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ "پہلے تو بہت پیتا پلاتا تھا۔ پر پچھلے کئی سال سے بالکل چھوڑ رکھی ہے۔"

رحیم داد نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ "مہربان علی تو تیرے ساتھ ہی گیا تھا ناں۔ اس نے جمیلہ کے بارے میں کیا پتہ لگایا؟"

"ابھی تو کچھ پتہ نہیں چل سکا۔" احسان شاہ نے جواب دیا۔ "میں نے مہربان علی کو لہور چھوڑ دیا ہے۔ وہ ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی لوٹے گا۔"

"کب تک واپس آجائے گا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"اسے کل شام تک واپس آجانا چاہیے۔ ویسے ساری باتوں کا پتہ کرکے ہی آئے گا۔"

"آج صبح تیرے لہور جانے کے کچھ ہی دیر بعد نادر یہاں آیا تھا۔" رحیم داد نے گہری سانس لے کے کہا۔

"کیسے آیا تھا وہ۔ کوئی خاص گل بات تو نہیں؟"

"اس نے تو بہت عجیب گل سنائی۔" رحیم داد نے اضطراب سے کہا۔ "میں تو اسے سن کر گھبرا گیا۔ تب سے انتظار کر رہا تھا' تو آئے تو ساری گل بات تجھے بتاؤں۔"

"کیا کہتا تھا؟" احسان شاہ نے رحیم داد کے چہرے پر بکھری ہوئی سراسیمگی محسوس کی۔ "تو کچھ

زیادہ ہی پریشان نظر آرہا ہے۔"

"پریشان ہونے کی بات ہی ہے۔ تیرے پاس ایک نوکر ہوتا تھا۔" رحیم داد کا لہجہ مدھم پڑ گیا۔ "دینا' وہی جسے تونے دارا کے ساتھ اللہ دسایا کے کتل پر لگایا تھا۔"

"اس کی تو میں نے کب کی چھٹی کردی۔ ایک رات ساوی کے نشے میں دھت ہو کر اس نے بہت رولا کیا۔ میں نے جوتے لگوا کر اسی رات اسے پنڈ سے نکال دیا تھا۔ بہت زیادہ تنگ کرنے لگا تھا۔" اس نے نظر بھر کر رحیم داد کا چہرہ دیکھا۔ "پر تجھے اس سے کیا لینا؟؟"

"تجھے یہ بھی پتہ ہے' اب وہ کہاں ہے؟؟"

"بالکل پتہ ہے۔" احسان شاہ نے نہایت اطمینان سے بتایا۔ "وہ پولیس کا چڑی چور بن گیا ہے۔ تھانے دار زمان خاں نے اسے مخبر لگا رکھا ہے۔"

"پر تجھے یہ پتہ نہیں' دینے ہی نے زینت کے بچے سلا مو سے واپس دلائے تھے۔ بچوں کو لے کر وہ زینت کے خصم جلیل کے ساتھ جمیلہ کے پاس پہنچا۔ زینت ان دنوں جمیلہ ہی کے پاس تھی۔" اس نے قدرے تامل کیا' احسان شاہ کی آنکھوں میں جھانک کر گویا ہوا۔ "تب سے وہ کئی بار جمیلہ کے پاس جا چکا ہے۔ نادر اسی کے بارے میں بتانے میرے پاس آیا تھا۔"

"کیا کہتا تھا نادر؟" احسان شاہ نے چونک کر پوچھا۔

"نادر کہتا تھا' دینے نے اللہ دسایا کے کتل کے بارے میں جمیلہ کو سب کچھ بتا دیا۔"

"نادر کو کیسے اس بات کا پتہ چلا' جمیلہ نے اسے بتایا ہے؟" احسان شاہ کے چہرے پر غبار پھیل گیا۔

"بات کچھ اس طرح ہے' زینت نے جنت کو بتایا اور اس نے ساری بات نادر کو بتا دی۔"

کمرے میں سکوت چھا گیا۔ دہکتے انگاروں کی روشنی میں رحیم داد اور احسان شاہ کے چہرے سنجیدہ نظر آرہے تھے۔ رحیم داد اور زیادہ دیر خاموش نہ رہا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ صبح نادر خاں سے جو کچھ سنا تھا' احسان شاہ کو تفصیل سے بتا دیا۔

احسان شاہ کچھ دیر کے لیے فکر میں ڈوب گیا۔ مگر جلد ہی اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ وہ زیر لب مسکرایا۔ "چوہدری' تو فکر نہ کر۔ دینے کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دے۔"

مگر رحیم داد مطمئن نہ ہوا۔ اس نے دبی زبان سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "شاہ جی' یہ تو سوچ دینا اب تیرا نوکر نہیں رہا۔"

"پر وہ تھانے دار زماں خاں کے ساتھ تو لگا ہوا ہے ناں۔ زمان میرا گہرا یار ہے۔ وہ دینے کو بالکل ٹھیک ٹھاک کر دے گا۔ تجھے پتہ نہیں' دینے کے خلاف ایک نہیں' جانے کتنے جرائم اور خطرناک وارداتوں کے کیس ہیں۔ کسی میں بھی اس کو جب چاہے اور جس طرح چاہے گردن سے پکڑ کر دبوچ سکتا ہے۔ وہ اس کی گرفت سے نہیں نکل سکتا۔"

"دینے کو تو زماں خاں سنبھال لے گا پر جمیلہ کا کیا بنے گا؟ اسے تو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ وکیل بھی اس کی مدد کر رہا ہے۔" رحیم داد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

احسان شاہ نے اس دفعہ کچھ نہ کہا۔ وہ نظریں جھکائے سوچتا رہا۔ اسی اثناء میں کمرے کا دروازہ کھلا۔ میاں عبدالسبحان داخل ہوا۔ حویلی کا ایک ملازم اس کے ہم راہ تھا۔ وہ نظریں جھکا کر ایک طرف خاموش کھڑا ہو گیا۔

میاں سبحان ادھیڑ تھا' جسم بھاری بھرکم تھا اور رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی تھی۔ وہ اودر کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ احسان شاہ اسے دیکھتے ہی تپاک سے بولا۔ "بہت دیر کردی میاں صاحب' میں تو کب سے انتظار کر رہا تھا۔" میاں سبحان نے اودر کوٹ اتار کر ملازم کو دیا۔ اس نے اودر کوٹ سنبھال کر احتیاط سے کھونٹی پر لٹکا دیا۔ ملازم چند لمحے ادب سے گردن نیچی کیے کھڑا رہا' پھر چپ چاپ کمرے سے باہر چلا گیا۔

میاں سبحان آتش دان کے قریب کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ احسان شاہ نے رحیم داد سے اس کا تعارف کرایا۔ میاں سبحان بہت بڑا زمین دار تھا۔ رحیم یار خان کے علاوہ لائل پور میں بھی اس کے مربعے تھے۔ ہزاروں ایکڑ اراضی پر پھیلی ہوئی کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ آم' امرود اور مالٹے کے باغات تھے۔ ذاتی شکار گاہ تھی۔ لیکن زمین داری سے زیادہ اسے سیاست سے گہری دلچسپی تھی۔

میاں سبحان نے کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد سیاست کا ذکر چھیڑ دیا۔ احسان علی شاہ سیاسی جوڑ توڑ کا ماہر تھا اور حکمران طبقے میں اس کا اثر و رسوخ بھی بہت تھا۔ میاں سبحان اس کے پاس ایک سیاسی غرض سے آیا تھا۔

لیکن رحیم داد کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ جلد ہی ان کی سیاسی گفتگو سے بے زار ہو گیا۔ اس نے اکتا کر جماہی لی۔ احسان شاہ نے اسے دیکھا' مسکرا کر بولا۔ "چوہدری! لگتا ہے تجھے نیند آرہی ہے۔ تو روٹی کھا کر سو جا۔ میں نے میاں صاحب سے کچھ ضروری گل بات کرنی ہے' دیر تک سلسلہ چلے گا۔ تجھ سے اب صبح آرام سے بات چیت ہو گی۔"

رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلا آیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے

ملازم سے کھانا منگوایا اور کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔

☆

مہربان علی دوسرے روز بھی نہ آیا۔ تیسرے روز بھی رحیم داد اس کا انتظار کرتا رہا۔ رحیم داد کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ باجراں کی خودکشی کے واقعے کے بعد وہ اس قدر خوف زدہ ہو گیا تھا کہ احسان شاہ کے زور دینے پر بھی اس نے کوٹ سے کسی کو نہ بلوایا۔ وہ کمرے میں اکیلا ہی سوتا۔ چوتھے روز مہربان علی سہ پہر کو لاہور سے واپس آیا۔ لیکن رحیم داد سے اس کی ملاقات شام کو ہوئی۔

رحیم داد اس وقت احسان شاہ کے ساتھ گرم کمرے میں بیٹھا شغل بادہ نوشی کر رہا تھا۔ کمرے کے باہر سرما کی ٹھٹھرتی رات پھیل کر دھواں دھواں ہو گئی تھی۔ ہوا بپھری ہوئی تھی۔ اس کے تیز اور تند تھپیڑے دروازوں اور کھڑکیوں پر دستک دے رہے تھے۔ آتش دان کے دہکتے انگاروں کی سرخ آنچ سے رحیم داد اور احسان شاہ کے چہرے دمک رہے تھے۔ خمار آلود آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔

مہربان علی سردی سے کپکپا رہا تھا۔ اس نے اونچی آواز سے سلام کیا اور آہستہ آہستہ آتش دان کی جانب بڑھا۔ احسان شاہ نے پوچھا۔ "مہربان! تو لہور سے کیا خیر خبر لایا؟ چوہدری تیرا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔"

"میں جی وکیل کے منشی سے ملا تھا اور اپنے طور پر بھی پوری چھان بین اور پوچھ تاچھ کی۔" مہربان علی نے سنبھل سنبھل کر بتایا۔ "نادر خاں کی اطلاع بالکل درست ہے جی۔ جمیلہ نے بیڈن روڈ پر کرائے کے مکان کا بندوبست کر لیا ہے۔ وہ مکان میں نے دیکھا ہے۔ اس کے مالک سے بھی ملا تھا۔"

رحیم داد نے پوچھا۔ "اور زمین کی بیع کے بارے میں تو نے کیا پتہ لگایا؟"

"زمین کا سودا بھی جی، بالکل طے ہو چکا ہے۔ پولیس کا ایک ریٹائرڈ انسپکٹر زمین خرید رہا ہے۔ اس کا نام عبداللہ خان ہے، امرتسر کا مہاجر ہے۔ ویسے اوکاڑے میں اس کے آم اور مالٹے کے باغات بھی ہیں۔"

احسان شاہ نے کرید کر پوچھا۔ "تو نے یہ بھی پتہ چلایا کہ زمین کی لکھا پڑھی کا کام کب تک پکا اور مکمل ہو جائے گا؟"

"وکیل کا منشی کہتا تھا سارے کاغذات تیار ہیں۔" مہربان علی نے بتایا۔ "جمیلہ اگلے مہینے کے شروع میں لہور پہنچ جائے گی۔ اس کے پہنچنے کے بعد بیع کی رجسٹری کا کام بھی شروع ہو جائے گا۔"

"مہربان علی، اب تو جا آرام کر۔" احسان شاہ مزید بات چیت کرنا نہ چاہتا تھا۔

مہربان علی چلا گیا۔

رحیم داد اس کی باتیں سن کر سخت پریشان ہو گیا۔ احسان نے گلاس اٹھا کر بڑا گھونٹ بھرا اور رحیم داد کو تسلی دینے لگا۔ "چوہدری! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بتا، تیرے اندازے میں جمیلہ کب تک لہور چلی جائے گی؟"

"مہربان علی نے بتایا تو تھا، وہ اگلے مہینے کے شروع میں لہور پہنچ جائے گی۔"

"اس کو چھوڑ۔" احسان شاہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اپنی گل کر۔"

"تاجاں کے ویاہ تک وہ کوٹلہ ہرکشن میں ضرور ٹھہرے گی۔ ویاہ سے نمٹنے کے بعد لہور جائے گی۔ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔"

"اس معاملے میں نادر خان سے بھی گل بات کرنی ہوگی۔ اسے ہر بات کا تجھ سے زیادہ پتہ ہے اسے مشورے کے لیے کل ہی بلانا ہوگا۔"

"ہاں جی اس سے بات کرنی بہت ضروری ہے۔" رحیم داد نے احسان شاہ کی رائے سے اتفاق کیا۔ "وہ جنت کے ذریعے جمیلہ کے ارادوں کا پتہ چلا سکتا ہے۔"

"تیری باتوں سے لگتا ہے، جنت بھی نادر خان کی طرح ہوشیار اور تیز ہے۔"

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "اس سے بھی کچھ زیادہ ہی تیز ہے۔"

"کیا بات ہے چوہدری، تیری طبیعت تو اس پر نہیں آگئی۔" احسان شاہ نشے میں جھوم کر ہنسنے لگا۔ "میں نے تو جنت کو ایک ہی بار دیکھا ہے۔ نادر کے ساتھ آئی تھی۔ رنگ روپ تو اس کا ٹھیک ٹھاک ہے۔ عمر بھی زیادہ نہیں۔"

مگر رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی، چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔ "نہیں شاہ جی ایسی کوئی گل شل نہیں۔"

احسان شاہ نے کچھ نہ کہا۔ گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور خالی کر دیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں باہر نکلے۔ احسان شاہ مڑا اور حویلی کے زنان خانے کی جانب روانہ ہو گیا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے روز شام کا اندھیرا پھیلتے ہی نادر خان آ گیا۔ احسان شاہ اور رحیم داد آتش دان کے سامنے بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

احسان شاہ نے کسی تمہید کے بغیر پوچھا۔ ”نادر تیری اطلاع کی تو میں نے تصدیق کرالی ہے۔ یہ تو پتہ چل گیا‘ جمیلہ نے لہور میں رہنے کے لیے مکان کا بندوبست کرلیا ہے۔ زمین بیچنے کا سودا طے ہوچکا ہے۔ اب رجسٹری ہونی رہ گئی ہے۔“

”تو بھی یہی خبر لایا تھا ناں؟“ رحیم داد نے مداخلت کی۔

لیکن احسان شاہ نے اس کی بات کو اہمیت نہ دی اور نہ ہی نادر خان کو بولنے کا موقع دیا۔ اس کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ ”نادر یہ بتا‘ تیرے اندازے میں جمیلہ کب تک کوٹلہ ہرکشن چھوڑ کے لہور چلی جائے گی؟“

”مجھے تو جی لگتا ہے کہ وہ تاجاں کے ویاہ کے فوراً ہی بعد لہور چلی جائے گی۔ میں نے اس بارے میں جنت سے پوچھا تھا۔ وہ یہی بتاتی تھی۔ میرے خیال میں وہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا تاجاں کے ویاہ تک تو وہ اپنے پنڈ میں ضرور ٹھہرے گی۔“ احسان شاہ نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

”ہاں جی‘ یہ تو طے ہے۔“ نادر خان نے وثوق سے کہا۔ ”تاجاں کا ویاہ تو وہ ایسے چاؤ اور لگن سے کررہی ہے جیسے اپنی سگی دھی کا ویاہ کررہی ہو۔ اس پر تو آج کل اسی کی دھن سوار ہے۔ کسی اور گل بات کا اسے ہوش ہی نہیں۔ جب دیکھو تاجاں کے ویاہ کے بارے میں باتیں کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔“

احسان شاہ سوچتا رہا۔ اس نے نادر خان کی باتوں پر کسی ردعمل کا فوری طور پر اظہار نہ کیا۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ جلتا ہوا ایک کوئلہ زور سے چٹخا۔ چنگاریاں اڑیں اور آتش دان کے باہر تک بکھر گئیں۔ احسان شاہ نے مڑکر آتش دان کے دہکتے ہوئے سرخ سرخ انگارے دیکھے پھر نادر سے پوچھا۔

”نادر یہ بتا‘ تاجاں کی جنج کس روز آئے گی؟“

”آج منگل ہے جی۔“ نادر خان سر اٹھا کر سوچنے لگا۔ ”جمعے کی شام کو جنج چڑھے گی۔ زمین دارنی نے مجھے یہی بتایا ہے اور اسی حساب سے ویاہ کی تیاریاں بھی ہورہی ہیں۔“

”مطلب یہ کہ اب صرف تین راتیں رہ گئیں ہیں۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”جو کچھ کرنا ہے انھی تین راتوں میں کرنا ہوگا۔ آج کی رات تو سمجھو گزر گئی۔ دو راتیں رہ جاتی ہیں۔“

رحیم داد اس کی بات کا مفہوم مطلق نہ سمجھ سکا۔ نادر خاں کے بشرے سے بھی ایسی ہی کیفیت ہویدا تھی۔ وہ تو خاموش رہا مگر رحیم داد نے بے چین ہوکر کہا۔ ”اب کیا ہوسکتا ہے؟“

”یہ تو مجھ پر چھوڑ دے‘ کیا ہوسکتا ہے اور کیا ہوگا۔“

”پر تاجاں کے ویاہ سے جمیلہ کے لہور جانے کا کیا ناتا؟“ وہ ابھی تک احسان شاہ کی بات کا مقصد نہ سمجھ سکا تھا۔

”تو چپ کرکے دیکھتا جا۔“ احسان شاہ بے پروائی سے بولا۔ قدرے تامل کیا‘ پھر نادر خاں کی جانب متوجہ ہوا۔ ”تاجاں تو اب مائیاں بیٹھ چکی ہوگی۔“

”ہاں جی‘ مائیاں تو وہ کئی روز پہلے بیٹھ چکی ہے۔“

”رات کو اس کے پاس کون رہتا ہے؟“ احسان شاہ نے استفسار کیا۔

”ویسے تو جی کئی زنانیاں رہتی ہیں۔ تاجاں کی ماں پھاتاں بھی رہتی ہے۔ پر زمین دارنی نے جنت کو خاص طور پر لگایا ہے کہ وہ رات کو تاجاں کے پاس رہے۔“ نادر خان نے احسان شاہ کو مطلع کیا۔ ”وہ تو جی آج کل تاجاں کے ساتھ ہی سوتی ہے۔“

”یہ تو اور بھی بہتر ہے۔“ احسان شاہ کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ ”اب تو کام آسان ہوجائے گا۔“

رحیم داد نے مضطرب ہوکر پہلو بدلا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ ”شاہ جی تو کرنا کیا چاہتا ہے؟“

”میں چاہتا ہوں جنج پہنچنے سے پہلے ہی تاجاں کو اٹھوالیا جائے۔ اسے لاکر یہاں حویلی میں رکھا جائے۔“ احسان شاہ نے نگاہیں اٹھا کر نادر خاں کو تیز نظروں سے دیکھا۔ ”تو نے بھی سن لیا نادر؟“

”بالکل سن لیا جی۔“ نادر خاں نے مستعدی سے جواب دیا۔

احسان شاہ کے چہرے پر خشونت پھیل گئی۔ وہ ایک ہاتھ اٹھا کے انگلیوں سے بائیں طرف کی مونچھ مروڑنے لگا۔ اس نے نادر خاں کو استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ ”وہ جمعرات کی رات ہوگی۔“ احسان شاہ سنبھل سنبھل کے بولنے لگا۔ ”اس رات فیکا دوسرے کرندوں کے ساتھ کوٹلہ ہرکشن پہنچ جائے گا۔ سب جیپ میں ہوں گے۔ جیپ درختوں تلے کھڑی کردی جائے گی۔ فیکا اور اس کے ساتھی بندے آدھی رات سے پہلے ہی پہنچ جائیں گے۔ اور اس گھر کے پاس چھپ کر بیٹھ جائیں گے جہاں تاجاں مائیاں بیٹھی ہے۔ اب تو یہ بتا‘ اس کام میں کوئی مشکل تو نہیں پڑے گی؟“

”نہیں جی‘ کوئی مشکل نہیں ہوگی۔“ نادر خاں نے جواب دیا۔ ”تاجاں جس گھر میں مائیاں بیٹھی ہے‘ اس کے نزدیک صرف مہمان خانہ ہے جس میں ان دنوں میں اپنی بچیوں کے ساتھ رہتا ہوں۔

آس پاس اور کوئی مکان شکان نہیں۔ آگے رڑی ہے۔ اس کے ساتھ جھنگر ہے جو گھر کے پچھواڑے تک پھیلا ہے۔ اس سے ذرا ہٹ کر باغ ہے۔" نادر خاں نے پورا حدود اربعہ بتایا۔ "یوں سمجھ لیں جی' ادھر ادھر ویرانہ ہی ویرانہ ہے۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" احسان شاہ سرہلا کے بولا۔ "جس کمرے میں تاجاں مائیاں بیٹھی ہے اس کا کوئی دروازہ آنگن میں یا گھر کے باہر بھی کھلتا ہے؟"

نادر خاں جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ احسان شاہ نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔ "مجھے نہ بتا۔ یہ ساری باتیں تو فیکا کے سامنے ہی بتانا۔ مجھ سے زیادہ اس کے لیے ان کا جاننا ضروری ہے۔" اس نے اونچی آواز سے کمرے کے دروازے پر بیٹھے ہوئے ملازم کو اندر بلایا۔ وہ آیا تو اسے ہدایت کی کہ رفیق عرف فیکا کو کمرے میں بھیج دے۔

وہ خاموشی سے چلا گیا۔ ذرا ہی دیر بعد رفیق آ گیا۔ چہرے مہرے سے وہ خاصا ہیبت ناک نظر آتا تھا۔ اس کا جسم لمبا اور مضبوط تھا۔ رنگ سیاہ تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور چمک دار تھیں۔ انداز میں اکھڑپن تھا۔ آواز بھدی اور کرخت تھی۔ وہ احسان شاہ کے روبہ رو نظریں جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

احسان شاہ نے نادر خاں سے کہا۔ "ہاں' اب بتا۔"

"وہ ایسا ہے جی' تاجاں جس کمرے میں مائیاں بیٹھی ہے' اس کے آدھے سے بھی کم حصے میں پردہ پڑا ہے۔" نادر خاں نے بتایا۔ "تاجاں پردے کے پیچھے رہتی ہے۔ اس حصے میں دروازہ بھی ہے جو گھر کے پچھواڑے کھلتا ہے' پر اس میں تالا پڑا رہتا ہے۔ اسے تب کھولا جاتا ہے جب تاجاں ٹٹی پیشاب کے لیے سویرے ہی سویرے باہر نکلتی ہے۔ وہاں جی کیکر کے درخت اور گھنی جھاڑیاں ہیں۔ اس کے آگے تھوڑا سا کھلا میدان ہے۔ میدان کے ایک طرف باغ ہے۔ جہاں باغ ختم ہوتا ہے وہاں حویلی کا کڑہ ہے جس میں ڈھور ڈنگر رہتے ہیں۔ اس سے ملا ہوا اصطبل ہے۔ کڑے اور اصطبل کی نگرانی کے لیے رکھوالا موجود رہتا ہے۔"

احسان شاہ نے رفیق کو مخاطب کیا۔ "فی کے! تو نے ساری گلاں سن لیں' پر تو آج یا کل رات خود موقعے پر جا کر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے' پوری طرح سمجھ لے۔ تجھے پرسوں رات کارروائی کرنی ہے۔" اس نے مڑ کر نادر خاں کی جانب دیکھا۔

"تو جا کر جنت کی ڈیوٹی لگا دے کہ وہ اس رات فیکا کے پہنچنے کے بعد تاجاں کو کسی بہانے باہر لے جائے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو چپکے سے دروازے کا تالا کھول دے۔ ہاں' یہ تو بتا' تالے کی چابی کس کے پاس رہتی ہے؟"

"جنت ہی کے پاس رہتی ہے۔ پہلے میں اسی گھر میں رہتا تھا۔ اسے تو میں نے ویاہ کے لیے خالی کیا ہے۔"

احسان شاہ نے رفیق کو مخاطب کیا۔ "فی کے! ویسے تو تیرا کام زیادہ مشکل نہیں پر میں چاہتا ہوں' ذرا بھی گڑبڑ نہ ہو۔ ہر کام خاموشی سے ہو جائے۔"

رفیق سینہ تان کر بولا۔ "شاہ جی' تیرا حکم چاہیے۔ سب کچھ ٹھیک ہی ہو گا۔ فکر کی کوئی گل نہیں۔"

"تو اب بہت پکا ہو گیا ہے۔" احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ پھر اس نے مڑ کے نادر کو دیکھا۔ "جب تاجاں کو فیکا اٹھا کر لے جائے تب تجھے کیا کرنا ہو گا؟ یہ گل بات تجھے مہربان علی سمجھا دے گا۔ اگے جو کچھ ہو گا اسے سب کچھ پتہ ہے۔ اس بارے میں وہ مجھ سے پہلے ہی بات کر چکا ہے۔ جیسا وہ کہے تیں نوں ویسا ہی کرنا ہو گا۔ سمجھ گیا نا؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" نادر خاں نے احسان شاہ کو اطمینان دلایا۔ "ہر کام ویسے ہی ہو گا جیسی مجھے ہدایت دی جائے گی۔"

احسان شاہ بولا۔ "اب تو فیکا کے ساتھ جا اور مہربان سے مل لے۔ وہ تیرا انتظار کر رہا ہو گا۔"

نادر خاں اور رفیق چلے گئے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ احسان شاہ بھی تھوڑی ہی دیر بعد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے پوچھا۔ "تو ابھی سے جا رہا ہے؟ آگے کیا کرنا ہے۔ اس بارے میں تجھ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

"اب تو کل ہی بات ہو گی۔" احسان شاہ نے جواب دیا۔ "آگے کی فکر نہ کر۔ اسے مجھ پر چھوڑ دے۔ چپ کر کے دیکھتا جا۔"

"پر مجھے یہ تو سمجھ لینے دے کہ کیا کیا کرنا ہو گا؟" رحیم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ "بہت سوچ سمجھ کر کام کرنا ہو گا۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

"پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہی ہو گا۔ میں کل تجھے ہر گل بات ٹھیک طرح سمجھا دوں گا۔ مجھے اب جانا ہے۔ میاں سبحان ایک ایم۔ پی۔ اے اور ڈپٹی کمشنر کے ہم راہ لائل پور سے آ رہا ہے۔ تینوں پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ میں نے ان سے بہت اہم باتیں کرنی ہیں۔"

"ان سے اسی کمرے میں گل بات کرنی ہے؟" رحیم داد نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں' ان سے بڑے کمرے میں بات چیت ہو گی۔ تیرا جی چاہے تو یہیں بیٹھ۔ پینے پلانے کا

ارادہ ہو تو اپنے لیے منگوا لے۔ میں نے آج نہیں پینی۔"

رحیم داد کی بے قراری دیکھ کر احسان شاہ نے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور اس کے ساتھ ساتھ دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ "چوہدری' تو جا کر آرام سے اپنے کمرے میں روٹی کھا۔"

اپنے کمرے میں پہنچ کر رحیم داد چپ چاپ لیٹا رہا۔ احسان شاہ کے اطمینان دلانے کے باوجود وہ خائف تھا۔ اس نے کھانا بھی نہ کھایا۔ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

صبح ہوئی تو اس کا یہی عالم تھا۔ احسان شاہ سے بھی اس کی ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ میاں سبحان اور لائل پور کے ڈپٹی کمشنر کے ساتھ تمام دن اور رات گئے تک مصروف رہا۔ جمعرات کو رحیم داد کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

میاں سبحان اور ڈپٹی کمشنر سہ پہر کو لاہور چلے گئے۔ مگر احسان شاہ سے رحیم داد کی ملاقات شام ہی کو ہوئی۔ وہ حسب معمول مطمئن اور چاق چوبند نظر آ رہا تھا۔ ملازم نے بوتل کے علاوہ گلاس بھی میز پر رکھ دیئے تھے۔ لیکن رحیم داد کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ احسان شاہ کے اشارے پر ملازم بوتل جگ اور گلاس واپس لے گیا۔

رحیم داد اس کے اس رویئے کا سبب جاننا چاہتا تھا' لیکن وہ چپ رہا۔ دونوں نے ساتھ کھانا کھایا پھر رات گزری' تاریکی بڑھی' سناٹا گہرا ہوتا گیا۔ رحیم داد کی بے چینی میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ مگر احسان شاہ سیاسی جوڑ توڑ کے بارے میں اپنے کارنامے سناتا رہا۔ رحیم داد بت بنا اس کی باتیں سنتا رہا۔ اسے احسان شاہ کی سیاسی سرگرمیوں سے ذرا لگاؤ نہ تھا۔ وہ اپنی سوچ میں گم تھا اور جمیلہ کے بارے میں غور کر رہا تھا۔

رات آدھی ہو گئی۔ آتش دان میں انگارے دہکتے رہے۔ کمرے کا دروازہ چرچراتا ہوا کھلا۔ رحمتے اندر داخل ہوئی۔

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دیکھا۔ رحمتے کے عقب میں تاجاں 'سکڑی سکڑائی سہمی ہوئی کھڑی ہے۔ وہ مانجھے کا زرد لباس پہنے ہوئے تھی۔ جو اب ملگجا ہو گیا تھا۔ وہ سردی سے کپکپا رہی تھی۔ اس کا چہرہ دوپٹے کے آنچل سے چھپا تھا۔ تاجاں کے داخل ہوتے ہی کمرے میں بٹنے کی تیز بو پھیل گئی۔

"یہ تاجاں آ گئی ہے جی۔" رحمتے نے اس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "نیکا اسے جیپ میں ڈال کر لایا ہے۔"

احسان شاہ نے تاجاں کو دیکھا اور لمحے بھر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر رحمتے کی جانب متوجہ ہوا۔ "رحمتے! اسے ساتھ کے کمرے میں پہنچا کر باہر سے دروازہ بند کر دے۔ تیں نوں کہیں اور نہیں جانا۔ دروازے پر ہی رہنا ہے۔"

رحمتے نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سی مڑی اور تاجاں کے ساتھ باہر چلی گئی۔ دونوں کے جانے کے بعد رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔ "تاجاں تو آ گئی پر اس کے آنے سے کیا ہو گا؟ مجھے اس سے کیا لینا۔"

"تجھے اس سے کچھ نہیں لینا پر جمیلہ کو تو اس کی سخت ضرورت ہے۔" احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ "چپ کر کے دیکھتا جا۔" احسان شاہ نے قدرے تامل کے بعد پر اعتماد لہجے میں کہا۔ "تھوڑی دیر میں جمیلہ بھی یہاں آ جائے گی۔"

"کیا نیکا اسے بھی اٹھا کر لائے گا؟"

"نہیں وہ یہاں اپنی مرضی سے آئے گی۔" احسان شاہ نے زور دے کر کہا۔ "اسے یہاں آنا پڑے گا۔"

رحیم داد کو احسان شاہ کی بات پر یقین نہ آیا لیکن وہ خاموش رہا۔ اس کی آنکھوں میں استعجاب جھلک رہا تھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے کلبلا رہے تھے۔

مگر احسان شاہ کا کہا بالکل درست نکلا۔ تاجاں کو پہنچے ہوئے گھنٹہ' سوا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ نادر خاں کمرے کے اندر آیا۔ اس کے ہم راہ جمیلہ بھی تھی۔ رحیم داد ششدر رہ گیا۔ اس کی رگوں میں خون جمنے لگا۔

آتش دان میں دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخ روشنی میں جمیلہ کا خوب صورت چہرہ تمتما رہا تھا۔ بالوں کی ایک لٹ بکھر کر ماتھے پر جھول رہی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں جھنجلاہٹ اور غصے کی تیز چمک تھی۔ وہ سفید اونی دو شالہ اوڑھے ہوئے تھی۔

وہ احسان شاہ کے روبہ رو سر اٹھا کے کھڑی ہو گئی۔ احسان شاہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی' مسکرایا اور بے تکلفی سے بولا۔ "آخر تو آ ہی گئی۔" اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور کھل اٹھی۔

"کھڑی کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔ سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی آئی ہے۔ ذرا گرم ہو جا۔"

"میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔" جمیلہ نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ بتا' تاجاں کہاں ہے؟"

”فکر نہ کر۔ وہ یہیں ہے اور بہت آرام سے ہے۔ اسے کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ وہ تجھے خود بتادے گی۔“

”میں اسے ملنا چاہتی ہوں اور ابھی ملنا چاہتی ہوں۔“ اس کے لہجے میں بڑی سوزش تھی۔ رحیم داد نے نرم لہجے میں اسے تسلی دینے کی کوشش۔ ”تو بالکل فکر نہ کر۔ تاجاں ٹھیک ٹھاک ہے۔“

جمیلہ نے سر کو خم دے کر رحیم داد کو قہر آلود نظروں سے دیکھا‘ مگر کوئی بات نہ کی۔ احسان شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”شاہ جی! مجھے ٹھیک ٹھیک بتا۔ تو نے تاجاں کو کہاں رکھا ہے؟ مجھے پہلے اسے ملنا ہے۔“

”ضرور مل لے‘ اپنا اطمینان کرلے۔“ احسان شاہ نے جمیلہ کے لہجے کی تلخی پر کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا‘ زیرلب مسکراتا رہا۔ ”اس سے ملنے اور اطمینان کرنے کے بعد یہاں واپس آجانا۔“ اس نے آواز میں نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”تو اسے واپس لینے ہی کے لیے یہاں آئی ہے ناں؟“

”میں اسے لینے ہی کے لیے آئی ہوں اور اسے لے کر ہی جاؤں گی۔“

”ضرور لے جا۔“ احسان شاہ کا لہجہ بدستور نرم اور شگفتہ تھا۔ ”پر اس سے مل تو لے۔“ احسان شاہ نے رحمتے کو بلایا اور جمیلہ کو اپنے ہم راہ لے جانے کا حکم دیا۔

جمیلہ کے جانے کے بعد احسان شاہ نے نادر خان سے دریافت کیا۔ ”نادر یہ تو بتا‘ تو جمیلہ کو یہاں لایا کیسے؟ چوہدری‘ یہ راز جاننے کے لیے بہت بے چین ہے۔ دیکھ تو کیسا حیران پریشان بیٹھا ہے۔“ وہ کھل کھلا کر ہنسنے لگا۔

”وہ ایسا ہوا جی جنت نے چپکے سے دروازہ کھول دیا تھا۔“ نادر خان نے بتایا۔ ”فیکا آرام سے اندر پہنچا۔ تاجاں بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے نزدیک پہنچ کر تاجاں کا جھٹ منہ دبا دیا۔ اسے اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور ایسی خاموشی سے باہر لے گیا کہ کمرے میں سوئی ہوئی زنانیوں میں سے کسی کو ذرا بھی پتہ نہ چلا۔“

”پر جنت تو جاگ رہی تھی ناں؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”بالکل جاگ رہی تھی جی بلکہ فیکا کے پہنچنے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اسے کہہ جو رکھا تھا۔“ نادر خاں نے رحیم داد کو بتایا۔ ”جب فیکا اپنے ساتھیوں کے ساتھ تاجاں کو جیپ میں ڈال کر لے گیا تب جنت میرے پاس آئی۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ اس نے سب کچھ مجھے بتادیا۔“

”جمیلہ اس وقت کہاں تھی؟“ احسان شاہ نے دریافت کیا۔

”وہ جی اوپر اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔“ نادر خان گویا ہوا۔ ”جنت کی زبانی جب مجھے یہ پتہ چل گیا کہ فیکا تاجاں کو اٹھا کر لے گیا ہے‘ تب مہربان علی کی ہدایت پر میں زمیں دارنی کے پاس گیا جنت میرے ساتھ تھی۔ اس نے زمین دارنی کو جگایا اور صاف صاف بتادیا کہ تاجاں کو اغوا کرلیا گیا۔ یہ سنتے ہی وہ بدحواس ہوگئی۔ گھبرائی ہوئی نیچے اتری اور اس کمرے میں گئی جہاں تاجاں مائیاں بیٹھی تھی۔ تاجاں کو وہاں نہ پا کر وہ پریشان ہوگئی۔“

”اس نے کوئی شور شرابا تو نہیں کیا؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

نہیں جی‘ وہ بالکل چپ کرکے رہ گئی۔ اس نے کسی کو بھی تاجاں کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ جنت کو بھی منع کردیا۔ وہ وہاں زیادہ دیر ٹھہری نہیں‘ فوراً مہمان خانے میں آگئی۔ میں اور جنت اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ ساری زنانیاں بے خبر سوتی رہیں۔ انھیں کچھ بھی پتہ نہ چلا؟“

”مہمان خانے میں پہنچ کر تو اس نے تجھ سے بھی پوچھ تاچھ کی ہوگی؟“ احسان شاہ نے استفسار کیا۔

”پہلے تو جی وہ جنت سے پوچھ تاچھ کرتی رہی پر اس نے زیادہ گل بات نہ کی۔ اسے جلد ہی واپس کمرے میں بھیج دیا۔ ساتھ ہی یہ ہدایت کی کہ خاموشی سے اپنی جگہ پر جا کر لیٹ جائے اور پوری طرح کوشش کرے کہ تاجاں کے بارے میں کسی کو کچھ پتہ نہ چلے۔“ نادر خاں سنبھل سنبھل کر ایک ایک تفصیل بیان کرتا رہا۔ ”جنت کے جانے کے بعد زمیں دارنی نے مجھ سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ تاجاں کو کون اٹھا کر لے گیا۔“

رحیم داد زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ ”تو نے کیا بتایا؟“

”میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا‘ شاہ جی کے بندے تاجاں کو اٹھا کر جیپ میں لے گئے ہیں۔“

”جمیلہ نے تجھ سے یہ نہیں پوچھا‘ تجھے کیسے پتہ چلا؟“

”اس نے مجھ سے یہ گل پوچھی تھی۔“ نادر خاں نے جواب دیا۔ ”میں نے اسے بتایا‘ تاجاں کو اٹھا کر لے جانے کے بعد شاہ جی کا ایک کرندہ میرے پاس مہمان خانے میں آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تھا۔ اس نے مجھے کہا‘ زمیں دارنی اگر تاجاں کو واپس لانا چاہتی ہے تو وہ شاہ جی کی حویلی پہنچ جائے۔ نہر کے کنارے جیپ کھڑی ہے‘ وہ اسے لے جائے گی۔“

”کیا تیرے پاس شاہ جی کا کوئی کرندہ سچ مچ آیا تھا؟“ رحیم داد نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے پوچھا۔

رحیم داد کے احمقانہ سوال پر احسان شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مگر نادر نے نہایت

متانت سے کہا۔

"میرے پاس آنا شانا کس کو تھا جی۔ میں نے تو مہربان علی کی ہدایت پر یہ بات زمیں دارنی سے کہی تھی۔" اس نے کھنکار کر گلاف صاف کیا۔ "یہ سنتے ہی اس کا تو برا حال ہوگیا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کے بولی۔ یہ کیا ہوگیا نادر؟ میری تو سمجھ کام نہیں کر رہی۔ کل تاجاں کی جنج آرہی ہے۔ جب تاجاں ہی نہ ہوئی تو کیسے ویاہ ہوگا؟ میں سب کو کیا جواب دوں گی؟ یہ کہتے کہتے جی وہ بلک بلک کر رونے لگی۔"

"وہ تو بالکل پاگل ہوگئی ہوگی۔" رحیم داد نے کہا۔

"پاگل تو جی اسے ہونا ہی تھا۔" نادر خاں بولا۔ "میں نے پہلے تو اسے دلاسا دیا۔ جب اس نے رونا بند کیا تو مشورہ دیا اب تو بے عزتی سے بچنے کی یہی صورت ہے' شاہ جی کے پاس چلا جائے اور تاجاں کو واپس لانے کے لیے منت سماجت کی جائے۔ ساتھ ہی میں نے زور دیا وکت بہت کم ہے جو کرنا ہے جلد سے جلد کرنا ہے۔ تاجاں کو سویرا ہونے سے پہلے ہی واپس آجانا چاہیے۔ ورنہ بات سارے پنڈ میں پھیل جائے گی۔ جنج آئی بھی تو واپس چلی جائے گی۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "یہ سن کر وہ تجھ سے نراض تو نہیں ہوئی؟"

"پتہ نہیں جی' اس نے میرے بارے میں کیا سوچا۔" نادر خاں کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ "میری باتیں سنتے ہی وہ ہاتھوں سے منہ چھپا کر ایک بار فیر رونے لگی۔ ئں چپ کر کے بیٹھا رہا پر ذرا ہی دیر بعد وہ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہوئی اور یہاں آنے کے لیے تیار ہوگئی۔ میرے ہم راہ وہ مہمان خانے سے باہر نکلی۔ جیپ بھی تب تک تاجاں کو ادھر پہنچا کر واپس آگئی تھی۔ زمین دارنی میرے ساتھ اس میں سوار ہوگئی۔"

احسان شاہ پوری روداد سن کر بولا۔ "نادر تو سچ مچ بہت کام کا بندہ ہے۔" وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔

"چوہدری! تو نادر کو تکڑا انعام دینا۔ اس نے زبردست کام کیا ہے۔"

"کام تو اس نے انعام ہی کا کیا ہے۔" رحیم داد نے بے ساختہ کہا۔ "اسے ضرور انعام ملے گا۔ شاہ جی تیری بات خالی نہیں جائے گی۔ فکر نہ کر۔"

احسان شاہ نے نادر خاں کو جلد ہی رخصت کردیا۔ "نادر! اب تو مہربان علی کے پاس جا۔ وہ تیرا انتظار کر رہا ہوگا۔" یہ کہتے کہتے وہ ٹھٹکا۔ "اور دیکھ باہر رحمتے ہوگی۔ اس سے کہہ کہ جمیلہ کو یہاں بھیج دے۔"

نادر خاموشی سے چلا گیا۔

"لے چوہدری' تیرا کام تو بن گیا۔" احسان شاہ نے ہنس کر رحیم داد سے کہا۔

رحیم داد سادگی سے بولا۔ "سچ پوچھ تو اب تک سمجھ نہیں آئی' کیا کام بنا۔"

"گھبرا نہیں' جمیلہ کو آنے دے۔ تھوڑی دیر میں سب کام پورا ہوجائے گا اور تجھے بھی سب پتہ چل جائے گا۔"

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ اس کی سانس کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ وہ بے چینی کے عالم میں بار بار پہلو بدلنے لگا۔ ٹھہر ٹھہر کر دروازے کی جانب دیکھتا۔ کمرے میں سکوت تھا۔ احسان شاہ بھی چپ تھا۔

☆

جمیلہ شکست خوردہ انداز میں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ سوگوار تھا۔ آنکھیں بھیگی ہوئی تھی۔ وہ نڈھال اور بہت تھکی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر کرسی کھسکائی اور احسان شاہ کے روبہ رو بیٹھ گئی۔ رحیم داد کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ چہرے پر دکھ کے سائے منڈلا رہے تھے۔

"تاجاں سے مل لی۔ وہ ٹھیک ٹھاک ہے ناں؟" احسان شاہ نے جمیلہ سے پوچھا۔

"ہاں' میں اس سے مل لی۔" جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے دیکھتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری' نظریں اٹھا کر احسان شاہ کی جانب دیکھا۔ "تیں نوں پتہ نہیں شاہ جی' وہ مجھے اپنی ماں کی طرح پیار کرتی ہے۔ چھوٹی سی تھی تو اس کا پیو مرگیا۔ بعد میں اسے میں نے ہی پالا۔ پچھلے سات سال سے میرے ہی پاس ہے۔ مانو اب تو وہ میری ہی دھی ہے۔" اس کے لہجے میں فریاد کا انداز تھا۔

"شاہ جی' تو نے ٹھیک نہیں کیا۔ تو اسے کیوں برباد کرنا چاہتا ہے؟ اس کا تو کیول ایک رانڈ ماں کے اور کوئی بھی نہیں۔"

"میں نوں تو اس سے کچھ نہیں لینا۔" احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ "تو چاہے تو وہ تیرے ساتھ واپس جاسکتی ہے۔ اس کی زندگی برباد ہونے سے بھی بچ سکتی ہے۔ سب کچھ تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔"

"شاہ جی' فیر تو کیا چاہتا ہے؟" جمیلہ کی آواز بھرا گئی۔ "میں تاجاں کو برباد ہونے سے بچانے کے لیے تیری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔" اس نے کسی مزاحمت کے بغیر احسان شاہ کے سامنے ہتھیار

ڈال دیئے۔ وہ اس کے پاس آنے سے پہلے ہی شاید یہ فیصلہ کرچکی تھی۔ اس نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔

"میں تاجاں کو اپنے ساتھ لے کر ہی جاؤں گی۔"

جمیلہ کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ آنکھوں میں ستارے جھل ملائے اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس نے بے قرار ہوکر اپنا چہرہ چھپا لیا۔ کمرے کی گہری خاموشی میں اس کی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ آتش دان میں سلگتے ہوئے انگاروں پر راکھ کی تہہ جم گئی تھی۔ احسان شاہ نے قریب رکھے ہوئے پوکر کا دستہ پکڑا اور لوہے کے آنکڑے سے انگارے کریدنے لگا۔

انگاروں کی آنچ تیز کرنے کے بعد اس نے پوکر ایک طرف رکھ دیا۔ مڑ کے جمیلہ کو دیکھا' بے رخی سے بولا۔ "اس طرح ٹسوے بہانے سے کام نہیں چلے گا۔" اس کا لہجہ تند ہوگیا۔ "تاجاں کو واپس لے جانے کے ارادے سے آئی ہے تو ٹھیک سے گل بات کر۔"

"کیا چاہتا ہے توں؟" جمیلہ کی شکستہ آواز ابھری۔

"میں یہ چاہتا ہوں' نہ تو اپنی زمین بیچ کرے گی اور نہ کوٹلہ ہرکشن چھوڑ کر لہور جائے گی۔" احسان شاہ کے لہجے میں گونج اور دبدبہ تھا۔ "تیرے سارے منصوبوں کا مجھے اور چوہدری کو پتہ چل چکا ہے۔" اس نے قہر آلود نظروں سے جمیلہ کو دیکھا۔ اس کا چہرہ درشت ہوگیا۔ ہونٹوں پر زہرخند نمودار ہوا۔

"اب بیٹھی ٹسوے بہا رہی ہے' جب تو لہور جانے کے لیے اپنے وکیل رندھاوا سے چپکے چپکے سکیمیں بنا رہی تھی' تب یہ نہ سوچا' تو کیا کرنے جا رہی ہے؟ چوہدری کو مغالطے میں رکھ کر کس طرح دھوکا دے رہی ہے؟"

"میں کسی کے ساتھ دھوکا نہیں کر رہی۔" اس نے سر اٹھا کے تیکھی نظروں سے احسان شاہ کو دیکھا۔ "میں اگر اپنی زمین بیچنا چاہوں اور لہور جا کر رہنا چاہوں تو یہ دھوکا کس طرح ہوا؟ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ توں یا چوہدری اس بارے میں مجھ سے پوچھنے والا کون ہوتا ہے؟"

"زیادہ تیزی نہ دکھا۔" احسان شاہ نے ڈپٹ کر کہا۔ "یہ بتا اور صاف صاف بتا' تاجاں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہے یا نہیں؟"

"تجھے پہلے ہی بتا چکی ہوں' میں اسی کارن یہاں آئی ہوں۔" جمیلہ کی آواز پھر بجھ گئی۔ "میں اسے اپنے ساتھ لے کر ہی جاؤں گی۔"

"ضرور اسے لے جا' خوشی سے لے جا۔" احسان شاہ کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "پر تاجاں کے ویاہ سے پہلے تیرا چوہدری کے ساتھ نکاح ہوگا۔"

جمیلہ کرسی پر پتھر کی طرح بیٹھی رہی۔ اس کے ذہن میں منڈلاتا ہوا جذبات کا سیلاب چہرے پر دھوپ چھاؤں بن کر لہرا رہا تھا۔

مگر احسان شاہ نے اسے زیادہ دیر غور کرنے کا موقع نہ دیا۔ "تجھے جو کچھ طے کرنا ہے' جلدی کر۔ ٹائم کم ہے۔ سویرا ہوگیا تو تاجاں کو واپس لے جانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ بات پنڈ میں پھیل گئی تو آئی ہوئی جنج واپس چلی جائے گی۔ پوری طرح یہ سوچ لے۔"

جمیلہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ احسان شاہ کی درشتی پر اس نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "شاہ جی جیت تو ہمیشہ تیری ہی ہوتی ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "میں تاجاں کو لے کر ہی جاؤں گی۔ تاجاں کو بلا لے۔ میں نے جلد سے جلد پنڈ پہنچنا ہے۔"

"تاجاں بھی آجائے گی۔" احسان شاہ کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ "پر اس کے یہاں آنے سے پہلے چوہدری کے ساتھ تیرا انتظام بھی تو ہوگا۔ نکاح ابھی ہوگا۔ بول کیا کہتی ہے؟"

"میں نے کیا کہنا ہے۔" اس نے مڑ کر خونخوار نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ رحیم داد نے گھبرا کے نگاہیں نیچی کرلیں۔ جمیلہ چند لمحے تک ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرتی رہی۔ "میں نے تو تاجاں کو یہاں سے لے کر ہی جانا ہے۔ میں اسے وچن دے کر آئی ہوں۔" اس کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔

احسان شاہ نے مزید بات نہ کی۔ فوراً مہربان علی اور نادر خاں کو بلایا۔ ان کے ہم راہ مسجد کا ملّا بھی تھا جسے مہربان علی نے عشاء کی نماز کے بعد ہی بلوا لیا تھا۔ وہ پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے نکاح نامہ تیار کر رکھا تھا۔ اسٹامپ پیپر پر جمیلہ کی زمین کی بیع کا رحیم داد کے ساتھ معاہدہ بھی لکھا ہوا اس کے پاس موجود تھا۔

ملّا نے احسان شاہ کے حکم پر رحیم داد کا جمیلہ سے نکاح پڑھایا۔ نادر خاں نے جمیلہ کی جانب سے وکیل کے فرائض انجام دیئے۔

احسان شاہ اور مہربان علی گواہ بنے۔ ایجاب و قبول ہوا۔ رحیم داد کے ساتھ جمیلہ نے بھی ہنکاری بھری۔ نکاح نامے پر دستخط بھی کردیئے۔ مسجد کے ملّا' رحیم داد' احسان شاہ' مہربان علی اور نادر خاں نے بھی دستخط کردیئے۔

نکاح کے بعد مہربان علی نے زمین کی بیع کی دستاویز جمیلہ کے سامنے پیش کی۔ جمیلہ کی آنکھیں آتش دان کے انگاروں کی مانند دہک رہی تھیں۔ اس نے نہ کوئی مین میخ نکالی نہ کسی برہمی کا اظہار

کیا۔ چپ چاپ بیع نامے پر بھی دست خط کر دیئے۔

مہربان علی، نادر خاں اور ملّا باہر چلے گئے۔ احسان شاہ نے رحمتے کو بلایا۔ وہ جمیلہ کو اپنے ہم راہ لے گئی۔

جمیلہ کو علیحدہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ اس کا حجلہ عروسی تھا۔ جمیلہ نے بجھی بجھی نظروں سے درودیوار پر ایک نظر ڈالی، تڑپ کر نچلا ہونٹ دانتوں کے نیچے دبایا اور نڈھال ہو کے بستر پر گر پڑی۔

ہر قسم کے ناول، ماہانہ ڈائجسٹ، بچوں کی کہانیاں، عمران سیریز
[illegible] لائبریری
منتظم احمد طارق 0301-7283296 0334-9630911

شوکت صدیقی

جانگلوس

۳۵

رحیم داد نے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

سامنے مسہری پر جمیلہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ خشک اور مٹیالا پڑ گیا تھا۔ اس نے ویران نظروں سے رحیم داد کو دیکھا اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”تو جو چاہتا تھا وہ ہو گیا۔“ اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ”دو بجنے والے ہیں۔ تاجاں کو جلد سے جلد واپس پہنچنا ہے۔“

”ابھی سویرا ہونے میں بہت دیر ہے۔“ رحیم داد نے بہ مشکل کہا اور کھویا کھویا سا جمیلہ کے قریب بیٹھ گیا۔

اسے سب کچھ خواب سا لگ رہا تھا۔ جمیلہ اب اس سے کچھ دور نہیں تھی۔ وہ جمیلہ، جس کے بارے میں وہ مسلسل سوچتا رہا تھا جسے حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے منصوبے بناتا رہا تھا، اس کے اتنی قریب تھی کہ وہ اس کے دل آویز چہرے کو جی بھر کے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے شاخ گل کی طرح مہکتے جسم کی خوشبو سونگھ سکتا تھا، اسے چھو سکتا تھا۔ اب وہ اس کی منکوحہ تھی، شریک حیات تھی۔ وہ اور اس کی تمام جائیداد اس کی تھی۔ مگر اتنی بڑی کامیابی کے باوجود اسے یکسوئی اور اطمینان قلب حاصل نہ تھا۔ وہ خوف زدہ اور گھبرایا ہوا تھا۔

رحیم داد نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا اور اسے منانے کی کوشش کی۔ ”بہت ناراض معلوم ہوتی ہے۔“ اس نے لہجے میں حلاوت اور نرمی پیدا کی۔ ”پہلے میری پوری گل سن لے۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا۔“

مگر جمیلہ نے اسے آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ تیوری پر بل ڈال کر بے رخی سے گویا ہوئی۔ ”مجھے

پتہ ہے تو کیا چاہتا ہے' کیا نہیں چاہتا؟ اب بتانے کے لیے رہ کیا گیا ہے۔"

"نہیں' تجھے کچھ پتہ نہیں۔ بات اس طرح نہیں ہے جس طرح تو سوچ رہی ہے۔" رحیم داد کا لہجہ بدستور نرم تھا۔ اس میں معذرت تھی' عاجزی تھی۔

"فضول گلاں نہ کر۔" جمیلہ نے بے زاری سے کہا۔ "چوہدری' میں ہار گئی۔ شاہ جی جیت گیا' تو بھی جیت گیا۔ میں تو سدا سے ہارتی رہی ہوں۔ مجھ ابھاگن کے ہاتھ میں جیت کی ریکھا ہی نہیں۔"

رحیم داد کھسک کر اور قریب ہو گیا اور ہاتھ بڑھا کر جمیلہ کے نرم و نازک رخساروں کو ہولے ہولے تھپکتے ہوئے بولا۔ "بہت ناراض لگتی ہے۔"

"میں تو کنجری ہوں۔ کنجری کی کیا ناراضی' کیا خوشی۔" جمیلہ کے لہجے میں تلوار کی کاٹ تھی۔

"رات گزرتی جا رہی ہے اور مجھے سویرا ہونے سے پہلے پہلے تاجاں کو لے کر پنڈ میں واپس پہنچانا ہے۔ میں تو برباد ہو چکی پر اس کا جیون برباد نہیں ہونے دوں گی۔"

"نہ تو برباد ہوئی اور نہ تاجاں ہو گی۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ اب وہ اپنی بدحواسی اور سراسیمگی پر قابو پا چکا تھا۔ "تو فکر نہ کر۔ تاجاں بہت شان سے ویاہ کرا اپنی سسرال جائے گی۔"

"چوہدری' بکواس بند کر۔ مجھے تیری کوئی گل بات نہیں سننی۔" اس نے بے زاری سے رحیم داد کو جھڑک دیا۔ "مجھے یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "چوہدری دروازہ بند کر دے۔"

رحیم داد خاموشی سے اٹھا اور دروازے کی زنجیر چڑھا دی۔

☆

تین بج چکے تھے۔ کہر میں لپٹی ہوئی رات دھواں دھواں تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا' ویرانی تھی۔

رحیم داد کمرے سے باہر نکلا۔ اس کے عقب میں جمیلہ تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ اجڑ کے کھنڈر بن گیا تھا۔ روشن آنکھوں کے چراغ بجھ گئے تھے۔ وہ رحمتے کے ساتھ سیدھی تاجاں کے پاس گئی۔ اسے دیکھتے ہی تاجاں سسکیاں بھرنے لگی۔ جمیلہ نے بڑھ کے اسے سینے سے لگایا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ پڑا۔ مگر اس نے جلد ہی خود کو سنبھالا۔ تاجاں کا ہاتھ پکڑا اور اس کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئی۔

رحیم داد اور نادر خان برآمدے ہی میں مل گئے۔ چاروں حویلی کے بڑے پھاٹک سے باہر نکلے۔ جیپ تیار کھڑی تھی۔ نادر خاں پچھلی نشست پر جمیلہ اور تاجاں کے ساتھ بیٹھا۔ جیپ کا انجن شو کرتا ہوا اسٹارٹ ہوا اور جیپ تیزی سے روانہ ہو گئی۔

رات کے پچھلے پہر وہ کوٹلہ ہر کشن میں پہنچ گئے۔ جمیلہ نے جیپ نہر کے کنارے درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے رکوائی۔ ہر طرف کہر کا غبار پھیلا تھا۔ گاؤں سو رہا تھا۔ جمیلہ جیپ سے نیچے اتری۔ اس نے تاجاں کا بازو تھام کر نیچے اترنے میں مدد کی۔ تاجاں ابھی تک سہمی ہوئی تھی۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ رات کے اندھیرے میں اسے اغوا کر کے احسان شاہ کی حویلی میں کیوں لے جایا گیا؟ نہ یہ معلوم تھا کہ جمیلہ اسے کس طرح واپس لائی۔ وہ خاموش اور سراسیمہ تھی۔

رحیم داد جیپ سے اتر کے جمیلہ کے پاس پہنچا اور پیار سے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے تسلی دینے کی کوشش کی۔ "تاجاں کی تو بالکل فکر نہ کر۔ نادر خان اسے جنت کے پاس آرام سے پہنچا دے گا۔" اس نے ہولے سے جمیلہ کے نرم و گداز بازو کو انگلیوں سے دبایا۔ "تو میرے ساتھ چل۔"

جمیلہ نے پلٹ کر اسے تیکھی نظروں سے دیکھا' بے زاری سے بولی۔ "چوہدری! اب تو اپنے کمرے میں جا کر سو۔ سویرے مجھے کئی ضروری کام کرنے ہیں۔"

رحیم داد نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ آگے بڑھا۔ وہ جمیلہ کی بے رخی پر کبیدہ خاطر نہ ہوا۔ اپنی کامیابی پر خوشی سے وارفتہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مہمان خانے کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھلا تھا۔ اس نے صحن عبور کیا اور دبے قدموں حویلی کے اندر پہنچ گیا۔

جمیلہ نے جیپ کے ڈرائیور کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ جیپ مڑی اور احسان شان کے گاؤں پیراں والہ کی سمت دوڑنے لگی۔ جمیلہ نے نادر خان کو ایک طرف لے جا کر سرگوشی میں ہدایت کی کہ وہ جنت کے پاس جائے اور نہایت احتیاط سے اس کمرے کا دروازہ کھلوائے جہاں تاجاں مانجھے بیٹھی ہوئی تھی۔

جمیلہ نے تاجاں کو اپنے پہلو سے قریب کر لیا۔ تاجاں کے ہلدی میں رنگے ہوئے مانجھے کے زرد اور ملگجے کپڑوں سے بٹنے اور پسینے کی ملی جلی بو اٹھ رہی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ دونوں سردی سے تھرتھراتی' کہر کی دھند میں لپٹی سنبھل سنبھل کر بڑھتی رہیں۔ جب گھر کے پچھواڑے پہنچیں تو انھوں نے چراغ کی زرد زرد روشنی میں دیکھا' جنت دروازہ کھولے دہلیز پر کھڑی ان کا انتظار کر رہی تھی۔

نادر خاں دروازے کے باہر اندھیرے میں خاموش کھڑا تھا۔ جمیلہ نے تاجاں کو سہارا دیا اور اس کے ساتھ ساتھ کمرے میں داخل ہو گئی۔ جنت نے آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ کنڈی لگائی اور تالا ڈال دیا۔ کمرے کے ایک گوشے میں پردا پڑا تھا۔ پردے کے دوسری طرف مہمان عورتیں اور بچے گہری نیند سو رہے تھے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ تاجاں کب کمرے سے گئی اور کس وقت

واپس آئی۔

جمیلہ تاجاں کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہری۔ احتیاط سے قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکلی۔ حویلی میں پہنچی اور زینے کی سیڑھیاں طے کر کے اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ نینا اور گڈو لحاف میں دبکے بے خبر سو رہے تھے۔ جمیلہ کا بدن سردی سے کپکپا رہا تھا۔ اس نے بستر پر دراز ہو کر لحاف اپنے ٹھٹھرتے ہوئے جسم پر ڈال لیا۔ جسم میں حدّت اور حرارت پیدا ہوئی تو اسے احسان شاہ کی حویلی کی ایک بات کچوکے لگانے لگی۔ وہ بے قرار ہو کر رونے لگی۔

☆

صبح ہو گئی۔ نیلگوں کہر کا گاڑھا گاڑھا غبار پھیلنے لگا۔ رات اب رخصت ہو چکی تھی۔ دودھیا روشنی دھیرے دھیرے فضا میں پھیلتی جا رہی تھی۔ سورج مشرقی افق پر ابھرنے لگا۔ کہر میں لپٹی مٹیالی دھوپ منڈیروں پر جھلکنے لگی۔ حویلی میں رفتہ رفتہ چہل پہل ہونے لگی۔ پھاتاں کے کچھ رشتے دار اور شریکے پہلے ہی آ گئے تھے اور اب تک جو آ نہ سکے تھے وہ بھی سویرے سویرے پہنچ گئے۔

جمیلہ نے پورے گاؤں کو تاجاں کے بیاہ میں شریک ہونے کا بلاوا دیا تھا۔ سورج اوپر چڑھ کر درختوں کی شاخوں کی آڑ سے جھلملانے لگا۔ ہر طرف سنہری دھوپ بکھرنے لگی۔ حویلی کی رونق اور گہما گہمی اور بڑھ گئی۔ عورتوں اور بچوں کے شوخ اور بھڑک دار لباس سرما کی گہری بسنتی اور چمک دار دھوپ میں جگمگا رہے تھے۔

جمیلہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ جھٹ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شام کو تاجاں کی برات آ رہی تھی۔ برات کے پہنچنے سے پہلے پہلے اسے شادی کی تمام تیاری مکمل کرنا تھی۔ اس نے نہا دھو کر جلدی جلدی ناشتا کیا۔ اونی شال اوڑھی۔ مہمان خانے میں پہنچی۔ نادر خاں اور جلیل وہاں موجود تھے اور اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جمیلہ نے دونوں کو اسکول کی جانب روانہ کیا۔ برات کے ٹھہرنے کا بندوبست اسکول ہی میں کیا گیا تھا۔

دن ڈھلے چہل پہل اور بڑھ گئی۔ شام کا جھٹپٹا ہوتے ہی جگہ جگہ گیس کے ہنڈے اور پیٹرومیکس روشن کر دیے گئے۔ برات کے پہنچنے کا وقت لحہ بہ لحہ قریب آتا جا رہا تھا۔ اپنا دکھ درد بھول کر جمیلہ سرگرمی سے ادھر ادھر گھومتی پھر رہی تھی۔ پڑچھتی کے قریب نوجوان سہاگنیں اور الھڑ دوشیزائیں چادریں تانے کھڑی تھیں۔ تاجاں کو تنی ہوئی چادروں کے پیچھے سرکنڈوں کی تیلیوں سے بنے ہوئے کھارے میں غسل کے لیے بٹھا دیا گیا تھا۔ میراثن اور نوجوان لڑکیوں نے ڈھولک کی تھاپ پر اونچی آواز سے گیت چھیڑا،

بدل گئے کھارے نی بی بی، آج ہوئی پرائی

نائن نے کھارے کے نیچے دیا روشن کر دیا۔ جمیلہ قریب ہی کھڑی تھی۔ دیے کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کے خوبصورت چہرے پر مسرت سے مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ آگے بڑھی، چادروں کے عقب میں پہنچی، جھکی اور مٹھی بھر ریزگاری جھلملاتے ہوئے دیے کے پاس نیک شگون کے طور پر رکھ دی۔ نائن نے ساری ریزگاری اٹھائی اور اپنی دھوتی کے ڈب میں رکھ لی۔ یہ اس کا حق تھا۔

نائن نے تاجاں کے میلے کچیلے مانجھے کے زرد کپڑے اتار کے ایک طرف رکھ دیے۔ اس نے ڈونگے میں گرم پانی بھر بھر کے تاجاں کے بدن پر ڈالا اور خوش بودار صابن سے مل مل کر اسے غسل دینے لگی۔ جب تک تاجاں نہاتی رہی کھارا لہائی کی رسم کے مطابق پھاتاں سات بار کھارے کے سامنے سے گزری۔ مراثن نے اونچی آواز سے گیت چھیڑا۔

کھارا چتر متر، کھارا اڈیا، کھارے توں اتار ویر وڈیا

میراثن کے ساتھ آواز ملا کر نوجوان لڑکیاں اور عورتیں بھی گانے لگیں۔ پھاتاں بھی ان کے ساتھ گا رہی تھی۔ گاتے گاتے اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ تاجاں غسل کر چکی تھی اور اس کا بھیگا ہوا بدن خشک کر کے چادر اوڑھا دی گئی تھی۔ مگر وہ کھارے میں بیٹھی رہی۔ اس کا کوئی بھائی نہ تھا جو نائن کو کھارا لہائی دیتا اور اس کا بازو تھام کر کھارے سے اٹھاتا۔ پھاتاں اپنی بیٹی کی اس محرومی پر آنسو بہا رہی تھی۔

جمیلہ تڑپ کے پھاتاں کے قریب پہنچی، تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ”تو رو رہی ہے پھاتاں۔ حد کر دی تو نے۔ چنتا نہ کر۔“ اس نے سینے پر ہاتھ مارا۔ ”تاجاں کا کوئی ویر نہیں تو کیا ہوا۔ میں کھارا لہائی دوں گی۔ آنسو پونچھ۔ خوشی کے سمے اس طرح آنسو نہیں بہاتے۔“

جمیلہ نے نائن کو کھارے لہائی کے پچاس روپے دیے۔ مگر نائن اڑ گئی۔ وہ زیادہ نیگ چاہتی تھی، ہنس کر بولی۔ ”زمین دارنی، میں نے کھارے لہائی میں تجھ سے تو مُنہ لینی تھی۔ مُنہ نہ دے پر اپنی شان دیکھ کر تو نیگ دے۔“ جمیلہ نے حیل حجت نہ کی۔ نائن کو سو روپے اور دیے۔ خوشی سے نائن کی باچھیں کھل گئیں۔

جمیلہ نے چادر میں لپٹی، سردی سے تھرتھراتی تاجاں کا بازو پکڑ کے اٹھایا اور سہارا دے کر کھارے سے نیچے اتارا۔ اپنی اونی شال کا پلو اس کے سر پر ڈالا، سہاگنوں اور مٹیاروں کے جھرمٹ میں تاجاں کو پڑچھتی سے بکرے کی جانب لے گئی۔ تاجاں کے غسل کرنے سے کچے فرش کی جو مٹی [illegible] اسے شگون کے طور پر اٹھا کر چھت پر پھینک دیا گیا۔

نائن بھی تاجاں کے ساتھ ساتھ پڑچھتی سے نکل کر کمرے میں پہنچی۔ اس نے سسرال سے آیا ہوا سرخ اور سنہری کاغذ کا سہاگ پڑا کھولا۔ اس میں آئینہ، کنگھی، مہندی، خوش بودار تیل، سرمہ، کاجل، زعفران، موتی، صندل اور سنگھار کی دوسری اشیا موجود تھیں۔ نائن نے تاجاں کے سر کے بالوں کو اجلے کپڑے سے خشک کیا۔ تھوڑا سا تیل تاجاں کے سر میں ڈالا۔ کنگھی سے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارا، آنکھوں میں کاجل لگایا۔ ہونٹوں پر سرخی کی ہلکی ہلکی تہ جمائی، پیشانی کے بالائی حصے اور بالوں پر افشاں چھڑکی۔ سسرال سے آیا ہوا بری کا جھلملاتا ہوا سرخ جوڑا پہنایا۔ ناک کے سوراخ میں نتھ ڈالی۔ کانوں میں جھمکے پہنائے، گلے میں تختیاں ڈالیں۔ ماتھے پر ٹیکا سجایا۔ کلائیوں میں چوڑیوں کے علاوہ کنگن پہنائے۔ پیروں میں جھانجھر ڈالیں۔

تاجاں کو دلہن بنانے اور اس کا سنگھار کرنے میں نوجوان سہاگنیں اور دوشیزائیں نہایت ذوق و شوق کے ساتھ نائن کا ہاتھ بٹاتی رہیں۔ دلہن کا بناؤ سنگھار ہوتا رہا۔ ساتھ ساتھ ڈھولک پر سنگھار کے گیت بھی گونجتے رہے۔

کنگھے نی رنگ رتے، میری نازو سنگاریں
میں کی جاناں باوری، جا کے نائناں تو پچھو
مہندی نی رنگ رتے، میری نازو سنگاریں
میں کی جاناں باوری، جاکے پنساری تو پچھو
دلیرے سرب سہاگنے میری نازو سنگاریں
میں کی جاناں باوری، جا کے سنیارے تو پچھو

سنگھار کے بعد تاجاں کا چہرہ تر و تازہ گلاب کے مانند شگفتہ اور دل آویز نظر آرہا تھا۔ گوٹا کناری لگے سرخ عروسی جوڑے میں، زیورات سے سجی بنی وہ گردن جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ جمیلہ نے گھونگھٹ اٹھایا۔ تاجاں کا تابندہ چہرہ دیکھ کے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ٹھوڑی اٹھا کے تاجاں کا چہرہ اوپر کیا اور بے اختیار اس کی پیشانی چوم لی۔

سنگھار کے گیت گونجتے رہے۔ کھنکتی ہنسی کی چھاگلیں بجتی رہیں۔ یکایک غلغلہ پڑا۔ "جنج آگئی جنج آگئی۔" نوجوان عورتیں، الھڑ کنواریاں اور بچے برات دیکھنے دوڑے۔

برات گاؤں کی گلیوں سے گزر کر حویلی کی جانب بڑھ رہی تھی۔ برات کے آگے ڈھول اور بین باجے بج رہے تھے۔ پٹاخے داغے جا رہے تھے۔ پھل جھڑیاں اور ماہ تابیاں چھوڑی جا رہی تھیں۔ برات کے ساتھ گیس بتیاں روشن تھیں۔ ان کی تیز روشنی میں دولہا پھولوں کے زرتار سہرے – چہرہ چھپائے گھوڑے پر سوار آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ پیچھے گھوڑوں، تانگوں اور ریڑھوں پر سوار براتی تھے۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی پیدل چل رہی تھی۔ وہ رک رک کر بھنگڑا ڈالتے اور کانوں پر ایک ہاتھ رکھ کر اونچی آواز سے تان لگاتے۔ کوئی ٹپّا الاپتے۔ برات میں شامل عورتیں اور لڑکیاں سر سے سر ملا کر بیاہ کے گیت گا رہی تھیں۔

گاؤں کی عورتیں اور مٹیاریں چوباروں اور چھتوں سے برات گزرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ برات حویلی کے عین سامنے پہنچی تو منڈیروں کی آڑ سے جھانکتی ہوئی تاجاں کی سہیلیاں اور نوجوان رشتے دار عورتیں تالیوں کی تھاپ پر ہنس ہنس کے سٹھنی اور کامن گیت گانے لگیں جن میں دولہا اور براتیوں پر پھبتیاں کسی جا رہی تھیں۔

چرکا کیوں ڈھکا لاڑیا، وے چرکا کیوں ڈھکا؟
جلی سکنے پائی وے، تیری ماں سکنے پائی وے!
لاڑیا کسوتریا، تیری ماں منجے تے موتریا!!
نک وڈھیاوے، تیری ماں منجے تے ہگیا!

مگر براتی عورتوں اور لڑکیوں نے اس طعنہ زنی پر نہ جوابی گیتوں کے ذریعے دلہن اور اس کے رشتہ داروں اور شریکوں کی دل آزاری کی کوشش کی اور نہ کسی طرح کی جھنجلاہٹ اور خفگی کا اظہار کیا، مسکراتی رہیں اور گیتوں کی تلخی اور استہزا برداشت کرتی رہیں۔

دولہا کی ماں کا اشارہ ملتے ہی برات کے ساتھ آنے والی میراثن نے اونچی آواز سے ایک گیت چھیڑا۔ برات میں شامل لڑکیوں اور عورتوں نے بھی اس کے ساتھ گانا شروع کر دیا۔ اس گیت میں طنز اور طعنہ زنی کے بجائے محبت کی حلاوت رچی ہوئی تھی۔

ہنس کے بلا، دل ہو گیا رضا
ساڈا پردیساں دا راکھا اے خدا
ڈھولکی بجا، ذرا ہنس کے بلا
لوکاں بے سمجھیاں دی جانے کی بلا
گولی ہاں میں تیری، میرا جاندا خدا
ماپے تیرے آپے پئے کرن گے نکاح

حویلی کی چھت پر کھڑی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں نے یہ گیت سنا تو ان کی آوازیں مدھم پڑ گئیں۔ مگر یہ خاموشی زیادہ دیر نہیں رہی۔ دفعتہً قہقہے بلند ہوئے اور تالیاں بھی بجنے لگیں۔ دولہا کا ہنس

ہنس کراس طور خیر مقدم کیا گیا۔

کی کراں کریاں، آج بنا تھی آیا مہمان

برات دھیرے دھیرے حویلی کے سامنے سے گزرتی ہوئی اسکول کے قریب پہنچی۔ وہاں برات کا خیر مقدم کرنے کے لیے رحیم داد پہلے سے موجود تھا۔ اس نے بڑھ کر براتیوں کا استقبال کیا۔ ایک ایک سے مصافحہ کیا، گلے ملا، خیریت پوچھی، دولھا کو مسند پر بٹھایا۔ مسند پر حویلی کے بڑے کمرے کا قالین بچھا تھا۔ آگے دریاں تھیں جن پر چاندنی کا فرش تھا۔ دولھا کے بیٹھتے ہی حویلی کے نائی نے اس کے منہ میں مصری کی ڈلی ڈالی اور دودھ پلایا۔ یہ گُھش کارہ تھا۔

گھش کارے کی رسم کے بعد براتیوں کے سامنے حقے تازہ کر کے رکھے گئے۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہوا بھی چل رہی تھی۔ مگر براتیوں کے لیے ہر کمرے میں انگیٹھی روشن تھی۔ رضائیوں کا بھی بندوبست تھا۔

کھانے کے بعد رات گئے تک رونق رہی۔ رحیم داد دولھا کے باپ اور رشتے داروں کی خاطر مدارات کرتا رہا۔ اسکول کی عمارت میں گیس بتیوں کی تیز روشنی تھی اور ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا تھا۔

☆

آدھی رات ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نادر خاں اور جلیل کو مہمانوں کی دیکھ بھال پر لگا کر وہ حویلی میں چلا آیا اور چوکنّا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا زینے کے قریب پہنچ گیا۔ سیڑھیاں طے کیں، جمیلہ کے کمرے کی جانب چلا، آہستہ سے دروازہ کھولا۔ کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ مگر اس کی لو مدّھم تھی۔ بستر پر جمیلہ کی بیٹی نینا لیٹی تھی۔ اس کے ساتھ ہی لحاف میں دبکا ہوا گندو بھی سو رہا تھا۔ ایک گوشے میں انگیٹھی رکھی تھی۔ اس کے قریب ہی چٹائی پر دوہرا دوڑھے حویلی کی ملازمہ تاراں بے خبر سو رہی تھی۔

کمرے میں جمیلہ نہیں تھی۔ مگر کچھ ہی دیر بعد کمرے کے باہر چھت پر آہٹ ابھری۔ رحیم داد چونکا۔ اس نے پلٹ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھا، باہر نکلا۔ ایک بار پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کہر کی گاڑھی گاڑھی دھند میں رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر ہر طرف دیکھا۔ لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ چاپ رفتہ رفتہ مدّھم پڑ گئی اور خاموشی میں ڈوب گئی۔ رحیم داد دیر تک ہکّا بکّا کھڑا رہا۔ پھر نیچے اتر گیا اور اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔

وہ زیادہ دیر نہیں سو سکا۔ نکاح کے لیے فجر کی نماز کے بعد کا وقت مقرر ہوا تھا۔ اذان ہونے سے

پہلے پہلے رحیم داد بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے بدل کے جلدی جلدی اسکول کی عمارت میں پہنچ گیا۔ تمام براتی جاگ رہے تھے۔ جو سو گئے تھے وہ بھی اب بیدار ہو چکے تھے۔ نکاح خواں وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ نماز کے بعد نکاح پڑھایا گیا۔ براتیوں کی جانب سے چھوارے اور کھانے نچھاور کیے گئے۔ رحیم داد نے دولھا اور اس کے باپ کو مبارک باد دی اور گرم جوشی سے دولھا کو گلے لگایا۔

جمیلہ بھی نکاح کے وقت دوسری عورتوں کے ساتھ عروسی جوڑے میں ملبوس تاجاں کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ ایجاب و قبول کا مرحلہ طے ہو گیا اور نکاح کی رسم مکمل ہو گئی تو جمیلہ نے آگے بڑھ کر تاجاں کو سینے سے چمٹا لیا۔ تاجاں رو رہی تھی۔ جمیلہ کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک ٹپک کر رخساروں پر بکھرنے لگے۔

جمیلہ آنسو پونچھتی ہوئی اٹھی۔ پھاتاں نزدیک ہی کھڑی تھی۔ اس کی پلکیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ اس نے جمیلہ کو اشارہ کیا اور دونوں آنگن میں پہنچ گئیں۔ پھاتاں حیران و پریشان نظر آ رہی تھی۔ جمیلہ کو بھی فکر ہوئی۔ لیکن اس نے تحمّل کیا اور خاموش کھڑی رہی۔

پھاتاں ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”بھین جی! برا نہ منا تو ایک گل پوچھوں؟“

”پوچھ، ضرور پوچھ۔“ جمیلہ نے مسکرا کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”پر تو تو کچھ پریشان لگ رہی ہے۔“

”گل ہی ایسی ہے جی۔“ پھاتاں بے قراری سے بولی۔ ”میں نے سنا ہے تو نے پرسوں رات پیراں والہ میں احسان شاہ کے سامنے چوہدری سے نکاح پڑھوا لیا۔“ اس کی آواز اٹکنے لگی۔ ”مجھے تو شام ہی کو پتہ چل گیا تھا۔ میں تو سنتے ہی اچنبھے میں رہ گئی۔ بھین جی! یہ سب ہوا کیسے؟ سمجھ نہیں آتی، تو سچ سچ بتا۔“

جمیلہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ اسے دکھ بھی ہوا اور غصہ بھی آیا کہ یہ راز رحیم داد یا نادر خاں کے سوا کوئی اور افشا نہیں کر سکتا تھا۔ جمیلہ اپنا غم و غصہ پھاتاں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور پھاتاں سے صرف اتنا پوچھا۔

”تجھے یہ بات کس نے بتائی؟“

”یہ بات تو سبھی کو ملوم ہے۔ براتیوں تک کو پتہ ہے۔“ پھاتاں نے مطلع کیا۔ ”مجھ سے تو اس بارے میں پھاتاں کی ساس بھی پوچھتی تھی۔“ اس نے جمیلہ کا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”کیا یہ سچ ہے بھین جی؟“

"ہاں پھاتاں! میں نے چوہدری سے ویاہ کرلیا۔" جمیلہ انکار نہ کر سکی۔ لیکن اس نے فوراً بات بنائی۔ "تجھے تو پتہ ہے۔ تاجاں کے سسرال والوں نے جھگڑا ڈالا تھا کہ میں رنڈ بیوہ ہوں' اس کارن تاجاں کے ویاہ میں نہیں بیٹھ سکتی۔" اس نے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "پر تاجاں تو میری دھی سمان ہے ناں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس کے ویاہ میں نہ بیٹھوں' سو میں نے نکاح کرلیا۔ رنڈ نہیں رہی' سہاگن بن گئی۔ تو تاجاں کی ساس سے کہہ دینا' اب تو اسے میرے بارے میں کوئی گلہ نہیں رہا۔"

پھاتاں اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "بھین جی! میں تاجاں کی ماں ہوں پر اس کے پیار میں تو مجھ سے بھی آگے نکل گئی۔ بھین جی! تو کتنی چنگی ہے' میرے پاس تیرے لیے دعا نکالنے کو بول نہیں رہے۔" وہ جمیلہ کے کندھے سے سر ٹکا کر رونے لگی۔

جمیلہ نے اس کی پیٹھ ہولے ہولے تھپ تھپائی۔ "خوشی کے سمے تو رو رہی ہے پھاتاں!" وہ زیر لب مسکرائی۔ "اب یہ رونا رلانا چھوڑ۔ تو نے ابھی کئی کام کرنے ہیں۔"

پھاتاں نے دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھے اور جمیلہ کے ساتھ پھر تاجاں کے پاس پہنچ گئی۔ دونوں سب کچھ بھول بھال کر ایک بار پھر شادی کے ہنگاموں میں کھو گئیں۔

☆

سورج چڑھ کر درختوں کی بلندی پر پہنچ گیا۔ حویلی کے سامنے میدان میں دیگیں چڑھی تھیں۔ پلاؤ' زردہ اور قورمہ پک رہا تھا۔ ایک طرف بڑا سا تندور لگا تھا جس سے تندوریا گرم گرم روٹیاں نکال رہا تھا۔ ہر طرف طرح طرح کے کھانوں کی مہک پھیلی تھی۔

دوپہر کے کھانے پر بھی رحیم داد موجود تھا۔ وہ ہر براتی اور مہمان سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا اور اصرار کر کے کھانا کھلا رہا تھا۔ اس کے رویّے میں میزبان کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ حویلی کے سربراہ کا طنطنہ بھی جھلک رہا تھا۔ ہر کام اس کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ وہ اونچے طرّے کی پگ سر پر رکھے' آن بان سے کرسی پر بیٹھا احکام جاری کر رہا تھا۔

مرد کھانا کھا چکے تو رحیم داد نے نادر خاں کو طلب کیا اور گردن اونچی کرتے ہوئے بولا۔ "نادر! اب تو زمیں درانی کے پاس جا۔ اسے کہہ کہ زنانیوں کے لیے روٹی کا بندوبست کرے۔"

نادر خاں اس کی ہدایت پر فوراً حویلی کی جانب چلا گیا۔

جمیلہ پہلے ہی عورتوں کے لیے دستر خوان بچھوا کر کھانا لگوا چکی تھی۔ وہ مہمانوں کے درمیان سرگرمی سے ادھر ادھر بھاگتی دوڑتی پھر رہی تھی۔ وہ بظاہر بہت مسرور اور شادمان نظر آ رہی تھی۔

مہمان کھانے سے فارغ ہوئے تو جمیلہ نے تاجاں' پھاتاں' جنت اور زینت کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے کچھ دیر بستر پر لیٹ کر آرام کیا۔ سورج مغرب کی سمت ڈھلکنے لگا تھا۔ دھوپ کی رنگت بدلتی جا رہی تھی۔ سائے بڑھنے اور پھیلنے لگے تھے۔ وہ جلد ہی اٹھ گئی۔ اس نے گرم پانی سے غسل کیا' بال خشک کیے۔ تھوڑا سا تیل ڈال کر اہتمام سے بال سنوارے' آنکھوں میں دنبالہ کاجل لگایا۔ ہونٹوں پر سرخی کی ہلکی سی تہہ جمائی۔ ماتھے پر جڑاؤ جھومر سجایا' کانوں میں مندرے پہنے' کلائیوں میں کنگن ڈالے۔ بائیں ہاتھ میں ہاتھی دانت کا منقّش چوڑا پہنا۔ گہری نارنجی ریشمی شلوار اور اسی رنگ کی قمیص پہنی۔ قمیص کے گریبان اور آستینوں پر سبز اور سیاہ دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ اس نے آئینے کے روبہ رو اپنے سنگھار کا جائزہ لیا اور سنہرے کنارے کی فیروزی شال اوڑھ لی۔

اس سج دھج سے وہ دلہن کے پاس پہنچی تو دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے محفل میں چاند اتر آیا ہو۔ اس کے شگفتہ اور تابندہ چہرے پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ وہ راج ہنس کی طرح گردن اٹھائے ہنستی مسکراتی چکا چوند پیدا کرتی مہمان عورتوں کے درمیان بیٹھ گئی۔

دن ڈھلے دولہا زنان خانے میں بلایا گیا۔ پھاتاں کے اصرار پر جمیلہ نے دولہا کو نیم گرم دودھ پلایا۔ پھاتاں نے مٹھائی کی تھالی بڑھا کے اس کے سامنے کر دی۔ جمیلہ نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور دولہا کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ مسکرائی اور دل جوئی سے اسے مٹھائی کھلائی۔ سلامی میں پانچ سو روپے اور ایک گھڑی دی۔ تاجاں کی رشتے دار اور دوسری عورتوں نے بھی حسب توفیق سلامی دی۔

سلامی کے دوران تاجاں کی سہیلیاں اور دوسری مہمان لڑکیاں دولہا سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہیں۔ اسے طرح طرح سے پریشان کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ دولہا کی بہنیں سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ انھوں نے اپنے دوپٹوں کے جھل ملاتے آنچلوں سے اس کے سر پر سایہ کر رکھا تھا۔ چھیڑ چھاڑ جاری رہی۔ قہقہے گونجتے رہے۔ میراثن نے ڈھولک پر تھاپ دی اور اونچی آواز سے ایک چھنڈ گیت شروع کیا۔ گیت کے بولوں میں بھی دولہا سے چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی۔

چنڈیر آگے آیئے جایئے' چھنڈیرا گے شگنا
اک ویاہ کے لے چلے دوجا بیتھے شگنا!
چھنڈیراگے آیئے جایئے' چھنڈیراگے کولا
پرہاں ہو کے بولو کڑیو' بنھیرا پالیا رولا

دن اور ڈھل گیا۔ سائے طویل ہو گئے۔ رحیم داد دولھا کے باپ اور دوسرے براتیوں کو کھٹ دکھائی کے لیے اپنے ہم راہ مہمان خانے میں لایا۔ یہاں صحن میں چارپائیوں پر جہیز کے رنگین اور چمکتے ہوئے ملبوسات اور دیگر ساز و سامان سجا کر رکھا گیا تھا۔ براتی جہیز سے سجی ہوئی کسی چارپائی کی جانب بڑھتے تو ڈھولی گردن میں پڑے ہوئے ڈھول پر زور سے چوٹ لگاتا۔ حویلی کا میراثی آگے بڑھ کر ہر سامان کے بارے میں براتیوں کو بتاتا۔ براتی باری باری ہر چارپائی کے قریب جاتے۔ سلیقے سے سجا سجایا جہیز دل چسپی اور اشتیاق سے دیکھتے۔ وہ خاصے مرعوب نظر آ رہے تھے۔ جمیلہ نے بڑے اہتمام اور لگن سے جہیز تیار کیا تھا۔ جہیز براتیوں کی توقع سے زیادہ قیمتی اور شان دار تھا۔ وہ حیرت سے ہاتھ بڑھا کر ہر چیز احتیاط سے چھوتے اور مسکرا کر اپنی پسند کا اظہار کرتے۔

شام کا جھٹ پٹا ہوتے ہی براتیوں کی جانب سے رخصتی کا تقاضا شروع ہوا۔ انھیں لگ بھگ آٹھ میل فاصلہ طے کرنا تھا۔ اندھیرے کے ساتھ سردی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ سورج کی کرنیں حویلی کی منڈیروں پر دھندلی پڑتی جا رہی تھیں۔ شام ہولے ہولے نیچے اتر رہی تھی۔

رخصتی کے وقت تاجاں بلک بلک کر رونے لگی۔ ہر چہرہ سوگوار ہو گیا۔ جمیلہ تاجاں کو تسلّی دینے لگی۔ مگر تسلّی دیتے دیتے بے اختیار خود جمیلہ کا دل بھر آیا۔ اس نے آنچل سے آنسو پونچھے، تاجاں کو دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر کھڑا کیا اور سہارا دیتی ہوئی کمرے سے نکل کر آنگن میں پہنچی۔

بیرونی دروازے کی دہلیز پر ڈولی رکھی تھی۔ جمیلہ اور دوسری عورتیں تاجاں کے ہم راہ ڈولی کی جانب بڑھیں۔ بھاتاں بھی ساتھ ساتھ تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔ میراثن نے رخصتی کا گیت چھیڑ دیا۔

لے چلے بابلا لے چلے
مینوں ڈولی پا کہار ،
بابلا لے چلے
رکھ لے بابلا، ہن دہاڑے چار
ہن کی بابلا تیرا دعوا
دس پرائی کوڑا بابلا

میراثن سوز بھری لے میں منڈھا گا رہی تھی۔ گیت کے بولوں میں ایسا درد تھا، ایسی کسک اور چبھن تھی کہ ہر شخص تڑپ اٹھا۔ ہر آنکھ پرنم ہو گئی۔ گیت کے اتار چڑھاؤ میں وہی ہل چل تھی جو دلھن بن کر ہر دوشیزہ کے دل میں رخصتی کے وقت طرح طرح کے خدشات اور وسوسوں میں ڈھل کر موج زن ہوتی ہے۔ یہ اس کے مچلتے امڈتے اور تڑپتے احساسات تھے جو منڈھے کے بول بن کر اس طرح فریاد کناں تھے۔

بابل، میری ڈولی لے کر کہار جا رہے ہیں
بابل، مجھے چند روز کے لیے اپنے پاس اور رہنے دے
دیکھ بابل، اب مجھ پر تیرا کیا دعوا
میں تو پرائے دیس کی ہو چکی

تاجاں زار و قطار رو رہی تھی۔ جمیلہ کی آنکھوں سے بھی جھڑی لگ گئی تھی۔ اس کے سلگتے ارمان سینے میں دھواں بن کر امڈ رہے تھے، بادل بن کر برس رہے تھے۔ اسے اپنے بابل کے گھر سے دلھن بن کر اس طرح رخصت ہونا نصیب نہیں ہوا تھا۔ بہت دن ہوئے اس نے بھی ایک الھڑ دوشیزہ کی طرح دلھن بننے کے خواب دیکھے تھے۔ اس کے خواب ادھورے ہی رہ گئے۔ رخصتی کے درد کی کسک محسوس کرنے کا اسے کبھی موقع نہیں ملا۔ آج تاجاں کو رخصت کرتے ہوئے وہ اس درد کی لذت محسوس کر رہی تھی۔ میراثن گا رہی تھی۔

لے چلے بابلا، لے چلے
مینوں ڈولی پا کہار

ڈولی میں سوار ہونے سے پہلے تاجاں تڑپ کے جمیلہ کے سینے سے چمٹ گئی۔ جمیلہ اسے سینے سے لگائے آنسو بہاتی رہی۔ سورج کب کا ڈوب چکا تھا۔ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ گیس بتیاں روشن کر دی گئی تھیں۔

جمیلہ نے تاجاں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بھاتاں اور دوسری عورتوں کی مدد سے تاجاں کو ڈولی میں سوار کرایا۔ منڈھے کے بول اونچے اور اونچے ہوتے گئے۔ میراثن کی آواز کا سوز فضا میں بکھرتا جا رہا تھا۔

سرما کی کہر آلود شب اداس اور نڈھال کھڑی تھی۔ ہر طرف سسکیاں ابھر رہی تھیں اور آنکھوں سے آنسو برس رہے تھے۔

کہاروں نے ڈولی اٹھائی۔ برات، ڈھول اور بین باجے بجاتی، پٹاخے چھوڑتی رخصت ہو گئی۔ تاجاں اپنے دولھا کے ساتھ سسرال چلی گئی۔ حویلی کی چہل پہل ماند پڑنے لگی۔ کھنکتے قہقہوں کے جل ترنگ خاموش ہو گئے۔

کچھ مہمان عورتیں شام ہی کو رخصت ہو گئی تھیں۔ جو ٹھہر گئی تھیں، جمیلہ ان کے ساتھ کچھ دیر

بیٹھی رہی۔ وہ بہت بجھی بجھی تھی۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور مہمان خانے سے گزر کر حویلی میں پہنچی۔

رحیم داد دروازے پر موجود تھا۔ وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جمیلہ نے اشک آلود نظروں سے اسے دیکھا' گردن جھکائی اور زینے کی سیڑھیاں طے کرتی ہوئی اوپر پہنچ گئی۔ وہ بہت شکستہ اور دل گرفتہ تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہو گئی۔

☆

پہر رات گزر چکی تھی۔ حویلی پر گہرا سناٹا چھایا تھا۔ جمیلہ کمرے میں تنہا تھی اور ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اچانک کمرے کا دروازہ چرچراتا ہوا کھلا۔ جمیلہ نے حیرت سے دیکھا' رحیم داد دروازے پر کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی جمیلہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ رحیم داد مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور اطمینان سے جمیلہ کے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں کچھ دیر سکوت طاری رہا۔ پھر رحیم داد کی آواز ابھری۔

"جمی لے!"

جمیلہ نے چونک کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس نے پہلی بار جمیلہ کو اس قدر بے تکلفی سے مخاطب کیا تھا۔ صرف اللہ وسایا مرحوم اسے پیار سے "جمی لے" کہتا تھا۔ کمرے میں سلگتی ہوئی انگیٹھی کی ہلکی ہلکی روشنی میں رحیم داد کی آنکھوں سے سرخی جھلک رہی تھی۔ ان میں ایسی تیز اور چبھتی ہوئی چمک تھی کہ وہ دم بہ خود رہ گئی۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ رحیم داد اس کے دل میں اٹھتی ہوئی ہل چل سے بے نیاز زیر لب مسکراتا رہا۔ اس نے پیار جتانے کی کوشش کی۔

"جمی لے! تو اتنی اداس اور پریشان کیوں ہے؟"

"ہاں چوہدری! میں بہت نراش اور دکھی ہوں۔" جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔"

"تو نے خاماخا کی پریشانی مول لے رکھی ہے۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "لگتا ہے' جانے کب سے بیمار ہے۔ تو نے تاجاں کا ویاہ تو ایسی دھوم دھام سے کیا جیسے تیری اپنی دھی ہو۔"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ وہ میری دھی سمان ہے۔" جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "نہ اس کا پیو ہے' نہ دیر ہے' نہ کوئی بھین' میرا بھی کوئی نہیں۔ میں اسے...."

رحیم داد اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "ایسا کیوں سوچتی ہے۔ تو مجھے اپنا نہیں سمجھتی؟"

جمیلہ گم صم بیٹھی رہی۔ رحیم داد نے دل جوئی کی کوشش کی۔ "لگتا ہے' تجھے تاجاں سے بہت

پیار ہے۔"

جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اس سے اتنا پیار نہ ہوتا تو میں احسان شاہ کی حویلی میں کیوں جاتی۔ اسے واپس لانے کے لیے تیری اور احسان شاہ کی ہر گل بات کیوں مان لیتی۔ پر چوہدری تو نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔"

رحیم داد نے اس کے لہجے کی تلخی اور کاٹ محسوس کی۔ آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "جو ہونا تھا ہو گیا۔ اس کے بارے میں نہ سوچ۔ آگے کی سوچ۔"

"آگے کی کیا سوچنا۔" جمیلہ نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "میں نے تو اسی حویلی میں رہنا ہے۔ تیری گھر والی ہی بن کے رہنا ہے۔"

رحیم داد جھوم اٹھا مگر اس نے اپنی وارفتگی کا اظہار نہیں کیا۔ نادم اور پشیمان ہونے کے انداز میں نظریں جھکا کر گویا ہوا۔ "تیری نراضی بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے اس رات تجھے بہت دکھ پہنچایا۔ مجھے بھی اس کا دکھ ہے۔ تجھ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" اس نے جمیلہ کے چہرے کو محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ گہری سانس بھری اور چہرے پر افسردگی طاری کرنے کی کوشش کی۔ "جمی لے! تو اتنی سوہنی ہے' اتنی خوبصورت ہے کہ بس یہی جی کرتا ہے تو میرے سامنے بیٹھی رہے اور میں تجھے دیکھتا رہوں۔" وہ بہت جذباتی ہو گیا۔ اس نے جمیلہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی انگلیوں میں بھینچ لیا۔

جمیلہ نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑایا' مسکرائی اور گردن کو خم دے کر دیکھا۔ "پیار ہی جتانا ہے تو آرام سے جتانا۔ آج مجھے نیند لگ رہی ہے۔ طبیعت بھی گڑبڑ ہے۔ تو بھی اپنے کمرے میں جا کر سو۔"

"نہیں' میں اب کہیں نہیں جاؤں گا۔" وہ بچّوں کی طرح مچلنے لگا۔ جمیلہ کے رخسار پر ہولے سے چٹکی بھر کر بولا۔ "میں تجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ تو بہت پریشان پریشان لگ رہی ہے۔"

"چوہدری! ضد نہ کر۔" جمیلہ نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ "میں نے کہہ دیا نا کہ میری طبیعت آج ٹھیک نہیں۔ سر میں درد بھی ہے۔"

"تو آرام سے لیٹ جا۔" رحیم داد خوشامد پر اتر آیا۔ "لا' میں تیرا سر دبا دوں۔ تو سو جائے گی تو میں چپ چاپ چلا جاؤں گا۔"

"مجھے تنگ نہ کر۔" اس دفعہ جمیلہ نے بیزاری سے کہا۔ "اب تو جا۔ مجھے اس سے اکیلا ہی چھوڑ دے۔ مجھے اکیلے ہی میں آرام ملے گا۔" اس نے تیکھی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "تو نے پہلے ہی کم گھاؤ لگائے ہیں' اب اور تنگ نہ کر۔"

رحیم داد نے جمیلہ کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو نرم پڑ گیا۔ "جیسی تیری مرضی۔" وہ روٹھنے کے انداز میں بولا۔ "میرے یہاں ٹھیرنے سے تجھے تکلیف ہوتی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"برا نہ منا۔" جمیلہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ "سچ جان، میری طبیعت اس سے ٹھیک نہیں۔ میں سویرے تیرے پاس آؤں گی۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ منہ لٹکائے باہر چلا گیا۔ اس کے قدموں کی آہٹ جب سناٹے میں گھل مل کر ڈوب گئی تو جمیلہ بستر سے نیچے اتری، آگے بڑھی۔ اس نے دروازے کی زنجیر چڑھا دی اور بستر پر لیٹ گئی۔

دوسرے روز وہ رحیم داد کے پاس نہیں گئی۔ اس نے سویرے ہی سویرے جلیل کو اپنے کمرے میں بلایا۔ جلیل ابھی تک اپنی بیوی، زینت اور بچوں کے ساتھ حویلی میں ٹھہرا تھا۔ جمیلہ نے اپنا ایک خط دے کر جلیل کو نہال دین کے پاس شامار کے روانہ کر دیا۔

جلیل کے جانے کے تھوڑی دیر بعد وہ نیچے اتری اور سیدھی ان مہمانوں کے پاس چلی گئی جو تاجاں کے بیاہ میں شرکت کرنے آئے تھے۔ وہ تمام وقت انھی کے ساتھ رہی۔ دونوں وقت کا کھانا بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر کھایا اور رات گئے تک بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ جب اندھیرا بڑھ گیا اور ہر طرف خاموشی چھا گئی تو وہ زینت کے ہم راہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جلیل ابھی تک شامار کے سے واپس نہیں آیا تھا۔

رحیم داد اپنے کمرے میں بیٹھا جمیلہ کا انتظار کرتا رہا۔ اس کی مضطرب نظریں دالان میں کھلنے والے دروازے کی جانب بار بار اٹھ جاتیں لیکن دروازہ نہ کھلا۔ رحیم داد نے بھی جمیلہ کے کمرے کی جانب جانے سے خود کو روکے رکھا۔

ایک اور رات گزر گئی۔

دوپہر تک رحیم داد، جمیلہ کے آنے کی آس میں کمرے میں ٹھہرا رہا اور آخر اکتا کر کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ ادھر ادھر بے زاری سے گھومتا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد واپس اپنے کمرے میں آیا اور کھانا کھا کے تھکا ہوا سا بستر پر لیٹ گیا۔

شام کو وہ کمرے میں تنہا تھا۔ جمیلہ اس کے دروازے کے سامنے سے گزری۔ اس کے ہم راہ جلیل، زینت اور ان کے بچے تھے۔ وہ دیپال پور واپس جا رہے تھے۔ جمیلہ انھیں رخصت کرنے حویلی کے پھاٹک تک گئی۔ پھاٹک کے عین سامنے تانگا کھڑا تھا۔ جلیل، بیوی بچوں کے ساتھ تانگے میں سوار ہو گیا۔

واپسی پر جمیلہ ایک بار پھر رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزری۔ رحیم داد بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اونچی آواز سے جمیلہ کو ٹوکا۔ "جمی لے!"

وہ خاموشی سے کمرے میں داخل ہوئی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

رحیم داد نے شکوہ کیا۔ "تو کل سویرے آئی نہیں۔ میں رات کو بھی دیر تک تیرا انتظار کرتا رہا۔ تو مہمانوں کے پاس بیٹھی گلاں کرتی رہی۔ وہاں سے اٹھی تو ادھر نہیں آئی۔ زینت کے ساتھ سیدھی اوپر چلی گئی۔"

جمیلہ خاموش بیٹھی رہی۔

مگر رحیم داد خاموش نہ رہا۔ لہجہ بدل کے قدرے مسکرایا۔ "اب تو تجھے ویاہ کے چکروں سے چھٹی مل گئی۔ سوچتا ہوں، سامان اوپر بھیج کر میں بھی تیرے پاس پہنچ جاؤں۔ یہاں تو اکیلے بہت جی گھبراتا ہے۔"

"تو پہلے بھی تو اسی کمرے میں اکیلا رہتا تھا، چند روز اور ٹھیر جا۔ فیر آجانا۔ اب تجھے روک بھی کون سکتا ہے۔"

"سامان تو کل سویرے بھی پہنچ سکتا ہے۔" جمیلہ کی طرف سے حوصلہ افزائی ہوئی تو وہ اترانے لگا اور بے تکلفی سے بولا۔ "میں تو آج تیرے ہی پاس رہوں گا۔ تیرے بنا اب مجھے نیند نہیں آتی۔" اس نے ایسی چبھتی ہوئی نگاہوں سے جمیلہ کی جانب دیکھا کہ اس کی نظریں جھک گئیں۔ رحیم داد اور بے قابو ہو گیا۔ "سچ، آج تو بہت سوہنی لگ رہی ہے۔ دیکھ انکار نہ کرنا۔"

جمیلہ نے نرمی سے انکار کر دیا۔ "تجھے تو پتہ ہی ہے، تاجاں آج ہی مکلاوے پر آئی ہے۔ وہ میرے ہی ساتھ ٹھیری ہے۔"

"تو نے اس کا ویاہ کر دیا اور بہت دھوم دھام سے کر دیا۔" رحیم داد نے برہمی کا اظہار کیا۔ "اب مکلاوا شکلاوا چھوڑ، اس چکر میں زیادہ نہ پڑ۔ بہت ہو گیا۔"

"چوہدری! تو کیسی گلاں کر رہا ہے۔" جمیلہ نے کسی قدر ناز سے گردن کو ہلکا سا خم دے کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "جب اس کا ویاہ کیا ہے تو ساری ہی ریتاں رسماں کرنی پڑیں گی۔ مکلاوا بھی کرنا پڑے گا۔ ایسا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

رحیم داد تیوری پر بل ڈال کر تیز لہجے میں بولا۔ "میں چاہتا ہوں اب یہ چکر ختم ہو جائے۔"

"ناراض نہ ہو۔" جمیلہ نے رسان سے کہا۔ "دو تین روز اور شانت رہ۔ تاجاں روز روز تو آنے

سے رہی۔ اب وہ پرائے گھر کی ہو چکی ہے۔"

"تو نے تاجاں کے بہت لاڈ کر لیے' آگے جو ہونا ہے' پھاتاں سے کہہ کہ وہ کرے۔ وہ اس کی ماں ہے۔ اس نے بھی تو کچھ کرنا چاہیے۔ تو نے ہر بات کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا۔"

"ٹھیک ہے' جیسا تو کہہ رہا ہے ویسا ہی ہو گا۔" جمیلہ اس دفعہ بھی نرمی سے بولی اور کھڑی ہو گئی۔ "میں نے اب جانا ہے۔"

"چلی جانا۔ کچھ دیر اور ٹھہر جا۔"

"مجھے اب نہ روک۔" وہ آگے بڑھتی ہوئی بولی۔ "مہمانوں میں میرا انتظار ہو رہا ہو گا۔ تو روٹی کھا اور سو جا۔"

جمیلہ نے رحیم داد کو مزید بولنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ آگے بڑھ گئی۔ رحیم داد اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

دو دن اور گزر جانے کے باوجود جمیلہ اس کے پاس نہیں آئی۔ تیسرے روز تاجاں اپنے دولھا کے ہم راہ چلی گئی۔ رحیم داد نے دوپہر کا کھانا کھایا اور اپنے کمرے ہی میں بیٹھا رہا مگر زیادہ دیر کمرے میں نہ ٹھہر سکا باہر نکل گیا۔

☆

سہ پہر کو نہال دین آگیا۔ رحیم داد اس وقت تک واپس حویلی میں نہیں آیا تھا۔ وہ ربیع کی فصلوں کی دیکھ بھال کی غرض سے کھیتوں کے درمیان گھوم رہا تھا۔ نادر خان لاہور گیا تھا۔ جمیلہ نے اس سے کچھ ایسی دوائیں منگوائی تھیں جو لاہور ہی میں مل سکتی تھیں۔

جمیلہ اپنے کمرے ہی میں تھی۔ اس نے نہال دین کو وہیں بلوا لیا۔ وہ اسے بہت عرصے سے جانتی تھی۔ اللہ وسایا سے ملنے' پہلے بھی نہال دین کئی بار حویلی میں آچکا تھا' مگر اللہ وسایا کے قتل کے بعد اس روز پہلی بار آیا تھا اور جمیلہ کے بلوانے پر آیا تھا۔ وہ جمیلہ کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ آدھ گھنٹے بعد نیچے اترا اور خاموشی سے چلا گیا۔

غروب آفتاب سے کچھ ہی دیر قبل رحیم داد اپنے کمرے میں واپس آیا۔ اس نے منہ ہاتھ دھو کر ایک پیالی گرم گرم چائے پی۔ شام ہو گئی۔ رحیم داد نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ اندھیرا گہرا ہوا تو اس نے جمیلہ کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ وہ کمرے سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ جمیلہ دروازہ کھول کر داخل ہوئی۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کی قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔ چہرے پر تابندگی اور نکھار تھا۔ وہ اس وقت بن سنور کر آئی تھی اور کچھ زیادہ ہی حسین اور دل ربا لگ رہی

تھی۔ جا رہی ہیں۔

رحیم داد نے اسے دیکھا تو بے قرار ہو گیا۔ سینے میں ہوک سی اٹھی لیکن اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ جمیلہ کرسی پر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ رحیم داد پھر بھی نہ بولا۔ آخر جمیلہ نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔

"چوہدری! تو چپ کر کے اس طرح کیوں بیٹھا ہے؟"

"یہ بتا تو مجھ سے کب تک دور دور رہے گی۔" رحیم داد نے شکوہ کیا۔ "اب تو سارے مہمان شیمان چلے گئے پر تیرے دھندے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔" اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی جھنجلاہٹ ابھرنے لگی۔ "صاف' صاف بتا' تو چاہتی کیا ہے؟"

رحیم داد کے چہرے کی تلخی جمیلہ نے بخوبی محسوس کی۔ لیکن وہ مرعوب نہیں ہوئی' کھل کر مسکرائی۔ "ایک گل پوچھوں' صاف صاف بتائے گا؟"

"پوچھ' کیا پوچھنا چاہتی ہے؟" رحیم داد نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔

"چوہدری! کیا تو سچ مچ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے؟"

"تجھے کیا پتہ' میں تجھ سے کتنا پیار کرتا ہوں۔" رحیم داد وارفتہ ہو کر بولا۔ "تیرے لیے تو میں نے بھکّر میں تک کھے پیر کی زیارت پر منت تک مانی۔ میری ایک پگ میں اب تک منت کی گرہ لگی ہے۔ میں نے اس پگ کو سنبھال کر الگ رکھ چھوڑا ہے۔"

"تو بھکّر بھی گیا تھا؟" جمیلہ نے دریافت کیا۔

"جن دنوں تو مجھ سے ناراض تھی اور بات کرنی چھوڑ رکھی تھی' میں بھکّر چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے منت مانی کہ تو سدا کے لیے میری بن جائے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "تِک کھے پیر کی زیارت پر مانی ہوئی منت خالی نہیں جاتی۔ تو نے دیکھ لیا میری مراد کس طرح پوری ہوئی اور تو مجھے مل گئی۔ یہ سب کچھ منت ہی کا نتیجہ ہے۔"

"کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔" جمیلہ نے نظریں نیچی کر لیں۔ "لگتا ہے تِکھا پیر بہت زبردست بزرگ رہا ہے۔ میں بھی تیرے ساتھ اس کی زیارت کو بھکّر چلوں گی۔"

"ضرور چل' بھکّر میں میرا یار سردار مراد خاں شاہانی رہتا ہے۔ دونوں اس کی حویلی میں ٹھہریں گے۔" رحیم داد نے خوش ہو کر کہا۔ "مراد خان' بیٹ کا وڈا زمیں دار ہے۔ بہت شان ہے اس کی۔ حویلی بھی شان دار ہے۔"

"مراد خان شاہانی سے تیری کب کی دوستی ہے؟" جمیلہ نے پوچھا۔

سے رہی۔ اب وہ گھروالی بن گئی ہے۔ تجھ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ سب کچھ تجھے صاف صاف بتا دوں گا۔ پر تو میرے پاس بیٹھتی ہی کب ہے۔ اب تک تجھے بتا بھی چکا ہوتا۔" رحیم داد نے کہا۔ "پر پہلے مجھے یہ بتا، آج رات تو میرے پاس یہیں رہے گی یا میں تیرے ساتھ اوپر چلوں؟"

"تو نے ابھی روٹی نہیں کھائی۔ روٹی کھا کر میرے پاس آجانا۔"

"میں روٹی تیرے ساتھ ہی کھاؤں گا۔" رحیم داد ضد کرنے لگا۔ "میں تو ابھی تیرے ساتھ چلوں گا۔ تو میری گھروالی ہے۔ اب یہ کوئی راز نہیں رہا۔ سب کو پتہ ہے۔"

"تو نے ہی سب کو بتایا ہے۔" جمیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"جھوٹ تو نہیں بتایا۔ نراض کیوں ہوتی ہے۔" رحیم داد ڈھٹائی سے ہنس کر بولا۔ "تیرے ساتھ میرا باقاعدہ نکاح ہوا ہے۔ پیراں والہ کے ملّا نے پڑھایا ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں؟"

"تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نے کب انکار کیا۔" جمیلہ نرم پڑ گئی۔ "تو الٹی سیدھی گلاں سوچ کر اپنے تئیں پریشان نہ کر۔" اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر ترچھی نگاہوں سے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "بات کیول اتنی ہے کہ میرے پاس پھاتاں اور پنڈ کی کئی دوسری زنانیاں آرہی ہیں۔ ان سے کچھ ضروری گل بات کرنی ہے۔ سمجھ گیا ناں؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" رحیم داد تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "پر تو پھاتاں شاتاں کا چکر اب چھوڑ دے تو زمین دارنی ہے، مزارعوں اور کمیوں کی زنانیوں سے تیرا میل ملاپ مجھے بالکل پسند نہیں۔"

"لے، تو نے ابھی سے مجھ پر رعب جمانا شروع کر دیا۔" وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ چنبیلی کی کلیوں کے سے اس کے سفید سفید دانت جھلکنے لگے۔ اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی ہاتھ بڑھا کر لیمپ کی روشنی میں دیکھی۔ "چوہدری! ابھی سات بجے ہیں۔ وہ دو اڑھائی گھنٹے سے کم تو میرے پاس نہیں ٹھیریں گی۔ تو دس بجے تک آجانا۔ کل سویرے اپنا سامان بھی اوپر بجھوا دینا۔ اب تجھے وہیں رہنا ہے ناں۔" وہ ایک بار پھر ہنسی۔ فضا میں جل ترنگ بجنے لگی۔ "لے اب تو خوش ہو جا۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی اونی شال درست کر کے اوڑھی اور آہستہ آہستہ کمرے سے نکل کر دالان میں پہنچ گئی۔

رحیم داد اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ملازم سے کھانا منگوایا۔ کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گیا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ رحیم داد کو قرار نہیں آیا۔ وہ اٹھ کر بستر سے نیچے اترا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اندھیرا گہرا ہو گیا۔

بہت دیر بعد اس نے اوپر کی منزل پر جانے والے زینے پر آہٹ سنی۔ ساتھ ہی نسوانی آوازیں ابھریں۔ رحیم داد نے اندازہ لگا لیا کہ پھاتاں اور گاؤں کی دوسری عورتیں واپس جا رہی ہیں۔ کمرے کے دروازے کا صرف ایک پٹ کھلا تھا۔ رحیم داد نے مڑ کر باہر دیکھا۔ وہ دھیمے لہجے میں باتیں کرتی صحن سے گزریں، پھاٹک پر پہنچیں اور چوکی دار سے کچھ دیر باتیں کرتی رہیں۔ رحیم داد کا کمرہ دور تھا اور دھند بہت گاڑھی تھی۔ وہ انھیں دیکھ نہیں سکا اور یہ بھی نہیں سن سکا کہ وہ چوکی دار سے کیا باتیں کر رہی ہیں۔ وہ حویلی سے چلی گئیں۔ چوکی دار نے پھاٹک بند کر دیا۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ کبھی کبھی چوکی دار کی کھنکار اور کھانسی گہری خاموشی میں ابھرتی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی سرسراہٹ تھی۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ رحیم داد نے گھڑی دیکھی۔ دس بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ اس نے کپڑے اتار کر اجلا لباس پہنا۔ سوٹ کیس سے شیشی نکال کر کرتے اور ڈاڑھی پر عطر لگایا۔ سر میں خوشبو دار تیل ڈالا۔ کنگھی سے سر اور ڈاڑھی کے بال سنوارے۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا اور آئینے کے روبرو کھڑے ہو کر مختلف زاویوں سے اپنی سج دھج دیکھنے لگا۔ وہ زیر لب مسکرا رہا تھا اور گنگنا رہا تھا۔ اس نے اونی دُوہر اوڑھی، کمرے سے نکلا اور دروازہ باہر سے بند کیا۔

دھند میں لپٹی ہوئی حویلی اونگھ رہی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ حویلی کے تمام نوکر چاکر اپنی اپنی کوٹھریوں کے دروازے بند کر کے بستروں میں دبکے ہوئے تھے۔ صرف چوکی دار جاگ رہا تھا۔ رحیم داد آہستہ آہستہ زینے کی جانب بڑھا۔ ابھی وہ قریب نہیں پہنچا تھا کہ دالان کے اندھیرے میں ایک دھندلا سا سایہ لہرایا۔ رحیم داد ٹھٹک گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر غور سے دیکھا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ دھند اتنی زیادہ تھی کہ وہ اسے پہچان نہ سکا۔ صرف اتنا اندازہ ہوا کہ کوئی سر سے پیر تک چادر لپیٹے بڑے پراسرار انداز میں دیوار سے لگا کھڑا ہے۔

رحیم داد نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

کوئی جواب نہ ملا۔ البتہ سائے میں حرکت ہوئی۔ پھر قریب سے اندھیرے میں آواز ابھری۔ "چوہدری میں ہوں جنت۔" وہ سامنے آگئی اور رحیم داد کے پہلو سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"تو اتنی رات گئے کیسے آگئی؟"

"تجھے پتہ ہے، نادر لہور گیا ہے۔" وہ سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بولی۔ اس کا جسم سردی سے کپکپا رہا تھا۔ "میں تو بہت دیر سے جاگ رہی تھی، انتظار کر رہی تھی کہ تو آج ضرور آئے گا۔ پر تو نہ آیا تو سوچا، خود جا کے دیکھوں۔"

رحیم داد نے جنت کو ٹرخانے کی کوشش کی۔ "تو اپنے کمرے میں جا۔ تیری بچیّاں اکیلی ہیں۔" جنت نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "تو کدھر جانے کے لیے نکلا تھا۔ میری

طرف آرہا ہو گا؟"

"نہیں!" رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "میں جمیلہ کے پاس جا رہا ہوں۔"

"اب تو وہ تیری گھر والی بن چکی ہے' جب چاہے اس کے پاس جا سکتا ہے۔"

"میں نے تو اس سے شام کو وعدہ کیا تھا۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ اب وہ پہلی سی جمیلہ نہیں رہی۔ تجھے تو پتہ ہی ہے۔"

"مجھے سب پتہ ہے۔ ایک ایک بات کا پتہ ہے۔ نادر مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ "پر تجھے یہ پتہ نہیں' زمین دارنی تجھ سے نکاح کرنے پر خوش نہیں۔ اس کی باتوں سے یہی لگتا ہے۔" اس نے رحیم داد کو بد ظن کرنے کی کوشش کی۔ "اب یہی دیکھ' وہ روز اپنے کمرے میں اکیلی سوتی ہے۔ تیری بالکل پرواہ نہیں کرتی۔ تو کیسا گھر والا ہے؟" وہ آہستہ آہستہ بولتی رہی۔ "میں تو کہتی ہوں' وہ آج بھی آرام سے سو رہی ہو گی۔ تو اس کے لیے اب تک جاگ رہا ہے۔"

"نہیں' وہ بھی جاگ رہی ہو گی۔" وہ جنت کا رخسار تھپ تھپاتے ہوئے بولا۔ "تجھے پتہ نہیں میں اس کے پاس نہیں گیا تو وہ نیچے اتر کر میرے کمرے میں پہنچ جائے گی۔ میں وہاں نہ ملا تو ہو سکتا ہے مجھے ڈھونڈتی ہوئی تیرے گھر پہنچ جائے۔ سوچ تب کتنی گڑ بڑ ہو گی۔" اسی وقت سیڑھیوں پر آہٹ ابھری۔ رحیم داد سراسیمہ ہو گیا۔ اس نے جنت سے کہا۔ "وہ نیچے آرہی ہے۔ وہ جمیلہ ہی ہو سکتی ہے۔"

جنت نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بھی خوف زدہ ہو گئی تھی۔ رحیم داد کا کمرہ فاصلے پر تھا اور زینہ قریب ہی تھا۔ کمرے تک جانے میں خطرہ تھا۔ دونوں اندھیرے میں دیوار سے چپٹے ہوئے دم بخود کھڑے رہے۔

چاپ قریب آتی گئی۔ چند لمحوں بعد دونوں نے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ جمیلہ نیچے آگئی ہے۔ وہ سردی سے بچنے کے لیے موٹا اونی دھسّا اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ رحیم داد اور جنت سانس روکے کھڑے تھے۔ جمیلہ چند قدم کے فاصلے پر زینے کی نزدیک کھڑی تھی۔ رحیم داد کو خدشہ تھا کہ جمیلہ اس کے کمرے میں نہ پہنچ جائے مگر وہ اس طرف نہیں گئی۔ مہمان خانے کے دروازے کی جانب بڑھی۔ قریب پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا اور مہمان خانے میں داخل ہو گئی۔

رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ "میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔"

"پر وہ تیرے کمرے کی طرف نہیں گئی۔" جنت نے سرگوشی کی۔ "مہمان خانے میں کیوں گئی ہے؟"

"لگتا ہے تیرے گھر کی طرف گئی ہے۔" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

جنت نے دبی زبان سے تائید کی۔ "مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔"

"اس نے تجھے گھر میں نہ پایا تو کیا سوچے گی؟"

"تو فکر نہ کر۔" جنت نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ "میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دوں گی۔ وہ میری بات مان لے گی۔" وہ مڑی۔ "مجھے اب چلنا چاہیے۔"

"تو اب کہاں جائے گی؟"

"یہ سب تو مجھ پر چھوڑ دے۔" جنت نے کہا۔ "اب تو اپنے کمرے میں جا۔ کچھ دیر بعد جمیلہ کے پاس جانا۔ تب تک وہ اپنے کمرے میں واپس پہنچ جائے گی۔ ہو سکتا ہے وہ تیرے ہی کمرے میں آجائے۔"

"یہ تو بتا' اتنی رات کو وہ تیرے گھر کیوں گئی ہے؟" رحیم داد نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے ڈھونڈنے کے ارادے سے تو نہیں گئی؟ اس رات اسے کچھ شبہ تو ہو گیا تھا جب میں تیرے گھر کے پچھلے کمرے میں چھپا ہوا تھا اور وہ نادر کے ساتھ اچانک پہنچ گئی تھی۔"

"مجھے تو نہیں لگتا کہ اسے کوئی شبہ ہوا تھا۔ ایسا ہوتا تو وہ کسی نہ کسی طور مجھ سے ضرور پوچھتی۔ وہ کسی اور ہی کام سے میرے گھر گئی ہو گی۔ تجھے ڈھونڈنا ہوتا تو پہلے تیرے کمرے میں جاتی۔"

"تیری گل ٹھیک ہی لگتی ہے۔ اب تو ٹُر جا۔"

جنت دروازے سے گزر کر مہمان خانے میں چلی گئی۔ جمیلہ بھی ادھر ہی گئی تھی۔ رحیم داد کچھ دیر بعد زینے کی جانب بڑھا اور سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ جمیلہ کے کمرے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ کمرے میں روشنی تھی۔ رحیم داد اندر چلا گیا۔ کمرے میں انگیٹھی دہک رہی تھی۔ انگیٹھی کے پاس دو کرسیاں رکھی تھیں۔ کرسیوں سے ذرا ہٹ کر دیوار کے ساتھ مسہری تھی۔ اس پر صاف ستھرا بستر بچھا تھا۔ رحیم داد چند لمحے بستر کو تکتا رہا پھر اس پر بیٹھ گیا۔ اس نے قریب رکھا ہوا لحاف کھسیٹا اور ٹانگوں پر ڈال لیا۔ وہ جمیلہ کے انتظار میں دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

☆

چھت پر چاپ سنائی دی اور رفتہ رفتہ نزدیک آتی گئی۔

دروازہ آہستہ سے کھلا اور جمیلہ اندر آگئی۔ اس نے سردی سے تھر تھراتے ہوئے دروازہ بند

کیا۔ مگر کنڈی نہیں لگائی۔ لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں جمیلہ نے رحیم داد کو بستر پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے لیکن جلد ہی غائب ہو گئے۔ وہ مسکرائی۔

"چوہدری' تو کب آیا؟"

"مجھے تو آئے دیر ہو گئی۔" رحیم داد بھی مسکرانے لگا۔ "پر تو اتنی رات گزرے سردی میں کہاں گئی تھی؟"

جمیلہ نے دھسّا اتار کر ایک طرف رکھا۔ کھونٹی پر لٹکی ہوئی سرخ شال اتار کر اوڑھی۔ کرسی پر بیٹھی اور دونوں ہاتھ انگیٹھی پر پھیلا کر تاپنے لگی۔ انگاروں سے ابھرتی ہوئی ہلکی ہلکی آنچ میں جمیلہ کا چہرہ شفق کے مانند سرخ ہو رہا تھا۔ وہ خوب صورت اور دل کش نظر آ رہی تھی۔ وہ گردن جھکائے دہکتے انگاروں کو تک رہی تھی۔ رحیم داد بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بے قرار ہو کر گہری سانس بھری اور آہستہ سے پوچھا۔

"تو نے بتایا نہیں تو کہاں گئی تھی؟"

"سوچا تھا نادر خان لہور سے واپس آ گیا ہو گا۔" جمیلہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ "میں نے اس سے دوائیاں منگائی تھیں' وہ لینے گئی تھی۔"

"نادر خان لہور سے لوٹ آیا؟"

"نہیں!" جمیلہ نے نہایت مختصر جواب دیا۔

"تو نادر کے گھر گئی تھی؟"

"نہیں' میں اس کے گھر نہیں گئی۔ ضرورت ہی نہیں پڑی۔ مہمان خانے سے باہر نکلی تو حمدا مل گیا۔ جانے اتنی رات کو کہاں سے آ رہا تھا۔ اسی نے بتایا کہ نادر ابھی نہیں لوٹا۔ اس سے باتیں کرتے کرتے مجھے ایک کام یاد آ گیا۔ میں نے اسے نور محمد کے گھر کی طرف بھیجا ہے۔"

"تاراں نہیں تھی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"مجھے تو نظر آئی نہیں۔ لگتا ہے' حویلی میں ہو گی۔ ویسے بھی عام طور پر وہ حویلی میں رہتی ہے۔"

"مجھے پتہ ہے' وہ حمدے سے خوش نہیں۔" رحیم داد مسکرا کر بولا۔ "اس کی ناراضی ہے بھی ٹھیک۔ شام ہوتے ہی نکل جاتا ہے اور کبھی کبھی تو رات بھر نہیں لوٹتا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "مہمان خانے کی دیکھ بھال کے لیے کوئی اور ہی بندہ لگانا پڑے گا۔ حمدا تو وہاں رات کو بھی نہیں ٹھیرتا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" جمیلہ نے اس سے اتفاق کیا۔ "میں نے پہلے بھی سوچا تھا پر تاجاں کے ویاہ میں ایسی پھنسی کہ یاد ہی نہ رہا۔ ویسے ان دنوں نادر خان بھی اپنے بال بچوں سمیت مہمان خانے میں ٹھیرا ہوا تھا۔ پہلے تو وہاں ہوتا تھا۔ پر اب کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

"مہمان خانہ اس طرح رات کو خالی نہیں رہنا چاہیے۔ حمدے کا کیا ہے' من موجی بندہ ہے' جب چاہا اٹھ کر چلا گیا۔ میرے سامنے بھی روز ہی ایسا کرتا تھا۔ سنا ہے پنڈ کی کسی مُٹیار کے چکّر میں رہتا ہے۔"

جمیلہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ رحیم داد بے قرار ہو کر بولا۔ "اُدھر کیوں بیٹھی ہے' ادھر میرے پاس آ جا۔ تجھے سردی نہیں لگ رہی؟ ویسے آج سردی کچھ زیادہ ہی ہے۔"

"ہاں' آج سردی زیادہ ہے۔" جمیلہ بولی۔ "انگیٹھی کی آگ سے ہاتھوں کو سینکنے میں بہت سواد مل رہا ہے۔" رحیم داد بستر سے اٹھا اور جمیلہ کے روبرو کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ اس نے بھی گردن جھکا کر اپنے ہاتھ انگیٹھی کے اوپر پھیلا دیے۔ دونوں گردن جھکائے انگارے تک رہے تھے۔ انگاروں پر سفید راکھ کی ہلکی تہہ جم گئی تھی۔

رحیم داد نے گردن کو ہلکا سا خم دیا اور بڑے چاؤ سے بولا۔ "جمی لے! میں تبھی یہاں آیا جب تو نے بلایا۔" اس کے لہجے میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ نمودار ہوئی۔ "تو سوچ بھی نہیں سکتی' میں تجھے کتنا چاہتا ہوں۔ تجھے کتنا پیار کرتا ہوں۔"

"مجھے پتہ ہے۔ بالکل ٹھیک طرح پتہ ہے۔" جمیلہ کے ہونٹوں پر زہرخند پھیل گیا۔ "اسی لیے تو نے احسان شاہ سے مل کر اللہ دسایا کا خون کرا دیا۔"

رحیم داد سٹ پٹا گیا۔ پریشان ہو کر بولا۔ "یہ بات تجھے اس سور دے پتّر دینے نے کہی ہو گی۔"

"کسی نے بھی کہی ہو' پر جھوٹ تو نہیں ہے۔"

"جس نے بھی تجھ سے ایسی گل کی' بالکل بکواس کی۔" رحیم داد نے جمیلہ کو منانے کی کوشش کی۔ "تو میرے دل میں جھانک۔ دیکھ اس میں تیرے لیے کتنا پیار ہے۔ تجھے کیا پتہ' میں تیرے پیار کی آگ میں کب سے جل رہا ہوں۔"

جمیلہ نے گردن اونچی کی اور رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "ایسی گلّاں تو کتنی اور زنانیوں سے پہلے کہہ چکا ہے۔" وہ مسکرائی مگر اس مسکراہٹ میں پیار یا لگاؤ نہیں تھا۔ "اس رات جنت سے بھی تو نے یہی بات کہی ہو گی جب تو اس کے گھر کے پچھلے کمرے میں پردے کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ تیرے ننگے پیر چادر کے نیچے سے صاف نظر آ رہے تھے اور تیرے جوتے اگلے کمرے میں منجی کے نیچے پڑے تھے۔" اس کے لہجے میں تلخی نمایاں ہو گئی۔ "جنت کے ساتھ تو نے

کب سے یاری لگا رکھی ہے؟ تو نے اسی لیے تو نادر کو مخبر نہیں لگایا؟"

رحیم داد بوکھلا کر بولا۔ "تو ایسی کڑوی گلاں کیوں کر رہی ہے؟" وہ سخت حیران نظر آ رہا تھا۔

جمیلہ نے تڑ سے جواب دیا۔ "اور کیسی گلاں کروں۔ تیری طرح جھوٹا پیار جتاؤں' یہی چاہتا ہے ناں؟"

رحیم داد دم بخود بیٹھا رہا۔ انگیٹھی میں انگارے سلگ رہے تھے۔ رات دبے قدموں گزرتی رہی۔ رحیم داد نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "تجھے سونا نہیں ہے؟ بہت رات ہو گئی۔" اس نے جمیلہ کا ہاتھ تھام کے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ "بہت ہو گئی ناراضی۔ ادھر آ' میرے ساتھ۔"

جمیلہ نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور تیکھے لہجے میں کہا۔ "بیٹھ' ابھی میں نے تجھ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

"صبح کر لینا۔" رحیم داد نے جمیلہ کا شانہ تھپکا۔ لیکن جمیلہ کرسی پر بیٹھی رہی۔ "تجھے نہیں اٹھنا؟" اس دفعہ رحیم داد کا لہجہ درشت تھا۔ جمیلہ انگیٹھی پر ہاتھ تاپتی رہی۔ رحیم داد کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ اس نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے کہا۔ "کان کھول کر سن لے' میں نہ اللہ وسایا کی طرح مجّھو ہوں نہ کبھی اس کی طرح تیرے پیو کا مزارع رہا۔ میرا نام چوہدری نور الٰہی ہے۔ میں جتنا سیدھا سادا بندہ نظر آتا ہوں اتنا ہی اندر سے ٹیڑھا بھی ہوں۔"

"مجھے پتہ ہے تو کیسا بندہ ہے' بہت ٹھیک طرح پتہ ہے۔" جمیلہ نے اس کی جانب دیکھے بغیر تلخ لہجے میں کہا۔ وہ رحیم داد کے غصے سے ذرا مرعوب نہ ہوئی۔

رحیم داد کے چہرے پر جھلاہٹ برسنے لگی۔ اس نے جمیلہ کا بازو پکڑ کے زور سے جھٹکا دیا۔ جمیلہ کرسی سے لڑھک کر فرش پر گر گئی۔ رحیم داد نے جھک کر اسے بانہوں میں اٹھا لیا۔ جمیلہ نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئی۔ رحیم داد نے اسے بستر پر پھینک دیا۔

جمیلہ کے بال بکھر کر منہ پر آ گئے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے بال درست کرتے ہوئے جل کر بولی۔ "چوہدری! تو پاگل تو نہیں ہو گیا۔ میں تجھے اتنا گرا ہوا نہیں سمجھتی تھی۔" اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

رحیم داد کے رویّے میں کوئی نرمی پیدا نہیں ہوئی۔ اس نے غصے سے جمیلہ کو ڈانٹا۔ "چپ کر میں نے بہت سن لی تیری کڑ کڑ۔" وہ بستر پر بیٹھ گیا۔

جمیلہ نے سہمی ہوئی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا اور دور سرکنے کی کوشش کی مگر رحیم داد نے ہاتھ بڑھا کر اسے دبوچ لیا۔ جمیلہ اس کے ہاتھوں کے حصار سے نکلنے کے لیے تلملائی بھی' تڑپی بھی لیکن خود کو آزاد نہ کرا سکی۔ ناچار اس نے رحیم داد کے بازو میں اپنے دانت گاڑ دیے۔ رحیم داد کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کے چہرے پر خون ابل آیا۔ اس نے غضب ناک ہو کر جمیلہ کے منہ پر زور سے تھپّڑ مارا۔ جمیلہ زور زور سے ہانپنے لگی۔ رحیم داد نے جھک کر دوبارہ اسے گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ عین اسی وقت کمرے کے باہر چھت پر قدموں کی آواز ابھری۔ رحیم داد نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازہ کھلا اور ڈھاٹے باندھے ہوئے دو آدمی آگے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ قد و قامت اور چال ڈھال سے دونوں خاصے دبنگ نظر آتے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور کندھے پر اسٹین گن لٹک رہی تھی۔ دوسرے کے ہاتھوں میں بھی چھوٹی رائفل دبی تھی۔

☆

رحیم داد سکتے میں رہ گیا۔ دونوں کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ آگے والے شخص نے جھٹ ڈھاٹا ہٹایا۔ رحیم داد نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ جمیلہ کا بڑا بھائی ہردیال تھا۔ ایک بار پہلے بھی وہ اسی طرح رات کے اندھیرے میں جمیلہ کو لینے آیا تھا۔ اس وقت اللہ وسایا زندہ تھا اور جمیلہ نے ہردیال کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ رحیم داد کو وہ رات یاد آ گئی۔

جمیلہ تڑپ کر بستر سے نیچے اتری اور بے قرار ہو کر بولی۔ "میرا دیر آ گیا۔" وہ ہردیال کے سینے سے لگ کر بے اختیار رونے لگی۔

ہردیال نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے کہا۔ "پارو! تو ابھی تک ویسی ہی پگلی ہے۔ رو کیوں رہی ہے؟ میں تو تجھے لینے آیا ہوں۔"

رحیم داد نے کسمسا کر پہلو بدلا۔ دوسرے آدمی نے جھٹ آگے بڑھ کر رائفل کی نال اس کی طرف موڑ دی اور ڈپٹ کر کہا۔ "چپ کر کے بیٹھا رہ۔ گڑبڑ کی کوشش کی تو گولی بھیجا پھاڑ کر باہر نکال دے گی۔" رحیم داد بستر پر جس طرح بیٹھا تھا اسی طرح دم سادھے بیٹھا رہا۔

ہردیال نے شفقت سے جمیلہ کا سر پکڑ کر چہرہ سامنے کیا۔ اس کی پیشانی چومی اور وارفتگی سے بولا۔ "نہال دین نے سنتوکھے کے ہاتھ جیسے ہی مجھے تیرا پتر پہنچایا' میں نے اسی سمے تیرے پاس آنے کی تیاری کر لی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے تو سندیسا بھیجے اور میں نہ آؤں۔ میں تو اس دن کا برسوں سے انتظار کر رہا تھا۔"

جمیلہ نے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "نہال دین میرے پاس دن ڈھلے آیا تھا۔ کہتا تھا تو آج رات

ساڑھے دس بجے تک یہاں پہنچ جائے گیا۔" اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے۔ "میں تجھے دیکھنے مہمان خانے سے باہر بھی گئی تھی پر تو دکھائی نہیں دیا۔ تو نے آنے میں دیر کر دی۔"

"ہاں، مجھے کچھ دیر ہو گئی۔" ہردیال نے بتایا۔ "وہ ایسا ہوا کہ ایک جیپ میں پنکچر ہو گیا تھا۔ پہیا بدلنے اور اسٹپنی لگانے میں سمے لگا۔ ویسے آج دھند بھی بہت ہے۔ رستہ صاف نظر نہیں آتا تھا۔"

"ماتا جی کا کیا حال ہے؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"تجھے دیکھے گی تو اسے دوسرا جیون مل جائے گا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پتا جی تو تجھے یاد کرتے کرتے سورگ باشی ہو گئے اور ماتا جی تیرے لیے روتے روتے سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ آنکھوں سے اب تو دکھائی بھی کم پڑتا ہے۔ پارو! تو ہمارے گھر کا اجالا تھی۔ تو پہنچے گی تو ہمارے آنگن میں سورج اتر آئے گا۔"

"بھاجی، تو سچ کہہ رہا ہے؟ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ جانے کیا ہو۔" اس نے دبی زبان سے اپنے خدشات کا اظہار کیا اور مڑ کے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "ویسے میں کبھی واپس نہ جاتی۔ تجھے ٹھیک طرح پتہ ہے۔ پر حالات ایک دم اس طرح پلٹ جائیں گے۔ ایسا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔"

ہردیال دل جوئی کرنے لگا۔ "تو ہماری پاروتی تھی، پاروتی ہی رہے گی۔ نراش نہ ہو۔ تجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ بالکل چنتا نہ کر۔" جمیلہ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ "جو کچھ ہوا اس میں تیرا دوش ہی کیا تھا۔" ہردیال بولتا رہا۔ "پگلی! تو اپنی ہی ماتا اور بھائیوں سے ڈر رہی ہے۔ تو ہم چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے۔ تجھے کیا پتہ، تیرے بنا ہم پر کیا بیتی۔ آٹھ برس سے اوپر ہو گئے پر ہم تجھے نہ بھول سکے۔ ہم تجھے کیسے بھول سکتے ہیں، پارو میری بہن۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے جمیلہ کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ جمیلہ بھی سسکیاں بھرنے لگی۔

دوسرے آدمی نے ہردیال کو ٹوکا اور سر پر منڈلاتے ہوئے خطرے سے خبردار کیا۔ "جیجا جی! رونا دھونا چھوڑ۔ سمے بہت کم ہے۔ ہمیں سورج نکلنے سے پہلے ہی بارڈر کراس کرنا ہے ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔"

ہردیال نے آنسو پونچھتے ہوئے جمیلہ سے پوچھا۔ "پارو! یہ بتا، نینا اور گڈو کدھر سو رہے ہیں؟ تو انھیں فوراً جگا دے۔ جتنا سامان چاہے لے چل۔ میرے پاس دو جیپیں ہیں۔" وہ اپنے سالے کی طرف متوجہ ہوا۔ "کشوری! تو جلدی سے رام مورتی اور شیدے کو بلا لا۔ سامان اٹھانا ہے۔ بچے نیند میں ہوں گے۔ انھیں گود میں اٹھا کر چلنا ہو گا۔"

کشوری چلا گیا۔ ہردیال نے ریوالور کا رخ رحیم داد کی جانب کر دیا۔ پیر سے کرسی کھسکائی۔ اور اس پر بیٹھ گیا۔ جمیلہ برابر والے کمرے میں گئی۔ وہ باری باری تین سوٹ کیس اٹھا کر لائی اور دروازے کے پاس ہی رکھ دیے۔ کچھ دیر بعد کشوری واپس آ گیا۔ اس کے ہم راہ ڈھاٹے باندھے ہوئے دو اور آدمی آئے۔ ان کے کندھوں پر بھی رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ دونوں نے سوٹ کیس اٹھائے اور باہر چلے گئے۔

جمیلہ سوتی ہوئی نینا کو اٹھا کر لائی اور اسے ہردیال کے ہاتھوں میں دے دیا۔ ہردیال نے اسے سینے سے لگایا اور ہولے ہولے اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ جمیلہ برابر والے کمرے میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کی گود میں گڈو تھا۔ وہ بھی گہری نیند سو رہا تھا۔

جمیلہ آگے بڑھی اور عین رحیم داد کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ "چوہدری! خوش ہو۔ تجھے میری زمیں داری بھی مل گئی۔ یہ حویلی، یہ زمین یہ کھیت، سب کچھ اب تیرا ہی ہے۔ آرام سے جیون گزار۔ موجاں کر۔" اس کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔

"تو جا رہی ہے جمیلہ۔" رحیم داد پہلی بار بولا۔ اس کا لہجہ نرم تھا۔

"تو کس جمیلہ کی بات کر رہا ہے۔" جمیلہ کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ "جمیلہ کو تو نے اسی رات مار ڈالا تھا جب احسان شاہ کی حویلی میں نکاح کا ناٹک رچایا گیا تھا۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑا اور ہانپتے ہوئے بولی۔ "اللہ وسایا کی جمیلہ تو مر گئی۔ میں تو اب پاروتی ہوں۔" اس نے ہردیال کی جانب اشارہ کیا۔ "دیکھ یہ میرا ویر کھڑا ہے۔ یہ اپنی بہن پاروتی کو لینے آیا ہے۔"

"یہ تو نے ٹھیک نہیں کیا۔" رحیم داد کا لہجہ بدستور نرم تھا۔ اس نے جمیلہ کو روکنے کی کوشش کی۔ "تجھے اس طرح اپنی زمیں داری، اپنا گھر بار چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔"

"میں نے کیا کرنا چاہیے کیا نہیں، یہ تیرے سوچنے کی گل نہیں۔" جمیلہ نے بے رخی سے کہا۔ "تجھے میرے بارے میں چنتا کرنے کی ضرورت نہیں۔ تو زمین اور جائیداد چاہتا تھا، وہ تجھے مل گئی۔ بیع نامے پر تو پہلے ہی مجھ سے زبردستی دستخط کرا چکا ہے۔ اب اور کیا چاہتا ہے۔ جو کچھ تجھے چاہیے تھا، سب مل گیا۔" جمیلہ مڑی۔

رحیم داد نے ٹوکا۔ "جمی لے گل سن۔"

وہ ایک دم بپھر گئی۔ "تو مجھے جمی لے کہنے والا کون ہوتا ہے؟ میرا تیرا کیا ناتا۔ تو مجھے جمی لے کہتا ہے تو میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ جی چاہتا ہے، تیرا منہ نوچ لوں۔ اللہ وسایا کو مار کر تو اللہ وسایا بننا چاہتا ہے۔ پاپی، خونی۔" اس کی آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں اور سانس پھول گئی۔

رحیم داد تلملا کر بولا۔ "تو ہندنی تھی ناں، ہندنی ہی نکلی۔"

"میں نے بھی تیرا مسلمان دیکھ لیا۔ بالکل ٹھیک طرح دیکھ لیا۔" وہ آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگی۔

رحیم داد غضب ناک ہو کر چیخا۔ "بکواس نہ کر۔" وہ بستر سے کودا اور نیچے آگیا۔ "میں تجھے نہیں جانے دوں گا۔ تو یہاں سے نہیں جا سکتی۔" وہ تیزی سے دروازے کی جانب لپکا۔

کشوری جھٹ سامنے آگیا۔ "چپ کر کے بیٹھ جا۔" اس نے رائفل کا بٹ گھما کر رحیم داد کے سر پر مارا۔ سر تو نہیں پھٹا مگر چوٹ ایسی کراری آئی کہ رحیم داد ڈگمگا گیا۔ کشوری نے اسے زور سے دھکا دیا۔ رحیم داد لڑکھڑاتا ہوا بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

ہردیال نے جمیلہ سے کہا۔ "یارو! دیر نہ کر۔ تو کشوری کے ساتھ چل۔" اس نے نینا کو کشوری لال کی گود میں دے دیا۔ جمیلہ نے گڈو کو سینے سے چمٹا کر شال کا پلو اس پر ڈال دیا۔

کشوری لال آگے بڑھا۔ جمیلہ اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دونوں کمرے سے نکل کر چھت پر پہنچ گئے۔

ہردیال بڑھ کر رحیم داد کے پاس گیا۔ اس نے جھک کر اسے دیکھا۔ چوٹ بھرپور آئی تھی۔ رحیم داد کی سانس دھیمی تھی اور رک رک کر چل رہی تھی۔ وہ بے سدھ پڑا تھا مگر ہردیال کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے رحیم داد کے منہ میں کپڑا ٹھونسا۔ دونوں ہاتھ پیچھے کیے اور جمیلہ کے ایک پرانے دوپٹے سے مضبوطی سے باندھ دیے۔ رحیم داد نے مطلق مزاحمت نہیں کی۔ وہ بستر پر کروٹ کے بل بے ہوش پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

ہردیال دروازے کے قریب پہنچا۔ اس نے ٹھٹک کر ایک بار پھر رحیم داد پر نظر ڈالی۔ لیمپ کی زرد روشنی میں وہ مردے کی طرح بے جان نظر آ رہا تھا۔ ہردیال نے کمرے سے نکل کر باہر سے دروازے کی زنجیر چڑھا دی اور تیزی سے زینے کی جانب لپکا۔ اس نے سیڑھیاں طے کیں اور حویلی سے گزر کر مہمان خانے میں چلا گیا۔ مہمان خانہ سنسان تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

وہ مہمان خانے سے باہر نکلا۔ جمیلہ دروازے کے پاس کشوری لال کے ساتھ کھڑی تھی۔ دونوں اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ ہردیال نے ایک بار پھر منہ پر ڈھاٹا باندھا۔ ریوالور، جیب میں رکھا اور اسٹین گن کندھے سے اتار کر ہاتھ میں دبالی۔

ہر طرف کہر کی گاڑھی گاڑھی دھند کا نیل گوں جال پھیلا تھا۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ ہوا دم بخود تھی۔ تینوں تیز تیز قدم اٹھاتے نہر کی جانب بڑھے۔ ان کی چاپ، آہستہ آہستہ ابھرتی رہی۔ یکایک سناٹے میں مویشیوں کے باڑے کی رکھوالی کرنے والے پہرے دار کی کھنکار سنائی دی۔ وہ رک رک کر کھنکار رہا تھا مگر تینوں رکے نہیں۔ انھوں نے رفتار اور تیز کر دی۔ ہردیال نے اسٹین گن مضبوطی سے تھام لی اور چوکنا ہو کر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔

پت جھڑ لگ چکا تھا۔ وہ درختوں کے نیچے پہنچے تو خشک پتے پیروں تلے چرمرا کر آہٹ پیدا کرنے لگے۔ جمیلہ نے گڈو کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ مگر اسے زیادہ دور نہیں چلنا پڑا۔ درختوں کے نیچے اندھیرے میں جیپیں کھڑی تھیں اور دھند میں سیاہ دھبوں کے مانند نظر آ رہی تھیں۔

ہردیال کے بازو کے سہارے جمیلہ جیپ کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ ہردیال اس کے برابر بیٹھ گیا۔ کشوری نے نینا کو ہردیال کی گود میں دے دیا اور خود دوسری جیپ میں جا کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد جیپوں کے انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سناٹے میں ابھری۔

دونوں جیپیں خشک پتے روندتی، آہٹیں پیدا کرتی تیزی سے دوڑنے لگیں۔ ہردیال کی جیپ پیچھے تھی۔ اس نے نینا کو جمیلہ کی گود میں دے دیا۔ اب وہ اسٹین گن سنبھالے چوکس بیٹھا تھا۔ اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ ایک اور شخص بیٹھا تھا۔ وہ بھی اپنی رائفل سنبھالے اندھیرے میں ادھر ادھر چوکنا نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

جیپیں ہچکولے کھاتی نہر کے کنارے کنارے دوڑ رہی تھیں۔ کہر کی دھند میں لپٹا ہوا کوٹلہ ہرکشن سو رہا تھا۔ جمیلہ مڑ مڑ کر حسرت بھری نظروں سے گاؤں کی جانب دیکھ رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے کوٹلہ ہرکشن کے دھند میں الجھے ہوئے مکانات اور کھیت کھلیان نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ جیپیں آگے بڑھتی رہیں۔ گاؤں پیچھے رہ گیا۔

۲۶

رحیم داد حویلی کی بالائی منزل کے کمرے میں بے ہوش پڑا تھا۔ رات آہستہ آہستہ تاریک ہوتی گئی، گزرتی گئی۔ رحیم داد کو ہوش آیا تو اس نے اپنے سر میں ہلکا ہلکا درد محسوس کیا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا تھا اور دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ کسمسایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ کونے میں لیمپ روشن تھا لیکن انگیٹھی میں سلگتے ہوئے انگارے بجھ کر راکھ کا ڈھیر بن چکے تھے۔

رحیم داد دروازے پر جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا، اسی اثنا میں باہر سے کنڈی کھلنے کی آواز ابھری۔ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دیکھا۔ جنت سردی سے کپکپاتی اندر داخل ہوئی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی رحیم داد کے قریب پہنچی۔ اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالا اور جلدی جلدی اس کے ہاتھ کھول دیے۔

رحیم داد نے دونوں کلائیاں سہلاتے ہوئے پوچھا۔ ”جنت تو کیسے آگئی۔ کیا جمیلہ چلی گئی؟“

”ہاں جی، وہ چلی گئی۔“ جنت نے بتایا۔ ”اسے گئے ہوئے بھی دیر ہو گئی۔“

”تجھے کیسے پتہ چلا وہ چلی گئی؟“

”مجھے سب پتہ ہے کیا کیا ہوا۔“ وہ بستر پر رحیم داد کے قریب بیٹھ گئی۔ ”جب وہ آئے تھے تو میں جاگ رہی تھی۔ پورے چھ بندے تھے۔ منہ پر منڈاسے باندھے ہوئے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں بندوکیں دبی تھیں۔ چار تو مہمان خانے کے باہر ہی ٹھہر گئے۔ پہلے دیوار پھاند کر دو اندر گئے۔ انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ دو اور اندر چلے گئے۔ دو بندے بندوکیں سنبھالے دروازے پر کھڑے رہے۔“

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”تو نے انھیں کیسے دیکھا؟“

”دروازے کی آڑ سے۔ میرے ہی سامنے زمین دارنی گڈو کو گود میں اٹھائے باہر نکلی۔ فیر دوسرے بھی باہر آگئے اور وہ ان کے ساتھ باہر چلی گئی۔ تیں نوں پتہ ہے وہ جیپوں میں بیٹھ کر آئے تھے۔ میں نے نہر کی طرف جیپوں کی آواز سنی تھی۔“

”میں نوں پتہ ہے وہ جیپوں میں ہی بیٹھ کر آئے تھے۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”یہ بتا انھیں گئے ہوئے کتنی دیر ہو گئی۔ مجھے تو ایک نے رفل کا بٹ اس زور سے سر پر مارا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ مجھے بالکل پتہ نہیں چلا وہ کب گئے اور کیسے گئے۔“

”میں نے بتایا نہیں، انھیں گئے ہوئے تو بہت دیر ہو گئی۔ اب تو میلوں دور چلے گئے ہوں گے۔ میں تیرے پاس پہلے ہی آجاتی پر اتنی ڈری ہوئی تھی کہ باہر نکلنے کی دیر تک ہمت نہیں ہوئی۔“ اس نے قدرے توقف سے کہا۔ ”کون تھے وہ؟ تجھے پتہ ہے؟“

”ایک تو جمیلہ کا وڈا بھرا ہردیال تھا۔ دوسرا ہردیال کا سالا کشوری لال تھا۔ وہ جمیلہ کو لینے آئے تھے۔ جمیلہ نے انھیں خود بلایا تھا۔“ رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ ”اب جمیلہ نہیں آئے گی۔ وہ چلی گئی۔“

”چوہدری! یہ ٹھیک ہی ہوا وہ چلی گئی۔ میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا وہ تیری کبھی نہیں بن سکتی۔“ اس نے منہ بگاڑ کر نفرت کا اظہار کیا۔ ”وہ ہندنی تھی ناں، اسے تو ایک روز یہاں سے جانا ہی تھا۔“ جنت مسکرانے لگی۔ ”پر اس کے جانے سے کیا ہوتا ہے، پوری زمیں داری تو اب تیرے ہی پاس آگئی۔“

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بے نیازی سے بولا۔ ”میرے سر میں بہت درد ہے۔“

”تو بیٹھا کیوں ہے؟ لیٹ جا۔“ جنت نے اظہار ہمدردی کیا۔ ”لگتا ہے، سر میں زیادہ چوٹ آئی ہے۔ لا میں تیرا سر دبا دوں۔“

رحیم داد نڈھال ہو کر خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ جنت نے اس کے جسم پر لحاف ڈال دیا۔ کھسک کر قریب ہو گئی اور سرہانے بیٹھ کر رحیم داد کا سر ہولے ہولے دبانے لگی۔

☆

رحیم داد دن چڑھے تک بستر پر پڑا رہا۔ اس نے کمرے ہی میں ناشتا کیا۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں

کھایا۔ نہ وہ کمرے سے باہر نکلا اور نہ نیچے اترا۔ وہ بہت افسردہ اور پریشان تھا۔ جمیلہ کے چھوٹ جانے کا اسے سخت ملال تھا۔

جمیلہ کا جانا زیادہ دیر چھپا نہ رہ سکا۔ حویلی کے نوکروں کو صبح ہی معلوم ہو گیا تھا۔ سہ پہر تک پورے کوٹلہ ہرکشن میں یہ خبر پھیل گئی۔ کچھ مزارعے رحیم داد سے ملنے آئے بھی مگر اس نے کسی سے ملنا اور جمیلہ کے بارے میں بات کرنا گوارا نہیں کیا۔ وہ بستر پر لیٹا رہا یا پھر بے چینی سے ٹہلتا رہا۔

دن ڈھلے‘ غروب آفتاب سے کچھ پہلے نادر خاں لاہور سے آگیا۔ رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں نادر خاں کو بتایا۔ ”نادر! جمیلہ کل رات اپنے بھائی ہردیال کے ساتھ سرحد پار چلی گئی۔“

”مجھے پتہ ہے جی! جنت نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ پر گل سچی ایہہ اے جی! اس نے تو ایک روز یہاں سے جانا ہی تھا۔ اس کا مجھے پہلے ہی پتہ چل گیا تھا۔“

”تو نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

”میں تاجاں کے ویاہ کی بھاگ دوڑ میں پھنسا رہا۔ تجھ سے گل کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔“ نادر خاں نے صفائی پیش کی۔ ”ویسے تجھے پتہ چل بھی جاتا تو تو اسے روک نہیں سکتا تھا۔ وہ بہت تیز اور ہوشیار ہے۔“

رحیم داد نے نادر خان کی تائید کی۔ ”مجھے تو اس نے آخر تک دھوکے میں رکھا۔ اس کی کسی بات سے شبہ ہی نہیں ہوا کہ وہ یہاں سے جانے کی تیاری کر چکی ہے۔“

”وہ تو جی‘ لگتا ہے ہر طرح تیاری کر چکی تھی۔“ نادر خان نے کہا۔ ”جبھی تو اس نے مجھے دوائیاں خریدنے لہور بھیج دیا تھا۔ میں تو کہتا ہوں‘ اسے دوائیوں شوائیوں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہ مجھے یہاں سے ہٹانے کا بہانہ تھا۔ دیکھ لے‘ جو دوائیاں میں خرید کر لایا ہوں‘ وہ میرے ہی پاس پڑی ہیں۔ اور وہ چلی بھی گئی۔“

رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ ”اب تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلی گئی۔“

”چوہدری! فکر نہ کر۔“ نادر خاں نے رحیم داد کو تسلی دی۔ ”وہ وہاں رہ نہ سکے گی۔“

”کیوں؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ ”وہاں رہنا نہ ہوتا تو یہاں سے جاتی ہی کیوں؟“

”زینت بھی تو چلی گئی تھی۔“ نادر خاں نے اپنے موقف کی تائید میں دلیل پیش کی۔ ”پر وہ رہ نہ سکی‘ واپس آگئی۔“

نادر خاں نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ حویلی کے پھاٹک پر جیپ ٹھہرنے کی آواز سنائی دی۔ رحیم داد نے چونک کر کہا۔ ”نادر! لگتا ہے‘ باہر جیپ آکر رکی ہے۔ دیکھ کون آیا ہے؟“ وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔ ”جمیلہ تو ہو نہیں سکتی۔“ نادر نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

رحیم داد بے چین ہو کر سوچنے لگا کہ اس وقت جیپ میں کون آسکتا ہے۔ وہ بار بار دروازے کی جانب دیکھتا۔ ذرا دیر بعد نادر خاں کے ساتھ احسان شاہ آتا نظر آیا۔ رحیم داد نے اسے دور سے پہچان لیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ قریب پہنچ کر گرم جوشی سے احسان شاہ کا خیر مقدم کیا اور اسے کرسی پر لا کر بٹھایا۔ احسان شاہ سیڑھیاں چڑھ کر آیا تھا۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”چوہدری‘ مجھے دوپہر ہی کو پتہ چل گیا تھا کہ رات جمیلہ چلی گئی۔“

”ہاں شاہ جی! وہ چلی گئی۔“ رحیم داد کے لہجے میں حزن و ملال تھا۔

”کیا اس کا بھرا ہردیال اسے لینے خود آیا تھا؟“

”ہاں جی‘ ہردیال خود آیا تھا۔ اس کا سالا کشوری لال بھی تھا۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”چار بندے اور تھے۔ سب پوری طرح مسلح تھے۔“

”مسلح ہو کر تو انھیں آنا ہی تھا۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”پر بہت حیرت کی بات ہے‘ وہ کسی روک ٹوک کے بغیر اتنی آسانی سے جمیلہ کو پنڈ سے نکال کر لے گیا۔“ اس نے مڑ کر نادر خاں کی طرف دیکھا۔ ”تو کہاں تھا؟“

”مجھے تو جی زمیں دارنی نے سویرے سویرے دوائیاں خریدنے لہور بھیج دیا تھا۔“ نادر خان نے صفائی پیش کی۔

”تو نہیں تھا تو کیا ہوا۔“ احسان شاہ تیکھے لہجے میں بولا۔ ”حویلی کے راکھے‘ نوکر چاکر‘ سب ہی ہوں گے۔ وہ سب کے سب پڑے مردوں کی طرح سوتے رہے۔ کسی کی آنکھ بھی نہ کھلی؟ کوئی انھیں نہ روک سکا؟“ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ پھیلنے لگی۔ ”یہ بتا نادر! وہ آئے کس رستے سے تھے؟“

”جب وہ آئے تو میری گھر والی جاگ رہی تھی‘ پر وہ بالکل اکیلی تھی۔ گھر میں صرف چھوٹی چھوٹی بچیاں تھیں۔“ نادر خان نے بتایا۔ ”وہ مہمان خانے کی دیوار پھاند کر داخل ہوئے تھے۔“

”مہمان خانے میں کوئی نہیں تھا؟“

"کوئی مہمان خانے میں نہ ہو' تب بھی حمدا ضرور رہتا ہے۔ اس کی گھر والی بھی عام طور پر وہیں رہتی ہے۔ حمدا تو جی مہمان خانے ہی کے کام کاج کے لیے ہے۔ وہ رات کو تو ضرور رہتا ہے۔" نادر خاں نے وضاحت کی۔ "ویسے جی حویلی کے پھاٹک پر راکھا بھی رہتا ہے۔"

"پر یہ سارے ہڈ حرام اس وکت کہاں تھے؟" احسان شاہ نے تیوری پر بل ڈال کر دریافت کیا۔ "کم سے کم شور تو مچا سکتے تھے۔ پنڈ میں جاگ ہو جاتی تو ہردیال اتنے آرام سے جمیلہ کو نہیں لے جا سکتا تھا۔"

"میں تو کہتا ہوں جی' نوکر چاکر سب ملے ہوئے تھے۔" نادر خان نے اظہار خیال کیا۔ "حمدا تو ضرور ملا ہوا تھا۔ اسے تو مہمان خانے میں موجود ہونا چاہیے تھا۔ جنت بتاتی تھی حمدا مہمان خانے میں تھا ہی نہیں۔ اس کی گھر والی بھی غائب تھی۔"

"جبھی تو وہ آرام سے مہمان خانے کے رستے آئے اور جمیلہ اور اس کے بچوں کو سامان کے ساتھ لے گئے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "جمیلہ ذرا بھی ڈری ہوئی نہیں لگتی تھی۔ اس نے آرام سے اپنے سوٹ کیس نکالے۔ بچوں کو ہردیال اور کشوری لال کی گود میں دیا۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "میں نے اسے روکنے کی کوشش کی اور چاہا کہ دروازے سے نکل کر پنڈ والوں اور حویلی کے نوکروں کو جگانے کے لیے شور مچاؤں پر کشوری لال نے میرا راستہ روک لیا۔"

احسان شاہ گردن جھکائے سوچتا رہا' ذرا دیر بعد اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ "چوہدری! ایسے تو تیری زمیں داری نہیں چلے گی۔ حویلی کے سارے راکھے اور نوکر چاکر نکال باہر کر۔ سب کمینے اور حرام خور ہیں۔ بالکل تیرے کام کے نہیں۔" وہ نادر کی جانب متوجہ ہوا۔ "نادر! یہ کام تجھے کرنا ہو گا۔ ان سب کو بر طرف کر کے مضبوط اور تگڑے بندے لگا۔ کرندے اور راکھے تو زور آور اور حوصلے والے ہونے ہی چاہیں' پر پکے وفادار بھی ہوں۔ انھیں مسلح کرنے کے لیے اسلحہ کی بھی ضرورت ہو گی۔"

"ایسا ہی کر لوں گا جی!" نادر نے احسان شاہ کو یقین دلایا۔ "پر اسلحہ تو یہاں مجھے نظر نہیں آیا۔"

"اللہ وسایا کے پاس تو ایک رائفل تھی۔ اتنا تو پتہ ہے۔ کہاں ہے وہ رائفل؟" احسان شاہ نے رحیم داد سے پوچھا۔

"وہ تو جمیلہ کے پاس ہی رہتی تھی۔" رحیم داد نے احسان شاہ کو بتایا۔ "مگر وہ رئفل اپنے ساتھ لے کر نہیں گئی۔ برابر کے کمرے میں ہو گی' اور بھی سامان پڑا ہے۔"

"نادر! تو رائفل کا لائسنس چوہدری کے نام تبدیل کرا لے۔ ایک ریوالور کا لائسنس نکلوانے کے لیے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں عرضی لگا۔" احسان شاہ ہدایت دیتا رہا۔ "لائسنس کا بندوبست تو میں کرا دوں گا۔ کچھ اسلحہ چوری اور سمگلنگ کا خرید لے۔ یہ کام تجھے فاٹافٹ کرنا ہو گا۔"

"شاہ جی! میں کل ہی اس کام پر لگ جاؤں گا۔" نادر خان نے مستعدی سے جواب دیا۔ "یہاں کا تو جی اب تک یہ حال رہا ہے کہ کہیں آنے جانے کے لیے اپنا تانگا تک نہیں۔ گھوڑیاں ہیں' وہ تو مزارعوں کے پاس بھی ہوتی ہیں۔ پر ان سے آج کل زمیں داری کا کام نہیں چل سکتا۔ میں لہور میں ایک تانگے کی خریداری کی بات کر کے آیا ہوں۔ تانگا تو جی بہت ضروری ہے۔"

"تیرا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ تانگا ضرور ہونا چاہیے۔ تانگے کا سودا پکا کر لے۔ میرے پاس دو جیپیں ہیں۔ جب سے نئی کار لی ہے' ایک جیپ خالی کھڑی ہے۔" وہ رحیم داد سے مخاطب ہوا "چوہدری! وہ جیپ میں تیرے لیے بھیج دوں گا۔"

"پر میں اس کی کیمت کیسے ادا کروں گا۔" رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔ "زمین داری کی ساری آمدنی تو جمیلہ کے پاس رہتی تھی۔"

"فکر نہ کر چوہدری۔" احسان شاہ بے نیازی سے بولا۔ "میں تجھ سے ابھی کچھ نہیں مانگ رہا۔ ربیع کی فصل کی واڈھی کے بعد دے دینا۔ تجھ سے میں نے سودے بازی تو کرنی نہیں' جتنے کی دو سال پہلے خریدی تھی اس سے ہزار ڈیڑھ ہزار کم دے دینا۔" اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔ "چوہدری' تو بہت پریشان دکھائی دے رہا ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"جمیلہ کے جانے کے بعد سے میں بہت پریشان ہوں۔"

"اب جمیلہ کا خیال دل سے نکال دے۔"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "شاہ جی! یہ بات سمجھ نہیں آتی' ہردیال بے کھٹکے ادھر آجاتا ہے۔ میں نے دو بار دیکھا ہے۔ دونوں بار وہ بالکل بے خوف اور نڈر لگا۔ کیا پاکستان میں اسے کوئی خطرہ نہیں؟"

"چوہدری' سچی بات یہ ہے ادھر کے سمگلروں سے اس کی یاری ہے۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "ہردیال خود وڈا سمگلر ہے۔ بارڈر پولیس اور رینجرز' سب کا اس نے بھتا باندھ رکھا ہے۔ اسے ادھر آنے سے کون روک سکتا ہے۔ اس کے کرندے ادھر اور اُدھر' دونوں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ خود کبھی نہیں نکلتا۔ بھین کو لینے آگیا تھا۔ اس کا سارا دھندا کرندوں کے ذریعے چلتا ہے۔ ویسے اس کا اُدھر بھی بہت اثر ورسوخ ہے۔ وزیروں اور وڈے سرکاری افسروں سے اس کا رابطہ ہے۔"

"وزیروں سے بھی اس کا میل ملاپ ہے؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "اس کا مطلب تو یہ

ہوا کہ سمگلنگ میں ان کا بھی ہاتھ ہے۔"

احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ "کیا کیا بتاؤں تجھے' نہ پوچھ چوہدری۔ زبان مت کھلوا۔ تجھے اتنا تو پتہ ہی ہو گا کہ پنجاب اور سندھ سے سرحد پار کنک سمگلنگ کر کے اتنی بھیجی گئی کہ ادھر کھانے کو بھی نہیں رہی۔ کتنے ہی وڈے زمیں داروں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا۔ کنک کے ذخیرے روک لیے۔ حالات اور بگڑ گئے۔ پنجاب نے کنک کی ایسی کمی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بہت گڑبڑ مچی۔ مجھے یاد ہے' فروری ۱۹۵۲ء میں لہور میں کنک کی مہنگائی کے خلاف آٹا ڈے منایا گیا اور ایک آٹا جلوس بھی نکلا۔ میں ان دنوں لہور میں ہوتا تھا۔"

"مجھے بھی یاد پڑتا ہے۔ بہت گڑبڑ ہوئی تھی۔ پر کنک کی جو کمی اور مہنگائی تب سے ہوئی ہے' اب تک ختم نہیں ہوئی۔"

"اس لیے نہیں ہوئی کی غلے کی سمگلنگ اب تک ختم نہیں ہوئی۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "تبھی تو امریکہ سے کنک منگوانی پڑی اور اب تک برابر ادھر ہی سے آ رہی ہے۔ سمگلنگ سے کنک کی جو کمی پڑی' اس نے سندھ میں اور بھی حالات خراب کیے۔ گورنر نے وزیر اعلیٰ کھوڑو اور صوبائی وزیر مال فضل اللہ کے خلاف پیروڈا کے تحت مکدمہ کائم کیا اور دونوں کو ان کے عہدوں سے بر طرف کر دیا۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ بلند کیا۔ "تجھے کہاں تک بتاؤں۔ یوں سمجھ لے۔ سمگلنگ کا چکر نیچے سے اوپر تک پھیلا ہوا ہے۔"

ایک نوکر نے انگیٹھی روشن کر کے کمرے میں رکھ دی تھی۔ کمرہ خوب گرم ہو گیا تھا۔ انگارے دہک رہے تھے۔ ان کی سرخی نے احسان شاہ اور رحیم داد کے چہرے گلابی بنا دیے تھے۔

"شاہ جی' کیا تو میری ایک مدد کر سکتا ہے؟" رحیم داد نے اچانک احسان شاہ سے پوچھا۔

"کوئی خاص گل بات ہے؟" احسان شاہ نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "بول! کیا مدد چاہتا ہے؟"

"میں جمیلہ سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔" رحیم داد نے نظریں جھکا کر دبی زبان سے کہا۔

"جان سے مارا جائے گا' اس چکر میں نہ پڑ۔" احسان شاہ نے اسے خبردار کیا۔ "ویسے تو اب اسے مل کر کرے گا بھی کیا۔ وہ تیرے ساتھ رہنا چاہتی تو یہاں سے جاتی ہی کیوں۔ وہ تیری نہیں بن سکتی۔"

"تجھے پتہ نہیں شاہ جی! مجھے اس سے کتنا پیار ہے۔" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اس کے جانے کے بعد مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہ حویلی ویران کر گئی۔ اب یہاں کچھ نہیں رہا۔"

اس کے لہجے میں التجا کا عنصر نمایاں ہو گیا۔ "شاہ جی! تجھے میری مدد کرنی ہی پڑے گی۔ میں اس سے ایک بار ضرور ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیا کرے گا مل کر؟"

"صرف اتنا کہوں گا' وہ جب بھی واپس آنا چاہے' آ سکتی ہے۔ اس حویلی کے دروازے اس کے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔"

"پر اب وہ تیرے پاس آنے ہی کیوں لگی۔" احسان شاہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "تو خود سوچ' ایک بار یہاں سے جانے کے بعد وہ کیسے واپس آ سکتی ہے۔"

"جلیل کے گھر والی زینت بھی تو اپنے رشتے داروں اور برادری والوں کے پاس سرحد پار چلی گئی تھی۔" رحیم داد نے کہا۔ "پر نہ اسے کسی نے وہاں کبول کیا اور نہ اس کے بچوں کو۔ اسے اتنا تنگ کیا' اتنا دکھ پہنچایا کہ ایک رات چھپتی لکتی بھاگ کر واپس آ گئی۔ مجھے بتاتی تھی اسے کیسے کیسے وہاں تنگ کیا گیا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "شروع شروع میں تو بہت آؤ بھگت ہوئی۔ خوب پیار بھی جتایا گیا۔ پر جوں جوں دن گزرتے گئے سب کی نظریں بدلتی گئیں۔ اسے اچھوت اور کمیوں سے بھی زیادہ برا سمجھا جانے لگا۔ گھنٹوں بیٹھی روتی رہتی' کوئی دلاسا بھی نہ دیتا۔ سب دور دور رہتے۔ اس کے بچوں کو نفرت سے دھتکارتے۔ ان سے گھن کھاتے۔"

احسان شاہ بیزار ہو کر بولا۔ "زینت کو گولی مار' یہ بتا تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف گل کر۔"

"شاہ جی! گل سمجھنے کی کوشش کر۔" رحیم داد نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔ "دیکھ زینت اور جمیلہ کا معاملہ ایک ہی جیسا ہے۔ زینت کی طرح جمیلہ بھی ایک مسلمان کے پاس اس کی گھر والی بن کر رہی۔ اس سے دو بچے بھی ہوئے۔ جس طرح زینت اور اس کے بچوں کو کبول نہیں کیا گیا' ٹھیک ایسا ہی کچھ عرصے بعد جمیلہ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوا' اور میں کہتا ہوں ضرور ہو گا' تب تو جمیلہ واپس آنے کا سوچ سکتی ہے۔ ادھر اس کی زمیں داری تھی۔ بہت شان تھی۔ میرے ساتھ پکے کاغذ پر اس کا نکاح بھی ہو چکا ہے۔ وہ اپنے گھر والوں سے لڑ جھگڑ کر واپس میرے پاس آ جائے تو تعجب کی کون سی گل ہے۔"

"سن لی' میں نے تیری ساری گل سن لی۔ اور سمجھ بھی لی ہے۔" احسان شاہ نے اکتا کر کہا۔ "سچ پوچھ تو میں جمیلہ کے بارے میں زیادہ جانتا بھی نہیں ہوں۔ تو اسے ٹھیک طرح سمجھتا ہے۔" احسان شاہ نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "پر ایک بات کان کھول کر سن لے۔ تو جمیلہ سے نہیں مل سکتا۔ ہردیال بہت زور آور ہے۔ تو نے جمیلہ کے پاس جانے کی کوشش کی اور ہردیال

کو پتہ چل گیا تو سمجھ لے، زندہ بچ کر نہیں آسکتا۔ میں تو کہتا ہوں، تو ادھر جانے کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔"

"تو کہتا ہے تو میں خود ادھر نہیں جاؤں گا۔" رحیم داد نے احسان شاہ کی بات مان لی، مگر باز نہیں آیا۔ "پر تو میری اتنی مدد تو کر سکتا ہے کہ کسی کے ذریعے میرا یہ پیغام جمیلہ تک پہنچا دے۔ وہ جب بھی واپس آنا چاہے میں اسے کچھ نہیں کہوں گا۔ وہ پہلے جس طرح یہاں رہتی تھی اسی شان سے رہے گی۔"

احسان شاہ نے کچھ نہیں کہا۔ رحیم داد بے قرار ہو کر بار بار اس کی جانب دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد احسان شاہ کی آواز ابھری۔ "چوہدری! ایمان کی بات یہ ہے کہ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ ہردیال کس شہر میں ہے۔"

"مجھے اتنا تو پتہ ہے وہ فیروز پور میں ہے۔"

"اگر تیری اطلاع صحیح ہے تو کام بن سکتا ہے۔ رفیع سمتہ سے اس کام میں مدد مل سکتی ہے۔ اس سے میری دوستی یاری ہے۔ میرے پاس آتا رہتا ہے۔ اس کا بھی سمگلنگ کا دھندا ہے۔ ہردیال سے تو شاید اس کی جان پہچان نہیں، پر اس کے کرندوں سے اس کی یاری ہے۔ ایک بار مجھے اس نے بتایا تھا۔ ویسے سمتہ خود بھی وڈا زمیں دار ہے۔ اور رسا گیر تو بہت زبردست ہے۔ پر بہت زندہ دل اور یاروں کا یار ہے۔ رہتا بھی بارڈر کے نزدیک ہے۔"

"شاہ جی! تو مجھے رفیع سمتہ سے ملوا دے۔ وہ میری مدد کر سکتا ہے۔ تو مجھے اس سے کب ملوائے گا؟"

"اتنا بے چین نہ ہو۔ صبر سے کام لے۔ مجھے پتہ ہے، تو جمیلہ کے لیے بہت پریشان ہے۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا امید افزا نظروں سے احسان شاہ کا چہرہ تکتا رہا۔

"چوہدری، میں تیری ضرور مدد کروں گا۔ تجھ سے یاری جو ٹھیری۔ رفیا مجھ سے ملنے آیا تو اسے لے کر تیرے پاس آجاؤں گا یا تجھے اپنی حویلی پر بلوا لوں گا۔ وہ کچھ ہی دنوں بعد آنے والا ہے۔ پر تو بے صبری سے کام نہ لے ورنہ مجھے ڈر ہے، کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔" احسان علی شاہ کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ "ویسے تجھے اتنا تو سوچنا چاہیے۔ جمیلہ نئی نئی اپنے گھر والوں کے پاس گئی ہے۔ ان سے اس کا بگاڑ ہونے میں کچھ مدت ضرور لگے گی۔ تجھے کچھ عرصہ انتظار کرنا پڑے گا۔"

رحیم داد نے احسان شاہ کی بات کی اہمیت اور نزاکت محسوس کی اور اسے یقین دلایا۔ "شاہ جی! تو جیسا کہتا ہے، میں ویسا ہی کروں گا۔"

رات بھیگنے لگی تو احسان شاہ نے جانے کا ارادہ کیا۔ رحیم داد نے اسے روکنا چاہا مگر وہ نہ رکا۔ جیپ تک پہنچتے پہنچتے رحیم داد اس سے مسلسل اصرار کرتا رہا۔

☆

دیکھتے ہی دیکھتے حویلی میں نت نئی تبدیلیاں ہونے لگیں۔ اور ہر گزرتے دن کے ساتھ ان میں اضافہ ہوتا گیا۔ بیشتر پرانے ملازمین نکال دیے گئے۔ ان کی جگہ نئے ملازم رکھے گئے۔ نادر خان نے اس سلسلے میں بڑی مستعدی دکھائی۔ اس نے احسان شاہ کی سفارش سے اللہ وسایا مرحوم کی عمدہ ساخت کی رائفل کا لائسنس تبدیل کرایا۔ رحیم داد کے لیے ریوالور کا لائسنس حاصل کیا اور جرمن ساخت کا ایک عمدہ ریوالور خرید بھی لیا۔ چھ سات کڑیل جوان حویلی کی نگرانی اور زمیں داری کا کام چلانے کے واسطے کارندوں کے طور پر ملازم رکھے۔ انھیں مسلح کرنے کے لیے چوری اور اسمگلنگ کا اسلحہ خریدا۔ آمد و رفت کے لیے ایک تانگا بھی خرید لیا گیا۔ احسان شاہ نے حسب وعدہ جیپ بھی بھجوا دی اور ڈرائیور کا بھی بندوبست کر دیا۔

رحیم داد نے جیپ پر سوار ہو کر گاؤں کا ایک چکر لگایا۔ نہر کے کنارے کنارے دور تک گیا۔ وہ جیپ میں بیٹھ کر احسان شاہ کے پاس جانا چاہتا تھا مگر احسان شاہ اپنے گاؤں پیراں والہ میں نہ تھا، لاہور جا چکا تھا۔

ایک عرصے سے ویران پڑے ہوئے مہمان خانے پر بھی توجہ دی گئی۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے ڈالے گئے۔ پرانا فرنیچر ہٹا کے نیا ڈالا گیا۔ مالی نے مہمان خانے کے وسیع صحن میں جگہ جگہ کیاریاں بنا کر قسم قسم کے پودے لگائے۔ موسم بدلا۔ پودوں میں شگوفے پھوٹے اور وہ پھولوں سے لد گئے۔ ان کی خوشبو سے صحن ہر وقت مہکتا۔ مہمان خانے میں اب رونق اور چہل پہل رہتی۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے احمد کے بجائے ایک نیا ملازم مقرر کیا گیا۔

موسم گرما شروع ہو چکا تھا۔ آفتاب غروب ہوتا، شام کا دھندلکا پھیلتا، مہمان خانے میں پیٹرومیکس روشن کر دیا جاتا۔ صحن میں کرسیاں ڈال دی جاتیں۔ مہمان خانے کے پچھواڑے، باغ میں رحیم داد کبھی کبھار بیٹھتا۔ دن ڈھلتے ہی عام طور پر مہمان خانے میں بھی پہنچ جاتا اور شام ہوتے ہی صحن میں بیٹھ کر دھڑلے سے شغل مے نوشی بھی کرتا۔

ان تبدیلیوں کے ساتھ رحیم داد خود کو بھی بڑی حد تک تبدیل کر چکا تھا۔ مگر وہ اب تک جمیلہ کو نہیں بھولا تھا۔ اس کی یاد اکثر ہوک بن کر سینے سے اٹھتی۔ احسان شاہ سے وہ اپنی اس بے قراری کا کھل کر اظہار بھی کر چکا تھا۔ وہ اسے اپنا وعدہ یاد دلانا چاہتا تھا۔ لیکن احسان شاہ لاہور سے ہنوز

اپس نہیں آیا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا، انگلستان سے بیرسٹر بن کر واپس آگیا تھا۔ لاہور میں اس نے پریکٹس بھی شروع کر دی تھی۔ ساتھ ہی وہ سیاست میں بھی داخل ہونا چاہتا تھا۔ احسان شاہ بیٹے کے لیے فضا سازگار بنا رہا تھا اور اسی مقصد سے اپنی نئی کوٹھی میں مقیم تھا۔

نادر خان اب زمیں داری کے کاموں میں زیادہ تن دہی اور سرگرمی سے حصہ لے رہا تھا۔ اس کی بیوی، جنت اپنی بچیوں کے ہم راہ میکے گئی ہوئی تھی اور وہاں چھوٹے بھائی کی شادی کے ہنگامو میں مصروف تھی۔ اس کے بھائی کی شادی فصل کی کٹائی کے بعد ہونے والی تھی۔ شادی سے پہلے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہ تھا۔

گندم کے پودے پک کر سنہری پڑ گئے تھے۔ اپریل کا دوسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا۔ گاؤں میں فصل کی کٹائی کی تیاری زور و شور سے ہو رہی تھی۔ اس دفعہ ربیع کی فصل بہت اچھی تھی۔ مزارعوں کے چہرے خوشی اور شادمانی سے دمک رہے تھے۔ نادر خاں بھی اسے اپنی کامیابی سمجھ کر مسرور نظر آتا تھا۔

لیکن رحیم داد کو فصل سے کوئی خاص رغبت اور دل چسپی نہیں تھی۔ اس نے فصل کی طرف کوئی توجہ ہی نہ دی۔ نادر خاں نئے کارندوں کے ساتھ فصل کی دیکھ بھال کے لیے موجود ہی تھا۔ نادر سویرے سویرے کھیتوں کی طرف چلا جاتا اور دن ڈھلے تک مزارعوں کے ساتھ رہتا۔ رحیم دا اپنے کمرے میں تنہا پڑا رہتا۔ سہ پہر کو غسل کرتا، لباس تبدیل کرتا اور شام ہوتے ہوتے مہما خانے میں پہنچ جاتا۔

نادر خاں ہر شام گھر جانے سے پہلے رحیم داد کو فصل کی کٹائی کے بارے میں رپورٹ دیتا۔ رح داد کبھی کبھار کوئی بات پوچھ لیتا ورنہ عام طور پر چپ رہتا۔ وہ ان دنوں بہت بجھا بجھا رہتا تھا۔ تنہا اور اکتاہٹ سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ احسان شاہ کے ساتھ پیراں والہ میں کچھ عرصہ قیا کرنا چاہتا تھا۔ وہاں اس کی دل بستگی کا سامان مہیا ہو سکتا تھا مگر شاہ جی لاہور میں جم کر بیٹھ گیا تھا پیراں والہ آنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

☆

گرمی بڑھ گئی تھی۔ دوپہر ہوتے ہوتے در و دیوار سلگتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ اس دفعہ گر جلد ہی شروع ہو گئی تھی اور کچھ زیادہ بھی تھی۔ ہوا چلتی تو گرد کے گرم گرم بگولے تیزی اٹھتے۔ ہوا ٹھہری ہوتی تو حبس ہو جاتا۔ آسمان غبار آلود ہوتا۔ فضا اداس اور بے کیف محس ہوتی۔ ایک ایسی ہی بے کیف شام کو رحیم داد مہمان خانے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ اچانک شام کی

ہوئی خاموشی میں ہارن بجنے کی تیز آواز ابھری۔ رحیم داد کا چہرہ خوشی سے جگ مگا اٹھا۔ اسے توقع تھی کہ احسان شاہ آیا ہو گا مگر وہ احسان شاہ نہ تھا، سردار مراد خان شاہانی تھا۔ وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ رحیم داد نے بڑھ کر اسے دونوں بازوؤں میں جوش و خروش سے بھینچ لیا، شکوہ کرنے کے انداز میں بولا۔ ”شاہانی تو اتنے دنوں کہاں غائب رہا؟“

”آرام سے گل بات ہو گی۔“ مراد خان نے جواب دیا۔

دونوں ہنستے مسکراتے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مراد خان نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے پوچھا۔ ”شاہ جی بتاتا تھا، جمیلہ تجھے چھوڑ کر سرحد پار چلی گئی۔“

”ہاں، وہ چلی گئی۔ شاہ جی نے ٹھیک ہی بتایا۔“

”سنا ہے اس کا بھرا آیا تھا اور رات کے اندھیرے میں اپنے ساتھ لے گیا۔“ مراد خاں شاہانی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”تو نے اسے کیسے جانے دیا۔ روک بھی نہ سکا؟“

”میں اکیلا تھا اور وہ کئی تھے، پوری طرح مسلح تھے۔“ رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔

”تیرے تک کھے پیر کی زیارت پر مانی ہوئی منت نے بھی کام نہ کیا۔“

”اس سے تو انکار نہیں کر سکتا کہ وہ تجھے مل گئی تھی۔ شاہ جی کہتا تھا جمیلہ کے ساتھ اس نے تیرا نکاح بھی پڑھوا دیا تھا۔ تو نے زیارت پر جو منت مانی تھی، وہ تو پوری ہو گئی۔“

”ایسی منت پوری ہونے سے کیا فائدہ جب وہ میرے پاس ٹھیری ہی نہیں۔“

”مجھے کیا پتہ تو نے کیا منت مانی تھی۔ میں تو یہ جانتا ہوں، تو نے یہ چاہا تھا کہ وہ تیری بن جائے۔“ شاہانی زیر لب مسکرایا۔ ”سچی بات یہ ہے کہ منت تو ایک طرح سے پوری ہو گئی۔ وہ تیرے ساتھ جڑ گئی۔“

دروازے پر آہٹ ہوئی۔ رحیم داد نے چوکنا ہو کر دیکھا۔ رحمتے اپنے تینوں بچوں کے ساتھ صحن میں داخل ہو رہی تھی۔ تینوں بیٹے ہی تھے۔ وہ ماں کے ساتھ چل رہے تھے۔ رحمتے کے سر پر بڑی سی گٹھری تھی اور ہاتھ میں ٹین کا پرانا ٹرنک لٹک رہا تھا۔

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”شاہانی یہ تو رحمتے ہے، تو اسے اپنے ساتھ کیسے لے آیا؟“

”اب اسے میرے ہی ساتھ رہنا ہے۔“

رحیم داد بدستور حیرت زدہ تھا، اس نے کرید کر پوچھا۔ ”شاہ جی نے اسے تیرے ساتھ آنے کی اجازت کیسے دے دی؟“

”وہ تو اسے اپنی حویلی سے نکال رہا تھا۔“ مراد خاں نے بتایا۔ ”میں نے شاہ جی سے کہا، اسے

مجھے دے دے۔ وہ خوشی سے تیار ہو گیا۔"

"شاہ جی اب کہاں ہے۔" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"آج ہی صبح میرے ساتھ لہور سے پیراں والہ آیا تھا۔" مراد خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "پر رات ہی بھر ٹھیرے گا، صبح واپس [illegible] جائے گا۔"

"دو چار روز بھی نہیں ٹھیرے گا؟" رحیم داد مضطرب ہو گیا۔

"نہیں۔" مراد خاں شاہانی نے کہا۔ "اس نے اب لہور ہی رہنا ہے۔ زمیں داری کی دیکھ بھال اس نے اپنے پتر نعمان شاہ کے حوالے کر دی ہے۔"

"پر وہ لہور میں کر کیا رہا ہے؟ بہت عرصے سے ادھر ہی ہے۔" رحیم داد ایک آنکھ دبا کر مسکرایا۔ "بات کیا ہے؟ صاف صاف بتا۔ تجھے تو پتہ ہی ہو گا اسے مل کر آ رہا ہے۔"

"وہاں بیٹھا وہ سیاست لڑا رہا ہے۔ گورنر سے اس نے یاری کر لی ہے۔ اس سے اکثر ملتا بھی رہتا ہے۔" سردار مراد خاں شاہانی نے بتایا۔ "آج کل شاہ جی کی کوٹھی پر ہر شام سیاست دانوں کی بیٹھک ہوتی ہے اور رات دیر تک چلتی ہے۔"

"تب تو اس کا ادھر ٹھیرنے کا لما ہی پروگرام لگتا ہے۔"

"ارادے تو اس کے کچھ ایسے ہی ہیں۔ ابھی تو اس نے وہیں ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ وہاں کب تک رہے گا۔ کچھ پتہ نہیں۔" مراد خاں نے قہقہہ لگایا۔ "سچ پوچھ تو خود شاہ جی کو بھی پتہ نہیں اس نے کب تک لہور ٹھیرنا ہے۔"

رحیم داد نے رحمتے کی جانب مڑ کر دیکھا۔ وہ اپنے تینوں بچوں کے ساتھ ایک طرف کھڑی تھی۔

"رحمتے، تو اس طرح کب تک کھڑی رہے گی؟" رحیم داد نے اونچی آواز سے مہمان خانے کے نئے ملازم کو پکارا۔ "گھماں ادھر آ۔"

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آیا اور رحیم داد کے روبرو ادب سے کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے رحمتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گھماں سے کہا۔ "اس نے ادھر ہی ٹھیرنا ہے۔ اس کے رہنے اور سونے کا بندوبست اپنی کوٹھڑی میں کر دے۔ تو حویلی میں جا کر سو جانا۔ اس کے لیے روٹی شوٹی کا بھی انتظام کر دے۔ اس نے ابھی روٹی کہاں کھائی ہو گی!!"

گھماں نہایت مستعدی سے بولا۔ "فکر نہ کریں جی۔ سارا بندوبست ہو جائے گا۔"

وہ رحمتے اور اس کے بچوں کو اپنی کوٹھری کی جانب لے جانے کے لیے مڑا۔ رحیم داد نے ٹوکا۔ "پہلے ایک گلاس تو لا۔"

وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور آن کی آن میں ایک گلاس لا کر رحیم داد کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ رحیم داد نے بوتل کھولی اور سردار مراد خاں شاہانی کے لیے پیگ بنانے لگا۔

رحیم داد نے مراد خاں سے پوچھا۔ "تو نے رحمتے کو کہاں لے جانا ہے۔ اسے بھکر ہی میں رکھے گا؟"

"نہیں، میں نے اسے بیٹ لے جانا ہے۔" مراد خاں نے بتایا۔ "رحمتے وہیں رہے گی۔"

"سلطری کا کیا بنے گا۔ وہ برا نہیں منائے گی؟"

"میں نے اسے نکال دیا۔" مراد خاں نے بے پروائی سے کہا۔

"تو نے اسے نکال دیا؟" رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ "وہ تو تیری جند جانی تھی، بہت چہیتی تھی۔"

"جب سے اس کے پتر کا مرن ہوا، ہر دم روتی رہتی تھی۔"

"جس روز وہ مرا، میں تو بیٹ ہی میں تھا۔"

"نہیں، اس دن سے جو اس نے ٹسوے بہانے شروع کیے تو بند ہی نہ ہوئے۔ جب دیکھو بیٹھی رو رہی ہے۔" مراد خاں نے تلخی سے کہا۔ "میں نے منع کیا تو چھپ چھپ کے روتی تھی۔ میں تو عاجز آ گیا۔ ویسے بھی وہ کام کی نہ رہی تھی۔ رو رو کر بیمار اور مریل لگنے لگی تھی۔ ایک رات مجھے غصہ آیا تو میں نے اسی دم اسے نکال دیا۔"

"کہاں گئی وہ؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کہاں گئی۔ پر تجھے اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تو نے جس سلطری کو دیکھا تھا، بعد میں وہ ویسی نہیں رہی تھی۔ دیکھ کر گھن آتی تھی۔"

"تو رحمتے کو لے کر جا تو رہا ہے۔ اس کے بھی پتر ہیں۔ کوئی مر گیا اور اس نے بھی سلطری کی طرح رو رو کر اپنا ناس مار لیا تو اس کا کیا کرے گا؟" رحیم داد مسکرا کے بولا۔ "اسے بھی نکال دے گا؟"

"اور کیا کروں گا۔" مراد خاں نے کہا۔ "میں نے اس کا کوئی زندگی بھر کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "ایسا ٹھیکہ تو میں نے صرف اپنی ذال کا لیا ہے۔ اسے ویاہ کر لایا ہوں۔ اس سے تو میری آگے نسل چلے گی۔"

"سلطری کے بچے بھی تو تیرے ہی ہیں۔"

"ہوں گے، ضرور ہوں گے۔" وہ جھوم کر بولا۔ "پر اس سے کیا فرک پڑتا ہے۔ کمی رن کے بچے

بھی کی ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی حق نہیں بنتا۔" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "رحمتے کے نکے بھی شاہ جی ہی کے ہیں پر اس نے رحمتے کے ساتھ انھیں بھی نکال دیا۔"

رحیم داد نے دبی زبان سے شکوہ کیا۔ "شاہ جی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"تیرا مطلب ہے وہ انھیں اپنی حویلی میں رکھتا، انھیں اپنے بچوں کی طرح پالتا۔ زمین دار بناتا، اپنی جائیداد کا وارث ٹھیراتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "برا نہ منانا چوہدری تو مجھے خاندانی زمیں دار نہیں لگتا ورنہ ایسے نہ سوچتا۔"

رحیم داد تلملا کر رہ گیا۔ جھینپ مٹانے کے لیے بولا۔ "لگتا ہے تجھے کچھ آج زیادہ ہی چڑھ گئی ہے۔ رم پی رہا ہے ناں۔ سنا ہے یہ وہسکی سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ ویسے آج گرمی بھی زیادہ ہے۔"

"ایسی گالہ نہیں۔" مراد خاں شاہانی اپنے موقف پر اڑا رہا۔ "کوئی وڈا اور خاندانی زمیں دار اس طرح سوچ ہی نہیں سکتا ورنہ کب کی زمیں داریاں اور جگیریں ختم ہو چکی ہوتیں۔ ایسی رناں تو زمیں داروں کا دل بہلانے کے لیے ہوتی ہیں۔" اس نے رحیم داد کو خمار آلود نظروں سے دیکھا۔

"زمیں داری چلانے کے لیے یہ ضروری بھی ہے۔ تجھے اتنا تو پتہ ہی ہے کہ گھروالی، مرد کی عزت ہوتی ہے۔ ہوتی ہے ناں؟"

"بالکل ہوتی ہے۔" رحیم داد نے اس کی تائید کی۔

"مزارعوں اور کمیوں کو کابو میں رکھنے کے لیے ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ان میں عزت اور آن کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ مزارع سر نہیں اٹھا پاتا۔" مراد خاں نے سنجیدگی سے کہا "مزارے اور کمی اسی طرح زمیں دار اور جگیردار کے تابع دار اور غلام رہ سکتے ہیں۔ ہمارے بزرگ اور وڈیرے ایسا نہ کرتے تو مزارے سرکشی اور بغاوت کر کے کب کے ہم سے زمیں داریاں چھین لیتے۔ کیا سمجھا؟" اس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ "لا، اسی بات پر ایک ڈبل بنا کر دے۔ تو نے مزہ خراب کر دیا۔"

رحیم داد نے مراد خاں کے گلاس میں رم ڈالی، پیگ بنایا اور گلاس مراد خاں کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے گلاس سنبھال کر غٹا غٹ کئی گھونٹ بھرے۔ رحیم داد نے گفتگو کا رخ بدلنے کی غرض سے پوچھا۔ "تو دو چار روز تو میرے ساتھ ٹھیرے ہی گا؟ میں تجھے جلد نہیں جانے دوں گا۔ بہت دنوں بعد تجھ سے ملنا ہوا ہے۔"

"نہیں، میں نے کل صبح جانا ہے۔" مراد خاں نے کہا۔ "تو بھی میرے ساتھ چل۔ یہاں اکیلا پڑا ہے، ساتھ رہے گا تو تیرا دل بھی بہلے گا۔ تیرے پاس جیپ آگئی ہے، اسی میں چلیں گے۔ میں

نے پہلے ملتان جانا ہے۔ وہاں سے ٹرین پکڑ لیں گے۔"

رحیم داد تھوڑی حیل حجت کے بعد رضامند ہو گیا۔ وہ بھی تنہائی سے اکتا گیا تھا۔ زمیں داری کی طرف سے اسے کوئی فکر نہ تھی۔ نادر خاں کی کارکردگی سے وہ مطمئن تھا۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ آسمان پر غبار چھایا ہوا تھا۔ ہوا رکی ہوئی تھی۔ دونوں کے چہروں پر پسینے کے قطرے لرز رہے تھے۔ مراد خاں نے اپنا گلاس ختم کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے گلاس ختم نہیں کیا۔ وہ پہلے ہی بہت پی چکا تھا۔ دونوں لڑکھڑاتے ہوئے کچھ دور ساتھ ساتھ چلے۔

سردار مراد خاں شاہانی جھومتا جھامتا رحمتے کے پاس پہنچا۔ وہ کوٹھری کے سامنے کھلے آسمان کے نیچے چارپائی پر لیٹی تھی اور ابھی تک جاگ رہی تھی۔ برابر کی چارپائی پر اس کے بچے بے خبر سو رہے تھے۔ مردا خاں کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں کاجل تھا۔ بالوں کو تیل ڈال کر سنوارا تھا۔ اس نے شام کو نہا دھو کر اجلے کپڑے پہنے تھے۔ وہ سبز لاچا باندھے ہوئے تھی۔ کرتا باریک ململ کا تھا اور دوپٹا گہرا بسنتی تھا۔ وہ پورا سنگھار کیے مراد خاں کا انتظار کر رہی تھی۔

رحمتے کا گہرا سانولا رنگ دالان میں روشن پیٹرومیکس کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ پنکھا جھلتے ہوئے اس نے مسکرا کر مراد خاں شاہانی کو دیکھا، چارپائی سے نیچے اتری، آہستہ سے بولی۔

"آج گری بہت ہے۔"

مراد خاں شاہانی نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے آگے بڑھ کر رحمتے کا بازو تھاما اور اس کے سہارے جھومتا جھامتا زینے کی طرف بڑھا۔ گھمّاں نے اس کے لیے چھت پر پلنگ بچھا کر اجلا بستر لگا دیا تھا۔ شاہانی کے قدم بری طرح ڈگمگا رہے تھے۔ رحمتے اسے بار بار سنبھالتی۔ دونوں نے سیڑھیاں طے کیں اور چھت پر پہنچ گئے۔ رحیم داد خاموش کھڑا مراد خاں شاہانی اور رحمتے کو دیکھتا رہا۔

سویرے سورج نکلنے سے پہلے ہی ڈرائیور نے جیپ حویلی کے پھاٹک پر لا کر کھڑی کر دی تھی۔ رحیم داد نے رات ہی کو سفر کے بارے میں گھمّاں کو ضروری ہدایات دے دی تھیں۔ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ گیا تھا۔ اس نے رحیم داد اور مراد خاں کو جگایا۔ نادر خاں کو بھی مطلع کیا۔

آسمان پر ہلکا ہلکا اجالا پھیلا تھا۔ مراد خاں شاہانی اور رحیم داد نے غسل کیا، لباس تبدیل کیا اور سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ رحمتے بھی پوری طرح تیار تھی۔ رحیم داد اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ شاہانی پچھلی نشست پر رحمتے اور اس کے بچوں کے ہم راہ بیٹھا تھا۔ روانگی کے وقت حویلی کے دوسرے ملازموں کے علاوہ نادر خاں بھی موجود تھا۔ رحیم داد نے نادر کو بتایا کہ وہ سردار مراد خاں شاہانی کے ساتھ بھکر جا رہا ہے۔

"واپسی کب تک ہوگی جی؟" نادر خاں نے دریافت کیا۔

اس دفعہ رحیم داد کے بجائے مراد خاں بولا۔ "چوہدری دیر ہی سے لوٹے گا' ویسے تو موجود ہی ہے۔"

"بھکر ہی میں ٹھیریں گے ناں؟" نادر خاں نے کرید کر پوچھا۔

"نہیں۔" مراد خاں شاہانی نے جواب دیا۔ "بھکر نہیں' بیٹ میں ٹھیریں گے۔ وہاں شکار کھیلیں گے۔ ادھر گرمی بھی کم ہوتی ہے۔ ساتھ میں دریا بہتا ہے۔ تو نے بیٹ تو دیکھا ہی ہے۔ کوئی ضروری کام ہو تو وہیں آجانا۔"

نادر خاں نے مزید بات چیت نہیں کی۔ رحیم داد نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور جیپ آگے بڑھ گئی۔ کچھ دور تک نہر کے ساتھ ساتھ دوڑتی رہی' پھر پختہ سڑک پر آگئی۔ سڑک ابھی تک سنسان تھی۔ ڈرائیور نے رفتار تیز کردی۔ جیپ چک بیدی کے راستے پاک پتن پہنچی اور وہاں سے شہر کی جانب روانہ ہوگئی۔ سڑک پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ کشادہ بھی تھی۔ جیپ تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔

مرید کوٹ پہنچتے پہنچتے دوپہر ہوگئی۔ ڈرائیور نے جیپ ٹھیرالی۔ ریڈی ایٹر کا ڈھکنا کھولا۔ کھولتا ہوا گرم پانی ذرا ٹھنڈا ہوا تو اس نے ریڈی ایٹر میں اوپر پانی بھر دیا۔ ناشتے دان میں کھانا تھا۔ ڈرائیور نے سڑک سے کچھ فاصلے پر درختوں کے سائے میں دری بچھا کر کھانا لگا دیا۔ رحیم داد اور مراد خاں کھانے سے فارغ ہوئے تو ڈرائیور نے رحمتے اور اس کے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا مگر انھوں نے زیادہ دیر قیام نہیں کیا۔ سب دوبارہ جیپ میں سوار ہوگئے۔ وہ ایک بار پھر سرمئی سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگی۔ دن ڈھلے جیپ شہر سے گزری۔ رحیم داد کو طرح طرح کے اندیشوں نے ستایا۔ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور سہما ہوا بیٹھا رہا۔ جیپ آن کی آن میں شہر سے نکل گئی۔

☆

لالیاں والہ بس اسٹاپ پر جیپ پہنچی تو ایک درخت کے نیچے راہ گیروں کا مختصر ہجوم نظر آیا۔ مراد خاں شاہانی نے جیپ رکوائی' نیچے اترا اور ہجوم کی جانب بڑھا۔ ڈرائیور اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ رحمتے بھی نیچے اتری اور اس کے اصرار کرنے پر رحیم داد کو بھی اترنا پڑا۔ دونوں ہجوم کی طرف بڑھے۔

قریب جا کر رحیم داد نے دیکھا' ایک عورت درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھی ہے۔ اس کا

اوپری جسم برہنہ تھا۔ زیر ناف بس ایک پھٹا پرانا چیتھڑا لپٹا تھا۔ اس کے بکھرے ہوئے بال خاک دھول سے اٹے تھے اور بدن پر میل کی تہہ جمی تھی۔ نہ جانے کب سے اس نے غسل نہیں کیا تھا۔ اس کی عمر ۴۵ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں مگر بجھی بجھی اور ویران تھیں میل کی تہہ کے نیچے سے اس کی گوری جلد جھلک رہی تھی۔ کبھی وہ خوب صورت اور دلکش رہی ہوگی لیکن اب غلاظت کا ڈھیر لگتی تھی۔ سب کی نظریں اسی کی جانب تھیں اور وہ بالکل بے نیاز بیٹھی تھی۔ قریب ہی ایک بوڑھا شخص بیٹھا تھا۔ وہ اس کے عریاں سینے پر چادر ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر عورت بار بار چادر جھٹک کر ایک طرف پھینک دیتی۔ اس نے سر اٹھایا اور آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ ایک نوجوان' جو وضع قطع سے کسی لاری کا کلینر نظر آتا تھا' عین اس کی سامنے کھڑا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی پگلی کا چہرہ غضب ناک ہوگیا۔ چیخ کر بولی۔ "تو ادھر بھی آگیا۔ دفع ہو جا میرے سامنے سے۔" نوجوان سخت سٹپٹایا اور خجل ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

ہجوم میں سے ایک ادھیڑ شخص لسی سے بھرا ہوا گلاس سنبھالے آگے بڑھا اور عورت کے نزدیک جا کر نرم لہجے میں عاجزی سے بولا "لے کرماں بھری' اسے پی لے۔" عورت نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا اور جھنجلا کے ایسا ہاتھ مارا کہ گلاس دور جا گرا۔ ساری لسی مٹی میں مل گئی۔ عورت ٹھٹھا مار کر ہنسی اور ادھر ادھر نگاہیں گھما کر رحیم داد کو دیکھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے چہرے کا اچانک رنگ بدلا۔ تیکھے لہجے میں بولی۔ "وے تو اکیلا ہی آگیا۔ حکیم کدھر ہے؟" رحیم داد پریشان ہوگیا۔ عورت برابر اسے گھورتی رہی۔ "تو حکیم کو جانتا ہے ناں؟ تو اسے ضرور جانتا ہے۔ تو اس کے ساتھ تھا۔ ہاں' تو ہی اس کے ساتھ تھا۔"

رحیم داد نے گھبرا کر مراد خاں کی طرف دیکھا۔ مراد خاں اس کے برابر ہی کھڑا تھا۔ اس نے مسکرا کر رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری' یہ تو مست ملنگ ہے' جو سمجھ آتی ہے بولتی ہے' پتہ نہیں کون ہے۔"

"میں جی' پچھلے کئی مہینے سے اسے ادھر ہی دیکھ رہا ہوں۔" ڈرائیور نے بتایا۔ وہ مراد خاں اور رحیم داد کے عقب میں کھڑا تھا۔ "کبھی لاریوں کے اس اڈے پر نظر آتی ہے کبھی دوسرے پر۔ غصہ آتا ہے تو پتھر اٹھا کر مارتی ہے۔ کپڑے لتے پہناؤ تو چیر پھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔ کبھی خوب زور زور سے روتی ہے۔ کبھی آپ ہی آپ ٹھٹھا مار کر ہنستی ہے' کبھی اکیلی بیٹھی گھنٹوں بڑبڑاتی رہتی ہے۔"

"پگلی جو ٹھیری۔" مراد خاں بولا۔ "پر یہ آئی کہاں سے؟"

"یہ جی کمال گڑھ کے حکیم چشتی کی گھر والی ہے۔" ڈرائیور نے مطلع کیا۔

حکیم چشتی کا نام سن کر رحیم داد کا چہرہ فق ہو گیا۔ مراد خاں شاہانی اس کی سراسیمگی سے بے نیاز تھا۔ اس نے ڈرائیور سے دریافت کیا۔ "حکیم اب کہاں ہے؟ اسے لے کیوں نہیں جاتا۔ اس کا علاج معالجہ کیوں نہیں کراتا؟"

"وہ تو جی بہت مدت سے لاپتہ ہے۔" ڈرائیور نے بتایا۔ "سنا ہے وہ جڑی بوٹیاں' دوائی بنانے کے لیے اکٹھی کرتا تھا اور ان کی تلاش میں جھل اور ویرانوں کی طرف چلا جاتا تھا۔ ایسے ہی گرمی کے دن تھے' ایک روز بوٹیوں کی تلاش میں ایسا گیا کہ فیر نہ لوٹا۔"

مراد خاں شاہانی نے حیرت اور دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "تجھے ان باتوں کا کیسے پتہ چلا؟"

"وہ ایسا ہے جی! میرا ایک ماماں ادھر لال سانی میں ہوتا ہے۔ لال سانی جی کمال گڑھ سے نزدیک ہی ہے۔ وہ حکیم چشتی سے دوا دارو کراتا تھا۔ اسی نے حکیم کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ اسے جانتا تھا۔ کہتا تھا بہت نیک بندہ تھا۔"

شاہانی نے کرید کر پوچھا۔ "تھانے میں حکیم کی گمشدگی کا پرچہ تو چاک کرایا ہی ہو گا؟"

"کرایا تو تھا۔ ماماں ہی بتاتا تھا۔ پولیس نے کھوج نکالنے کی بھی بہت کوشش کی پر کچھ پتہ نہ چلا۔" ڈرائیور نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بات یہ ہے جی! حکیم کا کوئی پتر تو ہے نہیں اور نہ کوئی رشتے دار' نہ اس کی گھر والی کا ادھر رشتے دار اور شریکا ہے جو اس کا پتہ چلانے کے لیے بھاگ دوڑ کرتا۔" اس نے پگلی کی جانب دیکھا۔ وہ گردن اٹھائے فضا میں گھور رہی تھی۔ "حکیم کی صرف ایک جوان بیٹی تھی۔ سنا ہے ایک پولسیا جو تفتیش کے لیے حکیم کے گھر آتا جاتا تھا اسے اٹھا کر لے گیا یا وہ خود ہی اس کے ساتھ بھاگ گئی۔"

رحیم داد نے استفسار کیا۔ "وہ بھی واپس نہیں آئی؟"

"نہیں جی! وہ بھی اپنے پیو کی طرح لاپتہ ہو گئی۔ جانے اب کہاں ہے اور کیسی ہے؟ کسی کو کچھ پتہ نہیں۔"

سردار مراد خاں نے حکیم چشتی کی پاگل بیوی کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ "پر یہ پگلی کیسے بن گئی؟"

ایک بوڑھا قریب کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا' وہ بیچ میں بول اٹھا۔ "میں بتاؤں جی یہ پگلی کیسے بنی۔ میرا نام جی بودی ہے۔ میں کمال گڑھ میں ہی رہتا ہوں۔" اس نے مراد خاں کے چہرے کی جانب دیکھا۔ "جب حکیم کی طرح اس کی دھی بھی لاپتہ ہو گئی تو یہ خود دونوں کی تلاش میں نکلی۔"

اس نے مڑ کر حکیم کی بیوی کی سمت دیکھا۔ "یہ تھانے کے چکر کاٹتی رہی۔ حکیم کے ملنے جلنے والوں کے گھر جاتی رہی۔ دن بھر ادھر ادھر گھومتی رہتی' شام کو واپس گھر آتی۔ ایک شام واپسی پر اندھیرا بڑھ گیا۔ دھند ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سردی بھی زوروں پر تھی۔ پڑوس کے پنڈ کا کوئی وڈا زمیں دار تاک میں لگا تھا' تب یہ تھی بھی بہت سوہنی۔ سنا ہے' اس نے اپنے کرندوں کے ذریعے اسے اٹھوا لیا۔"

"پہلے سے اس نے اپنے کرندوں کو لگا رکھا ہو گا؟" ڈرائیور نے قیاس آرائی کی۔

"ایسا ہی لگتا ہے جی!" بودی نے بتایا۔ "بہت دنوں تک یہ پنڈ میں نظر ہی نہیں آئی۔ مکان خالی پڑا رہا۔ بعد میں اسے دیکھا تو بالکل پاگل دیوانی ہو چکی تھی۔ کپڑے لتے پھٹے ہوئے' بال بکھرے ہوئے۔ اور اب تو اسے ذرا بھی ہوش نہیں۔ گالاں نکالتی ہے۔ ڈانٹتی ہے چیختی چلاتی ہے۔ پتھر اٹھا کر مارنے دوڑتی ہے۔"

"کہتے ہیں جی اب تو یہ مجذوب ہو گئی ہے۔" ڈرائیور نے پگلی کے قریب بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بابا روز اس کے پاس آتا ہے۔ روٹی لاتا ہے' مٹھائی لاتا ہے اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔"

"اور بھی ایسے کئی ہیں جی!" بودی بول پڑا۔ "کئی تو ایسے آتے ہیں جن کے ساتھ زنانیاں بھی ہوتی ہیں۔" اس نے مراد خاں شاہانی کی جانب دیکھا۔ "پر ایک گل اور بھی ہے جی!"

"وہ کیا؟" مراد خاں نے دریافت کیا۔

"وہ یہ ہے جی۔" بودی نے بتایا۔ "جس پر یہ غصے سے تھوک دے۔ سمجھو' اس کا کام بن گیا۔ سب یہی بتاتے ہیں۔ اسی لیے دور دور سے لوگ اس کے پاس آتے ہیں۔ منت کرتے ہیں' مٹھائی لاتے ہیں' دودھ لسی لاتے ہیں۔"

مراد خاں نے مسکرا کر رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری تو اس کے پاس ضرور چلا جا۔ اسے اپنے کسی کام کے لیے کہہ۔ یہ تجھ پر غصے سے ضرور تھوکے گی اور تیرا کام فٹافٹ بن جائے گا۔ تجھ سے تو اس نے بات بھی کی تھی' جیسے تجھے پہلے سے جانتی ہو۔ تو کبھی کمال گڑھ تو نہیں رہا؟"

"نہیں جی! میں ادھر کبھی نہیں گیا۔ اسے تو میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔" رحیم داد نے گھبرا کر صفائی پیش کی۔ "میں نے اس کی گالاں نہیں سنیں۔" رحیم داد نے بے زاری سے منہ بگاڑا۔ "مراد خاں! بہت دیر رک لیا' اب چل۔ لما سفر ہے۔" اس نے پگلی کی طرف اشارہ کیا۔ "میں نے اس سے کچھ نہیں لینا۔"

"تیرا مطلب ہے، ساری رات سفر کرنا ہے۔ ڈرائیور کو آرام نہیں کرنا؟" مراد خاں شاہانی مسکرا کر بولا۔ "رات ملتان میں سلیم خاکوانی کی حویلی میں گزارنی ہے۔"

دونوں مڑے، جیپ کی جانب بڑھے۔ انھوں نے دیکھا کہ رحمتے ایک اجلا دوپٹا ہاتھ میں دبائے تیز تیز قدم اٹھاتی ہجوم کی جانب بڑھی۔ وہ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتی حکیم چشتی کی پاگل بیوی کے قریب پہنچی۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ درخت کے نیچے اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ پگلی نظریں اٹھائے فضا میں گھور رہی تھی۔ درخت کی شاخوں کے درمیان سے جھانکتی ہوئی ڈوبتے سورج کی ایک کرن اس کے مٹیالے چہرے پر جھلملا رہی تھی۔ رحمتے اس کا جسم دوپٹے سے ڈھانکنے لگی۔ پگلی نے مطلق مزاحمت نہیں کی۔ رحمتے نے جس طرح اس کے جسم کے گرد دوپٹا لپیٹا، اس نے اسی طرح لپٹا رہنے دیا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے دوپٹے کے آنچل سے سر ڈھکا اور گھونگٹ نکال کر رحمتے کی جانب مڑ کر دیکھا اور اشارے سے اسے قریب بلایا۔ رحمتے کھسک کر اور نزدیک ہو گئی۔ پگلی کھل کھلا کر ہنسی، ہاتھ بڑھایا اور رحمتے کی دھوتی کا کنارا پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ دھوتی کھل گئی۔ رحمتے نیم برہنہ ہو گئی۔ وہ سخت پریشان ہوئی۔ اردگرد کھڑے ہوئے لوگوں میں سے بعض نے زور سے ٹھٹھا مارا۔

رحمتے بدحواسی میں جھک کر دہری ہو گئی۔ اس نے جلدی جلدی دھوتی باندھی۔ مگر وہ پگلی کے قریب سے ہٹی نہیں، وہیں بیٹھی رہی۔ پگلی نے اپنے سر اور سینے سے لپٹا ہوا دوپٹا اتار کر نفرت سے ایک طرف پھینک دیا، قہر آلود نظروں سے رحمتے کو دیکھا، ہاتھ بڑھا کے زور سے دھکا دیا اور چیخ کر بولی۔

"دفع ہو۔ میریاں آکھیاں اگوں دور ہو جا۔"

رحمتے سخت سراسیمہ ہوئی۔ وہ نظریں جھکائے ہوئے اٹھی اور سیدھی جیپ کی جانب لپکی اور اپنی نشست پر جا کے بیٹھ گئی۔ رحیم داد اور مراد خاں نے مسکرا کر رحمتے کو دیکھا اور جیپ میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور پہلے ہی اپنی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس نے جیپ اسٹارٹ کی۔

رحیم داد گم صم اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ رحمتے بھی پریشان اور خجل تھی۔ وہ گردن جھکائے سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔

مراد خاں شاہانی نے رحمتے کو چھیڑا۔ "رحمتے! پگلی کو تجھ پر غصہ تو آیا تھا۔ اگر وہ تھوک دیتی تو تیرا کام ضرور بن جاتا۔"

"میں نے جی اس سے کیا کام لینا تھا۔" رحمتے نے جھینپ کر کہا۔ "وہ ننگی تھی، مجھے لاج آئی۔ میں بھی تو اسی کی طرح زنانی ہوں۔ سو میں نے اُسے اپنا دوپٹا اڑھا دیا۔ پر وہ تو ایک دم پگلی ہے۔ اسے ذرا بھی ہوش نہیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اس پر ظلم بھی تو کتنا ہوا ہے۔ اس کا تو سب کچھ لٹ گیا۔ کچھ بھی نہیں بچا۔ اسے پاگل تو ہونا ہی تھا۔" رحمتے کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ "اب تو اسے نہ کوئی فکر ہے، نہ غم۔"

☆

جیپ تیزی سے سڑک پر دوڑتی رہی۔ گرمی کی شدت کم ہو گئی تھی۔ سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ سورج خزاں رسیدہ درختوں کی الجھی ہوئی برہنہ شاخوں کے پیچھے سرخ گولے کے مانند نظر آ رہا تھا۔ اس کا دہکتا ہوا الاؤ سرد پڑ گیا تھا۔ شام نیچے اترنے کے لیے اپنے بازو آہستہ آہستہ پھیلا رہی تھی۔ سڑک پر آمد و رفت بھی رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی۔

جیپ ملتان شہر میں داخل ہوئی تو رات گہری ہو چکی تھی۔ سلیم اللہ خاکوانی جاگ رہا تھا۔ مراد خاں سے اس کی پرانی یاد اللہ تھی۔ وہ بڑی گرم جوشی سے ملا اور انھیں اپنی کوٹھی میں ٹھہرایا۔

مراد خاں کا ارادہ صرف رات بھر قیام کرنے کا تھا مگر خاکوانی نے اصرار کر کے انھیں روک لیا۔ رحیم داد نے مراد خاں سے مشورہ کر کے اپنی جیپ واپس کو ٹلہ ہر کشن بھیج دی۔ ملتان میں ایک روز ٹھہرنے کے بعد دوسرے روز وہ کار پر سلیم اللہ کی جاگیر کی جانب روانہ ہو گئے۔ فصلوں کی کٹائی شروع ہو چکی تھی۔ جگہ جگہ کھیتوں میں گندم اور جو کے کٹے ہوئے پودوں کے ستھر نظر آ رہے تھے۔

سلیم اللہ خاکوانی اپنی جاگیر کے دورے پر نکلا تھا۔ مراد خاں شاہانی اور رحیم داد اس کے ہم راہ تھے۔ وہ گاؤں گاؤں گھومتے پھرے۔ ہر طرف چہل پہل تھی، خوشی اور مسرت تھی جو فصلوں کی کٹائی کے بعد مزارعوں اور کمیوں کی زندگی میں ہر سال نظر آتی ہے۔ اس بار ربیع کی فصل بہت اچھی تھی لہٰذا مسرت کا اظہار بھی زیادہ کیا جا رہا تھا۔

دو ہفتے سے بھی زیادہ جاگیر میں ٹھہرنے کے بعد سلیم اللہ خاکوانی واپس ملتان پہنچا۔ مراد خاں اور رحیم داد بھی اس کے ہمراہ تھے۔ واپسی کے بعد رحیم داد اور مراد خاں نے تین روز اور ملتان میں قیام کیا۔ گرمی بہت بڑھ گئی تھی۔ لو چلنے لگی تھی۔ دن بھر خاک اڑتی رہتی۔ گلی کوچے سنسان نظر آتے۔ مگر شام ہوتے ہی شہر کی رونق لوٹ آتی اور گرمی کی شدت کم ہوتی جاتی۔ رات خوش گوار ہوتی۔

مئی کی ایک غبار آلود صبح کو مراد خاں اور رحیم داد رخصت ہوئے۔ وہ خاکوانی کی کار میں اسٹیشن پہنچے۔ رحمتے اور اس کے بچے بھی ان کے ساتھ تھے۔ مراد خاں نے روانگی سے قبل اپنی آمد کے

بارے میں تار دے کر کریم بخش رادھانی کو مطلع کر دیا تھا۔ سلیم اللہ خاکوانی دونوں کو الوداع کہنے اسٹیشن تک آیا۔ اس نے گرم جوشی سے گلے مل کر دونوں کو رخصت کیا اور دوبارہ آنے پر زور دیا۔

مراد خاں شاہانی اور رحیم داد ٹرین میں سوار ہوئے اور مظفر گڑھ کے راستے بھکر کے لیے روانہ ہو گئے۔ مراد خاں اور رحیم داد سیکنڈ کلاس میں تھے اور رحمتے اپنے بچوں کے ساتھ تھرڈ کلاس کے ایک زنانہ ڈبے میں بیٹھی تھی۔

جب وہ بھکر پہنچے تو اسٹیشن کے باہر مراد خاں کی جیپ موجود تھی۔ ٹرین سے اترتے ہوئے مراد خاں نے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری' تک کھے پیر کا مزار سٹیشن کے احاطے ہی میں ہے۔ ایک بار فیر منت مان لے۔"

مگر رحیم داد آمادہ نہیں ہوا' بے دلی سے بولا۔ "نہیں جی! میں نے اب منت شت نہیں ماننی۔"

مراد خاں شاہانی نے اصرار کیا۔ "میرا کہا مان' اس دفعہ تجھے جمیلہ اس طرح مل جائے گی کہ ہمیشہ تیرے ہی پاس رہے۔"

رحیم داد کے دل میں جمیلہ کی یاد نے انگڑائی لی اور اس کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ وہ دل گرفتہ ہو کر بولا۔ "تجھے یقین ہے جمیلہ واپس آجائے گی؟"

"میں تو کہتا ہوں' وہ ضرور واپس آئے گی۔ تک کھے پیر کی زیارت پر مانی ہوئی منت اس بار بھی پوری ہو گی۔" سردار شاہانی نے رحیم داد کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "زیارت پر چڑھانے کے لیے چراغ اور میٹھی روٹیاں ڈرائیور کو بھیج کر بازار سے منگوائے لیتا ہوں۔ تو منت ماننے کو تیار ہو جا۔"

لیکن رحیم داد نے ارادہ بدل دیا۔ اس نے عذر پیش کیا۔ "بیٹ سے واپسی پر منت مانوں گا۔ ابھی رہنے دے۔"

مراد خاں نے اصرار نہیں کیا۔ وہ رحمتے اور رحیم داد کے ہم راہ جیپ میں بیٹھ گیا۔ مگر بھکر میں واقع اپنی حویلی کی جانب نہیں گیا۔ بیٹ کی سمت روانہ ہو گیا۔ جیپ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ سڑک پر دوڑنے لگی اور جب بیٹ میں داخل ہو کر ہموں والی پہنچی تو آفتاب غروب ہو رہا تھا۔

شفق کی سرخی سے دریائے سندھ کا پانی لالہ رنگ ہو گیا تھا۔ فضا خوش گوار تھی۔ یہ ساحلی علاقہ ہے۔ ملتان اور بھکر کے مقابلے میں گرمی بھی کم تھی۔ دریا کی جانب سے بھیگے بھیگے جھونکے آرہے تھے۔ طویل سفر کے بعد سب نے فرحت اور تازگی محسوس کی۔ جیپ حویلی کے پھاٹک پر رکی۔ مراد خاں کا کاردار کریم بخش رادھانی پھاٹک پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ مراد خاں جیپ سے نیچے اترا۔

رادھانی نے جھک کر سردار کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور نگاہیں جھکائے ہوئے ادب سے بولا۔

"خیر اے سئیں۔ خوش ہو۔ راضی باضی ہو۔ بالیں بچیں' ڈیڈھی پر دے سب خیر اے۔ بال جان' مال ڈھگی' سب خیر اے؟"

"شکر اے۔" مراد خاں نے مسکرا کر سرپرستانہ انداز میں کہا۔ "تو اپنا حوال سنا۔ خیر سلا اے؟"

"خیر سلا اے سئیں۔" رادھانی نے زیر لب مسکرانے کی کوشش کی۔

رحیم داد' رحمتے اور اس کے بچے بھی جیپ سے اتر چکے تھے۔ مراد خاں شاہانی آگے بڑھا۔ سب اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ پھاٹک عبور کر کے حویلی کے احاطے میں داخل ہوئے۔ شام کالی پڑتی جا رہی تھی' اندھیرا پھیل رہا تھا۔

مراد خاں سفر کی تکان سے نڈھال نظر آرہا تھا۔ اس کا لباس گرد آلود تھا۔ اس نے مڑ کر رادھانی کی طرف دیکھا۔ "جیپ سے سامان اتروا۔ میں نے نہا کر کپڑے بدلنے ہیں۔ سو بھی جلدی جاؤں گا۔ تجھ سے صبح آرام سے بات ہو گی۔"

"فکر نہ کر سئیں۔" کریم بخش رادھانی نے مستعدی سے جواب دیا۔ "تیرے اور چوہدری کے لیے میں نے ویڑے میں دو منجے ڈال کر بستر لگوا دیے ہیں۔ دھاون کے لیے حمام میں پانی بھی رکھ دیا ہے۔ روٹی جلدی کھانی ہے تو وہ بھی تیار ہے۔ سئیں! کوئی اور حکم؟"

مراد خاں قریب رکھی ہوئی کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ رحیم داد بھی اس کے نزدیک ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ رحمتے کچھ فاصلے پر سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ اس کے بچے بھی خاموش اور سہمے ہوئے تھے۔ کاردار کریم بخش رادھانی پھاٹک کے پاس کھڑے ہوئے نوکروں کی جانب بڑھا اور انھیں ضروری ہدایات دے کر واپس آگیا۔ مراد خاں شاہانی کی طرف جھک کر آہستہ سے بولا۔

"جیپ سے سامان اتار کر کمروں میں پہنچا دیا جائے گا۔ سئیں تو اب حمام میں چلا جا۔ دھاون سے طبیعت ایک دم تازہ ہو جائے گی۔ ویسے آج گرمی بھی زیادہ ہی ہے۔"

مراد خاں شاہانی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "تو نے فصل کی واڈھی کرا دی؟"

"ہا سئیں! کرا دی۔" رادھانی نے جواب دیا۔ "تیرا حکم ملتے ہی میں نے واڈھی شروع کرا دی تھی۔ اب تو گاہنے کے لیے پڑ میں بھی پہنچنے لگی ہے۔"

"سویرے تیرے ساتھ ادھر چلوں گا۔" مراد خاں نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا اور مڑ کر رحمتے

کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "یہ رحمتے ہے۔ یہیں رہے گی۔ اس کے ٹھیرنے کا بندوبست سکھڑی کی کوٹھڑی میں کردے۔" یہ کہہ کے وہ غسل کرنے حویلی کے اندر چلا گیا۔

رادھانی نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "سئیں چوہدری' تو بھی نہا دھو کر کپڑے بدل لے۔ تیرا سامان کمرے میں پہنچ گیا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "تیرے لیے میں نے اسی کمرے میں بندوبست کیا ہے جس میں تو پچھلی بار ٹھیرا تھا۔"

رحیم داد نے غسل کیا اور لباس تبدیل کیا۔ وہ واپس پہنچا تو مراد خاں شاہانی نہا دھو کر' اجلا لباس زیب تن کیے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ سامنے میز پر بوتل تھی' گلاس تھے اور جگ میں پانی تھا۔ سردار مراد خاں نے گلاس بھرے مگر انھوں نے زیادہ دیر شغل نہیں کیا۔ کھانا کھایا اور کھڑے ہو گئے۔

مراد خاں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رحیم داد ڈیرے کی جانب بڑھا۔ صحن میں دو بڑے بڑے پلنگ بچھے تھے۔ ان کے پائے رنگین اور اونچے تھے۔ بستر صاف ستھرے تھے۔ بستروں کے سرہانے نرم اور دبیز تکیے رکھے تھے۔ پائنتی پر دو تاہی قرینے سے رکھی تھی۔ دو تاہی پر رنگین دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ رحیم داد خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا اور دیر تک مراد خاں شاہانی کا انتظار کرتا رہا۔ وہ بار بار قریب کا پلنگ دیکھتا رہا مگر ہر بار بستر خالی نظر آتا۔ مراد خاں نہیں آیا۔ آخر رحیم داد سو گیا۔

صبح رحیم داد کی آنکھ کھلی تو مراد خاں شاہانی بستر پر بے خبر سو رہا تھا۔ رات وہ کب آ کر بستر پر لیٹا' رحیم داد کو خبر نہیں ہوئی۔ اس نے خاموشی سے اٹھ کے غسل کیا اور صحن میں واپس آیا تو مراد خاں بیدار ہو چکا تھا اور بستر پر تکیے کے سہارے بیٹھا انگڑائیاں لے رہا تھا۔

دونوں نے ناشتا کیا اور حویلی کے احاطے سے نکلے۔ کریم بخش رادھانی بھی ان کے ہم راہ تھا۔ تینوں کھیتوں کی جانب چلے۔ ربیع کی کٹائی مکمل ہو چکی تھی۔ کھیت ویران اور اجاڑ نظر آ رہے تھے۔ اکا دکا ستھر بھی تھے۔ یہ کٹی ہوئی فصل کے پودے تھے جو دھوپ میں سکھانے کے لیے بکھیر دیے گئے تھے۔ کھیتوں کے درمیان جگہ جگہ پڑ تھے۔ مٹی کے ان چبوتروں پر دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے گندم' جو اور چنے کے پودوں کے کھلیان تھے۔ یہ خشک پودے تھے اور ساندھنے کے لیے ان پر گید اور بیری کی سبز شاخوں کے پھلے چل رہے تھے۔

رحیم داد کا یہ معمول ہو گیا کہ ناشتے سے فارغ ہو کر مراد خاں اور رادھانی کے ساتھ صبح نکلتا۔ دوپہر تک گاؤں گاؤں کھیتوں کے درمیان گھومتا رہتا' مراد خاں یا رادھانی سے فصل کے ساندھنے کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا اور دوپہر کو مراد خاں شاہانی کے ہم راہ واپس آتا۔ پھر کھانا کھاتا اور آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتا۔ مراد خاں شاہانی بھی دوپہر کے بعد کھیتوں کی طرف کم ہی جاتا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی اور روز بہ روز شاہانی کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔

☆

گرمی میں اور اضافہ ہو گیا۔ رحیم داد تیز دھوپ میں گھومنے پھرنے سے کتراتا۔ مراد خاں نے بھی اس کی پریشانی محسوس کی۔ اب وہ خود بھی کئی کئی روز حویلی سے نہ نکلتا اور اگر نکلتا بھی تو دھوپ کی حدت بڑھنے سے پہلے آ جاتا۔

گرمی بڑھنے کے ساتھ ساتھ رحیم داد نے یہ بھی محسوس کیا کہ فصل کی کٹائی کے بعد عام طور پر جو خوشی اور شادمانی نظر آتی ہے' وہ کم ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ مزارعوں کے چہروں پر مسرت کے بجائے خلاف معمول خشونت ہوتی' جوش و خروش کے بجائے بے زاری اور چڑچڑا پن ہوتا۔ بٹائی کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ مزارعوں کے چہرے زیادہ بجھے بجھے دکھائی دیتے مگر رحیم داد نے اس سلسلے میں مراد خاں سے کوئی استفسار نہیں کیا۔ مراد خاں بھی چپ چپ رہتا۔ وہ بہت کم بات کرتا۔ کبھی کبھی شام ہوتے ہی ڈھانڈلوں اور نوانیوں کے پاس چلا جاتا اور آدھی رات تک نہ لوٹتا۔

رحیم داد اکتا گیا تھا اور واپس کوٹلہ ہرکشن جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مئی کی ایک گرم اور غبار آلود رات تھی۔ مراد خاں شاہانی دن ڈھلے نکل گیا اور اب تک نہیں لوٹا تھا۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ رحیم داد تنہا بیٹھا تھا۔ وہ وہسکی شراب کے تین گلاس خالی کر چکا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں کریم بخش رادھانی آ گیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "رادھانی! سردار کدھر گیا ہے؟"

"وہ تو جی! اکرم خاں نوانی کی طرف گیا ہے۔"

"کب تک واپس آئے گا؟"

"لگتا ہے' آج بھی دیر ہی سے لوٹے گا۔" رادھانی نے بتایا۔ "نوانیوں کے علاوہ ڈھانڈلے بھی ہیں۔ میں وہیں سے آ رہا ہوں۔ بات چیت لمبی ہی چلے گی۔"

"آج کل مراد خاں روز شام کو ڈھانڈلوں اور نوانی زمیں داروں کے پاس جا رہا ہے' اور دیر سے لوٹتا ہے۔" رحیم داد نے رادھانی کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ "سردار وہاں کیا کرتا رہتا ہے؟"

"بات ہی ایسی ہے جی!" کریم بخش رادھانی نے مختصر جواب دیا۔

"مجھے تو وہ پریشان پریشان دکھائی دیتا ہے۔ تو بھی پریشان لگتا ہے۔ خیر خیریت تو ہے؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ "پنڈ بھی سونے سونے نظر آتے ہیں۔ حویلی بھی ویران ویران لگتی ہے۔" رحیم داد نے نشے کی جھونک میں ہلکا قہقہہ لگایا۔ "کوئی پوپٹ رن بہت دنوں سے ادھر نہیں آئی؟"

"سئیں! آج کل ایسی گالہ نہ کر۔" رادھانی کے لہجے میں تردد تھا۔ "ادھر کا حال احوال ٹھیک نہیں۔ تجھے پتہ نہیں، بہت گڑبڑ مچی ہوئی ہے۔"

"لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے۔ پر نہ میں نے سردار مراد خاں سے پوچھا نہ اس نے بتایا۔" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ "تو بتا، ایسا کیوں ہے؟"

"سئیں! بات دراصل یہ ہے۔" رادھانی نے بتایا۔ "مزارے کہتے ہیں، اس بار بٹائی پر وہ ٹکا ٹیکس نہیں دیں گے۔"

"ٹکا ٹیکس؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "وہ کیا ہوتا ہے؟"

کریم بخش جواب دینے ہی والا تھا کہ پھاٹک پر اونچی آواز سے بولنے کا شور بلند ہوا۔ مراد خاں شاہانی واپس آگیا تھا۔ رادھانی تیز تیز قدم اٹھاتا پھاٹک کی جانب بڑھا۔ ذرا دیر میں مراد خاں شاہانی اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا اور رحیم داد کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ "کئی روز سے میں تجھے پریشان پریشان دیکھ رہا ہوں۔"

"ہا سئیں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

رحیم داد نے کہا۔ "یہ ٹکا ٹیکس کا کیا چکر ہے؟ میں نے تو کبھی ایسا ٹیکس ٹیکس نہیں سنا۔"

"تو نے سچ مچ نہیں سنا ہوگا اور تو اسے سمجھ بھی نہیں پائے گا۔ تیری طرف کے زمیں دار اپنے مزارعوں سے ایسا کوئی ٹیکس وصول نہیں کرتے۔"

"ادھر کب سے وصول کیا جا رہا ہے؟"

"آج سے نہیں انگریزوں کے زمانے سے وصول کیا جا رہا ہے۔"

"یہ ٹیکس ہوتا کیا ہے؟"

"یہ ٹیکس اس طرح شروع ہوا کہ افضل خاں ڈھانڈلہ نے جو بیٹ کا بہت وڈا جگیردار تھا، اپنے پتر اسلم خاں کا پرنا کیا۔" مراد خاں اپنے لیے پیگ بنا کر بولا۔ "افضل خاں ذیل دار بھی ہوتا تھا۔ دور دور تک مشہور تھا۔ اس نے بہت دھوم دھام سے اپنے پتر کے پرنے پر جشن منایا۔ لہور اور ملتان سے کنجریاں بلائیں۔ کئی روز تک ناچ گانے کی محفل جمی۔ بہت زوردار میل ہوا۔"

"میں نے تجھ سے افضل خاں اور اس کے پتر کے ویاہ کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔" رحیم داد نے لیٹے سے لہرا کر اسے ٹوکا۔

"چپ کر کے سنتا جا۔" مراد خاں نے مسکرا کر کہا۔ "وہ ایسا ہوا کہ ایک کنجری گانے کے ساتھ ساتھ ناچ بھی رہی تھی۔ مجرا کرتے ہوئے کسی طرح اس کے ماتھے کا ٹکا گر گیا۔ رات کو تو اسے کچھ معلوم نہیں ہوا۔ سویرے سو کر اٹھی تو اسے پتہ چلا کہ اسکا ٹکا غائب ہے۔ وہ افضل خاں ڈھانڈلہ کے پاس پہنچی اور ٹکا کھونے پر رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ افضل خاں ڈھانڈلہ بہت زور آور سردار تھا۔ اسے غصہ بھی بہت آتا تھا۔ اس نے ٹکا تلاش کرایا۔ ٹکا نہ ملا تو وہ بہت نراض ہوا۔" شاہانی نے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ "جانتے ہو اس نے کیا کیا؟" رحیم داد خاموش رہا۔ مراد خاں نے بتایا "افضل خاں نے کنجری کو نیا ٹکا بنوا کر دیا اور سزا کے طور پر اپنے تمام مزارعوں پر ٹکا ٹیکس لگا دیا۔ ہر پگ بن پر ایک من کنڑک۔"

"تب تو ایک ہی فصل پر ٹکے کی قیمت سے کہیں زیادہ مالیت کی گندم مل گئی ہوگی۔" رحیم داد کے لہجے میں استعجاب تھا۔ "اب تک یہ ٹیکس کیسے چل رہا ہے؟ تو نے ہی تو بتایا تھا کہ انگریزوں کے زمانے سے چل رہا ہے۔"

"گالہ سچی ایہہ اے کہ ایک بار جو ٹیکس زمیں دار اپنے مزارعوں پر لگا دیتے ہیں، وہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ تجھے بھی یہ اچھی طرح پتہ ہے۔ یہ بتا انگریزوں کے زمانے کا کون سا ٹیکس ختم ہوا؟ سبھی چل رہے ہیں بلکہ زمیں داروں نے کم کرنے کی بجائے بڑھا دیے ہیں۔"

"پر ٹکا ٹیکس تو افضل ڈھانڈلہ نے اپنے مزارعوں پر لگایا تھا۔ تجھے اور نوانی زمیں داروں نے اس سے کیا لینا۔"

"ہوا تو ایسا ہی تھا پر اب تو بیٹ کے سارے زمیں دار اپنے مزارعوں سے ٹکا ٹیکس وصول کرتے ہیں۔" مراد خاں نے بتایا۔ "ہوتا یہ ہے کہ ربیع کی داڑھی پر ہر زمیں دار اپنے مزارعے سے بٹائی کے وکت ایک من کنڑک ٹکا ٹیکس کے طور پر کاٹ لیتا ہے۔"

"افضل خاں ڈھانڈلہ ابھی زندہ ہے؟"

"نا سئیں! اسے تو مرے ہوئے بھی برسوں ہو گئے۔" مراد خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔ سنا ہے، بہت زبردست سردار تھا۔ کوئی مزارع اس کے سامنے گردن اٹھا کر نہیں بول سکتا تھا۔ اس کے پاس بہت عمدہ نسلوں کے کتے تھے۔ شکار بھی بہت کھیلتا تھا۔ مزارعوں کو ایک دم دبا کر رکھتا تھا۔ کوئی مزارع ذرا بھی سرکشی دکھاتا تو اس پر کتے چھوڑ دیتا، وہ اسے چیر پھاڑ کر برابر کر دیتے۔ تھانے دار اور دوسرے سارے افسر اس سے ڈرتے تھے۔؟"

"اوپر تک پہنچ ہو گی اس کی؟"

"بالکل تھی۔ انگریز اسے بہت مانتے تھے۔ لاٹ گورنر کے دربار میں اسے کرسی ملتی تھی۔" اس نے رحیم داد کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "افضل خاں ڈھانڈلہ کا مرن ہو گیا پر اس کا لگایا ہوا ٹکا ٹیکس ختم نہیں ہوا۔ ختم ہو بھی نہیں سکتا۔ چوہدری، تو خود ہی سوچ، ٹکا ٹیکس بند ہو گیا تو زمیں داروں کا کتنا گھاٹا ہو گا۔"

"مزارعوں نے ابھی تک کوئی گڑبڑ تو نہیں کی؟"

"یہ گڑبڑ کچھ کم ہے کہ وہ بٹائی پر ٹکا ٹیکس دینا نہیں چاہتے۔" مراد خاں شاہانی نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"پہلے بھی کبھی انھوں نے ٹکا ٹیکس دینے سے انکار کیا؟"

"نہیں! پہلی بار انھوں نے ایسا کیا ہے۔" مراد خاں کے چہرے پر جھنجلاہٹ ابھرنے لگی۔ "تجھے پتہ نہیں، بیٹ کے مزارعے اور کامے تو بہت سیدھے اور نیک بندے ہیں۔"

"پر وہ اچانک اتنے سرکش کیسے ہو گئے؟ میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، مزارعے نظریں اٹھا کر اپنے زمیں داروں سے گل بات نہیں کرتے۔ ادھر کے مزارعے تو بہت ہی نیک بندے لگتے ہیں۔ اب ان میں اتنا حوصلہ کیسے آ گیا؟" رحیم داد نے گلاس اٹھا کر لمبا گھونٹ بھرا۔ "کوئی نہ کوئی گل ضرور ہو گی۔"

"گالہ کچھ اس طرح ہے چوہدری۔" مراد خاں نے بتایا۔ "لہور اور لائل پور سے کچھ بندے ادھر آ گئے ہیں۔ وہ زمیں داروں کے خلاف جگہ جگہ گڑبڑ پھیلاتے ہیں۔ انھوں نے ہی مزارعوں اور کاموں کو بہکا کر یہ آگ بھڑکائی ہے۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "مزارعوں اور کاموں کے ساتھ مصلی، کٹانے اور کئی دوسرے بھی لگ گئے ہیں۔ ایک ملا بھی ان سے مل گیا ہے۔ اس کا نام مولوی احمد بخش ہے۔ وہ سب سے آگے ہے۔ جلسے کرتا ہے، تکریریں کرتا ہے۔ مزارعوں اور کمیوں کو زمیں داروں کے خلاف بھڑکاتا ہے۔"

"ڈھانڈلوں نے اب تک ان کے خلاف کچھ نہیں کیا؟" رحیم داد نے پوچھا۔ "ادھر کی زیادہ زمیں داری تو انھی کے پاس ہے۔ بڑے زمیں دار بھی وہی ہیں۔ شاہانی تو بہت کم ہیں۔ میں نے یہی سنا ہے۔"

"تو نے ٹھیک سنا ہے۔ بھوں والی میں ڈھانڈلے زمیں دار زیادہ ہیں۔ ویسے پورے بیٹ کے زیادہ زمیں دار ڈھانڈلے ہی ہیں۔ پر سوال صرف ڈھانڈلوں کا نہیں۔ گڑبڑ تو سارے بیٹ میں پھیل

گئی ہے۔ ڈھانڈلوں کے ساتھ نوانیوں اور شاہانیوں، سب کو مل کر سوچنا ہو گا۔"

"سب نے مل کر کیا سوچا؟"

"کارروائی کرنے ہی کی سوچ رہے ہیں۔ سارے ڈھانڈلے نوانی، شاہانی زمیں دار آپس کے تمام جھگڑے ٹنٹے بھول کر اکٹھے ہوتے جا رہے ہیں۔ روز میٹنگیں کرتے ہیں۔ مزارعوں کو دبانے کی سکیمیں بناتے ہیں۔"

"ابھی تک سکیمیں ہی بن رہی ہیں، ہوا ہوایا کچھ نہیں۔" رحیم داد کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔

"تجھے پتہ نہیں، زمیں داروں کے کرندوں اور دوسرے بندوں نے گڑبڑ پھیلانے والے مزارعوں پر مسلح حملے کیے۔ گھروں پر ہلا بول دیا۔ ڈھور مویشی اٹھوا لیے۔"

"تب تو وہ ڈر گئے ہوں گے۔"

"نا سئیں، ان کے حوصلے اور بڑھ گئے۔" مراد خاں نے بتایا۔ "ٹکا ٹیکس دینے سے تو وہ انکار کر ہی رہے ہیں۔ اب تو انھوں نے محصول دینا بھی بند کر دیا ہے۔" اس کے چہرے پر پریشانی پھیلنے لگی۔ "پچھلے کچھ دنوں سے یہ بھی خبریں مل رہی ہیں کہ مزارعوں نے زمینوں پر کبضہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ زمیں داروں کے مسلح کرندوں سے ڈٹ کر لڑتے ہیں۔ پورے بیٹ میں گڑبڑ پھیل چکی ہے اور کم ہونے کی بجائے بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے آج یہ طے کیا گیا ہے کہ بارڈر ملٹری پولیس بلائی جائے۔ کرندوں سے تو وہ اب دبنے کے نہیں۔ ضرورت پڑی تو بھکر بلکہ میاں والی سے بھی پولیس آجائے گی۔"

"جو مزارعے آگے آگے ہیں، انکے خلاف چوری ڈکیتی کے الزام میں پرچے بھی تھانے میں چاک کرانے چاہیں۔ کیسوں کو مکدے بنا کر بند کرانا ہو گا۔" رحیم داد نے تجویز پیش کی۔

"سبھی کچھ کرنا ہو گا۔ ایسے ہی تو نہیں بیٹھے رہنا۔"

دونوں نے اپنے اپنے گلاس خالی کیے، کھانا کھایا اور صحن میں بچھے ہوئے پلنگوں پر لیٹ گئے۔ مراد خاں تھکا ہوا تھا، جلد ہی سو گیا مگر رحیم داد جاگتا رہا۔ وہ واپس کوٹلہ ہرکشن جانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح ہوئی، دن چڑھا۔ ناشتے پر رحیم داد کی مرادد خاں سے ملاقات ہوئی۔ رادھانی بہت دیر سے اس کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ سویرے سویرے آگیا تھا۔ مراد خاں شاہانی کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔ کریم بخش رادھانی بھی سہما ہوا نظر آ رہا تھا۔ رحیم داد کے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد رادھانی اٹھ کر چلا گیا۔

رحیم داد نے ہمدردی کے انداز میں پوچھا۔ "سردار! تو رات سے بھی زیادہ پریشان نظر آرہا ہے۔ خیر سکھ ہے؟"

"تجھے تو پتہ ہی ہے' مزارعوں اور کاموں نے گڑبڑ مچا رکھی ہے۔" مراد خاں نے بتایا۔ "ان کے حوصلے برابر بڑھتے جا رہے ہیں۔ کسی طرح کابو میں نہیں آرہے۔"

"کوئی خاص بات ہوگئی؟"

"رات بستی نظام میں زبردست جھگڑا ہوا۔ ادھر نوانیوں کی زمیں داری ہے۔ مزارعوں نے کنڑک کے کھلیانوں اور ڈھیریوں پر جتھا کر رکھا ہے۔ کاردار اور کرندے ونڈائی کے لیے ونڈولوں کے ساتھ پہنچے تو مزارعوں نے انھیں روک دیا۔" مراد خاں ٹھہر ٹھہر کے بول رہا تھا۔ "کاردار اور کرندے مسلح ہو کر گئے تھے۔ انھوں نے ڈھیریاں اپنی تحویل میں لینے کی کوشش کی۔ اسی پر جھگڑا شروع ہوگیا۔"

"رات کو تو نے یہ نہیں بتایا تھا۔"

"مجھے پتہ ہی کب تھا۔" مراد خاں بولا۔ "صبح رادھانی گھبرایا ہوا آیا۔ اس نے مجھے بستی نظام کے بارے میں بتایا۔ کہتا تھا' مزارعوں کے ساتھ ان کے بال بچے بھی نعرے لگاتے تھے' پتھراؤ کرتے تھے۔ بہت خوں خرابہ ہوا۔ آخر زمیں داروں کے بندوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ کرتے بھی کیا۔ یوں سمجھو' ساری بستی نے ان پر ہلا بول دیا تھا۔ ان کے حوصلے اتنے بڑھ جائیں گے' یہ تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔"

کمرے میں خاموشی ہوگئی۔ چند لمحے بعد رحیم داد کی آواز ابھری۔ "اپنی سمجھ میں ایک بات آئی ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"کیسی بات؟" مراد خاں نے تجسس سے پوچھا۔

"ساری گڑبڑ ٹکا ٹیکس کی وجہ سے ہے ناں؟ اسے ختم کر دیا جائے تو سارے جھگڑے نمٹے اور ساری گڑبڑ ختم ہو جائے گی۔"

"سئیں' گالہہ صرف اتنی نہیں ہے۔" مراد خاں کا لہجہ تیکھا تھا۔ "یہ اپنے سرداروں اور زمیں داروں کی عزت اور آن کا بھی سوال ہے۔ ایک بار مزارعوں اور کمیوں کی گردن اونچی ہو گئی تو اسے جھکانا بہت مشکل ہو گا۔ آج وہ ٹکا ٹیکس ختم کرائیں گے تو کل پرنا ٹیکس' مرن ٹیکس' مونڈن ٹیکس' ڈھور ڈنگر ٹیکس' دری ٹیکس' ککڑ ٹیکس' سارے ہی ٹیکس ایک ایک کر کے ختم کراتے جائیں گے۔ تب زمیں داروں کا کیا بنے گا؟ خالی ونڈائی سے فصل پر کیا ملے گا؟ تو خود سوچ' صرف اس سے کیسے

کام چل سکتا ہے؟" اس نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ "سئیں' تو یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا۔ ادھر زمیں داری کرنا مخول نہیں ہے۔ مزارعے کو جوتی کے نیچے دبا کر رکھنا پڑتا ہے۔" اس کا چہرہ کرخت ہو گیا۔ "جہاں وہ سر اٹھائے' ٹھوکر مار کر توڑ دو۔"

"پر گڑبڑ اور بڑھی تو آگے کے لیے زمیں داروں نے کیا سوچا۔؟" رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔

"سوچنا کیا ہے' خون بہے گا۔ دس بیس کی لاشیں پڑی ہوں گی۔" مراد خاں کے وجود میں چھپا ہوا سردار جاگ اٹھا۔ غصے سے اس کی مونچھیں پھڑپھڑانے لگی تھیں۔ "پولیس عدالت سب اپنی ہے۔ ادھر سرداروں کا کانون چلتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں چکا چوند ابھری۔ "ہو سکتا ہے' آج ایسا ہی ہو۔ گڑبڑ زیادہ بڑھی تو یہی کرنا ہو گا۔ زمیں داروں نے سوچ رکھا ہے۔"

"تو نے رات بتایا تھا بارڈر ملٹری پولیس کو مدد کے لیے بلایا گیا ہے۔"

"ہاں' آج بارڈر ملٹری پولیس پہنچ جائے گی۔ پوری طرح مسلح بھی ہو گی۔ زمیں داروں اور ان کے بندوں کے پاس بھی ہر طرح کا اسلحہ ہے۔" مراد خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "دیکھنا ہے' گولیوں کی بوچھاڑ کے سامنے کتنی دیر ٹھہر سکیں گے۔ کتنی دیر پتھراؤ کریں گے۔ جو آگے آگے ہیں اور لیڈر بنے ہوئے ہیں' ان کے خلاف بلوے اور چوری ڈکیتی کے مکدمات پہلے ہی سے تیار رکھے ہیں۔ وہ آج ہی گرفتار کر لیے جائیں گے۔ پولیسیے حوالات میں بند کر کے ایسی مار لگائیں گے کہ ساری زورا زاری نکل جائے گی۔"

"تھوڑی بہت جو سکت رہ جائے گی' وہ مکدمے بازی کی بھاگ دوڑ اور عدالتوں کا چکر کاٹتے نکل جائے گی۔" رحیم داد نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی مکدموں کا فیصلہ مہینوں اور اکثر برسوں نہیں ہوتا۔ تب تک تو ان کا زور بالکل ہی ٹوٹ جائے گا۔ گڑگڑائیں گے' معافی مانگیں گے' بر پکڑیں گے۔" اس نے مراد خاں کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "مزارعوں کے ساتھ زمیں داروں اور سرداروں کے جھگڑے تو پہلے بھی ہوتے ہوں گے۔؟"

"کیوں نہیں۔" مراد خاں نے اسے آگاہ کیا۔ "بے دخلی پر تو اکثر ہوتے رہتے ہیں۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "پر سچی گالہہ ایہہ ہے سئیں۔ اتنی زیادہ گڑبڑ پہلے کبھی بیٹ میں نہیں ہوئی۔ اس بار تو سارے ہی مزارعوں نے زبردست اکٹھ کر رکھا ہے۔ لگتا ہے جیسے سب ایک ہو گئے ہیں۔" اس کے لہجے سے تردد عیاں تھا۔ "انھیں دبانے کے لیے بہت زور لگانا پڑے گا۔"

"آج تجھے تو کہیں نہیں جانا؟"

”مجھے رادھانی کے ساتھ بستی نظام جانا ہے۔“

رحیم داد نے شکوہ کیا۔ ”تو روز چلا جاتا ہے۔ میں یہاں اکیلا پڑا رہتا ہوں۔“

”تو بھی میرے ساتھ چل۔“

”میں تو واپس جانے کی سوچ رہا ہوں۔“ رحیم داد اس کے ہم راہ جانے پر رضامند نہیں ہوا۔

”چند روز ٹھیر جا۔ تب تک گڑبڑ بھی کم ہو جائی گی۔“ سردار مراد خاں شاہانی نے کہا۔ ”میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔ اکٹھے لہور پہنچیں گے۔ شاہ جی سے ملیں گے۔ مجھے اس سے یہاں کے حالات کے بارے۔ میں مشورہ بھی کرنا ہے۔“

”پر مجھے تو گڑبڑ جلد کم ہوتی نہیں لگتی۔“ رحیم داد بولا۔ ”یہاں ٹھیر کر میں تیری مدد بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے تو اب جانے ہی دے۔“

”جیسی تیری مرضی۔ پر جانا ہی ہے تو پرسوں جانا۔“

”پرسوں کیوں؟ آج ہی مجھے جانے دے۔“

”ضد نہ کر۔“ سردار مراد خاں نے مسکرا کر کہا۔ ”اس بارے میں بستی نظام سے واپسی پر بات کروں گا۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ مراد خاں کھڑا ہو گیا۔ وہ آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں پھاٹک پر پہنچے۔ سامنے جیپ کھڑی تھی۔ قریب ہی رادھانی بھی موجود تھا۔ اس کے ساتھ تین کارندے بھری ہوئی بندوقیں سنبھالے کھڑے تھے۔

مراد خاں اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کے سوار ہوتے ہی رادھانی اور مسلح کارندے بھی جیپ میں داخل ہوئے اور پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ مراد خاں اور کاردار رادھانی کے پاس بھی بھری ہوئی رائفلیں تھیں۔ سردار مراد خاں کی کمر سے چمڑے کے ہولسٹر میں پستول بھی لٹک رہا تھا۔

رحیم داد نے مراد خاں کو گرم جوشی سے رخصت کیا۔ جیپ کا انجن اسٹارٹ ہوا اور جیپ تیزی سے بستی نظام کی سمت روانہ ہو گئی۔

☆

دھوپ کی تمازت بڑھ چکی تھی۔ سورج درختوں کی چوٹیوں کے اوپر دہک رہا تھا۔ رحیم داد کو اپنے کمرے میں پہنچے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ باہر آہٹ ابھری۔ اس نے نظریں اٹھا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ نادر خاں کمرے کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ گرد اور پسینے سے مٹیالا پڑ گیا تھا۔ وہ تھکن سے نڈھال نظر آرہا تھا۔ رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

”تو کیسے آگیا نادر؟ خیر خیریت تو ہے؟“

”خیریت ہی ہے جی!“ وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔

”بہت تھکا ہوا لگ رہا ہے۔ بیٹھ جا۔“

نادر خاں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

رحیم داد نے زور دے کر دریافت کیا۔ ”تو نے بتایا نہیں، کیسے آنا ہوا؟“ اس نے نادر خاں کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”فکر کی تو کوئی گل نہیں؟ تو نے فصل کی واڈھی تو کرا دی ناں؟“

”وہ تو جی کب کی ہو چکی۔“ نادر خان نے بتایا۔ ”اب تو بٹائی ہونی ہے۔ میں اسی سلسلے میں تیرے پاس آیا ہوں۔“

”اچھا ہوا تو آگیا۔“ رحیم داد بولا۔ ”میں واپسی کی سوچ رہا تھا۔ آج ہی سردار سے گل بات ہوئی تھی۔ وہ تو مجھے روک رہا ہے۔“

”پر ادھر تو جی بہت گڑبڑ ہے۔ مزارعوں نے کھلم کھلا سرکشی شروع کر دی ہے۔“

”تجھے کیسے پتہ چلا؟“ رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔ ”ادھر آنے پر ہی پتہ چلا ہو گا۔“

”نہیں جی! مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی پتہ چل گیا تھا۔ وہ ایسا ہوا میں ایک روز منٹگمری گیا۔ ایک پرانا یار مل گیا۔ وہ لیہ میں ہوتا ہے۔ اس نے باتوں باتوں میں ادھر کی گڑبڑ کا ذکر کیا۔“ نادر خان نے بتایا۔

”اپنی طرف تو سب ٹھیک ٹھاک ہے؟“

”اپنی طرف کیا ہونا ہے جی!“ نادر نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”سارے ہی بندے راضی خوشی ہیں۔ فصل کی واڈھی کی بعد سے جشن کا سماں ہے۔ ڈھول بجتا ہے۔ بھنگڑا ڈالا جاتا ہے۔ ٹپے الاپے جاتے ہیں۔“ وہ مسکرایا۔ ”اب تو بٹائی کا انتظار ہے۔ تو پہنچے گا تو وہ بھی شروع ہو جائے گی۔“

”نادر! تو مزارعوں سے پچھلا کرض ادھار بٹائی پر وصول کرنے کو کہتا تھا۔“ اس کے لہجے میں تشویش کا عنصر غالب تھا۔ ”دیکھ، وصولی میں مزارعوں کے ساتھ زبردستی یا سختی نہ کرنا۔“

”سختی تو جی کچھ نہ کچھ کرنی ہی پڑے گی۔ آسانی سے تو کبھی وصولی نہیں ہوتی۔ اس کے بغیر کیسے کام بنے گا۔“

”نہیں، کوئی سختی کرنے کی ضرورت نہیں۔“ اس کا لہجہ تیکھا تھا۔ وہ کسانوں کی ٹکا ٹیکس تحریک

سے ڈر گیا تھا۔ ”بات سچی یہ ہے نادر! میں اپنی زمیں داری میں کوئی گڑ بڑ دیکھنا نہیں چاہتا۔“

”پر چوہدری یہ تو سوچ، آسانی سے ادھار وصول ہو جاتا تو کب کا وصول ہو چکا ہوتا۔ اللہ وسایا اور جمیلہ کی کمزوری سے مزارعوں نے فائدہ اٹھایا اور ادھار کم ہونے کی بجائے بڑھتا گیا۔“ نادر نے وضاحت کی۔ ”ویسے ادھر روپے کی ضرورت بھی ہے۔ جیپ کی رکم شاہ جی کو ادا کرنی ہے، اور بھی ضروری خرچے ہیں۔“

”میں یہ نہیں کہتا کہ ادھار وصول نہ کیا جائے۔“ رحیم داد نرم پڑ گیا۔ ”پر سختی سے بچنے کی کوشش کر۔ سمجھا بجھا کر نرمی سے کام نکال۔ میرا مطلب ہے، ایسا نہ کر کہ کوئی گڑ بڑ ہو۔ اللہ وسایا اور جمیلہ نے مزارعوں کا دماغ پہلے ہی خراب کر رکھا ہے۔ انھیں دھیرے دھیرے اپنے راستے پر لانا ہو گا۔ تو سمجھ گیا ناں؟“

”فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جیسا حکم ہو گا ویسے ہی ہو گا جی!“ نادر نے لمحے بھر کے لیے تامل کیا۔ ”واپسی کے بارے میں کیا سوچا؟“

”میں نے تجھے بتایا نہیں۔ آج ہی سردار مراد خان سے اس بارے میں میری بات ہوئی تھی۔“

”میں نے تو آج ہی واپس جانا ہے۔“ نادر خاں نے وضاحت کی۔ ”تیرے ساتھ ہی جانا ہے۔ بٹائی کی ساری تیاری ہو چکی ہے۔ میں نے تو اس کے لیے ونڈاوے بھی بلا کر بٹھا رکھے ہیں۔“

”واپسی کے بارے میں تو مراد خان کے آنے ہی پر طے ہو گا۔“

”شام تک واپسی ہو جائے تو ٹھیک ہے۔“ نادر خاں نے اپنی رائے ظاہر کی۔

رحیم داد نے گردن بڑھا کر دروازے کی جانب دیکھا اور نوکر کو اونچی آواز سے پکارا۔ نوکر فوراً آگیا۔ رحیم داد نے نادر خاں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ادھر ہی ٹھہرے گا۔ اسے اپنے ساتھ لے جا اور اس کے ٹھہرنے کا بندوبست کر دے۔“ نوکر کو ہدایات دینے کے بعد وہ نادر خاں کی جانب متوجہ ہوا۔ ”نادر تو اب جا۔ نہا دھو کر آرام کر۔ تجھ سے بعد میں گل بات ہو گی۔“

نادر خاں کے جانے کے بعد رحیم داد کمرے میں بیٹھا رہا۔ دوپہر ہو گئی۔ گرمی اور بڑھ گئی۔ دن ڈھلے وہ نہا دھو کر صحن میں گیا۔ نوکروں نے کرسیاں اور مونڈھے ڈال دیے تھے۔ رحیم داد ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نادر خاں بھی پہنچ گیا۔ رحیم داد دیر تک اس کے ساتھ اپنی زمین داری کی بارے میں باتیں کرتا رہا۔

اندھیرا پھیلنے پر نادر خاں کھانا کھانے چلا گیا۔ سفر کی تکان ابھی نہیں اتری تھی۔ وہ جلد ہی سو گیا۔

☆

رحیم داد صحن میں بیٹھا تھا۔ رات گزرتی رہی۔ وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ رجمتے آگئی۔ رحیم داد نے اس کا چہرہ نظر بھر کر دیکھا۔

وہ مضمحل اور تھکی تھکی نظر آ رہی تھی۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا۔ ”جوڑا واپس آگیا ہے۔ وہ صبح سردار کے ساتھ بستی نظام گیا تھا۔“

”اسے تو میں نے بھی سردار کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔“ رحیم داد اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”پر سردار اب تک نہیں آیا۔“ رحیم داد کے لہجے میں استعجاب کے ساتھ تشویش کا پہلو نمایاں تھا۔ ”جوڑے نے یہ نہیں بتایا سردار ادھر کیا کر رہا ہے؟ بستی نظام میں زیادہ گڑ بڑ تو نہیں ہوئی؟“

”یہ تو میں نوں پتہ نہیں۔ جوڑا کہتا تھا سردار رات ادھر ہی رہے گا۔ کل لوٹے گا۔ میں تجھے یہی بتانے آئی تھی۔“

”تو پریشان پریشان لگ رہی ہے۔ تیری طبیعت تو ٹھیک ٹھاک ہے؟“

”پچھلے کئی روز سے میری طبیعت گڑ بڑ ہے۔“ اس کے لہجے میں تردد تھا۔ ”میرا یہاں بالکل جی نہیں لگ رہا۔“

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”گھبرا نہیں۔ مراد خاں چند ہی دنوں میں دو چار زنانیاں اٹھوا کر ادھر پہنچا دے گا۔ تب تو اکیلی نہیں رہے گی۔ ان کی انچارج بن جائے گی۔ ایسے ہی جیسے شاہ جی کے کوٹ کی انچارج تھی۔“

”میں اب اس دھندے میں پڑنا نہیں چاہتی۔“ وہ بے زاری سے بولی۔ ”یہ بھی کوئی زندگی ہے، کنجروں سے بھی خراب۔“

”ایسی بات تھی تو سردار شاہانی کے ساتھ ادھر آئی کیوں؟ یہ تو تجھے پہلے ہی سوچنا تھا۔“

”غلطی ہو گئی۔ میں نے ٹھیک نہیں کیا۔“

”تجھے اب تو ادھر ٹھہرنا ہی ہو گا۔ سردار برا منائے گا۔ ایسا خیال دل سے نکال دے۔“ رحیم داد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”سردار سے میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں۔“

”بہت ناراض ہوا ہو گا۔“

”ناراض تو ہوا تھا، پر زیادہ نہیں۔“

"آگے کے لیے تونے کیا سوچا؟" رحیم داد نے اس کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔

"گھر والے کے پاس چلی جاؤں گی۔"

"گھر والے کے پاس؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "تونے تو ایک بار شاہ جی کے کوٹ میں مجھے کہا تھا کہ تجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں' وہ کہاں ہے اور کیسا ہے۔"

"پچھلے دنوں مجھے پتہ چلا تھا وہ بھاول پور میں ہے۔ پہلے وہ لوہار تھا پر اب لوہار کا دھندا چھوڑ کر غلہ منڈی میں دھڑوائی لگ گیا ہے۔ میرے بچے بھی اس کے ساتھ ہی ہیں۔ برسوں سے میں نے انھیں نہیں دیکھا۔" رحمتے کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ "بہت یاد آتے ہیں۔ اب تو اونچے ہو گئے ہوں گے۔ جانے کیسے لگتے ہوں گے۔"

"تو چلی تو جائے گی' پر تیرا گھر والا تجھے اپنے پاس رکھنے پر راضی ہو جائے گا؟" رحیم داد نے اپنے شبے کا اظہار کیا۔ "اسے پتہ ہے تو شاہ جی کے کوٹ میں برسوں رہ چکی ہے۔ نہ بھی پتہ ہو تو شاہ جی کی نشانی تیرے یہ تینوں چھوہرے تو موجود ہی ہیں۔"

"اسے پتہ ہے۔ سب کچھ پتہ ہے۔ پر وہ مجھے اپنے پاس رکھ لے گا۔" رحمتے نے رحیم داد کو یاد دلایا۔ "میں نے تجھے ایک بار بتایا بھی تھا۔ وہ مجھے لینے شاہ جی کے پاس آیا تھا۔ پر شاہ جی نے صاف انکار کر دیا۔ مجھے اس سے ملنے بھی نہیں دیا۔"

"مجھے تو نہیں لگتا اتنی لمبی مدت گزر جانے کے بعد وہ تجھے اپنی گھر والی بنا کر رکھ لے گا۔" رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔ "وہ مرد ہے۔ مرد کی کچھ غیرت اور آن ہوتی ہے۔"

"غیرت اور آن کی سوچے گا تو زندگی بھر رنڈوا ہی رہے گا۔"

"رنڈوا کیوں رہے گا؟ دوسرا ویاہ نہیں کر سکتا۔ میرا تو وچار ہے اس نے اب تک کسی کڑی سے ویاہ کر بھی لیا ہو گا۔"

"میں نوں پتہ ہے اس نے اب تک ویاہ نہیں کیا۔" رحمتے کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "وہ دوسرا ویاہ کر بھی نہیں سکتا۔ ویاہ کرنا کوئی مخول ہے۔ کوئی کڑی اسے مفت تو نہیں مل جائے گی۔ اس کا پیو پورا پورا مول لے گا۔ بھاری سمجھاوا مانگے گا۔"

"کتنا سمجھاوا مانگے گا؟"

"پندرہ ہزار سے کم سمجھاوا لیے بنا کوئی بھی اپنی بٹی کا ویاہ نہیں کرے گا۔" رحمتے نے رحیم داد کو بتایا۔ "میرا گھر والا تو اب ادھکڑ ہو گیا ہے۔ سر کے بال بھی کہیں کہیں سے چٹے ہو گئے ہیں۔ میں نے اس کے بارے میں یہی سنا ہے۔ جتنی عمر زیادہ ہو جاتی ہے اتنا ہی زیادہ سمجھاوا لیا جاتا ہے۔ بڈھے سے تو کوئی کوئی اپنی بٹی کا ویاہ کرنے کے لیے ۲۰ ہزار سے بھی زیادہ مانگتے ہیں۔" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "میرا گھر والا غریب دھڑوائی ہے۔ غلہ منڈی سے تو اتنی ہی مزدوری ملتی ہو گی کہ مشکل سے اپنا اور اپنے دونوں نکوں کا پیٹ پال سکے۔ وہ ویاہ کرنے کے لیے وہٹی کے پیو کو پندرہ ہزار روپے سمجھاوا کہاں سے دے گا۔"

"یہ سمجھاوا تو بٹی کو بیچنے کا سیدھا سیدھا بیوپار ہے۔" رحیم داد جل کر بولا۔ "ایویں ہی ریت بنا رکھی ہے۔"

"ایسا تو جی کرنا ہی پڑتا ہے۔ پہلے سے جو ریتاں رسماں چلی آ رہی ہیں انھیں کیسے چھوڑا جا سکتا ہے۔"

"مطلب یہ کہ تو اپنے گھر والے کے پاس چلی جائے گی اور وہ تجھے اپنے پاس رکھ بھی لے گا۔" رحیم داد نے بات مختصر کرتے ہوئے کہا۔

"خوشی خوشی رکھ لے گا۔ مجھ سے اسے ہر طرح کی مدد ملے گی۔ میں اس کا بازو بن کر رہوں گی۔"

"تیرے ساتھ تیرے تینوں چھوہروں کو بھی وہ رکھ لے گا؟"

"رکھ ہی لے گا۔" وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ "یہ اس کی روٹی تو نہیں کھائیں گے۔ میں بھی کہیں کام دھندے سے لگ جاؤں گی۔ خود بھی کھاؤں گی' اپنے بچوں کو بھی کھلاؤں گی۔"

"ایسا کر بچوں کو شاہ جی کے پاس پہنچا دے۔" رحیم داد نے مسکرا کر رحمتے کو چھیڑا۔

"چوہدری تو کیسی گلاں کر رہا ہے۔" وہ تنک کر بولی۔ "وہ کبھی ان کو نہیں رکھے گا۔ اس نے کبھی ان کو اپنا نہیں سمجھا۔ ان کی طرح اور جانے کتنے چھوہرے چھوہریاں ہیں۔" اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ "تو شاہ جی کی گل چھوڑ۔ یہ بتا' تجھے کب یہاں سے جانا ہے؟"

"میں تو کل چلا جاؤں گا۔ میرا منیجر نادر خاں آیا ہوا ہے۔ ادھر بٹائی شروع ہونے والی ہے۔ پر میرے واپس جانے سے تجھے کیا لینا؟"

"میں بھی تیرے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔ تو نے مظفر گڑھ ہی کے رستے سے لوٹنا ہے ناں؟"

"ہاں' اسی رستے سے جاؤں گا جس سے آیا تھا۔" رحیم داد نے بتایا۔

"تب تو ٹھیک ہے۔ مجھے ملتان کے ٹیشن پر چھوڑ دینا۔ میں وہاں سے بھاول پور چلی جاؤں گی' تو اپنے پنڈ چلا جانا۔ ٹھیک رہے گا ناں؟"

"ٹھیک تو رہے گا۔ پر سردار سے پوچھ لے۔"

"اس کی فکر نہ کر۔" رحمتے بولی۔ "کل وہ آئے گا تو میں اس سے ایک بار فیر بات کرلوں گی۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر رحمتے زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکی۔ "تو یہ طے رہا میں کل تیرے ساتھ ہی چلوں گی۔" اس نے گردن کو خم دے کر رحیم داد کو خاص ادا سے دیکھا۔ "ادھر میں بالکل اکیلی ہوں۔ سردار تو صبح سے پہلے نہیں لوٹے گا۔ آج میں ادھر ہی ٹھیر جاتی ہوں۔" اس کے انداز میں لگاوٹ تھی۔

مگر رحیم داد کا دماغ منتشر تھا۔ اس نے رکھائی سے کہا۔ "نہیں، اب تو جا کر اپنے بچوں کو دیکھ۔ تجھے کل صبح چلنا ہے تو تیاری بھی کرنی ہوگی۔"

رحمتے کا چہرہ دھندلا پڑ گیا۔ رخسار کا سیاہ مسا بھوزے کی مانند بدنما نظر آنے لگا۔ وہ خاموشی سے مڑی اور بوجھل قدموں سے آہستہ آہستہ اندھیرے میں گم ہو گئی۔ رحیم داد بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ اٹھا اور سونے کے لیے اپنے بستر کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ کوٹلہ ہرکشن واپس جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے سردار مراد خاں کا انتظار تھا۔

مراد خاں شاہانی رات کے پچھلے پہر واپس آگیا، مگر سویرے سویرے چلا بھی گیا۔ رحیم داد کو یہ اطلاع ملی تو وہ سخت حیرت زدہ ہوا۔ کسی نوکر کو علم نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ کاردار کریم بخش رادھانی بھی اس کے ہمراہ تھا۔ وہ موجود ہوتا تو مراد خاں کے بارے میں صحیح اطلاع دیتا۔

رحیم داد حیران و پریشان اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ نادر خاں بھی موجود تھا لیکن اس نے نادر خاں سے دیر تک بات نہیں کی۔ کچھ دیر بعد وہ کھڑا ہو گیا اور کمرے سے چلا گیا۔ یہ موسم گرما کی ایک ویران صبح تھی۔ حویلی کے وسیع احاطے میں سناٹا تھا۔ سورج گھنے درختوں کی آڑ سے جھانک رہا تھا۔ دم بہ دم گرم ہوتی ہوئی چمکیلی دھوپ پھیلتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ فضا میں تمازت گھلتی جا رہی تھی۔

رحیم داد دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ پھاٹک پر پہنچا۔ یہ دیکھ کر اسے سخت تعجب ہوا کہ سردار مراد خان شاہانی کی جیپ ایک درخت کے نیچے کھڑی ہے۔ ڈرائیور نزدیک ہی فرش پر بیٹھا تھا۔ رحیم داد پھاٹک سے گزر کر اس کے پاس پہنچا۔ ڈرائیور ہڑبڑا کر اٹھا اور نظریں جھکا کر ادب سے بولا۔

"سئیں خیرائے! خوش ہو، راضی ہو۔ خیر سلا اے۔ چوکھڑے ہو۔ تکڑے ہو۔"

رحیم داد نے اسے مزید بولنے کا موقع نہیں دیا۔ "یہ بتا، سردار کدھر ہے، کب آیا اور کہاں گیا ہے؟"

اس نے تابڑتوڑ کئی سوالات کر ڈالے۔

"سئیں! وہ پچھلی رات دیر سے لوٹا تھا۔" ڈرائیور نے بتایا۔ "سویلے سویلے سردار حکم خاں ڈھانڈلہ ادھر آیا۔ وہ اسے اپنی کار میں بٹھا کر لے گیا۔ آگے کا مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

رحیم داد آگے نہیں گیا۔ اس نے ابھی ناشتا نہیں کیا تھا۔ وہ ناشتے کے لیے دالان میں داخل ہوا تھا کہ رحمتے ایک کمرے سے نکل کر سامنے آگئی۔ اس نے نہا دھو کر اجلا لباس پہنا تھا۔ چہرے پر نکھار تھا۔ وہ ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد نے اس سے بھی مراد خاں کے بارے میں استفسار کیا۔ "رحمتے! تجھے پتہ ہے، سردار واپس آگیا ہے۔ پر اب وہ کدھر گیا ہے اور کب تک واپس آئے گا؟"

"یہ تو میں نوں پتہ نہیں وہ کب تک لوٹے گا۔" وہ تیکھے انداز میں بولی۔ "پر وہ رات ہی کو آگیا تھا اور صبح بہت تڑکے کہیں چلا بھی گیا۔"

"اس کے ساتھ تیری گل بات ہوئی تھی؟"

"اس نے مجھے رات ہی کو بلوا لیا تھا۔" رحمتے نے نظریں جھکا کر شرمانے کی کوشش کی۔ "بات کی تو تھی۔" اس کے انداز میں بے نیازی تھی۔ "پر وہ راضی نہیں ہوا۔ کہتا تھا، میں نے تجھے نہیں چھوڑنا۔ تو میرے ساتھ ہی رہے گی۔"

"پر تو نے آگے کے لیے کیا سوچا؟"

"میں نے جی کیا سوچنا۔" رحمتے نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "بات یہ ہے چوہدری" وہ انگلی سے سر کے بال کریدنے لگی۔ "جب وہ اتنے پیار سے روکے تو میں اسے چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔ وہ نراض ہو جائے گا ناں۔"

رحیم داد کچھ نہیں بولا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ رحمتے میں اسے سلطری کی جھلک نظر آئی اور اس کا انجام بھی یاد آیا۔ مگر اس نے اپنے رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔

رحمتے نے رحیم داد کو گم صم پایا تو آہستہ سے بولی۔ "مجھے اب جانا ہے۔ کئی کام کرنے ہیں۔" یہ کہتے ہی وہ پلٹی اور آگے بڑھ گئی۔

رحیم داد مرار خاں شاہانی کی واپسی کا منتظر تھا۔ مراد خاں دوپہر کو واپس آیا۔ کھانا اس نے رحیم داد کے ساتھ ہی کھایا۔

رحیم داد بستی نظام کی صورت حال جاننے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے مراد خاں سے پہلا سوال اسی سلسلے میں کیا۔ "سردار! بستی نظام میں مزارعوں کی گڑبڑ کا کیا حال ہے؟"

"ادھر تو اب ٹھیک ٹھاک ہے۔" مراد خاں نے بتایا۔ "جتنے مزارعوں اور کاموں پر گڑبڑ کرنے

کر شبہ تھا، رات کو گھروں پر چھاپے مار کر سب کو اٹھا لیا گیا۔ ملا احمد بخش بھی ادھر ہی تھا۔ پر وہ گرفتار نہیں ہو سکا۔ رات کے اندھیرے میں نکل گیا۔ پر کب تک گرفتاری سے بچے گا۔ جلد ہی پکڑا جائے گا۔ میں نے تجھے یہ نہیں بتایا، بھکر سے ایک تھانے دار بھی پولیس پارٹی کے ساتھ پہنچ گیا ہے۔"

"یہ تو نے چنگی خبر سنائی۔" رحیم داد بے ساختہ بولا۔ "پر تو صبح حکم خاں ڈھانڈلہ کے ساتھ کہاں گیا تھا؟"

"بستی نظام میں تو گڑبڑ گرفتاریوں کے بعد ختم ہو گئی۔ پر شریفاں والی میں بڑھتی ہوئی لگتی ہے۔ ادھر حکم خاں ڈھانڈلہ کی زمین داری ہے۔ وہ اسی کے بارے میں گل بات کرنے مجھے اپنی حویلی لے گیا تھا۔ ڈھانڈلوں کے علاوہ نوانی اور شاہانی زمیں دار بھی ادھر موجود تھے۔ میں اب تک ان کی ساتھ ہی تھا۔ مزارعوں کی گڑبڑ ہی کے بارے میں بات ہوتی رہی۔"

رحیم داد حرف مطلب پر آگیا۔ "سردار! میں اب تیرے پاس نہیں ٹھہر سکوں گا۔ میرا منیجر نادر خاں مجھے لینے آیا ہے۔"

"کب آیا وہ؟" مراد خاں نے حیرت سے پوچھا۔ "فکر کی کوئی گالہہ تو نہیں؟"

"نہیں، فکر کی کوئی گل بات نہیں۔" رحیم داد نے بتایا۔ "فصل کی بٹائی ہونی ہے۔ اس کے لیے میرا ادھر موجود ہونا ضروری ہے۔"

"کب تک تیرا جانے کا ارادہ ہے؟"

"روٹی کھانے کے بعد ہی چلا جاؤں گا۔" رحیم داد نے اسے مطلع کیا۔

"جیسی تیری مرضی۔" مراد خاں نے اسے روکنے پر اصرار نہیں کیا۔

"میری جیپ تجھے بھکر پہنچا دے گی۔ وہاں سے ٹرین پکڑ لینا۔"

رحیم داد نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے نادر خاں کو بلوا جیپ میں اپنا سامان رکھوایا اور کمرے سے باہر نکلا۔ سردار مراد خاں شاہانی اس کے ہمراہ تھا۔ ا نے رحیم داد کو گرم جوشی سے گلے لگایا اور رخصت کیا۔ رحیم داد اور نادر خاں جیپ میں بیٹھ گئے شاہانی کا ایک مسلح کارندہ بھی جیپ میں موجود تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ بندوق سنبھالے چوکس تھا۔

☆

جیپ کچے راستوں پر ہچکولے کھاتی ہوئی دوڑنے لگی۔ گاؤں کے گلی کوچوں سے گز

اور بستیوں کے درمیان سے آگے، اور آگے بڑھتی گئی۔ رحیم داد نے دیکھا کہ جگہ جگہ کسانوں کی ٹولیاں جمع ہیں۔ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی تھے۔ جیپ دیکھ کر وہ زور زور سے نعرے لگاتے۔

سرڈیون، جان ڈیون
ٹکا ٹکس نہ ڈیون!

ان کی آنکھیں سرخ تھیں۔ گلے کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ چہرے درشت تھے۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ رحیم داد دھڑکتے دل سے ان کے بپھرے ہوئے تیور دیکھتا رہا اور نعروں کی گھن گرج سنتا رہا۔

جیپ آگے بڑھتی گئی۔ ایک بستی سے گزری تو مردوں، عورتوں اور بچوں کے ایک ہجوم نے اسے روک لیا۔ ڈرائیور جہاندیدہ اور معاملہ فہم آدمی تھا۔ اس نے بہت ہوشیاری سے کام لیا۔ ہجوم کو ہر طرف سے یلغار کرتے دیکھ کر اوسان بجا رکھے۔ بپھرے ہوئے لوگوں کو روند کر تیزی سے آگے نکل جانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ رفتار سست کر دی اور کارندے سے بندوق لے کر سیٹ کے نیچے اس طرح ڈال دی کہ نظر نہ آئے۔ اس نے بریک لگائے۔ جیپ ٹھہر گئی۔ ہجوم اس کے چاروں طرف اکٹھا ہو کر زور زور سے نعرے لگانے لگا۔ ایک پتھر بھی جیپ کے مڈگارڈ پر آکر لگا۔ رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے ہجوم کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ کسانوں کی نفرت اور سرکشی بیٹ کے علاقے میں اس قدر شدت اختیار کر چکی ہے۔

مظاہرین اسے کسی سردار یا بڑے زمیں دار کی جیپ سمجھ کر ٹوٹ پڑے تھے۔ ان کے غضب ناک چہروں اور اوپر اٹھے ہوئے ہاتھوں سے غم و غصہ عیاں تھا۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ جیپ کو توڑ پھوڑ کر آگ لگا دیں گے۔ اس نازک مرحلے پر ایک بار پھر ڈرائیور نے اپنے حواس بحال رکھے۔ مصلحت اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گردن باہر نکالی۔ ایک نوجوان ہجوم کے آگے آگے تھا۔ ڈرائیور نے اسے نرم لہجے میں مخاطب کیا۔

"سئیں! ہم تو تیرے مہمان ہیں۔ رات منگری سے آئے تھے۔ اب واپس جاتے ہیں۔ ہمارا کسی سے کوئی جھگڑا نہیں۔ ہمیں اپنے گھر جانے دے۔ رب راضی ہو۔"

ہجوم میں سے کئی ملی جلی آوازیں ابھریں۔ "اگر تساں پردیسی ہو۔ ادھر کے زمیں دار بھی نہیں، تب ہمارا کوئی جھیڑا نہیں۔ لگاؤ ہمارے ساتھ نعرہ۔" ہجوم سے نعرے بلند ہوئے۔

سرڈیون، جان ڈیون

ٹکا ٹکس نہ ڈیون!

ڈرائیور نے ان کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر نعرہ لگایا۔ رحیم داد، نادر خاں اور مراد خاں کے کارندے نے بھی نعرہ لگایا۔ بچوں اور جوانوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ان کے چہروں کی درشتی مٹنے لگی۔ آنکھوں میں چراغ جھلملانے لگے۔ ہونٹوں پر تبسم ہویدا ہوا۔ ہجوم آہستہ آہستہ چھٹنے لگا۔

ڈرائیور نے مسکرا کر اونچی آواز سے کہا۔

"فی امان اللہ۔ بالیں بچیں، یاریں دوستیں سب کو خیر سلا ڈیوا ہے۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر لہرایا۔ بکھرے ہوئے ہجوم سے بھی ہاتھ بلند ہوئے اور لہرانے لگے۔ راستہ صاف ہو گیا۔ ڈرائیور نے ایکسیلیٹر دبایا۔ جیپ رفتہ رفتہ آگے بڑھنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے ہجوم جیپ کے پہیوں سے اٹھتے ہوئے گرد کے بادلوں میں اوجھل ہو گیا۔

جیپ راستوں کے پیچ و خم سے گزرتی، ہچکولے کھاتی پختہ سڑک پر آگئی۔ راہ میں اور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ مگر رحیم داد سہما ہوا بیٹھا رہا۔ بھکر اسٹیشن پہنچ کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔

ٹرین کے لیے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ٹرین اسٹیشن پر آکر ٹھہری۔ نادر خاں نے سامان رکھوایا۔ دونوں سوار ہوئے اور مظفر گڑھ کے راستے منٹگمری کے لیے روانہ ہو گئے۔

۳۷

دسمبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ سردی اچانک بڑھ گئی تھی۔ دن ڈھلتے ہی کہر کا دھند لکا کوٹلہ ہر کشن پر پھیلنا شروع ہو جاتا۔ سورج غروب ہونے پر دھند اور گہری ہو جاتی۔ سرما کی ایک ایسی ہی سرد اور کہر آلود شام تھی۔ رحیم داد اپنے منیجر نادر خاں کے ساتھ کمرے میں بیٹھا گندم کی فصل کے بارے میں بات چیت کر رہا تھا جس کی بوائی ہو چکی تھی۔ اب کھیتوں میں گندم کے نرم و نازک پودے ہوا کے جھونکوں سے لہراتے تھے۔ ان کی ہریالی آنکھوں کو فرحت اور تازگی بخشتی تھی۔

رحیم داد سہ پہر کو پیراں والہ سے لوٹا تھا۔ وہ احسان شاہ سے ملنے گیا تھا۔ احسان شاہ سے اس کی ملاقات بھی ہوئی مگر یہ ملاقات ادھوری رہی۔ کھل کر بات کرنے کا موقع نہ ملا۔ میاں سبحان پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ احسان شاہ اس کے ساتھ گفتگو میں ایسا الجھا ہوا تھا کہ رحیم داد پر پوری توجہ نہ دے سکا۔ دونوں ملکی سیاست کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور رحیم داد سیاسی اتار چڑھاؤ سے نابلد اور بے خبر تھا۔ لہٰذا وہ خاموش بیٹھا ان کی گفتگو سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ دوپہر کا کھانا اس نے احسان شاہ اور میاں سبحان کے ساتھ کھایا۔ لیکن کھانے سے فارغ ہونے کے بعد احسان شاہ زیادہ دیر اپنی حویلی میں نہ ٹھہرا۔ میاں سبحان کے ہم راہ لاہور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رحیم داد بھی پیراں والہ میں نہ رکا۔ کوٹلہ ہر کشن واپس آگیا۔

کمرے میں انگیٹھی دہک رہی تھی۔ انگاروں کی لال لال روشنی میں رحیم داد اور نادر خاں کے چہرے دمک رہے تھے۔ نادر خاں نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری، اپنی ایک تجویز ہے۔ کئی روز سے اس کے بارے میں بات کرنے کی سوچ رہا تھا۔"

"ضرور بات کر۔" رحیم داد مسکرا کر بولا۔ "پر اس سے پہلے بوتل اور گلاس منگوا۔ تھکا ہوا ہوں۔ سردی بھی آج زیادہ ہی ہے۔ طبیعت ذرا گرم ہو تو آرام سے گل بات ہو گی۔"

نادر خاں نے کسی ملازم کو طلب نہیں کیا' خود اٹھ کر باہر گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس تھا۔ وہسکی کی بوتل کمرے ہی میں موجود تھی۔ نادر نے رحیم داد کی ہدایت پر لوہے کی الماری کھولی۔ اندر سے بوتل نکالی اور میز پر رکھ دی۔ میز پر گلاس اور جگ پہلے سے رکھے تھے۔

نادر خاں نے ادب سے پوچھا۔ "اور کوئی حکم جی؟"

رحیم داد نے بوتل کھولی۔ پیگ بنا کر بڑا گھونٹ بھرا۔ مونچھوں کے بھیگے ہوئے بال ہاتھ سے صاف کیے۔ "اب بول' تجھے کیا کہنا ہے؟"

"کہنا کیا ہے جی' یہ تو چوہدری تجھے پتہ ہی ہے' اپنے پاس بہت سی پڑیلی زمین ہے۔" نادر خاں نے بتایا۔ "اس غیر مزروعہ زمین کے کچھ حصے پر جھنگر ہے۔ کہیں کھڈل ہے کہیں کھڑ دڑ۔ پر ہے گھسو۔" اس نے رحیم داد کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔ "ایسی زمین کو میرا بھی کہتے ہیں۔"

"یہ تو مجھے بھی پتہ ہے۔ آگے بتا۔"

"تب تو تجھے یہ بھی پتہ ہو گا۔ ایسی زمین کار آمد اور زرخیز ہوتی ہے۔ اس پر آسانی سے ہل چلایا جا سکتا ہے۔ ایسی زمین میں ریت کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ کنک اور کپاس کی فصلوں کے لیے ٹھیک رہتی ہے۔"

"مجھے یاد ہے' تو نے پڑیلی زمین پر کھیتی واڑی کرنے کی گل جمیلہ کے سامنے بھی کی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب تو نیا نیا مینجر لگا تھا۔ بعد میں تو نے اس کے بارے میں کچھ کہا ہی نہیں۔"

رحیم داد نے منہ بگاڑ کر نادر خاں کو دیکھا۔ "تب تو بہت وڈی وڈی گلاں کرتا تھا۔"

"میں نے تو جی جمیلہ سے اس بارے میں کئی بار کہا۔" نادر خاں نے صفائی پیش کی۔ "پر اس پر تو جی سکول اور ڈسپنسری بنانے کی دھن سوار تھی۔ اس طرف اس نے دھیان ہی نہیں دیا۔ بغیر روپیہ لگائے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ اس پر کچھ خرچ کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔"

"اب تجھے کیا کہنا ہے۔ ٹھیک ٹھیک بتا۔"

"میں نے یہ بتانا ہے جی۔ جن دنوں تو بھکر میں سردار مراد خاں کے پاس ہوتا تھا' میں نے مزارعوں اور کمیوں کو ویگار پر لگا کر جھنگر صاف کرا دیا تھا۔ پر پچھلی برسات میں فیر گھاس اور جنگلی بوٹے اگ آئے۔ ان کو تو آسانی سے صاف کرایا جا سکتا ہے۔ پر اب اس کے لیے کچھ نہ کچھ کر ہی پڑے گا۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "کتنی زمین ہو گی؟"

"چھ مربعے سے اوپر ہی ہو گی۔"

"یہ تو بہت ہوئی۔" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"ہاں جی' کافی زمین ہے۔ اسے قابل کاشت بنا لیا جائے تو اپنی زمیں داری آٹھ سو ایکڑ کے لگ بھگ ہو جائے گی۔" نادر خاں نے کارگزاری دکھانے کی کوشش کی۔ "ابھی تو جی میں زمیں داری اور بڑھاؤں گا۔ بات یہ ہے جی' جب تک جمیلہ ادھر تھی' زمیں داری پر لگانے کے لیے اپنی پاس روپیہ ہی کہاں تھا۔ پہلی بار دو فصلوں کی آمدنی اپنے ہاتھ میں آئی ہے۔ اب تو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔"

"میں تو کہتا ہوں کنک اور کپاس کی فصلوں کی بجائے پڑیلی پر آم اور مالٹے کے باغ لگا۔" رحیم داد نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "اس بارے میں تیرا کیا وچار ہے؟"

"آم اور مالٹے کے باغ بھی ٹھیک رہیں گے۔" نادر خاں نے رحیم داد کی تجویز سے اتفاق کیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی مشکلات کا بھی کھل کر اظہار کیا۔ "پر باغ لگانے سے پہلے یہ سوچنا ہو گا کہ ربیع اور خریف کی فصلوں کا جو مالیہ اور آبیانہ دیا جاتا ہے باغات کے لئے حسب ضابطہ زیادہ شرح سے دینا ہو گا اور اگلے برس ہی سے دینا ہو گا۔"

"لیکن باغوں سے آمدنی بھی تو فصلوں سے زیادہ ہو گی۔"

"چار برس سے پہلے آمدنی کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔" نادر خاں نے وضاحت کی۔ "مطلب میرے کہنے کا یہ ہے' اس سے پہلے درختوں میں پھل نہیں آتے۔ آمدنی تو پھلوں ہی سے ہو گی ناں۔"

"پر چار برس بعد تو ہر برس پابندی سے آمدنی ہو گی۔" رحیم داد ہنوز باغ لگانے پر مصر تھا۔ اس کے ذہن پر بیت کے مزارعوں کی شورش کا خوف غالب تھا۔ اور اس نے اپنے خدشات کا اظہار بھی کر دیا۔ "کھیتی واڑی پر خرچ بھی زیادہ آئے گا۔ ساتھ ہی مزارعوں کا بھی چکر چلے گا۔ باغات کے معاملے میں ایسا کوئی بکھیڑا نہیں ہو گا۔"

"باغ ہی لگانا ٹھیک رہے گا۔" نادر خاں نے مزید الجھنے کی کوشش نہیں کی۔

"باغ تو لگائے جا سکتے ہیں۔" رحیم داد کچھ دیر خاموش رہا' پھر نشے کی جھونک میں اچانک کھل کھلا کر ہنسا۔ "پر تو نے یہ بھی سوچا' پانی کہاں سے ملے گا؟"

"میں نے جی اس بارے میں پہلے ہی سوچ رکھا ہے۔"

"کیا سوچ رکھا ہے تو نے؟" رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر نادر خاں کی جانب دیکھا۔

"میں نے جی محکمہ نہر کے ایک اوور سیئر سے بات کی تھی۔" نادر خاں نے بتایا۔ "چوہدری' تجھے پتہ ہے' ہمیں تو راجباہ شرکی سے پانی ملتا ہے۔ اس کے لیے ہمارے چار موگھے ہیں۔"

"ان چار موگھوں سے تو اپنی فصلوں کو بھی پوری طرح پانی نہیں ملتا۔"

"پہلے میری پوری گل سن لے۔" نادر خاں نے فوراً وضاحت کی۔ "ایک موگھا ہمیں اور مل جائے تو کام بالکل ٹھیک بن جائے گا۔ بہت شان دار باغ لگ سکتے ہیں۔"

"سوچا تو بہت ٹھیک ہے تو نے۔" رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "پر اوور سیئر نیا موگھا کھولنے کے لیے تیار ہو جائے گا؟ یہ سوچ لے' کام آسان نہیں ہے۔"

"کام بن تو جانا چاہیے جی۔ پر اس کی مٹھی گرم کرنی ہوگی۔ میں ایسا کرتا ہوں' اوور سیئر کو کل شام ادھر بلوا لوں گا۔ اسے بھی پینے پلانے کا چسکا ہے" وہ زیر لب مسکرایا۔ "اس کے ساتھ تیری چنگی شام گزرے گی۔ معاملے کی بات بھی ہو جائے گی۔"

"تو بھی موجود رہنا۔" رحیم داد بولا۔ "کتنے میں وہ تیار ہو جائے گا؟"

"میرا خیال ہے' دو ہزار میں اوور سیئر اپنا کام کر دے گا۔"

"کل نہیں' تو اسے پرسوں بلا۔"

"پرسوں ہی بلا لوں گا۔" نادر خاں نے جواب دیا اور پہلو بدل کے بولا۔ "میں نے جی اب جا کر روٹی کھانی ہے۔"

"کیا جنت واپس آ گئی؟"

"ہاں جی۔" نادر خاں کھڑا ہو گیا۔ "وہ دوپہر کو آ گئی تھی۔"

"پر وہ گھر میں گھسی کیوں بیٹھی ہے' ادھر نہیں آئی؟" رحیم داد نے مسکرا کر دریافت کیا۔

"وہ ایسا ہے جی۔" نادر خاں نے نظریں جھکا کر آہستہ سے کہا۔ "جنت کے بال بچہ ہونے والا ہے۔ ایسے میں تیرے سامنے آتے ہوئے شرماتی ہے۔" رحیم داد کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ اس نے مزید کچھ نہیں کہا۔

نادر خاں چلا گیا۔

رحیم داد کمرے میں اکیلا بیٹھا وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ رات تاریک اور زیادہ سرد ہو گئی۔ رحیم داد نے گلاس خالی کیا۔ نوکر کو بلایا اور کھانا لانے کے لیے کہا۔

نوکر نے گلاس' جگ اور بوتل اٹھا کر میز صاف کی' کھانا لگایا اور دہلیز کے پاس نظریں جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا قد اونچا اور رنگ گہرا سانولا تھا۔ وہ جوان تھا مگر اپنی عمر سے زیادہ نظر آتا تھا۔ اس کی بجھی بجھی آنکھوں سے کچھ ایسی ویرانی جھلکتی تھی کہ رحیم داد متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ رحیم داد نے اسے غور سے دیکھا۔

"میں نے تجھے پہلی بار ادھر دیکھا ہے۔ لگتا ہے تو نیا نیا لگا ہے؟"

"میں جی پچھلے ہی مہینے ادھر لگا ہوں۔"

"تیرا نام کیا ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"رب نواز ہے جی!" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تیرا ویاہ ہو گیا؟" رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔

"ویاہ تو ہو گیا ہے جی!" رب نواز سر جھکا کے بولا۔ "پر گھر والی ادھر کیر میں ہے۔ کیر میرا پنڈ ہے۔ نور شاہ کے پاس ہی ہے۔ میں مزارع ہوتا تھا جی' پر زمیں دار نے ناراض ہو کر بے دخل کر دیا۔ یہ پچھلے برس کی گل ہے۔"

رحیم داد کھانا کھاتا رہا۔ رب نواز دہلیز کے قریب فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے لقمہ چباتے ہوئے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا۔ "تو جانگلی ہے؟"

"ہاں جی۔" اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر اعتراف کیا۔

"تیری گھر والی تو ادھر اکیلی ہی ہے ناں؟ تو اسے بھی ادھر بلا لے۔" رحیم داد نے کہا۔ "حویلی میں لگ جائے گی۔"

"بلا لوں گا جی' بالکل بلا لوں گا۔" وہ خوش ہو کر بولا۔

رحیم داد کھانے سے فارغ ہو چکا تھا۔ رب نواز برتن اٹھا کر چلا گیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

☆

دن ڈوبتے ہی رحیم داد کے پاس نادر خاں آیا۔ اس کے ہم راہ محکمہ نہر کا اوور سیر بھی تھا۔ اس کا نام اسلم تھا۔ قد میانہ تھا مگر جسم پر خوب چربی چڑھی ہوئی تھی۔ رحیم داد اس وقت مہمان خانے کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ وہ اسلم کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اسلم پہنچا تو وسکی کی نئی بوتل کھلی۔ اسلم نے تکلف سے کام نہیں لیا۔ نادر خاں خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد اور اسلم نے دو دو پیگ لگائے اور ہنس ہنس کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

نادر خاں نے اوور سیر کو سرخوشی کے عالم میں پایا تو فوراً حرف مطلب زبان پر لایا۔ "اسلم

صاحب! اپنے کام کے بارے میں کیا سوچا؟"

"یاد تو پڑتا ہے تو نے نیا موگھا کھولنے کی گل کی تھی۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"کب تک ہو جائے گا یہ کام!" اس دفعہ رحیم داد نے پوچھا۔ "پانی ملے تو اپنے مالٹے اور آم کے باغوں کا کام شروع ہو۔"

"نیا موگھا کھولنا تو بہت مشکل ہے۔" اسلم جھٹ سنجیدہ ہو گیا۔

"کوئی مشکل نہیں۔" رحیم داد نے اصرار کیا۔ "تو چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

"ایسی گل نہیں۔" اسلم اور سنجیدہ ہو گیا۔ "چوہدری، تجھے یہ تو پتہ ہی ہے۔ آگے چھوٹی چھوٹی زمینوں والے حصے دار ہیں۔ کسی کے پاس ۲۵ کلا سے زیادہ زمین نہیں۔ سچ پوچھ تو کم زمین رکھنے والے بہت زیادہ ہیں۔ وہ پہلے ہی پانی کی کمی کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔"

"اپنے چار موگھے ہیں۔ ایک اور بڑھ جائے گا تو کیا فرق پڑے گا۔" نادر خاں نے مسکرا کر کہا۔

"بہت فرق پڑے گا۔" اسلم نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشس کی۔ "گندم کی فصل کے لیے آج کل ویسے ہی پانی کی بہت مانگ ہے۔ پانی نہ ملا تو آگے کے چھوٹے زمیں دار تباہ ہو جائیں گے۔ تو نے یہ نہیں سوچا۔"

"کوئی تباہ شباہ نہیں ہونے کا۔" رحیم داد نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "میں ان کی زمینیں خرید لوں گا۔ اپنا مزارع لگا لوں گا۔ زیادہ ہی مزے میں رہیں گے۔ اسلم، تو ان کی فکر نہ کر۔"

"چوہدری تجھے یہ تو پتہ ہے، کسان کو اپنی زمین سے کتنا پیار ہوتا ہے۔" اسلم نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "ایسے آسانی سے وہ اپنی زمینیں چھوڑنے والے نہیں۔ کئی تو ان میں ایسے بھی ہیں جو اپنی زیر کاشت زمین بڑھانا چاہتے ہیں مگر پانی کی کمی کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے۔ روز ہی اس بارے میں میرے پاس آتے رہتے ہیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنا کام نہیں بنے گا۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کام بنے گا، اور ضرور بنے گا۔" نادر خاں نے مداخلت کی۔ "اب تو اسلم صاحب سے تیری یاری ہو گئی۔ تیری بات خالی نہیں جائے گی۔ نیا موگھا ضرور کھلے گا۔" اس نے طے شدہ منصوبے کے مطابق جیب سے ہزار روپے نکال کر اوور سیر کے سامنے رکھ دیے۔ "یہ نذرانہ رکھ لے۔ کوئی اور خدمت اپنے لیے ہو تو بتا۔"

اوور سیر بے رخی سے بولا۔ "یہ اپنے ہی پاس رکھ۔"

"نادر، پانچ سو اور نکال۔ اسے پوری طرح خوش کر دے۔" رحیم داد جھوم کر بولا اور مڑ کے اسلم کی جانب متوجہ ہوا۔ "دیکھ، اب انکار نہ کرنا۔ گلاس اٹھا، اسے خالی کر۔ تو نے ابھی کچھ نہیں لگائی۔"

"چوہدری مجھے سمجھنے کی کوشش کر۔" اسلم نے سنجیدگی سے کہا۔ "تجھے پتہ ہے میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے اوپر بھی انجینئر اور ایس ڈی او بیٹھے ہیں۔ بات ان تک پہنچے گی۔ اسی لیے اوپر سے نیچے تک سب کا حصہ لگتا ہے۔ مجھے ان سب کو ماہانہ بھتا دینا پڑتا ہے۔" اس نے گلاس اٹھا کر چسکی لگائی۔ "پانی کم ملا تو آگے کے حصے دار اوپر عرضیاں لگائیں گے۔ شکایتیں کریں گے۔ وہ چپ کر کے تو نہیں بیٹھ جائیں گے۔"

رحیم داد نے نادر خاں کی جانب دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ "نادر پورے دو ہزار کر دے۔" وہ اسلم سے مخاطب ہوا۔ "اسلم! اب میں انکار نہیں سنوں گا۔ موگھا تو اب کھولنا ہی ہو گا۔"

اسلم خاموش رہا۔ نادر نے پانچ سو روپے اور ملا دیے۔ رحیم داد نے پورے دو ہزار روپے اٹھا کر اسلم کی قمیص کی جیب میں ڈال دیے۔ وہ پھر بھی خاموش رہا رحیم داد نے اپنا گلاس اس کے گلاس سے ٹکرایا اور ہنس کر بولا۔

"یار اسے بھی ختم کر اور اپنے لیے خود بنا۔ وڈا بنا۔"

اسلم نے گلاس ہونٹوں سے لگا کے چڑھا لیا۔ وہ بڑا دھاکڑ پینے والا تھا۔ دونوں دیر تک پیتے رہے نادر خاں اٹھ کر جا چکا تھا۔ اسلم نشے سے لہرا کر بولا۔ "چوہدری، تو اپنا یار ہے، جگر ہے۔" اس نے رحیم داد کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا اور اپنا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

رحیم داد نے گھونٹ بھر کر کہا۔ "اب تو یاری پکی ہو گئی۔ کام بھی اپنا پکا ہونا چاہیے۔"

"فکر نہ کر چوہدری۔ تیرا کام ضرور ہو گا اور بالکل پکا ہو گا۔ میں نیل دار لگا کر کل ہی تیرے لیے نیا موگھا کھلوا دوں گا۔ ایک سے کام نہ چلے تو دوسرا بھی کھلوا لینا۔ جب تک اسلم ادھر اوور سیر لگا ہے، تیری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ کیا سمجھا؟"

رحیم داد نے خوشی سے جھک کر اس کا منہ چوم لیا۔ "کیا بات ہے تیری اسلم! یار ہو تو ایسا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "ابھی تو ایک ہی موگھا کھول دے۔ آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔"

"جیسی تیری مرضی، میں نے تو کچھ نہیں کہنا۔"

"موگھا تو کھل ہی جائے گا۔" رحیم داد نے اسلم سے کہا۔ "پر ایسا نہ کرنا کہ ادھر کا رستہ ہی بھول جائے۔ جب بھی شام کو فرصت ملے، ادھر آجایا کر۔ میں اکیلا ہی ہوتا ہوں، تیرے ساتھ

پرلطف شام گزرے گی۔ جیپ تو موجود ہی ہے۔ ڈرائیور تجھے چھوڑ دے گا۔ تجھے لینے بھی جا سکتا ہے۔"

"اس کی فکر نہ کر۔ میرے پاس سرکاری جیپ رہتی ہے۔ ویسے ادھر آنے کے لیے تانگا بھی مل جاتا ہے۔" اسلم نے خمار آلود نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "تو اتنے پیار سے بلائے گا تو کیوں نہیں آؤں گا۔ ویسے ایک بات سن لے، دیسی یا کوئی دوسری اپنے سے نہیں چلتی۔ کسی زمانے میں ساوی کا رسیا تھا۔ پر اب وہ بالکل منہ کو نہیں لگتی۔"

رحیم داد نے گردن اونچی کی اور ہنس کر بولا۔ "میں احسان شاہ کے ساتھ بیٹھ کر پینے والا ہوں۔ تجھے یہ تو پتہ ہی ہوگا، وہ کسی اور چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ میں بھی صرف اسکاچ وسکی لگاتا ہوں۔ تو اطمینان رکھ۔" دونوں نے گلاس خالی کر دیے۔

نوکر نے خالی گلاس اور بوتل اٹھا کر کھانا لگا دیا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی اسلم واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک بار پھر رحیم داد کو یقین دلایا۔ "چوہدری، جب تو کہے گا، موگھا کھول دیا جائے گا۔ تو کہہ تو کل ہی کھلوا دوں؟"

رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابھی نہیں۔ آرام سے کام ہونا چاہیے۔ نادر جب کہے گا تب کھول دینا۔"

رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے نادر خاں کو بلوایا۔ اسلم سے رخصت ہوا اور سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے کی جانب روانہ ہو گیا۔

نادر خاں نے اسلم کو سنبھالا۔ اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے، آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ زبان سے پوری بات ادا نہیں ہو رہی تھی۔ نادر اسے مہمان خانے کے دروازے تک لے گیا۔ باہر کھڑی ہوئی جیپ میں اسلم بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔ جیپ آگے بڑھی اور کچے راستے پر دوڑنے لگی۔

صبح ناشتے کے بعد رحیم داد نے نادر خاں کے ہم راہ غیر مزروعہ اور بڑیلی زمین کا معائنہ کیا، مزارعوں اور کمیوں کو بیگار پر لگایا اور زمین قابلِ کاشت بنانے کا کام شروع کر دیا۔ جھاڑیاں صاف کی گئیں، جنگلی پودے نکالے گئے۔ زمین کو ہل چلا کر ہموار کیا گیا، وٹ بندی کی گئی۔ پودے سیراب کرنے کے لیے نالیاں بنائی گئیں۔

☆

اسلم اکثر شام کو آجاتا۔ رات گئے تک پینے پلانے کا سلسلہ چلتا۔ اور عام طور پر آدھی رات سے پہلے پہلے وہ رحیم داد کی جیپ میں بیٹھ کر واپس چلا جاتا۔ سنیچر کی شام کو وہ ضرور آتا۔ کبھی کبھار رات بہت زیادہ ہو جاتی تو مہمان خانے ہی میں ٹھہر جاتا۔ رحیم داد اور اسلم کے تعلقات روز بروز گہرے اور خوش گوار ہوتے گئے۔ بیگانگی اور اجنبیت دور ہوتی گئی، بے تکلفی بڑھتی گئی۔

زمین قابلِ کاشت ہو گئی تو رحیم داد نے اسلم کو مطلع کیا۔ چند ہی روز بعد اوور سیر اسلم کی ہدایت پر بیل داروں نے راجباہ شرقی میں نیا موگھا کھول دیا۔ موگھے کا پانی نالیوں میں دوڑنے لگا۔ زمین نرم اور پولی ہو گئی۔ رحیم داد نے ملتان اور لائل پور کے زرعی فارموں سے آم اور مالٹے کے عمدہ پودے منگوائے۔ آٹھ ہوشیار اور تجربہ کار مالی ملازم رکھے۔ انھوں نے بیس بیس فٹ کے فاصلے پر زمین کھود کر پودے لگا دیے۔ مارچ کے پہلے ہفتے میں باغ لگانے کا کام مکمل ہو گیا۔ یہ پھاگن کے دن تھے۔ درختوں اور پودوں میں نئی کونپلیں پھوٹتی تھیں۔ شگوفے کھلتے تھے۔ آم اور مالٹے کے پودوں میں بھی جلد ہی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔

اسلم نے دو ہزار روپے لے کر اپنا کام کر دیا تھا۔ نادر خاں کے مشورے سے رحیم داد نے نہر میں جہاں نشان لگوایا، اسلم نے وہیں موگھا کھلوا دیا۔ مگر اس نے جس خدشے کا اظہار کیا تھا، وہ جلد ہی سامنے آ گیا۔ موگھا کھلنے کے بعد نہر سے نکلنے والے سوئے میں پانی کی سطح گر گئی۔ اس سوئے سے نشیبی علاقے کے چھوٹے حصے داروں اور زمیں داروں کو آب پاشی کے لیے پانی ملتا تھا۔ ربیع کی فصل ایسے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی جب گندم کے پودے گوبھ کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اس وقت پودوں کا بالائی سرا پھول کر موٹا ہو جاتا ہے اور سٹوں کے پھوٹ کر باہر نکلنے میں لگ بھگ پندرہ روز کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ گوبھ کی حالت پودوں کے لیے اس قدر نازک ہوتی ہے کہ اگر اس مرحلے پر فصل کو پانی لگانے میں تاخیر یا غفلت ہو جائے تو پیداوار میں ۵۰ فیصد تک کمی واقع ہو سکتی ہے۔ چنانچہ گندم کے پودوں کے لئے پانی کی سخت ضرورت تھی۔

کھیتوں کو پانی ملنے میں کمی ہوئی تو حصے داروں کو پریشانی اور تشویش لاحق ہوئی۔ ابتدا میں تو پانی کی کمی کا سبب سمجھ میں نہیں آیا۔ چھوٹے حصے داروں نے ایک دوسرے کو شک سے دیکھا۔ توڑ اور پانی کی نکاسی کی نالیوں کے نکوں کی کڑی نگرانی کی جانے لگی۔ جانچ پڑتال اور روک ٹوک شروع ہوئی۔ پانی کی تقسیم پر آپس میں جھگڑے اور فساد ہوئے۔ مار پیٹ اور سر پھٹول ہوئی۔

دوسری طرف مالیوں نے رحیم داد سے آم اور مالٹے کے باغات کے لیے پانی کی کمی کا گلہ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ موگھے کا منہ کچھ بڑا کر دیا جائے تاکہ پانی ضرورت کے مطابق مل سکے۔ مگر نادر خاں نے تجویز پیش کی کہ موگھا بڑا کرانے کے بجائے نیا موگھا کھلوایا جائے۔ رحیم داد نے نادر خاں کی

تجویز مان بھی لی۔

شام کو اسلم آیا۔ تین پیگ کے بعد اس پر سرخوشی طاری ہوئی تو رحیم داد حرف مطلب زبان پر لایا اور بے تکلفی سے بولا۔ "یار اسلم! تیری بادشاہت میں اپنا کام پورا نہیں بنا۔ یہ یاری تو نہ ہوئی۔"

"چوہدری تیری گل سمجھ نہیں آئی۔"

رحیم داد نے کھل کر بات کی۔ "تو نے ایک موگھا کھلوایا ہے۔ اس سے کام نہیں بن رہا۔ میرے باغوں کو زیادہ پانی کی ضرورت ہے۔ تو ادھر کا اوور سیئر لگا ہو اور میرے باغوں کے پودے سوکھ جائیں۔"

"تو چاہتا کیا ہے؟" اسلم نے نشے سے جھوم کر دریافت کیا۔ "صاف صاف بتا۔"

"بتانا کیا ہے۔ ایک موگھا اور کھلوا دے۔"

"بہت مشکل ہے۔" اسلم سنجیدہ ہو گیا۔

"اس میں مشکل کیا ہے؟" رحیم داد ہنس کر بولا۔ "ایک کھل سکتا ہے تو دوسرا بھی کھل جانا چاہیے۔"

"تجھے آگے کے حصے داروں کا بھی کچھ پتہ ہے؟"

"سب پتہ ہے، ٹھیک طرح پتہ ہے۔"

اسلم اور زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔ "تجھے کچھ پتہ نہیں۔" اس دفعہ اس کا لہجہ تیکھا تھا۔ "ادھر پہلے ہی گڑبڑ ہے۔ ایک موگھا اور کھل گیا تو معاملہ بہت خراب ہو جائے گا۔ تو اسے نہیں سمجھ سکتا۔"

"میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تو میرا کام کرنا نہیں چاہتا۔" رحیم داد نے روٹھنے کے انداز میں منہ بگاڑ کر کہا۔ اس کے چہرے کی چمک دمک بجھ گئی تھی۔

اسلم نے رحیم داد کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو نرم پڑ گیا۔ "چوہدری! میں نے تجھے یار کہا ہے تو ہمیشہ اپنا یار ہی سمجھوں گا۔" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "مجھے سمجھنے کی کوشش کر۔ یہ سوچ، میرے اوپر بھی افسر لگے ہیں۔"

"میں یاری دوستی میں اپنا کام نکالنا نہیں چاہتا۔" رحیم داد نے کاروباری پینترا اختیار کیا۔ "پہلے موگھا کھلنے کا جو کچھ دیا تھا، اس بار بھی دوں گا۔ مجھے پتہ ہے تجھے اوپر والوں کو بھی حصہ پہنچانا ہوتا ہے۔"

"رب سوہنہ، میں نے تجھ سے کچھ نہیں لینا۔" اسلم نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "تو میری فکر نہ کر۔ اکزیکٹو انجنیئر اور ایس ڈی او اس دفعہ بہت آنکھیں دکھائیں گے۔ ویسے سچ پوچھ تو معاملہ ہے بھی ٹیڑھا۔"

اسلم نے اپنی مجبوری اس طرح بیان کی کہ رحیم داد متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر اپنے مطالبے سے دست بردار نہیں ہوا۔ زور دیتا رہا۔ آخر اسلم آمادہ ہو گیا۔ لیکن دو کے بجائے تین ہزار روپے پر۔ رحیم داد نے نادر خاں کو گھر سے بلوایا اور اسلم کو تین ہزار روپے دلوا دیے۔

اسلم اس رات اپنے گھر نہیں گیا۔ کھانا کھایا اور مہمان خانے کے دالان میں پلنگ پر بستر لگوا کر سو گیا۔ صبح اس نے رحیم داد کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا۔ نادر خاں بھی موجود تھا۔ اسلم کی ہدایت کے مطابق نادر خاں نے رحیم داد کی جانب سے درخواست لکھی۔ درخواست میں پانی کی کمی بیان کی گئی تھی۔ خاص طور پر آم اور مالٹے کے باغات کے لیے پانی کی قلت پر زور دیا گیا تھا۔ مزید پانی مہیا کرنے کی غرض سے دو نئے موگھے کھولنے کی ضرورت پر ہمدردی سے غور کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔

نادر خاں درخواست لکھ چکا تو اسلم نے اسے توجہ سے پڑھا۔ اس میں ضروری ترمیم کی۔ نادر نے دوبارہ درخواست لکھی۔ اسلم کی ہدایت کے پیش نظر نادر نے درخواست پر چار مہینے پہلی کی تاریخ ڈالی۔ اسلم نے ایک بار پھر درخواست دیکھی۔ رحیم داد نے بھی اسے غور سے پڑھا اور دستخط کر دیے۔

اسلم نے درخواست جیب میں رکھی اور جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ وہ دو روز نہیں آیا۔ تیسرے روز آیا تو محکمہ نہر کے بیل داروں نے راجباہ شرقی میں ایک نیا موگھا کھول دیا تھا۔ یہ موگھا رحیم داد کی زمیں داری کی حدود میں کھولا گیا تھا اور اس کا منہ بھی پچھلے موگھوں سے بڑا تھا۔

نیا موگھا کھلنے کی بعد نہر کے سوئے میں پانی کی سطح اور گر گئی۔ نشیبی علاقے کے حصے داروں کو اور بھی کم پانی ملنے لگا۔ پانی کی بڑھتی ہوئی قلت سے فصلیں متاثر ہوئیں تو وہ سخت پریشان ہوئے۔ ان میں بے چینی پیدا ہوئی۔ اس دفعہ پانی کی کمی کا انھوں نے سراغ بھی لگا لیا۔

نشیبی علاقے کے متاثرہ حصے داروں نے صورت حال پر غور کرنے کے لیے پنچایت بلائی۔ مسئلے کے مختلف پہلوں پر تبادلہ خیال کیا اور فوری اقدام کے طور پر ایک وفد تشکیل دیا۔ وفد اعلیٰ حکام سے ملا۔ پانی کی چوری کی شکایت کی۔ انھیں بتایا کہ محکمہ آب پاشی کے اہل کار بڑے زمین داروں سے ساز باز کر کے غیر قانونی طور پر ریگولیٹروں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ نئے موگھے بنا دیتے ہیں۔ نہر میں شگاف ڈال دیتے ہیں۔ انھوں نے ہر طرح اپنی پریشانی بیان کی۔ سخت احتجاج کیا مگر کوئی

نتیجہ نہیں نکلا۔ اسلم نے کام پکا کیا تھا۔ اس نے رحیم داد کی درخواست کی بنیاد پر موگھے کھولے تھے اور اپنی کارروائی کی تائید میں معقول جواز بھی پیش کیا تھا۔

رحیم داد کو متاثرہ حصے داروں کی بھاگ دوڑ اور سرگرمیوں کا علم ہوا تو وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے نادر سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ "نادر! سنا ہے، آگے کے چھوٹے زمیں دار پانی کم ملنے پر رولا گولا کر رہے ہیں۔"

"وہ تو جی انھیں کرنا ہی تھا۔" نادر خاں نے بے نیازی سے کہا۔ "یہ تو پہلے ہی سے پتہ تھا، پر ہونا ہوانا کچھ نہیں۔"

"بہت کچھ ہو سکتا ہے۔" رحیم داد بدستور پریشان تھا۔ "پانی کی اس طرح چوری پر اپنے خلاف کارروائی ہو سکتی ہے۔ کچھ نہ ہوا تو بھی موگھے تو بند ہو سکتے ہیں۔ ایسا ہوا تو آم اور مالٹے کے باغوں کا کیا بنے گا؟ بہت پریشانی اٹھانی ہو گی۔"

"کچھ بھی نہیں ہو گا جی!" نادر خاں نے اطمینان دلایا۔ "اسلم بہت ہوشیار افسر ہے۔ اس نے سوچ سمجھ کر کام کیا ہے۔ اس نے اپنی نوکری خطرے میں نہیں ڈالنی۔"

"اپنی سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں۔" رحیم داد مطمئن نہیں ہوا۔ "مجھے تو یہ پتہ ہے کہ موگھے کانونی طور پر نہیں کھولے گئے۔"

"بالکل کانونی طور پر کھولے گئے ہیں۔" نادر خاں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تب ہی تو اسلم نے درخواست لکھوائی تھی۔"

"درخواست سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تو زیادہ پانی مانگنے کے لیے کوئی بھی زمیں دار لگا سکتا ہے۔"

"پر اپنی درخواست میں اور دوسرے زمیں داروں کی درخواست میں بہت فرک ہے۔" نادر خاں نے وضاحت کی۔ "ہم نے باغوں کے لیے پانی مانگا ہے۔ تجھے پتہ نہیں، پاکستان بننے سے بھی پہلے کا کانون ہے کہ باغوں کے لیے دوسری فصلوں کے مکابلے میں دگنا پانی نہر سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ کانون اب تک نافذ ہے۔ اسلم نے اسی کانون کی رو سے اپنی درخواست پر دونوں موگھے کھول دیے۔"

"اگر حصے دار یہ معاملہ اور اوپر تک لے گئے تو گڑبڑ پیدا کر سکتے ہیں۔"

نادر نے نہایت اطمینان سے کہا۔ "اوپر کیا، وہ عدالت تک چلے جائیں، تب بھی کچھ نہیں ہو گا۔ اسلم نے تمام کام کانون سامنے رکھ کر کیا ہے۔ ایسے کام وہ پہلے بھی کرتا رہا ہے۔ اسے سب پتہ ہے۔ میں نے کہا نا! اس نے اپنی نوکری نہیں چھوڑنی۔" نادر نے رحیم داد کی آنکھوں میں جھانکنے کی

کوشش کی۔ "اس نے درخواست پر جب پچھلی تاریخ ڈلوائی تھی، تبھی میں اس کی ہوشیاری مان گیا تھا۔"

"ایسا کرنے میں کون سی ہوشیاری تھی۔" رحیم داد بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا۔

"اس میں ہوشیاری یہ تھی کہ اس نے پچھلے موگھے کو بھی کانونی شکل دے دی۔ بلکہ آگے کے لیے بھی اپنے ہاتھ مضبوط کر لیے۔ اسے پہلے ہی ملوم تھا کہ بعد میں کیا کیا ہو سکتا ہے اور اس کا توڑ کس طرح کیا جائے۔ اسلم پیسہ تو دبا کے کھاتا ہے پر ہاتھ پاؤں بچا کر۔"

"سوچ لے، آگے کوئی گڑبڑ نہ ہو۔"

"فکر نہ کریں جی!" نادر خاں نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "حصے دار ادھر ادھر بھاگ دوڑ کرنے کے بعد آخر میں اپنے ہی پاس آئیں گے۔"

رحیم داد کو نادر خاں کی بات پر یقین نہیں آیا مگر اس نے مزید بے اطمینانی کا اظہار نہیں کیا۔

☆

ایک صبح نشیبی علاقے کے چھوٹے زمیں داروں کے دو نمائندے رحیم داد کے پاس آئے۔ نادر خاں کو ان کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ سیدھا رحیم داد کے کمرے میں پہنچا۔ نادر خاں نے اسے سمجھایا۔ "چوہدری، آگے کے حصے دار پانی کا جھگڑا چکانے آئے ہیں۔ تجھے ان سے زیادہ گل بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ان سے نمٹ لوں گا۔ پہلے بھی کئی بار ایسے معاملات طے کر چکا ہوں۔ تجھے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" رحیم داد نے بلا عذر اس کی تجویز مان لی۔

وہ نادر خاں کے ہم راہ حویلی کے بڑے کمرے میں پہنچا۔ دونوں نمائندے وہاں اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ گفتگو کا آغاز نادر ہی نے کیا۔

"کیسے آنا ہوا جی؟"

ایک جو سن و سال میں بڑا تھا، اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔ "میں جی نیک محمد ہوں۔" اس نے دوسرے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ کرم دین ہے۔ ہم دونوں پڑوس کے زمیں دار ہیں۔" وہ رحیم داد سے مخاطب ہوا۔ "چوہدری تو نے دو موگھے کھول کر ہمارا بیڑا گرک کر دیا۔" اس کا لہجہ تیکھا اور تلخ تھا۔

رحیم داد بولا۔ "میرے موگھوں سے تجھے کیا لینا؟"

اس نے جان بوجھ کر بے نیازی سے کام لیا۔

"حد ہو گئی جی!" اس دفعہ کرم دین بولا۔ "ہم چھوٹے حصے داروں کو پہلے ہی پانی کم مل رہا تھا،

تیرے موگھے کھل جانے سے سوئے میں اتنا پانی کم ہو گیا کہ فصلیں سوکھنے لگی ہیں۔ اس دفعہ برکھا بھی نہیں ہوئی۔ تو ہمیں تباہ کر دینا چاہتا ہے۔"

"تیرا مطلب ہے ہم نے سوچ سمجھ کر ایسا کیا ہے۔" نادر خاں نے بھی تیکھا لہجہ اختیار کیا۔ "آگے کے حصے داروں اور زمیں داروں سے ہماری دشمنی تو ہے نہیں۔ ہم انھیں تباہ کرنے کی کیوں سوچنے لگے؟؟"

"دشمنی تو نہیں پر یہ تو پتہ ہے۔ آج کل، جب فصلیں تیار کھڑی ہیں اور ان کے لیے زیادہ ہی پانی کی ضرورت ہے، تو نے موگھے کھول کر پانی بند کر دیا۔ ہماری فصلیں تباہ نہیں ہوں گی تو کیا ہو گا۔" کرم دین نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے صورت حال کی وضاحت کی۔

"تو یہ کہنا چاہتا ہے ہم نے غلط موگھے کھلوائے ہیں؟" نادر خاں کا لہجہ بدستور تیز اور تیکھا تھا۔

"غلط کام نہیں تو اور کیا ہے۔" کرم دین کے چہرے پر جھنجلاہٹ ابھرنے لگی۔ "سچ پوچھ تو یہ پانی کی کھلی چوری ہے۔"

"چوری ہے تو تھانے میں جا کر پرچہ چاک کرا۔" نادر خاں بھی مشتعل ہو گیا۔ "محکمہ نہر والوں کے پاس جا۔ اوپر درخواست لگا۔ عدالت میں جا۔ یہاں کیوں آیا ہے؟"

نیک محمد نے بات بگڑتی دیکھی تو جھٹ مداخلت کی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کرم دین کو روکا۔ "کرمے، تو چپ کر۔ میں نوں گل بات کرنے دے۔" وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا اور نرم لہجے میں بولا۔ "چوہدری، تجھ سے پہلے ادھر کا زمیں دار اللہ وسایا ہوتا تھا اور اس سے بھی پہلے لالہ کرشن دیال ہوتا تھا، پر پانی کے معاملے میں ہمارا کبھی کسی سے جھگڑا ٹنٹا نہیں ہوا۔ سب کو اپنے اپنے حصے کا پانی ملتا رہا۔"

"تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف گل کر۔" رحیم داد کے بجائے نادر خاں بولا۔

"کہنا کیا ہے جی۔" نیک محمد نے اس دفعہ بھی رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری، تو وڈا زمیں دار ہے۔ ہم چھوٹے حصے دار ہیں۔ پانی نہ ملا تو ہماری فصلیں سوکھ جائیں گی۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ "تو چاہے تو ہماری کھڑی فصلیں تباہ ہونے سے بچ سکتی ہیں۔"

"تو یہ چاہتا ہے کہ تیری فصلیں بچانے کے لیے ہم اپنا بیڑا غرک کر لیں۔" نادر خاں نے رحیم داد کی جانب سے ترجمانی کا فرض ادا کیا۔ "ہمارے باغ پانی کے بغیر سوکھ جائیں۔ تو خود ہی سوچ، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" نیک محمد نے نادر سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اٹھتے جذبات قابو میں

رکھے اور معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے زیادہ نرم لہجہ اختیار کیا۔ "پر تجھے ہماری فصلیں بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔"

"اس کے لیے تو محکمہ نہر کے افسروں سے گل بات کر۔" نادر خاں نے بے رخی سے کہا۔ "پانی تو وہی دیتے ہیں۔ وہی کچھ بندوبست کریں گے، ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"وہ تو جی کچھ نہیں کریں گے اور نہ ان سے اوپر والے کچھ کریں گے۔" نیک محمد نے نرمی سے کہا۔ "ہماری فصلیں بچانے کے لیے تجھے ہی کچھ کرنا ہو گا۔ ہم چھوٹے حصے داروں کی طرف سے اسی لیے آئے ہیں۔"

نادر خاں سر جھکا کر سوچنے لگا۔ رحیم داد بھی گم صم بیٹھا رہا۔

نیک محمد نے بے چین ہو کر پہلو بدلا اور نادر خاں کی جانب دیکھا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" ایک بار پھر وہ رحیم داد کی طرف متوجہ ہوا۔ "چوہدری، ہم تیرے پاس بہت امیدیں لے کر آئے ہیں۔ ہمیں نہ تیرے خلاف اوپر درخواست لگانی ہے نہ مکدمے بازی کرنی ہے۔ ہمیں تو اپنی فصلیں بچانی ہیں اور وہ تو ہی بچا سکتا ہے۔"

رحیم داد نے نادر سے پوچھا۔ "نادر، تو کس سوچ میں پڑ گیا؟" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "یہ بتا، ان کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"وہی، جو ایسے معاملات میں ہوتا ہے۔" نادر خاں نے گول مول جواب دیا۔

"کیا ہو سکتا ہے جی؟" کرم دین نے بے قرار ہو کر دریافت کیا۔

"ہم یہ کر سکتے ہیں کہ تمہارے ہاتھ کچھ پانی فروخت کر دیں۔" نادر خاں نے پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جواب دیا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ دوسرے موگھے کا منہ بڑا ہونے کے باعث باغات کی ضرورت سے زیادہ پانی مل رہا ہے۔ "یہ کوئی نئی گل نہیں۔ وڈے زمیں دار چھوٹے حصے داروں کی اسی طرح مدد کرتے ہیں۔ اس کا تم کو بھی پتہ ہو گا۔"

"سنا تو ہے جی پانی اس طرح فروخت ہوتا ہے۔" نیک محمد نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "پر اپنے ساتھ کبھی ایسا ہوا نہیں۔"

"پہلے نہیں ہوا تو اب ہو سکتا ہے۔" نادر خاں نے خالص کاروباری انداز میں کہا۔ "فصلیں بچانی ہیں تو پانی خریدنا ہو گا۔"

"یہ تو جی بہت مشکل ہو گا۔" کرم دین نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔

"مشکل ہو یا آسان۔ یہ میں نہیں جانتا۔" نادر خاں نے تیکھی نظروں سے کرم دین کو دیکھا۔

"تمھاری مدد میں اسی طرح کر سکتا ہوں۔" اس نے مشورہ دیا۔ "جاؤ اور دوسرے حصے داروں سے اس معاملے میں بات کرو۔ اچھی طرح سوچ لو' سمجھ لو۔" اس نے کرسی پر پہلو بدلا۔ "میں نے اور زمیں دار نے ابھی اور بھی کئی ضروری کام کرنے ہیں۔"

نیک محمد نے نادر کے رویے سے اندازہ لگا لیا کہ زیادہ حیل و حجت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

سچ تو یہ ہے کہ حیل و حجت اور تکرار کرنے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ اپریل کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ گرمی رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی۔ گندم کے پودوں کی رنگت سنہری پڑتی جا رہی تھی۔ گرمی میں اضافے کے ساتھ ساتھ بخارات کے ذریعے پودوں سے پانی کا اخراج تیز ہو گیا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے پودوں کو پانی کی شدید ضرورت تھی۔ پانی مناسب مقدار میں نہ ملنے کی صورت میں پودے تیزی سے مرجھانے لگتے ہیں جسے کاشتکاروں کی اصطلاح میں فصل کا ہل جانا کہا جاتا ہے۔ فصل ہل جائے تو بالیوں میں لہلہاتے ہوئے گندم کے دانے سکڑ جاتے ہیں۔ ان کی نشوونما رک جاتی ہے۔ وزن ہلکا پڑ جاتا ہے اور پیداوار بہت گھٹ جاتی ہے۔ لہٰذا صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر نیک محمد نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے نادر خان کو اپنی مجبوری کا احساس دلایا۔

"فیصلہ ہم دونوں تو جی کر نہیں سکتے۔ تو نے بالکل ٹھیک سوچا۔ دوسرے حصے داروں سے گل بات کرنی ہو گی۔ اس سے پہلے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اب یہ بھی بتا دے کہ پانی کس طرح خریدنا ہو گا۔ ہم نے واپس جا کر ساری باتیں بتانی ہوں گی۔"

"پنج روپے فی کلا کے حساب سے کیمت ادا کرنی ہو گی۔" نادر خاں نے کہا۔ "اور ساری رکم پیشگی دینی ہو گی۔"

"یہ تو بہت زیادہ ہے۔" نیک محمد نے عاجزی سے کہا۔ "یہ تو سوچ' چھوٹے حصے دار اتنی کیمت کیسے ادا کریں گے۔ پیشگی تو وہ بالکل نہیں دے سکتے۔ فصل کی واڈھی کے بعد ہی دے سکیں گے۔" اس نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "ہم چھوٹے حصے داروں کی غریبی کا خیال کر۔ کیمت میں کمی کر دے اور پیشگی کی شرط بھی ہٹا دے۔"

"میں نے جو کہہ دیا' ویسا ہی ہو گا۔" نادر خاں نے رعونت سے کہا۔

رحیم داد کو اس کا یہ انداز پسند نہیں آیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ نادر اس کا ملازم نہیں مالک و مختار ہے۔ رحیم داد نے فوراً مداخلت کی۔ نیک محمد سے دریافت کیا۔ "آگے کے چھوٹے حصے داروں کی کتنی زمین ہو گی؟"

نادر خاں کارگزاری دکھانے میں کچھ زیادہ ہی آگے بڑھ گیا۔ نیک محمد کے جواب دینے سے پہلے ہی بول پڑا۔ "زمین کتنی ہی ہو۔ ہم نے اس سے کیا لینا۔ سوال یہ ہے..."

رحیم داد کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس نے نادر خاں کو جھڑک دیا۔ "نادر! چپ کر۔" وہ نیک محمد کی جانب متوجہ ہوا۔ "ہاں جی کتنی زمین ہو گی؟"

"لگ بھگ ٣٥ مربعے ہو گی۔"

"ایسا کر فی ایکڑ تین روپے کے حساب سے کیمت چکا دینا۔ آدھی پیشگی اور آدھی فصل کی واڈھی پر۔" رحیم داد نے چہرے پر رعب اور دبدبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "اور یہ بھی سن لے۔ میں نے جو فیصلہ کر دیا وہ نہیں بدلے گا۔ سارے حصے داروں کو صاف صاف بتا دینا۔"

نیک محمد اور کرم دین نے بات کو طول نہیں دیا' فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے جلد آنے کا وعدہ کیا اور رخصت ہو کر حویلی سے چلے گئے۔

ان کے جانے کی بعد نادر خاں نے معذرت کرنے کے انداز میں صفائی پیش کی۔ "کوئی غلطی ہو گئی تو جی معافی دے دیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ انھیں اس طرح دبایا جائے کہ وہ اوپر جانے کی نہ سوچیں۔"

"تو نے انھیں بہت دبا دیا تھا۔" رحیم داد کی جھنجلاہٹ رفع ہو گئی۔ وہ مسکرایا۔ "اب سوچنا یہ ہے کہ وہ مان بھی جائیں گے؟"

"بالکل مان جائیں گے۔" نادر خاں بولا۔ "انھیں اپنی فصلیں بچانی ہیں۔ چوہدری' تجھے پتہ نہیں' سارے ہی حصے دار پانی کی کمی سے بہت پریشان ہیں۔ فصلوں کی بڑھوتری رک گئی ہے۔ ان کو سوکا لگنے کا ڈر ہے۔"

"ایسا ہو گیا تو اپنی دی ہوئی آدھی رکم تو نکل ہی آئے گی۔"

"میں تو پوری ہی نکلوانا چاہتا تھا۔" نادر کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ خوشامد پر اتر آیا۔ "پر زمیں دار تو بہت نیک اور رحم دل بندہ ہے۔ تیرا دل بہت وڈا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "میں نے تو یہ دیکھا ہے' دوسرے وڈے زمیں دار ایسے معاملوں میں چھوٹے حصے داروں کو بہت تنگ کرتے ہیں۔ ان کی مجبوری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پانی کی منہ مانگی کیمت وصول کرتے ہیں۔ ذرا بھی ترس نہیں کھاتے بلکہ زیادہ سے زیادہ کیمت مانگتے ہیں۔ اور جو کچھ وہ مانگتے ہیں' انھیں مل بھی جاتا ہے۔"

"نہیں جی! اتنا زیادہ تنگ نہیں کرنا چاہیے۔" رحیم داد ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس کا لہجہ بدل گیا۔ "میں

تو کہتا ہوں نادر اتنا ہی مل جائے، کافی ہے۔"

"فکر نہ کریں جی، باغ لگانے پر جو خرچ آیا ہے سب مل جائے گا۔ میں نے اس کے بارے میں پہلے ہی سوچ رکھا ہے۔"

"پورا خرچ کیسے نکل آئے گا۔" رحیم داد نے اس کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ "مالی بتاتے ہیں، بوٹے چار پانچ برس سے پہلے پھل نہیں دیں گے، تب تک خرچ تو ہوتا ہی رہے گا۔"

"پانی کی کیمت تو جی آگے بھی ملتی رہے گی۔ یہ تو طے ہے۔" نادر خاں نے وضاحت کی۔ "خریف کی واڈھی تک پودے خوب بڑھ جائیں گے۔ اگلی ربیع کی فصل پر باغ کی زمین پر کنک اور جو بوئی جا سکتی ہے۔ اس سے بھی اچھی کمائی ہو جائے گی۔"

"ہاں جی! یہ تو ہو سکتا ہے۔" رحیم داد خوش ہو کر بولا۔ "ایسا ہی کرنا ہو گا۔"

"اطمینان رکھیں جی! بالکل ایسا ہی ہو گا۔ میں نے سب تیاری کر رکھی ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ نادر خاں رحیم داد سے اجازت لے کر باہر چلا گیا۔

دوسرے روز سہ پہر کو نیک محمد اور کرم دین آئے۔ ان کے ہم راہ دو اور چھوٹے حصے دار بھی تھے۔ انھوں نے بات چیت میں قطعی نرم اور لچک دار رویہ اختیار کیا۔ رحیم داد نے جو شرائط پیش کی تھیں، ان کے بارے میں انھوں نے نہ مین میخ نکالی نہ سودے بازی کی کوشش کی۔ ہر بات بلا حیل و حجت مان لی۔ انھیں اپنی فصلوں کے لیے پانی کی شدید ضرورت تھی۔ وہ اس سلسلے میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ پانی کی مطلوبہ پیشگی رقم وہ ساتھ لائے تھے۔ رقم انھوں نے رحیم داد کے حوالے کی اور بقیہ نصف رقم فصل کی کٹائی پر ادا کرنے کا یقین دلایا۔ وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہرے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی چلے گئے۔

رحیم داد نے سمجھوتے کے مطابق اسی روز ایک موگھا بند کرا دیا۔ یہ چھوٹا موگھا تھا۔ اس کے بند ہوتے ہی نشیب کے حصے داروں کی فصلوں کے لیے پانی پہنچنے لگا۔

ربیع کی فصل کی کٹائی کے بعد ان کے نمائندے دوبارہ آئے اور حسب وعدہ بقیہ رقم بھی لائے۔ انھوں نے پورا حساب صاف کر دیا۔ اس دفعہ رحیم داد نے انھیں کھانا کھلایا، خاطر تواضع کی۔ محبت اور نرمی سے پیش آیا۔ اسی ملاقات میں آئندہ کے لیے پانی کا سودا بھی طے ہو گیا۔

☆

خریف کی فصل سے فارغ ہونے کے بعد نادر خاں نے پروگرام کے مطابق گندم کی بوائی کے لیے باغات کی زمین پر بھی ہل چلوایا اور دوسری زمینوں کے ساتھ اس پر بھی بوائی کرائی۔ رحیم داد نے بھی اس میں پوری پوری دلچسپی لی۔ وہ ناشتے سے فارغ ہونے کی بعد حویلی سے نکلتا اور دوپہر تک بوائی کی دیکھ بھال کرتا۔ اکثر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد بھی چلا جاتا اور شام کو لوٹتا۔

اوور سیئر اسلم کی آمد و رفت بند ہو چکی تھی۔ اس کا لائل پور تبادلہ ہو گیا تھا مگر جب تک وہ ضلع منٹگمری میں تعینات رہا، اکثر رحیم داد کے پاس آ جاتا اور ہفتے کی شام کو پابندی سے آتا۔ دونوں رات گئے تک پینے پلانے میں مصروف رہتے۔ اسلم کے بعد رحیم داد کی شامیں سونی ہو گئی تھیں۔ احسان شاہ سے بھی اس کی ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ ان دنوں سیاسی سرگرمیوں میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ یہ سیاست میں نت نئی تبدیلیوں، جوڑ توڑ، سازشوں اور دھڑے بندیوں کا دور تھا۔ احسان شاہ کبھی ایک سیاسی دھڑے کے ساتھ، کبھی دوسرے کے ساتھ لگ جاتا۔ جس کا ستارہ عروج پر دیکھتا، اس کی ہم نوائی کرتا، سیاسی وفاداریاں بدلتا اور ہر طرح کا فائدہ اٹھانے کی کوشس کرتا۔ ان دنوں وہ لاہور میں رہتا یا کراچی میں۔ اپنے گاؤں پیراں والہ کم ہی آتا اور جب بھی آتا، ایک دو روز سے زیادہ نہ ٹھہرتا۔

نادر خاں کے بچوں میں ایک کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس بار بیٹا پیدا ہوا۔ یہ تین بیٹیوں کے بعد ہوا تھا لہٰذا اس کا لاڈ پیار بھی زیادہ تھا۔ نادر کی بیوی جنت بی بی ہر وقت بیٹے کی دیکھ بھال میں لگی رہتی۔ وہ گھر سے بہت کم باہر نکلتی۔ رحیم داد شدید تنہائی میں مبتلا تھا۔ وہ تنہائی سے بچنے کے لیے زمیں داری کے امور میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیتا، خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا اور شام ہوتے ہیں شغل بادہ نوشی شروع کر دیتا۔ اکیلا بیٹھا پیتا رہتا۔

ایک سہ پہر نادر خاں اس کے پاس آیا۔ وہ زمین داری کے کام کے سلسلے میں تحصیل دار سے ملنے دیپال پور گیا تھا اور سیدھا وہیں سے آ رہا تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے رحیم داد سے کہا۔ "چوہدری! میں نے جمیلہ کے بارے میں تجھ سے جو کہا تھا، وہی ہوا نا۔"

جمیلہ کا نام سن کر رحیم داد چونکا۔ "کیا ہوا جمیلہ کو؟"

"وہی ہوا جو میرا اندازہ تھا۔" نادر خان مسکرا کر بولا۔ "بھائیوں اور بھرجائیوں کے ساتھ زیادہ عرصے گزارا نہیں ہوا۔ ان بن ہو گئی۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا؟" رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "تو یہاں ہے، وہ ادھر سرحد پار، فیروز پور میں ہے۔"

"وہ ایسا ہوا جی! دیپال پور میں مجھے جلیل مل گیا۔" نادر خاں نے بتایا۔ "وہ تو مجھے اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا، پر میں نہیں گیا۔ بات چیت اس سے ضرور ہوئی اور دیر تک ہوئی۔ جمیلہ کے بارے

میں وہی بتا تا تھا۔"

"پر جمیلہ سے وہ کہاں ملا؟ فیروز پور تو وہ جانے سے رہا۔" رحیم داد بدستور حیرت زدہ تھا۔

"جلیل فیروز پور تو نہیں گیا لیکن چند مہینے پہلے دہلی ضرور گیا تھا۔ دہلی میں اس کا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ ادھر نہیں آیا۔ پاکستان بنا تو وہ دہلی ہی میں تھا اور اب تک وہیں ہے۔ بال بچے دار ہے۔ جلیل اس سے ملنے گیا تھا۔ دہلی سے واپس آرہا تھا کہ جلندر کے سٹیشن پر اسے جمیلہ نظر آئی۔ وہ اس کے پاس گیا' بات چیت بھی کی۔"

رحیم داد نے بے قراری سے پوچھا۔ "جمیلہ کے بارے میں کیا بتایا اس نے؟"

"کہتا تھا' جمیلہ کی باتوں سے اسے یہ پتہ چلا کہ ہردیال کی گھروالی سے اس کا اتنا جھگڑا ہوا کہ وہ روٹھ کر چھوٹے بھائی منوہر دیال کے پاس امرت سر چلی گئی۔ پر وہاں بھی زیادہ دن نہ رہ سکی۔" نادر خاں سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ "ان دنوں وہ سب سے چھوٹے بھائی ایشور دیال کے پاس جلندر میں تھی۔ ہردیال اسے منانے آیا تھا اور اپنے ساتھ واپس فیروز پور لے جانا چاہتا تھا' پر اس کی باتوں سے ایسا لگتا تھا کہ وہ جانا نہیں چاہتی۔"

"تو گویا اب وہ جلندر میں ہے۔"

"پتہ نہیں جی جلندر میں ہے یا فیروز پور میں۔ جلیل اس سے کئی مہینے پہلے ملا تھا۔ بعد میں وہ کہاں گئی یہ تو اسے بھی خبر نہیں۔"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ "میرے بارے میں بھی اس نے جلیل سے گل بات کی؟"

"جلیل کہتا تھا' تیرے بارے میں بھی اس نے پوچھا تھا۔"

"برا ہی کہتی ہو گی۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھ سے سخت ناراض ہو کر گئی تھی ناں۔"

"پر اس نے جلیل سے تیرے بارے میں کسی ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔ صرف اتنا پوچھا کہ چوہدری کیسا ہے؟" نادر خاں نے بتایا۔ "اس نے اوروں کا بھی حال احوال پوچھا۔ جلیل کہتا تھا' وہ اب تک کوٹلہ ہرکشن کو بھولی نہیں۔ یہاں کے بارے میں باتیں کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایک ایک بات کا ذکر کرتی تھی۔ سب کو پوچھتی تھی' سب کو یاد کرتی تھی۔ لگتا ہے یہاں سے جانے پر وہ خوش نہیں ہے۔"

"یقین نہیں آتا۔" رحیم داد بے چارگی کے انداز میں بولا۔

"چوہدری' یہ تو سوچ' وہ یہ پنڈ کیسے بھول سکتی ہے۔" نادر خاں نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں رحیم داد کی خوشنودی حاصل کرنے کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ "وہ یہاں برسوں رہی ہے۔ دکھ تو دیکھے ہیں پر بہت سکھ بھی اٹھایا۔ زمیں داری تو وہی کرتی تھی' اللہ وسایا تو اس کا مزارع ہی لگتا تھا۔ سب یہی بتاتے ہیں۔" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟ تجھے یہ بھی پتہ ہے' دو بچوں کی ماں بھی وہ یہیں بنی۔ ادھر کی تو اسے ایک ایک گل بات یاد آتی ہو گی۔"

رحیم داد کو نادر خاں کی باتوں سے سہارا ملا۔ "ویسے وہ ملے تو اصلی گل کا پتہ چلے۔" اس کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ ابھری۔ "پر وہ مل بھی کیسے سکتی ہے۔" اس کے چہرے پر دکھ کا غبار چھا گیا۔

"ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی چلی آئے۔" نادر نے رحیم داد کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "میں کہتا ہوں جی' بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔ وہ تیری گھروالی ہے۔ تیرے ساتھ اس کا نکاح ہو چکا ہے' اور جی سب سے زیادہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس کی جو شان ادھر تھی وہاں کیسے ہو گی۔ وہاں تو اسے اچھوت ہی سمجھا جائے گا۔ مسلمان کے ساتھ گھروالی بن کر جو رہ چکی ہے۔ وہ ہندو ہیں۔ اسے اور اس کے بچوں کو کیسے کبول کر لیں گے۔ جلیل کی گھروالی' زینت کے بارے میں تجھے معلوم ہی ہے۔ اسے ادھر اتنا تنگ کیا گیا کہ وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ بھاگ کر فیر ادھر آگئی۔ ایسا ہی جمیلہ کے ساتھ بھی ہو رہا ہو گا۔ جلیل کی باتوں سے تو صاف یہی لگتا تھا۔"

"کہتا تو تو ٹھیک ہی ہے۔" رحیم داد نے نادر خاں سے اتفاق کیا۔

نادر مزاج شناس تھا۔ اس نے رحیم داد کی کمزوری بھانپ لی تھی۔ وہ کچھ دیر جمیلہ کے بارے میں اسی انداز سے باتیں کرتا رہا۔ رحیم داد دلچسپی اور توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ نادر خاں اٹھ کر چلا گیا مگر رحیم داد کے ذہن میں کھلبلی پیدا کر گیا۔ جمیلہ کی یاد ایک بار پھر شدت کے ساتھ ابھری۔ اس کا سراپا نظروں میں سہانے خواب بن کر منڈلانے لگا۔ وہ رات اس نے بڑی بے چینی میں بسر کی۔

☆

سردی ختم ہو رہی تھی۔ گرمی کی آمد آمد تھی۔ مارچ کی آخری تاریخوں کی ایک خوش گوار شام تھی۔ فضا میں پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی' چاند طلوع ہو رہا تھا۔ اندھیرا چھٹ رہا تھا۔ اجلی اجلی چاندنی در و دیوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ رحیم داد مہمان خانے میں بیٹھا اسکاچ وہسکی سے شغل کر رہا

تھا۔ اسی عالم میں اس نے مہمان خانے کے باہر جیپ رکنے کی آواز سنی۔ مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ احسان شاہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہم راہ رفیع سمہ بھی تھا۔ احسان شاہ کو دیکھتے ہی رحیم داد کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور احسان شاہ سے لپٹ گیا۔

رحیم داد نے احسان شاہ اور رفیع سمہ کو کرسیوں پر بٹھایا۔ احسان شاہ نے رفیع سمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ “چوہدری‘ یہ رفیع سمہ ہے۔ آج سہ پہر بہت مدت بعد میرے پاس آیا تھا۔ میں فوراً اسے تیرے پاس لے آیا۔”

رحیم داد نے مسکرا کر رفیع سمہ کی جانب دیکھا۔ اس کی عمر لگ بھگ رحیم داد کے برابر ہی تھی۔ قد اونچا اور جسم مضبوط تھا۔ رحیم داد نے جھوم کر بے تکلفی سے رفیع سمہ کو مخاطب کیا۔ “بہت انتظار کرایا تو نے۔” پھر وہ احسان شاہ کی جانب متوجہ ہوا۔ “شاہ جی! تجھے دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔ اس بار تو لہور جا کر ایسا بیٹھا کہ پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔”

“پروگرام کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا۔” احسان شاہ نے وضاحت کی۔ “کیا بتاؤں چوہدری‘ کیسے کیسے چکروں میں گھر گیا ہوں۔ اور ابھی تک ان سے نکل نہیں سکا۔ کل سویرے ہی واپس جانا ہے۔”

“کل جا رہا ہے؟” رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ “کیا اب تو نے لہور ہی میں ٹھہرنے کا طے کر لیا ہے؟”

“ایسا ہی سمجھ لے۔” احسان شاہ مسکرایا۔ “باتیں تو ہوتی رہیں گی‘ پہلے دو گلاس تو منگوا۔ لگتا ہے تو اکیلا ہی بیٹھا لگا رہا تھا۔”

“اکیلا ہی بیٹھ کر لگا لیتا ہوں۔” رحیم داد نے کہا۔ “تجھے تو پتہ ہے۔ ادھر اپنا کوئی ملنے جلنے والا نہیں۔”

اس نے نوکر کو بلایا‘ دو گلاس منگوائے‘ پیگ تیار کیے۔ گلاس رفیع سمہ اور احسان شاہ کے سامنے رکھ کر بولا۔ “لو جی‘ اپنے اپنے گلاس اٹھاؤ۔” سب نے گلاس اٹھائے‘ ہاتھ بڑھا کر ہولے سے ٹکرائے اور ایک ایک گھونٹ بھرا۔

سمہ خاموش بیٹھا رہا۔ احسان شاہ نے گردن ادھر ادھر گھما پھرا کر مہمان خانہ دیکھا‘ پھر رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ “چوہدری‘ بہت پرانی بات ہے۔ ان دنوں جنسی لال ادھر منیجر ہوتا تھا۔ میں ایک رات ہردیال سے ملنے آیا تھا‘ اسی مہمان خانے میں ٹھہرا تھا۔ تب یہ بہت شان دار ہوتا تھا۔ اللہ وسایا نے اس کا بالکل ناس مار دیا۔”

“ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ پہلے تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ تو نے بھی دیکھی تھی۔” رحیم داد نے بتایا۔ “میں نے پچھلے دنوں اسے ٹھیک ٹھاک کرایا ہے۔”

“ابھی اسے اور درست کرانے کی ضرورت ہے۔” احسان شاہ نے مشورہ دیا۔ “تجھے زمیں داری کرنی ہے تو سرکاری افسروں اور آس پاس کے وڈے زمین داروں سے میل ملاپ پیدا کرنا ہو گا‘ انھیں روٹی پر بلانا ہو گا۔ دعوتیں کرنی ہوں گی۔ ان کی دل چسپی کا سامان بھی کرنا ہو گا۔” اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ “مہمان آئیں گے تو ادھر ہی ٹھیریں گے۔ پر یہاں تو ایک ہی کمرہ ہے اور ایک کوٹھڑی رہ گئی ہے۔ پہلے تو کئی کمرے ہوتے تھے۔”

“سنا ہے اللہ وسایا نے سارے کمرے توڑ پھوڑ کر گھوڑوں کا اصطبل اور ڈنگروں کا ڈھارا بنوا دیا۔”

“اسے وڈا مہمان خانہ رکھنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔” احسان شاہ نے رحیم داد سے کہا۔ “وہ تو زمیں دار بن ہی نہیں سکا‘ مزارع کا مزارع رہا۔”

“پر میں گھوڑوں اور ڈنگروں کو کہاں لے جاؤں گا؟”

“سکول کو اصطبل بنا دے۔ ڈنگر اور مویشی بھی ادھر ہی پہنچا دے۔” وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ “سکول کی عمارت اصطبل کے لیے بالکل ٹھیک رہے گی۔ اب وہ اسی کام آنی چاہیے۔ تجھے زمیں داری کرنی ہے۔ مزارعوں کے منڈوں کو پڑھا لکھا کر ان کا دماغ خراب نہیں کرنا۔ اب یہ سکول شکول کا چکر نہیں چلنا چاہیے۔”

“سکول تو جمیلہ کے جانے کے بعد سے بند پڑا ہے۔”

“یہ تو ہونا ہی تھا۔” احسان شاہ بولا۔ “اب تو اسے اصطبل اور ڈھارا بنا۔ مہمان خانے کے کمرے بڑھا۔ اس کی شان بڑھا۔ زمین داری کی اصل شان تو اسی سے ملوم ہوتی ہے۔”

رفیع سمہ بھی دوسرا پیگ ختم کر چکا تھا‘ ہنس کر بولا۔ “چوہدری‘ تب تو شاہ جی کی طرح تجھے بھی کوٹ بنوانا ہو گا۔ ورنہ شان پیدا نہیں ہو گی۔”

“نہیں جی! میں شاہ جی کی طرح کا کوٹ نہیں بنوا سکتا۔ میں اتنا وڈا زمیں دار کہاں ہوں۔”

“کوٹ نہ بنوا پر مزارعوں کی گھر والیاں اور کڑیاں تو اٹھوانی ہی ہوں گی۔” احسان شاہ نشے میں جھوم کر بولا۔ “تجھے زمیں داری چلانی ہے۔ مہمانوں کے لیے دو چار پوپٹ زنانیاں تو ہونی ہی چاہیں۔” اس نے قہقہہ بلند کیا۔ “تو بھی جمیلہ کے جانے کے بعد رنڈوا رہ گیا ہے۔”

رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔ “شاہ جی! تو نے جمیلہ کے بارے میں سمہ سے بھی بات کی؟”

“نہیں‘ میں اس کو ادھر ہی چھوڑے جا رہا ہوں۔ رات تیرے مہمان خانے میں ٹھیرے گا۔ تو

آرام سے خود ہی بات کرلینا۔" احسان شاہ نے مڑ کر رفیع سمہ کی جانب دیکھا۔ "رفیے! تجھے یہ تو پتہ ہی ہے' چوہدری بھی اپنا گہرا یار ہے۔ تجھے اس کا ایک کام کرنا ہے' اور ضرور کرنا ہے۔"

"ضرور کروں گا۔ بتا کام کیا ہے؟" رفیع سمہ نے دریافت کیا۔

"یہ تو تجھے چوہدری ہی بتائے گا۔ مجھے واپس پیراں والہ جانا ہے۔ افسر مال میری ہی حویلی میں ٹھیرا ہے۔ انتظار کرتا ہو گا۔ اس سے مجھے کچھ ضروری گل بھی کرنی ہے۔ سویرے تو میں لہور چلا جاؤں گا۔"

احسان شاہ نے گلاس ختم کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد اور رفیع سمہ نے مہمان خانے کے باہر اسے رخصت کیا۔ دونوں واپس آئے اور اپنی اپنی کرسیوں پر پھر بیٹھ گئے۔ گلاس اٹھائے اور وہسکی کی چسکی لگانے لگے۔

رفیع سمہ نے پوچھا۔ "یہ جمیلہ کا کیا چکر ہے؟"

"وہ میری گھر والی ہے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "پہلے وہ ہندنی تھی۔ فسادات ہوئے تو ادھر رہ گئی۔ اس کے گھر والے ادھر سرحد پار ہیں۔ پچھلے دنوں اس کا بھرا ہردیال اپنے مسلح کرندوں کے ساتھ آیا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "ہردیال غلے کا بہت وڈا سمگلر ہے۔ تو اسے جانتا ہے؟"

"نام تو اس کا میں نے بہت سن رکھا ہے پر کبھی ملا نہیں۔" سمہ نے جواب دیا۔ "ویسے اس کے کرندوں سے میری جان پہچان ہے۔"

"سنا ہے' وہ فیروز پور میں رہتا ہے۔ مجھے یہ پتہ کرنا ہے' جمیلہ اس کے پاس ہے یا اپنے کسی اور بھائی کے گھر چلی گئی۔"

"یہ تو آسانی سے معلوم ہو جائے گا۔ پر تجھے ہردیال سے تو نہیں ملنا؟"

"نہیں مجھے اس سے نہیں ملنا بلکہ اسے تو میرے بارے میں پتہ بھی نہیں چلنا چاہیے۔ میں نے تو جمیلہ کو ایک سندیسا بھیجنا ہے۔ تیری جان پہچان کا کوئی ایسا بندہ ہے جو جمیلہ سے مل سکتا ہو؟" رحیم داد نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "پر اسے ادھر جمیلہ کے نام سے کوئی نہیں جانتا۔ وہاں سب اسے پاروتی کہتے ہیں۔ یہ تو میں تجھے بتا چکا ہوں' وہ ہردیال کی چھوٹی بھین ہے۔"

"اس بارے میں ابھی تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ واپسی پر کچھ کیا جا سکتا ہے۔ چوہدری' تو ایسا کر' میرے ساتھ چل۔ وہیں بیٹھ کر آرام سے سوچیں گے۔ میں کل اپنے پنڈ واپس جا رہا ہوں۔ تو میرے ساتھ چل سکتا ہے؟"

"میرا منیجر نادر خان لہور گیا ہے۔ کل سویرے آگیا تو میں تیرے ساتھ ہی چلوں گا۔" رحیم داد نے رضامندی کا اظہار کیا۔ "نادر کل نہ آیا تو تجھے ٹھیرنا ہو گا۔ وہ پرسوں ضرور آجائے گا۔ میرے پاس جیپ ہے' دونوں اس میں اکٹھے چلیں گے۔"

"پر میں ایک روز سے زیادہ کسی طور نہیں ٹھیر سکتا۔" رفیع نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "مجھے واپسی پر کئی بہت ضروری کام کرنے ہیں۔"

"نہیں' میں نے تجھے ایک روز سے زیادہ نہیں روکنا۔" رحیم داد نے اسے یقین دلایا۔

دونوں نے اپنے اپنے گلاس ختم کیے۔ ذرا دیر بعد نوکروں نے کھانا لگا دیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر رحیم داد اور رفیع سمہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سمہ کو نوکر نے مہمان خانے کے کمرے میں پہنچا دیا۔ رحیم داد حویلی میں چلا گیا۔

نادر خان دوسرے روز واپس نہیں آیا۔ مگر تیسرے روز دن چڑھے پہنچ گیا۔ رحیم داد نے اسے اپنا پروگرام بتایا اور رفیع سمہ کے ساتھ جیپ میں سوار ہو کر حویلی روڈ کے راستے بھاول نگر کی جانب روانہ ہو گیا۔

سورج غروب ہونے سے پہلے ہی دونوں صادق گنج پہنچ گئے۔ صادق گنج سے رفیع سمہ کا گاؤں زیادہ فاصلے پر نہیں تھا لیکن راستہ کچا تھا۔ سمہ کے گاؤں پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔

☆

رفیع سمہ کھاتا پیتا زمین دار تھا۔ گاؤں میں اس کا دو منزلہ عالیشان مکان تھا۔ رہتا بھی ٹھاٹ باٹ سے تھا۔ سواری کے لیے اس کے پاس بھی جیپ تھی۔

سمہ کا مکان پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ خوب کشادہ تھا۔ مکان کے اردگرد وسیع احاطہ تھا جس میں جگہ جگہ گھنے درخت تھے۔ باغیچہ تھا۔ کنواں تھا جس سے پانی نکالنے کے لیے ہینڈ پمپ لگا تھا۔ مہمانوں کے قیام کے لئے علیحدہ ڈیرا تھا۔ نوکروں کے واسطے مکان کے پچھواڑے مٹی کی بنی ہوئی کچی کوٹھریاں تھیں۔ قریب ہی مویشیوں کا باڑا اور اصطبل تھا۔ اصطبل میں عمدہ نسل کے کئی گھوڑے تھے۔ گائے اور بھینسوں کے علاوہ اونٹ بھی تھے۔

احاطے کے چاروں طرف اونچی چار دیواری تھی۔ اندر داخل ہونے کے لیے دو پھاٹک تھے۔ ایک بڑا دوسرا چھوٹا تھا۔ بڑے پھاٹک پر مسلح پہریدار مقرر تھا۔ چھوٹا پھاٹک پچھواڑے تھا جو گھر میں کام کاج کرنے والے نوکروں اور دوسرے کمیوں کی آمد و رفت کے لیے مخصوص تھا۔

رفیع سمہ کا مکان طرز تعمیر کے اعتبار سے دیہات کی پرانی وضع کی حویلیوں کی طرح کا نہ تھا۔ نیا نیا

بنا تھا۔ اسے دیکھ کر پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ رفیع سمہ خاندانی زمین دار نہ تھا۔ اس نے قیام پاکستان کے بعد ترقی کی اور اس میں روز بروز تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ مکان بھی اس نے سال سوا سال قبل تعمیر کیا تھا۔ اور اس کی توسیع کا کام ہنوز جاری تھا۔

رحیم داد کو اس نے ڈیرے کے ایک کمرے میں ٹھہرایا۔ کمرہ سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ آرام دہ بھی تھا۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ باغیچے میں بیٹھنے کے لیے کرسیاں موجود تھیں۔ مگر دونوں وہاں نہ بیٹھے۔ باغیچے کے سامنے برآمدہ تھا۔ اس کے پیچھے ہال نما کشادہ کمرہ تھا جس میں قالین کا فرش تھا۔ صوفے تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے۔ یہ رفیع سمہ کی بیٹھک تھی۔

بیٹھک میں لیمپ روشن تھا۔ نوکروں نے ایک میز پر پہلے ہی تھری ایکس رم کی بوتل رکھ دی تھی جو ہندوستان سے اسمگل ہو کر آئی تھی۔ میز پر دو گلاس بھی موجود تھے اور شیشے کے جگ میں پانی بھرا تھا۔ رفیع سمہ اور رحیم داد کرسیوں پر بیٹھ گئے اور شراب نوشی میں مشغول ہو گئے۔

دونوں نے رات کا کھانا ساتھ بیٹھ کر کھایا اور سویرے اٹھ کر ناشتا بھی ساتھ ہی کیا۔ دوپہر کے کھانے پر رفیع نے کھل کر بات کی۔ زندہ دل اور یار باش ہونے کے ساتھ ساتھ وہ صاف گو اور ہنس مکھ بھی تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے رحیم داد سے کہا۔

“چوہدری‘ میرے بارے میں شاہ جی نے تجھے بتا ہی دیا ہو گا۔ زمیں داری کے ساتھ ساتھ میرا دھندا اسمگلنگ اور رسا گیری بھی ہے۔” اس نے قہقہہ لگایا۔ “رسا گیری کے بغیر زمیں دار وڈا زمیں دار بن ہی نہیں سکتا۔”

“شاہ جی نے تیرے بارے میں کچھ بتایا تو تھا‘ پر زیادہ کھل بات نہیں ہوئی۔”

رفیع سمہ نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ “رسا گیری تو زمیں داروں کا کھیل ہے۔ بات یہ ہے جی‘ زمیں داری تو سچ پوچھو منشی اور کرندے چلاتے ہیں۔ زمیں دار خالی بیٹھے بیٹھے کریں بھی کیا۔ وہ دوسروں کے ڈنگر اور مویشی اٹھواتے ہیں۔ مزارعوں کی زنانیاں اٹھا کے انھیں ادھر سے ادھر کرتے ہیں‘ بیچ دیتے ہیں‘ یا رکم لے کر واپس کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی دو پارٹیوں کے بیچ میں پڑ کر سودا بھی طے کرا دیتے ہیں اور اپنا کمیشن وصول کر لیتے ہیں۔” وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ “دھندا برا نہیں۔ پر میں زنانیاں اٹھوانے کا دھندا نہیں کرتا۔”

“کیوں نہیں کرتا؟” رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

“بات یہ ہے چوہدری‘ میری گھر والی بہت زور آور ہے۔ وہ ہے بھی وڈے گھر کی۔ یہ دھندا اسے بالکل پسند نہیں۔”

“پر رسا گیری اور سمگلنگ اسے پسند ہے۔” رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ “یہ بات سمجھ نہیں آئی۔”

“یار رسا گیری کو وہ کیسے ناپسند کر سکتی ہے۔” سمہ نے بے تکلفی سے کہا۔ “اس کا پیو جتنا وڈا زمیں دار ہے‘ رحیم یار خان کا اتنا ہی مشہور رسا گیر بھی ہے۔ میری اس کی جان پہچان اسی چکر میں ہوئی تھی۔ میں اسے ایسا پسند آیا کہ اس نے اپنی دھی مجھ سے ویاہ دی۔”

“اسے یہ پتہ تھا کہ تو سمگلنگ بھی کرتا ہے؟”

“بالکل پتہ تھا۔ پر میری گھر والی شروع میں سمگلنگ کو برا سمجھتی تھی‘ اب نہیں سمجھتی۔ میرا پنڈ بارڈر کے نزدیک ہی ہے۔ یہ تو تجھے بھی پتہ ہے۔ ادھر رسا گیری اور سمگلنگ میں بہت آسانیاں ہیں۔ بس ادھر کا مال اُدھر اور اُدھر کا مال ادھر کرنا پڑتا ہے‘ فاصلہ بھی کم ہے۔ اب تک بہت آرام سے اپنا کام چل رہا ہے۔ سچی بات یہ ہے اسی کمائی سے میں نے پانچ سو کلا زمین خریدی۔ نئی ماڑی بنوائی‘ جیپ خریدی۔” رفیع سمہ نے ایک آنکھ دبائی۔ “میں تو کہتا ہوں چوہدری‘ تو بھی اپنی ساتھ لین میں لگ جا۔ زمیں داری کا مزا بھول جائے گا۔ سمگلنگ کا بھی عجب نشہ ہے۔ کمائی تو ایسی ہے‘ سمجھو روپیہ بارش کی طرح برستا ہے۔”

“بات یہ ہے جی‘ میں ہوں مہاجر۔ زمین داری بھی کلیم میں نئی نئی ملی ہے۔” رحیم داد نے صفائی پیش کی۔ “شاہ جی نے تجھے شاید یہ بات بتائی بھی ہو۔ رہ گئی رسا گیری اور سمگلنگ‘ وہ جی میں نے پہلے کبھی نہیں کی۔”

“اب شروع کر دے۔ ربیع کی فصل تو تیار ہی ہے۔ واڈھی پر شروع کر دے۔” اس نے رحیم داد کو سبز باغ دکھایا۔ “آڑھتی تجھے فصل کی اتنی کیمت کہاں دیں گے جو میں سمگلنگ کے ذریعے دلاؤں گا۔ دگنی کیمت سے بھی زیادہ مل جائے تو تعجب کی بات نہیں۔”

“نہیں‘ مجھے اس چکر میں نہ ڈال۔” رحیم داد سراسیمہ ہو گیا۔ “یہ بہت خطرناک دھندا ہے۔”

“کوئی خطرناک شطرناک دھندا نہیں۔” سمہ نے اس کی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کی۔ “دور سے دیکھو تو خطرہ ہی خطرہ نظر آتا ہے۔ نزدیک آئے گا تو اتنا خطرہ نظر نہیں آئے گا جتنا تو سمجھتا ہے۔” اس نے گرم جوشی سے رحیم داد کا ہاتھ تھام لیا۔ “یار تجھے کیا پتہ‘ اوپر سے نیچے تک سب کھاتے ہیں۔ سمگلنگ کی روک تھام کرنے والے تو دبا کے کھاتے ہیں۔ وہ نہ کھائیں تو سمگلنگ کا دھندا ایک روز نہ چلے۔ نزدیک سے دیکھے گا تو اس دھندے میں تجھے ایسا ایسا چہرہ دکھائی دے گا جس

کے بارے میں تو نے کبھی شبہ بھی نہ کیا ہوگا۔ کیا سمجھا؟"

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ رفیع سمہ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ "اب کچھ تیرے کام کے بارے میں بات ہو جائے جس کے لیے تو آیا ہے۔"

"وہ تو میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں۔" رحیم داد نے کہا۔

"وہ تو مجھے یاد ہے۔ کل رات چینی اور تیل سے لدے میرے ست اونٹھ سرحد پار جا رہے ہیں۔ میں اس سلسلے میں شام ہی کو نکل جاؤں گا۔ سارا بندوبست پہلے ہی کرنا ہوتا ہے۔" اس نے لسی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا، چند گھونٹ پیے۔ ہاتھ سے مونچھوں میں لگی ہوئی لسی کے قطرے صاف کیے۔ "آج رات میں نے تیرے ساتھ روٹی نہیں کھانی۔ تو اکیلا ہی روٹی کھا لینا۔ جس چیز کی ضرورت ہو، میرے نوکر اکبر کو بتا دینا۔ میں سویرے لوٹوں گا۔ جہاں میں جا رہا ہوں ادھر ہردیال کا بھی ایک کرندہ ہوگا۔ ہے تو وہ سکھ پر اس سے اپنی پرانی یاری ہے۔"

"تو سنتو کھے کی گل تو نہیں کر رہا؟" رحیم داد نے جھجک کر پوچھا۔

"ہاں، میں سنتو کھے ہی کی گل کر رہا ہوں۔ ویسے اس کا اصلی نام سردار سنتوکھ سنگھ ہے۔" رفیع سمہ نے حیرت زدہ نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "تو سنتو کھے کو جانتا ہے؟"

"میں اسے بالکل نہیں جانتا، کبھی دیکھا بھی نہیں۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "ہردیال جمیلہ کو لینے آیا تھا تو اس نے میرے سامنے سنتو کھے کا ذکر کیا تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے اتنا پتہ ضرور چل گیا تھا کہ وہ اس کے بہت اعتبار کا بندہ ہے۔"

"ٹھیک اندازہ لگایا تو نے۔" رفیع نے تائید میں کہا۔ "سنتو کھا اس کے پیو کے زمانے کا نوکر ہے۔ اب تو ادھکڑ ہو گیا ہے۔ داڑھی اور سر کے بال پکنے لگے ہیں۔ ہردیال اسے بہت مانتا ہے۔"

"تب تو سنتو کھے سے جمیلہ کے بارے میں ہر بات کا پتہ چل سکتا ہے۔"

"چل تو سکتا ہے۔ پر بہت گھما پھرا کر گل کرنی ہوگی۔" رفیع سمہ مسکرایا۔ "تو فکر نہ کر۔ میں باتوں باتوں میں اس سے سب کچھ پوچھ لوں گا۔"

"کیا کیا پوچھے گا؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر استفسار کیا۔

"یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔ میں اس سے آج ہی بات کرنے کی کوشش کروں گا۔ واپسی پر کل تجھے بتا بھی دوں گا اس سے کیا بات ہوئی۔"

دونوں کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ سمہ اٹھ کر ماڑی میں چلا گیا۔ رحیم داد کچھ دیر کرسی پر بیٹھا رہا، پھر اٹھا اور بستر پر جا کر دراز ہو گیا مگر اسے نیند نہیں آئی۔

☆

دن ڈھلے رحیم داد کمرے سے نکلا اور ٹہلتا ہوا درختوں کی طرف چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر چار دیواری کی قریب دو نو عمر لڑکے اٹو رَوڑا کھیل رہے ہیں۔ ان کے لباس بوسیدہ اور میلے کچیلے تھے۔ ایک کا قد ذرا نکلتا ہوا تھا، اس کے بال خشخشی تھے، آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ عمر نو دس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ دوسرا اس کا ہم عمر تھا۔ سر گھٹا ہوا، چہرہ گول مٹول، قد ذرا دبتا ہوا۔ وضع قطع سے دونوں کمیوں کے بچے نظر آتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پتھر کے دو دو ٹکڑے دبے تھے۔

ایک نے پتھر اچھالا۔ پتھر کچھ دور جا کر گرا۔ دوسرے کا قد قدرے اونچا تھا۔ اس نے ہاتھ میں دبے ہوئے پتھر ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ پھر سامنے پڑے ہوئے دوسرے کھلاڑی کے پتھر کا نشانہ باندھ کر ہاتھ میں دبا ہوا پتھر زور سے پھینکا مگر اس کا نشانہ چوک گیا۔

اب دوسرے کی باری تھی۔ اس نے زمین پر پڑا ہوا اپنا پتھر اٹھایا۔ اس نے بھی اپنے دونوں پتھروں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر بجایا۔ ایک ہاتھ اٹھایا اور پہلے کھلاڑی کے زمین پر پڑے ہوئے پتھر پر تاک کر اس طرح اپنا پتھر مارا کہ وہ ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ دونوں پتھروں کے ٹکرانے سے زور کی آواز پیدا ہوئی۔

جس کھلاڑی کا پتھر پٹ گیا تھا، اس کا منہ لٹک گیا۔ وہ ہار گیا تھا۔ کھیل کے اصول کی رو سے وہ زمین پر دونوں ہاتھ ٹکا کر گھوڑا بن گیا۔ دوسرا اپنی جیت سے سرشار ہنستا مسکراتا آگے بڑھا اور اچک کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔

دونوں بچوں کو اٹو روڑا کھیلتے دیکھ کر رحیم داد کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ وہ بہت اچھا کھلاڑی رہ چکا تھا۔ اس کا نشانہ بہت کم چوکتا تھا۔ عام طور پر اس کھیل میں جیتتا تھا اور ہارنے والے کھلاڑی کی پیٹھ پر شان سے اکڑ کر بیٹھتا تھا۔ منہ سے ٹخ ٹخ کی آواز نکال کر اسے چھیڑتا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا لڑکوں کے قریب پہنچ گیا۔ اوپر بیٹھا ہوا لڑکا ہارنے والے کھلاڑی کو چڑانے کے لیے اس کی پیٹھ دونوں ہاتھوں سے تھپ تھپا کر ہولے ہولے اچھل رہا تھا، قہقہے لگا رہا تھا۔ ہارنے والا کھلاڑی اس کے بوجھ سے دبا ہوا تھا۔ وہ خجل اور پریشان تھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ وہ رک رک کر ہاتھ پیروں کی مدد سے چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رحیم داد کے قدموں کی آہٹ سن کر دونوں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ جو کھلاڑی گھوڑا بنا ہوا تھا، وہ آگے بڑھتے بڑھتے ٹھٹکا اور رحیم داد کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے حیرت جھلکنے لگی۔ رحیم داد نے نزدیک سے

دیکھا تو اس کی صورت میں اسے اپنے پہلوٹی کے بیٹے کریما کی شباہت نظر آئی۔ وہی تیز چمکتی ہوئی آنکھیں، وہی رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں۔ دیکھنے میں وہ کریما ہی لگتا تھا، مگر کریما تو اپنی ماں نوراں کے ساتھ اکال گڑھ میں تھا۔ رحیم داد نے اسے آخری بار وہیں دیکھا تھا۔

کریما یہاں کیسے آگیا؟ رحیم داد تذبذب میں پڑ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا رہا۔

لڑکے نے رحیم داد کو اس طرح گھورتے دیکھا تو ایسا گھبرایا کہ فوراً سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا لڑکا اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا۔ وہ پھسلتا ہوا دھڑام سے نیچے گرا اور جھنجلا کر لڑنے کے لیے تیزی سے اٹھا۔ مگر اس کے اٹھنے سے پہلے ہی دوسرا لڑکا بگٹٹ بھاگا۔ وہ تیزی سے اس سمت بڑھا جدھر نوکروں اور کمیوں کی کچی کوٹھریاں تھیں۔ وہ مڑ مڑ کر رحیم داد کو دیکھتا بھی رہا۔ اس کے چہرے پر سراسیمگی کے ساتھ ساتھ تعجب بھی تھا۔ نیچے گرنے والا لڑکا کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا۔ رحیم داد کو چند لمحے تک گھورتا رہا، پھر وہ بھی اسی طرف بھاگا جدھر اس کا ساتھی گیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے دونوں لڑکے درختوں کی آڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

رحیم داد جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ دونوں لڑکے بھاگتے ہوئے ایسے غائب ہوئے کہ دوبارہ نظر نہیں آئے۔ نہ جانے وہ کہاں روپوش ہو گئے تھے۔ ان کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔

رحیم داد مڑا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا باغیچے میں پہنچ گیا۔ شیشم کے ایک گھنے درخت کے نیچے چند کرسیاں اور مونڈھے پڑے رہتے تھے۔ وہ تھکا ہوا سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دن ڈھل رہا تھا، سائے طویل ہو کر پھیلتے جا رہے تھے۔ ہوا میں تیزی تھی۔ شیشم کے خزاں رسیدہ پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہے تھے۔

سورج ماڑی کی اونچی ممٹی کے عقب میں ڈوب رہا تھا۔ دھوپ مٹیالی پڑ گئی تھی۔ خنکی ہولے ہولے بڑھنے لگی۔ رحیم داد اٹھا اور ڈیرے کی سمت بڑھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات ابھر رہے تھے۔ بیتے دنوں کی یادوں کے چراغ جل رہے تھے۔ بجھ رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔

☆

شام کا دھندلکا آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ نوکر نے لیمپ روشن کر دیا مگر رحیم داد کمرے میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ اٹھ کر برآمدے میں آگیا۔ سامنے سے رفیع سمہ نمودار ہوا، قریب آیا اور مسکرا کے بولا:

”چوہدری، میں تو اب جا رہا ہوں۔ تجھ سے کل صبح ملوں گا۔“

”سنتو کھا بھی ادھر ہو گا۔ اسے بھی ملے گا ناں؟“

”ہاں، وہ ادھر ہی ہو گا۔ اس نے مجھے پہلے ہی اطلاع بھجوا دی تھی۔ اس سے تو ملی گل ہو گی۔“

”جمیلہ کے بارے میں بھی بات کرنا۔“ رحیم داد نے یاد دہانی کراتے ہوئے کہا۔

”یار! یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”تجھے یہاں اپنے ساتھ لایا کس لیے ہوں۔ جمیلہ کے بارے میں تو اس سے بہت سی باتیں ہوں گی۔ اسے یہ تو پتہ ہی ہو گا کہ جمیلہ اپنے بھرا ہردیال کے ساتھ ہے۔“

”کیوں نہیں پتہ ہو گا۔ اسے سب کچھ ملوم ہے۔ جمیلہ نے ہردیال کو بلانے کے لیے جو خط بھیجا تھا، وہ سنتو کھے ہی نے پہنچایا تھا۔ ہردیال نے یہ گل میرے سامنے ہی جمیلہ کو بتائی تھی۔“ رحیم داد نے رفیع کو آگاہ کیا۔ ”اور دیکھ، اتنا خیال رکھنا سنتو کھے کے سامنے تو جمیلہ نہیں پاردتی یا پارو کہنا۔ ادھر اس کا یہی نام ہے۔“

”تو پروا نہ کر۔“ رفیع سمہ نے اسے اطمینان دلایا۔ ”مجھے پتہ ہے، سنتو کھے سے کس ڈھب سے بات کرنی ہو گی۔“ اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ”مجھے اب چلنا چاہیے۔ تو اپنے کمرے میں جا کر روٹی کھا۔ آرام سے سو۔ دل چاہے تو تھوڑی سی لگا لے۔ اکبرے کہہ دینا، وہ بندوبست کر دے گا۔“

”نہیں، آج میرا پینے کا ارادہ نہیں۔ کل تیرے ساتھ بیٹھ کر لگاؤں گا۔“

سمہ نے ہنس کر کہا۔ ”جیسی تیری مرضی۔“ وہ آگے بڑھ کے پھاٹک کی جانب روانہ ہو گیا۔

شام اب گہری ہو چکی تھی۔ ڈیرے کے کمروں میں روشنی جھلملا رہی تھی۔ رحیم داد کے علاوہ ڈیرے میں دو مہمان اور بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ رحیم داد برآمدے سے نکل کر باہر آگیا۔ اس نے دیکھا، دونوں مہمان ایک کمرے میں چارپائی پر بیٹھے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بھاول پوری حقے پر کش لگا رہے تھے۔ رحیم داد کی ان سے شناسائی نہ تھی۔ اس کا کمرہ بھی ڈیرے کے ایک گوشے میں بالکل الگ تھلگ تھا۔ رحیم داد کچھ دیر اندھیرے میں گم صم کھڑا رہا پھر وہ مڑا، کمرے کی جانب چلا مگر اندر نہ گیا۔ برآمدے میں دو مونڈھے پڑے تھے۔ درمیان میں چھوٹی میز بھی رکھی تھی۔ وہ ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

برآمدے کے آگے جال کے دو اونچے اونچے درخت تھے۔ رات کی آمد آمد تھی۔ درختوں تلے اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ اسے برآمدے میں بیٹھے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اکبر نے میز پر کھانا لگا دیا۔ کھانا چٹ پٹا اور خوش ذائقہ تھا۔ رحیم داد نے رغبت سے کھایا۔ کھانے کے بعد لسی کا پورا گلاس

چڑھایا' ڈکاری اور مونڈھے پر ذرا پھیل کر بیٹھ گیا۔ اکبر کھانے کے برتن اٹھا کر لے گیا۔ رات رفتہ رفتہ کالی کاجل ہو گئی۔ رحیم داد اٹھ کر کمرے کے اندر چلا گیا۔ بستر پر لیٹا مگر نیند نہ آئی۔ اس کے ذہن پر جمیلہ چھائی ہوئی تھی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ سناٹا بڑھ گیا تھا۔ رحیم داد کی آنکھ ذرا لگی ہی تھی کہ کھڑکی پر آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے جھٹ آنکھیں کھول دیں' گردن موڑی اور کھلی ہوئی کھڑکی کی جانب دیکھا۔ لوہے کی سلاخوں کے پیچھے اندھیرے میں کھڑا کوئی کمرے میں جھانک رہا تھا۔ اسے صرف دھندلا سایہ نظر آیا اور ہلکی سی جھلک۔ رحیم داد نے گردن اونچی کی حیران و پریشان ہو کر کھڑکی کی طرف غور سے دیکھا۔ وہاں اب کوئی نہ تھا۔

رحیم داد کی نیند اچاٹ ہو چکی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ زور سے کھنکارا۔ بستر سے نیچے اتر کے کھڑکی پر پہنچا اور سلاخوں کی آڑ سے باہر دیکھنے لگا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ہر طرف تاریکی کا جال پھیلا تھا۔ ہوا تیکھی تھی۔ ہوا کے ایک سرد جھونکے نے رحیم داد کے بدن میں ہلکی ہلکی کپکپی پیدا کر دی۔ عین اس وقت درختوں کے خشک پتوں پر دبی دبی چاپ ابھری۔ لیکن اندھیرا اس قدر گہرا تھا کہ اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے گردن گھما پھرا کر ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ چاروں طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ وہ کھڑکی کی چوکھٹ سے لگا خاموش کھڑا رہا۔ جب دیر تک کوئی آہٹ ابھری نہ آواز آئی تو وہ واپس جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔

نیند اڑ چکی تھی۔ وہ بستر پر چپ لیٹا رہا۔ اس کی نظریں بار بار کھڑکی کی جانب اٹھ جاتیں۔ کھڑکی کے باہر گھنے درخت تھے۔ پت جھڑ لگ چکا تھا۔ خزاں رسیدہ پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور ہوا کے بپھرے ہوئے جھونکوں سے آہستہ آہستہ کھڑکھڑا رہے تھے۔ رات گزرتی رہی۔ سردی بڑھ گئی۔ آخر رحیم داد کی آنکھ لگ گئی۔

رفیع سمہ آدھی رات کے بعد واپس آگیا تھا۔ مگر رحیم داد سے اس کی ملاقات سویرے ناشتے پر ہوئی۔ اس وقت بھی آسمان پر بادلوں کا غبار چھایا تھا۔ ہوا سنسناتی ہوئی چل رہی تھی۔ رات کو بوندا باندی بھی ہوئی تھی۔ موسم اچانک بدل گیا تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ صبح خنک اور دھندلی تھی۔

رحیم داد نے رفیع سمہ سے دریافت کیا۔ "سنتو کھے سے بھی تیری ملاقات ہوئی۔؟"

"بالکل ہوئی۔" سمہ نے مسکرا کے جواب دیا۔ "اس سے بہت ساری باتیں ہوئیں۔"

"جمیلہ کے بارے میں بھی گل بات ہوئی؟"

"کیوں نہیں ہوئی۔" رفیع سمہ اس کی بے چینی پر مسکراتا رہا۔ جان بوجھ کر مختصر جواب دیتا رہا۔

"جمیلہ کے بارے میں دیر تک بات ہوئی۔"

"کیا کہتا تھا وہ؟" رحیم داد تفصیل معلوم کرنے کے لیے بے تاب تھا۔

"تو نے جمیلہ کے بارے میں ٹھیک ہی سوچا تھا۔"

"کیا؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "صاف صاف گل کر۔"

"سنتو کھا کہتا تھا' جمیلہ کے فیروز پور پہنچنے پر تو سب بہت خوش تھے' امرت سر سے ہردیال کے دو بھائی رام دیال اور منوہر دیال' جمیلہ سے ملنے اپنے بال بچوں کے ساتھ فوراً پہنچے۔ جلندر سے چھوٹا بھائی ایشور دیال بھی پہنچا۔"

رحیم داد نے استفسار کیا۔ "کیا سب بھائی ساتھ نہیں رہتے؟" حالانکہ وہ جلیل کے حوالے سے نادر خاں کی زبانی سن چکا تھا کہ جمیلہ کے بھائی علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں۔ مگر وہ نادر خاں سے سنی ہوئی ہر بات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

"نہیں!" رفیع سمہ نے مطلع کیا۔ "ہردیال فیروز پور میں رہتا ہے۔ ماں بھی اس کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ ہردیال اپنے سالے کشوری لال کے ساتھ کاروبار کرتا ہے۔ رام دیال اور منوہر اپنا الگ بیوپار کرتے ہیں۔ وہ امرت سر میں ہوتے ہیں اور سب سے چھوٹا ایشور دیال جلندر میں ہے۔" اس نے رحیم داد کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "جمیلہ تیرے پاس سے گئی تو ہردیال کے ساتھ ہی ٹھیری تھی۔"

"وہ تو ابھی تک ہردیال کے ساتھ ہی ہو گی؟"

"نہیں اب وہ فیروز پور میں نہیں ہے۔ وہ ہردیال کے گھر سے چلی گئی۔"

رحیم داد نے پوچھا۔ "وہ کہاں چلی گئی؟"

"ہردیال کی گھر والی سے اس کا زبردست جھگڑا ہو گیا۔ جھگڑا تو پہلے بھی کئی بار ہوا پر اس دفعہ کچھ زیادہ ہی زوردار ہوا۔"

"کس بات پر جھگڑا ہوا؟"

"سنتو کھا کہتا تھا' ہردیال کی گھر والی غصے کی بہت تیز اور جھگڑالو ہے۔ چھوت چھات بھی بہت کرتی ہے۔ جمیلہ کے بچے اس کے برتن یا روٹی چھو لیتے یا رسوئی میں چلے جاتے تو وہ سخت ناراض ہوتی۔ انھیں مارتی پیٹتی' چیختی چلاتی۔ جمیلہ بولتی تو اسے طعنے دیتی۔" رفیع سمہ نے رحیم داد کو کسی قدر تفصیل سے بتایا۔ "بس جی' ایسی ہی باتوں پر جھگڑا شروع ہوا اور اکثر ہوتا رہا۔ ہردیال گھر والی کو منع کرتا۔ ڈانٹ پھٹکار بھی کرتا پر اس کی گھر والی بہت چنڈال ہے۔ ہردیال سے ڈانٹ کھا کر ٹسوے بہانے بیٹھ جاتی۔"

"بہت خراب زنانی ہے۔" رحیم داد نے تبصرہ کیا۔

"ہاں جی بہت خراب ہے وہ۔ سنتو کھا بھی یہی کہتا تھا۔" رفیع سمہ نے رحیم داد کی تائید کی۔ "کئی مہینے پہلے کا ذکر ہے۔ ہردیال گھر پر نہیں تھا' چنڈی گڑھ گیا تھا۔ ادھر اس کی گھر والی نے جیلہ سے سخت جھگڑا کیا۔ ننگی ننگی گالاں بھی نکالیں۔ مارنے کو بھی بار بار جھپٹی۔ جیلہ رونے لگی۔ دیر تک روتی رہی۔ سنا ہے' اسی روز اس نے گھر چھوڑ دیا اور بچوں کو بھی ساتھ لے گئی۔"

"کہاں چلی گئی تھی۔ سنتو کھا کیا بتاتا تھا؟"

"وہ بتاتا تھا جیلہ اپنے بچوں کے ساتھ منوہر دیال کے پاس امرت سر گئی تھی۔"

"تب تو اسے امرت سر میں ہونا چاہیے۔"

"نہیں' منوہر کی گھر والی سے بھی اس کی ان بن ہو گئی۔ کچھ دن وہ رام دیال کے ساتھ بھی ٹھہری رہی۔"

"اب کہاں ہے؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"امرت سر سے وہ ایشور دیال کے پاس جلندر چلی گئی۔ بلکہ ہوا یہ کہ ایشور دیال اسے امرت سر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔"

"ہردیال اسے منانے نہیں گیا؟"

"امرت سر بھی گیا تھا' جلندر بھی پہنچا۔ سنتو کھا کہتا تھا ہردیال نے جیلہ کو منانے اور اپنے ساتھ فیروز پور لانے کی بہت کوشش کی پر اس نے صاف انکار کر دیا۔"

"مطلب یہ کہ جیلہ اب فیروز پور میں نہیں' جلندر میں ایشور دیال کے ساتھ ہے۔"

"سنتو کھا تو یہی بتاتا ہے۔" سمہ نے رحیم داد سے اتفاق رائے کیا۔

"سنتو کھے کی باتوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ ایشور دیال کی گھر والی سے تو جیلہ کا جھگڑا اتنا نہیں ہوتا چھوت چھات تو وہ بھی کرتی ہو گی؟"

"جلندر کے بارے میں سنتو کھے کو کچھ پتہ نہیں۔" رفیع سمہ نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "وہ زیادہ تر فاضلکا میں رہتا ہے۔ جلندر اس کا بالکل جانا نہیں ہوتا۔"

"ادھر کے بارے میں کیسے پتہ چلے گا؟" رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "لگتا ہے تو نے جیلہ کے بارے میں پوری طرح پتہ نہیں کیا۔"

"فکر نہ کر۔" سمہ نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "جلندر کا حال احوال شنکر سے معلو ہو سکتا ہے۔ وہ پچھلے دنوں ادھر ہی تھا اور ایشور دیال ہی کے گھر ٹھہرا تھا۔"

"شنکر سے تو نہیں ملا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"نہیں۔" رفیع سمہ نے انکار میں گردن ہلائی۔ "وہ ہوشیار پور گیا ہے۔ واپسی پر اس سے ملوں گا۔ اس سے بھی میری بہت یاری ہے۔"

"وہ کب تک واپس آئے گا؟"

"یہ تو مجھے پتہ نہیں۔" سمہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "ایسا کر تو کچھ روز اور یہاں ٹھہر جا۔"

"میں زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتا۔" رحیم داد نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "یہ بھی تو ٹھیک سے پتہ نہیں وہ کب لوٹے گا۔"

"میں نے آج رات بھی جانا ہے۔ اندھیرا ہوتے ہی نکل جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے' آج ہی رات شنکر سے ملنا ہو جائے۔"

"ایسا ہو جائے تو بہت ٹھیک ہے۔" رحیم داد خوش ہو کر بولا۔

"شنکر سے گل بات ہو گئی تب تو میں کل سویرے آ جاؤں گا۔" سمہ مسکرایا۔ "تیرے ہی لیے آؤں گا ورنہ میرا پروگرام تو دو روز بعد لوٹنے کا تھا۔"

"اگر تو سویرے نہ آیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ شنکر سے تیری ملاقات نہیں ہوئی۔ تو نہ لوٹا تو میں سویرے واپس چلا جاؤں گا۔"

"جیسی تیری مرضی' لیکن میں چاہتا تھا کہ تو کچھ روز ٹھہر جاتا۔"

"کیا کروں گا ٹھہر کر۔ دو روز تک تو بھی ادھر نہیں ہو گا۔ اکیلے میں دل گھبرائے گا۔ ویسے کوٹلہ ہرکشن میں مجھے کئی ضروری کام بھی کرنے ہیں۔"

رفیع سمہ نے مزید اصرار نہیں کیا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ جلد ہی اٹھ کر چلا گیا۔ رحیم داد نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

شام کو رفیع سمہ کمرے میں آیا۔ بادل آسمان پر چھائے تھے۔ سمہ اور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔

رحیم داد نے کہا۔ "سردی بہت ہے' ہوا بھی تیز ہے۔ بارش بھی ہو سکتی ہے۔ ایسے میں تو کیسے جائے گا؟"

"ایسا موسم تو اپنے کام کے لیے بالکل ٹھیک ہوتا ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"بیٹھ کر آرام سے گل کر۔" رحیم داد اس سے بات چیت کرنا چاہتا تھا۔

"نہیں' مجھے اب جانا ہے۔ باہر جیپ تیار کھڑی ہے۔"

"تو سویرے نہیں آیا تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ تو شنکر سے ملنے کے بعد میرے پنڈ آ جانا۔ میں

تیرا انتظار کروں گا۔"

رفیع سمہ نے اسے اطمینان دلایا۔ "میں تیرے پاس ضرور آؤں گا۔ شنکر سے جو کچھ جمیلہ کے بارے میں پتہ چلے گا تجھے بتا دوں گا۔"

"یہ بتا' تیرے کہنے پر شنکر جالندھر جا کر میرا سندیسا جمیلہ تک پہنچا سکتا ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"ابھی تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شنکر سے ملنے کے بعد ہی بتا سکوں گا۔"

"ایسے کام نہیں چلے گا۔" رحیم داد نے اپنی بات پر زور دیا۔ "یہ کام تو شنکر سے کرانا ہی پڑے گا۔ شنکر تیرا گہرا یار ہے۔ وہ ضرور یہ کام کر دے گا۔"

"میں کب انکار کر رہا ہوں۔ تھوڑا صبر کر۔ شنکر سے میری گل بات تو ہو جائے۔" رفیع سمہ نے رحیم داد کو یقین دلایا۔ "سویرے نہ آیا تو تیرے بنر ضرور آؤں گا۔ تو اطمینان رکھ۔ میں شنکر سے ملتے ہی تیرے پاس آؤں گا۔"

رفیع سمہ مڑا۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ پھاٹک تک گیا۔ گرم جوشی سے اسے گلے لگا کر رخصت کیا۔ وہ جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔

☆

رات کا کھانا کھانے کے بعد رحیم داد باہر نہیں گیا' بستر پر لیٹ گیا۔ رات سنسان ہوتی گئی' تاریک اور سرد ہوتی گئی۔

ہوا درختوں کی شاخوں سے الجھتی ہوئی پھڑپھڑا رہی تھی۔ پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے' کھڑکھڑا رہے تھے۔ رحیم داد آنکھیں بند کیے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیند کا غلبہ بڑھ رہا تھا مگر وہ سو نہیں سکا۔

آہستہ سے آہٹ ہوئی۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول دیں۔ کھڑکی کی جانب مڑ کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا' البتہ دروازے پر رک رک کر آہٹ ابھر رہی تھی۔ کوئی ہولے ہولے دستک دے رہا تھا۔ دروازہ بند تھا مگر رحیم داد نے زنجیر نہیں چڑھائی تھی۔ اس نے سوچا' ڈیرے کا ملازم اکبر کسی کام سے آیا ہو گا۔ رحیم داد نے کروٹ بدل کر دروازے کی سمت دیکھا اور آواز ذرا اونچی کرتے ہوئے بولا۔

"دروازہ کھلا ہے' اندر آجا۔"

دروازے کا ایک پٹ چرچراتا ہوا دھیرے سے کھلا' کوئی جھپاک سے کمرے میں داخل ہوا

اس نے مڑ کر جھٹ دروازہ بند کر دیا۔ اس کی پشت رحیم داد کی طرف تھی مگر وہ اکبر نہیں تھا' کوئی عورت تھی۔ وہ پلٹی تو رحیم داد ششدر رہ گیا۔ اس نے پہلی نظر میں اسے پہچان لیا۔ وہ اس کی بیوی نوراں تھی۔ وہ دروازے سے پیٹھ ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی حیران اور گھبرائی ہوئی نظریں رحیم داد کی سمت تھیں۔ وہ سہمی ہوئی تھی اور سردی سے کپکپا رہی تھی۔

رحیم داد اٹھ کر تکیے کے سہارے بیٹھ گیا۔ اس نے نوراں کو پہچان کے بھی انجان بننے کی کوشش کی۔ بے رخی سے بولا۔ "کون ہے تو؟"

"آہستہ بول۔" اس نے رسان سے کہا۔ "میں نوراں ہوں۔"

"کون نوراں؟" رحیم داد نے بے اعتنائی سے پوچھا۔

نوراں نے کچھ نہ کہا۔ دھیرے دھیرے آگے بڑھی اور رحیم داد کے روبہ رو کچھ فاصلے پر رک کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ بجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "تو نوراں کو نہیں جانتا؟"

"میں کسی نوراں شوراں کو نہیں جانتا۔" رحیم داد نے بے زاری سے کہا۔ "تو یہاں کیسے آئی؟ کس لیے آئی؟"

"تجھے ملنے آئی ہوں۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"مجھ سے!" رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت کا اظہار کیا۔ "میں تو تجھے جانتا بھی نہیں۔ مجھ سے تجھے کیا لینا؟"

نوراں کچھ نہ بولی۔ کھوئی کھوئی سی کھڑی رہی۔ اس کے پیروں میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ وہ نیلی دھوتی باندھے ہوئے تھی۔ جھگا موٹی سفید ململ کا تھا۔ دوپٹہ ہلکا بسنتی تھا۔ وہ پھول دار کھیس اوڑھے ہوئی تھی۔ اس کا لباس دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے آج ہی کپڑے دھو کر پہنے تھے۔ سردی کے باوجود غسل بھی کیا تھا۔ آنکھوں میں کاجل اور سر میں تیل ڈالا تھا۔ اس کا چہرہ روکھا اور زردی مائل تھا۔

رحیم داد نے محسوس کیا کہ نوراں کے رخساروں کے شگفتہ پھول مرجھا گئے ہیں۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں' جن میں کبھی ستارے جھلملاتے تھے بجھ کر ویران ہو گئی ہیں۔ اس کا چمکتا دمکتا حسن اجڑ گیا تھا۔ چہکتی بولتی جوانی ڈھلک گئی تھی۔ وہ ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن گئی تھی۔

رحیم داد نے اسے چھیڑا۔ "تجھے اکبر نے میرے پاس بھیجا ہے؟"

"وہ مجھے تیرے پاس کیوں بھیجنے لگا؟" اس کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ تلخی بھی تھی۔ وہ

گردن جھکا کر دبی زبان سے بولی۔ "میں تو خود تیرے پاس آئی ہوں۔ کل رات بھی آئی تھی۔ پر اندر آنے کا حوصلہ نہ ہوا۔"

"لگتا ہے پچھلی رات تو کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔ تو ہی تھی ناں؟"

"ہاں، میں ہی تھی۔" اس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔

"پر تو آئی کیوں؟" رحیم داد تلخی سے بولا۔

نوراں ایک بار پھر چپ ہو گئی۔ اس نے نظریں اٹھائیں اور رحیم داد کے چہرے کو اس طرح تکنے لگی گویا کچھ تلاش کر رہی ہو۔ رحیم داد اس کی متلاشی اور نوکیلی نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ گھبرا گیا۔ سراسیمہ ہو گیا۔ اس نے جھٹ گردن موڑی۔ ہاتھ بڑھایا۔ سرہانے رکھی ہوئی عینک اٹھائی اور آنکھوں پر لگالی۔

وہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہی۔ اس کی نظریں بدستور رحیم داد کی جانب اٹھی تھیں۔ ان میں تلاش تھی، جستجو تھی۔

رحیم داد پریشان ہو گیا۔ اس نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "تو مجھے اس طرح گھور کیوں رہی ہے؟"

نوراں اس کے لہجے کی تلخی نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ "بالکل ویسی ہی آنکھیں وہی متھا۔" وہ کچھ اس انداز سے بول رہی تھی جیسے خواب میں بڑبڑا رہی ہو۔ "پہلے داڑھی نہیں تھی۔ آنکھوں پر عینک بھی نہیں ہوتی تھی۔ گال پر چوٹ کا یہ نشان بھی نہیں تھا۔"

رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ "تو کہنا کیا چاہتی ہے؟" اس کے لہجے سے پریشانی اور گھبراہٹ صاف عیاں تھی۔

وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی اور رحیم داد کے سامنے فرش پر دونوں گھٹنے اٹھا کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک بار پھر رحیم داد کے چہرے کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ نرمی سے بولی۔ "مجھے تو پتہ بھی نہ تھا۔ کریمے نے تجھے ادھر درختوں تلے دیکھا تھا۔ بھاگتا ہوا میرے پاس آیا۔ میرا ہتھ پکڑ کر باہر لایا۔ تو سامنے بیٹھا تھا۔ میں اور کریما درختوں کی آڑ سے چوری چوری تجھے دیکھتے رہے۔ کریما تو تیرے پاس جانے کے لیے مچل رہا تھا۔ ضد کر رہا تھا۔ پر میں نے اسے روک لیا۔"

رحیم داد نے ایک بار پھر انجان بننے کی کوشش کی۔ "یہ کریما کون ہے؟ وہی منڈا تو نہیں جو کل دن ڈھلے درختوں تلے اٹو روڑا کھیل رہا تھا۔ پر وہ تو دو تھے۔ ان میں کریما کون سا تھا؟"

"وہی تھا، جس کی آنکھیں اور ناک تیری ہی طرح ہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "وہ میرا وڈا پتر کریم داد ہے۔ آج بھی دن بھر تجھے چھپ چھپ کر دیکھتا رہا۔ وہ تو تیرے کمرے میں آنا بھی چاہتا تھا۔ پر میں نے اسے منع کر دیا۔"

"میں نے تو اسے پہلی بار دیکھا تھا۔" رحیم داد نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ "میں تو اسے بالکل نہیں جانتا۔ تجھے بھی نہیں جانتا۔"

نوراں تڑپ کر بولی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "سچ سچ بتا تو رحیم داد ہی ہے ناں؟ میں کسی کو یہ بات نہیں بتاؤں گی۔"

"تیرا مغز تو نہیں پھر گیا۔" رحیم داد نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے کہا۔ "میں کسی رحیم داد نحیم داد کو نہیں جانتا۔ جانے تو کس کی گل کر رہی ہے۔"

"تو، تو کون ہے؟" نوراں نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

"میراں ناں چوہدری نور الٰہی ہے۔" رحیم داد نے خفگی کا اظہار کرنے کی غرض سے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ "تو یہاں سے جا۔ مجھے تنگ نہ کر۔"

"ناراض نہ ہو۔ میں چلی جاؤں گی۔" وہ کسی قدر عاجزی سے بولی۔ "تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ مجھے ہی دھوکا ہوا۔ تو رحیمے کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے تو کادر آباد کے ٹبوں کے درمیان کتل کر دیا گیا۔"

"کون تھا وہ؟"

"وہ میرا گھر والا تھا۔" نوراں کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی چمک لہرائی۔ "مجھے بہت پیار کرتا تھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ "آنکھوں کی چمک دمک ماند پڑ گئی۔ اب تو اسے مرے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے۔"

"کیا کرتا تھا وہ؟" اس دفعہ رحیم داد کا لہجہ کھردرا نہ تھا۔

"زمیں دار تھا۔" نوراں نے فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے بتایا۔ "بارہ کلا سے اوپر اپنی زمین ہوتی تھی۔"

"تیری زمین داری کا کیا بنا؟"

"رحیمے کے مرنے کے بعد ختم ہو گئی۔" نوراں کی آواز میں درد کی کسک تھی۔ "گھربار سب کچھ اجڑ گیا۔" اس نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ "تو نے احمد کوٹ تو دیکھا ہوگا؟"

"نہیں، میں کبھی ادھر نہیں گیا؟"

"تو رہنے والا کہاں کا ہے۔؟" نوراں نے پوچھا۔

"میں گورداسپور کا مہاجر ہوں۔ موضع نصیرپور میں میرا گھر ہوتا تھا۔ ادھر اپنی زمیں داری بھی تھی۔ فسادات میں سب کچھ جاتا رہا۔ میں بچ بچا کر پاکستان آگیا۔"

"ادھر آکر کیا کر رہا ہے؟"

"کوٹلہ ہرکشن میں میری زمیں داری ہے۔ کلیم میں چوی مربعے الاٹ ہوئے تھے۔" رحیم داد نے نوراں کو بتایا۔

"تب تو وڈا زمیں دار ہوا تو' پر اپنی زمین پر تو سیف اللہ کے بھائیوں نے زبردستی کبضہ کر لیا۔ ابھی تک ان کے پاس ہے۔"

"کیوں کبضہ کر لیا انھوں نے؟"

"سیف اللہ اور اس کے بھائیوں کے ساتھ رحیمے کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ انھوں نے کھیتوں کی وٹ بندی کی آڑ میں ہماری زمین دبالی تھی۔ جھگڑے میں سیف اللہ زخمی ہو کر اسپتال چلا گیا۔ رحیم داد کو سزا ہو گئی۔" نوراں سنبھل سنبھل کر بول رہی تھی۔ "سیف اللہ بعد میں اسپتال میں مر گیا۔ اس کے بھائیوں نے بدلہ لینے کے لیے رات کے اندھیرے میں میرے گھر کو آگ لگا دی۔ میرا چھوٹا پتر شیما آگ سے جل کر مر گیا۔ میں کریمے اور چھوٹی کڑی' زینو کو لے کر اسی رات احمد کوٹ سے نکل گئی۔ وہ تو مجھے اور میرے سارے ہی بچوں کو کتل کر دینا چاہتے تھے۔ پر جمال دین نے بچا لیا۔ وہ مجھے اور بچوں کو لے کر اکال گڑھ آگیا۔"

"یہ جمال دین کون ہے؟" رحیم داد ہر تفصیل نوراں کی زبانی سننے کے لیے کوشاں تھا۔

"رحیمے کا بچپن کا ساتھی رہا ہے۔ دونوں میں بہت گہری یاری تھی۔ میں اکال گڑھ میں اسی کے ساتھ رہتی تھی۔" بات کہتے کہتے وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکی۔ "تو کبھی اکال گڑھ تو نہیں گیا؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے صاف انکار کر دیا۔ مگر فوراً ہی اس کے دل کا چور بول اٹھا۔ "یہ بات تو مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہے؟"

"میں' جن دنوں اکال گڑھ میں ہوتی تھی' ایک رات مجھے تیری ہی طرح کا ایک بندہ اپنے گھر کے اندر نظر آیا تھا۔ وہ دیوار کُود کر چوری سے آیا تھا۔"

"ہو گا کوئی۔ چوری چکاری کرنے آیا ہو گا۔"

"گھر میں دھرا ہی کیا تھا جو کوئی چوری کرنے آتا۔" وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

"تجھے سفنہ آیا ہو گا۔" رحیم داد نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"جمال دین بھی پہلے یہی کہتا تھا۔ پر صبح میں نے اور جمال دین نے گھر کے پچھواڑے گلی میں پیروں کے نشان دیکھے۔ دیوار پر بھی نشان تھے اور گھر کے اندر آنگن میں بھی گھاس کے مٹھے کے پاس نشان نظر آئے۔ وہ وہیں چھپ کر بیٹھا تھا۔"

☆

رحیم داد کو یاد آگیا کہ اکال گڑھ پہنچ کر اس نے کس طرح گھر کی دیوار پھاندی' اندر گیا۔ صحن میں بے خبر سوتے ہوئے کریما اور زینو کے رخساروں اور پیشانیوں کو چوما' کوٹھری کی طرف گیا۔ دروازے کی جھری سے اندر دیکھا۔ نوراں اس وقت جمال دین کے پہلو میں لیٹی تھی۔ پھر وہ اشتعال انگیز منظر اس کی نظروں کے سامنے آگیا جب جمال دین اسے بازوؤں میں اٹھائے برآمدے میں کھڑا تھا۔ نوراں نے اپنا ایک ہاتھ پیار سے جمال دین کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ وہ گھاس کے ڈھیر کے عقب میں دبکا ہوا جمال دین اور نوراں کو دیکھ رہا تھا۔

ان یادوں کے ساتھ ہی رحیم داد کا سینہ سلگنے لگا۔ غصے اور نفرت کا اچانک ایسا شدید حملہ ہوا کہ آنکھوں سے گویا دھواں اٹھنے لگا۔ اس نے جھٹ آنکھوں پر سے عینک اتاری اور انھیں ہتھیلیوں سے ملنے لگا۔ چند لمحے تک وہ آنکھیں ملتا رہا۔

اس نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے تیری باتیں بہت سن لیں۔ اب تو یہاں سے ٹر جا۔ مجھے نیند ملوم ہو رہی ہے۔"

"تو کہتا ہے تو چلی جاؤں گی۔ نراض نہ ہو۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "مجھے تھوڑی دیر اور بیٹھا رہنے دے۔"

رحیم داد کو جمال دین بھی اپنے لیے خطرہ معلوم ہوا۔ وہ اس کا بچپن کا ساتھی تھا۔ دونوں ایک ساتھ کھیل کود کر ایک ہی گاؤں میں پلے بڑھے تھے۔ وہ اسے پہچان سکتا تھا۔ اس کا پہچان لینا بہت خطرناک ہوتا۔ وہ اس کا رقیب تھا اور اسے اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس نے جمال دین کے بارے میں ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔

"یہاں بیٹھ کر کیا کرے گی۔ جمال دین تیرا انتظار کرتا ہو گا۔"

"جمال دین میرا کیوں انتظار کرنے لگا؟" وہ منہ بگاڑ کر نفرت سے بولی۔ "وہ تو مجھے چھوڑ کر کب کا چلا گیا۔"

"کہاں چلا گیا؟" رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔

"سنا ہے جھنگ میں ہوتا ہے۔ ادھر اس نے ویاہ بھی کر لیا۔" نوراں کے چہرے پر نفرت جھنجلاہٹ بن کر ہنوز چھائی ہوئی تھی۔

"تجھ سے اس نے نکاح شکاح نہیں کیا تھا؟" رحیم داد نے نوراں کو کریدا۔ "تجھے اس نے ایسے ہی رکھ چھوڑا تھا۔"

"کیسا نکاح؟ کہاں کا ویاہ؟ خالی لارے دیتا تھا۔ جھوٹ بولتا تھا۔ بکواس کرتا تھا۔" نوراں غصے سے پھٹ پڑی۔ "ٹھیک ہی ہوا۔ نکاح ہو جاتا تو جانے وہ کیا کرتا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "تجھے کیسے بتاؤں وہ کتنا برا بندہ تھا۔ اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔"

"کیا، کیا اس نے؟" رحیم داد کو جمال دین کے خلاف نوراں کی نفرت انگیز باتوں سے راحت مل رہی تھی۔

"یہ پوچھ کیا نہیں کیا اس نے۔" اس کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ "رحما جب جیل میں تھا میں ہر ملاقات پر احمد کوٹ سے اسے ملنے جیل جاتی تھی۔ تجھے پتہ نہیں مجھے اس سے کتنا پیار تھا۔ میں اس کے لیے کتنا روتی تھی۔"

"جب ہی تو نے جمال دین سے یاری لگالی تھی۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ "اب کہتی ہے مجھے رحمے سے بہت پیار تھا۔ میں اس کے لیے روتی تھی۔"

"تجھے پتہ نہیں جمال دین نے مجھ سے یاری لگانے کے لیے کیا چکر چلایا۔ یاری میں نے نہیں اس نے لگائی تھی۔" نوراں نے صفائی پیش کی۔ "اس نے مجھے بہکایا کہ رحمے کی سیف اللہ کی بہن کے ساتھ یاری تھی۔ وہ اسے چھپ کر ملتا تھا۔ جھگڑا تو اصلی یہی تھا۔ زمین اور وٹ بندی کا تو بہانہ تھا۔"

"تو نے آنکھیں بند کر کے اس کی ہر بات مان بھی لی۔"

"میں نے اس کی بات پہلے بالکل نہیں مانی تھی۔" نوراں نے وضاحت کی۔ "فیر اس نے ایسا کیا، بنی کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ بنی بھی رحمے کا پرانا یار تھا۔ ہر دم اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ جمال دین کے سکھانے پڑھانے پر اس نے بھی رحمے کے بارے میں ایسی ہی باتیں کیں۔ میں دونوں کے بہکانے میں آ گئی۔ مجھے رحمے پر اتنا غصہ آیا کہ اسے ملنے جیل جانا بھی چھوڑ دیا۔"

رحیم داد نے بالکل انجان بن کر دریافت کیا۔ "رحما جیل سے رہا ہونے کے بعد تجھے ملنے نہیں آیا؟"

"وہ جیل سے رہا ہی کب ہوا تھا۔ وہ ایک اور کیدی کے ساتھ جیل سے فرار ہو گیا تھا۔ جیل سے بھاگنے کے بعد وہ مجھے کبھی نہیں ملا۔ مل جاتا تو میں جمال دین کے ہاتھوں اس طرح برباد کیوں ہوتی۔"

"پر جمال دین نے تجھے چھوڑ کیوں دیا؟"

"وہ پکا ہڈ حرام تھا۔ کرتا دھرتا کچھ نہیں تھا۔ دن بھر گھر میں پڑا رہتا۔ شام کو نکلتا تو نشہ کر کے آتا۔ اس نے میرے سارے زیور اور کپڑے لتے بیچ ڈالے۔ جب کچھ نہ رہا تو ادھار مانگنے کے لیے پاس پڑوس میں بھیجتا۔" اس کا لہجہ افسردہ ہوتا گیا۔ "ایسے کب تک کام چلتا۔ ادھار ملنا بھی بند ہو گیا تھا۔ کوئی کب تک ادھار دیتا۔"

نوراں بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گئی۔ سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "فیر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا۔ میں ادھار نہ ملنے پر خالی ہاتھ واپس آتی تو وہ ننگی ننگی گالاں نکالتا۔ مجھے زمین پر گرا کر ٹھڈے مارتا۔ بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا۔ منت کرتی تب بھی نہ مانتا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "بچے کئی کئی وکھت بھوکے رہتے۔ بھوک سے بلبلا کر روتے تو وہ انھیں بھی مارتا۔"

"تو اسے چھوڑ کر کہیں اور چلی جاتی۔"

"سوچا تو کئی بار، پر سمجھ نہیں آتی تھی، کیا کروں۔ ایک رات ایسا ہوا۔ وہ نشے میں دھت ہو کر لوٹا۔ مجھے اور بچوں کو مارا۔ اس رات اس نے مجھے بہت مارا تھا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ نشے کی دھن میں خود ہی بتانے لگا کہ رحمے کے بارے میں اس نے اور بنی نے جو کچھ کہا تھا، سب جھوٹ تھا۔ رحمے سے تو سیف اللہ کی بہن کی نہ کبھی ملاقات ہوئی نہ گل بات۔"

"یہ ملوم ہونے کے بعد بھی تو اس کے ساتھ رہی۔"

"وہ ایسا ہوا کہ جب مجھے اصلی گل کا پتہ چلا تو بہت غصہ آیا۔ اس رات میں نے اسے چھوڑنے کا پکا ارادہ کر لیا۔" نوراں کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "کب تک اس کی مار کھاتی۔ اس کے جھوٹ کا بھی پتہ چل گیا تھا۔" اس نے رحیم داد کے چہرے پر نظر ڈالی۔ "رات کو جب وہ مست ہو کر سو گیا تو میں نے بچوں کو ساتھ لیا۔ چوری سے گھر کے باہر آئی اور سورج نکلنے سے پہلے نظام اولیا پہنچ گئی۔ ادھر میری رشتے کی ایک ممیری رہتی ہے۔ میں اس کے پاس ٹھیر گئی۔"

"جمال دین کو تیرے نظام اولیا جانے کا پتہ نہ چلا؟"

"بالکل چل گیا تھا۔ وہ مجھے لینے وہاں آیا۔ منت بھی کی۔ پر میں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ مجھے گالاں نکالتا ہوا چلا گیا۔ دوبارہ نہ آیا۔"

"تجھے یہ کیسے پتہ چلا کہ جمال دین جھنگ چلا گیا اور اس نے ادھر ویاہ بھی کر لیا؟" رحیم داد نے نوراں کو چھیڑا۔ "اس کو منانے جھنگ گئی ہو گی۔"

"توبہ کرو جی، میں اس کے پاس کیوں جانے لگی۔" نوراں جل کر بولی۔ "مجھے تو بعد میں اکال گڑھ کے نائی سے پتہ چلا تھا کہ جمال دین اپنے ایک شریکے کے پاس جھنگ چلا گیا۔ اس کے ویاہ کے بارے میں بھی اسی نے بتایا تھا۔"

"نظام اولیا سے تو یہاں کیسے آگئی؟"

"نظام اولیا میں جب ہوتی تھی تو پڑوس میں ایک چاک رہتا تھا۔ اس کی ایک بھین رانڈ ہے۔ وہ ادھر کام کرتی ہے۔ وہی مجھے اپنے ساتھ لے آئی۔ تب سے میں ادھر ہوں۔ چھ مہینے سے اوپر ہو گئے ادھر آئے ہوئے۔"

رحیم داد کے دل میں جو غم و غصہ تھا، نوراں کی باتیں سن کر بڑی حد تک زائل ہو چکا تھا۔ اسے وہ ایک بے سہارا اور مظلوم عورت نظر آئی۔ رفتہ رفتہ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں جذبہ ہمدردی نے سر ابھارا۔ وہ سالہا سال تک اس کی شریک حیات رہی تھی۔ وہ ایک اچھی اور محبت کرنے والی بیوی تھی۔ کھیتی باڑی کے کاموں میں برابر سے اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ دن رات محنت کرتی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس کے بچوں کی ماں تھی جو بالکل بے قصور تھے۔ اور اپنی ماں کے ساتھ غربت اور ناداری کی دن گزار رہے تھے۔

نوراں نے اسے خاموش پایا تو مسکرا کر پوچھا۔ "تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

رحیم داد نے اس کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر چھایا ہوا دکھ کر غبار مٹ گیا تھا۔ وہ اب مطمئن اور پر سکون نظر آرہی تھی۔ رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ سوچنے لگا، کیا وہ اسے اپنے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دے؟ اس پر ظاہر کر دے کہ وہ مرا نہیں زندہ ہے۔ مگر وہ ایسا کر نہ سکا۔ وہ نوراں پر یہ حقیقت آشکارہ کر کے خطرہ مول لینا نہ چاہتا تھا کہ وہ حکیم نذر محمد چشتی اور چوہدری نور الٰہی کا قاتل ہے۔ اس نے چوہدری نور الٰہی بن کر جعلی کلیم کے ذریعے کوٹلہ ہر کشن میں ڈھائی سو ایکڑ زمین اور بہت بڑی حویلی اپنے نام الاٹ کرالی ہے۔ جمیلہ کی ساڑھے تین سو ایکڑ زمین بھی ہتھیالی ہے۔ اب وہ علاقے کا ایک بڑا زمین دار ہے۔ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اگر اس کا راز فاش ہو جاتا تو تباہی اور بربادی کے دروازے کھل جاتے۔ اسے جیل بھی ہو سکتی تھی۔ حکیم چشتی اور نور الٰہی کے قتل کے جرم میں پھانسی بھی ہو سکتی تھی۔ جیل اور پھانسی کا خیال آتے ہی وہ سراسیمہ ہو گیا۔

"نوراں تو اب جا۔" رحیم داد نے گھبرا کر بے رخی سے کہا۔ "رات بہت ہو گئی ہے۔ تیرے بچے انتظار کرتے ہوں گے۔"

"وہ گہری نیند سو رہے ہیں۔ سویرا ہونے سے پہلے نہیں جاگیں گے۔ تو ان کی فکر نہ کر۔"

رحیم داد کو اس کے رویے سے اندازہ ہوا کہ وہ جانا نہیں چاہتی۔ اس نے نوراں سے پیچھا چھڑانے کے لیے بے زاری سے کہا۔ "میں نے تجھے پہلے ہی بتا دیا کہ میں تیرا رحیے نہیں ہوں۔ میں نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ میں چوہدری نور الٰہی ہوں۔ گورداسپور کا مہاجر۔ مجھ سے تجھے کیا لینا۔ اب تو جا کر سو۔ بہت رات ہو گئی۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔"

اس نے جماہی لینے کے لیے منہ کھولا۔

مگر نوراں نہ گئی۔ جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھی رہی۔ اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ آہستہ سے بولی۔ "جانے کیوں تیرے پاس سے جانے کو دل نہیں کرتا۔ تجھے نیند آرہی ہے تو سو جا۔ میں یہیں بیٹھی رہوں گی۔ کسی بھی وکھت اٹھ کر چپ چاپ چلی جاؤں گی۔"

"تو یہاں کیوں بیٹھی رہنا چاہتی ہے؟"

"تجھے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے میں اپنے رحیے کے پاس بیٹھی ہوں۔ سچ کہہ رہی ہوں مجھے بالکل ایسا ہی لگ رہا ہے۔"

"رحیے سے تجھے بہت پیار تھا۔؟"

"ہاں جی۔" اس نے آہستہ، آہستہ سر ہلایا۔ "مجھے اس سے بہت پیار تھا۔ ایسا لگتا ہے اس کے بعد میری زندگی میں کچھ نہیں رہا۔"

"ایسا کر کسی سے نکاح کر لے۔ ابھی تو جوان ہے۔" رحیم داد نے اسے مشورہ دیا۔

"کہاں جوان رہی۔" وہ شرما گئی۔ نظریں نیچی کرتے ہوئے بولی۔ "اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ تو نے مجھے پہلے نہیں دیکھا۔ میں ایسی نہ تھی۔" اس کا لہجہ دل گرفتہ ہو گیا۔ "میں نے اب کسی سے نکاح شکاح نہیں کرنا۔ دکھ اور تنگی کے جتنے دن ہیں کسی نہ کسی طرح کاٹ لوں گی۔ میرا کریما جوان ہو گیا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تو اسی کے سہارے زندہ ہوں۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ نوراں بھی سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ کمرے میں سکوت تھا۔ باہر درختوں تلے خشک پتے آہٹیں پیدا کر رہے تھے۔ پت جھڑ کی رات اور کالی ہو گئی۔ ڈیرا سنسان تھا۔ سب سو گئے تھے۔ صرف نوراں اور رحیم داد جاگ رہے تھے۔

رحیم داد نے نظریں اٹھا کر نوراں کی جانب دیکھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ اس کے سفید جھگے کا ایک بٹن ٹوٹا ہوا تھا۔ گریبان دور تک کھلا تھا۔ لیمپ کی زرد زرد مدھم روشنی میں اس کے گورے گورے سینے کا بالائی حصہ جھلک رہا تھا۔ رحیم داد کی نظروں میں چکا چوند پیدا ہو گئی۔ سانس

بھی بوجھل ہو گئی۔

نوراں نے گردن اٹھائی۔ رحیم داد کی جانب دیکھا۔ نوراں کی نظریں ملیں۔ وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکنے لگے۔ نوراں اس کی نظروں کی چمک دمک کی تاب نہ لا سکی۔ شرما گئی۔ اس کے رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی بکھر گئی۔ ناک میں پڑا ہوا کوکا جھلملانے لگا۔ ہونٹوں پر خفیف سی لرزش ہویدا ہوئی۔

اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ نگاہیں نیچی کیں اور فرش کو تکنے لگی۔ رحیم داد ٹکٹکی باندھے اسے تکتا رہا۔ وہ یادوں کی پگڈنڈیوں پر چلتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ بیتے دن چراغوں کی مانند جگمگانے لگے۔ نوراں ہنوز بت بنی بیٹھی تھی۔ وہ رحیم داد کو ویسی ہی نوراں نظر آئی جو خوبصورت تھی۔ جوان تھی اور جسے تنہائی میں پا کر وہ بے قرار ہو جاتا تھا۔ وارفتہ ہو جاتا تھا۔

نوراں اس وقت بھی تنہا تھی۔ رحیم دار وارفتہ ہو گیا۔ بے قرار ہو گیا۔ خود فراموشی کے عالم میں بستر سے نیچے اترا۔ دھیرے دھیرے اس طرح نوراں کی جانب بڑھا جیسے خواب میں چل رہا ہو۔ نوراں بدستور خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے نگاہیں نہ اٹھائیں۔ رحیم داد قریب پہنچ گیا۔ اس کی سانس تیز اور بے ترتیب تھی۔ پیروں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ نوراں کے عین مقابل جا کر کھڑا ہو گیا۔

اس کا کبڑا سایہ دیوار پر لہرا رہا تھا۔ باہر تیز ہوا درختوں کی شاخوں سے الجھ رہی تھی گنگنا رہی تھی۔ خشک پتے گر رہے تھے۔ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کمرے میں بوجھل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لیمپ کی لو ہولے ہولے بھڑک رہی تھی۔

رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ جھکا' ہاتھ بڑھا کر نوراں کا بازو پکڑا۔ اسے آہستہ سے اٹھایا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ٹوٹی ہوئی ڈال کی مانند جھوم کر رحیم داد کے کندھے سے لگ گئی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور وہ دھیرے دھیرے ہانپ رہی تھی۔

☆

باہر تیز ہوا شاخوں میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ خشک پتے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔ کھڑکھڑا رہے تھے۔ کمرے کے اندر لیمپ کی لو ہوا کے جھونکوں سے کبھی تیز ہو جاتی کبھی دھیمی پڑ جاتی۔ رات گزرتی رہی۔ کالی ہوتی گئی۔ رات آدھی ہو گئی' ڈھلنے لگی۔

نوراں آہستہ سے اٹھی۔ بستر سے نیچے اتری۔ رحیم داد جاگ رہا تھا۔ نوراں اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں جھانکا۔ مسکرائی۔ آہستہ سے بولی۔ "رحیے!"

رحیم داد کو ایسا محسوس ہوا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ سہانا خواب دیکھتے دیکھتے چونک کر بیدار ہو چکا تھا۔ یادوں کے حصار سے باہر آ چکا تھا۔ وسوسوں اور اندیشوں نے کلبلا کر سر ابھارا۔ آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ پھانسی کا پھندا سامنے لہرانے لگا۔

رحیم داد پریشان ہو کر اٹھ بیٹھا۔ بے اعتنائی سے بولا۔ "تو مجھے بار بار رحیے کیوں کہتی ہے؟"

"اور کیا کہوں تجھے۔؟" وہ شوخی سے کھل کر مسکرائی۔

رحیم داد کھردرے لہجے میں بولا۔ "میں رحیے نہیں ہوں۔ تجھے دھوکا ہوا۔" اس نے نوراں سے نظریں نہ ملائیں۔

"سچ بتا تو رحیے نہیں ہے؟" نوراں تذبذب کے عالم میں بولی۔

"میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔" رحیم داد نے اسے باور کرانے کی کوشش کی۔ "تو یہ خیال اپنے دل سے نکال دے۔"

"نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ ایک بار پھر مسکرائی۔ "مجھے پتہ ہے تو رحیے ہی ہے۔ تو کوئی اور نہیں ہو سکتا۔" اس کا لہجہ اعتماد سے بھرپور تھا۔ "پہلے مجھے تیرے بارے میں شبہ تھا۔ اب کوئی شبہ نہیں رہا۔ تو رحیے ہے' بالکل رحیے ہے۔"

"بیکار کی کڑ کڑ نہ کر۔" رحیم داد نے غصے سے آنکھیں نکال کر اسے ڈانٹا۔

"میں تیرا رحیے نہیں۔ چوہدری نور الٰہی ہوں۔ اب تو یہاں سے ٹر جا۔"

نوراں ہکا بکا ہو کر رحیم داد کا منہ تکنے لگی۔

رحیم داد مڑا۔ تکیے کے نیچے رکھا ہوا چمڑے کا بٹوہ نکالا۔ اسے کھولا۔ سو روپے کا ایک نوٹ نکالا نوراں کی جانب پلٹا۔ اور سو روپے کا نوٹ سرہانے کھڑی نوراں کے ہاتھ میں تھما کر بولا۔ "لے اسے رکھ لے۔ جا سو جا، کر۔" اس نے بدمعاشی سے آنکھ مار کر مسکرانے کی کوشش کی۔ "کسی نے ایک رات کے لیے اتنے روپے نہیں دیے ہوں گے۔"

نوراں ہاتھ میں نوٹ تھامے چند لمحے مبہوت کھڑی رہی۔ پھر وہ چونکی۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ بکھر گئی۔ پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے نوٹ انگلیوں میں بھینچ کر مسلا۔ رحیم داد کے منہ پر مارا۔ تڑپ کر بولی۔ "اسے اپنے ہی پاس رکھ۔ میں کنجری نہیں ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو' ستارے بن کر جھلملانے لگے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور بلک بلک کر رونے لگی۔

اس کی سسکیاں کمرے کی خاموشی میں ابھرنے لگیں۔ رحیم داد نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ مگر

کچھ بولا نہیں۔ خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے نظریں اٹھا کر روتی بلکتی نوراں کی جانب دیکھا بھی نہیں۔

نوراں کمرے میں زیادہ دیر نہ ٹھہری۔ اس نے دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھے۔ اس کا چہرہ مرجھا کر پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کا کاجل پھیل گیا تھا۔ بال بکھر کر منہ پر آ گئے تھے۔ وہ رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر مڑی۔ دروازے پر پہنچ کر اسے کھولا اور باہر چلی گئی۔

رحیم داد نے نگاہیں اٹھا کر نوراں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ بستر سے نیچے اترا۔ دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ واپس آیا۔ دیکھا' لیمپ کی دھندلی دھندلی روشنی میں سو روپے کا مڑا تڑا نوٹ بستر کی سلوٹوں کی درمیان پڑا ہے۔ رحیم داد ٹکٹکی باندھے نوٹ کو تکتا رہا۔ پھر وہ جھکا۔ نوٹ اٹھایا اور بٹوے میں رکھ دیا۔ اس نے مڑ کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ پت جھڑ کی ویران رات نڈھال کھڑی تھی۔ ہوا سسکیاں بھر رہی تھی۔ پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ اڑ اڑ کر ادھر ادھر بکھر رہے تھے۔

رحیم داد بستر پر دراز ہو گیا۔ خاموش لیٹا چھت کو تکتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے بے قرار ہو کر کروٹ بدلی۔ دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا اب نوراں کبھی اس کے پاس نہ آئے گی۔ وہ اپنے بیٹے کریم داد اور بھولی بھالی بیٹی زینو کو سینے سے لگا کر پیار نہ کر سکے گا۔ اس کے اور بیوی بچوں کے درمیان چوہدری نور الٰہی دیوار بن کر حائل ہو گیا تھا۔ یہ دیوار اس نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کی تھی۔ مضبوط اور اونچی کی تھی۔ اب وہ اسے گرا نہ سکتا تھا۔ گراتا تو خود اس کے ملبے کے نیچے دب کر رہ جاتا۔

وہ دیر تک جاگتا رہا۔ یادوں کی اونچی نیچی لہروں پر ڈولتا رہا۔ بے چینی سے بار بار کروٹیں بدلتا رہا۔ وہ تھک کر نڈھال ہو گیا۔ گہری نیند سو گیا۔

ملی جلی آوازوں کے ہلکے ہلکے شور سے رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ آوازیں نوکروں کی کوٹھریوں کی جانب سے ابھر رہی تھی۔ سردی اس وقت بھی اچھی خاصی تھی۔ رحیم داد بستر سے نیچے اترا۔ اونی دوہر اوڑھی۔ دروازہ کھولا۔ باہر نکلا۔ صبح ہو چکی تھی۔ مگر آسمان پر ابھی تک بادل چھائے تھے۔ روشنی دھندلی تھی۔ احاطے میں ہو کا عالم تھا۔ دور دور تک کوئی نظر نہ آتا تھا۔ رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس جانب بڑھا جدھر سے شور اٹھ رہا تھا۔

وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ ایک درخت کی آڑ سے اکبر نمودار ہوا۔ رحیم داد ٹھہر گیا۔ اکبر قریب آ کر بولا۔ "خیر اے سیں' خوش ہو' راضی ہو۔"

"زمیں دار واپس آ گیا؟" رحیم داد نے رفیع سمہ کے بارے میں دریافت کیا۔ "نا سیں' وہ ابھی

نہیں آیا۔"

"یہ شور کیسا ہو رہا ہے؟" رحیم داد نے نوکروں کی کوٹھریوں کی سمت ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔

"سیں بہت برا ہو گیا۔" اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ وہ پریشان اور گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ رحیم داد خاموش رہا۔ اس کے چہرے کو تکتا رہا۔ "وہ نوراں تھی ناں۔ ادھر نوکرانی لگی تھی۔" اکبر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "رات جانے اسے کیا ہوا۔ اس کے ایک نکا تھا اور ایک نکی۔ دونوں کا اس نے تیز کاتی سے گلا کاٹ ڈالا۔ اپنے کپڑوں پر تیل چھڑکا اور آگ لگا لی۔"

رحیم داد دم بخود رہ گیا۔ اس نے محسوس کیا۔ ہوا میں جلے ہوئے گوشت کی بو رچی ہے۔ وہ کچھ نہ بولا۔ منہ سے آواز ہی نہ نکلی۔ اس نے سنا۔ اکبر کہہ رہا تھا۔

"نوراں نے اندر سے در بند کر رکھا تھا۔ کسی کو پتہ ہی نہیں چلا۔ وہ چیخی چلائی بھی نہیں۔ چپ چاپ جلتی رہی۔ پاس کی کوٹھڑی میں رستم رہتا ہے۔ گوشت جلنے کی بو سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس وکھت اندھارا تھا۔ سردی بھی بہت تھی۔ وہ باہر نکلا۔ نوراں کی کوٹھڑی سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس نے در کھولنے کی کوشش کی' پر کھلا نہیں۔ تب رستم نے شور کیا۔ پاس پڑوس کے سارے ہی نوکر اور بانے اکٹھے ہو گئے۔ دروازہ توڑ کر اندر گھسے تو دھواں اتنا بھرا تھا کہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔"

"اب نوراں کیسی ہے؟" رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"سیں' اس کا تو مرن ہو گیا۔ جب میں پہنچا تو سسک رہی تھی۔" اکبر نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "سیں لگتا ہے اس پر آسیب تھا۔ جن کا اثر تھا۔ تب ہی اس نے ایسا کیا۔ بہت دکھ کی گالہہ ہے۔" اس کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ "وہ بری ذال نہیں تھی۔ بہت دکھیاری تھی۔ اس کا کوئی نہیں تھا۔"

رحیم داد بے قرار ہو کر بولا۔ "میرے ساتھ چل۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔" وہ نوراں اور اپنے دونوں بچوں کو آخری بار دیکھنا چاہتا تھا۔

مگر اکبر نے اسے روک دیا۔ "نا سیں' تو ادھر نہ جا۔ کیا کرے گا اسے دیکھ کر۔ جل کر اس کا منہ ایسا بگڑ گیا ہے کہ دیکھنے سے دل گھبراتا ہے۔ ڈر لگتا ہے۔ تو وہاں نہ جا۔ ویسے بھی تجھے اس سے کیا لینا۔"

رحیم داد نے نوراں کی کوٹھری کی جانب جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں واپس گیا۔

اکبر نے ناشتا لگا دیا۔ مگر رحیم داد نے کچھ نہ کھایا۔ کھایا ہی نہ گیا۔ بہت اداس اور دل گرفتہ تھا۔

اس نے اپنے ڈرائیور کو بلایا۔ سامان جیپ میں رکھوایا اور اس میں بیٹھ کر کوٹلہ ہرکشن کی جانب روانہ ہو گیا۔

کوٹلہ ہرکشن پہنچنے کے بعد بھی اس کے دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوا۔ وہ شام ہی سے پینے بیٹھ گیا۔ اور غم غلط کرنے کے لیے رات گئے تک شغل بادہ نوشی کرتا رہا۔ وہ رات اس نے بہت کرب اور بے چینی میں گزاری۔ اس کی کتنی ہی راتیں اسی بے چینی اور ذہنی اذیت میں کٹیں۔

☆

ایک روز دوپہر کو رفیع سمہ اچانک رحیم داد کے پاس پہنچ گیا۔

رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "تو نے بہت دیر لگا دی۔ کہاں رہا اب تک؟"

"شنکر سے مل نہ سکا تھا۔ اسے ملے اور گل بات کیے بغیر تیرے پاس آ کر کیا کرتا۔"

"شنکر تجھے کیوں نہیں ملا؟"

"وہ مجھے پرسوں ملا۔ ہوشیار پور سے بہت دیر بعد فا ضلکا آیا تھا۔ ہوشیار پور میں اپنے کسی شریکے کے ویاہ میں پھنسا رہا۔ تب ہی دیر سے لوٹا۔" رفیع سمہ نے وضاحت کی۔

"جمیلہ کے بارے میں اس سے گل بات تو ہوئی ہو گی؟"

"اس کے بارے میں دیر تک بات ہوتی رہی۔"

رحیم داد نے اپنی بے قراری چھپانے کی کوشش نہ کی' پوچھا۔ "کیا کہتا تھا وہ؟"

رفیع نے کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد اس کی پراسرار خاموشی سے پریشان ہو گیا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تو چپ کیوں ہو گیا؟ تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

رفیع نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ نرم لہجے میں گویا ہوا۔ "چوہدری' میرا کہنا مان۔ جمیلہ کا دھیان اب چھوڑ دے۔"

"کیوں؟" رحیم داد تڑپ کر بولا۔ "تو ایسی بات کیوں کہہ رہا ہے؟"

"میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ اس کے پاس سندیسا شندیسا پہنچانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔"

رحیم داد کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "صاف صاف بتا۔ شنکر کیا کہتا تھا؟"

"کیا کرے گا جان کر۔ تجھے دکھ ہی ہو گا۔"

رحیم داد پریشان ہو کر بولا۔ "وہ زندہ تو ہے نا؟" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور بے تابی سے رفیع سمہ کا چہرہ سوالیہ نظروں سے تکنے لگا۔

"وہ زندہ ہے۔ بالکل چنگی ہے۔ پر تو نے ایسا کیوں سوچا؟"

رحیم داد کو معاً نوراں یاد آ گئی۔ مگر اس نے نوراں کا ذکر نہیں کیا۔ صرف اتنا کہا۔ "تو بات اس طرح کر رہا ہے' میں سمجھا اس نے کہیں خودکشی تو نہیں کر لی۔"

"وہ خودکشی کیوں کرنے لگی؟" رفیع نے مسکرا کر کہا۔

رحیم داد کو اس کا مسکرانا اور چبا چبا کر بات کرنا پسند نہ آیا۔ کسی قدر تیکھے لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ٹھیک بتا۔ شنکر سے تیری کیا گل بات ہوئی؟ میں یہی جاننے کے لیے تیرا انتظار کر رہا تھا' اور تو گھما پھرا کر بات کر رہا ہے۔ صاف اور پوری بات بتاتا نہیں۔"

"صبر سے کام لے۔" رفیع سمہ کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ "صاف بات یہ کہ جمیلہ نے پچھلے مہینے جالندھر میں ویاہ کر لیا۔ اب وہ اپنے گھر والے کے ساتھ رہتی ہے۔"

رحیم داد کا چہرہ اتر گیا۔ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کیا کرتا ہے وہ؟" اس کی آواز حلق سے اس طرح نکل رہی تھی جیسے کہیں دور سے بول رہا ہو۔

"شنکر بتاتا تھا' ہے تو وہ ڈاکٹر پر دونوں آنکھوں سے اندھا ہے اور سکھ ہے۔"

"جمیلہ نے اس اندھے ڈاکٹر سے کیوں ویاہ کیا؟" رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے پوچھا۔ "اندھا اور وہ بھی سکھ۔ اسے کوئی ہندو ویاہ کرنے کو نہیں ملا۔"

"یہ تو جمیلہ ہی بتا سکتی ہے' اس نے ایسا کیوں کیا؟ میں کیا بتا سکتا ہوں۔" رفیع سمہ کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ "مجھے تو صرف یہ پتہ ہے کہ وہ اندھا ہے' سکھ ہے اور شرنارتھی ہے۔ فسادات ہوئے تو وہ پنڈی میں ہوتا تھا۔ شنکر کہتا تھا' رات کے اندھیرے میں اس کے مکان پر حملہ ہوا۔ اس کی جوان گھر والی اور دو بہنوں کو مسلمان بلوائی اٹھا لے گئے۔ ایک پتر بھی تھا' اسے خاندان کے دوسرے بندوں کے ساتھ حملہ کرنے والوں نے مار دیا۔"

"وہ تو بچ گیا تھا ناں؟"

"ہاں وہ بچ گیا۔" رفیع سمہ اس کے احمقانہ سوال پر مسکرانے لگا۔ "یار تو بھی کمال کرتا ہے۔ بچ نہ جاتا تو اب تک زندہ کیسے ہوتا۔ پر حملے میں وہ بھی گھائل ہو گیا تھا۔ سر پر ایسی زبردست چوٹ آئی کہ دونوں آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ کسی نہ کسی طرح سکھوں اور ہندوؤں کے ایک جتھے کے ساتھ سرحد پار پہنچ گیا۔ لیکن بالکل اکیلا تھا۔ اس کا کوئی بھی نہ بچا۔"

"جمیلہ کے بھائیوں نے اس کے ساتھ ویاہ کرنے پر برا نہیں منایا؟"

”ہردیال تو سخت زراض ہوا تھا۔“ رفیع سمہ نے جواب دیا۔ ”شنکر بتا تا تھا' ڈاکٹر کی جمیلہ کے بھرا یشور دیال سے یاری تھی۔ اس کے گھر پر جمیلہ کا ڈاکٹر کے ساتھ میل ملاپ بڑھا۔ پر جمیلہ نے جب ندھے سکھ ڈاکٹر سے ویاہ کرنا چاہا تو ایشور دیال نے بھی مخالفت کی۔ جمیلہ کو منع کیا۔ سمجھایا بجھایا پر وہ بہت ضدی ہے۔ ڈاکٹر سے ویاہ کرنے پر اس طرح اڑ گئی کہ ایشور دیال بھی راضی ہو گیا۔“

”تو گویا جمیلہ اب جلندر میں سکھ ڈاکٹر کے ساتھ رہتی ہے۔“

”نہیں ویاہ کے کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنی گھر والے کے ساتھ چندی گڑھ چلی گئی۔“ رفیع سمہ نے مطلع کیا۔ ”اب وہ چندی گڑھ میں ہوتی ہے۔ شنکر جمیلہ سے ملا تھا۔ کہتا تھا وہ ڈاکٹر کے ساتھ بہت خوش ہے۔ آرام سے ہے۔“

”یار حد ہو گئی۔“ رحیم داد جل کر بولا۔ ”اندھے کے ساتھ کیسے خوش رہ سکتی ہے۔“

”میں کیا بتا سکتا ہوں۔“ سمہ نے بے تکلفی سے ہنس کر کہا۔ ”میں نے تو نہ جمیلہ کو دیکھا نہ اس کے اندھے خصم کو۔“ اس نے رحیم داد کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ”تیرا اور جمیلہ کا بہت دنوں ساتھ رہا ہے۔ وہ تیری گھر والی رہ چکی ہے۔ تجھے اس کے بارے میں ٹھیک سے پتہ ہو سکتا ہے۔ میں نے تو شنکر سے جو کچھ سنا' تجھے بتا دیا۔“

”اپنی سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں۔“ رحیم داد نے بے بسی سے اظہار خیال کیا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس پر کوئی رد عمل نہ تھا۔ کوئی واضح تاثر نہ تھا۔

”میں کہتا ہوں تو جمیلہ کو سمجھ ہی نہیں پایا۔ وہ تجھے چھوڑ کر کبھی نہیں جاتی۔“ رفیع سمہ کے چہرے سے ذہانت جھلک رہی تھی۔ ”ساری باتیں سن کر مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ پیار کی بھوکی تھی۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی جو تو اسے دے نہ سکا۔ ڈاکٹر اندھا ہے تو کیا ہوا' جمیلہ کو اس میں دونوں ہی چیزیں مل گئیں۔“ اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ”چوہدری' برا نہ منانا۔ میں نے جو کچھ سوچا اور سمجھا تجھے صاف صاف بتا دیا۔ اب تجھے یہ بھی بتا دوں کہ تو اس کی واپسی کا دھیان' بالکل چھوڑ دے۔ وہ ہرگز تیرے پاس نہیں آئے گی۔“

”یہ بات تجھے شنکر نے بتائی تھی؟“ رحیم داد نے اپنے ڈوبتے دل کو ڈھارس دینے کی کوشش کی۔

”نہیں' میں نے اس کی باتوں سے یہ اندازہ لگایا۔“ رفیع سمہ نے وضاحت کی۔ ”ہاں' شنکر نے مجھے یہ ضرور بتایا کہ وہ ابھی تک اللہ وسایا کو نہیں بھولی۔ پر تجھے اچھا بندہ نہیں سمجھتی۔ میں تجھے زیادہ بتانا نہیں چاہتا۔ یوں سمجھ لے وہ تیرے پاس واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ اور یہ بھی سمجھ لے کہ اندھے ڈاکٹر سے اس نے سوچ سمجھ کر ویاہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے

کا سہارا ہیں۔ ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش ہیں۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”شنکر بتا تا تھا دونوں لٹے پٹے شرنارتھیوں کے لیے خیراتی اسپتال کھولنا چاہتے ہیں۔ ان پر ان دنوں اس کی دھن سوار ہے۔“

رحیم داد کو رفیع سمہ کا رویہ پسند نہ آیا۔ اس کے زخم خوردہ احساس کو ٹھیس پہنچی۔ مگر اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ اس کا چہرہ مضمحل اور مرجھایا ہوا تھا۔ وہ اجڑا اجڑا اور نڈھال نظر آرہا تھا۔

رفیع سمہ نے اس کی پریشانی محسوس کی۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”چوہدری جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔“ اس نے رحیم داد کی دل جوئی کی۔ ”ویسے مجھے پتہ ہے تجھے دکھ پہنچا ہے۔ تو کہہ تو آگے کے لیے سوچا جائے۔ میں تیری ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہوں۔ پر میں تجھ سے کہوں گا۔“

رحیم داد نے اسے پوری بات کہنے نہ دی۔ تیکھے لہجے میں بولا۔ ”مجھے پتہ ہے تو کیا کہنا چاہتا ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر زہرخند نمودار ہوا۔ ”تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ مجھے اب جمیلہ کو بھول جانا چاہیے۔ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔“

رفیع سمہ نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی غرض سے پوچھا۔ ”شاہ جی سے تو نہیں ملنا ہوا؟“

”نہیں۔“ رحیم داد نے گردن ہلا کر انکار کیا۔ ”پچھلی بار تیرے ساتھ ہی آیا تھا۔ تب سے نہیں ملا۔ وہ آج کل طرح طرح کے چکروں میں پھنسا ہوا ہے۔“

”میں چند روز بعد لور جاؤں گا۔ شاہ جی سے بھی ملنے کی کوشش کروں گا۔“

”شاہ جی سے کہنا' چوہدری تجھے بہت یاد کرتا ہے۔“

رفیع سمہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ عجلت میں تھا۔ رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ دو چار روز اس کے ساتھ قیام کرے۔ مگر سمہ رضامند نہ ہوا۔ وہ اپنی جیپ میں آیا تھا۔ اس میں سوار ہوا۔ دوبارہ آنے کا وعدہ کیا۔ جیپ آگے بڑھی اور دھول کے بادل اڑاتی تیزی سے دوڑنے لگی۔

رفیع سمہ کو رخصت کرنے کے بعد رحیم داد اور دل گرفتہ ہو گیا۔ وہ نڈھال اور بجھا بجھا نظر آرہا تھا۔

۳۸

ربیع کی فصل تیار کھڑی تھی۔ گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ تیز ہوائیں چلتیں تو گندم اور جو کے پودے جھولتے۔ لہلاتی فصلوں میں سیٹیاں بجتیں۔ اس بار فصل کچھ زیادہ ہی اچھی تھی۔ کسانوں کے چہرے خوشی سے دمکتے تھے۔

رحیم داد نے فصل کی کٹائی میں خلاف معمول زیادہ ہی دلچسپی لی۔ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کرتا۔ اس نے پے در پے جو صدمے اٹھائے تھے ان کی اذیت اور کرب سے فرار حاصل کرنے کا اسے ایک ہی راستہ نظر آیا کہ زمیں داری کے کاموں میں خود کو مصروف رکھے۔

فصل کی کٹائی ہو گئی۔ بٹائی بھی خوش اسلوبی سے ہو گئی۔ رحیم داد خریف کی بوائی کی تیار کر رہا تھا کہ ایک صبح احسان علی شاہ کا ملازم شیدا اس کے پاس آیا۔ احسان شاہ نے رحیم داد کو پیراں والہ بلایا تھا۔

دن ڈھلے رحیم داد نے جیپ نکلوائی اور اس میں بیٹھ کر پیراں والہ پہنچ گیا۔ احسان علی شاہ اپنی حویلی کے پھاٹک ہی پر مل گیا۔ حسب معمول اس نے گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ گلے سے لگا کر دل جوئی کی باتیں کیں۔ ”معاف کرنا چوہدری‘ میں ان دنوں ایسا پھنسا ہوا ہوں کہ کوشش کے باوجود تجھے اب تک نہ مل سکا۔“

رحیم داد خوش ہو گیا۔ مسکرا کر بولا۔ ”یہ بتا‘ آج تو نے کیسے بلایا۔ کوئی خاص گل بات ہے؟“

”خاص ہی سمجھ لے۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”میں نے زیادہ دیر نہیں ٹھیرنا۔ آج ہی لہور جانا ہے۔“

”ایسا تھا تو مجھے بلایا ہی کیوں؟“ رحیم داد نے گلہ کیا۔ ”میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ تیرے ساتھ چند روز ٹھیروں گا۔ بہت دن ہو گئے تجھے ملے ہوئے۔ بہت ساری باتیں کرنی تھیں۔ مشورے لینے تھے۔“

”باتیں بھی ہوں گی اور آرام سے ہوں گی۔“ احسان شاہ بے تکلفی سے ہنسا۔ ”تو ایسا کر اتوار کی شام کو میرے پاس لہور پہنچ جا۔ تیرے ڈرائیور نے میری کوٹھی دیکھ رکھی ہے۔ آرام سے پہنچ جائے گا۔ وہیں ساری باتیں کرلینا۔ اب تو میں نے جانا ہے۔“

”ادھر بیٹھ کر گل بات نہیں ہو سکتی۔“ رحیم داد اس کے ساتھ بیٹھ کر شغل بادہ نوشی کرنا چاہتا تھا۔ دل بہلانا چاہتا تھا۔

”نہیں۔“ احسان شاہ رضا مند نہ ہوا۔ ”میں نے تجھے لہور میں محکمہ بحالیات کے ایک افسر سے ملانا ہے۔ اس کا ایک کام مجھ سے اٹکا ہوا ہے۔ متروکہ جائیداد کے ایک اونچے فراڈ میں پھنس گیا ہے۔ نوکری جانے کے ساتھ جیل کاٹنے کا بھی خطرہ ہے۔ وہ چاہتا ہے میں گورنر سے سفارش کرکے معاملہ دبوا دوں۔ گورنر میری بات مان لے گا۔ اسے بھی آج کل میری ضرورت ہے۔“

”پر میں نے بحالیات اور آبادکاری کے افسر سے کیا لینا۔“ رحیم داد بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا۔

”تیرے پاس جو کلیم ہے وہ کس لیے ہے؟“ احسان شاہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”تو نے اسے کیڑوں کو کھلانے کے لیے رکھ چھوڑا ہے؟“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”جو کچھ الاٹ کرانا ہے ابھی الاٹ کرا لے۔ بعد میں کچھ بھی نہ رہے گا۔ کلیم کی دستاویزات پڑی پڑی سڑ جائیں گی۔ تو اکیلا کلیم ہولڈر نہیں۔ نہ جانے کتنے ہیں جو کلیم کے کاغذات دبائے الاٹمنٹ کے چکر میں سرکاری دفتروں کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ سفارش بھی پہنچا رہے ہیں۔ رشوت بھی کھلا رہے ہیں۔ پر الاٹمنٹ آسانی سے نہیں ملتی۔“

”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔“ رحیم داد نے جھٹ اپنی غلطی تسلیم کرلی۔ ”میں نے بھی الاٹمنٹ کے لیے بہت چکر کاٹے ہیں۔ تجھے یہ پتہ نہیں۔“

”مجھے پتہ ہے۔ اچھا اب کام کی گل سن۔ لائل پور میں دس ایکڑ کے لگ بھگ شہری متروکہ اراضی ہے۔ کوشش کی جائے تو تیرے کلیم میں الاٹ ہو سکتی ہے۔“

”میں اس کی الاٹمنٹ لے کر کیا کروں گا؟“ رحیم داد نے دبی زبان سے انکار کیا۔ وہ الاٹمنٹ

کے چکر میں پڑنا نہ چاہتا تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں اس کے کلیم کی جعل سازی کا راز افشا نہ ہو جائے اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

"اس پر ٹیکسٹائل مل لگے گی۔" احسان شاہ نے اس کی عدم دلچسپی نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا؟" رحیم داد نے ایک بار پھر کنّی کاٹنے کی کوشش کی۔ "مل تو لاکھوں میں لگتی ہے۔ اس کے لیے حکومت سے پرمٹ اور لائسنس بھی لینا پڑتا ہے۔"

"تو ان باتوں کی فکر نہ کر۔ یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دے۔" احسان شاہ نے اسے اعتماد میں لے کر بتایا۔ "بینک سے قرضہ مل جائے گا۔ مجھے جلد ہی کراچی بھی جانا ہے۔ پرمٹ اور لائسنس بھی نکلوا لوں گا۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "یہ تیرے سوچنے کی گل بات نہیں۔ میں سب بندوبست کر لوں گا۔ تو اکیلا نہیں ہوگا۔ میں بھی تیرے ساتھ شریک رہوں گا۔ کمپنی بنانی ہوگی۔ اسے رجسٹر کرانا ہوگا۔"

"مجھے تو جی صاف بات یہ ہے کہ کچھ پتہ نہیں۔"

"سب پتہ ہو جائے گا۔ میں نے کہا نا کہ میں بھی تیرے ساتھ رہوں گا۔" احسان شاہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تو خواہ مخواہ کی باتیں نہ سوچ۔ جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔"

"جیسی تیری مرضی۔" رحیم داد نے مزید الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ "تو جیسا کہے گا میں نے وہی کرنا ہے۔"

"مل لگانے کے لیے اپنے پاس زمین ضرور ہونی چاہیے۔" احسان شاہ نے کہا۔ "ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میں نے ساری سکیم سوچ رکھی ہے۔ تجھے صرف اتنا کرنا ہے کہ کلیم کے کاغذات لے کر اتوار کو لہور پہنچ جا۔ آگے کیا کرنا ہے، یہ تجھے نہیں سوچنا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ احسان شاہ نے بھی مزید بات چیت نہیں کی۔

احسان شاہ لاہور چلا گیا۔ رحیم داد واپس کوٹلہ ہر کشن آ گیا۔

☆

اتوار کو رحیم داد نے کلیم کے کاغذات کا بستہ نکالا۔ حفاظت سے سوٹ کیس میں رکھا۔ اسے لے کر جیپ میں بیٹھا اور لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ جیپ سڑکوں پر دوڑتی آگے بڑھی۔ ملتان روڈ پر پہنچتے ہی ڈرائیور نے رفتار تیز کر دی۔

مگر جیپ پتوکی کے نواح میں پہنچی تو ایک ٹائر میں پنکچر ہو گیا۔ ڈرائیور نے جیپ روک لی۔ جیک لگایا اور پہیہ اتارنے لگا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ دھوپ خیالی پڑتی جا رہی تھی۔ رحیم داد جیپ سے اترا

اور ایک درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔

اسے کھڑے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے کچے راستے پر درختوں کی آڑ سے ایک عورت اور مرد نکل کر سامنے آ گئے۔ رحیم داد نے دونوں کو دیکھا۔ اس نے مرد کو فوراً پہچان لیا۔ وہ لالی تھا۔ اس کے ہمراہ شاداں تھی۔ رحیم داد انھیں دیکھتے ہی سخت پریشان ہو گیا۔ دونوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے اس نے اپنا چہرہ موڑ لیا۔ اور سڑک کی سمت دیکھنے لگا۔

ملتان روڈ پر کاریں، بسیں اور دوسری گاڑیاں شور مچاتی ہوئی تیزی سے دوڑ رہی تھیں۔ کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے رحیم داد کی جیپ کھڑی تھی۔ ڈرائیور پہیہ اتار کر اسٹپنی چڑھانے میں مصروف تھا۔ رحیم داد درخت کے نیچے گم صم کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے گھبراہٹ جھلک رہی تھی۔ وہ زیاہ دیر ایک ہی حالت میں کھڑا نہ رہ سکا۔ اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ گردن موڑی۔ اچٹتی نظروں سے دیکھا۔ لالی کچے راستے سے نکل کر سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ شاداں اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے رحیم دا کی جانب بڑھ رہے تھے۔

رحیم داد نے جھٹ نگاہیں ادھر سے ہٹائیں اور سڑک پر گزرتی ہوئی گاڑیوں کو تکنے لگا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی گھبراہٹ میں اچانک اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ لالی کے سامنے آتے ہوئے کترا رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر لالی کی تیز اور عقابی نظروں نے اسے پہچان لیا تو وہ اس کے لیے زبردست خطرہ بن سکتا ہے۔ رحیم داد سے چوہدری نور الٰہی بن جانے کے بعد وہ خود کو ایسا سربستہ راز سمجھتا تھا جس میں کسی کو شامل کرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ اس معاملے میں وہ کسی کو اعتماد میں لینا چاہتا تھا۔ اسی رازداری کے باعث نوراں اور اس کے دونوں بچے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو گئے۔ لالی پر تو اسے مطلق اعتماد نہ تھا۔ وہ عادی مجرم اور سزا یافتہ تھا۔

رحیم داد کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے پگڑی کے شملے سے چہرہ پر آیا ہوا پسینہ پونچھا۔ عقب میں قدموں کی آہٹ سنی۔ چاپ دم بدم بڑھتی گئی۔ لالی اور شاداں قریب آ رہے تھے۔ رحیم داد نے سراسیمہ ہو کر جیپ کی طرف دیکھا۔ ڈرائیور زمین پر اکڑوں بیٹھا ہاتھ میں پانا سنبھالے پہیے کے نٹ بولٹ کس رہا تھا۔ رحیم داد نے قدم اٹھائے اور جیپ کی سمت بڑھا۔

قریب پہنچ کر اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔ "عابد، ابھی کتنی دیر اور لگے گی؟"

"اب بالکل دیری نہیں ہوگی جی۔ سارا کام ختم ہو گیا۔" یہ کہتا ہوا وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد جیپ کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد ڈرائیور بھی اسٹیرنگ وہیل سنبھال کر

اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے نظریں اٹھا کر جیپ میں لگے ہوئے آئینے میں دیکھا۔ اسے شاداں نظر آئی۔ لالی اس کے پیچھے تھا۔ وہ لمبے کرتے کے نیچے سفید دھوتی باندھے ہوئے تھا۔ پہلے سے کچھ نکھرا بھی ہو گیا تھا۔ سر برہنہ تھا۔ بالوں میں پڑا ہوا تیل دھوپ میں خوب چمک رہا تھا۔ شاداں بھی اجلا لباس پہنے ہوئے تھی۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔ چہرے پر نکھار تھا۔

رحیم داد پیٹھ موڑے چپ چاپ بیٹھا تھا اور آئینے میں دیکھ رہا تھا کہ دونوں رفتہ رفتہ جیپ کے نزدیک آتے جا رہے ہیں۔ شاداں کی نگاہیں جیپ ہی کی طرف اٹھی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ اور قدموں کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔

رحیم داد سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ "عابد! گڈی سٹارٹ کر۔"

ڈرائیور نے فوراً انجن اسٹارٹ کر دیا۔ انجن کی گڑگڑاہٹ میں قریب سے شاداں کی آواز ابھری۔ "چوہدری گل سن۔ گڈی روک لے۔ میری گل سن لے۔"

مگر رحیم داد نے اس کی ایک نہ سنی۔ پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔ ایک ہاتھ سے پگڑی کا اونچا طرہ درست کیا۔ اور گردن اکڑائے خاموش بیٹھا رہا۔ ڈرائیور نے کلچ دبا کر گاڑی گیئر میں ڈالی۔ ایکسیلیٹر پر پیر رکھا۔ جیپ تیزی سے آگے بڑھی۔ رحیم داد نگاہیں اٹھائے سامنے دیکھتا رہا۔ آگے جا کر اس نے درختوں کی اوٹ سے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ شاداں ابھی تک جیپ کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے برابر لالی کھڑا تھا۔ دور سے دونوں سایوں کی مانند دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔

جیپ فراٹے بھرتی لاہور کی سمت دوڑ رہی تھی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا لالی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن میں کھلبلی مچی تھی۔ اسی ذہنی خلفشار کے عالم میں وہ احسان شاہ کی کوٹھی پر پہنچا۔

☆

یہ ایک گرم اور بے رونق شام تھی۔ ہوا دم بخود تھی۔ ہر طرف امس اور گھٹن تھی۔ آسمان پر گہرا غبار چھایا تھا۔ اندھیرا رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ فضا میں گھل کر کالا پڑتا جا رہا تھا۔ احسان شاہ کوٹھی کے وسیع سبزہ زار کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھا تھا۔

وہ اپنے شام کے معمولات میں مگن تھا۔ سامنے میز پر جن کی بوتل رکھی تھی۔ ایک بڑے کٹورے میں برف کے ٹکڑے بھرے تھی۔ احسان شاہ کے ہاتھ میں گلاس تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر گلاس ہونٹوں سے لگاتا اور جن کے گھونٹ بھرتا۔ قریب ہی لکڑی کا اسٹول تھا۔ اس پر رکھا ہوا بجلی کا پنکھا تیزی سے گردش کر رہا تھا۔

رحیم داد کو دیکھتے ہی احسان شاہ نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "چوہدری' تو نے پہنچنے میں دیر کر دی۔"

"کیا ہو گیا شاہ جی؟" رحیم داد کرسی پر بیٹھتے ہوئے کسی قدر حیرت سے بولا۔

"ہونا ہوانا کیا تھا۔ پر تو کچھ دیر پہلے آجاتا تو چیمہ سے تیری ملاقات ہو جاتی۔"

"یہ چیمہ کون ہے جی؟" رحیم داد اور حیرت زدہ ہو گیا۔

"چیمہ محکمہ بحالیات کا وہی افسر ہے جس سے تیرے کلیم پر لائل پور میں زمین الاٹ کرانی ہے۔ سورج ڈوبنے سے کچھ دیر پہلے ہی میرے پاس آگیا تھا۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "اس نے تیرا بھی انتظار کیا۔ اسے کسی ضروری کام سے جانا تھا۔ اسے گئے ہوئے پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں گزرے۔"

"اب وہ کب ملے گا؟"

"مل جائے گا' فکر نہ کر۔" احسان شاہ نے اس کی تشویش فرو کرنے کی کوشش کی۔ "یہ بتا' کلیم کے کاغذات تو ساتھ لے کر آیا ہے نا؟"

"بالکل لے کر آیا ہوں۔" رحیم داد نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "دیکھنے ہیں تو دیکھ لے۔"

"مجھے ان سے کیا لینا۔" احسان شاہ بے نیازی سے بولا۔ "سویرے مہربان علی تیرے پاس آجائے گا۔ اسے کاغذات دے دینا۔ وہ ان کی مدد سے الاٹمنٹ کے لیے درخواست تیار کر دے گا۔ تو اس پر دستخط لگا دینا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ احسان شاہ نے میز پر رکھا ہوا خالی گلاس رحیم داد کی جانب سرکا دیا۔ "اپنے لیے خود ہی پیگ بنا لے۔" رحیم داد نے بوتل کھول کر جن انڈیلی۔ پیگ تیار کیا۔ گلاس ونٹوں سے لگایا۔ ایک بڑا گھونٹ بھر کر بولا۔

"شاہ جی تو نے وہسکی پینی چھوڑ دی؟"

"نہیں جی' ایسی کوئی گل نہیں۔" احسان شاہ مسکرا کر بولا۔ "وہسکی آج کل گرمی بہت کرتی ہے۔ گرمی کا موسم ہے نا۔ میرے پاس ان دنوں جن ہی چل رہی ہے۔" اس نے جن کا گھونٹ حلق ے نیچے اتارا۔ "تیرے لیے رم منگوا دوں۔ پچھلے دنوں سرحد پار سے چھ بوتلیں آئی ہیں۔ جی ہے تو بیئر پی لے۔ وہ بھی موجود ہے۔"

"نہیں' میرے لیے جن ہی ٹھیک ہے۔ جو تو پیئے گا وہی میں بھی لگاؤں گا۔"

احسان شاہ نے پھر چیمہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ "چیمہ بہت گھبرایا ہوا ہے۔"

"کسی لے چکر میں پھنس گیا؟"

"تجھے تو پتہ ہی ہے۔ جعلی اور بوگس الاٹمنٹوں کا دھندا کتنی زور شور سے چل رہا ہے۔ بحالیات اور آباد کاری کے سارے ہی چھوٹے وڈے افسر دبا کے رشوت کھا رہے ہیں۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "پر آپس میں لگتی بھی ہے۔ کسی نے اوپر شکایت لگا دی۔ اس پر چیمہ کے خلاف انکوائری شروع ہو گئی۔ معطل ہو جاتا۔ پر ابھی تک ایسا ہوا نہیں۔ سچ پوچھ تو کوئی سخت کارروائی ابھی ہوئی نہیں۔ ویسے معاملہ پے چیدہ اور سنگین ہے۔ چیمہ خود بتاتا تھا، نوکری بھی چلی جائے گی اور جیل بھی ہو جائے تو کوئی تعجب نہیں۔"

"میں نے تو جی کسی وڈے سرکاری افسر کو جیل جاتے دیکھا نہیں۔" رحیم داد نے ہنس کر بے تکلفی سے کہا۔ "شروع شروع میں بہت شور مچتا ہے۔ بعد میں سارا معاملہ اس طرح چپ کر کے دبا دیا جاتا ہے کہ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے، پر چیمہ کا معاملہ زیادہ ہی سنگین لگتا ہے۔ بات بہت دور تک جا پہنچی ہے۔ سنا ہے خود وزیر آباد کاری نے چیمہ کے خلاف انکوائری کا حکم دیا ہے۔"

"تو کیا سچ مچ چیمہ کو جیل ہو جائے گی؟" رحیم داد نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ہونی تو نہیں چاہیے۔" احسان شاہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "میں پرسوں گورنر سے مل رہا ہوں۔ اس سے چیمہ کے بارے میں بات کروں گا۔ اس کے صرف ایک ٹیلی فون کھڑکانے پر ساری انکوائری شنکوائری ختم ہو جائے گی۔ چوہدری، وہ آج کل بہت تگڑا جا رہا ہے۔ وزیر بحالیات کیا ا کی بات تو وزیر اعلیٰ بھی نہیں ٹال سکتا۔"

"ایسا کر شاہ جی، پہلے الاٹمنٹ کرا لے۔ اس کے بعد گورنر سے چیمہ کے بارے میں سفار کرنا۔" رحیم داد نے مشورہ دیا۔

"تو الاٹمنٹ کی فکر نہ کر۔ وہ تو چیمہ کو کرنا ہی پڑے گی۔ اسے ٹھیک طرح پتہ ہے گورنر میرے کیسے مراسم ہیں۔ چیمہ میرے ہاتھ سے نکل کر جائے گا کہاں؟" احسان شاہ نے رحیم د یقین دلایا۔ "کوئی گڑبڑ کی تو دوبارہ انکوائری شروع کرا دوں گا۔"

"تو پھر مجھے چیمہ سے مل کر کیا لینا۔ کام تو وہ کر ہی دے گا۔"

"جیسی تیری مرضی۔ پر میں اتنا ضرور کہوں گا سرکاری افسروں سے تجھے میل ملاپ

چاہیے۔ زمین داری چلانے کے لیے ایسی یاری دوستی بہت ضروری ہے۔" احسان شاہ نے نشے کی جھونک میں قہقہہ لگایا۔ "چوہدری، سچ پوچھ تو دونوں ہی کے لیے یہ ضروری ہے۔ افسر اگر زمین داروں کے کام آتے ہیں تو زمین دار بھی ان کی مدد کرتے ہیں۔ انھیں پروموشن دلواتے ہیں۔ ان کے تبادلے رکواتے ہیں۔ کسی چکر میں پھنس جائیں تو چھڑوا دیتے ہیں۔ اب یہ چیمہ ہی کا معاملہ دیکھ لے۔ اسے انکوائری سے بچنے کے لیے میری ضرورت ہے۔ اور مجھے زمین الاٹ کرانے کے لیے اس کی ضرورت ہے۔"

"تیرا مطلب ہے، حکومت، افسر اور زمیں دار مل کر چلاتے ہیں۔ یہی کہنا چاہتا ہے ناں؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"بالکل ایسا ہی ہے۔" احسان شاہ مسکرا کر بولا۔ "اسی لیے میں چاہتا ہوں چیمہ سے تیری ملاقات ہو جاتی۔ آگے بھی اس سے کام پڑ سکتا ہے۔ سرکاری افسروں سے ضرور میل ملاپ رکھنا چاہیے۔ پتہ نہیں کل کون کیا بن جائے۔" اس نے قہقہہ بلند کیا۔ "تجھے پتہ ہے، چوہدری محمد علی، وزیر اعظم ہونے پہلے سرکاری افسر ہوتا تھا۔ لیاکت علی خان جب وزیر اعظم ہوتا تھا تو چوہدری محمد علی سرکاری افسر لگا ہوا تھا۔ لیاکت علی خان کا پنڈی میں کتل ہوا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین دستور ساز اسمبلی کا اجلاس بلاتا۔ ان دنوں اسمبلی میں مسلم لیگ سب سے وڈی پارٹی ہوتی تھی۔ گورنر جنرل اس کے لیڈر سے حکومت بنانے کو کہتا۔ پر ایسا نہ ہوا۔ چوہدری محمد علی نے اپنے بنگلے پر گورنر جنرل اور سارے وزیروں کو اکٹھا کیا۔ ناظم الدین کو وزیر اعظم لگایا۔ غلام محمد کو گورنر جنرل اور خود مرکزی وزیر خزانہ بن گیا۔ نہ وہ اسمبلی کا ممبر تھا نہ مسلم لیگ کا۔"

"پر وہ کیسے وزیر بن گیا؟" رحیم داد نے حیرت سے دریافت کیا۔

"وہ افسروں کا افسر سیکریٹری جنرل جو تھا۔" احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ "غلام محمد بھی وزیر خزانہ بننے سے پہلے سرکاری افسر ہوتا تھا۔ وہ اتنا زور آور ہوتا تھا کہ اس نے وزیر اعظم ناظم الدین کو طرف کر دیا۔ ناظم الدین نے ملکہ الزبتھ سے مدد مانگنی چاہی پر غلام محمد نے اس کے اور دوسرے وزیروں کے ٹیلی فون کی تاریں ہی کٹوا دی تھیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ناظم الدین ہی نے ملکہ سے سفارش کی تھی کہ غلام محمد کو گورنر جنرل لگایا جائے۔ اور ملکہ نے اسے گورنر جنرل لگا بھی دیا۔"

"ملکہ کو یہ اختیار کیسے حاصل ہوا۔ وہ تو انگلستان کی ملکہ ہوتی ہے۔" رحیم داد نے تعجب سے پوچھا۔ "انگریزوں کی حکومت تو کب کی ختم ہو چکی۔"

"چوہدری تجھے کچھ پتہ نہیں۔ وہ انگلستان کے ساتھ ساتھ تب تک پاکستان کی بھی ملکہ تھی۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "گورنر جنرل' پاکستان میں اس کا نمائندہ ہوتا تھا۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تجھے معلوم ہے سکندر مرزا جو گورنر جنرل سے پاکستان کا پہلا صدر بن چکا ہے' پہلے سرکاری افسر ہی ہوتا تھا۔ وہ ڈیفنس سیکریٹری ہوتا تھا۔ اس سے پہلے پشاور کا ڈپٹی کمشنر بھی رہ چکا تھا۔"

"سکندر مرزا' افسر سے کیسے گورنر جنرل بن گیا؟"

"سکندر مرزا نے چوہدری محمد علی سے مل کر غلام محمد کو ہٹانے کی سکیم بنائی۔ چنانچہ محمد علی نے ملکہ الزبتھ کو لکھا کہ غلام محمد کو دو ماہ کی رخصت پر بھیج دیا جائے اور اس کی جگہ سکندر مرزا کو گورنر جنرل لگا دیا جائے۔ ملکہ نے چوہدری محمد علی کی سفارش منظور کر لی۔" احسان شاہ ٹھہر ٹھہر کر بتا رہا۔ "دو مہینے گزر گئے تو غلام محمد سے چوہدری محمد علی نے کسی نہ کسی طرح استعفے پر دستخط بھی لگوائے۔ استعفیٰ فوراً ملکہ کے پاس بھیج دیا گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی گئی کہ سکندر مرزا پکا گورنر جنرل لگا دیا جائے۔ ملکہ نے غلام محمد کا استعفیٰ منظور کر لیا اور سکندر مرزا کو گورنر جنرل دیا۔"

رحیم داد ہنوز حیرت زدہ تھا۔ "شاہ جی' تو نے بہت عجیب باتیں بتائیں۔ مجھے پتہ نہیں تھا سرکاری افسر اتنے طاکتور ہوتے ہیں۔"

"تجھے ایک اور دلچسپ گل سناؤں۔" احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ "سردار عبدالرشید' جو یونٹ بننے سے پیشتر سرحد کا وزیر اعلیٰ تھا' پہلے انسپکٹر جنرل پولیس ہوتا تھا۔ خان کیوم خان سرحد کا وزیر اعلیٰ تھا۔ اسے مرکزی وزیر لگایا گیا تو اس نے سردار رشید کو اپنی جگہ صوبے کا وزیر بنا دیا۔ سردار رشید بھی نہ صوبائی اسمبلی کا ممبر تھا نہ مسلم لیگ کا۔"

"شاہ جی' یہ بتا' یہ ون یونٹ کا کیا چکر ہے؟"

"ون یونٹ یہ ہوا کہ ادھر کے تینوں صوبوں اور بلوچستان کو ملا کر ایک صوبہ مغربی پاکستان گیا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "جب مری میں اسمبلی کا اجلاس ہوا اور اس یونٹ بنانے کا بل پیش ہوا تو میں وہاں موجود تھا۔ سردار رشید نے بھی دوسروں کے ساتھ مخالفت کی تھی اور یہ الزام لگایا تھا کہ ون یونٹ دراصل ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔ او سازش ثابت کرنے کے لیے ایک خفیہ دستاویز بھی پڑھ کر سنائی تھی۔"

"کیا تھی وہ دستاویز؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"دستاویز شستاویز کیا تھی' یہ دراصل میاں ممتاز دولتانہ کا ایک خط تھا' جو اس نے

چوہدری محمد علی کو دیا تھا۔ چوہدری محمد علی نے سردار رشید پر اعتماد کرتے ہوئے وہ خط اسے دے دیا۔ گل صرف اتنی تھی کہ اس میں دولتانہ نے لکھا تھا کہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ون یونٹ سے پنجاب کچھ گھاٹے میں رہے گا۔"

"وہ گھاٹا کیا تھا؟" رحیم داد بیچ میں بول اٹھا۔

"وہ یہ کہ مغربی پاکستان اسمبلی میں پنجاب کے ممبروں کا کوٹا ۵۶ فی صد بنتا تھا جسے کم کر کے ۴۰ فی صد کر دیا گیا تھا۔ اور اس کا ۱۶ فی صد حصہ چھوٹے صوبوں میں ان کی آبادی کے لحاظ سے بانٹ دیا گیا تھا۔"

"تب تو جی پنجاب ہی گھاٹے میں رہا۔"

"بالکل رہا۔ پر آگے چل کر دولتانہ نے اپنے کانفیڈنشل خط میں بتایا تھا کہ پنجاب کے افسروں کو شروع میں عہدوں اور نوکریوں پر اس طرح ہاتھ نہیں مارنا چاہیے کہ چھوٹے صوبے والے نراض ہو جائیں۔ انھیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اگر ون یونٹ کا منصوبہ ناکام ہو گیا تو اس ناکامی سے پنجاب اور بھی زیادہ گھاٹے میں رہے گا۔ وہ اس طرح رہے گا کہ ایسٹ پاکستان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وڈا اور طاکتور بن جائے گا۔ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر بنگالی جو فیصلہ کرانا چاہیں گے کرا لیں گے۔"

"اپنی سمجھ میں تو جی صاف بات ہے کچھ آیا نہیں۔" رحیم داد نے سادگی سے کہا۔ "مجھے تو یہ سارا چکر افسروں اور ان کی نوکریوں کا لگتا ہے۔"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا۔" احسان شاہ نے وضاحت کی۔ "پنجاب کا تو صرف نام ہی نام ہے۔ اصلی چکر تو یہ تھا کہ حکومت افسروں کے ہاتھ میں رہے پر ان کے فائدے کے ساتھ اپنا بھی تو فائدہ ہے۔ اسی لیے میں نے تجھے کہا تھا کہ افسروں سے میل ملاپ رکھنے کی کوشش کر۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "تجھے یہ ساری باتیں سمجھ لینی چاہییں۔ تجھے بھی آگے چل کر سیاست میں حصہ لینا ہو گا۔ کوشش کرے گا تو کبھی وزیر بھی لگ جائے گا۔ ورنہ اسمبلی کا ممبر تو بن ہی جائے گا۔"

رحیم داد نے چونک کر احسان شاہ کو دیکھا۔ احسان شاہ مسکرایا۔ دیر تک اسے سیاست کے اسرار و رموز سمجھاتا رہا۔ رات گہری ہو گئی۔ سناٹا بڑھ گیا۔ دونوں نے شراب نوشی ختم کی۔ کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔

* * *

صبح ناشتے کے بعد مہربان علی آ گیا۔ رحیم داد نے کلیم کے کاغذات اس کے حوالے کر دیے۔

مہران علی نے کاغذات الٹ پلٹ کر جگہ جگہ سے پڑھے۔ کلیم کے بارے میں جو نکات واضح نہ تھے ان کو سمجھنے کی کوشش کی۔ رحیم داد سے سوالات کیے۔ پوچھ گچھ کی۔ اور کاغذات کا بستہ سنبھال کر چلا گیا۔

شام کو رحیم داد کوٹھی کے سبزہ زار پر سید احسان شاہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ احسان شاہ اور رحیم داد ایک ایک پیگ لگا کر طلوع ہو رہے تھے۔ مہران علی بھی پہنچ گیا۔ اور الاٹمنٹ کے لیے درخواست تیار کر کے لایا تھا۔ مہران علی نے درخواست پڑھ کر سنائی۔ احسان شاہ نے اسے توجہ سے سنا۔ مسکرا کر بولا۔ "ٹھیک ہے۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا "چوہدری دستخط لگا دے۔" رحیم داد نے مہران علی کے ہاتھ سے قلم لیا اور خاموشی سے دستخط کر دیے۔

مہران علی درخواست لے کر چلا گیا۔

وہ ایسا گیا کہ کئی روز تک نظر نہ آیا۔ احسان شاہ بھی کم ہی نظر آتا۔ ان دنوں وہ سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ایک روٹ پرمٹ کے لیے بھی بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک بیٹے کے نام سے ایک ٹرانسپورٹ کمپنی قائم کر رکھی تھی۔ اسی کمپنی کے لیے وہ روٹ پرمٹ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ پرمٹ نیا نہ تھا۔ پہلے بھی وہ کئی روٹ پرمٹ لے چکا تھا۔ کمپنی کی لاریاں اور بسیں ان پرمٹوں کے مطابق مقررہ راستوں پر چل رہی تھیں۔ احسان شاہ کمپنی کا کام اور بڑھانا چاہتا تھا۔ اس کا منصوبہ تھا کہ وسطی پنجاب میں ہر طرف اس کی کمپنی کی بسوں کا جال پھیل جائے۔ اپنے اس منصوبے کا ذکر وہ رحیم داد سے بھی کر چکا تھا۔

رحیم داد کی احسان شاہ سے دن میں تو ملاقات ہی نہ ہوتی۔ مگر اکثر شام کو دونوں مل بیٹھتے۔ شراب نوشی کرتے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے۔ احسان شاہ عام طور پر سیاسی صورت حال کے بارے ہی میں بات کرتا۔ رحیم داد کو اپنی سیاسی سرگرمیوں سے آگاہ کرتا۔

پھر ایسا ہوا کہ تین روز تک وہ رحیم داد سے بالکل نہ مل سکا۔ رات کو کس وقت واپس آتا۔ رحیم داد کو مطلق علم نہ ہوتا۔ وہ بے خبر سوتا ہوتا۔

شام کو وہ ملا تو بہت نڈھال اور تھکا ہوا تھا۔ رحیم داد نے پوچھا۔ "شاہ جی، تو ادھر کہاں غائب رہا۔ پتہ نہیں تو کن چکروں میں پڑا ہے۔" اس کے انداز میں تجسس تھا۔ "تیرے روٹ پرمٹ، کیا بنا؟؟"

"وہ تو مل گیا پر میں ادھر ایک اور چکر میں پھنسا ہوا ہوں۔"

"وہی سیاست کا چکر ہو گا۔" رحیم داد مسکرا کر بولا۔

"ہے تو وہی چکر۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "گورنر نے میری یہ ڈیوٹی لگائی ہے کہ مسلم لیگی ممبروں کو گھیر گھار کر ری پبلکن پارٹی میں لاؤں۔ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب کی حمایت میں ان سے اسمبلی کے اندر ہاتھ اٹھواؤں۔ اب گورنر کی گل تو ماننی ہی پڑے گی۔ اس سے پرانی یاری جو ہوئی۔ اپنے بہت کام آتا ہے۔ لائل پور کی زمین کی الاٹمنٹ کے معاملے ہی کو دیکھ لے۔ گورنر اگر چیمہ کے خلاف انکوائری نہ رکواتے تو چیمہ رشوت کھائے بغیر کیسے الاٹمنٹ کر سکتا ہے۔ سنا ہے اس زمین کے لیے ۵۰ ہزار تک کی رشوت اسے پیش کی جا چکی ہے۔"

"یہ بتا چیمہ کے خلاف گورنر نے انکوائری رکوا دی؟؟"

"گورنر سے چیمہ کے بارے میں میری گل بات تو ہو چکی ہے۔ اس نے وعدہ بھی کر لیا ہے۔ اور جب اس نے وعدہ کر لیا تو سمجھ لے انکوائری ختم ہو جائے گی۔"

"چیمہ کو بھی اس گل کا پتہ ہے؟؟"

"ہاں، میں نے اسے بتا دیا ہے۔"

"تو بہت تھکا ہوا نظر آ رہا ہے۔ کیا کرتا رہا دن بھر؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"نہ پوچھ کیا کرتا رہا۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "ہر روز نیا تماشا دیکھنے میں آتا ہے۔ صوبائی اسمبلی کے کتنے ہی ممبر ایسے ہیں کہ صبح لیگ میں ہیں تو دوپہر کو ری پبلکن پارٹی میں۔ شام ہوتے ہوئے پھر لیگی بن جاتے ہیں۔ رات کو خبر آتی ہے کہ ری پبلکن پارٹی کے کیمپ میں پہنچ گئے۔ وعدے ہوتے ہیں۔ قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ حلف اٹھائے جاتے ہیں۔ کلام مجید پر دستخط کرائے جاتے ہیں۔ پر کسی کا اعتبار نہیں۔ راتوں رات وفاداریاں بدل جاتی ہیں۔ زبردست سودے بازی ہو رہی ہے۔ ہر طرح کی رشوت چل رہی ہے۔ پرمٹ، لائسنس، الاٹمنٹ کے ساتھ ساتھ دھونس اور دھمکی بھی چل رہی ہے۔ نہ پوچھ کیسے کیسے چکر چلائے جا رہے ہیں۔"

اس نے حسب معمول بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "پچھلے دنوں سپیکر کا انتخاب کرنے کے لیے اسمبلی کا اجلاس ہوا۔ مسلم لیگ پارٹی نے میر غلام علی تالپور کو اور ری پبلکن پارٹی نے چوہدری فضل الٰہی کو کھڑا کیا۔ نہ پوچھ کتنا رولا گولا ہوا۔ جسے دیکھو گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا ہے۔ ممبروں کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ شور شرابہ، کھینچا تانی، ہاتھا پائی، سب ہی کچھ ہوا۔ ووٹ گنے گئے تو برابر برابر نکلے۔ ممتاز علی قزلباش صدارت کر رہا تھا۔ اس نے اپنا کاسٹنگ ووٹ ری پبلکن پارٹی کے امیدوار کو دے دیا۔ لو جی اس طرح چوہدری فضل الٰہی سپیکر بن گیا۔"

"تب تو تیری ہی پارٹی کی جیت ہوئی ناں۔"

"وہ تو ہونی ہی تھی۔ سکندر مرزا اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے سے دو روز پہلے ہی لہور آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ری پبلکن پارٹی کو جتانے آیا تھا۔ اس کی اپنی پارٹی جو ہوئی۔" احسان شاہ کھل کھلا کر ہنسا۔ "پر سب سے دلچسپ تماشا اجلاس کے دوسرے دن دیکھنے میں آیا۔ لیگی ممبروں نے اسمبلی کی کارروائی کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا۔ حکومت کا دباؤ پڑا تو درخواست مسترد ہو گئی۔ ججوں کو نوکری کرنی تھی۔ ترکی جو لینی تھی۔ اسمبلی کا ایک سندھی ممبر، جو صوبائی وزیر اعلیٰ اور مرکزی وزیر بھی رہ چکا ہے، مسلم لیگی امیدوار کی حمایت میں سب سے آگے تھا۔ صبح ہائی کورٹ میں درخواست لگانے میں بھی آگے آگے تھا۔ بہت وڈی وڈی گلاں کرتا تھا۔ یہ کر دوں گا وہ کر دوں گا۔ سہ پہر ہوئی تو دیکھا، ری پبلکن پارٹی کے وزیر کی حیثیت سے حلف اٹھا رہا تھا۔"

"حد ہو گئی جی۔" رحیم داد چند لمحے حیرت زدہ بیٹھا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "مہربان علی اب تک نہیں لوٹا۔ کب تک آجائے گا؟"

"میں تجھے بتانا بھول گیا، وہ کل صبح واپس آ رہا ہے۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا وہ کل آ رہا ہے؟"

"میرا ایک کرندہ بھی پچھلے دنوں لائل پور گیا تھا۔ آج دوپہر کو واپس آیا ہے۔ وہی بتاتا تھا۔ چوہدری تو فکر نہ کر۔ مہربان علی پورا کام کر کے ہی آئے گا۔"

دوسرے روز رحیم داد کو مہربان علی کا انتظار رہا، مگر وہ نہ آیا۔ احسان شاہ بھی شام کی ٹرین سے اچانک کراچی چلا گیا۔ روانگی سے قبل رحیم داد سے ملا بھی نہیں۔ احسان شاہ کے ساتھ اس کا بڑا بیٹا، رحمان شاہ بھی کراچی گیا تھا۔

رحیم داد کو یہ اطلاع کوٹھی کے نوکروں سے ملی تو سخت حیرت زدہ ہوا۔ حیرت کی بات ہی تھی۔ رات ہی کو احسان شاہ کے ساتھ اس کی لمبی نشست رہی تھی۔ لیکن کراچی جانے کے بارے میں اس نے اشارہ تک نہ کیا۔ رحیم داد نے کرید کرید کر نوکروں سے پوچھا۔ مگر انہیں اس کے پروگرام کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ بالکل بے خبر تھے۔ احسان شاہ کے اس طرح پر اسرار طور پر چلے جانے سے رحیم داد سخت الجھن میں پڑ گیا۔

☆

کوٹھی پر ہر وقت سناٹا چھایا رہتا۔ احسان علی شاہ ہنوز کراچی میں تھا اور کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ کب واپس آئے گا۔

رحیم داد شدید تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ اس کا جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اپنے گاؤں، کوٹلہ ہرکشن واپس جانا نہ چاہتا تھا۔ اسے احسان شاہ کے منیجر مہربان علی کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا۔ کلیم کے تمام ضروری کاغذات بھی اس کی تحویل میں تھے۔ رحیم داد کلیم کے کاغذات اس کے پاس چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ وہ اپنے تمام کاغذات لے کر ہی واپس جانا چاہتا تھا۔

کئی روز گزر گئے۔ مگر مہربان علی نہ آیا۔ نہ یہ معلوم ہو سکا کہ زمین کے الاٹمنٹ کے بارے میں کیا کارروائی ہوئی اور وہ کب واپس آئے گا۔ مہربان علی نے لائل پور سے کوئی اطلاع بھی نہ بھیجی۔ رحیم داد کو کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ لائل پور میں کیا کر رہا ہے۔ وہ سخت تشویش میں مبتلا تھا۔ تشویش کا بنیادی سبب یہ تھا کہ الاٹمنٹ کی درخواست پر اس کے دستخط قطعی جعلی تھے۔ وہ چوہدری نور الٰہی نہ تھا رحیم داد تھا۔ کلیم، چوہدری نور الٰہی کے نام سے منظور ہوا تھا جسے قتل کر کے رحیم داد نے کلیم کی دستاویزات اپنے قبضے میں کر لی تھیں اور رحیم داد سے چوہدری نور الٰہی بن گیا تھا۔ اب وہ نور الٰہی کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ اسے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں اس کی جعل سازی کا پردہ نہ فاش ہو جائے۔

گرمی اپنے شباب پر تھی۔ دن بھر لو کے جھکڑ چلتے۔ در و دیوار سے چنگاریاں اڑتیں۔ زمین دھوپ کی تمازت سے تپتی۔ آسمان پر گرد کا غبار چھایا رہتا۔ سورج غبار کی اوٹ میں تانبے کے سرخ تھال کی مانند دہکتا۔ دن ڈھلے جب گرمی کی شدت کا زور قدرے ٹوٹتا تو نوکر کوٹھی کے وسیع لان میں کرسیاں قرینے سے لگا دیتے۔

رحیم داد اس روز بھی معمول کے مطابق دن ڈھلے لان کے ایک پر سکون گوشے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ فضا غبار آلود اور بوجھل تھی۔ رحیم داد نے کچھ ہی دیر پہلے غسل کیا تھا۔ اجلا لباس پہنا تھا مگر جسم پر پسینے کی نمی تھی۔ طبیعت میں اکتاہٹ تھی۔ تنہائی کا احساس رہ رہ کر ستاتا تھا۔

سائے پھیل کر طویل ہو گئے۔ دن کی چمک دمک دھندلی پڑ گئی۔ سورج ڈوب گیا۔ آسمان کی رنگت سرمئی ہو گئی۔ اندھیرا دھیرے دھیرے فضا میں گھلنے لگا۔ رحیم داد کرسی کی پشت سے سر ٹکائے گم صم بیٹھا تھا۔ ناگاہ کوٹھی کے پھاٹک پر ایک کار آ کر ٹھہری۔ ساتھ ہی کسی کی آواز بھی ابھری۔ رحیم داد کو آواز مانوس معلوم ہوئی۔ اس نے ذہن پر زور دیا اور جھٹ پہچان لیا۔ وہ سردار مراد خاں شاہانی تھا۔ چوکیدار سے احسان شاہ کے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔ رحیم داد کے چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اٹھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پھاٹک کی جانب بڑھا۔

مراد خاں شاہانی اسے دیکھتے ہی خوشی سے چیخا۔ "اوے چوہدری تو ادھر ہے!" وہ تیزی سے آگے

دھا۔ قریب پہنچا اور گرم جوشی سے رحیم داد کو دونوں بازوؤں میں دبوچ لیا۔

“شاہانی، تو کب آیا؟” رحیم داد نے علیحدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

“میں کل صبح آیا۔ تو نے شاہ جی کو کہاں بھیج دیا؟ سنا ہے کراچی گیا ہے۔”

“تو نے ٹھیک ہی سنا، وہ کراچی گیا ہے۔”

مراد خان شاہانی نے مڑکر سردار شہ زور خان مزاری کی جانب دیکھا۔ وہ قریب ہی کھڑا تھا۔ شاہانی نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ “سیں چوہدری، تو نے اسے نہیں پہچانا؟”

“کیوں نہیں پہچانا۔ یہ اپنا شہ زور مزاری ہے نا۔ بھکر میں تیری ہی حویلی میں تو اسے ملا تھا۔” رحیم داد نے آگے بڑھ کر مزاری کو گلے سے لگایا اور آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ “اسے میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ یہ تیرا یار ہے تو تیرے ساتھ اپنا بھی یار ہے۔” رحیم داد نے شاہانی کو مخاطب کیا۔ “دونوں اکٹھے ہی آئے ہو؟”

“میں تو ہفتہ بھر سے لہور میں ہوں۔” شاہانی کے بجائے مزاری نے جواب دیا۔

تینوں باتیں کرتے ہوئے لان کی جانب بڑھے۔

رحیم داد نے شہ زور مزاری سے دریافت کیا۔ “تو ہفتہ بھر سے ادھر کیا کر رہا تھا؟”

“کراچی سے ایک کار آنے والی تھی۔ اس کا سودا طے کرنے کے لیے آیا ہوں۔”

“ہو گیا سودا؟” رحیم داد نے مزاری سے پوچھا۔

“ہو گیا۔ کئی روز ہو گئے۔” سردار مزاری نے بتایا۔ “آج کل وہی کار میرے پاس ہے۔”

“بہت شاندار گاڑی ہے۔” سردار مراد خاں شاہانی نے ہنس کر کہا۔ “سیں چوہدری، یہ ڈرائیور بھی زبردست ہے۔ ایسی تیز گاڑی دوڑاتا ہے جیسے توپ سے نکلا ہوا گولا۔” اس نے بے تکلفی سے قہقہہ بلند کیا۔

تینوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے لان کے اس گوشے میں پہنچ گئے جہاں کرسیاں قرینے سے رکھی تھیں۔ انھوں نے کرسیاں کھسکائیں اور اطمینان سے بیٹھ گئے۔

رحیم داد نے شہ زور مزاری سے دریافت کیا۔ “شاہ جی سے تیرا میل ملاپ نہیں؟”

“ہے تو، پر زیادہ نہیں۔”

“تو ہفتہ بھر سے ادھر ہے، ایک روز بھی شاہ جی سے ملنے نہیں آیا؟” رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔

“کار کے چکر میں پھنسا رہا۔” سردار مزاری نے صفائی پیش کی۔

رحیم داد نے مڑکر شاہانی کی طرف دیکھا۔ “تو کل ہی ادھر کیوں نہیں آیا؟”

“کل اور آج سرکاری افسروں سے ملتا رہا۔” شاہانی نے بھی صفائی پیش کی۔ “فرصت ملتے ہی ادھر آیا ہوں۔”

“تیرے علاقے میں تو سخت گڑبڑ تھی۔” رحیم داد نے شاہانی سے کرید کر پوچھا۔ “اب ادھر کا کیا حال احوال ہے؟”

مزاری بیچ میں بول پڑا۔ “گڑبڑ تو اتنی زبردست تھی کہ بیٹ سے نکل کر مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خان کے مزارعوں اور کسانوں تک میں پھیلنے لگی تھی۔”

“اب تو سب ٹھیک ٹھاک ہے۔” شاہانی نے بتایا۔ “پولیس نے سختی سے دبا دیا۔ ویسے ابھی تک کہیں کہیں تھوڑی بہت گڑبڑ ہے۔”

“اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ گڑبڑ پوری طرح ختم نہیں ہوئی۔ دوبارہ بھڑک سکتی ہے۔” رحیم داد نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

“ایسا خطرہ تو ہے۔” سردار شہ زور مزاری نے رحیم داد سے اتفاق رائے کرتے ہوئے کہا۔ “ویسے بارڈر ملٹری پولیس کمک پر نہ آتی تو ضلع میانوالی کی پولیس سے ابھی تک گڑبڑ نہ دبتی۔”

“میں تو ان دنوں شاہانی کے ساتھ بیٹ ہی میں تھا۔” رحیم داد نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ “نہ پوچھ ادھر کیسی زبردست گڑبڑ تھی۔ میں تو سخت پریشان ہو گیا تھا۔ واپسی پر ایسا ہوا کہ سموں والی سے آگے مزارعوں اور کمیوں کے ایک ہجوم نے میری جیپ کو گھیر لیا۔ جسے دیکھو لال لال آنکھیں نکالے گھورتا تھا۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختا تھا۔ انھوں نے تو سمجھو ہلا ہی بول دیا تھا۔ پر ڈرائیور بہت ہشیار تھا۔ اس نے منت کی۔ سمجھایا بجھایا، تب جیپ ان کے گھیرے سے کسی نہ کسی طرح نکلی اور آگے بڑھی۔”

“اجڈ اور جانگلی جو ٹھہرے۔” سردار مزاری نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ “انھیں کیا پتہ تو کون ہے اور کس لیے آیا ہے؟ ان کے پاس اتنی سمجھ ہی ہوتی تو ایسی گڑبڑ کیوں کرتے۔ اپنے ہاتھوں اپنی خرابی کی۔ گرفتار ہوئے، جیل گئے۔ اب سزا بھگت رہے ہیں۔”

“کئی تو پولیس کی فائرنگ سے مارے بھی گئے۔” سردار مراد خاں شاہانی نے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔ “لاشیں بھی دریا میں بہا دی گئیں۔ مچھلیاں کھا گئیں۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔”

“سنا ہے زخمی بھی بہت ہوئے۔” مزاری بولا۔

رحیم ادنے بات مختصر کرتے ہوئے مشورہ دیا۔ "پر شاہانی تجھے اور بیٹ کے دوسرے زمین داروں کو اب بہت ہشیار اور چوکس رہنا چاہیے۔"

"سیں تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" سردار شاہانی نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ "یہاں سرکاری افسروں سے گڑبڑ کے بارے میں بات ہوئی تو پتہ چلا وہ بھی اسی انداز سے سوچ رہے ہیں۔ انھوں نے مزید پولیس فورس بھیجنے کی تیاری کر رکھی تھی۔ ادھر بھی سخت کھلبلی مچ گئی تھی۔ صوبائی وزیر داخلہ بہت پریشان تھا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "مجھ سے پہلے سردار ظفر خاں ڈھانڈلہ کی سربراہی میں بیٹ کے زمین داروں کا ایک وفد مری میں وزیر داخلہ سے ملا تھا۔ اس نے شورش اور گڑبڑ دبانے کے لیے ہر طرح کی سرکاری مدد کا وعدہ کیا ہے۔ مجھے کہتا تھا فکر کرنے کی کوئی گالہ نہیں۔ اب کی گڑبڑ ہوئی تو زیادہ سختی سے دبادی جائے گی۔"

رحیم داد نے موضوع بدلتے ہوئے مراد خاں شاہانی سے دریافت کیا۔ "تیرا کب تک ادھر ٹھیرنے کا ارادہ ہے۔" وہ لحہ بھر کے لیے خاموش رہا۔ "اور ہاں یہ تو بتا تو ٹھیرا کہاں ہے؟"

"میں مزاری کے ساتھ فلیٹیز میں ٹھیرا ہوں۔"

"فلیٹیز تو ہوٹل ہے ناں؟" رحیم داد بولا۔ "ہوٹل میں کیوں ٹھیرا ہے؟ ادھر شاہ جی کی کوٹھی پر ٹھیرتا۔ تیرے ساتھ بہت مزے سے وکت کٹتا۔ تجھے کیا پتہ، اکیلے میں یہاں کتنا جی گھبراتا ہے۔"

"تو ایسا کیوں نہیں کرتا۔ ہوٹل ہی میں آجا۔ وکت تو وہیں ٹھیک گزرے گا۔" شاہانی نے آنکھ دبا کر ہلکا قہقہہ لگایا۔ "ویسے بھی اب شاہ جی بوڑھا ہو گیا ہے۔ ایک زمانے میں اس کے پاس ایک سے ایک زوردار دانا تھا۔ تو نے تو اس کا کوٹ اچھی طرح دیکھ رکھا ہے۔ شاہ جی خود بھی عیش کرتا تھا یاروں کو بھی عیش کراتا تھا۔"

"پر اب تو اس نے سب کچھ ختم کر دیا۔" رحیم داد نے تبصرہ کیا۔

"اسے تو اب سیاست لڑانے سے فرصت نہیں۔" شاہانی نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "جب سے اس کا پتر لندن سے بیرسٹر بن کر لوٹا ہے، وہ دوسرے ہی چکروں میں رہتا ہے۔ سرکاری افسروں اور سیاست دانوں کے ساتھ جوڑ توڑ میں لگا رہتا ہے۔"

"میں تو کہتا ہوں جی، کراچی بھی وہ کسی ایسے ہی چکر میں گیا ہے۔"

"بالکل اسی چکر میں گیا ہے۔" شاہانی نے اس کی تائید کی۔

"سنا ہے اس نے اسمبلی کے لیگی ممبروں کو ری پبلکن پارٹی میں بھرتی کرانے کا دھندا شروع کر دیا ہے۔" وہ ٹھٹھا مار کر زور سے ہنسا۔ "اس کارگزاری کے صلے میں دبا کے الاٹمنٹیں، روٹ پرمٹیں اور طرح طرح کے لائسنس حاصل کر رہا ہے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے اچانک خاموش ہو گیا۔ تھکے ہوئے انداز میں اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ نظریں بلند کیں اور غبار آلود آسمان کو تکنے لگا۔ اس نے گہری سانس بھری۔ "سیں چوہدری، اب اس کے ساتھ اپنی یاری نہیں چل سکتی۔"

"پہلے سے وہ اب بدل تو گیا ہے پر اتنا نہیں جتنا تو سمجھتا ہے۔"

شاہانی نے رحیم داد کی بات نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "سیں چوہدری، آج پینے پلانے کا ارادہ نہیں؟"

"گرمی بہت ہے۔ شاہ جی بھی آج کل کم ہی پیتا ہے۔ اور جن ٹن پیتا ہے۔ اپنے کو تو بالکل پسند نہیں آتی۔" رحیم داد نے کہا۔ "گرمی میں تو سچ پوچھ ٹھنڈی ٹھنڈی ساوی پینے کو جی کرتا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "تو نے بھکر میں بہت زوردار ساوی پلائی تھی۔"

"ساوی پینے کا مزا تو بھکر ہی میں آتا ہے۔ ادھر ویسی ساوی نہیں ملتی۔" شاہانی ہنس کر بولا۔ "ادھر تو گرمی میں بیئر چلتی ہے۔ برف میں لگی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ البتہ سردار شہ زور خان مزاری نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔

"سیں ایسا کر ہمارے ساتھ ہوٹل چل۔" سردار شاہانی نے کہا۔ "وہاں دو چار گلاس بیئر کے لگائیں گے۔ فیر ہیرا منڈی چلیں گے۔" اس نے مڑ کر شہ زور کی جانب دیکھا۔ "مزاری نے ادھر ایک پھڑک دار کنجری رکھ چھوڑی ہے۔ ایک دم پوپٹ ہے۔ سوہنڑی ہے اور گاتی بھی بہت عمدہ ہے۔ دیکھے گا تو ایک دم مست ہو جائے گا۔ اس کے پاس ضرور چلنا ہے۔"

"تھوڑی دیر تو یہاں اور بیٹھ۔" رحیم داد بولا۔

"سیں چوہدری اب دیر نہ کر۔" مزاری نے گردن گھما پھرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ "ادھر تو ایسا سناٹا ہے کہ ہول آتا ہے۔ پتہ نہیں کیسے تیرا ٹائم کٹتا ہے۔"

"بس کٹ ہی جاتا ہے۔" رحیم داد بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "سچ پوچھ تو اپنے پنڈ میں بھی ایسے ہی کٹتا ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "ادھر بھی اپنا دل بہلانے والا کون ہے۔"

مزاری نے آنکھیں پھاڑ کر رحیم داد کو حیرت سے دیکھا۔ مگر تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔

شاہانی اس کے استعجاب کو تاڑ گیا۔ ہنس کر بولا۔ "مزاری تو اسے ٹھیک سے نہیں جانتا۔ عجب بندہ ہے۔ شراب پیتا ہے اور اکیلا بیٹھ کر پیتا ہے۔" اس نے قہقہہ بلند کیا۔ "اور اس سے بھی زیادہ

انوکھی گالہ یہ ہے کہ وڈا زمیں دار ہے پر رات کو بغیر کسی رن کے سوتا ہے۔ پتہ نہیں اسے نیند کیسے آجاتی ہے۔"

"تیرے مزارعے شزارے تو ہوں گے؟" سردار مزاری نے رحیم داد سے دریافت کیا۔

رحیم داد چپ رہا۔ مگر مراد خاں شاہانی چپ نہ رہ سکا۔ کہنے لگا۔ "مزارعے شزارے بھی ہیں۔ ان کے جوان گھر والیاں بھی ہیں۔ بھینسیں ہیں' کڑیاں ہیں۔" اس نے بے تکلفی سے ایک آنکھ دبائی۔ "سب ہی کچھ ہے۔ پر یہ اپنے مزارعوں سے ڈرتا ہے۔"

"مزارعوں سے ڈرتا ہے؟" مزاری کو سردار شاہانی کی بات پر یقین نہیں آیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ "سیں اس طرح تو تیری زمیں داری نہیں چلنے کی۔"

"چلے گی ضرور چلے گی۔" سردار شاہانی مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ "سیں چوہدری' تیری زمیں داری تو جیسے تیسے چلتی ہی رہے گی۔ پر اب تو ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہو جا۔"

سردار شہ زور خاں مزاری بھی کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے دبی زبان سے انکار کیا۔ "شاہانی مجھے نہ لے جا۔ میں نے کہیں نہیں جانا۔"

مراد خاں شاہانی اڑ گیا۔ اپنی بات پر زور دے کر بولا۔ "خاماخا' نخرا نہ دکھا۔ جب تک میں لہور میں ہوں' تجھے میرے ساتھ فلیٹیز میں ٹھیرنا ہے۔ ادھر اکیلا رہ کر کیا کرے گا۔ شاہ جی' دو تین ہفتے سے پہلے لوٹنے کا نہیں۔ لگتا ہے وہ لمبے پروگرام پر کراچی گیا ہے۔ تو اب اس کا انتظار نہ کر۔ جب تک مجھے ادھر رکنا ہے تو بھی ہوٹل میں ٹھیر جا۔ بعد میں کوٹلہ ہرکشن واپس چلا جانا۔"

رحیم داد مزید انکار نہ کر سکا۔

تینوں کوٹھی سے باہر نکلے۔ پھاٹک سے کچھ فاصلے پر سردار شہ زور مزاری کی لمبی چوڑی کیسر کوئزلر کھڑی تھی۔ کار دو سال پرانے ماڈل کی تھی۔ لیکن اتنی اچھی حالت میں تھی کہ بالکل نئی معلوم ہوتی تھی۔ سردار مزاری کو بھی بڑے جاگیرداروں کی طرح بڑی حویلی اور بڑی کار رکھنے کا شوق تھا۔ کار میں ڈرائیور موجود نہ تھا۔ شہ زور خاں مزاری نے داد طلب نظروں سے کار کی جانب دیکھا۔ آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہ اور شاہانی کار کے اندر داخل ہو گئے۔

رحیم داد نے کار میں بیٹھنے سے پہلے اپنی جیپ کے ڈرائیور کو بلایا اور اسے کوٹھی میں ٹھیرنے کی ہدایت کی۔

"چوہدری کا سامان بھی اٹھا لا۔" سردار مراد خاں شاہانی نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ ڈرائیور نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ ڈرائیور چپ چاپ کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ رحیم داد کا سوٹ کیس دبائے ہوئے نمودار ہوا۔ اس نے مزاری سے کنجی لی۔ کار کی ڈکی کھولی اور سوٹ کیس اس میں رکھ دیا۔ رحیم داد بھی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سردار مزاری نے اسٹیرنگ وہیل سنبھالا۔ انجن اسٹارٹ کیا۔ کار سڑک پر دوڑنے لگی۔

مراد خاں شاہانی نے مزاری کے بارے میں ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ بہت تیز رفتار سے کار دوڑا رہا تھا۔ مگر وہ بہت منجھا ہوا اور ہوشیار ڈرائیور بھی تھا۔

☆

کار تیزی سے دوڑتی رہی۔ کسی موڑ پر مڑتی تو پہیے پختہ سڑک سے اس طرح رگڑتے کہ ان سے نہایت تیز اور خوفناک آوازیں ابھرتیں۔ آس پاس سنسنی پھیل جاتی۔ راہ گیر بدکتے' اور سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر بھاگتے۔ لیکن مزاری کو اس قدر خطرناک انداز سے کار دوڑانے میں مزا آرہا تھا۔ وہ بے نیازی سے بیٹھا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔

رحیم داد خوف زدہ اور سہما ہوا تھا۔ وہ گم صم بیٹھا رہا۔ کار مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی مال پر پہنچی۔ مزاری نے رفتار اور تیز کر دی۔ کار ہوٹل کی جانب مڑی۔ آگے بڑھی۔ یکایک مزاری نے بریک لگائے۔ کار شور مچاتی ہوئی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ رحیم داد پھسلا اور مراد خاں شاہانی کے کندھے سے اس کا سر ٹکرا گیا۔ مگر اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔

تینوں نے آگے کی بتیوں کی تیز روشنی میں دیکھا۔ دو لمبے تڑنگے بلوچ ایک گھنے درخت کے نیچے سے نکل کر سڑک پر آگئے۔ مزاری نے انھیں تیز اور تیکھی نظروں سے دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کار کی جانب بڑھ رہے تھے۔ سردار مزاری نے بتیاں بجھا دیں۔ روشنی اتنی کم رہ گئی کہ دونوں بلوچ سایوں کی مانند دھندلے اور پراسرار نظر آنے لگے۔

سردار مزاری خاموش بیٹھا' نظریں اٹھائے ان کی جانب دیکھتا رہا۔ قریب پہنچ کر ایک بلوچ آگے بڑھا۔ وہ لمبی قمیص اور خوب گھیردار شلوار پہنے ہوئے تھا۔ سر پر ملگجی سفید پگڑی تھی۔ پگڑی کے نیچے گردن پر بالوں کے گھنے پٹے لہرا رہے تھے۔ ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال بھی گھنے اور سخت تھے۔ چہرہ تیز دھوپ سے جھلسا ہوا تھا۔ آنکھوں سے سرخی جھلک رہی تھی۔ ڈیل ڈول اور وضع قطع سے وہ اونچی چٹان کی مانند پر شکوہ اور ہیبت ناک نظر آتا تھا۔ گردن پر لہراتے ہوئے سر کے بالوں کے گلایک دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کوہستانی علاقے کا رہنے والا بلوچ ہے۔ اس نے پیشانی تک ہاتھ اٹھا کر سردار شہ زور خاں مزاری کو سلام کیا۔

مزاری نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ سامنے کھڑے ہوئے بلوچ کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ گردن کو ہلکا سا خم دیا۔ رعب دار لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"داؤد خاں! میں نے تجھ سے حوال نہیں لینا۔ یہ بتا کیا خبر لایا ہے؟"

"سردار' خبر تو چنگی ہی ہے۔" داؤد خاں نے مڑ کر پشت کی جانب دیکھا۔ دوسرا بلوچ اس کے زدیک ہی کھڑا تھا۔ وضع قطع سے وہ داؤد خاں سے قدرے مختلف تھا۔ اس کی گردن پر بالوں کے پٹے نہیں تھے۔ عمر بھی داؤد سے کم تھی۔ وہ بائیس برس سے زیادہ کا نہ لگتا تھا۔ قد بھی ذرا دبتا ہوا تھا۔ ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال بھی سخت اور گھنے نہ تھے۔ رنگت گندمی تھی۔ وہ شلوار کے بجائے منجھلا باندھے ہوئے تھا۔ داؤد نے اسے قریب آنے کا ہاتھ سے اشارہ کیا۔ آہستہ سے بولا۔

"بدھیل خاں' تجھے ٹھیک سے پتہ ہے' سردار کو بتا دے۔"

بدھیل خاں آگے بڑھا' جھکا اور سردار شہ زور مزاری کے پیروں کو چھو کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ چند لمحے خاموشی رہی' پھر مزاری کی آواز ابھری۔ وہ بدھیل سے دریافت کر رہا تھا۔ "بدھیل' یہ بتا سہراب لہور پہنچ گیا؟"

"نا سیں!" بدھیل خاں نے انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "وہ آج صبح اوچ پہنچ گیا۔"

"سہراب اوچ پہنچ گیا؟" مزاری نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "وہ اوچ کیسے پہنچا؟ وہ تو بلوکی میں تھا۔ اس نے تو لہور پہنچنا تھا۔ تو نے شاہ میر میں مجھے یہی بتایا تھا ناں؟"

"ہا سیں!" بدھیل نے سنبھلے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "سہراب' بلوکی میں ہی ٹھیرا تھا۔ پر وہ لہور نہیں آیا۔"

"وہ یہاں کیوں نہیں آیا؟" مزاری کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ تلخی بھی تھی۔

"سیں سردار گالہہ یہ ہے' لہور میں اس نے ممدوٹوں کے پاس ٹھہرنا تھا۔ پر ممدوٹوں کی کوٹھی میں آج کل کوئی نہیں۔ سب مری چلے گئے۔" بدھیل ٹھہر ٹھہر کر بتاتا رہا۔ "سہراب کو پتہ چلا تو اس نے لہور کا ارادہ چھوڑ دیا۔ بلوکی سے صادک آباد کی طرف لوٹا۔ پر ادھر نہ گیا۔ احمد پور شرکی سے اس نے گڈی بدلی اور اوچ پہنچ گیا۔"

"تجھے پتہ ہے' وہ صادک آباد کیوں نہیں گیا؟"

"سیں سردار! میں نے تو یہ سنا ہے' وہ مخدوموں کے پاس جمال دین والی میں زیادہ دیر ٹھیرنا نہیں چاہتا۔ تب ہی اس نے صادک آباد جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔" بدھیل نے داؤد خاں کی جانب مڑ کر دیکھا۔ اور اپنے بیان کی تائید میں اس سے تصدیق کرانا چاہی۔ "رادھو ایسا ہی بتاتا تھا ناں؟"

مزاری نے داؤد کو نظرانداز کرتے ہوئے بدھیل خاں سے دریافت کیا۔ "یہ بتا رادھو کہاں ہے؟"

"سیں' وہ تو اوچ ہی میں ہے۔" بدھیل نے مستعدی سے جواب دیا۔ "ہجر خاں کھوسہ بھی ادھر ہی ہے۔"

"اور کیا بتاتا تھا رادھو؟ اسے تو سہراب کے ارادوں کا ٹھیک طرح پتہ ہونا چاہیے۔"

"رادھو کہتا تھا' سہراب دوبارہ لغاریوں کے پاس واپس جانا چاہتا ہے" بدھیل نے سردار مزاری کو بتایا۔ "اوچ میں سہراب کا ایک چاچا ہے۔ سہراب اس کے ساتھ ہی ٹھیرا ہے۔ اس نے چاچا کے پتر' زردار' کو لغاریوں کے پاس چوٹی بھیجا تھا۔"

"زردار ابھی ادھر ہی ہے یا واپس آ گیا؟"

"سیں وہ واپس آ گیا ہے۔" بدھیل نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "رادھو یہ خبر لایا تھا۔ اس نے تو یہ بھی پتہ چلا لیا ہے کہ سہراب اوچ میں ابھی دو روز اور ٹھیرے گا۔ بعد میں کینجھر جائے گا۔ دن بھر ادھر ٹھیرے گا۔ وہاں سے غازی گھاٹ کی طرف جائے گا۔ اور دریا پار کر کے رات ہی کو ڈیرہ غازی کے رستے لغاریوں کے پاس چوٹی پہنچ جائے گا۔"

"اور تو اسے چوٹی پہنچ جانے دے گا؟" سردار مزاری نے قہر آلود نظروں سے بدھیل کو دیکھا۔ حکم دینے کے انداز میں ڈپٹ کر اونچی آواز سے بولا۔ "اسے کسی بھی طرح چوٹی نہیں پہنچنا چاہیے۔ ہ اب ادھر نہیں جائے گا۔ ہرگز نہیں جائے گا۔"

بدھیل خاں نے ہاتھ باندھ کر شہ زور خاں مزاری کو یقین دلایا۔ "سیں سردار' تو فکر نہ کر' ہراب کسی طرح چوٹی دوبارہ نہیں پہنچ سکے گا۔ تیرا حکم پورا ہو گا۔" وہ سینے پر ایک ہاتھ رکھ کر ادب ے جھکا۔ مزاری کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ "سیں تو بالکل فکر نہ کر۔"

ردار مزاری نے کچھ نہ کہا۔ گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے یافت کیا۔ "اوچ میں سہراب اکیلا ہے؟"

"نا سیں!" اس دفعہ بدھیل خاں کے بجائے داؤد نے جواب دیا جو دیر سے خاموش کھڑا تھا۔ وک زادی اس کے ساتھ ہی ہے۔"

شہ زور خاں مزاری نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ مگر اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ بکھر گئی۔ یں غصے سے چمکنے لگیں۔ وہ چپ چاپ کار سے باہر نکلا۔ داؤد اور بدھیل خاں کے قریب پہنچا۔ ل کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔ اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ بدھیل اور داؤد سر جھکائے اس

کے پیچھے چلے۔ تینوں درختوں کے نیچے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

☆

مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کار کے اندر خاموش بیٹھے تھے۔ کئی منٹ گزر گئے۔ سردار شہ زور خاں مزاری واپس نہیں آیا۔

رحیم داد نے اکتا کر سکوت توڑا۔ آہستہ سے پوچھا۔ "شاہانی یہ چکر کیا ہے؟"

"اسی چکر میں تو مزاری لہور آیا ہے۔ ہفتہ بھر سے یہاں ٹھیرا ہے۔ کار کے سودے کا تو صرف بہانہ تھا۔" مراد خاں شاہانی نے مسکرا کر بتایا۔

رحیم داد کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ لحہ بھر تک ہونق کی طرح مراد خاں کے چہرے کو تکتا رہا۔ پھر اس نے اٹکتے ہوئے دریافت کیا۔ "یہ ملوک زادی کون ہے؟"

"کیا کرے گا جان کر۔" مراد خاں شاہانی نے ٹالنا چاہا۔ "یہ مزاری کا گھریلو معاملہ ہے۔" اس نے آنکھ دبا کر ہلکا قہقہہ لگایا۔ "یاری آشنائی کا چکر ہے۔"

رحیم داد کو معاً حمیدہ یاد آ گئی۔ حمیدہ بھی ملوک زادی تھی۔ وہ مراد خاں شاہانی کی بہن تھی اور ہنوز غیر شادی شدہ تھی۔ سال سوا سال پہلے جب رحیم داد بھکر میں تھا اور مہمان کی حیثیت سے شاہانی کی شاندار حویلی کے مہمان خانے میں ٹھیرا تھا تو ایک رات حمیدہ اچانک اس کے کمرے میں آ گئی تھی۔ وہ رات بھر اس کے پاس رہی تھی۔

رحیم داد نے دبی زبان سے پوچھا۔ "مزاری کی بھین کا تو کوئی معاملہ نہیں ہے۔" اس نے شاہانی سے نظریں نہ ملائیں۔

"نہیں۔" مراد خاں شاہانی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "وہ اس کی بھین نہیں ماں ہے۔"

"وہ اس کی ماں ہے؟" رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں حیرت سے کہا۔ "نہیں یار، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سہراب اس کی ماں کو اٹھا کر کیسے لے جا سکتا ہے؟"

"وہ شہ زور کی سوتیلی ماں ہے۔ اس کا نام مرجان ہے۔" شاہانی نے کھل کر بتایا۔ "سہراب اسے اٹھا کر نہیں لے گیا۔ وہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ بھاگ گئی۔"

"سہراب سے اس کی یاری کیسے ہو گئی؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"بس ہو گئی یاری۔ مجھے کیا پتہ۔" شاہانی کے لہجے سے بیزاری آشکارہ تھی۔

"برا نہ منا۔ میں نے تو ایسے ہی ایک گل پوچھی تھی۔" رحیم داد نے معذرت کرنے کے انداز

میں آہستہ سے کہا۔

"برا منانے کی گالہہ نہیں۔" مراد خاں کا لہجہ اس دفعہ نرم تھا۔ "مجھے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ شہ زور کی سگی ماں کا تو مدت ہوئی مرن ہو گیا۔ اس کے پیو سردار نجیب خاں مزاری کی تین گھر والیاں تھیں۔ مرجان سب سے چھوٹی تھی۔ شہ زور کے پیو کا مرن ہوا تو وہ بالکل جوان تھی۔ اب بھی بھرپور جوان ہے۔ میں نے تو اسے دیکھا نہیں پر سنا ہے بہت سوہنڑی ہے۔"

"سہراب بھی وڈا زمین دار ہو گا؟"

"نہیں!" شاہانی نے بے تکلفی سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "وہ شہ زور کے ڈیرے کا ماشیا تھا۔ میں اسے ٹھیک طرح جانتا ہوں۔ کئی بار اس نے میرے بدن کی مالش بھی کی ہے۔ اچھا تکڑا اور ڈاڈھا جوان ہے۔"

"سہراب حویلی کے اندر بھی آتا جاتا ہو گا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"ماشیا حویلی کے اندر کیسے جا سکتا ہے۔ کوئی رن اس کے سامنے نہیں آ سکتی، کسی بھی نامحرم کے سامنے نہیں آ سکتی۔" شاہانی نے جھٹ تردید کی۔ "تجھے پتہ نہیں بلوچ سرداروں کی زال تو روچ موجیر ہوتی ہے۔ روچ موجیر کا مطلب سمجھتا ہے؟" اس نے رحیم داد کو استفہامیہ نظروں سے یکھا۔ "روچ موجیر کا مطلب ہے، سورج سے بھی پردہ کرنے والی رن۔ تو خود ہی سوچ سہراب یا کوئی در غیر بندہ حویلی کے اندر کیسے جا سکتا ہے۔"

"جب ایسی گل بات ہے تو وہ مرجان کو کیسے لے اڑا؟"

"مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں۔" شاہانی نے کہا۔ "صرف اتنا سنا ہے کہ حویلی سے ایک رات دونوں چھپتے چھپاتے کسی طرح نکل گئے۔ دن بھر تمن مزاری کے چک سلیم میں روپوش رہے۔ فیر کسی نہ کی طرح لغاریوں کے پاس چوٹی پہنچ گئے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "وہ ملوک زادی ہے۔ ے سہراب کے ساتھ نہیں بھاگنا چاہیے تھا۔ اس نے بہت برا کیا۔ شہ زور مزاری دونوں کو زندہ لا چھوڑے گا۔"

"شہ زور نے دونوں کو لغاریوں سے واپس نہیں مانگا؟"

"نہیں!" مراد خاں نے ہولے ہولے گردن ہلائی۔ "مانگتا بھی تو نہ دیتے۔ سہراب اور مرجان ،چوٹی کی سرحد میں داخل ہوتے ہی لغاری تمن دار کی پناہ حاصل کر لی تھی۔ اس طرح دونوں ا سکے باہوٹ بن گئے۔"

"باہوٹ بن جانے سے کیا ہوتا ہے؟" رحیم داد نے وضاحت چاہی۔

"ایک بار جب کوئی کسی کی پناہ میں آجاتا ہے یا باہوٹ بن جاتا ہے تو پناہ دینے والا اس کا میاردار بن جاتا ہے۔ اگر میاردار ایک بار پناہ دے کر منحرف ہو جائے تو بلوچ اسے ذلیل اور بے غیرت سمجھتے ہیں۔ اس کی ساری دھج دج، ساری عزت خاک میں مل جاتی ہے۔ اسے بے میار کہتے ہیں۔ یہ بلوچوں کا بہت پرانا دستور ہے۔ اسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔"

"پر سوال یہ ہے لغاریوں نے سہراب اور مرجان کو پناہ ہی کیوں دی؟ کیوں انھیں باہوٹ بنایا؟" رحیم داد اپنی بات کہتے کہتے لحہ بھر کو الجھا۔ "تو نے میاردار ہی تو کہا تھا نا؟"

"ہاں، پناہ دینے والے کو بلوچ میاردار ہی کہتے ہیں۔"

"لغاری تمن دار بھی تو سردار ہی ہو گا۔" رحیم داد بات پوری طرح سمجھنا چاہتا تھا۔ "اسے دوسرے بلوچ سردار کی عزت اور آن کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔"

"تو عزت اور آن کی گالہہ کرتا ہے۔" شاہانی مسکرا کر بولا۔ "لغاری یہی تو چاہتے تھے۔ وہ سہراب اور مرجان کو باہوٹ بنا کر مزاریوں کے متھے پر بدنامی اور خواری کا داغ لگانا چاہتے تھے۔ اسے ٹک کرنا کہتے ہیں۔ لغاریوں نے تو جان بوجھ کر سہراب اور مرجان کو باہوٹ بنایا۔ میں تو سمجھتا ہوں دونوں کو چوٹی میں خود لغاریوں ہی نے بلایا تھا۔"

"یہ تو انھوں نے ٹھیک نہیں کیا۔"

"چوہدری اصلی بات یہ ہے" شاہانی نے وضاحت کی۔ "مزاریوں سے لغاریوں کی بہت پرانی دشمنی ہے۔ دونوں کے درمیان روز ہی جھگڑے ٹنٹے ہوتے ہیں۔ اندھا دھند گولیاں چلتی ہیں۔ سچ پوچھ مزاریوں کو موقع ملتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتے۔ لغاریوں کو ٹک کرنے میں ذرا بھی نرمی یا رعایت سے کام نہ لیتے۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ شاہانی نے بے تکلفی سے رحیم داد کی ران پر ہاتھ مارا۔ ہلکا قہقہہ لگایا۔ "چوہدری، اب تو مزاریوں اور لغاریوں کی دشمنی اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ڈیرہ غازی خاں کے تمن دار دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔"

"کتنے تمن دار ہیں؟" رحیم داد نے اپنی معلومات کے لیے شاہانی سے دریافت کیا۔

"ویسے تو نو تمن دار ہوتے ہیں۔" مراد خاں شاہانی نے بتایا۔ "پر آٹھ ایسے ہیں جو دو گروہوں میں بٹے ہیں۔ ایک گروہ کی سرداری یا سربراہی مزاری کرتے ہیں اور دوسرے کی لغاری۔ مزاریوں کے ساتھ دریشک، گورچانی، اور کھوسہ تمن ہیں۔ اور لغاریوں کے ساتھ لنڈ، کیسرانی اور کھتران ہیں۔ صرف تمن بزدار کسی ایک کے ساتھ نہیں۔ ویسے بزدار اب زیادہ طاقت ور بھی نہیں

رہے۔"

"یہ بتا شاہانی، تیرے خیال میں مزاریوں اور لغاریوں میں زیادہ زور آور اور طاقت ور کون ہے؟"

"پہلے تو مزاری بہت طاقت ور ہوتے تھے۔" شاہانی نے رحیم داد کو بتایا۔ "تو نے سر امام بخش مزاری کا نام تو سنا ہی ہو گا۔ وہ بہت وڈا بلوچ سردار تھا۔ سچ پوچھ تو مزاریوں کو اسی نے آگے بڑھایا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں اس نے انگریزوں کی زبردست مدد کی۔ بلوائیوں کو کچلنے میں پوری طرح ان کا ساتھ دیا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "ویسے تو ان دنوں مزاریوں کا سردار، دوست محمد خاں تھا۔ پر وہ تو نام کا سردار تھا۔ سرداری تو اصل میں اس کا چاچا، امام بخش خان کرتا تھا۔ انگریز اس سے بہت خوش تھے۔ اسی کو مزاریوں کا سردار مانتے تھے۔" شاہانی نے مڑ کر رحیم داد کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔ "سئیں چوہدری، انگریزوں میں یہ زبردست خوبی تھی۔ جو ان کی مدد کرتا، ان کے ساتھ وفاداری کرتا اسے آگے لاتے تھے۔ بہت عزت دیتے تھے۔ منصب اور جگیر انعام میں دیتے تھے۔"

"جمیلہ بتاتی تھی اپنے شاہ جی کے بزرگوں اور وڈیروں نے بھی غدر میں بلوائیوں کے خلاف انگریزوں کی بہت مدد کی تھی۔"

"ضرور کی تھی۔ تبھی تو اس کے پاس اتنی وڈی جگیر ہے۔ اس کے پتر اونچے اونچے عہدوں پر لگے ہیں۔ انگریزوں ہی نے لگائے تھے۔" شاہانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب تو سر امام بخش خان مزاری کے بارے میں سن۔ ہوا یہ کہ انگریزوں نے جب ڈیرہ غازی خان کو اپنی عمل داری میں شامل کیا تو امام بخش خاں نے ان کی ہر طرح مدد کی۔ اس کی وفاداری سے خوش ہو کر انھوں نے اسے آنریری مجسٹریٹ بنایا۔ نواب بنایا، سر بنایا، اور فیر صوبائی درباری بنایا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "صوبائی درباری کا عہدہ بہت اونچا ہوتا تھا۔ اسے گورنر کے دربار میں کرسی ملتی تھی۔"

"تب تو وہ زبردست سردار تھا۔" رحیم داد نے مرعوب ہو کر کہا۔

"ہا سئیں، وہ مزاریوں کا زبردست سردار تھا۔" شاہانی نے رحیم داد سے اتفاق رائے کیا۔ "سچ پوچھ تو اسے آگے بڑھانے میں سر رابرٹ سنڈیمن کا ہاتھ تھا۔ وہ بہت بہادر اور وڈا انگریز افسر تھا۔ جب اس نے بلوچستان کی ریاست کلات پر چڑھائی کی تو امام بخش اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ بلوچوں کے خلاف ہر طرح سنڈیمن کی مدد کرتا تھا۔ سنڈیمن اس خدمت اور وفاداری سے اتنا خوش ہوا کہ اسے آگے اور آگے ہی بڑھاتا گیا۔ تب سے مزاری بھی آگے اور آگے بڑھتے گئے۔ سر امام بخش خاں کے بعد سردار بہرام خاں نے بھی بہت نام پیدا کیا۔ وہ بھی نواب بنا۔ سر بنا۔ پنجاب اسمبلی کا

ممبر بنا۔ وہ بھی انگریزوں کا زبردست وفادار تھا۔ بلوچوں کی بغاوتوں اور سرکشی کو دبانے میں اس نے بھی انگریزوں کی زبردست مدد کی تھی۔ انگریزوں نے ان خدمات سے خوش ہو کر مزاریوں کو خطابات دیے۔ وڈی وڈی جگیریں دیں۔ عہدے اور منصب دیے۔ کیا نہیں دیا۔"

"مزاری تو ہمیشہ سے ڈیرہ غازی خاں میں ہوتے تھے۔"

"سنا ہے پہلے سیستان میں ہوتے تھے۔ ان کا کیلہ ایک چشمے کے کنارے آباد تھا جس کا نام مزار تھا۔ بلوچی میں مزار شیر کو کہتے ہیں۔" شاہانی نے رحیم داد کو بتایا۔ "مزاری بلوچوں کا بہت زور آور کبیلہ ہوتا تھا۔ انھیں سردار جمال خاں ادھر لایا تھا۔ مزاری اپنے بارے میں یہی بتاتے ہیں۔"

"لغاری بلوچ، انگریزوں کے وفادار نہیں رہے ہوں گے۔ انگریزوں سے ان کی لگتی ہو گی۔" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

"نہیں۔" مراد خاں شاہانی نے انکار میں گردن ہلائی۔ "مزاریوں کی طرح لغاریوں نے بھی بلوچوں کی سرکشی اور بغاوت دبانے میں بہت خدمت کی۔ زبردست وفاداری دکھائی۔ سردار جلال خاں لغاری تو انگریزوں کا بہت وفادار ہوتا تھا۔ اس نے انگریزوں کی حمایت میں بلوچ باغیوں کے خلاف زبردست جنگیں لڑیں۔ اس کارگزاری کے صلے میں نواب کا خطاب پایا۔ چوٹی کی اتنی وڈی جگیر ملی جو آج تک لغاریوں کے پاس ہے۔ سردار جلال خاں لغاری کو بھی مجسٹریٹی کے اختیارات حاصل تھے۔"

"تب تو انگریزوں نے لغاریوں کو بھی آگے بڑھایا ہو گا۔"

"انگریزوں نے تو لغاریوں کو آگے بڑھانے کی ہر طرح کوشش کی پر نواب جلال خاں لغاری کے مرن کے بعد اس کے وارثوں کے درمیان ایسا جھگڑا کھڑا ہوا کہ جگیر برباد ہو گئی۔ اس برے زمانے میں سردار بہرام خاں مزاری نے لغاریوں کی بہت مدد کی۔ ان کے بہت کام آیا۔"

"کیا کیا اس نے؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"سردار سر بہرام خاں مزاری نے انگریز ڈپٹی کمشنر کی نگرانی میں لغاریوں کا بہت وڈا جرگہ بلایا۔ اس جرگے میں سردار بہرام کے علاوہ سردار جلاب خاں اور سردار جن وڈا خاں نے بھی شرکت کی تھی۔" مراد خاں شاہانی ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ "اسی جرگے میں سردار دین محمد کو تمن لغاری کا تمن دار بنایا گیا۔ اس طرح لغاریوں کا جھگڑا ختم ہوا اور ان کی جگیر تباہ ہونے سے بچ گئی۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مزاریوں نے لغاریوں کو تباہ ہونے سے بچایا۔ یہ تو لغاریوں پر مزاریوں کا زبردست احسان ہوا۔"

"پر لغاری کہتے ہیں، بہرام خاں مزاری نے یہ ساری کارروائی انگریز ڈپٹی کمشنر کے اشارے پر کی تھی۔ وہ انگریزوں کے بہت اعتماد کا بندہ تھا۔" شاہانی نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری، بات یہ ہے انگریزوں کے راج میں مزاریوں کے سامنے لغاریوں کی زیادہ نہ چلتی تھی۔ ویسے دونوں تمن کے درمیان انگریزوں کے ساتھ وفاداری دکھانے کے لیے زبردست مکابلہ رہتا تھا۔ دونوں ہی انگریزوں کی سرپرستی حاصل کر کے طاکت پکڑنا چاہتے تھے۔"

"پر اب تو لغاری ہی زیادہ طاکت ور لگتے ہیں۔" رحیم داد نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔" مراد خاں شاہانی نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "آج کل تو وہ بہت طاکت پکڑ گئے ہیں۔ بات یہ ہے لغاری پہلے یونینسٹ ہوتے تھے۔ اور یہ تو تجھے پتہ ہی ہو گا کہ یونینسٹ سیاسی طور پر انگریزوں کے بندے ہوتے تھے۔ بزدار پاکستان کے حامی تھے اور مسلم لیگی تھے۔ لغاری تمن دار نے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر لیگی بزدار امیدوار کے خلاف الیکشن لڑا اور بری طرح ہارا۔"

"تب تو لغاریوں کو کمزور پڑ جانا چاہیے تھا۔"

"پر لغاری تمن دار بہت ہشیار تھا۔" مراد خاں نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "اس نے مسلم لیگ میں گھسنے کے لیے اپنی ایک دھی ممدوٹوں کو دیاہ دی۔ ممدوٹوں کا ان دنوں بہت زور زورہ تھا۔ نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ، پنجاب کا وزیر اعلیٰ اور صوبائی مسلم لیگ کا صدر ہوتا تھا۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "دوسری دھی بھاول پور کے مخدوموں کو دیاہ دی اور اپنی ایک پوتی، کالا باغ کے نوابوں کے گھر میں دے دی۔ اس طرح لغاریوں نے رشتہ داریوں کے ذریعے ہر طرف میل جول بڑھا رکھا ہے۔ ان کا اثر رسوخ ڈیرہ غازی سے نکل کر پورے پنجاب میں پھیل گیا۔" اس نے ایک بار پھر قہقہہ بلند کیا۔ "اور ون یونٹ بننے کے بعد توری پبلکن پارٹی کے روپ میں یونینسٹ دوبارہ پنجاب میں طاکت پکڑنے لگے ہیں۔ لغاری ادھر بھی ہیں اور ادھر بھی۔ اس لیے سیاسی طور پر بہت زیادہ طاکت ور ہو گئے ہیں۔"

"یہ تمن دار بھی اپنی طرح زمیں دار ہوتے ہیں نا؟"

"زمین دار تو ہوتے ہی ہیں۔ پر تمن دار اپنے کیلہ کا سردار ہوتا ہے۔ پورے تمن پر اس کی حکومت ہوتی ہے۔ وہ کچہری اور عدالت لگاتا ہے۔ مکدموں کے فیصلے سناتا ہے۔" شاہانی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "تمن داروں کی اپنی جیلیں ہوتی ہیں۔ اب سے نہیں انگریزوں کے زمانے سے

یں۔ بلکہ انگریزوں کی تو مدت تک جیلیں بھی نہ تھیں۔ اپنے کیدی وہ تمن داروں ہی کی جیلوں میں ند کرنے کے لیے بھیجتے تھے۔"

"کچہری عدالت تو تو بھی لگاتا ہے۔ مکدموں کے فیصلے بھی سناتا ہے۔ سزائیں دیتا ہے۔ جرمانے لگاتا ہے۔ ٹیکس لگاتا ہے۔ تو تمن دار کیوں نہیں بن سکا؟" رحیم داد نے مسکرا کر دریافت کیا۔

"میں تمن دار ہو بھی نہیں سکتا۔ نہ میں اتنا وڈا جگیردار ہوں اور نہ میرے علاکے میں تمن داری کا دستور ہے۔" مراد خاں شاہانی نے وضاحت کی۔ "تمن داروں کو تو وہ عدالتی اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو مجسٹریٹوں کے پاس بھی نہیں ہوتے۔ ان کے فیصلے کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اختیارات انھیں انگریزوں کے زمانے سے حاصل ہیں اور ابھی تک ان کے پاس ہیں۔" اس نے بے تکلفی سے ہنس کر رحیم داد کو دیکھا۔ "ویسے میں اور بیٹ کے دوسرے بلوچ سردار اور وڈے زمیں دار کچہری بھی لگاتے ہیں۔ فیصلے بھی کرتے ہیں۔ سزائیں بھی دیتے ہیں۔ حکومت کو سب پتہ ہے۔ پر حکومت ہمارے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑاتی۔ تو نے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"شہ زور بھی تمن دار ہو گا؟"

"نہ وہ تمن دار ہے نہ سردار۔" شاہانی نے رحیم داد کو بتایا۔ "ویسے اب تو سارے ہی بلوچ جگیردار اور وڈے زمین دار اپنے کو سردار کہتے ہیں۔ شہ زور کے بارے میں مجھے اتنا پتہ ہے کہ وہ تمن دار کا رشتے میں بھائی ہے۔ وہ سردار نہیں بن سکتا۔ مکدم بھی نہیں بن سکتا۔ ویسے مکدم بھی کچہری لگاتا ہے۔ فیصلے سناتا ہے۔ سزائیں دیتا ہے۔ جرمانے لگاتا ہے۔ میں تجھے ساری گل بات سمجھا دوں، لیکن شہ زور مزاری ٹھیک طرح سمجھا سکتا ہے۔"

"مکدم کیا ہوتا ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"پہلے یہ سمجھ لے تمن کسے کہتے ہیں۔ تمن، جگیر اور زمین داری کو بھی کہتے ہیں۔ پر تمن ک مطلب ہے کیلہ۔" وہ ٹانگیں پھیلا کر بے تکلفی سے بیٹھ گیا۔ اور سردار اور مقدم کا فرق سمجھا لگا۔

درختوں کے نیچے اندھیرے میں آہٹ ہوئی۔ مگر کوئی سامنے نہیں آیا۔ صرف آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آوازیں ابھرتی رہیں۔ آوازیں اتنی دھیمی تھیں کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ رحیم دا نے نظریں اٹھا کر درختوں کی جانب دیکھا۔ لیکن شاہانی درختوں کے نیچے سرسراتی ہوئی سرگوشیو سے بے نیاز بیٹھا رہا۔ اس نے ادھر دیکھا بھی نہیں۔ نہایت اطمینان سے بلوچ قبائل کی سماجی در

بندی پر روشنی ڈالتا رہا۔

"ہر بلوچ کیلہ کا سردار ادھر ڈیرہ غازی خاں میں تمن دار کہلاتا ہے۔ ہر کیلہ کئی حصوں میں بٹا ہوتا ہے جو پھلّی کہلاتا ہے۔ ہر پھلّی کا سربراہ مکدّم ہوتا ہے۔ تمن دار کی طرح مکدّم کا منصب بھی موروثی ہوتا ہے۔ مکدّم بھی بہت بااثر اور طاکت ور ہوتا ہے۔ تمن دار یا سردار، اہم معاملات میں مکدّم کے مشورے کے بغیر فیصلے نہیں کرتے۔"

"تب تو شہ زور خاں کچہری عدالت نہیں لگا سکتا۔ نہ وہ سردار ہے نہ مکدّم۔"

"اس سے کیا فرک پڑتا ہے۔" شاہانی نے قہقہہ بلند کیا۔ "اپنی جگیر میں تو وہ سردار ہی سمجھا جاتا ہے۔ ادھر کچہری لگاتا ہے۔ فیصلے بھی سناتا ہے۔ اور سزائیں بھی دیتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اب تو بہت کچھ بدل گیا۔ جس کے پاس جگیر یا وڈی زمین داری ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اپنی جگیر میں تو اسی کی سرداری اور حکمرانی چلتی ہے۔"

"اس طرح تو مزاریوں کے بہت سے حصے اور ٹکڑے بن گئے ہوں گے۔"

"ایک طرح تو تیری گالہ ٹھیک ہی ہے۔" شاہانی نے تردید نہیں کی۔ "شروع میں تو مزاری کیلہ کے چار مشہور ٹکڑے ہوتے تھے۔ ان کے نام تھے۔ رستمانی، بلچانی، مصدانی اور سرگانی، پر اب تو بہت سے ہیں۔ ایک نہیں، جانے کتنی تو مزاری کیلہ میں پھلّیاں بن گئی ہیں۔ تب ہی تو مکدّموں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ بلوچوں کے دوسرے کیلوں کا بھی ایسا ہی حال ہے۔"

"شہ زور خاں تو پرانے والوں ہی میں سے ہو گا؟"

"ہاں اس کا تعلک بلچانیوں سے ہے۔ ایک بار شہ زور ہی نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔ میں نے مزاری کیلہ کے بارے میں جو کچھ بتایا، اسی سے سنا تھا۔ کبھی کبھی تو نشے کی ترنگ میں وہ مزاریوں کے بارے میں بہت باتیں بتاتا ہے۔ اور بہت عجیب و غریب باتیں بتاتا ہے۔"

☆

سردار شہ زور خان مزاری درختوں کے نیچے سے نمودار ہوا اور سڑک پر آگیا۔ داؤد اور بدھیل خان بھی اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ مگر چند ہی قدم اس کے ہم راہ چلنے کے بعد اجازت لے کر رخصت ہو گئے اور جس سمت سے آئے تھے اسی سمت خاموشی سے واپس چلے گئے۔

شہ زور آہستہ آہستہ چلتا ہوا کار کے قریب پہنچا۔ دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوا اور اسٹیئرنگ وھیل سنبھال کر چپ چاپ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی۔ ذرا دیر بعد وہ سڑک پر دوڑتی ہوئی ہوٹل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ مزاری گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے نہ کوئی بات

کی نہ کسی کی جانب متوجہ ہوا۔

کار ہوٹل کے اندر داخل ہوئی۔ تینوں باہر آئے۔ کمرے میں پہنچے۔ سردار مراد خاں شاہانی نے ہوٹل کے بیرے سے نصف درجن بیئر کی بوتلیں منگوائیں۔ ذرا دیر بعد بوتلیں آگئیں۔ گلاس بھی آگئے۔ تینوں کرسیاں کھسکا کر میز کے گرد بیٹھ گئے۔ بیرے نے بوتلیں کھولیں اور بیئر سے تینوں کے گلاس بھر دیے۔ گلاس اٹھائے گئے اور ہونٹوں سے لگائے گئے۔ بیئر بہت ٹھنڈی تھی۔ شاہانی نے گھونٹ بھرتے ہوئے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ "پسند آئی۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "گرمی میں تو ٹھنڈی بیئر ہی مزا دیتی ہے۔"

رحیم داد نے بھی گھونٹ بھرا۔ آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "چنگی ہے۔"

مزاری نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ ہنوز گم صم تھا۔ کھویا کھویا نظر آرہا تھا۔ شاہانی نے اسے چھیڑا۔ "شہ زور تو چپ چپ دکھائی پڑ رہا ہے۔ بات کیا ہے؟"

"کوئی خاص گالہہ نہیں۔" شہ زور مزاری نے ٹالنا چاہا۔

شاہانی نے شہ زور کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "ایسے کام نہیں چلے گا۔ صاف صاف بتا۔ کوئی نیا چکر تو نہیں چل گیا؟"

"چکر تو چل ہی رہا ہے۔ تجھے تو پتہ ہی ہے۔" شہ زور مزاری کا لہجہ بوجھل تھا۔ "لغاریوں نے تنگ کرنا تھا کر چکے۔ اب میں بدنامی کے اس سیاہ داغ کو زیادہ عرصے برداشت نہیں کر سکتا۔"

اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ اور نفرت کے سائے منڈلانے لگے۔ اس نے گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں نصف کے لگ بھگ خالی کر دیا۔ بیئر سے بھیگی ہوئی مونچھوں کو ہاتھ سے صاف کیا۔ مڑ کر شاہانی کی طرف دیکھا۔ "میں نے تو مزاداری کرنی ہے۔ اپنی عزت اور آن کے لیے سب ہی کچھ کرنا ہے۔" اس کی آواز اونچی ہو گئی۔ "اس بار لغاریوں سے کھل کر جنگ ہو گی۔"

"سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔" شاہانی نے خبردار کیا۔ "لغاری اب بہت زور پکڑ گئے ہیں۔"

"مجھے پتہ ہے۔" شہ زور خاں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "پر مزاری بھی بدلہ لینا جانتے ہیں۔ انھیں اتنا کمزور نہ سمجھ۔"

"سوچ لے۔" شاہانی کا رویہ ہنوز ناصحانہ تھا۔

"سوچ لیا، سب کچھ سوچ لیا۔ تو فکر نہ کر۔" مزاری نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور اس دفعہ پورا گلاس خالی کر دیا۔

شاہانی نے بوتل اٹھا کر شہ زور مزاری کا گلاس دوبارہ بیئر سے بھر دیا۔ اس کی جانب دیکھے بغیر

پوچھا۔ "آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"مجھے آج ہی واپس جانا ہے۔"

"تو نے تو ہیرا منڈی چلنے کا پروگرام بنایا تھا۔" شاہانی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

"ٹرین ساڑھے گیارہ بجے چھوٹتی ہے۔" مزاری نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے بتایا۔ "ابھی دس بجے ہیں۔ میں ٹرین ہی سے جاؤں گا۔ کار سے سفر کرنا آج کل ٹھیک نہیں۔"

"ایسی جلدی کیا ہے۔ کل دن کی ٹرین سے چلا جانا۔" شاہانی نے اسے رات بھر کے لیے روکنا چاہا۔ وہ ہیرا منڈی جانے اور رقص و سرود کی محفل سے لطف اندوز ہونے کے لیے بے چین تھا۔

"نہیں، میں نے آج ہی رات جانا ہے۔ میں اب یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔" شہ زور خاں مزاری آمادہ نہ ہوا۔ اس نے شاہانی کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ "تو بھی میرے ساتھ چل۔"

"مجھے تو ادھر کئی ضروری کام کرنے ہیں۔" شاہانی نے انکار کر دیا۔ مڑ کر رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "ایسا کر چوہدری کو لے جا۔ اسے ادھر کوئی کام شام بھی نہیں کرنا۔"

رحیم داد، جو دیر سے خاموش بیٹھا تھا، گھبرا کر بولا۔ "تو نے کیسے سوچا، مجھے یہاں کوئی کام شام نہیں۔ میں نے لائل پور کی زمین کی الاٹمنٹ لینی ہے۔"

"تو اس کی پرواہ نہ کر۔ وہ تو شاہ جی کرا لے گا۔" شاہانی ہنس کر بولا۔ "تجھے پتہ نہیں، وہ آج کل بہت اونچا جا رہا ہے۔ زمین کی الاٹمنٹ تو سمجھ لے اس نے کرا ہی لی۔ ویسے بھی اس کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ بلند کیا۔ "وہ تو ان دنوں وزارتوں کی الاٹمنٹ لا سکتا ہے۔"

شہ زور مزاری نے بھی زور دیا۔ "چوہدری، تو زمیں کی الاٹمنٹ ہی کے چکر میں ادھر ٹھیرا ہے تو میرے ساتھ ڈیرہ غازی خاں چل۔ وہاں ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی بہت متروکہ اراضی ہے۔ میری اپنی تحصیل راجن پور میں ابھی تک کتنی ایسی متروکہ اراضی ہے جو کسی کے نام الاٹ نہیں ہوئی۔ تحصیل دار تو اپنا ہی بندہ ہے۔ ڈپٹی کمشنر سے بھی یاری ہے۔ محکمہ بحالیات میں بھی اپنے کئی بندے لگے ہیں۔ جتنی چاہے زمین الاٹ کرا لے۔"

"میرے کلیم کے کاغذات تو شاہ جی کے منیجر، مہربان علی کے پاس ہیں۔" رحیم داد نے عذر پیش کیا۔ "ان کے بغیر کیسے الاٹمنٹ مل سکتی ہے۔"

"ایسا کر۔ پہلے چل کر اراضی دیکھ لے۔ الاٹمنٹ کی درخواست بعد میں لگانا۔" شہ زور خاں مزاری نے مشورہ دیا۔

رحیم داد کو ڈیرہ غازی خاں کی متروکہ جائیداد سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ مزاری کے ساتھ جانا بھی نہ چاہتا تھا۔ کہنے لگا۔ "صاف بات یہ ہے جی' تیرے ضلعے کی زمین کے بارے میں سنا ہے بارانی ہے یا دریا کے کنارے کی ہے۔ اور دریا کے کنارے کی زمین ہر سال برسات میں ڈوب جاتی ہے۔ سیلاب کھڑی فصلوں کو بہا لے جاتا ہے۔ ویسے بھی اس پر صرف ربیع کی فصل ہوتی ہے۔ میں نے ایسی زمین سے کیا لینا۔"

"تجھے یہ گالہہ کس نے بتائی۔؟" مزاری نے تیکھی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "تجھے یہ پتہ نہیں۔ ادھر نہری زمین بھی ہے اور بہت زرخیز بھی ہے۔ تبھی تو ادھر زرعی اراضی کی الاٹمنٹ نہیں ملتی۔ تو اس بھول میں نہ رہنا۔ بات یہ ہے کہ ساری ہی متروکہ اراضی وڈے سرداروں اور زمین داروں نے اپنے مزارعوں اور کرندوں کے ذریعے دبا رکھی ہے۔ کئی مہاجر الاٹمنٹ کے آرڈر لے کر پہنچے۔ سرداروں اور زمین داروں نے مارپیٹ کرا انھیں بھگا دیا۔ جنھوں نے افسروں کی مدد سے جمنے اور ٹھیرنے کی کوشش کی ان کا اس طرح صفایا کروا دیا گیا کہ لاش کا بھی پتہ نہ چلا۔"

"تب تو میں نے ادھر ہرگز زمین کی الاٹمنٹ نہیں لینی۔" رحیم داد پریشان ہو کر بولا۔ اس کے چہرے پر خوف کا سایہ منڈلانے لگا۔

"تو نے تو اسے ڈرا دیا۔" شاہانی نے ہنس کر مزاری کو مخاطب کیا۔ "ذرا اس کا چہرہ تو دیکھ۔ کتنا خوف زدہ نظر آ رہا ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر ہولے ہولے رحیم داد کی پیٹھ تھپ تھپائی۔ "سیں چوہدری' پرواہ نہ کر۔ شہ زور مزاری کے ہوتے ہوئے تیرے لیے ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی گالہہ نہیں۔ کوئی تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ تجھے پتہ نہیں ادھر اس کی بہت دھاک دھم ہے۔"

"شاہانی ٹھیک کہہ رہا ہے چوہدری۔" مزاری نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ گردن اٹھائی اور مونچھوں کو مروڑتے ہوئے بولا۔ "میرے ادھر ہوتے ہوئے تجھے کس سے ڈرنا شرنا۔ میں بلوچ سردار ہوں۔ اور میار دار بھی ہوں۔" اس کے لہجے میں جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ "تو مہمان بن کر میرے علاقے میں آئے گا۔ تیری حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔ جان دے دوں گا تجھ پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ یہ گالہہ تو پوری طرح سمجھ لے۔" اس نے گلاس اٹھا کر بیئر کا بڑا گھونٹ بھرا۔ "زمیں داری کا مزا اٹھانا ہے تو میری طرف آ۔ منٹگمری میں کیا زمین داری کرنی۔ وہ تو آباد کاروں کا ضلع ہے۔ ادھر کے وڈے زمیں داروں کا تو یہ حال ہے کہ گھر والیاں جانگلیوں اور کمیوں سے بھی یاری لگا لیں تو چپ کر جاتے ہیں۔ کالی اور کالے کے خلاف کچھ نہیں کرتے۔ زمین داری کی شان دیکھنا ہے تو ڈیرہ غازی خان چل۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "الاٹمنٹ شلاٹمنٹ کی بعد میں سوچنا۔ پہلے کچھ دن چل کر میرے ساتھ ٹھیر۔ فیر فیصلہ کرنا۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" شاہانی نے مزاری کی تائید کی۔ "مزاری کے ساتھ چلا جا۔ بہت آرام سے وکت گزرے گا۔ ہفتے ڈیڑھ ہفتے تک واپس آ جانا۔ تب تک شاہ جی بھی کراچی سے واپس آ جائے گا۔ میں اسے تیرے بارے میں بتا دوں گا۔"

شہ زور مزاری نے اصرار کیا۔ "سیں چوہدری' اب انکار نہ کرنا۔ بس اب تو میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جا۔" اس نے اپنا گلاس ختم کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

شاہانی نے اسے روکنا چاہا۔ "ڈیڑھ بوتل بیئر میں تیرا کیا بنے گا۔ ایک اور لگا لے۔ ویسے بیئر میں ہوتا ہی کیا ہے۔ پانی ہی پانی۔ پیشاب کرو' سب نکل جاتا ہے۔"

مزاری آمادہ نہ ہوا۔ "مجھے ابھی کئی کام کرنے ہیں۔" وہ آگے بڑھا اور اپنے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

رحیم داد اور شاہانی خاموش بیٹھے بیئر کے گھونٹ بھرتے رہے۔ رحیم داد گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاہانی نے اسے گم صم دیکھ کر کہا۔ "سیں چوہدری' تو کچھ پریشان پریشان لگ رہا ہے۔ نہیں جانا چاہتا تو نہ جا۔"

"نہیں' مجھے مزاری کے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض نہیں۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "سوچ رہا تھا کہ لائل پور کی زمین کی الاٹمنٹ تک مجھے ادھر ہی رکنا چاہیے۔ شاہ جی بھی نہیں ہے۔ وہ واپس آ جائے تو تیرے ساتھ ہی مزاری کے پنڈ چلوں گا۔"

"پر میں نے ادھر نہیں جانا۔" شاہانی نے اپنے پروگرام سے رحیم داد کو آگاہ کیا۔ "میں تو لہور سے واپسی پر سیدھا بھکر جاؤں گا۔ تجھے ادھر جانا ہے تو آج ہی چلا جا۔ نہ گیا تو مزاری برا منائے گا۔ میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا' تو الاٹمنٹ شلاٹمنٹ کی فکر نہ کر۔ مہربان علی بہت ہشیار بندہ ہے۔ سارا کام کر لے گا۔ تو اسے نہیں جانتا۔ وہ ایسے کاموں کا زبردست ماہر ہے۔ یوں سمجھ لے' شاہ جی کی زمین داری تو وہی چلاتا ہے۔" اس نے حسب معمول ہلکا قہقہہ لگایا۔ "شاہ جی تو سچ پوچھ' چھانٹ چھانٹ کر سوہنڑی زنانیاں رکھتا ہے۔ وہسکی کی چسکی لگاتا ہے اور سیاست لڑاتا ہے۔ اس نے کوئی اور کام نہیں کرنا۔ مہربان علی کے ہوتے ہوئے اسے کوئی اور کام کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ الاٹمنٹ کے لیے تیرے یہاں ہونے نہ ہونے سے کوئی فرک نہیں پڑتا۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔

مراد خاں شاہانی نے گلاس اٹھا کر بیئر کے کئی گھونٹ بھرے۔ "میرا کہا مان، تو مزاری کے ساتھ چلا جا۔ وہ خوش ہو جائے گا۔ بہت عیش کرائے گا۔ وہ یاروں کا یار ہے۔ ادھر ٹھہر کر اپنے مطلب کی متروکہ اراضی بھی دیکھ لینا۔ پسند آئے تو بعد میں الاٹمنٹ کے لیے درخواست لگا دینا۔ ویسے زمین تو جہاں بھی ملے ضرور لے لے۔ اور ادھر کی زمین تو بہت عمدہ ہے۔ دیکھنے کے بعد تجھے خود اندازہ ہو جائے گا۔"

"تو کہتا ہے تو چلا جاؤں گا۔" رحیم داد نے شاہانی کے مسلسل اصرار پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ویسے بھی ہر زمین دار کی طرح زمین اس کی بھی کمزوری تھی۔ جتنی زیادہ ہو اتنی ہی ہوس بڑھتی ہے۔

شاہانی نے مزید بات چیت نہ کی۔ خاموش بیٹھا رہا۔ دونوں چپ چاپ بیئر پیتے رہے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ کچھ دیر بعد شہ زور خاں مزاری واپس آگیا۔ وہ سفر کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔

"اپنا گلاس ختم کر۔ چلنے کے لیے کھڑا ہو جا۔"

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مگر اس نے اپنا گلاس ختم نہ کیا۔ شاہانی کے اصرار کرنے پر بھی نہ کیا۔ وہ پہلے ہی لگ بھگ دو بوتلیں چڑھا چکا تھا۔ مزید پینا نہ چاہتا تھا۔

رحیم داد غسل خانے میں گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر تر و تازہ ہوا۔ واپس آیا تو اس عرصے میں شاہانی بیرے کے ذریعے اس کا سوٹ کیس کار کی ڈکی میں رکھوا چکا تھا۔

تینوں کار [illegible] پہنچے۔ شاہانی ان کے ہم راہ اسٹیشن جانا نہ چاہتا تھا۔ اس نے دونوں کو گلے لگا کر رخصت کیا۔ شہ [illegible] ور رحیم داد کار میں داخل ہوئے اور پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ کار اسٹیشن کی سمت روانہ ہو گئی۔ اب اسے مزاری کا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اسٹیشن پہنچ کر شہ زور مزاری نے اپنا اور رحیم داد کا ٹکٹ خریدا اور دونوں ٹرین میں سوار ہو گئے۔ ٹرین روانہ ہوئی اور رات کی تاریکی میں شور مچاتی ہوئی لوہے کی پٹڑیوں پر تیزی سے دوڑنے لگی۔

☆

رحیم داد اور شہ زور مزاری شیخو پورہ اور چک جھمرہ کے راستے سرگودھا پہنچے۔ سرگودھا میں انہوں نے ایک روز قیام کیا۔ دونوں صغیر احمد سیال کے ساتھ ٹھہرے تھے۔ وہ بڑا زمین دار تھا۔ مزاری کا پرانا اور بے تکلف یار تھا۔ ان کی دوستی کا آغاز ہیرا منڈی کی ایک طوائف کے بالا خانے سے ہوا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں اس قدر گھل مل گئے کہ شہ زور جب لاہور آتا تو سرگودھا

سے گزرتے ہوئے اس کے پاس ضرور قیام کرتا۔ اکثر دونوں سرگودھا سے اکٹھے ہی لاہور جاتے۔ ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرتے۔ ہر شام داد عیش دینے ہیرا منڈی ضرور جاتے۔ لاہور سے واپسی پر بھی مزاری سرگودھا ضرور ٹھیرتا۔ مگر اس دفعہ صغیر احمد سیال کے اصرار کے باوجود مزاری نے ایک روز سے زیادہ سرگودھا میں قیام نہیں کیا۔

مزاری اور رحیم داد ایک بار پھر ٹرین میں سوار ہوئے۔ ٹرین شاہ پور صدر پہنچی۔ دو ایسے مسافر کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے جو وضع قطع سے بلوچ نظر آتے تھے۔ مسلح تھے اور مشتبہ بھی معلوم ہوتے تھے۔ رات کا سفر تھا۔ ٹرین فراٹے بھرتی ہوئی پٹڑیوں پر دوڑ رہی تھی۔ رحیم داد مسلح بلوچوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے جب بھی نظریں اٹھا کر دیکھا، دونوں کو اپنی جانب گھورتے ہوئے پایا۔ وہ عین اس کے مقابل کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے۔

مزاری دونوں بلوچوں سے بے نیاز اپنی نشست پر اطمینان سے لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے۔ رحیم داد کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ وہ سہما ہوا تھا اور چوکنا بھی تھا۔ وہ شہ زور مزاری سے مشتبہ بلوچوں کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔

کچھ دیر بعد سردار مزاری کے خراٹے ابھرنے لگے۔ لیکن دونوں بلوچ جاگ رہے تھے۔ رحیم داد بھی جاگ رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر مزاری پر غصہ آ رہا تھا جو ٹانگیں پسارے بے خبر سو رہا تھا۔ کمپارٹمنٹ میں گہری خاموشی تھی۔ روشنی بہت مدھم تھی۔ باہر ہوا کا شور تھا۔ بستیاں آتیں اور پلک جھپکتے گزر جاتیں۔ مکانوں میں ٹمٹماتے ہوئے چراغ، جگنوؤں کی مانند جھلملا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ ٹرین پٹڑی پر تیزی سے دوڑتی رہی۔ ایک بلوچ اونگھنے لگا۔ رحیم داد بھی تھک کر اونگھنے لگا۔ نیند کا غلبہ بڑھا تو آنکھ لگ گئی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ یکایک ہلکا ہلکا شور بلند ہوا۔ رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ ٹرین کسی اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ پلیٹ فارم پر ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ شہ زور مزاری ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا۔ رحیم داد نے چوکنا نظروں سے سامنے کی نشست پر نظر ڈالی۔ دونوں بلوچ غائب تھے۔ نہ جانے وہ کب اور کہاں اتر گئے تھے۔ ٹرین کچھ دیر ٹھہر کر آگے روانہ ہوئی۔ رحیم داد نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

رات گزری، صبح ہوئی۔ سفر جاری رہا۔ مزاری اور رحیم داد کندیاں سے گزرتے ہوئے محمود

کوٹ پہنچے۔ مزاری کے ایک دوست علی محمد جسکانی کی حویلی میں قیام کیا۔ جسکانی سے رحیم داد پہلی بار ملا تھا۔ اور پہلی ہی ملاقات میں اسے اندازہ ہو گیا کہ جسکانی نہ صرف مزاری کا گہرا یار ہے بلکہ اس کا رازدار بھی ہے۔

سورج غروب ہوتے ہی محفل جمی۔ بادہ و ساغر کا دور چلا۔ مزاری اور جسکانی کی گفتگو سے رحیم داد جلدی تاڑ گیا کہ انھیں بدھیل اور داؤد خاں کا انتظار ہے۔ پینے پلانے کا سلسلہ رات گئے تک چلتا رہا۔ لیکن رحیم داد جلد ہی اٹھ گیا۔ اس نے کھانا کھایا اور جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ سفر کی تکان سے چور چور تھا۔ لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا۔

بدھیل اور داؤد دوسرے روز بھی محمود کوٹ نہ پہنچے۔

شہ زور کے رویے سے رحیم داد کو یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ فوری طور پر اس کا ڈیرہ غازی خاں جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ وہ لاہور سے محمود کوٹ ہی کے لیے آیا تھا۔ یہاں ٹھہر کر اسے بدھیل اور داؤد خاں کا انتظار کرنا تھا۔ ان سے ملنے اور صلاح مشورہ کرنے کے بعد ہی آئندہ کا پروگرام تیار کرنا تھا۔

دوپہر کے کھانے پر مزاری نے باتوں باتوں میں علی محمد جسکانی کو رحیم داد کے بارے میں یہ بھی بتایا کہ وہ گورداس پور کا مہاجر ہے۔ اس کا ساڑھے چار ہزار ایکڑ اراضی کا کلیم منظور ہو چکا ہے۔ ڈیرہ غازی خاں میں متروکہ اراضی الاٹ کرانے کا ارادہ رکھتا ہے اور اسی مقصد سے اس کے ہمراہ روجھان شرقی جا رہا ہے۔

جسکانی نے یہ سنا تو مسکرا کر بولا۔ "متروکہ اراضی تو ادھر مظفر گڑھ میں بھی کافی ہے اور ابھی اس کی الاٹمنٹ بھی نہیں ہوئی۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "سیں چوہدری، ادھر کی زمین بھی بہت عمدہ ہے۔ سچ پوچھ تو ساری عمدہ زمینیں ہندوؤں اور سکھوں کے پاس ہی ہوتی تھیں۔ تو چاہے تو ادھر بھی الاٹمنٹ مل سکتی ہے۔ بہت سی متروکہ جائیداد زمین داروں اور کسانوں نے د رکھی ہے۔ کوشش کی جائے تو آسانی سے ان کی الاٹمنٹ مل جائے گی۔ محکمہ بحالیات کے افسرو اور ڈپٹی کمشنر سے اپنی بہت جان پہچان ہے۔"

رحیم داد تو خاموش رہا۔ لیکن مزاری نے کہا۔ "چوہدری زمین تو جدھر بھی ملے الاٹ کرا لے۔ ویسے بھی زیادہ تر متروکہ جائیداد اب الاٹ ہو چکی ہے۔ اب تو ایسی چھپی ہوئی اراضی رہ گئی ہے جو زمینداروں نے اپنے کرندوں اور مزارعوں کے ذریعے زبردستی دبا رکھی ہے۔"

"تو کہتا ہے تو ادھر بھی الاٹمنٹ کرا لوں گا۔" رحیم داد نے اظہار رضامندی کیا۔

"سیں چوہدری، تیرے پاس کلیم کے کاغذات تو ہوں گے؟" جسکانی نے رحیم داد سے دریافت کیا۔

"وہ تو جی لہور میں ہیں۔ شہ زور مزاری کے ساتھ تو میں صرف اپنے مطلب کی زمین دیکھنے جا رہا ہوں۔"

"ایسا کر لہور سے کاغذات لے کر میرے پاس آ جانا۔" علی محمد جسکانی نے کہا۔ "فکر نہ کر۔ دو اڑھائی سو ایکڑ زمین تو آسانی سے ادھر الاٹ ہو جائے گی۔ اس سے زیادہ تو ایک جگہ کلیم میں زمین الاٹ ہوتی بھی نہیں۔"

"کنون تو یہی ہے۔" مزاری نے ہنس کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "پر میں تو کئی ایسے مہاجروں کو جانتا ہوں جنھوں نے ایک ہی جگہ اڑھائی سو سے بھی زیادہ اراضی الاٹ کرا رکھی ہے۔ جان پہچان ہو اور مٹھی گرم کی جائے تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔ سارا کنون شنون دھرا رہ جاتا ہے۔ افسر چاہیں تو کیا نہیں کر سکتے۔"

"چوہدری برا نہ منانا۔" جسکانی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "متروکہ جائیداد کے معاملے میں تو ایسی دھاندلی ہو رہی ہے کہ تجھ سے کیا کہوں۔ ایسے بھی مہاجر ہیں، اور بہت ہیں، جو ایک جگہ متروکہ جائیداد الاٹ کراتے ہیں۔ کچھ دنوں بعد اسے بیچ کر اسی کلیم پر دوسری جگہ الاٹمنٹ لے لیتے ہیں۔ ان کا کلیم ختم ہی ہونے میں نہیں آتا۔" اس نے کچھ سوچ کر فوراً اپنا لہجہ بدلا۔ "پر تیرا کلیم تو بہت وڈا ہے تجھے ایسا دھندا کرنے کی کیا ضرورت۔"

"اپنا چوہدری نور الٰہی ایسے مہاجروں میں نہیں ہے۔" شہ زور خاں مزاری نے رحیم داد کی جانب سے صفائی پیش کی۔ "یہ تو الاٹمنٹ شلاٹمنٹ کو تیار ہی نہ تھا۔ میں بہت زور دے کر اسے اپنے ساتھ لایا ہوں۔"

"میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔" جسکانی نے خفیف ہو کر معذرت پیش کرنے کی کوشش کی۔ "میں نے تو ان مہاجروں کی بدنیتی بتائی تھی جنھوں نے الاٹمنٹوں کا باقاعدہ کاروبار کر رکھا ہے۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "ویسے جب چوہدری کے پاس پکا کلیم ہے تو اسے ضرور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ خیرات تو نہیں مانگ رہا۔ ادھر اتنی ہی اراضی چھوڑ کر آیا ہے۔ اس نے کربانی دی ہے۔ گھربار لٹوایا ہے۔" جسکانی نے رحیم داد کو خوش کرنے کی کوشش کی۔ "لٹ پٹ کر ادھر آیا ہے۔ سچ پوچھ تو ایسے ہی مہاجروں کی کربانی سے پاکستان بنا ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" مزاری نے اس کی تائید کی اور گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

"بدھیل اور داؤد آج بھی نہیں پہنچے۔"

"پہنچ جائیں گے۔ تو پریشان کیوں ہوتا ہے؟ کام بن جائے گا تب ہی آئیں گے۔" جسکانی نے مزاری کو تسلی دی۔

مزاری کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا نظر آرہا تھا۔

تینوں کھانے سے فارغ ہوئے اور اٹھ کر اپنے اپنے بستروں پر جا کر لیٹ گئے۔

سردار شہ زور خان مزاری رات کو بھی بدھیل اور داؤد خان کا بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ کئی روز گزر گئے۔

مگر دونوں میں سے کوئی بھی نہ آیا۔

☆

بدھیل خاں سویرے ہی سویرے آگیا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ اس کا لباس گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ کندھے پر دو ناج لٹک رہی تھی۔ یہ پرانی وضع کی بلوچی بندوق تھی۔ اور دیسی ساخت کی تھی۔ پستول سے ذرا بڑی تھی۔ بدھیل بہت تھکا ہارا نظر آرہا تھا۔ اسے دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ لمبا سفر طے کر کے پہنچا ہے۔

شہ زور خاں مزاری اس وقت رحیم داد کے ساتھ ناشتا کر رہا تھا۔ علی محمد جسکانی بھی موجود تھا۔ سورج چڑھ کر درختوں کی بلندی پر پہنچ چکا تھا۔ دھوپ کی تمازت بڑھتی جا رہی تھی۔ بدھیل نے کمرے میں داخل ہوتے ہی حسب دستور جھک کر مزاری کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ اور سر جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

مزاری نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "بدھیل، تجھے تو پہلے آنا تھا۔ اتنی دیر کہاں لگا دی؟"

"دیر تو ہو گئی سیں پر مجبوری تھی۔" بدھیل نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

مزاری نے دریافت کیا۔ "داؤد کدھر ہے۔ وہ کیوں نہیں آیا؟"

"وہ ہجر خاں کے ساتھ ہے۔ داؤد کا اس کے ساتھ رہنا ضروری تھا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اب تو حوال سنا۔" مزاری نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

"سیں سردارا!" بدھیل خاں اپنی کارگزاری سنانے لگا۔ "لہور سے واپسی پر میں اور داؤد اوچ پہنچے۔ سہراب اور ملوک زادی تب تک اوچ ہی میں تھے۔ ہم دونوں جام بیلا میں ہجر خاں کے پاس ٹھہر گئے۔ سیں، تجھے تو پتہ ہی ہے، رادھو بھی اوچ میں ہے اور سہراب کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اس نے سہراب سے اتنا میل ملاپ بڑھا لیا ہے کہ اس کے بارے میں اسے ذرا بھی شبہ نہیں۔"

"تو نے رادھو کو کچھ دیا بھی؟" مزاری نے پوچھا۔

"پنجا پہلے دیے تھے پنجا لہور سے لوٹنے کے بعد دیے۔ وہ بہت خوش ہوا۔" بدھیل نے بتایا۔

"اب تک اس کے پاس سو روپے پہنچ گئے۔"

"یہ تو نے ٹھیک کیا۔ پر وہ کام بھی ٹھیک ٹھاک کر رہا ہے؟"

"بالکل ٹھیک ٹھیک کر رہا ہے۔" بدھیل نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "شام کا اندھارا ہوتے ہی ہر روز میں اور داؤد چھپ کر اس کے پاس اوچ پہنچ جاتے۔ سہراب کے بارے میں پوچھتے۔ اس کا ارادہ تو اوچ میں دو روز ٹھہرنے کا تھا۔ پر اس کے چاچے کا پتر، زردار، چوٹی سے دیر میں لوٹا۔ اس کی واپسی کے بعد ہی سہراب اوچ سے نکلا اور ضلع مظفر گڑھ کی طرف چلا۔"

"اس کے ساتھ اور کون کون تھا؟"

"ملوک زادی تھی۔" بدھیل نے مزاری کی جانب نظریں اٹھائے بغیر بتایا۔ "زردار اور رادھو بھی تھے۔ اوچ سے علی پور کے رستے وہ جتوئی کلاں پہنچے۔ اور وہیں ٹھہر گئے۔ میں، داؤد اور ہجر خاں کے ساتھ ان کے پیچھے لگا رہا۔ پر ہم جتوئی کلاں نہیں گئے۔ سید والا میں ٹھہر گئے۔ سید والا کا فاصلہ جتوئی کلاں سے زیادہ نہیں۔ دو اڑھائی میل ہو گا۔"

"تم نے راستے میں انھیں اٹھانے کی کوشش نہیں کی؟" مزاری نے جرح کرنے کے انداز میں دریافت کیا۔

"سیں سردارا! رستے میں انھیں اٹھانا بہت مشکل ہے۔" بدھیل نے صفائی پیش کی۔ "وہ اونٹھ پر سفر کر رہے تھے۔ سویرے سورج نکلنے کے بعد سفر کرتے اور جب سورج ڈوبنے لگتا تو کسی وستی میں ٹھہر جاتے۔ پکی سڑک ہے۔ دن میں اس پر بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔ سڑک کے کنارے وستیاں بھی ودی ہیں۔ دن میں انھیں اٹھانا خطرناک تھا۔ ہاں، جتوئی کلاں میں ایک رات ہم نے سہراب اور ملوک زادی کو اٹھانے کا پروگرام بنایا۔"

"کیا بنا اس پروگرام کا؟" مزاری نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہم منہ پر منڈاسے باندھ کر اونٹھوں پر بیٹھے اور پچھلی رات کو اس جا پہنچے جہاں سہراب اور اس کے سنگی ٹھہرے تھے۔ میں نے اپنا اونٹھ مکان کی دیوار سے لگایا۔ آرام سے دیوار پر پہنچ گیا۔ سامنے دہڑے میں سہراب اور ملوک زادی سو رہے تھے۔ زردار اور رادھو مکان کے باہر گہری نیند میں پڑے تھے۔ میں دیوار سے نیچے اترنے ہی والا تھا کہ جاگ ہو گئی۔ کتوں نے بھونک بھونک کر کام خراب کر دیا۔ پر ہم کسی نہ کسی طرح جتوئی کلاں سے صاف بچ نکلے۔ کام بن جاتا تو ہم نے

دونوں کو اٹھانے اور دریا پار کر کے جام پور پہنچنے کی پوری تیاری کرلی تھی۔ دریا پار کرنے کے لیے بیڑی کا بھی بندوبست کرلیا تھا۔"

"سہراب، ابھی تک جتوئی کلاں میں ہے؟"

"نا سئیں! جتوئی کلاں میں تو وہ صرف دو رات اور ایک دن ٹھیرا۔" بدھیل نے مطلع کیا۔ "جتوئی کلاں سے آگے انھیں کینجھر رکنا تھا۔ پر انھوں نے ارادہ بدل دیا۔ سیدھے رحمان والی پہنچے۔ اب تک وہیں ہیں۔"

"آگے کے بارے میں پتہ ہے؟" مزاری نے استفسار کیا۔

"رادھو بتاتا تھا۔ کل سویرے وہ رحمان والی سے نکلیں گے۔ دوپہر تک غازی گھاٹ پہنچیں گے اور دریا پار کر کے سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے چورٹہ پہنچ جائیں گے۔ وہاں لغاریوں کے کرندے ان کے لیے موجود ہوں گے۔ وہ بھی شام تک چورٹہ پہنچیں گے۔" بدھیل خان سنبھل سنبھل کر بیان کرتا رہا۔ "لغاریوں کے پاس جیپ ہوگی اور وہ سب پوری طرح مسلح ہوں گے۔ وہ سہراب اور ملوک زادی کو اپنی حفاظت میں چوٹی لے جائیں گے۔ رادھو ان کے ساتھ غازی گھاٹ سے آگے نہیں جائے گا۔ واپس اپنے جھوک چلا جائے گا۔ ہاں، زرداران کے ساتھ چورٹہ تک جائے گا۔" اس نے نظریں اٹھا کر مزاری کی جانب دیکھا۔ "سئیں سردارا، میں نے تجھے ساری گالھ بتا دی۔ آگے جیسا تیرا حکم ہو ویسا کیا جائے۔"

علی محمد جسکانی اب تک خاموش بیٹھا تھا اور بدھیل کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے مزاری کو مخاطب کیا۔ "شہ زور! تو نے جو حوال لینا تھا لے لیا۔ اب آگے کی سوچ۔ دونوں اس بار بھی بچ کر نکل گئے اور چوٹی پہنچ گئے تو دوبارہ تیرے ہاتھ نہیں آئیں گے۔ چوٹی سے انھیں اٹھوانا آسان کام نہیں۔ بہت خون خرابہ ہوگا۔ تب بھی کامیابی کی امید بہت کم ہے۔"

"انھیں چورٹہ سے پہلے ہی اٹھانا ہوگا۔" مزاری نے بھاری بھرکم لہجے میں کہا۔ "انھیں ہرگز چوٹی نہیں پہنچنا چاہیے۔"

"لیکن تجھے بھی ادھر موجود رہنا ہوگا۔" جسکانی نے مشورہ دیا۔

"میرا وہاں موجود ہونا مناسب ہوگا؟"

"مناسب اور نامناسب تو میں جانتا نہیں۔ یہ تیرے طے کرنے کی بات ہے۔" جسکانی نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میں تو یہ جانتا ہوں کہ بدھیل، داؤد اور ہجرا ایسے خطرناک کام کے لیے کافی نہیں ہوں گے۔ مان لے لغاریوں سے ان کی مڈبھیڑ ہوگئی تو یہ ان کے سامنے کتنی دیر ٹھیر سکیں

گے۔"

"نا سئیں، ایسا نہ سوچ۔" بدھیل خان نے سینہ تان کر علی محمد جسکانی کی جانب دیکھا۔ "ہم تینوں میں سے بھاگنے والا کوئی نہیں۔ جان دے دیں گے پر پیچھے نہیں ہٹیں گے۔"

"جسکانی تجھے پتہ نہیں، تینوں ہی بہت حوصلے والے اور زور آور ہیں۔" مزاری نے کسی قدر جوش سے کہا۔ "تو انھیں نہیں جانتا۔ بہت مضبوط اور جیالے ہیں۔"

"پر یہ تو سوچ وہ تعداد میں ان سے زیادہ ہوں گے۔ پوری طرح مسلح بھی ہوں گے۔" اس نے نظریں اٹھا کر بدھیل کی طرف دیکھا۔ "میں تو سمجھتا ہوں سہراب اور زردار بھی مسلح ہوں گے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"سئیں، تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ مسلح تو سہراب اور زردار بھی ہیں۔ وہ تو ہر وکھت مسلح رہتے ہیں۔" بدھیل نے جسکانی کو بتایا۔ "ان کے پاس کاربینیں ہیں اور بھری ہوئی رہتی ہیں۔"

جسکانی نے اس دفعہ مزاری کو مخاطب کیا۔ "شہ زور سن لیا تو نے۔ میرا کہا مان، تو سہراب کے پہنچنے سے پہلے ہی غازی گھاٹ کے اس پار پہنچ جا۔ میں بھی تیرے ساتھ رہوں گا۔ جتنے مسلح بندے درکار ہوں گے، ساتھ لے لوں گا۔ تجھے تو پتہ ہے، میرے پاس کیسے کیسے زور آور کم دار اور کراوے ہیں۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "مزارعوں کی ڈال اور ڈھور ڈنگر تو اٹھاتے ہی رہتے ہیں، لڑائی ہو تو جم کر لڑتے بھی ہیں۔"

"تیری گالھ سمجھ آتی ہے۔" شہ زور مزاری رضامند ہوگیا۔ "مجھے بھی وہاں موجود رہنا ہوگا۔" اس نے توقف کیا۔ "پر ایک جیپ کی بھی ضرورت ہوگی۔"

"ایک نہیں دو جیپیں درکار ہوں گی، تاکہ دونوں کو اٹھا کر فٹافٹ نکل جائیں۔" جسکانی نے شہ زور مزاری کو اطمینان دلایا۔ "تو فکر نہ کر۔ میں جیپوں کا بندوبست کرلوں گا۔" "ادھر ڈیرہ غازی خاں میں میرے وڈے سالے سردار ظفراللہ خاں کھوسہ کی حویلی ہے۔ وہ شکاری بھی ہے۔ اس کے پاس دو جیپیں ہیں۔ ویسے بھی کھوسے تو لغاریوں کے خلاف مزاریوں کے ساتھ ہیں۔ تو کہہ تو اسے بھی بلوا لوں۔"

"نہیں، اسے بلانے کی ضرورت نہیں۔" مزاری نے جسکانی کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ "تو صرف اس کی دونوں جیپیں منگوا لے۔ آج ہی کسی کو اس کے پاس بھیج دے۔"

"کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی حویلی میں ٹیلی فون بھی ہے۔" جسکانی نے بتایا۔ "میں اسے فون کے ذریعے اطلاع پہنچا دوں گا۔ جیپیں کل صبح تک دراہمہ پہنچ جائیں گی۔ ہم کو آج ہی

رات دراہمہ پہنچنا ہو گا۔ دراہمہ میں اپنا ایک پرانا یار ہے، احمد بخش۔ رات اس کے پاس ٹھیریں گے۔ سویرے جیپوں کے پہنچنے پر آگے نکل جائیں گے۔ سرور والی نزدیک ہی ہے۔ سیم و تھور کا مارا ہوا غیر آباد اور ویران علاکہ ہے۔ وہیں درختوں کی اوٹ میں کہیں گھات لگا کر بیٹھ جائیں گے اور سراب کا انتظار کریں گے۔"

"میں سمجھتا ہوں سرور والی سے گیدڑ والا زیادہ ٹھیک رہے گا۔" مزاری نے تجویز پیش کی۔

"ویسے میں گیدڑ والا گیا نہیں۔ پر اتنا ضرور سنا ہے، ادھر درخت اور جھاڑیاں بہت ہیں۔ چھپ کر گھات لگانے کے لیے بہت ٹھیک جگہ ہے۔ ویسے جو تیری مرضی۔"

"یہ تو وہاں پہنچ کر ہی طے کرنا ہو گا۔" جسکانی نے کہا۔ "بات یہ ہے ادھر کے درخت کاٹ کاٹ کر بہت کچھ صاف کر دیا گیا ہے۔ روز ہی درخت کٹتے ہیں۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا: "ایسے ہی تیزی سے درخت اور بوٹے کٹتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب دریا کے اس پار چٹیل پدھر رہ جائے گا۔"

مزاری نے قدرے تامل کیا پھر بدھیل کی جانب متوجہ ہوا۔ "تو نے سارا پروگرام سن ہی لیا۔ اب تو واپس جا۔ داؤد اور ہجر کو ساری گالہہ سنا دے۔ سراب کی طرف سے پوری طرح چوکس رہنا۔ تو داؤد اور ہجر کے ساتھ کل دوپہر تک پہنچ جانا۔ میں تجھے سرور والی اور گیدڑ والا کے آس پاس ملوں گا۔" اس نے تنبیہہ کی۔ "دیکھ بہت ہشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ سراب یا زردار کو ذرا بھی شبہ نہ ہو۔ ورنہ سارا کام گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"سئیں سردارا، جیسا تو حکم کرے گا ویسا ہی ہو گا۔" بدھیل نے نہایت مستعدی سے مزاری کو یقین دلایا۔

"اب تو جا۔ میں تیرا، داؤد اور ہجر خاں کا دراہمہ سے آگے بیلے میں انتظار کروں گا۔"

بدھیل خاں نے کچھ نہ کہا۔ آگے بڑھا۔ جھک کر مزاری کے قدموں کو چھوا اور خاموشی سے چلا گیا۔

جسکانی نے اس کے جانے کے بعد کہا۔ "دوپہر کی روٹی کھانے کے بعد ہمیں غازی گھاٹ کے لیے روانہ ہو جانا چاہیے۔ چار کرادے بھی ساتھ چلیں گے۔"

"دو کافی ہوں گے۔" مزاری نے اس کی تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ "زیادہ بندے ہوں گے تو ایک کار سے کام نہیں چلے گا۔ غازی گھاٹ کے اس پار بھی دو سے زیادہ جیپیں درکار ہوں گی۔ تو نے یہ نہیں سوچا، بدھیل، ہجر اور داؤد بھی موجود ہوں گے۔ چوہدری بھی اپنے ساتھ ہی چلے گا۔"

"میں نے تیرے ساتھ جا کر کیا لینا۔" رحیم داد نے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ وہ اس بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔

"تجھے ڈیرہ غازی خاں نہیں چلنا؟"

"مجھے تو اب لوروالی جانے دے۔" رحیم داد نے بے زاری سے کہا۔ "بعد میں مراد خاں شاہانی کے ساتھ تیرے پاس آجاؤں گا۔"

"سئیں چوہدری، فکر نہ کر۔" جسکانی نے ہنس کر کہا۔ "میرے اور شہ زور کے ہوتے ہوئے تجھے ڈرنے شرنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے بڑے جوش کے ساتھ سینے پر ہاتھ مارا۔ "گولی پہلے مجھے لگے گی۔" اس نے قہقہہ بلند کیا۔ "یہ بتا بندوک چلانی تو آتی ہی ہو گی۔"

"برسوں شکار کھیلتا رہا ہوں۔" رحیم داد نے گردن کو خم دے کر پر اعتماد لہجے میں کہا۔ "نشانہ بھی سچا ہے۔"

"تب تو گھبرا کیوں رہا ہے؟" جسکانی بدستور مسکراتا رہا۔ "دیکھنے میں بھی تکڑا لگتا ہے۔ حوصلے سے کام لے۔"

جسکانی نے رحیم داد کی مردانگی کو للکارا تھا۔ تیر نشانے پر بیٹھا۔ رحیم داد جھٹ تیار ہو گیا۔ "تم دونوں کی یہی مرضی ہے تو ضرور چلوں گا۔ میں تو یاروں کا یار ہوں۔"

"شاہانی تیرے بارے میں یہی کہتا تھا۔" مزاری مسکرا کر بولا۔

جسکانی اٹھ کر چلا گیا۔

مزاری نے پہلو بدلا۔ چند لمحے بعد اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ کسی قدر بے قرار نظر آ رہا تھا۔

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔

تینوں کمرے سے باہر نکلے۔

حویلی کے صدر دروازے پر جسکانی کی فورڈ کھڑی تھی۔ کار تھی تو پرانی مگر بڑی تھی اور کشادہ بھی تھی۔

جسکانی کے دو کارندے بندوقیں زانو پر رکھے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے تھے۔ جسکانی کو دیکھتے ہی سب کار سے نیچے اترے۔ پیشانی تک ہاتھ اٹھا کر اونچی آواز سے سلام کیا۔ اور ایک طرف مودب ہو کر کھڑے ہو گئے۔

جاتے جن کو بسوں، ٹرکوں اور ایسی ہی دوسری گاڑیوں کے واسطے استعمال کیا جاتا۔ بلکہ کہیں کہیں تو دریا اس قدر خشک پڑ جاتا کہ اس پار جانے کے لیے درمیان سے راستے بن جاتے جن پر ہر طرح کی آمد و رفت رہتی۔ مگر ان دنوں گرمی اپنے شباب پر تھی۔ قراقرم کے فلک بوس پہاڑوں کی برف پگھل رہی تھی۔ پانی کے تیز ریلے سے دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس کا پاٹ پھیل کر دس میل سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ حد نظر تک پانی ہی پانی تھا۔ راستے اُمڈتی لہروں میں ڈوب کر اوجھل ہو گئے تھے۔ ان دنوں دریا کو اسٹیمر کے ذریعے عبور کیا جاتا تھا۔

شام کی آمد آمد تھی۔ غازی گھاٹ کی چہل پہل رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی۔

ساحل پر اسٹیمر تیار کھڑا تھا۔ برطانوی دور حکومت کی یادگار، یہ پرانا اور بوسیدہ اسٹیمر موسم گرما میں دریا پر آمد و رفت کے لیے اب تک استعمال میں آتا تھا۔ اس کی چمنی سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکل کر شام کے دھندلکے میں تحلیل ہو رہا تھا۔

ڈرائیور کار کا دروازہ کھول کر سب سے پہلے باہر آیا۔ اس کے ساتھ ہی علی محمد جسکانی کے دونوں مسلح کارندے بھی باہر آ گئے۔ جسکانی، مزاری اور رحیم داد بھی کار سے اتر کر باہر آ گئے۔ سب نے چہروں پر سے ڈھاٹے اتار دیے تھے۔ کچھ دیر کھلی فضا میں کھڑے سورج کی نارنجی کرنوں کو لہروں پر جھلملاتے ہوئے دیکھتے رہے، پھر اسٹیمر کی جانب بڑھے اور سوار ہو گئے۔ صرف کار کا ڈرائیور کنارے پر کھڑا رہا۔

اسٹیمر مسافروں سے بھر گیا۔ آگے بڑھا اور سرکش موجوں کے درمیان سے گزرتا ہوا دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ غازی گھاٹ پیچھے رہ گیا۔ مظفر گڑھ کی سرحد ختم ہو گئی۔ اب وہ ضلع ڈیرہ غازی خان کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ اسٹیمر سے اتر کر وہ دراہمہ کی جانب روانہ ہوئے جو دریا کے کنارے ہی واقع ہے۔

دراہمہ کے بارے میں مشہور ہے کہ کسی زمانے میں ڈیرہ غازی خان کا شہر یہیں آباد تھا۔ مگر جب دریائے سندھ نے اپنا راستہ بدلا تو دراہمہ اس کی تند اور تیز لہروں کی زد میں آ گیا۔ برسات میں ہر سال جب دریا چڑھتا تو سیلاب کا ریلا شہر کے ساحلی علاقے کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا۔ دراہمہ ٹوٹ پھوٹ کر رفتہ رفتہ اجڑنے لگا۔ اب وہ ایک چھوٹا سا قصبہ رہ گیا تھا جس میں ماضی کی یادگار، شکستہ اور اجڑی ہوئی عمارتیں کہیں کہیں نظر آتی تھیں۔

احمد بخش نے علی محمد جسکانی کو دیکھا تو بڑے تپاک سے پیش آیا۔ شہ زور مزاری اور رحیم داد سے بھی بہت گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ جسکانی نے اپنے منصوبے کے بارے میں احمد بخش کو اعتماد میں نہیں لیا۔ اسے کچھ نہ بتایا۔ سب نے رات کا کھانا کھایا اور جلد ہی بستروں پر لیٹ گئے۔ سفر کی تکان سے چور چور تھے۔ لیٹتے ہی گہری نیند سو گئے۔ مگر بہت تڑکے بیدار ہو گئے۔ انھوں نے ناشتا کیا اور بے چینی سے جیپوں کا انتظار کرنے لگے۔

پہر دن چڑھے جسکانی کے بڑے سالے 'ظفر اللہ خاں کھوسہ' کی دونوں جیپیں ڈیرہ غازی خان سے دراہمہ پہنچ گئیں۔ ایک جیپ میں جسکانی، مزاری اور رحیم داد بیٹھے۔ دوسری میں جسکانی کے دونوں مسلح کارندے تھے۔ احمد بخش نے دوپہر کے کھانے تک ٹھہرنے کے لیے اصرار بھی کیا مگر جسکانی نے جلد سے جلد ڈیرہ غازی خاں پہنچنے کا عذر پیش کیا۔ مزید قیام کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ احمد بخش نے دو بڑے بڑے ناشتے دانوں میں کھانا بند کر کے ساتھ کر دیا۔ جیپوں کے انجن اسٹارٹ ہوئے اور وہ دھول اڑاتی ہوئی روانہ ہو گئیں۔

سڑک پختہ تھی، لیکن آمد و رفت زیادہ نہ تھی۔ سبب اس کا یہ تھا کہ لاریوں کا کوئی مستقل اڈا نہ تھا۔ وقتاً فوقتاً بدلتا رہتا تھا۔ ان دنوں اڈا، دراہمہ کے بجائے سان میں تھا۔ اب لاریاں سان سے گیدڑ والا کے راستے ڈیرہ غازی شہر اور اس سے بھی آگے جاتی تھیں۔

دونوں جیپیں پختہ سڑک پر فراٹے بھرتی ہوئی دوڑتی رہیں۔ سرور والی جلد ہی آ گیا۔ فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ علی محمد جسکانی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سیم اور تھور نے پورے علاقے کو اجاڑ بنا دیا تھا۔ مگر سرور والی سے آگے بڑھتے ہی ہریالی نظر آنے لگی۔ سڑک کے دونوں جانب گھنی جھاڑیاں تھیں۔ کیکر، شرینہ اور ٹاہلی کے ساتھ ساتھ جنگلی درختوں کے گھنے جھنڈ تھے۔ جگہ جگہ لکڑی کے حصول کی خاطر درخت کاٹ دیے گئے تھے۔ درختوں کے کٹنے کے باعث اجاڑ میدان بن گئے تھے۔ ان کا سلسلہ دور تک پھیلتا جا رہا تھا۔

جیپیں گیدڑ والا نہ گئیں۔ راستے ہی میں ایک ایسی جگہ ٹھہر گئیں جہاں جھاڑیاں کثرت سے تھیں۔ جسکانی اور شہ زور مزاری جیپ سے اتر کر باہر آئے۔ دونوں نے گردنیں اٹھائیں، ادھر ادھر نظریں دوڑا کر گرد و پیش کا چوکنا نظروں سے جائزہ لیا۔ سڑک کے دونوں طرف گھنے اور گنجان درخت تھے۔ لمبی لمبی شاخیں پھیل کر اس طرح مل گئی تھیں کہ ان کے سائے میں سڑک کا یہ حصہ روپوش ہو گیا تھا۔ سڑک کے ایک جانب مٹی کے اونچے نیچے تودے بھی تھے۔

جسکانی اور مزاری آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ایک گھنے درخت کے نیچے چلے گئے۔ اس جگہ ٹھنڈک تھی۔ ہوا کے جھونکے نرم اور فرحت افزا تھے۔ دونوں کچھ دیر صلاح مشورہ کرنے کے بعد واپس سڑک پر آ گئے۔ جیپوں کی سمت بڑھے اور اپنی اپنی نشستوں پر جا کر بیٹھ گئے۔

جسکانی کی ہدایت پر ڈرائیوروں نے جیپوں کو نشیب میں اتار دیا۔ جیپیں ناہموار راستے پر ہچکولے کھاتی، جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتی، دھیرے دھیرے آگے بڑھیں اور سڑک سے ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر مٹی کے ایک بڑے اور اونچے تودے کی اوٹ میں کھڑی کر دی گئیں۔ ایک جیپ میں کلہاڑیاں موجود تھیں۔ کارندوں اور ڈرائیوروں نے درختوں کی شاخیں کاٹ کر جیپوں پر ڈال دیں۔ اب وہ اس طرح چھپ گئیں تھیں کہ سڑک پر گزرنے والے انھیں مطلق نہ دیکھ سکتے تھے۔

جسکانی جیپوں کے ڈرائیوروں سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے دونوں کو اعتماد میں لے کر اپنے منصوبے سے پوری طرح آگاہ کر دیا۔ وہ بالکل ہراساں نہ ہوئے۔ تھے بھی قوی ہیکل، بات چیت اور طور طریق سے بھی بلند حوصلہ نظر آتے تھے۔

☆

دھوپ کی تمازت بڑھنے لگی۔ سورج دہکنے لگا۔ دوپہر ہو گئی۔ جسکانی کے نوکروں نے درختوں کے گھنے سائے تلے چادر بچھائی اور ناشتے دانوں سے کھانا نکال کر لگا دیا۔ مزاری، جسکانی اور رحیم داد کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ مزاری کو بدھیل، داؤد اور ہجر خاں کا انتظار تھا۔ اس کی بے چین نظریں بار بار سڑک کی جانب اٹھ جاتیں۔ مگر بدھیل، داؤد اور ہجر خاں نظر نہ آئے۔

تینوں کھانے سے فارغ ہوئے۔ شہ زور مزاری اٹھا اور سڑک کی جانب بڑھا۔ مگر سڑک پر نہ گیا۔ کچھ فاصلے پر جال کے ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں بدھیل، داؤد اور ہجر خاں کو تلاش کر رہی تھیں۔ اب انھیں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔

مگر اسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ سرور والی کی سمت سے آنے والے اونٹوں کے عقب میں اسے داؤد خاں دکھائی دیا۔ بدھیل اور ہجر خاں بھی اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ مزاری نے فوراً ایک ڈرائیور کو بلایا اور اسے بدھیل اور ہجر خاں کی جانب دوڑایا۔ ذرا دیر بعد وہ تینوں کو اپنے ہم راہ لایا۔ تینوں پسینے سے شرابور تھے۔ تھکے ہوئے تھے اور بھوکے بھی تھے۔

مزاری نے دریافت کیا۔ "سہراب کے بارے میں کیا خبر ہے؟" اس کے لہجے سے بے چینی صاف عیاں تھی۔

"سب خیر اے سیں سئواڑا!" بدھیل خاں نے جواب دیا۔ "تو خوش ہو۔ راضی ہو۔ خیر سلا اے۔"

"پہلے کام کی گالہہ سنا۔" شہ زور خاں مزاری نے تیوری پر بل ڈال کر اسے ڈانٹا۔

بدھیل اس کے خفا ہونے پر سہم کر رہ گیا۔ ہجر خاں آگے بڑھا۔ اس نے نہایت مستعدی سے نایا۔ "سہراب اور زردار دن ڈھلے غازی گھاٹ پہنچ جائیں گے۔ ملوک زادی ان کے ساتھ ہی ہو ی۔ وہ دریا پار کر کے دراہمہ پہنچیں گے۔ کچھ دیر ادھر ٹھہریں گے اور سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے بور شہ پہنچنے کی کوشش کریں گے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "رادھو نے یہ خبر پہنچائی ہے۔ وہ ازی گھاٹ تک ان کے ساتھ رہے گا۔"

سردار مزاری نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر کسی قدر نرم لہجے میں نیوں سے مخاطب ہوا۔ "اب تم جا کر روٹی کھاؤ۔ تھوڑا آرام کرو۔ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔"

تینوں خاموشی سے آگے بڑھے اور آہستہ آہستہ درختوں کے نیچے چلنے لگے۔ مزاری آگے آگے چل رہا تھا۔ داؤد خاں اور ہجر خان بھی مسلح تھے۔ ان کے پاس دیسی ساخت کا اسلحہ تھا۔

ڈرائیور اور کارندے کھانا کھا رہے تھے۔ بدھیل، داؤد اور ہجر خاں بھی ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئے۔ شہ زور مزاری اس طرف نہ گیا۔ وہ علی محمد جسکانی اور رحیم داد کے پاس چلا گیا۔ دونوں کچھ فاصلے پر کھڑے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ قریب ہی مٹی کے تودے کی اوٹ میں دونوں جیپیں موجود تھیں۔ ان کی چھتوں پر تازہ کٹی ہوئی درختوں کی شاخیں اس طرح جھول رہی تھیں کہ وہ ان میں روپوش ہو گئی تھیں۔

شہ زور مزاری اور جسکانی اپنے منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگے۔ انھوں نے ہر ایک کی ڈیوٹی کی نوعیت اور ایک ایک تفصیل طے کی۔ صلاح مشورے میں رحیم داد بھی شریک تھا۔ مگر وہ بیشتر وقت خاموش رہا۔ اس نے سرگرمی اور جوش و خروش کا اظہار نہ کیا۔ رحیم داد کے لیے یہ قطعی نیا تجربہ تھا۔ مگر زیادہ ہنگامہ خیز اور حیرت انگیز نہ تھا۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد وہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہنگاموں سے دوچار ہو چکا تھا۔

دن ڈھلنے لگا۔ سائے طویل ہو گئے۔ سورج رفتہ رفتہ مغرب کی جانب جھکتا گیا۔ درختوں تلے ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا۔ اب ہر شخص کو معلوم ہو چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ پوری طرح مسلح تھے اور چہروں پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ سڑک پر آمد و رفت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اکا دکا راہ گیر سڑک پر گزرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

علی محمد جسکانی انچارج کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وہ اپنے علاقے کا مشہور رسہ گیر تھا۔ اس وقت وہ بہت سرگرم نظر آ رہا تھا۔ مختلف ہدایات جاری کر رہا تھا۔ ڈیوٹیاں مقرر کر رہا تھا۔ اس نے

داؤد' ہجر خاں اور اپنے دونوں کارندوں کو سڑک کی دوسری جانب روانہ کیا۔ داؤد کے ایک کندھے پر بھری ہوئی پلیسنگی لٹک رہی تھی۔ یہ دیسی ساخت کی بھدی اور بد وضع بلوچی بندوق تھی۔ اس کے دوسرے کندھے پر لچھوں کی صورت میں لپٹی ہوئی ایسی مضبوط اور لمبی رسی جھول رہی تھی جو کنواں صاف کرنے والے غوطہ خور ٹوبھوں کے پاس ہوتی ہے۔ رسی کے ایک سرے میں بڑا سا پھندا لگا تھا۔

چاروں' سڑک کے اس پار پہنچے۔ داؤد خاں نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر درختوں کا جائزہ لیا۔ سڑک کے بالکل کنارے شیشم کا ایک پرانا اور گھنا درخت تھا۔ داؤد نے اسے اپنے مقصد کے لیے موزوں پایا۔ وہ نہایت ہوشیاری سے درخت پر چڑھا اور گھنی شاخوں میں اس طرح دبک کر بیٹھ گیا کہ نظر نہ آتا تھا۔

ہجر خاں اور جسکانی کے دونوں مسلح کارندے جنگلی جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے مٹی کے تودوں کی آڑ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ ہجر خاں سب سے شروع میں تھا۔ اس کے سپرد یہ ذمہ داری تھی کہ سہراب' مرجان اور زردار جیسے ہی گھیرے کے اندر داخل ہوں وہ چوکس ہو جائے' مگر خاموش رہے اور جب تینوں بیچ میں پہنچ جائیں تو سیٹی بجا کر سگنل دے۔

بدمیل خاں' جسکانی کی ہدایت کے مطابق داؤد کے عین مقابل ایک اونچے درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ درخت خوب گھنا اور گنجان تھا۔ اس کی موٹی موٹی شاخیں سڑک پر اس طرح جھکی ہوئی تھیں کہ سامنے کے درختوں کی شاخوں سے مل گئی تھیں۔ اس درخت کے آس پاس جسکانی' مزاری اور رحیم داد جھاڑیوں اور درختوں کے تنوں کی اوٹ میں دبک کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے پاس بھری ہوئی رائفلیں تھیں۔ وہ پوری طرح چوکس تھے۔ بدمیل خاں کی زبانی انھیں یہ اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی کہ سہراب اور زردار' دونوں ہی مسلح ہیں۔ ان کے پاس بارہ بور کی دیسی قرابین تھیں۔ یہ چوڑے منہ کی چھوٹی چھوٹی بندوقیں تھیں' جن سے پستول کی مانند بیک وقت کئی گولیاں چلائی جا سکتی تھیں۔ ڈرائیوروں کے پاس صرف کلہاڑیاں تھیں۔ لہٰذا انہیں عقب میں رکھا گیا تھا اور صرف ضرورت پڑنے پر کمک کے لیے طلب کیا جا سکتا تھا۔

سورج کی روشنی دھیرے دھیرے مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ درختوں تلے اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ سب اپنے اپنے مورچوں پر چوکنا اور چوکس تھے۔ متجس نظروں سے سڑک کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ وقت اور گزرا۔ دھوپ گہری زرد ہو گئی اور سمٹ کر درختوں کی پھنگیوں پر جھلملانے لگی۔

سرور دالی کی سمت سے بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ نمودار ہوا۔ بھیڑیں اور بکریاں رک رک کر منہ

سے آوازیں نکال رہی تھیں۔ آگے اور آگے بڑھ رہی تھیں۔ اونچے قد کا ایک نوجوان چرواہا انھیں لمبی چھڑی سے ہنکاتا ہوا پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ریوڑ بڑھ کر سامنے پہنچ گیا۔ عین اس وقت دور سے ہارن کی تیز آواز ابھری۔ دیکھتے دیکھتے ایک ٹرک قریب پہنچ گیا۔ اب وہ ریوڑ کے عقب میں تھا۔ سڑک پر بھیڑ بکریاں اس طرح بکھری ہوئی تھیں کہ راستہ بند ہو گیا۔

ڈرائیور نے ریوڑ کو راستے سے ہٹانے کے لیے زور زور سے ہارن بجایا۔ بھیڑیں اور بکریاں بدحواس ہو کر تتر بتر ہو گئیں۔ کچھ نشیب میں اتر کر ادھر ادھر بھاگنے لگیں۔ جسکانی یہ صورت حال دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ دوسرے بھی گھبرا گئے۔ بھیڑ بکریاں شور مچاتی ہوئی ان کے آس پاس منڈلا رہی تھیں۔ چرواہا چھڑی سنبھالے ان کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ ٹرک ڈرائیور نے سڑک خالی پائی تو رفتار تیز کر دی اور گرد و غبار کے بادل اڑاتا آن کی آن میں دور نکل گیا۔

چرواہے نے جسکانی کے دونوں کارندوں اور ہجر خاں کو دیکھ لیا۔ ان کے ڈھاٹوں سے چھپے ہوئے چہروں' چمکتی آنکھوں اور ہاتھوں میں دبی ہوئی بندوقوں پر نظر پڑتے ہی وہ خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے کسی سے نظر نہ ملائی' نہ ہی منہ سے آواز نکالی۔ جلدی جلدی بھیڑ بکریوں کو اکٹھا کیا اور سڑک پر لے گیا۔ جب پورا ریوڑ اکٹھا ہو کر سڑک پر پہنچ گیا تو اسے ہنکاتا ہوا وہ گیدڑ والا کی سمت بڑھا۔ بار بار مڑ کر پیچھے دیکھتا۔ وہ بہت سہما ہوا تھا۔ چرواہا اور اس کا ریوڑ جلد ہی اڑتی ہوئی دھول میں گم ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

سڑک پر اب ہو کا عالم تھا۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ بھیڑ بکریوں کے پیروں اور ٹرک کے پہیوں سے جو خاک دھول اڑی تھی' رفتہ رفتہ شام کی جھٹپٹے میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ سورج اونچے اونچے درختوں کے پیچھے غروب ہو چکا تھا۔ درختوں کے نیچے تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ رادھو کی اطلاع کے مطابق سہراب' مرجان اور زردار کو اب تک گزر جانا چاہیے تھا۔ انھیں شام ہونے سے پہلے پہلے چورٹہ پہنچنا تھا جہاں لغاریوں کے مسلح کارندے ان کے منتظر تھے۔

مزاری چند منٹ تک خاموش کھڑا بے چینی سے پہلو بدلتا رہا' پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا جسکانی کے قریب پہنچا۔ اسے مخاطب کیا۔ "جسکانی' تو نے ٹرک کو غور سے دیکھا تھا؟" اس کے لہجے میں تجسس تھا۔

"دیکھا تو تھا۔" علی محمد جسکانی نے بتایا۔ "پر دھول مٹی اتنی اڑ رہی تھی کہ کچھ نظر نہ آیا۔ نہ ڈرائیور دکھائی دیا اور نہ ہی یہ نظر آیا کہ اس کے ساتھ کون بیٹھا تھا۔" اس نے تامل کیا۔ "بھیڑ بکریوں نے الگ تنگ کر رکھا تھا۔ پر خیریت ہوئی کہ چرواہا ادھر نہ آیا۔"

”وہ ادھر تو نہیں آیا پر جس طرح مڑ مڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا اس سے شبہ ہوتا ہے کہ اس نے دوسری طرف درختوں تلے ہجر خاں اور تیرے کراؤں کو دیکھ لیا تھا۔“

”لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے۔“ جسکانی نے بھی اس کے وسوسے کی تائید کی۔

”دیکھ لیا تو دیکھ لینے دے۔ مجھے اس کی اتنی فکر نہیں۔“ مزاری نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ ”بار بار یہ خیال تنگ کر رہا ہے کہ سہراب کو اب تک یہاں سے گزر جانا چاہیے تھا۔“ اس نے بے چین نگاہوں سے جسکانی کے چہرے کو دیکھا۔ ”تینوں ٹرک میں تو نہیں بیٹھے تھے؟“

”ہو سکتا ہے وہ اسی میں بیٹھے ہوں۔“ جسکانی نے دبی زبان سے اپنے شبے کا اظہار کیا۔

”ایسا ہے تو سمجھ لے، تینوں صاف بچ کر نکل گئے۔“ شہ زور مزاری کے چہرے پر پریشانی بکھر گئی۔

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ جسکانی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اب تو ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“ شہ زور نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

”اپنی سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ ان کا پیچھا کیا جائے۔“ جسکانی نے تجویز پیش کی۔ ”ٹرک زیادہ دور نہ گیا ہو گا۔ ڈرائیور بھی اپنے پاس بہت ہوشیار ہیں۔ دونوں جیپیں دوڑا کر رستے ہی میں ٹرک کو گھیر لیں گے۔“

مزاری خاموش رہا۔ مگر علی محمد جسکانی خاموش نہ رہا۔ اپنی بات پر زور دے کر بولا۔ ”بول کیا کہتا ہے۔ جو فیصلہ کرنا ہے فٹافٹ کر۔“

مگر شہ زور خاں مزاری کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ مشرق سے اُمڈتا ہوا شام کا دھندلکا ہر سو یلغار کر رہا تھا۔ ناگاہ دور سے اونٹوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں ابھریں۔

گھنٹیوں کی آوازیں شام کے سناٹے میں گونجتی رہیں۔ رفتہ رفتہ قریب، اور قریب آتی گئیں۔ ا آوازوں سے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ دراہمہ سے اونٹوں کا کوئی قافلہ آ رہا ہے۔ سب کی نظر اس طرف اٹھ گئیں۔ وہ پوری طرح چوکنا اور چوکس ہو گئے۔ ان کے کان گھنٹیوں کی آوازوں لگے تھے۔

سردار شہ زور مزاری کے ذہن میں مسلسل یہ وسوسہ کانٹا بن کر کھٹک رہا تھا کہ سہراب، مرجا اور زردار ٹرک میں موجود تھے، اور صاف بچ کر نکل گئے۔ وہ ان کا تعاقب بھی نہ کر سکا۔ ات

مہلت ہی نہ ملی۔ وہ دل شکستہ اور بجھا بجھا نظر آ رہا تھا۔

رحیم داد بھی قریب کی ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ میں دبکا ہوا کھڑا تھا۔ وہ مستعدی سے اپنی رائفل سنبھالے ہوئے تھا۔ اس نے مڑ کر شہ زور مزاری کی جانب دیکھا۔ اس کا افسردہ چہرہ دیکھا۔ چاہا کہ نزدیک جا کر اس کی دل جوئی کرے۔ اس کا حوصلہ بڑھائے۔ مگر وہ اس کے پاس نہ جا سکا۔ جس جگہ کھڑا تھا وہیں جما ہوا کھڑا رہا اور چوکنا نظروں سے اس سمت دیکھنے لگا جدھر سے گھنٹیوں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

☆

گھنٹیوں کی آوازیں بہت قریب آ گئیں۔ اونٹ اب درختوں کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گئے تھے۔ وہ ایک قطار میں چل رہے تھے۔ ان پر لکڑیوں کے گٹھے اور سرکنڈوں کے پولے لدے ہوئے تھے۔ اونٹ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔

سات اونٹ ایک ایک کر کے سامنے سے گزر گئے۔

سب دم بخود تھے اور نظریں اٹھائے گزرتے ہوئے اونٹوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظروں میں تجسس تھا۔ جستجو تھی۔ ہر آنکھ بے چینی سے سہراب، مرجان اور زردار کو تلاش کر رہی تھی۔ اونٹ ان کی بے چینی سے بے نیاز سڑک پر چلتے رہے۔ ان کی گردنوں میں پڑی ہوئی بڑی بڑی گھنٹیاں مسلسل بج رہی تھیں۔ ناگاہ گھنٹیوں کے شور میں سیٹی بجنے کی تیز آواز ابھری۔ سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ انھیں سگنل مل چکا تھا۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں۔

ساربان اونٹوں پر بیٹھے تھے یا نکیل پکڑ کر آگے آگے چل رہے تھے۔ شام کی ہلکی ہلکی روشنی میں ان کے چہرے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ داؤد خاں درخت کی گھنی شاخوں میں دبکا ہوا چوکس بیٹھا تھا۔ سیٹی سنتے ہی وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر اونٹ کو دیکھنے لگا۔ اونٹ اس کے سامنے سڑک پر گزر رہے تھے۔ قطار کے دو آخری اونٹ دیکھ کر وہ چونکا۔ ایک پر زردار سوار تھا۔ دوسرے پر مرجان، سہراب کے پہلو سے لگی ہوئی کجاوے میں بیٹھی تھی۔

زردار کا اونٹ آگے تھا۔ جب وہ عین اس درخت کے قریب سے گزرا جس پر داؤد خاں بیٹھا تھا تو زردار کا چہرہ صاف نظر آیا۔ داؤد نے جھٹ کندھے پر پڑی ہوئی رسی اتاری۔ اسے گھما کر زور سے زردار کی جانب پھینکا۔ مگر نشانہ چوک گیا۔ رسی کا پھندا زردار کے بجائے اونٹ کی گردن میں پڑا۔ داؤد نے فوراً جھٹکا دیا۔ پھندا تنگ ہو گیا۔ اونٹ بدکا۔ جھنجلا کر زور سے بلبلایا۔ اس کے قدم ڈگمگائے لیکن گرا نہیں۔ جلد ہی سنبھل گیا۔

زردار نے اونٹ کے گلے میں رسی کا پھندا دیکھا تو جھٹ پلٹا۔ درخت کی جانب دیکھا۔ اپنی قرابین اٹھائی۔ تابڑ توڑ دو گولیاں چلائیں۔ ایک گولی داؤد خاں کے کان کے برابر سے سنسناتی ہوئی گزری۔ وہ گھبرا گیا۔ اور گھبراہٹ میں رسی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اونٹ خوف زدہ ہو کر سرپٹ بھاگا۔ داؤد نے اپنی ہلیسنگی سے زردار پر گولی چلائی۔ وہ دوسری گولی چلا نہ سکا۔ زردار کا اونٹ دور جا چکا تھا۔ دھندلی روشنی میں وہ پرچھائیں کی مانند نظر آرہا تھا۔ گولیوں کی آوازوں سے دوسرے اونٹ بھی بدکے۔ بلبلاتے چیختے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے غول کی صورت میں تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگے۔

ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ مگر بدھیل خان نے خود کو قابو میں رکھا۔ سہراب کا اونٹ جیسے ہی درخت کی پھیلی ہوئی شاخوں کے نیچے پہنچا بدھیل چھلانگ لگا کر کجاوے میں کود گیا۔ مرجان نے اسے دیکھ کر زور سے چیخ ماری۔ بدھیل نے اس کی جانب توجہ نہ دی۔ آگے جھکا اور سہراب کے اس ہاتھ پر تھپکی دی جس میں بھری ہوئی قرابین دبی تھی۔ قرابین سہراب کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ بدھیل نے جھپٹ کر سہراب کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ اونٹ کی مہار سہراب کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اونٹ بے قابو ہو کر سڑک سے نشیب میں اتر گیا۔ لیکن زیادہ دور نہ جا سکا۔ جھاڑیوں سے الجھ کر رک گیا۔ مرجان کجاوے میں بیٹھی خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

بدھیل اور سہراب گتھم گتھا ہو گئے۔ دونوں زور آزمائی کرتے ہوئے کجاوے سے لڑھک کر نیچے گر گئے۔ سہراب نے زمین پر پہنچتے ہی خود کو بدھیل کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔ مگر بدھیل نے اسے نکل بھاگنے کا موقع نہ دیا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور پھر سہراب سے لپٹ گیا۔ سہراب ماشیا رہ چکا تھا۔ اس کا بدن مضبوط اور کسا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں زبردست کس بل تھا۔ اس نے پلٹ کر بدھیل کے منہ پر پوری قوت سے تھپڑ رسید کیا۔ چوٹ کراری آئی۔ بدھیل چکرا گیا۔ ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ سہراب نے دوبارہ آزاد ہونے کی کوشش کی۔ بدھیل اونچی آواز سے چیخا۔

”سئیں سردار، میں نے سہراب کو پکڑ رکھا ہے۔“

بدھیل کی آواز سنتے ہی سردار شہ زور خان مزاری تیزی سے اس سمت لپکا۔ علی محمد جسکانی اور رحیم داد بھی اس کے ساتھ ساتھ دوڑے۔

مزاری کو دیکھتے ہی سہراب سراسیمہ ہو گیا۔ اس نے بھاگنا چاہا۔ لیکن مزاری اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے سہراب کے کندھے پر رائفل کا بٹ زور سے مارا۔ ہاتھ تلا ہوا پڑا۔ سہراب کی

آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ لڑکھڑا کر گرا۔ مگر جاندار اور توانا تھا، جھٹ دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی۔

مزاری غصے سے دھاڑا۔ ”نمک حرام، اٹھنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔“

سہراب نے اٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ جس طرح گرا تھا ویسے ہی زمین پر پڑا رہا۔ آن کی آن میں جسکانی اور رحیم داد بھی پہنچ گئے۔ ہجر خان، داؤد اور دونوں کارندے بھی ان کے پیچھے پیچھے نمودار ہوئے۔ ڈرائیور بھی کلہاڑیاں سنبھالے ہوئے پہنچ گئے۔ سہراب سب کے نرغے میں خاموش پڑا تھا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

سڑک اب بالکل سنسان تھی۔ اونٹوں کا غول سرپٹ بھاگتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ ان کے ساتھ زردار بھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ داؤد خان اس کے نکل بھاگنے پر نادم اور شرمندہ تھا۔ مزاری نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

”داؤد، تو بتا۔ زردار کا کیا بنا؟“

داؤد نظریں جھکا کر بولا۔ ”سئیں وہ جتوالوں کے ساتھ ہی نکل گیا۔“

”تو نے اسے نکل جانے دیا۔“ مزاری نے غصے سے ڈانٹا۔

داؤد گڑگڑا کر عاجزی سے بولا۔ ”سئیں، میں نے رسے کا پھندا اس پر پھینکا تھا۔ پر وہ اونٹھ کی گردن میں پڑا۔ زردار نے جھٹ میری طرف گولی چلا دی۔ رسہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔“

مزاری قہر آلود نظروں سے اسے گھورنے لگا۔ بدھیل جھٹ داؤد کے آڑے آ گیا۔ اس نے ہونٹوں سے رستا ہوا خون پونچھا۔ اور ایک ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”سئیں سردارا، سہراب کا اونٹھ ادھر جھنگر میں کھڑا ہے۔ ملوک زادی اس کے کجاوے میں بیٹھی ہے۔“

مزاری نے بدھیل اور داؤد خاں کو اس طرف روانہ کیا۔ فوراً اونٹ لانے کی ہدایت کی۔

ہجر خان اپنی کارگزاری سنانے لگا۔ ”سئیں سردارا، اس نے زبردست دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔“ اس نے سہراب کی جانب ایک ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”یہ اور زردار جتوالوں کے اونٹھوں کے پیچھے پیچھے اپنے اونٹھ لگائے ہوئے تھے۔ ان کی اوٹ میں چھپ کر نکل جانا چاہتے تھے۔ پر میں نے جھٹ پہچان لیا۔ فوراً سیٹی مار کر سب کو خبردار کر دیا۔“

”تو نے بہت ہوشیاری دکھائی۔“ شہ زور خان مزاری نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”پر داؤد سے چوک ہو گئی۔ زردار بچ کر صاف نکل گیا۔“

جسکانی بولا۔ ”بدھیل نے زبردست کام دکھایا۔ لگتا بھی پھرتیلا اور زور آور ہے۔“

”کام تو سچ پوچھ، بدھیل ہی نے دکھایا۔“ مزاری نے علی محمد جسکانی کی تائید کی۔ ”وہ ہمت اور

پھرتی سے کام نہ لیتا تو زردار کی طرح یہ بھی نکل جاتا۔" اس نے زمین پر پڑے ہوئے سہراب کو حقارت سے دیکھا۔

بدھیل اونٹ کی نکیل تھامے ہوئے واپس آگیا۔ داؤد خان اس کے ہم راہ تھا۔ مرجان کجاوے میں سر جھکائے زخمی فاختہ کی مانند سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ دھندلی روشنی میں وہ ہیولے کی طرح نظر آرہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مزاری کی آنکھوں سے گویا چنگاریاں نکلنے لگیں۔ مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ صرف خونخوار نظروں سے مرجان کو گھورتا رہا جس نے بکل مار کر چادر کے پلو سے اپنا چہرا چھپا رکھا تھا۔

علی محمد جسکانی نے سر پر منڈلاتا ہوا خطرہ محسوس کیا۔ وہ مزاری کو ایک طرف لے گیا۔ اس کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ رکھ کر بولا۔ "شہ زور' اب فافٹ یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ زرداد بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ سیدھا چورٹہ پہنچے گا۔ لغاریوں کو فوراً سب کچھ بتا دے گا۔ تجھے تو پتہ ہی ہے کہ سہراب اور مرجان مدت سے لغاریوں کے باہوٹ ہیں۔ ان کی حفاظت کرنا ان کی ذمہ داری ہے۔ یہ ان کی آن اور مڑاواری کا سوال ہے۔ وہ فوراً یہاں پہنچنے اور سہراب او ملوک زادی کو چھڑا کر لے جانے کی کوشش کریں گے۔"

"تو کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔ اب یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہیے۔" شہ زور خان مزاری نے بھ اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ "آگے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دراہمہ واپس چلتے ہیں۔ رات احمد بخش کے پاس گزاریں گے۔ تڑکے ہی تڑکے نکل کھڑے ہوں گے۔ تو ڈیرہ غازی خاں شہر تک ہمارے ساتھ چلنا۔ میں وہاں سے اپنی دستی' شاہ میر' چلا جاؤں گا۔ تو واپس محمود کوٹ چلا جانا۔" اس نے جسکانی کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ "یہ ٹھیک رہے گا نا؟"

مگر جسکانی نے اس کی تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ "سب سے مشکل سوال یہ ہے کہ یہاں سے نکلنے کے لیے کون سا راستہ پکڑا جائے۔ دراہمہ جانا خطرے سے خالی نہیں۔ احمد بخش اتنا وڈا زمیں دا نہیں ہے کہ لغاریوں کے خلاف ہماری پوری طرح حفاظت کر سکے۔ اور یہ تو تجھے بھی پتہ ہو جاہیے کہ لغاری دراہمہ ضرور پہنچیں گے۔ ان کے ساتھ بندے بھی زیادہ ہی ہوں گے۔ ہر طرح اسلحہ بھی ہو گا۔ پوری تیاری کر کے آئے ہوں گے۔"

"کالہ تو تیری سمجھ آتی ہے۔" مزاری کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ وہ چند لمحے خاموش کھڑا سوچتا رہا' پھر مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے جوش سے بولا۔ "میں تو کہتا ہوں چورٹہ ہی چلتے ہیں۔ شہر جانے کا اور دوسرا تو کوئی رستہ نہیں' چورٹہ میں لغاریوں نے روکا تو کیا ہو؟

گولی ہی تو چلے گی' چلنے دے۔ میں سہراب اور مرجان کو پہلے ہی گولی مار دوں گا۔ ان کی لاشیں لغاریوں کے سامنے پھینک دوں گا۔ یہ میری عزت اور مڑاواری کا سوال ہے۔ آگے جو ہوتا ہے دیکھ لیں گے۔"

"ایسا ہی کرنا ہے تو چورٹہ کیوں جانا چاہتا ہے۔ ٹھیر کر لغاریوں کا انتظار کر۔ یہیں فیصلہ ہو جائے گا۔" جسکانی کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ لہجہ بھی تیز اور تیکھا تھا جسے شہ زور مزاری نے بھی محسوس کیا۔

"ناراض نہ ہو۔" مزاری نے سلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ بتا' اب کیا کیا جائے۔ تو نے تو اس بارے میں پہلے ہی سوچ رکھا ہو گا۔"

"تجھے پتہ نہیں۔ دراہمہ کے نزدیک سے بھی ایک رستہ شہر کی طرف جاتا ہے۔" علی محمد جسکانی نے بتایا۔ "اسے ٹھنڈی سڑک کہا جاتا ہے۔ میں نے تو یہاں سے نکلنے کے لیے وہی رستہ سوچ رکھا تھا۔ یہ رستہ چورٹہ سے اڑھائی میل نیچے سے گزرتا ہے۔ اس رستے کو پکڑنے میں لغاریوں سے مڈبھیڑ ہونے کا بھی کوئی خطرہ نہیں۔"

"یار تو نے تو کمال کر دیا۔" مزاری نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔ "مجھے تو ادھر کے رستوں کا کچھ اتا پتا نہیں۔ تو نے یہ گالہ پہلے ہی بتا دی ہوتی۔"

"پہلے ہی بتا دیتا۔ پر تو نے اس بارے میں مجھ سے پوچھا ہی کب۔ میں تو سمجھتا تھا تجھے ادھر کے رستوں کا ٹھیک طرح پتہ ہو گا۔" جسکانی نے وضاحت کی۔ "آگے جو کچھ کرنا ہے وہ فافٹ کر۔ چورٹہ زیادہ دور نہیں۔ زرداد اب تک وہاں پہنچ چکا ہو گا۔"

مزاری نے مزید بات چیت نہ کی۔ بڑھ کر بدھیل' داؤد اور ہجر خاں کے پاس پہنچا۔ انھیں ضروری ہدایات دیں۔ فوراً ہی جیپوں پر سے کٹی ہوئی شاخیں ہٹائی گئیں۔ بدھیل اور داؤد نے پگڑیوں سے سہراب کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ مگر مرجان کو ہاتھ نہ لگایا۔ وہ ملوک زادی تھی۔ ان کی نظروں میں ابھی تک اس کی عزت تھی۔ وہ اسے چھونے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔

☆

سردار شہ زور مزاری نے مرجان کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ وہ سہراب کے ساتھ فرار ہونے کے بعد سیاہ کار بن چکی تھی۔ شہ زور مزاری غصے سے دھاڑا۔ "کالی۔" اس نے مرجان کے لانبے سیاہ بال پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ مرجان کے حلق سے گھٹی ہوئی چیخ نکلی۔ وہ کجاوے سے نکل کر زمین پر آگئی۔

مزاری اسے کھینچتا ہوا ایک جیپ تک لے گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اس زور سے دھکا دیا کہ وہ جیپ کی پچھلی نشست پر دھڑام سے گری۔

داؤد اور بدھمیل نے سہراب کو بھی مرجان کے ساتھ ہی بٹھا دیا۔ بدھمیل اپنی بھری ہوئی دیسی ساخت کی بلوچی بندوق و تاج کے ساتھ دونوں کے قریب بیٹھ گیا۔ مزاری کی ہدایت پر داؤد اور ہجر خاں بھی ڈرائیور کے برابر اسی جیپ میں سوار ہو گئے۔

مزاری دوسری جیپ میں جسکانی اور رحیم داد کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ جسکانی کے دونوں کارندے ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گئے۔ سب پوری طرح مسلح اور چوکس تھے۔

جیپوں کے انجن اسٹارٹ ہوئے۔ جیپیں آگے بڑھیں اور جھاڑیوں کے درمیان سے راستہ بناتی ہوئی نشیب سے نکل کر سڑک پر آ گئیں۔ جیپیں اب دراہمہ کی جانب دوڑ رہی تھیں۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔

سرور والی سے گزر کر جیپیں آگے بڑھیں۔ اور رفتہ رفتہ دراہمہ سے قریب ہوتی گئیں۔ مگر دراہمہ ابھی میل سوا میل کے فاصلے پر تھا کہ عقب میں درختوں کی آڑ سے تیز روشنی ابھری۔ جسکانی کی ہدایت پر دونوں جیپوں کی بتیاں فوراً بجھا دی گئیں۔

علی محمد جسکانی نے مزاری کو خبردار کیا۔ ”لگتا ہے لغاری آ گئے۔“

”ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔“ شہ زور خاں مزاری نے بھی اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”اب کیا کیا جائے؟“

جسکانی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے ڈرائیوروں کو حکم دیا کہ جیپیں سڑک کے نشیب میں اتار دی جائیں۔ سڑک کے ایک جانب اجاڑ میدان تھا۔ مگر دوسری طرف جنگلی جھاڑیاں تھیں۔ گھنے درختوں کا جھنڈ تھا۔ دونوں جیپیں اس طرف نشیب میں اتار دی گئیں اور کچھ دور جانے کے بعد جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑی کر دی گئیں۔

سب جلدی جلدی جیپوں سے باہر نکلے اور درختوں کے تنوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ مگر بدھمیل جیپ سے نیچے نہ اترا۔ وہ سہراب اور مرجان کی جانب اپنی بھری ہوئی و تاج تانے نہایت چوکنا بیٹھا تھا۔ سہراب اور مرجان کے منہ میں اس طرح کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا کہ اگر وہ کوشش بھی کرتے تو آواز نہ نکلتی۔

روشنی رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی سڑک پر پہیوں کے دوڑنے کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ سب زمین پر لیٹ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں اور رائفلیں تھیں۔ اور ان کی نالیوں کا رخ سڑک کی جانب تھا۔

شہ زور خان مزاری دم سادھے جسکانی کے برابر ہی زمین پر لیٹا تھا۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں جسکانی سے کہا۔ ”میرا تو جی کرتا ہے کہ کالے اور کالی کو گولی مار دوں۔“ اس کا اشارہ سہراب اور مرجان کی طرف تھا جو بلوچوں کے قبائلی قانون کی رو سے زانی اور سیاہ کار تھے۔ لہٰذا واجب القتل تھے۔ ”دونوں کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ لغاریوں کو اگر ملیں تو صرف ان کی خون میں لتھڑی ہوئی لاشیں ملیں۔“

”فضول باتیں نہ کر۔“ جسکانی نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”تو کالے اور کالی کو بعد میں بھی سزا دے سکتا ہے۔ تو نے یہ بھی سوچا‘ گولی کی آواز سے لغاریوں کو صاف پتہ چل جائے گا کہ ادھر ہم چھپے ہوئے ہیں۔ تو چپ کر کے دیکھتا جا۔“

عین اس وقت ایک موڑ سے تین جیپیں نکل کر سامنے آ گئیں۔ ان کی تیز روشنی ہر طرف پھیل گئی۔ سب دم سادھے ہوئے تھے۔ ان کی نظریں چورٹہ کی سمت سے آنے والی جیپوں پر جمی تھیں اور ہاتھ بندوقوں کی لبلبی پر تھے۔ درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچ کر جیپوں کی رفتار سست پڑ گئی۔ ان میں درجن بھر سے بھی زیادہ افراد بیٹھے تھے۔ سب بندوقوں اور رائفلوں سے مسلح تھے۔ ان کی نظریں درختوں اور جھاڑیوں کی جانب اٹھی تھیں۔

مگر دونوں جیپیں رکی نہیں۔ ان کی رفتار میں اضافہ ہوا اور تیزی سے سڑک پر دوڑتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ وہ دراہمہ کی سمت جا رہی تھیں۔ جب ان کی پچھلی بتیوں کی سرخ روشنی بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو جسکانی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

مزاری نے جسکانی سے دریافت کیا۔ ”جیپوں میں لغاری ہی بیٹھے تھے نا؟ مجھے تو لغاری ہی لگتے تھے۔“

”ہاں وہی تھے اور کون ہو سکتا ہے۔“

”دراہمہ کی طرف گئے ہیں۔“ مزاری نے کہا۔ ”رستہ صاف ہے۔ کیوں نہ اب ہم چورٹہ کے رستے نکل جائیں۔ اب ادھر اپنا رستہ روکنے والا کوئی نہ ہو گا۔“

”نہیں‘ ادھر جانا خطرے سے خالی نہیں۔“ جسکانی نے شہ زور خاں مزاری کی تجویز رد کر دی۔ ”ادھر سے ایک کچا رستہ جاتا ہے۔ کچھ دور جا کر ٹھنڈی سڑک سے مل جاتا ہے۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”ویسے یہ رستہ خراب اور اونچا نیچا ہے۔ کہیں کہیں گڑھے اور کھنڈ ہیں۔ پر رستہ زیادہ لمبا نہیں۔ اب تو سب سے محفوظ یہی رستہ ہے۔“

”جیسی تیری مرضی۔ مجھے تو ادھر کے رستوں کا کچھ اتا پتا نہیں۔“ مزاری نے علی محمد جسکانی سے اختلاف رائے نہیں کیا۔ اس کا مشورہ خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔

ایک بار پھر سب جلدی جلدی جیپوں میں بیٹھ گئے۔ خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ لغاری کسی بھی وقت دراہمہ سے واپس آسکتے تھے۔ دونوں جیپیں سڑک پر آگئیں۔ مگر فرلانگ بھر راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ جسکانی کی ہدایت پر نشیب میں اتر گئیں۔ اور ایک کچے راستے پر اندھیرے میں ڈگمگاتی ہوئی آگے بڑھنے لگیں۔ ڈرائیور محتاط اور چوکنا تھے۔ جیپوں کو سنبھال سنبھال کر چلا رہے تھے۔

علی محمد جسکانی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ راستہ سخت ناہموار تھا۔ بار بار جیپوں کا توازن بگڑ جاتا۔ الٹنے کا خطرہ لاحق ہوتا۔ اب ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ آبادی کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ گرمیوں کی بوجھل اور بے کیف رات تھی۔ آسمان پر غبار چھایا تھا۔

کچا اور ناہموار راستہ زیادہ طویل نہ تھا۔ ڈیڑھ دو میل جنوب کی سمت جانے کے بعد ٹھنڈی سڑک آگئی۔ یہ بہت قدیم سڑک تھی۔ کنکروں کی بنی ہوئی تھی۔ لیکن اب اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ کنکر جگہ جگہ سے اکھڑ گئے تھی۔ اور ان کے اکھڑنے سے بڑے بڑے گڑھے پڑ گئے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف گھنے درخت تھے۔ بلندی پر پھیلی ہوئی دونوں طرف کی شاخیں اس طرح ایک دوسرے سے مل گئیں تھیں کہ سڑک پر چلتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا گویا کسی محراب کے نیچے سے گزر رہے ہوں۔ موسم گرما میں راہ گیروں کے لیے یہ سڑک بہت ٹھنڈی اور فرحت بخش تھی۔ مگر اس وقت ہوا بند تھی۔ فضا میں امس اور گھٹن تھی۔

دونوں جیپیں ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھیں۔ ان کی رفتار زیادہ نہ تھی۔ دو ڈھائی میل فاصلہ طے کرنے کے بعد سڑک مغرب کی سمت مڑ گئی تھی۔ جیپیں بھی اسی جانب مڑ گئیں۔ آگے اور آگے بڑھتی گئیں۔

ٹھنڈی سڑک ختم ہو گئی۔ جام پور روڈ آگئی۔ دونوں سڑکیں ایک پل پر ملتی تھیں۔ پل کے نیچے نہر تھی جو عرصہ دراز سے خشک پڑی تھی۔ پل پر پہنچ کر دونوں جیپیں ٹھہر گئیں۔ جسکانی، مزاری اور رحیم داد اتر کر باہر آئے۔ ہجر خان، داؤد، جسکانی کے کارندے اور دونوں ڈرائیور بھی باہر آگئے۔ صرف بدھیل اپنی ونآج سنبھالے سہراب اور مرجان کی نگرانی کے لیے ایک جیپ کی پچھلی نشست پر چوکس بیٹھا رہا۔

جسکانی نے کھلی فضا میں لمبی لمبی سانسیں بھریں۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ جسکانی نے مسکرا کر سردار شہ زور خاں مزاری سے کہا۔ ”آگے رستہ بالکل صاف ہے۔ اب تو بےکھٹکے چلا جا۔“

”روجھان تک تو ساتھ چل۔“ مزاری نے اصرار کیا۔

مگر علی محمد جسکانی رضامند نہ ہوا۔ ”مجھے اب ڈیرہ غازی خاں جانا ہے۔ رات شہر میں ظفر اللہ خاں کھوسہ کی حویلی میں ٹھیروں گا۔ سویرے محمود کوٹ چلا جاؤں گا۔ تو راجن پور جا کر ٹھیر جانا۔ اکیلا شاہ میر تک کیسے جیپ چلائے گا۔“

”ارادہ تو یہی ہے۔ مگر میں تیرے ڈرائیور کو ساتھ لے جاؤں گا۔ میں راستے میں کہیں ٹھیروں گا نہیں۔ سیدھا شاہ میر جاؤں گا۔“ مزاری نے جسکانی کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ ”راجن پور میں جیپ ڈرائیور کو دے دوں گا۔ آگے وہی چلائے گا، وہی جیپ کو واپس ڈیرہ غازی خان شہر لے جائے گا۔ البتہ تو داؤد اور ہجر کو اپنے ساتھ لیتا جا۔ میری جیپ میں ان کے لیے جگہ نہیں نکلے گی۔ سویرے دونوں کو واپس روانہ کر دینا۔“

”جیسی تیری مرضی۔“ جسکانی نے پس و پیش نہ کی۔ ”میں داؤد اور ہجر خاں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

”تو نے بہت کام دکھایا۔“ مزاری نے کھل کر جسکانی کی تعریف کی۔ ”تو نہ ہوتا تو یہ دونوں میرے ہاتھ نہ آتے۔“ اس نے سہراب اور مرجان کی طرف اشارہ کیا۔ ”صاف نکل جاتے یا لغاری ان کو نکال لے جاتے۔ تو نے بہت مدد کی۔ ہر کام آرام سے ہو گیا۔ نہ گولی چلی نہ خون خرابہ ہوا۔“

”ایسی ہگالہ نہ کر۔“ جسکانی نے ہنس کر کہا۔ ”مدد شدد کیا کرنی، یہ تو میرا اپنا کام تھا۔ تجھ سے یاری جو ٹھیری۔ میں اور تو الگ تو نہیں ہیں۔“ جسکانی نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔ ”اب تو جا، دیری نہ کر۔ ابھی تجھے لمبے سفر پر جانا ہے۔“

جسکانی آگے بڑھ کر مزاری سے بغل گیر ہوا۔ رحیم داد کو بھی گلے سے لگایا۔ دونوں سے رخصت ہو کر جیپ کی جانب بڑھا اور ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کارندے بھی ہجر خاں اور داؤد کے ساتھ پچھلی نشست پر کسی نہ کسی طرح بیٹھ گئے۔ انجن اسٹارٹ ہوا۔ ڈرائیور نے جیپ موڑی اور ڈیرہ غازی خاں شہر کی جانب روانہ ہو گئی۔

مزاری خاموش کھڑا اسے دور تک دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ اپنی جیپ پر جا کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ ڈرائیور بھی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ مگر اب وہ جیپ نہیں چلا رہا تھا۔

مزاری اسٹرنگ وھیل سنبھالے بیٹھا تھا۔ اس نے جیپ کا انجن اسٹارٹ کیا۔ کلچ دبا کر گیئر بدلا

ایکسی لیٹر ایک پیر سے دبایا۔ جیپ سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگی۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ جیپ دوڑتی رہی۔ جام پور سے گزر کر کوٹلہ دیوان پہنچی۔

رات ڈھلنے لگی تھی۔ مزاری بہت تھک گیا تھا۔ بار بار نیند کا غلبہ ہوتا۔ اس کا ہاتھ بہک جاتا۔ ایسے عالم میں جیپ چلانا خطرناک تھا۔ اس نے ایک سنسان مقام پر جیپ روک لی۔ ایک بار پھر باہر آیا۔

ڈرائیور نے اس کی ہدایت پر جیپ کے پچھلے حصے کے گرد چادر باندھ دی۔ آسمان کی رنگت اب بدلنے لگی تھی۔ ہوا میں خوشگوار خنکی آگئی تھی۔ صبح کی آمد کے آثار ہویدا ہونے لگے تھے۔

سہراب اور مرجان کا کھلی جیپ میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ویسے بھی بلوچ سرداروں اور بڑے زمین داروں کی مستورات کا کھلی جیپ میں سفر کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جاگیردار گھرانوں کی وہ خواتین جو پڑھ لکھ کر ماڈرن بلکہ الٹرا ماڈرن بن گئی تھیں اور یورپ اور امریکہ میں دھڑلے سے بے پردہ گھومتی تھیں، اپنے علاقے میں پہنچتیں تو چادر سے خود کو اس طرح چھپا لیتیں کہ جسم کا کوئی حصہ نظر نہ آتا۔ کھلی جیپوں میں بیٹھتیں تو ان پر چادر کا پردہ پڑا ہوتا۔

شہ زور مزاری نے جیپ کا اسٹیرنگ وھیل ڈرائیور کے حوالے کر دیا۔ خود بندوق سنبھال کر بیٹھ گیا۔ اس کی پشت پر سہراب تھا۔ مرجان تھی۔ دونوں کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کے منہ میں ٹھسے ہوئے کپڑے نکال دیے گئے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔ خوف سے سہمے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں مطلق نیند کا گزر نہ تھا۔ وہ جاگ رہے تھے۔ بدھیل بھی جاگ رہا تھا۔ اور اپنی دتاج سنبھالے چوکس بیٹھا دونوں کی کڑی نگرانی کر رہا تھا۔

جیپ تیز رفتار سے سنسان سڑک پر دوڑتی رہی۔ راجن پور پہنچی۔ مگر مزاری وہاں نہ رکا۔ جیپ روجھان شرقی کی سمت دوڑتی رہی۔ مشرقی افق پر ہلکا ہلکا اجالا پھیلنے لگا۔ رات ختم ہو رہی تھی۔ دن کی آمد آمد تھی۔

جیپ دوڑتی رہی۔ وقت گزرتا رہا۔ دھوپ پھیلنے لگی۔ جیپ مزاریوں کے علاقے 'روجھان شرقی' کی حدود میں داخل ہوئی۔ آگے بڑھی۔ شہ زور کے آبائی گاؤں شاہ میر میں پہنچی اور مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی کوٹ کے بڑے دروازے پر رک گئی۔ تمازت اب بڑھ گئی تھی۔ موسم گرما کا سورج آگ کے گولے کی مانند دہکنے لگا تھا۔

☆

کوٹ سے ملحق نیم پختہ اور پرانی عمارت تھی۔ اس میں بہت بڑا تہ خانہ تھا۔ تہ خانہ تاریک

تھا۔ فرش کچا تھا۔ ہر طرف سیلن اور نمی تھی۔ ہوا اور روشنی کے لیے صرف چھت کے قریب دو مختصر روشن دان تھے جن پر لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی تھیں۔

یہ تہ خانہ، جس سے سڑاند اور بدبو کے بھبکے اٹھتے تھے، سردار شہ زور خاں مزاری کی ذاتی جیل کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ مردوں اور عورتوں کی علیحدہ علیحدہ جیل تھی۔ ان کے دروازے بھی علیحدہ تھے۔ قیدیوں کو کھانے میں عام طور پر ڈوڈھا دیا جاتا تھا۔ اس میں جوار کی روٹی کے ساتھ شلجم کے پتوں کا ساگ ہوتا۔ گندم کی روٹی ہفتے میں ایک بار دی جاتی۔ اس کے ساتھ پتلی دال ہوتی۔ مگر کھانے پر جو خرچ آتا قیدیوں کے عزیز و اقارب سے وصول کیا جاتا۔ اور جتنا خرچ آتا اس سے زیادہ وصول کیا جاتا۔ خرچ نہ پہنچتا تو قیدیوں کو فاقے کرنے پڑتے۔

تہ خانے کی چھت پر اونچی فصیل نما چار دیواری تھی۔ چار دیواری کے اندر کسی کو بلا اجازت داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ چار دیواری کے اندر ایک سلسلے سے کوٹھریاں بنی تھیں۔ ان کے آگے طویل برآمدہ تھا۔ برآمدے کے آگے کھلا صحن تھا۔ کوٹھریوں میں جیل کے چوکیدار اور کارندے رہتے تھے۔ چار دیواری میں داخل ہونے کے لیے لوہے کا مضبوط پھاٹک تھا جو ہر وقت بند رہتا تھا۔ پھاٹک پر سخت پہرہ تھا۔ چوکی دار بندوقیں سنبھالے نہایت مستعدی سے پہرہ دیتے تھے۔ قیدیوں سے ملاقات کرنا بہت دشوار تھا۔ صرف سردار کی اجازت سے ملاقات کی جاسکتی تھی۔ لیکن ملاقات کے لیے کوئی خاص دن مقرر نہیں تھا۔

ایسی نجی جیلیں دوسرے قبائلی سرداروں اور بڑے زمین داروں کی بھی تھیں۔ بلکہ ہر حویلی یا کوٹ کے ساتھ نجی جیل بڑائی اور شان و شوکت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ضلع بھر میں کوئی سرکاری جیل نہ تھی۔ اس زمانے میں ڈپٹی کمشنروں اور مجسٹریٹوں کی عدالتوں سے سزا پانے والے قیدی بھی سرداروں کی نجی جیلوں میں بند کیے جاتے تھے۔ حکومت کی طرف سے ان کے اخراجات کے لیے ایک مقررہ رقم دی جاتی تھی۔

ضلع میں پہلی باقاعدہ جیل سیاسی قیدیوں کے لیے انگریزوں کے عہد حکومت میں تعمیر کی گئی۔ لیکن سرکاری جیل کے قیام کے بعد بھی سرداروں کی نجی جیلوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ وہ پہلے کی طرح اپنی جیلیں رکھتے۔ عدالت لگا کر اپنی مرضی اور اپنے قوانین کے مطابق مقدمات کے فیصلے کرتے۔ جنھیں مجرم قرار دیتے انھیں اپنی جیلوں میں سزا بھگتنے کے لیے قید کرتے۔

تمن دار اور مقدم کی ذاتی جیل، اس کی حویلی اور کوٹ کی طرح زیادہ بڑی ہوتی۔ ان میں قیدی بھی زیادہ بڑی تعداد میں رکھے جاتے۔ ڈیرہ غازی خاں کی طرح بلوچستان کے قبائلی سرداروں اور

جاگیرداروں کی بھی ایسی ہی نجی جیلیں تھیں جو زمین دوز تہہ خانوں میں قائم تھیں۔ ان میں دن رات برابر تھے۔ ہوا اور روشنی کا گزر نہ تھا۔

قیدیوں کو عام طور پر زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا یا لکڑی کے وزنی تختوں میں سوراخ کر کے اس طرح پیر ڈال دیے جاتے کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہتے۔ لمبی قید کاٹنے والے قیدیوں کے پیر تختوں کے شکنجے میں پڑے پڑے اس طرح ناکارہ ہو جاتے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو جاتے۔

نجی جیلوں میں قیدیوں کو طرح طرح سے اذیت پہنچائی جاتی‘ جسموں کو لوہے کی دہکتی ہوئی سلاخوں سے داغا جاتا۔ کئی کئی روز تک الٹا لٹکایا جاتا۔ سر کے نیچے آگ سلگا کر مرچوں کی دھونی دی جاتی۔ برہنہ جسموں پر کوڑے مارے جاتے۔ اس قدر سفاکی اور بے رحمی سے زدوکوب کیا جاتا کہ اکثر قیدیوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتے۔ بینائی جاتی رہتی‘ قوت سماعت ختم ہو جاتی۔ دماغ میں خلل پیدا ہو جاتا۔ ایسے قیدی رہائی کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لولے‘ لنگڑے‘ اندھے‘ بہرے‘ پاگل اور اپاہج ہو جاتے۔ ان اذیت ناک سزاؤں کے باعث سرداروں اور جاگیرداروں کی نجی جیلیں‘ عقوبت خانوں کے نام سے یاد کی جاتیں۔

یہ نجی قید خانے یا عقوبت خانے‘ جن میں قیدیوں کے لیے علاج معالجے کا کوئی بندوبست نہیں تھا‘ صدیوں پرانے اس عہد کی یادگار تھے جب غلاموں کو نافرمانی اور حکم عدولی کی پاداش میں مویشیوں کی طرح تاریک تہہ خانوں میں بند کر دیا جاتا تھا۔ انگریزوں کے دور حکمرانی میں بھی یہ عقوبت خانے اپنی تمام انسانیت سوزی کے ساتھ برقرار رہے۔ انگریزوں کی حکومت ختم ہو گئی۔ پاکستان بن گیا۔ مگر نجی قید خانے اور عقوبت خانے رکھنے کا رواج ختم نہ ہوا۔ عقوبت خانے بدستور قائم رہے اور قیدیوں پر ظلم و ستم ڈھانے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

شہ زور خان مزاری کی نجی جیل بھی ایک ایسی ہی جیل تھی۔ اس کے حکم پر سہراب اور مرجان کو قیدی بنا کر عقوبت خانے میں بند کر دیا گیا۔ ان کے پیروں میں لوہے کی بھاری بھاری زنجیریں ڈال دی گئیں۔ ان کی کڑی نگرانی کی جانے لگی۔ کسی کو ان سے ملنے اور بات کرنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔

سردار شہ زور مزاری قیدیوں کے بارے میں ضروری احکامات جاری کرنے کے بعد کوٹ کے زنان خانے میں چلا گیا۔ رحیم داد کا قیام مہمان خانے میں تھا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ سفر کی تکان سے جسم چور چور تھا۔ اس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ بستر پر جا کر ایسا سویا کہ دن ڈھلے

تک بے خبر سوتا رہا۔

شام کو مہمان خانے کے وسیع صحن کے پختہ چبوترے پر محفل جمی۔ رحیم داد کی فرمائش پر مزاری نے نہایت اہتمام سے بھنگ گھٹوائی جسے سرائیکی میں ساوی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ شہ زور مزاری کو بھنگ سے خاص رغبت نہ تھی۔

دونوں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ بیچ میں میز تھی۔ میز پر شیشے کے جگ میں دودھ کی مانند سفید بھنگ تھی۔ مزاری اور رحیم داد کے گلاسوں میں بھی تھی۔ دونوں گھونٹ گھونٹ پی رہے تھے۔ شام درو دیوار سے نیچے اتر کر پھیل گئی تھی۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

جب رحیم داد نے اپنا گلاس ختم کر دیا تو خالی گلاس میں جگ سے بھنگ انڈیلتے ہوئے شہ زور مزاری نے مسکرا کر پوچھا۔ ”سیں چوہدری‘ سچ سچ بتا میرے ڈیرے کی ساوی تجھے پسند آئی؟“

بھنگ چکی تھی اور اتنی خوش ذائقہ بھی نہ تھی جو رحیم داد نے بھکر میں مراد خاں شاہانی کی حویلی میں قیام کے دوران پی تھی۔ مگر مزاری کی دل جوئی کے خیال سے اس نے گردن ہلا کر بھنگ کی تعریف کی۔ ”چنگی ہے۔“ اس نے گلاس اٹھا کر بڑا گھونٹ بھرا۔ ”مزے دار ہے۔“

”تجھے پسند آئی۔“ شہ زور مزاری نے مسکرا کر کہا۔ ”ویسے میں ساوی بہت کم پیتا ہوں۔ اسے پی کر مجھے نشہ ہی نہیں ہوتا۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”نشہ تو سچ پوچھ اسکاچ وہسکی پی کر چڑھتا ہے۔“

”شاہ جی بھی یہی کہتا ہے۔“

”ضرور کہتا ہو گا۔ پرانا پینے والا ہے۔“ شہ زور نے کہا۔ ”میرا تو اس کے ساتھ زیادہ میل ملاپ نہیں۔ سنا ہے وہ اچھی شراب پیتا ہے اور اچھی رن رکھتا ہے۔“ مزاری نے بھنگ کا گھونٹ بھرا۔ ”سنا ہے ان کے لیے اس نے علیحدہ کوٹ بنا رکھا ہے۔ جس میں ایک سے ایک سوہنڑی رن رکھ چھوڑی ہے۔“

”پر اب تو اس نے کوٹ ختم کر دیا۔ سیاست کے چکر میں پڑ گیا ہے۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”ویسے میں نے اس کا کوٹ دیکھا ہے۔ کئی بار ادھر ٹھیر بھی چکا ہوں۔“

”تب تو تجھے اس کے کوٹ کے بارے میں سب پتہ ہو گا۔ کیسا ہوتا تھا اس کا کوٹ؟“ مزاری نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ ”مراد خاں شاہانی بہت تعریف کرتا تھا۔“

رحیم داد اسے احسان شاہ کے کوٹ اور اس میں قید رکھی جانے والی مزارعوں اور کسانوں کی لڑکیوں اور جوان عورتوں کے بارے میں بتانے لگا۔ شہ زور مزاری توجہ اور دلچسپی سے اس کی باتیں

سنتا رہا۔ اسی اثنا میں ایک کوتی دو کتوں کی زنجیر سنبھالے ہوئے نمودار ہوا۔ لبراڈر نسل کے کتوں کی یہ جوڑی، شہ زور خان مزاری نے پچھلے سال خریدی تھی۔ ان سے اسے خاص لگاؤ تھا۔

مزاری نے مسکرا کر پوچھا۔ "انھیں سیر کرانے لے گیا تھا؟"

"ہا سئیں!" کوتی نے ادب سے جواب دیا۔ "روز صبح شام سیر کرانے لے جاتا ہوں۔"

شہ زور خاں دونوں کتوں کو پیار بھری نظروں سے تکتا رہا۔ وہ اپنی لمبی لمبی زبانیں نکالے ہانپ رہے تھے۔ نہ اس نے کتوں کو قریب بلایا نہ اٹھ کر ان کے قریب گیا۔ چند لمحے تک انھیں دیکھتا رہا، پھر کوتی کی جانب متوجہ ہوا۔ "ویسے تو چنگے بھلے لگتے ہیں۔ کوئی پریشانی کی گالہہ تو نہیں؟"

"نا سئیں نا۔ سب خیر سلا ہے۔ فکر کی کوئی گالہہ نہیں۔" اس نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ جھک کر ایک کتے کی گردن پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔

"اب تو جا۔ میں سویرے ڈاگ ہاؤس دیکھنے آؤں گا۔"

کوتی خاموشی سے مڑا اور کتوں کی زنجیر سنبھالے ہوئے چلا گیا۔

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "تونے بھی ڈاگ ہاؤس بنا رکھا ہے۔؟"

"بنا تو رکھا ہے۔" شہ زور خان مزاری نے مسکرا کر کہا۔ "کتے بھی میرے پاس اچھی نسل کے ہیں۔"

"میں نے شاہانی کا ڈاگ ہاؤس دیکھا ہے۔" رحیم داد بولا۔ "بہت شان دار ہے۔ تیرا ڈاگ ہاؤس بھی شان دار ہی ہوگا۔"

"شان دار وان دار کیا، بس ٹھیک ہی ٹھاک ہے۔ ویسے تو سارے ہی سرداروں اور وڈے زمین داروں نے، جنھیں شکار کھیلنے اور کتے پالنے کا چسکا ہے، اپنے اپنے ڈاگ ہاؤس رکھ چھوڑے ہیں۔ کئی کے پاس تو بہت وڈے وڈے ہیں۔" مزاری نے بتایا۔ "شان دار ڈاگ ہاؤس تو سچ پوچھ، نواب جوناگڑھ کا ہوتا تھا۔ بہت شہرت تھی اس کی۔"

"بہت ہی زیادہ شاندار ہوگا۔"

"نہ پوچھ کتنا شاندار تھا۔ کتے بھی ایک سے ایک عمدہ اور اعلیٰ نسل کے رکھتا تھا۔ ان سے پیار بھی بہت کرتا تھا۔ ان کے لیے بہت شاندار محل بنا رکھا تھا۔" مزاری نے گلاس اٹھا کر بھنگ کا گھونٹ بھرا۔ "کتوں کے رہنے کے لیے الگ الگ کمرے تھے۔ ہر کمرے میں قالین بچھے ہوتے۔ بجلی ہوتی۔ یہاں تک کہ ٹیلی فون بھی لگے ہوتے۔"

"ٹیلی فون ہوتے تھے؟" رحیم داد نے سخت تعجب سے پوچھا۔

"کیا نہیں ہوتا تھا۔" مزاری نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کتوں کی دیکھ بھال کے لیے سینکڑوں نوکر تھے، ڈاکٹر تھے۔ نرسیں تھیں۔ راتب تیار کرنے کے لیے باورچی لگے تھے۔ ان کے سونے کے لیے مسہریاں تھیں۔ نرم نرم گدے تھے۔" مزاری کھل کر مسکرایا۔ "نہ پوچھ کیسے کیسے ان کے ناز نخرے اٹھائے جاتے تھے۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "کوئی کتا مرجاتا تو اس کا زبردست سیاپا ہوتا۔ نہایت شان سے اسے کبرستان پہنچایا جاتا۔ کبر کھودی جاتی۔ دفن کیا جاتا۔ کتنے ہی مرنے والے کتوں کے تو سنگ مرمر کے کبرے تیار کیے گئے تھے۔ ان کا کبرستان بھی علیحدہ ہی تھا۔"

"تیری گل بات سمجھ نہیں آئی۔" رحیم داد منہ پھاڑ کر ہونق کی طرح مزاری کا چہرہ تکنے لگا۔

"تجھے یہ سنکر اور تعجب ہوگا کہ ایک کتے کا تو بہت دھوم دھام سے پرنا بھی ہوا تھا۔" مزاری بدستور مسکراتا رہا۔

"تیرا مطلب ہے کتے کا ویاہ ہوا تھا۔" رحیم داد واقعی اور زیادہ حیرت زدہ نظر آنے لگا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے۔"

"بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔" مزاری نے نہایت اطمینان سے بتایا۔ "نواب کے پاس ایک لبراڈر ہوتا تھا۔ یہ اسی نسل کا کتا تھا جو تھوڑی دیر پہلے میرا کوتی لے کر آیا تھا۔ اس کا نام تھا۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے الجھا۔ چند لمحے خاموش رہا، پھر مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "یاد آگیا۔ بوبی نام تھا اس کا۔ کتی کا نام روشنا تھا۔ ان کا پرنا ہوا تو سرکاری طور پر اعلان کیا گیا۔ دعوت نامے چھپے۔ سارے راجے، مہاراجے، نواب اور وڈے سرکاری افسروں کو دعوت نامے بھیجے گئے۔ وائسرائے کو بھی بلایا گیا تھا۔"

"وائسرائے کو بھی بلایا گیا تھا؟" رحیم داد نے تجسس انگیز نظروں سے شہ زور مزاری کو دیکھا۔

"ہا سئیں، وائسرائے کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ پر اس نے انکار کردیا۔" سردار شہ زور خاں مزاری اب سنجیدہ ہوگیا تھا اور سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ "ویسے سارے ہی راجے، نواب، سرکاری افسر مہمان بن کر دور دور سے جوناگڑھ آئے تھے۔ بوبی کی جنج بہت دھوم دھام سے روانہ ہوئی۔ لگ بھگ ڈیڑھ لاکھ بندے شریک ہوئے۔ جنج کے آگے آگے باڈی گارڈ کا دستہ مارچ کرتا تھا، نواب اپنے شاہی ہاتھی پر سوار تھا۔ بوبی سہرا باندھے شاندار گھوڑے پر بہت سج دھج کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کا خاص کوتی بھی گھوڑے پر بیٹھا تھا اور اسے سنبھالے ہوئے تھا۔ فوجی بینڈ بجتا تھا۔ آتش بازی چھوڑی جاتی تھی۔"

رحیم داد حیرت سے بت بنا بیٹھا تھا۔ مزاری بتاتا رہا۔ "بوبلی جب روشنا کو بیاہ کر محل میں لایا تو زبردست دعوت ہوئی۔ عمدہ عمدہ کھانے اور پکوان مہمانوں کو کھلائے گئے۔ بوبلی اپنی بنری کے ساتھ بہت شان سے مسند پر بیٹھا تھا۔"

رحیم داد نے خمار آلود نظروں سے سردار مزاری کو دیکھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بھنگ کے نشے میں بہک رہا ہے۔ بے چین ہو کر بولا۔ "تو سچ کہہ رہا ہے۔" وہ ہولے ہولے لہرایا۔ "یقین نہیں آتا۔"

"مجھے جھوٹ بول کر تجھ سے کیا لینا۔" مزاری کا لہجہ قدرے تیکھا تھا۔ "میں تو اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ پر بوبلی اور اس کے پرنے کے بارے میں تو اخباروں میں خبریں اور تصویریں بھی چھپی تھیں۔"

"خرچہ بھی بہت آیا ہوگا۔"

"لاکھوں روپے خرچ ہوئے تھے۔" مزاری نے رحیم داد کو بتایا۔ "بمبئی کے ایک اخبار نے سخت اعتراض کیا تھا۔ لکھا تھا کہ ریاست کی سوا چھ لاکھ ننگی بھوکی رعایا میں سے بارہ ہزار غریب غربا کی اتنے روپے سے پورے ایک سال تک آرام سے گزر بسر ہو سکتی تھی۔" مزاری نے نشے کی جھونک میں زور کا قہقہہ بلند کیا۔ "پر ایسی باتوں سے کیا بنتا ہے۔ نواب کو اپنی ٹور اور شان دکھانی تھی، سو اس نے ایسی دکھائی کہ ہر طرف دھوم مچ گئی۔"

"نواب اب کدھر ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"ادھر کراچی میں ہوتا ہے۔" مزاری نے مطلع کیا۔ "اس نے ریاست جونا گڑھ پاکستان میں شامل کرنے کا اعلان کیا تھا۔ سردار پٹیل، ہندوستان کی حکومت میں ریاستوں کے معاملات کا مرکزی وزیر ہوتا تھا۔ اسے پتہ چلا تو سخت ناراض ہوا۔ ریاست کی ہندو رعایا کو بھکا کر زبردست گڑبڑ کرائی۔ اور ریاست پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ نواب بے چارہ کسی نہ کسی طرح چھپتا لکتا پاکستان پہنچا۔"

"تب تو ہندوؤں نے نواب کو بدنام کرنے کے لیے اخباروں میں ایسی خبریں چھاپی ہوں گی۔" رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"ایسا ہی ہوگا۔" سردار مزاری نے اختلاف رائے نہ کیا۔ "پر بوبلی اور روشنا کے پرنے کی بات تو پاکستان بننے سے بہت پہلے کی ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ مزاری بھی نہ بولا۔ دونوں اب خاصی تعداد میں بھنگ چڑھا چکے تھے۔ رات اجلی اور خوشگوار تھی۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے چلتے تھے۔ دونوں نشے سے جھوم رہے تھے۔

انھوں نے اپنے اپنے گلاس ختم کیے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆

سویرے سردار مزاری نے رحیم داد کے ساتھ ناشتا کیا۔ اس نے حویلی میں مزید قیام کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ گیراج سے اپنی پرانی پیکارڈ نکالی۔ اس کا ڈرائیور کیسر کوئزلر کار لے کر ابھی تک لاہور سے واپس نہیں آیا تھا۔

دونوں پیکارڈ میں بیٹھ گئے۔ کار شمشیر والی کی جانب دوڑنے لگی۔

پہر دن چڑھے کار شمشیر والی میں داخل ہوئی۔ یہ مزاری کی جاگیر میں دریائے سندھ کے کنارے چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ربیع کی فصل کٹ چکی تھی۔ کھیت اجاڑ تھے۔ جگہ جگہ کٹی ہوئی فصلوں کے ٹنڈے نظر آتے تھے۔ مگر کھیتوں کے آس پاس خوب ہریالی تھی۔ سایہ دار درخت زیادہ ہی گھنے اور گنجان تھے۔ اور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

درختوں کے دامن میں کثرت سے گھنی جنگلی جھاڑیاں تھیں۔ جھنگر تھے۔

شمشیر والی پر فضا اور ہری بھری بستی تھی۔ مگر آبادی کم تھی۔ سردار مزاری یہاں عام طور پر شکار کھیلنے آتا تھا۔ اس کے قیام کے لیے ایک بڑا اور کشادہ مکان تھا۔ گاؤں کے دوسرے مکانات عام طور پر دریائی گھاس اور سرکنڈوں کے بنے ہوئے تھے۔ چند مکانوں کی دیواریں مٹی میں بھوسا ملا کر کھڑی کی گئی تھیں۔ ان پر شہتیر ڈال کر اور بالائی حصے پر گیلی مٹی کا گارا پھیلا کر چھتیں ڈالی گئی تھیں۔ دیواریں سیدھی نہ تھیں۔ بلندی پر پہنچ کر اندر کی جانب جھک گئی تھیں۔

مزاری کے مکان کی دیواریں کچی اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ چھت بھی مٹی کی تھی۔ مگر دیواریں سیدھی تھیں۔ اس میں چار بڑے بڑے کمرے تھے۔ کمروں کے آگے طویل دالان تھا۔ اس کی چھت آگے جھکی ہوئی تھی تاکہ بارش کا پانی جمع نہ ہو۔ دالان کی چھت، کمروں سے قدرے نیچی بھی تھی۔ دالان کے سامنے وسیع احاطہ تھا۔ احاطے کے ایک حصے میں کئی کوٹھریاں تھیں جن میں چوکیدار اور نوکر چاکر رہتے تھے۔ اناج اور بھوسا رکھا جاتا تھا۔ احاطے میں جگہ جگہ گھنے اور سائے دار درخت تھے۔ احاطے کی چار دیواری مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اندر داخل ہونے کے لیے اونچا دروازہ تھا۔

گاؤں بلندی پر تھا۔ نشیب میں دریا بہتا تھا۔ گرمی کے دن تھے مگر ہر طرف پھیلی ہوئی ہریالی اور دریا کی سمت سے آنے والے ہوا کے بھیگے بھیگے جھونکوں نے گرمی کی شدت کم کر دی تھی۔ درختوں کے نیچے ٹھنڈک تھی۔

رحیم داد کو گاؤں پسند آیا۔ پر فضا تھا اور پر سکون بھی تھا۔ سورج ڈوبا' اندھیرا پھیلا دریا کی سمت سے نرم اور ٹھنڈے جھونکے آنے لگے۔ شام بڑی فرحت افزا اور سہانی تھی۔ رحیم داد اور مزاری نے دن ڈھلے غسل کیا تھا۔ اجلا لباس پہنا تھا۔ دونوں احاطے میں دالان کے سامنے مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔ پھر بوتل کھلی۔ شراب کا دورہ چلا اور اس کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ شراب دیسی تھی اور خاصی تند و تیز تھی۔

دونوں نے کھانا کھایا اور جھومتے جھامتے جا کر بستروں پر دراز ہو گئے۔ ان کے پلنگ احاطے کے ایک گوشے میں بچھے تھے۔

☆

رحیم داد سردار شہ زور خان مزاری کے ہم راہ اس بڑے کمرے میں چلا گیا جس میں کچہری لگائی جاتی تھی۔ کمرے میں دیوار کے قریب خوب چوڑا چکلا پلنگ تھا۔ اس کے پائے اونچے اونچے تھے۔ ان پر رنگ و روغن سے خوش نما نقش و نگار بنے تھے۔

پلنگ پر صاف ستھری چادر بچھی تھی۔ پائنتی دو تہی تھی۔ اس پر رنگین دھاگوں سے خوش نما کشیدہ کاری کی گئی تھی اور حاشیہ گہرا سرخ تھا۔ سرہانے بڑے بڑے دبیز تکیے تھے۔ مزاری آگے بڑھا۔ پلنگ کے اوپر پہنچا اور پاؤں پھیلا کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں پیروں کے پنجوں کو جوڑ کر ایک دوسرے سے ملایا اور گھٹنے سمیٹ کر اونچے کر لیے۔ سردار مزاری کا کاردار چاکر خاں سرگانی' جو شاہ میر سے اس کے ساتھ آیا تھا' کمرے میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ سرگانی کے اشارے پر ایک ملازم آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں خیری تھی۔ یہ سفید لٹھے کا ڈھائی گز لمبا ٹکڑا تھا۔ وہ سردار مزاری کے قریب پہنچا۔ جھکا اور نہایت احتیاط سے خیری اس کی کمر اور گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر بغل بندی کی۔ پھر خیری کے دونوں سروں کا اس طرح دموکا لگایا کہ آنکھوں کے سوا چہرے کا تمام حصہ ڈھک گیا۔

سردار شہ زور خان مزاری' جب قبائلی روایت کے مطابق اس طرح دلٹھ مار کر بیٹھ گیا تو ملازم نے حقہ تازہ کر کے پلنگ کے نزدیک اسٹول پر رکھ دیا۔ سردار اجلا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس پر عطر لگا تھا جس کی تیز خوشبو کمرے کی فضا میں رچی ہوئی تھی۔ مزاری نے حقے کی نے سنبھالی اور آہستہ آہستہ کش لگانے لگا۔

کمرے کے باہر دالان اور احاطے میں درختوں کے نیچے مزارعے اور کمی بیٹھے تھے۔ ان میں بزگر بھی تھے۔ یہ بھی مزارعے تھے۔ مگر ان کا حق کاشت موروثی تھا۔ موروثی مزارعوں کو بلوچستان میں

لٹ بستہ کہا جاتا ہے۔ مگر ڈیرہ غازی خان میں بھی پنجاب کے دوسرے اضلاع کی طرح وہ مزارعے یا راہک کہلاتے ہیں۔

مزارعے' بزگر اور کمی سرائیکی میں بات چیت کر رہے تھے جس میں بلوچی اور پنجابی کی آمیزش تھی۔ ان میں شمشیر والی کے علاوہ آس پاس کے ایسے گاؤں اور چکوں کے رہنے والے بھی شامل تھے جو سردار مزاری کی جاگیر میں شامل تھے۔ وہ اپنے مقدمے لے کر سردار کے پاس فیصلے کے لیے آئے تھے۔ چاکر خان سرگانی باری باری ہر مقدمہ پیش کرتا۔ کسی مقدمے میں مدعی اور مدعا علیہ دونوں موجود ہوتے کسی میں صرف مدعی حاضر ہوتا۔

کمرے میں جو بھی داخل ہوتا پیشانی تک ہاتھ اٹھا کر سردار شہ زور خان مزاری کو سلام کرتا اونچی آواز میں کہتا۔ "سئیں' سدا جیویں۔ سکھی صحت ہووے۔ خیر خیریت ہووے۔ رب راضی باضی ہووے۔" یہ دعائیہ جملے ادا کرتا ہوا وہ آگے بڑھتا' جھکتا' سردار کے قدموں کو چھو کر پیرن پودن کرتا۔ اور ادب سے گردن جھکا کر مزاری کے روبرو کھڑا ہو جاتا۔

مزاری کے چہرے پر رعب اور دبدبہ تھا۔ وہ حقے کی نے ہونٹوں سے ہٹا کر بھاری بھرکم لہجے میں مقدمہ پیش کرنے کے لیے کہتا۔ "اپنا دعویٰ بیان کر۔" مقدمہ پیش کیا جاتا۔ وہ پوری توجہ سے اسے سنتا۔

مقدمات مختلف قسم کے تھے اور بڑی تعداد میں فوجداری نوعیت کے تھے۔ ان میں زمین کی وٹ بندی اور پانی کے تنازعات تھے۔ قبائل کے پرانی دشمنی کے قضیئے تھے۔ میاں بیوی' سسر اور داماد کے خانگی جھگڑے تھے۔ سردار شہ زور مزاری پہلے مدعی کا بیان سنتا' پھر مدعا علیہ کو صفائی پیش کرنے کا موقع دیتا۔ فریقین اپنے اپنے گواہ پیش کرتے۔ بیانات اور شہادتیں سننے کے بعد سردار شہ زور زاری جرح کرتا۔ ہر نکتہ اور ہر دلیل سمجھنے کی کوشش کرتا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا مقدمے کے لف پہلوؤں پر غور کرتا رہتا' پھر اپنا فیصلہ سناتا۔ بعض مقدمات میں وہ چاکر خاں سرگانی سے بھی ورہ کرتا۔ اس کی رائے معلوم کرتا' اگر مشورہ قابل قبول ہوتا تو اس کی روشنی میں فیصلہ کرتا۔

مقدمات کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک ساربان داخل ہوا۔ اس نے دہلیز پر قدم رکھتے ہی دہائی دی۔ "ئں سردار' سدا جیویں۔ سئیں میں لٹ گیا۔ سئیں میں تباہ ہو گیا۔" وہ تیزی سے آگے بڑھا اور ی کے پیر پکڑ کر زار و قطار رونے لگا۔

زاری نے رعب دار لہجے میں اسے ڈانٹا۔ "سدھا کھڑا ہو۔ رونا پیٹنا چھوڑ۔ اپنا دعویٰ بیان

"سیں میرا نام ہاتو ہے۔ جتوال ہوں۔ پاس کی وستی میں رہتا ہوں۔ سیں، میرا اوٹھ چوری ہو گیا۔" ساربان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ گڑگڑا کر کہتا رہا۔ "سیں سردار! میں اوٹھ کے بنا کیا کر سکتا ہوں۔ میں تو تباہ ہو گیا۔ میرے بالیں بچیں بھوکے مر رہے ہیں۔ سیں میرا اوٹھ مجھے واپس دلا دے۔ توں سکھی صحت ہووے۔ رب راضی ہووے۔"

"تیرا اوٹھ کس نے چوری کیا؟" مزاری نے اونچی آواز میں دریافت کیا۔ "تجھے کسی پر شبہ ہے؟"

"ہا سیں! شبہ ہے بالکل شبہ ہے۔" ساربان ہاتو نے جلدی جلدی گردن ہلائی۔

سردار نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔ "کون ہے وہ؟"

"وہ وستی بنی شاہ میں رہتا ہے۔ اس کا نام لنگر ہے۔" ہاتو نے مستعدی سے بتایا۔ "سیں اسی نے میرا اوٹھ چوری کیا ہے۔ مجھے پتہ ہے اسی نے چوری کیا ہے۔ ویسے تو وہ ماچھی ہے پر چوری چکاری اس کا دھندا ہے۔ بالکل ملی مچھی ہے۔ دیکھنے میں مچھی، اندر سے سانپ۔"

"چاکر تو لنگر کو جانتا ہے؟" سردار مزاری نے مڑ کر اپنے کاردار کو دیکھا جو اس کی پشت پر باادب بلاحظہ کھڑا تھا۔

اس نے نہایت ادب سے جواب دیا۔ "ہا سیں، میں لنگر کو جانتا ہوں۔ باہر کھڑا ہے۔ میں نے اسے پہلے ہی بلوا لیا تھا۔"

"لنگر کو حاضر کیا جائے۔" مزاری نے حکم دیا۔ "اسے اپنی صفائی پیش کرنے دی جائے۔"

چاکر خاں سرگانی نے فورا لنگر کو بلوایا۔

ذرا دیر بعد ایک قوی ہیکل مچھیرا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ڈھیلی ڈھالی لمبی قمیص کے نیچے گہرے نیلے رنگ کا منجھلا باندھے ہوئے تھا۔ سر پر ململی پگڑی تھی۔ ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال سخت اور گھنے تھے۔ گردن تک بالوں کے لمبے لمبے سیاہ پٹے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور سرخی مائل تھیں۔ رنگت سیاہ تھی۔ اس نے جھک کر مزاری کو ادب سے سلام کیا۔ دعائیہ جملے کہے۔ قدم بوسی کی اور گردن جھکا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

سردار شہ زور خاں نے گھورتے ہوئے دریافت کیا۔ "یہ جتوال کہتا ہے، تو نے اس کا اوٹھ چوری کیا ہے۔ تجھے اپنی صفائی میں کیا کہنا ہے۔"

لنگر نے ایک ہاتھ سے اپنا کان پکڑا، پھر دونوں گالوں کو ہاتھ سے چھو کر انکار میں گردن ہلائی۔

"نا سیں نا۔ میں چوری رسہ گیری کا دھندا نہیں کرتا۔ میں نیک اور بھلا بندا ہوں۔ وستی بنی شاہ میں

مجھے سب جانتے ہیں۔" اس نے مڑ کر ساربان کی طرف دیکھا۔ "سیں سردار! یہ جتوال بالکل جھوٹا ہے۔ میرے ماتھے پر بدنامی کی کالک لگانا چاہتا ہے۔ میں نے اس کا اوٹھ ہرگز ہرگز چوری نہیں کیا۔ سیں یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے تو اس کا اوٹھ دیکھا بھی نہیں۔"

وہ اپنے ساتھ دو گواہ بھی لایا تھا۔ مزاری کے حکم پر دونوں گواہ پیش کیے گئے۔ انھوں نے قسم کھا کر لنگر کے بیان کی پوری پوری تائید کی۔ ساربان ہاتو کے الزام کو جھوٹا اور گمراہ کن قرار دیا۔

لنگر اور اس کے گواہوں کے بیانات سننے کے بعد سردار مزاری ہاتو کی جانب متوجہ ہوا۔ "ہاتو تجھے کسی اور پر تو اوٹھ کی چوری کا شبہ نہیں۔"

"نا سیں نا۔" ہاتو نے پورے اعتماد سے کہا۔ "مجھے کسی اور پر شبہ نہیں۔ میرا اوٹھ تو اسی نے چوری کیا ہے۔" اس نے لنگر کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہی رات کے اندھیرے میں میرا اوٹھ کھول کر لے گیا۔"

سردار نے کہا۔ "اس کے تو گواہ ہیں۔ تیرا بھی کوئی گواہ ہے؟"

"سیں سردار! میرا کوئی گواہ نہیں۔" ساربان نے عاجزی سے کہا۔ "میرا گواہ تو خدا ہے۔" اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر آسمان کی سمت بلند کیا۔ "میں نے اپنا اوٹھ بنی شاہ میں لنگر کے باڑے میں بندھا دیکھا تھا۔ سیں، میں پہلے کھوجی ہوتا تھا۔ اوٹھ کے پاؤں کے نشانات سے کھرا نکالتا وستی بنی شاہ پہنچا تھا۔ نشانات اس کے گھر تک جاتے تھے۔ وہاں اوٹھ موجود تھا۔ میں نے اسے جھٹ پہچان لیا۔ وہ میرا ہی اوٹھ تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

"لنگر وہاں موجود تھا؟" سردار مزاری نے دریافت کیا۔

"نا سیں، لنگر وہاں نہیں تھا۔ دریا کے کنارے اپنی بیڑی میں بیٹھا تھا۔" ہاتو نے جواب دیا۔ "میں اس کے پاس پہنچا۔ اپنے اوٹھ کے بارے میں اسے بتایا۔"

"لنگر نے تجھ سے کیا کہا؟" مزاری نے جرح کرنے کے انداز میں پوچھا۔

"اس نے جھوٹ بولا۔ صاف انکار کر دیا۔"

"تو نے اس کے خلاف تھانے میں پرچہ چاک کرایا تھا؟" سردار نے استفسار کیا۔

"نا سیں، میں نے ایسا نہیں کیا۔ پرچہ چاک کرانے کے لیے پولیس کی مٹھی گرم کرنی پڑتی ہے۔ میں غریب جتوال ہوں۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ "غریب کی فریاد پولسے کہاں سنتے ہیں۔ سیں سردار! میرا اوٹھ تو ہی دلوائے گا۔ تو سردار ہے۔ انصاف کرنے والا ہے۔ میرا فیصلہ تو ہی کرے گا۔ میں نے کسی اور کے پاس نہیں جانا۔"

"جب تو نے لنگر کے باڑے میں اپنا اوٹھ دیکھ لیا تھا تو کوئی کارروائی کیوں نہیں کی؟" مزاری نے کرید کر پوچھا۔ "میرا مطلب ہے' تو اپنا اوٹھ کھول کر کیوں نہیں لے آیا؟"

"سئیں' میں بالکل اکیلا تھا۔ لنگر مجھ سے تکڑا اور زور آور ہے۔" ہاتو نے وضاحت کی۔ "میں نے پہلے لنگر سے پوچھ تاچھ کی۔ جب اس نے صاف انکار کر دیا تو واپس اپنی دستی گیا۔ رات کو اپنے ماما کے پتر اور دو جتوالوں کو لے کر دوبارہ بنی شاہ پہنچا۔ تب لنگر اپنے گھر پر موجود تھا۔ پر اوٹھ غائب تھا۔"

"تو نے آگے کیا کیا؟" مزاری نے دریافت کیا۔

"میں نے پتہ چلایا۔ معلوم ہوا لنگر نے شام کا اندھیرا ہوتے ہیں اوٹھ کوٹلی جعفر پہنچا دیا۔" ہاتو نے مزاری کو بتایا۔ "میں کوٹلی جعفر پہنچا۔ پر میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس نے اوٹھ بیڑی میں بٹھا کر دریا پار پہنچا دیا۔"

لنگر تلملا کر بولا۔ "سئیں سردار' یہ صاف جھوٹ بول رہا ہے۔"

"چپ کر۔ خاماخا ٹرٹر نہ کر۔" سردار مزاری نے لنگر کو غصے سے ڈانٹا۔ "جب تجھے کہا جائے تب بولنا۔" وہ ساربان کی جانب متوجہ ہوا۔ "ہاتو! بعد میں تو نے اپنے اوٹھ کا کھوج نہیں نکالا۔ تجھے پتہ ہے' تیرا اوٹھ اب کہاں ہے؟"

"سئیں سردار! مجھے صرف اتنا پتہ ہے۔ میرا اوٹھ رحیم یار خاں میں ہے۔" ساربان عاجزی سے بولا۔ "کس دستی میں ہے' کہاں ہے؟ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ تو سردار ہے' تو جم شیر ہے۔ تجھ سے میں کیسے جھوٹ بول سکتا ہوں۔"

سردار مزاری' چند لمحے خاموش رہ کر لنگر سے مخاطب ہوا۔ "لنگر' اب تو بتا۔ تو نے ہاتو کا اوٹھ اگر چوری نہیں کیا' تو یہ تجھ پر چوری کا الزام کیوں لگا رہا ہے؟ تیرے سوا اسے کسی اور پر شبہ بھی نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟"

"سئیں سردار! گالہہ اصلی یہ ہے۔" لنگر نے مزاری کو بتایا۔ "اس کی چاچی میری چھٹیل ہے۔ میں نے اسے طلاک دی اور جب وہ چھٹیل ہو گئی تو اس کے چاچا سے اس نے نکاح کر لیا۔ میری وہی چھٹیل اب اسے اور اس کے چاچا کو میرے خلاف بھڑکاتی ہے۔ میری اس کی یہی دشمنی ہے اور پچھلے ایک سال سے ہے۔" اس نے مڑ کر ہاتو کو دیکھا۔ "اس سے پوچھ لے سردار۔ میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔"

"لنگر ٹھیک کہہ رہا ہے؟" سردار مزاری نے ہاتو سے پوچھا۔

"میری چاچی پہلے اس کی ذال ہوتی تھی۔ یہ تو اس نے ٹھیک ہی بتایا۔ پر اوٹھ کی چوری سے اس معاملے کا کیا میل۔" ہاتو نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "میں تو اپنے چاچا کے گھر بہت کم جاتا ہوں۔ میری چاچی' جواب اس کی چھٹیل ہے' مجھے ذرا پسند نہیں۔ وہ زبردست جھگڑالو رن ہے۔ مجھ سے بھی کئی بار جھگڑا لفنا کر چکی ہے۔ میں تو پچھلے چھ سات مہینے سے اس کے گھر گیا ہی نہیں۔" اس نے لنگر کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "سئیں' یہ بکواس کر رہا ہے۔ میرا اوٹھ اسی نے چوری کیا ہے۔ میں کسم کھا کر کہہ سکتا ہوں' میرا اوٹھ اس نے رحیم یار خان میں کہیں چھپا دیا ہے یا کسی کی ہاتھ بیچ دیا۔" وہ گڑگڑا کر فریاد کرنے لگا۔ "سئیں سردار! میرا اوٹھ مجھے دلا دے۔ میں تباہ ہو گیا۔ میں لٹ گیا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

لنگر نے ہاتو کو اس طرح زار و قطار روتے دیکھا تو نرم لہجے میں بولا۔ "سئیں سردار' میں یہ نہیں کہتا اس کا اوٹھ چوری نہیں ہوا۔ پر میں نے اسے نہیں چرایا۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ میرے گواہوں سے پوچھ لے۔"

سردار مزاری نے لنگر کو نظر انداز کرتے ہوئے ہاتو سے پوچھا۔ "تیرا ملیر اور دونوں جتوال جو تیرے ساتھ دستی بنی شاہ اور کوٹلی جعفر گئے تھے اور جنھوں نے تیرے اوٹھ کے بارے میں سنا بھی تھا' ان کی تو نے گواہی کیوں نہیں پیش کی؟"

"سئیں' انھوں نے اوٹھ دیکھا نہیں۔ اسے تو لنگر نے پہلے ہی بیڑی میں بٹھا کر دریا پار پہنچا دیا تھا۔" ہاتو نے وضاحت کی۔ "ایسے میں وہ کیا گواہی دے سکتے ہیں۔ ہاں وہ اس کی ضرور گواہی دے سکتے ہیں کہ میرے ساتھ دستی بنی شاہ اور کوٹلی جعفر گئے تھے۔ سئیں تو حکم کر تو میں ان سے اس کی گواہی دلوا دوں۔"

"نہیں ایسی گواہی سے کام نہیں چلے گا۔" سردار مزاری نے اختلاف رائے کیا۔ "ہاں' کسی نے لنگر کو تیرا اوٹھ چوری کرتے دیکھا ہو' اس کی گواہی تو پیش کر سکتا ہے۔"

"نا سئیں' میرا ایسا کوئی گواہ نہیں۔ تب ہی تو میں نے تجھے پہلے ہی صاف صاف کہہ دیا تھا' میرا کوئی گواہ نہیں۔" ہاتو نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ "سئیں سردار' میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ نہ تیرے سامنے جھوٹے گواہ پیش کروں گا۔"

مزاری نے کچھ نہ کہا۔ نظریں جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ رحیم داد بھی سرکنڈوں کے بنے ہوئے مونڈھے پر بت بنا خاموش بیٹھا تھا اور مقدمے کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ مقدمہ خاصا پیچیدہ تھا۔ رحیم داد یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کیا فیصلہ ہونا چاہیے۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد سردار شہ زور خان مزاری نے چاکر خان سرگانی کو مخاطب کیا۔ "چاکر! مکدمہ تو کچھ الجھا ہوا ہے۔ تو کچھ کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے۔"

"سئیں سردار! اونٹھ کی چوری کا ہاتو کے پاس کوئی پکا ثبوت نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی گواہ ہے نہ شہادت۔ لہٰذا ہاتو کا دعویٰ خارج کیا جا سکتا ہے۔" چاکر خاں سرگانی نے نہایت ادب سے اپنا موقف پیش کیا۔ "ویسے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جرگہ بلایا جائے اور معتبروں کے سامنے مکدمہ پیش کر دیا جائے۔ جرگہ جو فیصلہ کرے گا' وہی آخری فیصلہ ہو گا۔"

ہاتو تڑپ کر بولا۔ "نا سئیں' جرگہ نہیں' میرا فیصلہ تو سردار ہی کرے گا۔" وہ بچوں کی طرح مچل کر ضد کرنے لگا۔ "سئیں' تو ہی اونٹھ دلوا سکتا ہے۔ میرا فیصلہ تو ہی کرے گا۔"

"میں ہی فیصلہ کروں گا۔ پر آج نہیں' چار روز بعد۔" سردار مزاری نے مڑ کر چاکر خان کو دیکھا۔ "چاکر' یہ مکدمہ اتنا اہم نہیں کہ اس کے لیے جرگہ بلایا جائے۔" وہ ہاتو اور لنگر کی طرف متوجہ ہوا۔ "کچہری برخاست کی جاتی ہے۔ تم سب کو چار روز بعد فیصلے کے لیے حاضر ہونا ہو گا۔ چاکر خاں تم کو اس کے بارے میں بتا دے گا۔"

عدالت برخاست ہوتے ہی کمرہ خالی ہو گیا۔ چاکر خاں نے بڑھ کر مزاری کی کمر اور ٹانگوں سے لپٹی ہوئی خیری کی گرہ کھول دی۔ مزاری پلنگ سے نیچے اترا اور رحیم داد کے ہم راہ باہر چلا گیا۔

☆

جون کی سنسان دوپہر تھی۔ ہر طرف تیز اور چمکیلی دھوپ پھیلی تھی۔ ہوا گرم تھی۔ گر کچی اینٹوں سے بنی ہوئی اونچی اونچی دیواروں والے کمرے میں قدرے ٹھنڈک تھی۔ رحیم داد اور شہ زور خان مزاری کھانا کھا رہے تھے۔ رحیم داد بالکل خاموش تھا۔ اس کی آنکھیں سوچتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ بشرے سے الجھن جھلکتی تھی۔

سردار مزاری نے اس کے چہرے کو کئی بار نظر بھر کر دیکھا۔ لیکن وہ زیادہ دیر رحیم داد کی یہ کیفیت برداشت نہ کر سکا۔ مسکرا کر بولا۔

"سئیں چوہدری' تو کس سوچ میں پڑ گیا۔ خیر خیریت تو ہے؟"

رحیم داد نے نگاہیں اٹھا کر شہ زور خاں کی جانب دیکھا۔ مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ گردن جھکا کر بدستور کھانا کھاتا رہا۔

مزاری نے کرید کر پوچھا۔ "تو اس طرح چپ کر کے کیوں بیٹھا ہے؟" وہ کھل کر مسکرایا۔ "لگتا ہے' تو اب یہاں سے اکتا گیا۔ واپس جانا چاہتا ہے چلا جانا۔ مجھے بھی ادھر زیادہ دن نہیں ٹھیرنا۔"

"واپس تو میں نے جانا ہی ہے۔ تجھے پتہ ہے ادھر لہور میں شاہ جی کا منیجر مہربان علی میرا انتظار کرتا ہو گا۔ شاہ جی بھی اب تک کراچی سے آ گیا ہو گا۔ اسے ملنا بھی ہے۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "پر ابھی تو میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔" اس نے سوالیہ نظروں سے سردار مزاری کے چہرے کو دیکھا۔ "تجھے کل صبح اونٹھ کی چوری کے مکدمے کا فیصلہ کرنا ہے نا؟"

"وہ تو میں نے کرنا ہی ہے۔ پر تو اتنا پریشان کیوں ہے؟"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" اس بار رحیم داد مسکرا کر بولا۔ "سوچ رہا تھا' تو فیصلہ کس طرح کرے گا؟ چوری کا نہ کوئی ثبوت ہے اور نہ شہادت۔" اس نے گلاس اٹھا کر پانی کا گھونٹ بھرا۔ "ہاتو کی باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس کا اونٹھ تو چوری ہوا ہے۔ اور اسے صرف لنگر ہی پر شبہ ہے۔"

"لنگر کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟" سردار شہ زور مزاری نے اس کا عندیہ لینا چاہا۔

"اس کے تو دو گواہ بھی ہیں۔" رحیم داد نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "بیان بھی اس کا ٹھیک ٹھاک لگتا ہے۔ بات بھی کڑک کر کرتا ہے۔" اس کے چہرے پر ایک بار پھر الجھن نظر آنے لگی۔ "مان لے اس نے ہاتو کا اونٹھ چوری بھی کیا ہے۔ تب بھی تو اس کے خلاف ثبوت کہاں سے لائے گا؟"

"کل سویرے تو خود ہی دیکھ لینا۔" سردار مزاری نے بے نیازی سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "لنگر نے چوری کی ہے تو اس کا ثبوت بھی مل جائے گا۔ سب کچھ کھل کر سامنے آ جائے گا۔"

"اپنی سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں۔ جانے تو نے کیا سوچا ہے۔"

"چوہدری' سچ پوچھ' سوچا تو میں نے بھی کچھ نہیں۔ پر مکدمے کا فیصلہ تو کرنا ہی ہے۔" سردار مزاری نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "ایسے پیچیدہ اور الجھے ہوئے مکدموں کا ہمارے وڈیرے اور بزرگ بہت ٹھیک طرح فیصلہ کرتے رہے ہیں۔ ہم بلوچوں کا اپنا کانون ہے اور سالہا سال سے رائج ہے۔ ہر بلوچ اسے مانتا ہے' تسلیم کرتا ہے۔ کل صبح میں بلوچوں کے اسی روایتی کانون کی رو سے فیصلہ کروں گا۔"

"کیا فیصلہ کرے گا اور کیسے کرے گا؟" رحیم داد نے حیرت زدہ نظروں سے سردار مزاری کو دیکھا۔

وہ زیر لب مسکرایا۔ بے نیازی سے بولا۔ "تو موجود ہی ہو گا۔ دیکھ لینا' کتنا ٹھیک اور صحیح فیصلہ ہو گا۔ سارا جھوٹ سچ کھل کر سامنے آ جائے گا۔ لنگر نے چوری کی ہو گی تو اسے اپنے جرم کی پوری

پوری سزا ملے گی۔ ورنہ صاف بری ہو جائے گا۔"

رحیم داد نے مزید استفسار نہ کیا۔ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ مگر اس کے ذہن میں کھلبلی مچی تھی۔ چہرے سے بے چینی جھلکتی تھی۔ آنکھوں میں دبا دبا تجسس تھا۔ سردار مزاری نے اس کی ذہنی کیفیت پر توجہ نہ دی، کھانے سے فارغ ہوا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آرام کرنے چلا گیا۔ رحیم داد بھی کچھ دیر بعد قیلولہ کرنے کی غرض سے بستر پر دراز ہو گیا۔

دن ڈھلے رحیم داد بیدار ہوا۔ کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھا احاطے کے ایک گوشے میں گھنے درختوں تلے دو نوکر ایک بوسیدہ تیر و کمان رگڑ رگڑ کر صاف کر رہے ہیں۔ کمان بانس کی ڈھائی انچ چوڑی اور مضبوط کھپچّی کی بنی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس میں بندھی ہوئی تانت بھی ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ نوکر چربی مل کر کمان کو چمکا رہے تھے۔ تانت پر بھی انھوں نے اس طرح چربی ملی تھی کہ اب اس میں تناؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ تیر، خدنگ کی مضبوط لکڑی تراش کر بنایا گیا تھا۔ اس کی تیز نوک لوہے کی تھی۔ مگر اس کی چمک دمک بھی ماند پڑ چکی تھی۔ اسے سرسوں کے تیل میں بھیگی ہوئی ریت سے آہستہ آہستہ رگڑ کر چمکایا جا رہا تھا۔ قریب ہی چاکر خان سرگانی کھڑا تھا۔

رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا سرگانی کے قریب پہنچ گیا۔ سرگانی نے اونچی آواز سے اسے سلام کیا۔ رحیم داد نے تیر و کمان کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "چاکر خان یہ کہاں سے لایا؟"

"سئیں، میں سردار کے حکم پر شاہ میر گیا تھا۔ اسے کوٹ سے لایا ہوں۔" چاکر خاں سرگانی نے رحیم داد کو بتایا۔ "کل مکدمے کا فیصلہ کرنے کے لیے اس کی ضرورت پڑے گی۔"

"مکدمے سے تیر کمان کو کیا لینا؟" رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

سرگانی کھل کر مسکرایا۔ "سئیں، کل صبح تو خود دیکھ لینا۔"

سردار شہ زور خاں مزاری بھی ٹہلتا ہوا وہاں آ گیا۔ اس نے تیر و کمان کو دیکھا۔ چاکر خاں سے پوچھا۔ "تو اسے لے آیا؟"

"ہا سردار۔" سرگانی نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "اب اسے ٹھیک ٹھاک کروا رہا ہوں۔ تو نے اسے پہلے نہیں دیکھا۔ بہت خراب اور ردی حالت تھی اس کی۔"

مزاری نے چاکر خاں سرگانی سے مزید بات چیت نہ کی۔ چند لمحے خاموش کھڑا تیر و کمان دیکھتا رہا جسے دونوں نوکر اب زیادہ تندہی سے رگڑ رگڑ کر چمکانے کی کوشش کر رہے تھے۔ سردار مزاری آگے بڑھا اور رحیم داد کے ہم راہ ایک طرف چلا گیا۔

رحیم داد کی الجھن میں اور اضافہ ہو گیا۔ مگر اس نے شہ زور خاں مزاری کے سامنے اپنی الجھن کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے مقدمے کے بارے میں مزید گفتگو ہی نہ کی۔ مگر رات تجسس اور بے چینی کے عالم میں کٹی۔

☆

مزاری نے خلاف توقع اپنی قیام گاہ کے بجائے دریا کے ساحل پر کچہری لگائی۔ کچہری کے لیے ایک اونچے ریتلے تودے کو منتخب کیا گیا۔ جس پر ایک گھنے درخت کا سایہ تھا۔ بلندی پر تودے کی سطح ہموار تھی۔ اسے صاف کر کے غالیچہ بچھایا گیا۔ سردار مزاری اس پر دو لٹھ مار کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد بھی اس کے ہمراہ تھا۔ مگر وہ تودے کے اوپر نہ گیا۔ وہاں صرف سردار شہ زور خاں مزاری تھا۔ وہ اطمینان سے بیٹھا حقے پر آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔

تودے کے نشیب میں چاکر خاں سرگانی ایک طرف ادب سے گردن جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ سردار مزاری کے عین سامنے ہاتو تھا۔ ذرا ہٹ کر لنگر خاں اپنے دونوں گواہوں کے ساتھ نظریں نیچی کیے سہما ہوا کھڑا تھا۔ گاؤں کے تمام بڑے بوڑھے اور جوان بھی موجود تھے۔ وہ نیم دائرے میں ریتلی زمین پر بیٹھے تھے۔ ہر شخص گم صم تھا اور سردار مزاری کے دبدبے سے مرعوب نظر آتا تھا۔

کچھ ہی فاصلے پر دریائے سندھ بہہ رہا تھا۔ پہر دن گزر چکا تھا۔ دریا کی تیز اور تند لہریں امڈ رہی تھیں۔ مچل رہی تھیں۔ دھوپ سے جھلملا رہی تھیں۔

شہ زور خاں مزاری نے حقے کی نے ایک طرف کی۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔ لنگر خاں کی جانب نظریں اٹھا کر گویا ہوا۔ "لنگر، تو نے اپنی صفائی میں کچھ اور کہنا ہے۔" اس کے لہجے میں رعب اور دبدبہ تھا۔

لنگر نے نظریں بلند کیں۔ ہاتھ باندھ کر عاجزی سے بولا۔ "سئیں سردار! مجھے اپنی صفائی میں جو کچھ کہنا تھا پہلے ہی کہہ چکا۔ میں نے اب اور کچھ نہیں کہنا۔"

"تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ تو نے ہاتو جتوال کا اونٹھ چوری نہیں کیا۔ تو نے اپنے بیان میں یہی کہا تھا نا؟"

"ہا سئیں، میں نے یہی کہا تھا۔ ایک بار فیر کہتا ہوں، میں نے ہاتو کا اونٹھ چوری نہیں کیا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنے کان پکڑے اور انکار میں ہولے ہولے گردن ہلانے لگا۔ "سئیں سردار! میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ تو مالک ہے۔ میں تیرا غلام ہوں، بانھا ہوں۔ میں تیرے سامنے کیسے جھوٹ بول سکتا ہوں۔"

"تو نے اگر ہاتو کا اونٹھ چوری نہیں کیا تو تیرے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟" سردار شہ زور خاں مزاری نے جرح کرنے کے انداز میں دریافت کیا۔

"سئیں، ثبوت تو اسے پیش کرنا چاہیے۔" اس نے ہاتو کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "اس کے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں نے اس کا اونٹھ چوری کیا؟"

"سئیں سردارا، توں راضی باضی ہووی۔ سکھی، صحت ہووی۔ تیرے بالیں بچیں، ڈیڈھی پردے سب کی خیر ہووی۔" ہاتو گڑگڑا کر فریادی ہوا۔ "سئیں میرا اونٹھ لنگر ہی نے چوری کیا ہے۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے اپنا اونٹھ اس کے گھر کے آگے اپنی آنکھوں سے بندھا ہوا دیکھا تھا۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

"بکواس نہ کر۔ ثبوت پیش کر۔" لنگر خاں نے ڈپٹ کر کہا۔

سردار مزاری کو اس کا رویہ سخت ناگوار گزرا۔ اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ کڑک کر بولا۔ "لنگر!" اس کے لہجے سے برہمی ٹپک رہی تھی۔ "اس کا اونٹھ بھی چوری ہوا اور یہی ثبوت بھی پیش کرے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"اس کا تو کوئی گواہ بھی نہیں۔" لنگر نے نرم لہجے میں ایک بار پھر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "میرے تو دو گواہ موجود ہیں۔"

سردار مزاری نے اس کی دلیل رد کر دی۔ "تو نے جو گواہ پیش کیے، ان کے بیانات سے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ تو نے ہاتو کا اونٹھ چوری نہیں کیا۔" مزاری نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تجھے دریا میں غوطہ لگا کر اپنی بے گناہی کا ثبوت دینا ہو گا۔ یہ بلوچوں کی بہت پرانی ریت ہے۔ یہ ان کا اپنا کانون ہے۔ اس مکدمے کا فیصلہ اسی کانون کی رو سے ہو گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "تجھے بلوچوں کے اس کانون کا پتہ ہے؟"

"ہاں سردار! مجھے پتہ ہے۔ بالکل پتہ ہے۔" لنگر خاں نے نظریں اٹھا کر سردار مزاری کو دیکھا۔ مگر اس کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر دونوں ہاتھ جوڑے اور گڑگڑانے لگا۔ "سئیں سردارا، میں نے ہاتو کا اونٹھ چوری نہیں کیا۔ میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

"تو سچا ہے تو ڈرتا کیوں ہے؟" شہ زور خاں مزاری نے ڈپٹ کر کہا۔ "تیری سچائی کا ابھی امتحان ہو جائے گا۔ سارا جھوٹ سچ سامنے آجائے گا۔"

"سئیں، تجھے میرے بیان پر یکین نہیں تو میرے گواہوں سے پوچھ لے۔" لنگر خاں نے عاجزی سے کہا۔ "تو ان پر جیسی چاہے جرح کر لے۔"

"بکواس بند کر۔" سردار مزاری نے اسے جھڑک دیا۔ "یا تو یہ مان کہ اونٹھ تو نے چوری کیا ہے، ورنہ پکا ثبوت دینے کے لیے تیار ہو جا۔ تو اگر سچا ہے تو ہنستا مسکراتا پانی سے باہر آجائے گا۔" اس نے گہری نظروں سے لنگر خاں کو دیکھا۔ "بول کیا کہتا ہے؟"

"سئیں سردار! میں تیار ہوں۔" لنگر خاں آمادہ ہو گیا۔ "میں دریا میں غوطہ لگا کر اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کروں گا۔"

"شاباش! ہے تو اچھی پرکھ والا بلوچ لگتا ہے۔" سردار مزاری خوش ہو کر بولا۔

"سئیں، میرے پرکھے اور وڈیرے ماچھی نہیں تھے۔" لنگر نے اپنے بلوچ ہونے کے بارے میں مزاری کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ "وہ آجڑی ہوتے تھے۔ ان کے پاس شاندار گھوڑے تھے۔ بہت وڈا ٹلگ ہوتا تھا۔"

"یہ بتا، تیرا مددگار کون ہو گا؟"

لنگر نے اپنے ایک گواہ کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "سئیں یہ جلاوت میرا مددگار بنے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" مزاری مڑ کر چاکر خاں سرگانی کی جانب متوجہ ہوا۔ "چاکر! تیر کون چھوڑے گا؟"

"نوگیر!" سرگانی نے اونچی آواز سے پکارا۔ ریت پر بیٹھے ہوئے افراد نے نظریں گھما پھرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک نوجوان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا قد اونچا تھا۔ چھاتی کشادہ تھی۔ بازو مضبوط تھے۔ سرگانی نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سردار شہ زور خاں مزاری کو مطلع کیا۔ "سئیں سردار! میں نے اسے تیر چھوڑنے کے لیے تیار کیا ہے۔"

مزاری نے نوگیر کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "نوگیر! آگے آجا۔"

نوگیر خاں بڑھ کر آگے آگیا اور سردار مزاری کے روبرو نظریں جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ مزاری نے چاکر خاں سرگانی کو حکم دیا۔ "چاکر! اسے تیر کمان دے دے۔" اس نے گردن موڑ کر لنگر خاں کی جانب دیکھا۔ "لنگر اب تو دریا میں اتر جا۔ جب میں ہاتھ اٹھاؤں تو ٹھہر جانا۔ نوگیر کے تیر چھوڑتے ہی پانی کے اندر غوطہ مار لینا۔"

لنگر خاں نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے پگڑی اور قمیص اتار کر ایک طرف ریت پر رکھی۔ پیروں سے جوتے اتارے اور کپڑوں کے قریب ہی رکھ دیے۔ اس کے چہرے پر گہرا سکوت طاری تھا۔ وہ دریا کی جانب بڑھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پانی میں اتر گیا۔ وہ ٹھہرا نہیں۔ آگے اور آگے بڑھتا

گیا۔ پانی جب اس کے سینے سے بھی اوپر پہنچ گیا تو مزاری نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ اونچی آواز سے کہا۔ "ٹھیر جا لنگر۔" لنگر خاں رک گیا۔ دریا کی متلاطم موجوں کے درمیان اس کا سر ابھرا ہوا تھا۔ بقیہ جسم پانی کے اندر تھا۔ وہ کنارے سے خاصے فاصلے پر تھا اور گردن موڑے سردار شہ زور خاں مزاری کی سمت ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

سردار مزاری نے نوگیر خاں کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا۔ کمان چاکر خاں سرگانی سے لے کر کندھے پر لٹکائی۔ تیر ہاتھ میں سنبھالا اور کھلے میدان میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا سانولا چہرہ دھوپ کی تمازت سے تمتما رہا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کی نظریں بھی شہ زور مزاری کی جانب اٹھی تھیں۔

لنگر خاں کے مددگار جلاوت نے جھٹ اپنی پگڑی اور قمیص اتاری۔ پیروں سے جوتے علیحدہ کیے۔ شلوار کے پائنچے گھٹنوں سے اوپر کیے اور اس کا گھیر نیفے میں اڑس لیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا نوگیر کے نزدیک پہنچ گیا۔ اب وہ نہایت مستعد اور چاق چوبند نظر آ رہا تھا۔

نوگیر نے تیر چلّے پر چڑھایا۔ سب کی نظریں اس کی جانب اٹھی تھیں۔ نوگیر گردن کو خم دے کر چوکنا نگاہوں سے سردار مزاری کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے اشارے کا منتظر تھا۔ جلاوت دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے چوکس کھڑا تھا۔ دریا کی مچلتی لہروں کے اوپر لنگر خاں کا سر صاف نظر آ رہا تھا۔ سورج کی تیز کرنیں اس کے چہرے پر جھلملا رہی تھیں۔

اس کی آنکھوں سے پریشانی عیاں تھی۔ وہ گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ کبھی سردار مزاری کی جانب دیکھتا کبھی نوگیر کے ہاتھوں میں دبی کمان کو۔

ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ سردار مزاری مسند پر خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ تودے کے نشیب میں گاؤں کے بڑے بوڑھے اور جوان بیٹھے تھے۔ سب دم بخود تھے۔

رحیم داد حیران اور پریشان نظروں سے مزاری کی جانب دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے سردار شہ زور مزاری نے ہاتھ اٹھا کر نیچے کیا۔ نوگیر خاں کو سگنل ملا۔ اس نے کمان کو پوری قوت سے کھینچا اور چھوڑ دیا۔ تیر چلّے سے نکلا اور تیزی سے فضا میں سنسناتا ہوا چلا۔ لنگر خاں نے اپنی ناک انگلیوں سے دبائی اور جھٹ ڈبکی لگائی۔ وہ پانی کے اندر چلا گیا۔ جلاوت تیر پر نظریں جمائے سرپٹ دوڑا۔

تیر درختوں کی اوٹ میں غائب ہو گیا۔ اس کے تعاقب میں دیوانہ وار بھاگتا ہوا جلاوت بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ سب کی نظریں اسی سمت اٹھی تھیں جدھر جلاوت گیا تھا۔ دریا گنگناتا ہوا بہتا رہا۔ ہوا کے تھپیڑوں سے پانی میں ہلچل پیدا ہوتی۔ بار بار لہریں اٹھتیں اور کناروں سے ٹکرا کر بکھر جاتیں۔

آخر جلاوت درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ تیر اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔ وہ تیزی سے دوڑتا ہوا قریب آیا اور ریتیلے تودے پر چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ اس نے تیر مزاری کے سامنے ڈال دیا۔ لڑکھڑایا اور مزاری کے قدموں کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کی سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔

سردار شہ زور خاں مزاری نے تیر مٹھی میں دبا کر ہاتھ بلند کیا۔ اونچی آواز سے کہا۔ "لنگر، اپنا سر پانی سے باہر نکال۔ جلاوت تیر لے کر آ گیا۔ تیرا امتحان ختم ہو گیا۔"

مگر لنگر خاں کا سر پانی سے باہر نہ نکلا۔ ہر نگاہ دریا کی جانب اٹھی تھی۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ سردار مزاری نے زیادہ اونچی آواز سے لنگر کو پکارا۔ اس بار بھی نہ پانی میں ہلچل ہوئی نہ لنگر خاں کا سر لہروں کے درمیان ابھرا۔ شہ زور خاں مزاری نے تیسری بار لنگر خاں کو پکارا۔ اس کی آواز زیادہ اونچی اور گرج دار تھی۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ کوئی نہ بولا، سب خاموش تھے۔ دم بخود تھے۔ مڑ مڑ کر دریا کی جانب دیکھتے تھے۔ انھیں لنگر خان کی تلاش تھی۔ مگر اس کا سر پانی سے نہ ابھرا۔

مزاری کے حکم پر غوطہ خور پانی میں اترے۔ دور دور تک تیرتے ہوئے گئے۔ جگہ جگہ غوطے لگائے۔ لیکن لنگر خان کا کوئی سراغ نہ ملا۔

سردار مزاری دو زانو بیٹھا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں کے گرد خیری لپٹی ہوئی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ حقے کی نے ہونٹوں سے لگائے آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی تھی۔

دریائے سندھ پر سکون تھا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ سورج چڑھ کر آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ مگر درختوں کے نیچے ابھی تک ٹھنڈک تھی۔ دریا کی جانب سے آتے ہوئے بھیگے بھیگے جھونکے خوش گوار اور فرحت بخش تھے۔

ذرا دیر بعد سردار مزاری نے حقے کی نے ہاتھ سے ایک طرف کی۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔ حاضرین کو مخاطب کیا۔ "لنگر، اگر ڈوب کر مر گیا تو اس کی لاش اب تک ابھر کر پانی کے اوپر آ جانا چاہیے تھی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "میں نے غلط تو نہیں سوچا؟"

سامنے نیم دائرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک بوڑھے نے اس کی تائید کی۔ "ہاں سئیں،

اب تک اس کی لاش پانی پر آجانا چاہیے تھی۔"

ایک اور آواز ابھری۔ "سیں سردار، تونے بالکل ٹھیک سوچا۔"

مزاری نے اس بار کھل کر اپنے شک کا اظہار کیا۔ "لگتا ہے وہ پانی کے اندر ہی اندر تیرتا ہوا کسی طرف نکل گیا۔ وہ ماچھی ہے۔ زبردست تارا اور تیراک ہے۔ وہ بالکل ایسا کر سکتا ہے۔" اس کے چہرے سے جھنجلاہٹ جھلکنے لگی۔ "پر وہ بھاگ کر نہیں جا سکتا۔" اس نے مڑ کر چاکر خان سرگانی کی جانب دیکھا۔ "چاکر! بیڑیاں لنگر کو ڈھونڈنے کے لیے روانہ کر۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا ہو گا۔" اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ "لنگر کو گرفتار کیا جائے اور فوراً پیش کیا جائے۔"

حکم ملتے ہی چاکر خان سرگانی نے ملاحوں کو ہدایات جاری کیں کہ وہ لنگر خاں کو تلاش کریں اور جیسے بھی ممکن ہو پکڑ کر سردار مزاری کے روبرو پیش کریں۔ فوراً پانچ کشتیاں لنگر خاں کی تلاش میں مختلف سمتوں کو روانہ ہو گئیں۔

دیکھتے دیکھتے کشتیاں دریا کی سطح پر دھبوں کی مانند نظر آنے لگیں۔ پھر وہ لہروں پر ڈولتی، ہچکولے کھاتی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

☆

کشتیوں پر بیٹھے ہوئے ملاح چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ لنگر خاں کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ چپواروں پر تیزی سے چل رہے تھے۔ سانولے جسم دھوپ سے چمک رہے تھے۔ وہ بار بار ہاتھ اٹھا کر پیشانیوں پر آئے ہوئے پسینے کے قطروں کو پونچھتے اور زیادہ مستعدی سے کشتیوں کو آگے اور آگے بڑھاتے۔

نشیب میں، لگ بھگ تین میل آگے جہاں دریا نیم دائرہ بناتا ہوا مغرب کی جانب مڑتا تھا ایک کشتی کے ملاحوں کو دور سے جھاڑیوں سے الجھا ہوا گہرا نیلا منجھلا نظر آیا۔ جھاڑیاں دریا کے کنارے تھیں اور پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ منجھلا شاخوں سے الجھا ہوا تھا اور ہوا کے تھپیڑوں سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ ملاحوں نے فوراً کشتی موڑی اور جھاڑیوں کی جانب بڑھے۔ قریب پہنچ کر انھوں نے دیکھا نیلے منجھلے کے ساتھ ہی ایک گھنی شاخ میں لنگر خاں کی لاش پھنسی ہوئی تھی اور پانی پر ادھر ادھر ڈول رہی تھی۔ لاش بالکل برہنہ تھی۔

ملاح جھٹ کشتی سے پانی میں اترے۔ تیرتے ہوئے لاش کے قریب پہنچے۔ اسے گھنی شاخ سے علیحدہ کیا اور کشتی میں ڈال دیا۔ نیلا منجھلا، جسے پانی میں ڈبکی لگاتے وقت لنگر خاں باندھے ہوئے تھا، اب ملاحوں کے ہاتھ میں دیا تھا۔ انھوں نے منجھلا، لنگر خان کی برہنہ لاش پر ڈال دیا اور کشتی تیزی سے کھیتے ہوئے شمشیر والی کی سمت بڑھے۔

کشتی منزل مقصود پر پہنچی۔ کنارے لگائی گئی۔ لنگر خاں کی لاش اتاری گئی۔ اور سردار شہ زور خاں مزاری کے روبرو ریتلی زمین پر رکھ دی گئی۔ منجھلا ہٹا کر اس پر ایک ملگجی سفید چادر ڈال دی گئی۔

سردار مزاری نے لنگر کی لاش غور سے دیکھی مگر خاموش بیٹھا رہا۔ کچہری ابھی برخاست نہیں ہوئی تھی۔ تودے کے نشیب میں ہاتو کھڑا تھا۔ ذرا ہٹ کر جلاوت اور لنگر خاں کا دوسرا گواہ خمیسو خاں کھڑا تھا۔ ان کے نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ سہمے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ان کے چہروں سے خوف اور پریشانی جھلک رہی تھی۔

رحیم داد، ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے ریت پر بچھی ہوئی چٹائی پر گم صم بیٹھا تھا۔ وہ سہمی ہوئی نگاہوں سے بار بار لنگر خاں کی لاش دیکھتا جو ریت پر پڑی تھی۔ جس چادر سے لاش ڈھکی تھی وہ ہوا کے جھونکوں سے ہولے ہولے تھرتھرا رہی تھی۔ لنگر خاں کی موت سے رحیم داد خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے اور خدشات کلبلا رہے تھے۔

لیکن سردار مزاری کے چہرے پر گھبراہٹ یا پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔ لاش کے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد مقدمے کی کارروائی، جو معطل ہو گئی تھی، دوبارہ شروع ہو گئی۔ مزاری نے لنگر خاں کی لاش کی جانب ہاتھ اٹھا کر اپنا فیصلہ سنایا۔ وہ اونچی آواز سے سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔

"سب کو پتہ ہے کہ لنگر ماچھی تھا۔ ماچھی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت اچھا تیراک بھی تھا۔ سچا اور بے گناہ ہوتا تو میری پہلی ہی پکار پر پانی سے باہر نکل کر ہنستا مسکراتا سب کے سامنے آجاتا۔ پر وہ جھوٹا اور چور تھا۔ تب ہی ڈوب کر مر گیا۔ اسے مرنا ہی تھا۔ اس نے ہاتو کا اوٹھ چوری کیا تھا۔ اسے چوری کی سزا مل گئی۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر آسمان کی جانب اشارہ کیا۔ "سچ پوچھو تو اس کا فیصلہ اوپر والے نے کیا۔"

ایک بوڑھے نے جو وضع قطع سے گاؤں کی مسجد کا ملا نظر آتا تھا، اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اونچی آواز سے کہا۔ "سیں سردار، تونے بالکل سچ کہا۔ اصلی فیصلہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہوتا ہے۔ اس کی نظروں سے کوئی گناہ گار بندہ نہیں بچ سکتا۔ اسے اپنے کیے کی ضرور سزا ملتی ہے۔ لنگر کو بھی اللہ نے چوری کی سزا دی۔"

ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ سب چپ بیٹھے تھے۔ مگر ہاتو زیادہ دیر خاموش نہ رہا۔ اس نے ہالا دی۔ "سیں سردار، توں سکھی صحت ہووی۔ مال جان، سب کی خیر ہووی۔" اس نے قدرے

توقف کیا۔ "سیں، لنگر کو تو چوری کی سزا مل گئی۔ پر میرا کیا بنے گا؟" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ "سیں، میں مصیبت دا ماریا غریب جتوال ہوں۔ میں تباہ ہو گیا۔ مجھے میرا اوٹھ ولا دے...... توں سدا جیویں، رب راضی ہووی۔"

"تجھے، تیرا اوٹھ ملے گا، ضرور ملے گا۔ پر تو چپ کر کے کھڑا رہ۔" سردار مزاری نے اسے تسلی دی۔ گردن کو ہلکا سا خم دیا۔ جلاوت اور خمیسو خاں کی جانب متوجہ ہوا۔ انھیں قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ تند اور تیکھے لہجے میں بولا۔ "لنگر نے چوری کی تھی، اسے اپنے جرم کی سزا مل گئی۔ تم دونوں نے جھوٹی گواہی دی تھی، تم کو کیا سزا ملنی چاہیے؟"

جلاوت اور خمیسو نظریں نیچی کیے دم بخود کھڑے رہے۔ انھوں نے کچھ نہ کہا۔ ان کے چہروں پر خوف کے سائے پھیل گئے۔

سردار شہ زور خاں مزاری نے سامنے بیٹھے ہوئے گاؤں کے بڑے بوڑھوں پر نظر ڈالی۔ ان میں جو سب سے زیادہ معمر بلوچ نظر آتا تھا اسے مخاطب کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "بابے، تو عمر میں سب سے وڈا نظر آتا ہے۔ تو نے تو ایسے بہت مکدمے دیکھے ہوں گے۔ تو بتا جھوٹی گواہی دینے کی کیا سزا ہونی چاہیے؟ تو بلوچوں کی ریتاں رسماں ٹھیک طرح جانتا ہے۔ ان کے کانون کو بھی سمجھتا ہے۔ میں تیری رائے اور تیری صلاح معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

بوڑھا لاٹھی کے سہارے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سر اور ڈاڑھی کے بال روئی کے گالوں کی مانند سفید تھے۔ کمر بھی جھکی ہوئی تھی۔ دانت گر گئے تھے۔ وہ پوپلے منہ سے لڑکھڑاتی آواز میں گویا ہوا۔ "سردار! تو نے ٹھیک سوچا۔ میری عمراں بہت ہے۔ تو نے اپنے ماپیو سے سنا ہو گا۔ جب لاٹ سنڈمن نے کلات پر چڑھائی کی تو مزاریوں کا سردار امام بخش بھی اپنا لشکر لے کر اس کے ساتھ گیا تھا۔ اس کے لشکر میں میرا پیو بھی تھا۔ تب میں جوان تو نہیں تھا پر اتا وڈا ضرور تھا کہ اس کی بھیڑ بکریوں کے گلے کی پوری طرح دیکھ بھال کر سکتا تھا۔ اس کا بہت وڈا رمک ہوتا تھا۔ پنجاہ سے اوپر بکریاں رہی ہوں گی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پر میرا پیو لڑائی سے نہ لوٹا۔ میں نے اسے فیر کبھی نہیں دیکھا۔ وہ بہت بہادر اور زور آور تھا۔"

سردار مزاری نے اکتا کر بوڑھے کو ٹوکا۔ "بابے، میں نے تیرے پیو کے بارے میں نہیں پوچھا۔ تو میرے سوال کا جواب دے۔"

بوڑھا بلوچ، جو بات کہتے کہتے پٹڑی سے اتر گیا تھا، فوراً سنبھلا۔ کھنکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوا۔ "سیں سردار! میں نے ان بوڑھی آنکھوں سے نہ جانے کتنے ایسے مکدمے دیکھے ہیں۔"

اس نے آنکھوں پر لگی ہوئی موٹے موٹے شیشوں کی بوسیدہ عینک درست کی۔ "کاعدہ کنون تو یہ ہے کہ چور اگر اپنا جرم نہ مانے تو اسے اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے جلتی آگ میں سے گزرنا پڑتا ہے یا پانی میں غوطہ لگانا ہوتا ہے۔ ایسے ہی جیسے لنگر کو کرنا پڑا تھا۔" بوڑھے نے لنگر خاں کی لاش کی جانب اشارہ کیا۔ "لنگر نے چوری کی تھی۔ اسے اپنے جرم کی سزا مل گئی۔ اس کے دونوں گواہ جھوٹے ٹھیرے۔" اس نے نظر بھر کر جلاوت اور خمیسو کو دیکھا۔ "جھوٹے گواہوں کی سزا یہ ہوتی ہے کہ ان کی زبانیں کاٹ دی جاتی ہیں تاکہ آگے جھوٹی گواہی نہ دیں۔ اور انھیں دیکھ کر دوسرے توبہ کریں۔ عبرت پکڑیں۔"

اس نے بات ختم ہی کی تھی کہ ایک اور بوڑھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اونچی آواز سے کہا۔ "سیں سردار، میری عمراں ویسے تو دین دار سے کم ہے۔" اس نے بوڑھے کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "پر میں نے بھی ایسے مکدمے بہت دیکھے ہیں۔ مجھے پتہ ہے جھوٹی گواہی دینے کی یہ سزا مدت ہوئی بند کر دی گئی۔"

"ایسا نہ کہہ۔ مجھے بھی پتہ ہے یہ سزا بند نہیں کی گئی۔" بوڑھے دین دار نے وضاحت کی۔ "ہاں، اتنا ضرور ہے کہ اب ایسی سزا نہیں دی جاتی۔ پر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اب چور کے لیے جلتی آگ میں سے گزر کر یا گہرے پانی میں غوطہ لگا کر اپنی تئیں بے گناہ ثابت کرنے کا پہلا جیسا چلن بھی نہیں رہا۔" اس نے گردن اونچی کی اور شہ زور مزاری کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ "پر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ بلوچوں کا پرانا کنون ختم ہو گیا۔ بلوچستان میں اب تک یہی کنون چلتا ہے۔" اس نے قدرے توقف سے کہا۔ "یہ تو سردار کی مرضی ہے جیسے چاہے مکدمے کا فیصلہ کرے۔" اس کا لہجہ اونچا ہو گیا۔ "سردار نے بالکل صحیح فیصلہ دیا۔ اور بلوچوں کے کنون کی رو سے ٹھیک ٹھیک دیا۔"

حاضرین پر سکوت طاری ہو گیا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

جلاوت اور خمیسو گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئے۔ اور سر جھکا کر گڑگڑانے لگے۔ "سیں، توں سدا جیویں۔ تیرے بالیں بچیں جیویں۔ تو سکھی صحت ہووی۔ سیں سردار ہم سے بھل ہو گئی۔ ہماری غلطی معاف کر دے۔ سیں، آگے ایسی بھل نہیں ہو گی، کبھی نہیں ہو گی۔" وہ جھک کر ناک اور پیشانی ریتلی زمین پر رگڑنے لگے۔

"سر اوپر کرو۔" سردار مزاری نے دونوں کو ڈانٹا۔ انھوں نے اپنے سر اٹھائے اور عاجزی سے مزاری کی جانب دیکھنے لگے۔ مزاری نے پوچھا۔ "بتاؤ، چوری کا اوٹھ کہاں ہے؟ سچ سچ بتانا۔"

خمیسو خاموش رہا۔ جلاوت بولا۔ "سردار، ہم نے اوٹھ نہیں دیکھا۔ سئیں کسم لے لے۔ ہم نے ہاتو کا اوٹھ بالکل نہیں دیکھا۔ سئیں معافی دے دے۔ ہم سے بھل ہو گئی۔"

"ایسے کام نہیں چلے گا۔" مزاری نے گرج کر اونچی آواز سے کہا۔ "تم دونوں کی سزا صرف اسی صورت میں معاف ہو سکتی ہے کہ اوٹھ کا فوراً کھوج لگاؤ اور اسے پیش کرو۔"

دونوں نے ایک زبان ہو کر التجا کی۔ "سردار، ہم اوٹھ کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں، اوٹھ کیسا ہے؟ کہاں ہے؟ اور کس کے پاس ہے؟"

"جب تم کو کچھ پتہ نہیں تو گواہی دینے کیوں آ گئے؟"

"بھل ہو گئی۔ سئیں معافی دے دے۔ توں سدا جیویں۔"

سردار شہ زور خاں مزاری نے حقے کی نے سنبھالی۔ منہ سے لگائی۔ چپ چاپ بیٹھا حقے پر کش لگاتا رہا۔ سامنے بیٹھا ہوا ہر شخص دم بخود تھا۔ خاموش تھا۔ پھر اس خاموشی میں مزاری کی بھاری بھرکم آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "جلاوت اور خمیسو نے جھوٹی گواہی دی ہے۔ دونوں نے اپنے جرم کو مان بھی لیا ہے۔" سردار کے چہرے سے جلال ٹپک رہا تھا۔ وہ اپنا فیصلہ سنا رہا تھا۔

"جلاوت اور خمیسو پر چار سو روپے جرمانہ عائد کیا جاتا ہے جسے چاکر خاں کے پاس جمع کرانا ہو گا۔ ہاتو جتوال کا اوٹھ چوری ہوا ہے، اسے اوٹھ ملنا چاہیے۔ جلاوت اور خمیسو اسے اوٹھ واپس کریں گے۔ دونوں کو پندرہ روز کی مہلت دی جاتی ہے۔ تب تک ضمانت کے طور پر دونوں کے بال بچے کید میں رکھے جائیں گے۔ اگر انھوں نے اس مدت میں ہاتو کا اوٹھ اور جرمانہ پیش نہیں کیا تو دونوں کے ہل بیل اور گھربار ضبط کر لیا جائے گا۔ انھیں زمین سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ فیصلے پر فوراً عمل درآمد کیا جائے۔ چاکر خان کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ جلاوت اور خمیسو کے بال بچوں کو گرفتار کر لے۔ کچہری اب برخاست کی جاتی ہے۔"

چاکر خان سرگانی آگے بڑھا۔ تودے کے اوپر پہنچا۔ اس نے شہ زور مزاری کی ٹانگوں اور کمر کے گرد لپٹی ہوئی خیری کی گرہ کھول دی۔ مزاری نے ٹانگیں پھیلا کر سیدھی کیں۔ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ تودے سے نیچے اترا اور رحیم داد کے ہم راہ بستی کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆

شام کا اندھیرا دھیرے دھیرے بلندی سے نیچے اترنے لگا۔ سردار مزاری اور رحیم داد احاطے کے ایک گوشے میں کھلے آسمان تلے موڑھوں پر بیٹھے شراب نوشی کر رہے تھے۔ شراب ببول کی چھال سے کشید کی گئی تھی۔ بہت تلخ تھی۔ تند اور تیز بھی تھی۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ دونوں دکی شراب کے گھونٹ آہستہ آہستہ بھرتے رہے۔

قدموں کی آہٹ سن کر انھوں نے مڑ کر دیکھا۔ چاکر خان سرگانی اندھیرے سے نکل کر ان کی جانب بڑھا۔ اس کے ہم راہ دو عورتیں بھی تھیں۔ انھوں نے بوچھن کے آنچل سے بکل مار کر اپنے چہروں کو اس طرح چھپا رکھا تھا کہ صرف پیشانی اور آنکھیں نظر آتی تھیں۔ وہ نگاہیں نیچی کیے سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔

سردار مزاری نے دونوں کو خمار آلود نظروں سے دیکھا۔ اس کے بشرے سے استعجاب ہویدا تھا۔

چاکر خاں سرگانی پرانا مزاج شناس تھا۔ فوراً اس کے چہرے کے تاثرات بھانپ گیا۔ آگے بڑھ کر بولا۔ "سئیں سردار، یہ جلاوت اور خمیسو کی رن ہیں۔ ان کے بچے بھی حراست میں لے لیے گئے ہیں۔" اس نے نوکروں کی کوٹھریوں کی سمت ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "ادھر ایک کوٹھڑی میں بند ہیں۔"

مزاری کا چہرہ دمکنے لگا۔ ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ ابھری۔ جھوم کر بولا۔ "انھیں نہلا دھلا۔ اجلے کپڑے پہنا۔ روٹی کھلا اور کمروں میں پہنچا دے۔"

چاکر خاں کورنش بجا لانے کے انداز میں ذرا سا جھکا۔ اور خاموشی سے واپس چلا گیا۔ دونوں عورتیں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلیں۔ دالان کے ستون سے لٹکی ہوئی لالٹین کی روشنی میں وہ سکڑی سکڑائی آگے بڑھ رہی تھیں۔ مزاری نظریں اٹھائے دونوں کو تیکھی نظروں سے دیکھتا رہا۔ ان کے جسموں کے پیچ و خم کا جائزہ لیتا رہا۔

جلاوت اور خمیسو کی بیویاں چاکر خان سرگانی کے ساتھ اندھیرے میں اوجھل ہو گئیں۔ سردار مزاری نے گلاس اٹھا کر لمبا گھونٹ بھرا۔ وہ خاموش تھا۔ رحیم داد بھی خاموش تھا۔ احاطے میں خاموشی چھائی تھی۔

کمر گاؤں کے کسی گھر میں شادی کا ہنگامہ تھا۔ ڈھول کی تھاپ پر نوجوان عورتیں اور لڑکیاں آواز سے آواز ملا کر گا رہی تھیں۔ انھوں نے ایک شوخ سرائیکی گیت چھیڑا۔ یہ پہاکہ تھا۔ رات کے سناٹے میں ان کی آوازیں دور تک سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لہک لہک کر پہاکے کے بول الاپ رہی تھیں۔

سوہنی چلی اے بزار
مارے اکھ، اٹھاوے یار
تیڈے جوبن تے بہار!
تیڈا من کرے دھک دھک

پہاکے کا آخری بول انھوں نے موقع کی مناسبت سے بگاڑ دیا تھا۔ اور ڈھولک کی تیز تھاپ پر اسے بار بار دہرا رہی تھیں۔ بول کے ساتھ ساتھ قہقہے بھی بلند ہو رہے تھے۔

رحیم داد نے اپنا گلاس اٹھایا۔ ہونٹوں سے لگایا۔ بڑا سا گھونٹ بھرا۔ اس کی نگاہیں اس سمت اٹھی تھیں جدھر سرگانی کے ہمراہ جلاوت اور خمیسو کی نوجوان بیویاں گئیں تھیں۔

"کیا دیکھ رہا ہے چوہدری؟" مزاری نے ایک آنکھ دبا کر شوخی سے کہا۔ "ادھر بھی زمین الاٹ کرالے۔ ابھی بہت متروکہ اراضی پڑی ہے۔ زمین داری کا مزا آجائے گا۔ عیش کرے گا عیش۔"

"تو کہتا ہے تو الاٹ کرالوں گا۔" رحیم داد نے انکار نہیں کیا۔ قدرے تامل کے بعد کہا۔ "مجھے ایک بات بتا۔"

"پوچھ' کیا پوچھنا چاہتا ہے؟"

رحیم داد کے ذہن میں لنگر خاں کی موت کے بارے میں جو وسوسے اور خدشات کلبلا رہے تھے' زبان پر آگئے۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "لنگر دریا میں ڈوب کر مرگیا۔ اس نے تیرے ہی حکم پر پانی میں غوطہ لگایا تھا۔ اس کے اس طرح مرنے پر تیری خلاف کتل کا کیس بن سکتا ہے۔"

"چوہدری تو کس چکر میں پڑگیا۔" شہ زور خان مزاری نے بے نیازی سے قہقہہ لگایا۔ "پہاکہ سن۔ بہت پھڑک دار ہے۔" اس نے گلاس اٹھا کر آنکھوں کے سامنے کیا۔ لمحہ بھر تک اسے تکتا رہا' پھر ہاتھ بڑھا کر رحیم داد کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا۔ نشے سے لہرا کر بولا۔ "سئیں چوہدری' ابھی تو رات شروع ہوئی ہے۔"

رحیم داد کو سردار مزاری کی بے نیازی پر سخت تعجب ہوا۔ لیکن اس کا اظہار نہ کرسکا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ رات کے سناٹے میں ڈھولک ٹھنکتی رہی۔ پہاکے کے بول گونجتے رہے۔

تیڈا یار اے سنار
تیڈا یار اے منہیار

کچھ دیر بعد ڈھولک کی تک تک رک گئی۔ قہقہوں کا ایک طوفان امڈا۔ جل ترنگ کی مانند دیر تک فضا میں کھنکتا رہا۔ قہقہے تھمے تو ایک بار پھر ڈھولک پر تھاپ پڑی۔ تیز اور تیز ہوتی گئی۔ نوجوان سہاگنوں اور چنچل دوشیزاؤں کی دوسری ٹولی نے پہاکے کے جوابی بول چھیڑے۔ وہ جھوم جھوم کر اونچی آواز سے گانے لگیں۔

سنار ڈیوی جھانجھر اں

منہیار ڈیوی ہار!
توں چل تاں بزار

رات گزرتی گئی۔ کاجل کی طرح کالی ہوتی گئی۔ سردار شہ زور مزاری نے گلاس ختم کیا۔ اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہوگیا۔ دونوں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے برآمدے کی جانب بڑھے۔ سیڑھیاں طے کیں۔ اوپر پہنچے۔ برآمدے میں کچھ دور چلنے کے بعد اپنے اپنے کمروں کی سمت بڑھے۔

کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی میں سامنے پلنگ پر ایک نوجوان عورت پیر لٹکائے گم صم بیٹھی تھی۔ وہ سرخ گوٹ کا گھگرا پہنے ہوئے تھی۔ چولا زرد رنگ کا تھا۔ اس کے گریبان پر سیاہ دھاگے سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ سر کے بال سیاہ اور چمک دار تھے۔ چہرہ تیز دھوپ میں کام کاج کرنے سے تپ کر تانبے کی مانند سرخ پڑگیا تھا۔ اس کی عمر پچیس سال سے زائد نہ تھی۔ مگر سخت مشقت اور غذائیت کی کمی کے باعث وہ اپنی عمر سے زیادہ لگتی تھی۔

رحیم داد کمرے میں داخل ہو کر آگے بڑھا اور اس کے قریب پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ کسمسائی اور اپنا بدن سکیڑ لیا۔ رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔

"تو جلاوت کی گھر والی ہے یا خمیسو کی؟"

"میں خمیسو کی ذال ہوں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"ترا نام کیا ہے؟"

"کیا کرے گا جان کر۔" وہ بے رخی سے بولی۔

"اتا نکھرا نہ دکھا۔ آرام نال گل بات کر۔" رحیم داد نے اسے منانے کی کوشش کی۔ "مسکرا کر بول۔ یوں روٹھی روٹھی تو چنگی نہیں لگتی۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ خاموش بیٹھی رہی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ آنکھیں بجھی بجھی تھیں۔ رحیم داد خاموشی سے اکتا کر بولا۔ "چپ کر کے کیوں بیٹھی ہے۔ گل بات کر۔" اس نے نشے میں جھوم کر ہلکا قہقہہ لگایا۔ "تجھے پتہ نہیں۔ میں چاہوں تو خمیسو کو معافی دلا سکتا ہوں۔"

خمیسو کی بیوی نے چونک کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تو ایسا کر سکتا ہے؟" اس کے انداز میں حیرت اور استعجاب تھا۔

"ہاں' میں ایسا کر سکتا ہوں۔" رحیم داد نے گردن اٹھا کر اونچی کی۔ "تو فکر نہ کر۔ خمیسو کو معافی مل جائے گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس دفعہ اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ بے زاری اور جھنجلاہٹ کم ہو گئی تھی۔ "سردار اپنا فیصلہ نہیں بدلے گا۔ وہ کبھی اپنا فیصلہ نہیں بدلتا۔"

"یہ تیرے سوچنے کی گل نہیں۔" رحیم داد نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اس نے احتجاج نہ کیا۔ چپ بیٹھی رہی۔ "سردار میرا یار ہے۔ میرے کہنے پر وہ اپنا فیصلہ بدل سکتا ہے۔ تو کل ہی دیکھ لینا۔"

"سئیں، تو سچ کہہ رہا ہے۔" اس کا مرجھایا ہوا چہرہ دبی دبی مسرت سے دمکنے لگا۔ "سئیں توں سکھی صحت ہووی۔ رب راضی ہووی۔" اس کے لہجے سے خوشامد صاف عیاں تھی۔ "خمیسو کو معافی مل گئی تو میں اپنے گھر چلی جاؤں گی ناں؟"

"بالکل چلی جائے گی۔" رحیم داد کھسک کر اور قریب ہو گیا۔ عین اس وقت سنسان رات میں کسی بچے کے بلک بلک کر رونے کی آواز ابھری۔ خمیسو کی بیوی تڑپ کر اٹھی اور دروازے کی جانب بڑھی۔ رحیم داد نے جھٹ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ آگے نہ بڑھنے دیا۔ "تو کدھر چلی؟"

"سئیں، میرا نکا رو رہا ہے۔" وہ بے قرار ہو کر بولی۔ "میں نے اسے دودھ پلانا ہے۔ وہ بھوکا ہے۔"

"بیٹھ جا۔" رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔ "تو ابھی نہیں جا سکتی۔"

خمیسو کی بیوی نے بے بسی سے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ مگر رحیم داد اس کی بے قراری کو نظرانداز کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ "چلی جانا۔ چلی جانا۔ پر ابھی نہیں۔" وہ نشے کی جھونک میں کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

بچہ بھوک سے بلکتا رہا۔ اپنی ماں کے لیے روتا رہا۔ اس کے رونے کی آواز رک رک کر سناٹے میں ابھرتی رہی۔

☆

رحیم داد ناشتا کرنے پہنچا تو شہ زور مزاری موجود نہ تھا۔ ملازم نے خلاف توقع مزاری کے پہنچے بغیر ہی ناشتا لگا دیا۔ رحیم داد نے ملازم سے پوچھا۔ "نوشیر! آج سردار کدھر ہے۔ وہ ناشتا نہیں کرے گا؟" اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"سئیں، وہ تو سویرے سویرے چلا گیا۔" نوشیر نے جواب دیا۔

"کہاں گیا ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"یہ تو مجھے پتہ نہیں۔" نوشیر نے بتایا۔ "اتنا ضرور ملوم ہے، سویرے سویرے بہت تڑکے

تھانیدار آیا تھا۔ سردار اسی کے ساتھ چلا گیا۔"

"تھانیدار کے ساتھ گیا ہے؟" رحیم داد نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں۔" نوشیر نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

رحیم داد نے مزید استفسار نہ کیا۔ نوشیر چلا گیا۔ رحیم داد پریشان ہو گیا۔ اس کے ذہن میں ایک بار پھر خدشات ابھرنے لگے۔ سوچا کہیں ایسا تو نہیں کہ تھانیدار لنگر خان کی موت کے سلسلے میں پوچھ گچھ کے لیے شہ زور کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اسے پہلے ہی دھڑکا تھا۔ شہ زور مزاری کے اس طرح تھانیدار کے ہم راہ جانے پر اور سوا ہو گیا۔

وہ تمام دن پریشان رہا۔ مزاری شام کو بھی نہ لوٹا۔ چاکر خان سرگانی بھی پھر نہ آیا۔ نوشیر کو سرگانی کے بارے میں بھی کوئی علم نہ تھا۔ دو روز گزر گئے۔ سردار مزاری واپس نہ آیا۔

رحیم داد دوپہر کے کا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا تھا۔ باہر لو کے جھکڑ چل رہے تھے۔ کھڑکی بھی بند تھی۔ کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ یکایک دروازہ کھلا۔ جلاوت اندر داخل ہوا۔ وہ چادر سے اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھا۔ اس نے فوراً دروازہ بند کیا۔ چہرے سے لپٹی ہوئی چادر ہٹائی اور رحیم داد کی جانب بڑھا۔

رحیم داد گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر جلاوت کو دیکھنے لگا۔ وہ تیزی سے لپکا اور رحیم داد کے پیر پکڑ کر گڑگڑانے لگا۔

"سئیں، توں سدا جیوی۔ سکھی صحت ہووی۔"

رحیم داد کی گھبراہٹ جاتی رہی۔ اس نے اپنے پیروں کو جلاوت کی گرفت سے چھڑایا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "سیدھا کھڑا ہو کر گل بات کر۔ یہ بتا تو ادھر کیسے آیا؟"

جلاوت نے کچھ نہ کہا۔ رحیم داد کے پیروں پر سے ہاتھ ہٹائے اور سر جھکا کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

"سئیں، میں تیرے پاس اس لیے آیا ہوں کہ توں مجھے سردار سے معافی دلوا دے۔" اس نے نہایت عاجزی سے کہا۔ "سئیں، وہ تیرا کہا ضرور مان لے گا۔"

"یہ بات تجھ سے خمیسو کی گھر والی نے کہی ہے؟"

"نا سئیں، ایسی کوئی گالہہ نہیں۔" اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ "سئیں، خمیسو کی ذال تو کید مما ہے۔ میں اسے کیسے مل سکتا ہوں؟" اس نے ملتجی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "سئیں، مجھے

پتہ ہے‘ تو مجھے معافی دلوا سکتا ہے۔”

رحیم داد سر جھکا کر سوچنے لگا۔ جلاوت منت سماجت کرتا رہا۔ “سیں‘ رب راضی ہووی۔ توں سکھی صحت ہووی۔ مجھے معافی دلوا دے۔” وہ ایک بار پھر رحیم داد کے پیر پکڑنے کے لیے جھکا۔ رحیم داد نے جھٹ اپنے پیر سمیٹ لیے۔ معاملے کی نزاکت اور پیچیدگی پر روشنی ڈالتے ہوئے بولا۔

“میں سردار سے تیری معافی کے لیے سفارش تو کر سکتا ہوں پر سوال یہ ہے کہ ہاتو کے اونٹ کا کیا بنے گا۔ اس کا تو اونٹ چوری ہوا ہے۔ وہ اپنا اونٹ چاہتا ہے۔ جب تک اسے اونٹ نہیں ملے گا۔ وہ دہائی دیتا رہے گا۔ تو خود سوچ‘ وہ جتوال ہے۔ اونٹ کے بغیر وہ کیا کرے گا۔ کیسے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرے گا۔”

“سیں‘ میں اس کا اوٹھ کدھر سے لاؤں۔ مجھے تو اس کا کچھ پتہ نہیں۔” جلاوت نے اپنی مجبوری بیان کی۔ “اوٹھ خرید بھی نہیں سکتا۔ غریب راہک ہوں۔ زمین جوتنے کے لیے میرے پاس صرف ایک جوڑی ہے۔ اسے بھی بیچ دوں۔ مویشی بھی بیچ دوں‘ تب بھی اوٹھ نہیں خرید سکتا۔” اس کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔ “سیں‘ یہ بھی تو سوچ۔ جوڑی بیچ دوں تو کروں گا کیا۔ میرے بال بچے بھوکے مرجائیں گے۔ میں ان کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔ سیں‘ میں بالکل تباہ ہو جاؤں گا۔ تو مجھے تباہ ہونے سے بچا لے۔”

“تو اکیلا تو نہیں ہے۔” رحیم داد نے اسے یاد دلایا۔ “خمیسو بھی تو ہے۔ دونوں مل کر اونٹ خرید سکتے ہیں۔ جرمانہ ادا کر سکتے ہیں۔ سردار نے اپنے فیصلے میں بھی یہی حکم دیا ہے۔”

“سیں‘ تجھے پتہ نہیں۔ خمیسو کے پاس نہ زمین ہے نہ جوڑی۔ وہ تو آجری ہے۔ گلہ بانی کرتا ہے۔ تھوڑے سے مویشی رکھتا ہے۔ انھی سے کسی نہ کسی طرح گزر بسر کرتا ہے۔” جلاوت کے لہجے میں خمیسو کے لیے جذبہ ہمدردی تھا۔ “سیں‘ وہ تو مجھ سے بھی زیادہ غریب مسکین ہے۔”

“تب تو اکیلے تجھے ہی اوٹھ دینا ہو گا۔ جرمانہ بھی پورا تجھے ہی ادا کرنا ہو گا۔”

“نا سیں‘ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔” جلاوت نے جھٹ وضاحت کی۔ “میں اپنا ہی تاوان ادا نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے روپیہ کہاں سے لاؤں گا۔”

“مان لے خمیسو روپے اکٹھا نہ کر سکا‘ تب کیا ہو گا؟” رحیم داد نے خمیسو کے بارے میں پریشان ہو کر پوچھا۔

“پندرھاں روز گزرنے کے بعد وہ تاوان کا بندوبست نہ کر سکا تو سردار اس کے مال مویشی سب

ضبط کر لے گا۔” جلاوت نے مطلع کیا۔

“خمیسو کی گھر والی اور بچوں کا کیا بنے گا؟”

“وہ کید میں رہیں گے۔” جلاوت نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ “جب تک وہ کید میں رہیں گے‘ ان کی روٹی کا خرچہ خمیسو کو دینا پڑے گا۔ جب ان کی روٹی کا خرچہ نہیں پہنچے گا تو سردار ان کو شاہ میر بھیج دے گا۔ خمیسو کی رن حویلی میں ویگار پر لگا دی جائے گی۔ وہ اکیلی ذال نہیں‘ حویلی میں ایسی اور بھی کئی ہیں۔”

“کب تک وہ حویلی میں ویگار پر رہے گی؟” رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

“یہ تو سردار کی مرضی پر ہے۔” جلاوت نے رحیم داد کو بتایا۔ “اگر خمیسو نے ادھار لے کر تاوان ادا کر دیا تب تو وہ اپنی رن اور بچوں کو لے جائے گا۔ ایسا نہ کر سکا تو سردار جب تک چاہے گا اس کے بال بچوں کو ویگار پر لگائے رکھے گا۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ سردار ہے۔” وہ ایک بار پھر گڑگڑانے لگا۔ “سیں تو سردار سے کہے گا تو وہ معافی دے دے گا۔”

“پر ہاتو کے اوٹھ کا کیا بنے گا۔؟ اسے تو اپنا اوٹھ چاہیے۔” رحیم داد نے اسے مسئلے کی نزاکت کا احساس دلایا۔ “سردار تو اسے اوٹھ خرید کر دینے سے رہا۔”

“ایسا تو وہ ہرگز نہیں کرے گا۔” جلاوت پریشان ہو کر بولا۔

“جب ایسا ہے تو وہ تجھے کیسے معافی دے سکتا ہے۔” رحیم داد نے اپنا پیچھا چھڑانا چاہا۔ “میرا کہنا مان‘ جا کر کسی نہ کسی طرح روپے کا بندوبست کر۔ اس کے بغیر کام نہیں بنے گا۔”

“سیں‘ میں نے بہت کوشش کی۔” جلاوت نے عاجزی سے کہا۔ “ادھار بھی لینے کی کوشش کی‘ پر کام نہیں بنا۔ میں غریب راہک ہوں۔ اتا وڈا تاوان کیسے ادا کر سکتا ہوں۔”

“جب تو روپے کا بندوبست نہیں کر سکتا تو میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں۔” رحیم داد نے بے رخی سے کہا۔ “میں زیادہ سے زیادہ یہ کرا سکتا ہوں کہ جرمانے کی رقم معاف کروا دوں۔ پر ہاتو کے اوٹھ کا کیا بنے گا۔ اسے تو اوٹھ چاہیے۔ وہ بھی غریب جتوال ہے۔ اسے اٹھ نہ ملا تو اس کے بال بچے بھوکے مرجائیں گے۔”

جلاوت سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ چند لمحے بعد جلاوت نے نظریں بلند کیں۔ رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر قدرے اطمینان تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی چمک تھی۔

رحیم داد نے اس سے نظریں نہ ملائیں۔ بدستور خاموش بیٹھا رہا۔

"لنگر کی بیڑی بیچ کر ہاتو کے لیے اوٹھ خریدا جا سکتا ہے۔" جلاوت نے تجویز پیش کی۔ "سردار چاہے تو ایسا کر سکتا ہے۔ سئیں، ویسے بھی لنگر کی بیڑی اب کون چلائے گا۔ رن اس کی بیمار ہے۔ کچھ نہیں کر سکتی۔ بچے بھی بہت چھوٹے ہیں۔ وہ بیڑی دریا میں نہیں چلا سکتے۔ وہ تو چپوار بھی نہیں اٹھا سکتے۔"

رحیم داد کو اس کی خود غرضی پر کسی قدر تعجب ہوا۔ مگر نظرانداز کر گیا۔ کہنے لگا۔ "ایسا ہو تو سکتا ہے۔ لیکن مجھے یہ بتا، کیا یہ سچ ہے کہ ہاتو کا اوٹھ لنگر ہی نے چوری کیا تھا؟"

"سئیں، کسم لے لے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔" جلاوت نے اپنی صفائی پیش کی۔ "پر اتنا ضرور ہے۔ جب لنگر پانی میں ڈوب کر مر گیا تو یہ ثابت ہو گیا کہ اوٹھ اسی نے چوری کیا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہاتو ٹھیک ہی کہتا ہے۔ لنگر نے جھوٹ بولا تھا۔"

"لنگر نے چوری کی ہو تو حیرانگی کی گالہہ نہیں۔" جلاوت نے دبی زبان سے کہا۔ "وہ ماچھی تھا۔ اور ماچھی تو چوری چکاری کے لیے بدنام ہی ہیں۔"

رحیم داد نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ "تو اس کا یار تھا۔ تو بھی ماچھی رہا ہو گا۔"

"نا سئیں، میں تو راہک ہوں۔ تجھے بتا بھی چکا ہوں۔" جلاوت نے صفائی پیش کی۔ "میں تو مزاری بلوچ ہوں۔ پر اس سے کیا ہوتا ہے۔ سئیں، تجھ سے کیا چھپانا، مزاریوں کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے پرکھے اور وڈیرے بھی چوری ڈکیتی کرتے تھے۔ جب وہ پچھاں کے پہاڑوں میں رہتے تھے تو نیچے اتر کر مویشی اٹھا لے جاتے تھے۔" اس نے مغرب کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "ادھر دریا کنارے آ کر بسے تو راتوں کو چھپ چھپ کر ٹولیوں میں نکلتے۔ دریا کے کنارے کھڑی ہوئی بیڑیوں اور کشتیوں میں لدا ہوا سارا مال اسباب لوٹ کر لے جاتے۔ تب ہی تو لغاری اور دوسرے تمن، مزاریوں کو دریائی لٹیرے کہتے ہیں۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "سئیں، سچ پوچھ تو پرانے زمانے میں سارے ہی بلوچ تمن لٹیرے ہوتے تھے۔ پہاڑوں میں رہتے تھے۔ جب کھانے پینے کو کم پڑ جاتا تو نیچے اترتے۔ جو مکابلے پر آتا اسے مار دیتے اور لوٹ مار کر کے بھاگ جاتے۔ بلوچوں کی ایسی لوٹ مار کرنے والی ٹولیوں کو چاپاؤ کہا جاتا تھا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مزاری بھی پہلے چور ڈکیت ہوتے تھے۔"

"اب بھی ہوتے ہیں۔ چور ڈکیت تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔" جلاوت کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔

"تیری باتوں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ لنگر نے ہاتو کا اوٹھ چوری کیا تھا یا نہیں۔" رحیم داد اصل

موضوع پر آ گیا۔ "مجھے صاف صاف بتا۔"

"سئیں، سچ پوچھ تو مجھے اوٹھ کی چوری کا کچھ پتہ نہیں۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ گھگیا کر بولا۔ "میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔"

"جب تجھے کچھ پتہ ہی نہیں تھا تو گواہی دینے کیوں چلا آیا؟"

"سئیں، گالہہ اصلی یہ ہے کہ لنگر میرا پرانا یار تھا۔" جلاوت نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ "اس نے منت سماجت کی تو میں گواہی کے لیے تیار ہو گیا۔ ویسے سچی گالہہ پوچھ تو وہ یہ ہے کہ میں نے لنگر کے پاس ہاتو کا اوٹھ نہیں دیکھا۔ یہ بات میں کسم کھا کر کہہ سکتا ہوں۔"

رحیم داد بے زاری سے بولا۔ "اب تو جا۔ مجھے سونا ہے۔"

جلاوت نے ایک بار پھر گڑگڑا کر کہا۔ "سئیں، تو سردار سے مجھے معافی دلا دے گا ناں؟"

"سردار کو واپس آنے دے۔ میں تیرے بارے میں اس سے ضرور گل بات کروں گا۔" اس نے جلاوت کو اطمینان دلایا۔

جلاوت نے بڑھ کر اس کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ مڑا اور خاموشی سے باہر چلا گیا۔

☆

دن ڈھلے سردار شہ زور مزاری اچانک رحیم داد کے کمرے میں آ گیا۔ وہ اس وقت بے خبر سو رہا تھا۔ شہ زور مزاری نے اسے جھنجوڑ کر بیدار کیا۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول کر مزاری کو دیکھا، گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

سردار مزاری قریب پڑے ہوئے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تو مجھے دیکھ کر اتنا گھبرایا گھبرایا کیوں نظر آ رہا ہے۔ بات کیا ہے؟"

"تو تھانیدار کے ساتھ گیا تھا نا؟" رحیم داد ابھی تک حیران و پریشان تھا۔ "کوئی گڑبڑ کی گل تو نہیں؟"

"ایسی تو کوئی گالہہ نہیں۔" مزاری بھی حیرت زدہ ہو گیا۔ "پر تو یہ بات کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"لنگر کی موت کے بارے میں تو پولیس پوچھ تاچھ نہیں کر رہی؟" رحیم داد نے اپنے خدشے کا کھل کر اظہار کیا۔ "میں سمجھا پولیس تجھے تفتیش کے سلسلے میں لے گئی تھی۔"

"پولیس کیوں تفتیش کرنے لگی۔ تو خامخا ایسی باتیں کیوں سوچتا ہے۔" شہ زور مزاری کے لہجے میں اس بار تلخی تھی۔ "میں اپنی زمین داری میں بسنے والے بلوچوں کا سردار ہوں۔ مجھے کچہری لگانے اور مکدموں کا فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ ان معاملات میں نہ حکومت مداخلت کرتی

ہے نہ پولیس۔ تجھے پتہ ہے یہ بلوچ تمن داروں کا علاکہ ہے۔ یہاں ان کا ہی کانون چلتا ہے۔"

"تو ایسا گیا کہ مجھ سے مل کر بھی نہ گیا۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "میں سمجھا' نہ جانے تو اس طرح اچانک کیوں تھانیدار کے ساتھ چلا گیا؟ تجھے پتہ نہیں' میں تیرے بارے میں ادھر کتنا پریشان رہا۔"

"تو خاما خا پریشان رہا۔" اس نے بے نیازی سے قہقہہ لگایا۔ "میں تجھ سے مل کر نہ گیا یہ غلطی مجھ سے ضرور ہوئی۔ پر تجھ سے مل بھی تو نہ سکتا تھا۔ تو بے خبر سو رہا تھا۔ چاکر نے مجھے یہی بتایا تھا۔ وہ تیرے کمرے میں بھی گیا تھا۔"

"چاکر خان بھی مجھے نظر نہیں آیا۔ وہ بھی تیرے ساتھ گیا تھا؟"

"وہ میرے ساتھ نہیں گیا تھا۔ پر وہ ادھر بھی نہیں رہا۔ رودجھان گیا تھا۔" سردار مزاری نے بتایا۔ "مگر اسے تو کل شام کو واپس آجانا چاہیے تھا۔"

"پتہ نہیں۔" رحیم داد نے کہا۔ "مجھے تو وہ اب تک نظر نہیں آیا۔"

"میں واپس آگیا ہوں تو وہ اب ضرور آجائے گا۔"

"یہ تو بتا تو گیا کہاں تھا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"راجن پور گیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر بھی ادھر موجود تھا۔ اسی نے بلوایا تھا۔"

"کوئی خاص گل بات تھی؟" رحیم داد نے جھٹ پوچھا۔ وہ جلد سے جلد بات کی تہہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

"وہی سیاست کا چکر ہے۔" شہ زور خاں نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ "اسمبلی میں مزاریوں کے دو ووٹ ہیں۔ حکومت دونوں ووٹ ری پبلکن پارٹی کی حمایت میں دلوانا چاہتی ہے۔ ڈپٹی کمشنر کے پاس اوپر سے حکم آیا ہے۔ تب ہی وہ اتنی بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ مزاری سرداروں سے مل رہا ہے۔ حکم کی تعمیل کرنی جو ہوئی۔"

رحیم داد کی پریشانی اب بالکل ختم ہو چکی تھی۔ مسکرا کر بولا۔ "لگتا ہے تو بھی اسی چکر میں پڑ گیا جس میں آج کل شاہ جی الجھا ہوا ہے۔"

"میں تو پڑنا نہیں چاہتا تھا پر ڈپٹی کمشنر کی بات بھی تو ٹالی نہیں جا سکتی۔" مزاری نے صفائی پیش کی۔ "ویسے اس سے یاری بھی ہے۔ کام کا بندہ ہے۔"

کمرے کا دروازہ کھلا۔ اونچے قد کا ایک نوجوان داخل ہوا۔ وہ نائیلون کی ہلکی بش شرٹ اور سفید پتلون پہنے ہوئے تھا۔ رنگ اجلا تھا۔ وضع قطع اور صورت شکل سے تعلیم یافتہ نظر آتا تھا۔

مزاری نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔ رحیم دلو سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا ملیر ہے۔ آج کل وڈا سرکاری افسر لگا ہے۔" اس نے رحیم داد کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہ اپنا چوہدری نور الٰہی ہے۔ اس کے بارے میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں۔"

رحیم داد فوراً بستر سے نیچے اترا۔ آگے بڑھا اور شہ زور مزاری کے ماموں زاد بھائی سے نہایت گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔

"یہ بھی لہور سے مزاریوں کے ووٹوں کے چکر میں ادھر بھیجا گیا ہے۔" سردار مزاری نے اس کے آنے کا مقصد بیان کیا۔ "پر ابھی کچھ طے نہیں ہوا۔"

شہ زور خاں کا ماموں زاد بھائی ایک مونڈھا سرکا کر بیٹھ گیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی تھی۔

مگر رحیم داد خاموش نہ رہا۔ پلنگ پر پیر لٹکا کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ابھی تک کچھ طے کیوں نہیں ہوا؟" اس نے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔

"جھگڑا یہ کھڑا ہو گیا ہے کہ وزارت تو لغاریوں کو مل رہی ہے۔" شہ زور مزاری نے مسئلے کی پیچیدگی پر روشنی ڈالی۔ "وہ لیگی جو ٹھیرے اور اوپر والوں کو ری پبلکن پارٹی کے لیے لیگ کے ووٹ کاٹنے ہیں۔ پر سوال یہ ہے کہ مزاری سرکاری پارٹی کو کیوں ووٹ دیں؟ وہ کہتے ہیں وزارت ہم کو دو۔ ورنہ دونوں میں سے کسی کو نہ دو۔ اسی میں معاملہ الجھا ہوا ہے۔ مجھے دوبارہ جانا پڑے گا۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے ماموں زاد بھائی کے کندھے کو ہولے ہولے تھپ تھپایا۔ "یہ مجھے اپنے ساتھ ہی لے کر جائے گا۔ اسی لیے شمشیر والی آیا ہے۔"

"تو جا رہا ہے تو مجھے بھی لہور واپس جانے دے۔"

"ادھر تو جی سخت گرمی ہے۔" شہ زور کے ماموں زاد بھائی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "زبردست لو چل رہی ہے۔ اس بار ٹمپریچر ۱۱۸ فارن ہائٹ سے بھی اوپر پہنچ چکا ہے۔"

"سن لیا تو نے۔" سردار شہ زور خان مزاری نے ہنس کر کہا۔ "اتنی سخت گرمی میں لہور جا کر کیا کرے گا۔؟ آج کل شمشیر والی بہت پر سکون جگہ ہے۔ دریا کا کنارہ ہے۔ ہوا بھی زیادہ گرم نہیں۔ اور شام کو تو ادھر ٹھنڈ ہی رہتی ہے۔ جب تک گرمی زیادہ ہے تو ادھر ہی ٹھیر۔"

"تو یہاں سے کب جائے گا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"رات کو تو ادھر ہی رہوں گا۔ صبح ہوتے چلا جاؤں گا۔" سردار مزاری نے بتایا۔ "پرسوں دوپہر تک واپس آجاؤں گا۔ دوپہر کو نہ آسکا تو رات کو ضرور پہنچ جاؤں گا۔"

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ خاموش رہا۔

”تجھے ادھر کوئی تکلیف شکیت تو نہیں؟“ مزاری نے پوچھا۔ ”میں نے نوشیر کو کہہ دیا ہے۔ وہ تیری ٹھیک طرح دیکھ بھال کرے گا۔“ سردار مزاری اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اب مجھے چلنا ہے۔ تجھے شام کو ملوں گا۔“

شہ زور مزاری اپنے ماموں زاد بھائی کے ہم راہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

رات کو پینے پلانے کا دور چلا۔ مزاری اپنے ساتھ اسکاچ کی بوتل لایا تھا۔ رحیم داد اور مزاری وہسکی کی چسکی لگاتے رہے۔ مزاری کا ماموں زاد بھائی سرشام ہی کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔ دن بھر کا تھکا ہارا تھا۔ گہری نیند سو رہا تھا۔ دریا کی سمت سے آتے ہوئے جھونکے بھیگے بھیگے تھے۔ آسمان صاف اور اجلا تھا۔ ستارے جگنوؤں کی مانند جگمگا رہے تھے۔ فضا میں رعنائی تھی۔ شگفتگی اور فرحت تھی۔

سردار مزاری اور رحیم داد سرخوشی کے عالم میں تھے۔ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ رحیم داد کو یکایک جلاوت یاد آگیا۔ اس کی منت سماجت اور مجبوری یاد آگئی۔ اس کا ذکر چھیڑنے کی غرض سے رحیم داد نے تمہید باندھی۔ ”لنگر تو مر گیا۔“

مزاری اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”اس نے تو مرنا ہی تھا۔ جیسا کیا تھا اس کی سزا پائی۔ جتوال کا اوٹھ چوری کیا اور جھوٹ بھی بولا۔“ اس نے گردن کو خم دے کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”تو نے دیکھا‘ میں نے مکدمے کا کتنا ٹھیک فیصلہ کیا۔ ہمارے وڈوں اور وڈیروں نے سوچ سمجھ کر ہی بلوچوں کے لیے کانون بنائے تھے۔ اور ایسے زبردست بنائے تھے کہ انگریزوں کی بنائی ہوئی عدالتیں اور ان کے کانون آج تک ادھر رائج نہیں ہو سکے۔ کانون تو بلوچ سرداروں کا ہی چلتا ہے۔“ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”تو خود سوچ کتنا سستا انصاف ہے۔ نہ وکیل کھڑا کرنے کی ضرورت نہ ضمانت کی اور نہ مہینوں عدالتوں کی پیشیاں بھگتنے کی۔ بلکہ کبھی کبھی تو برسوں عدالت اور کچہری کے چکر کاٹنے پڑتے ہیں۔“

”تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ رحیم داد نے اس کی خوش نودی حاصل کرنے کی غرض سے ہاں میں ہاں ملائی۔ ”لنگر کو تو اس کے جرم کی ٹھیک ٹھیک سزا مل گئی۔ اب جلاوت اور خمیسو کا کیا بنے گا؟“

”دونوں نے جھوٹی گواہی دی تھی‘ اس کی انھیں سزا ملے گی۔“

”لگتا ہے وہ تو لنگر کی یاری میں گواہی دینے چلے آئے تھے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”اوٹھ

کی چوری کے بارے میں ان کو کچھ پتہ نہیں تھا۔“

”تو نے کیسے اندازہ لگایا؟“ مزاری کا لہجہ تیکھا تھا۔ ”دونوں میں سے کوئی تیرے پاس سفارش کرانے تو نہیں آیا؟“

رحیم داد قدرے سٹ پٹایا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ اور کھل کر بات کرنا چاہی۔ مگر وہ اپنی بات کہہ نہ سکا۔ چاکر خان سرگانی اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا۔ سردار مزاری اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”چاکر‘ تجھے تو کل رات یہاں پہنچنا تھا۔“

”سئیں‘ میں کل رات نہیں پہنچ سکا۔“ چاکر خاں سرگانی نے نہایت ادب سے جواب دیا۔ ”میں آج صبح یہاں پہنچا۔“

”پر اب تک تو رہا کہاں؟“ شہ زور مزاری نے تیوری پر بل ڈال کر سوال کیا۔

”سئیں‘ میں صبح سے ہاتو جتوال کو ڈھونڈ رہا تھا۔“

”اسے کیوں ڈھونڈ رہا تھا؟“ مزاری نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”یہاں پہنچتے ہی مجھے پتہ چلا کہ ہاتو کو اس کا اوٹھ مل گیا ہے۔“ سرگانی نے اٹکتے ہوئے بتایا۔

”ہاتو کو اس کا اوٹھ مل گیا!“ سردار مزاری نے حیران و پریشان ہو کر چاکر خان کو دیکھا۔ ”کہاں ملا اسے اپنا اوٹھ؟ کیسے ملا‘ کیوں کر ملا؟“

”سئیں سردار‘ یہ تو مجھے پتہ نہیں۔“ سرگانی کے چہرے پر لالٹین کی مدھم روشنی میں پریشانی اور گھبراہٹ صاف نظر آ رہی تھی۔ ”ٹھیک ٹھیک گالہ تو ہاتو ہی بتا سکتا ہے۔ میں یہی جاننے کے لیے صبح سے اب تک اسے تلاش کرتا رہا۔“

اب مزاری بھی پریشان نظر آنے لگا تھا۔ اس نے گلاس اٹھا کر وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا۔ سرگانی سے پوچھا۔ ”پہلے یہ تو بتا اوٹھ کہاں سے ملا اور کیسے ملا؟ تو نے اس کے بارے میں کیا سنا؟“

”میں نے سنا ہے‘ اوٹھ اس کے پیؤ کے پاس تھا۔ وہ ادھر اکبر والی میں رہتا ہے۔“ سرگانی کی آواز میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ تھی۔

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہاتو نے لنگر کے خلاف جھوٹا مکدمہ بنایا تھا۔“ مزاری نے اپنے شبے کا اظہار کیا۔ ”لنگر بے گناہ تھا۔“

”لگتا تو ایسا ہی ہے۔“ چاکر خان سرگانی نے دبی زبان سے اس کی تائید کی۔ ”تب ہی تو وہ بھگوڑا ہو گیا۔ پرسوں رات چپکے سے بھاگ گیا۔“

”کہاں گیا‘ بھاگ کر؟“ مزاری نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"مجھے پتہ چلا ہے' وہ فرار ہو کر کیمرانیوں کے علاکے کی طرف گیا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک نہیں ہوا۔" سردار مزاری اور پریشان ہو گیا۔ "کیمرانی اسے پناہ دے کر اپنا باہوٹ بنا لیں گے۔ کیمرانیوں کے ساتھ ہم مزاریوں کی پرانی دشمنی ہے۔ وہ لغاری تمن کے ساتھ ہیں۔ وہ تو اسے پناہ دے کر بہت خوش ہوں گے۔"

چاکر خان سرگانی نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ سر جھکائے سہما ہوا کھڑا رہا۔ سردار مزاری نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کے چہرے پر رفتہ رفتہ جھنجلاہٹ چھا رہی تھی۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد مزاری نے چاکر خاں سے دریافت کیا۔ "وہ اکیلا گیا ہے یا اپنی ذال اور بچوں کو بھی لے گیا ہے؟"

"سیں سردار وہ اکیلا ہی گیا ہے۔ اس کے بال بچے ادھر ہی ہیں۔" چاکر خاں نے بتایا۔

"اب تو جا۔" سردار مزاری نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ "صبح ہاتو کی ذال کو اس کے بچوں کے ساتھ پیش کر۔ کراووں کو اس کی نگرانی پر لگا دے تاکہ وہ بھاگ کر ہاتو کے پاس نہ پہنچ سکے۔"

"سیں سردار' میں صبح ہاتو کے بال بچوں کو تیرے سامنے پیش کر دوں گا۔" سرگانی نے مزاری کو یقین دلایا۔ "ان کی کڑی نگرانی بھی ابھی جا کر شروع کرائے دیتا ہوں۔"

شہ زور خان مزاری کچھ نہ بولا۔ چاکر خان سرگانی خاموشی سے مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

مزاری گم صم بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ رحیم داد نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ مزاری کا گلاس اٹھا کر بڑھایا۔ "لے تھوڑی سی لگا لے۔" مزاری نے گلاس سنبھالا اور وہسکی کا گھونٹ بھرا۔

رحیم داد نے کہا۔ "برا نہ مان تو ایک بات کہوں؟"

"کہہ کیا کہنا چاہتا ہے؟" مزاری نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے' ہاتو نے لنگر کے خلاف جھوٹا مکدمہ پیش نہیں کیا تھا۔"

"اگر ایسا تھا تو وہ بھاگا کیوں؟" مزاری نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔

"وہ تیری نراضی کے ڈر سے بھاگ گیا۔" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

"اسے ڈرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سچا تھا تو اپنا سچ ثابت کر سکتا تھا۔" شہ زور خان مزاری نے اس کی دلیل رد کر دی۔

"یہی تو وہ چاہتا نہ تھا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "سچ ثابت کرنے کے لیے اسے بھی گہرے پانی میں غوطہ لگانا پڑتا۔ لنگر کا انجام دیکھ کر وہ کیسے ایسا کر سکتا تھا۔"

سردار مزاری کو اس کی بات پسند نہ آئی۔ مگر کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموشی سے اسکاچ کا گھونٹ بھرا۔ اور گلاس خالی کئے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے ٹوکا۔ "کہاں چلا؟"

"مجھے اب سونا ہے۔" سردار مزاری نے بے زاری سے کہا۔ "بہت تھک گیا ہوں۔ نیند سے آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ اب تجھ سے صبح گل بات ہو گی۔"

وہ آگے بڑھا اور اس طرف چلا گیا جہاں اس کا ماموں زاد بھائی کھلے آسمان کے نیچے اجلے بستر پر سو رہا تھا۔ رحیم داد بھی اپنے پلنگ پر جا کر لیٹ گیا۔

☆

صبح کی دھوپ در و دیوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ سردار مزاری اپنے کمرے میں اونچی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اس کے روبرو فرش پر ایک عورت میلے کچیلے لباس میں سر جھکائے سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے قریب ہی دو نیم برہنہ بچے تھے۔ ان کے لباس بھی گندے اور بہت بوسیدہ تھے۔

رحیم داد نے کمرے میں پہنچتے ہی پہلی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ وہ ہاتو ساربان کی بیوی ہے۔ اور بچے بھی اسی کے ہیں۔

ہاتو کی بیوی کا چہرہ اجڑا ہوا تھا۔ وہ عاجزی سے گڑگڑا رہی تھی۔ "سیں' سردار!" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "اوٹھ ہاتو کے پیو کو کوٹلہ رحمان کے رستے میں ملا تھا۔ اس نے اوٹھ کو پہچان لیا اور اپنے گھر لے گیا۔ وہ یہی بتاتا تھا۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ پتہ نہیں۔ سیں' میں تجھ سے بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔"

"تو یہ گالہ کتنی بار بتائے گی۔ میں نے اسے سن لیا۔" مزاری نے بے رخی سے کہا۔ "اب تو اپنی بکواس بند کر۔"

رحیم داد خاموشی سے ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ ہاتو کی بیوی نے گھگیا کر سردار مزاری کو رام کرنے کی ایک بار پھر کوشش کی۔ "سیں معافی دے دے۔ توں سکھی صحت ہووی۔ رب راضی ہووی۔"

مزاری کا ماموں زاد بھائی اسی اثنا میں کمرے میں داخل ہوا۔ وہ غسل کر کے آیا تھا۔ اس کا لباس صاف ستھرا تھا۔ اس نے مزاری کو مخاطب کیا۔ "شہ زور تجھے چلنا نہیں۔ دھوپ تیز ہو گئی تو سفر میں

تکلیف ہو گی۔ گرمی بڑھ جائے گی۔"

"میں تو بالکل تیار بیٹھا ہوں۔" مزاری کے چہرے سے خشونت غائب ہو گئی۔ مسکرا کر بولا۔ "میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

مزاری پلنگ سے نیچے اترا۔ قریب کھڑے ہوئے چاکر خاں سرگانی کی جانب دیکھا۔ ہاتھ اٹھا کر ہاتو کی بیوی اور بچوں کی جانب اشارہ کیا۔ "انھیں شاہ میر لے جا اور جیل میں بند کر دے۔"

ہاتو کی بیوی تڑپ کر بولی۔ "سئیں سردارا! میری گالہ سن لے۔"

مگر مزاری نے اس کی ایک نہ سنی۔ مڑ کر اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ بے نیازی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ اس کا ماموں زاد بھائی ساتھ ساتھ چلا۔ رحیم داد بھی اٹھ کر ان کے ساتھ چلا۔

تینوں کمرے سے نکل کر چار دیواری کے پھاٹک پر پہنچے۔ سامنے مزاری کی نئی کار موجود تھی۔ رحیم داد نے سردار مزاری کو گلے لگا کر گرم جوشی سے رخصت کیا۔ اس کے بھائی سے بھی گلے ملا۔ ڈرائیور نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ شہ زور خاں مزاری اور اس کا ماموں زاد بھائی آگے بڑھے اور کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔

کار گاؤں کے کچے راستے پر گرد کے بادل اڑاتی آگے بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

رحیم داد واپس ہوا۔ احاطے میں داخل ہوتے ہی اسے چاکر خاں نظر آیا۔ وہ پھاٹک کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہمراہ ہاتو کی بیوی سر جھکائے چل رہی تھی۔ دونوں بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ خوف سے سہمے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

رحیم داد خاموشی سے ان کے قریب سے گزرا۔ کمرے میں پہنچا۔ ناشتا کیا۔ مگر اس کی طبیعت بوجھل تھی۔ دن بھر وہ مضمحل رہا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ ہوا گرم ہو گئی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نہ نکلا۔ دن ڈھلے اس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ گرمی کی شدت اب کم ہو گئی تھی۔ رحیم داد بھی اب کسی قدر بشاش نظر آ رہا تھا۔

۴۰

پہر رات گزر چکی تھی۔ احاطے میں گہرا سناٹا چھایا تھا۔ رحیم داد برآمدے میں آنکھیں بند کیے مونڈھے پر خاموش بیٹھا تھا۔ یکایک قدموں کی آہٹ ابھری۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دیکھا۔ ڈیرے کے ملازم نوشیر کی نوجوان بیوی نوری، اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گئی۔ وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی ہوئی اس کی جانب بڑھی اور قریب پہنچ کر کھڑی ہو گئی۔

رحیم داد نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ "خیسو کی گھر والی کدھر ہے؟"

"اس کی طبیعت گڑبڑ ہے۔" نوری نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "وہ آج تیرے پاس نہیں آ سکتی۔"

رحیم داد نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ "اس کی بجائے آج تو آئی ہے؟"

وہ شرما گئی۔ دوپٹے کے آنچل سے سر ڈھکتے ہوئے رسان سے بولی۔ "نا سئیں، ایسی کوئی گالہ نہیں۔" اس نے نگاہیں نیچی کر لیں۔

"فیر تو یہاں کیوں آئی ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ "نوشیر کہاں ہے؟"

"سئیں، وہ ادھر ہے۔" اس نے نوکروں کو کوٹھریوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو اس لیے آئی تھی۔" بات کہتے کہتے وہ جھجکی۔ اس کی آواز اور دھیمی ہو گئی۔ "تجھ سے ایک گالہ کہنی ہے، مان لے گا۔"

"کہہ، کیا کہنا چاہتی ہے؟" رحیم داد نے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "کوئی خاص گل بات

کہنی ہے؟“

”خاص ہی سمجھ لے۔“ وہ دبی زبان سے بولی۔

”صاف صاف بات کر۔“ رحیم داد نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ”تو اس طرح چبا چبا کر کیوں بات کر رہی ہے؟“

”تجھے پتہ ہے سردار کل ملوک زادی اور سہراب کو ادھر پہنچا گیا ہے۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

”ملوک زادی اور سہراب ادھر ہیں!“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ”شہ زور نے تو اس بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”کہاں ہیں دونوں؟“

”آہستہ بول۔“ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ سرگوشی کے انداز میں دھیرے سے بولی۔ ”ملوک زادی تو سردار کے ساتھ والے کمرے میں بند ہے۔ سہراب کو ادھر نوکروں کی ایک کوٹھڑی میں رکھا گیا ہے۔“

”وہ دونوں کو یہاں کیوں لایا ہے؟“

”دو تین روز میں جرگہ بیٹھے گا۔ دونوں پر مکدمہ چلایا جائے گا۔“ نوری نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ وہ رحیم داد کے قریب ہی فرش پر بیٹھ گئی۔ ”لگتا ہے سردار نے تجھے کچھ نہیں بتایا۔“

”ہاں اس نے مجھے ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔“

نوری نے جھک کر اپنا منہ رحیم داد کے قریب کیا۔ رسان سے بولی۔ ”ملوک زادی تجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ اس نے تجھے اپنے پاس بلایا ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ رحیم داد سراسیمہ ہو کر بولا۔ ”مرجان کے کمرے پر تو پہرہ ہو گا۔ اس کی اور سہراب کی تو کڑی نگرانی کی جا رہی ہو گی۔“

”وہ تو کی جا رہی ہے۔ پر کمرے کے دروازے پر کوئی نہیں ہے۔“ نوری نے رازدارانہ لہجے میں مطلع کیا۔ ”راکھے بندوکیں سنبھالے باہر پھاٹک پر بیٹھے ہیں۔“

”میں اس کے پاس کیسے جا سکتا ہوں؟ کمرے کے دروازے پر تو تالا پڑا ہو گا۔“

”تالا تو ضرور پڑا ہے۔ پر اس کی چابی میرے پاس ہے۔“ نوری آہستہ سے بولی۔ ”میں روٹی پہنچانے ملوک زادی کے کمرے میں گئی تو اس نے مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ یہ جاننے کی کوشش کی، یہاں کون کون ٹھیرا ہے۔ جب اسے یہ پتہ چلا کہ تو ادھر ہے تو اس نے مجھے تیرے پاس بھیجا۔ وہ تجھ سے کچھ ضروری گالہہ کہنا چاہتی ہے۔“

”نوشیر کو پتہ ہے کہ تو ادھر میرے پاس آئی ہے؟“

”ہا سئیں، اسے بالکل پتہ ہے۔“ نوری نے بلا جھجک کہا۔ ”اس سے صلاح کر کے ہی تو تیرے پاس آئی ہوں۔ تو اس کی فکر نہ کر۔“

رحیم داد مخمصے میں پڑ گیا۔ مرجان کے بارے میں اس کے ذہن میں بہت دنوں سے تجسس تھا۔ وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ بات کرنا بھی چاہتا تھا۔ مگر مزاری کے ناراض ہونے کا خطرہ تھا۔ اور یہ بات اسے گوارہ نہ تھی۔ وہ خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔

”سئیں، توں کس سوچ میں پڑ گیا؟“ نوری نے دریافت کیا۔

”یہ خطرناک کام ہے۔“ رحیم داد نے اپنے خدشے کا کھل کر اظہار کیا۔ ”شہ زور کو پتہ چل گیا کہ میں مرجان سے چھپ کر ملا تھا تو وہ بہت برا منائے گا۔ میں اسے نراض کرنا نہیں چاہتا۔“

”سئیں، تو بالکل فکر نہ کر۔ مجھے پتہ ہے سردار تجھ سے نراض نہیں ہو گا۔“ نوری نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”وہ تیرا گہرا یار ہے۔ تجھے بہت پیار کرتا ہے۔ تیری تعریف کرتا ہے۔ نوشیر سے چلتے چلتے کہہ گیا ہے کہ چوہدری کو ذرا تکلیف نہ ہو۔ اسے ہر طرح آرام پہنچانا، خوش رکھنا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔ پر مرجان کا معاملہ اور ہی طرح کا ہے۔ شہ زور کے نراض ہونے کا خطرہ ہے۔“ رحیم داد آمادہ نہ ہوا۔

”سئیں، تو بالکل نہ گھبرا۔“ نوری نے رحیم داد کی ہمت بڑھائی۔ ”نوشیر کہتا تھا، سردار تجھ سے نراض نہیں ہو سکتا۔ وہ بچپن سے اس کی نوکری کر رہا ہے۔ وہ اس کا پرانا بانھا ہے۔ اسے ٹھیک طرح جانتا ہے، سمجھتا ہے۔“ اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”پر سئیں، تو سردار سے میرے اور نوشیر کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔ تیری گالہہ اور ہے، تو اس کا یار ہے۔ اور مہمان بھی ہے۔ ہم دونوں تو اس کے مولی بانھے ہیں۔ ہم سے تو وہ سخت نراض ہو گا۔ چمڑی ادھیڑ ڈالے گا۔ کید میں ڈال دے گا۔“

”جب سردار کا اتنا ہی ڈر ہے تو اس چکر میں تو پڑی ہی کیوں؟“

”سئیں، سچی بات یہ ہے، ملوک زادی میرے سامنے روئی، گڑگڑائی۔ منت کی۔“ نوری نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”ہے تو وہ ملوک زادی ہی۔ میں اس کی منت اور زاری پر کیسے سن نہ ہوتی۔ کیسے چپ کر کے بیٹھی رہتی۔ نوشیر بھی اسی لیے مان گیا۔“ اس نے دوپٹے کا پلو کھول کر کڑے کی شکل کا ایک زیور دکھایا۔ ”سئیں، اس نے مجھے یہ منگی بھی دی ہے۔ سئیں، تو اس سے

ضرور مل لے۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"صاف، صاف بتا تو چاہتی کیا ہے؟" رحیم داد نے صورت حال پوری طرح سمجھنے کی کوشش کی۔

"سئیں، میں ملوک زادی کے کمرے کا پچھلا دروازہ چپکے سے کھول دوں گی۔" نوری نے جھک کر مدھم لہجے میں کہا۔ "ادھر درخت بہت ہیں۔ اندھیرا بھی زیادہ ہی رہتا ہے۔ تو آدھی رات کو آجانا۔ میں تجھے وہیں ملوں گی۔ تو پچھلے دروازے سے اندر چلا جانا۔ میں باہر کھڑی چوکیداری کرتی رہوں گی۔"

رحیم داد چند لمحے خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر تجسس، خوف پر غالب آگیا۔ وہ مرجان سے ملنے اور بات کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ آہستہ سے بولا۔ "نوری، اب تو ٹر جا۔ میں آدھی رات کو ادھر پہنچ جاؤں گا۔ تو میرا انتظار کرنا۔"

نوری نے مزید کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ آگے بڑھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی برآمدے سے نیچے اتری اور احاطے میں پھیلے ہوئے اندھیرے میں گم ہو گئی۔

☆

رات کا کارواں اپنا سفر طے کرتا رہا۔ اندھیرا گہرا ہو گیا۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ رحیم داد کی آنکھوں میں دور دور تک نیند کا گزر نہ تھا۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ مرجان کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ اسے اب تک دیکھ نہ سکا تھا۔ مزاری جب اسے سہراب کے ساتھ گرفتار کر کے شاہ میر لایا تو تمام وقت اس نے اپنا چہرہ دوپٹے کے آنچل سے چھپائے رکھا۔ اب وہ اس مرجان کو دیکھ سکتا تھا، جو بلوچ ملوک زادی تھی، جو کبھی سورج سے بھی پردہ کرتی تھی اور روچ موجر کہلاتی تھی۔ وہ اس سے بات بھی کرنا چاہتا تھا اور اس راز کا سراغ لگانا بھی چاہتا تھا کہ اس نے کسی بلوچ سردار یا امیر زادے کے بجائے حویلی کے ایک ادنا خدمت گار، سہراب کو کیوں پسند کیا؟ کیوں اس کے ساتھ فرار ہونے کا خطرہ مول لیا؟

رحیم داد مسلسل مرجان کے متعلق غور کرتا رہا۔ بہت دیر بعد وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے چوکنا نظروں سے باہر دیکھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ وہ آہستہ سے نیچے اترا۔ کمرے کے اندر گیا۔ گھڑی دیکھی۔ پونے بارہ بجے تھے۔ رات نصف سفر طے کر چکی تھی۔

وہ آئینے کے روبرو جا کر کھڑا ہو گیا۔ لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس نے گھوم پھر کر مختلف زاویوں سے اپنا عکس دیکھا۔ کنگھی اٹھا کر سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو سنوارا۔ مونچھوں کو انگلیوں سے آہستہ آہستہ مروڑ کر نوکیلا بنایا۔ کپڑے اس کے صاف ستھرے تھے۔ شام ہی کو نہا کر بدلے تھے۔ اس نے سوٹ کیس سے عطر کی شیشی نکالی۔ لباس اور ڈاڑھی پر ہلکا ہلکا عطر لگایا۔

ایک بار پھر آئینے میں اس نے اپنا عکس دیکھا۔ زیر لب مسکرایا۔ مڑا، کمرے سے باہر نکلا۔ دروازہ ہولے سے بند کیا۔ برآمدے سے اتر کر سنسان احاطے میں گیا اور ادھر ادھر دیکھتا بھالتا، دبے دبے قدموں چلتا ہوا پچھواڑے کے گھنے درختوں کی جانب بڑھا۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ ہو کا عالم تھا۔ رات آدھی ہو چکی تھی۔

وہ درختوں تلے پہنچا۔ اندھیرے میں ایک سایہ اسے اپنی جانب بڑھتا ہوا نظر آیا۔ سایہ اس کے قریب آگیا۔ رحیم داد نے غور سے دیکھا، وہ نوشیر کی بیوی، نوری ہی تھی۔

وہ مدھم لہجے میں بولی۔ "سئیں، توں آگیا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ نوری بھی خاموش رہی۔ آگے بڑھی۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ پھاٹک پر بیٹھے ہوئے مسلح پہریداروں میں سے کوئی زور سے کھنکارا۔ خوف سے نوری کے قدم ڈگمگائے۔ رحیم داد نے ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کا بازو تھام لیا۔ وہ سمٹ کر رحیم داد کے بہت قریب آگئی۔ وہ ہانپنے کے سے انداز میں زور زور سے سانس بھر رہی تھی۔ اس کا جسم ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔ وہ مڑ مڑ کر پھاٹک کی سمت دیکھ رہی تھی۔

نوری کا ہاتھ سخت اور کھردرا تھا۔ اس کے میلے لباس سے پسینے کی تیز بو اٹھ رہی تھی۔ رحیم داد نے اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال دیا۔ اس نے کسمسا کر سرگوشی کی۔ "سئیں، ملوک زادی تیرا انتظار کر رہی ہے۔" اس نے قریب کے ایک دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ اس کے پیچھے ہے۔"

رحیم داد چپ چاپ اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

نوری نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے علیحدہ کیا۔ آگے بڑھی۔ آہستہ سے دروازہ کھولا۔ مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ منہ آگے بڑھا کر بہت دھیرے سے بولی۔ "سئیں، تو اندر چلا جا۔ مجھے باہر ٹھہر کر چوکیداری کرنی ہے۔" وہ جہاں تھی وہیں رک گئی۔

رحیم داد اندر داخل ہوا۔ باہر سے نوری نے دروازہ بند کر دیا۔

کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ مرجان دیوار کے قریب بچھے ہوئے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی پلنگ سے نیچے اتری اور نظریں جھکا کر اس کے روبرو کھڑی ہو گئی۔ رحیم داد نے مرجان کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ بھرا بھرا میانہ قد، بیضوی چہرہ، سیاہ اور روشن آنکھیں، سبک خدوخال، کھلتا ہوا چمپئی رنگ۔ وہ چھبیس ستائیس سال کی جوان اور خوبصورت عورت تھی۔

مگر اب اس کی آنکھوں سے ویرانی جھلکتی تھی۔ چہرہ مرجھا کر زرد پڑ گیا تھا۔ وہ بلوچی ساخت کی قمیص، پشک، پہنے ہوئے تھی۔ پشک کا رنگ گلابی تھا۔ اور اس کے جیگ پر ہفت رنگی ریشمی دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ جیگ گریبان سے سینے تک پھیلا تھا جس کی کڑھائی میں چھوٹے چھوٹے شیشے بھی لگے تھے۔ کلائیوں پر چاندی کے منقش تملل بندھے تھے۔ کانوں میں سونے کے درتھے۔ سر کے بالوں پر جگمگاتی کید تھی۔ یہ سونے کی نازک زنجیر تھی جو کانوں کے دونوں دروں سے جڑی ہوئی تھی۔ ناک میں جھلملاتا پلوہ جھول رہا تھا اس میں چونی کے برابر فیروزہ آویزاں تھا۔ مرجان بڑی طرح دار بلوچ ملوک زادی تھی۔

مرجان نے رحیم داد کو خاموش پایا تو اس کی جانب جھجکتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ مونڈھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ "سئیں چوہدری، تو کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔"

رحیم داد نے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔ "تو نے مجھے یہاں کس لیے بلایا ہے؟"

"دھیرے بول۔" وہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر گویا ہوئی۔ "میں نے شہ زور کو ایک گالہہ کہلوانی ہے، توں ہی میری گالہہ اسے پہنچا سکتا ہے۔" وہ پلنگ پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ "ادھر اور کوئی ایسا نہیں جو اس سے بات کر سکے۔ میں نے اس رات گیدڑ والا سے شاہ میر جاتے ہوئے جیپ میں اندازہ کر لیا تھا کہ تیرے ساتھ اس کی کتنی گہری یاری ہے۔"

"تو نے شاہ میر میں کسی اور کے ذریعے ایسی کوشش کیوں نہیں کی؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"میں نے کوشش کی تھی۔ شہ زور کی رن کو بلوایا تھا۔ اس کی ماں اور بھین کو بھی بلوایا تھا۔" مرجان نے بتایا۔ "پر کوئی بھی میرے پاس نہ آیا۔ صاف انکار کر دیا۔ وہ سب شہ زور سے بہت ڈرتی ہیں۔"

"مجھے بتا، تجھے شہ زور سے کیا کہنا ہے؟" رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"تجھے پتہ نہیں، سارا جھگڑا جائیداد کا ہے۔" مرجان نے کھل کر بات کی۔ "شہ زور جائیداد کی خاطر میری جان لینا چاہتا ہے۔ اس نے دوبار میرا خون کرنے کی کوشش کی۔ پر میں کسی نہ کسی طرح بچ گئی۔"

"میری سمجھ میں ابھی کچھ نہیں آیا۔" رحیم داد بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا۔

"میں تجھے سب کچھ بتا دوں گی۔ کچھ نہیں چھپاؤں گی۔" مرجان نے رحیم داد کو یقین دلایا۔ "تجھے یہ تو پتہ ہو گا، میں شہ زور کی سوتیلی ماں ہوں۔ میرا پیو رند بلوچ تھا۔ وہ صادک آباد کا معمولی زمین دار تھا۔ میں چوداں سال کی تھی جب اس نے شہ زور کے پیو، سردار نجیب خان مزاری کے

ساتھ میرا پرنا کر دیا۔ لیکن پرنا کرنے سے پہلے اس نے میرے نام سردار نجیب خاں کی جگیر کا ایک حصہ لکھوا لیا تھا۔ پنج سال بعد سردار نجیب سے میرا ایک پتر پیدا ہوا۔ جب وہ تین سال کا تھا تو اچانک بیمار پڑا اور مر گیا۔"

"کیا بیماری ہوئی تھی اسے؟"

"بیماری شیماری تو ایسی خاص نہیں تھی۔" مرجان نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اس کے مرن کے بعد مجھے پتہ چلا کہ شہ زور اور اس کے چھوٹے بھائی نے میرے پتر کو زہر دے کر مار ڈالا تھا۔" مرجان کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ "شہ زور نے دو سال بعد اپنے بھائی کو بھی مار ڈالا۔ سردار نجیب کا پہلے ہی مرن ہو چکا تھا۔ یہ سب کچھ اس نے پوری جائیداد اپنے پاس رکھنے کے لیے کیا۔"

"تیرے اور کوئی اولاد نہیں ہوئی؟"

"نہیں!" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اب شہ زور جائیداد کا وہ حصہ جو میرے نام ہے اپنے پاس رکھنے کے لیے مجھے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔"

"تیرا پیو اب کہاں ہے؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"دو سال ہوئے اس کا بھی مرن ہو گیا۔"

"بھائی بھین نہیں ہیں؟"

"بھین کوئی نہیں۔" مرجان نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "دو بھائی تھے۔ چھوٹا تین سال ہوئے چلتی ٹرین سے گر کر مر گیا۔ وڈا ہے۔ وہ صادک آباد میں زمینداری کرتا ہے۔"

"تو اپنے بھرا کے پاس کیوں نہیں گئی؟" رحیم داد نے کہا۔ "مغاریوں کے پاس چوئی کیوں پہنچی؟"

"میں صادک آباد اسی کے پاس گئی تھی۔" مرجان کا چہرہ اور افسردہ ہو گیا۔ "پر اس نے ملنے سے صاف انکار کر دیا۔ مجھے اپنے گھر میں گھسنے بھی نہ دیا۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہے۔"

"وہ تجھ سے اتنا ناراض کیوں ہے؟"

"وہ مجھ سے تب ہی سے ناراض ہے جب میرا سردار نجیب خان کے ساتھ پرنا ہوا تھا۔" مرجان نے جواب دیا۔ "وہ اس رشتے کے سخت خلاف تھا۔ اس نے پیو سے اتنا جھگڑا کیا کہ گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ میرے پرنے میں بھی شریک نہیں ہوا۔ اب مجھ سے اور بھی زیادہ ناراض ہے۔ اور اس لیے ناراض ہے کہ میں سراب کے ساتھ کیوں نکلی۔"

"ناراض ہونے کی تو گل ہی ہے۔" رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "تو نے یہ نہیں سوچا

کہ سہراب کی ہے۔ وہ تیری ہی حویلی کا ماشیا تھا۔ تو نے یہ بہت برا کیا۔ یہ تو بہت ہی بدنامی کی گل ہے۔ تو نے سب کے منہ پر کالک لگا دی۔ تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"میں سہراب کے ساتھ نہ نکل بھاگتی تو شہ زور مجھے کتل کر دیتا۔" مرجان نے صفائی پیش کی۔ "شہ زور میرے خون کا پیاسا ہے۔ وہ اسی روز سے خار رکھتا ہے جب میں حویلی میں سردار نجیب کی رن بن کر داخل ہوئی۔"

"جب تجھے پتہ ہے کہ شہ زور تیرے خون کا پیاسا ہے تو اب تو اس سے کیا کہنا چاہتی ہے؟"

"وہ جائیداد ہی کے لیے تو میرے خون کا پیاسا ہے ناں۔" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "مجھے ایسی جائیداد نہیں چاہیے۔ وہ مجھے چھوڑ دے۔ میں خوشی سے ساری جائیداد اس کے نام لکھ کر دے دوں گی۔ مجھے اس سے اب کچھ نہیں لینا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "تو میری یہ بات شہ زور تک پہنچا دے۔" اس نے رحیم داد کی جانب حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ "چوہدری مجھے بچا لے۔ وہ مجھے مار ڈالے گا۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے جائیداد نہیں زندگی چاہیے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "سئیں چوہدری، مجھے زندگی دلا دے۔ میں تیرا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

مرجان نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور بلک بلک کر رونے لگی۔ رحیم داد اٹھ کر اس کے قریب گیا اور اس کا سر آہستہ آہستہ تھپک کر تسلی دینے لگا۔ "تو اطمینان رکھ، میں شہ زور سے ضرور بات کروں گا۔ اسے سمجھاؤں گا۔ اسے ہر طرح راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔ تو آنسو پونچھ۔ آرام سے سو۔ مجھے بھروسہ ہے وہ میری بات ضرور مان لے گا۔"

مرجان نے کچھ نہ کہا۔ اس کی سسکیاں کمرے کی خاموشی میں ابھرتی رہیں۔

دروازہ چرچراتا ہوا ذرا سا کھلا۔ رحیم داد اور مرجان نے سراسیمہ ہو کر اس طرف دیکھا۔ دروازے کی آڑ سے نوری کا چہرہ نظر آیا۔ رحیم داد نے مرجان کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "بہت دیر ہو گئی۔ اب مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ فکر نہ کر مرجان، جیسا تو چاہتی ہی ویسا ہی ہو گا۔" وہ آگے بڑھا اور باہر چلا گیا۔

نوری نے دروازہ بند کیا اور اس میں تالا ڈالنے لگی۔ رحیم داد نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ درختوں کے اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا اپنے کمرے کی جانب چلا۔ برآمدے میں پہنچا اور خاموشی سے بستر پر دراز ہو گیا۔

☆

سردار شہ زور خان مزاری واپس آیا تو سردار مراد خاں شاہانی بھی اس کے ہم راہ تھا۔ رحیم داد نے اسے حیرت سے دیکھا۔ خوش بھی ہوا۔ بڑھ کر نہایت گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا۔ "شاہانی، تو کیسے ادھر آ گیا؟"

شاہانی نے علیحدہ ہوتے ہوئے بتایا۔ "شاہ جی تو ابھی کراچی سے لوٹا نہیں۔ البتہ اس کا منیجر مہربان علی، لائل پور سے واپس آ گیا ہے۔ میں ایک روز شاہ جی کی کوٹھی پر گیا اور مہربان علی مجھے مل گیا۔ میں نے تیرے کلیم کے کاغذات اس سے لے لیے۔ مجھے پتہ تھا تو ابھی ادھر ہی ہے۔ سوچا تجھ سے مل لوں گا۔ کاغذات تیرے حوالے کر دوں گا۔"

"یہ تو نے بہت چنگا کام کیا۔" رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی پتہ چلا کہ لائل پور کی زمین کی الاٹمنٹ کا کیا بنا؟"

"مہربان کہتا تھا، الاٹمنٹ میں کچھ پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ زمین پہلے ہی دو کلیم ہولڈروں کو الاٹ ہو چکی ہے۔ مکدے بازی چل رہی ہے۔ معاملہ عدالت کے سامنے ہے۔"

"یہ تو نے چنگی خبر نہیں سنائی۔" رحیم داد بجھ کر رہ گیا۔

"فکر نہ کر چوہدری۔" شہ زور مزاری نے اسے تسلی دی۔ "میں نے ڈپٹی کمشنر اور محکمہ بحالیات کے افسروں سے تیرے بارے میں بات کر رکھی ہے۔ تحصیل راجن پور میں تیرے لیے متروکہ اراضی بھی دیکھ لی ہے۔ فاضل پور کے نزدیک ہے۔"

"کیسی زمین ہے؟" رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"تو نہری زمین کو کہتا تھا۔ یہ نہری ہی زمین ہے۔" مزاری نے رحیم داد کو بتایا۔ "بہت زیادہ زمین ہے۔ تیرے لیے اڑھائی سو ایکڑ تو آسانی سے الاٹ ہو جائے گی۔"

شام کا جھٹ پٹا تھا۔ اندھیرا فضا میں آہستہ آہستہ گھل رہا تھا۔ تینوں برآمدے کے سامنے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ نوکروں نے سرکنڈوں کے بنے ہوئے مونڈھے لا کر رکھ دیے۔ وہ اطمینان سے ان پر بیٹھ گئے۔

"چوہدری یہ تو بہت ٹھیک ہوا۔" شاہانی نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "تجھے ادھر زمین الاٹ ہو گئی تو شہ زور کے ساتھ اچھا وکت گزرے گا۔ یہ یاروں کا یار ہے۔ اور کام آنے والا بندہ ہے۔"

مزاری نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "شاہانی آج صبح شاہ میر پہنچ گیا تھا۔ میں نے اس سے تیرے کلیم کے کاغذات لے کر درخواست بھی تیار کروالی۔ چاکر خان کے پاس ہے۔ دستخط کر دینا۔ دو چار روز میں وہ درخواست لگا دے گا۔ الاٹمنٹ کی پرواہ نہ کر۔ کام فٹافٹ بن جائے گا۔ میں چاہتا ہوں تو ادھر میرے پاس آ جا۔"

"الاٹمنٹ مل جائے تو ادھر بھی آتا رہوں گا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "پر میری اصلی زمین داری تو کوٹلہ ہرکشن ہی میں ہے۔ اسے میں نہیں چھوڑ سکتا۔"

"کون کہتا ہے تو اسے چھوڑ دے۔" شاہانی نے اتفاق رائے کیا۔ "پر تیرا ادھر رہنا کون سا ضروری ہے۔ تجھے خود تو زمیں داری چلانی نہیں۔ تیرا کاردار نادر خاں کام کا بندہ لگتا ہے۔ وہ زمیں داری کی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکتا ہے۔ زمیں داری تو کاردار اور کم دار ہی چلاتے ہیں۔"

"سارے ہی وڈے زمین داروں کا کام ایسے ہی چلتا ہے۔ ذرا ہشیار رہنا پڑتا ہے۔ کاردار، کم دار اور مزارعوں پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔" مزاری نے مراد خاں شاہانی کی تائید کی۔

چاکر خان سرگانی بھی پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں الاٹمنٹ کی درخواست تھی۔ رحیم داد اس کے ہم راہ کمرے کے اندر گیا۔ لیمپ کی روشنی میں اس نے درخواست پر ایک نظر ڈالی اور دستخط کر دیے۔

سرگانی چلا گیا۔

رحیم داد احاطے میں واپس پہنچا تو شام گہری ہو چکی تھی۔ گھروں میں چراغ جھلملا رہے تھے۔ باورچی خانہ نوکروں کی کوٹھریوں کے قریب ہی تھا۔ ادھر گوشت بھونا جا رہا تھا۔ اس کی تیز خوش بو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ مزاری اور شاہانی کے سامنے اسکاچ کی بوتل رکھی تھی۔

مراد خاں شاہانی نے پیگ بنا کر رحیم داد کو دیا۔ اپنا گلاس اٹھایا۔ رحیم داد کے گلاس سے ٹکرایا اور وہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے بولا۔ "مزاری نے تیرا دل بہلانے کا بھی کوئی انتظام کیا؟"

"کیا تو ہے۔" رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔

مراد خاں شاہانی ہنس کر بولا۔ "لگتا ہے، تجھے ادھر پسند کی ذال نہیں ملی۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "چوہدری، پسند ناپسند کے چکر میں نہ پڑ۔ ہر ذال چنگی ہوتی ہے۔ بس نئی ہونی چاہیے اور ہر رات ملنی چاہیے۔"

"شاہانی تو ذال کے معاملے میں بالکل سندھی وڈیرا ہے۔" مزاری نے قہقہہ بلند کیا۔ "میری ایک بھین سانگھڑ میں دیا ہی ہے۔ اس کا خاوند سندھی بلوچ ہے۔ جانے کب سے اس کا خاندان ادھر آباد ہے۔ وہ سندھی کی ایک مثال سناتا ہے۔ وہ کچھ اس طرح ہے کہ بھوک میں تو کواڑ بھی پاپڑ لگتے ہیں۔ کہتا تھا رن کے معاملے میں تو سندھی وڈیروں کا حال یہ ہے کہ کسی جھاڑی پر بوچھن پڑا لہراتا ہو تو وڈیرے دونوں بازو پھیلا کر اسے بھی بھینچ لیتے ہیں۔"

سردار شہ زور خاں مزاری نے بات ختم کی تو زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ تینوں نشے کی جھونک میں دیر تک ہنستے رہے۔

نوکر نے پلیٹ میں گرم گرم تلا ہوا مرغ لا کر میز پر رکھ دیا۔ تینوں اسکاچ وہسکی کے گھونٹ بھرتے رہے۔ نوچ نوچ کر مرغ کا گوشت کھاتے رہے۔ رات کی تاریکی بڑھتی گئی۔ سناٹا سوا ہو گیا۔ شہ زور مزاری کچھ زیادہ ہی تھکا ہوا تھا۔ پہر رات گزرتے ہی اٹھ کر چلا گیا۔ شاہانی اور رحیم داد وہسکی سے شغل کرتے رہے۔

☆

سردار مزاری کے اچانک اٹھ کر چلے جانے پر رحیم داد پریشان ہو گیا۔ وہ مرجان کے بارے میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر شہ زور اکیلا نہ تھا۔ مراد خاں شاہانی بھی ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایسی بات چھیڑنا مناسب نہ معلوم ہوا۔

مگر مزاری جا چکا تھا۔ صبح جرگہ تھا۔ اسکے شروع ہونے سے پہلے ہی رحیم داد کو مرجان کا عندیہ نہ صرف مزاری کو پہنچانا تھا بلکہ اس پر اسے رضامند کرنے کی بھی اپنے طور پوری پوری کوشش کرنا تھی۔ رحیم داد آہستہ آہستہ وہسکی کے گھونٹ بھرتا رہا اور خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ مرجان کے معاملے پر کس طرح سردار مزاری سے بات کرے۔

مراد خاں شاہانی نے اسے خاموش پایا تو اکتا کر بولا۔ "سئیں چوہدری، تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

رحیم داد لحہ بھر تک ٹکٹکی باندھے اس کا چہرہ تکتا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے شہ زور سے ایک ضروری گل کرنی تھی۔"

"وہ اتنی دیر تیرے ساتھ بیٹھا رہا، تو نے تب گالہ کر لی ہوتی۔" شاہانی نے مشتبہ نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "لگتا ہے تو میرے سامنے بات کرنی نہیں چاہتا تھا۔"

"ہاں!" رحیم داد انکار نہ کر سکا۔ "بات ہی کچھ ایسی ہے۔"

"مجھے بتانے کی نہیں؟" شاہانی نے پوچھا۔

"اب تجھے ہی بتانی ہو گی۔" رحیم داد نے کہا۔ "شہ زور مزاری تو اب اپنے کمرے میں ہو گا۔ اس کے ساتھ جلاوت کی گھر والی یا کوئی اور زنانی ہو گی۔"

"ہاں، اب اسے ملنا مشکل ہو گا۔" شاہانی نے قدرے توقف کیا۔ "کوئی خاص گالہ نہ ہو تو مجھے بتا دے۔ ویسے تیری مرضی۔"

رحیم داد اپنا مونڈھا کھسکا کر مراد خاں شاہانی سے اور قریب ہو گیا۔ اس نے ادھر ادھر چوکنا نظروں سے دیکھا۔ آس پاس کوئی نظر نہ آیا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ رحیم داد کے چہرے سے

سراسیمگی عیاں تھی۔

مراد خاں شاہانی نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو آہستہ سے پوچھا۔ "سئیں چوہدری، تو اتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے؟"

"گل ہی ایسی ہے۔" رحیم داد نے رازدارانہ انداز میں دھیرے سے کہا۔ "تجھے پتہ ہے، مرجان ادھر ہی ہے۔"

"ہوگی۔ تجھے اس سے کیا لینا۔" مراد خاں شاہانی نے بے نیازی سے کہا۔

"پہلے میری گل تو سن لے۔" رحیم داد نے سرگوشی کی۔ "اس نے ایک رات مجھے اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔"

"مرجان نے تجھے اپنے پاس بلایا تھا!" شاہانی نے چونک کر حیرت زدہ نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "تو اس کے پاس گیا تھا؟"

"ہاں میں اس کے پاس گیا تھا۔"

"تو نے اسے دیکھا ہے؟" شاہانی بدستور حیرت زدہ تھا۔

"ویسے دیکھا تو میں نے اسے ایک بار پہلے بھی تھا۔ تب وہ چدر سے منہ چھپائے ہوئی تھی۔ اندھیرا بھی تھا۔ شہ زور مزاری بھی ساتھ تھا۔ میں دیکھ کر بھی اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔" رحیم داد نے شاہانی کو بتایا۔ "پر اس رات جب اس نے اپنے کمرے میں بلوایا تب میں نے اسے ٹھیک سے دیکھا۔"

"سنا ہے بہت سوہنڑی رن ہے۔ تو بتا کیسی ہے؟" شاہانی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"ہے تو جی وہ بہت سوہنی اور جوان بھی ہے۔ بالکل مُیار لگتی ہے۔" رحیم داد نے رک رک کر بیان کیا۔ "پر اب تو سمجھو اجڑ کر رہ گئی ہے۔ موت کے ڈر نے اسے ایک دم پیلا کر دیا ہے۔" اس نے شاہانی کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "تجھے پتہ ہے، اصل جھگڑا کیا ہے؟" پھر اس نے خود ہی اپنے سوال کا جواب بھی دے دیا۔ "سارا جھگڑا تو جائیداد کا ہے۔"

"اتنا تو مجھے بھی پتہ ہے۔ یہ بہت پرانا جھگڑا ہے۔" شاہانی نے بتایا۔ "یہ جھگڑا تو شہ زور کے پیو، سردار نجیب خاں کی زندگی ہی میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے مرن کے بعد بہت بڑھ گیا۔" اس نے گلاس اٹھا کر چسکی لگائی۔ "پر جائیداد کا جھگڑا تو بہت پیچھے رہ گیا۔ اب تو یہ جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ وہ سہراب کی ساتھ بھاگ کر لغاریوں کے پاس چلی گئی۔ تجھے پتہ ہے۔ لغاریوں سے مزاریوں کی کتنی زبردست دشمنی ہے۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "مرجان نے یہ بہت برا کیا۔ اس نے شہ زور مزاری اور اس کے خاندان کی پیشانی پر ٹِک لگا دیا۔ اسے اپنی ہی حویلی کے کمی سہراب کے ساتھ نہیں بھاگنا چاہیے تھا۔" شاہانی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "بھاگنے کے لیے سہراب کے سوا اسے اور کوئی نہیں ملا۔"

"مرجان کہتی تھی، شہ زور جائیداد حاصل کرنے کے لیے اسے جان سے مار دینا چاہتا تھا۔" رحیم داد نے مرجان کی جانب سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "شاید تجھے پتہ نہیں، شہ زور اور اس کے چھوٹے بھائی حنے مرجان کو دو بار زہر دے کر مار ڈالنے کی کوشش کی۔ جائیداد کے لیے تو اس نے اپنے بھائی کو بھی کتل کرا دیا۔"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم تھا۔" شاہانی کی آنکھوں میں استعجاب تھا۔ "میں نے تو یہ سنا ہے اس کی لاش جیپ میں پائی گئی تھی۔ وہ اکیلا اپنی جیپ چلا رہا تھا۔ لغاریوں نے چھپ کر اس پر حملہ کیا اور رات کے اندھیرے میں فرار ہو گئے۔ شہ زور نے مجھے یہی بتایا تھا۔ تو بالکل نئی گالہہ سنا رہا ہے۔"

"پتہ نہیں کون سچا ہے۔ مرجان تو مجھے یہی بتاتی تھی کہ اسے شہ زور نے کتل کرایا تھا۔"

"چوہدری، سچ پوچھ تو یہ جائیداد ہوتی ہی ایسی ظالم ہے۔ اندھا بنا دیتی ہے اندھا۔" شاہانی نے اس دفعہ اپنے شبے کا اظہار کیا۔ "اب یہ بتا۔ مرجان نے تجھے کس لیے رات کو اپنے پاس بلایا تھا۔" اس نے نشے کی جھونک میں ہلکا قہقہہ لگایا۔ "یاری لگانے کے لیے تو تجھے بلایا نہیں ہوگا۔"

"ایسی کوئی گل بات نہیں۔" رحیم داد نے کھل کر بتایا۔ "وہ چاہتی ہے، شہ زور اسے معافی دے دے۔ اسے چھوڑ دے۔ جرگے میں اس کا معاملہ پیش نہ کرے تو وہ اپنے حصے کی تمام جائیداد شہ زور کے نام لکھ دے گی۔ اسے زندگی چاہیے ہے جائیداد نہیں۔ شہ زور سے یہی بات کہنے کے لیے اس نے مجھے بلایا تھا۔"

"یہ بات تو وہ شہ زور سے خود بھی کہہ سکتی ہے۔" شاہانی نے کہا۔ "تیرے ذریعے کیوں کہلوانا چاہتی ہے؟"

"اس نے شہ زور سے گل بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ لگتا ہے، اسے کامیابی نہیں ہوئی۔" رحیم داد نے توجیہہ پیش کی۔ "میں نے تو اس کی باتوں سے یہی اندازہ لگایا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ یہ سمجھتی ہو کہ میرے سمجھانے بجھانے پر شہ زور راضی ہو جائے اور جائیداد لے کر اسے چھوڑ دے معافی دے دے۔"

مراد خاں شاہانی کچھ دیر خلا میں گھورتا رہا۔ وہ سوچتا ہوا نظر آرہا تھا۔ پھر اس نے مڑ کر رحیم داد

کی جانب دیکھا۔ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”سئیں چوہدری' ویسے تو شہ زور مزاری کو مرجان کی تجویز مان لینی چاہیے۔ پر اب ایسا ہو نہیں سکتا۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا؟“ رحیم داد نے مراد خاں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ ”اسے جائیداد چاہیے' وہ مل جائے گی۔ مرجان کا خون وہ کیوں اپنی گردن پر لینا چاہتا ہے۔ جب آسانی سے کام بن جائے تو خون خرابہ کرنے سے کیا فائدہ۔“ اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ ”مجھے کنون کا ٹھیک سے پتہ نہیں۔ پر ایسے ہی ایک مکدمے میں مجھے گواہ بننا پڑا تھا۔ میرے پڑوس میں ایک رانڈ تھی۔ اس کے بھی کوئی اولاد نہ تھی۔ مرنے کے بعد سوتیلے پتروں نے زمین پر کبضہ کر لیا۔ لیکن مرنے والی کے بھائی بھینوں نے ان کے خلاف مکدمہ کر دیا۔ اور جیت بھی گئے۔“

”تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“ شاہانی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مرجان کے مرنے کے بعد اس کا بھائی بھی جائیداد حاصل کرنے کے لیے شہ زور کے خلاف مکدمہ کر سکتا ہے۔ اسے جیت بھی جانا چاہیے۔“

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ مراد خاں شاہانی نے اختلاف رائے نہ کیا۔ ”شہ زور مزاری کو بھی اس کا پتہ ہو گا۔ تب ہی وہ جرگے کے سامنے مکدمہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ اگر مرجان پر سیاہ کاری کا جرم ثابت ہو گیا۔ اور جرگے نے اسے کالی اور سہراب کو کالا کرار دے دیا تو جائیداد پر مرجان کا حک ختم ہو جائے گا۔ اس کی ساری جائیداد خود بخود مزاری کو مل جائے گی۔“

”تب تو شہ زور نہیں مانے گا۔“ رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس نے قدرے توقف کیا۔ پھر سوالیہ نظروں سے شاہانی کی جانب دیکھا۔ ”کیا جرگے کے فیصلے کے خلاف عدالت میں معاملہ نہیں پیش کیا جا سکتا؟“

”پیش تو کیا جا سکتا ہے اور اکثر ایسے مکدمے عدالت میں پیش بھی کیے گئے۔“ شاہانی نے بتایا۔ ”پر بلوچ جرگے کے فیصلے کے خلاف عام طور پر سرکاری عدالتوں میں نہیں جاتے۔ اسے بہت برا سمجھا جاتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے مرجان کا بھائی ایسا کرے۔“ رحیم داد نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو یہاں رہتا بھی نہیں۔ ممکن ہے وہ جرگے کا فیصلہ نہ مانے۔“

”ایسا وہ کر تو سکتا ہے۔“ شاہانی نے رحیم داد سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔

”میں تو کہتا ہوں' شہ زور کے لیے یہ ٹھیک رہے گا کہ وہ مرجان کی تجویز مان لے۔“ رحیم داد نے ایک بار پھر مراد خاں شاہانی کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ ”خامخواہ کیوں جھگڑے میں

پھنسنا چاہتا ہے۔ اسے تو جائیداد ہی چاہیے ناں وہ مل جائے گی۔ مرجان کی جان لے کر اسے کیا ملے گا؟“

”مان لے وہ مرجان کی شرط منظور کر لے۔“ شاہانی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جائیداد اپنے نام لکھوا کر اسے چھوڑ دے۔ پر شہ زور یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ وہ سہراب کے ساتھ رہے۔“ شاہانی نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”سہراب کو تو وہ زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ کمی ہے۔ ملوک زادی کو بھگا کر لے گیا۔ اس کا یہ جرم کیسے معاف کیا جا سکتا ہے۔ اسے اتنے سنگین جرم کی ضرور سزا ملنی چاہیے۔ تو خود ہی بتا سہراب کو سزا ملنی چاہیے یا نہیں؟“

”ضرور ملنی چاہیے۔“ رحیم داد کے اندر چھپا ہوا زمین دار فوراً جاگ اٹھا۔ ”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ سہراب کمی ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں لینا۔ جتنا وڈا اس نے جرم کیا اتنی ہی سخت اسے سزا ملنی چاہیے۔“ رحیم داد نے تامل کیا۔ ”میرا خیال ہے مرجان بھی سہراب کو بچانے کی کوشش نہیں کرے گی۔ وہ تو اپنی جان بچانا چاہتی ہے۔ اسے اب یہ پتہ چل گیا ہے کہ اس نے سہراب ایسے کمی کے ساتھ فرار ہو کر غلطی کی۔“

”مرجان نے ایک اور زبردست غلطی یہ کی کہ لغاریوں کی پناہ میں چلی گئی۔ ان کی باہوٹ بن گئی۔“ شاہانی نے نشے سے لہرا کر کہا۔ ”اس نے بہت برا کیا۔ بہت برا کیا۔ اپنے بھائی کے پاس چلی جاتی تو بہت سی مصیبتوں سے بچ جاتی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟“ اس نے رحیم داد کی طرف خمار آلود نظروں سے دیکھا۔ ”سنا ہے اور تجھ سے ہی سنا ہے کہ اس کا ایک بھائی بھی ہے۔“

”تو نے ٹھیک ہی سنا۔“ رحیم داد نے اس کی اطلاع کی تصدیق کی۔ ”مرجان کا اب ایک ہی بھائی ہے۔ صادک آباد میں زمین داری کرتا ہے۔ مرجان نے مجھے یہی بتایا تھا۔ وہ یہ بھی بتاتی تھی کہ وہ اپنے بھائی کے پاس گئی تھی پر وہ اس سے اتنا زیادہ ناراض ہے کہ نہ بات کی اور نہ ہی اسے اپنے گھر میں داخل ہونے دیا۔ وہ روتی پیٹتی واپس آ گئی۔ اس کا کوئی ایسا شریکا بھی نہیں جس کے پاس جا کر وہ ٹھہر جاتی۔ لغاریوں کے پاس پناہ لینے نہ جاتی تو کس کے پاس جاتی۔“

رحیم داد نے مرجان کی اس طرح وکالت کی کہ مراد خاں شاہانی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ آہستہ سے بولا۔

”مجھے ان باتوں کا بالکل پتہ نہ تھا۔“

”پر تجھے یہ تو پتہ ہے کہ مرجان ایک بار تو لغاریوں کے پاس سے چلی آئی تھی۔“ رحیم داد نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”جب اسے کہیں بھی پناہ نہ ملی' کوئی اسے اپنے ساتھ

رکھنے پر تیار نہ ہوا تو مجبور ہو کر دوبارہ لغاریوں کے پاس جا رہی تھی۔ کرتی بھی کیا۔ اسے پتہ تھا کہ شہ زور نے اپنے بندے اسے اور سہراب کو پکڑنے یا کتل کرنے کے لیے لگا رکھے ہیں۔ وہ تو لغاریوں کے پاس پہنچ بھی جاتی پر رستے میں شہ زور مزاری نے اسے اور سہراب کو پکڑ لیا۔ میں تو شہ زور کے ساتھ ہی تھا۔ گیدڑ والا کے نزدیک اس نے دونوں کو پکڑا تھا۔"

"یہ تو مجھے پتہ ہے۔ شہ زور نے مجھے شاہ میر میں بتا دیا تھا۔" شاہانی نے بات مختصر کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ بتا آگے کیا کرنا ہے؟"

"میں نے تجھے بتایا نہیں کہ تو شہ زور مزاری کو سمجھا بجھا کر راضی کرنے کی کوشش کر۔" رحیم داد نے کہا۔ "تو اس کا پرانا یار ہے۔ تیری گل وہ مان لے گا۔ مرجان زندہ بچ گئی تو تجھے دعا ہی دے گی۔ وہ مرنا نہیں چاہتی۔ پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی۔ منت اور زاری کرتی تھی۔"

"مرجان کو نہیں مرنا چاہیے۔ تو ٹھیک کہہ رہا ہے 'ابھی تو وہ جوان ہے۔" شاہانی نے مرجان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا۔ "میں مرجان کے بارے میں مزاری سے بات تو کر سکتا ہوں۔ جب وہ لغاریوں کے پاس چوٹی میں تھی تو شہ زور نے مرجان کے بارے میں بات کی تھی۔ اور اپنا پرانا یار سمجھ کر کی تھی۔ ایسی بات ہر ایک سے تو نہیں کی جا سکتی۔"

"تب تو مزاری سے تو مرجان کے بارے میں نڈر ہو کر گل بات کر سکتا ہے۔ اسے سمجھا بجھا کر راضی بھی کر سکتا ہے۔"

"مزاری نے جب مرجان کے بارے میں بات کی تھی تب حالات اور تھے۔ تب وہ مجبور تھا۔ سخت پریشان تھا۔" شاہانی رک رک کر بول رہا تھا۔ "اب وہ مزاری کی کید میں ہے۔ ایسے میں مرجان کے بارے میں اس سے بات کروں گا تو وہ پوری طرح جرح کرے گا۔"

"شاہانی تو بھی عجب بندہ ہے۔" رحیم داد تیکھے لہجے میں بولا۔ "کبھی کچھ کہتا ہے کبھی کچھ۔ صاف گل بات کر۔"

"صاف ہی صاف گل بات کر رہا ہوں۔ نراض کیوں ہوتا ہے۔" شاہانی نے رحیم داد کو منانے کی کوشش کی۔

"تیری باتوں سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ مرجان کو بچانے کی کوئی صورت نہیں رہی۔" رحیم داد نے دل گرفتہ ہو کر بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

شاہانی وہسکی کا بڑا سا گھونٹ بھر کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کی بعد اس نے گردن اٹھا کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ "یہ بتا' شہ زور نے اگر مجھ سے یہ پوچھا کہ مرجان کو اس

نے چھوڑ دیا تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ دوبارہ لغاریوں کی باہوٹ نہ بن جائے۔ بتا میں اسے کیا جواب دوں گا۔ تو نے خود ہی بتایا تھا کہ لغاریوں کے علاوہ کوئی اسے اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں۔ یہ تو سوچ وہ جائے گی تو کہاں جائے گی؟ کس کے پاس جائے گی؟"

"یہ سوال مزاری کر تو سکتا ہے۔" رحیم داد نے شاہانی سے اتفاق رائے کیا۔

"ایک اور تجویز سمجھ آتی ہے۔" شاہانی نے کہا۔

"وہ کیا ہے؟ صاف صاف بتا۔" رحیم داد نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"اگر مرجان کسی سردار یا اونچی ذات برادری والے زمیں دار سے نکاح کر لے تو اس کے لیے کہیں جانے اور پناہ مانگنے کا سوال ہی پیدا نہ ہو گا۔" شاہانی نے اپنی تجویز کی وضاحت کی۔ "تب تو مزاری کو بھی رضا مند کیا جا سکتا ہے۔ پر سوال یہ ہے کہ ایسا بندہ کہاں ملے گا جو مرجان سے پرنا کرنے پر آمادہ ہو جائے۔"

"میں تو کہتا ہوں تو مرجان کو اپنی گھر والی بنا لے۔ وہ جوان ہے۔ سوہنی ہے اور ملوک زادی بھی ہے۔" رحیم داد نے مشورہ دیا۔ "تو بھی بلوچ سردار ہے۔ شہ زور مزاری بھی مان جائے گا۔"

"تو کیسی گالہ کر رہا ہے۔" شاہانی جھنجلا کر بولا۔ "تو اسے اپنی گھر والی کیوں نہیں بنا لیتا۔ تو اکیلا ہے۔ تجھے اپنے لیے ایک رن کی ضرورت بھی ہے۔"

"تو کہتا ہے تو میں مرجان سے ویاہ کر لوں گا۔ سچ پوچھ تو مرجان مجھے پسند بھی ہے۔" رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"سئیں چوہدری' تو مرجان کو اپنی رن بنا لے گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" مراد خاں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔ "یہ تو سوچ وہ سہراب کے ساتھ یاری لگا چکی ہے۔ مدت تک اس کے ساتھ رہی ہے۔ سب کو اس کے بارے میں پتہ ہے۔ وہ بہت بدنام ہو چکی ہے۔ ایسی بدچلن اور بے معیار ذال کو تو کیسے اپنی گھر والی بنا سکتا ہے؟"

"میں تیری طرح بلوچ سردار نہیں ہوں۔" رحیم داد نے پوری سنجیدگی کے ساتھ شاہانی کو باور کرانے کی کوشش کی۔ "مجھے بدنامی شدنامی کی فکر نہیں۔ جمیلہ بھی تو کئی کیموں اور مزارعوں کے پاس فسادات کے زمانے میں رہ چکی تھی۔ تجھے تو پتہ ہی ہے کہ میں تو اسے ہر طرح اپنی گھر والی بنانے پر تیار تھا۔ پر وہ راضی ہی نہیں ہوئی۔ واپس اپنے گھر والوں کے پاس چلی گئی۔"

"تو مرجان ہی سے کیوں پرنا کرنا چاہتا ہے؟" شاہانی نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی۔ "تجھے تو بہت عزت دار خاندان کی کڑی مل سکتی ہے۔"

"میں نے مرجان سے وعدہ کر لیا ہے۔" رحیم داد نے جوش و خروش کا اظہار کیا۔ "میں اسے مرنے نہیں دوں گا۔ اسے بچانے کے لیے پوری پوری کوشش کروں گا۔" اس نے پر اعتماد نظروں سے مراد خاں شاہانی کو دیکھا۔ "میں تو تیار ہوں۔ پر شہ زور مزاری بھی مان جائے گا کہ میں مرجان کو اپنی گھر دالی بنالوں؟ تجھے یہ تو پتہ ہی ہے کہ میں بلوچ سردار نہیں ہوں۔"

"تو بلوچ سردار نہیں ہے' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" مراد خاں شاہانی نے کہا۔ "لغاریوں نے اپنی ایک دھی مخدوموں کو اور دوسری ممدوٹوں کو دیا ہی ہے۔ وہ کون سے بلوچ سردار ہیں۔" اس نے گلاس اٹھا کر چسکی لگائی۔ "تو بھی وڈا زمین دار ہے۔ شہ زور مزاری کو تجھے کبول کر لینے میں کیا رکاوٹ ہو سکتی ہے۔"

"وہ تیار ہو سکتا ہے تو میں نکاح پڑھا کر مرجان کو اپنے ساتھ لے جانے پر بالکل تیار ہوں۔ میں مرجان کو موت کے منہ سے نکالنا چاہتا ہوں۔" اس کے لہجے میں جوش و خروش سے زیادہ عاجزی تھی۔ "شاہانی اسے بچانے میں میری مدد کر۔ تو مزاری سے بات کر۔ تو کہے گا تو وہ ضرور مان جائے گا۔"

"سئیں چوہدری' تو بہت نیک بندہ ہے۔" شاہانی نے رحیم داد کے جذبے کو سراہا اور یقین دلایا۔ "میں مزاری سے ضرور بات کروں گا۔ ہو سکتا ہے وہ اس شرط پر مان جائے کہ مرجان کے ساتھ تیرا پرنا ہو جائے اور مرجان اپنے حصے کی بگیر اور جائیداد سے دست بردار ہو جائے۔"

"تجھے کل سویرے ناشتے پر جرگہ شروع ہونے سے پہلے پہلے شہ زور سے اس معاملے میں گل بات کرنی ہو گی۔" رحیم داد نے مشورہ دیا۔ "میں ناشتا اپنے کمرے میں ہی کر لوں گا۔ تو اکیلے میں شہ زور سے کھل کر بات کر سکے گا۔ ضرورت پڑے تو مجھے بلا لینا۔"

مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کو ایک بار پھر یقین دلایا۔ "اطمینان رکھ میں شہ زور مزاری سے ضرور گل بات کروں گا۔ جیسا تو کہتا ہے ویسے ہی کروں گا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور جھومتا جھامتا اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ اس کا کمرہ بالکل نکڑ پر تھا۔

☆

اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ رات سنسان تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ صرف نوکروں کی ایک کوٹھری میں چراغ روشن تھا۔ اس کی دھندلی روشنی تاریکی میں روشن دھبے کی مانند جگمگا رہی تھی۔

رحیم داد نے قمیص اور شلوار اتار کر دھوتی باندھی اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں نشے سے بوجھل تھیں۔ لیٹتے ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ نیند کا غلبہ بڑھنے لگا۔

اس نے ذرا جھپکی ہی لی تھی کہ آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ دیکھا' نوری پلنگ کے قریب کھڑی ہے۔ وہ جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا اور نوری کا ہاتھ پکڑ کر قریب بٹھا لیا۔ اس کے کپڑے صاف ستھرے تھے۔ سر کے بالوں میں تیل چمک رہا تھا۔ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ اس کا سانولا چہرہ کمرے میں روشن لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں تازہ اور بشاش نظر آ رہا تھا۔

نوری نے بستر پر بیٹھتے ہی پوچھا۔ "تو نے ملوک زادی کے بارے میں سردار سے بات کی؟"

"شام ہی کو بات کی تھی۔ جیسے مرجان نے کہا ویسے ہی کی تھی۔" رحیم داد صاف جھوٹ بول گیا۔

"سئیں' یہ تو نے بہت ٹھیک کیا۔ توں سدا جیوی۔ سکھی صحت ہووی۔" وہ اسے دعائیں دینے لگی۔ اس کے انداز میں خوشامد تھی۔ "ملوک زادی بہت دکھ میں ہے۔ بار بار روتی ہے۔" اس کا لہجہ اور دھیما ہو گیا۔ "اس نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے۔"

"نوشیر کو پتہ ہے تو ادھر ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"بالکل پتہ ہے؟" نوری نے مسکرا کر بتایا۔ اس کے انداز میں لگاوٹ تھی۔ "اسے یہ بھی پتہ ہے ملوک زادی نے آج اپنے کئی اور گہنے بھی مجھے دے دیے ہیں۔" اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ "ان میں سونے کی باڑی بھی ہے۔ بہت سوہنڑی ہے۔ میں اسے یہاں پہنوں گی۔" اس نے اپنے کان کے درمیانی حصے کو انگلیوں سے پکڑ کر دکھایا۔ "یہ بتا' سردار تیری گالہہ سن کر کیا بولا۔"

"تو اس دکھت مرجان کے پاس جا سکتی ہے؟؟"

"اب تو مشکل ہے۔ سردار بھی ادھر موجود ہے۔" اس کے چہرے سے سراسیمگی جھلکنے لگی۔

"تو نے ملوک زادی سے کچھ کہلوانا ہے؟؟"

"بہت ضروری گل بات کہلوانی ہے۔" رحیم داد نے کہا۔

"نوشیر سے گالہہ کرنی ہو گی۔" وہ رسان سے بولی۔ "یہ بتا' سئیں' تو نے ملوک زادی سے کیا کہلوانا ہے؟؟"

"اسے جا کر بتا دے کہ جائیداد کے ساتھ اسے سہراب کو بھی چھوڑنا ہو گا اور مجھ سے دیاہ کرنا ہو گا۔"

"تو اسے اپنی رن بنا لے گا؟؟" اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رحیم داد سے دریافت کیا۔ "سوچ لے۔"

"سوچ لیا' بالکل سوچ لیا۔" رحیم داد نے اسے یقین دلایا۔ "میں مرجان کو بچانے کے لیے سب

کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ تو جا کر اسے بتا دے۔ اگر اس نے یہ شرط مان لی تو سردار اسے معاف کر دے گا۔ جرگے میں اس کا مکدمہ بھی پیش نہیں کرے گا۔"

"پتہ نہیں ملوک زادی تیری شرطاں مانتی ہے کہ نہیں۔" نوری نے آہستہ سے کہا۔ "میں نوشیر کے پاس جاتی ہوں۔ اس سے صلاح کرنے کے بعد ملوک زادی کو تیری گالہ بتانے کی کوشش کرتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر جانے لگی۔ رحیم داد نے ٹوکا۔ "دیر نہ لگانا۔ میں تیرا انتظار کروں گا۔"

وہ ہولے ہولے گردن ہلاتی' دبے قدموں چلتی ہوئی دور چلی گئی۔ رحیم داد پھر بستر پر لیٹ گیا۔ بے چینی سے نوری کا انتظار کرنے لگا۔

نوری جلد ہی واپس آگئی۔

"تو مرجان کے پاس گئی تھی؟" رحیم داد نے بے قراری سے پوچھا۔ "میں نے تجھے جو کہا تھا اسے بتا دیا نا؟ کیا کہا اس نے؟" وہ سوال پر سوال کرتا چلا گیا۔

"سئیں' میں اس کے پاس نہیں گئی۔ جا بھی نہیں سکتی تھی۔"

"کیوں؟" رحیم داد نے گھبرا کر دریافت کیا۔

"جب میں تیرے پاس تھی تو سردار نے نوشیر کو بلایا۔ ملوک زادی کے کمرے پر جو تالا پڑا ہے اس کی چابی نوشیر سے لے کر اپنے پاس رکھ لی۔" اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ "سردار ابھی جاگ رہا ہے۔ جلاوت کی رن بھی اس کے کمرے میں ہے۔"

"یہ تو بری خبر سنائی۔" رحیم داد اور پریشان ہو گیا۔ "سردار کو کچھ شبہ تو نہیں ہو گیا۔"

"پتہ نہیں۔" نوری نے کہا۔ "ویسے ایسا لگتا نہیں۔ سردار جب ادھر ہوتا ہے تو ملوک زادی کے کمرے کی چابی رات کو کبھی کبھی اپنے پاس رکھتا ہے۔"

"سردار اس سے ملنے تو نہیں گیا؟"

"اس کی مرضی ہے۔ مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔"

"یہ تو ٹھیک نہیں ہوا۔ مرجان سے میری بات کرنی بہت ضروری تھی۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

نوری نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ خاموشی سے اٹھ کر جانے لگی۔ رحیم داد نے روکنا چاہا۔ مگر وہ اس کے پاس مزید نہ ٹھہری۔ آگے بڑھی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی رات کی تاریکی میں گم ہو گئی۔ رحیم داد دیکھتا ہی رہ گیا۔ کچھ کہہ بھی نہ سکا۔

سویرے اس نے ناشتا اپنے کمرے ہی میں کیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ شاہانی کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ پہر دن گزرا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی۔ گیارہ بجے سے چند منٹ پہلے سردار مراد خاں شاہانی اس کے پاس آیا۔

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "شہ زور سے مرجان کے بارے میں تو نے گل بات کی؟" اس کے لہجے سے بے قراری آشکارہ تھی۔

"میں نے اس سے گالہ کرلی۔" مراد خاں شاہانی مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔ "اس نے کیا سوچا اور کیا طے کیا؟ وہ تجھے خود بتا دے گا۔ ویسے جرگہ آج نہیں ہو رہا۔"

"یہ تو نے زبردست خبر سنائی۔" رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی کا غبار مٹنے لگا۔ "یہ بتا' شہ زور سے تیری کیا کیا گل بات ہوئی؟"

"میں نے بتایا نہیں' وہ تجھ سے خود بات کرے گا۔ تجھے سب کچھ بتا دے گا۔"

"تو نے اس کی باتوں سے کیا اندازہ لگایا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ "وہ مان جائے گا ناں؟"

"مان تو جانا چاہیے۔ اس کی باتوں سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔"

"آگے تیرا کیا ارادہ ہے۔ ابھی تو یہاں ٹھیرے گا نہیں؟" رحیم داد نے مراد خاں کا پروگرام معلوم کرنا چاہا۔ "میں چاہتا ہوں' تیرے یہاں رہتے ہوئے سب کچھ آرام سے طے ہو جائے۔"

"لیکن مجھے تو ابھی واپس جانا ہے۔" مراد خاں شاہانی نے بتایا۔ "میں تو تیرے کلیم کے کاغذات پہنچانے آیا تھا۔ مجھے بھکر جانا ہے۔ تجھے تو پتہ ہی ہے ادھر گڑبڑ ہے اور ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی۔"

"ٹھیر جاتا تو ٹھیک تھا۔" رحیم داد نے شاہانی کو روکنا چاہا۔

شاہانی مزید قیام کرنے پر راضی نہ ہوا۔ اٹھ کر کھڑا ہوا اور باہر جانے کے لیے دروازے کی جانب مڑا۔ رحیم داد بھی اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں خاموش تھے اور آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ پھاٹک پر پہنچ کر بھی وہ خاموش رہے۔ پھاٹک کے سامنے مزاری کی کار کھڑی تھی۔ مزاری بھی موجود تھا۔ شاہانی باری باری دونوں سے بغل گیر ہوا۔ چاکر خاں سرگانی نے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ مراد خاں اندر داخل ہوا اور پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ کار آگے بڑھی' گرد و غبار کے بادل اٹھنے لگے۔ کار تیزی سے دوڑتی ہوئی ایک موڑ پر مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ رحیم داد واپس ہوا۔ مگر مزاری اس کے ہمراہ نہ گیا۔ چاکر خاں سرگانی کے ساتھ بستی کی جانب چلا گیا۔ رحیم داد سے اس کی کوئی بات چیت نہ ہوئی۔

رحیم داد اپنے کمرے میں پہنچا۔ موڑھا سرکایا اور اس پر بیٹھ گیا۔ اسے توقع تھی کہ مزاری اس کے پاس آئے گا۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ سردار شہ زور مزاری کمرے میں داخل ہوا۔ وہ تیز دھوپ میں چل کر آیا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ تھکا ہوا سا اس کے قرب ہی بیٹھ گیا۔

کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری' کلیم داخل کر دیا گیا۔ سرگانی بتا تا تھا چند روز میں الاٹمنٹ بھی مل جائے گی۔"

رحیم داد کو اس وقت متروکہ اراضی کے الاٹمنٹ سے زیادہ مرجان کے معاملے میں دلچسپی تھی۔ وہ مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے بے نیازی سے کہا۔ "تو کوشش کرے گا تو الاٹمنٹ ضرور مل جائے گی۔"

"سیں' تجھے الاٹمنٹ ملنے کی خوشی نہیں ہوگی؟" شہ زور خاں مزاری نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہوگی' کیوں نہیں ہوگی۔ اراضی ملنی کسے بری لگتی ہے۔" اس نے تامل کیا۔ پھر دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔ "مراد خاں شاہانی سے صبح تیری کچھ گل بات ہوئی تھی؟"

"ہوئی تو تھی۔" مزاری نے ہاتھ اٹھا کر پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ وہ رحیم داد سے نظریں ملانے سے کترا رہا تھا۔ دبی زبان سے بولا۔ "اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ جو کچھ تو نے اسے کہا اس نے مجھ سے کہہ دیا۔"

"تو نے کیا طے کیا؟" رحیم داد بے قرار ہو کر مجسم سوال بن گیا۔

"تجھے سب کچھ پتہ ہے۔ تجھ سے کچھ چھپا نہیں۔" اس نے رک رک کر رحیم داد سے کہا۔

"اب تو تجھ سے یاری بھی ہو گئی۔ تو بتا مجھے کیا طے کرنا چاہیے؟"

"شاہانی نے تجھے نہیں بتایا؟"

"اسے چھوڑ' اپنی گالہہ کر۔" سردار مزاری نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "میں تیری زبان سے سننا چاہتا ہوں کہ مرجان کے بارے میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں تیری صلاح لینا چاہتا ہوں۔"

"میری صلاح پوچھتا ہے تو میں تجھے یہی کہوں گا' مرجان اگر جگیر میں اپنا حصہ چھوڑنا چاہتی ہے اور تیرے نام کرنے پر تیار ہے تو اسے معافی دے دے۔"

"یہ شرط اس نے خود تجھے بتائی تھی؟" سردار مزاری نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"ہاں!" رحیم داد نے بہت مختصر جواب دیا۔ اسے دھڑکا تھا۔ کہیں مزاری یہ نہ پوچھ لے کہ وہ مرجان کے پاس پہنچا کیسے۔

مگر مزاری نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔ صرف اتنا کہا۔ "اپنی جائیداد تو وہ چھوڑ دے گی' پر وہ سہراب کو بھی چھوڑنے پر تیار ہے کہ نہیں؟" سردار مزاری کے تیوری پر بل پڑ گئے۔ لہجہ تلخ ہو گیا۔ "وہ اسے چھوڑے نہ چھوڑے پر میں اس نمک حرام کو نہیں چھوڑوں گا۔ وہ بالکل بھول بیٹھا کہ وہ کمی ہے اور مرجان ملوک زادی۔ اس سنگین جرم کی اسے سخت سزا ملنی چاہیے۔" اس نے گہری نظروں سے رحیم داد کے چہرے کو دیکھا۔ "تو بتا مجھے سہراب کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اسے اپنے کیے کی ضرور سزا ملنی چاہیے۔" رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اسے سہراب سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ مرجان کو بچانا چاہتا تھا جو خوبصورت تھی' جوان تھی' ملوک زادی تھی اور اسے پسند بھی تھی۔ اس نے برملا اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "مجھے سہراب سے کیا لینا۔ تو اسے جو سزا دینی چاہے خوشی سے دے۔" اس کے لہجے میں عاجزی پیدا ہو گئی۔ "پر مرجان کو معافی دے دے۔"

"تو کہتا ہے تو اسے معافی دے دوں گا۔" مزاری نے اس کی بات مان لی۔ "شاہانی کہتا تھا تو اسے اپنی رن بنانا چاہتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں' میں اس کے لیے تیار ہوں۔" رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "اگر تجھے کوئی اعتراض نہ ہو۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں نے اس سے اب کیا لینا۔" مزاری نے اپنی رضامندی دے دی۔ "تو وڈا زمیں دار ہے' عزت دار بھی ہے۔ تیرے گھر میں رہے گی تو عزت ہی سے رہے گی میرے لیے اور میرے خاندان کے لیے بدنامی کا سبب تو نہیں بنے گی۔" اس نے رحیم داد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ "پر سوال یہ ہے کہ وہ بھی اس کے لیے تیار ہے۔ تو نے اس بارے میں اس سے معلوم کر لیا ہے؟"

"نہیں' میں نے اس بارے میں ابھی تک اس سے کوئی بات نہیں کی۔" رحیم داد نے مزاری سے کہا۔ "تیری مرضی ہو تو میں آج ہی اس سے مل کر اس بارے میں پوچھ لیتا ہوں۔"

"ابھی نہیں۔" سردار مزاری آمادہ نہ ہوا۔ "پہلے میں اپنے نام جائیداد کے ٹرانسفر کی اسٹامپ پیپر پر دستاویز تیار کروا لوں۔ تو اسے لے کر مرجان کے پاس جانا۔ دستاویز پر اس کے دستخط لینا۔ وہ

دستخط کرنا جانتی ہے۔ انگوٹھے کا نشان نہ لگوانا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "دستخط کروانے سے پہلے اس سے پوچھ لینا کہ وہ تیرے ساتھ نکاح کرنا چاہتی ہے اور تیری ذال بن کر رہنا چاہتی ہے کہ نہیں؟"

"ایسا کیوں نہیں کرتا، تو خود دستاویز لے کر اس کے پاس چلا جا۔" رحیم داد نے مشورہ دیا۔ "اس سے میرے بارے میں بھی پوچھ لینا۔"

"نہیں، میں اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اسے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ میں اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔" سردار مزاری نے رحیم داد کی تجویز مسترد کر دی۔ "تجھے ہی اس کے پاس جانا ہو گا۔ اپنے بارے میں تجھے اس سے کالہ کرنی ہو گی۔ وہ تیار ہو جائے تو دستاویز پر تجھے دستخط کرنے ہوں گے۔ دوسرا گواہ چاکر خاں ہو گا۔ وہ بھی دستخط کرے گا۔"

"تو کہتا ہے تو میں اس کے پاس چلا جاؤں گا۔" رحیم داد آمادہ ہو گیا۔ "دستاویز تو کب تیار کرائے گا؟"

"میں ابھی اس کام کے لیے چاکر خان کو روانہ کیے دیتا ہوں۔ جیپ تو موجود ہے۔ وہ اس میں بیٹھ کر وکیل کے پاس چلا جائے گا۔ وہ بہت ہوشیار بندہ ہے۔ دستاویز تیار کروا کے کل شام تک واپس آجائے گا۔" سردار مزاری نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ اس کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نہ صرف پہلے ہی سے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا ہے بلکہ چاکر خاں سرگانی سے صلاح مشورہ بھی کر چکا ہے۔

مزاری اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کہاں چلا؟" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"میں نے چاکر کو دستاویز تیار کروانے کے لیے روانہ کرنا ہے۔ میں دوپہر کی روٹی کھانے تیرے پاس آؤں گا۔ اب مجھے جانے دے۔" مزاری آگے بڑھا اور کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ مزاری کے جانے کے بعد وہ کمرے ہی میں بیٹھا رہا۔ وہ خوش اور مطمئن تھا کہ سردار مزاری نے بغیر کسی حیل و حجت کے اس کی بات مان لی۔ جو کچھ وہ چاہتا تھا اس آسانی سے ہو جائے گا اسے یقین نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شہ زور خاں سرکش اور ضدی ہے لہٰذا طرح طرح کے سوال اٹھائے گا۔ رضامند بھی ہو گا تو مشکل ہی سے ہو گا۔

دوپہر کے کھانے پر سردار مزاری وعدہ کرنے کے باوجود اس کے پاس نہ آیا۔ وہ دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ آخر اس نے اکیلے ہی کھانا کھایا۔ مزاری کے نہ آنے پر رحیم داد کو تعجب بھی ہوا۔

مگر نہ اس نے کسی نوکر چاکر سے مزاری کے بارے میں بات کی اور نہ ہی اس کے کمرے میں جانے کی کوشش کی۔ کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔

شام کو سردار شہ زور خان مزاری سے اس کی ملاقات ہوئی۔ رحیم داد نے مرجان کا ذکر چھیڑا۔ "تو نے چاکر خاں کو دستاویز تیار کرنے کے لیے بھیج دیا؟"

"ہاں، وہ چلا گیا۔" مزاری نے مختصر جواب دیا۔

"چاکر کب تک لوٹے گا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"کل وکیل سے دستاویز تیار کرانے کے بعد آئے گا۔"

"مرجان کو بھی اس بارے میں پتہ ہے؟" رحیم داد نے بات آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

"نہیں۔" سردار مزاری نے آہستہ سے انکار میں سر ہلایا اور گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ "چاکر تیرے کلیم کے بارے میں بھی متعلقہ افسروں سے بات کرے گا۔ تجھے ادھر اراضی کی الاٹمنٹ مل جائے تو بہت مناسب ہو گا۔"

رحیم داد نے بھی مرجان کے بارے میں مزید بات چیت کرنے سے گریز کیا۔ مزاری کے رویے سے اس نے بھانپ لیا تھا کہ وہ مرجان کے مسئلے پر اس وقت گفتگو کرنے سے اجتناب برت رہا ہے۔ وہ رحیم داد کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھیرا۔ اس نے شراب سے بھی شغل نہ کیا، کھانا کھایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

مزاری چلا گیا۔ رحیم داد برآمدے میں پہنچا۔ کچھ دیر مونڈھے پر خاموش بیٹھا رہا اور مرجان کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر وہ اٹھا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

صبح ناشتے پر بھی مرجان کے متعلق مزاری سے کوئی بات نہ ہوئی۔ نہ رحیم داد نے کوشش کی اور نہ ہی مزاری نے۔ دوپہر کا کھانا دونوں نے حسب معمول ساتھ ہی بیٹھ کر کھایا۔ ادھر ادھر کی باتیں بھی ہوئیں، مگر مرجان کا مسئلہ زیر بحث نہ آیا۔

دن ڈھلے سردار مزاری نے رحیم داد کو اپنے کمرے میں بلوایا۔ وہ اس وقت صاف ستھرا لباس پہنے پلنگ پر بیٹھا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی اس نے اونچی آواز سے کہا۔ "سن، تو سو تو نہیں رہا تھا؟" اس نے جواب کا انتظار نہ کیا۔ اپنی بات جاری رکھی۔ "چاکر خاں واپس آگیا ہے؟"

"کدھر ہے وہ؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"باہر ہے۔" سردار مزاری پلنگ سے نیچے اترا۔ "وہ دستاویز تیار کروا لایا ہے۔ تیرے پاس اسے لے کر آئے گا۔ تو مرجان کے پاس چلا جانا۔ چاکر جہاں بتائے وہاں اس سے دستخط لگوا لینا۔"

"تو بھی تو موجود ہو گا نا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"نہیں، مجھے بہت ضروری کام سے روجھان جانا ہے۔" مزاری نے رحیم داد کو مطلع کیا۔

"تجھے کب جانا ہے؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ابھی جا رہا ہوں۔" سردار مزاری آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ چلا۔ دونوں دروازے سے گزرے۔ برآمدے میں پہنچے۔ مزاری نے رحیم داد سے کہا۔ "چاکر کو سب پتہ ہے۔ میرا موجود ہونا ضروری نہیں۔"

دونوں ساتھ ساتھ برآمدے میں چلتے رہے۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ "تو کب تک لوٹے گا؟"

"سویرے واپس آجاؤں گا۔" مزاری نے بتایا۔ دونوں رحیم داد کے کمرے کے سامنے پہنچے۔ مزاری ٹھہر گیا۔ "تو اب آرام کر۔ باہر دھوپ بہت تیز ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ مزاری آگے بڑھ گیا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بستر پر نہیں لیٹا۔ مونڈھے پر بیٹھا چاکر خاں سرگانی کا انتظار کرتا رہا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ سائے طویل ہو گئے مگر سرگانی نہیں آیا۔

☆

سورج غروب ہو چکا تھا۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ رحیم داد کمرے سے باہر نکلا اور برآمدے میں ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ اسے برآمدے میں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ چاکر خاں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹامپ پیپر دبا تھا۔

رحیم داد نے اسٹامپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔ "یہ دستاویز ہے نا؟"

"ہا سئیں!" اس نے نہایت ادب سے جواب دیا۔ "تجھے اس پر ملوک زادی سے دستخط کرادنے ہیں۔" وہ کمرے کے اندر چلا گیا۔ جیب سے ماچس نکال کر لیمپ روشن کیا۔ اسے ایک ہاتھ میں سنبھالے ہوئے باہر آیا۔ اسٹامپ رحیم داد کے سپرد کیا۔ "اسے پڑھ لے۔"

رحیم داد نے دیکھا دستاویز اردو میں لکھی تھی اور مرجان کی جانب سے تھی۔ تحریر کی رو سے مرجان نے بہ قائم ہوش و حواس اور بہ رضا و رغبت اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ املاک اپنے سوتیلے بیٹے، سردار شہ زور خاں مزاری کے نام منتقل کر دی تھی۔ دستاویز ہرچند کہ عدالتی زبان میں تھی مگر سیدھی سادی تھی۔ کوئی پیچیدگی اور الجھاؤ نہ تھا۔ رحیم داد نے اسے آسانی سے پڑھ لیا۔

جب وہ دستاویز کا مطالعہ کر چکا تو چاکر خاں سرگانی نے جھک کر انگلی کے اشارے سے بتایا۔

"سئیں چوہدری، تجھے اس جگہ ملوک زادی سے دستخط لینے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، میں یہیں اس کے دستخط لگوالوں گا۔" رحیم داد نے ہامی بھرلی۔ "مجھے اس کے پاس اکیلے جانا ہو گا یا تو بھی میرے ساتھ چلے گا؟"

"نا سئیں، میں نے ملوک زادی کے پاس جا کر کیا لینا۔" چاکر خاں سرگانی نے کہا۔ "تو اکیلا ہی اس کے پاس جائے گا۔ تجھے اس سے بہت باتیں کرنی ہیں۔ مجھے سب پتہ ہے۔ سردار نے مجھے پوری طرح سمجھا دیا ہے۔"

چاکر خاں سرگانی واپس کمرے میں گیا۔ لیمپ طاق میں رکھا۔ لوٹ کر رحیم داد کے پاس آیا۔ جیب سے فونٹین پین نکال کر رحیم داد کے حوالے کیا۔ "سئیں، اسے رکھ لے۔ تجھے اس سے ملوک زادی کے دستاویز پر دستخط کرانے ہیں۔"

رحیم داد نے قلم لے لیا۔ مگر خاموش رہا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے کلبلا رہے تھے۔ خدشہ تھا کہ کہیں مرجان دستخط کرنے سے انکار نہ کر دے۔ اپنے ساتھ نکاح پڑھانے کا اظہار کرے تو بھڑک نہ اٹھے۔ وہ ادھیڑبن میں مبتلا تھا اور گم صم بیٹھا تھا۔

چاکر خاں سرگانی جہاں دیدہ اور گھاگ تھا۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے رحیم داد کی ذہنی الجھن بھانپ گیا۔ مسکرا کر بولا۔ "سئیں، تو کس سوچ میں پڑ گیا۔؟"

رحیم داد نے چونک کر اس کی جانب دیکھا، خود کو سنبھالا۔ جھٹ سوال کیا۔ "مجھے مرجان سے دستخط لینے کب جانا ہو گا؟"

"ابھی چلنا ہو گا۔" سرگانی نے رحیم داد کو بتایا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چاکر خاں سرگانی نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "سئیں، میرے ساتھ آ۔" وہ آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ چلا۔

دونوں شام کے ہلکے ہلکے اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے اس کمرے کے دروازے پر پہنچے جس میں مرجان کو قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ دروازے پر قفل پڑا تھا۔ چاکر خاں سرگانی نے کنجی نکال کر قفل کھولا اور دروازے کا ایک پٹ سرکا کر اندر جانے کا اشارہ کیا۔

رحیم داد اندر چلا گیا۔ چاکر خاں سرگانی باہر ہی ٹھہر گیا۔

☆

مرجان گم صم بیٹھی تھی۔ لیمپ کی زرد روشنی میں اس کا چہرہ مرجھایا ہوا نظر آرہا تھا۔ آنکھیں ویران تھیں۔ لباس ملگجا پڑ گیا تھا۔ اب وہ اور بھی زیادہ اجڑ گئی تھی۔ اس نے رحیم داد کو دیکھا تو

ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ حیران و پریشان ہو کر بولی۔

"سئیں' تو یہاں کیسے آ گیا؟"

رحیم داد نے اسے تسلی دی۔ "گھبرا نہیں' میں چوری سے نہیں آیا ہوں۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "شہ زور کی اجازت سے آیا ہوں۔"

"اس نے تجھے ادھر آنے کی اجازت دے دی؟" وہ بدستور حیرت زدہ تھی۔ اس قدر گھبرائی ہوئی تھی کہ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہی تھی۔

"تو نے ہی تو شہ زور سے گل بات کرنے کو کہا تھا۔ میں نے تیرے بارے میں اس سے صاف صاف گل کی۔" رحیم داد نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دیوار کے قریب ایک مونڈھا پڑا تھا۔ بوسیدہ اور کمزور تھا۔ رحیم داد اس پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں حبس تھا۔ گھٹن تھی۔ سخت گرمی تھی۔ ہوا اور روشنی کے لیے صرف ایک روشندان تھا۔ جو چھت کے قریب بلندی پر تھا۔ رحیم داد گرمی سے پریشان ہو کر بولا۔ "یہاں تو بہت گرمی ہے۔ تو یہاں کیسے رہتی ہے؟"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ گرمی بہت ہے۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "گرمی شرمی کی فکر نہ کر۔ یہ بتا شہ زور نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟" اس کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیل گئے۔ "پر وہ خود فیصلہ کب کرے گا۔ وہ تو جرگے سے فیصلہ کرائے گا۔ میں نے یہی سنا ہے۔"

"جرگے سے فیصلہ کراتا تو مجھے تیرے پاس کیوں آنے کی اجازت دیتا؟"

"تیرا مطلب ہے جرگہ نہیں ہو رہا؟"

"جرگہ تو کل صبح ہونے والا تھا۔ تجھے بھی پتہ ہو گا۔" رحیم داد نے کہا۔ "پر اب جرگہ نہیں ہو گا۔"

مرجان کے چہرے پر چھائے ہوئے سائے رفتہ رفتہ مٹنے لگے۔ وہ سر جھکا کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ پریشانی اور قید میں بھی حسین نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد بے قرار نظروں سے اس کے چہرے کو تکنے لگا۔ مرجان نے نگاہیں اٹھائیں' دونوں کی نظریں ملیں۔ مرجان نے جھٹ نظریں نیچی کر لیں۔ دبی زبان سے پوچھا۔

"شہ زور نے کیا فیصلہ کیا؟"

"فیصلہ اسے نہیں اب تو تجھے کرنا ہے۔" رحیم داد کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔

"میں' میں کیا فیصلہ کر سکتی ہوں۔ تو کیسی گالہ کر رہا ہے؟" اس کے لہجے میں گھبراہٹ اور حیرت کا امتزاج تھا۔

"؟ہاں' تجھے ہی فیصلہ کرنا ہو گا۔" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ "تو نے مجھے جو کچھ کہا تھا' میں نے شہ زور سے کہہ دیا۔" اس نے اپنی اہمیت جتائی۔ "پہلے تو وہ تیار نہیں ہوا۔ تجھ سے سخت ناراض ہے۔ پر جب میں نے اسے سمجھایا بجھایا تو وہ تیار ہو گیا۔"

"اب وہ کیا چاہتا ہے؟" مرجان نے دریافت کیا۔

"وہی جو تو چاہتی تھی۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "تو ساری جائیداد اس کے نام کر دے گی تو وہ تجھے معافی دے دے گا۔ تو یہی تو چاہتی تھی ناں؟"

"تو نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں یہی چاہتی تھی۔" مرجان نے اعتراف میں آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "اب وہ کیا چاہتا ہے؟"

"اس نے وکیل کے مشورے سے جائیداد اپنے نام کرنے کی دستاویز بنوائی ہے۔" رحیم داد نے ہاتھ میں دبا ہوا اسٹامپ پیپر مرجان کو دکھایا۔ اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "پڑھ سکتی ہے تو اسے پڑھ لے۔"

"میں اتنا پڑھنا نہیں جانتی۔ ہاں دستخط بنا لیتی ہوں۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"تو نے صرف اپنے دستخط ہی لگانے ہوں گے۔ میں نے دستاویز اچھی طرح پڑھ لی ہے۔" رحیم داد نے اسے اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ "مجھے تو ٹھیک ٹھاک لگی۔ پتہ نہیں تجھے مجھ پر بھروسہ ہے کہ نہیں۔"

"میرے لیے تجھ پر بھروسہ کرنے کے سوا اور رستہ ہی کون سا ہے۔" اس کا لہجہ صاف اور تیکھا تھا۔ رحیم داد نے اندازہ لگایا کہ وہ خاصی ذہین اور سمجھ دار ہے۔ مرجان نے لمحہ بھر کے لیے خاموشی اختیار کی' پھر رحیم داد سے دریافت کیا۔ "شہ زور کی اور بھی شرطاں ہوں تو صاف صاف بتا دے۔"

""تجھے سہراب کو چھوڑنا ہو گا۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "ویسے تو اسے چھوڑنے کو نہ بھی تیار ہو تب بھی شہ زور اسے معافی نہیں دے گا۔"

مرجان نے کسی فوری رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کا چہرہ ایک بار پھر افسردہ ہو گیا۔ اس نے گردن جھکا لی اور خاموش بیٹھی رہی۔

"تو کس سوچ میں پڑ گئی؟" رحیم داد خاموش نہ رہ سکا۔

"سوچ رہی تھی' کھور جتنا میرا ہے اتنا ہی سہراب کا بھی ہے۔" مرجان نے رحیم داد کی جانب پراعتماد نظروں سے دیکھا۔ "جب وہ جائیداد لے کر مجھے معافی دے سکتا ہے تو اسے سہراب کو بھی

معافی دینی چاہیے۔ اسے تو جائیداد چاہیے' وہ اسے مل جائے گی۔ اس کے بعد اسے مجھ سے اور سہراب سے کیا لینا۔"

"یہ تو سوچ سہراب ماشیا ہے۔ حویلی کا پرانا نوکر رہ چکا ہے۔" رحیم داد نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ "اس نے اپنے مالک سے نمک حرامی کی ہے۔"

"ٹھیک ہے سہراب حویلی کا ماشیا ہوتا تھا۔ شہ زور اور اس کے پیئو کا باغھا رہ چکا ہے۔" اس کا لہجہ تیز اور تیکھا تھا۔ "مجھے ٹھیک طرح پتہ ہے۔" اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ تیوری پر بل پڑ گئے۔ "سہراب نے زیادہ سے زیادہ نمک حرامی ہی تو کی ہے۔ شہ زور کی طرح خونی تو نہیں ہے۔ جائیداد کے لیے اس نے اپنی سگے بھائی کو کتل تو نہیں کروایا۔"

"لگتا ہے تو سہراب کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔" رحیم داد نے زچ ہو کر کہا۔

"سیں تو خود ہی سوچ۔ سہراب نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے بچانے کی کوشش کی۔" مرجان نے اپنے موقف کی وضاحت کی۔ "وہ مجھے کوٹ سے نکال کر نہ لے جاتا تو شہ زور جائیداد لینے کے لیے کب کا میرا خون کر چکا ہوتا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "شہ زور کے ساتھ اگر اس نے نمک حرامی کی ہے تو میرے ساتھ تو وفاداری کی ہے۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟ یہ تو خود غرضی اور کمینگی ہوگی۔ میں اسے دھوکا نہیں دے سکتی۔"

اس کے لہجے کے اعتماد سے رحیم داد کو بخوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ پہلی سی مرجان نہیں رہی تھی جس نے اپنی زندگی بچانے کے لیے رو رو کر اس سے التجا کی تھی۔ پچھلے چند دنوں میں اس نے موت کو اس قدر قریب پایا کہ اس کا ڈر اور خوف کم ہو گیا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ مرجان خود سر اور دبنگ عورت ہے۔ وہ زندگی سے بیزار اور اکتائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد نے اسے رام کرنے کی کوشش کی۔ نرم لہجے میں بولا۔ "تو بھی ٹھیک کہہ رہی ہے۔" وہ اس سے الجھنا نہ چاہتا تھا۔ اس نے پینترا بدلا اور عزت اور خاندانی وجاہت کا واسطہ دیا۔ "مرجان' یہ تو سوچ' تو ملوک زادی ہے اور سہراب کمی ہے۔ شہ زور یہ کیسے دیکھ سکے گا تو سہراب سے یاری لگائے۔ اس کے ساتھ رہے۔ وہ بلوچ سردار ہے۔ یہ اس کی شان اور آن کا سوال ہے۔"

"سیں' شان اور آن کی گالہہ نہ کر۔" وہ جھنجلا کر بولی۔ "مجھے اس کی شان اور آن کا سب پتہ ہے۔ وہ ہر رات کسی ذال کے ساتھ حرام کاری کرتا ہے۔ اسے گندہ کرتا ہے۔" اس کا لہجہ اور تلخ اور تیکھا ہو گیا۔ "پر اپنی مونچھ اونچی کیے عزت والا بنا پھرتا ہے۔ سردار کہلاتا ہے۔ اسی عزت اور آن کے لیے اپنی عینوں اور رن کو حویلی کی اونچی اونچی دیواروں کے اندر بند رکھتا ہے۔ ان کی کڑی

چوکیداری کرواتا ہے۔" اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ "پر چوکیداری شوکیداری سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے پتہ ہے کس نے کس کمی اور کس باغے اور نوکر سے یاری لگا رکھی ہے۔ کیسے راتوں کو چھپ چھپ کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ مجھے کیا نہیں معلوم؟ میں نے ان آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔" مرجان کے ہونٹوں پر زہر خند ہویدا ہوا۔ "شہ زور کو تو یہ بھی پتہ نہیں ہوگا کہ وہ کسی باغے کا پتر ہے یا سردار نجیب خان کا۔"

"ایسی الٹی سیدھی گلاں نہ کر۔" رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ گھبرا کر دروازے کی جانب دیکھا جس کے دوسری طرف چاکر خان سرکانی کے موجود ہونے کا امکان تھا۔ "لگتا ہے تو معافی شعافی نہیں چاہتی۔" اس کے لہجے میں شکوہ کرنے کا انداز صاف نمایاں تھا۔ "ایسا ہی تھا تو اس رات تو نے نوری کے ذریعے مجھے کیوں بلایا تھا؟ کیوں مجھے رو رو کر کہا تھا کہ تجھے معافی دلانے کے لیے شہ زور سے گل بات کروں۔" اس کا لہجہ قدرے تیکھا ہو گیا۔ "اپنی زندگی بچانے کے لیے تو جائیداد تک چھوڑنے کو تیار تھی۔ تو ایسا نہ کہتی تو میں کیوں شہ زور کو معافی دینے پر راضی کرتا؟" اس نے ہاتھ میں دبے ہوئے اشامپ پیپر کو سامنے کر دیا۔ "یہ دستاویز کیوں تیار کرواتا؟"

مرجان خاموش بیٹھی رہی۔ گردن جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کے چہرے پر بکھری ہوئی جھنجلاہٹ رفتہ رفتہ مٹتی جا رہی تھی۔

"تو مرنا چاہتی ہے؟" رحیم داد نے اسے زیادہ دیر خاموش نہ رہنے دیا۔

"کون خوشی سے مرنا چاہتا ہے؟" مرجان نے دل گرفتہ ہو کر جواب دیا۔ موت پر زندہ رہنے کی خواہش غالب آ گئی۔ "مرنا ہی ہوتا تو تجھے کیوں اپنے پاس بلاتی؟" وہ لحہ بھر کے لیے خاموش رہی' پھر اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پر میں یہ بھی نہیں دیکھ سکتی کہ سہراب کو شہ زور مار ڈالے۔"

"سہراب کو بھی معافی دلانے کی ایک صورت ہو سکتی ہے؟"

"وہ کیا؟" مرجان نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"تو کسی اور سے نکاح پڑھا لے۔" رحیم داد نے ریا کاری سے کام لیا۔ نہایت نرمی سے گویا ہوا۔ "اگر تو ایسا کرنے پر تیار ہو جائے تو میں کسی نہ کسی طرح شہ زور کو راضی کر لوں گا کہ وہ سہراب کو بھی معافی دے دے۔" اس نے نظر بھر کر مرجان کو دیکھا۔ "ضد کرنے سے کام نہیں چلے گا' اس طرح تیرے ساتھ سہراب کی بھی جان بچ جائے گی۔ میں تو کہتا ہوں تو میری صلاح مان لے۔ ایک بار دونوں کی جان بچ جائے تو آگے کے لیے جو تیرا جی کرے کرنا پر شہ زور کو راضی کرنے کے لیے ابھی تو تیرے لیے یہی ٹھیک رہے گا کہ سہراب کے علاوہ تو کسی اور سے نکاح پڑھوا لے۔"

رحیم داد نے کچھ اس ڈھب سے بات کی کہ مرجان رضامند ہو گئی۔ رسان سے بولی۔ "تیری
صلاح دیسے تو ٹھیک ہی لگتی ہے' پر اتنی بدنامی کے بعد کون مجھے اپنی رن بنانے کے لیے تیار ہو جائے
گا؟ شہ زور تو یہی چاہے گا کہ وہ کوئی وڈا زمیں دار ہو اور عزت دار بندہ ہو۔ ایسا بندہ کون ہو سکتا

ہے؟"
"میں تو کسی ایسے بندے کو نہیں جانتا۔" رحیم داد نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ "یہ تو تجھے ہی
سوچتا ہو گا۔ اس میں دیری بھی نہیں ہونی چاہیے۔"
"میں تو یہاں بند ہوں۔ میں اس بارے میں کیا کر سکتی ہوں۔" اس نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔
"تو نے جب میری اتنی مدد کی ہے تو اس معاملے میں بھی تو ہی میری مدد کر سکتا ہے۔"
"تجھے تو پتہ ہی ہے میں یہاں بالکل اجنبی ہوں۔ کسی سے میل ملاپ بھی نہیں۔" رحیم داد نے
حتیاط سے کام لیا۔ دل کی بات زبان پر نہ آنے دی۔ صورت حال کا تقاضا بھی یہی تھا۔
مرجان نے ایک بار پھر اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ عاجزی سے بولی۔ "سئیں چوہدری' اس بارے
بس تجھے ہی مدد کرنی ہو گی۔ میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔"
"میں تیری یہی مدد کر سکتا ہوں کہ خود تجھ سے نکاح کر لوں۔" رحیم داد ڈرتے ڈرتے حرف
مطلب زبان پر لایا۔ "برا نہ مناتا۔ یہ تیری مرضی پر ہے کہ مانے یا نہ مانے' فیصلہ تجھے ہی کرنا

ہے۔"
"میں نے کیا فیصلہ کرنا ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "سئیں' تو بہت نیک بندہ ہے۔
سمجھ نہیں آتی' تو ایسا کیوں چاہتا ہے؟"
رحیم داد نے اپنی اہمیت جتائی۔ "میں نے تو تجھے بچانے کے لیے ایسا سوچا ہے۔" اس نے لہجے
میں رقت پیدا کی۔ "مرجان' تجھے پتہ نہیں' میں بھی تیری طرح مصیبت کا مارا ہوا ہوں۔ گورداسپور
کے موضع نصیرپور کا مہاجر ہوں۔ فسادات میں گھربار لٹ گیا۔ وڈا پتر میری آنکھوں کے سامنے
بلوائیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ جوان دھی کو بھی وہ اٹھا کر لے گئے۔ میں بیڑی میں سوار ہو کر کسی
کسی طرح راوی پار کر کے اکیلا ہی پاکستان پہنچ سکا۔ گھر والی اور بچوں کا پتہ نہیں کیا بنا۔ زندہ ہیں
سب ختم ہو گئے۔ بہت تلاش کیا۔ پر کسی کا پتہ نہ چلا۔" اس نے گہری سانس بھری "تب سے
اکیلا ہوں۔" اس نے مرجان کی جانب دیکھا۔ "میں نے اپنے بارے میں تجھے سب کچھ بتا دیا۔

بھی نہیں چھپایا۔"
"نہ بھی بتاتا تو کیا فرق پڑتا۔" مرجان نے کہا۔ "مجھے تو اتنا پتہ تھا کہ تو بھی وڈا زمیں دار ہے

شہ زور کا گہرا یار ہے۔"

"تو نے کیا طے کیا؟" اس بار رحیم داد اپنی بے قراری پر قابو نہ رکھ سکا۔

"طے کیا کرنا ہے۔ تیار ہوں۔" مرجان نے اپنی رضامندی کا کھل کر اظہار کر دیا۔ "پر چوہدری تجھے سہراب کو بھی معافی دلانا ہو گی۔ تو نے مجھ سے پکا وعدہ کیا ہے۔"

"تجھ سے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کروں گا۔" رحیم داد نے نہایت جوش و خروش سے کہا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر مرجان کو یقین دلایا۔ "یہ مرد کا وعدہ ہے۔"

مرجان خاموش رہی۔ رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مرجان کے قریب گیا۔ اسٹامپ اس کے ہاتھوں میں دیا۔ مڑا اور لیمپ اٹھا کر واپس مرجان کی پاس پہنچا۔ فونٹین پین نکالا۔ مرجان کی جانب بڑھایا۔ "لے' اب دستاویز پر اپنے دستخط لگا دے۔"

رحیم داد نے انگلی رکھ کر جس جگہ بتایا مرجان نے اسی جگہ دستخط کر دیے۔

رحیم داد نے دستاویز مرجان سے واپس لی۔ لیمپ جہاں رکھا تھا وہیں رکھا۔ مرجان سے مخاطب ہوا۔ "مرجان' مجھے اب جانا ہے۔ چاکر خان باہر میرا انتظار کرتا ہو گا۔"

مرجان نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "سئیں!" وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ دنوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بے اختیار رونے لگی۔

رحیم داد نے اس کے جھکے ہوئے سر کو ہولے ہولے تھپکتے ہوئے تسلی دی۔ "پریشان نہ ہو۔ ب ٹھیک ہو گا۔"

مرجان کی سسکیاں رک رک کر کمرے کی خاموشی میں ابھرتی رہیں۔

رحیم داد آگے بڑھا۔ کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔

☆

شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ رات کی آمد آمد تھی۔ چاکر خان سرگانی دروازے سے کچھ فاصلے پر کھڑا رحیم داد کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی قریب آیا۔ "سئیں' تو نے بہت دیر لگا دی۔" رحیم داد خاموش رہا۔

چاکر خاں نے دروازے میں تالا ڈال کر کنجی سے بند کر دیا۔

دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کمرے کے سامنے پہنچے جس میں رحیم داد کا قیام تھا۔ برآمدے میں پلنگ بچھا کر رحیم داد کا بستر لگا دیا گیا تھا۔

رحیم داد تھکا ہوا سا بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے چاکر خان سرگانی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

چاکر خاں نے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "سیئں، تو چپ چپ نظر آرہا ہے۔ کوئی فکر کی گالہہ تو نہیں؟" اس نے رحیم داد کے چہرے کو غور سے دیکھا جس پر گہری سنجیدگی چھائی تھی۔ "کیا ملوک زادی نے دستخط نہیں لگائے؟؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے بتایا۔ "اس نے دستخط لگا دیے ہیں۔" رحیم داد نے ہاتھ میں دبا ہوا اسٹامپ چاکر خاں سرگانی کی جانب بڑھایا۔ "یہ رہی دستاویز۔ اسے اندر جا کر لیمپ کی روشنی میں ٹھیک سے دیکھ لے۔"

چاکر خاں کی آنکھوں میں خوشی کی چمک ابھری۔ اس نے دستاویز رحیم داد کے ہاتھ سے لے لی۔ مسکرا کر بولا۔ "کام بن گیا۔ اب تجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟؟"

رحیم داد نے صاف گوئی سے کام نہ لیا۔ بات بنانے کی کوشش کی۔ "اس نے آسانی سے دستخط نہیں لگائے۔ دیر تک مغزماری کرنی پڑی۔ تب وہ تیار ہوئی۔"

"وہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔" سرگانی کے لبوں پر بدستور مسکراہٹ تھی۔ "تو دیر تک اس کے پاس رہا، اس کا مطلب بالکل صاف ہے کہ وہ تجھ سے سخت حجت کر رہی تھی۔ میں نے پتہ ہے وہ کتنی ضدی اور سرپھری رن ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔

چاکر اٹھ کر کمرے کے اندر گیا۔ لیمپ کی روشنی میں دستاویز پر مرجان کے دستخط دیکھے۔ جب اچھی طرح اطمینان کر لیا تو لیمپ اٹھا کر رحیم داد کے پاس آیا۔ دستاویز اس کے سامنے رکھی۔ "سیئں، اب تو بھی گواہ کے طور پر دستخط کر دے۔" اس نے انگلی رکھ کر دستخط کرنے کی جگہ بتائی۔

رحیم داد نے قلم لے کر دستخط کر دیے۔ چاکر خاں نے دستاویز واپس لے لی۔ رحیم داد نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔ "سردار کل صبح واپس آجائے گا نا؟؟"

"ضرور آجائے گا سیئں۔" چاکر خاں نے اسے یقین دلایا۔ "وہ یہی کہہ کر گیا ہے۔"

رحیم داد نے مزید استفسار نہ کیا۔ چاکر خان سرگانی بھی زیادہ دیر نہ رکا۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "سیئں، اب تو روٹی کھا کر آرام کر۔ میں نے کئی اور کام کرنے ہیں۔" وہ مڑا اور خاموشی سے چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر لیٹ گیا۔ وہ ذہنی طور پر پریشان تھا۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال ستا رہا تھا کہ شہ زور مزاری کسی صورت میں سہراب کو زندہ نہ چھوڑے گا۔ مرجان کو اس کا علم ہو گا تو اسے نہ صرف شدید دکھ ہو گا بلکہ اس کی طرف سے بھی بدگمان ہو جائے گی۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ سہراب کو معافی مل جائے۔ اس کی خواہش تھی کہ سہراب کا کانٹا راستے سے صاف ہو جائے اور مرجان نکاح کے بعد پوری طرح اس کے قبضے میں آجائے۔

مگر اسے زیادہ دیر اس مسئلے پر غور کرنے کا موقع نہ ملا۔ ملازم کھانا لے کر آگیا۔ لیکن وہ نوشیر نہیں تھا۔ رحیم داد نے اسے بغور دیکھا۔ دریافت کیا۔

"تیرا نام کیا ہے؟"

اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ "سیئں، میرا ناں سانجھی ہے۔"

"نوشیر کدھر ہے۔ وہ کیوں نہیں آیا؟"

"سیئں، مجھے پتہ نہیں وہ کدھر ہے؟" اس نے رحیم داد سے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔

رحیم داد خاموش رہا۔ سر جھکا کر کھانا کھانے لگا۔ سانجھی برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد کھانا کھا چکا تو وہ برتن اٹھا کر لے گیا۔ رحیم داد بستر پر نہ لیٹا۔ مونڈھے پر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ رات گہری ہو گئی۔ اندھیرا بڑھ گیا۔ احاطے میں سناٹا چھا گیا۔

بہت دیر بعد وہ اٹھا اور دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔

سردار مزاری صبح واپس نہ آیا۔ چاکر خان سرگانی بھی نظر نہ آیا۔ رحیم داد تمام دن شہ زور مزاری کا انتظار کرتا رہا۔ شام ہو گئی مگر مزاری کے واپس پہنچنے کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ نوشیر بھی اس کے پاس نہ آیا۔ رات کا کھانا بھی سانجھی ہی لے کر آیا۔

رحیم داد نے اس سے پوچھا۔ "سردار آج صبح آنے کو کہہ گیا تھا اب تک نہیں آیا۔ تجھے پتہ ہے وہ کب آئے گا؟"

"سیئں، مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔"

"چاکر خان بھی صبح سے نظر نہیں آیا۔ نوشیر بھی نہیں آیا۔ دونوں کہاں ہیں؟" رحیم داد نے سانجھی سے پوچھا۔

"سیئں، مجھے پتہ نہیں۔" سانجھی نے مختصر جواب دیا۔ اس کے رویئے سے بیزاری جھلک رہی تھی۔ رحیم داد نے بھی اسے محسوس کیا۔ مگر چپ رہا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ اٹھا برآمدے کے سامنے ٹہلنے لگا۔ سانجھی جا چکا تھا۔ احاطے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پھاٹک پر مسلح پہرے دار بیٹھے تھے۔ ان کی کھنکار رات کے سناٹے میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔

رحیم داد واپس برآمدے میں گیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ اسے توقع تھی کہ نوری رات گئے اس

کے پاس آئے گی۔ وہ بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ پہر رات گزر گئی۔ رحیم داد کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک گزر نہ تھا۔ وہ جاگ رہا تھا اور اس کے کان آہٹ پر لگے تھے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ رات کالی ہو کر کاجل بن گئی۔ سناٹا اور گہرا ہو گیا۔

آدھی رات سے کچھ پہلے برآمدے میں چاپ ابھری۔ رحیم داد نے چونک کر کروٹ بدلی۔ اس جانب دیکھا۔ اندھیرے میں ایک سایہ نظر آیا۔ چاپ قریب اور قریب آتی گئی۔ رحیم داد اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ توقع تھی کہ وہ نوری ہو گی۔ مگر وہ نوری نہیں خمیسو کی بیوی تھی۔ وہ صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے تھی۔ بالوں میں تیل چمک رہا تھا۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔

رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔ "اب تو تو ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

"سئیں، ٹھیک ہی ہوں۔" وہ اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "پر نکے کی طبیعت گڑبڑ ہے۔ ہر دم روتا رہتا ہے۔ بہت مشکل سے اسے سلا کر آئی ہوں۔"

"کیا ہو گیا نکے کو؟" رحیم داد نے نرم لہجے میں دریافت کیا۔

"سئیں، اسے تپ چڑھی ہے۔" اس نے بتایا۔ "تو نے خمیسو کو معافی دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ لگتا ہے تو نے اس کے بارے میں سردار سے گالہہ نہیں کی۔" اس کے لہجے میں عاجزی پیدا ہو گئی۔ "سئیں، اسے معافی دلوا دے۔ میرا بھی ادھر جی گھبراتا ہے۔ گھر بہت یاد آتا۔ خمیسو بھی برے حال میں ہو گا۔"

رحیم داد نے اسے اطمینان دلایا۔ "گھبرا نہیں، سردار کل واپس آجائے گا۔ میں اس سے خمیسو کو معافی دلانے کے بارے میں ضرور کل بات کروں گا۔"

"پہلے بھی تو نے یہی کہا تھا۔" اس نے شکوہ کیا۔ "اب تو خمیسو کو ویسے بھی معافی مل جانی چاہیے۔ سنا ہے ہاتو کو اس کا اوٹھ مل گیا۔ اس نے جھوٹی شکایت لگائی تھی۔ تب ہی تو اوٹھ لے کر بھاگ گیا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اب خمیسو کو ضرور معافی مل جائے گی۔"

"سئیں، تو سردار سے کل ضرور گالہہ کرے گا ناں؟" اس نے اصرار کیا۔

"کروں گا، ضرور کروں گا۔" رحیم داد نے اسے یقین دلایا۔ "یہ بتا نوشیر کدھر ہے؟ کل سے بالکل نظر نہیں آیا۔ اس کی گھر والی، نوری، بھی نہیں آئی۔ دونوں کہاں ہیں؟"

"سئیں، میں نے بھی نوشیر اور نوری کو نہیں دیکھا۔" اس نے جھجکتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔

"ساجھی کی رن بتاتی تھی، سردار نے دونوں کو شاہ میر بھیج دیا۔ بہت ناراض ہے ان سے۔"

"سردار ان سے کیوں ناراض ہے؟" رحیم داد نے حیران و پریشان ہو کر خمیسو کی بیوی کو دیکھا۔ بے چینی سے پوچھا۔ "ٹھیک ٹھیک بتا؟"

"سئیں، مجھے ان کے بارے میں اتنا ہی پتہ ہے۔" وہ گڑگڑا کر بولی۔ "میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔"

رحیم داد نے مزید استفسار نہ کیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے سائے پھیل گئے۔ ذہن میں طرح طرح کے سوالات منڈلانے لگے۔ خمیسو کی بیوی نے اس کے ذہنی خلفشار کی جانب توجہ نہ دی۔ خاموش بیٹھی رہی۔

سناٹا بڑھ گیا تھا۔ رات اور کالی ہو گئی۔ برآمدے کے قریب ہی شیشم کا گھنا درخت تھا۔ اس کی الجھی ہوئی شاخوں میں کوئی پرندہ پھڑپھڑایا۔ گہری خاموشی میں ارتعاش پیدا ہوا اور پھر سکوت طاری ہو گیا۔

☆

صبح بھی ناشتا رحیم داد نے اکیلے ہی کیا۔ اور اپنے کمرے میں کیا۔ ناشتا بھی ساجھی لے کر آیا تھا۔ مگر رحیم داد نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بھی خاموش رہا۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہوا تو ساجھی چپ چاپ اندر آیا اور برتن اٹھا کر چلا گیا۔

ساجھی کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد چاکر خان سرگانی کمرے میں آیا۔ مسکرا کر یہ خوش خبری سنائی۔ "سردار نے بتایا ہے۔ سئیں تیری درخواست پر کارروائی شروع ہو گئی ہے۔ فکر نہ کر الاٹمنٹ بھی چند روز میں مل جائے گی۔"

"کیا سردار واپس آگیا؟" رحیم داد نے جھٹ سوال کیا۔

"سئیں، وہ تو سویرے ہی سویرے ادھر پہنچ گیا تھا۔"

"کدھر ہے وہ، میرے پاس کیوں نہیں آیا؟" رحیم داد نے تعجب کا اظہار کیا۔

"سئیں آج ادھر جرگہ ہے ناں۔" سرگانی نے بتایا۔

"آج جرگہ ہے؟" رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دریافت کیا۔ "جرگہ کیوں بلایا گیا ہے؟"

"جرگے کے سامنے ملوک زادی اور سہراب کا مکدمہ پیش ہو گا۔"

رحیم داد دم بخود رہ گیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ "جرگہ

کب شروع ہو گا؟"

"سئیں، دوپہر کی روٹی کھانے کے بعد شروع ہو گا۔" چاکر خان سرگانی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "سردار ادھر اپنے کمرے میں معتبروں کے ساتھ بیٹھا بات چیت کر رہا ہے۔ جرگے میں شرکت کرنے کے لیے گیارہ معتبر آئے ہیں۔"

"میں جرگے کی کارروائی نہیں دیکھ سکتا؟"

"مشکل ہی ہے سئیں۔" چاکر خاں نے جواب دیا۔ "جرگہ تو بند کمرے میں ہو گا۔ وہاں تو سردار ہو گا۔ معتبر ہوں گے۔ ان کے علاوہ سہراب ہو گا۔ ملوک زادی ہو گی۔ وہ پردے کے پیچھے بیٹھی ہو گی۔"

"تو جرگے میں موجود نہیں رہے گا؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"میں بھی رہوں گا۔ سئیں، میرا کام پیش کار کی طرح ہو گا۔" سرگانی سنبھل سنبھل کر بتا تا رہا۔ "بدھیل، ہجر خاں اور داؤد بھی رہیں گے۔ تینوں گواہ ہیں۔ سردار کے ساتھ ہی ادھر پہنچے ہیں۔"

"سردار سے کہنا، چوہدری تجھے اپنے کمرے میں بلا رہا ہے۔" رحیم داد نے چاکر خان سرگانی کے ذریعے شہ زور خان مزاری کو پیغام بھجوایا۔

"سئیں، تو اطمینان رکھ، میں سردار سے ضرور کہہ دوں گا۔" چاکر خان سرگانی نے یقین دلایا۔

چاکر خاں چلا گیا۔ رحیم داد کمرے میں بیٹھا سردار شہ زور مزاری کا انتظار کرتا رہا۔ دوپہر ہو گئی، مگر وہ نہ آیا۔ البتہ ساجھی کھانا لے کر آ گیا۔ رحیم داد نے کھانا کھایا۔ اسے توقع تھی کہ شہ زور خان مزاری اس کے پاس ضرور آئے گا۔ کمرے کے باہر چہل پہل تھی۔ ملی جلی آوازوں کا دبا دبا شور ابھر رہا تھا۔

دن ڈھلنے لگا۔ سردار مزاری اس کے پاس نہ آیا۔ رحیم داد تھک کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ وہ کچھ دیر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔

شام ہونے سے کچھ دیر پہلے رحیم داد نیند سے بیدار ہوا۔ کمرے کے باہر سناٹا تھا۔ جرگہ اب ختم ہو چکا تھا۔ سناٹے سے رحیم داد نے یہی اندازہ لگایا۔ اس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا اور برآمدے میں جا کر ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ شام در و دیوار سے نیچے اتر کر پھیل چکی تھی۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

پہر رات ہو گئی۔ سردار مزاری آہستہ آہستہ چلتا ہوا رحیم داد کے پاس آیا۔ وہ تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ آتے ہی مونڈھا کھسکا کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بیزار اور روٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"طبیعت تو تیری ٹھیک ہے ناں؟" سردار شہ زور مزاری نے پوچھا۔

"ٹھیک ہی ہے۔" رحیم داد نے بے رخی سے جواب دیا۔ "مجھے کل لہور واپس جانا ہے۔"

"چلا جانا۔" مزاری نے بے تکلفی سے کہا۔ "مجھے بھی جانا ہے۔ اکٹھے ہی چلیں گے۔"

"نہیں، مجھے کل ہی جانا ہے۔" رحیم داد نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "مجھے اب یہاں ہرگز نہیں ٹھیرنا۔"

"اوہو تو، تو سخت ناراض لگتا ہے۔ مجھے پتہ ہے تو کیوں ناراض ہے۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ رحیم داد کو منانے کی کوشش کی۔ نرم لہجے میں بولا۔ "میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔"

"میں نے تجھے بلایا تھا۔ تو میرے پاس آیا کیوں نہیں؟"

"میں معتبروں کے ساتھ جرگے میں بیٹھا تھا۔ تیرے پاس کیسے آتا؟ جرگہ ختم ہوتے ہی سیدھا ادھر آیا۔" سردار شہ زور مزاری نے صفائی پیش کی۔

"تو نے تو پکا وعدہ کیا تھا کہ جرگہ نہیں ہو گا۔" رحیم داد نے شکوہ کیا۔

"میں نے تجھے یار کہا ہے تو ہمیشہ یار ہی رہے گا۔" شہ زور مزاری نے دل جوئی کرنے کے انداز میں کہا۔ "تجھے کئی باتوں کا پتہ نہیں۔ جب تجھے پتہ چلے گا تب سب کچھ تیری سمجھ میں آ جائے گا۔"

رحیم داد نے گلہ کیا۔ "تو نے مجھے بتایا ہی کب۔"

"سئیں چوہدری تو ادھر پہلی بار آیا ہے۔" مزاری نے سنجیدگی سے کہا۔ "تو بلوچوں اور ان کی کبائلی روایات اور رسم و رواج کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ان کا اپنا کانون ہے۔ تجھے پتہ ہے سردار کیا ہوتا ہے؟ سرداری کیسے چلتی ہے؟" اس نے رحیم داد کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "تجھے کیا پتہ مجھے جرگہ کیوں بلانا پڑا؟"

رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ "یہ بتا، جرگے نے کیا فیصلہ کیا؟" عین اسی وقت نوکروں کی کوٹھری کی جانب سے تیز زنانی چیخ ابھری۔ رحیم داد تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مزاری بھی اس کے ساتھ ہی اٹھا۔ "چوہدری، میرے ساتھ آ۔ تجھے خود پتہ لگ جائے گا جرگے نے کیا فیصلہ کیا۔"

"مجھے ادھر نہ لے جا۔" رحیم داد نے سراسیمہ ہو کر انکار میں گردن ہلائی۔

مزاری نے بے تکلفی سے رحیم داد کا ہاتھ تھام لیا۔ "ادھر زمین داری کرنی ہے تو تجھے سب کچھ دیکھنا پڑے گا۔"

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ تھکے تھکے قدموں سے شہ زور خاں مزاری کے ہم راہ چلنے لگا۔ دونوں برآمدے سے اتر کر احاطے میں پہنچے۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ خاموشی تھی۔ دونوں نوکروں کی کوٹھریوں کی جانب بڑھے۔ درختوں کے نیچے پہنچے۔ خشک پتے ان کے جوتوں کے نیچے ہلکی ہلکی آہٹ پیدا کر رہے تھے۔

سردار مزاری اور رحیم داد ایک کوٹھری کے سامنے پہنچ گئے۔ چاکر خان سرگانی باہر کھڑا تھا۔ اس نے بڑھ کر کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔ شہ زور مزاری آگے تھا۔ رحیم داد اس کے عقب میں پریشان اور سہا ہوا کھڑا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سانس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ پیشانی پسینے سے تربتر تھی۔

کوٹھری میں لالٹین روشن تھی۔ اس کی ملگجی زرد روشنی میں دیوار کے نزدیک سہراب کی لاش پڑی تھی۔ اس پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ مگر اس کی گھنی سیاہ ڈاڑھی اور چہرے کا کچھ حصہ چادر کا کونا سرک جانے کے باعث نظر آ رہا تھا۔ اسے بہت پہلے پھانسی دی جا چکی تھی۔

چھت کے بیچوں بیچ مضبوط شہتیر تھا۔ اس میں لوہے کا کڑا تھا۔ کڑے سے رسی بندھی تھی۔ اس کا پھندا مرجان کی گردن میں پڑا تھا۔ مرجان کا منکہ ٹوٹ چکا تھا۔ گردن ایک طرف جھول رہی تھی۔ وہ مر چکی تھی۔ لاش کے نیچے ایک اسٹول الٹا ہوا تھا۔ اسی اسٹول پر چڑھ کر اس نے رسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈالا تھا۔

دروازے کے قریب دو بلوچ معتبر کھڑے تھے۔ ان کی ڈاڑھیاں سفید تھیں اور خوب گھنی تھیں۔ مونچھیں بھی سفید تھیں اور چڑھی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے تھے۔ چہروں پر سختی اور گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ رحیم داد نے مرجان کی لاش کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں ابل کر باہر نکل آئی تھیں۔ زبان منہ سے باہر لٹکی ہوئی تھی۔ گردن کھنچ کر لمبی ہو گئی تھی۔ اس کا خوبصورت اور دل آویز چہرہ مسخ ہو کر مٹیالا پڑ گیا تھا۔

رحیم داد یہ لرزہ خیز منظر زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا۔ اسے کوٹھری میں سخت گھٹن محسوس ہوئی۔ جی متلانے لگا۔ اس نے حواس باختہ ہو کر کوٹھری کی دھندلی روشنی میں ادھر ادھر دیکھا اور چپ چاپ نکل کر باہر کھلی فضا میں آ گیا۔ مزاری کوٹھری کے اندر ہی رہا۔

دریا کی سمت سے آنے والے تیکھے جھونکے درختوں کے پتوں میں اس طرح سرسراتے ہوئے گزر رہے تھے گویا سسکیاں بھر رہے ہوں۔ احاطے پر سناٹا چھایا تھا۔ کوٹھریوں کے دروازے بند

تھوڑی دیر بعد سردار شہ زور خاں مزاری باہر نکلا۔ دونوں معتبر اس کے ہمراہ تھے۔ چاکر خان سرگانی گردن جھکائے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ سب خاموش تھے۔ ان کے چہروں پر سنجیدگی بکھری ہوئی تھی۔

سردار مزاری نے مڑ کر چاکر خان سرگانی کی جانب دیکھا۔ "چاکر، مسجد کے ملا کو بلوا لے۔ وہ لاشوں کو غسل دے کر کفن ڈال دے گا۔ تو نے کفن تو تیار کرا ہی لیا ہو گا؟"

"ہا سئیں، میں نے کفن دفن کی پوری تیاری کر رکھی ہے۔" چاکر خان سرگانی نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "تو بالکل فکر نہ کر۔"

"اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ دونوں کو سورج نکلنے سے پہلے پہلے دبا دیا جائے۔" سردار مزاری نے حکم دیا۔

"چاکر تجھے پتہ ہونا چاہیے، کالے اور کالی کو رات کے اندھیرے میں ہی دفن کیا جاتا ہے۔" ایک معتبر نے اپنی سفید ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خبردار کیا۔ "ان بدکاروں پر دن کی پاک صاف روشنی نہیں پڑنی چاہیے۔ ان کی تو نماز جنازہ بھی نہیں ہوتی۔ نہ فاتحہ پڑھی جاتی ہے نہ نذر نیاز ہوتی ہے۔"

"سئیں، مجھے سب پتہ ہے۔" چاکر خان سرگانی نے یقین دلایا۔ "سارا ہی کام ٹھیک ٹھاک طرح ہو جائے گا۔"

سردار مزاری نے گردن گھما کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "سئیں چوہدری، تو بہت تھکا ہوا لگتا ہے۔ تھوڑا آرام کر۔ میں تیرے پاس چند منٹ بعد پہنچ جاؤں گا۔ سونا نہیں، میرا انتظار کرنا۔"

مزاری آگے بڑھا اور معتبروں کے ہم راہ احاطے کے پھاٹک کی جانب چل دیا۔ چاکر خان سرگانی مڑا اور درختوں کے نیچے اندھیرے میں جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

رحیم داد گم صم تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا برآمدے کی جانب بڑھا اور ایک مونڈھے پر جا کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ وہ نڈھال اور شکستہ نظر آ رہا تھا۔ قریب ہی اس کا پلنگ تھا مگر وہ بستر پر جا کر لیٹا نہیں۔ کھویا کھویا سا بیٹھا رہا۔ اس کے جذبات میں ہلچل برپا تھی۔

رحیم داد کو سردار شہ زور مزاری کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ آیا اور اس کے قریب مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ اس نے بے نیازی سے پوچھا۔ "چوہدری، تو کب تک ایسے چپ کر کے بیٹھا رہے گا؟" وہ زیر لب مسکرایا۔ "روٹی شوٹی بھی کھائی؟"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" رحیم داد نے بے زاری سے جواب دیا۔

"ایسا کر تھوڑی سی وہسکی لگا لے۔ مراد خاں شاہانی لہور سے لایا تھا۔ میرے کمرے میں پڑی ہے۔" وہ بدستور غیر سنجیدہ تھا۔ "ایک دم کھلاوڑا بن جائے گا۔ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔"

"نہیں، میں نے آج نہیں پینی۔" رحیم داد نے بے رخی سے انکار کر دیا۔ "تیرا جی کرے تو ضرور لگا۔ میری فکر نہ کر۔"

"تو نے نہیں پینی تو میں بھی نہیں لگاؤں گا۔ پر یہ بتا تو اتنا روٹھا روٹھا کیوں ہے؟"

"تو بھی عجب بندہ ہے۔" رحیم داد اس کی ڈھٹائی پر بلبلا اٹھا۔ جل کر بولا۔ "پوچھتا ہے، میں زاض کیوں ہوں؟ ایک طرف یاری کا دم بھرتا ہے دوسری طرف تو نے نوشیر اور نوری کو میرے پاس آنے سے روک دیا۔"

"نوری اور نوشیر کا میرے سامنے نام نہ لے۔" مزاری کا لہجہ اچانک بدل گیا۔ چہرے پر جھنجلاہٹ برسنے لگی۔ "زیور اور کھنڑوں کے لالچ میں دونوں نے نمک حرامی کی۔ مرجان سے مل کر سازباز کی۔ میں نے انھیں جیل میں ڈال دیا ہے تاکہ انھیں اور دوسرے کراووں اور بانھوں کو پتہ چل جائے کہ میرا حکم نہ ماننے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔"

"نوری اور نوشیر کے بارے میں تجھے شاہانی نے بتایا تھا؟"

"نہیں!" مزاری نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اس نے ان کے بارے میں کوئی گالہ نہیں کی۔ پر مجھے سب کچھ پتہ چل گیا۔" اس کا رویّہ اور سخت ہو گیا۔ "میں اتنا چوکنا نہ رہوں تو فیر چل چکی سرداری۔"

"تب تو یہ بھی تجھے پتہ ہو گا کہ میں اپنی مرضی سے مرجان سے ملنے نہیں گیا تھا۔ اس نے ہی مجھے اپنے پاس بلوایا تھا۔" رحیم داد کا انداز اب مدافعانہ تھا۔

"تو بھول رہا ہے۔ یہ گالہ تو نے پہلے بھی مجھے بتائی تھی۔" سردار شہ زور خان مزاری نے رحیم داد کو یاد دلایا۔ "تجھے مجھ سے گلہ ہے اور تو مجھ سے زاض بھی ہے۔ پر مجھے بھی تجھ سے گلہ ہے۔ تو چھپ کر مرجان سے ملنے کیوں گیا؟ تو میرا یار ہے۔ تجھے اس سے کیا لینا تھا۔ تجھے پتہ تھا کہ اس نے مجھ تنگ کیا، بدنام کیا۔ میری ناک پر کالک لگا دی۔"

رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مگر اس نے اظہار ندامت کے بجائے دفاعی حربہ آزمایا۔ "تو نے میری حرکت پر برا منایا تھا تو پہلے اس کا گلہ کیوں نہ کیا؟ تب تو چپ کر کے رہ گیا۔" اس نے سردار مزاری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "تو نے تو برا منانے کی بجائے

جائیداد اپنے نام کرانے کے لیے جھٹ دستاویز تیار کروائی۔ اس پر دستخط لینے کے لیے مجھے مرجان کے پاس بھیجا۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "تجھے کیا پتہ دستاویز پر دستخط لینے کے لیے میں نے کس طرح مرجان کو راضی کیا۔ وہ آسانی سے دستخط کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔"

"مجھے سب پتہ ہے۔ چاکر نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔" شہ زور کا لہجہ نرم پڑ گیا۔

"تو وعدہ کر کے پلٹ گیا۔ یہ تو نے ٹھیک نہیں کیا۔" رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "تو نے بہت برا کیا۔ تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "تجھے ایسا کرنا بھی تھا تو کسی اور کو اس کام پر لگایا ہوتا۔ مجھ سے یہ کام نہ لیا ہوتا۔ تجھے پتہ نہیں مجھے کتنا دکھ پہنچا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے، مجھے تجھ سے ایسا کام نہیں کرانا چاہیے تھا۔" سردار مزاری نے معذرت کرنے کے انداز میں کہا۔ "تو خود کو اب پریشان نہ کر۔ جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا۔"

"کیا ٹھیک ہوا؟" رحیم داد تڑپ کر بولا۔ "تو اسے معافی دے دیتا، اس کا خون نہ کرتا تو تیرا کچھ نہ جاتا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے چہرے پر غم کے سائے پھیل گئے۔ آنکھوں میں جھلملاتے چراغ دھندلے پڑ گئے۔ "وہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔ زندہ رہنا چاہتی تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔"

"لگتا ہے تجھے اس سے بہت ہمدردی ہے۔" سردار مزاری نے کہا۔ "تو اس سے پرنا کرنا چاہتا تھا۔ اپنی رن بنانا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا۔" رحیم داد نے اعتراف کیا۔ ساتھ ہی صفائی بھی پیش کی۔ "تو یہ سمجھتا ہے کہ مجھے اس سے پیار شیار تھا، تو یہ ٹھیک نہیں۔ میں تو اسے صرف اس لیے اپنی گھر والی بنانا چاہتا تھا کہ اس کی زندگی بچ جائے اور اس کی جائیداد تجھے مل جائے۔ میں تجھ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

"تو بالکل سچ کہہ رہا ہے۔" سردر مزاری نے اس کی نیک نیتی کے بارے میں کسی شک کا اظہار نہ کیا۔ "مجھے یہ بھی پتہ ہے تو بہت نیک بندہ ہے۔ دل بھی تیرا بہت نرم ہے۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "پر تجھے یہ پتہ نہیں وہ کتنی مکار اور فریبی تھی۔ تو اس کی چترائی اور چالاکی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" اس نے رحیم داد کے چہرے کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "وہ تجھے اور مجھے، دونوں کو دھوکا دینا چاہتی تھی۔ تیرے سامنے خوب ٹسوے بہائے۔ منت اور زاری کی۔ تیرا دل پگھل گیا۔ تو نے اس کی باتوں کو سچ مان لیا۔"

"یہ تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ وہ میرے سامنے پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ منت سماجت بھی کی۔" رحیم

داد نے سردار مزاری کی تائید کی۔

"سئیں چوہدری' جھگڑا صرف جائیداد کا نہیں۔ مرجان نے مجھے تنگ کیا۔ میری ناک پر سیاہی مل دی۔" سردار مزاری نے وضاحت کی۔ "میں اپنی ناک صاف کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے مجھے یہ معاملہ جرگے کے سامنے پیش کرنا پڑا۔"

رحیم داد نے مداخلت نہیں کی۔ خاموش بیٹھا رہا۔ مزاری بتاتا رہا۔ "میں چاہتا تو دونوں کو تب ہی ختم کر دیتا جب میں نے گیدڑ والا میں ان کو پکڑ لیا تھا۔ میں ان کا خون کر دیتا تو بلوچوں کے کانون کی روسے یہ ہرگز جرم نہ ہوتا۔ پر میں چاہتا تھا کہ دونوں کو ان کے جرم کی سزا جرگے کی جانب سے ملے۔ صرف اسی طرح میں اس بدنامی اور رسوائی کی کالک صاف کر سکتا تھا جو اس نے میری پیشانی پر لگائی تھی۔ جرگے کے فیصلے کے بعد اب کوئی میرے خلاف یہ تو الزام نہیں لگائے گا کہ میں نے جائیداد ہتھیانے کے لیے اس کا اور سہراب کا خون کیا۔"

"جرگے نے کیا فیصلہ دیا تھا؟" رحیم داد کے انداز میں تجسس تھا۔

"وہ تو سئیں تو نے دیکھ ہی لیا۔" سردار مزاری نے بتایا۔ "جرگے میں دونوں کے خلاف سیاہ کاری کا جرم ثابت ہو گیا تھا۔ جرگے نے مرجان کو کالی اور سہراب کو کالا مان لیا۔ بلوچ کانون کی رد سے کالی کی سزا یہ ہے کہ اسے خود اپنے ہاتھ سے گلے میں پھندا ڈال کر پھانسی پر لٹکنا پڑتا ہے۔ کالے کو کوئی بھی پھانسی پر چڑھا سکتا ہے۔ دونوں کے بارے میں جو فیصلہ ہوا وہ سارے معتبروں کا فیصلہ ہے۔ معتبر اپنے اپنے کیلوں کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ان کا فیصلہ سب کو ماننا پڑتا ہے۔ کوئی اس کے خلاف نہیں بول سکتا۔"

"جو بھی تو نے کیا' اپنے تئیں ٹھیک ہی کیا۔" رحیم داد نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "پر میں تو یہی سوچتا ہوں کہ ایسا نہ ہوتا تو بہت ٹھیک تھا۔"

"تو سمجھتا ہے کہ مرجان سے نکاح پڑھانے کے بعد تو اسے اپنے ساتھ لے جاتا اور کوٹلہ ہرکشن میں اپنی رن بنا کر رکھتا اور وہ تیرے ساتھ آرام سے رہتی؟"

"کیوں نہیں رہتی؟ کس کے پاس جاتی؟ کہیں بھی تو اس کا ٹھکانا نہیں تھا۔" رحیم داد نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "ویسے میں نے اس کی مرضی ملوم کر لی تھی۔ وہ مجھ سے ویاہ کرنے اور میری گھر والی بننے کے لیے بالکل رضامند تھی۔"

"ہرگز رضامند نہ تھی۔ بالکل جھوٹ بول رہی تھی۔" سردار مزاری نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "مجھے پتہ ہے وہ تیرے ساتھ نکاح پڑھا لیتی۔ تیرے ساتھ گھر والی بن کر کوٹلہ ہرکشن بھی چلی جاتی۔" اس کے ہونٹوں پر زہرخند ہویدا ہوا۔ "پر ایک روز چپکے سے تیری حویلی سے نکلتی اور سیدھی ممدوٹوں کے پاس لسور پہنچتی۔ وہ اسے پوری حفاظت کے ساتھ لغاریوں کے پاس چوٹی پہنچا دیتے۔"

"ایسا کر کے اسے کیا ملتا؟" رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "ویسے بھی وہ تیرا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ دستاویز پر دستخط کرنے اور مجھ سے نکاح کرنے کے بعد وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔"

"وہ بہت کچھ کر سکتی تھی۔" سردار مزاری نے ہنس کر کہا۔ "سئیں چوہدری' تجھے کچھ پتہ نہیں۔ وہ لغاریوں کی مدد سے میرے اور تیرے دونوں کے خلاف پولیس میں پرچہ چاک کراتی۔ یہ الزام لگاتی کہ میں نے ڈرا دھمکا کر زبردستی دستاویز پر دستخط کرائے اور جائیداد ہتھیا لی۔ تجھ پر وہ میرے ساتھ سازباز کرنے اور جبری نکاح کرنے کا الزام لگاتی۔"

"کیا وہ ایسا بھی کر سکتی تھی؟" رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔

"وہ بالکل ایسا کر سکتی تھی۔" مزاری نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "اور ایسا ہی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ یہ راز کسی اور نے نہیں بتایا خود مرجان نے بتایا اور پھانسی پر لٹکنے سے پہلے بتایا۔"

"کیا کہتی تھی وہ؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔

سردار مزاری نے تفصیل سے بتایا۔ "پھانسی کا پھندا گردن میں ڈالنے سے پہلے وہ غصے سے پاگل ہو گئی۔ چیخ چیخ کر معتبروں سے کہنے لگی۔ جرگے کے سامنے مکدمہ پیش نہ ہوتا اور مجھے معاف کر دیا جاتا تو میں شہ زور اور اس کے یار چوہدری' دونوں کو عدالت میں بلاتی۔ سہراب کا خون کرنے اور جائیداد پر کبضہ کرنے کے لیے اشٹامپ پر زبردستی دستخط کرانے کا الزام لگاتی۔ پورا پورا بدلہ لیتی۔ پر میں ہار گئی۔ میں اپنا بدلہ نہ لے سکی۔" سردار شہ زور مزاری نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ "فیر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔"

رحیم داد پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ حیران و پریشان نظر آ رہا تھا۔ مزاری بھی خاموش رہا۔ رات اور سنسان ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد سردار مزاری نے پہلو بدلا۔ مسکرا کر بولا۔ "تو پریشان نظر آ رہا ہے۔ اب تو آرام کر۔ خیسو کی رن تیرے پاس آ جائے گی۔ تیری ساری پریشانی جاتی رہے گی۔"

اس نے اٹھنا چاہا۔ مگر رحیم داد نے روک دیا۔ "شہ زور' تو میری اک بات مانے گا؟"

"بتا' کیا کہنا چاہتا ہے۔؟" مزاری نے مستعدی سے کہا۔

"ہاتو کا اونٹھ مل جانے کی بعد یہ تو ثابت ہو گیا کہ لنگر نے چوری نہیں کی تھی۔"

"ہاتو کا اونٹھ مل جانے سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ لنگر نے چوری نہیں کی تھی۔" شہ زور نے

رحیم داد کی دلیل مسترد کر دی۔ "ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ چوری کرنے کے بعد لنگر نے جس کے پاس ادٹھ چھپا کر رکھا تھا اس نے سزا کے ڈر سے اسے چھوڑ دیا ہو اور وہ ہاتو کے پیؤ کو مل گیا۔ جب تک پوری تفتیش نہ کی جائے' تب تک ٹھیک ٹھیک کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "لنگر کی گالہہ چھوڑ' صاف' صاف بتا تو چاہتا کیا ہے؟"

"میں چاہتا ہوں تو خمیسو اور جلاوت کو معافی دے دے۔ ان کے بال بچوں کو چھوڑ دے تاکہ وہ اپنے گھر چلے جائیں۔" رحیم داد نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔

"تو کہتا ہے تو دونوں کو معافی دے دوں گا۔" سردار مزاری نے مسکرا کر کہا۔ "اب تو خوش ہو جا۔ تجھے یار کہا ہے تو تیری بات بھی ماننی پڑے گی۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "مجھے جانا ہے۔ جلاوت کی رن میرا انتظار کرتی ہو گی۔"

سردار مزاری اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے اسے مزید روکنے کی کوشش نہ کی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا رات کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ اٹھ کر بستر پر نہ گیا۔ رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کرتی رہی۔

☆

تاریکی میں ایک پرچھائیں لہرائی۔ رحیم داد نے چونک کر دیکھا۔ خمیسو کی بیوی اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گئی۔ وہ پریشان اور گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سئیں تو نے اپنی کھٹ یہاں کیوں ڈلوائی؟" خمیسو کی بیوی نے ایک ہاتھ اٹھایا اور درختوں کے جھنڈ کی جانب اشارہ کیا۔ "ادھر ملوک زادی اور سہراب کے مردوں کو نہلایا جا رہا ہے۔"

رحیم داد نے گردن موڑ کر اس سمت نظر دوڑائی۔ درختوں تلے لالٹین کی دھندلی دھندلی روشنی میں انسانی سائے ادھر ادھر حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔ پانی گرنے کی آواز ابھری رہی تھی۔ رحیم داد نے خمیسو کی بیوی کے گھبرائے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "سئیں' تو نے خمیسو کو معافی دلانے کو کہا تھا۔ تو نے سردار سے بات کی تھی؟" اس کی نظروں میں التجا تھی۔ "سئیں تو اسے معافی دلوا دے۔ بھل ہو گی۔ سئیں توں سدا جیودی۔ سکھی صحت ہو وی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

"خمیسو اور جلاوت کو معافی مل جائے گی۔ کل تو اپنے گھر چلی جائے گی۔ جلاوت کی گھر والی بھی چلی جائے گی۔ سردار نے معافی دینے کا مجھ سے وعدہ کر لیا ہے۔"

"سئیں' تو سچ کہہ رہا ہے؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ رحیم داد کو اس طرح دیکھنے لگی جیسے اس کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔ وہ بے قرار ہو کر بولی۔ "سئیں ٹھیک ٹھیک بتا۔ سردار نے وعدہ کر لیا ہے؟"

"میں تجھ سے جھوٹ نہیں بول رہا۔" رحیم داد نے اسے باور کرایا۔ "خمیسو اور جلاوت کو اب نہ ہاتو کے لیے ادٹھ کا بندوبست کرنا پڑے گا نہ سردار کو جرمانہ ادا کرنا ہو گا۔"

وہ دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "سئیں تو جھوٹ نہیں بول سکتا۔ تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ ویران آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے۔ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر رحیم داد کو دیکھا۔ اس میں عشوہ تھا۔ لگاوٹ تھی۔ "سئیں تو کمرے کے اندر چل۔ میں کھٹ اندر ڈال دوں گی۔ تیرے ہی پاس رہوں گی۔"

"مجھے یہیں بیٹھا رہنے دے۔" رحیم داد نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تو اپنے ننگے کے پاس جا۔ وہ بھوکا ہو گا۔ جلاوت کی گھر والی کو بھی بتا دینا۔"

"وہ تو سردار کے کمرے میں ہے۔ سویرے اسے بتا دوں گی۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ مگر وہ خاموش نہ رہی۔ "سئیں تو ناراض تو نہیں ہے؟" اس نے عاجزی سے کہا۔ "میں اب جاؤں؟"

"ہاں' اب تو ٹر جا۔" رحیم داد نے بے رخی کا مظاہرہ کیا۔

خمیسو کی بیوی آگے بڑھی۔ برآمدے سے نیچے اتری اور نوکروں کی کوٹھری کی جانب روانہ ہو گئی۔ رحیم داد بت بنا چپ بیٹھا رہا۔ ہوا میں تیزی تھی۔ خشک پتے ہولے ہولے آہٹیں پیدا کر رہے تھے۔ فضا میں کافور کی تیز بو رچی ہوئی تھی۔

رحیم داد نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ مڑ کر درختوں کی جانب دیکھا۔ اندھیرے میں لالٹین کی روشنی زرد دھبے کی مانند نظر آ رہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے بار بار لالٹین کی لو بھڑکتی۔ درختوں کے نیچے رکھے ہوئے جنازوں کا اجلا اجلا کفن کبھی نمایاں ہو جاتا کبھی دھندلا پڑ جاتا۔ ان میں ایک مرجان کا جنازہ تھا اور دوسرا سہراب کا۔ مرجان کالی قرار دی گئی تھی اور سہراب کالا۔ دونوں کو سیاہ کاری کے جرم میں جرگے کے حکم پر پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ کفن میں لپٹی ہوئی ان کی لاشیں لالٹین کی دھندلی روشنی میں دور سے نظر آ رہی تھیں۔

رحیم داد اس طرح زیادہ دیر نہ بیٹھ سکا۔ پریشان ہو کر اٹھا۔ کمرے کے اندر گیا۔ اس نے لباس تبدیل کیا۔ دھوتی باندھی اور برآمدے کی جانب بڑھا۔ مگر دروازے پر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ جنازے اب چارپائیوں پر رکھے تھے۔ مزاری کے کارندے اور نوکر چاکر چارپائیوں کو کاندھوں پر اٹھائے

آہستہ آہستہ پھاٹک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ایک کارندہ ہاتھ میں لالٹین سنبھالے جنازوں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ بستر کی جانب بڑھا اور نڈھال ہو کر لیٹ گیا۔ اسے بہت دیر تک نیند نہ آئی۔ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

رات سخت ذہنی کرب کے عالم میں کٹی۔ صبح اس نے حسب معمول سردار مزاری کے ساتھ ناشتا کیا اور دھوپ کی تمازت بڑھنے سے پہلے ہی مزاری کے ہم راہ جیپ میں بیٹھ کر شاہ میر کی جانب روانہ ہو گیا۔

۴۱

رحیم داد بے زار اور اکتایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شاہ میر پہنچنے کے چند ہی روز بعد سویرے ہی سویرے اس نے سردار شہ زور خان مزاری سے صاف صاف کہہ دیا۔ "مزاری' میں نے لہور جانا ہے۔ اب تیرے ساتھ نہیں ٹھہر سکتا۔"

سردار مزاری نے اس بار بھی اس کی حوصلہ افزائی نہ کی' مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔ "لہور جانا ہے تو ضرور جا۔ میں کب کہتا ہوں نہ جا' پر میں نے بھی لہور جانا ہے۔ دونوں اکٹھے ہی چلیں گے۔"

"تو بعد میں پہنچ جانا۔ مجھے جانے دے۔"

"میں نے ادھر شاہ میر میں کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔ ان سے فارغ ہوتے ہی چل دوں گا۔" شہ زور مزاری نے اسے روکنے کے لیے عذر پیش کیا۔ "چند روز میں سارے کام نمٹ جائیں گے۔ تو چند روز بھی انتظار نہیں کر سکتا؟"

"میں لہور میں تیرا انتظار کروں گا۔" رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔ "میں نے شاہ جی سے مل کر لائل پور کی الاٹمنٹ کا فیصلہ کرانا ہے۔ تجھے پتہ نہیں ادھر کی زمین کتنی کام کی ہے۔ میں نے اسے اپنے نام الاٹ کرانا ہے اور فوری طور پر کرانا ہے۔"

"شاہانی بتاتا تھا' وہ تو جھگڑے کی اراضی ہے۔ اس کے تو کئی دعویدار ہیں۔ اس کے فیصلے میں تو دیر لگے گی۔" سردار مزاری نے کہا۔ "جب تک ادھر کا فیصلہ ہو ادھر تجھے الاٹمنٹ بھی مل جائے گی۔ تیری درخواست پر کارروائی شروع ہو چکی ہے۔ اب تو الاٹمنٹ ملنے کا انتظار ہے۔ اس میں

زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ محکمہ بحالیات میں اوپر سے نیچے تک سارے ہی اپنے بندے لگے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر اور افسر مال سے بھی یاری ہے۔ قبضہ بھی جلد مل جائے گا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" رحیم داد نے اس کی تائید کی۔ "ادھر کی الاٹمنٹ کا کام تو دیکھ لے گا۔ لائل پور کا معاملہ الجھا ہوا ہے۔ اس کے لیے مجھے خود جا کر کوشش کرانی ہوگی۔"

"ضرور کرانا۔ پر ادھر کی اراضی کی الاٹمنٹ کے لیے تیرا یہاں موجود ہونا بھی ضروری ہے۔" سردار مزاری نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "میں آج ہی چاکر خاں کو روانہ کرتا ہوں کہ وہ افسروں سے مل جل کر کم سے کم مدت میں الاٹمنٹ حاصل کرلے۔ تو چند روز ادھر آرام کر۔ اپنی اراضی کی الاٹمنٹ لے اور چلا جا۔ بعد میں چاکر تیری اراضی کی دیکھ بھال کرتا رہے گا۔" اس کے لہجے میں نرمی اور محبت کی شیرینی گھلی ہوئی تھی۔ "میری خوشی ہے تو ابھی نہ جا۔ دونوں اکٹھے چلیں گے۔ کچھ ہی دنوں کی تو بات ہے۔"

رحیم داد نے مزاری کے مسلسل اصرار کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ لاہور جانے کا ارادہ ترک کردیا۔ سردار مزاری نے خوش ہو کر فوراً چاکر خاں سرگانی کو بلایا اور اسے ڈیرہ غازی خاں شہر کی جانب روانہ کردیا۔

رحیم داد کوٹ کے ڈیرے میں ٹھہرا رہا۔ شاہ میر پہنچتے ہی سردار شہ زور خاں کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ روزانہ ہی ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد کچہری لگاتا۔ کچہری کا بندوبست عام طور پر مہمان خانے کے اس وسیع اور کشادہ کمرے میں کیا جاتا جو روشن اور ہوادار بھی تھا۔ اس کی کھڑکیاں صحن میں کھلتی تھیں۔ زیادہ گرمی اور حبس ہوتا تو کچہری درختوں تلے لگتی۔ سردار مزاری اونچے اور چوڑے چکلے پلنگ پر بیٹھ جاتا۔ کوئی باٹھایا کراوا اس کے پیروں اور کمر کے گرد خیری لپیٹ کر زانو بندی کر دیتا۔

کچہری میں طرح طرح کے مقدمات پیش کیے جاتے۔ سردار مزاری مقدمے کی کارروائی کے دوران حسب معمول سنجیدہ رہتا۔ اس کے چہرے پر رعب ودبدبہ چھایا ہوتا۔ وہ فریقین کے بیانات پوری توجہ سے سنتا۔ گواہوں پر جرح کرتا۔ مقدمہ سمجھنے اور اصل حقیقت کا سراغ لگانے کی حتی الوسع کوشش کرتا۔ فیصلہ سنانے سے قبل کچھ دیر مقدمے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا۔ اس کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوتا۔ ہر فریق کو تسلیم کرنا پڑتا۔ کوئی فریق اس کے فیصلے کے خلاف سرکاری عدالت سے رجوع کرنے کا مجاز نہ تھا۔ اگر کوئی ایسی جرات کرتا تو حکم عدولی اور نافرمانی کے الزام میں اس کے خلاف قبائلی قوانین کے مطابق مقدمہ چلایا جاتا اور کڑی سزا دی جاتی۔

کچہری، سردار شہ زور مزاری کی آمدنی کا نہایت اچھا اور معقول وسیلہ تھی۔ وہ مقدمات کی باقاعدہ فیس وصول کرتا اور جرمانے کی رقم بھی۔ سردار مزاری دوپہر تک کچہری لگاتا۔ پھر کھانا کھاتا اور آرام کرنے حویلی کے اندر چلا جاتا۔ شام کو پینے پلانے کا شغل ہوتا۔ دوست احباب اور سرکاری افسر آجاتے تو جوا بھی ہوتا۔ رات گئے تک اس کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ ہزاروں روپے ادھر سے ادھر ہو جاتے۔

رحیم داد، دل بہلانے کے لیے کچہری میں جا کر بیٹھ جاتا۔ مقدمات کی کارروائی دلچسپی سے سنتا۔ اور اس سے بھی زیادہ دلچسپی سے فیصلے سنتا۔ مقدمات کی طرح فیصلے بھی عجیب وغریب ہوتے۔ ان کے ذریعے رحیم داد کو بلوچوں کے روایتی قوانین اور ان کے قبائلی رسم ورواج سمجھنے کا موقع ملتا۔

چاکر خان سرگانی، ڈیرہ غازی خاں شہر سے واپس نہیں آیا تھا۔ وہ رحیم داد کے کلیم کی بنیاد پر متروکہ اراضی کا الاٹ منٹ حاصل کرنے کے لیے اعلیٰ حکام اور سرکاری اہل کاروں سے ملاقاتیں کر رہا تھا۔ دفتروں کے چکر کاٹ رہا تھا۔ فائلوں کو ایک شعبے سے دوسرے شعبے تک جلد سے جلد پہنچانے کی کوشش میں لگا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں کچہری کا انتظام وانصرام، کم دار وحدت خاں گورچانی کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ وہ پیش کار کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ مقدمات کی فیس اور جرمانوں کی رقم وصول کرتا تھا۔ رجسٹر میں باقاعدہ اس کا اندراج کرتا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا۔ لیکن پرانا ملازم تھا۔ کم دار کی حیثیت سے کام کرتے کرتے زمین داری کے امور کے ساتھ کچہری کے معاملات بھی خوش اسلوبی سے انجام دینے لگا تھا۔ وہ سردار شہ زور مزاری کا مزاج بخوبی سمجھتا تھا۔ اس کی نظریں پہچانتا تھا۔

ایک صبح کچہری لگی تھی۔ رحیم داد بھی کمرے میں موجود تھا۔ سردار مزاری، پلنگ پر دلٹھ مارے بیٹھا تھا۔ اس کی طبیعت قدرے مکدر تھی۔ رات اس نے کچھ زیادہ ہی شراب نوشی کی تھی۔ اور قمار بازی میں ہارا بھی زیادہ تھا۔ اس کے چہرے سے تھکن اور شب بیداری کے اثرات ہویدا تھے۔ آنکھوں میں سرخی تھی۔ ہونٹ خشک تھے۔ مقدمات کی کارروائی کے دوران بار بار پانی پیتا۔ ایک ملازم پشت پر کھڑا نہایت مستعدی سے پنکھا جھل رہا تھا۔ قریب ہی کم دار وحدت خاں ادب سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے دو ماتحت کراوے دروازے کے دائیں بائیں چاق چوبند کھڑے تھے۔

مقدمات کی سماعت جاری تھی۔ سردار شہ زور خاں مزاری، فریقین کے بیانات سن رہا تھا۔ گواہوں پر جرح کر رہا تھا۔ اور بیانات اور جرح کی روشنی میں قبائلی قوانین اور ضابطوں کے

مطابق فیصلے کر رہا تھا۔ عام طور پر وہ فریقین کے مابین صلح صفائی کرانے کی کوشش کرتا۔ جرم سنگین نوعیت کا ہوتا تو جرمانہ عائد کرتا۔ زیادہ سنگین ہوتا تو جرمانے کے ساتھ ساتھ قید کی سزا بھی دیتا۔

کمرے کی فضا بوجھل تھی۔ خلاف معمول خاموشی کچھ زیادہ ہی تھی۔ ایک بوڑھی بلوچ عورت اپنا مقدمہ پیش کرنے کی غرض سے داخل ہوئی۔ اس کا لباس میلا کچیلا اور بوسیدہ تھا۔ سر کے بال بھی میلے چیکٹ تھے۔ جسم سے پسینے کی بو کے تیز بھبکے اٹھ رہے تھے۔ وہ آگے بڑھی اور سردار مزاری کے روبرو ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

سردار مزاری نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ بوڑھی عورت نے گڑگڑا کر فریاد کی۔ "سئیں سردار سدا جیویں۔ سکھی صحت ہوویں۔ سئیں! میں لٹ گئی۔ تباہ ہو گئی۔ میں فریادی ہوں۔ تیرے پاس نروار کے لیے آئی ہوں۔ مجھے پکا یقین ہے' تو میرے ساتھ نیائے کرے نا۔ توں ضرور نیائے کرے گا۔"

"تیرے ساتھ پورا پورا نروار اور انصاف ہو گا۔" سردار مزاری نے بوڑھی بلوچ عورت کو یقین دلایا۔ "پروا نہ کر۔ صاف صاف بتا' تیرے ساتھ کیا ظلم ہوا۔ کس نے ظلم کیا؟ بے دھڑک اپنا بیان پیش کر۔"

"سئیں! میرے گھر والے کا مدت ہوئی مرن ہو گیا۔ تب سے میں رنڈ بیوہ ہوں۔" بوڑھی عورت نے گلوگیر لہجے میں اپنا بیان شروع کیا۔ "میری صرف ایک نینگر دھی ہے۔ اس کا ابھی پرنا نہیں ہوا۔ کنواری ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ "سئیں! میری دھی کو اغوا کر لیا گیا۔ اٹھا لیا گیا۔ چار روز سے وہ اسی کے پاس ہے۔ اس نے مجھے تک کر دیا۔ بے عزتا کر دیا۔ توں اسے سزا دے کر میری تک صاف کر دے' کالک کا داغ مٹا دے۔" اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے۔ "سئیں سردار! میرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ میں مصیبت کی ماری ہوں۔ غریب ہوں۔ حلیم ہوں۔ سئیں میرا کوئی بھی نہیں۔"

بوڑھی عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سردار مزاری اس کی آہ وزاری سے بہت متاثر ہوا۔ نرم لہجے میں اسے تسلی دی۔ "صبر کر' صبر کر۔ تجھے پتہ ہے' اسے کون اغوا کر کے لے گیا؟"

"سئیں' میں نے پتہ ہے۔ اچھی طرح پتہ ہے۔" اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

سردار کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔ "کون ہے وہ؟ کہاں رہتا ہے؟"

"سئیں سردار! وہ چک رحمان کا بدھیل خاں ہے۔" بوڑھی بلوچ عورت نے بتایا۔ "میرے گھر والے کا عتر بجا ہے۔ اس طرح وہ میرا ایک شلوار ہوتا ہے۔ بہت نزدیک کا رشتہ سانگا ہے۔"

بدھیل کا نام سن کر رحیم داد چونکا۔ وہ بدھیل کو کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس حقیقت سے بخوبی واقف

تھا کہ وہ شہ زور خان مزاری کا بہت وفادار اور جانثار تھا۔ قابل اعتماد تھا۔ رازدار تھا۔ سہراب اور مرجان کی گرفتاری میں اس نے بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ ایسا زبردست کارنامہ انجام دیا تھا کہ شہ زور مزاری کا بدنامی اور خجالت سے جھکا سر اونچا ہو گیا۔ اس کا دبدبہ اور وقار بحال ہو گیا۔

رحیم داد نے غور کیا' سردار مزاری کا چہرہ بھی دم بھر کے لیے متغیر ہو گیا۔ مگر بوڑھی بلوچ عورت رحیم داد کے ذہنی خلفشار اور سردار مزاری کے چہرے کے تاثرات سے بے نیاز' بدھیل خاں کے خلاف بولتی رہی۔ "سئیں! سب کو پتہ ہے۔ 'میری دھی اب تک اس کے گھر میں ہے۔"

"تو نے اپنی دھی کو واپس لانے کی کوشش کی؟" سردار مزاری نے دریافت کیا۔ "تو بدھیل کے گھر گئی تھی۔"

"سردار! میں اس کے گھر گئی تھی۔" عورت نے جواب دیا۔ "پر اس نے ساوئنی کو واپس دینے سے صاف انکار کر دیا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "سئیں' میری دھی کا ناں ساوئنی ہے۔ بدھیل کے لیے تو وہ رشتے کے اعتبار سے نیاڑی ہے۔ تجھے پتہ ہے' نیاڑی کے ساتھ لک چھپ کے یاری لگانا بلوچوں میں حرام سمجھا جاتا ہے۔ اور اسے ورغلا کر لے جانا کتنا وڈا جرم ہوتا ہے۔ تو بلوچ سردار ہے۔ تجھے تو سب پتہ ہے ناں؟"

"یہ بتا' جب تو بدھیل کے گھر ساوئنی کو لینے گئی تو اس نے تجھے کیا کہا؟" سردار مزاری نے سوال کیا۔

"سئیں' وہ بہت ناراض ہوا۔" بوڑھی عورت نے جواب دیا۔ "چیخ کر بولا' ساوئنی یہاں سے نہیں جائے گی۔ کوئی اسے نہیں لے جا سکتا۔" بات کہتے کہتے وہ لمحے بھر کے لیے ٹھٹکی۔ "سئیں! اس نے تو یہ بھی کہا۔ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں سردار کا لاڑلا ہوں۔ میں اس کا..."

"بکواس نہ کر۔" سردار شہ زور مزاری نے جھنجلا کر ڈانٹا۔ "وہ ہرگز ایسی گالھ نہیں کہہ سکتا۔" اس کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا۔ تیوری پر بل پڑ گئے۔ "کوئی میرا لاڑلا شاڑلا نہیں۔"

بوڑھی عورت خوف سے زرد پڑ گئی۔ گھگیا کر بولی۔ "سئیں سردار! میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔" اس کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔ "میں نے تو اپنی ساوئنی واپس لینی ہے۔ میں نے بدھیل سے کیا لینا۔ توں نیائے کر۔ میرے ساتھ انصاف کر۔" وہ گڑگڑا کر دعائیں دینے لگی۔ "سئیں سردار سدا جیویں' رب راضی ہووے۔ میں صدکے ونجاں۔"

"تیرے ساتھ انصاف ہو گا۔ پورا انصاف ہو گا۔" مزاری نے ایک بار پھر اسے یقین دلایا۔ عورت نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ خاموش کھڑی رہی۔ سردار مزاری نے مڑ کر وحدت خاں

گورچانی کی جانب دیکھا۔ “وحدت، کل صبح بدھیل کو ساوَنی کے ساتھ پکڑ کر کچہری میں پیش کیا جائے۔” وہ بوڑھی عورت کی طرف متوجہ ہوا۔ “اب تو جا۔ کل بدھیل اور ساوَنی کے ساتھ تیری بھی پیشی ہوگی۔”

بوڑھی عورت دعائیں دیتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

سورج اب آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا تھا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ گرمی اس روز کچھ زیادہ ہی تھی اور سردار مزاری کی طبیعت بھی مضمحل تھی۔ لہٰذا کچہری، معمول سے کچھ پہلے ہی برخاست کردی گئی۔

دوسرے روز کچہری لگی۔ مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ وحدت خان گورچانی نے بدھیل کو سردار مزاری کے روبرو پیش کیا۔ ساوَنی کی بوڑھی ماں بھی موجود تھی۔ شہ زور مزاری کے چہرے پر کچھ زیادہ ہی سنجیدگی چھائی تھی۔ اس کی آنکھیں سوچتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ بدھیل خان جب سامنے آیا تو اس نے نظریں اٹھائیں۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے چہرے کو دیکھا اور گردن اٹھا کر دیوار کو تکنے لگا۔ وہ انگلیوں سے آہستہ آہستہ مونچھیں مروڑ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد سردار مزاری کی بھاری بھرکم آواز ابھری۔ “بدھیل۔” اس نے بوڑھی عورت کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ “تو اس ذال کو جانتا ہے؟”

بدھیل نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ خاموش رہا۔ مگر ساوَنی کی ماں خاموش نہ رہی۔ تیکھے لہجے میں بولی۔ “کیوں نہیں جانتا؟ بالکل جانتا ہے۔ سئیں سردارا، یہ تو۔”

سردار مزاری نے اسے آگے نہ بولنے دیا۔ غصے سے ڈپٹ کر بولا۔ “بڈھڑی، چپ کر کے کھڑی رہ۔ جب تجھ سے پوچھا جائے تب بول۔” ساوَنی کی ماں ڈانٹ سن کر سہم گئی۔ نظریں جھکا کر فرش کو تکنے لگی۔

مزاری نے بدھیل کی جانب دیکھا۔ “اس ذال نے تیرے خلاف سیاہ کاری کا الزام لگایا ہے۔ اپنے بیان میں کہا ہے تو اس کی دھی، ساوَنی، کو اٹھا کر لے گیا۔ وہ ابھی تک تیرے پاس ہے۔” اس نے قدرے تامل کیا۔ “تو اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتا ہے؟”

“سئیں سردار، میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ سب کچھ سچ بتا دوں گا۔” بدھیل نے اپنی صفائی میں کہا۔ “یہ ٹھیک ہے کہ ساوَنی سے میں پیار کرتا ہوں۔ اسے اپنی رن بنانا چاہتا ہوں۔ میں اس کے ساتھ پرنا کرنا چاہتا تھا۔” اس نے نظریں موڑ کر بوڑھی کو دیکھا۔ “میری ماں اس کے پاس بازو منگن کے لیے گئی۔ میں بھی گیا۔ ایک بار نہیں بار بار گیا۔ اس کی منت کی۔ زاری کی پر اس نے

ہر باری میری منت کو ٹھکرا دیا۔ میرے ساتھ ساوَنی کا پرنا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔”

ساوَنی کی ماں نے تیکھی نظروں سے بدھیل کو دیکھا۔ مگر خاموش رہی۔ بدھیل خان سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ “سئیں، سچی گالھ یہ ہے کہ یہ ایک بڈھے سے ساوَنی کا پرنا کرنا چاہتی ہے۔ اس کا ناں، تاج محمد ہے۔ وہ میران پور کا سنارا ہے۔ اس کے پاس بہت مال متال ہے۔ یہ ساوَنی کے لیے اس سے دو ہزار روپے لے رہی تھی۔”

بوڑھی عورت کے لیے اب غصے پر قابو پانا ممکن نہ رہا۔ تلملا کر بولی۔ “سئیں، اس سے پوچھ، یہ میرا کیا لگتا ہے؟ ساوَنی، میری دھی ہے۔ میری جس سے مرضی ہوگی اس کے ساتھ ساوَنی کا پرنا کروں گی۔ یہ کون ہوتا ہے؟ یہ ساوَنی کو اٹھا کر کیوں لے گیا؟”

“سئیں سردارا، یہ بالکل غلط کہہ رہی ہے۔ میں ساوَنی کو اٹھا کر نہیں لے گیا۔” بدھیل نے فوراً تردید کی۔ “ساوَنی اپنی مرضی سے چل کر میرے گھر آئی تھی۔”

“سئیں، یہ صاف جھوٹ بول رہا ہے۔” بوڑھی عورت کے لہجے میں تلخی اور جھنجلاہٹ تھی۔ “یہ اوٹھ پر بیٹھ کر اندھیرے میں میرے گھر آیا۔ اور ساوَنی کو زبردستی اٹھا کر لے گیا۔”

“تجھے کیسے پتہ چلا کہ یہ ساوَنی کو زبردستی اٹھا کر لے گیا۔” سردار مزاری نے جرح کرنے کے انداز میں ساوَنی کی ماں سے دریافت کیا۔ “کیا ساوَنی نے تجھے ایسا کہا ہے؟”

“نا سئیں۔” بوڑھی عورت نے انکار میں گردن ہلائی۔ “میں اس کے گھر گئی تھی۔ پر اس نے مجھے ساوَنی سے ملنے ہی نہیں دیا۔ اس کی ماں نے اسے گھر کے اندر بند کر رکھا ہے۔ کسی سے اسے ملنے نہیں دیتی۔”

“سئیں سردار، یہ بالکل جھوٹ بول رہی ہے۔” بدھیل خاں نے صفائی پیش کی۔ “ساوَنی کو میری اماں نے کہیں چھپا کر نہیں رکھا۔ جب یہ میرے پاس آئی تو ساوَنی میرے گھر میں تھی ہی نہیں۔”

“کہاں ہے وہ؟” سردار مزاری نے بدھیل سے سوال کیا۔

“سئیں سردار، مجھے کچھ پتہ نہیں، وہ کہاں ہے۔” بدھیل نے بتایا۔

ساوَنی کی ماں تڑپ کر بولی۔ “سئیں، یہ فریبی ہے۔ بالکل جھوٹا ہے۔ اسے سب پتہ ہے، ساوَنی کہاں ہے۔ وہ اس کے گھر ہی میں ہے۔”

سردار شہ زور خاں مزاری نے بوڑھی عورت کو نظرانداز کرتے ہوئے مڑ کر وحدت خاں گورچانی کی طرف دیکھا۔ “وحدت! کل تجھے حکم دیا گیا تھا کہ بدھیل کے ساتھ ساوَنی کو بھی پیش کیا جائے۔ تو اسے کیوں نہیں لایا؟” اس کا لہجہ درشت ہو گیا۔ “وہ کیوں نہیں آئی؟ کدھر ہے وہ؟”

"سئیں سردار' میں بدھیل کے گھر خود گیا تھا۔" وحدت خان نے وضاحت کی۔ "پر ساوَنی وہاں نہیں تھی۔"

"تو نے گھر کی تلاشی لی تھی؟" سردار مزاری نے سوال کیا۔

"میں نے گھر کی پوری تلاشی لی تھی۔ جب ساوَنی وہاں نہیں ملی تو اسے ڈھونڈنے کی ہر جگہ کوشش کی۔ پر اس کا کچھ سراغ نہیں ملا۔"

"سئیں' اس نے اسے کہیں چھپا دیا ہے۔" ساوَنی کی ماں نے بدھیل کی طرف غصے اور نفرت سے دیکھا۔ "اسے پتہ ہے وہ کہاں ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ گڑگڑانے لگی۔ "سئیں' مجھے میری ساوَنی دلوا دے۔ میں غریب ہوں۔ حلیم ہوں۔ رنڈ بیوہ ہوں۔ میرا کوئی نہیں۔ میرے ساتھ نیائے کیا جائے۔ توں سردار ہے۔ مالک ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"صبر کر۔ تسلی رکھ۔" سردار مزاری نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "تیرے ساتھ نیائے ہو گا۔ پورا پورا انصاف ہو گا۔"

بدھیل کے چہرے پر خوف اور پریشانی کے سائے منڈلانے لگے۔ ساوَنی کی ماں دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔ کمرے میں کچھ دیر کے لیے گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ پھر سردار مزاری کی آواز ابھری۔ اس نے وحدت کو مخاطب کیا۔

"وحدت! ساوَنی کو پوری طرح تلاش کر۔ جہاں بھی ملے پکڑ کر پیش کیا جائے۔ جب تک وہ برآمد نہ ہو' تب تک بدھیل کیدی رہے گا۔ اسے جیل میں بند کر دیا جائے۔"

یہ حکم صادر کرنے کے بعد مقدمے کی کارروائی آئندہ پیشی تک ملتوی کر دی گئی۔

☆

ساوَنی کچہری میں حاضر تھی۔ اس کی ماں بھی موجود تھی۔ بدھیل بھی تھا۔ ساوَنی جوان تھی اور خوش شکل بھی تھی۔ قد نکلتا ہوا تھا' جسم چھریرا تھا۔ رنگ اجلا تھا۔ مگر غذائیت کی کمی اور سخت مشقت کے باعث زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھوں سے خوف جھلکتا تھا۔ اس کا لباس بوسیدہ اور ملگجا تھا۔ وہ دوپٹے کے آنچل سے چہرے کا نصف سے زائد حصہ چھپائے سہمی ہوئی کھڑی تھی۔

مقدمے کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے وحدت خان گورچانی نے ساوَنی کو پیش کیا۔ ہاتھ کے اشارے سے سردار شہ زور مزاری کو آگاہ کیا۔ "سئیں سردار' یہ ساوَنی حاضر ہے۔"

"تو نے اسے کہاں سے برآمد کیا؟" مزاری نے دریافت کیا۔

وحدت نے بتایا۔ "آج صبح یہ خود ہی حاضر ہو گئی۔"

مزاری نے نظر بھر کر ساوَنی کو دیکھا' پوچھا۔ "تیرا ناں' ساوَنی ہے؟"

"ہا سئیں!" ساوَنی نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر اقرار کیا۔

"تو اب تک کہاں تھی؟" مزاری نے سوال کیا۔

"میں اپنی سوتر کے پاس تھی۔" ساوَنی نے لرزتی آواز میں کہا۔ "وہ چک سلیم میں رہتی ہے۔ وہ مجھے بہت پیار کرتی ہے۔ اس کا گھر والا بھی نیک بندہ ہے۔ دونوں نے مجھے بہت آرام سے رکھا۔"

"تو اس کے پاس کیوں گئی؟"

"ماں کے ڈر سے گئی تھی۔ وہ ناراض ہوتی۔ مجھے مارتی پیٹتی۔" ساوَنی نے سردار مزاری کو مطلع کیا۔

"بدھیل کو پتہ تھا تو اپنی سوتر کے گھر میں ہے؟"

"نا سئیں!" اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ "میں کسی کو بتائے بنا' ایک شام چپ چپاتے اس کے پاس چلی گئی تھی۔"

"سئیں سردار' یہ جھوٹ بول رہی ہے۔" ساوَنی کی ماں نے مداخلت کی۔ "اسے بدھیل نے ادھر پہنچایا ہو گا۔ ایسے ہی وہ اسے اٹھا کر بھی لے گیا تھا۔"

سردار مزاری نے اس کی مداخلت کو پسند نہ کیا۔ قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر ساوَنی کی جانب متوجہ ہوا۔ "ساوَنی' تیری ماں کہتی ہے بدھیل تجھے زبردستی اٹھا کر لے گیا تھا۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

ساوَنی کچھ نہ بولی۔ گردن جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ کچہری میں موجود ہر شخص کی نظریں ساوَنی کی جانب اٹھی تھیں۔ چہروں پر تجسس کے تاثرات ہویدا تھے۔

جب ساوَنی نے دیر تک سوال کا جواب نہ دیا تو سردار شہ زور نے نرمی سے اصرار کیا۔ "ڈر نہیں' سچ سچ بتا۔"

ماں نے بھی پچکار کر محبت بھرے لہجے میں کہا۔ "ساوَنی' توں سردار نے صاف صاف بتا دے' بدھیل تجھے اٹھا کر لے گیا تھا۔ اپنے گھر میں بند کر رکھا تھا۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا ناں؟"

ساوَنی نے ماں کی جانب توجہ نہ دی۔ نظریں اٹھا کر مزاری کی جانب دیکھا اور انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگی۔

"خالی گردن نہ ہلا۔" مزاری نے ڈپٹ کر کہا۔ "جو کچھ کہنا ہے' زبان سے کہہ اور ٹھیک ٹھیک

بیان کر۔"

"میں اپنی مرضی سے بدھیل کے گھر گئی تھی۔" ساوَنی کی آواز کپکپا رہی تھی۔ نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ "سئیں، اس نے مجھے اٹھایا نہیں۔"

"سردار، یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ صاف صاف جھوٹ بول رہی ہے۔" ماں نے گلوگیر لہجے میں احتجاج کیا۔ "بدھیل نے اسے ڈرایا دھمکایا ہے۔"

مزاری نے ساوَنی سے سوال کیا۔ "کیا تیری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے؟ بدھیل نے تجھے ڈرایا دھمکایا ہے؟"

"نا سئیں!" اس بار ساوَنی کے لہجے میں اعتماد جھلک رہا تھا۔ "بدھیل نے مجھے بالکل ڈرایا دھمکایا نہیں۔ میں اس کے ساتھ راضی باضی تھی۔" بات کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے چھلکتی آنکھوں سے سردار مزاری کی جانب دیکھا۔ آنسو پلکوں سے ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر گرنے لگے۔ "سئیں، میں تاج محمد سے پرنا کرنا نہیں چاہتی۔ ماں اس کے ہاتھ مجھے بیچ دینا چاہتی ہے۔ وہ بڈھا کھوسٹ ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے گھن آتی ہے۔"

ماں غصے سے دانت پیستی ہوئی ساوَنی پر جھپٹی، اس کی پیٹھ پر زور سے دوہتڑ مارا اور سر کے بال نوچنے کھسوٹنے لگی۔ چیخ چیخ کر کوسنے لگی۔ شہ زور خان مزاری کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا۔ اس نے خونخوار نظروں سے بوڑھی عورت کو دیکھا۔ جھنجلا کر ڈانٹا۔ "الگ ہٹ۔ چپ کر کے کھڑی ہو۔ آگے تو نے ایسی حرکت کی تو کچہری سے باہر نکال دوں گا۔ جرمانہ ڈال دوں گا۔"

ساوَنی کی ماں، سردار مزاری کو غصے کے عالم میں دیکھ کر سہم گئی۔ اس نے ساوَنی کے بالوں کو چھوڑ دیا۔ اور روتے ہوئے بولی۔ "سئیں، میں لٹ گئی۔ میں برباد ہو گئی۔ بدھیل نے اس پر جادو ٹونا کر دیا ہے۔" اس نے ہاتھ سے ساوَنی کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ ایسی ہو ہی نہیں سکتی۔ میں اس کی ماں ہوں۔ اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں نے اسے جنا ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے کون جانتا ہے۔"

"بہت بول چکی۔ بند کر اپنی بکواس۔" سردار مزاری نے ایک بار پھر برہم ہو کر اسے جھڑکا۔ "تو چپ کر کے کھڑی نہیں رہ سکتی؟ تجھے پتہ ہے، یہ کچہری ہے۔"

کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ ہر شخص دم بخود تھا۔ سردار مزاری نے گردن جھکائی اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چہرے پر چھائے ہوئے غصے اور جھنجلاہٹ کا غبار رفتہ رفتہ چھٹنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے نظریں اٹھا کر ساوَنی کو دیکھا۔ اسے مخاطب کیا۔ "ساوَنی، یہ بتا تو بدھیل کے پاس کتنے روز رہی تھی۔؟"

"دو روز۔" ساوَنی نے سردار مزاری سے نظریں ملائے بغیر دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور سراسیمگی پھیل گئی۔

ساوَنی کی ماں ڈانٹ پھٹکار کے باوجود اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس نے ایک بار پھر مداخلت کی۔ "سئیں سردار، یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" بوڑھی عورت نے نفرت سے ساوَنی کو دیکھا۔ "پر دو روز میں اس نے اپنی پت بگاڑ لی۔" اس نے بدھیل کی طرف اشارہ کیا۔ "اس نے ساوَنی کو خراب کر دیا۔ سئیں سردار یہ کالا ہے۔ اسے کڑی سزا ملنی چاہیے۔"

"اگر یہ کالا ہے تو ساوَنی بھی کالی ہوئی۔" سردار مزاری نے تیکھی نظروں سے ساوَنی کی ماں کو دیکھا۔ "تجھے پتہ ہے کالے اور کالی کی سزا کیا ہوتی ہے؟"

ساوَنی کی ماں دم بخود رہ گئی۔ جھنجلاہٹ اور برہمی کے بجائے اس کے چہرے پر خوف اور سراسیمگی کے سائے پھیل گئے۔

رحیم داد کچہری میں موجود تھا۔ کالا اور کالی کے الفاظ سن کر وہ بھی پریشان ہو گیا۔ اسے اب اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ کالے کالی کی سزا کیا ہوتی ہے۔ وہ سہراب اور مرجان کا ہولناک انجام دیکھ چکا تھا جن پر سیاہ کاری کے الزام میں مقدمہ چلا تھا اور جرگے نے کالا اور کالی قرار دے کر دونوں کو پھانسی کی سزا دی تھی۔ رحیم داد نے بدھیل اور ساوَنی کو دیکھا۔ ان کے چہروں پر اسے موت کے سائے منڈلاتے نظر آئے۔

سردار مزاری نے ساوَنی سے دریافت کیا۔ "سچ، سچ بتا، بدھیل نے تجھے خراب تو نہیں کیا؟"

"نا سئیں۔" ساوَنی نے شرما کر اٹکتے ہوئے بتایا۔ "میں بالکل ستھری ہوں۔ نیک مئی ہوں۔"

"کیا ثبوت ہے کہ بدھیل نے تجھے خراب نہیں کیا۔ تو کالی نہیں ہوئی؟" مزاری نے جرح کی۔

ساوَنی نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش کھڑی رہی۔ مزاری کے سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ نظریں جھکائے فرش کو تکتی رہی۔ سردار مزاری گردن جھکا کر ایک بار پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے نظریں اٹھا کر ساوَنی کو دیکھا۔ لمحہ بھر تک اس کے چہرے کو تکتا رہا۔ مگر اس پر مزید جرح نہ کی۔ مڑ کر وحدت خاں گورچانی کی جانب متوجہ ہوا۔ "وحدت!" اس نے ساوَنی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ کوٹ میں رہے گی۔ اسے پرسوں کچہری میں پیش کرنا۔ فیصلہ بھی اسی روز سنایا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے سیں!" وحدت خاں گورچانی نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ اس نے قدرے تامل کیا۔ پھر دبی زبان سے دریافت کیا۔ "بدھیل کے بارے میں کیا حکم ہے؟"

"اسے چھوڑ دیا جائے۔ اب یہ اپنے گھر جا سکتا ہے۔ اسے اگلی پیشی پر کچہری میں حاضر ہونا ہو گا۔" مزاری نے بدھیل کی رہائی کے لیے حکم جاری کیا۔

مقدمے کی کارروائی دو روز کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

☆

دوپہر کو رحیم داد نے شہ زور مزاری کے ساتھ کھانا کھایا۔ مگر مقدمے کے بارے میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ رات کو بھی نہیں ہوئی۔ دوسرے روز سردار مزاری نے کچہری نہ لگائی۔ رحیم داد سے بھی اس کی ملاقات نہ ہوئی۔

دن ڈھلے رحیم داد نے معمول کے مطابق غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ کمرے سے باہر نکلا۔

مہمان خانے کے وسیع صحن میں نوکروں نے مونڈھے ڈال دیئے تھے۔ چھڑکاؤ بھی کیا تھا۔ زمین سے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

رحیم داد ایک مونڈھے پر جا کر بیٹھ گیا۔ شام کے سرمئی سائے در و بام پر پھیلتے جا رہے تھے۔ کمروں اور کوٹھریوں میں لیمپ اور چراغ روشن کر دیئے گئے تھے۔ مہمان خانے کے ایک گوشے میں باورچی خانہ تھا۔ باورچی خانے سے کھانوں کی خوشبو نکل کر فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ موسم گرما کی یہ شام بوجھل اور بے کیف تھی۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ رحیم داد بدن پر پسینے کی نمی محسوس کر رہا تھا۔ اسے سردار مزاری کا انتظار تھا۔

شام گہری ہو گئی تھی۔ مگر شہ زور مزاری نہ آیا۔ رحیم داد اس کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ اسی اثنا میں بدھیل خاں آ گیا۔ وہ آہستہ' آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے حیرت سے دیکھا' پوچھا۔ "بدھیل' تو ادھر کیسے آ گیا؟"

"سیں' میں نے سردار سے ملنا تھا۔" بدھیل نے جواب دیا۔

"سردار' تجھے ملا؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"ہا سیں۔ پر اس سے کوئی گالہہ نہیں ہوئی۔ وہ جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اس نے مجھے دیکھا پر کچھ بولا نہیں۔" بدھیل خاں نے رحیم داد کو بتایا۔ "وہ اپنے مانماں کے پاس رجھان گیا ہے۔ اس کا مانماں بیمار ہے۔"

"تو سردار سے کیوں ملنا چاہتا تھا؟"

"سیں' میں نے اسے یہ بتانا تھا کہ ساوَنی بالکل ستھری ہے۔ بے گناہ ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔" بدھیل نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پر تو نے اسے گھر میں رکھا ہی کیوں؟"

"سیں' میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ جب ساوَنی چھپ کر میرے گھر آئی تو میں گھبرا گیا۔ ماں نے بھی برا منایا۔ میں نے ساوَنی کو کہا کہ وہ اپنی ماں کے پاس واپس چلی جائے۔ پر وہ رونے لگی۔ بولی' میں نے ماں کے پاس واپس نہیں جانا۔ وہ مجھے تاج کے ہاتھ بیچ دے گی۔ سیں' میں اسے اپنے گھر سے تو نہیں نکال سکتا تھا۔ وہ میرے گھر میں پناہ مگن آئی تھی۔" بدھیل رک رک کر بولتا رہا۔ "ویسے سیں' میں اس سے بہت پیار بھی کرتا ہوں۔"

"وہ بھی تجھ سے پیار کرتی ہے؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"پیار نہ کرتی تو میرے گھر کیوں آتی۔ میں تو اس سے پرنا کرنا چاہتا تھا۔ پر اس کی ماں مجھ سے بھی دو ہزار روپے مانگتی تھی۔" بدھیل نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "میں غریب راہک ہوں۔ اتنا روپیہ کہاں سے لاتا۔"

"تو سردار کا مزارع ہے؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "میں تو سمجھتا تھا تو اس کا کرندہ ہے۔ کرندہ نہ ہوتا تو سردار تجھے سراب اور مرجان کو پکڑنے پر داؤد اور ہجر خاں کے ساتھ کیوں لگاتا۔"

"سیں' یہ اس کی مرضی ہے۔ جب چاہے وہ کسی بھی راہک یا مزارعے کو باٹھایا کرادا بنا کر دیگار پر لگا دے۔ جو کام چاہے لے۔ وہ سردار ہے' مالک ہے۔ اس کا حکم تو ماننا ہی پڑتا ہے۔" بدھیل نے اپنی مجبوری بیان کی۔

"مان لے سردار نے تجھے کالا اور ساوَنی کو کالی سمجھا' تب تو وہ تجھے اور ساوَنی کو پھانسی پر بھی لٹکا سکتا ہے۔" رحیم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"کنون تو یہی ہے۔" بدھیل نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ویسے سردار کی مرضی ہے۔ جیسا چاہے فیصلہ دے۔"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ مگر بدھیل نے اسے زیادہ دیر خاموش نہ رہنے دیا۔ نرم لہجے میں دریافت کیا۔ "سیں' تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

رحیم داد نے اس کے سوال کا براہ راست جواب نہ دیا۔ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اور سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے مشورہ دیا۔ "موت تیرے سر پر کھڑی ہے' تو یہاں سے بھاگ

کیوں نہیں جاتا؟"

"نا سئیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔" بدھیل کے چہرے پر سراسیمگی چھا گئی۔ "میں نے بھاگنے کی کوشش کی، تب تو سردار بالکل یہ سمجھے گا، میں گناہ گار ہوں۔ وہ مجھے کالا بنا کر ایک دم پھانسی پر لٹکا دے گا۔ ہرگز زندہ نہ چھوڑے گا۔ لگتا ہے توں نے اس کا غصہ نہیں دیکھا۔ ایسا گرم ہو جاتا ہے کہ میں تجھے کیا بتاؤں۔" اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ "ویسے میں بھاگنا بھی چاہوں تو بھاگ نہیں سکتا۔ تجھے پتہ نہیں کم دار وحدت خان نے میرے پیچھے دو کراوے لگا دیئے ہیں۔ وہ میری کڑی پہریداری کرتے ہیں۔ ہردم ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔"

"یہاں تو مجھے کوئی ایسا کراوا یا کرندہ نظر نہیں آتا۔" رحیم داد نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

"دونوں کوٹ کے باہر بیٹھے ہیں۔" بدھیل نے مڑ کر سہمی ہوئی نظروں سے حویلی کے صدر دروازے کی جانب دیکھا۔ "دونوں ہی مسلح ہیں۔ ہردم چوکس رہتے ہیں۔"

"یہ بتا، تو میرے پاس کیوں آیا ہے؟"

"سئیں، میں سردار سے جو کچھ بتانا چاہتا ہوں، توں اسے بتا دے۔" بدھیل خان نے جھک کر رحیم داد کے پیر پکڑ لیے۔ گڑگڑا کر فریاد کرنے لگا۔ "سئیں توں سدا جیویں، رب راضی ہووی۔ سردار تیرا یار ہے۔ تجھ پر بھروسہ کرتا ہے۔ توں جو کہے گا مان لے گا۔"

رحیم داد نے اپنے پیر چھڑاتے ہوئے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ "تو کہتا ہے تو میں سردار سے تیرے بارے میں بات کروں گا۔ پر یہ اس کی مرضی ہے، مانے نہ مانے۔"

"میں نے پتہ ہے، وہ ضرور مان لے گا۔" بدھیل عاجزی سے بولا۔

"اب تو یہاں سے جا۔ سردار آتا ہی ہو گا۔" رحیم داد نے بیزاری سے کہا۔ "تجھے میرے پاس دیکھ کر ہو سکتا ہے وہ ناراض ہو جائے۔"

بدھیل نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ خاموشی سے مڑا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا حویلی کے صدر درواز کی جانب بڑھنے لگا۔

شام اور گہری ہو گئی۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ رات ہو گئی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا، شہ زور خان مزاری کا انتظار کرتا رہا۔

رات گئے سردار مزاری واپس آیا۔ وہ اس وقت سرخوشی کے عالم میں تھا۔ قدم بہکے ہوئے، آنکھیں چڑھی ہوئیں۔ اس نے ایک مونڈھا کھینچا اور اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "معاف کرنا چوہدری، مجھے لوٹنے میں دیر ہو گئی۔ جاتے ہوئے تجھ سے مل بھی نہ سکا۔"

"مجھے پتہ ہے، تیرا ماما بیمار ہے۔ تو اسی کے پاس گیا تھا نا؟" رحیم داد نے کہا۔ "اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟"

"صبح کچھ زیادہ گڑبڑ ہو گئی تھی پر اب پہلے سے ٹھیک ہے۔"

"بیماری کیا ہے اسے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"ایک بیماری ہو تو بتاؤں۔ سب سے وڈی بیماری تو خود بڑھاپا ہے۔ بہت عمر ہو گئی ہے اس کی۔ چل پھر بھی نہیں سکتا۔ دن رات بستر ہی پر پڑا رہتا ہے۔ اب تو اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ میں زیادہ دیر اس کے پاس ٹھہر نہ سکا۔"

"جب تو اس کے پاس زیادہ دیر نہیں رہا تو اب تک کہاں تھا؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"راجن پور سے تحصیل دار آیا ہے۔ اسے بھی ملنا تھا۔" سردار مزاری نے بتایا۔ "اس نے پکڑ کر بٹھا لیا۔ اور بھی سرکاری افسر موجود تھے۔ بوتل کھلی تھی۔ گلاس ٹکرا رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ روٹی بھی ان کے ساتھ ہی کھائی۔" اس نے تامل کیا۔ "تو نے روٹی کھا لی ہو گی؟"

"نہیں!" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تیرا انتظار کر رہا تھا۔"

"حد کر دی تو نے، اب تک بھوکا بیٹھا ہے۔"

"جب تو آ گیا ہے تو کھا لوں گا۔ ویسے مجھے زیادہ بھوک بھی نہیں ہے۔" رحیم داد بدستور مسکراتا رہا۔

سردار مزاری خاموش رہا۔ رحیم داد بھی نہیں بولا۔ مگر زیادہ دیر چپ نہ رہا، حرف مطلب پر آ گیا۔ "تو نے کل صبح بدھیل اور ساؤنی کے مکدے کا فیصلہ کرنا ہے نا؟"

"کرنا تو ہے، پر تجھے اس سے کیا لینا۔" مزاری کے لہجے میں بیزاری جھلک رہی تھی۔ اس نے اپنی مخمور آنکھوں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "بدھیل تو تیرے پاس نہیں آیا تھا؟" نشے کی لہر سے اس کا سر ہولے ہولے جھومنے لگا۔ "ضرور آیا ہو گا۔ مجھے ملا تھا۔ تجھے بھی ملا ہو گا۔ ملا تھا نا؟"

"ہاں، وہ مجھے ملا تھا۔" رحیم داد انکار نہ کر سکا۔

"کیا کہتا تھا؟" سردار مزاری نے کرید کر پوچھا۔

"کہتا تھا، میں نے تو ساؤنی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ وہ پاک دامن ہے۔ بالکل بے گناہ ہے۔"

رحیم داد نے مزاری کو آگاہ کیا۔

"اس نے جو کچھ کہا تو نے مان بھی لیا۔ لگتا ایسا ہی ہے۔" مزاری نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "سئیں چوہدری' تو بہت نیک بندہ ہے۔ یہ تو سوچ' دونوں ہی بھرپور جوان ہیں۔ یاری بھی لگا رکھی ہے۔ دو راتوں تک اکٹھے بھی رہے۔" اس کا لہجہ ناصحانہ ہو گیا۔ "جوانی تو اندھی ہوتی ہے نا۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تجھے یا مجھے کیا پتہ؟"

"مجھے تو دونوں ہی بے گناہ لگتے ہیں۔" رحیم داد نے بدھیل اور ساوَنی کی حمایت میں کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ دونوں بے گناہ ہیں؟" سردار مزاری نے جرح شروع کر دی۔

رحیم داد کے پاس کوئی مناسب جواب نہ تھا۔ اس نے پینترا بدلا اور مزاری کے ذہن میں بدھیل کے حق میں ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "تجھے یہ تو پتہ ہے' بدھیل تیرا کتنا وفادار بندہ ہے۔ سہراب اور مرجان کو پکڑنے میں اس نے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ تیری پگ اونچی کرنے کے لیے اس نے یہ سب کچھ کیا تھا۔"

"وفاداری اپنی جگہ' پر وفاداری سے اس کا جرم تو ختم نہیں ہو جاتا۔" مزاری متاثر نہ ہوا۔ "مجھے انصاف کرنا ہے اور جرم کو سامنے رکھ کر ہی کرنا ہے۔"

"مان لے بدھیل نے ساوَنی کو خراب کر دیا' تب تو کیا کرے گا؟" رحیم داد نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔

"سزا تو وہی دینی ہو گی جو کالے اور کالی کو بلوچوں کے کانون کے رو سے دی جانی چاہیے۔"

سردار مزاری کے لہجے میں تذبذب کا عنصر غالب تھا۔ رحیم داد نے بھی اسے محسوس کیا۔ اور اسی تذبذب کا سہارا لے کر اس نے زیادہ کھل کر بات کی۔ "یہ بتا تجھے کل کیا فیصلہ دینا ہے؟"

"میں نے اس بارے میں ابھی کچھ سوچا نہیں۔ جو بھی فیصلہ دوں گا' کل صبح تو سن لینا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں نے اب جانا ہے۔ تو روٹی کھا کر سو جا۔"

رحیم داد اس سے مزید بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ ٹھہرا نہیں۔ جھومتا جھومتا آگے بڑھ گیا۔ رحیم داد صرف اس کی جانب دیکھتا ہی رہ گیا۔

☆

رات جاگ رہی تھی۔ رحیم داد بھی جاگ رہا تھا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ سخت ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا۔ بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ اسے بدھیل اور ساوَنی کے بارے میں

تشویش تھی۔ دونوں ہی نوجوان تھے۔ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور اس کی نظروں میں بے قصور بھی تھے۔ اسے دھڑکا تھا کہ سردار شہ زور خاں مزاری انھیں کالا اور کالی قرار دے کر کہیں پھانسی پر نہ چڑھا دے۔ وہ سردار تھا۔ سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس سے کوئی بازپرس کرنے والا نہ تھا۔ لنگر خاں کو اس کے حکم پر دریا میں ڈوب کر مرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ سہراب اور مرجان کی موت کا لرزہ خیز منظر بار بار اس کی نظروں کے سامنے آ جاتا۔ وہ بدھیل اور ساوَنی کو اس طرح مرتے ہوئے دیکھنا نہ چاہتا تھا۔

صبح ہوئی۔ رحیم داد کی بے کلی ختم نہ ہوئی۔ وہ شہ زور مزاری سے مقدمے کے بارے میں ایک بار پھر بات کرنا چاہتا تھا۔ بدھیل اور ساوَنی کو بچانے کی یہ آخری کوشش تھی' مگر سردار مزاری خلاف معمول ناشتے پر نہ آیا۔ زنان خانے سے نکل کر سیدھا اس کمرے میں چلا گیا جس میں کچہری لگتی تھی۔ رحیم داد اس کا انتظار ہی کرتا رہ گیا۔

سردار مزاری نے اسے کچہری میں بلوایا بھی نہیں۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا خود ہی وہاں پہنچ گیا۔ مزاری نے اسے داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ مگر خاموش رہا۔ رحیم داد ایک موڑھے پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ سردار مزاری حسب دستور دو-لٹھ مارے پلنگ پر بیٹھا تھا۔

کچہری پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ ہر شخص چپ تھا۔ کچھ دیر بعد سردار شہ زور مزاری نے نظریں اٹھا کر بدھیل اور ساوَنی کو دیکھا۔ دونوں دم بخود تھے۔ ان کے چہرے خوف سے مٹیالے پڑ گئے تھے۔ آنکھیں ویران اور افسردہ تھیں۔

ان کے قریب ہی ساوَنی کی ماں ادب سے سر جھکائے کھڑی تھی۔ وہ بھی خوف زدہ اور سہمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ حویلی کا ماشیا پشت پر کھڑا مزاری کے کندھے اور بازوؤں کے پٹھے ہولے ہولے دبا رہا تھا۔

سردار مزاری نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوا۔ "میں نے سب کے بیانات سنے۔ ان کی جانچ پڑتال بھی کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ساوَنی کی ماں نے بدھیل کے خلاف جو الزام لگایا ہے' وہ ٹھیک اور درست ہے۔"

رحیم داد نے بے قرار ہو کر پہلو بدلا۔ پریشان ہو کر سردار مزاری کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر رعب اور دبدبہ تھا۔ وہ نہایت یکسوئی کے ساتھ بول رہا تھا۔ "بدھیل نے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا ہے' اس کی تائید ساوَنی کے بیان سے تو ہوتی ہے۔ پر ساوَنی کیوں کہ برابر سے شریک جرم ہے' اس واسطے اس کے بیان کی کوئی اہمیت نہیں۔ بدھیل نے خود بھی مانا ہے' تسلیم کیا ہے کہ ساوَنی اس کے

گھر میں دو روز تک رہی۔ پر اس الزام سے انکاری ہے کہ وہ ساوَنی کو اٹھا کر نہیں لایا۔ اپنے اس بیان کو سچ ثابت کرنے کے لیے اس نے نہ کوئی گواہی پیش کی نہ شہادت۔"

"سئیں سردار! گواہی اور شہادت تو ساوَنی کی ماں نے بھی پیش نہیں کی۔ اس طرح تو اس کے الزام کی سچائی بھی ثابت نہیں ہوتی۔" بدھیل خان نے دلیل پیش کی۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے بکھرے ہوئے تھے۔ ہونٹ خشک تھے۔ آنکھوں کے چراغ مدھم پڑ گئے تھے۔ چہرے پر موت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ وہ نڈھال اور شکستہ نظر آرہا تھا۔

"اس کی دھی اٹھالی جائے اور وہی گواہ اور شہادت بھی پیش کرے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر تو بے گناہ ہے تو اپنی بے گناہی کا تجھے ثبوت دینا ہو گا۔ تیرے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں۔" سردار مزاری نے اس کی دلیل سختی سے مسترد کردی۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"سئیں سردار! میں سچ کہہ رہی ہوں بدھیل مجھے اٹھا کر نہیں لایا۔" ساوَنی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنسو پلکوں سے ڈھلک کر رخساروں پر بہنے لگے۔ "بدھیل بے گناہ ہے۔"

"سئیں' یہ جھوٹی ہے۔ ایک دم کوڑی ہے۔ جھوٹے ہنج بہا کر بدھیل کو بے گناہ ثابت کرنا چاہتی ہے۔" ماں نے قہر آلود نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ "تیرے رودن پٹن سے بدھیل بے گناہ نہیں بن سکتا۔" اس نے مڑ کر شہ زور خاں مزاری کو مخاطب کیا۔ "سئیں سردار' یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ بدھیل نے اسے خراب کردیا۔ یہ کالی ہو گئی۔"

"تیرا یہ الزام درست نہیں ہے۔" سردار مزاری نے تیکھی نظروں سے ساوَنی کی ماں کی جانب دیکھا۔ "ساوَنی کو بدھیل نے خراب نہیں کیا تھا۔ وہ کالی نہیں کہی جا سکتی۔"

رحیم داد نے سردار مزاری کا بدلا ہوا رویہ دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ یہ اچانک تبدیلی قطعی خلاف توقع تھی۔ وہ ہونق کی کی طرح منہ پھاڑ کر اس کا چہرہ تکنے لگا۔ بدھیل اور ساوَنی نے بھی حیرت زدہ نظروں سے سردار شہ زور مزاری کی جانب دیکھا۔ ان کے چہروں پر چھائی ہوئی مردنی رفتہ رفتہ زائل ہوتی جارہی تھی۔ سب گم صم تھے۔ مہر بہ لب تھے۔

مگر ساوَنی کی ماں زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے مزاری کے رویئے کے خلاف احتجاج کیا۔ "سئیں سردار! مجھے پتہ ہے۔"

"تجھے کچھ پتہ نہیں۔" سردار مزاری نے اسے مزید بولنے کا موقع نہ دیا۔ درشت لہجے میں بولا۔

"بدھیل کے پاس دو روز ساوَنی رہی تھی یا تو؟" اس نے ساوَنی کی ماں کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ "تجھے کیا پتہ کہ ساوَنی کالی ہے۔ مجھے پتہ ہے اور ٹھیک طرح پتہ ہے کہ وہ کالی نہیں ہے۔" ساوَنی نے چونک کر سردار مزاری کے چہرے پر نظر ڈالی۔ پھر اس کی گردن جھک گئی۔ رخساروں پر سرخی پھیل گئی۔ مزاری اونچی آواز سے بولتا رہا۔ "جب ساوَنی کالی نہیں ہے تو بدھیل کیسے کالا ہو سکتا ہے۔" وہ ساوَنی کی ماں کی جانب متوجہ ہوا۔ زور سے دھاڑا۔ "میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نا سئیں' توں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" سردار مزاری کو غضب ناک دیکھ کر ساوَنی کی ماں کا چہرہ خوف سے فق ہو گیا۔ گڑگڑا کر معذرت کرنے لگی۔ "سئیں' توں سردار ہے۔ توں مالک ہے۔ توں غلط نہیں بول سکتا۔ ہرگز غلط نہیں بول سکتا۔ میں نے ہی غلط سوچا۔ بھل ہو گئی۔ میکوں معافی دیدے۔" وہ زار و قطار رونے لگی۔ "سئیں' میں فریادی ہوں۔ تیرے پاس نیائے کے لیے آئی ہوں۔"

"ہنج نہ بہا۔ چپ کر کے کھڑی رہ۔ تیرے ساتھ نیائے کیا جائے گا۔ پورا پورا انصاف ہو گا۔" سردار مزاری کے چہرے پر چھائی ہوئی جھنجلاہٹ کا غبار چھٹنے لگا۔ لہجہ نرم پڑ گیا' اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اپنا فیصلہ سنایا۔ "بدھیل کے خلاف یہ الزام ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ساوَنی کو اٹھا کر لے گیا۔ دو روز اسے اپنے گھر میں رکھا۔ اس لیے وہ کانون کی نظروں میں مجرم ہے۔ اس جرم کی سزا کے طور پر اسے چٹی ادا کرنی ہو گی۔"

رحیم داد نے حیران و پریشان ہو کر سردار مزاری کو دیکھا۔ وہ چٹی کی تفصیل بیان کر رہا تھا۔ "بدھیل کو پانچ سو روپے جرمانہ ادا کرنا ہو گا۔ جرمانے کی رکم میں سے اڑھائی سو ساوَنی کی ماں کو تاوان کے طور پر دیا جائے گا۔ چٹی کے کانون کی رو سے بدھیل کو ساوَنی کی طرح کی دو عدد جوان ننگر رن بھی پیش کرنی ہوں گی۔"

"سئیں سردار' میں دو ننگر کہاں سے لاؤں گا۔" بدھیل نے ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے کہا۔ "میری تو صرف ایک بھین ہے۔ وہ بھی پندرھاں برس سے کم ہی ہو گی۔ اس کے علاوہ ماں ہے۔" اس کے لہجے میں رقت پیدا ہو گئی۔ "سئیں' میرا اور کوئی نہیں۔"

"بھین اور ماں ہی کو لے آ۔" سردار مزاری نے مطلق مروت سے کام نہ لیا۔ مڑ کر ساوَنی کی ماں کی جانب دیکھا۔ "تیرا کوئی پتر ہے؟ بچہ ہو یا جوان۔ پرنیا ہو یا بن پرنیا۔ کوئی فرک نہیں پڑتا۔ بدھیل کی بھین سے اس کا پرنا کردیا جائے گا۔ وہ اسے اپنی ذال بنا کر رکھ سکتا ہے۔"

"نا سئیں' میرا کوئی پتر نہیں۔" ساوَنی کی ماں نے بتایا۔ "میں تجھے پہلے ہی بتا چکی ہوں' ساوَنی کے

سوا میرا کوئی نہیں۔"

"ساوَنی کا کوئی بھائی نہیں اس لیے بدھیل کی بھین اور ماں کو کوٹ میں رکھا جائے گا۔" سردار مزاری نے اعلان کیا۔ "جب تک بدھیل جرمانہ اور مکدمے کی پوری فیس جمع نہیں کرائے گا' اپنی ماں اور بھین کو نہیں پہنچائے گا' تب تک ساوَنی کو حویلی ہی میں رہنا ہو گا۔ بدھیل اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے تو اسے چٹی کو پورا کرنا ہو گا۔"

مقدمے کا فیصلہ سن کر ساوَنی کی ماں اور بدھیل خاموش رہے۔ مگر ساوَنی بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کی دبی دبی سسکیاں کمرے کے گہرے سکوت میں رک رک کر ابھرتی رہیں۔ بدھیل سر جھکائے کچہری سے باہر چلا گیا۔ ساوَنی کی ماں بھی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ ساوَنی کو دوبارہ زنان خانے میں پہنچا دیا گیا۔

دن گزرا' رات ہوئی۔ مگر مزاری سے رحیم داد کی ملاقات نہ ہو سکی۔ صبح ناشتے پر وہ اس کے پاس آیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد رحیم داد نے بدھیل کے مقدمے کا ذکر چھیڑا۔ کھل کر اپنے تجسس کا اظہار کیا۔ "مزاری' یہ بتا تجھے کیسے پتہ چلا کہ ساوَنی کو بدھیل نے خراب نہیں کیا؟ تو نے ساوَنی کی ماں کو تو چپ کرا دیا پر تیرے پاس کیا ثبوت کہ ساوَنی کالی نہیں ہوئی؟ بدھیل کے ساتھ دو روز رہنے کے بعد بے گناہ اور پاک صاف رہی۔"

"سئیں چوہدری' تو نے تو حد کر دی۔ بالکل بھولا بادشاہ ہے۔" شہ زور خاں ٹھٹھا مار کر زور سے ہنسا۔ "تجھے پتہ نہیں ساوَنی کل اور پرسوں ساری رات میرے کمرے میں رہی تھی۔" اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "جب مکدمے کا فیصلہ مجھے کرنا تھا تو ثبوت بھی میں نے ہی لینا تھا نا؟"

رحیم داد کو دل لگی سوجھی۔ "تب تو وہ کالی ہو گئی اور تو کالا۔" اس نے مسکرا کر مزاری کو چھیڑا۔

"تو نے کچہری لگا رکھی ہے؟" سردار مزاری کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ لہجہ درشت ہو گیا۔ "سردار کے ساتھ سونے پر کوئی رن کیوں کر کالی ہو سکتی ہے؟" اس نے قہر آلود نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "تو نے یہ سوچا کیسے؟ لگتا ہے تو خاندانی زمین دار نہیں ہے۔"

رحیم داد کی سٹی گم ہو گئی۔ معذرت کرنے کے انداز میں بولا۔ "ناراض نہ ہو۔ میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔ میرا مطلب تجھ پر الزام لگانا ہرگز نہیں تھا۔"

"تیرا مطلب کچھ بھی ہو۔" مزاری کی جھنجلاہٹ کم نہ ہوئی۔ "اگر تیری ایسی ہی سوچ ہے تو ادھر

زمین الاٹ کرانے کا دھیان چھوڑ دے۔ تجھے کچھ پتہ نہیں کہ سرداری اور زمیں داری کیا ہوتی ہے۔"

"میں تو مخول کر رہا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا تو اتنا برا منائے گا۔" رحیم داد نے اسے منانے کی کوشش کی۔ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر گفتگو کا رخ بدلنے کی غرض سے دریافت کیا۔ "یہ بتا' لہور چلنے کا کب تک ارادہ ہے؟ میں اب زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھیر سکتا۔"

"چاکر کو تو آ جانے دے۔" مزاری کا غصہ اب ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ لہجہ بھی سنبھلا ہوا تھا۔ "لگتا ہے الاٹمنٹ میں کوئی پیچیدگی پیدا ہو گئی' ورنہ چاکر کو اب تک الاٹمنٹ کا آرڈر لے کر آ جانا چاہیے تھا۔"

"ایسا کر۔ کسی کو شہر بھیج کر چاکر خاں سے میرے کاغذات واپس منگوا لے۔" رحیم داد نے کہا۔ "الاٹمنٹ شلاٹمنٹ ہوتی رہے گی۔ مجھے لہور جانے دے۔ تو بعد میں میں آ جانا۔ میں کچھ روز شاہ جی کی کوٹھی میں ٹھیروں گا۔ اسے ملنے کے بعد ہی واپس کوٹلہ ہرکشن جاؤں گا۔"

"میرا کہا مان' تو چاکر کے لوٹنے کا ایک دو روز انتظار کر لے۔" مزاری نے مشورہ دیا۔ "ورنہ جیسا تو کہتا ہے وہی کروں گا۔"

رحیم داد نے مزید اصرار نہ کیا۔ سردار مزاری اٹھ کر چلا گیا۔

☆

چاکر خاں سرگانی کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ چند ہی روز بعد کا ذکر ہے۔ رحیم داد اور شہ زور خاں مزاری دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد باتیں کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں چاکر خاں آ گیا۔ اس کا لباس گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ چہرے پر سفر کی تکان کے آثار نمایاں تھے۔ مگر ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ بغل میں کاغذات کی مسل دبی تھی۔

چاکر خاں نے جھک کر سردار مزاری کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور سر جھکا کر ادب سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس نے خیر و عافیت دریافت کی۔ "خیر اے سئیں' خوش ہو' راضی ہو' خیر سلا اے۔"

"شکر اے' تساں اپنا حوال سنا۔" مزاری نے جواب دیا۔ "اتنی دیر کیوں لگا دی۔ الاٹمنٹ میں کوئی چکر تو نہیں پڑ گیا؟"

"سئیں' وہ ایسا ہوا کہ ڈپٹی کمشنر لہور گیا تھا۔ اس کی واپسی کا انتظار کرنا پڑا۔" چاکر خان سرگانی نے صفائی پیش کی۔

"بہت زیادہ دیر لگا دی تو نے۔" مزاری نے کہا۔ "چوہدری پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے لہور جانا

ہے۔ ادھر ضروری کام ہے اس کا۔"

"سئیں سردار، دیر تو لگ گئی پر کام پکا ہو گیا۔" چاکر خاں سرگانی نے مسل، سردار مزاری کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ رہا، زمین کی الاٹمنٹ کا آرڈر۔" اس نے مسل کھول کر حکم نامہ دکھایا۔

شہ زور نے حکم نامہ ہاتھ میں لے کر پڑھا، مسکرایا۔ اور مسل رحیم داد کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ "سئیں چوہدری، مبارک ہو۔ تجھے اڑھائی سو ایکڑ متروکہ اراضی، دلاور والا میں الاٹ ہو گئی ہے۔"

رحیم داد نے مسل ہاتھ میں سنبھالی۔ الاٹمنٹ آرڈر پر نظر ڈالی۔ اس کے چہرے پر خوشی سے سرخی پھیل گئی۔ آنکھوں میں چراغ جگمگانے لگے۔ اسے توقع نہیں تھی کہ الاٹمنٹ اتنی آسانی سے مل جائے گا اور اس قدر کم مدت میں مل جائے گا۔ نہ سرکاری دفتروں کے چکر کاٹنا پڑے۔ نہ افسروں سے ملنے کے لیے صبر آزما انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ نہ کسی قسم کی سفارش پہنچانے کی ضرورت پیش آئی۔ ہر کارروائی اطمینان بخش طور پر مکمل ہو گئی۔

چاکر خاں سرگانی اپنی کارکردگی سنانے لگا۔ "سئیں! الاٹمنٹ لینے کے لیے میں بحالیات والوں کے پاس پہنچا۔ صدر دفتر کے اہل کاروں سے ملا۔ افسر مال اور تحصیل دار سے ملا۔ پٹواری سے ملا۔ فٹافٹ فائل اگے بڑھوائی۔ کام نکلوانے کے لیے کئیوں کی مٹھی گرم کی۔ سئیں، تجھے پتہ ہے، اس کے بغیر فائل آگے نہیں بڑھتی۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "دلاور والا بھی گیا۔ اراضی کا معائنہ کیا۔ بہت عمدہ زمین ہے۔ فاضل پور کے نزدیک ہی ہے۔ فاضل پور موضع ہے۔ وڈی وستی ہے۔"

"مجھے پتہ ہے تو بہت ہوشیار ہے۔ افسروں اور اہل کاروں سے کام نکلوانے کا ہر گُر جانتا ہے۔"

شہ زور مزاری نے خوش ہو کر داد دی۔ مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری، اپنا چاکر بہت کام کا بندہ ہے۔ سچ پوچھ تو میری زمینداری اسی نے سنبھال رکھی ہے۔"

"پر سئیں، کبضہ ملنے میں مشکل پیش آئے گی۔" چاکر خاں نے دبی زبان میں اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

رحیم داد تو خاموش رہا۔ مگر سردار مزاری نے چونک کر پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

"زمین، راہکوں اور مزارعوں نے دبا رکھی ہے۔" چاکر خاں سرگانی نے مطلع کیا۔ "پہلے بھی کئی بار مہاجروں کو الاٹ ہو چکی ہے پر راہکوں نے کبضہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ بہت گڑبڑ مچائی۔ ابھی تک جمے بیٹھے ہیں۔"

"ایسا ہے، تب تو الاٹمنٹ ملنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔" شہ زور خاں مزاری نے بجھے ہوئے لہجے

میں کہا۔ "تو نے الاٹمنٹ لینے سے پہلے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا؟ کچھ تو سوچا ہوتا۔"

"سوچا تھا، سئیں بالکل سوچا تھا۔" چاکر خاں سرگانی نے وضاحت کی۔ "صدر دفتر کے ایک اہل کار نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔"

"اس کے خبردار کرنے پر بھی تو نے الاٹمنٹ آرڈر نکلوا لیا۔ تیری گالہہ سمجھ نہیں آئی۔" مزاری کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔

"سئیں فکر نہ کر۔" سرگانی نے مزاری کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "تمن دریشک کا تمندار ہے۔ دریشکوں سے مدد مل جائے تو کبضہ آسانی سے مل جائے گا۔" اس نے مزاری کے چہرے کی جانب دیکھا جس پر چھائی ہوئی خشونت زائل ہوتی جا رہی تھی۔ "سردار عظمت اللہ خاں دریشک سے تیری گہری یاری ہے۔ توں کہے گا تو وہ ضرور مدد کرے گا۔ ادھر اس کی زمیں داری ہے۔ تھانیدار سے اس کا بہت زیادہ میل ملاپ ہے۔ کبضہ حاصل کرنے کے لیے اپنا کام تو پولیس ہی سے پڑے گا۔ پولیس پیچھے ہو تو کبضہ لینے سے کون روک سکتا ہے۔ پولسے تو راہکوں کی ساری زورا زوری اور اکڑ ایسے نکال دیں گے کہ آگے انھیں سر اٹھانے اور گڑبڑ کرنے کی کبھی ہمت نہیں ہو گی۔" اس نے قدرے توقف سے کہا۔ "سئیں، میں نے غلط تو نہیں سوچا؟"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ سردار عظمت اللہ خاں دریشک اپنا پرانا یار ہے۔" مزاری کے لہجے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ "اس کی تو تھانیدار ہی سے نہیں، سارے ہی وڈے افسروں سے یاری دوستی ہے۔ عظمت سے زمین کا کبضہ لینے میں پوری پوری مدد مل سکتی ہے۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "سئیں چوہدری، پروا نہ کر۔ زمین کی الاٹمنٹ مل گئی تو کبضہ بھی مل جائے گا۔"

"تو نے زمین کی الاٹمنٹ دلا دی، کبضہ بھی دلا دے گا۔ پر اس کی دیکھ بھال بھی تو نے ہی کرنی ہو گی۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے تجھے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے تو کوٹلہ ہرکشن ہی میں رہنا ہے۔ ویسے ادھر آتا جاتا رہوں گا۔"

"تو فکر نہ کر۔ دیکھ بھال کرنے کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔" مزاری نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ "ویسے تجھے کرنا بھی کیا ہے۔ زمین داری تو کاردار اور کمدار ہی چلاتے ہیں۔ تو اپنے کاردار کو ادھر بھیج دینا۔"

"میں اسے ضرور بھیج دوں گا۔ پر وہ یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔ کوٹلہ ہرکشن کی ساری زمین داری وہی چلاتا ہے۔" رحیم داد نے مجبوری کا اظہار کیا۔ "میں تو ادھر کسی کو تیرے علاوہ جانتا بھی نہیں۔ جب تو نے اتنا احسان کیا ہے تو زمین داری چلانے کے لیے کسی بھروسے کے بندے کا انتظام

بھی تجھے ہی کرنا ہو گا۔"

"احسان کی گالہ نہ کر۔" مزاری نے کہا۔ "تو جیسا چاہتا ہے ویسا ہی بندوبست ہو جائے گا۔" وہ چاکر خاں سرگانی کی جانب متوجہ ہوا۔ "چاکر! تجھے چوہدری کے لیے ایک بندہ تلاش کرنا ہو گا۔ زمین داری کے کام کا تجربہ رکھتا ہو۔ محنتی ہو اور ایماندار بھی ہو۔ تیری نظر میں ایسا کوئی بندہ ہے؟"

"عزیز خاں گٹھوال ٹھیک رہے گا۔"

"کون عزیز خاں گٹھوال؟ میں تو کسی ایسے بندے کو نہیں جانتا۔" شہ زور خاں مزاری نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

"سیں تو نے اسے دیکھا تو ہے‘ پر زیادہ نہیں جانتا۔" چاکر خاں نے مسکرا کر کہا۔ "میں جن دنوں مظفر گڑھ میں خاکوانیوں کے پاس ہوتا تھا‘ گٹھوال بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ میں ادھر آگیا تو اس نے بھی خاکوانیوں کی نوکری چھوڑ دی۔ آڑھت کا کام شروع کر دیا‘ پر چلا نہیں۔ آج کل وہ خالی ہے۔ میں اسے ٹھیک طرح جانتا ہوں۔ ہشیار بھی ہے اور بھروسے کا بندہ ہے۔"

"اب کہاں ہوتا ہے وہ؟" مزاری نے دریافت کیا۔

"سیں‘ وہ راجن پور میں ہوتا ہے۔" چاکر خاں نے بتایا۔ "چوہدری کو جو اراضی الاٹ ہوئی ہے‘ گٹھوال ہی نے اس کا کھوج نکالا تھا۔ یہ پہلے رائے بہادر ہتورام کے پوتے‘ بالا رام کی جگیر میں ہوتی تھی۔ بالا رام پاکستان بنتے ہی سرحد پار چلا گیا۔ اس کی ساری جگیر اور زمین داری ادھر ہی رہ گئی۔" اس نے تامل کیا۔ "سیں سردار‘ توں تو بالا رام کو تو جانتا ہی ہو گا۔"

"جانتا ہوں‘ اچھی طرح جانتا ہوں۔ بہت وڈا زمین دار ہوتا تھا۔" مزاری نے مسکرا کر کہا۔ "اور اس کے دادا ہتورام کو کون نہیں جانتا۔ ڈیرہ غازی خاں میں اسسٹنٹ کمشنر رہ چکا تھا۔ بعد میں رابرٹ سنڈیمن کے ساتھ کوئٹہ چلا گیا۔ ادھر بھی وڈا افسر لگا تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد راجن پور ہی آگیا تھا۔ بہت شاندار حویلی ہے اس کی۔ بالا رام اسی میں رہتا تھا۔"

"بالا رام کی راجن پور والی حویلی بھی ابھی کسی کو الاٹ نہیں ہوئی۔ گٹھوال بتاتا تھا۔ متروکہ اراضی کرار دے کر اسے کسٹوڈین کے حوالے کر دیا گیا۔ آج کل اس میں کلانور کے راٹھور مہاجر بسے ہوئے ہیں۔ کوشش کی جائے تو الاٹ ہو جائے گی۔ ڈپٹی کمشنر چاہے تو الاٹمنٹ کے ساتھ ساتھ کبضہ بھی جلد مل جائے گا۔" چاکر خاں نے مشورہ دیا۔ "حویلی بہت عالیشان ہے‘ کیوں نہ اس کی الاٹمنٹ کے لیے بھی چوہدری کی طرف سے درخواست لگا دی جائے؟"

"لگا دے‘ ضرور لگا دے۔ چوہدری کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" مزاری نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "سیں چوہدری‘ میں نے غلط تو نہیں سوچا؟"

"تو نے بالکل ٹھیک سوچا۔" رحیم داد نے ہنس کر کہا۔ "تو جو کچھ سوچے گا میری بھلائی کے لیے ہی سوچے گا۔ تیری مرضی سے میری مرضی الگ تو نہیں ہو سکتی۔ حویلی کی الاٹمنٹ کے لیے بھی درخواست لگوا دے۔ مل جائے تو رہنے کو شان دار جگہ ہو جائے گی۔"

سردار مزاری چند لمحے خاموش رہ کر چاکر خاں سرگانی کی جانب متوجہ ہوا۔ "چاکر‘ یہ بتا۔ گٹھوال اتنا ہشیار ہے کہ چوہدری کی زمیں داری کا ٹھیک طرح کام چلا سکے؟"

"سیں سردار‘ میں نے بتایا ناں کہ اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ چوہدری کے لیے بہت کار آمد ثابت ہو گا۔" چاکر خاں نے مزاری کو اطمینان دلایا۔ "ویسے چوہدری کی زمیں داری ہی کتنی ہے۔ کل اڑھائی سو ایکڑ اراضی ہے۔ گٹھوال تو وڈی سے وڈی زمیں داری آسانی سے چلا سکتا ہے۔ بہت ہشیار بندہ ہے۔"

"ٹھیک ہے‘ اسے فوراً یہاں بلوا لے۔" مزاری نے حکم دیا۔ "اب تو جا۔ نہا کر روٹی شوٹی کھا۔ بہت تھکا ہوا لگتا ہے۔"

چاکر خاں چلا گیا۔ سردار شہ زور مزاری بھی رحیم داد کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ وہ بھی آرام کرنے چلا گیا۔

☆

رحیم داد کو عزیز گٹھوال کا انتظار تھا۔

عزیز گٹھوال تو نہ آیا نادر خان آگیا۔ اور کچھ اس طرح اچانک آیا کہ اسے دیکھ کر رحیم داد بھونچکا رہ گیا۔ پہر دن گزر چکا تھا۔ کمرے کے باہر تیز اور چمکیلی دھوپ پھیلی تھی۔ ہوا میں تمازت بڑھ گئی تھی۔ صحن میں چہل پہل تھی۔ ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور ابھر رہا تھا۔ سردار مزاری کچھ ہی دیر پہلے اٹھ کر گیا تھا۔ اور اب کچہری میں بیٹھا مقدمات کے فیصلے کر رہا تھا۔

رحیم داد بھی معمول کے مطابق کچہری میں بیٹھ کر مقدمات کی کارروائی دیکھنا چاہتا تھا مگر نادر خاں کے پہنچنے کے بعد اس نے کمرے سے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کی غیر متوقع آمد سے رحیم داد کے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے گردش کرنے لگے۔ اس نے نادر خاں کے گرد آلود چہرے پر نظر ڈالی۔ ٹرین اور لاریوں کے تکلیف دہ سفر اور مسلسل شب بیداری کے باعث وہ خستہ حال اور کچھ زیادہ ہی بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ ڈاڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ چہرے کی جھریاں نمایاں ہو گئی تھیں۔

رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ "نادر، خیر خیریت تو ہے؟ فکر کی تو کوئی گل بات نہیں؟" اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "تو کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔"

"فکر کی کوئی گل نہیں۔" نادر خاں نے سرکنڈوں کے بنے ہوئے موڑھے پر بیٹھتے ہوئے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ "میں تو جی ایک ضروری مشورے کے لیے آیا تھا۔ مجھے تو پتہ بھی نہ تھا کہ تو ادھر ہے۔" اس نے کندھے پر پڑے ہوئے پرنے سے چہرے پر آیا ہوا پسینہ پونچھا۔ "میں تو سیدھا لہور گیا۔ سوچا تھا تو شاہ جی کی کوٹھی پر ملے گا۔ جاتے ہوئے بتایا بھی یہی تھا۔ میں تجھ سے ملنے شاہ جی کی کوٹھی پہنچا۔ اپنی جیپ باہر ہی کھڑی تھی۔ ڈرائیور بھی موجود تھا۔ اس کی زبانی پتہ چلا کہ تو ادھر ہے۔"

"شاہ جی کراچی سے واپس آگیا؟"

"مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ شاہ جی کب کراچی گیا۔" نادر خاں نے نہایت معصومیت سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ "میں نے ڈرائیور سے اِس کے بارے میں پوچھا بھی نہیں۔ کوٹھی کے اندر بھی نہ گیا۔ وہاں سے سیدھا سٹیشن پہنچا۔ اور یہاں آنے کے لیے ٹرین میں سوار ہو گیا۔" اس نے اپنی پریشانی کا اظہار کرنا چاہا۔ "ادھر کے سفر میں تو جی بہت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ ڈیرہ غازی خاں کے بارے میں تجھے پتہ ہے کہ ادھر تو ٹرین بھی نہیں چلتی۔"

نادر خاں کی زبانی سفر کی روداد سنتے سنتے رحیم داد اکتا گیا۔ اس نے نادر خاں کو اس سلسلے میں مزید کہنے کا موقع نہ دیا۔ دریافت کیا۔ "یہ بتا تو کس سلسلے میں مشورہ کرنے میرے پاس آیا ہے۔ کوئی خاص گل بات ہے؟"

"پچھلے دنوں رفیع سمہ دوبار آیا۔" نادر خاں نے بتایا۔ "پہلی بار جب وہ آیا اور اسے یہ پتہ چلا کہ تو موجود نہیں ہے تو خاموشی سے چلا گیا۔ پچھلے جمعے کو فیر آیا۔" بات کہتے کہتے لحہ بھر کے لیے وہ ٹھٹکا۔ "اس بار اس نے کھل کر مجھ سے گل بات کی۔"

"کیا کہتا تھا وہ؟" رحیم داد نے گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"تجھے پتہ ہے وہ غلے کی سمگلنگ کا دھندا کرتا ہے۔" نادر خاں نے بتایا۔ "کہتا تھا جن دنوں تو اس کا مہمان تھا اس نے اس بارے میں تجھ سے بات بھی کی تھی۔ اور تو راضی بھی ہو گیا تھا۔"

"اتنا تو مجھے یاد ہے کہ سمہ نے غلے کی سمگلنگ کے بارے میں گل بات کی تھی۔" رحیم داد انکار نہ کر سکا۔ "وہ میری فصل بھی سرحد پار سمگل کرنے کو کہتا تھا۔ دام اور مل بھی بہت بتاتا تھا۔ پر میں ہوں ہاں کر کے رہ گیا۔ سوچا تھا فصل کی داڈھی کے بعد تجھ سے اس معاملے میں بات کروں گا۔ پر ایسے کاموں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے خوف آتا ہے۔ اس میں خطرہ بہت ہے۔"

"خطرہ تو ہے۔" نادر خاں نے کہا۔ "پر فائدہ بھی اتنا ہی زیادہ ہے۔ آڑھتی فصل کی اتنی کیمت نہیں ادا کریں گے جتنی سمگلنگ سے ملے گی۔ سمہ کہتا تھا لگ بھگ دگنی ہو گی۔"

"تو اس بارے میں کیا سوچتا ہے؟"

"میں نے کیا سوچنا ہے جی۔ فیصلہ تو تجھے کرنا ہے۔" نادر خاں نے رحیم داد کے سوال کے جواب میں کہا۔ "ویسے فصل تو ابھی اپنے ہی پاس ہے۔ آڑھتی چکر کاٹ رہے ہیں۔ نرخ تو تیری واپسی پر طے ہو گا۔ میں نے ان سے یہی کہہ دیا۔"

"سمہ سے تو نے کیا کہا؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"میں نے اسے کیا کہنا تھا جی۔" نادر خاں نے بتایا۔ "صاف صاف بتا دیا کہ زمیں دار کی اجازت کے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ جیسا وہ حکم کرے گا، میں نے ویسا ہی کرنا ہو گا۔" اس نے تامل کیا۔ "میں یہی معلوم کرنے آیا ہوں۔ اس سلسلے میں میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"سمہ کب آنے کو کہہ گیا ہے؟"

"چند روز میں آنے کو کہہ گیا تھا۔" نادر خاں نے رحیم داد کو بتایا۔ "جو فیصلہ کرنا ہے اس میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ فوراً جواب دینا ہو گا۔"

رحیم داد نے نادر خاں کے رویّے سے اندازہ لگا لیا کہ وہ غلے کی اسمگلنگ میں رفیع سمہ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا ہے۔ مگر رحیم داد تیار نہ تھا۔ وہ کسی ایسی مہم جوئی میں شریک ہونے سے ڈرتا تھا جس میں گرفتار ہونے کا اندیشہ ہو۔ وہ پولیس کا سامنا کرنے اور عدالت کے روبرو پیش ہونے سے گھبراتا تھا۔ اس میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ صرف جیل جانے کا نہیں بلکہ پھانسی پر لٹک جانے کا بھی خطرہ تھا۔

اسے طرح طرح کے وسوسے ستانے لگے۔ وہ گردن جھکا کر ممکنہ خطرات کے بارے میں غور کرنے لگا۔ نادر خاں نے اسے متفکر اور پریشان دیکھا تو کرید کر پوچھا۔ "چوہدری، تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"نادر، بات یہ ہے میں نے کبھی ایسا خطرناک دھندا کیا نہیں۔" رحیم داد نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ "میں فوراً کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ سوچ کر بتاؤں گا۔ تو تھکا ہوا ہے۔ جا کر آرام کر۔ تجھ سے بعد میں گل بات ہو گی۔"

"جیسی تیری مرضی۔ ویسے میرا ارادہ آج ہی واپس جانے کا تھا۔"

”نہیں، تو ابھی نہیں جا سکتا۔ تجھ سے کئی ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ رحیم داد نے اسے واپس کوٹلہ ہرکشن جانے سے روک لیا۔

”میرے لیے یہی حکم ہے جی تو ٹھہرے جاتا ہوں۔“ نادر خاں نے اصرار نہ کیا۔ ایک تابع دار اور فرض شناس ملازم کی طرح رحیم داد کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

رحیم داد نے ایک نوکر کو بلایا۔ اسے ہدایت کی کہ مہمان خانے میں نادر خاں کے ٹھہرنے اور کھانے پینے کا مناسب بندوبست کر دیا جائے۔

نادر خاں نوکر کے ہم راہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رحیم داد بھی کمرے میں زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ کچھ دیر تنہا بیٹھا سوچتا رہا، پھر اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کمرے کی جانب روانہ ہو گیا جس میں کچہری لگی تھی۔

دن گزرا، شام ہوئی، رحیم داد صحن میں بیٹھا تھا۔ مہمان خانے میں جسے ڈیرہ یا وساخ کہا جاتا ہے، خاصی چہل پہل تھی۔ گرمی کی شدت قدرے کم ہو چکی تھی۔ چراغ روشن ہو چکے تھے۔ باورچی خانے کے چولھے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ فضا میں ملی جلی آوازوں کا شور رچا ہوا تھا۔ زندگی جاگ رہی تھی، مسکرا رہی تھی۔

رحیم داد تنہا تھا۔ بیزار اور اکتایا ہوا تھا۔ سردار شہ زور خاں مزاری سہ پہر کو روجھان چلا گیا تھا اور اب تک واپس نہ آیا تھا۔ وہ موجود نہ ہوتا تو رحیم داد کے لیے وقت کاٹنا دوبھر ہو جاتا۔ مزاری کے بغیر وہ شغل بادہ نوشی بھی نہ کرتا۔ حالانکہ کئی بار اس نے اصرار بھی کیا۔ لیکن اکیلے بیٹھ کر شراب پینا اسے کچھ اچھا نہ لگا۔ ملازم گلاس اور بوتل لے کر آتا بھی تو وہ منع کر دیتا۔ البتہ بھنگ پینے میں اسے عار نہ تھا۔ مگر لسی کو بھنگ پر ترجیح دیتا۔ ان دنوں اس کا یہی معمول تھا۔

اس وقت بھی رحیم داد کے سامنے لسی سے بھرا ہوا کانسی کا لمبا گلاس رکھا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا ٹھنڈی ٹھنڈی لسی کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نادر خاں پہنچ گیا اور کرسی کھسکا کر رحیم داد کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ وہ غسل کر کے آیا تھا۔ لباس بھی صاف ستھرا تھا۔ تمام دن آرام کرنے کے بعد اب وہ ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔

رحیم داد نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ ”نادر، تو بہت دیر سوتا رہا۔“

”بہت تھک گیا تھا جی۔“ نادر نے شکوہ کرنے کے انداز میں سفر کی مشکلات بیان کیں۔ ”ادھر تو جی سفر کرنا اور وہ بھی گرمی میں بہت دشوار ہوتا ہے۔ کیا بتاؤں جی مجھ پر کیا بیتی۔ لاریاں ایسی پرانی کھٹارا ہیں کہ چلنے میں ایک ایک پرزہ شور کرتا ہے۔ سڑک بھی کچی ہے۔ جگہ جگہ گڑھے ہیں۔ لاری اس پر دوڑتی ہے تو ایسی گرد اڑاتی ہے، ایسے جھٹکے لگتے ہیں کہ بدن کا جوڑ جوڑ ہل جاتا ہے۔ اب تک ہڈیاں دکھ رہی ہیں۔ اور خاک تو ایسی جمی کہ بار بار نہانے پر بھی ایسا لگتا ہے کہ خاک ابھی اتری نہیں۔“

”پر لاری تو ادھر آتی نہیں۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”سڑک تو بہت دور رہ جاتی ہے۔ تو شاہ میر تک آیا کیسے؟ تانگا شانگا بھی نہیں ملتا۔“

”بس جی، کسی نہ کسی طرح یہاں تک پہنچ ہی گیا۔“ نادر خاں نے سفر کی مزید دشواریاں بیان کرنے سے احتراز کیا۔ گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ ”سمہ کے بارے میں کیا سوچا جی؟ میں نے واپس جا کر اسے جواب دینا ہو گا۔“

”سوچتا تو اس کے بارے میں دن بھر رہا۔ پر سمجھ نہیں آتی کیا کیا جائے۔“ رحیم داد نے ایک بار پھر اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ”تجھے پتہ ہے، یہ سمگلنگ کا دھندا کتنا خطرناک ہے۔ ویسے روپے کی ابھی اتنی زیادہ ضرورت بھی نہیں کہ ایسا خطرناک کام کیا جائے۔“

”روپے کی ضرورت تو ہے اور بہت زیادہ ہی ہے۔“

”وہ کس لیے؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ نظروں سے نادر خاں کو دیکھا۔

”زمیں داری بڑھانے کے لیے۔“ نادر خاں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اپنے پاس لگ بھگ آٹھ سو ایکڑ اراضی ہے۔ اتنی کم اراضی کے لیے منیجری کرتے مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ زمیں داری اور بڑھے تاکہ منیجری کرنے کا کچھ مزا آئے۔ مجھے بھی محنت کرنے اور اپنی کارگزاری دکھانے کا موقع ملے۔“

”پر تو زمیں داری بڑھائے گا کیسے؟“ رحیم داد اور زیادہ حیرت زدہ ہو گیا۔ ”غیر مزروعہ اور رپڑیلی زمین پر تو نے باغات لگا لیے۔ زمیں داری بڑھانے کے لیے اور زمین کہاں سے آئے گی؟“

”اس کے بارے میں تو بعد میں بتاؤں گا۔“ نادر خاں نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ پہلے سمہ کا معاملہ طے ہو جائے۔“

”تو بتا اس معاملے میں کیا، کیا جائے۔ تو نے کیا سوچا؟“

”میں تو جی یہی صلاح دوں گا سمہ کی بات مان لی جائے۔ اس میں جتنا فائدہ ہے خطرہ اتنا زیادہ نہیں۔“ نادر خاں نے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”چوہدری، تجھے شاید پتہ نہیں۔ غلے کی سمگلنگ تو اپنا شاہ جی بھی کرتا ہے اور ساری سمگلنگ رفیع سمہ کے ذریعے ہوتی ہے۔ اب سے نہیں برسوں سے ہو رہی ہے۔“

"پر شاہ جی نے کبھی مجھے ایسی گل بات نہیں بتائی۔" رحیم داد نے تعجب سے کہا۔ "تجھے کیسے پتہ چلا شاہ جی اپنی فصلوں کی سرحد پار سمگلنگ کراتا ہے اور سمہ کے ذریعے کراتا ہے؟؟" وہ لحہ بھر کے لیے ٹھٹکا۔ "شاہ جی نے سمہ کے بارے میں مجھے یہ تو بتایا تھا کہ وہ سمگلر ہے پر یہ نہیں بتایا کہ سمہ کے ساتھ مل کر وہ بھی سمگلنگ کرتا ہے۔"

"مجھے تو جی یہ گل سمہ ہی نے بتائی تھی۔" نادر نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "وہ تو جی یہ بھی بتاتا تھا کہ شاہ جی کی فصل تو گوداموں اور کھلیانوں سے اٹھ کر سرحد پار جانی بھی شروع ہو گئی۔ اب تک آدھی سے زیادہ فصل سمگل ہو چکی ہے۔"

"یہ تو نے بہت تعجب کی گل سنائی۔"

"سچ تو یہ ہے جی' مجھے اس بارے میں پہلے ہی سے پتہ تھا۔ سمہ کے ساتھ شاہ جی کی یاری کا اصل سبب بھی یہی ہے۔"

"تیری باتوں کا صاف مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ سمہ کے ساتھ معاملہ کر لیا جائے۔" رحیم داد نے مسکرا کر اپنے ردعمل کا برملا اظہار کیا۔ "پر یہ سوچ لے' ہے یہ کام خطرناک۔" اس نے نادر خاں کے چہرے کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "جو کچھ کرنا ہے' تجھے ہی کرنا ہو گا۔"

"فکر نہ کریں جی۔" نادر خاں نے ہونٹوں پر بھی ہلکی ہلکی مسکراہٹ ابھری۔ "مجھے تو جی صرف اجازت چاہیے۔ آگے کی مجھ پر چھوڑ دیں۔" اس نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ "پروا نہ کریں جی سب کام بالکل ٹھیک ہو گا۔"

"جیسی تیری مرضی۔" رحیم داد رضامند ہو گیا۔ "میری طرف سے تجھے اجازت ہے۔"

"اب جی' یہ بھی سن لیں۔ میں زمیں داری کس طرح بڑھانا چاہتا ہوں۔"

"سنا' ضرور سنا۔" رحیم داد نے خوش ہو کر اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔

"تجھے یہ تو پتہ ہی ہے کہ اپنی زمین داری کے نشیب میں جو چھوٹے زمیندار اور حصے دار ہیں' ان کا پانی باغات لگانے کے بعد ہم نے کم کر دیا ہے۔" نادر خاں سنبھل سنبھل کر بتانے لگا۔ "ان کی زمینوں کے لیے تو لگانے کو اتنا کم پانی مل رہا ہے کہ انھوں نے منجی کے بوٹوں کی جو پنیری لگائی تھی' سب سوکھ گئی۔ دوسری فصلوں کو بھی پورا پانی نہ ملا تو وہ بھی خراب ہو گئیں۔"

"ایسی گل بات ہے تو وہ بہت گڑبڑ کر سکتے ہیں۔" رحیم داد نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔

"ان کو جو گڑبڑ کرنی تھی کر چکے۔" نادر خاں نے رحیم داد کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی۔ "اوپر تک درخواستیں لگائیں۔ سرکاری دفتروں کے بہت چکر کاٹے۔ پر اپنا کام ایسا پکا تھا کہ کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ آخر مجبور ہو کر ہمارے پاس آئے۔ اور اپنی فصلوں کے لیے ہم سے پانی خریدنے لگے۔ تجھے ساری باتوں کا ٹھیک طرح سے پتہ ہے۔"

"وہ تو مجھے ہے۔" رحیم داد نے کہا۔ "میں سمجھا' وہ کوئی نئی گڑبڑ کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے لسی کا گھونٹ بھرا۔ "کھیتوں کو لگانے کے لیے کافی پانی نہ ملے اور فصلیں سوکھ جائیں تو کوئی زمین دار یا مزارع کیسے چپ کر کے بیٹھ سکتا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"انھوں نے یہ کیا کہ سندھ میں بیراجوں کی جو زمینیں نکلی ہیں' وہ الاٹ کرانی شروع کر دیں۔" نادر خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "اب وہ آبادکار بن کر سندھ جا رہے ہیں۔"

"ادھر کی اراضی کا کیا کریں گے؟"

"اسے وہ فروخت کرنا چاہتے ہیں۔" نادر خاں نے بتایا۔ "ادھر زمیں داری چلانے کے لیے بھی تو روپے کی ضرورت ہو گی۔ صرف زمین الاٹ کرا لینے سے تو کام نہیں چلتا۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا کہ وہ اپنی زمین فروخت کرنا چاہتے ہیں؟"

"کئی تو میرے پاس آ چکے ہیں۔ ویسے بھی حق شفعہ کی رو سے سب سے پہلے اپنا ہی حق بنتا ہے۔ اپنی زمینیں جو ان کے ساتھ ملتی ہیں۔ ان کو تو اپنی زمینیں فروخت کرنے سے پہلے ہم سے صلاح مشورہ کرنا ہی ہو گا۔ کنون یہی ہے۔"

"پر وہ تو اپنی زمینوں کی بہت کیمت مانگتے ہوں گے۔" رحیم داد نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

"مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔ ضرورت کے مطابک پانی نہ ملنے سے وہ بہت پریشان ہیں۔ دوسری طرف یہ سننے میں آیا ہے کہ بیراجوں کی زمین بہت زرخیز ہے۔ پانی بھی بہت ہے۔ وہ جلد سے جلد ادھر جا کر کاشت شروع کرنا چاہتے ہیں۔"

"تیرا مطلب ہے وہ اپنی زمینیں سستے دام فروخت کر دیں گے۔"

"ان کی باتوں سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔" نادر خاں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ضرورت مند ہیں' اس لیے سستے داموں زمینیں فروخت کر دیں گے۔"

"سوال یہ ہے کہ زمین خریدنے کے لیے اتنا روپیہ کہاں سے آئے گا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔ "اگر پوری فصل ربیع سمہ کے ذریعے سمگل کرا دی جائے' تب بھی اتنا روپیہ تو نہیں ملے گا کہ ساری زمینیں خریدی جا سکیں۔"

"ساری زمینیں خریدنے کا تو نہ میرا ارادہ ہے اور نہ اتنی گنجائش ہی ہے۔" نادر خاں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "میں تو یہ چاہتا ہوں اتنی زمین خرید لی جائے کہ اپنے پاس ۵۰ مربع اراضی ہو

جائے۔"

"تو یہ کہنا چاہتا ہے' ساڑھے چار سو کلا زمین خرید لی جائے؟"

"چاہتا تو میں یہی ہوں۔" نادر خاں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اپنے پاس کم سے کم اتنی زمین تو ہو کہ زمین داری کی کچھ شان نظر آئے۔"

"پر اس کے لیے روپے کی بھی تو ضرورت ہوگی۔" رحیم داد کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

"کچھ روپیہ اپنے پاس ہے' کچھ شاہ جی سے ادھار لیا جا سکتا ہے۔" نادر خان نے مشورہ دیا۔ "میں تو سمجھتا ہوں جی' وہ اس معاملے میں ضرور مدد کرے گا۔ مجھے پتہ ہے وہ تجھے کتنا مانتا ہے۔ وہ تو تجھے بہت وڈا زمیں دار دیکھنا چاہتا ہے۔ اوروں کی گل بات نہیں کرتا۔ خود مجھ سے وہ ایسا ہی خیال ظاہر کر چکا ہے۔" اس نے رحیم داد کے چہرے کو نظریں اٹھا کر دیکھا۔ "تو شاہ جی سے بات کر کے تو دیکھ۔ وہ ضرور تیری مدد کرے گا۔"

"تھوڑی بہت رقم تو وہ ادھار دے سکتا ہے۔ پر اتنی نہیں کہ جس سے ساڑھے چار سو کلا زمین خریدی جا سکے۔" رحیم داد نے نادر خاں کی تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ "ویسے میں شاہ جی سے ادھار مانگنا نہیں چاہتا۔ مان لے اس نے انکار کر دیا تب کیا ہوگا؟ خامخا شرمندگی اٹھانی ہوگی۔" اس نے گلاس اٹھا کر لسی کے کئی گھونٹ بھرے۔ "جتنا اپنے پاس روپیہ ہے' بس اتنی ہی زمین خریدنے کی سوچ۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "روپیہ ہوگا تو بعد میں بھی زمین خریدی جا سکتی ہے۔"

"جیسی تیری مرضی۔" نادر خاں نے بددل ہو کر دھیمے لہجے میں کہا۔ "پر میں ایک گل ضرور کہوں گا ایسا موکع روز' روز نہیں ملتا۔" اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "ویسے تجھے پتہ ہی ہے' زمین دار کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اپنی زمین کم کرنے کی بجائے ہمیشہ بڑھانے کے چکر میں رہتا ہے۔"

☆

چاکر خاں سرگانی اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گیا۔

رحیم داد نے اسے دیکھا تو مسکرا کر پوچھا۔ "تو اکیلا ہی آ گیا۔ تیرا سردار کدھر ہے؟"

"سیں' میں سردار کے ساتھ نہیں گیا تھا۔" چاکر خاں سرگانی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔

"تجھے یہ تو پتہ ہوگا' وہ کب تک واپس آئے گا؟" رحیم داد نے سرگانی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "تو کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔"

چاکر خاں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "سیں چوہدری' مجھے بالکل پتہ نہیں سردار کب تک لوٹے گا۔

میں تو تجھے یہ بتانے آیا تھا کہ عزیز گٹھوال کل صبح یہاں پہنچ جائے گا۔"

"پر اب تک وہ رہا کہاں؟" رحیم داد نے گٹھوال کے بارے میں استفسار کیا۔

"سیں' وہ دلاور والا گیا تھا۔ اراضی دیکھ کر اور ساری معلومات اکٹھی کر کے ہی تیرے پاس آئے گا۔" چاکر خاں سرگانی نے بتایا۔ "وہ بہت ہشیار بندہ ہے۔ تو اس سے مل کر بہت خوش ہوگا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اسے تیرے پاس لگایا ہے۔ زمیں داری کے کام کا اسے بہت تجربہ ہے۔ سارا کام سنبھال لے گا۔ اس کے ہوتے ہوئے تجھے کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے نادر خاں کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہ نادر خاں ہے۔ آج ہی کوٹلہ ہرکشن سے ادھر آیا ہے۔ میرا منیجر ہے۔"

"سیں تو نے اسے مشورے کے لیے بلایا ہے؟" سرگانی نے پوچھا۔

"نہیں' ایک ضروری کام کے بارے میں گل بات کرنے خود ہی آیا ہے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "اسے تو میں نے اب تک یہ بھی نہیں بتایا کہ دلاور والا میں میرے نام اڑھائی سو ایکڑ متروکہ زرعی اراضی الاٹ ہو چکی ہے۔"

چاکر خان سرگانی نے نادر خاں سے پوچھا۔ "سیں' تو ادھر آرام سے ہے ناں؟ کوئی تکلیف شکلیف تو نہیں؟"

"بالکل آرام سے ہوں۔" نادر خاں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "کوٹ کا ڈیرہ بہت شاندار ہے۔ کمرے بھی وڈے اور کھلے ہوئے ہیں۔ پر گرمی ادھر بہت زیادہ ہے۔"

"اس بار کچھ زیادہ ہی گرمی پڑی ہے۔" سرگانی نے بھی گرمی کی شدت کا اعتراف کیا۔ "تو شمشیر والی آتا تو گرمی اتنی نہ لگتی۔ دریا کا کنارہ ہے۔ صبح شام ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ چوہدری بھی پچھلے دنوں سردار کے ساتھ ادھر ہی ہوتا تھا۔ یہاں آئے ہوئے تو اسے چند ہی روز ہوئے ہیں۔"

نادر خاں خاموش رہا۔ مگر رحیم داد مزید خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے چاکر خاں سرگانی سے دریافت کیا۔ "تجھے ٹھیک طرح پتہ ہے کہ عزیز گٹھوال کل صبح یہاں پہنچ جائے گا؟"

"سیں' تو فکر نہ کر۔ وہ ضرور پہنچ جائے گا۔" سرگانی اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں چلا۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"سیں' میں نے سردار کے ایک ضروری کام کے لیے جانا ہے۔" سرگانی نے جواب دیا۔ "میں تو صرف گٹھوال کے کل یہاں آنے کی اطلاع دینے آیا تھا۔"

چاکر خاں سرگانی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور شام کے پھیلتے ہوئے گہرے

اندھیرے میں گم ہو گیا۔

نادر خاں نے رحیم داد سے کہا۔ “مجھے بھی کل واپس جانا ہے۔ سویرے ہی سویرے نکل جاؤں گا۔ ویسے مجھے اب یہاں ٹھہرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ جو صلاح مشورہ کرنا تھا کر لیا۔”

“نہیں، تو ابھی یہیں ٹھہرے گا۔ تجھ سے اور بھی ضروری باتیں کرنی ہیں۔”

“میں تو اس لیے فوراً واپس کوٹلہ ہرکشن جانا چاہتا تھا کہ سمہ چند ہی روز میں آنے کو کہہ گیا تھا۔” نادر خاں نے وضاحت کی۔ “اب تو اسے ملنا میرے لیے ضروری ہو گیا ہے۔”

“میں نے تجھ سے دلاور والا کی اراضی کے بارے میں صلاح کرنی ہے۔” رحیم داد نے کہا۔ “میں چاہتا ہوں تو بھی دلاور والا کا ایک چکر لگا کر دیکھ لے۔” اس نے مسکرا کر نادر خاں کی جانب داد طلب نظروں سے دیکھا۔ “اسی الاٹمنٹ کی خاطر تو میں ادھر آیا تھا۔ اور اب تک ٹھہرا ہوا تھا۔ سچ پوچھ تو مجھے امید نہیں تھی اتنی آسانی سے الاٹمنٹ مل جائے گی۔”

“زمین تو جی جہاں ملے ضرور لے لینی چاہیے۔ پر ادھر زمیں داری چلانے میں بہت دشواریاں ہیں۔ طرح طرح کے جھگڑے بکھیڑے ہیں۔”

“فکر نہ کر۔ تجھے ادھر نہیں لگاؤں گا۔” رحیم داد نے ہنس کر نادر خاں کو اطمینان دلایا جس کے چہرے سے دبی دبی پریشانی جھلک رہی تھی۔ “میں نے اس بارے میں پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ ادھر کی زمینداری چلانے کے لیے عزیز گٹھوال کو لگایا ہے۔”

“کیسا بندہ ہے؟” نادر خاں نے دریافت کیا۔ اس کے چہرے پر چھایا ہوا پریشانی اور بے زاری کا ہلکا ہلکا غبار چھٹ چکا تھا۔ اب وہ مطمئن اور بشاش نظر آ رہا تھا۔

“میں نے تو اسے ابھی تک دیکھا بھی نہیں وہ کل صبح آ رہا ہے۔ تو بھی اسے مل کر پتہ چلا لینا کیسا بندہ ہے۔ ویسے تیرے سامنے ہی تو عزیز گٹھوال کے بارے میں مزاری کا کامدار، چاکر خاں گل بات کر رہا تھا۔ تو نے سنا نہیں، وہ اسے بہت ہشیار اور کام کا بندہ بتا رہا تھا۔”

“چاکر خاں اس کے بارے میں ٹھیک ہی بتاتا ہو گا۔ اس نے سوچ سمجھ کر ہی عزیز گٹھوال کی سفارش کی ہو گی۔ پہلے سے اسے ٹھیک طرح جانتا ہو گا۔” نادر خاں نے کوشش کی کہ زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ ادا ہو جس سے عزیز گٹھوال کی مخالفت کا پہلو نکلے۔ اسے ڈر تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ رحیم داد اسے دلاور والا کی زمیں داری کی دیکھ بھال پر مقرر کر دے۔ وہ ادھر آنا نہ چاہتا تھا۔ اگر وہ تیار بھی ہو جاتا تو اس کی بیوی، جنت ہرگز رضامند نہ ہوتی۔ لہٰذا نادر خاں نے ملاقات سے پہلے ہی گٹھوال کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ “زمیں دار، تو نے گٹھوال کو لگا کر بہت ٹھیک فیصلہ کیا۔ وہ ادھر ہی کا رہنے والا ہے۔ حالات ٹھیک طرح سمجھتا ہے۔ تجھے ایسے ہی بندے کی ضرورت بھی تھی۔”

“ابھی میں نے گٹھوال کے بارے میں پوری طرح طے نہیں کیا۔” رحیم داد نے نادر خاں کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ “وہ کتنا ہشیار اور کام کا بندہ ہے یہ تو اسے ملنے کے بعد ہی اندازہ ہو گا۔ تو بھی اس سے گل بات کرنا۔ پتہ چلانا کام بھی چلا سکتا ہے کہ نہیں۔ یہ سوچ لے، میں نے ادھر روز روز نہیں آنا۔ جس کو بھی ادھر لگایا جائے گا اس پر پورا پورا بھروسہ کرنا ہو گا۔ میں اسی لیے تجھے روک رہا ہوں۔”

“جیسا حکم کریں جی ویسا ہی کروں گا۔ میں گٹھوال سے ملنے کے بعد واپس جاؤں گا۔”

“نادر، اب تو جا کر روٹی کھا۔ آرام کر۔ تو صبح میرے پاس آ جانا۔”

نادر خاں خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

رحیم داد تنہا بیٹھا سردار شہ زور مزاری کا انتظار کرتا رہا، اندھیرا بڑھتا گیا۔ مہمان خانے کی چہل پہل کم ہوتی گئی۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ رات تاریک ہو گئی۔ مگر سردار شہ زور خاں مزاری واپس نہ آیا۔ نوکروں کو مطلق علم نہ تھا کہ وہ کہاں گیا ہے اور کس کے پاس گیا ہے۔

☆

پہر دن گزر چکا تھا۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ عزیز گٹھوال خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا۔ چاکر خاں سرگانی اس کے ہم راہ تھا۔ نادر خان دونوں کی آمد سے پہلے ہی کمرے میں موجود تھا۔ سردار شہ زور خاں رات کے پچھلے پہر واپس آ گیا تھا اور ابھی تک زنان خانے سے مہمان خانے میں نہیں آیا تھا۔

عزیز گٹھوال ساٹھ کے پیٹے میں تھا۔ مگر صحت بہت اچھی تھی۔ جسم مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ قد ذرا چھوٹا تھا۔ طبیعت میں خوشامد کی حد تک انکساری تھی۔ بات نپی تلی کرتا تھا اور سنبھل سنبھل کر بولتا تھا۔

رحیم داد نے اسے پرکھنے والی تیز نظروں سے دیکھا۔ دریافت کیا۔ “عزیز! تو دلاور والا گیا تھا؟”

“ہا سئیں، بالکل گیا تھا۔” عزیز گٹھوال نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ “کئی روز سے ادھر ہی تھا۔ سیدھا وہیں سے آ رہا ہوں۔”

اس بار نادر خاں نے سوال کیا۔ “زمین کیسی ہے؟ بنجر یا کلر تو نہیں ہے؟”

“نا سئیں۔” عزیز گٹھوال نے انکار میں سر ہلایا۔ “بہت عمدہ زمین ہے۔ پانی بھی بہت ہے۔ ایسی

زرخیز زمین تو پوری تحصیل میں نہیں ہوگی۔"

"اچھی اور زرخیز کیوں نہیں ہوگی۔" چاکر خان مسکرا کر بولا۔ "میں نے الاٹمنٹ لینے سے پہلے ہی زمین کے بارے میں پتہ کر لیا تھا۔" اس نے مڑ کر عزیز گٹھوال کی جانب دیکھا۔ "چوہدری کو یہ بتا تو ادھر اب تک کیا کرتا رہا؟"

"میں وستی والوں سے ملتا رہا۔ پٹواری سے بھی ملا۔" گٹھوال نے بتایا۔ "راہکوں کے بارے میں پتہ کیا۔"

"سنا ہے زمین راہکوں اور مزارعوں نے دبا رکھی ہے۔" رحیم داد نے کہا۔ "کبضہ بہت مشکل سے ملے گا۔" وہ چاکر خاں کی جانب متوجہ ہوا۔ "چاکر' ذنے یہی بتایا تھا نا؟"

چاکر خاں کے جواب دینے سے پہلے ہی عزیز گٹھوال بول پڑا۔ "سئیں' تو نے ٹھیک ہی سنا۔" اس کے چہرے سے ہلکی ہلکی پریشانی جھلکنے لگی۔ "کئی راہکوں اور مزارعوں نے پٹواری کی مٹھی گرم کر کے اپنا کبضہ پکا کر لیا ہے۔ زمینوں کے انتقالات بھی اپنے نام کرا لیے ہیں۔ پٹواری کے پاس تو رجسٹر خسرہ گرداوری ہوتا ہے ناں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے انتقالات دیکھے ہیں۔"

"اگر ایسا ہے تو زمیں کی الاٹمنٹ کیسے ملی؟" نادر خاں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

چاکر خاں سرگانی بہت سٹ پٹایا۔ اس نے فوراً صفائی پیش کی۔ "پر پٹواری نے تو مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔" اس نے گٹھوال کی جانب مڑ کر دیکھا۔ "تو نے پٹواری سے پوچھا تھا یا اس نے خود بتایا؟"

"پتہ تو پٹواری کو بھی نہ تھا۔" عزیز گٹھوال نے وضاحت کی۔ "یہ کارروائی تو اس سے پہلے کے کسی پٹواری نے کی تھی۔" اس نے براہ راست چاکر خاں کو مخاطب کیا۔ "سئیں چاکر خاں' لگتا ہے پٹواری نے رجسٹر خسرہ گرداوری دیکھے بغیر مسل صدر دفتر بھیج دی۔"

"تب تو گڑبڑ پیدا ہو سکتی ہے۔" نادر خاں نے کھل کر اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ "اگر معاملہ عدالت تک گیا تو الاٹمنٹ منسوخ ہو سکتی ہے۔"

"چاکر خاں تو سب سے ملا۔ اہل کاروں سے' افسروں سے' اوپر سے نیچے تک سب کے پاس گیا پر تو نے یہ پتہ نہیں کیا کہ کئی مزارعوں کے نام زمین سرکاری ریکارڈ میں منتقل ہو چکی ہے؟" رحیم داد نے تیکھی نظروں سے چاکر خاں سرگانی کو دیکھا۔ اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"سئیں چوہدری' فکر نہ کر۔" چاکر خاں نے مسکرا کر رحیم داد کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ "پٹواری نے اپنی کارروائی ڈالی تو اس کے اوپر تحصیل دار بھی بیٹھا ہے۔ وہ انتقالات خارج کر کے

زمین تیرے نام کر دے گا۔" وہ زیادہ بے تکلفی سے کھل کر مسکرایا۔ "تحصیل دار کی سردار سے گہری یاری ہے۔ میری بھی اس سے جان پہچان ہے۔ سئیں تو بالکل پرواہ نہ کر۔ یہ کام مجھ پر چھوڑ دے۔ تجھے اس معاملے میں کچھ نہیں کرنا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا' بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

عزیز گٹھوال نے بھی چاکر خاں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ رحیم داد کو مزید مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "تحصیل دار بالکل ایسا کر سکتا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "انتقالات کیا' گرداوریاں تک منسوخ ہو سکتی ہیں' بدل سکتی ہیں۔ اپنا چاکر خان سب کچھ کرا سکتا ہے۔ اس کی تو صدر دفتر تک پہنچ ہے۔ جیسا چاہے گا آرام سے کرا لے گا۔ سئیں اس معاملے میں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

رحیم داد کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی کا غبار چھٹنے لگا۔ وہ سرگانی اور گٹھوال کی یقین دہانی سے مطمئن ہو گیا' مگر نادر خاں مطمئن نہ ہوا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے مزارعے آگے چل کر بہت گڑبڑ پیدا کریں گے۔" اس نے سرگانی کو نظر بھر کر دیکھا۔ "مجھے ادھر کے راہکوں اور مزارعوں کے بارے میں پتہ ہے۔ بہت سرکش اور زور آور ہیں۔" نادر خاں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "چاکر خاں' تو نے بھی سنا ہو گا۔ دو تین سال پہلے کا ذکر ہے۔ خریف کی فصل پر چوٹی کے لغاری سرداروں نے موضع کمال خاں کے چانڈیہ کھوسہ مزارعوں اور راہکوں کو زمینوں سے بے دخل کرنے کے لیے نزدیک کے پہاڑوں سے سو سے بھی زیادہ ہدیانی بلوچوں کو بلایا۔ ان کے ذریعے مونجی کی فصل اٹھانے کی بھی کوشش کی۔ ہدیانیوں نے بستی پر رات کے اندھیرے میں حملہ کر دیا۔ پر کھوسہ مزارعوں نے حملہ آوروں کو گھیرے میں لے لیا۔ زبردست لڑائی ہوئی۔ آخر ہدیانی حملہ آوروں کو پسپا ہونا پڑا۔ بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔"

"تو نے یہ تو سنا' پر یہ نہیں سنا کہ بعد میں کیا ہوا؟" چاکر خاں نے بے نیازی سے کہا۔ "لغاریوں نے کھوسہ راہکوں کے خلاف دوسرا حربہ استعمال کیا۔ پولیس اور کنون کا چکر چلایا۔ ان کے خلاف دفعہ ۳۶۵-۱۴۹/۱۴۸ کے تحت مکدمے بنوائے۔ لغاری زمیں داروں کے خلاف کھوسہ راہکوں نے بھی پرچے چاک کرائے۔ پر لغاریوں کے پرچے درج ہو گئے۔ کھوسوں کے پرچے خارج ہو گئے۔" اس نے نادر خاں کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "راہکوں کو پولیس نے بند کر دیا۔ لغاری زمین داروں نے ان کی غیر حاضری میں مونجی کی فصل اٹھوا لی۔ بعد میں سارے سرکش راہکوں کو بے دخل بھی کر دیا۔" اس نے بے تکلفی سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "سئیں ادھر سرداروں کا کنون چلتا ہے اور کوئی کنون نہیں چلتا۔ ادھر راہک اور مزارعے سر اٹھائیں تو ان کا سر کچل دیا جاتا ہے۔"

نادر خاں خاموش رہا۔ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کبضہ ملنے میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔“

”سئیں تو فکر نہ کر، کوئی گڑبڑ نہیں ہو گی۔ سب کام ٹھیک ٹھاک اور آرام سے ہو جائے گا۔“ چاکر خاں نے نہایت اعتماد سے کہا۔

مگر نادر خاں اس کی یقین دہانی سے مطمئن نہ ہوا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے، پر مجھے شبہ ہے کبضہ اتنی آسانی سے نہیں ملے گا۔“

چاکر خاں سرگانی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا، لیکن خاموش رہا۔

۴۲

اس روز کچہری میں سب سے پہلے ایک ایسے مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی جو خاصہ پیچیدہ اور سنگین تھا۔ یہ مقدمہ سردار شہ زور خان مزاری کے روبرو پہلی بار پیش نہیں ہوا تھا۔ اس کی سماعت ایک عرصے سے جاری تھی۔ اب تک کئی پیشیاں پڑ چکی تھیں۔ رحیم داد ان میں بھی شرکت کر چکا تھا۔ وہ فریقین اور ان کے گواہوں کے بیانات سن چکا تھا۔ سردار مزاری کے علاوہ وہ چاکر خاں سرگانی سے بھی اس کے بارے میں کئی بار بات چیت کر چکا تھا۔ لہٰذا اس کے پس منظر سے بخوبی آگاہ ہو چکا تھا۔

وہ کچہری میں خاموش بیٹھا دلچسپی اور انہماک سے مقدمے کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ مگر مقدّمے کے سماعت نے طول کھینچا تو رحیم داد اکتا گیا۔ اس نے سوچا بعد میں چاکر خان سرگانی سے اس روز کی کارروائی کی پوری روداد سن لے گا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور کچہری سے باہر چلا گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچا تو نادر خان موجود تھا۔ وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔

رحیم داد نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے نادر خان سے دریافت کیا۔ ”نادر، تو صبح سے اب تک ادھر ہی رہا؟“

”نہیں جی، میں تو کچھ ہی دیر پہلے ادھر آیا تھا۔“

”کوئی خاص گل بات تو نہیں؟“

”خاص گل بات تو نہیں۔“ نادر خاں نے دبی زبان سے کہا۔ ”صرف یہ کہنے آیا تھا کہ مجھے واپس کوٹلہ ہرکشن جانے کی اجازت مل جائے۔“

”لگتا ہے‘ تجھے اپنے بال بچے یاد آ رہے ہیں۔“

”ایسا نہیں ہے جی‘ میں نے ادھر کئی ضروری کام کرنے ہیں۔“ نادر خان نے وضاحت کی۔ ”رفیع سمہ آنے کو کہہ گیا تھا۔ وہ آیا اور میں نہ ملا تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔“

”تیری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ سمگلنگ کا فیصلہ کر کے ہی ادھر آیا تھا۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔

”ایسی گل بات نہیں ہے جی۔ بغیر اجازت میں کیسے ایسا فیصلہ کر سکتا ہوں۔“ نادر خاں نے جھٹ صفائی پیش کی۔ ”رفیع سمہ سے پوچھ لیں جی۔ میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا کہ زمیں دار کے حکم کے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ وہ انگلی سے سر کے بال کریدنے لگا۔ ”پر میں یہ گل ایک بار فیر کہوں گا کہ سمہ سمگلنگ کے ذریعے فصل کا جتنا دلا دے گا‘ آڑھتی ہرگز نہ دیں گے۔ ویسے ادھر روپے کی زیادہ سے زیادہ ضرورت بھی ہے۔ چھوٹے حصے داروں اور زمین داروں کی زمینیں اس وکت جس مول مل رہی ہیں‘ بعد میں اتنی سستی زمینیں نہیں ملیں گی جتنی بھی خریدی جائیں خرید لیں۔“

”خریدنے کو تو ان کی ساری ہی زمینیں خرید لی جائیں‘ پر اس کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا؟“ رحیم داد نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

”میں تو کہتا ہوں جی ادھر ڈیرہ غازی خان میں جو زمین الاٹ ہوئی ہے اسے بھی فروخت کر دیں۔“ نادر خاں نے مشورہ دیا۔ ”اس طرف ہم نے کیا لینا۔ اپنی اصل زمین داری تو ادھر ہی ہے۔ اسی کو بڑھانا چاہیے تاکہ پوری طرح اس کی دیکھ بھال بھی ہو سکے۔“

”نادر ایسا نہ سوچ۔“ رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ ”شہ زور مزاری نے یہ بات سن لی تو بہت برا منائے گا۔ میں اسے نراض کرنا نہیں چاہتا۔ یہ تو سوچ اس نے ادھر زمین الاٹ کرانے کی کتنی زبردست کوشش کی ہے۔ میری یاری دوستی ہی کے لیے تو اس نے ایسا کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے جی۔ آگے میں ایسی گل بات نہیں کہوں گا۔“ نادر خان نے فوراً اپنی تجویز واپس لے لی۔ ”پر اتنا ضرور کہوں گا کہ زمین تو الاٹ ہو گئی‘ کبضہ کب ملے گا اور کیسے ملے گا؟“

”تو نے سنا نہیں چاکر خان سرگانی اس بارے میں کیا کہہ رہا تھا۔“

”برا نہ منائیں جی‘ مجھے تو چاکر خان ہشیار بندہ نہیں لگتا۔ ویسے وہ گلاں وڈی وڈی کرتا ہے۔“ نادر خان نے دبی زبان سے چاکر خان سرگانی کی مخالفت کی۔

مگر رحیم داد کو اس کا رویہ پسند نہ آیا۔ تیکھے لہجے میں بولا۔ ”تو کہتا ہے وہ ہُشیار بندہ نہیں ہے۔ پر تو نے یہ نہیں سوچا زمین کی الاٹمنٹ تو اسی نے کرائی ہے۔ زمین الاٹ کرانا مخول ہے۔ تجھے پتہ نہیں اس کے لیے کتنی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے۔ الاٹمنٹ ایسے ہی نہیں مل جاتی۔ اور اب تو ملتی ہی کہاں ہے۔ کتنے ہی کلیم ہولڈر اپنے اپنے کلیم دبائے اِدھر اُدھر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ الاٹمنٹ کہیں نہیں ملتی۔“

”پتہ نہیں جی اس نے کیسے الاٹمنٹ لے لی۔“ نادر خاں نے کہا۔ ”اپنی سمجھ میں تو آتا نہیں کہ رجسٹر خسرہ گرداوری میں زمین کے مالکانہ حکوک دوسروں کے پاس ہوں اور الاٹمنٹ تیرے نام کر دی جائے۔ پٹواری ایسی غیر کنونی کارروائی کر ہی نہیں سکتا۔ اور جب تک درخواست پر پٹواری کی رپورٹ نہ لگی ہو الاٹمنٹ ہو ہی نہیں سکتی۔“

”ہو سکتی ہو یا نہ ہو سکتی ہو پر چاکر نے الاٹمنٹ کرا ہی لی۔“ رحیم داد نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ”غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”وہ تو جی بالکل ٹھیک ہے۔“ نادر خاں نے تائید کی۔ ”الاٹمنٹ بھی سولاں آنے پکی ہے۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”بات یہ ہے جی‘ ادھر کوئی کاعدہ کنون تو ہے نہیں۔ افسر بھی نااہل اور بدعنوان ہیں۔ یہاں تو وہ افسر لگائے جاتے ہیں جن کو سزا دینی منظور ہوتی ہے۔ تب ہی تو افسروں میں اس ضلع کو کالا پانی کہا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ادھر تو سرداروں کی حکمرانی ہے۔ جیسا وہ چاہتے ہیں افسر ویسا ہی کرتے ہیں۔ ملازمت جو کرنی ہوئی۔ سرداروں سے تو حکومت بھی ڈرتی ہے۔ تب ہی تو ان کے معاملات میں مداخلت نہیں کی جاتی۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”اب یہی دیکھ لیں جی‘ سرکاری عدالتیں موجود ہیں۔ پولیس بھی ہے‘ تھانے بھی ہیں‘ پر مکدموں کا فیصلہ جرگے میں ہوتا ہے یا سردار اپنی عدالتیں لگا کر کرتے ہیں۔“

”یہ تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے تو۔“ رحیم داد نے نادر خان سے اختلاف رائے نہ کیا۔ ”سردار نہ صرف عدالت اور کچہری لگاتے ہیں‘ بلکہ مکدمے کی فیس بھی لیتے ہیں۔ جرمانے لگاتے ہیں‘ سزائیں دیتے ہیں‘ ان کی تو اپنی جیلیں بھی ہیں۔ اپنا سردار شہ زور مزاری روز ہی کچہری لگاتا ہے۔ مکدموں کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس کی بھی اپنی جیل ہے جس میں آج بھی نہ جانے کتنے کیدی بند ہیں۔“

”تب ہی تو میں کہتا ہوں ادھر زمین داری چلانی بہت مشکل ہے۔“

”اس کی تو فکر نہ کر۔ یہ بتا‘ الاٹمنٹ تو مل گئی آگے کیا کرنا ہے؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”کبضہ کیسے ملے گا؟“

”اس کے لیے سب سے پہلے یہ کرنا ہو گا کہ صدر دفتر جا کر آرڈر نکلوایا جائے۔ اسے لے کر

پٹواری سے ملا جائے۔ اس کی مٹھی گرم کی جائے۔ موجودہ مالکان کے انتقالات منسوخ کرائے جائیں اور اپنے نام کرا لیے جائیں۔" نادر خان نے مشورہ دیا۔ "یہ کام جلد سے جلد ہو جانا چاہیے' اگر موجودہ مالکان کو پتہ چل گیا اور انھوں نے عدالت میں مکدمہ وائر کر دیا تو بہت گڑ بڑ ہو گی۔ عدالت رجسٹر خسرہ گرداوری کی بنیاد پر الاٹمنٹ منسوخ کر سکتی ہے۔ اس لیے کہ اب تک جو کارروائی ہوئی ہے وہ بالکل غیر کنونی ہے۔"

"یہ تو چاکر کو پہلے ہی سوچنا چاہیے تھا۔" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"تب ہی تو جی' میں نے کہا تھا چاکر اتنا ہشیار بندہ نہیں جتنا وہ خود کو ظاہر کرتا ہے۔"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "زمین کا کبضہ لینے کے لیے کیا ایسا کرنا ضروری ہے؟"

"بالکل ضروری ہے۔ اس کے بغیر تو کبضہ مل ہی نہیں سکتا۔"

"میں اس کے بارے میں آج ہی شہ زور سے بات کروں گا۔" رحیم داد نے نادر خان کو اطمینان دلایا۔

"بالکل کریں جی۔ اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ نادر خان بھی چپ بیٹھا رہا۔ کمرے میں کچھ دیر خاموشی چھائی رہی' پھر رحیم داد کی آواز ابھری۔ اس نے کہا۔ "یہ کام بھی چاکر خان ہی کر سکتا ہے۔ عزیز گھوال کو بھی اس کے ساتھ لگا دوں گا۔"

"اسے ضرور لگائیں جی۔" نادر خان نے رحیم داد کی تجویز سے اتفاق کیا۔ "گھوال مجھے چاکر سے زیادہ ہشیار اور کام کا بندہ نظر آتا ہے۔"

"ایسا ہی کروں گا۔ دونوں کو لگا دوں گا تاکہ کام فٹافٹ ہو جائے۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"چاکر اور گھوال کے ساتھ تو بھی چلا جا۔"

"میں نے صدر دفتر جا کر کیا لینا ہے۔" نادر خان نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "میں تو ادھر کے کسی افسر کو جانتا بھی نہیں۔"

"تجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "تو ان کے ساتھ آسانی سے شہر پہنچ جائے گا۔ وہاں سے لہور چلا جانا۔ شاہ جی کراچی سے واپس آگیا ہو تو اسے بتا دینا کہ زمین کی الاٹمنٹ کے لیے میں ادھر ٹھیرا ہوا ہوں' کبضہ ملتے ہی اس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "شاہ جی سے ملنے کے بعد تو واپس کوٹلہ ہرکشن چلا جانا۔"

"سمہ آئے تو اس سے بات پکی کر لوں؟"

"بالکل کر لے۔ اس کے لیے تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔" رحیم داد بے تکلفی سے مسکرایا۔ "تجھے فصل کی سمگلنگ کرنی ہے تو وہ بھی کر لے۔ پر ساری ذمہ داری تیری ہی ہو گی۔" اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔ "اور یہ بھی سن لے۔ کوئی گڑ بڑ ہوئی تو تجھے ہی نمٹنا ہو گا۔ میں نے اس میں خود کو نہیں پھنسانا۔"

"فکر نہ کریں جی۔" نادر خان نے رحیم داد کو یقین دہانی کرائی۔ "جیل بھی جانا پڑا تو چلا جاؤں گا' پر تجھ پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔" اس نے جوش و خروش سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ "آزمائش کا وکت آیا تو دیکھ لینا میں تیرا کتنا وفادار اور جانثار ہوں۔"

"وہ تو مجھے پتہ ہے۔" رحیم داد خوش ہو کر بولا۔ "پر جو کچھ کرنا ہشیاری سے کرنا۔"

"اطمینان رکھیں جی۔ سب ٹھیک ہی ہو گا۔" نادر خان نے اسے ایک بار پھر یقین دلایا۔ "ویسے رفیع سمہ بہت ہشیار بندہ ہے۔ اس کی اوپر سے نیچے تک سب سے یاری ہے۔ سمگلنگ سے خود کھاتا ہے تو دوسروں کو بھی کھلاتا ہے۔ ہر ایک کا اس نے بھتا باندھ رکھا ہے۔"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" رحیم داد نے مطمئن ہو کر کہا۔ "برسوں سے یہ دھندا کر رکھا ہے۔ اب تک تو کسی چکر میں پڑا نہیں۔ تجھے پتہ نہیں' بہت شان سے رہتا ہے۔ میں تو اس کی ماڑی میں ٹھیر چکا ہوں۔"

"سمہ بھی تیری بہت تعریف کرتا ہے۔" نادر خاں لمحہ بھر کے لیے رکا۔ "فصل کا روپیہ سمہ سے مل جائے تو زمین کی خریداری کے لیے حصے داروں اور زمین داروں کو بیعانہ دے دوں۔؟"

"تو ٹھیک سمجھتا ہے تو ضرور دے دے۔"

"چوہدری' سودا تو تیری واپسی کے بعد ہی طے ہو گا۔" نادر خاں نے وضاحت کی۔ "بیعانہ دینے سے اطمینان ہو جائے گا۔"

اب دوپہر ہو گئی تھی۔ نادر خاں نے کرسی چھوڑتے ہوئے پوچھا۔ "اجازت ہو تو جی' روٹی کھا لوں؟ جانے سے پہلے اور بھی ضروری باتیں پوچھ لوں گا۔"

"ہاں' اب تو جا۔" رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ "شہ زور مزاری ادھر آگیا تو اس کے ساتھ روٹی کھا لوں گا۔ ورنہ اکیلے ہی کھاؤں گا۔ مجھے بھی بھوک معلوم ہو رہی ہے۔"

نادر خان کمرے سے باہر چلا گیا۔

☆

دھوپ تیز ہو گئی۔ گرمی بڑھ گئی۔ کچہری برخاست ہو گئی۔ رحیم داد یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھا کہ مقدمے کا کیا فیصلہ ہوا۔ مگر سردار شہ زور مزاری اس کے پاس نہیں آیا۔ وہ کچہری سے اٹھ کر سیدھا زنان خانے میں چلا گیا۔ چاکر خان سرگانی بھی نہ آیا۔

رحیم داد نے ڈیرے کے ملازم کو بلایا۔ کھانا منگوایا اور اکیلے ہی بیٹھ کر کھایا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ بستر پر لیٹ گیا۔

شام کو سردار شہ زور خان مزاری سے رحیم داد کی ملاقات ہوئی۔

دونوں مہمان خانے کے پختہ چبوترے پر بیٹھے تھے۔ سامنے شراب کی بوتل رکھی تھی۔ گلاس تھے جن میں شراب تھی۔ دونوں ایک ایک پیگ چڑھا کر سرور کے عالم میں تھے۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ اندھیرا بڑھتا اور پھیلتا جا رہا تھا۔ چراغ روشن کر دیے گئے تھے۔ باورچی خانے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ فضا میں کھانوں کی تیز خوشبو رچی ہوئی تھی۔

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”صبح کے مکدمے کے بارے میں تو نے کیا فیصلہ دیا۔“ اس کے لہجے سے تجسس عیاں تھا۔

شہ زور مزاری نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”مکدمہ الجھا ہوا ہے‘ اگلی پیشی پر فیصلہ سناؤں گا۔ اب کی لمبی تاریخ دی ہے۔ اگلے مہینے ساعت کروں گا۔“

”مکدمہ تو بہت الجھا ہوا ہے۔“ رحیم داد نے مقدمے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ ”یہ بتا‘ تو نے فیصلہ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟؟“

”کارروائی پوری ہو جائے تو فیصلہ بھی دے دوں گا۔“ سردار مزاری نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ موضوع بدلنے کی غرض سے پوچھا۔ ”سرگانی بتاتا تھا گھوال آگیا ہے۔ تجھے مل بھی چکا ہے۔ تو نے اسے ملازم رکھنے کے بارے میں کیا سوچا؟؟“

”اسے لگا تو لوں‘ پر وہ کرے گا کیا؟؟“

”تیری زمیں داری کی دیکھ بھال کرے گا۔ اور کیا کرنا ہے اس نے۔“ سردار مزاری کے لہجے میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔

”زمین داری کی دیکھ بھال تو وہ تب کرے گا جب زمین کا کبضہ مل جائے۔“ رحیم داد نے شہ زور مزاری کو مطلع کیا۔ ”ابھی تو الاٹمنٹ بھی پکی نہیں۔“

”پکی کیوں نہیں ہے؟“ شہ زور نے حیران ہو کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”سیں تو کیسی گالھ کر رہا ہے؟ میں نے تو اسے خود دیکھا ہے۔ تو نے بھی دیکھا ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟؟“

”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔“ رحیم داد نے صورت حال واضح کرنے کی کوشش کی۔ ”الاٹمنٹ تو مل گئی پر رجسٹر خسرہ گرداوری میں زمین کے انتقالات تو مزارعوں ہی کے نام ہیں۔ اس طرح تو زمین کے کنونی مالک وہی ہوئے۔“ اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ ”رجسٹر خسرہ گرداوری کے اعتبار سے تو اپنی الاٹمنٹ غیر کنونی بن جاتی ہے۔“

”پر چاکر خان نے تو یہ گالھ مجھے نہیں بتائی۔“

”عزیز گھوال بتاتا تھا‘ وہ دلاور والا بھی گیا تھا۔ صدر دفتر میں کاغذات کی بھی جانچ پڑتال کر چکا ہے۔ اس نے پٹواری کے پاس رجسٹر خسرہ گرداوری بھی دیکھا۔“

”بہت ہشیار بندہ لگتا ہے۔“

”وہ تو یہ بھی بتاتا تھا کہ مزارعے بہت سرکش ہیں۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”انتقالات ان کے نام ہیں۔ کبضہ ان کا پکا ہے۔ وہ تو بہت گڑبڑ ڈالیں گے۔ تجھے پتہ نہیں‘ اس متروکہ اراضی کی پہلے بھی کئی بار الاٹمنٹ ہو چکی ہے۔ پر مزارعوں نے کبضہ نہ دیا۔ بلکہ کئی نے تو پٹواری کی مٹھی گرم کر کے انتقالات اپنے نام کرا لیے۔“

سردار مزاری نے گلاس اٹھا کر لمبا گھونٹ بھرا۔ اس کے چہرے سے تشویش جھلکنے لگی۔ اس نے فوراً چاکر خان سرگانی کو طلب کیا۔

ذرا دیر بعد چاکر خان آگیا۔

”چاکر‘ یہ تو نے چوہدری کے لیے کیسی الاٹمنٹ کرائی ہے؟“ اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی‘ جسے سرگانی نے بھی محسوس کیا۔ اس کے بشرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ اس نے مودب ہو کر جواب دیا۔ ”سیں سردار‘ تو نے تو الاٹمنٹ کا سرکاری حکم نامہ دیکھا ہے۔ چوہدری نے بھی دیکھا ہے۔ اس میں تو کوئی گڑبڑ نہیں۔“

”گڑبڑ تو سرکاری ریکارڈ میں ہے۔“ سردار مزاری نے سرگانی کو تیکھی نظروں سے دیکھا ”تو نے یہ بھی پتہ نہ کیا کہ رجسٹر خسرہ گرداوری میں اراضی کے انتقالات کئی مزارعوں نے اپنے نام کرا رکھے ہیں؟؟“

رحیم داد بھی خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ”اس طرح تو الاٹمنٹ غیر کنونی بن جاتی ہے۔“

”سیں‘ چوہدری‘ تو فکر نہ کر۔“ چاکر خان سرگانی نے نرم لہجے میں رحیم داد کو مطمئن کرنے کی

کوشش کی۔ "آج ہی دوپہر کو تیرے کاردار نادر خان سے میری گالہہ ہوئی تھی۔ میں نے اسے ٹھیک طرح سمجھا دیا ہے۔"

"کیا سمجھایا ہے تونے؟" سردار مزاری نے تحکّمانہ لہجے میں سرگانی سے دریافت کیا۔

"سئیں سردار، میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ رجسٹر خسرہ گرداوری میں مزارعوں کے انتقالات منسوخ کرا کے چوہدری کے نام کروائے جائیں گے۔"

"پر یہ کام فٹافٹ ہونا چاہیے۔" اس دفعہ رحیم داد بولا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ "مزارعوں کو الاٹمنٹ کا پتہ چل گیا تو وہ معاملہ عدالت میں لے جائیں گے۔"

"عدالت میں، تو وہ انتقالات منسوخ ہونے کے بعد بھی جا سکتے ہیں۔ پر اس سے کوئی فرک نہیں پڑتا۔" چاکر خان سرگانی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "سئیں چوہدری، تو بالکل فکر نہ کر۔ سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میں چاہتا ہوں اس کام میں دیری نہ ہو۔" رحیم داد نے زور دے کر کہا۔

سردار مزاری نے بھی رحیم داد کی تائید کی۔ "چوہدری ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تو کل صبح صدر دفتر کے لیے روانہ ہو جا۔ اور راہکوں کے انتقالات فٹافٹ منسوخ کرا کے چوہدری کے نام کرا دے۔ سرکاری ریکارڈ میں کوئی ایسا اندراج نہیں رہنا چاہیے جس سے آگے چل کر پریشانی اٹھانی پڑے۔"

"عزیز گھوال کو بھی اپنے ساتھ لے جانا اور میرے مینجر نادر خان کو بھی۔" رحیم داد نے چاکر خاں سے کہا۔ "نادر تیرے ساتھ ٹھیرے گا نہیں۔ اس نے لہور جانا ہے۔"

"سئیں جیسا حکم کریں، ویسا ہی ہو گا۔ میں کل ہی صبح گھوال اور نادر کے ہم راہ شہر چلا جاؤں گا۔" سرگانی نے سر جھکا کر نہایت ادب سے کہا۔

"اب تو جا۔" سردار شہ زور مزاری نے چاکر خاں سرگانی کو حکم دیا۔

سرگانی مڑا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا چبوترے کی سیڑھیوں سے نیچے اترا اور شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

صبح صدر دفتر کے لیے روانہ ہونے سے پہلے وہ رحیم داد کے کمرے میں آیا۔ رحیم داد اسی وقت غسل کر کے آیا تھا اور اپنے بھیگے ہوئے سر کے بالوں کو تولیے سے خشک کر رہا تھا۔ سرگانی کے ہمراہ عزیز گھوال اور نادر خان بھی تھے۔

سرگانی نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "سئیں چوہدری، میں شہر جا رہا ہوں۔" اس نے اپنی بات پر

زور دینے کی کوشش کی۔ "تیرے ہی کام سے جا رہا ہوں۔ کوئی اور حکم میرے لیے ہو تو بتا دے۔"

"میں نے کیا بتانا ہے۔" رحیم داد نے بے نیازی سے کہا۔ "تجھے سب کچھ پتہ ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کام فٹافٹ ہو جانا چاہیے۔ اس میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

"سئیں تو جیسا چاہتا ہے ویسا ہی ہو گا۔" اس بار عزیز گھوال نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ اس کا لہجہ نرم تھا، مگر اس میں مستعدی کی جھلک نمایاں تھی۔

رحیم داد خاموش رہا۔ سرگانی اور گھوال چلے گئے۔ نادر خان ٹھہر گیا۔ رحیم داد نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "نادر تو نے نہیں جانا؟"

"کیوں نہیں جانا؟" اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"فیر تو ٹھیر کیوں گیا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

نادر خان نے نہایت ادب سے دریافت کیا۔ "میرے لیے کوئی اور حکم ہو تو بتا دیں۔"

"کل دن میں تو تجھ سے ساری باتیں ہو چکی ہیں۔" رحیم داد نے کہا۔ "ویسے میں بھی زیادہ دیر ادھر نہیں ٹھیروں گا۔"

نادر خاں چند لمحے ادب سے سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ پھر رحیم داد سے اجازت لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

☆

کئی روز گزر گئے، مگر نہ چاکر خان سرگانی واپس آیا اور نہ ہی عزیز گھوال۔ رحیم داد بے چینی سے ان کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے لیے وقت کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ ایک روز تو اس قدر اکتا گیا کہ اس نے سنجیدگی سے سوچا کہ دلاور والا کی وہ اراضی، جو اسے الاٹ ہوئی تھی، کسی کے ہاتھ فروخت کر دے۔ بات دراصل یہ تھی کہ وہ ڈیرہ غازی خان کی سماجی زندگی سے، جس پر قبائلی رسم و رواج کی گہری چھاپ تھی، ہنوز مانوس نہیں ہو سکا تھا۔ اسے اجنبیت کا احساس قدم قدم پر ہوتا۔

اس نے طے کیا کہ اس سلسلے میں شہ زور خان مزاری سے اپنا مدعا بیان کرے گا اور اسے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرے گا۔ اس کی مرضی کے بغیر وہ اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا نہ چاہتا تھا۔ ویسے بھی سردار مزاری کی مدد اور تعاون کے بغیر زمین فروخت کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ مزاری کے علاوہ کسی کے ساتھ نہ اس کا ربط ضبط تھا نہ میل ملاپ۔ علاقے کی زمین داروں اور سرکاری افسروں سے کبھی ملاقات بھی ہوئی تو ہمیشہ سردار مزاری کے ساتھ ہی ہوئی۔ ان ملاقاتوں کی نوعیت بھی رسمی تھی اور صورت آشنائی تک محدود تھی۔

رحیم داد تمام دن دلاور والا کی اراضی بیچنے کے بارے میں سوچتا رہا۔ لیکن رات کو اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ہوا یہ کہ سردار مزاری سہ پہر ہی کو روجھان چلا گیا۔ اس کے بیمار اور ضعیف ماموں کی طبیعت ایک بار پھر بگڑ گئی تھی۔ وہ رات گئے تک واپس نہ آیا۔

رحیم داد نے کھانا کھایا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ فضا میں امس تھی۔ گھٹن تھی۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ آسمان پر غبار چھایا تھا۔ مہمان خانے کا ایک ملازم سرہانے کھڑا آہستہ اہستہ پنکھا جھل رہا تھا۔ رحیم داد نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ کروٹ بدل کر اس کا سرسری جائزہ لیا، پوچھا۔

"تو ادھر نیا نیا لگا ہے؟ میں نے تجھے پہلے نہیں دیکھا۔"

"سئیں، تو نے بالکل ٹھیک سوچا۔" ملازم نے جواب دیا۔ "سردار نے پچھلے ہی جمعہ کو مجھے اپنا بانھا لگایا ہے۔ مجھے ادھر آئے ہوئے آج چھیواں روز ہے۔"

"تیرا نام کیا ہے؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"اب تو جی سب مجھے دریاما کہتے ہیں۔"

"لگتا ہے پہلے تیرا نام کچھ اور ہوتا تھا۔"

"ہا سئیں، میرا نام پہلے منصب ہوتا تھا۔" دریاما نے بتایا۔ "تب میں مظفر گڑھ میں گورمانیوں کے پاس چھمائی دار ہوتا تھا۔"

"تو گورمانیوں کے پاس کیوں نہیں رہا؟"

"سئیں، تجھے پتہ ہی ہے۔ چھمائی دار، دونوں ہی فصلیں تیار کرتا ہے پر اسے فصل کی واڈھی پر راہ کی شاہ کی تو ملتی نہیں۔ کوئی تنخواہ بھی نہیں ملتی۔ کپڑا لتا بھی تب ملتا ہے جب بالکل پھٹ جاتا ہے۔ صرف روٹی ملتی ہے۔" دریاما آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ "راہک یا مزارع تو را کی لینے کے علاوہ منجی پر بھی بیٹھ سکتا ہے۔ پر چھمائی دار تو صرف زمین پر بیٹھ سکتا ہے اور زمین دار کی اجازت کے بنا پرنا بھی نہیں کر سکتا۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "چھمائی دار تو سئیں ویگار کرنے کے لیے پیدا ہوتا ہے اور ویگار کرتے کرتے ایک روز ختم ہو جاتا ہے۔"

"یہ بتا تو چھمائی دار کیسی بن گیا؟"

"سئین، گالہ اس طرح ہے کہ میرے پیئو نے زمین دار سے ترائے سو روپیہ ادھار لیا تھا۔ اس کی کھڑی فصل چھل اور سیلاب میں بہہ گئی تھی۔ مویشی بھی بہہ گئے تھے۔ کچھ بھی نہ بچا تھا۔" دریاما نے بتایا۔ "زمین دار نے ادھار بھی دیا تو اس شرط پر کہ جب تک ادھار ادا نہ ہو گا تب تک میں اس کے پاس رہن رہوں گا۔ تب میں چوداں برس کا ہوتا تھا۔"

"تیرے پیو نے زمین دار کے تین سو ادھار کے ادا نہیں کیے؟" رحیم داد نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ چھریرے جسم کا نوجوان تھا۔ قد زیادہ اونچا نہ تھا۔ مونچھیں سیاہی مائل تھیں مگر زیادہ گھنی نہ تھیں۔ "تو ۲۲ سال سے تو کم کا نہیں لگتا۔"

"سئیں، توں نے ٹھیک سوچا۔ ماں بتاتی تھی، جب میں پیدا ہوا تب کوئٹہ میں زلزلہ آیا تھا۔" اس نے رحیم داد کا قیاس درست قرار دیتے ہوئے کہا۔ "میں گرمانیوں کے پاس ست سال سے اوپر ہی رہا۔ میرے پیو کا ادھار ادا کرتے کرتے مرن ہو گیا۔ پر وہ کم نہ ہوا کچھ بڑھ ہی گیا۔"

"وہ کیسے؟" رحیم داد نے حیرت زدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ "تیری گل سمجھ نہیں آئی۔"

"وہ ایسا ہے سئیں۔" دریاما نے وضاحت کی۔ "زمین دار کا کاردار ہر سال سود لگا کر ادھار کی رکم بڑھا دیتا تھا۔ میرا پیو جتنا ادا نہیں کرتا تھا سود اس سے زیادہ لگ جاتا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "زمین دار تو سمجھو ادھار کے بدلے ساری ہی فصل اٹھا لے جاتا تھا۔"

"تب تو اس کا ادھار ادا ہو جانا چاہیے تھا۔"

"کیسے ادا ہو جاتا۔" دریاما نے بتایا۔ "سئیں، توں تو زمین دار ہے۔ توں نے پتہ ہے نائی، موچی، لوہار، ترکھان اور ایسے ہی سارے کمیوں کو فصل سے حصے کے طور پر جو رولگ دیا جاتا ہے، وہ بھی راہک اور مزارعے کی ڈھیریوں سے دیا جاتا ہے۔" وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش رہا۔ "آدھا مالیہ بھی راہک کو دینا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ طرح طرح کے ٹیکس ہیں جو زمین دار کو دینے ہوتے ہیں۔ در ٹیکس، کھڑکی ٹیکس، ککو ٹیکس، جُ ٹیکس، موذن ٹیکس، پرنا ٹیکس، مرن ٹیکس، کتنے ہی تو ٹیکس ہیں اور سارے ہی فصل کی واڈھی پر زمیں دار کو ادا کیے جاتے ہیں۔ مزارعے یا راہک کے پاس فصل میں سے بچتا کیا ہے۔ بیج اور کھاد خریدنے کے لیے ہر فصل پر ادھار ہی لینا پڑتا ہے۔"

رحیم داد نے بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔ "مطلب کی گل بات کر۔" اس کا لہجہ قدرے تیکھا تھا۔ "یہ بتا تو نے اپنا نام کیوں بدلا؟"

"سئیں، میں یہی بتا رہا تھا۔" اس نے نظریں جھکا کر دبی زبان سے کہا۔ "وہ ایسا ہوا جی، مجھے وستی کی ایک رن سے پیار ہو گیا۔"

رحیم داد کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے دریاما کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔ "کون تھی وہ؟"

"سئیں، اس کا ناں سوجھلا تھا۔" دریاما کی آنکھوں میں چراغ جھلملانے لگے۔ "ویسے تو وہ رنڈ

بیوہ تھی۔ پر دیکھنے میں بالکل کنواری لگتی تھی۔ جوان اور سوہنڑی تھی۔ بال بچہ بھی نہ تھا۔ کوئی بھی اس کا نہ تھا۔ صرف ایک بڈھا چاچا تھا۔"

"تونے سوجھلا سے ویاہ کرلیا تھا؟"

"سئیں ارادہ تو یہی تھا۔" وریاما نے بتایا۔ "پر زمین دار کی مرضی کے بنا کیسے پرنا یا ویاہ کر سکتا تھا۔ میں نے اجازت مانگی تو وہ ایک دم گرم ہوگیا۔ آنکھیں نکال کر بولا۔ تو چھمائی دار ہو کر پرنا کرے گا۔ خواب تو نہیں دیکھ رہا؟ توں اسے روٹی کہاں سے کھلائے گا؟ ابھی تو وہ ادھار بھی ادا نہیں ہوا جو تیرے پیو نے لیا تھا۔ چل دفع ہو یہاں سے۔ آگے ایسی گالہ سوچنا بھی نہیں۔" اس نے بجھی ہوئی نظروں سے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "سئیں، وہ بہت وڈا زمین دار ہے۔ ہزاروں کلا زمین ہے اس کے پاس۔ وہ اتنا ناراض ہوا کہ میں ڈر کر منت اور زاری کرنے لگا۔ پر اس کا غصہ کم نہ ہوا۔ اس نے اپنے کمدار کو بلا کر حکم دیا۔ اس کے سو جوتے لگا تاکہ آگے پرنا کرنے کی نہ سوچے۔ اس نے وہیں ٹھک ٹھک سو جوتے لگائے اور دھکے دے کر باہر نکال دیا۔"

"وریامے!" رحیم داد نے اسے مخاطب کیا۔ "تیرے زمین دار نے ٹھیک ہی تو کیا تو نے سوجھلا سے یاری لگانے سے پہلے یہ نہیں سوچا اسے روٹی کہاں سے کھلائے گا، کپڑا لتا کیسے بنائے گا؟ تو چھمائی دار تھا۔ تجھے تنخواہ تو ملتی نہیں تھی۔ فصل سے بٹائی یا را کی بھی نہیں ملتی تھی۔ ویاہ یا پرنا کرتا تو گھر والی کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا۔"

"سئیں، وہ بہت محنتی ذال ہے۔ مونج سے رسیاں بٹتی۔ کھجور کی پتیوں سے پنکھے اور چٹائیاں بناتی۔" وریاما نے بتایا۔ "اور بھی کئی طرح کے کام کرتی تھی۔ اپنی روٹی تو وہ محنت کر کے کھا ہی سکتی تھی اور مجھے بھی کھلا سکتی تھی۔ وہ تو میرا بازو بن سکتی تھی۔"

"جب زمین دار نے پرنا کرنے کی اجازت نہ دی، تو تو نے کیا کیا؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"سئیں، میں نے یہ کیا۔ ایک رات جب سردی بہت تھی اور اندھیارا بھی تھا، میں نے سوجھلا کو اپنے ساتھ لیا اور چھپتا چھپاتا دستی سے نکل کر خانے وال پہنچا۔ ایک ملاں سے نکاح پڑھوایا اور وہ میری رن بن گئی۔"

"خانے وال میں تو کیا کرتا رہا؟"

"خانے وال تو میں تھوڑے دن رہا۔" وریاما نے رحیم داد کے سوال کے جواب میں بتایا۔ "میں وہاں سے رحیم یار خان پہنچا اور مخدوموں کے پاس چلا گیا۔ سئیں، میں ریاستی ہوں۔ میرا دادا بھی ادھر ہی کا ہوتا تھا۔ میرا وڈا بھرا وہاں راہک تھا۔ میں اس کے ساتھ رہنے لگا۔ اس نے مجھے اور میری رن سوجھلا کو مخدوموں کے پاس لگا دیا۔ وہ حویلی میں کام کرتی تھی اور میں پہریدار لگا دیا گیا۔ وہ حویلی مخدوم کے وڈے پتر، مخدوم زادے کی تھی۔ وہ جی بہت وڈا حاکم ہے، صوبائی وزیر ہے۔ ریس میں گھوڑے دوڑاتا ہے۔ سیاست لڑاتا ہے۔ بینکوں سے ادھار لیتا ہے اور کبھی واپس نہیں کرتا۔ عیش کرتا ہے۔ بہت ٹھاٹھ ہیں جی اس کے۔"

"سنا ہے اس کی تو کئی گھر والیاں ہیں۔ حویلیاں بھی کئی ہوں گی۔"

"سئیں یہ تو میں نے پتہ نہیں، اس کی حویلیاں کتنی ہیں اور کہاں کہاں ہیں؟ پر ذال کئی ہیں۔" وریاما نے مسکرا کر کہا۔ "ایک کو تو اس نے چھوڑ رکھا ہے۔ وہ کراچی میں ہوتی ہے۔ نائی کا کام کرتی ہے ادھر۔"

رحیم داد نے چونک کر اسے دیکھا۔ حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "نائی کا کام کرتی ہے؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ہا سئیں، میں نے یہی سنا ہے۔ تجھ سے میں نے جھوٹ نہیں بولنا۔" وریاما نے دبی زبان سے کہا۔ "اس نے یہ کام ولایت جا کر سیکھا ہے۔ پر وہ صرف رناں کے بال کاٹتی ہے۔ اس کے پاس کئی ذال ملازم ہیں۔ وہ بدشکل رن کو سوہنڑی اور بڈھی کو جوان بنا دیتی ہے۔ اس کی بہت آمدنی ہے جی۔ ویسے بھی اسے مخدوم زادے سے مہر میں بہت روپیہ ملا ہے۔ سئیں، اس نے تو ایک فلم بھی بنائی ہے۔ بہت زبردست رن ہے۔ مخدوم زادہ اب تک اس سے ڈرتا ہے۔"

"یہ تو نے بہت عجب گالہ سنائی۔" رحیم داد ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

وریاما نے اسے اپنی جانب متوجہ پایا تو مسکرا کر بولا۔ "سئیں، تجھے ایک اور عجب گال سناؤں۔"

"ضرور سنا۔" رحیم داد نے اس کی باتوں میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں بے قراری تھی۔

"سئیں، وہ ایسا ہوا کہ مخدوم زادے کو ایک وڈے سرکاری افسر کی بیٹی سے پیار ہوگیا۔ دونوں میں بہت دن تک یاری چلتی رہی۔ پر جب مخدوم زادے نے اس سے پرنا کرنا چاہا تو پہلے تو اس کے پیو نے انکار کر دیا۔ فیر اس نے ایک کڑی شرط لگائی۔" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور خاموشی سے پنکھا جھلنے لگا۔

رحیم داد اس کی خاموشی زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا۔ اس نے کرید کر پوچھا۔ "پرنا یا ویاہ کرنے کی کیا شرط لگائی تھی اس نے؟"

"اس نے یہ شرط لگائی کہ پرنا تب ہی ہو سکتا ہے جب مخدوم خود اپنے پتر کا بازو منگن کے لیے

اس کے پاس آئے۔" دریاما نے بتایا۔ "یہ شرط اس لیے لگائی تھی کہ اسے پتہ تھا کہ مخدوم بازو منگن کے لیے نہیں آئے گا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ مخدوم اس رشتے کے سخت خلاف ہے۔ اصلی گالھ یہ ہے سئیں کہ وہ اپنی بیٹی کا مخدوم زادے سے پرنا کرنا ہی نہ چاہتا تھا۔"

"آگے کیا ہوا؟" رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔

"مخدوم زادے نے اپنے پیو کی بہت منت کی اور کسی نہ کسی طرح اسے راضی باضی بھی کر لیا۔" دریاما نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "مخدوم بازو منگن کے لیے گیا۔ پر مخدوم زادے کے ساتھ سرکاری افسر کی بیٹی کا پرنا نہ ہو سکا۔"

"کیوں؟" رحیم داد نے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔

"سئیں' میں نے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ مخدوم واپس آیا تو وہ بھی اس کے ساتھ تھی۔" دریاما نے نہایت سادگی سے بتایا۔ "پر اب وہ مخدوم کی رن تھی۔ اور مخدوم زادے کی سوتیلی ماں بن چکی تھی۔"

"تو سچ کہہ رہا ہے؟" رحیم داد نے یقین نہ ماننے کے انداز میں پوچھا۔

"ہا سئیں' بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

"مخدوم زادے کو پتہ چلا ہوگا تو بہت نراض ہوا ہوگا۔"

"نا سئیں' اس نے کچھ بھی نہ کیا۔ چپ کر کے بیٹھ گیا۔"

"پر مخدوم تو بہت بوڑھا ہے۔" رحیم داد کے بشرے سے تعجب جھلک رہا تھا۔ "کڑی کے پیو نے اس کے ساتھ کیسے ویاہ کر دیا؟"

"پتہ نہیں جی' مخدوم نے کیا چکر چلایا۔" دریاما نے بتایا۔ "مجھے تو یہ ملوم ہے وہ اب مخدوم کی گھر والی ہے۔"

"مخدوم زادے نے اپنے پیو کی اس زیادتی اور حق ماری پر کچھ نہیں کیا؟" رحیم داد نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "اس نے کچھ نہ کچھ رولا تو ضرور ڈالا ہوگا۔"

"اس نے صرف اتنا کیا۔" دریاما نے سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ "اس نے چپکے چپکے اس سے یاری لگا رکھی ہے۔" وہ لمحے بھر کے لیے خاموش رہا پھر مسکرا کر بولا۔ "اب تو مخدوم کو بھی اس یاری آشنائی کا پتہ چل گیا ہے۔ پر اس نے کبھی شور شرابہ نہیں کیا۔"

"بدنامی کے ڈر سے چپ کر کے رہ گیا ہوگا۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" دریامے نے مختصر جواب دیا۔

رحیم داد نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔ "دریامے' تو نے یہ نہیں بتایا کہ تیرا نام منصب سے دریاما کیسے پڑ گیا۔ تو نے خود بدلا ہے؟"

"نا سئیں' میں کیوں ایسا کرنے لگا۔" اس نے وضاحت کی۔ "ایک روز مخدوم کا حکم آیا کہ میں اپنا نام بدل کر دریام رکھ لوں۔ یہ حکم اس لیے آیا تھا کہ اس کے ایک پوتے کا نام انھی دنوں منصب رکھا گیا تھا۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "مخدوم یہ کیسے سن سکتا تھا کہ اس کے معمولی نوکر کا نام بھی وہی ہو جو ایک مخدوم زادے کا تھا۔ سئیں' اس طرح میں منصب سے دریام بن گیا۔ فیر آگے چل کر دریاما ہو گیا۔"

"تو مخدوموں کے پاس سے ادھر کیسے آ گیا؟"

دریاما نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش کھڑا ہولے ہولے پنکھا جھلتا رہا۔

رحیم داد نے اصرار کیا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"سئیں' ڈر لگتا ہے۔" دریاما نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "یوں سمجھ لے میری مت ماری گئی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "مخدوم کی ایک بیٹی نے میرے ساتھ کے ایک پہریدار کے ساتھ یاری لگا رکھی تھی۔ وہ تھا بھی من موجی اور سوہنڑا گھبرو۔ سب کو مخدوم زادی کے ساتھ اس کی یاری کا پتہ تھا۔ پر مجھے خیر خواہی سوجھی۔ ایک روز مخدوم کی پاس پہنچا۔ شام ہو چکی تھی۔ وہ اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔"

"مخدوم نے تیری گل بات سن کر کیا کیا؟"

"سئیں' وہ تو ایک دم گرم ہو گیا۔" دریاما نے رحیم داد کے سوال کے جواب میں کہا۔ "اتنا زیادہ نراض ہوا کہ جھٹ ایک کمدار کو بلایا' اور اسے حکم دیا کہ مجھے جیل میں ڈال دیا جائے۔" اس نے رحیم داد کی جانب مڑ کر دیکھا۔ "سئیں اس کی اپنی جیل ہے۔ ایسی ہی جیسے ادھر کے سرداروں کی ہوتی ہے۔"

"تو جیل میں کب تک رہا؟"

"میں جیل گیا ہی نہیں۔" اس نے بتایا۔ "کمدار مجھے جیل کی طرف لے کے چلا تو رستے میں' میں نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بہانہ بنایا کہ سخت درد ہو رہا ہے۔ پہلے تو اس نے آنکھیں دکھائیں پر جب میں نے اس کی بہت منت کی تب وہ مجھے ٹٹی کرانے کے لیے کھیتوں کی طرف لے گیا۔ شام کا اندھیارہ تو پھیلا ہی تھا۔ کھیتوں میں گھستے ہی میں اس کی نظروں سے بچتا بچاتا دھیرے دھیرے ایک طرف نکل گیا اور سویرا ہونے سے پہلے ہی مخدوموں کی دستی سے دور چلا گیا۔"

"تیری گھر والی ادھر ہی رہ گئی؟"

"ہا سئیں، وہ ادھر ہی ہے۔" دریاما نے بتایا۔ "میرے اس طرح فرار ہونے پر میری رن کو سزا ملی۔ اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ میرے بھرا کو بھی سزا دی گئی۔ اسے حکم دیا گیا کہ مجھے پکڑ کر حاضر کرے ورنہ اڑھائی ہزار جرمانہ بھرے۔ جب تک جرمانہ ادا نہ ہو گا جیل میں رکھا جائے گا۔ سئیں، وہ بہت غریب ہے، حلیم ہے۔ معمولی راہک ہے۔ اتنا بھاری جرمانہ کیسے ادا کرتا۔ اس لیے اسے بھی جیل میں بند کر دیا گیا۔"

"یہ تو نے ٹھیک نہیں کیا۔" رحیم داد نے منہ بگاڑ کر اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ "خود تو صاف بچ کر نکل آیا۔ اپنے بھرا اور گھر والی کو پھنسوا دیا۔ ان کے ساتھ تو بہت ظلم ہوا۔"

"سئیں، توں ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میری ہی وجہ سے دونوں کو جیل جانا پڑا۔" اس نے نظریں جھکا کر صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "پر میں کرتا کی کیا۔ مخدوم کے پاس چلا جاؤں تو وہ مجھے جیل میں تو ڈال ہی دے گا پتہ نہیں اور جانے کتنی کڑی سزا دے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "میں تو اب اڑھائی ہزار روپے اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ بھرجائی کو پہنچا دوں۔ جرمانہ مل جائے تو مخدوم میرے بھرا کو رہا کر دے گا۔ وہ باہر نکلنے کے بعد منت زاری کر کے میری رن سوجھلا کو بھی جیل سے رہائی دلا سکتا ہے۔"

"تو نے اب تک کتنا روپیہ اکٹھا کر لیا؟"

"ابھی تو پورے اڑھائی سو بھی اکٹھے نہیں ہوئے۔" دریاما نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مخدوموں کی دستی سے نکلنے کے بعد پہلے تو میں ملتان میں گیلانیوں کے پاس رہا۔ ادھر میرے چاچا کا ایک پتر ہوتا ہے۔ میرے اس سوتر نے مجھے گیلانیوں کے ڈیرے پر لگوا دیا۔"

"تو نے گیلانیوں کی نوکری کیوں چھوڑ دی؟"

"سئیں، تجھے یہ تو پتہ ہو گا۔ گیلانی بھی گدی نشین اور مخدوم زادے ہوتے ہیں۔ بہت وڈے زمیں دار بھی ہیں۔" دریاما نے بتایا۔ "گیلانیوں کو کسی طرح میرے بارے میں پتہ چل گیا۔ وہ مجھے پکڑ کر مخدوموں کے پاس بھیجنا چاہتے تھے۔ میرے سوتر کو گیلانیوں کے ارادوں کے بارے میں معلوم ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا۔ اب ادھر رہنا خطرناک تھا۔ اس لیے میں بھاگ کر یہاں آ گیا۔ پر سئیں، میں نے ادھر بھی زیادہ دن نہیں ٹھہرنا۔" اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ "سئیں توں سدا جیویں، رب راضی ہووے، توں سردار سے یہ گالہہ نہ بتانا۔"

"فکر نہ کر۔ میں تیرے بارے میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گا۔" رحیم داد نے اسے اطمینان دلایا۔

"پر مجھے یہ بتا تو ادھر ٹھہرنا کیوں نہیں چاہتا۔"

"سئیں، ادھر رہ کر میں اڑھائی ہزار روپیہ کبھی اکٹھا نہیں کر سکوں گا۔" دریاما نے وضاحت کی "گیلانیوں کے پاس ہوتا تھا تو ڈیرے پر وڈے زمین دار اور سرکاری افسر روز ہی آ کر ٹھہرتے تھے۔ مجھے بخشیش دیتے تھے۔ پر ادھر تو بالکل سُکّا معاملہ ہے۔ نہ بخشیش نہ انعام، کچھ بھی ملتا ملاتا نہیں۔"

اس کے انداز میں حسن طلب تھا۔ رحیم داد فوراً بھانپ گیا کہ بن بلائے وہ کیوں اس کے پاس آیا اور پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔ اس خدمت گزاری کا مطلب اس پر واضح ہو چکا تھا۔ مگر اس وقت وہ اسے کچھ دے نہیں سکتا تھا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے دریاما سے دریافت کیا۔

"تو ادھر آیا ہی کیوں؟ ملتان کی طرح کسی اور وڈے شہر کی طرف نکل جاتا۔ کسی ایسے زمین دار کی حویلی پر لگ جاتا جس کے ڈیرے پر وڈے افسر اور زمین دار آ کر ٹھہرتے ہوں۔"

"ایسا ہی کروں گا جی۔ میرا ارادہ کراچی جانے کا ہے۔ مجھے پتہ ہے وہ کتنا وڈا شہر ہے۔ ادھر کام بھی مل جاتا ہے اور مزدوری بھی ٹھیک ٹھاک لگتی ہے۔" دریاما نے بتایا۔ "ادھر تو سئیں، میں مخدوموں اور گورمانیوں کی سزا سے بچنے کی لیے آ گیا تھا۔ میں نے تو کوئی سنگین جرم بھی نہیں کیا۔ وہ جو کتل، ڈکیتی اور ایسے ہی دوسرے وڈے وڈے جرم کرتے ہیں، ادھر سے بھاگ کر اسی طرف آتے ہیں۔ کسی وڈے سردار کے باٹے یا نوکر بن جاتے ہیں۔ سردار کی پناہ مل جائے تو نہ پولیس کچھ بگاڑ سکتی ہے اور نہ کنون نہ عدالت۔ ادھر تو سرداروں ہی کا کنون چلتا ہے۔ سئیں، میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

رحیم داد نے غور کیا، دریاما بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ جس طرح دوسرے اضلاع اور علاقوں کے مقابلے میں دریاما یہاں خود کو محفوظ سمجھتا ہے اسی طرح کوٹلہ ہرکشن کی بہ نسبت وہ بھی ڈیرہ غازی خاں میں زیادہ محفوظ ہے۔ کوٹلہ ہرکشن میں کسی بھی وقت اس کا کوئی ایسا قرابت دار یا شناسا مل سکتا ہے جو اسے پہچان لیتا۔ پولیس سے مخبری کر دیتا۔ پھر جیل ہی نہیں اسے پھانسی پر لٹکنا پڑتا۔ نام اور حلیہ تبدیل کرنے کی باوجود خطرہ اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ ڈیرہ غازی خان میں یہ خطرہ کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہاں نہ کسی جان پہچان والے سے مڈبھیڑ ہونے کا خدشہ تھا نہ پولیس کا دھڑکا۔ اس نے دلاور والا کی اراضی فروخت کرنے اور اس سلسلے میں سردار شہ زور مزاری سے بات کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

☆

شہ زور مزاری روجھان سے واپس آگیا تھا۔ مگر رحیم داد سے اس کی ملاقات نہ ہوئی۔ وہ کچہری میں بیٹھا مقدمات کے فیصلے سنا رہا تھا۔ رحیم داد بھی کچہری میں حسب معمول دل بہلانے اور وقت گزارنے کی غرض سے چلا گیا۔

اس نے دیکھا چاکر خان سرگانی کچہری میں موجود تھا۔ سردار مزاری بھی پر نہایت آن بان سے بیٹھا تھا۔ اس کے روبرو بدھیل سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ قریب ہی ایک ادھیڑ عورت سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کا لباس نہایت بوسیدہ تھا۔ چہرہ ویران اور اجڑا ہوا تھا۔ افلاس اور سخت محنت نے اسے وقت سے پہلے ہی بوڑھا بنا دیا تھا۔ وہ بدھیل کی ماں تھی۔ اس کے ساتھ ایک نوعمر لڑکی کھڑی تھی۔ اس کی عمر تیرہ چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔ مگر غذائیت کی کمی کے باعث اس کا جسم بڑھنے اور پھیلنے کے بجائے سکڑ کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنی عمر سے کم نظر آرہی تھی۔ وہ دوپٹے کے آنچل سے بکل مار کر چہرہ کسی قدر چھپائے ہوئے تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے پھیلے تھے۔

سردار شہ زور خان مزاری نے گردن موڑ کر سرگانی کو دیکھا۔ اونچی اور گرج دار آواز سے بولا۔

”چاکر!“ اس نے ہاتھ اٹھا کر بدھیل کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس نے چٹی کی شرائط پوری کر دیں؟“

”ہا سیں!“ چاکر خاں سرگانی نے نہایت ادب سے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”بدھیل نے جرمانے کی رکم اور مکدمے کی فیس جمع کرا دی ہے۔ ماں اور بھین کو بھی لے آیا ہے۔ دونوں کچہری میں حاضر ہیں۔“

سردار نے بدھیل کی ماں اور بہن کو نظر بھر کر دیکھا۔ پھر حکم دیا۔ ”فیصلے کی رو سے ساؤنی کو بدھیل کی تحویل میں دے دیا جائے۔ ساؤنی کی ماں کو اڑھائی سو روپے تاوان کے دیئے جائیں۔ بدھیل کی ماں اور بھین کو کوٹ میں رکھا جائے۔ وہ اب ادھر ہی رہیں گی۔“

کچہری پر سکوت طاری ہو گیا۔ بدھیل کی ماں نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آنسو ٹپک ٹپک کر رخساروں پر گرنے لگے۔ بیٹی، جو اب تک حیران و پریشان کھڑی تھی، ماں کو آنسو بہاتے دیکھ کر رونے لگی۔

سردار مزاری نے ساؤنی کو بلوایا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ رحیم داد نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ روپ اب نکھر گیا تھا۔ بالوں میں تیل چمک رہا تھا۔ لباس اجلا تھا۔ جسم بھی اب پہلے کی نسبت سڈول اور کسی قدر بھاری ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں دوشیزگی کی حیا اور جھجک کے بجائے بے باکی اور شوخی نمایاں تھی۔

سردار مزاری نے ساؤنی کو بدھیل کے حوالے کرتے ہوئے نصیحت کے ساتھ ساتھ تنبیہہ بھی

کی۔ ”اسے لے جا۔ ابھی جا کر مسجد کے ملاں کو بلانا اور اس کے ساتھ نکاح پڑھوا لینا۔ اب میں تیرے خلاف سیاہ کاری کا الزام نہ سنوں، ورنہ کڑی سزا دوں گا۔“

بدھیل گڑگڑا کر دعائیں دینے لگا۔ ”سیں سردار سدا جیویں، بالیں بچیں سکھی صحت ہوویں، خیر سلا ہو۔ رب راضی ہو۔“ اس نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ ”الایا گلایا معاف۔“

ساؤنی آگے بڑھی اور بدھیل کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔

بدھیل نے مڑ کر ماں اور بہن کو دیکھا۔ گہری سانس بھری۔ دونوں سسکیاں بھرنے لگیں۔ وہ ان سے رخصت ہوتے ہوئے کچھ کہہ بھی نہ سکا۔ گردن جھکائی، مڑا اور آستین سے آنسو پونچھتا ہوا دروازے کی سمت بڑھا۔ ساؤنی اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دونوں باہر چلے گئے۔

ان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد بدھیل کی ماں اور بہن ایک کارندے کی نگرانی میں کچہری کے باہر چلی گئیں۔ دونوں کو کوٹ میں پہنچا دیا گیا۔

☆

کچہری برخاست ہونے کے بعد چاکر خان سرگانی فوراً رحیم داد کے کمرے میں پہنچا۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”جس کام کے لیے تو گیا تھا اس کا کیا بنا؟“ اس کے لہجے سے بے چینی صاف عیاں تھی۔

”سیں تیرا حکم چاہیے۔“ وہ چہک کر بولا۔ ”تیرا کام ہو گیا۔ ایک دم پکا کام ہو گیا۔ رجسٹر خسرہ گرداوری میں اراضی کے انتقالات کا اندراج تیرے نام ہو گیا۔ پچھلے انتقالات خارج کر دیے گئے۔ میں نے اپنے سامنے پٹواری سے کرائے ہیں۔“ وہ کھکھلا کر بے تکلفی سے ہنسا۔ ”کرتا کیسے نہیں۔ صدر دفتر کا حکم تھا۔ فیر اس کی مٹھی بھی تو ٹھیک طرح گرم کی تھی۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”اس کے بغیر تو سیں کام چلتا ہی نہیں۔“

”مجھے پتہ تھا تو پکا ہی کام کر کے آئے گا۔ سردار بالکل ٹھیک کہتا ہے، چاکر تو بہت ہشیار بندہ ہے۔“ رحیم داد نے خوش ہو کر داد دی۔ ”یہ بتا عزیز گھوال کدھر ہے؟ وہ اب تک نظر نہیں آیا۔“

”سیں، چوہدری میں نے اسے ادھر چھوڑ دیا۔“ سرگانی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”وہ یہ پتہ کر کے آئے گا کہ قبضہ ملنے میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گی۔ اگر ایسا امکان ہوا تو اس کا پہلے سے بندوبست کرا لیا جائے۔“

سرگانی نے مزید بات چیت نہ کی۔ وہ چلا گیا۔

رحیم داد کی دو روز تک اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ تیسرے روز دن ڈھلے وہ آیا۔ عزیز گٹھوال اس کے ہم راہ تھا۔ دونوں خاموشی سے سرکنڈوں کے مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔ گٹھوال نڈھال اور تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کی بشرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ سرگانی بھی گم صم تھا۔

رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ "گٹھوال! کیا خبر لایا؟ تو پریشان پریشان نظر آرہا ہے۔"

" سیں گالہہ ہی ایسی ہے۔" اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"صاف صاف بتا۔" رحیم داد نے گٹھوال کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔

" سیں، کبضہ ملنے میں بہت مشکل پڑے گی۔" گٹھوال نے بتایا۔ "انکالات خارج ہونے کی اطلاع میرے پہنچنے سے پہلے ہی دلاور والا پہنچ گئی تھی۔ وہ تو جی بہت سرکش اور جھگڑالو بندے ہیں۔ میں نے ان کو نرمی سے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی تو میرے گلے پڑ گئے۔ غصے سے آنکھیں نکال کر زور زور سے چیخنے چلانے لگے۔"

"تو نے کیا کیا؟" رحیم داد کی آواز اونچی ہو گئی۔ چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔

" سیں، میں نے کیا کرنا تھا۔ چپ کر کے چلا آیا۔" عزیز گٹھوال نے مسکین سی صورت بنا کر صفائی پیش کی۔ "ویسے تو وہ تعداد ۱۸ ہیں۔ ان میں سے بھی صرف ۱۰ نے مالکانہ حکوک حاصل کر لیے تھے۔"

"وہی جن کے انکالات خارج کر دیے گئے؟"

"ہا سیں۔" گٹھوال نے بتایا۔ "اٹھ تو ابھی تک راہک اور مزارے ہیں۔ ان کا کبضہ تو پہلے ہی غیر کنونی تھا۔" اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کے چہرے کی جانب دیکھا۔ "پر سیں، وہ سب ایک ہیں۔ انھوں نے آپس میں سنگت کر رکھی ہے۔ سب ہی ایک دوسرے کی پوری طرح مدد کر رہے ہیں۔"

"پنڈ کے دوسرے بندے کیا کہتے ہیں؟" رحیم داد نے صورت حال پوری طرح سمجھنے کی غرض سے کرید کر دریافت کیا۔ "تو ان سے بھی ملا تھا؟"

"پہلے میں انھی سے ملا تھا۔" گٹھوال نے مطلع کیا۔ "ان کی باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ پوری وستی ہی راہکوں اور مزارعوں کے ساتھ ہے۔"

"وہ تو سیں ہونا ہی چاہیے۔" چاکر خان سرگانی پہلی بار بولا۔ "برسوں سے اکٹھے رہتے آئے ہیں۔ کوم بھی ایک ہے۔ سارے ہی تو بوھڑ ہیں۔ آپس میں گہرے رشتے ناتے ہیں۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ عزیز گٹھوال بھی کچھ نہ بولا۔ مگر چاکر خان زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔

اس نے رحیم داد کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ " سیں، فکر کی کوئی گالہہ نہیں۔"

"دلاور والا تو گیا تھا یا گٹھوال؟" رحیم داد نے جھنجلا کر کہا۔ "اسے ادھر کے بارے میں زیادہ پتہ ہے یا تجھے؟"

" سیں، نراض نہ ہو۔" سرگانی نے نرم لہجے میں کہا۔ "گٹھوال سے ساری باتیں میں پہلے ہی سن چکا ہوں۔ مجھے سب پتہ ہے اور اس کے بارے میں برابر سوچتا بھی رہا ہوں۔"

"کیا سوچا تو نے؟" رحیم داد کے چہرے سے جھنجلاہٹ بدستور عیاں تھی۔

" سیں، تجھے تو پتہ ہی ہے۔ زمیں داری میں تو ایسے چکر چلتے ہی رہتے ہیں۔" اس کا لہجہ بدستور اطمینان بخش تھا۔ "راہکوں کے ساتھ تو ایسے جھگڑے ٹنٹے روز کی گالہہ ہے۔"

"تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف گل کر۔" رحیم داد نے سرگانی کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔

" سیں، میں سردار کو سب کچھ بتا دوں گا۔ تو بھی اس سے بات کر لینا۔" چاکر خان سرگانی نے وضاحت کی۔ "سردار عظمت اللہ دریشک سے مدد لینی ہو گی۔ وہ اپنے سردار کا گہرا یار ہے۔ دلاور والا اسی کے علاکے میں ہے۔ سردار عظمت اللہ بہت وڈا زمیں دار ہے۔ اور بہت زور آور سردار بھی ہے۔ وہ مدد کرے گا تو کبضہ ایک ہی روز میں مل جائے گا۔ سارے راہکوں اور مزارعوں کی سرکشی اور اکڑ رسی کے بل کی طرح نکال کر رکھ دے گا۔ سیں، تو بالکل فکر نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

چاکر خان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گٹھوال بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں چلے گئے۔

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ چاکر خان سرگانی کے اطمینان دلانے کے باوجود اس کی پریشانی رفع نہ ہوئی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔

☆

شام نکھری نکھری تھی۔ فضا میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو بسی تھی۔ غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے ہلکی بوندا باندی ہوئی تھی۔ مگر اب مطلع صاف تھا۔ ہوا کے نرم نرم جھونکوں میں سرسراہٹ تھی، شگفتگی تھی۔ گہرے نیلے آسمان پر بادلوں کے سفید سفید ٹکڑے دوڑ رہے تھے۔

سردار شہ زور خان مزاری اور رحیم داد مہمان خانے کے وسیع صحن میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

رحیم داد نے دلاور والا کی اراضی کا قضیہ چھیڑ دیا۔ وہ کسی قدر پریشان اور فکر مند نظر آرہا تھا۔ لیکن سردار مزاری اس کی ذہنی پریشانی سے مطلق متاثر نہ ہوا۔ بے نیازی سے بولا۔ " سیں چوہدری، فکر نہ کر۔ چاکر نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں نے سوچ رکھا ہے آگے کیا کرنا ہو گا۔"

"تو نے کیا سوچا؟" رحیم داد کے لہجے میں اضطراب تھا۔

"سرکش اور جھگڑالو راہکوں کو بے دخل کر کے اپنے راہک لگانے ہوں گے۔ ان کو بے دخل نہ کیا گیا تو آگے بھی تنگ کرتے رہیں گے۔"

"بے دخل کرنے کی صورت میں تو بہت گڑ بڑ ہو گی۔" رحیم داد نے دبی زبان سے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ "پرانے مزارعے ہیں' آسانی سے بے دخل نہیں ہوں گے۔"

"آسانی سے تو کوئی بھی راہک اور مزارع زمین نہیں چھوڑتا۔" سردار مزاری کا لہجہ قدرے تیکھا ہو گیا۔ "ان کو تو زبردستی بے دخل کرنا پڑتا ہے۔"

"پر یہ تو سوچ' دلاور والا تیری زمین داری سے دوری پر ہے۔"

"مجھے بھی پتہ ہے کہ دلاور والا میری زمیں داری سے دوری پر ہے۔" شہ زور خان مزاری نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "پر مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ دلاور والا تمن دریشک کے علاقے میں ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو میں تجھے متروکہ اراضی کی ادھر الاٹمنٹ نہ دلاتا۔"

"دریشکوں کے بارے میں چاکر بھی بتاتا تھا کہ زمین کا کبضہ لینے کے لیے ان سے مدد مل سکتی ہے۔"

"اس نے بالکل ٹھیک سوچا۔ صرف مدد نہیں' پوری پوری مدد مل سکتی ہے۔" سردار مزاری نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "عظمت اللہ دریشک ادھر کا سردار ہوتا ہے۔ وہ میرا پرانا یار ہے۔ زور آور اور با اثر بھی ہے۔ بہت وڈا زمیں دار ہے۔ ہزاروں ایکڑ پر اس کی زمیں داری پھیلی ہوئی ہے۔"

"تب تو سب سے پہلے اس سے مشورہ کرنا ہو گا۔"

"خالی مشورہ ہی نہیں' راہکوں کو بے دخل کرنے کے لیے اس سے کچھ بندے بھی لینے ہوں گے۔"

"پولیس کی مدد بھی لینی ہو گی۔"

"بالکل لینی ہو گی۔" شہ زور خان مزاری نے اتفاق رائے کیا۔ "پولیس کی مدد کے بغیر کام آسانی سے نہیں بنے گا۔ کوئی کارروائی کرنے سے پہلے پولیس کو اعتماد میں لینا ہو گا۔"

"یہ تو بہت ضروری ہے۔"

"بالکل ضروری ہے۔" مزاری نے وضاحت کی۔ "راہکوں اور مزارعوں کو بے دخل کرنے کے لیے پولیس کی مدد سے ان کے خلاف کئی طرح کے مکدمے بنوانے ہوں گے۔ جو راہک زیادہ اکڑ دکھائیں گے اور گڑ بڑ پیدا کرنے کی کوشش کریں گے ان کو گرفتار کر کے تھانے میں بلوانا ہو گا۔ حوالات میں بند کر کے پٹائی کرانی ہو گی۔" اس نے داد طلب نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "ان میں ڈر اور خوف پیدا کرنے اور دہشت بٹھانے کے لیے ایسا کرنا بہت ضروری ہے۔ تو سمجھ گیا نا میری بات کا مطلب؟"

"سمجھ گیا' بالکل سمجھ گیا۔" رحیم داد نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "یہ بتا اُدھر کے تھانے دار سے بھی تیری یاری ہے؟"

"پتہ نہیں' آج کل اُدھر کون تھانے دار لگا ہے۔" سردار مزاری نے رحیم داد کے سوال کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ "تھانے دار کوئی بھی ہو' اس سے کیا اثر پڑتا ہے۔ عظمت اللہ دریشک کا تو یار ہی ہو گا۔ صرف تھانے دار ہی نہیں سارے ہی سرکاری افسروں سے اس کی یاری ہے۔ ویسے تو تحصیل راجن پور کے سرکاری افسروں سے اپنی بھی گہری یاری ہے۔" وہ بے تکلفی سے کھل کر مسکرایا۔ "سئیں چوہدری' یہ تو تجھے بھی اچھی طرح پتہ ہو گا۔ سرکاری افسروں سے یاری دوستی کے بغیر زمین داری نہیں چل سکتی۔"

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اپنی ذہنی الجھن کا اظہار کیا۔ "تیری باتوں سے تو ایسا لگتا ہے یہ معاملہ تو لمبا ہی کھنچے گا۔"

"لمبا بھی ہو سکتا ہے۔" سردار مزاری نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"پر میں تو اب زیادہ روز ادھر نہیں ٹھیر سکتا۔" رحیم داد کے لہجے میں بے زاری اور اکتاہٹ نمایاں تھی۔ "مجھے کوٹلہ ہرکشن جانا ہے۔ اور جلد ہی جانا ہے۔ میں نے ادھر کتنے ہی ضروری کام نمٹانے ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ ادھر آئے ہوئے تجھے کافی دن ہو گئے۔" سردار مزاری نے نرم لہجے میں کہا۔ "میں کوشش کروں گا تیرا کام جلد سے جلد ہو جائے۔"

"ایسا کر اپنے یار سردار عظمت اللہ دریشک کو مشورے کے لیے یہاں بلوا لے۔" رحیم داد نے تجویز پیش کی۔ "ویسے ٹھیک تو یہی رہے گا کہ خود ہم کو اس کے پاس جانا چاہیے۔"

"تو نے بالکل ٹھیک سوچا۔" سردار شہ زور مزاری نے اس کی تجویز کی تائید کی۔ "اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ کل ہی صبح اس کی طرف چلتے ہیں۔"

اس نے چاکر خان سرگانی کو طلب کیا۔ وہ آیا تو اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا اور ضروری ہدایات دے کر رخصت کر دیا۔

صبح، سورج نکلنے سے قبل سردار شہ زور خان مزاری کی کار حویلی کے پھاٹک کے سامنے کھڑی تھی۔ ڈرائیور کار کے نزدیک ہی موجود تھا۔ چاکر خان سرگانی بھی ایک طرف کھڑا تھا۔

سردار مزاری پھاٹک سے نمودار ہوا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ تھا۔ عزیز گھوال دونوں کے پیچھے پیچھے ادب سے سر جھکائے چل رہا تھا۔ چاکر خان نے بڑھ کر کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔ مزاری کار میں داخل ہوا۔ رحیم داد کو اس نے اپنے ساتھ بٹھایا۔ عزیز گھوال کو آگے کی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چاکر خان سرگانی باہر ہی کھڑا رہا۔ وہ ان کے ہم راہ نہ گیا۔

ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کی۔ آن کی آن میں آگے بڑھی اور گرد و غبار کے بادل اڑاتی ہوئی کچے راستے پر تیزی سے دوڑنے لگی۔

دن ڈھلنے سے پہلے پہلے کار راجن پور پہنچ گئی۔

۴۳

راجن پور میں سردار شہ زور خاں مزاری کے قیام کو دوسرا روز تھا۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ تھا۔ مزاری کو پروگرام کے مطابق جانا تو عظمت اللہ دریشک کے پاس تھا مگر راجن پور میں عطاء اللہ خان بزدار مل گیا۔ وہ اس کا پرانا ملنے والا تھا۔ اس نے اصرار کیا تو مزاری ٹھہر گیا۔

سہ پہر کو وہ رحیم داد کے ساتھ کار میں بیٹھ کر باہر نکلا۔ رحیم داد کو رائے بہادر ہیتو رام کی حویلی دکھائی۔ حویلی پرانی تھی، لیکن بہت عالیشان تھی۔ رحیم داد کو پسند بھی آئی۔ اس وقت تک کسٹوڈین کی تحویل میں تھی اور کسی کو الاٹ نہ ہوئی تھی۔ شہ زور مزاری نے رحیم داد کا عندیہ معلوم کیا تو اس نے حویلی کے الاٹمنٹ میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔

سردار مزاری کی بھی خواہش تھی کہ حویلی رحیم داد کو الاٹ ہو جائے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "میں یہ حویلی دکھانے اسی لیے لایا تھا کہ تجھے پسند ہو تو اس کی الاٹمنٹ کے لیے کوشش کی جائے۔"

"پر اس میں تو کئی مہاجر خاندان ٹھہرے ہوئے ہیں۔" رحیم داد نے کہا۔ "قبضہ لینے کے لیے ان کو بھی بے دخل کرنا ہو گا۔" اس کے لہجے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ "دلاور والا کی اراضی کی طرح اس پر بھی جھگڑا کھڑا ہو گا۔"

"اگر دلاور والا کی زمین کا قبضہ مل سکتا ہے تو اس کا بھی مل جائے گا۔" سردار مزاری نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "ویسے میرا خیال ہے الاٹمنٹ کے لیے درخواست تو لگا ہی دینی چاہیے۔ آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔ بول کیا کہتا ہے؟"

"جیسی تیری مرضی۔" رحیم داد نے سردار مزاری کی تجویز سے اختلاف نہ کیا۔ "الاٹمنٹ کی

درخواست لگانے میں اپنا کیا جاتا ہے۔"

"میں شام کو اپنے وکیل راشد احمد انصاری کو بلاؤں گا۔" سردار مزاری نے رحیم داد کو بتایا۔ "اس سے الاٹمنٹ کی درخواست تیار کرواؤں گا۔ آگے کی کارروائی وکیل کے مشورے سے چاکر اور گٹھوال کرتے رہیں گے۔ تجھے الاٹمنٹ کے لیے ادھر ٹھیرنا نہیں پڑے گا۔"

"تیرا وکیل راجن پور ہی میں ہوتا ہے۔"

"ہاں وہ ادھر ہی ہوتا ہے۔ ویسے تو میرے اور بھی کئی وکیل ہیں۔ پر کوئی مکدمہ پیچیدہ ہو تو میری طرف سے راشد انصاری ہی پیروی کرتا ہے۔" شہ زور خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "بہت ہشیار وکیل ہے تو اس سے مل کر خوش ہوگا۔ دلاور والا کی زمین کی الاٹمنٹ کی درخواست بھی اسی نے تیار کی تھی۔ الاٹمنٹ دلانے میں چاکر کی مدد بھی کی تھی۔"

"تب تو دلاور والا کی زمین کے جھگڑے کا بھی اس کو پتہ ہوگا۔"

"بالکل ہوگا۔ پر اس سلسلے میں میری اب تک وکیل سے کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔"

"شام کو تو وہ آرہا ہے نا؟"

"ضرور آئے گا۔ دلاور والا کی زمین کے بارے میں اس سے مشورہ لینا ہے۔" شہ زور خاں نے رحیم داد کو بتایا۔ "اس سے مشورہ لینے ہی کے لیے تو میں ادھر ٹھیر گیا۔ سوچا عظمت اللہ دریشک سے ملنے سے پہلے کنونی پہلو بھی پوری طرح سمجھ لینا چاہیے۔"

"ویسے تو بھی کسی وکیل سے کم کنون نہیں جانتا۔" رحیم داد نے سردار شہ زور مزاری کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے کہا۔ ویسے قانونی مہارت کے معاملے میں وہ مزاری سے مرعوب بھی تھا۔ "تو روز ہی کچہری لگاتا ہے۔ ایسے الجھے ہوئے اور پے چیدہ مکدموں کے فیصلے کرتا ہے کہ کئی بار تو میں حیران رہ گیا۔"

"پر وکیل' وکیل ہی ہوتا ہے۔" شہ زور خاں مزاری نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔ "راشد نے دیوانی اور فوجداری ہر طرح کا کانون پڑھ رکھا ہے۔ بلکہ اکثر اپنی کچہری کے مکدمات کے بارے میں اس سے مشورہ بھی لے لیتا ہوں۔"

"جب سے تیرے ساتھ ٹھیرا ہوں' میں نے تو کبھی راشد انصاری وکیل کو تیرے پاس مشورہ دینے کے لیے آتے نہیں دیکھا۔"

"میں اسے بہت کم مشورے کے لیے بلاتا ہوں۔ پچھلے دنوں اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔" شہ زور مزاری نے وضاحت کی۔ "سچ پوچھ تو کانون کے بارے میں جو کچھ میں نے سیکھا۔ وہ اپنے پیشے

ے سیکھا۔ وہ کچہری میں مکدمات کی کارروائی کے دوران ہمیشہ مجھے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ بعد میں بھی ان کے بارے میں بتاتا تھا۔ وہ بہت زبردست بلوچ سردار تھا۔ سرکاری عدالتیں تک اس کے فیصلے کو مانتی تھیں۔"

"فیصلے تو تیرے بھی کم زبردست نہیں ہوتے۔" رحیم داد بدستور اسے خوش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

سردار شہ زور مزاری مسکرا کر خاموش ہوگیا۔

شام کو وکیل سردار شہ زور مزاری کے پاس آیا۔ وہ ادھیڑ تھا۔ چہرے مہرے سے سنجیدہ اور بردبار نظر آتا تھا۔ لباس اور وضع قطع سے استغنا اور بے نیازی جھلکتی تھی۔ وہ سونی پت کا رہنے والا تھا۔ تعلیم دہلی میں حاصل کی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں فرقہ دارانہ فسادات کی آگ بھڑکی تو کسی نہ کسی طرح جان بچا کو بیوی بچوں کے ساتھ پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوگیا اور مہاجر بن گیا۔ کچھ عرصہ لاہور میں وکالت کی مگر جمی نہیں۔ سونی پت میں مکان کے علاوہ زرعی اراضی چھوڑ کر آیا تھا۔ اس کا کلیم داخل کیا جو منظور ہوگیا۔ بھاگ دوڑ کی تو ضلع ڈیرہ غازی خاں کی تحصیل راجن پور میں زرعی اراضی اور ایک مکان الاٹ ہوگیا۔ گزشتہ پانچ برس سے وہ وہیں مقیم تھا۔ زمین داری کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ وکالت بھی کرتا تھا۔

وکیل جب پہنچا تو سردار مزاری کے علاوہ رحیم داد' در عزیز گٹھوال بھی موجود تھے۔ سردار مزاری نے رحیم داد سے وکیل کا تعارف کرایا۔ دلاور والا کی اراضی کے بارے میں تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ وکیل نے تمام باتیں توجہ سے سنیں۔ الاٹمنٹ آڈر اور دوسری متعلقہ دستاویزات کا مطالعہ کیا۔

"راشد تو کس نتیجے پر پہنچا؟" شہ زور مزاری نے وکیل کی رائے معلوم کرنا چاہی۔

"یہ تو جی آپ کو اچھی طرح علم ہے کہ الاٹمنٹ کی درخواست میں نے ہی تیار کی تھی۔ مجھے اس کے بارے میں پہلے ہی سے بہت کچھ معلوم ہے۔" وکیل نے اظہار خیال کیا۔ "کیس بہت مضبوط ہے۔ الاٹمنٹ بھی پکا ہے۔ رہ گیا زمین پر قبضہ حاصل کرنے کا مسئلہ تو یہ تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس میں عام طور پر جھگڑا کھڑا ہوتا ہے۔"

"اسی جھگڑے کو نمٹانے کے لیے تو تجھ سے مشورہ کرنا ہے۔" سردار مزاری نے وکیل سے کہا۔ "یہ بتا آگے کیا کارروائی کرنی ہے۔"

"آپ نے اپنے طور پر اس سلسلے میں کیا سوچا؟"

”میرا تو یہ خیال ہے کہ سارے راہکوں کو فوری طور پر بے دخل کر دیا جائے۔“ شہ زور مزاری نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”وہ کبضہ دینے میں پہلے ہی تنگ کر رہے ہیں‘ آگے اور زیادہ کریں گے۔“

”راہکوں اور مزارعوں کو بے دخل کرنے کے تمام حربے اور طریقے آپ مجھ سے زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں۔ اب تک کتنے ہی مزارعوں کو بے دخل کر چکے ہیں۔ آپ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں۔“ وکیل نے مسکرا کر شہ زور مزاری کی طرف دیکھا۔ ”جہاں تک اس تنازعے کے قانونی پہلو کا تعلق ہے تو یہ سیدھا سیدھا دیوانی کیس ہے۔ لیکن اسے فوجداری بنانا ہو گا۔ تب ہی کام بنے گا۔“

”وہ کیسے؟“ اس دفعہ رحیم داد بولا جو اب تک خاموش بیٹھا تھا۔

”وہ اس طرح کے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۴۵ کے تحت‘ عدالت سے زمین قرق کروائی جائے۔“ وکیل نے قانونی چارہ جوئی کا طریقہ کار کسی قدر وضاحت سے بتایا۔ ”اس میں زیادہ لمبا چکر بھی نہیں۔ تھانے میں صرف اس مضمون کی رپٹ درج کرانی ہو گی کہ زمین کے قبضے کے سلسلے میں چونکہ مزارعوں کے ساتھ تنازعہ ہے لہٰذا ان کی طرف سے نقص امن کا شدید خطرہ ہے۔ وہ آمادہ فساد ہیں۔ پولیس کیس رجسٹر کرنے کے بعد چالان مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کر دے گی۔“

”تب تو پولس کے ساتھ ساتھ مجسٹریٹ کو بھی ملانا ہو گا۔ اس کی مٹھی بھی گرم کرنی ہو گی۔“ رحیم داد نے مداخلت کی۔

”چوہدری صاحب‘ یہ آپ کی دردسری نہیں۔ اس کی آپ بالکل فکر نہ کریں۔“ اس نے مسکرا کر شہ زور مزاری کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس معاملے کو آپ مزاری صاحب پر چھوڑ دیں۔ ان کو اچھی طرح پتہ ہے کہ پولیس اور مجسٹریٹ سے کس طرح کام لیا جائے۔ کس طور ان کی مدد حاصل کی جائے۔“

”سئیں چوہدری‘ یہ تیرے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔ راشد ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تجھے نہ تھانے جانے کی ضرورت ہے نہ عدالت۔“ سردار مزاری نے گردن اکڑا کر رعونت سے مونچھ پر ہاتھ پھیرا۔ ”تھانیدار اور مجسٹریٹ خود تیرے پاس پہنچ جائیں گے۔“ وہ وکیل کی جانب متوجہ ہوا۔ ”راشد‘ یہ بتا آگے کیا کارروائی کرنی ہو گی؟“

”کارروائی تو مجسٹریٹ کو کرنی ہو گی۔“ وکیل کھل کر مسکرایا۔ ”مزاری صاحب‘ میں اس سلسلے میں کیا بتا سکتا ہوں۔ آپ کو تو اچھی طرح معلوم ہے کہ قانونی چارہ جوئی کے ذریعے مزارعوں اور

ہکوں کو کس طرح بے دخل کیا جاتا ہے۔ آپ کو تو اس کے علاوہ بھی دوسرے تمام حربوں اور یقوں کا اچھی طرح پتہ ہے۔“

”میں چاہتا ہوں چوہدری کو بھی پتہ چل جائے آگے کیا کیا کرنا ہو گا۔“

”آپ کو تو اچھی طرح علم ہے کہ مجسٹریٹ ایسے مقدمات میں عام طور پر مزارعے یا راہک کی غیر ضری میں زمین قرق کرنے کا حکم جاری کرتا ہے۔“ وکیل نے قانونی چارہ جوئی کی مزید تفصیل ئی۔ ”اس حکم کے ذریعے مزارعے کو زمین کے نزدیک جانے‘ ہل چلانے‘ پانی لگانے اور فصل ٹنے سے روک دیا جاتا ہے۔“

”ایسی صورت میں تو مکدمہ مہینوں کیا برسوں چل سکتا ہے۔“ رحیم داد نے اپنی الجھن کا اظہار یا۔ ”میں نے غلط تو نہیں سوچا؟“

”آپ نے جی بالکل ٹھیک سوچا۔“ وکیل نے اس کے خیال کی تائید کی۔ ”سچ پوچھئے تو ہونا بھی یسا ہی چاہیے۔ بلکہ آپ کی طرف سے تو یہ کوشش ہونی چاہیے کہ مقدمہ زیادہ سے زیادہ طول پڑتا جائے۔“

”وہ کیوں؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا۔

”وہ اس لیے کہ عدالت میں روز روز کی پیشیوں سے مزارع پریشان ہو جاتا ہے۔ مقدمہ بازی لرنا ہنسی ٹھٹھا نہیں۔ قدم قدم پر روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ مزارعے کو اس کے لیے قرض ادھار لینا ڑتا ہے۔ مقدمہ جس قدر طول پکڑتا جاتا ہے‘ قرض کا بوجھ اسی قدر بڑھتا جاتا ہے۔“ وکیل کے ہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔ وہ نہایت اعتماد کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ ”ایک طرف تو وہ مالی ریشانی کا شکار ہوتا ہے دوسری طرف دباؤ ڈالنے کی خاطر قرقی کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کے ہانے پولیس کی جانب سے طرح طرح کے چالان کیے جاتے ہیں۔ تھانے میں بلا کر دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ آخر وہ اتنا تنگ آ جاتا ہے کہ سمجھوتہ کرنے کے لیے منت سماجت کرتا ہے۔ زمین دار کے پیروں پر پگڑی ڈال دیتا ہے اور جب اس سے بھی کام نہیں چلتا تو بدحواس ہو کر صرف زمین ہی نہیں‘ اپنی آبائی بستی تک چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔“

”سئیں چوہدری‘ یہ تو تجھے بھی پتہ ہے کہ لمبی مکدمے بازی کے لیے راہک کے پاس نہ روپیہ ہوتا ہے نہ دکت۔ وہ تو کچھ ہی مدت بعد حوصلہ چھوڑ بیٹھتا ہے۔“ سردار مزاری نے وکیل کی تائید کرتے ہوئے مزید وضاحت کی۔ ”تب ہی تو مالک کی جانب سے پیش کار کو رشوت دے کر پیشیاں بڑھائی جاتی ہیں۔ لمبی لمبی تاریخیں لی جاتی ہیں۔“

”میں تیرا اور وکیل کا مطلب بالکل سمجھ رہا ہوں۔“ رحیم داد نے اپنے رد عمل کا برملا اظہار کیا۔ ”پر میں تو اتنی مدت تک ادھر ٹھیر نہیں سکتا۔ یہ تو بہت لمبا چکر ہے۔ میں نے کوٹلہ ہرکش واپس جاکر ادھر کی زمین داری دیکھنی ہے۔ کئی ضروری کام ہیں جن کو نمٹانا ہے۔“

”چوہدری نور الٰہی صاحب، آپ کو ادھر ٹھیرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔“ وکیل نے اس کی مجبوری محسوس کرتے ہوئے اظہار خیال کیا۔ ”آپ نے اگر مجھے اپنا وکیل مقرر کیا تو مقدمے کی پیشیوں سے تو میں نمٹ لوں گا۔ ویسے مناسب تو یہ ہو گا کہ آپ مختار نامہ دے کر مقدمے کی پیروی اور دوسرے ضروری کاموں کے لیے کسی کو اپنا مختار بنا دیں۔“

”سئیں چوہدری یہ تو تجھے کرنا ہی پڑے گا۔“ شہ زور مزاری نے وکیل کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ ”گھوال کو تو نے ملازم تو رکھ ہی لیا ہے۔ اسی کو اپنا مختار بنا دے۔ تیری غیر حاضری میں آگے تو اسی نے کام چلانا ہو گا۔“

”تو کہتا ہے تو اسے مختار نامہ دے دوں گا۔“ رحیم داد نے بھی اختلاف رائے نہ کیا۔ مگر ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کی۔ ”پر ساری ذمہ داری تجھے ہی لینی ہو گی۔ عزیز گھوال جو بھی کارروائی کرے گا تیری اجازت اور مشورے ہی سے کرے گا۔“

”اس بارے میں تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“ مزاری نے مسکرا کر اسے اطمینان دلایا۔

”تو جیسا کہتا ہے ویسا ہی ہو گا۔“

وکیل نے جانے کے لیے اٹھنا چاہا تو سردار مزاری نے اسے ٹوکا۔ ”سئیں راشد، تجھے دو ضروری کام کرنے ہوں گے۔ ایک تو تجھے گھوال کے لیے مختار نامہ تیار کرنا ہو گا اور دوسرے یہ کہ رائے بہادر ہیتو رام کی حویلی الاٹ کرانے کے لیے چوہدری کی طرف سے درخواست بھی تیار کرنی ہو گی۔“

”مگر اس حویلی کے معاملے میں تو بہت جھگڑے چل رہے ہیں۔“

”چلنے دے۔“ شہ زور مزاری نے وکیل سے کہا۔ ”درخواست لگانے میں کیا جاتا ہے۔ کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے الاٹمنٹ مل جائے۔ کبضہ لینے کے بارے میں بعد میں سوچ لیں گے۔“ اس نے مسکرا کر وکیل کی جانب دیکھا۔ ”اپنا وکالت نامہ بھی لیتا آنا۔ چوہدری سے دستخط کرا لینا۔ مکدمہ چلانا پڑا تو پیروی تجھے ہی کرنی ہو گی۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”پر یہ سارے کام جلد ہی ہونے چاہئیں۔“

”میں ساری دستاویزات کل دس بجے تک تیار کر کے لے آؤں گا۔“ وکیل نے سردار مزاری کو اطمینان دلایا۔ صبح آنے کا وعدہ کیا اور اٹھ کر چلا گیا۔

دوسرے روز راشد احمد انصاری وکیل وقت مقررہ پر پہنچ گیا۔ مگر وہ مطلوبہ دستاویزات تیار نہیں کر سکا تھا۔ اس نے معذرت کی تو شہ زور خان مزاری نے مسکرا کر کہا۔ ”فکر کی کوئی گالھہ نہیں، بعد میں تیار کر لینا۔ میں نے تو آج عظمت اللہ دریشک کے پاس جانا ہے۔ اس سے بھی اس سلسلے میں صلاح مشورہ کرنا ہے۔ تجھے ادھر ہی بلا لوں گا۔“

وکیل نے وکالت نامے پر رحیم داد سے دستخط کرائے اور مطمئن ہو کر چلا گیا۔

☆

سردار شہ زور مزاری نے راجن پور کو خیرباد کہا۔ رحیم داد اور عزیز گھوال کے ساتھ کار میں بیٹھ کر فاضل پور کی جانب روانہ ہوا۔ سفر زیادہ لمبا نہ تھا۔ لیکن دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ لو بھی چل رہی تھی۔ سڑک سنسان تھی۔ کہیں کہیں اکا دکا راہ گیر نظر آتے تھے۔ کار فراٹے بھرتی سڑک پر تیزی سے دوڑتی رہی۔

سردار دریشک کا گاؤں ’کوٹ اکبر‘ سڑک سے دور تھا۔ مگر خاصا بڑا گاؤں تھا۔ فاضل پور سے نزدیک بھی تھا۔ کوٹ اکبر جانے کے لیے ایک کچی سڑک فاضل پور سے جاتی تھی۔ کار فاضل پور پہنچ کر اسی کچی سڑک پر مڑ گئی۔ کوٹ اکبر میں داخل ہوئی اور سردار دریشک کی حویلی کے سامنے جا کر ٹھہر گئی۔

عظمت اللہ دریشک اس وقت اپنی حویلی میں موجود تھا۔ سردار شہ زور مزاری کے آنے کی اطلاع ملی تو ہنستا مسکراتا ہوا نمودار ہوا۔ نہایت گرم جوشی سے شہ زور مزاری سے بغل گیر ہوا۔ مزاری نے رحیم داد سے اس کا تعارف کرایا۔ وہ اس سے بھی گلے ملا۔ خندہ پیشانی سے پیش آیا۔

اس نے بلوچوں کے روایتی انداز میں حال احوال پوچھنے کے بعد سوال کیا۔ ”سئیں شہ زور، یہ بتا تو اچانک کیسے آ گیا؟ میں تو دوپہر کی روٹی کھانے کے بعد شہر جانے والا تھا۔ اچھا ہوا تو پہلے ہی آ گیا۔“ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

”آرام سے بیٹھ کر بات ہو گی۔“ شہ زور خان مزاری نے چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں تو سخت گرمی ہے۔ اندر چل۔“

سب مہمان خانے میں پہنچے۔ اطمینان سے بیٹھے تو سردار دریشک نے اپنا سوال دہرایا۔ ”اب بتا کیسے آنا ہوا؟“

شہ زور مزاری نے اپنی آمد کی غایت بیان کی۔ عظمت اللہ دریشک نے پوری توجہ سے اس کی

ایک ایک بات سنی۔ اس کے چہرے پر رفتہ رفتہ سنجیدگی طاری ہوتی گئی۔ کچھ دیر وہ سر جھکائے سوچتا رہا۔ پھر گویا ہوا۔ "مجھے دلاور والا کی اس متروکہ اراضی کے بارے میں ٹھیک طرح پتہ ہے۔ یہ تو جھگڑے کی اراضی ہے۔ پہلے بھی کئی مہاجروں کو الاٹ ہوئی۔ پر کبضہ کسی کو نہ مل سکا۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تو نے چوہدری کو کہاں پھنسا دیا؟ الاٹمنٹ لینے سے پہلے مجھ سے تو مشورہ کر لیا ہوتا۔" اس کے لہجے میں شکوہ کرنے کا انداز تھا۔

"جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔" سردار مزاری نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "اب تو الاٹمنٹ لے ہی لی ہے۔ اور زمین کا کبضہ بھی لینا ہے۔" اس نے اپنی بات پر زور دیا۔ "یہ بتا تو اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتا ہے؟"

"جو مدد تو چاہے گا کروں گا۔" اس نے سینے پر ہاتھ مار کر جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ "جان مانگے گا تو تیرے لیے جان بھی حاضر ہے۔ تیری مدد سے تو تمن دار بھی انکار نہیں کر سکتا۔ آپس کا پرانا اتحاد اور سنگت جو ٹھیرا۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "ویسے تو میرا یار بھی ہے۔ تیری مدد نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"وہ تو مجھے پتہ تھا کہ تو پوری پوری مدد کرے گا۔ ورنہ میں چوہدری کے ساتھ تیرے پاس آتا ہی کیوں۔" سردار مزاری نے مسکرا کر کہا۔ "یہ بتا آگے کیا کرنا ہے؟"

عظمت اللہ دریشک نے اپنے کار دار غوث بخش لاشاری کو بلایا۔ وہ حاضر ہوا تو اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "غوث' میں نے انکار نہیں سننا۔ چوہدری کو کبضہ ملنا چاہیے۔" اس نے چہرے پر رعب اور دبدبہ طاری کیا۔ "یہ کام کرنا ہے اور ہر صورت میں کرنا ہے۔" عظمت اللہ نے مڑ کر سردار شہ زور مزاری کی جانب دیکھا۔ "تجھے ٹھیک طرح پتہ ہے' شہ زور سے میری کتنی گہری یاری ہے۔ یہ خود چل کر میرے پاس مدد کے لیے آیا ہے۔ اس کی مدد تو کرنی ہی کرنی ہے۔"

"سیں سردار! توں جو حکم کرے گا ویسا ہی ہو گا۔" غوث بخش لاشاری نے نہایت مستعدی سے سردار عظمت اللہ کو یقین دلایا۔

"یہ بتا' آگے کیا کارروائی کرنی ہو گی؟" سردار دریشک نے سوال کیا۔

"دلاور والا کے کئی چھوٹے زمین دار اور راہک میرے جاننے والے ہیں۔ ان سے ملوں گا۔ پوچھ تاچھ کروں گا۔ یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا اس معاملے میں وہ کس انداز سے سوچ رہے ہیں۔" غوث بخش لاشاری نے جواب دیا۔ "جب تک پورے طور پر حالات کا پتہ نہ چلے گا تب تک کوئی کارروائی کیسے کی جا سکتی ہے۔ حالات کو سامنے رکھ کر آگے کے بارے میں سوچنا ہو گا۔"

"ادھر کی زمیں داری کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے چوہدری نے اسے لگایا ہے۔" شہ زور مزاری نے گھٹوال کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "اس کا نام عزیز گھٹوال ہے۔ یہ دلاور والا گیا بھی تھا۔ غوث تو اس کی بھی سن لے۔ تجھے حالات کو سمجھنے میں اس سے بھی مدد ملے گی۔"

عزیز گھٹوال نے بتایا۔ "سیں' تجھے یہ تو پتہ ہی ہے کہ ادھر چوہدری کو اڑھائی سو ایکڑ زرعی اراضی الاٹ ہوئی ہے جس پر ۱۸ راہک کاشت کرتے ہیں۔ سب ہی پرانے راہک ہیں۔ ان میں سے اٹھ ایسے ہیں جنھوں نے ہندو مالک کے ہندوستان جانے کے بعد زمین پر ناجائز کبضہ کر رکھا ہے۔ دس کے پاس مالکانہ حکوک ہوتے تھے۔ پر اب نہیں رہے۔"

"وہ کس طرح؟" غوث بخش لاشاری نے عزیز گھٹوال سے کرید کر پوچھا۔

"صدر دفتر کے حکم پر ان کے انتقالات خارج ہو کر چوہدری کے نام ہو چکے ہیں۔" گھٹوال نے مطلع کیا۔ "پٹواری نے رجسٹر خسرہ گرداوری میں ان کا اندراج بھی کر دیا ہے۔"

"تب تو کام آسانی سے بن سکتا ہے۔" عظمت اللہ دریشک نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔ "غوث تو ایسا کر۔ پہلے ان اٹھ راہکوں سے ملنے کی کوشش کر' جن کے پاس کبھی مالکانہ حکوک نہیں رہے۔ ان کو اطمینان دلا کہ جیسے وہ پچھلے زمین دار کے راہک تھے ویسے ہی چوہدری کے رہیں گے۔ ان کو بالکل تنگ نہیں کیا جائے گا۔ آرام سے کاشت کرتے رہیں۔" اس نے اپنی تجویز کی کسی قدر وضاحت کی۔ "ٹھیک سے کوشش کی جائے تو ان کو اپنے ساتھ ملایا جا سکتا ہے۔ دوسرے راہک تو انتقالات منسوخ ہونے کی وجہ سے سخت ناراض ہوں گے۔ وہ تو جھگڑا ڈالیں گے۔ ان کے بارے میں آگے سوچا جائے گا کہ کس طور نمٹا جائے۔"

"سیں سردار' وہ سب ایک ہیں۔" عزیز گھٹوال نے مداخلت کی۔ "ان کا آپس میں بہت سنگت اور اتحاد ہے۔"

"سب سے پہلے اسی سنگت کو توڑنا ہو گا۔ تب ہی تو کام بنے گا۔" عظمت اللہ دریشک نے گھٹوال سے کہا۔ "یہ بہت ضروری ہے۔" وہ غوث بخش لاشاری کی جانب متوجہ ہوا۔ "غوث تو یہ کوشش کر کہ ان میں کسی نہ کسی طرح پھوٹ پڑ جائے۔" اس نے سردار مزاری کی طرف مسکرا کر داد طلب نظروں سے دیکھا۔ "شہ زور! ایسا کرنا ٹھیک رہے گا؟"

"تو نے بالکل ٹھیک سوچا۔" شہ زور مزاری نے اس کی تجویز سے پورا پورا اتفاق کیا۔ "اٹھ راہک ٹوٹ کر اپنے ساتھ آ گئے تو دوسرے کمزور پڑ جائیں گے۔"

غوث بخش لاشاری نے بھی سردار دریشک کی تائید کی۔ ”سیں سردار، جیسا تو نے سوچا ہے ویسے ہی کرنا ہوگا۔“

”پر تو خود ولا ورالا نہ جانا۔“ عزیز گھوال نے غوث بخش کو خبردار کیا۔

”یہ تو مجھ پر چھوڑ دے آگے کیا کرنا ہے۔“ غوث بخش لاشاری نے عزیز گھوال کی تنبیہہ کو اہمیت نہ دی۔

”غوث اب تو جا۔“ سردار دریشک نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”جیسا میں نے کہا ہے تو نے ویسا ہی کرنا ہے۔“

غوث بخش لاشاری نے سردار عظمت اللہ دریشک کو یقین دلایا کہ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرے گا۔ اور اس سلسلے میں جو کوشش کرے گا اس سے جلد ہی مطلع کرے گا۔

☆

غوث بخش لاشاری خلاف توقع شام کو نہ آیا۔ دوسرے روز سہ پہر کو آیا۔ سردار دریشک اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ شہ زور مزاری اور رحیم داد بھی بیٹھے تھے۔ عزیز گھوال بھی موجود تھا۔ وہ تینوں سے ذرا ہٹ کر گردن جھکائے ادب سے بیٹھا تھا۔

سردار دریشک نے غور کیا کہ غوث بخش لاشاری کا چہرہ اترا ہوا ہے۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے غوث بخش کی جانب دیکھا، دریافت کیا۔ ”غوث، تو پریشان پریشان نظر آ رہا ہے۔ لگتا ہے کام بنا نہیں۔“

”ہا سیں، معاملہ بہت الجھا ہوا ہے۔ آسانی سے کام نہیں بنے گا۔“ غوث بخش نے بجھے ہوئے لہجے میں مطلع کیا۔

”تو راکھوں سے ملا تھا۔ کیا کہتے تھے وہ؟“

”سیں سردار، وہ تو بہت لمبی لمبی باتیں کرتے ہیں۔“ غوث بخش لاشاری نے عظمت اللہ دریشک کو بتایا۔ ”میں نے ان کو بہت سمجھایا۔ اطمینان بھی دلایا۔ پر وہ کسی طرح راضی نہیں ہوئے۔“

”مجھے پہلے ہی ملوم تھا کہ وہ کسی طرح راضی باضی نہیں ہوں گے۔“ عزیز گھوال نے اپنی ناکامی کے بارے میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”میں بھی ان سے ملا تھا۔ ہر طرح سمجھایا بجھایا۔“ اس نے مڑ کر شہ زور مزاری کی جانب دیکھا۔ ”سیں سردار، تجھے پتہ ہے، میں نے تجھے اور چوہدری کو یہی بتایا تھا نا؟“

”تو چپ کر۔“ عظمت اللہ دریشک نے غصے سے گھوال کو ڈانٹا۔ دریشک کو اس کی مداخلت نہایت شاق گزری۔ اس نے غوث بخش کو مخاطب کیا۔ ”غوث تو بتا۔ کیا کہتے تھے وہ؟“

”سیں، تیری ہدایت کو سامنے رکھتے ہوئے میں سب سے پہلے اٹھ راکھوں کے وڈوں اور وڈیروں سے ملا۔ آرام سے ان کو سمجھایا۔ پر وہ اپنی ہی کہتے رہے۔ میری کسی گالہہ کو مان نے اور سمجھنے کو تیار ہی نہ ہوئے۔“

”وہ اس طرح کیوں اڑے ہوئے ہیں؟“ عظمت اللہ دریشک نے غوث بخش لاشاری سے سوال کیا۔

”ان کی تو سیں، دلیل ہی نرالی ہے۔“

”کیا دلیل ہے ان کی؟ میں بھی تو سنوں۔“ سردار دریشک نے غوث بخش لاشاری سے سوال کیا۔

اس کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ تجسس بھی تھا۔

”سیں، میں ان کے ایک نمائندے کو اپنے ساتھ لایا ہوں۔“ غوث بخش نے مطلع کیا۔ ”وہ تجھے اپنی دلیل خود ہی بتا دے گا۔“

”کدھر ہے وہ؟“ دریشک نے چونک کو پوچھا۔

”حویلی کے باہر بیٹھا ہے۔“ غوث بخش لاشاری نے بتایا۔ ”تیری اجازت ہو تو میں اسے بلا لوں۔“

”ضرور بلا۔“ دریشک نے اجازت دے دی۔ ”اسے پیش کر۔ تو نے یہ ٹھیک کیا کہ اسے اپنے ساتھ ہی لے آیا۔ اس سے صاف صاف گالہہ ہوگی۔“

غوث بخش لاشاری فوراً حویلی سے باہر گیا۔ واپس آیا تو ایک ادھیڑ مزارع اس کے ہم راہ تھا۔ وہ لاشاری کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس کا جسم دبلا پتلا تھا۔ مگر مضبوط اور گٹھا ہوا۔ قد نکلتا ہوا تھا۔ گردن قدرے جھکی ہوئی تھی۔ سر پر ململی پگڑی تھی۔ بال کھچڑی تھے۔ لباس بھی میلا اور بوسیدہ تھا۔ وہ بار، بار پگڑی کے شملے سے چہرے پر آیا ہوا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ بدن سے بھی پسینے کی تیز بو اٹھ رہی تھی۔

عظمت اللہ دریشک کے روبرو پہنچتے ہی اس نے حسب دستور دعائیہ کلمات ادا کیے۔ ”سیں سردار، سکھی صحت ہوویں، بالیں بچیں، یاریں دوستیں، سب کو خیر سلا ہوویں۔ مال جان، مال ڈھگی کوں خیر ہوویں۔ رب راضی ہویں۔“

عظمت اللہ نے پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

"نصیر بوھڑ۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"راکھوں نے تجھے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے؟"

"نا سئیں!" اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ "مجھے کسی نے نمیندا ٹمیندا نہیں بنایا۔ نہ مجھے کسی نے بھیجا۔" اس نے مڑ کر غوث بخش لاشاری کی جانب دیکھا۔ "سئیں نے بلایا۔ میں چلا آیا۔"

"تو اسے جانتا ہے؟" عظمت نے رحیم داد کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ تیرا زمیں دار چوہدری نور الٰہی ہے۔ آگے تو نے اسے راہ کی یا بٹائی دینی ہو گی۔ اپنا زمین دار ماننا ہو گا۔ پوری پوری عزت دینی ہو گی۔"

نصیر بوھڑ نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ مگر خاموش کھڑا رہا۔ اس نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا۔ اس کا سکڑا ہوا چہرہ چلچلاتی دھوپ سے جھلسا ہوا تھا جس پر اس وقت گہری سنجیدگی چھائی تھی۔

"تو نے میری گالھ کا جواب نہیں دیا؟" سردار دریشک نے قدرے بلند آواز سے پوچھا۔

"سئیں سردار، تیرے کاردار نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔" اس نے ایک بار پھر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "پہلے دیکھا نہیں تھا، اب دیکھ لیا۔"

"یہ میری گالھ کا جواب نہیں ہے۔" عظمت اللہ دریشک کا لہجہ تیکھا تھا۔

"سئیں سردار، میں نے جو جواب دینا ہے، تیرے کاردار کو پتہ ہے۔" اس نے مڑ کر غوث بخش لاشاری پر نظر ڈالی۔ "اس نے تو تجھے سب کچھ بتا ہی دیا ہو گا۔ میں نے اب کیا کہنا۔"

"یہ کہتا تھا تو چوہدری کو اپنا زمیں دار ماننے کو تیار نہیں۔"

"سئیں، میں ماننے نہ ماننے والا کون ہوتا ہوں۔ میں اکیلا تو نہیں ہوں۔" اس نے نہایت اعتماد سے جواب دیا۔ "اور بھی کئی بندے ہیں۔"

"وہ چوہدری کو زمیں دار اور اپنے تئیں راہک ماننے کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟" دریشک نے استفسار کیا۔

"سئیں، پہلے وہ راہک یا مزارعے ہوتے تھے اب نہیں رہے۔"

"زمین دار بن گئے ہیں وہ؟" سردار دریشک کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔

"اب نہیں بنے۔ پچھلے کئی سال سے زمیں دار ہیں۔" نصیر بوھڑ نے بلا جھجک جواب دیا۔

"کیسے بن گئے زمیں دار؟ کس نے ان کو زمیں دار بنایا؟" سردار دریشک کے لہجے میں استعجاب تھا۔ شہ زور مزاری اور رحیم داد کے چہروں سے بھی حیرت جھلک رہی تھی۔ وہ نظریں اٹھائے

نصیر بوھڑ کو دیکھ رہے تھے جو نہایت سکون سے ان کے روبرو کھڑا تھا۔

"سئیں سردار، توں نے ٹھیک طرح پتہ ہے۔ جب پاکستان بننے جا رہا تھا تب مسلم لیگی لیڈر ہر طرف گھومتے پھرتے تھے۔ جلسے کرتے تھے۔ جلوس نکالتے تھے۔ تجھے یاد ہے نا؟" نصیر بوھڑ نے سردار دریشک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

"مجھے یاد ہے، بالکل یاد ہے۔" سردار عظمت اللہ دریشک نے اعتراف کیا۔ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ تیوری پر بل پڑ گئے۔ "صاف صاف گالھ کر۔ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

"سئیں، انھوں نے چیخ چیخ کر اور بار بار کہا تھا۔ مسلم لیگ کے لیے الیکشن میں پرچی ڈالو تاکہ پاکستان بن جائے۔ اور جب پاکستان بن جائے گا تو زمین وڈے زمین داروں اور جگیرداروں سے چھین کر کسانوں اور راہکوں کو دے دی جائے گی۔ جس زمین پر ہل چلاتے ہیں، وہ ان کی ہو جائے گی۔ وہ مزارعے اور راہک نہیں رہیں گے زمین دار بن جائیں گے۔" نصیر بوھڑ سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ "تب ہی تو سئیں، سارے راہکوں نے مسلم لیگ کے لیے بکسوں میں پرچیاں ڈالیں۔ اور پاکستان بن گیا۔"

"اور تم نے زمین پر کبضہ کر لیا اور زمین دار بن گئے۔" سردار دریشک نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ مڑ کر سردار مزاری کی جانب دیکھا۔ "شہ زور تو اس کی گالھ سن رہا ہے۔"

شہ زور مزاری تو خاموش رہا مگر نصیر بوھڑ خاموش نہ رہا۔ اس نے نہایت اطمینان سے سردار عظمت اللہ دریشک سے کہا۔ "سئیں سردار، ہم نے کسی کی زمین نہیں چھینی۔ جو زمین میرے پاس ہے، اس پر میں راہک کے طور پر برسوں ہل چلاتا رہا۔ میرا پیئو بھی چلاتا رہا۔ اس کا پیئو بھی چلاتا رہا۔ یہ زمین پہلے ایک ہندو زمیں دار کی ہوتی تھی۔ وہ بہت وڈا زمین دار تھا۔ اس کے پاس ہزاروں کلا زمین ہوتی تھی۔ پاکستان بنا تو وہ بھاگ کر ہندوستان چلا گیا۔ اس کی زمین کا کوئی مالک نہ رہا۔"

"جب کوئی مالک نہ رہا تو تم نے اس کی زمین دبا لی اور زمین دار بن گئے۔" سردار عظمت اللہ دریشک نے نصیر بوھڑ کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "تم سب نے یہ نہیں سوچا۔ ایسے بھلا کوئی زمیں دار بن سکتا ہے۔ کنون بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔ لوٹ تو نہیں لگی ہے کہ جس کا جی چاہا زمین پر کبضہ کر لیا اور راہک سے مالک بن بیٹھا۔"

"سئیں، یہ اکیلے میرے سوچنے کی گالھ نہیں۔ سب اسی طرح سوچتے ہیں۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "نہ وہ کسی اور کو زمیں دار ماننے کو راضی ہیں نہ راہ کی یا بٹائی دینے کو۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری سے پہلے بھی کئی مہاجروں نے اس زمین کی الاٹمنٹ لی پر

قبضہ کسی کو نہ ملا۔ بہت جھگڑا ڈالا پر ہاتھ کچھ نہ آیا۔ جہاں سے آئے تھے وہیں چلے گئے۔" اس دفعہ اس نے براہ راست رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "سئیں چوہدری' توں وڈا زمیں دار ہے۔ سنا ہے تیرے پاس پہلے بھی بہت زمین ہے۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ "تجھے پتہ نہیں ہم سب غریبی علیمی میں کسی نہ کسی طرح گزر بسر کر رہے ہیں۔ توں ہم کو کیوں تنگ کرنا چاہتا ہے؟"

"چوہدری کسی کو تنگ کرنا نہیں چاہتا۔" دریشک نے رحیم داد کی وکالت کی۔ "چوہدری تو صرف اتنا چاہتا ہے کہ تم پہلے کی طرح محنت کرو۔ فصل پیدا کرو۔ اپنی را کی لو۔ بٹائی میں زمین دار کے طور پر اس کا جو حصہ بنتا ہو اسے دو۔"

"سئیں سردار' برا نہ منانا۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر عاجزی کا مظاہرہ کیا "سئیں' توں جو کچھ چاہتا ہے وہ نہیں ہو گا۔ کوئی اسے نہیں مانے گا۔"

سردار عظمت اللہ دریشک کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ بے زاری سے بولا۔ "نصیرے! میں نے تیری بکواس اور نہیں سننی۔ اب تو جا۔" اس کا لہجہ اچانک درشت ہو گیا۔ "اپنے یاروں اور سنگتیوں سے کہہ دینا' چوہدری دوسرے مہاجروں کی طرح ادھر اکیلا نہیں ہے۔ وہ سردار شہ زور خان مزاری کا یار ہے اور میرا بھی۔" اس نے غصے سے پھڑپھڑاتی ہوئی اپنی گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ "آگے کے لیے وہ ٹھیک طرح سوچ رکھیں۔ زمین داری کا خناس اپنے دماغ سے نکال دیں۔" یہ سیدھی سادی دھمکی تھی۔

نصیر بوھڑ نہ اس کے غصے سے مرعوب ہوا نہ دھمکی سے۔ اس نے گردن اٹھا کر سردار عظمت اللہ دریشک کی جانب دیکھا اور اطمینان بخش لہجے میں گویا ہوا۔ "سئیں سردار! فی امان اللہ۔" وہ مڑا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔

سردار عظمت اللہ دریشک کی تیوری پر بل پڑے تھے۔ آنکھوں سے جھنجلاہٹ اور کدورت جھلک رہی تھی۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ ہر شخص خاموش تھا اور جھنجلایا ہوا نظر آتا تھا۔ نصیر بوھڑ کی صاف اور کھری باتوں نے ان کے ذہنوں میں کھلبلی برپا کر دی تھی۔

کچھ دیر بعد شہ زور مزاری کی آواز ابھری۔ اس نے غوث بخش لاشاری کو مخاطب کیا۔ "نصیر کی باتوں سے پتہ چلتا ہے وہ راہک جن کے انتقالات منسوخ ہو گئے ہیں زیادہ ہی رولا ڈالیں گے۔ ان کے بارے میں تو نے کیا پتہ لگایا؟"

"سئیں وہ تو معاملے کو عدالت میں لے جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنا ایک وکیل بھی کھڑا کر دیا ہے۔" غوث بخش لاشاری نے بتایا۔ "سنا ہے صدر دفتر کے حکم کے خلاف وہ اپیل دائر کرنے والے ہیں۔"

"ابھی انھوں نے اپیل دائر تو نہیں کی۔" مزاری نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"جہاں تک مجھے پتہ ہے' ابھی تک نہیں کی۔" غوث بخش نے جواب دیا۔

"تب تو آگے کی پیش بندی کے لیے فوری طور پر کانونی کارروائی کرنی ہو گی۔" مزاری نے دریشک کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ "عظمت! تیرا کیا خیال ہے؟"

"جیسی تیری مرضی۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔ "ویسے میں تجھے یہ بتا دوں کہ یہ جھگڑا کانونی کارروائیوں سے طے ہونے کا نہیں۔ اسے تو زور آزمائی سے طے کرنا ہو گا۔"

"مجھے بھی پتہ ہے' ہو گا تو ایسے ہی۔ پر کانونی طور پر بھی اپنی پوزیشن زیادہ مضبوط کرنی ہو گی۔ میرے وکیل نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔" شہ زور مزاری نے عظمت اللہ دریشک کو بتایا۔ "ایسا کرتے ہیں' وکیل کو ادھر ہی بلائے لیتے ہیں۔"

"ادھر بلانے کی کیا ضرورت ہے۔" دریشک نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ "درخواستیں تو راجن پور ہی میں لگانی ہوں گی۔ وکیل بھی وہیں ملے گا۔ فوری کارروائی کرنی ہے تو کل ہی راجن پور پہنچ جانا چاہیے۔"

سردار شہ زور مزاری نے اس کی تجویز قبول کر لی۔ رحیم داد نے بھی تائید کی۔

☆

سردار شہ زور مزاری اور سردار عظمت اللہ دریشک کے ہم راہ رحیم داد' عزیز گھوال اور غوث بخش لاشاری راجن پور پہنچے۔ راشد احمد انصاری وکیل سے ملے۔ اس نے ضروری دستاویزات تیار کر لی تھیں۔ ان میں عزیز گھوال کے نام رحیم داد کا مختار نامہ تھا۔ دفعہ ۱۲۵ کے تحت مزارعوں کے خلاف چارہ جوئی کی درخواست تھی۔ اور دوسری رائے بہادر ہیتو رام کی حویلی کے الاٹمنٹ کے لیے تھی۔

رحیم داد نے مختار نامے اور دونوں درخواستوں پر دستخط کر دیے تو وکیل نے مشورہ دیا۔ "ابھی ضابطے کی کارروائی مکمل نہیں ہوئی۔"

"وہ کیسے مکمل کرنی ہو گی؟" سردار عظمت اللہ خان دریشک نے وکیل سے دریافت کیا۔

"دریشک صاحب' پہلے مقدمہ کی نوعیت سمجھ لی جائے تو بہتر ہے۔" وکیل نے عظمت اللہ دریشک سے کہا۔ "اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سب ہی راہک یا مزارع چھپر بند ہیں یعنی ان کا حق مزارعت قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ بعد میں جب ہندو زمین دار چلا گیا تو وہ مزارع خود

کاشت کار بن گئے اور دس نے تو مالکانہ حقوق بھی حاصل کر لیے۔"

"مگر جب زمیں کو متروکہ اراضی ڈیکلئر کر دیا گیا اور چوہدری کے نام اس کی الاٹمنٹ ہو گئی تو مزارعوں کی نوعیت بدل گئی۔" سردار دریشک نے وکیل پر اپنی قانونی مہارت کا سکہ جمانے کی کوشش کی۔

"جی نہیں۔" وکیل نے وضاحت کی۔ "آپ ایک قانونی نکتہ نظرانداز کر گئے۔ اور وہ یہ ہے کہ دس مزارعوں کی نوعیت اس وقت تبدیل ہوئی جب رجسٹر خسرہ گرداوری میں ان کے انتقالات منسوخ ہو گئے اور چوہدری صاحب کی نام منتقل ہو گئے۔"

"سئیں' تو نے ٹھیک بتایا۔" سردار دریشک نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ "اب تو سوچنا یہ ہے کہ آگے ضابطے کی کارروائی کیا کرنی ہے؟"

"اب تو انھیں مزارع تابع مرضی مالک بنانا ہے۔" وکیل نے مطلع کیا۔

"اور سئیں' وہ اس کے لیے بالکل تیار نہیں۔" اس بار شہ زور مزاری نے لقمہ دیا۔ "کل ان کا ایک بندہ آیا تھا۔ وہ تو بہت اونچی اونچی باتیں کرتا تھا۔"

"کرنا بھی چاہیے۔" وکیل مسکرا کر بولا۔ "گزشتہ نو دس سال سے وہ زمین پر قابض ہیں۔ آسانی سے تو دست بردار نہیں ہوں گے۔ اپنا قبضہ جائز ثابت کرنے کے لیے پوری پوری کوشش کریں گے۔"

"ایسا تو وہ کر ہی رہے ہیں۔" اس بار بھی شہ زور مزاری بولا۔

"ضابطہ فوجداری کے تحت جو کارروائی کی جائے گی' اس کا طریقہ تو میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔ بلکہ اس کے لیے درخواست بھی تیار کی جا چکی ہے۔ چوہدری صاحب نے اس پر دستخط بھی کر دئے۔ اب تو اسے ضروری کارروائی کے لیے آگے بڑھانا ہے۔" وکیل نے وضاحت سے اپنا موقف بیان کیا۔ "مگر اس کے ساتھ ہی ٹیننسی ایکٹ کے تحت تحصیل دار کو اس مضمون کی درخواست بھی دینی ہو گی کہ مزارعے بٹائی دینے سے انکاری ہیں۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "اپنا مقدمہ مضبوط بنانے کے لیے ان کے خلاف دوسرے ایسے الزامات بھی عائد کرنے ہوں گے جو ٹیننسی ایکٹ کے تحت ضروری ہیں۔ مثلاً یہ کہ مزارعے کاشت کی طرف پوری توجہ نہیں دے رہے ہیں جس کے باعث پیداوار گھٹ رہی ہے۔ زمین خراب ہو رہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔" اس نے شہ زور مزاری اور عظمت اللہ دریشک کو نظر بھر کر دیکھا۔ "آپ دونوں تو خاندانی زمیں دار ہیں۔ آپ کو تو بخوبی علم ہو گا کہ مزارعوں کو بے دخل کرنے کے لیے کس کس طرح کی دیوانی اور فوجداری کارروائی کی جاتی ہے۔"

"سئیں' ایسا ہے تو ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے دوسری درخواست بھی تیار کر لی جائے۔" شہ زور مزاری نے کہا۔ "اس پر چوہدری سے دستخط لگوا لے اور درخواست تحصیل دار کے سامنے پیش کر دے۔"

"پر یہ ساری کارروائی آج ہی پوری ہو جانی چاہیے۔" سردار دریشک نے تاکید سے کہا۔

"آج ہی پوری ہو جائے گی۔ میں درخواست تیار کر کے چوہدری صاحب سے دستخط کروا لوں گا اور تحصیل دار کے سامنے پیش کر دوں گا۔" وکیل نے دریشک کو باور کرایا۔

اس نے کیا بھی ایسا ہی۔ گھنٹہ بھر کے اندر اندر درخواست تیار کی اور رحیم داد سے اس پر دستخط بھی کرا لیے۔

ایک درخواست تحصیل دار کے دفتر میں پیش کر دی گئی' دوسری تعزیرات پاکستان کی دفعہ ١٤٥ کے تحت قانونی چارہ جوئی کے لیے تھانے میں۔ تحصیل دار اور تھانے دار دونوں ہی سردار شہ زور مزاری اور عظمت اللہ دریشک کے نہ صرف جاننے والے تھے بلکہ بے تکلف دوست بھی تھے۔ لہٰذا دونوں درخواستوں پر فوری کارروائی کے احکامات بھی جاری کر دیئے گئے۔

سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے وہ راجن پور سے کوٹ اکبر واپس پہنچ گئے۔

دلاور والا کی زمین پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے رحیم داد سے زیادہ سردار شہ زور مزاری فکرمند تھا۔ اور سردار عظمت اللہ خان دریشک کو شہ زور مزاری سے بھی زیادہ تشویش تھی۔ نصیر بوہڑ سے بات چیت کرنے کے بعد یہ اس کے وقار کا مسئلہ بن گیا تھا۔

دن ہو یا رات' جس وقت بھی تینوں یکجا ہوتے' دلاور والا کی زمین کا ذکر ضرور ہوتا۔ اور ایک بار جب یہ ذکر چھڑ جاتا تو گھنٹوں جاری رہتا۔ رحیم داد کی درخواست پر تحصیل دار نے ہنوز کوئی فیصلہ نہیں دیا تھا۔ اسے ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔ حالانکہ درپردہ وہ شہ زور مزاری اور عظمت اللہ دریشک کو یقین دلا چکا تھا کہ فیصلہ رحیم داد ہی کے حق میں ہو گا۔

لیکن سردار دریشک تحصیل دار کے فیصلے اور پولیس کی کارروائی سے پہلے اپنے طور پر کارروائی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک شام اس نے کھل کر اس کا اظہار بھی کیا۔ اس وقت شہ زور مزاری اور رحیم داد کے علاوہ اس کا کاردار' غوث بخش لاشاری بھی موجود تھا۔ عزیز گھوال مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں راجن پور میں مقیم تھا۔

سردار عظمت اللہ دریشک نے شہ زور مزاری کو مخاطب کیا۔ "شہ زور' پتہ نہیں تحصیل دار کب

فیصلہ سنائے گا۔ ہم نے کب تک اس کا انتظار کرنا ہو گا۔ ابھی تو بیانات لیے جائیں گے۔ گواہ پیش ہوں گے۔ ثبوت مہیا کئے جائیں گے۔"

"تحصیل دار کو عدالتی کارروائی تو پوری کرنی ہی ہو گی۔" شہ زور مزاری نے اپنے رائے کا اظہار کیا۔ "اس کے فیصلے سے پہلے کیا ہی کیا جا سکتا ہے؟"

سردار عظمت اللہ دریشک اپنی بات پر اڑا رہا۔ "راہکوں کو بے دخل ہی تو کرنا ہے۔" اس نے اپنی گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ "میرے یا تیرے لیے یہ کوئی نئی یا انوکھی گالہہ نہیں۔ پہلے بھی کتنوں ہی کو بے دخل کیا ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"تو نے بالکل ٹھیک کہا۔" سردار مزای نے اس کی تائید کی۔ "پر یہ تو سوچ۔ ایک بار جب تحصیل دار کے سامنے بے دخلی کی درخواست لگا دی گئی تو فیصلے تک تو چپ کر کے بیٹھنا ہی پڑے گا۔"

"تو میری گالہہ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

"تو سمجھائے گا تب ہی تو سمجھوں گا۔" سردار مزاری نے مسکرا کر دریشک سے کہا۔ "مجھے کیا پتہ تو نے کیا سوچ رکھا ہے اور تو کیا کرنا چاہتا ہے؟"

"میں چاہتا ہوں کہ اپنے کچھ مسلح کرادے اور زور آور بندے دلاور والا بھیجوں۔ وہ چوہدری کی طرف سے راہکوں کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کریں۔ توڑ پھوڑ کریں۔ جو کوئی آکڑ دکھائے' دنگا فساد کرے' اس کی پٹائی کریں۔"

"اس طرح تو اپنا مکدمہ کمزور پڑ جائے گا۔" رحیم داد نے مداخلت کی۔

"کمزور نہیں اور مضبوط ہو سکتا ہے۔" دریشک نے ہنس کر کہا۔ "راہک ڈر جائیں گے۔ مکدمے بازی چھوڑ کر صلح صفائی کرنے کے کوششیں کریں گے۔ منت کریں گے۔ زاری کریں گے۔"

"مان لے وہ ڈرانے دھمکانے میں نہ آئے' تب کیا ہو گا؟" رحیم داد اپنی بات پر جما رہا۔

"ہو گا کیا۔ وہ تھانے میں پرچہ چاک کرانے کی کوشش کریں گے۔" دریشک نے رحیم داد کو باور کرایا۔ "تو اطمینان رکھ۔ ان کی رپورٹ درج نہیں ہو گی بلکہ تیری نہ صرف درج ہو جائے گی اس پر فافٹ کارروائی بھی شروع ہو جائے گی۔ تجھے تو پتہ ہی ہے کہ تھانیدار اپنا بندہ ہے۔ گہرا یار ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ سردار شہ زور مزاری نے بھی عظمت اللہ دریشک کے ساتھ مزید حجت کرنے سے گریز کیا۔ یہ اس کا علاقہ نہ تھا دریشک کا تھا۔ رحیم داد کو زمین کا قبضہ دلانے کے لیے اسے عظمت اللہ دریشک کی مدد درکار تھی۔ لہٰذا اس کی مرضی اور منشا کو اہمیت دینا ضروری تھا۔ اسی مقصد کے تحت وہ رحیم داد کے ساتھ کوٹ اکبر آیا تھا۔

☆

سردار عظمت اللہ دریشک نے اپنے کارندوں اور نوجوان مزارعوں کو اکٹھا کیا۔ اور ضروری ہدایت دے کر ایک مضبوط اور قوی ہیکل کمدار کی سربراہی میں انھیں دلاور والا کی جانب روانہ کیا اور سردار شہ زور مزاری اور رحیم داد کے ساتھ بیٹھ کر بے چینی سے ان کا انتظار کرنے لگا۔

وہ واپس آئے۔ مگر ان کی حالت دگرگوں تھی۔ چہروں کی رنگت اڑی اڑی تھی۔ لباس بے ترتیب اور گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ وہ نڈھال اور درماندہ نظر آتے تھے۔ گھبراہٹ اور پریشانی ان کی آنکھوں سے جھلکتی تھی۔ سردار عظمت اللہ نے ان کی یہ ابتری اور خستہ حالی دیکھی تو خود بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پوری بستی اٹھارہ مزارعوں کی حمایت میں سینہ سپر ہو گئی۔ سب ہی بوھڑ تھے۔ تعداد میں بھی بہت زیادہ تھے اور مسلح بھی تھے۔ وہ ہر طرف سے شور مچاتے ہوئے نکلے اور اس طرح یلغار کی کہ سردار دریشک کے آدمی ان کے نرغے میں پھنس گئے۔ جان بچانا مشکل ہو گئی۔ کسی نہ کسی طور گلوخلاصی حاصل کی۔ اس طرح پسپا ہوئے کہ نظریں ہزیمت اور گھبراہٹ سے جھکی ہوئی تھیں اور بوھڑوں کے سر اونچے تھے اور گردنیں تنی ہوئی تھیں۔

سردار دریشک نے چاہا تھا کہ خوف و ہراس پھیلا کر مزارعوں کو جھکنے پر مجبور کر دیا جائے۔ مگر اس کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ وہ سخت چراغ پا ہوا۔ چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا۔ آنکھوں سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ اس نے غیظ و غضب کے عالم میں نہ صرف اپنے کمدار اور کارندوں کو بلکہ سب ہی کو گالیاں دیں۔ دیر تک چیختا چلاتا رہا' دھاڑتا رہا' پھر دھتکار کر سب کو کمرے سے نکال دیا۔

اس کی آن بان اور عزت و وقار کو سخت ٹھیس پہنچی تھی۔ اب وہ اور بھڑک اٹھا تھا۔ اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ اس نے راہکوں یعنی مزراعوں کی سرکشی اور شورش کچلنے کے لیے دوسرے حربے اور ہتھکنڈے آزمانے کا تہیہ کیا جو سرداروں اور بڑے زمیں داروں کا عام وتیرہ ہے۔

اس نے علاقے کے تھانیدار کو بلایا۔ اس کا نام عبدالغنی خاں نیازی تھا۔ تن و توش کے اعتبار سے بڑا دبنگ نظر آتا تھا۔ اس کی سخت دلی اور مزاج کی برہمی کا دور دور تک شہرہ تھا۔ جب وہ آیا تو سردار شہ زور مزاری اور رحیم داد بھی موجود تھے۔ سردار دریشک نے تھانیدار کو تازہ صورت حال سے آگاہ کیا۔ بوھڑوں کے خلاف اپنی شدید نفرت اور کدورت کا اظہار کیا۔

مسئلے کے ہر پہلو کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ آخر باہمی صلاح مشورے سے یہ طے پایا کہ ان بوھڑوں

کے خلاف مویشیوں کی چوری اور ایسے ہی دوسرے الزامات کی بنیاد پر جھوٹے مقدمے قائم کئے جائیں جو سرکشی اور محاذ آرائی میں پیش پیش ہیں۔ ان کو گرفتار کیا جائے اور حوالات میں بند کرکے اس طرح زدوکوب کیا جائے کہ نہ صرف ان کا سارا طنطنہ اور کس بل نکل جائے بلکہ دوسرے بوہڑ بھی عبرت حاصل کریں۔ دہشت زدہ ہو کر سردار وریشک کے پیروں پر اپنے سروں کی پگڑیاں ڈال دیں۔

تھانے واپس جا کر عبدالغنی خاں نیازی نے بوہڑوں کے خلاف مقدمات قائم کئے اور ان کی گرفتاری کے لیے پوری تیاری بھی کرلی۔ مگر دلاور والا جانے سے قبل وہ کوٹ اکبر پہنچا۔ پولیس کی ایک جماعت اس کے ساتھ تھی۔ ادھر سردار عظمت اللہ دریشک کی حویلی کے سامنے کھلے میدان میں اس کے کارندے، تگڑے اور مضبوط مزارعے اور کمی سورج غروب ہوتے ہی اکٹھا ہونے شروع ہونے لگے تھے۔ ان کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔

پہر رات گزری تو میدان میں ہر طرف چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ ملی جلی آوازوں کا شور تھا۔ ان کے لیے کھانے کے علاوہ خاص طور پر بھنگ گھونٹ کر تیار کی گئی تھی۔ وہ بھنگ کے گلاس پر گلاس چڑھا رہے تھے۔ بہک رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ پولیس والے بھی شریک ہو کر ان کے رنگ میں رنگتے جا رہے تھے۔ ہر طرف ہنگامہ ہاؤ ہو برپا تھا۔ ایک نوجوان نے نشے میں جھوم کر دوہڑہ چھیڑا۔ کان پر ایک ہاتھ رکھ کر تان لگائی۔

عاشق مست مدام جہاں بھر جام شکر دا پیوے
جے وت ہک لنگاں یار ڈکھیو نے
لوں لوں دے وچ ساہ پورے اے رج رنجا بھر جیوے
جے وت ہک لنگاں یار ڈکھیوے

اس کی آواز پاٹ دار اور سریلی تھی۔ دوسرے بھی نشے کی ترنگ میں اس کی آواز سے آواز ملا کر کورس کے انداز میں دوہڑے کے بول الاپنے لگے۔ ان کی آوازیں اونچی اور اونچی ہوتی گئیں۔ وہ جھوم رہے تھے۔ لہرا رہے تھے۔ رات جاگ رہی تھی۔ فضا گنگنا رہی تھی۔ بول رہی تھی۔ بتا رہی تھی۔

یہ سدا کا مست عاشق شکرانے کے جام بھر کر پئے
اگر ایک بار بھی اپنے محبوب کو دیکھ لے
میرے روئیں روئیں میں لہر دوڑ جائے، زخمی روح زندہ ہو جائے

اگر ایک بار بھی اپنے محبوب کو دیکھ لے

حویلی کے وسیع صحن میں سردار وریشک، سردار مزاری، تھانیدار عبدالغنی نیازی اور رحیم داد کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ شراب سے شغل کر رہے تھے۔ ہنس رہے تھے ہنسا رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ رات جاگ رہی تھی۔ وہ بھی جاگ رہے تھے۔

رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کرتی رہی۔ سنسان اور تاریک ہوتی گئی۔ رات آدھی ہو گئی۔ تھانیدار نے گھڑی دیکھی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ حویلی سے باہر آیا۔ سردار وریشک، سردار مزاری اور رحیم داد اس کے ہم راہ تھے۔ تھانیدار نے مسکرا کر سردار عظمت اللہ کو مخاطب کیا۔ "سردار! فکر نہ کر۔ صبح سارے بدمعاش اور سرکش بوہڑوں کو باندھ کر تیرے سامنے پیش کر دوں گا۔" اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر مونچھوں پر تاؤ دیا۔ نخوت سے گردن کو اکڑایا۔

سردار دریشک نے ہنس کر کہا۔ "مجھے پتہ ہے تو کامیاب لوٹے گا۔ پہلے بھی کب ناکام ہوا ہے۔ ہر معرکہ سر کیا ہے۔"

تھانیدار نے نشے کی ترنگ میں قہقہہ لگایا۔ سردار دریشک اور سردار شہ زور مزاری سے رخصت ہوا۔ آگے بڑھا۔ رحیم داد اور غوث بخش لاشاری بھی اس کے ساتھ ساتھ چلے۔ تینوں ایک جیپ میں بیٹھ گئے۔ کچھ پولیس والے بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ایک جیپ اور بھی تھی۔ پولیس کے بقیہ سپاہی اس میں بیٹھ گئے۔ سردار دریشک کے کارندے اور گرگے گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو گئے۔

دونوں جیپیں آگے آگے تھیں۔ ان کے عقب میں گھوڑے اور اونٹ تھے۔ تھانیدار کی کمر پر لٹکتے ہوئے ہولسٹر میں بھرا ہوا پستول تھا۔ رحیم داد اور غوث بخش لاشاری کے پاس بارہ بور کی دونالی بندوقیں تھیں۔ دو کانسٹیبل بھی پرانی وضع کی رائفلوں سے مسلح تھے۔ سردار دریشک کے کارندوں اور گرگوں کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور اونچی اونچی ڈانگیں تھیں۔ ہر ڈانگ پر تیز دھار کی چمکیلی چھوی چڑھی ہوئی تھی۔ وہ کچے اور ناہموار راستوں پر دھول کے بادل اڑاتے دلاور والا کی سمت جا رہے تھے۔

تھانیدار عبدالغنی خاں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اندھیرے میں نہایت خاموشی سے بستی کا محاصرہ کر لیا جائے۔ اور رات کے پچھلے پہر اس طرح اچانک گھروں پر چھاپہ مارا جائے کہ سب بے خبر سوتے ہوں۔ کسی ملزم کو فرار ہونے کا موقع نہ ملے۔ سب کو آسانی سے حراست میں لے لیا جائے۔

☆

بوھڑوں کو پولیس کے چھاپے کی سن گن مل گئی تھی۔ وہ نہ صرف چوکس اور چوکنا تھے بلکہ پولیس اور اس کے مددگاروں کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ گاؤں کے ارد گرد جھنگر اور گھنی جھاڑیاں تھیں جن کے درمیان کہیں کہیں ٹیلے اور ٹبے تھے۔ بوھڑوں نے ٹیلوں پر مورچے لگا رکھے تھے۔ ان کے پاس کلہاڑیاں اور ڈانگیں تھیں۔ پتھروں کی ڈھیریاں تھیں۔ گوپھن اور دوسا نگھیاں تھیں جو فصلوں اور باغوں سے پرندوں کو بھگانے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ مگر اس وقت وہ ان سے ایک موثر ہتھیار کا کام لینا چاہتے تھے۔ دوسا نگھیوں یا غلیلوں کے ذریعے دور نشانے پر تاک کر مارنے کے لیے انھوں نے مٹی کی گولیاں تیار کی تھیں جن کو کمہار نے بھٹی میں پکا کر پختہ اور مضبوط بنا دیا تھا۔

عورتیں اور بچے مکانوں کی چھتوں پر بیٹھے تھے۔ انھوں نے بھی چھوٹے بڑے پتھروں کی ڈھیریاں جگہ جگہ بنا رکھی تھیں۔ معذور اور بیماروں کو چھوڑ کر بستی کے تمام بوڑھے بھی مستعد اور سرگرم نظر آ رہے تھے۔ وہ گھروں کے دروازوں پر بیٹھے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ کھانس رہے تھے' کھنکار رہے تھے' باتیں کر رہے تھے۔

سب ہی چوکنا اور چوکس تھے۔ جاگ رہے تھے اور ان طرح طرح کی ذمہ داریوں سے پوری طرح باخبر تھے جو خطرے کے وقت ان کو انجام دینا تھیں۔

رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ آسمان پر ستاروں کے کنول جگمگا رہے تھے۔ ہوا سرسراتی ہوئی درختوں سے گزر رہی تھی۔ سب چوکنا نظروں سے بار بار گردنیں اٹھا کر ان راستوں کو دیکھ رہے تھے جو مختلف سمتوں سے گاؤں کی طرف آتے تھے۔ یکایک دور شمال میں تیز روشنی ابھری جو رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ آہٹیں اور آوازیں بھی ابھرنے لگیں۔ بستی پر فوراً گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ عورتیں چھتوں کی منڈیروں کی اوٹ میں دبک گئیں۔ نوجوانوں نے مورچے سنبھال لیے۔ بوڑھوں نے گھروں میں گھس کر دروازے بند کر لیے۔ بستی پر اب ہو کا عالم طاری تھا۔

شمال میں درختوں کی آڑ سے ابھرتی ہوئی تیز روشنی جیپوں کی تھی جن میں رحیم داد اور غوث بخش لاشاری کے علاوہ تھانیدار اور پولیس کے سپاہی بیٹھے تھے۔ تھانیدار عبدالغنی خان نیازی نے جیپیں گاؤں سے دور درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے رکوائیں۔ جیپوں کے رکتے ہی گھوڑے اور اونٹ بھی ٹھہر گئے۔

جیپوں کی بتیاں بجھا دی گئیں۔ سب سے پہلے تھانیدار باہر آیا۔ رحیم داد اور غوث بخش لاشاری بھی باہر آ گئے۔ دوسرے بھی جیپوں' گھوڑوں اور اونٹوں پر سے اتر کر نیچے آ گئے۔ سب تھانیدار عبدالغنی خاں نیازی کے گرد اکٹھا ہو گئے۔ اس نے ایک ڈرائیور کو جیپوں' گھوڑوں اور اونٹوں کی نگرانی پر مقرر کیا۔ دوسروں کو ساتھ لیا۔ ضروری ہدایات دیں اور آگے بڑھا۔ سب کچے راستوں پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بستی کی جانب بڑھے۔ قریب پہنچے۔

تھانیدار نے کچھ لوگوں کو گرد و نواح میں جگہ جگہ تعینات کیا۔ گاؤں بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ تھانیدار نے قدم آگے بڑھائے۔ رحیم داد اور غوث بخش بھی اس کے ساتھ ساتھ چلے۔ ان کے علاوہ پولیس کی جمعیت تھی۔ سردار دریشک کے کارندے اور مزارعے تھے۔ مگر جیسے ہی وہ گاؤں کی حدود میں داخل ہوئے اچانک ہر طرف سے زور زور سے سیٹیاں بجنے لگیں۔ عورتوں اور بچوں نے حلق کے اندر سے طرح طرح کی آوازیں نکالیں۔ رات کے سناٹے میں ان کا شور اس قدر پرہول اور خوفناک تھا کہ ان پر سراسیمگی اور گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ وہ ٹھٹک کر جہاں تھے وہ وہیں رک گئے۔

عبدالغنی خان نیازی دبنگ اور دھاکڑ پولیس افسر تھا۔ ڈاکوؤں اور خطرناک مجرموں کے خلاف کتنے ہی سنگین معرکے سر کر چکا تھا۔ اس نے فوراً خود کو سنبھالا۔ پلٹ کر رائفل بردار کانسٹیبلوں کی جانب دیکھا۔ ہوائی فائر کرنے کا حکم دیا۔ چار پانچ فائروں کے بعد تمام آوازیں یک لخت بند ہو گئیں۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

تھانیدار اپنی جمعیت کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس کی گردن اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ چال میں دبدبہ تھا۔ لیکن جب وہ اور اس کے ساتھی آبادی کے درمیان پہنچ گئے تو ایک بار پھر زور زور سے سیٹیاں بجنے لگیں۔ خوفناک آوازیں ابھرنے لگیں اور ان آوازوں کے ساتھ ساتھ ہر سمت سے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ وہ اس وقت بالکل کھلی جگہ پر کھڑے تھے اور تاروں کی روشنی میں نمایاں اور صاف نظر آ رہے تھے۔

پتھر کھٹا کھٹ جسموں سے ٹکرانے لگے۔ کوئی ان کی زد سے محفوظ نہ رہا۔ پتھر نوکیلے تھے اور ان میں ایسی تیز دھار بھی تھی کہ جسم کے جس حصے پر لگتے اسے زخمی کر دیتے۔ ایک بھاری پتھر بھد سے رحیم داد کی پیٹھ پر لگا۔ وہ بے قرار ہو کر پلٹا۔ اسی وقت دوسانگھی سے نکلی ہوئی مٹی کی پختہ گولی' اس کے دائیں کندھے کی ہڈی سے ٹکراتی ہوئی گزر گئی۔ وہ تکلیف سے بلبلا اٹھا۔ اور ایک ہاتھ سے کندھا پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

دوسرے بھی پتھروں کی چوٹوں سے بچ نہ سکے۔ ایک نوکیلا پتھر تھانیدار کے سر پر اس طرح لگا کہ اس کی ٹوپی گر گئی۔ سر جھنجھنا اٹھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ مگر اس نے ہمت سے کام لیا۔ ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھی اور سب کو زمین پر لیٹ جانے کا حکم دیا۔ سب جلدی جلدی پیٹ کے بل لیٹ گئے۔ اور پتھروں اور مٹی کی پختہ گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے سروں کو دونوں ہاتھوں سے چھپانے کی کوشش کی۔

مگر فرش پر لیٹ جانے کے باوجود پتھروں کی بوچھاڑ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ پتھر ان کے سروں پر اور کمر پر، گردن پر، ٹانگوں اور ہاتھوں پر، غرضیکہ جسم کے ہر حصے پر کھٹا کھٹ گر رہے تھے، ٹکرا رہے تھے۔ زخم پر زخم لگا رہے تھے۔ ان کے چاروں طرف پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ جوابی کارروائی کے طور پر انھوں نے کئی بار پتھر اٹھا کر مارنے کی بھی کوشش کی۔ مگر اپنے دشمن انھیں کہیں نظر نہ آئے۔ رات کے اندھیرے میں وہ کمین گاہوں میں مورچے لگائے اس طرح دبکے بیٹھے تھے کہ ان کو دیکھنا اور تلاش کرنا ممکن نہ تھا۔

تھانیدار عبدالغنی سخت الجھن میں مبتلا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ پسپائی کی صورت میں بدنامی کا ڈر تھا۔ وہ بدنامی مول لینا نہ چاہتا تھا۔ اس کی ہوا اکھڑ جاتی۔ علاقے پر جو دھاک بیٹھی تھی ملیا میٹ ہو جاتی۔ فائرنگ سے وہ حتی الوسع گریز اختیار کرنا چاہتا تھا۔ بظاہر اس کا کوئی نتیجہ بھی برآمد ہوتا معلوم نہ ہوتا تھا۔

وہ اسی ادھیڑبن میں مبتلا تھا کہ بوھڑوں نے نیا حربہ آزمایا۔ انھوں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق، سیٹیوں، خوفناک آوازوں اور پتھراؤ کے ساتھ ساتھ گھنی جھاڑیوں میں بھیڑیں اور بکریاں دوڑانا شروع کر دیں۔ ان کے کھروں کی آہٹوں سے ایسی آوازیں ابھریں جن سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ بہت سے لوگ نقل و حرکت کر رہے ہیں۔

اس تازہ حربے کا خاطرہ خواہ نفسیاتی رد عمل ہوا۔ تھانیدار کے پاس زیادہ بڑی جمعیت نہ تھی۔ کہیں سے کمک ملنے کی امید بھی نہ تھی۔ اسے اپنی افرادی قوت کے مقابلے میں بوھڑوں کی تعداد بہت بھاری معلوم ہوئی۔ دوسروں نے بھی یہی محسوس کیا۔ پتھروں کی زبردست بارش سے سب پہلے ہی بدحواس تھے۔ تھانیدار بھی کم پریشان نہ تھا۔ اس اثنا میں ایک بھاری پتھر رحیم داد کے سر پر گرا۔ پگڑی سر پر نہ ہوتی تو بھیجا نکل کر باہر آ جاتا۔ مگر چوٹ ایسی کراری آئی تھی کہ رحیم داد تڑپ اٹھا۔ اس نے کروٹ بدلی، اٹھا اور بدحواس ہو کر سرپٹ بھاگا۔

تھانیدار نے پلٹ کر رحیم داد کو دیکھا۔ عین اس وقت دوسانگھی سے نکلی ہوئی مٹی کی ایک ٹھوس گولی اس کی کنپٹی پر اس طرح لگی کہ وہ چکرا گیا۔ خون کی ایک دھار بہتی ہوئی رخسار سے گردن تک پہنچ گئی۔ تھانیدار عبدالغنی نیازی اس چوٹ سے سنبھلا بھی نہ تھا کہ رحیم داد کو بھاگتے دیکھ کر دوسرے بھی ایک ایک کر کے بھاگنے لگے۔ تھانیدار نے گھبرا کر فائرنگ کا حکم دیا۔ اپنا پستول نکال کر خود بھی گولی چلائی۔ مگر کسی کو پتہ نہ تھا کہ وہ کس پر گولی چلا رہا ہے۔

مگر اس اندھادھند، فائرنگ کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ پتھروں کی بوچھاڑ سست پڑ گئی۔ سب کے قدم پہلے ہی اکھڑ چکے تھے۔ تھانیدار نے پسپا ہونے ہی میں عافیت سمجھی۔ وہ رک رک کر پستول سے فائرنگ کرتا ہوا اٹھا اور بھاگنا شروع کر دیا۔ پھر تو ایسی بھگدڑ مچی کہ جس کا جدھر منہ اٹھا، اسی طرف بھد بھد کرتا ہوا بھاگا۔ پتھراؤ ایک بار پھر تیز ہو گیا۔ اور اس میں تیزی پیدا ہوتے ہی بھاگنے والوں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی۔

پتھروں اور مٹی کی گولیوں کی چوٹیں سہتے، تکلیف سے بلبلاتے، وہ کسی نہ کسی طرح گاؤں سے باہر نکلے اور درختوں کے اس جھنڈ کی طرف دوڑنا شروع کر دیا جہاں جیپیں تھیں، گھوڑے اور اونٹ تھے۔ وہ بغیر رکے ہوئے مسلسل دوڑتے رہے۔

درختوں کے جھنڈ کے نیچے پہنچنے پر ہر شخص بدحواس اور پریشان تھا۔ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ زخمی اور گھائل تھا۔ کسی کو ہلکے زخم لگے تھے کسی کو گہرے۔ ان کے جسم پسینے سے شرابور تھے۔ لباس خاک سے لتھڑے ہوئے تھے۔ سروں کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ گھبراہٹ اور بھگدڑ میں کسی کی ٹوپی اور پگڑی چھوٹ گئی تھی اور کسی کے جوتے۔

تھانیدار عبدالغنی خان نیازی بالکل خاموش تھا۔ اس کی حالت کچھ زیادہ ہی ابتر تھی۔ وہ خوب تنومند تھا۔ لہٰذا بھاگتے وقت سب سے زیادہ اسے پریشانی اٹھانا پڑی۔ چوٹیں بھی زیادہ آئی تھیں۔ اس کی ٹوپی بھی بھاگتے ہوئے کہیں گر گئی تھی۔ وردی کی ایک آستین پھٹ گئی تھی۔ چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ مگر آنکھوں میں خوف و ہراس کے بجائے شدید غم و غصہ تھا۔

وہ کنپٹی کے گہرے زخم پر ایک ہاتھ سے رومال رکھے ہوئے تھا تاکہ زیادہ خون نہ بہے۔ اسی عالم میں وہ جیپ پر سوار ہو گیا۔ رحیم داد اور غوث بخش لاشاری اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ رحیم داد نے کسی سے نظریں نہ ملائیں۔ وہ گم صم بیٹھا تھا۔ غوث بخش بھی خاموش تھا۔ پولیس والے دونوں جیپوں میں بیٹھ گئے۔ دوسرے گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو گئے۔ اور جس راستے سے ولاور والا آئے تھے اسی راستے سے کوٹ اکبر واپس ہوئے۔

☆

سردار عظمت اللہ دریشک اور شہ روز خان مزاری بے قراری سے انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ واپس پہنچے تو دونوں ان کی ابتر حالت دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ عالم یہ تھا کہ کوئی لنگڑا کر چل رہا تھا۔ کوئی کراہ رہا تھا۔ کسی کا منہ سوجا ہوا تھا کسی کی آنکھ۔ کسی کی گردن اکڑی ہوئی تھی کسی کے ہونٹ پھٹے ہوئے تھے۔ خون زخموں سے رس رس کر جگہ جگہ سیاہ دھبوں کی طرح جم گیا تھا۔

سردار دریشک نے حیران و پریشان ہو کر تھانیدار سے پوچھا۔ ”سیّں عبدالغنی‘ یہ کیا ہو گیا؟“

”یہ تو اپنے بندوں سے معلوم کر لینا۔ مجھے فوراً واپس تھانے جانا ہے۔ مرہم پٹی کرانی ہے۔ اپنی اور اپنے جوانوں کی میڈیکل رپورٹ تیار کرانی ہے۔“ اس نے رک رک کر کہا۔ ”ملزموں کے خلاف مضبوط کیس تیار کرانا ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ ”سردار‘ تجھے فوری طور سے مجسٹریٹ سے ملنا ہو گا۔ ملزموں کی زمین قرق کرانے کے لیے دفعہ ۱۴۵ کے تحت عدالت کا حکم جاری کرانا ہو گا۔ میں نے چوہدری کی درخواست پر ضابطے کی کارروائی مکمل کر کے عدالت میں پہلے ہی چالان پیش کر دیا ہے۔ راشد احمد وکیل کو سب پتہ ہے۔“

”تو جیسا کہتا ہے وہ تو میں کرا لونگا‘ پر یہ تو بتا یہ سب کچھ ہوا کیسے؟“ وہ بدستور حیرت زدہ تھا۔

”میں نے کہا نا تو ساری تفصیل لاشاری یا اپنے کسی بھی بندے سے معلوم کر لینا۔“ یہ کہتے کہتے اس کے وجود میں چھپا ہوا تھانیدار جاگ اٹھا۔ آنکھوں سے شرارے اڑنے لگے۔ لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”مجھے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر رپورٹ کرنی ہے۔ پولیس کی زبردست فورس اکٹھی کرنی ہے۔ دلاور والا کے ایک ایک بوھڑ کی مونچھ پیشاب سے نہ منڈوائی تو عبدالسمیع خان نیازی کے نطفے سے نہیں۔“ وہ غصے سے دھاڑا۔ ”ان کے مکانوں کو مسمار کرانا ہے۔ فصلوں کو آگ لگوانی ہے۔ زنانیوں کے سروں کے بال کٹوانے ہیں۔ ان کو برہنہ کر کے رات بھر نچوانا ہے۔ ان کے مردوں کے سامنے نچوانا ہے۔ ان کے مردوں کو بھی ننگا کر کے نچوانا ہے۔ میں ان کو دکھا دوں گا پولیس سے ٹاکرہ لینا مخول نہیں ہے۔ ایسی عبرت ناک سزادوں گا زندگی بھر یاد رکھیں گے۔“

سردار دریشک نے تھانیدار کو روکنے کے لیے اصرار کیا مگر وہ نہ رکا۔ دونوں جیپوں میں زخمی اور خستہ حال کانسٹیبلوں کے ساتھ بیٹھ کر راجن پور واپس چلا گیا۔ سردار دریشک نے اپنے کاردار غوث بخش لاشاری سے کرید کرید کر ایک ایک تفصیل معلوم کی۔ جب تمام باتیں سامنے آ گئیں تو وہ بھی سخت برہم ہوا۔ بوھڑوں کی سرکشی کے خلاف جذبہ انتقام سوا ہوا۔

مگر رحیم داد تمام وقت خاموش بیٹھا رہا۔ پوچھنے پر بھی کچھ نہ بولا۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ آنکھیں سلگتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ سردار دریشک کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اپنے کمرے میں گیا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

دن ڈھلے رحیم داد نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ کمرے سے باہر نکل کر ڈیرے کے صحن میں پہنچا تو شام در و دیوار سے آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی۔ سردار شہ زور مزاری صحن میں اکیلا بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس کے پاس پہنچا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ شہ زور مزاری نے اس کی دل جوئی کی مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔

”چوہدری‘ تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ چند روز میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تو یہ تھانیدار کی ناک کا مسئلہ بن گیا ہے۔ تو نے سنا نہیں وہ کیا کہہ کر گیا ہے۔“

”میں نے سب کچھ سنا ہے۔“ اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”پر میں تجھے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ نہ میں نے زمین کا کبضہ لینا ہے نہ ادھر زمین داری کرنی ہے۔“

”تو کیا کہہ رہا ہے؟“ مزاری نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

”میں نے ادھر ہرگز زمین داری نہیں کرنی۔“ رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”میں تو پہلے ہی ایسا سوچ رہا تھا۔ کل رات جو کچھ دلاور والا میں ہوا اس کے بعد تو میرے لیے ادھر زمین داری کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تجھے زمین داری کون سی چلانی ہے۔“ شہ زور مزاری نے اس کی حوصلہ افزائی کی کوشش کی۔ ”تو نے گھوال کو اپنا مختار تو بنا ہی دیا ہے۔ وہ زمین داری کی دیکھ بھال کرتا رہے گا۔“ اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”چوہدری‘ یہ تو سوچ عظمت اللہ کو پتہ چلا تو وہ تیرے بارے میں کیا سوچے گا۔ کہے گا چوہدری ڈر گیا۔ دوسرے بھی یہی کہیں گے۔“

”اگر وہ ایسا سوچیں گے تو ٹھیک ہی سوچیں گے۔“ رحیم داد نے پردہ پوشی کی کوشش نہ کی۔ حقیقت یہ ہے کہ رات کے ہولناک واقعے کے بعد وہ بہت خوف زدہ ہو گیا تھا۔ ”جو کچھ ہو چکا وہی کم نہیں۔ آگے جو کچھ ہونے والا ہے اس کے بارے میں تو میں سننا بھی نہیں چاہتا۔ مجھے پتہ ہے تھانیدار نے جو کچھ کہا ہے وہ ایسا کر سکتا ہے اور ضرور کرے گا۔ تو بھی یہی چاہتا ہے۔ عظمت اللہ دریشک تو بالکل ایسا ہی چاہتا ہے۔ پر میں کسی طور اس خطرناک جھگڑے میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔ تو چاہے مجھے بزدل کہہ یا ڈرپوک۔ میں نے تجھے اپنے دل کی بات صاف صاف بتا دی۔“

”پر یہ تو سوچ کمدے کا کیا بنے گا۔ زمین کا کیا ہو گا؟“ سردار شہ زور مزاری نے پریشان ہو کر کہا۔

”تو میری ایک مدد کر سکتا ہے؟“

”کیا مدد چاہتا ہے؟“ سردار مزاری نے بے چین ہو کر سوال کیا۔

"میں دلاور والا کی زمین فروخت کرنا چاہتا ہوں۔" رحیم داد نے اپنا عندیہ ظاہر کیا۔ "تو نے میری اب تک بہت مدد کی ہے ایک مدد اور کر دے۔ مجھے اس زمین کا کوئی گاہک مہیا کر دے اور اگر تو لینا چاہے تو میں خوشی سے تجھے بیچ کر دوں گا۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "تجھ سے تو کچھ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زمین تو سچ پوچھ تیری ہی ہے۔ تو نے ہی الاٹ کرائی ہے۔"

"میرے لیے تو ادھر زمین لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" سردار مزاری نے صاف انکار کر دیا۔ "یہ تمن دریشک کا علاکہ ہے۔ اس کے لیے تو عظمت اللہ سے بات کرنی ہوگی۔ وہ تیری مدد کر سکتا ہے۔" اس نے ایک بار پھر رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "ویسے میری مرضی ہے کہ تو ایسا نہ سوچ۔ کل رات جو کچھ ہوا' لگتا ہے اس سے تو بہت گھبرا گیا۔ چند روز میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "زمین داری میں تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ اس سے گھبرانا اور پریشان ہونا نہیں چاہیے۔"

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "سچ پوچھ تو میرا مینجر نادر خان بھی یہی چاہتا ہے۔ تجھے پتہ ہے وہ پچھلے دنوں ادھر آیا تھا۔" رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "بات دراصل یہ ہے ادھر کوٹلہ ہرکشن میں چھوٹے زمین داروں اور حصہ داروں کی زمین بہت سستے مول مل رہی ہے۔ اور اس لیے مل رہی ہے کہ چھوٹے زمین داروں کو سندھ میں بیراجوں کی زمین الاٹ ہو گئی ہے۔ وہ ادھر کی زمین بیچ کر جلد سے جلد ادھر جانا چاہتے ہیں۔"

سردار شہ زور مزاری نے اس کی بات کاٹ کر مداخلت کی۔ "وہ جو کچھ چاہتے ہیں' مجھے اس سے کچھ نہیں لینا۔ یہ بتا تو کیا چاہتا ہے؟"

"مجھے ان کی زمین خریدنے کے لیے روپے کی سخت ضرورت ہے۔" رحیم داد نے کھل کر اپنا مقصد بیان کیا۔

"یہ بات تو نے پہلے بتانی تھی۔" شہ زور نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اگر تو نے پہلے بتایا دیا ہوتا تو معاملہ اتنا آگے کیوں جاتا۔"

"میں نے سوچا تو ناراض ہوگا۔ اس لیے صرف سوچتا ہی رہ گیا۔" اس بار اس نے صاف گوئی سے کام نہیں لیا۔ رحیم داد مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اسی اثنا میں سردار عظمت اللہ دریشک پہنچ گیا۔ اس نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "تو بہت چپ چپ نظر آرہا ہے۔"

رحیم داد تو خاموش رہا مگر شہ زور مزاری خاموش نہ رہا۔ اس نے کہا۔ "چوہدری' ادھر زمین داری کرنا نہیں چاہتا۔ دلاور والا کی زمین فروخت کرنا چاہتا ہے۔"

"لگتا ہے کل رات کی گڑبڑ نے اسے بہت تنگ کیا۔" عظمت اللہ دریشک نے بے تکلفی سے کہا۔ "فکر نہ کر۔ چند روز کی گالہ ہے فیر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

رحیم داد کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شہ زور مزاری بول پڑا۔ "یہ ٹھہرا مہاجر' ادھر کی زمین داری اس کے لیے بالکل نیا تجربہ ہے۔" اس نے مسکرا کر عظمت اللہ کو دیکھا۔ "ویسے اس نے ادھر کوٹلہ ہرکشن میں زمین بھی خریدنی ہے۔ سستی مل رہی ہے اور اس کی زمینوں سے ملی ہوئی ہے۔ اس کی خریداری کے لیے اسے روپے کی ضرورت ہے۔"

"یہ تو ٹھیک نہیں رہے گا۔" سردار دریشک ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ "اس مرحلے پر ایسا کرنے سے تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔" اس نے گردن اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری اب تو میری آن کا سوال پیدا ہو گیا ہے۔"

"ایسا کر تو دلاور والا کی زمین خرید لے۔"

"میری پاس تو ویسے ہی بہت زمین ہے۔" سردار دریشک رضامند نہ ہوا۔

"پر یہ زمین تو تیری آن کا مسئلہ بن گئی ہے۔ اسے تو تجھے ہی خریدنا چاہیے۔" مزاری نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "اپنی آن کی خاطر تجھے خریدنا چاہیے۔"

"تو کہتا ہے تو خرید لوں گا۔" وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "بول چوہدری' کیا لے گا زمین کا؟"

"جو تو دے۔ میں نے تجھ سے مول تول تو کرنا نہیں۔" رحیم داد نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

سردار مزاری نے مداخلت کی۔ "زمین کا مول تو بعد میں طے ہو جائے گا' پر یہ بات پکی ہو گئی کہ دلاور والا کی زمین اب تیری ہوگی۔" اس نے بات کو طول دینے کے بجائے اختصار سے کام لیا۔ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "چوہدری' تو جانے کو کہتا تھا تو واپس جا۔ میں اور دریشک زمین کے مکدمے سے نمٹنے کے بعد کوٹلہ ہرکشن پہنچ جائیں گے۔" وہ مسکرایا۔ "کچھ دن تیرے مہمان رہیں گے۔ وہیں بیع نامہ تیار ہوگا اور زمین کی کیمت بھی ادا کر دی جائے گی۔" اور اس نے عظمت اللہ دریشک کی جانب مڑ کر دیکھا۔ "میں نے ٹھیک ہی کہا نا؟"

"تو جیسا کہے گا ویسا ہی ہوگا۔" سردار دریشک نے شہ زور مزاری کی تجویز مان لی۔

زمین کا معاملہ خلوص اور محبت کی فضا میں طے ہو گیا۔ وکیل کے مشورے پر رحیم داد نے عزیز گھوال کا مختار نامہ منسوخ کر کے سردار عظمت اللہ کو اپنا مختار عام مقرر کر دیا۔ اب وہ جلد سے جلد ڈیرہ غازی خان چھوڑ دینا چاہتا تھا۔

سردار عظمت اللہ دریشک نے گلے لگا کر رحیم داد کو رخصت کیا۔ سردار شہ زور مزاری اس کے ساتھ غازی گھاٹ تک گیا۔ دلاور والا کی زمین کا تنازعہ حائل نہ ہوتا تو وہ حسب وعدہ اس کے ساتھ لاہور جاتا۔

رحیم داد ایک بار پھر اسٹیمر پر سوار ہوا۔ دریائے سندھ عبور کیا۔ مظفر گڑھ پہنچا اور ٹرین میں بیٹھ کر لاہور کی جانب روانہ ہو گیا۔

۴۴

بھری دوپہر تھی اور چلچلاتی گرمی۔ ریل گاڑی شور مچاتی، کھٹ کھٹ کرتی، لوہے کی پٹڑیوں پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ رحیم داد سکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھا تھا۔ اس کے علاوہ کئی اور مسافر بھی تھے۔ وقت گزارنے کے لیے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کوئی اخبار، کوئی اونگھ رہا تھا۔ کچھ ہنس بول رہے تھے۔ ایک مسافر اوپر کی نشست پر لیٹا اطمینان سے سو رہا تھا۔ اس نے چھت میں لگے ہوئے پنکھے کا رخ موڑ کر اپنی طرف کر لیا تھا۔ اس کا ایک پیر نشست سے باہر نکلا ہوا تھا جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دراز قد ہے۔

رحیم داد گرمی اور تپش سے بے زار اور اکتایا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ نشست پر جو مسافر بیٹھا تھا وہ اخبار کے مطالعے میں اس قدر غرق تھا کہ جب رحیم داد ڈبے میں داخل ہوا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تو اس نے صرف نظریں اٹھا کر دیکھا اور پھر اخبار پڑھنے میں محو ہو گیا۔ رحیم داد نے بھی اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ اخبار سے اسے کبھی دلچسپی نہ رہی۔ اس وقت بھی اس نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ نہ خبروں کی سرخیوں پر نظر ڈالی نہ تصاویر پر۔

وہ کچھ دیر گم صم بیٹھا رہا پھر گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ آسمان پر بادلوں کے ہلکے ہلکے سرمئی لکّے منڈلا رہے تھے۔ سورج ان کی اوٹ میں چھپ جاتا تو دور تک سائے پھیل جاتے۔ فضا دم بھر کے لیے سہانی ہو جاتی۔ مگر جب سورج دوبارہ نمودار ہوتا تو منظر اچانک بدل جاتا۔ دھوپ اتنی تیز اور چمکیلی ہوتی کہ آنکھوں میں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی۔

ریل گاڑی سرپٹ دوڑتی رہی۔ وقت گزرتا رہا۔ سورج بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ سائے

گھٹنے بڑھتے رہے۔ ریل گاڑی کی رفتار سست پڑ گئی۔ پٹڑیاں بدلنے لگیں۔ ریل گاڑی ٹھہر گئی۔ سامنے اسٹیشن کی مختصر اور پرانی عمارت تھی۔ اسٹیشن کے عقب میں شرینہ کے ایک گھنے اور تن آور درخت کے نیچے دو تانگے کھڑے تھے۔ سامنے کنکر کی بنی ہوئی سڑک تھی جس پر دوڑتا ہوا ایک تانگا تیزی سے اسٹیشن کی عمارت کی سمت بڑھ رہا تھا۔ کچھ مسافر ریل گاڑی کے مختلف ڈبوں سے اترے اور اسٹیشن کی عمارت کی جانب بڑھے۔ کچھ سوار ہونے کے لیے افراتفری کے عالم میں بھاگ دوڑ رہے تھے۔

ایک شخص جو وضع قطع سے ریلوے کا ملازم نظر آتا تھا، ایک ہاتھ میں پانی سے بھری ہوئی بالٹی اور دوسرے میں المونیم کا گلاس تھامے کھڑکی کے پاس سے گزرا۔ رحیم داد نے اسے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ وہ پیاسا تھا اور پانی پینا چاہتا تھا۔ یکایک قریب سے آواز ابھری۔

"آپ کو پیاس محسوس ہو رہی ہے تو میرے پاس پانی موجود ہے۔ اسے جانے دیجئے۔"

رحیم داد نے پلٹ کر دیکھا۔ ساتھ بیٹھا ہوا مسافر اس کی جانب نگاہیں اٹھائے بے تکلفی سے مسکرا رہا تھا۔ وہ ادھیڑ تھا۔ سر پر بال بہت کم تھے اور ان میں بھی سیاہ کم اور سفید زیادہ تھے۔ وہ ململ کا باریک کرتا اور کھلی موری کا اجلا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ جسم قدرے بھاری تھا۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ آنکھوں پر چوڑے فریم کی عینک تھی۔ چہرا بھرا بھرا تھا۔ بانسے پر کسی پرانی چوٹ کا نشان تھا۔ جس سے ناک تکونی ہو کر بدوضع ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ خاصا سفری ساز و سامان تھا۔ چوڑا چکلا اور اونچا ناشتے دان تھا۔ پانی سے بھری ہوئی صراحی تھی۔ تھرماس تھا۔ دو ٹوکریاں تھیں۔ ایک میں تولیا، کنگھا، صابن دانی اور ضرورت کی ایسی ہی دیگر اشیاء تھیں۔ دوسری آموں سے بھری ہوئی تھی۔ رکھ رکھاؤ اور آن بان سے وہ کھاتا پیتا اور باوقار نظر آتا تھا۔

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر وہ خاموش نہ رہا۔ کہنے لگا۔ "یہ کنویں کا پانی ہے۔ اسے پی کر معدہ خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ گرمی کے موسم میں ویسے بھی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔" اس نے ہاتھ میں دبا ہوا اخبار ایک طرف رکھا۔ جھکا صراحی پر رکھا ہوا شیشے کا گلاس اٹھایا اس میں صراحی سے پانی انڈیلا۔ عین اس وقت انجن زور سے چنگھاڑا۔ گارڈ کی سیٹی چیخی۔ ریل گاڑی ایک جھٹکے سے کھسکی اور لوہے کی پٹڑیوں پر آگے بڑھنے لگی۔

گلاس میں بھرا ہوا پانی چھلکا اس نے فورا گلاس مضبوطی سے پکڑ لیا۔ لحہ بھر توقف کیا۔ پھر گلاس رحیم داد کی جانب بڑھایا۔ رحیم داد نے اسے ہاتھ میں لے لیا۔ ہونٹوں سے لگانا چاہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ تھرماس اٹھایا۔ اس کا ڈھکنا کھولا۔ برف کی ایک ڈلی نکالی اور گلاس میں

ڈالتے ہوئے بولا۔ "اب آپ شوق سے پئیں۔" اس نے نظریں موڑیں اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ سورج انگارے کی مانند دہک رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت اور چمک سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ بے قرار ہو کر اس نے پہلو بدلا اور آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔ "غضب کی گرمی پڑ رہی ہے۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔

"ٹھیک کہا جی آپ نے، آج تو بہت گرمی ہے۔" رحیم داد نے پانی کا ٹھنڈا ٹھنڈا گھونٹ بھرتے ہوئے اس کی تائید کی۔

"ایسی ویسی گرمی ہے۔ در دیوار سے چنگاریاں اڑ رہی ہیں۔" اس نے تولیا اٹھا کر چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھا۔ رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر نہایت شائستگی سے دریافت کیا۔ "نام پوچھ سکتا ہوں آپ کا؟"

"چوہدری نور الٰہی۔" رحیم داد نے صرف نام بتانے پر اکتفا کیا۔

"تو گویا آپ چودھری صاحب ہیں۔ خوب بہت خوب۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" اس نے مسکرا کر اظہار خوش نودی کیا۔ "مجھے مرزا اسرار بیگ کہتے ہیں۔ مظفر گڑھ میں کچھ زمین داری ہے۔ وہیں سے آ رہا ہوں۔" اس نے کسی قدر تفصیل سے اپنا تعارف کرایا۔ "چودھری صاحب، آپ کا شغل کیا ہے؟" اسرار بیگ نے قیاس آرائی کی۔ "بظاہر تو آپ بھی مجھے زمین دار معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہاں جی زمین دار ہی ہوں" رحیم داد نے جواب دیا۔ "ادھر دیپال پور میں اپنی زمیں داری ہے۔"

"ادھر کیسے آنا ہوا؟" مرزا اسرار بیگ نے بات آگے بڑھائی۔

"میں تو جی ڈیرہ غازی خاں سے آ رہا ہوں۔" رحیم داد نے مطلع کیا۔ "ادھر بھی تحصیل راجن پور میں مجھے کچھ زمین الاٹ ہوئی ہے۔"

"متروکہ آراضی ہے؟" مرزا نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"ہاں جی متروکہ اراضی ہے۔"

"تو گویا آپ بھی مہاجر ہیں۔ بھئی بہت خوب۔" مرزا اسرار بیگ نے بے تکلفی سے اظہار مسرت کیا۔ "چودھری صاحب، مہاجر تو میں بھی ہوں۔ مظفر گڑھ میں میری جو آراضی ہے وہ بھی میرے کلیم کی بنیاد پر الاٹ ہوئی ہے۔"

رحیم داد نے کچھ کہنا چاہا مگر مرزا نے اسے بولنے کا موقع نہ دیا۔ "آپ سے تو اب تفصیل سے

بات چیت ہوگی۔ کیوں نہ پہلے کھانا کھالیا جائے؟" اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ "فی الحال تو کوئی اسٹیشن نزدیک نظر نہیں آتا۔ گاڑی تو دیر ہی میں رکے گی۔" وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "بات یہ ہے چودھری صاحب۔ میرا ملازم آگے کے کسی تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں سفر کررہا ہے۔ مگر اس کا انتظار کرنا فضول ہے۔ بھوک بھی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"جیسی آپ کی مرضی۔ ویسے مجھے بھوک زیادہ نہیں لگ رہی" رحیم داد نے تکلف سے کام لیا۔

سامنے کی نشست پر بیٹھے ہوئے ایک مسافر نے مداخلت کی۔ "میں نے کہا جی، آگے کوٹ ادو ہے۔ وڈا اسٹیشن ہے۔ وہاں ٹرین دیر تک ٹھہرے گی۔"

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ البتہ مرزا اسرار بیگ نے مڑ کر اس مسافر کی جانب دیکھا۔ "بالکل درست فرمایا آپ نے۔ مجھے بالکل خیال نہ رہا کہ کوٹ ادو پر گاڑی خاصی دیر ٹھہرے گی۔ زیادہ دیر انتظار بھی نہ کرنا پڑے گا۔" وہ رحیم داد کی طرف متوجہ ہوا۔ "چودھری صاحب، کھانا تو اب وہیں کھانا مناسب رہے گا۔ میرا ملازم آکر کھانا لگا دے گا۔ بڑا مستعد اور فرمانبردار ہے۔ میں ہمیشہ سفر میں اسے اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے جی، کوٹ ادو ہی پر روٹی کھالیں گے۔" رحیم داد نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔

"کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو سٹیشن پر مل جائے گی۔"

مرزا اسرار بیگ نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی اور اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہاں تو آج کل سخت گرمی پڑ رہی ہے۔ سنا ہے ڈیرہ غازی میں تو اور بھی زیادہ گرمی ہے۔ ویسے بھی وہاں کچھ زیادہ ہی گرمی پڑتی ہے۔ علاقہ بھی نہایت پس ماندہ ہے۔ نہ ریل گاڑی ہے نہ کوئی ڈھنگ کی سڑک۔ آمدورفت کے معاملے میں تو ادھر بہت تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔"

"ہاں جی، وہاں کا حال کچھ ایسا ہی ہے۔" رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "اور جی گرمی تو ادھر بہت ہی زیادہ ہے" اس نے گرمی کی شدت کا سبب بتانے کی کوشش کی۔ "دور دور تک خشک اور بنجر پہاڑ پھیلے ہیں۔ گرمی تو پھر پڑنی ہی چاہیے۔"

"مجھے بھی ڈیرہ غازی خان میں متروکہ آراضی الاٹ ہو رہی تھی۔ مگر جب وہاں جاکر خود اپنی آنکھوں سے حالات کا جائزہ لیا تو ارادہ ترک کردیا۔ زمیں داری کے لیے تو نہایت ناموزوں جگہ ہے۔ سنا ہے مزارعے بھی بہت سرکش اور اکھڑ ہیں۔" مرزا اسرار بیگ نے مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا۔ بے تکلفی سے گویا ہوا۔ "بھئی چودھری صاحب، آپ ادھر کہاں پھنس گئے؟"

"بس جی پھنس ہی گیا۔" رحیم داد نے سنجیدگی سے کہا۔ "ولاور والا میں اڑھائی سو ایکڑ زمین ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ تو جی آپ کو پتہ ہی ہے الاٹ ہو ہی نہیں سکتی۔ پر اب میں نے سوچا اسے فرؤخت کردوں۔ یوں سمجھئے جی، سودا بھی طے ہو چکا ہے۔"

"بہت مناسب فیصلہ کیا آپ نے۔" مرزا نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "بات دراصل یہ ہے ادھر زمیں داری کرنا ہمارے اور آپ کے بس کی بات نہیں۔ وہاں تو صرف بلوچ سردار ہی داری کرسکتے ہیں۔"

"ادھر تو جی، حکومت ہی سرداروں کی ہے۔ جیلیں ان کی، کچہری عدالت ان کی۔" رحیم داد نے کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "سرکاری افسر بھی جیسے ان کے اپنے بندے ہیں۔ جو چاہتے ہیں ان کرالیتے ہیں۔ نہ کریں تو تبادلہ کرا دیتے ہیں۔ ان کی تو جی اوپر تک پہنچ ہے۔"

"میں نے بھی یہی سنا ہے۔ حالانکہ میرا وہاں بہت مختصر قیام رہا۔ مگر چند ہی روز میں صورت حال ع ہو گئی۔" مرزا اسرار بیگ نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔ لمحہ بھر خاموش رہا۔ پھر گویا ۔ "چودھری صاحب یہ متروکہ آراضی کے معاملے میں ڈھائی سو ایکڑ کی قید لگانے کی تک اپنی میں نہیں آئی۔ بہت پریشانی اٹھانا پڑتی ہے۔"

"ہاں جی پریشانی تو بہت ہوتی ہے۔"

"اب یہی دیکھیے، خوشاب میں بھی مجھے اتنی ہی زرعی آراضی الاٹ ہوئی ہے۔ میں وہیں جا رہا ہ۔" مرزا اسرار بیگ کے لہجے سے بے زاری ہویدا تھی۔ "یہ ادھر ادھر بکھری ہوئی زمیں داری درد سری کا باعث بنتی ہے۔ ایک ہی جگہ ساری زمین داری ہو تو یکسوئی اور اطمینان سے اس کی بھال ہو سکتی ہے۔ میری اس رائے سے آپ بھی اتفاق کریں گے۔"

"ہاں جی، بات تو آپ نے ٹھیک ہی کہی۔ پر کیا کریں حکومت نے پالیسی ہی ایسی بنا رکھی ہے۔" م داد نے فوراً تائید کی۔ "ویسے جی، میری اصلی زمین داری تو ضلع منٹگمری ہی میں ہے۔"

"کیا میں معلوم کر سکتا ہوں وہاں کتنی آراضی ہے آپ کے پاس؟" مرزا اسرار بیگ نے نہایت نگی سے سوال کیا۔

"لگ بھگ ۳۲ مربعے ہوں گے۔" رحیم داد نے بڑے فخر سے مرزا اسرار بیگ کو مطلع کیا۔

"تب تو چودھری صاحب آپ خاصے بڑے زمیں دار ہیں۔" مرزا اسرار بیگ نے مسکرا کر کہا۔ رے پاس بھی بس اتنی ہی آراضی ہوگی۔" اس نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔ "کچھ زیادہ ہوگی۔ کوئی ساڑھے گیارہ بارہ سو ایکڑ۔ مگر صاحب یہ بھی کیا زمین داری ہوئی۔ ادھر پنجاب اور ادھر

سندھ میں تو ایسے بھی زمین دار ہیں، جن کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین ہے۔ سرحد اور بلوچستان کا حال تو صحیح طور پر معلوم نہیں۔ سنا ہے، وہاں بھی بعض خوانین اور سرداروں کے پاس اتنی ہی بڑی زرعی آراضی ہے۔"

"ضرور ہوگی جی۔" رحیم داد بے تکلفی سے مسکرایا۔ "ان کے سامنے تو جی ہم بہت چھوٹے زمیں دار ہوئے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"بالکل بجا فرمایا آپ نے۔" مرزا نے اتفاق رائے کیا۔ "ویسے میری بھی اصلی زمیں داری سندھ میں ہے۔ میرپور خاص کا نام تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ وہیں میری زمین ہے۔ کچھ الاٹمنٹ کے ذریعے ملی ہے۔ کچھ خریدی ہے۔"

"دوسری جگہ کی زمینیں فروخت کر کے خریدی ہوگی۔" رحیم داد نے نہایت بھونڈے پن سے اپنے فوری ردعمل کا اظہار کیا۔

"نہیں جناب، ایسی کوئی بات نہیں۔" مرزا اسرار بیگ کو رحیم داد کا رویّہ شاق گزرا۔ مگر اس نے درگزر کیا۔ وضاحت کے طور پر بتایا۔ "چودھری صاحب، میرا معاملہ دوسرے مہاجرین سے بہت مختلف ہے۔ میں نے ہجرت کرنے سے پہلے ہی اپنا کچھ روپیہ یہاں منتقل کرا دیا تھا۔ زمین کا بیشتر حصہ میں نے اسی روپے سے خریدا۔"

"برا نہ منائیں جی، بہت سے مہاجرین نے اپنی زمیں داری اسی طرح بڑھائی ہے۔" رحیم داد نے اپنے موقف کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس دفعہ اس کا لہجہ نرم تھا اور اس میں معذرت کا بھی پہلو تھا۔

"ایسا ہوا ہے اور بہت ہوا ہے۔" مرزا نے مسکرا کر کہا۔ "اور ہونا بھی چاہیے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، ادھر ادھر بکھری ہوئی زمیں داری میں بڑی دردسری اٹھانا پڑتی ہے۔ ایک جگہ زمیں داری ہو تو اطمینان سے دیکھ بھال ہوتی ہے۔"

"ویسے جی، متروکہ جائیداد کے معاملے میں بہت گڑبڑ ہوئی۔"

"بالکل درست فرمایا آپ نے۔" مرزا اسرار نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "چودھری صاحب، آپ سے کیا بتاؤں، متروکہ جائیداد کے سلسلے میں کیسی لوٹ مار مچی ہے۔ بعض لوگوں نے تو اسے باقاعدہ کاروبار بنا لیا ہے۔ جگہ جگہ الاٹمنٹ حاصل کرتے ہیں اور جوں ہی موقع ملتا ہے متروکہ مکانات اور دکانیں پگڑی پر دے کر یا بیچ کر کسی دوسرے شہر کی طرف نکل جاتے ہیں۔ اس دھندے میں لاکھوں کے وارے نیارے ہو گئے۔"

"ضرور ہو گئے ہوں گے جی۔"

"جعلی فردِ حقیت اور جعلی کلیم فارموں کی بنیاد پر متروکہ آراضی کا الاٹمنٹ ایک علیحدہ ہی چکر ہے۔ میں آپ سے کیا کیا بتاؤں۔" مرزا اسرار بیگ نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "چودھری صاحب، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "بھائی، ایک دن مر کر اللہ کو بھی منہ دکھانا ہے۔ اس وقت نہ دولت کام آئے گی نہ جائیداد۔" مرزا اسرار نے ران پر ہاتھ مارا اور گردن ہلا، کر گنگنانے لگا۔

سکندر جب چلا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔

رحیم داد متاثر ہو کر بولا۔ "ہاں جی، اصلی گل تو یہی ہے۔" اس کے لہجے سے خفت اور پشیمانی عیاں تھی۔

مرزا اسرار بیگ نے مزید بات چیت نہ کی۔ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ سامنے چٹیل میدان تھا جس میں بگولے منڈلا رہے تھے۔ کہیں کہیں کیکر کی جھاڑیاں تھیں، جو سایوں کی مانند دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ ریل گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی لوہے کی پٹڑیوں پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔

کوٹ ادو آ گیا۔ ریل گاڑی اسٹیشن کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گئی۔ پلیٹ فارم پر بھاگ دوڑ مچی تھی۔ طرح طرح کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ڈبے کے چند مسافر دروازہ کھول کر نیچے اتر گئے۔ کچھ نئے مسافر سوار ہوئے اور اپنا سامان ادھر ادھر رکھنے لگے۔ مرزا اسرار بیگ کا ملازم بھی ڈبے میں داخل ہوا۔ وہ بھی ادھیڑ تھا۔ ملگجا لباس، چہرے پر چھدری ڈاڑھی۔ سر پر دوپلی سفید ٹوپی۔ کندھے پر چار خانے کا رومال۔ وہ پریشان اور گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

مرزا نے اسے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ "تم آ گئے۔"

"سرکار! آپ نے کھانا تو ابھی نہیں کھایا۔" ملازم نے ناشتے دان پر نظر ڈالی۔

"میاں عبدل، تم بھی کمال کرتے ہو۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا کہ تم آؤ، کھانا لگاؤ۔ مگر تم نے تو پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔ نہ آتے تو خود ہی کھانا نکالنا پڑتا۔"

"ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔ معافی چاہتا ہوں۔" عبدل نے عاجزی سے صفائی پیش کی۔ "میں تو ہر اسٹیشن پر حاضری دیتا۔ مگر کیا کروں، جگہ دور کے ڈبے میں ملی ہے۔ چھوٹے اسٹیشنوں پر تو گھڑی بھر کے لیے گاڑی ٹھہرتی ہے۔ ڈرتا ہوں بھاگ دوڑ میں کہیں ٹرین نہ چھوٹ جائے۔ مجھے اپنی نہیں آپ کی تکلیف کی فکر تھی۔"

"اچھا اب تم باتیں کم کرو۔" مرزا اسرار بیگ نے اسے جھڑکا۔ "کھانا لگاؤ۔ سخت بھوک لگی

ہے۔"

عبدل نے فورا حکم کی تعمیل کی۔ ٹوکری سے زرد رنگ کا چھپا ہوا چھوٹا سا دسترخوان نکالا، مرزا اسرار اور رحیم داد کے درمیان نشست پر بچھایا۔ فرش پر بیٹھ کر ناشتے دان کھولا۔ اور دسترخوان پر کھانا چن دیا۔ کھانے میں پراٹھے تھے۔ بھنا ہوا مرغ تھا۔ کباب تھے۔ آلو کا سالن تھا۔ بھنڈی کی بھجیا تھی۔ آم کا اچار تھا۔

عبدل نے گلاس میں ہاتھ دھونے کا پانی دیا۔ مرزا اسرار بیگ اور رحیم داد نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر پانی سے دھوئے اور کھانے کی جانب رجوع ہو گئے۔ کھانا وافر تھا۔ مرغن تھا اور خوش ذائقہ بھی تھا۔ دونوں رغبت سے کھانا کھانے لگے۔ عبدل نے ٹوکری سے آم نکالے اور ایک پلیٹ میں کاٹ کاٹ کران کی قاشیں رکھنے لگا۔

مرزا اسرار بیگ اصرار کر کے رحیم داد کو کھانا کھلانے لگا۔ پلیٹ اس کی جانب سرکاتا۔ بار بار کھانے کے لیے کہتا۔ رحیم داد نے بھی تکلف سے کام نہ لیا۔ خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔

دونوں کھانے سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ گارڈ کی سیٹی ابھری۔ عبدل نے جانا چاہا تو مرزا اسرار بیگ نے اسے روک لیا۔ "اب کھانا کھلا کر ہی جانا۔ اگلے اسٹیشن پر اتر کر اپنے کمپارٹمنٹ میں چلے جانا۔"

"جو حکم سرکار کا۔" عبدل نے نہایت ادب سے جواب دیا۔

ریل گاڑی شور مچاتی آگے بڑھی۔ رفتہ رفتہ اس کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ کوٹ اڈو کا اسٹیشن، مکانات اور کوچہ و بازار پیچھے رہ گئے۔ رحیم داد اور مرزا اسرار بیگ کھانے سے فارغ ہوئے تو عبدل نے بچا ہوا کھانا اٹھا کر ایک طرف رکھا۔ آم کی قاشوں سے بھری ہوئی پلیٹ دسترخوان پر رکھ دی۔ مرزا نے پلیٹ اٹھائی اور رحیم داد کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔ "چودھری صاحب، یہ آم ملاحظہ فرمائیے۔ میرے اپنے باغ کے ہیں۔ میں نے باغپت اور ملیح آباد سے خاص طور پر آم کے پودے منگوا کر لگائے ہیں۔ آپ کو ضرور پسند آئیں گے۔"

رحیم داد کو آم پسند بھی آئے، عمدہ اور خوش ذائقہ تھے۔ حالانکہ اس نے کچھ زیادہ ہی کھانا کھایا تھا۔ مگر آم اس قدر لذیز تھے کہ وہ ہاتھ نہ روک سکا۔ ایک کے بعد دوسری قاش اٹھاتا رہا۔ مرزا اسرار بیگ خوش خوراک تھا۔ وہ بھی رغبت اور ذوق و شوق سے آم کھاتا رہا۔ پلیٹ خالی ہو گئی تو عبدل نے اور آم نکالے۔ مگر رحیم داد نے منع کر دیا۔ مرزا اسرار کے اصرار کرنے کے باوجود آم کھانے پر آمادہ نہ ہوا۔

دونوں نے ایک بار پھر کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر دھوئے۔ برف کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیا اور ٹانگیں پھیلا کر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ عبدل نے دسترخوان اٹھایا۔ جھاڑا اور تہ کر کے ٹوکری میں رکھ دیا۔ جھوٹے برتن اٹھا کر دھونے کی غرض سے غسل خانے میں چلا گیا۔ واپس آ کر اس نے برتنوں کو بھی ٹوکری میں رکھا اور بچا کھچا کھانا لے کر ایک گوشہ میں بیٹھ کر کھانے لگا۔

مرزا اسرار بیگ آنکھیں بند کیے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ رحیم داد بھی اونگھ رہا تھا۔ ریل گاڑی کھٹ کھٹ کرتی لوہے کی پٹڑیوں پر سرپٹ دوڑتی رہی۔ ایک چھوٹا اسٹیشن آیا۔ گاڑی رکی۔ عبدل اترا اور اپنے ڈبے کی جانب چلا گیا۔ مرزا اسرار نے کھڑکی سے گردن نکال کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔

ریل گاڑی آگے بڑھی۔ اور تیزی سے دوڑنے لگی۔ گرمی اب اور بڑھ گئی تھی۔ مرزا نے پانوں کی ڈبیا اٹھائی۔ کھولی اور رحیم داد کی جانب بڑھائی۔ مسکرا کر کہا۔ "لیجیے پان سے شوق فرمائیے۔"

رحیم داد نے انکار کر دیا۔ "نہیں جی، میں پان نہیں کھاتا۔" مرزا نے مزید اصرار نہیں کیا۔ ڈبیا سے ایک پان نکال کر منہ میں رکھا۔ بٹوہ کھولا۔ چھالیا اور تمباکو نکالی۔ چٹکی بھر کر منہ میں ڈالی۔

چند لمحے تک وہ پان چباتا رہا۔ پھر کھڑکی سے منہ باہر نکال کر پیک تھوکی۔ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ "چودھری صاحب، آپ کہاں جا رہے ہیں۔"

"میں نے جی لہور جانا ہے۔"

"آپ کا تو خاصا لمبا سفر ہے۔" مرزا نے مسکرا کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ "کبھی آپ کا کراچی آنا نہیں ہوتا؟"

"نہیں جی، میں اب تک کراچی نہیں گیا۔" رحیم داد نے سادگی سے جواب دیا۔

"میرا مستقل قیام کراچی ہی میں رہتا ہے۔" مرزا اسرار بیگ نے بتایا۔ "پہلے جمشید روڈ پر رہتا تھا۔ وہاں مجھے ایک کوٹھی الاٹ ہوئی تھی۔ کئی سال اس میں مقیم رہا۔ پھر اسے فروخت کر دیا۔"

باتوں کی رو میں اسے بالکل یاد نہ رہا کہ کچھ ہی دیر پہلے وہ متروکہ مکانات اور دکانیں الاٹ کرانے اور انھیں فروخت کر کے نئے الاٹمنٹ حاصل کرنے کے رجحان کی شدید مذمت کر چکا تھا۔

"اب آپ کہاں رہتے ہیں جی؟"

"اب تو میں اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ رہتا ہوں۔" مرزا نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "وہ سرکاری افسر ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں اس نے پچھلے ہی سال اپنا بنگلہ تعمیر کرایا ہے۔ نہایت خوبصورت اور عالیشان ہے۔ آپ اسے دیکھ کر خوش ہوں گے۔" اس نے ایک بار پھر پان کی پیک تھوکی۔

"ویسے ہندوستان میں میری جو کوٹھی تھی، وہ بھی کم شاندار نہ تھی۔ زمین داری بھی بہت بڑی تھی۔ پورے تین گاؤں تھے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "سب کچھ چھوٹ گیا۔ خواب وخیال ہو گیا۔"

"ہاں جی، سب ہی کچھ چھوٹ گیا۔" رحیم داد نے اس کی تائید کی۔

"کراچی آیئے تو غریب خانے پر ضرور تشریف لایئے۔ بلکہ میرے ساتھ ہی قیام کیجئے۔" مرزا نے کہا۔ "میں رخصت ہونے سے پہلے آپ کو اپنا پتہ اور ٹیلی فون نمبر دے دوں گا۔ کراچی آنے کا جب بھی ارادہ ہو تو ٹیلی فون کر دیجئے گا یا تار سے مطلع کر دیجئے گا۔ اسٹیشن پر اپنی کار بھیج دوں گا۔ آپ کو مطلق زحمت اٹھانا نہ پڑے گی۔"

"کراچی آؤں گا تو جی آپ کو ضرور تار بھیج دوں گا۔"

"ضرور آیئے۔ اب آپ سے ملاقات ہو گئی ہے تو اسے برقرار بھی رہنا چاہیے۔" مرزا نے اصرار کیا۔ "یہ بھی محض اتفاق ہے۔ ورنہ میں عام طور پر فرسٹ کلاس میں ہی سفر کرتا ہوں۔ اس ٹرین میں صرف ایک ہی فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ ہے۔ اور اس کی بھی تمام سیٹیں پہلے ہی سے ریزرو تھیں۔ مجبوراً سیکنڈ کلاس میں سفر کرنا پڑا۔"

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ وہ اس کی گفتگو سے اتنا مرعوب ہو گیا تھا کہ مزید بات چیت نہ کر سکا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ مگر مرزا اسرار بیگ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ کہنے لگا۔ "میرا مشورہ مانیں تو ہمیشہ فرسٹ کلاس ہی میں سفر کریں۔ کرایہ تو زیادہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ مگر سفر آرام و سکون سے گزرنے کے ساتھ ساتھ تعلقات پیدا کرنے اور مراسم بڑھانے کا پورا پورا موقع ملتا ہے۔"

رحیم داد کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ وہ بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ مرزا اسرار بیگ فوراً تاڑ گیا۔ مسکرایا اور کھل کر بتانے لگا۔ "چودھری صاحب، یہ تو آپ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ زندگی میں اثر و رسوخ پیدا کیے بغیر کام نہیں چلتا۔" اس کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔ "فرسٹ کلاس میں اعلیٰ سرکاری حکام کے علاوہ اسمبلیوں کے ممبروں اور کبھی کبھی تو وزیروں سے بھی مراسم پیدا کرنے کے مواقع مل جاتے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے سفر وسیلہ ظفر۔ میں نے تو بھائی بزرگوں کے اس قول کو گرہ میں باندھ لیا ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنسا۔

رحیم داد بھی ہنسنے لگا۔

چند لمحے خاموشی رہی، پھر مرزا اسرار بیگ کی آواز ابھری۔ اس نے بات چھیڑی۔ "چودھری صاحب، ہندوستان کے کس علاقے سے آپ کا تعلق رہا ہے؟"

"میں جی گورداسپور میں ہوتا تھا۔"

"وہاں تو بڑا خون خرابا ہوا۔ مسلمانوں کا زبردست قتل عام ہوا۔ سکھوں اور ہندوؤں نے بڑے مظالم ڈھائے۔" اس نے اظہار ہمدردی کیا۔ "بھائی، آپ نے تو بہت دکھ اٹھائے ہوں گے۔ بڑی تباہی و بربادی دیکھی ہو گی۔ نہ جانے کیسی کیسی مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھا کر پاکستان پہنچے ہوں گے۔"

"نہ پوچھئے جی کیا کیا دکھ نہ اٹھانے پڑے۔" اس نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "بس کسی نہ کسی طرح ادھر پہنچ ہی گیا۔" رحیم داد نے چوہدری نور الٰہی مرحوم کی اس الم ناک روداد کو سنانے سے اجتناب برتا جسے وہ اپنی ذات سے منسوب کر کے اکثر سناتا تھا اور اس کی بنیاد پر سننے والوں کی ہمدردی حاصل کرتا تھا۔ مگر اب وہ احتیاط سے کام لیتا تھا۔ اور تفصیل میں جانے سے گریز کرتا تھا۔ مرزا اسرار بیگ کو تو وہ قصداً کچھ بتانا نہ چاہتا تھا۔ مرزا کی گفتگو سے یہ تو واضح ہی ہو چکا تھا کہ وہ مہاجر ہے۔ ممکن ہے گورداسپور میں بھی رہ چکا ہو یا وہاں کے کسی ایسے مہاجر خاندان سے واقف ہو، جو چوہدری نور الٰہی مرحوم کا عزیز یا رشتہ دار ہو۔ تفصیلات بتانے میں خطرے کا امکان تھا۔ اور وہ کوئی خطرہ مول لینا نہ چاہتا تھا۔ اس نے چہرے پر افسردگی کے تاثرات پیدا کیے۔ بجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ "اب تو جی ساری باتیں پرانی ہو گئیں۔ کبھی یاد آجاتی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔"

"ہاں، چودھری صاحب، وہ ایک ڈراؤنا خواب ہی تھا۔" مرزا اسرار بیگ نے آہ سرد کھینچی۔ "گھر بار، مال دولت، عزت و ناموس سب کچھ لٹا اور اسے لٹتے ہوئے ان گناہ گار آنکھوں سے دیکھنا بھی پڑا۔" اس کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیل گئے۔ "کاش، یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہتا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ اس نے عینک اتاری۔ رومال سے آنسو پونچھے۔ "چودھری صاحب، ایک بار جب یہ زخم ہرے ہو جاتے ہیں تو کلیجہ کٹنے لگتا ہے۔ ایسی ٹیس اٹھتی ہے کہ ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ بے اختیار دل بھر آتا ہے۔"

رحیم داد اس کا حزن و ملال دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ تسلی دینے کے انداز میں بولا۔ "صبر کریں جی، جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا۔ اب تو صبر ہی کرنا پڑے گا۔"

مرزا اسرار بیگ کھویا کھویا سا بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر افسردگی چھائی تھی۔

☆

اوپر کی نشست پر لیٹا ہوا مسافر اتر کر نیچے آگیا۔ وہ چھریرے بدن کا قد آور جوان تھا۔ وہ سامنے کی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ بش شرٹ کی جیب سے کنگھا نکالا اور سر کے بکھرے ہوئے بالوں کو

درست کرنے لگا۔

مرزا اسرار بیگ نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ وہ نظریں جھکائے خیالات میں غرق تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے گردن اٹھائی۔ رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اور دل گرفتہ ہو کر بولا۔ "چودھری صاحب سچ پوچھے تو پاکستان ہمارے اور آپ کے ایسے لٹے پٹے اور ستم رسیدہ مہاجرین کی قربانیوں سے حاصل ہوا ہے۔" اس کے لہجے میں اچانک جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ "ہم نے سب کچھ لٹا کر اور اپنے پیاروں کے خون کا نذرانہ دے کر یہ نیا وطن بنایا ہے۔"

رحیم داد تو خاموش رہا۔ مگر اس بار سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان کی آواز ابھری۔ وہ الجھے ہوئے بالوں کو کنگھے سے سنوارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "مرزا صاحب، آپ نے بالکل درست فرمایا۔ واقعی آپ نے قیام پاکستان کی جدوجہد میں زبردست قربانیاں دی ہیں۔ میں تو اس کا عینی شاہد ہوں۔"

مرزا اسرار بیگ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ "آپ کی تعریف؟" اس کا لہجہ تیکھا تھا۔

"معاف کیجئے، میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"خاکسار کو صغیر احمد کہتے ہیں۔" اس نے کنگھا جیب میں رکھا۔ "مرزا صاحب، آپ تو شاید مجھے نہ جانتے ہوں۔ مگر میں آپ کی ذات گرامی سے بخوبی واقف ہوں۔ دہرہ دون کا رہنے والا کون آپ سے واقف نہ ہو گا۔ آپ تو بڑی مشہور و معروف شخصیت ہیں۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "میں تو آپ کو اس وقت سے جانتا ہوں، جب آپ ضلع کچہری میں عرائض نویس تھے۔ اور پھر آپ کا وہ دور بھی دیکھا، جب آپ کانگرسی نیتا بن گئے۔ ان دنوں آپ کھادی کا کرتا اور پاجامہ اور بنا چام کی پھٹی ہوئی چپل پہنتے تھے۔ گاندھی ٹوپی لگاتے تھے۔ پنڈت گوبند ولبھ پنت، رفیع احمد قدوائی، حافظ محمد ابراہیم اور ایسے ہی دوسرے بڑے کانگرسی نیتاؤں کی آمد پر پیش پیش ہوتے تھے۔ ان کا سواگت کرتے تھے۔ گلے میں ہار پھول ڈالتے تھے۔ زندہ باد اور جے ہند کے نعرے لگاتے تھے۔"

"میاں اب بس بھی کیجئے۔" مرزا اسرار بیگ نے صغیر احمد کو ٹوکا۔ "خدا معلوم آپ کس کا ذکر لے بیٹھے۔ میرا تو کبھی کانگریس سے تعلق نہیں رہا۔ معلوم ہوتا ہے آپ کو میرے بارے میں مغالطہ ہوا۔"

"مرزا صاحب، آپ کے بارے میں تو ہرگز مغالطہ نہیں ہو سکتا۔" صغیر احمد نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "میں اوپر لیٹا بہت دیر سے آپ کی باتیں سن رہا تھا۔ میں نے تو آپ کی وہ عالیشان کوٹھی بھی دیکھی ہے جو رام گلی کے نکڑ پر واقع تھی۔" وہ بدستور مسکراتا رہا۔ "ممکن ہے وہ کبھی کوٹھی رہی ہو مگر میں نے جسے دیکھا، وہ ایک بوسیدہ مکان تھا۔ جس کی دیواریں کائی سے کالی پڑ چکی تھیں۔

دروازے پر کواڑوں کے بجائے پھٹا پرانا پردہ پڑا رہتا تھا۔ اور اس کا مالک بھی ماتادین حلوائی تھا۔ وہی ماتادین حلوائی جس کی صدر بازار میں بہت بڑی مٹھائی کی دکان تھی۔"

"آپ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔" مرزا اسرار بیگ نے اس بار تلخ لہجے میں مداخلت کی۔ "خدا معلوم آپ کس کا ذکر کر رہے ہیں۔ میرے تو فرشتوں کو بھی پتہ نہیں کہ رام گلی کہاں ہے۔"

"آپ کو پتہ نہیں، مگر مجھے پتہ ہے۔" صغیر احمد اپنی بات پر اڑا رہا۔ "ہاں، یہ پتہ نہیں کہ آپ کی زمیں داری کے وہ پورے تین گاؤں کہاں واقع تھے۔ جن کا آپ ذکر فرما رہے تھے۔ معاف کیجیے، میں نے تو آپ کو ہمیشہ پھٹے حال دیکھا۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر عجز و انکسار کا مظاہرہ کیا۔ "البتہ الیکشن کا زمانہ آپ کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس وقت آپ کا لباس بھی اجلا ہوتا۔ ہر وقت کلے میں پان کا بیڑا دبا ہوتا۔ اور بیڑی کے بجائے سگریٹ سے شوق فرمانے لگے تھے۔ اور جب آپ ضلع کانگریس کمیٹی کے جوائنٹ سیکریٹری بن گئے تب تو آپ کے ٹھاٹھ باٹ اور بھی بڑھ گئے تھے۔ سنا ہے ان دنوں رائے صاحب کنور کنھیا لال کی جانب سے آپ کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا تھا۔ آپ کنور صاحب کو تو اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ وہی جن کے دہرہ دون میں چائے کے باغات تھے۔"

"دیکھیے میاں صاحبزادے، آپ بہت زیادتی فرما رہے ہیں۔" مرزا اسرار بیگ نے خفا ہو کر کہا۔

"مرزا صاحب میں تو کوئی زیادتی نہیں کر رہا ہوں۔" وہ نہایت اطمینان سے بولتا رہا۔ "زیادتی تو آپ نے صرف مجھ سے نہیں بلکہ دہرہ دون کے سارے ہی مسلمانوں کے ساتھ اس وقت فرمائی تھی جب آپ مسلم لیگ کے امیدوار کے مقابلے میں صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑنا چاہتے تھے۔ میں ان دنوں مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن میں تھا اور دوسرے مسلمان طلباء کے ساتھ میں نے آپ کے گھر کے سامنے بھوک ہڑتال بھی کی تھی تاکہ آپ اس ارادے سے باز آجائیں۔"

"بھئی آپ کہاں کی ہانک رہے ہیں؟" اس دفعہ مرزا اسرار بیگ نے درشت لہجے میں کہا۔ "معلوم نہیں آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔ استغفراللہ، کیسا الیکشن، کس کا الیکشن؟ میں نے تو کبھی اسمبلی وسمبلی کا الیکشن نہیں لڑا۔"

"لڑتے تو آپ ضرور۔ کوشش بھی پوری پوری کی تھی۔ مگر کانگریس پارلیمنٹری بورڈ نے ٹکٹ ہی نہیں دیا۔" صغیر احمد نے کہا۔ "سنا ہے، آپ نے تو بورڈ کے فیصلے کے خلاف کانگریس ہائی کمان سے اپیل بھی کی تھی لیکن وہ بھی مسترد ہو گئی۔ اس کے باوجود آپ کی وفاداری میں فرق نہ آیا۔ ان دنوں نیشنلسٹ مسلم کی اصطلاح وضع ہوئی تھی۔ آپ بھی نیشنلسٹ مسلم بن گئے تھے اور کانگرسی امیدوار کے لیے دن رات بھاگ دوڑ کرتے تھے۔" وہ کھلکھلا کے ہنسا۔ "یہ خاکسار اس زمانے

میں طلباء کے اس گروہ میں شامل تھا جس کا کام نیشنلسٹ مسلمانوں کے جلسوں کو درہم برہم کرنا اور ناکام بنانا ہوتا تھا۔" اس نے مرزا اسرار بیگ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "آپ کو تو اچھی طرح یاد ہو گا۔ ایک بار انتخابی جلسے میں زبردست ہنگامہ ہوا۔ لاٹھیاں اور ڈنڈے چلے۔ کرسیاں اٹھا اٹھا کر پھینکی گئیں۔ ایک کرسی آپ کے چہرہ انور پر لگی۔ آپ شاید جلسے کی صدارت فرما رہے تھے۔ کرسی آپ کے چہرے پر ایسی لگی کہ ناک زخمی ہو گئی۔ آپ کو اسپتال جانا پڑا تھا۔"

رحیم داد نے جھٹ مرزا اسرار بیگ کی تکونی اور بد وضع ناک کی جانب دیکھا۔ اور یک لخت دیکھتا رہا۔ غور کرتا رہا کہ ناک پر چوٹ کا نشان بھی ہے۔

صغیر احمد نے رحیم داد کی جانب توجہ نہ دی۔ نہایت اطمینان سے بولتا رہا۔ "مرزا صاحب، آپ اسپتال سے نکلے تو لونڈے لپاڑے آپ کی ناک دیکھتے تھے، اور شرارت سے مرزا سنگھاڑا کا نعرہ لگاتے تھے۔ تب سے آپ کا نام مرزا سنگھاڑا پڑ گیا۔ جدھر نظر اٹھتی دیواروں پر مرزا سنگھاڑا لکھا ہوا نظر آتا۔ آپ کے عجیب و غریب کارٹون بنے ہوتے۔"

"زبان سنبھال کر بات کریں۔" مرزا اسرار بیگ ایک دم پھٹ پڑا۔ غصے سے چہرہ سرخ پڑ گیا۔ "برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" وہ غیظ و غضب کے عالم میں ہانپنے لگے۔ "آپ حد سے تجاوز کرتے جا رہے ہیں۔"

مرزا اسرار کی اونچی آواز سن کر ڈبے میں بیٹھے ہوئے تمام مسافر دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ صغیر احمد کے چہرے سے بھی اب مسکراہٹ اور شگفتگی غائب ہو چکی تھی۔ اس نے تیکھی نظروں سے دیکھا اور تڑپ کر بولا۔ "مرزا صاحب، ان زخموں کو بھی تو یاد کیجئے جو آپ نے ستم رسیدہ مسلمانوں کو محض سیاسی اختلافات کی بنا پر لگائے تھے۔ یاد کیجئے وہ دن جب دہرہ دون میں فسادات کی آگ بھڑکی۔ ہردوار سے شرنارتھیوں کے غول کے غول دہرہ دون پہنچنے لگے اور مقامی ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ مسلمانوں پر حملے کرنے لگے۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کے والنٹیر خنجر اور بلم اٹھائے ہر طرف دندناتے پھرتے تھے۔ مسلمانوں کے خلاف کھلم کھلا اشتعال انگیز نعرے لگاتے تھے۔"

ریل گاڑی پٹڑیوں پر تیزی سے دوڑتی رہی۔ ڈبے کے تمام مسافر صغیر احمد کی جانب دیکھ رہے تھے اور وہ تیکھے لہجے میں بول رہا تھا۔ "مرزا صاحب، آپ کو وہ رات تو یاد ہو گی جب متاثرہ محلوں کے مسلمان کسی نہ کسی طور وائسرے روڈ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ مسلمانوں کا مضبوط گڑھ تھا۔ مگر بلوائیوں کی اس پر نگاہ تھی۔ انھوں نے اس رات حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ تمام تیاریاں مکمل تھیں۔"

"پر حملہ تو جی ہندوؤں اور سکھوں نے کرنا تھا۔" رحیم داد نے مرزا اسرار بیگ کی حمایت میں داخلت کی۔ "مرزا صاحب کو ان کے حملے سے کیا لینا تھا۔"

"سنتے جائیے۔" صغیر احمد نے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ "جب حملے کی اطلاع مسلمانوں کو پہنچی تو ن کا ایک وفد چھپتا چھپاتا کسی نہ کسی طرح مرزا صاحب کے پاس پہنچا۔ درخواست کی کہ مسلمانوں ی جان و مال بچانے کے لیے اعلیٰ حکام سے مدد دلوائی جائے۔ میں اس وفد میں شامل تھا۔ مجھے یاد ہے۔" اس نے مرزا اسرار بیگ کو مخاطب کیا۔ "مرزا صاحب، آپ کو بھی اچھی طرح یاد ہو گا کہ آپ نے کسی قسم کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ جب بار بار گڑگڑا کر فریاد کی۔ دہائی دی تو آپ نے دھتکار دیا تھا۔ اور طنزیہ فرمایا تھا، میرے پاس کیوں آئے ہو؟ پاکستان جاؤ۔ تم نے اپنا پاکستان بنا لیا۔ اب تم کو وہیں اماں ملے گی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ یاد ہے نا آپ کو؟ آپ کو شاید اب یاد نہ رہا ہو۔ مگر مجھے اب تک ایک ایک بات یاد ہے۔ آپ کانگریس کمیٹی کے دفتر میں نہایت آن بان سے کرسی پر بیٹھے تھے اور نہایت اطمینان سے پان چبا رہے تھے۔"

"کیوں مرزا صاحب، یہ سچ کہہ رہے ہیں؟" صغیر احمد کے برابر بیٹھے ہوئے ایک مسافر نے دریافت کیا۔

"بھائی مجھے تو کچھ خبر نہیں۔ انھی سے پوچھو۔" مرزا اسرار بیگ نے صغیر احمد کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آواز میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ "یہ جو کچھ کہیں ٹھیک ہے، میں بوڑھا یہ جوان۔ میں ان کے ساتھ دھینگا مشتی تو کرنے سے رہا۔"

"آگے کیا ہوا جی؟ ہندوؤں اور سکھوں کے حملے کا کیا بنا؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"وہ تو مہاویر تیاگی کو دعا دیجئے کہ انھوں نے ہزاروں مسلمانوں کو اس رات قتل و غارت گری سے بچا لیا۔"

"وہ کون تھے جی؟"

"اس وقت وہ یوپی اسمبلی کے ممبر تھے۔" صغیر احمد نے بتایا۔ "مرزا صاحب کی طرف سے نا امید ہونے کے بعد مسلمانوں کا وفد ان کے پاس پہنچا۔"

"پر وہ تو ہندو تھا۔ وہ کیا مدد کرتا۔" صغیر احمد کے برابر بیٹھے ہوئے مسافر نے اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔

"وہ نہ صرف ہندو ہیں بلکہ کٹر کانگریسی بھی ہیں۔" صغیر احمد نے جواب دیا۔ "انھوں نے وفد کی

باتیں پوری توجہ سے سنیں اور صورت حال کی نزاکت کو بھی محسوس کیا۔ اسی وقت ایس پی کو فون کیا۔ وہ سکھ تھا اور نہایت متعصب سکھ تھا۔ اس نے پولیس کی امداد مہیا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ مگر تیاگی جی نے حوصلہ نہ ہارا۔ ڈپٹی کمشنر سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی متعصب ہندو تھا۔ اس نے کسی قسم کی مدد دینے کے بجائے الٹا تیاگی کو طعنہ دیا۔ کہنے لگا۔ پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کا جو قتل عام ہو رہا ہے ان کی آپ کو کوئی فکر نہیں۔ یہاں کے مسلمانوں کا بڑا غم ہے۔"

"تب تو تیاگی بھی کچھ نہ کر سکا ہو گا۔" ایک مسافر نے تبصرہ کیا۔

"نہیں جناب، تیاگی جی نے تب بھی ہتھیار نہ ڈالے۔ بڑی جرات کا مظاہرہ کیا۔" صغیر احمد نے بتایا۔ "انھوں نے غصے سے ڈپٹی کمشنر کو ڈانٹا۔ چیخ کر کہا۔ میں تم کو معطل کرتا ہوں اور شہر کا انتظام اسی وقت سے اپنے ہاتھ میں لیتا ہوں۔ انھوں نے کیا بھی ایسا ہی۔ فوراً اپنی جیپ نکالی۔ کانگریس کے کچھ والنٹیر اپنے ساتھ لیے۔ وفد کے ممبروں کو دوسری جیپ میں بٹھایا۔ ایس پی کو بھی معطل کیا۔ جس تھانے دار نے انکار کیا اسے بھی فوراً معطل کیا۔ پولیس کی ایک مسلح جمعیت اپنے ساتھ لی۔ جیپ پر لاؤڈ اسپیکر نصب کرایا۔ واٹسرے روڈ پہنچے۔ مسلمانوں کو اطمینان دلایا۔ وہاں سے اس علاقے میں گئے جہاں حملے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ لاؤڈ اسپیکر پر ان کو خبردار کیا کہ اگر کسی نے گڑ بڑ کی تو اس کو سخت سزا دی جائے گی۔ ضرورت پڑی تو فائرنگ بھی کی جائے گی۔ ذرا بھی کسی بلوائی کے ساتھ رعایت نہیں ہو گی۔"

"اس کا کیا نتیجہ نکلا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"ہوا یہ کہ بلوائی ڈر گئے۔ اور ایسے ڈرے کہ دوبارہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔" صغیر احمد نے بتایا۔ "مگر بعد میں مسلمانوں کے لیے حالات خراب ہی ہوتے گئے۔" اس نے مسکرا کر مرزا اسرار بیگ کی جانب دیکھا۔ "یہاں تک کہ مرزا صاحب کو بھی ہندوستان چھوڑ کر پاکستان آنا پڑا۔ ان کے بڑے صاحبزادے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ سنا ہے وہ کلیم افسر ہیں۔ کیوں مرزا صاحب میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

"میں تو یہی کہوں گا کہ آپ غلط فہمی کا شکار ہیں۔" مرزا اسرار بیگ نے ہٹ دھرمی سے کام لیا۔ اس نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی غرض سے پوچھا۔ "اچھا اب اس قضیئے کو چھوڑیے، یہ بتایئے آپ کا شغل کیا ہے؟"

مرزا اسرار بیگ نے جھنپ مٹانے کے لیے مسکرانے کی کوشش کی۔ مگر صغیر احمد مطلق متاثر نہ

اس کا لہجہ بدستور طنزیہ تھا۔ "آپ مطلق پریشان نہ ہوں۔ نہ میں سی آئی ڈی میں ہوں نہ میرا بں سے تعلق ہے۔ میں محکمہ زراعت سے وابستہ ہوں۔ سیکنڈ کلاس میں دیکھ کر آپ میرے ے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ میں معمولی سرکاری ملازم ہوں۔ تھل ڈیولپمنٹ جیکٹ کے سلسلے میں ریگ زار کی خاک چھانتا پھرتا ہوں۔ عام طور سے تھرڈ کلاس میں سفر کرتا یا کبھی کبھار انٹر میں۔ آج تھرڈ اور انٹر کلاس میں جگہ نہ مل سکی تو سیکنڈ کلاس میں بیٹھ گیا۔ ت بھر کا جاگا ہوا بھی تھا۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ "بہرحال آپ کو کسی طور بان ہونے کی ضرورت نہیں۔ متروکہ جائیداد کی لوٹ مار اتنی عام ہے کہ کس کس کو جعلی فرد ت، جعلی کلیم اور جعلی الاٹمنٹ حاصل کرنے کا الزام دیا جائے۔ جس کا موقع لگتا ہے مطلق ں چوکتا۔ کیا مہاجر کیا مقامی، اس حمام میں سب ننگے ہیں۔"

اس کی باتیں سن کر رحیم داد کا چہرہ بھی فق ہو گیا۔ وہ گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ مرزا رار بیگ نے بھی کوئی تبصرہ نہ کیا۔ خاموشی سے اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔ صغیر احمد اٹھا اور دروازہ ول کر غسل خانے میں چلا گیا۔

رحیم داد نے آنکھیں بند کر لیں اور ٹانگیں کسی قدر پھیلا دیں۔ نیند کا غلبہ ہوا۔ وہ ریل گاڑی ے جھٹکوں کے ساتھ آہستہ آہستہ جھومنے لگا۔ ایک بار نیند کا ایسا جھونکا آیا کہ اس کا سر کھڑکی سے را گیا۔ رحیم داد نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

مرزا اسرار بیگ اس کی جانب دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ رحیم داد خفیف ہو کر آنکھیں ملنے لگا۔

مرزا اسرار بیگ نے مشورہ دیا۔ "چودھری صاحب، آپ کو نیند معلوم ہو رہی ہے۔ اوپر جا کر طمینان سے سو جائیے۔ یہاں آپ بے چین رہیں گے۔"

رحیم داد نے اس کا مشورہ قبول کر لیا۔ جوتے اتارے اور اوپر کی نشست پر چلا گیا۔ قمیص اتار ر کھونٹی پر ٹانگ دی۔ مرزا اسرار بیگ سے تکیہ لے کر سرہانے رکھا اور ٹانگیں پسار کر اطمینان ے لیٹ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر چھت سے لگے ہوئے پنکھے کا رخ بھی اپنی طرف کر لیا۔ کچھ دیر نکھیں بند کیے خاموش پڑا رہا، پھر سو گیا۔

☆

ریل گاڑی شور مچاتی کھٹ کھٹ کرتی دوڑتی رہی۔ اسٹیشن آتے رہے، جاتے رہے۔ ریل گاڑی ٹھیرتی، اور پھر آگے بڑھ جاتی۔ مسافر اترتے رہے، سوار ہوتے رہے۔ لیہ کا اسٹیشن آیا تو غیر احمد نے اپنا اٹیچی کیس سنبھالا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

مرزا اسرار بیگ خاموش بیٹھا تھا۔ صغیر احمد نے اس کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر ایک بار پھر اسے چھیڑا۔ کھنکار کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ "مرزا سنگھاڑا!" وہ کھل کر مسکرایا۔ "معاف کیجئے، مرزا اسرار بیگ صاحب اگر کوئی گستاخی ہوگئی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔"

مرزا اسرار بیگ نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ صغیر احمد آگے بڑھا اور ڈبے سے نکل کر باہر پلیٹ فارم پر آگیا۔ وہ آہستہ آہستہ اسٹیشن کی عمارت کی جانب بڑھنے لگا۔ مرزا اسرار بیگ اسے دور تک دیکھتا رہا۔

ریل گاڑی آگے بڑھ گئی۔ مرزا اسرار بیگ خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھائی تھی۔ اس نے نہ کسی مسافر کی جانب دیکھا نہ کسی سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ صغیر احمد نے اس کے ذہن میں کھلبلی برپا کر دی تھی۔

رحیم داد اوپر کی نشست پر بے خبر سوتا رہا۔

دن ڈوبا رات ہوگئی۔ ہر سو اندھیرا پھیل گیا۔ مرزا اسرار بیگ نے رحیم داد کو آہستہ آہستہ جھنجھوڑا۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ مرزا نے مسکرا کر کہا۔ "چودھری صاحب بہت سو چکے ہیں۔ رات ہوگئی۔ اٹھئے کھانا کھا لیجئے۔" رحیم داد آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا نشست سے نیچے اترا۔ قمیص کھونٹی سے اتار کر پہنی اور غسل خانے میں چلا گیا۔

رحیم داد منہ ہاتھ دھو کر باہر آیا اور مرزا اسرار بیگ کے برابر بیٹھ گیا۔ اس کا ملازم عبدل موجود تھا۔ اس نے کھانا لگا دیا۔ رحیم داد نے کھانا کھاتے ہوئے ڈبے میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ مسافروں میں اب نئے چہرے نظر آ رہے تھے۔ پرانے غائب تھے۔ صغیر احمد بھی اسے دکھائی نہ دیا۔ رحیم داد نے مرزا اسرار بیگ سے دریافت کیا۔ "وہ بندہ چلا گیا؟ میرا مطلب ہے صغیر احمد گیا؟"

"جی ہاں، وہ مردود دفان ہوگیا۔" مرزا نے جل کر کہا۔ "لیہ پر اتر گیا۔ عجب نا معقول شخص تھا۔"

"ہاں جی، چنگا بندہ نہیں تھا۔" رحیم داد نے تبصرہ کیا۔

"سخت واہیات شخص تھا۔ نہایت لپاڑیا۔" مرزا اسرار بیگ غصے سے بل کھاتے رہے اور صغیر احمد کو برا بھلا کہتے رہے۔ "خدا معلوم یہ خبیث کہاں سے نازل ہوگیا۔"

"آپ کی جی اس کے ساتھ کب کی جان پہچان ہے؟"

"توبہ کیجئے چودھری صاحب، میں نے تو اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ خدا دوبارہ نہ دکھائے۔" مرزا اسرار بیگ نے صفائی پیش کی۔ "مجھے تو حیرت اس کی ڈھٹائی پر ہے۔ کس دھڑلے سے جھوٹ پر جھو

رہا تھا۔ طرح طرح کے الزام لگا رہا تھا۔ نہ میں کبھی دہرہ دون میں رہا نہ کبھی میرا کانگریس سے رہا۔ میں تو پانی پت کا رہنے والا ہوں۔ وہیں سے لٹ پٹ کر پاکستان آیا۔"

"آپ نے جی اسے صاف صاف یہ گل بات بتائی کیوں نہیں؟" رحیم داد نے لقمہ چباتے ہوئے نت کیا۔

"چودھری صاحب، اس نا معقول نے مجھے بولنے کا موقع ہی کب دیا۔ برابر اپنی ہی ہانکتا رہا۔" ار بیگ نے جھنجلا کر کہا۔ "اس کے جھوٹے الزامات کا تو صرف ایک ہی جواب تھا اور وہ یہ تھا جوتا اٹھا کر اس کی چندیا پر تڑا تڑ لگائے جاتے۔ ساری شتشول بازی نکل جاتی۔ مگر ہاتھا پائی میں ان کس کا ہوتا۔ مجھے تو وہ کوئی اوباش اور چڑ قناتیا لگتا تھا۔ اس کا کچھ نہ جاتا۔ اس کی عزت ہی ہے جو جاتی۔ شریف آدمی تو شرافت میں مارا جاتا ہے۔ اسی لیے خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔"

"اس نے تو جی بہت بکواس کی۔"

"طبیعت ایسی مکدر کر دی کہ کھانا کیا کھا رہا ہوں، زہر مار کر رہا ہوں۔" مرزا اسرار بیگ نے اپنے رنج و غصے کا اظہار کیا۔ "غضب خدا کا، کیسے کیسے نازیبا الزامات لگائے۔ اور کس ڈھٹائی سے ے جن کا نہ سر نہ پیر۔"

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ صغیر احمد کے بارے میں جلی کٹی سناتا رہا۔ اپنے دل کی ں نکالتا رہا۔ رحیم داد بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ مرزا کے ملازم، عبدل نے جھوٹے برتن کر صاف کیے۔ ٹوکری میں حفاظت سے رکھے۔ ناشتا دان بند کیا۔ اسٹیشن آیا تو وہ اپنے ڈبے کی چلا گیا۔

وقت گزرتا رہا۔ رات تاریک ہوتی گئی۔ مرزا اسرار بیگ نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چودھری ب، خوشاب تک تو آپ کا ساتھ رہے گا۔ آپ سرگودھا کے راستے لاہور جائیں گے نا؟"

"نہیں جی، میں اس راستے سے نہیں جاؤں گا۔" رحیم داد نے انکار میں گردن ہلائی۔ حالانکہ وہ ارشہ زور مزاری کے ہم راہ اسی راستے سے آیا تھا۔ واپس بھی اسی راستے سے جانا چاہتا تھا۔ روانگی سے قبل اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ کہنے لگا۔ "میں تو جی پنڈی جاؤں گا۔ وہاں سے لہور لیے ٹرین پکڑوں گا۔"

"بہرحال کندیاں تک تو ساتھ رہے گا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "آپ کے ساتھ بہت اچھا نہ گزرا۔"

رحیم داد نے اس کی تائید کی۔ بلاشبہ مرزا اسرار بیگ کے ساتھ اس کا سفر نہ صرف اچھا گزرا تھا

بلکہ بڑے آرام سے گزرا تھا۔ کھانے پینے کے علاوہ اسے مرزا سے ہر طرح کی سہولت ملی تھی۔

کندیاں آگیا۔ عبدل ڈبے میں قلی کے ہم راہ داخل ہوا۔ اس نے تمام سامان باہر نکالا۔ مرز اسرار بیگ رخصت ہوتے ہوئے رحیم داد سے بغل گیر ہوا۔ مگر نہ اس نے اپنا کراچی کا پتہ دیا او نہ ہی رحیم داد نے طلب کیا۔ مرزا اسرار بیگ ڈبے سے نکل کر باہر گیا تو رحیم داد بھی اس کے سا پلیٹ فارم پر گیا۔

☆

ریل گاڑی آگے روانہ ہوئی تو ڈبے میں صرف دو مسافر رہ گئے۔ مگر داؤد خیل پر وہ بھی اتر گئے ڈبا اب بالکل خالی رہ گیا تھا۔ رات ڈھل چکی تھی۔ مگر رحیم داد کو نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ سہ پہ بہت دیر تک گہری نیند سو چکا تھا۔ رحیم داد کچھ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر اٹھ کر گیا۔

ڈبے میں اندھیرا تھا۔ رحیم داد نے بستر پر لیٹنے سے قبل تمام بتیاں بجھا دی تھیں۔ صرف خانے کی بتی روشن تھی۔ جس کی مدھم روشنی دروازے میں لگے ہوئے شیشے سے چھن چھن کر آرہی تھی۔ مگر یہ روشنی اتنی کم تھی کہ ایک زرد دھبے کی مانند نظر آتی تھی۔

رحیم داد کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ریل گاڑی اندھیرے میں دوڑتی رہی۔ کسی بستی کے نزد سے گزرتی تو دور سے چراغوں کی روشنی جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتی ہوئی معلوم ہوتی۔ بستی قریب تو روشنیوں کی جگمگاہٹ تیز ہو جاتی اور آن کی آن میں گزر کر پیچھے رہ جاتی۔

گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی۔ رحیم داد اتر کر پلیٹ فارم پر چلا گیا۔ ریل گاڑی کچھ دیر وہاں تھی۔ رحیم داد ٹہلتا ہوا انجن تک چلا گیا۔ گارڈ کی سیٹی چیخی تو وہ چونکا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ڈبے کی طرف چلا۔ اس کا ڈبا بہت پیچھے تھا۔ رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ گاڑی میں حرکت پیدا تو وہ اور زیادہ پریشان ہوا۔ اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ اب گاڑی کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ مگر داد اچھل کر پائیدان پر قدم جمانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے ہینڈل دوسرے سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

ڈبے میں اندھیرا چھایا تھا۔ رحیم داد نے دروازہ بند کیا۔ چٹخنی چڑھائی اور دروازے سے کر زور زور سے ہانپنے لگا۔ اس کی سانس ہنوز پھولی ہوئی تھی۔ اوسان بجا نہ تھے۔

جب ذرا قرار آیا اور آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو اسے اپنے قریب سرسر محسوس ہوئی۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ تمام نشستیں خالی تھیں۔ وہ حیران د

وازے کے قریب کھڑا تھا۔ یکایک دھندلی روشنی میں ایک سایہ لہرایا۔ رحیم داد نے سراسیمہ ہو کر ہا۔ چند قدم کے فاصلے پر کوئی کھڑا تھا۔ رحیم داد خوف زدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ نہ بولا نہ رحیم داد۔ دونوں اپنی اپنی جگہ بت بنے کھڑے تھے۔

رحیم داد نے خود کو سنبھالا۔ ہمت سے کام لیا۔ آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھایا۔ سوئچ ٹٹولا اور چھت پر ہوا بلب روشن کر دیا۔ ڈبے میں روشنی پھیل گئی۔ رحیم داد دم بخود رہ گیا۔ حیرت سے آنکھیں اڑ کر دیکھا۔ جمال دین‘ ایک نشست کا سہارا لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ رحیم داد نے پہلی ہی ظر میں اسے پہچان لیا۔ اس کا لباس میلا کچیلا اور بوسیدہ تھا۔ پگڑی گلے میں پڑی تھی۔ سر کے بال ھرے ، ے تھے اور خاک دھول سے اٹے تھے۔ حجامت بڑھی ہوئی تھی۔ چہرہ ستا ہوا تھا‘ اور بالا ٹھیالا نظر آرہا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورتے رہے۔ جمال دین کو دیکھ کر رحیم ا سخت سراسیمہ ہو گیا تھا۔ اس کا خدشہ بیجا بھی نہ تھا۔ جمال دین اس کا بچپن کا ساتھی تھا۔ لنگوٹیا رتھا۔ دونوں ایک ہی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے اور ایک ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ وان ہو کر بھی ان کی یاری دوستی قائم رہی۔ وہ ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے۔ ایک دوسرے کی ہر لرح مدد بھی کرتے۔ زمین کی وٹ بندی پر جب رحیم داد کا سیف اللہ اور اس کے بھائیوں کے ساتھ مسلح تصادم ہوا تو یہ جمال دین ہی تھا جس نے کلہاڑی سنبھال کر رحیم داد کا ساتھ دیا تھا۔ جم کر قابلہ کیا تھا۔ زخمی ہوا تھا اور رحیم داد کے ساتھ ہی جیل بھی گیا تھا۔ بعد میں وہ ضمانت پر رہا ہو گیا ور اقدام قتل کے مقدمے میں بری بھی ہو گیا تھا۔ رحیم داد کو سزا ہو گئی۔ وہ جیل ہی میں رہا۔

اب ایک طویل مدت کے بعد وہ آمنے سامنے کھڑے تھے۔ رحیم داد نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی کہ جمال دین نے اسے پہچان تو نہیں لیا۔ اس نے اجنبیت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کون ہے و؟“

جمال دین نے کوئی جواب نہ دیا۔ نظریں اٹھائے رحیم داد کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

رحیم داد نے خبردار کرنے کے انداز میں کہا۔ ”تجھے پتہ نہیں یہ سیکنڈ کلاس ہے۔ اس کا کرایہ بت زیادہ ادا کرنا ہو گا۔“ اس نے لہجے میں نرمی پیدا کی۔ ”اگلے سٹیشن پر اتر جانا۔“

”یں نے جہاں اترنا ہو گا اپنی مرضی سے اتروں گا۔“ جمال دین نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تو مجھے روکنا والا کون؟ تو کوئی ٹکٹ بابو لگا ہے؟ جیسے تو مسافر ویسے میں۔“

رحیم داد نے اس کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ مگر وہ یہ بھی نہ چاہتا تھا

کہ وہ موجود رہے اور خطرہ بن کر اس کے سر پر مسلسل منڈلاتا رہے۔ اس دفعہ اس نے دھمکی سے کام لیا۔ "تجھے اترنا پڑے گا۔ تو اس ڈبے میں نہیں سفر کر سکتا۔ میں زنجیر کھینچ کر ٹرین رکوا لوں گا۔" اس نے زنجیر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

جمال دین نے جھٹ دھوتی کے ڈب سے چاقو نکالا اور اسے کھول کر زور سے چیخا۔ "ٹھہر جا۔"

رحیم داد کھلا ہوا چاقو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔

رحیم داد نے سہمی ہوئی نظروں سے جمال دین کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی جھلک رہی تھی۔ چہرے پر دحشت طاری تھی۔ وہ ہاتھ میں چاقو دبائے ڈراؤنا اور خوف ناک نظر آ رہا تھا۔ رحیم داد سنبھلا بھی نہ تھا کہ جمال دین اچھل کر تیزی سے اس پر جھپٹا۔ اس نے چاقو سے وار کیا۔ رحیم داد جھپاک سے ایک طرف ہٹ گیا۔ جمال دین اپنے ہی حملے کے زور میں لڑکھڑا کر آگے نکل گیا۔ چاقو کا پھل دروازے سے ٹکرا کر لکڑی میں اتر گیا۔

جمال دین لکڑی میں پھنسے ہوئے چاقو کو جھٹکا دے کر نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ رحیم داد ا اثناء میں سنبھل چکا تھا۔ وہ پلٹا اور جھپٹ کر پشت کی جانب سے جمال دین کو دونوں ہاتھوں م دبوچ لیا۔ جمال دین گھبرا گیا۔ چاقو پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ مڑا اور رحیم داد کے ہاتھوں کے شکنجے سے نکلنے کے لیے زور آزمائی کرنے لگا۔ دیکھنے میں وہ دبلا پتلا تھا، مگر ہاتھ پیروں میں کس بل تھا رحیم داد کے لیے اسے قابو میں رکھنا آسان نہ رہا۔ اس نے بھی پوری قوت صرف کر دی۔ دیر ت کشمکش جاری رہی۔ آخر جمال دین اس کی پکڑ سے خود کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔

مگر رحیم داد نے اس سے قبل کہ جمال دین سنبھلے نہایت چابک دستی سے چاقو کے دستے کو تھ لیا۔ زور لگا کر اسے کھینچا۔ چاقو اب اس کے ہاتھ میں تھا۔ جمال دین جھپٹنے کے لیے پلٹا تو رحیم چاقو ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا۔ دونوں ہانپ رہے تھے۔ لیکن جمال دین اب کمزور پڑ چکا تھا۔ وہ نہ اور رحیم داد کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپتا رہا اور قہر آلود نظروں سے رحیم کو گھور رہا تھا۔

"تو ڈکیتی کے ارادے سے آیا تھا؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"نہیں۔" جمال دین نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میں نے چوری ڈکیتی کبھی نہیں کی، میں ایسا کام نہیں کرتا۔"

"کسی کا خون کر کے بھاگا ہے؟" رحیم داد نے سوال کیا۔

جمال دین کے چہرے پر چھائی ہوئی جھنجلاہٹ غائب ہو گئی۔ آنکھوں سے گھبراہٹ جھلکنے لگ

خاموش کھڑا رہا۔ اس دفعہ رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔ "صاف صاف بتا۔" اس نے ایک بار پھر دھمکی دی۔ "ورنہ میں زنجیر کھینچ کر گاڑی روک لوں گا۔ تجھے فرار ہونے بھی نہیں دوں گا۔ گرفتار کرا دوں گا۔" اس نے جمال دین کو خائف کرنے کی غرض سے زنجیر کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

"زنجیر نہ کھینچ۔" اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔ "میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے، تو ادھر بیٹھ جا۔" رحیم داد نے ہاتھ کے اشارے سے سامنے کی نشست کی طرف اشارہ کیا۔ "تجھ سے آرام سے گل بات ہو گی۔"

جمال دین آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور رحیم داد کی ہدایت کے مطابق خاموشی سے بیٹھ گیا۔ رحیم داد بھی اپنی نشست پر پہنچا۔ ٹانگیں سمیٹ کر اوپر کیں اور تکیے سے کمر ٹکا کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ چاقو ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔ رحیم داد نے جمال دین کی جانب دیکھا اور لہجے میں بھاری بھرکم پن پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، اب بتا تو کیا واردات کر کے آیا ہے؟"

"کیا کرے گا جان کر۔" جمال دین نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے کوئی واردات کی بھی ہے تو تجھے اس سے کیا لینا۔" اس کی آواز کا تیکھا پن پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اب اس میں التجا کا پہلو نمایاں تھا۔ "تو پریشان نہ ہو۔ میں نے یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا۔ اگلے ٹیشن پر اتر جاؤں گا۔"

"تجھے کہاں جانا ہے؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"مجھے خود پتہ نہیں کہاں جانا ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "کہیں بھی چلا جاؤں گا۔"

رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا کہ جمال دین جلد سے جلد ڈبے سے باہر چلا جائے۔ وہ بلائے ناگہانی بن کر نازل ہوا تھا اور اس کے لیے مسلسل پریشانی کا سبب بنا ہوا تھا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ بار بار نیند کا غلبہ ہوتا۔ رحیم داد کی آنکھیں بند ہو جاتیں۔ چاقو پر گرفت کمزور پڑ جاتی۔ چاقو اس کے لیے مددگار ہونے کے ساتھ ساتھ خطرے کا باعث بھی تھا۔ اگر جمال دین دوبارہ اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اسے قتل کرنے سے نہ چوکتا۔ اس کی نیت ایسی ہی معلوم ہوتی تھی۔

رحیم داد نے سوچا چاقو تکیے کے نیچے رکھ کر سو جائے۔ مگر خطرہ پھر بھی موجود تھا۔ جمال دین نیند کی غفلت سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ آخر اس نے چاقو سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہا۔ ساتھ ہی جمال دین پر احسان بھی جتایا۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔ جمال دین کی جانب متوجہ ہوا۔ "تو آرام سے سیٹ پر لیٹ جا۔ میں نے تجھے تنگ کر کے کیا لینا۔" اس نے چاقو سامنے کر دیا۔ "تو اس سے ڈر رہا ہے تو میں اسے پھینکے دیتا ہوں۔" اس نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر چاقو ایک گھنی جھاڑی کی طرف

اچھال دیا۔

جمال دین پر رحیم داد کے اس اقدام کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "تو مجھے برا بندہ نہیں لگتا۔" وہ معذرت کرنے لگا۔ "مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں نے بہت برا کیا۔ مجھے تجھ پر حملہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہ گڑگڑانے لگا۔ "تو اجازت دے تو میں یہیں بیٹھا رہوں۔ صبح ہوتے چلا جاؤں گا۔"

"تو نے تو اگلے سٹیشن پر اترنے کو کہا تھا۔" رحیم داد نے اسے چوکنا ہو کر دیکھا۔ "کسی دوسرے ڈبے میں جا کر بیٹھ جا۔"

"چلا تو جاؤں پر ادھر خطرہ ہے۔ کوئی مجھے پہچان لے گا تو گرفتار کرا دے گا۔ تیرا ڈبا خالی تھا تبھی تو اس میں آ گیا۔" جمال دین نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔ "پیدل بھی اب چلنے کی ہمت نہیں۔ کل رات میں حجری میں تھا۔ تب سے برابر پیدل چل رہا ہوں۔ روٹی شوٹی بھی نہیں کھائی۔"

"خون کیا ہے کسی کا؟" رحیم داد نے نرمی سے پوچھا۔ "مجھے صاف صاف بتا دے۔ شاید میں تیری کچھ مدد ہی کر سکوں۔"

"ہاں جی، میں نے خون ہی کیا ہے؟" جمال دین نے دبی زبان سے کہا۔

"کس کا خون کیا؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"میں جی جھنگ میں سید زادوں کے پاس لگا ہوا تھا۔ گھر والی بھی میرے ساتھ تھی۔ اس کا نام بلّو تھا۔ میں اسے اکال گڑھ سے ویاہ کر لایا تھا۔ اس کے ساتھ پہلے سے میری یاری بھی رہ چکی تھی۔ پر اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ میں زمین دار کے کام سے شہر جاتا تو کئی کئی روز ادھر رہتا۔" وہ آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ "میرے پیچھے وہ چھپ چھپ کر باری سے ملتی۔ وہ بھی سید زادوں کا نوکر تھا۔ ایک بار جب میں کئی روز بعد شہر سے لوٹا تو بلّو غائب تھی۔"

"باری کے ساتھ بھاگ گئی تھی؟" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

"ہاں جی، وہ اس کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔" جمال دین نے اعتراف کیا۔ "میں نے بہت تلاش کیا، پر کوئی پتہ نہ چلا۔ یہ کئی مہینے ادھر کی گل ہے۔ پچھلے دنوں مجھے ایک لاری ڈرائیور نے بتایا۔ اس نے باری کو حجری میں دیکھا تھا۔ بلّو بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ مجھے بہت غصہ چڑھا۔ فورا حجری پہنچا۔ پتہ چلا کہ ڈرائیور نے ٹھیک ہی بتایا تھا۔"

"تو بلّو کو واپس لینے تھانے نہیں گیا؟"

"نہیں جی، اسے واپس لے کر کیا کرتا۔ وہ میرے کام کی کہاں رہی تھی۔" اس نے رحیم داد

سے تیکھے لہجے میں کہا۔

"ایسا تھا تو حجری گیا ہی کیوں؟" رحیم داد نے جرح کرنے کے انداز میں سوال کیا۔

"غیرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے جی۔ میں دونوں سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے گیا تھا۔" جمال دین نے کسی قدر جوش سے کہا۔ "آدھی رات تک میں حجری کے نزدیک ایک جھنگر میں چھپا رہا۔ جب ہر طرف سناٹا چھا گیا تو میں پنڈ میں داخل ہوا۔ باری کے گھر پر پہنچا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر ہانک لگائی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔ میں نے دیکھتے ہی اس پر حملہ کیا۔ پورا چاکو اس کے پیٹ میں اتار دیا۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ میں نے دوسرا وار کیا تو اس کی ساری انتڑیاں پیٹ سے نکل کر باہر آ گئیں۔"

"بلّو کا کیا بنا؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"باری نے زخمی ہونے کے بعد شور مچایا تو وہ بھی باہر آ گئی۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ لیا۔ اس نے بہت منت کی۔ پر میں نے اسے نہیں چھوڑا۔ زمین پر گرا کر اس کا گلا کاٹ ڈالا۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "اسی چاکو سے دونوں کا خون کر دیا جو تو نے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔"

"شور شرابے سے پنڈ میں جاگ ہو گئی ہو گی۔"

"ہاں جی بالکل ہو گئی تھی۔" جمال دین نے رحیم داد کو بتایا۔ "کئی بندوں نے تو مجھے پکڑنے کی بھی کوشش کی۔ دور تک میرا پیچھا کیا۔ پر میں کسی نہ کسی طرح نکل بھاگا۔ ان کے ہاتھ نہ لگا۔"

"تو نے ادھر ہی کے کسی سٹیشن سے ٹرین کیوں نہ پکڑی؟" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے استفسار کیا۔ "یہاں تک پیدل کیوں آیا؟"

"ادھر سے ٹرین پکڑنا خطرناک تھا۔" جمال دین نے جواب دیا۔ "واردات کی اطلاع ملتے ہی پولیس نے آس پاس کے ٹیشنوں کی نگرانی شروع کر دی ہو گی۔ میں نوں پتہ ہے پولیس ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہے۔"

"تو بہت ہشیار بندہ لگتا ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "حوصلے والا بھی ہے۔ صاف بچ کر نکل آیا۔"

"ہاں جی، چھپتا لکتا کسی طرح ادھر پہنچ ہی گیا۔ آگے کیا ہو گا، کچھ پتہ نہیں۔" جمال دین نے رحیم داد کو یقین دلایا۔ "میں نے ذرا بھی جھوٹ نہیں بولا۔ تجھے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔"

جمال دین اب مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی وحشت اور پریشانی مٹتی جا رہی تھی۔ آنکھوں کی سرخی بھی کم ہو گئی تھی۔ اس نے ٹانگیں پھیلائیں اور کھڑکی سے ٹیک لگا کر

اطمینان سے بیٹھ گیا۔

رحیم داد نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "اب تو سو جا۔ بہت تھکا ہوا ہے۔ تجھے آرام کی ضرورت ہے۔"

جمال دین خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد نے قمیص اتار کو کھونٹی پر ٹانگی۔ سوٹ کیس کھول کر دھوتی نکالی۔ اور شلوار اتار کر دھوتی باندھنے لگا۔

☆

جمال دین کی آنکھیں یکایک چمکنے لگیں۔ ان میں حیرانی تھی۔ تجسس تھا۔ وہ نظریں اٹھائے رحیم داد کی برہنہ کمر کی جانب غور سے دیکھ رہا تھا۔ رحیم داد کے چہرے کا رخ دوسری جانب تھا۔ اس نے مڑ کر جمال دین کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ دھوتی باندھ کر اس نے شلوار بھی کھونٹی پر لٹکا دی۔

مگر جب وہ پلٹا تو جمال دین نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے میں نے تجھے کہیں دیکھا ہے۔ آواز بھی کچھ پہچانی پہچانی لگتی ہے۔"

رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ مگر اس نے فوراً خود کو سنبھالا۔ لہجے میں بے نیازی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "دیکھا ہو گا۔ پر میں نے تو تجھے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں تیرا نام کیا ہے۔"

"میرا ناں جمال دین ہے۔" اس کی آنکھوں سے تجسس بدستور عیاں تھا۔ "تو کبھی احمد کوٹ میں تو نہیں رہا۔ پہلے میں بھی ادھر ہی ہوتا تھا۔"

"میں نے تو احمد کوٹ کا نام ہی پہلی بار سنا ہے۔" رحیم داد نے جمال دین سے نظریں نہ ملائیں۔ بے زاری سے بولا۔ "بے کار باتیں کر کے اپنا مغز خراب نہ کر' اب تو سو جا۔"

رحیم داد اب اس کے سامنے موجود رہنا نہ چاہتا تھا۔ روشنی بھی نہ چاہتا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کھونٹی پر سے قمیص اتار کر پہنی اور ہاتھ بڑھا کر سوئچ دبا دیا۔ چھت میں لگا ہوا روشن بلب بجھ گیا۔ ڈبے میں اندھیرا پھیل گیا۔ رحیم داد نے اپنی نشست کی جانب بڑھتے ہوئے صفائی پیش کی۔

"میں نے بتی اس لیے بجھا دی کہ اگلے سٹیشن پر ٹرین رکی اور کوئی سیکنڈ کلاس کا مسافر ہوا تو بتی جلتے دیکھ کر اندر آنے کی کوشش کرے گا۔ دروازہ کھٹکھٹائے گا۔ اندھیرا ہوا تو سمجھے گا اندر کے سارے مسافر سو رہے ہیں۔ رات کو سیکنڈ کلاس کے سوتے ہوئے مسافروں کو جگایا نہیں جاتا۔ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے کا ایک یہ بھی فائدہ ہے۔" رحیم داد اپنی نشست پر بچھا ہوا بستر درست کرنے لگا۔ تکیہ اپنی جگہ رکھا۔ جمال دین کی جانب دیکھا۔ "اب تو بیٹھا کیوں ہے؟ سو جا۔"

جمال دین خاموش رہا۔ ٹانگیں سمیٹ کر اوپر کیں۔ ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھا اور اطمینان سے لیٹ گیا۔

رحیم داد بھی بستر پر لیٹ گیا۔ ریل گاڑی ہچکولے کھاتی' فراٹے بھرتی تیزی سے دوڑتی رہی۔ وقت گزرتا رہا۔ رات اور ڈھل گئی۔ رحیم داد نے کروٹ بدلی اور جمال دین کی جانب سے منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ مگر غنودگی اس قدر بڑھی کہ آنکھ لگ گئی۔

یکایک رحیم دا کو کھٹکا معلوم ہوا۔ آنکھ کھل گئی۔ اسے اپنی کمر پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ کوئی اس پر جھکا ہوا رک رک کر سانس لے رہا تھا۔

وہ چند لمحے تو سہا ہوا دم بخود پڑا رہا۔ پھر اس نے کروٹ بدلی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا' دھندلی دھندلی روشنی میں جمال دین اس کے قریب کھڑا ہے۔ اس وقت وہ بہت پراسرار نظر آ رہا تھا۔

"تو یہاں کھڑا کیا کر رہا تھا؟" رحیم داد نے ڈپٹ کر پوچھا۔

جمال دین نے اس کے استفسار کو نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "تو رحیما ہے نا؟" اس کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔

"کون رحیما' کیسا رحیما؟" رحیم داد نے جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔ "میں کسی رحیما شحیما کو نہیں جانتا۔"

مگر جمال دین اس کی برہمی سے ذرا بھی مرعوب نہ ہوا۔ ڈھیٹ بنا کھڑا رہا۔ مسکرا کر بولا۔ "مجھے پتہ ہے تو رحیما ہے۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ تو رحیما ہی ہے۔" اس کا لہجہ نرم اور شگفتہ ہو گیا۔ "رحیمے' تو مجھے صاف صاف بتا دے۔ میں تیرا پرانا یار ہوں۔ کسی کو تیرے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تو مجھ پر بھروسہ رکھ۔" وہ نہایت اطمینان سے سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔

رحیم داد سخت حواس باختہ ہوا۔ اس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ مگر اس نے حوصلے سے کام لیا۔ "تیرا مغز تو نہیں فر گیا۔" اس نے جمال دین کو ڈانٹا۔ ہاتھ بڑھا کر بجلی کا سوئچ دبایا۔ ڈبے میں روشنی پھیل گئی۔ رحیم داد نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے جمال دین کو گھورا۔

"ناراض نہ ہو۔" جمال دین گڑگڑانے لگا۔ "سچ بتا تو کبھی احمد کوٹ میں تو نہیں رہا؟"

"بکواس نہ کر۔ جا اپنی جگہ جا کر بیٹھ۔" رحیم داد نے اونچی آواز سے کہا۔

"تو رحیما نہیں ہے؟" جمال دین اپنی جگہ پر جما کھڑا رہا۔

"نہیں۔" رحیم داد نے غصے سے آنکھیں نکال کر کہا۔ "بیکار کی بکواس نہ کر۔ یہاں سے ٹر جا۔"

جمال دین پلٹا اور اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے رحیم داد کے چہرے کو تکتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "اگر تو رحیما نہیں تو فیر کون ہے؟"

"میں چوہدری نور الٰہی ہوں۔" رحیم داد نے بتایا۔ "پہلے گورداسپور کے موضع نصیر پور میں ہوتا تھا۔ فسادات میں لٹ پٹ کر پاکستان آ گیا۔ اب کوٹلہ ہرکشن میں ہوتا ہوں۔ ادھر میری زمین داری ہے۔ متروکہ اراضی سے کلیم کی بنا پر الاٹ ہوئی ہے۔"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ میں نے ہی غلط اندازہ لگایا۔" اس کے رویے سے تذبذب آشکارہ تھا۔

"یہ بتا۔ تو میرے سرہانے کھڑا کیا کر رہا تھا؟"

"وہ جی ایسا ہے نوراں نے ایک گل بتائی تھی۔"

"کون نوراں؟" رحیم داد نے مداخلت کی۔

"وہ رحیما کی گھر والی ہوتی تھی۔" جمال دین نے بتایا۔ "جب رحیما جیل میں تھا تو میری اس سے یاری ہو گئی۔ میں اسے اکال گڑھ لے گیا۔"

"تو نے کس کس سے یاری لگائی؟ ایسا تو تو گبھرو بھی نظر نہیں آتا کہ ہر مٹیار ہر زنانی تجھ پر مرمٹے۔" رحیم داد نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"میں پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ان دنوں تو نے مجھے نہیں دیکھا۔" جمال دین نے سادگی سے کہا۔ "تب میں بہت تگڑا اور زور آور ہوتا تھا۔"

"تو نے بلّو کی طرح نوراں کو بھی کتل کر دیا ہو گا۔"

"نہیں جی' وہ تو مجھ سے لڑ جھگڑ کر چک بیدی چلی گئی تھی۔" جمال دین نے بتایا۔ "بلّو سے میری پہلے سے یاری چل رہی تھی۔ میں نے اس سے ویاہ کیا اور جھنگ کی طرف ایک یار بیلی کے ساتھ چلا گیا۔ اگے تجھے پتہ ہے کیا ہوا۔"

"رحیمے کا کیا بنا؟" رحیم داد نے انجان بن کر پوچھا۔

"وہ جیل سے فرار ہو گیا۔" جمال دین نے بتایا۔ "پر سیف اللہ کے بھائیوں نے اسے نہیاری دو آب کے ٹبوں پر کتل کر دیا۔"

"جب رحیما کتل ہو گیا تو میں یا اور کوئی کیسے رحیما ہو سکتا ہے۔" رحیم داد ہنسنے لگا۔ "تو بھی

عجب بندہ ہے۔ تیرے دماغ میں کچھ گڑبڑ تو نہیں؟"

"نہیں جی ایسی کوئی گل نہیں۔" جمال دین نے صفائی پیش کی۔ "پتہ تو یہی چلا تھا کہ رحیما کتل کر دیا گیا۔ احمد کوٹ میں اس کی لاش لا کر دفن کی گئی۔ ادھر اس کی کبر بھی ہے۔ پر نوراں کہتی تھی رحیما مرا نہیں زندہ ہے۔"

"اس کو کیسے پتہ چلا رحیما زندہ ہے؟"

"وہ ایسا ہوا جی' جب میں نوراں کے ساتھ اکال گڑھ میں تھا تو ایک رات نوراں نے مجھے جگا کر بتایا کہ اس نے رحیمے کو گھر میں دیکھا ہے۔ میں نے تلاش کیا۔ پر وہ کہیں نظر نہ آیا۔"

"نظر کیسے آتا وہ تو مر چکا تھا۔"

"پر صبح اٹھ کر میں نے اور نوراں نے دیکھا۔ گھر کے اندر اور باہر گلی میں جگہ جگہ پیروں کے نشان صاف نظر آئے۔"

"کسی چور ڈکیت کے ہوں گے۔"

"میں نے بھی نوراں سے یہی کہا تھا۔ پر وہ نہ مانی۔ بار بار یہی کہتی تھی وہ رحیما ہی تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔"

"نوراں نے ایسے ہی کہا ہو گا۔" رحیم داد نے اس کے مغالطے کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی۔ "یہ بتا تو اندھیرے میں میرے نزدیک کھڑا کیا کر رہا تھا؟"

"وہی تو جی میں بتا رہا تھا۔" جمال دین نے وضاحت کی۔ "نوراں اپنی بات پر اڑی رہی۔ کہتی تھی رات گھر میں رحیما ہی آیا تھا۔ میں اسے پہچان سکتی ہوں۔ برسوں اس کے ساتھ رہی ہوں۔ اس کے تین بچوں کو پیدا کیا ہے۔ میں اس کی گھر والی ہوں۔ میں اسے جتنا جانتی ہوں' کوئی نہیں جانتا۔ میرے سوا اسے کوئی نہیں پہچان سکتا۔ اس کے بدن پر کئی ایسی نشانیاں ہیں جنھیں صرف میں جانتی ہوں۔ کہتی تھی سب سے وڈی پہچان اس کی کمر سے تھوڑا نیچے ایک لال لال پیسہ برابر نشان ہے۔ وہ کیسے لگا' کب لگا؟ یہ مینوں پتہ اے۔"

رحیم داد خوف سے دم بخود رہ گیا۔ واقعی اس کی کمر پر ایک گہرا سرخ نشان موجود تھا۔ اس نشان کے بارے میں اسے ایک ایک بات یاد آنے لگی۔

☆

کئی سال پہلے کا ذکر ہے۔ اس وقت رحیم داد کا پہلوٹی کا بیٹا کریم داد عرف کریما چھے مہینے کا تھا۔ ایک روز کھیتوں میں پانی دیتے ہوئے اس کا پیر پھسل کر آڈ میں چلا گیا۔ وہ دھڑام سے گرا۔ کمر میں

زور کا جھٹکا آیا۔ ایسا شدید درد اٹھا کہ کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ کسی پہلو قرار نہ آتا۔ کروٹ بدلنے پر ٹیس اٹھتی۔ بہت علاج معالجہ کرایا مگر درد کم نہ ہوا۔ آخر گاؤں کی ایک بوڑھی عورت 'مائی شیداں' کے مشورے پر نوراں ایک پیر کے پاس گئی۔ اس نے کمر پر باندھنے کے لیے تعویز دیا۔ مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ اسی پیر نے ایک ٹونکا بتایا۔ دو روپے نذرانے کے لیے اور تانبے کا ایک پیسہ دیا۔ کوئی دعا پڑھ کر اس پر دم کی۔ ہدایت کی کہ پیسے کو انگاروں پر رکھ کر گرم کیا جائے اور جب انگاروں ہی کی طرح سرخ پڑ جائے تو اس سے کمر کو داغا جائے۔

ماگھ کی اندھیری رات تھی۔ مہاوٹوں کی سردی پڑ رہی تھی۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے تھے۔ شام کو بارش بھی ہوئی تھی۔ مگر اب بارش بند ہو چکی تھی۔ البتہ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ رحیم داد کی کمر کا درد کچھ اور شدید ہو گیا تھا۔ وہ چٹائی پر اوندھا لیٹا تھا۔ قریب ہی انگیٹھی رکھی تھی۔ اس میں سرخ سرخ انگارے دہک رہے تھے۔

نوراں انگیٹھی کے ایک طرف اکڑوں بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چمٹا تھا۔ وہ گردن جھکائے انگیٹھی میں بھرے ہوئے انگاروں کو تک رہی تھی جن کے درمیان پیر کا دم کیا ہوا تانبے کا پیسہ رکھا تھا۔ وہ چمٹے سے بار بار پیسے کو الٹ پلٹ رہی تھی تاکہ وہ پوری طرح گرم ہو جائے۔

رحیم داد کے چہرے کا رخ نوراں کی جانب تھا۔ مگر وہ پوری توجہ سے انگاروں کو دیکھ رہی تھی جن کی گہری سرخ روشنی سے اس کے رخساروں پر شفق پھوٹ رہی تھی۔ رحیم داد کو اس روپ میں وہ اس قدر خوبصورت اور دل ربا نظر آ رہی تھی کہ کمر کی تکلیف کے باوجود وہ ٹکٹکی باندھے اس کے شعلہ گوں چہرے کو تک رہا تھا۔

نوراں نے دہکتے انگاروں کو دیکھتے دیکھتے ایک بار گردن کو خم دے کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ شوخی سے مسکرائی۔ رحیم داد کی کمر پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرا۔ پلٹ کر انگاروں کو دیکھا۔ تانبے کا پیسہ اب انگاروں ہی کی طرح سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھ میں دبے ہوئے چمٹے سے دہکتا ہوا پیسہ اٹھایا۔

رحیم داد نے گھبرا کر اپنا چہرہ دوسری جانب کر لیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور دانت سختی سے بھینچ لیے۔

نوراں نے چمٹے میں دبا ہوا سرخ سرخ پیسہ رحیم داد کی برہنہ کمر پر رکھا اور پیر کی ہدایت کے مطابق زور سے دبا دیا۔ رحیم داد تکلیف کی شدت سے تڑپ اٹھا۔ بلبلا کر اس بری طرح چیخا کہ نوراں اس کی پیٹھ پر سر رکھ کر بے اختیار رونے لگی۔

داغنے سے کمر کی کھال جل کر سیاہ پڑ گئی تھی۔ رحیم داد ساری رات تڑپتا رہا۔ تکلیف سے کراہتا رہا۔ ہائے ہائے کرتا رہا۔ نوراں بھی رات بھر جاگتی رہی۔ بے قرار ہو کر آنسو بہاتی رہی۔ زخم ایسا گہرا آیا کہ مہینوں دوا دارو کرنا پڑا۔ نوراں راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کی مرہم پٹی کرتی تھی۔ گھنٹوں اس کے سرہانے بیٹھتی دل جوئی کرتی رہتی تھی۔

زخم پکنے سڑنے کے بعد ٹھیک تو ہو گیا۔ مگر اس کا نشان نہ مٹا۔ اب تک باقی تھا اور کمر سے ذرا نیچے دائیں طرف صاف نظر آتا تھا۔ نوراں اسے دیکھ کر ایک مدت تک اظہار پشیمانی کرتی رہی۔ بار بار خود کو برا بھلا کہتی۔ رحیم داد سمجھاتا تو رونے لگتی۔

☆

رحیم داد یادوں کی پگڈنڈیوں پر بھٹکتا رہا۔ جمال دین اس کے خیالات اور احساسات سے بے نیاز ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ "مجھے جب یہ شبہ ہوا کہ تو رحیما ہے تو میں نے یہ نشان تیری کمر پر دیکھنے کی کوشش کی۔"

رحیم داد نے چونک کر جمال کی جانب دیکھا۔ "تو اندھیرے میں کھڑا میری کمر پر وہی نشان دیکھ رہا تھا۔" اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

"ہن جی' سچی گل بات تو یہی ہے۔" جمال دین نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "جب تو کپڑے بدل رہا تھا تو میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی بھی تھی۔"

"تو مخول تو نہیں کر رہا؟" رحیم داد نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"میں نے مخول کر کے تجھ سے کیا لینا۔" اس نے نہایت معصومیت سے جواب دیا۔ "سچ پوچھ تو تیری آنکھیں' تیری ناک' تیری آواز سب رحیمے کی طرح ہیں۔" اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے رحیم داد کے چہرے کو دیکھا۔

"تو نے فیر وہی بکواس شروع کر دی۔" رحیم داد نے ایک بار پھر اسے ڈانٹا۔ "تو گھاس تو نہیں کھا گیا۔"

"ناراض نہ ہو۔" جمال دین نے نرمی سے کہا۔ "اگر تو رحیما نہیں ہے تو کمیص ہٹا کر مجھے اپنی کمر دکھا دے۔ میرا شک جاتا رہے گا۔"

رحیم داد غصے سے تڑپ کر اٹھا اور جھپٹ کر جمال دین کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر نشست سے نیچے گر گیا۔ رحیم داد تلملا کر دھاڑا۔ "میں ابھی ٹرین رکوا کر تجھے گرفتار کرواتا ہوں۔ تو خونی ہے' ایک نمبر کمینہ ہے۔ میں نے تجھے ہرگز نہیں چھوڑنا۔" وہ چیختا چلاتا آگے بڑھا اور

زنجیر کا دستا پکڑ لیا۔

جمال دین فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دہائی دیتا ہوا رحیم داد کی جانب بڑھا۔ "ایسا نہ کر۔ میری گل تو سن۔" اس نے جھپاک سے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ رحیم داد زنجیر کھینچنا چاہتا بھی نہ تھا۔ جمال دین کو گرفتار کرانے کی کوشش میں وہ خود بھی گرفتار ہو جاتا۔ رحیم داد نے تھوڑی سی کشمکش کے بعد زنجیر کا دستا چھوڑ دیا۔

وہ چند لمحے خاموش بیٹھا آہستہ آہستہ ہانپتا رہا۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ آگے بڑھا۔

جمال دین نے ٹوکا۔ "تو کدھر چلا؟"

رحیم داد نے بڑھ کر غسل خانے کا دروازہ کھولا۔ آنکھیں نکال کر جمال دین کو دیکھا۔ خوف زدہ کرنے کی غرض سے دھمکی دی۔ "اندر بھی ٹرین روکنے کی زنجیر ہے۔" وہ غسل خانے میں داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ مگر اس نے زنجیر نہ کھینچی۔ ایسا ارادہ بھی نہ تھا۔ اس نے گردن جھکا کر کمر کے سرخ نشان کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ پشت کی جانب نشیب میں ایسا دبا ہوا تھا کہ مڑ مڑ کر دیکھنے کے باوجود نظر نہ آیا۔

اس نے انگلیوں سے کمر کے نچلے حصے کی کھال آہستہ آہستہ ٹٹولی۔ ایک جگہ گول دائرے میں کھال ناہموار اور کچھ کھردری تھی۔ یہی زخم کا نشان تھا۔ وہ سخت پریشان ہوا۔

جمال دین اس کے لیے اب سنگین خطرے کا باعث بن گیا تھا۔ اس کے بارے میں اسے پہلے ہی شبہ تھا۔ کمر کے نشان سے وہ اسے پہچان بھی سکتا تھا۔ وہ شدید ذہنی اذیت میں مبتلا ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا کرے؟ کس طرح جمال دین سے چھٹکارا حاصل کرے؟

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دروازہ کھولا۔ غسل خانے سے باہر نکلا۔

اسے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ جمال دین اپنی نشست پر موجود نہ تھا۔ رحیم داد نے حیران و پریشان ہو کر اسے ادھر ادھر تلاش کیا۔ لیکن اس کا کہیں سراغ نہ ملا۔ اس نے اپنا سوٹ کیس دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر موجود تھا۔ رحیم داد حیرت میں ڈوبا ہوا اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا اور غور کرنے لگا کہ جمال دین کہاں غائب ہو گیا۔ اس کی نظر دروازے کے اوپر گئی۔ دیکھا، چٹخنی کھلی ہے۔

وہ گومگو کے عالم میں بیٹھا جمال دین کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ریل گاڑی کی رفتار سست پڑ گئی۔ ذرا ہی دیر بعد گاڑی ٹھہر گئی۔ رحیم داد نے کھڑکی سے گردن باہر نکال کر دیکھا، ریل گاڑی ایک ویرانے میں کھڑی تھی۔ پٹڑی کے دونوں طرف جنگلی جھاڑیاں تھیں۔ کہیں کہیں اکا دکا درخت تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ مشرقی افق پر ہلکا ہلکا اجالا پھوٹ رہا تھا۔ رات کا چل چلاؤ

ھا۔ صبح کاذب اندھیرے سے جھانک رہی تھی۔

رحیم داد نے بولنے اور باتیں کرنے کی ملی جلی آوازیں سنیں۔ دیکھا، کئی مسافر اپنے اپنے ڈبوں ے اترے اور ٹرین کے اس سرے کی طرف چلے جدھر گارڈ کا ڈبا تھا۔ رحیم داد کو تجسس پیدا ہوا۔ بھی دروازہ کھول کر باہر آیا اور دوسرے مسافروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

ریل گاڑی سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر ہلکی ہلکی سرمئی روشنی میں گارڈ، ٹکٹ چیکر اور ریلوے کے دوسرے ملازم، چند مسافروں کے ساتھ ہجوم کی صورت میں کھڑے نظر آئے۔ رحیم داد قریب ہنچا۔ دیکھا، لوہے کی پٹڑیوں کی دونوں جانب انسانی جسم کے کٹے پھٹے حصے گوشت کے لوتھڑوں کی کل میں بکھرے ہوئے تھے۔ ہر طرف تازہ تازہ خون پھیلا تھا۔ ریل گاڑی کے پہیوں سے کٹ کر لوئی مسافر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کا نچلا دھڑ غائب تھا۔ صرف گردن اور سینے کا کچھ حصہ باقی تھا۔ یہ نال دین تھا جو خاک و خون میں لتھڑا ہوا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کب کا دم توڑ چکا تھا۔ اس کی بے نور نکھیں رحیم داد کے چہرے کو تک رہی تھیں۔

رحیم داد یہ دل خراش منظر دیکھ کر لرز گیا۔ وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا بھی اس کے لیے خطرناک تھا۔ ہ خاموشی سے مڑا اور سر جھکا کر تھکے تھکے قدموں سے واپس ہوا۔ اپنے ڈبے کے پاس پہنچا۔ روازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

۷۵

رحیم داد لاہور پہنچا۔ اسٹیشن سے باہر نکلا۔ تانگے پر بیٹھا اور سیدھا احسان شاہ کی کوٹھی پر پہنچا۔ پھاٹک پر رحیم داد کا ڈرائیور، عابد، مل گیا۔ وہ اس کی ہدایت پر ہنوز وہاں مقیم تھا۔ عابد کی زبانی رحیم داد کو معلوم ہوا کہ احسان شاہ دو روز قبل کراچی سے واپس آگیا ہے۔ مگر وہ کوٹھی میں اس وقت موجود نہ تھا۔ اس کا منیجر، مہربان علی بھی غائب تھا۔

دن ڈھل رہا تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے تھے۔ صبح بارش بھی ہوئی تھی۔ لیکن اب بارش کے ساتھ ساتھ ہوا بھی ٹھہری ہوئی تھی۔ شدید حبس تھا جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کسی بھی وقت بادل ٹوٹ کر برسیں گے اور ہر طرف جل تھل ہو جائے گا۔

طویل سفر کی ماندگی سے رحیم داد نڈھال ہو رہا تھا۔ لباس اور سر کے بالوں پر گرد جمی تھی۔ جسم سے پسینے کی تیز بو اٹھ رہی تھی۔ وہ فوراً غسل خانے میں گھس گیا اور دیر تک نہاتا رہا۔ باہر آیا۔ اجلا لباس پہنا۔ قدرے تازگی محسوس ہوئی۔ وہ کوٹھی کے وسیع لان میں بید کی بنی ہوئی ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ شام ہونے سے پہلے ہی اندھیرا اس قدر زیادہ تھا کہ شام کا گمان ہوتا تھا۔

مگر رحیم داد زیادہ دیر لان میں نہ بیٹھ سکا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے موٹے موٹے قطرے گرنے لگے۔ بادل زور سے گرجے اور موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ نوکرو نے جھپاک جھپاک کرسیاں اٹھائیں اور برآمدے میں ڈال دیں۔ رحیم داد بارش کے تیز ہوتے اٹھ کر برآمدے میں چلا گیا۔ اس نے ایک کرسی کھسکائی اور اس پر بیٹھ گیا۔ ایک نوکر نے گرم گر چائے لا کر میز پر رکھ دی۔ چائے کے ساتھ بسکٹ بھی تھے۔ رحیم داد بسکٹ کھاتا رہا۔ چائے

ونٹ حلق سے اتارتا رہا اور بارش سے لطف اٹھاتا رہا۔

فضا اب سہانی ہو گئی تھی۔ بارش کے ساتھ ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ گھاس پر، درختوں پر ہر طرف جھم، رم جھم مینہ برس رہا تھا۔ نوکروں نے کوٹھی کی بتیاں روشن کر دی تھیں۔ روشنی دریچوں ے پھوٹ کر باہر بکھر رہی تھی۔ بارش کے قطرے روشنی میں جھلملاتی جھالر کی مانند ہوا کے دکوں سے لہرا رہے تھے۔ احسان علی شاہ واپس نہ آیا تھا۔ رحیم داد برامدے میں خاموش بیٹھا بے نی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

رات کے آٹھ بجے سے کچھ دیر قبل ایک لمبی چوڑی کار کوٹھی کے پھاٹک پر آکر رکی۔ احسان ہ کار سے باہر نکلا اور بارش سے بچتا بچاتا کوٹھی میں داخل ہوا۔ ایک نوکر نے بڑھ کر رحیم داد کی مد کی اطلاع دی۔ احسان شاہ فوراً برآمدے میں پہنچا۔ رحیم داد اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سان شاہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور نہایت گرم جوشی سے بغل گیر ہو گیا۔

رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "شاہ جی، تو کراچی ایسا گیا کہ پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔ نی دیر ادھر کیا کرتا رہا؟"

"میں تو کراچی میں طرح طرح کے چکروں میں پھنسا رہا۔ روز ہی واپس آنے کی سوچتا، پر کوئی نہ وئی ایسا کام نکل آتا کہ رکنا پڑتا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کے برابر کرسی پر بیٹھتے ہوئے صفائی یش کی۔ "پر تو ادھر ڈیرہ غازی خان میں اب تک کیا کرتا رہا؟ سنا ہے سردار شہ زور خان مزاری کے اتھ تھا۔ شاہانی نے تجھے اس سے ملوایا ہوگا۔"

"ہاں جی، اسی نے شہ زور سے ملوایا تھا۔" رحیم داد نے بتایا۔ "ویسے بہت پہلے بھکر میں بھی اس سے ملا تھا۔ مراد خاں شاہانی ہی کی حویلی میں ملا تھا۔"

"مہربان علی بتاتا تھا، شاہانی تیرے کلیم کے کاغذات بھی ادھر لے گیا تھا۔ مل گئے نا؟"

"مل گئے، بالکل مل گئے۔ اب تو میرے ہی پاس ہوتے ہیں۔" رحیم داد نے احسان شاہ کو مطلع کیا۔

"کلیم کے کاغذات تو نے کیوں منگوائے تھے؟" احسان شاہ نے دریافت کیا۔

"میں نے تو نہیں منگوائے تھے شاہانی خود ہی لایا تھا۔ پر ان کے ملنے سے ادھر دلاور والا میں اڑھائی سو ایکڑ متروکہ زرعی اراضی میں نے اپنے نام الاٹ کروالی ہے۔" رحیم داد نے جواب دیا۔

"یہ دلاور والا کدھر ہوا؟"

"تحصیل راجن پور میں ہے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "ویسے راجن پور میں ایک حویلی کی الاٹمنٹ کے لیے بھی درخواست لگا دی ہے۔ بڑی شاندار حویلی ہے۔ پہلے ایک ہندو کی تھی۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں آرہا۔ ادھر کا بہت مشہور زمین دار ہوتا تھا۔ پاکستان بنا تو وہ بھی ہندوستان چلا گیا۔"

"چوہدری، تو بھی کہاں جا کر پھنس گیا۔" احسان شاہ کے لہجے سے بے زاری آشکارہ تھی۔ "سرکاری افسر تو اسے کالا پانی کہتے ہیں۔ تو نے الاٹمنٹ نکلوانے سے پہلے مجھ سے مشورہ تو کر لیا ہوتا۔"

"میں نے تو بار بار تیرے پاس آنے کا ارادہ کیا۔ پر شہ زور نے آنے ہی نہیں دیا۔ کہتا تھا میں بھی تیرے ساتھ لہور چلوں گا۔" رحیم داد نے احسان شاہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "ویسے تو لہور رہا ہی کب۔ شاہانی آیا تو اس نے یہی بتایا کہ تو کراچی سے واپس نہیں آیا۔ نادر خان ادھر سے ہوتا ہوا میرے پاس گیا تھا۔ اس نے بھی یہی بتایا تھا۔ یہاں آ بھی جاتا تو مشورہ کیسے کرتا؟ تو ادھر رہا ہی کب۔"

"زمیں تو الاٹ کرا لی۔ شہ زور کوشش کرے گا تو حویلی کی الاٹمنٹ بھی مل جائے گی۔ اس کا ادھر کے سرکاری افسروں میں بہت اثر درسوخ ہے۔ اس کا اپنا چچیرا وڈا افسر لگا ہے۔ پر تو ادھر رہ بھی سکے گا؟ زمین داری چلا سکے گا؟ اور سب سے اہم بات یہ کہ کوٹلہ ہرکشن کی زمین داری کا کیا بنے گا؟"

"شاہ جی، تجھے تو پتہ ہی ہے۔ میری اصلی زمین داری تو کوٹلہ ہرکشن ہی میں ہوتی ہے۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔" رحیم داد نے احسان شاہ کو اپنے موقف سے آگاہ کیا۔ "ویسے جی ادھر زمیں داری کرنی بہت مشکل ہے۔ مزارے ایسے سرکش اور خراب ہیں تجھ سے کیا بتاؤں۔ انھوں نے تو ساری ہی زمین دبا رکھی ہے۔ کبضہ دینے کو تو بالکل تیار نہیں۔"

"اس کی تو فکر نہ کر۔ شہ زور دلا دے گا۔"

"وہی کوشش کر رہا ہے۔ پر دلاور والا، تمن دریشک کے علاکے میں ہے۔ شہ زور مزاری مجھے ادھر کے ایک سردار کے پاس لے گیا تھا۔ اس کا نام عظمت اللہ دریشک ہے۔ کوٹ اکبر میں رہتا ہے۔"

"تب تو زمین کا کبضہ مل جانا چاہیے۔" احسان علی شاہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "میں عظمت اللہ خان دریشک کو بھی جانتا ہوں۔ لہور آتا رہتا ہے۔"

"زمین کا کبضہ دلانے کے لیے دوبار اس نے اپنے بندے بھیجے۔ ایک بار تو تھانیدار بھی پولیس

رنی کے ساتھ گیا تھا۔" رحیم داد نے بتایا۔ "دلاور والا میں سارے ہی بوھڑ آباد ہیں۔ ایسے رکش اور جھگڑالو ہیں کہ زنانیوں اور بچوں تک نے رات کے اندھیرے میں مورچے لگا کر ایسا شور ڑابہ کیا۔ ایسے پتھر برسائے کہ سب ہی زخمی ہوئے۔ میرے بھی بہت چوٹ آئی۔ تھانیدار تو سب ے زیادہ زخمی ہوا۔ نہ جانے کس طرح جان بچا کر نکل پائے۔"

"حد ہو گئی۔" احسان شاہ کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ جھنجلاہٹ بھی تھی۔ "لگتا ہے زارے بہت ہی زیادہ بدمعاش ہیں۔ پر دلاور والا جانے کی ابھی ضرورت ہی کیا تھی۔ پہلے ان کے لاف جگہ جگہ سے مکدمے بنوانے تھے۔ جو زیادہ سرکش اور آگے آگے تھے ان کو بلا کر تنگ کیا انا۔ حوالاتوں اور جیلوں میں بند کیا جاتا۔ مکدمے بازی میں تو ان کے مال مویشی تک بک جاتے۔ یشان ہو کر خود آتے اور پیروں پر پگڑیاں ڈال دیتے۔"

"اب عظمت اللہ نے یہی سوچا ہے۔ تھانیدار تو بہت غصے میں تھا۔ وہ تو بوھڑوں کے خلاف ت سخت کاروائی کرنے کو کہتا تھا۔" رحیم داد کے لہجے میں تشویش تھی۔ "پر شاہ جی، میں تو گھبرا لیا۔ میں نے شہ زور مزاری سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں نے ادھر زمین داری نہیں کرنی۔ میرا ارادہ ہے کہ اراضی عظمت اللہ کے ہاتھ فروخت کر دوں۔ وہ تیار بھی ہو گیا۔ وہ سارے مزارعوں لو بے دخل کر کے کبضہ بھی لے سکتا ہے۔ ان سے نمٹ بھی سکتا ہے۔ میں نے غلط فیصلہ تو نہیں لیا؟"

"تو نے ٹھیک ہی فیصلہ کیا۔ میں بھی تجھے یہی مشورہ دینا چاہتا تھا۔" احسان شاہ نے اتفاق رائے لیا۔ "تو نے بہت ٹھیک کیا۔ پر یہ تو بتا کتنے میں سودا طے کیا؟"

"میں نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ شہ زور پر چھوڑ دیا وہ جیسا مناسب سمجھے طے کر دے۔ ہ عظمت اللہ دریشک کو لے کر میرے پاس آنے کو کہتا تھا۔ وہیں بیع ہو جائے گی۔ بلکہ میں تو ان کو نیرے پاس لے آؤں گا۔ تیرے ہی سامنے سب کچھ طے ہو گا۔ جیسا تو کہے گا میں نے تو وہی کرنا ہے۔"

"پر ادھر کی زمین کا مول کچھ زیادہ نہیں ہے۔ بارانی یا چاہی ہے تو کسی کام کی نہیں۔"

رحیم داد نے فوراً وضاحت کی۔ "زمین تو نہری ہے۔ پانی پورا پورا ملتا ہے۔ زرخیز بھی ہے۔ میں نے عزیز گھوال کو زمین داری کی دیکھ بھال کے لیے لگایا تھا۔ بہت ہشیار بندہ ہے۔ اس نے ساری علومات اکٹھی کر لی تھیں۔"

"تب تو زمین کے ڈیڑھ لاکھ تک مل جانے چاہئیں۔" احسان شاہ نے قیاس آرائی کی۔ "پر

جھگڑے کی زمین ہے۔ عظمت اللہ دریشک کبضہ دلانے میں بھی مدد کرے گا۔ ایسی صورت میں لاکھ روپے بھی دے دے تو برے نہیں۔"

"میں نے اسے مختار نامہ بھی دے دیا ہے۔" رحیم داد نے احسان شاہ کو مطلع کیا۔ "ویسے مجھے ادھر روپے کی ضرورت بھی تھی۔ میری زمین داری کے نیچے کے چھوٹے زمین دار اور حصے دار اپنی زمینیں بیچ رہے ہیں اور سستی بیچ رہے ہیں۔ نادر ان سے بات بھی کر چکا ہے۔ بلکہ وہ خود چل کر اس کے پاس آئے تھے۔ نادر اس بارے میں مجھ سے بات کرنے ڈیرہ غازی خان آیا تھا۔"

نوکر نے آ کر اطلاع دی کہ کھانا لگا دیا گیا ہے۔ احسان شاہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد کو اس نے مخاطب کیا۔ "چوہدری، روٹی کھالے۔ وہیں بیٹھ کر آرام سے باتیں کریں گے۔" رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں کھانے کے کمرے میں جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میز پر کھانا موجود تھا۔ دونوں کھانا کھانے لگے۔

احسان شاہ نے پوچھا۔ "چھوٹے حصے دار اپنی زمینیں کیوں فروخت کرنا چاہتے ہیں؟"

"انھیں اپنی فصلوں کے لیے پانی کم مل رہا ہے۔ دوسرے ان کو سندھ کے بیراجوں میں سستے داموں زمیں الاٹ ہو رہی ہے۔ وہ ادھر کی زمینیں بیچ کر ادھر جانا چاہتے ہیں۔"

"ابھی تو غلام محمد بیراج مکمل بھی نہیں ہوا۔ زمینوں کی الاٹمنٹ کیسے شروع ہو گئی؟" احسان شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ "جب میں کراچی میں تھا تو میں نے بھی سنا تھا کہ آباد کاروں میں یہ افواہ گرم ہے کہ بیراج کی زمینوں کی الاٹمنٹ شروع ہونے والی ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی نے اونچا چکر چلایا ہے۔"

"ایسا ہی ہو گا۔ مجھے تو کچھ پتہ نہیں۔ نادر نے جو مجھے بتایا وہ میں نے تجھے بتا دیا۔ سچی گل کیا ہے؟ یہ مجھے بالکل پتہ نہیں۔"

"نہ نادر کو اصلی گل کا پتہ ہے نہ حصے داروں کو۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی ٹھیک سے پتہ نہیں۔ اس کے لیے تو پوری طرح معلومات کرنی ہوں گی۔" احسان شاہ نے کہا۔ "پر اس چکر میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اب تو بارش شروع ہو چکی ہے۔ پانی کی کمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب تو بیچنے والے بھی سستے داموں زمین نہیں بیچیں گے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ ابھی تو زمین خریدنے کا خیال چھوڑ دے۔"

"کہتا تو شاہ جی تو ٹھیک ہی ہے۔" رحیم داد نے اس کی تائید کی۔ "جب نہر میں پانی کی کمی ہو جائے گی تو میں اپنے موگھوں سے زیادہ پانی لینے لگوں گا۔ نیچے پانی کم ہو گا۔ فصلیں سوکھنے لگیں گی تو

حصے دار زمینیں فروخت بھی کریں گے تو کم سے کم ہی دام مانگیں گے۔ ابھی تو ان سے سودے کی بات ہی کرنی ٹھیک نہیں۔"

"میں تجھ سے یہی کہنا چاہتا تھا۔" احسان علی شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "ابھی تو تجھے کئی ضروری باتیں بتانی ہیں۔ دلاور والا کی زمین فروخت ہونے کے بعد جو روپیہ آئے اسے زیادہ ضروری کاموں میں لگایا جا سکتا ہے۔ تجھے کیا خبر، میں کراچی میں اتنے عرصے رہا تو کیا کیا کرتا رہا؟"

"تو بتائے تو پتہ چلے گا۔" رحیم داد نے گلہ کیا۔ "ویسے تو مجھے ملے بنا اچانک کراچی چلا گیا۔ یہ بھی نہ بتایا کہ کیوں جا رہا ہے؟ مہربان علی بھی لائل پور جا چکا تھا۔ کسی نے مجھے کچھ نہیں بتایا میں تو بہت پریشان ہو گیا تھا۔"

"ہاں چوہدری تیری شکایت بالکل ٹھیک ہے۔" احسان شاہ نے اظہار پشیمانی کیا۔ "مجھے بالکل اچانک کراچی جانا پڑا۔ سویرے ہی سویرے جانا تھا۔ سوچا تجھے گہری نیند سے جگا کر بات کروں گا تو تیرے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔ کام اتنا ضروری تھی کہ رک بھی نہ سکتا تھا۔"

رحیم داد بہت دیر سے یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھا کہ لائل پور کی زمین کے الاٹمنٹ کا کیا فیصلہ ہوا۔ وہ فوراً حرف مطلب پر آ گیا۔ "شاہ جی، تو نے اب تک یہ نہیں بتایا لائل پور کی زمین کی الاٹمنٹ کا کیا بنا؟"

"یہ تو تجھے پتہ ہی ہو گا کہ زمین کا جھگڑا چل رہا ہے۔ دو دعویداروں کو وہ اراضی پہلے ہی الاٹ ہو چکی ہے۔ انھوں نے عدالت میں مکدمہ بھی دائر کر رکھا ہے۔"

"شاہانی نے مجھے اس بارے میں بتایا تھا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ زمین میرے نام الاٹ نہیں ہو سکتی۔ چیمہ نے کچھ نہیں کیا۔"

"چیمہ نے تو تیرے نام الاٹمنٹ کر دی۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ "اب تو سوال کبضہ ملنے کا ہے۔ جب تک معاملہ عدالت کے سامنے ہے اور اس کا فیصلہ نہیں ہو جاتا کبضہ کیسے مل سکتا ہے؟" اس نے قدرے توقف کیا۔ "پر میں نے اس کا بھی ایک حل نکالا ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر سوال کیا۔

"میں نے کراچی سے واپس آتے ہی اس سلسلے میں کوشش شروع کر دی ہے۔" اس نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "محکمہ بحالیات کے اعلیٰ حکام کو ایک وزیر کی سفارش پہنچائی کہ دونوں ہی دعویداروں پر اس طرح دباؤ ڈالیں کہ عدالت سے اپنے مکدمے واپس لے لیں اور اپنی اپنی الاٹمنٹوں سے دست بردار ہو جائیں۔"

"تو سمجھتا ہے، وہ آسانی سے مان جائیں گے۔؟"

"آسانی سے تو کوئی بھی نہیں مانتا۔" احسان شاہ نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "ان کو یہ پیشکش کی گئی ہے کہ وہ کسی دوسری جگہ متروکہ اراضی کی الاٹمنٹ لے لیں اور لائل پور کی زمین سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔"

"ایسا ہو جائے تو بہت ٹھیک ہے۔ شاہ جی تو نے حل تو بہت ٹھیک نکالا ہے۔" رحیم داد نے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ اس کے بشرے سے خوشی آشکارہ تھی۔ "میں تو کہتا ہوں جی ان کو رضا مند ہو جانا چاہیے۔ مکدمے بازی کے چکر سے بھی بچ جائیں گے اور اراضی بھی مل جائے گی۔"

"مشکل یہ ہے کہ زمین بہت عمدہ ہے۔ اس پر تو نہ جانے کتنوں کی آنکھ لگی ہے۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "لاکھوں روپے کی اراضی ہے۔"

"کیا اسے بھی دلاور والا کی زمین کی طرح فروخت کرنے کا ارادہ ہے؟" رحیم داد نے احسان شاہ کی بات سے یہی نتیجہ اخذ کیا۔

"کیسی عجب گل کر رہا ہے چوہدری۔" احسان شاہ نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت کا اظہار کیا۔ "تجھے پتہ ہے اس زمین پر تو میں نے ٹیکسٹائل مل لگانی ہے۔ جلد ہی اس کا پرمٹ بھی مل جائے گا۔ مشینری امپورٹ کرنے کا لائسنس بھی نکلوالوں گا۔ بینک سے کرضہ لینے کا بندوبست ہو چکا ہے۔ میں نے تو ساری تیاری کر رکھی ہے۔" اس کی آنکھوں میں مسرت جھلکنے لگی۔ "میں کراچی میں ٹھہر کر صرف سیاست ہی نہیں لڑاتا رہا۔ اپنا کام بھی کرتا رہا۔ ایک دن بھی آرام سے نہ بیٹھا۔ کبھی اس کے پاس جاتا کبھی اس کے پاس۔ اپنا کام جو نکلوانا ہوا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر احسان شاہ بولتا رہا۔ "میں نے جلد ہی ایک لیمٹڈ کمپنی کا اعلان کرنا ہے۔ اس کی کاغذی تیاری مکمل ہو چکی ہے۔ اب تو اسے رجسٹر کرانا ہے۔ پر کمپنی کے کنٹرولنگ شیئرز اپنے پاس رکھنے ہیں۔ دلاور والا کی زمین کے روپے سے تو بھی کمپنی کے شیئر خرید لینا۔ میں تجھے کمپنی کا ڈائریکٹر لگا دوں گا۔"

رحیم داد کی سمجھ میں احسان شاہ کا منصوبہ مطلق نہ آیا۔ پریشان ہو کر گویا ہوا۔ "شاہ جی، مجھے تو زمین داری ہی کرنے دے۔" اس کے لہجے سے بے زاری عیاں تھی۔ "مجھے ڈائرکٹری شائرکٹری نہیں کرنی۔ مجھے اس چکر میں نہ ڈال۔"

"تو گھبرا کیوں گیا؟" احسان علی شاہ نے ہنس کر کہا۔ "عیش کرے گا۔ کمپنی کے منافع میں سے تجھے ڈیویڈنڈ تو ملے گا ہی، اس کے علاوہ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کئی الاؤنس بھی ملیں گے۔ تو اکیلا ڈائریکٹر نہیں ہو گا کئی اور بھی ہوں گے۔ مینجنگ ڈائریکٹر تو میرا وڈا پتر رحمان علی شاہ ہو گا۔"

"نہیں، شاہ جی، مجھ سے یہ کام نہیں ہو گا۔" رحیم داد ہنوز گھبرایا ہوا تھا۔ "تجھے تو پتہ ہی ہے کہ مجھے انگریزی نہیں آتی۔ تو نے ڈائریکٹر لگا دیا تو کیسے کام چلاؤں گا۔"

"تجھے تو صرف بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگوں میں حاضری لگانی ہو گی۔ چپ کر کے بیٹھا رہنا۔ دوسروں کی سنتا رہنا۔" وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ "دوسروں نے بھی صرف باتیں ہی کرنی ہوں گی۔ کام تو مینجر اور دوسرے بندے چلاتے ہیں۔ جہاں تک انگریزی جاننے کا سوال ہے تو کراچی میں کئی مل مالک اور وڈے وڈے سیٹھ تو ایسے ہیں کہ انگریزی میں اپنے ٹھیک سے دستخط بھی نہیں لگا سکتے۔ وہ کمپنیوں کے صرف ڈائریکٹر ہی نہیں مینجنگ ڈائریکٹر اور چیئرمین بنے بیٹھے ہیں۔"

"پر مجھے تو جی کچھ پتہ نہیں۔"

"سب پتہ چل جائے گا۔ شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" احسان شاہ نے رحیم داد کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔ "کچھ عرصے بعد تو سب کچھ سمجھنے لگے گا۔" احسان شاہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ "ویسے چوہدری، تجھے انگریزی ضرور سیکھ لینی چاہیے۔ مہربان علی سے کہوں گا وہ تیرے لیے ٹیوٹر کا بندوبست کر دے گا۔"

"وہ کیا کرے گا؟" رحیم داد نے ہونق کی طرح منہ پھاڑ کر احسان شاہ کی طرف دیکھا۔

"وہ تجھے انگریزی پڑھائے گا۔ تو اسے اپنے ساتھ کوٹلہ ہرکشن لے جانا۔ تجھے ادھر کرنا ہی کیا ہوتا ہے۔ آرام سے انگریزی پڑھنا۔ اگے تجھے اس کی ضرورت پڑے گی۔" احسان شاہ نے مشورہ دیا۔ "ویسے تو اخبار ضرور پڑھا کر تاکہ تجھے یہ تو پتہ چلے کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے؟ سیاست کا کیا رنگ ڈھنگ ہے؟"

"تو کہتا ہے تو اخبار بھی پڑھ لیا کروں گا۔" رحیم داد نے اس بار انکار نہ کیا۔ "پر میں نے تیری طرح سیاست میں حصہ نہیں لینا۔"

"سیاست میں حصہ نہ لے پر اس کے بارے میں جاننا تو چاہیے۔" احسان شاہ کا انداز سرپرستانہ تھا۔ "ویسے وڈا زمین دار بننا ہے تو سیاست میں بھی تجھے دلچسپی لینی ہو گی۔ زمین داری تو تیرا منیجر اور منشی چلاتے رہیں گے۔ تو خالی رہ کر کیا کرے گا۔ خود بخود سیاست سے دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "تیری زمین داری بڑھ جائے تو دیکھوں گا تو سیاست سے خود کو کیسے الگ رکھتا ہے۔ اسمبلیوں کی ممبری حاصل کرنے کی سوچے گا۔ وزیر بننے کے خواب دیکھے گا۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "چوہدری، میں تجھے ایک راز کی بات بتاؤں۔ ہر وڈے زمین دار کے دماغ میں ایک

وزیر چھپا ہوتا ہے۔ وہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ حالات اسے پیدا کر دیتے ہیں۔"

رحیم داد اس کی باتوں سے متاثر نہ ہوا۔ گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "اور تو سب کچھ تو کرتا ہی رہتا پر سب سے پہلے لائل پور کی زمین کا کبضہ ملنا چاہیے۔" رحیم داد کو بنیادی طور پر اسی سے دلچسپی تھی۔ اور جب سے اس نے یہ سنا تھا کہ زمین کی مالیت لاکھوں روپے ہے تو اس کی دلچسپی اور بڑھ گئی تھی۔

احسان علی شاہ نے بھی اس کی بات کی اہمیت محسوس کی۔ "تجھے پتہ نہیں، آج کل میں اسی کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ میری تو یہی کوشش ہے کہ جلد سے جلد زمین مل جائے۔ کل بھی کئی سرکاری افسروں سے اسی سلسلے میں ملنا ہے۔ دونوں دعویدار راضی ہو جائیں تو فوراً زمین اپنے کبضے میں آجائے گی۔" اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی پھیل گئی۔ "زرعی اراضی حاصل کرنا مشکل نہیں پر شہری اراضی حاصل کرنا کتنا مشکل ہے۔ اس کا تجھے کچھ اندازہ نہیں۔"

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔

بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ہوا میں نمی تھی۔ خنکی تھی۔ موسم خوش گوار تھا۔ احسان شاہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد سے رخصت ہو کر اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا۔ رحیم داد بھی خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

صبح ناشتے پر احسان علی شاہ سے رحیم داد کی پھر ملاقات ہوئی۔ رحیم داد کو ٹلہ ہرکشن واپس جانے کے لیے بے چین تھا۔ مگر احسان شاہ نے اسے روک لیا۔ اس کا خیال تھا کہ لائل پور کی زمین کا تصفیہ ہونے تک وہ لاہور ہی میں ٹھہرا رہے۔ عین ممکن ہے کسی مرحلے پر اس کی ضرورت پڑے۔ عذر داری کرنا ہو یا نئی درخواست پیش کرنا پڑے، ایسی صورت میں رحیم داد کے دستخط ضروری تھے۔ وہ کوٹلہ ہرکشن چلا جاتا تو بروقت چارہ جوئی کرنے میں مشکل پیش آتی۔

احسان شاہ کے زور دینے پر رحیم داد نے کوٹلہ ہرکشن جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

احسان شاہ زمین حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگا رہا۔ مگر معاملہ بہت الجھا ہوا تھا۔ دو دعویدار پہلے ہی موجود تھے۔ ان کے کلیم تصدیق شدہ تھے۔ فردِ حقیت اور دوسری دستاویزات بھی مکمل تھیں۔ الاٹمنٹ بھی ان کے پاس تھے۔ حکام میں دونوں کا اثر و رسوخ بھی تھا۔ ایک دعویدار کی پشت پناہی درپردہ ایک مرکزی وزیر کر رہا تھا دوسرے کی محکمہ بحالیات کے ایک اعلیٰ افسر سے قریبی رشتے داری تھی۔ تنازعہ طول کھینچتا جا رہا تھا۔ لیکن احسان علی شاہ نے ہمت نہ ہاری۔ وہ بھی اپنی کوشش میں لگا رہا۔ رحیم داد سے ملاقات ہوتی تو اسے صورت حال سے آگاہ بھی کرتا رہتا۔ مگر احسان شاہ نے اس کے سامنے کسی مایوسی یا ناامیدی کا اظہار نہ کیا۔ بار بار یقین دلاتا کہ قضیہ جلد ہی طے ہو جائے گا اور زمین کا قبضہ مل جائے گا۔

رحیم داد لائل پور کی زمین ملنے کی خوش خبری سننے کا بے چینی سے منتظر تھا۔ اس کا بیشتر وقت احسان شاہ کی کوٹھی ہی پر گزرتا۔

☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ مہربان علی خاموشی سے رحیم داد کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہم راہ ایک اجنبی تھا۔ اس کے بال خشک تھے۔ آنکھوں پر بوسیدہ عینک تھی۔ گال پچکے ہوئے تھے۔ بش شرٹ پر سلوٹیں تھیں۔ پتلون بھی ڈھیلی ڈھالی تھی۔ اور اس کی موریاں کثرت استعمال سے گھس گئی تھیں۔ جوتے پر گرد کی تہہ تھی۔ وہ ہر پہلو سے پریشان حال اور ضرورت مند نظر آتا تھا۔

مہربان علی نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "چوہدری، تیرے لیے یہ ماسٹر لایا ہوں۔ شاہ جی نے کہا تھا چوہدری کو کسی ایسے بندے کی ضرورت ہے جو اسے انگریزی پڑھا سکے۔"

اس نے آگے بڑھ کر رحیم داد کو نہایت ادب سے سلام کیا۔

مہربان علی نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری، اب تو اس سے گل بات کر لے۔ میں نے شاہ جی کے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔" رحیم داد نے اسے روکنے کے لیے اصرار بھی نہ کیا۔

رحیم داد نے اس شخص کو نظر بھر کر دیکھا۔ "تو کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا، تیرا نام کیا ہے؟"

"مجھے عبداللطیف کہتے ہیں۔" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے نہایت ادب سے بتایا۔

رحیم داد تکیے کا سہارا لیے بستر پر بیٹھا تھا۔ عبداللطیف نے عاجزی اور انکساری کا مظاہرہ کیا تو رحیم داد کی گردن اکڑ گئی۔ قدو قامت کچھ اونچا ہو گیا۔ سامنے بیٹھا ہوا عبداللطیف اسے کم تر اور مسکین نظر آیا۔ اس نے آواز میں بھاری بھرکم پن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انٹرویو لینے کے انداز میں سوال کیا۔

"لطیف! تو نے کتنا پڑھا ہے؟"

"جناب میں انٹرمیڈیٹ پاس ہوں۔" عبداللطیف نے رحیم داد سے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔ "ایک بار بی اے کا پرائیویٹ امتحان بھی دیا تھا۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ بعد میں بھی امتحان میں بیٹھنے کی تیاری کی، لیکن حالات کچھ ایسے ناسازگار پیدا ہوئے کہ امتحان نہ دے سکا۔"

عبداللطیف نے رحیم داد کو متاثر کرنے غرض سے اپنی تعلیمی استعداد کے بارے میں کسی قدر

وضاحت سے بتایا۔ رحیم داد اس کی باتیں سن کر متاثر بھی ہوا۔ اسے معاجیلہ یاد آگئی۔ وہ بھی بی اے فائنل کی طالبہ تھی۔ اسی اثناء میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ تمام تعلیمی ادارے بند ہو گئے۔ اسے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر لاہور سے دیپال پور واپس جانا پڑا تھا۔ تعلیم کا سلسلہ ایسا منقطع ہوا کہ دوبارہ جاری نہ ہو سکا۔ رحیم داد اس کی علمیت اور دانائی سے بہت زیادہ مرعوب تھا۔ اس نے چونک کر عبداللطیف کو دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔

"تو نے تو بہت پڑھ رکھا ہے۔"

"جی ہاں، اتنی تعلیمی استعداد تو رکھتا ہوں کہ آپ کو ہر مضمون پڑھا سکتا ہوں۔" عبداللطیف نے اسے اطمینان دلایا۔

"میں نے تو صرف انگریزی پڑھنی ہے۔"

"میں آپ کو انگریزی پڑھا دوں گا۔" عبداللطیف نے رحیم داد سے کہا۔ "لیکن آپ کو اردو اور فارسی پڑھنا ہو تو وہ بھی پڑھا سکتا ہوں۔"

"فارسی پڑھنے کی تو مجھے کوئی ضرورت نہیں۔" رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "اردو تھوڑی بہت جانتا ہوں۔ پر انگریزی بالکل نہیں جانتا۔"

"تب تو انگریزی کے ساتھ ساتھ آپ کو اردو کی تعلیم بھی حاصل کرنا چاہیے۔" اس نے مشورہ دیا۔ "یہ میری اپنی رائے ہے۔ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔"

"دونوں ہی پڑھ لوں گا۔" رحیم داد نے اس کا مشورہ قبول کر لیا۔

"شام کے علاوہ آپ جو بھی وقت مقرر کریں گے، میں پڑھانے کے لیے آجاؤں گا۔" اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ گفتگو کا موضوع بھی بدلا۔ رحیم داد سے دریافت کیا۔ "آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہوا ہے؟"

"چھ بجنے میں دس منٹ رہتے ہیں۔" رحیم داد نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے بتایا۔

"مجھے اپنے ایک ٹیوشن کے لیے جانا ہے۔" اس نے گردن بڑھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ "بادل بھی گھر آئے ہیں اور مجھے جانا بھی دور ہے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "کل میں کس وقت آجاؤں؟"

"نو بجے تک آجانا۔ کل آرام سے گل بات ہو گی۔" رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی بے چینی سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگر رحیم داد روکنا بھی چاہتا تو وہ نہ رکتا۔ معذرت کر کے چلا جاتا۔

عبداللطیف نے سلام کیا۔ آگے بڑھا اور دروازے سے باہر چلا گیا۔ رحیم داد نظریں اٹھائے اسے دور تک دیکھتا رہا۔ پہلی نظر میں اس نے رحیم داد کو بالکل متاثر نہ کیا تھا۔ وضع قطع اور شکل و صورت سے وہ نہایت پھٹیچر نظر آتا تھا۔ مگر گفتگو کے بعد رحیم داد کو اندازہ ہوا کہ وہ آداب مجلس سے واقف تھا۔ پڑھا لکھا تھا اور بات کرنے کا اسے سلیقہ بھی تھا۔

دوسرے روز رحیم داد اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہ آیا۔ تیسرے روز وہ آیا اور ٹھیک نو بجے آیا۔ آتے ہی اس نے معذرت کی۔ "معاف کیجئے چودھری صاحب، میں کل حاضر نہ ہو سکا۔ ایک ضروری کام میں ایسا پھنسا کہ دوپہر تک فرصت نہ مل سکی۔"

رحیم داد نے نہ خفگی کا اظہار کیا نہ شکوہ، مسکرا کر بولا۔ "کوئی بات نہیں۔ بہت ضروری کام رہا ہو گا۔" اس نے ایک نوکر کو بلایا۔ چائے لانے کی ہدایت کی۔ اس وقت تک عبداللطیف کمرے کے ماحول سے مانوس ہو چکا تھا۔ وہ کرسی پر اطمینان سے بیٹھا تھا۔ لباس اس کا وہی تھا جو پہلے روز تھا بلکہ کچھ زیادہ ہی ملگجا ہو گیا تھا۔ چہرہ بھی زیادہ مرجھایا اور ستا ہوا نظر آرہا تھا۔

رحیم داد اس روز بستر کے بجائے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے عبداللطیف کی ذات میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "لطیف، تو آج کل کیا کر رہا ہے؟"

"فی الحال تو ایک عرصے سے بے روزگار ہوں۔" عبداللطیف نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔

"بے روزگار ہے تو کام کیسے چلتا ہے؟"

"ایک صاحب کے بچوں کو شام کے وقت پڑھاتا ہوں۔" اس نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "اس سے کسی نہ کسی طرح کام چلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"لگتا تو تو بھی اپنی طرح مہاجر ہی ہے۔" رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔ "میں نے غلط اندازہ تو نہیں لگایا؟"

"بالکل درست فرمایا آپ نے۔" عبداللطیف نے مسکرا کر اعتراف کیا۔ "رہنے والا تو میں بجنور کا ہوں۔ مگر ملازمت کے سلسلے میں کئی برس سے دہلی میں مقیم تھا۔" اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر دکھ کا سایہ پھیل گیا۔ "دہلی میں فسادات ہوئے تو مجھے بھی گھربار چھوڑنا پڑا۔ ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی۔ پھر دوسرے مصیبت زدہ مسلمانوں کے ایک قافلے کے ساتھ میں بھی کسی نہ کسی طرح بیوی بچوں کے ہمراہ پاکستان کی سرحد میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔"

"پاکستان پہنچ کر کیا کرتا رہا؟" رحیم داد نے عبداللطیف کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے پوچھا۔

“کچھ مدت تک یہیں لاہور کے ایک مہاجر ریلیف کیمپ میں بیوی بچوں کے ساتھ رہا۔ کیمپ ہی کے قیام کے دوران ہمارے کارڈ وغیرہ بنے۔ مگر جب حکومت نے مہاجرین کو دوسرے شہروں میں منتقل کیا تو مجھے ٹرین میں بٹھا کر شیخوپورہ پہنچا دیا گیا۔ کئی مہینے بے روز گار رہا۔ بھاگ دوڑ کی تو ایک اسکول میں ٹیچر مقرر ہو گیا۔ تنخواہ قلیل تھی۔ مگر کسی نہ کسی طرح گزر بسر ہو جاتی تھی۔” عبدالطیف اپنی پریشان حالی کے بارے میں بتاتا رہا۔ رحیم داد پوری توجہ کے ساتھ اس کی باتیں سنتا رہا۔ “سب سے بڑا مسئلہ رہائش کا تھا۔ مگر وہ اس طرح حل ہو گیا کہ ایک ہندو نے مشکل کشائی کی۔ وہ بھی اسکول ٹیچر رہ چکا تھا۔ اس کے بال بچے سرحد پار جا چکے تھے۔ ان دنوں وہ بالکل تنہا رہتا تھا۔”

“پر وہ کیوں نہ گیا؟” رحیم داد نے مداخلت کی۔

“اس کی کچھ زرعی آراضی تھی۔ ذاتی مکان بھی تھا۔ وہ اپنی جائیداد فروخت کر کے ہندوستان جانا چاہتا تھا۔” عبدالطیف نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ “وہ بوڑھا آدمی تھا۔ نیک دل تھا اور خوش اخلاق بھی تھا۔ پاس پڑوس والوں سے اس کے بہت خوش گوار تعلقات تھے۔ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ٹھیرا ہوا تھا۔” اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ “چوہدری صاحب‘ واقعی وہ بہت بھلا مانس تھا۔ میری پریشانی کا حال سن کر بہت متاثر ہوا۔ مجھے اپنے ساتھ ٹھیرانے پر رضامند ہو گیا۔ مکان تھا تو چھوٹا اور پرانا بھی تھا مگر سر چھپانے کے لیے بہت کافی تھا۔”

“تیرے رہنے سے اس کو بھی تو مدد ملی ہو گی۔” رحیم داد نے تبصرہ کیا۔ “اکیلے میں تو ہر دم جان سے مارے جانے کا خطرہ لگا رہتا ہو گا۔”

“جی ہاں‘ اس حیثیت سے دیکھا جائے تو میرے ساتھ رہنے سے اسے ایک طرح کا تحفظ مل گیا۔ مگر چوہدری صاحب‘ وہ زمانہ بڑا پر آشوب تھا۔ پرانے رشتے ٹوٹ چکے تھے۔ وضع داری ختم ہو چکی تھی۔ آپس میں بھائی چارہ نہ رہا تھا۔ ایک دوسرے کا اعتبار اٹھ چکا تھا۔” عبدالطیف نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ “آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ وہ مجھے بھی شک و شبہ کی نظروں سے دیکھتا تھا۔”

“تجھے کیسے پتہ چلا وہ تجھ پر بھی شک کرتا تھا؟” رحیم داد کی آنکھوں سے حیرت آشکارہ تھی۔

“سخت گرمی میں بھی وہ کمرے میں سوتا تھا اور ہمیشہ اندر سے دروازہ بند کر لیتا تھا۔ ایک رات ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ چائے کی طلب نے ستایا۔ میں نے چائے بنانے کے لیے بیوی کو جگایا۔ مگر گھر میں ماچس نہ تھی۔” عبدالطیف اب رحیم داد کی شخصیت اور اس کے رعب و دبدبے کے حصار سے باہر نکل چکا تھا اور نہایت اطمینان سے بول رہا تھا۔ “ماچس لینے کے لیے میں نے کیدار ناتھ کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔” اس نے قدرے تامل کیا۔ “میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ اس کا نام کیدار ناتھ ساہنی تھا۔”

“دروازہ کھٹکھٹانے پر وہ کیا بولا؟” رحیم داد نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

“میں یہی بتا رہا تھا کہ میں نے کیدار ناتھ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ پہلے تو اس نے دیر تک دروازہ ہی نہ کھولا۔ جب میں مسلسل کھٹکھٹاتا رہا تو اس نے دروازہ کھولا۔ ہاتھ جوڑ کر گھگیانے لگا۔ ”مجھے قتل نہ کرنا۔ تم کو جو چاہیے ہو لے لو۔“” عبدالطیف زیر لب مسکرایا۔ “وہ اس طرح سکڑا سکڑایا کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا کہ پہلے تو میں حیران و پریشان کھڑا گھورتا رہا۔ پھر اس کی مضحکہ خیز حالت دیکھ کر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔”

“جان کا ایسا ہی خوف تھا تو وہ ادھر ٹھیرا ہی کیوں؟” رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ “بال بچوں کے ساتھ ہی سرحد پار چلا جاتا۔”

“چوہدری صاحب‘ یہ جائیداد اور املاک کی محبت بھی بڑی ظالم ہوتی ہے۔ نہ جان کو پرواہ رہتی ہے نہ موت کا خوف۔” کہنے کو تو عبدالطیف باتوں کی رو میں کہہ گیا۔ معاً اسے خیال آیا کہ رحیم داد بھی صاحب جائیداد ہے۔ اس کی بات ناگوار گزر سکتی ہے۔ اس نے فوراً پینترا بدلا۔ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کی غرض سے صفائی پیش کی۔ “لیکن یہ بھی تو غور کرنے کی بات ہے کہ وہ معمولی اسکول ٹیچر تھا۔ نہ جانے کس طرح اپنی خواہشات مار کر اور پیٹ کاٹ کر پیسہ پیسہ جوڑا ہو گا۔ تب مکان بنایا ہو گا۔”

“ہاں جی مکان اسی طرح بنتا ہے۔” رحیم داد نے تائید کی۔ “پر اسے مکان کی اچھی کیمت نہیں ملی ہو گی۔”

“اچھی اور بری قیمت تو اس وقت ملتی جب مکان فروخت ہو جاتا۔” عبدالطیف نے بتایا۔ “کیدار ناتھ نے بہت کوشس کی۔ مگر نہ مکان بک سکا نہ زرعی آراضی۔ کوئی خریدار ہی نہ ملا۔ لوگ تو مفت حاصل کرنے کی تاک میں لگے تھے۔ وقت جتنا گزرتا گیا حالات اور خراب ہوتے گئے۔ پڑوسیوں نے اسے خبردار کیا۔ مجھے بھی بڑھتے ہوئے خطرہ سے آگاہ کیا۔”

“کیدار ناتھ کا کیا بنا؟” رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔

“وہ اس قدر خوف زدہ ہوا کہ ایک روز مکان میرے سپرد کر کے اپنے بال بچوں کے پاس ہندوستان چلا گیا۔ معلوم نہیں پہنچا بھی کہ نہیں۔ میں نے تو یہ دیکھا کہ جاتے وقت مڑ مڑ کر اپنے گھر کو دیکھتا تھا۔ اور بار بار آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسو پونچھتا تھا۔” عبدالطیف نے ٹھنڈی سانس بھری۔ “آج بھی وہ منظر یاد آتا ہے تو دل تڑپ اٹھتا ہے۔”

"ہاں جی' بالکل ایسا ہی ہوا ہو گا۔" رحیم داد نے اپنی جمانے کی کوشش کی۔ لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "جب میں نے نصیر پور چھوڑا تو اپنے گھر کو اسی طرح مڑ مڑ کر تکتا تھا۔ گھر والی تو پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔"

"درست فرمایا آپ نے۔" عبدالطیف نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "اس دکھ کا اندازہ تو وہی بخوبی لگا سکتا ہے جس پر ایسا کڑا وقت پڑا ہو۔ اپنا گھر بار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑا ہو۔"

"پر کیدار ناتھ کے جانے سے تجھے تو رہنے کا پکا ٹھکانا مل گیا۔" رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "تو نے تو کبضہ کی بنیاد پر آسانی سے اسے اپنے نام الاٹ کرا لیا ہو گا۔"

"چوہدری صاحب ایسی اپنی قسمت کہاں۔ کیدار ناتھ ساہنی کے چلے جانے سے سرچھپانے کا سہارا بھی جاتا رہا۔" عبدالطیف نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "نہ معلوم کتنی ہی نظریں پہلے ہی سے اس مکان پر لگی تھیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ مکان حاصل کرنے ہی کی غرض سے کیدار ناتھ کو طرح طرح سے ڈرایا دھمکایا گیا تھا۔ عجب نہیں کہ کسی روز اسے قتل بھی کر دیا جاتا۔"

"ایسا بھی خطرہ تھا؟" رحیم داد نے تعجب کا اظہار کیا۔

"بالکل تھا۔ بوڑھے کیدار ناتھ کو اس خطرے کا بخوبی اندازہ بھی ہو گیا تھا۔" عبدالطیف نے رحیم داد کو بتایا "تب ہی تو وہ اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ جان بچا کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔"

"اس کے جانے کے بعد کیا ہوا؟"

"کچھ ہی دنوں بعد گوالیار کے ایک مہاجر نے کلیم کی بنیاد پر مکان اپنے نام الاٹ کرا لیا۔"

"تو نے کیا کارروائی کی؟"

"میں سوچ ہی رہا تھا کیا کروں۔" عبدالطیف نے بجھے ہوئے لہجے میں رحیم داد کو بتایا۔ "ایک روز وہ پولیس لے کر آیا اور مکان پر قبضہ کر لیا۔ میں اس وقت اسکول میں طلباء کو پڑھا رہا تھا واپس آ کر دیکھا' میرا سامان گھر کے باہر پڑا تھا۔ بیوی ایک ٹرنک پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی میں چھوٹی بچی تھی۔ اسے بخار تھا۔ بیوی نے مجھے دیکھا تو بلک بلک کر رونے لگی۔ گھر کے اندر قہ گونج رہے تھے۔ مکان ملنے پر خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "چوہد صاحب' کسی نے سچ کہا ہے۔ کہیں بجتے ہیں نقارے' کہیں ماتم بھی ہوتے ہیں۔ دنیا اسی کا ہے۔"

"تیرے ساتھ تو بہت ظلم ہوا۔" رحیم داد نے اظہار ہمدردی کیا۔

"نہ پوچھئے کیسے کیسے ظلم ہوئے۔ آپ سے کیا کیا بتاؤں۔" عبدالطیف کے چہرے پر افسردگ

ئی۔ "ایک بار پھر رہائش کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ میں اکیلا بے گھر نہ تھا۔ میری طرح نہ جانے کتنے اور سر چھپانے کے لیے چھت کی تلاش میں سرگرداں تھے۔"

"تیرا کلیم شلیم نہیں تھا؟"

"جناب کلیم تو تب ہوتا جب ہندوستان میں میری کوئی جائیداد یا املاک ہوتی۔ وہاں بھی کرائے کے مکان میں رہتا تھا' یہاں بھی کرائے کے مکان کی تلاش تھی۔" عبدالطیف نے صاف گوئی سے رحیم داد کو اپنے بارے میں بتایا۔ "حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ بنوانے والوں نے دھڑلے سے بوگس کلیم بنوائے اور ان کی بنیاد پر الاٹمنٹ بھی حاصل کیے۔ راتوں رات دولت مند اور صاحب جائیداد بن گئے۔ مگر میرے پاس نہ رشوت دینے کے لیے رقم تھی نہ وسائل تھے' نہ اعلیٰ حکام تک رسائی تھی۔ اور سچ پوچھئے تو نہ مجھ میں جعل سازی کی ہمت ہی تھی۔"

وہ باتوں کی دھن میں ایک بار پھر بہک گیا۔ مگر فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مہربان علی کی زبانی وہ رحیم داد کے بارے میں سن چکا تھا کہ وہ مہاجر ہے اور اپنے بہت بڑے کلیم کی بنیاد پر متروکہ جائیداد الاٹ کرا چکا ہے۔ بہت بڑا زمین دار بن چکا ہے۔ اس نے جھٹ تلافی کی۔ معذرت کرنے کے انداز میں کہا۔ "مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سے ایسے مہاجر ہیں جو ہندوستان میں لاکھوں کی جائیداد چھوڑ کر آئے مگر ان کا اتنا بڑا کلیم منظور نہ ہوا۔ اور متروکہ جائیداد میں سے الاٹمنٹ کے ذریعے کچھ ملا بھی تو ہزار طرح کی مشکلات برداشت کرنے کے بعد۔ بات یہ ہے چوہدری صاحب' چند برے اور بد دیانت افراد کی مجرمانہ حرکتوں کے باعث سارے ہی مہاجر بدنام ہوئے۔ ایک گندی مچھلی سارے ہی تالاب کو گندہ کرتی ہے۔" عبدالطیف اب خود اپنی تردید کر رہا تھا۔

رحیم داد نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "بعد میں تو کہیں نہ کہیں رہنے کو ٹھکانا مل گیا ہو گا؟"

"کرائے کا مکان بہت تلاش کیا' لیکن کہیں ملا نہیں۔" عبدالطیف نے بتایا۔ "بہت عرصے تک یہ عالم رہا کہ چند ہفتے کسی ایک ملنے والے کے ساتھ ٹھیر جاتا چند مہینے کسی دوسرے کے ساتھ۔ کوئی مستقل طور ٹھکانا نہ تھا۔ سامان اٹھائے ادھر ادھر پھرتا تھا۔ جہاں موقع ملتا پڑاؤ ڈال دیتا۔ آخر مرگھٹ میں جگہ ملی۔ وہیں رہنے لگا۔"

"مرگھٹ میں!" رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر عبدالطیف کو دیکھا' جس کے چہرے پر نزاں چھائی ہوئی تھی۔ "وہاں تو ہندو اپنے مردے جلاتے ہیں۔"

"مگر اب تو نہ ہندو رہے تھے نہ ان کے مردے اور ارتھیاں۔ ان کو جلانے وہاں کون آ" عبدالطیف نے بے نیازی سے کہا۔ "مرگھٹ بہت پرانا تھا اور ایک مدت سے بالکل ویران پڑا مردوں کا کریا کرم کرنے والے، لکڑیوں پر ارتھی رکھ کر چتا بنانے والے، اس پر تیل یا گھی ڈا آگ لگانے والے اور ایسے ہی دوسرے کام کرنے والے سارے ہی ہندو، فسادات کے بعد گئے تھے۔ صرف ایک ہندو مرگھٹ کی دیکھ بھال کے لیے ٹھیرا رہا۔ پھر وہ بھی اپنے بال بچوں ک کر چلا گیا۔ بلکہ سننے میں تو یہ بھی آیا کہ اس کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ مجھے صحیح طور پر علم نہیں ا کیا حشر ہوا۔ میں نے تو جب مرگھٹ دیکھا تو وہاں کسی انسان کا نام و نشان تک نہ تھا۔"

"کیسی جگہ تھی؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

☆

عبدالطیف جب پہلی بار گیا تو مرگھٹ پر ہو کا عالم طاری تھا۔ شیشم اور نیم کے درختوں کے جھنڈ کے آس پاس کئی کچے مکانات تھے۔ ایک مکان کسی قدر بڑا تھا۔ اس میں دو کمرے تھے۔ کوٹھری تھی۔

کھانا پکانے کے لیے چھوٹی سی رسوئی بھی تھی۔

صحن میں مٹی کی ٹوٹے ہوئے برتن بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف دو بوسیدہ چارپائیاں تھیں۔ قریب ہی ایک گوشے میں پھٹے پرانے کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ صحن میں گھاس اور جنگلی کثرت سے تھے۔ کمروں میں مکڑیوں کے جگہ جگہ جالے تھے۔ دوسرے گھروں کا حال بھی ا تھا۔

خالی اور اجڑے ہوئے مکانات سے کچھ فاصلے پر ایک سادھی تھی۔ مگر وہ پختہ اینٹوں کی بن تھی۔ سادھی میں گیدڑوں نے گہرے گہرے بھٹ بنا رکھے تھے۔ سادھی سے متصل دو کو تھیں جن میں مردوں کو نذر آتش کرنے کے لیے کبھی تیل اور گھی کے کنستر رکھے جاتے تھے اب ان میں چند ٹوٹے پھوٹے زنگ آلود ٹین کے ڈبے اور کنستر ادھر ادھر بے ترتیبی سے تھے۔

کوٹھریوں کے آگے چھپر تھا۔ چھپر کے سامنے ایک طرف لکڑیوں کا ڈھیر تھا۔ ایک اونچی لکڑیاں تولنے کے لیے ترازو لٹک رہی تھی جس کا ایک پلڑا ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو چکا تھا۔

مرگھٹ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے پیپل کا ایک گھنا درخت ملتا تھا۔ اس کے چبوترہ تھا۔ ارتھیاں کریا کرم سے پہلے اسی پختہ چبوترے پر لا کر رکھی جاتی تھیں۔ چبوترے

ر ہینڈ پمپ تھا جس کا ہینڈل زنگ آلود ہو چکا تھا۔

رگھٹ میل سوا میل کے رقبے میں پھیلا تھا۔ جگہ جگہ راکھ کی مٹی مٹی ڈھیریاں تھیں جن کے رد کوئلے اور جلی ہوئی لکڑیوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ مردوں کی ہڈیاں بھی نظر آتی تھیں۔ ہر طرف خاک اڑتی تھی اور ویرانی برستی تھی۔

☆

بدالطیف نے مرگھٹ کے بارے میں رحیم داد کو تفصیلات بتانے سے گریز کیا۔ صرف اس قدر پر اکتفا کیا۔ "چوہدری صاحب، نہ پوچھئے کیسی جگہ تھی۔ بالکل اجاڑ اور ویران۔ ایسی ہی جیسے اور ویران مرگھٹ ہوتے ہیں۔"

"یہ تو بتا، تو ادھر پہنچا کیسے؟" رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"میرے ساتھ اسکول میں ایک ٹیچر تھا۔ اس کا نام جبار خان تھا۔ وہ بھی میری ہی طرح بے گھر در تھا۔ اسی نے اس جگہ کا سراغ نکالا۔" عبدالطیف نے مطلع کیا۔ "وہی مجھے مرگھٹ لے گیا وہ پہلے بھی کئی بار وہاں جا چکا تھا اور گھوم پھر کر اچھی طرح جائزہ بھی لے چکا تھا۔ مرگھٹ کے ے میں ہر طرح کی واقفیت بھی رکھتا تھا۔"

"پر تو ایسی ویران جگہ رہنے کو تیار کیسے ہو گیا؟"

"مجبوری جو تھی۔" عبدالطیف نے مسکرا کر کسی قدر بے تکلفی سے جواب دیا۔ "اکیلا تو شاید وہاں رہنے پر تیار نہ ہوتا مگر جبار خان نے ہمت بندھائی تو میں رضامند ہو گیا۔ کرتا بھی کیا۔ نے کے لیے کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ جس کے گھر میں عارضی قیام تھا وہ سامان اٹھا کر باہر پھینکنے کی دھمکی چکا تھا۔ آخر ہم دونوں نے ایک روز اپنا اپنا سامان اٹھایا اور بیوی بچوں کے ساتھ مرگھٹ میں نے کے لیے پہنچ گئے۔ بڑا مکان اس نے مجھے رہنے کے لیے دے دیا۔ اس لیے کہ اس کا چھوٹا تھا۔ اس کا صرف ایک بچہ تھا۔ اور میرے تین تھے۔"

"رگھٹ تو بہت ڈراؤنی جگہ ہوتی ہے۔ تجھے ادھر ڈر اور خوف نہیں لگا؟" رحیم داد نے مسکرا کر آرائی کی۔ "ضرور لگا ہو گا۔"

☆

بدالطیف مرگھٹ پر رہنے کے لیے پہنچا تو اتوار کا دن تھا۔ اسکول میں چھٹی تھی۔ اس نے بیوی

کے ساتھ مل کر کمروں سے مکڑیوں کے جالے ہٹائے۔ مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے اور پھٹے پرانے کپڑے اٹھا کر گھر سے دور پھینکے۔ صحن کو گھاس اور جنگلی پودوں سے صاف کیا۔ کمروں کی صفائی کی اور رات کا کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔ دن بھر گھر کی صفائی کرنے کے بعد اس قدر تھک گیا تھا کہ فوراً ہی گہری نیند سو گیا۔

جاڑے کی رات تھی۔ عبداللطیف بیوی بچوں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سو رہا تھا۔ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ باہر صحن میں کوئی چل رہا ہے۔ قدموں کی دبی دبی آہٹ ابھر رہی تھی۔ کمرے میں گوشت کے جلنے کی بو پھیلی تھی۔ وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ دیکھا بیوی پہلے ہی بیدار ہو چکی ہے۔ وہ خوف زدہ اور سہمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

عبداللطیف کھنکارتا ہوا بستر سے نیچے اترا۔ لالٹین کی لو اونچی کی۔ اسے ہاتھ میں لٹکایا۔ جی کڑا کیا اور دھڑکتے دل سے دروازہ کھولا۔ بیوی بھی اٹھ کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ دہلیز پر دم بخود کھڑی رہی۔ عبداللطیف نے لالٹین اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی نظر نہ آیا۔ ہر طرف کہر کا ہلکا سرمئی دھندلکا پھیلا تھا۔ اس نے جبار خان کو آواز دی۔ وہ بھی جاگ رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں ڈنڈا سنبھالے فوراً گھر سے باہر نکلا اور سردی سے کپکپاتا ہوا عبداللطیف کے پاس پہنچ گیا۔

دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ خوف اور سراسیمگی کا احساس زائل کرنے کے لیے ہنستے رہے، قہقہے لگاتے رہے۔ بھوت پریت کے وجود کو واہمہ قرار دے کر ایک دوسرے کو مطمئ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جبار خان چلا گیا۔ مگر عبداللطیف آدھی رات تک جاگتا رہا۔ بیو بھی جاگتی رہی۔ ذرا بھی آہٹ ہوتی، چونک کر دروازہ کی جانب دیکھتی۔

پہلی رات سخت بے چینی میں کٹی۔ دوسری رات آئی، تیسری آئی۔ جاڑے کی یہ راتیں ڈرا خوف کے عالم میں گزرتی رہیں۔ بار بار آنکھ کھل جاتی۔ کبھی رات کے پر ہول سناٹے میں رو اور سسکیاں بھرنے کی آوازیں ابھرتیں کبھی تیز تیز قدموں سے دوڑنے کی۔ ہوا تیز ہوتی تو ایسا ہوتا جیسے پیپل کے پیڑ پر بیٹھا کوئی کھلکھلا کر ہنس رہا ہے۔ قہقہے لگا رہا ہے۔ سب سے زیادہ خو ہراس گیدڑ پھیلاتے۔ سرشام ہی ان کے غول کے غول مرگھٹ میں منڈلانے لگتے۔ ایسی ناک آوازیں نکالتے تھے کہ بچے نیند سے بیدار ہو جاتے اور ڈر کر زور زور سے رونے لگتے۔

ملنے جلنے والوں سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کیا تو طرح طرح کی باتیں سننے میں آئیں۔ کس چڑیل کا ذکر کیا کسی نے چھل پیری کا واقعہ سنایا۔ کسی نے سرکٹے کے بارے میں بتایا کہ اس

ب ہوتا ہے۔ صرف گردن ہوتی ہے اور وہ نرخرے سے ایسی خوف ناک آواز نکالتا ہے کہ سننے لا ڈر کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ کسی نے اگیا بیتال کا قصہ چھیڑ دیا کہ وہ چھلاوا ہوتا ہے۔ مرگھٹ ں کا مسکن ہوتا ہے۔ آگ کی مانند دہکتا ہے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ ایک جگہ نہیں ٹکتا۔ ان ں کو سن کر خوف اور سوا ہوا۔

عبداللطیف اور جبار خان عام طور پر سورج غروب ہونے سے پہلے ہی گھروں کو واپس پہنچ تے۔ کسی وجہ سے کبھی دیر ہو جاتی تو واپسی پر کئی بار ایسا محسوس ہوا کہ مرگھٹ کے اندھیرے میں پانک شعلہ بھڑکا۔ آن کی آن میں قریب آیا اور دور جا کر غائب ہو گیا۔ مگر پلک جھپکتے ہی پھر نمودار تا۔ معاً اگیا بیتال کا خیال آتا اور خوف سے دل دہل جاتا۔ قدم ڈگمگا جاتے۔ کہنے والے کہتے ہیں لہ یہ مردوں کی ہڈیوں سے خارج ہونے والا ایک کیمیائی عنصر 'فاسفورس' ہوتا ہے جو آگ کی طرح لتا ہوا نظر آتا ہے اور پھر فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

ڈر اور خوف سے پریشان ہو کر عبداللطیف نے کئی بار مرگھٹ چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ مگر کہیں سر ہپانے کا ٹھکانا نہ ملا۔ اسی عالم میں جاڑا گزر گیا۔ گرمی کا موسم شروع ہوا تو راتوں کا پر ہول سناٹا چھ کم ہو گیا۔ مرگھٹ کی ویرانی بھی زیادہ محسوس نہ ہوتی۔ اب راتیں مختصر ہو گئی تھیں اور دن ویل ہو گئے تھے۔ سورج جلد طلوع ہوتا اور دیر سے غروب ہوتا۔

عبداللطیف اور جبار خان رفتہ رفتہ مرگھٹ کے کے ماحول سے مانوس ہوتے گئے۔ خوف اور شت میں اس قدر کمی آ گئی کہ چاندنی راتوں میں دونوں گھر کے باہر چارپائی ڈال کر بیٹھ جاتے۔ ائے پیتے، سگریٹوں پر کش لگاتے اور رات گئے تک اطمینان سے باتیں کرتے رہتے۔

بچے دن بھر مرگھٹ میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے۔ بے دھڑک اس چبوترے پر لیٹ جاتے جس پر بھی ارتھیاں رکھی جاتی تھیں۔ کبھی کھیل کود میں کسی چتا کی بچی کچی راکھ اڑاتے، ہنستے، قہقہے اتے۔ اکثر مردوں کی ہڈیاں اٹھا کر گھروں میں لے آتے۔ ابتدا میں تو ان کو ڈرایا دھمکایا گیا۔ انٹ ڈپٹ سے بھی کام لیا گیا۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ مردوں کی ہڈیوں کا خوف بھی جاتا رہا۔ رگھٹ مرگھٹ نہ رہا عام میدان بن گیا۔ زندگی کے ہنگامے موت کے خوف پر غالب آ گئے۔

☆

رحیم داد نے مرگھٹ کے بارے میں ڈر اور خوف کا اظہار کیا تو عبداللطیف نے مسکرا کر بے ازی سے کہا۔ "شروع شروع میں تو واقعی بہت ڈر معلوم ہوتا تھا۔ خاص طور پر راتیں بہت راؤنی ہوتیں۔ اکثر جاگتے ہوئے گزر جاتیں۔ مگر بعد میں تو یہ عالم ہوا کہ مرگھٹ مرگھٹ ہی نہ

معلوم ہوتا۔ نہ کبھی ڈر محسوس ہوتا نہ خوف۔ میں لگ بھگ تین سال تک مرگھٹ میں رہا۔"

"لطیف، تو تین سال تک مرگھٹ میں رہا؟ حد ہو گئی۔" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"صرف میں اور جبار خان ہی وہاں نہیں رہے۔ سال بھر بھی نہ گزرا تھا کہ دوسرے خالی مکان بھی آباد ہو گئے۔" عبدالطیف نے بتایا۔ "پھر تو ایسا بھی ہوا کہ میری طرح کے دوسرے بے گھر لوگوں نے بھی رہنے کے لیے مرگھٹ میں اپنے گھر خود بنانے شروع کر دیے۔ بعض نے اینٹوں کی پختہ دیواریں کھڑی کیں اور ان پر چھپریا ٹین کے سائبان ڈال کر رہنے لگے۔"

"کسی نے روک ٹوک تو نہیں کی؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"روک ٹوک کون کرتا۔ مرگھٹ کی زمین تھی۔ نہ کوئی مالک تھا نہ کوئی دعویدار۔ نہ کرایہ نہ کسی قسم کا ٹیکس۔" عبدالطیف نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "ہر شخص اپنے مکان کو ذاتی ملکیت سمجھتا تھا۔ میں بہت خوش تھا۔ دل ہی دل میں کہتا، چلو زندگی میں اپنا بھی ایک عدد مکان ہو گیا۔ تھا تو شہر سے دور لیکن اطمینان اور سکون حاصل تھا۔ مزے سے گزر بسر ہو رہی تھی۔"

"تو نے وہ مکان بعد میں فروخت کر دیا یا کرائے پر چڑھا دیا؟"

"نہ میں نے اسے فروخت کیا نہ ہی کسی کو کرائے پر دیا۔" عبدالطیف کے چہرے پر ایک بار پھر دکھ کے سائے پھیل گئے۔ "جب اجاڑ اور ڈراؤنے مرگھٹ پر اچھی خاصی آبادی ہو گئی، ویرانی کے بجائے زندگی کی چہل پہل اور رونق نظر آنے لگی تو ہوشیار پور کے ایک مہاجر وکیل نے ہوشیاری دکھائی۔ مہاجرین کی آبادکاری کے نام پر ایک کواپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی قائم کی۔ ایک ریٹائرڈ سیشن جج کو اس کا سرپرست بنایا۔ سوسائٹی کو باقاعدہ رجسٹر کرایا اور سرکاری افسروں اور اہل کاروں سے سازباز کر کے اور تگڑی رشوت دے کر مرگھٹ کی زمین سوسائٹی کے نام پر الاٹ کرا لی۔"

"مرگھٹ کو الاٹ کرا لیا، یہ کیسے ہو گیا؟" رحیم داد نے تعجب سے عبدالطیف کو دیکھا۔

"اس کا علم تو ان سرکاری افسروں کو ہو گا، جنھوں نے الاٹمنٹ کا حکم جاری کیا۔" عبدالطیف کے لہجے میں تلخی پیدا ہو گئی۔ "کس قانون اور کس ضابطے کے تحت ایسا کیا گیا یہ مجھے نہیں معلوم۔ کوشش بھی نہ کی۔"

"پر جب الاٹمنٹ کا حکم دیا ہو گا تو تجھے بھی پتہ چل گیا ہو گا۔"

"تمام کارروائی اس قدر رازداری سے کی گئی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔" عبدالطیف نے رحیم داد کو بتایا۔ "پتہ اس وقت چلا جب وکیل نے عدالت سے سب کی بے دخلی کے احکامات حاصل کیے اور ایک روز پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ پہنچا۔ تمام مکانات پولیس کی مدد سے خالی کرائے۔ ان کو کدالوں اور بیلچوں سے توڑ پھوڑ کر مسمار کر دیا گیا۔"

"پر وکیل کو اس سے کیا ملا؟" رحیم داد اب تک بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا تھا۔

"اس نے مرگھٹ کی زمین کو دو دو اور چار چار مرلے کے چھوٹے بڑے پلاٹوں میں تقسیم کیا۔ ان میں سے بیشتر کو سوسائٹی کے فرضی ممبروں کے نام الاٹ کر کے فروخت کر دیا۔ اس طرح اس نے لاکھوں روپے پیدا کر لیے۔"

"لگتا ہے وکیل بہت اونچا کاریگر تھا۔" رحیم داد نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔

عبدالطیف نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "جب تک میں رہا اسے خاموش کالونی کہا جاتا تھا۔ بعد میں اس کا کیا نام رکھا گیا، یہ مجھے نہیں معلوم۔ میں ایسا دل برداشتہ ہوا کہ شیخوپورہ ہی چھوڑ دیا۔ لاہور آ گیا۔ تب سے یہیں ہوں۔"

اس نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ ایک ملازم کمرے میں داخل ہوا۔ رحیم داد کو یہ پیغام پہنچایا کہ احسان شاہ نے اسے بلایا ہے۔ رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ عبدالطیف بھی کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے اسے مخاطب کیا۔ "لطیف، تو کل آ جانا۔ میں آج شاہ جی سے بھی تیرے بارے میں مشورہ کر لوں گا۔" رحیم داد آگے بڑھا۔ عبدالطیف سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

☆

احسان علی شاہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ رحیم داد اس کے پاس پہنچا۔ احسان علی شاہ نے مسکرا کر پوچھا۔ "چوہدری تو کمرے میں بیٹھا کس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا؟"

"عبدالطیف تھا۔" رحیم داد نے قریب کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"کون عبدالطیف؟" احسان شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

"وہی جسے مہربان علی لایا تھا۔" رحیم داد نے بتایا۔ "تو نے کہا تھا انگریزی پڑھنے کے لیے ماسٹر لگا لے۔ وہ اسی لیے آیا تھا۔"

احسان شاہ نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "مہربان سے تو میں نے ہی کہا تھا۔ وہ تیرے لیے ماسٹر لے آیا؟ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔ تجھے کیسا لگا؟"

"مجھے تو ٹھیک ٹھاک بندہ لگتا ہے۔ بی اے تک پڑھا ہے۔ کہتا تھا امتحان دیا تھا پر بی اے پاس نہیں کر سکا۔"

"پر تجھے پڑھانے کے لیے تو اتنی تعلیم کافی ہے۔"

”پہلے بھی سکول میں پڑھاتا رہا ہے۔ “ رحیم داد نے احسان شاہ کا عندیہ لینا چاہا۔ ”تیری رائے ہو تو اسے لگا لوں۔ “

”پڑھنا تجھے ہے یا میں نے؟“ احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ ”تجھے ٹھیک ٹھاک معلوم ہوتا ہے تو لگا لے۔ اپنے ساتھ لے جا۔ “

”میں نے اسے کل بلایا ہے۔ “ رحیم داد نے مطلع کیا۔ ”پتہ نہیں، وہ کوٹلہ ہر کشن جانے کو تیار بھی ہو گا کہ نہیں۔ اس کے بال بچے ادھر ہی ہوتے ہیں۔ “

”مہربان نے اسے یہ بات پہلے ہی بتا دی ہو گی۔ آگے اس کی مرضی ہے۔ تو اس سے پوچھ لینا۔ “

”پوچھ لوں گا۔ “ رحیم داد نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”یہ بتا تو نے مجھے کس لیے بلایا ہے؟“

”میں کل صبح پشاور جا رہا ہوں۔ “

”کب تک واپسی ہو گی؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”ہفتہ بھر لگ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ پہلے آ جاؤں۔ “ کوٹلہ ہر کشن جانا چاہے تو چلا جانا۔ ویسے تیری مرضی ہے۔ میرے واپس آنے تک ٹھیر سکتا ہے تو ٹھہر جا۔ “

”کیا کروں گا ادھر ٹھیر کر۔ پتہ نہیں لائل پور کی زمین کا جھگڑا کب طے ہو۔ تو نے تو مجھے اس کے لیے روکا تھا۔ “ رحیم داد نے تجسس کا اظہار کیا۔ ”یہ بتا، لائل پور کی زمین کا کیا بنا؟“

”اس کے فیصلے میں تو دیر لگے گی۔ ویسے میری کوشش تو یہی ہے کہ جلد ہی کام بن جائے۔ جھگڑا عدالت میں نہ جاتا تو بہت پہلے زمین اپنے پاس آ جاتی۔ “ احسان شاہ نے رحیم داد کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ ”تو کوٹلہ ہر کشن ہی میں ٹھیرنا۔ ضرورت ہو گی تو تجھے بلا لوں گا۔ “

”میں کل نہیں تو پرسوں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ ویسے بھی مجھے اب اپنے پنڈ میں ہونا چاہیے۔ وہاں سے آئے ہوئے ڈیڑھ مہینے سے بھی کچھ اوپر ہی ہو گیا۔ “

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ دونوں اٹھ کر کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔

دوسرے روز صبح ہی صبح احسان شاہ پشاور کے لیے روانہ ہو گیا۔

ساڑھے نو بجے عبداللطیف آ گیا۔ رحیم داد اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اس نے غور کیا کہ عبداللطیف بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی بش شرٹ پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔ پیشانی پر بھی پسینے کے قطرے بکھرے ہوئے تھے۔ اس روز گرمی بھی زیادہ تھی۔ آسمان پر بادل چھائے تھے، مگر ہوا بند تھی۔ حبس اس قدر تھا کہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

”عبداللطیف تو رہتا کہاں ہے؟“ رحیم داد نے اس کی خستہ حالت دیکھ کر قیاس آرائی کی۔ ”لگتا ہے کہیں دور ہی رہتا ہے۔ “

”یہاں سے کم و بیش پانچ میل کا فاصلہ ہو گا۔ “

”تب تو بہت دور سے چل کر آ رہا ہے۔ “ رحیم داد نے نرم لہجے میں کہا۔ ”کرائے کا مکان لے رکھا ہو گا۔ “

”نہیں چوہدری صاحب“ عبداللطیف نے بتایا۔ ”اتنی آمدنی ہی نہیں کہ مکان کا کرایہ ادا کر سکوں۔ لہٰذا تلاش ہی نہیں کیا۔ “

”پر کہیں نہ کہیں تو رہتا ہی ہو گا۔ “

”میں نے آپ سے بتایا تھا کہ شام کو ایک صاحب کے بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ “ عبداللطیف نے رحیم داد کو کسی قدر تفصیل سے اپنی رہائش کے بارے میں بتایا۔ ”وہ آگرہ کے مہاجر ہیں۔ انارکلی میں ان کی جوتوں کی دکان ہے۔ آگرہ میں بھی یہی کاروبار کرتے تھے۔ سنا ہے وہاں بہت بڑا کاروبار تھا۔ مکان بھی اپنا ذاتی تھا۔ یہاں ان کو جو کوٹھی الاٹ ہوئی ہے اس میں گیراج بھی ہے۔ مگر گیراج میں رکھنے کے لیے کار نہیں ہے۔ میں اسی گیراج میں بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ “

”اس میں تو بہت تکلیف ہوتی ہو گی۔ “ رحیم داد نے اظہار ہمدردی کیا۔

”ہوتی تو ہے لیکن یہی کیا کم ہے کہ سر چھپانے کو ٹھکانا تو ہے۔ “ اس کے لہجے میں دفعتہً افسردگی پیدا ہو گئی۔ ”شاید اسے بھی جلد ہی خالی کرنا پڑے۔ سنا ہے اسے جوتوں کا گودام بنانے کا منصوبہ زیر غور ہے۔ صرف سنا ہی سنا ہے۔ کسی نے اس سلسلے میں مجھ سے بات نہیں کی۔ “

”فکر نہ کر، اب تجھے زیادہ دنوں پریشانی نہیں اٹھانی پڑے گی۔ “ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”تو میرے ساتھ کوٹلہ ہر کشن چل۔ بال بچوں کو بھی ساتھ لے لے۔ ادھر ٹھیرنے کو بہت جگہ ہے۔ ویسے مہربان علی نے تجھے بتا ہی دیا ہو گا۔ تجھے کوٹلہ ہر کشن جانا ہو گا۔ “

”انھوں نے مجھے صرف اتنا ہی بتایا تھا۔ “ عبداللطیف کے مرجھائے ہوئے چہرے پر تازگی ابھرنے لگی۔ ”دوسری تفصیلات کے بارے میں فیصلہ آپ کریں گے۔ “

”فیصلہ تو میں نے کر لیا ہے۔ “ رحیم داد نے عبداللطیف کو بتایا۔ ”تجھے ۶۰ روپے مہینہ تنخواہ ملے گی۔ رہنے کو مکان اور فصل پر غلہ بھی ملے گا۔ اپنے پاس بہت مویشی ہیں۔ دودھ اور مکھن بھی ملے گا۔ “ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”جان بن جائے گی تیری۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھ۔ بدن پر ذرا بھی گوشت نہیں۔ ہڈیوں کا پنجر نظر آتا ہے۔ “

"آپ کب تک کوٹلہ ہرکشن جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"مجھے تو کل جانا ہے۔" رحیم داد نے کہا۔ "اگر تجھے میری نوکری کرنی منظور ہے تو کل میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جا۔"

"مگر میں اتنی جلدی کیسے چل سکتا ہوں۔" عبداللطیف نے اپنی مشکل بیان کی۔ "میرے ساتھ بیوی بچے بھی تو ہیں۔"

"ایسا کر، تو کل میرے ساتھ کوٹلہ ہرکشن چل۔" وہاں ٹھیر کر دو چار روز میں دیکھ لے، سمجھ لے۔ آگے جیسی تیری مرضی۔ بال بچوں کو بعد میں ادھر لے آنا۔"

"آپ کی تجویز نہایت مناسب ہے۔" عبداللطیف نے اتفاق رائے کیا۔

رحیم داد نے جیب سے پچاس روپے نکال کر عبداللطیف کو دیئے۔ "لے یہ رکھ لے۔ جو کتابیں شروع میں پڑھانی ہیں، ان کو خرید لینا۔ کاپیاں شاپیاں بھی خرید لینا۔ جو روپے بچ جائیں اپنے پاس رکھ لینا۔ تجھے گھر کا کام چلانے کے لیے گھر والی کو بھی تو کچھ دے کر جانا ہوگا۔"

"جی ہاں، مجھے سب سے زیادہ یہی فکر تھی۔" عبداللطیف کے لہجے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔

"کل آپ کس وقت یہاں سے روانہ ہوں گے؟"

"صبح ناشتا کر کے چلنے کا ارادہ ہے۔ تب تک تو پہنچ جائے گا نا؟"

"میں صبح ٹھیک آٹھ بجے پہنچ جاؤں گا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اجازت ہو تو میں اب چلا جاؤں۔"

"بالکل چلا جا۔ کل میں تیرا انتظار کروں گا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔

عبداللطیف نے سلام کیا اور باہر چلا گیا۔

صبح آٹھ بجنے سے چند منٹ پہلے ہی عبداللطیف پہنچ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بوسیدہ اٹیچی تھا جس میں چند کپڑے اور ضروری ساز و سامان تھا۔ بغل میں بستر دبا تھا جو ایک دری، چادر اور تکیے کو لپیٹ کر بنایا گیا تھا۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہو کر سفر کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ کوٹھی کے پھاٹک پر اس کی جیپ کھڑی تھی۔ رحیم داد نے عبداللطیف کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ کوٹھی سے باہر نکلا اور عبداللطیف کے ہم راہ اس میں بیٹھ گیا۔ جیپ آگے بڑھی اور پختہ سڑک پر دوڑنے لگی۔

بارش رکی ہوئی تھی۔ راستے میں بھی بارش سے سابقہ نہ پڑا۔ مگر جب جیپ کوٹلہ ہرکشن میں پہنچی تو چھما چھم بارش ہو رہی تھی۔ اطلاع ملتے ہی نادر خان حویلی کے پھاٹک پر پہنچ گیا۔ رحیم داد کو ادب سے سلام کیا۔ مزاج پوچھا۔ حال احوال معلوم کیا۔ رحیم داد نے اسے عبداللطیف سے ملایا۔

اس کی آمد کا مقصد بیان کیا۔ اور یہ ہدایت کی کہ عبداللطیف کے قیام کا عارضی طور پر مہمان خانے میں بندوبست کر دیا جائے۔

رحیم داد نے نادر خان سے زیادہ بات چیت نہ کی۔ سفر کی تکان سے نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ غسل کرنے کے بعد آرام کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مڑ کر نادر خان کی جانب دیکھا۔ "نادر، تجھ سے کل صبح آرام سے گل بات ہوگی۔ اب تو میں بہت تھکا ہوا ہوں۔" وہ آگے بڑھا اور اپنے کمرے کی جانب روانہ ہو گیا۔ نادر خان خاموش کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

عبداللطیف بھی گم صم کھڑا تھا۔ وہ حویلی کی شان و شوکت اور رحیم داد کی آن بان دیکھ کر بہت مرعوب ہوا۔ نادر خان کے ہم راہ مہمان خانے میں گیا۔ ایک کمرے میں داخل ہوا جس میں نوکروں نے پہلے ہی اس کا بستر لگا دیا تھا۔ نادر خان اس کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ وہ اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

ناشتا کرنے کے بعد رحیم داد صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ اوپر کی منزل سے اتر کر نیچے آیا۔ بڑے کمرے میں پہنچا اور ایک صوفے پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اس نے نادر خان کو طلب کیا اور خاموش بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد نادر خان پہنچ گیا۔ اس کی بیوی، جنت بھی اس کے ہم راہ تھی۔ وہ بن سنور کر آئی تھی اور دوپٹے کے آنچل سے ہلکا سا گھونگھٹ نکال کر اپنے شوہر کے پہلو میں سمٹی سمٹائی کھڑی تھی۔ گود میں اپنے شیر خوار بیٹے کو اٹھائے ہوئے تھی۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو چونک پڑا۔ معاً اسے اپنا پہلوٹی کا بیٹا کریم داد یاد آگیا۔ بچپن میں وہ ہو بہو ایسا ہی تھا۔ مگر کریم داد عرف کریما اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی ماں نوراں کے ساتھ آگ میں جل کر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کی یاد کے ساتھ ہی اس کا دل بجھ کر رہ گیا۔

جنت شرماتی لجاتی آگے بڑھی اور اپنے بچے کو رحیم داد کی طرف بڑھایا۔ رحیم داد نے اسے ہاتھوں میں لے کر سنبھالا۔ سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ گال کو پیار سے تھپ تھپایا اور جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ نادر خان بہت خوش نظر آرہا تھا تھا۔ چار بیٹیوں کے بعد یہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جنت کا چہرہ بھی مسرت سے سرخ پڑ گیا تھا۔

بچے نے ماں کی طرف دیکھا۔ رونے کے لیے منہ بگاڑا۔ رحیم داد نے اسے واپس جنت کی گود میں دے دیا۔ وہ سر جھکائے مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ دروازے پر پہنچ کر ٹھٹکی۔ مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ جنت نے بچے کو سینے سے چمٹا کر پیار کیا اور باہر نکل گئی۔

رحیم دار نے نادر خان کی جانب دیکھا۔ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ اس کے قریب ہی ایک

صوفے پر بیٹھ گیا تو رحیم داد نے دریافت کیا۔ "رفیع سہ فصل اٹھا کر لے گیا؟"

"ہاں جی' وہ لے گیا۔ اس کی جو رقم بنتی تھی وہ بھی دے گیا۔" اس کے ہاتھ میں نوٹوں کی گڈیاں موجود تھیں۔ "یہ رہی جی پوری رقم۔"

رحیم داد نے رومال میں لپٹے ہوئے نوٹ لے کر اپنے قریب رکھ لیے۔

نادر خان نے کہا۔ "سہ خریف کی فصل اٹھانے کو بھی کہتا تھا۔"

"خریف کی فصل کے بارے میں واڈھی پر سوچا جائے گا۔" رحیم داد نے بے نیازی سے کہا۔ "یہ بتا' تو نے نیچے کے چھوٹے زمین داروں اور حصے داروں کی زمین خریدنے کے لیے بیعانہ شیعانہ تو ابھی نہیں دیا؟"

"تیری اجازت کے بغیر کیسے دے سکتا تھا۔ ویسے شہ زور مزاری کی حویلی میں میں نے تجھ سے پوچھ لیا تھا۔ پر نہ اب تک کسی کو کچھ دیا نہ بات پکی کی۔" نادر خان نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "پچھے مہینے ان کے کچھ بندے سودا طے کرنے کی نیت سے آئے بھی تھے۔ میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا۔ چوہدری کی واپسی سے پہلے کچھ طے نہیں ہو سکتا۔"

"یہ تو نے بہت ٹھیک کیا۔" رحیم داد خوش ہو کر بولا۔ "میں نے اس بارے میں شاہ جی سے بھی گل بات کی تھی۔ اس نے مشورہ دیا ہے کہ ابھی تو برسات کا موسم ہے۔ پانی ویسے ہی بہت ہے۔ بارش کے بعد جب پانی کی کمی ہو جائے تب سودا کرنا ٹھیک رہے گا۔"

"شاہ جی نے مشورہ تو ٹھیک ہی دیا۔" نادر خان نے رحیم داد کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "جب پانی کی کمی ہو تو اپنے موگھوں سے زیادہ پانی نکالنا شروع کر دیا جائے۔ فصلیں خراب ہونے لگیں گی تو بہت سستے مول زمینیں مل جائیں گی۔"

"پر شاہ جی تو یہ بھی کہتا تھا کہ ابھی غلام محمد بیراج تیار نہیں ہوا۔ سندھ میں بیراجوں کی زمینوں کی الاٹمنٹ کیسے شروع ہو گئی؟" رحیم داد نے نادر خان کو مطلع کیا۔ "زمینوں کی الاٹمنٹ تو تب ہی ہونی چاہیے جب بیراج بن کر تیار ہو جائے۔"

"مجھے تو جی بیراجوں کی زمینوں اور ان کی الاٹمنٹوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔" نادر خان نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ "اور اب تو' تو آ ہی گیا ہے جو طے کرنا ہو گا طے کر لینا۔" اس نے بات کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ "دلاور والا کی زمین کا کیا بنا جی؟"

"وہ تو بہت جھگڑے کی زمین ہے۔ مزارعے اتنے سرکش اور جھگڑالو ہیں کہ میں تجھے کیا بتاؤں۔ انھوں نے تو بہت رولا کیا۔ کسی طرح کبضہ دینے کو تیار نہیں۔"

"جب ایسا ہے تو اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا۔" نادر خان نے دبی زبان سے کہا۔ "میں نے تو جی پہلے ہی کہا تھا ایسی جھگڑے کی زمین اپنے پاس رکھنا ٹھیک نہیں۔"

"تو نے جو کہا تھا میں نے وہی کیا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "سردار عظمت اللہ دریشک کے ہاتھ اسے فروخت کر دیا۔ اب زمین کا کبضہ اس نے ہی حاصل کرنا ہو گا۔ جب کبضہ مل جائے گا تو وہ زمین کی کیمت یہاں آ کر ادا کر دے گا۔ اس کے بارے میں میں نے خود طے نہیں کیا۔ شہ زور مزاری پر چھوڑ دیا ہے۔ شاہ جی کو بھی میں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس کی کوٹھی پر لکھا پڑھی ہو جائے گی۔"

"یہ تو جی بہت ہی ٹھیک ہو گیا۔" نادر خان نے مسکرا کر تائید کی۔

بارش رکی ہوئی تھی۔ رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے کمرے میں گیا۔ نادر خان نے فصل کی جو رقم دی تھی' اسے لوہے کی مضبوط ٹرنک میں رکھ کر تالا لگایا۔ واپس آیا اور نادر خان کے ہم راہ خریف کی فصل کا معائنہ کرنے کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

☆

رحیم داد نے عبداللطیف کو بلایا۔ وہ آیا تو رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔ "تجھے ادھر کوئی تکلیف شکیت تو نہیں؟ نوکر تو مہمان خانے میں موجود ہی رہتا ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو اسے بتا دینا۔"

"آپ کی مہربانی ہے۔ چوہدری صاحب' میں بہت آرام سے ہوں۔" عبداللطیف نے اسے اطمینان دلایا۔ "مجھے یہاں کسی بات کی تکلیف نہیں۔" اس نے رسان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ "اگر سفر کی تھکن دور ہو گئی ہو تو کیوں نہ آج ہی شام سے پڑھائی کا سلسلہ شروع کر دیا جائے؟"

رحیم داد نے بلا عذر اس کی بات مان لی۔

عبداللطیف شام کو کتابیں لے کر رحیم داد کے پاس پہنچ گیا اور تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رحیم داد نے پڑھائی میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ عبداللطیف بھی پوری توجہ سے اسے پڑھاتا۔ ہر لفظ اور ہر جملہ ذہن نشین کراتا۔ رحیم داد کہیں الجھتا یا اسے دقت پیش آتی تو نہایت صبر و سکون سے سمجھاتا اور نہایت وضاحت سے بار بار سمجھاتا۔

وہ رحیم داد کو صبح و شام دونوں وقت پابندی سے پڑھاتا رہا۔ ہفتہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ رحیم داد سے اجازت لے کر عبداللطیف لاہور گیا اور بیوی بچوں کو بھی لے آیا۔ ان کے ٹھہرنے کا انتظام بھی مہمان خانے میں ہی کیا گیا۔ رحیم داد کے پاس کوئی مہمان آتا ہی نہ تھا۔ پاس پڑوس کے زمین

داروں سے اس کا میل جول بھی نہ تھا۔ سرکاری افسروں اور اہل کاروں سے بھی اس نے کبھی مراسم پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لہٰذا مہمان خانہ عام طور پر خالی ہی رہتا تھا۔

برسات کے موسم میں تو ویسے بھی کسی مہمان کے آنے اور قیام کرنے کی توقع نہ تھی۔ عبداللطیف نہایت سکون سے مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کی صحت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی۔ جسم پر گوشت چڑھنے لگا تھا۔ چہرہ بھر گیا تھا۔ رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی جھلکنے لگی تھی۔

عبداللطیف کی بیوی کو کچھ عرصہ تو اجنبیت کا احساس ہوا۔ وہ بیزار اور اکتائی ہوئی رہتی۔ مگر جب جنت کے ساتھ میل ملاپ بڑھا تو اس کا دل لگ گیا۔ بیشتر وقت جنت ہی کے ساتھ ہنستے بولتے گزرتا۔ جنت بھی ہر طرح اس کی مدد کرتی۔ دل جوئی کرتی۔ نادر خان کا رویّہ بھی عبداللطیف کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ وہ ہر طرح اس کا خیال رکھتا۔ عبداللطیف زیادہ تعلیم یافتہ بھی تھا۔ لہٰذا نادر خان کو لکھنے پڑھنے کے کام میں اس سے مدد ملتی۔

برسات کا بھیگا بھیگا موسم گزر گیا۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہو گئی۔ جاڑا شروع ہو گیا۔ رحیم داد نہایت لگن اور دلچسپی سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ عبداللطیف پوری توجہ سے اس کی تعلیمی استعداد بڑھانے کے لیے کوشاں تھا۔ رحیم داد نے پینا پلانا بہت کم کر دیا تھا۔ کبھی ہڑک اٹھتی تو کمرے میں تنہا بیٹھ کر شغل کر لیتا۔ نادر خان کی غیر حاضری میں وہ کبھی کبھار چوری چھپے جنت کو اپنے کمرے میں بلا لیتا۔ مگر اب وہ بہت محتاط رہتی تھی۔ کترانے اور دور دور رہنے کی کوشش کرتی۔ عبداللطیف کی بیوی میں اس نے کبھی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ وہ سیدھی سادھی گھریلو عورت تھی۔ بھدی اور کم رو بھی تھی۔ بناؤ سنگھار کا بھی شوق نہ تھا۔ ویسے بھی رحیم داد استاد کی حیثیت سے عبداللطیف کا خاصا احترام کرتا تھا۔ حالانکہ وہ عمر میں اس سے بہت بڑا نہ تھا۔

جاڑا بھی ختم ہو گیا۔ کھیتوں میں گندم اور جو کے ہرے بھرے پودے لہرا رہے تھے۔ گرمی کی آمد آمد تھی۔ مگر اس عرصے میں نہ احسان شاہ نے رحیم داد کو بلایا اور نہ ہی رحیم داد اس سے ملنے کے لیے لاہور گیا۔ دلاور والا کی زمین کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ حسب وعدہ نہ سردار شہ زور مزاری اس کے پاس آیا اور نہ سردار عظمت اللہ دریشک نے کوئی پیغام بھیجا۔ رحیم داد کو تشویش پیدا ہوئی اور اس میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔

اپریل کے آغاز میں رحیم داد ایک صبح اپنی جیپ میں بیٹھا اور لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ احسان شاہ کی کوٹھی پر پہنچا۔ وہ تو نظر نہ آیا مگر مہربان علی مل گیا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی مسکرا کر بولا۔

”میں تو تیرے پنڈ کی طرف آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ تو آ گیا یہ ٹھیک ہوا۔ چوہدری ‘لائل پور کی زمین کا تصفیہ ہو گیا ہے ‘ کبضہ بھی مل گیا۔“

”یہ خوش خبری سننے کے بعد رحیم داد سارا گلہ شکوہ بھول گیا۔ اس کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا۔ پوچھا۔ ”شاہ جی کدھر ہے؟“

”وہ کل ہی کراچی گیا ہے۔“ مہربان علی نے مطلع کیا۔ ”مجھے کہہ گیا تھا کہ تجھے لائل پور کی زمین کے بارے میں خوش خبری سنا دوں۔“

”شاہ جی کراچی کیوں گیا ہے؟“

”جہاں تک مجھے پتہ ہے وہ اپنی کمپنی ‘جوائنٹ اسٹاک ایکسچینج میں رجسٹر کرا چکا ہے۔“ مہربان علی نے بتایا۔ ”ٹیکسٹائل مل لگانے کا پرمٹ اور مشینری امپورٹ کرنے کا لائسنس نکلوانے گیا ہے۔ بینک سے کرضہ بھی لینا ہے۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”تجھے تو مجھ سے زیادہ پتہ ہونا چاہیے۔ تجھے تو کمپنی کا ڈائرکٹر لگایا گیا ہے۔ میں نے تو ساری ہی دستاویزات دیکھی ہیں۔“

”شاہ جی نے مجھے بتایا تو تھا۔ آگے کا مجھے پتہ نہیں۔“ رحیم داد نے صاف گوئی سے بتایا۔ ”شاہ جی کب تک لوٹے گا؟“

”اس دفعہ تو جی اس کا لمبا ہی پروگرام ہے۔ پتہ نہیں کب واپس آئے۔ بتا کر بھی نہیں گیا۔“

”سردار شہ زور مزاری یا سردار عظمت اللہ دریشک تو پچھلے دنوں ادھر نہیں آئے؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔ اس کے لہجے سے بے چینی آشکارہ تھی۔

”میرے سامنے تو جی دونوں میں سے کوئی نہیں آیا۔“ مہربان علی نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ”شاہ جی نے بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

رحیم داد نے مزید پوچھ گچھ نہیں کی۔ اسے جو کچھ معلوم کرنا تھا معلوم کر چکا تھا۔ اس نے احسان شاہ کی کوٹھی پر ایک روز قیام کیا۔ دوسرے روز وہ واپس جانے لگا تو مہربان علی موجود تھا۔ رحیم داد اپنی جیپ میں جا کر بیٹھا تو مہربان علی نے کہا۔

”چوہدری ‘ مجھے بھی جانا ہے۔ کوٹھی کے نامکمل حصے کی تعمیر کے لیے اینٹوں کا بندوبست کرنا ہے۔ ادھر اینٹوں کے بھٹے ہیں۔ مجھے وہیں جانا ہے۔ تو مجھے ادھر چھوڑ دینا۔“

”ضرور چھوڑ دوں گا۔“ رحیم داد نے مسکرا کر مہربان علی سے پچھلی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور کو ہدایت کی۔ ”عابد ‘جیپ فیروز پور روڈ کی طرف لے چل۔ مہربان کو ادھر پہنچانا ہے۔“

مہربان علی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ جیپ تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ فیروز پور روڈ پہنچی۔ مہربان علی اینٹوں کے ایک بھٹے کے سامنے اتر گیا۔

جیپ آگے بڑھی۔ میل بھر سے بھی کم راستہ طے کیا ہو گا کہ ڈرائیور نے اسے روک کر ایک سائے دار درخت کے نیچے کھڑا کر دیا۔ ڈرائیور کو ریڈایئٹر میں پانی ڈالنا تھا۔ وہ ٹین کا خالی ڈبا ہاتھ میں دبا کر ایک طرف چلا گیا۔ رحیم داد بھی نیچے اترا اور جیپ کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔

سڑک کے دونوں طرف جگہ جگہ اینٹوں کے بھٹے تھے۔ ان کی چمنیوں سے گاڑھا گاڑھا سیاہ دھواں اٹھ کر فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ رحیم داد نظریں اٹھائے اس سمت دیکھ رہا تھا جدھر ڈرائیور گیا تھا۔

"وے چوہدری' تو ادھر کیسے؟" اچانک عقب سے آواز ابھری۔

رحیم داد نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ شاداں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ گھبراہٹ میں کچھ کہہ نہ سکا۔ لیکن شاداں نے مسکرا کر پوچھا۔ "چوہدری' تو نے مجھے پہچان لیا ناں؟"

رحیم داد نے گہرے سبز شیشوں کا چشمہ آنکھوں پر درست کرتے ہوئے حیرانی کا اظہار کیا۔ "تو شاداں تو نہیں ہے؟"

"ہاں جی' میں شاداں ہی ہوں۔" وہ چہک کر بولی۔ "پچھلے سال تو مجھے چتو کی پر نظر آیا تھا۔ میں نے بار بار ہانک لگائی۔ تجھے بہت روکا۔ پر تو نہ رکا۔ گڈی میں سوار ہو کر چلا گیا۔ اس روز تو لالی بھی میرے ساتھ تھا۔"

"کون لالی؟" رحیم داد نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"تو لالی کو نہیں جانتا؟" شاداں کے لہجے میں استعجاب تھا۔ "پر تو نے اسے کہاں دیکھا ہو گا۔" اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "ہاں' یہ تو یاد ہو گا میں تجھے کاسم بیلا میں ملی تھی۔ ان دنوں تو گردیزیوں کے ساتھ ٹھیرا ہوا تھا۔ لالی تب ملتان جیل میں ہوتا تھا۔ کاسم بیلا جیل سے زیادہ دور نہیں۔ میں اسی کے لیے ادھر تھی۔ تجھے بتایا بھی تھا۔"

"کچھ یاد تو پڑتا ہے۔" رحیم داد نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ "تو نے کاسم بیلا کیوں چھوڑ دیا؟"

"میں اپنے بچوں کے پاس چلی گئی تھی۔"

"تیرے بچے بھی ہیں؟" رحیم داد نے مسکرا کر دریافت کیا۔

"گھر والا بھی تھا۔" شاداں نے بتایا۔

رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ "اب وہ کہاں ہے؟"

"اپنے پنڈ میں ہوتا ہے۔ بچے بھی اس کے ساتھ ہی ہیں۔" شاداں نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "پر

اب وہ میرا گھر والا نہیں رہا۔ میں نے پچھلے دنوں اس سے طلاک لے لی۔ اس نے دوسرا ویاہ بھی کر لیا ہے۔"

"تب تو لالی سے تو نے بھی ویاہ کر لیا ہو گا۔" رحیم داد نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔

"نہیں!" وہ نظریں جھکا کر آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگی۔ "پر اب کر لوں گی۔"

"لالی' اب کدھر ہوتا ہے؟" رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"وہ اب جیل سے چھوٹ چکا ہے۔" شاداں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "تب میں چتو کی میں اپنے ماماں کے پاس ہوتی تھی۔ لالی کو پتہ تھا۔ جیل سے نکلتے ہی سیدھا میرے پاس پہنچا۔"

"لالی نے کوئی کام دھندا بھی شروع کیا یا ابھی تک۔" رحیم داد نے مسکرا کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"نہیں جی' ایسی کوئی گل بات نہیں۔" شاداں فوراً اس کا اشارہ سمجھ گئی۔ اس نے صفائی پیش کی۔ "لالی پہلے ایک کارخانے میں لگ گیا تھا۔ پر وہاں چھانٹی ہوئی تو اس کی نوکری بھی جاتی رہی۔ اب بھٹے پر پتھیرا لگ جائے گا۔" اس نے ایک اونچی چمنی کی طرف ہاتھ اٹھا دیا۔ "جمعدار حنیف ڈوگر نے لگوایا ہے۔ بھٹے کے لیے وہی پتھیروں کی بھرتی کرتا ہے۔ لالی اس کے پاس گیا ہے۔"

"تو بھی لالی کے ساتھ بھٹے پر لگ گئی؟"

"ہاں جی میں بھی لگ جاؤں گی۔ دونوں مل کر کام نہیں کریں گے تو گزارہ کیسے ہو گا۔" شاداں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پر محنت بہت کرنی پڑتی ہے۔ دہاڑی بھی کم ملتی ہے۔"

ڈرائیور ڈبے میں پانی بھر کر لے آیا تھا۔ وہ ریڈایئٹر کا ڈھکنا کھول کر پانی ڈالنے لگا۔ رحیم داد اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اسی اثنا میں شاداں کی آواز ابھری۔ "چوہدری' لے دیکھ لالی بھی آ گیا۔"

رحیم داد نے مڑ کر دیکھا۔ لالی ایک بھٹے سے نکل کر جیپ کی طرف آ رہا تھا۔ رحیم داد نے لالی کو دیکھا تو سخت سراسیمہ ہوا۔

شاداں اس کی گھبراہٹ سے بے نیاز بولتی رہی۔ "چوہدری' تو وڈا زمیں دار ہے۔ لالی کو اپنے پاس لگا لے۔ میں بھی تیری حویلی میں لگ جاؤں گی۔ دونوں ساتھ رہیں گے۔ بھٹے پر تو سخت دھوپ اور گرمی میں کام کرنا پڑے گا۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ "تو لالی کو اپنے پاس لگا لے گا ناں؟"

"یہ تو دیکھنے ہی میں مویشی چور لگتا ہے۔" رحیم داد نے منہ بگاڑ کر بے زاری کا اظہار کیا۔ "تجھے پتہ نہیں' میں دوسرے وڈے زمیں داروں کی طرح رسہ گیری کا دھندا نہیں کرتا۔"

"نا جی نا' لالی نے دوسروں کے ڈھور ڈنگر اٹھانے کا دھندا کبھی نہیں کیا۔" شاداں نے لالی کی

جانب سے تردید کی۔

"فیر، جیل کیوں گیا تھا؟"

"پر اب اس نے چوری ڈکیتی بالکل چھوڑ دی ہے۔" شاداں نے رحیم داد کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ "کبھی ایسا گندا کام نہیں کرے گا۔ چوہدری، اس نے مجھ سے پکا وعدہ کیا ہے۔ اب تو بالکل نیک بندہ بن گیا ہے۔ میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔"

"اس کے وعدے کا کیا اعتبار۔" رحیم داد کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ "یہ ٹھہرا چور ڈکیت۔ میں شریف اور عزت دار زمین دار ہوں۔ ایسے سزا یافتہ اور جرائم پیشہ بندے کو اپنے پاس رکھ کر میں نے اپنی عزت خراب کرنی ہے؟"

لالی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا جیپ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ شاداں نے مسکرا کر کہا۔ "لے یہ تیرے پاس آگیا۔ تو خود اس سے گل بات کر لے۔"

رحیم داد نے لالی کی طرف مطلق توجہ نہ دی۔ آگے بڑھا اور جھپاک سے جیپ میں بیٹھ گیا۔ شاداں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ "چوہدری، میری گل تو سن۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔ رحیم داد نے اس کے شور میں سنا۔ شاداں کہہ رہی تھی۔ "چوہدری، تو لالی سے تو مل لے۔" رحیم داد نے مڑ کر اس کی جانب نہ دیکھا۔ گردن اونچی کیے سامنے دیکھتا رہا۔ جیپ آگے بڑھ گئی۔

لالی نے شاداں سے پوچھا۔ "یہ کون تھا؟"

"یہ اپنا چوہدری نور الٰہی ہے۔" شاداں نے بتایا۔ "گورداسپور کا مہاجر ہے۔ پر آج کل منٹگمری میں ہوتا ہے۔ کوٹلہ ہرکشن کا وڈا زمیں دار ہے۔ میں نے اس کے بارے میں پہلے بھی تجھ سے گل بات کی تھی۔ یاد ہے ناں، تتو کی پر بھی یہ نظر آیا تھا۔"

لالی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "یہ چوہدری نور الٰہی ہے۔" وہ گردن اٹھا کر جیپ کی طرف دیکھنے لگا۔

جیپ فراٹے بھرتی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے دور نکل گئی۔ شاداں اور لالی سڑک کے کنارے کھڑے کھوئی کھوئی نظروں سے رحیم داد کی جیپ دیکھ رہے تھے، جو گرد و غبار کے بگولے اڑاتی رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھی۔

۴۲

تیموں کے ایک بھٹے پر لالی اور شاداں، مٹی کے گارے سے کچی اینٹیں تیار کر رہے تھے۔ لالی رف دھوتی باندھے ہوئے تھا جس پر جگہ جگہ داغ دھبے تھے۔ چلچلاتی دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے سر پر پگڑی تھی۔ پگڑی بھی دھوتی کی طرح بوسیدہ اور میلی کچیلی تھی اور بے ترتیبی سے بندھی ئی تھی۔ اس کے بدن کی رنگت سیاہ پڑ گئی تھی۔ ہاتھوں اور گردن کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔

لالی کے قریب ہی شاداں اینٹیں تیار کرنے میں مصروف تھی۔ اس کے لمبے لمبے بال بکھرے ئے تھے۔ دھوپ اور گرد سے مٹیالے پڑ گئے تھے۔ بالوں کی بے ترتیب لٹیں ہوا کے جھونکوں سے ڑاڑ کر چہرے پر آجاتیں جن کو وہ مٹی سے بھرے ہوئے ہاتھوں سے بار بار ہٹا کر سر کے پیچھے لے نے کی کوشش کرتی۔ اس کا چہرہ سورج کی تیز کرنوں سے جھلس کر تانبے کی طرح دہک رہا تھا۔ نکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی تھی اور ہونٹ خشک پڑ گئے تھے۔

دونوں کے جسم پسینے سے شرابور تھے۔ وہ رک رک کر پیشانی پر بکھرے ہوئے پسینے کے قطرے کو نچھتے۔ ہاتھوں کو پھرتی سے چلاتے۔ لوہے کے سانچوں میں گارا بھر بھر کا اینٹیں تیار کرتے۔ ان پر ٹے کے ٹریڈ مارک کا نشان ڈالتے، کھسکتے، پہلو بدلتے اور آگے بڑھ جاتے۔ ان کو نہ گرمی کی شدت احساس تھا نہ بھوک پیاس کا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اینٹیں تیار کرنے کی دھن میں مگن تھے۔

سورج چڑھ کر آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا تھا۔ آسمان غبار آلود تھا۔ زمین سے گرمی کے بھبکے ٹھتے تھے۔ لو کے گرم گرم جھکڑ چلتے تھے۔ دھوپ کی تمازت سے جسم پگھلتے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ رمی اپنے شباب پر تھی۔ پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی گول چمنی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

فیروز پور روڈ کے کئی میل کے علاقے میں جگہ جگہ بھٹوں کی اونچی نیچی چمنیاں تھیں جو دور سے نظر آتی تھیں۔ کچھ چمنیاں پختہ تھیں کچھ لوہے کی معمولی چادروں کی بنی ہوئی تھیں۔ یہ چمنیاں دھواں اگل رہی تھیں جو رفتہ رفتہ فضا میں پھیلتا جا رہا تھا۔ چمنیوں کے دامن میں وسیع میدان تھے جن میں بڑے بڑے گڑھے تھے۔ ان گڑھوں سے پتھیرے زمین کھود کو مٹی نکالتے۔ مٹی میں ضرورت کے مطابق پانی ملاتے' پھاؤڑے اور ہاتھوں کی مدد سے اسے آٹے کی طرح گوندھ کر گارا تیار کرتے' گارے کو سانچوں میں بھر کر اینٹیں تیار کرتے۔

پتھیروں میں کڑیل جوان' بوڑھے' بچے اور عورتیں سب ہی شامل تھے۔ پورے پورے کنبے اور خاندان تھے۔ دوسری ذات برادریوں کے علاوہ ان میں شیخ' مصلّی اور عیسائی زیادہ بڑی تعداد میں تھے۔ بیشتر بھاول پور کے رہنے والے تھے جن کو ریاستی کہا جاتا تھا۔ یہ خاندانوں کی صورت میں کام کرتے۔ یہ پتھیرے نہ صرف پنجاب کے دور دراز علاقوں کے بھٹوں پر اینٹیں تیار کرتے۔ بلکہ بلوچستان بھی جاتے جہاں کوئٹہ کا وہ مشہور بھٹہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں اینٹیں تیار کرنے کا سب سے بڑا بھٹہ ہے۔

گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر پتھیروں کے سدھے ہوئے ہاتھ مشینوں کی طرح تیزی سے چل رہے تھے۔ ان کے سامنے ہموار زمین تھی جس پر دور تک ریت بچھی تھی۔ دوپہر کی دھوپ میں ریت چاندی کے تاروں کی طرح جھلملا رہی تھی۔ اینٹیں سانچوں سے نکل نکل کر ریت کے اس چمکتے دمکتے فرش پر قطاروں میں پھیلتی جا رہی تھیں۔ یہ کچی اینٹیں تھیں۔

اینٹیں دھوپ میں سوکھ کر سخت ہو جاتیں تو چٹے بنا کر ان کی گنتی کی جاتی۔ گنتی کے بعد چٹوں پر گیلا چونا اس طرح چھڑک دیا جاتا کہ گنتی میں دوبارہ شامل کرانے کے لیے کوئی پتھیرا ہیرا پھیری نہ کر سکے۔ کمہار ان اینٹوں کو چٹوں سے نکال نکال کر گدھوں پر لادتے یا ریڑھوں کے ذریعے بھٹوں تک پہنچاتے۔ بھرائی کرنے والے مزدور ان کو اٹھا اٹھا کر بھٹوں کے اندر اس مہارت سے چن دیتے کہ آگ تمام اینٹوں کو ایک ساتھ پکا کر سرخ کر دے۔ جب کچی اینٹیں چن دی جاتیں تو جلائی کا کام کرنے والے آگے بڑھتے اور لکڑیاں اور کوئلے سلگا کر آگ روشن کر دیتے۔ سرخ سرخ انگارے دہکتے۔ شعلے بلند ہوتے اور بھٹوں کی چمنیاں گاڑھا گاڑھا سیاہ دھواں اگلنے لگتیں۔

ہر بھٹے کی چمنی کے عین نیچے پختہ چبوترہ تھا جس پر ریت اور نرم مٹی بچھی تھی۔ اس چبوترے کو پتھیروں کی اصطلاح میں توا کہا جاتا ہے۔ توا رفتہ رفتہ سرخ پڑتا جاتا اور اس پر چنی ہوئی کچی اینٹیں دہکتے انگاروں کی تیز انچ سے تپ کر ٹھوس اور پختہ بن جاتیں۔ پھر وہ مرحلہ آتا جب آگ بجھ جاتی تو کچھ ٹھنڈا ہو جاتا۔ اینٹوں کی تپش کم ہو جاتی۔ تب بھٹوں سے اینٹیں نکالنے والوں کا کام شروع ہوتا۔ ان کے پیروں میں لکڑی کی کھڑاویں ہوتیں اور انگلیوں پر کپڑے کی پٹیاں لپٹی ہوتیں تاکہ پیر اور انگلیاں اینٹوں اور توے کی تمازت سے جھلس نہ جائیں۔

پختہ اینٹوں کو باہر نکالا جاتا۔ ایک بار پھر ریڑھوں اور ٹھیلوں میں بھرا جاتا اور میدان کے ایک گوشے میں ترتیب سے لگا کر چٹے بنا دیئے جاتے۔ توے کے اوپر سے سرخ سرخ راکھ ہٹا کر بھٹہ صاف کر دیا جاتا۔

☆

تیموں کے بھٹے پر اینٹیں تیار کرنے والے اپنے اپنے کام میں جتے تھے۔ لالی اور شاداں کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ ان کے سامنے کچی اینٹوں کی قطاریں پھیلتی جا رہی تھیں۔ گارا کم ہوتا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اینٹوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔

گارا ختم ہو گیا۔ مگر شاداں کام کرنے کے لیے مستعد تھی۔

”ہور گارا تیار کر۔“ شاداں نے دوپٹے کے پلّو سے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے لالی کو للکارا۔ ”پھوڑا اٹھا فٹافٹ مٹی نکال۔ آج تو زیادہ ہی کام کرنا ہو گا۔ تو نے سویرے ہی سویرے مجھے جگا کر کیا کہا تھا۔ یاد ہے ناں؟“

”یاد ہے بالکل یاد ہے۔“ لالی مسکرا کر بے نیازی سے بولا۔ ”تھوڑا دم لینے دے۔“ وہ پھسکڑا مار کر زمین پر بیٹھ گیا۔

شاداں نے منہ بگاڑ کر پھر ڈانٹا۔ ”پوستی نہ بن۔ اٹھا پھوڑا۔“ اس نے قریب پڑے ہوئے پھاؤڑے کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

لیکن لالی نہ اٹھا۔ دانت نکال کر ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

اسی لمحے عقب سے آواز ابھری۔ ”بھین جی' تھوڑا پانی مجھے پلا دے۔“

شاداں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک نوجوان پتھیرن کچی اینٹوں کے نزدیک نڈھال بیٹھی تھی۔ اس کے میلے کچیلے بال خاک سے اٹے ہوئے تھے۔ ماتھے پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے بکھرے تھے۔ یرقان اور غذائیت کی کمی کے باعث چہرہ مرجھا کر میلا پڑ گیا تھا۔ سر کے بال بھورے ہو گئے تھے۔ وہ بیمار اور لاغر نظر آ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ ہانپ رہی تھی۔ اس کی جوانی سسک رہی تھی اور بڑھاپے کے سائے وقت سے پہلے ہی منڈلانے لگے تھے۔ اس کے سامنے میلے اور بوسیدہ کپڑے پر نصف روٹی رکھی تھی۔ روٹی کے ساتھ ہری مرچیں اور نمک کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں تھیں۔

شاداں اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ فوراً اٹھی اور شیشم کے اس درخت کی جانب بڑھی جس کے نیچے پانی سے بھرا ہوا مٹکا رکھا تھا۔ وہ مٹکے کے پاس پہنچی۔ مٹی کے پیالے میں پانی بھرا اور اسے سنبھالے ہوئے اس عورت کے قریب گئی۔ پیالہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ پیالہ ہونٹوں سے لگا کر بے صبری سے غٹاغٹ پانی پینے لگی۔

وہ پانی پی چکی تو شاداں نے پوچھا۔ "ہور پانی چاہیے؟"

اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ پیالہ قریب ہی رکھ لیا۔ اس میں ابھی پانی موجود تھا۔ اس نے روٹی کا ٹکڑا توڑ کر لقمہ بنایا۔ منہ میں رکھا۔ مرچ اٹھا کر دانتوں سے کتری اور نمک کی ایک ڈلی منہ میں ڈال کر چبانے لگی۔

شاداں نے پوچھا۔ "تیرا نام مریم ہے؟"

"ہاں!" اس نے لقمہ چباتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

شاداں نے اسے غور سے دیکھا۔

☆

کل دن ڈھلے شاداں جب لالی کے ساتھ اینٹیں تیار کرنے میں مصروف تھی تو یکایک پتھیروں، کمہاروں، بھرائی اور جلائی کرنے والے مزدوروں کی ملی جلی آوازوں کے شور میں نسوانی چیخیں بلند ہوئیں۔ شاداں جھٹ اس طرف متوجہ ہوئی۔ دیکھا ایک نوجوان عورت کچی اینٹوں کی قطاروں کے پاس زمین پر پڑی بے قراری سے پہلو بدل رہی ہے۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے پتھیروں میں سے چند عورتیں اٹھیں۔ جھپاک سے قریب پہنچیں۔ سروں سے چادریں اتاریں اور اس کے چاروں طرف چادروں کا پردہ تان کر کھڑی ہو گئیں۔

شاداں بھی گھبرا کر وہاں پہنچ گئی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک پتھیرن نے بچہ جنا ہے۔ بچہ چادروں کے حصار کے اندر ٹیاؤں ٹیاؤں کر رہا تھا۔ اسی اثناء میں ایک بوڑھی عورت، پتھیروں کی جھونپڑیوں کی جانب سے نمودار ہوئی۔ نزدیک پہنچی۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ اسے سنبھالے ہوئے وہ چادروں کے پیچھے گئی۔ چھری سے نال کاٹی۔ بچے کو علیحدہ کیا۔ ذرا ہی دیر بعد زچہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لال لال گوشت کا لوتھڑا، نوزائیدہ بچہ، اس کے ہاتھوں میں کلبلا رہا تھا۔ زچہ ایک عورت کے سہارے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک جھونپڑی میں داخل ہو گئی۔

یہ زچہ مریم تھی اور شاداں کے سامنے بیٹھی ہری مرچ اور نمک کے ساتھ روٹی کھا رہی تھی۔ دوسرے پتھیروں اور بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کے ساتھ ہی صبح کام پر آ گئی تھی۔ اور مٹ

کے گارے سے کچی اینٹیں تیار کر رہی تھی۔ چلچلاتی دھوپ سے اس کا جسم پگھل رہا تھا۔ وہ پسینے سے شرابور تھی۔

شاداں نے حیرت سے پوچھا۔ "تو نے کل ہی بچہ جنا ہے اور آج کام پر بھی آ گئی؟"

"لگتا ہے تو نے بھٹے پر نیا نیا کام شروع کیا ہے۔" مریم کے ہونٹوں پر پھیکی پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ادھر رہے گی تو پتہ چل جائے گا کیا کیا ہوتا ہے۔ کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔"

"پر تجھے کچھ روز آرام تو کرنا ہی چاہیے۔" شاداں نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ "ایسے تو بیمار پڑ جائے گی۔ دیکھ تو کتنی کمزور لگ رہی ہے۔ جا کر آرام کر، کل آنا۔"

"آرام کرنے لگیں تو گزارہ کیسے ہو۔" وہ گہری سانس بھر کر بولی۔ "ویسے ہی خالی پیٹ رہنا پڑتا ہے۔ آرام کی سوچنے لگیں تو بھوک اور ننگ سے مر جائیں۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ "ادھر رہے گی تو تجھے بھی ایسا ہی کرنا ہو گا۔" آرام شارام بھول جا۔"

مریم نے روٹی ختم کی۔ مٹی کا پیالہ اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا کر پانی پینے لگی۔

"میں تو کبھی ایسا نہیں کروں گی۔" شاداں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"تیری بات دوسری ہے۔ پر ہم نے تو سب کچھ کرنا ہوتا ہے۔" مریم کی آواز میں درد کی کسک تھی۔ "جتنا زیادہ کام کریں، اتنا ہی کم ہوتا ہے۔"

"تجھے اتنا زیادہ کام کیوں کرنا پڑتا ہے؟" شاداں کے لہجے میں تجسس تھا۔

"وہ ایسا ہے جی۔" مگر وہ اپنی بات پوری نہ کر سکی۔ قریب سے مردانہ آواز ابھری۔ "مریم تو نے کام نہیں کرنا؟ باتیں ہی کرتی رہے گی۔"

شاداں نے گردن کو خم دے کر دیکھا۔ ایک پتھیرا تیکھی نظروں سے مریم کو گھور رہا تھا۔ شاداں نے مریم سے پوچھا۔ "یہ تیرا گھر والا ہے؟"

"ہاں!" مریم آہستہ سے بولی۔ اس نے مٹی کا پیالہ اٹھایا اور سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی ہوئی پانی کے مٹکے کی جانب بڑھی۔ قریب پہنچی، پیالہ پانی سے بھرا اور ہونٹوں سے لگا کر خالی کر دیا۔ پیالہ مٹکے کے پر رکھا اور واپس آ گئی۔

لالی، گارا بنانے کے لیے اب مٹی کھود رہا تھا۔

مریم اپنی جگہ بیٹھ کر اینٹیں بنانے لگی۔ اس نے شاداں کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ سر جھکائے مستعدی سے سانچوں میں گارا بھرتی رہی۔ شاداں اٹھ کر لالی کے پاس چلی گئی اور کھدی ہوئی مٹی میں پانی ملا کر گارا تیار کرنے لگی۔

مریم کے شوہر نے ڈپٹ کر کہا۔ "مریم تیز ہاتھ چلا۔"

"چلا تو رہی ہوں۔" مریم نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "عنایت، مجھے تنگ نہ کر۔ تجھے پتہ ہے، میری طبیعت ٹھیک نہیں۔"

"مجھے پتہ ہے، سب پتہ ہے۔" عنایت مسیح نے نظریں اٹھا کر بیوی کی طرف نہ دیکھا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چلتے رہے۔ سانچوں میں گارا بھر بھر کر اینٹیں بناتے رہے۔ وہ بڑبڑانے کے انداز میں رک رک کر بولتا رہا۔ "پر مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ شام کو چھٹا بجے گا.."

"مجھے بھی پتہ ہے۔ تب ہی تو سویرے ہی کام پر آگئی۔" مریم کے لہجے میں ہنوز گلہ شکوہ تھا۔ "نکّے کو صرف ایک بار دودھ پلانے گئی تھی۔ بار بار اس کے رونے کی آواز سنتی ہوں۔ پر کام چھوڑ کر اس کے پاس نہیں گئی۔" وہ اپنے نوزائیدہ بچے کے بارے میں بتا رہی تھی۔ "بھوک سے رو رہا ہے۔ شور مچا رہا ہے۔"

"تو نے شیماں کو بھی ادھر نکّے کے پاس چھوڑ رکھا ہے۔" عنایت مسیح نے مریم کو یاد دلایا۔

"اس کا کام بھی تو ہم نے ہی کرنا ہوگا۔"

"شیماں کو ادھر نہ چھوڑتی تو نکّا اکیلا رہ جاتا۔ کسی کو تو اس کے پاس رہنا ہی چاہیے۔" مریم نے صفائی پیش کی۔ "ویسے چار سال کی شیماں کتنا کام کر سکتی ہے۔"

"یہ جو سارے ذرا ذرا سے نکّے اور نکّیاں ہیں، ان کو دیکھ رہی ہے۔" عنایت نے ہاتھ اٹھا کر لہرایا اور ان کم سن اور نو عمر بچوں اور بچیوں کی جانب اشارہ کیا جو عورتوں اور مردوں کے ساتھ طرح طرح کے کام کر رہے تھے۔ "یہ کھیل تماشا تو نہیں کر رہے۔ کام ہی تو کر رہے ہیں ناں؟"

"تو چاہتا ہے شیماں کو بھی ادھر کام پر لگا لیتی۔ نکّے کو ادھر اکیلا چھوڑ دیتی تاکہ روتے روتے اس کا مرن ہو جائے۔" مریم نے جھنجلا کر عنایت کی جانب دیکھا۔ "یہی چاہتا ہے ناں؟"

"میں تو یہ جانتا ہوں کام کم ہوا تو نہ تجھے کھانے کو ملے گا نہ نکّے کو۔" عنایت مسیح کے سدھے ہوئے ہاتھ تیزی سے چلتے رہے۔ اس کے ہاتھوں اور گردن کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ گال پچکے ہوئے تھے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ بدن پر گوشت اس قدر کم تھا کہ جگہ جگہ سے ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ مسلسل کام کرتا رہا اور بولتا رہا۔

"آگے کی سوچ مریم، آگے کی۔"

"سوچتے سوچتے میرا تو مگز فر گیا۔" وہ بے زاری سے بولی۔

"تجھے پتہ ہے ہماری دہاڑی تو پیشگی میں کٹ جاتی ہے۔ ملتا ہے کیا ہے؟ زیادہ کام نہیں کرے گی

تو ہفتہ کیسے گزرے گا؟" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "منشی، میرا یا تیرا چاچا یا ماماں تو ہے نہیں۔ ذرا بھی رعایت نہیں کرے گا۔ ایک ایک پیسہ کاٹ لے گا۔"

عنایت مسیح جن اندیشوں اور وسوسوں سے سہما ہوا تھا۔ کام ختم ہونے کے بعد کھل کر سامنے آگئے۔ وہی ہوا جو اس نے مریم سے کہا تھا۔

☆

یہ ہفتے کی شام تھی۔ پتھیروں اور بھٹے پر کام کرنے والے دوسرے محنت کشوں کا چٹھا تقسیم کیا جا رہا تھا۔ ان کو ہفتے بھر کی محنت کی اجرت ادا کی جا رہی تھی۔ بھٹے کے مالک، میاں اسلم کا منشی، ایک بوسیدہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے لکڑی کی بھدی میز تھی۔ میز پر رجسٹر رکھا تھا۔ قریب ہی دھندلی سی لالٹین تھی۔ میز کے اردگرد پتھیرے، کمہار، بھرائی کرنے والے اور دوسرے مزدور نیم دائرے میں بیٹھے تھے۔

منشی کے سپاٹ چہرے پر سنجدگی سے زیادہ خشونت تھی۔ آنکھوں سے بے مہری جھلکتی تھی۔ وہ بار بار اپنی عینک درست کرتا۔ رجسٹر کے اوراق پلٹتا۔ لالٹین کی زرد زرد روشنی میں نظریں جھکا کر ان کو دیکھتا۔ وہ پتھیروں کا چٹھا تقسیم کر رہا تھا۔ رجسٹر کے مندرجات کا غور سے جائزہ لینے کے بعد وہ نظریں اٹھاتا۔ اونچی آواز سے نام پکارتا۔ نام سنتے ہی مطلوبہ پتھیرا اٹھ کر کھڑا ہو جاتا اور منشی کے روبرو پہنچ جاتا۔ وہ پتھیرے کے انگوٹھے پر روشنائی لگاتا۔ اس کا ہاتھ پکڑتا۔ قریب لاتا اور رجسٹر کے کھلے ہوئی ورق پر پتھیرے سے انگوٹھے کا نشان لگواتا۔ معاوضے کی رقم گن کر اس کے حوالے کر دیتا۔ کوئی پتھیرا معاوضے کی رقم لینے کے بعد اعتراض کرتا یا بے اطمینانی کا اظہار کرتا تو وہ بے زاری سے اسے معاوضے کی تفصیل بتا دیتا۔ مزید حجت کرتا تو غصے سے جھڑک دیتا۔

وہ پتھیروں کے نام پکارتا رہا۔ ایک کے بعد دوسرا پتھیرا اس کے سامنے پہنچتا رہا اور اپنا معاوضہ وصول کرتا رہا۔ منشی نے عنایت مسیح کا نام پکارا۔ وہ اٹھا اور جھٹ منشی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ منشی نے رجسٹر میں انگوٹھے کا نشان لگوایا اور دو روپے آٹھ آنے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

عنایت معاوضے کی رقم ہاتھ میں لیے چند لمحے گم صم کھڑا رہا۔ پھر اس نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔ "سئیں منشی، یہ تو بہت کم ہے۔ اس بار تو میں نے زیادہ ہی محنت کی ہے۔ دہاڑی بھی اتنی ہی ہونی چاہیے۔"

منشی نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ ہاتھ اٹھا کر اپنی عینک درست کی۔ جھک کر رجسٹر دیکھا اور طوطے کی طرح فر فر پڑھنے لگا۔

تعداد اینٹ	۶٬۲۲۵
فی ہزار پر بیس اینٹ کے حساب سے کٹوتی	۱۲۵
ٹوٹ پھوٹ	۱۰۰
کل اینٹ جس کی ادائیگی کی گئی	۶٬۰۰۰
دو روپے فی ہزار کی شرح سے چھ ہزار اینٹ کی اجرت	۱۲روپے
ٹیڑھی ونگی اینٹوں پر کٹوتی	ایک روپے چار آنے
دو آنے فی ہزار کی شرح سے جمعداری	۱۲ آنے
وصولی پیشگی	۷ روپے ۸ آنے
کل اجرت	۲ روپے ۸ آنے۔

عنایت مسیح نے حساب کتاب کی پوری تفصیل سنی، مگر مطمئن نہ ہوا۔ منہ بگاڑ کر بولا۔ "سیں منشی، تیرا حساب سمجھ نہیں آیا۔"

"وہ تو کبھی نہیں آئے گا۔" منشی نے بے رخی سے کہا۔ "تیرے اڑھائی روپے بنتے ہیں وہ تجھے مل گئے نا؟"

"وہ تو جی مل گئے۔" عنایت اب گڑگڑانے لگا۔ "پیشگی اس دفعہ کم کاٹ۔ سیں، تجھے پتہ ہے میری ذال نے کل ہی نکا جنا ہے۔"

"مجھ سے پوچھ کر جنا ہے؟" منشی نے اسے ڈانٹا۔ "خاما خاکی ٹرٹر نہ کر۔ مجھے ابھی دوسروں کو بھی چٹھا بانٹنا ہے۔" اس نے مڑ کر حنیف ڈوگر کو دیکھا جو ہاتھ میں چمڑے کا چھتر دبائے کھڑا تھا۔ منشی نے اسے ہشکارا۔ "ڈوگرا! اسے سنبھال۔ سیدھی گل بات اسے سمجھ نہیں آتی۔"

حنیف ڈوگر فوراً آگے بڑھا۔ اس نے عنایت مسیح کا بازو پکڑ کر زور سے کھینچا۔ عنایت نے احتجاج کیا۔ "میرا بازو تو چھوڑ۔" مگر ڈوگر نے اس کا بازو نہ چھوڑا۔ کھینچتا ہوا ایک طرف لے گیا چھتر اٹھایا اور سڑاک سڑاک عنایت کی کمر اور پیٹھ پر مارنے لگا۔

عنایت مسیح نے کھا جانے والی نظروں سے حنیف ڈوگر کو دیکھا۔ نہ اس نے اپنی کمر اور پیٹھ چوٹ سہلائی نہ زبان سے کچھ کہا۔ خاموشی سے مڑا اور سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی جھونپ کی جانب روانہ ہو گیا۔

وہ جھونپڑی میں داخل ہوا۔ دیکھا شاداں اس کی بیوی کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی ہے۔ ا نوزائیدہ بچہ مریم کے سامنے پڑا تھا۔ شیماں جھونپڑی کے باہر بے خبر سو رہی تھی۔ چراغ کی د

دھندلی روشنی میں مریم کا چہرہ مرجھایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مگر عنایت نے نہ شاداں کی جانب توجہ دی نہ بیوی کے مرجھائے ہوئے چہرے پر۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

مریم نے اس کے تمتمائے ہوئے چہرے اور تیوری پر پڑے ہوئے بل دیکھے تو دم بخود رہ گئی۔ نرم لہجے میں دریافت کیا۔ "دہاڑی مل گئی؟"

"ہاں!" عنایت نے تلخی سے جواب دیا اور ہاتھ میں دبی ہوئی ڈھائی روپے کی رقم حقارت سے اس کے سامنے پھینک دی۔ "لے یہ رہی دہاڑی۔"

"کل اڑھائی روپے!" مریم نے دور روپے اور اٹھنی اٹھاتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ "اتنا کم کیوں ملا؟"

"یہ جا کر منشی سے پوچھ۔" عنایت نے تلخی سے کہا۔ "آگے اتنا بھی نہیں ملے گا۔ تجھ سے کام ہو نہیں سکتا۔ شیماں کو تو نے ننّھے کی دیکھ بھال پر لگا دیا۔ جتنا کم کام ہو گا دہاڑی اتنی ہی کم ملے گی۔"

"پر اب گزارہ کیسے ہو گا؟ پورا ہفتہ کیسے کٹے گا؟" وہ دل گرفتہ ہو کر اپنی پریشانی بیان کرنے لگی۔ "روٹی نہیں ملے گی تو ننّھے کو دودھ کیسے پلاؤں گی۔" بچے نے اچانک رونا شروع کر دیا۔ "بھوک سے رو رہا ہے۔"

وہ غصے سے چیخا۔ "ایسا کر اس کا گلا گھونٹ دے۔" بچہ اس کی اونچی آواز سن کر اور زور زور سے رونے لگا۔ عنایت مسیح مشتعل ہو گیا۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ "میں خود ہی اس کا گلا دبائے دیتا ہوں۔" وہ تڑپ کر بچے کی جانب بڑھا۔

مریم جھپاک سے اٹھی اور عنایت کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ مگر وہ غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مریم کو دھکا دیا۔ وہ پہلے ہی نڈھال تھی۔ دھکے سے سنبھل نہ سکی۔ لڑکھڑاتی ہوئی دور جا کر گری۔ عنایت مسیح بچے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے بچے کی جانب ہاتھ بڑھائے۔

شاداں بے قرار ہو کر چیخی۔ "تو پاگل تو نہیں ہو گیا۔" وہ تیزی سے اٹھی اور عنایت کے دونوں کندھے پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔

عنایت مسیح نے پلٹ کر شاداں کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔ وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ شاداں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ "اتنا ناراض نہ ہو۔ آرام سے گل کر، آرام سے۔" اس نے عنایت کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف لے گئی۔ عنایت خاموش رہا اور اپنی سانس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ شاداں نے پیالہ اٹھایا۔ قریب رکھے ہوئے گھڑے سے اس میں پانی انڈیلا

پیالہ لے کر عنایت کے پاس گئی اور اس کے ہاتھ میں دے کر بولی۔ "لے پانی پی لے۔" عنایت پیالہ ہونٹوں سے لگا کر پانی پینے لگا۔

مریم ابھی تک فرش پر پڑی تھی۔ اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ اس کا جسم آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ رک رک کر سسکیاں بھر رہی تھی۔

شاداں نے دھوتی کے ڈب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور عنایت مسیح کی طرف بڑھا کر بولی۔

"لے اسے رکھ لے۔ اپنا کام چلا۔"

"میں نے تیرے روپے نہیں لینے۔" عنایت نے انکار کر دیا۔ "میں تیرا ادھار ادا نہیں کر سکوں گا۔ پیشگی ہی اب تک ادا نہیں کر سکا۔ تیرا ادھار کیسے چکاؤں گا۔"

"جب تیرے پاس ہوں دے دینا۔ میں تجھ سے مانگوں گی نہیں۔" شاداں نے نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ "تو بالکل فکر نہ کر۔"

مریم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شاداں کو منع کرنے لگی۔ "بھین جی' اپنے روپے واپس لے لے۔" وہ دوپٹے کے آنچل سے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں خشک کرنے لگی۔ "تو نئی نئی آئی ہے۔ تجھے پتہ نہیں' ادھر کوئی کسی کو ادھار نہیں دیتا۔ ہوتا ہی نہیں' ادھار دیں کہاں سے۔"

"ابھی تو میرے پاس ادھار دینے کو ہے۔" شاداں مسکرا کر بولی۔ "جب نہیں ہو گا تو نہیں دوں گی۔ اب تو جھگڑا ختم کر۔"

مگر مریم نے جھگڑا ختم نہ کیا۔ اس نے غصے سے چیخ کر عنایت سے کہا۔ "تو نکّے کا گلا دبا دے ضرور دبا دے۔ پر یہ بھی سوچ لے' اس کے کفن دفن کو کوئی ادھار نہیں دے گا۔ نہ منشی دے گا نہ مالک۔"

عنایت مسیح سر جھکائے گم صم بیٹھا رہا۔ مریم کی آواز ابھرتی رہی۔ "تجھے پتہ ہے' پچھلے جاڑے میں واحد کے پتر کا مرن ہوا تو کیا ہوا تھا۔ واحد' منشی کے پاس گیا۔ میاں صاحب کے پاس بار بار گیا۔ منت کی' زاری کی۔ پر اس نے صاف انکار کر دیا۔ کہا جب تک پیشگی ادا نہیں ہو گی کوئی ادھار نہیں ملے گا۔"

"میت کو اٹھانے کے لیے بھی کچھ نہیں دیا۔ ہائے ربّا' وہ کیسا بندہ ہے۔" شاداں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مریم کو دیکھا۔

"تین روز تک لاش پڑی رہی۔ جب بہت زیادہ بو اٹھنے لگی تو ڈوگر آ کر واحد پر سخت گرم ہوا۔ گالاں نکالیں۔ چھتر تھام کر بار بار اسے مارنے کو جھپٹا۔" مریم بتاتی رہی۔ "واحد نے شام تک کفن

دفن کا وعدہ کیا۔ تب ڈوگر نے اسے چھوڑا۔ واحد ایک ایک کے آگے ہاتھ پھیلاتا تھا۔ کسی نے کچھ دیا' کسی نے انکار کر دیا۔ پر پورے سات روپے بھی اکٹھے نہ ہوئے۔ اس میں تو کفن بھی نہ آ سکتا تھا۔"

"فیر لاش کا کیا بنا؟" شاداں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ویسے میونسپلٹی کی مردہ گاڑی لاش اٹھانے آ گئی تھی۔" اس دفعہ عنایت مسیح نے جواب دیا۔ "پر شام ہونے سے پہلے پہلے میاں صاحب کے حکم پر منشی ۱۵ روپے لے کر پہنچ گیا تھا۔"

"اب یاد آیا تجھے۔" مریم نے تیکھے لہجے میں کہا۔ پھر وہ شاداں کی جانب متوجہ ہوئی۔ "ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔ کئی بار ہو چکا ہے۔ تجھے کیا پتہ' ادھر کیا کیا ہوتا ہے۔"

مریم کی باتیں سن کر شاداں پریشان ہو گئی۔ اسی عالم میں وہ لالی کے پاس پہنچی۔

☆

لالی اپنی جھونپڑی کے سامنے کھلے آسمان کے نیچے بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ایک ادھیڑ پتھیرا بھی بیٹھا تھا۔ دونوں باتیں کر رہے تھے۔

لالی نے شاداں کو دیکھا تو تعجب سے پوچھا۔ "تو اب تک کدھر تھی؟" اس نے پاس بیٹھے ہوئے پتھیرے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ باری ہے۔ پرانا پتھیرا ہے۔ تیرے بارے میں بار بار پوچھ رہا تھا۔"

"کیا پوچھ رہا تھا تو؟" شاداں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

"ناراض نہ ہو۔" باری نے صفائی پیش کی۔ "تو جوان رن ہے۔ تجھے رات کو اس طرح اکیلے نہیں جانا چاہیے۔"

"تیرا مطلب ہے کوئی مجھے اٹھا کر لے جائے گا۔" شاداں کے لہجے میں بدستور جھنجلاہٹ تھی۔

"آہستہ بول' آہستہ۔" باری نے اسے نرمی سے ٹوکا۔

"تجھے پتہ نہیں شاداں۔" لالی نے دبی زبان سے بتایا۔ "باری کی ایک دھی میاں صاحب نے اپنے پاس رکھ چھوڑی ہے۔ دوسری ڈوگر کے پاس ہے۔ ایک ۱۲ سال کی ہے دوسری ۱۰ سال کی۔ باری مجھے تیرے آنے سے پہلے یہی بتا رہا تھا۔"

"باری' تو نے ان کو واپس لانے کے لیے کچھ نہیں کیا؟" شاداں نے حیرت سے دریافت کیا۔

"غریب پتھیرا ہوں' کیا کر سکتا ہوں؟" باری نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ادھر تو بات کرنے کی بھی اجازت نہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔" شاداں نے اس کی تائید کی۔ "ادھر تو کوئی کسی سے گل بات نہیں کرتا۔ سب چپ چپ رہتے ہیں۔ پوچھو تو بتاتے بھی نہیں۔ ایسے دیکھتے ہیں جیسے سنا ہی نہیں۔"

"سب میاں اسلم اور اس کے کرندوں سے ڈرتے ہیں۔ کرندے تو شکاری کتوں کی طرح جھپٹتے ہیں۔ ایسی زبردست مار لگاتے ہیں کہ میرا جوڑ جوڑ درد کرتا ہے۔" باری نے دھیمے لہجے میں اپنا دکھ درد بیان کیا۔ "میں تو جنم جنم کا پتھیراں ہوں۔ میرا پیو بھی پتھیرا تھا۔ چھوٹی سی عمر میں اس نے مجھے بھی بھٹے پر لگا دیا تھا۔ میں نے سارے ہی بھٹوں پر کام کیا ہے۔"

"میاں اسلم ہمیشہ سے ہی اس بھٹے کا مالک ہے؟" لالی نے سوال کیا۔

"نا جی۔ میں تو اسے برسوں سے جانتا ہوں۔" باری نے کہا۔ "بھٹوں کے مالک سب ہی ہندو ہوتے تھے۔ لالہ سرل چند اور امرناتھ سب سے زیادہ بھٹوں کے مالک تھے۔ میاں اسلم تو لالہ سرل چند کا منشی ہوتا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے منشی گیری کرتے دیکھا ہے۔ پاکستان بنا تو سرل چند بھی دوسرے ہندوؤں کے ساتھ بھاگ کر امرتسر چلا گیا۔"

"میاں اسلم پہلے منشی ہوتا تھا؟" شاداں کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"ہاں جی' لالہ سرل چند کا منشی تھا اور بہت وفادار منشی تھا۔" باری نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "شروع شروع میں تو چوری چھپے لالہ سرل چند کو بھٹے کی آمدنی کے ہزاروں روپے بھی پہنچاتا رہا۔ بعد میں مالک بن بیٹھا۔ تجھے پتہ ہے' اب تو میاں اسلم کے کئی بھٹے ہوتے ہیں۔"

"پہلے بھی بھٹوں پر ایسا ہی ہوتا تھا۔ پتھیروں کو اسی طرح تنگ کیا جاتا تھا؟" اس دفعہ لالی نے پوچھا۔

"دہاڑی تو کم ملتی تھی۔ ایک ہزار اینٹ بنانے کے چوداں آنے سے ایک روپیہ تک ملتا تھا۔ تب اتنی مہنگائی بھی نہیں تھی۔" باری بتاتا رہا۔ "جمعداری دو پیسے ہزار اینٹ پر کٹتی تھی۔ پر ہر ہفتے ایک من لکڑی' مٹی کا تیل اور گڑ دیا جاتا تھا۔" اس نے لالی کی جانب دیکھا۔ "ہاں' ہزار اینٹ پر اسی طرح ۲۰ اینٹوں کی کٹوتی ضرور ہوتی تھی۔"

"پر اب تو نہ لکڑی ملتی ہے نہ تیل نہ گڑ۔ جمعداری بھی زیادہ ہو گئی ہے۔" شاداں نے تبصرہ کیا۔ "پتھیرے لکڑی' تیل اور گڑ کیوں نہیں مانگتے؟"

"شروع شروع میں ملتا تھا۔ جب بند ہوا تو پتھیروں نے رولا کیا۔ پر ان کو ایسی کڑی سزائیں دی گئیں' ایسی مار لگائی گئی کہ سب چپ کر کے بیٹھ گئے۔" باری نے دھیمے لہجے میں بتایا۔ "اب تو ایسا ڈر اور خوف ہے کہ کڑیاں اور زنانیاں بھی اٹھائی جائیں تب بھی کچھ نہیں کر پاتے۔"

"ایسی گل نہ کر۔ باری تیری تو غیرت مر گئی ہے۔" لالی نے جھنجلا کر طعنہ دیا۔

باری نے پلٹ کر قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا تھا۔ اسی وقت حنیف ڈوگر کی آواز ابھری۔ وہ کسی پتھیرے یا بھٹہ مزدور پر برس رہا تھا۔ گندی گندی گالیاں دے رہا تھا۔ مارنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ ڈوگر کی آواز سنتے ہی باری کے چہرے سے غصہ غائب ہو گیا۔ وہ سراسیمہ ہو گیا۔ خاموشی سے اٹھا اور اندھیرے میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

حنیف ڈوگر ایک جھونپڑی کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ وہ لالی اور شاداں ہی کی جانب آ رہا تھا۔

حنیف ڈوگر کے ہم راہ دو کارندے بھی تھے۔ دونوں ہی مسلح تھے۔ دھندلی دھندلی روشنی میں وہ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ان کے چہروں پر خشونت تھی۔ آنکھوں سے سفاکی جھلکتی تھی۔ وہ بار بار اپنی گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے۔ زور زور سے کھنکارتے تھے۔ ان کی آمد کے ساتھ ہی ہر آواز اور ہر آہٹ ختم ہو گئی۔ ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ نہ کوئی بول رہا تھا نہ کھانس رہا تھا۔ بھٹے کا وسیع میدان دفعتہً قبرستان کی طرح سنسان ہو گیا تھا۔

ڈوگر کے ہاتھ میں اس وقت بھی چمڑے کا چھتر دبا تھا۔ وہ بھی میاں اسلم کا کارندہ تھا۔ قابل اعتماد تھا اور محرم راز بھی تھا۔ اس کا کام بھٹے کی نگرانی کرنا تھا۔ بھٹے پر کام کرنے والے پتھیروں اور دوسرے محنت کشوں کو دہشت زدہ کرنا تھا۔ ان کو پوری طرح قابو میں رکھنا اور ضرورت کے مطابق بھٹے کے لیے پتھیرے اور مزدور فراہم کرنا بھی تھا۔

کوئی پتھیرا یا بھٹہ مزدور سرکشی کرتا یا ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کرتا تو ڈوگر اس کے جسم پر چھتر مارنا شروع کر دیتا۔ ہنگامہ کرنے والے اگر تعداد میں زیادہ ہوتے تو وہ مسلح کارندوں کے ساتھ ان پر دھاوا بول دیتا۔ مار مار کر ان کو لہولہان کر دیتا۔ طرح طرح کی سزائیں دیتا۔ کسی کی دہاڑی کٹوا دیتا کسی کو چمنی کے دہکتے ہوئے توے پر برہنہ پا کھڑا کر دیتا۔ کسی کو درخت سے الٹا لٹکا کر مرچوں کی دھونی دیتا۔ ہر پتھیرا اور ہر بھٹہ مزدور اس کے نام سے تھرّاتا تھا' لرزتا تھا۔ اس کے سامنے نظریں اٹھا کر بات کرنے کی جرات نہ کرتا تھا۔

بھٹے پر جب کام زیادہ ہوتا تو حنیف ڈوگر پتھیروں اور دوسرے مزدوروں کی بھرتی کے لیے میاں اسلم کے حکم پر نکلتا۔ بستی بستی' گاؤں گاؤں گھومتا پھرتا۔ ایسے کسانوں کو تلاش کرتا جن کے پاس کھیتی باڑی کے لیے زمین نہ ہوتی۔ جو کھیت مزدور ہوتے یا زمیں داروں کے ہاتھوں بے دخل ہونے

والے بے روزگار اور پریشان حال مزارعے ہوتے۔ ان کو وہ کم سے کم اجرت پر بھرتی کرتا۔ ان کی مجبوری اور زبوں حالی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ ہنگامی حالات اور فوری ضرورت کی صورت میں وہ زیادہ اجرت پر بھی پتھیروں اور بھٹہ مزدوروں کو بھرتی کرنے سے دریغ نہ کرتا۔ میاں اسلم نے اسے ایسے اختیارات بھی دے رکھے تھے۔

پتھیروں اور مزدوروں کو بھرتی کرنے کے بعد وہ ریل گاڑی یا لاری سے جتھوں کی صورت میں بھٹے پر پہنچاتا۔ مگر ایک بار بھٹے کی حدود میں داخل ہونے کے بعد کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کی چوبیس گھنٹے کڑی نگرانی کی جاتی۔ اگر کوئی پتھیرا یا مزدور کسی اشد ضرورت کے تحت اپنے آبائی گاؤں یا عزیز واقارب کی غمی یا خوشی میں شرکت کرنے کے لیے جانا چاہتا تو عام طور پر اسے اجازت ہی نہ ملتی اور ملتی بھی تو اس شرط پر کہ اس کے بال بچوں کو یرغمال بنا کر رکھا جاتا۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ کوئی پتھیرا اس قیدوبند سے گھبرا کر فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ پکڑا جاتا تو اسے کڑی سزا دی جاتی۔ رات کو ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں زنجیریں ڈال کر قید کر دیا جاتا۔ فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو ڈوگر اس کی تلاش میں نکلتا۔ اس کا سراغ لگانے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ اور ایک روز اچانک چھاپہ مار کر اسے پکڑ لیتا۔ پولیس اس کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتی۔ بھٹے تک پہنچانے میں ہر طرح کی مدد کرتی اور اس کے صلے میں نقد محنتانہ وصول کرتی۔

حنیف ڈوگر ہرچند کہ میاں اسلم کا کارندہ تھا۔ نہایت وفادار تھا۔ حامی اور مددگار بھی تھا۔ اس کے لیے ہر جائز اور ناجائز کام کرنے کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتا تھا۔ وہ کسی دوسرے بھٹے کے لیے نہ کام کر سکتا تھا نہ اس سے کوئی تعلق رکھ سکتا تھا۔ مگر اس تمام کارگزاری اور جانثاری کے باوجود اس کی حیثیت ایک ٹھیکیدار سے زیادہ نہ تھی۔ اسے نہ کوئی تنخواہ ملتی تھی نہ کمیشن ملتا تھا اور نہ کسی قسم کا بھتہ یا الاؤنس۔

اسے صرف جمعداری ملتی تھی۔ یہ جمعداری ہر ہزار کچی اینٹ پر مقرر تھی۔ ہر ہفتے جب چٹھا بانٹا جاتا تو پتھیروں کو اجرت ادا کرنے سے پہلے ہی جمعداری کی رقم کاٹ لی جاتی۔ کوئی پتھیرا نہ اس کے خلاف احتجاج کر سکتا تھا نہ اعتراض۔ جمعداری کی ادائیگی ایک تسلیم شدہ ضابطہ تھا جو سالہا سال سے رائج تھا۔ اتنا قدیم تھا کہ کسی کو یہ بھی علم نہیں کہ کب رائج ہوا اور کس نے رائج کیا۔

پتھیروں کی فی ہزار کچی اینٹ کی اجرت میں اضافہ ہوتا تو جمعداری میں بھی اضافہ ہوتا۔ لیکن جمعدار کو چونکہ بھٹہ مالک کی خوشنودی اور سرپرستی حاصل ہوتی تھی' لہٰذا ہر بار جب پتھیرے اپنی اجرت بڑھانے کے لیے آواز بلند کرتے اور اپنی اجرت بڑھانے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو

جمعداری میں اجرت کے تناسب سے کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو جاتا۔

حنیف ڈوگر کو ان دنوں ہر ہزار کچی اینٹ پر دو آنے جمعداری مل رہی تھی۔ مگر وہ اپنی جمعداری میں اضافہ کرانے کے لیے پتھیروں اور دوسرے بھٹہ مزدوروں پر ہر طرح کا ظلم و ستم ڈھا رہا تھا تاکہ میاں اسلم پر اپنی زیادہ سے زیادہ وفاداری اور خیرخواہی کا سکّہ بٹھا سکے۔ اس کی خوشنودی اور اعتماد حاصل کر سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بھٹے کے لیے سستے اور جفاکش پتھیرے بھی مہیا کرنے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔

یہ میاں اسلم کی مرضی پر تھا کہ کسی پتھیرے کو کب تک بھٹے پر رکھا جائے اور کب علیحدہ کر دیا جائے۔ مگر وہ کسی بھی صورت میں ان کو آزاد نہ کرتا تھا۔ کاروبار میں مندی ہوتی تو وہ ان کو دوسرے بھٹوں کے مالکان کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا۔ اس سلسلے میں باقاعدہ مول تول ہوتا۔ موسمی حالات اور رسد و طلب کی روشنی میں بھاؤ طے کیا جاتا اور جب سودا پٹ جاتا تو مویشیوں کے ریوڑ کے طرح ان کو خریدار کے حوالے کر دیا جاتا۔

ہر بھٹے کا مالک پتھیروں کا اسی طرح لین دین کرتا تھا۔ حالانکہ بھٹوں کے مالکان میں سخت کاروباری رقابت تھی اور کبھی کبھی تو یہ رقابت اتنی شدید ہو جاتی کہ مسلح تصادم بھی ہوتے۔ مقدمے بازی ہوتی اور برسوں چلتی۔ مگر پتھیروں کے معاملے میں وہ ایک دوسرے سے ہر طرح کا تعاون کرتے۔ کوئی پتھیرا فرار ہو کر کسی دوسرے بھٹے پر پہنچ جاتا تو اسے گرفتار کر کے فوراً اس کے مالک کے پاس پہنچا دیا جاتا۔ بھٹوں کے مالک ضرورت کے مطابق پتھیرے خریدتے بھی تھے اور فروخت بھی کرتے تھے۔

خرید و فروخت کے اس کاروبار میں پتھیروں اور بھٹہ مزدوروں کے خاندان بکھر جاتے۔ شوہر ایک بھٹے پر ہوتا تو بیوی کسی دوسرے پر۔ باپ کہیں ہوتا بیٹا کہیں اور۔ جب وہ بچھڑ کر بکھر جاتے تو ایک دوسرے کو یہ بھی خبر نہ ہوتی کہ کون کہاں ہے؟ کس بھٹے پر کام کر رہا ہے؟ کس شہر میں ہے' کس علاقے میں ہے؟ یہاں تک کہ آمنے سامنے یا قریب کے بھٹے پر کام کرنے کے باوجود وہ مہینوں بے تعلق اور بے خبر رہتے اور اگر کسی دوسرے شہر کے بھٹے پر لگا دیئے جاتے تو برسوں ایک دوسرے سے جدا رہتے بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاتے۔

پتھیروں اور دوسرے بھٹہ مزدوروں کی خرید و فروخت کی بنیاد' بھٹہ مالکوں کی **اصطلاح** میں پیشگی ہوتی تھی۔ پیشگی کی صورت یہ ہوتی کہ جب پتھیروں یا بھٹہ مزدوروں کو بھرتی کیا جاتا تو عام طور پر وہ بالکل قلاش ہوتے۔ ان کے بدن پر لباس کے بجائے چیتھڑے ہوتے۔ مسلسل فاقہ کشی

سے نیم جاں ہوتے۔ وہ بھوک اور افلاس سے مجبور ہو کر ہی اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرنے کے لیے آمادہ ہوتے تھے۔ بیشتر مقروض بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ قرض کی ادائیگی اور فوری ضروریات کے لیے بھرتی کے وقت بھٹہ مالکان کی جانب سے پتھیروں کو کچھ رقم پیشگی دے دی جاتی۔ یہ ایسا قرض ہوتا جو قسطوں میں پتھیروں اور بھٹہ مزدوروں کی اجرت سے کٹتا رہتا۔

قرض دینے کا یہ طریقہ کار قیام پاکستان سے قبل ہندو بھٹہ مالکان نے رائج کیا تھا۔ مگر سود در سود کی بنیاد پر وہ پتھیروں کو قرض کے جال میں اس طرح جکڑ دیتے تھے کہ کم ہونے کے بجائے گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا۔

قرض میں اس اضافے کا ایک بنیادی سبب یہ بھی تھا کہ ہر ہفتے چٹھا بانٹتے وقت پتھیروں کی اجرت سے پیشگی رقم کی جو قسط کاٹی جاتی وہ حساب کتاب کے رجسٹر میں کم اور اکثر سرے سے درج ہی نہیں کی جاتی۔ پتھیرے اور بھٹہ مزدور ان پڑھ اور جاہل ہوتے۔ انھیں مطلق خبر نہ ہوتی کہ رجسٹر میں ان کے نام کے خانے میں کتنی رقم کا اندراج کیا گیا اور آیا کیا بھی گیا کہ نہیں۔

منشی ان کے ان پڑھ ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتا اور مالک کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کارگزاری دکھانے کی کوشش کرتا۔ اس کارگزاری کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پیشگی کا سلسلہ ایک بار شروع ہوتا تو کبھی ختم نہ ہوتا۔ پتھیرے اور بھٹہ مزدور مالکان کی ایک طرح سے ذاتی ملکیت بن جاتے۔ ملک تقسیم ہوا۔ آزاد ہوا۔ مگر ہندو بھٹہ مالکان نے پیشگی کا جو طریقہ کار رائج کیا تھا، اسی طرح برقرار رہا۔ اس میں سرمو فرق نہ آیا۔ بلکہ اس پر پہلے کی بہ نسبت زیادہ سختی سے اس طرح عمل درآمد کیا جاتا کہ پیشگی کا طریقہ کار کھلی دھاندلی بن گیا۔

لالی نے بھی بھٹے پر کام شروع کرنے سے قبل تین سو روپے پیشگی لیے تھے حالانکہ اسے اتنی رقم کی ضرورت نہ تھی۔ شاداں کے پاس کچھ کم پچاس روپے موجود تھے۔ ان سے وہ کام چلا سکتا تھا مگر حنیف ڈوگر کے اصرار کرنے پر اس نے بھی دوسرے پتھروں کے ساتھ پیشگی وصول کرلی تھی۔ بعد میں بھی ڈوگر کا رویّہ اس کے ساتھ دوستانہ رہا۔ بات کرتا تو لہجے میں نرمی اور شگفتگی ہوتی اس شفقت اور سرپرستی کو نہ صرف اس نے محسوس کیا بلکہ دوسرے پتھیروں اور بھٹہ مزدوروں نے بھی محسوس کیا تھا۔ لالی اس کی اس قدر مہربانی کا مقصد ہنوز سمجھ نہ سکا تھا۔ وہ اس سے خائف تھا اور کتراتا بھی تھا۔ اس لیے کہ بھٹے پر کام کرنے والے سارے ہی پتھیرے اور محنت کش ڈوگر سے شدید نفرت کرتے تھے۔

☆

حنیف ڈوگر اپنے مسلح گرگوں کے ساتھ آگے بڑھا اور لالی کے قریب پہنچ گیا اس نے شاداں کو ایسی چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ وہ گھبرا گئی۔ دوپٹہ کھینچ کر سر ڈھک لیا۔ نظریں جھکا کر فرش کو خاموشی سے تکنے لگی۔

لالی نے اٹھ کر ڈوگر کو سلام کیا۔ پوچھا۔ "جمعدار کیسے آنا ہوا ہے؟"

"تجھ سے کچھ ضروری گل بات کرنی تھی۔" حنیف ڈوگر نے اس وقت بھی مسکرا کر شفقت کا اظہار کیا۔ "آ میرے ساتھ۔"

"صبح بات نہیں ہو سکتی۔" لالی نے ٹالنا چاہا۔ "اب تو مجھے اونگھ لگ رہی ہے۔ آج تو میں بہت تھک گیا۔ کام بھی زیادہ ہی کیا تھا۔"

"سو جانا۔ میں نے تجھے زیادہ دیر نہیں روکنا۔"

"جیسی تری مرضی۔" لالی مزید انکار نہ کرسکا۔

حنیف ڈوگر نے دونوں مسلح کارندوں کو گشت پر روانہ کردیا اور لالی کے ہم راہ جھونپڑیوں کے قریب سے گزرنے لگا۔ وہ اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر چلتے رہے اور گہرے گڑھوں سے بچتے بچاتے میدان کے دوسرے سرے پر پہنچ گئے۔ ان کے سامنے ایک کشادہ کوٹھری تھی جس پر ٹین کا سائبان تھا۔

سائبان کے نیچے دیسی شراب کشید کرنے کی بھٹی تھی۔ جنوبی دیوار میں طاق تھا۔ اس میں لالٹین رکھی تھی۔ اس کی دھندلی روشنی میں دو آدمی بیٹھے تھے۔ وہ صرف دھوتیاں باندھے ہوئے تھے۔ کوٹھری میں گرمی اور امس تھی ان کے چہروں اور پیٹھ پر پسینے کے قطرے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ شراب کشید کر رہے تھے۔ ہر طرف تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔

دروازہ کھلا تھا۔ حنیف ڈوگر اندر داخل ہوگیا۔ لالی بھی اس کے ساتھ ساتھ اندر چلا گیا۔ شراب کشید کرنے والوں نے مڑ کر ڈوگر اور لالی کو دیکھا۔ اونچی آواز سے سلام کیا۔ لالی کو بھٹی کے بارے میں سن گن مل چکی تھی۔ مگر پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ اس نے حیرت زدہ نظروں سے بھٹی کی اس نلکی کو دیکھا جس سے قطرہ قطرہ شراب ٹپک رہی تھی اور نلکی کے نیچے رکھے ہوئے ایک پیپے میں جمع ہو رہی تھی۔

خالی اور شراب سے بھرے ہوئے کئی پیپے کوٹھری کے ایک گوشے میں رکھے تھے۔ شراب سے بھری ہوئی چند بوتلیں بھی تھیں۔ ڈوگر نے مسکرا کر لالی کی جانب دیکھا۔ پوچھا۔ "پینی ہے؟"

"نہیں جی، میں ایسا کام نہیں کرتا۔" لالی نے صاف انکار کردیا۔

”جیسی تیری مرضی۔“ ڈوگر نے اصرار نہ کیا۔ اس کے منہ سے بھبکے نکل رہے تھے۔ آنکھیں نشے سے چڑھی ہوئی تھیں۔ ”میں نے تو شام ہی کو اپنا کوٹا پورا کر لیا تھا۔“

لالی خاموش کھڑا رہا۔ حنیف ڈوگر بھٹی کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ گرمی اور حبس سے اس کے ماتھے پر بھی پسینے کے قطرے جھلملانے لگے تھے۔ وہ باہر نکلا۔ لالی بھی اس کے ہم راہ باہر آ گیا۔ تازہ ہوا میں ان کو سکون ملا۔ ہوا کے جھونکے ٹھنڈے اور خوشگوار محسوس ہوئے۔ دونوں آگے بڑھے۔ شراب کشید کرنے کی بھٹی سے بیس پچیس قدم کے فاصلے پر بھٹے کا دفتر تھا۔ اس کی دیواریں پختہ تھیں۔ دفتر کے دروازے پر اس وقت قفل پڑا تھا۔

دفتر سے منسلک پختہ کمرہ تھا۔ اس کا دروازہ بھی مقفل تھا اور صرف میاں اسلم کی آمد پر کھلتا تھا۔ وہ اکثر رات کو اس کمرے میں ٹھہرتا بھی تھا۔ سرما کی طویل اور کہر آلود راتوں میں یہ کمرہ عام طور پر آباد رہتا تھا۔ میاں اسلم دوست احباب کے ساتھ آتا۔ پیتا پلاتا۔ بے تکلفی سے قہقہے لگاتا۔ داد عیش دیتا۔ کبھی آدھی رات کو اٹھ کر چلا جاتا اور کبھی صبح تک کمرے میں مقیم رہتا۔

کمرے کی کنجی بھٹے کے ایک پرانے ملازم کے پاس رہتی تھی۔ وہ ادھیڑ تھا۔ قابل اعتماد تھا اور دفتر کی پشت پر ایک جھونپڑی میں اکیلا رہتا تھا۔ وہ اس وقت جاگ رہا تھا۔ حنیف ڈوگر اور لالی کے پہنچتے ہی وہ اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا اور ایک چارپائی لا کر دفتر کے سامنے ڈال دی۔ حنیف ڈوگر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ لالی کو بھی اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔ اس نے ملازم کو مخاطب کیا۔

”میراں، پانی تو پلا۔ بہت پیاس لگی ہے۔“

میراں مڑا اور ذرا ہی دیر بعد المونیم کے گلاس میں پانی لے کر واپس آ گیا۔

حنیف ڈوگر نے پانی پی کر گلاس میراں کو واپس دیا۔ وہ خاموشی سے اپنی جھونپڑی کی جانب چلا گیا۔ ڈوگر نے مڑ کر لالی کو دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ ”پتہ ہے میں تجھے یہاں کس لیے لایا ہوں۔“

”مجھے کیا پتہ تو کس لیے لایا ہے۔“ لالی نے اپنی لاعلمی کا برملا اظہار کیا۔ ”جب تک تو بتائے گا نہیں مجھے کیسے پتہ چلے گا۔“

”بھٹے پر جو کام کر رہا ہے اس سے تو خوش ہے؟“ ڈوگر نے قطعی مختلف سوال کیا۔

لالی نے چونک کر ڈوگر کے چہرے کی جانب دیکھا۔ ”جمعدار، میں تیری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔“

”مطلب یہ کہ تو شاداں کے ساتھ سخت دھوپ اور گرمی میں اینٹیں تیار کرنے کا جو کام کرتا ہے تجھے پسند ہے؟“ ڈوگر نے اس دفعہ اپنی بات کا مفہوم وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کی۔

”میں تو جی، جب بہت چھوٹا تھا تب بھی بھٹے پر کام کرتا تھا۔“ لالی نے حنیف ڈوگر کو آگاہ کیا۔ ”سخت گرمی میں کام کرتا تھا اور کڑاکے کے جاڑے میں بھی کرتا تھا۔ ویسے ہی اب کرتا ہوں۔ کام جو کرنا ہوا۔ کوئی مفت میں تو دہاڑی دیتا نہیں۔“

”تو اب تک میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔“ ڈوگر نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ لو دھوپ میں کام کر کے تو اور شاداں دونوں ہی ختم ہو جائیں گے۔ بدن پر نہ گوشت رہے گا نہ خون۔ کچھ ہی دنوں بعد ہی تم دونوں دوسرے پتھیروں کی طرح ہڈیوں کا پنجر رہ جاؤ گے۔ یہی دیکھ جب تو ادھر آیا تھا تو کیسا تھا اور اب تیرا کیا حال ہے۔ شاداں بھی ایسی لگتی ہے جیسے بھٹے کے اندر سے جھلس کر نکلی ہو۔“

”وہ تو مجھے بھی پتہ ہے۔ پتھیرے کا کام ہی ایسا ہوتا ہے۔“

”میں چاہتا ہوں تو پتھیرے کا کام چھوڑ دے۔“ حنیف ڈوگر نے کھل کر بات کی۔ ”کرندہ لگ جا۔“ اس نے لالی کا بازو پکڑ کر انگلیوں سے گوشت ٹٹولا۔ ”تو تگڑا جوان ہے۔ بہت چنگا کرندہ بن سکتا ہے۔ کام بھی کم کرنا ہوگا۔“

”صرف دیسی شراب پی کر نشے میں بڑھکیں مارنی ہوں گی۔ پتھیروں اور کمہاروں کی کڑیاں اٹھا کر تیرے پاس پہنچانی ہوں گی۔ کوئی گڑبڑ کرے گا، شور شرابہ کرے گا تو دبا کے اس کی پٹائی کرنی ہوگی۔“ لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”یہی کام کرنا ہوگا؟“

”زیادہ اونچی اونچی گلاں نہ کر۔“ ڈوگر مشتعل ہو گیا۔ ”مجھے پتہ ہے تو چوری ڈکیتی کرتا رہا ہے۔ کئی بار جیل میں بھی بند رہا ہے۔“ اچانک اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ”تو چاہتا ہے نیک بندہ بن کر رہ تاکہ پولیسیے تجھے تنگ نہ کریں۔ سچ سچ بتا میں نے غلط تو نہیں سوچا؟“

”تو نے ٹھیک ہی سوچا ہے۔“

”تو پولسیوں کی فکر نہ کر۔“ حنیف ڈوگر نے لالی کو رام کرنے کی کوشش کی۔ ”سارے ہی میاں اسلم کے یار ہیں۔“ اس نے کمرے کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”جاڑا آنے دے تب دیکھنا تھانیدار اور دوسرے وڈے افسر تجھے ہر رات ادھر نظر آئیں گے۔ پر گرمی میں بھی کبھی کبھی ادھر محفل جمتی ہے۔ یہیں کمرے کے سامنے کرسیاں ڈال دی جاتی ہیں۔ رات دیر تک پینے پلانے کا شغل ہوتا ہے۔“

”ہوتا ہوگا جی، پر میں نے اس سے کیا لینا۔“

”تنخواہ ٹھیک ٹھاک ملے گی۔ سب پر رعب بھی رہے گا۔“ ڈوگر نے لالی کو متاثر کرنے کی ایک

اور کوشش کی۔ "میرے کہنے پر چلے گا تو عیش کرے گا۔"

لالی پھر بھی آمادہ نہ ہوا۔ حنیف ڈوگر کے سمجھانے بجھانے اور اصرار کرنے کے باوجود آمادہ نہ ہوا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ "میں تو جی پتھیرا ہوں اور پتھیرا ہی رہ کر ادھر کام کروں گا۔ میں نے کرندہ شرندہ نہیں بننا۔" لالی نے اس کی پیشکش سختی سے مسترد کردی۔ "تو مجھے پتھیرا رکھنا نہیں چاہتا تو میں تیرا بھٹہ چھوڑ دوں گا کسی اور بھٹے پر لگ جاؤں گا۔"

"دوسرے بھٹے پر جانے کی نہ سوچ۔ آگے ایسی گل نہ کرنا۔" ڈوگر نے تنبیہہ کی۔ "تو پتھیرا رہنا چاہتا ہے تو پتھیرا ہی رہ۔ میں نے تو تیرے ہی بھلے کو کہا تھا۔ سوچا تھا سخت گرمی اور لو سے تنگ ہوگا۔"

"لو دھوپ کی تو فکر نہ کر۔ اس کے بارے میں تو پتھیرا لگنے سے پہلے میں نے سوچ رکھا تھا۔" لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "میں اکیلا تو نہیں ہوں۔ دوسرے بندے بھی ہیں۔ سب ہی دھوپ اور گرمی میں کام کرتے ہیں۔"

"پر ان میں کئی ایسے ہیں جو ٹھیک بندے نہیں ہیں۔ کام چور اور کمینے ہیں۔ سختی کرو تو میرے اور میاں اسلم کے خلاف طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ گند اور نفرت پھیلاتے ہیں۔" ڈوگر نے حقارت سے منہ بگاڑ کر لالی کو خبردار کیا۔ "تو ان کی باتوں پر کبھی دھیان نہ دینا۔"

"میرا تو جی ادھر کسی سے میل ملاپ ہی نہیں ہے۔" لالی نے اسے اطمینان دلایا۔ "دن بھر کام کرنے کے بعد اتنا تھک جاتا ہوں کہ کسی سے گل بات کرنے کو جی نہیں کرتا۔"

"میں یہ نہیں کہتا تو کسی سے میل ملاپ نہ رکھ۔ گل بات نہ کر۔" اس کا لہجہ رازدارنہ ہوگیا۔ "پر کوئی گند اور نفرت پھیلانے کی کوشش کرے تو مجھے اس کے بارے میں بتا دینا۔"

لالی نے حیرت زدہ ہو کر ڈوگر کی جانب دیکھا مگر خاموش رہا۔ ڈوگر نے نشے کی جھونک میں لہرا کر بے تکلفی سے لالی کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔ "تو فکر نہ کر۔ میں منشی سے تیرے بارے میں بول دوں گا۔ آگے نہ وہ تیری دہاڑی سے ٹوٹ پھوٹ کاٹے گا نہ خراب اور ٹیڑھی ونگی اینٹوں کا چکر چلائے گا۔ پیشگی میں بھی کوئی ہیر پھیر نہیں کرے گا۔ تجھے بالکل تنگ نہیں کرے گا۔ ٹھیک ٹھیک دہاڑی دے گا۔"

لالی ہنوز خاموش رہا۔ اس نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ ڈوگر اسے اعتماد میں لے کر کہتا رہا۔ "ادھر ایسے اور بھی بندے ہیں جو مجھے بھٹے پر کام کرنے والوں کے بارے میں ایک ایک بات بتاتے ہیں۔ وہ میرے کہنے پر چلتے ہیں۔ میں بھی ہر طرح ان کی مدد کرتا ہوں۔" اس نے مسکرا کر لالی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "تو میری بات کا مطلب سمجھ گیا نا؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" لالی کا لہجہ طنزیہ تھا۔ "تو چاہتا ہے' میں تیرے لیے مخبری کروں۔ یہی چاہتا ہے نا؟"

"مخبری شخبری نہیں' میں تو صرف یہ چاہتا ہوں تو ادھر رہے تو ایسا بندہ بن کر رہے جس پر میں بھی بھروسہ کر سکوں۔ اس میں تیرا ہی فائدہ رہے گا۔"

"جمعدار تیری بہت بہت مہربانی۔" لالی نے انکساری سے کام لیا۔ "پر میں ایسا کام نہیں کر سکتا۔ میں نے مخبری ہی کرنی ہوتی تو پولیس کا مخبر لگ جاتا۔ اس میں تو زیادہ فائدہ تھا۔ پر میں کسی ایسے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔"

لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ حنیف ڈوگر نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے سے جھنجلاہٹ اور برہمی آشکارہ تھی۔ مگر وہ چپ رہا۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔

لالی کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ حنیف ڈوگر کے رویّے میں نمایاں تبدیلی آگئی ہے۔ بات کرتا تو تیوری پر بل پڑے ہوتے۔ لہجہ کرخت اور تحقیر آمیز ہوتا۔ وہ لالی کو بات بات پر ڈانٹتا ڈپٹتا۔ طرح' طرح سے پریشان کرنے کی کوشش کرتا۔

منشی بھی اب چِھٹّا بانٹتے وقت اس کی اجرت سے زیادہ سے زیادہ کٹوتی کرتا۔ ٹوٹ پھوٹ بڑھا کر لکھتا۔ خراب اور غیر معیاری اینٹوں میں اضافہ کر دیتا۔ اینٹوں کی کم سے کم تعداد مقرر کر کے معاوضہ ادا کرتا۔ پیشگی کی وصولی میں بھی گھپلا کرتا۔ ہرچند کہ لالی کی تعلیمی استعداد بہت واجبی سی تھی مگر رجسٹر میں درج کی جانے والی ہر تفصیل پڑھ سکتا تھا۔ وہ انگوٹھا لگانے کے بجائے ہمیشہ دستخط کرتا تھا اور دستخط کرنے سے پہلے رجسٹر میں لکھی جانے والی کچی اینٹوں کی تعداد اور ان کے معاوضے کی رقم ضرور پڑھتا تھا۔ کوئی غلطی دیکھتا تو منشی کو ٹوکتا اور اسے درست کراتا۔

منشی نے اسے پریشان کرنے اور پیشگی کی وصولی میں دھاندلی کرنے کی غرض سے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایسے شکستہ اور جناتی خط میں اندراج کرتا کہ لالی کے لیے اس کا پڑھنا مشکل ہوتا۔ لالی نے اس کے اس رویے کے خلاف احتجاج کیا۔ بگڑ کر بولا۔ "منشی' صاف صاف لکھ۔ تو لکھتا کچھ ہے پڑھتا کچھ اور ہے۔" مگر منشی نے اسے جھڑک دیا۔ "بکواس نہ کر۔" وہ بہت اونچی آواز سے بولا۔ یہ ڈوگر کے لیے اشارہ تھا جو اس کی پشت پر اپنے مسلح کرگوں کے ساتھ چِھٹّا بٹتے وقت موجود رہتا تھا۔ وہ فوراً بڑھا۔ ڈپٹ کر لالی سے کہا۔ "کنون نہ بگھار۔ دہاڑی لے اور آگے بڑھ۔" وہ چمڑے کا چھتر

سنبھال کر لالی کو قہر آلود نظروں سے دیکھنے لگا۔

لالی نے حنیف ڈوگر سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ منشی نے جو کچھ دیا لے کر خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ بعد میں بھی اس نے کئی بار منشی سے احتجاج کیا۔ اسے ٹوکا۔ مگر ہر بار ڈوگر چمڑے کا چھتر سنبھالے اسے دہشت زدہ کرنے کی غرض سے بڑھ کر سامنے آجاتا۔ ویسے دوسرے پتھیروں کے ساتھ بھی اس کا رویہ ایسا ہی تھا۔ لیکن ڈوگر نے لالی کو کبھی چھتر سے مارا پیٹا نہیں۔ صرف ڈرانے دھمکانے پر اکتفا کیا۔ لالی نے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ منشی جو دہاڑی دیتا خاموشی سے لے لیتا۔

لالی اب چپ چپ رہتا۔ شاداں سے بھی کم بات چیت کرتا۔۔ وہ خود بھی پریشان تھی۔ لالی کو گم صم دیکھتی تو اور پریشان ہو جاتی۔

☆

ایک شام لالی کھانا کھانے کے بعد بستر پر لیٹا تھا۔ شاداں اس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ بھٹے کے وسیع میدان میں جگہ جگہ چولہوں میں آگ روشن تھی۔ کوئی روٹی پکا رہا تھا۔ کوئی کھا چکا تھا۔ کوئی کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ بچوں کے رونے اور شور مچانے کے ساتھ ساتھ عورتوں اور مردوں کی ملی جلی آوازیں بھی ابھر رہی تھیں۔ مگر لالی خاموش تھا۔

شام خوش گوار تھی۔ شدید گرمی کے بعد موسم کسی قدرے بدل گیا تھا۔ آسمان پر صبح سے بادل چھائے تھے۔ لیکن بارش نہیں ہوئی تھی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی اور سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ لالی چت لیٹا تھا اور آسمان کو تک رہا تھا۔ بادلوں کی اوٹ سے کہیں کہیں کوئی ستارہ جھلملاتا ہوا نظر آرہا تھا۔

شاداں نے لالی کو مخاطب کیا۔ "لالی' میں نے تجھ سے ایک گل کہنی ہے۔ کئی روز سے اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

مگر لالی نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش لیٹا رہا۔

"تو بولتا کیوں نہیں؟" اس دفعہ شاداں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"بول' کیا کہنا چاہتی ہے؟" لالی نے اس کی جانب دیکھے بغیر بے نیازی سے کہا۔

"میں نے اب ادھر نہیں رہنا۔" شاداں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے لالی کو مطلع کیا۔ "میں تجھے صاف صاف کہے دیتی ہوں۔"

"تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔" لالی نے کروٹ بدل کر شاداں کی جانب تیکھی نظروں سے دیکھا' دھیرے سے بولا۔ "ڈوگر کو پتہ چل گیا تو گلے پڑ جائے گا اور زیادہ تنگ کرے گا۔"

"تو کچھ ہی کہہ۔ پر میں نے اب یہاں نہیں رہنا۔" وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔

"کیسے جائے گی؟ کس کے ساتھ جائے گی؟" لالی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"جاؤں گی کس کے ساتھ' تیرے ساتھ جاؤں گی۔ اکیلی نہیں جاؤں گی۔" اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ عاجزی سے بولی۔ "دیکھ لالی' میں نے تیری ہر گل بات مان لی۔ جو تو نے کہا میں نے وہی کیا۔ تیرے ساتھ بھٹے پر بھی لگ گئی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "مجھے' اب ادھر نہیں رہنا۔ گرمی میں' دھوپ میں سخت کام کرو پر نہ کپڑے لتے رہے نہ ٹھیک سے کھانے کو روٹی ملتی ہے۔ ایسے کب تک کام چلے گا۔ ذرا اپنی حالت دیکھ۔ میں نے تو اب آئینہ ہی دیکھنا چھوڑ دیا۔ لگتا ہے اپنی نہیں کسی اور کی شکل دیکھ رہی ہوں۔"

"تو چاہتی کیا ہے؟" لالی بھنا کر بولا۔

"ذرا سوچ تو یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ خانہ بدوشوں کی طرح میدان میں پڑے ہیں۔ میں چاہتی ہوں۔ میرا بھی گھر ہو۔" شاداں نے اپنی محرومیوں کا اظہار کیا۔ "سب سمجھتے ہیں میں تیری گھر والی ہوں۔ پر کسی کو کیا پتہ۔ میرا تو تیرے ساتھ ویاہ بھی نہیں ہوا۔" اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔ "میں یہاں سے نکل کر سب سے پہلے تیرے ساتھ نکاح پڑھواؤں گی۔ کیا تو ایسا نہیں چاہتا؟"

"بالکل چاہتا ہوں۔" شاداں نے اس کے دل کی بات کہی تھی۔ وہ یکایک سنجیدہ ہو گیا۔ "پر یہ تو سوچ۔ ہم یہاں سے نکل کیسے سکتے ہیں۔ تجھے پتہ ہے کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں۔ اور جب تک پیشگی ادا نہیں ہو جاتی بھٹے سے کہیں اور جا ہی نہیں سکتے۔"

"تجھے پتہ ہے' پیشگی تو کبھی ادا نہیں ہو گی۔" شاداں نے گہری سانس بھری۔ "اب تو اسے ادا کرنے کو بھی کچھ نہیں رہا۔"

لالی نے کچھ نہ کہا۔ گردن جھکا کر سوچنے لگا۔

شاداں چند لمحے خاموش بیٹھی لالی کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کرید کر پوچھا۔ "تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"سوچ رہا تھا' ہم دونوں تو اکٹھے یہاں سے نکل نہیں سکتے۔" لالی نے اپنی تجویز شاداں کے سامنے پیش کی۔ "ایسا کر تو یہاں سے کسی بہانے نکل جا۔"

"میں اکیلی تو ہرگز نہیں جاؤں گی۔" شاداں نے لالی کی بات کاٹ کر اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ "تو بھی میرے ساتھ ہی چلے گا۔"

"پہلے میری پوری گل تو سن لے۔" لالی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "یا تو میں جا سکتا ہوں یا تو۔ دونوں ہرگز نہیں جا سکتے۔ کسی ایک کو پیشگی ادا کرنے کے لیے رکنا ہی پڑے گا۔ اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ تجھے میں یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے ہی رکنا پڑے گا۔"

"تب تو کبھی تو نہیں نکل سکے گا۔" شاداں نے اس کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔ "نہ پیشگی کبھی ادا ہو گی نہ تو نکل سکے گا۔"

لالی نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اپنا منہ شاداں کے قریب کر کے رازداری سے مدھم لہجے میں کہا۔ "جب تو یہاں سے چلی جائے گی تو میں کسی نہ کسی طرح یہاں سے باہر نکل جاؤں گا۔" اس نے مسکرا کر شاداں کو دیکھا۔ "جب میں جیل سے فرار ہو سکتا ہوں تو یہاں سے نکلنا میرے لیے کیا مشکل ہے۔"

"مجھے تو ابھی سے ڈر لگ رہا ہے۔" شاداں کے چہرے پر گھبراہٹ نظر آنے لگی۔ "تو نے کرندوں کو دیکھا ہے۔ کتوں کی طرح ادھر ادھر سونگھتے پھرتے ہیں۔ تو ان کے ہوتے ہوئے کیسے نکل سکے گا؟"

"یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔" لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "مجھے تو یہ فکر ہے کہ تو یہاں سے نکلے گی کیسے؟ ڈوگر ویسے بھی خار کھاتا ہے۔ وہ تو ہرگز تجھے جانے نہیں دے گا۔"

"کوئی نہ کوئی بہانہ سوچ لے۔" شاداں اس کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے پر رضامند ہو گئی۔ "ڈوگر کی منت سماجت کر لینا۔"

"تو کہتی ہے تو ایسا بھی کر لوں گا۔" شاداں کی بات لالی کے دل کو لگی۔

"ضرور کر لینا۔" شاداں نے مسکرا کر کہا۔ "اپنا کام ہی تو نکالنا ہے۔ آگے ہم نے اس سے کیا لینا۔"

"ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ میں جلد ہی ڈوگر سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ اس نے غصے سے دو چار گلاں بھی نکالیں تو وہ بھی چپ کر کے سن لوں گا۔ اسے تو میں کسی نہ کسی طرح راضی کر ہی لوں گا۔ مجھے پتہ ہے وہ کیا چاہتا ہے۔"

"یہاں سے تو جیسے بھی ہو فاٹ فٹ نکل جانا چاہیے۔ بہت گندی جگہ ہے۔ جیل بھی ایسی ہی ہوتی ہو گی۔" شاداں نے لالی سے پوچھا۔ "میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

"تو نے ٹھیک ہی کہا۔ ایک طرح سے یہ بھی جیل ہی ہے۔" لالی نے اس کی تائید کی۔ ساتھ ہی اپنی تشویش کا بھی اظہار کیا۔ "یہ بتا یہاں سے نکل کر تو جائے گی کہاں؟"

"ویسے تو میں اپنے ماماں کے پاس بھی جا سکتی ہوں۔ پہلے بھی اس کے ساتھ ہی ٹھیری ہوئی تھی۔" شاداں نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "میرا ارادہ چوہدری نور الٰہی کے پاس کوٹلہ ہرکشن جانے کا ہے۔"

لالی نے جھٹ مداخلت کی۔ "تو بار بار اس کا ذکر کرتی ہے۔ پر نہ جانے کیوں مجھے وہ بالکل چنگا بندہ نہیں لگا۔"

"تو چوہدری کو جتنا برا سمجھتا ہے وہ ایسا برا بندہ نہیں ہے۔ دکھی بھی ہے۔ پہلے گورداسپور کے موضع نصیر پور میں ہوتا تھا۔ فسادات اور بلوے ہوئے تو گھر بار، بال بچے سب چھوٹ گئے۔" شاداں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اس کا کوئی بھی نہیں رہا۔"

"یہ باتیں تو اس کے بارے میں پہلے بھی بتا چکی ہے۔" لالی نے ناگواری سے کہا۔ "اب اور کتنی بار بتائے گی۔"

"نراض نہ ہو۔" شاداں نے نرمی سے کہا۔ "سچ پوچھ تو میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ وہ نیک بندہ ہے۔ وڈا زمین دار ہے۔ تجھے اپنے ساتھ لگا لے گا۔ میں بھی اس کی حویلی میں لگ جاؤں گی۔ دونوں آرام سے رہیں گے۔"

"پر میں چاہتا ہوں تو چوہدری کے پاس نہ جانا۔ یہاں سے نکل کر اپنے ماماں کے پاس جانا۔"

"تیری مرضی ہے تو ماماں ہی کے پاس چلی جاؤں گی۔" شاداں نے اس کی بات مان لی۔ مگر دبی زبان سے یہ بھی کہا۔ "پر یہ بتا دوں میں چوہدری سے کہوں گی تو وہ ہم دونوں کو ضرور لگا لے گا۔ ادھر ادھر دھندا ڈھونڈنے سے بچ جائیں گے۔"

"تو کہتی ہے تو چوہدری کے پاس کوٹلہ ہرکشن بھی چلے جائیں گے۔" لالی نے شاداں سے مزید الجھنے کی کوشش نہ کی۔ "پر میں جب یہاں سے فرار ہو کر باہر نکلوں گا تو تیرے ماماں کے گھر پہنچوں گا۔ تو میرا وہیں انتظار کرنا۔"

شاداں نے انکار نہ کیا۔ فوراً ہامی بھر لی۔

لالی کی ہدایت پر شاداں صبح کام پر نہ گئی۔ تمام دن چادر اوڑھے اپنی جھونپڑی میں پڑی رہی۔ لالی اکیلا ہی گارا بناتا رہا اور لوہے کے سانچوں میں بھر بھر کر اینٹیں تیار کرتا رہا۔ شاداں کی غیر حاضری کے بارے میں کوئی چتیرا پوچھتا تو کہہ دیتا کہ بیمار ہے۔ شاداں کے پاس کوئی عیادت کرنے جاتا تو وہ بھی یہی کہتی۔ آواز میں نقاہت پیدا کرنے کی کوشش کرتی اور بہت دھیمے لہجے میں بولتی۔ کوئی بھی چتیرا یا بھٹہ مزدور کام سے غیر حاضر ہونے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ غیر

حاضری کے نتیجے میں اس کی دہاڑی نہ لگتی اور دہاڑی کا نہ لگنا پریشانی کا باعث ہوتا۔ ہفتہ گزارنا مشکل ہو جاتا۔ شاداں دوسرے روز بھی کام پر نہ گئی۔ جھونپڑی میں بیماروں کی طرح پڑی رہی۔ لالی اکیلا ہی کام کرتا رہا۔ دو ہی روز میں بھٹے پر یہ بات پھیل گئی کہ شاداں بیمار ہے۔

تیسرے روز لالی سورج غروب ہوتے ہی حنیف ڈوگر سے ملنے گیا۔

☆

موسم گرما کی سلگتی ہوئی شام در و بام سے آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ جھونپڑیوں میں چراغ روشن ہو گئے تھے۔ ڈوگر شام کے جھٹ پٹے میں بھٹے کے دفتر کے سامنے چارپائی پر بیٹھا تھا۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے تازگی اور سرخوشی پیدا کرنے کے لیے پینے پلانے کا شغل شروع نہیں کیا تھا۔

لالی اندھیرے سے نکل کر سامنے آیا تو اس نے چونک کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی، استعجاب تھا۔ اس نے منہ بگاڑ کر حقارت سے پوچھا۔ ”میرے پاس کیوں آیا ہے؟“

لالی نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”تجھ سے ایک گل کرنی تھی۔“ وہ مجرم کی طرح اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔

”میں نے اس وکھت کوئی گل شل نہیں سنی۔“

”کل آ جاؤں گا جی۔ جب تو کہے گا تب آ جاؤں گا۔“ لالی گڑگڑانے لگا۔ ”جمعدار، مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دے۔“

”تجھے اب اپنی غلطی کا پتہ چلا۔“

لالی خاموش کھڑا رہا۔ ڈوگر نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔ تیوری پر بل ڈال کر گویا ہوا۔ ”تجھے اپنی غلطی کا تب پتہ چلا جب منشی نے تیرا دماغ پوری طرح ٹھیک کر دیا۔ ابھی تو وہ اور چابی کسے گا۔“ اس کا لہجہ اور درشت ہو گیا۔ ”تیرے ایسے ٹیڑھے پتھیرے روز ہی ادھر آتے ہیں۔ پر جیسے ہی چابی کسی گئی ایک دم ٹھیک ہو کر رستے پر آ جاتے ہیں۔“

لالی بدستور نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ اس نے خاموش رہنے ہی میں عافیت سمجھی۔ وہ چاہتا تھا ڈوگر اپنی برہمی کا پوری طرح اظہار کر لے۔ اور جب اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے تو حرف مطلب زبان پر لائے۔ حنیف ڈوگر نے جھنجلا کر اسے برا بھلا کہا۔ گندی گندی مغلظات بھی سنائیں۔ مگر لالی مطلق مشتعل نہ ہوا۔ اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ چپ چاپ کھڑا رہا۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ اندھیرا اور بڑھ گیا۔ پھر ڈوگر کی آواز ابھری۔ ”شاداں کیسی ہے؟“

اس دفعہ اس کا لہجہ درشت نہ تھا۔

”وہ تو جی سخت بیمار ہے۔“ لالی نے آہستہ سے کہا۔

”فکر نہ کر، دو چار روز میں چنگی ہو جائے گی۔“

”جمعدار، تجھے پتہ نہیں وہ بہت بیمار ہے۔“ لالی نے تشویش کا اظہار کیا۔ ”ٹھیک سے بول بھی نہیں سکتی۔ ہائے ہائے کرتی رہتی ہے۔“

”دوا دارو کے لیے کل کسی کرندے کے ساتھ اسے خیراتی شفا خانے بھجوا دوں گا۔“ حنیف ڈوگر نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ”تو فکر نہ کر۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔“ یکایک اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا اس سے سخت گرمی میں کام نہ کرا۔ تب تو تو اونچا اڑ رہا تھا۔ وڈی وڈی گلاں کرتا تھا۔ کرندہ لگ جاتا تو عیش کرتا۔ اب تو کرندہ بھی نہیں لگ سکتا۔ میاں صاحب نے ایک بندے کو لگا دیا ہے۔“

”ہاں جی غلطی ہو گئی۔“ لالی نے اطمینان کی سانس لی۔ نہ وہ پہلے کارندہ بننا چاہتا تھا اور نہ اب ایسا کوئی ارادہ تھا۔ لالی نے دبی زبان سے اظہار مدعا کیا۔ ”وہ تو جی علاج کے لیے اپنے ماماں کے پاس جانا چاہتی ہے۔“

”وہ کسی پنڈ میں رہتا ہو گا۔ ادھر پنڈ میں کس سے علاج کرائے گی؟“ ڈوگر نے لالی کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ ”نہ ڈاکٹر نہ حکیم، علاج کون کرے گا؟“

”نہیں جی، وہ گوجرانوالہ شہر میں رہتا ہے۔“ لالی نے فوراً بات بنائی۔ ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ ”وہ ایک ڈاکٹر کا کمپوڈر لگا ہوا ہے۔ ادھر شاداں کا علاج بہت ٹھیک ٹھاک ہو سکتا ہے۔“

”تو اسی لیے میرے پاس آیا ہے۔“ ڈوگر نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

”ہاں جی۔ آیا تو اسی لیے تھا۔“ لالی انکار نہ کر سکا۔

”اس کے لیے تو میاں صاحب سے اجازت لینی ہو گی۔“ ڈوگر نے ٹالنا چاہا۔

”تو چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔“ لالی نے خوشامد اور چاپلوسی سے کام لیا۔ ”سچ پوچھ تو بھٹہ تو ہی چلاتا ہے۔ تیرے بنا تو ادھر ایک روز کام نہیں چل سکتا۔ سارا ہی کام تو کرتا ہے۔ یہ تو سب ہی کو پتہ ہے۔“

”پر میاں صاحب کو تو پتہ نہیں میں کتنا کام کرتا ہوں۔“ اس نے دبی زبان سے شکوہ کیا۔ ”سارے ہی بھٹوں کے جمعداروں کو پتھیرے بھرتی کرنے کا نہ صرف کمیشن ملتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو مالک خوش ہو کر بخشش اور انعام بھی دیتے ہیں۔“

"تجھے بھرتی کرنے پر کمیشن دمیشن نہیں ملتا؟" لالی نے اس کی خوش نودی حاصل کرنے کی غرض سے لہجے میں استعجاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"توبہ کرو جی۔ کیسا کمیشن کہاں کا انعام۔ اوپر سے ڈانٹ ڈپٹ بھی سننی پڑتی ہے۔"

"جمعدار یہ تو ٹھیک گل نہیں ہوئی۔" لالی نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ "تیرے ساتھ تو بہت بے انصافی ہو رہی ہے۔ تیرا ایسا کام کا بندہ تو میاں صاحب کو ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔"

"جب یہ بھٹہ چھوڑ دوں گا تب اسے پتہ چلے گا۔" ڈوگر نے تلخی سے کہا۔ مگر فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "پر یہ گل تو کسی سے نہ بتانا۔" اس نے دھمکی دی۔ "تجھے پتہ نہیں بدلہ لینے پر آؤں تو میں کیا نہیں کر سکتا۔ ڈھونڈے سے لاش بھی نہیں ملے گی۔"

"مجھے پتہ ہے تو کتنا زور آور ہے۔" اس نے ڈوگر کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ "تو مجھ پر بھروسہ رکھ۔ ایسی گل تو میں شاداں کو بھی نہیں بتاؤں گا۔ تو بالکل فکر نہ کر۔"

ڈوگر مطمئن ہو کر بولا۔ "تو شاداں کو کب اس کے ماماں کے گھر بھیجنا چاہتا ہے؟"

"جب تو کہے گا تب بھیج دوں گا۔" لالی نے خوش ہو کر کہا۔ "ویسے میں اسے جلدی بھیجنا چاہتا ہوں۔ اس کی طبیعت زیادہ ہی گڑبڑ ہے۔"

"کل صبح جب میاں اسلم ادھر دفتر میں آئے گا تو میں شاداں کے بارے میں اسے بتا دوں گا۔" حنیف ڈوگر نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "اس کو بتانا بہت ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ بعد میں بہت گرم ہوتا ہے۔ ننگی ننگی گالاں نکالتا ہے۔ تب ہی تو میں کوشش کرتا ہوں کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔"

"ایسی گل بات ہے تو اس سے ضرور مشورہ کر لینا۔" لالی نے ٹوہ لگانے کی غرض سے دریافت کیا۔ "اگر تو اجازت دے تو میں شاداںِ کو چھوڑنے گوجرانوالہ چلا جاؤں۔ تجھے تو پتہ ہی ہے وہ کتنی سخت بیمار ہے۔" لالی نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "اسے ماں کے پاس چھوڑ کر فوراً واپس آجاؤں گا۔"

"تو کیسے جا سکتا ہے؟" ڈوگر ایک دم بھڑک اٹھا۔ "جب تک شاداں واپس نہیں آجائے گی تو بھٹے سے باہر نہیں جا سکتا۔ تو اتنے دنوں سے بھٹے پر کام کر رہا ہے، تجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ پیشگی ادا کرنے کے لیے کسی نہ کسی کو ضرور ضمانت کے طور پر رکھا جاتا ہے۔ ویسے تو عام طور پر کسی کو چھٹی دی ہی نہیں جاتی۔"

لالی کو اندازہ تھا کہ وہ یہی کہے گا۔ وہ خاموش رہا۔ ڈوگر بولتا رہا۔ "چھٹی تو ان کو دی جاتی ہے جن کا پورا ٹبر ادھر ہوتا ہے۔ بال بچے ہوتے ہیں۔ تو شاداں کے جانے کے بعد اکیلا رہ جائے گا۔ تیرا ادھر سے فرار ہونا کوئی مشکل نہیں۔"

"ایسی گل نہ کر۔" لالی نے اسے ٹوکا۔ "میں نے پیشگی کے تین سو روپے کے لیے فرار ہی ہونا ہوتا تو اب تک چوری ڈکیتی کرتا ہوتا۔ ادھر بھٹے پر لو دھوپ میں اینٹیں بنانے کا دھندا نہ کرتا۔"

لالی کی بات حنیف ڈوگر کے دل کو لگی۔ اس کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ وہ شاداں کو چھٹی دینے پر پوری طرح رضامند ہو گیا۔

لالی جھونپڑی میں واپس گیا۔ شاداں کو خوش خبری سنائی تو اس کے چہرے پر تازگی آگئی۔

صبح کو لالی اکیلا ہی کام پر گیا۔ شاداں جھونپڑی میں رہی۔ چادر سے منہ لپیٹے اس طرح بے حال پڑی رہی گویا سخت علیل ہو۔

دوپہر کو میاں اسلم معمول کے مطابق بھٹے سے چلا گیا تو ڈوگر نے لالی کو اپنے پاس بلایا۔ ہنس کر بولا۔ "تو چاہے تو شاداں کو آج ہی گوجرانولہ بھیج دے۔ ورنہ کل سویرے بھیج دینا۔" دفعتہ اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ "تجھے یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ میاں صاحب نے میری ضمانت پر شاداں کو بھٹہ چھوڑنے کی اجازت دی ہے۔ اگر شاداں کے جانے کے بعد یہاں سے بھاگ گیا تو تیری پیشگی میری جمعداری سے کاٹ لی جائے گی۔"

"جمعدار تیری بہت بہت مہربانی۔" لالی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ خوشامد بھی کی۔ "تو بہت نیک بندہ ہے۔ مجھے اب پتہ چلا تو دل کا کتنا بھلا ہے۔" اس نے سینے پر ہاتھ مار کر جوش و خروش کا اظہار کیا۔ "تو بالکل اطمینان رکھ میں تجھ سے ہرگز دھوکا نہیں کروں گا۔"

حنیف ڈوگر خاموش بیٹھا اپنی مونچھیں مروڑتا رہا۔

لالی اٹھ کر سیدھا اپنی جھونپڑی میں گیا۔ شاداں کو مطلع کیا۔ وہ سہ پہر کو جانا چاہتی تھی۔ مگر لالی نے اسے روک لیا۔

رات کو دونوں دیر تک جاگتے رہے۔ مدھم لہجے میں باتیں کرتے رہے۔ آئندہ کے بارے میں منصوبے بناتے رہے۔

شاداں بہت تڑکے بیدار ہو گئی۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ روٹی پکائی۔ لالی کو جھنجوڑ کر جگایا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دیکھا، شاداں سفر کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ مشرقی افق پر روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اجالا دھیرے دھیرے پھیلتا جا رہا تھا۔ بھٹے پر چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔

شاداں نے روانگی سے پہلے رازداری میں کہا۔ "دیکھ لالی تو جلدی پہنچنے کی کوشش کرنا۔ میں تیرا

انتظار کروں گی۔ تو نے دیری کی تو میں پریشان ہو جاؤں گی۔"

"تو اطمینان رکھ' میں جلدی تیرے پاس پہنچنے کی کوشش کروں گا۔" لالی نے مسکرا کر شاداں کو دیکھا۔ "تو سیدھی اپنے ماماں کے پاس جائے گی نا؟"

"اسی کے پاس جاؤں گی۔ اور میں نے کہاں جانا ہے؟"

"میں نے سوچا تو ماماں کا کہہ کر کہیں چوہدری کے پاس نہ چلی جائے۔" لالی نے اسے چھیڑا۔ "تو اسے بہت یاد کرتی ہے۔ بار بار اس کا ذکر کرتی ہے۔"

"تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔" شاداں تنک کر بولی۔ "میں نے چوہدری سے کیا لینا۔ وہ میرا کون لگتا ہے۔" اس نے لالی کے چہرے کی جانب دیکھا۔ "ویسے میں یہ ضرور کہوں گی۔ وڈا زمین دار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بھلا بندہ بھی ہے۔"

"مجھے کیا پتہ وہ کیسا بندہ ہے۔" لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "میں تو اسے بالکل نہیں جانتا۔ میری تو اس سے کبھی گل بات بھی نہیں ہوئی۔"

"میں تو اسے کئی بار مل چکی ہوں۔ گل بات بھی کر چکی ہوں۔" اس نے ایک بار پھر اپنا مدعا بیان کیا۔ "اگر وہ ہم دونوں کو اپنے پاس لگا لے تو آرام نال رہیں گے۔" اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "تو کہہ تو میں اس بارے میں بات کرنے اس کے پاس کوٹلہ ہرکشن چلی جاؤں؟"

لالی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کھویا کھویا سا نظر آ رہا تھا۔

شاداں نے ٹوکا۔ "لالی' تو کس سوچ میں پڑ گیا؟"

"نہ جانے مجھے کیوں ایسا لگتا ہے چوہدری کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟ کب دیکھا ہے؟ کچھ پتہ نہیں۔" لالی نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔

"تو پہلے بھی کئی بار یہ بات کہہ چکا ہے۔" شاداں نے مسکرا کر کہا۔ "تجھے ایسے ہی شک ہو گیا ہے۔ تو چوہدری سے پہلے ملا ہوتا تو وہ تجھے ضرور پہچان لیتا۔ پر مجھے پتہ ہے وہ تو تجھے بالکل نہیں جانتا۔"

"ایسا ہی ہو گا۔" لالی نے بات خواہ مخواہ بڑھانے کی کوشش نہ کی۔

شاداں نے اصرار کیا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"کون سی بات؟" لالی نے شاداں کے چہرے کی جانب حیرت زدہ نظروں سے دیکھا۔

"حد کر دی تو نے۔" شاداں نے ہاتھ جھٹک کر اپنی بات دہرائی۔ "تو کہہ تو میں چوہدری کے پاس کوٹلہ ہرکشن چلی جاؤں۔" وہ اسے خوش کرنے کے لیے مسکرانے لگی۔ "میں چاہتی ہوں جب تو میرے پاس پہنچے تو میں تیرے لیے کام دھندے کا بندوبست کر رکھوں۔ میں نے غلط تو نہیں سوچا ہے؟"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ پر جب تک میں پہنچ نہ جاؤں تو اپنے ماماں ہی کے پاس رہنا۔" لالی نے تاکید کی۔ "کسی کے پاس نہ جانا۔ پتہ نہیں میں کب اور کس روز تیرے پاس پہنچوں۔"

"ایسا ہی کروں گی۔" شاداں نے یقین دلایا۔ ساتھ ہی اپنے خدشات کا بھی اظہار کیا۔ "دیکھ بہت ہشیاری سے کام لینا۔ ایسا نہ ہو کسی چکر میں پھنس جائے۔ مجھے پتہ بھی نہ چلے گا۔ اب تو میں ادھر آ بھی نہ سکوں گی۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "ویسے ادھر رہ کر بھی کسی کو کسی کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ میں نے کبھی سوچا نہ تھا یہ اتنی خراب اور گندی جگہ ہو گی۔"

"اب تو تجھے یہاں سے آزادی مل گئی۔" لالی نے آہستہ سے کہا۔ اس کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔ "پتہ نہیں میں یہاں سے کب نکل سکوں گا۔"

شاداں بھی افسردہ ہو گئی۔ دونوں کچھ دیر خاموش رہے' پھر شاداں نے اپنی گٹھری اٹھائی اور چلنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ آگے بڑھی۔ لالی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں خاموش تھے۔ اداس اور دل گرفتہ تھے۔

وہ لالی سے رخصت ہوئی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی بھٹے کی حدود سے باہر چلی گئی۔ مڑ مڑ کر لالی کو دور تک دیکھتی رہی۔ پھر ایک موڑ پر شاداں نظروں سے اوجھل گئی۔ لالی دیر تک گم صم کھڑا رہا۔

دھوپ اب ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ اس کی چمک اور تمازت بھی بڑھ گئی تھی۔

۳۷

لالی اب زیادہ سے زیادہ محنت کرتا۔ سویرے ہی سویرے کام پر چلا جاتا۔ مٹی کھود کر گارا تیار کرتا۔ سانچوں میں گارا بھر کر اینٹیں بناتا۔ تھلے پر کچی اینٹوں کی قطاریں بنتی جاتیں۔ دوسرے پتھیروں کے مقابلے میں وہ کچھ زیادہ ہی دیر تک کام میں جٹا رہتا۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد منہ ہاتھ دھوتا۔ چولہے میں آگ سلگاتا اور روٹی پکانے بیٹھ جاتا۔ کھانا کھاتا اور دن بھر کی سخت محنت مشقت سے ایسا نڈھال اور تھکا ہارا ہوتا کہ بستر پر لیٹتے ہی آنکھ لگ جاتی۔

سورج طلوع ہوتا' غروب ہوتا۔ وقت' دن رات میں بدلتا رہتا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ لالی کی بے چینی بڑھتی گئی۔ شاداں کے جانے کے بعد ہی اس نے فرار ہونے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ وہ موقعے کی تاک میں تھا۔ گھوم پھر کر بھٹے کے محل وقوع کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔

دن میں فرار ہونا ممکن نہ تھا۔ باہر آنے جانے پر سخت روک ٹوک تھی۔ خاص طور پر ان پتھیروں اور بھٹہ مزدوروں کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی کی جاتی جن کی پیشگی واجب الادا تھی۔ بھٹے پر کام کرنے والوں کی بھاری اکثریت ایسے ہی قرض داروں پر مشتمل تھی۔ رات کا وقت فرار ہونے کے لیے مناسب اور سازگار تھا۔ نہ کسی قسم کی چہل پہل ہوتی نہ گہما گہمی۔ پہر رات گزرتے ہی بھٹے پر سناٹا طاری ہو جاتا۔ رات جس قدر آگے بڑھتی سناٹا بھی اسی قدر بڑھتا۔

سنسان اور اندھیری راتوں کو لالی اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ فرار ہونے کا منصوبہ بناتا۔ گرد و پیش کا جائزہ لیتا۔ اس کے کان ہر آہٹ اور ہر آواز پر لگے ہوتے۔ نظریں ادھر ادھر گردش کرتیں۔ طرح طرح

ے اندیشوں اور وسوسوں کے ساتھ ساتھ فرار ہونے کی امنگ اور ترنگ بھی ہوتی۔ وہ مناسب وقعے کی تلاش میں برابر لگا رہا۔

چاند کی ابتدائی تاریخوں کا ذکر ہے۔ ایک رات لالی نے فرار ہونے کا تہیہ کیا۔ چاند مغربی افق پر لوع ہوا اور چند گھنٹے بعد غروب ہو گیا۔ آسمان بھی دھندلا اور غبار آلود تھا۔ چاند کے غروب ہوتے ی اندھیرا چھا گیا۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ لالی سویا نہیں جاگتا رہا۔ بے چینی سے روٹیں بدلتا رہا۔ بار بار گردن اٹھا کر چوکنا نظروں سے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھتا۔ بھٹے کی گرانی کرنے والے پہریدار گشت پر تھے۔ ان کے قدموں کی آہٹ رات کے سناٹے میں رک رک ر ابھر رہی تھی۔

لالی جاگتا رہا اور پہریداروں کے قدموں کی آہٹ سنتا رہا۔ چاپ کبھی قریب آجاتی کبھی دور ہو اتی۔ مگر وہ جھونپڑیوں اور جھگیوں کے آس پاس ہی منڈلا رہے تھے۔ رات آدھی ہو گئی۔ رات ھلنے لگی۔ پہریداروں کے قدموں کی آہٹ بھی مدھم پڑ گئی۔ وہ بھی اب تھکن اور نیند کے غلبے ے نڈھال ہو رہے تھے۔ وہ وقفے وقفے سے سخت اور بنجر زمین پر اپنی لاٹھیاں بجاتے اور اس طرح لکارتے اور بولتے کہ ان کی آواز میں غنودگی کا عنصر شامل ہوتا۔

پہریداروں کی آوازیں جب دور ہو گئیں اور مدھم ہوتے ہوتے سناٹے میں تحلیل ہو کر ختم ہو ئیں تو لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جھونپڑیوں کے آگے کھلے میدان میں مرد' عورتیں اور بچے ارپائیوں اور فرش پر بے خبر سو رہے تھے۔ لالی نے نظریں گھما پھرا کر ادھر ادھر دیکھا اور گہری نیند ونے والوں کے درمیان سے گزرتا ہوا دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔

وہ جھونپڑیوں سے دور نکل گیا۔ پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ سونے والے ہنوز بے خبر سو رہے تھے۔ ھونپڑیاں اور جھگیاں سایوں کی مانند دھندلی نظر آرہی تھیں۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر طرف ہو کا الم تھا۔ لالی آگے بڑھتا گیا۔ ناگاہ اس نے قدموں کی آہٹ سنی۔ کوئی اسی کی طرف آرہا تھا۔ لالی نے سراسیمہ ہو کر آواز کی جانب پلٹ کر نظر دوڑائی۔ ایک سایہ اندھیرے میں اس کی آنکھوں کے امنے لہرایا۔ وہ جھٹ اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا۔ نگاہیں گھما پھرا کر آس پاس دیکھا۔ تھوڑے ا فاصلے پر اینٹوں کا چٹا تھا۔ لالی آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا اس طرف بڑھا۔ قریب پہنچا اور چٹے کی وٹ میں دبک کر بیٹھ گیا۔

قدموں کی آہٹ رفتہ رفتہ نزدیک آتی گئی۔ لالی چٹے کی اوٹ میں دبکا ہوا بیٹھا رہا۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ لالی دم سادھے چپ بیٹھا رہا۔ انتظار کرتا رہا کہ آنے

والا گزر جائے اور دور چلا جائے تو وہ اٹھ کر آگے بڑھے اور بھٹے کی حدود سے باہر نکل جائے۔ آگے ویرانہ تھا۔ کیکر اور جنگلی بیریوں کی جگہ جگہ جھاڑیاں تھیں۔ ان کی آڑ میں چھپتا چھپاتا وہ آگے نکل جاتا۔ فرار ہو کر شاداں کے پاس پہنچ جاتا جو اپنے ماموں کے گھر میں اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔

مگر چاپ عین اس کے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔ لالی سنبھلا بھی نہ تھا کہ کسی نے لاٹھی سے ٹھوکا دیا۔ لاٹھی پر لوہے کی ٹھوس شام چڑھی تھی۔ لاٹھی کمر سے جھجھلتی ہوئی گزری اور گھٹنے پر اس زور سے ٹکرائی کہ لالی تڑپ اٹھا۔ ساتھ ہی آواز ابھری۔

"اوئے، کون ہے تو؟"

لالی نے مڑ کر دیکھا۔ تاریکی میں ایک پہریدار اس کے سر پر بھوت کی مانند کھڑا تھا۔

لالی نے گھٹنا سہلاتے ہوئے جھٹ بات بنائی۔ "پیٹ میں جی سخت مروڑ تھی۔ ادھر ٹٹی کرنے آگیا تھا۔"

لیکن پہریدار نے اس کا عذر قابل اعتنا نہ سمجھا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "اتنی دور کیوں آیا؟ ادھر جگیوں کے نزدیک ہی کیوں نہیں بیٹھ گیا؟" اس نے غصے سے لالی کو دیکھا جو سہما ہوا بیٹھا تھا۔ "تجھے پتہ نہیں ادھر ٹٹی کرنے کی اجازت نہیں۔ اینٹیں گندی اور خراب ہو جاتی ہیں۔"

لالی نے گڑگڑا کر معذرت کی۔ "غلطی ہو گئی جی۔"

"کھڑا ہو۔" پہریدار نے لالی کی گردن اپنے مضبوط ہاتھ سے دبوچی اور ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا۔

لالی کو غصہ تو بہت آیا مگر اس نے مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ الجھنے اور مزید تاویل پیش کرنے کی کوشش نہ کی۔ لنگڑاتا ہوا آہستہ آہستہ اپنی جھونپڑی کی جانب چلا۔ پہریدار سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ جھونپڑی کے قریب پہنچ کر اس نے ایک بار پھر لالی کو ڈانٹا، تنبیہہ کی اور زمین پر اپنی لاٹھی بجاتا اور زور زور سے کھنکارتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

لالی خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ آس پاس سونے والوں میں سے کئی کی نیند پہریدار کی ڈانٹ ڈپٹ سے اچاٹ ہو گئی۔ کسی نے کروٹ بدلی کسی نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ مگر نہ کوئی بولا نہ پرسش احوال کی۔ لالی بھی چپ پڑا رہا۔ لاٹھی سے گھٹنے میں ایسی کراری چوٹ آئی تھی کہ درد کی کسک سے دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ کسی پہلو قرار نہ تھا۔ بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ بہت دیر بعد اسے نیند آئی۔ صبح کام پر بھی دیر سے گیا۔ گھٹنے کی تکلیف کے باعث ٹھیک سے کام بھی نہ کر سکا۔

گھٹنے پر چوٹ سے ورم آگیا تھا۔ وہ دو تین روز تک درد میں جتلا رہا۔ چلنے پھرنے اور کام کرنے میں تکلیف ہوتی۔ مگر اس واقعے کے بعد وہ بہت محتاط ہو گیا۔ یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ بھٹے سے فرار ہونا وہ جس قدر آسان سمجھتا تھا ایسا نہ تھا۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ اپنے ارادے پر مضبوطی سے جما رہا۔ اس نے زیادہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے اور اپنے منصوبے کو زیادہ سے زیادہ ہوشیاری سے عملی جامہ پہنانے کا ایک بار پھر تہیہ کیا۔ وہ فرار ہونے کے لیے دن رات سوچتا رہا۔ اور مناسب موقعے کی تلاش میں لگا رہا۔

☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ یکایک تیز ہوا کے جھکڑوں کے ساتھ بادل گھر کر آئے۔ بارش کا چھینٹا بھی ڑا۔ تھلوں پر رکھی ہوئی اینٹیں دھوپ میں خشک ہونے کے لیے دور دور تک قطاروں میں پھیلی ھیں۔ بارش بیس منٹ بھی نہ ہوئی مگر خاصی تیز تھی۔ کچی اینٹیں بڑی تعداد میں موٹے موٹے قطروں سے بھیگ کر جگہ جگہ سے چخ گئیں۔ ایسی اینٹیں ناکارہ قرار دے کر مسترد کر دی جاتی ہیں۔ پتھیروں کو ان کی کوئی اجرت نہیں دی جاتی۔

بارش ختم ہو گئی۔ مگر بھٹے پر کام نہ ہو سکا۔ گارا بارش کے پانی سے تر بتر ہو کر اس قابل نہ رہا تھا کہ اسے سانچوں میں بھر کر اینٹیں تیار کی جا سکیں۔ زمین بھی نم تھی اور بھیگی ہوئی اینٹیں، جو ٹوٹنے ھوٹنے سے بچ گئی تھیں، اس قابل نہ رہی تھیں کہ کمہار ان کو اٹھاتے اور ریڑھوں میں بھر کر پکنے کے لیے بھٹے کے اندر پہنچاتے۔

مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ہوا بھیگی بھیگی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ام ہونے سے پہلے ہی شام کا سماں تھا۔ فضا نہایت سہانی اور خوش گوار تھی۔ مگر پتھیرے سوگوار ھے۔ ان کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں دکھ کے سائے منڈلاتے تھے۔ ان کی ایک وز کی دہاڑی ماری گئی تھی۔ ان کی اجڑی اور بکھری ہوئی زندگی میں یہ ایک دل خراش سانحہ تھا۔

شام دھیرے دھیرے بھٹے کے در و دیوار پر پھیلتی جا رہی تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنی ونپڑیوں کے سامنے نڈھال اور گم صم بیٹھے تھے۔ کہیں کہیں چولہوں میں آگ روشن تھی۔ فضا ن پکی ہوئی روٹیوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ مگر نہ روز مرہ کی چہل پہل تھی نہ ملی جلی آوازوں کا ر تھا۔ ہر طرف بے کیف خاموشی چھائی تھی۔

اس خاموشی سے اکتا کر بہاول پور کے ایک ریاستی پتھیرے نے کان پر ہاتھ رکھ کر تان لگائی ر ایک ماہیا الاپنے لگا۔

بدلی آگئی ہے ساونڑ دی
کوئی تدبیر ڈسا
رٹھے یار مناونڑ دی
ہٹیاں تے کھنڈ وکدی
ہک تال غریبی ہے
دوجھا سنجڑاں کنڈ کھتی
باغاں وچ گھا کوئی ناں
جیڑھے پاسے ماہی ٹریا
• اوں پاسے دا راہ کوئی ناں

اس کی آواز میں سوز تھا۔ درد کی کسک تھی۔ سانولی سلونی شام اجڑ کر راکھ ہو گئی۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادل دھواں دھواں ہو گئے۔ فضا بوجھل اور نڈھال ہو گئی۔ سرسراتی ہوئی ہوا میں ماہیے کے بولوں کی بازگشت تھی۔ لالی بھی اپنی جھونپڑی کے سامنے خاموش بیٹھا تھا۔ ماہیا سن کر تڑپ اٹھا' جس کے بولوں کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

ساون کی بدلی گھر کر آگئی۔ کوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ روٹھے ہوئے یار کو منا سکوں! دکانوں پر شکر اور شیرینی بک رہی ہے۔ ادھر غربت ہے۔ یار نے بھی مجھ سے منہ موڑ لیا ہے باغوں میں کہیں سبزہ نہیں ہے۔ جدھر میرا محبوب گیا ہے' اس طرف جانے کا کوئی راستہ نہیں۔

لالی کو شاداں یاد آگئی۔ اس کے پاس جانے اور اسے دیکھنے کے لیے وہ بے قرار ہو گیا۔ اس نے نئے عزم اور تازہ ولولے کے ساتھ فرار ہونے کا تہیہ کیا۔ موسم بھی فرار ہونے کے لیے سازگار تھا۔ اندھیرا دم بہ دم بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے روٹی پکائی۔ کھانا کھایا۔ اور رات کے سنسان ہونے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

لیکن پہر رات بھی نہ گزری تھی کہ میاں اسلم اپنے چند دوستوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ سیدھا بھٹے کے دفتر گیا۔ اسے کھلوایا۔ نوکروں نے جھپاک جھپاک کرسیاں نکال کر دفتر کے سامنے رکھیں۔ ایک میز بھی رکھی۔ میاں اسلم اپنے یار دوستوں کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھ گیا۔ اس کا اشارہ ملتے ہی میراں بھٹی میں گیا۔ دیسی شراب کی بوتل لایا اور میاں اسلم کے سامنے میز پر رکھ دی۔ گلاس بھی رکھ دیئے اور پانی سے بھرا ہوا جگ بھی میز پر رکھ دیا۔ پینے پلانے کا دور شروع ہو گیا۔

میاں اسلم لگ بھگ مہینہ بھر بعد رات کے وقت بھٹے پر آیا تھا۔ اس کی آمد کے خبر آن کی آن

میں ہر طرف پھیل گئی۔ لالی کو اطلاع ملی تو اس نے فرار ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اب ایسی کوشش میں ناکامی کے امکانات زیادہ تھے۔ طرح طرح کے خطرات تھے۔ اور سب سے بڑا خطرہ میاں اسلم کا بھٹے پر موجود ہونا تھا۔ جب تک وہ موجود تھا' ہر کارندہ اور ہر نوکر مستعد اور چوکس تھا۔ لالی بستر پر خاموش لیٹا تھا۔ دفتر کی سمت سے قہقہوں اور بے تکلفی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے کی ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ان آوازوں میں بھٹے کے مالک میاں اسلم کی آواز بھی شامل تھی۔ لالی ان آوازوں کو سنتا رہا۔ پھر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ سو گیا۔

☆

رات کے سناٹے میں دبا دبا شور بلند ہوا۔ لالی کی آنکھ کھل گئی۔ شور مغربی کونے کی جھونپڑیوں میں ہو رہا تھا۔ البتہ دفتر کی جانب خاموشی چھائی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پینے پلانے کی محفل ختم ہو چکی ہے۔ رات ابھی آدھی نہیں گزری تھی۔ مگر ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ لالی اٹھا اور تاریکی میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا اس طرف روانہ ہوا جدھر شور اٹھ رہا تھا۔

قریب جا کر اس نے دیکھا' ایک بوسیدہ جھونپڑی کی دہلیز پر ایک عورت سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اور بلک بلک کر رو رہی تھی۔ جھونپڑی کے اندر چراغ روشن تھا۔ اس کی پھیکی پھیکی روشنی میں عورت کا چہرہ مٹیالا نظر آ رہا تھا۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔ دو ننگ دھڑنگ نو عمر بچے بھی اس کے پہلو میں حیران و پریشان بیٹھے تھے۔ لالی نے پہلی ہی نظر میں عورت کو پہچان لیا۔ وہ سلامو جتھیرے کی بیوی' جگنی تھی۔ سلامو کا نام بھی اسلم تھا۔ مگر سب اسے سلامو کہتے تھے۔

سلامو کی بیوی کی سسکیاں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ لیکن سلامو غائب تھا۔ اس کی بیوی کے آس پاس بھٹے پر کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کا ہجوم تھا۔ ہجوم زیادہ بڑا نہ تھا اور اس میں بھی اکثریت سلامو کے عزیز و اقارب کی تھی۔ لالی بھی ہجوم میں شامل ہو گیا۔ دریافت کرنے پر عقدہ کھلا کہ اندھیرے میں دو کارندے آئے اور جھونپڑی کے باہر سوتی ہوئی سلامو کی چودہ سالہ بیٹی رانو کو اٹھا کر لے گئے۔ انھوں نے جب رانو کو اٹھانے کی کوشش کی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے مزاحمت کی۔ ہاتھ پیر چلائے۔ چیخنے چلانے کی بھی کوشش کی۔ لیکن ایک کارندے نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس زور سے دبایا کہ آواز نہ نکل سکی۔

سلامو اور اس کی بیوی کی بھی آنکھ کھل گئی۔ دونوں نے پریشان ہو کر دیکھا' رانو کا بستر خالی تھا۔ کارندے اسے اٹھا کر تاریکی میں غائب ہو چکے تھے۔ اب سلامو کی بیوی اپنی رسوائی اور بے بسی پر آنسو بہا رہی تھی۔ اور سلامو اپنی بیٹی کو واپس لینے میاں اسلم کے پاس گیا تھا جو ابھی تک دفتر کے

برابر والے کمرے میں موجود تھا۔

ہجوم میں شامل عورتوں اور مردوں کے چہروں پر جھنجلاہٹ تھی۔ آنکھوں میں نفرت کے شرارے تھے۔ وہ دبی زبان سے اپنے اپنے طور پر غم وغصے کا اظہار کر رہے تھے۔ جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔ کوئی احتجاج کر رہا تھا۔ کوئی رانو کی ماں سے اظہار ہمدردی کر رہا تھا' تسلی دے رہا تھا' دلجوئی کر رہا تھا۔ اور وہ رو رو کر ستا رہی تھی۔

"میں نے اور سلامو نے تو یہ سوچا تھا جی کہ اب کے برکھا میں پنڈ جا کر رانو کا ویاہ کر دیں گے۔ نکاح تو تب ہی کر دیا تھا جب وہ نو سال کی تھی۔ اب تو وداع کرنا تھا۔ اسے سوہرے بھیجنا تھا۔" وہ بے قرار ہو کر سینے پر دو ہتھڑ مارتی۔ "ہائے ربا' میں تو برباد ہو گئی۔"

وہ روتی رہی' بلکتی رہی' فریاد کرتی رہی۔ اپنا دکھ درد سناتی رہی۔ اندھیری رات دم بخود کھڑی تھی۔ آسمان پر ابھی تک بادل چھائے تھے۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی' سرسراہٹ تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ لالی خاموش کھڑا تھا۔ نہ اس نے کوئی تبصرہ کیا نہ کسی رد عمل کا اظہار کیا۔

کچھ دیر بعد قدموں کی آہٹ ابھری۔ سلامو اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا۔ قریب آیا تو دھندلی دھندلی روشنی میں سب نے دیکھا۔ وہ اکیلا تھا۔ رانو اس کے ساتھ نہیں تھی۔ اس کے بکھرے ہوئے بال گرد سے آلودہ تھے۔ قمیص پھٹ کر لیر لیر ہو گئی تھی۔ برہنہ پیٹھ اور کمر پر چھتر کی مار کے نشان صاف نظر آ رہے تھے جن سے خون رس رہا تھا۔ ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی۔ کنپٹی اور رخساروں پر خراشیں تھیں۔

بیوی نے اسے تنہا دیکھا تو اور زور زور سے رونے لگی۔ تڑپ کر بولی۔ "تو اکیلا آگیا۔ میری رانو کو نہیں لایا۔ ہائے' اب میں اس کے گھر والے کو کیا بتاؤں گی۔ اسے کیسے منہ دکھاؤں گی۔" وہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ گلے شکوے کر رہی تھی۔ "سلامو' تو رانو کو کیوں نہیں لایا؟ تیری غیرت کو کیا ہو گیا۔؟ بول' اب بولتا کیوں نہیں؟"

سلامو کچھ نہ بولا۔ یکایک اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر تناؤ پیدا ہو گیا۔ ہانپنے کے سے انداز میں زور زور سے سانس لینے لگا۔ اس نے خونخوار نظروں سے اپنی بیوی' جگنی' کو دیکھا۔ تیزی سے جھپٹا اور اس کی کمر پر اس زور سے لات ماری کہ وہ دوہری ہو گئی۔ سلامو نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بال پکڑے' اپنی طرف کھینچا' اور پاگلوں کی طرح مارنے لگا۔ کئی مرد ہجوم سے نکل کر جھٹ اس کے قریب پہنچے اور پکڑ کر علیحدہ کیا۔ مگر وہ بار بار ان کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتا۔ بیوی کو ننگی ننگی گالیاں دیتا' بپھرتا اور مارنے کے لیے جھپٹتا۔

شور سن کر ہر طرف سے مرد اور عورتیں گھبرا کر وہاں پہنچ گئے۔ ہجوم اب بڑھ گیا تھا۔ سب سلامو کو دیکھ رہے تھے۔ فرش پر بے سدھ پڑی ہوئی جگنی کو دیکھ رہے تھے۔ بول رہے تھے' باتیں کر رہے تھے' بڑبڑا رہے تھے۔ کوئی سلامو کو لعن طعن کر رہا تھا۔ کوئی سمجھا بجھا کر اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی اس کی بیوی سے اظہار ہمدردی کر رہا تھا۔

اسی اثنا میں حنیف ڈوگر کئی کارندوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ قریب پہنچ کر اس نے سلامو کو غصے سے ڈانٹا۔ "اوئے حرام دے' تو نے فیر رولا کیا۔ ابھی تیرا دماغ ٹھیک نہیں ہوا۔ کچھ اور گرمی اتروانی ہے؟"

ڈوگر کو دیکھتے ہی سب دم بخود ہو گئے۔ ہجوم بکھرنے لگا۔ سب دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگے۔ حنیف ڈوگر نے ان کو بھی قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ گندی سی گالی دے کر زور سے دھاڑا۔ "یہاں تماشا دیکھنے آئے ہو؟ جاؤ' جا کر سو جاؤ' سویرے کام نہیں کرنا۔" کسی نے کچھ نہ کہا۔ اور سب منتشر ہو کر اس کی نظروں سے بچتے بچاتے اپنی اپنی جھونپڑیوں کی جانب کھسکنے لگے۔ لالی بھی پیچھے ہٹا' مڑا اور اپنی جھونپڑی کی سمت روانہ ہو گیا۔ بعد میں سلامو اور اس کی بیوی پر کیا گزری اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔

صبح ہوئی تو لالی نے دیکھا' سلامو سانچوں میں گارا بھر بھر کر اینٹیں بنا رہا تھا۔ بیوی بھی اس کے ساتھ کام کر رہی تھی اور رانو بھی موجود تھی۔ وہ سر جھکائے اینٹیں تیار کرنے میں مصروف تھی۔ بادل اب چھٹ چکے تھے۔ گہرے نیلے آسمان پر ابر کے سفید سفید ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔ ان کے پیچھے سورج چمک رہا تھا۔ گرمی پھر بڑھ گئی تھی۔

سلامو کام کرتا جاتا۔ پیشانی پر آیا ہوا پسینا پونچھتا اور جھنجلا جھنجلا کر کبھی بیوی کو گالیاں دیتا' کبھی بیٹی کو۔ اس کی اونچی آواز بار بار سنائی دیتی۔ آس پاس کام کرنے والے پتھیرے اسے نرم لہجے میں سمجھاتے بجھاتے۔ خاموش رہنے کی تلقین کرتے۔ مگر وہ باز نہ آیا۔ برابر گالم گلوچ کرتا رہا۔ جو سمجھانے کی کوشش کرتا اس پر بھی غصے سے برستا۔ اس کے چیخنے چلانے کی آواز بھٹے کے دفتر تک پہنچ رہی تھی جہاں اسلم بیٹھا تھا۔ وہ اس روز خلاف معمول سہ پہر کو آیا تھا۔

میاں اسلم کے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد حنیف ڈوگر پتھیروں کی جانب آتا ہوا نظر آیا۔ وہ سیدھا سلامو کے پاس پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں چھتر دبا تھا جسے وہ آہستہ آہستہ ہلا رہا تھا۔ حنیف ڈوگر نے غصے سے سلامو کو ڈانٹا پھٹکارا۔ گالیاں بھی دیں۔ آنکھیں نکال کر جھپٹا اور سڑاک سڑاک چھتر مارے۔ سلامو چند لمحے خاموش کھڑا پٹتا رہا اور تیکھی نظروں سے ڈوگر کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے

جھپٹ کر ڈوگر کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ کچی اینٹوں سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ سنبھل کر پلٹا اور چھتر اٹھا کر سلامو پر جھپٹا۔ مگر سلامو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

دونوں میں زور آزمائی ہونے لگی۔ آخر ڈوگر نے جھٹکا دے کر اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔ اب وہ سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے بھر بھر کر سلامو کو چھتر سے مارنا شروع کر دیا۔ سلامو بلبلا بلبلا کر کبھی ادھر ہٹتا کبھی ادھر۔ پھر ایک ایسا مرحلہ آیا کہ وہ جھپٹا اور ڈوگر سے چمٹ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی ہر طرح کوشش کرنے لگے۔ اس کشمکش اور کھینچا تانی میں دونوں نے اپنی پیروں سے تازہ بنی ہوئی کچی اینٹوں کو روند کر مسمار کر دی۔

یہ سب اینٹیں سلامو، اس کی بیوی اور بیٹی نے بنائی تھیں۔ مگر اس کی بیوی اور بیٹی سہمی ہوئی کھڑی تھیں اور سلامو کو ڈوگر سے ہاتھا پائی اور زور آزمائی کرتے دیکھ رہی تھیں۔ پتھیروں اور دوسرے بھٹہ مزدوروں نے بھی کام چھوڑ دیا تھا اور دونوں کو لڑتے جھگڑتے دیکھ رہے تھے۔ وہ خاموش تھے اور حیران و پریشان نظر آ رہے تھے۔ نہ کسی نے سلامو کو منع کیا نہ بیچ بچاؤ کی کوشش کی۔

حنیف ڈوگر بھاری بھرکم تھا۔ اس کے جسم پر خوب گوشت چڑھا تھا۔ تگڑا اور مضبوط بھی تھا۔ اس کے مقابلے میں سلامو دبلا پتلا تھا۔ گوشت کم اور ہڈیاں زیادہ نمایاں تھیں۔ ڈوگر بار بار دھکا دے کر سلامو کو گرا دیتا۔ کبھی اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا کبھی سر کے بال پکڑ کر اٹھاتا اور گھما کر چھتر مارتا۔ مگر سلامو ہر بار اس کی گرفت سے آزاد ہو جاتا۔ پلٹتا اور پھر جھپٹتا۔ وہ برابر پٹتا رہا، مار کھاتا رہا۔ مگر باز نہ آیا۔ اب ڈوگر لمبی لمبی سانسیں بھر کر ہانپنے لگا تھا۔

سلامو نے ایک بار لچک کے اس زور سے ڈوگر کے منہ پر تھپڑ مارا کہ وہ چکرا گیا۔ سنبھلا بھی نہ تھا کہ سلامو نے اچھل کر دھکا دیا۔ ڈوگر لڑکھڑا کر گارے میں گر پڑا۔ سلامو نے جھپٹ کر اس کی گردن پکڑ لی اور گارے میں ٹھونس دی۔ مگر ڈوگر نے جلد ہی زور لگا کر اپنی گردن گارے سے باہر نکال لی۔ اس کا چہرہ گارے سے لت پت ہو کر نہایت ڈراؤنا اور ہیبت ناک نظر آ رہا تھا۔ وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا اور اونچی آواز سے سلامو کو گالیاں دے رہا تھا۔

چیخ پکار سن کر آنا" فانا" چاروں طرف سے کارندے حنیف ڈوگر کی مدد کو دوڑے۔ انھوں نے سلامو کو دبوچ کر بے بس کر دیا۔ ڈوگر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گارے سے لتھڑا ہوا اس کا چہرہ دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ وہ اس بری طرح ہانپ رہا تھا کہ سانس سینے میں نہ سماتی تھی۔ نہ اس نے سلامو کو مارنے کی کوشش کی اور نہ ہی گالیاں دیں۔ سب کی سامنے اس کی ایسی کرکری ہوئی تھی کہ وہ کسی سے نظر

ملانے کے قابل نہ رہا تھا۔ وہ چہرے سے گارا پونچھتا، کپڑے جھاڑتا، دفتر کی جانب روانہ ہوا۔ اس کی ہدایت پر کارندے سلامو کو مارتے پیٹتے اور گھسیٹتے ہوئے اسی سمت لے گئے جدھر حنیف ڈوگر گیا تھا۔

سارے پتھیرے اور بھٹہ مزدور ہکا بکا کھڑے تھے۔ نہ کسی نے کارندوں سے باز پرس کی اور نہ ہی سلامو کو چھڑانے اور آزاد کرانے کی کوشش کی۔ صرف سلامو کی بیوی اور بیٹی کے چہروں پر غم و غصہ برس رہا تھا۔ وہ سسکیاں بھر کر رو رہی تھیں اور قہر آلود نظروں سے سلامو کو کارندوں کے نرغے میں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

ڈوگر کے ساتھ ساتھ سلامو بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بھٹے پر سکوت طاری ہو گیا۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں جتے ہوئے تھے۔ کسی کو مطلق پتہ نہ چلا کہ سلامو کا کیا حشر ہوا۔ اس کی بیوی بھی ادھر نہ گئی۔ سہمی ہوئی بیٹھی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ اس کے ساتھ صرف اس کی بیٹی رو رہی تھی۔ نہ کوئی ان کو تسلی دینے آیا نہ کسی نے دل جوئی کی۔ سب خاموش اور دہشت زدہ تھے۔

☆

سورج مغرب میں اتر گیا۔ شام نیچے اترنے لگی، پھیلنے لگی۔ جھٹ پٹے میں پتھیروں اور بھٹہ مزدوروں نے دیکھا، سلامو دفتر کے عقب سے نکلا۔ کارندے اس کے بازو اور ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ وہ نہایت حقارت اور بے دردی سے سلامو کو دھکے دیتے ہوئے چمنی کی جانب بڑھے اور بھٹے کے اندر داخل ہو گئے۔

سلامو کو بھٹے کے دہکتے ہوئے توے پر کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے پیر برہنہ تھے۔ توے پر پہنچتے ہی اس کے تلوے سلگنے لگے۔ اس نے تکلیف اور جلن برداشت کرنے کی غرض سے اپنے دانت بھینچ لیے۔ تپتے توے سے وہ نیچے نہ اتر سکتا تھا۔ دو کارندے اس کی نگرانی پر مامور تھے اور نہایت چوکس کھڑے تھے۔ سلامو بار بار پیر پٹختا۔ بے بسی سے ادھر ادھر دیکھتا۔ اس کے پیر جھلتے رہے، سلگتے رہے۔ اس نے بے بسی سے گردن ہلائی۔ درد سے تلملایا، منہ پھاڑا اور بے اختیار چیخ نکل گئی۔

شام کے سناٹے میں چمنی کے اندر سے سلامو کی گھٹی گھٹی چیخیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ اس کی بیوی اور بیٹی ہر چیخ پر تڑپ اٹھتیں۔ روتیں، آنسو بہاتیں، بے قرار ہو کر چمنی کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھتیں جس کے بیچوں بیچ گرم توے پر سلامو کھڑا تھا۔ اس توے کو کوئلے اور لکڑیاں جلا کر انگارے کی طرح گرم کیا جاتا تھا اور کچی اینٹوں کو پکا کر پختہ بنایا جاتا تھا۔ اب اس توے پر کچی

ینوں کے بجائے کارندوں نے سلامو کو کھڑا کر دیا تھا۔ اس کے پیر جل رہے تھے۔ وہ تکلیف سے بے حال ہو کر چیخ رہا تھا' چلا رہا تھا' دہائی دے رہا تھا۔

موسم گرما کی سلگتی شام رفتہ رفتہ تاریک ہوتی گئی۔ بھٹے پر کام کرنے والا ہر پتھیرا ہر محنت کش سہا ہوا تھا' خوف زدہ تھا۔ سلامو کی چیخیں سن رہا تھا۔ اچانک چیخیں بند ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد سلامو بھٹے سے باہر نکلا۔ مگر چند قدم چلتے ہی لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ وہ فرش پر بے حال پڑا تھا۔ کارندوں نے اسے کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ مگر نہ وہ کھڑا ہو سکتا تھا نہ چل سکتا تھا۔

ایک مضبوط اور قوی ہیکل کارندے نے بڑھ کر اسے اٹھایا اور کندھے پر ڈال لیا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا سلامو کی جھونپڑی کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا۔ جھونپڑی کے اندر داخل ہوا اور سلامو کو بستر پر ڈال دیا۔ کارندہ چلا گیا۔ سلامو خاموش لیٹا تھا اور رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ اس کے تلوے جل کر سیاہ پڑ گئے تھے۔ کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ بیوی اور نوجوان بیٹی' رانو نے اس کا یہ حال دیکھا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ دونوں بچے بھی ماں اور بہن کو روتے دیکھ کر منہ بسورنے لگے۔ جھونپڑی میں کہرام برپا تھا۔

سب سے پہلے عزیز دار اور کنبے والے سلامو کو دیکھنے جھونپڑی کے اندر گئے۔ رفتہ رفتہ دوسرے پتھیرے اور بھٹہ مزدور بھی پہنچنے لگے۔ لالی بھی گیا۔ اس نے دیکھا' چراغ کی زرد زرد روشنی میں سلامو آنکھیں بند کئے پڑا تھا اور بے قراری سے اپنی گردن ادھر ادھر ہلا رہا تھا۔ نہ وہ بول رہا تھا نہ بات کر رہا تھا۔ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ مٹیالا پڑ گیا تھا۔

ایک پتھیرے نے سلامو کی بیوی جگنی کو مشورہ دیا۔ "پیروں پر دیوے کا گرم گرم تیل روئی ڈبو کر لگا دے۔ جلن کم پڑ جائے گی۔"

"دیوے کے تیل سے کیا بنے گا۔ یہ علاج تجھے کس نے بتایا؟" سلامو کے بوڑھے چچا نے اسے ٹوکا اور اپنا نسخہ تجویز کیا۔ "دودھ مل دے۔ آرام آجائے گا' پر دودھ ابلا ہوا نہ ہو۔ دودھ بالکل تازہ ہو تو فوراً آرام آجائے گا۔"

"بابے تو نے بھی حد کر دی۔" سلامو کے سرہانے کھڑے ہوئے ایک نوجوان کمہار نے حیرت کا اظہار کیا۔ "ادھر بھٹے پر دودھ کہاں ملے گا اور تازہ دودھ ملنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "یہاں تو نمک کی روٹی بھی پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتی۔ تو دودھ کی گل کر رہا ہے۔"

باری بھی جھونپڑی میں موجود تھا۔ وہ جنم جنم کا پتھیرا تھا۔ اس کا باپ بھی پتھیرا تھا۔ اور کم سنی ہی میں اسے اینٹیں بنانے پر اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ اب وہ ادھیڑ ہو چکا تھا۔ سر کے بال کھچڑی ہو گئے تھے۔ وہ دور اور نزدیک کے مختلف بھٹوں پر کام کر چکا تھا۔ اس کی دو نوجوان بیٹیاں ابھی تک میاں اسلم اور حنیف ڈوگر کے قبضے میں تھیں۔ ایک جوان بیٹا تھا۔ وہ کسی اور بھٹے پر کام کر رہا تھا۔ بیوی کہیں اور کام کر رہی تھی۔ باری کو بیٹے اور بیوی کی بارے میں کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟

جوانی میں باری بھی بہت سرکش اور جیالا مشہور تھا۔ بھٹہ مالکوں اور ان کے جمعداروں کے طرح طرح کے مظالم جھیل چکا تھا۔ دو بار سزا کے طور پر بھٹے کے دہکتے ہوئے توے پر بھی کھڑا ہو چکا تھا۔ اسے ہر طرح کے ظلم و ستم کا بخوبی تجربہ تھا۔

باری نے پہلا کام تو یہ کیا کہ دوسرے پتھیروں کی مدد سے سلامو کو جھونپڑی سے باہر نکالا اور تازہ ہوا میں ایک چارپائی پر لٹا دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ ایک طرف چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں کچے آلو دبے تھے۔ خدا معلوم کہاں سے ڈھونڈ کر لایا تھا۔ وہ جھونپڑی کے اندر گیا۔ چراغ کی روشنی میں آلو پتھر پر رکھ کر اچھی طرح کچلے۔ مٹی کی ایک پلیٹ میں سمیٹ کر رکھے۔ سلامو کے پاس پہنچا اور ہولے ہولے کچلے ہوئے آلوؤں کا لیپ سلامو کے تلوؤں پر لگانے لگا۔

سلامو نے تلملا کر پہلو بدلا۔ باری نے نرم لہجے میں اسے سمجھایا۔ "گھبرا نہیں' تھوڑی دیر میں آرام آجائے گا۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "مجھے بھی پتہ ہے۔ توے پر کھڑے ہونے کی بعد پیروں میں کتنی تکلیف ہوتی ہے۔"

باری نے آلوؤں کا لیپ سلامو کے دونوں تلوؤں پر اچھی طرح لگا دیا۔ سلامو کچھ دیر تو بے قرار رہا' مگر اب وہ خاموش پڑا تھا اور آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ بیوی چارپائی کی پٹی سے لگی اس کے سرہانے بیٹھی تھی اور آہستہ آہستہ سر دبا رہی تھی۔ قریب ہی اس کی بیٹی' رانو اور دونوں بچے دم بخود بیٹھے تھے۔

ڈوگر ایک طرف سے دو کارندوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ سلامو کی پاس پہنچا اور اس کے ساتھ ساتھ وہاں موجود دوسروں کو بھی گالیاں دینے لگا' دھونس اور دھمکی دینے لگا۔ مگر اس دفعہ کوئی ہٹا نہیں۔ جس جگہ کھڑا تھا وہیں رہا۔ حنیف ڈوگر برافروختہ ہو کر اور زور زور سے ڈانٹنے پھٹکارنے لگا۔ پتھیروں اور دوسرے بھٹہ مزدوروں کے چہروں پر جھنجلاہٹ پھیلنے لگی۔ احتجاج کے طور پر طرح طرح کی آوازیں ابھرنے لگیں۔

"جمعدار گالاں نہ نکال۔"

"رب سے ڈر۔ اتنا ظلم کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔"

"کڑیاں اور زنانیاں اٹھاتے ہوئے تجھے شرم کرنی چاہیے۔"

"سلامو نے جو کچھ کیا بالکل ٹھیک کیا۔"

"ہن جی، یہ عزت کا سوال ہے۔"

آوازیں اونچی اور اونچی ہوتی گئیں۔ لہجہ تلخ تر ہوتا گیا۔ چہروں کا تناؤ بڑھ گیا۔ آنکھوں سے غم و غصہ جھلکنے لگا۔ حنیف ڈوگر نے ان کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو طرح طرح کی دھمکیاں دیتا ہوا اپنے کارندوں کے ہم راہ چلا گیا۔ وہ سخت چراغ پا تھا۔

رات گزری۔ صبح ہوئی۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ صرف سلامو اپنی جھونپڑی میں تنہا لیٹا تکلیف سے کراہتا رہا۔ بے چینی سے بار بار کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کی بیوی جگنی اور بیٹی رانو گارا بنا رہی تھیں اور گارے کو سانچوں میں بھر بھر کر اینٹیں تیار کر رہی تھیں۔ سلامو کے دونوں کم سن بچے بھی ماں اور بہن کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ اپنی بساط کے مطابق مستعدی سے مدد کر رہے تھے۔

حنیف ڈوگر دن بھر نظر نہ آیا۔ مگر شام کو جب جھٹپٹا ہوا تو وہ حسب معمول منشی کے عقب میں کارندوں کے ہم راہ موجود تھا۔ وہ منشی کے سامنے نیم دائرے میں فرش پر بیٹھے ہوئے پتھیروں اور بھٹہ مزدوروں کو غصے سے گھور رہا تھا۔ گزشتہ شب اس کی جو بے عزتی ہوئی تھی، اس پر سخت برہم تھا۔ اس کی آنکھوں سے جو کدورت اور نفرت جھلک رہی تھی، اس کی شدت کا اندازہ اس وقت ہوا جب کسی کو منشی نے اجرت نہ دی۔ ہفتے بھر کی پوری دہاڑی پیشگی میں کاٹ لی۔ جس نے بھی احتجاج کرنے کی کوشش کی حنیف ڈوگر نے بپھر بپھر کر اس کی پیٹھ اور کمر پر سڑاک سڑاک چھتر لگائے۔ مگر نہ کوئی ہنگامہ ہوا نہ گڑبڑ۔

☆

تمام پتھیرے اور بھٹہ مزدور رات بھر جاگتے رہے۔ چوری چھپے ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ سرگوشیاں کرتے رہے۔ تمام رات یہ خفیہ سرگرمیاں جاری رہیں۔ صبح ہوئی تو کوئی پتھیرا اور کوئی بھٹہ مزدور کام پر نہ گیا۔ سب اپنی جھونپڑیوں میں بیٹھے رہے۔

پھر دن گزرا۔ سورج چڑھ کر آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا۔ دوپہر ہو گئی۔ مگر بھٹہ سنسان تھا۔ نہ کوئی چہل پہل تھی نہ گہما گہمی۔ حنیف ڈوگر اپنے کارندوں کے ساتھ پیچ و تاب کھاتا ہوا

جھونپڑیوں پر پہنچا۔ چیخا چلایا۔ ڈرایا دھمکایا۔ مگر کوئی بھی جھونپڑی سے نکل کر کام پر نہ گیا۔

دوسرے روز بھی کوئی کام پر نہ گیا۔

میاں اسلم اس صورت حال سے سخت پریشان ہوا۔ اسے ایک سرکاری عمارت کی تعمیر کے لیے بہت بڑی تعداد میں اینٹیں فراہم کرنا تھیں اور کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں فراہم کرنا تھیں۔ یہ ٹھیکہ اس نے بہت بھاگ دوڑ کرنے اور تگڑی رشوت دینے کے بعد حاصل کیا تھا۔ ٹھیکے کی بنیادی شرط وقت مقرر کے اندر اینٹیں فراہم کرنا تھی۔ تاخیر کی صورت میں ٹھیکہ منسوخ ہو جانے کا شدید خطرہ تھا۔

سہ پہر کو میاں اسلم نے ڈوگر کو طلب کیا۔ وہ اس وقت بھٹے کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ بشرے سے گھبراہٹ اور پریشانی عیاں تھی۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ چہرے سے پسینا پونچھ رہا تھا۔ حنیف ڈوگر دفتر میں داخل ہوا اور سر جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

میاں اسلم نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ "ڈوگر، آج بھی بھٹے پر کام شروع نہیں ہوا۔"

"فکر نہ کریں جی، کل کام شروع ہو جائے گا۔" حنیف ڈوگر نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "بھوکے مریں گے تو سارے ہی پتھیرے اور مزدور خود ہی کام پر پہنچ جائیں گے۔"

"اور وہ کل بھی کام پر نہ آئے تو؟"

"نئے پتھیرے بھرتی کر کے لے آؤں گا۔" ڈوگر نے صفائی پیش کی۔ "کیا کریں جی۔ سب نے بہت تنگ کر رکھا ہے۔ آنکھیں دکھاتے ہیں۔ رولا کرتے ہیں۔ ان کی چھابی کسنا بہت ضروری تھی۔ آگے بھی بہت زیادہ تنگ کریں گے۔"

"تو چھابی کستا رہنا، ادھر اپنا پلیتھن نکل جائے گا۔" میاں اسلم برس پڑا۔ "تو بالکل کام کا بندہ نہیں۔ ایک دم ہڈ حرام ہو گیا ہے۔ تجھ سے جمعداری نہیں ہونے کی۔"

"میاں صاحب، میری گل تو سنو۔" ڈوگر نے عاجزی سے ایک بار پھر صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"میں نے تیری کوئی گل شل نہیں سنی۔" میاں اسلم جھنجلا کر زور سے چیخا۔ "تو میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جا۔ نکل جا یہاں سے۔"

حنیف ڈوگر نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ مڑا اور گردن جھکائے ہوئے چپ چاپ دفتر سے باہر چلا گیا۔

شام کو میاں اسلم نے تمام پتھیروں اور دوسرے محنت کشوں کو بلایا۔ جب وہ دفتر کے باہر

پہنچ گئے تو میاں اسلم باہر آیا۔ میراں نے کرسی نکال کر دفتر کے باہر رکھ دی۔ میاں اسلم اس پر اطمینان سے بیٹھ کر سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ اس کے روبہ رو بھٹے پر کام کرنے والے تمام پتھیرے اور مزدور فرش پر بیٹھے تھے۔ ان کے جسموں سے پسینے کی تیز بو اٹھ رہی تھی۔ ان کے چہرے بالکل سپاٹ تھے۔ وہ نظریں اٹھائے میاں اسلم کی طرف دیکھ رہے تھے۔

میاں اسلم نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اونچی آواز سے سب کو مخاطب کیا۔ "کیوں جی' تم سب نے دو روز سے کام کیوں بند کر رکھا ہے؟"

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ سب خاموش بیٹھے رہے۔

"بولو' جواب دو۔ تم نے کام کیوں بند کر رکھا ہے؟" اس دفعہ اس نے زیادہ اونچی آواز سے پوچھا۔

سب نظریں گھما پھرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ وہ سراسیمہ اور گھبرائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی' پھر ایک بوڑھا پتھیرا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سب اسے بابا نور دین کہتے تھے۔ بابا نور دین نے پچھلے چند روز کے واقعات سنبھل سنبھل کر میاں اسلم کو سنائے۔ حنیف ڈوگر اور کارندوں کے ظلم و ستم بتائے۔ منشی کی دھاندلی سے آگاہ کیا۔ اس نے رانو کے اغوا کی واردات اور سلامو پر ڈھائے جانے والے جبر و تشدد کی روداد اس قدر دل گرفتہ اور جذباتی ہو کر سنائی کہ آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ بابا نور دین نے بوسیدہ قمیص کا دامن اٹھایا اور اپنے آنسو پونچھنے لگا۔

میاں اسلم خاموش بیٹھا بابا نور دین کی ایک ایک بات پوری توجہ سے سنتا رہا۔ جب اس نے اپنی بات ختم کی تو میاں اسلم نے رانو کے اغوا پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ڈوگر نے کرندوں کے ذریعے رانو کو اٹھوایا تھا؟ یہ تو اس نے بہت گندی حرکت کی۔ اس نے ایسا کیوں کیا۔ وہ اسے اٹھا کر کہاں لے گیا تھا؟"

رانو بھی اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی تھی اور تعجب سے آنکھیں پھاڑے میاں اسلم کو دیکھ رہی تھی جس کے ساتھ اس نے تمام رات بے بسی کے عالم میں بسر کی تھی۔

مگر میاں اسلم اس کے احساسات اور حیرانی و پریشانی سے بالکل بے نیاز تھا۔ اس نے تیوری پر بل ڈالے' چہرے پر جھنجلاہٹ طاری کی اور اپنی برہمی کا اظہار کیا۔ "میں ڈوگر کی جمعداری ختم کر دوں گا۔ اس کی چھٹی کر دوں گا۔"

مجمعے میں ہلکی ہلکی سرسراہٹ ہوئی۔ دبی دبی سرگوشیاں ابھریں۔ مرجھائے ہوئے چہروں پر میان جھلکنے لگا۔ میاں اسلم نے سلامو کی بیوی' جگنی' کو بلایا۔ پندرہ روپے جیب سے نکال کر ا مو کے علاج معالجے کے لیے دیئے۔ اسے تسلی بھی دی۔ اس نے گردن اٹھا کر سامنے بیٹھے ئے پتھیروں اور دوسرے محنت کشوں کو دیکھا۔ غصے سے حنیف ڈوگر اور کارندوں کو برا بھلا کہا۔ ں کو فہمائش کرنے کا وعدہ کیا اور پتھیروں کو خوش کرنے کے لیے فی ہزار کچی اینٹ کی اجرت میں آنے کے اضافے کا اعلان کیا۔

اس اعلان سے پتھیرے واقعی خوش ہو گئے۔ بن مانگے مراد پوری ہوئی تھی۔ وہ ہنستے مسکراتے ں اسلم کو دعائیں دیتے اپنی اپنی جھونپڑیوں اور جگیوں کی جانب روانہ ہو گئے۔ سلامو کی بیوی ں اپنا سارا دکھ درد بھول گئی۔ پندرہ روپے اس کی دھوتی کے ڈب میں نہایت حفاظت سے رکھے ے۔ باری سب سے زیادہ خوش تھا۔ اس کی دونوں بیٹیاں جو لگ بھگ چار مہینے سے لاپتہ تھیں ات ہی کو واپس آ گئی تھیں۔

میاں اسلم نے ایسا انجر پھینکا کہ پتھیرے اس سے نہال ہو گئے۔ ان کے سوکھے پتلے اور مریل موں میں گویا بجلی دوڑ گئی۔ وہ اب دبا کے محنت کرتے۔ زیادہ جوش و خروش سے کام کرتے اور ثر و بیشتر بلا عذر چودہ چودہ گھنٹے کام کرتے۔ بھٹے کے وسیع میدان میں ہر طرف اینٹوں کے چٹے ر آتے تھے۔

منشی کا رویّہ بھی بدل گیا تھا۔ اب وہ چٹھا بانٹتے وقت بے زاری اور جھنجلاہٹ کا اظہار نہ کرتا۔ ی سے بات کرتا۔ پیشگی بھی کم سے کم کاٹتا۔ ٹوٹ پھوٹ اور ٹیڑھی بیڑھی اینٹوں کی کٹوتی میں بھی عایت سے کام لیتا۔ ہنسنے بولنے اور ملنے جلنے پر بھی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ کارندے بھی بہت کم ر آتے۔ اور حنیف ڈوگر تو بالکل نظر نہ آیا۔ عام خیال یہ تھا کہ میاں اسلم نے اس کی جمعداری م کر دی ہے۔

☆

لالی نے زیادہ سے زیادہ کمائی کرنے کی خاطر فرار ہونے کا ارادہ عارضی طور پر ملتوی کر دیا تھا۔ وہ رج ڈوبنے کے بعد بھی دیر تک اینٹیں بناتا رہتا۔ وہ تھکا ہارا کام سے واپس آتا۔ جلدی جلدی ٹی پکاتا اور کھانا کھاتے ہی بے خبر ہو کر سو جاتا۔ دو ہفتے سے بھی زائد عرصہ اسی عالم میں گزر گیا۔ ر ایک صبح اس نے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا' حنیف ڈوگر بھٹے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہم او ایسے نئے پتھیرے بھی تھے جنہیں لالی نے پہلی بار دیکھا تھا۔

لالی نے معمول کے مطابق کچی اینٹیں تیار کیں۔ کام ختم کیا۔ کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ کر سو

گیا۔ پہر رات گزری تھی کہ کسی نے اسے زور زور سے جھنجوڑا۔ لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا۔ ایک مسلح کارندہ سرہانے کھڑا تھا۔ لالی نیند سے بوجھل آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کارندے نے ڈپٹ کر کہا۔ "فٹافٹ اپنا سامان اٹھا۔"

"کیوں؟" لالی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔" کارندہ آنکھیں نکال کر بولا۔ اندھیرے میں وہ بھوت کی مانند خوفناک نظر آ رہا تھا۔

لالی نے اس سے الجھنے کی کوشش نہ کی۔ چارپائی سے نیچے اترا اور جلدی جلدی اپنا سامان اکٹھا کرنے لگا۔ کارندے نے اپنی لمبی ڈانگ سے اس کی کمر کو ٹھوکا دیا۔ تیکھے لہجے میں بولا۔ "تیزی سے ہاتھ چلا۔" لالی نے کچھ نہ کہا۔ اپنا سامان سمیٹ کر گٹھری بنالی اور کارندے کی جانب دیکھنے لگا۔

"ادھر چل۔" کارندے نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر چلنے کا اشارہ کیا۔

لالی چپ چاپ آگے بڑھا۔ کارندہ اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ لالی ہنوز حیران و پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ چلتے چلتے اس نے دبی زبان سے دریافت کیا۔ "تو مجھے کہاں لے جا رہا ہے؟" اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"چپ کر کے چلتا رہ۔" کارندے نے بے رخی سے ڈانٹا۔ "بیکار کی بکواس نہ کر۔"

ڈانٹ سن کر لالی کو مزید پوچھ گچھ کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ وہ اپنی گٹھری سنبھالے، کان دبائے، کارندے کے ہم راہ چلتا رہا۔ دونوں اندھیرے میں ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیروں اور گڑھوں سے بچتے بچاتے آگے بڑھتے رہے۔ نہ کارندے نے کوئی بات چیت کی اور نہ ہی لالی بولا۔ کارندہ گردن اٹھائے نہایت مستعدی سے چل رہا تھا۔

لالی نے دور سے دیکھا، بھٹے کے نکڑ پر سڑک کے کنارے ایک ٹرک کھڑا تھا۔ کارندہ ٹرک ہی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ لالی بھی اس کے ساتھ اسی طرف بڑھا۔ قریب جا کر اسے جمعدار حنیف ڈوگر نظر آیا۔ وہ ٹرک کے نزدیک دھندلی دھندلی روشنی میں نہایت پر اسرار انداز میں کھڑا سگریٹ پر کش لگا رہا تھا۔ سگریٹ کا سلگتا ہوا کنارہ اندھیرے میں بار بار دہکتا۔ اس کے دہکنے سے سرخ سرخ روشنی پھیلتی۔

حنیف ڈوگر نے لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ سرسری نظر سے اسے دیکھا اور کارندے کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس نے لالی کو ٹرک کے پچھلے حصے میں بٹھا دیا جو کھلا ہوا تھا۔ کئی ہتھیرے پہلے ہی

ـ میں موجود تھے۔ سب ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔ لالی بھی سہما ہوا تھا۔ ہتھیرے جھونپڑیوں کی ـ سے کارندوں کی نگرانی میں آتے رہے اور ٹرک میں بیٹھتے رہے۔ پھر ان کی آمد کا سلسلہ بند ہو ا۔

چار مسلح کارندے بھی ٹرک پر سوار ہو گئے اور ہتھیروں کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ حنیف ڈوگر نے ـ کے آس پاس گھوم پھر کر ہتھیروں کا جائزہ لیا اور ڈرائیور کے برابر بیٹھ گیا۔ انجن اسٹارٹ ہوا ٹرک سڑک پر دوڑنے لگا۔ ٹرک میں انیس ہتھیرے سوار تھے۔ ان میں مرد تھے۔ عورتیں تھیں ر بچے بھی تھے۔ مگر سلامو اور اس کے بال بچے ان میں شامل نہ تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ امو ابھی تک چل پھر نہیں سکتا تھا۔ البتہ اس کے لگ بھگ سب ہی عزیز و اقارب ٹرک میں یا۔ ے تھے۔

ردعنی

ٹرک رات کے سناٹے میں سڑک پر دوڑتا رہا۔ مختلف راستوں سے گزرتا، موڑ کاٹتا، کبھی دائیں بغور دیکھ ف اور کبھی بائیں طرف گھومتا، آگے اور آگے بڑھتا رہا۔ ہتھیرے چپ بیٹھے تھے۔ نہ کوئی تھا نہ بات کر رہا تھا۔ انھیں کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کدھر جا رہے ہیں؟ انھوں نے کی ، یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہ کی۔ اور اگر جھونپڑیوں اور جھگیوں سے نکلتے ہوئے ایسی شش کی بھی تو ان کو بھی لالی کی طرح کارندوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کر دیا تھا۔

بھٹے کے چاروں کارندے نہایت چوکس بیٹھے تھے۔ دو کے پاس بندوقیں بھی تھیں جنھیں وہ بوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ وہ چوکنا نظروں سے ٹرک میں بیٹھے ہوئے ہتھیروں کو گھور رہے ہ۔ کبھی کبھار کوئی بوڑھا کھانستا تو خاموشی کا طلسم ٹوٹ جاتا۔ کارندے کھانسی کی آواز کے تھ ہی چونک پڑتے اور غصے سے کھانسنے والے ہتھیرے کو دیکھتے۔ ان کے چہروں پر سختی اور رشتگی تھی۔ نام کو بھی نرمی اور مروت نہ تھی۔ وہ اپنے ہر رویے اور ہر انداز سے ڈرے سہمے تھیروں کو دہشت زدہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

ٹرک نے ایک موڑ کاٹا تو گشت کرنے والی پولیس کی ایک ٹولی سامنے آ گئی۔ ایک پولیس والے ہاتھ اٹھا کر ٹرک روکنے کا اشارہ کیا۔ ٹرک رک گیا۔ کارندوں نے جھٹ اپنی بندوقیں قریب کی ہوئی ہتھیروں کی گٹھریوں کی اوٹ میں چھپا دیں۔ پولیس والے ٹرک کی تلاشی لینے کی غرض ے آگے بڑھے۔

حنیف ڈوگر خود نیچے اترا۔ نرم لہجے میں ایک پولیس والے کو مخاطب کرتے ہوئے گویا ہوا والدار جی، ٹرک میں ہتھیرے بیٹھے ہیں۔ ان کو بھٹے پر پہنچانے جا رہا ہوں۔"

حوالدار نے ٹرک کے نزدیک جا کر پتھیروں اور کارندوں کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ سارے پتھیرے چپ بیٹھے رہے۔ کسی نے ڈر کے مارے چوں تک نہ کی۔ حوالدار اور دوسرے پولیس والوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

حوالدار نے ڈوگر سے پوچھا۔ "تو کون ہے؟"

"میں جی جمعدار ہوں۔" حنیف ڈوگر نے اسے مطلع کیا۔ "سارے ہی پتھیرے میاں اسلم کے بھٹے کے ہیں۔"

حوالدار نے مزید پوچھ گچھ نہ کی۔ ہاتھ ہلا کر ٹرک آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ حنیف ڈوگر ٹرک پر سوار ہوا اور ڈرائیور کے برابر بیٹھ گیا۔ ٹرک ایک بار پھر سڑک پر دوڑنے لگا۔ کارندوں نے جھک ہاتھ بڑھا کر اپنی بندوقیں نکالیں۔ انھیں سنبھالا اور چوکس ہو کر بیٹھ گئے۔

ادھر ٹرک لکھوڈیر کے بھٹے پر پہنچ کر رک گیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ حنیف لالی، ر ٹرک کو ایسے پیچیدہ اور طویل راستوں سے گھما پھرا کر لے گیا تھا کہ پتھیروں کو نہ تو راستے کا کی سمت کا اندازہ ہو سکا اور نہ یہ علم ہوا کہ وہ کہاں پہنچے اور کس بھٹے پر پہنچے؟ وہ حیرت زدہ تھے۔ ڈ ہوئے تھے۔ تھکن اور نیند سے نڈھال تھے۔

ٹرک کے پہنچتے ہی بھٹے کا جمعدار، زماں خان، کئی کارندوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ پتھیرے ٹرک سے نیچے اترے۔ حنیف ڈوگر نے پتھیروں کو زماں خان کے حوالے کیا۔ اس نے ان کی گنتی کی حنیف ڈوگر زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ زماں خان سے رخصت ہوا اور ڈرائیور کے ساتھ ایک بار پھر بیٹھ گیا۔ اس کے ہم راہ آنے والے چاروں کارندے بھی ٹرک پر سوار ہو گئے۔ ٹرک اسٹارٹ ہوا او فیروز پور روڈ کی جانب واپس روانہ ہو گیا۔

زماں خان کی ہدایت پر لالی اور دوسرے پتھیروں کو بھٹے کے کارندوں نے دفتر کے پاس درختو کے نیچے پہنچا دیا۔ نہ انھوں نے کارندوں سے کچھ پوچھا اور نہ ہی انھوں نے کچھ بتایا۔ پتھیرے بے سرو سامانی کے عالم میں رات بھر درختوں کے نیچے پڑے رہے۔ سویرے کچھ جھونپڑیاں خا کرائی گئیں اور ان کے لیے رہائش کا بندوبست کر دیا گیا۔ مگر انھیں پرانے پتھیروں سے الگ تھلگ رکھا گیا۔

لالی نے دوپہر تک آرام کیا۔ کھانا کھایا اور کام کرنے پہنچ گیا۔ اس نے مٹی کھود کر گارا تیار اور سانچوں میں بھر بھر کر کچی اینٹیں تیار کرنے لگا۔ تھکن اور شب بیداری کے باعث اس رو زیادہ دیر تک کام نہ کر سکا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی اٹھ گیا۔ سرِ شام ہی پڑ کر سو گیا اور ا

نیند سویا کہ صبح ہونے سے پہلے آنکھ نہ کھل سکی۔

☆

ہی روز میں لالی نئے ماحول سے مانوس ہو گیا۔ لکھوڈیر کے بھٹے اور تیموں کے بھٹے میں کوئی تھا۔ پتھیروں پر وہی روک ٹوک اور پابندی تھی۔ جمعدار اور کارندوں کی وہی شورہ پشتی بات بات پر ڈانٹتے ڈپٹتے تھے۔ حقارت سے دھتکارتے تھے۔ تمام دن کڑی نگرانی کرتے تھے۔ کو پہریدار جھونپڑیوں کے اردگرد گشت کرتے تھے۔ زمین پر زور زور سے لاٹھیاں مار کر بجاتے اونچی آواز سے کھنکارتے تھے۔ کوئی پیشاب کو بھی اٹھتا تو فوراً ڈپٹ کر ٹوکتے تھے۔

تے کی شام کو چٹھا بانٹا گیا۔ لالی کو پانچ روز کی دہاڑی کا صرف ڈیڑھ روپیہ ملا تو وہ بہت چکرایا۔ ے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ صورت شکل سے وہ بھی خرانٹ لگتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی اندر دھنسی آنکھیں، پھولے پھولے گال، بے ڈول جسم، پیٹ بڑھا ہوا۔ وہ گردن جھکائے رجسٹر کو بغور دیکھ ۔

لی نے دریافت کیا۔ "سوا چار ہزار اینٹ کی تو یہ بہت کم دہاڑی ہوئی۔ تو نے ٹوٹ پھوٹ کی کٹوتی کی؟" اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

ٹوٹ پھوٹ تو اتنی نہیں بنتی۔ پر تیری طرف پیشگی بہت ہے۔" منشی نے اس کی جانب دیکھے بغیر دیا۔

کتنی پیشگی ہوتی ہے جی؟"

پورے آٹھ سو روپے۔" منشی نے لالی کو مطلع کیا۔

آٹھ سو!" لالی ہکا بکا ہو کر منشی کا منہ تکنے لگا۔ "میری طرف تو جی دو سو سے بھی کم پیشگی ہوتی "

"کتنی پیشگی پہلے ہوتی تھی، اس کے بارے میں جمعدار حنیف ڈوگر بتائے گا۔" منشی نے بے ن سے بتایا۔ "میرے رجسٹر میں آٹھ سو روپے پیشگی کے لکھے ہیں۔" اس دفعہ اس نے نظریں ر لالی کی جانب دیکھا۔ "تیرے نام پر اتنی ہی پیشگی ڈوگر کو ادا کی گئی ہے۔" اس کا لہجہ تلخ اور ہو گیا۔ "کان کھول کر سن لے۔ ادھر رہ کر تجھے اتنی ہی پیشگی ادا کرنی ہو گی۔"

"پر میں نے تو جی، کل تین سو روپے پیشگی لی تھی۔" لالی نے وضاحت کی۔ "میرے حساب سے جائے تو لگ بھگ سو روپے پیشگی کے ادا بھی کر چکا ہوں۔"

"میں نے تیرے حساب کو نہیں دیکھنا۔ میں نے تو وہ دیکھنا ہے جو میرے رجسٹر میں درج ہے۔"

اس کی آواز اونچی ہو گئی، برہم ہو کر بولا۔ "اب تو میرا مغز نہ کھا۔ اپنی دہاڑی اٹھا اور یہاں سے ٹرجا۔ تو اکیلا نہیں، میں نے اوروں کو بھی چتھا باشنا ہے۔"

لالی نے منشی سے مزید حجت کرنے کی کوشش نہ کی۔ خاموشی سے اپنی جھونپڑی میں گیا۔ آٹھ سو روپے پیشگی کی اطلاع نے اسے ذہنی طور پر اس قدر پریشان کر دیا تھا کہ نہ تو اس نے روٹی پکائی اور نہ ہی کچھ کھایا پیا۔ نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا اور بے چین ہو کر کروٹیں بدلنے لگا۔

شام جب رات میں ڈھل گئی تو واجد اس کے پاس آیا۔ وہ بھی پتھیرا تھا۔ بیوی اور ایک نو عمر بیٹے کے ساتھ قریب کی جھونپڑی میں رہتا تھا۔ سخت محنت اور غذائیت کی کمی نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا بنا دیا تھا۔ سر اور ڈاڑھی کی بال کھچڑی ہو گئے تھی۔ ہر وقت کھانستا بھی رہتا تھا۔

لالی نے واجد کو دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ واجد اس کے برابر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پوچھا۔ "تو شام سے چپ پڑا ہے۔ تو نے روٹی بھی نہیں کھائی۔ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس کے لہجے سے ہمدردی عیاں تھی۔

"طبیعت تو ٹھیک ہی ہے۔ پر بھوک ہی نہیں لگی۔"

"تو کچھ پریشان پریشان نظر آ رہا ہے۔" واجد نے قیاس آرائی کی۔ "لگتا ہے دہاڑی بہت کم ملی۔ میں نے دیکھا تھا تو منشی سے پیشگی کے بارے میں پوچھ تاچھ کر رہا تھا۔ میں تو منشی کے بالکل سامنے ہی بیٹھا تھا۔ کتنی پیشگی تو نے لے رکھی ہے؟"

"پیشگی تو میں نے تین سو لی تھی۔ سو روپے کے لگ بھگ دہاڑیوں سے کٹ بھی چکے تھے۔" لالی نے اسے مہربان پایا تو دل کی بات زبان پر لایا۔ "میرے حساب سے دو سو سے کچھ ہی اوپر ہو گی۔ تب میں میاں اسلم کے بھٹے پر کام کرتا تھا۔ ادھر آیا تو منشی نے اٹھ سو پیشگی جتائی۔ ساری دہاڑی پیشگی میں کاٹ لی، کل ڈیڑھ روپیہ دیا۔"

"ہاں جی، یہ پیشگی کا چکر ہی ایسا ہے۔ ایک بار شروع ہو جائے تو کبھی ختم نہیں ہوتا۔" واجد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "جتنی کٹتی ہے اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ ایک بھٹے سے دوسرے پر جاؤ تو اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ منشی سے پوچھو تو ٹھیک سے بتاتا بھی نہیں۔ اپنی مرضی سے جتنی چاہتا ہے کاٹ لیتا ہے۔ آنکھیں نکال کر ڈانٹتا ہے۔"

"تو نے کتنی پیشگی لے رکھی ہے؟" لالی نے دریافت کیا۔

"کوئی پیشگی شیشگی نہیں لی۔" واجد نے وضاحت کی۔ "جب ملتان کے بھٹوں پر کام کرتا تھا، تب بھی نہیں لی۔ میں نے تو کبھی پیشگی نہیں لی۔"

"تب تو ادھر کیسے آ گیا؟ جمعدار زیادہ دہاڑی کا لالچ دے کر لایا ہو گا۔"

"نا جی، ایسی کوئی گل بات نہیں۔" واجد نے لالی کو بتایا۔ "وہ ایسا ہوا جی کہ میرا ایک بھتیجا، جی ٹی روڈ کے بھٹے بندے ماراں پر پتھیرا لگا ہوا تھا۔ اس کا ناں ہاشم ہے۔ بھٹے کے مالک نے اس پر ہزار روپے پیشگی بنا رکھی تھی۔ ساری دہاڑی پیشگی میں کاٹ لیتا تھا۔ ہاشم کے پاس ہفتے بھر کی روٹی کو بھی نہ بچتا۔ اس کا پتر بیمار پڑا۔ منت سماجت کرنے پر بھی بھٹہ مالک نے اس کے دوا دارو کے لیے ادھار نہ دیا۔ وہ بیماری اور بھوک سے مر گیا۔ تھا تو پندراں سال کا پر جوان لگتا تھا۔ یہ اونچا ہوتا تھا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اونچائی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ "ہاشم خود بھی بیمار رہتا تھا اور اس کی گھر والی بھی روگی تھی۔ بھٹہ مالک نے ہاشم کو بہت تنگ کر رکھا تھا۔"

"تنگ تو جی سارے ہی پتھیروں کو اسی طرح کیا جاتا ہے۔" لالی نے تبصرہ کیا۔

"ہاشم کو زیادہ ہی تنگ کر رکھا تھا۔" واجد نے مطلع کیا۔ "اس کے بارے میں جب مجھے پتہ چلا تو بہت دکھ ہوا۔ اپنے خاندان والوں سے بات کی۔ وہ بھی پتھیرے تھے اور ایک ہی بھٹے پر اکٹھے کام کرتے تھے۔ سب کے صلاح مشورے سے یہ طے کیا گیا کہ ہاشم کو بھوک اور تنگ سے نکالنے کی کوشش کی جائے۔ ورنہ وہ بھی اپنے پتر کی طرح مر جائے گا۔"

"تم سب نے اس کے لیے کیا کیا؟" لالی نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کرنا کیا تھا جی، ملتان سے لہور پہنچے اور ہاشم کی پیشگی اتارنے کے لیے بندے ماراں کے بھٹے پر کام کرنے لگے۔" واجد نے بتایا۔ "ہم اٹھ بندے تھے۔ ان میں تین زنانیاں بھی تھیں۔ سب یہ سوچ کر گئے تھے کہ ہاشم کو اپنے ساتھ ہی ملتان لے جائیں گے۔ ہم نے دن رات زبردست محنت کی۔ اینٹیں بنا بنا کے ڈھیر لگا دیے۔ کئی لاکھ اینٹیں بنا ڈالیں۔"

"تب تو ہاشم کی پیشگی ادا ہو گئی ہو گی۔"

"ادا تو ہو جانا چاہیے تھی، پر ایسا ہوا نہیں۔" واجد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مہینہ بھر سے کچھ اوپر ہوا ہو گا کہ ہم سب کو فیروز پور روڈ کے ایک بھٹے کے مالک کو تین ہزار روپے لے کر فروخت کر دیا گیا۔ ہم کو اپنے فروخت ہونے کا بھی تب پتہ چلا جب نئے بھٹے پر پہنچے۔"

"ہاشم بھی تمہارے ساتھ ہی نئے بھٹے پر چلا گیا ہو گا؟"

"نہ وہ ہمارے ساتھ آیا نہ ہی اس کی پیشگی ادا ہوئی۔ وہ پہلے کی طرح اپنی گھر والی کے ساتھ بندے ماراں کے بھٹے پر کام کرتا رہا۔"

"یہ کیسے ہوا؟" لالی نے حیرت کا اظہار کیا۔

"بس ایسے ہی ہوا جی جیسے میں بتا رہا ہوں۔" واجد نے لالی کی حیرت پر توجہ نہ دی۔ "ہم سب کو ایک رات زبردستی ٹرک میں بھرا گیا اور ایسے ہی ادھر پہنچا دیا گیا جیسے تو ادھر آیا ہے۔" اس نے سوالیہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "تو اپنی مرضی سے تو ادھر نہیں آیا۔"

"تو مرضی کی گل کر رہا ہے۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ میاں اسلم کے بھٹے سے اٹھا کر مجھے کیوں لایا گیا؟" لالی نے بے زاری سے بتایا۔

"پتھیروں کی خرید و فروخت ایسے ہی ہوتی ہے۔ ان کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب اور کہاں جانا ہوگا۔ لگتا ہے تو نیا نیا پتھیرا لگا ہے۔"

"ایسی ہی گل بات ہے۔" لالی نے اس کی تائید کی۔ ساتھ ہی دریافت کیا۔ "یہ بتا تو فیروز پور روڈ کے بھٹے سے ادھر لکھوڈیر کیسے آ گیا۔ تو میاں اسلم کے بھٹے پر تو نہیں کام کرتا تھا؟"

"نا جی، وہ شریف خان کا بھٹہ ہوتا تھا۔" واجد نے فوراً تردید کی۔ "اس کے بھٹے پر لگ بھگ ہم نے دو مہینے کام کیا۔ وہ جی سردی کے دن تھے۔ ہم کو رہنے کے لیے کوئی جھونپڑی کوئی جھگی بھی نہ دی گئی۔ سردی سے بچنے کے لیے رات ہم چمنی کے پاس گزارتے۔ وہ گرم ہوتی تھی۔ اندر کچی اینٹیں پکانے کے لیے آگ جلتی رہتی تھی۔ تب بھی سردی سے نیند نہ آتی۔ چادریں اوڑھے سکڑے سکڑائے پڑے رہتے۔"

"تمہارے پاس رضائیاں نہیں تھیں؟"

"ہمارے پاس رضائیاں بنانے کو کچھ بھی نہ تھا۔" واجد نے لالی کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ "شریف خان کی جب بہت منت سماجت کی تو اس نے بیس بیس روپے پیشگی دی۔ ہم نے اس کے بھٹے پر دو مہینے تک کام کیا۔ پر ہم کو کچھ بھی نہ ملا۔ پیشگی کے ساتھ ساتھ وہ تین ہزار بھی ہماری دہاڑیوں سے کاٹے گئے جو بندے ماراں کے بھٹہ مالک نے ہم کو خریدنے کے لیے شریف خان کو دیے تھے۔" اسے کھانسی کا ٹھسکا لگا۔ وہ بے چین ہو کر کھانسنے لگا۔ جب ذرا قرار آیا تو اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں جی، تو میں یہ بتا رہا تھا کہ شریف خاں نے ہم کو بہت تنگ کیا۔ اتنا تنگ کیا کہ کھانے کو روٹی بھی نہ ملتی۔ تب ہم نے شور شرابہ کیا۔"

"تب تو شریف خان نے اپنی کرندوں کے ذریعے سب کی زبردست پٹائی کی ہوگی۔" لالی نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"ان دنوں وہ لہور میں نہیں تھا۔ اس کا جمعدار بھی نہیں تھا۔ دونوں کوئٹہ گئے ہوئے تھے۔ تب ہی تو ہم نے بھٹہ چھوڑا اور واپس ملتان چلے گئے۔ پر ادھر بھی زیادہ دن نہ ٹھہرے۔ لودھراں چلے

گئے۔"

"ہاشم کا کیا بنا؟" لالی نے استفسار کیا۔ "وہ ابھی تک بندے ماراں کے بھٹے پر کام کر رہا ہے یا کہیں اور چلا گیا؟"

"وہ جی، اپنے رب کے پاس چلا گیا۔" واجد نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "پچھلے دنوں اس کا مرن ہو گیا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔" لالی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پر تم آٹھوں بندے تو شریف خان کے چکر سے چھوٹ ہی گئے۔"

"کہاں چھوٹے جی۔ ہفتہ بھر نہ گزرا تھا کہ شریف خاں اپنے جمعدار رحمان اور دو کرندوں کے ساتھ پہلے ملتان پہنچا۔ وہاں سے اس نے ہمارے بارے میں پتہ کیا اور لودھراں پہنچ گیا۔ تھانیدار سے ملا۔ ہمارے خلاف پرچہ چاک کرایا۔" واجد نے بتایا۔ "رات کے اندھیرے میں پولیس نے گھروں پر اس طرح چھاپے مارے جیسے ہم نے کوئی وڈا جرم کیا ہے۔ سب کو گرفتار کر کے تھانے لے جایا گیا۔ رات بھر چھتروں اور سوٹوں سے پٹائی کی گئی اور حوالات میں بند کر دیا گیا۔"

"پر پولیس نے ایسا کیوں کیا؟ تو نے تھانیدار سے نہیں پوچھا؟"

"پوچھا تھا۔" واجد نے جواب دیا۔ "تھانیدار نے بتایا کہ ہم نے شریف خان کے اڑھائی ہزار پیشگی کے ادا کرنے ہیں۔ ہم نے انکار کیا۔ قسمیں کھائیں۔ پر اس نے ہماری ایک نہ سنی۔ گالاں نکالیں۔ لاتوں اور مکوں سے پٹائی بھی کی۔"

"شریف خان نے تگڑی رشوت دی ہوگی یا سفارش پہنچائی ہوگی۔" لالی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"ایسا ہی ہوگا۔ میں نوں کچھ پتہ نہیں۔" واجد نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ "مجھے تو یہ پتہ ہے کہ تھانیدار کے حکم پر ہم سب کو دھکے دے دے کر ایک لاری میں بھرا گیا۔ ایک حوالدار اور تین پولیسے نگرانی پر لگائے گئے۔ پہلے ہم سب ملتان گئے۔ وہاں سے ہاشم کے بھائی اور پیو کو پکڑ کر بٹھایا۔ اس کا پیو بوڑھا اور بیمار تھا۔ اس نے گڑگڑا کر منت کی تو اسے چھوڑ دیا گیا۔ وہاں سے اوکاڑے لے جایا گیا۔ رات بھر سب کو ایک کوٹھڑی میں بند کر کے رکھا گیا۔ کھانے کو روٹی بھی نہ دی گئی۔ اس کے کرندے بندوقیں اور پستول دکھا کر ڈراتے دھمکاتے رہے۔"

"یہ تو بہت ظلم ہوا جی۔" لالی نے اپنے غم و غصے کا اظہار کیا۔ "جعلی پیشگی بنائی اور اوپر سے اتنا تنگ بھی کیا۔"

"سنتا جا کیسا کیسا ظلم ہوا۔" واجد کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "اوکاڑے سے شریف خان ہم سب کو لہور لے گیا۔ اس کے سات بھٹے ہیں۔ کرندوں نے پہلے تو ہم سب کی دبا کے پٹائی کی۔ فیر منہ میں جوتے دے کر کمر میں رسیاں ڈالی گئیں اور تمام بھٹوں پر سارے پتھیروں کے سامنے گھمایا تاکہ وہ بھی ڈر جائیں اور آگے شریف خان کے خلاف شور شرابہ اور گڑبڑ کرنے کی ہمت نہ کریں۔"

"تم سب کو اس لیے یہ سزا دی گئی تھی کہ شریف خان کی مرضی کے خلاف اس کا بھٹہ چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے؟"

"ہاں جی' یہ اسی کی سزا دی گئی تھی۔" واجد نے تائید کی۔ "شریف نے مہینہ بھر تک اپنے ایک بھٹے پر ہم سب کو رکھا۔ بعد میں اس بھٹے کے جمعدار' رحمان' کے ذریعے فروخت کر دیا۔ تب سے جی میں ادھر ہی ہوں۔"

"دوسرے بندے بھی تیرے ساتھ ہی ہوں گے۔"

"نا جی' ایسا نہیں ہے۔" اس نے انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "دوسروں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ کہاں کہاں ہیں اور کس کس بھٹے پر کام کر رہے ہیں؟ میری ایک دھی اور ایک پتر کا بھی پتہ نہیں کدھر ہیں' کیسے ہیں؟" اس نے گہری سانس بھری۔ "یہ پیشگی کا چکر ہی ایسا ہے۔ اس سے کبھی چھٹکارہ نہیں ملنے کا۔ ہر ہفتے دہاڑی سے کٹتی ہے پر کبھی ختم نہیں ہوتی۔"

لالی اس کی باتیں سن کر اور پریشان ہو گیا۔ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ واجد اٹھ کر اپنی جھونپڑی میں گیا۔ ایک روٹی اور مرچیں لایا۔ لالی کے آگے رکھ کر بولا۔ "لے اسے کھا لے' تو نے شام سے کچھ نہیں کھایا۔" لالی نے انکار کیا۔ مگر واجد نے اصرار کر کے کھانا کھلا دیا۔

واجد زیادہ دیر نہ رکا۔ اٹھ کر چلا گیا۔

☆

لالی بستر پر لیٹ گیا۔ مگر سویا نہیں جاگتا رہا۔ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ لالی نے اس رات فرار ہونے کا فیصلہ کیا۔ رات گزرتی رہی۔ آدھی سے زیادہ ہو گئی۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ صرف پہریداروں کے کھنکارنے اور لاٹھیاں بجانے کی آوازیں رک رک کر سناٹے میں ابھر رہی تھیں۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ جھونپڑیوں کے سامنے پتھیرے اور مزدور گہری نیند سو رہے تھے۔ وہ اٹھا اور دبے دبے قدموں چلتا ہوا ایک طرف بڑھا۔ کبھی قدموں کی رفتار تیز کر دیتا کبھی سست۔ کبھی ٹھہر جاتا۔ وہ راستہ بدلتا' رکتا' مڑتا' پہریداروں کی نظروں سے بچتا بچاتا

بھٹے کی حدود سے نکل کر پختہ سڑک پر پہنچ گیا۔

مگر وہ ٹھہرا نہیں۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ بھٹہ اب پیچھے رہ گیا تھا اور گہرے اندھیرے میں نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ دونوں جانب ویرانہ تھا۔ لالی تیز تیز قدم اٹھاتا آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ اسے توقع نہ تھی کہ اس قدر آسانی سے وہ بھٹے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ مڑ مڑ کر عقب میں دیکھتا۔ مگر دور دور تک نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ نہ آدم تھا نہ آدم زاد۔

اس نے میل سوا میل فاصلہ طے کیا تھا کہ دور سے روشنی جھلملاتی نظر آئی۔ ساتھ ہی پختہ سڑک پر گھوڑے کے دوڑنے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ ٹاپیں رفتہ رفتہ قریب آتی گئیں۔ لالی نظریں اٹھائے روشنی کی سمت دیکھتا گیا۔ اس نے قدموں کی رفتار میں اعتدال پیدا کیا۔ اور آگے بڑھتا رہا۔ کچھ دور آگے جانے کے بعد اس نے دیکھا' ایک تانگا سامنے سے آ رہا ہے۔ تانگا دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا۔ مگر نہ اس نے راستہ بدلا اور نہ اپنی جگہ رکا۔ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔

تانگا قریب آ آ گیا۔ اس کی رفتار اچانک سست پڑ گئی۔ نزدیک پہنچ کر تانگا چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ لالی نے مڑ کر چوکنا نظروں سے دیکھا' ایک شخص تانگے کی پچھلی نشست سے نیچے اترا۔ لالی نے گردن موڑی اور اپنی رفتار تیز کر دی۔ فوراً عقب سے آواز ابھری۔

"اوئے خانہ خراب' تو ادھر کیسے آ گیا؟"

لالی نے پلٹ کر دیکھا۔ بھٹے کا جمعدار' زماں خان' تانگے کی لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ سینما کا آخری شو دیکھ کر ایک کارندے کے ہم راہ بھٹے کی جانب واپس جا رہا تھا۔ کارندہ بھی تانگے سے اتر کر سڑک پر آ گیا تھا اور زماں خان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ لالی نے دونوں کو دیکھا تو سراسیمہ ہو گیا۔ مڑا' سڑک سے نشیب میں اترا اور سرپٹ بھاگنے لگا۔

زماں خان کے ساتھ ساتھ کارندے نے بھی لالی کا تعاقب کیا۔ زماں خان نے اسے روکنے کی غرض سے زور سے ڈانٹا۔ "ٹھہر جا' ورنہ بہت برا ہو گا۔" مگر لالی کہاں ٹھہرنے والا تھا۔ اس نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ زماں خان غصے سے چیختا چلاتا' ڈانٹتا ڈپٹتا' برابر اس کا تعاقب کرتا رہا۔ وہ بھی نہایت چست اور پھرتیلا تھا۔ دوڑتا بھی تیز تھا۔

لیکن لالی اس کے ہاتھ نہ آیا۔ وہ عادی اور منجھا ہوا چور رہ چکا تھا۔ بھاگنے کے معاملے میں چھلاوا تھا۔ آن کی آن میں دور نکل گیا۔ وہ ایک پرانے بھٹے سے گزر رہا تھا جو ختم ہو کر اب ویران پڑا تھا۔ جگہ جگہ گہرے گڑھے تھے۔ ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے بکھرے ہوئے ڈھیر پھلانگتا' جھاڑیوں سے

دامن بچاتا' ادھر ادھر مڑتا تیزی سے دوڑتا رہا۔ وہ جلد سے جلد بھٹے کی حدود سے نکل جانا چاہتا تھا تاکہ پوری رفتار سے دوڑ سکے اور زماں خان کی پہنچ سے اتنی دور نکل جائے کہ وہ اس کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔

خوف اور گھبراہٹ کے باوجود وہ پوری احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ ناہموار زمین پر دوڑتے ہوئے کہیں ٹھوکر بھی کھاتا تو فوراً خود کو سنبھال لیتا۔ مگر ایک گڑھے سے بچتے ہوئے اندھیرے میں اینٹوں کے ایک ڈھیر سے اس بری طرح ٹکرایا کہ اس کے قدم ڈگمگا گئے۔ اچھل کر دور گرا اور لڑھکتا ہوا گہرے گڑھے میں چلا گیا۔ سر میں ایسی کراری چوٹ آئی کہ آنکھوں کے سامنے ستارے گردش کرنے لگے۔ وہ خاک میں لتھڑا ہوا زمین پر بے حال پڑا تھا اور منہ کھولے زور زور سے ہانپ رہا تھا۔

دور سے قدموں کی آہٹ ابھری اور رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ لالی نے سنا' زماں خان اونچی آواز سے کارندے کو بلا رہا تھا۔

"کرمے! اسی طرف آجا۔ میں نے اسے ادھر ہی بھاگتے دیکھا تھا۔"

لالی خاموش پڑا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ زماں خان اور کرما دوسری طرف چلے جائیں تو وہ راستہ بدل کر نکل بھاگنے کی کوشش کرے۔ قدموں کی آہٹ اور قریب آگئی۔ لالی نے مڑ کر اس سمت دیکھا۔ دھندلی روشنی میں زماں خان گڑھے کے اوپر نظر آیا۔ لالی کے کپڑوں کی سفیدی اندھیرے میں صاف نظر آرہی تھی۔ زماں خان نے اسی دیکھا تو ٹھہر گیا۔

لالی نے خطرہ بھانپ لیا۔ اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ مگر اس وقت تک زماں خان دوڑ کر عین اس کے سر کے اوپر پہنچ چکا تھا۔ اس نے چھلانگ لگائی اور اس طرح نیچے آیا کہ لالی زمین پر لوٹ لگا کر اپنی جگہ سے ہٹ نہ جاتا تو وہ اس کے اوپر ہی گرتا۔ لالی اٹھا اور تیزی سے آگے بڑھا' زماں خان اس کے پیچھے لپکا۔ لالی نے نشیب سے اوپر جانے کے لیے زقند بھرنے کی کوشش کی۔ لیکن زماں خان نے جھپٹ کر اس کی ٹانگ پکڑ لی۔

لالی لڑکھڑا کر گرا۔ زماں خاں نے جھٹ اسے دبوچ لیا۔ لالی نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ دونوں میں زور آزمائی ہونے لگی۔ مگر لالی کمزور پڑ رہا تھا۔ سخت محنت اور پوری غذا نہ ملنے کے باعث اس کے جسم میں اب پہلا سا کس بل نہ رہا تھا۔ زماں خان مضبوط اور توانا تھا۔ اس نے لالی کو اپنی گرفت سے نکلنے نہ دیا۔

اسی اثناء میں کرما بھی پہنچ گیا۔ وہ بھی لالی سے لپٹ گیا۔ اب زماں خان اور کرما نے لالی کو پوری طرح قابو میں کر لیا تھا۔ دونوں دھکے دیتے ہوئے اسے گڑھے سے اوپر لے گئے اور سڑک کی جانب بڑھنے لگے۔ لالی کی سانس دھونکنی کی طرح زور زور سے چل رہی تھی۔ اس نے دونوں کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کی کوشش نہ کی۔ چپ چاپ ان کے نرغے میں چلتا رہا۔

زماں خان نے چلتے چلتے لالی کے منہ پر غصے سے تھپڑ مارا۔ دریافت کیا۔ "تو پہریداروں کی نظروں سے بچ کر فرار کیسے ہوا؟"

لالی نے بات بنانے کی کوشش کی۔ "میں جی فرار شرار نہیں ہوا تھا۔ میرا چاچا ادھر ہی ہوتا ہے بہت بیمار ہے۔ اسے ملنے جا رہا تھا۔ صبح واپس آجاتا۔ جمعدار میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ بالکل سچ سچ بتا رہا ہوں۔"

زماں خان کو اس کی ڈھٹائی پر اور تاؤ آیا۔ اس نے تڑاق سے ایک تھپڑ اور رسید کیا۔ "مجھے پتہ ہے تو بالکل سچ بول رہا ہے۔" اس نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "تب ہی تو مجھے دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔"

"میں تجھے دیکھ کر ڈر گیا تھا۔" لالی نے خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی ایک اور کوشش کی۔ "بات یہ ہے جی' میں کسی پہریدار کو بتا کر نہیں آیا تھا۔ بتاتا تو وہ بھٹے سے باہر جانے نہ دیتا۔"

"اب تو چپ کر کے چل۔ بیکار کی بکواس نہ کر۔" زماں نے ایک بار پھر مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ لیکن مارا نہیں۔

لالی خاموش ہو گیا۔ زماں خان اور کرما اس کے بازوؤں کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ اور سڑک سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ تینوں اونچی نیچی ناہموار زمین پر سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے۔ ہر طرف بکھری ہوئی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں' خودرو پودوں اور جھاڑیوں سے بچنے کی غرض سے بار بار ادھر ادھر مڑتے تھے۔ آخر وہ اس پگڈنڈی پر پہنچ گئے جو بھٹے کے درمیان سے گزرتی ہوئی سڑک کی طرف جاتی تھی۔

تانگا ابھی تک سڑک پر کھڑا تھا۔ اس کی لالٹینوں کی روشنی تاریکی میں دور سے نظر آرہی تھی۔ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے وہ سڑک پر آگئے۔ زماں خان نے حقارت سے دھکا دے کر لالی کو تانگے پر سوار کرایا۔ اس نے مطلق احتجاج نہ کیا۔ سہما ہوا خاموشی سے کوچوان کے برابر بیٹھ گیا۔

کوچوان نے مسکرا کر زماں خان سے کہا۔ "میں نے تو سوچا تھا جی' یہ اب ہاتھ نہیں آنے کا۔ پر تو اسے پکڑ ہی لایا۔"

"نکل کیسے جاتا۔" زماں خان نے رعونت سے کوچوان کی جانب دیکھا۔ "اسے پتہ نہیں۔ میرا

ناں زماں خان ہے۔ یہ کیا ہے' اس سے بہت زیادہ بدمعاش ہتھیرے میں نے دیکھے ہیں۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "اول تو میں اسے نکل کر جانے ہی نہ دیتا۔ اور اگر اندھیرے میں نکل بھی جاتا تو میں اس کا پتہ چلا لیتا۔ پکڑ کر بھٹے پر لے آتا۔" اس نے مڑ کر کرما کو دیکھا۔ "کرمے' تیں نوں یاد ہے۔ وہ جو تین ہتھیرے چپکے سے بھاگ نکلے تھے انھیں میلسی اور حاصل پور سے پکڑ کر لایا تھا۔ وہ تو بہت چالاک تھے۔ یہ تو ان کے سامنے کچھ بھی نہیں۔"

زماں خان اپنی ترنگ میں بولتا رہا۔ کوچوان نے تانگا آگے بڑھایا۔ گھوڑے کے سموں میں لگی ہوئی لوہے کی نئی نعلیں پختہ سڑک پر ٹپ ٹپ بجنے لگیں۔ زماں خان اور کرما مضبوطی سے لالی کے بازو اور ہاتھ پکڑے چوکس بیٹھے تھے۔

۲۸

رات کے سناٹے میں گھوڑے کے سموں سے ٹپ ٹپ کی آواز تسلسل سے ابھر رہی تھی۔ تانگا سنسان سڑک پر تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ ہوا کے سرسراتے ہوئے جھونکے جسموں سے ٹکرا رہے تھے۔ آسمان صاف شفاف تھا۔ ستاروں کے کنول جھلملا رہے تھے۔

لالی کو بھٹے کے جمعدار زماں خان اور کارندے کرما نے اپنے مضبوط ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ مگر لالی نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ موقعے کی تاک میں تھا۔ تانگے نے میل بھر سے زیادہ راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ اس نے زور زور سے کھانسنا شروع کر دیا۔ اس کی بے چینی سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اچانک کھانسی کا شدید دورہ پڑا ہے۔ کھانستے کھانستے لالی نے ادھر ادھر پہلو بدلا۔ زماں خان اور کرما کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

لالی آگے جھکا' کسمسایا اور دونوں کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ کھسک کر تانگے کے اگلے سرے پر پہنچا۔ جھپاک سے زقند بھری اور تانگے سے دور جا کر گرا۔ لالی نے ایسی پھرتی دکھائی اور اس صفائی سے چلتے ہوئے تانگے سے کود کر باہر گیا کہ زماں خان اور کرما ہکا بکا رہ گئے۔ کوچوان بھی چکرا گیا۔ اس نے حیرت زدہ نظروں سے مڑ کر دیکھا۔ لالی کی نشست خالی تھی۔

سڑک پر گرتے ہی لالی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ چوٹیں آئی تھیں۔ داہنے گھٹنے میں رک رک کر ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ مگر اس نے کسی چوٹ چپیٹ کی ذرا پرواہ نہ کی۔ کھڑا ہوا اور سڑک پر نہایت تیزی سے دوڑنے لگا۔

زماں خان نے ڈپٹ کر کوچوان سے کہا۔ "تانگا روک۔"

کوچوان نے تانگا روکنے کی کوشش کی۔ لیکن تانگا رکنے بھی نہ پایا تھا کہ زماں خان نے چھلانگ لگائی۔ سڑک پر گرا اور دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ اس نے گرتے گرتے کرما کو چیخ کر مدد کے لیے پکارا۔

کرما بھی کود کو تانگے سے باہر آگیا۔ اس کے قدم لڑکھڑائے' مگر اس نے خود کو سنبھال لیا اور زماں خان کی جانب بڑھا' وہ اب اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے مڑ کر کرما کی طرف نہ دیکھا اور لالی کے تعاقب میں سڑک پر دوڑنا شروع کر دیا۔ کرما بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔

لالی نے پختہ سڑک پر قدموں کی آہٹ سنی۔ پلٹ کر دیکھا' زماں خان اور کرما اس کے تعاقب میں تھے۔ وہ کچھ دور تو سڑک پر دوڑتا رہا' پھر سڑک سے کچے میں اتر گیا۔ زمین بنجر اور ناہموار تھی۔ یہ چٹیل میدان تھا۔ چھپنے اور اوجھل ہونے کے لیے دور دور تک کوئی درخت نہ تھا۔ کہیں کہیں خود رو پودوں کی جھاڑیاں تھیں' لیکن اتنی گھنی اور بڑی نہ تھیں کہ وہ ان کی اوٹ میں دبک کر روپوش ہونے کی کوشش کرتا۔ وہ منہ اٹھائے برابر دوڑتا رہا۔

زماں خان اور کرما بھی سڑک سے اتر کر میدان میں پہنچ گئے۔ لالی دھندلے سائے کی مانند ان کے سامنے بھاگتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ انھوں نے تعاقب جاری رکھا۔ زماں خان آگے آگے تھا۔ اس کی رفتار بھی تیز تھی۔ اور جوش و خروش بھی زیادہ تھا۔ مگر لالی رفتہ رفتہ دور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا دھندلا سایہ اور زیادہ دھندلا ہوتا جا رہا تھا۔ زماں خان نگاہیں اٹھائے لالی کی جانب دیکھتا رہا اور سرپٹ دوڑتا رہا۔ کرما بھی اس کے عقب میں تھا اور زیادہ سے زیادہ تیز رفتار سے دوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لالی دوڑتے دوڑتے دور نکل گیا۔ مگر اس نے اپنی رفتار سست نہ کی۔ آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے اور ان کی روشنی میں منزل سے بے خبر' لالی مسلسل دوڑ رہا تھا۔ یکایک خود رو پودوں کے درمیان سے ایک شخص نکل کر سامنے آگیا۔ کوئی راہ گیر تھا۔ کسی ضرورت سے جا رہا تھا۔ وہ اس طرح سامنے آیا کہ بچتے بچتے بھی لالی بچ نہ سکا۔ اس زور سے ٹکرایا کہ وہ بھی گرا اور لالی بھی سنبھل نہ سکا۔ اس کے پیر لڑکھڑائے اور وہ ایک جھاڑی پر گرا۔ یہ کیکر کی جھاڑی تھی۔ زیادہ گھنی نہ تھی۔ لیکن لالی کی دھوتی اور قمیص کانٹوں سے کچھ اس ڈھب سے الجھی کہ نکلنے کے بجائے وہ اس میں پھنس کر رہ گیا۔

لالی خود کو جھاڑی کے کانٹوں سے چھڑانے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ زماں خان دوڑتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ تیزی سے جھپٹا اور لالی کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ لالی نے اس کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی۔ اسی اثناء میں کرما بھی پہنچ گیا۔ وہ بھی لالی پر جھپٹا اور گردن

ایک ہاتھ ڈال کر اس طرح دبایا کہ وہ بے بس ہو گیا۔

زماں خان بری طرح ہانپ رہا تھا۔ کرما بھی ہانپ رہا تھا اور لالی بھی۔ راہ گیر جھاڑی سے ہٹ کر قدم کے فاصلے پر پڑا تھا۔ تینوں کو حیران و پریشان ہو کر دیکھ رہا تھا۔ وہ سخت خوف زدہ اور سہما ہوا اس نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ جس طرح زمین پر پڑا تھا اسی طرح دم بخود پڑا رہا۔

زماں خان ذرا سنبھلا تو زور سے دھاڑا۔ "تجھے پتہ نہیں' میں پولیس میں رہ چکا ہوں۔ مجھ سے رکوئی مجرم نکل نہیں سکا۔" اس نے گردن پکڑ کر لالی کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ منہ کے بل ن پر گرا۔

لالی کچھ دیر زمین پر پڑا رہا' پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کرما نے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا منہ پر زوردار تھپڑ بھی رسید کیا۔ لالی تڑپ اٹھا۔ غصے سے بے قابو ہو کر کرما پر جھپٹا۔ گردن جھکا اس کے منہ پر ٹکر ماری۔ کرما چوٹ سے سنبھلا بھی نہ تھا کہ لالی نے دوسری ٹکر ماری۔ اس بار سنبھل نہ سکا۔ لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ زماں خان بڑھ کر قریب پہنچا تو لالی نے پلٹ کر مکا مارا۔ مکا ہی پر ایسا بیٹھا کہ زماں خان کا سر گھوم گیا۔

لالی نے ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر کرما اٹھ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ زماں خان ن جھپٹا اور لالی کو دبوچ کر بے بس کر دیا۔ زماں خان اپنا جبڑا ایک ہاتھ سے سہلاتے ہوئے بولا۔ خانہ خراب' تو نے تو میرا دانت ہی توڑ دیا تھا۔" اس نے لالی کے منہ پر جھنجلا کر تھپڑ مارا۔

کرما نے بھی مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ مگر زماں خان نے روک دیا۔ "رہنے دے کرمے' بھٹے چل کر اس کی ٹھیک طرح گرمی اتارنی ہے۔" اس نے دھکا دے کر لالی کو آگے بڑھایا۔ تیکھے لہجے ل بولا۔ "تیری پیشگی کے آٹھ سو روپے حنیف ڈوگر کو بھٹے کے مالک نے نہیں دیے' میں نے اپنی ب سے دیے ہیں۔" اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "میں نے تو تجھے پکڑنا ہی پکڑنا تھا۔"

لالی خاموش رہا اور زماں خان اور کرما کے ہاتھوں میں جکڑا ہوا چلتا رہا۔ تینوں سڑک کی جانب وانہ ہوئے۔ میدان عبور کیا اور سڑک پر پہنچ گئے۔ تانگا موجود تھا۔ تینوں تانگے کے قریب پہنچے۔ کوچوان' تانگے سے اتر کر نیچے آگیا۔ زماں خان کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ بار یہ نکل ہی گیا۔ پر جمعدار تو نے اسے چھوڑا نہیں پکڑ ہی لایا۔ تو بھی بہت اونچی چیز ہے۔"

"جمعداری کرنا مخول نہیں۔" زماں خان نے گردن اکڑا کر کہا۔

"پر بادشاہو' اسے میرے نزدیک نہ بٹھانا۔" کوچوان نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ "ایسا کود کر وا کی طرح گیا کہ میں تو دیکھ بھی نہ سکا۔"

زمان خان نے کچھ نہ کہا۔ پہلے لالی کے سر سے پگڑی اتاری، پھر کما کے سر سے۔ دونوں پگڑیوں سے لالی کے ہاتھ پیر مضبوطی سے باندھے اور پشتارے کی مانند اٹھا کر تانگے کی پچھلی نشست پر ڈال دیا۔ خود بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا اور لالی کی ٹانگیں اپنے پیروں کے نیچے دبا لیں۔ کما اگلی نشست پر کوچوان کے برابر بیٹھ گیا اور لالی کی گردن اس طرح اپنے ایک ہاتھ کے حلقے میں دبالی کہ اگر بھاگنے کی کوشش کرے تو اس کی گرفت سے نکل نہ سکے۔

تانگا آگے بڑھا۔ سڑک پر دوڑنے لگا۔ بھٹے پر پہنچا۔ تانگا دیکھ کر پہریدار بھی پہنچنے لگے۔ زماں خان کی ہدایت پر لالی کو تانگے سے نیچے اتارا گیا۔ وہ بت کی مانند خاموش تھا اور آنے والے طوفان کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر کوئی طوفان نہ آیا۔ زماں خان نے نہ اسے مارا پیٹا اور نہ ہی گالی گلوچ کی۔ تانگے والے کو کرایہ دے کر رخصت کیا۔ لالی کے ہاتھوں اور پیروں کو کھلوایا۔

"جمعدار!" لالی نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"چپ کر کے کھڑا رہ۔" زماں خان نے غصے سے ڈانٹا۔

لالی نے مزید کچھ نہ کہا۔ زماں خان نے لوہے کی زنجیر منگوائی جس سے معتوب پتھیروں اور مزدوروں کو باندھ کر رکھا جاتا تھا۔ زنجیر آئی تو اس سے لالی کے دونوں ہاتھوں کو کس کر باندھا گیا۔ زنجیر کے دونوں سروں کے حلقوں میں تالا ڈال دیا گیا۔

بھٹے کے دفتر کے برابر ایک کوٹھری تھی۔ زماں خان نے اسے کھلوایا اور لالی کو اس میں بند کر دیا۔ کوٹھری کے دروازے پر نہ صرف لوہے کا مضبوط تالا پڑا تھا بلکہ ایک پہریدار بھی نگرانی پر مقرر تھا۔

دو روز تک لالی کو کوٹھری میں قید رکھا گیا۔

☆

صبح ہوتے ہی لالی کو باہر لایا جاتا۔ ہاتھوں پر لپٹی ہوئی زنجیر کا تالا کھولا جاتا۔ زنجیر علیحدہ کی جا
اور کام پر لگا دیا جاتا۔ دن بھر وہ بھٹے کے دوسرے پتھیروں کے ساتھ کچی اینٹیں بناتا۔ جب ت
کام کرتا اس کی کڑی نگرانی کی جاتی۔ شام کو دونوں ہاتھ پھر جکڑ دیئے جاتے۔ زنجیر کے حلقوں
تالا ڈالا جاتا، اور کوٹھری میں بند کر دیا جاتا۔

تیسرے روز کوٹھری کے بجائے لالی کو جھونپڑی میں رکھا گیا۔ یہ جھونپڑی دوسری جھونپڑیوں
جگیوں سے الگ تھلگ ایک گوشے میں تھی۔ البتہ بھٹے کے دفتر سے قریب تھی۔ اس رات
کے ساتھ ایک اور پتھیرے کو بھی رکھا گیا۔ دونوں کا ایک ایک ہاتھ ملا کر زنجیر سے جکڑ دیا

ر کے سروں کو جوڑ کر تالا ڈال دیا گیا۔ زنجیر اس قدر کس کر لپیٹی گئی کہ کلائیوں کی کھال میں اتر
ے سخت تکلیف ہوئی۔ مگر لالی نے اف نہ کی۔ دوسرا پتھیرا بھی چپ رہا۔ نہ اس نے کسی طور
اج کیا نہ دہائی دی۔

دونوں کو جھونپڑی کے اندر ایک ہی چارپائی پر لٹایا گیا۔ ٹانگوں پر مضبوط رسی لپیٹ کر چارپائی کی
ں سے اس طرح باندھ دی گئی کہ وہ نیچے نہ اتر سکیں۔ ان کی نگرانی کے لیے کوئی پہریدار تو مقرر
ں کیا گیا، مگر رات بھر جھونپڑی کے اردگرد پہریداروں کا گشت رہا۔ وہ رات کے سناٹے میں زور
رسے کھنکارتے۔ اپنی لاٹھیاں وقفے وقفے سے زمین پر مار کر بجاتے۔ ان کے قدموں کی آہٹ
لسل ابھرتی رہی۔ کبھی کبھار ان کے بولنے اور باتیں کرنے کی آوازیں بھی سنائی دیتیں۔

مگر لالی خاموش تھا۔ دوسرا پتھیرا بھی گم صم تھا۔ دونوں چارپائی پر چت لیٹے جھونپڑی کی چھت
تک رہے تھے۔ اپنے اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ نہ انھوں نے ایک دوسرے سے
ت چیت کی نہ پرسش احوال۔ دونوں دم بخود اور سہمے ہوئے تھے۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی
ی۔ لالی نے گردن موڑ کر قریب لیٹے ہوئے پتھیرے کی جانب دیکھا۔ وہ بھی ابھی تک جاگ رہا
۔ لالی نے اس کا نام پوچھا۔

"ارشاد!" اس نے لالی کی طرف دیکھے بغیر نہایت مختصر جواب دیا۔

لالی نے اس کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کی۔ "تجھے کس چکر میں یہ سزا ملی؟"

ارشاد خاموش رہا۔

لالی نے اصرار کیا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

"چپ کر کے پڑا رہ۔" وہ بے رخی سے بولا۔ "کوئی راکھا ادھر آ گیا تو دونوں کی چھتر سے پٹائی
رے گا۔"

"حد ہو گئی جی، بات کرنے پر کیوں پٹائی ہو گی؟"

لیکن اس بار بھی ارشاد خاموش رہا۔ وہ بہت خوف زدہ اور سہما ہوا نظر آ رہا تھا۔ نگاہیں اٹھائے
رستور چھت کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ نوجوان تھا۔ عمر بیس اکیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جسم لاغر
فا۔ سخت محنت اور غذائیت کی کمی اس کے چہرے پر ویرانی بن کر چھائی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے
رومی جھلکتی تھی۔ جسم کی ہڈیاں جگہ جگہ سے ابھری ہوئی تھیں کیلشیم کی کمی کے باعث بال بھورے
گئے تھے۔

لالی نے بھی اس سے مزید گفتگو کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ چپ چاپ لیٹا رہا اور پہریداروں کی

آوازیں سنتا رہا۔ جھونپڑی میں حبس تھا۔ اس کا بدن پسینے کی نمی سے چپچپا رہا تھا۔ اسی عالم میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ مگر ذرا ہی دیر بعد کھل گئی۔ ارشاد نے کروٹ لی۔ جسم کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی ہلا۔ لالی کے ہاتھ کو جھٹکا لگا۔ اسے بھی پہلو بدل کر کروٹ لینا پڑی۔ رات بھر یہی ہوتا رہا۔ ارشاد کروٹ بدلتا تو لالی بیدار ہو جاتا۔ لالی کروٹ لیتا تو ارشاد کی نیند اچاٹ ہو جاتی۔ کبھی ہاتھوں کی زنجیر پریشان کرتی کبھی پیروں میں بندھی ہوئی رسی۔ دونوں ہر بار جھنجلاتے۔ دل ہی دل میں کڑھتے۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہتے۔ تمام رات نہایت بے چینی میں کٹی۔

ان کی راتیں اسی طرح سوتے جاگتے بے چینی میں کٹتی رہیں۔ دن میں ان کو کھلا رکھا جاتا۔ کچی اینٹیں بنوائی جاتیں اور رات ہوتے ہی ہاتھوں اور پیروں کو زنجیر اور رسی سے باندھ کر چارپائی پر لٹا دیا جاتا۔ چھٹے کا دن آیا۔ وہ خوشی خوشی ہفتے بھر کی دہاڑی لینے منشی کے روبرو پہنچے۔ مگر دونوں ہی خالی ہاتھ لوٹے۔ ان کو کچھ بھی نہ ملا۔ صرف ہفتے بھر کے راشن کے طور پر فی کس ڈھائی سیر آٹا اور ایک چھٹانک نمک دیا گیا۔ ڈیڑھ چھٹانک سرخ مرچ بھی دی گئی۔

اس رات ارشاد بہت بے قرار اور پریشان معلوم ہوتا تھا۔ وہ بار بار کروٹ بدلتا۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے کروٹیں بدل بدل کر لالی کی نیند بھی اڑا دی۔ شام سے رک رک کر بارش ہو رہی تھی۔ ہوا سنسناتی ہوئی چل رہی تھی۔ پہریدار بھی گشت پر نہ تھے۔ لیکن وہ جاگ رہے تھے۔ چوکس اور چوکنا بھی تھے۔ رک رک کر کھانس رہے تھے۔ کھنکار رہے تھے۔ ان کی آوازیں رات کی خاموشی میں ابھر رہی تھیں۔

ارشاد نے ایک بار کروٹ بدلی تو لالی نے اس کے ساتھ پہلو بدلتے ہوئے احتجاج کیا۔ ”یار' تو نے آج سونا نہیں؟“

”نیند نہیں آرہی۔“ ارشاد نے آہستہ سے کہا۔ ”سر میں درد ہے۔“

لالی نے کھلا ہوا ہاتھ اٹھا کر اس کی پیشانی پر رکھا۔ ”بخار تو بالکل نہیں ہے۔“ اس نے اظہار ہمدردی کیا۔ ”شام کو بتاتا تو کسی جتھیرے سے اسپرو کی ٹکیہ مانگ لیتا۔ اسے کھانے سے درد جا رہتا۔“ وہ ایک ہاتھ سے سے ہولے ہولے اس کا سر دبانے لگا۔

ارشاد کو کچھ سکون ملا۔ وہ خاموش لیٹا رہا۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی۔ لالی نے سر دباتے دباتے دریافت کیا۔

”تو پہلے تو اس بھٹے پر نہیں ہوتا تھا۔ کہاں تھا تو؟“

”میں جی ملتان روڈ کے ایک بھٹے پر ہوتا تھا۔ وہ بھی ملک صاحب کا بھٹہ ہے۔“ ارشاد نے بتایا

”تجھے یہ تو پتہ ہی ہو گا کہ اس بھٹے کا مالک 'ملک نثار محمد' ہے۔“

”مجھے پتہ ہے یہ ملک کا بھٹہ ہے۔ پر یہ نہیں پتہ اس کے اور بھی بھٹے ہوتے ہیں اور کہاں کہاں ہوتے ہیں۔“ لالی نے اسے مطلع کیا۔ ”پر تو ادھر کیسے آگیا؟“

”کیا کرے گا جان کر۔“ اس نے بے زاری سے کہا۔

”نہیں بتانا چاہتا تو نہ بتا۔“ لالی نے کہا۔ ”باتیں کرنے سے کچھ آرام ہی ملے گا۔ نیند بھی آجائے گی۔“

”تو نے سر دبایا تو درد کچھ کم ہو گیا۔“ ارشاد نے کروٹ بدلی۔ لالی کو بھی کروٹ بدلنا پڑی۔ اب دونوں چت لیٹے تھے۔ مگر لالی اس کا سر نہیں دبا سکتا تھا۔ ارشاد نے گہری سانس بھری۔ ”ملتان روڈ کے بھٹے پر ہم آٹھ جتھیرے ایسے تھے جن کو بھٹے کا جمعدار 'دلاور' حاصل پور سے خرید کر لایا تھا۔ پچھلے مہینے منشی سے پیشگی پر ہمارا جھگڑا ہو گیا۔ اس نے ہفتے بھر کی لگ بھگ پوری ہی دہاڑی کاٹ لی۔ دوسرے تو سب چپ کر کے رہ گئے۔ پر دیدار چپ نہ رہا۔ وہ منشی کے گلے پڑ گیا۔ منشی ایک دم گرم ہو گیا۔ پہلے تو اس نے ننگی ننگی گالاں نکالیں' فیر دوات اٹھا کر ماری۔ دیدار کے متھے پر اس زور سے لگی کہ خون نکل آیا اور اس کے منہ پر پھیل گیا۔“

”منشی بہت غصے والا بندہ تھا۔“ لالی نے تبصرہ کیا۔ ”اسے اتنا غصہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”وہ جی بہت ہی غصہ کرتا ہے۔ بات بات پر گالاں نکالتا ہے۔ غصے سے پاگل ہو جاتا ہے۔“ ارشاد آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ ”پہلے بھی کئی بار وہ ایسا ہی کر چکا تھا۔ کبھی رجسٹر اٹھا کر منہ پر مار دیتا۔ کبھی کچھ اور۔ جو ہاتھ میں آجاتا وہی اٹھا کر مار دیتا۔“

”دیدار کے متھے سے خون بہتا دیکھ کر ساتھ کے جتھیروں کو بھی غصہ آگیا ہو گا۔“

”ہاں جی' ایسا ہی ہوا۔“ ارشاد نے اس کی تائید کی۔ ”سب پہلے ہی منشی سے خار کھائے ہوئے تھے۔ اس روز وہ بھی اتنے گرم ہو گئے کہ منشی پر ایک دم ہلا بول دیا۔ منشی کو گرا کر لاتوں اور مکوں سے زبردست پٹائی کی۔“

”بھٹے کا جمعدار موجود نہیں تھا؟“

”نہیں!“ ارشاد نے آہستہ آہستہ انکار میں گردن ہلائی۔ ”کرندے بھی صرف دو ہی تھے۔ وہ منشی کی مدد کو آئے تو ان کی بھی دبا کے پٹائی کی گئی۔“

”پر بعد میں تو جمعدار اور بھٹے کے دوسرے کرندوں نے تم سب کو زبردست مار لگائی ہو گی۔“

”ہاں جی بہت پٹائی کی۔“ ارشاد نے لالی کو بتایا۔ ”ہم تو بھٹہ چھوڑ کر حاصل پور کی طرف نکل

جانا چاہتے تھے۔ پر ہمارے نکلنے سے پہلے ہی جمعدار پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ کرندوں کے علاوہ اور بھی کئی بندے تھے۔ سب مسلح تھے۔ ایک کے پاس تو بھری ہوئی کاربین بھی تھی۔ وہ آگے آگے تھا۔ اسے دیکھ کر سب ڈر گئے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پٹائی کرنے کے بعد ہم سب کے ہاتھوں کو زنجیروں سے جکڑا گیا اور ایک جھگی میں بند کر دیا گیا۔"

"میں بھی دو روز تک ایسے ہی بند رہ چکا ہوں۔"

"تو نے بھی منشی سے جھگڑا کیا تھا؟" ارشاد نے پوچھا۔

"میں نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔" لالی نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "بھٹے سے تو نکل بھی گیا تھا اور بہت دور چلا گیا تھا۔ پر میرا نصیبہ ہی خراب تھا۔"

"کیا ہو گیا تھا؟" ارشاد نے بے چینی کا اظہار کیا۔

"رستے میں اس بھٹے کا جمعدار زماں خان مل گیا۔ وہ ایک کرندے کے ساتھ فلم دیکھ کر لوٹ رہا تھا۔ اس نے مجھے پکڑ لیا اور تانگے میں ڈال کر واپس لے آیا۔" لالی کے لہجے سے افسردگی جھلکنے لگی۔ "تو بتا' آگے کیا ہوا؟"

"آگے کیا ہونا تھا جی۔" ارشاد نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "تین روز تک تو روٹی بھی نہیں دی گئی۔ جھگی کے باہر ہر دکھت دو کرندے موجود رہتے تھے۔ صبح کو ٹٹی پیشاب کے لیے لے جاتے۔ پر سر پر کھڑے ہو کر کڑی نگرانی کرتے تھے۔"

"تم سب کو کام پر بھی نہیں لگایا گیا؟"

"کام شام کیسا' رات ہو یا دن' ہر دم جھگی میں بند رکھا جاتا تھا۔" ارشاد کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "ویسے بھوک کے مارے اٹھا بھی نہ جاتا تھا۔ نہ پوچھ کیا برا حال تھا۔" اس نے لحہ بھر کے لیے تامل کیا۔ "چوتھے روز روٹی ملی۔ مجھے ادھر بھیج دیا گیا۔ دوسروں پر کیا بیتی' کچھ پتہ نہیں۔ کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟ میں تو یہاں اکیلا ہی آیا تھا۔" اس نے گردن موڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ "تو میری گل سن رہا ہے ناں؟"

مگر لالی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آنکھیں بند کیے بے خبر سو رہا تھا۔ ارشاد نے اسے جگانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔ بارش اب بند ہو چکی تھی۔ پہریداروں نے گشت شروع کر دیا تھا۔ ان کے قدموں کی آہٹ رات کے سناٹے میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔

☆

مطلع بالکل صاف تھا۔ ہوا میں سرسراہٹ تھی۔ نیلے نیلے آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ لالی اور ارشاد دن بھر کچی اینٹیں بناتے رہے۔ شام کو انھوں نے روٹیاں پکائیں۔ کھانا کھایا۔ بھٹے کے کارندوں نے ان کے ہاتھ زنجیر سے جکڑ دیے۔ چارپائی پر لٹایا اور پیروں کو رسیوں سے باندھ دیا۔

رات کو ارشاد ہی نے بات چھیڑی۔ "میں تجھے بتا رہا تھا' ملتان روڈ کے بھٹے پر مجھ پر کیا بیتی۔ ادھر سے مجھے یہاں کیسے آنا پڑا۔" وہ مسکرایا۔ "مڑ کر دیکھا' تو سو رہا تھا۔"

"ہاں جی اونگھ آ گئی تھی۔ پر میں نے تیری پوری گل سن لی تھی۔" لالی نے صفائی پیش کی۔ "ساری رات ٹھیک سے سونے کو بھی نہیں ملتا۔ تو پلٹتا ہے تو میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں پلٹتا ہوں تو تو جاگ اٹھتا ہے۔ پتہ نہیں کب تک یہ چکر چلے گا۔"

"یہ تو ملک نثار کو پتہ ہو گا۔" ارشاد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس کی مرضی ہے جب چاہے سزا ختم کر دے' پر ابھی تو وہ چھوڑے گا نہیں۔ پتھیرے بتاتے ہیں بہت ظالم بندہ ہے۔"

"مجھے تو یہ پتہ ہے بھٹوں کے سارے ہی مالک ایک جیسے ہوتے ہیں۔ پتھیروں کو تو وہ ڈھور ڈنگر سمجھتے ہیں۔" لالی نے تیکھے لہجے میں اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ گردن کو خم دے کر ارشاد کی جانب دیکھا۔ "تو مجھے پرانا پتھیرا نہیں لگتا۔ تو کیسے اس چکر میں پھنس گیا۔"

"بس جی پھنس ہی گیا۔" ارشاد نے بتایا۔ "جب کوئی کام دھندا نہ ملا تو پتھیرا لگ گیا۔ پیٹ بھرنے کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے پتھیرا بننا پڑے گا۔ میرا پیو تو مجھے پڑھا لکھا کر وڈا افسر بنانا چاہتا تھا۔ اب تو یہ بالکل خواب لگتا ہے۔" اس کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔ "دیکھتے دیکھتے سب کچھ بدل گیا۔ کیا سے کیا ہو گیا؟"

"تو مہاجر تو نہیں ہے؟" لالی نے قیاس آرائی کی۔

"ہاں جی' میں مہاجر ہی ہوں۔" ارشاد نے بتایا۔ "میں گورداس پور میں ہوتا تھا۔ فسادات کی اگ بھڑکی تو بھاگ کر ادھر آ گیا۔"

"جب فسادات اور بلوے شروع ہوئے' تب تو کتنے برس کا تھا؟"

"میں جی دس گیاراں برس کا رہا ہوں گا۔" ارشاد نے لالی کو بتایا۔ "پر مجھے سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ عید منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میرے دو بھائی بہین وڈے تھے۔ ماں نے سب کے لیے نئے کپڑے لتے سلوائے تھے۔ ٹھیک چاند رات کو آس پاس کے سکھوں اور ہندوؤں نے پنڈ پر دھاوا بول دیا۔ ان کو تو مسلمانوں نے بھگا دیا تھا' پر ان کے بھاگنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ریاست پٹیالہ کی ملٹری کے فوجی' جیپوں اور لاریوں میں بھر کر حملہ کرنے پہنچے۔ ان کے پاس تو مشین گنیں بھی تھیں۔"

"انھوں نے تو بہت خون خرابہ کیا ہوگا۔" لالی نے تشویش کا اظہار کیا۔

"کوئی خون خرابہ نہیں ہوا۔ ان کے آنے سے پہلے ہی پنڈ کے سارے مسلمان بندے فصلوں میں چھپ گئے تھے۔" ارشاد نے بتایا۔ "ان کی لاریوں اور جیپوں کی بتیاں اس طرح چمک رہی تھیں کہ بہت دور تک روشنی پھیلی تھی۔ سکھ فوجی لاریوں اور جیپوں سے کود کود کر نیچے اتر رہے تھے۔ ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔ مڑ مڑ کر ہر طرف دیکھ رہے تھے۔ سارے مسلمان ڈرے ہوئے چپ کر کے بیٹھے تھے۔ پر وہ فصلوں کی طرف نہیں آئے۔ مجھے تو اب تک یاد ہے گیانی ہرنام سنگھ ایک فوجی افسر کے سامنے ہاتھ جوڑے منت کر رہا تھا۔"

"ہرنام سنگھ بھی سکھ ہی تھا نا۔ اس نے مخبری نہیں کی؟" لالی نے حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا۔

"ہاں جی، بالکل سکھ تھا۔ پر بہت نیک بندہ تھا۔ پنڈ ہی میں رہتا تھا۔ ماں بتاتی تھی، اسی نے سب کو بچایا تھا۔ اور وہی سب کو پنڈ سے نکال کر تریموں کے پتن پر لے گیا تھا۔" ارشاد سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ "سب مسلمان بندے پنڈ سے اس طرح گھبرائے ہوئے نکلے کہ گھروں کو بھی نہ جا سکے۔ سب کچھ چھوڑ دیا۔ کچھ بھی نہ لیا۔ سکھ فوجیوں کے دوبارہ آنے کا ڈر لگا تھا۔ پر مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ رستے میں کئی بار میں اپنے نئے کپڑوں کے لیے رویا۔ ماں سے واپس گھر چلنے کی ضد کرتا۔ وہ ناراض ہوتی۔ آنکھیں نکال کر ڈانٹتی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ہر دم تو سکھوں اور ہندوؤں کے حملے کا سر پر خطرہ تھا۔ نئے کپڑے پہننے اور عید منانے کا کسی کو ہوش ہی کب تھا۔ عید کا تو پتہ ہی نہ چلا۔" اس کا لہجہ اور افسردہ ہو گیا۔ "عیدیں تو بعد میں بھی آتی رہیں مگر میں نئے کپڑے کبھی نہ پہن سکا۔"

"تو اکیلا تو پاکستان نہیں آیا۔ تیرے ماں پیو، بہین بھائی بھی آئے ہوں گے۔" لالی نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کرید کر پوچھا۔ "وہ کدھر ہوتے ہیں؟"

"یہ نہ پوچھ، وہ کدھر ہوتے ہیں، اور کہاں ہوتے ہیں؟" اس نے آہ سرد کھینچی اور یوں گویا ہوا۔ "تریموں کے پتن تک تو سب ساتھ تھے۔ پر بیڑیاں اور کشتیاں چند ہی تھیں۔ بیچ میں راوی بہتا تھا اور اس پار پاکستان کی سرحد تھی۔ بس بیڑیوں میں سوار ہو کر راوی پار کرنا تھا۔ سارے ہی ملاح اور ماجھی مسلمان تھے۔ پر ایک ایک بندے کا کئی کئی سو کرایہ مانگتے تھے۔ تریموں کے پتن پر اور بھی نہ جانے کتنے مسلمان بندے پڑے تھے۔ ہر روز اور ہر دم ان کی ٹولیاں پہنچ رہی تھیں۔ سب ہی لٹ پٹ کر آ رہے تھے۔ پر ملاحوں نے نہ کسی سے رعایت کی نہ ترس کھایا۔ وہ تو جی دبا کے کمائی کر رہے تھے۔ ادھر سارے ہی بندے ننگے بھوکے تھے۔ جیبیں خالی تھیں۔ نہ کھانے کو روٹی تھی نہ سر چھپانے کو چھت تھی۔ اوپر سے زبردست بارشیں ہو رہی تھیں۔ ہر دم حملے کا بھی ڈر رہتا تھا۔"

"پر حملہ ہوا بھی کہ نہیں؟" لالی نے اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔

"بالکل ہوا تھا، ایک بار نہیں، بار بار ہوا۔" ارشاد نے مطلع کیا۔

دونوں چت لیٹے تھے۔ نہ پہلو بدل رہے تھے نہ کروٹ لے رہے تھے۔ ارشاد آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ "مجھے اب تک یاد ہے۔ اس روز بارش رکی ہوئی تھی۔ آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ سب نے اپنے بھیگے ہوئے کپڑے لتے دھوپ میں سوکھنے کے لیے ریت پر اور جنگلی جھاڑیوں پر پھیلا رکھے تھے۔ ایک دم شور اٹھا۔ بلوائی آگئے، بلوائی آگئے۔ دور سے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ سب ادھر اُدھر بھاگے۔ نزدیک ہی کھیت بھی تھے اور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں مکئی اور کماد کی فصلیں کھڑی تھیں۔ ماں میرا اور سردار کا ہاتھ پکڑ کر کھیتوں کی طرف دوڑی اور فصلوں میں گھس گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد سکھ حملہ آور گھوڑے دوڑاتے ہوئے پہنچ گئے۔ وہ اندھا دھند گولیاں چلا رہے تھے۔ خون میں ڈوبی ہوئی لال لال تلواریں اٹھائے کبھی ادھر حملہ کرتے کبھی ادھر۔ جو سامنے آیا اسے قتل کر دیا۔ نہ زنانی دیکھی، نہ بوڑھا نہ بچہ۔ ہر طرف رونے چلانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ گھوڑوں کے دوڑنے سے ریت کے بادل اٹھ رہے تھے۔ میں ماں سے چمٹا ہوا ڈرا سہا بیٹھا تھا۔"

"سارے مسلمانوں نے اکٹھے ہو کر سکھوں کا مقابلہ نہیں کیا؟"

"کئی جوانوں نے مقابلہ بھی کیا۔ پر کتنی دیر کرتے۔ ادھر لڑنے کے لیے تھا ہی کیا؟ صرف ڈانگیں اور کلہاڑیاں تھیں۔ وہ بھی تھوڑے ہی بندوں کے پاس تھیں۔ ادھر بلوائیوں کے پاس بندوقیں تھیں۔ رائفلیں تھیں۔ تلواریں تھیں۔ پوری تیاری کر کے حملہ کرنے آئے تھے۔" ارشاد نے وضاحت کی۔

"تب تو بہت مسلمان بندے مارے گئے ہوں گے۔" لالی نے تبصرہ کیا۔

"ہاں جی، بہت مارے گئے۔" ارشاد نے اعتراف کیا۔ "جب میں ماں کے ساتھ فصلوں سے باہر آیا تو شام ہو چکی تھی۔ ہر طرف خون میں ڈوبی ہوئی لاشیں ریت پر پڑی تھیں۔ ان میں میرا وڈا بھرا، کرم الٰہی بھی تھا۔ وہ بلوائیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ زخمی بھی بہت تھے۔ کوئی تڑپ رہا تھا۔ کوئی کراہ رہا تھا۔ نہ پوچھ کیسا ڈراؤنا سماں تھا۔ میں تو ایسا ڈرا ہوا تھا کہ رو بھی نہ سکا۔ ماں، کرم الٰہی کی لاش سے لپٹ کر روتی رہی۔"

"تیرا پیو کدھر تھا؟" لالی نے پوچھا۔

"ایک زخمی بندے نے بتایا۔ وہ بیڑی میں سوار ہو کر راوی پار چلا گیا تھا۔ بار بار سب کو پکارتا تھا۔ گھبرایا ہوا ادھر ادھر دوڑتا تھا۔ جب کوئی نہ ملا کوئی نہ آیا تو وہ آخری بیڑی سے چلا گیا۔" ارشاد نے دل گرفتہ ہو کر بتایا۔ "اسی زخمی بندے نے یہ بھی بتایا تھا کہ سکھ بلوائی میری جوان بھین صابرہ کو بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔ کرم الٰہی اس کو بچانے کے لیے دوڑا بھی تھا۔ پر گولی کھا کر ایسا گرا کہ دوبارہ اٹھ نہ سکا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "مجھے بہت پیار کرتا تھا۔"

"سکھ رات کو حملہ کرتے تھے یا صرف دن میں؟"

"وہ تو جی ان کی مرضی تھی۔ جب جی کرتا اکٹھے ہو کر، گھوڑیاں دوڑاتے ہوئے آتے اور دھاوا بول دیتے۔ ان کے آتے ہی ہم کھیتوں میں بھاگ کر چھپ جاتے۔" ارشاد نے لالی کو مطلع کیا۔ "خریف کی فصل سمجھو تیار ہی تھی۔ روئی شوئی تو ملتی نہیں تھی۔ مکئی کے سٹوں میں دانے آگئے تھے۔ ان کو کھا کر پیٹ بھرتے تھے۔"

ارشاد اپنی بات کہتے کہتے اچانک چپ ہو گیا۔ لالی نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ آنکھیں کھولے چھت کو تک رہا تھا۔ لالی نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "ارشاد، تو چپ کیوں ہو گیا؟"

"کیا، کیا بتاؤں تجھے۔ اب یاد کرتا ہوں تو لگتا ہے، وہ سب کچھ ڈراؤنا خواب تھا۔" ارشاد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب حملہ ہوتا تو تڑ تڑ گولیوں کی آوازیں ابھرتیں۔ ایک گولی میرے چھوٹے بھائی سردار الٰہی کی ٹانگ میں لگی، بہت خون نکلا۔ دوا دارو کو تو کچھ تھا نہیں۔ ماں نے پٹی شٹی باندھ دی تھی۔ گولی ٹانگ کے اندر ہی رہ گئی تھی۔ سردار چل بھی نہ سکتا تھا۔ ہر دم پڑا درد سے ہائے ہائے کرتا رہتا۔"

"اب وہ کہاں ہوتا ہے؟"

"وہ جی ہمارے ساتھ نہ آسکا۔" ارشاد نے دل گرفتہ ہو کر بتایا۔ "وہ ایسا ہوا جی کہ ماں نے ایک ملاح کی بہت منت کی۔ اس کے پاس جو زیور شیور تھا سب اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اسے کچھ ترس آگیا۔ وہ ہم سب کو اپنی بیڑی میں اس پار لے جانے پر تیار ہو گیا۔ ہم بیڑی میں بیٹھنے جا ہی رہے تھے کہ حملہ آور گھوڑیاں دوڑاتے ہوئے آگئے۔ ان کو دیکھتے ہی بھگدڑ مچ گئی۔ کوئی ادھر بھاگا کوئی ادھر۔ ماں نے مجھے اور سکینہ کو بیڑی میں بٹھا دیا تھا۔ وہ بھی میری وڈی بھین تھی۔ پر صابرہ سے چھوٹی تھی۔"

"صابرہ سب سے وڈی تھی؟"

"نا جی وہ کرم الٰہی سے چھوٹی تھی۔" ارشاد نے لالی کو بتایا۔ "سب سے وڈا تو کرم الٰہی تھا۔ بہت زور آور اور گبھرو ہوتا تھا۔"

"اب تو آگے کی بتا۔ سردار کا کیا بنا؟"

"سردار پیچھے رہ گیا تھا۔ کسی نہ کسی طرح لنگڑا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ پر اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ ماں اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ تب تک حملہ آور نزدیک آگئے تھے۔ ملاح نے گھبرا کر ماں کو زور زور سے ڈانٹا۔ وہ گڑگڑانے لگی۔ پر ملاح نے اس کی ایک نہ سنی۔ بازو پکڑ کر کھینچا اور دھکا دے کر جلدی سے بیڑی میں ڈال دیا۔ خود بھی بیڑی میں سوار ہوا اور تیزی سے اسے آگے بڑھانے لگا۔"

"سردار بیڑی میں نہ بیٹھ سکا؟" لالی نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"وہ جی کنارے پر کھڑا زور زور سے ماں، ماں پکار رہا تھا۔ ماں ملاحوں کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ منتیں کر رہی تھی۔ ملاحوں سے رو رو کر کہہ رہی تھی، بیڑی واپس لے چلو۔ میں نے اپنے پتر کے بنا نہیں جانا۔"

ارشاد نے آہ بھرنے کے انداز میں لمبی سانس لی۔ "ادھر بلوائیوں نے بیڑیوں پر بھی فائر کھول دیا تھا۔ گولیاں چیختی ہوئی ہمارے پاس سے گزر رہی تھیں۔ سب ڈر کر کشتی میں لیٹ گئے۔ پر ماں روتی رہی، گڑگڑاتی رہی۔ ملاح بھی بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ نراض ہو کر ماں کو ننگی ننگی گالاں نکالنے لگے۔ دوسرے بندے بھی آنکھیں نکال کر چیخنے لگے۔ کہنے لگے تو عجیب زنانی ہے۔ تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ اپنے ساتھ ہم سب کی جان لینا چاہتی ہے۔"

"تب تو وہ بھی چپ کر کے بیٹھی رہی ہو گی۔" لالی نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

"نہیں جی، ماں برابر روتی رہی، چیختی رہی۔ وہ تو دریا میں کود جاتی پر کئی بندوں نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس پار پہنچ کر بھی وہ سردار سردار کی پکار لگاتی رہی۔ ان دنوں زبردست بارشیں ہوتی تھیں۔ دریا چڑھا ہوا تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا اور اتنا شور کرتا ہوا بہہ رہا تھا کہ ماں کی آواز سردار تک پہنچ بھی نہ سکتی تھی۔ دوسرا کنارہ نظر بھی نہ آتا تھا۔ شام بھی ہو رہی تھی۔"

"سردار بعد میں بھی نہ آیا؟"

"وہ کبھی نہیں آیا۔ وہ چھوٹا سا تو چھوہرا تھا۔ چھ سال کا بھی نہ رہا ہو گا۔ زخمی بھی تھا۔ کون اسے اپنے ساتھ لاتا۔ ہر ایک کو اپنی اپنی جان کی فکر تھی۔ پتہ نہیں ہمارے آنے کے بعد اس کا کیا بنا۔ کرم الٰہی کی طرح کسی بلوائی کی گولی یا تلوار نے اسے بھی ختم کر دیا ہو گا۔ وہ تو بھاگ کر فصلوں میں چھپ بھی نہیں سکتا تھا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "دونوں بھائی مارے گئے۔ بھین بھی گئی۔ پتہ نہیں

زندہ ہے کہ مرگئی۔“

ارشاد نے کروٹ بدلی اور منہ دوسری طرف کرلیا۔ لالی کو بھی اس کے ساتھ ساتھ کروٹ بدلنا پڑی۔ ارشاد بالکل خاموش تھا۔ لالی نے آواز بھی دی۔ مگر وہ نہ بولا۔ لالی نے محسوس کیا' وہ رو رہا تھا۔ اس کی دبی دبی سسکیوں کی سرسراہٹ خاموشی میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔ لالی بھی افسردہ ہوگیا۔ ارشاد کو تسلی بھی نہ دے سکا۔ چپ لیٹا رہا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆

لالی اور ارشاد اپنے اپنے تھلّوں پر پہنچے۔ گارا بنایا اور اسے سانچوں میں بھر بھر کر کچی اینٹیں تیار کرنے لگے۔ شام تک کام کرتے رہے۔ روٹی پکائی اور مرچ اور نمک سے کھا کر جھونپڑی کے سامنے بیٹھ گئے۔ ایک کارندے نے ان کے ہاتھوں کو زنجیر سے جکڑ کر تالا ڈال دیا۔ جھونپڑی کے اندر لے گیا۔ چارپائی پر لٹایا اور پیروں کو رسی سے باندھ دیا۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ بھٹے کی چہل پہل اجڑ گئی۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا اور اس سناٹے میں گشت کرنے والے پہریداروں کے قدموں کی آہٹ وقفے وقفے سے ابھرنے لگی۔ لالی اور ارشاد جاگ رہے تھے۔ دونوں چت لیٹے تھے۔ اس طرح لیٹنے میں ان کو آرام ملتا تھا۔

پچھلی رات گفتگو کرنے کے بعد لالی کو ارشاد سے ہمدردی ہوگئی تھی۔ وہ اسے بہت مظلوم اور دل گرفتہ نظر آیا۔ اس کی ذات میں دلچسپی بھی پیدا ہوئی۔ اس نے کرید کر پوچھا۔ ”ارشاد' جب تو پاکستان پہنچا تو تیرا پیو کدھر تھا؟ وہ تو تم سب کا انتظار ہی کرتا ہوگا۔“

”پتہ نہیں جی۔ وہ ہم کو ملا ہی نہیں۔“ ارشاد نے جواب دیا۔ ”ہم سب کو لہور کے باڈلی رفیوجی کیمپ میں ٹھیرا گیا تھا۔“

”تیرا پیو بھی دوسرے پناہ گیروں کے ساتھ اسی کیمپ میں ٹھیرا ہوگا۔“ لالی نے قیاس آرائی کی۔

”کیمپ کا تو جی یہ حال تھا کہ ہر طرف بندے ہی بندے نظر آتے تھے۔ زنانیاں تھیں' منڈے اور کڑیاں تھیں۔ سب ہی اپنے اپنوں کو یاد کرکے روتے تھے۔ کسی کو کسی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ سب ہی اپنوں کو ڈھونڈتے تھے۔ ایک ایک سے پوچھتے تھے۔ ماں تو مجھے کہیں جانے بھی نہ دیتی تھی۔ ڈرتی تھی ادھر ادھر بھٹک کر کھو نہ جاؤں۔ وہ مجھے اور سکینہ کو چھوڑ کر پیو کو ڈھونڈنے نکل جاتی۔ اس کے بارے میں پوچھتی پھرتی۔ پر اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔“ ارشاد نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”ایک روز ہم تینوں کو ٹرک میں بھر کر لہور سے لائل پور پہنچا دیا گیا۔ ماں نے پیو کو وہاں بھی تلاش کیا۔ پر وہ نہ ملا۔“

”بعد میں تو نے اس کا کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی؟“

”کیوں نہیں کی۔“ ارشاد نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”میں تو چھوٹا تھا۔ ماں اسے برابر ڈھونڈتی رہی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ ہوتا۔ وہ گھروں میں نوکری چاکری کرتی۔ ہر ایک سے پیو کے بارے میں پوچھتی۔ کئی سال اسی طرح گزر گئے۔ اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم لائل پور سے خوشاب گئے' سیالکوٹ گئے' گوجرانوالہ گئے۔ اسی کو ڈھونڈتے ہوئے ملتان پہنچے۔ وہاں پتہ چلا کہ وہ بہاول نگر کے موضع نذر محمد جھلن میں ہوتا ہے۔ ماں مجھے ساتھ لے کر نذر محمد جھلن پہنچی۔“

”تیری بہین سکینہ ساتھ نہیں آئی تھی۔“ لالی نے کرید کر پوچھا۔ ”اسے کسی کے پاس چھوڑ دیا تھا؟“

ارشاد خاموش رہا۔ مگر لالی خاموش نہ رہا۔ اس نے اصرار کیا۔ ”تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ سکینہ بھی تو تیرے ساتھ ہی پاکستان آئی تھی نا؟“

”آئی تھی' بالکل آئی تھی۔ میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“ ارشاد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جب ہم خوشاب میں ہوتے تھے تو سکینہ بھی ساتھ ہی تھی۔ ماں کے ساتھ وہ بھی ایک زمیں دار کی حویلی میں کام کرتی تھی۔ اس نے ہم کو شاہ پور جہانیاں کے پیر انعام محمد کے پاس بھیج دیا۔ وہ بہت وڈا زمیں دار تھا۔ اس کے پاس سینکڑوں مربع اراضی تھی۔ حویلی بھی بہت شاندار تھی۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”ایک روز ماں کو پتہ چلا کہ سکینہ کے پیٹ میں بچہ ہے۔ وہ سخت ناراض ہوئی۔ سکینہ کو مارا۔ گالاں نکالیں' بددعائیں دیں۔ وہ چپ بیٹھی رہی۔ نہ کچھ بولی نہ روئی۔ رات کو روٹی بھی نہ کھائی۔ چپ کرکے سو گئی۔ صبح دیکھا' تو وہ غائب تھی۔ بعد میں اس کی لاش نہر میں تیرتی ہوئی ملی۔“

”اسے کسی نے کتل کرکے لاش نہر میں ڈال دی تھی؟“

”اسے کتل شتل نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے نہر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی تھی۔“ ارشاد نے دل گرفتہ ہوکر گہری سانس بھری۔ ”زمیں دار کو پتہ چلا تو اس نے ماں کو اپنے کمرے میں بلایا۔ دو سو روپے دیے اور دھمکی دی کہ سکینہ کے بارے میں کسی سے کچھ کہا تو تیرے پتر کی بھی جان جائے گی۔ ماں ایسی ڈری کہ مجھے ساتھ لے کر ایک رات چھپتی لکتی شاہ پور جہانیاں سے نکل گئی۔“

”جب تو ماں کے ساتھ نذر محمد جھلن پہنچا تو تیرا پیو وہاں موجود تھا یا تیری ماں کو غلط اطلاع ملی

تھی؟"

"اطلاع تو بالکل ٹھیک تھی' پر وہ وہاں موجود نہ تھا۔ " ارشاد نے بتایا۔ "نذر محمد جھلن میں اسے چار مربع متروکہ اراضی الاٹ ہو گئی تھی۔ وہ ادھر شان سے زمیں داری کرتا رہا۔ "

"پر وہ اپنی زمین داری چھوڑ کر چلا کیوں گیا؟"

"وہ مخدوموں کا علاکہ ہے۔ " ارشاد نے لالی کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ "مخدوم رحمان شاہ ادھر کا بہت وڈا زمین دار ہوتا ہے۔ اس نے کسی بھی مہاجر کو ادھر ٹھیرنے نہ دیا۔ طرح طرح سے تنگ کرتا تھا۔ مزارعوں کو سرکشی پر اکساتا تھا۔ اس کے کرندے مسلح ہو کر آتے' ڈراتے دھمکاتے۔ جب میرا پیو ڈرانے دھمکانے پر بھی اپنی زمین داری چھوڑنے پر تیار نہ ہوا تو اس نے اپنے کرندوں کو بھیجا۔ وہ اسے گرفتار کر کے مخدوم کے پاس لے گئے۔ وہ مجسٹریٹ بھی ہوتا تھا۔ اس نے میرے پیو کے خلاف مویشی چوری کا جھوٹا مکدمہ بنوایا۔ اس کی اپنی جیل بھی تھی۔ اس نے میرے پیو کو اپنی جیل میں بند کر دیا۔ اس کی خریف کی فصل تیار کھڑی تھی۔ اسے بھی اٹھوا لیا۔ گھر توڑ پھوڑ کر گرا دیا۔ بہت ظلم کیا جی؟"

"تیرا پیو کب تک مخدوم کی جیل میں رہا؟"

"یہ تو جی مجھے پتہ نہیں۔ " ارشاد نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ "سنا ہے جب وہ جیل سے نکلا تو سخت بیمار تھا۔ اسے بخار رہتا تھا۔ ہر دم کھانستا رہتا تھا۔ جیل سے نکلنے کے بعد وہ ایک روز بھی نذر محمد جھلن میں نہ ٹھیرا۔ مخدوم چاہتا بھی یہی تھا۔ اس کے پاس منظور شدہ کلیم ہوتا تھا۔ وہ متروکہ اراضی کی الاٹمنٹ کے لیے کسی اور طرف نکل گیا۔ "

"اس کے پاس کلیم بھی ہوتا تھا؟ پہلے بھی زمیں دار ہی رہا ہو گا؟" لالی نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔

"ہاں جی' وہ زمیں دار ہی ہوتا تھا۔ " ارشاد نے نہایت اعتماد سے بتایا۔ "ویسے تو وہ ریاست پٹیالہ کی پولیس میں حوالدار ہوتا تھا' پر ماں بتاتی تھی ضلع گورداس پور کے موضع نصیرپور میں اس کے پاس سات مربعے ہوتے تھے۔ پکی ماڑی تھی۔ وہ اچھا وڈا زمیں دار تھا۔ "

لالی نے چونک کر گردن موڑی۔ ارشاد کو غور سے دیکھا۔ "تو پہلے گورداس پور کے موضع نصیر پور میں ہوتا تھا؟" وہ پہلے سے بھی زیادہ حیرت زدہ نظر آتا تھا۔

ارشاد نے بھی اس کے لہجے میں حیرت محسوس کی۔ "ہاں جی' نصیرپور ہی میں ہوتا تھا۔ پر اس میں اتنے اچنبھے کی کون سی گل ہے؟"

لالی نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے استفسار کیا۔ "تیرے پیو کا نام کیا تھا۔ وہ چوہدری تو نہیں تھا؟"

"ہاں جی چوہدری ہی تھا۔ " ارشاد نے کہا۔ "اس کا نام چوہدری نور الٰہی اور میرا ارشاد الٰہی ہے۔ پر تو ایسی گل بات کیوں پوچھ رہا ہے؟" اس کے لہجے میں بھی استعجاب تھا۔ "تو اسے جانتا ہے؟"

"ہاں میں اسے جانتا ہوں۔ " لالی نے مسکرا کر خوش خبری سنائی۔

ارشاد الٰہی نے بے قرار ہو کر پوچھا۔ "تو نے اسے کہاں دیکھا کب دیکھا؟"

"میں ان دنوں فیروز پور روڈ کے ایک بھٹے پر نیا نیا *تمیرا لگا تھا۔ " لالی نے بتایا۔ "تیرا پیو جیپ میں بیٹھ کر ادھر آیا تھا۔ "

"یہ کب کی گل ہے؟" ارشاد الٰہی کی آواز میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ تھی۔

"پچھلے ہی برس کی گل ہے۔ یہی گرمی کے دن ہوتے تھے۔ "

"تب تو اسے نہیں جانتا۔ " ارشاد الٰہی کا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرے پیو کو تو مرے ہوئے بھی تین برس سے اوپر ہو گئے۔ "

"تجھے کسی نے غلط بتایا۔ وہ مرا نہیں' زندہ ہے۔ " لالی نے اسے باور کرانے کی کوشش کی۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے۔ " اس نے شاداں کا حوالہ دیے بغیر مطلع کیا۔ "مجھے یہ بھی پتہ ہے وہ گورداس پور کے موضع نصیرپور کا مہاجر ہے۔ اس کا نام چوہدری نور الٰہی ہے۔ تب ہی تو میں نے اس کا نام اور موضع پوچھا تھا۔ "

"پر میں نے تو اس کی کبر بھی دیکھی ہے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ وہ مکان بھی دیکھا ہے جس میں وہ مرا تھا۔ " ارشاد الٰہی نے لالی کا بیان تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ "پتہ نہیں تو کس کی گل کر رہا ہے۔ "

"تو نے کب اس کی کبر دیکھی تھی؟" لالی نے جھجکتے ہوئے استفسار کیا۔

"دو برس پہلے دیکھی تھی۔ " ارشاد الٰہی نے مطلع کیا۔ "تو پچھلے برس کی گل کر رہا ہے۔ " اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "وہ کبر سے نکل کر تو تیرے پاس آنے سے رہا۔ تجھے دھوکا ہوا۔ وہ کوئی اور ہی بندہ ہو گا۔ "

"تیری بات سمجھ نہیں آئی۔ " لالی الجھن میں پڑ گیا۔ اسے یقین تھا کہ شاداں نے اسے نور الٰہی

کے بارے میں وہی بتایا تھا' جو اس کی زبانی سنا تھا۔ وہ اس سے ایک بار نہیں کئی بار مل چکی تھی۔ ایک عرصے سے اسے جانتی تھی لالی نے کرید کر پوچھا۔ "ارشاد' یہ بتا تو نے اپنے پیو کی کبر کہاں دیکھی تھی۔ تو وہاں تک پہنچا کیسے؟"

"میں نے چک ۵۸ میں اس کی کبر دیکھی تھی۔" ارشاد الٰہی نے بتایا۔ "میں ان دنوں بھی حاصل پور ہی میں ہوتا تھا۔ وہیں مجھے پٹیالہ کے ایک مہاجر سے پتہ چلا تھا۔ میرا پیو بھی متروکہ اراضی کی الاٹمنٹ کے لیے ادھر گیا تھا' پر اسے وہاں الاٹمنٹ نہیں ملی۔ بعد میں وہ چک ۵۸ چلا گیا اور ادھر الاٹمنٹ کے لیے کوشش کر رہا تھا۔ ان دنوں وہ بیمار تھا اور وہیں رہتا تھا۔ مجھے جیسے ہی اس کے بارے میں پتہ چلا' میں فوراً چک ۵۸ پہنچا۔"

"ماں بھی تیرے ساتھ گئی تھی؟"

"لو جی' وہ کیوں نہ جاتی۔ وہی تو مجھے لے کر ادھر گئی تھی۔" ارشاد الٰہی نے جواب دیا۔ "چک ۵۸ زیادہ وڈا پنڈ نہیں ہے۔ پہلے دو زمیں دار ہوتے تھے۔ ایک مسلمان اور دوسرا ہندو کراڑ تھا۔ مسلمان زمین دار تو ابھی تک ادھر ہوتا ہے پر ہندو زمین دار پاکستان بننے کے بعد بال بچوں کے ساتھ بھاگ کر سرحد پار چلا گیا۔ بعد میں اس کی زمینوں پر مزارعوں نے کبضہ کر لیا۔ اکبر بھی اس کا مزارع تھا۔ پر بہت نیک بندہ ہے۔ اکبر چاہتا تھا' وہ زمین جو اس نے دبا رکھی تھی' میرے پیو کے نام الاٹ ہو جائے اور وہ اس کا مزارع بن کر کاشت کرے۔"

"اکبر کے پاس جو زمین تھی' وہ تیرے پیو کے نام الاٹ ہو گئی تھی؟"

"الاٹ تو ہو جاتی پر میرا پیو بہت بیمار تھا۔ اکبر بتاتا تھا وہ کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ ہر وکھت منجی پر پڑا کھانسا کرتا۔ بکھار بھی رہتا تھا۔ کھانستا تو منہ سے خون بھی آتا تھا۔" ارشاد الٰہی نے گہری سانس بھری۔ "اسے جی ٹی بی تھی۔ اسے یہ بیماری مخدوموں کی جیل میں ہی ہو گئی تھی۔ ٹھیک سے دوا دارو بھی نہیں ہوا۔ ایک حکیم سے دوائی لاتا تھا۔ پر بیماری کم نہ ہوئی اور بڑھ گئی۔"

"جب وہ اتنا سخت بیمار تھا تو اس کا کام کیسے چلتا تھا۔"

"اکبر اور اس کی گھر والی' جیناں میرے پیو کا سارا کام کرتے تھے۔ جیناں اس کے لیے روٹی تیار کرتی تھی۔ صبح شام خود پہنچاتی تھی۔ اس کے کپڑے دھوتی تھی۔ گھر کی صفائی کرتی تھی۔ خوشی خوشی ہر کام کرتی تھی۔ اکبر بھی اس کی مدد کرتا تھا۔ حکیم دوسرے پنڈ میں ہوتا تھا۔ وہ ان سے اس کے لیے دوائی لاتا تھا۔" ارشاد الٰہی آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ "دونوں بہت نیک بندے ہیں۔ مزارع نہ ہونے پر بھی وہ خود کو میرے پیو کا مزارع سمجھتے تھے۔"

"تو ان سے ملا تھا؟" لالی نے دریافت کیا۔

"میں چک ۵۸ گیا۔ تو ان کے ہی گھر میں ٹھیرا تھا۔" ارشاد الٰہی نے لالی کو بتایا۔ "میں نے وہ مکان بھی دیکھا جس میں میرا پیو رہتا تھا۔ جیناں مجھے اور ماں کو لے کر وہاں گئی تھی۔ رو رو کر میرے پیو کے بارے میں بتاتی تھی۔ کہتی تھی' وہ ہر دم ہم سب کو یاد کرتا رہتا تھا۔ جگہ جگہ ڈھونڈتا تھا۔"

"تیرے پیو کے پاس تو روپیہ پیسہ بھی ہو گا۔ اس کا تو منظور شدہ کلیم بھی تھا۔ اکبر اور جیناں نے وہ سب کچھ تجھے اور تیری ماں کو نہیں دیا؟"

"میرے پیو کے بکسے سے کل ۲۲ روپے نکلے تھے جس سے اس کا کفن دفن کر دیا گیا۔" ارشاد الٰہی نے جواب دیا۔ "کلیم کے کاغذات بکسے سے نہیں نکلے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "جیناں نے مجھے وہ بکسہ دکھایا تھا جس میں میرے پیو کے کپڑے لتے تھے۔ کنگھی اور آئینہ تھا۔ اس کی پگڑی اور جوتے تک جیناں نے بکسے میں بند کر کے رکھ چھوڑے تھے۔"

"پر اس کے کلیم کے کاغذات کہاں گئے؟ اکبر اور جیناں کے تو وہ کسی کام کے نہ تھے۔" لالی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "تو نے یا تیری ماں نے ان کے بارے میں اکبر اور جیناں سے ملوم نہیں کیا؟"

"ملوم کیا تھا۔ ماں نے تو بار بار پوچھا تھا۔" ارشاد الٰہی نے کہا۔ "اکبر کہتا تھا اس نے کلیم کے کاغذات میرے پیو کے پاس دیکھے بھی تھے۔ وہ ان کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر رکھتا تھا۔ زمین کی الاٹمنٹ کے لیے سرکاری افسروں کے پاس جاتا تو کاغذات اس کے ہاتھ میں دبے ہوتے تھے۔ واپسی پر بکسے میں رکھ دیتا تھا اور اس میں تالا ڈال دیتا تھا۔ اس کے پاس سیکل بھی ہوتی تھی۔ اسی پر سوار ہو کر وہ سرکاری افسروں کے پاس جاتا تھا۔ وہ سیکل بھی میں نے دیکھی۔" ارشاد الٰہی نے گردن موڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ "اکبر نے سیکل' بکسہ اور بستر' سب کچھ مجھے دے دیا تھا۔ سیکل تو میں نے بعد میں بیچ دی تھی۔ کرتا بھی کیا' ان دنوں تو اپنے پاس پیٹ بھرنے کو بھی کچھ نہ تھا۔"

لالی کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ کلیم کے کاغذات ہوتے تو اکبر وہ بھی تجھے دے دیتا۔"

"ضرور دے دیتا۔ میں نے بتایا نا کہ اکبر بہت نیک بندہ ہے۔ میں نے اور ماں نے پوچھا تو ہر بار یہی کہتا تھا' پتہ نہیں کہاں چلے گئے۔ نہ بکسے میں ملے نہ بستر تلے ملے۔ بہت ڈھونڈا پر کہیں نہ ملے۔" ارشاد الٰہی لحہ بھر خاموش رہ کر گویا ہوا۔ "پر اس نے ایک عجب گل بھی بتائی۔"

"وہ کیا تھی؟" لالی نے بے چینی کا اظہار کیا۔

"اکبر کہتا تھا' میرے پیو کے مرنے سے دو تین روز پہلے اس کے پاس ایک انجان بندہ آکر ٹھہر تھا۔ نہ وہ کبھی گھر سے باہر نکلا نہ اسے کسی نے دیکھا۔"

"اکبر کو اس کے بارے میں کیسے پتہ چلا؟؟"

ارشاد الٰہی نے لالی کو بتایا۔ "اکبر نے ایک شام کھڑکی سے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے پیو کے نزدیک موڑھے پر بیٹھا آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا۔ اکبر نے اس کے بارے میں اپنی گھر والی جیناں کو بھی بتایا تھا۔ پر جیناں نے جب میرے پیو سے پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ بولا' جیناں تجھ دھوکا ہوا۔ میرے پاس تو کوئی بندہ نہیں آیا۔"

"اکبر کو دھوکا ہی ہوا ہو گا۔" لالی نے تبصرہ کیا۔

"پر اکبر بتاتا تھا کہ جیناں سے بات کرنے کے بعد بھی اسے اطمینان نہ ہوا۔ دوسرے روز شام کا اندھیرا ہوتے ہی وہاں پہنچا۔ چھپ کر کھڑکی سے جھانکا تو وہ میرے پیو کے پاس موجود تھا آرام سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر میرے پیو کو پانی بھی پلایا تھا۔ اکبر نے اسے ٹھیک طر دیکھا تھا۔" ارشاد الٰہی نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "پر سویرے وہ اس بھید کو جاننے کے میرے پیو کے پاس پہنچا تو وہ بستر پر مرا ہوا پڑا تھا۔"

"یہ تو بہت اچنبھے کی گل ہوئی۔" لالی نے حیرت سے کہا۔ "تو نے اس بارے میں کھوج لگا کی کوشش نہیں کی؟؟"

"جیناں کہتی تھی' وہ موت کا فرشتہ تھا۔ بھیس بدل کر میرے پیو کی روح کھینچنے آیا تھا۔" ار الٰہی نے آہستہ سے کہا۔ "یہ بات اسے مسجد کے ملاں نے بتائی تھی۔"

"پتہ نہیں کیا چکر تھا۔" لالی نے اپنی رد عمل کا اظہار کیا۔

ارشاد الٰہی نے کچھ نہ کہا۔ خاموش لیٹا رہا۔ لالی بھی تھوڑی دیر چپ پڑا سوچتا رہا' پھر اس آہستہ سے کھنکار کر کہا۔ "اپنی سمجھ میں تو یہ آتا ہے' مرنے والا تیرا پیو نہیں تھا۔ کوئی اور ہی تھا۔" اس نے مسکرا کر ارشاد کی طرف دیکھا۔ "شادے! تیرا پیو مرا نہیں زندہ ہے۔ اس نے کلیم کے ذریعے ضلع منٹگمری کی تحصیل دیپال پور میں متروکہ اراضی الاٹ کرا رکھی ہے۔ کو ہر کشن میں اس کی زمیں داری ہے۔ وہ ادھر کا وڈا زمیں دار ہے۔ شان سے حویلی میں رہتا۔ حویلی بھی اسے کلیم ہی میں ملی ہے۔" یہ تمام تفصیلات اسے شاداں ہی نے بتائی تھیں۔ مگر لالی اس بار بھی شاداں کے متعلق ارشاد الٰہی سے کوئی ذکر نہ کیا۔ ضرورت بھی نہ تھی۔ لالی نے ایک پھر اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "لگتا ہے' تجھے اپنے پیو کے بارے میں ٹھیک سے پتہ

"شاید ایسا ہی ہو۔" ارشاد الٰہی مخمصے میں پڑ گیا۔ اس نے مزید وضاحت کی۔ "پر میں دو بار اپنے کے بارے میں پوچھ تاچھ کے لیے چک ۵۸ جا چکا ہوں۔ کادر آباد سٹیشن سے بہت نزدیک ہے۔ سمجھ' نہریاری دو آب کے ٹبوں کے بالکل اس پار ہے۔ آگے تخت ہزارہ ہے۔"

☆

لالی کو رحیم داد یاد آ گیا۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد اس نے روپوش ہونے کے لیے نہریاری آب کے اجاڑ اور اونچے نیچے ٹبوں اور ٹیلوں کو اپنا ٹھکانا بنایا تھا۔ رحیم داد بھی اس کے ہم راہ ۔ اس کی لاش بھی ٹیلوں کے درمیان ہی ملی تھی۔ پولیس کی حراست میں رحیم داد کی لاش اسی شناخت کی تھی۔ لیکن لاش اس بری طرح مسخ ہو چکی تھی کہ صرف جیل کی وردی ہی سے ازہ لگایا جا سکتا تھا جو ہنوز مقتول کے جسم پر موجود تھی۔ البتہ اسے اپنی وہ ہمیانی بار بار دیکھنے کے جو نظر نہ آئی تھی جس میں تین ہزار سے اوپر رقم تھی۔ یہ ہمیانی پولیس سے مقابلہ کرتے ہوئے نے احتیاطاً رحیم داد کے حوالے کر دی تھی۔ اور یہ ہدایت بھی کی تھی کہ اسے حفاظت سے کمر کرد باندھ لے۔ مگر لاش کی کمر پر ہمیانی نہ تھی۔ قاتلوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی یا ہو سکتا ہے لیس والوں نے اڑا لی ہو۔ لالی نے اس وقت ہمیانی کے بارے میں یہی قیاس آرائی کی تھی۔

وہ اب تک نہ ہمیانی بھولا تھا نہ رحیم داد کو۔ اس کی نگاہوں میں چوہدری نور الٰہی کا چہرہ گردش رنے لگا۔ اس چہرے کی پیچھے اسے رحیم داد کی ہلکی سی جھلک نظر آئی جسے اس نے چوہدری نور الٰہی دیکھتے ہی محسوس بھی کیا تھا۔ لیکن لالی نے اپنے اس شبے کا کبھی شاداں سے اظہار نہ کیا۔ لالی ے اسے صرف چند لمحے کے لیے دیکھا تھا۔ نہ بات چیت کا موقع ملا تھا نہ غور سے دیکھنے کا۔ دوبارہ قات کی نوبت ہی نہ آئی۔ شبہ ابھرا اور ذہن کے نہاں خانے میں دب کر گم ہو گیا۔ مگر اب وہ اس ے متعلق خاموشی سے لیٹا ہوا سوچ رہا تھا۔

"تو کس سوچ میں پڑ گیا؟" ارشاد الٰہی نے اس کی طویل خاموشی سے اکتا کر دریافت کیا۔

لالی خیالات کے حصار سے فوراً باہر نکل آیا۔ ارشاد الٰہی سے پوچھا۔ "تو اپنے پیو کو دیکھ کر پہچان لے گا نا؟؟"

"پہچان تو لینا چاہیے۔" اس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ "ویسے دس گیاراں برس میں میری [illegible] بھی بہت بدل گیا ہو گا۔"

ارشاد الٰہی کے لہجے سے تذبذب آشکارہ تھا۔ لالی نے بھی اسے محسوس کیا۔ "پر تیری ماں تو

اسے دیکھتے ہی پہچان لے گی۔ ” اس نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ “وہ اسے ضرور پہچان لے گی۔ برسوں گھر والی بن کر اس کے ساتھ رہی ہے۔ اس کے تین پتردں اور دو بیٹیوں کو پیدا کر چکی ہے۔ ” لالی نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ “تو میری بات کا مطلب سمجھ گیا نا؟”

مگر ارشاد الٰہی! اتنا ذہین اور جہاندیدہ نہ تھا کہ لالی کی بات کی تہہ تک پہنچ جاتا۔ وہ چند لمحے تک ہونق کی طرح نظریں اٹھائے لالی کو تکتا رہا‘ پھر اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ “ہاں وہ اسے پہچان لے گی۔ دیکھتے ہی پہچان لے گی۔ ” اس کے رویّے سے اعتماد جھلک رہا تھا۔

“تیری ماں آج کل کہاں ہوتی ہے؟”

ارشاد الٰہی نے لالی کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ چپ لیٹا چھت کو تکتا رہا۔

مگر لالی چپ نہ رہ سکا۔ اصرار کر کے پوچھا۔ “شادے! تجھے یہ تو پتہ ہی ہو گا کہ تیری ماں کہاں ہے اور کس کے پاس ہے؟”

“ملتان میں ہوتی ہے۔ ” ارشاد الٰہی نے لالی کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔ وہ نگاہیں اٹھا چھت کو تک رہا تھا۔

“ادھر بھی کسی کے پاس نوکرانی شوکرانی لگی ہوئی ہے؟” لالی نے کرید کر دریافت کیا۔ “کوئی کوئی کام دھندا تو کرتی ہی ہو گی۔ ”

“کیا کرے گا جان کر وہ کیا کرتی ہے۔ ” ارشاد الٰہی نے بے زاری سے کہا۔

“جب تو نے سب کچھ مجھے بتا دیا تو یہ بھی بتا دے وہ کیا کرتی ہے؟” لالی نے دبی زبان سے احتجا کیا۔ “ویسے نہیں بتانا چاہتا تو نہ بتا۔ مجھے اس سے کیا لینا۔ ”

“میں نے تجھے یہ نہیں بتایا کہ ‘جب ہم لہور کے رفیوجی کیمپ میں ہوتے تھے تو ایک رات ر کار نہ جانے کس طرح سکینہ کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ ”

“رضا کار تیری بہین کو اٹھا کر لے گئے تھے؟” لالی نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔

“ہاں جی رضا کار ہی اٹھا کر لے گئے تھے۔ ” ارشاد الٰہی نے بلا جھجک بتایا۔ “پر یہ بات بھی ا رضا کار ہی نے ماں کو بتائی تھی۔ ” اس نے گردن گھما کر لالی کی جانب دیکھا۔ “سب ہی بندے ا سے تو نہیں ہوتے۔ چنگے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ وہ رضا کار بھی چنگا اور نیک بندہ تھا۔ ا نام وارث تھا۔ عمر بھی اس کی زیادہ نہیں تھی۔ ٢٢ برس سے زیادہ کا نہ ہو گا۔ ہر ایک کی مد تھا۔ کبھی ناراض نہ ہوتا تھا۔ بات بھی بہت پیار سے کرتا تھا۔ ”

لالی نے ارشاد الٰہی کو ٹوکا۔ “تو سکینہ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وارث کو کہاں سے بیچ میں آیا۔ ”

“ہاں جی‘ میں سکینہ ہی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ” ارشاد الٰہی نے لالی کی مداخلت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ “تجھے پتہ نہیں وارث کتنا بھلا بندہ تھا۔ پہلے کالج میں پڑھتا تھا۔ پر ان دنوں تو سکول کالج سب بند تھے۔ میں جب نصیر پور میں ہوتا تھا تو پرائمری اسکول کی تیسری جماعت میں ہوتا تھا۔ ہمیشہ اول آتا تھا۔ تب ہی تو میرا پیو مجھے آگے پڑھا کر وڈا افسر دیکھنا چاہتا تھا پر نصیر پور چھوٹا تو میری پڑھائی بھی چھوٹ گئی۔ سکول جانا نصیب نہ ہوا۔ روٹی تو پیٹ بھر کر ملتی نہیں تھی۔ پڑھتا کیسے طرح طرح کے کام دھندے کرتا رہا۔ کبھی یہاں لگ گیا کبھی وہاں۔ ” اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ “اپنے نصیب میں تو ‘تھیرا بننا لکھا تھا۔ آخر ‘تھیرا بن گیا۔ گل ایہہ ہے۔ ”

“سکینہ کیسے واپس ملی؟” لالی نے اکتا کر مداخلت کی۔

“وارث ہی کی مدد سے ملی تھی۔ ” ارشاد الٰہی نے بتایا۔ “رضا کاروں نے اسے ایک کنجری کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ یہ اطلاع بھی وارث ہی نے دی تھی۔ ماں کو پتہ چلا تو وہ اس کنجری سے سکینہ کو واپس لینے ہیرا منڈی پہنچی۔ پر اس نے واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ ماں نے ناراض ہو کر شور شرابہ کیا۔ کنجری اور اس کے دلّوں نے ماں کو مارا پیٹا اور دھکّے دے کر اپنے گھر سے نکال دیا۔ ” اس نے جھنجلا کر گالی دی۔ “ایسے زور سے اسے دھکّا دیا کہ سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی دور جا کر گری۔ کمر میں ایسی زبردست چوٹ آئی کہ اس سے اٹھا بھی نہ گیا۔ زمین پر پڑی ہائے ہائے کرتی تھی۔ ”

“وارث اس کے ساتھ نہیں تھا؟”

“وہ بعد میں پولیس لے کر پہنچا تھا۔ ” ارشاد نے لالی کو مطلع کیا۔ “پولیس کو دیکھ کر کنجری اور اس کے دلّے ڈر گئے۔ سکینہ کو واپس کر دیا۔ بہت ساری منتیں بھی کیں۔ ”

“اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وارث مدد نہ کرتا تو سکینہ واپس نہ آتی۔ ” لالی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ “کنجری کے ساتھ رہ کر کنجری بن جاتی۔ ”

“ہاں جی‘ ایسا ہی ہوتا۔ ماں کو تو انھوں نے دھکّے دے کر نکال ہی دیا تھا۔ ” ارشاد الٰہی نے کہا۔ “کئی روز تو وہ پڑی رہی۔ کمر پر بہت زور کی چوٹ آئی تھی۔ بعد میں مالش کرانے سے کچھ ٹھیک ہو گئی تھی۔ پر ٹھیک سے چل نہ سکتی تھی۔ دھیرے دھیرے درد جاتا رہا۔ ہاں‘ سردی میں اس کا درد بڑھ جاتا۔ کچھ عرصہ وہ بھی میرے ساتھ حاصل پور کے بھٹے پر کام کرتی رہی۔ پر ایک رات اندھیرے میں بھٹے کے گڑھے میں گر گئی۔ اس بار بھی اس کی کمر پر چوٹ آئی اور ایسی زبردست چوٹ آئی کہ اس سے کام نہ کیا جاتا تھا۔ لنگڑا لنگڑا کر چلتی تھی۔ جب اس میں بالکل کام کرنے کی

سکت نہ رہی تو ایک روز حاصل پور سے چلی گئی۔ مجھے بتایا بھی نہیں۔ بعد میں پتہ چلا وہ ملتان چلی گئی تھی۔"

"ملتان میں وہ کیا کرتی ہے؟"

"اب تجھ سے کیا چھپانا' وہ ملتان کی ایک درگاہ پر بھیک مانگتی ہے۔" ارشاد الٰہی نے افسردہ لہجے میں بتایا۔ "وہ ملنگوں اور بھکاریوں کے ساتھ رہتی ہے۔"

"تو اس کے پاس گیا نہیں؟" لالی نے دریافت کیا۔

"نہیں' پر مجھے پتہ ہے وہ کہاں ہوتی ہے۔"

"تجھے اس کے پاس جانا چاہیے تھا۔" لالی نے اس کے رویے کو پسند نہ کیا۔ "اسے اپنے پاس لا کر رکھتا۔ تجھے یہ جان کر دکھ نہیں ہوتا' تیرے ہوتے ہوئے وہ لاوارثوں کی طرح ملتان میں پڑی بھیک مانگتی رہے۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" ارشاد نے لالی کی بات پر کسی خفگی کا اظہار نہ کیا۔ "میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اسے اپنے پاس لے آؤں۔ پر میں ملتان جا نہ سکا۔ ملتان روڈ کے بھٹے کا جمعدار ولاور دوسرے پتھیروں کے ساتھ مجھے بھی خرید کر حاصل پور سے لہور لے آیا۔ تب سے میں ادھر ہی ہوں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "اب تو ماں کے پاس جا بھی نہیں سکتا۔ پتہ نہیں کیسی ہے؟ کس حال میں ہے؟"

"پرواہ نہ کر شادے' میں تجھے ماں کے پاس ملتان لے جاؤں گا۔" لالی نے اسے تسلی دی۔

"تو مجھے ماں کے پاس لے جائے گا۔" ارشاد الٰہی نے تعجب کا اظہار کیا۔ "تو مجھے ملتان کیسے لے جا سکتا ہے۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "بھٹے سے باہر جانے کی تو اجازت نہیں۔ تو ملتان جانے کی گل کر رہا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"تجھے جلد ہی پتہ چل جائے گا میں تجھے کیسے ملتان لے جاؤں گا۔" لالی نے اسے اطمینان دلایا۔

"سمجھ نہیں آتی تو مجھے کیسے لے جائے گا۔؟" ارشاد الٰہی مطمئن نہ ہو سکا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر زنجیر کو آہستہ آہستہ ہلایا۔ "یہ زنجیر دیکھ رہا ہے۔"

"دیکھ رہا ہوں' بالکل دیکھ رہا ہوں۔ پر یہ ہمیشہ تو ہاتھوں میں نہیں پڑی رہے گی۔ ایک نہ ایک روز تو اس سے چھٹکارہ مل ہی جائے گا۔"

"مان لے زنجیر سے ہاتھوں کو باندھنا بند بھی کر دیا گیا تب بھی تو بھٹے سے باہر کیسے نکلے گا؟" ارشاد الٰہی نے بے دلی سے کہا۔ "تو نے دیکھا نہیں کرندے ہم دونوں کی کتنی کڑی نگرانی کرتے

ہیں۔ دن میں تو رات سے بھی زیادہ نگرانی کرتے ہیں۔ کسی دوسرے پتھیرے سے بات تک تو کرنے نہیں دیتے۔ آنکھیں نکال کر ڈانٹتے ہیں۔"

"نگرانی شگرانی تو چلتی ہی رہے گی۔" لالی کے لہجے میں اعتماد تھا۔ "تو دیکھ لینا۔ ایک روز یہاں سے صاف نکل جاؤں گا اور تجھے بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"میں نے ایسا نہیں کرنا۔" ارشاد الٰہی نے صاف انکار کر دیا۔ وہ خوف زدہ اور گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ "تو ایسا کیوں کر کر سکتا ہے؟"

"یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔" لالی نے اسے ایک بار پھر مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "تو چپ کر کے دیکھتا جا۔ میں جیسا کہوں تو ویسا ہی کرنا دونوں آرام سے نکل جائیں گے۔"

"نہیں جی' اس طرح کسی اور چکر میں پڑ جائیں گے۔" ارشاد الٰہی آمادہ نہ ہوا۔ وہ بدستور خوف زدہ تھا۔ "یہ تو سوچ فرار ہونے کی کوشش میں پکڑے گئے تو کیا ہو گا؟"

"پکڑے بھی گئے تو کیا ہو گا۔ جیسے اب زنجیر سے جکڑ کر رکھا گیا آگے بھی ایسے ہی رکھا جائے گا۔ جان سے تو نہیں مار دیا جائے گا۔ پھانسی پر تو نہیں لٹکایا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا۔ نگرانی اور سخت کر دی جائے گی۔" لالی نے اسے للکارا۔ "شادے! حوصلے سے کام لے حوصلے سے۔" اس نے آہستہ آہستہ زنجیر ہلائی۔ "تجھے اس زنجیر سے ہاتھ میں درد ملوم نہیں ہوتا؟"

"کیوں نہیں ملوم ہوتا۔ رات میں ٹھیک سے نیند بھی نہیں آتی۔ دن میں اینٹیں تیار کرنے اور گارا بنانے میں بھی بہت تکلیف ہوتی ہے۔"

"یہ تو سوچ نہ دہاڑی لگتی ہے نہ پیٹ بھر روٹی ملتی ہے۔ اس طرح ہم کب تک، ویگار کرتے رہیں گے؟ کب تک اس طرح زنجیر اور رسی سے جکڑے ہوئے ساری ساری رات پڑے رہیں گے؟" لالی نے ارشاد الٰہی کی ہمت افزائی کی۔ "اس مصیبت سے نکلنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔" اس نے ارشاد الٰہی کو ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ "کیسے یہاں سے نکلیں گے' یہ تیرے سوچنے کی گل نہیں۔ آگے میں جو کچھ کروں گا اچھی طرح سوچ بچار کر کے کروں گا۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "میں تجھے ماں سے بھی ملاؤں گا اور تیرے پیو کے پاس بھی لے جاؤں گا۔ تجھے غلط اطلاع ملی۔ تیرا پیو مرا نہیں زندہ ہے۔ وہ کوٹلہ ہرکشن میں شان سے زمیں داری کرتا ہے۔ تو اس کے پاس چلا گیا تو عیش کرے گا۔"

ارشاد الٰہی نے دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ مگر زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔ خاموش لیٹا چھت کو تکتا رہا۔ لالی نے بھی مزید بات چیت نہ کی۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور سونے کی

کوشش کرنے لگا۔

☆

لالی معمول کے مطابق سانچے میں گارا بھر کر اینٹیں تیار کرتا رہا اور مسلسل ارشاد الہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی اجڑنے اور ٹوٹ پھوٹ کر بکھرنے کی دل گداز روداد سن کر وہ شدت کے ساتھ متاثر ہوا تھا۔ لالی کو اس سے گہری ہمدردی اور لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طور ارشاد الہی کو بھٹے سے نکال کر باہر لے جائے۔ اس کے ہم راہ کوٹلہ کرشن پہنچے چوہدری نور الہی سے ملے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ آیا وہ ارشاد الہی کا باپ ہے کہ نہیں؟ اگر وہ واقعی اس کا باپ نکلا تو ایک دوسرے سے مل کر دونوں کس قدر خوش ہوں گے۔ ارشاد الہی کے دن پھر جائیں گے۔ طرح طرح کی اذیت ناک مصیبتوں سے نجات مل جائے گی۔ اس کی اپاہج ماں کو ملتان میں مزاروں اور خانقاہوں پر بھیک کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے گا۔ وہ اپنے شوہر کے پاس پہنچ جائے گی۔ برسوں کے بچھڑے ایک بار پھر مل بیٹھیں گے تو کتنے مسرور اور شاداں ہوں گے۔ اس خوشی میں جو لذت اور گرم جوشی تھی اس کے احساس سے لالی وارفتہ ہو جاتا۔

وہ اینٹیں تیار کرتا رہا اور سوچتا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ دوپہر ہو گئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ سہ پہر ہو گئی۔ ایک کارندہ اس کے پاس آیا اور یہ پیغام لایا کہ بھٹے کے مالک ‘ملک نثار محمد’ نے اسے بلایا ہے۔ لالی کو حیرت کے ساتھ ساتھ تشویش بھی لاحق ہوئی۔ تشویش کی بات ہی تھی۔ اب تک اس کی ملک نثار محمد کے سامنے پیشی نہیں ہوئی تھی۔ ویسے بھی عام طور پر نہ وہ کسی پتھیرے سے بات کرتا تھا نہ اپنے دفتر میں بلاتا تھا۔ پتھیروں اور دوسرے بھٹہ مزدوروں سے اس کا رابطہ ہمیشہ جمعدار کے وسیلے سے رہتا تھا۔

لالی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دفتر کی جانب چلا۔ کارندہ اس کے ہم راہ تھا۔ مگر وہ دروازے کے باہر رک گیا۔ لالی دفتر کے اندر چلا گیا۔ ملک نثار محمد کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ لالی نے اونچی آواز سے سلام کیا۔ ملک نثار نے کوئی جواب نہ دیا۔ اخبار میز پر ڈالا اور نظریں اٹھا کر لالی کی جانب متوجہ ہوا۔

”تو لالی پتھیرا ہے؟“ ملک نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔

”ہاں جی!“ لالی نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

ملک نے نہایت گندی گالی دی۔ چیخ کر بولا۔ ”تو نے اپنی بدمعاشی نہیں چھوڑی۔“

”میں نے تو جی کچھ نہیں کیا۔“ لالی نے سادگی سے کہا۔ ”میں تو جی دن بھر اینٹیں بناتا ہوں۔ شام کو زنجیر سے باندھ کر منجی پر ڈال دیا جاتا ہوں۔ بھٹے کے پہریدار رات بھر کڑی نگرانی کرتے ہیں۔“ اس نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”نہ کسی سے مل سکتا ہوں نہ گل بات کر سکتا ہوں۔“

”تیرے ساتھ شادا پتھیرا نہیں ہوتا؟“

”ہاں جی‘ وہ تو ہوتا ہے۔“ لالی نے اعتراف کیا۔ ”رات ہوتے ہی میرا اور اس کا ہاتھ زنجیر سے جکڑ کر تالا لگا دیا جاتا ہے۔ پیروں سے رسی لپیٹ کر منجی سے باندھ دی جاتی ہے۔“

”تیرے منہ میں تو تالا نہیں ڈالا جاتا۔ تو شادا سے گل بات تو کر سکتا ہے۔“

لالی نے گھبرا کر ملک کی جانب دیکھا۔ مگر خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔

”چپ کر کے کیوں کھڑا ہے۔ بولتا کیوں نہیں؟“ ملک نثار محمد نے ڈپٹ کر کہا۔ ”تو نے پہلے بھی یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ لگتا ہے تجھے ٹھیک سے سزا نہیں ملی۔ تب ہی دوبارہ فرار ہونے کی سوچ رہا ہے اور شادا کو بھی اپنے ساتھ نکال لے جانا چاہتا ہے۔“

”نہیں جی‘ ایسی کوئی گل بات نہیں۔“ لالی نے صفائی پیش کی۔ ”لگتا ہے کسی نے میرے بارے میں تجھے غلط اطلاع دی ہے۔“

”کوئی اور نہیں‘ تیرا ساتھی شادا خود میرے پاس آیا تھا۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا کہ تو کیا کرنا چاہتا ہے۔“ ملک کے ہونٹوں پر زہرخند نمودار ہوا۔ ”اب تو کہہ دے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔“

”اگر اس نے تجھ سے ایسی بات کہی تو بالکل غلط کہی۔“ لالی نے نہایت ڈھٹائی سے کہا۔ ”اس نے جھوٹ بولا ہے۔ میں نے کبھی اس سے ایسی گل بات نہیں کہی۔“

ملک نثار محمد نے باہر دروازے پر کھڑے ہوئے کارندے کو آواز دی۔ وہ اندر آیا تو ملک نے اس سے کہا۔ ”شادا پتھیرے کو یہاں بھیج دے۔“

لالی سخت پریشان ہوا۔ سہما ہوا خاموش کھڑا رہا۔ ملک بھی چپ بیٹھا بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ارشاد الہی اندر داخل ہوا۔ اس نے لالی کو دیکھا تو بہت سٹ پٹایا۔ جھٹ گردن موڑی اور ملک نثار محمد کی جانب منہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔

”اس نے کل رات تجھے فرار ہونے کے لیے کہا تھا نا؟“ ملک نے ہاتھ اٹھا کر لالی کی جانب

اشارہ کیا۔

ارشاد الٰہی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بشرے سے گھبراہٹ اور پریشانی جھلک رہی تھی۔

ملک نے اسے ڈانٹا۔ "چپ کیوں ہے؟ بتاتا کیوں نہیں؟"

اس بار اس نے اقرار کرنے کے انداز میں گردن ہلائی۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

"اس طرح گردن نہ ہلا۔ ٹھیک ٹھیک بتا۔" ملک نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے ارشاد الٰہی کو دیکھا۔ "اس نے یہاں سے نکل بھاگنے کے لیے تجھے کیا کہا تھا؟"

"اس نے وہی کہا تھا جو میں پہلے بتا چکا ہوں۔" ارشاد الٰہی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "یہ بھٹے سے بھاگ جانا چاہتا ہے۔ مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہتا تھا۔"

لالی نے جھنجلا کر ارشاد الٰہی کو دیکھا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "بکواس نہ کر۔ میں نے تجھ سے کب ایسی گل بات کہی تھی۔ تجھے جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی۔"

"چپ کر کے کھڑا رہ۔" ملک نے برہم ہو کر لالی کو ڈانٹا۔ مڑ کر ارشاد الٰہی کی طرف متوجہ ہوا۔ "صاف صاف بتا' اس نے تجھے کیا کہا تھا؟"

"اس نے کہا تھا۔ یہاں سے فرار ہونے کے بعد یہ مجھے اپنے ساتھ لے کر میرے پیو کے پاس جائے گا۔ مجھے اس سے ملائے گا۔"

"یہ بات تو نے مجھے پہلے نہیں بتائی تھی۔" ملک نثار نے تیکھی نظروں سے ارشاد!! کو دیکھا۔ قدرے توقف کیا "یہ بتا تیرا پیو کہاں ہوتا ہے؟"

"وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ وہ مر چکا ہے۔" ارشاد الٰہی نے مطلع کیا۔ اس کے لہجے سے افسردگی عیاں تھی۔

لالی نے پلٹ کر ارشاد الٰہی کی جانب دیکھا۔ "اسے جی کچھ پتہ نہیں۔ وہ مرا نہیں زندہ ہے۔"

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ جی۔ اسے مرے ہوئے کئی برس ہو گئے۔" ارشاد الٰہی نے لالی کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "مجھے اچھی طرح پتہ ہے وہ کب مرا اور کہاں مرا؟" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "یہ تو جی مجھے بہکانے کے لیے ایسا کہہ رہا تھا تاکہ میں اس کے ساتھ یہاں سے فرار ہو جاؤں۔"

"نہیں جی' اسے بالکل پتہ نہیں۔" لالی نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "اسے کسی نے غلط بتایا۔ میں نے اسے دیکھا ہے اور مجھے یہ بھی پتہ ہے وہ کہاں ہوتا ہے؟"

اس بار ملک نثار محمد نے مداخلت کی۔ "شادے کا پیو زندہ ہے یا مر گیا۔ مجھے اس سے کچھ نہیں لینا پر اس سے تو انکار نہیں کر سکتا تو شادا کو اس کے پیو سے ملانے کے بہانے یہاں سے فرار ہو

چاہتا تھا اور اپنے ساتھ اسے بھی لے جانا چاہتا تھا۔"

لالی کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ جوش میں آ کر ایسی بات کہہ گیا تھا جو اسے نہیں کہنا چاہیے تھی۔ اس نے گھبرا کر ملک نثار محمد کی جانب دیکھا۔ لمحہ بھر خاموش رہا۔ خود کو سنبھالا اور ایک بار پھر جھوٹ بولنے کی کوشش کی۔ جھجکتے ہوئے گویا ہوا۔ "میں نے تو جی اسے صرف اس کے پیو کے بارے میں بتایا تھا۔ فرار ہونے کو نہیں کہا تھا۔ یہ بالکل جھوٹ بول رہا ہے۔"

"مجھے اچھی طرح پتہ چل گیا ہے۔ کون جھوٹ بول رہا ہے کون سچ؟" ملک نثار محمد نے ڈپٹ کر کہا۔ "تو نے ایک بار پہلے بھی فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ کہہ دے یہ بھی جھوٹ ہے۔"

لالی نے نظریں نیچی کر لیں۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ خاموش کھڑا فرش کو تکتا رہا۔ اسی اثناء میں جمعدار زمان رخان دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

بھٹے کے مالک نے اسے مخاطب کیا۔ "یہ ٹھیک ہوا تو بھی آ گیا۔ میں تجھے بلانے ہی والا تھا۔" اس نے غصے سے گالی دے کر لالی کی جانب دیکھا۔ "یہ خانہ خراب دوبارہ یہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"ضرور کر رہا ہو گا جی۔" جمعدار نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "مجھے پتہ چلا ہے یہ تو جی جیل سے بھی فرار ہو چکا ہے۔ چوری ڈکیتی کے جرم میں کئی بار سزا کاٹ چکا ہے۔" اس نے خونخوار نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "اس بار میں اس کی ایسی چابی کسوں گا۔ ایسی کڑی سزا دوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھے۔" جمعدار نے نثار محمد کو یقین دلایا۔ "فکر نہ کریں جی۔ میں اس کو بالکل ٹھیک کر دوں گا۔ ساری بدمعاشی نکال دوں گا۔"

"میں نے اب اس کے ساتھ نہیں رہنا جی۔" ارشاد الٰہی نے ہاتھ اٹھا کر لالی کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ مجھے بہت تنگ کرے گا۔"

"نہیں تجھے اب اس کے ساتھ نہیں رکھا جائے گا۔ ہاتھوں میں زنجیر بھی نہیں ڈالی جائے گی۔" ملک نثار محمد نے ارشاد الٰہی کو اطمینان دلایا۔

"میری دہاڑی بھی لگانی شروع کر دی جائے۔ بہت مہربانی ہو گی جی۔" ارشاد الٰہی نے گڑگڑا کر کہا۔ "جو غلطی ہو گئی اسے معاف کر دیا جائے۔"

ملک نثار محمد نے فیصلہ سنانے کے انداز میں جمعدار کو ہدایت کی۔ "زمان' ابھی جا کر منشی سے کہہ دے' آج سے شادا کی بھی دوسرے جتھیروں کی طرح دہاڑی لگانی شروع کر دے۔ اسے علیحدہ جھگی دی جائے۔ مجھے یہ کام کا بندہ لگتا ہے۔"

اس نے ایک بار پھر لالی کو خفگی سے دیکھا۔ "یہ تو دیکھنے میں بھی خطرناک جرائم پیشہ لگتا ہے۔" اس نے گردن موڑی۔ جمعدار کی طرف متوجہ ہوا۔ "زمان' تو نے بھٹے کے لیے اسے کیسے بھرتی کر لیا؟؟"

"یہ جی پہلے تیموں کے بھٹے پر پتھیرا ہوتا تھا۔" جمعدار نے فوراً صفائی پیش کی۔ "ادھر سے دوسرے پتھیروں کے ساتھ آیا تھا۔ تب مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ یہ سزا یافتہ ہے۔ کئی بار جیل میں رہ چکا ہے۔"

"تو دونوں کو اپنے ساتھ لے جا۔" ملک نثار نے حکم صادر کرنے کی انداز میں اونچی آواز سے کہا۔ "اور دیکھ' شادا کا آگے خیال رکھنا۔"

جمعدار آگے بڑھا۔ ارشاد الٰہی اور لالی اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ تینوں چپ چاپ باہر چلے گئے۔

باہر نکل کر جمعدار نے لالی کو اپنے ہم راہ آنے کا اشارہ کیا اور ارشاد الٰہی سے نرم لہجے میں کہا۔

"شادے' تو جا کر آرام سے اپنا کام کر۔"

ارشاد الٰہی خاموشی سے مڑا۔ اپنے تھلّے پر پہنچا اور سانچوں میں گارا بھر کر اینٹیں تیار کرنے لگا۔ بھٹہ مالک کے حکم پر اسے قید و بند سے چھٹکارا مل گیا۔ اسی روز سے اس کی دہاڑی بھی لگنے لگی۔ رہنے کے لیے علیحدہ جھگی بھی مل گئی۔ لالی کے خلاف مخبری کرنے کا اسے خاطر خواہ صلہ ملا۔

۳۹

جمعدار زماں ایک جھونپڑی میں پہنچا۔ لالی اس کے ہم راہ تھا۔ جھونپڑی بالکل خالی تھی اور بھٹے سے الگ تھلگ ایک ویران گوشے میں تھی۔ جمعدار نے لالی کے تمام کپڑے اتروائے اور اس کے برہنہ جسم پر پانی میں بھیگے ہوئے چھتر اس طرح بے دردی سے سڑاک سڑاک لگائے کہ لالی تکلیف سے تڑپ اٹھا۔ بلبلا کر چیخنے چلانے لگا۔ کبھی ادھر مڑتا کبھی ادھر۔ مگر جمعدار کا ہاتھ برابر چلتا رہا۔ وہ پیترے بدل بدل کر لالی کو مارتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ خود بے حال ہو گیا۔ منہ پھاڑ کر زور زور سے ہانپنے لگا۔

لالی کے جسم پر نیل پڑ گئے تھے۔ کہیں کہیں سے کھال بھی پھٹ گئی تھی۔ زخموں سے خون رس رہا تھا۔ اسی حالت میں کمر کے گرد رسی باندھ کر بھٹے پر گشت کرایا گیا۔ اس کا جسم مادر زاد برہنہ تھا۔ زخموں سے ٹیس اٹھ رہی تھی۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے پتھیروں اور دوسرے بھٹہ مزدوروں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

عورتیں لالی کو اس حال میں دیکھتیں تو گھبرا کر دوپٹے کے آنچل سے منہ چھپا لیتیں۔ بھٹے پر کام کرنے والا ہر شخص دم بخود تھا۔ خوف سے لرزہ براندام تھا۔ پورے بھٹے پر دہشت طاری تھی۔ نہ کوئی بول رہا تھا نہ بات کر رہا تھا۔

ارشاد الٰہی کے سامنے سے گزرتے ہوئے لالی ٹھٹکا۔ نظریں بلند کیں' ارشاد الٰہی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ سینے میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے منہ بگاڑا۔ گہری سانس بھری اور جھنجلا کر حقارت سے زمین پر تھوک دیا۔ جمعدار نے آگے بڑھ کر لالی کی کمر پر

سڑاک سے چھتر مارا۔ ہاتھ بھرپور پڑا۔ لالی درد کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اس کے قدم خود بخود اٹھ گئے۔ آگے بڑھا اور نظریں جھکائے ہوئے پتھیروں کے درمیان سے گزرنے لگا۔

بھٹے کا گشت کرانے کے بعد دن ڈھلے لالی کے پیروں کو رسی سے جکڑا گیا اور شیشم کے درخت کی ایک مضبوط ڈال سے باندھ کر لٹکا دیا گیا۔ اس کی ٹانگیں اوپر تھیں اور سر نیچے تھا۔ جسم پر ہنوز کوئی لباس نہ تھا۔ نہ اس نے کوئی مزاحمت کی نہ شور مچایا۔ اس کے لیے یہ نیا تجربہ نہیں تھا۔ کئی بار اقبال جرم کرانے کے لیے تھانوں میں اسی طرح الٹا لٹکایا جا چکا تھا۔ اس کا سابقہ ایک ایسے بکٹ تھانے دار سے بھی پڑ چکا تھا جو ملزموں کو الٹا لٹکا کر طرح طرح سے اذیتیں پہنچانے کے باعث رسا شاہ کے نام سے مشہور تھا۔ لہٰذا اسے بخوبی اندازہ تھا کہ اگر اس نے ہنگامہ برپا کرنے کی ذرا بھی کوشش کی تو اس کے زخمی جسم کو چھتر مار مار کر مزید زخمی کر دیا جائے گا۔ وہ الٹا لٹکا ہوا تھا اور آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔

شام ہو گئی۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ پتھیروں نے کام ختم کر دیا۔ جھونپڑیوں میں چراغ جھلملانے لگے۔ چولہوں میں آگ سلگنے لگی۔ تازہ روٹیوں کی خوشبو فضا میں رچ گئی۔ لالی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ روٹیوں کی خوشبو سے بھوک کی شدت اور بڑھ گئی۔ مگر اس نے بھوک پر تو قابو پا لیا‘ البتہ پیشاب پر قابو پانا اس کے لیے ممکن نہ رہا۔ ایک کارندہ اس کی نگرانی پر مامور تھا۔ لالی نے گڑگڑا کر اس سے فریاد کی۔ اپنی تکلیف بیان کی‘ منت سماجت کی۔

لیکن وہ ذرا متاثر نہ ہوا۔ نہایت بے رخی سے منہ بگاڑ کر بولا۔ ”تو چاہتا ہے میں تجھے نیچے اتار دوں۔ جانتا ہے کیا ہو گا؟ جمعدار مجھے بھی تیری طرح الٹا لٹکا کر چھتر سے مار لگائے گا۔ پیشاب کرنا ہے تو کر لے۔ کس نے منع کیا ہے؟ میں تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“

لالی خاموش ہو گیا۔ بے چین ہو کر جسم کو ادھر ادھر گردش دینے لگا۔ مگر وہ دیر تک یہ تکلیف اور اذیت برداشت نہ کر سکا۔ پھر ایک لمحہ ایسا آیا جب اس کی قوت برداشت نے جواب دے دیا۔ پیشاب نکلا اور اس کے قطرے اس کے جسم پر پھیلنے لگے۔ اور پھیلتے پھیلتے اس کے چہرے تک پہنچ گئے۔ اس نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ مگر پیشاب کی قطرے نتھنے کے راستے ناک کے اندر جانے لگے۔ اس نے سانس روک لی۔ کسی نہ کسی طرح ایک ہاتھ اٹھا کر منہ اور ناک پر رکھ لیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ مگر اس کا برہنہ پیٹ‘ سینہ‘ گردن‘ چہرہ اور سر کے بال پیشاب سے تربتر ہو گئے۔

پیشاب کرنے کے بعد اسے سکون تو ملا لیکن اس کی تیز بو اور گندگی کے احساس سے جی متلانے لگا۔ وہ بار بار ابکائی لیتا اور ہر بار آلائش اس کے منہ سے خارج ہوتی۔ اس نے گردن ہلا ہلا کر چہرہ ادھر ادھر کیا۔ بے بسی سے سامنے بیٹھے ہوئے کارندے کو دیکھا۔ مگر وہ لاتعلق بیٹھا نہایت بے نیازی سے سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔

اندھیرا بڑھتا اور پھیلتا گیا۔ رات ہو گئی۔ بھٹے پر سناٹا چھا گیا۔ پہریداروں نے گشت لگانا شروع کر دیا۔ گہری خاموشی میں ان کے قدموں کی آہٹیں اور وقفے وقفے سے کھنکارنے کی آوازیں ابھرتی رہیں۔ لالی درخت سے الٹا لٹکا ہوا تھا۔ رات آدھی ہو گئی۔ رات ڈھلنے لگی۔ صبح ہو گئی۔ پتھیرے جھونپڑیوں سے نکل نکل کر اپنے تھلّوں پر پہنچنے لگے۔ گارا تیار کر کے اینٹیں بنانے لگے۔

بھٹے پر ہر طرف چہل پہل تھی۔ ملی جلی آوازوں کا شور تھا۔ پتھیرے اینٹیں تیار کر رہے تھے۔ کمہار سوکھی ہوئی اینٹیں ریڑیوں اور ٹھیلوں میں بھر بھر کر چمنی کے نیچے پہنچا رہے تھے۔ بھرائی کرنے والے مزدور کچی اینٹیں توے پر جما رہے تھے۔ آگ سلگائی جا چکی تھی۔ تیز آنچ سے کچی اینٹیں تپ کر پختہ ہو رہی تھیں۔ چمنی سے گاڑھا گاڑھا سیاہ دھواں اٹھ رہا تھا اور آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔

لالی ہنوز الٹا لٹکا ہوا تھا۔ پتھیرے اور دوسرے بھٹہ مزدور سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے اور خوف زدہ ہو کر زیادہ تن دہی سے اپنے کام میں جٹ جاتے۔ دوپہر ہو گئی۔ سورج مغربی افق کی سمت کھسکنے لگا۔ سائے طویل ہو گئے۔ اس عرصے میں کئی بار لالی کی قوت مزاحمت جواب دے گئی۔ اس پر غشی طاری ہو جاتی۔ آنکھیں بند ہو جاتیں۔ منہ سے رال بہنے لگتی۔ جب اس کی حالت بہت غیر ہو جاتی تو جمعدار زماں کو اطلاع دی جاتی۔ وہ آتا۔ لالی کی دگرگوں حالت کا اندازہ لگاتا۔ اسے نیچے اتارتا۔ پینے کو پانی دیتا۔ مگر کھانے کو کچھ نہ دیا۔ صرف ایک بار لسی پلائی۔ لالی کچھ دیر بے سدھ پڑا رہتا۔ مگر جب حالت کچھ سنبھل جاتی تو جمعدار پھر اسے درخت سے الٹا لٹکا دیتا۔

غروب آفتاب سے کچھ پہلے ملک نثار محمد بھٹے میں داخل ہوا۔ لالی کے قریب سے گزرا۔ حقارت سے اس پر ایک چبھتی ہوئی نظر ڈالی اور گردن اٹھائے بے نیازی سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے چلنے والے کارندے بھی بے نیازی سے گزر گئے۔ کسی نے اس کی جانب توجہ دینے کی مطلق زحمت گوارہ نہ کی۔ ہر شخص خاموش تھا اور اپنے رویے سے لاتعلقی کا اظہار کرتا تھا۔

جھٹ پٹا ہوتے ہی جمعدار زماں خان اس کے قریب آیا۔ کچھ دیر قہر آلود نظروں سے اسے گھورتا رہا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر لالی کے منہ پر تابڑ توڑ کئی تھپڑ مارے۔ زماں خان کا جسم بھاری بھرکم اور مضبوط تھا۔ ہاتھ ایسے کرارے پڑے کہ لالی کا ایک ہونٹ پھٹ گیا۔ اس سے خون رس رس کر

بہنے لگا اور رخسار سے بہتا ہوا پیشانی تک پھیل گیا۔ لالی چپ چاپ الٹا لٹکا رہا۔ نہ اس نے دہائی دی نہ احتجاج کیا۔

جمعدار کے حکم پر کارندوں نے لالی کو درخت سے نیچے اتارا۔ دونوں پیروں کو رسی سے آزاد کیا۔ مگر ہاتھ بدستور زنجیر سے جکڑے رہے۔ لالی تھکن اور نقاہت سے نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ کھڑا بھی نہ ہو سکا۔ لڑکھڑا کر فرش پر گر گیا۔ منہ پھاڑ کر زور زور سے ہانپنے لگا۔ جمعدار نے اشارہ کیا۔ ایک کارندے نے مٹی کے پیالے میں پینے کو پانی دیا۔ پانی پی کر ذرا قرار آیا۔ مگر وہ فرش پر بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد اسے پہننے کے لیے کپڑے دیے گئے۔ مگر وہ ان کو پہن نہ سکتا تھا۔ اس دفع اس کے ہاتھ بھی کھول دیے گئے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے کپڑے پہنے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

شام دھیرے دھیرے بھٹے کے در و دیوار پر اتر رہی تھی۔ سرمئی دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ جھونپڑیوں کے آگے چولہوں پر کھانا پک رہا تھا۔ اس کی خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ لالی کی بھوک شدت سے بیدار ہوئی۔ مگر اسے کچھ کھانے کو نہ دیا گیا۔ جھونپڑی میں پہنچایا گیا اور چارپائی پر ڈال کر ہاتھوں کو ایک بار پھر زنجیر سے جکڑ کر تالا ڈال دیا گیا۔ پیروں کے گرد رسی لپیٹ کر چارپائی کی پٹیوں سے باندھ دیا گیا۔

پہلے اس کا ایک ہاتھ زنجیر سے جکڑا جاتا تھا۔ مگر اس دفعہ اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے جکڑ دیے گئے۔ اسی طرح پہلے رسی اس طور پیروں سے باندھی جاتی تھی کہ وہ کروٹ بدل سکتا تھا۔ اب وہ اپنے پیروں کو ہلا نہ سکتا تھا۔ صرف چت لیٹا رہ سکتا تھا یا اٹھ کر بیٹھ سکتا تھا۔ زنجیر اس قدر کس کر باندھی گئی تھی کہ اس کے حلقے گوشت کے اندر پیوست ہو گئے تھے۔ کلائیوں میں درد سے ٹیس اٹھ رہی تھی۔

ایک پہریدار اس کی جھونپڑی کے آگے گشت لگاتا رہا۔ وقفے وقفے سے اس کے جوتوں کی آہٹ ابھرتی۔ جھونپڑی کے عین سامنے پہنچ کر وہ ٹھٹکتا۔ ایک نظر جھونپڑی کے اندر ڈالتا اور آگے بڑھ جاتا۔ لالی رات بھر بھوکا رہا۔ دن میں بھی اسے کھانے کو کچھ نہ دیا گیا۔

☆

شام ہونے سے کچھ دیر قبل بادل گھر کر آئے اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اندھیرا بڑھا۔ شام ہو گئی۔ اندھیرے کے ساتھ ساتھ بارش بھی تیز ہو گئی۔ بارش کے چھینٹے ہوا کے ساتھ جھونپڑی کے اندر پہنچنے لگے۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی اور سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ تیز بارش سے بھٹے میں ہر طرف جل تھل ہو گیا تھا۔

رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کرتی رہی۔ ہر سو گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا تھا۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ بادل رک رک کر زور سے گرجتے تھے۔ تیز بارش کے باعث پہریداروں نے گشت لگانا ختم کر دیا تھا۔ البتہ بھٹے کے مشرقی گوشے سے ان کے بار بار کھنکارنے اور بولنے کی آوازیں خاموشی میں ابھر رہی تھیں۔ لالی خاموش لیٹا تھا۔ نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ بے چین ہو کر بار بار پہلو بدلنے کی کوشش کرتا۔ مگر دونوں پیر رسی سے اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ وہ کسی طور کروٹ نہ لے سکتا تھا۔

بے چینی جب زیادہ بڑھی تو لالی بے قرار ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے جھونپڑی کے باہر نظر دوڑائی۔ بارش کے قطروں کی جھالر کے سوا اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہ آیا۔ کچھ دیر وہ گم صم بیٹھا رہا، پھر آگے جھکا۔ ہاتھ کو بڑھا کر پیروں تک لے گیا۔ انگلیوں سے پیروں میں بندھی ہوئی رسی ٹٹولی۔ رسی سوت کی بنی ہوئی تھی۔ ہاتھ کی انگلی سے زیادہ موٹی نہ تھی۔ لالی نے ہاتھوں کو ادھر ادھر گھمایا۔ رسی کی گرہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مگر بار بار کوشش کے باوجود اس کے ہاتھ نہ آئی۔ اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کا ہاتھ رسی کی گرہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ گرہ چارپائی کے ایک پائے کے نچلے حصے کے گرد رسی لپیٹ کر لگائی گئی تھی۔

لالی نے دونوں پیروں کو زور زور سے اس طرح ہلایا کہ گرہ ڈھیلی پڑ کر کھل جائے۔ اس کے پیر تکلیف سے دکھنے لگے مگر رسی کی گرہ نہ کھلی۔ لالی نے دل برداشتہ ہو کر گہری سانس بھری اور نڈھال ہو کر لیٹ گیا۔ مگر اسے قرار نہ آیا۔ ایک بار پھر اٹھ کر بیٹھا۔ ہاتھ کو بڑھا کر رسی کے قریب لے گیا۔ اس نے رسی کاٹنے کی غرض سے تالے کے دھاردار کنارے سے آہستہ آہستہ رگڑی۔ اس کے ہاتھوں کی حرکت تیز اور تیز ہوتی گئی۔ لیکن رسی نہ کٹی۔ لالی کے ہاتھ شل ہو گئے۔ وہ زور زور سے ہانپنے لگا اور زیادہ دیر بیٹھ نہ سکا۔ تھکا ہوا سا چارپائی پر پھر لیٹ گیا۔

وہ دیر تک جاگتا رہا۔ بھوک اور نقاہت سے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ جسمانی تکلیف کے ساتھ ساتھ ذہنی کوفت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ بارش کے قطروں کی آواز مسلسل ابھر رہی تھی۔ آخر پچھلے پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ جھونپڑی میں گہرا اندھیرا تھا۔ یکایک خاموشی میں آہٹ ابھری۔ لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک سایہ لہرایا اور رفتہ رفتہ قریب آ گیا۔

بارش ابھی رکی نہ تھی۔ مگر اس کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ رات کے گہرے سکوت میں بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں جل ترنگ کی مانند بج رہی تھیں۔ ہوا بدستور تیز تھی اور سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ لالی کچھ دیر دم بخود پڑا رہا، پھر گھبرا کر اٹھا۔ سہمی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔ ”کون ہے؟“ وہ حیرت

سے سائے کی جانب آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔

"دھیرے بول۔" اندھیرے میں آواز ابھری۔

لالی نے فوراً پہچان لیا۔ وہ ارشاد الٰہی تھا اور لالی کے بالکل نزدیک کھڑا تھا۔ لالی نے غصے اور نفرت سے منہ بگاڑ کر کہا۔ "تو یہاں کیوں آیا؟" اس کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ "کتل کرنے آیا ہے؟"

ارشاد الٰہی نے اس کی خفگی پر کوئی توجہ نہ دی۔ ہاتھ میں دبی روٹی کا نوالہ توڑ کر لالی کے منہ کے قریب لے گیا۔ نرم لہجے میں بولا۔

"لے اسے کھا لے۔"

"میں نے کچھ نہیں کھانا۔" لالی نے روٹھے ہوئے بچے کی مانند گردن جھٹک کر انکار کیا۔ "تو یہاں سے چلا جا۔ میں نے تیری روٹی شوٹی نہیں کھانی۔"

ارشاد الٰہی نے اس دفعہ بھی مطلق برا نہ مانا۔ نوالہ لالی کے منہ میں ٹھونس دیا۔ مسکرا کر بولا۔

"پہلے روٹی کھا لے۔ بعد میں ناراض ہونا۔ مجھے پتہ ہے' تو نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا۔"

لالی کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے روٹی کا لقمہ چبانے لگا۔ ارشاد الٰہی نے بھی مزید بات چیت نہیں کی۔ روٹی کے لقمے بنا بنا کر لالی کو کھلاتا رہا۔ لالی بھوک سے بے قرار تھا۔ چند لمحے تو اس نے تکلف برتا' پھر ہبڑ ہبڑ روٹی کے لقمے کھانے لگا۔ ارشد الٰہی سہما ہوا تھا۔ بار بار مڑ کر جھونپڑی سے باہر نظر دوڑاتا۔

لالی روٹی کھا چکا تو ارشاد الٰہی نے جھونپڑی میں رکھے ہوئے گھڑے سے المونیم کے گلاس میں پانی انڈیلا۔ واپس لالی کے پاس گیا۔ گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ لالی نے پانی پی کر آہستہ سے ڈکار لی۔ پیٹ میں غذا پہنچی تو نقاہت کم ہوئی۔ جان میں جان آئی۔ حواس بجا ہوئے۔ اس نے ارشاد الٰہی سے پوچھا۔ "پہلے تو نے میرے خلاف ملک نثار سے مخبری کی۔ سزا دلوائی۔ اب روٹی لے کر آیا۔ تو نے ایسا کیوں کیا؟" وہ ابھی تک ارشاد الٰہی کے بدلے ہوئے رویّے پر حیران و پریشان تھا۔

"مجھے پتہ نہیں تھا' تیرے ساتھ اتنا ظلم ہو گا۔" اس نے نرم لہجے میں اظہار پشیمانی کیا۔ "غلطی ہو گئی۔ معافی دے دے۔"

"پر تو مجھے کب تک اس طرح چوری چوری روٹی کھلاتا رہے گا؟" لالی نے اپنے خدشے کا اظہا کیا۔ "جمعدار کو پتہ چل گیا تو تجھے بھی میری طرح سخت سزا دے گا۔ تجھے پتہ ہے' وہ کتنا ظالم ہے۔"

"مجھے سب پتہ ہے۔ پر تو چپ کر کے بیٹھا رہ۔" ارشاد الٰہی نے تنبیہہ کی۔

لالی خاموش ہو گیا۔ ارشاد نے دھوتی کے ڈب سے چاقو نکالا۔ اسے کھولا۔ لالی نے کھلا ہوا چاقو اس کے ہاتھ میں دیکھا تو سخت سراسیمہ ہوا۔ گھبرا کر بولا۔ "تو کیا کرنا چاہتا ہے؟" اس نے پریشانی کے عالم میں زنجیر سے جکڑے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر چہرے کے سامنے کر لیے۔

مگر ارشاد الٰہی نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ نہ زبان سے کچھ کہا۔ آگے بڑھا اور لالی کے پیروں میں بندھی ہوئی رسی جلدی جلدی چاقو سے کاٹنے لگا۔ اس کے رویّے سے صاف عیاں تھا کہ وہ خود کو خطرے میں ڈال کر پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت لالی کو قید سے رہائی دلانے کی غرض سے آیا ہے۔

رسی کٹ گئی۔ لالی کے دونوں پیر آزاد ہو گئے۔ اس نے پیروں کو آہستہ آہستہ ہلا کر اطمینان کیا۔ اب وہ چارپائی سے نیچے اتر سکتا تھا۔ چل پھر سکتا تھا۔ جھونپڑی سے نکل کر باہر جا سکتا تھا۔

ارشاد الٰہی نے چاقو بند کیا۔ دھوتی کے ڈب میں حفاظت سے رکھا۔ سرگوشی کرنے کے انداز میں آہستہ سے بولا۔ "بھٹے کی پہریداری پر آج رات صرف دو راکھے ہیں۔ دونوں ہی نشے میں مست پڑے ہیں۔"

"تجھے ان کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟" لالی نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ادھر آنے سے پہلے میں ان کی جھگی میں گیا تھا۔ دونوں ایسے بے سدھ پڑے ہیں کہ ان کو میرے آنے کا ذرا بھی پتہ نہ چلا۔" اس نے جھک کر باہر دیکھا۔ "بارش ابھی رکی نہیں۔ ایسے میں تو آرام سے فرار ہو سکتا ہے۔"

"تو میرے ساتھ نہیں چلے گا؟" لالی نے اسے ایک بار پھر اپنے ہم راہ فرار ہونے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں!" اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ "مجھے تیرے ساتھ نہیں جانا۔" ارشاد الٰہی نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ "تو میری فکر نہ کر۔ فٹافٹ یہاں سے نکل جا۔" اس کی آواز خوف سے تھرتھرا رہی تھی۔ قدرے توقف کے بعد اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تیرا اب ادھر ٹھہرنا ہم دونوں ہی کے لیے بہت خطرناک ہو گا۔"

"تھوڑی دور بھی میرے ساتھ نہیں چلے گا؟"

"نہیں۔" ارشاد الٰہی نے لالی کی مطلق حوصلہ افزائی نہ کی۔ "میں تو اب چھپتا لکتا اپنی جھگی میں جاؤں گا۔ میں نے تو اب یہاں ایک منٹ بھی نہیں رکنا۔"

لالی کچھ کہہ نہ سکا۔ خاموشی سے ارشاد الٰہی کو دیکھتا رہا۔

ارشاد الٰہی نے گردن جھکا کر باہر چوکنا نظروں سے دیکھا۔ باہر رم جھم رم جھم مینہ برس رہا تھا۔ بھیگی ہوئی ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ ارشاد الٰہی نے پلٹ کر لالی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ چپ چاپ آگے بڑھا۔ جھونپڑی سے باہر نکلا۔ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا اور پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا گہری تاریکی میں اوجھل ہو گیا۔

☆

لالی چارپائی سے نیچے اترا۔ لڑکھڑایا اور گرتے گرتے بچا۔ اس کی دونوں ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔ ان میں رہ رہ کر اینٹھن ہو رہی تھی۔ نقاہت بھی بہت تھی۔ کچھ دیر تک وہ اندھیرے میں گم صم کھڑا رہا۔ پھر اس نے ہمت سے کام لیا۔ قدم اٹھایا۔ ڈگمگایا، سنبھلا۔ دوسرا قدم اٹھایا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا اس کے پیر پتھر کے بن گئے ہیں۔ بھاری اور بے جان۔ وہ جھونپڑی کے دوسرے سرے تک گیا۔ واپس آیا۔ اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ جھونپڑی کے اندر ٹہلنے لگا تاکہ ٹانگوں میں توانائی اور اعتدال پیدا ہو جائے۔ وہ رک رک کر قدم اٹھاتا۔ بار بار پیروں کو جھٹکتا۔ رسی کٹ جانے کے بعد اس کی ٹانگیں آزاد ہو گئی تھیں لیکن دونوں ہاتھ لوہے کی مضبوط زنجیر سے جکڑے ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھوں کو ہلایا۔ ادھر ادھر گھمانے چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر زنجیر کی کڑیاں گوشت میں اس طرح پیوست ہو گئی تھیں کہ ہلانے سے کلائیوں میں ٹیس اٹھتی تھی۔

اس کے لیے اب جھونپڑی میں مزید ٹھہرنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ باہر نکلنا خطرناک تھا تو جھونپڑی میں رکنا اور بھی زیادہ خطرناک تھا۔ نہ صرف اس کے لیے بلکہ ارشاد الٰہی کے لیے بھی جو ہر طرح کا خطرہ مول لے کر چھپتا چھپاتا اس کے پاس آیا تھا۔ کھانا لایا تھا اور کھلایا بھی تھا۔ پیروں میں بندھی ہوئی رسی چاقو سے کاٹی تھی۔ چلنے پھرنے کے قابل بنایا تھا اور فرار ہونے کا پورا پورا موقع فراہم کیا تھا۔ وہ اس موقعے کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے گردن بڑھا کر چوکنا نظروں سے باہر دیکھا۔ ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ بارش کی ننھی منی بوندیں مسلسل آسمان سے گر رہی تھیں۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ اس کی جھونپڑی، بھٹے کے ایک گوشے میں الگ تھلگ تھی۔ سامنے نیم دائرے میں پتھیروں اور دوسرے بھٹہ مزدوروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ ان کے آگے گہرا اور وسیع گڑھا تھا جس کی مٹی نکال کر اینٹیں بنائی جا چکی تھیں۔

دائیں طرف لگ بھگ سو قدم کے فاصلے پر بھٹے کا دفتر تھا۔ اس کے قریب دو جھونپڑیاں تھیں

ایک جھونپڑی کے باہر لالٹین کی ہلکی ہلکی زرد روشنی بکھری ہوئی تھی۔ وہ جھونپڑی کے اندر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر اتنا ضرور جانتا تھا کہ دونوں پہریدار اسی جھونپڑی میں موجود ہیں۔ جھونپڑی پر گہری خاموشی طاری تھی۔ ارشاد الٰہی کی اطلاع کے مطابق دونوں ہی پہریدار نشے میں دھت تھے اور بے سدھ پڑے تھے۔

لالی اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا۔ بھیگی ہوئی ہوا کا سرد تھپیڑا منہ پر لگا۔ قدم لڑکھڑائے۔ جسم سردی سے کپکپایا۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ خوف زدہ نظروں سے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ خاموشی تھی۔ بارش کی بوندوں سے ہلکا ہلکا جل ترنگ بجتا تھا۔ جگہ جگہ پانی سے بھرے ہوئے گڑھے تھے۔ کیچڑ تھی۔ وہ پانی اور کیچڑ سے بچتا بچاتا، سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ اچانک پیر رپٹا۔ قدم ڈگمگائے، گرا اور دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ گرنے سے خاموشی میں آہٹ پیدا ہوئی۔ عین اس وقت کوئی آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔

اس نے بدحواس ہو کر دفتر کی جانب دیکھا۔ مگر وہاں سکوت طاری تھا۔ کھانسی دفتر کے عقب سے ابھر رہی تھی۔ لالی دم سادھے پڑا رہا اور اس سمت دیکھتا رہا جدھر سے کھانسی رک رک کر ابھر رہی تھی۔ مگر اسے کوئی نظر نہ آیا۔ صرف چمنی اندھیرے میں دھندلی دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔ بارش کے باعث بھٹی سرد پڑی تھی۔ نہ وہاں آگ روشن کی گئی نہ چمنی کے نیچے دہکتے ہوئے توے پر کچی اینٹیں رکھ کر پکائی گئیں۔

لالی کے دونوں ہاتھ زنجیر سے جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے لیے اٹھنا اور اٹھ کر کھڑا ہونا آسان نہ تھا۔ خطرہ بھی سر پر منڈلا رہا تھا۔ کھانسی وقفے وقفے سے سناٹے میں ابھر رہی تھی۔ وہ پانی اور کیچڑ میں لتھڑا ہوا کچھ دیر زمین پر پڑا رہا اور بارش میں بھیگتا رہا۔ اس کا جسم بار بار سردی سے تھرتھراتا، لیکن وہ اس طرح زیادہ دیر پڑا نہ رہ سکتا تھا۔ اسے جلد سے جلد بھٹے کی حدود سے بہت دور نکل جانا چاہیے تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ ہانپتے ہوئے کروٹ بدلی۔ جھکا، کہنیوں کے بل اٹھا اور ٹانگوں پر پورا زور دے کر کھڑا ہوا تو گرتے گرتے بچا۔

وہ چند لمحے اندھیرے میں کھڑا رہا اور بارش میں بھیگتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے قدم اٹھایا۔ آگے بڑھا۔ بار بار ٹھٹکتا، مڑ کر عقب میں دیکھتا وہ ڈرا سہما آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ بھٹے کی حدود سے باہر نکلا اور پختہ سڑک پر پہنچ گیا۔

اس نے اپنی رفتار تیز کر دی اور بارش کے قطروں سے بے نیاز آگے بڑھتا گیا۔ اس کے کپڑے پانی اور کیچڑ سے لت پت تھے۔ ایک کہنی فرش سے اٹھنے کی کوشش میں چھل گئی تھی۔ اس میں

مسلسل سوزش ہو رہی تھی۔ لیکن نہ وہ اسے چھو سکتا تھا نہ دیکھ سکتا تھا۔ نہ یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ زخم کہاں ہے اور کیسا ہے۔ خوف بھی دامن گیر تھا۔ وہ پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھتا۔ مگر دور تک نہ کوئی آواز تھی نہ آہٹ۔ صرف ہوا کی سرسراہٹ تھی اور بادلوں سے گرتی ہوئی بوندوں کا ہلکا ہلکا جل ترنگ تھا۔ لیکن وہ زیادہ دور نہ جا سکا۔ جسم تھکن اور سردی سے شل ہو گیا تھا۔ قدم آگے نہ بڑھتے۔ آخر وہ ایک گھنے درخت کے نیچے پہنچ کر ٹھہر گیا اور آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔

رات ڈھل رہی تھی۔ درخت کے پتوں سے بارش کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وہ ایک موٹی شاخ کی آڑ میں سکڑا سکڑایا کھڑا تھا۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ وہ بھٹے سے فرار ہونے میں کامیاب تو ہو گیا تھا مگر اب یہ مسئلہ سامنے تھا کہ کہاں جائے اور کس کے پاس جائے؟ وقت کم تھا اور سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے اسے بہت دور نکل جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ درخت کے نیچے سہا ہوا کھڑا رہا اور کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

مشرقی افق پر بادلوں کے پیچھے ہلکا ہلکا اجالا پھیلتا جا رہا تھا۔ صبح کی آمد آمد تھی۔ بارش ہلکی ہوتے ہوتے رک گئی۔ مگر ہوا تیز تھی۔ اس میں خنکی بھی تھی۔ لالی کا لباس ابھی تک بھیگا ہوا تھا۔ جسم سردی سے کپکپا رہا تھا۔ صبح کی آمد کے ساتھ خطرہ بڑھ گیا تھا۔ وہ درخت کے نیچے سے نکلا اور سڑک پر پہنچ گیا۔ سڑک دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ فیروز پور روڈ ہے اور وہ اس وقت چونگی امر سدھو کے گرد و نواح میں ہے۔ سڑک ہنوز سنسان تھی۔ دور دور تک نہ کوئی راہ گیر تھا نہ کسی گاڑی کی آواز تھی۔ لالی نے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔

اب آبادی کے نشانات نظر آنے لگے تھے۔ دور تک اونچے نیچے مکانات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ایک پختہ عمارت پر پولیس اسٹیشن کا بورڈ دھندلی دھندلی روشنی میں دور سے نظر آیا۔ لالی ا دیکھ کر ٹھٹکا۔ خوف زدہ بھی ہوا۔ مسلسل چلتے چلتے اس کے پیر شل ہو گئے تھے۔ دونوں ہاتھ زنجیر جکڑے ہوئے تھے۔ مزید آگے جانے کی اس میں سکت نہ رہی تھی اور خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ کہی اور جانے کے بجائے وہ سیدھا تھانے میں پہنچا۔ اس وقت تھانہ ہی اسے محفوظ مقام معلوم ہوا۔

☆

تھانے پر خاموشی چھائی تھی۔ لالی ہیڈ محرر کے پاس گیا اور اس کے روبرو گردن جھکا کر کھڑا گیا۔ ہیڈ محرر رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ آنکھوں میں نیند کی غنودگی تھی۔ وہ مضمحل اور تھکا ہوا ن آرہا تھا۔ اس نے چونک کر لالی کو دیکھا۔ اس کے بال بھیگ کر پیشانی اور کنپٹیوں پر بکھرے ہو تھے۔ لباس پر جگہ جگہ مٹی کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ پیر کیچڑ سے لت پت تھے اور ہاتھ زنجیر ی طرح جکڑے ہوئے تھے۔

وہ لالی کو چند لمحے تک حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتا رہا' پھر ٹوہ لگانے کے انداز میں دریافت کیا۔ ون ہے تو؟"

لالی نے مسکین سی صورت بنا کر آہستہ سے بتایا۔ "میرا نام لال دین ہے جی۔ پتھیرا ہوں۔ ک نثار محمد کے بھٹے پر کام کرتا ہوں۔"

"تیرے ہاتھوں میں یہ زنجیر کیوں پڑی ہے؟" ہیڈ محرر بدستور حیرت زدہ تھا۔

لالی نے رقت انگیز لہجے میں بتایا کہ بھٹے کے مالک ملک نثار محمد نے اپنے جمعدار اور کارندوں کے ریعے اس پر کس قدر ظلم و ستم ڈھایا۔ کیسی کیسی ایذا پہنچائی۔ کس طرح قیدی بنا کر رکھا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور پلکوں سے ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر بہنے لگے۔

ہیڈ محرر ادھیڑ تھا۔ ڈاڑھی اور سر کے بال کھچڑی ہو چکے تھے۔ چہرے پر عام پولیس والوں کی سی نی اور خشونت نہ تھی۔ عیال دار تھا اور دردمند دل بھی رکھتا تھا۔ پچھلے ہی دنوں اس کا بڑا بیٹا' بھری جوانی میں داغ مفارقت دے گیا تھا۔ لالی کی الم ناک روداد سن کر وہ بہت متاثر ہوا۔ تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ فکر نہ کر۔ ملزمان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔" اس نے روزنامچہ کھسکا کر سامنے کیا۔ قلم اٹھا کر ابتدائی رپورٹ درج کرنا چاہی مگر کچھ سوچ کر ہاتھ روک لیا۔

"حوالدار جی!" لالی نے تعجب سے ہیڈ محرر کو مخاطب کیا۔ "تو نے میری رپٹ نہیں لکھنی؟"

"نہیں!" ہیڈ محرر نے قلم ایک طرف رکھتے ہوئے نرم لہجے میں وضاحت کی۔ "کیس کی نوعیت خاصی سنگین ہے۔ ایس ایچ او صاحب کے سامنے تیری پیشی ہونی ضروری ہے۔ وہی تیرا بیان لیں گے اور ضروری کارروائی کا حکم جاری کریں گے۔ وہ صبح نو بجے تک تھانے میں آئیں گے۔ ویسے میری ڈیوٹی بھی اب ختم ہونے والی ہے۔" اس نے لالی کو اطمینان دلایا۔ "پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ٹھاک ہی ہو گا۔"

لالی اس کی وضاحت سے مطمئن ہو گیا۔ اس نے مزید اصرار نہ کیا۔

ہیڈ محرر نے ایک کانسٹیبل کو بلایا۔ لالی کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اسے اپنے ساتھ لے جا۔ ویرے ایس ایچ او صاحب کے سامنے پیش کرنا ہو گا۔"

کانسٹیبل نے لالی کو اپنے ہم راہ آنے کا اشارہ کیا۔ آگے بڑھا اور لالی کو حوالات کے سامنے

ایک گوشے میں بٹھا دیا۔ نہ لالی نے اس سے کوئی بات کی اور نہ ہی اس نے لالی سے کچھ پوچھا۔ کانسٹیبل چلا گیا۔ لالی سر جھکائے چپ بیٹھا رہا۔

صبح ہو گئی۔ دن چڑھے تھانیدار اپنے دفتر میں پہنچا۔ لالی کو اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس س گڑگڑا کر اسے بھی اپنی اذیت ناک روداد سنائی۔ ہاتھ جوڑ کر دادرسی چاہی۔ تھانیدار کچھ ہی عر قبل تھانے میں تعینات ہوا تھا۔ سرگرم اور مستعد افسر تھا۔ ہوشیار اور دبنگ تھا۔ اپنی کارکردگ سے علاقے پر دھاک بٹھانے کے ساتھ ساتھ افسرانِ بالا کی زیادہ سے زیادہ خوشنودی بھی حاص کرنا چاہتا تھا۔ تھانیدار نے لالی کا بیان توجہ سے سنا۔ الزامات کی نوعیت پوری طرح سمجھنے کے لی مختلف سوالات بھی کیے۔

لالی کے لیے یہ پہلا موقع نہ تھا۔ وہ کئی بار تھانیداروں اور دوسرے پولیس افسروں کے روبر پیش ہو چکا تھا۔ ان کے مزاج اور افتادِ طبع کو بخوبی سمجھتا تھا۔ بات کرنے کا ڈھب جانتا تھا۔ اس ہر سوال کا سوچ سمجھ کر اور سنبھل سنبھل کر جواب دیا۔ تھانیدار کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے لہجے میں رقّت پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔

تھانیدار کے بشرے سے رعب و دبدبہ ٹپک رہا تھا۔ اس نے لالی کو غور سے دیکھا۔ کر ا پوچھا۔ "تو بھٹے سے فرار ہو کر یہاں پہنچا کیسے؟"

لالی اس سوال کے لیے پہلے ہی سے ذہنی طور پر تیار تھا۔ مگر وہ تھانیدار کو صاف بات بتانا چاہتا تھا۔ خدشہ تھا کہ اگر اس نے ارشاد الٰہی کا نام بتایا تو بھٹہ مالک نثار محمد اسے بھی اپنے جبر و تش کا نشانہ بنائے گا۔ طرح طرح سے پریشان و ہراساں کرے گا۔ اس نے سرے سے ارشاد الٰہی کا ذ ہی نہ کیا۔ کہنے لگا۔ "وہ جی ایسا ہوا کہ میرے پیر جس رسی سے جکڑ کر باندھے گئے تھے اس کی گ میں نے کسی نہ کسی طرح کھول لی۔ منجی سے نیچے اترا۔ باہر نکلا۔ سب بے خبر سو رہے تھے۔"

"تیری نگرانی پر کل رات کوئی پہریدار نہیں لگایا گیا تھا؟"

"ایک نہیں جی دو راکھے نگرانی پر تھے۔ پر دونوں ہی نشہ کر کے مست پڑے تھے۔ ان کو بالکا ہوش نہیں تھا۔" لالی نے تھانیدار کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "بارش بھی ہو رہی تھی۔ طرف اندھیرا چھایا تھا۔ میں چھپتا لکتا بھٹے سے نکل کر سڑک پر پہنچا اور بارش میں بھیگتا ہوا یہاں گیا۔"

تھانیدار خاموش بیٹھا رہا۔ لالی نے عاجزی سے کہا۔ "میرے ساتھ بہت ظلم ہوا جی۔ بھاگ ادھر نہ آتا تو وہ مجھے جان سے مار دیتے۔ میرے ساتھ انصاف کیا جائے۔ میں اسی لیے یہاں

ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "دوبارہ بھٹہ مالک کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ مجھے زندہ نہ چھوڑے گا۔ وہ بہت ظالم ہے۔ اور اس کا جمعدار تو بہت ہی ظالم ہے۔ ذرا ترس نہیں کھاتا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ جمعدار کا جبر و تشدد یاد کر کے اس کا دل بھر آیا۔ آنسو پلکوں سے ٹپکنے لگے۔

تھانیدار نے کسی فوری ردِعمل کا اظہار نہ کیا۔ نہ تسلی دی نہ دل جوئی کی۔ چند لمحے خاموش رہا، پھر اس نے ایک کانسٹیبل کو بلایا۔ اسے حکم دیا کہ بھٹے پر جائے اور ملک نثار محمد کو اپنے ہم راہ لے کر آئے۔ کانسٹیبل نے جوتے کی ایڑیاں جوڑ کر کھٹاک سے سلام کیا۔ مڑا، کمرے سے باہر نکلا اور بھٹے کی جانب روانہ ہو گیا۔

لالی کو ایک بار پھر حوالات کے سامنے بینچ پر بٹھا دیا گیا۔ اسے چائے بھی پلائی گئی۔ مگر اس کے دونوں ہاتھ لوہے کی زنجیر سے ہنوز جکڑے ہوئے تھے۔ اور نہ ہی اس کی رپورٹ درج کی گئی تھی۔ وہ گومگو کے عالم میں بیٹھا رہا۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ ملک نثار محمد کے پہنچنے کے بعد ضابطے کی کیا کارروائی ہو گی۔

لگ بھگ گھنٹہ بھر بعد کانسٹیبل واپس آیا۔ لیکن اس کے ساتھ ملک نثار محمد نہیں تھا۔ بھٹے کا جمعدار، زماں خان تھا۔ اس کے پہنچتے ہی تھانیدار نے لالی کو بھی اپنے دفتر میں طلب کیا۔ لالی فوراً تھانیدار کے سامنے پہنچا اور نظریں جھکا کر ادب سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

جمعدار زماں خان وہاں موجود تھا۔ اس نے کرسی کھسکائی اور اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر نہ کسی قسم کی پریشانی تھی نہ گھبراہٹ۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ مسکرا کر تھانیدار کے سامنے پیش کیا۔ اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ جمعدار نے پیکٹ سے سگریٹ نکالی، سلگائی اور بے نیازی سے کش لگانے لگا۔

تھانیدار کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ جمعدار کا رویّہ اسے شاق گزرا ہے۔ مگر اس نے کسی برہمی کا اظہار نہ کیا۔ لالی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جمعدار سے دریافت کیا۔

"اسے جانتے ہو؟"

"کیوں نہیں جانتا جی، اپنے بھٹے کا پتھیرا ہے۔" جمعدار نے تیوری پر بل ڈال کر لالی کو دیکھا۔ "رات کو چپکے سے فرار ہو گیا تھا۔ یہ جی ایک نمبری بدمعاش ہے۔ پہلے بھی ایسی کوشش کر چکا ہے۔ پر میں نے اسے پکڑ لیا۔ بھاگنے نہ دیا۔" وہ تھانیدار کی جانب متوجہ ہوا۔ "سامنے کھڑا ہے۔ اس سے پوچھ لیں۔"

مگر تھانیدار نے لالی سے کچھ نہ پوچھا۔ جمعدار سے سوال کیا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ اسے مارا پیٹا گیا؟

ضرب شدید پہنچائی گئی۔ ننگا کر کے درخت سے الٹا لٹکایا گیا۔ تین روز تک کچھ کھانے کو نہ دیا گیا۔"

"یہ بالکل بکواس کرتا ہے جی۔ نہ اسے مارا پیٹا گیا نہ الٹا کر کے لٹکایا گیا۔" جمعدار نے نہایت ڈھٹائی سے تردید کی۔ "یہ جی بہت جھوٹا ہے۔ اس نے سب غلط بتایا۔"

"کیا یہ بھی غلط ہے کہ اس کے ہاتھوں اور پیروں کو باندھ کر حبس بے جا میں رکھا گیا؟" تھانیدار نے اس دفعہ اونچی آواز سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔ "اس کے زنجیر سے جکڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ رہے ہو۔"

"ایسا تو جی کرنا ہی پڑتا ہے۔" جمعدار انکار نہ کر سکا۔ اس نے لالی کو حقارت سے دیکھا۔ "آپ کو پتہ نہیں جی۔ یہ حرام دا کتنا کمینہ اور بدمعاش ہے۔ یہ ان دھوکے باز پتھیروں میں سے ہے جو ہزاروں روپے منت اور خوشامد کر کے پیشگی لے لیتے ہیں اور چپکے سے کسی روز فرار ہو جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایسی کارروائی نہ کی جائے تو کیسے کام چلے۔ پیشگی وصول کرنے کے لیے تو ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔"

لالی نے مداخلت کی۔ "پیشگی کا معاملہ تو یہ ہے جی، جتنی ادا کرو اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ تو جی کبھی ختم نہیں ہوتی۔"

تھانیدار نے لالی کی مداخلت نظرانداز کرتے ہوئے جمعدار سے کہا۔ "تو گویا تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ اسے مارا پیٹا گیا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر لالی کی جانب اشارہ کیا۔ "زنجیر سے جکڑ کر حبس بے جا میں رکھا گیا۔"

جمعدار نے اس دفعہ صاف گوئی سے کام لیا۔ نہایت بے باکی سے بتایا۔ "میں نے بتایا نا جی، ایسا نہ کریں تو کیسے کام چلے۔ ان کی تو اس طرح چابی کسنی ہی پڑتی ہے۔" وہ دانت نکال کر بھونڈے پن سے ہنسنے لگا۔

تھانیدار کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا وہ زور سے دھاڑا۔ "ٹھیک سے بات کر۔" وہ بپھر کر اٹھا۔ آگے بڑھا اور جمعدار کے منہ پر تڑ سے تھپڑ رسید کیا۔

ہاتھ ایسا کرارا پڑا کہ کرسی ڈگمگائی۔ جمعدار نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ مگر وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ تھانیدار نے زناٹے کا ایک اور ہاتھ رسید کیا۔ جمعدار لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ تھانیدار اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ جمعدار اٹھا۔ سراسیمہ ہو کر وحشت زدہ نظروں سے تھانیدار کی جانب دیکھا۔ ایسا گھبرایا کہ زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔

جمعدار کرسی کی جانب بڑھا۔ تھانیدار نے ٹوکا۔ ڈپٹ کر حکم دیا۔ "کھڑا رہ۔" اس نے غضب ناک ہو کر کئی گالیاں دیں۔ تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "بھٹے کا مالک کہاں ہے؟ وہ کیوں نہیں آیا؟"

"وہ تو جی دفتر میں بیٹھا ہے۔" جمعدار نے مسکین سی صورت بنا کر مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اسی نے مجھے ادھر بھیجا تھا۔"

تھانیدار نے ایک کانسٹیبل کو طلب کیا۔ جمعدار کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "اسے لے جاؤ اور حوالات میں بند کر دو۔"

جمعدار سہمی ہوئی نظروں سے تھانیدار کے جھنجلائے ہوئے چہرے کو تکنے لگا۔ وہ اس قدر خوف زدہ تھا کہ اپنی صفائی میں کچھ کہہ بھی نہ سکا۔ ہکا بکا کھڑا رہا۔ تھانیدار مڑ کر لالی کی جانب متوجہ ہوا۔ "تو نے بالکل ٹھیک بتایا۔ تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔" اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ "دوسرے پتھیروں پر بھی اسی طرح جبر و تشدد ہوتا ہو گا۔"

"بہت ہوتا ہے جی۔ چھتر سے سڑاک سڑاک مارا جاتا ہے۔ ننگا کر کے سارے بھٹے پر گھمایا جاتا ہے۔ درخت سے باندھ کر الٹا لٹکایا جاتا ہے۔" لالی رقت انگیز لہجے میں سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ "بھٹی کے گرم گرم توے پر اتنی دیر تک کھڑا رکھا جاتا ہے کہ چیخیں نکل جاتی ہیں۔ پیروں کی کھال جل جاتی ہے۔ نہ کوئی دوا دارو ہوتا ہے نہ بھٹے سے باہر جانے دیا جاتا ہے۔ چوبیس گھنٹے راکھے کڑی نگرانی کرتے ہیں۔ کیا بتاؤں جی، پتھیروں پر کیسا کیسا ظلم ہوتا ہے۔"

"اطمینان رکھ، اب ظلم نہیں ہو گا۔" تھانیدار نے تسلی دی۔ سامنے کھڑے ہوئے کانسٹیبل کو مخاطب کیا۔ "کھوکھر، اسے اپنے ساتھ لے جا۔ اس کے ہاتھ کھول دے۔ کھانے کو بھی دے۔ پتہ نہیں کب سے اسے روٹی نہیں ملی۔"

کھوکھر جانے کے لیے مڑا تو تھانیدار نے اسے ٹوکا۔ "بات سن۔ بھٹے کے مالک 'نثار محمد' کو یہاں لے کر آ۔ دو کانسٹیبل ساتھ لیتا جا۔ سیدھی طرح آ جائے تو ٹھیک ہے۔ گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے یا ہیکڑی دکھائے تو پکڑ کر لے آ۔ حوالات میں بند کر کے اس کی بھی گرمی اتارنی ہے۔ اس کے خلاف جبر و تشدد اور حبس بے جا میں رکھنے کے الزامات ہیں۔ خاصا سنگین کیس ہے۔"

کھوکھر نے نہایت مستعدی سے دونوں پیروں کی ایڑیاں جوڑ کر کھٹاک سے تھانیدار کو سلیوٹ کیا۔ جمعدار زماں خان کا بازو پکڑا اور نہایت تحقیر کے ساتھ دھکے دیتا ہوا باہر لے گیا۔ لالی بھی دونوں کے پیچھے پیچھے چلا۔ وہ خاموش اور سہما ہوا نظر آ رہا تھا۔

باہر نکل کر جمعدار کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ لالی کے ہاتھوں میں پڑی ہوئی زنجیر کا تالا کسی نہ کسی طرح کھولا گیا۔ ہاتھ آزاد ہوئے تو لالی نے دیکھا کلائیوں میں زنجیر کی کڑیاں پیوست ہونے سے

گڑھے پڑ گئے تھے۔ دونوں ہاتھ ابھی تک دکھ رہے تھے۔ مگر وہ ہاتھوں کی تکلیف سے بے نیاز دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ زیر لب مسکرا رہا تھا۔ مڑ مڑ کر حوالات کی جانب دیکھ رہا تھا جس کی سلاخوں کے پیچھے جمعدار زماں خان حیران و پریشان کھڑا تھا۔

لالی نے کھانا کھایا۔ چائے بھی پی۔ اور ہیڈ محرر کے کمرے میں پڑی ہوئی بنچ پر خاموشی سے بیٹھا رہا۔

☆

دوپہر کو بھٹے کا مالک نثار محمد تھانے میں داخل ہوا۔ لالی نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ہم راہ دو افراد اور بھی تھے۔ ایک تو ملک نثار محمد کا منشی تھا۔ دوسرے کو لالی نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وضع قطع سے وہ کھاتا پیتا اور معزز نظر آتا تھا۔ چال ڈھال میں تمکنت تھی، طمطراق تھا۔ وہ آگے بڑھا اور سب سے پہلے ایس ایچ او کے کمرے میں داخل ہوا۔ ملک نثار محمد اور اس کا منشی بھی اندر چلے گئے۔ دونوں سہمے ہوئے اور خوف زدہ معلوم ہوتے تھے۔ تھانیدار اپنے کمرے میں موجود تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے کسی واردات کی تفتیش کرنے کے بعد واپس آیا تھا۔

تینوں کو کمرے میں گئے ہوئے دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ تھانیدار نے ایک کانسٹیبل کو اندر بلایا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ باہر نکلا۔ سیدھا حوالات کے دروازے پر پہنچا۔ قفل کھولا۔ جمعدار کو باہر نکالا اور تھانیدار کے کمرے میں پہنچا دیا۔ لالی خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ تھانیدار کے دفتر میں چائے پہنچائی گئی۔ لالی بے چینی سے مڑ مڑ کر اس طرف دیکھتا رہا۔ کمرے سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

نصف گھنٹے بعد ملک نثار محمد کمرے سے باہر نکلا۔ منشی اور دوسرا شخص بھی باہر آیا۔ جمعدار زماں خان بھی ان کے ہم راہ تھا۔ ایس ایچ او انھیں رخصت کرنے دروازے تک آیا۔ لالی یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ نہ جمعدار اور نہ ہی ملک نثار محمد حوالات کی جانب آئے۔ ان کے چہروں سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ وہ آگے بڑھے اور نہایت سکون سے قدم اٹھاتے تھانے کی حدود سے باہر چلے گئے۔

لالی صورت حال کی اس تبدیلی پر غور ہی کر رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل اس کے پاس آیا۔ اپنے ہم راہ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں حوالات کے دروازے پر پہنچے۔ قفل کھولا گیا۔ کانسٹیبل نے حقارت سے دھکا دے کر لالی کو حوالات میں داخل کر دیا۔ دروازہ بند کیا گیا

ر اس میں قفل ڈال دیا گیا۔

لالی بہت چکرایا۔ اس نے احتجاج کیا۔ ”یار تو نے مجھے کیوں بند کر دیا۔ میں نے کیا جرم کیا ے؟؟“

”یہ ایس ایچ او صاحب سے پوچھ جن کے حکم سے تجھے بند کیا گیا۔“ کانسٹیبل نے بے رخی سے واب دیا۔

”پر میں تو فریاد لے کر یہاں آیا تھا۔“ لالی ہنوز حیران و پریشان تھا۔

”بکواس نہ کر۔“ کانسٹیبل نے آنکھیں نکال کر ڈانٹا۔ مڑا اور اس کی جانب مزید توجہ دیے بغیر ایک طرف چلا گیا۔

لالی حوالات کے آہنی دروازے کی سلاخیں تھامے حیرت زدہ کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ تبدیلی اچانک کیسے رونما ہوئی۔ عجب ماجرا تھا۔ جمعدار آزاد ہو کر ملک نثار محمد کے ساتھ جا چکا تھا اور لالی حوالات میں بند تھا۔ وہ گم صم کھڑا کانسٹیبلوں کو دیکھ رہا تھا جو تھانے میں ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ کسی نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ وہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

دوسرے روز بھی لالی حوالات میں رہا۔ اس روز اتوار تھا۔ لالی کو کچھ خبر نہ تھی کہ اسے کیوں حوالات میں رکھا گیا؟ اس کے خلاف کیا الزام عائد کیا گیا؟ پیر کی صبح اسے حوالات سے باہر نکالا گیا۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالی گئیں۔ علاقہ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ مزید تفتیش اور پوچھ گچھ کے لیے پولیس کی درخواست پر عدالت نے ایک ہفتے کا ریمانڈ دے دیا۔ لالی کو ہتھکڑیاں ڈال کر تھانے میں واپس لایا گیا۔ ایک بار پھر حوالات میں بند کر دیا گیا۔ وہ سخت آزردہ اور نڈھال تھا۔

مگر نہ لالی سے مزید پوچھ گچھ کی گئی اور نہ ہی تھانیدار کے رو بہ رو پیشی ہوئی۔ حوالات میں کئی اور بھی ملزم بند تھے۔ لیکن کوئی بھی اس کا شناسا نہ نکلا۔ ان کے جو عزیز و اقارب اور ملنے جلنے والے آتے، ان میں بھی کوئی ایسا نظر نہ آیا جس سے اس کی جان پہچان ہوتی۔ وہ خود کو یک و تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کر رہا تھا۔ حیران و پریشان بھی تھا۔ وہ تھانے میں دادرسی کی غرض سے آیا تھا مگر نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ بھٹے کے مالک، ملک نثار محمد اور جمعدار زماں خان کے بجائے اسے ملزم قرار دے کر حوالات میں ڈال دیا گیا۔

وہ اسی پریشانی کے عالم میں تھا کہ ایک روز بھٹے کا جمعدار اس کے پاس آیا۔ لالی نے اسے دیکھا تو

نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ "اب کیا لینے آیا ہے؟"

جمعدار مسکرا کر نرمی سے گویا ہوا۔ "تیں نوں اب تو پتہ چل گیا کہ تو ملک نثار کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کی بہت اوپر تک جان پہچان ہے۔ سارے ہی وڈے افسروں سے یاری ہے۔ اس روز ملک جب تھانیدار سے ملنے آیا تھا تو اپنے ساتھ صوبائی اسمبلی کے ممبر کو لایا تھا۔ تو نے دیکھ لیا۔ اس کے آنے سے میں حوالات سے باہر آگیا اور تو اندر رہ گیا۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔ "سوچ لے' ابھی کچھ نہیں ہوا۔ پولیس نے تیرے خلاف ابھی نہ مکدمہ بنایا ہے نہ عدالت م چالان پیش کیا ہے۔"

"تو چاہتا کیا ہے؟" لالی نے حیرت کا اظہار کیا۔

"بھٹے پر چل کر کام کر۔ تو نے جو پیشگی ادا کرنی ہے ادا کر۔" جمعدار نے اسے سمجھانے ک کوشش کی۔ "میں نے ملک کو منت کر کے راضی کر لیا ہے۔ اب وہ تجھے کوئی سزا شزا نہیں د گا۔ آرام سے پہلے کی طرح کام کرنا۔" اس نے ادھر ادھر چوکنا نظروں سے دیکھ کر سرگوشی کی "ملک نثار کے کہنے پر تھانیدار معاملہ دبا دے گا۔ تجھے حوالات سے رہائی مل جائے گی۔"

لیکن لالی آمادہ نہ ہوا۔ بے رخی سے بولا۔ "میں نے اب بھٹے پر نہیں جانا۔ نہ پیشگی ادا کرنی۔ اور نہ ہی پتھیرے کا کام کرنا ہے۔"

"ایسا سوچے گا تو جیل کاٹنی ہوگی۔"

"جیل کیوں کاٹنی ہو گی؟" لالی اس کی دھمکی سے مرعوب نہ ہوا۔ "میں نے جرم ہی کیا ہے؟"

جمعدار نے جل کر کہا۔ "آگے تجھے پتہ چل جائے گا کیا جرم کیا ہے؟"

لالی خاموش رہا۔ جمعدار چلا گیا۔

ریمانڈ کی مدت ختم ہونے کے بعد لالی کو دوبارہ مجسٹریٹ کے روبرو پیش کیا گیا۔ پولیس نے عدالت سے ایک ہفتے کا اور ریمانڈ مانگا۔ وہ بھی مل گیا۔ لالی پھر حوالات میں واپس آگیا۔ دوسر روز بھٹے کا جمعدار' زماں خان پھر اس کے پاس آیا۔ سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ ڈرایا دھما بھی۔ لیکن لالی کسی طور بھٹے پر واپس جانے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ جمعدار اس بار بھی ناکام ا جھنجلایا ہوا گیا۔

لالی کو عدالت میں حاضر کیا گیا۔ اس دفعہ پولیس نے اس کے خلاف چالان بھی پیش کر دیا پولیس نے تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۸۲ کے تحت سرقہ بالجبر کا مقدمہ قائم کیا تھا۔ مقدمہ کی بن

بھٹے کے منشی کی رپورٹ تھی جس میں لالی کے خلاف یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ اس نے چاقو دکھا کر منشی کو دہشت زدہ کیا اور پانچ ہزار سے زائد کی وہ رقم زبردستی چھین کر فرار ہو گیا جو پتھیروں اور دوسرے بھٹہ مزدوروں کا چٹھا بانٹنے کے لیے اس کی تحویل میں تھی۔ استغاثہ کے مطابق ابتدائی رپورٹ درج کرنے کے بعد پولیس کی ایک جمعیت نے لالی کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارے اور اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ چوری کی رقم بھی برآمد ہو گئی۔ اس کے عینی شاہد بھی تھے۔ چالان میں استغاثہ کے گواہوں کی فہرست بھی درج تھی۔

عدالت نے مقدمے کی آئندہ سماعت تک کے لیے لالی کو جیل بھیج دیا۔

لالی کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ خالی جیبیں' خالی ہاتھ۔ لہٰذا وہ اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے نہ کوئی وکیل کھڑا کر سکا اور نہ ہی ضمانت کے لیے کوئی بھاگ دوڑ کرنے والا تھا۔ وہ بالکل بے یار و مددگار تھا۔ مقدمے کی سماعت کا سلسلہ جاری رہا۔ پیشیاں پڑتی رہیں۔ لگ بھگ دس مہینے جیل میں گزر گئے۔ مگر مقدمے کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ حالانکہ لالی' حوالاتی تھا لیکن جیل میں اسے ان قیدیوں کی طرح مشقت کرنا پڑتی جن کو عدالتوں سے مجرم قرار دیا جا چکا تھا۔

لالی نے عدالت کے روبرو اپنی صفائی پیش کی۔ خود کو بے قصور ثابت کرنے کی ہر طرح کوشش کی۔ بھٹے کے مالک اور جمعدار نے جو ظلم و ستم ڈھایا تھا' گڑگڑا کر اور رقت انگیز لہجے میں اس کی ایک ایک تفصیل بیان کی۔ مگر اپنے بیان کی تائید میں نہ وہ کوئی ثبوت پیش کر سکا نہ گواہ۔ دوسری طرف استغاثہ کی جانب سے ایک نہیں کئی گواہ پیش کیے گئے۔ ان میں بھٹے کا منشی تھا' جمعدار تھا اور وہ پتھیرے بھی شامل تھے' جن کو بخوبی علم تھا کہ لالی بے قصور ہے اور بھٹے کے مالک نے انتقامی کارروائی کے طور پر اس کے خلاف جھوٹا مقدمہ تیار کیا ہے جس میں اسے پولیس کے اہل کاروں کی پوری پوری حمایت اور تائید حاصل ہے۔

گواہوں کے علاوہ وکیل سرکار کو اپنے دلائل میں لالی کے داغدار ماضی سے بہت مدد ملی۔ پولیس ریکارڈ کے مطابق وہ عادی مجرم رہ چکا تھا۔ چوری اور ڈکیتی کے کئی مقدمات میں سزا کاٹ چکا تھا۔ جرح کے دوران وہ لالی سے اس کے سابقہ جرائم کا اعتراف کرانے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ اس نے لالی کے خلاف دستاویزی ثبوت بھی پیش کیے۔ غرضیکہ استغاثہ نے بہت مضبوط مقدمہ تیار کیا تھا۔

آخر کار مقدمہ کی سماعت مکمل ہو گئی۔ وہ دن بھی آگیا جب عدالت نے اپنا فیصلہ سنایا۔ اسے دفعہ ۳۸۲ کے تحت سرقہ بالجبر کے جرم میں ایک سال قید با مشقت اور دو ہزار روپے جرمانہ کی سزا

دی گئی۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید تین ماہ قید بھگتنے کا حکم دیا گیا۔

لالی نے مقدمے کا فیصلہ نہایت صبر و سکون سے سنا۔ نہ اس نے فریاد کی نہ احتجاج اور نہ ہی ماتحت عدالت کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کرنے کے بارے میں سوچا۔ اتنے وسائل ہی نہ تھے۔ عدالت نے جو فیصلہ دیا' اس کے لیے وہ ذہنی طور پر پہلے ہی تیار تھا۔ مقدمے کا رخ دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ فیصلہ اس کے خلاف ہی ہو گا۔ پولیس کی حراست میں وہ عدالت سے باہر نکلا اور دوسرے قیدیوں کے ساتھ جیل کی گاڑی میں خاموشی سے سوار ہو گیا۔ گاڑی سینٹرل جیل کی جانب روانہ ہو گئی۔ لالی جیل میں واپس پہنچ گیا۔ اب وہ حوالاتی نہ رہا تھا سزا یافتہ قیدی بن چکا تھا۔

جیل میں کتنے ہی قیدی ایسے تھے جن سے لالی کی شناسائی تھی' یاری دوستی تھی۔ ان میں کئی ایسے بھی تھے جو قید کی مدت پوری ہونے کے بعد رہا ہوئے۔ لالی نے ان کے ذریعے شاداں کو پیغام بھیجا کہ وہ آئے اور اس سے ملے۔ ایسا ہر پیغام بھیجنے کے بعد وہ ملاقات کے دن کا بے چینی سے انتظار کرتا۔ ملاقات کا دن آتا۔ اس کی نگاہیں ملاقاتیوں کے ہجوم میں شاداں کو تلاش کرتیں۔ مگر ہر بار اس کی نظریں بے قراری سے بھٹکتی رہ گئیں اور ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ شاداں اسے دکھائی نہ دی۔ وہ اس سے ملنے نہ آئی۔

وہ شاداں کی جانب سے مایوس ہو گیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ شاداں کی یاد کے نقوش دھندلے پڑ گئے۔ لیکن بھولنے کی کوشش کے باوجود وہ اسے بھلا نہ سکا۔ صبح ہوتی شام ہوتی۔ دن ہفتوں میں' اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے۔ ادھر ملک میں بھی نت نئی تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ مرکز اور صوبوں میں آئے دن وزارتیں ٹوٹتی اور بنتی رہیں۔ اسمبلیوں میں سیاسی جماعتوں اور گروہوں کے مابین پرانے رشتے ختم ہوتے' نئے گٹھ جوڑ ہوتے۔ راتوں رات اکثریت' اقلیت میں اور اقلیت' اکثریت میں بدل جاتی۔ نئے وزیر اعلیٰ اور نئے وزیر اعظم مقرر ہوتے۔

ملک فیروز خاں نون' وزیر اعظم تھے۔ فروری ۱۹۵۹ء میں ہونے والے عام انتخابات کا ہر طرف چرچا تھا۔ لیکن انتخابات سے چار مہینے قبل اکتوبر ۱۹۵۸ء کی ایک رات کو ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ مارشل لا نافذ کر کے فوج نے اقتدار مملکت پر قبضہ کر لیا۔ اسمبلیاں توڑ دی گئیں۔ آئین منسوخ کر دیا گیا۔ سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ کتنے ہی سیاسی اور ٹریڈ یونین رہنماؤں اور کارکنوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ کئی سیاسی نظر بندوں کو سینٹرل جیل میں بھی رکھا گیا جس میں لالی تھا۔

* * *

لالی کی رہائی میں کچھ کم دو مہینے باقی تھے۔ اب وہ جیل کی زندگی سے مانوس ہو چکا تھا۔ ایک روز اسے اطلاع ملی کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔ ملاقات کا دن تھا۔ ہر طرف چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ قیدی ہنستے مسکراتے نظر آ رہے تھے۔ لالی نے جا کر دیکھا' ملاقاتیوں کے ہجوم میں' شاداں بھی موجود تھی۔ لالی نے اسے دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔

شاداں اب اتنی بدل چکی تھی کہ پہلی نظر میں تو وہ اسے پہچان ہی نہ سکا۔ لالی نے جب اسے آخری بار دیکھا تھا تو بھٹے پر چلچلاتی دھوپ اور لو کے گرم گرم تھپیڑوں میں کام کرنے سے اس کا رنگ روپ ماند پڑ گیا تھا۔ چہرہ جھلس کر راکھ ہو گیا تھا۔ بال بھورے پڑ گئے تھے۔ آنکھیں بے رونق اور ویران نظر آتی تھیں۔ سخت محنت اور غذائیت کی کمی کے باعث اس کا مضبوط اور بھرا بھرا صحت مند جسم مرجھا گیا تھا۔ جلد کھردری پڑ گئی تھی۔ دانت گندے اور پیلے پیلے نظر آتے تھے۔ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ سن رسیدہ لگتی تھی۔ اس کے ملگجے اور بوسیدہ لباس سے پسینے کی تیز بو کے بھبکے اٹھتے تھے۔

مگر اب شاداں کا رنگ نکھر گیا تھا۔ چہرے پر شگفتگی اور رعنائی کی چاندنی تھی۔ آنکھیں ایسی روشن اور اجلی تھیں گویا چراغ جھلملا رہے ہوں۔ لباس بھی عمدہ اور بھڑکیلا تھا۔ وہ بڑے زمیں دار گھرانوں کی عورتوں کی طرح ریشمی کرتا اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ جسم کا بالائی حصہ سفید اونی شال سے ڈھکا تھا۔ ہاتھوں میں طلائی کنگن اور کانوں میں جڑاؤ مندرے تھے۔ لباس سے عطر کی ہلکی ہلکی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ دل ربا اور طرح دار نظر آ رہی تھی۔

لالی نے اس کی یہ سج دھج دیکھی تو ایسا حیرت زدہ ہوا کہ کچھ کہہ نہ سکا۔ گم صم کھڑا کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ شاداں کا چہرہ کندن کی طرح دمکنے لگا۔ رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے شرما کر شال کھینچی اور سر ڈھک لیا۔ نظریں جھکا کر بولی۔ "تو مجھے اس طرح گھور کیوں رہا ہے؟" اس کے انداز میں پہلی سی بے باکی اور اکھڑ پن نہ تھا۔

"دیکھ رہا ہوں تو کتنی بدل گئی ہے۔ پہلے تو میں تجھے پہچان ہی نہ سکا۔" لالی نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔ "لشکارے مار رہی ہے۔ تو اب تک رہی کہاں؟ میں نے کتنے بندے ترے پاس بھیجے' پر تو نہ آئی۔" اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔ "تو اپنے ماماں ہی کے پاس ہے نا؟"

"نہیں۔" شاداں نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "اس کی تو موت کو بھی بہت مدت ہو گئی۔ میرے پہنچنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ مر گیا۔"

"تیرا ماماں مر گیا؟" لالی نے حیران و پریشان ہو کر دریافت کیا۔ "کیسے مر گیا؟"

"سویرے دودھ لے کر جا رہا تھا۔" شاداں کی چہرے پر افسردگی کا غبار چھا گیا۔ آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔ "وڈی سڑک پر اس کی سیکل ایک بس سے ٹکرا گئی۔ بس اسے کچلتی ہوئی گزر گئی۔ یہ بھی پتہ نہ چلا، کس کی بس تھی اور کہاں چلی گئی؟ ماماں کی لاش گھر آئی تو ایسی خراب ہو گئی تھی کہ پہچانی نہ جاتی تھی۔ بس کا پہیا اس کی سر پر سے گزر گیا تھا۔"

"یہ تو نے بہت بری خبر سنائی۔ تیرا ماماں بہت نیک بندہ تھا۔" لالی نے اظہار ہمدردی کیا۔ "تجھے تو بہت پیار کرتا تھا۔"

"نہ پوچھ کتنا پیار کرتا تھا۔" شاداں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اپنی اولاد کی طرح سمجھتا تھا۔"

"پر تو نے اس کا گھر کیوں چھوڑ دیا؟ مامی تو موجود تھی۔"

"ماماں کی موت کے بعد تو اس نے زبردست سیاپا کیا۔ اسے یاد کر کے بہت روتی تھی۔" شاداں نے بتایا۔ "پر عدت پوری ہوتے ہی اس نے ایک دودھی سے نکاح پڑھوا لیا۔ وہ چنگا بندہ نہیں ہے۔ مجھے طرح طرح سے تنگ کرتا تھا۔ نشہ کر کے مامی کو بھی مارتا پیٹتا تھا۔ ایک شام مامی گھر پر نہیں تھی۔ وہ نشہ کر کے آیا۔ مجھے اکیلا پایا تو نوچنے کھسوٹنے لگا۔ اتنے میں مامی بھی آ گئی۔ اس نے اپنے گھر والے کو تو کچھ نہ کہا۔ الٹا مجھ پر ناراض ہوئی۔ گندی گندی گالاں نکالیں۔ مجھے اتنا غصہ آیا کہ دوسرے ہی روز اس کا گھر چھوڑ دیا۔"

"گھر چھوڑ کر تو کہاں گئی؟" لالی نے دریافت کیا۔

"جاتی کہاں، سیدھی تیرے پاس پہنچی۔" شاداں نے مطلع کیا۔ "پر تو تیموں کے بھٹے کو چھوڑ چکا تھا۔ کسی کو پتہ نہ تھا تو کہاں ہے؟ کس بھٹے پر کام کر رہا ہے؟ کتنے ہی پتھیروں سے پوچھ تاچھ کی پر کسی نے تیرے بارے میں کچھ نہ بتایا۔"

"بھٹے کے جمعدار کو تو میرے بارے میں سب کچھ پتہ تھا۔ تو نے اس سے کیوں نہیں پوچھا؟"

"اس کے پاس اس ڈر سے نہ گئی کہ پکڑ کر بھٹے پر نہ لگا دے۔" شاداں نے بتایا۔ "جب تو نہ ملا تو میں کاسم بیلا اپنی کمیری کے پاس چلی گئی۔ جب تو ملتان جیل میں ہوتا تھا تب بھی میں اس کے ساتھ رہتی تھی۔ پر اس بار اس کی بیوہ نناں بھی گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ موجود تھی۔ ایسی جھگڑالو کہ میں تجھ سے کیا بتاؤں۔ روز ہی مجھ سے جھگڑا کرتی تھی۔ تنگ آ کر میں نے کاسم بیلا بھی چھوڑ دیا۔"

"تو کاسم بیلا سے یہاں آ گئی ہے؟"

"تب تو مجھے پتہ بھی نہ تھا تو جیل میں ہوتا ہے۔"

"فیر تو یہاں کیسے پہنچی؟" لالی نے دریافت کیا۔

پچھلی جمعرات کو میں پاک پتن گئی تھی۔" شاداں نے جواب دیا۔ "وہاں بابا فرید کی زیارت پر
گئی۔ جب سے اس کا گھر چھوڑا پہلی بار ملی تھی۔ تیرے جیل کے کئی ساتھی اس کے گھر جا
ے۔ ان سے مامی نے تیرے بارے میں جو کچھ سنا تھا مجھے سب بتایا۔"

ب تو کہاں ہوتی ہے؟"

اسم بیلا چھوڑنے کے بعد میں چوہدری نورالٰہی کے پاس نوکری کرنے چلی گئی تھی۔" شاداں
کو مطلع کیا۔ "تب سے میں کوٹلہ ہرکشن میں ہوں۔"

نوکرانی تو بالکل نہیں لگتی۔" لالی نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ "تو نے چوہدری سے ویاہ تو نہیں
"

ں، میں نے اس سے ویاہ کر لیا۔ اب وہ میرا گھر والا ہے۔" شاداں نے دبی زبان سے
کیا۔

ششدر رہ گیا۔ چند لمحے شاداں کو گھورتا رہا، پھر اس نے یقین نہ آنے کے انداز میں پوچھا۔
چوہدری سے ویاہ کر لیا؟ کب کیا ویاہ؟"

پچھلے مہینے کیا ہے۔" شاداں نے نہایت سکون سے جواب دیا۔

تڑپ کر بولا۔ "تجھے پتہ ہے چوہدری کیسا بندہ ہے؟"

ں نوں پتہ ہے، ٹھیک طرح پتہ ہے وہ کیسا بندہ ہے۔" شاداں نے لالی کی آنکھوں میں
ڈال کر کہا۔ "تجھ سے بہت زیادہ چنگا بندہ ہے۔ وڈا زمیں دار ہے۔ شان سے رہتا ہے۔
کرتا ہے۔ ہر طرح کا آرام پہنچاتا ہے۔"

ب تو آرام سے ہے تو اب میرے پاس کیوں آئی ہے؟" لالی نے غصے سے جھنجلا کر شاداں کو

رے پاس یہ بتانے آئی ہوں کہ میں اب چوہدری کی گھر والی بن چکی ہوں۔ وہ تجھے بالکل پسند
تا۔" شاداں نے لالی کو خبردار کیا۔ "آگے تو میرے پاس نہ آنا۔ میں نے تجھ سے اب کچھ
۔"

ں کا مطلب یہ ہوا کہ تو مجھے دھوکا دیتی رہی۔ تو نے مجھ سے جھوٹے وعدے کیے۔" لالی نے

وتا وعدہ میں نے کیا یا تو نے؟" شاداں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تو نے پکا وعدہ کیا تھا کہ
لیتی چھوڑ دے گا۔ پر تو باز نہ آیا۔ چوری کی پکڑا گیا۔ اب جیل میں بند ہے۔" اس کا لہجہ

اور تلخ ہو گیا۔ "میں نے تیرے ایسے چور ڈکیت سے کوئی رشتہ ناتا نہیں رکھنا۔"

"تجھے غلط اطلاع ملی۔ میں نے کوئی چوری ڈکیتی نہیں کی۔" لالی نے صفائی پیش کی۔ "بھٹے کے مالک نثار محمد اور اس کے جمعدار نے پولیس کی مٹھی گرم کر کے میرے خلاف جھوٹا کیس بنوایا اور مجھے جیل میں بند کروا دیا۔"

"مجھے سب پتہ ہے تو جیل میں کیوں ہے؟ ماسی نے تیرے بارے میں مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔" شاداں اس کی صفائی سے ذرا متاثر نہ ہوئی۔ "اسے تو تیرے ہی جیل کے ساتھی کیدیوں نے ساری باتیں بتائی ہیں۔"

"انھیں کچھ پتہ نہیں۔" لالی نے شاداں کو مطمئن کرنے کی ایک بار پھر کوشش کی۔ "تو ملک نثار محمد کے بھتیروں سے پوچھ لے۔ ان کو پتہ ہے کہ کس طرح میرے خلاف جھوٹا مکدمہ بنایا گیا۔"

"میں نے کسی سے کچھ نہیں پوچھنا۔" اس نے اس دفعہ سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ویسے بھی میں نے اب تجھ سے کیا لینا۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ مجھے تو اب چوہدری کی گھر والی ہی بن کر رہنا ہے۔"

"یہ کیوں نہیں کہتی اب تو وڈی زمیں دارنی بن گئی ہے۔ شان سے رہتی ہے۔ عیش کرتی ہے۔ اب میرے ایسے غریب بندے سے تجھے کیا لینا۔" لالی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تو جو چاہتی تھی تجھے مل گیا۔"

"تیرا جو جی چاہے سوچتا رہ۔" شاداں نے مڑتے ہوئے کہا۔ "پر آگے تو مجھے ملنے یا میرے پاس آنے کی نہ سوچنا۔"

شاداں آگے بڑھی اور آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ لالی لوہے کی سلاخیں ہاتھوں سے تھامے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سامنے ایک گھنے درخت کے نیچے جیپ کھڑی تھی۔ شاداں جیپ کے نزدیک پہنچی اور پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا بھی نہیں۔

جیپ کا انجن شور مچاتا ہوا اسٹارٹ ہوا۔ پہیے حرکت میں آئے۔ جیپ تیزی سے مڑی۔ پختہ سڑک پر پہنچی اور تیز رفتار سے دوڑنے لگی۔

لالی لوہے کی سلاخیں دونوں ہاتھوں سے تھامے جیپ کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جیپ آن کی آ میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ شاداں چلی گئی۔ لالی کی پہنچ سے بہت دور چلی گئی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ لیے اس سے رخصت ہو چکی تھی۔ لالی سے منہ موڑ کر کسی اور کی بن چکی تھی۔

لالی نے دل گرفتہ ہو کر گہری سانس بھری اور بے قرار ہو کر اپنا سر سلاخوں پر رکھ دیا۔

۵

شاداں کوٹلہ ہرکشن واپس پہنچی تو پہر رات گزر چکی تھی۔ رحیم داد بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ شاداں سفر کی تکان سے نڈھال تھی۔ لالی سے ملنے کے بعد ذہنی طور پر پریشان بھی تھی۔ آنکھیں بجھی بجھی تھیں اور چہرے پر افسردگی چھائی تھی۔

رحیم داد نے شاداں کو افسردہ اور مضمحل پایا تو اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ "شاداں! تو کچھ پریشان پریشان سی لگ رہی ہے۔ لگتا ہے لالی سے تیرا جھگڑا ہو گیا۔ میں نے پہلے ہی منع کیا تھا اس کے پاس نہ جا، پر تو نے میری بات نہ مانی۔ یہ نہ سوچا وہ بدنام مجرم ہے۔ چوری ڈکیتی کرنا اور جیل جانا اس کا دھندا ہے۔ سمجھ نہیں آتی تو اس کے چکر میں کیسے پڑ گئی۔"

شاداں کے دل کے کسی گوشے میں ابھی تک لالی کے لیے جگہ تھی۔ رحیم داد کی جلی کٹی باتیں سن کر اس نے لالی کی جانب سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "پر وہ تو کہتا تھا، میں نے چوری نہیں کی۔ بھٹے کے مالک نے پولیس کو اپنے ساتھ ملا کر میرے خلاف جھوٹا مکدمہ بنایا اور مجھے جیل میں بند کرا دیا۔"

"شاداں، تو جتنی سوہنی ہے اتنی ہی بھولی بھی ہے۔" رحیم داد نے محبت سے اس کا گال تھپتھپایا۔ "کوئی مجرم کبھی یہ نہیں کہتا اس نے جرم کیا ہے۔ ہمیشہ اپنے تئیں بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تو جب پولیس دبا کے پٹائی کرتی ہے تب بتاتا ہے اس نے کیا جرم کیا ہے۔ اور لالی تو ایسا پکا جرائم پیشہ ہے کہ زبردست مار پڑنے پر بھی اپنا جرم صاف صاف بتانے کا نہیں۔ تجھے پتہ نہیں وہ کتنا خطرناک بندہ ہے۔"

"وہ تو مجھے یہ بھی کہتا تھا کہ بھٹے کے سارے ہی بھتیروں کو پتہ ہے اس نے چوری نہیں کی۔" شاداں پر رحیم داد کی باتوں کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس نے لالی کی جانب سے مزید صفائی پیش کی۔ "وہ تو یہاں تک کہتا تھا تجھے میری بات پر یقین نہ ہو تو بھٹے پر جا کر بھتیروں سے پوچھ لے۔ خود ہی پتہ چل جائے گا میں جھوٹ بول رہا ہوں یا سچ۔"

"وہ کچھ ہی کہے اور اپنے بے گناہ ہونے کے بارے میں کیسی ہی صفائی پیش کرے' پر میں تجھے صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ اب تو میری گھر والی ہے' آگے میں تیری زبان سے لالی کا ذکر نہ سنوں۔" رحیم داد اچانک بھڑک اٹھا۔ تیوری پر بل ڈال کر اس نے تیکھے لہجے میں شاداں کو خبردار کیا۔ "نہ تو اب اسے ملے گی اور نہ وہ کبھی یہاں آئے گا۔ میں عزت دار زمیں دار ہوں۔ ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میری گھر والی کسی بدنام جرائم پیشہ کے ساتھ کسی بھی طرح کا میل ملاپ رکھے۔"

شاداں نے رحیم داد کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو نرم پڑ گئی۔ فوراً اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "برا نہ منا۔ تو جیسا کہتا ہے ویسا ہی ہو گا۔ میں نے لالی کو صاف صاف کہہ دیا۔ آگے نہ کبھی یہاں آئے اور نہ مجھے ملنے کی کوشش کرے۔ میں اسے یہی کہنے جیل گئی تھی اور تجھے بتا کر گئی تھی۔" اس نے گردن کو ہلکا سا خم دیا' مسکرا کر دیکھا اور رحیم داد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا لیا۔ "چوہدری' تو میرا گھر والا ہے۔ زندگی بھر کا سنگی ساتھی ہے۔ میں نے اب لالی شالی سے کیا لینا۔"

اس کے انداز میں لگاوٹ تھی۔ دلداری تھی۔ ناز اور عشوہ تھا۔ رحیم داد اس کی اس ادا پر تڑپ اٹھا۔ ساری برہمی اور کدورت کافور ہو گئی۔ ایسا وارفتہ ہوا کہ بے اختیار دونوں بازوؤں میں سمیٹ کر شاداں کو سینے سے لگا لیا۔ اس کے کندھے محبت سے ہولے ہولے تھپکنے لگا۔

☆

فروری کا مہینہ تھا۔ سردی کا زور اب کسی قدر ٹوٹ چکا تھا۔ مگر اس وقت فضا میں خاصی خنکی تھی۔ کہر کی ہلکی نیلگوں دھند چھٹتی جا رہی تھی۔ سورج درختوں کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت لطف دیتی تھی۔ ربیع کی فصل تیاری کے مرحلے میں تھی۔ ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ گندم کے ہرے بھرے پودے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ سرسوں کے کھیتوں میں زرد زرد پھولوں سے لدی ہوئی شاخیں جھوم رہی تھیں۔ بسنت کی آمد آمد تھی۔ فضا خوش گوار تھی' مہک رہی تھی۔

رحیم داد صبح سے کھیتوں کے درمیان گھوم رہا تھا۔ فصل کے بارے میں مزارعوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ جب وہ حویلی میں واپس پہنچا تو سہ پہر دن گزر چکا تھا۔ سورج نیلے آسمان پر دمک رہا تھا۔ دھوپ کی حرارت اور گرمی بڑھ گئی تھی۔

رحیم داد ٹہلتا ہوا مہمان خانے میں چلا گیا۔ مہمان خانہ خالی پڑا تھا۔ ماسٹر عبداللطیف اپنے بال بچوں کے ساتھ جا چکا تھا۔ اسے سکھر کے ایک اسکول میں ملازمت مل گئی تھی۔ پچھلے چار ماہ سے وہ سکھر ہی میں تھا۔ رحیم داد نے اسے روکنا بھی چاہا مگر اس کی بیوی کسی طور راضی نہ ہوئی۔ وہ مزاج کی تیز اور طرار تھی۔ آئے دن نادر خان کی بیوی 'جنت' سے اس کا جھگڑا ہوتا تھا۔ عبداللطیف بیوی سے دبتا بھی تھا۔ منع کرتا تو اس کی ذرا پروا نہ کرتی۔ حقارت سے جھڑک دیتی۔ عبداللطیف روز روز کے جھگڑے سے عاجز آ گیا تھا۔ اور جیسے ہی اپنے رشتے کے ایک سالے کے ذریعے ملازمت کی سبیل پیدا ہوئی اور بیوی نے دباؤ ڈالا' اس نے بستر بوریا باندھا اور سکھر کے لیے روانہ ہو گیا۔

عبداللطیف کے جانے کی بعد رحیم داد نے مہمان خانے کی مرمت کرائی تھی۔ دو نئے کمرے تعمیر کرائے تھے۔ پرانا فرنیچر ہٹا کر نیا فرنیچر ڈلوایا تھا۔ در و دیوار پر نیا رنگ روغن کیا گیا۔ پردے تبدیل کیے گئے۔ اب مہمان خانے کا حلیہ بالکل بدل گیا تھا اور اس قابل ہو گیا تھا کہ سرکاری افسر اور دوسرے مہمان قیام کرتے تو آرام و سکون محسوس کرتے۔

رحیم داد مہمان خانے سے باہر جا رہا تھا کہ دروازے پر نادر خان مل گیا۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ "تو سیدھا لہور ہی سے آ رہا ہے؟"

"دو روز تو مہربان علی کے پاس شاہ جی کی کوٹھی میں رہا' پر رات کو پیراں والہ آ گیا تھا۔ مہربان بھی ساتھ ہی آیا ہے۔ وہ پیراں والہ ہی میں ہے۔"

"وہ پیراں والہ کیوں آ گیا؟"

"شاہ جی آج کراچی سے واپس آ رہا ہے۔" نادر خان نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "وہ لہور کی بجائے اس دفعہ پیراں والہ ٹھیرے گیا۔"

"شاہ جی کب پیراں والہ پہنچے گا؟"

"اسے لینے سویرے ہی سویرے ڈرائیور کار لے کر سٹیشن چلا گیا تھا۔ مہربان نے مجھے ادھر بھیج دیا۔ کہا چوہدری کو اپنی ساتھ لے کر پیراں والہ آ جا۔ شاہ جی نے چوہدری سے آج ہی ملنا ہے۔ فون پر شاہ جی نے اسے یہی کہا تھا۔"

"ایسا ہے تو روٹی کھا کر پیراں والہ کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔" رحیم داد نے اپنا پروگرام بتایا۔ "تب تک شاہ جی بھی پہنچ جائے گا۔"

نادر خان سے رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ وہ اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ رحیم داد حویلی کی جانب مڑ گیا۔

دوپہر کا کھانا شاداں کے ساتھ کھانے کے بعد رحیم داد نے جیپ منگوائی اور احسان شاہ سے ملنے پیراں والہ کی سمت روانہ ہو گیا۔ نادر خان بھی اس کے ہم راہ تھا۔ نادر خان اب پہلے کی نسبت کسی قدر فربہ ہو گیا تھا۔ مگر اس کے سر اور مونچھوں کے بال زیادہ سفید ہو گئے تھے جو مہندی کا وسمہ لگانے کے باعث سرخی مائل نظر آتے تھے۔ البتہ وہ ابھی تک نہایت چاق چوبند تھا اور اپنے فرائض نہایت مستعدی سے انجام دے رہا تھا۔

☆

رحیم داد پیراں والہ پہنچا۔ احسان علی شاہ حسب معمول نہایت گرم جوشی سے ملا۔ مسکرا کر بولا ”چوہدری، سنا ہے تو نے ویاہ کر لیا۔“

”تو نے ہی تو کراچی جانے سے پہلے کہا تھا فوراً ویاہ کر لے۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”میں نے وہی کیا جو تو نے کہا تھا۔ پہلے بھی تیرا مشورہ میں نے کب ٹالا ہے۔“

”یہ تو نے بہت نیک کام کیا۔ تیرے لیے ویاہ کرنا بہت ضروری تھا۔“ اس نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔ ”وہٹی کیسی ہے؟ کہاں کیا ویاہ؟“

”بس جی ٹھیک ہی ٹھاک ہے۔“ رحیم داد نے کھل کر بات نہ کی۔ وہ شاداں کے بارے میں اسے کچھ بتانا نہ چاہتا تھا۔ ”ایک گھر والی چاہیے تھی وہ آ گئی۔“

احسان شاہ نے بھی مزید پوچھ گچھ نہ کی۔ ہنس کر بے تکلفی سے بولا۔ ”نئی نئی وہٹی ملی ہے۔ تو آج کل تو اس کے ناز نخرے اٹھانے میں لگا ہو گا۔ عیش کر رہا ہو گا۔“ اس نے ایک آنکھ دبا کر سرگوشی کی۔ ایسی بات کہی کہ رحیم داد کچھ کہہ نہ سکا۔ شرما کر رہ گیا۔

احسان شاہ اسے لان پر لے گیا۔ سہ پہر کی ہلکی ہلکی دھوپ میں کئی کرسیاں گھاس پر قرینے سے رکھی تھیں۔ ایک کرسی پر علی نواز چانڈیو بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ وہ سندھ کا ایک بڑ وڈیرا تھا۔ ادھیڑ تھا۔ احسان شاہ کے ساتھ کراچی سے آیا تھا اور اس کے حویلی کی مہمان خانے م ٹھہرا تھا۔ احسان شاہ نے رحیم داد سے اس کا تعارف کرایا۔ اس نے اٹھ کر رحیم داد سے مصاف کیا۔ حسب دستور حال احوال دریافت کیا۔

جب تینوں اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھ گئے تو علی نواز چانڈیو نے احسان شاہ کو مخاطب کیا ”سائیں احسان شاہ! تو نے اخبار میں وہ خبر تو پڑھی ہو گی۔ ڈیرہ غازی خان کے علاقے، چوٹی بالا

ایک نہر چوری ہو گئی۔“

”نہر چوری ہو گئی؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ ”نہر کیسے چوری ہو سکتی ہے جی۔ یہ بات سمجھ نہیں آئی۔“

”سمجھ نہ آنے والی بات ہی ہے۔ اب تک تو مویشیوں کی چوری کی واردات سنی تھیں۔ مال اسباب اور روپے پیسے کی چوری سنی تھی۔ طرح طرح کی اور چوریاں سنی تھیں، لیکن نہر کی چوری کے بارے میں تو اب تک نہ سنا نہ دیکھا۔“ علی نواز نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”سائیں، معلوم ہوتا ہے تو نے وہ خبر نہیں پڑھی۔“

”کیوں نہیں پڑھی، پر اب تو خبر پرانی ہو گئی۔“ احسان شاہ نے بتایا۔ ”اس کے بارے میں تو انکوائری بھی ہوئی تھی۔“

”نہر تو جی چوری ہونے سے رہی۔“ رحیم داد نے کھل کر اپنے تجسس کا اظہار کیا۔ ”یہ تو کچھ اور ہی چکر جان پڑتا ہے۔“

”چکر شکر کیا ہے۔ ہوا یہ کہ لغاریوں کا ایک وڈا سردار، صوبائی وزیر زراعت و آب پاشی لگ گیا تھا۔ اس کی وزارت کے زمانے میں چوٹی بالا کے لیے ایک نہر تعمیر کرنے کے منصوبے پر کام ہو رہا تھا۔“ احسان شاہ نے مطلع کیا۔ ”لغاری سرداروں کی زمینیں چوٹی زیریں کے علاقے، درخواست جمال میں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے چوٹی بالا میں نہر نکلنے سے وزیر کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اس نے سوچا موقعے سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چوٹی بالا کی بجائے نہر کے پانی سے اپنی بنجر اور غیر مزروعہ زمینوں کو زرخیز بنایا جائے۔ اس نے محکمہ آب پاشی کے افسروں اور انجینئروں کو اپنے ساتھ ملایا۔ کسی کو پروموشن دی۔ کسی کی تنخواہ بڑھائی۔ نہر کی کھدائی رکوائی۔ سروے رپورٹ بدلوائی اور سرکاری ریکارڈ میں بالا کی جگہ زیریں لکھوا دیا۔“

”یہ تو جی اس نے زبردست کارروائی ڈالی۔“ رحیم داد نے ہنس کر تبصرہ کیا۔

”اس طرح جو نہر چوٹی بالا سے گزرنی تھی، چوٹی زیریں پہنچ گئی۔“ احسان شاہ نے مزید تفصیل بتائی۔ ”چوٹی بالا کی پیاسی زمینیں، جو برسوں سے پانی کو ترس رہی تھیں، بنجر اور غیر آباد ہی رہیں۔ اور چوٹی زیریں کے درخواست جمال کی زیر کاشت اراضی میں ہزاروں ایکڑ کا اضافہ ہو گیا۔ زمیں ایسی زرخیز ہو گئی کہ اب سونا اگلتی ہے۔ ویران اور چٹیل میدان کی جگہ ہر طرف فصلیں لہلاتی نظر آتی ہیں۔“

”سائیں، چوٹی بالا میں بھی تو زمین دار ہوں گے۔ انھوں نے شور شرابہ نہیں کیا۔“ علی نواز نے

کرید کر پوچھا۔ "ان کے ساتھ تو بہت ظلم ہوا۔"

"چوٹی بالا میں زمیں دار تو ہوتے ہیں' پر زیادہ تر چھوٹے ہی زمیں دار ہیں۔ لغاری سرداروں کے سامنے تو بہت چھوٹے ہیں۔ ان کا زیادہ اثر و رسوخ بھی نہیں۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "انھوں نے احتجاج کیا۔ اوپر درخواستیں بھی لگائیں۔ ان کے وفد وزیر اعلیٰ اور گورنر سے بھی ملے۔ پر کوئی کارروائی نہ ہوئی۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "چوٹی بالا کا ایک وکیل بہت ہشیار نکلا۔ وہ لہور میں پریکٹس کرتا ہے۔ اس کی کچھ زمین داری بھی چوٹی بالا کے علاکے میں ہوتی ہے۔ اس نے ایک اخبار کے ایڈیٹر سے مل کر نہر کی چوری کی خبر لگوا دی۔ خبر ایسی انوکھی اور چونکا دینے والی تھی کہ ہر طرف اس کا چرچا ہو گیا۔ بات اتنی زیادہ پھیلی کہ ایک ممبر نے صوبائی اسمبلی میں بھی اس مسئلے کو اٹھایا۔ زبردست بحث ہوئی۔ آخر یہ طے ہوا کہ سارے معاملے کی انکوائری کرائی جائے۔"

"سائیں' انکوائری کا کیا نتیجہ نکلا؟" علی نواز چانڈیو نے استفسار کیا۔

"نتیجہ کیا نکلنا تھا۔ ایک ایس ڈی او اور دو اوور سیئر معطل کر دیے گئے۔" احسان شاہ نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "وزیر آب پاشی اور اس کے گروپ کے اسمبلی ممبروں نے دباؤ ڈال کر ان کو بھی ملازمت پر بحال کرا دیا۔ تینوں کو صرف اتنی سزا ملی کہ تبادلہ کر کے دوسرے ضلع میں لگا دیا گیا۔"

"وزیر آب پاشی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی؟"

"اس کے خلاف کیا کارروائی ہونی تھی۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو بتایا۔ "صوبائی اسمبلی میں اس کا گروپ بہت تکڑا تھا۔ اس کے گروپ کے ممبروں کی مدد جاتی رہتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ پوری کابینہ ہی ختم ہو جاتی۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "وزیر اعلیٰ اور دوسرے وزیروں کو اس کے خلاف کارروائی کر کے اپنی وزارتوں سے ہاتھ دھونا تھا؟"

"سائیں' یہ تو بہت سنگین جرم تھا۔"

"یار علی نواز تو کیسی گل کر رہا ہے۔ ایسے جرائم تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ سیاست میں ان کو ج شرم نہیں سمجھا جاتا۔" احسان شاہ نے علی نواز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "یہ جو وڈ وڈے زمیں دار اسمبلی کی ممبری حاصل کرنے اور وزیر بننے کے لیے اتنا روپیہ پیسہ خرچ کرتے ہیں بھاگ دوڑ کرتے ہیں۔ طرح طرح کی رشوتیں دیتے ہیں' تو وہ صرف اسمبلی میں تکریریں کر وزیر کہلانے کے لیے تو نہیں کرتے۔ پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔" اس نے قدرے توقف ک

"سچی بات یہ ہے جی۔ ان کو ایسا کرنا بھی چاہیے۔ گھاٹے کا سودا کوئی نہیں کرتا۔ غلط کہہ رہا

میں؟"

مگر رحیم داد نے اس سے اتفاق رائے نہیں کیا۔ "جب ایس ڈی او اور اوور سیئر معطل کیے گئے تو وزیر کے خلاف بھی کچھ نہ کچھ کارروائی تو ہونی ہی چاہیے تھی۔ جرم بھی اس نے معمولی نہیں کیا تھا۔ پوری نہر کی نہر رستہ بدل کر اپنی بنجر زمینوں کو زرخیز بنانے کے لیے لے گیا۔ حد ہو گئی جی۔"

"چوہدری' تجھے پتہ نہیں۔ وہ لغاریوں کا بہت وڈا سردار ہے۔ تو ڈیرہ غازی خان میں رہ چکا ہے۔ تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ سرداروں سے تو ہر حکومت ڈرتی ہے۔ ادھر تو ان کی حکمرانی اور ان کا ہی کنون چلتا ہے۔" احسان شاہ نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "سرداروں کے خلاف نہ پہلے کوئی کارروائی ہوتی تھی اور نہ اب ہوتی ہے۔ تب ہی تو ساری انکوائری شنکوائری دبا دی گئی۔"

"ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا۔" رحیم داد نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔

"ویسے انکوائری سے ہوتا بھی کیا۔ نہر تو بن ہی چکی تھی۔ نہ اسے توڑ پھوڑ کر ختم کیا جا سکتا تھا نہ اٹھا کر چوٹی زیریں سے چوٹی بالا پہنچایا جا سکتا تھا۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "لغاری وزیر نے جو کرنا تھا کر لیا۔ اس کی میلوں تک پھیلی ہوئی بیکار اور بنجر زمینوں کو اتنا پانی ملنے لگا کہ جیسی چاہے فصلیں اگائے۔ اس کے ساتھ دوسرے لغاری سرداروں کے بھی عیش ہو گئے۔ چوٹی بالا والوں کے شور شرابے صرف شور شرابے ہی ہو کر رہ گئے۔"

"سائیں' چوٹی بالا کے زمین داروں کی زمینیں تو ابھی تک بنجر اور غیر آباد پڑی ہیں۔ وہ کیسے چپ رہ سکتے ہیں۔" علی نواز چانڈیو نے تازہ ترین صورت احوال سے آگاہ کیا۔ "انھوں نے معاملے کو دوبارہ اٹھایا۔ تب ہی تو ایک بار پھر انکوائری شروع ہونے والی ہے۔ اور اس بار تو مارشل لا کے تحت ہونے والی ہے۔ میں نے یہی بتانے کے لیے تو بات چھیڑی تھی۔ سائیں اب حالات پہلے سے نہیں رہے۔ نہ اسمبلیاں رہیں نہ ان کی ممبری نہ وزارتیں۔ وہ سارا سیاسی چکر ہی ختم ہو گیا۔"

"انکوائریاں تو دوسرے بھی کئی وزیروں کے خلاف ہو رہی ہیں۔ پر میں تو یہی کہوں گا ہونا ہوانا کچھ نہیں۔" احسان شاہ نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی "علی نواز تو خاندانی وڈیرا ہے بہت وڈا زمیں دار ہے۔ یہ بتا تو نے کبھی کسی وڈے زمیں دار کے خلاف کارروائی ہوتے دیکھی یا سنی ہے۔"

"پہلے تو نہیں دیکھی لیکن آئندہ کی کچھ خبر نہیں۔" اس کے لہجے سے تشویش صاف عیاں تھی۔ "سائیں' روز ہی تو مارشل لا کے نئے نئے ضابطے جاری کیے جا رہے ہیں۔ طرح طرح کے آرڈیننس نافذ ہو رہے ہیں۔ سب سے زیادہ پریشانی تو زرعی اصلاحات کی ہے جو سر پر تلوار کی طرح

لٹک رہی ہے۔"

☆

علی نواز چانڈیو نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا ان کی نوعیت یہ تھی کہ ملک میں مارشل لاء نافذ ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد زرعی اصلاحات کا اعلان ہوا۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے حکم سے ایک لینڈ ریفارم کمیشن مقرر کیا گیا۔ کمیشن نے ۱۹۵۹ء کے اوائل میں اپنی رپورٹ مارشل لا حکومت کو پیش کر دی۔ اس رپورٹ کی بنیاد پر فروری میں مارشل لا ضابطہ نمبر ۶۴ نافذ کیا گیا۔ اس ضابطے کے ذریعے جو زرعی اصلاحات کی گئیں، وہ کچھ اس طرح تھیں۔

۱۔ زرعی اراضی کی حد ملکیت پانچ سو ایکڑ نہری یا ہزار ایکڑ بارانی یا ۳۶ ہزار پیداواری یونٹ جو بھی زیادہ ہو، مقرر کی گئی۔

۲۔ ۸؍ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے بعد اگر کسی زمیں دار نے جس کی اراضی مقررہ حد ملکیت سے زیادہ تھی اور اس نے اپنی اراضی یا اس کا کچھ حصہ رہن، بیع یا ہبہ کر دیا تھا، ایسا ہر رہن، بیع یا ہبہ کالعدم قرار دے دیا گیا۔

۳۔ مقررہ حد ملکیت اراضی سے یونیورسٹیوں اور منظور شدہ تعلیمی اداروں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

۴۔ دینی اور رفاہی اداروں کو بھی مقررہ حد ملکیت اراضی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

۵۔ گھوڑی پال، گائے پال اور بکری پال فارموں کے مالکان کو بھی مقررہ حد ملکیت سے، فارموں کے زیر استعمال اراضی کی حد تک، مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

۶۔ زرعی اراضی کے مالکان کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ مقررہ حد ملکیت کے علاوہ ۵۰ ایکڑ اراض باغات کے مالک رہ سکتے ہیں۔

۷۔ مالکان اراضی کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ ۱۸ ہزار پیداواری یونٹ تک اپنے ورثا میں تقـ کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسی مستورات کو، جن کی وہ کفالت کرتے ہوں، ۶ ہزار پیداواری یون منتقل کر سکتے ہیں یا بطور عطیہ دے سکتے ہیں۔

۸۔ مقررہ حد ملکیت اور مستثنیات کے تحت آنے والی اراضی کے علاوہ تمام فاضل اراض مالکان سے بحق سرکار لے لی جائے گی اور ایک مقررہ فارمولے کے تحت اس اراضی کے مالکوں معاوضہ دیا جائے گا۔

۹۔ مالکان سے حاصل کی جانے والی اراضی، مزارعوں اور گزارہ ملکیت سے کم اراضی ر والوں کے ہاتھوں فروخت کرنا ممنوع قرار دیا گیا اور فروخت کے وقت قابض مزارعوں کا حق اف

قرار دیا گیا۔

۱۰۔ غیر اقتصادی ملکیتوں کی فروخت اور تقسیم وغیرہ پر پابندی عائد کر دی گئی۔

۱۱۔ مزارعوں کی بے دخلی کے متعلق مروجہ قوانین جاری رکھے گئے۔

☆

علی نواز کے بشرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ رحیم داد بھی مضمحل اور گم صم بیٹھا تھا۔ مگر احسان علی شاہ مطمئن اور نہایت ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر علی نواز کی جانب دیکھا۔ بے تکلفی سے گویا ہوا۔ "جب سے مارشل لا ریگولیشن ۶۴ سامنے آیا ہے علی نواز تیری طرح زرعی اصلاحات کا بھوت نہ جانے کتنے وڈے زمیں داروں اور جاگیرداروں کے سروں پر خطرہ بن کر منڈلا رہا ہے۔ سب ہی تیری طرح ڈرے ہوئے ہیں۔" اس کا لہجہ قدرے سنجیدہ ہو گیا۔ "پر یہ تو سوچ، زرعی اصلاحات پہلی بار تو ہوئی نہیں۔ پیچھے بھی ہوتی رہی ہیں۔"

"مشرقی پاکستان میں تو سائیں ۱۹۵۰ء ہی میں زرعی اصلاحات کا قانون لاگو ہو گیا تھا۔ کسی بھی زمیں دار یا مالک اراضی کو ایک سو بیگھہ سے زیادہ زمین رکھنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔" علی نواز چانڈیو نے مطلع کیا۔

"یہ ایک سو بیگھہ کتنے کلا زمیں ہوتی ہے؟" رحیم داد نے استفسار کیا۔

"۳۳ ایکڑ اور وہ بھی نی کنبہ۔" علی نواز چانڈیو نے جواب دیا۔

"یہ تو جی بہت کم زمین ہوئی۔" رحیم داد نے پریشان ہو کر کہا۔ "اتنی تھوڑی زمین سے کیا بنتا ہو گا۔"

احسان شاہ نے رحیم داد کی تشویش نظر انداز کرتے ہوئے علی نواز چانڈیو سے کہا۔ "ادھر کی گل چھوڑ، بنگال اسمبلی میں تو پاکستان بننے سے پہلے ہی زمیں داری ختم کرنے کا کنون منظور ہو چکا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں تو اسے لاگو کیا گیا تھا۔ اور وہ بھی اس لیے کیا گیا تھا کہ مشرقی پاکستان کے لگ بھگ سارے ہی وڈے زمیں دار ہندو ہوتے تھے۔ مسلمان زمیں دار چھوٹے تھے اور مغربی پاکستان کی طرح وڈے اور تکڑے بھی نہ تھے۔ اس طرف کا تو حال ہی کچھ اور ہے۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "وزیر تک ایسے ہیں کہ دیکھنے میں بالکل یتیم نظر آتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے معمولی مکانوں میں رہتے ہیں۔ نہ کسی کے پاس موٹر ہے نہ گڈی۔ اور کسی کے پاس ہے تو ایسی پرانی کھٹارا جیسے کباڑ خانے سے اٹھا کر لایا ہو۔ میں تو ادھر کئی بار جا چکا ہوں۔ سب کو ٹھیک طرح جانتا ہوں۔"

"کراچی میں ادھر کے وزیروں سے تو ہمارا بھی میل ملاپ رہتا ہے۔" علی نواز چانڈیو نے کہا۔

"سائیں، تجھے تو معلوم ہی ہے۔ میں تو زیادہ تر کراچی میں ہی رہتا ہوں اور برسوں سے رہتا ہوں۔"

"مجھے پتہ ہے اور ٹھیک طرح پتہ ہے تو کراچی ہی میں ہوتا ہے۔ پر تو اکیلا نہیں۔ سندھ کے زیادہ تر وڈے زمیں دار اور جگیر دار کراچی یا حیدر آباد میں ہوتے ہیں۔ سب ہی نے وہاں اپنی اپنی کوٹھیاں اور بنگلے بنا رکھے ہیں۔"

"سائیں ایسا نہ کریں تو کیسے کام چلے۔ گوٹھ میں نہ بجلی ہے نہ نلکے، اسکول ہیں بھی تو ایسے ہیں کہ ان میں ہاریوں کے بچے بھی پڑھتے ہیں۔ اب ہاریوں کے بچوں کے ساتھ ہمارے بچے کیسے پڑھ سکتے ہیں؟"

"ادھر تو سکول بننے ہی نہیں چاہیے۔ ہاریوں اور مزارعوں کے پتر پڑھ لکھ جاتے ہیں تو سرکشی کرتے ہیں۔ کنون کی گل بات کرتے ہیں۔" احسان شاہ نے علی نواز چانڈیو کو مشورہ دیا۔ "میں نے تو اپنی زمیں داری میں آج تک کوئی سکول شکول نہیں بننے دیا۔ ڈپٹی کمشنر نے بھی بہت زور لگایا، پر میں نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔"

"سائیں تو نے بالکل ٹھیک کیا۔" علی نواز نے احسان شاہ سے اتفاق رائے کیا۔ "گوٹھ میں نہ رہنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔ جوان لڑکے ادھر زمیں داری پر رہتے ہیں تو بدمعاشوں اور پتھاریداروں کی صحبت میں رہ کر خراب ہو جاتے ہیں۔ ہاریوں کی عورتوں کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ نشہ کرتے ہیں، مرغ اور کتے پالتے ہیں۔ ان کو لڑاتے ہیں۔ لمبی لمبی شرطیں لگاتے ہیں۔ ہزاروں روپیہ برباد کرتے ہیں۔ زمیں داری سے تو ان کو کچھ مطلب ہوتا نہیں۔ صرف عیاشی کرتے ہیں۔"

احسان شاہ نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تجھے یہ تو پتہ ہو گا سندھ میں زرعی اصلاحات کے لیے ہاری کمیٹی بنائی گئی تھی۔"

"سائیں، بالکل یاد ہے۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں بنی تھی۔"

"سر راجر ٹامس اس کا چیئرمین ہوتا تھا۔" احسان شاہ نے بات آگے بڑھائی۔ "مسعود بھی اس کمیٹی کا ممبر ہوتا تھا۔ بہت وڈا افسر تھا۔ آئی سی ایس تھا۔ پر نہ جانے کیسے زمیں داروں کا سخت دشمن بن گیا تھا۔" اس نے ایک عدد گندی گالی دی۔ "کسی کمی خاندان سے رہا ہو گا۔ اس نے زمین داروں کے خلاف بہت بکواس کی۔ ہاری کمیٹی کی رپوٹ کے ساتھ اختلافی نوٹ بھی لکھا۔" احسان شاہ کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ "اس میں یہ کہا تھا کہ زمیں داری بالکل ختم کر دی جائے اور ان کی ساری اراضی کسانوں کو دے دی جائے۔ پر حکومت میں بھی زمیں دار موجود تھے۔

انھوں نے دباؤ ڈال کر مسعود کا اختلافی نوٹ رکوا دیا تھا۔" اس نے مڑ کر علی نواز کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "تجھے تو اس کے بارے میں یاد ہو گا۔"

"یاد ہے۔ سائیں ہم کو بالکل یاد ہے۔" علی نواز نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

"تجھے یہ بھی پتہ ہو گا سر راجر ٹامس خود بھی بہت وڈا زمیں دار تھا۔" احسان شاہ نے مطلع کیا۔ "تب ہی تو اس نے جو رپوٹ تیار کرائی تھی اس میں صاف صاف لکھا تھا کہ ہاریوں کو اگر کوئی تکلیف شکلیف ہے تو وہ خود اس کے ذمے دار ہیں۔ زمیں دار تو ہر طرح ان کی مدد ہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پر وہ ان کے احسانات کو مانتے ہی نہیں اور نہ ان کی مدد سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

"سائیں، تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" علی نواز نے بھی اپنی معلومات کا مظاہرہ کیا۔ "کمیٹی نے تو اپنی رپوٹ میں ہاریوں کو مستقل حقوق کاشت دینے پر بھی اعتراض کیا تھا۔ لیکن کمیٹی کے ممبروں کی اکثریت نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ حکومت، بٹائی کو باقاعدہ بنائے اور ہاریوں کو ان کے حقوق دینے کے لیے قانون بنائے۔"

"پر اس کا تو کچھ نتیجہ نکلا شکلا نہیں۔ ہاں، مسعود کے نوٹ کے بارے میں اخبارات نے بہت شور شرابہ کیا۔" احسان شاہ نے جتایا۔ "حکومت سے مطالبہ کیا کہ کمیٹی کی رپوٹ شائع کی ہے تو مسعود کا اختلافی نوٹ بھی شائع کیا جائے۔ تب ہی تو لیاکت علی خان نے اس معاملے کی جانچ پڑتال کے لیے مسلم لیگ کی ایک خاص کمیٹی بھی بنائی تھی۔ اس کمیٹی نے بھی زمیں داروں کے خلاف کارروائی کرنے پر زور دیا تھا۔ پر زمیں دار بھی کمزور نہیں تھے۔ ان کا بھی مسلم لیگ میں زبردست زور رہا ہے۔ انھوں نے وہ رپوٹ ہی دبوا دی۔"

"لیکن سائیں، ملاؤں اور مولویوں نے بھی زمیں داروں کی بہت مدد کی۔" علی نواز چانڈیو نے کہا۔ "انھوں نے مسعود کے خلاف یہ فتویٰ دیا کہ وہ کمیونسٹ اور ملحد ہے اور اس کا اختلافی نوٹ غیر اسلامی ہے۔ یہ فتویٰ اخبارات میں چھپوانے کے علاوہ ملاؤں کی طرف سے مفت بانٹا گیا۔ پوسٹر بنا کر ہر جگہ دیواروں پر لگایا گیا۔"

"پر تجھے پتہ نہیں اس فتوے نے آگے چل کر بہت گڑبڑ پیدا کی۔" سید احسان علی شاہ نے انکشاف کیا۔ "یہ فتویٰ حکومت سندھ نے دس ہزار روپے رشوت دے کر ملاؤں سے لیا تھا۔ مسعود کے ہاتھ اس کا دستاویزی ثبوت لگ گیا۔ اس نے صوبائی حکومت کو ہتک عزت کا مکدمہ چلانے کا نوٹس دیا۔ ۵ لاکھ روپے ہرجانے کا مطالبہ کیا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "ادھر

اخبارات میں یہ اعتراض اٹھایا جا رہا تھا کہ جب مسعود کا نوٹ شائع ہی نہیں ہوا تو ملاؤں کو کیسے پتہ چل گیا اس میں کیا لکھا ہے۔ تب تک وہ ایک خفیہ سرکاری دستاویز تھی۔"

"ہاں سائیں، بہت گڑبڑ پیدا ہوئی تھی۔" علی نواز چانڈیو نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس وقت پیر الٰہی بخش وزیر اعلیٰ تھا۔ اس اسکنڈل سے اس کی اتنی بدنامی ہوئی کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اسے برطرف کر کے یوسف ہارون کو سندھ کا وزیر اعلیٰ لگا دیا۔ اس نے وزیر اعلیٰ بنتے ہی مسعود کا اختلافی نوٹ چھاپنے کا حکم دیا۔ آخر اسے شائع کر دیا گیا۔"

"پر یہ ہوا بہت برا۔" احسان شاہ نے منہ بگاڑ کر خفگی کا اظہار کیا۔ "لیاکت علی خان کو اس طرح دبنا نہیں چاہیے تھا۔"

"سائیں ایسا نہ کیا جاتا تو کیسے کام چلتا۔" علی نواز چانڈیو نے احسان شاہ سے اتفاق رائے نہ کیا۔ "تجھے معلوم نہیں۔ سندھ میں ان دنوں ہاریوں نے بٹائی کی زبردست تحریک چلا رکھی تھی۔ وہ فصل کا نصف حصہ مانگتے تھے۔ ان کے لیڈر میاں محمد مبارک تالپور، خداداد اور رئیس بروہی تھے۔ ایک تھانیدار بھی ملازمت چھوڑ کر ان کے ساتھ لگ گیا تھا۔"

"تھانیدار بھی ان کے ساتھ لگ گیا تھا؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں سائیں، صرف تھانیدار ہی نہیں، شہداد پور کا ایک ہندو ڈاکٹر آشا رام بھی ان کے ساتھ تھا۔" علی نواز نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "حیدر بخش جتوئی تو بہت بڑا افسر تھا۔ کلکٹر لگا ہوا تھا۔ مگر سرکاری نوکری چھوڑ کر ہاریوں کا لیڈر بن گیا۔ کئی بار جیل بھی گیا۔"

"اس زمانے میں سندھ میں ہاریوں نے گڑبڑ بھی بہت پھیلا رکھی تھی۔" احسان شاہ نے تبصرہ کیا۔

"تب ہی تو ہاری کمیٹی کے بعض ممبروں کو جھکنا پڑا۔" علی نواز نے بتایا۔ "کمیٹی کی رپوٹ کی بنیاد پر ۱۹۵۰ء میں سندھ ٹیننسی ایکٹ بھی منظور کرنا پڑا۔ اس ایکٹ کے تحت ہاریوں سے بے گار لینے اور نذرانہ وصول کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ ہاریوں کو یہ حق بھی دیا گیا کہ جو ہاری کم از کم تین سال تک ایک ہی مالک کے چار ایکڑ پر کاشت کرے، اسے مستقل ہاری ہونے کا حق حاصل ہو جائے گا۔"

"سچ، سچ بتا۔ ان زرعی اصلاحات کا اور مسعود کی سفارشات کا کیا نتیجہ نکلا؟" احسان شاہ نے دریافت کیا۔ "ہاریوں کو جو کچھ دیا گیا تھا، مل گیا؟"

"شروع شروع میں تو سائیں سارے ہی زمیں داروں کو دینا پڑا۔ فصل کی نصف بٹائی بھی دینی پڑی۔ نہ دیتے تو ہاریوں کے لیڈر اپنے ساتھیوں کے جتھے لے کر پہنچ جاتے۔ وہ سرخ جھنڈا ہاتھوں میں اٹھائے، نعرے لگاتے ہوئے گوٹھ میں داخل ہوتے اور زبردستی فصل کا نصف حصہ ہاریوں کو دے دیتے۔ ترازو نہ ملتی تو ٹین کے ڈبے سے فصل کو دو برابر حصون میں بانٹ دیتے۔" علی نواز ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ "وڈیرے اور زمیں دار اپنی مدد کے لیے پتھاریداروں کو اکٹھا کرتے، مگر ہاریوں کی طاقت ان دنوں ایسی زبردست تھی کہ پتھاریدار اور پولیس والے لال جھنڈے والوں کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوتے۔ وڈیرے ان سے ایسے ڈرے ہوئے تھے کہ سرہاری کے ایک ہندو وڈیرے بھانومل، کے گوٹھ میں لال جھنڈے والے پہنچے تو وہ اتنا گھبرا گیا کہ گھوڑوں کی لگام پکڑ کر ان کو نیچے اترنے کے لیے سہارا دیا۔ اپنے ہاتھ سے گھوڑوں کو کھونٹوں سے باندھا۔ اوطاق میں لے جا کر خود نیچے زمیں پر بیٹھا اور ان کو چارپائی پر بٹھایا۔ جو انھوں نے کہا، بالکل ویسا ہی کیا۔"

"لگتا ہے سندھ کے زمیں دار بہت کمزور اور بزدل ہیں۔" احسان شاہ نے جھنجلا کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"سائیں، ایسی بات نہیں۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا۔" علی نواز نے وضاحت کی۔ "بعد میں وڈیروں نے بھی اپنی طاقت بڑھائی۔ اپنے کمداروں اور نوکروں کی تعداد میں اضافہ کیا۔ پتھاریداروں اور پولیس کی مدد حاصل کی۔ سرکاری افسروں کو لمبی لمبی رشوتیں دے کر اپنے ساتھ ملایا۔ ہاریوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو کچلنے کی پوری پوری تیاری کی۔" اس نے احسان شاہ کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔ "سائیں، اس سلسلے میں تجھے ایک واقعہ سناتا ہوں۔ میرپور خاص میں ربوہ کے مرزا حامد کی بہت بڑی جاگیر ہے۔ اسکے ایک گوٹھ میں فصل کی کٹائی ہو چکی تھی۔ مگر بٹائی نہ ہوئی تھی۔ گوٹھ کے سارے ہی مرد، ہاری کمیٹی کے ایک جلسے میں شرکت کرنے شہر گئے ہوئے تھے۔ قادیانوں کے مینجر نے موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ اپنے کمداروں اور پتھاریداروں کو لے کر گوٹھ میں پہنچا۔ ان کو حکم دیا کہ ساری فصل اٹھا کر لے جائیں۔ گوٹھ کی ایک بوڑھی عورت مائی بختاور نے ان کو فصل نہ اٹھانے دی۔ اناج کی ڈھیری پر جا کر لیٹ گئی۔ کہنے لگی آدھی سے زیادہ فصل کا ایک دانا اٹھانے نہ دوں گی۔ زمیندار کے آدمیوں نے اس کی ذرا پرواہ نہ کی۔ بندوقیں تان کر پہلے اسے دھمکی دی۔ جب وہ نہ ہٹی تو فائرنگ شروع کر دی۔ اتنی گولیاں برسائیں کہ اس کا بدن چھلنی ہو گیا۔ وہ اناج کے ڈھیری ہی پر مر گئی۔ کمداروں اور پتھاریداروں نے اس کی لاش اٹھا کر ایک طرف پھینکی اور ساری فصل اٹھا کر لے گئے۔"

"ہاریوں نے بعد میں بہت شور شرابہ کیا ہو گا۔" رحیم داد نے تبصرہ کیا۔

"ہاں سائیں' انھوں نے بہت شور مچایا۔ جلسے کیے۔ تھانے میں رپوٹ لکھوائی۔ وزیروں اور افسروں کو درخواستیں دیں۔ لیکن کوئی کارروائی نہ ہوئی۔" علی نواز چانڈیو نے بتایا۔ "پھر تو زمیں داروں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے کہ ہاریوں کو پوری بٹائی دینی بھی بند کر دی۔ بے دخلیاں بھی شروع کر دیں۔ جو سرکش ہاری تھے ان کے خلاف فوجداری کیس بنائے اور جیلوں میں بند کروا دیا۔ مویشی اٹھوائے۔ نوجوان عورتوں کو اغوا کر لیا۔ گھروں میں آگ لگا کر ٹریکٹر چلوا دیے۔ ہاری ایسے ڈرے کہ کتنے ہی اپنے گوٹھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ دوسروں نے وڈیروں کے پیروں پر ٹوپیاں اور پگڑیاں ڈال دیں۔"

"زمیں داروں کو یہ کام تو پہلے ہی کرنا چاہیے تھا۔" احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "اصلی گل بات یہ ہے جی' کنون تو بنتے ہی رہتے ہیں۔ ان کی پابندی کون زمین دار کرتا ہے۔ کنون تو پہلے بھی زمیں داروں کا چلتا تھا بعد میں بھی چلتا رہا۔ ہاری یا مزارعے جب بہت زیادہ شور شرابہ کرتے ہیں تو ان کو چپ کرنے کے لیے زرعی اصلاحات کا چکر چلا دیا جاتا ہے۔"

"پنجاب میں بھی تو پہلے زرعی اصلاحات ہو چکی ہیں۔" رحیم داد نے یاد دلایا۔

"اس کے بارے میں تو مجھے بھی اچھی طرح پتہ ہے۔" علی نواز نے کہا۔ "سندھی وڈیروں میں بھی اس کا بہت ذکر ہوتا تھا۔ سائیں' مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مارچ ۱۹۴۹ء کا زمانہ تھا۔ اخباروں میں اس کی خبریں روز چھپتی تھیں۔ حکومت پنجاب نے ایک انکوائری کمیٹی بنائی تھی۔ ملک فیروز خان نون اس کا چیرمین تھا۔ اس کمیٹی کی رپوٹ پر ۱۹۵۰ء میں اور پھر ۱۹۵۲ء میں زرعی اصلاحات کی گئی تھیں۔ ان کا مقصد بے دخلیوں کو روکنا اور مزارعوں کو تحفظ دینا تھا۔" اس نے مڑ کر احسان شاہ کی جانب دیکھا۔ "سائیں' تجھے بھی یاد ہو گا۔ پنجاب اسمبلی کے جنوری ۱۹۵۳ء کے اجلاس میں بڑی گرما گرم بحث کے بعد زرعی اصلاحات کے بل پاس ہوئے تھے۔"

"تجھے تو پچھلی زرعی اصلاحات کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ یہ بھی پتہ ہے کہ کوئی مالک اراضی' جو ایک ایکڑ سے زیادہ کا مالک ہو' ۵۰ ایکڑ نہری' ۷۵ ایکڑ نیم زرعی اور سو ایکڑ بارانی زمین سے زیادہ خود کاشت کے لیے نہیں رکھ سکتا۔ پر کس نے اس کی پابندی کی۔" احسان شاہ نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "مزارعوں کی بے دخلیاں جیسے پہلے ہوتی تھیں ویسے ہی بعد میں بھی ہوتی رہیں۔ بٹائی پر زمیں دار نہ مزارعے کو رسید دیتے ہیں نہ اس کے حصے کی پوری فصل دیتے ہیں۔ مزارعے کو بے دخل کرنا ہو تو اپنے حصے کی فصل نہیں اٹھاتے اور بٹائی نہ کرنے کے الزام میں مزارعے کے خلاف درخواست لگا دیتے ہیں۔ مطلب کہنے کا یہ ہے جی کہ ان زرعی اصلاحات کا کچھ

بھی نہ بنا۔"

علی نواز نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ رحیم داد بھی خاموش بیٹھا رہا۔

احسان شاہ بولتا رہا۔ "زرعی اصلاحات کے تحت تو یہ بھی کنون میں تھا کہ کوئی مالک اراضی' مزارعے کو اس بیج کے علاوہ جو اس نے ادھار دیا ہو' زیادہ وصول کرے یا لگان کے علاوہ کوئی وصولی' خرچ' محصول یا نذرانہ وصول کرے' مزارعے کو غیر کنونی طور پر بے دخل کرے یا مکررہ خود کاشت اراضی سے زیادہ اپنے پاس رکھے اور افسر مال کو اس کی اطلاع نہ دے تو اس کے لیے ایک سال کی جیل اور جرمانے کی سزا یا دونوں ہی دی جا سکتی ہیں۔" اس نے مسکرا کر علی نواز چانڈیو کو دیکھا۔ "اب تو ہی ایمان سے بتا۔ سارے ہی زمیں دار کھلی خلاف ورزی کرتے ہیں' پر کون زمیں دار جیل گیا؟ کس پر جرمانہ لگا؟ کچھ بھی نہ ہوا۔ زمیں داری اسی رستے پر شان سے چل رہی ہے جس پر زرعی اصلاحات سے پہلے چلتی تھی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"سائیں' بات تو تیری ٹھیک ہی ہے۔ لیکن ان دنوں حالات بھی دوسرے تھے۔" علی نواز کے لہجے سے ایک بار پھر تشویش آشکارہ تھی۔ "تب تک ملک میں مارشل لاء نہیں لگا تھا۔ نہ مارشل لاء کے ضابطے تھے نہ فوجی عدالتیں تھیں۔ اب تو نہ وکیل پیش ہو سکتے ہیں نہ ضمانت ہو سکتی ہے۔ آج مقدمہ شروع ہوا کل فیصلہ ہو گیا۔ جیل بھی ہوتی ہے' جرمانہ بھی لگتا ہے اور کوڑے بھی لگائے جاتے ہیں۔"

"تو فکر نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" احسان شاہ نے اسے اطمینان دلایا۔

"سائیں تیری بات دوسری ہے۔" علی نواز پریشان نظر آ رہا تھا۔ "تیرا ایک بیٹا محکمہ مال میں بڑا افسر ہے۔ بھتیجا فوج میں کرنیل ہے اور مارشل لاء میں لگا ہوا ہے۔ تجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"میں نے کہا نا کہ تو فکر نہ کر۔" احسان شاہ نے ایک بار پھر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "چوہدری کو بھی میں نے اسی سلسلے میں گل بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔ تجھ سے آرام سے بات ہو گی۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "میں تو یاروں کا یار ہوں۔ ہمیشہ یاروں کی مدد ہی کرتا ہوں۔ تجھے پریشان دیکھ کر ہی تو اپنے ساتھ لے آیا۔ اب تو آرام سے یہاں رہ اور اپنا معاملہ مجھ پر چھوڑ دے۔ تجھے پریشان ہونے کی ذرا بھی ضرورت نہیں۔"

علی نواز نے مزید کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

دن ڈھل رہا تھا۔ سائے طویل ہو کر دور دور تک پھیلتے جا رہے تھے۔ دھوپ کی حرارت میں کمی

آگئی تھی۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب کی جانب اتر رہا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ ملازم نے چائے لا کر میز پر رکھ دی۔ تینوں چائے پینے لگے۔

علی نواز بہت تھکا ہوا تھا۔ چائے پینے کے بعد اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆

رحیم داد اور سید احسان علی شاہ ہلکی ہلکی دھوپ میں لان پر بیٹھے تھے۔ احسان شاہ نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "چوہدری' زرعی اصلاحات سے علی نواز بہت ڈرا ہوا ہے۔ اس کے پاس اراضی بھی بہت ہے۔ ساڑھے چھ ہزار کے لگ بھگ ہوگی۔ اور یہ اس میں سے ایک ایکڑ بھی زرعی اصلاحات کے تحت حکومت کو دینا نہیں چاہتا۔"

"یہ تو جی بہت زیادہ زمین ہوئی۔" رحیم داد نے کہا۔ "اسے تو بہت زیادہ زمین دینی بھی ہوگی۔"

"زمین کے معاملے میں تو یہ اتنا لالچی ہے کہ کمی کرنے کی بجائے اسے بڑھانے کی فکر میں رہتا ہے۔ تب ہی تو اس کی دو بیٹیاں ویاہ کے بعد بھی ابھی تک گھر میں کنواری بیٹھی ہیں۔"

"ویاہ کے بعد بھی کنواری ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" رحیم داد نے تعجب کا اظہار کیا۔ "اپنی سسرال نہیں گئیں۔ ان کے گھر والے کیسے ہیں جنھوں نے ان کو اس کے پاس چھوڑ رکھا ہے؟"

"ان کا کوئی گھر والا نہیں۔" احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔

"تب ان کا ویاہ کیسے ہوا؟"

"بہت عجب طرح سے ہوا۔ سنے گا تو حیران ہو گا۔" احسان شاہ بدستور بے تکلفی سے مسکراتا رہا۔ "پچھلے سال علی نواز مجھے کراچی سے اپنے گوٹھ لے گیا۔ ادھر بھی اس نے بہت شاندار حویلی بنا رکھی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جمعے کا دن تھا۔ رات کو اس نے اپنے کچھ رشتے داروں اور شریکوں کو اکٹھا کیا۔ گوٹھ کی مسجد کا ملا بھی آیا۔"

"وہ کس لیے آیا تھا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"نکاح پڑھانے آیا تھا۔"

"تب تو جنج بھی آئی ہوگی۔ اس کے ساتھ دوہٹی کا گھوٹ بھی آیا ہو گا۔"

"نہ براتی آئے نہ دولہا۔ یہی تو میں تجھے بتانے جا رہا تھا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "لکڑی کی ایک چوکی پر رحل لا کر رکھی گئی۔ اس پر ریشمی جزدان میں بند کران مجید رکھا گیا۔ سارے مہمان چوکی کے گرد نیم دائرے میں بیٹھ گئے۔ ہر طرف اگربتیوں کی خوشبو پھیلی تھی۔ کران مجید جزدان سے نکال کر اس طرح رکھا گیا کہ سب اسے دیکھ سکتے تھے۔"

"یہ سب کچھ کس لیے کیا گیا تھا؟" رحیم داد نے بے چین ہو کر مداخلت کی۔

"چپ کر کے سنتا جا۔" احسان شاہ نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔ "کران مجید پر پھولوں کا ہار ڈالا گیا۔ ملا نے ایک وکیل' دو گواہوں کے ہم راہ حویلی میں عورتوں کے بیچ میں بیٹھی ہوئی دوہٹی کے پاس بھیجا۔ انھوں نے اس سے اجازت لی۔ واپس آ کر ملا کو بتایا۔ ملا نے اونچی آواز سے نکاح پڑھایا۔ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ دوسروں نے بھی دعا کے لیے اپنے اپنے ہاتھ اٹھائے۔ لو جی نکاح ہو گیا۔ چھوارے اور مٹھائی بانٹی گئی۔ سب نے علی نواز کو مبارک باد دی۔ سب کچھ بالکل اسی طرح ہوا جیسے نکاح میں ہوتا ہے۔ بعد میں علی نواز نے سب کو روٹی کھلائی۔"

"پر نکاح ہوا کس کے ساتھ؟" رحیم داد نے حیران و پریشان ہو کر دریافت کیا۔

"کران مجید کے ساتھ ہوا تھا۔" احسان شاہ نے بتایا۔

"کران مجید کے ساتھ کیسے نکاح ہو سکتا ہے۔؟" رحیم داد ہنوز حیرت زدہ تھا۔ "علی نواز نے ایسا کیوں کیا؟"

"ایسا اس لیے کیا تھا کہ کسی مرد کے ساتھ ویاہ کرتا تو بیٹی کے ساتھ اس کے حصے کی زمین اور جائیداد بھی چلی جاتی۔ علی نواز جائیداد اپنے خاندان میں رکھنا چاہتا ہے۔" احسان شاہ نے مسکرا کر بتایا۔ "پہلے بھی ایک بیٹی کا اس نے نکاح کران مجید کے ساتھ پڑھایا تھا۔ دونوں اس کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔"

"پر یہ تو بہت غلط بات ہوئی۔"

"پتہ نہیں غلط ہے یا صحیح۔" احسان شاہ نے کہا۔ "یہ تو ملا ہی کو معلوم ہو گا جس نے نکاح پڑھایا تھا۔ پر مجھے اتنا ضرور پتہ ہے کہ جائیداد اپنے پاس رکھنے کے لیے ادھر کے کتنے ہی زمیں دار اپنی بیٹیوں کا نہ صرف کران شریف سے بلکہ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ چاند اور سورج سے نکاح پڑھا کر اپنے ہی ساتھ رکھتے ہیں۔ وہ زندگی بھر کنواری ہی رہتی ہیں اور بوڑھی ہو کر مر جاتی ہیں۔"

رحیم داد کو معاً بھکر کے مراد خاں شاہانی کی بہن حمیدہ یاد آگئی۔ مسکرا کر بولا۔ "تب تو حویلی کے نوکر چاکر عیش کرتے ہوں گے۔"

احسان علی شاہ نے اس کے طنز کا مفہوم فوراً بھانپ لیا۔ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "جس کڑی کا کران سے نکاح ہو جاتا ہے' اسے بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی سخت نگرانی بھی کی جاتی ہے۔ اگر وہ کسی سے چوری چھپے یاری لگا لے تو اسے بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ سزا کے طور پر اسے اور اس کے یار دونوں کو کارا کاری کرار دے کر کتل کر دیا جاتا ہے۔"

”پر شاہ جی، یہ تو بہت بری رسم ہوئی۔“

”سندھ میں ایسی ایک اور رسم بھی ہے۔“ احسان شاہ نے بتایا۔ ”مرید اپنے پیر کی خوش نودی اور برکت حاصل کرنے کے لیے منت مانتے ہیں۔ اپنی سب سے زیادہ سوہنی کڑی کو اس کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں۔ اسے عمدہ سے عمدہ کھلاتے ہیں۔ جب وہ جوان ہو جاتی ہے تو ایک روز پیر کو اپنے گھر بلاتے ہیں۔ اس کی دعوت کرتے ہیں۔ کڑی کا وہٹی کی طرح خوب سنگھار کرتے ہیں۔ پیر کے آگے ہاتھ جوڑ کر منت ساجت کرتے ہیں کہ وہ اسے کبول کر لے۔ جب وہ راضی ہو جاتا ہے تو کڑی کو رات گئے اس کے کمرے میں پہنچا دیتے ہیں۔ وہ ایک رات یا جتنی راتوں تک چاہے اسے اپنے ساتھ سلاتا ہے۔“

رحیم داد حیران و پریشان بیٹھا احسان شاہ کی باتیں سنتا رہا۔ وہ اسے بتاتا رہا۔ ”ایسی کڑی کو بڑھنی کہتے ہیں۔ پیر تو بعد میں اس کے پاس کبھی نہیں آتا، پر بڑھنی بھی ایک طرح سے پیرنی بن جاتی ہے۔ اس کی اتنی عزت ہوتی ہے کہ لوگ اس کے پاس مرادیں مانگنے آتے ہیں۔ نذرانے چڑھاتے ہیں۔ اس کی خدمت کرتے ہیں۔“

”اس کا بھی ویاہ نہیں ہوتا ہوگا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”نہیں، بڑھنی بننے کے بعد وہ پیر کے علاوہ کسی دوسرے مرد کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔“ احسان شاہ نے جواب دیا۔ ”اگر وہ چوری چوری کسی سے یاری لگا لے اور پتہ چل جائے تو ماں پیو یا بھائی رات کو اسے گوٹھ سے باہر جنگل میں لے جاتے ہیں۔ اس کے سر کے بال کھول دیے جاتے ہیں۔ دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیے جاتے ہیں۔ اس کو زمین پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ سر جھکا کر کسی لکڑ پر ٹکا دیا جاتا ہے۔ کلہاڑی تھام کر گردن پر ایسا بھرپور وار کیا جاتا ہے کہ سر کٹ کر علیحدہ ہو جاتا ہے۔“

”جب اس کے ساتھ ایسا کیا جاتا ہے تو وہ شور شرابہ نہیں کرتی؟“

”سنا ہے وہ اپنا گناہ چپ کر کے مان لیتی ہے۔ سزا کے لیے بھی آسانی سے راضی ہو جاتی ہے۔ نہ شور شرابہ کرتی ہے نہ فریاد۔“ احسان شاہ نے مطلع کیا۔ ”خاموشی سے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر دیتی ہے۔“

”پر شاہ جی یہ تو سیدھا سیدھا کتل ہوا۔“ رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”پولیس اس جرم کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتی۔“

”پولیس کو بھی اس رسم کا پتہ ہے۔“ احسان شاہ نے بتایا۔ ”اور پولیس کوئی کارروائی کرے تو کیسے۔ کتل کے فوراً ہی بعد لاش کو دفن کر دیا جاتا ہے۔ اگر پولیس کو لاش مل جائے یا کتل کا پتہ چل جائے تو کوئی گواہ نہیں ملتا۔ گوٹھ یا پنڈ کے سارے ہی بندے ایسے کتل کو بالکل ٹھیک سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک بڑھنی کو اپنے گناہ کی یہی سزا ملنی چاہیے۔“

”زمیں دار بھی اپنی کڑیوں کو اسی طرح پیر کے سامنے پیش کرتے ہیں؟“

”عام طور پر پیر کے ہاری مرید ہی ایسا کرتے ہیں۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”زمیں داروں کے بارے میں مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں۔“

”وہ تو جائیداد کو بچانے کے لیے صرف اپنی کڑیوں کا کران یا چاند سورج کے ساتھ نکاح کر دیتے ہیں۔“ رحیم داد نے تبصرہ کیا۔ ”تیرے یار علی نواز نے بھی ایسا ہی کیا۔ ویسے شاہ جی، سچی بات یہ ہے، کوئی بھی زمیں دار یہ نہیں چاہتا کہ اس کی اراضی کم ہو جائے۔“

”تب ہی تو علی نواز زرعی اصلاحات سے اتنا زیادہ پریشان ہے۔“

”پریشان تو جی، میں بھی بہت ہوں۔“ رحیم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

”تیری اراضی ہی کتنی ہے جو تو اتنا پریشان ہے۔“ احسان شاہ نے بے نیازی سے مسکرا کر کہا۔

”نیچے کے حصے داروں اور چھوٹے زمیں داروں کی زمین خریدنے کے بعد میری زمین داری، لگ بھگ ۱۳سو ایکڑ ہو جائے گی۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”دلاور والا کی زمیں دریشکوں کے ہاتھ نہ بیچ کی ہوتی تو اور زیادہ ہو جاتی۔“

”اسے بیچ کر تو نے بہت ٹھیک کام کیا۔“

”پر عظمت اللہ دریشک نے اس کا پورا معاوضہ اب تک نہیں دیا۔“ رحیم داد نے شکوہ کیا۔

”تو اس کا مطالبہ بھی نہ کرنا۔“ احسان شاہ نے مشورہ دیا۔ ”عظمت اللہ تو اسے خرید کر خود مصیبت میں پھنس گیا۔ تجھے پتہ ہے بوھڑوں کو بے دخل کرنے کے لیے اسے کیا کیا کرنا پڑا؟“

”میں نے اس کے بارے میں سنا تو ہے پر پوری طرح معلوم نہیں۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”تو نے بھی مجھے اس کے بارے میں پہلے کب بتایا۔“

”عظمت اللہ دریشک نے اپنے ساتھ پولیس کی تکڑی پارٹی لی۔ اس کے اپنے بندے بھی تھے۔ سب ہی پوری طرح مسلح تھے۔ رات کے اندھیرے میں اچانک وہ دلاور والا پہنچا اور پنڈ کا چاروں طرف سے گھیراؤ کر کے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ بوھڑ ایسے ڈرے کہ منت ساجت کرنے لگے۔ پر اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔“

”بوھڑوں نے بھی تو اس کے بندوں اور پولیس کے ساتھ پہلے کم بدمعاشی نہیں کی تھی۔“ رحیم

داد نے کہا۔ "میں تو وہاں موجود ہی تھا۔ تھانیدار تک کو بری طرح زخمی کر دیا تھا۔ دریشک کو غصہ تو آنا ہی چاہیے تھا۔"

"اسی غصے میں اس نے پنڈ کی رڑی میں سب کو اکٹھا کیا۔ حکم دیا کہ ککڑ کی بولی بولو۔ بعد میں کھوتی کی آوازیں نکالو۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ فیر اس نے سارے مردوں کو کپڑے اتار کر ناچنے کو کہا۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "وہ ننگے ہو کر ناچتے رہے۔ عظمت اللہ اور تھانیدار آرام سے بیٹھے شراب پیتے رہے۔ اتنی زیادہ پی کہ بدمست ہو گئے۔ اسی حالت میں انھوں نے زنانیوں کو بھی ننگا کر کے نچوایا۔ جب سب ناچتے ناچتے تھک کر گرنے لگے تو کہا دوڑ لگاؤ۔ انھوں نے دوڑ لگائی۔ ادھر دریشک کے کرندوں نے فصلوں اور گھروں میں آگ لگوا دی۔ کتنے ہی بوڑھے اور بچے جل کر زخمی ہو گئے۔ مویشی تو نہ جانے کتنے مر گئے۔ سارا پنڈ جل کر راکھ ہو گیا۔"

"تب تو بعد میں بہت شور شرابہ ہوا ہو گا۔" رحیم داد نے کہا۔

"بہت زیادہ شور شرابہ ہوا۔" احسان شاہ نے بتایا۔ "اخباروں میں خبریں چھپیں۔ معاملہ اتنا بڑھا کہ انکوائری ہوئی۔"

"اب تو معاملہ عدالت کے سامنے ہے۔" رحیم داد نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"تجھے سب کچھ تو پتہ ہے۔ اس پر بھی گلہ ہے کہ زمین کا پورا معاوضہ نہیں ملا۔" احسان شاہ نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔ "چوہدری' زیادہ لالچ ٹھیک نہیں ہوتا۔"

"شاہ جی' یہ بتا زرعی اصلاحات کے بارے میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟" رحیم داد نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے استفسار کیا۔

"تو نے مارشل لاء ریگولیشن ۶۴ پڑھ لیا ہے؟"

"ہاں جی' پڑھ تو لیا ہے۔ تب ہی تو اتنا پریشان ہوں۔"

"اس میں پریشانی کی کون سی گل ہے۔" احسان شاہ نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ "۵ سو ایکڑ اراضی تو اپنے پاس رکھ ہی سکتا ہے۔ ڈیڑھ سو ایکڑ باغات کے ہو گئے۔ گھر والی کے علاوہ تیرا او کوئی تو ہے نہیں۔ ورنہ ۱۲ ہزار پیداواری یونٹ تو اسے عطیہ کے طور پر دے سکتا ہے۔"

"پر یہ تو ۸ سو ایکڑ سے کچھ اوپر اراضی بنتی ہے۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ " اراضی بچ گئی اس کا کیا بنے گا؟"

"تین سو ایکڑ اپنے بھروسے کے مزارعوں کے نام اکتوبر ۱۹۵۸ء سے پہلے کی تاریخوں میں بیچ دے۔" احسان علی شاہ نے مشورہ دیا۔

"مزارعے بعد میں گڑبڑ کریں گے۔" رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "اللہ وسایا اور جیلے نے پہلے ہی ان کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔"

"سرکشی تو نہیں کرتے۔" احسان شاہ نے کہا۔ "ویسے بیع کے ساتھ ہی ان سے ادھار کی رسید پر نشانی انگوٹھا لگوا لینا اور ادھار پر زمیں رہن رکھ لینا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "اس طرح تو ایک ہاتھ سے زمیں دے کر دوسرے سے لے لے گا۔"

"پر شاہ جی' پچھلی تاریخوں میں بیع کیسے ہو گی؟" رحیم داد ہنوز پریشانی میں مبتلا تھا۔

"اس کی تو فکر نہ کر۔ پٹواری سے رجسٹر خسرہ گرداوری میں انتقالات اراضی کی پچھلی تاریخیں ڈلوا دوں گا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ "پٹواری اپنا بندہ ہے۔ بس اس کی مٹھی گرم کرنی ہو گی۔ اس کے بغیر تو وہ اپنے سگے پیو کے لیے بھی کچھ نہیں کرنے کا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "اور دیکھ' یہ خیال رکھنا زمیں داری کے ایسے تمام کاغذات اور دستاویزات ہمیشہ اپنے پاس رکھنا۔ اس معاملے میں گھر والی پر بھی بھروسہ نہ کرنا۔"

"پر شاہ جی' سوال یہ ہے تیرے حساب سے ساری زمین تو میرے پاس نہ رہ سکے گی۔"

"کچھ نہ کچھ تو سرکار کو دینی ہی ہو گی۔" احسان شاہ نے دریافت کیا۔ "یہ بتا' تیرے پاس بنجر اور بے کار کتنی زمین ہے؟"

"پہلے تو بہت تھی' پر کچھ زمین پر میں نے باغات لگوا لیے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "ڈیڑھ سو کلا ے زیادہ بنجر اور غیر آباد پڑی ہے۔"

"یہ زمین تیرے لیے تو بیکار ہی ہے نا۔ اسے سرکار کو نہری بتا کر دے دے۔" احسان شاہ مسکرا کر بولا۔ "یہ مفت نہیں جائے گی۔ اس کا ایک روپے سے پانچ روپے تک حکومت معاوضہ دے گی جو وراثتی بونڈ کی صورت میں ملے گا۔ یہ رقم سٹیٹ بینک کے کھاتے میں عوامی کرض کے نام سے ڈال دی جائے گی۔ اس پر تجھے چار فی صد سالانہ سود ملتا رہے گا۔ اپنی بنجر اور غیر مزروعہ اراضی کو نہری اور زرخیز دکھائے گا تو معاوضہ بھی چنگا ملے گا۔ اسے فروخت کرتا تو ہرگز اتنی کیمت نہ ملتی۔" وہ بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ "جتنا تو حکومت کو دے گا نہیں' اس سے زیادہ تجھے ملے گا۔ تو زرعی اصلاحات سے فضول میں پریشان ہے۔ اس میں تو تیرا فائدہ ہی فائدہ ہے۔"

"ایسا ہو جائے تب تو فائدہ ہی رہے گا۔" رحیم داد کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ "پر میں یہ سب کچھ کروں گا کیسے؟"

"اس کی تو فکر نہ کر۔ میرا مینیجر مہربان علی بہت ہشیار بندہ ہے۔ تو نادر کو اس کے ساتھ لگا دینا۔"

احسان شاہ نے کہا۔ ”حکومت کو زمین داری کے بارے میں جو گوشوارے بھر کر دینے ہیں‘ مہربان اور نادر مل کر تیار کر لیں گے۔ پٹواری اور محکمہ مال کے افسروں سے مل جل کر اپنا کام نکال لیں گے۔ جو رشوت وشوت دینی ہو گی اس کے بارے میں بھی وہی طے کریں گے۔ تجھے اب اس معاملے میں سوچنے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آرام سے کوٹلہ ہرکشن جا اور اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ عیش کر۔“

”میں کل تیرے پاس فیر آجاؤں گا۔“ رحیم داد نے کرسی چھوڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ”تو ابھی تو ادھر ہی ہے نا؟“

”نہیں‘ کل دوپہر کی روٹی کھا کر‘ میں نے علی نواز چانڈیو کے ساتھ لہور جانا ہے۔ اسے ادھر کچھ ضروری کام ہے اور مجھے اس کا وہ کام کروانا ہے۔“ احسان شاہ نے مطلع کیا۔ ”پر میں ہفتہ بھر بعد واپس آجاؤں گا۔ گوشوارے بھرنے کا کام اپنی نگرانی میں کراؤں گا۔ تجھے بھی بلوا لوں گا۔“

سورج مغربی افق پر پہنچ چکا تھا۔ دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر جھلملا رہی تھی۔ دن ختم ہو رہا تھا۔ شام کی آمد آمد تھی۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔

رحیم داد آگے بڑھا۔ احسان شاہ اس کے ساتھ ساتھ حویلی کے باہر گیا۔ گلے لگا کر گرم جوشی سے رحیم داد کو رخصت کیا۔ رحیم داد نے احسان شاہ کی ہدایت پر نادر خان کو مہربان علی سے گوشواروں کے بارے میں صلاح مشورہ کرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ رحیم داد اپنی جیپ میں بیٹھا اور کوٹلہ ہرکشن کے لیے روانہ ہو گیا۔

☆

اپریل کا آخری ہفتہ تھا۔ موسم بدل چکا تھا‘ گرمی شروع ہو گئی تھی۔ ربیع کی فصل تیار کھڑی تھی۔ گندم اور جو کے پودے سورج کی تمازت سے پک کر سنہری ہو گئے تھے۔ ہوا چلتی تو کھیتوں میں سرسراہٹیں ہوتیں۔ سیٹیوں کی سی ہلکی ہلکی جھنکار گونجتی۔ فروری اور مارچ کے اوائل میں بارش بھی ہوئی تھی۔ کھیتوں کو سیراب ہونے کے لیے خوب پانی ملا تھا۔ لہٰذا اس دفعہ فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ گندم کے پودے‘ خوشوں سے لدے ہوئے تھے۔

زمیں دار اور مزارعے اپنی فصلوں کو دیکھتے تو خوشی سے ان کے چہرے دمکنے لگتے۔ شاداں بھی بہت خوش و خرم تھی۔ اب وہ بڑی زمیں دارنی بن چکی تھی۔ شاندار حویلی میں رہتی تھی۔ اچھے سے اچھا کھاتی تھی۔ عمدہ سے عمدہ لباس پہنتی تھی۔ خدمت کے لیے ہر وقت نوکرانیاں آگے پیچھے گھومتی تھیں۔ گاؤں کا ہر فرد اسے عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔

اس کی چال ڈھال میں تمکنت آگئی تھی۔ رکھ رکھاؤ اور سلیقہ آگیا تھا۔ مزارعوں اور کمیوں کی عورتوں سے بات کرتی تو اس کے انداز میں طنطنہ اور رعب داب ہوتا۔ اس کا کسا ہوا مضبوط جسم حالانکہ اب کسی قدر پھیل گیا تھا مگر اس میں بھدا پن نہ تھا۔ اس کی شخصیت اور نکھر گئی تھی۔ رنگ خاصا اجلا ہو گیا تھا۔ رخساروں پر گلاب کھلتے تھے۔ آنکھوں میں ستارے جھلملاتے تھے۔ زندگی میں پہلی بار اسے اس قدر عیش و آرام ملا تھا کہ وہ ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی۔ خوشی اور مسرت میں مگن رہتی۔

رحیم داد اس کا ہر طرح خیال رکھتا۔ ناز برداری کرتا۔ اسے خوش دیکھ کر خود بھی مسرور ہوتا۔ وہ نکھر کر جتنی خوبصورت اور طرح دار ہوتی جا رہی تھی رحیم داد اس پر اتنا ہی زیادہ فریفتہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے اپنے ساتھ جیپ میں بٹھا کر نہر کے کنارے اکثر شام کو سیر کرانے لے جاتا۔ کئی بار کپڑے اور زیورات کی خریداری کے لیے اسے شہر بھی لے گیا۔ خریداری کے ساتھ ساتھ دونوں نے سینما میں ساتھ بیٹھ کر تین چار بار فلمیں بھی دیکھیں۔ اس کی اسی دل داری اور دل جوئی نے شاداں کو بھی رحیم داد کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ اپنے دکھ بھرے ماضی کی تلخ یادیں بھولتی جا رہی تھی۔

شاداں کسی سے بدکتی یا بھڑکتی تھی تو وہ ادھیڑ عمر نادر خان کی جوان بیوی‘ جنت تھی۔ اس نے اب تک شاداں کی اہمیت اور مرتبے کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ ہر معاملے میں ہم سری بلکہ خود کو اونچا اور زیادہ اہم ثابت کرنے کی کوشش کرتی۔ شاداں کو ذرا خاطر میں نہ لاتی۔ وہ موجود بھی ہوتی تو جنت نوکر چاکروں پر اس طرح حکم چلاتی گویا وہی زمیں دارنی اور حویلی کی مالک و مختار ہے۔

جنت کئی بچوں کی ماں تھی‘ مگر ہر وقت بنی ٹھنی رہتی تھی۔ لباس بھی شوخ اور بھڑکیلا پہنتی تھی۔ اس کا رنگ خوب کھلتا ہوا اور گورا تھا جو شاداں کو شاق گزرتا تھا۔ جنت کبھی رحیم داد کے سامنے آتی تو اٹھلا اٹھلا کر بات کرتی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے باکی سے مسکراتی۔ اس کے ہر انداز میں عشوہ ہوتا‘ لگاوٹ ہوتی۔ شاداں اس کی یہ ادائیں اور غمزے دیکھتی تو دل ہی دل میں کڑھتی۔

شاداں کو اس کی ایک اور حرکت بھی سخت ناگوار گزرتی۔ وہ رحیم داد کے پاس آتی تو ہمیشہ اپنے اکلوتے بیٹے شاکر کو ساتھ لاتی اور نہایت بے تکلفی سے رحیم داد کی گود میں دے دیتی۔ رحیم داد بھی بچے کے ساتھ شفقت سے پیش آتا۔ اسے زانو پر بٹھاتا۔ محبت سے سر پر ہاتھ پھیرتا۔ زیادہ خوش ہوتا تو اس کے رخسار چوم لیتا۔ اسے ہنسانے کے لیے طرح طرح کی حرکتیں کرتا۔

ایک شام ایسا ہوا کہ جنت کا بیٹا باغیچے میں رحیم داد کی گود میں بیٹھا تھا۔ رحیم داد پیار سے اس

کے سر کے بالوں کو انگلیوں سے سنوار رہا تھا۔ مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جنت بھی خوشی سے مسکرا رہی تھی۔ مسکراتے مسکراتے اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ ”زمیں دار، شاکر تیرے پاس آ کر ایسا خوش ہوتا ہے جیسے تیرا اپنا پتر ہو۔“ شاداں نے چونک کر پہلے جنت کو مشتبہ نظروں سے دیکھا پھر شاکر کو۔ اسے گول مٹول، گورے چٹے شاکر میں رحیم داد کی شباہت صاف جھلکتی نظر آئی۔

اس وقت تو وہ خاموش رہی، مگر شبہ اس کے دل میں گھر کر گیا۔ رات کو اس نے رحیم داد سے اپنے شبے کا اظہار بھی کر دیا۔ ”چوہدری، آج جنت نے اپنے شاکر کے بارے میں یہ کیوں کہا وہ تیرا پتر لگتا ہے؟؟“

”اس نے ایسے ہی کہہ دیا ہوگا۔“ رحیم داد نے جھٹ بات بنائی۔ اس نے شاداں کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”تجھے، اس پر پیار نہیں آتا؟؟“

رحیم داد نے بات اس ڈھب سے کی کہ شاداں لاجواب ہو گئی۔ صرف اتنا کہہ سکی۔ ”پر جنت مجھے ذرا اچھی نہیں لگتی۔“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”خصم کو دیکھو تو کتنا بوڑھا لگتا ہے اور وہ ال چٹک مٹک کرتی ہے جیسے الھڑ مٹیار ہو۔“ شاداں کے چہرے پر جھنجلاہٹ پھیل گئی۔

مگر رحیم داد پر سکون رہا۔ بے نیازی سے بولا۔ ”وہ جانے اور اس کا خصم۔ تجھے اس سے لینا؟؟“

”پر وہ تیرے سامنے ایسے نخرے کیوں دکھاتی ہے؟ ذرا بھی تو اسے شرم نہیں آتی۔“ شادا نے کھل کر اپنے شبے کا اظہار کیا۔ ”تو نے اس سے یاری تو نہیں لگا رکھی؟“

”تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔“ رحیم داد ایک دم بھڑک اٹھا۔ ”کوئی اور گل بات کر۔ ب کی گلاں نہ کر۔“ وہ بے زاری سے منہ بگاڑ کر بولا۔ ”اپنی طبیعت آج کل ویسے ہی پریشان ر ہے۔ تجھے یاری آشنائی نظر آ رہی ہے۔“

رحیم داد نے تیوری پر بل ڈال کر کچھ اس طرح ڈپٹ کر بات کی کہ شاداں نرم پڑ گئی۔ اس بات آگے نہ بڑھائی۔ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ”میں بھی دیکھ رہی ہوں تو ادھر کچھ سے پریشان پریشان دکھائی پڑتا ہے۔ روٹی بھی ٹھیک سے نہیں کھاتا۔ اکیلا بیٹھا سوچتا رہتا“ شاداں نے ہمدردی کے ساتھ ساتھ گلہ بھی کیا۔ ”تجھے پریشانی ہے کچھ بتاتا بھی تو نہیں۔“ اس اصرار کیا۔ ”بول تو آج کل پریشان اور کھویا کھویا کیوں رہتا ہے؟؟“

رحیم داد ان دنوں واقعی سخت پریشانی میں مبتلا تھا۔ لیکن اصرار کے باوجود اس نے شاداں پریشانی سے آگاہ نہ کیا۔ بات کو صاف ٹال گیا۔ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”فصل تیار کھڑی ہے، پر کٹائی کے لیے ابھی تک لاوے ہی نہیں ملے۔ نادر خان ان کی تلاش میں دن رات بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔“ اس کی آواز بوجھل ہو گئی۔ ”ویسے جب سے گرمی بڑھی ہے، طبیعت گڑبڑ ہی رہتی ہے۔ سر میں ہلکا ہلکا درد بھی رہتا ہے۔“

”کسی ڈاکٹر یا حکیم کو دکھا کر دوائی لے لے۔“ شاداں نے دل جوئی کی۔ ”ایسے کس طرح کام چلے گا؟؟“

رحیم داد نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”تو کہتی ہے تو دوائی بھی لے لوں گا۔“ اس نے بات کا رخ بالکل موڑ دیا۔ شاداں کو اپنی اصل پریشانی کے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا۔ بتانا بھی چاہتا تو اسے مطلق نہ بتا سکتا تھا۔ اس کی پریشانی اور ذہنی الجھن کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ بھی نہ بتا سکتا تھا۔

☆

رحیم داد کی پریشانی ایسا سربستہ راز تھی جو صرف اور صرف اس کی ذات تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس راز میں کسی کو شریک کرنے کا مطلب سراسر خطرہ مول لینا تھا۔ خطرہ ایسا ویسا بھی نہ تھا۔ اس میں جیل جانے سے کہیں زیادہ پھانسی پر لٹک جانے کا واضح امکان تھا۔ رحیم داد کی اس پریشانی کا سبب یہ تھا کہ پچھلے دنوں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ محکمہ بحالیات کے تفتیشی شعبے نے سینکڑوں ایسے جعلی کلیموں کا سراغ لگایا ہے جن کے ذریعے لگ بھگ بارہ کروڑ روپے مالیت کی متروکہ زرعی اراضی اور صنعتی اداروں پر ناجائز طریقے سے قبضہ کر لیا گیا تھا۔ ایک سرکاری اعلامیہ کے مطابق صرف صوبہ سندھ میں ڈیڑھ کروڑ کی متروکہ زرعی املاک سالہا سال سے غیر مستحق افراد کے قبضے میں تھیں۔ ایسی دھاندلی اور ہیرا پھیری کے معاملے میں پنجاب کی صورت حال کم تشویش ناک نہ تھی۔

محکمہ بحالیات کا تفتیشی شعبہ ان دنوں بہت مستعد تھا۔ اپنی کارگزاری دکھانے کی غرض سے نہایت سرگرمی سے متروکہ جائیداد کی لوٹ کھسوٹ اور بدعنوانیوں کے بارے میں چھان بین کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں حکومت کی جانب سے یہ اعلان بھی کیا جا چکا تھا کہ متروکہ جائیداد پر غیر قانونی قبضہ کرنے والے مجرموں کو مارشل لا کے تحت سخت سزائیں دی جائیں گی۔ ان میں جرمانہ، قید با مشقت اور کوڑوں کی سزا شامل تھی۔

تفتیش اور تحقیقات کا سلسلہ ہنوز جاری تھا کہ اسی اثناء میں حکومت نے ایک نیا قانون نافذ کیا۔

اسے "پاکستان میں متروکہ جائیداد کی تنظیم کا قانون" کہا گیا۔ اس نئے قانون کے ذریعے ۱۹۵۷ء کے متروکہ جائیداد کی تنظیم کے ایکٹ (۷) میں نہ صرف اہم ترمیمات کی گئیں بلکہ اس کے تحت متروکہ جائیداد کی تحقیق اور جانچ پڑتال کے لیے ایک خصوصی ٹریبونل بھی قائم کیا گیا۔ اس ٹریبونل کی اہمیت واضح کرنے کے لیے ہائی کورٹ کے ایک جج کو بھی رکن کی حیثیت سے شامل کیا گیا تھا۔

رحیم داد ہر روز پابندی سے اخبار پڑھتا تھا۔ متروکہ جائیداد کی لوٹ کھسوٹ کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات اور حکومت کے نت نئے اقدامات کی خبریں پڑھ پڑھ کر اس کی پریشانیوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے کسی پہلو قرار نہ تھا۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا۔ خطرہ سر پر منڈلاتا نظر آتا۔ اپریل اسی پریشانی اور طرح طرح کے خدشات میں گزر گیا۔

مئی کا مہینہ شروع ہوا۔ گرمی اور بڑھ گئی۔ چلچلاتی دھوپ میں جسم پگھلتا ہوا محسوس ہوتا۔ نادر خان نے فصل کی کٹائی کے لیے لاووں کا بندوبست کر لیا تھا۔ انھوں نے گاؤں کے باہر میدان میں درختوں تلے ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ فصل کی کٹائی شروع ہو چکی تھی۔ رحیم داد بھی اس کی دیکھ بھال میں سرگرمی سے حصہ لے رہا تھا۔ وہ سویرے ہی سویرے کھیتوں کی طرف نکل جاتا اور دوپہر کو واپس آتا۔

اس روز بھی رحیم داد کھیتوں سے تھکا ہارا حویلی میں واپس آیا۔ گرمی کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس کا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ چہرہ اور لباس خاک دھول سے آلود تھا۔ اس نے غسل کیا۔ اجلا لباس پہنا۔ اپنے کمرے میں گیا' میز پر اخبار رکھا تھا۔ اس نے اخبار اٹھایا اور اسے پڑھنے لگا۔

ان دنوں اخبارات کے نامہ نگار اور کالم نویس بہت سرگرم تھے۔ متروکہ جائیداد کی دھاندلیوں کے بارے میں خبروں کو نمایاں طور پر شائع کیا جا رہا تھا۔ صفحہ اول پر ایک ایسی دو کالمی خبر تھی جس کی سرخی پر رحیم داد کی نظر ٹھٹک گئی۔ یہ محمد یار کھنڈ' ایڈیشنل کمشنر بحالیات کا ایک انٹرویو تھا۔ انھوں نے کچھ ہی عرصہ قبل بہاول پور ڈویژن کا دورہ مکمل کیا تھا۔

محمد یار کھنڈ نے اپنے اس انٹرویو میں یہ انکشاف کیا تھا کہ ضلع بہاول نگر کی تحصیل منچن آباد میں زرعی اراضی کے سلسلے میں ایسے پچاس کلیم ان کے معائنہ میں آئے جو مشتبہ اور جعلی تھے۔ انھوں نے ایسے کلیم فارموں کو مفصل تحقیقات کے لیے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ یار کھنڈ نے موقعے پر جو ابتدائی تحقیقات کی تھی' اس سے یہ عقدہ کھلا کہ منچن آباد میں بیشتر متروکہ اراضی کا الاٹمنٹ جعلی کلیموں کے ذریعے حاصل کیا گیا تھا۔

محمد یار کھنڈ نے ضلع منٹگمری کا بھی دورہ کیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ تحصیل پاک پتن میں درجن بھر سے زیادہ جعل سازی اور دھوکہ دھی کی واردات کا سراغ ملا ہے جن میں جعلی کلیموں اور بوگس کلیم فارموں کی بنیاد پر متروکہ جائیداد الاٹ کرائی گئی تھی۔ ان کلیم فارموں کو سینٹرل ریکارڈ آفس لاہور' اور تحصیل کے دفاتر میں جعل سازی کے ذریعے تیار کیا گیا تھا۔ انھوں نے یہ دلچسپ انکشاف بھی کیا کہ ایک دعویدار کو اصل ریکارڈ کے مطابق ۱۷۹ کنال متروکہ اراضی الاٹ ہونا چاہیے تھی' مگر اسے ۲۲۴۳ کنال زمین ناجائز طور پر الاٹ کر دی گئی۔

محمد یار کھنڈ نے زور دے کر کہا تھا کہ جعلی دستاویز بنانے والوں اور محکمہ بحالیات کے حکام کو دھوکا دے کر غیر قانونی طور پر متروکہ املاک الاٹ کرانے والوں کے خلاف مفصل تحقیقات کی جا رہی ہے۔ ایسے دعویداروں کے خلاف جنھوں نے جعلی کلیم فارموں کے ذریعے متروکہ جائیداد اپنے نام الاٹ کرا رکھی ہے' سخت کارروائی کی جائے گی۔ ان کی تمام ایسی جائیداد نہ صرف بحق سرکار ضبط کر لی جائے گی' بلکہ مارشل لا کے مختلف قوانین اور ضابطوں کے تحت عبرت ناک سزائیں بھی دی جائیں گے تاکہ متروکہ جائیداد کے سلسلے میں ہونے والی ہر طرح کی بدعنوانی اور جعل سازی کا مکمل طور پر سدباب ہو جائے۔

رحیم داد نے یہ خبر پڑھی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس قدر ہراساں ہوا کہ دوپہر کا کھانا بھی نہ کھا سکا۔ شاداں نے اصرار بھی کیا۔ مگر سر میں درد ہونے کا بہانہ کر کے اسے ٹال دیا۔ اس کے بشرے سے پریشانی عیاں تھی۔ آنکھوں میں خوف کے سائے منڈلاتے تھے۔ اس نے ذہنی انتشار پر قابو پانے کے لیے پانی کے کئی گلاس پیے اور نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔

شاداں سرہانے بیٹھ کر محبت سے اس کا سر دبانے لگی۔ رحیم داد نے منع بھی کیا' مگر وہ باز نہ آئی ہولے ہولے اس کا سر دباتی رہی۔ رحیم داد کو اس کی انگلیوں کے لمس سے کسی قدر سکون بھی ملا۔ مگر بے چینی کم نہ ہوئی۔ وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا' پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔

☆

دن ڈھلے رحیم داد نے غسل کیا۔ لباس بھی تبدیل کیا اور باغیچے میں جا کر بیٹھ گیا۔ شام دھیرے دھیرے نیچے اتر رہی تھی۔ دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ گرمی کا زور کسی قدر ٹوٹ چکا تھا۔ ہوا میں فرحت اور تازگی تھی۔ لیکن رحیم داد ہنوز مضمحل اور گم صم تھا۔ اسے اپنے سر پر خطرہ منڈلاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ بات ہی ایسی تھی۔ نہ وہ مہاجر تھا اور نہ چوہدری نور الٰہی جس کے کلیم کی دستاویزات پر جعلی دستخط ثبت کر کے اس نے کوٹلہ ہرکشن کی متروکہ اراضی اور حویلی کا الاٹمنٹ حاصل کر لیا تھا۔ اب وہ علاقے کا ایک بڑا زمیندار سمجھا جاتا تھا۔

وہ اسی خوف اور پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا کہ نوکر نے آکر احسان علی شاہ کی آمد کی اطلاع دی۔ رحیم داد نے شاداں کو اشارہ کیا۔ وہ باغیچے سے اٹھ کر حویلی میں چلی گئی۔ رحیم داد بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ احسان شاہ کے پاس پہنچا۔ گرم جوشی سے بغل گیر ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا باغیچے میں واپس آگیا۔ دونوں اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

احسان شاہ نے رحیم داد کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی کو فوراً بھانپ لیا۔ اظہار ہمدردی کے طور پر دریافت کیا۔ ”چوہدری، خیریت تو ہے؟ تو کچھ پریشان پریشان سا نظر آرہا ہے۔“ اس نے لہجے میں بے تکلفی پیدا کی۔ ”تو زرعی اصلاحات سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ وہ معرکہ تو گزر گیا۔ تیرے گوشوارے داخل ہو گئے۔ ان پر کوئی اعتراض شتراض بھی نہیں ہوا۔ زمین بھی تو نے صرف ۷۵ ایکڑ حکومت کے حوالے کی۔ سارا کام تیری مرضی کے مطابک ہو گیا اور بالکل ٹھیک ٹھاک طور پر ہو گیا۔“

”مجھے جی اس میں کیا کرنا تھا۔ جیسے تو نے ہدایت دی، مہربان اور نادر نے ویسے ہی گوشوارے بھر دیے۔ جتنی زمین انھوں نے چھوڑی وہی میں نے حکومت کو دے دی۔“

”صرف تو نے ہی نہیں، سارے وڈے زمیں داروں نے ایسا ہی کیا۔“ احسان شاہ نے مطلع کیا۔ ”زرعی اصلاحات کے تحت زمین داروں کو جو رعایت دی گئی تھی، اس سے تو انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کے علاوہ مویشی فارموں، شکار گاہوں اور چراگاہوں کی کوئی حد نہیں رکھی گئی۔ ہر ایک نے اپنی مرضی چلائی اور حکومت نے تسلیم بھی کر لی۔ رحیم یار خان کے ایک جگیردار نے جو شکار گاہ دکھائی ہے، وہ ایک لاکھ ایکڑ سے بھی اوپر زمین پر پھیلی ہے۔ اسی طرح کتنے ہی وڈے زمیں داروں نے ایسی چراگاہیں تیار کی ہیں، اور ایسے مویشی خانے بنائے ہیں جو ہزاروں ایکڑ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ سچ پوچھ تو یہ ساری ہی زیر کاشت اراضی ہے اور بہت زرخیز ہے۔ نہ بنجر ہے نہ کلر۔ بنجر اور کلر تو حکومت کے حوالے کر دی اور اس کا نہری اور زرخیز زمین کے مول معاوضہ وصول کریں گے۔“

”حد ہو گئی جی۔“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

”کئی وڈے زمین دار اور جگیردار تو اپنی پرانی اور بیکار زمین سے پہلے ہی تنگ آچکے تھے۔“ احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ ”تب بھی ۳ کروڑ ۹۳ لاکھ اراضی میں سے کل تین لاکھ ایکڑ زمیں داروں نے حکومت کو دی۔ میرا پتر یہی بتاتا تھا۔“ اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ ”اس اراضی کو بھی زمیں دار جب چاہیں گے واپس لے لیں گے۔ میں نے تجھے کہا تھا نا کہ ایسی زرعی اصلاحات

ے کچھ ہوتا ہوانا نہیں۔ پہلے بھی زرعی اصلاحات ہو چکی ہیں۔ ان کا جو نتیجہ نکلا وہ کسے نہیں معلوم۔ جنرل ایوب خان زمین دار نہیں ہے۔ اس لیے اسے زمین داروں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ جب وہ خود وڈا زمیں دار بن جائے گا تب اسے سب پتہ چل جائے گا۔“ اس نے قدرے تأمل کے بعد کہا۔ ”تو دیکھ لینا وہ جلد ہی وڈا زمیں دار بن جائے گا اور یہ کام اس کا یار جنرل برکی کرے گا۔ اسے تو دیوانگی کی حد تک زمین حاصل کرنے کا مرض ہے۔“

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ گم صم بیٹھا رہا۔

احسان شاہ نے کہا۔ ”چوہدری، تو چپ کر کے کیوں بیٹھا ہے؟“ اس نے تشویش کا اظہار کیا۔ ”تو مجھے پریشان لگتا ہے۔ بتا نا، پریشانی کیا ہے؟“

رحیم داد تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ وہ اپنی پریشانی احسان شاہ کو بتانا نہ چاہتا تھا۔ مگر اسے شاداں کی طرح ٹال بھی نہ سکتا تھا۔ وہ اس کا ہمدرد تھا اور ہر آڑے وقت میں کام بھی آتا تھا۔ اس نے دبی زبان سے کہا۔ ”متروکہ اراضی کے بارے میں آج کل جو خبریں چھپ رہی ہیں، تو نے وہ تو پڑھ ہی رکھی ہوں گی۔“

”ضرور پڑھ رکھی ہیں۔ پر تجھے ان سے کیا لینا۔“ اس نے چونک کر رحیم داد کو دیکھا۔ رسان سے پوچھا۔ ”تیرے کلیم مین کوئی گڑ بڑ شڑ بڑ تو نہیں؟“

رحیم داد نے اسے صحیح صورت حال سے تو آگاہ نہیں کیا، صرف اتنا بتایا۔ ”وہ ایسا ہے جی، میرے کلیم کی دستاویزوں پر دستخطوں میں کچھ گڑ بڑ ہو گئی تھی۔ ان دنوں اللہ وسایا زندہ تھا۔ اس نے اور اس کے وکیل رندھاوا نے معاملہ ٹھیک ٹھاک کرا دیا تھا۔“ وہ لحہ بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔ مڑ کر احسان شاہ کو دیکھا۔ ”اس کے بارے میں تو تجھے بھی پتہ ہو گا۔“

”کچھ یاد تو پڑتا ہے۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”پر وہ تو بہت پرانی بات ہو گئی۔ اب تو اس کے بارے میں کیوں اتنا پریشان ہے؟“

”پریشانی کی بات ہی ہے جی۔“ رحیم داد نے وضاحت کی۔ ”متروکہ جائیداد کی الاٹمنٹوں کی آج کل دوبارہ جانچ پڑتال ہو رہی ہے۔ روز ہی اخباروں میں ان کے بارے میں طرح طرح کی خبریں چھپ رہی ہیں۔ کسی افسر نے دستخطوں کا معاملہ فیر اٹھا دیا تو خاماخا کا چکر شروع ہو جائے گا۔“ رحیم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ ”مارشل لا کا زمانہ ہے۔ ڈرتا ہوں اس چکر میں کہیں میری الاٹمنٹ منسوخ نہ ہو جائے۔“

”اس طرح الاٹمنٹ منسوخ نہیں ہوتی۔“ احسان شاہ نے اسے اطمینان دلایا۔ ”یہ دستخطوں کا

بھی عجب چکر ہے۔ وکت کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت بدلتے ہی رہتے ہیں۔ مارشل لا لگنے سے کچھ ہی دنوں پہلے کا ذکر ہے۔ نواب مشتاک احمد گورمانی کے ساتھ ایسا ہی چکر چلا۔“

”وہ کیا تھا جی؟“ رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

”تجھے پتہ ہے سیاست دانوں میں تو ایک دوسرے سے لگتی ہی رہتی ہے۔ کبھی یاری دوستی ہے تو کبھی مخالفت میں بیان بازی ہوتی ہے۔ گرانے کے لیے سازشیں ہوتی ہیں۔“ احسان شاہ نے بتایا۔ ”کراچی کے ایک انگریزی اخبار کے ایڈیٹر نے‘ جس کا اخبار چلتا چلاتا نہیں تھا‘ حکومت سے اشتہارات اور کچھ روپیہ اینٹھنے کے لیے فیروز خان نون کے اشارے پر گورمانی کے خلاف چکر چلایا۔ فیروز خان نون تب وزیر اعظم ہوتا تھا۔ صدر اسکندر مرزا کی حمایت سے وزیر اعظم لگا تھا۔ ان دنوں اسکندر مرزا کی گورمانی سے سخت لگتی تھی۔“

”گورمانی کے خلاف اخبار نے کیا چکر چلایا تھا؟“ رحیم داد نے اسے ٹوکا۔

”اس میں گورمانی کا ایک خط چھپا تھا جو ہندوستان کے وزیر داخلہ سردار پٹیل کے نام تھا۔ جب یہ خط لکھا گیا تب گورمانی ریاست بھاول پور کا وزیر اعظم ہوتا تھا۔“ احسان شاہ نے تفصیل بتائی۔ ”پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ گورمانی نے سردار پٹیل کو اپنے خط میں لکھا تھا۔ اگر اس کو ہندوستان کی حکومت میں وزیر لگا دیا جائے تو وہ ریاست بھاول پور اپنی کوششوں سے ہندوستان میں شامل کرا دے گا۔ سردار پٹیل نے اس کی شرط مان لی۔ گورمانی کو اس سلسلے میں خط بھی لکھا۔“

”پر ریاست بھاول پور تو ہندوستان میں شامل نہیں ہوئی۔ پاکستان ہی میں رہی۔“ رحیم داد نے مداخلت کی۔

”گورمانی بہت ہشیار بندہ ہے۔ اسے تو دراصل سردار پٹیل کے خط کی ضرورت تھی۔ خط اس کے ہاتھ آیا تو اسے لے کر وزیر اعظم لیاکت علی خان کے پاس پہنچا۔ سردار پٹیل کا اسے خط دکھایا۔ سنا ہے وہ سخت پریشان ہوا۔ نواب گورمانی نے جو شرط سردار پٹیل کو پیش کی تھی وہی اسے پیش کی۔“ احسان شاہ اطمینان سے بولتا رہا۔ ”لیاکت علی خان نے اس کی شرط مان لی۔ اپنی کابینہ میں وزیر لگا دیا۔ اس طرح ریاست بھاول پور‘ ہندوستان میں نہ جا سکی۔ پاکستان میں شامل ہو گئی۔“

”پر اس میں دستخطوں کا کیا چکر تھا؟“

”اخبار میں خط چھپا تو گورمانی کی بہت بدنامی ہوئی۔ سچ پوچھ تو اسے چھاپا ہی اسی لیے گیا تھا۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”گورمانی نے جھٹ ایک بیان کے ذریعے اس کی تردید کی۔ خط کو جعلی بتایا۔ ساتھ ہی اخبار کے خلاف عدالت میں ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اخبار سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کی تردید کرے اور معافی مانگے۔“ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔ ”اخبار نے معافی نہ مانگی۔ ادھر ملک فیروز خان نے بھی اخبار کی حمایت میں بیان دے دیا۔“

”گورمانی نے تب کیا کیا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”وہ بھی کمزور نہیں تھا۔ وزیر اعظم کی کھلم کھلا اور صدر اسکندر مرزا کی درپردہ حمایت کے باوجود ڈٹا رہا۔ عدالت کو بتایا کہ اس نے سردار پٹیل کو کبھی ایسا خط لکھا ہی نہیں۔ خط پر اس کے جعلی دستخط بنائے گئے ہیں۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”اس مرحلے پر عدالت نے دستخطوں کی جانچ پڑتال کرنے والے ایکسپرٹ کو بلایا۔ اس نے دستخط کا ٹھیک طرح معائنہ کرنے کے بعد عدالت کو بتایا کہ خط پر جو دستخط ہیں وہ نواب گورمانی کے نہیں ہیں۔“

”عدالت نے کیا فیصلہ دیا؟“

”عدالت نے جعلی خط چھاپنے کے جرم میں اخبار کے ایڈیٹر کو جیل میں بند کر دیا۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو بتایا۔ ”ایڈیٹر کو جیل بھی کاٹنی پڑی اور عدالت کے حکم پر تین روز تک اپنے اخبار کے پہلے صفحے پر معافی نامہ بھی چھاپنا پڑا۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”فیروز خان نون کی بھی بہت بدنامی ہوئی۔ خیال تو یہ تھا کہ اتنی بدنامی کی بعد وہ حکومت سے استعفیٰ دے دے گا۔ انگلستان کا وزیر اعظم ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔ پر فیروز خان جما رہا۔ چپ کر کے بیٹھ گیا۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دستخط گورمانی کے تھے ہی نہیں۔ جعلی بنائے گئے تھے۔“ رحیم داد کے دل کا چور بول اٹھا۔

”اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سننے میں آئیں۔“ احسان شاہ نے وضاحت کی۔ ”خط بالکل جعلی ہوتا تو فیروز خان نون اس کی حمایت نہ کرتا۔ وہ بھی کم ہشیار نہیں ہے۔ اس نے بھی خط چھپوانے سے پہلے اطمینان کر لیا ہو گا۔ ویسے وہ خط تو بھوپال کا ایک حکیم دلبر حسین لایا تھا۔ پر سنا ہے وہ اسے ہندوستانی افسروں سے مل ملا کر سرکاری فائلوں میں سے کسی نہ کسی طرح اڑا کر لایا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ خط کے بارے میں ہندوستانی حکومت کی جانب سے بھی کوئی تردید نہیں کی گئی۔“

”تب تو خط جعلی نہ تھا۔ نواب گورمانی نے سردار پٹیل کو ایسا خط لکھا ہو گا۔“

”مجھے ایک وڈے سرکاری افسر نے کراچی میں بتایا تھا کہ گورمانی نے ایسا خط لکھا تو تھا۔ پر وہ بہت ہی زیادہ ہشیار بندہ ہے۔ اسے پتہ تھا کہ آگے چل کر یہ راز کبھی نہ کبھی ضرور کھلے گا۔“ احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ ”سنا ہے اس نے یہ کیا کہ خط پر اپنے ہاتھ سے دستخط نہ کیے۔ اپنے بھروسے

کے کسی بندے سے ایسے دستخط کروائے جو اس کے دستخط سے بالکل ملتے جلتے تھے۔"

"یہ تو جی اس نے زبردست چکر چلایا۔" رحیم داد بے ساختہ ہنس پڑا۔

"پتہ نہیں کیا سچ ہے کیا جھوٹ۔ اس سلسلے میں طرح طرح کی باتیں سننے میں آئیں۔ پر اتنا ضرور ہے کہ نواب گورمانی زبردست سیاست داں ہونے کے ساتھ ساتھ ہشیار بھی بہت ہے۔ جب اس کے خلاف یہ معاملہ چل رہا تھا تو اس کی ہوشیاری کے بارے میں ہندوستان کے مشہور انگریزی اخبار "ٹائمز آف انڈیا' نے بھی ایک دلچسپ خبر چھاپی تھی۔"

"وہ کیا تھی جی؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"خبر میں لکھا تھا کہ گورمانی نے اونٹوں کی دموں کے ذریعے لاکھوں روپے بنائے تھے۔"

"تیری گل سمجھ نہیں آئی۔" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "اونٹوں کی دموں سے کیسے لاکھوں روپے بن سکتے ہیں؟"

"اخبار نے بتایا تھا کہ دوسری جنگ عظیم میں گورمانی وڈا سرکاری افسر لگا ہوا تھا۔ فوجی سازوسامان کی جو سپلائی بھاول پور اور جیسلمیر کے ریگستانی رستے سے ہوتی تھی وہ اونٹوں کے ذریعے ہوتی تھی اور گورمانی کی نگرانی میں ہوتی تھی۔ رستے میں اکثر اونٹ مر جاتے تو حکومت اس کا معاوضہ ادا کرتی تھی۔ پر جتنے اونٹ ہوتے نہیں تھے' اس سے کہیں زیادہ کا معاوضہ وصول کیا جاتا۔" احسان شاہ نے رحیم داد کو آگاہ کیا۔ "پر یہ بات زیادہ دن چھپی نہ رہ سکی۔ حکومت کو پتہ چلا تو اس بدعنوانی کی روک تھام کے لیے یہ حکم جاری کیا گیا کہ جتنے اونٹ رستے میں مر جائیں' ان کا معاوضہ وصول کرنے کے لیے ساتھ میں مرے ہوئے اونٹ کی دم بھی کاٹ کر بھیجی جائے ورنہ پے منٹ نہیں ہوگا۔"

"ایسا کیا بھی گیا کہ نہیں؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"کیوں نہیں کیا گیا؟ سرکاری حکم جو تھا۔" احسان شاہ نے کہا۔ "مرنے والے اونٹوں کا معاوضہ لینے کے لیے دمیں کاٹ کر بھیج دی جاتیں۔"

"تب تو بدعنوانی بالکل بند ہو جانی چاہیے تھی۔"

"ہرگز بند نہیں ہوئی۔ بدعنوانی کرنے والے تو ہر روک تھام کا توڑ بھی نکال لیتے ہیں۔" احسان شاہ نے بے تکلفی سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "ہوتا یہ تھا کہ جو دمیں بھیجی جاتیں ان کو مال خانے میں رکھ دیا جاتا۔ بعد میں مال خانے کے انچارج کو رشوت دے کر چوری چوری دمیں واپس لے لی جاتیں۔ ان کو نئے مرنے والے اونٹوں کی دموں کے ساتھ دوبارہ بھیج دیا جاتا۔ سب ہی مل کر کھاتے تھے۔

اس طرح لاکھوں روپے کی ہیرا پھیری ہوتی رہی۔ پر اس کا بھی پتہ چل گیا۔ ایک روز تو چلنا ہی تھا۔ لڑائی کا زمانہ تھا' بدنامی کے ڈر سے دبا دیا گیا۔ یہ اونٹوں کی دموں کے سکینڈل کے نام سے مشہور ہوا۔"

"تو سچ کہہ رہا ہے شاہ جی؟" رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں پوچھا۔

"ویسے میں نے وہ اخبار تو دیکھا نہیں پر سننے میں یہی آیا ہے۔" احسان شاہ نے کہا۔ "ویسے یہ تو تجھے بھی ماننا پڑے گا کہ نواب گورمانی بہت ہشیار بندہ ہے۔ ہشیار نہ ہوتا تو مرکزی حکومت میں وزیر کیسے لگتا۔ مغربی پاکستان کا گورنر کیسے بنتا۔ سیاسی جوڑ توڑ کا تو وہ ماہر ہے۔ جواب نہیں اس کا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ گورمانی زبردست سیاست داں رہا ہے۔" رحیم داد نے سید احسان علی شاہ کی تائید کی۔ "وہ تو جی ہر حکومت میں ہوتا تھا۔"

"سچی گل تو ایسہ ہے چوہدری' صرف نواب گورمانی ہی نہیں چوہدری محمد علی' غلام محمد' اسکندر مرزا سب ہی بہت ہشیار بندے ہیں۔ ورنہ سرکاری افسری کرتے کرتے کیسے وزیر اعظم' گورنر جنرل' اور صدر بن گئے۔" احسان شان نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "ذرا سوچ تو چوہدری محمد علی' غلام محمد اور اسکندر مرزا نے پاکستان بنانے کے لیے کیا کیا تھا۔ یہ بھی پتہ نہیں پاکستان بنانے کے لیے انھوں نے مسلم لیگ کو الیکشن میں ووٹ بھی دیا تھا کہ نہیں۔"

"پر وہ اتنے وڈے وڈے حاکم کیسے بن گئے؟"

"میں نے بتایا نا۔ وہ بہت ہشیار بندے ہیں۔ انھوں نے انگریز افسروں کی ماتحتی میں کام کیا ہے۔" اس نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "انگریز افسروں کی کیا بات تھی۔ وہ حکومت چلانا جانتے تھے۔ انگریز افسروں سے ہی انھوں نے بھی حکومت چلانی سیکھی اور یہ بھی سیکھا کہ حکومت کیسے حاصل کی جاتی ہے۔"

رحیم داد دلچسپی اور انہماک سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ احسان شاہ مسکرا مسکرا کر بتاتا رہا۔ "تجھے پتہ ہے' چوہدری محمد علی کیسے سیاست میں آیا۔ ہوا یہ کہ جب لیاقت علی خان کا پنڈی میں کتل ہوا تو اس رات کو چوہدری محمد علی نے سارے وزیروں کو اپنی کوٹھی پر اکٹھا کیا۔ تب وہ حکومت میں سکرٹری جنرل ہوتا تھا۔ اس نے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کو وزیر اعظم بنایا۔ غلام محمد کو گورنر جنرل لگایا۔ گورمانی کو وزیر داخلہ بنایا۔ اور وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین کو گورنر بنا کر صوبہ سرحد میں پھینکا اور خود وزیر خزانہ بن گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ نہ وہ مسلم لیگ کا لیڈر تھا اور نہ دستور ساز اسمبلی کا ممبر تھا۔ ایسا چکر چلایا کہ کسی کو مخالفت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔"

”اسکندر مرزا تب کیا ہوتا تھا؟“

”وہ وزارت دفاع کا سیکریٹری ہوتا تھا۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”وہ پولیٹیکل ایجنٹ رہ چکا تھا۔ طرح طرح کی رشوت دے کر کبائلی سرداروں کو اپنے کنٹرول میں رکھتا تھا۔ جو سردار سرکشی کرتا اس کے خلاف دوسروں کو لگا دیتا۔ وہ آپس میں لڑتے تو ان میں صلح صفائی بھی وہی کراتا تھا۔ چوہدری محمد علی‘ سرکاری افسر سے وزیر بنا تو سکندر مرزا کو بھی وزیر بننے کی سوجھی اور وزیر بن بھی گیا۔ اتنا آگے بڑھا کہ محمد علی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ کبھی کسی پارٹی میں نہ رہا۔ ہمیشہ سیاست سے باہر رہا اور سیاست لڑاتا بھی رہا۔ ایسی زبردست سیاست لڑاتا تھا کہ سارے ہی سیاست داں اس کی مٹھی میں رہتے تھے۔ جسے چاہا اوپر چڑھا دیا جسے چاہا گرا دیا۔“

”پر جنرل ایوب خان تو اسکندر مرزا سے بھی زیادہ ہشیار نکلا۔ اس نے اسکندر مرزا کا ایسا پتا کاٹا کہ اسے صرف حکومت ہی سے نہیں پاکستان سے بھی باہر نکال دیا۔“ رحیم داد نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ ”ویسے شاہ جی‘ دیکھا جائے تو ایوب خان اور اس کے جرنیلوں نے بھی پاکستان بنانے کے لیے کیا کیا تھا۔ سنا ہے انگریزوں کی فوج میں ایوب خان کرنیل ہوتا تھا۔“ وہ زیب لب مسکرایا۔ ”پر اب تو جی اپنے جرنیلوں کے ساتھ ٹھاٹھ سے حکومت کر رہا ہے۔ سیات ایسی بند کی ہے کہ سارے ہی سیاست داں چپ کر کے بیٹھ گئے ہیں۔“

”اس کے پاس بندوک جو ہے‘ اور بندوک سے کون نہیں ڈرتا؟“ احسان شاہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ ”بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ یہ بتا تیری الاٹمنٹ میں اور تو کوئی گڑبڑ نہیں؟“

”نہیں جی‘ اور کوئی گڑبڑ نہیں۔“ رحیم داد نے جواب دیا۔

”مان لے تیرا کلیم اگر جعلی بھی ہے تب بھی تجھے فکر کرنے کی ذرا ضرورت نہیں۔ تیرا کوئی کچ نہیں بگاڑ سکتا۔“ احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ ”اب تجھ سے کیا چھپانا۔ جمیلہ کے پنڈ‘ لا کشن دیال کی متروکہ اراضی کا اچھا خاصا حصہ میرے پاس ہے۔ تجھے تو پتہ ہی ہے میں کہاں کا مہا ہوں۔ میرے پاس تو کوئی کلیم شلیم بھی نہیں۔“

”پر تو نے اس پر کیسے کبضہ کر رکھا ہے؟“

”الاٹمنٹ کرا رکھی ہے۔“ احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ ”پر اپنے نام سے نہیں‘ اپنے ایک مہاجر منشی کے نام سے۔“

”اگے چل کر اس نے کوئی گڑبڑ کی تو کیا ہوگا؟“

”کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ احسان شاہ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ ”الاٹمنٹ کے سا ہی اراضی کی بیع کرر کھی تھی۔ پکا کام کیا ہے۔ اب وہ ساری اراضی میری ملکیت ہے۔ پر ایسا میں نے ہی نہیں کیا۔ کتنے ہی غیر مہاجر زمیں داروں نے بھی اسی طرح متروکہ جائیداد پر کبضہ کر رکھا ہے۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”چوہدری‘ سچ پوچھ تو کتنی ہی جگہ ہندوؤں اور سکھوں کی جائیداد اور اراضی پر کبضہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف بھڑکا کر فسادات کرائے گئے۔“

”چکر تو زبردست چلایا۔ فسادات سے ڈر کر ہندو اور سکھ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سرحد پار چلے گئے اور ان کی جائیداد اور اراضی پر بعد میں کبضہ کر لیا گیا۔“

”ویسے ایسہ گل بھی ہے کہ ہندو بنئے اور لالے ادہار اور سود در سود کے ذریعے مسلمانوں کی اراضی اور جائیداد دھیرے دھیرے اپنی ملکیت میں لیتے جا رہے تھے۔ وڈے زمین دار بن گئے تھے۔“ احسان شاہ نے وضاحت کی۔ ”ایسی لوٹ مار مچا رکھی تھی کہ مسلمان ان سے خار کھانے لگے تھے۔ ان کے سینوں میں آگ تو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی مسلمان زمین داروں نے یہ آگ ذرا بھڑکائی تو ایسی پھیلی کہ پھیلتی ہی چلی گئی۔“

”شاہ جی‘ تو نے ٹھیک ہی کہا۔“ رحیم داد نے اس کی تائید کی۔ ”بالکل ایسا ہی ہوا۔ ادھر کے مسلمانوں نے جو کچھ ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ کیا ویسا ہی ادھر انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا۔“ رحیم داد نے خود کو مہاجر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ”تجھے کیا بتاؤں‘ ادھر کے مسلمانوں پر کتنا ظلم ہوا۔ اس کے بارے میں کبھی سوچتا ہوں تو لگتا ہے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔“

”ہاں جی‘ بہت ظلم ہوا۔ اب اس کی یاد نہ کر۔ دکھ ہی ہوگا۔“ احسان شاہ نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ ”تو اپنی الاٹمنٹ شلاٹمنٹ کے بارے میں فکر نہ کر۔“ اس نے سینے پر ہاتھ مار کر اپنے جوش و جذبے کا اظہار کیا۔ ”میرے ہوتے ہوئے تجھے گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ملک میں مارشل لاء لگ گیا تو کیا ہوا‘ سرکاری افسر تو وہی ہیں جو پہلے تھے۔ اب وہ فوجیوں کے ساتھ مل کر حکومت چلا رہے ہیں۔ ویسے فوجی ہوں یا غیر فوجی افسر‘ سارے ہی اپنے بندے ہیں۔“

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ احسان شاہ بھی کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے دبی زبان سے پوچھا۔ ”چوہدری‘ ایک گل تو بتا۔ میں نے سنا ہے‘ تیری گھر والی پہلے نوکرانی ہوتی تھی؟“

رحیم داد فوراً تاڑ گیا کہ نادر خان نے شاداں کے بارے میں احسان شاہ کو آگاہ کر دیا۔ اب انکار کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ”ہاں جی‘ تو نے ٹھیک ہی سنا۔ مجھے تجھ سے

جھوٹ نہیں بولنا۔"

"چوہدری، تجھے ویاہ کرنے کے لیے کوئی اور کڑی نہیں ملی۔" احسان شاہ کا لہجہ تیکھا تھا۔ "اس سے یاری لگائی تھی تو لگائے رکھتا۔ نوکرانیاں شوکرانیاں تو ہوتی اسی کام کے لیے ہیں۔ پر ان سے ویاہ نہیں کیا جاتا۔"

"تو بھول گیا۔ تو نے ہی تو کہا تھا جھیتی نال ویاہ کرلے۔" رحیم داد نے صفائی پیش کی۔ "واہٹی ڈھونڈتا تو دیر لگتی۔ لمبا چکر چلتا۔ فوری طور پر تو وہی مجھے ویاہ کرنے کے لیے نظر آئی۔ دھوم دھام تو کرنی نہیں تھی۔ مسجد کے ملاں کو بلایا اور خاموشی سے نکاح پڑھوالیا۔"

"جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب اگے کی سوچ۔" احسان شاہ نے الجھنے کی کوشش نہ کی۔ "تجھے پتہ ہونا چاہیے اب تو وڈا زمین دار ہے۔ تجھے اپنی نسل کے بارے میں پوری طرح سوچ بچار کرنی چاہیے۔ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ کسی عزت دار اور اونچے زمیں دار خاندان کی کڑی ویاہ کرلا تاکہ تیرا بھی نام اونچا ہو اور تیرے بال بچوں کا بھی۔" اس نے بات کو مختصر کیا۔ "ایسا کر، میرے ساتھ لہور چل۔ میں نے پیراں والہ نہیں، لہور ہی جانا ہے۔ وہاں اکٹھے بیٹھ کر سوچیں گے اس معاملے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔"

رحیم داد کی پریشانی احسان علی شاہ سے گفتگو کرنے کے بعد کم ہو گئی تھی، مگر ہنوز خوف زدہ تھا۔ کوٹلہ ہرکشن کے بجائے لاہور اسے زیادہ محفوظ مقام معلوم ہوا۔ وہاں احسان شاہ موجود تھا۔ اگر اس کے کلیم کے بارے میں کوئی تحقیقات ہوتی اور اس کے نتیجے میں کسی قسم کا خطرہ لاحق ہوتا تو احسان شاہ بروقت مدد کر سکتا تھا۔ ہر طرح سے مشکل کشائی کر سکتا تھا۔ وہ بہت بڑا زمیں دار تھا۔ سرکاری حلقوں میں اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ ملنسار اور یار باش بھی تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سرکاری افسروں سے کام نکالنے کا گر بھی جانتا تھا۔

رحیم داد نے تامل نہ کیا۔ فوراً احسان علی شاہ کے ہم راہ لاہور جانے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ ذرا ہی دیر بعد اٹھ کر حویلی میں چلا گیا۔

شاداں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ رحیم داد نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ جلد ہی لوٹنے کا وعدہ کیا۔ اس نے شاداں سے زیادہ بات چیت نہ کی۔ واپس احسان شاہ کے پاس پہنچا۔ اس کے ساتھ کار میں بیٹھا اور لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔

۵۱

دن کے بارہ بجے کا عمل تھا۔ بھری دوپہر تھی۔ گرمی بڑھ گئی تھی۔ شاداں کمرے میں تنہا تھی۔ باہر چلچلاتی دھوپ پھیلی تھی۔ شاداں کا یہ معمول تھا کہ رات بالائی منزل پر بسر کرتی۔ سورج غروب ہوتے ہی چھت پر چھڑکاؤ کر دیا جاتا۔ نوکر کمرے سے پلنگ نکال کر باہر چھت پر بچھا دیتے۔ ان پر اجلا بستر لگا دیا جاتا۔ صبح اٹھ کر وہ ناشتا اوپر ہی کی منزل پر کرتی تھی۔ دھوپ کی تمازت بڑھ جاتی تو پہر دن چڑھے نیچے چلی جاتی۔ وہاں بھی آرام کرنے کے لیے اس کا کمرہ مخصوص تھا۔ رحیم داد کوٹلہ ہرکشن میں موجود ہوتا تب بھی اس کے اس معمول میں فرق نہ آتا۔

رحیم داد ابھی تک لاہور سے واپس نہیں آیا تھا۔ شاداں اس روز خلاف معمول بالائی منزل کے کمرے میں تھی۔ وہ نیچے جانے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ ایک نوکرانی نے اطلاع دی۔

"چوہدرانی، تجھے ملنے کوئی بندہ آیا ہے۔"

"مجھے ملنے کون آیا ہے؟" شاداں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"یہ تو مجھے پتہ نہیں کون ہے۔" نوکرانی نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ "اپنا نام لالی بتاتا ہے۔"

لالی کا نام سن کر شاداں چونکی۔ اسے لالی کا آنا ناگوار گزرا۔ پیشانی پر بل پڑ گیا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی جھنجلاہٹ چھا گئی۔ اس نے سوچا، لالی سے ملنے سے صاف انکار کر دے۔ اب وہ اس سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ رحیم داد اسے سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس کے نام سے بھڑکتا تھا۔ وہ رحیم داد کو ناراض کرنا نہ چاہتی تھی۔ مگر وہ لالی کو بھی ناراض نہ کر سکتی تھی۔ لالی اسے سکھ نہ دے سکا لیکن اسے کبھی دکھ پہنچانے کی بھی کوشش نہ کی تھی۔

شاداں چند لمحے تذبذب کے عالم میں گم صم بیٹھی رہی، پھر اس نے نوکرانی سے کہا۔ "اسے وڈے کمرے میں بٹھا دے۔ میں تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

نوکرانی خاموشی سے مڑی اور واپس چلی گئی۔

شاداں نے گرمی کے باوجود سفید ریشمی چادر اوڑھی۔ جسم کے بالائی حصے کو اچھی طرح ڈھانکا کمرے سے باہر نکلی۔ چھت عبور کی اور زینے کی سیڑھیاں طے کر کے بڑے کمرے میں پہنچ گئی۔ لالی کمرے میں موجود تھا۔ اس کا لباس بوسیدہ اور میلا کچیلا تھا۔ چہرہ اور سر کے بال خاک دھول سے اٹے ہوئے تھے۔ وہ تھکا ہارا اور نڈھال نظر آ رہا تھا۔ اس کے بشرے سے پریشان حالی آشکارہ تھی۔

شاداں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی چادر کے پلو سے بکل مار کر نصف چہرہ چھپا لیا۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور لالی کے قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے پلٹ کر نوکرانی کی جانب دیکھا۔ لسّی لانے کی ہدایت کی، پھر لالی کی طرف متوجہ ہوئی۔ لالی کی آنکھوں میں حسرت و یاس تھی۔ اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے شاداں کو دیکھا۔

شاداں اس سے آنکھیں نہ ملا سکی۔ فوراً نگاہیں جھکا لیں۔ آہستہ سے بولی۔ "اب تو کیوں آیا ہے؟ چوہدری کو پتہ چلے گا تو سخت ناراض ہو گا۔ میں تجھے یہی بتانے جیل گئی تھی۔ پر منع کرنے پر بھی تو نے میری بات نہ مانی اور یہاں چلا آیا۔ یہ تو نے ٹھیک نہیں کیا۔" اس کے لہجے سے ناگواری عیاں تھی۔

"تو نے اس روز میری پوری گل بات ہی کب سنی تھی۔ اپنی ہی کہتی رہی۔" لالی نے شکوہ کیا۔ "میں تجھے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں چوری ڈکیتی کرنے کے جرم میں جیل نہیں گیا تھا۔ تجھ سے وعدہ کرنے کے بعد میں نے تو کبھی چوری ڈکیتی کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ تجھے پتہ نہیں۔"

"مجھے پتہ بھی نہیں کرنا۔" شاداں نے اسے آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ "تجھے جو کچھ بتانا تھا اسی روز مجھے بتا دیا تھا۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "تو جیل کیوں گیا؟ کیسے گیا؟ مجھے اب اس سے کچھ نہیں لینا۔"

"تو پہلے میری گل تو سن لے۔" لالی نے اصرار کیا۔

مگر شاداں نے اس دفعہ بھی اسے صفائی پیش کرنے کا موقع نہیں دیا۔ "میں نے کچھ نہیں سننا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔" اس کے لب و لہجے میں اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے لالی کو نظر بھر کر دیکھا۔ "میں اب چوہدری کی گھر والی بن چکی ہوں۔ اس کے سوا کسی اور مرد کے بارے

میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔"

"سوچنا بھی نہیں چاہیے۔" لالی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آواز میں تلخی پیدا ہو گئی۔ اس نے نظریں گھما پھرا کر دروازوں پر پڑے ہوئے خوش رنگ پردے، فرش پر بچھا ہوا نرم نرم قالین اور صوفے دیکھے۔ شاداں کا قیمتی لباس دیکھا۔ "ایسی شاندار حویلی میں رہ کر تو کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب تو وڈی زمیں دارنی بن گئی ہے۔ عیش کر رہی ہے۔"

لالی کے لہجے میں طنز تھا۔ جھنجلاہٹ اور برہمی تھی۔ شاداں نے اسے محسوس کیا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ مگر اس نے ضبط کا دامن نہ چھوڑا۔ خاموش بیٹھی رہی۔ اپنے رویّے سے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ لالی نے قدرے توقف کیا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر زہرخند نمایاں ہوا۔ "لگتا ہے تجھے چوہدری سے بھی پیار ہو گیا ہے۔"

"ہاں!" شاداں نے اس کی جانب دیکھے بغیر نہایت مختصر جواب دیا۔

"یہ بتا، تیرا کب تک چوہدری سے پیار کرنے کا ارادہ ہے؟" اس کے لہجے میں تحقیر تھی، تلوار کی کاٹ تھی۔ "تو نے پہلے بالے سے یاری لگائی۔ اس کے لیے اپنے خصم کو چھوڑا۔ گھر بار چھوڑا، بال بچوں کو چھوڑا۔ فیر بالے سے ناراض ہوئی تو اس کا خون کر دیا۔ مجھ سے یاری لگالی۔"

لالی کے منہ سے بالے کا ذکر سن کر شاداں لرز کر رہ گئی۔ اس کے بشرے سے ٹپکتی ہوئی برہمی کافور ہو گئی۔ اسے تمام عرصے میں پہلی بار اندازہ ہوا کہ لالی اس کے لیے خطرہ بھی بن سکتا ہے۔ وہ نہ صرف اقبال عرف بالا کے قتل کے راز سے واقف تھا، بلکہ اس نے بالا کی لاش ٹھکانے لگانے میں اس کی پوری پوری مدد بھی کی تھی۔ وہ اس کے جہانگیرہ کے مکان کی اس کوٹھری کو بھی اچھی طرح جانتا تھا جس میں گہرا گڑھا کھود کر لاش دفن کی گئی تھی۔

شاداں نے بولنا چاہا، مگر سراسیمگی کے عالم میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اسی اثنا میں نوکرانی لسی کا گلاس لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ آگے بڑھی، شاداں کے اشارے پر گلاس لالی کو پیش کیا۔ مگر لالی نے گردن ہلا کر انکار کر دیا۔ "میں نے لسی شسی نہیں پینی۔" اس کی آنکھوں سے خفگی جھلک رہی تھی۔

شاداں نے اصرار کیا۔ "گرمی میں چل کر آیا ہے۔ ٹھنڈی لسی پینے سے آرام ملے گا۔" اس کا لہجہ نرم اور شیریں تھا۔ لالی مزید انکار نہ کر سکا۔ پیاسا بھی تھا۔ گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس نے بے نیازی سے گلاس ہاتھ میں لیا اور ہونٹوں سے لگا کر بڑا گھونٹ بھرا۔

نوکرانی نے شاداں سے پوچھا۔ "زمین دارنی روٹی تیار ہے۔ یہیں لے آؤں یا تو نے اپنے

کمرے میں کھانی ہے؟"

"میں بعد میں روٹی کھاؤں گی۔" شاداں نے نوکرانی کو ہدایت کی۔ "پہلے تو لالی کے لیے روٹی لے آ۔ یہ روٹی کھا کر جائے گا۔"

نوکرانی چلی گئی۔ لالی نے گلاس خالی کیا۔ ایک طرف رکھا۔ اور ایک ہاتھ سے بھیگی ہوئی مونچھیں صاف کرنے لگا۔ شاداں خاموش بیٹھی رہی۔ لسی پینے سے لالی کو سکون ملا۔ اس کے غم و غصے میں کمی پیدا ہوئی۔ لیکن وہ ہنوز روٹھا ہوا تھا۔ منہ بگاڑ کر بولا۔ "مجھے اب جانا ہے۔ تیری روٹی شوٹی نہیں کھانی۔" اس نے اٹھنے کے لیے پہلو بدلا۔

مگر شاداں نے اسے اٹھنے نہ دیا۔ "کہاں چلا؟ تجھے روٹی کھا کر جانا ہو گا۔ رستے میں تجھے کہاں روٹی ملے گی۔" اس نے پیار سے ڈانٹا۔ "اتنی نراضگی ٹھیک نہیں۔ چپ کر کے بیٹھا رہ۔ دیکھ تو' تو نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔" اس نے اظہار ہمدردی کیا۔

"میرا کچھ بھی حال ہے' تجھے اس سے کیا لینا۔" لالی نے ایک بار پھر گلہ شکوہ شروع کر دیا۔ شاداں چاہتی بھی یہی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ لالی کہتا رہا۔

"یاد ہے' تو نے مجھ سے کیسے کیسے وعدے کیے تھے۔ وہ سب کیا تھا؟"

"اسے بھول جا۔" شاداں نے نرمی سے کہا۔ "میں نے کہا ناں جو ہونا تھا ہو گیا۔"

لالی نے افسردہ نظروں سے شاداں کو دیکھا۔ مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ صرف گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

نوکرانی کھانا لے کر آئی۔ اس نے چھوٹی میز اٹھا کر لالی کے سامنے رکھی اور کھانا اس پر چن دیا۔ کھانا عمدہ اور مرغن تھا۔ پراٹھے تھے' بھنا ہوا گوشت تھا' سبزی تھی' دال تھی اور چاول بھی تھے۔ لالی نے نوالا توڑا اور کھانے لگا۔ لالی پچھلی رات سے بھوکا تھا۔ کھانا خوش ذائقہ تھا۔ وہ سر جھکا کر رغبت سے کھاتا رہا۔ شاداں خاموش بیٹھی اسے کھانا کھاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

لالی نے کھانا کھاتے کھاتے نظریں اٹھا کر شاداں کو دیکھا۔ پوچھا۔ "تجھے پتہ ہے چوہدری کون ہے؟"

"مجھے سب پتہ ہے وہ کون ہے کیسا ہے؟" شاداں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

"تجھے کچھ پتہ نہیں۔" لالی کا لہجہ اونچا ہو گیا۔

"دھیرے بول۔" شاداں نے نرمی سے سمجھایا۔ "تو چوہدری کو مجھ سے زیادہ نہیں جانتا۔ وہ میرا گھر والا ہے۔ مجھ سے پیار بھی کرتا ہے۔ مجھے ہر طرح آرام پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نے تو اپنی زمیں داری میں سے ڈیڑھ سو کلا زمین بھی میرے نام لکھ دی ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں نے اپنے پہلے گھر والے کو چھوڑ کر جو غلطی کی اس کی سزا بھی پائی۔ لالی میں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ تو جیل چلا گیا۔ تجھے کیا پتہ میں نے کیسی کیسی مصیبتیں جھیلی ہیں۔" اس کے لہجے میں رقت پیدا ہو گئی۔ "اب میں وہ دکھ وہ مصیبتیں نہیں اٹھا سکتی۔ اتنی جوان بھی نہیں رہی۔ میں چوہدری سے دھوکا نہیں کر سکتی۔" اس کا چہرہ شرم سے گلابی ہو گیا۔ نگاہیں جھک گئیں۔ "میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

لالی کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے چونک کر شاداں کو دیکھا۔ وہ رحیم داد کے بارے میں اسے جو کچھ بتانا چاہتا تھا بتا نہ سکا۔ شاداں آہستہ آہستہ بولتی رہی۔ "میں نے ایک بار اپنا گھر اجاڑا ہے اب اسے دوبارہ اجاڑنے کی مجھ میں بالکل ہمت نہیں۔ میں اب تیرے کام کی بھی نہیں رہی۔ تو کسی سوہنی کڑی سے ویاہ کر کے اپنا گھر بسا لینا۔"

"میں نے کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا' یہ تیرے سوچنے کی بات نہیں۔" لالی نے جل کر اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔

"نراض نہ ہو۔" شاداں نے عاجزی سے کہا۔ "میں تیری منت کرتی ہوں مجھے تنگ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں نے برسوں دکھ اٹھانے کے بعد آرام پایا ہے' خوشی کے دن دیکھے ہیں۔ میری اس خوشی کو برباد کرنے کی نہ سوچنا۔" اس نے آب دیدہ ہو کر لالی کو دیکھا۔ "اب تو یہاں نہ آنا۔ میرا رستہ اور ہے تیرا اور۔ ہم نے اب ایک دوسرے سے کچھ نہیں لینا۔ سمجھ لے تیری شاداں مر گئی۔" اس کا لہجہ اور جذباتی ہو گیا۔ "ہاں لالی' وہ شاداں اب مر گئی۔ میں نے جس روز چوہدری کے ساتھ نکاح کیا تھا وہ اسی روز مر گئی تھی۔" اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ آنسو پلکوں سے ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر بہنے لگے۔

لالی بھی جذباتی ہو گیا۔ وہ شاداں کو اس قدر دل گرفتہ نہ دیکھ سکا۔ تڑپ کر بولا۔ "شاداں آنسو پونچھ لے۔ میں اب تیرے پاس کبھی نہیں آؤں گا۔ تجھے بھول جانے کی کوشش کروں گا۔" جذبات کی شدت سے اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ اس نے پانی سے بھرا ہوا گلاس اٹھایا اور غٹاغٹ پی گیا۔ پانی پینے سے طبیعت میں ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ وہ پھر شاداں کی جانب متوجہ ہوا۔ "شاداں' میں نے ہمیشہ تجھے خوشی دینے کی کوشش کی پر دے نہ سکا۔ تو چوہدری کے ساتھ رہ کر خوش ہے تو تیری خوشی کے ساتھ میں بھی خوش ہوں۔"

شاداں نے آنسو پونچھے۔ اس کے چہرے پر چھایا ہوا افسردگی کا غبار چھٹنے لگا۔ اس نے لالی کی خوش نودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ "مجھے پتہ ہے' تیرا دل بہت وڈا ہے۔" وہ لالی کی دل جوئی

کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے یہ بھی پتہ ہے‘ تو نے زندگی بھر دکھ ہی اٹھائے ہیں۔ تو کسی کو دکھ نہیں پہنچا سکتا۔“

لالی خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ شاداں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لالی نے ٹوکا۔ ”کہاں چلی؟“

”میں اوپر اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ تیرے لیے کچھ روپے لے کر آتی ہوں۔ لگتا ہے تیرے پاس کچھ بھی نہیں۔“

”تو مجھے رشوت دینا چاہتی ہے؟“ لالی نے مسکرا کر چوٹ کی۔

”ایسی گل نہ کر۔“ شاداں نے گردن کو خم دے کر تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”تو نے ہمیشہ ہی میری مدد کی ہے۔ میری ج ملک کی گولی سے مر گئی۔ تو نے مجھے ویسی ہی دوسری بُنّ لا کر دی۔ بعد میں دو ہزار روپیہ بھی دیا۔ تو نے کب میری مدد نہیں کی؟“ اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ ”اب میں تیری کچھ مدد کر سکتی ہوں تو اسے رشوت کہہ رہا ہے۔ تو مجھے اتنا ذلیل سمجھتا ہے؟“

”ناراض نہ ہو۔“ لالی نرم پڑ گیا۔ دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ ”میں نے تو تجھے چھیڑنے کے لیے کہا تھا۔ تو ایک دم بھڑک اٹھی۔“

شاداں نے کچھ نہ کہا۔ تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے باہر چلی گئی۔ لالی سر جھکا کر کھانا کھانے لگا۔

دروازے پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ لالی نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں نہ شاداں تھی نہ اس کی نوکرانی۔ سامنے رحیم داد کھڑا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ رحیم داد کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ ڈپٹ کر پوچھا۔ ”کون ہے تو؟“ لالی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ٹٹولنے والی نظروں سے رحیم داد کے چہرے کو تکتا رہا۔

”بولتا کیوں نہیں؟ کون ہے تو؟“ اس دفعہ رحیم داد نے زیادہ برہمی کا اظہار کیا۔

”میں لالی ہوں جی۔“ لالی نے دبی زبان سے کہا۔

”تو جیل میں ہوتا تھا نا۔ باہر کیسے آگیا؟“

”سزا ختم ہو گئی تو باہر آگیا۔“ لالی نے تلخی سے کہا۔ ”میرے باہر آنے سے تجھے تکلیف ہوئی؟“

”بکواس نہ کر۔“ رحیم داد بھڑک اٹھا۔ ”یہاں کیسے آیا؟ تجھے کس نے یہاں آنے دیا؟“

لالی کچھ نہ بولا۔ ٹکٹکی باندھے رحیم داد کی جانب دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے اور ہر ہر انداز کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ ہر چند کہ اس کی آنکھوں پر اب عینک تھی۔ چہرے پر ڈاڑھی تھی۔ اور رخسار پر زخم کا ہلال نما واضح نشان تھا۔ اس کا حلیہ بڑی حد تک بدل چکا تھا۔ مگر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور لہجے میں اس رحیم داد کی جھلک تھی جو مدت تک لالی کی ساتھ جیل میں رہ چکا تھا اور اسی کے ہم

راہ جیل سے فرار بھی ہوا تھا۔ لالی کا شبہ رفتہ رفتہ پختہ ہو گیا۔

رحیم داد اس کی متجسس نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ غضب ناک ہو کر چیخا۔ ”تو میری حویلی میں داخل کیسے ہوا؟“ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ آواز اونچی ہو گئی۔ ”چور‘ ڈکیت۔ کیسی شان سے صوفے پر بیٹھا آرام سے روٹی کھا رہا ہے۔ تیری اتنی ہمت کیسے ہوئی؟“ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ میز پر زور سے ٹھوکر ماری۔ میز الٹ گئی۔ کھانے کی قابیں اور پلیٹیں چھناکے کے ساتھ فرش پر گریں اور ادھر ادھر بکھر گئیں۔ رحیم داد کا غصہ کم نہ ہوا۔ ”تجھے اس کمینی نے بلایا ہو گا۔ کدھر ہے وہ؟ کہاں چلی گئی؟“ وہ شاداں کو گالیاں دیتا رہا۔

لالی پر سکون رہا۔ اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ گلاس اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا کر پانی پینے لگا۔ رحیم داد زور سے دھاڑا۔ ”نکل جا یہاں سے۔ میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جا۔“ مگر لالی اس کے غیظ و غضب سے مرعوب نہ ہوا۔ ڈھیٹ بن کر بولا۔ ”اتنی گرمی نہ دکھا۔ پانی تو پی لینے دے۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ اس نے پانی پیا۔ گلاس فرش پر رکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد غصے سے ہانپ رہا تھا۔ مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ نڈھال ہو کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ لالی دروازے کی جانب بڑھا۔ ٹھٹکا‘ رحیم داد کو ایک بار پھر ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ رحیم داد اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ وہ مڑا اور چہرے پر آیا ہوا پسینہ پونچھنے لگا۔

لالی کمرے سے باہر نکلا۔ دالان میں پہنچا تو شاداں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس نے لالی کو ٹوکا۔ ”تو کہاں چلا؟“

لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”اندر جا کر دیکھ۔ تیرا پیار کرنے والا کھسم تجھے اور مجھے دونوں کو ننگی ننگی گالاں نکال رہا ہے۔“ شاداں کے چہرے پر سراسیمگی طاری ہو گئی۔ لالی نے اس کی جانب مزید توجہ نہ دی۔ آگے بڑھا اور قدم اٹھاتا ہوا حویلی سے باہر چلا گیا۔

☆

حویلی کے سامنے کھلے میدان میں ہر طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ لو بھی چل رہی تھی۔ لالی دھوپ کی تمازت اور لو کے تھپیڑوں سے بے نیاز چلتا رہا۔ لاریوں کے اڈے پر پہنچا۔ نیلی ٹرانسپورٹ کی ایک لاری میں سوار ہوا۔ شہر پہنچ کر وہ لاہور جانے والی بس میں بیٹھ گیا۔

لاہور پہنچنے کے بعد بھی اس کے ذہن پر رحیم داد سوار تھا۔ اس نے لالی کو جس حقارت سے دھتکار کر اپنی حویلی سے نکالا تھا‘ اس بے عزتی اور ذلت کو وہ بھولا نہ تھا۔ اسے رہ رہ کر رحیم داد کی گالیاں اور ڈانٹ پھٹکار یاد آ رہی تھی۔ جتنا وہ ان کو یاد کرتا اسی شدت کے ساتھ رحیم داد کے

خلاف اس کی نفرت اور کدورت بڑھتی جا رہی تھی۔ رحیم داد کے ساتھ ساتھ وہ شاداں سے بھی خفا تھا۔

رحیم داد کے بارے میں اس کا شبہ پختہ ہو گیا تھا۔ مگر وہ ارشاد الٰہی سے اس کی تصدیق کرانا چاہتا تھا۔ اپنے اطمینان کے لیے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس کا باپ چوہدری نور الٰہی نہیں بلکہ رحیم داد ہے جو اس کے کلیم کی بنیاد پر متروکہ اراضی الاٹ کرا کے کوٹلہ ہر کشن کا بہت بڑا زمیں دار بن گیا ہے۔

وہ ارشاد الٰہی کو تلاش کرنے ملک نثار محمد کے بھٹے پر پہنچا۔ جیل جانے سے قبل ارشاد الٰہی اسی بھٹے پر پتھیرا تھا۔ لالی نے بھٹے کے پتھیروں سے چوری چھپے رابطہ قائم کیا۔ ارشاد الٰہی کے بارے میں دریافت کیا۔ مگر وہ اب اس بھٹے پر نہیں تھا۔ جمعدار نے کچھ دوسرے پتھیروں کے ساتھ اسے کسی اور بھٹے کے مالک کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ مگر پوچھ گچھ کے باوجود یہ پتہ نہ چل سکا کہ ارشاد الٰہی کس بھٹے پر پہنچایا گیا تھا۔

لالی نے فیروز پور روڈ، جی ٹی روڈ اور بیدیاں روڈ کے تمام ہی بھٹوں پر ارشاد الٰہی کو تلاش کیا۔ مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اس نے ہمت نہ ہاری۔ اسی کوشش میں لگا رہا کہ کہیں اس کا سراغ مل جائے۔ وہ ارشاد الٰہی کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ ایک شام اس کا پرانا ساتھی غنی چنّا مل گیا۔ وہ تالا توڑنے اور نقب زنی میں ماہر تھا۔ کئی بار پکڑا گیا۔ جیل گیا، مگر باز نہ آیا۔ اب وہ منجھا ہوا جرائم پیشہ بن چکا تھا۔

غنی چنّا اصرار کر کے لالی کو اپنے گھر لے گیا۔ نہ اس کی بیوی تھی نہ بچے۔ دو بڑے بھائی تھے۔ وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ لاہور ہی میں رہتے تھے۔ لیکن چنّا ان سے ملتا نہ تھا۔ وہ بھی اس سے کتراتے تھے۔ چنّا مصری شاہ کے چھوٹے سے تنگ و تاریک مکان میں رہتا تھا۔ لالی کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ غنی نے زور دیا تو وہ اس کے ساتھ ہی رہنے لگا۔

غنی نے لالی کو اپنے ڈھرے پر لگانا چاہا۔ اسے ایک معاون و مددگار کی ضرورت تھی۔ لالی نے بہت چاہا کہ جس دلدل سے ایک بار نکل چکا ہے دوبارہ اس میں نہ گرے۔ مگر نہ اسے کہیں کام دھندا ملا اور نہ ہی سر چھپانے کے لیے جگہ ملی۔ مسلسل بے روزگاری اور پریشان حالی سے تنگ آ کر اس نے غنی کا کہا مان لیا۔ ویسے بھی نہ اب شاداں اس کی رہی تھی اور نہ اس وعدے کی کوئی اہمیت رہی تھی جو اس نے چوری ڈاکہ زنی نہ کرنے کے سلسلے میں اس سے کیا تھا۔

لالی اور غنی چنّا مل جل کر چوری ڈکیتی کرتے اور چوری کا مال آپس میں بانٹ لیتے۔ رہتے بھی

ایک ہی گھر میں تھے۔ لالی ایک بار پھر نڈر اور بے باک جرائم پیشہ بن گیا۔ ایسے دھڑلے سے واردات کرتا کہ کبھی کبھی تو چنّا دنگ رہ جاتا۔

دو مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ گرمی کا زور ٹوٹنے لگا۔ جولائی کا مہینہ تھا۔ بارش کا پہلا چھینٹا پڑ چکا تھا۔ ایک رات غنی چنّا اور لالی چوری کی نیت سے کرشن نگر کے ایک مکان میں داخل ہوئے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ واردات سے پہلے ہی جاگ ہو گئی۔ گھبرا کر دونوں نے راہ فرار اختیار کی۔ لالی تو بچ کر صاف نکل گیا۔ چنّا بدحواس ہو کر چھت پر پہنچ گیا۔ شور زیادہ بلند ہوا تو اس نے برابر کے مکان پر پہنچنے کی کوشش کی۔

دونوں مکانوں کے درمیان تنگ گلی حائل تھی۔ غنی نے زقند بھری لیکن چھت کے منڈیر پر اس کا پیر اس طرح پھسلا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ لڑکھڑا کر دھڑام سے گلی کے پختہ فرش پر گرا۔ ٹخنہ اتر گیا۔ اس نے چوٹ کی مطلق پروا نہ کی۔ سرپٹ بھاگا اور فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ گھر پہنچا تو لالی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ چوٹ تازہ تھی، لہٰذا رات کو اس کی شدت کا پوری طرح اندازہ نہ ہو سکا۔ چنّا صبح سو کر اٹھا تو پیر میں شدید درد کے ساتھ ساتھ ورم بھی تھا۔

غنی چنّا اب گھر ہی پر رہتا۔ ٹوٹی ہڈیاں جوڑنے اور ہڈیوں کے اکھڑے ہوئے جوڑ بٹھانے والے ایک معالج کے علاج معالجے سے ٹخنے کی ہڈی کا جوڑ تو بیٹھ گیا لیکن ابھی تک وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوا تھا۔ اس عرصے میں چوری کی ساری رقم ختم ہو گئی۔ فاقہ کشی کی نوبت آ گئی۔ لہٰذا ایک رات لالی اکیلا ہی چوری کرنے کے ارادے سے نکلا۔

آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ہوا مدھم چل رہی تھی۔ رات تاریک اور سنسان تھی۔

لالی نے ایک مکان تاڑا۔ گھوم پھر کر جائزہ لیا۔ موقع و محل دیکھا۔ یہ پرانی وضع کا بنگلہ تھا۔ اس کے پچھلے حصے کی دیواریں زیادہ اونچی نہ تھیں۔ آس پاس آبادی بھی کم تھی۔ جگہ جگہ گھنے درخت تھے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ لالی اچھل کر آسانی سے ایک دیوار پر چڑھ گیا۔ بنگلے کے وسیع صحن میں ایک پلنگ پڑا تھا۔ کوئی اس پر بے خبر سو رہا تھا۔ لالی نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور آہستہ سے نیچے اتر گیا۔

صحن کے ساتھ کھپریل کی چھت کا طویل برآمدہ تھا۔ لالی دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔ برآمدے میں پہنچا۔ ایک کمرے کے دروازے پر رکا۔ ہولے سے دھکا دیا۔ مگر دروازہ بند تھا۔ دوسرا بھی اندر سے بند تھا۔ البتہ نکڑ کے کمرے کا دروازہ ہاتھ لگاتے ہی چرچراتا ہوا کھل گیا۔ لالی دم سادھے کمرے کے باہر کھڑا رہا۔ اس نے مڑ کر پلنگ پر لیٹے ہوئے شخص کی جانب دیکھا۔ وہ بدستور گہری نیند

سو رہا تھا۔

لالی نے نہایت احتیاط سے دروازے کا ایک پٹ کھولا۔ کمرے کے اندر داخل ہوا۔ قمیص ک جیب سے چھوٹی سی ٹارچ نکالی۔ اسے روشن کیا۔ کمرہ زیادہ بڑا نہ تھا۔ ایک گوشے میں میز تھی۔ اس پر چند کتابیں رکھی تھیں۔ کلائی پر باندھنے کی گھڑی بھی ایک طرف رکھی تھی۔ میز کے قریب ہی کھونٹی پر پتلون اور بش شرٹ لٹکی ہوئی تھی۔ لالی نے ٹارچ بجھا دی۔ ہاتھ بڑھا کر پتلون اور بش شرٹ کی جیبیں ٹٹولیں۔ پتلون کی پچھلی جیب میں چند کرنسی نوٹ موجود تھے۔ اس نے نوٹ نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیے۔ میز پر رکھی ہوئی گھڑی بھی اٹھا کر جیب میں ڈال لی۔

میز سے ذرا ہٹ کر لکڑی کی اونچی الماری تھی۔ وہ اس کی جانب بڑھا۔ مگر اس کا ایک پیر قریب رکھے ہوئے پیڈسٹل لیمپ سے کچھ اس طرح ٹکرایا کہ لیمپ ڈگمگا کر کرسی پر گرا اور کرسی اس کے بوجھ سے الٹ گئی۔ رات کے سناٹے میں اچانک شور ہوا۔ لالی سراسیمہ ہو کر جہاں تھا وہیں دم بخو کھڑا رہا۔ باہر صحن میں کوئی آہستہ سے کھنکارا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر قدموں کی آہٹ سنائ دی اور رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔

دروازے کی دہلیز پر اندھیرے میں ایک سایہ لہرایا۔ لالی کو خطرے کا شدت سے احساس ہوا۔ و سنبھلا بھی نہ تھا کہ دیوار پر لگا ہوا بلب روشن ہو گیا۔ کمرے میں ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ لالی۔ جھٹ چاقو نکالا۔ اسے کھولا اور مضبوطی سے ہاتھ میں دبا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ سامنے سلی لودھی کھڑا تھا۔ اس کے سر کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں نیند کا خما تھا۔ چہرے پر خوف و ہراس تھا۔ اس کا جسم چھریرا تھا۔ عمر ۴۵ برس سے زیادہ نہ تھی۔ مگر بالوں م وقت سے پہلے سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ وہ اپنی عمر سے کچھ زیادہ ہی سن رسیدہ نظر آتا تھا۔

لالی نے سلیم لودھی کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ اسے سامنے دیکھ کر بہت سٹ پٹایا۔ لالی جب جیل میں قیدی تھا تو انھی دنوں سلیم لودھی بھی نظربند تھا۔ اسے مارشل لا کے ایک ضابطے کے تح دوسرے سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کے ساتھ تخریب کاری اور ملک دشمنی کے الزام میں گرفتا کر کے جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ بی کلاس قیدی تھا اور لالی کو اس کا مشقتی لگایا گیا تھا۔ لالی ساتھ اس کا رویّہ نہایت دوستانہ اور مشفقانہ تھا۔ اس کے لہجے میں ہمیشہ نرمی اور شگفتگی ہوتی۔ لا بھی اسے عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ کبھی اسے شکایت کا موقع نہ دیا۔

سلیم لودھی نے بھی لالی کو پہچان لیا تھا۔ کچھ دیر حیران و پریشان کھڑا لالی کو تکتا رہا، پھر ا ہوئے پوچھا۔ ”تو لالی تو نہیں ہے؟“ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔ ”یاد پڑتا ہے تو میرے سا

بل میں تھا۔“

لالی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بت بنا خاموش کھڑا رہا۔

”یار، تو بولتا کیوں نہیں؟“ اس دفعہ اس کے انداز میں کسی قدر بے تکلفی تھی۔ ”تو لالی ہے؟“

”ہاں جی، میں لالی ہی ہوں۔“ لالی نے نظریں جھکا کر دبی زبان سے کہا۔

”تو یہاں پہنچا کیسے؟“ اس نے پلٹ کر صحن کی چار دیواری کی جانب دیکھا۔ ”دیوار پھاند کر آیا وگا۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”چوری کرنے آیا تھا۔ مگر تو نے غلط مکان کا انتخاب کیا۔ میرے پاس شکل سے تیس پینتیس روپے ہوں گے۔ ان سے تیرا کیا کام بنے گا؟“

لالی بہت خجل ہوا۔ لیکن نہ اس نے معذرت کی نہ صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ سر جھکائے زموں کی طرح چپ کھڑا رہا۔ سلیم لودھی مسکرا مسکرا کر بولتا رہا۔ ”یار، چوری ہی کرنی تھی تو کسی ال دار کا گھر تاکا ہوتا۔ زر و مال بھی تگڑا ہاتھ آتا۔“ وہ لمحے بھر کے لیے ٹھٹکا۔ ”ویسے اس گھر کو دیکھ کر بھی مغالطہ ہوتا ہے۔ یہ میری چھوٹی بہن کا گھر ہے۔ اس کا شوہر پی ڈبلیو ڈی کا ٹھیکیدار ہے۔ پیسے والا بھی ہے۔ مگر آج کل وہ بال بچوں کے ساتھ مری میں ہے۔ برسات شروع ہو چکی ہے۔ اب اسے واپس آجانا چاہیے۔“

سلیم لودھی نے جھک کر فرش پر اوندھی پڑی ہوئی کرسی اٹھا کر سیدھی کی۔ لالی کی جانب متوجہ ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو ابھی تک دبا تھا۔ سلیم لودھی نے سہمی ہوئی نظروں سے چاقو دیکھا۔ ”یار لالی، اسے بند کر کے جیب میں رکھ۔ دیکھ کر خواہ مخواہ ڈر لگتا ہے۔“ اس نے چاقو کی جانب اشارہ کیا۔

لالی نے اس کی طرف دیکھے بغیر چاقو بند کیا اور جیب میں رکھ لیا۔ ساتھ ہی جیب سے گھڑی اور چند نوٹ نکال کر خاموشی سے میز پر رکھ دیے۔ سلیم لودھی نے نوٹ اور گھڑی دیکھ کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ ”یار یہ تو میرے پاس آخری اثاثہ تھا۔ لے جاتا تو سگریٹ خریدنے کو بھی کچھ نہ رہتا۔“ اس نے مسکرا کر شوخی سے لالی کو دیکھا۔ ”ہاں گھڑی کے بغیر تو کسی نہ کسی طرح کام چل سکتا ہے۔ تجھے اس کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہو تو لے جا۔“

”نہیں جی، میں نے کچھ نہیں لینا۔“ لالی نے انکار میں گردن ہلائی۔ اس کی آواز میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ تھی۔ لہجے میں معذرت اور پشیمانی تھی۔ ”مجھے تو جی بالکل پتہ نہ تھا کہ آپ یہاں رہتے یں۔ سچ کہہ رہا ہوں مجھے بالکل پتہ نہ تھا۔“

”تو سچ ہی کہہ رہا ہو گا۔“ سلیم لودھی نے پیڈسٹل لیمپ اٹھا کر درست کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔ ”ویسے رشوت خور اور چور کسی کے یار نہیں ہوتے۔“

لالی نے کچھ نہ کہا۔ خاموش کھڑا رہا۔ سلیم لودھی نے سوئچ دبایا۔ چھت سے لٹکتا ہوا بجلی کا پنکھا تیزی سے گردش کرنے لگا۔ سلیم لودھی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے قریب رکھی ہوئی دوسری کرسی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”تو کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔ اب تو نیند آنکھوں سے اڑ ہی گئی۔ تجھ سے کچھ باتیں ہی ہو جائیں۔“

لالی خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”جب تو جیل میں تھا تو خود کو بے گناہ ثابت کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ تیرے خلاف چوری ڈکیتی کا جھوٹا کیس بنایا گیا۔ کسی جرم کے بغیر تجھے جیل میں بند کر دیا گیا۔ یہی کہا کرتا تھا نا؟“

”ہاں جی یہی کہتا تھا۔“ لالی نے تردید نہ کی۔ ”اور جی میں غلط بھی نہیں کہتا تھا۔“

”یہ بھی تو کہتا تھا کہ تو نے چوری ڈکیتی چھوڑ دی ہے۔“ سلیم لودھی نے مسکرا کر طنز کیا۔ ”یہاں تو دیوار پھاند کر آدھی رات کو چوری کرنے کے لیے نہیں مجھ سے ملنے آیا ہو گا۔“

”اصلی بات یہ ہے جی۔“ لالی نے صفائی پیش کی۔ ”کئی سال پہلے میں نے شاداں سے چوری ڈکیتی نہ کرنے کا پکا وعدہ کیا تھا۔ محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنے کی کوشش کی۔ بھٹوں پر پتھیرا لگ گیا۔“ لالی کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ ”پر جب میں جیل میں تھا تو اس نے مجھ سے دھوکا کیا۔ ایک زمیں دار سے ویاہ کر لیا۔“

”اس نے ٹھیک ہی کیا۔ تیرے انتظار میں بیٹھی رہتی تو بھوک اور مفلسی سے مر جاتی۔“ سلیم لودھی نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ ”اب آرام سے رہتی ہو گی۔ عیش کرتی ہو گی۔“

”ہاں جی بہت عیش کرتی ہے۔ وڈی زمین دارنی بن گئی ہے۔“ لالی کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ ”اس کا گھر والا ویسے ہے تو بہت وڈا زمین دار‘ پر اس نے جعلی کلیم کے ذریعے متروکہ اراضی الاٹ کرا رکھی ہے۔ بے ایمانی اور دھوکے فریب سے اتنا وڈا زمیں دار بن گیا ہے۔“

”صرف وہی نہیں‘ سارے ہی وڈے زمیں داروں نے بے ایمانی‘ اور دھوکے فریب کے ذریعے اتنی وسیع زمین داریاں حاصل کی ہیں۔ کچھ نے خود اس طرح حاصل کی ہیں‘ کچھ ایسے ہیں جن کے بزرگوں نے اسی طرح کی تھیں اور مرنے کے بعد اپنے وارثوں کے لیے چھوڑ گئے۔“ سلیم لودھی اطمینان سے بولتا رہا۔ ”کسی نے زبردستی زمین دبا لی‘ کسی نے انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے ملک اور اس کے محکوم عوام سے غداری کی اور انعام کے طور پر دولت اور جاگیر پائی۔“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”انگریزوں کی حکومت تھی‘ تب بھی وہ عیش کرتے تھے۔ اب بھی عیش کرتے ہیں۔ پہلے وہ انگریزوں کے ساتھ مل کر حکومت چلاتے تھے۔ اب ان کے دیسی ماتحتوں اور کارندوں کے ساتھ مل کر چلاتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو لوٹ مار اور غداری کے صلے میں ملنے والی زمیں داریاں کب کی ختم ہو جاتیں۔ بحق سرکار ضبط کر کے بے زمین کسانوں میں تقسیم کر دی جاتیں۔“

”مجھے اس بارے میں جی کچھ پتہ نہیں۔“

”تجھے تو یہ بھی پتہ نہ ہو گا کہ تو چور ہے تو وہ زمیں دار بھی چور ہے‘ جس نے تیری شاداں سے شادی کر لی۔“ سلیم لودھی نے لالی کو بتایا۔ ”بلکہ تو چھوٹا چور ہے‘ اور وہ بڑا چور ہے۔“

”وہ کیسے چور ہو سکتا ہے جی؟ اس نے چوری ڈکیتی تو نہیں کی۔“ لالی اس کی بات کا مفہوم مطلق نہ سمجھ سکا۔ نہایت سادگی سے بولا۔ ”یہ بات بالکل سمجھ نہیں آئی۔“

”آ بھی نہیں سکتی۔ تو اکیلا نہیں۔ کروڑوں ایسے بندے ہیں جو یہ بات نہیں سمجھ سکتے۔“ سلیم لودھی نے میز پر رکھی ہوئی اپنی گھڑی اٹھائی۔ لالی کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ گھڑی دیکھ رہا ہے جسے تو چوری کر کے لے جانا چاہتا تھا۔ اسے میں نے دو سو روپے میں خریدا تھا۔ تو اسے چرا کر لے جاتا تو یوں سمجھ لے‘ میرے دو سو روپے کی چوری کر لیتا۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟“

”ہاں جی‘ یہ تو بالکل ٹھیک گل ہوئی۔“ لالی نے اس کی تائید کی۔

”یہ دو سو روپے کیسے بنے؟“ سلیم لودھی سر اٹھا کر لمحہ بھر سوچتا رہا‘ پھر گویا ہوا۔ ”یہ میری لگ بھگ ۱۵ روز کی تنخواہ تھی۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ میری ۱۵ روز کی محنت دو سو روپے میں بدل گئی۔ یہ گھڑی اٹھا کر تو لے جاتا تو در اصل وہ مری ۱۵ دن کی محنت کی چوری ہوتی۔“ اس نے غور سے لالی کا چہرہ دیکھا۔ ”تو میری بات کا مطلب سمجھ رہا ہے نا؟“

”ہاں جی‘ بالکل سمجھ رہا ہوں۔“ لالی نے مستعدی سے جواب دیا۔

”اب تو ذرا اپنی شاداں کے شوہر کے بارے میں سوچ۔“ سلیم لودھی نے کہا۔ ”اس کے مزارعے چلچلاتی دھوپ‘ کڑاکے کی سردی اور سخت بارشوں میں فصلیں اگاتے ہیں۔ ہل چلاتے ہیں‘ بوائی کرتے ہیں‘ فصلوں کو پانی لگاتے ہیں۔ دن رات محنت کرتے ہیں۔ اور زمیں دار کچھ نہیں کرتا۔ پر بٹائی پر آدھی بلکہ اس سے کہیں زیادہ فصل اپنے حصے کے طور پر لے جاتا ہے۔“ اس نے لالی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”لے جاتا ہے نا؟“

”ہاں جی‘ بالکل لے جاتا ہے۔“

”جس طرح میری ۱۵ روز کی محنت گھڑی میں بدل گئی‘ بالکل اسی طرح مزارعوں کی محنت فصل

میں بدل جاتی ہے۔" وہ اس انداز سے بات کر رہا تھا جیسے اسکول کا کوئی استاد اپنے شاگرد کو کوئی نکتہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کا استدلال عام فہم تھا۔ بات کرنے کا انداز دل نشین اور اثر انگیز تھا۔ وہ بتاتا رہا۔ "زمیں دار جب فصل کا آدھے سے بھی زیادہ حصہ بٹائی کے ذریعے اٹھا کر لے جاتا ہے تو وہ دراصل اپنے حصے کی شکل میں مزارعوں کی کئی مہینوں کی محنت چرا کر لے جاتا ہے۔"

"یہ بات سمجھ نہیں آئی جی۔" لالی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ "زمین جو اس کی ہوتی ہے۔ زمین دار اسی کی بنا پر اپنے حصے کی فصل لے جاتا ہے۔ یہ چوری تو نہیں ہوئی۔"

"میں نے تجھے بتایا نہیں کہ وڈے زمین داروں کو یا ان کے بزرگوں کو یہ زمین انگریز حاکموں کی خدمت اور وطن سے غداری کرنے کے صلے میں ملی تھی۔ سچ پوچھ تو انگریز بھی چور تھے۔"

"وہ جی کیسے چور ہوئے؟" لالی نے مداخلت کی۔

"وہ اس طرح چور ہوئے کہ وہ بھی اس ملک کے عوام کی محنت طرح طرح سے لوٹتے تھے۔ زمیں دار اور جاگیردار اس لوٹ مار میں ان کی مدد کرتے تھے۔ وہ لوٹ کے مال میں ان کے ساجھے دار ہوتے تھے۔ لوٹ کے حصے کا یہ مال زمین ہوتی تھی۔ لگ بھگ سارے ہی وڈے زمین دار ایسے ہی زمین حاصل کر کے بنے ہیں۔"

"پر اب تو جی زمین ان ہی کی ہوئی نا۔" لالی قائل نہ ہوا۔

"تو میری یہ گھڑی چرا کر لے جاتا تو یہ چوری ہی کا مال ہوئی نا؟" سلیم لودھی نے مسکرا کر لالی کو دیکھا۔ "زمین دار کا معاملہ تو اور بھی مختلف ہے۔ جس طرح ہوا' روشنی اور پانی سب ہی کی ملکیت ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کے اعتبار سے ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اسی طرح زمین بھی سب کی ملکیت ہے۔ ہر ایک کو اپنی ضرورت کے اعتبار سے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ زمین تو اس کی ہونی چاہیے جو فصل اگانے کے لیے اس پر ہل چلائے۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "اس طرح' تو خود ہی سوچ' تو اگر چور ہے تو تیری شاداں کا زمین دار شوہر تجھ سے وڈا چور ہے۔ ہر چوری دراصل محنت ہی کی چوری ہوتی ہے۔" سلیم لودھی نے لالی کے چہرے کو دیکھا۔ "تو میری بات کا مطلب سمجھ گیا نا؟"

لیکن اس کی بات کا مفہوم لالی بالکل نہ سمجھ سکا۔ اسے یاد آیا کہ جیل میں بھی وہ کبھی کبھی ایسی ہی بے تکی باتیں کرتا تھا۔ اور جب بولنے پر آتا تو بے تکان بولتا تھا۔ تب ہی تو جیل کے عملے کے ارکان اسے خبطی اور سنکی کہتے تھے۔ اور چکر منشی تو اسے ہمیشہ چریا کہہ کر یاد کرتا تھا۔ غرضیکہ سلیم لودھی کا انقلابی فلسفہ لالی کے پلے نہ پڑا۔ البتہ رحیم داد کے بارے میں اس نے جو کچھ کہا تھا' اسے سن کر وہ بہت خوش ہوا۔ سلیم لودھی کی یہ بات اس کے دل کو لگی۔ اس نے نہایت جوش و خروش سے سلیم لودھی کی تائید کی۔ "وہ تو جی بہت ہی وڈا چور ہے۔ میرا تو یہ پکا شبہ ہے' اس نے جعلی کلیم سے زمین الاٹ کرائی ہے' اور وڈا زمین دار بن کر اپنی شان اور ٹوہر دکھاتا ہے۔" لالی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "اس نے مجھے چور اور جرائم پیشہ کہہ کر اپنی حویلی سے نکال دیا۔ میری بہت بے عزتی کی۔ گندی گندی گالاں نکالیں۔ آپ کو جی اس کے بارے میں پتہ نہیں۔"

"مجھے اس کے بارے میں پتہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔" سلیم لودھی نے قطع کلام کرتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔ "سارے ہی وڈے زمین دار ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ دوسروں کی محنت نہایت بے دردی سے چوری کرتے ہیں اور خود کو چور نہیں بلکہ شریف اور عزت دار سمجھتے ہیں۔ تیرے ایسے چھوٹے چوروں کو نیچ اور کمینہ سمجھتے ہیں۔ ان کو دھتکارتے ہیں۔ ذلیل کرتے ہیں۔ ان کو گرفتار کروا کر جیل میں ڈلوا دیتے ہیں۔" اس کے ہونٹوں پر زہرخند ابھرا۔ "خیریت ہوئی کہ اس نے تجھے جیل نہیں بجھوایا۔ آئندہ تو اس کے پاس گیا' تو وہ تجھے چوری کے الزام میں ضرور گرفتار کروا دے گا۔"

"پر میں نے ایک بار شاداں کے پاس ضرور جانا ہے۔ اسے رحیم داد کے بارے میں کئی باتیں بتانی ہیں۔"

"تو اسے جو کچھ بتائے گا' وہ اس پر بالکل اعتبار نہیں کرے گی۔" سلیم لودھی نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ "تو اب اسے بھول جا۔ وہ اب وڈی زمین دارنی بن چکی ہے۔ عیش کرتی ہے۔ آرام سے رہتی ہے۔ اور اسے یہ سارا عیش و آرام اس کے زمین دار شوہر ہی نے دیا ہے۔ وہ نہ اسے چھوڑ سکتی ہے اور نہ اس کے خلاف کچھ سن سکتی ہے۔" اس نے لالی کو نظر بھر کر دیکھا۔ "بات در اصل یہ ہے کہ ایک بار عیش و آرام کا چسکا لگ جائے تو مشکل ہی سے چھوٹتا ہے۔" سلیم لودھی لمحہ بھر خاموش رہ کر بے تکلفی سے بولا۔ "یار تو جو چاہتا ہے اب نہیں ہو سکتا۔"

لالی نے غور کیا' شاداں نے بھی اس سے یہی بات کہی تھی۔ اس کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ سلیم لودھی نے نرم لہجے میں کہا۔ "لالی اب تو شاداں کی نہیں اپنی فکر کر۔" اس نے لالی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "تو چوری ڈکیتی نہیں چھوڑ سکتا؟"

"چھوڑ تو دی تھی جی۔" لالی نے کہا۔ "میں نے اس بارے میں پہلے بھی بتایا تھا۔"

"تو ہی اپنی محبوبہ شاداں کی بات کرے گا۔" سلیم لودھی کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ "اگر اس نے تجھے

دھوکا دیا' بے وفائی کی تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تو خود کشی کر لے۔ یہ چوری ڈکیتی اختیار کرنا' سچ پوچھ تو خود کشی ہی کرنا ہوا۔ یہ تباہی کا راستہ ہے۔"

لالی سر جھکائے کچھ دیر سوچتا رہا' پھر اس نے سر اٹھا کر سلیم لودھی کو دیکھا۔ آہستہ سے بولا۔ "آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں لگا سکتے؟"

"میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں تو آج کل خود بے روزگار ہوں۔"

"آپ تو جی کسی کالج میں پڑھاتے ہیں۔" لالی نے اسے یاد دلایا۔ "جیل میں تو جی آپ نے مجھے یہی بتایا تھا۔"

"پہلے میں انگریزی کا پروفیسر ہوتا تھا۔" سلیم لودھی نے لالی کو مطلع کیا۔ "مگر جب میں جیل سے رہا ہو کر کالج پہنچا تو معلوم ہوا کہ مجھے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔"

"ایسا کیوں کیا گیا جی؟" لالی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"مجھ پر یہ الزام لگایا گیا کہ میں طلباء کو حکومت کے خلاف بھڑکاتا ہوں' ان کو دہشت گردی پر اکساتا ہوں۔ تخریب کاری کرتا ہوں۔" سلیم لودھی نے بتایا۔ "اسی الزام میں مجھے گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔"

"یہ تخریب کاری کیا ہوتی ہی جی؟"

"وہی باتیں جو میں چھوٹے چور اور بڑے چور کے بارے میں تجھے بتا رہا تھا۔" سلیم لودھی نے ہنس کر کہا۔ "حکومت کے نزدیک یہ تخریب کاری ہے۔ ملک دشمنی ہے۔"

"آپ نے تو جی سچی سچی گلاں کی تھیں' کچھ کچھ تو سمجھ بھی آتی ہیں۔"

"یہی تو لطیفہ ہے۔ سچ بات کہو تو تخریب کاری کہلاتی ہے۔ ملک دشمنی سمجھی جاتی ہے۔ جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ملازمت سے نکال دیا جاتا ہے۔" سلیم لودھی کا لہجہ تیکھا تھا۔ "ایوب خان اپنے جرنیلوں کے ساتھ رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح بندوق دکھا کر حکومت پر قبضہ کر لے تو اسے ڈاکہ زنی نہیں حب الوطنی کہا جاتا ہے۔ نظریہ ضرورت قرار دیا جاتا ہے۔" وہ روانی سے بولتا رہا۔ "مارشل لا لگا کر طرح طرح کے ضابطوں سے اپنے ہی ملک کے پرامن عوام کو ڈرایا دھمکایا جائے۔ جبر و تشدد کا نشانہ بنایا جائے تو اسے غنڈہ گردی اور دہشت گردی نہیں' ملک اور قوم کی خدمت ثابت کرنے کے لیے ریڈیو اور اخبارات سے دن رات پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ کیسی کیسی قصیدہ خوانی ہوتی ہے۔" اس کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ "ادھر اپنا حال یہ ہے کہ سچ بات کہنا بھی چاہیں تو کہہ نہیں سکتے۔" وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

لالی نے اس کی باتوں میں کسی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ اکتا کر بولا۔ "ٹیم کیا ہو گیا ہے جی؟"

سلیم لودھی نے گھڑی اٹھا کر دیکھی۔ لالی کو بتایا۔ "چار بجنے والے ہیں۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ جمائی لی۔ "لگتا ہے تجھے نیند معلوم ہو رہی ہے۔ اب تو جا۔ جی چاہے تو کبھی آ جانا۔ مگر چوری کے ارادے سے نہیں۔"

"ایسی گل نہ کریں جی۔" لالی نے احتجاج کیا۔ "آپ تو اب ادھر ہی ہوتے ہیں نا؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا' کب تک یہاں رہوں۔" سلیم لودھی نے کہا۔ "پتہ نہیں مری سے واپسی کے بعد بہنوئی مجھے اب ٹھہرنے بھی دے گا کہ نہیں۔ وہ میری وجہ سے حکومت کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ سرکاری ٹھیکیدار جو ٹھہرا۔"

سلیم لودھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں کمرے سے باہر نکلے۔ برآمدے سے گزر کر صحن میں پہنچے۔ سلیم لودھی نے آگے بڑھ کر بیرونی دروازہ کھولا۔ لالی خاموشی سے باہر چلا گیا۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

لالی اپنے ٹھکانے پر واپس پہنچا تو مسجدوں سے اذان کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ مشرقی افق پر ہلکی ہلکی کافوری روشنی پھیل رہی تھی۔ صبح کی آمد آمد تھی۔ غنی چتّا بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے تشویش کا اظہار کیا۔ "تو نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟"

"کوئی گڑبڑ' شڑ بڑ نہیں ہوئی۔" لالی نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔ "پر کام نہیں بنا۔"

"کام نہیں بنا۔" اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ "تو اب تک رہا کہاں؟"

"یار اب سونے دے۔ مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔" لالی نے بے زاری سے کہا۔ "بعد میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔"

چتّا خاموش ہو گیا۔ وہ اس وقت لالی سے الجھنا نہ چاہتا تھا۔ لالی نے آنکھیں بند کیں اور گہری نیند سو گیا۔ وہ دوپہر تک بے خبر سوتا رہا۔

☆

سلیم لودھی کی باتوں کا لالی پر کچھ اثر ہوا تو یہ ہوا کہ رحیم داد کے خلاف اس کی نفرت دوچند ہو گئی۔ رات کو وہ چوری کے ارادہ سے نکلا۔ اس دفعہ اس نے ایک جنرل اسٹور تاکا۔ تالا توڑ کر دکان کے اندر داخل ہوا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس نے دکان کا جائزہ لیا۔ کاؤنٹر کی ایک دراز کی تلاشی لی

تو نقدی نظر آئی۔ رقم زیادہ نہ تھی۔ ۳۶۸ روپے تھے۔ لالی نے تمام روپے اٹھا کر جیب میں رکھے اور جس ہوشیاری سے دکان کے اندر پہنچا تھا اسی ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

دوسرے ہی روز اس نے ایک بار پھر ارشاد الٰہی کی تلاش شروع کر دی۔ وہ رحیم داد کے بارے میں جتنا غور کرتا اسی قدر اس کا یہ گمان پختہ ہوتا جاتا کہ وہ ارشاد الٰہی کا باپ نہیں ہو سکتا۔ ارشاد الٰہی کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی تو وہ کسی طرح پینتیس سے زیادہ نہ تھا۔ مستزاد یہ کہ ارشاد الٰہی سے بڑی ایک بہن بھی تھی جسے بلوائی اٹھا لے گئے تھے اور اس سے بھی بڑا ایک بھائی تھا جو تریموں کے پتن پر دریائے راوی کے کنارے سکھ حملہ آوروں کے ہاتھوں ہلاک ہو چکا تھا۔

یہ تمام باتیں ارشاد الٰہی نے اسے بتائی تھیں۔ اس نے باتوں باتوں میں یہ بھی بتایا تھا کہ اس کا اور اس کے بڑے بھائی بہن کا باپ ایک ہی تھا اور اس کی ماں نے دوسری شادی بھی نہیں کی تھی۔ عمر کے اعتبار سے وہ ادھیڑ تھا۔ اس کے سر اور ڈاڑھی کے بال کہیں کہیں سے سفید بھی ہو چکے تھے۔ اس کے برعکس رحیم داد جوان تھا اور اس کا ایک بھی بال سفید نہ تھا۔ علاوہ ازیں، حلیہ بہت حد تک تبدیل ہو جانے کے باوجود لالی کو اس کے چہرے کے خدوخال، آواز اور بات کرنے کے انداز میں اس رحیم داد کی جھلک نظر آتی تھی جو مدت تک اس کے ساتھ رہ چکا تھا۔

رحیم داد نے نہ صرف شاداں کو اس سے چھین لیا تھا بلکہ اسے ذلیل و خوار کر کے اپنی حویلی سے نکالا بھی تھا۔ لالی اس سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کوشش میں ارشاد الٰہی اس کے لیے نہایت کارآمد اور موثر ہتھیار ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے ذریعے وہ رحیم داد کو بے نقاب کر سکتا تھا۔ گرفتار کرا سکتا تھا۔ سیف اللہ کے قتل اور جعلی کلیم کی بنیاد پر متروکہ اراضی الاٹ کرانے کے جرم میں جیل بھجوا سکتا تھا۔ پھانسی پر لٹکوا سکتا تھا۔

چند روز کی بھاگ دوڑ کے بعد اس بار وہ ارشاد الٰہی کا سراغ لگانے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ برسات کا موسم تھا۔ ان دنوں بھٹوں پر عام طور سے کام بند رہتا تھا۔ لہٰذا پتھیروں اور مزدوروں سے ملنا آسان تھا۔

جی ٹی روڈ کے ایک بھٹے کے واقف کار پتھیرے کے ذریعے اسے یہ اطلاع ملی کہ ارشاد ا میلسی کے ایک بھٹے پر کئی مہینے سے کام کر رہا ہے۔

لالی اس روز ارشاد الٰہی کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی غرض سے جی ٹی روڈ بھٹے پر ایک بار پھر گیا۔ واپسی پر وہ بہت مطمئن تھا اور میلسی جا کر ارشاد الٰہی سے ملنے کا منصوبہ

تھا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے تھے۔ شام ہونے سے پہلے ہی شام کا سماں تھا۔ بارش ہونے کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ ہوا بھیگی بھیگی تھی۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ دور دور تک کوئی راہ گیر دکھائی نہ دیتا تھا۔

بارش شروع ہونے سے پہلے ہی وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس کے قدموں کی رفتار تیز تھی۔ وہ سر جھکائے اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا سڑک کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ ناگاہ عقب میں ہارن کی آواز ابھری۔ لالی نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک جیپ سڑک پر دوڑتی ہوئی اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ آن کی آن میں جیپ اس کے قریب پہنچی اور آگے نکل گئی۔ مگر کچھ فاصلے پر جا کر اس کی رفتار سست پڑ گئی۔ جیپ رک گئی۔

جیپ میں رحیم داد بیٹھا تھا۔ اس نے اب ڈرائیونگ سیکھ لی تھی اور اکثر خود ہی جیپ چلاتا تھا۔ ان دنوں اس کا ڈرائیور بیمار تھا۔ لہٰذا اس وقت خود ہی جیپ چلا رہا تھا۔ وہ ایک بھٹے کے مالک سے ملنے کے بعد واپس کوٹلہ ہرکشن جا رہا تھا۔ اس نے لالی کو پہچان لیا تھا اور جیپ روک کر اس کے نزدیک آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

لالی قدم بڑھاتا ہوا جیپ کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے چلتے چلتے جیپ کے اندر جھانکا۔ رحیم داد اگلی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اسٹیئرنگ وھیل پر تھا اور دوسرے سے گیئر کو آہستہ آہستہ ادھر ادھر ہلا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گیئر پھنس گیا ہے اور وہ اسے درست کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

لالی نے بھی رحیم داد کو پہچان لیا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا۔ غور سے رحیم داد کو دیکھا۔ اسکی گردن جھکی ہوئی تھی اور وہ گیئر درست کرنے میں منہمک تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر نہ لالی کی طرف دیکھا اور نہ ہی کوئی توجہ دینے کی کوشش کی۔

لالی نے نفرت سے رحیم داد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ مگر وہ رکا نہیں۔ پیچ و تاب کھاتا ہوا خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ مسلسل رحیم داد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

جیپ اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ لالی آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ اس نے فرلانگ بھر راستہ بھی نہ طے کیا ہو گا کہ سڑک پر جیپ کے پہیوں کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ لیکن اس نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا۔ تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

جیپ کے پہیوں کی آواز قریب آتی گئی۔ پھر اس قدر قریب آ گئی کہ لالی نے پلٹ کر دیکھا۔ جیپ سڑک سے اتر کر کچے راستے پر دھول اڑاتی طوفان کی مانند اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ لالی کو فوراً

خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے تیزی سے نشیب میں اترنے کی کوشش کی۔ وہ سخت بدحواس او سراسیمہ تھا۔

لالی نشیب میں جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ جیپ اس کے سر پر پہنچ گئی۔ اس زور سے ٹکرائی لالی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ جیپ گرد کے بادل اڑاتی ہو تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ کچھ دور جانے کے بعد کچے راستے سے پھر پختہ سڑک پر پہنچ گئی۔ او نہایت تیز رفتار سے دوڑتی ہوئی بہت دور نکل گئی۔

لالی گرد و غبار میں لتھڑا ہوا سڑک کے کنارے بے سدھ پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں ا وہ رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ سڑک ویران تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ بادل ایک بار زور گرجے اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

☆

اکتوبر کے نیم گرم نیم سرد شب و روز تھے۔ برسات کا موسم ختم ہو چکا تھا۔ مگر خلاف مع کوٹلہ ہرکشن میں اس روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ آسمان پر کالی کالی گھٹائیں چھائی تھی رات تاریک اور ساکت تھی۔ ہوا میں نمی تھی' سرسراہٹ تھی۔ لالی کوٹلہ ہرکشن میں داخل دس بج رہے تھی۔ بستی پر ہو کا عالم طاری تھا۔ ہر طرف کیچڑ تھی۔ جگہ جگہ بارش کے پانی بھرے ہوئے گڑھے تھے۔

لالی کیچڑ اور پانی سے بھرے ہوئے گڑھوں سے بچتا بچاتا سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا حو جانب بڑھ رہا تھا۔ سنسان رات میں مینڈکوں کے زور زور سے ٹرانے کی آوازیں رک رک کر رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا حویلی کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ سامنے مہمان خانہ تھا او سے متصل نادر خان کا مکان تھا۔ مکان پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ ایک کھڑکی کی جھری سے ر اس طرح پھوٹ رہی تھی کہ اندھیرے میں زرد زرد دھبے کی مانند نظر آتی تھی۔ لیکن مہمان میں اندھیرا تھا۔

وہ مہمان خانے کے دروازے کے قریب گیا۔ چوکنا نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ خانے میں بھی خاموشی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ لیکن د اندر سے بند تھا۔ وہ کچھ دیر اندھیرے میں دم سادھے کھڑا رہا' پھر نگاہیں اٹھا کر مہمان خانے دیواری کی بلندی کا اندازہ لگایا۔ دیواریں زیادہ اونچی نہ تھیں۔ اس نے چاقو نکالا' کھولا اور ا میں دبالیا۔

اس نے دونوں ہاتھ بلند کیے' جسم سمیٹ کر زور سے اچھلا اور دیوار کے اوپر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر اچھلنے کے ساتھ ہی کمر میں ٹیس اٹھی۔ یہ اس چوٹ کی تکلیف تھی جو رحیم داد کی جیپ سے ٹکرانے کے باعث ریڑھ کی ہڈی میں آئی تھی۔ یہ چوٹ ایسی شدید تھی کہ وہ کئی روز تک بستر پر پڑا رہا۔ کروٹ بھی بدلتا تو درد سے بلبلا اٹھتا۔ اس چوٹ کے علاوہ جیپ کی ٹکر سے کمر اور ٹانگوں پر زخم بھی آئے تھے' مگر زیادہ گہرے نہ تھے۔ کوئی ہڈی پسلی بھی نہ ٹوٹی تھی۔ علاج معالجے سے وہ صحت یاب تو ہو گیا تھا' لیکن جھٹکا لگتا تو چمک کے ساتھ کمر میں ابھی تک درد ہوتا تھا۔

لالی دیوار سے چمٹ کر لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ جب ذرا قرار آیا تو اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ صحن بالکل خالی تھا۔ البتہ برآمدے میں ایک چارپائی نظر آ رہی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسی سمت دیکھتا رہا۔ مگر نہ کوئی آہٹ ابھری نہ آواز۔ وہ ٹانگیں لٹکا کر آہستہ سے نیچے اترا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ نہایت احتیاط سے بیرونی دروازے کی کنڈی کھول دی تاکہ خطرے کی صورت میں آسانی سے باہر نکل جائے۔ وہ ہوشیار اور منجھا ہوا چور تھا اور ہر ایسا چور واردات سے پہلے فرار ہونے کا بندوبست کر لیتا ہے۔

وہ دبے دبے قدموں چلتا ہوا برآمدے میں پہنچا۔ چارپائی کو قریب سے دیکھا مگر چارپائی خالی تھی۔ مہمان خانے کا ملازم موجود نہ تھا۔ لالی نے نہایت احتیاط سے کمروں کا جائزہ لیا لیکن سب خالی تھے۔ مہمان خانے کی جانب سے اطمینان کرنے کے بعد وہ پھر صحن میں آیا۔ گردن اٹھا کر اس دروازے پر پہنچا جو حویلی میں کھلتا تھا۔ لالی نے آہستہ سے دھکا دیا۔ دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ وہ خاموشی سے اندر چلا گیا۔

حویلی میں پہنچ کر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ سب بے خبر سو رہے تھے۔ البتہ صدر دروازے پر بیٹھا ہوا چوکیدار جاگ رہا تھا۔ اس کی کھنکار وقفے وقفے سے رات کی خاموشی میں ابھر رہی تھی۔ لالی حویلی کے طویل دالان میں داخل ہوا۔ بائیں ہاتھ کو اوپر جانے کا زینہ تھا۔ وہ آگے نہ گیا۔ زینے میں داخل ہوا اور سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ چھت خالی تھی۔ مگر سامنے کے کمرے میں روشنی تھی۔

لالی نے چاقو مضبوطی سے ہاتھ میں دبا لیا۔ نہایت ہوشیاری سے آگے بڑھا اور دروازے کے نزدیک پہنچ گیا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ لالی نے گردن بڑھائی۔ دروازے کی اوٹ سے اندر دیکھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں لیمپ روشن تھا۔ مدھم روشنی میں رحیم داد عین اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ صرف بنیان پہنے ہوئے تھا اور اس کی نیچے دھوتی تھی۔

اس لباس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بستر پر لیٹنے جا رہا ہے۔ لالی نے اسے دیکھا تو لمحہ بھر کے لیے سراسیمہ ہو گیا۔ لیکن وہ جلدی ہی سنبھل گیا۔ رحیم داد اس طرح کھڑا تھا کہ اس کی پشت لالی کی طرف تھی۔ لالی نہایت خاموشی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ رحیم داد کو اس کی آمد کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

لالی دہلیز کے قریب چپ چاپ کھڑا رہا۔ ٹکٹکی باندھے نہایت چوکنا نظروں سے رحیم داد کو دیکھتا رہا۔ کئی لمحے اسی عالم میں گزر گئے۔ پھر لالی نے جرات سے کام لیا۔ ٹوہ لگانے کی غرض سے رحیم داد کو بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ ”رحیمے!“ اس کا یہ نفسیاتی حربہ کارگر ثابت ہوا۔ رحیم داد چونکا۔ فوراً پلٹ کر دیکھا۔ لالی کو روبرو پایا تو بوکھلا گیا۔ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”تت‘ تت‘ تو لالی ہے!!“ وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ سہمی ہوئی نظروں سے لالی کو گھورنے لگا۔

”ہاں‘ میں لالی ہوں۔“ لالی نے اس کی خوف زدہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میں مر گیا۔“ اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ ”تو نے تو اپنی جیپ چڑھا کر مجھے مار ڈالنے کی پوری کوشش کی تھی‘ پر میں اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں رحیمے۔“

”تو مجھے رحیمے کیوں کہہ رہا ہے؟“ رحیم داد کے چہرے پر گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ جھنجلاہٹ بھی چھا گئی۔ ”میرا نام چوہدری نور الٰہی ہے۔ میں کسی رحیمے تیمے کو نہیں جانتا۔“

”تو رحیمے کو نہیں جانتا تو آواز دینے پر پلٹا کیوں؟“ لالی نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔

”تجھے دھوکا ہوا۔“ اس دفعہ رحیم داد کا لہجہ سنبھلا ہوا تھا۔ ”میں نے تجھ سے جھگڑا نہیں کرنا۔“

رحیم داد چاہتا تو شور مچا کر اپنے نوکروں کو مدد کے لیے بلا سکتا تھا۔ لالی کو پکڑ کر چوری کے الزام میں پولیس کے حوالے کر سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ پولیس کی تحویل میں جانے کی بعد وہ اس کے لیے اور خطرناک بن جاتا۔ لہٰذا اس نے صرف دھمکی پر اکتفا کیا۔ ”اب تو یہاں سے چپ کر کے چلا جا ورنہ مجھے اپنے نوکروں کو بلانا پڑے گا۔“

”اسے دیکھا ہے۔“ لالی نے جھٹ کھلا ہوا چاقو سامنے کر دیا۔ ”آواز نکالی تو چھاتی میں ایسا اتار دوں گا کہ سانس بھی نہ لے سکے گا۔“

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ خونخوار نظروں سے لالی کو گھورتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اچانک وہ تیزی سے پلٹا۔ میز پر رکھا ہوا کانسی کا گلاس اٹھا کر لالی کے سر پر مارا۔ لالی بھی غافل نہ تھا۔ اس نے نہایت ہوشیاری سے سر ایک طرف کر لیا۔ گلاس اس کے کان کے پاس سے گزرتا ہوا کھڑکی کے پردے سے الجھ کر فرش پر گر گیا۔ اس کے گرنے سے ہلکی سی جھنکار ابھری۔ لالی نے مڑ کر اس جانب دیکھا۔

لالی کی نظر بھٹکی تو رحیم داد نے فوراً موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ وہ تیزی سے جھپٹا اور لالی کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ لالی نے خود کو اسکی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے زور لگایا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ دونوں زور آزمائی کرنے لگے۔ لالی کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ رحیم داد میں اس سے کہیں زیادہ کس بل ہے۔ وہ پہلے سے اور قوی ہو گیا ہے۔ رحیم داد نے لالی کو اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ کر بے بس کر دیا تھا۔

لالی کے کے ہاتھ میں ہنوز چاقو دبا تھا۔ اس نے آخری حربے کے طور پر چاقو سے وار کرنے کی کوشش کی۔ مگر رحیم داد نے اسے وار کرنے کا موقع نہ دیا۔ جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ کر چاقو چھین نے کی کوشش کی۔ لالی نے مدافعت کی۔ اس چھینا جھپٹی میں چاقو لالی کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور چلا گیا۔

رحیم داد چاقو اٹھانے کے لیے جھپٹا۔ لالی نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ زور سے جھٹکا دیا۔ رحیم داد لڑکھڑا کر گرا۔ لالی اس سے چمٹ گیا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ رحیم داد نے اس بار بھی طاقت کے بل پر لالی کو زیر کر لیا۔ اسے مضبوطی سے پکڑا‘ زور لگایا اور ڈھکیلتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ اس نے لالی کو دیوار سے اڑا دیا۔ غضب ناک ہو کر تھپڑ اور گھونسے مارنے لگا۔ لالی خاموشی سے مار کھاتا رہا۔ اس نے کسی طرح کی مزاحمت نہ کی۔ رحیم داد نے اس بری طرح دبا رکھا تھا کہ وہ مزاحمت کر بھی نہ سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ پولیس والوں کے ہاتھوں اتنی مار کھا چکا تھا کہ اب پٹنے کا عادی ہو گیا تھا۔ پولیس تشدد کے ذریعے کبھی اس سے اقبال جرم کرانے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ مار کھا کھا کر اس کی کھال سخت اور ہڈیاں مضبوط ہو گئی تھیں۔

رحیم داد اس پر جھکا ہوا تھا۔ بپھر بپھر کر مار رہا تھا۔ مارتے مارتے رحیم داد کے ہاتھ شل ہو گئے۔ چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ لالی بظاہر نڈھال اور شکستہ نظر آ رہا تھا۔ مگر موقعے کی تلاش میں تھا اس نے رحیم داد کا زور اور دباؤ ٹوٹتا ہوا محسوس کیا تو فوراً خود کو سنبھالا۔ اپنی پیٹھ پوری طرح دیوار سے لگائی۔ دونوں پیر سمیٹے‘ تیزی سے اوپر اٹھائے اور رحیم داد کے پیٹ پر زور سے مارے۔ وہ اس اچانک اور شدید حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ اس کے جسم کا توازن کچھ اس طرح بگڑا کہ قدم اکھڑ گئے۔ وہ پلٹ کر فرش پر دھڑام سے گرا۔

لالی نے ایک بار پھر اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچنا چاہی۔ ٹانگ تو اسکے ہاتھ نہ آئی‘ دھوتی آ گئی۔ رحیم

داد کا نچلا دھڑ بالکل برہنہ ہو گیا۔ اس نے کروٹ لی۔ اٹھنا چاہا۔ لیکن لالی نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ دھوتی ایک طرف پھینکی۔ عقاب کی طرح جھپٹا اور اچھل کر اس قدر زور سے کمر پر لات ماری کہ رحیم داد فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

لالی پلٹا اور آگے بڑھ کر فورا اپنا چاقو اٹھا لیا۔ رحیم داد کے پاس پہنچا اور گردن گھٹنے سے دبا کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد اب بے بس ہو چکا تھا۔ وہ خاموش پڑا رہا۔ اور آہستہ آہستہ ہانپتا رہا۔ لیمپ کی روشنی میں اس کے برہنہ کولہے پر زخم کا بڑا سا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔ لالی اس نشان کو دیکھ کر چونکا اور بغور دیکھنے لگا۔ رحیم داد کو کچھ خبر نہ تھی۔ وہ رک رک گہری سانس بھر رہا تھا۔

لالی نے زخم کے نشان پر چاقو کی نوک آہستہ سے چبھوئی۔ رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "رحیے!" رحیم داد نے تکلیف سے منہ بگاڑا۔ لالی مسکرا کر بولا۔ "تو نے داڑھی رکھ لی۔ عینک لگانی شروع کر دی۔ ہر طرح اپنا حلیہ بدل لیا۔ نام بھی بدل لیا۔ پر تو اس نشان کو نہ بدل سکا۔" رحیم داد دم بخود پڑا رہا۔ لالی بولتا رہا۔ "تیری شناخت کا یہ نشان تو تھانے اور جیل، دونوں جگہ رجسٹروں میں لکھا ہے۔" اس نے رحیم داد کی گردن پر رکھے ہوئے گھٹنے کو دبایا۔ "اب چپ کر کے کیوں پڑا ہے؟ کہہ دے میں رحیم داد نہیں، چوہدری نور الٰہی ہوں۔ اور احمد کوٹ کا نہیں، ضلع گورداسپور کے موضع نصیر پور کا مہاجر ہوں۔" اس نے اپنے گھٹنے کو ذرا سا اور دبایا۔

"میری گردن تو چھوڑ۔" رحیم داد نے تکلیف سے بے قرار ہو کر فریاد کی۔

"پہلے میری بات کا جواب دے۔" لالی نے اس دفعہ گھٹنے پر زور دے کر رحیم داد کی گردن ک زیادہ قوت سے دبایا۔

رحیم داد چیں بول گیا۔ "بتا دوں گا، سب کچھ بتا دوں گا۔" اس نے بلبلا کر عاجزی سے کہا۔ "میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔" وہ منہ کھول کر زور زور سے ہانپنے لگا۔ اس کی آنکھیں تکلیف سے پھ ہوئی تھیں۔

لالی علیحدہ ہو گیا۔ اٹھا اور رحیم داد کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ چاقو بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ رحیم داد کچھ دیر بے سدہ پڑا رہا۔ پھر اس نے پہلو بدلا۔ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ لڑکھڑاتے قدموں آگے بڑھا۔ دھوتی اٹھائی اور اسے باندھنے لگا۔ اس نے لالی سے نظریں نہ ملائیں۔ وہ نڈھال ا شکست خوردہ نظر آ رہا تھا۔

لالی نے چاقو لہراتے ہوئے حکم دینے کے انداز میں کہا۔ "سامنے بیٹھ جا۔" رحیم داد گرد جھکائے ہوئے بڑھا اور بستر پر پیر لٹکا کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ چہر پر ویرانی چھائی تھی۔

"رحیے!" لالی نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "یہ بتا، نہر باری دو آب کے نزدیک ٹبوں پر جیل کی وردی میں جو لاش ملی تھی، وہ کس کی تھی؟"

"تو اسے نہیں جانتا۔" رحیم داد نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ حکیم چشتی تھا۔"

"تجھے پتہ نہیں میں اسے جانتا ہوں۔ اس نے ایک بار میرا علاج بھی کیا تھا۔ شادو مجھے اس کے پاس لے گیا تھا۔ وہ دوائی نہ دیتا تو میں کب کا مر چکا ہوتا۔ وہ بہت نیک بندہ تھا۔" لالی کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ "اس کا خون کر کے تو نے ٹھیک نہیں کیا۔"

"ان باتوں کو چھوڑ۔" رحیم داد نے اس دفعہ نظریں اٹھا کر لالی کی جانب دیکھا۔ "صاف صاف بتا۔ تو چاہتا کیا ہے؟"

"پہلے یہ بتا، تو نے جیپ دوڑا کر مجھے جان سے مار دینے کی کوشش کیوں کی تھی؟"

"صاف بات یہ ہے کہ مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ تو نے مجھے پہچان لیا۔" اس نے عذر پیش کیا۔ "مجھے تیری طرف سے زبردست خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اپنی جان بچانے کے لیے میں تجھے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے حکیم کا بھی اسی لیے خون کیا تھا کہ اس نے جیل کی وردی میں مجھے دیکھ لیا تھا۔"

"تیری گھر والی نوراں اور بال بچے کہاں ہیں؟"

"وہ اس دنیا میں اب نہیں رہے۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "نوراں کو بھی مجھ پر شبہ ہو گیا تھا۔"

"تو نے جان بچانے کے لیے اپنی بیوی بچوں کا بھی خون کر دیا۔" لالی نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "مجھے یہ پتہ نہ تھا تو اتنا ظالم اور بے رحم ہے۔"

"میں نے ان کا خون نہیں کیا۔" رحیم داد نے صفائی پیش کی۔ "اس نے تیل چھڑک کر خود ہی آگ لگائی اور بچوں کے ساتھ جل کر مر گئی۔"

لالی کچھ نہ بولا۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔

☆

کمرے میں ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے نم آلود جھونکے آ رہے تھے۔ باہر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ پختہ چھت پر بارش کے قطروں سے ہلکا ہلکا جل ترنگ بج رہا تھا۔ رات سنسان اور بھیگی ہوئی تھی۔

"تجھے اچھی طرح پتہ ہے میں شاداں سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ میں نے اس کے سوا دنیا میں کسی بھی عورت سے اتنا پیار نہیں کیا۔" لالی نے خاموشی کو توڑا اور افسردہ لہجے میں رک رک کر بولنے

لگا۔ "یہ جانتے ہوئے بھی تو نے اس سے ویاہ کر لیا۔ اسے مجھ سے چھین لیا۔ مجھے مار ڈالنے کی کوشش کی۔" اس کی باتوں سے اچانک تلخی جھلکنے لگی۔ "اب مجھ سے پوچھتا ہے میں کیا چاہتا ہوں؟"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو مجھ سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔" رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"ہاں، میں تجھ سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔" لالی نے بڑے جوش سے کہا اور کھلا ہوا چاقو نکال کر سامنے کر دیا۔

رحیم داد نہ خوف زدہ ہوا نہ پریشان۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ "تو نے مجھے کتل کر دیا تو یہ بھی جان لے، تو بھی میری طرح اپنی جان بچانے کے لیے ایک کے بعد دوسرا کتل کرتا جائے گا۔ اور پھانسی کا پھندا ہر گھڑی تیرے سر پر خطرہ بن کر لٹکتا رہے گا۔" وہ نہایت اطمینان سے بول رہا تھا۔ "تو موت سے جتنا دور بھاگے گا وہ اتنا ہی تیرے نزدیک آتی جائے گی۔ ہر دم اس کے ڈر سے سہما ہوا رہے گا۔"

لالی نے چونک کر رحیم داد کو دیکھا اور اس کی دانش مندی اور سوجھ بوجھ سے دنگ رہ گیا۔ نئے ماحول اور نئے حالات نے اسے اس قدر تبدیل کر دیا ہے، لالی نے سوچا بھی نہ تھا۔ اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے نفرت اور کدورت کے چراغ بجھ گئے۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔

لالی کو خاموش پا کر رحیم داد نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ "میں نے اپنے تجربے سے جو کچھ سیکھا، تجھے بتا دیا۔ آگے تیری مرضی۔" رحیم داد نے اسے مزید متاثر کرنے کی کوشش کی۔ "میں نے غلط اندازہ تو نہیں لگایا۔ تو مجھے کتل کرنے ہی کے ارادے سے آیا تھا نا؟"

"نہیں، میں نے تجھے کتل نہیں کرنا۔ میں نے آج تک کسی کا خون نہیں کیا۔" لالی نے پسپائی اختیار نہ کی۔ "پر میں نے تجھ سے بدلہ لینا ہے۔ اور ضرور لینا ہے۔"

رحیم داد جو اب تک نہایت مطمئن نظر آ رہا تھا، لالی کی بات سن کر بہت سٹپٹایا۔ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "تو کیا کرے گا؟"

"تو نے جس چوہدری نور الٰہی کے کلیم کے ذریعے اتنی وڈی متروکہ اراضی الاٹ کرا رکھی ہی اس کا پتر ارشاد الٰہی زندہ ہے۔" لالی نے چبھتی ہوئی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "اور میں اسے جانتا ہوں۔"

"تو اسے کیسے جانتا ہے؟" رحیم داد کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے پھیل گئے۔

"جن دنوں میں ملک نثار کے بھٹے پر پتھیرا لگا ہوا تھا، وہ بھی میرے ساتھ کام کرتا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی جھگی میں اکٹھے رہتے تھے۔ وہ اپنے پیو کے بارے میں مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔" لالی بے باکی سے مسکرانے لگا۔ "تو صاف صاف سننا چاہتا ہے تو وہ بھی سن لے۔ میں ارشاد الٰہی کی جانب سے تیرے خلاف تھانے میں پرچہ چاک کرواؤں گا۔ کتل اور جعل سازی کے الزام میں تجھے گرفتار کروا کر مکدمہ چلواؤں گا۔ آگے جو کچھ ہونا ہے، اس کے بارے میں تو خود اندازہ لگا سکتا ہے۔"

لالی اس کا فوری رد عمل معلوم کرنا چاہتا تھا، مگر رحیم داد بالکل خاموش رہا۔ چند لمحے بعد اس نے لالی سے ایک بالکل مختلف سوال کیا۔ "یہ بتا، تجھے شاداں سے بہت محبت ہے؟"

"ہاں!" لالی نے تعجب سے رحیم داد کو دیکھا۔ "پر تو مجھ سے یہ بات کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"میں تجھے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر تو نے مجھے گرفتار کروایا تو یہ بھی سمجھ لے تیری شاداں بھی نہیں بچے گی۔" رحیم داد گردن اٹھائے نہایت سنبھلے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔ اس کے انداز میں زمین دارانہ طنطنہ تھا۔

لالی نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ "اس نے کیا کیا؟"

"میں نے سیف اللہ اور حکیم چشتی کا خون کیا ہے تو شاداں نے بالے کا۔" رحیم داد نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "تو اس راز کو پوری طرح جانتا ہے۔ تو جہانگیرہ کے اس مکان کی کوٹھڑی کو بھی جانتا ہے جس میں تو نے بالے کی لاش دبائی تھی۔" اس نے براہ راست دھمکی دی۔ "تو نے لاش ٹھکانے لگانے میں شاداں کی مدد کی تھی۔ اس کو اعانت جرم کہا جاتا ہے۔" رحیم داد نے اپنی قانونی سوجھ بوجھ سے لالی کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ "اس الزام میں شاداں کے ساتھ تو بھی گرفتار ہو گا۔ تیرے خلاف بھی مکدمہ چلے گا۔ آگے جو کچھ ہو گا، وہ تجھے سوچنا ہے۔"

تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ لالی بہت چکرایا۔ اس نے صورت احوال کے اس پہلو کے بارے میں بالکل نہیں سوچا تھا۔ بالا کے قتل کی واردات کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

رحیم داد نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ "میں نے تو اپنے بارے میں سوچ لیا۔ یہ بتا تو نے شاداں اور اپنے بارے میں کیا سوچا؟"

"میرے خلاف تو ہر کارروائی کر سکتا ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی گل بات نہیں۔" لالی نے رحیم داد کو خبردار کیا۔ "پر شاداں تو تیری گھر والی ہے۔ تو اسے پیار بھی کرتا ہے۔ پیار نہ کرتا تو اسے سے ویاہ کیوں کرتا۔"

"مجھے شاداں سے کوئی پیار شیار نہیں۔" رحیم داد نے نہایت حقارت سے کہا۔ "میں نے اسے

نہیں بلایا تھا۔ وہ خود ہی میرے پاس آئی تھی اور منتیں کر کے میری حویلی میں نوکرانی لگ گئی تھی۔"

"اگر ایسی ہی گل بات ہے تب تو نے اس سے ویاہ کیوں کیا؟"

"وہ تو میری ایک ضرورت تھی۔" رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "مجھے جلد سے جلد ویاہ کرنا تھا اور اس لیے کرنا تھا کہ زرعی اصلاحات کے تحت حکومت میری سیکڑوں ایکڑ اراضی ضبط کر لیتی۔ اسے بچانے کے لیے مجھے ایک گھر والی چاہیے تھی جس کے نام عارضی طور پر میں اپنی کچھ اراضی علیحدہ کر سکتا تھا۔ گوشواروں کی خانہ پری کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔" رحیم داد بے باکی سے مسکرانے لگا۔ "مجھے شاداں ہی ایسی زنانی نظر آئی جسے میں فوری طور پر اپنی گھر والی بنا سکتا تھا۔ سچ پوچھ تو ان دنوں وہ مجھے بہت سوہنی بھی لگ رہی تھی۔"

"پر اب تو وہ تیری گھر والی ہے۔ تجھے اس کے بارے میں اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔" لالی نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

"کیوں نہیں سوچنا چاہیے؟" رحیم داد یکایک بھڑک اٹھا۔ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "تجھے پتہ ہے‘ میں وڈا زمیں دار ہوں‘ عزت دار ہوں۔ شاداں ایسی کی زنانی کو جو میری ہی حویلی میں نوکرانی رہ چکی ہو‘ کب تک اپنی گھر والی بنا کر رکھ سکتا ہوں؟ مجھے آگے کے بارے میں بھی سوچنا ہے۔ مجھے اپنی نسل خراب نہیں کرنی۔"

"تو کیا تو اسے چھوڑ دینا چاہتا ہے؟"

"بالکل چھوڑ دوں گا۔ بلکہ اب تک اسے چھوڑ بھی چکا ہوتا۔ پر مسجد کے ملاں نے روک دیا۔ کہنے لگا جب تک وہ حاملہ ہے طلاک نہیں ہو سکتی۔ شرع اس کی اجازت نہیں دیتی۔" رحیم داد نے اپنے ارادے سے کھل کر لالی کو آگاہ کیا۔ "میں تو یہ مہینہ ختم ہوتے ہی دوسرا ویاہ کرنے والا ہوں۔ احسان شاہ کی ایک بیوہ بھین کی بیٹی سلیمہ کے ساتھ رشتہ بھی طے ہو چکا ہے۔"

"یہ احسان شاہ کون ہے؟" لالی نے کرید کر پوچھا۔

"میرا بہت گہرا یار ہے۔ ادھر کا وڈا اور خاندانی زمین دار ہے۔" رحیم داد نے نہایت فخر سے بتایا۔ "تو اسے نہیں جانتا۔ شاداں جانتی ہے۔"

"شاداں کو یہ بھی پتہ ہے کہ تو دوسرا ویاہ کرنے والا ہے اور اسے طلاک دینا چاہتا ہے؟"

"میں نے ابھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے پتہ چل گیا ہے۔" رحیم داد نے کہا۔ "لگتا ہے ‘نادر خان کی گھر والی‘ جنت نے اسے ضرور کچھ نہ کچھ بتا دیا ہے۔ تب ہی پچھلے کئی روز سے وہ روٹھی روٹھی نظر آتی ہے۔ رات بھی نیچے ہی کے کمرے میں رہی۔ یہاں

ہی آتی ہے۔ آج سویرے اس نے مجھ سے بات بھی کرنی چاہی۔ میرا خیال ہے وہ اسی سلسلے میں مجھ سے پوچھنا چاہتی تھی‘ پر میں نے اسے ٹال دیا۔"

"تو نے یہ بھی سوچا طلاک ہونے کے بعد وہ اپنے بچے کے ساتھ کہاں جائے گی؟" لالی نے شاداں کے لیے شدت کے ساتھ جذبہ ہمدردی محسوس کیا۔ اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ "اس کا تو کوئی بھی نہیں۔ وہ کس کے پاس جائے گی۔ کیا کرے گی؟ کیسے گزر بسر کرے گی؟"

"پہلے بھی تو کسی نہ کسی طرح گزر بسر کرتی تھی۔ آگے بھی کر لے گی۔" رحیم داد نے منہ بگاڑ کر حقارت سے کہا۔ "میں نے کوئی اس کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔"

لالی اس کے زمیں دارانہ طنطنے پر پہلے ہی بھنایا ہوا تھا۔ برابر ضبط سے کام لے رہا تھا۔ دل ہی دل میں سلگ رہا تھا۔ رحیم داد کی کھلی خود غرضی کے اس مظاہرے پر وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔ دانت پیس کر بولا۔ "بکواس نہ کر۔" وہ تیزی سے جھپٹا اور رحیم داد کے سر پر پہنچ گیا۔ کھلا ہوا چاقو سامنے کر کے غصے سے لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگا۔ "یہ پورا گردن میں اتار دوں گا۔ آواز بھی نہ نکل سکے گی۔" اس نے چاقو کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔ "تجھے اپنی عزت اور نسل کے خراب ہونے کا ایسا ہی خیال تھا تو اس سے ویاہ کیوں کیا؟"

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ لالی بڑبڑاتا رہا۔ "تیری تو عزت ہے‘ اس کی کوئی عزت نہیں۔" لالی نے جھنجلا کر رحیم داد کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ لالی نے اچھل کر اس کی کمر پر لات ماری۔ لات ایسی کراری لگی کہ رحیم داد لڑکھڑا کر پلنگ سے نیچے گر گیا۔ لالی غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ جھٹ اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ رحیم داد اس قدر بد حواس ہو گیا کہ منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ لالی کی آواز ابھرتی رہی۔ "خونی‘ دھوکے باز۔" اس نے حقارت سے منہ بگاڑا۔ "کہتا ہے ‘میں وڈا زمیں دار ہوں‘ عزت دار ہوں۔ مجھے پتہ ہے تو کتنا عزت دار ہے۔ آخ تھو!" لالی نے غضب ناک ہو کر اس کے منہ پر تھوک دیا۔

"میری گل تو سن۔" رحیم داد گھگیانے لگا۔

"بہت سن لیں تیری گلاں۔" لالی نے اس کے رخسار پر تھپڑ مارا۔ چاقو لہرا کر بولا۔ "تیرے جیسے پاپی اور کمینے کو میں نے زندہ نہیں چھوڑنا۔"

"مجھے پہلے ہی پتہ تھا تو مجھے قتل کرنے کے ارادے سے آیا ہے۔" رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ "پر اس کا انجام بھی سوچ لے۔" اس نے لالی کو دبی زبان سے دھمکی دی۔ "اس کے بارے میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں۔"

"مجھے پتہ ہے' سب پتہ ہے۔" لالی کے غصے کا جھاگ اب آہستہ آہستہ بیٹھنے لگا تھا۔ رحیم داد نے بھی اسے بھانپ لیا۔ لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے اس نے لالی سے کہا۔ "مجھے جان سے مار کر تجھے کیا ملے گا؟"

لالی خاموش رہا۔ رحیم داد نے عاجزی سے کہا۔ "پہلے میری ایک گل سن لے۔ بعد میں جو تیرا جی کرے کرنا۔"

لالی بدستور خاموش رہا۔ مگر رحیم داد کے سینے پر سے اتر کر علیحدہ ہو گیا۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے گڑگڑا کر کہا۔ "تو اجازت دے تو منجی پر بیٹھ جاؤں۔"

"بیٹھ جا۔" لالی نے منہ بگاڑ کر حقارت سے کہا۔

رحیم داد اٹھا اور ایک بار پھر پلنگ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس کا سارا طنطنہ اور طمطراق کافور ہو گیا تھا۔ منہ لٹکا ہوا تھا۔ آنکھوں میں خوف کے سائے منڈلا رہے تھے۔

☆

بارش اب رک گئی تھی مگر ہوا تیز تھی اور درختوں میں سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ رات کالی اور سنسان تھی۔ کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ لیمپ کی لو ہوا کے جھونکوں سے ہولے ہولے ڈگمگا رہی تھی۔ اس کی گھٹتی بڑھتی روشنی میں دیواروں پر پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔

رحیم داد نے سر اٹھایا۔ لالی کی طرف دیکھا۔ نرم لہجے میں بولا۔ "ایک تجویز سمجھ آئی ہے۔ یہ اس کے لیے مجھے تیری مدد چاہیے ہو گی۔"

"کیا تجویز ہے؟" لالی نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"تو شاداں سے پیار کرتا ہے نا۔" رحیم داد نے لالی کے چہرے پر سے نظریں ہٹا لیں۔ "ایسا کر' اسے اپنے ساتھ لے جا۔ اس میں ہم تینوں ہی کا بھلا ہے۔" رحیم داد نے کھل کر بات کی۔ "نہ تجھے مجھ سے بدلہ لینے کے لیے ارشاد الٰہی کی مدد کے بارے میں سوچے گا اور نہ مجھے شاداں اور تجھے گرفتار کرانے کے لیے پولیس کو بالے کے قتل کا راز بتانے کی ضرورت پڑے گی۔" اس۔ مسکرانے کی کوشش کی۔ "تجھے تیری شاداں مل جائے گی۔"

"تو اپنی چار سو بیسی سے باز نہیں آئے گا۔" لالی نے جل کر اسے گالی دی۔ "میں تیرا مطل ٹھیک طرح سمجھ گیا۔" اس نے نفرت سے رحیم داد کو دیکھا۔ "ایسا کر کے شاداں سے تیرا پنڈ چھوٹ جائے گا۔ شان سے نیا ویاہ کرے گا۔ وڈا زمیں دار بن کر عیش کرے گا۔" اس کا لہجہ بدل گیا۔ "یہی چاہتا ہے نا؟ رحیمے تو بہت کتی چیز ہے۔"

"پہلے میری پوری گل تو سن لے۔" رحیم داد نے گالیاں سن کر بھی کسی برہمی کا اظہار نہ کیا۔ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرے پاس تیرے چار ہزار روپے ہیں۔ وہی جو تو نے ہمیانی میں رکھ کر مجھے نہرباری دو آب کے ٹبوں پر دیے تھے۔ یاد ہے نا؟"

"کیوں نہیں یاد؟ بالکل یاد ہے۔" لالی نے گردن ہلا کر کہا۔ "یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے۔"

"میں صرف چار ہزار نہیں' تجھے دس ہزار روپے دوں گا۔" رحیم داد نے کھل کر اپنی تجویز لالی کے سامنے رکھی۔ "اتنے روپے سے تو کوئی بھی دھندا شروع کر سکتا ہے۔ شاداں کے ساتھ آرام سے رہ سکتا ہے۔"

تجویز معقول تھی اور دل کو بھی لگتی تھی۔ مگر لالی بھی کم کائیاں اور گھاگ نہ تھا۔ جیل میں ہر طرح کے جرائم پیشہ افراد کے ساتھ عرصہ دراز تک رہ چکا تھا۔ ان میں چور اچکے' سٹے باز' جعل ساز' بلیک میلر' سب ہی شامل تھے۔ نہایت فخر سے اپنے کارنامے سناتے تھے۔ طرح طرح کے گر اور ہتھکنڈوں سے آگاہ کرتے تھے۔ اس وقت لالی کا پلا بھاری تھا۔ رحیم داد دبا ہوا تھا۔ لالی نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر سودے بازی کرنا چاہی۔ کہنے لگا۔ "دس ہزار تو بہت کم ہوئے' ۵۰ ہزار تو دے۔" لالی کا غصہ رفع ہو چکا تھا۔ لہجے میں سنجیدگی پیدا ہو چکی تھی۔

"تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔" رحیم داد نے بھنا کر اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔

"دماغ میرا خراب ہو گیا یا تیرا۔" لالی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "تو اتنا وڈا زمیں دار ہے۔ تیرے پاس سیکڑوں کلا زمین ہے۔ رہنے کو شاندار حویلی ہے۔ سواری کو جیپ ہے۔ کام کرنے کو نوکر چاکر ہیں۔ کیا نہیں ہے تیرے پاس؟ عیش کر رہا ہے۔"

"تو اپنی گل کر۔" رحیم داد نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ اس دفعہ اس کا رویہ نرم تھا۔ "لالچ مت کر۔ بعد میں پچھتائے گا۔" اس نے لالی کو نظر بھر کر دیکھا۔ "سوچ لے۔"

"سوچ لیا' سوچ لیا۔" لالی ذرا مرعوب نہ ہوا۔ "سوچنا تو تجھے ہے۔" اس نے پینترا بدلا' رحیم داد کو دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی۔ "میں نے تو صرف لاش ٹھکانے لگائی تھی۔ اور لاش ٹھکانے لگانے یا دبانے کی سزا پھانسی نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ چار پانچ سال کی سزا ہو گی۔ پہلے بھی کاٹ چکا ہوں' ایک بار اور کاٹ لوں گا۔" اس نے رحیم داد کو کھل کر خطرے سے خبردار کیا۔ "تو نے تو ایک سے زیادہ قتل کیے ہیں۔ اور قتل کی سزا پھانسی ہی ہوتی ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"تو نے نہیں' پر شاداں نے تو بالے کا قتل کیا ہے۔" رحیم داد نے بھی لالی کی کمزوری سے فائدہ

اٹھانے کی کوشش کی۔

"تو مجھ سے زیادہ کنون جانتا ہے؟" لالی کا لہجہ بدستور تیکھا تھا۔ اس نے رحیم داد پر رعب جمانے کی کوشش کی۔ "تجھے پتہ ہے کہ زنانی کے لیے کتل کی سزا پھانسی نہیں ہوتی۔ میں ایک بار نہیں کئی بار جیل جا چکا ہوں۔ مجھے کنون کے بارے میں تجھ سے زیادہ پتہ ہے۔ میں نے تو کبھی کسی زنانی کو پھانسی پر لٹکتے نہ دیکھا نہ سنا۔" اس کے ہونٹوں پر زہرخند نمودار ہوا۔ "تو اپنی فکر کر۔ تو کتلِ عمد کے جرم میں دفعہ ۳۰۲ کے تحت پھانسی سے نہیں بچ سکتا۔"

"اس کا فیصلہ تو نے نہیں عدالت نے کرنا ہے۔" رحیم داد نے اپنے دفاع میں تاویل پیش کی۔ مگر لالی کی باتیں سن کر وہ دہل گیا تھا۔ اسے مطلق اندازہ نہ تھا کہ قانونی سوجھ بوجھ کے معاملے میں لالی اس سے کسی طور کم نہ تھا۔ لالی کی دھمکی کا اس پر خاطرخواہ اثر ہوا تھا۔ اس نے لالی سے الجھنے کی کوشش نہ کی۔ معاملہ فہمی سے کام لیا۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔

"کڑوی اور جھگڑے کی گل بات کرنے سے نہ تجھے فائدہ ہوگا نہ مجھے اور نہ ہی شاداں کو۔ ایسی بات کر جس میں تینوں کا بھلا ہو۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" لالی نے بھی مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ سیدھی سیدھی معاملے کی بات کی۔ "تو نے چوہدری نور الٰہی کے کلیم کے ذریعے لاکھوں روپے کی متروکہ جائیداد الاٹ کرالی۔ تو اس میں سے مجھے ۵۰ ہزار بھی نہیں دے سکتا۔"

"تجھے پتہ نہیں۔ یہ جائیداد میں نے صرف اپنی کوشش سے الاٹ کرائی ہے۔ چوہدری نور الٰہی تو برسوں بھاگ دوڑ کرنے اور سرکاری دفتروں کے دن رات چکر کاٹنے کے بعد بھی ساڑھے باراں کلا گزارہ اراضی بھی الاٹ نہ کرا سکا۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "وہ تو بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ تخت ہزارہ کے نزدیک ایک چک میں پڑا خون تھوکتا تھا۔ اسے ٹی بی ہو گئی تھی۔ بالکل اکیلا تھا۔ سسک سسک کر دم توڑ رہا تھا۔"

لالی خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے رحیم داد کو نہ روکا اور نہ ہی ٹوکا۔ وہ اس کی باتیں توجہ سے سن رہا۔

بات کہتے کہتے رحیم داد نے کاروباری پینترا بدلا۔ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ "لالی' میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولتا۔" اس نے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "سچی گل بات یہ ہے کہ میرے پاس اتنا روپیہ نہیں جتنا تو مانگ رہا ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "میں کوشش کر کے کسی کسی طرح ۲۵ ہزار روپے کا بندوبست کر سکتا ہوں۔" اس کا لہجہ نرم اور سرپرستانہ ہو گیا۔ "مے

نا مان۔ اتنا روپیہ لے لے۔ اس سے تو کوئی بھی اچھا کاروبار کر سکتا ہے۔ چوری ڈکیتی چھوڑ۔ ں میں ہردم جیل جانے کا خطرہ سر پر منڈلاتا رہتا ہے۔ تو کب تک جیل کاٹتا رہے گا۔ نیک بندہ بنے کی کوشش کر۔ میں تو تجھے ابھی تک اپنا یار بیلی سمجھتا ہوں۔" اس کا رویّہ ناصحانہ ہو گیا۔ اس ں اپنایت تھی۔ بے تکلفی تھی۔ "تو لہور میں نہ رہنا۔ پولیئے تجھے آرام سے رہنے نہیں دیں گے۔ ح طرح سے تنگ کرتے رہیں گے۔ پہلے تو یہی پوچھیں گے کہ کاروبار کرنے کے لیے تیرے پاس پیہ کہاں سے آیا۔ میری گل بات کا مطلب تو سمجھ رہا ہے ناں؟"

"بالکل سمجھ رہا ہوں۔" لالی نے اختلاف رائے نہ کیا۔ "تو اپنی بات پوری کر۔"

"میرا تو مشورہ یہ ہے کہ تو کراچی چلا جا۔ وہاں نہ تجھے پولیس کا ڈر ہوگا نہ جان پہچان والوں کا۔" رحیم داد نے لالی کو رسان سے سمجھایا۔ "کراچی بہت وڈا شہر ہے۔ وہاں تو آرام سے کوئی نہ کوئی اروبار شروع کر سکتا ہے۔" وہ کھل کر بے تکلفی سے مسکرایا۔ "شاداں کو اپنی ساتھ لے جا۔ بش کر۔ آرام سے زندگی بسر کر۔ جو کچھ تو نے اب تک کیا اسے بھول جا۔ آگے کی سوچ۔"

رحیم داد نے لالی کو شیشے میں اتارنے کے لیے ہر نفسیاتی حربہ اور ہر گر آزمایا۔ اس کا خاطرخواہ نجہ بھی برآمد ہوا۔ لالی اس کی تجویز پر پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے پر مجبور ہو گیا۔ رحیم داد نے اسے زندگی کے ایسے نشیب و فراز سمجھائے اور ایسی فضا پیدا کی جس کے حصار سے باہر نکلنا شکل تھا۔

لالی خاموش بیٹھا رہا اور گردن جھکائے سوچتا رہا۔

رحیم داد نے اسے خاموش پایا تو کسی قدر بے چین ہو کر پوچھا۔ "لالی تو کس سوچ میں پڑ گیا۔ بجھے میری تجویز منظور نہیں؟"

"سوچ رہا ہوں' میں نے تیری تجویز مان بھی لی' پر سوال یہ ہے کہ شاداں بھی اس کے لیے تیار ہوگی کہ نہیں؟" لالی نے کھل کر اپنے تذبذب کا اظہار کیا۔ "اس بارے میں پہلے اس سے بھی پوچھنا ہوگا۔ میں نے غلط تو نہیں سوچا؟"

لالی کی بات دل لگتی تھی۔ رحیم داد نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ لالی ی خاموش تھا۔

۵۲

لالی اور رحیم داد کمرے میں خاموش بیٹھے تھے۔

آخر کمرے کے گہرے سکوت میں لالی کی آواز ابھری۔ "رحیمے' تو نے میری بات کا جواب دیا۔"

رحیم داد نے نگاہیں اٹھا کر لالی کی جانب دیکھا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا' اچانک باہر قدموں کی آہٹ ابھری۔

لالی اور رحیم داد نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ چا رفتہ قریب آتی گئی۔

شاداں اندھیرے سے نکل کر سامنے آگئی۔ لالی کو کمرے میں دیکھ کر وہ دہلیز پر ٹھٹکی۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

رحیم داد نے اس کا استعجاب نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "شاداں' تو ابھی تا رہی تھی؟"

"مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔" شاداں بدستور دہلیز پر کھڑی رہی۔

"ادھر کیوں کھڑی ہے؟" رحیم داد نے اسے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ "ادھر آ کے

شاداں وہاں ٹھہرنا تو نہیں چاہتی تھی مگر لالی کو اتنی رات گئے رحیم داد کے کمرے م حیران و پریشان ہو گئی تھی اور یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھی کہ وہ رحیم داد کے اندھیری رات میں کیوں آیا ہے؟ کس لیے آیا ہے؟ وہ ان سوالات پر غور کرتی ہوئی آ

آگے بڑھی۔ مگر رحیم داد کے قریب بستر پر نہ بیٹھی۔ ایک کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گئی۔

کمرے میں سکوت تھا۔ شاداں زیادہ دیر اپنی بے چینی قابو میں نہ رکھ سکی۔ اس نے گردن موڑ کر لالی کی جانب دیکھا' استفسار کیا۔ "تو یہاں کیسے آیا؟" لالی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ گم صم بیٹھا رہا۔ اسے خاموش پا کر وہ رحیم داد کی طرف متوجہ ہوئی۔ "چوہدری' تو نے اسے بلایا ہے؟" شاداں نے ہاتھ اٹھا کر لالی کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ کیوں آیا اور کیسے آیا؟ یہ میں تجھے بعد میں بتاؤں گا۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "پہلے یہ با تو اتنی رات گئے کیسے ادھر آ گئی؟"

"میرے یہاں آنے کی مناہی ہے؟" شاداں نے تند لہجے میں پوچھا۔ "جب چاہوں' جس وقت چاہوں آ سکتی ہوں۔ مجھے کون روک سکتا ہے؟"

"تجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ تو بالکل یہاں آ سکتی ہے۔ یہ تیرا اپنا گھر ہے۔" رحیم داد نے نرم لہجے میں اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "میں سمجھا تو نے کوئی خاص گل بات کرنی ہے۔"

"تو نے ٹھیک ہی سوچا۔" شاداں کا لہجہ مدھم پڑ گیا۔ "میں نے تجھ سے ایک خاص ہی گل کرنی تی۔ پر اب نہیں کروں گی' کل کر لوں گی۔"

"مجھے پتہ ہے تو کیا گل کرنا چاہتی ہے۔" رحیم داد نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "میں دوسرا ویاہ کر رہا ہوں۔ تو یہی معلوم کرنا چاہتی ہے نا؟" وہ بے نیازی سے مسکرایا۔ "اس بارے میں تجھے جنت نے بتایا ہو گا۔"

"میں اس کنجری سے بات نہیں کرتی۔" جنت کا نام سن کر شاداں پھٹ پڑی۔ جو بات وہ لالی کے سامنے کرنا نہ چاہتی تھی' جھنجلاہٹ میں بے ساختہ زبان پر آ گئی۔ "پر اس نے حویلی کی ساری ہی نوکرانیوں میں یہ بات پھیلا دی ہے۔ شام ہی کو کریماں نے بھی مجھے یہی بات کہی تھی۔ وہ جنت کے پاس سے اٹھ کر میرے پاس آئی تھی۔" اس نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "وہ کنجری ایسی گلاں کیوں کر رہی ہے؟ بتا وہ ایسا کیوں کہتی ہے۔؟"

"سچ بات سننا چاہتی ہے؟" رحیم داد نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں میں سچ ہی بات سننا چاہتی ہوں۔" اس کا لہجہ بدستور تند اور تیکھا تھا۔

"جنت نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہے۔" رحیم داد نے کھل کر بات کی۔ وہ اب ذہنی طور پر پکے ارادے سے شاداں کو آگاہ کرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

مگر شاداں ایسی بات رحیم داد کے منہ سے سننے کے لیے ذہنی طور پر بالکل آمادہ نہ تھی۔ حیرت

سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "تو سچ کہہ رہا ہے؟"

"ہاں!" رحیم داد نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ بات میں اب تجھ سے چھپانا نہیں چاہتا۔ شاداں غصے سے تڑپ کر بولی۔ "اگر تو نے ایسا کیا تو یہ بھی سن لے۔ میں نے اس کے سا نہیں رہنا۔ ہرگز نہیں رہنا۔"

"کیا کرے گی؟" رحیم داد نے اس کا ارادہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔

"کچھ ہی کروں گی' جو جی کرے گا کروں گی۔" وہ غصے اور جھنجلاہٹ کے عالم میں آگے کچھ نہ سکی۔ ویسے اسے خود بھی اندازہ نہ تھا کہ اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ وہ کس طرح اس کا اظہار کر گی۔ اس نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ اب تک اس نے جس بات کو افواہ سمجھا تھا اچانک حقیقت بن کر سامنے آگئی تھی۔

"میں چاہتا ہوں تو جو کچھ کرنا چاہتی ہے' اس کے بارے میں آرام سے گل بات ہو جائے رحیم داد نے نرم اور سلجھے ہوئے لہجے میں اظہار خیال کیا۔ "اگر تو یہاں نہیں رہنا چاہتی تو ا بھی سوچا جا سکتا ہے۔"

"کیا تو مجھے چھوڑ دینا چاہتا ہے؟" شاداں نے پریشان ہو کر اس کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔

"ارادہ تو میرا یہی ہے۔" اس نے مڑ کر لالی کی طرف دیکھا۔ "اس بارے میں لالی سے بات کر چکا ہوں۔"

"یہ میرا اور تیرا معاملہ ہے۔" اس نے منہ بگاڑ کر اپنی برہمی کا اظہار کیا۔ "یہ بیچ میں بول کون ہوتا ہے۔ اس نے کیا لینا؟"

لالی نے مداخلت کی۔ اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "رحیمے' میری گل سن۔" لالی نے بوجھ کر اسے رحیمے کہا۔ وہ شاداں کو ذہنی جھٹکا دینا چاہتا تھا۔ وہ جھٹکا لگا بھی۔ شاداں ہکا بکا ہو کا منہ تکنے لگی۔ چند لمحے وہ اسی عالم میں بیٹھی رہی' پھر اس نے پوچھا۔ "تو نے چوہدری کو کیوں کہا؟" اس کے لہجے میں تجسس اور بے چینی تھی۔

"میں اسے ہمیشہ رحیمے ہی کہتا ہوں۔" لالی نے گردن اٹھا کر پر اعتماد لہجے میں کھل کر کیا۔ "تجھے پتہ ہے یہ کون ہے؟" اس نے رحیم داد کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ چوہدری نورالٰہی میرا پرانا یار رحیم داد ہے۔"

شاداں نے یقین نہ آنے کے انداز میں رحیم داد سے دریافت کیا۔ "لالی سچ کہہ رہا ہے؟ داد ہی ہے؟" وہ سخت حیران و پریشان تھی۔

رحیم داد نے کوئی جواب نہ دیا۔ نظریں جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔

لالی نے شاداں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ "اس سے کیا پوچھ رہی ہے؟ مجھ سے بات کر۔" وہ رحیم داد کی زمیں دارانہ شان و شوکت کی بلند و بالا عمارت توڑ پھوڑ کر نہ صرف ملبے کا ڈھیر بنا دینا چاہتا تھا بلکہ شاداں کو اس کی پرکشش شخصیت کے حصار سے باہر بھی لانا چاہتا تھا۔ "اس نے سیف اللہ ہی کا خون نہیں کیا' حکیم چشتی کا بھی کتل کیا ہے۔ چوہدری نورالٰہی بن کر اس کے کلیم کے ذریعے جعل سازی سے اتنی وڈی متروکہ جائیداد بھی الاٹ کرائی ہے۔ وڈا زمیں دار بن گیا ہے۔"

رحیم داد کو اس کی باتیں سخت ناگوار گزریں۔ اس نے جھنجلا کر قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ لالی نے بھی اس کی برہمی محسوس کی۔ اس نے فوراً پینترا بدلا۔ شاداں کو ایک اور زوردار ذہنی جھٹکا دیا۔ "تو نے اسے اب تک نہیں پہچانا۔ جب تو نے بالے کا خون کیا تھا تو اس رات یہ بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے اور اس نے مل کر تیرے مکان کی کوٹھڑی میں کھدائی کی تھی۔ اور بالے کی لاش اس میں دبائی تھی۔ یاد ہیں نا تجھے وہ ساری باتیں؟"

رحیم داد کے چہرے پر چھایا ہوا غم و غصہ زائل ہو گیا۔ اب وہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔ مگر لالی نے اس دفعہ شاداں کو جو ذہنی جھٹکا دیا تھا وہ اس قدر لرزہ خیز تھا کہ وہ بدحواس ہو گئی۔ تڑپ کر بولی "ہائے ربا' ایہہ کیہہ ہو گیا؟ میں کیہہ کراں؟" وہ خود پر قابو نہ پا سکی۔ بے قرار ہو کر رونے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آمڈ کر رخساروں پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

لالی چاہتا بھی یہی تھا۔ شاداں اب ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی تھی۔ اس کی ساری تیزی طراری ختم ہو گئی تھی۔ لالی نے ڈپٹ کر کہا۔ "اس طرح ٹسوے بہانے سے کام نہیں چلے گا۔ بول' اب کیا کہتی ہے؟ تجھے ساری ہی باتوں کا ٹھیک طرح پتہ چل گیا۔ بتا اب تو نے آگے کیا کرنا ہے؟"

"سمجھ نہیں آتی' کیا کہوں؟" وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بے بسی سے بولی۔

"تجھے سمجھ نہیں آتی۔ پر میں نے اور لالی نے مل کر ایک تجویز سوچی ہے۔" اس دفعہ رحیم داد نے بات شروع کی۔ "تجویز یہ ہے کہ لالی تجھے اپنے ساتھ کراچی لے جائے گا۔"

"میں نے اس کے ساتھ نہیں جانا۔" شاداں ایک دم بھڑک اٹھی۔ "مجھے اس کے ساتھ ہی رہ' ہوتا تو تجھ سے ویاہ کیوں کرتی۔" اس نے کھا جانے والی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "یہ چوری ڈکیتی کرے گا۔ جیل جائے گا۔ میں نے ایسے خطرناک بندے کے ساتھ نہیں رہنا۔"

"میں اسے ۲۵ ہزار روپے دوں گا' جس سے یہ کراچی میں کوئی بھی ٹھیک ٹھاک دھندا شروع کر سکتا ہے۔" رحیم داد نے شاداں کو رضامند ہونے کے لیے اپنی تجویز کھل کر بیان کی۔ "اسے چوری

ڈکیتی کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ محنت سے اپنا کام دھندا کرے گا۔ تجھے آرام سے اپنی گھر والی بنا کر رکھے گا۔"

"میں نے تو اس سے وعدہ کرنے کے بعد چوری ڈکیتی بالکل چھوڑ دی تھی۔" لالی نے فوراً صفائی پیش کی۔ "میرے خلاف تو ملک نثار محمد نے چوری کا جھوٹا مکدمہ بنایا تھا۔ میں نے اس کے بھٹے سے فرار ہو کر پتھیروں پر ہونے والے ظلم کے خلاف تھانے میں پرچہ چاک کرایا تھا۔ اس لیے اس نے مجھ سے بدلہ لیا۔ پولیس کے ساتھ مل کر مجھے جیل بجھوا دیا۔" اس نے براہ راست شاداں کو مخاطب کیا۔ "شاداں، تجھے تو ٹھیک سے پتہ ہے بھٹوں میں پتھیروں پر کتنا ظلم ہوتا ہے۔ تو نے تو میرے ساتھ بھٹے پر کام بھی کیا ہے۔ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔"

شاداں نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ گردن جھکائے گم صم بیٹھی رہی۔

رحیم داد نے زور دے کر اس سے پوچھا۔ "بول، تو نے کیا سوچا۔ تجھ سے اب کچھ بھی چھپا نہیں۔ ساری باتیں تیرے سامنے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں، اس میں ہم تینوں ہی کا بھلا ہے۔" اس نے قائل کیا، پھر کھل کر اپنے ارادے سے شاداں کو آگاہ کیا۔ "ویسے میں تجھے صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ اب تو میرے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

"میں نے بھی تیرے ایسے خونی اور دھوکے باز کے ساتھ نہیں رہنا۔" شاداں نے جل کر کہا۔

لالی نے جھٹ مداخلت کی۔ "رحیمے، جب تک تو اسے طلاک نہیں دے گا یہ میرے ساتھ کیسے جا سکتی ہے؟"

"جب یہ اپنے پہلے کھسم کو چھوڑ کر بالے کے ساتھ جہانگیرہ میں رہتی تھی، تب اس نے کون سی طلاک لے رکھی تھی۔" رحیم داد نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔

"پرانی گلاں نہ نکال۔" شاداں نے بھنا کر رحیم داد کو ٹوکا۔ "میں نے اب ایسا نہیں کرنا۔"

"ویسے تو جب نکاح کی لکھا پڑھی نہ ہوئی تو طلاک کا کاغذ لکھنے سے کیا فائدہ؟" رحیم داد نے شاداں سے الجھنے کی کوشش نہ کی۔ معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "تو کہتی ہے تو میں کاغذ لکھ کر بھی دے دوں گا۔ ویسے میری طرف سے تجھے پوری اجازت ہے جہاں جی کرے رہے۔ میری رائے پوچھ تو میں یہی کہوں گا، تجھے لالی سے اچھا گھر والا نہیں ملے گا۔ یہ جتنا تجھے پیار کرتا ہے، کوئی نہیں کر سکتا۔" اس نے مڑ کر لالی پر نظر ڈالی۔ "میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

"یہ تو اسے بھی ٹھیک طرح پتہ ہے۔" لالی نے جذباتی ہو کر شاداں کی جانب دیکھا۔ گہری سانس بھری۔ آواز میں رقت پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "میں تو اسے اپنے ساتھ لے جانے کو تیار ہوں پر یہ بھی میرے ساتھ جانے کو تیار ہے کہ نہیں؟"

شاداں نے کچھ نہ کہا، نہ لالی کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔ گردن جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

"تو اس کی فکر نہ کر۔ مجھے پتہ ہے یہ تیرے ساتھ چلی جائے گی۔ اب تو آگے کی سوچ۔" رحیم داد نے اپنے طور پر بات ختم کر دی۔ لالی کی جانب متوجہ ہوا۔ "تو جا کر آرام سے مہمان خانے میں سو۔ ساری باتیں تو سمجھ لے طے ہی ہو گئیں۔ میں نے اب تجھے روپیہ دینا ہے۔ اس کا بھی کل ہی کوشش کر کے کسی نہ کسی طرح بندوبست کر دوں گا۔"

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گا۔ لالی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ رحیم داد نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ "میں تیرے ساتھ مہمان خانے میں چلوں گا۔ تجھے اس کے بارے میں کچھ اتا پتہ نہیں۔ میرا خیال ہے، وہاں نوکر بھی نہ ہو گا۔ اسے کل شام سے بخار ہے۔ سویرے کسی دوسرے نوکر کا بندوبست ہو جائے گا۔ تجھے کسی طرح کی تکلیف نہیں ہو گی۔"

وہ آگے بڑھا۔ لالی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ شاداں نے نگاہیں اٹھا کر دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ مگر نہ کچھ بولی اور نہ ہی اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس کا چہرہ مرجھا کر زرد پڑ گیا تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں میں ہر وقت جھلملاتے ہوئے چراغ بجھ گئے تھے۔ وہ شکستہ اور دل گرفتہ نظر آ رہی تھی۔

☆

آسمان پر گھرے بادل چھائے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ رحیم داد اور لالی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے زینے میں داخل ہوئے۔ سیڑھیوں سے اتر کر نیچے پہنچے۔ مہمان خانے میں جانے والا دروازہ ہوا سے پاٹوں پاٹ کھل گیا تھا۔ رحیم داد نے اسے نظر انداز کر دیا۔ لالی کے ہم راہ مہمان خانے میں چلا گیا۔

مہمان خانے میں کوئی نہ تھا۔ اندھیرا تھا۔ خاموشی تھی۔ رحیم داد نے برآمدے میں پہنچ کر ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ لالی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے جیب سے ٹارچ نکال کر روشن کی۔ سامنے پلنگ موجود تھا۔ اس پر اجلا بستر تھا۔ پلنگ کے سرہانے میز تھی۔ اس پر لیمپ رکھا تھا۔ قریب ہی ماچس بھی موجود تھی۔ رحیم داد نے ماچس اٹھا کر لیمپ روشن کر دیا۔ کمرے میں زرد زرد روشنی پھیل گئی۔

رحیم داد نے باغیچے میں کھلنے والی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے۔ ہوا کے بھیگے بھیگے جھونکے کمرے کے اندر آنے لگے۔ رحیم داد کمرے میں زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اس نے لالی کو مخاطب کیا۔

"اب تو بستر پر آرام سے سو۔ میں سویرے تیرے پاس آؤں گا۔" ایک بار پھر اس نے لالی کو یقین دلایا۔ "اطمینان رکھ۔ میں کل ہی روپے دے کر شاداں کو تیرے ساتھ رخصت کردوں گا۔ پر جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہی کرنا۔ سیدھا کراچی جانا۔"

"تو جیسا کہتا ہے ویسا ہی کروں گا۔" لالی نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے مختصر جواب دیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر آہستہ سے جماہی لی۔ وہ تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا۔ نیند سے آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

رحیم داد خاموشی سے بڑھا۔ کمرے سے باہر نکلا اور ہاتھ بڑھا کر دروازے کے دونوں پٹ بھیڑ دیئے۔ اس نے مہمان خانے کا صحن عبور کیا۔ حویلی میں داخل ہوا۔ زینے کی سیڑھیاں طے کرکے چھت پر پہنچا۔ دیکھا شاداں کمرے سے باہر نکل رہی ہے۔ اس نے قریب پہنچ کر ٹوکا۔

"شاداں' تو کہاں جا رہی ہے؟"

"میں نے اب یہاں رک کر کیا لینا ہے۔" شاداں نے منہ بگاڑ کر بے زاری کا اظہار کیا۔ "جو کچھ طے ہونا تھا وہ تو سب طے ہو گیا۔"

"ابھی کچھ طے نہیں ہوا۔" رحیم داد نے مسکرا کر ہولے ہولے شاداں کی پیٹھ تھپ تھپائی اور محبت سے اس کا بازو تھام لیا۔ "ابھی تو میں نے تجھ سے کئی ضروری باتیں کرنی ہیں۔ تجھے بتانا ہے میں نے آگے کیا کرنا ہے۔"

"میں نے پتہ ہے تجھے آگے کیا کرنا ہے۔" وہ ہنوز روٹھی ہوئی تھی۔

"تجھے کچھ پتہ نہیں۔" رحیم داد بے تکلفی سے مسکراتا رہا۔ "تجھے اصلی گل بات کا تو تب چلے جب میں تجھے بتاؤں گا۔" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "اندر چل۔ آرام سے گل بات ہوگی۔"

رحیم داد اس کا بازو تھامے ہوئے آگے بڑھا۔ شاداں اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ رحیم داد۔ شاداں کو کرسی پر بٹھایا اور دوسری کرسی کھسکا کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ شاداں بھونچکا ہو سوچ رہی تھی کہ رحیم داد کے رویے میں یہ اچانک تبدیلی کیسے پیدا ہو گئی؟ وہ تو جلد سے جلد ا سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتا تھا اور کچھ ہی دیر پہلے اس کا برملا اظہار بھی کر چکا تھا۔ شاداں نے۔ چینی سے پہلو بدلا۔ تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"صاف صاف بتا' تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ کیا کرنا چاہتا ہے؟"

"تو سمجھتی ہے میں تجھے چھوڑ دوں گا۔" اس نے شاداں کا ہاتھ محبت سے تھام لیا۔ "تو ا سوہنی ہے کہ میں جا نہیں سکتا۔ مجھ سے پیار بھی کرتی ہے۔ مجھے ہر طرح آرام پہنچاتی ہے۔ ا

سب سے بڑھ کر یہ کہ تو میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "تو خود ہی سوچ میں تجھے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ تو چلی گئی تو یہ حویلی ویران ہو جائے گی۔"

"سمجھ نہیں آتی تو کیسا بندہ ہے۔ کبھی کچھ کہتا ہے کبھی کچھ۔" شاداں نے تیوری چڑھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "بھول گیا' تھوڑی ہی دیر پہلے تو لالی کے سامنے کیا کہہ رہا تھا؟ تو نے اس کے ساتھ کیا طے کیا تھا؟"

"وہ تو میں لالی کو بہکانے کے لیے کہہ رہا تھا۔"

"کیوں؟" شاداں نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔

"نہ میں تجھے چھوڑنا چاہتا ہوں اور نہ لالی کو کچھ دینا چاہتا ہوں۔" رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "مان لے' میں نے اسے ۲۵ ہزار روپے دے دیئے تو وہ جا کر عیش کرے گا۔ جب روپے خرچ ہو جائیں گے تو بعد میں اور روپے لینے کے لئے مجھے بلیک میل کرتا رہے گا۔"

"وہ کس طرح کرے گا؟" شاداں اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکی۔

"وہ اس طرح کرے گا کہ اگر میں اسے روپے دینے سے انکار کردوں گا تو دھمکی دے گا کہ پولیس کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دے گا۔ مجھے اپنی جان بچانے کے لیے اس کی بات ماننی پڑے گی۔ وہ اسی طرح دھمکی دے کر مجھ سے بار بار روپیہ اینٹھتا رہے گا۔" رحیم داد نے لحہ بھر توقف کرنے کے بعد پوچھا۔ "تو خود ہی سوچ وہ ایسا کر سکتا ہے کہ نہیں؟"

"وہ ایسا کر تو سکتا ہے۔" شاداں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "پر وہ ایسا کرے گا نہیں۔"

"وہ بالکل ایسا ہی کرے گا۔ وہ پرانا جرائم پیشہ ہے۔ برسوں سے چوری ڈکیتی کر رہا ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔" رحیم داد نے شاداں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ "میں اسے جتنا جانتا ہوں تو نہیں جانتی۔ میں جیل میں مدت تک اس کے ساتھ رہ چکا ہوں۔ اسی کے بہکانے پر میں جیل سے فرار ہوا۔ اگر میں اس کے ساتھ فرار نہ ہوتا تو میں نے اب تک جو کچھ کیا کبھی نہ کرتا۔" اس نے دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ "تو سوچ نہیں سکتی اس نے میرے ساتھ کتنا ظلم کیا۔ مجھے برباد کر دیا۔ مجھے کہیں کا نہ رہنے دیا۔"

"اب تو کیا کرنا چاہتا ہے؟" شاداں نے دبی زبان سے دریافت کیا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔" رحیم داد کا لہجہ یکایک درشت ہو گیا۔ وہ تڑپ کر اٹھا۔ تیزی سے کمرے میں گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں رائفل دبی ہوئی تھی۔ شاداں ایسی حواس باختہ ہوئی کہ کچھ نہ کہہ سکی۔ رحیم داد نے منہ بگاڑ کر اپنی نفرت اور کدورت کا اظہار کیا۔ "میں ہمیشہ کے لیے لالی

کا کانٹا ہی ختم کر دینا چاہتا ہوں۔"

"تو کیا تو اسے قتل کر دے گا؟" شاداں سراسیمہ ہو کر کھڑی ہو گئی۔ "میں تجھے ایسا نہیں کرنے دوں گی۔"

"لگتا ہے تجھے لالی سے بہت پیار ہے۔"

"بکواس نہ کر۔" شاداں آنکھیں نکال کر تیکھے لہجے میں بولی۔ "مجھے تو تیری فکر ہے۔ یہ تو سوچ' اسے قتل کر کے تو پھانسی پہ نہیں لٹک جائے گا؟" اس نے قدرے توقف کیا۔ "پولیسیئے تفتیش کرنے آئیں گے تو ان سے کیا کہے گا؟"

"کہہ دوں گا ڈکیتی کرنے آیا تھا۔ مجھ پر بندوک تان کر کھڑا ہو گیا۔ اگر میں گولی نہ چلاتا تو مجھے جان سے مار دیتا۔ یہ بھی کہوں گا' وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دو ڈکیت اور بھی تھے۔ سب پوری طرح مسلح تھے۔ لالی زخمی ہو کر گرا تو اس کے دونوں ساتھی گھبرا کر اندھیرے میں فرار ہو گئے۔ وہ لالی کی بندوک بھی اٹھا کر لے گئے۔"

"تو جو کچھ کہے گا پولیسیئے اسے آسانی سے مان بھی لیں گے؟" شاداں قائل نہ ہوئی۔

"بالکل مان لیں گے۔ تھانیدار اپنے احسان علی شاہ کا یار ہے' مجھ سے بھی اس کی جان پہچان ہے۔ لالی کو ۲۵ ہزار دینے کی بجائے تھانیدار کو ۵ ہزار بھی دوں گا تو وہ معاملے کو بالکل دبا دے گا۔" رحیم دار ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ "لالی پرانا جرائم پیشہ ہے۔ چوری ڈکیتی کرنے کے جرم میں کئی بار جیل جا چکا ہے۔ پچھلے ہی دنوں چوری کرنے کے جرم میں جیل سے رہا ہو کر نکلا ہے۔ پچھلے ریکارڈ سے پولیس کو اس کے خلاف کیس تیار کرنے میں پوری پوری مدد ملے گی۔" رحیم داد کھل کر مسکرایا۔ "شاداں' تو بالکل فکر نہ کر۔ میں نے اس بارے میں پہلے ہی سے سب کچھ سوچ رکھا ہے۔"

"پر خطرہ تو ہے۔" شاداں نے ایک بار پھر اسے باز رکھنے کی کوشش کی۔ "میں کہتی ہوں تو لالی کی جان لے کر اپنی جان کیوں خطرے میں ڈالنا چاہتا ہے؟ کوئی ایسی تدبیر سوچ۔"

رحیم داد نے اسے اپنی بات بھی پوری نہ کرنے دی۔ جھنجلا کر بولا۔ "کان کھول کر سن لے شاداں۔" اس کا چہرہ خونخوار ہو گیا۔ آنکھوں سے خون ابلنے لگا۔ "جسے بھی اس راز کا پتہ چل جاتا ہے کہ میں چوہدری نور الٰہی نہیں رحیم داد ہوں میں اسے کبھی زندہ نہیں چھوڑتا۔" وہ رائفل کے میگزین میں کارتوس ڈالنے لگا۔

شاداں دم بخود رہ گئی۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ خوف زدہ ہو کر رحیم داد کے چہرے کو تکنے لگی۔ جو اس وقت بہت ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔

☆

لالی مہمان خانے میں گہری نیند سو رہا تھا۔

رات کے پچھلے پہر آہٹ سے لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اسے کمرے کے باہر چاپ سنائی دی جو رفتہ رفتہ دور ہوتی جا رہی تھی' پھر گہری خاموشی میں ڈوب گئی۔ لالی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ مگر کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ مگر نیند نہیں آئی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی نظر میز پر پڑی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا چاقو موجود نہ تھا۔ لالی نے اپنے اردگرد خطرہ منڈلاتا ہوا محسوس کیا۔ وہ آہستہ سے نیچے اترا۔ میز پر رکھی ہوئی اپنی ٹارچ اٹھائی۔ دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ اس نے گردن نکال کر باہر دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ واپس میز کے قریب گیا۔ پھونک مار کر لیمپ بجھایا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

مہمان خانہ بدستور ویران تھا۔ بارش رک گئی تھی۔ لیکن بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ لالی نے صحن میں نکل کر حویلی کی بالائی منزل کی سمت گردن اٹھا کر دیکھا۔ اسے کمرے میں روشنی جھلملاتی ہوئی نظر آئی۔ یکایک ایسا محسوس ہوا کہ بالائی منزل پر کوئی آہستہ آہستہ کراہ رہا ہے۔ مگر یہ کراہ جلد ہی خاموشی میں ڈوب گئی۔

لالی اس دروازے کی جانب لپکا جو حویلی میں کھلتا تھا۔ قریب پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ دروازہ اندر سے بند ہے۔ لالی اچھل کر دیوار پر چڑھ گیا اور ٹانگیں لٹکا کر حویلی میں اترا۔ حویلی بالکل سنسان تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ سب بے خبر سو رہے تھے۔ لالی زینے میں داخل ہوا اور چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ مگر اس میں خاموشی چھائی تھی۔ لالی زینے کے قریب اندھیرے میں دبکا ہوا دم بخود کھڑا رہا۔ جب کمرے میں کسی قسم کی آہٹ نہ ابھری تو وہ دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔ دروازے کی اوٹ سے اس نے اندر نظر ڈالی۔ لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں اسے شاداں کرسی پر بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ رحیم داد بستر پر لیٹا تھا۔ لالی نے پلٹ کر نگاہیں دوڑائیں۔ بارش سے بھیگی ہوئی چھت بالکل ویران تھی۔ گاؤں اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔

وہ آہستہ سے آگے بڑھا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔ اس کی پرچھائیں دیوار پر لہرائی۔ شاداں نے چونک کر لالی کی جانب دیکھا۔ وہ فوراً اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں تازہ تازہ خون سے لتھڑا ہوا چاقو دبا تھا۔ لالی نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا وہ اس کا چاقو تھا۔ لالی خوف زدہ نظروں سے

شاداں کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر وحشت طاری تھی۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔

شاداں نے خون خوار نظروں سے لالی کو دیکھا۔ تیز لہجے میں پوچھا۔ "تو یہاں کیوں آ گیا؟"

لالی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ "تو نے خون میں ڈوبا ہوا چاقو کیوں دبا رکھا ہے؟ کسی کا خون کیا ہے؟"

شاداں نے بستر کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "تو بھی دیکھ لے۔"

لالی نے دیکھا بستر کی چادر اور تکیے پر لال لال خون پھیلا تھا۔ رحیم داد بے جان لیٹا تھا۔ اس کا گلا کٹا ہوا تھا۔ گوشت کے لوتھڑوں سے ابھی تک خون رس رس کر ادھر ادھر بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ چہرہ نہایت خوف ناک نظر آ رہا تھا۔ وہ لالی کے پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔

لالی پریشان ہو کر شاداں کی جانب متوجہ ہوا۔ "یہ تو نے کیا کر دیا شاداں؟"

شاداں نے خون آلود چاقو اس کے سامنے کر دیا۔ "اسے دیکھ رہا ہے۔" اس نے غضب ناک ہو کر خبردار کیا۔ "چپ کر کے یہاں سے چلا جا۔ ورنہ تجھے بھی کاٹ کر اس کے برابر لٹا دوں گی۔" اس کا چہرہ ڈراؤنا ہو گیا۔ آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔ وہ ہانپنے کے انداز میں رک رک کر گہری سانس بھر رہی تھی۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ اس وقت وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ تھی۔

لالی کو وہ رات یاد آ گئی جب اس نے پہلی بار شاداں کو دیکھا تھا۔ اس وقت بھی اس کا چہرہ اتنا ہی ڈراؤنا تھا۔ اس رات اس نے بالا کا قتل کیا تھا اور لالی کو اسی طرح خونخوار نظروں سے گھور کر دھمکی دی تھی۔ وہ بالکل وہی شاداں تھی۔ ویسے ہی بکھرے ہوئے بال۔ وہی لال لال ڈراؤنی آنکھیں۔ وہی چہرے پر چھائی ہوئی وحشت و دیوانگی۔

لالی نے نرمی سے کہا۔ "تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

شاداں نے بپھر کر اسے ڈانٹا۔ "تو مجھ سے یہ کہنے والا کون ہوتا ہے؟" اس نے چاقو پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ "جا‘ ٹر جا یہاں سے۔" وہ چاقو اٹھا کر لالی پر جھپٹی۔ وار کیا۔ مگر لالی جھکائی دے کر صاف بچ گیا۔ لالی نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ شاداں نے اسے چھڑانے کی کوشش کی۔ لالی نے ہاتھ مروڑ کر چاقو چھین لیا۔

وہ خاموش کھڑی اسے قہر آلود نظروں سے گھورتی رہی۔ پھر بپھر کر اس پر جھپٹی۔ چاقو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لالی نے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ نرمی سے سمجھایا۔ "ہوش میں آ شاداں

پاگل تو نہیں ہو گئی؟" مگر وہ باز نہ آئی۔ اس نے لالی کے اس ہاتھ کو جھپٹ کر پکڑ لیا جس میں چاقو دبا تھا اور اس زور سے جھٹکا دیا کہ چاقو لالی کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے لپکی۔ لیکن لالی نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر رہ گئی۔ لالی نے اسے سنبھلنے اور سنبھل ر جھپٹنے کا موقع نہ دیا۔ اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا‘ دوسرا‘ پھر تیسرا۔ شاداں چکرا گئی۔ تیورا کر رش پر گری۔ چند لمحے بے حال پڑی ہانپتی رہی‘ پھر سسکیاں بھرنے لگی۔

لالی نے چاقو اٹھا کر اپنے قبضے میں کیا۔ کمرے کے ایک گوشے میں رکھی ہوئی صراحی کے قریب گیا۔ گلاس میں پانی انڈیلا۔ اسے ایک ہاتھ میں سنبھالے ہوئے واپس شاداں کے پاس پہنچا اور اس کے نزدیک ہی فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے پیار سے اس کا سر تھپکا۔ سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ خاموشی ے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لالی نے گلاس بڑھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ "تھوڑا سا پانی پی لے۔"

شاداں نے مزاحمت نہ کی۔ خاموشی سے پانی پینے لگی۔ وہ پورا گلاس چڑھا گئی۔ لالی نے بازو تھام کر اسے کھڑا کر دیا اور قریب رکھی ہوئی کرسی پر بٹھا دیا۔

شاداں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی وحشت کم ہو چکی تھی۔ وہ اب مضمحل اور نڈھال نظر آ رہی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں رحیم داد کا کٹا ہوا گلا اور اس کی پھٹی ھٹی بے نور آنکھیں دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ لالی سے یہ ہولناک منظر زیادہ دیر نہ دیکھا گیا۔ اس نے چادر ڈال کر اس کا خوف ناک چہرہ چھپا دیا۔ بارش ابھی تک تھمی ہوئی تھی۔ لیکن بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی۔ رات تاریک اور سنسان تھی۔

لالی بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے شاداں کی جانب دیکھا۔ اظہار تاسف کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "تو نے یہ ٹھیک نہیں کیا شاداں۔ سب کچھ طے ہو چکا تھا اور تیرے سامنے ہی طے ہوا تھا۔"

شاداں نے جواب نہ دیا۔ گم صم بیٹھی رہی۔ لالی نے زور دے کر کہا۔ "تو نے ایسا کیوں کیا؟ بولتی کیوں نہیں؟"

شاداں نے نظریں اٹھا کر لالی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ نکھوں سے وحشت برسنے لگی۔ نفرت سے منہ بگاڑ کر بولی۔ "تجھے پتہ ہے بالے نے میرے ساتھ ھوکا کیا تھا تو میں نے اس کا چھری سے گلا کاٹ ڈالا تھا۔ یہ تو بہت زیادہ گندا اور پاپی تھا۔" اس نے حیم داد کی لاش کی جانب حقارت سے دیکھا۔ "اس نے تو مجھ سے زبردست دھوکا کیا۔ اسے میں ے زندہ چھوڑ دیتی۔"

"مجھے بھی پتہ ہے‘ اس نے تیرے ساتھ دھوکا کیا۔" لالی نے نرم لہجے میں کہا۔ "لگتا ہے تجھے

بالے کی طرح اس سے بھی پیار ہو گیا تھا۔ یہی بات ہے نا؟"

"بالکل ایسی گل بات نہیں۔" شاداں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میں نے تو اس سے صرف اس لیے ویاہ کیا تھا کہ مجھ سے اب دکھ نہیں اٹھائے جاتے تھے۔ تو جیل میں تھا۔ میرا نہ کوئی گھر تھا نہ کوئی ٹھکانا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ایک بار اپنا گھر اجاڑ کر میں نے سوچا تھا دوبارہ گھر بساؤں گی۔ میرے بال بچے ہوں گے۔ گھر والا ہو گا۔ آرام سے زندگی گزاروں گی۔"

"پر تو میرے ساتھ بھی اسی طرح آرام سے زندگی گزار سکتی تھی۔ میں تو تیرے ساتھ تیرے بچے کو بھی ہمیشہ اپنا ہی سمجھتا۔ تجھے کیا پتہ میں تجھ سے کتنا پیار کرتا ہوں۔" لالی نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "میں غریب بندہ ہوں۔ تو مجھے کیوں پیار کرنے لگی؟ کیوں میرے ساتھ رہتی؟ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"سچ بات معلوم کرنا چاہتا ہے۔" شاداں نے کہا۔ "میں نے زندگی میں صرف بالے سے پیار کیا۔" اس نے نظر بھر کر لالی کو دیکھا۔ "میں نے تجھے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہتی ہوں' تو برا بندہ نہیں' بہت بھلا ہے' اور میرے لیے تو ہمیشہ ہی بھلا رہا ہے۔ مجھے پیار بھی کرتا ہے۔" وہ لحہ بھر خاموش رہی' پھر گویا ہوئی۔ "میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ میں تیرے ساتھ جانے کو بالکل تیار تھی۔"

"پر تو نے اس لیے ارادہ بدل دیا کہ میں تجھے اتنا آرام نہ دے سکوں گا جو تجھے یہاں مل رہا ہے۔ میں تجھے رہنے کے لیے ایسی شاندار حویلی اور زمین داری کی ٹوہر نہیں دے سکتا۔"

"ایسی گل بات نہیں۔"

"اور کیا گل بات ہے؟" لالی نے مداخلت کی۔ شاداں کی بات کاٹ کر بولا۔ "رحیم داد مجھے ہزار روپے دے رہا تھا۔ اتنے روپے سے تو بہت کچھ ہو سکتا تھا۔"

"تجھے کچھ پتہ نہیں۔" شاداں نے وضاحت کی۔ "وہ تجھے ایک پیسہ نہ دیتا۔"

"تیرے سامنے ہی تو اس نے وعدہ کیا تھا۔" لالی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ کتنا دھوکے باز تھا تجھے کچھ بھی پتہ نہیں۔" شاداں نے بتایا۔ "مہمان خانے میں پہنچانے کے بعد وہ واپس آیا اور مجھے بہکانے کی کوشش کی۔ کہنے لگا' نہ میں د ویاہ کر رہا ہوں نہ تجھے چھوڑنا چاہتا ہوں۔ میں تو لالی کا کانٹا ہی ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ میری جا لیے زبردست خطرہ بن گیا ہے۔"

لالی نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ "وہ مجھے کتل کرنا چاہتا تھا؟"

"ہاں!" شاداں نے دیوار پر کھونٹی سے لٹکی ہوئی رائفل کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہ اس نے تجھے جان سے مار دینے کے لیے بھر کر رکھی تھی۔ وہ سویرا ہونے سے پہلے ہی تجھے گولی مار کر ختم کر دینا چاہتا تھا۔"

"مجھے پتہ نہیں تھا' وہ اتنا وڈا دھوکے باز تھا۔" لالی ہنوز حیرت زدہ تھا۔

شاداں نے اسے رحیم داد کے خطرناک منصوبے سے پوری طرح آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔ "پر جب اس نے گھتّے سے آنکھیں نکال کر یہ کہا کہ جو کوئی یہ راز جان جاتا ہے' میں چوہدری نور الٰہی نہیں رحیم داد ہوں تو میں اسے کبھی زندہ نہیں چھوڑتا' یہ سن کر میں اتنی ڈر گئی کہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ میں نے سوچا اس کا یہ راز تو مجھے بھی معلوم ہو گیا ہے۔ وہ مجھے صاف صاف دھوکا دے رہا ہے۔ تجھے کتل کرنے کے بعد مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ پر میں نے اس بارے میں اس سے کچھ نہ کہا۔ اس کی باتیں سن کر چپ بیٹھی رہی۔"

"یہ تو نے بالکل ٹھیک کیا۔" لالی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "کچھ کہتی تو اسے تیرے بارے میں شبہ ہو جاتا۔"

"ہاں' اسے ذرا بھی شبہ نہ ہوا۔" شاداں نے لالی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "جب میں سونے کے لیے نیچے جانے لگی تو اس نے پیار محبت کی باتیں کیں۔ بار بار یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ مجھے چھوڑنا نہیں چاہتا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "نیچے آ کر میں بستر پر لیٹ گئی۔ پر مجھے نیند نہ آئی۔ دیر تک چپ کر کے لیٹی رہی' فیر اٹھ کر تیرے کمرے میں گئی۔ سوچا تجھے جگا کر سب کچھ بتا دوں پر بعد میں' میں نے ارادہ بدل دیا۔ مجھے ڈر لگا تو گھتّے میں کہیں اس کا خون نہ کر دے۔ مجھے پتہ ہے تیرا گھتہ بھی کم نہیں۔ میں نے میز پر رکھا ہوا تیرا چاکو اٹھا لیا اور چپ کر کے نکل گئی۔"

"تو میرا چاکو اٹھانے آئی تھی؟" لالی نے چونک کر شاداں کی طرف دیکھا۔ "میں تو فوراً جاگ گیا تھا۔ پر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ چپ کر کے لیٹا رہا۔"

"میں اپنے کمرے میں نہیں گئی۔ یہاں آ گئی۔ رحیم داد بے خبر سو رہا تھا۔ اسے میرے آنے کا ذرا پتہ نہ چلا۔ مجھے بندوک چلانی نہیں آتی۔ ورنہ میں اسے گولی مار کر ختم کر دیتی۔" شاداں نے لالی کو بتایا۔ "میں نے آہستہ سے چاکو کھولا اور رحیم داد کا گلا کاٹ دیا۔ وہ ذرا ہی دیر بعد ختم ہو گیا۔"

"میں نے اس کے ہائے ہائے کرنے کی آواز تو سنی تھی' تب ہی تو میں ادھر آیا۔"

"اس نے صرف تھوڑی سی ہائے ہائے کی اور وہ بھی زیادہ زور سے نہیں۔" شاداں بولی۔ "پر اس کی آواز تو نے بھی سن لی۔"

لالی نے کچھ نہ کہا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے شاداں سے کہا۔ "جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب آگے کی سوچ۔ سویرا ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ لاش بھی کھود کر کہیں دبائی نہیں جا سکتی۔ سب کو پتہ چل جائے گا۔"

"وہ تو چلنا ہی ہے۔" شاداں نے نہایت اطمینان سے کہا۔ "میں نے اس بارے میں پہلے ہی سوچ رکھا ہے۔"

"کیا سوچ رکھا ہے؟" لالی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"صاف صاف کہہ دوں گی' میں نے خون کیا ہے۔" شاداں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں نے اب زندہ نہیں رہنا۔ مجھے ایسی گندی زندگی نہیں چاہیے۔" اس نے بے زاری سے کہا۔ "اب تو جا' بیکار میں پکڑا جائے گا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔"

"ایسے تو نہیں چھوڑوں گا۔" لالی کے لہجے میں اچانک جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ "تو نے میری جان بچائی اور میں تجھے چھوڑ کر چلا جاؤں۔ تو مجھے اتنا کمینہ اور خود غرض سمجھتی ہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ اب میں جیسا کہتا ہوں' وہ کر۔"

"کیا کرنا چاہتا ہے تو؟" شاداں نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔

"تو نیچے جا کر اپنے یہ خون لگے کپڑے بدل لے۔ انھیں کہیں چھپا دینا۔ بعد میں جلا کر راکھ کر دینا تاکہ تجھ پر کوئی الزام نہ آئے۔"

"اور تو کیا کرے گا؟" شاداں نے دریافت کیا۔

"میں یہیں بیٹھا رہوں گا' پولیس کے آنے کا انتظار کروں گا۔" لالی نے نہایت سکون سے اپ منصوبہ بتایا۔ "پولیس سے صاف صاف کہہ دوں گا' میں نے خون کیا ہے۔"

"ایسا کرے گا تو پھانسی پر نہیں لٹک جائے گا؟"

"تیرے لیے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔" اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ "تو کتل کے الزام مد پکڑی جائے یہ میں نہیں دیکھ سکتا۔"

"اور میں چپ کر کے یہ دیکھتی رہوں کہ خون میں کروں اور تو پھانسی سے لٹک جائے۔"

"ہاں' تجھے ایسا ہی کرنا ہو گا۔" لالی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "مجھے پھانسی لگنے سے کسی کو د نہیں ہو گا۔ کچھ بھی نہ ہو گا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ "میرا تو کوئی نہیں' کوئی بھ نہیں۔" اس کی پلکوں سے آنسو ڈھلک کر رخساروں پر آ گئے۔ "مجھے یہ تو خوشی ہو گی تو آرام رہے گی۔ یہ حویلی' یہ ساری زمین داری تیری ہو گی۔" اس نے قمیص کے دامن سے آنسو پونچھ

"میری ایک خواہش ہے' اور وہ یہ کہ تیرا جو بچہ پیدا ہو' اس کا نام لالی رکھنا۔ اس سے تو ضرور پیار کرے گی۔ میں سمجھ لوں گا مجھے تیرا پیار مل گیا۔ تو ایسا ضرور کرنا۔"

شاداں نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ بت کی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

"کب تک تو اس طرح یہاں بیٹھی رہے گی؟" لالی نے پوچھا۔

"تو چاہتا کیا ہے؟" شاداں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"تو نے سنا نہیں' میں نے اب تک کیا بکواس کی؟" وہ جھنجلا کر بولا۔ "نیچے جا اور فٹافٹ کپڑے بدل۔"

"میں نے کہیں نہیں جانا۔" شاداں نے صاف انکار کر دیا۔

"تو نہیں جائے گی۔" لالی نے غضب ناک ہو کر کہا۔

"نہیں' میں نے کہیں نہیں جانا۔" شاداں اپنی ضد پر اڑی رہی۔ "چاقو مجھے دے اور تو یہاں سے جا۔"

"تجھے نہیں جانا یہاں سے؟" لالی تیکھی نظروں سے شاداں کو گھورتا ہوا اٹھا۔ قریب پہنچا۔ چاقو سامنے کر کے بولا۔ "اگر تو نے میری بات نہیں مانی تو میں اپنے ہاتھ سے تیرا گلا کاٹ دوں گا اور اپنا بھی کاٹ ڈالوں گا۔ تجھے پتہ ہے' میں جو کہتا ہوں اسے کر کے دکھا بھی دیتا ہوں۔"

شاداں نے لالی کو اس قدر غیظ و غضب کے عالم میں دیکھا تو سراسیمہ ہو گئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اسے تو پرے ہٹا۔" اس نے خون آلود چاقو کی جانب اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "لا' یہ مجھے دے۔ خون تیرے کپڑوں سے بھی لگ جائے گا۔"

"لگنے دے۔" لالی نے بے نیازی سے کہا۔

"پاگل نہ بن۔ اسے دے دے۔ میں اسے پانی سے دھو کر صاف کر دوں گی۔" شاداں نے اسے نرم لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی۔ "میں اپنی جان بچانے کے لیے تجھے پھانسی پر لٹکنے نہیں دوں گی۔ یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔" اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیا۔ "میں اپنے خون بھرے کپڑے بدل کر دوسرے پہن لوں گی۔ جیسا تو کہتا ہے ویسا ہی کروں گی۔ پر تو یہاں ٹھہرے گا نہیں۔ جھیتی نال چلا جانا۔"

"نہیں' میں نے کہیں نہیں جانا۔" لالی نے آہستہ آہستہ انکار میں گردن ہلائی۔

"تو نے میری بات نہیں مانی تو میں نے بھی کہیں نہیں جانا۔" وہ بھی اپنی ضد پر اڑ گئی۔ "چاہے تو میرا خون ہی کر دے۔ مجھے خوشی ہو گی کہ تیرے ہاتھوں ماری جاؤں۔"

"تو چاہتی کیا ہے؟" لالی نے زچ ہو کر پوچھا۔

"جو میں کہہ رہی ہوں وہ کر۔ لا اسے مجھے دے دے۔" شاداں کی نظریں لالی سے ملیں۔ لالی کو اس کی آنکھوں میں ستاروں کے کنول جھلملاتے دکھائی دیے۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت اور دل آویز تھیں۔ لالی اس کی شفاف آنکھوں کی جھیلوں میں ڈوب گیا' کھو گیا۔ شاداں نے ہاتھ بڑھایا اور چاقو لے لیا۔ لالی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

شاداں مڑی اور برابر والے کمرے کی سمت بڑھی۔

"ادھر کہاں چلی؟" لالی نے اسے ٹوکا۔

"میرے کپڑے لتے اسی کمرے میں رکھے ہیں۔" شاداں نے جواب دیا۔

"فٹافٹ واپس آنا۔ میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ تو بھی میرے ساتھ چلے گی۔" لالی نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ "رات ختم ہو رہی ہے۔ سویرا ہونے سے پہلے پہلے دونوں یہاں سے بہت دور نکل جائیں گے۔" لالی نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "سن رہی ہے ناں؟"

شاداں نے نہ کوئی جواب دیا نہ مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ آگے بڑھی' کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔ اس نے اندر سے دروازے کے پٹ بند کر دیے۔

بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ بوندا باندھی پھر شروع ہو گئی تھی۔ ہوا کے بپھرے ہوئے جھونکے کمرے کے اندر آتے۔ لیمپ کی لو بار بار بھڑکتی۔ دیواروں پر پرچھائیاں منڈلانے لگتیں۔ بستر پر رحیم داد کی لاش پڑی تھی۔ اس کے ڈراؤنے چہرے پر پڑی ہوئی چادر پر خون کے دھبے نمایاں ہو گئے تھے۔ لالی نے لاش کی جانب نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ چپ بیٹھا شاداں کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔

بھیگی بھیگی اندھیری رات دھیرے دھیرے اپنا آخری سفر طے کر رہی تھی۔ تیز ہوا درختوں کی شاخوں سے الجھتی ہوئی پھڑپھڑا رہی تھی۔ کئی منٹ گزر گئے' مگر شاداں کمرے سے باہر نہ نکلی۔ بستی کے کسی مکان سے پچھلی رات کے سناٹے میں مرغ کی بانگ ابھری اور ٹھہر ٹھہر کر ابھرتی رہی۔ رات ختم ہو رہی تھی۔ صبح کی آمد آمد تھی۔ لالی نے پریشان ہو کر مشرقی رخ کے اس کمرے کی سمت دیکھا جس میں شاداں کپڑے تبدیل کرنے گئی تھی۔ یکایک کمرے میں دھم سے کچھ گرا۔ آہٹ ہوئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

لالی بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا۔ سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے آواز دی۔ "شاداں' شاداں' تو اندھیرے میں کیا کر رہی ہے؟" کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے مزید انتظار نہ کیا۔ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے ایک بار پھر شاداں کو پکارا۔ لیکن اس دفعہ بھی کوئی جواب نہ ملا۔ کمرے میں گہرا سکوت تھا۔

لالی نے جیب سے ٹارچ نکال کر روشن کی۔ اس نے ادھر ادھر نظریں گھما پھرا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک دیوار کے پاس روشنی کے زرد زرد حلقے میں اسے شاداں نظر آئی۔ وہ فرش پر خون میں لت پت پڑی تھی۔ لالی وہاں مزید نہ ٹھہرا۔ باہر نکلا۔ لیمپ اٹھایا اور اسے سنبھالے ہوئے واپس کمرے میں پہنچا۔

شاداں دم توڑ رہی تھی۔ اس کی گردن میں چاقو پیوست تھا۔ شہ رگ کٹ گئی تھی۔ گلے کے گہرے زخم سے خون ابل ابل کر اس کے سینے پر' کپڑوں اور فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔

لالی نے شاداں کو اس جانکنی کے عالم میں دیکھا تو لرز کر رہ گیا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا۔ ہاتھ کپکپانے لگے۔ اس نے لیمپ قریب کے ایک ٹرنک پر رکھ دیا اور شاداں کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی حیران و پریشان نگاہوں سے شاداں کی گردن دیکھنے لگا جو دور تک کٹی ہوئی تھی۔ گوشت کے لوتھڑوں میں پھنسا ہوا چاقو گہرائی تک اتر گیا تھا۔ لالی نے تڑپ ہو کر کہا۔ "شاداں' یہ تو نے کیا کر لیا؟ میں نے تو سوچا تھا۔ دونوں رات کے اندھیرے میں چھپتے لکتے نکل جائیں گے۔ شادو کے پاس لائل پور جائیں گے۔ تو اس کے گھر میں چھپ کر بیٹھ جاتی۔ میرے بارے میں تو کسی کو پتہ نہیں میں کب آیا اور کب یہاں سے چلا گیا۔" لالی بے قراری کے عالم میں بولتا رہا۔ مگر شاداں نے کچھ بھی نہ کہا۔ اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ اس نے آنکھیں کھول کر لالی کو دیکھا اور دیکھتی رہی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ ان میں جھلملاتے ہوئے چراغ بجھ گئے۔ منکا ایک طرف ڈھلک گیا۔ شاداں ختم ہو گئی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ لالی اسے سفر آخرت پر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے سینے سے دھواں اٹھا۔ آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس نے دل گرفتہ ہو کر گہری سانس بھری۔ اب کچھ بھی نہ رہا تھا۔ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ شاداں اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ اس نے وہی کیا جو سوچا تھا' پہلے سے طے کر رکھا تھا۔

لالی نے جھک کر شاداں کے چہرے پر بکھرے ہوئے بال ہٹائے۔ اس کی اجلی اور روشن پیشانی کو چوما اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لیمپ اٹھایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس نے لیمپ اسی جگہ پر رکھ دیا جہاں سے اٹھایا تھا۔ مڑا' رحیم داد کی لاش پر ایک نظر ڈالی۔ آگے بڑھا۔ دروازے سے گزر کر چھت پر پہنچا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندھی ہو رہی تھی۔

زینے کی سیڑھیاں طے کر کے وہ نیچے پہنچا۔ حویلی پر ویرانی چھائی تھی۔ صدر دروازے پر بیٹھا ہوا چوکیدار زور سے کھنکارا۔ لالی نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ فوراً مہمان خانے کی جانب بڑھا۔ دروازے سے گزر کر اندر داخل ہوا۔ مہمان خانہ ہنوز سنسان تھا۔ اس نے باہر جانے والے دروازے کی کنڈی چڑھائی۔ اچھلا اور دیوار پر پہنچ گیا۔

جب وہ دیوار سے نیچے اترا تو عین اس وقت مہمان خانے کے برابر والے مکان میں کوئی زور زور سے کھانسنے لگا۔ ذرا ہی دیر بعد دروازہ کھلا۔ نادر خان باہر نکلا۔ وہ دس قدم سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ لالی جھٹ دیوار کے ساتھ اندھیرے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ نادر خان اس کی جانب بڑھا۔ مگر چند قدم چلنے کے بعد مڑا اور واپس گھر میں چلا گیا۔

بستی کے مکانوں میں اب بوڑھوں کے کھانسنے کھنکارنے' بچوں کے رونے اور مویشوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی ہلکی ہلکی آوازیں وقفے وقفے سے ابھر رہی تھیں۔ کالے کالے بادلوں کے مشرقی کناروں سے ہلکی ہلکی کافوری روشنی پھوٹ رہی تھی۔ رات کا چل چلاؤ تھا۔ صبح طلوع ہو رہی تھی۔

لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بارش تیز نہ تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ لالی نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ کیچڑ اور پانی سے بھرے ہوئے گڑھوں سے بچتا بچاتا آگے بڑھا۔ نہر کے پاس پہنچا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ مڑ کر کوٹلہ ہرکشن کے مکانوں کو دیکھا اور ان کے درمیان ابھری ہوئی دو منزلہ حویلی دیکھی جس کی بالائی منزل کے کمروں میں رحیم داد اور شاداں کی لاشیں پڑی تھیں۔ اس نے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ دن نکلنے سے پہلے پہلے وہ کوٹلہ ہرکشن سے بہت دور چلا جانا چاہتا تھا۔

پہر دن چڑھے وہ چک بیدی پہنچ گیا۔ بارش اب تھم چکی تھی۔ لاریوں کے اڈے پر چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ اس نے ڈرائیور ہوٹل میں جا کر گرم گرم پراٹھا کھایا۔ چائے پی۔ شب بیداری کا خمار کچھ کم ہوا۔ باہر نکلا تو نیلی ٹرانسپورٹ کی ایک بس شہر جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ وہ بس پر سوار ہو گیا۔ بس ذرا ہی دیر بعد روانہ ہو گئی۔ وہ لاہور جانا چاہتا تھا جہاں غنی چٹّا رہتا تھا۔ اس کا گھر ہی اب لالی کا واحد ٹھکانا تھا۔ پچھلے کئی مہینے سے وہ چٹّے کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔

لیکن شہر پہنچ کر لالی نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ لاہور جانے کے بجائے میلسی کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆

لالی میلسی پہنچا تو شام در و بام سے نیچے اتر رہی تھی۔ وہ سیدھا اینٹوں کے اس بھٹے پر گیا جہاں ارشاد الٰہی دوسرے پتھیروں کے ساتھ کام کرتا تھا۔ بھٹے کا جمعدار اکبر سانول تھا۔ لمبا تڑنگا' کالا بھجنگ۔ چہرے پر چیچک کے گہرے گہرے داغ۔ صورت شکل سے جتنا خوف ناک نظر آتا تھا مزاج کے اعتبار سے اتنا ہی درشت اور کڑوا بھی تھا۔ لالی اس سے ملا۔ ارشاد الٰہی کے بارے میں دریافت کیا۔

"جمعدار' پتھیرا ارشاد الٰہی ادھر ہی ہوتا ہے؟"

"تو شادا کے بارے میں پوچھ رہا ہے؟" جمعدار اکبر سانول نے تیوری پر بل ڈال کر بے رخی سے جواب دیا۔ "وہ ادھر ہی ہوتا ہے' پر تجھے اس سے کیا لینا؟"

"میں جی' شادا سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تو اسے نہیں مل سکتا۔" سانول نے بے زاری سے منہ بگاڑا۔ "اسے کوئی نہیں مل سکتا۔"

"میں اسے کیوں نہیں مل سکتا؟" لالی نے لہجے میں عاجزی پیدا کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"اس کی طبیعت گڑبڑ رہتی ہے۔ بخار آتا ہے۔ ہر دم کھانستا رہتا ہے۔" اس نے لالی کو بتایا۔ "اس سے کام دھندا بھی نہیں ہوتا۔ منتیں کر کے پیشگی لیتا رہتا ہے۔ اس کی پیشگی بہت زیادہ ہو گئی ہے۔" جمعدار نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "تجھے پتہ نہیں جس پتھیرے کی پیشگی بہت زیادہ ہو جاتی ہے وہ نہ بھٹے سے باہر جا سکتا ہے اور نہ کسی سے مل سکتا ہے۔ بھٹہ مالک رانا محمود نے اس پر سخت پابندی لگا رکھی ہے۔" وہ منہ ٹیڑھا کر کے بڑبڑانے لگا۔ "ایسی سختی نہ کریں تو پیشگی کیسے وصول ہو۔ پتھیرے تو سارے ہی ہڈ حرام اور نکمے ہوتے ہیں۔"

اکبر سانول کے سخت گیر رویے سے لالی کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اسے ارشاد الٰہی سے ملنے نہیں دے گا۔ اس کا ذاتی تجربہ تھا کہ جمعدار کی مرضی کے بغیر کوئی بھی کسی پتھیرے سے نہ مل سکتا ہے نہ بات کر سکتا ہے۔ اس نے جمعدار سے الجھنے کی کوشش نہ کی اور جس ارادے سے آیا تھا اس کا کھل کر اظہار کر دیا۔

"جمعدار' میں اس کی پیشگی ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو اس کی پیشگی ادا کرے گا؟" جمعدار نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت کا اظہار کیا۔ "تو اسکا ضامن بنے گا؟ جب تک اس کی پیشگی ادا نہ ہو گی بھٹے پر کام کرتا رہے گا؟"

"ہاں جی' جب تک شادا کی پیشگی ادا نہ ہو گی میں کام کرتا رہوں گا۔ میں پہلے بھی پتھیرا رہ چکا ہوں۔ مجھے پیشگی کے بارے میں اچھی طرح پتہ ہے کیسے ادا ہوتی ہے۔" لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "تو اسے چھٹی دے دے' میں اس کی جگہ کام کروں گا۔"

جمعدار نے لالی کو اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا۔ اس کا ایک بازو پکڑ کر گوشت انگلیوں سے

ٹٹولا۔ مسکرا کر بولا۔ ”دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک لگتا ہے۔ پتھیرا بھی رہ چکا ہے۔“ اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا۔ ”ٹھیک ہے، شادا کو چھٹی مل جائے گی۔ تجھے اس کی جگہ لگا دیا جائے گا۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”پر ایسا کرنے سے پہلے رانا محمود سے اجازت لینی ہو گی۔ وہ یہاں موجود بھی ہے۔ تو یہیں ٹھہر۔ میں اس سے تیرے بارے میں بات کرنے جا رہا ہوں۔“

جمعدار مڑا۔ آگے بڑھا اور اندھیرے میں اوجھل ہو گیا۔

لالی چپ چاپ کھڑا رہا۔

شام اب گہری ہو گئی تھی۔ مگر آسمان صاف تھا۔ ستارے جھلملا رہے تھے۔ پتھیروں اور بھٹے پر کام کرنے والے دوسرے مزدوروں کی جھونپڑیوں میں چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ چولہوں سے دھواں اٹھ کر فضا میں منڈلا رہا تھا۔

لالی کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جمعدار اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گیا۔ قریب پہنچ کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”میرے ساتھ آ۔“ وہ آگے بڑھا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

دونوں بھٹے کے مالک رانا محمود کے پاس پہنچے۔ وہ ادھیڑ تھا۔ سر کے بال کالے کم سفید زیادہ تھے۔ چہرے مہرے سے کاروباری اور گھاگ نظر آتا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ سامنے بھدی سی لکڑی کی میز تھی جس پر کھلا ہوا رجسٹر رکھا تھا۔ قریب ہی اس کا منشی بھی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔

رانا محمود آنکھوں پر چشمہ لگائے سامنے رکھے ہوئے رجسٹر کو لالٹین کی روشنی میں غور سے دیکھ رہا تھا۔ جمعدار اکبر سانول نے کھنکار کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ رانا محمود نے گردن اونچی کی اور مڑ کر جمعدار کو دیکھا۔ لالی اس کے پہلو میں مسکین سی صورت بنائے سکڑا سکڑایا کھڑا تھا۔

جمعدار نے لالی کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ ”یہ جی، شادا کا ضامن ہے۔ اس کی جگہ کام کرنا چاہتا ہے۔“

”سامنے آ۔“ بھٹے کے مالک نے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

لالی آگے بڑھا اور اس کے روبرو سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ رانا محمود نے آنکھوں پر لگا ہوا چشمہ اتارا اور لالی کو پرکھنے والی نظروں سے دیکھا۔ دریافت کیا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“ اس کے لہجے میں رعب اور دبدبہ تھا۔

”لالی۔“ لالی نے مختصر جواب دیا۔

”یہ جی، پتھیرا بھی رہ چکا ہے۔“ جمعدار نے لقمہ دیا۔

لالی گھبرا گیا کہ اب رانا محمود پوچھے گا، کتنے بھٹوں پر کام کیا؟ کتنے عرصے کام کیا اور چھوڑا کیوں؟ مگر اسے سخت حیرت ہوئی کہ رانا محمود نے نہ صرف یہ کہ ایسی کوئی پوچھ گچھ نہیں کی بلکہ اس سے مزید بات چیت ہی نہیں کی۔ وہ جمعدار اکبر سانول کی جانب متوجہ ہوا۔

”تجھے یہ ٹھیک ٹھاک لگتا ہے تو کام پر لگا دے۔ کام تو تجھے ہی اس سے لینا ہے۔“

”تو جی فیر شادا کو چھٹی دے دی جائے؟“ جمعدار نے پوچھا۔

”ہاں، اسے چھٹی دے دے۔“ رانا محمود نے جمعدار سے اتفاق رائے کیا۔ ”وہ اپنا علاج معالجہ کرا لے گا۔“ قدرے توقف کے بعد اس نے مڑ کر منشی کی جانب دیکھا۔ ”رحمت، ایسا کر۔ شادا کی پیشگی لالی کے نام ڈال دے۔ اور اسکا انگوٹھا لگوا لے۔“

منشی نے فوراً سرخ جلد کا دبیز رجسٹر نکالا۔ اسے کھولا۔ ورق الٹے۔ قلم اٹھایا۔ لالی سے دریافت کیا۔ ”تیرا پورا نام کیا ہے؟“

”لال دین ولد کرم دین۔“ لالی نے بغیر پوچھے اپنی ولدیت بھی بتا دی۔

”یہیں میلسی میں رہتا ہے؟“

”ہاں جی یہیں رہتا ہوں۔“ لالی نے جان بوجھ کر لاہور کا پتہ نہ بتایا جہاں وہ ان دنوں مقیم تھا۔

منشی سر جھکا کر لالٹین کی روشنی میں رجسٹر کے سادہ ورق پر لکھنے لگا۔ اس نے پیشگی کا اقرار نامہ تیار کیا۔ لالی کو قریب بلایا اور رجسٹر سامنے کر کے انگلی سے بتایا۔

”یہاں انگوٹھا لگا دے۔“

لالی نے روشنائی لگائی اور منشی رحمت کی ہدایت کے مطابق انگوٹھا لگا دیا۔ وہ عام طور پر انگوٹھا لگانے کے بجائے دستخط کرتا تھا۔ تھوڑا بہت لکھ پڑھ بھی لیتا تھا۔ لیکن بھٹہ مالک کے سامنے یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ بالکل جاہل اور ان پڑھ ہے۔

رانا محمود نے آنکھوں پر چشمہ لگایا اور ایک بار پھر توجہ سے سامنے رکھا ہوا رجسٹر دیکھنے لگا۔

جمعدار نے لالی کو اپنے ہم راہ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا۔ لالی اس کے عقب میں چلا۔

باہر آ کر جمعدار نے ایک کارندہ بلایا۔ لالی کو اس کے سپرد کیا اور یہ ہدایت کی۔ ”اسے شادا کے پاس لے جا۔“ وہ لالی کی جانب متوجہ ہوا۔ ”لالی، تو جا کر شادا سے گل بات کر۔ میں بھی تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچ جاؤں گا۔“ وہ مڑا اور بھٹہ مالک رانا محمود کے پاس واپس چلا گیا۔

☆

جھونپڑی میں چراغ روشن تھا۔ اس کی مدھم روشنی میں ارشاد الٰہی چارپائی پر لیٹا رک رک کر

کھانس رہا تھا۔ باہر رات کی تاریکی پھیلی تھی۔ آس پاس کی جھونپڑیوں اور جگیوں سے بولنے اور بات کرنے کی ملی جلی آوازیں آہستہ آہستہ ابھر رہی تھیں۔

لالی بھٹے کے کارندے کے ساتھ جھونپڑی میں داخل ہوا۔ کارندہ لالی کو جھونپڑی میں پہنچا کر خاموشی سے واپس چلا گیا۔

ارشاد الٰہی نے لالی کو دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ فوراً اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ خاموشی سے لالی کا چہرہ تکنے لگا۔ لالی نے مسکرا کر کہا۔ "شادے' تونے مجھے پہچانا نہیں۔ میں لالی ہوں۔"

"کیوں نہیں پہچانا۔" ارشاد الٰہی ہنوز حیرت زدہ تھا۔ اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ "پر تو یہاں آیا کیسے؟" لالی نے ارشاد الٰہی کو غور سے دیکھا۔ اس کا لاغر جسم اب ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ رنگت پیلی پڑ گئی تھی۔ آنکھیں اور اندر دھنس گئی تھیں۔ ان کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ حجامت بڑھی ہوئی تھی۔ لالی کو دھچکا لگا۔ اس نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "تونے اپنی حالت کیا بنالی ہے؟"

"بخار آتا ہے۔ کھانسی بھی آتی ہے۔"

"مجھے پتہ نہیں تھا تو اتنا بیمار ہے۔"

"کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔" ارشاد الٰہی نے لالی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

لالی نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔ "دوائی شوائی بھی لے رہا ہے؟"

"تو دوائی کی بات کر رہا ہے کھانے کو روٹی تو ملتی نہیں۔" ارشاد الٰہی بجھے ہوئے لہجے میں اپنی پریشان حالی بیان کرنے لگا۔ "پچھلے دنوں تو اتنا بیمار رہا کام بھی نہیں کر سکتا تھا۔ منجی پر پڑا رہتا تھا۔" بات کرتے کرتے وہ ہولے ہولے ہانپنے لگا۔ "پر اب طبیعت کچھ ٹھیک ہے۔ سوچتا ہوں کل صبح سے کام شروع کر دوں۔"

"پر تو کام کیسے کرے گا؟ کتنا تو بیمار ہے۔"

"کام نہیں کروں گا تو روٹی کہاں سے ملے گی؟ پیشگی کیسے ادا ہو گی؟"

"فکر نہ کر۔ اب تجھے پیشگی ادا نہیں کرنی پڑے گی۔" لالی نے مسکرا کر اسے اطمینان دلایا۔

"پیشگی کیوں نہیں ادا کرنی ہو گی؟" ارشاد الٰہی نے آنکھیں پھاڑ کر لالی کو دیکھا۔

"میں تیری پیشگی ادا کروں گا۔ تیری جگہ میں یہاں کام کروں گا۔ تجھے چھٹی مل گئی ہے۔" لالی نے اسے مطلع کیا۔ "میں پہلے جمعدار کے ساتھ بھٹہ مالک رانا محمود کے پاس گیا تھا۔ سب کچھ طے ہو گیا۔ میں نے پیشگی کی رسید پر انگوٹھا بھی لگا دیا۔"

"پر تونے ایسا کیوں کیا؟"

"میں تو بہت پہلے چاہتا تھا' تو اس چکر سے نکل جا۔ پر تونے میری بات ہی نہیں مانی۔ الٹی میری شکایت جا کر لگا دی۔"

"ہاں جی' بہت غلطی ہو گئی۔" ارشاد الٰہی نے اظہار تاسف کیا۔ "تجھ پر ملک نثار اور اس کے جمعدار نے بہت ظلم کیا۔"

"جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔" لالی نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ "تو ٹھیک کہتا تھا۔ تیرا پیو مر گیا۔ پر میں نے بھی غلط نہیں کہا تھا۔ کوٹلہ ہرکشن میں جو چوہدری نور الٰہی تھا' اس نے جعل سازی کر کے تیرے پیو کے کلیم کے ذریعے بہت وڈی زمیں داری اور جائیداد الاٹ کرا لی تھی۔ وہ اب نہیں رہا۔ پچھلے دنوں وہ بھی مر گیا۔" لالی نے جان بوجھ کر رحیم داد کے قتل اور شاداں کی خودکشی کا تذکرہ نہیں کیا اور نہ یہ بتایا کہ دونوں سے نہ صرف اچھی طرح واقف تھا بلکہ ان کے ساتھ اس کے دیرینہ اور گہرے مراسم تھے۔ جیل میں پیشہ ور مجرموں اور طرح طرح کے اخلاقی قیدیوں کے ساتھ رہ کر وہ ہوشیار اور آزمودہ کار ہو گیا تھا۔ اس نے بہت محتاط رویہ اختیار کیا۔ شاداں کا تو سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔ رحیم داد کے بارے میں صرف اسی قدر بتایا۔ "اس بندے کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ سنا ہے اس کا کوئی وارث بھی نہیں اور اگر وارث ہوتا بھی تو کوئی فرک نہ پڑتا۔ اپنے پیو کا اصلی وارث تو 'تو' ہے۔"

"پر میں کیا کر سکتا ہوں؟" ارشاد الٰہی نے نہایت سادگی سے اپنے فوری ردعمل کا اظہار کیا۔

"تو ایسا کر۔ یہاں سے سیدھا ملتان جا۔" لالی نے مشورہ دیا۔ "ماں کو اپنے ساتھ لے اور کوٹلہ ہرکشن پہنچ کر پیو کی زمیں داری اور جائیداد حاصل کرنے کی کوشش کر۔"

"میں جاؤں گا کیسے؟" ارشاد الٰہی نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ کھانے تک کو تو ہے نہیں۔ پڑوس کا پتمبر الیما نیک بندہ ہے۔ وہ کھانے کو روٹی دے دیتا ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "جب وہ روٹی نہیں دیتا تو بھوکا پڑا رہتا ہوں۔ ویسے تو اب بھوک بھی نہیں لگتی۔"

لالی نے جیب سے روپے نکالے۔ ان کو گنا۔ اس کے پاس اس وقت ۴۸ روپے تھے۔ اس نے ۱۸ روپے اپنے لیے رکھ لیے۔ ۳۰ روپے ارشاد الٰہی کی جانب بڑھاتے ہوئے گویا ہوا۔ "لے یہ روپے رکھ لے۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "اب تو تو ملتان جا سکتا ہے۔"

ارشاد الٰہی نے روپے لے لیے۔ رقت انگیز لہجے میں بولا۔ "مجھے پتہ نہیں تھا تیرا دل اتنا وڈا!

ہے۔ کیسے بتاؤں تو کتنا نیک بندہ ہے۔" اس نے وفور جذبات سے وارفتہ ہو کر لالی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں اور بے اختیار رونے لگا۔

"اوئے شادے' تو تو رونے لگا۔" لالی نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ "یار' اس میں نیکی کرنے کی کونسی بات ہے۔ بندہ بندے کے کام آتا ہی ہے۔" وہ ہولے ہولے اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ "آنسو پونچھ لے اور کام کی گل سن۔"

ارشاد الٰہی نے کچھ نہ کہا۔ کرتے کا دامن اٹھا کر آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسو پونچھنے لگا۔

"کوٹلہ ہرکشن جانا تو ایسی حالت میں نہ جانا۔" لالی نے اس کے میلے کچیلے اور بوسیدہ لباس کی جانب اشارہ کیا۔ "شان سے جانا۔ ایسی شان سے کہ دیکھنے میں زمیں دار لگے۔ اپنے لیے اور ماں کے لیے نئے کپڑے سلوا لینا۔" بات کہتے کہتے وہ جھجکا۔ "پر تو نئے کپڑے سلوائے گا کیسے؟" لالی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بار پھر روپے نکالے۔ تین جیب میں رکھ لیے اور پندرہ روپے ارشاد الٰہی کو دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "لے یہ بھی رکھ لے۔ اب تو تیرے اور تیری ماں' دونوں کے نئے کپڑے بن جانے چاہییں۔"

لیکن اس بار ارشاد الٰہی نے روپے لینے سے انکار کر دیا۔ "انھیں اپنے ہی پاس رہنے دے۔ تجھے بھی تو ضرورت پڑے گی۔"

"فکر نہ کر۔ اپنا کام چل جائے گا۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ اصرار کر کے روپے ارشاد الٰہی کو دے دیے۔ ساتھ ہی تاکید کی۔ "تو یہاں سے فنافٹ چلا جا۔ ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی۔ ملتان جانے والی بس پکڑنا۔ ماں کو ساتھ لینا اور کوٹلہ ہرکشن پہنچنے کی کوشش کرنا۔"

"پر وہاں پہنچ کر کیسے ثابت کروں گا میں چوہدری نور الٰہی کا پتر ہوں۔ اس کی زمیں داری اور جائیداد کا وارث ہوں۔" ارشاد الٰہی نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔ "مجھے تو اپنے پیو کے بارے میں ٹھیک سے کچھ یاد بھی نہیں۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں' ماں کو اپنے ساتھ لے جانا۔ اسے سب پتہ ہو گا۔ وہ ایک ایک بات بتا دے گی۔" لالی نے بے تکلفی سے ارشاد الٰہی کی پیٹھ پر ہولے سے دھپ مارا۔ "یار' تو تو ابھی سے گھبرانے لگا۔ پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہی ہو گا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "زمیں داری مل جائے تو اس کی شان میں مجھے نہ بھول جانا۔"

"تجھے کیسے بھول سکتا ہوں۔" ارشاد الٰہی کے مرجھائے ہوئے چہرے پر اچانک رونق آ گئی۔ اس نے ایک بار پھر لالی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں گرم جوشی سے دبا لیا۔ "زمیں داری مل گئی تو پہلا کام؛ کروں گا تیرے پاس آؤں گا' پیشگی ادا کروں گا تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ دونوں مل کر زمین داری چلائیں گے۔ یہ ٹھیک رہے گا ناں؟"

"شادے' تو تو ابھی سے سفنے دیکھنے لگا۔" لالی کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ "مجھے تو سب سے زیادہ خوشی اس کی ہو گی کہ تجھے تیرا حک مل جائے۔ ایسا ہو جائے تو میرے پاس آنا ضرور۔"

"ضرور آؤں گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے تیرے پاس نہ آؤں۔" ارشاد الٰہی نے اسے یقین دلایا۔

"میں تیرا انتظار کروں گا۔"

ارشاد الٰہی نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دریافت کیا۔ "یہ تو بتا' میں کوٹلہ ہرکشن پہنچوں گا کیسے؟ مجھے تو ادھر کے بارے میں کچھ اتا پتا نہیں۔"

لالی اسے کوٹلہ ہرکشن کے راستے کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ اسی اثناء میں جمعدار اکبر سانول آ گیا۔ اس نے مسکرا کر لالی کو مخاطب کیا۔ "لالی' تو نے اپنے یار سے ٹھیک طرح گل بات کر لی۔ کل ہی سے کام شروع کر دے۔"

"کل ہی شروع کروں گا۔" لالی نے رضامندی کا اظہار کیا۔

جمعدار نے مڑ کر ارشاد الٰہی کی جانب دیکھا۔ "لالی نے بتا ہی دیا ہو گا کہ تجھے چھٹی مل گئی۔ تیری پیشگی یہ ادا کرے گا۔" اس نے قدرے تامل کے بعد دریافت کیا۔ "یہ بتا اب تیرا ارادہ کیا ہے؟ ابھی جائے گا یا کل صبح؟"

ارشاد الٰہی کے جواب دینے سے پہلے ہی لالی نے لقمہ دیا۔ "آج ہی جائے گا جی۔ اور ابھی جائے گا۔ یہ بہت بیمار ہے' جا کر اپنا علاج کرائے گا۔"

"ہاں جی' میرا یہی ارادہ ہے۔" ارشاد الٰہی نے لالی کی تائید کی۔

"ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ آ۔ میں تجھے بھٹے کے باہر پہنچا دوں۔" سانول نے کوئی رخنہ نہ ڈالا۔

ارشاد الٰہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی نے گلے لگا کر رخصت کیا تو ارشاد الٰہی بے قرار ہو کر سسکیاں بھرنے لگا۔ لالی نے ہولے ہولے پیٹھ تھپک کر تسلی دی۔ ارشاد الٰہی آگے بڑھا اور جمعدار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

لالی خاموش کھڑا دونوں کو دیکھتا رہا۔ ارشاد الٰہی نے چلتے چلتے کئی بار مڑ مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ آخر وہ اور جمعدار اندھیرے میں اوجھل ہو گئے۔

لالی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔ تھکا ہارا تھا اور مسلسل جاگتا بھی رہا تھا۔ کچھ دیر کروٹیں بدلتا رہا پھر بے خبر ہو کر سو گیا۔

* * *

لالی سویرے ہی سویرے کام کرنے پہنچ گیا۔ اس نے مٹی کھود کو گارا بنایا اور سانچوں میں بھر بھر کر کچی اینٹیں تیار کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ ہنر مندی سے چل رہے تھے۔ ہاتھوں کے ساتھ ساتھ پیر بھی تیزی سے چل رہے تھے۔ جھپاک سے کبھی ادھر جاتا کبھی ادھر۔

سورج چڑھ کر آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا۔ دھوپ میں تیزی آگئی۔ لالی دھوپ کی بڑھتی ہوئی تمازت سے بے نیاز کام میں جتا رہا۔ تھلّے پر پھیلی ہوئی اینٹوں کی قطاروں میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے قمیص اتار کر ایک طرف رکھ دی تھی۔ اس کا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ مگر ہاتھ اور پیر ہنوز تیزی سے چل رہے تھے۔

جمعدار اکبر سانول پتھیروں کے کام کا معائنہ کرتا ہوا لالی کے پاس بھی آیا۔ وہ ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا چھتر دبا تھا۔ سیاہ چہرہ دھوپ سے اور سیاہ پڑ گیا تھا اور کچھ زیادہ ہی کریہہ اور خوف ناک نظر آ رہا تھا۔

لالی کی اس پر نظر پڑی تو فوراً سلام کیا اور گردن جھکا کر مودب کھڑا ہو گیا۔ وہ جمعدار کی خوش نودی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جمعدار اس کے روّیے سے خوش بھی ہو گیا۔ چہرے پر چھائی ہوئی خشونت کچھ کم ہو گئی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا لالی کے قریب آیا۔ اس کی پسینے سے بھیگی ہوئی پیٹھ ہولے ہولے تھپک کر گویا ہوا۔

”اوئے لالی، تو نے تو شام ہونے سے پہلے ہی تھلّا اینٹوں سے بھر دیا۔ تو تو بہت کام کا بندہ ہے۔“

”کام تو جی کرنا ہی کرنا ہے۔“ لالی نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔

”تجھے یہاں کوئی تکلیف شکلیف تو نہیں؟“

”نہیں جی، بہت آرام سے ہوں۔“ لالی نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ”منشی کو بول دے ابھ پیشگی کم کاٹے۔ میرے پاس جو روپے تھے سب شادا کو دے دیے۔ اس کے پاس تو گھر جانے کو کرا بھی نہیں تھا۔“ لالی نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ ”ایسا ہو جائے تو تیری بہت مہربانی ہو گی۔“

”تو بالکل فکر نہ کر۔ میں منشی کو بول دوں گا تیری پیشگی زیادہ نہ کاٹے۔ ٹیڑھی میڑھی اینٹیں بھ گنتی میں کم نکالے۔“ جمعدار نے رضا مندی کا اظہار کیا۔ وہ لالی کے کام سے بہت زیادہ مطمئن نظ آتا تھا۔ کہنے لگا۔ ”ویسے تجھے پیشگی چاہیے ہو تو وہ بھی دلوا دوں گا۔“

”نہیں جی، ابھی ضرورت نہیں۔“ لالی آمادہ نہ ہوا۔ ”ابھی تو مجھے شادا کی پیشگی ادا کرنے کی فک ہے۔ ضرورت پڑی تو بعد میں مانگ لوں گا۔“

”جیسی تیری مرضی۔“ جمعدار اکبر سانول نے خوش نودی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بار پھر لالی کی پیٹھ تھپ تھپائی۔ ”اب تو اپنا کام کر۔ میں کام کرنے والے بندے کی ہمیشہ مدد کرتا ہوں۔ کام چور اور نکمّے کے لیے اسے کام میں لاتا ہوں۔“ اس نے ہاتھ میں دبا ہوا چھتر آہستہ آہستہ لہرایا۔ ”کیسا ہی ٹیڑھا بندہ ہو اس سے ایک دم سیدھا ہو جاتا ہے۔“

جمعدار مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

لالی اپنے کام میں جت گیا۔ دبادب اینٹیں تیار کرنے لگا۔ جمعدار کے نرم روّیے سے اس کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ بہت مطمئن تھا کہ پہلے ہی روز اپنے کام سے اس کی خوش نودی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ جمعدار کو کسی طور ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ بھٹے پر سب سے زیادہ اہم شخصیت جمعدار کی ہوتی ہے۔ اس کا عتاب زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے۔

لالی غروب آفتاب کے بعد تک محنت اور پوری لگن سے کام کرتا رہا۔ شام کو اس نے روٹی پکا کر کھائی اور تھکن سے نڈھال ہو کر چارپائی پر لیٹ گیا۔

لالی مستعدی اور جانفشانی سے صبح سے شام تک کام کرتا رہتا۔ وہ نہ کسی پتھیرے سے غیر ضروری بات چیت کرتا اور نہ ہی اس نے کسی سے میل جول بڑھانے کی کوشش کی۔ اپنے کام سے غرض رکھتا۔ جمعدار اکثر کام کے دوران اس کے پاس آتا اور اس کے کام سے مطمئن ہو کر چلا جاتا۔ لالی نے کبھی اسے شکایت کا موقع نہ دیا۔

سنیچر کا دن آگیا۔ شام کو چٹھا بٹا۔ ہفتے بھر کے کام کا پتھیروں اور دوسروں بھٹہ مزدوروں کو معاوضہ دیا گیا۔ جمعدار نے لالی سے جو وعدہ کیا تھا اس کا نتیجہ بھی اس روز برآمد ہوا۔ منشی نے دوسرے پتھیروں کے مقابلے میں اس کے ساتھ زیادہ نرم رویہ اختیار کیا۔ پیشگی بھی زیادہ نہیں کاٹی۔ ٹیڑھی میڑھی اینٹیں بھی کم مسترد کیں۔ لالی نے دو پتھیروں کے برابر کام کیا تھا۔ اسے کچھ کم دس روپے معاوضہ ملا۔

* * *

رانا محمود کے بھٹے پر کام کرنے والوں میں دوسرے بھٹوں کے برعکس نو عمر لڑکوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان میں کوئی بھی تیرہ چودہ برس سے زیادہ عمر کا نہ تھا۔ لیکن یہ پتھیرے کم تھے بیشتر بھٹہ مزدور تھے۔ وہ ٹوٹی پھوٹی پختہ اینٹیں ہتھوڑیوں سے توڑ کر روڑی بناتے۔ کچی اینٹیں ریڑھوں اور ٹھیلوں میں بھر کر چمنی کے پاس پہنچاتے۔ بھٹے سے پک کر نکلنے والی مختلف قسم کی اینٹوں کے علیحدہ علیحدہ چٹے بناتے۔

ان لڑکوں کی رہائش کا بندوبست سب سے الگ تھلگ ایک ہی جگہ کیا گیا تھا۔ یہ مویشیوں کے باڑے کے مانند طویل سائبان تھا جس کی دیواریں کچی تھیں اور پھوس کی چھت تھی۔ ان کو کام کرنے کی کوئی مزدوری نہیں ملتی تھی۔ کھانے کے لیے ہر ایک کو ہفتہ بھر کا راشن ملتا تھا۔ راشن میں آٹے کے علاوہ نمک ملتا تھا اور مرچیں۔ مہینے میں صرف ایک بار پاؤ بھر دال ملتی تھی۔ عام طور پر یہ چنے کی دال ہوتی تھی۔

جمعدار اکبر سانول ان کی بھرتی کے لیے گاؤں گاؤں، بستی بستی گھومتا رہتا تھا۔ غربت اور افلاس کے مارے عیال دار والدین کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتا اور فی لڑکا دو ڈھائی ہزار معاوضہ دے کر خرید لیتا۔ فوری ضرورت کے لیے بردہ فروشوں کے ذریعے بھی خریداری کرتا تھا۔ مگر بردہ فروش عام طور پر زیادہ قیمت لیتے تھے۔ ہر لڑکے کی خریداری پر جمعدار کو معقول کمیشن ملتا تھا۔ ایک بار بھٹے کی حدود میں داخل ہونے کے بعد انھیں کبھی واپس جانا نصیب نہ ہوتا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد انھیں چھپر کے نیچے مویشیوں کی طرح ہانک کر پہنچا دیا جاتا۔ ہاتھوں کو زنجیروں سے جکڑ کر باندھ دیا جاتا اور پیروں میں بیڑیاں ڈال کر تالے لگا دیے جاتے جن کی کنجیاں جمعدار کی تحویل میں رہتی تھیں۔ وہ لمبی لمبی قطاروں کی صورت میں چٹائیوں پر سوتے تھے۔ یہ چٹائیاں گندی اور بوسیدہ ہوتی تھیں اور ان میں کھٹملوں کی اس قدر بہتات ہوتی کہ انھیں چین سے نیند بھی نہ آتی۔ ان کی کڑی نگرانی کی جاتی۔ رات کو یہ نگرانی اور سخت کر دی جاتی۔ دو مسلح پہریدار رات بھر نہایت مستعدی سے ان کی چوکیداری پر تعینات رہتے۔

لالی نے انھیں بھٹے پر کام کرتے اور ادھر ادھر آتے جاتے دیکھا تھا۔ مگر کسی سے بات چیت کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ ایک شام کو ایسا ہوا کہ اس نے کھانے کے لیے روٹی کے بجائے چاول پکائے۔ وہ پلیٹ میں چاول نکال کر کھانا شروع ہی کرنے والا تھا کہ ایک نو عمر لڑکا اندھیرے سے نکل کر جھونپڑی میں داخل ہوا اور اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کی عمر بارہ برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ بہت سہا ہوا نظر آرہا تھا۔ بار بار پلٹ کر چوکنا نظروں سے پیچھے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

لالی نے چونک کر اسے دیکھا۔ حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "اوئے، کون ہے تو؟"

"میں نیرا ہوں جی۔ بھٹے پر کام کرتا ہوں۔"

"یہاں کیسے آیا؟" لالی ہنوز حیرت زدہ تھا۔

"مجھے تھوڑے سے چاول کھانے کو دے دے۔" نیرا نے ہاتھ سے اپنے پچکے ہوئے پیٹ کو ہولے ہولے تھپ تھپایا۔ گڑگڑا کر بولا۔ "بہت بھوک لگی ہے۔ کل رات سے کچھ نہیں کھایا۔"

"نیرے! تجھے کھانے کو روٹی نہیں ملتی؟"

"روٹی کھانے سے پیٹ میں بہت درد ہوتا ہے۔" اس کے لہجے میں رقت پیدا ہو گئی۔ "ٹٹی آتی ہے۔ ٹٹی کے ساتھ خون بھی آتا ہے۔"

لالی نے اس بار اسے غور سے دیکھا۔ اس کا جسم لاغر تھا۔ چہرہ بے رونق اور مرجھایا ہوا تھا۔ وہ خارش زدہ کتے کی طرح بیمار اور مرگھلا نظر آرہا تھا۔ لالی اس کی حالت زار دیکھ کر پسیج گیا۔ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے گویا ہوا۔

"لگتا ہے تجھے تو پیچش ہے۔ کوئی دوائی شوائی نہیں لیتا؟"

"نہیں جی، دوائی شوائی کہاں ملتی ہے۔" نیرا نے شکوہ کیا۔ "بھٹے سے باہر تو جانے نہیں دیا جاتا۔" وہ ندیدیوں کی طرح للچائی ہوئی نظروں سے پلیٹ میں رکھے ہوئے چاولوں کو تکنے لگا۔ "تو مجھے تھوڑے سے چاول نہیں دے سکتا؟"

"ضرور دوں گا تجھے چاول۔" لالی نے جھک کر نیچے رکھا ہوا مٹی کا پیالہ اٹھایا۔ پلیٹ سے آدھے سے بھی زیادہ چاول نکال کر پیالے میں رکھے اور ان پر دال بھی ڈال دی۔ پیالہ اس کی جانب بڑھا کر چمکارتے ہوئے گویا ہوا۔ "لے پتر، یہ کھا لے۔"

نیرا نے چاولوں سے بھرا ہوا پیالہ لیا اور وہیں فرش پر بیٹھ کر ہبڑ ہبڑ کھانے لگا۔ اس نے چند ہی لقمے چاولوں کے کھائے تھے کہ اچانک ایک کارندہ آفت ناگہانی کی طرح نازل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چھتر دبا تھا۔ اس نے خونخوار نظروں سے نیرا کو دیکھا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "اوئے حرام دے۔ تو ادھر بیٹھا عیش کر رہا ہے۔ میں تجھے نہ جانے کہاں کہاں ڈھونڈتا رہا۔" اس نے جھپٹ کر نیرا کا بازو پکڑا اور اس زور سے جھٹکا دیا کہ نیرا ڈگمگا کر ایک طرف لڑھک گیا۔ پیالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چٹاخ سے گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ چاول دور تک فرش پر بکھر گئے۔

نیرا نے بدحواس ہو کر بکھرے ہوئے چاولوں کو دیکھا اور فرش سے اٹھا کر جلدی جلدی کھانے لگا۔ کارندے نے غضب ناک ہو کر اس کی پیٹھ پر زور سے چھتر مارا۔ دوسرا، تیسرا، وہ زناٹے سے چھتر مارتا رہا۔ مگر نیرا فرش پر اوندھا پڑا اپٹتا رہا اور چاول اٹھا اٹھا کر بے صبری سے کھاتا رہا۔

لالی اس کی بے بسی دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ اس نے کارندے کو ٹوکا۔ "یار، اسے کھا تو لینے دے۔ بہت بھوکا لگتا ہے۔" اس نے اپنی پلیٹ اٹھا کر نیرا کی طرف بڑھائی۔ "نیرے، لے یہ کھا لے۔ وہ چاول تو مٹی میں مل کر خراب ہو گئے۔"

کارندے نے بھنا کر لالی کو دیکھا۔ "اوئے تو چپ کر۔" وہ تیزی سے لالی پر جھپٹا۔ سڑاک سے

ایک چھتر لالی کے کندھے پر مارا۔ لالی تکلیف سے بلبلا اٹھا۔ پلیٹ اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔

کارندہ آنکھیں نکال کر لالی کو ڈانٹنے پھنکارنے لگا۔ ”تو نے اسے یہاں کیوں بلایا؟ تو اس کا ماماں لگتا ہے؟“ اس نے ایک اور چھتر مارا۔ اس دفعہ ہاتھ کمر پر پڑا۔

لالی کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر طرح دے گیا۔ وہ کسی سے جھگڑا فساد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ خاموشی سے وقت گزارنا چاہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ ارشاد الٰہی جلد ہی آئے گا۔ پیشگی کی تمام رقم بے باق کرے گا اور اسے جمعدار کی قید سے چھڑا کر اپنے ہم راہ لے جائے گا۔ لہٰذا اس نے برہمی کا اظہار کرنے کے بجائے اپنی کمر سہلاتے ہوئے نرمی سے صفائی پیش کی۔

”میں نے اسے نہیں بلایا۔ یہ تو خود ہی ادھر آیا تھا۔ میں نے تو اسے پہلی بار دیکھا ہے۔“

کارندے نے ڈپٹ کر لالی کو تنبیہہ کی۔ ”آگے اسے یہاں نہ دیکھوں۔ ورنہ تیری چمڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔“ لالی کو ڈانٹنے پھنکارنے کے بعد وہ نیرا کی جانب متوجہ ہوا جو زمین پر پڑا ابھی تک چاول اٹھا اٹھا کر کھا رہا تھا۔ کارندہ اس کے قریب گیا اور مردار بھیڑ کی طرح گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔

لالی اس قدر دل گرفتہ ہوا کہ کھانا بھی نہ کھایا۔ بھوکا ہی سو گیا۔

☆

لالی دوسری پتھیروں اور بھٹہ مزدوروں سے الگ تھلگ رہتا۔ پہلے ہی دن سے اس نے جو وتیرہ اختیار کیا تھا اس پر سختی سے قائم رہا۔ محنت اور لگن سے کام کرتا۔ جمعدار کو ہر طرح مطمئن رکھنے کی کوشش کرتا۔

اس روز لالی سرِ شام ہی کھانا کھا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ جھونپڑی میں خاموشی چھائی تھی۔ لیکن آس پاس کی جھونپڑیوں اور جھگیوں سے ابھی تک ہنسنے بولنے، بوڑھوں کے کھانسنے کھنکارنے اور بچوں کے رونے کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔

لالی خاموش لیٹا ہر آواز اور ہر آہٹ سن رہا تھا۔ اسی اثناء میں جھونپڑی کے باہر کوئی آہستہ سے کھنکارا۔ اس نے گردن بڑھا کر اندر جھانکا۔ دھیمے لہجے میں پوچھا۔

”لالی، جاگ رہا ہے؟“

لالی نے آواز پہچان لی۔ وہ تاج محمد تھا۔ وہ بھی پتھیرا تھا۔ دو چار جھونپڑیاں چھوڑ کر اس کی جھونپڑی تھی۔ وہ ادھیڑ تھا اور بیمار بھی رہتا تھا۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر کھانستا رہتا۔ لالی نے رات کے سناٹے میں اکثر اس کی کھانسی سنی تھی۔ وہ ایک بار پہلے بھی لالی کے پاس آیا تھا۔ آٹا مانگنے آیا تھا۔ صبح سے اس نے اور اس کے بیوی بچوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ لالی نے آٹے کے علاوہ اسے ایک روپیہ ادھار بھی دیا تھا۔ مگر زیادہ بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ وہ دم بھر کے لیے ٹھہرا تھا۔

لالی اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ”تاجے باہر کیوں کھڑا ہے؟ اندر آجا۔“

تاج محمد اندر آگیا۔ لالی سمٹ کر ایک طرف ہو گیا۔ تاج محمد سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”ادھر آرام سے بیٹھ جا۔“ تاج محمد اس کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”سنا ہے رانا محمود کی ماں کا آج دن ڈھلے مرن ہو گیا۔“ لالی نے کہا۔ ”رانا نے زبردست سیاپا کیا ہے۔ سوگ میں تین روز تک بھٹے پر کام بند رہے گا۔“

”ہاں جی ایسا ہی ہو گا۔“ تاج محمد نے بجھے ہوئے لہجے میں اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا۔ ”پچھلے دنوں بارش کی وجہ سے کام بند رہا۔ اب یہ تین دن کی چھٹی آگئی۔ پہلے ہی کم تنگی نہیں تھی پیشگی لے کر کسی نہ کسی طرح پیٹ بھرنا پڑ رہا تھا۔ تب ہی تو پیشگی کبھی ادا نہیں ہو پاتی۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”یہ پیشگی ایسی گلے پڑی ہے کسی طرح پنڈ ہی نہیں چھوڑتی۔“

”پیشگی کا چکر بھی عجب چکر ہے۔ ایک بار جو اس چکر میں پھنس گیا فیر نہیں نکلتا۔“

”تیری پیشگی تو بہت زیادہ ہے۔“ تاج محمد نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ اس کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔

”پر تیرے ساتھ تو بہت دھوکا ہوا۔“

”دھوکا کیسے ہوا؟“ لالی نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔

”تو شادا کی پیشگی ادا کر رہا ہے ناں؟“

”ہاں جی، اسی کی پیشگی ادا کر رہا ہوں۔“ لالی ہنوز حیرت زدہ تھا۔ ”پر اس میں دھوکے شوکے کی کون سی گل بات ہے۔“

”شادا کی پیشگی تو پہلے ہی معاف ہونے جا رہی تھی۔“

”شادا کی پیشگی معاف ہونے جا رہی تھی۔ وہ کیسے؟“ لالی کی حیرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ ”ایسا تو کبھی ہوتا نہیں۔“

”اس کی چھٹی کی جا رہی تھی۔“ تاج محمد نے بتایا۔ ”جب کسی کی چھٹی کر دی جاتی ہے اور بھٹے سے اس کا کوئی ناتا نہیں رہتا تو فیر پیشگی کو تو معاف ہونا ہی ہوتا ہے۔“

”پر سوال یہ ہے کہ شادا کی چھٹی کیوں کی جا رہی تھی؟“

”تو شادا کا یار ہے پر لگتا ہے تجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔“ تاج محمد کھسک کر لالی کے

قریب ہو گیا۔ مدھم لہجے میں بولا۔ ”وہ سخت بیمار ہے۔ اسے ہر دم بخار رہتا ہے۔ کھانسی بھی ہے اور کھانسی کے ساتھ منہ سے خون بھی آتا ہے۔ اسے ٹی بی ہے۔“

”تجھے کیسے پتہ چلا شادا کو ٹی بی ہے؟“ لالی نے گھبرا کر دریافت کیا۔

”ڈاکٹر نے جمعدار کو میرے سامنے بتایا تھا۔“ تاج محمد نے کھل کر بات کی۔ ”وہ شادا کو لے کر سرکاری اسپتال گیا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ ان دنوں مجھے بھی بخار رہتا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے تو ملیریا بتایا اور دوائی دے دی۔ شادا کے لیے کہا' اسے ٹی بی ہے۔“ اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ ”ڈاکٹر نے تو یہ بھی کہا تھا اس کے پھیپھڑے بالکل بیکار ہو گئے۔ اب یہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ تھوڑے ہی دنوں میں مر جائے گا۔ تبھی تو اس کی چھٹی کی جا رہی تھی۔ کفن دفن جو کرنا پڑتا۔“

”مجھے یہ پتہ نہیں تھا وہ اتنا زیادہ بیمار ہے۔“ لالی فکر مند ہو گیا۔

”شادا تو بالکل جوان ہے۔“ تاج محمد نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ”اسے ابھی نہیں مرنا چاہیے۔“

”تاجے' فکر نہ کر شادا اتنی جلدی مرنے کا نہیں۔“ لالی نے تاج محمد کے ساتھ ساتھ خود کو بھی مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”یہاں سے جانے کے بعد وہ اپنا علاج کرائے گا اور بالکل چنگا ہو جائے گا۔“ اس نے بات کا رخ بدل دیا۔ ”یہ بتا تو آیا کیسے؟“ مسکرا کر پوچھا۔ ”ادھار لینے آیا ہے؟“

”نہیں' میں ایک اور ہی کام سے آیا ہوں۔“

”کیا کام ہے؟“

”تو میری ایک مدد کر سکتا ہے؟“

”کیسی مدد چاہتا ہے؟“ لالی نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”صاف صاف بتا۔“

”تو ناجو سے ویاہ کر لے۔“ تاج محمد نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔

”ناجو کون؟“ لالی نے پوچھا۔ ”تیری دھی؟“

”ہاں۔“ تاج محمد بدستور سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ”اب وہ پوری طرح جوان ہو گئی ہے۔ جمعدار اسے بری طرح گھورتا رہتا ہے۔ اس کی نیت ٹھیک نہیں۔ مجھے ہر دم فکر رہتی ہے وہ اپنے کرندوں سے اسے اٹھوا نہ لے۔“ وہ رک رک کر بولتا رہا۔ ”جب تک چاہے گا زبردستی اپنی پاس رکھے گا۔ جی کرے گا تو واپس کر دے گا ورنہ ملتان لے جا کر کنجروں کے ہاتھ بیچ دے گا۔ وہ کئی جوان کڑیوں کو اٹھوا کر ایسا ہی کر چکا ہے۔“ اس کا چہرہ اداس ہو گیا۔ ”میں غریب ہتھیرا ہوں۔ کچھ بھی تو نہیں کر سکتا۔ رولا یا جھگڑا کروں گا تو الٹا لٹکا کر چھتر سے مار لگائے گا۔ تجھے پتہ نہیں' وہ کتنا ظالم اور گندہ ہے۔“

لالی پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ مگر اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

مگر تاج محمد خاموش نہ رہا۔ عاجزی سے بولا۔ ”تو مجھے بدنامی سے بچا سکتا ہے۔ ناجو کو برباد ہونے سے بچا سکتا ہے۔“ اس نے لالی کو رضا مند کرنے کے لیے اونچ نیچ سے بھی آگاہ کیا۔ ”تو اکیلا بندہ ہے۔ تجھے بہت وڈی پیشگی ادا کرنی ہے۔ تجھے پتہ ہے ناجو کتنی اہری اور محنتی ہے۔ دونوں مل کر کام کریں گے تو تیری پیشگی جلد ادا ہو جائے گی۔ تجھے اپنی روٹی بھی نہیں پکانی پڑے گی۔ بیمار پڑ جائے گا تو تیری دیکھ بھال کرے گی۔ وہ تیرا ہر کام کرے گی۔ جیسا کہے گا ویسا ہی کرے گی۔ ویاہ کر کے تو اس کے ساتھ آرام سے رہے گا۔“

”چاچا' اس معاملے میں تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“ لالی نے صاف انکار کر دیا اور انکار کی وجہ بھی بتا دی۔ ”بات یہ ہے نہ میرا ابھی ویاہ کرنے کا ارادہ ہے اور نہ یہاں رہنے کا۔“ اس نے گردن اونچی کر کے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”میں ہتھیرا بن کر یہاں کید رہنا نہیں چاہتا۔ یہاں کام کرنے والا ہر بندہ کیدی ہے۔ یہ تو جیل ہے۔ سرکاری جیل سے بھی بری۔ مجھے اس جیل میں نہیں رہنا۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”پر تو پیشگی ادا کیے بنا یہاں سے کیسے جا سکتا ہے؟“ تاج محمد نے حیرت زدہ ہو کر اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ ”یہاں سے بھاگنے کی ہرگز ہرگز کوشش نہ کرنا۔“ اس نے لالی کو خبردار کیا۔ ”کرندے اور راکھے بہت چوکنا رہتے ہیں۔ تو ان کی نظروں سے بچ کر باہر نہیں جا سکتا۔ پکڑا گیا تو جمعدار بہت ظلم کرے گا۔ تو سوچ بھی نہیں سکتا' وہ کیسے کیسے ظلم کرتا ہے۔“

”مجھے ٹھیک طرح پتہ ہے وہ کتنا ظالم اور برا بندہ ہے۔“ لالی نے تاج محمد سے اختلاف نہ کیا۔ ”میں یہاں سے فرار ہونے کی بالکل کوشش نہیں کروں گا۔“ اس نے مطلع کیا۔ ”شادا جلد ہی واپس آئے گا۔ پیشگی کے سارے روپے رانا محمود کے سامنے ڈالے گا اور مجھے اپنے ساتھ لے جائے گا۔“

”شادا واپس آئے گا؟ تو کیسی گل بات کر رہا ہے؟“ تاج محمد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”بھٹوں پر کام کرتے کرتے اب تو میرے بال بھی چٹے ہو گئے۔“ اس نے اپنے سر کے کھچڑی بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ”میں نے تو دیکھا نہیں' کسی کی بیماری کے بعد چھٹی کر دی گئی ہو اور وہ بچنے پر واپس آیا ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ جو یہاں سے جاتا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا جاتا ہے۔“

”شادا کے معاملے میں ایسا نہیں ہو گا۔“ لالی نے کھل کر بات نہ کی۔ صرف اتنا کہا۔ ”اس نے

مجھ سے پکا وعدہ کیا ہے۔ وہ آئے گا اور ضرور آئے گا۔"

"مجھے تو ایسا لگتا نہیں کہ شادا واپس آئے گا۔" تاج محمد مطمئن نہیں ہوا۔

لالی نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ خاموش بیٹھا رہا۔

تاج محمد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ نڈھال اور بجھا بجھا نظر آرہا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ لالی کو الجھن میں مبتلا کر گیا۔ مگر وہ ناامید نہ ہوا۔ چارپائی پر لیٹ کر دیر تک ارشاد الٰہی کے بارے میں سوچتا رہا۔

☆

لالی حسب معمول مستعدی سے کام کرتا رہا۔ صبح سے شام تک سانچوں میں گارا بھر کر اینٹیں تیار کرتا اور ہر روز بے چینی سے ارشاد الٰہی کی واپسی کا انتظار کرتا۔

موسم بدل رہا تھا۔ درختوں میں پت جھڑ لگ گیا تھا۔ تیز ہوائیں چلتیں۔ خزاں رسیدہ پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے۔ ہوا کے جھونکوں سے کھڑکھڑاتے ہوئے ادھر ادھر بکھر جاتے۔ آسمان پر غبار چھایا رہتا۔ دن میں گرمی رہتی۔ مگر رات کو ہلکی ہلکی خنکی ہو جاتی۔ بھٹے پر زور شور سے کام ہو رہا تھا۔ چمنی سے گاڑھا گاڑھا سیاہ دھواں نکلتا اور فضا میں پھیل جاتا۔

لالی اپنے تھلے پر بیٹھا اینٹیں بنا رہا تھا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ سورج ڈھلک کر مغربی افق پر پہنچ گیا تھا۔ چتیرے اب تھکے تھکے نظر آرہے تھے۔ لالی بھی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ صبح سے اس کی طبیعت بھی کچھ مضمحل تھی۔ سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ مگر وہ کام کرتا رہا۔ اسی اثناء میں لیما اس کے پاس آگیا۔

. لالی نے ہاتھ چلاتے چلاتے اس کی جانب دیکھا۔ لیما کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں بھی بجھی بجھی تھیں۔ لالی نے اسے افسردہ دیکھا تو ہاتھ روک کر پوچھا۔ "لیمے' تو کچھ پریشان پریشان لگ رہا ہے۔ بات کیا ہے؟؟"

"تو نے نیرا کو دیکھا ہے ناں۔" لیما نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہی چھوہرا جو ہر دم روتا رہتا تھا۔ ماں پیو کو بہت یاد کرتا تھا۔"

"میں اسے جانتا ہوں۔" لالی نے لیما کو غور سے دیکھا۔ "بیمار بھی رہتا ہے۔ پر تو اس کے بارے میں کیا کہنا چاہتا ہے؟؟"

"نیرا مر گیا۔"

"کب مرا وہ؟" لالی بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"تھوڑی دیر پہلے۔ میں ادھر ہی سے آرہا ہوں۔"

"پر وہ اتنا بیمار تو نہیں لگتا تھا۔"

"تیں نوں پتہ نہیں وہ بہت بیمار تھا۔" لیما نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اتنا بیمار تھا کہ اس کی چھٹی کر دی گئی تھی۔ آج شام اپنے پنڈ جانے والا تھا۔ چلا جاتا تو ماں پیو سے مل لیتا۔ ان کے پاس جانے کو بہت کہتا تھا۔ پر جاتا کیسے۔ اسے تو جمعدار خرید کر لایا تھا۔ وہ تو..."

لیما نے بات پوری بھی نہ کی تھی کہ سامنے سے جمعدار آتا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر لیما گھبرا گیا۔ وہ مڑا اور اپنے تھلّے کی جانب چلا گیا۔ لالی اداس اور دل گرفتہ تھا۔ وہ کھویا کھویا سا کھڑا رہا۔

جمعدار قریب آگیا اور ہاتھ میں دبا ہوا چھتر ہولے ہولے ہلاتا ہوا خاموشی سے گزر گیا۔

جمعدار دور چلا گیا تو لالی پھر اپنا کام کرنے لگا۔ گارا ختم ہو گیا تھا۔ اس نے زمین کھود کر مٹی نکالی۔ اس میں پانی ملایا۔ آٹے کی طرح گوندھ کر گارا تیار کیا اور سانچوں میں بھر بھر کر اینٹیں تیار کرنے لگا۔ مگر اب وہ بے دلی سے کام کر رہا تھا۔ چابک دستی اور پھرتی ماند پڑ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

دن ڈھلا۔ سورج کھسکتا ہوا دھیرے دھیرے مغربی افق پر اپنی الوداعی شعاعیں بکھرتا ہوا اوجھل ہو گیا۔ شام ہو گئی۔ غبار آلود آسمان دھندلا ہو کر تاریک ہو گیا۔ ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔

خزاں کی ایسی کتنی ہی اداس شامیں آئیں اور دبے پاؤں گزر گئیں۔ لالی کی بے کیف زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ صبح سے شام تک بھٹے پر کام کرتا رہا۔

۵۳

خزاں کی ایک شام کا ذکر ہے۔ لالی کام ختم کر کے جھونپڑی میں پہنچا تو نڈھال اور بہت تھکا ہارا تھا۔ مگر اسے ابھی کھانا پکانا تھا۔ بھوکا سو جاتا تو دوسرے روز کام ٹھیک سے نہ ہوتا۔ کام کم ہوتا تو اجرت بھی کم ملتی۔ پیشگی کا بوجھ سر پر سوار تھا۔ اسے اتارنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کام کرنا ضروری تھا۔

اس نے چولہا سلگایا۔ دال تو کسی نہ کسی طور پک گئی۔ مگر روٹی پکانا دوبھر ہو گیا۔ لکڑیاں گیلی تھیں۔ بار بار آگ ٹھنڈی پڑ جاتی۔ پھونک پھونک کر اسے تیز کرنا پڑتا۔ سانس پھول جاتی۔ دھواں اتنا اٹھتا کہ آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔

وہ جھکا ہوا چولہا پھونک رہا تھا کہ پشت پر آواز ابھری۔ "لکڑیاں گیلی ہیں۔ آرام سے آگ نہیں پکڑیں گی۔"

لالی پہلے ہی پریشان تھا۔ اس نے جھنجلا کر گردن موڑی۔ دیکھا، ناجو سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ لالی کو اس کی شوخی سخت ناگوار گزری۔ جل کر بولا۔ "لکڑیاں گیلی ہیں یا سوکھی، تجھے ان سے کیا لینا؟ چل اپنا رستہ پکڑ۔"

"وے زراض کیوں ہوتا ہے۔" وہ اٹھلا کر بولی۔ "لکڑیاں تنگ کر رہی ہیں تو مجھے کیوں آنکھیں دکھا رہا ہے؟"

"روٹی مجھے پکانی ہے تجھے تو نہیں پکانی۔" لالی نے بے زاری کا اظہار کیا۔

"پرے ہٹ۔" وہ دھوتی سنبھال کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ "تجھ سے آج روٹی نہیں پکنے کی۔

میں تیری روٹی پکائے دیتی ہوں۔"

وہ گردن جھکا کر زور زور سے سلگتی ہوئی لکڑیوں کو منہ سے پھونکنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آنچ تیز ہو گئی۔ لکڑیوں سے شعلے اٹھنے لگے۔ ناجو نے گردن کو خم دے کر لالی کی جانب دیکھا۔ "آگ ایسے جلتی ہے۔" اس نے آٹے سے پیڑا بنایا۔ جھپاک جھپاک اسے ہاتھوں پر پھیلایا اور روٹی توے پر ڈال دی۔

لالی ایک طرف کھسک گیا اور چپ چاپ بیٹھا رہا۔

ناجو چولہے کے سامنے بیٹھی روٹی پکاتی رہی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ آگ کی تپش سے چہرہ تمتما رہا تھا۔ بالوں کی ایک لٹ بکھر کر بار بار رخسار پر آجاتی اور وہ ایک ہاتھ سے بار بار ہٹا دیتی۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ مگر جسم سڈول اور کسا ہوا تھا۔ کولہے چوڑے اور بھرے بھرے تھے۔ چہرہ خون کی گرمی سے دمک رہا تھا۔ آنکھوں میں جوانی کی کہکشاں جگمگا رہی تھی۔

ناجو روٹی پکاتی رہی۔ لالی چپ چاپ بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ اس کے ہاتھ سخت اور کھردرے تھے اور بدن سے پسینے کی بو اٹھ رہی تھی۔ لالی کو معاً شاداں یاد آگئی۔ روٹی پکاتے ہوئے اس کے ہاتھ بھی اسی طرح جھپا جھپ چلتے تھے۔ وہ بھی چہرے پر آئی بالوں کی لٹ روٹی پکاتے پکاتے ایک ہاتھ سے ہٹاتی رہتی تھی۔ شاداں کی یاد کے ساتھ کتنے ہی سہانے خواب آنکھوں میں اتر آئے۔ وہ یادوں کی پگڈنڈیوں پر بھٹکتا ہوا بہت دور نکل گیا۔

"لے روٹی پک گئی۔" ناجو کی آواز ابھری۔

لالی نے چونک کر دیکھا۔ وہ چولہے کے سامنے بیٹھی ہاتھوں میں لگا ہوا آٹا صاف کر رہی تھی۔ اس نے لالی کی جانب پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مگر جب وہ باہر جانے کے لیے مڑی تو لالی نے ٹوکا۔ "تو جا رہی ہے ناجو؟"

"جاؤں گی نہیں تو کیا یہیں بیٹھی رہوں گی۔" ناجو نے منہ بگاڑ کر بے رخی سے کہا۔

لالی کو اس کا تیکھا اور کڑوا لہجہ ناگوار نہ گزرا۔ شاداں بھی اسی لہجے اور اسی ٹھنٹے سے بات کرتی تھی۔ ناجو آگے بڑھی تو لالی نے ایک بار پھر ٹوکا۔ "کدھر چلی؟ بات تو سن۔"

وہ ٹھٹکی۔ گردن کو خم دے کر لالی کی جانب دیکھا۔ "کہہ، کیا کہنا چاہتا ہے؟" اس کا لہجہ بدستور تیکھا تھا۔

"جا کر اپنے پیو کو میرے پاس بھیج دے۔"

"کیوں؟ اسے میری شکایت لگانی ہے؟" وہ تلخی سے بولی۔

"زیادہ تیزی نہ دکھا۔" لالی نے مسکرا کر اسے ڈانٹا۔ "جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔"

ناجو چلی گئی۔ لالی نے کھانا نکالا اور چارپائی پر بیٹھ کر کھانے لگا۔ وہ نظریں اٹھا کر بار بار جھونپڑی کے باہر دیکھنے لگا۔ اسے تاج محمد کا انتظار تھا۔

لالی کھانا کھا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ پھر رات گزر گئی۔ تاج محمد نہیں آیا۔ لالی انتظار کرتے کرتے سو گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ لیکن تاج محمد اس کے پاس نہ آیا۔

ہفتے کی شام کو چھٹا بٹا۔ لالی نے اپنی اجرت لیتے ہوئے منشی سے پوچھا۔ "میری پیشگی اب کتنی رہتی ہے؟"

"بہت رہتی ہے۔" منشی نے رجسٹر کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھے۔ "ابھی تو سو روپے بھی ادا نہیں ہوئے۔"

لالی بہت چکرایا۔ اس کا خیال تھا کہ اب تک پیشگی کے کئی سو روپے ادا ہو چکے ہوں گے۔ مگر اس نے منشی سے تکرار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اسے ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس میں سراسر اس کا نقصان تھا۔ حاصل کچھ نہیں ہوتا۔

ہفتے بھر کی مزدوری کے روپے دھوتی کے ڈب میں رکھتے ہوئے لالی نے سوچا۔ صرف اس کی تنہا محنت سے تو پیشگی کا بوجھ کبھی سر سے نہیں اتر سکے گا۔ یکایک اسے ناجو یاد آ گئی۔ وہ شاداں کی طرح محنتی اور جفاکش ہے۔ اس کے ہاتھ سدھے ہوئے ہیں اور تیزی سے چلتے ہیں۔ بغیر آرام کیے صبح سے شام تک کام کرتی ہے۔ تاج محمد ٹھیک کہتا ہے۔ اس کے ساتھ شادی کر کے وہ بہت آرام سے رہے گا۔ دونوں مل کر جلد ہی پیشگی ادا کر دیں گے۔ اس کی سپاٹ اور بے کیف زندگی میں سرخوشی اور گہما گہمی پیدا ہو جائے گی۔

شام کے جھٹ پٹے میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا وہ اپنی جھونپڑی کی جانب جا رہا تھا۔ ابھی چولہا جلا کر اسے کھانا پکانا تھا۔ کپڑے بھی دھونا تھے۔ بہت میلے ہو گئے تھے۔ ایسے سارے کام ناجو کر سکتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہوتی تو ان کے متعلق سوچنا بھی نہ پڑتا۔ اسے تاج محمد سے مل کر اب ناجو کے رشتے کی بات طے کر لینا چاہیے۔ مگر وہ اس کے پاس آیا کیوں نہیں؟ ہو سکتا ہے نا اس کا پیغام دینا بھول گئی ہو۔

لالی اپنی جھونپڑی سے دور ہی تھا کہ ایک موڑ پر تاج محمد مل گیا۔ چلتے ہوئے اس کی کمر اس طر جھکی ہوئی تھی کہ وہ اپنی عمر سے کچھ زیادہ ہی بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ لالی بڑھ کر اس کے قریب گیا اور جا

شکوہ کیا۔

"چاچا میں نے تجھے بلایا تھا تو آیا نہیں۔"

"تو نے مجھے کیوں بلایا تھا؟" تاج محمد نے دریافت کیا۔

"مجھے ناجو کے بارے میں تجھ سے بات کرنی تھی۔" لالی نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔ "میں ناجو ے بیاہ کرنے پر تیار ہوں۔"

"پر تجھے تو ہتھیرا بن کر یہاں ٹھہرنا نہیں۔" تاج محمد کے لہجے میں تلخی تھی۔ "کہتا تھا یہ تو رکاری جیل سے بھی بری جیل ہے۔ شادا آئے گا اور پیشگی ادا کر کے تجھے لے جائے گا۔"

"ان دنوں میں نیا نیا آیا تھا۔ ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں سوچتا تھا۔ اب تو مجھے یہیں رہنا ہے۔ ور ہتھیرا بن کر ہی رہنا ہے۔" لالی نے صفائی پیش کی۔ "چاچا' تو نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جس کی یک بار بھٹے سے چھٹی کر دی جاتی ہے وہ واپس نہیں آتا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا جاتا ہے۔" اس کے چہرے پر افسردگی کے سائے پھیل گئے۔ "نیرا کی طرح شادا بھی اپنے رب کے پاس چلا گیا۔"

"تیرا مطلب ہے شادا مر گیا۔"

"ایسا ہی لگتا ہے۔" لالی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "زندہ ہوتا تو ضرور واپس آتا اور پیشگی ادا کر کے مجھے اپنے ساتھ لے جاتا۔ اس نے مجھ سے پکا وعدہ کیا تھا۔"

"مجھے یہ تو پتہ نہیں اس نے تجھ سے کیا وعدہ کیا تھا۔ پر میں یہ جانتا ہوں وہ زندہ ہے۔" تاج محمد نے لالی کو مطلع کیا۔ "آج کل اڈہ لاریاں جوند سنگھ والا میں ہوتا ہے۔ اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ دونوں اڈے پر بھیک مانگتے ہیں۔"

لالی نے چونک کر تاج محمد کو دیکھا۔ حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "تجھے کس نے بتایا کہ شادا زندہ ہے؟"

"جمعدار بتاتا تھا۔ اس نے شادا اور اس کی ماں کو جوند سنگھ والا میں بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تھا۔" تاج محمد نے لالی کو بتایا۔ "جمعدار پچھلے دنوں ہتھیروں کی بھرتی کرنے کے لیے ادھر بھی گیا تھا۔"

"چاچا' تو سچ کہہ رہا ہے؟" لالی نے اس طرح حیرت کا اظہار کیا جیسے اسے تاج محمد کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

"مجھے تجھ سے جھوٹ بول کر کیا لینا۔" تاج محمد نے وضاحت کی۔ "جمعدار نے مجھے جو بتایا میں نے تجھے بتا دیا۔" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "پر جمعدار کو یہ نہ بتانا میں نے تجھے شادا کے

بارے میں بتایا ہے۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچے۔ بیکار میں میرے گلے پڑ جائے۔ تجھے پتہ ہے اس کام کتنا برا ہے۔"

"چاچا، تو اطمینان رکھ میں جمعدار سے شادا کے بارے میں کوئی گل بات نہیں کروں گا۔" لا نے اسے یقین دلایا اور ایک بار پھر حرف مطلب پر آگیا۔ "یہ بتا۔ ناجو کے بارے میں اب کیا ہے؟ میں نے تو تیری بات مان لی۔"

تاج محمد نے کچھ نہ کہا۔ سر جھکائے چپ چاپ لالی کے ساتھ چلتا رہا۔

لالی نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔ "چاچا تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"سمجھ نہیں آتی کیا جواب دوں۔"

"کیوں؟" اس نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔

"تجھے پتہ ہے۔ ناجو کی ماں تو بیمار ہی رہتی ہے۔ ہر دم منجی پر پڑی ہائے ہائے کرتی رہتی میں بھی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ مجھ سے اب کام نہیں ہوتا۔ نکا بہت چھوٹا ہے۔" تاج محمد ٹھہر ٹھہ اپنی پریشانی بیان کرتا رہا۔ "ناجو ویاہ کر چلی گئی تو ہم سب کا کیا بنے گا۔ سچ پوچھ تو اکیلی ناجو ہی کرتی ہے۔ وہ کام نہ کرے تو کھانے کو روٹی بھی نہ ملے۔"

اس کا جواب سن کر لالی بہت چکرایا۔ حیرت بھی ہوئی، غصہ بھی آیا۔ جل کر بولا۔ "چاچا، نے تیرے آگے ہاتھ تو نہیں جوڑے تھے۔ تو نے خود ہی تو کہا تھا کہ ناجو کو اپنی گھر والی بنا لے۔ تو نے اس کے رشتے کی بات کی تھی تب تو نے یہ باتیں نہیں سوچی تھیں۔"

"تب تو جمعدار کا ڈر تھا۔" تاج محمد نے جواز پیش کیا۔

"اور اب جمعدار نیک بندہ بن گیا ہے۔ تو سمجھتا ہے اب وہ ناجو کو کرندوں سے نہیں اٹھوا گا۔" لالی ہنوز جھنجلایا ہوا تھا۔ تاج محمد کا رویّہ اسے سخت ناگوار گزرا تھا۔ "کہتا تھا مجھے بدنامی بچا لے۔ ناجو کو برباد ہونے سے بچا لے۔" وہ غصے سے بڑبڑانے لگا۔ "کبھی کچھ کہتا ہے کبھی پتہ نہیں کیسا بندہ ہے؟ ایک دم خود غرض اور نکما۔"

"بکواس نہ کر۔" تاج محمد بھی ایک دم بھڑک اٹھا۔ "ناجو میری دھی ہے۔ میں جب چاہے ویاہ کروں۔ جس سے چاہوں کروں۔ یہ میری مرضی ہے۔ تو مجھ سے پوچھنے والا کون؟" اس صاف انکار کر دیا۔ "مجھے ناجو کا ویاہ تیرے ساتھ نہیں کرنا۔"

لالی سکتے میں آگیا۔ کچھ کہتے نہ بن پڑا۔ تاج محمد نے بھی مزید بات چیت نہیں کی۔ مڑا اور جھگی کی جانب چلا گیا۔

☆

لالی اب زیادہ مستعدی اور جانفشانی سے کام کرنے لگا تھا۔ وہ سویرے ہی سویرے اپنے تھلّے پر ہ جاتا اور شام کو اس وقت تک اینٹیں بناتا رہتا جب تک اندھیرا گہرا نہ ہو جاتا۔ ہفتے کے روز چھٹّا ا تو وہ منشی رحمت کی ہر طرح خوشامد کرتا۔ کم سے کم پیشگی کٹواتا اور زیادہ سے زیادہ مزدوری وصول نے کی کوشش کرتا۔

سردی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ دن میں دھوپ مزا دیتی اور رات کو آگ کے قریب بیٹھنے میں ـ آتا۔ جن بھٹہ مزدوروں اور پتھیروں کے پاس سردی سے محفوظ رہنے کے لیے گرم بستر نہیں ، وہ چمنی کے ارد گرد لیٹ جاتے۔ حرارت اور گرمی حاصل کرتے اور صرف ایک سوتی چادر ھ کر کسی نہ کسی طرح رات بسر کرتے۔ لحاف اور رضائیاں بنانے کے لیے پیشگی حاصل کرنے کی شش کی جاتی۔ جمعدار کی طرح طرح سے خوشامد ہوتی۔ منشی کو راضی کیا جاتا۔ وہ ہر ضرورت مند رخواست قبول بھی کر لیتا۔ اس لیے کہ برسات اور جاڑے میں پیشگی دینے کا عام دستور تھا۔ پیشگی تو دے دیتا مگر بھٹہ مالک کی ہدایت پر سختی سے عمل کرتا۔ ہیرا پھیری اور جعل سازی کرنے باز نہ آتا۔ جتنی پیشگی دیتا اس سے زیادہ رقم رجسٹر میں درج کرتا۔ ان پڑھ پتھیروں اور بھٹہ روں کو مطلق علم نہ ہوتا کہ منشی نے ان کے نام کتنی پیشگی لکھی ہے۔ وہ آنکھ بند کر کے انگوٹھا تے اور جتنی رقم ملتی خوشی خوشی لے لیتے۔

لالی بھی پیشگی لینا چاہتا تھا اور زیادہ سے زیادہ لینا چاہتا تھا۔ حالانکہ اس کے پاس ڈیڑھ سو سے زیادہ روپے موجود تھے۔ مگر تاج محمد سے گفتگو کرنے کے بعد وہ زیادہ سے زیادہ رقم اکٹھا کرنے کر میں رہتا۔ اسی مقصد کے تحت وہ ایک رات جمعدار کے پاس پہنچا۔

معدار کی جھونپڑی بھٹے کے ایک گوشے میں الگ تھلگ تھی۔ اس کی دیواریں پختہ تھیں جو اور ٹوٹی پھوٹی اینٹوں سے تعمیر کی گئی تھیں۔ ان کی چنائی بھٹے سے نکلنے والی سرخ راکھ سے کی ئی۔ اس کی جھونپڑی دوسری جھونپڑیوں اور جھگیوں سے بڑی بھی تھی۔

لالی اس کے پاس پہنچا تو اول شب تھی۔ جمعدار اس وقت تنہا تھا۔ چارپائی پر تھکا ہوا سا بیٹھا لالی کو دیکھ کر اس نے پوچھا۔

کیسے آیا؟"

تجھے ملنے آیا تھا۔" لالی نے جاتے ہی خوشامد شروع کر دی۔ "جمعدار، بہت تھکا ہوا نظر آرہا لگتا ہے آج تجھے بہت کام کرنا پڑا۔ ویسے تجھے تو روز ہی بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ سچ پوچھ تو بھٹہ

توہی چلاتا ہے۔" لالی اس کے سرہانے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اس کے کندھے آہستہ آہستہ دبانے لگا۔

"تو نے بتایا نہیں کیسے آیا؟" جمعدار نے مسکرا کر پوچھا۔

"تیری مدد چاہیے ہے۔" لالی کے لہجے میں عاجزی تھی۔

"کیسی مدد؟" جمعدار کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "چھٹی کے لیے تو نہیں آیا؟ ایسی گل بات نہ کرنا۔ اس کے بارے میں تو سوچنا بھی نہیں۔"

"نہیں جی' مجھے چھٹی شٹی نہیں چاہیے۔" لالی نے فوراً تردید کی۔ "مجھے تو پیشگی چاہیے ہے۔"

"تو میرے پاس کیوں آیا؟ منشی کے پاس جا۔ وہ تو آج کل سب ہی کو پیشگی دنے رہا ہے۔"

"مجھے کچھ زیادہ ہی پیشگی لینی ہے۔" لالی اور بھی زیادہ مستعدی سے جمعدار کے کندھے دبانے لگا۔ "تو منشی سے کہہ دے گا تو جتنی پیشگی کے لیے کہوں گا وہ دے دے گا۔ مجھے پتہ ہے وہ تیری سفارش پر انکار نہیں کر سکتا۔"

"کتنی پیشگی تجھے چاہیے؟"

"چاہیے تو چار سو ہیں۔ پر تین سو بھی مل جائیں تو کام چل جائے گا۔"

"تین سو تو بہت ہوئے۔ تجھے تو پہلے ہی بہت وڈی پیشگی ادا کرنی ہے۔" جمعدار نے مسکرا کر اپ رد عمل کا اظہار کیا۔ "اتنی زیادہ پیشگی لے کر تاجا کی کڑی تاجو سے ویاہ تو نہیں کرنا؟" اس نے لالی کو خبردار کیا۔ "پر تجھے یہ پتہ ہونا چاہیے تاجو میری رکھیل ہے۔ جب چاہتا ہوں رات کو اسے بلا ہوں۔ مفت میں رکھیل بنا کر نہیں رکھا۔ جتنی تاجو کو ہر ہفتے دہاڑی ملتی ہے اتنی ہی اس کے پیو کو کام کئے دیتا ہوں اور اپنے ڈب سے نکال کے دیتا ہوں۔" اس کا لہجہ اچانک تند اور تلخ ہو گیا۔ "تاجو سے ویاہ کرنے کا دھیان دل سے نکال دے ورنہ بہت پچھتائے گا۔"

"نہیں جی' مجھے تاجو سے ویاہ نہیں کرنا۔ کسی نے تجھے غلط بتایا۔" لالی کے دل کو سخت دھچکا لگا مگ اس نے خود کو سنبھالا۔ فوراً بات بنائی۔ "میں اس سے کیوں ویاہ کرنے لگا۔ میری گھر والی نہیں ہے؟"

"تیرا ویاہ ہو چکا ہے؟"

"کئی سال ہو گئے۔ اب تو دو نکوں کا پیو ہوں۔" لالی نے نہایت ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ "گھ والی کو روپے بھیجنے کے لیے تو پیشگی مانگ رہا ہوں۔ وہ بیمار رہتی ہے۔ ادھار بھی اس نے بہت رکھا ہے۔" وہ گڑگڑانے لگا۔ "چار سو پیشگی دلا دے۔ جمعدار تیری بہت مہربانی ہو گی۔"

"تو کہتا ہے تو چار ہی سو دلوا دوں گا۔ پر تو گھر والی کو روپے بھیجے گا کیسے؟ منی آڈر کرنے کے لیے ڈاک خانے جانے کی اجازت نہیں۔" جمعدار نے تیکھے لہجے میں کہا۔ قدرے تامل کے بعد بولا۔ "جتنے روپے بھیجنے ہوں' مجھے دے دینا۔ میں منی آڈر کروا دوں گا۔ تجھے رسید مل جائے گی۔ دوسرے وتھیروں کے لیے بھی ایسا ہی کرتا ہوں۔"

"کب تک مل جائے گی یہ پیشگی؟"

"میں کل سویرے منشی کو بول دوں گا۔ تو دوپہر کو اس کے پاس چلا جانا۔ وہ تجھے روپے دے دے گا۔" جمعدار اکبر سانول نے لالی کو مطلع کیا۔ "میں چند دنوں بعد وتھیرے لینے بھاول نگر جاؤں گا۔ نیں نوں جھیتی نال روپے منی آڈر کرنے ہوں تو مجھے پرسوں دے دینا۔ ورنہ واپسی پر تیرا کام کر وں گا۔"

"تیری بہت بہت مہربانی۔" لالی نے منی آرڈر بھیجنے کے بارے میں مزید بات چیت نہیں کی۔ معدار کے کندھے اور زیادہ مستعدی سے دبانے لگا۔

"اب تو ٹر جا۔" جمعدار نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے آج رات تاجو کو بلایا ہے۔ وہ آتی ہی ہو لی۔"

لالی باہر نکلا اور اپنی جھونپڑی کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ اندھیرے میں دو ائے نظر آئے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ سائے قریب آ گئے۔ لالی نے دونوں کو پہچان لیا۔ اج محمد آگے آگے تھا اور تاجو اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ تاج محمد نے اس کی جانب کوئی توجہ دی۔ لیکن تاجو مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ لالی نے نہ اسے ٹوکا نہ روکا۔ خاموشی سے ان ے برابر سے گزر گیا۔ لیکن اس نے دل میں ہلکی سی کسک محسوس کی۔

دوسرے روز دوپہر کو وہ منشی رحمت کے پاس گیا۔ جمعدار نے حسب وعدہ سویرے ہی سویرے ی سے اس کی سفارش کر دی تھی۔ اس نے مسکر کر لالی کو دیکھا' پوچھا۔ "پیشگی لینے آیا ہے؟" ر رجسٹر کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ "یہاں انگوٹھا لگا دے۔" منشی نے انگلی رکھ کر بتایا۔

لالی نے پڑھا۔ رجسٹر میں چار سو کے بجائے سات سو کی رقم کا اندراج کیا گیا تھا۔ اسے غصہ تو ت آیا۔ مگر ضبط سے کام لیا۔ اس نے نہ اعتراض کیا نہ احتجاج۔ وہ منشی پر یہ واضح کرنا نہیں چاہتا ا کہ وہ لکھ پڑھ بھی سکتا ہے۔ اس نے خاموشی سے انگوٹھا لگایا۔ منشی سے چار سو روپے لے کر ردھوتی کے ڈب میں رکھ لیے۔

☆

لالی کے پاس اب ساڑھے پانچ سو سے بھی زیادہ روپے تھے۔ وہ جلد سے جلد بھٹے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اسے صرف جمعدار اکبر سانول کے بہاول نگر جانے کا انتظار تھا۔ اس کی موجودگی میں فرار ہونا خطرناک تھا۔ وہ بڑا گھاگ اور بے ڈھب جمعدار تھا۔ برسوں سے جمعداری کر رہا تھا۔ ہر پتھیرے پر نظر رکھتا تھا اور ہر وقت چوکنا رہتا تھا۔

لالی کی ان دنوں یہی کوشش رہتی کہ جمعدار سے آمنا سامنا نہ ہو۔ مبادا وہ منی آرڈر کے بارے میں پوچھ بیٹھے۔ جمعدار نظر بھی آتا تو وہ اس قدر انہماک سے کھٹا کھٹ اینٹیں بنانے لگتا گویا اسے دیکھا ہی نہیں۔ اس کی گردن جھکی ہوتی اور ہاتھ تیزی سے چلتے رہتے۔ شام ہوتے ہی وہ کام ختم کرتا۔ سیدھا اپنی جھونپڑی میں جاتا اور چولہا جلا کر کھانا پکانے میں مصروف ہو جاتا۔

چند ہی روز بعد جمعدار بہاول نگر چلا گیا۔ وہ صرف دو روز کے لیے گیا تھا۔ انھی دو دنوں میں لالی اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔ وقت بہت کم تھا اور اسے جو کچھ کرنا تھا جلد سے جلد کرنا تھا۔ مگر ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر اور پوری احتیاط سے اٹھانا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر فرار ہوتے ہوئے پکڑا گیا تو ایسی ہولناک سزا ملے گی جس کے تصور ہی سے وہ لرزہ براندام ہو جاتا۔ ملک نثار محمد کے بھٹے سے فرار ہونے کی پاداش میں جمعدار زماں خان نے اس کی جو درگت بنائی تھی اسے اب تک فراموش نہ کر سکا تھا۔

دن میں تو فرار ہونے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ رات کے اندھیرے میں ایسی کوشش کی جا سکتی تھی۔ بھٹہ میلسی کی آبادی سے الگ تھلگ ایک ویرانے میں تھا۔ اس کا محل وقوع کچھ اس طرح تھا کہ رات کو بھی فرار ہونا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس کے اردگرد دور تک پھیلا ہوا لق و دق میدان تھا۔ جس میں پیلو اور ببول کے اکا دکا درخت تھے۔ جھاڑیاں کہیں کہیں تھیں اور اتنی گھنی اور اونچی بھی نہ تھیں کہ ان کی اوٹ میں دبک کر چھپا جا سکے۔ میدان سے گزرنے والا دور ہی سے نظر آتا تھا۔

بھٹے کے صرف ایک طرف کھیت تھے جن کا سلسلہ بستی ۲۰۳ ڈبلیو بی تک جاتا تھا۔ ان میں کماد فصل تیار کھڑی تھی۔ اگر لالی کسی طرح ان کھیتوں کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو کے اونچے اونچے پودوں میں چھپتا چھپاتا آسانی سے فرار ہو سکتا تھا۔ مگر کماد کے کھیتوں کی دن را نگرانی کی جاتی تھی۔ رات کو یہ نگرانی اور سخت کر دی جاتی۔ کھیتوں کے آگے مٹی کی لگ بھگ فٹ اونچی دیوار تھی جسے زمیں دار نے اپنی فصلوں کو مویشیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے تعمیر کر تھا۔ بھٹے کا ایک چوکیدار اس دیوار کے سامنے رات بھر چوکس کھڑا نگرانی کرتا رہتا تھا۔ اگر ک پتھیرا یا بھٹہ مزدور بھولے سے بھی کھیتوں کے قریب چلا جاتا تو وہ سختی سے ڈانٹتا تھا اور چھتر سنبھال کر مارنے کے لیے جھپٹتا تھا۔ ہاتھ آ جاتا تو دو چار چھتر لگانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔

اس روز آسمان ابر آلود تھا۔ ہوا بھی سنکی ہوئی تھی۔ سردی چمک گئی تھی۔ لالی کام ختم کر کے شام کو اپنی جھونپڑی میں پہنچا تو بدن میں سردی سے ہلکی ہلکی کپکپاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چولہا روشن کیا۔ کھانا پکانے سے پہلے چائے تیار کی۔ پیالے میں انڈیلی اور گرم گرم چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔ تھکا ہوا بھی تھا۔ چائے پینے میں بڑا لطف آیا۔ اسی اثناء میں بھٹے کا ایک کارندہ نواز گل آ گیا۔ وہ ریاست دیر کا اتمان زئی پٹھان تھا۔ اس کی عمر ۴۰ برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ مگر جسم مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ وہ ان کارندوں میں سے تھا جن سے لالی نے شناسائی اور کچھ میل جول پیدا کر لیا تھا۔ نواز گل کبھی کبھار لالی کی جھونپڑی میں بھی آ جاتا اور وہ بھی چائے پینے کے لیے۔ ورنہ چپ چاپ اس کی جھونپڑی کے سامنے سے گزر جاتا۔ وہ اس وقت یہ معلوم کرنے کے لیے گشت پر نکلتا تھا کہ تمام پتھیرے کام ختم کر کے اپنی جھونپڑیوں میں پہنچ گئے کہ نہیں۔ پتھیرے عام طور پر گڑ کی چائے بناتے تھے‘ مگر لالی گڑ کے بجائے چائے میں شکر ڈالتا تھا۔ لہٰذا اس کی چائے نواز گل کو پسند بھی آتی تھی۔

لالی چولہے کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے نواز گل کو اپنے قریب بٹھایا۔ پیالے میں چائے ڈالی اور پیالہ اس کی جانب بڑھا دیا۔ نواز گل بھی چائے پینے لگا۔

لالی نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ”لالہ‘ آج سردی بہت ہے۔“

”سردی ادھر کہاں پڑتا ہے۔“ نواز گل نے بے نیازی کا اظہار کیا۔ ”سردی تو دیر میں پڑتا ہے۔ آج کل تو وہاں برف گرتی ہے۔ ہر طرف سفید سفید برف نظر آتی ہے۔ درختوں پر‘ مکانوں کی چھتوں پر‘ راستوں پر۔“

”تب تو سارے ہی راستے بند ہو جاتے ہوں گے۔ کوئی کام دھندا نہیں ہوتا ہو گا۔“

”ہاں جی‘ چھ مہینے تک کوئی کام دھندا نہیں ہوتا۔“

”بہت مشکل سے گزر بسر ہوتی ہو گی۔“ لالی نے دریافت کیا۔ ”تم ادھر کیا کرتے تھے؟“

”جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا تھا۔ اسے فروخت کرتا تھا۔ مزدوری کرتا تھا۔“ نواز گل نے لالی کو بتایا۔ ”ان دنوں امارا باپ زندہ تھا۔ میں چھوٹا تھا۔ شادی بھی نہیں ہوا تھا۔ باپ کے ساتھ بلزئی چلا جاتا۔ بلزئی دیر سے آٹھ میل آگے ہے۔ بلزئی سے پیٹھ پر دو ڈھائی من بوجھ اٹھا کر عشریت تک لے جاتا تھا۔ یہ تیس میل سے بھی زیادہ لمبا راستہ ہے۔ اور بہت خطرناک ہے۔ کہیں سیدھی

چڑھائی ہوتی کہیں ایک دم ڈھلوان آجاتا۔ راستے میں لواری کی چوٹی پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ بہت اونچی چوٹی ہے۔ نیچے دیکھو تو سر چکرانے لگے۔"

"یہ تو سخت محنت کا کام تھا۔ بہت خطرناک بھی تھا۔" لالی نے تبصرہ کیا۔

"کہیں کہیں تو راستہ اتنا تنگ ہوتا کہ کسی مزدور کا پیر پھسل جاتا یا پتھر سے ٹھوکر لگ جاتا تو لڑھک کے نیچے ایسے گہرے کھڈ میں جاتا کہ لاش نکالنا بھی مشکل ہو جاتا۔ راستے میں پہاڑوں کی چوٹیوں سے برف کے تودے گرتے تھے۔ بہت مزدور ان کے نیچے دب کر مرجاتے۔" نواز گل نے گہری سانس بھری۔ "امارا باپ بھی ایسے ہی تودے کے نیچے دب کر مر گیا۔ کئی مہینے بعد جب برف پگھلی تو لاش نکالی گئی۔" اس نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ "بڑی سخت مزدوری تھی۔"

"پر مزدوری تو چنگی ملتی ہوگی۔"

"ٹھیکیدار پانچ روپی فی من مزدوری دیتا تھا۔" نواز گل نے بتایا۔ "جس دن کام نہیں ملتا تو جیری کین ہوتا۔ کوئی مزدوری نہیں ملتا تھا۔ سات میل پیدل آنے جانے کا سفر بالکل بے کار جاتا۔ ایسا تب ہوتا تھا جب عشریت سے چترال جانے کے لیے کوئی سامان نہ ہوتا۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "باپ کے مرنے کے بعد ام بلزئی سے دیر واپس آگیا۔"

"دیر میں اینٹیں بنانے کے بھٹے نہیں ہوتے؟" لالی نے دریافت کیا۔

"نہیں، بھٹے پشاور میں ہوتے ہیں' دیر میں بھٹے مٹے نہیں ہوتے۔ لکڑی سے مکان بنائے جاتے ہیں۔" نواز گل نے جواب دیا۔ "زیادہ تر مکان نواب محمد شاہجہاں خان کے ہیں۔ وہ ادھر کا حاکم ہے۔ مکان کا کرایہ چار روپی فی مربع گز کے حساب سے وصول کیا جاتا ہے۔ کرایہ زیادہ ہوتا ہے اس لیے ایک ایک کمرے میں دس دس بارہ بارہ لوگ رہتا ہے۔ وہیں بھیڑ بکریاں بھی رکھی جاتی ہیں۔" اس نے نظر بھر کر لالی کی جانب دیکھا۔ "کرائے میں دیری ہو تو جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟ نواب کے ملازم سامان اٹھا کر باہر ڈال دیتے ہیں۔ زبردستی مکان خالی کرا لیتے ہیں۔ کرائے دار کو باہر کھڑا کر دیتے ہیں۔ چاہے برف باری ہوتی ہو یا طوفان آیا ہو۔ وہ ذرا بھی ترس نہیں کھاتے۔ کوئی رعایت نہیں کرتے۔ کرائے داروں کے لیے نواب کا یہی حکم ہے۔"

"تب تو ادھر بہت ظلم ہوتا ہے۔"

"یارا تم کو کیا پتہ کتنا ظلم ہوتا ہے؟" نواز گل نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "نواب کی ضرورت کے لیے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانی پڑتی ہیں۔ مویشیوں کے لیے گھاس لانی پڑتی ہے۔ وہ شکار پر جاتا ہے تو اس کے کتوں کے ساتھ دوڑنا پڑتا ہے۔ محل اور قلعے بنانے ہوتے ہیں۔ زمین کاشت کرنی ہوتی ہے۔ صبح سے شام تک بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ مگر اس کا کوئی دہاڑی کوئی مزدوری نہیں ملتا۔" اس نے چائے کا بڑا گھونٹ بھرا۔ "ایسی بیگار نواب کے لیے کرنی پڑتی ہے اور خوانین کے لیے بھی۔ خوانین بھی بڑے زمیں دار ہوتے ہیں۔ ہر کسان کو جو اپنی زمین پر کاشت کرتا ہے اسے اپنے خاندان کا ایک جوان بیگار کے لیے دینا لازمی ہے ورنہ زمین کا ایک حصہ نواب یا خوانین کو دینا پڑتا ہے۔ کوئی ایسا نہ کرے تو اسے دیر یا چکدرہ کی جیل میں بند کر دیا جاتا ہے۔"

رات اب آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ چولہے میں جلتی ہوئی لکڑیوں سے شعلے ابھر کر لہرا رہے تھے۔ ان کی روشنی میں نواز گل کا سرخ چہرہ اور زیادہ سرخ نظر آرہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں۔ وہ چائے کے گھونٹ بھرتا رہا اور لالی کو بتاتا رہا۔

"بیگار تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ نواب کسانوں سے مویشی رکھنے پر کلنگ بھی وصول کرتا تھا۔ یہ ٹیکس گھی کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ جتنے زیادہ مویشی ہوں اتنا ہی زیادہ گھی لیا جاتا ہے۔ ۳۰ سیر سے من بھر تک سالانہ گھی لیا جاتا ہے۔ نواب اپنے نوکروں اور کرندوں کو کوئی تنخواہ نہیں دیتا۔ ان کے گزارے کے لیے ہر خاندان سے دس سیر غلہ فصل پر وصول کیا جاتا ہے۔ کسی کے بچہ پیدا ہو تو ایک مرغ اور ایک روپیہ نواب کو دینا ہوتا ہے۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "وہ کیا کیا ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔ نواب زادگان اور خوانین کے علاوہ ریاست میں کسی کو اجلا لباس پہننے کا اجازت نہیں۔ مکانوں پر ٹین کی چھت ڈالنے اور کھڑکی یا روشن دان پر شیشہ لگانے کا اجازت نہیں۔ کوئی اس کا حکم نہ مانے تو جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ٹوپی نہ پہنے تب بھی جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ لیکن نواب زادگان ٹوپی نہیں پہنتے۔"

"لالہ' ریاست کا نواب کیسا بندہ ہے؟" لالی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"عیش کرتا ہے۔ بہت عالی شان محل میں رہتا ہے۔ ایک نہیں اس کے کئی شاندار محل اور قلعے ہیں۔" نواز گل نے لالی کو بتایا۔ "وہ زبردست خنزیر ہے۔ اس کی چھ تو زنانیاں ہیں۔ دو سو عورات ہیں جو اس کی داشتائیں ہیں۔ ریاست میں کوئی خوبصورت لڑکی نظر آجائے تو اسے بلوا کر محل میں زبردستی رکھ لیتا ہے۔"

"وہ پاگل تو نہیں ہو گیا؟" لالی نے جل کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"اس کا باپ نواب اورنگ زیب خان اس سے بھی بڑا پاگل کا بچہ تھا۔" نواز گل کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ "نواب اورنگ زیب خان کی ایک زنانی بہت خوبصورت تھی۔ اس سے اسے بہت محبت تھی۔ وہ مر گئی تو نواب اورنگ زیب خان نے بہت غم منایا۔ اسی غم میں اس پاگل کے

بچے نے خدا کے نام انگریز پولیٹکل ایجنٹ کی معرفت ایک چٹھی بھیجی۔ اس میں لکھا۔ اللہ تعالیٰ! اگر تو اپنی رحمت سے میری زنانی کو دوبارہ زندہ کر دے تو میں تو تیرے نام پر دو سو بھیڑوں کی قربانی کروں گا۔ نمازیں پڑھوں گا۔ ہر سال حج کروں گا۔ اس چٹھی پر اس نے ریاست کی سرکاری مہر لگائی۔ دستخط کیے۔ اپنے پیر سے اس پر سفارش لکھوائی اور رجسٹری سے بھجوا دی۔ نواب مدت تک جواب کا انتظار کرتا رہا۔ اس کا ایک ملازم روزانہ صبح شام ڈاک خانے جاتا اور یہ معلوم کرتا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی درخواست کا جواب آیا کہ نہیں۔"

"یار نواز گل' تو سچ کہہ رہا ہے؟" لالی نے حیران و پریشان ہو کر نواز گل کی جانب دیکھا۔

"یہ بالکل سچ ہے۔" نواز گل نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "ریاست دیر کا ہر رہنے والا یہ بات جانتا ہے۔"

"ادھر تو سچ مچ بہت ظلم ہوتا ہو گا۔" لالی نے اظہار خیال کیا۔

"نواب محمد شاہجہاں خان کے علاوہ بڑا خان ہے۔ وہ بھی کسانوں اور مالا تاروں پر بہت ظلم کرتا ہے۔"

"یہ مالا تار کون ہوتے ہیں؟" لالی نے اظہار خیال کیا۔

"مالا تار وہ مزارع یا کسان ہوتے ہیں جو زمین کے مالک کو بٹائی نہیں دیتے۔ گھی' بکریاں اور مرغیاں دیتے ہیں۔ عشر ادا کرتے ہیں جو فصل کا دسواں حصہ ہوتا ہے۔" نواز گل کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ "یارا تم کو کیا کیا بتائیں۔ سرحد کے دوسرے خوانین جو بڑے زمیں دار ہیں غریب لوگ پر ایسا ہی ظلم کرتے ہیں۔ کسان پہاڑ اور چٹانیں کھود کو کھیتی باڑی کے لیے زمین نکالتے ہیں۔ اس پر فصل اگاتے ہیں۔ خوانین انھیں بے دخل کر کے خود زمین کے مالک بن جاتے ہیں۔" اس نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔ "امارا ایک رشتے دار شالی ہشت نگر کے موضع کنڈو میں کھیتی باڑی کرتا تھا۔ خان نے پولیس کو رشوت دے کر اس کے خلاف مقدمہ بنوایا۔ اس کا زمین قرق کروایا۔ اس کا گھر بار سب کچھ تباہ ہو گیا۔ آخر وہ پریشان ہو کر محنت مزدوری کرنے کراچی چلا گیا۔ ام کو بھی وہی کراچی لے گیا تھا۔"

نواز گل نے چائے ختم کر کے پیالہ رکھ دیا۔ اٹھنے کے لیے پہلو بدلا۔ کہنے لگا۔ "اب میں روانہ جاؤں گا۔ تجھ سے آج بہت باتیں کر لیں۔"

لالی نے اسے جانے نہ دیا۔ بے تکلفی سے بولا۔ "یار' تھوڑی دیر تو اور بیٹھ۔ تو نے بہت عجیب غریب باتیں بتائیں۔" اس نے نواز گل کے پیالے میں اور چائے ڈال دی۔ "لے ایک پیالہ چائے ورپی۔ اسے ختم کر کے چلا جانا۔"

نواز گل نے انکار نہ کیا۔ پیالہ اٹھا کر چائے پینے لگا۔

"تو کراچی کتنا عرصہ رہا؟" لالی نے پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔

"ادھر ام سات سال رہا۔" نواز گل نے بتایا۔ "وہاں بھی مزدوری کرتا تھا۔"

"کراچی تو نے کیوں چھوڑ دیا؟"

"ام اور سرحد کا دوسرا لوگ ادھر ایک خالی میدان میں جھگیاں ڈال کر رہتا تھا۔ وہ کسی ہندو کا زمین تھا۔ وہ ہندوستان چلا گیا تھا۔ ایک مسلم لیگی لیڈر نے وہ زمین اپنے نام الاٹ کرا لیا۔ ام کو بولا۔ زمین خالی کر دو۔" نواز گل نے تلخی سے کہا۔ "وہی بے دخلی کا چکر ادھر بھی شروع ہو گیا جس کی وجہ سے ام سرحد سے کراچی آیا تھا۔"

"آگے کیا ہوا؟" لالی نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"ام نے زمین خالی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے بہت ڈرایا دھمکایا۔ پولیس کو بھی لایا۔ مگر ام نے زمین خالی نہ کیا۔"

"تب اس نے کیا کیا؟"

"اس خنزیر نے ایک رات اماری جھگیوں میں آگ لگوا دی۔" نواز گل نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس رات ہوا بھی بہت تیز چل رہی تھی۔ ساری ہی جھگیاں جل گئیں۔ ایک بھی نہ بچی۔ سامان بھی جل گیا۔ ایک زنانی اور دو بچے بھی جل کر مر گئے۔"

"سب نے اس کے خلاف پولیس میں پرچہ نہیں درج کرایا؟"

"اخبار میں اس کا خبر بھی چھپا۔ لیکن نہ پولیس نے اس کے خلاف کارروائی کیا نہ سرکاری افسروں نے۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ ام کو وہ جگہ چھوڑنا پڑا۔" نواز گل نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ام ایسا مایوں ہوا کہ کراچی چھوڑ دیا۔ پر وطن واپس نہیں گیا۔ ادھر آ گیا۔"

"یہاں تو تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔

"کیا ٹھیک ٹھاک ہے۔" نواز گل نے منہ بگاڑ کر بے زاری کا اظہار کیا۔ "کام بہت زیادہ ہے۔ رات کو ڈیوٹی دو۔ دن میں بھی کام کرو۔ اور پگار بہت کم۔ تم کو تو پیشگی ملتا ہے۔ ام کو تو وہ بھی نہیں ملتا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "گھر خرچہ بھیجنا ہے۔ زنانی بیمار ہے۔ بچہ بھی بیمار ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہاں سے ان کو خرچہ مرچہ بھیجا جائے۔"

"تجھے گھر بھیجنے کے لیے کتنے روپے کی ضرورت ہے؟" لالی نے دریافت کیا۔

"پچاس روپے تو کم سے کم بھیجے ہی جائیں۔" نواز گل نے بتایا۔ مگر ساتھ ہی حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا۔ "لیکن تم نے یہ بات کیوں پوچھا؟"

"نواز گل' تو میرا یار ہے۔ میرا بھائی ہے۔" لالی نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔ "مجھے پیشگی ملی ہے۔ میں تیری مدد کروں گا۔" اس نے دھوتی کے ڈب سے سو روپے نکالے اور نواز گل کی جانب بڑھا دیئے۔ "پچاس نہیں سو روپے گھر بھیج دے۔"

"لیکن میں تمہارا یہ روپی کیسے ادا کروں گا؟" نواز گل نے روپے لیتے ہوئے کہا۔

"تو اس کی فکر کیوں کر رہا ہے؟ میں تجھ سے روپے کب واپس مانگ رہا ہوں۔" لالی نے چہرہ افسردہ بناتے ہوئے کہا۔ "میرا پتر بھی سخت بیمار ہے۔ وہ میرا ایک ہی بچہ ہے۔ مجھے اس سے بہت پیار ہے۔ اس کے لیے میں ہر دم پریشان رہتا ہوں۔" اس نے آواز میں رقّت پیدا کی اور منہ بسور کر گویا ہوا۔ "لالہ' اگر وہ مر گیا تو سمجھ نہیں آتی میرا کیا ہو گا؟ تو بھی اپنے پتر کا پیو ہے۔ تو میرے درد کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔"

"پریشان نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اسے شفا دے گا۔" نواز گل اسے تسلی دینے لگا۔ "ام اس کے لیے نماز پڑھنے کے بعد دعا کرے گا۔"

"لالہ' میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔" لالی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "پر میں اس کے پاس کیسے جا سکتا ہوں؟"

"تم تو اس کے پاس نہیں جا سکتا۔" نواز گل نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "تم کو تو بھٹے سے باہر جانے کا بالکل اجازت نہیں۔"

"جا تو سکتا ہوں۔ بس تمہاری تھوڑی سی مدد کی ضرورت ہے۔" لالی نے اس کی صاف گوئی کے باوجود ہمت نہیں ہاری۔

"تم امارا کیا مدد چاہتا ہے؟" نواز گل نے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

"لالہ' بندہ بندے کے کام آتا ہے۔ دنیا میں ایک دوسرے کا کام ایسے ہی چلتا ہے۔" لالی نے اس دفعہ کھل کر بات کی۔ "کل رات تم اپنی ڈیوٹی کھیتوں کی طرف لگوا لو۔"

"امارا تو کل ویسے ہی ادھر کا ڈیوٹی ہے۔ لیکن تم کو اس سے کیا لینا؟" نواز گل بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔

"میں ایک بار کماد کی فصل میں داخل ہو گیا تو سمجھ لو کام بن گیا۔" لالی نے بے دھڑک ہو کر کہا۔

"اور جو کسی نے تم کو ادھر دیکھ لیا۔ دوسرے پہریدار بھی ہیں۔ رات بھر روونڈ پر رہتے ہیں۔" نواز گل نے لالی کو خطرے سے خبردار کیا۔ "تب کیا ہو گا؟"

"تو مجھے سخت ڈانٹ پلاتا۔ گالاں بھی نکالنا۔ ایک آدھ چھتر بھی لگا دینا۔" لالی نے اسے ڈھب پر لانے کی کوشش کی۔ "پرواہ نہ کر۔ میں گالاں چپ کر کے سن لوں گا۔ مار بھی کھا لوں گا۔" لالی نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "پر میں تو ایسے وکھت آؤں گا جب بالکل سناٹا ہو گا۔ آج کل اندھیرا بھی بہت ہوتا ہے۔ کوئی مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔"

"بہت مشکل ہے۔ تم فرار ہو گیا تو جمعدار گرم ہو گا۔" نواز گل نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ "بھٹہ مالک ام کو نوکری سے نکال دے گا۔"

"بھٹہ مالک یا جمعدار کو پتہ ہی کیسے چلے گا میں کدھر سے گیا۔" لالی نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "تو اکیلا تو نہیں۔ دوسرے پہریدار بھی تو ڈیوٹی پر رہتے ہیں۔ ذمہ داری تو سب ہی کی ہوتی ہے۔ وہ کس کس کو نوکری سے نکالے گا۔"

لالی نے بات دل لگتی کہی تھی۔ نواز گل کی سمجھ میں بھی آ گئی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ لالی نے مالی اعانت کے طور پر اسے سو روپے رشوت بھی دی تھی۔ اصرار کر کے بڑے خلوص سے چائے پلائی تھی۔ پوری توجہ اور دلچسپی سے اس کے دکھ درد کی روداد سنی تھی۔ ہر طرح سے دلجوئی کی تھی۔ نواز گل کے لیے انکار کرنے کی گنجائش نہ رہی۔

لالی نے اسے خاموش پایا تو ایک بار پھر خوشامد درآمد سے کام لیا۔ "لالہ' تیری بہت مہربانی ہو گی۔ میں اپنے پتر سے مل لوں گا۔ زندگی بھر تجھے دعائیں دوں گا۔" اس نے بڑے جذباتی انداز میں نواز گل کا ہاتھ دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیا۔

لالی نے ایسے رقّت انگیز لہجے میں بات کی کہ نواز گل پسیج گیا۔ اس کا کندھا تھپکتے ہوئے گویا ہوا۔ "تم اپنے بیمار بچے کے پاس ضرور جائے گا۔" اس نے سینے پر ہاتھ مار کر وعدہ کیا۔ "ام تمارا مدد کرے گا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "کل رات ام ادھر تمارا انتظار کرے گا۔"

نواز گل چلا گیا۔ لالی نے جلدی جلدی روٹی پکائی۔ کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گیا۔ مگر نواز گل کے وعدے کے باوجود اسے پوری طرح یقین نہ تھا کہ بھٹے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے گا۔

☆

رات آدھی سے بھی زیادہ گزر چکی تھی۔ جھونپڑیوں اور جھگیوں میں گہری خاموشی تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ یکایک لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ کوئی ہولے ہولے اس کا

کندھا جھنجوڑ رہا ہے۔ لالی گہری نیند میں تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھا دھندلی دھندلی روشنی میں نواز گل اس کے سرہانے کھڑا ہے۔

اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "نواز گل تم!" وہ سخت حیران و پریشان تھا۔

نواز گل نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر تاکید کی۔ "شی' آہستہ بولو۔" اس نے جھک کر سرگوشی کی۔ "جلدی سے اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ اور امارے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟" لالی ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ سراسیمگی میں بھی مبتلا تھا۔

"کل کی بجائے تم آج ہی رات کو نکل جاؤ۔"

لالی چارپائی سے نیچے اترا۔ نواز گل کے قریب پہنچ کر اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "آج کیوں؟"

"جمعدار کل شام کو واپس آجائے گا۔ اس کے آنے کے بعد تم بھٹے سے باہر نہیں جا سکے گا۔ وہ خنزیر بہت ہوشیار ہے۔" نواز گل نے لالی کو بتایا۔ "جمعدار کے کل شام واپس آنے کا اطلاع ام کو ایک کرندے نے دیا۔ اسے منشی نے بتایا تھا۔"

"مگر لالہ آج رات تو کھیتوں کی طرف دوسرے پہریدار کی ڈیوٹی ہو گی۔" لالی نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "وہ مجھے کیسے جانے دے گا؟"

"تم اس کا فکر نہ کرو۔ سب پہریداروں کو سردی لگتا ہے۔ ادھر چمنی کے پاس آگ سے بدن کو گرم کرتا ہے۔" نواز گل نے وضاحت کی۔ "وہاں بیٹھ کر چائے پیتا ہے۔ کھیتوں کی طرف اب کوئی ڈیوٹی پر نہیں ہے۔ سمجھ گیا؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" لالی نے مسکرا کر گردن ہلائی۔ "تب تو اپنا کام بن جائے گا۔"

نواز گل نے جیب سے سو روپے نکالے اور لالی کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ "لو' اپنا یہ روپی رکھ لو۔ تمارا بچہ بیمار ہے۔ جا کر اس کا علاج ملاج کراؤ۔ تم کو ادھر روپی کا ضرورت ہو گا۔"

لالی نے روپے واپس نہ لیے۔ کہنے لگا۔ "یار' تیرا پتر بھی تو بیمار ہے۔ تیری گھر والی کو اس کے علاج کے لیے روپے کی ضرورت ہے۔ یہ روپے تو اسے بھیج دے۔ میری فکر نہ کر۔ اپنا کام چل جائے گا۔"

"نہیں' یہ روپی ام نہیں لے گا۔ ام نے ایک بار تم کو بول دیا۔ اپنا روپی اپنے پاس رکھو۔" نواز گل نے اس بار سختی سے کہا۔ "باتیں کم کرو۔ جیسا کہتا ہوں ویسا کرو۔ ورنہ تم اپنے بیمار بچے کے پاس نہیں جا سکے گا۔"

نواز گل آگے بڑھا۔ لالی نے خاموشی سے روپے دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے اور نواز گل کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں جھونپڑی سے باہر نکلے۔

بھٹے پر گہرا سکوت طاری تھا۔ ہر طرف کہر کا نیل گوں دھندلکا پھیلا تھا۔ دونوں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے گڑھوں اور ادھر ادھر بکھری ہوئی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں سے بچتے بچاتے آہستہ آہستہ بڑھتے رہے۔ بھٹے کی چمنی دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی۔ اس کے نیچے جلتی ہوئی لکڑیوں کا الاؤ روشن تھا۔ چمنی کے کھلے ہوئے در سے گہری سرخ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس روشنی میں بھٹے پر کام کرنے والے مزدور اور دوسرے لوگ پرچھائیوں کی مانند ادھر ادھر گردش کر رہے تھے۔

سردی اب اور بڑھ گئی تھی۔ لالی کا بدن تھر تھرا رہا تھا۔ وہ بغلوں میں دونوں ہاتھ دبائے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ نواز گل اس سے چند قدم آگے تھا۔ لالی کی نظریں برابر اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ جدھر مڑتا لالی بھی اسی طرف مڑ جاتا۔ چلتے چلتے اس نے کئی بار اندھیرے میں ٹھوکر بھی کھائی مگر سنبھل جاتا۔ ایک بار ایسی ٹھوکر لگی کہ لڑکھڑا کر دھڑام سے گرا۔ گھٹنے پر خاصی کراری چوٹ آئی۔ لیکن نواز گل کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کا خطرہ تھا۔ لہٰذا گھٹنے کے درد کی پرواہ کیے بغیر جلدی سے اٹھا اور لنگڑاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

دونوں چلتے چلتے ایک موڑ سے نکلے تو سامنے کماد کے کھیت تھے۔ نواز گل مٹی کی دیوار سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گیا۔ لالی اس کی جانب بڑھنے لگا۔ قریب پہنچا ہی تھا کہ چمنی کے نیچے پھیلی ہوئی سرخ سرخ روشنی میں ایک پہریدار نظر آیا جو اسی سمت آرہا تھا۔ نواز گل نے اسے دیکھا تو سراسیمہ ہو گیا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"واپس جاؤ' واپس جاؤ۔ پہریدار آتا ہے۔"

مگر لالی منع کرنے کے باوجود نہ رکا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دیوار کی جانب بڑھا۔ نواز گل نے اس بار ڈپٹ کر کہا۔ "تم نے امارا بات نہیں سنا؟ فوراً واپس جاؤ۔"

پہریدار اب سامنے آگیا تھا۔ لالی بدستور خاموش رہا۔ آگے بڑھا اور دیوار کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ نواز گل نے غصے سے چیخ کر کہا۔ "ٹھیرو۔ تم کیدر جاتا ہے؟" وہ جھنجلایا ہوا اس کی طرف جھپٹا۔

لالی نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اچھلا اور دیوار کی بلندی پر دونوں ہاتھ رکھ کر زقند بھری اور گنّے کے اونچے اونچے پودوں کے درمیان جا کر گرا۔ اسی وقت دیوار کے پیچھے آواز ابھری۔

"کون تھا؟ کدھر چلا گیا؟"

"ام نے اسے روکا۔ مگر وہ خنزیر دیوار پھاند کر کھیتوں میں چلا گیا۔ پتہ نہیں کون تھا۔" نواز گل

تیکھے لہجے میں بتا رہا تھا۔ "اندھیرے سے نکلا اور ایک دم غائب ہو گیا۔"

لالی اس سے زیادہ نہ سن سکا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور پودوں کو ہاتھوں سے ادھر ادھر ہٹاتا ہوا کھیتوں کی منڈیر پر سرپٹ دوڑنے لگا۔ کئی بار گنے کے پودوں سے الجھ کر ڈگمگایا۔ لمبے لمبے تیز دھار کے پتوں سے جسم پر جگہ جگہ خراشیں بھی آئیں۔ لیکن رکا نہیں۔ آگے، اور آگے بڑھتا گیا۔

کماد کے کھیتوں سے گزر کر وہ باہر نکلا تو سنسان رڑی میں کھڑا تھا۔ یہ گاؤں کے سامنے کا وسیع میدان تھا۔ اس پار مکانات تھے جو دھند میں لپٹے ہوئے دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ کہیں کہیں روشنی جھلک رہی تھی جو کہر کے جال میں الجھی ہوئی زرد زرد دھبوں کی مانند معلوم ہو رہی تھی۔

لالی رڑی عبور کر کے بستی میں نہ گیا۔ مڑا اور ایک جھنگر میں داخل ہو گیا۔ وہ جنگلی جھاڑیوں اور خودرو پودوں کے درمیان سے گزرتا ہوا انجان راستوں پر چلتا رہا۔ رات تاریک تھی اور سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن کہیں ٹھہرے بغیر اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔ جب وہ موضع قادر بلوچ کے نزدیک پہنچا تو مشرقی افق پر اجالا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ دھند میں الجھی ہوئی سرما کی صبح طلوع ہو رہی تھی۔

میلسی کی بستی پیچھے رہ گئی تھی۔ آگے کوٹ ملک تھا۔ قادر بلوچ سے میلسی روڈ زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ ایک راہ گیر نے اسے یہی بتایا تھا۔ وہ اسی سمت چلتا ہوا میلسی روڈ پر پہنچا تو دن نکل آیا تھا۔ کہر کا غبار چھٹنے لگا تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ اب چہل پہل اور آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ وہ بس میں سوار ہوا اور ملتان کے راستے جوند سنگھ والا کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆

شام ہو چکی تھی۔ ہر طرف کہر کا ہلکا ہلکا نیلگوں دھند لکا پھیلتا جا رہا تھا۔ مگر جوند سنگھ والا میں بسوں کے اڈے پر ابھی تک گہما گہمی تھی۔ لالی جیسے ہی بس سے اترا ایک گداگر اس کی جانب بڑھا۔ اس کے بکھرے ہوئے بال خاک دھول سے اٹے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی۔ چہرہ بے رونق اور مرجھایا ہوا تھا۔ لباس نہایت گندا اور بوسیدہ تھا۔

گداگر نے قریب پہنچ کر ہاتھ پھیلایا اور گھگیا کر صدا لگائی۔

دے جا سخیا اللہ نام!
مولا بنائے تیرے کام

لالی نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ ارشاد الٰہی تھا۔ اس کی نظریں لالی کی نظروں سے دو چار ہوئیں

تو چہرے پر سراسیمگی اور گھبراہٹ چھا گئی۔ اس نے بھی لالی کو پہچان لیا تھا۔ وہ فوراً مڑا اور تیزی سے ایک جانب بڑھ کر چاہا کہ اندھیرے میں اوجھل ہو جائے۔ لالی نے جھپٹ کر اس کا ایک ہاتھ تھام لیا۔ ڈپٹ کر بولا۔

"اوئے شادے کدھر چلا۔ تو نے مجھے پہچانا نہیں؟"

"تو لالی ہے ناں۔" ارشاد الٰہی نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "تو یہاں کیسے آیا؟"

ارشاد الٰہی کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ چہرے پر دہشت طاری تھی۔ لالی نے ارشاد الٰہی کو اس قدر خوف زدہ پایا تو دل لگی سوجھی۔ اسے اور دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی۔ "جمعدار اکبر سانول نے مجھے بھیجا ہے کہ تجھے پکڑ کر بھٹے پر لے چلوں۔ تجھ سے پیشگی وصول کرنی ہے۔"

"ایسا نہ کرنا۔" وہ مسکین سی صورت بنا کر گڑگڑانے لگا۔ "مجھ سے اب بھٹے پر کام نہیں ہو سکتا۔ بہت بیمار ہوں۔ کام کروں گا تو مر جاؤں گا۔"

"تو ادھر عیش کرتا رہے اور میں ادھر تیری پیشگی ادا کروں۔ تو یہ چاہتا ہے۔" لالی نے آنکھیں نکال کر اسے ڈانٹا۔ "دھوکے باز، مجھ سے واپس آنے کا پکا وعدہ کر کے آیا تھا اور ادھر آ کر چھپ گیا۔ تجھے بھٹے پر لے جا کر جمعدار کے سامنے پیش کروں گا۔"

ارشاد الٰہی اس قدر بدحواس ہو گیا کہ لالی کے پیر پکڑ لیے۔ "مجھے بھٹے پر نہ لے جا۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "مجھے معافی دے دے۔"

"اٹھ کر کھڑا ہو۔" لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔

ارشاد الٰہی اٹھا اور ہاتھ جوڑے ہوئے لالی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"یہ بتا تو میرے پاس آیا کیوں نہیں؟" لالی نے دریافت کیا۔ "میں نے تو تیری مدد کرنی چاہی تھی اور تو میری گردن پھنسوا کر صاف نکل گیا۔ تو نے میری نیکی کا یہ صلہ دیا۔"

"تجھے پتہ ہے، میں پہلے ہی سخت بیمار تھا۔ ماں کے پاس ملتان پہنچا تو میری حالت ایسی تھی کہ یوں لگتا تھا دو چار روز میں مر جاؤں گا۔ مجھ سے بولا تک نہ جاتا تھا۔ بستر پر پڑا پڑا کھانستا تھا اور خون تھوکتا تھا۔" ارشاد الٰہی رقت انگیز لہجے میں صفائی پیش کرنے لگا۔ "ماں مجھے سرکاری اسپتال لے گئی۔ ڈاکٹر نے علاج کے لیے انجکشن بتائے۔ پر ایسے انجکشن اسپتال سے نہیں ملتے تھے۔ ماں بھیک مانگ کر پیسے اکٹھے کرتی تھی اور میرے لیے انجکشن خرید کر بازار سے لاتی تھی۔ دو مہینے تک اسپتال میں پڑا رہا اور انجکشن لگواتا رہا۔ پوری طرح چنگا بھی نہ ہوا تھا کہ اسپتال سے چھٹی کر دی گئی۔ ماں مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ تب تک میں چل بھی نہیں سکتا تھا۔"

“اب تو ٹھیک ٹھاک لگتا ہے۔” لالی نے غور سے دیکھا۔

“بعد میں بھی انجکشن لگتے رہے۔” ارشاد الٰہی نے بتایا۔ “ان سے میں چنگا ہو گیا تو ماں مجھے ادھر لے آئی۔ میں بھی اس کے ساتھ بھیک مانگنے لگا۔ یہاں بس سٹاپ پر چنگی بھیک مل جاتی ہے۔”

دونوں بس اسٹاپ سے ذرا ہٹ کر ایک درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ارشاد الٰہی ابھی تک سہما ہوا تھا اور گڑگڑا کر صفائی پیش کر رہا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایک بار پھر پوچھا۔

“تو مجھے بھٹے پر کام کرنے تو نہیں لے جائے گا۔”

“میں تجھے کیسے بھٹے پر لے جاؤں گا؟ میں تو خود ادھر سے بھاگ کر تیرے پاس آیا ہوں۔” لالی نے اس کا خوف رفع کرنے کی غرض سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ “پر شادے‘ تو ہے بہت ڈرپوک۔”

“تو نے مجھے ڈرا ہی اتنا دیا تھا۔” ارشاد الٰہی اب سنبھل چکا تھا۔ “پچھلے دنوں جمعدار ادھر آیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ بھی لیا تھا۔ میں سمجھا اس نے تجھے ادھر بھیجا ہے۔ فیر تو نے باتیں بھی ایسی کیں کہ ڈر نہ جاتا تو کیا کرتا۔ سچ کہتا ہوں‘ بھٹے کے بارے میں سوچتے ہی جان نکل جاتی ہے۔ تجھے پتہ ہے کتنی خراب جگہ ہے۔ وہاں کام کرنے سے تو بھیک مانگنی ٹھیک ہے۔ پیشگی تو گلے نہیں پڑتی۔”

“یہ بتا‘ تو کوٹلہ ہرکشن بھی گیا کہ نہیں؟” لالی نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

“ایک بار گیا تھا؟”

“ماں کو بھی ساتھ لے گیا تھا؟”

“نہیں‘ وہ نہیں گئی۔ وہ تو مجھے بھی وہاں جانے نہیں دے رہی تھی۔”

“کوٹلہ ہرکشن جا کر تو نے کیا کیا؟” لالی نے دریافت کیا۔

“وہاں جا کر کرنا کیا تھا۔ وہ تو جی بہت وڈی زمیں داری ہے۔ حویلی اتنی شاندار ہے کہ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔” ارشاد الٰہی نے بتایا۔ “پر میرے پیو کی اتنی زمیں داری کہاں تھی۔ پورے دس مربع بھی نہیں تھی۔ گھر بھی معمولی تھا۔ تھا تو پکی اینٹوں کا بنا ہوا مگر بہت چھوٹا تھا۔ اتنی وڈی زمین داری اور ایسی شاندار حویلی اسے کیسے الاٹ ہو سکتی تھی۔ تجھے دھوکا ہوا۔”

“مجھے یہ تو پتہ نہیں تیرے پیو کی کتنی زمیں داری اور کتنی جائیداد تھی‘ پر مجھے یہ پتہ ہے کہ کوٹلہ ہرکشن کی زمیں داری اور حویلی رحیم داد نے تیرے پیو کے نام سے الاٹ کرا رکھی تھی۔” لالی نے وضاحت کی۔ قدرے تامل کے بعد دریافت کیا۔ “تو نے کچھ پوچھ تاچھ بھی کی؟ یہ نہیں بتایا وہاں جا کر تو نے کیا کیا؟”

“کوٹلہ ہرکشن میں داخل ہوتے ہی میں حویلی کے پھاٹک پر پہنچا۔ وہاں کئی نوکر موجود تھے۔ ایک سے میں نے پوچھ تاچھ کرنی چاہی۔ اتنے میں ایک شاندار کار آ کر بالکل میرے سامنے رکی۔ سارے نوکر اس کی طرف دوڑے۔ ایک نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اندر سے ایک بندہ بہت شان سے نکلا۔ سر پر اونچے طرے کی پگ۔ کمیص پر سونے کے چمکتے ہوئے بٹن۔ ہاتھ پر سونے کی گھڑی۔” ارشاد الٰہی سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ “اس نے میری طرف دیکھا۔ گردن ٹیڑھی کر کے پوچھا۔ کون ہے تو؟ میں نے اپنے بارے میں بتانا چاہا‘ پر میرے بولنے سے پہلے ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔”

“اور تو نے چپ کر کے لے بھی لیا۔” لالی نے جل کر کہا۔

“لے نہ لیتا تو کیا کرتا؟”

“تجھے پتہ تھا اس نے بھکاری سمجھ کر تجھے بھیک دی تھی؟” لالی کا لہجہ بدستور تلخ اور تیکھا تھا۔

“بالکل پتہ تھا۔” ارشاد الٰہی نے سادگی سے جواب دیا۔ “اتنی بھیک تو مجھے آج تک کسی نے نہیں دی۔ پیسہ دو پیسہ ملتی ہے۔ بہت ہوا تو آنہ دو آنہ۔”

“حد کر دی تو نے۔” لالی نے جھنجلا کر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا۔ “تو بھکاری کا بھکاری ہی رہا۔” اس نے منہ بگاڑ کر حقارت سے ارشاد الٰہی کو دیکھا۔ “نوٹ اس کے منہ پر مارا ہوتا۔ اسے بتاتا تو کون ہے؟ کس لیے آیا ہے؟”

“اس نے مجھ سے کوئی گل بات ہی نہیں کی۔ نہ میری طرف مڑ کر دیکھا نہ کسی اور کی طرف۔ گردن اٹھائے حویلی کے اندر چلا گیا۔” ارشاد الٰہی نے وضاحت کے ساتھ ساتھ قیاس آرائی بھی کی۔ “اس کی شان اور ٹوہر دیکھ کر تو مجھے ایسا لگا وہی ادھر کا زمیں دار ہے۔” اس نے گردن کو خم دے کر لالی سے دریافت کیا۔ “تو تو کہتا تھا کوٹلہ ہرکشن کا زمین دار مر گیا۔”

“پتہ نہیں وہ کون تھا۔” لالی نے حیرت کا اظہار کیا۔ “میں نے تو یہی سنا ہے کہ ادھر کا زمین دار رحیم داد تھا جو کئی مہینے پہلے مر گیا۔ وہ خود کو چوہدری نور الٰہی بتاتا تھا۔”

“میں نے کہا ناں۔ تجھے دھوکا ہوا۔” ارشاد الٰہی نے زور دے کر کہا۔ “کسی نے تجھے غلط بتایا۔”

“مجھے ٹھیک طرح پتہ ہے وہ مر چکا ہے۔” لالی نے اس دفعہ بھی کھل کر بات نہیں کی۔ وہ اسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ جب رحیم داد کا قتل ہوا تو اس وقت وہ حویلی میں موجود تھا۔ اس نے ارشاد الٰہی

کو غور سے دیکھا اور تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "تو اسی حلیے میں کوٹلہ ہرکشن گیا تھا؟ میں نے تجھے کہا تھا نئے کپڑے پہن کر شان سے جانا۔ اس کے لیے تجھے روپے بھی دیے تھے۔"

"وہ سارے ہی روپے ملتان پہنچتے ہی دوا علاج پر خرچ ہو گئے تھے۔" ارشاد الٰہی نے وضاحت کی۔ "نئے کپڑے لتے کیسے بنواتا؟"

"تب تو جس نے بھی تجھے بھکاری سمجھا ٹھیک ہی سمجھا۔ تو تو دیکھنے ہی میں بھک منگا لگتا ہے۔" لالی نے منہ بگاڑ کر بے زاری کا اظہار کیا، پوچھا۔ "تیری ماں کدھر ہے؟"

"ادھر جھگی میں ہے۔" ارشاد الٰہی نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر بتایا۔

"مجھے اس کے پاس لے چل۔"

ارشاد الٰہی آگے بڑھا۔ لالی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ جھگی قریب ہی تھی جسے درختوں کی شاخوں، ٹین کے پرانے ٹکڑوں، لکڑی کے ٹوٹے پھوٹے تختوں اور پھٹے پرانے کپڑوں سے تیار کیا گیا تھا۔ جھگی کے اردگرد سوکھی جھاڑیوں کی اونچی باڑھ تھی۔

لالی نے جھگی کے اندر داخل ہو کر دیکھا ایک ادھیڑ عورت چولہے کے سامنے بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ اس کے بے رونق چہرے پر غربت اور افلاس کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا آدھے سے بھی زیادہ سر سفید تھا۔ لباس میلا اور بوسیدہ تھا۔ وہ ارشاد الٰہی کی ماں کلثوم بی بی تھی۔

ارشاد الٰہی نے لالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "اماں، یہ لالی ہے۔ اس کے بارے میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں۔"

کلثوم بی بی نے لالی کو اس طرح گھگیا کر دعائیں دینا شروع کر دیں جیسے خیرات مانگ رہی ہو۔ لالی نے مسکرا کر فوراً اسے ٹوکا۔ "بے بے، تو اب اس طرح دعائیں شعائیں دینا چھوڑ دے۔ زمین دارنی کی شان پیدا کر۔ تو تھوڑے ہی دنوں میں وڈی زمین دارنی بن نے والی ہے۔"

"مخول نہ کر۔ میں نوں سب پتہ ہے۔" کلثوم بی بی نے بے زاری کا اظہار کیا اور ارشاد الٰہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "جب تو نے اسے بھٹے سے چھٹی دلا کر میرے پاس بھیجا تھا تب یہ بھی ایسی ہی وڈی وڈی گلاں کرتا تھا۔ اپنے نصیب میں تو بھیک مانگنی ہی لکھی ہے۔"

"بے بے، ایسے نہ سوچ۔" لالی نے بات کو طول دینے کی کوشش نہ کی۔ "تجھ سے آرام سے گل بات ہوگی۔ پہلے تو مجھے روٹی کھلا۔ سخت بھوک لگی ہے۔"

لالی فرش پر بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ ارشاد الٰہی بھی، اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کی ماں نے کھانا تیار کیا۔ دال روٹی تھی جسے اس نے المونیم کی میلی میلی رکابیوں میں نکالا۔ وہ دونوں ہاتھ

گھٹنوں پر رکھ کر اٹھی۔ تکلیف سے منہ بگاڑا۔ تیکھے لہجے میں ارشاد الٰہی کو مخاطب کیا۔ "شادے، ہ سے اب روٹی نہیں پکنے کی۔ کمر میں سخت درد ہوتا ہے۔ تو رات کو بھی بازار سے روٹی لے آیا ر۔" وہ دائیں طرف ذرا سا جھک کر لنگڑاتی ہوئی چلی اور کھانا لالی اور ارشاد الٰہی کے سامنے لا کر بھ دیا۔ خود چولہے کے سامنے بیٹھ کر کھانے لگی۔

لالی نے کھانا کھاتے ہوئے ارشاد الٰہی سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "جمعدار اکبر سانول مجھے اش کرتا ہوا ادھر بھی آئے گا۔ شاید کل ہی آ جائے۔ اسے پتہ ہے تو ادھر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے برے ساتھ تجھے بھی پکڑ کر بھٹے پر لے جائے۔" اس نے ارشاد الٰہی کو خوف زدہ کرنے کی کوشش ی اور وہ خوف زدہ ہو بھی گیا۔ اس کی ماں کچھ زیادہ ہی خوف زدہ ہو گئی۔ گھبرا کر بولی۔

"تب تو یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔" اس نے تجویز پیش کی۔ "ملتان واپس چلتے ہیں۔"

"ملتان تو میلسی سے نزدیک ہے۔ ادھر تو اور بھی زیادہ خطرہ ہے۔" لالی نے اس کی تجویز سے فاق نہ کیا۔ مگر مسئلہ یہ درپیش تھا کہ وہاں سے جایا کہاں جائے۔ اس کا کوئی ٹھور ٹھکانا تو تھا نہیں۔ لے دے کے ایک غنی چٹا کا گھر تھا۔ مگر وہ اس کے پاس جانا نہ چاہتا تھا۔ معاً اسے شادو یاد آ گیا۔ وہ ں کا پرانا دوست تھا۔ بہت مخلص تھا اور اس کی مدد کرنے سے کبھی دریغ نہ کرتا تھا۔ شادو کا خیال تے ہی اس نے فوراً کہا۔ "لائل پور چلتے ہیں۔ ادھر میرا پرانا یار شادو ہوتا ہے۔ اس کے پاس ہم رام سے ٹھہر سکتے ہیں۔ لائل پور دور بھی ہے۔ جمعدار کے ادھر پہنچنے کا کم خطرہ ہے۔ سویرے ہی یرے یہاں سے نکل جائیں گے۔"

ارشاد الٰہی اور اس کی ماں نے لالی کی رائے سے اختلاف نہ کیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے د تینوں رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ لالی بتاتا رہا کہ آئندہ انھیں کیا کرنا ہو گا۔ ارشاد الٰہی ر اس کی ماں نے پہلے پہل تو لالی کی باتوں کو اہمیت نہ دی۔ طرح طرح کے سوالات کرتے۔ اپنے رشات اور شک و شبے کا اظہار کرتے۔ مگر لالی نے سمجھا بجھا کر آمادہ کر لیا کہ جیسا وہ کہے گا دونوں ل پر عمل کریں گے۔

لالی بہت تھکا ہوا تھا۔ لیٹتے ہی سو گیا۔ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کلثوم بی بی بھی جھگی کے ایک وشے میں سو گئے۔

مبح تینوں اٹھ کر بس میں سوار ہوئے۔ خانے وال پہنچے۔ اسٹیشن جا کر لائل پور کے ٹکٹ ریدے۔ ٹرین آئی تو تیسرے درجے کے ایک ڈبے میں جا کر بیٹھ گئے۔

☆

پہر رات گزر چکی تھی۔ سردی بڑھ چکی تھی۔ لالی لائل پور پہنچا۔ ارشاد الٰہی اور اس کی ما دونوں ہم راہ تھے۔ سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے تینوں شادو کے گھر پر پہنچے۔ مگر گھر کے دروازے تالا پڑا تھا۔ سخت کوفت ہوئی۔ سردی کے ساتھ سناٹا بھی بڑھ گیا تھا۔ پاس پڑوس کے دروازے تھی۔ گلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ لالی حیران و پریشان کھڑا سوچتا رہا۔ کہاں جائے کس کے پا جائے؟ شادو کے علاوہ شہر میں کوئی شناسا بھی نہ تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے طے کیا رات اسٹیشن کے مسافر خانے میں بسر کی جائے۔

سردی میں زیادہ دیر ٹھہرنا ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ ارشاد الٰہی کی ماں کا برا حال تھ بوڑھی تھی اور جسم پر لباس بھی پھٹا پرانا تھا۔ وہ سردی سے سکڑی سکڑائی ایک کونے میں دبکی کھڑی تھی۔ بادل نخواستہ تینوں واپس ہوئے۔ مگر گلی کے نکڑ پر پہنچے ہی تھے کہ سامنے سے شادو ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی لالی کی جان میں جان آئی۔ لپک کر اس کے قریب پہنچا۔

"اوے لالی تو اتنی رات کو کہاں سے آ ٹپکا؟" شادو نے آگے بڑھ کر لالی کو اپنے بازوؤں میں لیا۔ محبت سے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے گویا ہوا۔ "تو ہمیشہ ایسے ہی اچانک ملتا ہے۔ کہاں رہا تک؟"

"پہلے گھر کا دروازہ کھول۔ اندر بیٹھ کر آرام سے کُھل بات ہو گی۔" لالی نے سردی تھر تھراتے ہوئے کہا۔ "تو نہ ملتا تو پتہ نہیں اپنا کیا بنتا۔ رات گزارنے سٹیشن جا رہا تھا۔"

شادو نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ تینوں کو گھر کے ایک کمرے میں پہنچایا۔ چارپائیوں پر جھ جھپاک بستر لگائے۔ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کو گرم گرم بستر ملے تو ان کے ہوش بجا ہوئے۔

شادو نے لالی کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر لے گیا۔ آہستہ سے پوچھا۔ "تو ان دونوں کو سے پکڑ لایا۔؟ کوئی نیا چکر چلایا ہے؟ یہ تو دیکھنے ہی میں بھک منگے لگتے ہیں۔"

"ایسا نہ کہہ۔ گوداسپور کے مہاجر ہیں۔ بہت پریشان ہیں۔ پاکستان آتے ہوئے اپنے خا سے بچھڑ گئے۔ نہ جانے کب سے انھیں تلاش کر رہے ہیں۔" لالی نے کھل کر بات نہ کی۔ ان کے خاندان والوں کو جانتا ہوں۔ دونوں کو ان سے ملانے لے جاؤں گا۔" اس نے مسکرا تکلفی سے کہا۔ "یار زندگی بھر چوری ڈکیتی کی۔ کبھی کبھی نیک کام بھی کر لینا چاہیے۔" ا بات کا رخ فوراً موڑ دیا۔ "یہ بتا بھابی کہاں ہے؟"

"وہ اپنی چھوٹی بہن کے ویاہ میں شریک ہونے جہلم گئی ہے۔"

"کب تک ادھر رہے گی؟"

"ہفتے بھر سے پہلے تو اس کے واپس آنے کا کوئی پروگرام نہیں۔" شادو نے لالی کو بتایا۔ "پر تجھے اس کے واپس آنے کی فکر کیوں ہے؟ جب تک چاہے ٹھہر۔ تو پہلی دفعہ تو اس گھر میں آیا نہیں۔"

"مجھے زیادہ دن ادھر نہیں ٹھہرنا۔ اس کی واپسی سے پہلے ہی چلا جاؤں گا۔" لالی نے وضاحت کی ساتھ ہی دریافت کیا۔ "تو آج کل کیا کر رہا ہے؟"

"میاں سبحان ہی کے پاس ہوں۔ ڈرائیوری کر رہا ہوں۔" شادو نے بتایا۔ "اسی کے ایک کام سے آیا تھا۔ کل چلا جاؤں گا۔"

"جانے سے پہلے ایک کام کرتا جا۔ مجھے اپنے لیے اور ان دونوں کے لیے کپڑے لتے سلوانے ہیں۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ "میں چاہتا ہوں جب یہ اپنے گھر والوں کے پاس جائیں تو ٹھیک ٹھاک ہو کر جائیں۔"

"تیرا یہ کام کر کے ہی جاؤں گا۔" شادو نے لالی سے اتفاق رائے کیا۔ "تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ سچ کہتا ہوں ان کپڑوں میں تو یہ بے چارے بالکل بھکاری لگتے ہیں۔ ان کی مدد کر کے تو نے بہت چنگا کام کیا۔"

دونوں میں مزید بات چیت نہ ہوئی۔ وہ کمرے میں گئے۔ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں لحافوں میں دبکے ہوئے بے خبر سو رہے تھے۔ شادو اور لالی بھی سونے کے لیے برابر کے کمرے میں چلے گئے۔

صبح اٹھ کر شادو پوریاں اور چھولے لایا۔ تینوں کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا۔ میاں سبحان کی لمبی چوڑی پیکارڈ اس کے پاس تھی۔ دن چڑھے تینوں کو اس میں بٹھا کر بازار لے گیا۔ لالی تو سب کے لیے ایک ایک جوڑا سلوانا چاہتا تھا لیکن شادو کے مشورے پر دو دو جوڑے سلوانے پر تیار ہو گیا۔ جو کپڑا انھوں نے پسند کیا شادو نے خریدا۔ لالی نے اصرار بھی کیا۔ مگر شادو نے اس کی ایک نہ سنی۔ قیمت اپنی جیب سے ادا کی اور درزی کو سلنے کے لیے کپڑا دے دیا۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی کہ کپڑے جلد سے جلد تیار کر دے۔

دوپہر کو شادو چلا گیا اور یہ وعدہ کیا کہ چند ہی روز میں واپس آکر ان کی خیر خیریت معلوم کرے گا۔

چوتھے روز کپڑے تیار ہو گئے۔ لالی درزی کے پاس گیا۔ سلائی ادا کر کے کپڑے لے آیا۔ تینوں نے اس روز گرم پانی سے غسل کیا۔ نئے لباس پہنے۔ مگر باہر نہ گئے۔ ان کا بیشتر وقت گھر ہی میں گزرتا۔ کبھی بازار بھی جاتے تو چوکنا رہتے۔ ہر دم جمعدار اکبر سانول کا خوف دامن گیر رہتا۔

دو روز بعد شادو بھی آ گیا۔ اس نے لالی سے پوچھا۔ "آگے تیرا کیا پروگرام ہے؟"

"تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔" لالی نے بتایا۔ "یہاں سے ان دونوں کے ساتھ لہور جاؤں گا۔ وہاں

ایک روز ٹھیر کر دیپال پور چلا جاؤں گا۔"

"لہور میں تو ٹھیرے گا کہاں؟" شادو نے دریافت کیا۔

"غنی چتّا کے پاس ٹھیرنے کا ارادہ ہے۔" لالی نے بے زاری کا اظہار کیا۔ "سچ پوچھ تو میں اس کے پاس ٹھیرنا نہیں چاہتا۔ تجھے پتہ ہے' وہ چوری ڈکیتی کرتا ہے۔ اور میں نے یہ دھندا بالکل چھوڑ دیا۔"

"یہ تو نے ٹھیک سوچا۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔" شادو نے خوش نودی کا اظہار کیا۔ "میں چتّے کو کبھی نہیں ملا۔ صرف اتنا سنا ہے کہ کئی بار کا سزا یافتہ ہے۔ اس کے پاس تیرا ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔ پولیس تجھے بھی مشتبہ نظروں سے دیکھے گی۔" اس نے تجویز پیش کی۔ "اگر تو کل لہور چلنا چاہے تو میرے ساتھ چل۔ میں لہور ہی جا رہا ہوں۔ ادھر میاں بجان کی کوٹھی ہے۔ انیکسی میں جب تک چاہے ٹھیر سکتا ہے۔ ویسے کوٹھی بھی بالکل خالی ہے۔ میاں سبحان پرسوں رحیم یار خان جا رہا ہے۔ ادھر اس کی شکار گاہ ہے۔ باہر سے مہمان آئے ہیں۔ میاں سبحان ان کے ساتھ شکار کھیلے گا۔"

لالی نے اس کی تجویز بلا عذر مان لی۔ دوسرے روز ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کے ہم راہ میاں سبحان کی چمکتی دمکتی پیکارڈ میں بیٹھ کر لالی لاہور چلا گیا۔ شادو نے حسب وعدہ تینوں کے قیام کا بندوبست میاں سبحان کی کوٹھی کی انیکسی میں کرا دیا۔ شادو رخصت ہوتے وقت حسب معمول لالی سے گرم جوشی کے ساتھ بغل گیر ہوا۔ اس کی پیٹھ محبت سے تھپکتے ہوئے بولا۔ "دیپال پور سے واپسی پر بھی ادھر ہی ٹھیر جانا۔ میں کوٹھی کے نوکروں کو بول دوں گا۔ فکر نہ کر' تو ادھر آرام سے رہ سکتا ہے۔ میں بھی ادھر آتا جاتا رہتا ہوں۔"

شادو چلا گیا۔

تینوں نے رات انیکسی میں بسر کی۔ صبح ہوئی۔ دن چڑھے لالی نے ارشاد الٰہی کو اپنے ہم راہ لیا۔ انار کلی گیا۔ بازار سے اپنے اور ارشاد الٰہی کے لیے طلّے دار کھسّے خریدے۔ عمدہ ململ کی پگڑیاں اور ان کے ساتھ کلدار سنہرے کلاہ بھی لیے۔ دو اونی لوئیاں بھی خریدیں۔ کلثوم بی بی کے لیے ایسی قیمتی جوتی خریدی جو بڑے گھرانوں کی زمیں دارنیاں اور چوہدرانیاں پہنتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے لیے سفید کشمیری شال بھی لی جس پر سنہری کلابتو سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔

بازار سے واپسی کے بعد تینوں نے نہا دھو کر نئے لباس پہنے۔ میلے کپڑے دھلنے کے لیے ایک ملازم کے سپرد کیے۔ کوٹھی سے نکل کر اسٹیشن گئے۔ ریل گاڑی میں سوار ہو کر منٹگمری پہنچے اور وہاں

سے بس میں بیٹھ کر پاک پتن کے راستے کوٹلہ ہر کشن روانہ ہو گئے۔ عٹی رحمان کے اڈے پر بس سے اترے اور تانگے میں بیٹھ کر کوٹلہ ہر کشن پہنچ گئے۔

☆

سرما کی شام ختم ہو رہی تھی۔ مگر کہر میں لپٹا ہوا کوٹلہ ہر کشن جاگ رہا تھا۔ گھروں میں چہل پہل تھی۔ ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ چراغوں کی دھندلی دھندلی روشنی کہیں کہیں ٹمٹما رہی تھی۔ تانگا حویلی کے سامنے جا کر ٹھہرا۔ لالی تانگے سے اترا۔ ارشاد الٰہی بھی اپنی ماں کے ساتھ نیچے اترا۔ لالی نے تانگے والے کو کرایہ دیا۔ تانگا مڑا اور عٹی رحمان کی جانب واپس روانہ ہوا۔

نادر خان حویلی کے بڑے دروازے ہی پر مل گیا۔ اس نے تینوں کو حیرت سے دیکھا۔ ان کے لباس اور وضع قطع سے خاصا مرعوب بھی ہوا۔ خندہ پیشانی سے آنے کا سبب دریافت کیا۔

لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "اندر چل کر آرام سے بات ہو گی۔"

نادر خان نے مزید پوچھ گچھ کرنے سے گریز کیا۔ خاموشی سے انھیں حویلی کے اندر لے گیا۔ بڑے کمرے میں گیا۔ تینوں کو صوفوں پر بٹھایا۔ کمرے کی آرائش سے جاگیردارانہ شان و شوکت جھلکتی تھی۔ کلثوم بی بی نے گھبرا کر اپنی شال کے پلو سے بکل مارا اور منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ ارشاد الٰہی بھی گم صم تھا۔

لالی چونکہ پہلے بھی آ چکا تھا لہٰذا وہ زیادہ اجنبیت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

نادر خان نے گفتگو کا آغاز کیا۔ اپنے بارے میں بتایا۔ "میں جی یہاں کا منیجر ہوں۔ میرا نام نادر خان ہے۔"

لالی نے اپنے متعلق کچھ کہنے سے اجتناب کیا۔ ارشاد الٰہی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "یہ جی چوہدری نور الٰہی کا پتر چوہدری ارشاد الٰہی ہے۔" اس نے مڑ کر کلثوم بی بی کی طرف دیکھا۔ "اور یہ اس کی گھر والی ہے۔"

نادر خان نے حیران و پریشان ہو کر دونوں کو دیکھا۔ چند لمحے دم بخود بیٹھا رہا۔ مگر جہاں دیدہ اور معاملہ فہم تھا۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔ نرم لہجے میں بولا۔ "چوہدری بھی اکثر ان کا ذکر کرتا تھا۔ برسوں ان کو جگہ جگہ ڈھونڈتا رہا۔"

"ضرور ڈھونڈتا ہو گا۔ یہ بھی اسے برسوں سے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ پاکستان آتے ہوئے ایسے بچھڑے کہ اب تک نہ مل سکے۔" لالی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ارشاد الٰہی تو ان دنوں چھوٹا ہو گا۔ اسے تو زیادہ یاد نہ ہو گا۔"

”چھوٹا تو ضرور تھا۔ پر مجھے بھی سب پتہ ہے۔“ ارشاد الٰہی نے اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کی۔ ماں نے بھی اس کی تائید کی۔ ”اسے پتہ تو ہونا چاہیے‘ جب ہم نے نصیر پور چھوڑا تو یہ لگ بھگ دس برس کا رہا ہو گا۔“

”بے جی۔“ لالی نے ارشاد الٰہی کی ماں کو نادر خان کے سامنے احترام سے مخاطب کیا۔ ”پر جتنا تجھے پتہ ہو گا اسے اتنا کہاں معلوم ہو گا۔“ اس نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ ”تو نے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو گا۔“

”ہن جی کیوں نہیں دیکھا۔“ اس نے آہ سرد کھینچی۔ ”کیا بتاؤں‘ کیسے بتاؤں۔ ہم پر کیا کیا گزری۔ اب تو سب کچھ ڈراؤنا سفنہ لگتا ہے۔“ اس کے چہرے پر افسردگی کے سائے پھیل گئے۔ ”نصیر پور میں شان سے رہتے تھے۔ ادھر اپنی بہت وڈی زمیں داری ہوتی تھی۔ کیا نہیں تھا ہمارے پاس۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے نظریں جھکا کر سوچتی رہی‘ پھر گویا ہوئی۔ ”میں نوں اب تک یاد ہے۔ عید سے ایک روز پہلے کی گل ہے۔ سب خوشی خوشی عید کا چاند دیکھ رہے تھے۔ ٹھیک سے دیکھ بھی نہ سکے تھے اتنے میں سکھ بلوائیوں نے پنڈ پر حملہ کر دیا۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”ہائے وہ کیسی ڈراؤنی کالی رات تھی۔ سب کچھ گھر میں چھوڑ چھاڑ کر ایسے نکلے کہ دوبارہ اسے دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ نہ جانے کیسے چھپتے لکتے ڈرے ڈرائے کسی نہ کسی طرح تریموں کے پتن پر پہنچے۔ نہ پوچھ ادھر کیسا کیسا ظلم ہوا۔ ان آنکھوں نے کیا کیا دیکھا۔“ اس نے بے قرار ہو کر آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”ہائے ربا۔ تب ہی مر جاتی تو ٹھیک تھا۔“

اس کی آواز گلو گیر ہو گئی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ نادر خان سکتے کے سے عالم میں خاموش بیٹھا رہا۔ لالی بھی گم صم تھا۔

کلثوم بی بی سسکیاں بھرتی رہی اور رک رک کر بتاتی رہی کہ تریموں کے پتن پر کس طرح بلوائی گھوڑے دوڑاتے ہوئے اچانک حملہ آور ہوئے۔ کس طرح انھوں نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ حملہ آوروں سے جان بچانے کے لیے کیوں کر انھوں نے قریب کے کھیتوں میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ کیسے اس کی جوان بیٹی صابرہ کو بلوائی اٹھا کر لے گئے اور بہن کو ان کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش میں اس کا پہلوٹی کا جوان بیٹا کرم الٰہی مارا گیا۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں نظر آتی تھیں۔ اوپر سے موسلا دھار بارش ہوتی تھی۔ دور دور تک کھیتوں کے سوا کوئی جائے پناہ نظر نہ آتی تھی۔ بلوائی بالکل اچانک حملے کرتے تھے اور اندھا دھند فائرنگ کرتے تھے۔ ملاح کشتیوں پر راوی کے اس پار لے جانے کا بھاری کرایہ مانگتے تھے۔ ہر طرف افراتفری مچی تھی۔ اسی افراتفری میں شوہر بھی بیوی بچوں سے بچھڑ گیا۔ پاکستان پہنچ کر بھی اس سے ملنا نصیب نہ ہوا۔

ارشاد الٰہی بھی بیچ بیچ میں لقمہ دیتا رہا۔ کبھی ماں کی تائید کرتا کبھی وضاحت کرتا۔ کوئی بات بھول جاتی تو یاد دلانے کی کوشش کرتا۔

نادر خان یہی دردناک روداد رحیم داد کی زبانی بھی سن چکا تھا۔ لیکن کلثوم بی بی نے جس قدر وضاحت سے رو رو کر اور دل گرفتہ ہو کر اسے سنایا‘ نادر خان اسے سن کر بہت متاثر ہوا۔ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

”چوہدرانی‘ تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ پر تو اب تک کہاں رہی؟ چوہدری کو تلاش کرتی ہوئی ادھر کیوں نہیں آئی؟“

کلثوم بی بی تو خاموش رہی۔ اس کے بجائے صرف ارشاد الٰہی کو بولنا تھا۔ لالی اسے اور اس کی ماں کو پچھلے چند دنوں میں اچھی طرح سمجھا بجھا چکا تھا۔ ضروری ہدایات دے چکا تھا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی نے فوراً وضاحت کی۔

”میں ماں کے ساتھ پہلے یہاں آیا تھا۔ تب میرا پیو ادھر نہیں ہوتا تھا۔ جب وہ نہ ملا تو اسے ڈھونڈتا ہوا کیمبل پور چلا گیا۔ کسی نے بتایا تھا کہ وہ ادھر ہوتا ہے۔ تب سے ہم دونوں کیمبل پور میں رہے۔ ادھر آ ہی نہیں سکے۔“

”لیکن تم دونوں نے بہت دیر کر دی۔“ نادر خان نے مطلع کیا۔ ”مجھے یہ بتاتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا ہے کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”وہ اپنے رب کے پاس چلا گیا۔ اس نے دوسرا ویاہ کر لیا تھا۔ اس کی دوسری گھر والی کا نام شاداں تھا۔ پر چوہدری کی اس سے بنی نہیں۔ وہ بہت ضدی اور جھگڑالو زنانی تھی۔ اس کا غصہ بہت خراب تھا۔ ایک رات غصے سے ایسی پاگل ہوئی کہ اس نے سوتے میں چھری سے چوہدری کا گلا کاٹ ڈالا اور اسی چھری سے اپنے گلا کاٹ کر خودکشی کر لی۔ دونوں ہی ختم ہو گئے۔“

”ہم کو اس کی اطلاع مل چکی ہے۔“ لالی نے ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان دونوں کو جب اس کا پتہ چلا تو بہت روئے پیٹے۔ بہت سیاپا کیا۔“ وہ اب حرف مطلب پر آنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کلثوم بی بی تنک کر بولی۔

”نہیں جی‘ نہ ہم نے کوئی پٹی ڈالی‘ نہ سیاپا کیا۔ ہم نے اس سے کیا لینا تھا۔ وہ نہ جانے کون بندہ تھا۔ ہم نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔“

لالی بہت سٹ پٹایا۔ وہ چاہتا تھا کہ رحیم داد کے ذکر کے بغیر ہی کام چل جائے۔ اس نے کو ٹلہ

ہرکشن جانے سے پہلے ارشاد الہی اور اس کی ماں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ کم سے کم بولیں۔ اسی وقت بولیں جب وہ ان سے بولنے کو کہے اور وہ جو کچھ کہے اسے خاموشی سے سن لیں۔ نہ اس کی مخالفت کریں اور نہ ہی اس کی کسی بات کی تردید کرنے کی کوشش کریں۔

ارشاد الہی نے لالی کی پریشانی بھانپ لی۔ اس نے فوراً ماں کو ٹوکا۔ ”اماں‘ لالی جو کہہ رہا ہے اسے کہنے دے۔ تو بیچ میں نہ بول۔“

”وے‘ میں کیوں نہ بولوں؟ تو چپ کر۔“ اسے بیٹے کی بات سخت ناگوار گزری۔ تیکھے لہجے میں بولی۔ ”لالی کو کیا پتہ تیرا پیو کیسا بندہ تھا۔ میں نوں پتہ ہے اس نے کوئی دوسرا ویاہ نہیں کیا۔ وہ بہت نیک بندہ تھا۔ مجھے بہت پیار کرتا تھا۔ دوسرا ویاہ کرنے کی تو وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔“ اس نے نادر خان کی طرف دیکھا۔ ”میرے گھر والے کی نہ دوسری گھر والی تھی نہ کسی نے چھری سے گلا کاٹ کر اس کا خون کیا۔ وہ تو برسوں پہلے مر گیا تھا۔ تخت ہزارہ کے نزدیک چک ۵۸ میں اس کی موت ہوئی تھی۔ میں نے اس کی کبر بھی دیکھی ہے۔“ اس نے ارشاد الہی کو مخاطب کیا۔ ”شادے‘ اپنے پیو کی کبر تو تو نے بھی دیکھی ہے۔ اکبر اور اس کی گھر والی جیناں نے دکھائی تھی۔ تیں نوں یاد ہے ناں۔“

ارشاد الہی نے جھنجلا کر ماں کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ لیکن کچھ بولا نہیں۔ لالی بھی خاموش رہا۔ مگر نادر خان خاموش نہ رہ سکا۔

”چوہدرانی کی باتوں سے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ کوٹلہ ہرکشن کا جو زمیں دار تھا وہ کوئی دوسرا تھا چوہدری نور الہی تھا۔“ اس نے اس دفعہ براہ راست لالی کو مخاطب کیا۔ ”تجھے کسی نے غلط اطلاع دی۔“

لالی نے بات بگڑتے دیکھی تو فوراً پینترا بدلا۔ اب کھل کر بات کرنے کے سوا چارہ کار نہ رہا تھا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”نادر خان‘ جیسا تو سوچ رہا ہے ایسا نہیں ہے۔ بے جی کو پتہ نہیں۔“

”کیوں نہیں پتہ؟“ کلثوم بی بی نے تلخ لہجے میں مداخلت کی۔ ”میں مرنے والے کے خلاف کوئی غلط بات نہیں سن سکتی۔“ وہ بے قرار ہو کر رونے لگی۔ سسکیاں بھر کر بین کرنے لگی۔ ”ہائے‘ اب وہ نہیں رہا تو اس پر الزام لگائے جا رہے ہیں۔ اسے بدنام کیا جا رہا ہے۔ میں نصیباں دی ماری نے سننے کو زندہ ہی کیوں رہ گئی؟“

لالی کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔ نرم لہجے میں کلثوم بی بی کو مخاطب کیا۔ ”بے جی‘ کوئی تیرے گھر والے پر نہ الزام لگا رہا ہے نہ اسے بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے پوری بات کہہ لینے دے۔“

ارشاد الہی نے لالی کی تائید کی۔ ”لالی ٹھیک کہہ رہا ہے اماں۔ تو چپ کر کے اس کی گل بات سن لے۔“

لالی نے مڑ کر نادر خان کی جانب دیکھا۔ ”ہاں تو جی میں یہ بتا رہا تھا کہ میں نے کوئی غلط گل بات نہیں کہی۔ بے جی بھی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اسے یہ پتہ نہیں کہ اس پنڈ کا جو زمیں دار تھا وہ اس کا گھر والا چوہدری نور الہی نہیں تھا۔ نہ وہ مہاجر تھا اور نہ کبھی نصیرپور میں رہا تھا۔ اس کا اصلی نام رحیم داد تھا۔ وہ اسی ضلع کے پنڈ احمد کوٹ کا رہنے والا تھا۔ ادھر اس کی چھوٹی سی زمیں داری ہوتی تھی۔ کھیتوں کی وٹ بندی پر اس کا اپنے ہی پنڈ کے ایک زمیں دار سیف اللہ سے جھگڑا ہو گیا۔ اس جھگڑے میں سیف اللہ مارا گیا۔ رحیم داد کو سزا ہو گئی اور وہ جیل میں بند کر دیا گیا۔“ لالی سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ ”ایک رات وہ جیل سے فرار ہو گیا۔ اور نہرباری دوآب کے نزدیک ویران ٹبوں میں جا کر چھپ گیا۔ ادھر اسے کمال پور کا حکیم چشتی مل گیا۔ اسے رحیم داد نے کتل کر دیا۔ اپنی جیل کی وردی اسے پہنا دی اور اس کے کپڑے لتے خود پہن لیے۔ پولیس نے اسے رحیم داد کی لاش سمجھا اور احمد کوٹ لے جا کر دفن کرا دیا۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ نادر خان نے اپنے شک وشبے کا اظہار کیا۔ ”کپڑے لتے بدل لینے سے دونوں کی شکلیں تو نہیں بدل گئیں۔ پولیس ایسی غلطی نہیں کر سکتی۔ تیری بات سمجھ نہیں آئی۔“

”رحیم داد نے لاش کو پتھر سے کچل کر ایسا بگاڑ دیا تھا کہ کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔“ لالی نے وضاحت کی۔ ”پولیس نے اس کی شناخت جیل کی وردی سے کی۔ رحیم داد نے پولیس کو دھوکا دینے کے لیے لاش کو بگاڑا ہی کچھ اس طرح تھا۔“

”وہ اتنا دھوکے باز تھا۔ یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔“ نادر خان نے حیرت کا اظہار کیا۔

”چپ کر کے سنتا جا۔ وہ کتنا وڈا دھوکے باز تھا۔ تجھے اس کا کچھ انداز نہیں۔“ لالی نے نادر خان کو بتایا۔ ”حکیم چشتی کا خون کرنے کے بعد وہ چک ۵۸ پہنچا۔ وہاں اسے چوہدری نور الہی مل گیا۔ وہ کئی روز تک اس کے گھر میں چھپا رہا۔ چوہدری ان دنوں سخت بیمار تھا۔ میرا خیال ہے اس نے اپنے اور اپنے کلیم کے بارے میں رحیم داد کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ ایک رات چوہدری چل بسا۔ اس کے مرنے کے بعد رحیم داد نے اس کے کلیم کے کاغذات چرائے اور رات کے اندھیرے میں باہر نکل

گیا۔ گرفتاری سے بچنے کے لیے اس نے داڑھی رکھ لی۔ آنکھوں پر چشمہ لگانے لگا۔ اپنا نام بدل کر چوہدری نور الٰہی رکھ لیا۔ جعل سازی اور چار سو بیسی کر کے چوہدری نور الٰہی کے کلیم پر متروکہ اراضی اور جائیداد کی الاٹمنٹ کرا لی اور اس طرح کوٹلہ ہرکشن کا زمیں دار بن گیا۔" لالی نے مسکرا کر نادر خان کی طرف دیکھا۔ "اب تو سب کچھ تو ٹھیک طرح سمجھ گیا۔" پھر وہ کلثوم بی بی کی جانب متوجہ ہوا۔ "بے جی، تجھے بھی اصل گل بات کا پتہ چل گیا۔"

"تو نے جو کچھ بتایا ہو سکتا ہے ٹھیک ہی ہو۔" نادر خان نے مشتبہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "پر یہ سمجھ نہیں آئی۔ تجھے ان باتوں کا کیسے پتہ چلا؟ تیری اس سے یاری دوستی ہوتی تو کبھی اس کے پاس ضرور آتا۔ پر میں تو یہاں کئی برس سے ہوں۔ میں نے تجھے ادھر کبھی نہیں دیکھا۔"

یہی وہ نازک مرحلہ تھا جس سے بچنے کے لیے وہ رحیم داد کے ذکر سے کترا رہا تھا۔ لالی کو یہ خدشہ تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے وہ باتیں بتانے پر مجبور ہونا پڑے جن کے اظہار سے بات بننے کے بجائے بگڑ جائے اور رحیم داد اور شاداں کے قتل کے شبے میں اسے دھر لیا جائے۔ بیٹھے بٹھائے لینے کے دینے پڑ جائیں۔ مگر وہ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کی طرح سادہ لوح اور گھامڑ نہیں تھا۔ جہاں دیدہ اور گھاگ تھا۔ برسوں عادی مجرموں کے ساتھ رہ چکا تھا۔ پولیس سے بارہا سابقہ پڑ چکا تھا۔ لہٰذا بات بنانے کا گر جانتا تھا۔ اس نے حاضر دماغی سے کام لیا۔ نادر خان کے استفسار پر بتایا۔

"رحیم داد سے میری جان پہچان تھی۔ پر جب پولیس نے یہ بتایا کہ نہر باری دوآب کے نزدیک اسے کتل کر دیا گیا تو میں نے بھی مان لیا کہ وہ مر گیا۔ مجھے کیا پتہ وہ نام بدل کر ادھر زمیں داری کر رہا ہے۔ پچھلے دنوں ایسا ہوا کہ برسوں بعد مجھے اچانک رحیم داد کا بہت پرانا اور گہرا یار جمال دین مل گیا۔ وہ مجھے بھی جانتا ہے۔ اسی نے مجھے رحیم داد کے بارے میں ساری باتیں بتائیں۔ شاید وہ مجھے یہ راز کبھی نہ بتاتا۔ پر اب تو رحیم داد اس دنیا سے جا چکا ہے۔ جمال دین اس کے بارے میں مجھ سے کچھ چھپاتا تو کس کے لیے چھپاتا۔" قدرے توقف کے بعد وہ حرف مطلب پر آ گیا۔ "جمال دین سے مجھے یہ باتیں معلوم ہوئیں تو میں ان دونوں کو لے کر یہاں آ گیا۔"

"یہاں کیوں آئے؟" نادر خان نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"رحیم داد نے جو کچھ کیا وہ جانے اور اس کا رب جانے۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔" لالی نے کھل کر بات کی۔ "پر اس نے جو زمیں داری اور جائیداد چھوڑی ہے اس کا اصلی مالک تو چوہدری نور الٰہی تھا ناں۔ اس کے وارثوں کی حیثیت سے اس پر ان دونوں کا حک بنتا ہے۔ اب یہ زمیں داری اور جائیداد ان کو ملنی چاہیے۔ یہی اس کے اصلی وارث ہیں۔"

نادر خان پرانا گھاگ تھا اور جس کا نمک کھاتا تھا اس کا وفادار بھی تھا۔ اس نے لالی کی مطلق حوصلہ افزائی نہ کی۔ بے رخی سے بولا۔ "مجھے یہ تو پتہ نہیں اصلی چوہدری نور الٰہی کون تھا اور جعلی چوہدری نور الٰہی کون تھا۔ اور نہ مجھے یہ پتہ ہے کہ یہ دونوں کس کے وارث ہیں۔" اس نے سراسر دروغ گوئی سے کام لیا۔ "میں تو یہ جانتا ہوں کہ ادھر کا جو زمیں دار ہوتا تھا اس نے موت سے پہلے اپنی زمیں داری اور جائیداد پیراں والہ کے زمیں دار سید احسان علی شاہ کے ہاتھ بیع کر دی تھی۔"

لالی اس کی بات سن کر چونکا۔ رحیم داد نے مرنے سے پہلے اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ ہر راز پر سے پردہ اٹھا دیا تھا۔ لیکن اس نے اشارہ تک نہ کیا کہ اپنی زمیں داری اور جائیداد فروخت کر دی ہے۔ ایسا ہوتا تو وہ اس کا تذکرہ ضرور کرتا۔ لالی نے دبی زبان سے اپنے شک و شبے کا اظہار کیا۔ "میں نے سنا ہے وہ تو بہت شان سے زمیں داری کر رہا تھا اور بہت خوش بھی تھا۔ اسے زمیں داری اور جائیداد بیچنے کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟"

"تیں نوں پتہ نہیں۔ وہ لائل پور میں کپڑا بنانے کا بہت وڈا کارخانہ لگا رہا تھا۔ کارخانے کے لیے اسے زمین کی الاٹمنٹ بھی مل گئی تھی۔" نادر خان نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے جواز پیش کیا۔ "کارخانہ لگانے کے لیے اسے بہت زیادہ روپے کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں وہ مجھ سے بھی مشورہ کرتا رہتا تھا۔" اس نے اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کی۔ "میں نے منع بھی کیا، پر وہ نہ مانا۔ زمیں داری اور جائیداد بیع کر دی۔ اسے ڈیرہ غازی خان کے موضع ولاوردالا میں بھی کلیم کی بنیاد پر اڑھائی سو ایکڑ متروکہ زرعی اراضی الاٹ ہوئی تھی۔ اس نے وہ اراضی بھی راجن پور کے زمیں دار سردار عظمت اللہ دریشک کے ہاتھ بیع کر دی۔"

نادر خان نے اس طرح جما کر بات کی کہ لالی کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اس نے سوچا تھا کہ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کو زمیں داری اور جائیداد مل گئی تو اسے بھٹے کی صبر آزما زندگی سے نجات مل جائے گی۔ ارشاد الٰہی اسے زمیں داری میں اپنے ساتھ لگا لے گا۔ اس نے لالی سے ایسا وعدہ بھی کیا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی کے سائے پھیل گئے۔ اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

"بیع کی رجسٹری وغیرہ بھی ہو گئی؟"

نادر خان اس کے استفسار پر کچھ گھبرا گیا۔ اس نے دبی زبان سے بتایا۔ "بیع کی رجسٹری شاید نہیں ہوئی۔"

لالی کو امید کی ایک کرن نظر آئی۔ اس نے کرید کر دریافت کیا۔ "بیع کی رجسٹری کیوں نہیں ہوئی؟ کوئی خاص وجہ تھی؟"

"مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں۔ جب بیع کا معاملہ طے ہو رہا تھا میں ان دنوں سخت بیمار تھا۔ مجھے ٹائی فائڈ ہو گیا تھا۔" نادر خان نے عذر پیش کیا۔ "بیع کی رجسٹری شاید اس لیے نہیں ہو سکی تھی کہ مارشل لا کی زرعی اصلاحات کا کچھ چکر پڑ گیا تھا۔ پر میں نے وہ مختار نامہ دیکھا ہے جو چوہدری نے مرنے سے پہلے احسان علی شاہ کو دیا تھا۔"

"پر مختار نامے کی بنیاد پر کسی جائیداد کے وارثوں کو ان کے حق سے محروم تو نہیں کیا جا سکتا۔" لالی نے جیل میں قیدیوں سے سنی سنائی باتوں کا سہارا لیا۔ ان سے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کی روشنی میں اپنی قانونی سوجھ بوجھ کا اظہار کیا۔ "میں نے تو اس سلسلے میں یہی سنا ہے۔"

"یہ تو کوئی وکیل ہی بتا سکتا ہے۔" نادر خان نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔

"یہاں آنے سے پہلے ہم نے وکیل سے مشورہ کیا تھا۔" لالی نے نادر خان کو مرعوب کرنے کے لیے نیا حربہ آزمایا۔ "بلکہ ہم تو وکیل کو ساتھ لے کر آ رہے تھے۔ پر یہ سوچ کر اسے نہ لائے کہ پہلے معلومات حاصل کر لی جائیں۔"

ارشاد الٰہی اور اس کی ماں نے حیرت زدہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ مگر خاموش بیٹھے رہے۔

لالی کا حربہ کار آمد ثابت ہوا۔ نادر خان اس کی باتوں سے واقعی مرعوب ہو گیا۔ اس نے پسپائی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "زمیں داری اور جائیداد کے بارے میں تو ساری معلومات احسان شاہ سے ہی مل سکتی ہیں۔ ادھر کا زمین دار تو وہی ہے۔ میں تو پہلے بھی منیجر تھا اور اب بھی منیجر ہوں۔"

"تو مجھے احسان شاہ سے ملوا دے۔" لالی نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ "اصلی گل بات تو ہم نے اسی سے کرنی ہے۔" اس نے ذرا جما کر بات کی۔ "مختار نامہ دیکھنا ہے۔ اور دوسرے ضروری کاغذات بھی دیکھنے ہیں۔"

"شاہ جی سے ضرور مل لیں۔" نادر خان نے بلا عذر اس کی بات مان لی۔ "آج تو وہ پیراں والہ میں ہے۔ عام طور پر ادھر ہی ہوتا ہے یا لہور میں۔ ادھر بھی آتا رہتا ہے۔"

"وہ یہاں کب آئے گا؟" لالی نے دریافت کیا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ وہ یہاں کب آئے گا۔ اس کی مرضی ہے۔ جب جی کرتا ہے آ جاتا ہے۔" نادر خان نے لالی کو بتایا۔ "ویسے میں اسے اطلاع کروا دوں گا۔ تب تک تم تینوں مہمان خانے میں ٹھیرو۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "تھکے ہوئے ہو۔ آرام کرو۔ روٹی ٹکر کھاؤ۔"

نادر خان نے ملازم کو بلایا۔ تینوں کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہ تینوں مہمان ہیں۔ ان کو مہمان خانے میں لے جا۔ لہنا سے کہنا ان کو آرام سے رکھے۔ کسی طرح کی بھی تکلیف نہ ہو۔"

لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ارشاد الٰہی بھی کھڑا ہو گیا۔ اس کی ماں بھی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھی۔ تینوں ملازم کے ہم راہ باہر چلے گئے۔

نادر خان اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے سے پریشانی آشکارہ تھی۔ لالی نے اپنی باتوں سے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر اٹھا اور اسی وقت پیراں والہ جانے کا ارادہ کیا۔

☆

مہمان خانے کا اب نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ اس کی از سر نو تعمیر کی گئی تھی۔ توسیع بھی کی گئی تھی۔ پہلے مہمانوں کے قیام کے لیے صرف تین کمرے تھے۔ جنہیں ڈھا کر پانچ نئے کمرے تعمیر کیے گئے تھے۔ پرانا فرنیچر ہٹا کر نیا فرنیچر ڈالا گیا تھا۔ ایک بڑا کمرہ تھا جو بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس میں سلیقے سے صوفہ سٹ رکھے تھے۔ بڑی چھوٹی میزیں تھیں۔ کرسیاں تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر خوش رنگ پردے ڈالے گئے تھے۔ کمروں کے آگے طویل برآمدہ تھا۔ برآمدے کے سامنے کشادہ صحن تھا۔ اس کا کچا فرش پختہ کر دیا گیا تھا۔ صحن کے اردگرد کیاریاں تھیں۔ ان میں گلاب کثرت سے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ موسمی پودے بھی تھے جن میں رنگا رنگ پھول ہوا کے جھونکوں سے جھومتے تھے۔ فضا کو معطر کرتے تھے۔

صحن کے ایک گوشے میں مہمان خانے کی دیکھ بھال کرنے والے نوکروں کی رہائش کے لیے کوٹھریاں تھیں۔ چار دیواری بھی نئی تعمیر کی گئی تھی۔ اس میں لکڑی کا مضبوط دروازہ لگایا گیا تھا۔

عرصہ ہوا جب لالی بھی مہمان خانے میں ایک رات قیام کر چکا تھا۔ اس وقت رحیم داد زندہ تھا۔ لالی نے مہمان خانے کو اس بار دیکھا تو بہت مرعوب ہوا۔ اس کی شان ہی نرالی تھی۔ اسے علیحدہ کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ارشاد الٰہی اور اسکی ماں کا قیام ایک ہی کمرے میں تھا۔ مگر یہ کمرہ بڑا تھا۔ اس میں دو مسہریاں تھیں جن پر اجلے بستر لگے تھے۔ ہر مسہری کے ساتھ میز رکھی تھی۔ میزوں کے علاوہ بیٹھنے کے لیے کرسیاں بھی موجود تھیں۔ کمروں میں خوبصورت لیمپ روشن تھے۔ لالی کی طرح ارشاد الٰہی اور اس کی ماں' دونوں ہی مہمان خانہ دیکھ کر مرعوب ہوئے تھے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی مرعوب ہوئے۔ حیرت سے نظریں اٹھا کر ہر طرف دیکھتے تھے۔

لالی نے رات کا کھانا ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کے ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ ملازم نے دونوں میزیں ملا کر کھانا سلیقے سے چن دیا تھا۔ بیٹھنے کے لیے میزوں کے اردگرد کرسیاں لگا دی تھیں۔ کھانا لگانے کے بعد وہ دہلیز کے قریب مودب کھڑا رہا۔ کھانے کے دوران کسی کو پانی پینے کی خواہش ہوتی تو فوراً

بڑھ کر شیشے کے جگ سے گلاس میں پانی ڈالتا اور اسے احتیاط سے پیش کرتا۔ کھانا خوب مرغن تھا اور خوش ذائقہ بھی تھا۔ تینوں بھوکے بھی تھے۔ انھوں نے بہت رغبت سے کھانا کھایا۔

تینوں کھانے سے فارغ ہوئے تو ملازم نے برتن اٹھائے۔ دونوں میزیں جھاڑن سے صاف کیں اور انھیں اپنی سابقہ جگہ پر رکھ دیا۔ کمرے سے باہر جاتے ہوئے وہ ٹھٹکا۔ مسکرا کر نرم لہجے میں گویا ہوا۔

"میرا نام لہنا ہے جی۔ تیں نوں پتہ ہی ہے۔ پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ میں ابھی جاگ رہا ہوں۔ اپنی کوٹھڑی میں رہوں گا۔ کوئی ضرورت ہو تو مجھے بلا لیں۔"

"نہیں، جی اب کوئی ضرورت نہیں۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ "روٹی تو نے مزیدار کھلائی۔ جی خوش ہو گیا۔"

لہنا نے لالی کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کو غور سے دیکھا اور چند لمحے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر مڑا اور خاموشی سے چلا گیا۔ کلثوم بی بی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "لہنا مجھے اور شادا کو گھور کیوں رہا تھا؟" اس کے لہجے میں اشتباہ تھا۔

"اپنے نئے زمیں دار اور اس کی ماں کو دیکھ رہا تھا۔" لالی بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ "آگے اس نے ادھر نوکری جو کرنی ہے۔ بے بے، تو نے یہ نہیں دیکھا۔ لہنا نے کیسے آرام سے روٹی کھلائی۔"

"ہشیار اور کام کا بندہ لگتا ہے۔" ارشاد الٰہی نے لہنا کے بارے میں خوش نودی کا اظہار کیا۔

"اسے ہشیار تو ہونا ہی چاہیے۔" لالی نے ارشاد الٰہی کی رائے سے اتفاق کیا۔ "ادھر مہمان خانے میں وڈے افسر اور زمین دار آ کر ٹھہرتے ہیں۔ ان کو ہر طرح خوش رکھنا پڑتا ہے۔"

"ویسے مہمان خانہ ہے بہت شاندار۔" ارشاد الٰہی نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں جی بہت شاندار ہے۔ پر حویلی بھی کم شاندار نہیں۔" لالی نے مسکرا کر ارشاد الٰہی کو دیکھا۔ "اب تو ادھر کا زمیں دار تو بن ہی رہا ہے۔ جیسی مرضی ہو ویسی شاندار حویلی بھی کر لینا۔"

"ایسا اپنا نصیب کہاں جو اتنی وڈی زمیں داری اپنی بن جائے اور رہنے کو ایسی شاندار حویلی ملے۔" ارشاد الٰہی کی ماں کلثوم بی بی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "مجھے تو سب کچھ ابھی تک سفنہ ہی لگتا ہے۔"

"اماں ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔" ارشاد الٰہی نے بجھے ہوئے لہجے میں ماں کی تائید کی۔ "مجھے تو زمیں داری اور جائیداد ملتی ملاتی معلوم نہیں ہوتی۔"

"شادے، حوصلے سے کام لے۔" لالی نے اس کی مایوسی رفع کرنے کی کوشش کی۔ "زمیں داری

اور ساری جائیداد تو تجھے ملنی ہی ملنی ہے۔ ہم نے کوئی دھوکا فریب تو کرنا نہیں۔ اس پر تیرا پورا پورا حق بنتا ہے۔ یہ تیرے پیو کی جائیداد ہے۔ تو اور تیری ماں اس کے اصلی وارث ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ پر نادر خان کی باتوں سے تو کچھ اور ہی لگتا ہے۔" ارشاد الٰہی ہنوز غیر مطمئن تھا۔

"یار تو کس چکر میں پڑ گیا۔ نادر خان کچھ ہی کہتا رہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔" لالی نے وضاحت کی۔ "نادر کو تو خود کچھ پتہ نہیں۔ کبھی کچھ کہتا ہے کبھی کچھ۔ پہلے کہتا تھا کہ زمیں داری اور جائیداد کی بیع ہو گئی۔ میں نے پوچھ تاچھ کی اور وکیل سے مشورہ کرنے کی بات کی۔"

"تو نے کس وکیل سے مشورہ کیا تھا اور کب کیا تھا؟" ارشاد الٰہی نے حیرت زدہ ہو کر لالی کو ٹوکا۔

"وہ تو میں نے نادر خان پر رعب جمانے کے لیے سیدھی سیدھی بلف چال چلی تھی۔" لالی نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "ایسا چکر چلایا کہ وہ ایک دم گھبرا گیا۔"

"یہ تو میں نے بھی دیکھا وہ گھبرا سا گیا تھا۔ کہنے لگا بیع کی رجسٹری تو ہو نہیں سکی۔ مختار نامہ مل گیا ہے۔" ارشاد الٰہی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے اب تک کوئی لکھا پڑھی نہیں ہوئی۔ نادر خان ایسے ہی چکر چلا رہا تھا۔" لالی نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "اسے تو ایسی ہی باتیں کرنی چاہئیں۔ اس کی نوکری کا جو معاملہ ہے۔"

"زمیں داری مل جائے تو نادر کو ہرگز نہ رکھنا۔" ارشاد الٰہی کی ماں نے مداخلت کی۔ "مجھے وہ ٹھیک بندہ نہیں لگتا۔ اس کی تو چھٹی کر دینی چاہیے۔"

لالی نے چوکنا نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا۔ "بے بے آہستہ بول۔ نادر سے ابھی بگاڑنا ٹھیک نہیں۔ ورنہ بہت گڑبڑ ڈالے گا۔ اسے تو بالکل پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ ہم نے آگے کیا کرنا ہے۔"

"پر یہ تو سوچ۔ نادر نہ رہا تو زمیں داری کون چلائے گا۔" ارشاد الٰہی نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "مجھے تو زمین داری کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔" اس نے نظر بھر کر لالی کے چہرے کو دیکھا۔ "لالی، تو زمیں داری چلا سکتا ہے؟"

"ویسے تو زمین داری کا مجھے بھی کوئی تجربہ نہیں۔ پر میں یہ جانتا ہوں کہ زمیں داری تو منشی اور کاردار چلاتے ہیں۔ صرف ان کے کام کی نگرانی کرنی ہوتی ہے۔ وہ میں کر سکتا ہوں۔" لالی نے

اپنے بارے میں ارشاد الٰہی کا عندیہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ "یہ تو تیری مرضی پر ہے۔ تو مجھے اپنے ساتھ لگانا چاہے گا تو زمیں داری چلانے کی پوری کوشش کروں گا۔"

"ایسی گل بات نہ کر۔" ارشاد الٰہی کی ماں نے پیار سے لالی کو ڈانٹا۔ "شادا تجھے کیوں نہی لگائے گا؟ تو اور شادا علیحدہ تھوڑا ہی ہیں۔ میرے لیے تو جیسے شادا ویسے تو۔"

"تجھے میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔" ارشاد الٰہی نے لالی کو باور کرایا۔ "تیری ہی کوشش سے ز زمین داری مل رہی ہے۔ مجھے تو اس کے بارے میں پتہ تک نہیں تھا۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "میری مرضی کیا۔ سب کچھ تو تجھے ہی کرنا ہے۔ میں نے تو وہی کرنا ہے جو تو کہے گا۔"

"پتر اب تو ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔" ارشاد الٰہی کی ماں نے مسکرا کر لالی سے کہا۔ "تیر لیے ویاہ کر وہٹی لاؤں گی۔ دونوں حویلی کے چوبارے میں رہنا"

"حویلی کے اوپر کے حصے میں کئی کمرے ہیں۔ شادا کی وہٹی ویاہ کر لانا تو دونوں کو ادھر ہی رکھنا۔ لالی نے مشورہ دیا۔ "بے بے تو بھی اوپر ہی کے کمرے میں رہنا۔ ضرورت پڑی تو اور کمرے بنوالیں گے۔ اوپر بہت جگہ ہے۔"

"نا پتر' میں کوٹھے پر نہیں رہ سکتی۔" اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر منہ بگاڑا۔ "میں تو اوپر جا ہی نہی سکتی۔ ہردم تو کمر میں درد رہتا ہے۔ زینے کی سیڑھیوں پر کیسے چڑھ سکوں گی۔"

"ہاں اماں' سیڑھیاں چڑھنے اترنے سے تجھے بہت تکلیف ہو گی۔" ارشاد الٰہی نے ماں ک تکلیف محسوس کرتے ہوئے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"ویسے بے بے' اوپر رہنے میں تجھے بہت آرام رہتا۔ گرمی میں تو رات کو شان سے سوتی۔" لا نے کلثوم بی بی کو بتایا۔ "پر حویلی کا آنگن بھی بہت وڈا ہے۔ تو نے دیکھا نہیں؟"

"اندھیرے میں کیا دیکھتی۔" ارشاد الٰہی کی ماں نے اظہار خیال کیا۔ "حویلی مل گئی تو آرام س دیکھوں گی۔ ابھی دیکھ کر کیا لینا۔"

"بے بے فکر نہ کر۔ حویلی بھی ملے گی اور زمیں داری بھی۔ بس تو دعا کرتی رہ۔"

"پتر' وہ تو میں کرتی رہی ہوں۔ ورنہ اپنے نصیب میں تو اب سب کے آگے بھیک کے لیے ہا پھیلانا ہی رہ گیا ہے۔" اس نے دل گرفتہ ہو کر گہری سانس بھری۔ "میں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں نہ پوچھ مجھ پر کیسی کیسی مصیبت پڑی ہے۔"

"بے بے' اب تیری مصیبت کے دن ختم ہو گئے۔" لالی نے کلثوم بی بی کو تسلی دی۔ "اب شان سے زمیں دارنی بن کے ادھر رہنا۔ نوکرانیوں پر حکم چلانا۔"

"نصیر پور میں تو میں زمین دارنی ہی ہوتی تھی۔ کئی نوکرانیاں تھیں میرے گھر میں۔" ارشاد الٰہی کی ماں کلثوم بی بی نے ایک بار پھر آہ سرد کھینچی۔ "بعد میں تو خود نوکرانی بننا پڑا۔ ہائے کیا کیا نہ ہوا میرے ساتھ۔"

"بے بے' بیتے دنوں کو بھول جا۔ آگے کی سوچ آگے کی۔" لالی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جماہی لی۔ "بہت نیند لگ رہی ہے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دروازے کی جانب بڑھا۔

ارشاد الٰہی اور اس کی ماں نے اسے روکنے پر اصرار نہ کیا۔ وہ بھی بہت تھکے ہوئے تھے اور اب سونا چاہتے تھے۔

۵۴

آتش دان میں سرخ سرخ انگارے دہک رہے تھے۔ احسان علی شاہ آتش دان کے قریب آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ انگاروں سے پھوٹتی ہوئی روشنی میں سرخ پڑ گیا تھا۔ وہ سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ذرا ہٹ کر اس کا منیجر مہربان علی بھی کرسی پر بیٹھا تھا۔

دونوں بالکل خاموش تھے۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔

احسان علی شاہ نے قریب رکھا ہوا پوکر اٹھایا اور اس کا چوبی دستہ ہاتھ میں دبائے ہوئے انگاروں پر جمی ہوئی راکھ کریدنے لگا۔ ذرا دیر تک وہ خاموشی سے انگاروں کو الٹتا پلٹتا رہا۔ پھر اس نے مڑ کر مہربان علی کی سمت دیکھا۔ پوکر آتش دان کے نزدیک دیوار سے ٹکا کر کھڑا کیا اور بجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

”تو گویا بات بنی نہیں۔“ اس نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ ”اور کیا کہتا تھا وکیل؟“

”کہتا تھا‘ کو ئی ہر کسی کی زمین داری پر بغیر دستاویزی ثبوت کے زیادہ عرصے تک کبضہ نہیں رکھا جا سکتا۔“

”لیکن چوہدری نور الٰہی کا مختار نامہ تو میرے نام کا موجود ہی ہے۔“ احسان شاہ نے گردن موڑ کر مہربان علی کی جانب دیکھا۔ ”اسے دستاویزی ثبوت کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا؟ مختار نامہ بھی تو دستاویز ہی ہے ناں؟“

”شاہ جی‘ تیں نوں پتہ ہے۔ مختار نامے پر چوہدری نور الٰہی کے جعلی دستخط بنائے گئے ہیں۔“

”پر یہ کون پوچھ رہا ہے کہ چوہدری کے دستخط اصلی ہیں یا جعلی؟“ احسان شاہ نے دریافت کیا۔

”یہ سوال تو تب پیدا ہو سکتا ہے جب کوئی اسے عدالت میں چیلنج کرنے والا ہو۔ مجھے تو ایسا کوئی نظر نہیں آتا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے جی۔ پر تیں نوں یہ بھی پتہ ہے۔ مختار نامے پر ان دنوں کی تاریخ پڑی ہے جب چوہدری زندہ تھا۔“ مہربان علی نے احسان شاہ کو مطلع کیا۔ ”چوہدری کے مرنے کے بعد تو مختار نامہ خود بخود ختم ہو گیا۔ اب اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں رہی۔“

”یہ بات تجھے وکیل نے بتائی ہے؟“

”ہاں جی اسی نے بتائی ہے۔“

”پر تو نے تو مختار نامہ وکیل کے مشورے سے بنوایا تھا۔“

”فوری طور پر کبضہ لینے کے لیے یہی نکتہ سمجھ میں آیا تھا۔“ مہربان علی نے وضاحت کی۔ ساتھ ہی اپنی کارگزاری کا بھی اظہار کیا۔ ”اسے فائنٹ حاصل کرنے کے لیے مجھے کتنی کوشش کرنی پڑی۔ کسی کو رشوت دی۔ کسی کی منت کی۔ مختار نامے کے لیے پرانی تاریخوں کا سٹامپ پیپر ہی حاصل کرنا بہت مشکل کام تھا۔“

احسان شاہ نے کسی فوری رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”مختار نامہ بنوانے سے تو کہیں بہتر تھا کہ بیع کی جعلی دستاویز تیار کروالی جاتی۔“

”اس کے لیے تو سب سے پہلے سوچا گیا تھا۔ بلکہ اس کا مسودہ بھی بن گیا تھا۔ پر اس کی رجسٹری کرانے میں کتنی مشکل پیش آ رہی تھی۔“ مہربان علی نے احسان شاہ کو یاد دلایا۔ ”رجسٹرار سے معاملہ طے بھی کر لیا جاتا تو سب سے دشوار مسئلہ زرعی اصلاحات کا تھا۔ تیرے پاس تو ۵ سو ایکڑ حد ملکیت سے زیادہ پہلے ہی زرعی اراضی موجود ہے۔ چوہدری نور الٰہی کی اراضی کیسے خرید سکتا تھا۔ تیں نوں یاد نہیں اس کے بارے میں کتنا سوچ وچار کیا گیا؟“

”یاد آیا۔ ایسی ہی دشواری پیش آئی تھی۔“ احسان شاہ نے بات مختصر کرتے ہوئے کہا۔ ”جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب تو یہ سوچ آگے کیا کرنا ہے؟“

”اس بارے میں تو وکیل سے ملنے کے بعد ہی سے میں نے سوچنا شروع کر دیا تھا۔“

”کوئی نیا نکتہ کوئی نئی سکیم سمجھ آئی؟ تو نے تو دیر تک وکیل سے صلاح مشورہ کیا ہے۔ بہت سے پہلو سامنے آئے ہوں گے؟“

”میں نے تو جی یہ سوچا ہے کہ دوسرا مختار نامہ حاصل کیا جائے اور اس دفعہ چوہدری کے کسی وارث سے مختار نامہ لیا جائے۔ نہ پچھلی تاریخوں کا سٹامپ پیپر تلاش کرنے کی ضرورت نہ جعلی

دستخط کی۔"

"چوہدری کا تو اب کوئی بھی نہیں رہا۔ پہلی گھروالی اور بچوں کے بارے میں کہتا تھا۔ برسوں ڈھونڈتا رہا۔ ان کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ دوسری گھروالی تھی اس نے بھی اس کے ساتھ ہی خودکشی کر لی۔" احسان شاہ نے مہربان علی کو آگاہ کیا۔ "اب اس کے وارث کو کہاں سے پیدا کیا جائے؟ تو یہ نہیں سوچا۔"

"جب اس کا کوئی وارث ہی نہیں تو کسی کو بھی کھڑا کیا جا سکتا ہے۔" مہربان علی نے تجویز پیش کی۔ "کوئی بھروسے کی زنانی مل جائے تو کام آسانی سے بن سکتا ہے۔ اسے چوہدری کی گھروالی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ آرام سے نکاح نامہ بھی بن سکتا ہے۔ صرف عدالت سے اس کی وراثت سرٹیفکیٹ نکلوانے کے لیے بھاگ دوڑ کرنی ہوگی۔"

"بات تو تیری سمجھ آتی ہے' پر ایسی زنانی کون ہو سکتی ہے جو اپنے بھروسے کی ہو اور آسانی سے مجھے مختار نامہ بھی دے دے؟"

"شاہ جی' یہ تو تمیں نوں ہی سوچنا پڑے گا۔"

احسان شاہ نے کچھ نہ کہا۔ سر جھکا کر آتش دان میں دہکتے ہوئے انگاروں کو تکنے لگا۔ اس کے چہرے پر انگاروں کی آنچ کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بت بنا خاموش بیٹھا تھا۔ مہربان علی بھی خاموش تھا۔ کمرہ خوب گرم تھا۔ مگر گہری خاموشی نے فضا کو بوجھل بنا دیا تھا۔

احسان شاہ نے گردن اٹھائی اور سامنے کی دیوار خواب ناک نظروں سے تکتے ہوئے بولا۔

"چوہدری ہوشیار بندہ نہیں تھا۔ کبھی کبھی بالکل غلط فیصلے کرتا تھا۔ جب اس نے یہ بتایا کہ اس کی دوسری گھروالی نوکرانی رہ چکی ہے تو میں نے اسے شرم دلائی۔ اپنی غلطی پر ایسا پچھتایا کہ اسے طلاک دے کر الگ کرنے پر تیار ہو گیا۔" مہربان علی کی جانب دیکھے بغیر احسان شاہ بولتا رہا۔ "میری بھانجی سلیمہ سے ویاہ کرنے پر بالکل رضامند ہو گیا تھا۔ کہتا تھا شاہ جی' تیرے ساتھ رشتے داری ہو گئی تو میری عزت بڑھ جائے گی۔"

"سلیمہ بی بی کدھر ہوتی ہے جی؟" مہربان علی نے دریافت کیا۔

"میرے ہی ساتھ رہتی ہے۔" احسان شاہ نے مڑ کر مہربان علی کی جانب دیکھا۔ "اڑھائی برس کی تھی تو ماں چل بسی۔ پیو پہلے ہی گردن توڑ بخار میں مبتلا ہو کر مر گیا تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد میں اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ تب سے وہ میرے ہی پاس ہے۔"

"اس سے زیادہ کس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔" مہربان علی نے دبی زبان سے پوچھا۔ "شاہ جی اگر تمیں نوں کوئی اعتراض نہ ہو تو سلیمہ کو چوہدری کا وارث بنایا جا سکتا ہے۔ اس کا تو چوہدری سے رشتہ بھی طے ہو چکا تھا۔ اپنے پنڈ کی مسجد کا ملّا آرام سے نکاح نامہ تیار کر دے گا۔ نکاح کے گواہ اور وکیل کے لیے اپنے اعتماد کے ایسے بندے بھی مل جائیں گے جو ضرورت پڑنے پر عدالت میں گواہی دے سکیں۔ گواہوں کے لیے میں اور نادر خان تو موجود ہی ہیں۔ دو بندے اور تلاش کر لیں گے۔ تو وکیل بن جانا۔ وکیل تو وہٹی کی طرف کا ہوتا ہے ناں۔"

"تجویز تو تیری ٹھیک لگتی ہے۔ سلیمہ سے مختار نامہ بھی مل سکتا ہے۔" احسان شاہ نے مہربان علی کی رائے سے اتفاق کیا۔ ساتھ ہی اپنے خدشے کا بھی اظہار کیا۔ "مگر ایک نہ ایک دن تو اس کا ویاہ کرنا ہوگا۔ معلوم نہیں وہ کیسا بندہ ہو۔ بعد میں اس کی نیت خراب ہو جائے۔ زمیں داری اور جائیداد اپنی تحویل میں لینا چاہے۔ یہ جائیداد بہت ظالم ہوتی ہے۔"

"تیرے چھوٹے پتر' رحمان شاہ سے عمر کم ہے تو اس کے ساتھ سلیمہ بی بی کا ویاہ کر دے۔ تمیں نوں رحمان شاہ کا ویاہ تو کرنا ہی ہے۔" مہربان علی نے مشورہ دیا۔

"میں تو سلیمہ کا ویاہ رحمان شاہ سے کرنے کے بارے میں پہلے ہی سوچ رہا تھا۔ پر اس کی ماں راضی نہیں ہوتی۔" احسان شاہ نے اپنی مجبوری بتائی۔ "وہ رحمان شاہ کا ویاہ کسی وڈے زمیں دار خاندان میں کرنا چاہتی ہے۔"

"جب سلیمہ بی بی خود وڈی زمین دارنی بن جائے گی تب تو اسے راضی ہو جانا چاہیے۔" مہربان علی نے مسکرا کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "ویسے بھی رحمان شاہ کی ماں تیری گھروالی ہے۔ تیرا کہا کیسے ٹال سکتی ہے۔"

"رحمان شاہ کی ماں کو میں راضی کر لوں گا' پر اس سلسلے میں وکیل سے ضرور مشورہ کر لینا چاہیے۔"

مہربان علی کچھ کہنا چاہتا تھا اسی اثناء میں ملازم نے کمرے میں داخل ہو کر نادر خان کے آنے کی اطلاع دی۔ احسان شاہ نے نادر خان کو فوراً بلایا۔

نادر خان کمرے میں داخل ہوا اور سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"کیسے آیا نادر؟" احسان شاہ نے اس کی غیر متوقع آمد پر حیرت کا اظہار کیا۔ "کوئی خاص گل بات تو نہیں؟"

"خاص ہی گل بات ہے۔" نادر خان نے جواب دیا۔

"آرام سے بیٹھ کرتا۔ کیا کہنا چاہتا ہے؟"

نادر خان کرسی کھسکا کر احسان شاہ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس نے قدرے تامل کے بعد احسان شاہ کو بتایا۔ "شاہ جی، تجھے یہ بتانے آیا ہوں چوہدری نور الٰہی کی پہلی گھر والی آئی ہے۔ اس کے ساتھ چوہدری کا پتر ارشاد الٰہی بھی ہے۔"

"چوہدری کی گھر والی اور اس کا پتر۔" احسان شاہ سخت حیرت زدہ ہوا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "دونوں کہاں ہیں؟ کدھر ہیں؟"

مہربان علی نے بھی حیران و پریشان ہو کر نادر خان کو دیکھا۔ مگر خاموش رہا۔

"دونوں آج شام کو آئے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک بندہ اور ہے۔ اس کا نام لالی ہے۔ اس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہی چوہدری کی گھر والی اور اس کے پتر کو لایا ہے۔" نادر خان نے احسان شاہ کو مطلع کیا۔ "میں نے تینوں کو مہمان خانے میں ٹھیرا دیا ہے۔"

"کس لیے آئے ہیں؟ اس بارے میں انھوں نے کچھ بتایا؟" احسان علی شاہ نے دریافت کیا۔

"چوہدری کے وارث کی حیثیت سے اس کی زمیں داری اور جائیداد پر کبضہ کرنے آئے ہیں۔"

"کیا ثبوت کہ وہ چوہدری کے وارث ہیں؟" مہربان علی نے جرح کرنے کے انداز میں نادر خان سے سوال کیا۔ "ان کے پاس وراثت کا سرٹیفکیٹ ہے؟ کوئی اور ایسی دستاویز جس سے یہ ثابت ہو سکے وہ چوہدری کی بیوہ ہے۔ ارشاد الٰہی اس کا پتر ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "اب تک وہ رہے کہاں؟ پہلے کیوں نہیں آئے؟"

"انھوں نے ایسا کوئی ثبوت تو پیش کیا نہیں اور نہ میں نے ان سے کوئی ثبوت مانگا۔" نادر خان نے مہربان علی کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "میں نے انھیں چوہدری کی زمیں داری کا کبضہ تو دینا نہیں تھا جو ان سے ثبوت مانگتا۔ بیکار میں جھگڑا کھڑا کرنے سے کیا فائدہ؟"

"تو نے ان سے پوچھ تاچھ تو کی ہو گی۔" اس دفعہ احسان شاہ نے استفسار کیا۔

"بالکل کی تھی جی۔" نادر خان نے مستعدی سے جواب دیا۔ "انھوں نے اپنے بارے میں بالکل وہی باتیں بتائیں جو چوہدری بتایا کرتا تھا۔ بلکہ چوہدری سے بھی کچھ زیادہ ہی تفصیل سے بتایا۔"

"یہ تو کوئی ثبوت نہیں ہوا۔" احسان شاہ مطمئن نہ ہوا۔ "ہو سکتا ہے انھوں نے یہ ساری باتیں کسی سے سن رکھی ہوں۔ چوہدری بھی دوسرے مہاجروں کی طرح اپنے لٹ پٹ کر آنے کے بارے میں سب ہی کو بتایا کرتا تھا۔" اس نے نادر خان کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "وہ دھوکے باز بھی ہو سکتے ہیں۔ تو نے ان کے بارے میں کیا اندازہ لگایا؟"

"دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک لگتے ہیں۔ وڈے زمیں داروں کی طرح اونچے طرے کی پگ لگائے شان سے آئے ہیں۔ ارشاد الٰہی کی ماں بھی عمدہ شال اوڑھے ہوئے چوہدرانی لگتی ہے۔ پر میرا اندازہ ہے کہ معمولی زمیں دار ہیں۔" نادر خان نے احسان شاہ کو آگاہ کیا۔ "تینوں دھوکے باز تو نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ دھوکے باز تو دراصل چوہدری تھا۔"

"چوہدری دھوکے باز تھا؟" احسان شاہ بہت چکرایا۔

"اس نے تو جی خود کو چوہدری نور الٰہی بنا رکھا تھا۔ اس کا نام تو رحیم داد تھا۔ اسی ضلع کے پنڈ احمد کوٹ کا رہنے والا تھا۔ مہاجر بھی نہیں تھا۔ اس نے تو نصیر پور کبھی دیکھا بھی نہیں جہاں کا چوہدری نور الٰہی تھا۔ وہ تو کئی سال پہلے فوت ہو گیا۔ رحیم داد اس کے کلیم کے کاغذات چرا لایا تھا۔"

"تجھے یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟" احسان شاہ نے دریافت کیا۔

"لالی نے بتائی تھیں۔ وہ رحیم داد کو جانتا ہے۔"

"کیا کہتا تھا وہ؟"

لالی نے رحیم داد کے بارے میں نادر خان کو جو کچھ بتایا تھا وہ اس نے تفصیل سے احسان علی شاہ کو بتا دیا۔

"وہ اتنا زبردست دھوکے باز اور فریبی تھا یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ دیکھنے میں تو بالکل سیدھا سادا لگتا تھا۔" احسان شاہ نے مڑ کر مہربان علی کی جانب دیکھا۔ بجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ "مہربان، تو نے جو سکیم بنائی تھی وہ تو بیکار ہو گئی۔ اب تو کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔"

احسان شاہ کے بجائے مہربان علی نے نادر خان کو مخاطب کیا۔ "نادر، تو نے ان سے اتنی باتیں ہی کیوں کیں؟ یہ کہہ کر انھیں ٹرخا دیتا کہ زمیں داری اور ساری جائیداد کی شاہ جی کے نام بیع ہو چکی ہے۔ بہت عرصے سے اس کے پاس ہے۔ لکھا پڑھی کرنے کے بعد حاصل کی گئی ہے۔"

"مہربان علی، تو کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہا ہے؟" اس دفعہ بھی نادر خان کا لہجہ تیکھا تھا۔ "میرے اتنا کہہ دینے سے وہ چپ کر کے چلے جاتے؟ یہ اتنی وڈی جائیداد کا معاملہ ہے۔ کوئی بھی دعویدار اس طرح آسانی سے اپنے حک سے دست بردار ہو سکتا ہے؟ اول تو ہمارے پاس کوئی رجسٹری شدہ بیع نہیں۔ انھوں نے دیکھنی چاہی تو کیا دکھائیں گے؟" وہ احسان شاہ کی جانب متوجہ ہوا۔ "شاہ جی، وہ ایسے ہی جائیداد کے دعویدار بن کر نہیں آ گئے۔ وکیل سے مشورہ کر کے آئے

ہیں، بلکہ وکیل کو بھی اپنے ساتھ لانا چاہتے تھے۔ وہ تو عدالت میں چوہدری نور الٰہی کے وارث ہونے کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس تو صرف مختار نامہ ہے اور وہ بھی جعلی۔"

"مختار نامہ تو بالکل بیکار ہے۔ اس کی اب کوئی قانونی حیثیت نہیں رہی۔" احسان شاہ کے اندر کا جاگیردار بیدار ہو گیا۔ چہرے سے جلال ٹپکنے لگا۔ اس نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ "پر میں نے کوٹلہ ہر کشن کی زمیں داری اپنے پاس رکھنی ہے۔ وہ میں نہیں دینے کا۔ یہ میری عزت کا سوال ہے۔"

"برا نہ منائیں جی تو ایک بات کہوں۔" مہربان علی نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "چوہدری کی بیوہ سے نکاح کر لیا جائے تو سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا۔"

"وہ میرے ساتھ نکاح کرنے پر کیوں تیار ہونے لگی اور اگر وہ تیار بھی ہو جائے تو اس سے کیا ملے گا؟" احسان شاہ نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "اصلی وارث تو اس کا پتر ہے۔ جائیداد پر بیوہ کا حق تو روپے میں دو آنے برابر بنتا ہے۔" اس نے مہربان علی کی تجویز مسترد کر دی۔ "مجھے تو پوری جائیداد اپنے پاس رکھنی ہے۔"

"تب تو ان سے اس پر بات کی جا سکتی ہے کہ کچھ رقم لے کر وہ اپنے حق سے دست بردار ہو جائیں اور جائیداد شاہ جی کے نام کر دیں۔" مہربان علی نے نادر خان کو مخاطب کیا۔ "نادر، اگر ان سے گل بات کی جائے تو وہ کیا مطالبہ کریں گے؟ تیرا اندازہ کیا ہے؟"

"جائیداد سے تو وہ دست بردار نہیں ہونے کے۔ اگر کسی طرح تیار بھی ہو گئے تو بہت لمبی کیمت مانگیں گے۔" نادر خان نے قیاس آرائی کی۔ "ان کی باتوں سے تو یہی لگتا ہے۔ وکیل سے مشورہ کر کے آئے ہیں۔"

"کیمت ہی دینی ہے تو جائیدار فروخت کرنے والے بہت مل جائیں گے۔ میں پہلے ہی ہزاروں روپے خرچ کر چکا ہوں۔ نیا مہمان خانہ بنوایا ہے۔ حویلی کی مرمت کرائی ہے۔ نیا فرنیچر ڈلوا دیا ہے۔ ٹیوب ویل لگوایا ہے۔" احسان شاہ نے نادر خان کی جانب دیکھا۔ "سارا خرچ تو تیرے ہی ہاتھوں سے ہوا ہے۔" اس نے منہ بگاڑ کر اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔ "میں نے اب کچھ نہیں دینا۔ اگر کچھ دینا بھی پڑا تو ان کو ہرگز نہیں دوں گا۔ اپنا کبضہ برکرار رکھنے کے لیے سرکاری افسروں کو دوں گا۔ ان سے تو روز ہی واسطہ پڑتا ہے۔ ان دونوں سے مجھے آگے کیا لینا۔"

مہربان علی اور نادر خان نظریں جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔ آتش دان میں انگاروں کی آنچ دھیمی پڑ گئی تھی۔ احسان شاہ نے ہاتھ بڑھا کر پوکر کا چوبی دستہ پکڑا اور انگاروں کو آہستہ آہستہ کریدنے لگا۔ آنچ تیز ہو گئی۔ آتش دان سے ابھرتی ہوئی روشنی سرخی بن کر اس کے چہرے پر دہکنے لگی۔

کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ کچھ دیر بعد نادر خان کی آواز ابھری۔ "شاہ جی، ان تینوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟ وہ پوچھیں تو میں کیا جواب دوں؟"

"انھیں جواب کیا دینا۔" احسان شاہ کی آنکھوں میں مجرمانہ چمک ابھری۔ اس کا چہرہ خوف ناک نظر آنے لگا۔ "اب تو ایک ہی راستہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تینوں کا ٹنٹا ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ لاشیں رات کے اندھیرے میں ادھر کسی گھنے جھنگر میں دبا دی جائیں گی یا نہر میں ڈال دی جائیں گی۔"

نادر خان کے چہرے پر خوف کا سایہ پھیل گیا۔ "شاہ جی، ایسا نہ سوچ۔" اس کی آواز میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ تھی۔ "وہ ایک نہیں تین ہیں۔ اکٹھے تین بندوں کو ٹھکانے لگانے سے بہت گڑبڑ پیدا ہو سکتی ہے۔"

"نادر ٹھیک کہہ رہا ہے۔" مہربان علی نے نادر خان کی تائید کی۔ "ایسا کیوں نہ کیا جائے۔ چوری ڈکیتی کا مکدمہ بنوا کر تینوں کو اندر کروا دیا جائے۔"

"سال دو سال بعد تینوں رہا ہو جائیں گے۔ فیر وہی مصیبت سامنے ہو گی۔" احسان شاہ نے اس کی تجویز مسترد کر دی۔ "کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔"

"۳۰۲ کا مکدمہ بنوایا جائے۔" مہربان علی نے نئی تجویز پیش کی۔ "اس میں تو تینوں پھانسی سے بھی لٹک سکتے ہیں۔ پھانسی نہ ہوئی تو عمر کید سے تو نہیں بچ سکتے۔"

"دفعہ ۳۰۲ کے تحت کیس بنوانے کے لیے تو کسی کو کتل بھی کروانا پڑے گا۔" نادر خان نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "ایسا بندہ کون ہو سکتا ہے؟"

"یہ تو تھانیدار ہی بتا سکتا ہے کہ ضابطے کی کیا کارروائی کی جائے۔ مکدمہ تو اسے ہی بنانا ہو گا۔" احسان شاہ نے مہربان علی کو مخاطب کیا۔ "مہربان، تو ایسا کر کل صبح تھانے چلا جا۔ ایس ایچ او شاہ نواز خان اعوان کو یہاں لے آ۔ بہت دبنگ اور حوصلے والا پولیس افسر ہے۔ میرا بہت گہرا یار ہے۔ تجھے تو پتہ ہے میری ہی سفارش پر اسے ادھر تعینات کیا گیا ہے۔ میرا کام تو خوشی خوشی کرے گا۔"

"یہ تو جی میں نے بھی غور کیا ہے، تھانیدار شاہ نواز خان تجھے بہت مانتا ہے۔ جیسا تو کہے گا ویسا ہی کرے گا۔" مہربان علی نے احسان شاہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "پچھلے اتوار کی شام کو تو وہ ادھر تیرے ہی پاس تھا۔"

"اپنے ایک کام سے آیا تھا۔ ایک چکر میں پھنس گیا ہے۔ اسکے خلاف انکوائری ہو رہی ہے۔"

احسان شاہ نے بتایا۔ ”اس کے لیے اوپر بات کرنی ہے۔ معاملہ بہت الجھا ہوا ہے۔“

”ان تینوں کا کانٹا بیچ سے نکل جائے تو سلیمہ بی بی کو چوہدری نور الٰہی کا وارث بنانے کے لیے کوشش کی جائے۔“ مہربان علی نے اپنا منصوبہ ایک بار پھر پیش کیا۔ ”ان تینوں کی اچانک آمد نے تو سارا پروگرام ہی گڑبڑ کردیا۔“

”مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں مہربان علی کی سکیم کیا ہے۔ پر شاہ جی، میرا خیال ہے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے وکیل سے مشورہ کرلیا جائے۔“ نادر خان نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ وہ مہربان علی کے مقابلے میں اپنی اہمیت جتانا چاہتا تھا۔ ”فریق مخالف کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ بھی اپنے وکیل سے گل بات کرکے آئے ہیں۔ پتہ نہیں ان کے پیچھے اور کون کون ہے۔ وہ ایسے ہی تو نہیں چلے آئے۔“

احسان علی شاہ کو نادر خان کی بات دل لگتی معلوم ہوئی۔ اس میں استدلال تھا، وزن تھا۔ اس نے نادر خان کی تائید کرتے ہوئے مہربان علی کی جانب دیکھا۔ ”نادر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وکیل سے پہلے مشورہ کرنا ضروری ہے۔ مہربان، تو کل وکیل کے پاس بھی چلا جا۔ اسے اپنے ساتھ ہی لیتا آ۔ تھانیدار بھی ادھر ہی ہوگا۔ دونوں سے تفصیلی بات کرنے کے بعد ہی طے کرنا ہوگا آگے کیا کیا جائے۔ اس سے پہلے ہم نے کوئی فیصلہ نہیں کرنا۔“ اس کے بدلے ہوئے رویّے سے اندازہ ہوتا تھا کہ نادر خان نے اس کی سوچ کا رخ بدل دیا تھا۔ غیظ و غضب اب سرد پڑچکا تھا۔ معاملہ فہمی اور سوجھ بوجھ غالب آچکی تھی۔ احسان علی شاہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

”ہم نے جو کچھ بھی کرنا ہے بہت سوچ سمجھ کے کرنا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی مصیبت گلے پڑجائے۔“

مہربان علی کو احسان شاہ کا بدلا ہوا رویّہ پسند نہ آیا۔ اور اس لیے بھی پسند نہ آیا کہ اسے بدلنے میں نادر خان کی رائے کو دخل تھا جسے وہ کم تر اور کوڑھ مغز سمجھتا تھا۔ اور ہمیشہ یہ کوشش کرتا تھا کہ اس کی رائے کو بالادستی حاصل نہ ہو۔ وہ احسان شاہ کی نظروں میں سرخ رو نہ ہوجائے۔ مگر احسان شاہ نے اس وقت اس طرح دو ٹوک بات کی تھی کہ اس نے مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ احسان شاہ کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

”شاہ جی! جیسی تیری مرضی۔ میں کل وکیل کے پاس بھی چلا جاؤں گا اور اسے اپنے ہم راہ لانے کی کوشش کروں گا۔“

”میرے لیے کیا حکم ہے جی۔“ نادر خان نے احسان علی شاہ سے دریافت کیا۔

احسان علی شاہ نے ضروری ہدایات دے کر نادر خان کو رخصت کردیا۔

☆

سورج چڑھ کر درختوں کے اوپر پہنچ گیا تھا۔ کہر کی دھند چھٹ چکی تھی۔ سرما کی ہلکی بسنتی دھوپ پگھلے ہوئے سونے کی مانند ہر طرف پھیلی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد لالی اور ارشاد الٰہی مہمان خانے کے صحن میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ناشتے میں پراٹھے تھے جن پر تازہ مکھن رکھا تھا۔ تلے ہوئے مرغ تھے۔ آم کا اچار تھا اور لسی سے لبالب بھرے ہوئے کانسی کے اونچے اونچے گلاس تھے۔ رات کے کھانے کی طرح ناشتا بھی انھوں نے رغبت سے کیا تھا اور اب کرسیوں پر اطمینان سے بیٹھے دھوپ کی خوش گوار حرارت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ارشاد الٰہی کی ماں کمرے کے اندر ہی تھی۔ کچھ دیر قبل نادر خان کی بیوی جنت اس کے پاس آگئی تھی۔ ارشاد الٰہی کی ماں کلثوم بی بی کی کمر میں درد کی کسک رہ رہ کر اٹھ رہی تھی۔ وہ لحاف اوڑھے خاموش لیٹی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب کا غبار چھایا تھا۔

جنت نے اس کے قریب کرسی کھسکا کر بیٹھتے ہوئے خیریت دریافت کی۔ کلثوم بی بی نے کراہتے ہوئے بتایا۔ ”کمر میں سخت درد ہے۔ سردی میں درد اسی طرح بڑھ جاتا ہے۔ آج کچھ زیادہ ہی ہے۔“ وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر ہولے ہولے دبانے لگی۔

جنت نے فوراً ایک نوکرانی کو بلایا۔ اپنے گھر سے تیل کی شیشی اور پیتل کی کٹوری منگوائی۔ کٹوری میں تیل ڈالا۔ نوکرانی کو ہدایت کی کہ تیل چولہے کی آنچ پر رکھ کر گرم کرلائے۔ نوکرانی تیل گرم کرکے لے آئی تو جنت نے اس میں انگلی ڈبو کر اندازہ لگایا کہ تیل زیادہ گرم تو نہیں ہے۔ تیل نیم گرم تھا۔ جنت نے نوکرانی سے کہا۔

”چوہدرانی کی کمر میں سخت درد ہے۔ مریم تو تیل سے کمر کی مالش کردے۔“

مریم نے تیل کی کٹوری سنبھالی اور کلثوم بی بی کے قریب بیٹھ کر آہستہ آہستہ مالش کرنے لگی۔ مالش سے کلثوم بی بی کو بہت آرام ملا۔ جنت کرسی پر بیٹھی کلثوم بی بی کی دل جوئی کرتی رہی۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔

مالش کرانے کے بعد کلثوم بی بی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جنت کی ہدایت پر مریم نے کلثوم بی بی کے سر میں تھوڑا سا تیل ڈال کر سر اور بالوں میں کھپایا۔ کنگھی سے بالوں کو سنوارا اور چوٹی باندھنے لگی۔

جنت تھوڑی دیر بعد اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور دوبارہ آنے کا وعدہ کرکے اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔ کلثوم بی بی اس کے برتاؤ اور رکھ رکھاؤ سے بہت متاثر ہوئی۔ جلد ہی آنے پر اصرار کیا۔

مریم خاموش بیٹھی اس کی چوٹی گوندھتی رہی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چلتے رہے۔

کمرے کے باہر صحن میں لالی اور ارشاد الٰہی ابھی تک کرسیوں پر بیٹھے دھوپ کھا رہے تھے۔ ان کے قریب ہی گلاب کے پھولوں کا تختہ تھا۔ سفید اور عنابی گلاب ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے شاخوں میں جھول رہے تھے۔ ان کی پنکھڑیوں پر ابھی تک شبنم کے قطرے چمکیلی دھوپ میں جگمگا رہے تھے۔

لالی اور ارشاد الٰہی کو نادر خان کا انتظار تھا۔ مگر وہ ابھی تک ان کے پاس آیا نہیں تھا۔ دھوپ کی تمازت رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی۔ دونوں کے چہرے تمتمانے لگے اور پسینے کی نمی پیشانی پر محسوس ہونے لگی۔

لالی نے اکتا کر انگڑائی لی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ارشاد الٰہی کو مخاطب کیا۔ "یار یہاں کب تک بیٹھا رہے گا۔ باہر نکل کر اپنی زمیں داری تو دیکھیں۔"

"نادر خان کا انتظار نہیں کرے گا؟"

"اتنا انتظار تو کر لیا۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ باہر ہی مل جائے۔"

ارشاد الٰہی نے مزید بات چیت نہ کی۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونون آگے بڑھے اور مہمان خانے سے باہر چلے گئے۔ گاؤں کی رڑی میں پہنچے۔ اس وسیع میدان میں مزارعے اور کمی ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ سب انھیں مڑ مڑ کر حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ سویرے ہی سے ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک بوڑھے نے قریب پہنچ کر سلام کیا۔ اٹکتے ہوئے پوچھا۔

"سنا ہے جی' تسی پنڈ کے نئے زمیں دار ہو۔"

لالی نے ارشاد الٰہی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "یہ چوہدری نور الٰہی مرحوم کا پتر چوہدری ارشاد الٰہی ہے۔ اپنے پیو کی زمیں داری سنبھالنے آیا ہے۔ اب یہ ادھر ہی رہے گا۔ اس کی ماں بھی ساتھ ہی آئی ہے۔"

"ہن جی ضرور سنبھالے اپنے پیو کی زمیں داری۔" بوڑھے نے مسکرا کر خوش نودی کا اظہار کیا۔

ارشاد الٰہی کی گردن تن گئی۔ سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ لالی نے بھی چہرے پر رعب اور دبدبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

دونوں گردنیں اونچی کیے رڑی سے گزر کر کھیتوں کی طرف نکل گئے اور ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک راستے پر آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ یہ اتنی کشادہ پگڈنڈی تھی جس پر دو آدمی اطمینان سے ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔ اس کے دونوں جانب کھیت تھے۔ ان کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ ربیع کی فصل کی بوائی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ گندم اور جو کے نرم و نازک پودوں نے کھیتوں میں سبز مخمل بچھا دی تھی۔ ہوا کے بپھرے ہوئے جھونکوں سے پودے بار بار جھومتے۔ کھیتوں میں سبزے کی لہریں اٹھتیں۔

کہیں کہیں نکے کے پاس بیٹھے ہوئے مزارعے آڈ کے پانی سے اپنے کھیتوں کو سیراب کر رہے تھے۔ لالی اور ارشاد الٰہی بے نیازی سے گردن اٹھائے چپ چاپ ان کے قریب سے گزرے۔

دونوں کھیتوں کے آس پاس کچھ دیر گھومتے پھرتے رہے' پھر باغوں کی طرف چلے گئے۔ آم کے اکا دکا درختوں میں بور آگیا تھا۔ سفید سفید پھولوں کے گچھوں پر شہد کی مکھیاں منڈلا رہی تھیں۔ چند درختوں میں کیڑا لگ گیا تھا۔ ایک ادھیڑ مالی ایسے پودوں پر کیڑا مار دوا چھڑک رہا تھا۔ دونوں کو اس نے سلام کیا اور زیادہ مستعدی سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

مالٹے کے درخت دیکھ کر دونوں کے چہرے کھل اٹھے۔ سرخ سرخ مالٹے شاخوں سے جھولتے ہوئے بہت خوبصورت نظر آ رہے تھے۔ لالی نے ہاتھ اونچا کر کے ایک مالٹا توڑا اور ارشاد الٰہی کی جانب بڑھا کر بولا۔ "شادے' یہ مالٹا دیکھ رہا ہے۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "باغ تو کھیتوں سے بھی زیادہ شاندار ہے۔ یار بہت وڈی زمیں داری ہے۔ زندگی بھر عیش کرے گا۔"

مالٹے کے ایک درخت کی اوٹ سے باغ کا رکھوالا نمودار ہوا۔ دونوں کے قریب آیا اور حیرت زدہ نظروں سے انھیں دیکھنے لگا۔ لالی نے اسے ٹوکا۔ "ایسے کیا دیکھ رہا ہے؟" اس نے ارشاد الٰہی کی سمت اشارہ کیا۔ "تو نے اسے نہیں پہچانا؟ یہ کوٹلہ ہرکشن کا نیا زمیں دار ہے۔ چوہدری نور الٰہی کا پتر چوہدری ارشاد الٰہی۔"

رکھوالے نے فوراً ارشاد الٰہی کو سلام کیا۔ گھگیا کر معذرت کرنے لگا۔ "معاف کرنا جی۔ میں نے پہچانا نہیں۔ پہلی بار ادھر آئے ہو ناں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک سرخ سرخ مالٹا شاخ سے توڑا اور ارشاد الٰہی کو دیتے ہوئے کہا۔ "اس بار تو جی فصل پچھلے برس سے بھی چنگی ہے۔"

ارشاد الٰہی فوراً زمیں دار بن گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر خوش نودی کا اظہار کیا۔ دونون آگے بڑھ گئے۔ رکھوالا اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

لالی اور ارشاد الٰہی دیر تک باغوں میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ جب تھک گئے تو واپس مہمان خانے میں چلے گئے اور سیدھے اس کمرے میں پہنچے جس میں ارشاد الٰہی اپنی ماں کے ساتھ ٹھیرا تھا۔ مگر کمرہ خالی تھا۔ ارشاد الٰہی کی ماں موجود نہ تھی۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ لالی نے لمبا کو

بلایا۔ کلثوم بی بی کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ جنت کے ہم راہ حویلی دیکھنے گ ہے۔

لالی نے مسکرا کر لہنا سے کہا۔ "لہنے، بہت پیاس لگی ہے ٹھنڈی لسی پلا۔"

لہنا نے مستعدی سے جواب دیا۔ "ابھی لایا جی۔" وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

لہنا ذرا ہی دیر بعد لسی سے بھرے ہوئے دو گلاس لایا اور دونوں کے سامنے میز پر رکھ دیے۔ لا اور ارشاد الٰہی لسی پینے لگے۔ لہنا نے دریافت کیا۔ "کوئی اور حکم جی؟"

"نہیں، اب تو ٹر جا۔" اس دفعہ ارشاد الٰہی بولا۔

لہنا چلا گیا۔ دونوں لسی پینے لگے۔ اسی اثناء میں نادر خان آگیا۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہو معذرت کی۔ "معاف کرنا جی۔ میں سویرے نہیں آسکا۔ رات کو شاہ جی سے ملنے پیراں والہ چلا گ تھا۔ وہاں سے لوٹا تو رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اس لیے دیر سے سو کر اٹھا۔" اس قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

"کوئی تکلیف شکلیف تو نہیں؟"

"ویسے تو بہت آرام ہے۔ پر کپڑے بہت گندے ہو گئے ہیں۔" لالی نے بتایا۔ "ہم اپنے ساتھ کپڑے لتے تو لائے نہیں تھے۔ ادھر ٹھیرنے کا ارادہ تو تھا نہیں۔ سوچا تھا شاہ جی سے گل بات کر کے واپس چلے جائیں گے۔ بعد میں آرام سے آئیں گے۔"

"کپڑوں کی فکر نہ کریں جی۔ نئے تیار ہو جائیں گے۔ حویلی کا اپنا درزی ہے۔ میں اسے بھیج دوں گا۔ وہ تینوں کی ناپ لے لے گا۔ میں آج ہی شہر جا کر کپڑا لے آؤں گا۔ درزی سے کہوں گا ف فٹ کپڑے سی دے۔ کل شام تک کپڑے تبدیل کرنے کا بندوبست ہو جائے گا۔"

"کوئی فکر کی گل نہیں۔" ارشاد الٰہی نے مسکرا کر کہا۔ "ایک روز اور انھی کپڑوں میں گزارہ کر لیں گے۔"

"تو شاہ جی کے پاس گیا تھا۔ تیری اس سے کیا گل بات ہوئی؟" لالی نے فوراً وہ سوال اٹھایا جر کا جواب جاننے کے لیے وہ گزشتہ رات سے بے چین تھا۔

"وہ بہت مصروف تھا۔ کچھ سرکاری افسران اس کی حویلی میں ٹھیرے ہیں۔ انھی کے ساتھ باتوں میں لگا ہوا تھا۔" نادر خان نے صحیح صورت حال بتانے سے گریز کیا۔ گول مول جواب دیا۔ "تب ہی تو مجھے ادھر اتنی دیر ہو گئی۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہمارے بارے میں تیری شاہ جی سے گل بات ہی نہیں ہوئی۔" ارشاد الٰہی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

"بات تو ہوئی تھی، پر زیادہ تفصیل سے نہیں ہوئی۔" نادر خان نے مطلع کیا۔ "شاہ جی نے کہا ہے کہ وہ تم سے ملے گا اور آرام سے بیٹھ کر گل بات کرے گا۔"

"تو نے کیا اندازہ لگایا؟" لالی نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بے قراری تھی۔ "ارشاد الٰہی کو زمین داری دینے میں کوئی جھگڑا انتظا تو نہیں کھڑا کرے گا؟"

"مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔" نادر خان نے کھل کر بات نہ کی، ٹالنے کی کوشش کی۔ "وہ بہت وڈا جگیردار ہے۔ اس کی زمیں داری ہزاروں ایکڑ پر پھیلی ہوئی ہے۔ زرعی اصلاحات کے تحت خاندان کے سارے ہی بندوں میں بانٹنے کے بعد بھی اس نے بہت زیادہ اراضی حکومت کو دے دئی۔" اس نے قدرے تامل کے بعد نرم لہجے میں کہا۔ "کوٹلہ ہر کشن کی زمیں داری تو اس نے اس لیے سنبھال لی تھی کہ چوہدری سے اس کی بہت گہری یاری تھی۔"

"تب تو چوہدری نور الٰہی کے وارث کی حیثیت سے اسے ارشاد الٰہی کو ادھر کی زمیں داری دے دینی چاہیے۔" لالی نے قیاس آرائی کی۔

"فکر نہ کریں جی۔" نادر خان نے دونوں کو اطمینان دلایا۔ "سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی ہو گا۔ شاہ جی کو جیسے ہی فرصت ملی وہ تم سے ملنے خود ادھر آئے گا۔ تب تک ادھر آرام سے ٹھیریں۔ کوئی ضرورت ہو تو مجھے بتا دیں۔"

"کپڑے لتے کا بندوبست ہو جائے تو ادھر ٹھیرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔" لالی نے ایک بار پھر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

"وہ تو جی کل شام تک ہو جائے گا۔" نادر خان نے یقین دلایا۔ "اس کی بالکل فکر نہ کریں۔ میں یہاں سے اٹھ کر کپڑا لینے شہر چلا جاؤں گا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے ٹھٹکا۔ مڑ کر دونوں کو دیکھا۔ "چوہدرانی کی دیکھ بھال کے لیے میں نے اپنی گھر والی کو لگا دیا ہے۔ وہ چوہدرانی کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گی۔"

نادر خان باہر چلا گیا۔

نادر خان سے گفتگو کرنے کے بعد لالی اور ارشاد الٰہی خاصے مطمئن ہو گئے تھے۔ ان کے چہروں سے مسرت اور شادمانی عیاں تھی۔ وہ اپنے تاریک ماضی سے نکل کر روشن مستقبل میں داخل ہونے کے سہانے خواب دیکھ رہے تھے۔

☆

حویلی کے پچھواڑے دور تک پھیلا ہوا وسیع میدان تھا جو مویشیوں کی چراگاہ کے طور پر استعما ہوتا تھا۔ یہ جوہ تھا جس میں کیکر اور شیشم کے اکا دکا درخت تھے۔ خود رو پودوں کی جھاڑیاں تھیں ہری بھری گھاس تھی۔ کہیں چھدری کہیں خوب گھنی۔ جوہ کے ایک طرف مویشیوں کا باڑا تھا ج کی چار دیواری کا ایک حصہ پچھلی برسات میں گر گیا تھا۔ پہلے اس جگہ اسکول تھا۔ یہ اسکول جم نے قائم کیا تھا۔ اس میں گاؤں کے بچوں کو ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ جمیلہ بچوں کو خود پڑھاتی ؛ اور اسکول کی دیکھ بھال بھی کرتی تھی۔ وہ اسے باقاعدہ سرکاری طور پر تسلیم شدہ پرائمری اسکول؛ چاہتی تھی۔ مگر جب وہ کوٹلہ ہر کشن چھوڑ کر اپنے بڑے بھائی ہردیال کے ہم راہ سرحد پار چلی گئ عرصہ دراز تک اسکول کی عمارت ویران پڑی رہی۔ اسکول بند ہو گیا تھا۔ رحیم داد نے اسے چلا۔ میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ احسان علی شاہ نے رحیم داد کے قتل کے بعد کوٹلہ ہر کشن کی زمیں داری ا تمام جائیداد پر قبضہ کیا تو اسکول کو مویشیوں کا باڑا بنا دیا۔

باڑے کی دیوار سے متصل ٹین کی چھت کا سائبان تھا۔ سائبان کے نیچے رحیم داد مرحوم جیپ کھڑی تھی جو اب عام طور پر نادر خان کے استعمال میں رہتی تھی۔

جیپ تو موجود تھی مگر ڈرائیور غائب تھا۔ نادر خان سائبان کے سامنے کھڑا ڈرائیور کا انتظار رہا تھا۔ وہ لالی، ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کے نئے لباس سلوانے کے لیے کپڑا لینے شہر جانا چا تھا۔ ڈرائیور تو نہیں آیا۔ البتہ جوہ کے درمیان سے گزرتی ہوئی پگڈنڈی پر لہنا نظر آ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا باڑے کی جانب آ رہا تھا۔

لہنا قریب پہنچا تو نادر خان نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "لہنے! تو مہمان خانے سے ادھر کیے آ گیا؟"

"میں تو تجھے دیر سے پنڈ میں ڈھونڈ رہا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"تو مجھے کیوں ڈھونڈ رہا تھا؟"

"تجھ سے ایک ضروری گل کرنی تھی۔"

"ایسی کیا گل کرنی تھی جو تو مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں آ گیا؟" نادر خان ہنوز حیرت زدہ تھا۔

"یہ جو ارشاد الٰہی مہمان خانے میں ٹھیرا ہے، کیا ادھر کا زمیں دار بن گیا ہے؟" لہنا نے دریافت کیا۔

"ابھی تو نہیں بنا۔" نادر خان نے جواب دیا۔ "پر تجھے کیسے پتہ چلا؟"

"حد ہو گئی جی۔" لہنا نے تعجب کا اظہار کیا۔ "سارے پنڈ میں چرچا ہے کہ ارشاد الٰہی پنڈ کا

زمین دار ہے۔ تجھے اب تک پتہ نہیں؟"

"مجھے کچھ پتہ نہیں۔" نادر خان نے بے زاری سے ٹالنے کی کوشش کی۔

"تو ارشاد الٰہی کو کب سے جانتا ہے؟"

"میں نے تو اسے پہلی بار دیکھا ہے۔" نادر خان نے ایک بار پھر بے زاری کا اظہار کیا۔ "پر تو ایسی بات کیوں پوچھ رہا ہے؟ مہمان خانے میں جا کر اپنا کام کر۔ مہمانوں کو آرام پہنچا۔ انھیں کوئی تکلیف شکیف نہ ہو۔"

"وہ تو جی میں کر ہی رہا ہوں۔ میں تو تجھے یہ بتانے آیا ہوں کہ ارشاد الٰہی کو میں پہلے سے جانتا ہوں۔"

"تو اسے پہلے سے جانتا ہے؟" نادر خان نے لہنا کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ "تب تو یہ بھی جانتا ہو گا کہ وہ چوہدری نور الٰہی کا پتر ہے۔"

"یہ تو جی میں نوں پتہ نہیں۔ پر اتنا پتہ ہے کہ ارشاد الٰہی ایک بار پہلے بھی ادھر آ چکا ہے۔"

"وہ ادھر پہلے بھی آیا تھا؟ کب آیا تھا؟" نادر خان نے لہنا سے پوچھا۔ "میں نے کل رات سے پہلے اسے یہاں کبھی نہیں دیکھا۔"

"پچھلے سال بھی انھی دنوں وہ یہاں آیا تھا۔ تو اس روز لہور گیا تھا۔" لہنا نے بتایا۔ "میں حویلی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے ادھر کے زمیں دار کے بارے میں پوچھا۔ اتنے میں شاہ جی کی گڈی حویلی کے آگے آ کر رکی۔ شاہ جی نے ارشاد الٰہی کو دیکھا۔ اس کے کپڑے لتے گندے اور پھٹے پرانے تھے۔ سر کے بال بھی گندے تھے۔ دیکھنے میں بھک منگا لگتا تھا۔ شاہ جی نے بھی اسے بھک منگا سمجھا۔ جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اسے دیا۔ اس نے چپ کر کے نوٹ لے لیا اور بنا کچھ کہے سنے چلا گیا۔"

"تجھے دھوکا ہوا۔ وہ کوئی اور ہو گا۔" نادر خان کو یقین نہیں آیا۔ "چوہدری ارشاد الٰہی تو کسی طرف سے بھکاری نہیں لگتا۔"

"تجھے پتہ نہیں۔ وہ بھکاری ہی ہے۔" لہنا نے اس دفعہ ذرا جما کے کہا۔ "میں اسے اور اس کی ماں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"تو اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" نادر خان نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ تیکھے لہجے میں ڈپٹ کر کہا۔ "آگے ایسی گل بات نہ کرنا۔ جا کر اپنا کام کر۔"

"ناراض نہ ہو۔ پہلے میری پوری گل تو سن لے۔" لہنا نے نرم لہجے میں بتایا۔ "میں کوئی غلط گل

بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ ارشادالٰہی کے یہاں آنے کے کچھ ہی دنوں بعد میں جوند سنگھ والا گیا۔ تیں نوں پتہ ہے ادھر میرا چاچا رہتا ہے۔ میں اسی کے پاس گیا تھا۔ میں نے دیکھا بس سٹاپ پر ارشادالٰہی بھیک مانگ رہا تھا۔ ساتھ میں اس کی ماں بھی تھی۔ وہ ایک درخت کے نیچے چادر بچھائے بیٹھی تھی دونوں ہی بھیک مانگ رہے تھے۔"

نادر خان اس کی باتیں سن کر ششدر رہ گیا۔ اس نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ "لہنے! تو کہہ رہا ہے؟"

"بالکل سچ کہہ رہا ہوں جی۔" لہنا نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "پچھلے مہینے میں جوند سنگھ والا گیا۔ تب بھی ارشادالٰہی اپنی ماں کے ساتھ بس سٹاپ پر بھیک مانگ رہا تھا۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "ساتھ میں میرا چاچا بھی تھا۔ اس نے بھی دونوں کو بھیک مانگتے دیکھا تھا۔ میرے چاچا سے پوچھ لے۔ میں کل ہی جوند سنگھ والا جا کر اسے ادھر لے آؤں گا۔ وہ تو دونوں کو ٹھیک طرح پہچانتا ہے۔ روز ہی ان کو بھیک مانگتے بس سٹاپ پر دیکھتا ہے۔"

نادر خان نے کچھ نہ کہا۔ خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ اسی اثناء میں سامنے سے ڈرائیور آتا ہوا نظر آیا۔ نادر خان نے مڑ کر لہنا کی جانب دیکھا۔ "لہنے! تو جا کر مہمان خانے میں اپنا کام کر۔ مہمانوں پہلے کی طرح آرام سے رکھ۔ ارشادالٰہی اور اس کی ماں کو بالکل پتہ نہ چلے کہ تو ان کو جانتا ہے۔ اور کسی سے بھی ان کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔"

"تیں نوں مہمان خانے نہیں جانا؟" لہنا نے پوچھا۔

"پہلے شہر جانے کا ارادہ تھا۔ پر اب شاہ جی کے پاس پیراں والہ جاؤں گا۔" نادر خان نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی تھی۔

ڈرائیور اب قریب آچکا تھا۔ لہنا نے مزید بات چیت نہیں کی۔ خاموشی سے مڑا اور آگے بڑھ گیا۔

☆

دن ڈھل رہا تھا۔ سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ دھوپ کی چمک دمک ماند پڑ گئی تھی۔ کلثوم بی بی مہمان خانے میں واپس آئی۔ لالی اور ارشادالٰہی کمرے میں بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

کلثوم بی بی کا دل حویلی میں ایسا لگا کہ دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے صحن میں چارپائی ڈلوائی۔ اجلا بستر لگوایا اور ٹانگیں پسار کر اطمینان سے لیٹ گئی۔ دھوپ کی ہلکی ہلکی حدت سے اسے بہت سکون ملا۔ ایک نوکرانی اس کے قریب بیٹھ گئی اور آہستہ

آہستہ کمر اور پنڈلیاں دبانے لگی۔ عرصہ دراز بعد اسے اتنی آسائش نصیب ہوئی تھی۔ ایسا آرام ملا کہ آنکھ لگ گئی۔ وہ دیر تک سوتی رہی۔ آخر جنت نے ہولے ہولے جھنجھوڑ کر اسے جگایا۔ درزی کپڑوں کی ناپ لینے آیا تھا۔ لالی اور ارشادالٰہی کی ناپ وہ مہمان خانے میں جا کر پہلے ہی لے چکا تھا۔ جنت نے کلثوم بی بی کی ناپ ملے کر درزی کو بتا دی۔ ساتھ ہی تاکید کی کہ جلد سے جلد کپڑے تیار کر دے۔

کلثوم بی بی کمرے میں پہنچ کر اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئی تو لالی نے شکوہ کیا۔ "بے بے، تو حویلی میں جا کر ایسی بیٹھی کہ دوپہر کی روٹی کھانے بھی ادھر نہ آئی۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "لگتا ہے حویلی تجھے بہت پسند آئی۔"

"ہاں جی بہت پسند آئی۔" کلثوم بی بی کے چہرے پر خوشی جھلکنے لگی۔ "بہت شاندار ہے۔ بالکل محل لگتی ہے۔ یہ وڈے وڈے کمرے۔ ایک نہیں کئی ہیں۔ ہر کمرے میں کپڑے لتے رکھنے کے لیے الماریاں، میزیں، کرسیاں، اچی اچی منجیاں۔ ان پر اجلے اجلے بستر لگے ہوئے۔ کیا نہیں ہے؟" اس نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔ "میں نے تو اپنے لیے ایک کمرہ پسند بھی کر لیا ہے۔"

"نوکرانیاں کیسی ہیں؟" ارشادالٰہی نے دریافت کیا۔

"مریم تو ٹھیک ٹھاک لگتی ہے۔ دیر تک بیٹھی میری کمر دباتی رہی۔" کلثوم بی بی نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "دوسری تو ایک دم ہڈ حرام لگتی ہے۔ مریم کے سوا سب کو نکال کر دوسری نوکرانیاں لگاؤں گی۔"

"اماں، تو نے کسی نوکرانی سے جھگڑا تو نہیں کیا؟" ارشادالٰہی نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ "تیرا غصہ بہت خراب ہے۔"

"وے میں پاگل ہوں۔" کلثوم بی بی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ابھی تو چپ کر کے سب کو دیکھتی رہی۔ زمیں داری اپنے پاس آجائے تب ان سے پوچھوں گی۔"

"زمیں داری تو ملنی ہی ملنی ہے۔ تو اس کی فکر نہ کر۔" لالی نے اسے مطلع کیا۔ "نادر خان دوپہر کو آیا تھا۔"

"کیا کہتا تھا وہ؟" ارشادالٰہی کی ماں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"وہ کل رات شاہ جی سے ملنے پیراں والہ گیا تھا۔ کہتا تھا دو چار روز میں شاہ جی ادھر آئے گا۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔" لالی نے کلثوم بی بی کو بتایا۔

"زمیں داری اور جائیداد تو مل جائے گی ناں؟"

"کیوں نہیں ملے گی؟" لالی نے کلثوم بی بی کو اطمینان دلایا۔ "شاہ جی ادھر آ کس لیے رہا ہے۔"

کلثوم بی بی خاموش رہی۔ اس کے چہرے سے مسرت جھلکنے لگی۔ عمدہ غذا کھانے کو ملی اور آرام و آسائش سے رہنا نصیب ہوا تو دو ہی دن میں اس کا روپ رنگ نکھر گیا۔ غربت و افلاس کا غبار مٹ گیا اور بجھی بجھی بے رونق آنکھوں میں چاندنی اتر آئی۔

لالی نے اس کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ "بے شبے تو تو ابھی سے وڈی زمیں دارنی لگ رہی ہے۔"

"زمیں داری تو تجھے اور شادا کو سنبھالنی ہے۔ "میں نے اس سے کیا لینا۔" ارشاد الٰہی کی ماں نے بے نیازی کا اظہار کیا۔

"شادے!" لالی نے فوراً منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ "آگے میں تجھے چوہدری کہوں گا۔" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "ہاں تو چوہدری جب تو کوٹلہ ہرکشن کا زمین دار بن جانا تو مجھے اپنا منیجر لگا لینا۔"

"نادر خان کا کیا بنے گا؟" ارشاد الٰہی کی ماں نے فوراً اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "اس کی گھر والی جنت نے تو مجھے بہت آرام پہنچایا۔ میری ایسی دیکھ بھال کرتی ہے، کہ تجھے کیا بتاؤں۔"

"اماں، تو اس کی فکر نہ کر۔" ارشاد الٰہی نے ماں کو اطمینان دلایا۔ "زمیں داری مل جائے تو اس کے بارے میں سوچیں گے۔ لالی کے ساتھ مل کر تو مجھے زمیں داری چلانی ہے۔"

تینوں اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ آئندہ کے منصوبے بناتے رہے۔

شام ہو گئی۔ مگر نادر خان نہ آیا۔ تاریکی پھیلنے لگی۔ رات کالی کاجل ہو گئی۔ سردی بڑھ گئی۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔ کوٹلہ ہرکشن سو گیا۔ لیکن نادر خان نظر نہ آیا۔

صبح ہوئی۔ کلثوم بی بی ناشتے سے فارغ ہوتے ہی حویلی میں چلی گئی۔ لالی اور ارشاد الٰہی کے لباس اتنے میلے کچیلے ہو گئے تھے کہ مہمان خانے سے باہر جاتے ہوئے انھیں عار محسوس ہوا۔ انھوں نے صحن میں کرسیاں ڈلوائیں اور دھوپ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

دونوں کی حجامت بھی بڑھ گئی تھی۔ لالی نے لہنا کو بلایا۔ اس سے دریافت کیا۔ "لہنے، حویلی کا درزی ہے تو نائی بھی ہو گا؟"

"کیوں نہیں ہے جی، بالکل ہے۔" لہنا نے جواب دیا۔ "پر وہ کل شام سے جیون شاہ گیا ہوا ہے۔"

"یہ جیون شاہ کدھر ہے؟" اس دفعہ ارشاد الٰہی نے دریافت کیا۔

"عارف والا روڈ پر ہے جی۔ ادھر اس کی بھین ہے۔ اسے ملنے گیا ہے۔" لہنا نے بتایا۔ "کل صبح نہ آیا تو شام کو ضرور واپس آ جائے گا۔"

"ادھر اور کوئی نائی شائی نہیں ہے؟" لالی نے ہاتھ سے رخسار سہلاتے ہوئے کہا۔ "داڑھی بنوانی ہے۔ بہت بڑھ گئی ہے۔ سر کے بال بھی کٹوانے ہیں۔"

لہنا نے مستعدی کا مظاہرہ کیا۔ "فکر نہ کریں جی۔ میں پنڈ کے نائی سینا کو لے کر آتا ہوں۔ سینا بھی بہت ہشیار نائی ہے۔"

لہنا چلا گیا۔ دوپہر کو کھانا لے کر آیا تو لالی نے نائی کے بارے میں پوچھا۔ لہنا نے نظریں جھکا کر کہا۔ "سینا تو جی بیمار ہے۔ اسے بخار ہے۔ ٹھیک ہو گیا تو کل بلا لاؤں گا۔"

لالی نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

دو روز گزر گئے۔ لیکن نادر خان نظر نہ آیا۔ نہ جنت کو اس کے بارے میں کچھ معلوم تھا نہ لہنا کو۔ بار بار پوچھنے پر بھی دونوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ لالی اور ارشاد الٰہی سخت پریشان تھے۔ ان کے لباس پچھلے پانچ روز میں بہت میلے کچیلے ہو گئے تھے۔ حجامت بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ ابھی تک نہ حویلی کا نائی جیون شاہ سے واپس آیا تھا اور نہ گاؤں کے نائی سینا کا بخار اترا تھا۔ کچھ تو سردی کے باعث اور کچھ اجلا لباس نہ ہونے کے سبب دونوں غسل بھی نہ کر سکے تھے۔ وہ کوٹلہ ہرکشن میں زمین دارانہ کر و فر اور آن بان سے داخل ہوئے تھے۔ اب اپنی پرانی جون میں آ گئے تھے۔ وضع قطع سے کسی بھٹے کے جمعدار معلوم ہوتے تھے۔

☆

جمعرات کی شام تھی۔ لالی اور ارشاد الٰہی کمرے میں بیٹھے نادر خان کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ باہر کہر کا ہلکا نیلگوں دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ ارشاد الٰہی کی ماں بھی کمرے میں موجود تھی۔ اسے کچھ زیادہ ہی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ رضائی اوڑھے پلنگ پر دو تکیوں کے سہارے بیٹھی تھی۔

"نادر خان کدھر چلا گیا؟" ارشاد الٰہی کی ماں نے بے چین ہو کر پہلو بدلا "اب تک واپس نہیں آیا۔"

"پتہ نہیں کدھر چلا گیا۔ کسی کو بتا کر بھی نہیں گیا۔" لالی نے اسے بتایا۔ "لگتا ہے شاہ جی کے پاس گیا ہے۔ اس نے روک لیا ہو گا۔"

"ایسا ہی لگتا ہے۔" ارشاد الٰہی نے بھی اس کی تائید کی۔ "ورنہ وہ اب تک ضرور آ جاتا۔ اسے

گئے ہوئے کئی روز ہو گئے۔"

نادر خان کے بارے میں تینوں کئی روز سے ایسی ہی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ لالی کچھ ہی دالا تھا کہ یکایک مہمان خانے کے باہر جیپ کے ہارن کی تیز آواز شام کے سناٹے میں ابھر ہارن کی آواز سنتے ہی لہنا اپنی کوٹھری سے نکلا اور بیرونی دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

ارشاد الٰہی نے لالی سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے نادر خان واپس آگیا۔"

"ہو سکتا ہے احسان علی شاہ بھی اس کے ساتھ ہی آیا ہو۔" لالی نے ارشاد الٰہی کے خیال اتفاق کیا۔ اپنی لوئی کھول کر دوبارہ جسم کے گرد لپیٹی اور کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

ارشاد الٰہی بھی اپنی لوئی درست کرنے لگا۔

لہنا اندھیرے سے نکل کر دروازے کی دہلیز پر نمودار ہوا۔ لیمپ کی روشنی میں اس کے چہر چھائی ہوئی پریشانی صاف نظر آرہی تھی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "پولسے آ ہیں۔"

لالی نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ "پولیس والے یہاں کیوں آئے ہیں؟"

ارشاد الٰہی بھی گھبرا گیا۔

"پتہ نہیں جی کیوں آئے ہیں؟" لہنا نے بتایا۔ "دونوں کو باہر بلاتے ہیں۔"

لالی چند لمحے دم بخود بیٹھا رہا۔ پھر اس نے میز پر رکھی ہوئی اپنی اونچے طرے کی پگ اٹھا کر ر رکھی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مڑ کر ارشاد الٰہی کو دیکھا۔

"شادے' تو بھی میرے ساتھ آ۔"

ارشاد الٰہی نے بھی اپنی پگ اٹھا کر سر پر رکھی اور لوئی سنبھالتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی آ بڑھا۔ ارشاد الٰہی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ دونوں کمرے سے نکل کر صحن میں پہنچے اور مہمان خا سے باہر چلے گئے۔ انھوں نے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا۔ دھندلی دھندلی کہر میں لپٹے ہوئے پولیس والے سامنے کھڑے تھے۔ دو پولیس کی یونیفارم میں تھے اور تین سادہ لباس میں تھے۔ کے عقب میں دو جیپیں کھڑی تھیں۔

"دونوں میں لالی کون ہے؟" ایک پولیس والے نے پوچھا جو ہیڈ کانسٹیبل معلوم ہوتا تھا۔

لالی نے آگے بڑھ کر بتایا۔ "میرا نام جی لالی ہے۔" اس نے نظریں اٹھا کر دریافت کیا۔ "کی آنا ہوا جی؟"

"اندر جا کر بیٹھ جا۔" ہیڈ کانسٹیبل نے ہاتھ اٹھا کر ایک جیپ کی طرف اشارہ کیا۔

"کہاں جانا ہے؟" لالی اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ آگے نہیں بڑھا۔

"تھانے چلنا ہے۔"

"تھانے کیوں چلنا ہے؟"

"یہ وہیں پہنچ کر پتہ چل جائے گا۔"

"مجھے تھانے کیوں لے جا رہے ہو؟ میں نے کوئی جرم کیا ہے؟" لالی جرح کرنے لگا۔ "میرے خلاف کوئی وارنٹ شارنٹ ہے؟"

"اوئے بکواس نہ کر۔" ہیڈ کانسٹیبل نے ڈپٹ کر کہا۔ اور جھپٹ کر لالی کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا۔ اس نے پلٹ کر قریب کھڑے ہوئے کانسٹیبل کی جانب دیکھا۔ "فضل دین اسے جیپ میں بٹھا۔ لیکن پہلے اس کی تھوڑی گرمی اتار دے۔ بہت کتون چھانٹتا ہے۔"

لالی تھپڑ کھا کر سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ فضل دین نے بڑھ کر لالی کی گردن دبوچی۔ زور سے دھکا دیا اور پینترا بدل کے ایسی کراری لات ماری کہ لالی لڑکھڑا کر گرا اور دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ اس کی اونچے طرے کی پگ بھی ایک طرف جا کر گری۔ دو کانسٹیبلوں نے اسے اٹھایا اور دھکے دیتے ہوئے جیپ کے قریب لے گئے۔ یہ رحیم داد مرحوم کی جیپ تھی جسے لالی پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ دونوں کانسٹیبلوں نے لالی کو پچھلی نشست پر بٹھا دیا۔ ایک کانسٹیبل اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

ارشاد الٰہی سہما ہوا کھڑا تھا اور لالی کی تذلیل ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ "اوئے تو کیوں کھڑا ہے۔ تیں نوں تھانے نہیں جانا؟" وہ ایک بار پھر فضل دین کی جانب متوجہ ہوا۔ "اس کے بھی ٹھڈ لگا۔ کیسا شان سے اکڑا کھڑا ہے۔"

فضل دین نے فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے زور زور سے دو لاتیں ایسی ماریں کہ ارشاد الٰہی ڈگمگا کر گرا۔ اٹھا اور پھر گرا۔ اس کی اونچے طرے کی پگ بھی قریب کی ایک جھاڑی میں جا کر ری۔ اسے بھی دھکے دے کر دوسری جیپ میں پچھلی نشست پر بٹھا دیا گیا۔ یہ احسان علی شاہ کی جیپ، تھی اور ڈرائیور بھی اسی کا تھا۔

لاڑ اور ارشاد الٰہی جیپوں میں بٹھا دیے گئے تو ایک کانسٹیبل مہمان خانے میں گیا۔ واپس آیا تو ارشاد الٰہی کی ماں کلثوم بی بی اس کے ہم راہ تھی۔ وہ اس قدر حواس باختہ تھی کہ کئی بار ٹھوکر کھا کر گری۔ وہ اس وقت کچھ زیادہ ہی لنگڑا کر چل رہی تھی۔ اسے ارشاد الٰہی کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ ایک کانسٹیبل بھی دونوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دوسرا آگے کی نشست پر ڈرائیور کے قریب بیٹھا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل دو کانسٹیبلوں کے ساتھ اس جیپ میں بیٹھ گیا جس میں لالی موجود تھا۔

ڈرائیوروں نے انجن اسٹارٹ کیے۔ دونوں جیپیں آگے بڑھیں۔ لہنا مہمان خانے کے دروازے پر سہما ہوا کھڑا تھا اور جیپوں کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا جو آن کی آن میں کہر کے دھندلکے میں اوجھل ہو گئیں۔

☆

حوالات میں اندھیرا تھا۔ سیلن تھی اور سخت بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ لالی، ارشاد الٰہی اور اس کی ماں، تینوں دیواروں سے لگے سکڑے سکڑائے ٹھنڈے فرش پر لیٹے تھے اور سردی سے کپکپا رہے تھے۔ ان کے علاوہ حوالات میں دو ملزم اور بھی تھے۔ وہ قتل کے الزام میں گرفتار کر کے لائے گئے تھے۔

ارشاد الٰہی کی ماں جب لالی اور ارشاد الٰہی کے ساتھ حوالات میں داخل ہوئی تو اس قدر خوف زدہ تھی کہ بت بنی خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی گھبرا کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے لالی کو دیکھتی کبھی ارشاد الٰہی کو۔ کچھ دیر بعد اس کے حواس کچھ بجا ہوئے تو اس نے لالی سے پوچھا۔

"لالی پتر، پولسئے ہم کو پکڑ کر کیوں لائے ہیں؟"

ارشاد الٰہی بھی اب تک دم بخود بیٹھا تھا۔ اس نے بھی لالی سے ایسا ہی سوال کیا۔ لالی کیا جواب دیتا۔ اسے خود نہیں معلوم تھا کہ تینوں کو گرفتار کر کے کیوں حوالات میں بند کیا گیا ہے؟ اسے صرف اتنا شبہ تھا کہ اس کارروائی کے پیچھے احسان علی شاہ کا ہاتھ ہے۔ لیکن پولیس نے ان کے خلاف کیا الزام عائد کیا ہے اس کا اسے کوئی اندازہ نہ تھا۔ مگر اس نے اپنے شبے کا ارشاد الٰہی اور اس کی ماں سے مطلق اظہار نہ کیا۔ صرف اتنا کہا۔

"پتہ نہیں پولیس نے ہم کو کیوں پکڑا ہے؟ سمجھ نہیں آتی ایسی کارروائی ہمارے خلاف کیوں کی گئی؟ صبح ہونے ہی پر پتہ چل سکے گا۔" اس نے چوکنا نظروں سے باہر کی جانب دیکھا۔ کسی کانسٹیبل کو دروازے کے قریب نہ پایا تو رسان سے دونوں کو سمجھایا۔ "ایس ایچ او کے سامنے میں جو بیان دوں تم دونوں بھی وہی کہنا۔ یہ ہرگز نہ بتانا کہ تم جوندسنگھ والا کے بس سٹاپ پر بھیک مانگتے تھے۔ بے بے، تو زیادہ نہ بولنا۔ تو بھی مصیبت میں پھنس جائے گی اور ہم کو بھی پھنسوا دے گی۔ فکر نہ کر سب ٹھیک ٹھاک ہی ہو گا۔"

لالی دونوں کو اسی طرح دیر تک سمجھاتا بجھاتا رہا۔ طرح طرح سے تسلی دیتا رہا۔ ان کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ خوف زائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

جاڑوں کی پہاڑ سی رات کاٹے نہیں کٹ رہی تھی۔ تینوں سونے کی کوشش کرتے رہے۔ بے چین ہو کر بار بار پہلو بدلتے۔ مگر سو نہ سکے۔ آنکھ لگ جاتی تو ذرا ہی دیر بعد کھل جاتی۔ کڑاکے کی سردی تھی اور طرح طرح کے اندیشے ستاتے تھے۔ البتہ دوسرے دونوں ملزم حوالات کے ایک گوشے میں بے خبر سو رہے تھے۔ وہ اقبال جرم کر چکے تھے یا ان کو امید تھی کہ جلد ہی ضمانت پر رہا ہو جائیں گے۔

صبح ایس ایچ او شاہ نواز خان اعوان کے سامنے تینوں کی پیشی ہوئی۔ وہ بڑا قوی ہیکل پولیس افسر تھا۔ چہرے پر رعب اور دبدبہ تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر چبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ سامنے رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھنے کو بھی نہ کہا۔ تینوں کو کھڑا رکھا۔ وہ کچھ دیر تینوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دریافت کیا۔

"تم سب کیا کرتے ہو؟ کوٹلہ ہرکشن کس لیے آئے تھے۔"

"ہم جی کیمبل پور سے آئے تھے۔ ادھر ہماری زمیں داری ہے۔" لالی نے تینوں کی نمائندگی کرتے ہوئے وہی کہا جو اپنے بارے میں نادر خان کو بتا چکا تھا۔ اس نے ارشاد الٰہی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "یہ چوہدری نور الٰہی کا پتر چوہدری ارشاد الٰہی ہے۔ اس کا پیو کوٹلہ ہرکشن کا زمیں دار ہوتا تھا۔ اسے پچھلے ہی دنوں اس کی موت کا پتہ چلا۔ اس کے وارث کی حیثیت سے یہ اپنی ماں کے ساتھ اپنے پیو کی زمیں داری اور جائیداد سنبھالنے کو ٹلہ ہرکشن آیا تھا۔"

ارشاد الٰہی نے بھی ایسا ہی بیان دیا۔ کلثوم بی بی نے اس کی تائید کی۔

"تو گویا تم زمیں دار ہو۔" تھانیدار شاہ نواز خان اعوان نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "اور کوٹلہ ہرکشن کی زمیں داری کا قبضہ لینے آئے ہو۔"

"ہاں جی، ہم اسی لیے آئے ہیں۔" لالی نے بیٹھنے کے لیے کرسی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"سیدھا کھڑا ہو۔" تھانے کے ایس ایچ او نے زور سے لالی کو ڈانٹا۔ وہ ایک دم روایتی تھانے دار بن گیا۔ چہرے پر خشونت چھا گئی۔ آنکھوں سے جلال برسنے لگا۔ اس نے تینوں کی پشت پر کھڑے ہوئے کانسٹیبل کی جانب دیکھا اور آواز میں گھن گرج پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "میرداد!"

کانسٹیبل میرداد بڑھ کر آگے آیا اور اپنے جوتوں کی ایڑیاں کھٹاک سے ٹکرا کر سلیوٹ کیا۔

"ان کو منشی سمندر خان کے پاس لے جاؤ۔" تھانے دار نے کرخت لہجے میں حکم دیا۔ "اسے کہو ان کو لتر پریڈ کرائے۔ ایسی کہ زمیں داری کی گرمی بالکل اتر جائے۔"

میرداد نے حکم کی تعمیل میں زمیں داری کی گرمی وہیں اتارنا شروع کر دی۔ اس نے تڑاق سے لالی کے منہ پر تھپڑ مارا۔ ٹانگ گھما کر ارشاد الٰہی کے چوتڑوں پر زور سے ٹھڈ لگایا۔ کلثوم بی بی کا بازو

پکڑ کر جھٹکا دیا۔ تینوں کو مارتا پیٹتا، دھکے دیتا باہر لے گیا۔

تھانے دار شاہ نواز خان اطمینان سے بیٹھا ہونٹوں میں دبی ہوئی سگریٹ کے کش لگاتا رہا اور تینوں کی درگت بنتے دیکھتا رہا۔

کانسٹیبل میرداد انھیں اس جگہ لے گیا جہاں ملزموں سے اقبال جرم کرایا جاتا تھا۔ تینوں کو وہاں پہنچا کر وہ خاموشی سے چلا گیا۔

کلثوم بی بی نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور رازدارانہ لہجے میں لالی سے پوچھا۔ "لالی پتر یہ لتر پریڈ کیا ہوتی ہے؟"

"یہ سب ہم کو ڈرانے دھمکانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔"

"پر ہم کو کیوں ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے؟" کلثوم بی بی نے پوچھا۔ "ہم نے کیا جرم کیا ہے جو ہمارے ساتھ ایسا کیا جا رہا ہے؟"

کلثوم بی بی بہت دہشت زدہ نظر آ رہی تھی۔ ارشاد الٰہی بھی سہما ہوا تھا۔ لالی نے قیاس آرائی کی۔ "لگتا ہے یہ سارا چکر احسان علی شاہ نے چلایا ہے۔ اس نے جائیداد اور زمیں داری پر زبردستی کبضہ جو کر رکھا ہے۔ وہ تم دونوں کو زمیں داری اور جائیداد دینا نہیں چاہتا۔ پولیس کے ذریعے دباؤ ڈلوا رہا ہے تاکہ ہم جائیداد اور زمین داری اس سے نہ لے سکیں۔ اس کے علاوہ اور تو کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی۔"

"مجھے تو زمیں داری اور جائیداد ملتی ملاتی ملوم نہیں ہوتی۔" کلثوم بی بی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بے بے حوصلے سے کام لے۔ زمیں داری اور جائیداد سب کچھ تم دونوں کو ملے گی اور ضرور ملے گی۔ تمہارا اس پر کنونی حک بنتا ہے۔" لالی نے اس کی ہمت بندھائی۔ ساتھ ہی ایک بار پھر خبردار کیا۔ "پر بے بے تو بالکل وہی کہنا جو میں نے کہا ہے۔ گھبرانا نہیں، سب ٹھیک ہی ہوگا۔" اس نے مڑ کر ارشاد الٰہی کی جانب دیکھا۔ "شادے! تو بھی حوصلہ رکھ۔ ڈرنا شرنا نہیں۔ سچی بات یہ ہے۔"

مگر وہ سچی بات بتا نہ سکا۔ میرداد واپس آ گیا۔ اس کے ہم راہ سات کانسٹیبل اور تھے۔ ان میں منشی سمندر خان بھی شامل تھا۔ اس کا چہرہ گینڈے کی طرح بھدا اور خوف ناک تھا۔ جسم مضبوط تھا۔ دوسرے بھی ہٹے کٹے اور لحیم شحیم تھے۔

میرداد نے لالی، ارشاد الٰہی اور اسکی ماں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے سمندر خان کو

بتایا "یہ رہے جی ملزمان۔ دھوکا دہی اور چار سو بیسی کے الزام میں کوٹلہ ہرکشن سے گرفتار کر کے لائے گئے ہیں۔"

"حوالدار جی، ہم نے نہ کوئی چار سو بیسی کی ہے اور نہ کسی کو دھوکا دیا ہے۔" لالی نے منشی سمندر خان کو مخاطب کرتے ہوئے صفائی پیش کی۔ "ہمارے خلاف یہ بالکل غلط اور جھوٹا الزام ہے۔ ہم تو کوٹلہ ہرکشن۔"

"بکواس نہ کر۔" منشی نے لالی کو غصے سے جھڑک دیا۔ آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ "مجھے پتہ ہے تم کوٹلہ ہرکشن کس لیے آئے تھے۔" اس نے مڑ کر قریب کھڑے ہوئے کانسٹیبل کی جانب دیکھا۔ "لیا ایں نو چھتر۔"

ایک کانسٹیبل بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹیوب ویل کے پٹے کے دو ٹکڑے دبے ہوئے تھے جن میں سے ہر ایک لگ بھگ دو فٹ لمبا تھا۔ یہ چھتر تھے۔ ان کو لتر بھی کہا جاتا ہے۔ لالی ایسے چھتر پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ تھانے میں ملزموں کے خلاف ان سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ اس نے خوف زدہ ہو کر سمندر خان کو ایک بار پھر مخاطب کیا۔

"حوالدار، میری گل تو سن۔"

سمندر خان نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کانسٹیبلوں سے کہا۔ "ان دونوں کو چھتر پریڈ کے لیے تیار کرو۔" اس نے لالی اور ارشاد الٰہی کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

لالی نے بار بار احتجاج کیا۔ صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ مگر بات سننے کے بجائے تھپڑوں اور لاتوں سے اسے خاموش کر دیا گیا۔ کانسٹیبلوں نے دونوں کے کپڑے اتارے اور مادر زاد برہنہ کر دیا۔ کلثوم بی بی ایک گوشے میں دہشت زدہ بیٹھی تھی۔ اس نے لالی اور اپنے جوان بیٹے کو اس عالم میں دیکھا تو بدحواس ہو کر اپنا منہ چادر سے چھپا لیا۔

دونوں کو برہنہ کر کے فرش پر اوندھے منہ لٹا دیا گیا۔ چار کانسٹیبل لالی اور ارشاد الٰہی کا ایک ایک ہاتھ دبا کر بازوؤں پر بیٹھ گئے۔ ایک کانسٹیبل، لالی کی دونوں ٹانگیں جوڑ کر پنڈلیوں پر اس طرح بیٹھ گیا کہ دونوں پیر اس کے مضبوط ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ ارشاد الٰہی کی ٹانگیں دبوچ کر اسی طرح ایک اور کانسٹیبل بیٹھ گیا۔ کانسٹیبلوں نے دونوں کو اس طرح بے بس کر دیا تھا کہ وہ اپنے جسموں کو بالکل نہ ہلا سکتے تھے۔

جب دونوں کانسٹیبلوں نے لالی اور ارشاد الٰہی کو بالکل بے بس اور مجبور کر دیا تو سمندر خان آگے بڑھا اور لالی کے قریب پہنچا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھتر دبا تھا۔ دوسرا چھتر میرداد کے ہاتھ میں

تھا۔ وہ بڑھ کر ارشاد الٰہی کے قریب پہنچ گیا۔ سمندر خان اور میرداد ہاتھ گھما گھما کر لالی اور ارشاد الٰہی کی کمر اور چوتڑوں پر سڑاک سڑاک چھتر مارنے لگے۔

لالی کے لیے یہ نیا تجربہ نہ تھا۔ وہ تھانوں کے اندر پولیس کے ہاتھوں کئی بار چھتروں کی مار کھا چکا تھا۔ اینٹوں کے بھٹوں پر بھی جمعدار اور کارندوں کے ہاتھوں اسی طرح پٹ چکا تھا۔ البتہ ارشاد الٰہی کو پولیس کے ایسے تشدد سے پہلی بار سابقہ پڑا تھا۔ مگر بھٹوں پر جمعدار اور کارندوں کے ہاتھوں وہ بھی بارہا چھتروں کی مار کھا چکا تھا۔ لہٰذا دونوں نے نہ دہائی دی اور نہ واویلا کیا۔ خاموشی سے مار کھاتے رہے۔ صرف دانتوں کو بھینچ کر سسکیوں کی سی آوازیں منہ سے نکالتے اور تکلیف سے بے قرار ہو کر ادھر ادھر پہلو بدلنے کی کوشش کرتے۔

ارشاد الٰہی کی ماں نے کچھ دیر تو ضبط کیا۔ سہمی ہوئی بیٹھی رہی اور بیٹے پر ہوتے ہوئے ظلم و ستم کو دیکھتی رہی۔ بے بسی سے آنسو بہاتی رہی۔ آخر اس کے صبر کا بندھن ٹوٹ گیا۔ بے قرار ہو کر گڑگڑانے لگی۔

”وے اسے نہ مار۔ اسے ٹی بی ہے۔ اسے بخار رہتا ہے۔ کھانسی کے ساتھ خون آتا ہے۔ یہ مر جائے گا۔“

”اوئے بکواس نہ کر۔“ کانسٹیبل میرداد نے آنکھیں نکال کر اسے ڈانٹا۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی سسکیاں بھرتی رہی۔ پھر تڑپ کر اٹھی اور میرداد کے پیروں پر سر رکھ دیا جو ارشاد الٰہی کی چھتر سے پٹائی کر رہا تھا۔ اس نے جھنجلا کر کلثوم بی بی کی کمر اور پیٹھ پر ٹھوکریں ماریں۔ غصے سے دھتکارا۔ گالیاں دیں۔ بال پکڑ کر علیحدہ کرنا چاہا۔ لیکن اس نے پیر نہ چھوڑے۔ میرداد کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔ مارتے مارتے تھک بھی گیا تھا۔ اس نے مڑ کر حوالدار سمندر خان کی جانب دیکھا۔

”بہت ہو گیا۔ اتنا کافی ہے اس کے لیے۔“

سمندر خان بڑھ کر قریب پہنچا۔ ٹھوکر مار کر ارشاد الٰہی کو حکم دیا۔ ”کھڑا ہو جا۔“

ارشاد الٰہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ عالم یہ تھا کہ ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ چہرے پر وحشت طاری تھی۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ حواس بجا نہیں تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑے ٹکر ٹکر سمندر خان کو دیکھ رہا تھا۔

☆

میرداد، ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کو ایس ایچ او کے کمرے میں لے گیا۔

ایس ایچ او شاہ نواز خان اعوان ابھی تک اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے دونوں کو گردن اٹھا کر دیکھا۔ مسکرا کر پوچھا۔ ”اتر گئی زمیں داری یا ابھی کچھ اور اتاری جائے۔“

ارشاد الٰہی دم بخود کھڑا رہا۔ مگر اس کی ماں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگی۔ ”نہیں جی، ہم نے کوئی زمیں داری شمیں داری نہیں کرنی۔“

”کیا یہ سچ ہے، تم دونوں اڈہ لاریاں جوند سنگھ والا پر بھیک مانگتے تھے؟“ ایس ایچ او نے دریافت کیا۔

کلثوم بی بی نے وضاحت کرنا چاہی۔ ”وہ ایسا ہے جی، جب ہم نصیر پور سے پاکستان پہنچے تو شادا کا پیسہ۔“

”بکواس نہ کر۔“ ایس ایچ او شاہ نواز خان نے غصے سے ڈانٹا۔ ”جو پوچھتا ہوں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دے۔“

”ہن جی، ہم دونوں جوند سنگھ والا کے بس سٹاپ پر بھیک مانگتے تھے۔“ کلثوم بی بی نے گھبرا کر اعتراف کیا۔

” کیمبل پور تم دونوں کس سلسلے میں گئے تھے؟“

”نہیں جی، ہم ادھر کبھی نہیں گئے۔“ ارشاد الٰہی کی ماں کلثوم بی بی نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”ہم نے تو جی کیمبل پور دیکھا بھی نہیں۔“

”لالی، تم کو کہاں ملا تھا؟“ تھانیدار شاہ نواز خان اعوان نے سوال کیا۔

”وہ جی پہلی بار مجھے لہور میں ملک نثار کے بھٹے پر ملا تھا۔“ اس دفعہ ارشاد الٰہی نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں ادھر ”تھیرے ہوتے تھے۔“

”ہم کو تو جی کچھ پتہ نہیں تھا۔“ کلثوم بی بی نے صفائی پیش کی۔ ”لالی ہم کو بہکا کر زمیں داری اور جائیداد دلانے جوند سنگھ والا سے کوٹلہ ہر کشن لایا تھا۔“

تھانیدار نے لمبی ”ہوں“ کی۔ ہولے ہولے گردن ہلائی۔ ”تو لالی تم دونوں کو کوٹلہ ہر کشن لایا تھا۔“ لمحہ بھر کے لیے اس نے خاموشی اختیار کی۔ پھر دریافت کیا۔ ”مائی، تیرا اور کون کو ہے؟ میرا مطلب ہے۔ کوئی شریکا، کوئی عزیز دار۔“

”میرا بس یہی ایک پتر ہے۔“ کلثوم بی بی نے ارشاد الٰہی کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس کے علاوہ میرا اور کوئی نہیں۔ وڈا پتر کرم الٰہی تھا۔ پاکستان آتے ہوئے تریموں کے پتن پر سکھ بلوائیوں نے اسے مار ڈالا۔ میری وڈی دھی صابرہ تھی۔ اسے بلوائی اٹھا لے گئے۔ چھوٹی میرے ساتھ پاکستان آئی

تھی۔ وہ بھی مر گئی۔ گھر والا بھی نہیں رہا۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنسو رخساروں پر لڑھکنے لگے۔ "اب تو جی ہم دونوں کا کوئی بھی نہیں رہا۔"

"ٹھیک ہے۔" تھانیدار شاہ نواز نے مڑ کر کانسٹیبل میرداد کی طرف دیکھا۔ "میرداد' ان کو لے جاؤ۔ روٹی شوٹی کھلاؤ۔ انھیں آرام سے رکھو۔"

میرداد نے ایک بار پھر اٹینشن ہو کر کھٹاک سے سیلوٹ کیا۔ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں سے چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ ان کے ہم راہ دروازے کی جانب بڑھا۔ ایس ایچ او نے اسے ٹوکا۔ "میرداد۔"

میرداد ٹھٹکا۔ پلٹ کر ایس ایچ او کی جانب متوجہ ہوا۔ ایس ایچ او نے حکم دیا۔ "ان کو حوالات میں پہنچا کر لالی کو ادھر بھیج دو۔"

تینوں چلے گئے۔ ایس ایچ او شاہ نواز خان خاموش بیٹھا سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔

لالی ایک کانسٹیبل کے ساتھ ایس ایچ او کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ ہوش ٹھکانے نہیں تھے۔ قدم ڈگمگا رہے تھے۔ بال بکھر کر منہ پر آ گئے تھے۔ آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔

تھانیدار نے نظریں اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ مسکرا کر پوچھا۔ "تو کیمبل پور کا زمیں دار ہے ناں؟"

"ہاں جی۔" لالی نے مختصر جواب دیا۔

"تیری زمیں داری ابھی نہیں اتری۔ کچھ اور اتاری جائے۔" تھانیدار نے غضب ناک ہو کر ڈانٹا۔ "ارشاد الٰہی کے ساتھ اینٹوں کے بھٹے پر تو نہیں تیری ماں کا کوئی یار پتھیرا لگا ہوا تھا؟"

لالی نے چونک کر تھانیدار کو دیکھا۔ مگر کچھ بولا نہیں۔ سر جھکایا اور خاموش کھڑا رہا۔

"کوٹلہ ہر کشن کی زمیں داری پر دھوکے فریب سے کبضہ کرنے کے لیے تجھے کوئی اور نہیں ملا؟" تھانیدار تیکھے لہجے میں گویا ہوا۔ "اڈہ لاریاں جوند سنگھ والا پر بھیک مانگنے والے یہ دونوں بھکاری ہی تجھے ملے۔"

لالی سمجھ گیا کہ سارا کھیل بگڑ گیا۔ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں نے سب کچھ اگل دیا۔ اب مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے پسپائی اختیار کی۔ عاجزی سے بولا۔ "غلطی ہو گئی جی۔"

"سوال یہ ہے کہ تو نے یہ خطرناک کھیل کیوں کھیلا؟" تھانیدار شاہ نواز خان نے زور دے کر پوچھا۔ "سچ سچ بتا' تو نے ایسا کیوں کیا؟ کس لیے کیا؟" اس نے قہر آلود نظروں سے سے لالی کو دیکھا۔ "جھوٹ بولا تو منجی چڑھاؤں گا۔ رولر پھروا دوں گا۔ الٹا لٹکا کر چمڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔ ایسی مار لگاؤں گا کہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔"

"میں نے جی جھوٹ نہیں بولنا۔ سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔" لالی نے گڑگڑا کر صفائی پیش کی۔ "یہ ٹھیک ہے جی ارشاد الٰہی اور اس کی ماں جوند والا سنگھ کے بس سٹاپ پر بھیک مانگتے ہیں۔ پر یہ بالکل سچ ہے ارشاد الٰہی کوٹلہ ہرکشن کے زمیں دار چوہدری نور الٰہی مرحوم کا پتر ہے اور اس کی ماں چوہدری کی بیوہ ہے۔ دونوں اس کی جائیداد کے اصلی وارث ہیں۔"

"پر نہ تو ارشاد الٰہی نے اور نہ ہی اس کی ماں نے اپنے بیان میں ایسی کوئی گل بات میرے سامنے کی۔" تھانیدار نے منہ بگاڑ کر اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔ "تو اویں پھنے خان بن کے آ گیا۔"

لالی مرعوب نہ ہوا۔ اس نے نڈر ہو کر کہا۔ "دونوں نے تیرے سامنے ڈر کے مارے ایسی گل بات نہیں کی۔ پر وہ عدالت میں جا کر یہی کہیں گے جو میں نے تجھے بتایا۔ یہ تو چوہدری نور الٰہی کے کلیم کے کاغذات سے ثابت ہو جائے گا کہ اس کا وارث کون ہے۔"

"تو نے کسی وکیل شکیل سے اس سلسلے میں مشورہ کیا ہے؟" تھانیدار کا لہجہ اس دفعہ بدلا ہوا تھا۔

لالی نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ خوف اور دہشت کے حصار سے وہ رفتہ رفتہ باہر نکل رہا تھا۔ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "ابھی تو جی مشورہ نہیں کیا۔ پر بعد میں تو کیا جا سکتا ہے۔"

"جو تیرا جی کرے ضرور کرنا۔ یہ تیرا اور ارشاد الٰہی کا معاملہ ہے۔ مجھے اس سے کچھ نہیں لینا۔" تھانیدار نے اپنی غیر جانب داری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ "پر مجھے جو تفتیش کرنی ہے وہ تو کرنی ہی کرنی ہے۔ اس سلسلے میں تجھ سے بعد میں گل بات کروں گا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی کی جانب ہاتھ اٹھاتے ہوئے کانسٹیبل کو ہدایت کی۔ "اسے لے جا۔ حوالات میں بند کر دے۔"

ایس ایچ او شاہ نواز خان اعوان نے اپنی ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھی اور دفتر سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کانسٹیبل نے مڑ کر لالی کی طرف دیکھا۔ اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ کانسٹیبل دروازے کی جانب بڑھا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

☆

شام کو احسان علی شاہ کی جیپ تھانے کے باہر آ کر رکی۔ نادر خان نیچے اترا اور تھانے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو تھانیدار شاہ نواز خان اعوان اس کے ہم راہ تھا۔ دونوں خاموشی سے جا کر جیپ میں بیٹھ گئے۔ جیپ آگے بڑھی اور سڑک پر دوڑنے لگی۔

جیپ پیران والہ پہنچی تو پہر رات گزر چکی تھی۔ جاڑوں کی رات تھی۔ سر شام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ تھانیدار اور نادر خان جیپ سے باہر نکلے۔ حویلی کے مہمان خانے میں پہنچے۔

آتش دان میں انگارے دہک رہے تھے۔ احسان شاہ آتش دان کے قریب بیٹھا تھا۔ وہ تھانیدار کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھا۔ گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ تھانیدار کو صوفے پر بٹھایا۔

احسان علی شاہ کا منیجر مہان علی بھی کمرے میں موجود تھا۔ نادر خان بھی اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ دونوں خاموش تھے۔

"شاہ نواز۔" احسان شاہ نے تھانیدار کو مخاطب کیا۔ "تو نے تینوں کی پٹائی شتائی بھی کرائی؟"

"وہ تو جی کرائی ہی تھی۔" تھانیدار نے جواب دیا۔ "اس کے بغیر کیسے کام چلتا۔"

"انھوں نے کچھ کام کی گل بات بتائی؟" احسان شاہ نے دریافت کیا۔

"زیادہ ٹارچر کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ تینوں نے اپنے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔" تھانیدار نے احسان شاہ کو مطلع کیا۔ "نادر خان کی اطلاع بالکل درست ہے۔ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں اڈہ لاریاں جوند سنگھ والا پر بھیک مانگتے تھے۔ انھوں نے اس کا اعتراف بھی کرلیا۔ پر تجھے یہ پتہ نہیں ارشاد الٰہی پہلے بہتیرا تھا۔ لالی بھی بہتیرا رہ چکا ہے۔ دونوں ایک ہی بھٹے پر کام کرتے تھے۔ وہیں دونوں میں میل جول پیدا ہوا۔"

"لالی بہتیرا رہ چکا ہے؟" نادر خان نے حیرت سے تھانیدار کو دیکھا۔ "وہ تو خود کو کیمبل پور کا زمیں دار بتاتا تھا۔ کوٹلہ ہرکشن میں اس شان سے آیا تھا کہ میں تو اسے زمیں دار ہی سمجھا۔"

"مجھے بھی پہلے اس نے یہی بتایا تھا۔" تھانیدار نے کہا۔ "لیکن تھرڈ ڈگری کے بعد تینوں میرے سامنے پیش کیے گئے تو ساری زمیں داری شمیں داری بھول گئے۔ گڑگڑانے لگے۔ فریاد کرنے لگے۔ سب کچھ اگل دیا۔"

"تب تو تینوں کے خلاف سیدھا سیدھا دھوکا دہی کا کیس بنتا ہے۔" احسان علی شاہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"دھوکا دہی کا کیس ہی تو نہیں بنتا۔ ورنہ سارا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا۔" تھانیدار نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "تینوں آسانی سے اندر ہو جاتے۔ سزا بھی لمبی ہو جاتی۔"

"دھوکا دہی کا کیس کیوں نہیں بنتا؟" مہان علی نے دریافت کیا۔

"یار مہان علی، تو نے اپنے یہ بال کہاں سفید کر لیے؟" تھانیدار نے مسکرا کر طنزیہ لہجے میں مہان علی کو مخاطب کیا۔ "یہ تو سوچ اتنی وڈی زمین داری اور جائیداد پر کوئی بھکاری یا بھٹے کا معمولی بہتیرا دعویٰ کرنے کی کیسے ہمت کر سکتا ہے؟ اس کے دعوے کی کچھ تو بنیاد ہوگی۔ ایسے ہی تو زمیں داری اور جائیداد لینے نہیں چلے آئے۔" اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ "کیس کی نوعیت سے پتہ چلتا ہے کہ ارشاد الٰہی کوٹلہ ہرکشن کے زمیں دار چوہدری نور الٰہی مرحوم کا پتر ہے اور کلثوم بی بی اس کی بیوہ ہے۔ اگر معاملہ عدالت میں گیا تو ارشاد الٰہی کا وکیل محکمہ سیٹلمنٹ کے ریکارڈ سے ثابت کر دے گا کہ دونوں چوہدری نور الٰہی کے وارث ہیں۔ تلاش کر کے اور بھی دستاویزی ثبوت مہیا کیے جا سکتے ہیں۔ گواہ بھی آسانی سے مل جائیں گے۔ گورداس پور کے ادھر بہت مہاجر ہیں۔ ان ں موضوع نصیر پور کے رہنے والے بھی ہوں گے۔"

"کوئی اور کیس بنا کر تینوں کو اندر نہیں کرایا جا سکتا؟" احسان علی شاہ نے پوچھا۔

"اندر ہی کروانا ہے تو ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کو 'انسداد گداگری ایکٹ' کے تحت آسانی سے جیل بھجوایا جا سکتا ہے۔ اصلی دعویدار تو دہی دونوں ہیں۔" تھانیدار شاہ نواز خان نے وضاحت کی۔ "لیکن یہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۰۹ ہے اور اس دفعہ کے تحت زیادہ سے زیادہ چھے مہینے کی سزا ہوگی۔ رسہ گیری یا چوری ڈکیتی کا کیس بھی مشکل سے بنے گا اور اگر بن بھی گیا تو زیادہ لمبی سزا نہیں ہوگی۔" اس نے احسان شاہ کے چہرے کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "شاہ جی، کیس کے ان پہلوؤں پر وکیل کے ساتھ بیٹھ کر ہم پہلے ہی دیر تک غور کر چکے ہیں۔ اور آخر اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ ایسے فوجداری مقدمات سے تیرا کام نہیں بنے گا۔ یہ جائیداد کا جھگڑا ہے۔ سیدھا سیدھا سول کیس ہے۔ اس کا فیصلہ تو عدالت دیوانی سے ہوگا۔ اسے لڑنے کے لیے تیرا کیس بہت کمزور ہے۔ میری یہ رائے وکیل نے بھی تسلیم کی تھی۔"

"جب کوئی مضبوط کیس ہی نہیں بنتا تو فیر تینوں کا ٹنٹا ہی کیوں نہ ختم کر دیا جائے۔" احسان علی شاہ کی آنکھیں آتش دان میں دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخ سرخ آنچ میں کچھ زیادہ ہی سرخ نظر آنے لگیں۔ چہرے سے سفاکی جھلکنے لگی۔ "لاشیں بھی آسانی سے ٹھکانے لگائی جا سکتی ہیں۔"

"شاہ جی، پہلے بھی تو ایسا کہہ چکا ہے۔ میں ایک بار فیر تجھے کہوں گا۔ یہ خیال اپنے دل سے نکال دے۔ ایسے خطرناک چکر میں نہ پڑ۔" تھانیدار کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ "تیں نوں پتہ ہے، میرے خلاف قتل کے ایک کیس میں پہلے ہی انکوائری ہو رہی ہے۔ میرے تھانے کی حدود میں ایک نہیں اکٹھے تین قتل ہو گئے تو میں مارا گیا۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "کیا تو میری نوکری لینا چاہتا ہے۔"

"کچھ اور سوچ۔" احسان علی شاہ نے زور دے کر کہا۔ "یہ سمجھ لے کوٹلہ ہرکشن کی زمیں داری میں نے ہرگز ہرگز نہیں چھوڑنی۔" اس کا لہجہ درشت ہو گیا۔ "میں یہ دیکھ ہی نہیں سکتا کہ کوئی

بھک منگا یا کمی کوٹلہ ہرکشن میں زمیں داری کرے جس کا میں زمیں دار رہ چکا ہوں۔ اب تو یہ میری عزت اور آن کا سوال بن گیا ہے۔"

کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر مہربان علی کی آواز ابھری۔ "اب تو ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" تھانیدار نے دریافت کیا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ارشاد الٰہی اور اس کی ماں سے سمجھوتہ کرلیا جائے؟" مہربان علی نے دبی زبان سے اپنی تجویز پیش کی۔ "انھیں یہ پیشکش کی جائے کہ وہ کچھ رقم لے کر اپنے دعوے سے دست بردار ہو جائیں اور شاہ جی کے نام زمیں داری اور جائیداد منتقل کرنے پر راضی ہو جائیں۔ دونوں بھک منگے ہیں۔ آسانی سے تیار ہو جائیں گے۔ تھانے میں ایس ایچ او صاحب کی طرف سے دباؤ ڈالا جائے تو کام آرام سے بن جائے گا۔"

"یہ تجویز مہربان علی نے پہلے بھی پیش کی تھی۔ اور میں نے اس کی مخالفت کی تھی۔" نادر خان نے مہربان علی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ وہ اپنے دعوے سے دست بردار ہونے کی بہت لمبی کیمت مانگیں گے۔ تب تک مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ بھک منگے اور بالکل کنگال ہیں۔ اب تو صورت حال ہی بدل گئی۔ وہ بہت کم پر تیار ہو جائیں گے۔"

"میں تو سمجھتا ہوں زیادہ سے زیادہ ۵۰ ہزار میں معاملہ طے ہو سکتا ہے۔" مہربان علی نے براہ راست احسان علی شاہ کو مخاطب کیا۔ "شاہ جی' کیا خیال ہے۔ اتنے روپے پر سمجھوتہ کیا جا سکتا ہے؟"

"پچاس ہزار تک تو میں دینے کو تیار ہوں۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی دے دوں گا۔" احسان علی شاہ نے مہربان علی کی تجویز بادل نخواستہ قبول کرلی۔ "جب ان کے خلاف کوئی مضبوط کیس ہی نہیں بنتا تو اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"شاہ جی' ایسا ہرگز نہ کرنا۔" تھانیدار نے مہربان علی کی تجویز سختی سے مسترد کردی۔ "ایسا کیا گیا تو مجھے ڈر ہے ۵۰ ہزار روپے کے ساتھ ساتھ کوٹلہ ہرکشن کی زمیں داری بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔"

"وہ کیسے؟" مہربانی علی نے حیران و پریشان ہو کر اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔

"سمجھوتے کی دستاویز پر دستخط ہونے کے بعد جب ۵۰ ہزار روپے مل جائیں گے تو لالی ان کو کسی وکیل کے پاس لے جائے گا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ بالکل ایسا کرے گا۔ وہ بہت ہوشیار بندہ ہے۔"

تھانیدار نے اپنے موقف کی وضاحت کی۔ "ویسے بھی غور کرنے کی بات یہ ہے کہ لالی ہو یا کوئی اور وہ لاکھوں روپے کی اتنی وڈی جائیداد صرف ۵۰ ہزار میں دینے پر کیسے تیار ہو جائے گا؟ وہ وکیل کے ساتھ جا کر تھانے میں رپٹ درج کرائیں گے کہ شاہ جی نے ان سے زبردستی دستاویز پر دستخط کروا لیے۔ اعانت جرم کے الزام میں مجھے بھی ساتھ میں شامل کریں گے کہ میں نے تھانے میں لے جا کر ان پر دباؤ ڈالا۔ ڈرایا دھمکایا۔ میرے خلاف حبس بے جا میں رکھنے' مار پیٹ اور تشدد کرنے کے الزام میں دفعہ ۳۰۷ کے تحت مقدمہ چلائیں گے۔ ابھی تو وہ بالکل ننگے بھوکے ہیں۔ ان کے پاس کچھ نہیں۔ ۵۰ ہزار روپے ان کے ہاتھ میں آئے تو اسی سے شاہ جی کے خلاف شان سے مقدمہ لڑیں گے۔"

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ احسان شاہ سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ مہربانی علی اور نادر خان بھی گم صم تھے۔ آتش دان میں سلگتی ہوئی لکڑیوں میں سے ایک زور سے چٹخی۔ ایک شرارہ تیزی سے ابھرا اور روشنی کی لکیر بناتا ہوا فضا میں بکھر گیا۔

احسان شاہ نے چونک کر آتش دان کی جانب دیکھا اور لمحہ بھر تک ٹکٹکی باندھے انگاروں کو دیکھتا رہا۔ پھر تھانیدار کی طرف متوجہ ہوا۔ "شاہ نواز' تو یہ چاہتا ہے کہ میں کوٹلہ ہرکشن کی زمیں داری ان بھک منگوں کو دے دوں۔ یہ نہیں ہو گا۔" اس کے چہرے پر غم و غصے کے سائے پھیل گئے۔ "تو میری کوئی مدد نہیں کر سکتا؟ تیری یاری میرے کب کام آئے گی؟"

"شاہ جی۔" تھانیدار نے احسان شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "۵۰ ہزار انھیں دینے کی بجائے تو مجھے دے سکتا ہے؟"

"یہ روپے تو لے لے۔ پر میرا کام پکا ہونا چاہیے۔" احسان علی شاہ فوراً رضامند ہو گیا۔

"رب سونہہ' مجھے اس میں سے ایک پیسہ بھی لینا حرام ہے۔" تھانیدار نے قسم کھا کر احسان شاہ کو باور کرانے کی کوشش کی۔ "اگر ایک بندہ ہوتا تو دس ہزار ہی میں کام بن جاتا۔ لیکن وہ اکٹھے تین ہیں۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ "اب تک تو لیتا ہی رہا مگر تیری خاطر اس دفعہ رشوت دوں گا اور ان سب کو دوں گا جن سے مجھے کام کرانا ہے۔"

"مگر تو میرا کام کرائے گا کیسے؟" احسان علی شاہ نے پوچھا۔ "روپے تو میں تجھے کل ہی صبح پہنچا دوں گا۔"

"یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔" تھانیدار نے کھل کر بات نہیں کی۔ "میں چاہتا ہوں تیرا کام بھی بن جائے اور کوئی خطرہ بھی مول لینا نہ پڑے۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "شاہ جی اب مجھے

جانے دے۔ تیرے کام کے لیے ابھی سے کوشش کرنی ہوگی۔" تھانیدار شاہ نواز اعوان اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "تیرا کام تو ہو جائے گا لیکن میرے کام کا کیا بنا؟"

"تو میرا کام نہ بھی کرتا تب بھی تیرا کام تو مجھے کرانا ہی تھا۔" احسان علی شاہ نے تھانیدار کو یقین دلایا۔ "تو اس کی فکر نہ کر۔ تیرے کام کے لیے کل ہی لہور جا رہا ہوں۔"

احسان علی شاہ بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

☆

حوالات سے قتل کے دونوں ملزم جا چکے تھے۔ اب صرف ارشاد الٰہی، اس کی ماں اور لالی رہ گئے تھے۔ رات ہو چکی تھی۔ مگر ارشاد الٰہی پولیس کی مار سے ابھی تک سنبھلا نہیں تھا۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ کروٹ بھی بدلتا تو بدن سے ٹیس اٹھتی۔ وہ فرش پر نڈھال پڑا تھا۔ قریب ہی اس کی ماں لیٹی تھی۔ وہ دل گرفتہ اور بجھی بجھی سی تھی۔ کوٹلہ ہرکشن کے قیام کے دوران اس نے مستقبل کے جو سنہرے خواب دیکھے تھے، بکھر کر تار تار ہو چکے تھے۔

لالی کے بھی کمر اور پیٹھ میں شدید درد ہو رہا تھا۔ مگر وہ حوصلے والا تھا۔ کئی بار اس سے بھی زیادہ سخت مار کھا چکا تھا۔ اس نے ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کو تسلی دینا چاہی مگر انھوں نے بے رخی اختیار کی۔ سیدھے منہ بات ہی نہیں کی۔ لالی نے ان کے رویے میں یہ تبدیلی دیکھی تو صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن دونوں مطلق نہ پسیجے، بلکہ ارشاد الٰہی کی ماں نے نفرت سے منہ بگاڑ کر جھڑک دیا۔

"وے تنگ نہ کر۔ ہم نے اب تجھ سے کوئی گل بات نہیں کرنی۔"

لالی نے ڈھیٹ بن کر اسے منانے کی کوشش کی۔ "بے بے، بہت ناراض ملوم ہوتی ہے۔ مجھے بتا، تو اتنی ناراض کیوں ہے؟"

کلثوم بی بی نے اسے گھورا اور ایسا منہ پھیرا کہ دوبارہ پلٹ کر نہ دیکھا۔

تینوں کھانا کھا چکے تھے۔ انھیں کمبل بھی دیے گئے تھے۔ مگر بہت بوسیدہ اور گندے تھے۔ ان میں جوئیں بھی تھیں۔ لیکن انھیں اوڑھ کر وہ سردی سے کسی قدر محفوظ رہ سکتے تھے۔ وہ فرش پر خاموش لیٹے تھے۔ انھیں کچھ خبر نہیں تھی کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ صرف لالی نے ایس ایچ او کی گفتگو سے اندازہ لگایا تھا کہ تینوں کو دھوکا اور فریب دہی کے الزام میں گرفتار کر کے حوالات میں بند کیا گیا ہے۔ لیکن وہ صفائی پیش کر چکا تھا اور مزید صفائی پیش کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔

تینوں رات گئے تک جاگتے رہے۔ حوالات کے باہر پولیس والوں کے بولنے اور بھاری بھاری

بوٹوں سے چلنے پھرنے کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن ان کے پاس کوئی نہ آیا۔

آدھی رات سے کچھ پہلے تینوں سو گئے۔

صبح ہو گئی۔ کوئی ان کے پاس نہ آیا۔ دن چڑھے انھوں نے ایس ایچ او کو اپنے دفتر میں جاتے ہوئے دیکھا۔ مگر اس نے تینوں میں سے کسی کو اپنے دفتر میں نہ بلایا۔ بہت دیر بعد وہ باہر نکلا۔ تینوں نے لوہے کی سلاخوں والے دروازے کے پیچھے سے اسے دیکھا۔ لیکن اس نے مڑ کر ایک نظر بھی ان پر نہ ڈالی۔ خاموشی سے چلا گیا۔

دوپہر ہو گئی۔ لیکن نہ کوئی کانسٹیبل ان کے پاس آیا اور نہ ہی کھانے کو کچھ ملا۔ وہ شام تک انتظار کرتے رہے۔ بھوک نے ستایا تو لالی نے لوہے کا دروازہ ہلا ہلا کر شور مچایا۔ کھانے کو مانگا۔ ارشاد الٰہی تو چپ پڑا رہا۔ مگر اس کی ماں چپ نہ رہی۔ اس نے بھی چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

وہ زیادہ دیر ہنگامہ برپا نہ کر سکے۔ چار کانسٹیبل شام کے دھندلکے میں حوالات کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ انھوں نے ننگی ننگی گالیاں دیں۔ تھپڑوں اور لاتوں سے تینوں کو بے رحمی سے مارا پیٹا۔ ان کے جسم پر جو لباس تھا اسے بھی نوچ ناچ کر تار تار کر دیا۔ کھانے کو بھی کچھ نہ دیا۔ واپس گئے تو کمبل بھی اٹھا کے لے گئے۔

پہر رات گزر گئی۔ تینوں بھوک سے نڈھال تھے۔ اور ٹھنڈے فرش پر لیٹے سردی سے کپکپا رہے تھے۔ دفعتہً حوالات کا دروازہ کھلا۔ اس دفعہ تین کانسٹیبل اندر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑی بڑی بالٹیاں دبی تھیں۔ ان میں کیچڑ اور غلاظت ملا ہوا کالا کالا پانی بھرا تھا۔ ارشاد الٰہی، اس کی ماں اور لالی نے ان کو دیکھا۔ مگر سہمے ہوئے پڑے رہے۔ کانسٹیبلوں نے گندے پانی سے بھری ہوئی بالٹیاں تینوں پر الٹ دیں۔ انھوں نے احتجاج کیا تو کانسٹیبلوں نے ٹھوکریں مار مار کر اور ڈانٹ ڈپٹ کے خاموش کرا دیا۔

تینوں پہلے ہی سردی سے کپکپا رہے تھے۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی جسم پر پڑا تو سردی سے ان کا اور برا حال ہو گیا۔ دو کانسٹیبل حوالات کے باہر دروازے پر تعینات تھے۔ وہ وقفے وقفے سے اندر جاتے تینوں کو جھنجھوڑتے اور زور زور سے ٹھوکریں مارتے۔ تمام رات وہ یہی کارروائی کرتے رہے۔ نہ خود سوئے اور نہ ہی ارشاد الٰہی، اس کی ماں اور لالی کو سونے دیا۔

دن نکلا، کانسٹیبلوں کی ڈیوٹی بدل گئی۔ دو نئے کانسٹیبل آ گئے۔ وہ بھی وقفے وقفے سے اندر جاتے۔ جھنجھوڑتے، لاتیں مارتے، ٹھوکریں لگاتے۔ طرح طرح سے ستاتے۔ انھوں نے دن میں بھی تینوں کو سونے نہ دیا اور نہ ہی کھانے کو کچھ دیا۔

شام کو دونوں کانسٹیبل چلے گئے۔ دو نئے کانسٹیبل ڈیوٹی پر آ گئے۔ انھوں نے بھی لالی، ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کو نہ کھانے کو کچھ دیا اور نہ ہی سونے دیا۔ رات بھر تینوں کو ننگی ننگی گالیاں دیتے رہے۔ ڈانٹتے ڈپٹتے رہے۔ جھنجھوڑتے رہے۔ ٹھوکریں اور لاتیں مارتے رہے۔ انھیں بیدار رکھنے کے لیے طرح طرح کے حربے آزماتے رہے۔ بھوک اور شب بیداری سے وہ اس قدر بے حال تھے کہ نہ بول سکتے تھے نہ بات کر سکتے تھے اور نہ ہی کسی طور احتجاج کر سکتے تھے۔ جاڑوں کی یہ طویل اور سرد رات بھی تینوں نے سخت اذیت اور کرب کے عالم میں بسر کی۔

صبح ہوتے ہی رات کی شفٹ کے کانسٹیبل رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے گھنٹہ بھر بعد صرف ایک کانسٹیبل آیا۔ وہ ان کے لیے کھانا بھی لایا مگر مسلسل فاقہ کشی اور شب بیداری کے باعث وہ اس قدر ناتواں اور نڈھال تھے کہ ان سے کچھ کھایا نہ گیا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی تینوں کے ہاتھوں میں ہتکڑیاں ڈالی گئیں اور کانسٹیبلوں کی نگرانی میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں پہنچا دیا گیا۔

عدالت میں پولیس کی جانب سے ان کے خلاف چالان پیش کیا گیا جس کے مطابق تینوں کی گرفتاری لیونٹک ایکٹ کے تحت عمل میں آئی تھی۔ پولیس نے انھیں پاگل اور جنونی قرار دیتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ مسمیان لالی اور ارشاد الٰہی اور مسمات کلثوم بی بی لاوارث اور بے سہارا ہیں۔ کوئی ان کی دیکھ بھال اور نگہداشت کرنے والا نہیں۔ ان کو اگر آزاد اور کھلے بندوں گھومنے پھرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تو وہ حالت جنون میں نہ صرف اپنی بلکہ دوسروں کی زندگی کے لیے شدید خطرے کا باعث بن سکتے ہیں۔ لہٰذا عدالت مجاز سے درخواست کی جاتی ہے کہ امن عامہ کے بہترین مفاد میں انھیں اس وقت تک نظر بند رکھنے کے احکامات صادر کیے جائیں جب تک ان کا ذہنی توازن درست نہ ہو جائے۔

عدالت کی کارروائی شروع ہوئی تو مجسٹریٹ کے رو بہ رو تینوں کی پیشی ہوئی۔ پیش کار نے ان کے مقدمے کی مسل مجسٹریٹ کے ملاحظے کے لیے پیش کی۔ اس نے مسل کھولی۔ پولیس کے چالان کا مطالعہ کیا۔ گردن اٹھا کر تینوں کو غور سے دیکھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ حجامت بڑھی ہوئی تھی۔ بال خاک دھول اور میل سے اٹے ہوئے تھے۔ چہرے اور لباس کیچڑ اور گندے پانی سے آلودہ ہو کر سیاہ پڑ گئے تھے۔ مسلسل جاگنے سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ لالی کی شلوار کا ایک پائنچا غائب تھا۔ دوسرا نصف سے بھی کم رہ گیا تھا۔ قمیص پر جگہ جگہ چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ آستینیں بھی غائب تھیں۔ ارشاد الٰہی کے جسم پر میلی چیکٹ قمیص تھی اور شلوار پھٹ کر جانگیا بن گئی تھی۔ اس کی ماں

کے سر سے دوپٹہ غائب تھا۔ کرتا اور شلوار اس طرح پھٹے ہوئے تھے کہ وہ نیم برہنہ ہو گئی تھی۔

تینوں سہمے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ ان کے گھناؤنے چہروں پر وحشت برس رہی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجسٹریٹ کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے سروں میں جوئیں پڑ گئی تھیں۔ وہ بے چین ہو کر بار بار اپنے بالوں کو کھبڑ کھبڑ کھجا رہے تھے۔ وضع قطع اور حلیے سے تینوں پاگل اور سودائی نظر آ رہے تھے۔

مجسٹریٹ ٹکٹکی باندھے ذرا دیر تک ان کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر سر جھکا کر فیصلہ لکھنے لگا۔

لالی کھڑا سوچ رہا تھا کہ وہ عدالت کو اس ظلم و ستم سے آگاہ کرے گا جو اس پر، ارشاد الٰہی اور اس کی ماں پر پچھلے چند روز میں پولیس کے ہاتھوں ڈھایا گیا تھا۔ مقدمے کی نوعیت اور اصل حقیقت تفصیل سے مجسٹریٹ کے سامنے بیان کرے گا۔ لیکن مجسٹریٹ نے نہ اس سے کوئی سوال کیا نہ ہی اس کا بیان ریکارڈ کیا۔ تینوں سے سرے سے کوئی بات ہی نہیں کی۔

لالی خاموش کھڑا سوچتا رہا اور مجسٹریٹ سر جھکائے لکھتا رہا۔ اس نے پولیس کے موقف کی تائید کرتے ہوئے یہ حکم جاری کیا کہ جیل کا ڈاکٹر حسب قاعدہ تینوں کا معائنہ کرے اور اگر وہ بھی اپنی طبی رپورٹ میں انھیں پاگل اور ذہنی عدم توازن کا شکار قرار دے تو تعزیرات پاکستان کے دفعہ ٦ کے تحت ان کے خلاف ضابطے کے کارروائی عمل میں لائی جائے۔

مجسٹریٹ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پولیس کی نگرانی میں تینوں کو ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا گیا۔ لالی نے ڈسٹرکٹ جیل کو دیکھا تو یہ سمجھا کہ مجسٹریٹ نے جوڈیشل ریمانڈ پر [illegible] کو جیل میں رکھنے کا حکم دیا ہے۔ ابھی مقدمے کی سماعت مکمل نہیں ہوئی۔ وہ اس جیل میں پہلے بھی حوالاتی کی حیثیت سے رہ چکا تھا۔ لہٰذا اسے بخوبی علم تھا کہ جن ملزموں کے مقدمات زیر سماعت ہوتے ہیں انھیں سینٹرل جیل کے بجائے ڈسٹرکٹ جیل میں رکھا جاتا ہے۔ وہ زیادہ سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ آئندہ پیشی پر وہ اپنے بیان میں کیا کہے گا اور کس طرح تینوں کو مظلوم اور بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کرے گا؟

جیل میں پہنچنے کے بعد ڈاکٹر نے تینوں کا طبی معائنہ کیا۔ مگر اس نے بھی مطلق پوچھ گچھ نہ کی۔ چند ہی منٹ میں تینوں کو نبٹا دیا اور ان کے پاگل اور جنونی ہونے کی تصدیق کرتے ہوئے اپنی رپورٹ جیلر کو پہنچا دی۔

ارشاد الٰہی اور اس کی ماں کو کچھ خبر نہ تھی کہ ان کے خلاف کیا کارروائی کی جا رہی ہے۔ لالی بھی صورت حال سے قطعی بے خبر تھا۔ مگر جب اسے اور ارشاد الٰہی کو اس عقوبت خانے میں داخل

کیا جانے لگا جس میں پاگلوں کو قید رکھا جاتا تھا تو لالی بہت سٹ پٹایا۔ اس نے گھبرا کر احتجاج کیا۔

"اوئے نمبردار، یہ تو چریا وارڈ ہے۔ اس میں کیوں بند کر رہا ہے؟" وہ لال ٹوپی والے نمبردار کی جانب متوجہ ہوا۔ "یار، میں پاگل شاگل نہیں ہوں، میرا دماغ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔"

نمبردار نے منہ بگاڑ کر اسے غصے سے ڈانٹا۔ "اوئے چپ کر۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ "ہر پاگل یہاں آکر شروع شروع میں ایسی ہی بکواس کرتا ہے۔" اس نے دھکا دے کر لالی کو اندر کر دیا۔ لالی برابر واویلا کرتا رہا۔ "نمبردار، میری گل تو سن۔ یار، میری گل تو سن۔" مگر اس نے لالی کی ایک نہ سنی۔ پلٹ کر ارشاد الٰہی کو دیکھا۔ وہ حیران و پریشان کھڑا ٹکر ٹکر اس کا منہ تک رہا تھا۔ نمبردار نے ایک ہاتھ سے اپنی لال ٹوپی درست کی اور دوسرے ہاتھ سے ارشاد الٰہی کو زور سے دکھا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ نمبردار نے دروازہ بند کیا۔ تالا لگایا۔ بے نیازی سے مڑا اور آگے بڑھ گیا۔

قریب ہی زنانہ پاگل خانہ تھا۔ ارشاد الٰہی کی ماں کو اس میں پہنچا دیا گیا۔ پاگل خانے کی کوٹھری میں دو عورتیں پہلے سے موجود تھیں۔ دونوں ہی سڑی سودائی تھیں۔ کلثوم بی بی کو دیکھ کر انھوں نے بے ڈھنگے پن سے قہقہے لگائے۔ طرح طرح سے شکلیں بنائیں۔ اوٹ پٹانگ باتیں کیں۔ خود کو ان کے نرغے میں پا کر کلثوم بی بی اس قدر حواس باختہ ہوئی کہ چیخنے چلانے لگی۔

"ہائے میں مر گئی۔ یہ تو پاغل خانہ ہے۔" وہ غضب ناک ہو کر پاگل اور دیوانی عورتوں کو ڈانٹنے پھٹکارنے لگی۔ "چپ کرو کنجریو۔ پرے ہٹو۔ میں پاغل شاغل نہیں ہوں۔" اس نے چیخ چیخ کر لالی کو بھی گالیاں اور کوسنے دیے۔ "وے لالی حرام دے۔ تیرا بیڑا ڈبے۔ ہم جوند سنگھ والا میں بھلے چنگے تھے۔ خانہ خراب، تو بہکا کر ہمیں وہاں سے لے آیا اور یہاں پاغل خانے میں ڈلوا دیا۔ وے تیرا گھر نہ رہے۔ تو مر جائے۔"

کلثوم بی بی کی چیخ پکار چریا وارڈ میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ لالی نے اس کے کوسنے اور طعنے سنے تو سخت پریشان ہوا۔ غصہ بھی آیا اور دکھ بھی ہوا۔ اپنی بے بسی اور مجبوری پر دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ پھر وہ ارشاد الٰہی کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ فرش پر بے حال پڑا تھا۔ رک رک کر کھانس رہا تھا۔ کھانستے کھانستے اس نے ایک بار تھوکا تو بلغم کے ساتھ کہیں کہیں خون بھی ملا ہوا تھا۔ لالی گھبرا کر اس کی جانب بڑھا اور قریب جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے ارشاد الٰہی کے ماتھے پر ایک ہاتھ رسان سے رکھ دیا۔ ماتھا گرم تھا۔ ارشاد الٰہی کو بخار تھا۔ لالی اور زیادہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"شادے! کیسی طبیعت ہے؟"

ارشاد الٰہی آنکھیں بند کیے خاموش لیٹا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ لالی نے اصرار کیا۔ لہجے میں اور نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "بہت طبیعت خراب ہے؟" اس نے قدرے تامل کے بعد پوچھا۔ "یار کچھ تو بتا۔ کیسی طبیعت ہے؟"

ارشاد الٰہی نے آنکھیں کھول کر لالی کو دیکھا۔ جھنجلا کر بولا۔ "کیسی بھی طبیعت ہے، تجھے اس سے کیا لینا؟"

"یار، تو بھی اپنی ماں کی طرح مجھ سے نراض ہے۔" لالی نے خفگی رفع کرنے کی کوشش کی۔ "میں تو تم دونوں کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ تجھے اور تیری ماں کو کوٹلہ ہرکشن کی زمیں داری اور جائیداد مل جاتی تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔ اتنی خوشی ہوتی کہ میں تجھے بتا نہیں سکتا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پر میری طرح تم دونوں کی بھی کسمت خراب ہے۔"

ارشاد الٰہی نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ وہ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانس بھرتا رہا۔ کچھ دیر اسی عالم میں پڑا رہا۔ پھر اس نے کروٹ بدلی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ لالی نے زید کچھ نہ کہا۔ ارشاد الٰہی بھی خاموش لیٹا تھا اور رک رک کر کھانس رہا تھا۔

ان دونوں کے علاوہ کئی پاگل قیدی وہاں اور بھی موجود تھے۔ تین تو ایسے تھے جو اس وارڈ میں س سال سے بھی زیادہ عرصے سے قید تھے اور ایک بوڑھا تو اتنا نحیف و ناتواں تھا کہ بولتا تھا تو آواز بھی لڑکھڑاتی تھی۔ مگر سب اس وقت خلاف معمول خاموش تھے۔ لالی بھی خاموش تھا اور سر ائے گم صم بیٹھا تھا۔ یکایک پشت کی جانب سے کسی نے اونچی آواز میں صدا لگائی۔

"اوئے بھول جا۔"

لالی چونکا۔ پلٹ کر دیکھا۔ ایک پاگل بائیں پیر کے گھٹنے پر دایاں پیر ٹکائے نہایت اطمینان سے آسن جمائے ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر لالی سخت حیران و پریشان ہوا۔ وہ سلیم لودھی تھا۔ ہاں وہی تھا۔ لالی نے اسے پہچان لیا۔ مگر اب وہ بالکل بدل چکا تھا۔ اس کی حجامت بڑھی ہوئی تھی۔ سر کے بال سرکنڈوں کی مانند کھڑے تھے۔ چہرے پر جھریاں تھیں۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ وہ ٹوٹ پھوٹ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔

لالی حیرت سے آنکھیں پھاڑے سلیم لودھی کو دیکھ رہا تھا جسے اس بار بھی تخریب کاری اور ملک دشمن سرگرمیوں کے الزام میں نظر بند کیا گیا تھا۔ اسے گرفتار کر کے پہلے شاہی قلعہ، لاہور، کے عقوبت خانے میں لے جایا گیا تھا جہاں اس قدر ذہنی اور جسمانی تشدد کیا گیا کہ وہ اپنا ذہنی توازن

برقرار نہ رکھ سکا۔ لیکن ذہنی امراض کے اسپتال میں داخل کرنے کے بجائے اسے پچھلے مہینے منٹگمری جیل منتقل کر دیا گیا اور چریا وارڈ میں پاگلوں کے ساتھ رکھا گیا۔ سلیم لودھی اس وقت لالی کی موجودگی سے قطعی بے نیاز تھا۔ اس کے لاغر جسم پر جیل کی وردی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ مراقبے کے عالم میں بگلے کی طرح ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اسی عالم میں اس نے داہنا ہاتھ اٹھایا۔ انگشت شہادت کو چھت کی جانب بلند کیا اور پھر وہی صدا لگائی۔ ”اوئے بھول جا۔“ سلیم لودھی نے اوئے کو اس طرح لمبا کر کے کھینچا کہ اس کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔

لالی نے دل گرفتہ ہو کر سوچا، سلیم لودھی واقعی پاگل اور چریا ہو گیا ہے۔ اس کی اس صدا کا نہ معلوم کیا مطلب ہے۔ لیکن، اس خود فراموشی کے عالم میں وہ جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ وہ سب کچھ بھول چکا ہے اور صرف پاگل اور دیوانہ رہ گیا ہے۔ اسے بھی سب کچھ بھول جانا چاہیے۔ یہ بھی بھول جانا چاہیے کہ وہ لالی ہے۔ اب وہ صرف ایک پاگل ہے جس کا نہ کوئی ماضی ہے نہ مستقبل۔ جیل کے چریا وارڈ میں پاگلوں کے ساتھ رہ کر اسے سلیم لودھی کی طرح پاگل ہی بن کر رہنا ہو گا۔ یہ ایسا وارڈ ہے جس میں داخل ہونے کا تو راستہ ہے مگر واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ اس میں قیدی بننے کے بعد کوئی رہائی پا کر نہیں نکلتا۔ اس کی لاش ہی نکلتی ہے۔

سلیم لودھی نے ایک بار پھر اونچی تان میں صدا لگائی۔ ”اوئے بھول جا۔“

ارشاد الٰہی پر یکایک شدید کھانسی کا دورہ پڑا۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے سینہ دبوچ کر زور زور سے کھانسنے لگا۔ اس نے کھنکار کر فرش پر تھوکا۔ بلغم کے ساتھ جیتا جیتا خون کا لوتھڑا بھی نکلا۔ ارشاد الٰہی نڈھال ہو کر ایک طرف لڑھک گیا۔

۱۸ ستمبر ۱۹۸۹ء

(ختم شد)

[illegible] ڈائجسٹ بچوں کی کہانیاں [illegible]
[illegible]
[illegible]